بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ

اور ہم نے آپ پر اس کتاب کو نازل کیا جو ہر چیز کا روشن بیان ہے

تبیان القرآن

علامہ غلام رسول سعیدی

شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمیہ کراچی - ۳۸

فرید بک سٹال (رجسٹرڈ)

۳۸ - اردو بازار لاہور

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ

اور ہم نے آپ پر اس کتاب کو نازل کیا جو ہر چیز کا روشن بیان ہے

تبیان القرآن

جلد اول

المقدمہ ○ الفاتحہ ○ البقرہ

علامہ غلام رسول سعیدی

شیخ الحدیث دار العلوم نعیمیہ کراچی-۳۸

ناشر

فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸-اردو بازار لاہور

سرنامہ

بہ حضور سرورِ کائنات

علیہ افضلُ الصلوٰت واکمل التحیّات

اے اللہ! مجھ پر حق کی حقانیت واضح کر اور

مجھے اِس کی اتّباع عطا فرما!

اے اللہ! مجھ پر باطل کا بطلان واضح کر اور

مجھے اِس سے اجتناب عطا فرما!

آمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین الذی استغنی فی حمدہ عن الحامدین وانزل القرآن تبیانا لکل شیٔ عند العارفین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد الذی استغنی بصلوٰۃ اللہ عن صلوۃ المصلین واختص بارضاء رب العالمین الذی بلغ الینا ما انزل علیہ من القران وبین لنا ما نزل علیہ بتبیان وکان خلقہ القرآن وتحدی بالفرقان وعجز عن معارضتہ الانس والجان وھو خلیل اللہ حبیب الرحمٰن لواءہ فوق کل لواء یوم الدین قائد الانبیاء والمرسلین امام الاولین والاخرین شفیع الصالحین والمذنبین واختص بتنصیص المغفرۃ لہ فی کتاب مبین وعلی الہ الطیبین الطاھرین وعلی اصحابہ الکاملین الراشدین وازواجہ الطاھرات امھات المؤمنین وعلی سائر اولیاء امتہ وعلماء ملتہ اجمعین۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ واشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ۔ اعوذ باللہ من شرور نفسی ومن سیئات اعمالی من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ اللھم ارنی الحق حقا وارزقنی اتباعہ۔ اللھم ارنی الباطل باطلا وارزقنی اجتنابہ۔ اللھم اجعلنی فی تبیان القران علی صراط مستقیم وثبتنی فیہ علی منھج قویم واعصمنی عن الخطأ والزلل فی تحریرہ واحفظنی من شر الحاسدین وزیغ المعاندین فی تقریرہٖ اللّٰھم الق فی قلبی اسرار القرآن واشرح صدری لمعانی الفرقان ومتعنی بفیوض القرآن ونور لی بانوار الفرقان واسعد لی لتبیان القرآن، رب زدنی علما رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا۔ اللّٰھم اجعلہ خالصا لوجھک ومقبولا عندک وعند رسولک واجعلہ شائعا ومستفیضا ومفیضا ومرغوبا فی اطراف العالمین الی یوم الدین واجعلہ لی ذریعۃ للمغفرۃ ووسیلۃ للنجاۃ وصدقۃ جاریۃ الی یوم القیامۃ وارزقنی زیارۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الدنیا وشفاعتہ فی الاخرۃ واحینی علی الاسلام بالسلامۃ وامتنی علی الایمان بالکرامۃ۔ اللّٰھم انت ربی لا الہ الا انت خلقتنی وانا عبدک وانا علی عھدک ووعدک ما استطعت اعوذ بک من شر ما صنعت ابوء لک بنعمتک علی وابوء لک بذنبی فاغفر لی فانہ لا یغفر الذنوب الا انت امین یارب العالمین۔

اللہ ہی کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے O

تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لئے مخصوص ہیں جو ہر تعریف کرنے والے کی تعریف سے مستغنی ہے' جس نے قرآن مجید نازل کیا جو عارفین کے حق میں ہر چیز کا روشن بیان ہے اور صلوٰۃ وسلام کا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول ہو جو خود اللہ تعالیٰ کے صلوٰۃ نازل کرنے کی وجہ سے ہر صلوٰۃ بھیجنے والے کی صلوٰۃ سے مستغنی ہیں' جن کی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ رب العالمین ان کو راضی کرتا ہے' اللہ تعالیٰ نے ان پر قرآن نازل کیا' اس کو انہوں نے ہم تک پہنچایا اور جو کچھ ان پر نازل ہوا اس کا روشن بیان انہوں نے ہمیں سمجھایا۔ ان کے اوصاف سراپا قرآن ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کی مثال لانے کا چیلنج کیا اور تمام جن اور انسان اس کی مثال لانے سے عاجز رہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے خلیل اور محبوب ہیں' قیامت کے دن ان کا جھنڈا ہر جھنڈے سے بلند ہوگا۔ وہ نبیوں اور رسولوں کے قائد ہیں' اولین اور آخرین کے امام ہیں۔ تمام نیکوکاروں اور گناہ گاروں کی شفاعت کرنے والے ہیں۔ یہ ان کی خصوصیت ہے کہ قرآن مجید میں صرف ان کی مغفرت کے اعلان کی تصریح کی گئی ہے اور ان کی پاکیزہ آل' ان کے کامل اور ہادی اصحاب اور ان کی ازواج مطہرات امہات المومنین اور ان کی امت کے تمام علماء اور اولیاء پر بھی صلوٰۃ و سلام کا نزول ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں' وہ واحد ہے' اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں اپنے نفس کے شر اور بداعمالیوں سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔ جس کو اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ گمراہی پر چھوڑ دے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ اے اللہ! مجھ پر حق واضح کر اور مجھے اس کی اتباع عطا فرما اور مجھ پر باطل کو واضح کر اور مجھے اس سے اجتناب عطا فرما۔ اے اللہ! مجھے ''تبیان القرآن'' کی تصنیف میں صراط مستقیم پر برقرار رکھ اور مجھے اس میں معتدل مسلک پر ثابت قدم رکھ۔ مجھے اس کی تحریر میں غلطیوں اور لغزشوں سے بچا اور مجھے اس کی تقریر میں حاسدین کے شر اور معاندین کی تحریف سے محفوظ رکھ۔ اے اللہ! میرے دل میں قرآن کے اسرار کا القاء کر اور میرے سینہ کو قرآن کے معانی کے لئے کھول دے' مجھے قرآن مجید کے فیوض سے بہرہ مند فرما۔ قرآن مجید کے انوار سے میرے قلب کی تاریکیوں کو منور فرما۔ مجھے ''تبیان القرآن'' کی تصنیف کی سعادت عطا فرما۔ اے میرے رب! میرے علم کو زیادہ کر' اے میرے رب! تو مجھے (جہاں بھی داخل فرمائے) پسندیدہ طریقے سے داخل فرما اور مجھے (جہاں سے بھی باہر لائے) پسندیدہ طریقہ سے باہر لا اور مجھے اپنی طرف سے وہ غلبہ عطا فرما جو (میرے لئے) مددگار ہو۔ اے اللہ! اس تصنیف کو صرف اپنی رضا کے لئے مقدر کر دے اور اس کو اپنی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مقبول کر دے' اس کو قیامت تک تمام دنیا میں مشہور' مقبول' محبوب اور اثر آفریں بنا دے' اس کو میری مغفرت کا ذریعہ' میری نجات کا وسیلہ اور قیامت تک کے لئے صدقہ جاریہ کر دے۔ مجھے دنیا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور قیامت میں آپ کی شفاعت سے بہرہ مند کر' مجھے سلامتی کے ساتھ اسلام پر زندہ رکھ اور ایمان پر عزت کی موت عطا فرما' اے اللہ! تو میرا رب ہے' تیرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں' تو نے مجھے پیدا کیا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں اور میں تجھ سے کئے ہوئے وعدہ اور عہد پر اپنی طاقت کے مطابق قائم ہوں۔ میں اپنی بداعمالیوں کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔ تیرے مجھ پر جو انعامات ہیں میں ان کا اقرار کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ مجھے معاف فرما کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ آمین یا رب العالمین!

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

حدیث دل

اللہ تعالیٰ کا بہت کرم اور بے حد احسان ہے کہ "شرح صحیح مسلم" کی تکمیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے "تبیان القرآن" لکھنے کی سعادت عطا فرمائی اور کلام رسول کی تشریح کے بعد کلام اللہ کی تفسیر کی توفیق عطا فرمائی۔ ہمارے علماء متقدمین نے تفسیر کے موضوع پر اس قدر زیادہ اور عظیم کام کیا ہوا ہے کہ اس پر کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہو سکتا' البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ علماء اسلام کی زیادہ تر کاوشیں عربی زبان میں ہیں جن تک عام اردو دان طبقہ کی رسائی نہیں ہے تو اس بات کی بے شک ضرورت تھی کہ علوم اور معارف کے ان جواہر پاروں کو سہل اور عام فہم انداز میں جدید اسلوب نگارش کے مطابق اردو زبان میں منتقل کر دیا جائے۔ اسی طرح قرآن مجید کے تراجم کا حال ہے' ہمارے بزرگ علماء نے اپنے اپنے زمانہ میں اس دور کی زبان کے مطابق قرآن مجید کے مفاہیم کو اردو زبان میں منتقل کیا اور ان کی یہ مساعی بہت قابل قدر بلکہ لائق رشک ہیں لیکن زبان کا اسلوب اور مزاج وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے' اس وجہ سے میں محسوس کرتا تھا کہ اس دور کے اردو پڑھنے والوں کے مزاج اور ان کے اسلوب کے مطابق قرآن مجید کا ترجمہ کرنا چاہیے تاکہ پڑھنے والوں کے لیے وہ ترجمہ اجنبی اور نامانوس نہ ہو۔

میں نے قرآن مجید کا ترجمہ تحت اللفظ نہیں کیا اور نہ ہی ایسا کیا ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ سے بالکل الگ اور عربی متن کی رعایت کیے بغیر قرآن مجید کے مفہوم کی ترجمانی کی جائے۔ میں نے اپنے آپ کو قرآن مجید کے الفاظ اور عبارت کا پابند رکھا ہے لیکن لفظی ترجمہ نہیں کیا۔ تفسیر میں میں نے اسلام کے مسلمہ عقائد کو دلائل سے مزین کیا ہے اور قرآن مجید کی جن آیات میں احکام اور مسائل کا ذکر ہے وہاں میں نے تمام فقہی مذاہب کا دلائل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ہمارے متقدمین مفسرین نے قرآن کریم کی تفسیر میں جو نکات بیان کیے ہیں ان میں سے میں نے استفادہ کیا ہے لیکن جو بہت بعید نکات ہیں یا دور از کار تاویلات ہیں ان کو ترک کر دیا ہے۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں زیادہ سے زیادہ احادیث اور آثار کو پیش کروں' عام طور پر مفسرین صرف حدیث کا ذکر کر دیتے ہیں اس کی تخریج نہیں کرتے۔ میں نے کافی محنت اور جانفشانی کر کے "تبیان القرآن" میں درج ہر حدیث کی تخریج کی ہے اور اس کا مکمل حوالہ بیان کیا ہے' البتہ حافظ منذری' حافظ الہیثمی اور حافظ سیوطی چونکہ علم حدیث میں بہت ثقہ ہیں اس لیے ان کی تصانیف میں درج مسلم ائمہ حدیث کی روایات کو ان کے حوالوں کے ساتھ ذکر کر دیا ہے اور کہیں کہیں اصل ماخذ کے حوالوں کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔ ہمارے بعض مصنفین ایسا کرتے ہیں مثلاً حافظ سیوطی نے ایک حدیث کو دس ائمہ حدیث کے حوالوں سے ذکر کیا ہے' اب وہ حافظ سیوطی کا ذکر کیے بغیر اس حدیث کو ان حوالوں کے ساتھ ذکر کر دیتے ہیں اور یہ تلبیس کرتے ہیں کہ گویا اس حدیث کو انہوں نے ان دس حدیث کی کتابوں سے تلاش کیا ہے۔ اسی طرح علامہ شامی نے اگر کسی مسئلہ کو دس فقہاء کے حوالوں سے ذکر کیا ہے تو وہ علامہ شامی کا ذکر کیے بغیر اس مسئلہ کو ان دس فقہاء کے حوالوں سے ذکر کر دیتے ہیں اور پڑھنے والے پر یہ تاثر قائم کرتے ہیں کہ گویا انہوں نے اس مسئلہ کو ان دس فقہاء کے

حوالوں سے تلاش کیا ہے' میرے نزدیک یہ تلبیس سخت مذموم ہے۔ اگر حافظ منذری یا حافظ الہیثمی یا حافظ سیوطی نے کسی حدیث کو دس ائمہ حدیث کے حوالوں سے ذکر کیا ہے تو میں نے اس طرح لکھا ہے کہ حافظ منذری یا حافظ سیوطی نے اس حدیث کو ان دس ائمہ حدیث کے حوالوں سے ذکر کیا ہے اور اس کا مکمل حوالہ دیا ہے اور کسی کی محنت اور جانفشانی کو اپنی طرف منسوب کرنے کی مذموم تلبیس نہیں کی۔ اسی طرح فقہاء کے حوالہ جات کا معاملہ ہے۔

نئے اور تازہ مسائل میں غور و فکر اور اجتہاد کی کافی وسعت اور گنجائش ہے اور ظاہر ہے اس میں علماء کی آراء مختلف ہوتی ہیں اور جو عالم بھی کسی تازہ اور نئے مسئلہ میں غور و فکر سے اجتہاد کرتا ہے وہ پوری دیانتداری اور خدا خوفی سے اس کے حکم کو دلائل شرعیہ سے اخذ کرتا ہے' اگر کسی عالم کو اس سے اختلاف ہو تو اس کو دلائل کے ساتھ اپنا نظریہ تو بیان کرنا چاہیے لیکن فریق مخالف پر کیچڑ نہیں اچھالنی چاہیے اور طعن و تشنیع سے کام نہیں لینا چاہیے' بدقسمتی سے ہمارے ہاں لوگوں کا یہ مزاج نہیں ہے اور لوگوں کا جس شخص سے کسی علمی مسئلہ میں اختلاف ہو وہ اس کو جاہل' خائن اور اس نوع کے دیگر القابات سے نوازتے ہیں بلکہ اس کو دین اور ملت سے خارج کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ان تازہ مسائل میں سے بعض مسائل میں ہمارا دوسرے علماء سے اختلاف ہے لیکن ہم نے اپنا موقف دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان علماء کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھا اور ان کے اعزاز' اکرام اور احترام کو پوری طرح قائم رکھا ہے' مثلاً ہمارے نزدیک اگر نماز کے پورے وقت میں ٹرین نہ رکے تو چلتی ٹرین میں نماز پڑھنا فرض ہے اور اس کا اعادہ واجب نہیں ہے' تاہم جو علماء اس عمل کو ناجائز کہتے ہیں' ہم نے ان کو مطعون نہیں کیا' اسی طرح ہمارے نزدیک ایلوپیتھک دواؤں سے علاج کرنا اور ضرورت کے وقت خون کو منتقل کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے' اور اعضاء کی پیوندکاری جائز نہیں ہے' ہم نے اس سلسلہ میں ان کے دلائل پر بحث کی ہے لیکن طعن اور تشنیع سے اجتناب کیا ہے۔ علی ہذا القیاس۔

جن موضوعات پر "شرح صحیح مسلم" میں مفصل بحث آچکی ہے' بعض جگہ میں نے اسی بحث کو نقل کر دیا ہے' بعض جگہ اس کو ملخص کیا ہے' اور بعض جگہ ان مباحث کو از سر نو لکھا ہے' ترجمہ میں' میں نے زیادہ تر علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ کے ترجمہ "البیان" سے استفادہ کیا ہے اور تفسیر میں زیادہ تر احکام القرآن' الجامع لاحکام القرآن' البحر المحیط' تفسیر کبیر' الدر المنثور اور روح المعانی سے استفادہ کیا ہے۔ جدید تفاسیر میں سے تفسیر منیر' مراغی' فی ظلال القرآن اور تفسیر قاسمی بھی میرے پیش نظر رہی ہیں۔ اسباب نزول کے بیان میں "جامع البیان" پر زیادہ تر اعتماد کیا ہے۔ احادیث کی بہت سی کتابیں جن کے ہم پہلے صرف نام سنتے تھے الحمد للہ اب وہ چھپ گئی ہیں اور ہمیں دستیاب ہیں' میں نے زیادہ تر کوشش کی ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں احادیث کو ان کے اصل حوالہ جات کے ساتھ ذکر کروں' اسی طرح فقہی مباحث میں مذاہب ائمہ کو ان کی اصل کتابوں کے حوالے کے ساتھ درج کیا ہے' ماخذ اور مراجع کی فہرست میں نے سنین وفات کی ترتیب سے مرتب کی ہے اور میرا گمان یہ ہے کہ پہلی بار اس نوع کی فہرست مرتب کی گئی ہے۔ اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ ایک نظر میں یہ معلوم ہو جائے گا کہ محدث' مفسر' فقیہ یا مصنف کس زمانہ اور کس دور کا ہے۔

دس رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ کے مبارک دن اس تفسیر کا آغاز ہوا تھا اور بارہ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ کے مسعود دن میں اس کی پہلی جلد اختتام کو پہنچ گئی۔ فالحمد للہ رب العلمین۔

اس جلد میں ایک مقدمہ ہے اور الفاتحہ اور البقرہ کی تفسیر ہے' میں نے اس تفسیر کو متوسط طریقہ پر لکھا ہے' اس میں بہت زیادہ تفصیل ہے نہ بہت اختصار ہے' مسائل حاضرہ پر میں نے بہت شرح و بسط کے ساتھ "شرح صحیح مسلم" میں لکھ دیا ہے' اس

طرح عبادات اور معاملات پر بھی سیر حاصل بحث اس میں آگئی ہے تاہم جو مسائل اور مباحث اس میں آنے سے رہ گئے ہیں ان شاء اللہ ان کا اس میں تفصیل کے ساتھ ذکر کروں گا۔ معاصرین اور عہد قریب کے مفسرین کی تحقیقات اور نگارشات کو میں نے اپنے پیش نظر رکھا ہے اور جہاں میری رائے ان کے ساتھ متفق نہیں ہو سکی میں نے ادب اور احترام کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔

اخیر میں' میں ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کے منصۂ شہود پر آنے میں میرے ساتھ تعاون کیا' خاص طور پر سید اعجاز احمد صاحب' صاحبزادہ محسن اعجاز صاحب (فرید بک سٹال)' پروفیسر مولانا مفتی منیب الرحمان صاحب زید مجہم' مولانا محمد ابراہیم فیضی صاحب وغیرہم کا میں خصوصیت کے ساتھ شکر گزار ہوں' اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس کتاب کو مکمل کرنے کی توفیق دے' اس کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرمائے اور مجھے' اس کتاب کے تمام معاونین اور قارئین کو دنیا اور آخرت کے ہر شر سے محفوظ رکھے اور دنیا اور آخرت کی ہر خیر ہمیں عطا فرمائے۔ آمین

غلام رسول سعیدی غفرلہ

خادم الحدیث دار العلوم نعیمیہ' بلاک نمبر ۱۵' فیڈرل بی ایریا کراچی ۳۸

۲۶ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ / ۲۴ اگست ۱۹۹۵ء

✿✿✿✿✿

اَلْمُقَدَّمَۃُ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مقدمہ تفسیر

قرآن مجید کی تفسیر سے پہلے ضروری ہے کہ بطور مقدمہ چند اہم امور کو جان لیا جائے' اس لیے پہلے ہم وحی کی حقیقت' قرآن مجید کی تعریف' قرآن مجید کے فضائل' قرآن مجید کا اعجاز' قرآن مجید کو تھوڑا تھوڑا نازل کرنے کی وجوہ' سب سے پہلی اور سب سے آخری آیت کی تحقیق' مکی اور مدنی سورتوں کی بحث' قرآن مجید کو جمع کرنے اور اس کی سات قراءتوں کا بیان' اور قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کی تعداد کا ذکر کریں گے' پھر تفسیر اور تاویل کی تعریف' تفسیر کے فضائل' تفسیر بالرائے کی تحقیق' امہات مآخذ تفسیر' شروط تفسیر' طبقات مفسرین اور بعض دیگر اہم امور کو بیان کریں گے۔ فنقول و باللّٰہ التوفیق و بہ الا ستعانۃ یلیق.

وحی کا لغوی اور اصطلاحی معنی

علامہ ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:

حدیث میں وحی کا بہ کثرت ذکر ہے' لکھنے' اشارہ کرنے' کسی کو بھیجنے' الہام اور کلام خفی پر وحی کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

(نہایہ ج ۴ ص ۱۶۳' مطبوعہ موسسۃ مطبوعاتی' ایران' ۱۳۶۴ھ)

علامہ مجد الدین فیروز آبادی لکھتے ہیں:

اشارہ' لکھنا' مکتوب' رسالۃ' الہام' کلام خفی' ہر وہ چیز جس کو تم غیر کی طرف القاء کرواسے اور آواز کو وحی کہتے ہیں۔

(قاموس ج ۴ ص ۵۷۹' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۲ھ)

علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

وحی اس کلام کو کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کی طرف نازل فرماتا ہے۔ ابن الانباری نے کہا: اس کو وحی اس لیے کہتے ہیں کہ فرشتہ اس کلام کو لوگوں سے مخفی رکھتا ہے' اور وحی نبی کے ساتھ مخصوص ہے جس کو لوگوں کی طرف بھیجا جاتا ہے' لوگ ایک دوسرے سے جو خفیہ بات کرتے ہیں وہ وحی کا اصل معنی ہے' قرآن مجید میں ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ (الانعام: ۱۱۲)

اور اس طرح ہم نے سرکش انسانوں اور جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنادیا جو خفیہ طور پر ملمع کی ہوئی جھوٹی بات (لوگوں کو) دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کو پہنچاتے ہیں۔

اور ابو اسحٰق نے کہا ہے کہ وحی کا لغت میں معنی ہے خفیہ طریقہ سے خبر دینا' اسی وجہ سے الہام کو وحی کہتے ہیں' ازہری نے کہا ہے: اسی طرح سے اشارہ کرنے اور لکھنے کو بھی وحی کہتے ہیں۔ اشارہ کے متعلق یہ آیت ہے:

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۝ (مریم: ۱۱)

سو زکریا اپنی قوم کے سامنے (عبادت کے) حجرہ سے باہر نکلے' پس ان کی طرف اشارہ کیا کہ تم صبح اور شام (اللہ کی)

تسبیح کیا کرو○

اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جو خفیہ طریقہ سے کلام کیا گیا اس کے متعلق ارشاد فرمایا:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ (الشوریٰ:۵۱)

اور کوئی بشر اس لائق نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی سے یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج دے جو اس کے حکم سے وہ پہنچائے جو اللہ چاہے۔

بشر کی طرف وحی کرنے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بشر کو خفیہ طور سے کسی چیز کی خبر دے یا الہام کے ذریعہ یا خواب کے ذریعہ یا اس پر کوئی کتاب نازل فرمائے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کتاب نازل کی تھی یا جس طرح سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کیا' اور یہ سب اعلام (خبر دینا) ہیں' اگرچہ ان کے اسباب مختلف ہیں۔

(تاج العروس ج ۱۰ ص ۳۸۵ 'مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں: وحی کا اصل معنی سرعت کے ساتھ اشارہ کرنا ہے' یہ اشارہ کبھی رمز اور تعریض کے ساتھ کلام میں ہوتا ہے اور کبھی محض آواز سے ہوتا ہے' کبھی اعضاء اور جوارح سے ہوتا ہے اور کبھی لکھنے سے ہوتا ہے' جو کلمات انبیاء اور اولیاء کی طرف القاء کیے جاتے ہیں ان کو بھی وحی کہا جاتا ہے' یہ القاء کبھی فرشتہ کے واسطے سے ہوتا ہے جو دکھائی دیتا ہے اور اس کا کلام سنائی دیتا ہے' جیسے حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی خاص شکل میں آتے تھے اور کبھی کسی کے دکھائی دیئے بغیر کلام سنا جاتا ہے' جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا' اور کبھی دل میں کوئی بات ڈال دی جاتی ہے' جیسے حدیث میں ہے: جبرئیل نے میرے دل میں بات ڈال دی' اس کو ''نفث فی الروع'' کہتے ہیں اور کبھی یہ القاء اور الہام کے ذریعہ ہوتا ہے جیسے اس آیت میں ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ (القصص:۷)

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو الہام فرمایا کہ ان کو دودھ پلاؤ۔

اور کبھی یہ القاء تسخیر ہوتا ہے' جیسے اس آیت میں ہے:

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۙ (النحل:۶۸)

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ ڈال دیا کہ پہاڑوں میں' درختوں میں اور ان چھپریوں میں گھر بنا جنہیں لوگ اونچا بناتے ہیں○

اور کبھی خواب میں القاء کیا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: نبوت منقطع ہوگئی ہے اور سچے خواب باقی رہ گئے ہیں۔

(المفردات ص ۵۱۶۔۵۱۵ ملخصاً 'مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

علامہ ابن منظور افریقی نے بھی وحی کا معنی بیان کرتے ہوئے کم و بیش یہی لکھا ہے۔

(لسان العرب ج ۱۵ ص ۳۸۱۔۳۷۹ 'مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ' قم' ایران)

علامہ بدرالدین عینی نے وحی کا اصطلاحی معنی یہ لکھا ہے:

اللہ کے نبیوں میں سے کسی نبی پر جو کلام نازل کیا جاتا ہے وہ وحی ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۴ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

اور علامہ تفتازانی نے الہام کا معنی یہ بیان کیا ہے:

دل میں بہ طریق فیضان کسی معنی کو ڈالنا یا الہام ہے۔ (شرح عقائد نسفی ص ۱۸ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی)

ضرورت وحی اور ثبوت وحی

انسان مدنی الطبع ہے اور مل جل کر رہتا ہے اور ہر انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے خوراک' کپڑوں اور مکان کی ضرورت ہوتی ہے اور افزائش نسل کے لیے نکاح کی ضرورت ہے۔ ان چار چیزوں کے حصول کے لیے اگر کوئی قانون اور ضابطہ نہ ہو تو ہر زور آور اپنی ضرورت کی چیزیں طاقت کے ذریعہ کمزور سے حاصل کرلے گا' اس لیے عدل اور انصاف کو قائم کرنے کی غرض سے کسی قانون کی ضرورت ہے' اور یہ قانون اگر کسی انسان نے بنایا تو وہ اس قانون میں اپنے تحفظات اور اپنے مفادات شامل کرے گا' اس لیے یہ قانون مافوق الانسان کا بنایا ہوا ہونا چاہیے تاکہ اس میں کسی کی جانب داری کا شائبہ اور وہم و گمان نہ ہو' اور ایسا قانون صرف خدا کا بنایا ہوا قانون ہو سکتا ہے' جس کا علم خدا کے بتلانے اور اس کے خبر دینے سے ہی ہو سکتا ہے اور اسی کا نام وحی ہے۔

انسان عقل سے خدا کے وجود کو معلوم کر سکتا ہے' عقل سے خدا کی وحدانیت کو بھی جان سکتا ہے' قیامت کے قائم ہونے' حشر ونشر اور جزاء وسزا کو بھی عقل سے معلوم کر سکتا ہے لیکن وہ عقل سے اللہ تعالیٰ کے مفصل احکام کو معلوم نہیں کر سکتا۔ وہ عقل سے یہ جان سکتا ہے کہ اللہ کا شکر ادا کرنا اچھی بات ہے اور ناشکری بری بات ہے لیکن وہ عقل سے یہ نہیں جان سکتا کہ اس کا شکر کس طرح ادا کیا جائے' اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے خبر دینے سے ہی ہوگا اور اسی کا نام وحی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں عبث اور بے مقصد نہیں بھیجا بلکہ اس لیے بھیجا ہے کہ وہ اپنی دنیاوی ذمہ داریوں کو پورا کرنے اور حقوق اور فرائض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور اس کی دی ہوئی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرے۔ برے کاموں اور بری خصلتوں سے بچے اور اچھے کام اور نیک خصلتیں اپنائے' اور اللہ تعالیٰ کی عبادات کیا کیا ہیں' اور وہ کس طرح ادا کی جائیں' وہ کون سے کام ہیں جن سے بچا جائے اور وہ کون سے کام ہیں جن کو کیا جائے؟ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے بتلانے اور خبر دینے سے ہی ہو سکتا ہے اور اسی کا نام وحی ہے۔

انسان کو بنیادی طور پر کھانے پینے کی اشیاء' کپڑوں اور مکان کی حاجت ہے اور اپنی نسل بڑھانے کے لیے ازدواج کی ضرورت ہے' لیکن اگر کسی قاعدہ اور ضابطہ کے بغیر ان چیزوں کو حاصل کیا جائے تو یہ نری حیوانیت ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ سے ان کو حاصل کیا جائے تو یہ محض عبادت ہے اور اس قاعدہ اور ضابطہ کا علم اللہ تعالیٰ کے بتلانے اور اس کی خبر دینے سے ہی ہو سکتا ہے اور اسی کا نام وحی ہے۔

بعض چیزوں کو ہم حواس کے ذریعہ جان لیتے ہیں جیسے رنگ' آواز اور ذائقہ کو' اور بعض چیزوں کو عقل سے جان لیتے ہیں جیسے دو اور دو کا مجموعہ چار ہے یا مصنوع کے وجود سے صانع کے وجود کو جان لیتے ہیں' لیکن کچھ ایسی چیزیں ہیں جن کو حواس سے جانا جا سکتا ہے نہ عقل سے' مثلاً نماز کا کیا طریقہ ہے' کتنے ایام کے روزے فرض ہیں' زکوٰۃ کی کیا مقدار ہے اور کس چیز کا کھانا حلال ہے اور کس چیز کا کھانا حرام ہے' غرض عبادات اور معاملات کے کسی شعبہ کو ہم حواس خمسہ اور عقل کے ذریعہ نہیں جان سکتے' اس کو جاننے کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے وحی!

بعض اوقات حواس غلطی کرتے ہیں مثلاً ریل میں بیٹھے ہوئے شخص کو درخت دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اور بخار زدہ شخص کو میٹھی چیز کڑوی معلوم ہوتی ہے اور حواس کی غلطیوں پر عقل تنبیہ کرتی ہے۔ اسی طرح بعض اوقات عقل بھی غلطی کرتی ہے مثلاً عقل یہ کہتی ہے کہ کسی ضرورت مند کو مال نہ دیا جائے مال کو صرف اپنے مستقبل کے لیے بچا کے رکھا جائے اور جس طرح

حواس کی غلطیوں پر متنبہ کرنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے' اسی طرح عقل کی غلطیوں پر متنبہ کرنے کے لیے وحی کی ضرورت ہے۔

وحی کی تعریف میں ہم نے یہ ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کو جو چیز بتلاتا ہے وہ وحی ہے' اور نبوت کا ثبوت معجزات سے ہوتا ہے اب یہ بات بحث طلب ہے کہ وحی کے ثبوت کے لیے نبوت کیوں ضروری ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر نبوت کے بغیر وحی کا ثبوت ممکن ہوتا تو اس دنیا کا نظام فاسد ہو جاتا' مثلاً ایک شخص کسی کو قتل کر دیتا اور کہتا مجھ پر وحی اتری تھی کہ اس شخص کو قتل کر دو۔ ایک شخص بہ زور کسی کا مال اپنے قبضہ میں کر لیتا اور کہتا کہ مجھ پر وحی نازل ہوئی تھی کہ اس کے مال پر قبضہ کر لو' اس لیے ہر کس و ناکس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ وحی کا دعویٰ کرے۔ وحی کا دعویٰ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت پر فائز کیا ہو' لہٰذا وحی کا دعویٰ صرف نبی ہی کر سکتا ہے اور نبوت کا دعویٰ تب ثابت ہو گا جب وہ اس کے ثبوت میں معجزات پیش کرے گا۔

ایک سوال یہ ہے کہ جب نبی کے پاس فرشتہ وحی لے کر آتا ہے تو نبی کو کیسے یقین ہوتا ہے کہ یہ فرشتہ ہے اور یہ اللہ کا کلام لے کر آیا ہے؟ امام رازی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ فرشتہ نبی کے سامنے اپنے فرشتہ ہونے اور حامل وحی الٰہی ہونے پر معجزہ پیش کرتا ہے' اور امام غزالی کی بعض عبارات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کو ایسی صفت عطا فرماتا ہے جس سے وہ جن' فرشتہ اور شیطان کو الگ الگ پہچانتا ہے جیسے ہم انسانوں' جانوروں اور نباتات اور جمادات کو الگ الگ پہچانتے ہیں کیونکہ ہماری رسائی صرف عالم شہادت تک ہے اور نبی کی پہنچ عالم شہادت میں بھی ہے اور عالم غیب میں بھی۔

وحی کی اقسام

بنیادی طور پر وحی کی دو قسمیں ہیں: وحی متلو اور وحی غیر متلو۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر الفاظ اور معانی کا نزول ہو تو یہ وحی متلو ہے اور یہی قرآن مجید ہے' اور اگر آپ پر صرف معانی نازل کیے جائیں اور آپ ان معانی کو اپنے الفاظ سے تعبیر کریں تو یہی وحی غیر متلو ہے اور اس کو حدیث نبوی کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی متعدد صورتیں ہیں جن کا احادیث صحیحہ میں بیان کیا گیا ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت حارث بن ہشام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور کہا: یا رسول اللہ! آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کبھی کبھی وحی گھنٹی کی آواز کی طرح (مسلسل) آتی ہے اور یہ مجھ پر بہت شدید ہوتی ہے۔ یہ وحی (جب) منقطع ہوتی ہے تو میں اس کو یاد کر چکا ہوتا ہوں' اور کبھی میرے پاس فرشتہ انسانی شکل میں آتا ہے' اور مجھ سے کلام کرتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا جاتا ہے میں اس کو یاد کرتا جاتا ہوں۔ حضرت عائشہ نے کہا: میں نے دیکھا ہے کہ سخت سردی کے دنوں میں آپ پر وحی نازل ہوتی' اور جس وقت وحی ختم ہوتی تھی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ بہہ رہا ہوتا تھا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث پر یہ سوال ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول وحی کی صرف دو صورتیں بیان کی ہیں' اس کی کیا وجہ ہے؟ علامہ بدرالدین عینی نے اس کے جواب میں یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ یہ ہے کہ قائل اور سامع میں کوئی مناسبت ہونی چاہیے تاکہ ان میں تعلیم اور تعلم اور افادہ اور استفادہ متحقق ہو سکے اور یہ اتصاف یا تو اس طرح ہو گا کہ سامع پر قائل کی صفت کا غلبہ ہو اور وہ قائل کی صفت کے ساتھ متصف ہو جائے اور "صلصلۃ الجرس" (گھنٹی کی آواز) سے یہی

پہلی قسم مراد ہے اور یا قائل سامع کی صفت کے ساتھ متصف ہو جائے اور یہ دوسری قسم ہے جس میں فرشتہ انسانی شکل میں متشکل ہو کر آپ سے کلام کرتا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی پہلی قسم کی تشبیہ گھنٹی کی آواز کے ساتھ دی ہے' جس کی آواز مسلسل سنائی دیتی ہے اور اس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا' اس میں آپ نے یہ متنبہ کیا ہے کہ جس وقت یہ وحی قلب پر نازل ہوتی ہے تو آپ کے قلب پر خطاب کی ہیبت طاری ہوتی ہے اور وہ قول آپ کو حاصل ہو جاتا ہے لیکن اس قول کے ثقل کی وجہ سے اس وقت آپ کو اس کا پتا نہیں چلتا اور جب اس کے جلال کی ہیبت زائل ہو جاتی ہے تو پھر آپ کو اس کا علم ہوتا ہے' اور وحی کی یہ قسم ایسی ہے جیسے ملائکہ پر وحی نازل ہوتی ہے' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ آسمان پر کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو فرشتے عاجزی سے اپنے پروں کو پھڑپھڑاتے ہیں جیسے پتھر پر زنجیر ماری جائے اور جب ان کے دلوں سے وہ ہیبت زائل ہوتی ہے تو وہ آپس میں کہتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں: حق فرمایا اور وہ عظیم اور کبیر ہے' اور اس حدیث میں ہم پر یہ ظاہر ہوا ہے کہ وحی کی پہلی قسم دوسری سے شدید ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم حالت بشری سے فرشتہ کی حالت کی طرف منتقل ہوتے تھے' پھر آپ پر اس طرح وحی کی جاتی تھی جس طرح فرشتوں پر کی جاتی ہے' اور یہ آپ کے لیے مشکل تھا اور دوسری قسم میں فرشتہ انسانی شکل میں آتا تھا اور یہ قسم آپ کے لیے آسان تھی۔

(عمدۃ القاری ج ۱ ص ۴۴' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر ۱۳۴۸ھ)

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ گھنٹی کی آواز میں ہر چند کہ عام لوگوں کے لیے کوئی معنی اور پیغام نہیں ہوتا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس آواز میں کوئی معنی اور پیغام ہوتا تھا جیسا کہ اس ترقی یافتہ دور میں ہم دیکھتے ہیں جب ٹیلی گرام دینے کا عمل کیا جاتا ہے تو ایک طرف سے صرف ٹک ٹک کی آواز ہوتی ہے اور دوسری طرف اس سے پورے پورے جملے بنالیے جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ ہوسکتا ہے کہ وحی کی یہ آواز بہ ظاہر صرف گھنٹی کی مسلسل ٹن ٹن کی طرح ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس میں پورے پورے فصیح و بلیغ جملے موجود ہوں۔

علامہ بدرالدین عینی نے نزول وحی کی حسب ذیل اقسام بیان کی ہیں:

(۱) کلام قدیم کو سننا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا' جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا' جس کا ذکر آثار صحیحہ میں ہے۔

(۲) فرشتہ کی رسالت کے واسطہ سے وحی کا موصول ہونا۔

(۳) وحی کو دل میں القاء کیا جائے' جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: روح القدس نے میرے دل میں القاء کیا۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف اسی طرح وحی کی جاتی تھی' اور انبیاء علیہم السلام کے غیر کے لیے جو وحی کا لفظ بولا جاتا ہے وہ الہام یا تسخیر کے معنی میں ہوتا ہے۔

علامہ سہیلی نے ''الروض الانف'' (ج ۱ ص ۱۵۲ - ۱۵۳' مطبوعہ ملتان) میں نزول وحی کی یہ سات صورتیں بیان کی ہیں:

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند میں کوئی واقعہ دکھایا جائے۔

(۲) گھنٹی کی آواز کی شکل میں آپ کے پاس وحی آئے۔

(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں کوئی معنی القاء کیا جائے۔

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فرشتہ انسانی شکل میں آئے اور حضرت جبریل آپ کے پاس حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ

کی شکل میں آئیں' حضرت دحیہ کی شکل میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ حسین ترین شخص تھے' حتیٰ کہ وہ اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر چلا کرتے تھے' مبادا عورتیں ان کو دیکھ کر فتنہ میں مبتلا ہوں۔

(۵) حضرت جبرائیل آپ کے پاس اصلی صورت میں آئے' اس صورت میں ان کے چھ سو پر تھے جن سے موتی اور یاقوت جھڑتے تھے۔

(۶) اللہ تعالیٰ آپ سے یا تو بیداری میں پردہ کی اوٹ سے ہم کلام ہو جیسا کہ معراج کی شب ہوا' یا نیند میں ہم کلام ہو جیسے "جامع ترمذی" میں ہے: اللہ تعالیٰ میرے پاس حسین صورت میں آیا اور فرمایا: ملاء اعلیٰ کس چیز میں بحث کر رہے ہیں؟

(۷) اسرافیل علیہ السلام کی وحی' کیونکہ شعبی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت اسرافیل کے سپرد کر دیا گیا تھا اور وہ تین سال تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے رہے' اور وہ آپ کے پاس وحی لاتے تھے' پھر آپ کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سپرد کر دیا گیا' اور "مسند احمد" میں سند صحیح کے ساتھ شعبی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس سال کی عمر میں مبعوث کیا گیا اور تین سال تک آپ کی نبوت کے ساتھ حضرت اسرافیل علیہ السلام رہے اور وہ آپ کو بعض کلمات اور بعض چیزوں کی خبر دیتے تھے' اس وقت تک آپ پر قرآن مجید نازل نہیں ہوا تھا اور جب تین سال گزر گئے تو پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ کے پاس رہے' پھر بیس سال آپ پر آپ کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا' دس سال مکہ میں اور دس سال مدینہ میں اور تریسٹھ سال کی عمر میں آپ کا وصال ہوا' البتہ واقدی وغیرہ نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے علاوہ آپ کو اور کسی فرشتہ کے سپرد نہیں کیا گیا۔

(عمدۃ القاری ج ۱ ص ۴۰ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر ۱۳۴۸ھ)

قرآن مجید کی تعریف اور قرآن مجید کے اسماء

اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ سابقہ آسمانی کتابوں کے مختلط' محرف اور محو ہو جانے کے بعد دنیا میں قیامت تک وحی الٰہی صرف قرآن مجید کی صورت میں باقی اور محفوظ رہے' گزشتہ شریعتیں' شریعت مصطفوی کے بعد منسوخ ہو گئیں اور اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے صرف شریعت محمدی اور دین اسلام کے واجب القبول ہونے کا اعلان فرما دیا' اور دین اسلام اور شریعت محمدی کی اساس اور برہان قرآن مجید ہے' اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر دلائل ہیں' انبیاء سابقین اور سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت' رسالت اور ان کی عظمتوں کا بیان ہے' حلال اور حرام' عبادات اور معاملات' آداب اور اخلاق کے جملہ احکام کا بیان ہے' معاد جسمانی' حشر ونشر اور جنت و دوزخ کا تفصیل سے ذکر ہے' اور انسان کی ہدایت کے لیے جس قدر امور کی ضرورت ہو سکتی ہے' ان سب کا قرآن مجید میں بیان ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ (النحل: ۸۹)

اور ہم نے آپ پر اس کتاب کو نازل کیا ہے جو ہر چیز کا روشن بیان ہے اور ہدایت اور رحمت ہے اور مسلمانوں کے لیے بشارت ہے ۝

علماء اصول فقہ نے قرآن مجید کی یہ تعریف کی ہے:

قرآن مجید' اللہ تعالیٰ کا معجز کلام ہے جو ہمارے نبی سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عربی زبان میں نازل ہوا' یہ مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور ہم تک تواتر سے پہنچا ہے' اس کی ابتداء سورہ فاتحہ سے ہے اور اس کا اختتام سورہ الناس پر ہے۔

قرآن مجید کے ترجمہ پر قرآن مجید کا اطلاق نہیں ہوگا کیونکہ قرآن مجید الفاظ عربیہ میں ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا. (یوسف:۲) ہم نے اس کتاب کو بہ طور عربی قرآن نازل کیا۔

اسی طرح قراءات شاذہ جو تواتر سے منقول نہیں ہیں ان پر بھی قرآن مجید کا اطلاق نہیں ہوگا۔

قرآن مجید میں قرآن مجید کے پانچ اسماء ذکر کیے گئے ہیں: قرآن' فرقان' کتاب' ذکر اور نور' ان اسماء کا ذکر حسب ذیل آیات میں ہے:

اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌۙ‏ ○ فِىۡ كِتٰبٍ مَّكۡنُوۡنٍۙ ○ (الواقعہ:۷۸-۷۷) بے شک یہ بہت معزز قرآن ہے ○ محفوظ کتاب میں (موجود ہے) ○

بَلۡ هُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِيۡدٌ ○ فِىۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ ○ (البروج:۲۲-۲۱) بلکہ وہ بہت معظم قرآن ہے ○ لوح محفوظ میں (لکھا ہوا ہے) ○

قرآن مجید میں اٹھاون مرتبہ "القرآن" کا ذکر ہے' دس مرتبہ "قرآن" کا ذکر ہے اور دو مرتبہ "قرانه" کا بہ طور مصدر ذکر ہے۔ قرآن کا لفظ قراءت سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے پڑھنا اور چونکہ اس کو بہت زیادہ پڑھا جاتا ہے اس لیے اس کو قرآن کہتے ہیں۔ نیز "قرء" کا معنی ہے جمع کرنا' اور چونکہ قرآن مجید میں سورتیں اور آیات مجتمع ہیں اس لیے اس کو قرآن کہتے ہیں۔

فرقان کا ذکر اس آیت میں ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِىۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰى عَبۡدِهٖ لِيَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِيۡنَ نَذِيۡرَا ۙ (الفرقان:۱) بہت برکت والا ہے جس نے اپنے (محبوب) بندہ پر "فرقان" کو نازل کیا تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے ڈرانے والا ہو ○

فرقان' فرق سے ماخوذ ہے اور کیونکہ یہ کتاب حق اور باطل' ایمان اور کفر اور خیر اور شر کے درمیان فرق کرتی ہے' اس لیے اس کا نام فرقان ہے۔

کتاب کا ذکر ان آیات میں ہے:

ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ ۛۚ فِيۡهِ ۛۚ. (البقرہ:۲) یہ عظیم کتاب (ہے) اس میں کوئی شک نہیں (ہے)۔

قَالُوۡا يٰقَوۡمَنَاۤ اِنَّا سَمِعۡنَا كِتٰبًا اُنۡزِلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰى. (الاحقاف:۳۰) جنوں نے کہا: اے ہماری قوم! بے شک ہم نے ایک کتاب کو سنا ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے۔

کتاب کا لفظ کتب سے بنا ہے' اس کے معنی ہیں جمع کرنا اور اس میں مختلف قصص' آیات اور احکام کو جمع کیا گیا ہے' اس لیے اس کا نام کتاب ہے۔

ذکر اس آیت میں مذکور ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ ○ (الحجر:۹) بے شک ہم ہی نے "ذکر" نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں ○

ذکر کے معنی ہیں نصیحت اور چونکہ قرآن مجید میں بہت زیادہ نصیحتیں بیان کی گئی ہیں اس لیے اس کا نام ذکر ہے۔

نور کا ذکر اس آیت میں ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمۡ بُرۡهَانٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ نُوۡرًا مُّبِيۡنًا ○ (النساء:۱۷۴) اے لوگو! بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے مستحکم دلیل آگئی اور ہم نے تمہاری طرف بیان کرنے والا

نور نازل کیا۔○

نور اس کو کہتے ہیں جو خود ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرے اور قرآن مجید بھی خود ظاہر ہے اور بہت سی اخبار' احکام اور اسرار کا مظہر ہے۔

مذکور الصدر اسماء کے علاوہ قرآن مجید کو مصحف بھی کہتے ہیں' مصحف کا معنی ہے جس میں صحیفوں کو جمع کیا گیا ہو اور صحیفہ چری ٹکڑے یا کاغذ کے ورق کو کہتے ہیں۔ علامہ نیشاپوری نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کو جمع کرنے کے بعد اس کا نام رکھنے کے متعلق لوگوں سے مشورہ کیا اور پھر اس کا نام مصحف رکھا۔

(غرائب القرآن ج ۱ ص ۲۵' مطبوعہ مطبعہ کبری امیریہ بولاق' مصر' ۱۳۲۳ھ)

قرآن کریم کے فضائل اور اجر و ثواب

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرآن مجید کا علم حاصل کرے اور لوگوں کو قرآن کریم کی تعلیم دے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۵۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت براء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص سورہ کہف پڑھ رہا تھا' اس کے گھر میں ایک جانور تھا۔ اچانک وہ جانور بدکنے لگا' اس نے دیکھا کہ ایک بادل نے اس کو ڈھانپا ہوا ہے' اس شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کا ذکر کیا' آپ نے فرمایا: اے شخص! پڑھتے رہو' یہ سکینہ ہے جو قرآن مجید کی تلاوت کے وقت نازل ہوتی ہے۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۶۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص قرآن مجید میں ماہر ہو وہ معزز اور بزرگ فرشتوں کے ساتھ رہتا ہے' اور جس شخص کو قرآن مجید پڑھنے میں دشواری ہوتی ہو اور وہ اٹک اٹک کر قرآن پڑھتا ہو اس کو دو اجر ملتے ہیں۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۶۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ سنو! عنقریب فتنے برپا ہوں گے' میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ان فتنوں سے نکلنے کی کیا صورت ہے؟ آپ نے فرمایا: کتاب اللہ! اس میں تم سے پہلے لوگوں کی خبریں ہیں اور تمہارے بعد والوں کے لیے پیش گوئیاں ہیں اور یہ تمہارے درمیان حکم ہے' یہ (حق اور باطل کے درمیان) فیصل ہے' بے فائدہ نہیں ہے' جس متکبر نے اس کو ترک کر دیا اللہ تعالیٰ اس کو ہلاک کر دے گا' جس نے اس کے علاوہ کسی اور چیز میں ہدایت کو تلاش کیا اللہ تعالیٰ اس کو گمراہی میں رہنے دے گا' یہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے' یہ حکمت آمیز نصیحت ہے' یہ صراط مستقیم ہے' اس کی وجہ سے خواہشات میں کجی نہیں آئے گی' کسی زبان کا کلام اس کے مشابہ نہیں ہو سکتا' علماء اس سے کبھی سیر نہیں ہوں گے' بار بار پڑھنے کے باوجود اس سے اکتاہٹ نہیں ہو گی' اس کے اسرار کبھی ختم نہیں ہوں گے' جنوں نے جب اس کو سنا تو اس پر ایمان لانے میں بالکل توقف نہیں کیا اور بے ساختہ کہا: بے شک ہم نے حیرت انگیز کلام سنا جو صراط مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے' ہم اس پر ایمان لے آئے۔ جس نے اس کے مطابق کہا اس نے سچ کہا' جس نے اس پر عمل کیا اس کو اجر دیا گیا' جس نے اس کے مطابق حکم کیا اس نے عدل کیا' جس نے اس کی دعوت دی وہ

صراط مستقیم پر ہدایت یافتہ ہے۔ (جامع ترمذی ص ۴۱۲-۴۱۳ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کتاب اللہ سے ایک حرف پڑھا اس کے لیے ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا دس گنا اجر ہے' اور میں یہ نہیں کہتا کہ ''الم'' ایک حرف ہے' بلکہ الف ایک حرف ہے' اور لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(جامع ترمذی ص ۴۱۳ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن قرآن پڑھنے والا آئے گا تو قرآن کہے گا: اے رب! اس کو مزین کر' تب اس کو عزت کا تاج پہنایا جائے گا' پھر قرآن کہے گا: اے رب! اس کو اور مزین کر' تو اس کو عزت والے حلے پہنائے جائیں گے' پھر قرآن کہے گا: اے رب! اس سے راضی ہو جا' تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے گا' پھر اس شخص سے کہا جائے گا: قرآن پڑھتا جا اور (جنت کے درجوں میں) چڑھتا جا اور ہر آیت کے بدلہ میں اس کو نیکی دی جائے گی۔ یہ حدیث حسن ہے۔ (جامع ترمذی ص ۴۱۳ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے پیٹ میں قرآن نہ ہو وہ ویران گھر کی مانند ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (جامع ترمذی ص ۴۱۴ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا: قرآن پڑھتا جا اور جنت کے درجوں میں چڑھتا جا' اور جس طرح دنیا میں آہستہ آہستہ قرآن پڑھتا تھا' اسی طرح پڑھ' جہاں تو آخری آیت پڑھے گا وہی تیرا ٹھکانہ ہوگا۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (جامع ترمذی ص ۴۱۴ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: علانیہ قرآن پڑھنے والا' علانیہ صدقہ کرنے والے کی مانند ہے اور پوشیدگی سے قرآن پڑھنے والا پوشیدگی سے صدقہ دینے والے کی مثل ہے۔ (جامع ترمذی ص ۴۱۴ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رب تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: جو شخص قرآن پڑھنے میں مشغولیت کی وجہ سے میرا ذکر نہ کر سکا اور مجھ سے دعا نہ کر سکا' میں اس کو دعا کرنے والوں سے زیادہ عطا فرماؤں گا' اور اللہ کے کلام کی فضیلت باقی کلاموں پر ایسی ہے جیسے اللہ کی فضیلت مخلوق پر ہے۔

(جامع ترمذی ص ۴۱۵ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ ''الحمد للہ رب العلمین'' پڑھتے' پھر ٹھہرتے' پھر ''الرحمن الرحیم'' پڑھتے' پھر ٹھہرتے' پھر ''مالک یوم الدین'' پڑھتے۔

(جامع ترمذی ص ۴۱۵ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ کی مخلوق سے کچھ لوگ اہل اللہ ہیں' صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! وہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: اہل قرآن' وہ اہل اللہ ہیں اور اللہ کے خاص بندے ہیں۔

(سنن کبریٰ ج ۵ ص ۱۷ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۱ھ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صرف دو شخصوں میں حسد

(رشک) کرنا جائز ہے' ایک وہ شخص جس کو اللہ نے مال دیا اور وہ دن رات اس مال کو (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن دیا اور وہ دن رات قیام میں قرآن پڑھتا ہے۔

(سنن کبریٰ ج ۵ ص ۲۷ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۱ھ)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: جس شخص نے قرآن مجید پڑھا اور اس کو حفظ کیا' اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کر دے گا اور اس کو اس کے گھر کے دس ایسے افراد کی شفاعت کرنے والا بنائے گا جن میں سے ہر ایک کے لیے جہنم واجب ہو چکی ہو۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۹ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حافظ نور الدین الہیثمی بیان کرتے ہیں:

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں قرآن مجید پڑھانے کا حکم دیا اور اس پر برانگیختہ کیا' اور فرمایا: قیامت کے دن جب قرآن پڑھنے والے کے گھر والوں کو بہت سخت حاجت ہو گی تو قرآن ان کے پاس آئے گا اور مسلمان سے کہے گا مجھے پہچانتے ہو؟ وہ شخص کہے گا: تم کون ہو؟ وہ کہے گا: میں وہ ہوں جس سے تم محبت کرتے تھے اور اس سے جدائی کو ناپسند کرتے تھے' جو تم کو کھینچتا تھا اور تم کو قریب کرتا تھا' وہ شخص کہے گا: شاید تم قرآن ہو' پھر قرآن اس کو اس کے رب عزوجل کے پاس لے جائے گا' اس کے دائیں طرف فرشتہ ہو گا اور بائیں طرف جنت ہو گی' اس کے سر کے اوپر سکینہ کو رکھا جائے گا' اور اس کے ماں باپ کو تمام دنیا سے قیمتی حلے دیئے جائیں گے' وہ کہیں گے کہ ہمارے اعمال تو اس انعام کے لائق نہیں' یہ کس چیز کا صلہ ہیں؟ قرآن کہے گا: یہ تمہارے بیٹے کے قرآن پڑھنے کی وجہ سے ہے۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے' اس کی سند میں سوید بن عبد العزیز متروک راوی ہے اور ہشیم نے اس کے متعلق اچھے کلمات کہے ہیں اور اس کے باقی راوی ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۶۰ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے بزرگ لوگ حاملین قرآن ہیں۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں سعد بن سعید ضعیف راوی ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۶۱ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

معاذ بن انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں' آپ نے فرمایا: جس شخص نے سبحان اللہ العظیم کہا اس کے لیے جنت میں ایک پودا اگایا جاتا ہے اور جس نے پورا قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا اس کے والدین کو ایک تاج پہنایا جائے گا جو سورج کی روشنی سے زیادہ حسین ہو گا۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں زبان بن فائد ضعیف راوی ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۶۲-۱۶۱ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے قرآن مجید کی کسی ایک آیت کو قصداً سنا' اس کے لیے ایک نیکی کو دگنا کر کے لکھا جائے گا اور جس نے اس کو تلاوت کیا وہ قیامت کے دن اس کے لیے نور ہو جائے گی۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے' اس کی سند میں عباد بن میسرہ ہے۔ امام احمد نے اس کو ضعیف کہا ہے اور امام ابن حبان نے اس کی توثیق کی ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۶۲ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن پڑھنے والا جب قرآن کے حلال کو حلال قرار دے اور اس کے حرام کو حرام قرار دے تو وہ اپنے گھر کے ان دس افراد کے لیے شفاعت کرے گا جن میں سے ہر ایک کے لیے جہنم واجب ہو چکی ہو گی' اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں جعفر بن حارث ضعیف

راوی ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۶۲ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت '۱۴۰۲ھ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص یہ پسند کرتا ہو کہ اس سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرے وہ غور کرے اگر وہ قرآن سے محبت کرتا ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص علم کا ارادہ کرے وہ قرآن میں غور کرے کیونکہ اس میں اولین اور آخرین کا علم ہے۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے کئی سندوں سے روایت کیا ہے اور ایک سند کے راوی حدیث صحیح کے راوی ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۶۵ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت '۱۴۰۲ھ)

عثمان بن عبداللہ بن اوس اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مصحف میں دیکھے بغیر قرآن پڑھنے کا ہزار درجہ اجر ہے اور مصحف میں دیکھ کر پڑھنے کا دو ہزار درجہ اجر ہے۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے اس کی سند میں ابو سعید بن عون ہے' ابن معین سے اس کے متعلق دو روایتیں ہیں' ایک روایت میں اس کی تضعیف کی ہے اور دوسری میں اس کی توثیق کی ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۶۵ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت '۱۴۰۲ھ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اپنے بیٹے کو ناظرہ قرآن پڑھایا اس کے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور جس نے اس کو زبانی قرآن پڑھایا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ایسی صورت میں اٹھائے گا جیسے چودھویں رات کا چاند ہوتا ہے اور اس کے بیٹے سے کہا جائے گا: قرآن پڑھو اور جب بھی وہ ایک آیت پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کے باپ کا ایک درجہ بلند کردے گا حتیٰ کہ اس کا بیٹا وہ تمام قرآن پڑھ لے گا جو اس کو یاد ہے۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے ''معجم اوسط'' میں روایت کیا ہے اور اس کی سند کے ایک راوی کو میں نہیں پہچانتا۔
(مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۶۶۔۱۶۵ مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت '۱۴۰۲ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بھی اپنے بچے کو دنیا میں قرآن کی تعلیم دیتا ہے اس کو قیامت کے دن جنت میں تاج پہنایا جائے گا' جس کو تمام جنت والے پہچان لیں گے کہ یہ دنیا میں اس کے بیٹے کو قرآن پڑھانے کی وجہ سے پہنایا گیا ہے۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے معجم اوسط میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں جابر بن سلیم ہے' جس کو ازدی نے ضعیف کہا ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۶۶۔۱۶۵ مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت '۱۴۰۲ھ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس گھر میں قرآن پڑھا جائے اس میں بہت خیر ہوتی ہے اور جس گھر میں قرآن نہ پڑھا جائے اس میں کم خیر ہوتی ہے۔ اس حدیث کو امام بزار نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں عمرو بن نبہان ضعیف روای ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۷۱ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت '۱۴۰۲ھ)

قرآن مجید کو پڑھنے اور سننے کے احکام' آداب اور بعض ضروری مسائل

جو شخص قرآن مجید کی تلاوت کا ارادہ کرے اس کو چاہیے کہ اپنے منہ کو ہر قسم کی بدبو سے اچھی طرح صاف کرلے' خاص طور پر تمباکو نوشی کرنے والے' نسوار ڈالنے والے اور کچا لہسن اور پیاز کھانے والوں کو کسی اچھی پیسٹ سے منہ صاف کرنا چاہیے اور منہ میں الائچی وغیرہ رکھنی چاہیے اور دیگر عطریات کی خوشبو لگانی چاہیے کیونکہ فرشتے تلاوت قرآن کے دوران حاضر ہوتے ہیں اور بدبو سے ان کو تکلیف ہوتی ہے' اور خوشبو سے راحت ہوتی ہے۔

قرآن مجید کی تلاوت باوضو کرنا مستحب ہے' اور اگر قرآن مجید کو چھوئے بغیر زبانی بے وضو پڑھا جائے تو جائز ہے' اس پر

تمام مسلمانوں کا اجماع ہے اور اس سلسلہ میں بکثرت احادیث ہیں' تاہم یہ خلاف مستحب اور خلاف اولیٰ ہے۔ اگر پانی نہ ملے تو تیمم کر کے تلاوت کرے' جس عورت کو حیض نہ ہو صرف استحاضہ کا خون جاری ہو وہ بے وضو کے حکم میں ہے' وہ نماز کے کسی ایک وقت کے شروع میں وضو کر لے تو دوسرے وقت کے شروع ہونے تک اس کا وضو رہے گا بہ شرطیکہ کسی اور وجہ سے اس کا وضو نہ ٹوٹے' جنبی اور حائض کے لیے قرآن مجید کی تلاوت کرنا حرام ہے' خواہ ایک آیت ہو یا اس سے کم ہو' البتہ جنبی اور حائض بغیر تلفظ کے دل میں قرآن مجید کو پڑھ سکتے ہیں' البتہ اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ تسبیح' تہلیل' تحمید' درود شریف اور دیگر تمام اذکار اور وظائف جنبی اور حائض پڑھ سکتے ہیں اور اگر تلاوت قرآن کا قصد نہ ہو تو بطور دعا قرآن مجید کی آیات بھی پڑھ سکتے ہیں مثلاً بہ طور شکر ''الحمد لله رب العلمين'' پڑھ سکتے ہیں۔ سواری پر بیٹھتے وقت ''سبحان الذی سخر لنا هذا'' والی آیت اور مصیبت کے وقت ''انا لله وانا اليه راجعون'' پڑھ سکتے ہیں' لیکن یہ بھی خلاف مستحب اور خلاف افضل ہے۔

کسی پاک اور صاف جگہ پر بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرنی چاہیے۔ مسجد میں تلاوت کرنا بہت عمدہ ہے' اسی طرح اعتکاف میں اور جب بھی انسان مسجد میں داخل ہو اعتکاف کی نیت کرے' اگر مسجد میں تنہا ہو تو متوسط بلند آواز سے تلاوت کرے اور اگر اور لوگ بھی تلاوت کر رہے ہوں' یا دوسرے لوگ نماز اور اذکار میں مشغول ہوں تو پھر آہستہ تلاوت کرے تاکہ کسی کی تلاوت اور عبادت میں خلل نہ پڑے' نیز سر ڈھانپ کر سکون' خضوع' خشوع' وقار اور ادب کے ساتھ بیٹھ کر تلاوت کرے اور قبلہ کی طرف منہ کر کے تلاوت کرے۔ حدیث میں ہے کہ بہترین نشست وہ ہے جس میں منہ قبلہ کی طرف ہو۔ امام ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حمام میں قرآن مجید کی تلاوت نہ کرے۔ ابومیسرہ سے روایت ہے کہ پاک جگہ قرآن مجید کی تلاوت کی جائے' آج کل لوگ اٹیچ باتھ میں وضو کرتے ہیں' بسم اللہ اور وضو کی دعائیں اس جگہ پڑھنی نہیں چاہئیں اور کسی بھی مہان' مبتذل اور غیر محترم جگہ پر قرآن مجید پڑھنے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے سے اجتناب کیا جائے۔

قرآن مجید کی تلاوت شروع کرنے سے پہلے ''اعوذ بالله من الشيطن الرجيم'' پڑھے' اور قرآن مجید کی آیات کے معانی میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کرے' جس آیت میں ذوق و شوق اور وجد آئے اس کو بار بار دہرائے' کیونکہ امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات صبح تک اس آیت کو بار بار پڑھتے رہے:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (المائدہ: ۱۱۸)

اگر تو ان کو عذاب دے تو بیشک یہ تیرے بندے ہیں' اور اگر تو ان کو بخش دے تو' تو بہت غالب' بڑی حکمت والا ہے ○

(سنن نسائی ج ۱ ص ۱۵۷-۱۵۶ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک رات صبح تک آپ اس آیت کو دہراتے رہے:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ (الجاثیہ: ۲۱)

کیا جن لوگوں نے گناہ کیے ہیں انہوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ ہم انہیں ان لوگوں کی مثل کر دیں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے کہ ان (سب) کی زندگی اور موت برابر ہو جائے' وہ کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں ○

اسی طرح صحابہ کرام اور فقہاء تابعین سے منقول ہے کہ انہوں نے تلاوت کے دوران بعض آیات کو بار بار پڑھا۔

قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے یا تلاوت کو سنتے ہوئے جب اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب' اس کی گرفت اور اس کے عذاب کی آیات سے گزریں تو اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونا چاہیے۔ قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا وَ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَ یَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا
(بنی اسرائیل: ۱۰۹۔۱۰۷)

بے شک جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا' جب ان پر اس (قرآن) کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر جاتے ہیں O اور کہتے ہیں کہ ہمارا رب (ہر عیب سے) پاک ہے' بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہونا ہے O اور وہ روتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ (قرآن) ان کے (دلوں میں) خوف خدا کو اور زیادہ کرتا ہے O

اس سلسلہ میں بہ کثرت احادیث ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن پڑھتے ہوئے روؤ' اگر رونا نہ آئے تو کوشش کر کے روؤ۔ (سنن ابن ماجہ ص ۹۵' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نماز میں قرآن مجید پڑھتے ہوئے اس قدر روتے تھے کہ مشرکوں کی عورتیں بھی ان کا گریہ سن کر متاثر ہوتی تھیں۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۰۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ ھ) اسی طرح بہ کثرت صحابہ اور تابعین سے تلاوت قرآن کے دوران رونا منقول ہے۔

قرآن مجید کو ترتیل کے ساتھ آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا چاہیے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جلدی جلدی پورا قرآن پڑھنے کی بہ نسبت میرے نزدیک یہ بہتر ہے کہ صرف ایک سورت ترتیل کے ساتھ پڑھ لی جائے' قرآن مجید میں ہے:

وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا (المزمل: ۴) قرآن مجید آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے O

مجاہد سے روایت ہے کہ ہمیں جلدی جلدی قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کچھ لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور وہ ان کے گلوں کے نیچے سے نہیں اترتا' لیکن جب قرآن مجید دل میں ٹھہر کر جم جائے تو نفع دیتا ہے۔ ترتیل کے ساتھ پڑھنے میں قرآن کی زیادہ توقیر اور احترام ہے اور اس کی دل میں زیادہ تاثیر ہوتی ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۷۳' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی' ۱۳۷۵ ھ)

جب قرآن مجید کی کوئی ایسی آیت پڑھے جس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کا ذکر ہو تو اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت اور مغفرت کا سوال کرے' اور جب عذاب کی آیت کو پڑھے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے پناہ طلب کرے' جب کسی آیت میں اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کا ذکر ہو تو سبحان اللہ کہے۔ امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں' حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب (نفلی) نماز میں کسی رحمت کی آیت کو پڑھتے تو اس کا سوال کرتے اور جب عذاب کی آیت پڑھتے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے اور جب اللہ کی عظمت کی آیت پڑھتے تو سبحان اللہ کہتے۔ (سنن ابن ماجہ ص ۹۶' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی) انبیاء علیہم السلام اور صالحین کا ذکر ہو تو دعا کرے کہ اللہ ان کی اتباع نصیب فرمائے۔ اسی طرح جنت کے ذکر پر جنت کا سوال کرے اور دوزخ کے ذکر پر دوزخ سے پناہ مانگے۔ جب یہ آیت پڑھے: "الیس اللّٰہ باحکم الحاکمین" تو کہے: "بلی وانا علی ذالک من الشاھدین" جب "فبای الاء ربکما تکذبان" پڑھے یا "فبای حدیث بعدہ یومنون" پڑھے تو کہے: "امنت باللّٰہ" جب "الیس ذالک بقادر علی ان یحیی الموتی" پڑھے تو کہے: "بلی"۔ (سنن ابوداؤد' جامع ترمذی) امام شافعی کے نزدیک نماز میں بھی اس طرح دعا کرنا اور جواب دینا مستحب ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کا

استحباب فرض نماز کے غیر میں ہے' فرض نماز میں اس طرح کرنا مکروہ ہے' البتہ نفلی نمازوں میں جائز ہے اور ''سنن ابن ماجہ'' میں نفلی نماز کی تصریح ہے۔

قرآن مجید کی تلاوت کے دوران اس کا مکمل احترام ملحوظ رکھے' اس دوران باتیں نہ کرے ہنسنے سے گریز کرے الا یہ کہ کوئی ناگزیر بات کرنی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ (الاعراف: ۲۰۴) اور جب قرآن مجید پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے ○

امام ابو داؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب تک وہ اپنے ارادہ کے مطابق قراءت نہیں کر لیتے تھے کسی سے بات نہیں کرتے تھے' اور امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ قرآن مجید سے فارغ ہونے سے پہلے بات نہیں کرتے تھے۔

جب قرآن مجید پڑھا جائے تو اس کے سننے کے متعلق فقہاء احناف کے دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ قرآن مجید کا سننا فرض عین ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا سننا فرض کفایہ ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں:

قرآن مجید کا سننا مطلقاً واجب ہے' خواہ نماز میں سنے یا خارج از نماز میں' کیونکہ یہ آیت اگرچہ نماز کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے لیکن اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے خصوصیت سبب کا نہیں ہوتا' لیکن یہ اس وقت واجب ہے جب کوئی عذر نہ ہو' ''قنیہ'' میں مذکور ہے کہ گھر میں بچہ قرآن کریم پڑھ رہا ہو اور گھر والے کام میں مشغول ہوں تو وہ نہ سننے میں معذور ہیں' بہ شرطیکہ انہوں نے کام پہلے شروع کیا ہو ورنہ نہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کی تلاوت کے دوران فقہ کی کتابوں کے مطالعہ کرنے کا حکم ہے' ''فتح القدیر'' میں ''خلاصہ'' سے منقول ہے کہ کوئی شخص فقہ لکھ رہا ہو اور اس کے پاس بیٹھ کر کوئی شخص قرآن پڑھنا شروع کر دے اور اس کے لیے قرآن مجید کو سننا ممکن نہ ہو تو گناہ پڑھنے والے پر ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص چھت پر قرآن مجید پڑھے اور لوگ سوئے ہوئے ہوں تو پڑھنے والا گنہ گار ہوگا' کیونکہ وہی شخص ان کے استماع سے اعراض کا سبب بنا ہے' کیونکہ وہ ان کو جگا کر ایذاء پہنچا رہا ہے اور شرح المنیہ میں مذکور ہے کہ اصل یہ ہے کہ قرآن مجید کا سننا فرض کفایہ ہے' کیونکہ قرآن مجید پڑھنے کا حق یہ ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے اور اس کو ضائع نہ کیا جائے اور بعض لوگوں کے خاموش ہونے سے یہ حق ادا ہو جاتا ہے جیسے مسلمان کے سلام کا جواب دینا اس مسلمان کے حق کی رعایت کی وجہ سے واجب ہے اور بعض لوگوں کے جواب دینے سے یہ حق ادا ہو جاتا ہے' اور باقی تمام لوگوں سے وجوب ساقط ہو جاتا ہے' ہاں! قرآن مجید پڑھنے والے پر قرآن کریم کا احترام کرنا واجب ہے' بایں طور کہ بازاروں میں قرآن نہ پڑھے' نہ ایسی جگہوں پر قرآن مجید پڑھے جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں' اگر اس نے ایسی جگہوں پر قرآن مجید پڑھا تو وہی شخص قرآن مجید کے احترام کو ضائع کرنے والا ہوگا' نہ کہ مصروف اور مشغول لوگ تا کہ لوگ حرج میں مبتلا نہ ہوں۔ علامہ حموی نے اپنے استاذ قاضی القضاۃ منقاری زادہ سے نقل کیا ہے کہ ان کی تحقیق یہ ہے کہ قرآن مجید کا سننا فرض عین ہے۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۳۶۷-۳۶۶' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

ہمارے زمانہ میں لوگ مسجدوں میں مائیک پر تراویح اور شبینے پڑھتے ہیں اور باہر کے اسپیکروں کو کھول دیتے ہیں جس سے محلوں اور بازاروں میں دور دور تک قرآن مجید کی آواز جاتی ہے اور لوگ اپنی مصروفیات کی وجہ سے قرآن مجید نہیں سن سکتے اور یوں قرآن مجید کی بے حرمتی ہوتی ہے اور اس کا گناہ ان پر ہوتا ہے جو مسجد کے باہر کے اسپیکر چلاتے ہیں' اس لیے واجب ہے کہ صرف مسجد کے اندر کے اسپیکروں کو چلایا جائے اور ان کی آواز بھی اتنی اونچی نہ کی جائے جس سے مسجد کے باہر آواز جائے۔

تلاوت کے دوران صرف قرآن مجید پر نظر رکھنی چاہیے ادھر ادھر نہ دیکھے خاص طور پر اجنبی عورتوں اور خوبصورت اور بے ریش لڑکوں کی طرف نہ دیکھے کیونکہ خوبصورت بے ریش لڑکے بھی عورتوں کے حکم میں ہیں اور عورتوں کی بہ نسبت ان سے قضاء شہوت زیادہ سہل ہے۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۲۷۳ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ) البتہ خرید و فروخت' علاج معالجہ اور تعلیم کے وقت بہ قدر ضرورت ان کی طرف دیکھنا جائز ہے' ٹکٹکی باندھ کر ان کی طرف نہ دیکھے اور یہ حکم صرف بے ریش لڑکے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ جو شخص بھی اس کی شہوت کا محل ہو' مرد ہو یا عورت اس کی طرف دیکھنا جائز نہیں۔

قرآن مجید کو مصحف کی ترتیب کے مطابق پڑھنا چاہیے مثلاً پہلے سورۂ فاتحہ' پھر سورۂ بقرہ' امام طبرانی' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں' انہیں بتایا گیا کہ ایک شخص الٹی قراءت کرتا ہے' فرمایا: اس کا دل الٹا ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۶۸) اس لیے کسی سورت کے آخر سے شروع تک الٹا پڑھنا سخت ممنوع ہے' البتہ بچوں کو تعلیم کے لیے آخری پارہ کی آخری سورتوں سے حفظ کی ابتداء کرانا جائز ہے۔ قرآن مجید کو مصحف سے دیکھ کر پڑھنا' زبانی پڑھنے سے افضل ہے کیونکہ مصحف میں دیکھنا بھی عبادت مقصودہ ہے لیکن اگر کسی شخص کا خضوع اور خشوع اور تدبر اور تفکر زبانی پڑھنے سے زیادہ ہوتا ہے تو اس کو زبانی پڑھنا افضل ہے' امام طبرانی نے حضرت عثمان بن عبداللہ بن اوس ثقفی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بغیر مصحف کے پڑھنے کے ہزار درجات ہیں اور مصحف میں دیکھ کر پڑھنے کے دو ہزار درجات ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۶۵) بعض صورتوں میں قرآن مجید کو آہستہ پڑھنا افضل ہے اور بعض صورتوں میں بلند آواز سے پڑھنا افضل ہے' آہستہ پڑھنا خدشہ ریا سے مامون ہے' اور جب یہ خطرہ نہ ہو تو بلند آواز سے پڑھنا افضل ہے' کیونکہ اس میں عمل زیادہ ہے اور اس کا فائدہ دوسروں تک پہنچتا ہے' اور اس سے پڑھنے والے کا دل بیدار اور اس کا ذہن متوجہ رہتا ہے' اور اس کو سننے کا ثواب بھی ملتا ہے' اس کی نیند دور ہوتی ہے اور اس کی تروتازگی زیادہ ہوتی ہے اور وہ غافلوں کو متنبہ کرتا ہے لیکن یہ فضیلت اس وقت ہے جب اس کے بلند آواز کے ساتھ پڑھنے سے کسی کی نیند' آرام' عبادت اور کام میں حرج اور خلل نہ ہو' قرآن مجید کو خوش الحانی کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ امام ابوداؤد اور امام نسائی وغیرہما نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی آوازوں کے ساتھ قرآن مجید کو مزین کرو۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۰۷)

البتہ قرآن مجید کو سازوں اور دھنوں کے تابع کر کے نہیں پڑھنا چاہیے اور نہ اس طرح کہ صیغہ بدل جائے یا لفظ حدود قراءت سے نکل جائے' جن فقہاء کرام نے قرآن مجید کو تغنی کے ساتھ پڑھنے سے منع کیا ہے اس کا یہی محمل ہے۔

قرآن مجید کو پڑھنا مطلقاً مستحب ہے مگر بعض احوال میں مکروہ ہے۔ نماز کے رکوع' سجود اور تشہد میں قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے' امام کے پیچھے قیام میں بھی قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے' بیت الخلاء اور حمام میں قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے' اونگھتے ہوئے اور جمعہ کے خطبہ کے وقت نمازیوں کا قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے۔ حالت طواف میں قرآن مجید پڑھنا امام مالک کے نزدیک مکروہ ہے اور جمہور علماء کے نزدیک جائز ہے۔ دوسری رکعت میں پہلی رکعت سے بہت زیادہ قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے' ایک یا دو آیتیں زیادہ ہوں تو حرج نہیں۔ اسی طرح نماز میں اتنی زیادہ قراءت کرنا جو مقتدیوں پر گراں اور دشوار ہو یہ بھی مکروہ ہے یا کسی ایک سورت کو معین کر لینا اور دوسری سورت پڑھنے کو ناجائز سمجھنا یہ بھی مکروہ ہے۔

جب کوئی شخص قرآن مجید پڑھ رہا ہو اور اس دوران کوئی بزرگ عالم دین' یا اس کا والد یا اس کا استاد آجائے تو اس کے احترام اور اکرام کے لیے کھڑا ہونا جائز ہے۔ (فتاویٰ قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ج ۳ ص ۴۲۲' مطبوعہ مطبع کبری بولاق' مصر' ۱۳۱۰ھ) اکرام اور تعظیم کے لیے قیام کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم' آپ کے اصحاب اور فقہاء تابعین اور علماء صالحین سے ثابت ہے' بہ شرطیکہ

اس میں ریا اور دنیاوی غرض نہ ہو۔

جب کوئی شخص چلتے ہوئے قرآن مجید پڑھ رہا ہو اور اس کا کسی قوم پر گزر ہو تو قراءت منقطع کر کے ان کو سلام کرے اور پھر سے قراءت شروع کر دے' اور مستحب یہ ہے کہ دوبارہ اعوذ باللہ پڑھے اور اگر کوئی شخص قرآن مجید پڑھنے والے کے پاس آئے تو اولیٰ یہ ہے کہ وہ اس کو سلام نہ کرے' اگر اس نے سلام کر دیا تو قاری اشارہ سے جواب دے اور اگر اس نے زبان سے جواب دیا تو دوبارہ اعوذ باللہ پڑھ لے اور اگر قرآن کریم پڑھنے کے دوران چھینک آئے تو الحمد للہ کہنا مستحب ہے۔

امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قرآن مجید کو ایک ماہ میں ختم کیا جائے اور سات دن سے کم میں ختم نہ کیا جائے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۵۶ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

قرآن مجید کو نماز میں ختم کرنا مستحب ہے یا سنت فجر میں ختم کرے' اور اگر غیر نماز میں ختم کرے تو دن یا رات کے اول حصہ میں ختم کرے' حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جب قرآن مجید ختم کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے دعا کرتے' بعض احادیث صحیحہ میں ہے کہ ختم قرآن کے وقت اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے' اور ختم قرآن کے وقت دعا کرنا مستحب ہے' اس وقت اپنے اہم کاموں اور عام مسلمانوں کی فلاح کے لیے دعا کرنی چاہیے۔ قرآن مجید کی یا مصحف کی تخفیف کرنا' یا اس کی تکذیب کرنا' یا اس کے کسی حرف پر انکار کرنا یا اس میں قصداً کسی حکم کو کم کرنا یا زیادہ کرنا یا تحریف کرنا کفر ہے' اور بغیر علم کے قرآن مجید کے معنی بیان کرنا یا اس کی تفسیر کرنا حرام ہے۔ امام ابوداؤد' حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اپنی رائے سے قرآن مجید میں کوئی بات کی اگر چہ وہ صحیح ہو پھر بھی اس نے خطا کی۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۸) قرآن مجید یاد کر کے اس کو بھول جانا سخت گناہ ہے۔ امام ابوداؤد' حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جس شخص نے بھی قرآن مجید پڑھ کر بھلا دیا وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے کوڑھ کی حالت میں ملاقات کرے گا۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۰۷) امام بخاری حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں نے فلاں فلاں آیت بھلا دی بلکہ یہ کہے کہ فلاں فلاں آیت نے مجھے بھلا دیا۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۵۳) قرآن مجید پڑھ کر دم کرنا جائز ہے۔ امام بخاری' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات کو سورہ اخلاص' سورہ فلق اور سورہ الناس پڑھ کر اپنی دونوں ہتھیلیوں پر دم کرتے' پھر ان ہتھیلیوں کو اپنے سر اور اپنے چہرے پر اور جہاں تک ہاتھ پہنچتا ان ہتھیلیوں کو جسم پر پھیرتے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۳۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

تفسیر کی کتابوں کو بے وضو ہاتھ لگانے کی تحقیق

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

تفسیر کی کتابیں مصحف کی مثل ہیں (قرآن مجید کی طرح ان کو بھی بلا وضو چھونا جائز نہیں ہے) باقی دیگر شرعی کتابوں کا یہ حکم نہیں ہے اور ماسوا تفسیر کے باقی دینی کتابوں کو بے وضو چھونا جائز ہے" "درر" میں "مجمع الفتاویٰ" سے اسی طرح منقول ہے۔ "سراج" میں لکھا ہے کہ مستحب یہ ہے کہ باقی شرعی کتابوں کو بھی بے وضو ہاتھ نہ لگائے' لیکن "اشباہ" میں یہ قاعدہ مذکور ہے کہ جب حلال اور حرام مجتمع ہوں تو حرام کو ترجیح دی جاتی ہے اور ہمارے اصحاب نے بے وضو تفسیر کی کتابوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت دی ہے اور انہوں نے یہ فرق نہیں کیا کہ اس کتاب میں اکثر حصہ تفسیر کا ہو یا قرآن مجید کا اور اگر وہ یہ فرق کرتے تو بہتر تھا۔

(در مختار علیٰ ہامش رد المختار ج ۱ ص ۱۱۹۔۱۱۸ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں تین اقوال ہیں:

(۱) بے وضو کے لیے مصحف (قرآن کریم) کو ہاتھ لگانا مکروہ (تحریمی) ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک اسی طرح احادیث اور کتب فقہ کو بھی بے وضو کا ہاتھ لگانا مکروہ ہے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ مکروہ نہیں ہے۔ (خلاصۃ الفتاویٰ) ''شرح المنیہ'' میں لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ احادیث اور کتب فقہ میں جو قرآن مجید کی آیات ہیں وہ بہ منزلہ تابع ہیں اور حدیث اور فقہ کی کتابوں کے مس کرنے والے کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ قرآن مجید کو مس کر رہا ہے۔

(۲) علامہ ابن ہمام نے ''فتح القدیر'' میں کہا ہے کہ تفسیر' حدیث اور فقہ کی کتابوں کو بے وضو چھونا بھی مکروہ ہے کیونکہ یہ کتابیں قرآن مجید کی آیات سے خالی نہیں ہوتیں۔ اس قول کے مطابق نحو کی شروحات کو بھی بے وضو ہاتھ لگانا مکروہ ہوگا کیونکہ ان میں بھی قرآن مجید کی آیات ہوتی ہیں (بلکہ بعض منطق کی کتابوں میں بھی قرآن مجید کی آیات ہوتی ہیں)۔

(۳) ''النہر الفائق'' میں مذکور ہے کہ جن کتابوں میں قرآن مجید کی آیات زیادہ ہوں ان کتابوں کو بے وضو چھونا مکروہ ہے اور جن کتابوں میں قرآن مجید کی آیات کم ہوں ان کو بے وضو چھونا مکروہ نہیں ہے کیونکہ اعتبار اکثر اور اغلب کا ہوتا ہے۔ اس بنا پر کتب تفسیر کو بے وضو چھونا مکروہ ہوگا اور باقی دینی کتابوں کو بے وضو چھونا مکروہ نہیں ہوگا' اور ان کتابوں میں بھی جس جگہ قرآن مجید کی آیات لکھی ہوں وہاں بے وضو ہاتھ نہ لگایا جائے۔

علامہ شامی نے اس تیسرے قول کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ تفسیر کی کتابوں میں قرآن مجید کی آیات کو بالقصد لکھا جاتا ہے بالتبع نہیں لکھا جاتا اس لیے یہ مصحف کے مشابہ ہیں۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۱۱۹۔ ۱۱۸ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

قرآن مجید کا اعجاز

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے' جو عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ یہ سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے نہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ○ (النساء: ۸۲)

تو کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اور اگر قرآن اللہ کے غیر کی جانب سے ہوتا تو وہ اس میں بہت اختلاف پاتے ○

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ○ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ○ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ○ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ؕ○ (الشعراء: ۱۹۵۔ ۱۹۲)

اور بے شک وہ (قرآن) رب العٰلمین کا نازل کیا ہوا ہے ○ جسے جبرئیل نے نازل کیا ○ آپ کے قلب پر تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں ○ واضح عربی زبان میں ○

قرآن مجید معجز کلام ہے' اور تمام جن و انس مل کر بھی اس کی نظیر لانا چاہیں تو وہ اس کی نظیر نہیں لا سکتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ. (بنی اسرائیل: ۸۸)

آپ کہیے کہ اگر تمام انسان اور جن قرآن کی مثل لانے پر جمع ہو جائیں تو وہ اس کی مثل نہیں لا سکتے۔

نیز فرمایا:

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ

کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے قرآن خود گھڑ لیا ہے آپ فرما دیجئے کہ پھر تم اس کی مثل دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ

صٰدِقِيْنَ ○ (ہود: ۱۳) اور اپنی مدد کے لیے اللہ کے سوا جس کو بلا سکتے ہو بلا لو اگر تم سچے ہو ○

اور فرمایا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۔ (البقرہ: ۲۳) اگر تم کو (اس کلام کے کلام ربانی ہونے میں) شک ہے جس کو ہم نے اپنے (محبوب) بندہ پر نازل کیا ہے تو اس کی مثل ایک سورت ہی لے آؤ۔

اور یہ بھی فرمایا:

فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۞ (الطور: ۳۴) انہیں چاہیے کہ وہ اس کی مثل کوئی بات (آیت) لے آئیں اگر وہ سچے ہیں ○

عدیم النظیر ہونے کے اعتبار سے قرآن مجید کا معجز ہونا

چودہ سو سال سے زیادہ گزر چکے ہیں اور دن بہ دن دنیا میں علوم وفنون کی ترقی ہو رہی ہے' اور اسلام کے مخالفین اور منکرین بھی بہت زیادہ ہیں' اس کے باوجود آج تک کوئی شخص قرآن مجید کی کسی ایک سورت یا کسی ایک آیت کی مثال نہیں لا سکا' اگر کسی شخص کی قدرت میں اس کی کسی ایک سورت یا کسی ایک آیت کی مثال لانا ممکن ہوتا تو وہ اب تک لا چکا ہوتا۔ قرآن مجید کی ہر سورت بلکہ ہر آیت ایک چیلنج ہے اور اس کی ہر آیت معجز ہے اور اس کی ہر آیت قرآن کریم کی صداقت' اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی روشن دلیل ہے۔

قرآن مجید کے معجز ہونے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ چودہ سو سال سے لے کر آج تک کوئی اس کی نظیر اور مثال نہیں لا سکا۔ علامہ طبری نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں صرف مواعظ (نصیحتیں) بیان کی ہیں' اور زبور میں صرف اللہ تعالیٰ کی حمد اور ثناء ہے اور انجیل میں صرف مثالیں بیان کی ہیں' اور ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کتاب نازل کی ہے اس میں مواعظ' حمد وثناء اور تمثیلات بھی ہیں اور وہ تمام خصوصیات ہیں جو کتب سابقہ میں تھیں اور ان میں مستزاد یہ ہے کہ قرآن مجید میں ایسے اصول اور احکام بیان کئے گئے ہیں جو عہد رسالت سے لے کر قیامت تک آنے والی تمام نسل انسانی کے نظام حیات کے لیے کافی اور وافی ہیں۔

فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے قرآن مجید کا معجز ہونا

قرآن مجید میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں ان کی عبارت ایسی فصیح وبلیغ ہے کہ بڑے بڑے فصحاء اور بلغاء حیران و ششدر رہ گئے اور ان کو یہ تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں' اللہ وحدہٗ لاشریک کا کلام ہے۔ قرآن مجید کے مضامین میں توحید و رسالت ہے' ہدایت ہے' ترغیب وترہیب ہے' وعد اور وعید ہے' امر اور زجر ہے' قصص ہیں' دلائل اور براہین ہیں' مثالیں ہیں' حقائق کائنات ہیں اور ان کے اسرار ہیں' ماضی اور مستقبل کے واقعات ہیں' غیب کی خبریں ہیں اور بہ کثرت پیش گوئیاں ہیں جو حرف بہ حرف صادق ہوئیں اور مسلسل صادق ہو رہی ہیں۔

قرآن مجید کے مضامین جس نظم اور عبارت میں بیان کئے گئے ہیں ان کے معجز ہونے کا اور انسان کی قدرت کے قاصر ہونے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک فصیح وبلیغ انسان جب ایک خطبہ یا قصیدہ لکھتا ہے تو وہ اس میں اپنی تمام صلاحیت بروئے کار لاتا ہے' پھر اس میں مسلسل غور کرتا رہتا ہے اور کئی لفظ حذف کرتا ہے' کئی جملے تبدیل کرتا ہے' لکھتا ہے' مٹاتا

ہے' پھر درج تصحیح کرتا ہے' پھر کسی اور شخص کو دکھاتا ہے اور وہ اس میں طبع آزمائی کرتا ہے اور اس کی تنقیح کرتا ہے اور اس میں غور وفکر کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے' پھر بھی حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں اب کوئی لفظ تبدیل نہیں کیا جاسکتا یا کوئی جملہ حذف نہیں کیا جاسکتا' اور قرآن مجید میں کسی ایک لفظ کو اس کی جگہ سے ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھنا چاہیں تو تمام لغت عرب کو چھاننے کے بعد بھی اس لفظ کا متبادل نہیں مل سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کلام معجز ہے اور انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر غور وفکر کے فی البدیہہ یہ کلام پیش کیا جبکہ آپ امی تھے' کسی مکتب میں لکھنے پڑھنے کبھی نہیں گئے تھے اور یہ ایسا کلام ہے کہ اس کی ہر آیت میں اعجاز ہے' اس سے معلوم ہوا کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

کفار عرب میں سے بعض لوگوں نے قرآن مجید کو جب پہلی بار سنا تو سنتے ہی اس کے اعجاز کو جان لیا اور فوراً مسلمان ہو گئے' اور بعض نے اس کے اعجاز کو جانا' لیکن عناداً کفر کیا' کسی نے کہا: یہ شعر ہے' کسی نے کہا: کہانت (جنوں کا کلام) ہے' کسی نے کہا: یہ سحر ہے۔ جن لوگوں نے قرآن مجید کو سنتے ہی اس کے اعجاز کو جان لیا ان میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں جو سورۂ طٰہٰ کی چند آیات سنتے ہی ہادی اسلام کی دہلیز پر قبول اسلام کے لیے جا پہنچے' اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ ہیں جو حم السجدہ کی ابتدائی چند آیات سنتے ہی مسلمان ہو گئے' اور جو قرآن مجید کے اعجاز کا ادراک کرنے کے باوجود کفر پر قائم رہے ان میں سے عتبہ ہے' اور ولید بن مغیرہ ہے۔ علامہ ابوالحیان اندلسی نے بیان کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ نے بنو مخزوم سے کہا: میں نے ابھی ابھی (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ایسا کلام سنا ہے جو کسی انسان کا کلام ہو سکتا ہے نہ جن کا' اس کلام میں شہد کی شیرینی ہے اور سمندروں کی روانی ہے' اس کی بلندی ثمر آور ہے اور اس کی گہرائی چشموں کا منبع ہے' یہ کلام سب کلاموں پر فائق اور غالب ہے اور اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا' اس کے باوجود وہ نفسانیت اور حسد سے مغلوب ہو گیا اور یہ کہہ کر ایمان نہیں لایا:

فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝ (المدثر: ۲۵۔۲۴)

پس اس نے کہا: یہ وہی جادو ہے جو پہلے سے ہوتا چلا آیا ہے ۝ یہ محض بشر ہی کا قول ہے ۝

(البحر المحیط ج ۱ ص ۱۸' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

کمی اور زیادتی نہ ہو سکنے کے اعتبار سے قرآن مجید کا معجز ہونا

قرآن مجید نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن کریم میں سے کسی لفظ کو کم کیا جاسکتا ہے نہ اس میں کسی لفظ کو زیادہ کیا جاسکتا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر: ۹)

بے شک ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں ۝

اس آیت میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کا محافظ ہے اس لیے اس میں کوئی سورت بلکہ کوئی آیت بلکہ کوئی لفظ بھی کم نہیں ہو سکتا۔ اس چیلنج کو چودہ صدیاں گزر گئیں اور اسلام کا کٹر سے کٹر مخالف بھی یہ ثابت نہیں کر سکا کہ قرآن مجید میں فلاں سورت یا فلاں آیت یا فلاں لفظ کم ہو گیا ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ (حم السجدۃ: ۴۲۔۴۱)

اور بے شک یہ قرآن بہت معزز کتاب ہے ۝ باطل (غیر قرآن) اس میں سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں کسی لفظ کو بڑھایا نہیں جاسکتا اور چودہ سو سال گزر چکے ہیں اور کوئی بڑے

سے بڑا منکر اسلام بھی یہ ثابت نہیں کر سکا کہ قرآن مجید کی فلاں آیت میں تحریف ہوگئی اور پہلے قرآن مجید میں یہ لفظ نہیں تھا اور اس کو بعد میں ملایا گیا' اور قرآن مجید میں کسی لفظ کے کم نہ ہو سکنے اور زیادہ نہ ہو سکنے کے ان دونوں دعووں کی صداقت قرآن مجید کی حقانیت کی دلیل ہے اور یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے۔

پیش گوئیوں کے اعتبار سے قرآن مجید کا معجز ہونا

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ○ (البقرہ: ۹۵۔ ۹۴)

آپ کہیے: اگر اللہ کے نزدیک دار آخرت' لوگوں کے سوا صرف تمہارے لیے مخصوص ہے تو اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو ○ اور جو کام وہ پہلے کر چکے ہیں ان کی وجہ سے وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے ○

اس آیت میں قرآن نے پیش گوئی فرمائی ہے کہ یہودی ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے' یہودی قرآن کے منکر اور مخالف تھے' ان کو چاہیے تھا کہ وہ اسلام اور قرآن کی تکذیب کے لیے موت کی تمنا کرتے' لیکن وہ موت کی تمنا نہ کر سکے اور قرآن مجید کا صدق ظاہر ہو گیا اور یہ قرآن مجید کا عظیم معجزہ ہے کہ قرآن نے مخالفین کے دلوں کے متعلق پیش گوئی کی اور وہ قرآن مجید کی پیش گوئی کے خلاف دل میں خیال تک نہ لا سکے!

نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ (البقرہ: ۱۴۲)

اب یہ جاہل لوگ کہیں گے کہ مسلمان جس قبلہ پر (پہلے) تھے اس سے ان کو کس نے پھیر دیا۔

اس آیت میں قرآن مجید نے یہودیوں کے متعلق یہ پیش گوئی کی ہے کہ وہ ضرور تحویل قبلہ پر اعتراض کریں گے' یہودی جو قرآن کے منکر اور مخالف تھے ان کو چاہیے تھا کہ وہ اس پر کوئی اعتراض نہ کرتے اور کہتے کہ دیکھو قرآن جھوٹا ہو گیا۔ قرآن نے کہا تھا کہ یہ تحویل قبلہ پر اعتراض کریں گے اور ہم نے کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن ہوا وہی جس کی قرآن نے پیش گوئی کی تھی' قرآن مجید نے مخالفین کی زبانوں کے متعلق پیش گوئی کی کہ یہ فلاں بات کہیں گے اور انہوں نے وہی بات کہی اور قرآن مجید کا صدق ظاہر ہو گیا' اور یہ قرآن کریم کا عظیم معجزہ ہے کہ مخالفین کی زبانوں اور ان کے دلوں کے ذریعہ قرآن مجید کی تصدیق ہوئی۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ. (المائدہ: ۴۳)

اور وہ آپ کو کیسے منصف بنائیں گے حالانکہ ان کے پاس تورات ہے' جس میں اللہ تعالیٰ کا حکم موجود ہے۔

اس آیت میں حکم اللہ سے مراد رجم ہے' یعنی شادی شدہ زانی کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ قرآن مجید نے یہ دعویٰ کیا کہ تورات میں یہ حکم موجود ہے' یہود آئے دن تورات میں تحریف کرتے رہتے ہیں' اگر وہ چاہتے یا چاہیں تو تورات سے رجم کا حکم نکال دیں' اور پھر کہیں کہ دیکھو قرآن نے کہا تھا کہ تورات میں رجم کا حکم ہے' حالانکہ اس میں یہ حکم نہیں ہے' کتنی صدیاں گزر گئیں تورات میں کتنی تبدیلی اور تحریف ہوئی اور کتنی آیتیں نکال دی گئیں لیکن رجم کی آیت تورات میں ہر دور میں موجود رہی اور یہ قرآن مجید کی صداقت کی زبردست دلیل ہے اور قرآن مجید کا عظیم معجزہ ہے۔

تورات کی حسب ذیل آیات میں رجم کا حکم موجود ہے:
پر اگر یہ بات سچی ہو کہ لڑکی میں کنوارے پن کے نشان نہیں پائے گئے تو وہ اس لڑکی کو اس کے باپ کے گھر کے دروازہ پر نکال لائیں اور اس کے شہر کے لوگ اسے سنگسار کریں کہ وہ مر جائے کیونکہ اس نے اسرائیل کے درمیان شرارت کی کہ اپنے باپ کے گھر میں فاحشہ پن کیا۔ یوں تو ایسی برائی کو اپنے درمیان سے دفع کرنا۔ (استثناء: باب ۲۲' آیت: ۲۱-۲۰)
اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہو گئی اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرے' تو تم ان دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں۔ لڑکی کو اس لیے کہ وہ شہر میں ہوتے ہوئے نہ چلائی اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنے ہمسایہ کی بیوی کو بے حرمت کیا۔ یوں تو ایسی برائی کو اپنے درمیان سے دفع کرنا۔
(استثناء: باب ۲۲' آیت: ۲۴-۲۳)

یوحنا کی انجیل میں بھی تورات کے حوالے سے رجم کا حکم موجود ہے: (یوحنا: باب ۸' آیت: ۵)
اللہ تعالیٰ نے فرعون کے متعلق فرمایا:
فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً ۚ سو آج ہم تیرے (بے روح) جسم کو بچالیں گے تا کہ تو (یونس: ۹۲) اپنے بعد والوں کے لیے (عبرت) کا نشان ہو جائے۔

جب فرعون سمندر میں غرق ہو گیا تو چاہیے تھا کہ فطرت کے عادی نظام کے مطابق سمندر کی موجیں اسے دور کہیں بہا کر لے جاتیں اور سمندر کا کھارا پانی اس کے گوشت اور پوست کو گلا دیتا اور سمندری جانور اس کو کھا لیتے' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے جسم کو باقی رکھا تا کہ دنیا دیکھ لے کہ خدائی کے دعوے دار کا کیا انجام ہے' سو سمندری موجوں نے اس کے بے جان جسم کو ایک ٹیلہ پر پھینک دیا' یہ جگہ آج بھی جبل فرعون کے نام سے مشہور ہے' اس کی لاش کو دیکھ کر بنو اسرائیل کو بھی اس کی موت کا یقین ہو گیا اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے بھی اس میں اللہ کی قدرت پر دلیل ہے کیونکہ مصر کے عجائب گھر میں اس کی لاش آج بھی محفوظ ہے اور ماہرین آثار قدیمہ کی تحقیق ہے کہ یہی وہ فرعون (رعمیس ثانی یا منفتاح دوم) ہے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ ہوا تھا۔ ہر چند کہ قرآن مجید نے یہ نہیں کہا کہ قیامت تک کے لوگوں کے لیے اس کا جسم باقی اور محفوظ رہے گا اور بہ طور نشان عبرت قائم رہے گا لیکن قرآن مجید نے یہ کہا ہے کہ وہ فرعون کے (بے جان) جسم کو بعد والوں کے لیے عبرت کا نشان بنا دے گا۔ یہ فرعون ۱۲۶۳ قبل مسیح میں غرق ہوا (اردو دائرۃ المعارف ج ۱۵ ص ۲۷۵) اور یہ ۱۹۹۶ء ہے اور اس کی موت کو اب تین ہزار دو سو انسٹھ سال گزر چکے ہیں اور اس کا جسم اب بھی مصر کے عجائب خانہ میں موجود ہے اور دیکھنے والوں کے لیے یہ اب بھی عبرت کا نشان ہے۔ مصر پر غیر مسلموں کی حکومت بھی رہی اور بہ ظاہر ان کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ فرعون کی لاش کو تباہ و برباد اور نیست و نابود کر دیتے لیکن یہ قرآن کریم کا عظیم معجزہ ہے کہ اس نے مخالفین اسلام اور دشمنان قرآن کے ہاتھوں بھی فرعون کی لاش کی حفاظت کرائی اور قرآن مجید کی پیش گوئی کے مطابق وہ آج بھی بعد والی نسلوں کے لیے عبرت بنا ہوا ہے۔

حقائق کائنات کی خبر دینے کے اعتبار سے قرآن کا معجز ہونا

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:
وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝ (الانبیاء: ۳۳) اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو پیدا کیا' (سورج اور چاند) ہر ایک (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہا ہے ۝

نیز فرمایا:

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ (الرعد: ۲، فاطر: ۱۳)

اور اس (اللہ تعالیٰ) نے سورج اور چاند کو ایک نظام کا پابند کیا' (ان میں سے) ہر ایک مقرر میعاد تک چل رہا ہے۔

اور فرمایا:

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ (یٰس: ۴۰۔۳۸)

اور سورج اپنے مقرر راستے پر چلتا رہتا ہے' یہ زبردست علیم ذات کا مقرر کیا ہوا نظام ہے O اور ہم نے چاند کی بھی منزلیں مقرر کردی ہیں حتیٰ کہ وہ ان سے گزرتا ہوا کھجور کی پرانی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے O نہ سورج چاند کو پکڑ سکتا ہے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے' اور ہر ایک (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہا ہے O

قدیم فلسفیوں کا یہ نظریہ تھا کہ زمین ساکن ہے اور چاند اور سورج اور دیگر کواکب سیارہ حرکت کررہے ہیں' اس کے بعد سائنس دانوں نے یہ کہا کہ زمین متحرک ہے اور چاند سورج وغیرہ ستارے ساکن ہیں۔ مجھے یاد ہے آج سے چالیس سال پہلے میں نے ایک سائنس کے طالب علم سے کہا کہ قرآن میں ہے: سورج اور چاند متحرک ہیں تو اس نے کہا: یہ غلط ہے' سورج اور چاند ساکن ہیں۔ میرا اس وقت بھی یہی ایمان تھا کہ صحیح وہی ہے جو قرآن نے کہا ہے اور اب سائنس دانوں نے آلات رصدیہ سے مشاہدہ کرکے یہ تحقیق کرلی ہے کہ زمین بھی متحرک ہے اور چاند اور سورج بھی متحرک ہیں۔ جس حقیقت کو سائنس دانوں نے برسہا برس کے مشاہدات' تجربوں اور تحقیق سے پایا اب سے چودہ سو سال پہلے ایک امی نبی نے بغیر کسی رصد گاہ کے یہ بتایا کہ سورج اور چاند دونوں حرکت کررہے ہیں اور ہر سیارہ اپنے مدار میں تیر رہا ہے' زمین کا جو حصہ سورج کے سامنے آجاتا ہے وہاں دن ہوتا ہے اور جو حصہ اس سے چھپا رہتا ہے وہاں رات ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا چودہ سو سال بعد سائنس نے اس کی تصدیق کردی ہے' کیا یہ اس بات کی واضح دلیل نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو کچھ فرمایا تھا یہ کسی انسان کا کلام نہیں تھا بلکہ وحی الٰہی تھی اور یہ قرآن کریم کا عظیم معجزہ ہے کہ جو کچھ قرآن نے کہا تھا چودہ سو سال بعد علم اور سائنس نے اس کی حرف بہ حرف تصدیق کردی۔

نیز قرآن مجید نے فرمایا:

يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ (الزمر: ۶)

وہ تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تین تاریکیوں میں تم کو پیدا کرتا ہے' ایک پیدائش کے بعد دوسری پیدائش۔

جس وقت علم تشریح الاعضاء کی ابتداء نہیں ہوئی تھی اس وقت قرآن مجید نے یہ بتایا تھا کہ رحم کے اندر تین تاریکیوں میں انسان کی تخلیق ہوتی ہے اور جدید میڈیکل سائنس نے اب انکشاف کیا ہے کہ رحم کے اندر تین پردوں میں انسان کی تخلیق ہوتی ہے۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝ (الرحمٰن: ۲۰۔۱۹)

اس نے (تلخ اور شیریں) دو سمندر رواں کردیئے' جو ایک دوسرے سے (بہ ظاہر) ملے ہوئے ہیں O ان کے درمیان ایک حجاب ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے O

حاتم دیالا نے لکھا ہے کہ فرانسیسی سائنس دان کوسٹیو (COSTEAU) جو سمندری تحقیقات میں عالمی شہرت رکھتے ہیں' نے یہ دریافت کیا کہ بحیرہ روم اور بحر اوقیانوس' کیمیاوی اور حیاتیات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں' اور ان کے ملنے کے مقام پر بھی یہ ایک دوسرے میں خلط ملط نہیں ہوتے' اور جبل الطارق (جبرالٹر) کی باڑھ دونوں کو الگ کرتی ہے' اس تحقیق کے بعد جب کوسٹیو کو ان قرآنی آیات کا علم ہوا تو وہ قرآن مجید کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے مسلمان ہو گیا۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

قرآن کریم کا معجز ہونا دس اعتبار سے ہے:

(۱) قرآن مجید ایسی حسین نظم اور عبارت میں نازل ہوا ہے جو بالکل منفرد ہے' اس سے پہلے زبان عرب میں اس کی کوئی مثال تھی نہ کسی اور زبان میں' کیونکہ اس سے پہلے اصناف کلام میں' یا شعر تھا' یا کہانت (جنوں کا کلام) تھی یا سحر تھا' صحیح مسلم میں ہے' حضرت ابوذر کے بھائی حضرت انیس نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا: مکہ میں میری ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو تمہارے دین پر ہے' ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کو اللہ نے رسول بنایا ہے' میں نے پوچھا کہ لوگ ان کو کیا کہتے ہیں؟ اس نے کہا: لوگ ان کو شاعر' کاہن اور ساحر کہتے ہیں' حضرت انیس خود شاعر تھے' انہوں نے کہا: بہ خدا میں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے یہ کاہنوں کا قول نہیں ہے' اور میں نے اس کلام کا شعر کی تمام اصناف اور اقسام سے تقابل کر کے دیکھا' یہ شعر نہیں ہے' بہ خدا! وہ سچے ہیں اور لوگ جھوٹے ہیں۔ اسی طرح جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات پڑھیں:

حٰمٓ ۝ تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ۝ (حم السجدۃ: ۴۔۱)

حم ۝ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ کلام ہے' جو نہایت رحم کرنے والا اور بے حد رحیم ہے ۝ یہ کتاب ہے جس کی آیتیں وضاحت سے بیان کی گئی ہیں' درآں حالیکہ یہ عربی قرآن (عربی میں پڑھا جاتا ہے) علم والے لوگوں کے لیے ۝ خوشخبری دینے والا ہے اور ڈرانے والا ہے' سو اکثر لوگوں نے (اس سے) منہ پھیر لیا تو وہ نہیں سنتے ۝

تو عتبہ بن ربیعہ نے ان آیات کو سن کر کہا کہ یہ جادو ہے نہ شعر ہے اور اس نے کہا: اس نے فصاحت اور بلاغت میں قرآن کی طرح کوئی اور کلام نہیں سنا' اور اس نے قرآن مجید کے معجز ہونے کا اقرار کر لیا۔

(۲) قرآن مجید کا اسلوب کلام عرب کے تمام اسالیب سے مختلف ہے۔

(۳) قرآن مجید کے خطاب میں ایسی جلالت اور عظمت ہے جو کسی اور خطاب میں متصور نہیں ہے' جیسا کہ ان آیات سے ظاہر ہے:

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ ۝ (ق: ۳۔۱)

ق' قرآن کریم کی قسم ۝ بلکہ ان کو اس پر تعجب ہوا کہ انہی میں سے ایک ڈرانے والا آ گیا تو کافروں نے کہا: یہ عجیب بات ہے ۝ جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو کیا دوبارہ زندہ ہوں گے؟) یہ لوٹنا تو فہم سے بعید ہے ۝

نیز فرمایا:

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○ (المومن:۱۶) آج کس کی بادشاہی ہے؟ صرف اللہ کی ہے جو واحد ہے سب پر غالب ہے○

ابن الحصاء نے کہا: یہ حسین نظم منفرد اسلوب اور جلالت خطاب ہر سورت بلکہ ہر آیت میں لازم ہیں اور ان تین اوصاف سے قرآن مجید کی ہر سورت تمام انسانوں کے کلام سے ممتیز ہے اور انہی اوصاف کے ساتھ قرآن مجید کی نظیر لانے کا چیلنج کیا گیا ہے اور ہر سورت میں یہ تین اوصاف الگ الگ اطوار سے بیان کیے گئے ہیں۔ سورہ کوثر قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورت ہے اس میں بھی یہ تینوں امور بہ طریق اتم موجود ہیں اور اس میں غیب کی خبریں بھی ہیں ایک خبر یہ ہے کہ آپ کو کوثر دی جائے گی اور یہ اس کو مستلزم ہے کہ آپ کے پیروکار دنیا میں تمام رسولوں کے پیروکاروں سے زیادہ ہوں گے اور فی الواقع ایسا ہی ہوا دوسری ولید بن مغیرہ کے متعلق یہ پیش گوئی ہے کہ وہ مقطوع النسل ہوگا حالانکہ اس آیت کے نزول سے پہلے وہ بہت مالدار اور کثیر الاولاد تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے مال اور اولاد کو ہلاک کر دیا اور اس کی نسل منقطع کر دی۔

(۴) قرآن مجید میں عربی زبان کے مطابق ایسا تصرف ہے کہ ہر کلمہ اور حرف اپنی جگہ پر صحیح ہے اور کسی کلمہ اور حرف کو اس کی جگہ سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے اور بعثت سے پہلے آپ نے کوئی کتاب پڑھی تھی اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھا تھا پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کے واقعات بیان کیے اور گزشتہ اقوام کے واقعات پڑھے اور اہل کتاب کے سوالات کے جوابات دیئے انہوں نے بہ طور چیلنج کے آپ سے اصحاب کہف حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا ماجرا اور ذوالقرنین کا حال پوچھا اور آپ نے ان کا صحیح صحیح واقعہ بیان کر دیا حالانکہ آپ ایک ان پڑھ قوم سے مبعوث ہوئے تھے اور خود امی تھے کسی مکتب میں گئے تھے نہ کسی استاد سے پڑھا تھا نہ کسی کتاب کا مطالعہ کیا تھا اس لیے آپ کا یہ دعویٰ سچا ہو گیا کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

(۶) قرآن مجید کے وعدوں کا سچا اور پورا ہونا اللہ تعالیٰ نے جتنے وعدے کیے ہیں ان سب کا پورا ہونا مشاہدہ میں آ چکا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کفار آپ کو بے وطن کریں گے اور اللہ آپ کی مدد فرمائے گا اور جو وعدے کسی شرط کے ساتھ معلق کیے گئے وہ اس شرط پر پورے ہوئے مثلاً:

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ (الطلاق:۳) اور جو اللہ پر توکل کرے تو وہ اسے کافی ہے۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ (الطلاق:۲) اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کے لیے نجات کا راستہ بنا دے گا○

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ (الانفال:۶۵) اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب ہو جائیں گے۔

(۷) قرآن کریم نے مستقبل کے واقعات کے متعلق ایسی خبریں دی ہیں جن کو وحی کے سوا جاننے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ (الفتح:۲۸) وہ (اللہ) ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین تمام دینوں پر غالب آجائے گا' اور فی الواقع ایسا ہو گیا' حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما جب کسی کافر قوم پر حملہ کرتے تو مسلمان لشکر کو یہ باور کرا دیتے کہ انہی کو غلبہ حاصل ہو گا' حتیٰ کہ وہ پے در پے فتوحات حاصل کرتے رہے اور شرق و غرب اور بحر و بر میں اسلام پھیل گیا۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ. (الفتح: ۲۷)

بے شک اللہ نے اپنے رسول کو حق کے ساتھ سچا خواب دکھایا کہ اللہ کے چاہنے سے تم ضرور بہ ضرور مسجد حرام میں امن کے ساتھ داخل ہو گے۔

اور آٹھ ہجری کو فتح مکہ کے دن ایسا ہو گیا۔

الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۗ.

الم O اہل روم (فارس سے) شکست کھا گئے O قریب کی زمین میں اور وہ اپنی شکست کے بعد عنقریب فتح یاب ہوں گے O چند سالوں میں۔ (الروم: ۴-۱)

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اہل فارس بہت طاقتور اور رومی ان کے مقابلہ میں بہت کمزور تھے اور اس وقت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رومی ایرانیوں کو شکست دیں گے' لیکن چند سال بعد وہی ہوا جس کی قرآن نے پیش گوئی کی تھی۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ. (الانفال: ۷)

اور جب اللہ نے تم سے وعدہ فرمایا کہ دو گروہوں میں سے ایک گروہ یقیناً تمہارے لیے ہے۔

ایک گروہ کفار کا تجارتی قافلہ تھا جس پر قبضہ سے مسلمانوں کو مال و دولت کی فراوانی حاصل ہوتی' اور دوسرا گروہ کفار کا لشکر تھا جس پر فتح حاصل کرنے سے مسلمانوں کی ہیبت کفار پر چھا جاتی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رجحان کے پیش نظر مسلمانوں نے لشکر کفار سے مقابلہ کا فیصلہ کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق ان کو فتح عطا فرمائی:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠. (النور: ۵۵)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے' ان سے اللہ نے وعدہ فرمایا کہ وہ انہیں زمین میں ضرور بہ ضرور خلافت دے گا' جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرام نے ایمان اور اعمال صالحہ کی اعلیٰ روایات قائم کیں اور اللہ تعالیٰ نے خلفاء راشدین کی خلافت کو روئے زمین پر عرصہ دراز تک قائم رکھا اور جب تک مسلمان اسلام پر کاربند رہے اور تبلیغ اسلام میں سرگرم رہے اللہ تعالیٰ نے ان کو حکومت عطا کی اور زمانہ میں سرخ رو رکھا۔ (برصغیر میں مسلمانوں کی طویل غلامی کا باعث یہ تھا کہ وہ جذبہ جہاد سے عاری ہو چکے تھے' اور اپنی حکمرانی کے طویل دور میں تبلیغ اسلام کو چھوڑ بیٹھے تھے)۔

(۸) قرآن مجید میں حلال اور حرام اور دیگر احکام شرعیہ کا بیان ہے جو نوع انسانی کے لیے مکمل دستور حیات ہے۔

(۹) قرآن مجید میں ایسی بلیغ حکمتیں بیان کی گئی ہیں جو عادۃً ایک انسان نہیں بیان کر سکتا۔

(۱۰) قرآن مجید میں تناسب اور یکسانیت ہے اور اس میں ظاہراً اور باطناً کوئی اختلاف نہیں ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (النساء: ۸۲)

اور اگر قرآن اللہ کے غیر کی جانب سے ہوتا تو وہ ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے O

(علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۷۵۔ ۷۳ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ)

قرآن مجید میں تناسب دو اعتبار سے ہے: ایک تو یہ ہے کہ قرآن مجید کی تمام آیات فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے معجز ہیں اور کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جو فصاحت اور بلاغت میں درجہ اعجاز سے کم ہو اس کے برعکس انسان کے کلام میں عادۃً یکسانیت نہیں ہوتی 'بعض جملے اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں اور بعض سرسری ہوتے ہیں' بعض کتابوں میں شروع شروع میں تو بہت تحقیق ہوتی ہے اور بعد میں محض بھرتی ہوتی ہے' اسی طرح شروحات میں ابتداء میں تو بہت تفصیل کی جاتی ہے اور بعد میں صرف برائے نام شرح ہوتی ہے' اور اول تا آخر پوری کتاب میں ایک معیار کو قائم رکھنا یہ انسان کے بس میں نہیں ہے' یہ صرف اسی قادر اور قیوم کے کلام کا اعجاز ہے' اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان نسیان اور خطاء کا پتلا ہے وہ ایک جگہ کچھ لکھتا ہے اور دوسری جگہ کچھ لکھ دیتا ہے جو اس کے خلاف ہوتا ہے' اس لیے تناقض اور اختلاف سے مبرا ہونا یہ اللہ رب العزت ہی کے کلام کو زیبا ہے اور اسی کے کلام کا خاصہ ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب (قرآن مجید) کے سوا ہر کتاب کی عصمت کا انکار فرماتا ہے۔

(درمختار علی ہامش ردالمختار ج ۱ ص ۲۵ مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ استنبول ۱۳۲۷ھ)

علامہ شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز کے سوا کسی کتاب کے لیے عصمت کو مقرر نہیں کیا یا کسی اور کتاب کی عصمت پر راضی نہیں ہے' یہ صرف اسی کی کتاب کی شان ہے جس کے حق میں فرمایا:

لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ (حٰمٓ السجدۃ: ۴۲) اس کتاب میں باطل سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔

سو قرآن مجید کے علاوہ دوسری کتابوں میں خطائیں اور لغزشیں واقع ہوتی ہیں' کیونکہ وہ انسان کی تصنیفات ہیں اور خطا اور لغزش انسان کی سرشت ہے۔

علامہ عبدالعزیز بخاری نے ''اصول بزدوی'' کی شرح میں لکھا ہے کہ بویطی نے امام شافعی سے روایت کیا ہے کہ امام شافعی نے کہا: میں نے اس کتاب کو تصنیف کیا ہے' میں نے اس میں صحت اور صواب کو ترک نہیں کیا لیکن اس میں ضرور کوئی نہ کوئی بات اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہوگی' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (النساء: ۸۲) اور اگر قرآن اللہ کے غیر کی جانب سے ہوتا تو لوگ اس میں ضرور بہت اختلاف پاتے ۝

لہٰذا تم کو اس کتاب میں جو بات کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ملے اس کو چھوڑ دو' کیونکہ میں کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف رجوع کرنے والا ہوں۔ مزنی بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام شافعی کی کتاب ''الرسالۃ'' ان کے سامنے اسی مرتبہ پڑھی' اور ہر مرتبہ امام شافعی اُس میں کسی خطاء پر مطلع ہوئے' بالآخر امام شافعی نے فرمایا: اب تصحیح کو چھوڑ دو' اللہ تعالیٰ اس بات سے انکار فرماتا ہے کہ اس کی کتاب کے سوا اور کوئی کتاب صحیح ہو۔

(ردالمختار ج ۱ ص ۲۶ مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ استنبول ۱۳۲۷ھ)

نسخ کی تحقیق

علوم قرآن میں نسخ بھی ایک اہم اور معرکۃ الآراء موضوع ہے' ہم اس سلسلہ میں پہلے نسخ کا لغوی اور شرعی معنی بیان کریں گے پھر نسخ میں مذاہب اسلامیہ اور بعض متجددین کے نظریات کا ذکر کریں گے اس کے بعد ''نسخ القرآن بالقرآن ' نسخ القرآن بالسنۃ' نسخ السنۃ بالقرآن '' اور '' نسخ السنۃ بالسنۃ '' کا تفصیل سے ذکر کریں گے اور مثالوں اور شواہد سے ان چاروں قسموں کی وضاحت کریں گے' اور اس سلسلہ میں اہل حق کے نظریہ پر دلائل پیش کریں گے اور مخالفین کے شبہات کا ازالہ کریں گے۔ فنقول و باللہ التوفیق.

نسخ کا لغوی معنی

علامہ مجد الدین فیروز آبادی لکھتے ہیں:

نسخ کا معنی ہے: کسی چیز کو زائل اور متغیر کرنا' کسی چیز کو باطل کر کے دوسری چیز کو اس کا قائم مقام کرنا۔

(قاموس ج ۱ ص ۵۳۳ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۲ھ)

علامہ زبیدی حنفی لکھتے ہیں:

عرب کہتے ہیں: ''نسخت الشمس الظل '' سورج نے سائے کو منسوخ کر دیا' یعنی سائے کو زائل کر دیا' سائے کو لے گیا' ایک آیت نے دوسری آیت کو منسوخ کر دیا' یعنی اس کے حکم کو زائل کر دیا اور نسخ کا معنی ہے: ایک چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا' لیث نے کہا: نسخ کی تعریف یہ ہے کہ جس چیز پر پہلے عمل کیا جاتا تھا اس کو زائل کر دیا جائے اور کسی نئے کام پر عمل کیا جائے' فراء نے کہا: نسخ یہ ہے کہ پہلے ایک آیت پر عمل کیا جائے' پھر دوسری آیت نازل ہو تو اس پر عمل کیا جائے اور پہلی آیت پر عمل کو ترک کر دیا جائے اور ابن الاعرابی نے کہا: نسخ یہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز سے تبدیل کر دیا جائے۔

(تاج العروس ج ۲ ص ۲۸۲ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

نسخ کا شرعی معنی

امام رازی لکھتے ہیں:

ناسخ وہ دلیل شرعی ہے' جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ناسخ سے پہلے جو حکم کسی دلیل شرعی سے ثابت تھا وہ حکم اب نہیں ہے اور نسخ کی یہ دلیل پہلے حکم کی دلیل سے متاخر ہوتی ہے اور اگر یہ ناسخ نہ ہوتا تو وہی حکم ثابت رہتا۔

(تفسیر کبیر ج ۱ ص ۴۳۳ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

نسخ یہ ہے کہ ایک دلیل شرعی کے بعد ایک اور دلیل شرعی آئے جو پہلی دلیل شرعی کے حکم کے خلاف کو واجب کرے۔

(توضیح تلویح ج ۲ ص ۳۱ 'مطبوعہ دار الکتب العربیہ الکبری' مصر)

علامہ میر سید شریف لکھتے ہیں:

صاحب شرع کے حق میں کسی حکم شرعی کی انتہاء کو بیان کرنا نسخ ہے' اس حکم کی انتہا اللہ تعالیٰ کے نزدیک معلوم ہوتی ہے' مگر ہمارے علم میں اس حکم کا دوام اور استمرار ہوتا ہے اور ناسخ سے ہمیں اس حکم کی انتہا معلوم ہوتی ہے' اس لیے ہمارے حق میں نسخ تبدیل اور تغییر سے عبارت ہے۔ (کتاب التعریفات ص ۱۰۶ 'مطبوعہ المطبعۃ الخیریۃ' ۱۳۰۶ھ)

علامہ محمد عبد العظیم زرقانی لکھتے ہیں:

کسی حکم شرعی کو دلیل شرعی سے ساقط کر دینا نسخ ہے۔ (مناہل العرفان ج ۲ ص ۱۰۷ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

نسخ میں مذاہب

امام رازی لکھتے ہیں:

ہمارے نزدیک نسخ عقلاً جائز ہے اور دلائل سمعیہ سے نسخ ثابت اور واقع ہے' اس میں یہود کا اختلاف ہے' بعض یہود نے نسخ کا عقلاً انکار کیا اور بعض یہود نے نسخ کو عقلاً جائز کہا اور سمعاً انکار کیا' بعض مسلمانوں سے بھی نسخ کا انکار منقول ہے' جمہور مسلمین نے نسخ کے جواز اور وقوع پر اس سے استدلال کیا ہے کہ دلائل سے حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ثابت ہے اور جب تک یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ آپ سے پہلے کی تمام شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں اس وقت تک آپ کی نبوت اور شریعت ثابت نہیں ہوگی اس لیے قطعی طور پر نسخ واقع ہے۔

یہود کے خلاف نسخ پر حجت یہ ہے کہ تورات میں ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی ذریت کے لیے تمام جانور حلال کر دیئے تھے' پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل پر بہت سے جانور حرام کر دیئے' دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام بہن کا بھائی سے نکاح کر دیتے تھے اور اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں اس کو حرام کر دیا گیا۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۴۳۳۔ ۴۳۴ 'مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علامہ محمد عبدالعظیم زرقانی لکھتے ہیں:

نصاریٰ نے بھی نسخ کا انکار کیا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا: آسمان اور زمین زائل ہو جائیں گے اور میرا کلام زائل نہیں ہوگا' اس کا اولاً جواب یہ ہے کہ جو کتاب ان کے ہاتھوں میں ہے ہم اس کو وہ انجیل تسلیم نہیں کرتے جو حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئی تھی' کیونکہ اس میں تاریخی واقعات ہیں جن کو بعض عیسائیوں نے وضع کیا ہے' جس میں حضرت مسیح کی ولادت' ان کی نشوونما' ان کی دعوت' ان کے سفر' ان کے معجزات اور ان کے وعظ اور مناظرات کا ذکر ہے' اور اس میں ان کے صلیب پر چڑھائے جانے کا بیان ہے اور ان واقعات کے راویوں کی کوئی سند نہیں ہے اور نہ ان کے ضبط اور اتصال کا بیان ہے۔

اور برتقدیر تسلیم حضرت مسیح علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نبوت منسوخ نہیں ہوگی نہ کہ ان کی شریعت' اور متی کی انجیل میں حضرت مسیح کا یہ ارشاد مذکور ہے کہ آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: امتوں کے راستوں پر نہ جاؤ اور سامریوں کے شہر میں نہ داخل ہو' اور مرقس کی انجیل میں مذکور ہے: "تمام عالم میں جاؤ" اور قول ثانی قول اول کا ناسخ ہے۔

(مناہل العرفان ج ۲ ص ۱۰۱۔ ۱۰۰ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

نیز علامہ زرقانی لکھتے ہیں:

اہل اسلام میں سے ابو مسلم نے نسخ کا انکار کیا ہے اور ان کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۝ (حٰم السجدۃ: ۴۲)

اس کے پاس باطل نہیں آسکتا' اس کے سامنے سے نہ اس کے پیچھے سے' یہ حکمت والے حمد کیے ہوئے (رب) کی طرف سے اتاری ہوئی (کتاب) ہے ۝

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس حکم کو منسوخ فرمایا ہے وہ باطل نہیں ہے بلکہ جس زمانہ میں وہ حکم مشروع تھا اس زمانہ کے اعتبار سے وہی حکم برحق تھا' اور اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ قرآن مجید میں باطل چیز نہیں آسکتی' اور اس آیت کا معنی یہ

ہے کہ قرآن مجید کے بیان کردہ عقائد عقل کے موافق ہیں اور اس کے احکام حکمتوں پر مبنی ہیں اور اس کی دی ہوئی خبریں واقع کے مطابق ہیں اور اس کے الفاظ تغییر اور تبدیل سے محفوظ ہیں اور اس میں کسی وجہ سے بھی خطاء کا در آنا ممکن نہیں ہے۔

(مناہل العرفان ج ۲ ص ۱۰۲-۱۰۳ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

نسخ کے متعلق پرویز صاحب کے نظریہ کا علمی جائزہ

غلام احمد پرویز صاحب کے نزدیک پچھلی شریعتیں منسوخ ہو گئی ہیں اور قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے اور قرآن مجید میں جہاں نسخ کا ذکر ہے اس سے مراد شرائع سابقہ کا منسوخ ہونا ہے اور قرآن مجید میں نسخ کی نفی پر انہوں نے یہ دلیل قائم کی ہے:

اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن کریم میں کسی بات کا حکم دیا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کر دینا چاہیے' چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل کر دی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ حکم اس سے پہلے حکم سے بہتر ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ اس نئی آیت میں یہ کہیں نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس سے فلاں آیت کو منسوخ سمجھا جائے' اس لیے قرآن کریم میں منسوخ آیات بھی اسی طرح سے موجود ہیں اور ناسخ آیات بھی۔ اللہ نے ان کے متعلق کہیں نہیں بتایا کہ فلاں آیت منسوخ ہے فلاں آیت سے۔ یہ تعیین بعد میں روایات کی رو سے یا مفسرین کے اپنے خیالات کی رو سے کیا گیا' چنانچہ ان آیات کی تعداد ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی' حتیٰ کہ شاہ ولی اللہ کے نزدیک ان کی تعداد صرف پانچ ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

اس عقیدہ کی رو سے اب دیکھئے کہ خدا' قرآن کریم اور رسول اللہ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ خدا کا تصور اس قسم کا ہے کہ وہ آج ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات بتا دیتے ہیں کہ وہ حکم ٹھیک نہیں تھا اس لیے وہ قرآن کریم کے اس حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم دے دیتا ہے۔ (لغات القرآن ص ۱۶۰۸' مطبوعہ ادارہ طلوع اسلام' ۱۹۸۴ء)

قائلین نسخ کے نزدیک نسخ کی یہ تعبیر ہرگز نہیں ہے جو پرویز صاحب نے بیان کی ہے بلکہ نسخ کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن حالات میں جو حکم پہلے دیا تھا ان حالات میں وہی حکم برحق اور صحیح تھا اور جب حالات بدل گئے تو اللہ تعالیٰ نے حکم بدل دیا اور بعد کے حالات میں وہی حکم صحیح اور برحق ہے' اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء میں کفار کی زیادتیوں کے خلاف عفو و درگزر کا حکم دیا کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی اتنی جمعیت نہیں تھی کہ وہ کفار سے ایک بڑی جنگ کا خطرہ مول لیتے' اس لیے فرمایا:

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۔ (البقرہ: ۱۰۹) تو انہیں معاف کر دو اور درگزر کرو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اپنا کوئی (اور) حکم لے آئے۔

اور جب مسلمانوں کی جمعیت قوی ہو گئی تو یہ ارشاد فرمایا:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ (التوبہ: ۵) تم جہاں کہیں بھی مشرکین کو پاؤ تو ان کو قتل کر دو' اور ان کا محاصرہ کر لو اور ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ بیٹھو۔

نیز ۹ ھ میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو بیت اللہ میں داخل ہونے سے منع فرما دیا' اس کا صریح مفاد یہ ہے کہ ۹ ھ سے پہلے مشرکین کو بیت اللہ میں داخل ہونے اور طواف کرنے کی اجازت تھی اور اس آیت کے نازل ہونے کے بعد یہ اجازت منسوخ کر دی گئی' وہ آیت یہ ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِھِمْ ھٰذَا ۚ (التوبہ: ۲۸)

اے ایمان والو! تمام مشرکین محض ناپاک ہیں تو وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ آئیں۔

نیز پرویز صاحب نے سابقہ شریعتوں کے منسوخ ہونے کو جائز کہا ہے تو کیا ان کے طور پر معاذ اللہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک شریعت کو نازل کیا' پھر سوچا کہ معاذ اللہ یہ شریعت ٹھیک نہیں ہے تو دوسری شریعت کو نازل کر دیا اور جس دلیل سے یہ نسخ جائز ہے اسی دلیل سے اسلام کے بعض احکام کا منسوخ ہونا بھی جائز ہے۔

پرویز صاحب سابقہ شریعتوں کے منسوخ ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دوسری بات یہ ہے کہ انسانیت کے تقاضے اور اس کی ذہنی سطح بھی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر کو اٹھتی چلی آ رہی ہے' اس لیے ہر قوم کو اس کے حالات اور ارتقائی سطح کے مطابق ہی احکام دیئے جاتے تھے۔ ان کی سطح سے بلند احکام وقوانین روک لئے جاتے تھے' تا آنکہ ان کے بعد دوسری قوم آتی جو ارتقائی منزل میں ان سے آگے ہوتی' تو وہ ''روکے ہوئے'' احکام وقوانین اس وقت نازل کر دیئے جاتے۔ تنزیل وحی میں یہ اصول بھی کارفرما رہا ہے۔

(لغات القرآن ص ۱۹۰۹ 'مطبوعہ ادارہ طلوع اسلام' ۱۹۸۴ء)

یہی بات اسلام کے بعض احکام کے نسخ کے متعلق کہی جا سکتی ہے اور اس کی واضح مثال یہ ہے کہ پہلے شراب نوشی سے منع کیا گیا نہ جوئے کو حرام کیا گیا۔ مکی زندگی کے پورے دور اور مدینہ منورہ کے ابتدائی دور میں شراب اور جوا مباح رہے' بعد میں جب مسلمانوں کے دل ودماغ میں اسلام پوری طرح رچ بس گیا تو شراب اور جوئے کو مکمل اور قطعی طور پر حرام کر دیا گیا' حرمت شراب کے متعلق ان آیات کو غور سے پڑھا جائے:

یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ۭ قُلْ فِیْھِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا ۭ (البقرہ: ۲۱۹)

لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں' آپ فرما دیجئے: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے' اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔

اس آیت سے بھی شراب اور جوئے کی ایک گونہ اباحت کا پہلو نکلتا ہے۔

نیز فرمایا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ۔ (النساء: ۴۳)

اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم اس چیز کو سمجھنے لگو جس کو تم کہتے ہو۔

اس آیت سے بھی یہ مفہوم نکلتا ہے کہ حالت نماز کے علاوہ دیگر احوال میں شراب نوشی سے منع نہیں کیا گیا ہے اور غیر اوقات نماز میں شراب نوشی کی اباحت ہے اور سورہ مائدہ کی مذکور ذیل آیت سے اس اباحت کو کلی اور قطعی طور پر منسوخ کر دیا گیا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (المائدہ: ۹۰)

اے ایمان والو! شراب' جوا' بت اور جوئے کے تیر (سب) محض ناپاک ہیں' شیطانی کاموں میں سے ہیں' سو تم ان سے بچو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ○

جس قوم کو اسلام کا پیغام پہنچایا گیا تھا وہ جوئے اور شراب کی رسیا تھی اور یک لخت ان پر شراب کو حرام کرنا حکمت کے

خلاف تھا اس لیے بہ تدریج ان پر شراب کی خرابیاں واضح کی گئیں اور شراب کے سلسلہ میں ان پر مختلف النوع پابندیاں عائد کی گئیں اور جب ان کے دلوں میں اسلام کی جڑیں راسخ ہو گئیں اور وہ اسلام کے حکم کے مقابلہ میں ہر مرغوب طبعی کو ترک کرنے پر تیار ہو گئے تو شراب نوشی کی سابقہ اباحت کو منسوخ کر کے شراب کو قطعی طور پر حرام کر دیا گیا۔

اسی طرح زنا کار عورتوں کے لیے پہلے آسان سزا رکھی کہ ان کو گھروں میں قید کر دیا جائے اور بعد میں جب اسلام کی جڑیں لوگوں کے دل و دماغ میں راسخ ہو گئیں تو کنواری عورتوں کے لیے سو کوڑوں کی سزا مقرر فرمائی اور شادی شدہ عورتوں کے لیے رجم کی حد مقرر فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰى یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ○ (النساء: ۱۵)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کریں تو ان کے خلاف اپنے چار مردوں کی گواہی طلب کرو، پھر اگر وہ ان کے خلاف گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں اس وقت تک مقید رکھو کہ انہیں موت آجائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ پیدا فرما دے (کوئی اور حد مقرر فرما دے) ○

پھر زانی عورتوں کی اس سزا (گھروں میں تاحیات مقید رکھنا) کو منسوخ کر کے یہ حد مقرر فرمائی:

اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ (النور: ۲)

(کنواری) زانیہ عورت اور (کنوارے) زانی مرد ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

پرویز صاحب لکھتے ہیں:

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس میں ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔ اس کا ہر حکم اپنی جگہ محکم و غیر متبدل ہے، البتہ ہر حکم خاص حالات کے ماتحت نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ جب حالات بدل جائیں تو اس کی جگہ قرآن کا دوسرا حکم نافذ ہو جاتا ہے، مثلاً صلوٰۃ کے لیے وضو کرنے کا حکم ہے، لیکن اگر پانی نہ ملے یا انسان مریض ہو تو وضو کی جگہ تیمم کا حکم ہے۔ ان حالات میں وضو کا حکم پیچھے ہٹ جائے گا اور تیمم کا حکم آگے آجائے گا۔ جب پانی مل جائے گا (یا مرض جاتا رہے گا) تو پھر وضو کا حکم آگے آجائے گا اور تیمم کا حکم پیچھے چلا جائے گا۔ (لغات القرآن ۱۶۱۲، مطبوعہ ادارہ طلوع اسلام ۱۹۸۴ء)

نسخ کا معنی بیان کرتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں:

نسخ کے معنی ہیں ایک چیز کو مٹا دینا اور اس کی جگہ دوسری چیز کو لے آنا۔ دوسری چیز کو اس کے قائم مقام کر دینا (ابن فارس) "نسخت الشمس الظل" آفتاب نے سایہ کو ہٹا دیا اور اس کی جگہ روشنی لے آیا یا کسی چیز میں تبدیلی کر دینا "نسخت الریح اثار الدیار" ہوا نے آبادی کے آثار (نشانات و علامات) کو تبدیل کر دیا۔

(لغات القرآن ص ۱۶۰۶، مطبوعہ ادارہ طلوع اسلام ۱۹۸۴ء)

پرویز صاحب قرآن مجید کے الفاظ کا مفہوم احادیث اور آثار کے بجائے لغت سے متعین کرتے ہیں اور لغت میں نسخ کا معنی کسی چیز کو مٹا دینا اور اس کی جگہ دوسری چیز کو لے آنا ہے، کسی حکم کو بار بار آگے پیچھے کرنا نہیں ہے اور تیمم کے وقت وضو منسوخ نہیں ہوتا بلکہ بدستور مشروع رہتا ہے، اسی طرح جس معاشرہ میں چوری اور زنا نہ ہو وہاں حدود مٹ نہیں گئیں بلکہ بدستور مشروع ہیں، اسی طرح جس شخص کے پاس مال نہ ہو یا جو مرتے وقت ترکہ نہ چھوڑے اس کے حق میں زکوٰۃ اور میراث بدستور مشروع ہیں مٹ نہیں گئے لیکن چونکہ ان لوگوں کے حق میں ان احکام شرعیہ کی فرضیت کی شرائط نہیں پائی گئیں اس لیے ان پر یہ

احکام فرض نہیں ہوئے ایسا نہیں ہے کہ یہ احکام منسوخ یا معطل ہو گئے۔ اس کے برخلاف ہم نے مثالوں کے ذریعہ جو منسوخ احکام بیان کیے ہیں وہ کسی حال میں بھی مشروع نہیں ہو سکتے۔

نسخ کے وقوع پر قرآن مجید سے استدلال

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ (البقرہ: ۱۰۶)

ہم جو آیت منسوخ کر دیتے ہیں یا اس کو بھلا دیتے ہیں' تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ (النحل: ۱۰۱)

اور جب ہم ایک آیت کو بدل کر اس کی جگہ دوسری آیت لاتے ہیں' اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ نازل فرماتا ہے' تو کافر کہتے ہیں: آپ یہ آیتیں خود بنا لیتے ہیں' (یہ بات نہیں) بلکہ ان میں سے اکثر جاہل ہیں ○

ان دونوں آیتوں میں نسخ کے وقوع کی واضح اور روشن دلیل ہے' پرویز صاحب نے آیت کا معنی یہاں سابقہ شریعتیں اور حوادث کائنات کیا ہے اور یہ دونوں معنی لغت اور اسلوب قرآن کے خلاف ہیں اور باطل ہیں۔

تمام علماء سلف کا اس پر اجماع ہے کہ شریعت اسلامیہ میں نسخ واقع ہے اور قرآن مجید میں بعض ایسی آیات ہیں جن کے احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ ان کی تفصیل ان شاء اللہ ہم عنقریب ذکر کریں گے۔

ثبوت نسخ کے ذرائع

علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

نسخ کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح نقل (حدیث) سے کیا جائے گا' یا کسی صحابی کا قول اس طرح منقول ہو کہ فلاں آیت فلاں آیت سے منسوخ ہو گئی' اور کبھی نسخ کو استنباط سے معلوم کیا جائے گا' جب دو آیتوں میں قطعی تعارض ہو اور کسی دلیل سے معلوم ہو جائے کہ ان میں سے ایک آیت متاخر ہے' نسخ کے متعلق عام مفسرین کے قول پر اعتماد نہیں کیا جائے گا اور نہ بغیر کسی نقل صریح کے مجتہدین کے اجتہاد پر عمل کیا جائے گا' کیونکہ نسخ میں کسی ایسے حکم کو اٹھا لینا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ثابت تھا اور اس کی جگہ کسی دوسرے حکم کو ثابت کرنا ہے اور اس میں نقل اور تاریخ پر اعتماد کیا جاتا ہے نہ کہ رائے اور اجتہاد پر' نسخ کے ثبوت میں علماء کا اختلاف ہے' بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ نسخ میں اخبار آحاد صحیحہ بھی معتبر نہیں ہیں اور بعض علماء اس میں تساہل کر کے یہ کہتے ہیں کہ مفسر یا مجتہد کے قول سے' نسخ ثابت ہو جاتا ہے' اصل میں یہ دونوں قول افراط اور تفریط پر مبنی ہیں۔

(الاتقان ج ۲ ص ۲۴' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور)

مصنف کی تحقیق کے مطابق قرآن مجید کی آیات منسوخہ کا بیان

ہماری تحقیق کے مطابق قرآن مجید کی بارہ آیات کا حکم منسوخ ہے' ان کے منسوخ ہونے پر دلائل ان شاء اللہ ہم ان کی آیات کی تفسیر میں تفصیل سے بیان کریں گے' وہ آیات یہ ہیں:

(۱) كُتِبَ عَلَیْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَیْرَا ۚ ۖ الْوَصِیَّةُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ ○ (البقرہ: ۱۸۰)

جب تم میں سے کسی کو موت آئے تو اگر وہ کچھ مال چھوڑے تو اس پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے لیے دستور کے موافق وصیت کرے' یہ متقین پر حق ہے ○

اس آیت کا مفاد یہ ہے کہ والدین اور قرابت داروں کے لیے اس شخص پر وصیت کرنا فرض ہے جس کی موت کا وقت قریب آپہنچا ہو اور تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے البتہ اس کے ناسخ میں اختلاف ہے' بعض لوگوں نے کہا: یہ آیت اس حدیث سے منسوخ ہے:

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابی امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے' اس لیے اب وارث کے لیے وصیت جائز نہیں ہے۔

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۴۰' مطبوعہ مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

امام دارمی نے اس حدیث کو عمر بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۳۰۲' مطبوعہ نشر السنہ' ملتان)

اور بعض علماء نے یہ کہا کہ یہ آیت اجماع سے منسوخ ہے' کیونکہ اس پر تمام امت کا اجماع ہے کہ والدین اور قرابت داروں کے لیے وصیت کرنا واجب نہیں ہے۔

اور صحیح یہ ہے کہ یہ آیت مواریث کی آیات سے منسوخ ہے' کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے والدین اور قرابت داروں کے حصے خود متعین کر دیئے تو ان کے لیے وصیت کرنا جائز نہ رہا' عکرمہ اور حسن بصری کا بھی یہی مذہب ہے۔

(سنن دارمی ج ۲ ص ۳۰۲' مطبوعہ نشر السنہ' ملتان)

(۲) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (البقرہ: ۱۸۳) — اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا ہے جس طرح سے پہلے لوگوں پر روزہ فرض کیا گیا تھا تا کہ تم متقی بن جاؤ ۝

اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ سونے کے بعد روزہ دار پر کھانا' پینا اور عمل زوجیت حرام ہو جس طرح پچھلی امتوں پر سونے کے بعد یہ کام حرام ہو جاتے تھے کیونکہ اس آیت میں ہمارے روزوں کو پچھلی امتوں کے روزوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے' پھر اس کے بعد امت مسلمہ کو سہولت دی گئی اور روزہ دار کے لیے رات میں کھانا پینا اور عمل زوجیت حلال کر دیا گیا:

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ ۚ (البقرہ: ۱۸۷) — روزے کی رات میں تمہارے لیے عورتوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا۔

(۳) يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۚ (البقرہ: ۲۱۷) — لوگ آپ سے ماہ حرام میں قتال کا حکم پوچھتے ہیں' آپ کہئے کہ ان مہینوں میں قتال کرنا بڑا گناہ ہے۔

رجب' ذوالقعدہ' ذوالحجہ اور محرم یہ حرمت والے مہینے ہیں' اس آیت میں ان مہینوں میں قتال کرنے کی حرمت بیان کی ہے اور اس آیت کے آخری حصہ میں اس حرمت کو منسوخ کر دیا گیا ہے:

وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ (البقرہ: ۲۱۷) — اور اللہ کی راہ سے روکنا' اور اللہ اور مسجد حرام کا کفر کرنا اور اہل حرم کو وہاں سے نکالنا' اللہ کے نزدیک زیادہ بڑا گناہ ہے' اور فساد کرنا قتل سے بہت بڑا گناہ ہے۔

نیز حرمت والے مہینوں میں قتال کا منسوخ ہونا ان آیات سے بھی واضح ہے:

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ۚ (التوبہ: ۳۶) — اور تم سب مشرکوں سے قتال کرو جیسا کہ وہ تم سب سے قتال کرتے ہیں۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوهُمْ . (التوبہ:٥) تم جہاں کہیں بھی مشرکین کو پاؤ تو ان کو قتل کردو۔

سورہ توبہ کی پہلی آیت میں اشخاص کا عموم ہے اور دوسری آیت میں امکنہ کا عموم ہے یعنی ہر مشرک کو ہر جگہ قتل کردو اور اشخاص اور امکنہ کا عموم ازمنہ کے عموم کو بھی مستلزم ہے یعنی ہر وقت ہر زمانہ میں ان کو قتل کردو اور یہ آیتیں حرمت والے مہینوں میں قتال کی ممانعت کی ناسخ ہیں۔

(۴) وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۚ وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ ۗ . (البقرہ:٢٤٠) اور جو لوگ تم میں سے مرجائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں وہ (مرنے سے پہلے) اپنی بیویوں کے لیے ان کے گھر سے نکالے بغیر ایک سال کا خرچ دینے کی وصیت کرجائیں' پھر اگر وہ (خود) نکل جائیں تو تم پر ان کے اس کام کا کوئی گناہ نہیں ہے جو انہوں نے دستور کے موافق کیا۔

اس آیت میں بیوہ عورت کی عدت ایک سال مقرر کی ہے' اس کے بعد یہ عدت منسوخ کرکے چار ماہ دس دن کردی گئی:

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ . (البقرہ:٢٣٤) اور جو لوگ تم میں سے وفات پاجائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ عورتیں چار ماہ دس دن کی عدت گزاریں۔

(۵) وَإِن تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ اللَّهُ ۖ . (البقرہ:٢٨٤) اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے خواہ تم اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ' اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔

اس آیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ دل میں آنے والے خطرات پر بھی محاسبہ اور مواخذہ ہوگا' لیکن مذکورہ ذیل آیت سے اس کو منسوخ کردیا گیا:

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ . (البقرہ:٢٨٦) اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کرتا۔

اور دل میں آنے والے خطرات انسان کی قدرت اور اختیار میں نہیں ہیں' لہٰذا ان پر مواخذہ کرنے کو منسوخ کردیا گیا۔

(۶) وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ ۖ فَإِن شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا ۝ (النساء:١٥) اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کریں تو ان کے خلاف اپنے چار مردوں کی گواہی طلب کرو' پھر اگر وہ ان کے خلاف گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں اس وقت تک مقید رکھو کہ انہیں موت آجائے' یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ پیدا فرمادے (کوئی اور حد مقرر فرمادے)۝

یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہوگئی۔

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ . (النور:٢) (کنواری) زانیہ عورت اور (کنوارے) زانی مرد' ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

(۷) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ . (المائدہ:٢) اے ایمان والو! اللہ کی نشانیوں اور حرمت والے مہینوں کی بے حرمتی نہ کرو۔

حرمت والے مہینوں میں قتال کا حکم منسوخ ہوچکا ہے' اس کی تفصیل نمبر ۳ میں گزر چکی ہے۔

(۸) إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو پر

وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○ (الانفال: ۶۵)

غالب آ جائیں گے اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں تو وہ ہزار کافروں پر غالب آ جائیں گے' کیونکہ وہ بے وقوف لوگ ہیں ○

یہ حکم اس آیت سے منسوخ ہو گیا:

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (الانفال: ۶۶)

اب اللہ نے تمہارے لیے تخفیف کر دی اور اس کو علم ہے کہ تم میں کمزوری ہے' سو اگر تم میں سو صابر آدمی ہوئے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے' اور اگر تم میں ایک ہزار ہوئے تو وہ اللہ کے اذن سے دو ہزار پر غالب آ جائیں گے۔

(۹) اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۫ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (النور: ۳)

زانی مرد صرف زانیہ یا مشرکہ عورت سے نکاح کرے' اور زانیہ عورت صرف زانی یا مشرک مرد سے نکاح کرے اور مسلمانوں پر یہ (نکاح) حرام کر دیا گیا ہے ○

یہ آیت ان آیتوں سے منسوخ ہو گئی ہے:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ؕ (النساء: ۳)

اور تم اپنے بے نکاح مردوں اور عورتوں' اور نیک غلاموں اور باندیوں کا نکاح کر دو۔

اس آیت میں مطلقاً بے نکاح مردوں اور عورتوں کے نکاح کرنے کا حکم دیا ہے اور ان کے ساتھ غیر زانی کی قید نہیں لگائی۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ. (النساء: ۳)

تو اپنی پسند کے موافق عورتوں سے نکاح کرو۔

(۱۰) لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَلَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ؕ (الاحزاب: ۵۲)

ان (موجودہ ازواج) کے بعد اور عورتیں آپ کے لیے حلال نہیں ہیں اور نہ یہ کہ آپ ان بیویوں کی جگہ اور بیویاں تبدیل کریں' خواہ ان کا حسن آپ کو پسند ہو ماسوا اس کنیز کے جو آپ کی ملک ہو۔

جب ازواج مطہرات نے عسرت اور تنگ دستی کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنا پسند کر لیا اور مزید خرچ کا مطالبہ ترک کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی' پھر بعد میں اس حکم کو منسوخ کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید ازواج کے ساتھ نکاح کی اجازت دے دی' ہر چند کہ اس اجازت کے باوجود آپ نے پھر کوئی نکاح نہیں کیا' وہ آیت یہ ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۫ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ (الاحزاب: ۵۰)

اے نبی! ہم نے آپ کے لیے آپ کی وہ بیویاں حلال فرما دیں جن کا آپ مہر دے چکے ہیں' اور وہ کنیزیں جن کے آپ مالک ہیں جو اللہ نے آپ کو مال غنیمت میں عطا فرمائی ہیں' اور آپ کے چچا کی بیٹیاں' اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی' اور ایمان والی عورت

اگر (بلاعوض) اپنا آپ نبی کو ہبہ کر دے' بشرطیکہ نبی اس سے نکاح کرنا چاہیں' یہ حکم آپ کے لیے مخصوص ہے' ماسوا دوسرے مسلمانوں کے۔

(۱۱) يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۚ. (المجادلہ: ۱۲)

اے ایمان والو! جب تم تنہائی میں رسول سے کچھ عرض کرنا چاہو تو اپنی عرض کرنے سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔

اس کی ناسخ یہ آیت ہے:

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۚ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ. (المجادلہ: ۱۳)

کیا تم تنہائی میں اپنی بات گوش گزار کرنے سے قبل صدقہ دینے سے گھبراتے ہو؟ جب تم نے یہ نہ کیا اور اللہ نے رحمت سے تم پر رجوع کیا تو نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو' اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

(۱۲) يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۚ (المزمل: ۴-۱)

اے چادر لپیٹنے والے O رات کو نماز میں قیام کریں خواہ تھوڑی رات O آدھی رات یا اس سے کچھ کم کریں O یا اس پر کچھ زیادتی کریں اور ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھیں O

ان آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قیام لیل فرض کیا گیا ہے' خواہ نصف شب ہو یا اس سے کم یا زیادہ' بعد میں مذکور ذیل آیت سے اس قیام کو منسوخ کر دیا:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۚ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۚ. (المزمل: ۲۰)

بے شک آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ (کبھی) دو تہائی رات کے قریب قیام کرتے ہیں' (کبھی) آدھی رات کے قریب اور (کبھی) ایک تہائی رات کے قریب' اور آپ کے ساتھیوں میں سے ایک جماعت بھی ہوتی ہے' اور اللہ دن رات کا اندازہ کرتا ہے' وہ جانتا ہے کہ (اے مسلمانو!) تم ہرگز اس کا احاطہ نہ کرسکو گے' پھر اس نے تم پر رحمت سے رجوع کیا' تو جتنا تم کو آسان لگے قرآن پڑھ لیا کرو۔

ہمارے نزدیک قرآن مجید کی ان بارہ آیتوں کا حکم منسوخ ہو چکا ہے اور ان کے علاوہ وہ آیتیں ہیں جن میں نبوت کے ابتدائی دور میں کفار کی زیادتیوں کے مقابلہ میں صبر وضبط سے کام لینے کا حکم دیا تھا پھر آیت سیف نازل ہونے کے بعد ان کا حکم منسوخ ہو گیا۔

علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ قرآن مجید کی بیس آیتوں کا حکم منسوخ ہے۔ (الاتقان ج ۲ ص ۲۳' مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور) اور بعض علماء نے بائیس آیات لکھی ہیں لیکن ہم نے باقی دس آیتوں میں غور کیا تو ان میں ایسا تعارض نہیں ہے کہ ان کو جمع کرنا اور ان میں تطبیق دینا ممکن نہ ہو اور ان میں سے ہر ایک آیت کا الگ الگ محمل ہے' اس کی تفصیل ان شاء اللہ اپنے اپنے مقام پر آئے گی' اگر ہمیں اپنے قارئین کی اکتاہٹ کا خدشہ نہ ہوتا تو ہم ان سب کا یہاں تفصیل سے ذکر کرتے۔

احکام شرعیہ کو منسوخ کرنے کی حکمتیں

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ ان آیات کی تلاوت کو باقی رکھا گیا ہے اور ان کے حکم کو منسوخ کر دیا گیا ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ جس طرح قرآن مجید کی اس لیے تلاوت کی جاتی ہے کہ اس سے ایک شرعی حکم معلوم کیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے اسی طرح اس کی اس لیے تلاوت کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے اور اس کی تلاوت سے ثواب ملتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ بالعموم احکام میں نسخ تخفیف کے لیے ہوا ہے جیسا کہ ان مثالوں سے واضح ہے' اور منسوخ الحکم آیتوں کو اس لیے برقرار رکھا گیا تاکہ مسلمان ان آیات کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر شکر ادا کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مشقت سے نجات دی اور ان کے لیے آسان احکام مشروع کر دیئے۔

یہ کلام ان آیات کے متعلق ہے جن میں مشکل احکام کو منسوخ کر کے آسان احکام مشروع کیے گئے' لیکن بعض منسوخ الحکم آیات ایسی ہیں جن میں آسان احکام کو منسوخ کر کے مشکل احکام مشروع کیے گئے ہیں' ان کی حکمت یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو وہ زمانہ فترت تھا اور برسوں سے جو عقائد' عادات اور معمولات ان میں رچ بس گئے تھے اور ان کی فطرت ثانیہ بن چکے تھے اور یک لخت ان تمام چیزوں سے ان کو چھڑانا بہت مشکل تھا' کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو خدشہ تھا کہ وہ اسلام کو ہی چھوڑ جاتے' اس کی مثال یہ ہے کہ قریش نے وسائل کی کمی کی وجہ سے کعبہ کی نامکمل تعمیر کی تھی' نبی صلی اللہ علیہ وسلم بناء ابراہیم کے مطابق کعبہ کو تعمیر کرنا چاہتے تھے (بناء ابراہیم میں حطیم کعبہ میں داخل تھا) اور آپ اس میں دخول اور خروج کے لیے دو دروازے بنانا چاہتے تھے' لیکن آپ نے اس لیے ایسا نہیں کیا کہ اہل عرب کو کعبہ سے بہت والہانہ اور جذباتی عقیدت تھی' اگر نئی تعمیر کے لیے کعبہ کو منہدم کیا جاتا تو جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ اسلام چھوڑ جاتے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۲ (مفصلاً) مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ) سو اسی وجہ سے شروع میں آسان احکام مشروع کیے گئے اور جب لوگ اسلام میں راسخ ہو گئے تو پھر نسبۃً سخت احکام مشروع کیے گئے' حرمت خمر کی مثال سے ہم اس کی پہلے بھی وضاحت کر چکے ہیں۔

بعض ایسے احکام منسوخ کیے گئے جو مشکل اور سہل ہونے میں ناسخ کے مساوی ہیں' ان میں نسخ کی حکمت یہ تھی کہ مسلمانوں کو ابتلاء اور امتحان میں ڈالا جائے تاکہ مومنوں اور منافقوں میں امتیاز ہو جائے اور خبیث اور طیب الگ الگ ہو جائیں' جیسے بیت المقدس کے قبلہ ہونے کو منسوخ کر کے بیت اللہ کو قبلہ بنایا گیا تو مومن اس امتحان میں کامیاب ہوئے اور منافقوں کا خبث ظاہر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۭ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۭ (البقرہ: ۱۴۳)

(اے رسول!) آپ (پہلے) جس قبلہ پر تھے وہ ہم نے اسی لیے مشروع کیا تھا کہ جو لوگ رسول کی پیروی کرتے ہیں ان کو ہم ان لوگوں سے ممتاز کر دیں جو الٹے پاؤں پھر جاتے ہیں' اور بے شک یہ (تحویل قبلہ) شاق تھا ماسوا ان لوگوں کے جن کو اللہ نے ہدایت فرمائی۔

یہ بحث اسلام کے بعض احکام کے نسخ کے سلسلہ میں تھی' رہا یہ امر کہ اسلام کے آنے کے بعد پچھلی تمام شریعتیں منسوخ ہو گئیں' اس کی حکمت یہ ہے کہ نوع انسان اپنی عقل اور شعور کے اعتبار سے اس طرح تدریجاً ترقی کرتی رہی ہے جس طرح بچہ اپنی نشوونما کے اعتبار سے بہ تدریج ترقی کرتا ہے' اس لیے ہر نبی کے عہد میں نوع انسان اپنی عقل اور شعور کے اعتبار سے جس

درجہ میں تھی اسی درجہ کے اعتبار سے اس پر احکام شرعیہ مشروع کیے گئے اور جب نوع انسان اپنے کمال ارتقاء کو پہنچ گئی تو سابقہ تمام احکام منسوخ کر کے اس پر قیامت تک کے لیے ایک کامل شریعت نازل کر دی گئی۔

"نسخ القرآن بالسنة" کے قائلین اور ان کے دلائل

امام مالک' اصحاب امام ابی حنیفہ' جمہور اشاعرہ اور معتزلہ اس کے قائل ہیں کہ سنت سے قرآن کا نسخ ہو سکتا ہے' ان کی دلیل یہ ہے کہ سنت بھی اسی طرح وحی الٰہی ہے جس طرح قرآن وحی الٰہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم: ۳-۴)
اور وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتے ○ ان کا کلام وہی ہوتا ہے جو ان کی طرف وحی کی جاتی ہے ○

اور قرآن اور حدیث میں اس کے سوا اور کوئی فرق نہیں ہے کہ قرآن کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں اور حدیث کے الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انشاء اور ترتیب پر مبنی ہیں اور دونوں کے معنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے منزل ہیں' اس لیے عقلاً اور شرعاً یہ جائز ہے کہ کسی ایک وحی سے ثابت ہونے والا حکم دوسری وحی سے منسوخ کر دیا جائے۔

"نسخ القران بالسنة" کے مانعین اور ان کے دلائل کا تجزیہ

امام شافعی' امام احمد کے ایک قول اور اہل ظاہر کے نزدیک سنت سے قرآن کا نسخ جائز نہیں ہے' ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل: ۴۴)
اور ہم نے آپ کی طرف قرآن اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کو یہ بیان کر دیں کہ ان کی طرف کیا نازل کیا گیا ہے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب قرآن کے معانی بیان کرنے میں منحصر ہے اور اگر سنت قرآن کی ناسخ ہو تو سنت قرآن کے بیان کی بجائے اس کی رافع ہو جائے گی۔

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں کوئی کلمہ حصر نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف بیان کرنے والے ہیں' مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۝ (الفرقان: ۱)
وہ بڑی برکت والا ہے جس نے اپنے (مقدس) بندے پر فیصلہ کرنے والی کتاب نازل کی' تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے ڈرانے والا ہو ○

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نذیر فرمایا ہے' حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشیر بھی ہیں' تو جس طرح آپ کو نذیر کہنے سے آپ کے بشیر ہونے کی نفی نہیں ہوتی اسی طرح آپ کی سنت کے بیان ہونے سے اس کے ناسخ ہونے کی نفی نہیں ہوتی اور بالفرض اگر آپ کا منصب صرف قرآن کے بیان کرنے میں منحصر ہو تو پھر آپ کا شارع ہونا اور بعض چیزوں کو حلال اور بعض چیزوں کو حرام کرنا بھی اس حصر کے خلاف ہو گا حالانکہ قرآن مجید سے آپ کا شارع ہونا اور آپ کے لیے تحلیل اور تحریم کا منصب بھی ثابت ہے۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (الحشر: ۷)
اور رسول جو کچھ تمہیں دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) رک جاؤ۔

اس آیت میں آپ کے شارع ہونے کا بیان ہے۔

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ . (الاعراف: ۱۵۷)

اور وہ (نبی امی) پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزیں ان پر حرام کرتے ہیں۔

اس آیت میں آپ کے منصب تحلیل اور تحریم کا بیان ہے۔

نیز ہم یہ کہتے ہیں کہ نسخ' بیان کے منافی نہیں ہے' کیونکہ سنت سے قرآن کا کوئی حکم بالکلیہ منسوخ نہیں ہوا بلکہ قرآن مجید کی بعض آیات کے عموم کو سنت سے خاص کرلیا گیا ہے اور سنت سے یہ متعین کرنا کہ اس آیت کے عموم سے فلاں فرد کو خاص کرلیا گیا ہے یہ بھی قرآن کا بیان ہے۔

مخالفین کی دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآن سے سنت کی حجیت ثابت ہے' اب اگر سنت خود قرآن کی ناسخ ہو تو سنت بھی حجت نہیں رہے گی کیونکہ نسخ رفع ہے اور جب اصل اٹھ جائے گی تو فرع بھی اٹھ جائے گی' اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کی جن آیات سے سنت کی حجیت ثابت ہے سنت ان کے لیے ناسخ نہیں ہے حتیٰ کہ یہ اعتراض لازم آئے' بلکہ وہ دوسری بعض آیات کے عموم کی ناسخ ہے۔

مخالفین کی تیسری دلیل یہ آیت ہے:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ . (یونس: ۱۵)

اور جب ہماری روشن آیتیں ان پر تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں جن کو (آخرت میں) ہم سے ملاقات کی امید نہیں ہے: آپ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آئیں یا اس کو بدل دیں' آپ کہیے: میرے لیے اس کو اپنی طرف سے بدلنا جائز نہیں ہے' میں صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں تبدیلی کرنا آپ کے اختیار میں نہیں اور سنت کے ناسخ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن کے الفاظ تبدیل کردیئے جائیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے عموم سے بعض افراد کو خاص کرلیا جائے۔

مخالفین کی چوتھی دلیل یہ آیت ہے:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ . (البقرہ: ۱۰۶)

جو آیت ہم منسوخ کردیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں۔

دلیل کی تقریر یہ ہے کہ اگر سنت قرآن کی ناسخ ہو تو اس سے لازم آئے گا کہ سنت قرآن کی مثل ہو یا اس سے افضل ہو' اور یہ محال ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ سنت کے الفاظ اور نظم قرآن کی مثل نہیں ہوسکتے اور سنت کے ناسخ قرآن ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ قرآن کے عموم اور اطلاق کی تقیید کرتی ہے اور سنت متواترہ سے ثابت ہونے والا حکم بھی اسی طرح قطعی ہے جس طرح قرآن قطعی ہے' نیز ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ سنت بھی وحی الٰہی ہے' اس لیے درحقیقت منسوخ کرنے والا' اللہ تعالیٰ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقط مبلغ اور معبر ہیں۔

"نسخ القرآن بالسنۃ" میں سنت کا محمل

واضح رہے کہ جو سنت قرآن مجید کے عام حکم کے لیے ناسخ ہوتی ہے یہ وہ سنت ہے جو وحی پر مبنی ہو۔ اس سے مراد سنت اجتہادیہ نہیں ہے' نیز اس سے مراد سنت قطعیہ ہے اور جو سنت ظنی الثبوت ہو وہ اس میں داخل نہیں۔ بعض احادیث سنداً اخبار آحاد ہیں' اس کے باوجود صحابہ کرام نے ان سے قرآن مجید کے عام حکم سے بعض افراد کو خاص کرلیا' مثلاً قرآن مجید میں عام حکم ہے کہ " وَاِنۡ كَانَتۡ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصۡفُ‌ؕ (النساء: ۱۱) ایک بیٹی کو باپ کے ترکہ سے نصف حصہ دیا جائے" لیکن حضرت ابوبکر نے اس حدیث کی بناء پر کہ "ہمارا وارث نہیں بنایا جاتا' ہم نے جو چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے" (صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت سے حصہ نہیں دیا' اور قرآن مجید کے عموم کی خبر واحد سے تخصیص کرلی' اسی طرح قرآن مجید میں کسی معاملہ میں دو مرد گواہ بنانے کا حکم عام ہے لیکن صحابہ نے ایک حدیث کی بنا پر حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۲' مطبوعہ مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ) اور اس کی اور بھی مثالیں ہیں' اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احادیث ہم تک واصل ہونے کے اعتبار سے اخبار آحاد ہیں اور صحابہ کرام نے چونکہ یہ احادیث بلاواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھیں اس لیے ان کے نزدیک یہ اسی طرح قطعی الثبوت تھیں جس طرح قرآن مجید قطعی ہے' سو انہوں نے سنت قطعیہ سے قرآن مجید کے عموم کو منسوخ مانا ہے نہ کہ سنت ظنیہ سے۔

"نسخ القرآن بالسنۃ" میں نسخ کا محمل

علامہ صدر الشریعہ لکھتے ہیں:

قرآن کو سنت سے منسوخ کرنے کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں کعبہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھتے تھے' اور مدینہ آنے کے بعد بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھتے تھے' پس اگر پہلا حکم (مکہ مکرمہ میں کعبہ کی طرف نماز پڑھنا) قرآن سے ثابت تھا تو یہ سنت سے منسوخ ہو گیا اور دوسرا حکم (مدینہ میں بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا) سنت سے ثابت تھا اور اس کو قرآن نے منسوخ کر دیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں تھے تو کعبہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھتے تھے اور یہ معلوم نہیں کہ یہ حکم کتاب سے ثابت تھا یا سنت سے' پھر جب آپ مدینہ آئے تو سولہ مہینے بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو کر نمازیں پڑھیں' اور یہ حکم کتاب سے ثابت نہ تھا بلکہ سنت سے ثابت تھا' پھر کتاب سے یہ حکم منسوخ کر دیا گیا اور آپ کو مسجد حرام کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھنے کا حکم دیا: " فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ‌ؕ " (البقرہ: ۱۴۴) پس سنت کا کتاب سے منسوخ ہونا یقینی ہے اور کتاب کا سنت سے منسوخ ہونا مشکوک ہے۔ (توضیح مع تلویح ج ۲ ص ۳۵' مطبوعہ دار الکتب العربیۃ الکبریٰ' مصر)

میں کہتا ہوں کہ اگر سنت کے ناسخ قرآن ہونے سے یہ مراد ہے کہ قرآن مجید سے ثابت شدہ حکم بالکلیہ سنت سے مرتفع ہو جائے تو اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور یہ محض جواز عقلی کے درجہ میں ہے اور اگر اس کی یہ تقریر کی جائے کہ جو حکم قرآن مجید میں عام ہے اس کو سنت سے خاص کر دیا گیا یا اس کے عموم سے چند افراد کو مستثنیٰ کرلیا گیا تو اس کی بہت مثالیں ہیں۔

"نسخ القرآن بالسنۃ" کی مثالیں

(۱) اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِىۡ فَاجۡلِدُوۡا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا مِائَةَ جَلۡدَةٍ‌ (النور: ۲) زانیہ اور زانی ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

قرآن میں یہ حکم عام ہے خواہ زانیہ اور زانی کنوارے ہوں یا شادی شدہ اور سنت سے اس حکم کو کنواروں کے ساتھ خاص

کرلیا گیا اور شادی شدہ زانیوں کو رجم کا حکم دیا گیا۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے یہ خدشہ ہے کہ کچھ زمانہ گزر جانے کے بعد کوئی کہنے والا کہے گا کہ قرآن مجید میں رجم نہیں ہے اور وہ اس فرض کے ترک سے گنہ گار ہوں گے' جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے' سنو! شادی شدہ زانی پر رجم کی سزا برحق ہے' جب کہ گواہی سے یا حمل یا اعتراف سے زنا ثابت ہو' سنو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۹۔۱۰۰۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

(۲) اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ○ بے شک ایمان والوں پر نماز (ایک) وقت مقرر میں فرض ہے ○ (النساء: ۱۰۳)

اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر نماز کو اس کے وقت میں پڑھا جائے لیکن سنت متواترہ سے عرفات کی عصر کو خاص کرلیا گیا کیونکہ میدان عرفات میں وہ اپنے وقت سے پہلے ظہر کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اور مزدلفہ کی مغرب کو خاص کرلیا گیا کیونکہ وہ اپنے وقت کے بعد عشاء کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔

(۳) فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ (النساء: ۳) تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں' ان سے نکاح کرلو دو دو سے' تین تین سے اور چار چار سے۔

اس آیت میں عموم ہے اور ہر شخص بہ شرط عدل دو دو' تین تین اور چار چار نکاح کرسکتا ہے' لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی حیات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنت ابی جہل کے ساتھ نکاح کرنے سے منع فرمادیا۔

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدہ فاطمہ کے اوپر ابوجہل کی لڑکی کو نکاح کا پیغام دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک میں کسی حلال کو حرام نہیں کرتا' اور نہ حرام کو حلال کرتا ہوں' لیکن بہ خدا! رسول اللہ کی بیٹی اور دشمن خدا کی بیٹی ایک محل میں جمع نہیں ہوسکتیں۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۸۳' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

(۴) وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ (النساء: ۴۳) اور حالت جنابت میں جب تک غسل نہ کرلو مسجد کے قریب نہ جاؤ' الا یہ کہ مسجد کو عبور کرنا ہو۔

اس آیت کے مطابق کوئی شخص بھی جنبی ہو کر مسجد میں داخل نہیں ہوسکتا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عموم سے اپنے آپ کو اور حضرت علی کو خاص کرلیا۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے علی! میرے اور تمہارے سوا کوئی شخص بھی اس مسجد سے حالت جنابت میں نہیں گزر سکتا۔

(جامع ترمذی ص ۵۳۵' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

ان کے علاوہ اور بھی بہت مثالیں ہیں لیکن اختصار کی وجہ سے ہم نے صرف اسی قدر پر اکتفاء کی ہے۔

"نسخ السنة بالقرآن" کا بیان

امام ابوحنیفہ' امام مالک اور امام احمد کے نزدیک سنت کا قرآن سے نسخ جائز ہے' اور امام شافعی کے اس میں دو قول ہیں جمہور کی دلیل یہ ہے کہ سنت اور قرآن دونوں وحی ہیں اور ایک وحی کا دوسری وحی سے منسوخ ہونا جائز ہے۔

اور اس کی چند مثالیں ہیں:

(۱) ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھنا سنت سے معلوم ہے۔ امام بخاری نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آنے کے بعد سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ) اور یہ حکم اس آیت سے منسوخ ہے:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ. (البقرہ: ۱۴۴)

تو آپ اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں' اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو اپنا رخ اسی کی طرف پھیرو۔

(۲) پہلے رمضان کی راتوں میں (سونے کے بعد) کھانا پینا اور عمل تزویج حرام تھا۔

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رمضان میں جب کوئی شخص روزہ رکھتا اور شام کو سو جاتا تو اس پر کھانا پینا اور عورت حرام ہو جاتی حتیٰ کہ وہ اگلے روز افطار کرے' ایک مرتبہ حضرت عمر بن الخطاب' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے رات کو لوٹے' وہ آپ کے پاس باتیں کرتے رہے تھے' انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیوی سوئی تھیں' انہوں نے ان سے اپنی خواہش ظاہر کی' بیوی نے کہا: میں تو سو چکی ہوں' حضرت عمر نے کہا: تم نہیں سوئی تھیں' اور ان سے اپنی خواہش پوری کر لی' حضرت کعب بن مالک نے بھی ایسا ہی کیا تھا' صبح حضرت عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور آپ کو ماجرا سنایا' اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۚ. (البقرہ: ۱۸۷)

اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنی جانوں میں خیانت کرتے تھے' اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تم کو معاف کر دیا' تو اب تم ان سے مباشرت کر سکتے ہو' اور جو (اولاد) اللہ نے تمہارے لیے مقدر کی ہے اس کو تلاش کرو' اور کھاؤ اور پیو حتیٰ کہ تمہارے لیے صبح کا سفید دھاگا (رات کے) سیاہ دھاگے سے ممتاز ہو جائے۔

(مسند احمد ج ۳ ص ۴۶۰' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ حدیبیہ میں یہ شرط مان لی تھی کہ اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو آپ اس کو مکہ واپس کر دیں گے' اس شرط کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوجندل کو واپس کر دیا تھا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۸۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

پھر ایک عورت مسلمان ہو کر مدینہ منورہ آئی' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو واپس کرنے کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۚ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ۚ. (الممتحنہ: ۱۰)

اے ایمان والو! جب تمہارے پاس ایمان والی عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم ان کو آزما لیا کرو' اللہ ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے' پھر اگر تمہیں ان کے ایمان کا یقین ہو جائے تو انہیں کفار کی طرف نہ لوٹاؤ۔

''نسخ السنۃ بالسنۃ'' کا بیان

نسخ السنۃ کی چار قسمیں ہیں: سنت متواترہ کا سنت متواترہ سے نسخ' سنت آحادیہ کا آحادیہ سے نسخ اور سنت آحادیہ کا سنت متواترہ سے نسخ' یہ تین قسمیں بالاتفاق جائز ہیں' اور سنت متواترہ کا سنت آحادیہ سے نسخ اہل ظاہر کے نزدیک جائز ہے اور جمہور کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

جمہور کی دلیل یہ ہے کہ تواتر سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقہ کے لیے رہائش اور نفقہ کا حق رکھا ہے' حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے اس کے خلاف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ روایت بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے سکنیٰ کا حق نہیں دیا تھا' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس روایت کو مسترد کر دیا اور صحابہ نے اس رد کو برقرار رکھا' اس کی وجہ یہی تھی کہ حضرت فاطمہ بنت قیس کی یہ روایت سنت متواترہ کے خلاف تھی۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

امام شعبی نے حضرت فاطمہ بنت قیس کی روایت بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے سکنیٰ (رہائش) اور نفقہ (خرچہ) نہیں رکھا' پھر اسود نے اپنے ہاتھ سے کنکریاں اٹھا کر پھینک دیں اور کہا: افسوس ہے تم ایسی حدیث بیان کرتے ہو' حضرت عمر نے فرمایا تھا' ہم اللہ کی کتاب اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ایک عورت کے قول کی بنا پر ترک نہیں کریں گے' ہم نہیں جانتے کہ اس کو (صحیح) حدیث یاد ہے یا یہ بھول گئی' اس کو سکنیٰ بھی ملے گا اور نفقہ بھی' اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ان کو اپنے گھروں سے نہ نکالو الا یہ کہ ان میں سے کوئی عورت کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب کرے۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۸۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

نسخ السنۃ کا ثبوت یا تو شارع علیہ السلام کی تصریح سے ہوتا ہے' جیسے امام مالک روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تمہیں تین دن کے بعد قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے سے منع کیا تھا' پس اب کھاؤ' صدقہ اور ذخیرہ کرو' اور میں نے تم کو نبیذ بنانے سے منع کیا تھا' پس اب نبیذ بناؤ اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا' اب قبروں کی زیارت کرو اور کوئی بے ہودہ بات مت کرو۔ (موطا امام مالک ص ۴۹۶' مطبوعہ مجتبائی پاکستان' لاہور)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تم کو بعض برتنوں (دبا' حنتم' مزفت اور مقیر) میں پینے سے منع فرمایا تھا' اور بے شک برتن کسی چیز کو حلال کرتا ہے اور نہ حرام کرتا ہے' اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۶۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تم کو چمڑے کے برتنوں میں پینے سے منع کیا تھا' اب تم ہر برتن میں پیا کرو' البتہ نشہ آور مشروب نہ پینا۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۶۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

یا نسخ السنۃ کا ثبوت صحابہ کی تصریح سے ہوتا ہے جیسے:

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل یہ تھا کہ آپ آگ سے پکی ہوئی چیز کو

کھانے کے بعد وضو نہیں کرتے تھے۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۵ مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور ۱۴۰۵ھ)

نسخ السنۃ کی معرفت کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ تاریخ سے یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں سنت فلاں سنت سے موخر ہے جیسے آپ نے اپنے پہلے مرض میں فرمایا: امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر پڑھو اور آخری مرض میں آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور لوگ کھڑے ہوئے تھے اور آپ نے ان کو منع نہیں فرمایا تو آخری مرض کی سنت پہلے حکم کی ناسخ ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک گھوڑے پر سوار ہوئے اور اس سے گر گئے جس سے آپ کی بائیں جانب زخمی ہو گئی تب آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور ہم بھی آپ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے نماز کے بعد آپ نے فرمایا: امام اس لیے بنایا جاتا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے جب وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو تم کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور جب وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو اور جب وہ "سمع اللہ لمن حمدہ" کہے تو تم "ربنا ولك الحمد" کہو اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم سب بیٹھ کر نماز پڑھو امام بخاری کہتے ہیں کہ امام حمیدی نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم سب بیٹھ کر پڑھو" مرض قدیم میں تھا پھر اس کے بعد آخری مرض میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور لوگ آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے اور آپ نے ان کو بیٹھنے کا حکم نہیں دیا اور عمل آخری سنت پر کیا جائے گا اور آخری سنت یہی ہے کہ آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور صحابہ آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۹۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

بعض علماء نے ایک چوتھی قسم بھی ذکر کی ہے کہ جس حدیث کے خلاف پر علماء کا اجماع ہو جائے وہ بھی منسوخ ہے اور اس کی یہ مثال دی ہے کہ "جامع ترمذی" میں یہ حدیث ہے کہ جو شخص شراب پیے اس کو کوڑے مارو دوبارہ اور سہ بارہ بھی کوڑے مارو اور اگر چوتھی بار شراب پیے تو اس کو قتل کر دو علامہ نووی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے اور ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ اس کے نسخ پر اجماع کی دلالت ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ شراب پینے پر قتل نہیں کیا جائے گا۔

(شرح مسلم ج ۲ ص ۷۱ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۷۵ھ)

اس پر یہ اعتراض ہے کہ حضرت ابن عمر اس حدیث پر عمل کے قائل ہیں اور ابن حزم کا بھی یہی مختار ہے لہٰذا اس حدیث کے خلاف پر اجماع نہیں ہے۔ (توضیح الافکار ج ۱ ص ۴۱۹ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

میری رائے یہ ہے کہ جو حدیث سند صحیح سے ثابت ہو وہ اجماع پر مقدم ہے اور ائمہ اور علماء کے اجماع میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ حدیث رسول کے مزاحم ہو سکے نسخ تو دور کی بات ہے۔

اسباب نزول کا بیان

قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہیں: ایک قسم وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ابتداءً نازل کیا اور وہ کسی خاص سبب یا واقعہ کے ساتھ مربوط نہیں تھی وہ محض مخلوق کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی اس قسم کی آیات بہ کثرت ہیں۔

دوسری قسم وہ ہے جو کسی خاص سبب یا خاص واقعہ کے ساتھ مربوط ہے یا کسی سوال کے جواب میں نازل کی گئی ان اسباب اور واقعات کو مفسرین کی اصطلاح میں سبب نزول اور شان نزول کہا جاتا ہے بعض اوقات ایک آیت کے متعدد اسباب ہوتے ہیں اور بعض اوقات ایک سبب کی وجہ سے متعدد آیات نازل ہوتی ہیں اور ہر چند کہ آیت کسی خاص مورد اور واقعہ میں نازل ہو لیکن جمہور ائمہ اور مفسرین کے نزدیک خصوصیت مورد کی بجائے عموم الفاظ کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

اسباب نزول کے فوائد

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ (البقرہ: ۱۱۵)

اور مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کے ہیں تو جہاں کہیں تم منہ کرو وہیں اللہ (تمہاری طرف متوجہ) ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ جس طرف چاہے منہ کر کے نماز پڑھ لے اور اس کے لیے سفر اور حضر میں کہیں بھی بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھنا واجب نہیں ہے' لیکن اس آیت کا صحیح معنی صرف شان نزول سے معلوم ہوتا ہے۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت مسافر کی نماز اور سواری پر نفل نماز پڑھنے کے متعلق نازل ہوئی ہے' یعنی سفر میں نمازی کو یہ رخصت دی گئی ہے کہ وہ نفل نماز سواری پر پڑھ سکتا ہے خواہ سواری کا رخ کسی طرف ہو' اسی طرح اگر نماز کے پورے وقت میں ٹرین تیز رفتاری سے دوڑتی رہے اور کہیں نہ رکے تو چلتی ٹرین میں فرض نماز بھی پڑھی جائے گی خواہ ٹرین کا رخ کسی طرف ہو۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت ایک قوم کے متعلق نازل ہوئی جس پر ایک غزوہ میں قبلہ مشتبہ ہو گیا تھا اور انہوں نے اندھیرے میں جنوب یا شمال کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لی اور جب صبح ہوئی تو پریشان ہوئے کہ ان کی نماز ہوئی یا نہیں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ (البقرہ: ۱۵۸)

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں' سو جس نے بیت اللہ کا حج یا عمرہ کیا تو اس پر صفا اور مروہ کے چکر لگانے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

(روح المعانی ج ۲ ص ۳۶۵ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

اس آیت سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صفا اور مروہ کی سعی مباح ہے واجب نہیں ہے' عروہ بن زبیر کو بھی یہی اشکال لاحق تھا' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کے جواب میں فرمایا تھا کہ اگر یہ سعی مباح ہوتی تو یہ آیت اس طرح ہوتی: "فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَّطَّوَّفَ بِهِمَا" (البقرہ: ۱۵۸) اگر وہ ان کی سعی نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں' پھر حضرت عائشہ نے اس آیت کا شان نزول بتلا کر یہ سمجھایا کہ سعی واجب ہونے کے باوجود اس طرح کیوں فرمایا: صفا اور مروہ کے چکر لگانے میں کوئی حرج نہیں' اس کی تفصیل اس حدیث میں ہے:

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

عروہ نے اس آیت: (البقرہ: ۱۵۸) کو پڑھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا: اس آیت کی رو سے اگر کوئی شخص صفا اور مروہ میں سعی نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: اے بھتیجے! تم نے درست نہیں کہا' اگر اس آیت کا وہی معنی ہوتا جس طرح تم نے تاویل کی ہے تو یہ آیت اس طرح ہوتی: "لا جناح علیه ان لا یطوف بهما" جو ان کے درمیان سعی نہ کرے اسے کوئی گناہ نہیں' لیکن یہ آیت انصار کے متعلق نازل ہوئی ہے' وہ اسلام لانے سے پہلے مناۃ (بت) کے لیے احرام باندھتے تھے جس کی وہ مشلل کے پاس عبادت کرتے تھے' پھر جو احرام باندھتا وہ صفا اور مروہ کی سعی میں گناہ سمجھتا' پھر جب وہ اسلام لے آئے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق سوال کیا اور عرض کیا: (یا رسول

اللہ) ہم (زمانہ جاہلیت میں) صفا اور مروہ کی سعی میں گناہ سمجھتے تھے تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: (ترجمہ) بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں' سو جس نے بیت اللہ کا حج یا عمرہ کیا تو اس پر صفا اور مروہ کے چکر لگانے (سعی کرنے) میں کوئی حرج نہیں ہے' حضرت عائشہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان سعی کو واجب قرار دیا ہے' پس کسی شخص کے لیے ان کے درمیان سعی کو ترک کرنا جائز نہیں ہے' عروہ کہتے ہیں: میں نے ابوبکر بن عبدالرحمان کو یہ حدیث سنائی تو انہوں نے کہا: لاریب یہی علم ہے' میں نے پہلے یہ نہیں سنا تھا' اور میں نے اہل علم سے یہ سنا تھا کہ زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگ (انصار کے ان لوگوں کے سوا جن کا حضرت عائشہ نے ذکر کیا ہے) مناۃ کے لیے احرام باندھتے تھے یہ سب صفا اور مروہ میں طواف کرتے تھے' جب اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کرنے کا حکم دیا اور قرآن میں صفا اور مروہ کا ذکر نہیں کیا' تو انہوں نے کہا: یارسول اللہ! ہم (زمانہ جاہلیت میں) صفا اور مروہ کا طواف کرتے تھے اور بے شک اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا حکم دیا ہے اور صفا کا ذکر نہیں کیا تو اگر ہم اب بھی صفا اور مروہ کا طواف کریں تو آیا کوئی گناہ ہے؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: (ترجمہ) بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں' سو جس نے بیت اللہ کا حج یا عمرہ کیا تو اس پر صفا اور مروہ کی سعی میں کوئی گناہ نہیں ہے' ابوبکر بن عبدالرحمان نے عروہ سے کہا: تو سنو! یہ آیت ان دونوں فریقوں کے متعلق نازل ہوئی ہے' وہ لوگ جو زمانہ جاہلیت میں صفا اور مروہ میں طواف کرنے کو گناہ سمجھتے تھے' اور وہ لوگ جو زمانہ جاہلیت میں ان کے درمیان طواف کرتے تھے' پھر اسلام لانے کے بعد ان کے درمیان طواف کرنے کو اس لیے گناہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا حکم دیا تھا اور صفا کا ذکر نہیں کیا تھا' حتیٰ کہ بعد میں بیت اللہ کے طواف کے بعد صفا کا ذکر بھی فرمادیا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۲۳۔ ۲۲۲ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ آیت کس لیے نازل ہوئی' اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس آیت کے نزول کے دو سبب ہیں' جیسا کہ اس حدیث میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

عام سبب اور آیت کے عام الفاظ

قرآن مجید میں کبھی سبب عام ہوتا ہے اور آیت کے الفاظ بھی عام ہوتے ہیں اور کبھی سبب خاص ہوتا ہے اور آیت کے الفاظ بھی خاص ہوتے ہیں' اور کبھی سبب خاص ہوتا ہے اور آیت کے الفاظ عام ہوتے ہیں اور اسی میں اختلاف ہے' جمہور کے نزدیک خصوصیت سبب کا اعتبار نہیں کیا جاتا بلکہ عموم الفاظ کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

پہلی صورت جب سبب اور الفاظ دونوں عام ہوں تو بالاتفاق عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے' اور اس کی سورۂ آل عمران میں بہ کثرت مثالیں ہیں جو غزوہ بدر اور غزوہ احد کے سلسلے میں نازل ہوئیں مثلاً یہ آیت ہے:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۹)

اور سستی نہ کرو اور غمگین نہ ہو' اگر تم کامل مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے ۝

یہ آیت بالعموم اہل احد کے متعلق نازل ہوئی' اس کے الفاظ عام ہیں اور اس میں عموم ہی کا اعتبار ہے۔

خاص سبب اور آیت کے خاص الفاظ

دوسری صورت میں جس میں سبب اور لفظ خاص ہو تو خصوص ہی کا اعتبار ہوتا ہے اور لفظ کا خاص ہونا یا علم کی وجہ سے ہو گا یا لام عہد کی وجہ سے۔

علم کی وجہ سے خصوصیت کی مثال یہ آیت ہے:

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا

پھر جب زید نے اس (قطع تعلق) کی غرض پوری کر لی

تو ہم نے (عدت کے بعد) آپ کا اس سے نکاح کر دیا۔ (الاحزاب: ۳۷)

حضرت زید بن حارثہ اور ان کی زوجہ حضرت زینب بن جحش رضی اللہ عنہا میں ان بن رہتی تھی' اس وجہ سے وہ ان کو طلاق دینا چاہتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو روکتے تھے' بہر حال جب زید نے طلاق دے دی تو عدت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت زینب بنت جحش کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کر دیا۔

اور لام عہد کی وجہ سے خصوصیت کی مثال یہ آیات ہیں:

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۝ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ۝ وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ ۝ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ۝ (اللیل: ۲۱-۱۷)

اور سب سے بڑے متقی کو جہنم سے بہت دور رکھا جائے گا ۝ جو حصول پاکیزگی کے لیے اپنا مال راہ الٰہی میں خرچ کرتا ہے ۝ اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے ۝ اس کا یہ مال خرچ کرنا صرف اپنے رب اعلیٰ کی رضا جوئی کے لیے ہے ۝ اور وہ ضرور عنقریب راضی ہوگا ۝

یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئیں' جب انہوں نے حضرت بلال کو خرید کر آزاد کر دیا جن کو ایمان لانے کے جرم میں سخت عذاب دیا جا رہا تھا' کفار نے کہا: ضرور بلال نے پہلے کوئی ابوبکر پر احسان کیا ہوگا جس کا بدلہ اتارنے کے لیے ابوبکر نے ان کو آزاد کیا ہے' اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ بلال تو الگ رہے روئے زمین پر کسی کا ابوبکر پر کوئی دنیاوی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ دیا جا سکے۔ ان کا یہ عمل تو صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہے' اور اس آیت کے مصداق صرف حضرت ابوبکر تھے کیونکہ باقی تمام مسلمانوں پر کسی نہ کسی کا کوئی نہ کوئی دنیاوی احسان ضرور تھا' اس آیت میں حضرت ابوبکر کو ''الاتقی'' سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ لام عہد ہے اور اس سے مراد حضرت ابوبکر ہیں' لہٰذا اس آیت کا سبب بھی خاص ہے اور الفاظ بھی خاص ہیں۔

خاص سبب اور آیت کے عام الفاظ

تیسری صورت یہ ہے کہ آیت کا سبب خاص ہو اور الفاظ عام ہوں۔ اس صورت میں جمہور علماء کے نزدیک عموم الفاظ کا اعتبار کیا جاتا ہے' اس کی مثال یہ آیات ہیں:

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُن لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ ۙ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ۝ وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۝ (النور: ۷-۶)

اور جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور ان کے پاس ان کی اپنی جانوں کے سوا اور کوئی گواہ نہ ہو تو ایسے کسی شخص کی گواہی یہ ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ بے شک وہ ضرور سچا ہے ۝ اور پانچویں گواہی یہ کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو ۝

اس آیت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

امام ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت ہلال بن امیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: میں عشاء کے وقت اپنی اہلیہ (خولہ بنت عاصم) کے پاس گیا تو میں نے اس کے پاس ایک مرد (شریک بن سحماء) دیکھا' میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ناپسند کیا' صحابہ کرام کا خیال تھا کہ اب حضرت ہلال پر حد قذف لگ جائے گی' تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

(روح المعانی ج ۱۸ ص ۱۰۴ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

ان آیات میں لعان کا حکم بیان کیا گیا ہے اور ہر چند کہ اس کا سبب نزول حضرت ہلال بن امیہ کے ساتھ خاص ہے لیکن اس کے الفاظ عام ہیں اور جو شخص بھی اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے اور اس کے پاس چار گواہ نہ ہوں تو شوہر اور بیوی کے درمیان لعان کیا جائے گا۔ امام بخاری نے بھی اس حدیث کو اختصار کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۹۹ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی ۱۳۸۱ھ)

امام بخاری حضرت سہل بن سعد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عویمر رضی اللہ عنہ نے پہلے حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معلوم کیا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو دیکھے تو آیا اس کو قتل کردے؟ تو پھر وہ قتل کر دیا جائے گا' تو وہ کیا کرے؟ حضور نے اس کو ناپسند کیا' تب حضرت عویمر نے کہا کہ میں حضور سے براہ راست سوال کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان تھے' حضرت عویمر آئے اور کہا: یارسول اللہ! یہ بتائیے کہ ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ ایک مرد کو دیکھے تو آیا وہ اس کو قتل کردے؟ تو پھر آپ اس کو قصاص میں قتل کر دیں گے! پھر وہ شخص کیا کرے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے اور تمہاری بیوی کے متعلق مجھ پر آیت نازل ہو چکی ہے۔ جاؤ اس کو لے آؤ' حضرت سہل نے کہا: پھر ان دونوں نے لعان کیا۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۰۰۔۷۹۹ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی ۱۳۸۱ھ)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ہلال بن امیہ اور حضرت عویمر رضی اللہ عنہ ان دونوں کے واقعے ان آیات کا شان نزول ہیں اور یہ کہ ان آیات کے دو سبب نزول ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ (المجادلہ: ۴۔۳)

اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں (اپنی بیوی سے کہیں: تیری پشت میری ماں کی پشت کی طرح ہے) پھر اس کام کے لیے لوٹنا چاہیں جس کے لیے اتنی سخت بات کہہ چکے ہیں (یعنی عمل زوجیت) تو ان پر عمل تزویج سے پہلے ایک غلام کو آزاد کرنا ہے' یہ ہے وہ نصیحت جو تمہیں کی جاتی ہے اور اللہ تمہارے کاموں سے خوب خبردار ہے ۝ تو جس کو غلام نہ مل سکے وہ عمل تزویج سے پہلے مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے' پھر جو (روزوں کی بھی) طاقت نہ رکھے تو اس پر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔

علامہ سیوطی ان آیات کا شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

امام ابن ماجہ' امام ابن ابی حاتم' امام حاکم نے تصحیح سند سے اور امام ابن مردویہ اور امام بیہقی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضرت خولہ بنت ثعلبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے شوہر کی شکایت کی اور کہا کہ میرا شوہر میری جوانی کھا گیا اور اب میں زیادہ عمر کی ہو گئی اور میرے بچے بھی نہیں رہے تو اس نے مجھ سے ظہار کر لیا' وہ مسلسل یہ شکایت کرتی رہی حتیٰ کہ یہ آیات نازل ہو گئیں۔ (درمنثور ج ۶ ص ۱۷۹ مطبوعہ مکتبہ آیت اللہ العظمی' ایران)

ظہار کی آیات کا سبب خاص ہے اور وہ خولہ بنت ثعلبہ کے شوہر کا ان سے ظہار کرنا ہے اور اس کے الفاظ عام ہیں اور اعتبار اسی عموم کا ہے' یعنی ہر ظہار کرنے والے مسلمان کا یہی حکم ہے۔

ایک آیت کے متعدد اسباب اور ایک سبب کی متعدد آیات

ہم اس سے پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ بعض اوقات ایک آیت کے نزول کے متعدد اسباب ہوتے ہیں' اسی طرح بعض اوقات سبب واحد ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں متعدد آیات نازل ہوتی ہیں' اس کی مثال یہ ہے کہ امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت میں عورتوں کا ذکر کیا ہو تو سورہ آل عمران میں کئی آیات نازل ہوئیں' نیز امام حاکم نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ مردوں کا ذکر کرتے ہیں اور عورتوں کا ذکر نہیں کرتے تو یہ آیت نازل ہوئی:

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ○ (الاحزاب: ۳۵)

بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں' اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور اللہ کو بہت یاد کرنے والی عورتیں' اللہ نے ان سب کے لیے بخشش اور بہت بڑا ثواب تیار کیا ہے ○

اور یہ آیت نازل ہوئی:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ○ (آل عمران: ۱۹۵)

پس ان کے رب نے ان کی دعا قبول کر لی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا خواہ مرد ہو یا عورت' تم سب آپس میں ہم جنس ہو تو جن لوگوں نے ہجرت کی اور وہ اپنے گھروں سے نکالے گئے اور جن کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں اور جنہوں نے جہاد کیا اور وہ شہید ہوئے' تو میں ضرور ان کے سب گناہ مٹا دوں گا' اور ضرور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اللہ کی طرف سے ثواب ہوگا' اور اللہ ہی کے پاس بہترین ثواب ہے ○

اسباب نزول سے متعلق یہ اہم اور ضروری مباحث تھے جن کا ہم نے یہاں ذکر کیا ہے۔

مکمل قرآن یکبارگی نازل نہ کرنے کی حکمتیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تیئیس سالہ زندگی میں قرآن مجید متفرق طور پر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا رہا' یکبارگی مکمل کتاب نازل نہیں ہوئی' قرآن مجید میں ہے:

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۞ (بنی اسرائیل:۱۰۶)

اور ہم نے اس قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ آپ اس کو ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کے سامنے پڑھیں اور ہم نے اس کو (حسب حالات) بہ تدریج نازل کیا ہے O

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۞ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۞ (الفرقان: ۳۳-۳۲)

اور کافروں نے کہا: اس (رسول) پر پورا قرآن ایک ہی مرتبہ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ ہاں! ہم نے اسی طرح (تھوڑا تھوڑا نازل کیا ہے) تاکہ ہم اس پر آپ کا دل مضبوط کریں اور ہم نے اس کی بہ تدریج تلاوت فرمائی ہے O اور (اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ) جب بھی یہ لوگ آپ کے پاس کوئی عجیب سوال لے کر آئے تو ہم نے اس کا (بروقت) صحیح اور ٹھوس جواب دیا اور واضح اور روشن بیان کر دیا O

قرآن مجید کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنے کی حکمتیں حسب ذیل ہیں:

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم ان پڑھ تھی اور لکھنا پڑھنا ان کا بالعموم شعار نہ تھا' اگر قرآن یکبارگی مکمل نازل ہو جاتا تو ان کے لیے اس کو ضبط کرنا مشکل ہوتا اور ان سے اس میں بہت غلطیاں ہوتیں' نبی صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے' نزول کتاب سے پہلے آپ لکھتے اور پڑھتے نہیں تھے اور تورات کو یکبارگی نازل کیا گیا' کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسے پڑھ کر لوگوں کو سناتے تھے۔

(۲) جس شخص کے پاس کتاب ہو وہ اس کتاب پر اعتماد کر لیتا ہے اور اس کو حفظ کرنے میں تساہل اور سستی کرتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے یکبارگی مکمل کتاب نازل نہیں فرمائی تاکہ آسانی سے اس کو حفظ کیا جا سکے اور مسلمان اس میں سستی نہ کریں۔

(۳) اگر مکمل کتاب یکبارگی نازل کر دی جاتی تو پوری شریعت ایک مرتبہ ہی نازل ہو جاتی اور اس پر عمل کرنا لوگوں کے لیے دشوار ہوتا' اس کے برعکس جب قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا تو لوگ بہ تدریج احکام کے مکلف ہوئے اور ان پر عمل کرنا لوگوں کے لیے آسان ہو گیا۔

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بار بار حضرت جبرائیل سے ملاقات کرتے تو ان کی ملاقات سے آپ کا دل قوی ہو جاتا اور تبلیغ رسالت میں پیش آنے والی کلفتوں اور دشواریوں پر آپ کا صبر اور پختہ ہو جاتا اور فرائض نبوت کی ادائیگی میں آپ کا شوق اور ولولہ اور بڑھ جاتا۔

(۵) تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنے سے قرآن مجید کا اعجاز اور واضح ہو گیا' کیونکہ اگر کسی انسان کی قدرت میں ایسا کلام لانا ممکن ہوتا تو وہ بھی اس طرح کی چند آیات پیش کر دیتا۔

(۶) مختلف مواقع پر لوگ مختلف سوالات کرتے تھے اور ان کے سوالوں کے جواب میں قرآن مجید کی آیات نازل ہوتی رہتی تھیں اگر مکمل کتاب یکبارگی نازل ہوتی تو یہ ممکن نہ تھا۔

(۷) جب قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم چند آیتوں کے ساتھ ان کو چیلنج کرتے اور جب وہ قرآن کریم کی چند آیتوں کی نظیر بھی نہ لا سکے تو پورے قرآن کی نظیر نہ لانا اور زیادہ واضح ہو گیا اور آپ کے دل میں اور استحکام

آ گیا کہ یہ قوم آپ کے معارضہ سے عاجز ہے۔

(۸) اگر پورا قرآن کریم ایک ہی بار نازل ہو جاتا تو حضرت جبرائیل صرف ایک بار آتے اور آپ کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان سفارت منقطع ہو جاتی اور جب کہ قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا تو آپ کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان سفارت کا رابطہ تاحیات قائم رہا۔

(۹) اس میں آپ کی دوسرے رسولوں پر فضیلت ہے کیونکہ ان پر یکبارگی کتاب نازل کر دی گئی اور ان کے پاس صرف ایک بار حضرت جبرائیل آئے اور اس کے بعد ان کے اور اللہ کے درمیان سفارت منقطع ہو گئی' اور جو سفارت کا رابطہ دوسرے رسولوں کے ساتھ صرف ایک بار ہوا وہ رابطہ آپ کے ساتھ تاحیات برقرار رہا۔

(۱۰) حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یکبارگی کوہ طور پر تورات نازل ہوئی' تو کوہ طور کو مہبط وحی الٰہی ہونے کا شرف حاصل ہوا اور جب حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تھوڑا تھوڑا کر کے مختلف اوقات اور مختلف مقامات پر قرآن مجید نازل ہوا تو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے متعدد مقامات کو مہبط وحی الٰہی ہونے کا شرف حاصل ہوا حتیٰ کہ ام المومنین حضرت عائشہ کے بستر پر بھی قرآن نازل ہوا۔

(۱۱) مختلف اسباب اور واقعات کی وجہ سے بھی قرآن مجید کی آیات نازل ہوتی تھیں' مثلاً کسی کافر یا منافق نے کوئی دل آزار کلمہ کہا تو اس کے رد میں آپ کو تسلی دینے کے لیے آیات نازل ہوئیں' مسلمانوں نے رات کے روزے میں روزہ توڑ لیا تو رات کا روزہ ختم کرنے میں آیات نازل ہوئیں۔ منافقین نے حضرت عائشہ پر تہمت لگائی تو آپ کی براءت میں آیات نازل ہوئیں' علیٰ ھذا القیاس اگر قرآن مجید مکمل یکبارگی نازل ہوتا تو یہ ممکن نہ تھا۔

(۱۲) بعض اوقات کوئی حکم نازل کیا جاتا' پھر اس کو منسوخ کر دیا جاتا' مثلاً پہلے بیوہ عورت کی عدت ایک سال رکھی گئی' پھر یہ عدت چار ماہ دس دن کر دی گئی' اور مکہ مکرمہ میں جہاد شروع نہیں کیا گیا اور کفار کے مقابلہ میں صبر و ضبط کا حکم دیا گیا تھا اور مدینہ منورہ میں جہاد کا حکم دیا گیا' اس طرح ناسخ اور منسوخ آیتوں اور احکام کا سلسلہ اسی وقت ممکن تھا جب قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہو۔ اگر قرآن مجید یکبارگی نازل ہوتا تو یہ ممکن نہ تھا۔

(۱۳) عرب کے لوگ زمانہ جاہلیت کی عادتوں اور رسموں میں جکڑے ہوئے تھے' اگر یکبارگی ان پر تمام احکام شرعیہ کا بوجھ ڈال دیا جاتا تو وہ گھبرا جاتے اور ممکن تھا کہ وہ ان تمام احکام کو قبول نہ کر پاتے' اس لیے حکمت اور مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ ان کو بہ تدریج احکام کا مکلف کیا جائے' اس لیے قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا تاکہ جو عادات ان میں راسخ ہو چکی تھیں ان کو آہستہ آہستہ بدلا جائے۔

(۱۴) جیسے جیسے واقعات اور حوادث پیش آتے رہے اور ان کے اعتبار سے جس جس طرح حکمت اور مصلحت کا تقاضا تھا اسی اعتبار سے قرآن مجید کو نازل کیا جاتا رہا۔

رمضان کے مہینہ کی شب قدر میں قرآن مجید کا نزول شروع ہوا اور مسلسل تیئس سال تک سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا رہا اور اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی زندگی کا کوئی وقت وحی الٰہی سے رابطہ کے بغیر نہیں گزرا اور حضرت جبرائیل کی رفاقت اور معیت سے آپ کی بعثت کی زندگی کا کوئی دور خالی نہیں رہا۔

سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت اور سورت کا بیان

علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے کون سی آیت نازل ہوئی' اس مسئلہ میں متعدد اقوال ہیں اور صحیح قول یہ ہے کہ سب سے پہلے "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ" (العلق: ۱) نازل ہوئی' امام بخاری' امام مسلم اور دیگر ائمہ حدیث نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء سچے خوابوں سے کی گئی' آپ جب بھی کوئی خواب دیکھتے تو روشن صبح کی طرح اس کی تعبیر آ جاتی' پھر آپ کے دل میں خلوت گزینی کی محبت پیدا کی گئی' آپ حراء میں جا کر کئی کئی راتیں گزارتے اور وہاں عبادت کرتے' آپ وہاں قیام کے لیے کھانا لے جاتے' اس کے بعد حضرت خدیجہ کے پاس لوٹتے اور پھر کھانا لے جاتے' آپ غار حراء میں تھے کہ ایک دن فرشتہ آیا' اور اس نے کہا: پڑھیے' آپ نے فرمایا: میں پڑھنے والا نہیں ہوں (یا' میں کیا پڑھوں؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس نے مجھے پکڑ کر خوب بھینچا حتیٰ کہ اس نے پوری قوت صرف کر دی' پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا: پڑھیے' میں نے کہا: میں پڑھنے والا نہیں ہوں (یا' میں کیا پڑھوں؟) اس نے سہ بارہ مجھے پکڑ کر بھینچا حتیٰ کہ اس نے پوری قوت صرف کی' پھر مجھے چھوڑ کر کہا: پڑھیے "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ" (العلق: ۱) اور یہ آیت "مَا لَمْ يَعْلَمْ" (العلق: ۵) تک پڑھی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیتوں کو دہرایا اور درانحالیکہ آپ کے کندھے کپکپا رہے تھے۔

امام حاکم نے "مستدرک" میں اور امام بیہقی نے "دلائل النبوۃ" میں سند صحیح کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ قرآن مجید کی جو سورت سب سے پہلے نازل ہوئی وہ "اقرا باسم ربك" ہے۔

امام طبرانی نے حدیث صحیح کی شرط کے مطابق سند صحیح کے ساتھ ابو رجاء عطاردی سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری دو سفید کپڑے پہنے ہوئے ایک حلقہ میں ہم کو قرآن پڑھا رہے تھے' جب انہوں نے "اقرا باسم ربك الذی خلق" کی تلاوت کی تو کہا: یہ پہلی سورت ہے' جو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے۔

امام سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اپنی سند کے ساتھ عبید بن عمیر سے روایت کیا ہے کہ حضرت جبرائیل' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ سے کہا: پڑھیے' آپ نے فرمایا: میں کیا پڑھوں؟ بہ خدا! میں پڑھنے والا نہیں ہوں' حضرت جبرائیل نے کہا: "اقرا باسم ربك الذی خلق" اور یہ پہلی آیت نازل ہوئی تھی۔

ابو عبید نے فضائل قرآن میں مجاہد سے نقل کیا ہے کہ قرآن کی پہلے نازل ہونے والی سورتوں میں "اقرا باسم ربك" اور "نٓ وَالْقَلَمِ" (القلم: ۱) ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے "يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ" (المدثر: ۱) نازل ہوئی' کیونکہ امام بخاری اور امام مسلم نے ابو سلمہ بن عبد الرحمان سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے پوچھا کہ سب سے پہلے کون سی سورت نازل ہوئی؟ تو انہوں نے کہا: "یایھا المدثر" (الحدیث) اس حدیث کا یہ جواب ہے کہ سب سے پہلی آیت "اقرا باسم ربك" ہے اور سب سے پہلے جو مکمل سورت نازل ہوئی وہ "یایھا المدثر" ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ "اقرا باسم ربك" کے نزول کے بعد کچھ عرصہ کے لیے وحی کا آنا رک گیا تھا' اس فترت اور وقفہ کے بعد جو سب سے پہلی سورت نازل ہوئی وہ "یا یھا المدثر" ہے' تیسرا جواب یہ ہے کہ سورہ مدثر اس لحاظ سے پہلی سورت ہے کہ اس میں احکام ہیں' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ کرنے اور لوگوں کو خدا کے عذاب سے ڈرانے کا حکم دیا ہے اور "اقرا باسم ربك" مطلقاً سب سے پہلی آیت ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ سورہ فاتحہ سب سے پہلی سورت ہے' امام بیہقی اور امام واحدی نے ابو میسرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ سے فرمایا کہ جب میں خلوت میں ہوتا ہوں تو میں ایک آواز سنتا ہوں' بہ خدا! مجھے خوف ہے کہ یہ کوئی عجیب و غریب بات ہے! حضرت خدیجہ نے کہا: معاذ اللہ' اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ایسا نہیں کرے گا' بہ خدا

آپ امانت کو ادا کرتے ہیں' صلہ رحمی کرتے ہیں اور سچ بولتے ہیں' پھر جب حضرت ابوبکر' حضرت خدیجہ کے پاس آئے تو حضرت خدیجہ نے ان کو یہ قصہ سنایا اور کہا: (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ورقہ کے پاس جاؤ' سو وہ آپ کے ساتھ ورقہ کے پاس گئے اور یہ قصہ سنایا اور فرمایا: جب میں خلوت میں ہوتا ہوں تو کوئی مجھے پیچھے سے آواز دیتا ہے: یا محمد! یا محمد! تو میں بھاگ کر افق میں (بہت دور) چلا جاتا ہوں' ورقہ نے کہا: آپ ایسا نہ کریں' جب یہ آواز آئے تو آپ ٹھہرے رہیں اور سنیں کہ وہ کیا کہتا ہے' پھر آکر مجھے بتائیں' پھر آپ کو تنہائی میں آواز آئی: یا محمد! کہیے: ''بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ رب العالمین'' حتیٰ کہ'' ولا الضالین '' تک سورہ فاتحہ آپ نے سنی' یہ حدیث مرسل ہے اور اس کے روای ثقہ ہیں' امام بیہقی نے کہا: اگر یہ حدیث محفوظ ہے تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ یہ واقعہ سورہ اقراء اور سورہ مدثر کے نزول کے بعد پیش آیا۔

چوتھا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے'' بسم اللہ الرحمن الرحیم '' نازل ہوئی' واحدی نے اپنی سند کے ساتھ عکرمہ اور حسن سے روایت کیا ہے کہ پہلی آیت'' بسم اللہ الرحمن الرحیم '' اور پہلی سورت اقراء ہے۔

(الاتقان ج ۱ ص ۲۲۔ ۲۳' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت اور سورت کا بیان

علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

اس میں اختلاف ہے کہ سب سے آخر میں کون سی آیت نازل ہوئی' امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سب سے آخر میں یہ آیت نازل ہوئی: '' یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ ؕ '' (النساء:۱۷۶) اور سب سے آخری سورت' سورہ توبہ ہے' امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ سب سے آخر میں آیت ربا نازل ہوئی ہے' امام بیہقی نے بھی حضرت عمر سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اس سے مراد یہ آیت ہے: '' یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا '' (البقرہ:۲۷۸) امام احمد اور امام ابن ماجہ نے بھی حضرت عمر سے یہ روایت کیا ہے کہ سب سے آخر میں آیت ربا نازل ہوئی ہے۔

امام نسائی نے از عکرمہ از ابن عباس روایت کیا ہے کہ آخری آیت یہ ہے: '' وَ اتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ '' (البقرہ:۲۸۱)۔ امام ابن جریر نے بھی حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آخری آیت یہ ہے: '' وَ اتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ '' (البقرہ:۲۸۱) اس آیت کے نزول کے اکیاسی (۸۱) دن بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تھا' اور امام ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ قرآن مجید کی جو آخری آیت نازل ہوئی وہ '' وَ اتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ '' (البقرہ:۲۸۱) ہے اور اس کے نزول کے نو دن بعد پیر کے دن ۲۸ ربیع الاول کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ میراث میں آخری آیت '' یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ '' (النساء:۱۷۶) ہے اور سود میں آخری آیت '' یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا '' (البقرہ:۲۷۸) ہے اور مطلقاً آخری آیت '' وَ اتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ '' (البقرہ:۲۸۱) ہے۔

امام حاکم نے '' مستدرک '' میں حضرت ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ آخری آیت '' لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ '' (التوبہ:۱۲۸) ہے۔

امام مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آخری سورت جو نازل ہوئی وہ '' اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ '' (النصر:۱) ہے۔

امام ترمذی اور امام حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے جو سورت آخر میں نازل ہوئی وہ سورہ مائدہ ہے۔

امام ترمذی اور امام حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آخری سورت سورہ مائدہ اور سورہ فتح ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مشہور روایت ہے کہ سب سے آخر میں سورہ توبہ نازل ہوئی ہے۔

امام بیہقی نے یہ کہا ہے کہ ان مختلف روایات کی بہ تقدیر صحت یہ توجیہ ہے کہ ہر صحابی نے اپنے نظریہ کے مطابق کہا ہے' قاضی ابوبکر نے یہ کہا ہے کہ ان اقوال میں سے کوئی بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح ارشاد نہیں ہے' اور ہر صحابی کا قول اس کے اجتہاد اور غلبہ ظن پر محمول ہے۔ (الاتقان ج ۱ ص ۲۷۔ ۲۶ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

مکی اور مدنی سورتوں کی معرفت

علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

مکی اور مدنی سورتوں کے متعلق علماء کی تین اصطلاحیں ہیں' ان میں زیادہ مشہور یہ ہے کہ جو سورتیں ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں وہ مکی ہیں اور جو سورتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں وہ مدنی ہیں' عام ازیں کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی ہوں یا مدینہ میں' فتح مکہ کے سال نازل ہوئی ہوں یا حجۃ الوداع کے سال میں' یا کسی سفر کے دوران نازل ہوئی ہوں۔

دوسری اصطلاح یہ ہے کہ جو سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں وہ مکی ہیں خواہ وہ ہجرت کے بعد مکہ میں نازل ہوئی ہوں اور جو مدینہ میں نازل ہوئیں وہ مدنی ہیں' اس اصطلاح کی بناء پر مکی اور مدنی سورتوں میں ایک واسطہ ہوگا کیونکہ جو آیات دوران سفر نازل ہوئیں وہ مکی ہوں گی نہ مدنی' اور امام طبرانی نے ''معجم کبیر'' میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن تین جگہوں میں نازل ہوا ہے' مکہ' مدینہ اور شام میں۔ ولید نے کہا: شام سے مراد بیت المقدس ہے' اور شیخ عماد الدین بن کثیر نے کہا: شام کی تفسیر تبوک سے کرنا زیادہ بہتر ہے' اور میں کہتا ہوں کہ مکہ میں اس کے مضافات مثلاً منیٰ' عرفات اور حدیبیہ داخل ہیں اور مدینہ میں بدر' احد اور سلع داخل ہیں۔

تیسری اصطلاح یہ ہے کہ جن سورتوں میں اہل مکہ سے خطاب ہو' وہ مکی ہیں اور جن سورتوں میں اہل مدینہ سے خطاب ہو وہ مدنی ہیں۔

قاضی ابوبکر نے کہا: مکی اور مدنی سورتوں کی معرفت میں صحابہ اور تابعین کی معرفت پر اعتماد کیا گیا ہے' اور اس سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ارشاد منقول نہیں ہے' اور فرائض اور واجبات میں سے کوئی چیز ان کی معرفت پر موقوف نہیں ہے' البتہ ناسخ اور منسوخ کی معرفت میں سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے کا دخل ہے۔

(الاتقان ج ۱ ص ۹۔ ۸ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

عہد رسالت میں قرآن مجید کو جمع کرنے کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سب سے پہلے قرآن مجید کو حفظ کر کے سینوں (دماغوں) میں جمع کیا گیا اور سب سے پہلے یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ (ذہن مبارک) میں محفوظ اور جمع ہوا۔

قرآن مجید میں ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ؕ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۚ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ؕ (القیامہ: ۱۹۔ ۱۶)

آپ (قرآن یاد کرنے کے لیے) جلدی جلدی زبان کو حرکت نہ دیں ○ بے شک اس کو (آپ کے ذہن میں) محفوظ کرنا اور آپ کا اسے پڑھنا ہمارے ذمہ ہے ○ تو جب ہم اس

کو پڑھ چکیں تو پھر آپ اس پڑھے ہوئے کو پڑھیں O پھر بے شک اس کا بیان ہمارے ذمہ ہے O

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا دور کیا کرتے تھے اور جس سال آپ کا وصال ہوا آپ نے دو مرتبہ جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا دور کیا۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت سیدتنا فاطمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سرگوشی کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا: جبرئیل ہر سال مجھ سے قرآن مجید کا دور کرتے ہیں اور اس سال انہوں نے مجھ سے دو مرتبہ دور کیا ہے اور مجھے یہ یقین ہے کہ اب میرا وقت آ گیا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ جواد تھے' اور آپ کی جود و سخا رمضان کے مہینے میں بہت زیادہ ہوتی تھی' کیونکہ حضرت جبریل ماہ رمضان کی ہر رات میں آپ سے ملاقات کرتے تھے حتیٰ کہ ماہ رمضان پورا ہو جاتا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے قرآن کریم کا دور کرتے تھے اور جب جبریل آپ سے ملاقات کرتے تو آپ بارش برسانے والی ہواؤں سے زیادہ خیر کی سخاوت فرماتے تھے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر صحابہ کرام قرآن مجید کو یاد کرتے تھے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

ابراہیم نخعی بیان کرتے ہیں کہ مسروق کے سامنے حضرت عبداللہ بن عمرو نے حضرت عبداللہ بن مسعود کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا: میں ان سے ہمیشہ محبت کرتا ہوں کیونکہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ چار آدمیوں سے قرآن مجید کو حاصل کرو: عبداللہ بن مسعود' سالم' معاذ اور ابی بن کعب۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی' ۱۳۸۱ھ)

شقیق بن سلمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ہمیں خطبہ دیا اور کہا: بہ خدا! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے (سن کر) ستر سے زیادہ سورتیں یاد کی ہیں' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو علم ہے کہ مجھے کتاب اللہ کا سب سے زیادہ علم ہے حالانکہ میں ان سب سے افضل نہیں ہوں۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

مسروق بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں' کتاب اللہ کی جو سورت بھی نازل ہوتی تھی' مجھے اس کے متعلق علم ہوتا تھا کہ یہ سورت کہاں نازل ہوئی ہے اور کتاب اللہ کی جو آیت نازل ہوتی تھی مجھے اس کے متعلق علم ہوتا تھا کہ یہ کس کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم رکھتا ہے اور اونٹ پر سفر کر کے اس تک پہنچا جا سکتا ہے تو میں سفر کر کے اس کے پاس جاتا۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کس نے قرآن جمع کیا تھا' انہوں نے کہا: چار صحابہ نے اور وہ سب انصار میں سے تھے' حضرت ابی بن کعب' حضرت معاذ بن جبل' حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابوزید رضی اللہ عنہم۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس وقت صرف چار صحابہ نے

قرآن مجید جمع کیا تھا' حضرت ابو درداء' حضرت معاذ بن جبل' حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابو زید۔
(صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی ۱۳۸۱ھ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی موخر الذکر دو حدیثوں پر دو اعتراض ہوتے ہیں' ایک اعتراض یہ ہے کہ پہلی حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے چار صحابہ میں حضرت ابی بن کعب کا ذکر کیا ہے اور دوسری حدیث میں حضرت ابو درداء کا ذکر کیا ہے اور یہ ان کے ذکر کردہ حصر کے خلاف ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ جس حدیث میں حضرت ابو درداء کا ذکر ہے وہ غیر محفوظ اور غیر راجح ہے' اور محفوظ اور راجح وہ حدیث ہے جس میں حضرت ابی بن کعب کا ذکر ہے اور اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ حضرت انس نے دو مختلف وقتوں میں یہ حدیثیں بیان کی ہوں' ایک دفعہ حضرت ابی بن کعب کا ذکر کیا اور دوسری دفعہ حضرت ابو درداء کا ذکر کیا' اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ابن ابی داؤد نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ انصار میں سے پانچ صحابہ نے قرآن مجید کو جمع کیا ہے: حضرت معاذ بن جبل' حضرت عبادہ بن صامت' حضرت ابی بن کعب' حضرت ابو درداء اور حضرت ابو ایوب انصاری' یہ حدیث مرسل ہونے کے باوجود حسن ہے اور اس کا ایک شاہد بھی ہے' کیونکہ شعبی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں چھ صحابہ نے قرآن مجید کو جمع کیا جن میں حضرت ابو درداء' حضرت معاذ' حضرت ابو زید' اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم شامل ہیں' مرسل ہونے کے باوجود اس حدیث کی سند صحیح ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی شخص نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے قرآن مجید جمع کرنے کا انکار کیا ہو تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اس کا رد کرنے کے لیے بہ طریق حصر حضرت ابو درداء کا ذکر کیا ہو۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۵۳ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت انس نے یہ بیان کیا ہے کہ صرف چار صحابہ نے قرآن مجید جمع کیا' حالانکہ ابو عبید نے ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے قراء صحابہ میں خلفاء اربعہ' حضرت طلحہ' حضرت سعد' حضرت ابن مسعود' حضرت حذیفہ' حضرت سالم' حضرت ابو ہریرہ' حضرت عبداللہ بن سائب' حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت عبداللہ بن زبیر شامل ہیں اور خواتین میں سے حضرت عائشہ' حضرت حفصہ اور حضرت ام سلمہ ہیں (البتہ ان میں سے بعض نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد قرآن مجید مکمل کیا) اور ابن ابو داؤد نے مہاجرین میں سے حضرت تمیم بن اوس داری اور حضرت عقبہ بن عامر اور انصار میں سے حضرت عبادہ بن صامت' حضرت معاذ ابو حلیمہ' حضرت مجمع بن حارثہ' حضرت فضالہ بن عبید اور مسلمہ بن مخلد وغیرہم کا ذکر کیا' (اور ان میں سے بھی بعض نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد قرآن کریم جمع کیا تھا) اور جن صحابہ نے قرآن مجید کو جمع کیا ان میں حضرت ابو موسیٰ اشعری' حضرت عمرو بن عاص' حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت ام ورقہ ہیں۔

علامہ مازری نے کہا ہے کہ حضرت انس نے جو یہ کہا ہے کہ چار صحابہ کے سوا اور کسی نے قرآن کو جمع نہیں کیا' اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نفس الامر اور واقع میں بھی اسی طرح ہو' اور حضرت انس کی طرف سے توجیہ یہ ہے کہ ان کو ان چار کے سوا باقی کا علم نہیں تھا' ورنہ اس کا کس طرح احاطہ ہوسکتا ہے جب کہ صحابہ بہت زیادہ تھے اور مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے' اور حضرت انس کا یہ قول صرف اسی وقت درست ہوسکتا ہے جب تمام صحابہ میں سے ہر ایک نے حضرت انس سے ملاقات کر کے ان کو یہ بتایا ہو کہ اس نے مکمل قرآن جمع نہیں کیا اور یہ عادۃً بہت بعید ہے۔

اس حدیث کی وجہ سے ملحدوں نے قرآن مجید کے متواتر ہونے پر طعن کیا ہے' تاہم اگر فی نفسہ یہ قول درست بھی ہوتا' تب بھی جم غفیر میں سے ہر ایک کو پورا قرآن مجید یاد نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس جم غفیر کو مجموعی طور پر بھی قرآن مجید یاد

نہ ہو اور تواتر کی یہ شرط نہیں ہے کہ ہر فرد کو پورا قرآن حفظ ہو بلکہ اگر کل نے مل کر کل کو یاد کر رکھا ہو پھر بھی کافی ہے اور علامہ قرطبی نے اس سے استدلال کیا ہے کہ جنگ یمامہ میں ستر حافظ قرآن شہید ہو گئے تھے' اسی طرح عہد رسالت میں بیر معونہ میں ستر قاری شہید ہو گئے تھے' اس لیے یہ قول کیسے درست ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صرف چار صحابہ کو پورا قرآن مجید یاد تھا۔

حضرت انس کی اس حدیث کی بعض مزید توجیہات یہ ہیں:

(۱) تمام وجوہ اور تمام قراءات کے ساتھ صرف ان چار صحابہ کو پورا قرآن مجید یاد تھا۔

(۲) ان چار صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ سن کر پورا قرآن مجید یاد کیا تھا باقی صحابہ نے پورا قرآن آپ سے بلاواسطہ نہیں سنا تھا۔

(۳) یہ چار صحابہ قرآن مجید کی تعلیم دینے میں بہت مشہور تھے اور باقی اتنے مشہور نہیں تھے' اس لیے ان کا حال مخفی رہا' انہوں نے ریا اور عجب کے خدشہ سے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا۔

(۴) ان چار کے جمع کرنے سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے مکمل قرآن مجید لکھ کر جمع کیا تھا اور باقی صحابہ نے دل میں یاد کیا تھا۔

(۵) ان چار نے اعلان کر دیا تھا کہ انہوں نے مکمل قرآن جمع کیا ہے اور باقی صحابہ نے اعلان نہیں کیا تھا۔

(فتح الباری ج ۹ ص ۵۲-۵۱ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

علامہ نیشاپوری لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن جمع کر لیا گیا تھا' کیونکہ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاتب قرآن کو یہ حکم دیتے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں جگہ لکھ دو' اور جب بھی کوئی سورت نازل ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاتب کو یہ حکم دیتے کہ اس کو فلاں سورت کے بعد لکھو۔

(غرائب القرآن ج ۱ ص ۲۴ 'مطبوعہ مطبع امیریہ کبری بولاق' مصر' ۱۳۲۳ھ)

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر صحابہ کرام قرآن مجید لکھ لیتے تھے' اور مشہور یہ ہے کہ پچیس صحابہ کاتب وحی تھے' اور تحقیق یہ ہے کہ وہ ساٹھ صحابہ تھے' ان میں زیادہ مشہور خلفاء اربعہ' حضرت ابی بن کعب' حضرت زید بن ثابت' حضرت معاویہ بن ابی سفیان' حضرت یزید بن ابی سفیان' حضرت مغیرہ بن شعبہ' حضرت زبیر بن عوام' حضرت خالد بن ولید' پھر علامہ زحیلی نے ابوعبیدہ کے حوالے سے ان حفاظ صحابہ کا ذکر کیا ہے جن کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں اور یہ لکھا ہے کہ زیادہ مشہور حفاظ حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت ابی بن کعب' حضرت ابو درداء' حضرت معاذ بن جبل' حضرت زید بن ثابت' حضرت ابن مسعود اور حضرت ابو موسیٰ اشعری تھے۔ (التفسیر المنیر ج ۱ ص ۲۱-۲۰ 'مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۱ھ)

حضرت ابوبکر کے عہد میں قرآن مجید کو جمع کرنے کا بیان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن مجید کو ایک مصحف میں اس لیے جمع نہیں کیا گیا کہ نزول وحی کا عمل آپ کی حیات مبارکہ میں مسلسل جاری تھا اور ہر وقت کسی نئی وحی کے نازل ہونے کا امکان تھا' البتہ قرآن مجید کی تمام آیات کپڑے کے ٹکڑوں پر' ہڈیوں پر' پتھروں پر اور پتوں سے صاف کی ہوئی کھجور کی ٹہنیوں پر لکھی ہوتی تھیں' پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جنگ یمامہ کے دوران بہت سے حفاظ قرآن شہید ہو گئے' تب قرآن مجید کو پہلی بار ایک مصحف میں جمع کرنے

کی تحریک ہوئی' جیسا کہ اس حدیث میں ہے:

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ یمامہ کے دوران' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے بلوایا' اس وقت ان کے پاس حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے' حضرت ابوبکر نے کہا: میرے پاس حضرت عمر آئے اور کہا: جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ قرآن شہید ہو گئے' اور مجھے یہ خدشہ ہے کہ اگر یونہی مختلف جنگوں میں حفاظ قرآن شہید ہوتے رہے تو بہت سا قرآن مجید چلا جائے گا' اور میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ قرآن مجید کو جمع کرنے کا حکم دیں' میں نے حضرت عمر سے کہا: آپ ایسا کام کیوں کر رہے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟ حضرت عمر نے کہا: بہ خدا! اس میں خیر ہے' پھر حضرت عمر مسلسل مجھ سے یہ کہتے رہے' حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے میرا شرح صدر کر دیا' اور میری رائے حضرت عمر کی رائے کے موافق ہو گئی۔ حضرت زید بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے کہا: تم عقل مند شخص ہو اور ہم کو تمہارے متعلق کسی قسم کی کوئی بدگمانی نہیں ہے' اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وحی لکھتے تھے' سو تم قرآن مجید کو تلاش کر کے جمع کرو' بہ خدا! اگر یہ لوگ مجھ سے یہ کہتے کہ پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دو تو یہ میرے لیے اتنا دشوار نہ ہوتا جتنا قرآن مجید کو جمع کرنے کے حکم پر عمل کرنا میرے لیے دشوار تھا' میں نے کہا: آپ لوگ ایسا کام کیوں کر رہے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟ حضرت ابوبکر نے کہا: بہ خدا! اس میں خیر ہے' پھر حضرت ابوبکر مجھ سے مسلسل اصرار کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے میرا سینہ کھول دیا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر کا سینہ کھول دیا تھا' پس میں نے قرآن کریم کو تلاش کرنا شروع کیا' میں نے پتوں سے صاف کی ہوئی کھجور کی شاخوں' پتھروں اور مسلمانوں کے سینوں سے قرآن مجید کو جمع کیا' حتیٰ کہ سورہ توبہ کی آخری آیت: ''لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ'' (التوبہ: ۱۲۸) مجھے حضرت ابوخزیمہ انصاری کے پاس ملی' پھر صحیفوں میں جمع شدہ یہ قرآن مجید حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس رکھا گیا' پھر ان کی وفات کے بعد تاحیات حضرت عمر کے پاس رہا' پھر ان کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما کے پاس رہا۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

ابن ابی داؤد نے مصاحف میں سند حسن کے ساتھ عبد خیر سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی نے فرمایا: مصاحف کا سب سے زیادہ اجر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہوگا' اللہ تعالیٰ حضرت ابوبکر پر رحم کرے' وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مصحف میں قرآن مجید کو جمع کیا' بعض روایات میں حضرت علی کے پہلے جمع کرنے کا ذکر ہے لیکن وہ ضعیف روایات ہیں اور بعض روایات میں حضرت عمر کے پہلے جمع کرنے کا ذکر ہے لیکن اس سے مراد ہے: ان کا جمع کرنے کے لیے مشورہ دینا۔

ابن ابی داؤد بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے آ کر کہا: جس شخص نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر جتنا قرآن مجید لکھ لیا ہو وہ اس کو لے کر آئے اور اس وقت لوگ صحیفوں میں' تختیوں پر اور پتوں سے خالی شاخوں پر لکھتے تھے اور حضرت زید کسی سے اس وقت تک کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے جب تک کہ دو گواہ اس پر گواہی نہ دیتے اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت زید صرف لکھے ہوئے کو کافی نہیں سمجھتے تھے حتیٰ کہ دو گواہ اس پر گواہی دیتے کہ اس کو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے' حالانکہ حضرت زید بن ثابت خود حافظ قرآن تھے لیکن وہ حفاظت میں مبالغہ کرنے کے لیے ایسا کرتے تھے۔

ابن ابی داؤد بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر اور حضرت زید سے فرمایا کہ آپ دونوں مسجد کے دروازہ پر

بیٹھ جائیں' اور جو شخص کتاب اللہ پر دو گواہ لے کر آئے اس کو لکھ لیں' علامہ ابن حجر نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دو گواہ اس پر گواہی دیں کہ انہوں نے اس آیت کو حفظ کیا تھا اور اسکو لکھ لیا تھا' علامہ سخاوی نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اس پر گواہی دیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس آیت کو لکھ لیا گیا تھا' ابوشامہ نے کہا: ان کی اس سے غرض یہ تھی کہ صرف اسی آیت کو لکھا جائے جس کے متعلق یہ یقین ہو جائے کہ علی التعیین اس آیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھ لیا گیا تھا' کیونکہ جب تک کسی آیت کا تحریری ثبوت نہ مل جائے وہ اس کے صرف حفظ کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔

ابن اشتہ نے مصاحف میں لیث بن سعد سے روایت کیا ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر نے قرآن کو جمع کیا' اور حضرت زید نے لکھا' لوگ حضرت زید کے پاس قرآن مجید کی آیات لے کر آتے اور جب تک وہ ان آیتوں کے لکھے جانے پر دو گواہ پیش نہ کرتے حضرت زید ان کو نہیں لکھتے تھے' اور سورہ توبہ کی آخری آیت کے مکتوب ہونے پر صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری کی شہادت تھی' حضرت زید نے کہا: اس کو لکھ لو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ کی اکیلی شہادت کو دو شہادتوں کے برابر قرار دیا ہے' پھر اس آیت کو لکھ لیا گیا۔ (الاتقان ج ۱ ص ۵۸۔۵۷' مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور' ۱۴۰۰ھ)

جس حدیث میں حضرت خزیمہ کی شہادت کو دو شہادتوں کے برابر قرار دیا گیا ہے وہ یہ ہے:

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

عمارہ بن خزیمہ کے چچا رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا: وہ گھوڑے کی قیمت لے کر آتے ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی جلدی چل کر گھوڑے کی قیمت لینے گئے اور وہ اعرابی آہستہ آہستہ چلتا رہا' لوگ اس اعرابی کے ساتھ چلنے لگے اور اس سے اس گھوڑے کی قیمت پوچھنے لگے اور ان کو یہ پتا نہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس گھوڑے کو خرید چکے ہیں' اس اعرابی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ندا کی: اگر آپ اس گھوڑے کو خرید رہے ہیں تو ٹھیک ہے' ورنہ میں اس گھوڑے کو بیچ رہا ہوں' جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابی کی یہ ندا سنی تو آپ نے فرمایا: کیا میں تم سے یہ گھوڑا خرید نہیں چکا؟ اعرابی نے کہا: نہیں! بہ خدا میں نے یہ گھوڑا آپ کو نہیں بیچا' آپ نے فرمایا: کیوں نہیں! میں تم سے یہ گھوڑا خرید چکا ہوں' اعرابی کہنے لگا: اچھا آپ گواہ لائیں' حضرت خزیمہ نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک یہ گھوڑا آپ نے اس سے خریدا ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مڑ کر حضرت خزیمہ سے فرمایا: تم کس بنا پر گواہی دے رہے ہو؟ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ کی تصدیق کرنے کی وجہ سے' تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ کی شہادت کو دو مردوں کی شہادت کے برابر قرار دیا۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۲' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

بہ ظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت خزیمہ کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دینا ان کے ایمان کی پختگی کی بنا پر تھا اور اس بات کا انعام تھا کہ انہوں نے بن دیکھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کی تصدیق کر دی لیکن درحقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نور نبوت سے دیکھ رہے تھے کہ ایک وقت آئے گا کہ سورہ توبہ کی آخری آیت کے لکھے جانے پر حضرت خزیمہ کے علاوہ اور کوئی گواہ نہیں ہوگا' اگر حضرت خزیمہ کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر نہ قرار دیا گیا تو سورہ توبہ کی آخری آیت قرآن میں درج ہونے سے رہ جائے گی اور قرآن نامکمل رہ جائے گا' سو اس حدیث سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی اختیار کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ جس کو چاہیں نواز دیں اور ایک گواہی کو دو کے برابر کر دیں اور آپ کے علم کی عظمتوں کا بھی پتا چلتا ہے کہ مستقبل میں ہونے والے واقعات آپ کی نظر میں ہوتے ہیں اور نہ صرف نظر میں ہوتے ہیں بلکہ آپ ان کا تدارک بھی فرماتے ہیں۔

حضرت عثمان کے عہد میں قرآن مجید کو جمع کرنے کا بیان

قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا تھا' اور ہر قبیلہ کو ایک حرف پر قرآن مجید پڑھنے کی اجازت تھی' لیکن جب اسلام سرزمین عرب سے نکل کر دنیا کے دور دراز علاقوں میں پہنچا اور لوگوں نے مختلف حرفوں پر قرآن پڑھا تو جو شخص دوسرے حرف سے ناواقف تھا' اس نے اس کی تکذیب شروع کر دی مثلاً کوئی پڑھتا تھا: ''ننشزها'' اور دوسرا پڑھتا تھا: ''ننشرها'' یا کوئی پڑھتا تھا: ''فتمت كلمة ربك'' اور دوسرا پڑھتا تھا: ''تمت كلمات ربك'' اور ہر شخص کو یہ اصرار تھا کہ جس حرف پر اس نے قرآن پڑھا ہے وہ صحیح ہے اور دوسرے کا پڑھا ہوا غلط ہے۔ اس صورت کی اصلاح کے لیے حضرت عثمان نے اس نسخہ کو منگوایا جو حضرت ابوبکر کے عہد میں جمع کیا گیا تھا' اور اس کی متعدد نقلیں تیار کرا کے تمام شہروں میں بھجوا دیں اور باقی تمام نسخوں کو اکٹھا کر کے پانی میں دھو ڈالا اور پھر ان اوراق کو جلا ڈالا' اور تمام امت کو قرآن مجید کے ایک حرف پر جمع کر دیا جو لغت قریش کے مطابق تھا اور یہ وہی نسخہ تھا جس کو حضرت ابوبکر کے عہد میں جمع کیا گیا تھا اور بعد میں حضرت ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رکھوایا گیا تھا۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت حذیفہ بن یمان' حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور وہ آرمینیا اور آذربائجان کو فتح کرنے کے لیے جہاد میں گئے ہوئے تھے' حضرت حذیفہ نے حضرت عثمان کو مسلمانوں کے قراءت میں اختلاف سے خبردار کیا' حضرت حذیفہ نے حضرت عثمان سے کہا: اے امیر المومنین! اس سے پہلے کہ یہ امت اپنی کتاب میں یہود و نصاریٰ کی طرح مختلف ہو جائے اس کی کوئی تدبیر کیجئے' پھر حضرت عثمان نے حضرت حفصہ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس جو صحیفے ہیں وہ ہمیں بھیج دیجئے ہم ان کو مصاحف میں نقل کریں گے' پھر آپ کو واپس کر دیں گے' حضرت حفصہ نے وہ مصحف حضرت عثمان کے پاس بھیج دیا' حضرت عثمان نے حضرت زید بن ثابت' حضرت عبداللہ بن زبیر' حضرت سعید بن العاص اور حضرت عبدالرحمان بن حارث بن ہشام سے کہا کہ وہ اس مصحف کو لکھیں اور حضرت عثمان نے قریشیوں کی جماعت سے کہا: جب تمہارا اور حضرت زید بن ثابت کا کسی قراءت میں اختلاف ہو تو اس کو لسان قریش میں لکھنا کیونکہ قرآن مجید لسان قریش میں نازل ہوا ہے' سو انہوں نے ایسا ہی کیا' اور جب انہوں نے حضرت حفصہ کے مصحف سے نقل کر کے ایک مصحف تیار کر لیا تو حضرت عثمان نے حضرت حفصہ کا مصحف ان کو واپس بھیج دیا' اور جو مصحف اس سے نقل کر کے تیار کیا تھا اس کی نقلیں تیار کر کے ہر علاقہ میں بھجوا دیں اور یہ حکم دیا کہ اس کے ماسوا جس قدر صحائف میں قرآن مجید لکھا ہوا ہے ان کو جلا دیا جائے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

حضرت زید' حضرت ابن الزبیر' حضرت سعید اور حضرت عبدالرحمٰن قرآن مجید لکھنے کے لیے بیٹھے اور جب ان کا اس میں اختلاف ہوتا کہ اس لفظ کو کس لغت پر لکھا جائے تو وہ حضرت عثمان کی طرف رجوع کرتے مثلاً تابوت میں اختلاف ہوا کہ اس لفظ کو کس لغت پر لکھا جائے' آیا اس کو ہا کے ساتھ تابوہ لکھا جائے یا تا کے ساتھ تابوت لکھا جائے' حضرت زید بن ثابت نے کہا: یہ تابوہ ہے اور تین قریشی صحابہ نے کہا: یہ تابوت ہے' تب انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کیا' حضرت عثمان نے فرمایا: اس کو لغت قریش پر لکھو کیونکہ قرآن لغت قریش پر نازل ہوا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر' مطبوعہ ادارۃ الاندلس' بیروت' ۱۳۸۵ھ)

حضرت عثمان کے دور میں اوراق قرآن جلانے کا محمل اور قرآن کریم کے بوسیدہ اوراق کے متعلق فقہاء کے نظریات

''صحیح بخاری'' کی مذکور الصدر حدیث میں یہ گزر چکا ہے کہ حضرت عثمان نے اپنے جمع کیے ہوئے مصحف کی نقلیں سب شہروں میں بھجوائیں اور اس سے پہلے جن صحیفوں میں قرآن لکھا ہوا تھا ان کو جلانے کا حکم دیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی لکھتے ہیں:

ابن ابی داؤد اور طبرانی وغیرہ نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان کے بھیجے ہوئے مصحف کے خلاف جو مصحف تھا اس کو حضرت عثمان نے جلانے کا حکم دیا' اور اس زمانہ میں عراق میں مصاحف کو جلایا گیا' اور سوید بن غفلہ نے حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ مصاحف جلانے کے سلسلہ میں حضرت عثمان کے متعلق خیر کے سوا اور کچھ نہ کہو' اور ابو قلابہ کی روایت میں ہے: جب حضرت عثمان مختلف شہروں میں مصحف بھیجنے سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے ان شہر والوں کی طرف لکھا: ''میں نے اس اس طرح قرآن مجید جمع کیا' اور میرے پاس (پہلے) جو کچھ لکھا ہوا تھا اس کو میں نے مٹا دیا' اور تمہارے پاس جو کچھ پہلے لکھا ہوا ہے تم بھی اس کو مٹا دو۔'' اور مٹانے کا مفہوم ان صحائف کو دھونے اور جلانے سے عام ہے اور اکثر روایات میں جلانے کی تصریح ہے اور ہو سکتا ہے' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کاغذات سے آیات کے نقوش کو دھو کر پھر انہیں جلا دیا ہو' اور قاضی عیاض مالکی نے وثوق سے کہا ہے کہ پہلے ان کاغذات کے نقوش کو دھویا' پھر اس کو مٹانے میں مبالغہ کے لیے ان کاغذات کو جلا ڈالا' علامہ ابن بطال نے کہا: اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ جن کتابوں میں اللہ کا نام لکھا ہوا ہو' ان کو جلانا جائز ہے' اس عمل میں ان کتابوں کی تکریم ہے' اور ان کو بے ادبی سے بچانا ہے۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۲۱ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور' ۱۴۰۱ھ)

علامہ بدر الدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

حضرت ابوبکر کے عہد میں جو مجموعہ تیار کیا گیا تھا وہ سورتوں کے الگ الگ صحائف تھے' ہر سورت میں آیات ترتیب سے تھیں لیکن تمام سورتیں متفرق تھیں' ترتیب وار نہ تھیں اور حضرت عثمان نے جو مصحف جمع کیا وہ مرتب تھا' اس میں سورتیں ترتیب وار تھیں' حضرت عثمان نے جو باقی صحائف کو جلانے کا حکم دیا تھا' اس کا علامہ کرمانی نے یہ جواب دیا ہے کہ جو آیات منسوخ التلاوت تھیں یا جو غیر لغت قریش پر آیات تھیں' یا آیات کے ساتھ جو تفسیر لکھی ہوئی تھی اس کو جلانے کا حکم دیا تھا' قاضی عیاض نے کہا ہے کہ آیات کو دھو کر پھر نقوش کے محو میں مبالغہ کرنے کے لیے کاغذات کو جلایا تھا' علامہ ابن بطال نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ بے ادبی سے بچانے کے لیے جن کتابوں میں اللہ تعالیٰ کا نام لکھا ہے ان کو جلا دیا جائے' لیکن یہ جلانے کی صورت اس دور میں تھی' اور اب اگر قرآن مجید کے کسی ورق کو زائل کرنا ہو تو اس کو دھونا بہتر ہے اور ہمارے اصحاب حنفیہ نے یہ کہا ہے کہ جب مصحف بوسیدہ ہو جائے اور وہ نفع پہنچانے کے قابل نہ رہے تو اس کو ایسی پاک جگہ دفن کر دیا جائے جو لوگوں کے پیروں تلے آنے سے بعید ہو۔ (عمدۃ القاری ج ۲۰ ص ۱۹۔ ۱۸ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو صحائف جلائے تھے' ان پر قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کو قیاس نہیں کرنا چاہیے کیونکہ انہوں نے ان اوراق کو جلایا تھا جن کا قرآن ہونا ان کے نزدیک ثابت نہیں تھا' یا جو الفاظ تفسیر قرآن کے الفاظ کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے تھے جن کا الگ کرنا ممکن نہ تھا' انہوں نے جلانے کو اس لیے اختیار کیا تھا تاکہ کوئی شخص یہ شک نہ کرے کہ انہوں نے قرآن مجید کا کچھ حصہ ترک کر دیا ہے' کیونکہ اگر وہ واقعۃً قرآن ہوتا تو کوئی مسلمان اس کے جلانے کو جائز نہ کہتا'

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اس کی راکھ کو محفوظ کرنے اور نجاست سے بچانے کا حکم بھی نہیں دیا' اور بحث اس میں ہے کہ جس کا قرآن ہونا قطعیت سے ثابت ہے' جب اس کے اوراق بوسیدہ ہو جائیں تو ان کو دھونا متعین ہے یا نہیں' بلکہ چاہیے یہ کہ دھونے کے بعد ان کے غسالہ (دھوون) کو پی لیا جائے کیونکہ قرآن ہر بیماری کی دوا ہے۔

(مرقات ج ۵ ص ۲۹ 'مطبوعہ مکتبہ امدادیہ' ملتان' ۱۳۹۰ھ)

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے جو بوسیدہ اوراق کے دھونے کا مسئلہ لکھا ہے یہ ان کے زمانہ کے اعتبار سے ہے' آج کل جب کہ پختہ سیاہی سے طباعت ہوتی ہے تو ان کا دھونا متصور نہیں ہے' ان کو عزت و احترام سے ایسی جگہ دفن کر دینا چاہیے جو جگہ لوگوں کے پیروں تلے نہ آتی ہو۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

جن بوسیدہ کتابوں سے نفع حاصل نہ کیا جا سکے' ان سے اللہ' فرشتوں اور رسول علیہ السلام کا نام مٹا کر باقی کو جلا دیا جائے' اور ان کو اسی طرح جاری پانی میں ڈالنے میں بھی حرج نہیں ہے یا ان کو دفن کر دیا جائے اور یہ احسن ہے' جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کے متعلق کہا جاتا ہے۔ (در مختار علی ہامش حاشیۃ الطحطاوی ج ۴ ص ۲۱۰ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۵ھ)

علامہ احمد طحطاوی لکھتے ہیں:

قرآن مجید جب بوسیدہ ہو جائے اور اس کو پڑھنا دشوار ہو تو ہم اس کو آگ میں نہیں جلائیں گے' ہم اسی پر عمل کرتے ہیں۔ (حاشیۃ الطحطاوی ج ۴ ص ۲۰۱ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۵ھ)

علامہ شامی لکھتے ہیں:

"مجتبیٰ" میں لکھا ہے کہ جب مصحف پرانا اور بوسیدہ ہو جائے تو اس کو دفن کرنا احسن ہے جیسے نبیوں اور ولیوں کو دفن کیا جاتا ہے' اور باقی دینی کتابیں جب بوسیدہ ہو جائیں تو ان کا بھی یہی حکم ہے' اور دفن کرنا تعظیم کے خلاف نہیں ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو بھی دفن کیا جاتا ہے' اور ذخیرہ میں لکھا ہے کہ جب مصحف پرانا ہو جائے اور اس سے پڑھنا دشوار ہو جائے تو اس کو آگ میں نہیں جلایا جائے گا' امام محمد نے اسی طرف اشارہ کیا ہے اور ہم اسی پر عمل کرتے ہیں اور مناسب یہ ہے کہ ایک کپڑے میں لپیٹ کر اس کی لحد بنائی جائے' کیونکہ اگر اس کی قبر بہ طریق شق بنائی گئی تو اس پر مٹی گرے گی اور اس میں ایک قسم کی تحقیر ہے' ہاں اگر چھت بنا کر پھر مٹی ڈالی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے' اسی طرح اگر کسی پاک جگہ قرآن مجید کو رکھ دیا جائے جہاں نہ کسی بے وضو کا ہاتھ لگے نہ گرد و غبار پڑے اور نہ اس کی تعظیم میں فرق آئے تو یہ بھی جائز ہے۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۲۷۱-۲۷۳ 'مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ' استنبول' ۱۳۲۷ھ)

قرآن مجید کے غیر محرف ہونے کے متعلق علماء شیعہ کی تصریحات

شیخ ابو علی فضل بن حسن طبرسی لکھتے ہیں:

اگر تم یہ سنو کہ روایات شاذہ میں ہے کہ قرآن مجید میں تحریف ہوئی اور اس کا بعض حصہ ضائع ہو گیا' تو ان روایات کا کوئی وزن نہیں ہے' یہ روایات مضطرب اور ضعیف ہیں اور یہ روایات مسلمانوں کے مخالف ہیں۔

(مجمع البیان ج ۱ ص ۱۹ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۴۱۱ھ)

نیز شیخ طبرسی لکھتے ہیں:

شیخ المحدثین نے "کتاب الاعتقاد" میں لکھا ہے کہ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس قرآن کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ

وسلم پر نازل کیا یہ وہ قرآن ہے جو مسلمانوں کے درمیان موجود ہے' اور وہ اس سے زیادہ نہیں ہے اور جو ہماری طرف یہ منسوب کرتا ہے کہ ہم اس سے زیادہ قرآن کو مانتے ہیں وہ جھوٹا ہے اور جن روایات میں ہے کہ قرآن مجید کو کم کر دیا گیا ہے ان کے کئی محمل ہیں' شیخ مفید نے فصل الخطاب کے اواخر میں لکھا ہے کہ قرآن مجید میں سے کوئی کلمہ' کوئی آیت اور کوئی سورت کم نہیں ہوئی' البتہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے مصحف میں آیات قرآن کے معانی کی جو تفسیر اور تاویل لکھی ہوئی تھی اس کو حذف کر دیا گیا' سید مرتضیٰ نے کہا ہے کہ قرآن مجید میں کوئی کمی نہیں ہے' بعض امامیہ اور بعض حشویہ نے بعض ضعیف روایات کی بناء پر یہ کہا کہ قرآن مجید میں کمی کی گئی ہے لیکن ان کا اختلاف غیر معتبر ہے اور شیخ طوسی نے تفسیر تبیان کے اول میں لکھا ہے کہ قرآن مجید میں زیادتی اور کمی کے موضوع پر بحث کرنا' مناسب نہیں ہے' کیونکہ قرآن مجید میں زیادتی کے باطل ہونے پر اجماع ہے اور کمی کا قول کرنا بھی مسلمانوں کے مذاہب کے خلاف ہے' اور ہمارا صحیح مذہب یہی ہے اور یہی ظاہر الروایات ہے' البتہ بہت سی روایات میں قرآن مجید میں کمی کرنے کا ذکر ہے لیکن یہ روایات اخبار احاد ہیں جو علم اور عمل کے لیے مفید نہیں ہیں اور ان سے اعراض کرنا بہتر ہے۔ (مجمع البیان ج ۱ ص ۲۶' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۴۱۱ھ)

شیخ کاشانی لکھتے ہیں:

قرآن مجید جس طرح نازل ہوا تھا اسی طرح باقی ہے' اور زیادتی اور کمی سے محفوظ ہے' تمام علماء اسلام عام ہوں یا خاص اس پر متفق ہیں کہ قرآن مجید میں کوئی چیز زیادہ نہیں ہوئی' البتہ کمی کے متعلق ایک جماعت کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید میں کمی ہوئی ہے اور منافقین نے چند آیات کو حذف کر دیا اور شیعہ فرقے کے اکثر علماء اور سنی علماء اس پر متفق ہیں کہ قرآن مجید میں کوئی تغیر' تبدل' کمی اور زیادتی نہیں ہوئی (الی قولہ) جن روایات سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں تحریف' تبدیل' حذف یا تغیر ہوا ہے ان روایات کی تاویل اور توجیہ کرنی چاہیے اور اگر ان روایات کی توجیہ نہ ہو سکے تو ان کو مسترد کر دینا چاہیے۔

(منہج الصادقین ج ۱ ص ۲۸-۲۷' مطبوعہ خیابان ناصر خسرو ایران)

جمع قرآن کے متعلق علماء شیعہ کا نظریہ

آیت اللہ مکارم شیرازی لکھتے ہیں:

اس جگہ ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ایک گروہ کے درمیان یہ مشہور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن متفرق صورت میں تھا' اس کے بعد (حضرت) ابوبکر یا (حضرت) عمر یا (حضرت) عثمان کے زمانہ میں اس کو جمع کیا گیا' اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن اسی طرح جمع کیا ہوا تھا جس صورت میں آج جمع کیا ہوا ہے' اور اس کی ابتداء میں بھی سورت فاتحہ تھی' اور اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ یہ سورت سب سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس پر متعدد دلائل ہیں کہ جس صورت میں آج قرآن ہمارے سامنے ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے حکم سے اس کو اسی طرح جمع کیا گیا تھا۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ علی بن ابراہیم نے امام صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: قرآن مجید ریشم اور کاغذ وغیرہ کے ٹکڑوں میں متفرق ہے اس کو جمع کرو' پھر حضرت علی علیہ السلام اس مجلس سے اٹھے اور زرد رنگ کے ایک کپڑے میں قرآن مجید کو جمع کر کے اس پر مہر لگا دی۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ مشہور سنی عالم خوارزمی نے "کتاب المناقب" میں علی بن رباح سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابی بن کعب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مجید کو جمع کیا تھا۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اہل سنت کے مشہور امام حاکم نیشاپوری نے "مستدرک" میں حضرت زید بن ثابت سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قرآن کو متفرق ٹکڑوں سے جمع کر کے پیش کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک جس آیت کا جو مقام تھا وہاں اس آیت کو رکھنے کا حکم دیتے تھے البتہ اس وقت یہ نوشتہ متفرق تھا (یکجا نہ تھا)' پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے کہا کہ اس کو ایک جگہ جمع کریں اور ہم کو اس سے خبردار کرتے تھے کہ کہیں قرآن ضائع نہ ہو جائے۔

علماء شیعہ کے بہت بڑے عالم سید مرتضیٰ کہتے ہیں کہ جس صورت میں آج ہمارے پاس قرآن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس صورت میں موجود تھا۔

طبرانی اور ابن عساکر' شعبی سے روایت کرتے ہیں کہ چھ انصاری صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مجید کو جمع کیا اور قتادہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انس سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کس نے قرآن کو جمع کیا تھا؟ انہوں نے کہا: چار صحابہ نے اور وہ سب انصار سے تھے: حضرت ابی بن کعب' حضرت زید بن ثابت' حضرت معاذ اور حضرت ابوزید۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی نے قرآن جمع کیا تھا یا دوسروں نے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی نے صرف قرآن کو جمع نہیں کیا تھا بلکہ اس مجموعہ میں قرآن بھی تھا' تفسیر بھی تھی' آیات کا شان نزول بھی تھا اور اس کی مثل دیگر امور تھے' اور ہمارے ہاتھوں میں جو قرآن ہے یہ حضرت عثمان کا جمع کیا ہوا ہے جس میں انہوں نے اختلاف قراءات کو ختم کر کے ایک قراءت پر قرآن کو جمع کیا اور حروف پر نقطے لگائے کیونکہ اس سے پہلے نقطے لگانے کا رواج نہ تھا' البتہ اس پر اصرار کرنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن جمع کیا ہوا نہ تھا یہ حضرت عثمان یا خلیفہ اول یا دوم کا حصہ ہے' محض ان کی فضیلت سازی ہے۔ (تفسیر نمونہ ج ۱ ص ۱۱-۸ مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ ایران' ۱۳۶۹ھ)

تفسیر نمونہ کے اس اقتباس میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مجید کو جمع کر لیا گیا تھا' یہ ہمارے مخالف نہیں ہے جب کہ اس میں یہ اعتراف کر لیا ہے کہ جمع کا مطلب یہ ہے کہ آیات اور سورتوں کے محل اور مقامات بتا دیئے گئے تھے اور اس کو لکھ کر جمع کر لیا گیا تھا لیکن ایک جگہ جمع نہیں کیا گیا' ایک جگہ جمع پہلی بار حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں حضرت عمر کے مشورہ سے کیا گیا اور حضرت عثمان نے مختلف لغات یا قراءات کو ختم کر کے ایک قراءت پر قرآن مجید کو جمع کیا اور یہ بہت بڑی فضیلت ہے' کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

سات حرفوں پر قرآن مجید کے نزول کی تحقیق

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبریل نے مجھے ایک حرف پر قرآن پڑھایا' میں نے ان سے رجوع کیا اور مسلسل زیادتی طلب کرتا رہا اور وہ حروف زیادہ کرتے رہے حتیٰ کہ سات حرفوں پر انتہا ہو گئی۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۷-۷۴۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

نیز امام بخاری نے حضرت عمر سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے' اس میں ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے' جو حرف تم کو آسان لگے' اس پر قرآن پڑھو۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۷ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ سات حرفوں سے کیا مراد ہے؟ ابو حاتم محمد بن حبان البستی نے اس مسئلہ میں علماء کے پینتیس اقوال ذکر کیے ہیں ہم ان میں سے پانچ اقوال کا اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے:

(۱) اکثر اہل علم مثلاً سفیان بن عیینہ عبد اللہ بن وھب ابن جریر طبری ابو جعفر طحاوی وغیرھم کا یہ نظریہ ہے کہ سات حرفوں سے مراد ہے سات مختلف الفاظ سے متقارب معانی مثلاً ''اقبل'' تعال'' اور ''ھلم'' ان سب کا معنی ہے آؤ اور ''اذھب'' اسرع'' اور ''عجل'' ان کا معنی ہے: جاؤ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعب سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۱۳ ''للذین امنوا انظرونا'' میں ''للذین امنوا امھلونا'' للذین امنوا اخرونا'' للذین امنوا ارقبونا'' پڑھتے تھے اور حضرت ابی بن کعب سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۲۰ ''کلما اضاء لھم مشوا فیہ'' میں ''مروا فیہ'' اور ''سعوا فیہ'' پڑھتے تھے اور ''صحیح بخاری'' اور ''صحیح مسلم'' میں ہے کہ ان تمام حروف کا معنی واحد ہے اور ان میں حلال اور حرام کا کوئی فرق نہیں ہے۔

امام طحاوی نے کہا ہے کہ ان حروف میں پڑھنے کی لوگوں کو اس لیے اجازت دی گئی تھی کہ وہ اپنی لغت کے علاوہ دوسری لغت پر پڑھنے سے عاجز تھے' کیونکہ ماسوا چند کے وہ سب ان پڑھ لوگ تھے اور دوسروں کی لغت پر پڑھنے سے ان کو دشواری ہوتی تھی' اس لیے جب معنی واحد ہو تو ان کو اختلاف الفاظ کی اجازت دی گئی' حافظ ابن عبد البر نے کہا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ سات حروف میں پڑھنے کی اجازت اس خاص وقت میں ضرورت کی بناء پر تھی اور جب یہ ضرورت ختم ہوگئی تو سات حروف میں پڑھنے کی اجازت ہی ختم ہوگئی اور اب صرف ایک حرف پر قرآن مجید پڑھنے کی اجازت ہے' جس حرف پر ابتداء میں قرآن مجید نازل ہوا تھا۔

(۲) ایک قوم نے یہ کہا کہ سات حرفوں سے مراد عرب کی سات لغات ہیں اور اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ ایک لفظ کو سات لغات پر پڑھا جائے گا' بلکہ یہ سات لغات قرآن مجید میں متفرق ہیں' بعض آیات لغت قریش پر ہیں' بعض لغت ھذیل پر ہیں' بعض لغت ہوازن پر ہیں' بعض لغت یمن پر ہیں' علامہ خطابی نے کہا کہ ''عبد الطاغوت'' کو سات لغات پر پڑھا گیا ہے' ان کی مراد یہ ہے کہ بعض آیات کو سات لغات پر پڑھا گیا ہے اور ہر آیت اس طرح نہیں ہے۔ ابو عبید اور ابن عطیہ کا یہی مختار ہے' ابو عبید نے اس پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ''صحیح بخاری'' میں ہے کہ حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمان نے صحابہ کی ایک جماعت کو مصحف لکھنے کا حکم دیا تو فرمایا: جب تمہارا اور زید کا اختلاف ہو تو اس لفظ کو لغت قریش پر لکھنا' قاضی ابن الطیب اور حافظ ابن عبد البر نے یہ کہا ہے کہ جس کا یہ قول ہے کہ قرآن مجید لغت قریش پر نازل ہوا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کا اکثر حصہ لغت قریش پر نازل ہوا ہے کیونکہ اس میں بعض الفاظ دوسری لغات پر بھی ہیں۔

(۳) ایک قوم نے یہ کہا کہ یہ سات لغات مضر میں ہیں' کیونکہ حضرت عثمان نے کہا ہے کہ قرآن لغت مضر پر نازل ہوا ہے اور انہوں نے یہ کہا کہ قریش' کنانہ' اسد' ھذیل' تمیم' ضبہ اور قیس یہ سب مضر کے قبائل ہیں اور یہ سات لغات انہی مراتب پر ہیں' البتہ مضر میں بعض شواذ بھی ہیں کیونکہ قیس میں مونث کی ضمیر خطاب میں کاف کی جگہ شین لاتے ہیں اور ''جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا'' (مریم: ۲۴) کو یوں پڑھتے ہیں: ''جعل ربش تحتش سریا'' اور تمیم ''الناس'' کو ''النات'' اور ''اکیاس'' کو ''اکیات'' پڑھتے ہیں' قرآن مجید کو اس طرح پڑھنا جائز نہیں ہے۔

(۴) سات حروف سے مراد سات قراءات ہیں، صاحب ''الدلائل'' اور قاضی ابن الطیب نے کہا ہے کہ ہم نے اختلاف قراءات میں تتبع کیا تو یہ سات ہیں۔ حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر کلمہ اور ہر آیت میں سات قراءات جاری ہوتی ہیں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک کلمہ میں قراءات کی زیادہ سے زیادہ سات وجوہ ہیں، اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بعض کلمات میں سات سے زیادہ وجوہ قراءات ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اکثر اور غالب کلمات میں سات سے زیادہ قراءات نہیں ہیں۔ (فتح الباری ج ۹، ص ۳۲، طبع لاہور) اس اختلاف قراءات کی حسب ذیل مثالیں ہیں:

(ا) حرکت متغیر ہو اور صورت اور معنی متغیر نہ ہو مثلاً ''ولا یضار کاتب ولا شهید'' ر پر زبر ہو یا پیش ہو۔

(ب) صیغہ کا تغیر ہو، مثلاً ''بَعِّد بین اسفارنا'' اور ''بَاعِد بین اسفارنا'' پہلی قراءت میں امر کا صیغہ ہے اور دوسری میں فعل ماضی کا۔

(ج) نقطہ کا تغیر ہو مثلاً ایک قراءت میں ''ثم ننشرها'' ہے اور ایک قراءت میں ''ثم ننشزها'' ہے۔

(د) قریب المخرج لفظ کے ساتھ تبدیل کرنے یا نہ کرنے کا فرق، مثلاً ایک قراءت میں ہے ''طلح منضود'' اور دوسری قراءت میں ''طلع منضود'' ہے۔

(ہ) تقدیم اور تاخیر کا فرق ہو، مثلاً ''وجاءت سکرة الموت بالحق'' اور حضرت ابوبکر صدیق، طلحہ بن مصرف اور زین العابدین کی قراءت میں ہے: ''وجاءت سکرة الحق بالموت''۔

(و) زیادتی اور کمی کے ساتھ تغیر مثلاً حضرت ابن مسعود اور حضرت ابو درداء کی قراءت میں ہے: ''والليل اذا يغشى والنهار اذا تجلى والذكر والانثى'' یہ کمی کی مثال ہے کیونکہ مشہور قراءت میں ہے ''وما خلق الذكر والانثى'' اور زیادتی کی مثال یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود کی قراءت ''وانذر عشيرتك الاقربين'' کے بعد ہے ''ورهطك منهم المخلصين''۔

(ز) ایک کلمہ کو دوسرے مترادف کلمہ کے ساتھ بدلنا، مثلاً مشہور قراءت میں ہے: ''كالعهن المنفوش'' اور حضرت ابن مسعود اور سعید بن جبیر کی قراءت میں ہے: ''كالصوف المنفوش''۔

(۵) سات حرفوں سے مراد قرآن مجید کے سات معانی ہیں اور وہ یہ ہیں: امر، نہی، وعد، وعید، قصص، مجادلہ اور امثال۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ ان عنوانات کو حروف نہیں کہتے، نیز اس پر اجماع ہے کہ حلال، حرام اور کسی معنی کے تغیر میں وسعت کی گنجائش نہیں ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۴۱۔ ۴۲، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران، ۱۳۸۷ھ)

قرآن مجید کی سورتوں، آیتوں اور حرفوں کی تعداد کا بیان

سورت کا لفظ سور مدینہ سے ماخوذ ہے، شہر کے گرد جو دیوار ہوتی ہے جس نے شہر کا احاطہ کیا ہوا ہوتا ہے اس کو سور مدینہ کہتے ہیں اور قرآن کی سورت نے بھی اس کے مضامین کا احاطہ کیا ہوا ہوتا ہے، یا اس کا معنی ہے: منازل قراءت میں سے ایک منزل۔

علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

اس پر اجماع ہے کہ قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتیں ہیں، اور ایک قول یہ ہے کہ ایک سو تیرہ سورتیں ہیں، انہوں نے سورہ انفال اور سورہ توبہ کو ایک سورت قرار دیا ہے۔

آیت کا لغوی معنی علامت ہے اور اس کی اصطلاحی تعریف یہ ہے: قرآن مجید کا ایک طائفہ (مجموعہ) جو ماقبل اور مابعد سے منقطع ہو، ایک قول یہ ہے کہ آیت کسی سورت کا ایک حصہ ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ آیت ایک کلام کے ماقبل اور مابعد سے

منقطع ہونے کی علامت ہے۔ علامہ زمخشری نے کہا: آیات کا علم توقیفی ہے اس میں قیاس کی مجال نہیں ہے' یہی وجہ ہے کہ ''الم'' جس سورت میں بھی ہے اس کو ایک آیت شمار کیا ہے اور ''المص'' کو بھی ایک آیت شمار کیا ہے۔

''الر'' اور ''المر'' کو ایک آیت نہیں شمار کیا' ''حم' یٰس'' اور ''طٰہٰ'' کو ایک آیت شمار کیا ہے اور ''طس'' کو آیت نہیں شمار کیا۔

آیات کو شمار کرنا بہت مشکل اور دقیق کام ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آیت کی طرف پر وقف فرماتے تھے اور بعض اوقات دو آیتوں کو ملا کر پڑھتے' جس سے سننے والا یہ گمان کرتا کہ یہ ایک آیت ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی کل آیات کی تعداد چھ ہزار چھ سو سولہ (۶۶۱۶) ہے اور قرآن مجید میں کل تین لاکھ تئیس ہزار چھ سو اکہتر (۳۲۳۶۷۱) حروف ہیں۔ علامہ دانی نے کہا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ قرآن مجید میں چھ ہزار آیات ہیں' پھر اس کے بعد اختلاف ہے' بعض نے کہا: اس سے زائد نہیں ہیں۔ بعض نے کہا: دو سو چار زائد ہیں' بعض نے کہا: چودہ زائد ہیں' بعض نے انیس کہا' بعض نے پچیس کہا اور بعض نے چھتیس کہا۔ (الاتقان ج ا ص ۶۷۔ ۶۴ ملخصاً' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ) بعض محققین کی رائے ہے کہ کل آیات کی تعداد ۶۲۳۶ ہے۔

قرآن مجید کے محفوظ اور غیر مبدل ہونے پر مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات

ہم پہلے تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کو تین مرتبہ جمع کیا گیا ہے:

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں کتابت میں قرآن مجید کو جمع کیا گیا' اور تمام سورتوں اور آیتوں کو مرتب کر کے اپنی اپنی جگہ لکھ دیا گیا' امام بخاری روایت کرتے ہیں: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے میری طرف پیغام بھیجا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی کو لکھتے تھے' لہٰذا اب تم قرآن مجید کو جمع کرو۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

سو کھڑیوں پر' پتھروں پر اور کپڑوں کے ٹکڑوں پر قرآن مجید کو لکھا گیا لیکن یہ تمام اجزاء متفرق تھے اور کسی کتابی شکل میں مجتمع اور مدون نہیں تھے۔

(۲) حضرت ابوبکر کے عہد میں لغت قریش کے مطابق قرآن مجید کا ایک مجموعہ کتاب یا مصحف کی شکل میں مرتب کرلیا گیا' لیکن مسلمانوں کو اپنی لغات کے مطابق قرآن مجید پڑھنے کی اجازت تھی۔

(۳) حضرت عثمان کے عہد میں اسی نسخہ قرآن کی نقول تیار کی گئیں جو حضرت ابوبکر کے زمانہ میں لغت قریش پر مرتب کیا گیا تھا' اور تمام اسلامی شہروں میں اسی کی نقول ارسال کی گئیں اور باقی تمام نسخوں کو دھلوا کر جلوا دیا گیا۔

عہد رسالت سے لے کر آج تک تمام امت مسلمہ کے پاس یہی قرآن مجید ہے' اس میں کسی قسم کی کوئی کمی اور بیشی نہیں ہوئی' مستشرقین اور غیر مسلم محققین نے قرآن مجید کے محفوظ اور غیر مبدل ہونے پر کئی اعتراضات کئے ہیں' جن میں سے بعض اعتراض تو بالکل سطحی اور بے وزن ہیں جو مطلقاً لائق التفات نہیں ہیں' ہم چونکہ بلاوجہ طوالت سے اجتناب کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہم صرف ان اعتراضات کے جوابات لکھ رہے ہیں جن کی بہر حال کوئی نہ کوئی بنیاد ہے۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن مجید محفوظ نہیں تھا تو بعد والوں کو کیسے محفوظ رہے گا' اس کی سند یہ ہے:

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات مسجد میں ایک شخص کو قرآن مجید کی ایک سورت پڑھتے ہوئے سنا' تو آپ نے فرمایا: اللہ اس شخص پر رحمت فرمائے' اس نے مجھے فلاں فلاں آیت یاد دلا دی جو مجھے فلاں فلاں سورت سے بھلا دی گئی تھی۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۵۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس اعتراض کا جواب یہ ہے:

اللہ تعالیٰ بعض اوقات اپنی کسی حکمت کو پیدا کرنے کے لیے کسی چیز کی طرف سے وقتی طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ ہٹا دیتا ہے اور بعد میں آپ کو پھر اس کی طرف متوجہ کر دیتا ہے' عام لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض اوقات وہ کسی چیز کو بھول جاتے ہیں' پھر کسی سے سُن کر یا کسی اور سبب سے ان کو وہ چیز یاد آجاتی ہے' اس سے قرآن مجید کے محفوظ اور غیر مبدل ہونے پر کیا زد پڑتی ہے' اس حدیث کا منشاء صرف اتنا ہے کہ کسی چیز سے وقتی طور پر توجہ کا ہٹ جانا منصب نبوت کے خلاف نہیں ہے' اس شخص کے حفظ کرنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیتوں کو حفظ کر لیا تھا' پھر وحی لکھنے والوں سے اس آیت کو لکھوا دیا تھا' اور مسلمانوں کو اس آیت کی تبلیغ فرما دی تھی اور انہوں نے آپ سے سن کر ان آیتوں کو یاد کر لیا تھا۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ چند آیتوں کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بکری کھا گئی تھی اس لیے وہ ضائع ہو گئیں اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

امام احمد روایت کرتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رجم کی آیت نازل کی گئی اور بالغ آدمی کو دس چسکیاں دودھ پلانے سے رضاعت کی آیت نازل کی گئی' یہ آیتیں ایک پتے پر لکھی ہوئی تھیں جو میرے گھر میں میرے تکیہ کے نیچے رکھا ہوا تھا' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو ہم آپ کی تیمارداری میں مشغول ہو گئے اور ایک چوپایہ گھر میں داخل ہوا اس پتے کو کھا گیا۔ (مسند احمد ج ۶ ص ۲۶۹' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت رجم اور دس چسکیوں سے رضاعت کے ثبوت کی آیت منسوخ التلاوت ہے' خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی اس کے منسوخ ہونے کی قائل ہیں' نیز اس کا ثبوت محض خبر واحد سے ہے تواتر سے نہیں ہے اور قرآن اس مجموعہ کلام اللہ کا نام ہے جو ہم تک تواتر سے پہنچا ہے' لہٰذا ان آیتوں کے ضائع ہونے سے قرآن مجید کے محفوظ ہونے پر کوئی اشکال نہیں ہے۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین ("قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" (الفلق: ۱) اور "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" (الناس: ۱)) کو قرآن مجید کی دو سورتیں نہیں مانتے تھے' اور اس کا ثبوت ان احادیث سے ہے:

امام احمد روایت کرتے ہیں:

عبد الرحمان بن یزید بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے مصاحف سے معوذتین کو کھرچ دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ دونوں اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام میں سے نہیں ہیں۔

(مسند احمد ج ۵ ص ۱۳۰۔۱۲۹' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے' امام احمد کی سند صحیح ہے اور امام طبرانی کی سند ثقہ ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۴۹' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

عبدالرحمان بن یزید بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود معوذتین کو کھرچ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ جو اس میں نہیں' اس کو تم کیوں زیادہ کرتے ہو؟ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابن مسعود نے کہا: انہوں نے قرآن میں اس کو خلط کر دیا جو اس میں نہیں ہے' تیسری روایت میں ہے کہ حضرت ابن مسعود نے کہا: یہ دونوں کتاب اللہ سے نہیں ہیں' چوتھی روایت میں ہے کہ حضرت ابن مسعود نے کہا: جو قرآن میں نہیں اس کو قرآن کے ساتھ خلط نہ کرو' یہ دونوں پناہ طلب کرنے کی دعائیں ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دعاؤں کے ذریعہ پناہ طلب کی ہے۔

(المعجم الکبیر ج ۹ ص ۲۳۵ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

اس اشکال کے جواب میں حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

علامہ نووی نے اس کے جواب میں شرح المہذب میں لکھا کہ تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ معوذتین اور سورہ فاتحہ قرآن مجید میں شامل ہیں اور جو شخص ان میں سے کسی چیز کا بھی انکار کرے گا وہ کافر ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے جو معوذتین کے قرآن ہونے کا انکار منقول ہے وہ نقل باطل ہے اور روایت صحیح نہیں ہے۔ شیخ ابو محمد بن حزم نے بھی "محلی" میں اس روایت کو جھوٹ قرار دیا ہے۔ امام رازی نے بھی تفسیر کبیر میں اس نقل کو جھوٹ اور باطل قرار دیا ہے۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ اگر بالفرض یہ روایات صحیح ہوں تو ان کی توجیہ یہ ہے کہ ہر چند کہ حضرت ابن مسعود کے نزدیک معوذتین کا قرآن ہونا ثابت تھا لیکن ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معوذتین کا قرآن مجید میں لکھوانا ثابت نہیں تھا (اگرچہ دوسرے صحابہ کے نزدیک لکھوانا بھی ثابت تھا) اس لیے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کے لکھنے پر رد فرماتے تھے۔ امام رازی نے یہ جواب دیا ہے کہ فی نفسہ اگرچہ معوذتین کا قرآن ہونا متواتر ہے لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ متواتر نہیں تھا۔

(فتح الباری ج ۸ ص ۷۴۳۔ ۷۴۲ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ شرح مواقف میں ہے قرآن مجید کی بعض سورتوں میں جو بعض صحابہ کا اختلاف منقول ہے وہ اخبار آحاد سے منقول ہے اور ان سورتوں کا قرآن ہونا تواتر سے ثابت ہے اور آحاد میں اتنی قوت نہیں ہے کہ وہ تواتر کے مزاحم ہو سکیں اور نہ ظن' یقین کے معارض ہو سکتا ہے۔ (روح المعانی ج ۳۰ ص ۲۷۹ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آپ نے حافظ الہیثمی سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے یا ثقہ ہے' اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ نقل باطل ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ صرف سند کے صحیح ہونے سے حدیث کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ حدیث کی سند صحیح ہو اور اس کے متن میں کوئی علت خفیہ قادحہ ہو اور وہ حدیث معلل ہو یا اس میں شذوذ ہو اور وہ حدیث شاذ ہو اور یہ دونوں امر صحت حدیث کے منافی ہیں۔ یہ حدیث شاذ اس لیے ہے کہ یہ زیادہ صحیح راویوں کی روایت کے خلاف ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں: حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ آج رات مجھ پر ایسی آیات نازل کی گئی ہیں جن کی مثل نہیں دیکھی گئی "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" (الفلق: ۱) اور "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" (الناس: ۱)۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۷۲ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ (جامع ترمذی ص ۴۸۵ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں علت خفیہ یہ ہے کہ یہ تواتر اور اجماع مسلمین کے خلاف ہے' لہٰذا یہ حدیث شاذ اور معلل ہے' اس لیے یہ حدیث غیر صحیح اور غیر معتبر ہے اور لائق استدلال نہیں ہے۔

ایک اور توجیہ یہ کی گئی ہے کہ حضرت ابن مسعود نے معوذتین کے قرآن ہونے کا انکار اس وقت کیا تھا جب انہیں ان کے قرآن ہونے کا علم نہیں ہوا تھا اور جب ان کو ان کے قرآن ہونے کا علم ہو گیا اور تواتر اور اجماع سے ان کا قرآن ہونا ثابت ہو گیا تو حضرت ابن مسعود بھی معوذتین کے قرآن ہونے پر ایمان لے آئے' اور اس کی دلیل یہ ہے کہ عاصم کی قراءت از زر عنہ از ابن مسعود ہے اور اس میں سورہ فاتحہ بھی ہے اور معوذتین بھی ہیں' اور یہ چیز سند صحیح کے ساتھ حضرت ابن مسعود سے ثابت ہے۔

حضرت ابن مسعود نے جس طرح معوذتین کو اپنے مصحف میں نہیں لکھا تھا اسی طرح انہوں نے سورہ فاتحہ کو بھی اپنے مصحف میں نہیں لکھا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سورہ فاتحہ کا ان کے نزدیک قرآن ہونا اس قدر جلی اور واضح تھا کہ اس کو لکھ کر محفوظ کرنے کی ان کے نزدیک ضرورت نہیں تھی' کیونکہ سورہ فاتحہ کو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے' سو اس طرح کی توجیہ معوذتین کے متعلق بھی کی جا سکتی ہے' تاہم قطعی اور یقینی بات یہ ہے کہ سورہ فاتحہ اور معوذتین کا قرآن ہونا تواتر سے ثابت ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا انکار خبر واحد سے ثابت ہے اور خبر واحد خبر متواتر کے مزاحم نہیں ہو سکتی۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ حضرت ابی بن کعب نے اپنے مصحف میں دعاء قنوت ''اللھم انا نستعینک و نستغفرک الخ'' بھی لکھی ہوئی تھی اور اس کا نام سورہ خلع اور سورہ حفد رکھا تھا اور موجودہ قرآن میں یہ سورت نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں کمی بیشی ہوئی ہے۔

حافظ الہیثمی بیان کرتے ہیں:

ابو اسحاق بیان کرتے ہیں کہ ہم کو امیہ بن عبداللہ بن خالد نے خراسان میں نماز پڑھائی اور دو سورتوں میں سے ''انا نستعینک و نستغفرک الخ'' پڑھا' اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال صحیح ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۵۷' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

حضرت ابن مسعود کے مصحف میں ایک سو بارہ سورتیں تھیں کیونکہ انہوں نے معوذتین کو نہیں لکھا' اور حضرت ابی بن کعب کے مصحف میں ایک سو سولہ سورتیں ہیں کیونکہ انہوں نے قرآن مجید کے آخر میں دو سورتیں حفد اور خلع لکھی ہیں۔

امام ابو عبید نے ابن سیرین سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابی بن کعب نے اپنے مصحف میں فاتحۃ الکتاب' معوذتین اور ''اللھم انا نستعینک و اللھم ایاک نعبد'' لکھا۔ حضرت ابن مسعود نے ان کو ترک کر دیا اور حضرت عثمان نے ان میں سے فاتحۃ الکتاب اور معوذتین کو لکھا۔ (الاتقان ج ۱ ص ۶۵' مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور)

حافظ سیوطی نے اپنی تفسیر کے آخر میں سورۃ الخلع اور سورہ الحفد سے متعلق روایات جمع کی ہیں۔

(الدر المنثور ج ۶ ص ۴۲۱۔۴۲۰' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کلام اللہ کے اس مجموعہ کا نام ہے جو تواتر سے ثابت ہے اور سورہ خلع اور سورہ حفد اخبار آحاد سے ثابت ہیں لہٰذا یہ قرآن نہیں ہیں اور حضرت ابی بن کعب کی طرف سے توجیہ یہ ہے کہ وہ ان کو بہ طور قنوت اور دعا کے اپنے مصحف میں لکھتے تھے بہ اعتبار قرآن کے نہیں لکھتے تھے۔

قرآن مجید پر نقطے اور اعراب لگانے کی تاریخ اور تحقیق

شروع میں جب قرآن مجید کو لکھا جاتا تھا تو قرآن مجید کے حروف پر نقطے نہیں لگائے جاتے تھے اور نہ حرکات' سکنات اور

اعراب لگائے جاتے تھے اور نہ رموز اوقاف تھے' کیونکہ اہل عرب اپنی زبان اور محاورہ کی مدد سے نقطوں اور حرکات' سکنات اور اعراب کے بغیر بالکل صحیح قرآن پڑھ لیتے تھے' اور نہ انہیں کسی فقرہ کو ملانے یا اس پر وقف کرنے کے لیے رموز اوقاف کی ضرورت تھی' وہ اہل زبان تھے اور ان تمام چیزوں سے مستغنی تھے' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو مصحف تیار کرایا تھا وہ بھی ان تمام چیزوں سے معری تھا' پھر جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا اور غیر عرب لوگ مسلمان ہوتے گئے اور وہ اہل زبان نہ ہونے کی وجہ سے قراءت میں غلطیاں کرنے لگے تو پھر قرآن مجید کی کتابت میں ان تمام چیزوں کا اہتمام اور التزام کیا گیا۔ سب سے پہلے قرآن مجید کے حروف پر نقطے لگائے گئے' پھر حرکات' سکنات اور اعراب لگائے گئے' پھر قرآن مجید کو صحیح پڑھنے کے لیے قراءت اور تجوید کے قواعد مقرر کیے گئے' اور عام لوگوں کی سہولت کے لیے قرآن کریم کی آیتوں پر رموز اوقاف کو لکھا گیا۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

عبدالملک بن مروان نے مصحف کے حروف کو متشکل کرنے اور ان پر نقطے لگانے کا حکم دیا' اس نے اس کام کے لیے حجاج بن یوسف کو شہر واسط میں فارغ کر دیا' اس نے بہت کوشش سے اس کام کو انجام دیا اور اس میں احزاب کا اضافہ کیا' اس وقت حجاج عراق کا گورنر تھا' اس نے حسن اور یحییٰ بن یعمر کے ذمہ یہ کام لگایا' اس کے بعد واسط میں ایک کتاب لکھی جس میں قراءت کے متعلق مختلف روایت کو جمع کیا' بڑے عرصہ تک لوگ اسی کتاب پر عمل کرتے رہے حتیٰ کہ ابن مجاہد نے قراءات میں ایک کتاب لکھی۔

زبیدی نے ''کتاب الطبقات'' میں مبرد کے حوالہ سے یہ لکھا ہے: جس شخص نے سب سے پہلے مصحف کے حروف پر نقطے لگائے وہ ابو الاسود الدؤلی (متوفی ۶۹ھ) ہیں اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ابن سیرین کے پاس ایک مصحف تھا' جس پر یحییٰ بن یعمر نے نقطے لگائے تھے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۶۳' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ھ)

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں:

ابو الاسود الدؤلی کا پورا نام ہے: ظالم بن عمرو بن سفیان بن جندل بن یعمر بن حلس بن نفاثہ بن عدی بن الدیل بن بکر الدیلی' یہ وہ شخص ہیں جنہوں نے سب سے پہلے علم نحو کو وضع کیا' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بتایا کہ کلام کی کل تین قسمیں ہیں: اسم' فعل اور حرف اور فرمایا: اس بنیاد پر تم قواعد تحریر کرو۔

ایک قول یہ ہے کہ ابو الاسود عراق کے گورنر زیاد کے بچوں کو پڑھاتا تھا' ایک دن وہ زیاد کے پاس گیا اور کہا: اللہ امیر کی خیر کرے' میں دیکھتا ہوں کہ عربوں کے ساتھ بہ کثرت عجم مخلوط ہو گئے ہیں اور ان کی زبان متغیر ہو گئی ہے' کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ میں ان کے لیے ایسے قواعد تحریر کروں جن کی بناء پر وہ درست طریقہ سے عربی بولیں؟ زیاد نے کہا: نہیں' پھر ایک دن ایک شخص نے زیاد سے کہا: ''توفی ابانا و ترك بنون'' زیاد نے حیرت سے کہا: ''توفی ابانا و ترك بنون؟'' (کہنا چاہیے تھا: ''توفی ابونا و ترك بنین'' ہمارا باپ فوت ہو گیا اور اس نے بیٹے چھوڑے ہیں' گویا اس نے عربی میں گرامر کی غلطی کی) تب زیاد نے کہا: ابو الاسود کو بلاؤ' جب وہ آیا تو اس سے کہا: لوگوں کے لیے وہ قواعد تحریر کرو جن سے میں نے پہلے تم کو منع کیا تھا۔

ایک قول یہ ہے کہ زیاد نے از خود ابو الاسود سے اس علم کی فرمائش کی لیکن اس نے زیاد سے معذرت کر لی' پھر ایک دن ابو الاسود نے ایک شخص سے سنا' وہ سورہ توبہ کی آیت غلط پڑھ رہا تھا:

اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ۬ وَرَسُوْلُهٗ ؕ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہیں۔

(التوبہ: ۳)

اس آیت میں رسولہ میں رسول پر پیش ہے وہ شخص زیر پڑھ رہا تھا اور اس سے یہ معنی ہو جاتا ہے: اللہ مشرکوں اور اپنے رسول سے بیزار ہے۔ العیاذ باللہ! تب ابوالاسود زیاد کے پاس گیا اور کہا: میں اب عربی قواعد لکھنے پر تیار ہوں' اس وقت ابوالاسود نے زبر کی علامت حرف کے اوپر ایک نقطہ قرار دی (ـــــ ٘ ــــ) اور پیش کی علامت حرف کے سامنے ایک نقطہ قرار دی (ـــــــ ٘) اور زیر کی علامت حرف کے نیچے ایک نقطہ قرار دی (ـــــ ٖ ــــ)۔ ابوالاسود ۶۹ ھ میں بصرہ میں طاعون کی بیماری میں فوت ہوا' اس کی عمر ۸۵ سال تھی۔

(وفیات الاعیان ج ۲ ص ۵۳۹۔۵۳۵ ملخصا' مطبوعہ منشورات الشریف الرضی ایران' ۱۳۶۴ ھ)

حافظ ابن عساکر نے اس واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص نے سورہ توبہ کی اسی آیت کو غلط پڑھا تو حضرت عمر نے ابوالاسود کو قرآن مجید کے قواعد مرتب کرنے کا حکم دیا۔

(مختصر تاریخ دمشق' مطبوعہ دار الفکر' ۱۴۰۴ ھ)

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ عراق کے گورنر زیاد کے کہنے سے ابوالاسود نے عربی زبان کے قواعد مرتب کیے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۳۱۲' دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۳ ھ)

علامہ زرقانی لکھتے ہیں:

عبدالملک بن مروان نے حجاج کو یہ حکم دیا کہ قرآن مجید پر نقطے لگائے جائیں اور حجاج نے نصر بن عاصم اللیثی اور یحییٰ بن یعمر العدوانی کو اس کام کے لیے مقرر کیا' یہ دونوں' ابوالاسود الدؤلی کے شاگرد تھے اور ایک قول یہ ہے کہ ابوالاسود نے سب سے پہلے نقطے لگائے اور اس پر مورخین کا اتفاق ہے کہ جب ابوالاسود نے ایک شخص کو سورہ توبہ کی آیت غلط پڑھتے سنا تو اس نے علم نحو ایجاد کیا اور زبر' زیر اور پیش کے لیے نقطوں کی علامات وضع کیں۔ ایک عرصہ تک حرکات اور اعراب کے لیے یہی علامات رائج رہیں لیکن چونکہ ان علامات کا نقطوں کے ساتھ التباس اور اشتباہ تھا اس لیے پھر زبر' زیر اور پیش کے لیے (ـــَــ' ـــِــ' ـــُــ) اس طرح کی علامات مقرر کر دی گئیں۔ (مناہل العرفان ج ۱ ص ۴۰۱۔۴۰۰' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

عبدالملک بن مروان ۶۶ ھ میں سریر آرائے سلطنت ہوا اور ۸۶ ھ میں فوت ہوا' اور ابوالاسود ۶۹ ھ میں فوت ہوا' اس کا مطلب یہ ہے کہ ۶۶ ھ اور ۶۹ ھ کے درمیان میں قرآن مجید پر نقطے اور اعراب لگائے گئے۔

قرآن مجید پر رموز اوقاف کی تاریخ اور تحقیق

قرآن مجید کو صحیح پڑھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وقف اور وصل کا صحیح علم حاصل کیا جائے' یعنی کس جملہ کو دوسرے جملہ یا کس لفظ کو دوسرے لفظ کے ساتھ ملا کر پڑھنا ہے یا کس جملہ اور لفظ کو دوسرے جملہ اور لفظ سے جدا کر کے پڑھنا ہے' اردو میں اس کی مثال ہے: روکو' مت جانے دو' اگر روکو پر وقف کر لیا جائے تو اس کا معنی روکنا ہے اور روکو مت' پر وقف کر کے جانے دو' پڑھا جائے تو اس کا معنی نہ روکنا ہے' قرآن مجید سے اس کی حسب ذیل دو واضح مثالیں ہم پیش کر رہے ہیں:

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ (آل عمران: ۷)

اور اس کی (آیات متشابہات کی) تاویل کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔

اس آیت میں اگر ''الا اللہ'' پر وقف کیا جائے تو یہی معنی ہوگا جو ہم نے لکھا ہے اور اگر ''والراسخون فی العلم'' پر وقف کیا جائے تو معنی بدل جائے گا اور اب یوں معنی ہوگا: آیات متشابہات کی تاویل کو اللہ اور علماء راسخین کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ . (التوبہ: ۲۰-۱۹)

اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۝ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔

اس آیت میں اگر ''القوم الظلمین'' پر وقف کیا جائے تو یہی معنی ہوگا جو ہم نے لکھا ہے اور اگر اس پر وقف نہ کیا اور اس کو دوسری آیت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو پھر یہ معنی ہوگا: اللہ ان ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا' اور ایسے لوگوں کو ظالم کہنا قرآن مجید کی بہت ساری آیتوں کی تکذیب ہے اور قرآن مجید کی تکذیب کفر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں صحیح جگہ پر وقف نہ کرنا قرآن مجید کے معنی اور منشاء کو بدل دیتا ہے اور بعض اوقات کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

اہل عرب اپنی زبان دانی کی وجہ سے جس طرح بغیر اعراب کے قرآن مجید کو صحیح پڑھنے پر قادر تھے اسی طرح وہ قرآن مجید کو پڑھتے وقت صحیح جگہ پر وقف کرتے تھے اور ان سے معنی میں کوئی غلطی واقع نہیں ہوتی تھی لیکن جب اسلام کا پیغام عرب کے باہر پہنچا اور عربی زبان سے ناواقف لوگوں نے قرآن مجید کو پڑھنا شروع کیا تو معانی سے لاعلمی کی وجہ سے وہ غلط جگہ پر وقف کرنے لگے' اس لیے اس وقت کے علماء نے قرآن مجید کی آیات پر رموز اوقاف لگانے کی ضرورت محسوس کی۔ سب سے پہلے اس موضوع پر امام احمد بن یحییٰ الثعلب النحوی المتوفی ۲۹۱ھ نے ''کتاب الوقف والابتداء'' کے نام سے کتاب لکھی۔ اس طرح تیسری صدی ہجری میں قرآن مجید کی آیات پر رموز اوقاف لگائے گئے۔

قرآن مجید کی آیات پر وقف کرنے کی اصل یہ حدیث ہے:

امام طحاوی روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایک بڑے عرصہ تک ہمارا یہ معمول رہا کہ ہم میں سے کوئی شخص قرآن پڑھنے سے پہلے ایمان لے آتا تھا' سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی سورت نازل ہوتی' ہم اس سورت کے حلال اور حرام کا علم حاصل کرتے' اور اس چیز کا علم حاصل کرتے کہ اس سورت میں کہاں کہاں وقف کرنا چاہیے جس طرح تم آج کل قرآن مجید کا علم حاصل کرتے ہو' اور اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ ایمان لانے سے پہلے قرآن کو پڑھ لیتے ہیں' وہ فاتحہ سے لے کر آخر قرآن تک قرآن پڑھتے ہیں اور ان سے کسی کو یہ پتا نہیں ہوتا کہ قرآن نے کس چیز کا حکم دیا ہے' اور کس چیز سے منع کیا ہے اور نہ اس کو یہ پتا ہوتا ہے کہ قرآن کی آیتوں میں کس کس جگہ وقف کرنا چاہیے۔

(شرح مشکل الآثار ج ۲ ص ۸۵' مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ' بیروت' ۱۴۱۵ھ)

اس حدیث کو امام حاکم[1] اور امام بیہقی[2] نے بھی روایت کیا ہے۔

حافظ الہیثمی نے فرمایا: اس حدیث کو امام طبرانی نے ''المعجم الاوسط'' میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۶۵' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:

الوقف والابتداء کے موضوع پر حسب ذیل علماء اور ائمہ نے کتابیں تصنیف کی ہیں:

امام ابوسعید حسن بن عبداللہ السیرافی المتوفی ۳۶۸ھ' امام ابوجعفر احمد بن محمد النحاس النحوی المتوفی ۳۳۸ھ' امام احمد بن یحییٰ

---

1 (امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ' المستدرک ج ۱ ص ۳۵' مطبوعہ مکتبہ دار الباز' مکہ مکرمہ)

2 (امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' سنن کبریٰ ج ۳ ص ۱۲۰' مطبوعہ نشر السنہ' ملتان)

الثعلب النحوی المتوفی ۲۹۱ھ' امام محمد بن حسن الرؤاسی' امام ابن مقسم محمد بن الحسن المتوفی ۳۵۵ھ' امام ابوبکر محمد بن القاسم بن بشار الانباری المتوفی ۳۲۸ھ' امام محمد بن محمد بن عبدالرشید بن طیفور السجاوندی المتوفی ۵۶۰ھ' امام ابو عمرو عثمان الدانی المقرہ المتوفی ۴۴۴ھ' امام الزجاج النحوی المتوفی ۳۱۰ھ' امام برہان الدین ابراہیم بن عمر الجعبری المتوفی ۷۳۲ھ' امام ابوعبداللہ محمد بن محمد بن عباد المنتزی النحوی المتوفی ۳۴۴ھ' امام ابومحمد عبدالسلام بن علی بن عمر الزوادی المتوفی ۶۸۱ھ۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۱۴۷۱ ' مطبوعہ مطبع اسلامیہ طہران' ۱۳۷۸ھ)

وقف کی پانچ مشہور اقسام ہیں: وقف لازم' وقف مطلق' وقف جائز' المرخص بوجہ' اور المرخص ضرورۃ' ان کی تعریفات اور مثالیں حسب ذیل ہیں:

(وقف لازم) اس کو کہتے ہیں کہ اگر اس جگہ وقف نہ کیا جائے اور ملا کر پڑھا جائے تو ایسا معنی لازم آئے گا جو اللہ کی مراد نہیں ہے' اس کی مثال یہ ہے:

مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ○ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ. (البقرہ: ۹۔۸) (وہ منافق) مومن نہیں ہیں ○ وہ اللہ کو دھوکا دیتے ہیں۔

اگر اس جگہ ''بمومنین'' پر وقف نہ کیا جائے اور اس کو ''یخدعون اللہ'' کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ معنی ہوگا: وہ منافق ایسے مومن نہیں ہیں جو اللہ کو دھوکا دیں' حالانکہ مراد یہ ہے کہ وہ مطلقاً مومن نہیں ہیں۔

(وقف مطلق) وہ ہے جس کو ملائے بغیر ابتداءً پڑھنا مستحسن ہو' اس کی مثال یہ ہے:

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۚ. (النور: ۵۵) اور اللہ ان کے خوف کے بعد ان کی حالت کو ضرور امن سے بدل دے گا' وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں قرار دیں گے۔

پہلے جملہ میں اللہ تعالیٰ کے فعل کا بیان ہے' اور دوسرے جملہ میں بندوں کے فعل کا بیان ہے' اس لیے ان دونوں جملوں کو ملائے بغیر الگ الگ پڑھنا مستحسن ہے۔

وقف جائز وہ ہے جس میں ایک جملہ کو دوسرے جملہ سے ملا کر پڑھنا اور پہلے جملہ پر وقف کر کے دوسرے کو ابتداءً پڑھنا دونوں طرح جائز ہو' اس کی مثال یہ آیت ہے:

''وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ''. (یوسف: ۲۴)

اگر ''ھم بھا'' پر وقف کیا جائے تو معنی اس طرح ہوگا: عزیز مصر کی عورت نے یوسف کے ساتھ برے فعل کا قصد کیا اور یوسف نے اس عورت سے اجتناب کا قصد کیا' اگر یوسف نے زنا کی برائی پر اپنے رب کی برہان کا مشاہدہ نہ کیا ہوتا تو وہ اس برائی میں مبتلا ہو جاتے اور اگر ''ھم بھا'' کے بعد والے جملہ سے ملا کر پڑھا جائے تو معنی اس طرح ہوگا:

عزیز مصر کی عورت نے یوسف کے ساتھ برے فعل کا قصد کیا' اگر یوسف نے اس فعل کی برائی پر اللہ کی برہان کا مشاہدہ نہ کیا ہوتا تو وہ بھی اس عورت کے ساتھ برے فعل کا قصد کر لیتے۔

واضح رہے کہ ''ھم'' کا درجہ عزم سے کم ہوتا ہے' ''ھم'' کا معنی ہے: کسی فعل کا قصد کیا جائے اور اس میں اس فعل کو نہ کرنے کا بھی پہلو ہو' اور عزم کا معنی ہے: کسی فعل کو کرنے کا پختہ قصد ہو اور اس میں اس فعل کو نہ کرنے کا پہلو بالکل نہ ہو۔ اس کی وضاحت ہم نے ''وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ '' (البقرہ: ۲۳۵) میں کر دی ہے۔

المرخص بوجہ' جس میں ایک وجہ سے وقف کرنا اور دوسری وجہ سے ملا کر پڑھنا جائز ہو' اس کی مثال یہ آیت ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ. (البقرہ:۸۶)

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلہ دنیا کی زندگی خریدی تھی' سو ان کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی۔

''فلا یخفف عنهم العذاب'' پہلے جملہ کے لیے بہ منزلہ سبب اور جزاء ہے اور اس کا تقاضا ملا کر پڑھنا ہے اور لفظ فاء ابتداء کو چاہتا ہے اس لیے پہلے جملہ پر وقف کر کے ''فلا یخفف'' سے ابتداء پڑھنا بھی جائز ہے۔

الرخص ضرورۃ جو لفظ یا جملہ پہلے لفظ یا جملہ سے مستغنی نہ ہو اور اس میں اصل ملا کر پڑھنا ہو' لیکن مسلسل پڑھنے کی وجہ سے انسان کا سانس ٹوٹ جائے اور وہ ملا کر پڑھنے کے بجائے ٹھہر جائے تو اس کی اجازت ہے اور دوبارہ ملا کر پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے' اس کی مثال یہ آیت ہے:

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً ۖ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً. (البقرہ:۲۲)

جس ذات نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا۔

''انزل من السماء'' میں ''انزل'' کی ضمیر ''الذی'' کی طرف لوٹ رہی ہے اس لیے یہ جملہ پہلے جملہ سے مستغنی نہیں ہے اور ان کو ملا کر پڑھنا چاہیے لیکن اگر طول کلام کی وجہ سے پڑھنے والے کا سانس ٹوٹ جائے اور وہ ''والسماء بناء'' پر وقف کرے تو اس کی اجازت ہے کیونکہ ''وانزل من السماء ما'' کو الگ پڑھنے سے بھی اس کا معنی سمجھ میں آجاتا ہے۔

جس جگہ ملا کر پڑھنا ضروری ہے اور وقف کرنا جائز نہیں ہے یہ وہ کلام ہے جو شرط اور جزاء پر مشتمل ہو' شرط اور جزا کو ملا کر پڑھنا ضروری ہے اور شرط پر وقف کرنا جائز نہیں ہے یا کلام مبتدا اور خبر پر مشتمل ہو تو مبتدا پر وقف کرنا صحیح نہیں ہے' اسی طرح موصوف اور صفت کو ملا کر پڑھنا چاہیے اور موصوف پر وقف نہ کیا جائے۔ اس کی مثال یہ ہے:

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ۝ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ. (البقرہ:۲۶-۲۷)

اور اللہ صرف فاسقوں کو گمراہ کرتا ہے ۝ جو اللہ کے عہد کو پکا کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں۔

اس آیت میں ''الذین ینقضون'' ''الفاسقین'' کی صفت ہے' اس لیے ان کو ملا کر پڑھا جائے۔

رموز اوقاف کی تفصیل حسب ذیل ہے:

م: وقف لازم

ط: وقف مطلق

سکتہ: اس طرح ٹھہرا جائے کہ سانس نہ ٹوٹے' پورے قرآن مجید میں صرف سات جگہ یہ علامت ہے۔

مذکور الصدر علامات پر وقف کرنا ضروری ہے۔

لا: جب ۵ اور ۃ کے بغیر ''لا'' ہو تو ملا کر پڑھنا ضروری ہے' اس کی مثال یہ آیت ہے:

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ. (البقرہ:۸۹)

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کتاب آ گئی' جو اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو ان کے پاس (اصل آسمانی کتاب) ہے حالانکہ وہ (یہود) اس سے پہلے (اس کتاب اور صاحب کتاب کے وسیلہ سے) کفار کے خلاف فتح کی دعا کرتے تھے۔

''وکانوا من قبل'' کا جملہ سابقہ جملہ کی ''ھم'' ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے اور حال اور ذوالحال میں فصل نہیں ہوتا

اس لیے یہاں ملا کر پڑھنا ضروری ہے۔

حسب ذیل مقامات پر وصل کر کے پڑھنا اولیٰ ہے:

ز: وقف مجوز

ج۔ز: وقف جائز و مجوز

ق: وقف کا قول ضعیف ہے۔

صلی: وصل کر کے پڑھنا اولیٰ ہے۔

اور جہاں قف لکھا ہوا سکا معنی ہے: وقف کرنا اولیٰ ہے۔

صل: ملاؤ۔

ۛ: اس کا مطلب ہے: اس وقف یا وصل میں اختلاف ہے۔

ہ: وقف اور وصل دونوں جائز ہیں۔

ج: وقف کرنا جائز ہے۔

ص: وقف کی رخصت ہے۔

قرآن مجید میں جب ایک مضمون ختم ہو جاتا ہے تو وہاں رکوع کی علامت ع لکھی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں کل ۵۵۸ رکوع ہیں' یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی۔ قرآن مجید میں سورتوں کے اسماء اور آیتوں کی تعداد لکھنے کا بھی پہلے رواج نہیں تھا' حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ میں اس کا بہ کثرت رواج ہے اور علماء سلف کی اتباع کرنا اولیٰ ہے۔ (تفسیر القرآن ج ۷ ص ۴۵۱' مطبوعہ ادارہ اندلس' بیروت' ۱۳۸۵ ھ)

''فتاویٰ عالم گیری'' میں مذکور ہے: قرآن مجید میں سورتوں کے اسماء اور آیتوں کی تعداد لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہر چند کہ یہ ایک نیا کام ہے لیکن یہ بدعت حسنہ ہے' اور کتنے ہی کام نئے ہیں اور وہ بدعت حسنہ ہیں اور کتنی چیزوں کا حکم زمان اور مکان کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے۔ (فتاویٰ عالم گیری ج ۵ ص ۳۲۳ مطبوعہ مطبع بولاق' مصر' ۱۳۱۰ ھ)

مضامین قرآن کا خاکہ ایک نظر میں

(۱) قرآن مجید کے پارے	۳۰	(۷) وعید	۱۰۰۰
(۲) قرآن مجید کی سورتیں	۱۱۴	(۸) قصص و اخبار	۱۰۰۰
(۳) قرآن مجید کی آیتیں حضرت ابن عباس کی روایت کے مطابق	۶۶۱۶	(۹) عبر و امثال	۱۰۰۰
		(۱۰) حرام و حلال	۵۰۰
(۴) امر	۱۰۰۰	(۱۱) دعا	۱۰۰
(۵) نہی	۱۰۰۰	(۱۲) منسوخ الحکم آیات (باعتبار شہرت)	۱۲
(۶) وعد	۱۰۰۰		

تفسیر اور تاویل کا لغوی معنی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

فسر کا معنی ہے: معقول کا اظہار کرنا' مفرد الفاظ کی تفسیر اور مشکل معنی کے بیان کو تفسیر کہتے ہیں اور کبھی تفسیر پر تاویل کا

اطلاق ہوتا ہے' اسی لیے خواب کی تعبیر بیان کرنے کو تفسیر اور تاویل کہتے ہیں۔

(المفردات ص ۳۸۰' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران' ۱۳۴۲ھ)

علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

ابن الاعرابی نے کہا: فسر کا معنی ظاہر کرنا اور بند چیز کو کھولنا ہے "بصائر" میں ہے: معنی معقول کو منکشف کرنا فسر ہے' نیز فسر کا معنی طبیب کا پیشاب کا معائنہ کرنا ہے' تفسرہ اس پیشاب کو کہتے ہیں جس سے مریض کے مرض پر استدلال کیا جاتا ہے' اس کا طبیب معائنہ کرتے ہیں' اور اس کے رنگ سے مریض کے مرض پر استدلال کرتے ہیں' تفسیر اور تاویل دونوں کا ایک معنی ہے' یا تفسیر مشکل لفظ کی مراد کے بیان کرنے کو کہتے ہیں' اور تاویل دو احتمالوں میں سے کسی ایک احتمال کے ترجیح دینے کو کہتے ہیں جو ظاہر عبارت کے مطابق ہو" "لسان العرب" میں اسی طرح مذکور ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو مجمل قصے ہیں ان کی شرح کرنا اور مشکل الفاظ کے معانی بیان کرنا اور آیات کا شان نزول بیان کرنا تفسیر ہے اور معانی متشابہ کو بیان کرنا تاویل ہے اور جن الفاظ کا غور و فکر کیے بغیر قطعیت کے ساتھ معنی معلوم نہ ہو سکے وہ متشابہ ہیں۔

(تاج العروس ج ۳ ص ۴۷۰' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر' ۱۳۰۶ھ)

علامہ میر سید شریف لکھتے ہیں:

تفسیر کا لغوی معنی ہے: کشف اور ظاہر کرنا اور اصطلاحی معنی ہے: واضح لفظوں کے ساتھ آیت کے معنی کو بیان کرنا' اس سے مسائل مستنبط کرنا' اس کے متعلق احادیث و آثار بیان کرنا اور اس کا شان نزول بیان کرنا۔

(کتاب التعریفات ص ۲۸' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر' ۱۳۰۶ھ)

تاویل کا لغوی معنی ہے: لوٹانا اور اصطلاح شرع میں ایک لفظ کو اس کے ظاہری معنی سے ہٹا کر ایک ایسے معنی پر محمول کرنا جس کا وہ احتمال رکھتا ہو اور وہ احتمال کتاب اور سنت کے موافق ہو' مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ" (الروم: ۱۹) وہ مردے سے زندہ کو نکالتا ہے' اگر اس آیت میں انڈے سے پرندے کو نکالنا مراد ہو تو تفسیر ہے اور اگر کافر سے مومن کو پیدا کرنا یا جاہل سے عالم کو پیدا کرنا مراد ہو تو یہ تاویل ہے۔ (کتاب التعریفات ص ۲۲' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر' ۱۳۰۶ھ)

تفسیر کی اصطلاحی تعریف

علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں:

تفسیر وہ علم ہے جس میں الفاظ قرآن کی کیفیت نطق' ان کے مدلولات' ان کے مفرد اور مرکب ہونے کے احکام' حالت ترکیب میں ان کے معانی اور ان کے تتمات سے بحث کی جاتی ہے۔ (البحر المحیط ج ۱ ص ۲۶' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۲ھ)

الفاظ قرآن کی کیفیت نطق سے مراد علم قراءات ہے' الفاظ قرآن کے مدلولات سے مراد ان الفاظ کے معانی ہیں اور اس کا تعلق علم لغت سے ہے' مفرد اور مرکب کے احکام' اس سے مراد علم صرف' علم نحو (عربی گرامر) اور علم بیان اور علم بدیع (فصاحت اور بلاغت) ہے اور حالت ترکیب میں الفاظ قرآن کے معانی سے مراد یہ ہے کہ کبھی لفظ کا ظاہری معنی مراد نہیں ہوتا اور اس کو مجاز پر محمول کیا جاتا ہے' اس کا تعلق علم معانی اور بیان سے ہے اور تتمات سے مراد ناسخ اور منسوخ کی معرفت' آیات کا شان نزول اور مبہمات قرآن کا بیان کرنا ہے۔

علامہ ابن الجوزی لکھتے ہیں:

کسی چیز کو (جہالت کی) تاریکی سے نکال کر (علم کی) روشنی میں لانا تفسیر ہے' اور کسی لفظ کو اس کے اصل معنی سے نقل

کر کے دوسرے معنی پر محمول کرنا تاویل ہے، جس کی وجہ ایسی دلیل ہو کہ اگر وہ دلیل نہ ہوتی تو اس لفظ کو اس کے ظاہر سے نہ ہٹایا جاتا۔ (زاد المسیر ج ۱ ص ۴ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۴۰۷ھ)

تفسیر اور تاویل کا فرق

جس لفظ کا صرف ایک معنی ہو اس کا بیان کرنا تفسیر ہے اور جس لفظ کے کئی معانی ہوں تو دلیل سے کسی ایک معنی کو بیان کرنا تاویل ہے' امام ماتریدی نے کہا ہے کہ قطعیت سے بیان کرنا کہ اس لفظ کا یہ معنی ہے' اور اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ تعالیٰ نے اس لفظ سے یہ معنی مراد لیا ہے' یہ تفسیر ہے' سو اگر کسی دلیل قطعی کی بنا پر یہ شہادت دی گئی ہے تو یہ تفسیر صحیح ہے ورنہ تفسیر بالرائے ہے' اور یہ منع ہے' اور لفظ کے کئی محتملات میں سے کسی ایک احتمال کو بغیر قطعیت اور شہادت کے متعین کرنا تاویل ہے' اور ابو طالب ثعلبی نے بیان کیا ہے کہ لفظ کی حقیقت اور مجاز کو بیان کرنا تفسیر ہے' جیسے "صراط" کی تفسیر راستہ ہے اور "صیب" کی تفسیر بارش ہے اور تاویل لفظ کے باطن کو بیان کرنا ہے مثلاً "اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝" (الفجر: ۱۴) اس کا لفظی معنی ہے: بے شک آپ کا رب ضرور گھات میں ہے اور اس کی تاویل یہ ہے کہ وہ نافرمانوں کو دیکھ رہا ہے اور اس سے ان کو نافرمانی کرنے سے ڈرایا گیا ہے۔ تاویل میں دلیل قطعی سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ یہاں لفظ کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے۔ علامہ اصبہانی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ تفسیر کا معنی ہے: قرآن کے معانی کو بیان کرنا' کبھی اس میں مشکل الفاظ کے معانی بیان کیے جاتے ہیں مثلاً بحیرہ' سائبہ اور وصیلہ کے معانی اور کبھی کوئی کلام کسی قصہ کو متضمن ہوتا ہے اور اس قصہ کے بیان کیے بغیر اس کلام کی معرفت نہیں ہوتی' مثلاً

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ. (التوبہ: ۳۷) تقدیم و تاخیر کفر میں زیادتی کے سوا کچھ نہیں۔

یہ آیت اس قصہ کو متضمن ہے کہ کفار اپنی ہوائے نفس کی بناء پر مہینوں کو آگے پیچھے کر دیتے تھے اور تاویل میں کبھی لفظ کو عموم پر محمول کیا جاتا ہے اور کبھی خصوص پر' مثلاً ایمان کا لفظ مطلقاً تصدیق کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے اور تصدیق شرعی کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

اور کبھی ایک لفظ جو کئی معنی میں مشترک ہے اس کے کسی ایک معنی کی تعیین کی جاتی ہے جیسے "قرء" یہ حیض اور طہر دونوں میں مشترک ہے۔ بعض علماء نے کہا: تفسیر کا تعلق روایت کے ساتھ ہے اور تاویل کا تعلق درایت کے ساتھ ہے' اور ابو نصر قشیری نے کہا: تفسیر اتباع اور سماع میں منحصر ہے اور تاویل کا تعلق استنباط کے ساتھ ہے' علامہ بغوی اور کواشی نے کہا کہ آیت جس معنی کا احتمال رکھتی ہو اور اس کا سیاق اور سباق اس کے موافق ہو اور وہ معنی کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو تو استنباط کے طریقہ سے آیت کو اس معنی پر محمول کرنا تاویل ہے' اور بعض علماء نے تفسیر کا یہ معنی بیان کیا: آیات کے اسباب نزول اور ان کے قصص اور ان کے مکی اور مدنی ہونے کا علم اور ان کے محکم' متشابہ' ناسخ' منسوخ' خاص' عام' مطلق' مقید' مجمل' مفسر' حلال' حرام' وعد' وعید' امر' نہی' عبر اور امثال کا علم تفسیر ہے' اور علامہ زرکشی نے کہا: تفسیر وہ علم ہے جس سے اس کتاب کی فہم حاصل ہوتی ہے جو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے' اور اس کے معانی کا بیان اور اس کے احکام کا استخراج معلوم ہوتا ہے' اور علم لغت' نحو' صرف' علم بیان' اصول فقہ اور قراءات سے اس میں مدد حاصل ہوتی ہے اور اس کی معرفت کے لیے اسباب نزول اور ناسخ اور منسوخ کو جاننے کی ضرورت ہے۔ (الاتقان ج ۲ ص ۱۷۴ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

علم تفسیر کا فائدہ قرآن مجید کے معانی کی معرفت ہے اور اس کی غرض سعادت دارین ہے' اور اس کا موضوع کلام اللہ لفظی ہے کیونکہ موضوع وہ ہوتا ہے جس کے عوارض ذاتیہ سے اس علم میں بحث کی جاتی ہے اور علم تفسیر میں کلام لفظی کے عوارض ذاتیہ

سے بحث کی جاتی ہے۔

تفسیر قرآن کی فضیلت پر عقلی دلائل

امام راغب اصفہانی نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ تمام صنعتوں میں سب سے افضل صنعت قرآن مجید کی تفسیر اور تاویل ہے کیونکہ صنعت کی فضیلت یا تو اس کے موضوع کے اعتبار سے ہوتی ہے' جیسے کہا جاتا ہے کہ سنار کی صنعت دباغ کی صنعت سے افضل ہے کیونکہ سنار کا موضوع سونا اور چاندی ہے اور دباغ (کھال رنگنے والا) کا موضوع مردار کی کھال ہے' یا صنعت کی فضیلت اس کی غرض کے اعتبار سے ہوتی ہے جیسے طب کی صنعت جمعدار کی صنعت سے افضل ہے کیونکہ طب کی غرض صحت کا افادہ کرنا ہے اور جمعداری کی غرض بیت الخلاء کی صفائی ہے' نیز صنعت کی فضیلت صورت کے اعتبار سے ہوتی ہے' جیسے تلوار کی صنعت بیڑیاں بنانے کی صنعت سے افضل ہے۔

اور صنعت تفسیر ان تینوں جہات کے اعتبار سے تمام صنعتوں سے افضل ہے' کیونکہ اس کا موضوع اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو ہر حکمت کا منبع اور ہر صورت کا معدن ہے اور اسکی صورت اللہ تعالیٰ کے مخفی اسرار کا اظہار ہے اور تدوین شریعت ہے اور یہ ہر صورت سے افضل ہے اور اس کی غرض سعادت حقیقیہ تک پہنچنا اور خیر کثیر کا حصول ہے جو ہر غرض سے افضل ہے' قرآن مجید میں ہے:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ
(البقرہ:۲۶۹)

اور جسے حکمت دی گئی تو بے شک اسے خیر کثیر دی گئی۔

ایک قول یہ ہے کہ خیر کثیر سے مراد قرآن کریم کی تفسیر ہے۔

تفسیر قرآن کی فضیلت کے متعلق احادیث اور آثار

علامہ ابن عطیہ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ قرآن کا کون سا علم افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کی عربیت' سو تم اس کو شعر میں تلاش کرو' نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن مجید کے معانی کی فہم حاصل کرو' اور اس کے مشکل الفاظ کے معنی تلاش کرو' کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے معانی کی معرفت حاصل کرنے کو پسند کرتا ہے (اس حدیث کو امام ابو یعلیٰ نے حضرت ابن مسعود سے اور امام بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ سعیدی غفرلہ)

قاضی ابو محمد عبدالحق رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قرآن مجید کے اعراب شریعت میں اصل ہیں' کیونکہ اسی کے ذریعہ وہ معانی حاصل ہوتے ہیں جو شرع میں مطلوب ہیں۔

قاضی ابو العالیہ نے ''وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ'' (البقرہ:۲۶۹) کی تفسیر میں کہا: حکمت سے مراد قرآن کی فہم ہے' اور قتادہ نے کہا: حکمت سے مراد قرآن میں تفقہ کرنا ہے اور دوسرے علماء نے کہا: حکمت سے مراد قرآن کی تفسیر ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے علم کی تعریف کی' ان میں سے ایک شخص نے کہا: میں آپ پر قربان جاؤں' آپ کا خود اتنا عظیم مقام ہے اور آپ حضرت جابر کی تعریف کر رہے ہیں؟ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: حضرت جابر کو قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر کا علم ہے: ''اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَاۗدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ۭ''

(القصص: ۸۵)۔

شعبی نے کہا: مسروق نے ایک آیت کی تفسیر کے لیے بصرہ کا سفر کیا' وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ جو شخص اس آیت کی تفسیر کرتا تھا وہ شام چلا گیا ہے' پھر وہ شام پہنچے اور اس شخص سے اس آیت کی تفسیر کا علم حاصل کیا۔

ایاس بن معاویہ نے کہا: جو لوگ قرآن کریم پڑھتے ہیں اور اس کی تفسیر کو نہیں جانتے' وہ ان لوگوں کی مثل ہیں جن کے پاس اندھیری رات میں بادشاہ کا مکتوب آیا ہو اور ان کے پاس چراغ نہ ہو اور ان کو علم نہ ہو سکے کہ اس میں کیا لکھا ہے اور وہ اس وجہ سے پریشان اور مضطرب ہوں' اور جو لوگ قرآن مجید کی تفسیر جانتے ہیں' ان کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جن کے پاس رات کے وقت بادشاہ کا مکتوب آیا ہو اور اس کے پڑھنے کے لیے ان کے پاس چراغ موجود ہو۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اس کی تفسیر نہیں جانتا' وہ شعر پڑھنے والے جنگلی کی طرح ہے۔ (یعنی اشعار کی طرح جلدی جلدی پڑھتا ہے۔)

مجاہد نے کہا: اللہ کے نزدیک اس کی مخلوق میں سب سے زیادہ پسندیدہ وہ شخص ہے جس کو قرآن مجید کا سب سے زیادہ علم ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص اس وقت تک مکمل فقیہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کو قرآن کی وجوہ کثیرہ کا علم نہ ہو۔

حسن بصری نے کہا: غیر عربی ہلاک ہو گئے' ان میں سے ایک شخص قرآن مجید پڑھتا ہے اور اس کی وجوہ (تفسیر) سے جاہل ہوتا ہے' پھر وہ اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتا ہے۔

حضرت ابن عباس اپنی مجلس میں پہلے قرآن پڑھتے' پھر اس کی تفسیر کرتے' پھر حدیث بیان کرتے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہر چیز کا علم قرآن میں ہے' لیکن انسان کی عقل اس کو حاصل کرنے سے عاجز ہے۔

علامہ ابوالحیان اندلسی نے بھی ان احادیث اور آثار کو بیان کیا ہے۔ (البحر المحیط ج ۱ ص ۱۹۔ ۱۴' المکتبۃ التجاریہ' مکہ مکرمہ)

قرآن مجید کی تفسیر کرنے پر اعتراضات کے جوابات

حافظ الہیثمی نے ''مسند بزار'' اور ''مسند ابو یعلیٰ'' کے حوالے سے یہ روایت ذکر کی ہے کہ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ماسوا ان چند معدود آیات کے جن کا علم حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو پہنچایا ہے' قرآن مجید کی کسی آیت کی تفسیر اپنی رائے سے نہ بیان کی جائے۔ (مجمع الزوائد ج ۶ ص ۳۰۳' مطبوعہ دار الکتاب العربی' ۱۴۰۲ھ)

علامہ ابوالحیان اندلسی متوفی ۷۵۴ھ اور علامہ عبدالرحمان ثعالبی متوفی ۸۷۵ھ نے اس کے جواب میں یہ کہا کہ یہ حدیث ان امور کی تفسیر پر محمول ہے جن کا تعلق توقیف سے ہے' مثلاً جن کا تعلق مغیبات سے ہے' جیسے وقت وقوع قیامت کا علم' یا صور پھونکنے کی تعداد اور آسمان و زمین کی تخلیق کی ترتیب کا علم' اور اس سے وہ امور خارج ہیں جن کا تعلق بیان لغت' مشکل اعراب قرآن' شان نزول اور احکام کے استخراج اور استنباط سے ہے۔

امام ترمذی حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے قرآن میں اپنی رائے سے صحیح بات بھی کہی تو اس نے خطا کی۔ (جامع ترمذی ص ۴۱۹' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی) اس حدیث کو امام ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۸' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

علامہ آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اس حدیث کی صحت کے متعلق بحث کی گئی ہے "مدخل" میں ہے کہ اس حدیث کی صحت پر اعتراض ہے اور اگر بالفرض یہ حدیث صحیح ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس شخص نے محض اپنی رائے سے صحیح بات بھی کہی ہے تو اس نے طریقہ میں خطا کی ہے کیونکہ قرآن مجید کی تفسیر کا طریقہ یہ ہے کہ معنی بیان کرنے کے لئے لغت کی طرف رجوع کیا جائے اور ناسخ اور منسوخ کو بیان کرنے کے لیے احادیث کی طرف رجوع کیا جائے اور مراد بیان کرنے کے لیے صاحب شرع کی طرف رجوع کیا جائے اور جب یہ امور نہ ہوں تو پھر غور وفکر کرنے اور آیات سے معانی اور احکام کا استنباط کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کا تیسرا جواب یہ ہے کہ جو شخص قرآن کی تفسیر میں کوئی ایسی بات کہے جو اس کے مذہب کے موافق ہو اور اپنے مذہب کو اصل اور قرآن مجید کو اس کے تابع قرار دے تو اس نے واقعی خطا کی ہے کیونکہ اصل قرآن کریم ہے جو اس کے موافق ہو وہ مقبول ہے اور جو اس کے مخالف ہو وہ مردود ہے اور اس حدیث کا چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث متشابہات پر محمول ہے جن کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے تو ان کے متعلق اگر اس نے اپنی رائے سے کوئی صحیح بات بھی کہی تو اس کی خطا یہ ہے کہ اس نے آیات میں رائے زنی کی ہے جن میں غور وفکر کی اجازت نہیں ہے اور اس کا پانچواں جواب یہ ہے کہ جس شخص نے بلا دلیل قطعیت کے ساتھ یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کی یہی مراد ہے اس نے خطا کی کیونکہ بلا دلیل قطعیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مراد بیان کرنا جائز نہیں ہے۔ (روح المعانی ج ۱ ص ۶ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

امام ترمذی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے بغیر علم کے قرآن میں کوئی بات کہی وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے' نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اپنی رائے سے قرآن میں کوئی بات کہی وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے' پہلی حدیث حسن صحیح ہے اور دوسری حسن ہے۔ (جامع ترمذی ص ۴۱۹ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

ان حدیثوں کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(۱) جس شخص نے بغیر علم کے قرآن مجید کے کسی اشکال کو حل کرنے کی کوشش کی' یہ وعید اس کے متعلق ہے۔

(۲) جس شخص کو علم ہو کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ حق کے خلاف ہے اور محض ہوائے نفس یا انانیت یا اپنی موضوعی فکر کی تائید میں کہہ رہا ہے' وہ اس وعید کا مصداق ہے۔

(۳) جس شخص نے بغیر کسی یقینی یا ظنی دلیل کے کوئی بات کہی یا بغیر کسی ایسی عقلی دلیل کے بات کہی جو قواعد شرع کے مطابق ہو۔

(۴) جس شخص نے ائمہ لغت' ائمہ عربیہ اور ائمہ مجتہدین کی نقل کے بغیر' قرآن مجید کے کسی لفظ کا معنی یا کوئی شرعی حکم بیان کیا۔

(۵) جس شخص نے اسباب نزول اور ناسخ ومنسوخ سے متعلق بغیر نقل صحیح کے اپنی طرف سے کوئی بات کہی' یہ وعید اس کے متعلق ہے۔

قرآن مجید کی تفسیر کرنے کی مشروعیت اور جواز پر قرآن مجید' احادیث اور آثار سے دلائل

تفسیر کی مشروعیت اور جواز پر قرآن مجید اور احادیث میں بہت دلائل ہیں' بعض ازاں یہ ہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ (النساء: ۸۳)

اور اگر وہ اس بات کو رسول کی طرف لوٹا دیتے اور ان کی طرف لوٹا دیتے جو ان میں سے صاحبان امر ہیں' تو اس بات (کی مصلحت) کو وہ لوگ جان لیتے جو کسی بات کا نتیجہ نکالتے

کے اہل ہیں۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا○ (محمد: ۲۴)	کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں○
كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ○ (ص: ۲۹)	ہم نے آپ کی طرف کتاب کو نازل کیا ہے یہ مبارک ہے تاکہ وہ اس میں غور کریں اور عقلمند لوگ نصیحت حاصل کریں○
وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ○ (العنکبوت: ۴۳)	اور یہ مثالیں ہیں جن کو ہم لوگوں کے لیے بیان فرماتے ہیں اور ان کو صرف علم والے ہی سمجھتے ہیں○

امام ابو نعیم اور دیگر ائمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قرآن نرم اور ذو وجوہ ہے (اس کے متعدد محامل ہیں) سو اس کو سب سے بہتر محمل پر محمول کرو۔ (روح المعانی ج ۱ ص ۶ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا آپ کے پاس کوئی (مخصوص) کتاب ہے؟ فرمایا: نہیں' صرف کتاب اللہ یا (استنباط کی) وہ فہم ہے جو مسلمان شخص کو دی گئی ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سینہ سے لگایا اور دعا کی کہ اے اللہ! اس کو کتاب کا علم عطا فرما۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۷ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سینہ سے لگایا اور دعا کی: اے اللہ! اس کو سنت اور قرآن کی تاویل کا علم عطا فرما۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۵ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

امام حمیدی' امام احمد' امام ابن حبان' امام طبرانی اور امام بغوی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس کے لیے دعا میں فرمایا: اے اللہ! اس کو دین کی فقہ (فہم) عطا فرما اور اس کو تاویل کا علم عطا فرما۔

(فتح الباری ج ۱ ص ۱۷۰ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

اور امام ترمذی اور امام نسائی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بار میرے لیے حکمت کی دعا کی' اس لیے کتاب سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد سنت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا اور فرمایا: تم کیا خوب ترجمان قرآن ہو۔ (مجمع الزوائد ج ۹ ص ۲۷۶ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

طبقات مفسرین کا بیان

مفسرین کے چھ مشہور طبقات ہیں:

(۱) دس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن مجید کی تفسیر کرنے میں معروف ہیں: حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت عبد اللہ بن مسعود' حضرت ابن عباس' حضرت ابی بن کعب' حضرت زید بن ثابت' حضرت ابو موسیٰ

اشعری اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم۔

خلفاء راشدین میں حضرت علی متوفی ۴۰ھ کی تفسیری روایات باقی خلفاء سے بہت زیادہ ہیں' اور حضرت ابن مسعود متوفی ۳۸ھ کی روایات حضرت علی سے بھی زیادہ ہیں' حضرت عبداللہ بن عباس متوفی ۶۸ھ' ترجمان القرآن' حبر الامۃ اور امام المفسرین ہیں' اور ان سے بے شمار تفسیری روایات منقول ہیں' علامہ فیروز آبادی صاحب ''القاموس'' کی روایت سے وہ تفسیر چھپ گئی ہے جو حضرت ابن عباس کی طرف منسوب ہے' علامہ فیروز آبادی نے اس کا نام ''تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس'' رکھا ہے۔

اس تفسیر کو حضرت ابن عباس کی تفسیر قرار دینا درست نہیں ہے کیونکہ اس تفسیر کی سند یہ ہے: از کلبی از ابی صالح از ابن عباس (الدر المنثور ج ۱ ص ۱' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران) اور محمد بن سائب کلبی کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

لیث بن ابی سلیم نے کہا: کوفہ میں دو کذاب تھے' ایک کلبی اور دوسرا سدی' یحییٰ بن معین نے کہا: یہ کوئی چیز نہیں' ابو عوانہ نے کہا: میں نے کلبی سے کفریہ اقوال سنے ہیں' ابو جزء نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ کلبی کافر ہے' یزید بن زریع نے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ کلبی کافر ہے۔ میں نے اس کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جبرئیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لائے' آپ کسی کام کے لیے اٹھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آ کر بیٹھ گئے تو جبرئیل نے حضرت علی پر وحی نازل کر دی' وہ اپنا سینہ پیٹ کر کہتا تھا کہ میں سبائی ہوں' میں سبائی ہوں' عقیلی نے کہا: وہ عبداللہ بن سبا کے اصحاب میں سے تھا' ابو جناب کلبی کہتے ہیں کہ ابو صالح نے حلف اٹھا کر کہا: میں نے کلبی کو تفسیری روایات بالکل نہیں سنائیں' سفیان ثوری کہتے ہیں کہ کلبی نے کہا: میں نے از ابو صالح از ابن عباس جس قدر روایات بیان کی ہیں وہ سب جھوٹ ہیں' ان کو مجھ سے روایت نہ کرو' یہ شخص ۱۴۶ھ میں فوت ہو گیا تھا۔ (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۸۰۔۱۷۸' مطبوعہ دائرۃ المعارف' حیدر آباد دکن' ۱۳۲۶ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ جس سند سے ''تنویر المقباس'' مروی ہے' وہ جھوٹی سند ہے اور اس کتاب میں ہر قسم کی روایات ہیں اور اس کتاب کو حضرت ابن عباس کی تفسیر قرار دینا صحیح نہیں ہے' حضرت ابن عباس کی صحیح تفسیری روایات وہ ہیں جو مستند کتب احادیث میں اسانید صحیحہ سے مروی ہیں۔ حضرت ابن عباس کی جس روایت میں محمد بن سائب کلبی متوفی ۱۴۶ھ اور محمد بن مروان السدی متوفی ۱۸۶ھ دونوں موجود ہوں وہ غایت درجہ کی ضعیف روایت ہے۔

(۲) مفسرین کا دوسرا طبقہ تابعین کا ہے' ان میں حضرت ابن عباس متوفی ۶۸ھ کے حسب ذیل تلامذہ بہت مشہور ہیں' یہ علماء مکہ ہیں:

(ا) مجاہد بن جبر متوفی ۱۰۳ھ (ب) سعید بن جبیر متوفی ۹۴ھ (ج) عکرمہ مولیٰ ابن عباس متوفی ۱۰۵ھ (د) طاؤس بن کیسان یمانی متوفی ۱۰۶ھ (ہ) عطاء بن ابی رباح متوفی ۱۱۴ھ

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ متوفی ۳۸ھ کے حسب ذیل تلامذہ تفسیری روایات میں معروف ہیں' یہ علماء کوفہ ہیں:

(ا) علقمہ بن قیس متوفی ۱۰۲ھ' (ب) اسود بن یزید متوفی ۷۵ھ' (ج) ابراہیم نخعی متوفی ۹۵ھ' (د) شعبی متوفی ۱۰۵ھ

حضرت زید بن اسلم متوفی ۱۳۶ھ کے تلامذہ' یہ علماء مدینہ ہیں:

(ا) عبدالرحمٰن بن زید متوفی ۱۸۲ھ' (ب) مالک بن انس متوفی ۱۷۹ھ' (ج) حسن بصری متوفی ۱۲۱ھ' (د) عطا بن ابی مسلم خراسانی متوفی ۱۳۵ھ (ہ) محمد بن کعب قرظی متوفی ۱۱۷ھ (و) ابوالعالیہ رفیع بن مہران ریاحی متوفی ۹۰ھ (ز) ضحاک بن مزاحم متوفی ۱۰۵ھ (ح) عطیہ بن سعید عوفی متوفی ۱۱۱ھ (ط) قتادہ بن دعامہ سدوسی متوفی ۱۱۷ھ (ی) ربیع بن انس متوفی ۱۳۹ھ (ک) اسماعیل بن عبدالرحمان سدی متوفی ۱۲۷ھ

(۳) مفسرین کا تیسرا طبقہ وہ ہے جس نے صحابہ اور تابعین کے اقوال کو جمع کیا ہے' ان میں مشہور علماء حسب ذیل ہیں:
(ا) سفیان بن عیینہ متوفی ۱۹۸ھ (ب) وکیع بن جراح کوفی متوفی ۱۹۷ھ (ج) شعبہ بن حجاج متوفی ۱۶۰ھ (د) یزید بن ہارون سلمی (ہ) عبدالرزاق متوفی ۲۱۱ھ (د) آدم بن ابی ایاس متوفی ۲۲۱ھ (ز) اسحاق بن راھویہ متوفی ۲۳۸ھ (ح) روح بن عبادہ متوفی ۲۰۵ھ (ط) عبداللہ بن حمید جہنی (ی) ابوبکر بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ

(۴) مفسرین کے چوتھے طبقہ میں ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ ہیں' وہ اس زمانہ میں سب سے مشہور مفسر تھے' علامہ سیوطی نے ''اتقان'' میں لکھا ہے کہ ان کی کتاب بہت عظیم تفسیر ہے' وہ متضاد اقوال میں تطبیق دیتے ہیں اور بعض کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں' علامہ نووی اور علامہ ابواسحاق اسفرائنی نے اس تفسیر کی بہت تعریف کی ہے' حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ کی تفسیر بھی اسی کا خلاصہ ہے۔ ان کے علاوہ اس طبقہ کے دیگر مفسرین یہ ہیں:
(ا) علی بن ابی طلحہ متوفی ۱۴۳ھ (ب) ابن ابی حاتم عبدالرحمان بن محمد رازی متوفی ۳۲۷ھ (ج) ابوعبداللہ محمد ابن ماجہ قزوینی متوفی ۲۷۳ھ (د) ابن مردویہ ابوبکر احمد بن موسیٰ اصفہانی متوفی ۴۱۰ھ (ہ) ابوالشیخ بن حبان بسی متوفی ۳۵۴ھ' (و) ابراہیم بن منذر متوفی ۲۳۶ھ

(۵) پانچویں طبقہ میں ایسے مفسرین ہیں جنہوں نے اپنی تفسیروں میں اسانید کو حذف کر دیا' ان کے اسماء حسب ذیل ہیں:
(ا) ابواسحاق زجاج ابراہیم بن السری النحوی متوفی ۳۱۰ھ (ان کی تفسیر کا نام معانی القرآن ہے) (ب) ابوعلی فارسی متوفی ۳۷۷ھ' یہ لغت اور بلاغت میں ماہر تھے (ج) ابوبکر محمد بن الحسن المعروف بالنقاش الموصلی متوفی ۳۵۱ھ (د) مکی بن ابی طالب القیسی النحوی المغربی متوفی ۴۳۷ھ (ہ) ابوجعفر النحاس مصری متوفی ۳۳۸ھ (و) ابوالعباس احمد بن عمار المھدوی متوفی ۴۳۰ھ (ان کی تفسیر کا نام ہے: التفصیل الجامع لعلوم التنزیل)

(۶) چھٹے دور میں ایسے مفسرین ہیں جنہوں نے اپنے اپنے زمانوں کے چیلنج کا مقابلہ کیا' کیونکہ اسلام کی نشر و اشاعت کئی براعظموں تک ہو چکی تھی اور مخالفین اسلام' قرآن کریم اور اسلام پر طرح طرح کے اعتراضات کر رہے تھے' یونان کے فلسفی' منطق اور فلسفہ سے اسلام پر اعتراض کر رہے تھے' یہود و نصاریٰ الگ اعتراضات کر رہے تھے' دہریوں نے بھی ایک طوفان اٹھا رکھا تھا' اور فقہی مکاتب فکر کے اختلاف کی وجہ سے آپس میں لے دے ہو رہی تھی' اس دور میں قرآن مجید کی تفسیر کے ساتھ ساتھ ایک اور رنگ بھی شامل ہو گیا اور اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:
(ا) بعض علماء نے صرف قرآن مجید کی فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے قرآن کریم کی تفسیر کی' ان میں مشہور علامہ جاراللہ زمخشری متوفی ۵۳۸ھ کی تفسیر ''کشاف'' ہے' یہ چونکہ معتزلی تھے اس لیے تفسیر میں اعتزال کا رنگ غالب ہے۔
(ب) بعض علماء نے صرف قرآن مجید کے الفاظ کے لغوی معنی بیان کئے' اس سلسلہ میں امام راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ کی ''المفردات'' بہت مشہور ہے' اور ابوزکریا یحییٰ بن زیاد فراء متوفی ۲۰۷ھ کی معانی القرآن ہے۔ یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔
(ج) بعض علماء نے خصوصیت کے ساتھ قرآن مجید کے صرفی اور نحوی مباحث کو موضوع بنایا' زجاج نے اس موضوع پر ''معانی القرآن'' کے نام سے تفسیر لکھی اور علامہ واحدی نیشاپوری متوفی ۴۶۸ھ نے ''البسیط'' کے نام سے تفسیر لکھی' اور علامہ ابوحیان محمد بن یوسف اندلسی متوفی ۷۵۴ھ نے ''البحر المحیط'' لکھی' یہ کتاب نو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ ''البحر المحیط'' نحو کے علاوہ دیگر علوم اور مباحث کی بھی جامع ہے اور بہت عمدہ تفسیر ہے۔

(د) بعض علماء نے صرف گزشتہ واقعات اور قصص کی طرف توجہ کی اور انہوں نے قرآن مجید کے بیان کردہ قصص کی تفسیر میں کتب تاریخ اور اسرائیلیات سے جو چاہا نقل کر دیا' انہوں نے اس سلسلہ میں تورات' انجیل اور اہل کتاب کے نزدیک دوسری معتبر کتابوں پر اقتصار نہیں کیا' بلکہ انہوں نے یہودی اور عیسائی علماء سے جو کچھ سنا اس کو صحیح اور ضعیف کی تحقیق کیے بغیر نقل کر دیا اور اس بات کو واضح نہیں کیا کہ کون سی بات شرع اور عقل کے مخالف یا موافق ہے' ان میں زیادہ مشہور ابواسحاق احمد بن محمد ثعلبی کی ''الکشف والبیان من تفسیر القرآن'' ہے اور علامہ علاؤ الدین بن محمد المعروف بالخازن متوفی ۷۲۵ھ کی ''لباب التاویل'' ہے۔

(ہ) بعض علماء نے صرف فقہی مسائل کے استنباط اور تحقیق کی طرف توجہ کی' ان میں علامہ ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ کی ''احکام القرآن'' اور علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ کی ''الجامع لاحکام القرآن'' ہے۔

علامہ ابوبکر رازی نے فقہ حنفی پر دلائل فراہم کیے ہیں' اور اختلاف مسائل میں زیادہ تر فقہ شافعی کا رد کیا ہے' اور علامہ قرطبی مذاہب اربعہ کا ذکر کرتے ہیں اور فقہ مالکی کے دلائل فراہم کرتے ہیں' فقہ کے علاوہ قرآن مجید کے دیگر اسرار اور نکات کا بھی بیان کرتے ہیں' علامہ ابوبکر رازی کی تفسیر تین جلدوں میں ہے اور انہوں نے صرف فقہی احکام سے متعلق آیات کی تفسیر کی ہے اور علامہ قرطبی کی تفسیر بیس جلدوں پر مشتمل ہے اور یہ بہت جامع تفسیر ہے' علامہ ابوالحسن ماوردی شافعی متوفی ۴۵۰ھ نے ''النکت والعیون'' کے نام سے چھ جلدوں میں تفسیر لکھی ہے اور اس میں فقہ شافعی پر دلائل فراہم کیے ہیں' اور علامہ احمد جیون حنفی متوفی ۱۱۳۰ھ نے بھی احکام سے متعلق آیات کی ایک جلد میں مختصر تفسیر لکھی ہے جو ''التفسیرات الاحمدیہ'' کے نام سے دستیاب ہے۔

(و) بعض علماء نے زیادہ تر عقائد کے مباحث سے بحث کی اور اپنے زمانہ کے گمراہ فرقوں کا رد کیا' ان میں امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ کی ''تفسیر کبیر'' مشہور ترین تفسیر ہے' اس میں معتزلہ' جبریہ' قدریہ اور رافضیہ کا بہت رد کیا گیا ہے اور آیات سے بہت نفیس اور عمدہ نکات کا استنباط کیا ہے' فقہی مسائل میں فقہ شافعی کو ترجیح دینے میں کافی مبالغہ کیا ہے' آیات کا شان نزول بیان کیا ہے اور احادیث کا بھی ذکر کیا ہے' امام رازی سے پہلے ایسی جامع تفسیر کسی نے نہیں لکھی تھی' ان کی وفات کو آٹھ سو سال گزر گئے اور اس کے بعد بہت تفسیریں لکھی گئیں لیکن امام رازی کی تفسیر کو کوئی تفسیر نہیں پہنچ سکی وہ واقعی تفسیر کبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ امام رازی کے درجات بلند کرے اور ان کو اپنے قرب خاص سے نوازے۔

(ز) بعض علماء نے فضائل' آداب' صوفیاء کی حکایات اور وعظ اور نصیحت پر زور دیا' ان میں علامہ اسماعیل حقی متوفی ۱۱۳۷ھ کی ''روح البیان'' بہت مشہور ہے۔

(ح) بعض علماء نے اپنی تفسیر میں ایسے حقائق کی طرف اشارہ کیا جو صرف ارباب سلوک پر منکشف ہوتے ہیں اور طریقت اور معرفت کے رموز بیان کیے ہیں' ان میں محی الدین بن عربی متوفی ۶۳۸ھ کی تفسیر ہے جو ''عرائس البیان'' کے نام سے مشہور ہے۔

(ط) متاخرین میں علامہ سید محمود آلوسی حنفی ۱۲۷۰ھ کی ''روح المعانی'' بہت عمدہ اور جامع تفسیر ہے' اس میں صرف' نحو' بلاغت' قراءات' شان نزول اور عقائد سے بحث کی ہے اور فقہی مسائل میں فقہ حنفی کو ترجیح دی ہے' علامہ نبہانی نے

''شواہد الحق'' میں لکھا ہے کہ ان کا پوتا نعمان آلوسی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور شیخ ابن تیمیہ کے افکار سے متاثر تھا اور اس نے ان کی تفسیر کے بعض مقامات میں تحریف کر دی ہے۔

سید محمد قطب شہید نے ''فی ظلال القرآن'' لکھی ہے اور اس میں مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات لکھے ہیں۔

علامہ طنطاوی جوہری نے ''الجواہر فی تفسیر القرآن'' لکھی ہے اور قرآن مجید کے مضامین کو سائنس کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے۔

(ی) اردو تفاسیر میں ہمارے شیخ حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ العزیز کی تفسیر ''التبیان'' نہایت جامع تفسیر ہے اس کا صرف ایک پارہ لکھا جا سکا' اگر آپ کو حیات مہلت دیتی اور آپ یہ تفسیر مکمل کر لیتے تو یہ تفسیر تمام اردو تفاسیر پر فائق ہوتی۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ''تفہیم القرآن'' چھ جلدوں پر محیط ہے' اس تفسیر میں بعض مقامات پر مقام نبوت کا ادب اور احترام نہیں کیا گیا اور ایک امتی کو اپنے نبی سے جو عقیدت اور محبت ہوتی ہے' اس کا مصنف اس سے محروم ہے' یہ وہابی عقائد کی ترجمان ہے۔

حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری کی ''ضیاء القرآن'' پانچ جلدوں پر مشتمل ہے' اس میں آیات اور مندرج احادیث کا ترجمہ بالعموم تحت اللفظ ہے' تفسیر میں زیادہ تر اختصار ہے' تفسیر کی عبارت اردو ادب کا بہترین شاہکار ہے' اس میں مسلک اعلیٰ حضرت کو ترجیح دی گئی ہے۔

حضرت مفتی احمد یار خاں نعیمی رحمہ اللہ کی ''تفسیر نعیمی'' بہت مبسوط تفسیر ہے۔ وہ گیارہویں پارے تک پہنچے تھے کہ انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ تفسیر امام احمد رضا رحمہ اللہ کے افکار کی ترجمان ہے۔

مفتی محمد شفیع کی ''معارف القرآن'' آٹھ جلدوں میں ہے' اس میں ترجمہ قرآن شیخ محمود الحسن کا ہے' اور خلاصہ تفسیر کے عنوان سے شیخ تھانوی کی مکمل ''بیان القرآن'' ہے' اور معارف و مسائل کے عنوان سے خود مفتی محمد شفیع نے تفسیر کی ہے' اس تفسیر کا ماخذ ''تفسیر قرطبی'' اور ''البحر المحیط'' ہے' اس تفسیر میں دیوبندی رنگ کو اجاگر کیا گیا ہے۔

شیخ امین احسن اصلاحی کی ''تدبر قرآن'' ہے' یہ نو جلدوں میں ہے' انہوں نے فہم القرآن کے لیے ادب جاہلیت کو بہت اہمیت دی ہے اور احمد فراہی کی فکر کے تابع ہیں۔ یہ اپنی تفسیر میں احادیث' آثار صحابہ' اقوال تابعین اور متقدمین کی تفسیروں کا بالکل ذکر نہیں کرتے' صرف اپنے ذاتی غور و فکر کا حاصل بیان کرتے ہیں' اقوال مجتہدین سے بحث کرتے ہیں نہ فقہی احکام سے۔

قرآن مجید کی تفسیر کے اصل ماخذ

قرآن مجید کی تفسیر کے چار اہم ماخذ ہیں' ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) کسی آیت کی جو تفسیر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو لیکن اس میں ضعیف اور موضوع روایات سے احتراز کرنا واجب ہے' اور ایسی روایات بہت زیادہ ہیں' اسی وجہ سے امام احمد نے کہا ہے کہ تین قسم کی کتابوں کی کوئی اصل نہیں ہے' مغازی' ملاحم (میدان ہائے جنگ) اور تفسیر۔

(۲) قرآن مجید کی تفسیر کا دوسرا ماخذ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیان کردہ تفسیر ہے' کیونکہ قرآن مجید کی تفسیر کے متعلق صحابہ کرام کے اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے بہ منزلہ ہیں اور تابعین کے اقوال کی طرف رجوع کرنے میں

حنابلہ کے دو قول ہیں' ابن عقیل نے منع کیا ہے' لیکن عام مفسرین کا عمل اس کے برعکس ہے انہوں نے تابعین کے اقوال کو اپنی تفسیروں میں درج کیا ہے' کیونکہ اکثر و بیشتر تابعین کے اقوال صحابہ سے سماع پر مبنی ہوتے ہیں۔

(۳) تیسرا ماخذ لغت ہے' کیونکہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے' امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جس شخص کو لغت عرب کا علم نہ ہو اور وہ قرآن مجید کی تفسیر کرے تو میں اس کو عبرتناک سزا دوں گا۔

(۴) چوتھا ماخذ قواعد شرعیہ کے لحاظ سے قرآن مجید کی آیات سے احکام کا استخراج اور معانی کا استنباط ہے' جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس کے لیے دعا کی اور کہا: اے اللہ! اس کو دین کی فہم عطا فرما اور اس کو تاویل کا علم عطا فرما اور حضرت علی نے جو فرمایا تھا' مگر اس میں قرآن مجید کی وہ فہم ہے جو ہر شخص کو دی جاتی ہے' اس سے بھی یہی مراد ہے اور بغیر کسی اصل اور قاعدہ کے محض رائے اور اجتہاد سے قرآن مجید کی تفسیر کرنا جائز نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ (بنی اسرائیل: ۳۶) اور جس چیز کا تم کو علم نہیں اس کے درپے نہ ہو۔

''اور شیطان تمہیں صرف برے کاموں اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسی باتیں کہنے کا حکم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے''۔ (البقرہ: ۱۶۹)

قرآن مجید کی تفسیر کے لیے ضروری علوم

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

قرآن مجید کی تفسیر میں علم لغت کی ضرورت ہے کیونکہ علم لغت کے ذریعہ مفردات قرآن کے وضعی معنی معلوم ہوتے ہیں' اور صرف اور نحو کے قواعد کا علم ضروری ہے کیونکہ اس سے قرآن مجید کی حرکات اور اعراب کا علم ہوتا ہے اور یہ پتا چلتا ہے کہ فلاں اعراب اور حرکت کے لحاظ سے قرآن مجید کا کیا معنی ہے' معانی' بیان اور بدیع (فصاحت و بلاغت) کے علم کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے ذریعہ مقتضی حال کے اعتبار سے معانی' حقیقت' مجاز اور کنایات کے مختلف پیرایوں کے اعتبار سے قرآن مجید کے معانی اور تحسین کلام کا علم ہوتا ہے' علم حدیث کی ضرورت ہے' اس سے اسباب نزول کا علم ہوتا ہے' علم اصول فقہ کی ضرورت ہے' اس سے قرآن مجید کے عام' خاص' مطلق' مقید اور امر اور نہی کی دلالت کا علم ہوتا ہے' علم کلام کی ضرورت ہے تاکہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کیا چیز جائز ہے اور کیا محال ہے اور نبی کی صفات اور اس کے مقام کا علم ہو' اور علم قراءت کی ضرورت ہے تاکہ بعض قراءات کے بعض پر راجح ہونے کی وجہ معلوم ہو سکے۔ (روح المعانی ج ۱ ص ۶' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

۞۞۞۞۞

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

(١)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الفاتحہ

آیاتہا ۷	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	(۱) سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ (۵) رکوعہا ۱

سورۃ الفاتحہ مکی ہے اللہ ہی کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے اس میں ایک رکوع اور سات آیات ہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ﴿۲﴾ مٰلِكِ

تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے O نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے O روز جزاء کا

يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ﴿۳﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ﴿۴﴾ اِهْدِنَا

مالک ہے O (اے پروردگار!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں O ہم کو

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ

سیدھے راستہ پر چلا O ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾ ع

نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا O

المنزل ۱ | ع ۱

سورہ فاتحہ کے اسماء

سورہ فاتحہ کے بہت اسماء ہیں اور کسی چیز کے زیادہ اسماء اس چیز کی زیادہ فضیلت اور شرف پر دلالت کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورہ فاتحہ بہت شرف اور مرتبہ والی سورت ہے ان اسماء کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) فاتحۃ الکتاب: فاتحۃ الکتاب کے ساتھ اس سورت کو اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ مصحف کا افتتاح اس سورت سے ہوتا ہے، تعلیم کی ابتداء بھی اس سورت سے ہوتی ہے اور نماز میں قراءت کا افتتاح بھی اس سورت سے ہوتا ہے اور ایک قول کے مطابق کتاب اللہ کی سب سے پہلے یہی سورت نازل ہوئی تھی اور بہ کثرت احادیث میں تصریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کو فاتحۃ الکتاب فرمایا۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے فاتحۃ الکتاب کو

نہیں پڑھا اس کی نماز (کامل) نہیں ہوئی۔ (جامع ترمذی ص ۴۳ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی)

اس حدیث کو امام ابن ماجہ[1] اور امام احمد[2] نے بھی روایت کیا ہے۔

(۲) ام القرآن: کسی چیز کی اصل اور اس کے مقصود کو ام کہتے ہیں اور پورے قرآن کا مقصود چار چیزوں کو ثابت کرنا ہے: الوہیت (اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات) معاد (مرکر دوبارہ اٹھنا) نبوت اور قضاء وقدر سورہ فاتحہ میں ''الحمد لله رب العالمین الرحمان الرحیم'' کی الوہیت پر دلالت ہے اور ''مالك یوم الدین'' کی معاد پر دلالت ہے ''ایاك نعبد و ایاك نستعین'' کی اس پر دلالت ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قضاء اور قدر سے ہے اور انسان مجبور محض ہے نہ اپنے افعال کا خالق ہے اور ''اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین'' کی نبوت پر دلالت ہے کیونکہ اس آیت میں اس راستہ کی ہدایت کی دعا کی گئی ہے جو انعام یافتہ لوگوں کا راستہ ہے اور انعام یافتہ لوگ انبیاء علیہم السلام ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کو ''ام القرآن'' فرمایا ہے امام دارمی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الحمدللہ ''ام القرآن'' ہے اور ''ام الکتاب'' ہے اور ''سبع مثانی'' ہے۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۳۲۱ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان)

اور امام مسلم نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ''لاصلوة لمن لم یقرء بام القرآن'' جو ام القرآن نہ پڑھے اس کی نماز کامل نہیں ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۶۹ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۷۵ھ)

(۳) سورۃ الحمد: اس سورت کا نام ''سورۃ الحمد'' بھی ہے کیونکہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی حمد ہے جیسے سورہ بقرہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سورت میں بقرہ کا ذکر ہے اسی طرح سورہ اعراف سورہ انفال اور سورہ توبہ کے اسماء ہیں نیز مذکور الصدر ''سنن دارمی'' کی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کو الحمدللہ سے تعبیر فرمایا ہے۔

(۴) السبع المثانی: قرآن مجید میں ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ. (الحجر: ۸۷) ہم نے آپ کو سات آیتیں دیں جو دہرائی جاتی ہیں۔

امام بخاری نے روایت کیا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الحمد لله رب العلمین'' السبع المثانی ہے اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۹ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

سنن دارمی کی مذکور الصدر حدیث میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کو السبع المثانی فرمایا۔ اس سورت کو السبع اس لیے فرمایا ہے کیونکہ اس میں سات آیتیں ہیں اور مثانی فرمانے کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(اول) اس سورت کے نصف میں اللہ تعالیٰ کی ثناء ہے اور نصف میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے (ثانی) ہر دو رکعت نماز میں اس کو دو مرتبہ پڑھا جاتا (ثالث) یہ سورت دوبار نازل کی گئی ہے (رابع) اس سورت کو پڑھنے کے بعد نماز میں دوسری سورت کو پڑھا جاتا ہے۔

(۵) ام الکتاب: سنن دارمی کی مذکور الصدر حدیث میں اس سورت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ام الکتاب'' فرمایا ہے اور

---

[1] امام ابوعبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ سنن ابن ماجہ ص ۶۰ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی

[2] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ مسند احمد ج ۲ ص ۴۲۸ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۳۹۸ھ

''صحیح بخاری'' میں ہے: حضرت ابوسعید خدری نے ایک شخص پر سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کیا جس کو بچھو نے کاٹا ہوا تھا اور کہا: میں نے صرف ام الکتاب پڑھ کر دم کیا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

(۶) الوافیہ: سفیان بن عیینہ نے اس کا نام سورہ وافیہ رکھا' کیونکہ صرف اس سورت کو نماز میں آدھا آدھا کر کے نہیں پڑھا جا سکتا' لیکن یہ توجیہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سورۂ الکوثر کو بھی ایک رکعت میں آدھا آدھا کر کے نہیں پڑھا جا سکتا لہٰذا یوں کہنا چاہیے کہ اس سورت کے مضامین جامع اور وافی ہیں اس لیے اس کو وافیہ کہا جاتا ہے۔

(۷) الکافیہ: اس سورت کو کافیہ اس لیے کہتے ہیں کہ دوسری سورتوں کے بدلہ میں اس سورت کو پڑھا جا سکتا ہے اور اس سورت کے بدلہ میں کسی سورت کو نہیں پڑھا جا سکتا۔ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ام القرآن'' دوسری سورتوں کا عوض ہے اور دوسری کوئی سورت اس کا عوض نہیں۔

(تفسیر کبیر ج ۱ ص ۹۰' الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۱۱۳)

(۸) الشفاء: امام دارمی روایت کرتے ہیں:

حضرت عبدالملک بن عمیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فاتحۃ الکتاب ہر بیماری کی شفاء ہے۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۳۲۰ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امراض جسمانی بھی ہیں اور روحانی بھی' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے متعلق فرمایا ہے: ''فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ'' (البقرہ: ۱۰) ان کے دلوں میں بیماری ہے' اور اس سورت میں اصول اور فروع کا ذکر ہے' جن کے تقاضوں پر عمل کرنے سے روحانی امراض میں شفاء حاصل ہوتی ہے اور اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی ثناء اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے جس سے جسمانی اور دیگر ہر قسم کی بیماریوں سے شفاء حاصل ہوتی ہے۔

(۹) سورۃ الصلوٰۃ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس سورت پر صلوٰۃ کا اطلاق کیا ہے' امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ نماز (سورہ فاتحہ) کو میرے اور میرے بندہ کے درمیان آدھا' آدھا تقسیم کیا گیا ہے اور میرے بندہ کے لیے وہ ہے جس کا وہ سوال کرے' پس جب بندہ کہتا ہے: ''الحمد للہ رب العلمین'' تو میں کہتا ہوں: بندہ نے میری حمد کی۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۰-۱۶۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

(۱۰) سورۃ الدعاء: یہ سورت اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے شروع ہوتی ہے' پھر بندہ کی عبادت کا ذکر ہے' پھر اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم پر ثابت قدم رہنے کی دعا ہے اور دعا اور سوال کا یہی اسلوب ہے کہ پہلے داتا کی حمد و ثناء کی جائے' پھر دست طلب بڑھایا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی ہے' پھر اپنے لیے دعا کی ہے:

الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۙ﴿﴾ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۙ﴿﴾ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۙ﴿﴾ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۙ﴿﴾ وَالَّذِيْٓ أَطْمَعُ أَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ؕ﴿﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّأَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۙ﴿﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۙ﴿﴾ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۙ﴿﴾ (الشعراء: ۸۵-۷۸)

وہ جس نے مجھے پیدا کیا تو وہی مجھے ہدایت دیتا ہے O اور وہی مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے O اور جب میں بیمار پڑوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے O اور وہی مجھے وفات دے گا اور پھر زندہ فرمائے گا O اور اسی سے مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن وہی میری (ظاہری یا اجتہادی) خطائیں معاف فرمائے گا O اے میرے رب! مجھے حکم عطا فرما اور مجھے نیکوں کے ساتھ لاحق کر

دے O اور میرے بعد آنے والی نسلوں میں میرا ذکر خیر جاری رکھ O اور مجھے جنۃ النعیم کے وارثوں میں شامل کر دے O

حضرت یوسف علیہ السلام نے دعا کی:

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ O (یوسف: ۱۰۱)

اے آسمانوں اور زمینوں کو ابتداءً پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے میری وفات اسلام پر کر اور مجھے نیکوں کے ساتھ لاحق کر دے O

سو دعا کا یہی طریقہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی جائے' پھر اس سے سوال کیا جائے' اور سورہ فاتحہ میں اسی طریقہ سے دعا کرنے کی تعلیم دی ہے' اس لیے اس کو سورہ دعا کہتے ہیں۔

علامہ بقاعی نے ان اسماء کے علاوہ سورۂ فاتحہ کے اسماء میں اساس' کنز' واقیہ' رقیہ اور شکر کا بھی ذکر کیا ہے۔

علامہ بقاعی نے ان اسماء میں نظم اور ربط کو بیان کیا ہے' وہ لکھتے ہیں:

(۱) فاتحہ کے اعتبار سے ہر نیک چیز کا افتتاح اس سورت سے ہونا چاہیے (۲) اور ام کے لحاظ سے یہ ہر خیر کی اصل ہے (۳) اور ہر نیکی کی اساس ہے (۴) اور ثنی کے لحاظ سے دوبار پڑھے بغیر یہ لائق شمار نہیں (۵) اور کنز کی حیثیت سے یہ ہر چیز کا خزانہ ہے (۶) ہر بیماری کے لیے شفا ہے (۷) ہر ہم کے لیے کافی ہے (۸) ہر مقصود کے لیے وافی ہے (۹) واقیہ کے لحاظ سے ہر برائی سے بچانے والی ہے (۱۰) رقیہ کے اعتبار سے (۱۱) ہر آفت ناگہانی کے لیے دم ہے (۱۲) اس میں حمد کا اثبات ہے جو صفات کمال کا احاطہ ہے (۱۳) اور شکر کا بیان ہے جو منعم کی تعظیم ہے (۱۴) اور یہ بعینہ دعا ہے' جو مطلوب کی طرف توجہ ہے' ان تمام امور کی جامع صلوٰۃ ہے۔ (نظم الدرر ج ۱ ص ۲۰۔۱۹' مطبوعہ دار الکتاب الاسلامی' قاہرہ' ۱۴۱۳ھ)

علامہ آلوسی نے سورہ فاتحہ کے بائیس اسماء کا ذکر کیا ہے' ان میں فاتحۃ القرآن' تعلیم المسئلۃ' سورۃ السوال' سورۃ المناجاۃ' سورۃ التفویض' شافیہ' اور سورۃ النور بھی ہیں۔

سورہ فاتحہ کے فضائل

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو سعید بن معلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نماز پڑھ رہا تھا' (دوران نماز) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا' میں حاضر نہ ہوا' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں اس وقت نماز پڑھ رہا تھا' آپ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: "اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ ۔ (الانفال: ۲۴) اللہ اور رسول کے بلانے پر (فوراً) حاضر ہو جاؤ"۔ پھر فرمایا: سنو! میں تم کو مسجد سے باہر نکلنے سے پہلے قرآن کی سب سے عظیم سورت کی تعلیم دوں گا' پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا' جب ہم نے باہر نکلنے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے فرمایا تھا: میں تم کو قرآن کی سب سے عظیم سورت کی تعلیم دوں گا' آپ نے فرمایا: "الحمد للّٰہ رب العلمین" یہ سبع مثانی ہے اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۴۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی سب سے عظیم سورت' سورت فاتحہ ہے' اور اس کا نام "السبع المثانی" بھی ہے' اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر نماز کے دوران بلائیں' تب بھی آنا واجب ہے' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے نماز نہیں ٹوٹتی۔

نیز امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں تھے ہم نے ایک جگہ قیام کیا' ایک لڑکی نے آ کر کہا کہ قبیلہ کے سردار کو ایک بچھو نے ڈس لیا ہے اور ہمارے لوگ حاضر نہیں ہیں' کیا تم میں سے کوئی شخص دم کر سکتا ہے؟ ہم میں سے ایک شخص ان کے ساتھ گیا جس کو اس سے پہلے ہم دم کرنے کی تہمت نہیں لگاتے تھے اس نے اس شخص پر دم کیا جس سے وہ تندرست ہو گیا' اور اس سردار نے اس کو تیس بکریاں دینے کا حکم دیا' اور ہم کو دودھ پلایا' جب وہ واپس آیا تو ہم نے اس سے پوچھا: کیا تم پہلے دم کرتے تھے؟ اس نے کہا: نہیں' میں نے تو صرف ام الکتاب (سورہ فاتحہ) پڑھ کر دم کیا ہے' ہم نے کہا: اب اس کے متعلق کوئی بحث نہ کرو' حتیٰ کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کے متعلق پوچھ لیں' ہم مدینہ پہنچے تو ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو کیا معلوم کہ یہ دم ہے' (ان بکریوں کو) تقسیم کرو اور ان میں سے میرا حصہ بھی نکالو۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۵۰، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورہ فاتحہ پڑھ کر بیمار شخص پر دم کرنا جائز ہے' اس لیے سورت کو ''سورۃ الرقیہ'' اور ''سورۃ الشفاء'' بھی کہتے ہیں' اور اس حدیث میں یہ تصریح بھی ہے کہ اس سورت کو ''ام الکتاب'' بھی کہتے ہیں' اور یہ کہ قرآن پڑھ کر دم کرنے کی اجرت لینا جائز ہے اور اس قرآن مجید اور کتب دینیہ پر اجرت لینے کا بھی جواز ہے' اور اس میں مصحف کو قیمۃً فروخت کرنے اور مصحف کی کتابت پر اجرت لینے کا بھی جواز ہے اور یہ کہ استاذ کی تعلیم سے تلمیذ کو جو آمدنی ہو اس میں استاذ کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اب کسی بیمار کو سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کیا جائے اور وہ شفاء نہ پائے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دم کرنے والے میں روحانیت کی کمی ہے' سورہ فاتحہ کے شفاء ہونے میں کوئی کمی نہیں ہے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابی! اور وہ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے' حضرت ابی نے مڑ کر دیکھا اور حاضر نہیں ہوئے' حضرت ابی نے جلدی جلدی نماز پڑھی' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''السلام علیك یا رسول اللّٰہ!'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وعلیك'' اے ابی! جب میں نے تم کو بلایا تھا تو تم کو آنے سے کس چیز نے روکا تھا؟ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! میں نماز میں تھا' آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو میری طرف وحی فرمائی ہے کیا تمہیں اس میں یہ حکم نہیں ملا'' اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ (الانفال: ۲۴) جب اللہ اور رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمہیں زندہ کر دے گی تو (فوراً) حاضر ہو جاؤ۔'' حضرت ابی نے کہا: کیوں نہیں؟ اور میں ان شاء اللہ دوبارہ ایسا نہیں کروں گا' آپ نے فرمایا: کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ میں تم کو ایسی سورت کی تعلیم دوں' جس کی مثل تورات میں نازل ہوئی نہ انجیل میں' نہ زبور میں نہ قرآن میں؟ میں نے کہا: جی! یا رسول اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نماز میں کس طرح پڑھتے ہو؟ تو انہوں نے ام القرآن (سورہ فاتحہ) پڑھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! اس کی مثل تورات میں نازل ہوئی ہے نہ انجیل میں' نہ زبور میں نہ فرقان میں' یہ ''السبع من المثانی'' (دو دو بار پڑھی جانے والی سات آیتیں) ہے اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے' یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (جامع ترمذی ص ۴۰۸، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام بغوی نے بھی اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے' نیز وہ اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''السبع من المثانی '' میں ''من '' زائدہ ہے'اس سے مراد سورہ فاتحہ ہے جس کی سات آیتیں ہیں'اور اس کو مثانی اس لیے کہتے ہیں کہ ہر نماز میں سورہ فاتحہ کو دوبار پڑھا جاتا ہے۔ایک قول یہ ہے کہ مثانی استثناء سے ماخوذ ہے' کیونکہ اس سورت کے ساتھ یہ امت مستثنیٰ ہے۔اس امت سے پہلی امتوں پر یہ سورت نازل نہیں کی گئی۔ایک قول یہ ہے کہ یہ ثنا سے ماخوذ ہے' کیونکہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے'اور ایک قول یہ ہے کہ مثانی سے مراد قرآن مجید ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ ۚ اللہ نے بہترین کلام نازل فرمایا' ایسی کتاب جس کی آیتیں آپس میں متشابہ ہیں بار بار دہرائی ہوئی ہیں۔ (الزمر: ۲۳)

تمام قرآن کو مثانی اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں قصص اور امثال کو دہرایا گیا ہے'اس تقدیر پر ''السبع من المثانی '' کا معنی ہے: قرآن کی سات آیتیں اور ایک قول یہ ہے کہ مثانی سے مراد قرآن مجید کی وہ سورتیں ہیں جن میں سو سے کم آیتیں ہوں۔

اور اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے نماز باطل نہیں ہوتی' کیونکہ تم ''السلام علیك ایها النبی '' کہہ کر نماز میں حضور سے خطاب کرتے ہو'جب کہ کسی اور کے ساتھ نماز میں خطاب کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔(شرح السنۃ ج ۳ ص ۱۵۔۱۴)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے اور میرے بندے کے درمیان صلوٰۃ (سورۃ فاتحہ) کو آدھا آدھا تقسیم کر دیا گیا ہے'اور میرے بندہ کے لیے وہ چیز ہے جس کا وہ سوال کرے'اور جب بندہ کہتا ہے: ''الحمد للّٰہ رب العلمین ''تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندہ نے میری حمد کی'اور جب وہ کہتا ہے: ''الرحمٰن الرحیم ''تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندہ نے میری ثناء کی'اور جب وہ کہتا ہے: ''مالك یوم الدین ''تو اللہ فرماتا ہے: میرے بندہ نے میری تعظیم کی'اور ایک بار فرمایا: میرے بندہ نے (خود) کو میرے سپرد کر دیا'اور جب وہ کہتا ہے: ''ایاك نعبد وایاك نستعین ''تو اللہ فرماتا ہے: یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے'اور میرے بندہ کے لیے وہ ہے جس کا وہ سوال کرے'اور جب وہ کہتا ہے: ''اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین ''تو اللہ فرماتا ہے: یہ میرے بندہ کے لیے ہے'اور میرے بندہ کے لیے وہ چیز ہے جس کا وہ سوال کرے۔(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۰۔۱۶۹'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی'۱۳۷۵ھ)

اس حدیث میں سورہ فاتحہ کا ذکر ہے'اور اس کے شروع میں ''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم '' کا ذکر نہیں ہے'اس سے علماء احناف اور مالکیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ ''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ''سورہ فاتحہ کا جز نہیں ہے'اور یہ ان کی بہت قوی دلیل ہے'فقہاء شافعیہ نے اس کے جواب میں جو تاویلات کی ہیں وہ بہت ضعیف ہیں'ہم نے ''شرح صحیح مسلم'' جلد اول میں ان کا ذکر کر کے ان کا رد کیا ہے۔

امام نسائی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جس وقت جبرئیل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے اوپر کی جانب سے ایک چرچراہٹ کی آواز سنی' حضرت جبرائیل نے کہا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج کھولا گیا ہے اور آج سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا۔اس دروازہ سے ایک فرشتہ نازل ہوا' حضرت جبرائیل نے کہا: یہ فرشتہ جو زمین

کی طرف نازل ہوا ہے یہ آج سے پہلے کبھی نازل نہیں ہوا تھا' اس فرشتہ نے آ کر سلام کیا اور کہا: آپ کو دو نوروں کی بشارت ہو جو آپ کو دیئے گئے ہیں اور آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے (ایک نور) فاتحۃ الکتاب ہے اور (دوسرا) سورہ بقرہ کی آخری آیتیں ہیں' ان میں سے جس حرف کو بھی آپ پڑھیں گے وہ آپ کو دے دیا جائے گا۔

(سنن نسائی ج ۵ ص ۱۳-۱۲' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام دارمی روایت کرتے ہیں:

عبد الملک بن عمیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فاتحۃ الکتاب سے ہر بیماری کی شفاء ہے۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۳۲۰' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

حافظ نور الدین الہیثمی بیان کرتے ہیں:

حضرت ابوزید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کے کسی راستہ میں جا رہا تھا' آپ نے ایک شخص کی آواز سنی جو تہجد کی نماز میں ام القرآن (سورہ فاتحہ) پڑھ رہا تھا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر اس سورت کو سنتے رہے حتیٰ کہ اس نے وہ سورت ختم کر لی' آپ نے فرمایا: قرآن میں اس کی مثل (اور کوئی سورت) نہیں ہے' امام طبرانی نے اس حدیث کو ''معجم اوسط'' میں روایت کیا ہے' اس کی سند میں ایک راوی حسن بن دینار ضعیف ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۶ ص ۳۱۰' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جس دن فاتحۃ الکتاب (سورہ فاتحہ) نازل ہوئی' اس دن ابلیس بہت رویا تھا اور یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی تھی۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے ''معجم اوسط'' میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۶ ص ۳۱۱' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

سورہ فاتحہ کا مقام نزول

سورہ فاتحہ کے نزول کے متعلق متعدد روایات ہیں' بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے' اس لیے محققین کا یہ موقف ہے کہ یہ سورت دو بار نازل ہوئی ہے' ایک بار مکہ میں اور ایک بار مدینہ میں۔ علامہ سیوطی نے ان تمام روایات کو جمع کر دیا ہے۔

علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

واحدی نے ''اسباب النزول'' میں اور ثعلبی نے اپنی تفسیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سورہ فاتحہ مکہ میں ایک خزانہ سے نازل ہوئی ہے جو عرش کے نیچے ہے۔

امام ابن ابی شیبہ نے ''مصنف'' میں اور ابونعیم اور بیہقی دونوں نے اپنی اپنی ''دلائل النبوۃ'' اور واحدی اور ثعلبی نے از ابی میسرہ از عمرو بن شرحبیل روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: جب میں خلوت میں ہوتا ہوں تو میں ایک آواز سنتا ہوں' بہ خدا! مجھے یہ خدشہ ہے کہ یہ کوئی عجیب و غریب چیز ہے' حضرت خدیجہ نے کہا: معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ایسا نہیں کرے گا' بہ خدا! آپ امانت کو ادا کرتے ہیں' صلہ رحمی کرتے ہیں اور سچ بولتے ہیں' اسی اثناء میں حضرت ابوبکر آئے' اس وقت گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں تھے' حضرت خدیجہ نے ان کو بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا' اور کہا: آپ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ورقہ کے پاس جائیں' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو حضرت ابوبکر نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ ورقہ کے پاس چلیں' آپ نے پوچھا: تم کو کس نے بتایا؟ انہوں نے

کہا: حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے' پھر دونوں ورقہ کے پاس گئے' اور اس کو واقعہ سنایا' آپ نے فرمایا: جب میں خلوت میں ہوتا ہوں تو مجھے اپنے پیچھے سے آواز آتی ہے: یا محمد! یا محمد! تو میں بھاگنے لگتا ہوں' ورقہ نے کہا: آپ ایسا نہ کریں' جب آپ کے پاس یہ آواز آئے تو آپ ٹھہرے رہیں اور سنیں کہ وہ کیا کہتا ہے' پھر مجھے آکر بتائیں' پھر جب آپ خلوت میں تھے تو آپ کو آواز آئی: یا محمد! کہیے: ''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم' الحمد للّٰہ رب العلمین'' اور اس کو' ولا الضالین'' تک پڑھا' اور کہا: کہیے: ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' پھر آپ ورقہ کے پاس گئے اور اس کو یہ واقعہ سنایا' ورقہ نے کہا: آپ کو بشارت ہو' میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وہی ہیں جس کے آنے کی ابن مریم کو بشارت دی گئی تھی اور آپ کے پاس حضرت موسیٰ کے ناموس کی مثل ہے' اور آپ نبی مرسل ہیں۔

امام ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جب بنو سلمہ کے جوان مسلمان ہوئے اور عمرو بن جموح کا بیٹا مسلمان ہوا تو عمرو کی بیوی نے عمرو سے کہا: تم اپنے بیٹے سے پوچھو وہ اس شخص سے کیا روایت کرتے ہیں؟ عمرو نے اپنے بیٹے سے کہا: مجھے اس شخص کا کلام سناؤ تو اس کے بیٹے نے پڑھا: ''الحمد للّٰہ رب العلمین'' اور'' الصراط المستقیم'' تک پڑھا' اس نے کہا: یہ کتنا حسین اور جمیل کلام ہے' کیا اس کا سارا کلام اسی طرح ہے؟ اس کے بیٹے نے کہا: اے ابا! اس سے بھی زیادہ حسین ہے' اور یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے' ان تینوں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔

امام ابن ابی شیبہ نے'' مصنف'' میں' ابوسعید بن اعرابی نے'' معجم'' میں اور طبرانی نے'' اوسط'' میں مجاہد کی سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب فاتحۃ الکتاب نازل ہوئی تو ابلیس خوب رویا اور یہ مدینہ میں نازل ہوئی تھی۔

وکیع اور فریابی نے اپنی تفسیروں میں' ابوبکر بن انباری نے'' فضائل قرآن'' میں' امام ابن ابی شیبہ نے'' مصنف'' میں' عبد بن حمید اور ابن منذر نے اپنی تفسیر میں ابوبکر بن انباری نے'' کتاب المصاحف'' میں' ابوالشیخ نے'' العظمۃ'' میں اور ابونعیم نے'' حلیہ'' میں مجاہد سے روایت کیا ہے کہ فاتحۃ الکتاب مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

وکیع نے اپنی تفسیر میں مجاہد سے روایت کیا ہے کہ فاتحۃ الکتاب مدینہ نازل ہوئی ہے۔

(الدرالمنثور ج ۱ ص ۳' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

ان تینوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ فاتحہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے۔

سورۃ فاتحہ کی آیات کی تعداد

ہم اس سے پہلے مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں کہ سب سے پہلے سورہ علق اور سورہ مدثر کی چند آیات نازل ہوئیں' اور جو سب سے پہلے مکمل سورت نازل ہوئی وہ سورہ فاتحہ ہے' یہ سورت دو بار نازل ہوئی' ایک بار مکہ میں اور ایک بار مدینہ میں اور اس میں بالاتفاق سات آیتیں ہیں' اس لیے اس کو'' السبع المثانی'' کہا جاتا ہے' فقہاء شافعیہ اور فقہاء حنبلیہ کے نزدیک'' بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم'' سورہ فاتحہ کا جز ہے اور اس سمیت سورہ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں اور علماء احناف اور علماء مالکیہ کے نزدیک'' بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم'' سورہ فاتحہ کا جز نہیں ہے[۱] ان کے نزدیک'' صراط الذین انعمت علیھم'' ایک آیت ہے اور اول الذکر کے نزدیک'' صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین'' مل کر ایک آیت ہے۔'' بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم'' سورہ فاتحہ کا جز ہے یا نہیں اس پر مفصل گفتگو عنقریب آئے گی۔

۱۔ علامہ موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامہ حنبلی متوفی ۶۲۰ ھ' المغنی ج ۱ ص ۲۸۴' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۰۵ ھ

سورۂ فاتحہ کے مضامین

قرآن مجید کے حسب ذیل مضامین ہیں:

(۱) توحید: نزول قرآن کے وقت دنیا میں بالعموم بت پرستی کا دور دورہ تھا' اور کفار عرب توحید کے دعوی دار ہونے کے باوجود اپنے زعم میں اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے بتوں کی عبادت کرتے تھے' اس لیے قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ صرف خالق اور رب ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کو واحد ماننا کافی نہیں ہے بلکہ استحقاق عبادت کے اعتبار سے بھی اس کو واحد ماننا ضروری ہے' یعنی اس کے سوا اور کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔

(۲) نبوت: عام انسان کی عقل اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کو جاننے کے لیے ناکافی ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام حاصل کرنے سے عاجز ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہ نمائی کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور نبی چونکہ اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے' اس کو ماننا اللہ کو ماننا اور اس کا انکار کرنا اللہ کا انکار کرنا ہوتا ہے' اس لیے قرآن نے نبی کے ماننے کو ضروری قرار دیا ہے۔

(۳) عبادت: بدن' مال اور ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق صرف کرنا عبادت ہے' قرآن نے یہ بتایا ہے کہ انسان خود اور اس کا مال اس کی ملکیت نہیں ہے' اللہ کی ملکیت ہے' اب وہ کس طرح اپنی جان اور مال کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق صرف کرے' یہ قرآن نے تفصیل سے بتایا ہے۔

(۴) وعد اور وعید: اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بندہ پر انعام فرمائے گا جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے اور بندہ کی نافرمانی کرنے سے اللہ تعالیٰ نے اس کو عذاب سے ڈرایا ہے' اس وعد اور وعید کو اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے۔

(۵) قصص اور امثال: گزشتہ امتوں کے صالحین کے واقعات اور نافرمانوں پر عذاب کی عبرت انگیز مثالیں۔

(۶) معاد: مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے اور مومنین کے لیے جزاء اور کفار کے لیے سزا کا بیان۔

(۷) دعا: تمام عبادات کا خلاصہ اور حاصل اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں انسان کو ہدایت عطا فرمائے اور اس پر تاحیات برقرار رکھے اور آخرت میں عذاب سے نجات' جنت نعیم' اپنی خوشنودی' رضا اور دیدار عطا فرمائے۔ سورہ فاتحہ میں ان تمام مضامین کو اجمال' اختصار اور اشارات سے بیان کر دیا گیا ہے۔

(۱) سورہ فاتحہ کے شروع میں فرمایا: "الحمد للہ رب العلمین. تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے" یعنی حمد کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے' کیونکہ وہی تمام جہانوں کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی اپنی پرورش سے ان کو باقی رکھے ہوئے ہے' آسمان' زمین' پہاڑ' سمندر' جمادات' نباتات' حیوانات' انسان اور جن یہ سب اپنے وجود میں کسی موجد کے اور اپنی بقا میں کسی رب کے محتاج ہیں' اور یہ سب ممکنات ہیں' اس لیے ان کو پیدا کرنے والا اور ان کو باقی رکھنے والا ممکن نہیں ہو سکتا کیونکہ ممکن تو پھر انہی کی طرح اپنے وجود اور بقاء میں محتاج ہوگا' اس لیے ضروری ہے کہ ان کا موجد اور ان کا رب واجب بالذات ہو' اور واجب بالذات صرف اللہ تعالیٰ ہے' وہی تمام جہانوں کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ان کی پرورش کرنے والا ہے' اس کائنات رنگ و بو میں جو حسن اور کمال ہے وہ اسی کا دیا ہوا ہے' اور حمد حسن اور کمال پر ہوتی ہے تو تمام محامد کا وہی مستحق ہے اور تمام تعریفیں اسی کے لائق ہیں' اس آیت میں جہاں یہ بتایا ہے کہ تعریف کا مستحق صاحب کمال نہیں ہے خالق کمال ہے' وہاں یہ بھی بتا دیا ہے کہ تمام کائنات کا خالق اور مربی اللہ تعالیٰ ہے اور یہ

قرآن کا وہ پہلا مضمون ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

(۲) سورہ فاتحہ کی چھٹی آیت میں ہے: ''صراط الذین انعمت علیھم. ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا'' اور جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ان کا بیان اس آیت میں ہے:

اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ‌ۚ . (النساء:۶۹) — جن پر اللہ نے انعام کیا وہ انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین ہیں۔

نیز فرمایا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنۡ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ‌ۚ . (مریم:۵۸) — جن پر اللہ نے انعام کیا وہ نسل آدم سے انبیاء ہیں۔

قرآن مجید کا دوسرا اہم مضمون نبوت ہے اور اس کی طرف اشارہ ''صراط الذین انعمت علیھم '' میں ہے۔

(۳) قرآن مجید کا تیسرا اہم مضمون عبادت ہے' اور اس کا ذکر ''ایاك نعبد. ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں'' میں ہے۔

(۴) وعد اور وعید کی طرف اشارہ ''مالك یوم الدین ''میں ہے۔

(۵) گزشتہ امتوں کے واقعات اور مثالیں' نیکوں پر انعام اور بدکاروں پر غضب اور عذاب' اس کی طرف اشارہ چھٹی اور ساتویں آیت ''صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ''میں ہے۔

(۶) مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے اور مومنین کے لیے جزاء اور کفار کے لیے سزا کی طرف اشارہ بھی ''مالك یوم الدین ''میں ہے۔

(۷) قرآن مجید کا بہت اہم مضمون اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ہے' اور اس سورت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کس طرح دعا کی جائے' اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے' جس کا ذکر ''الحمد للّٰہ رب العلمین الرحمٰن الرحیم ''میں ہے۔ پھر خضوع اور خشوع کا اظہار کیا جائے جس کا ذکر ''ایاك نعبد و ایاك نستعین ''میں ہے' پھر اپنے عجز اور احتیاج کو بیان کیا جائے جس کا بیان ''ایاك نعبد و ایاك نستعین ''میں ہے' پھر حرف مدعا زبان پر لایا جائے اور اس سے مانگا جائے' نیز یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ سے کیا مانگا جائے اور کیا نہ مانگا جائے تو بتلایا اس سے صراط مستقیم پر برقرار رہنے کی ہدایت مانگو وہ راستہ جو اللہ تعالیٰ کے انعام یافتگان کا راستہ ہے نہ ان کا راستہ جن پر اللہ تعالیٰ نے غضب فرمایا اور نہ گمراہوں کا' پھر جیسے ہی ہدایت کی دعا ختم ہوتی ہے تو اس کے جواب میں فوراً ہدایت آجاتی ہے ''المٓO ذالك الکتاب لا ریب فیه هدی للمتقین ''یعنی تم نے ہم سے ہدایت مانگی تھی تو یہ پوری کتاب تمہارے لیے ہدایت ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ سے دعا کرو گے تو اس دعا کی استجابت یقینی ہے۔

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ

میں شیطان مردود (کے وسوسوں) سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں

اعوذ باللہ کے مفردات کے معانی

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ (النحل: ۹۸)

پس جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کریں○

استعاذہ کا معنی ہے: کسی ناپسندیدہ چیز سے بچنے کے لیے کسی چیز کی پناہ میں آنا' شیطان کا لفظ ''شطن'' سے ماخوذ ہے' اس کا معنی ہے خیر سے دور ہونا' شیطان کو شیطان اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی رحمت سے دور ہو گیا' ایک قول یہ ہے کہ شیطان ''شیط'' سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے: ہلاک ہونا' اس بناء پر شیطان کو شیطان اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب میں ہلاک ہو گیا' رجیم کا لفظ ''رجم'' سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے سنگسار کرنا' قتل کرنا' لعنت کرنا اور دھتکارنا' چونکہ اللہ تعالیٰ نے شیطان پر لعنت کی ہے' اس کو دھتکار کر راندہ بارگاہ کر دیا ہے اس وجہ سے اس کو رجیم کہتے ہیں۔

اعوذ باللہ کے صرف اور اعراب کا بیان

شیطان صفت مشبہ کا صیغہ ہے' اگر یہ ''شیط'' سے بنا ہے تو اس کا وزن فعلان ہے اور اگر یہ ''شطن'' سے بنا ہے تو اس کا وزن فیعال ہے' رجیم فعیل کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور مفعول کے معنی میں ہے' اس کا معنی ہے: راندہ ہوا' دھتکارا ہوا۔

''من'' ابتداء کے لیے ہے اور جار مجرور ''اعوذ'' کے متعلق ہے' اس کا معنی ہے: میں شیطان رجیم سے پناہ مانگنے کی ابتداء اللہ سے کرتا ہوں' اور یہ من سببیہ بھی ہو سکتا ہے' اور اس کا معنی ہوگا: شیطان رجیم کے سبب سے میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔

نماز اور غیر نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق احادیث

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو نماز میں قیام کرتے تو اللہ اکبر کہتے' پھر پڑھتے:

''سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالى جدك ولا اله غيرك'' پھر تین مرتبہ ''لا اله الا الله'' پڑھتے' پھر تین مرتبہ پڑھتے: ''الله اكبر كبيرا اعوذ بالله السميع العليم من الشيطن الرجيم من همزه و نفخه و نفثه'' (میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں جو بہت سننے والا' بہت جاننے والا ہے' شیطان رجیم کے مجنون کرنے' اس کے تکبر اور اس کے شر سے) اس کے بعد آپ قراءت کرتے۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۱۱۳' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث کو امام عبدالرزاق[1] اور امام بیہقی[2] نے بھی روایت کیا ہے۔

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں:

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے تو فرماتے: ''اللهم انی اعوذ بك من الشيطان الرجيم من همزه و نفخه و نفثه''۔ (المصنف ج ۱ ص ۲۳۸' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ)

امام عبدالرزاق روایت کرتے ہیں:

عطاء نے کہا: اعوذ باللہ پڑھنا ہر قراءت میں واجب ہے خواہ وہ قراءت نماز میں ہو یا غیر نماز میں' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: پس جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کریں۔ (النحل: ۹۸) ابن جریج نے کہا: ہاں! میں

---

[1] امام عبدالرزاق بن ہمام متوفی ۲۱۱ھ' المصنف ج ۱ ص ۱۸۳' مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۰ھ

[2] امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' سنن کبریٰ ج ۱ ص ۳۶-۳۵' مطبوعہ نشر السنہ' ملتان

پڑھتا ہوں" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اعوذ باللہ السمیع العلیم الرحمٰن الرحیم' من الشیطان الرجیم واعوذ بك رب ان یحضرون اوید خلوا بیتی الذی یووینی" عطاء نے کہا: یہ پڑھنا بھی تمہیں کفایت کرے گا' لیکن تم" اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" سے زیادہ نہ پڑھا کرو۔ (المصنف ج ۱ ص ۸۴ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۰ ھ)

عثمان بن ابی العاص بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے اور میری تلاوت قرآن کے درمیان شیطان حائل ہوجاتا ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس شیطان کا نام خنزب ہے' تم جب اس کو محسوس کرو تو" اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" پڑھو اور بائیں جانب تین بار تھوکو۔ (المصنف ج ۱ ص ۸۵ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۰ ھ)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید پڑھنے سے پہلے" اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" پڑھتے تھے۔ (المصنف ج ۱ ص ۸۶ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۰ ھ)

ابراہیم نے کہا: ہر چیز سے پہلے" اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" پڑھنا کافی ہے۔

(المصنف ج ۱ ص ۸۵ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۰ ھ)

نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء مالکیہ کا مذہب

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

امام مالک فرض نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے قائل نہیں ہیں' اور تراویح میں پڑھنے کے قائل ہیں۔

(الجامع الاحکام القرآن ج ۱ ص ۸۶ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ ھ)

علامہ دردیر مالکی لکھتے ہیں:

نفل نماز میں سورہ فاتحہ سے پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھنا (بلاکراہت) جائز ہے اور فرض نماز میں مکروہ ہے۔

(الشرح الکبیر علی ھامش الدسوقی ج ۱ ص ۲۵۱ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء حنبلیہ کا مذہب

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

نماز میں قراءت سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت ہے' حسن' ابن سیرین' عطا' ثوری' اوزاعی' شافعی اور اصحاب رائے کا بھی نظریہ ہے' امام مالک نے کہا: نماز میں قراءت سے پہلے اعوذ باللہ نہ پڑھے کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نماز کو" الحمدللہ رب العلمین" سے شروع کرتے تھے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(المغنی ج ۱ ص ۲۰۶-۳۰۲ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۰۵ ھ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کا محمل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اعوذ باللہ اور بسم اللہ کو جہراً نہیں پڑھتے تھے' سراً پڑھتے تھے اور جہراً قراءت" الحمد للّٰہ رب العلمین" سے شروع کرتے تھے تاکہ اس روایت کا ان احادیث سے تعارض نہ ہو جس میں قراءت قرآن سے پہلے" اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" پڑھنے کی تصریح ہے۔

نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء شافعیہ کا مذہب

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

دعاء استفتاح (سبحانك اللھم) کے بعد" اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم" پڑھنا مستحب ہے' ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے کہ" اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم" پڑھے اور ہر اس لفظ کا پڑھنا جائز ہے' جس سے

یہ معنی حاصل ہو اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ نماز سری ہو یا جہری اس کو سراً پڑھے' ایک قول یہ ہے کہ جہری نماز میں جہراً پڑھے' ایک قول یہ ہے کہ پڑھنے والے کو اختیار ہے' ایک قول یہ ہے کہ مستحب یہ ہے کہ قطعاً آہستہ پڑھے' نیز مذہب یہ ہے کہ ہر رکعت میں اعوذ باللہ پڑھے اور پہلی رکعت میں پڑھنا زیادہ موکد ہے' امام شافعی نے اس کی تصریح کی ہے۔

(روضۃ الطالبین ج ا ص ۳۴۶ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء احناف کا مذہب

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

جب نماز میں قراءت شروع کرے تو اعوذ باللہ پڑھے' اگر سورہ فاتحہ مکمل پڑھنے کے بعد اس کو اعوذ باللہ پڑھنا یاد آیا تو اب اس کو چھوڑ دے اور اگر سورہ فاتحہ کے دوران اس کو یاد آیا تو اعوذ باللہ پڑھے اور از سر نو سورہ فاتحہ پڑھے' اور جب شاگرد استاد کو قرآن مجید سنائے تو اس وقت اعوذ باللہ نہ پڑھے' یعنی اس وقت پڑھنا سنت نہیں ہے' جب مسبوق اپنی بقیہ نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو تو قراءت سے پہلے اعوذ باللہ پڑھے' امام عید کی نماز میں تکبیرات عید کے بعد اعوذ باللہ پڑھے کیونکہ تکبیرات عید کے بعد قراءت شروع ہوتی ہے۔ (درمختار علی ہامش ردالمختار ج ا ص ۳۲۹۔۳۲۸' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

اگر سورہ فاتحہ کے دوران اس کو اعوذ باللہ پڑھنا یاد آیا تو اب سورہ فاتحہ کو دوبارہ اعوذ باللہ کے ساتھ پڑھنا درست نہیں ہے' کیونکہ اس سے لازم آئے گا کہ سنت کی وجہ سے فرض (قراءت) کو چھوڑ دیا جائے' نیز اس سے واجب کا ترک کرنا بھی لازم آئے گا کیونکہ سورہ فاتحہ یا اس کے اکثر حصہ کو دوبارہ پڑھنا سجدہ سہو کا موجب ہے' اور فقیہ ابوجعفر نے ''نوادر'' میں ذکر کیا ہے کہ نمازی نے اللہ اکبر پڑھنے کے بعد اعوذ باللہ اور ''بسم اللّٰہ'' پڑھی اور ثناء پڑھنا بھول گیا تو اب ثناء نہ پڑھے' اسی طرح اگر اس نے اللہ اکبر کے بعد قراءت شروع کر دی اور ثناء' اعوذ باللہ اور ''بسم اللّٰہ'' پڑھنا بھول گیا تو اب ان کو دوبارہ نہ پڑھے کیونکہ ان کا محل فوت ہو گیا اور اس پر سجدہ سہو نہیں ہے' اس کو زاہدی نے ذکر کیا ہے (خلاصہ یہ ہے کہ علامہ حصکفی کا یہ کہنا درست نہیں کہ اگر اعوذ پڑھنا بھول گیا اور سورہ فاتحہ پڑھنا شروع کر دی تو اعوذ پڑھ کر از سر نو سورہ فاتحہ پڑھنا شروع کرے)۔

''ذخیرہ'' میں یہ مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص ''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھے اور اس سے اس کا مقصد قرآن مجید کی تلاوت ہو تو اس سے پہلے اعوذ باللہ پڑھے اور اگر حصول برکت کے لیے بسم اللہ پڑھتا ہے تو پھر اس سے پہلے اعوذ باللہ نہ پڑھے' کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب کوئی شخص شکر ادا کرنے کی نیت سے ''الحمد للّٰہ رب العلمین'' پڑھتا ہے تو پھر اس سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے' اور اگر قرآن مجید کی تلاوت کا قصد کرتا ہے تو پھر اس سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا ضروری ہے۔ یہ قاعدہ پڑھنے کے اعتبار سے ہے افعال کے لیے یہ قاعدہ نہیں ہے' اس لیے بیت الخلاء جانے سے پہلے ''اعوذ باللّٰہ من الخبث والخبائث'' پڑھنا اس قاعدے کے منافی نہیں ہے۔ (ردالمختار ج ا ص ۳۲۹' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ حلبی حنفی لکھتے ہیں:

نماز میں ثناء کے بعد اعوذ باللہ پڑھنا جمہور علماء کے نزدیک سنت ہے۔ ثوری اور عطا نے یہ کہا ہے کہ یہ واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید پڑھنے سے پہلے ''اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم'' پڑھنے کا حکم دیا ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا یہ قول اجماع کے خلاف ہے۔ اعوذ باللہ پڑھنے کے محل میں اختلاف ہے' امام ابو یوسف کے نزدیک اس کا محل ثناء کے بعد ہے اور یہ قراءت کے تابع نہیں ہے' لہٰذا جو شخص بھی ثناء پڑھے گا وہ اعوذ باللہ پڑھے گا' کیونکہ اعوذ

باللہ پڑھنا دفع وسوسہ کے لیے ہے اور دفع وسوسہ کے سب محتاج ہیں' لہٰذا امام اور منفرد جس طرح ثناء کے بعد اعوذ باللہ پڑھیں اسی طرح مقتدی بھی پڑھے اور عید کی نماز میں بھی امام اس کو ثناء کے بعد پڑھے نہ کہ تکبیرات کے بعد' اور امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک اعوذ باللہ پڑھنا قراءت کے تابع ہے' لہٰذا جو شخص تلاوت قرآن کرے گا وہی اعوذ باللہ پڑھے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ طلب کرو' اور مقتدی چونکہ قراءت نہیں کرتا اس لیے وہ اعوذ باللہ نہیں پڑھے گا اور امام اور منفرد چونکہ قراءت کرتے ہیں اس لیے وہ اعوذ باللہ پڑھیں گے۔ اسی طرح عید کی نماز میں چونکہ قراءت تکبیرات کے بعد شروع ہوتی ہے اس لیے تکبیرات کے بعد اعوذ باللہ پڑھی جائے گی۔ فتاویٰ قاضی خاں' ہدایہ' اس کی شروح' کافی' اختیار اور اکثر کتابوں میں امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے قول کو ترجیح دی گئی ہے کہ اعوذ باللہ پڑھنا قراءت کے تابع ہے اور ہمارا بھی یہی مختار ہے۔ (غنیۃ المستملی ص ۳۰۴' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۱۲ھ)

نیز علامہ حلبی حنفی لکھتے ہیں:

دوسری رکعت میں ثناء پڑھے گا نہ اعوذ باللہ پڑھے گا کیونکہ ان کا محل اول صلوٰۃ اور اول قراءت ہے' اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ دوسری رکعت میں قراءت سے پہلے اعوذ باللہ نہ پڑھنے سے امام ابو یوسف کی تائید ہوتی ہے کہ اعوذ باللہ پڑھنا ثنا کے تابع ہے اور جب دوسری رکعت میں ثنا نہیں پڑھی جائے گی تو اعوذ باللہ بھی نہیں پڑھی جائے گی' اگر یہ قراءت کے تابع ہوتی جیسا کہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے تو دوسری رکعت میں قراءت سے پہلے اعوذ باللہ کو بھی پڑھا جاتا' سو اس طریقہ میں امام ابو یوسف کے قول پر عمل ہے حالانکہ تمہارے نزدیک امام ابوحنیفہ اور امام محمد کا قول مختار ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب نمازی نے ایک مرتبہ قراءت سے پہلے اعوذ باللہ کو پڑھ لیا اور قراءت کے درمیان میں کسی اجنبی فعل کو داخل نہیں کیا تو اس کے لیے دوبارہ اعوذ باللہ پڑھنا سنت نہیں ہے اور افعال نماز' قراءت کے حق میں اجنبی نہیں ہیں کیونکہ نماز کے اعتبار سے تمام افعال واحد ہیں' لہٰذا اس کی قراءت کے دوران کوئی اجنبی فعل خلل انداز نہیں ہوا' اس لیے اب اعوذ باللہ کا تکرار مسنون نہیں ہے۔

(غنیۃ المستملی ص ۳۲۴' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۱۲ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ ہی کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے

بائے بسم اللہ کا معنی

عربی زبان میں باء متعدد معانی کے لیے آتی ہے اور اس میں تفصیل ہے کہ بسم اللہ میں باء کس معنی میں ہے' علامہ زمخشری کی تحقیق یہ ہے کہ بسم اللہ میں باء مصاحبت اور ملابست کے لیے ہے یعنی شروع کرنے کا فعل اللہ تعالیٰ کے نام سے ملابس ہے اور اس کے نام کے ساتھ شروع ہے' جیسے کہتے ہیں: "کتبت بالقلم" "میں نے قلم کے ساتھ لکھا" یا اس کا معنی ہے: "متبرکا بسم اللہ اقراء" "اللہ کے نام سے برکت حاصل کرتے ہوئے میں پڑھتا ہوں یا شروع کرتا ہوں"[1] اور علامہ بیضاوی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ باء استعانت کے لیے ہے' یعنی اللہ کے نام کی مدد سے میں شروع کرتا ہوں۔

(انوار التنزیل علی ہامش عنایۃ القاضی ج ۱ ص ۳۸' مطبوعہ بیروت)

بعض علماء نے یہاں فعل امر مقدر کیا ہے' یعنی اللہ کے نام سے ہی شروع کرو۔

[1] علامہ جار اللہ محمود بن عمر زمخشری متوفی ۵۲۸ھ' کشاف ج ۱ ص ۵۔۴' مطبوعہ مطبعہ بہیہ' مصر' ۱۳۴۳ھ

فعل کو بسم اللہ کے بعد مقدر کرنے کی وجوہ

اس فعل کو بسم اللہ سے پہلے مقدر نہیں کیا بلکہ "بسم اللّٰہ" کے بعد مقدر کیا ہے یعنی "بسم الله اقرء یا اشرع" "اللہ کے نام سے ہی شروع کرتا ہوں یا پڑھتا ہوں' اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فعل کو بسم اللہ کے بعد مقدر ماننے سے عربی قواعد کے مطابق حصر ہو جائے گا اور معنی ہوگا: اللہ ہی کے نام سے شروع کرتا ہوں' مشرکین کسی اہم کام کو بتوں کے نام سے شروع کرتے تھے اور جب ہم کہیں گے: اللہ ہی کے نام سے شروع کرتا ہوں تو اس سے ان مشرکین کا رد ہوگا' جیسے قرآن مجید میں ہے: "ایاك نعبد" اس میں بھی فعل کو موخر ذکر کیا ہے تاکہ حصر مستفاد ہو' اس کا معنی ہے: ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں' دوسری وجہ یہ ہے کہ مقدم اس کو کیا جاتا ہے جو اہم ہو اور اللہ تعالیٰ کے نام اور ہمارے فعل ان دونوں میں اہم اللہ تعالیٰ کا نام ہے' اس لیے فعل کو موخر اور اللہ تعالیٰ کے نام کو مقدم ماننا چاہیے' تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بندہ کے تذلل کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر ہو اور پھر ہمارے کام کا ذکر ہو' چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہ ترتیب نفس الامر اور واقع کے بھی مطابق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نام پہلے ہے ہم اور ہمارا فعل بعد میں ہے' پانچویں وجہ یہ ہے کہ انبیاء سابقین نے بعض مواقع پر پہلے اپنا ذکر کیا اور پھر اللہ تعالیٰ کا' اور ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقع پر پہلے اللہ تعالیٰ کا نام لیا' پھر اپنا نام لیا' مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ" (الشعراء: ۶۲) "بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے" اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" (التوبہ: ۴۰) "بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے" اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کی طرف خط لکھا:

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (النمل: ۳۰) بے شک یہ (خط) سلیمان کی طرف سے ہے اور بے شک یہ اللہ کے نام سے ہے جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے ۝

اور ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ھرقل کی طرف خط لکھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (سیدنا) محمد عبداللہ ورسولہ کی جانب سے روم کے بادشاہ ھرقل کے نام" (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵)

اور صلح نامہ حدیبیہ میں لکھوایا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ وہ ہے جس کا (سیدنا) محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فیصلہ کیا ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۷۹)

سو اگر فعل بسم اللہ سے پہلے مقدر مانا گیا تو حضرت موسیٰ اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی اتباع ہوگی اور اگر بسم اللہ کے بعد فعل کو مقدر مانا گیا تو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہوگی اور چھٹی وجہ یہ ہے کہ بسم اللہ کے بعد فعل کو مقدر ماننا کلام اللہ کے مطابق ہے کیونکہ قرآن مجید میں فعل کا ذکر بسم اللہ کے بعد ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ط (ھود: ۴۱) اللہ کے نام کی مدد سے ہے' اس کشتی کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا۔

ہم نے بسم اللہ کا ترجمہ کیا ہے: اللہ ہی کے نام سے (شروع کرتا ہوں) اس میں لفظ اللہ کو پہلے ذکر کر کے ان وجوہ کی طرف اور "ہی" سے حصر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بسم اللہ میں اسم کا الف حذف کرنے کی وجہ

مشہور نحوی فراء لکھتے ہیں:

تمام مصاحف کے لکھنے والوں اور قراء کا اس پر اجماع ہے کہ بسم اللہ میں اسم کا الف محذوف ہے اور "فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝" (الواقعہ: ۷۴' الحاقہ: ۵۲) میں الف کو برقرار رکھا گیا ہے کیونکہ سورتوں اور دیگر کتابوں کی ابتداء میں بسم اللہ کی جگہ معروف ہے' اور پڑھنے والا اس کے معنی سے ناواقف نہیں ہے اور اس کے الف کو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے' اس لیے اس کو حذف کر دیا' کیونکہ عرب کا طریقہ اختصار' اور کثیر الاستعمال لفظ کے حروف کو کم کرنا ہے بہ شرطیکہ اس کا معنی معروف ہو' اور "فسبح باسم ربك" میں الف کو برقرار رکھا گیا ہے کیونکہ بسم اللہ کی بہ نسبت "باسم ربك" کا استعمال بہت کم ہے' کیا تم نہیں دیکھتے کہ کھانے' پینے' ذبح کرنے بلکہ ہر نیک کام سے پہلے بسم اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ (معانی القرآن مطبوعہ بیروت)

علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اسم کا الف جو حذف کیا گیا ہے اس کے عوض بائے بسم اللہ کو لمبا کر کے لکھا جاتا ہے۔

لفظ اللہ کا معنی اور کے وصف یا علم ہونے کی تحقیق

علامہ مکی بن ابی طالب لکھتے ہیں:

لفظ اللہ اصل میں "الاہ" ہے پھر اس پر الف لام داخل کیا گیا تو "الالاہ" ہو گیا' پھر تخفیفاً الف کو حذف کیا اور اس کی حرکت پہلے لام پر داخل کر دی اور پہلے لام کا دوسرے لام میں ادغام کر دیا تو یہ لفظ "اللہ" ہو گیا ایک قول یہ ہے کہ یہ اصل میں "لاہ" ہے' اس پر الف لام داخل کیا اور لام کا لام میں ادغام کیا تو یہ لفظ "اللہ" ہو گیا اور خلیل سے منقول ہے کہ اس کی اصل "ولاہ" ہے۔ (مشکل اعراب القرآن' مطبوعہ انتشارات نور' ایران' ۱۳۶۲ھ)

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

"الہ" کا معنی ہے حیرت زدہ ہونا' کیونکہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال میں غور کرتا ہے تو حیرت زدہ ہو جاتا ہے' اور "لاہ" سریانی زبان کا لفظ ہے' جو چیز بلند اور محجوب ہو اس کو "لاہ" کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسانی آنکھوں سے محجوب ہے اور جو چیز اس کے لائق نہ ہو اس سے بلند ہے' اور "ولاہ" کا معنی ہے بچہ کا خوف زدہ ہو کر ماں کی طرف لپکنا' اور تمام مخلوق اپنے مصائب اور پریشانیوں میں گھبرا کر اللہ تعالیٰ کی طرف لپکتی ہے' ان وجوہ سے کہا جاتا ہے کہ لفظ اللہ "الہ" سے "لاہ" سے یا "ولاہ" سے بنا ہے۔ ابن اثیر نے کہا: یہ "الہ" سے بنا ہے اور منذری نے کہا: یہ "الالہ" سے بنا ہے۔

(لسان العرب ج ۱۳ ص ۴۶۹۔ ۴۶۷' مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ' قم' ایران)

اور علامہ فیروز آبادی لکھتے ہیں:

سیبویہ نے کہا کہ لفظ اللہ کا "لاہ" سے بنا جائز ہے' اس کا معنی بلندی اور ارتفاع ہے۔

(قاموس ج ۴ ص ۴۱۶' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

علامہ زبیدی حنفی لکھتے ہیں:

زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ لفظ اللہ ذات واجب الوجود کے لیے علم (شخصی نام) ہے جو کہ تمام صفات کمال کی جامع ہے اور یہ لفظ مشتق نہیں ہے' ابن العربی نے کہا: یہ علم ہے اور الہ حق پر دلالت کرتا ہے اور یہ تمام اسماء حسنیٰ الٰہیہ احدیہ کا جامع ہے۔

(تاج العروس ج ۱ ص ۴۷۳' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

ہمارے نزدیک تحقیق یہی ہے کہ لفظ اللہ کسی لفظ سے نہیں بنا' اور یہ اصل میں علم ہے وصف نہیں ہے کیونکہ لفظ اللہ موصوف ہوتا ہے اور کسی موصوف کی صفت نہیں بنتا' نیز اللہ تعالیٰ کی متعدد صفات ہیں اور ان صفات کے عمل کے لیے کسی موصوف کی ضرورت ہے اور لفظ اللہ کے علاوہ اور کوئی لفظ اس کی صلاحیت نہیں رکھتا' اور اگر لفظ اللہ مشتق اور صفت ہو تو پھر لا الہ الا اللہ سے

توحید ثابت نہیں ہوگی کیونکہ صفت کلی ہوتی ہے اور شرکت کثیرین سے مانع نہیں ہوتی اور علامہ بیضاوی کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ لفظ اصل میں وصف تھا اور غلبہ استعمال کی وجہ سے بہ منزلہ علم ہو گیا کیونکہ پھر مرتبہ وضع میں توحید ثابت نہیں ہوگی' اور ''الہ'' اور ''لاہ'' کے ساتھ لفظی مناسبت سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ لفظ ان میں سے کسی ایک لفظ سے بنا ہو اور حق یہ ہے کہ جس طرح اللہ کی ذات کسی سے نہیں بنی اسی طرح اس کی ذات پر دلالت کرنے والا بھی کسی لفظ سے نہیں بنا۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

علامہ سعد الدین تفتازانی اور علامہ عصام الدین نے کہا ہے کہ لفظ اللہ اس ذات کے لیے علم (شخصی نام) ہے جو واجب الوجود ہے' اور تمام صفات محمودہ کی جامع ہے' اور علامہ میر سید شریف نے کہا: جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا ادراک کرنے سے انسان کی عقل حیران اور عاجز و درماندہ ہے اسی طرح اس کی ذات پر دلالت کرنے والے اسم کی حقیقت کو پانے سے بھی عقلیں حیران اور پریشان ہیں۔ کسی نے کہا: یہ لفظ سریانی ہے' کسی نے کہا: یہ عربی ہے' کسی نے کہا: یہ وصف اور مشتق ہے' کسی نے کہا: علم ہے اور جمہور کا موقف یہ ہے کہ لفظ اللہ عربی ہے اور علم مرتجل ہے (کوئی اور لفظ اس کی اصل نہیں ہے) امام ابوحنیفہ' امام محمد بن الحسن' امام شافعی اور خلیل کا بھی نظریہ ہے' امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم یہی اسم ہے' امام طحاوی اور دیگر کثیر علماء اور عارفین کا یہی قول ہے۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۵' مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ' استنبول' ۱۳۲۷ھ)

رحمٰن اور رحیم کا معنی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

رحمت اس رقت قلب کو کہتے ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ مرحوم پر احسان کیا جائے' کبھی یہ لفظ رقت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنی' اور جب رحمت اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو پھر اس کا معنی صرف احسان اور افضال ہے نہ کہ رقت قلب' اور جب رحمت آدمیوں کی صفت ہو تو پھر اس کا معنی رقت اور شفقت ہے۔

رحمان کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی پر کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ رحمان کا معنی ہے: وہ ذات جس کی رحمت ہر چیز کو محیط ہو' اور اس معنی کا مصداق اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا' اور رحیم کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے غیر پر بھی ہو سکتا ہے کیونکہ رحیم کا معنی ہے: جو بہت رحم کرتا ہو' قرآن مجید میں رحیم کا اطلاق اللہ پر بھی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر نہایت مہربان اور بہت رحم فرمانے والا ہے ○ (الحج: ۶۵)

اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ (التوبہ: ۱۲۸) بے شک تمہارے پاس تمہی میں سے ایک عظیم رسول آئے جن پر تمہارا مشقت میں مبتلا ہونا سخت دشوار ہے' وہ تمہاری بھلائی پر بہت حریص ہیں اور مومنوں پر نہایت مہربان اور بہت رحم فرمانے والے ہیں ○

ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں رحمٰن ہے کیونکہ دنیا میں اس کا احسان مومنوں اور کافروں دونوں پر ہے اور آخرت میں رحیم ہے کیونکہ آخرت میں اس کا احسان صرف مومنوں پر ہوگا کافروں پر نہیں ہوگا۔

(المفردات ص ۱۹۲ ـ ۱۹۱ مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران ۱۳۴۲ھ)

رحمٰن کو رحیم پر مقدم کرنے کی وجوہ

خلاصہ یہ ہے کہ رحمان اور رحیم دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور رحمان میں رحیم کی بہ نسبت زیادہ مبالغہ ہے۔ اب یہاں ایک سوال یہ ہے کہ عرب کا طریقہ یہ ہے کہ صفات مدح میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں: "فلان عالم نحریر" (فلاں شخص عالم ماہر ہے) اس لیے بہ ظاہر پہلے رحیم اور پھر رحمان کا ذکر ہونا چاہیے تھا' اس کا جواب یہ ہے کہ رحمٰن کا اطلاق چونکہ اللہ تعالیٰ کے غیر پر نہیں ہوتا' اس لیے یہ لفظ اللہ کی طرح ہے اور بہ منزلہ علم ہے' اور رحیم وصف ہے اور علم وصف پر مقدم ہوتا ہے' دوسرا جواب یہ ہے کہ رحمٰن کا لفظ تمام عظیم اور جلیل نعمتوں کو شامل ہے جو بہ منزلہ اصول ہیں اور رحیم اس کا تتمہ ہے جو فروعی اور دقیق نعمتوں کو شامل ہے اور جو لفظ جلیل' عظیم اور اصل نعمتوں پر دلالت کرتا ہے وہ اس لفظ پر مقدم ہونا چاہیے جو دقیق اور فروعی نعمتوں پر دلالت کرتا ہے' تیسرا جواب یہ ہے کہ رحمٰن کا تعلق دنیا سے ہے اور رحیم کا تعلق آخرت سے ہے اور دنیا آخرت سے پہلے ہے' اس لیے رحمٰن کا ذکر رحیم سے پہلے کیا ہے' چوتھا جواب یہ ہے کہ رحمان عام ہے کیونکہ اس کا تعلق مومن اور کافر دونوں سے ہے اور رحیم خاص ہے کیونکہ اس کا تعلق صرف مومن سے ہے اور عام خاص پر مقدم ہوتا ہے اس لیے رحمان کو رحیم پر مقدم کیا ہے' کیونکہ رحمٰن میں رحیم کی بہ نسبت زیادہ مبالغہ ہے' اس لیے ہم نے رحمٰن کا معنی "نہایت رحم فرمانے والا" اور رحیم کا معنی "بہت مہربان" کیا ہے۔

بسم اللہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رمز اور اشارہ

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

الف بسیط اور مطلق ہے اور وہ اپنی بساطت اور اطلاق کی وجہ سے اللہ عزوجل کی ذات مطلقہ پر دلالت کرتا ہے اور الف کے بعد باء ہے اور یہ تمام تعینات پر مقدم ہے سو باء اپنے تعین اول کے لحاظ سے حقیقت محمدی پر دلالت کرتی ہے' اسی طرح بسم اللہ کی باء میں ذات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف اشارہ ہے' اور باء پر کسرہ (زیر) ہے اور اس سے آپ کی صفت رحمت کی طرف اشارہ ہے' قرآن مجید میں ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ (الانبیاء: ۱۰۷) — اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے صرف بہ طور رحمت بھیجا ہے ○

نیز فرمایا:

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ (التوبہ: ۱۲۸) — اور مومنوں پر نہایت مہربان اور بہت رحم فرمانے والے ہیں ○

اس میں یہ رمز ہے کہ جن پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے اور جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہیں اگرچہ وہ صاحب خلق عظیم ہیں اور ان کا ہر وصف اعلیٰ ہے لیکن ان پر صفت رحمت کا غلبہ ہے' وہ "رءوف رحیم" ہیں اور جس کی طرف وہ دعوت دے رہے ہیں وہ "الرحمن الرحیم" ہے' یہی وجہ ہے کہ قرآن کی ہر سورت سے پہلے بسم اللہ ہے اور اس میں آپ کی صفت رحمت کی طرف اشارہ ہے' سورہ توبہ کی ابتداء میں بسم اللہ نہیں لکھی گئی' وہ براءۃ سے شروع ہے اور باء سے آپ کی ذات اور باء کی فتح (زبر) سے آپ کی صفت جلال کی طرف اشارہ ہے' قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتیں ہیں' ایک سو تیرہ سورتوں میں بسم اللہ کے ذکر سے آپ کی رحمت کی طرف اشارہ ہے اور ایک سورت میں براءۃ کی نصب سے آپ کے غضب کی

طرف اشارہ ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہر سورت کی لوح جبیں پر حقیقت محمدی کی طرف رمز ہے۔ ایک سو تیرہ سورتوں میں آپ کے جمال کی طرف اور ایک سورت میں آپ کے جلال کی طرف اشارہ ہے۔ (روح المعانی ج ۱ ص ۵۲۔۵۱ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

بعض محققین نے بیان کیا کہ بسم اللہ میں باء کے بعد اسم اللہ ہے اور اسم اللہ میں بھی حقیقت محمدی کی طرف رمز ہے کیونکہ اسم وہ ہے جو مسمّٰی پر دلالت کرے اور یوں تو ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ذات پر دلالت کرتی ہے لیکن کامل دلالت کرنے والا وہ ہوگا جس کی دلالت سب کے لیے ہو' جو نبیوں اور رسولوں کے لیے بھی اللہ کی دلیل ہو' انسانوں اور جنوں کے لیے بھی رہنما ہو' شجرو حجر' دشت وجبل' بحر و بر اور کائنات کی ہر حقیقت کے لیے دلیل ہو اور ایسی کامل دلیل بہ جز ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں ہے تو وہی اسم اللہ ہیں اور یوں اسم اللہ میں بھی حقیقت محمدی کی طرف رمز ہے۔ آپ اللہ کا اسم ہیں اور اسم مسند اور مسند الیہ ہوتا ہے اور آپ اللہ کی طرف مسند ہیں اور ساری کائنات کے لیے مسند الیہ ہیں' اسم کا خاصہ ہے حرف جر' اور جر کا معنی ہے کھینچنا اور آپ لوگوں کو جہنم کے کنارے سے کھینچ کھینچ کر جنت کی طرف لائے اور حروف جارہ میں ''من'' اور ''الی'' ہیں' ''من'' ابتدا کے لیے اور ''الی'' انتہاء کے لیے ہے اور نبوت کی ابتداء بھی آپ سے ہے اور نبوت کی انتہا بھی آپ پر ہے اور حروف جارہ میں باء ہے' باء الصاق کے لیے آتی ہے یعنی ایک چیز کو دوسری چیز سے ملانے کے لیے' اور آپ نے بندوں کو خدا سے ملایا ہے' اور حروف جارہ میں ''علی'' ہے' ''علی'' استعلاء اور بلندی کے لیے آتا ہے اور آپ ساری کائنات پر بلند ہیں' خلاصہ یہ ہے کہ بسم اللہ کی باء' باء کے کسرہ اور اسم اللہ ان سب میں حقیقت محمدی کی طرف رمز ہے۔

''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' سے متعلق فقہی مباحث

ایک بحث یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے شروع میں جو ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' لکھی ہے آیا وہ قرآن کریم کا جز ہے یا نہیں۔ دوسری بحث یہ ہے کہ آیا وہ سورۂ فاتحہ کا جز ہے یا نہیں' تیسری بحث یہ ہے کہ سورتوں کے اوائل میں جو ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' لکھی ہے وہ ان سورتوں کا جز ہے یا نہیں۔ چوتھی بحث یہ ہے کہ نماز میں بسم اللہ پڑھی جائے یا نہیں' چھٹی بحث یہ ہے کہ بسم اللہ کو جہراً پڑھا جائے یا آہستہ' اور ساتویں بحث میں بسم اللہ کے احکام شرعیہ اور مسائل ہیں اور آٹھویں بحث میں بسم اللہ کے فوائد اور حکمتیں ہیں۔

''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کے آیت قرآن ہونے کی تحقیق

علامہ ابوبکر رازی لکھتے ہیں:

مسلمانوں کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورۂ نمل کی یہ آیت ''اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝'' (النمل: ۳۰) قرآن کریم کا جز ہے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی وہ ''اقرا باسم ربك الذی خلق'' ہے۔ مسعودی نے حارث کلبی سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے مکاتیب کی ابتداء میں ''باسمك اللهم'' لکھتے تھے' حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: ''بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ'' (ہود: ۴۱) تو آپ بسم اللہ لکھنے لگے پھر یہ آیت نازل ہوئی: ''قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ'' (الاسراء: ۱۱۰) تو آپ ''بسم اللہ الرحمن'' لکھنے لگے۔ ''سنن ابوداؤد'' میں روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کو اس وقت تک نہیں لکھا جب تک کہ سورۂ نمل نازل نہیں ہوئی' اور جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ حدیبیہ لکھوایا تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: لکھو' ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' تو سہیل نے کہا: ''باسمك اللهم'' لکھو کیونکہ ہمارے نزدیک رحمٰن معروف نہیں ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' پہلے قرآن مجید میں نہیں تھی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس

کو سورہ نمل میں نازل کیا۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۸ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

"صحیح بخاری" میں ہے: جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھوائی تو سہیل نے کہا: بہ خدا! میں نہیں جانتا کہ رحمن کیا چیز ہے لیکن آپ "باسمك اللهم" لکھیں جس طرح آپ پہلے لکھتے تھے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۷۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی ۱۳۸۱ھ)

ہر چند کہ سورہ نمل کی سورت ہے لیکن اس سے پہلے متعدد سورتیں نازل ہو چکی تھیں اگر "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ہر سورت کے اوائل کا جز ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء ہی سے "باسمك اللهم" کی بجائے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھتے لہٰذا "سنن ابو داؤد" کی مذکور الصدر حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سورہ نمل نازل ہونے سے پہلے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" قرآن مجید میں نہیں تھی اور نہ ہی اوائل سورہ قرآن کا جز تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم کے سورہ فاتحہ کے جز نہ ہونے کی تحقیق اور مذاہب اربعہ

علامہ ابوبکر رازی حنفی لکھتے ہیں:

اس میں اختلاف ہے کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سورہ فاتحہ کا جز ہے یا نہیں' قراء کوفیہ نے اس کو سورہ فاتحہ کی ایک آیت قرار دیا ہے اور قراء بصریہ نے اس کو سورہ فاتحہ کی آیات سے شمار نہیں کیا' ہمارے اصحاب (فقہاء احناف) سے یہ تصریح منقول نہیں ہے کہ یہ سورہ فاتحہ کی آیت ہے' البتہ ہمارے شیخ ابوالحسن کرخی نے فقہاء احناف کا یہ مذہب نقل کیا ہے کہ بسم اللہ کو نماز میں جہراً نہیں پڑھا جائے گا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ فقہاء احناف کے نزدیک بسم اللہ سورہ فاتحہ کی ایک آیت نہیں ہے' ورنہ اس کو بھی جہراً پڑھا جاتا جیسے سورہ فاتحہ کی باقی آیات کو جہراً پڑھا جاتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک بسم اللہ سورہ فاتحہ کی ایک آیت ہے۔

فقہاء احناف کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے اور میرے بندے کے درمیان صلوٰۃ (سورہ فاتحہ) کو نصف' نصف تقسیم کر دیا گیا ہے' نصف میرے لیے ہے اور نصف میرے بندہ کے لیے ہے اور میرے بندہ کے لیے وہ ہے جس کا وہ سوال کرے' پس جب بندہ کہتا ہے: "الحمد لله رب العلمين" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بندہ نے میری حمد کی اور جب بندہ کہتا ہے: "الرحمن الرحيم" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بندہ نے میری تعظیم کی یا میری ثنا کی' اور جب بندہ کہتا ہے کہ "مالك يوم الدين" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بندہ نے خود کو میرے سپرد کر دیا' اور جب بندہ کہتا ہے: "اياك نعبد و اياك نستعين" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے اور میرے بندہ کے لیے وہ ہے جس کا وہ سوال کرے' پھر میرا بندہ کہتا ہے: "اهدنا الصراط المستقيم" آخر سورت تک' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندہ کے لیے وہ ہے جس کا وہ سوال کرے۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۹-۸ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۰-۱۶۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اگر بسم اللہ سورہ فاتحہ کا جز ہوتی تو سورہ فاتحہ کی آیات میں اس کا بھی ذکر اس حدیث میں ہوتا' اور جب آپ نے سورہ فاتحہ کی آیات میں بسم اللہ کا ذکر نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ بسم اللہ' سورہ فاتحہ کی آیت اور جز نہیں ہے۔

"شرح صحیح مسلم" جلد اول میں ہم نے اس کے مزید دلائل ذکر کیے ہیں اور علماء شافعیہ نے ان دلائل کے جو جوابات دیئے ہیں ان پر بحث کی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سورہ فاتحہ کی جز نہیں

ہے اور امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک سورہ فاتحہ کی جز ہے۔

اوائل سور میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ان سورتوں کے جز نہ ہونے کی تحقیق اور مذاہب اربعہ

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

اوائل سور میں بسم اللہ قرآن کا جز ہے' کیونکہ امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سوئے ہوئے تھے' پھر آپ نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا ہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: مجھ پر ابھی ایک سورت نازل ہوئی ہے' پھر آپ نے تلاوت کی: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ (الکوثر)۔

(شرح مسلم ج ۱ ص ۱۷۲ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ کوثر سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کو تبرکاً پڑھا ہے' سورۂ کوثر کی آیت ہونے کے لحاظ سے نہیں پڑھا کیونکہ اگر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ہر سورت کی ابتداء میں اس کا جز ہوتی تو آپ پر سب سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' نازل ہوتی حالانکہ ''صحیح بخاری'' اور دیگر کتب صحاح میں یہ تصریح ہے کہ آپ پر سب سے پہلے ''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ'' (العلق: ۱) نازل ہوئی ہے اور اس پر سب کا اجماع ہے کہ آپ پر سب سے پہلے یہی آیت نازل ہوئی ہے۔

علامہ ابن العربی مالکی لکھتے ہیں:

اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ سورہ نمل میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کتاب اللہ کی آیت ہے اور ہر سورت کی ابتداء میں اس کے آیت ہونے میں اختلاف ہے' امام مالک اور امام ابوحنیفہ یہ کہتے ہیں کہ ہر سورت کی ابتداء میں یہ آیت نہیں ہے' اس کو اس لیے ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہاں سے سورت شروع ہوئی ہے۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۵ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت)

علامہ ابوالحسن مرداوی حنبلی لکھتے ہیں:

اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ سورہ فاتحہ کے سوا ہر سورت کے اول میں بسم اللہ اس سورت کا جز نہیں ہے' علامہ زرکشی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔ (انصاف ج ۲ ص ۴۸ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۳۷۴ھ)

غالباً علامہ مرداوی کو اس مسئلہ میں امام شافعی کے اختلاف کا علم نہیں ہے۔

علامہ ابوبکر رازی حنفی لکھتے ہیں:

اس میں اختلاف ہے کہ آیا اوائل سور میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ان سورتوں کی ایک آیت ہے یا نہیں؟ ہمارے نزدیک ہر سورت کے اول میں جو ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ہے وہ اس سورت کی آیت نہیں ہے' کیونکہ اس سورت کے ساتھ بسم اللہ کو جہراً نہیں پڑھا جاتا' نیز جب یہ سورہ فاتحہ کی جز نہیں ہے تو اسی طرح باقی سورتوں کی بھی جز نہیں ہے' کیونکہ یہ کسی کا قول نہیں ہے کہ یہ سورہ فاتحہ کی جز نہیں ہے اور باقی سورتوں کی جز ہے' اور امام شافعی کا یہ قول ہے کہ ہر سورت سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اس سورت کی ایک آیت ہے اور ان سے پہلے یہ قول کسی نے نہیں کیا۔ اس سے پہلے صرف یہ اختلاف تھا کہ یہ سورہ فاتحہ کی جز ہے یا نہیں۔ اوائل سور سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے جز نہ ہونے کے یہ دلائل ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اس کا کیا سبب ہے کہ آپ نے سورہ توبہ اور سورہ انفال کو سات بڑی سورتوں میں رکھا ہے اور آپ نے ان دو سورتوں کے درمیان ''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم'' نہیں لکھی؟ حضرت عثمان نے کہا: جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کئی آیات نازل ہوتیں تو آپ کسی لکھنے والے کو بلاتے اور فرماتے: اس آیت کو فلاں سورت میں رکھو اور جب آپ پر ایک یا دو آیتیں نازل ہوتیں تب بھی آپ اسی طرح فرماتے' سورہ انفال اس وقت نازل ہوئی جب آپ شروع شروع مدینہ میں آئے تھے اور سورہ توبہ قرآن کی آخری سورتوں میں سے ہے اور سورہ انفال کا مضمون سورہ توبہ کے مضمون کے مشابہ تھا تو میں نے یہ گمان کیا کہ یہ اس کے ساتھ لاحق ہے' اس لیے میں نے ان دونوں کو سات بڑی سورتوں میں رکھا' اور ان کے درمیان ''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم'' کی سطر نہیں لکھی۔ اس حدیث میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ تصریح کی ہے کہ ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کسی سورت کا جز نہیں ہے اور وہ سورت سے پہلے بسم اللہ کو صرف دو سورتوں کے درمیان فصل کے لیے لکھتے تھے' نیز اگر ہر سورت سے پہلے بسم اللہ اس سورت کا جز ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلانے سے ہر شخص کو اس کا علم ہوتا' جیسا کہ دوسری آیات کا سب کو بغیر کسی نزاع کے علم ہے۔ دوسری دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن میں ایک سورت کی تیس آیتیں ہیں جو اپنے پڑھنے والے کی شفاعت کرتی رہے گی حتیٰ کہ اس کی مغفرت کردی جائے گی (وہ سورت ہے) ''تبارك الذی بیدہ الملك'' اور تمام قراء وغیرہ کا اس پر اتفاق ہے کہ سورہ ''تبارك الذی'' میں ''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم'' کے علاوہ تیس آیتیں ہیں' اگر بسم اللہ اس سورت کا جز ہو تو اس سورت کی اکتیس آیتیں بن جائیں گی اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے خلاف ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ تمام قراء اور فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ سورہ کوثر کی تین اور سورہ اخلاص کی چار آیتیں ہیں' اگر بسم اللہ کو ان سورتوں کا جز مانا جائے تو پھر ان کی آیتوں کی تعداد چار اور پانچ ہو جائے گی اور یہ ان کے اتفاق کے خلاف ہے۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۱۱۔۹ ملخصاً 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

نماز میں بسم اللہ پڑھنے کے متعلق مذاہب اربعہ

علامہ ابوبکر رازی حنفی لکھتے ہیں:

امام ابوحنیفہ' امام محمد' امام زفر اور امام شافعی یہ کہتے ہیں کہ نماز میں ''اعوذ باللّٰہ'' کے بعد سورہ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھی جائے' اور اس میں اختلاف ہے کہ آیا ہر رکعت میں بسم اللہ پڑھی جائے یا نہیں' اسی طرح سورت سے پہلے بسم اللہ پڑھی جائے یا نہیں۔ امام ابو یوسف نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے کہ ہر رکعت میں ایک مرتبہ سورہ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھے اور امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک (ضم) سورت سے پہلے دوبارہ بسم اللہ نہ پڑھے' اور امام محمد اور حسن بن زیاد نے امام ابوحنیفہ سے یہ روایت کیا ہے کہ جب پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے بسم اللہ پڑھ لی ہے تو اب اس نماز میں سلام پھیرنے تک اس پر بسم اللہ پڑھنے کا حکم نہیں ہے' اور اگر اس نے ہر سورت کے ساتھ بسم اللہ پڑھ لی تو مستحسن ہے۔ حسن بن زیاد نے کہا: اگر وہ مسبوق ہے تو اس کی پہلی رکعت میں اس پر بسم اللہ پڑھنا ضروری نہیں ہے' کیونکہ امام پہلی رکعت میں بسم اللہ پڑھ چکا ہے اور امام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔

امام مالک بن انس نے یہ کہا ہے کہ فرض نماز میں بسم اللہ کو آہستہ پڑھے نہ بلند آواز سے اور نفل میں اس کو اختیار ہے' اگر

چاہے تو پڑھے اور اگر چاہے تو ترک کردے اور ہمارے نزدیک تمام نمازوں میں بسم اللہ پڑھے کیونکہ حضرت ام سلمہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں پڑھتے تھے: ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للّٰہ رب العلمین“ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم‘ حضرت ابوبکر‘ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی اقتداء میں نمازیں پڑھیں‘ وہ پست آواز سے بسم اللہ پڑھتے تھے اور بعض روایات میں ہے کہ وہ جہراً بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ (احکام القرآن ج ا ص ۱۲۔ ۱۳ ملخصاً مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور‘ ۱۴۰۰ھ)

امام شافعی کے نزدیک چونکہ ہر سورت کے اول میں بسم اللہ اس سورت کا جز ہے اس لیے ان کے نزدیک ہر رکعت میں سورہ فاتحہ اور سورت سے پہلے بسم اللہ پڑھی جائے گی اور امام احمد کے نزدیک بسم اللہ صرف سورہ فاتحہ کا جز ہے اس لیے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھی جائے گی اور سورت سے پہلے نہیں پڑھی جائے گی۔

نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو آہستہ سے پڑھنے کی تحقیق اور مذاہب اربعہ

علامہ ابوبکر رازی حنفی لکھتے ہیں:

ہمارے اصحاب (احناف) اور ثوری نے یہ کہا ہے کہ نماز میں ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ کو آہستہ پڑھا جائے‘ اور امام شافعی نے کہا ہے کہ بسم اللہ کو نماز میں جہراً پڑھے‘ یہ اختلاف اس وقت ہے جب امام نماز میں جہراً قراءت کرے‘ اس مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بہت اختلاف ہے‘ عمر بن ذر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر کے پیچھے نماز پڑھی تو انہوں نے بلند آواز سے ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ پڑھی‘ حماد نے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بسم اللہ کو آہستہ پڑھتے تھے‘ پھر سورہ فاتحہ جہر سے پڑھتے تھے‘ حضرت انس سے بھی اسی طرح مروی ہے‘ ابراہیم نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے اصحاب ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ آہستہ پڑھتے تھے‘ جہر سے نہیں پڑھتے تھے‘ اور حضرت انس سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ آہستہ پڑھتے تھے‘ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے‘ اور مغیرہ نے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ نماز میں بسم اللہ کو جہر سے پڑھنا بدعت ہے‘ امام ابوحنیفہ‘ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نماز میں بسم اللہ کو جہر سے پڑھنا اعرابیوں (بدوؤں) کا طریقہ ہے‘ اسی طرح عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ابووائل بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر اور حضرت علی نماز میں ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ کو جہر سے پڑھتے تھے نہ ”اعوذ باللّٰہ“ کو نہ آمین کو‘ اور حضرت انس اور حضرت عبداللہ بن مغفل سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم‘ حضرت ابوبکر‘ حضرت عمر اور حضرت عثمان نماز میں بسم اللہ کو آہستہ سے پڑھتے تھے اور حضرت عبداللہ بن مغفل جہر سے بسم اللہ پڑھنے کو بدعت کہتے تھے۔ (جامع ترمذی ص ۶۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کو ”اللّٰہ اکبر“ اور ”الحمد للّٰہ رب العلمین“ کی قراءت سے شروع کرتے تھے اور سلام سے ختم کرتے تھے‘ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی فرض نماز میں ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ کو جہراً نہیں پڑھا‘ نہ حضرت ابوبکر نے نہ حضرت عمر نے۔

(احکام القرآن ج ا ص ۱۶۔ ۱۷ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور‘ ۱۴۰۰ھ)

علامہ ابوالحسن مرداوی حنبلی لکھتے ہیں:

بسم اللہ کو نماز میں جہراً نہ پڑھا جائے‘ خواہ ہم اس کو سورہ فاتحہ کا جز کہیں یا نہ کہیں‘ یہی صحیح قول ہے‘ مجد نے اپنی شرح میں اس کی تصحیح کی ہے اور انہوں نے لکھا ہے کہ ترک جہر کی روایت میں کوئی اختلاف نہیں ہے‘ خواہ ہمارے نزدیک یہ سورہ فاتحہ کا جز

ہے ابن حمدان ابن تیمیہ ابن جوزی اور زرکشی وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے اور اس قول کو مقدم رکھا ہے اور یہی جمہور کا موقف ہے۔

ابن حامد اور ابوالخطاب نے ایک روایت جہر کی بیان کی ہے بہ شرطیکہ بسم اللہ کو سورہ فاتحہ کا جز کہا جائے ابن عقیل نے بھی اس کا ذکر کیا ایک قول یہ ہے کہ مدینہ میں جہر کیا جائے اور ایک قول یہ ہے کہ نفل میں جہر کیا جائے اور شیخ تقی الدین کا مختار یہ ہے کہ ”بسم اللہ‘ اعوذ باللہ“ اور سورہ فاتحہ کو نماز جنازہ وغیرہ میں کبھی کبھی جہر سے پڑھا جائے۔

(انصاف ج ۲ ص ۴۹۔۴۸ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۳۷۷ھ)

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

سنت یہ ہے کہ جہری نماز میں سورہ فاتحہ اور اس کے بعد کی سورت سے پہلے ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ کو جہراً پڑھا جائے۔
(شرح مسلم ج ۱ ص ۱۷۸ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۷۵ھ)

علامہ ابن رشد مالکی لکھتے ہیں:

امام مالک نے فرض نماز میں بسم اللہ پڑھنے سے منع کیا ہے خواہ جہری نماز ہو یا سری سورہ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھے نہ اس کے بعد والی سورت سے پہلے اور نفل نماز میں جائز کہا ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۸۹ مطبوعہ دارالفکر بیروت)

خلاصہ یہ ہے کہ امام شافعی کے نزدیک جہری نماز میں سورہ فاتحہ اور بعد کی سورت سے پہلے بسم اللہ کو جہراً پڑھے اور امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک جہری نماز میں سورہ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ کو آہستہ پڑھے اور امام مالک کے نزدیک فرض نماز میں مطلقاً بسم اللہ نہ پڑھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے احکام شرعیہ اور مسائل

علامہ سید احمد طحطاوی ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ کے احکام شرعیہ کے بیان میں لکھتے ہیں:

(۱) ذبح کرتے وقت‘ شکار کی طرف تیر پھینکتے وقت اور شکاری کتا چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ ”البحر الرائق“ میں لکھا ہے کہ بسم اللہ کہنا ضروری نہیں ہے صرف اللہ کا نام لینا شرط ہے اور بعض کتابوں میں ہے: ”الرحمٰن الرحیم“ نہ کہے (صرف بسم اللہ کہے) کیونکہ ذبح کے وقت رحمت کا ذکر مناسب نہیں ہے۔

(۲) ”قنیہ“ میں لکھا ہے کہ ہر رکعت میں ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ پڑھنا واجب ہے اور اس کے ترک سے سجدہ سہو کرنا لازم ہے لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔

(۳) وضو کی ابتداء میں ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ پڑھنا سنت ہے استنجاء سے پہلے اور بعد بھی‘ لیکن حالت استنجاء اور محل نجاست میں نہ پڑھے۔ اگر وضو کے شروع میں ”بسم اللہ“ پڑھنا بھول گیا تو دوران وضو جب بھی یاد آئے بسم اللہ پڑھ لے وضو کے اول میں ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ پڑھنا سنت ہے اور درمیان میں پڑھنا مستحب ہے۔

(۴) کھانے کی ابتداء میں ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ پڑھنا سنت ہے اگر بھول گیا تو درمیان میں پڑھنا بھی سنت ہے اور درمیان میں یوں پڑھے: ”بسم اللہ اولہ واخرہ“۔

(۵) سورہ فاتحہ کے بعد دوسری سورت سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے خواہ نماز سری ہو یا جہری۔

(۶) کسی کتاب کے شروع میں اور ہر نیک اور اہم کام کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے۔

(۷) قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے ”اعوذ باللہ“ کے بعد ”بسم اللہ“ پڑھنا مستحب ہے۔

(۸) مشتبہ چیز کھاتے وقت ''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھنا مکروہ ہے' جمہور کے نزدیک تمبا کونوشی کے وقت بھی بسم اللہ پڑھنا مکروہ ہے۔

(۹) سورہ انفال کے بعد سورہ توبہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مکروہ ہے' اگر سورہ توبہ سے ہی پڑھنا شروع کیا ہے تو پھر بعض مشائخ کے نزدیک بسم اللہ مکروہ نہیں ہے۔

(۱۰) اٹھنے' بیٹھنے' چلنے پھرنے اور دیگر کاموں کے وقت بسم اللہ پڑھنا مباح ہے۔

(۱۱) ''خلاصۃ الفتاوی'' میں مذکور ہے: اگر کسی شخص نے شراب پیتے وقت یا حرام کھاتے وقت یا زنا کرتے وقت بسم اللہ پڑھی تو وہ کافر ہو جائے گا' یہاں حرام سے مراد حرام قطعی ہے' کیونکہ کسی کام کے شروع میں اللہ تعالیٰ سے استعانت اور برکت حاصل کرنے کے لیے بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے مدد اسی کام میں حاصل کی جائے گی جس کام کو اس نے جائز کیا ہو اور اس پر وہ راضی ہو اس لیے کسی حرام کام پر بسم اللہ پڑھنا اسکو حلال قرار دینے کے مترادف ہے اور حرام کو حلال قرار دینا کفر ہے۔

(۱۲) جنبی اور حائض کے لیے بہ طور قرآن ''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھنا حرام ہے' البتہ بطور ذکر اور برکت حاصل کرنے کے لیے پڑھنا جائز ہے۔ (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج ۱ ص ۶۔۵' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۵ھ)

اللہ تعالیٰ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اسماء لکھنے اور پڑھنے کے آداب

علامہ سید احمد طحطاوی لکھتے ہیں:

''فصول'' میں مذکور ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے کوئی نام سنے اس پر اللہ کی تعظیم کرنا واجب ہے مثلاً ''عزوجل' جل مجدہ'' یا ''تبارک وتعالیٰ'' کہے اور بعض کتابوں میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا نام لکھے تو اس کے ساتھ کوئی تعظیمی کلمہ مثلاً عزوجل لکھے' اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام پڑھنے کی حفاظت کرے اور بار بار پڑھنے سے نہ اکتائے' اگر اصل کتاب میں صلوٰۃ وسلام نہ ہو تو خود زبان سے پڑھے' اسی طرح صحابہ کرام کے ناموں کے ساتھ رضی اللہ عنہ اور علماء کے اسماء کے ساتھ رحمہ اللہ لکھے اور پڑھے' اور صرف صلوٰۃ یا سلام پر اختصار کرنا مکروہ ہے' ملا مسکین نے لکھا ہے: یہ مکروہ نہیں ہے' لیکن ان کی مراد یہ ہے کہ یہ مکروہ تحریمی نہیں ہے مکروہ تنزیہی بہر حال ہے' اسی طرح لکھتے وقت رمز اور اشارہ سے صلوٰۃ وسلام اور رضی اللہ عنہ لکھنا (مثلاً ص یا صلعم یا رض لکھنا) مکروہ ہے مکمل ''علیہ الصلوٰۃ والسلام'' اور ''رضی اللّٰہ عنہ'' لکھے' تاتارخانیہ کے بعض مقامات پر لکھا ہے کہ جس نے علیہ السلام کو ہمزہ اور میم کے ساتھ لکھا وہ کافر ہو جائے گا کیونکہ یہ تخفیف ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تخفیف کفر ہے' تاہم یہ کفر اس وقت ہوگا جب کوئی شخص تخفیف کے قصد سے ایسا کرے گا' بہر حال اس سے احتیاط لازم ہے۔ (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج ۱ ص ۶' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۵ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے فوائد اور حکمتیں

(۱) علامہ ابن جریر طبری نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء حسنیٰ کو مقدم کر کے ہمیں یہ ادب سکھایا ہے کہ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے تمام اقوال' افعال اور مہمات کو اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ سے شروع کیا کریں۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۳۸' مطبوعہ مطبعہ امیریہ کبری' بولاق' مصر' ۱۳۲۳ھ)

(۲) علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ کھانے' پینے' ذبح کرنے' جماع کرنے' وضو کرنے' کشتی میں سوار ہونے' غرض ہر (صحیح) کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ. (الانعام: ۱۱۸) تو اس (ذبیحہ) سے کھاؤ' جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا. اور نوح نے کہا: اس کشتی میں سوار ہو جاؤ' اس کا چلنا اور رکنا اللہ کے نام سے ہے۔ (ہود: ۴۱)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دروازہ بند کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھو' چراغ گل کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھو' برتن ڈھانکتے ہوئے بسم اللہ پڑھو اور مشک کا منہ بند کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھو اور فرمایا: اگر تم میں سے کوئی شخص عمل تزویج کے وقت کہے: بسم اللہ' اے اللہ! ہم کو شیطان سے محفوظ رکھ اور جو (اولاد) ہم کو عطا کرے اس کو بھی شیطان سے محفوظ رکھ' تو اگر اس عمل میں ان کے لیے اولاد مقدر کی جائے گی تو اس کو شیطان کبھی ضرر نہیں پہنچا سکے گا' اور آپ نے عمر بن ابی سلمہ سے فرمایا: اے بیٹے! بسم اللہ پڑھو اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ' اور آپ نے فرمایا: شیطان ہر کھانے کو حلال کر لیتا ہے ماسوا اس کھانے کے جس پر بسم اللہ پڑھی گئی ہو' حضرت عثمان بن ابی العاص نے آپ سے شکایت کی کہ جب سے وہ اسلام لائے ہیں ان کے جسم میں درد رہتا ہے' آپ نے فرمایا: تین بار بسم اللہ پڑھو اور سات بار یہ پڑھو' اعوذ بعزۃ اللہ وقدرتہ من شر ما اجد واحاذر'' یہ تمام احادیث صحیح ہیں' اور امام ابن ماجہ اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بنو آدم بیت الخلاء میں داخل ہوں تو ان کی شرم گاہوں اور شیاطین کے درمیان بسم اللہ حجاب ہے' اور امام دار قطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرتے تو پہلے بسم اللہ پڑھتے' پھر اپنے ہاتھوں پر پانی ڈالتے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ا ص ۹۸۔ ۹۷' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران)

(۳) ہر نیک اور صحیح کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کی انسان کو عادت پڑ جائے تو پھر اس کا برے کاموں سے باز رہنا زیادہ متوقع ہوگا' کیونکہ اگر وہ کسی وقت خواہش نفس سے مغلوب ہو کر برائی میں ہاتھ ڈالے گا تو عادۃً اس کے منہ سے بسم اللہ نکلے گی اور پھر اس کا ضمیر اس کو سرزنش کرے گا۔

(۴) انسان اسی کا نام بار بار لیتا ہے' جس سے اس کو محبت ہوتی ہے' اس لیے جو انسان ہر صحیح کام کے وقت بسم اللہ پڑھتا ہے یہ اس کی اللہ تعالیٰ سے محبت کی دلیل ہے۔

(۵) علامہ قرطبی لکھتے ہیں: سعید بن ابی سکینہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت علی نے ایک شخص کو ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھتے دیکھا تو فرمایا: اس کو خوبصورت لکھو' کیونکہ ایک شخص نے بسم اللہ کو خوبصورت لکھا تو اس کو بخش دیا گیا۔

(۶) سعید بن ابی سکینہ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے کاغذ کو دیکھا اس میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھی ہوئی تھی' اس نے اس کو اٹھا کر بوسہ دیا اور اس کو اپنی آنکھوں پر رکھا تو اس کی بخشش دیا گیا۔

(۷) بشر حافی پہلے ایک ڈاکو تھے' انہوں نے راستہ میں ایک کاغذ دیکھا جو لوگوں کے پیروں تلے آ رہا تھا' انہوں نے اس کاغذ کو اٹھایا تو اس میں اللہ تعالیٰ کا نام لکھا ہوا تھا' انہوں نے بہت قیمتی خوشبو خریدی اور اس کاغذ پر وہ خوشبو لگائی اور اس کو حفاظت کے ساتھ رکھ دیا' رات کو خواب میں انہوں نے سنا کوئی کہہ رہا تھا اے بشر! تم نے میرے نام کو خوشبو میں رکھا ہے' میں تم کو دنیا اور آخرت میں خوشبودار رکھوں گا۔ اس کے بعد انہوں نے توبہ کی اور ولی کامل بن گئے۔

(۸) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کے انیس فرشتوں سے نجات دے وہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھے تاکہ اللہ تعالیٰ بسم اللہ کے ہر حرف کے بدلہ اس کو جہنم کے ایک فرشتہ سے محفوظ رکھے کیونکہ بسم اللہ کے انیس حرف ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ا ص ۹۲۔ ۹۱' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران)

(۹) امام رازی لکھتے ہیں: روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنی انگوٹھی دی اور فرمایا: اس میں "لا الٰہ الا اللّٰہ" لکھواؤ' حضرت ابوبکر نے نقاش سے کہا: اس میں "لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ" لکھ دو' جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ انگوٹھی پیش کی تو اس میں لکھا ہوا تھا: "لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ ابوبکر صدیق" آپ نے پوچھا: اے ابوبکر! یہ زائد (کیسے لکھا ہوا ہے؟) حضرت ابوبکر نے کہا: یارسول اللہ! میں نے آپ کے نام کو اللہ تعالیٰ کے نام سے جدا کرنا پسند نہیں کیا اور باقی میں نے نہیں لکھوایا' اور حضرت ابوبکر اس پر شرمندہ تھے' تب جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا: یارسول اللہ! ابوبکر کا نام میں نے لکھا ہے کیونکہ جب ابوبکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کو اللہ عزوجل کے نام سے جدا کرنے پر راضی نہ تھے تو اللہ تعالیٰ' ابوبکر کے نام کو آپ کے نام سے جدا کرنے پر راضی نہ تھا اور اس میں سے نکتہ یہ ہے کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت کی وجہ سے آپ کے فراق کو گوارا نہ کرے وہ اللہ تعالیٰ کی عنایات کا مرکز بن جاتا ہے تو جو اللہ تعالیٰ سے محبت کی وجہ سے اس کے نام سے فراق نہ گوارا کرے اور ہر کام کے ساتھ اللہ کا نام لے وہ کب اللہ تعالیٰ کی عنایات سے محروم ہوگا!

(۱۰) حضرت نوح علیہ السلام نے "بسم اللّٰہ مجرھا و مرسھا" کہا تو طوفان سے نجات پالی' حالانکہ بسم اللہ "بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" کا نصف ہے تو جب ایک بار نصف بسم اللہ کے پڑھنے سے طوفان سے نجات مل گئی تو جو شخص ساری عمر بسم اللہ پڑھتا رہے' وہ نجات سے کیسے محروم ہوگا!

(۱۱) قیصر روم نے حضرت عمر کی طرف لکھا کہ اس کے سر میں درد رہتا ہے جس سے افاقہ نہیں ہوتا' میرے لیے کوئی دوا بھیج دیجئے' حضرت عمر نے اس کے پاس ایک ٹوپی بھیجی' وہ اس ٹوپی کو پہن لیتا تو آرام آجاتا اور اس ٹوپی کو اتار دیتا تو پھر سر میں درد شروع ہوجاتا' وہ حیران ہوا' اور ایک دن اس نے ٹوپی کو کھول کر دیکھا تو اس میں ایک کاغذ تھا جس میں لکھا ہوا تھا: "بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم"۔

(۱۲) بعض کفار نے حضرت خالد بن ولید سے کہا: آپ ہمیں اسلام کی دعوت دیتے ہیں' آپ ہمیں اسلام کی صداقت پر کوئی نشان دکھائیے تاکہ ہم بھی اسلام لے آئیں' حضرت خالد نے زہر منگایا اور "بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" پڑھ کر کھالیا اور اللہ تعالیٰ کے اذن سے صحیح سالم کھڑے رہے' مجوس نے کہا: واقعی یہ دین حق ہے۔

(۱۳) حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ایک قبر کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ عذاب کے فرشتے ایک مردہ کو عذاب دے رہے ہیں' جب اپنے کام سے واپس لوٹے تو اس قبر میں رحمت کے فرشتوں کو دیکھا جن کے پاس نور کے طباق تھے' حضرت عیسیٰ کو اس سے تعجب ہوا' انہوں نے نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی' اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ اے عیسیٰ! یہ شخص گنہ گار تھا اور جب یہ مرا تو عذاب میں مبتلا ہوگیا' مرتے وقت اس کی بیوی حاملہ تھی' اس کے بچہ ہوا' اس نے اس کو پالاحتیٰ کہ وہ بڑا ہوگیا' اس نے اس کو مکتب میں داخل کیا' وہاں اس کو معلم نے "بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" (ان کی زبان میں) پڑھائی تو مجھے حیا آئی کہ جو بچہ زمین کے اوپر میرا نام لے رہا ہے' اس کے باپ کو میں زمین کے نیچے عذاب میں مبتلا رکھوں!

(۱۴) سورۂ توبہ میں قتال کا ذکر ہے' لہٰذا اس سے پہلے بسم اللہ نہیں لکھی گئی' اور ذبح سے پہلے "بسم اللّٰہ ' اللّٰہ اکبر" کہا جاتا ہے "بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" نہیں کہا جاتا کیونکہ ذبح کے وقت رحمت کا ذکر مناسب نہیں ہے' تو جو شخص ہر روز سترہ مرتبہ فرض نمازوں میں "بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" پڑھے گا وہ کب عذاب میں مبتلا ہوگا۔

(تفسیر کبیر ج ۱ ص ۸۹۔ ۸۷ مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۳۹۸ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہےO (الفاتحہ: ۱)

حمد کے لغوی اور اصطلاحی معانی

علامہ جوہری لکھتے ہیں:

حمد' ذم کی نقیض ہے' تحمید' حمد سے زیادہ بلیغ ہے اور حمد شکر سے زیادہ عام ہے' جس شخص میں بہ کثرت خصال محمودہ ہوں اس کو محمد کہتے ہیں۔ (الصحاح ج ۲ ص ۴۶۶ مطبوعہ دارالعلم بیروت' ۱۴۰۴ھ)

علامہ فیروز آبادی لکھتے ہیں:

حمد کا معنی ہے: شکر' رضا' جزاء اور حق کو ادا کرنا' تحمید کے معنی ہیں: اللہ کی بار بار حمد کرنا' اور محمد کے معنی ہیں: جس کی بار بار حمد کی گئی ہو۔ (قاموس ج ۱ ص ۵۱۳۔ ۵۱۲' داراحیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۲ھ)

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

حمد مذمت کی نقیض ہے' ثعلب نے کہا: حمد کا تعلق نعمت اور غیر نعمت دونوں سے ہے اور شکر کا تعلق صرف نعمت سے ہے۔ لحیانی نے کہا: حمد شکر ہے اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے' اخفش نے کہا: ''الحمد للّٰہ'' کا معنی ہے: ''الشکر للّٰہ'' اور کہا: ''الحمد للّٰہ'' اللہ کی ثناء اور اس کی تعریف ہے' ازہری نے کہا: شکر صرف اس ثناء کو کہتے ہیں جو نعمت پر کی جاتی ہے' اور حمد بعض اوقات کسی کام کے شکر کو کہتے ہیں اور کبھی ابتداءً نعمت کے بغیر کسی شخص کی ثناء کو حمد کہتے ہیں' سو اللہ کی حمد اس کی ثناء ہے اور اس کی ان نعمتوں کا شکر ہے جو سب کو محیط ہیں' اور حمد شکر سے عام ہے۔

(لسان العرب ج ۳ ص ۱۵۵ مطبوعہ نشر ادب الحوذۃ' قم' ایران' ۱۴۰۵ھ)

علامہ ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:

حمد اور شکر متقارب ہیں اور ان میں حمد زیادہ عام ہے' کیونکہ تم انسان کی صفات ذاتیہ اور اس کی عطاء پر اس کی حمد (تعریف) کرتے ہو اور اس کی صفات ذاتیہ پر اس کا شکر نہیں ادا کرتے (مثلاً کسی کی سخاوت کی تعریف کرنا شکر ہے اور اس کے حسن کی تعریف کرنا شکر نہیں حمد ہے) حدیث میں ہے: حمد رئیس شکر ہے' جس شخص نے اللہ کی حمد نہیں کی اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا' حمد شکر کی رئیس اس لیے ہے کہ اس میں نعمت کا اظہار اور اس کو مشہور کرنا ہے اور حمد شکر سے عام ہے۔

(نہایہ ج ۱ ص ۴۳۷۔ ۴۳۶ مطبوعہ مؤسسۃ مطبوعاتی' ایران' ۱۳۶۴ھ)

علامہ میر سید شریف' حمد پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حمد: کسی خوبی کی بطور تعظیم ثنا کرنا خواہ کسی نعمت کی وجہ سے ہو یا اس کے بغیر۔

حمد قولی: زبان سے اللہ تعالیٰ کی وہ تعریف کرنا جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی زبانوں کے ذریعہ خود اپنی تعریف فرمائی ہے۔

حمد فعلی: اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے بدن سے نیک اعمال کرنا۔

حمد حالی: روح اور قلب کے اعتبار سے ثناء کرنا' مثلاً علمی اور عملی کمالات سے متصف ہونا' اور اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متخلق ہونا۔

حمد عرفی: منعم کے انعام کی وجہ سے کوئی ایسا فعل کرنا جس سے اس کی تعظیم ظاہر ہو' عام ازیں کہ زبان سے ہو یا دیگر

انقضاء ہے۔ (کتاب التعریفات ص ۲۲۔۴۱، مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر، ۱۳۰۶ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ کسی چیز کی غیر اختیاری خوبی پر اس کی تعریف کرنا مدح ہے، مثلاً یاقوت اور موتی کی خوبصورتی پر تعریف کرنا اور کسی شخص کے انعام اور احسان پر اس کی تعظیماً ثنا کرنا شکر ہے اور کسی کی اختیاری خوبی پر اس کی تعظیماً تعریف کرنا خواہ اس نے کوئی نعمت دی ہو یا نہ دی ہو، یہ حمد ہے۔ کائنات کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ جس کو اللہ نے کوئی نہ کوئی نعمت نہ دی ہو اس لیے اللہ تعالیٰ کی ہر ثنا اور ہر تعریف اس کا شکر ہے اور اس کی ہر حمد شکر کے ضمن میں ہے۔

تمام تعریفوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے استحقاق پر دلیل

"الحمد للّٰہ" میں الف لام یا استغراق کے لیے ہے یا جنس کے لیے ہے، اگر یہ لام استغراق ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ ہر حامد کی ہر زمانہ میں ہر حمد اللہ کا حق ہے اور اس کے ساتھ خاص ہے، اور اگر لام جنس کا ہو تو معنی یہ ہے کہ حمد کی ماہیت اور حقیقت اللہ کا حق اور اس کی ملک ہے، اور یہ اس کے منافی ہے کہ حمد کا کوئی فرد اللہ کے غیر کے لیے ثابت ہو، تو ہر دو طریقوں سے یہ معلوم ہوا کہ حمد صرف اللہ کا حق ہے کسی اور کا حق نہیں ہے، کیونکہ تعریف کسی حسن اور کمال کی ہوتی ہے اور تمام محاسن اور کمالات کا مبدا اللہ تعالیٰ ہے تو ثابت ہوا کہ تمام تعریفات کا مستحق بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ "للّٰہ" میں لام، یا اختصاص لائق کے لیے ہے یا ملک کے لیے ہے، پہلی صورت میں معنی یہ ہے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں، کیونکہ ہر چیز کو اس نے پیدا کیا ہے اور ہر چیز اس کے فضل اور احسان سے معمور ہے، دوسری صورت میں معنی یہ ہے کہ تمام تعریفوں کا اللہ ہی مالک ہے کیونکہ ہر چیز ہر حال میں اللہ کی مملوک ہے تو جس حال میں وہ حمد کرتے ہیں اس حال میں بھی وہ اللہ کی مملوک ہیں، لہٰذا وہ حمد بھی اللہ کی مملوک ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بہ ظاہر کسی پھول کی خوشبو کی تعریف کر رہا ہے، یا کسی عالم کے علم کی تعریف کر رہا ہے تو وہ درحقیقت اللہ ہی کی تعریف کر رہا ہے کیونکہ اس پھول میں خوشبو اور عالم میں علم کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس لیے یہ تعریف درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے اور اسی ایک جملہ سے مخلوق پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے کیونکہ جو شخص سورج کی، کسی نبی کی یا کسی دیوی اور دیوتا کی پرستش کرتا ہے وہ ان میں کسی خوبی اور کمال کو دیکھ کر ان کی پرستش کرتا ہے حالانکہ وہ کمال اور حسن ان کا اپنا ذاتی نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا اور اس کا عطا کردہ ہے اس لیے پرستش کا حق دار صاحب کمال نہیں ہے خالق کمال ہے۔

مخلوق کا شکر ادا کرنے سے پہلے خالق کا شکر ادا کیا جائے

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کیا محسن شکر یہ ادا کیے جانے کا مستحق نہیں ہے، امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۳۰۶، مطبوعہ مطبع مجتبائی، پاکستان، لاہور، ۱۴۰۵ھ)

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر محسن اور ہر منعم کا شکر ادا کرنا چاہیے اور ہم اس سے منع نہیں کرتے، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر نعمت درحقیقت اللہ تعالیٰ سے ملتی ہے، اس لیے کسی منعم کے انعام اور کسی محسن کے احسان پر اس کی تعریف کرنے اور اس کا شکر ادا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد کی جائے اور اس کا شکر ادا کیا جائے کیونکہ ہر نعمت اور ہر احسان درحقیقت اللہ کی دی ہوئی نعمت اور اس کا احسان ہے، مثلاً کسی بھوکے شخص کو بھوک سے بلبلاتے دیکھ کر کوئی شخص اس کو کھانا کھلا دیتا ہے، بہ ظاہر اس شخص کا احسان ہے، لیکن غور کیجئے اگر اللہ کھانا ہی پیدا نہ کرتا تو وہ شخص بھوکے کو کیسے کھلاتا، یا کھانا تو پیدا کیا تھا لیکن اس شخص کے پاس کھانا خریدنے کے لیے پیسے نہ ہوتے تو کہاں سے کھلاتا، کھانا بھی ہوتا، اس کے حصول کے لیے پیسے بھی ہوتے لیکن اس کے دل میں بھوکے کو دیکھ کر رحم نہ پیدا ہوتا تو بھوکے کو کب کھلا سکتا تھا، یہ سب کچھ ہوتا لیکن بھوکے آدمی میں کھانے کی صلاحیت نہ ہوتی مثلاً

اس کے منہ میں ناسور ہوتا' یا اوپر کا جبڑا نچلے جبڑے پر بیٹھ جانے کی وجہ سے اس کا منہ بند ہو گیا ہوتا تو وہ بھوکے کو کب کھلا سکتا تھا؟ تو نعمت بھی اس نے پیدا کی' نعمت کے حصول پر منعم کو قدرت بھی اس نے دی' نعمت دینے کے لیے منعم میں رحم کا جذبہ بھی اس نے پیدا کیا اور نعمت سے فائدہ اٹھانے کی منعم علیہ میں صلاحیت بھی اس نے پیدا کی' تو پھر حمد اور شکر کا کون مستحق ہو گا؟ اس لیے اولاً اسی کی حمد کی جائے اور اسی کا شکر ادا کیا جائے' اب یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے ظاہری وسائل اور اسباب کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور اس ظاہری منعم اور محسن کا بھی شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کماحقہٗ حمد وثنا سے مخلوق کا عاجز ہونا

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں لامحدود ہیں' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ (النحل: ۱۸) اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گنو تو انہیں گن نہ سکو گے۔

تو جب ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گن نہیں سکتے تو ان کا شکر کیسے ادا کر سکتے ہیں؟ نیز اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق اور قدرت کے بغیر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں ہو سکتا' اس لیے جب انسان کسی نعمت پر شکر ادا کرے تو اس شکر ادا کرنے کی توفیق اور قدرت پر بھی شکر ادا کرے' پھر اس دوسرے شکر کی توفیق پر شکر ادا کرے اور یوں ساری عمر ختم ہونے کے باوجود اس کی کسی ایک نعمت کا شکر ادا نہیں ہو سکتا' "تفسیر کبیر" میں منقول ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہی عرض کیا کہ خدایا! میں تو تیری ایک نعمت کا بھی شکر ادا نہیں کر سکتا کجا غیر متناہی نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے داؤد! جب تم نے یہ جان لیا کہ تم ہماری نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے عاجز ہو تو ہمارا شکر ادا ہو گیا' بس تم اپنی قدرت اور طاقت کے مطابق ہمارا شکر ادا کرتے رہو!

ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ بندے اس کی حمد کرنے سے عاجز ہیں اور اس کی استطاعت نہیں رکھتے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود اپنی حمد کی اور فرمایا: "الحمد لله رب العلمين" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کی نعمتوں کا عارف' اور اس کی حمد وثناء میں رطب اللسان رہنے والا کون ہو سکتا ہے! اس کے باوجود آپ بارگاہِ الٰہیہ میں عرض کرتے ہیں: "لا احصی ثناء علیك انت كما اثنيت على نفسك. میں تیری ایسی ثنا نہیں کر سکا جیسی ثنا تو خود اپنی کرتا ہے"۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۹۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اللہ کی حمد کرنے کے احوال اور اوقات

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کلام کی ابتداء "الحمد لله" سے نہیں کی جائے گی وہ ناتمام رہے گا۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۳۰۹' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس مہتم بالشان کام کی ابتداء "الحمد لله" سے نہیں کی گئی وہ ناتمام رہے گا۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۳۶' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومن کا کیسا نصیب رکھا ہے! اس کو اگر بھلائی پہنچتی ہے تو اپنے رب کی حمد کرتا ہے اور اس کا شکر ادا کرتا ہے اور اگر اس کو

مصیبت پہنچتی ہے تو اپنے رب کی حمد کرتا ہے اور صبر کرتا ہے۔

(مسند احمد ج ۲ ص ۱۸۲ ـ ۱۷۷ ـ ۱۷۳ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۳۹۸ ھ)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب ایک بندہ کا بچہ فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے: تم نے میرے بندہ کا بچہ اٹھالیا؟ وہ کہتے ہیں: ہاں! اللہ فرماتا ہے: تم نے اس کے دل کا ٹکڑا اٹھالیا' وہ کہتے ہیں: ہاں! اللہ فرماتا ہے: میرے بندہ نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں: تیری حمد کی اور "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھا' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندہ کے لیے جنت میں ایک گھر بنادو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔

(جامع ترمذی ص ۱۶۶ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۴۱۵ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۳۹۸ ھ)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کھاتے یا پیتے تو دعا کرتے: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہم کو کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔ (جامع ترمذی ص ۴۹۹ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کھانا کھا کر کہا: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں' جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا اور مجھ کو بغیر کوشش اور طاقت کے یہ رزق دیا' تو اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کردیے جائیں گے۔ (جامع ترمذی ص ۴۹۹ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: جب تم میں سے کوئی شخص اپنا پسندیدہ خواب دیکھے تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس پر "الحمد للہ" کہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۳۴ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کسی شخص کو چھینک آئے تو وہ "الحمد للہ" کہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۱۹ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی ۱۳۸۱ ھ)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سونے کا ارادہ کرتے تو دعا کرتے: اے اللہ! میں تیرے نام سے مرتا ہوں اور زندہ ہوتا ہوں اور جب بیدار ہوتے تو دعا کرتے: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے میرے نفس پر موت وارد کرنے کے بعد اس کو زندہ کیا' اور اسی کی طرف اٹھنا ہے۔

(جامع ترمذی ص ۴۹۲ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی ٹیلے یا کسی بلندی پر چڑھتے تو فرماتے: اے اللہ! ہر بلندی سے زیادہ بلندی تیرے لیے ہے' اور ہر حمد سے بالا حمد تیرے لیے ہے۔

(مسند احمد ج ۳ ص ۱۲۷ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۳۹۸ ھ)

اللہ کی حمد کی فضیلت اور اجر و ثواب

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پاکیزگی نصف ایمان ہے' "الحمد للّٰہ" میزان کو بھر دیتا ہے اور "سبحان اللّٰہ" اور "الحمد للّٰہ" آسمان اور زمین کے درمیان کو بھر دیتے ہیں۔

(صحیح مسلم ج ١ ص ١١٨' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ١٣٧٥ھ)

یعنی "الحمد للّٰہ" یا اس کے اجر کو اگر مجسم کیا جائے تو اس سے میزان بھر جائے گی' "سبحان اللّٰہ" سے مراد اللہ کی تنزیہ ہے اور "الحمد للّٰہ" سے مراد اس کی ثناء ہے گویا آسمان اور زمین کے درمیان ہر چیز اللہ تعالیٰ کے نقص سے بری ہونے اور اس کی تعریف اور ثناء پر دلالت کرتی ہے۔

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن کے بعد چار کلام افضل ہیں اور وہ بھی قرآن سے ہیں' تم ان میں جس سے بھی ابتداء کرو کوئی مضائقہ نہیں ہے "سبحان اللّٰہ' الحمدللّٰہ' لاالٰہ الا اللّٰہ" اور "اللّٰہ اکبر"۔ (مسند احمد ج ٥ ص ٢٠' ج ٣ ص ٣٦' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ١٣٩٨ھ)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے سو مرتبہ صبح اور سو مرتبہ شام کو "سبحان اللّٰہ" کہا اس نے گویا سو حج کیے اور جس نے سو مرتبہ صبح اور سو مرتبہ شام کو "الحمد للّٰہ" کہا اس نے گویا جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سو گھوڑے مہیا کیے۔ (جامع ترمذی ص ٥٠٠' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس نے کہا: "الحمد للّٰہ" شکر ہے' اللہ کی فرمانبرداری کرنا ہے اور اس کی نعمت اور ہدایت کا اقرار کرنا ہے۔ (جامع البیان' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ١٤٠٩ھ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم کہتے ہو: "الحمد للّٰہ رب العلمین" تو تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہو اور وہ تم کو زیادہ نعمت دے گا۔ (جامع البیان ج ١ ص ٤٦' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ١٤٠٩ھ)

اسود بن سریع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو حمد سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں ہے اسی لیے اس نے اپنی حمد کی اور فرمایا: "الحمد للّٰہ"۔ (جامع البیان ج ١ ص ٤٦' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ١٤٠٩ھ)

علامہ قرطبی بیان کرتے ہیں:

امام مسلم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بندہ کی اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ وہ کچھ کھائے تو اللہ کی حمد کرے اور کچھ پیے تو اللہ کی حمد کرے۔

حسن بصری نے کہا: ہر نعمت کی بہ نسبت "الحمد للّٰہ" کہنا افضل ہے۔

امام ابن ماجہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب کوئی بندہ اللہ کی دی ہوئی کسی نعمت پر "الحمد للّٰہ" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس سے افضل نعمت عطا فرماتا ہے۔

"نوادر الاصول" میں حضرت انس بن مالک کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے: اگر کسی کو تمام

دنیا دے دی جائے پھر اس کو "الحمد للہ" کہنے کی توفیق دی جائے تو "الحمد للہ" کہنے کی نعمت تمام دنیا سے افضل ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۱۳۱ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

خود اپنی حمد و ثنا کرنے کی شرعی نوعیت

جس طرح کبریائی صرف اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے اور انسان کے لیے تکبر کرنا حرام ہے 'اسی طرح انسان کا عیوب سے اپنی تنزیہہ اور محاسن سے خود اپنی حمد و ثناء کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے' کیونکہ تسبیح اور تنزیہہ اور حمد و ثنا اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے' اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خودستائی سے منع فرمایا ہے اور اس کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝ (النجم: ۳۲) خودستائی نہ کرو' پرہیزگاروں کو وہی زیادہ جانتا ہے ۝

تزکیہ کا معنی ہے: عیوب اور قبائح سے منزہ کرنا یعنی نہ عیوب سے اپنی براءت بیان کرو نہ اپنے محاسن بیان کرو۔

علامہ آلوسی اس آیت کے شان نزول میں لکھتے ہیں:

یہ آیت ان مسلمانوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو نیک اعمال کرتے' پھر اپنی نمازوں' اور حج کا ذکر کرتے تھے۔

(روح المعانی ج ۲۷ ص ۶۴ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ جب یہود و نصاریٰ نے اپنی تعریف کی اور یہ کہا: "نحن ابناء اللہ و احباءہ ۝" "ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں اور بعض روایات میں ہے کہ یہودیوں نے کہا: ہم بچوں کی طرح گناہوں سے پاک ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ . (النساء: ۴۹) کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا جو اپنی پاکیزگی کا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جسکو چاہتا ہے پاکیزہ بنا دیتا ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۵ ص ۲۴۶ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

ابن عطا کہتے ہیں: میں نے اپنی بیٹی کا نام برہ (نیکوکارہ) رکھا' مجھ سے حضرت زینب بنت ابی سلمہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام سے منع فرمایا ہے' میرا نام پہلے برہ تھا' (یعنی نیکی کرنے والی) تو میرا نام زینب رکھا گیا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم خودستائی نہ کرو' اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ تم میں سے نیکی کرنے والا کون ہے' صحابہ نے پوچھا: پھر ہم اس کا کیا نام رکھیں؟ آپ نے فرمایا: اس کا نام زینب رکھو۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۰۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

قرآن مجید کی ان آیات اور اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ انسان کا خود اپنی تعریف اور حمد و ثنا کرنا اور اپنے آپ کو عیوب اور قبائح سے بری اور پاک دامن کہنا' اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ناپسندیدہ ہے' تسبیح اور تنزیہہ اور حمد و ثنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کو زیبا ہے' وہی ہر عیب اور نقص سے پاک ہے اور وہی تمام خوبیوں اور کمالات کا جامع ہے اور وہی تمام تعریفوں اور حمد و ثنا کا مستحق ہے۔

تاہم اگر کسی غرض صحیح کی وجہ سے انسان اپنی تعریف کرے تو یہ جائز ہے جیسے حضرت عثمان نے باغیوں کے سامنے اپنی تعریف و توصیف کی تاکہ وہ باغی بغاوت سے باز آجائیں اور ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

ابوعبدالرحمان سلمی بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمان کا محاصرہ کرلیا گیا تو انہوں نے اپنے گھر کی چھت سے ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر یاد دلاتا ہوں کہ جب جبل حراء ہلنے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے حراء! پرسکون ہو جا! کیونکہ تجھ پر صرف نبی ہے یا صدیق ہے یا شہید ہے' باغیوں نے کہا: ہاں! آپ نے کہا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر یاد دلاتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک کے لیے یہ فرمایا تھا' اس کے لیے کون مقبول خرچ مہیا کرتا ہے؟ اس وقت مسلمان سخت مشکل اور تنگ دستی میں تھے تو میں نے اس لشکر کے لیے زادِ راہ مہیا کیا' باغیوں نے کہا: ہاں! پھر آپ نے کہا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر یاد دلاتا ہوں کیا تمہیں علم ہے کہ چاہ رومہ (ایک کنواں) سے صرف قیمت دے کر پینے کے لیے پانی حاصل کیا جاتا تھا' میں نے اس کنویں کو خرید کر امیروں' غریبوں اور مسافروں کے لیے وقف کر دیا' باغیوں نے کہا: ہاں! اس کے علاوہ اور بہت سی نیکیاں حضرت عثمان نے گنوائیں۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(جامع ترمذی ص ۵۳۱۔ ۵۳۰ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

نیز امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

ثمامہ بن حزن قشیری بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان نے باغیوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: میں تم کو اللہ کی اور اسلام کی قسم دیتا ہوں کیا تم کو علم ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آئے تو چاہ رومہ کے سوا اور کوئی میٹھے پانی کا کنواں نہیں تھا' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی ہے جو چاہ رومہ کو خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دے؟ اور اس نیکی کے عوض میں جنت لے لے! میں نے اس کنویں کو خالص اپنے مال سے خریدا اور آج تم مجھ کو اس کنویں کا پانی پینے نہیں دیتے! حتیٰ کہ میں سمندر کا کھارا پانی پی رہا ہوں! باغیوں نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: میں تم کو اللہ کی اور اسلام کی قسم دیتا ہوں کیا تم کو علم ہے کہ مسجد نبوی میں جگہ کم تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی ہے جو فلاں شخص سے زمین خرید کر اس مسجد کو وسیع کرے؟ اور اس نیکی کے عوض جنت لے لے! پھر اس جگہ کو میں نے اپنے خالص مال سے خریدا تھا اور آج تم مجھے اس میں دو رکعت نماز پڑھنے نہیں دیتے! باغیوں نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: میں تم کو اللہ کی اور اسلام کی قسم دیتا ہوں کیا تم کو علم ہے کہ غزوہ تبوک کے لیے میں نے اپنے مال سے خرچ مہیا کیا تھا' انہوں نے کہا: ہاں! آپ نے پھر فرمایا: میں تم کو اللہ کی اور اسلام کی قسم دیتا ہوں کیا تم کو علم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں جبل ثبیر پر کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر' حضرت عمر تھے اور میں تھا' اس وقت پہاڑ ہلنے لگا' حتیٰ کہ اس کے پتھر نیچے گرنے لگے' تو آپ نے اس پر اپنا پیر مارا اور فرمایا: اے ثبیر! ساکن ہو جا! تجھ پر نبی ہے' صدیق ہے اور دو شہید ہیں' باغیوں نے کہا: ہاں! آپ نے تین بار فرمایا: اللہ اکبر! خدا کی قسم! ان باغیوں نے میرے حق میں گواہی دے دی اور میں شہید ہوں۔ (جامع ترمذی ص ۵۳۱ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت عثمان نے باغیوں کے سامنے اپنی حمد و ثنا اس لیے کی تھی کہ یہ باغی اسلام کے لیے حضرت عثمان کی خدمات اور بارگاہ رسالت میں ان کے مقام کو پہچان کر بغاوت سے باز آجائیں' تو ایسی کوئی غرض صحیح ہو مثلاً غاصبوں کے سامنے اپنا استحقاق ثابت کرنے کے لیے یا محض اللہ تعالیٰ کے انعامات بیان کرنے کے لیے اپنی تعریف کی جائے اور اس سے اپنی بڑائی کا اظہار کرنا مقصود نہ ہو تو پھر اپنی تعریف کرنا جائز ہے اور اگر حمد و ثنا سے اپنی بڑائی کا اظہار کرنا مقصود ہو تو اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں' حمد و ثناء اور کبریائی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور اسی کو زیبا ہے۔

کسی دوسرے شخص کے سامنے اس کی حمد وثنا کرنے کی شرعی نوعیت

جس طرح بغیر کسی غرض صحیح کے خود اپنی تعریف کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے اسی طرح کسی غرض صحیح کے بغیر کسی دوسرے شخص کے سامنے اس کی تعریف کرنا بھی مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص نے کسی کی تعریف کی' آپ نے فرمایا: تم پر افسوس ہے تم نے تو اپنے صاحب کی گردن کاٹ دی' یہ جملہ آپ نے کئی بار فرمایا: جب تم میں سے کسی شخص نے اپنے صاحب کی لامحالہ تعریف کرنی ہو' تو یوں کہو کہ میرا فلاں کے متعلق یہ گمان ہے اور اس کو حقیقت میں اللہ ہی جاننے والا ہے' اور میں کسی کو اللہ کے نزدیک سراہا ہوا نہیں کہتا' خواہ وہ اس کے متعلق اسی طرح جانتا ہو۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کا ذکر کیا گیا' ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص فلاں فلاں چیز میں اس سے افضل نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم پر افسوس ہے! تم نے اپنے صاحب کی گردن کاٹ دی۔ یہ جملہ آپ نے کئی بار فرمایا' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم میں سے کسی شخص نے خواہ مخواہ اپنے بھائی کی تعریف کرنی ہو' تو یہ کہے: میرا فلاں کے متعلق یہ گمان ہے خواہ وہ اس کو اسی طرح سمجھتا ہو اور وہ یہ نہ کہے کہ وہ اللہ کے نزدیک ایسا ہی ہے۔

(صحیح مسلم ج ٢ ص ٤١٤ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ١٣٧٥ھ)

ان احادیث میں کسی شخص کے سامنے اس کی تعریف سے منع کیا گیا ہے اور بعض احادیث سے اس کا جواز بھی ثابت ہے'

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں فرمایا کہ اللہ سبحانہ نے ایک بندے کو دنیا اور جو اس کے پاس ہے' اس کے درمیان اختیار دیا تو اس نے اس چیز کو اختیار کرلیا جو اللہ کے پاس ہے' حضرت ابوبکر یہ سن کر رونے لگے' حضرت ابوسعید کہتے ہیں: میں نے دل میں سوچا: اگر اللہ نے ایک بندے کو دنیا اور جو اس کے پاس ہے اس کے درمیان اختیار دے دیا ہے اور اس نے جو اللہ کے پاس ہے اس کو پسند کرلیا تو اس بوڑھے کو کیا چیز رلاتی ہے؟ لیکن آپ کے اس ارشاد میں بندے سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور حضرت ابوبکر ہم سب سے زیادہ عالم تھے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! مت روؤ! بے شک اپنی صحبت اور مال سے مجھ پر سب سے زیادہ احسان کرنے والے ابوبکر ہیں' اور اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن اسلام کی اخوت اور محبت قائم رہے گی' اور ابوبکر کے دروازے کے سوا مسجد میں (کھلنے والا) ہر دروازہ بند کردیا جائے' باقی نہ رکھا جائے۔

(صحیح بخاری ج ١ ص ٥١٦' ٦٧' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ١٣٨١ھ)

اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ (جامع ترمذی ص ٥٢٦۔ ٥٢٥ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان کے سامنے بھی ان کی تعریف کی ہے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان احد (پہاڑ) پر چڑھے' وہ ہلنے لگا' آپ نے فرمایا: اے احد ساکن ہوجا! تجھ پر صرف نبی' صدیق اور دو شہید ہیں۔

(جامع ترمذی ص ۵۳۰ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اور آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی ان کی تعریف کی ہے' امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا: تم میرے لیے ایسے ہو جیسے حضرت موسیٰ کے لیے ہارون تھے مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ (جامع ترمذی ص ۵۳۵ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت' کراچی)

منہ پر تعریف کرنے کے جواز اور عدم جواز کا محمل

امام مسلم نے ایسی احادیث ذکر کی ہیں' جن میں کسی کے سامنے اس کی تعریف کرنے سے منع کیا گیا ہے' جبکہ "معجم طبرانی" میں ایسی روایات ہیں جن میں کسی کے سامنے تعریف کرنے کی اجازت ہے اور صحاح ستہ میں بکثرت ایسی روایات ہیں جن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کے سامنے ان کی تعریف کی ہے' اس لیے علماء کرام نے ان احادیث میں یہ تطبیق دی ہے کہ اگر کسی کے سامنے اس کی تعریف کرنے سے اس کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہو تو پھر اس کے سامنے اس کی تعریف نہ کی جائے اور اگر یہ خدشہ نہ ہو تو پھر اس کے سامنے اس کی تعریف جائز ہے۔

علامہ یحییٰ بن شرف نووی لکھتے ہیں:

امام مسلم نے وہ احادیث ذکر کی ہیں' جن میں کسی کے منہ پر تعریف کرنے سے منع کیا گیا ہے' صحیح بخاری' صحیح مسلم اور بکثرت کتب حدیث میں ایسی روایات بھی ہیں جن میں منہ پر تعریف کی گئی ہے' ان احادیث میں تطبیق اس طرح ہے کہ کسی کی بے جا تعریف کرنا یا تعریف میں مبالغہ کرنا' یا دنیاوی طمع کی وجہ سے تعریف کرنا یا جس شخص کے متعلق یہ اندیشہ ہے کہ وہ تعریف سن کر اکڑ جائے گا یا تکبر میں مبتلا ہو جائے گا' اس کے منہ پر تعریف کرنا منع نہیں ہے' اور جس شخص کے کمال تقویٰ اور عقل میں پختگی کی وجہ سے یہ خدشہ نہ ہو اس کے منہ پر تعریف کرنا منع نہیں ہے' بہ شرطیکہ وہ بے جا تعریف نہ ہو اور دنیاوی طمع کی وجہ سے نہ ہو' بلکہ اگر کسی دینی مصلحت کی وجہ سے تعریف کی جائے یا کسی شخص میں کسی نیک خصلت کے حصول یا اس کی زیادتی کے لیے یا اس کو اس نیک خصلت پر برقرار رکھنے کے لیے یا اس نیک خصلت کی اقتداء کے لیے اس کے منہ پر تعریف کی جائے تو یہ تعریف کرنا مستحب ہے۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۴۱۴ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی ۱۳۷۵ھ)

علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

علامہ ابن بطال نے کہا ہے کہ ممانعت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص کسی کی ان اوصاف کے ساتھ تعریف کرے گا جو اس میں نہ ہوں تو ہو سکتا ہے کہ وہ شخص اپنے متعلق ان اوصاف کا یقین کر لے اور ان اوصاف پر اعتماد کر کے وہ شخص اپنے اعمال ضائع کر دے اور نیکی کی جدوجہد کرنا چھوڑ دے (مثلاً ایک شخص کسی سے کہے: میں نے تم کو خواب میں بارگاہ رسالت میں دیکھا ہے' اور تمہارے جنتی ہونے کی بشارت سنی ہے یا کہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ جو تمہارے ہاتھ پر بیعت کرے گا وہ جنتی ہوگا' یا جو تمہارے وعظ میں شریک ہوگا وہ جنتی ہوگا۔ العیاذ باللہ) اس لیے جس حدیث میں یہ ہے کہ تعریف کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈال دو' اس کا مطلب یہ ہے کہ جھوٹی تعریف کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈال دو اور جس شخص نے ان اوصاف کے ساتھ تعریف کی جو موصوف میں موجود ہوں تو وہ اس حکم میں داخل نہیں ہے' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے اشعار اور خطاب میں آپ کی تعریف کی اور آپ نے ان کے منہ میں مٹی نہیں ڈالی۔ علامہ ابن بطال کا کلام ختم ہوا۔

امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ کسی شخص نے حضرت عثمان کے سامنے ان کی تعریف کی تو حضرت مقداد نے اس کے منہ

پر کنکریاں پھینکیں اور مذکور الصدر حدیث سے استدلال کیا' اس حدیث کا دوسرا محمل یہ ہے کہ منہ پر مٹی ڈالنے کا مطلب ہے اس کو ناکام اور نامراد کرنا یعنی جھوٹی تعریف کرنے والے کی غرض اور مقصد کو پورا نہ کرو' تیسری توجیہ یہ ہے کہ اس سے کہو: تمہارے منہ میں مٹی' چوتھی توجیہ یہ ہے کہ ممدوح اور موصوف اس جھوٹی تعریف سے دھوکا نہ کھائے اور تعریف کرنے والے سے کہے: تم غلط کہہ رہے ہو میں ایسا نہیں ہوں' اور یہ اس کے منہ میں مٹی ڈالنا ہے' پانچویں توجیہ یہ ہے کہ وہ شخص جس مقصد اور غرض سے تعریف کر رہا ہے اس کا وہ مقصد پورا کر کے اس کا منہ بند کر دیا جائے اور اس کو روانہ کر دیا جائے' مثلاً کوئی شخص کسی سے کچھ رقم مانگنے کے لیے اس کی بے جا تعریف کر رہا ہے تو وہ اس کو وہ رقم دے کر کہے: یہ رقم لو اور جاؤ' اور یہ اس کے منہ کو بند کرنا ہے جو اس کے منہ میں مٹی ڈالنے کے مترادف ہے' علامہ بیضاوی اور علامہ طیبی نے اسی توجیہ کو اختیار کیا ہے۔

امام غزالی نے ''احیاء العلوم'' میں لکھا ہے کہ مدح کی آفت یہ ہے کہ مدح کرنے والا کبھی جھوٹ بولتا ہے اور کبھی اپنی مدح سے ممدوح کو مزید برائی میں مبتلا کرتا ہے' خصوصاً جب وہ فاسق یا ظالم کی مدح کرے' امام ابو یعلیٰ نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ جب فاسق کی مدح کی جائے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے' اور کبھی وہ ایسی تعریف کرتا ہے جو اس کے نزدیک محقق نہیں ہوتی' اور جس شخص کی مدح کی جائے وہ اس خطرہ سے خالی نہیں ہے کہ وہ اترانے لگے یا تکبر کرے یا تعریف کی شہرت پر اعتماد کر کے عمل میں کمی کر دے' اگر تعریف ان قباحتوں سے خالی ہو تو پھر اس میں حرج نہیں ہے بلکہ بعض اوقات تعریف مستحب ہوتی ہے' ابن عیینہ نے کہا: جو شخص اپنے نفس کو پہچانتا ہو اس کو کسی کی تعریف سے ضرر نہیں ہوتا اور بعض سلف نے کہا: جب کسی کے منہ پر تعریف کی جائے تو وہ دعا کرے: اے اللہ! میرے ان کاموں کو بخش دے جن کو یہ لوگ نہیں جانتے اور ان کی تعریف کی وجہ سے میری پکڑ نہ کر اور مجھے ان کے گمان سے بہتر بنا دے۔ (فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۷۸۔ ۴۷۷' مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ لاہور)

رب کا لغوی اور شرعی معنی

علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

الرب اللہ عزوجل ہے' اور وہ ہر چیز کا رب ہے' یعنی ہر چیز کا مالک ہے' اور تمام مخلوق اس کی ملک میں ہے' اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور وہ ''رب الارباب'' اور ''مالك الملوك'' ہے' ابو منصور نے کہا: لغت میں مالک' سید' مدبر اور مہتمم پر رب کا اطلاق ہوتا ہے اور جب اس پر الف لام ہو (الرب) تو پھر اس کا اللہ عزوجل کے غیر پر اطلاق نہیں ہوتا' اور جب اللہ تعالیٰ کے غیر پر رب کا اطلاق کیا جائے تو پھر اس کی کسی چیز کی طرف اضافت کی جاتی ہے جیسے ''رب الدار'' (مکان کا مالک)' حدیث میں علامات قیامت کے ذکر میں ہے: ''ان تلد الامة ربتها. باندی اپنی مالکہ کو جنم دے گی'' یعنی بہت زیادہ باندیاں ہوں گی' اور اذان کی دعا میں ''اللهم رب هذه الدعوة. اے اس نداء کے صاحب'' اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کوئی مملوک اپنے مالک کو میرا رب نہ کہے' آپ نے اس کو ناپسند کیا کہ مالک کو رب قرار دے کر اس کو ربوبیت میں اللہ کے ساتھ شریک کیا جائے۔ قرآن مجید میں ہے: ''اذكرني عند ربك'' حضرت یوسف علیہ السلام نے قیدی سے کہا: تم اپنے رب کے سامنے میرا ذکر کرنا' اور یہاں عزیز مصر پر رب کا اطلاق کیا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ کلام اس زمانہ اور ان لوگوں کے عرف کے مطابق تھا' اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گم شدہ اونٹ کے متعلق فرمایا: ''حتى يلقاها ربها. اونٹ چرتا پھرے گا حتیٰ کہ اپنے رب (مالک) سے مل جائے گا'' کیونکہ جانور عبادت کرتے ہیں نہ احکام کے مخاطب ہوتے ہیں' بلکہ جانور مال و متاع کے حکم میں ہیں اور جس طرح رب الدار وغیرہ کی اضافت جائز ہے اسی طرح ان کی طرف اضافت بھی جائز ہے' اور حضرت یوسف علیہ السلام نے جو فرمایا تھا: ''انه ربي احسن مثواي. بے شک وہ عزیز مصر

میرا صاحب ہے اس نے مجھے اچھی رہائش دی ہے۔'' یہاں بھی صاحب پر رب کا اطلاق ان کے عرف کے مطابق ہے یا اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے اچھی رہائش دی ہے رب کی جمع ارباب اور ربوب ہے اور راسخ عالم یا عالم باعمل یا بہت بڑے عالم کو ربانی کہتے ہیں جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فوت ہوئے تو محمد بن حنفیہ نے کہا: آج اس امت کے ربانی فوت ہو گئے۔ (تاج العروس ج ۱ ص ۲۶۰ مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۰۶ ھ)

العلمین کا لغوی اور عرفی معنی

علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

عالم، خاتم، طابق اور دانق کے وزن پر ہے اس کا معنی ہے: کل مخلوق اسی طرح صحاح میں ہے یا آسمان اور اس کے نیچے جو جواہر اور اعراض ہیں وہ عالم ہیں جس طرح خاتم مہر لگانے کا آلہ ہے اسی طرح عالم اسم آلہ ہے اس کا معنی ہے موجد کو جاننے کا آلہ حضرت جعفر صادق نے کہا: عالم کی دو قسمیں ہیں عالم کبیر اور عالم صغیر۔ آسمان اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ عالم کبیر ہے اور انسان عالم صغیر ہے اور انسان میں وہ سب کچھ ہے جو عالم کبیر میں ہے۔ ہمارے شیخ نے کہا ہے کہ مخلوق کو عالم اس لیے کہتے ہیں کہ وہ صانع پر علامت ہے بعض مفسرین نے کہا: عالم اس کو کہتے ہیں جس سے خالق کا علم حاصل ہو پھر بہ طور تغلیب جن اور انس میں سے عقلاء پر اس کا اطلاق کیا گیا' یا جن اور انس پر' یا انسان اور فرشتوں پر' اور سید شریف کا مختار یہ ہے کہ اس کا اطلاق ہر جنس پر کیا جاتا ہے' اور تمام اجناس کے مجموعہ پر بھی کیا جاتا ہے۔

زجاج نے کہا: عالم کا اس لفظ سے کوئی واحد نہیں ہے اور اس کے علاوہ اور کسی لفظ کی جمع واؤ اور نون (عالمون یا عالمین) کے ساتھ نہیں آتی'' بصائر'' میں مذکور ہے کہ اس کی جمع اس لیے آتی ہے کہ موجودات کی ہر نوع ایک عالم ہے مثلاً عالم انسان' عالم نار' وغیرہ اور روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دس ہزار سے زیادہ عالم پیدا کئے ہیں اور اس کی جمع سالم اس لیے آتی ہے کہ انسان بھی عالم کا ایک فرد ہے (ورنہ غیر ذوی العقول کی جمع' جمع مکسر ہوتی ہے) ایک قول یہ ہے کہ اس کی جمع سالم اس لیے آتی ہے کہ اس سے مراد مخلوق کی اصناف میں سے صرف ملائکہ' جن اور انس ہیں اور دوسرے غیر ذوی العقول یا غیر ذوی العلوم اس سے مراد نہیں ہیں' یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے' جعفر صادق نے کہا: اس سے صرف انسان مراد ہے اور ہر انسان ایک عالم ہے' میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس نے'' رب العلمین'' کی تفسیر میں کہا:'' رب الجن و الانس'' اور قتادہ نے اس کی تفسیر میں کہا: تمام مخلوق کے رب' ازہری نے کہا: حضرت عباس کے قول کی دلیل یہ آیت ہے:

لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِينَ نَذِيرًا ۙ (الفرقان: ۱) تاکہ آپ عالمین کے لیے نذیر ہو جائیں O

اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم جانوروں اور فرشتوں کے لیے نذیر نہیں ہیں حالانکہ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں' آپ صرف جن اور انس کے لیے مبعوث ہوئے ہیں' اور وھب بن منبہ سے مروی ہے کہ کل اٹھارہ ہزار عالم ہیں اور یہ دنیا ان میں سے ایک عالم ہے۔ (تاج العروس ج ۸ ص ۴۰۷ مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۰۶ ھ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

حضرت ابو سعید خدری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے چالیس ہزار عالم پیدا کئے اور یہ دنیا شرق سے غرب تک ایک عالم ہے' مقاتل نے کہا: اسی ہزار عالم ہیں' چالیس ہزار خشکی میں ہیں اور چالیس ہزار سمندر میں' ابو العالیہ سے مروی ہے کہ جن ایک عالم ہے' انس ایک عالم ہے' ان کے سوا زمین کے چار زاویے ہیں اور ہر زاویہ میں پندرہ سو عالم ہیں۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۱۳۸ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ ھ)

العلمین کے متعلق اقوال میں مصنف کا مختار

میں کہتا ہوں کہ ان تمام اقوال میں صحیح قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر موجود عالم ہے' اور مخلوق عالم میں شامل ہے' اور اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے:

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ○ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَہُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ○ (الشعراء: ۲۳۔۲۴)

فرعون نے کہا: رب العلمین کیا ہے؟○ (موسیٰ نے) کہا: وہ آسمانوں' زمین اور ان کے درمیان ہر چیز کا رب ہے' اگر تم یقین کرنے والے ہو○

اس آیت میں یہ تصریح ہے کہ تمام آسمان' زمینیں اور ان کے درمیان ہر چیز عالم ہیں' اور اس کی جمع عالم کی انواع اور اصناف کے اعتبار سے لائی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تربیت میں غور وفکر

ایک بیج زمین میں گرا دیا جاتا ہے' پھر زمین میں وہ پھول جاتا ہے' پھولنے کے بعد وہ ہر طرف سے پھٹ سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کی وجہ سے وہ صرف اوپر اور نیچے سے پھٹتا ہے' اوپر سے پھٹ کر اس میں سے ایک جز زمین کو پھاڑ کر نکلتا ہے اور درخت بن جاتا ہے' اس میں شاخیں پھوٹتی ہیں' پھر ان شاخوں میں پھول کھلتے ہیں اور پھل بنتے ہیں اور پھلوں میں چھلکا بنتا ہے' مغز بنتا ہے اور مغز میں روغن ہوتا ہے' اور بیج کے نیچے سے جو جز زمین کو پھاڑ کر نکلتا ہے وہ جڑ بنتی ہے اور زمین کی گہرائی میں راستہ بناتی ہوئی وہ جڑیں نکل جاتی ہیں اور مٹی اور پانی سے اپنی طبعی غذا حاصل کر کے پورے درخت کو پہنچاتی ہیں اور اس کو سرسبز اور شاداب رکھتی ہیں۔

باپ کی پشت سے ایک قطرہ نکل کر ماں کے رحم میں پہنچتا ہے' پھر وہ قطرہ پہلے جما ہوا خون بن جاتا ہے' پھر گوشت کا ٹکڑا' پھر اس میں ہڈیاں' رگیں اور مختلف اعضاء بنتے ہیں' پھر ان میں الگ الگ اثرات کی قوتیں رکھی جاتی ہیں' آنکھ میں دیکھنے کی' کان میں سننے کی اور زبان میں گویائی کی قوت رکھی جاتی ہے تو سبحان ہے وہ جس نے ہڈی میں سماعت' چربی میں بصارت اور گوشت کے ایک ٹکڑے میں گویائی رکھی!

ماں باپ کے دل میں ایسا جذبہ رکھا کہ انہوں نے اپنے سکھ اور آرام کو چھوڑ کر اس کی پرورش کی' ماں کے سینے میں اس کے لیے دودھ اتارا اور باپ کے دل میں شفقت رکھی اور یوں تدریجاً اس کو پالتا رہا' تربیت کرتا رہا' بڑھاتا رہا اور جب وہ اپنی نشوونما کے کمال طبعی کو پہنچ کر بالغ ہو گیا' اس کا شعور پختہ اور عقل کامل ہو گئی تب کہا: اب ہماری ان نعمتوں کا شکر ادا کرو' ہمارے ان کمالات کی حمد وثناء کرو جن کے نتیجہ میں تم اس کمال طبعی تک پہنچے ہو' دیکھو! اس نے تمہارے چلنے کے لیے زمین بنائی ہے' تمہارے سانس لینے کے لیے ہواؤں کے سمندر رواں دواں کیے ہوئے ہیں' تمہارے پینے کے لیے آسمان سے پانی اتارا اور زمین کی تہوں میں چشمے جاری کیے' تمہیں روشنی پہنچانے کے لیے دن بنایا' تمہارے آرام کے لیے رات بنائی' سورج کی حرارت سے تمہاری کھیتیاں پکتی ہیں اور چاند کی کرنوں سے ان میں ذائقہ پیدا ہوتا ہے' کیا اللہ تعالیٰ کے ان تمام احسانوں اور نعمتوں کو دیکھنے اور غور کرنے کے بعد تمہارے دلوں میں اس کی حمد وثنا کرنے اور اس کا شکر بجالانے کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا!

کمال ذات' گزشتہ احسان' رجا اور خوف سے حمد وثناء کا تقاضا

دنیا میں انسان کسی شخص کی چار وجوہ سے تعریف کرتا ہے: یا اس لیے کہ وہ شخص اپنی ذات وصفات میں کامل ہے اور

عیوب اور نقائص سے بری ہے' خواہ اس نے اس انسان پر کوئی احسان کیا ہے یا نہیں' وہ شخص کمال ذات کی وجہ سے اس کی تعریف کرتا ہے' دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نے اس پر ماضی میں احسانات کیے ہیں اور انعامات دیے ہیں تو وہ ان گزشتہ احسانوں کی وجہ سے اس کی تعریف کرتا ہے' تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ مستقبل میں اس سے انعامات کی توقع رکھتا ہے' چوتھی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کے غیظ و غضب اور اس کے قہر اور قدرت سے ڈر کر اس کی تعریف کرتا ہے' تو گویا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر تم کمال ذات کی وجہ سے کسی کی حمد و ثناء کرتے ہو تو میری ذات کامل ہے' سو میری حمد کرو اور اس کی طرف ''الحمد للّٰہ'' سے اشارہ ہے اور اگر گزشتہ نعمتوں کی وجہ سے حمد و ثنا کرتے ہو تو ساری نعمتیں میں نے دی ہیں' میری تعریف کرو' میں ہی ''رب العٰلمین'' ہوں' اور اگر مستقبل میں نعمتیں حاصل کرنے کے لیے تعریف کرتے ہو تو میں ''الرحمٰن الرحیم'' ہوں' سو میری حمد کرو اور اگر ڈر اور خوف کی وجہ سے حمد و ثنا کرتے ہو تب بھی میری حمد و ثنا کرو میں ہی ''مالک یوم الدین'' ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے O (الفاتحہ: ۲)

بعض مفسرین کی فروگزاشت

''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم'' کی تفسیر میں ہم ''الرحمٰن الرحیم'' کی تفسیر کو بیان کر چکے ہیں' یہاں پر ہم بعض مفسرین کی ایک فروگزاشت پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

انسان کا خاصہ ہے کہ جب کوئی چیز اس کی نگاہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے تو وہ مبالغہ کے صیغوں میں اس کو بیان کرتا ہے' اور اگر ایک مبالغہ بول کر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس شے کی فراوانی کا حق ادا نہیں ہوا' تو پھر وہ اس معنی کا ایک اور لفظ بولتا ہے تا کہ وہ کمی پوری ہو جائے جو اس کے نزدیک مبالغہ میں رہ گئی ہے۔ اللہ کی تعریف میں رحمٰن کا لفظ استعمال کرنے کے بعد پھر رحیم کا اضافہ کرنے میں بھی یہی نکتہ پوشیدہ ہے۔ رحمان عربی زبان میں بڑے مبالغہ کا صیغہ ہے لیکن خدا کی رحمت اور مہربانی اپنی مخلوق پر اتنی زیادہ ہے' اس قدر وسیع ہے' ایسی بے حد و حساب ہے کہ اس کے بیان میں بڑے سے بڑا مبالغہ لفظ بول کر بھی جی نہیں بھرتا' اس لیے اس کی فراوانی کا حق ادا کرنے کے لیے پھر رحیم کا لفظ مزید استعمال کیا گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم کسی شخص کی فیاضی کے بیان میں ''سخی'' کا لفظ بول کر جب تشنگی محسوس کرتے ہیں تو اس پر ''داتا'' کا اضافہ کرتے ہیں۔ رنگ کی تعریف میں جب ''گورے'' کو کافی نہیں پاتے تو اس پر ''چٹے'' کا لفظ اور بڑھا دیتے ہیں۔ درازی قد کے ذکر میں جب ''لمبا'' کہنے سے تسلی نہیں ہوتی تو اس کے بعد ''تڑنگا'' بھی کہتے ہیں۔ (تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۴' مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن' لاہور' ۱۹۸۳ء)

ہمارے شیخ علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ العزیز نے اس پر دو اعتراض کیے ہیں' اول یہ کہ اگر کسی اہم چیز کا بیان مبالغہ کے صیغوں سے کرنا انسان کا خاصہ ہے تو اس کو اللہ کے کلام پر منطبق کرنا درست نہیں ہے کیونکہ خاصہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ جس چیز کا خاصہ ہو اسی میں پایا جاتا ہے' دوسرے میں نہیں پایا جاتا' دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ''الرحمٰن الرحیم'' کی مثال گورے چٹے اور لمبے تڑنگے سے دینا صحیح نہیں ہے کیونکہ ''الرحمٰن الرحیم'' دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور گورے چٹے اور لمبے تڑنگے میں سے کوئی لفظ بھی مبالغہ کا صیغہ نہیں ہے۔ (التبیان ص ۳۰۔ ۲۹' کاظمی پبلیکیشنز' ملتان' ۱۹۹۳ء)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: روز جزاء کا مالک ہے O (الفاتحہ: ۳)

مالک اور مَلِک کی دو قراءتیں

مالک اور مَلِک اس آیت میں دونوں متواتر قراءتیں ہیں' امام عاصم' امام کسائی اور امام یعقوب کی قراءت میں مالک ہے

اور باقی پانچ ائمہ کی قراءت میں مَلِک ہے۔

مالک اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی مملوکہ چیزوں میں جس طرح چاہے تصرف کرنے پر قادر ہو اور مَلِک اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی رعایا میں احکام (امر و نہی) نافذ کرتا ہو۔

قرآن مجید کی بعض آیات مالک کی موافقت میں ہیں اور بعض مَلِک کی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ. (آل عمران: ٢٦)

کہیے: اے اللہ! ملک کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے اور تو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت میں مبتلا کرتا ہے' اور تمام بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۝ (الانفطار: ١٩)

یہ وہ دن ہے جس میں کوئی شخص کسی شخص کے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا' اور اس دن اللہ ہی کا حکم ہوگا۔

ان دونوں آیتوں سے مالک کی تائید ہوتی ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ (الناس: ٢-١)

آپ کہیے: میں تمام لوگوں کے رب' تمام لوگوں کے بادشاہ کی پناہ میں آتا ہوں۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ (المؤمن: ١٦)

آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ کی جو واحد ہے اور سب پر غالب ہے ۝

اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ. (الحج: ٥٦)

اس دن صرف اللہ ہی کی بادشاہی ہوگی' وہی ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔

اور ان دو آیتوں سے مَلِک کی تائید ہوتی ہے۔

یوم کا عرفی اور شرعی معنی

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

عرف میں طلوع شمس سے لے کر غروب شمس تک کے زمانہ کو یوم کہتے ہیں' اور اعمش کے سوا اہل سنت کے نزدیک شریعت میں طلوع فجر ثانی سے لے کر غروب شمس تک کے وقت کو یوم کہتے ہیں اور یوم قیامت اپنے معروف معنی میں حقیقت شرعیہ ہے۔

(روح المعانی ج ١ ص ٨٣' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

یوم قیامت کی مقدار

قیامت کے دن کے متعلق قرآن مجید میں ہے:

تَعْرُجُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝ (المعارج: ٤)

جبرئیل اور فرشتے اس کی طرف عروج کرتے ہیں (جس دن عذاب ہوگا) اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال ہے ۝

امام ابویعلیٰ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں' عرض کیا گیا: یارسول اللہ! قرآن مجید میں اس دن کے متعلق ہے

کہ وہ پچاس ہزار برس کا ہوگا' یہ کتنا لمبا دن ہوگا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم اس ذات کی جس کے قبضہ وقدرت میں (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے! مومن پر اس دن میں تخفیف کی جائے گی' حتیٰ کہ وہ جتنی دیر میں دنیا میں فرض نماز پڑھتا تھا اس پر وہ دن اس سے بھی کم وقت میں گزرے گا۔ (مسند ابویعلیٰ ج ۲ ص ۳۲۴ ' مطبوعہ دارالمامون تراث بیروت' ۱۴۰۴ھ)

اس حدیث کو حافظ ابن جریر (جامع البیان ج ۲۹ ص ۴۵) اور حافظ ابن کثیر (تفسیر ابن کثیر ج ۷ ص ۱۱۳) نے بھی اپنی اپنی سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے اور امام ابن حبان نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

(موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان' ص ۶۳۸ ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت)

امام بیہقی نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

علامہ سیوطی نے بھی اس کو امام احمد' امام ابویعلیٰ' امام ابن جریر' امام ابن حبان اور امام بیہقی کے حوالوں سے ذکر کیا ہے۔

(الدرالمنثور ج ۶ ص ۲۶۵ ـ ۲۶۴ ' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ ' ایران)

علامہ آلوسی نے بھی اس کو مذکور الصدر حوالہ جات کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

(روح المعانی ج ۲۹ ص ۵۷ ' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

حضرت ابوسعید خدری کی حدیث مذکور کے متعلق حافظ الہیثمی لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابویعلیٰ نے روایت کیا ہے' اس کا ایک راوی ضعیف ہے اور اس کی سند حسن ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۳۳۷ ' مطبوعہ دارالکتاب العربی' ۱۴۰۲ھ)

نیز حافظ الہیثمی لکھتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ رب العلمین کے سامنے آدھے دن تک کھڑے رہیں گے جو پچاس ہزار برس کا ہوگا اور مومن پر آسانی کردی جائے گی' جیسے سورج کے مائل بہ غروب ہونے سے اس کے غروب ہونے تک' اس حدیث کو امام ابویعلیٰ نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۳۳۷ ' مطبوعہ دارالکتاب العربی' ۱۴۰۲ھ)

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ کافر کے لیے قیامت کا دن پچاس ہزار برس کا مقرر کیا جائے گا کیونکہ اس نے دنیا میں نیک عمل نہیں کیے۔ (مسند احمد ج ۳ ص ۷۵ ' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

عدل وانصاف کا یہ تقاضا ہے کہ جو لوگ دنیا میں اس طرح نماز پڑھتے ہیں کہ گویا وہ نماز میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہیں' پھر وہ اس میں اس طرح محو ہوجاتے ہیں کہ انہیں گردوپیش کا ہوش نہیں رہتا' امام ابوحنیفہ نماز پڑھ رہے تھے کہ مسجد کی چھت سے سانپ گر پڑا' افراتفری مچ گئی مگر وہ اسی محویت سے نماز پڑھتے رہے' ایک انصاری صحابی کو نماز کے دوران تیر لگا' خون بہتا رہا اور وہ اسی انہماک سے نماز پڑھتے رہے' امام بخاری کو نماز میں بھڑ نے سترہ ڈنک مارے اور انہیں احساس تک نہ ہوا' سو ایسے ہی کاملین کی یہ جزاء ہوگی کہ قیامت کے دن ان کو فی الواقع دیدار الٰہی عطا کیا جائے اور جب ان کو دیدار الٰہی عطا کیا جائے گا تو وہ اس کی دید میں ایسے مستغرق ہوں گے کہ قیامت کے ہنگامہ خیز پچاس ہزار برس گزر جائیں گے اور ان کو یوں معلوم ہوگا جیسے ایک فرض نماز پڑھنے کا وقت گزرا ہو' لیکن اللہ تعالیٰ ہم پر عدل نہیں کرم فرماتا ہے' عدل کے لحاظ سے تو ہم دنیا میں بھی کسی نعمت کے مستحق نہیں ہیں' اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی ہم کو نیکوں کے صدقہ میں نعمتیں دیتا ہے' سو آخرت میں بھی ان نیکوں کے طفیل ہم پر

قیامت کا دن بہ قدر فرض نماز گزرے گا اور اپنے دیدار سے مسرور فرمائے گا۔

وقوع قیامت پر عقلی دلیل

ہم اس دنیا میں دیکھتے رہتے ہیں کہ بعض لوگ ظلم کرتے کرتے مرجاتے ہیں اور ان کو ان کے ظلم پر کوئی سزا نہیں ملتی اور بعض لوگ ظلم سہتے سہتے مرجاتے ہیں اور ان کی مظلومیت پر کوئی جزا نہیں ملتی' اگر اس جہان کے بعد کوئی اور جہان نہ ہو تو ظالم سزا کے بغیر اور مظلوم جزا کے بغیر رہ جائے گا اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے' اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس عالم کے بعد کوئی اور عالم ہو جس میں ظالم کو سزا دی جائے اور مظلوم کو جزا۔

اور جزاء اور سزاء کے نظام کے برپا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس عالم کو بالکلیہ ختم کر دیا جائے' کیونکہ جزاء اور سزا اس وقت جاری ہو سکتی ہے جب بندوں کے اعمال ختم ہو جائیں' اور جب تک تمام انسان اور یہ کائنات ختم نہیں ہو جاتی لوگوں کے اعمال کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا' مثلاً قابیل نے قتل کرنے کا طریقہ ایجاد کیا' اب اس کے بعد جتنے قتل ہوں گے ان کے قتل کے جرم سے قابیل کے نامہ اعمال میں گناہ لکھا جاتا رہے گا' اس لیے جب تک قتل کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا قابیل کا نامہ اعمال مکمل نہیں ہوگا' اسی طرح ہابیل نے ظالم سے بدلہ نہ لینے کی رسم ایجاد کی' اب اس کے بعد جو شخص بھی یہ نیکی کرے گا اس کی نیکی میں سے ہابیل کے نامہ اعمال میں نیکی لکھی جاتی رہے گی' اس لیے جب تک اس نیکی کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا ہابیل کا نامہ اعمال مکمل نہیں ہوگا' اسی طرح ایک شخص مسجد یا کنواں بنا کر مرجاتا ہے تو جب تک اس مسجد میں نماز پڑھی جاتی رہے گی' جب تک اس کنوئیں سے پانی پیا جاتا رہے گا' اس شخص کے نامہ اعمال میں نیکیاں لکھی جاتی رہیں گی اور کوئی شخص بت خانہ یا شراب خانہ بنا کر مر گیا تو جب تک وہاں بت پرستی یا شراب نوشی ہوتی رہے گی اس کے نامہ اعمال میں برائیاں لکھی جاتی رہیں گی۔

اس لیے جب تک یہ دنیا اور اس دنیا میں انسان موجود ہیں اس وقت تک لوگوں کا نامہ اعمال مکمل نہیں ہو سکتا اور لوگوں کے نامہ اعمال کو مکمل کرنے کے لیے دنیا اور دنیا والوں کو مکمل ختم کرنا ضروری ہے اور اسی کا نام قیامت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اس کی متقاضی ہے کہ جزا اور سزا کا نظام قائم کیا جائے اور جزا اور سزا کو نافذ کرنے سے پہلے قیامت کا قائم کرنا ضروری ہے۔

وقوع قیامت پر شرعی دلائل

یہ دنیا دار الامتحان ہے اور اس میں انسان کی آزمائش کی جاتی ہے اور اس امتحان کا نتیجہ اس دنیا میں ظاہر نہیں ہوتا لیکن نیک اور بد' اطاعت گزار اور نافرمان' موافق اور مخالف اور مومن اور کافر میں فرق کرنا ضروری ہے اور یہ فرق صرف قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى ۝ (النجم: ۳۱)

تاکہ برے کام کرنے والوں کو ان کی سزا دے اور نیکی کرنے والوں کو اچھی جزا دے ۝

أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ ۝ (ص: ۲۸)

کیا ہم ایمان والوں اور نیکی کرنے والوں کو زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح کر دیں گے؟ یا ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں جیسا کر دیں گے؟ ۝

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۚ سَاءَ مَا

کیا برے کام کرنے والوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ ہم ان کو ان لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور انہوں

يَحْكُمُوْنَ ○ (الجاثیہ: ٢١)
نے نیک کام کیے کہ (ان سب کی) زندگی اور موت برابر ہو جائے؟ وہ کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں ○

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ○ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○ (القلم: ٣٦-٣٥)
کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں جیسا کر دیں گے ○ تمہیں کیا ہوا' تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟ ○

دنیا میں راحت اور مصیبت کا آنا مکمل جزاء اور سزا نہیں ہے

ہر چند کہ بعض لوگوں کو دنیا میں ہی ان کی بداعمالیوں کی سزا مل جاتی ہے مثلاً ان کا مالی نقصان ہو جاتا ہے' یا وہ ہولناک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا ان پر دشمنوں کا خوف طاری ہو جاتا ہے' لیکن یہ ان کی بداعمالیوں کی پوری پوری سزا نہیں ہوتی' اور ہم کتنے ہی لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ ساری عمر عیش پرستی' ہوسناکیوں اور ظلم و ستم کرنے میں گزار دیتے ہیں' پھر اچانک ان پر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے اور ان کی دولت اور طاقت کا نشہ کافور ہو جاتا ہے' لیکن ان کے جرائم کے مقابلہ میں یہ بہت کم سزا ہوتی ہے' اس لیے ان کی مکمل سزا کے لیے ایک اور جہان کی ضرورت ہے جہاں قیامت کے بعد ان کو پوری پوری سزا ملے گی۔

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ (السجدہ: ٢١)
اور ہم ان کو بڑے عذاب سے پہلے (دنیا میں) ہلکا عذاب ضرور چکھائیں گے تاکہ وہ باز آجائیں ○

اس طرح بہت سے نیک بندے ساری عمر ظلم و ستم سہتے رہتے ہیں اور مصائب برداشت کرتے رہتے ہیں اور انہیں اپنی زندگی میں آرام اور راحت کا بہت کم موقع ملتا ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ قیامت کو قائم کرے گا اور ہر شخص کو اس کی نیکی اور بدی کی پوری پوری جزا اور سزا دے گا۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○ (الزلزال: ٨-٧)
سو جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کی (جزا) پائے گا ○ اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اس کی (سزا) پائے گا ○

دین کا لغوی معنی

علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

دین کا معنی ہے جزا اور مکافات' قرآن مجید میں "مالك يوم الدين" کا معنی ہے: یوم جزاء کا مالک' دین کا معنی عادت بھی ہے' کہا جاتا ہے: "مازال ذالك دينى" "میری ہمیشہ سے یہ عادت ہے' اور دین کا معنی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے' اور دین کا معنی طاعت ہے' حدیث میں ہے:

يمرقون من الدين مروق السهم من الرمية.
وہ امام کی اطاعت سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔

(علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ١٢٠٥ھ' تاج العروس ج ٩ ص ٢٠٨-٢٠٧' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر' ١٣٠٦ھ)

دین' شریعت اور مذہب وغیرہ کی تعریفات

میر سید شریف لکھتے ہیں:

دین ایک الٰہی دستور ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتا ہے جو عقل والوں کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے' دین اور ملت متحد بالذات ہیں اور مختلف بالاعتبار ہیں' کیونکہ شریعت بہ حیثیت اطاعت دین ہے اور بہ حیثیت ضبط اور تحریر ملت ہے' اور جس حیثیت سے اس کی طرف رجوع کیا جائے مذہب ہے' ایک قول یہ ہے کہ دین اللہ کی طرف منسوب ہے اور ملت

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے اور مذہب مجتہد کی طرف منسوب ہے۔

(کتاب التعریفات ص ۴۷ مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۰۶ھ)

عبودیت کا التزام کر کے حکم ماننا شریعت ہے ایک قول یہ ہے کہ شریعت دین کا ایک راستہ ہے۔

(کتاب التعریفات ص ۵۵ مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۰۶ھ)

علامہ بدر الدین عینی لکھتے ہیں:

''شرعۃ ومنھاجا'' کی تفسیر میں قتادہ نے کہا: دین ایک ہے اور شریعت مختلف ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۱۷ مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۸ھ)

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اہل تورات کے لیے تورات مقرر کی اور اہل انجیل کے لیے انجیل اور اہل قرآن کے لیے قرآن مقرر کیا اور یہ تقرر شریعتوں اور عبادتوں میں ہے اور اصل توحید ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۶ ص ۲۱۱ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ)

امام بخاری مجاہد سے روایت کرتے ہیں:

اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ کو اور حضرت نوح کو ایک ہی دین کی وصیت کی ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

قرآن مجید میں ہے:

اللہ نے تمہارے لیے اسی دین کا راستہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جس دین کی ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین واحد ہے اور وہ اسلام ہے۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ۚ (المائدہ: ۴۸) ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ شریعت اور واضح راہ عمل بنائی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر نبی کی شریعت الگ ہے۔

قرآن مجید کی ان آیات' احادیث اور عبارات علماء کا حاصل یہ ہے کہ جو عقائد اور اصول تمام انبیاء میں مشترک ہیں مثلاً توحید' رسالت' قیامت' جزاء' سزا' اللہ کی تعظیم اور اس کے شکر کا واجب ہونا' قتل اور زنا کا حرام ہونا' ان کا نام دین ہے اور ہر نبی نے اپنے زمانہ کے مخصوص حالات کے اعتبار سے عبادات اور نظام حیات کے جو مخصوص احکام بتائے وہ شریعت ہے' ان کو مدون اور منضبط کرنا ملت ہے اور امام اور مجتہد نے کتاب اور سنت سے جو احکام مستنبط کیے ان کا نام مذہب ہے' اور مشائخ طریقت نے جو اوراد اور وظائف کے مخصوص طریقے بتائے ان کا نام مسلک اور مشرب ہے اور کسی مخصوص درسگاہ کے نظریات کا نام مکتب فکر ہے' مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم دین کے اعتبار سے مسلمان ہیں' شریعت کے اعتبار سے محمدی ہیں' مذہب کے اعتبار سے ماتریدی اور حنفی ہیں اور مسلک اور مشرب کے اعتبار سے قادری ہیں اور مکتب فکر کے لحاظ سے بریلوی ہیں۔

اللہ' رب' رحمٰن' رحیم اور مالک یوم الدین میں وجہ ارتباط

سورہ فاتحہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پانچ اسماء ذکر کیے ہیں: اللہ' رب' رحمٰن' رحیم اور مالک یوم الدین اور ان میں

ارتباط اس طرح ہے کہ "اللّٰہ" کے تقاضے سے اس نے انسان کو پیدا کیا "رب" کے تقاضے سے اس نے غیر متناہی نعمتوں سے انسان کی پرورش کی "رحمٰن" کے تقاضے سے انسان کے گناہوں پر پردہ رکھا "رحیم" کے تقاضے سے انسان کی توبہ قبول کر کے اس کو معاف فرمایا اور "مالک یوم الدین" کے تقاضے سے انسان کو اس کے اعمال صالحہ کی جزاء عطا فرمائی۔

اگر یہ سوال ہو کہ "بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" میں بھی اللہ تعالیٰ کی صفت رحمٰن و رحیم کا ذکر ہے اور سورہ فاتحہ کی ابتداء میں پھر ان صفات کا ذکر ہے اس کی کیا وجہ ہے کہ رحمٰن اور رحیم کو دو مرتبہ ذکر کیا ہے اور باقی اسماء کا دو مرتبہ ذکر نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس میں یہ اشارہ ہو کہ اللہ تعالیٰ پر رحمت کا غلبہ ہے اس لیے بندہ کو اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور ہر وقت اس کی رحمت پر نظر رکھنی چاہیے اس کے بعد "مالک یوم الدین" فرمایا کہ کہیں اس کی رحمت سے دھوکا کھا کر انسان گناہوں پر دلیر نہ ہو جائے کیونکہ وہ "مالک یوم الدین" بھی ہے۔

جس طرح اس آیت میں فرمایا ہے:

غَافِرِ الذَّنۡبِ وَقَابِلِ التَّوۡبِ شَدِيۡدِ الۡعِقَابِ ذِي الطَّوۡلِ ؕ (المومن: ۳) وہ گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا' بہت سخت عذاب دینے والا' قدرت والا ہے۔

"الحمد للّٰہ" میں مسند الیہ مقدم ہے اور خبر معرفہ ہے اور عربی قواعد کے مطابق ایسی ترکیب مفید حصر ہوتی ہے' نیز اللہ تعالیٰ کی صفات رب' رحیم اور "مالک یوم الدین" بہ منزلہ علت ہیں' اس اعتبار سے معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی حمد کا مستحق نہیں ہے کیونکہ وہی رب ہے' وہی رحمان' رحیم اور مالک روز جزاء ہے' اور اس میں یہ رمز ہے کہ جس میں یہ صفات نہ ہوں وہ تو ستائش کے لائق بھی نہیں ہے چہ جائیکہ وہ پرستش کا مستحق ہو اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ ہی حمد و ثنا کے لائق ہے اور وہی عبادت کا مستحق ہے تو ہم سے یہ کہلوایا: اے پروردگار! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے پروردگار!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں ○ (الفاتحہ: ۴)

عبادت کا لغوی معنی

علامہ جوہری لکھتے ہیں:

عبودیت کی اصل خضوع اور ذلت ہے' عبادت کا معنی ہے: اطاعت کرنا اور تعبد کا معنی ہے: تنسک (فرمانبرداری کرنا)۔

(الصحاح ج ۲ ص ۵۰۳' مطبوعہ دار العلم' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

لغت میں عبادت کا معنی ہے خضوع (تواضع اور عاجزی) کے ساتھ اطاعت کرنا۔

(لسان العرب ج ۳ ص ۲۷۳' مطبوعہ نشر ادب الحوذۃ' قم' ایران' ۱۴۰۵ھ)

علامہ سید زبیدی لکھتے ہیں:

عبادت کا معنی ہے طاعت' بعض ائمہ نے کہا کہ عبودیت کی اصل ذلت اور خشوع ہے' دوسرے ائمہ نے کہا: عبودت کا معنی ہے: رب کے فعل پر راضی ہونا' اور عبادت کا معنی ہے: ایسا فعل کرنا جس سے رب راضی ہو' اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ آخرت میں عبادت ساقط ہو جائے گی عبودت ساقط نہیں ہوگی' کیونکہ عبودت یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے حقیقت میں متصرف ہونے کا عقیدہ نہ رکھے' ہمارے شیخ نے کہا: یہ صوفیہ کی اصطلاح ہے' اس میں لغت کا دخل نہیں ہے' ازہری نے کہا: غلام جو اپنے مولیٰ کی خدمت کرتا ہے اس کو عبادت نہیں کہتے اور مسلمان جو اپنے رب کی اطاعت کرتا ہے اس کو عبادت

کہتے ہیں اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: "اعبدوا ربکم" اس کا معنی ہے: اپنے رب کی اطاعت کرو' اور "ایاك نعبد" کا معنی ہے: ہم خضوع اور عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔ ابن الاثیر نے کہا: عبادت کا لغت میں معنی ہے: عاجزی کے ساتھ اطاعت کرنا۔ (تاج العروس شرح القاموس ج ۲ ص ۴۱۰' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر' ۱۳۰۶ھ)

عبادت کا اصطلاحی معنی

علامہ میر سید شریف لکھتے ہیں:

نفس کی خواہش کے خلاف' اپنے رب کی تعظیم کے لیے مکلف کا کوئی کام کرنا عبادت ہے۔

عہد کو پورا کرنا' اللہ کی حدود کی حفاظت کرنا' جو مل جائے اس پر راضی رہنا اور جو نہ ملے اس پر صبر کرنا عبودیت ہے۔

(کتاب التعریفات ص ۹۳' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر' ۱۳۰۶ھ)

قرآن مجید میں عبادت کا لفظ توحید اور اطاعت کے لیے استعمال ہوا ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا. (النساء: ۳۶) اللہ کو واحد مانو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ. (یٰس: ۶۰) اے اولاد آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی اطاعت نہ کرنا۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عبادت کا اصطلاحی معنی ہے: اعتقاد الوہیت کے ساتھ کسی کی تعظیم اور اطاعت کرنا اور "یایها الناس اعبدوا ربکم" کا معنی ہے: اے لوگو! اپنے رب کو الٰہ مان کر اس کی تعظیم اور اطاعت کرو' اور "ایاك نعبد" کا معنی ہے: ہم اعتقاد الوہیت کے ساتھ تیری تعظیم اور اطاعت کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں عبد کے اطلاقات

قرآن مجید میں پانچ قسم کے لوگوں پر عبد کا اطلاق کیا گیا ہے:

(۱) غلام اور مملوک پر عبد کا اطلاق کیا گیا ہے:

اَلْعَبْدُ بِالْعَبْدِ. (البقرہ: ۱۷۸) غلام کے بدلہ میں غلام (کو قتل کیا جائے)۔

"ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ" اللہ مثال بیان فرماتا ہے ایک مملوک (غلام) کی جس کو کسی چیز پر قدرت نہیں ہے۔ (النحل: ۷۵)

(۲) جو اللہ کی تسخیر سے عبد ہیں:

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ○ (مریم: ۹۳) آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہیں وہ اللہ کی بارگاہ میں بطور عبد حاضر ہوں گے ○

(۳) جو اپنے اختیار سے اللہ کے عبد ہیں اور عبدیت میں کامل ہیں:

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ○ (بنی اسرائیل: ۳) ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا' بے شک وہ (نوح) عبد شاکر تھے ○

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا. (بنی اسرائیل: ۱) سبحان ہے وہ جو اپنے (مقدس) عبد کو رات کے ایک قلیل حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔

(۴) جو اپنے اختیار سے اللہ کے عبد ہیں اور عبدیت میں ناقص ہیں:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (المائدہ: ۱۱۸)

اگر تو انہیں عذاب دے تو بے شک وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو بے شک تو ہی بہت غالب ہے بڑی حکمت والا ہے ۝

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ (الزمر: ۵۳)

کہیے: اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

(۵) جو اپنے اختیار سے غیر اللہ کے عبد ہیں:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝ (الفرقان: ۱۷)

اور جس دن اللہ انہیں جمع کرے گا اور جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے پھر اللہ ان (معبودوں) سے فرمائے گا: کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا وہ خود ہی گمراہ ہو گئے تھے؟ ۝

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (یٰس: ۳۰)

ہائے افسوس ان بندوں پر! ان کے پاس جو رسول بھی آیا یہ اس کا مذاق اڑاتے تھے ۝

خلاصہ یہ ہے کہ جو مملوک اور غلام ہیں' جو تسخیراً عبد ہیں' جو اپنے اختیار سے اللہ کے عبد ہیں اور عبد کامل ہیں اور جو اپنے اختیار سے اللہ کے عبد ہیں اور عبد ناقص ہیں اور جو اپنے اختیار سے غیر اللہ کے عبد ہیں ان سب پر قرآن مجید میں عبد کا اطلاق کیا گیا ہے۔

اپنے غلام کو "میرا عبد" کہنے کی کراہت اور عبد النبی وغیرہ نام رکھنے کی تحقیق

غلام کے لیے اپنے مالک کو میرا رب کہنا مکروہ تنزیہی ہے' اسی طرح مالک کا غلام کو میرا عبد کہنا مکروہ تنزیہی ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں کوئی شخص یہ نہ کہے کہ اپنے رب کو کھلاؤ' اپنے رب کو پلاؤ' بلکہ میرا سید اور میرا مولا کہے' اور تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے: میرا عبد اور میری بندی' اسے یہ کہنا چاہیے: میرا نوکر' میری نوکرانی اور میرا غلام۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۴۶۔۳۴۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام احمد بن حنبل روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنے مملوک کے لیے میرا عبد نہ کہے' لیکن میرا خادم کہے' اور نہ مملوک اپنے مالک کو میرا رب کہے لیکن میرا سید کہے۔

(مسند احمد ج ۲ ص ۴۴۴' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علامہ ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: کوئی شخص اپنے مملوک کو میرا عبد نہ کہے بلکہ میرا نوکر یا خادم کہے' یہ ممانعت اس لیے کی گئی ہے تاکہ مالک سے تکبر اور بڑائی کی نفی کی جائے اور مالک کی طرف غلام کی عبودیت کی نسبت کی نفی کی جائے کیونکہ اس کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہی تمام بندوں کا رب ہے۔

(نہایہ ج ۳ ص ۱۷۰' مطبوعہ موسسہ مطبوعاتی' ایران' ۱۳۶۴ھ)

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

کسی شخص کا اپنے مملوک کو میرا عبد کہنا مکروہ تنزیہی ہے حرام نہیں ہے' کراہت کی وجہ یہ ہے کہ اس کا مملوک اللہ کا عبد ہے اور اس کی عبادت کرتا ہے' اب اگر اس کا مالک بھی اس کو اپنا عبد کہے تو یہ شرک اور مشابہت کو واجب کرتا ہے' لہٰذا اس سے احتراز کے لیے مستحب ہے کہ وہ اس کو میرا نوکر اور میرا خادم کہے' اور یہ حرام اس لیے نہیں ہے کہ قرآن مجید میں مالک کی طرف عبد کی اضافت کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۭ (النور: ۳۲) اور تم اپنے بے نکاح (آزاد) مردوں اور عورتوں کا اپنے نیک عباد (غلاموں) اور باندیوں سے نکاح کردو۔

علامہ ابن بطال نے کہا کہ اس آیت کی رو سے کسی شخص کا اپنے غلام کو میرا عبد کہنا جائز ہے اور احادیث میں ممانعت تغلیظ کے لیے ہے تحریم کے لیے نہیں' اور یہ مکروہ اس لیے ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے کیونکہ اس کا غلام بہر حال اللہ کا عبد ہے' اب اگر وہ اسے میرا عبد کہے گا تو اس سے اس غلام کا مشترک ہونا لازم آ گیا۔

(عمدۃ القاری ج ۱۳ ص ۱۱۰' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

بعض لوگوں کا نام عبد النبی اور عبد الرسول رکھا جاتا ہے۔

شیخ اشرف علی تھانوی نے کفر اور شرک کی باتوں کا بیان اس عنوان کے تحت لکھا ہے:

علی بخش' حسین بخش' عبد النبی وغیرہ نام رکھنا۔ (بہشتی زیور ج ۱ ص ۴۵' مطبوعہ ناشران قرآن لمیٹڈ لاہور)

ظاہر ہے کہ یہ دین میں غلو اور زیادتی ہے' عبد النبی اور عبد الرسول نام رکھنا' سورۂ نور کی اس آیت کے تحت جائز ہے اور احادیث میں جو ممانعت وارد ہے اس کی وجہ سے مکروہ تنزیہی ہے۔ ہمارے نزدیک مختار یہی ہے کہ عبد النبی' عبد الرسول اور عبد المصطفیٰ نام رکھنا' ہر چند کہ جائز ہے لیکن چونکہ احادیث میں اس کی ممانعت ہے' اس لیے مکروہ تنزیہی ہے' اس لیے افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ ان کے بجائے غلام رسول اور غلام مصطفیٰ نام رکھے جائیں۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

فقہاء نے عبد فلاں نام رکھنے سے منع کیا ہے' اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبد النبی نام رکھنا ممنوع ہے' علامہ مناوی نے علامہ دمیری (شافعی) سے نقل کیا ہے کہ ایک قول جواز کا ہے جب کہ اس نسبت سے مشرف ہونا مقصود ہو' اور اکثر فقہاء نے اس خدشہ سے منع کیا ہے کہ کوئی حقیقت عبودیت کا اعتقاد کرے' جیسے عبد الدار نام رکھنا جائز نہیں ہے۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۲۶۹' مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ' استنبول' ۱۳۲۷ھ)

عبادت کا اللہ تعالیٰ میں منحصر ہونا

(اے پروردگار!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں O اس آیت میں عبادت کا اللہ تعالیٰ میں حصر کر دیا ہے' بعض علماء نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ اس حصر کی وجہ کیا ہے' اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی الٰہ (مستحق عبادت) نہیں ہے' اس لیے ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں اور کسی کی عبادت نہیں کرتے' اور اس کی یہ توجیہ بھی کی گئی ہے کہ عبادت نہایت تعظیم کو کہتے ہیں اور نہایت تعظیم اسی کی کی جائے گی جس نے بے شمار نعمتیں دی ہوں اور چونکہ تمام نعمتیں اسی کی دی ہوئی ہیں' اس لیے عبادت بھی اسی کی کی جاتی ہے' دیکھئے اللہ تعالیٰ ہم کو عدم سے وجود میں لایا' جہل سے نکال کر علم عطا فرمایا' پھر تمام زمین' آسمان' سیارگان'

جمادات' نباتات اور حیوانات کو ہمارے نفع کے لیے مسخر کر دیا!

وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا ○ (مریم: ۹)
اور بے شک میں نے تم کو اس سے پہلے پیدا کیا' حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے ○

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (النحل: ۷۸)
اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا' حالانکہ تمہیں کسی چیز کا علم نہ تھا اور تمہارے کان' آنکھیں اور دل بنائے تاکہ تم شکر بجا لاؤ ○

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ (الجاثیہ: ۱۳)
اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمینوں میں ہے سب کو اس نے اپنی طرف سے تمہارے نفع کے لیے مسخر کر دیا۔

اس سے بڑا اور کیا انعام ہوگا! تو اس کے سوا اور کون عبادت کا مستحق ہوگا۔

''ایاك نعبد'' میں حرف خطاب کو مقدم کرنے کے اسرار اور نکات

اس آیت میں یوں نہیں فرمایا: ''نعبدك'' ہم تیری عبادت کرتے ہیں' بلکہ فرمایا ہے: ''ایاك نعبد'' تیری ہی عبادت کرتے ہیں' ہم' اللہ تعالیٰ کا ذکر پہلے ہے اور ہماری عبادت کرنے کا ذکر بعد میں ہے' اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہے اور ہم اور ہماری عبادات بعد میں ہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے: جس شخص کی نظر نعمت کے وقت نعمت کی بجائے منعم پر ہو' تو مصیبت کے وقت اس کی نظر مصیبت کی بجائے مصیبت میں مبتلا کرنے والے پر ہوتی ہے' پھر مصیبت' مصیبت نہیں رہتی اور نعمت آنے کے بعد اگر وہ نعمت زائل ہو جائے تو اس کو ملال نہیں ہوتا' اور جس کی نظر نعمت پر ہوتی ہے تو حصول نعمت کے وقت بھی وہ پریشان رہتا ہے کہ کہیں وہ نعمت زائل نہ ہو جائے اور مصیبت کے وقت بھی وہ رنج اور افسوس میں مبتلا رہتا ہے' اور جس کی نظر ہر حال میں اللہ پر ہو وہ ہمیشہ خوش رہتا ہے' لہٰذا ان کے مقام کا کیا کہنا جن کی توجہ ہر حال میں صفات کی بجائے ذات کی طرف رہتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''واذکروا نعمتی'' میری نعمت کو یاد کرو اور حضرت سیدنا محمد کی امت سے فرمایا: ''فاذکرونی اذکرکم'' تم مجھے (میری ذات کو) یاد کرو' میں تمہیں یاد کروں گا' ان کی رسائی صفت تک تھی ہماری رسائی ذات تک کر دی ہے اور جب اس تصور سے انسان کہے گا: تیری ہی عبادت کرتے ہیں' ہم' اور اس کی ذات کا اس لیے مقدم ذکر کرے گا کہ وہ ہر حال میں پہلے اس کو دیکھتا ہے بعد میں اور کو دیکھتا ہے تو پھر ''ایاك نعبد'' پڑھنے کا کچھ اور لطف ہوگا!

نیز اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ کامل عبادت یہ ہے کہ تم اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اس سے بالمشافہ خطاب کر رہے ہو' اور اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ عبادت میں صعوبت اور مشقت تو بہت ہے لیکن جب عابد کی نظر معبود کے جمال پر ہو اور وہ محو نظارہ ذات ہو تو پھر کسی مشقت اور صعوبت کا پتا نہیں چلتا جس طرح مصر کی عورتوں کی نظر جب حسن یوسف پر پڑی تو انہوں نے پھل کی جگہ انگلیاں کاٹ ڈالیں اور ان کو کچھ درد نہیں ہوا' یہی وجہ ہے کہ ایک صحابی کو نماز کے دوران تیر لگتے رہے' خون بہتا رہا اور وہ اسی انہماک سے نماز پڑھتے رہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۹) مسجد کی چھت سے سانپ گر پڑا' بھگدڑ مچ گئی اور امام ابوحنیفہ اسی محویت سے نماز پڑھتے رہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۲۹) امام بخاری کو نماز میں تتیہ نے سترہ ڈنک مارے اور ان کو کچھ پتا نہیں چلا۔ (فتح الباری ج ۱۴ ص ۴۸۱۔ ۴۸۰) عروہ بن زبیر کے کسی عضو میں زخم ہو گیا' اس عضو کا کاٹنا ضروری تھا' جب انہوں نے نماز شروع کی تو لوگوں نے وہ عضو کاٹ دیا اور ان کو ذرا احساس نہیں ہوا۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۲۹)

''ایاک نعبد'' میں جمع کا صیغہ لانے کے اسرار اور نکات

اس آیت میں فرمایا ہے: ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں' یہاں پر لفظ جمع لایا گیا ہے' کیونکہ اگر بندہ یوں کہتا کہ میں تیری عبادت کرتا ہوں تو اس سے تکبر اور عجب کا وہم ہوتا اور جب کہا: ہم (سب) تیری ہی عبادت کرتے ہیں تو اس کا حاصل یہ ہے کہ میں تیرے عبادت گزار بندوں میں سے ایک عبادت گزار بندہ ہوں اور اس میں تواضع اور انکسار ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بندہ اپنی عبادت کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ اس کا اللہ تعالیٰ کے سامنے ذکر کرے' اس میں بہت سے نقائص اور تقصیرات ہیں' اس لیے وہ اپنی عبادت کو تمام عبادت گزاروں کی عبادت میں درج کر کے ذکر کرتا ہے کہ ان عبادت گزاروں میں صالحین اور مقبولین بھی ہیں' جن کی عبادتوں کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا' اور یہ اس کے کرم سے بعید ہے کہ وہ بعض کی عبادتیں قبول کرے اور بعض کو مسترد کردے۔

علامہ محی الدین درویش لکھتے ہیں:

ایک شرعی مسئلہ یہ ہے کہ جو آدمی مختلف جنس کی چیزوں کو بیع واحد کے ساتھ فروخت کرے' پھر خریدار بعض چیزوں کے کسی عیب پر مطلع ہو تو اس کو تمام چیزیں واپس کرنے کا اختیار ہے' یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ بعض چیزوں کو رکھ لے اور بعض کو واپس کردے' کیونکہ تمام چیزیں بیع واحد کے ساتھ فروخت کی گئی ہیں' وہ ان میں تفریق نہیں کرسکتا (مثلاً کوئی شخص سیبوں کا ایک کریٹ خریدے اور کوئی ایک سیب داغدار ہو تو وہ صرف اس سیب کو واپس نہیں کرسکتا یا سب کو واپس کرے گا یا سب کو رکھے گا) علیٰ ھذا القیاس جب عبادت گزار نے اپنی عبادت کو ناقص اور معیوب جانا تو اس نے اپنی عبادت کو الگ نہیں پیش کیا بلکہ تمام عابدوں کی عبادت میں درج کردیا' اس امید سے کہ تمام عبادات مسترد نہیں ہوں گی' کیونکہ ان میں بعض مقبولین کی عبادات بھی ہیں اور جب باقی مقربین کی عبادات مقبول ہوں گی تو اس کی عبادت بھی مقبول ہوجائے گی اور یہی اس کے کرم عظیم کے مناسب اور فضل عمیم کے لائق ہے۔ (اعراب القرآن الکریم وبیانہ ج ١ ص ١٨' دار ابن کثیر' بیروت' الطبعۃ الثالثۃ' ١٤١٢ھ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھر میں نماز پڑھنے پر ایک نماز کا اجر ہے اور قبائل کی مسجد (محلہ کی مسجد) میں نماز پڑھنے پر پچیس نمازوں کا اجر ہے (بعض روایات کے مطابق ستائیس نمازوں کا اجر ہے) اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے پر پانچ سو نمازوں کا اجر ہے' اور مسجد اقصیٰ میں پچاس ہزار نمازوں کا اجر ہے' اور میری مسجد (مسجد نبوی) میں نماز پڑھنے کا (بھی) پچاس ہزار نمازوں کا اجر ہے' اور مسجد حرام میں نماز پڑھنے کا اجر ایک لاکھ نمازوں کا اجر ہے۔ (مشکوٰۃ ص ٧٢' مطبوعہ اصح المطابع' دہلی)

اجر میں اس اضافہ کی وجہ ایک تو ان مساجد کی عظمت اور خصوصیت ہے' دوسری وجہ یہ ہے کہ محلہ کی مسجد کی نسبت جامع مسجد میں زیادہ نمازی ہوتے ہیں' اور جہاں زیادہ نمازی ہوں گے وہاں اللہ کے نیک بندے بھی زیادہ ہوں گے' اللہ تعالیٰ اپنے مقرب اور نیک بندوں کو زیادہ اجر عطا فرمائے گا اور ان کے واسطے سے سب نمازیوں کو زیادہ اجر و ثواب عطا فرمادے گا' علیٰ ھذا القیاس جیسے جیسے نمازیوں کی تعداد بڑھتی جائے گی اجر و ثواب بڑھتا جائے گا' اس لیے بندہ اپنی عبادت کا علیحدہ ذکر نہیں کرتا بلکہ تمام عابدوں کی عبادت میں اپنی عبادت ضم کر کے ذکر کرتا ہے تاکہ اسے بھی وہ برکتیں مل جائیں جو مقربین بارگاہ ناز کے طفیل سب عابدوں کو ملیں گی۔

غیبوبت سے خطاب کی طرف التفات کے اسرار اور نکات

بلاغت کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ کلام کے پیرائے کو مثلاً صیغہ غائب سے صیغہ خطاب کی طرف منتقل کیا جائے' اس کو

اصطلاح میں التفات کہتے ہیں' کیونکہ مسلسل ایک طرز سے سننے والا اکتا جاتا ہے اور جب کلام کا پیرایہ تبدیل کیا جاتا ہے تو سننے والے کا ذہن حاضر اور بیدار رہتا ہے اور اس کا شوق برقرار رہتا ہے اور تجسس بڑھتا رہتا ہے۔

سورہ فاتحہ کے شروع کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کا صیغہ غائب کے ساتھ ذکر کیا گیا اور اس کی حمد و ثناء کی گئی' پھر "ایاک نعبد. ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں" میں اس سے بالمشافہ خطاب کیا گیا' اس میں صنعت التفات کے علاوہ حسب ذیل اسرار ہیں:

(۱) جب بندہ نے اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت' رحمت اور اس کے مالک ہونے کا ذکر کیا تو اس کو حریم ناز میں داخل ہونے کی اجازت ملی اور اس سے کہا گیا کہ اب جو کہنا ہے بالمشافہ کہو تو بندہ نے کہا: "ایاک نعبد و ایاک نستعین"۔

(۲) دعا اور سوال میں اصل یہ ہے کہ بالمشافہ خطاب کر کے سوال کیا جائے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا" (طٰہٰ: ۱۱۴) "آپ کہیے کہ اے رب! میرے علم کو زیادہ کر' سو اسی نہج پر یہاں بہ صورت خطاب دعا کی گئی ہے۔

(۳) "الحمد" سے "مالک یوم الدین" تک اللہ کی حمد و ثناء ہے' اور تعریف میں اصل یہ ہے کہ غیاب میں کی جائے اور "ایاک نعبد" میں عبادت کا ذکر ہے اور عبادت میں اصل یہ ہے کہ حضور میں اور بالمشافہ ہو' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان تعبد اللہ کانک تراہ. — تم اس طرح عبادت کرو گویا کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو۔

(امام ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

استعانت کے معنی

استعانت کا لفظ عون سے ماخوذ ہے' علامہ زبیدی عون کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کسی کام پر مدد کرنے والے کو عون کہتے ہیں' عرب کہتے ہیں: جب قحط آتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے اعوان بھی آتے ہیں' یعنی ٹڈیاں' مکھیاں اور بیماریاں' لیث نے کہا: ہر وہ چیز جو تمہاری مدد کرے وہ تمہاری عون ہے' جیسے روزہ عبادت کے لیے عون ہے' اس کی جمع اعوان ہے' اور عرب کہتے ہیں: "استعنتہ فاعاننی" میں نے اس سے مدد طلب کی تو اس نے میری مدد کی۔

(تاج العروس ج ۹ ص ۲۸۵' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

"ایاک نستعین" کی تفسیر

علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری لکھتے ہیں:

"ایاک نستعین" کا معنی یہ ہے: اے ہمارے رب! ہم اپنی عبادات' اپنی طاعات اور اپنے تمام معاملات میں صرف تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں' تیرے سوا اور کوئی مددگار نہیں ہے' کفار اپنے معاملات میں اپنے باطل معبودوں سے مدد طلب کرتے ہیں اور ہم اخلاص کے ساتھ تیری عبادت کرتے ہیں اور اپنے تمام امور میں تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: ہم اپنی اطاعت اور تمام امور میں تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۵۳' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

عبادت کو استعانت پر مقدم کرنے کی وجوہ

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ عبادت بھی اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتی پھر بہ ظاہر یہ چاہیے تھا کہ پہلے "ایاک نستعین"

ہوتا پھر ''ایاك نعبد'' ہوتا' اس کا ایک جواب یہ ہے کہ واؤ ترتیب کا تقاضا نہیں کرتی جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ۝ (آل عمران: ۴۳) اے مریم! اپنے رب کی عبادت کر' سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۝

اس آیت میں پہلے سجدہ اور پھر رکوع کا ذکر ہے حالانکہ ترتیب کے اعتبار سے پہلے رکوع اور پھر سجدہ ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ وسیلہ مقصود پر مقدم ہوتا ہے' بندہ کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب تم نے دعا اور سوال کرنا ہو تو اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو' تا کہ تمہاری دعا قبول ہو' اس لیے مدد طلب کرنے سے پہلے عبادت کرنے کا ذکر کیا گیا' تیسرا جواب یہ ہے کہ اس سے پہلے ''الحمد للّٰہ رب العلمین'' اور ''مالك یوم الدین'' فرمایا تھا تو اسی وزن پر ''ایاك نعبد و ایاك نستعین'' فرمایا' اگر ''ایاك نستعین و ایاك نعبد'' ہوتا تو ان آیات کے آخری الفاظ کا اختتام ایک فصل اور ایک وزن پر نہ ہوتا۔

اولیاء اللہ سے استعانت کی تحقیق

علامہ سید محمود آلوسی لکھتے ہیں:

استعانت میں عموم مراد ہے' ہر چیز میں ہم صرف تجھ سے ہی استعانت کرتے ہیں کیونکہ حدیث صحیح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس سے فرمایا:

اذا استعنت فاستعن باللّٰہ. (جامع ترمذی ص ۳۶۱) جب تم مدد طلب کرو تو اللہ سے۔

اسی حدیث کی وجہ سے حضرت ابن عباس نے استعانت میں عموم کا قول اختیار کیا ہے' سو جس شخص نے اپنے اہم معاملات بلکہ دوسرے غیر اہم معاملات میں بھی غیر اللہ سے مدد چاہی ہو تو اس نے ایک عبث عمل کیا' اللہ تعالیٰ سے کیوں نہیں مدد طلب کی جاتی حالانکہ وہ غنی کبیر ہے اور دوسروں سے کیسے مدد طلب کی جائے گی جب کہ سب اس کے محتاج ہیں' اور محتاج کا محتاج سے مدد طلب کرنا ناپختہ رائے ہے اور عقل کی کج روی' اور میں نے کتنے لوگوں کو دیکھا جنہوں نے غیر اللہ سے عزت اور دولت طلب کی اور وہ ذلیل اور فقیر ہوئے' سو اللہ کے سوا اور کوئی اس لائق نہیں کہ اس سے مدد طلب کی جائے۔

(روح المعانی ج ۱ ص ۹۱ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

علامہ مراغی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کریں اور نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی ایسی تعظیم کریں جیسی معبود کی تعظیم کی جاتی ہے اور اللہ کے سوا کسی سے مدد نہ طلب کریں اور کسی کام کو پورا کرنے کے لیے جو طاقت درکار ہوتی ہے وہ کسی اور سے نہ مانگیں ماسوا ان اسباب کے جن کا کسب کرنا اور جن کو حاصل کرنا ہمارے لیے عام اسباب میں مشروع اور میسر ہے۔

اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اسباب کو مسببات کے ساتھ مربوط کیا ہے' اسی طرح ارتفاع موانع پر بھی ان کو موقوف کیا ہے اور ان اسباب کے حصول کے لیے انسان کو علم اور معرفت سے نوازا ہے اور موانع اور رکاوٹوں کے دور کرنے پر انسان کو قدرت عطا کی ہے اور اسی اعتبار سے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں اور تعاون کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ (المائدہ: ۲) اور تم نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۙ (الکہف: ۹۵)

ذوالقرنین نے کہا: میرے رب نے جس پر مجھے قدرت دی ہے وہ (تمہارے مال سے) بہتر ہے تو تم (محنت کے کام میں) طاقت سے میری مدد کرو میں تمہارے اور ان کے درمیان نہایت مضبوط دیوار بنادوں گا ○

اسی اعتبار سے ہم بیماروں کی شفا کے لیے اطباء سے دوائیں طلب کرتے ہیں اور دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے ہتھیاروں اور سپاہیوں سے مدد طلب کرتے ہیں اور اپنی فصلوں کی فراوانی کے لیے حشرات الارض اور مضر کیڑوں مکوڑوں کو دور کرتے ہیں اور ان کو ہلاک کرتے ہیں' اور ان اسباب کے بغیر اگر ہم بیماروں کے لیے شفاء اور دشمن پر غلبہ چاہتے ہوں تو اس کے لیے صرف اللہ تعالیٰ سے استعانت کی جائے گی اور زمین و آسمان کی تمام حاجات کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے دست سوال دراز کیا جائے گا اور نبی کی حیات طیبہ میں ہمارے لیے اسوہ اور نمونہ ہے' آپ نے مختلف غزوات میں کفار کے خلاف غلبہ اور فتح کے لیے صرف اللہ کے آگے ہاتھ پھیلائے ہیں' اسی سے فتح اور نصرت کی دعائیں کی ہیں اور اسی سے بیماری میں حصول شفا کے لیے دعا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا اور فرمایا ہے کہ میں تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ تم سے قریب ہوں۔

سو جو شخص اپنی حاجات پوری کرانے کے لیے' کسی بیمار کی شفا کے لیے' دشمن پر غلبہ کے لیے یا اولاد کی طلب کے لیے اولیاء اللہ کے مزارات پر جا کر ان سے مدد مانگتا ہے وہ شخص سیدھے راستہ سے گمراہ ہو گیا' اس نے اللہ کی شریعت سے اعراض کیا اور اس نے زمانہ جاہلیت کے بت پرستوں کا سا کام کیا۔ (تفسیر المراغی ج ۱ ص ۳۲۔ ۳۳' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

ہمارے نزدیک علامہ مراغی کا یہ فتویٰ علی الاطلاق صحیح نہیں ہے' زمانہ جاہلیت میں کفار بتوں کو مستحق عبادت قرار دیتے تھے اور اسی عقیدہ کے ساتھ ان سے استعانت کرتے تھے' لیکن جو مسلمان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو مستحق عبادت قرار نہ دیتا ہو' اور نہ اولیاء اللہ کو متصرف بالذات سمجھتا ہو' نہ ان کو تصرف میں مستقل سمجھتا ہو بلکہ یہ سمجھتا ہو کہ اولیاء اللہ' اللہ کی دی ہوئی قدرت اور اس کے اذن سے اس کائنات میں تصرف کرتے ہیں اور اسی عقیدہ کے ساتھ ان سے استعانت کرے تو اس مسلمان کا یہ فعل شرک ہے نہ زمانہ جاہلیت کے بت پرستوں کا سا کام ہے' تاہم ہمارے نزدیک شریعت کا اصل تقاضا یہی ہے کہ ان تمام امور میں صرف اللہ تعالیٰ سے استعانت کرنی چاہیے' اولیاء اللہ بھی اللہ کے محتاج ہیں اور ہم بھی اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں' تو سلامت روی اسی میں ہے کہ ہر حاجت اللہ سے طلب کی جائے اور ہر ضرورت میں اس کے آگے دست سوال دراز کیا جائے۔

ہم نے ان پڑھ عوام اور جہلاء کو اولیاء اللہ کے مزارات پر بارہا سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے' جو منع کرنے کے باوجود باز نہیں آتے' اسی طرح ان کو مزارات پر صاحب مزار کی نذر اور منت مانتے ہوئے دیکھا ہے حالانکہ سجدہ عبادت ہو یا سجدہ تعظیم' اللہ کے غیر کے لیے جائز نہیں ہے اور نذر بھی عبادت ہے اور غیر اللہ کی نذر ماننا جائز نہیں۔

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ

وہی ہے جو تم کو خشک زمین اور سمندر میں چلاتا ہے' حتیٰ کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ کشتیاں موافق ہوا کے ساتھ لے کر چلتی ہیں اور وہ اس پر خوش ہوتے ہیں' تو (اچانک) کشتیوں پر تند و تیز آندھیاں آئیں اور سمندر کی موجوں نے ان کو ہر طرف سے گھیر لیا اور (مسافروں نے) سمجھ لیا کہ وہ طوفان میں گھر گئے' تب سب

إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ (یونس: ۲۳۔۲۲)

نے اپنے دین کو خالص اللہ کے لیے کر کے دعائیں مانگیں کہ اگر تو نے ہمیں اس (طوفان) سے بچالیا تو ہم ضرور تیرے شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے O پھر جب اللہ نے ان کو بچالیا تو وہ ناگہاں زمین میں ناحق زیادتی کرنے لگے۔

جب انسان مصائب کے گرداب اور پریشانیوں کے طوفان میں گھر جائے تو کٹر سے کٹر مشرک بھی صرف اللہ ہی کی طرف رجوع کرتا ہے' سو مسلم اور موحد اس بات کے زیادہ لائق اور مستحق ہے کہ وہ اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں میں صرف اللہ تعالیٰ سے التجاء کرے' اسی سے مدد مانگے اور اسی کے آگے ہاتھ پھیلائے۔

امام رازی سورہ یونس آیت: ۱۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ان کافروں نے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کی صورتوں کے بت بنالیے تھے اور ان کا یہ زعم تھا کہ جب وہ ان بتوں کی عبادت کریں گے تو وہ بت اللہ کے پاس ان کی شفاعت کریں گے' اور اس زمانہ میں اس کی نظیر یہ ہے کہ بہت لوگ اولیاء اللہ کی قبروں کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کا یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ جب وہ ان قبروں کی تعظیم کریں گے تو وہ اللہ کے پاس ان کی شفاعت کریں گے۔ (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۵۵۶' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

قبر کو سجدہ کرنا' قبر کا طواف کرنا اور حصول منفعت کے لیے صاحب قبر کی نذر ماننا' قبر کے سامنے جھکنا' یہ تمام امور ناجائز اور حرام ہیں۔

اولیاء اللہ سے استعانت کا صحیح طریقہ

ہونا یہ چاہیے کہ اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت کی جائے کیونکہ زیارت قبور سنت ہے' ان کے مزارات پر ایصال ثواب کیا جائے' یہ بھی احادیث سے ثابت ہے' ان کی مغفرت اور ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کی جائے' کیونکہ قرآن مجید میں وفات یافتہ مسلمانوں کے لیے دعا کرنے کی تعلیم ہے' اور ان کے وسیلہ سے اپنی حاجات کی قبولیت کی دعا کی جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ بنت اسد کی مغفرت کے لیے اپنے اور انبیاء سابقین کے وسیلہ سے دعا فرمائی ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ ہماری حاجت روائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کردیں اور اس کی اصل نابینا کی حدیث ہے جس کو ان شاء اللہ ہم عنقریب تفصیل سے بیان کریں گے' اب ہم وسیلہ اور غیر اللہ سے استمداد کے موضوع پر تفصیل سے لکھ رہے ہیں۔ فنقول و باللّٰہ التوفیق و بہ الاستعانۃ یلیق.

وسیلہ کا لغوی معنی

علامہ ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:

ھی فی الاصل ما یتوصل بہ الی الشیء ویتقرب بہ.

جس چیز سے کسی شے تک رسائی حاصل کی جائے اور اس شے کا تقرب حاصل کیا جائے وہ وسیلہ ہے۔

(علامہ مجد بن اثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ' نہایہ ج ۵ ص ۱۸۵' مطبوعہ مؤسسۃ مطبوعاتی' ایران' ۱۳۶۴ھ)

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

الجوھری: الوسیلۃ ما یتقرب بہ الی الغیر.

امام لغت علامہ جوہری نے کہا ہے کہ جس چیز سے غیر کا تقرب حاصل کیا جائے وہ وسیلہ ہے۔

(سید جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور افریقی متوفی ۷۱۱ھ لسان العرب ج ۱۱ ص ۷۲۵۔ ۷۲۴ مطبوعہ نشر ادب الحوزہ قم ایران ۱۴۰۵ھ)

علامہ زبیدی نے ابن اثیر اور علامہ جوہری کے حوالوں سے وسیلہ کی تعریف میں مذکور الصدر عبارات نقل کی ہیں۔

(تاج العروس ج ۸ ص ۱۵۲ مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۰۶ھ)

علامہ ابن منظور افریقی اور علامہ زبیدی نے علامہ جوہری کی جس عبارت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

جس چیز سے غیر کا تقرب کیا جائے وہ وسیلہ ہے۔ (الصحاح ج ۵ ص ۱۸۴۱ مطبوعہ دار العلم بیروت ۱۴۰۴ھ)

ائمہ لغت کی ان تصریحات سے واضح ہوگیا کہ جس چیز سے غیر کا تقرب حاصل کیا جائے وہ وسیلہ ہے اللہ تعالیٰ کا تقرب اعمال صالحہ اور عبادات سے حاصل ہوتا ہے' تاہم انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جو عزت اور وجاہت حاصل ہے' اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت دعا کے لیے اس عزت اور وجاہت کو پیش کرنا اور ان سے دعا کی درخواست کرنا بھی جائز ہے' زندگی میں اور وفات کے بعد بھی۔

انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کی ذوات سے توسل کے متعلق فقہاء اسلام کی عبارات

امام محمد بن جزری آداب دعا میں لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انبیاء علیہم السلام اور صالحین کا وسیلہ پیش کرے۔

(حصن حصین مع تحفۃ الذاکرین ص ۳۴ مطبوعہ مطبع مصطفے البابی مصر ۱۳۵۰ھ)

ملا علی قاری اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

مصنف نے کہا: دعا میں انبیاء اور صالحین کا وسیلہ پیش کرنا امور مستحبہ میں سے ہے کیونکہ ''صحیح بخاری'' کی کتاب الاستسقاء میں ہے:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پہلے ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کرتے تھے تو (اے اللہ!) تو بارش نازل فرماتا تھا' اب ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم کے وسیلہ سے دعا کرتے ہیں تو ہم پر بارش نازل فرما' پھر ان پر بارش ہوجاتی' اور جیسا کہ نابینا کی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کا ذکر ہے جس کو امام حاکم نے اپنی ''مستدرک'' میں روایت کیا اور یہ کہا کہ یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے' اور امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث صحیح' غریب ہے اور ہم نے اس کو ''حصن'' میں ذکر کیا ہے اور حدیث ابوامامہ کی بناء پر جس کو ہم نے صبح کی دعاؤں میں ذکر کیا ہے' اس حدیث کو امام طبرانی نے ''معجم کبیر'' اور ''کتاب الدعاء'' میں ذکر کیا ہے۔

(الحرز الثمین ص ۱۷۶ مطبوعہ مطبعہ امیریہ' مکہ مکرمہ' ۱۳۰۴ھ)

امام جزری نے حضرت ابوامامہ کی جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

اسئلك بنور وجهك الذی اشرقت له السموات والارض وبكل حق هو لك وبحق السائلین علیك.

اے اللہ! میں تجھ سے تیری ذات کے اس نور کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں جس سے آسمان اور زمین روشن ہیں اور تیرے ہر حق کے وسیلہ سے اور جو سوال کرنے والوں کا تجھ پر حق ہے' اس کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں۔

(امام محمد بن جزری متوفی ۸۳۳ھ' حصن حصین مع تحفۃ الذاکرین ص ۶۸ مطبوعہ مطبع مصطفے البابی واولادہ' مصر ۱۳۵۰ھ)

ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

سوال کرنے والوں کا اللہ پر اس لیے حق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (اپنے کرم سے) ان کی دعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے'

گویا کہ بندے نے اللہ تعالیٰ سے بندوں پر اس کے حق کے وسیلہ سے' اور سائلین کا اللہ پر جو حق ہے اس کے وسیلہ سے سوال کیا' اللہ تعالیٰ کا حق یہ ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں' اس کی حمد وثناء کریں' اس کے احکام پر عمل کریں' اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے رکیں' اور بندوں کا اللہ پر یہ حق ہے کہ وہ اپنے وعدہ کے مطابق ان کو ثواب عطا کرے' کیونکہ اس کے وعدہ کا پورا ہونا واجب ہے' کہ اس کا وعدہ حق ہے اور اس کی خبر صادق ہے۔ (الحرز الثمین ص ۱۷۹' مطبوعہ امیریہ' مکہ مکرمہ' ۱۳۰۴ھ)

شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

ہم یہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے والا یہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے فلاں کے حق اور فلاں فرشتے اور انبیاء اور صالحین وغیرہم کے حق سے سوال کرتا ہوں یا فلاں کی حرمت اور فلاں کی وجاہت کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں' اس دعا کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک ان مقربین کی وجاہت ہو' اور یہ دعا صحیح ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان مقربین کی وجاہت اور حرمت ہے' جس کا یہ تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ان کی قدر افزائی کرے اور جب یہ شفاعت کریں تو ان کی شفاعت قبول کرے' حالانکہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کون اس سے شفاعت کر سکتا ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۱ ص ۲۱۱' مطبوعہ بامر فہد بن عبد العزیز)

غیر مقلد عالم قاضی شوکانی لکھتے ہیں:

یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ پر سائلین کے حق سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو مسترد نہ کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ وعدہ فرمایا ہے: مجھ سے دعا کرو' میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا۔

(تحفۃ الذاکرین ۶۹' مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی واولادہ' مصر' ۱۳۵۰ھ)

نیز قاضی شوکانی لکھتے ہیں:

میں کہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام کے وسیلہ کے جواز پر وہ حدیث دلیل ہے جس کو امام ترمذی نے روایت کر کے کہا: یہ حدیث حسن' صحیح اور غریب ہے' امام نسائی' امام ابن ماجہ' اور امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اور امام حاکم نے اس کو روایت کر کے کہا: یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم کی شرط پر صحیح ہے' حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا: یارسول اللہ! دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری بصارت بحال کر دے' آپ نے فرمایا: یا میں رہنے دوں؟ اس نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ پر نابینائی بہت دشوار ہے' آپ نے فرمایا: جاؤ وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھو' پھر کہو: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں' اور محمد نبی رحمت کے وسیلہ سے میں تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں' الحدیث۔ ''حصن حصین'' کے باب صلوٰۃ الحاجۃ میں اس حدیث کا ذکر آئے گا' اور صالحین کے توسل کے جواز پر وہ حدیث دلیل ہے جو صحیح (بخاری) میں ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے بارش کے لیے دعا کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ! ہم تیرے نبی کے عم محترم کے وسیلہ سے دعا کرتے ہیں۔

(تحفۃ الذاکرین ص ۳۷' مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی واولادہ' مصر' ۱۳۵۰ھ)

حضرت آدم علیہ السلام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کرنا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا مانگی جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا۔

امام بیہقی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب حضرت آدم سے (اجتہادی) خطاء ہوگئی تو انہوں نے کہا: اے رب! میں تجھ سے بہ حق (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے' اللہ عزوجل نے فرمایا: اے آدم! تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے جانا حالانکہ میں نے ابھی ان کو پیدا نہیں کیا؟ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: کیونکہ اے رب! جب تو نے مجھے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور تو نے مجھ میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو عرش کے پایوں پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا' سو میں نے جان لیا کہ تو نے جس کے نام کو اپنے نام کے ساتھ ملا کر لکھا ہے وہ تجھ کو تمام مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہوگا۔ اللہ عزوجل نے فرمایا: اے آدم تم نے سچ کہا' وہ مجھے مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہیں اور کیونکہ تم نے ان کے وسیلہ سے سوال کیا ہے اس لیے میں نے تم کو بخش دیا اور اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کرنا نہ ہوتا تو میں تم کو پیدا نہ کرتا۔ (دلائل النبوۃ ص ۴۸۹' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

اس حدیث کی سند میں عبد الرحمن بن زید بن اسلم ایک ضعیف راوی ہے لیکن فضائل میں حدیث ضعیف معتبر ہوتی ہے۔

امام طبرانی نے بھی اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ حضرت عمر سے روایت کیا ہے۔

(معجم صغیر ج ۲ ص ۸۳۔ ۸۲' مطبوعہ مکتبہ سلفیہ' مدینہ منورہ' ۱۳۸۸ھ)

امام ابن جوزی نے بھی اس حدیث کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' اور حضرت میسرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اس مضمون کی حدیث کو روایت کیا ہے۔ (الوفاء ص ۳۳' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' فیصل آباد)

شیخ ابن تیمیہ نے بھی ان دونوں حدیثوں کو روایت کیا ہے' لیکن انہوں نے لکھا ہے کہ ابونعیم حافظ نے اس حدیث کو ''دلائل النبوۃ'' میں روایت کیا ہے' اس نسبت میں شیخ ابن تیمیہ کو خطالاحق ہوئی' یہ حدیث حافظ ابونعیم کی ''دلائل النبوۃ'' میں نہیں ہے بلکہ حافظ بیہقی کی ''دلائل النبوۃ'' میں ہے' ان دونوں حدیثوں کے متعلق شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

یہ دونوں حدیثیں احادیث صحیحہ کی تفسیر کے درجہ میں ہیں۔ (مجموع الفتاویٰ ج ۲ ص ۹۶' مطبوعہ دار الجیل' ریاض' ۱۴۱۸ھ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو حافظ الہیثمی نے بھی ذکر کیا ہے' وہ اس روایت کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام طبرانی نے ''معجم صغیر'' اور ''معجم اوسط'' میں روایت کیا ہے اور اس کے ایک راوی کو میں نہیں پہچانتا۔

(مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۵۳' مطبوعہ دار الکتاب العربی' ۱۴۰۲ھ)

شیخ ناصر الدین البانی نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ (توسل ص ۱۰۶' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت)

امام حاکم نیشاپوری نے بھی اس حدیث کو حضرت عمر سے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح الاسناد لکھا ہے۔

(المستدرک ج ۲ ص ۶۱۵' مطبوعہ دار الباز للنشر والتوزیع' مکہ مکرمہ)

امام حاکم نیشاپوری نے ایک اور حدیث اس کے مقارب روایت کی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف یہ وحی کی: اے عیسیٰ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ' اور جو تمہاری امت میں سے ان کا زمانہ پائے اس کو بھی ان پر' ایمان لانے کا حکم دو' کیونکہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو میں آدم کو پیدا نہ کرتا اور اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو جنت اور دوزخ کو پیدا نہ کرتا اور میں نے عرش کو پانی پر پیدا کیا تو وہ ہلنے لگا' پھر میں نے اس پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا تو وہ ساکن ہوگیا۔ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور امام بخاری اور امام مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔ (المستدرک ج ۲ ص ۶۱۵' مطبوعہ دار الباز للنشر والتوزیع' مکہ مکرمہ)

علامہ ذہبی نے ان دونوں حدیثوں کے راویوں کی صحت سے اختلاف کیا ہے' لیکن شیخ ابن تیمیہ کی تصحیح مقدم ہے۔

علامہ سیوطی نے امام حاکم' امام بیہقی' امام طبرانی' امام ابونعیم اور امام ابن عساکر کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کو بیان کیا ہے۔ (خصائص کبریٰ ج ۱ ص ۶ 'مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ فیصل آباد)

علامہ قسطلانی نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کو امام حاکم کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

(المواہب اللدنیہ مع الزرقانی ج ۱ ص ۴۴ 'مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۳۹۳ھ)

علامہ زرقانی نے اس کی شرح میں امام حاکم اور ابوالشیخ کے حوالے سے حضرت ابن عباس کی مذکور الصدر روایت بیان کی ہے اور لکھتے ہیں کہ امام حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے اور علامہ سبکی نے ''شفاء السقام'' میں اور علامہ بلقینی نے اپنے فتاویٰ میں اس تصحیح کی تائید کی ہے اور کہا ہے کہ اس قسم کی بات رائے سے نہیں کہی جا سکتی' اس لیے یہ حدیث حکماً مرفوع ہے' علامہ ذہبی نے کہا: اس کی سند میں عمرو بن اوس ہے' پتا نہیں وہ کون ہے؟ اور امام دیلمی نے حضرت ابن عباس سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ میرے پاس حضرت جبرائیل آئے اور انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اگر آپ نہ ہوتے تو میں جنت کو پیدا کرتا نہ نار کو پیدا کرتا۔ (شرح المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۴۴ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۳ھ)

ملا علی قاری نے بھی امام دیلمی کی اس روایت کو استشہاد کے طور پر پیش کیا ہے۔

(موضوعات کبیر ص ۵۹ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' دہلی' ۱۳۱۵ھ)

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے حقیقت محمدی پر بحث کرتے ہوئے یہ دو حدیثیں لکھی ہیں:

اگر آپ کو پیدا کرنا نہ ہوتا تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا' اگر آپ کو پیدا کرنا نہ ہوتا تو میں اپنی ربوبیت کو ظاہر نہ کرتا۔

(مکتوبات دفتر سوم' حصہ دوم' مکتوب نمبر ۱۲۲)

یہ حدیثیں ہر چند کہ ان الفاظ کے ساتھ کتب حدیث میں مذکور نہیں ہیں لیکن یہ معنیً ثابت ہیں' حدیث لولاک پر ''مقالات سعیدی'' میں ہمارا ایک تفصیلی مقالہ ہے۔

ان احادیث سے یہ واضح ہو گیا کہ مقربین بارگاہ کے وسیلہ سے دعا کرنا ابتداء آفرینش سے مشروع اور معمول ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام مدح میں اس دعا کا ذکر فرما کر اس کے جواز اور استحسان کو بیان فرما دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خود اپنے وسیلہ سے دعا فرمانا

حافظ الہیثمی بیان کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت فاطمہ بنت اسد بن ہاشم رضی اللہ عنہا فوت ہو گئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی لحد کھودنے سے فارغ ہو گئے تو آپ ان کی لحد میں لیٹ گئے اور یہ دعا کی: اللہ ہی جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے' اور وہی زندہ ہے جسے موت نہیں آئے گی' اے اللہ! اپنے نبی اور مجھ سے پہلے انبیاء کے وسیلہ سے میری ماں فاطمہ بنت اسد کی مغفرت فرما' ان کو حجت القا فرما' ان کی قبر کو وسیع کر' بلاشبہ تو سب سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے' پھر آپ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور آپ نے' حضرت عباس نے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو قبر میں اتارا' اس حدیث کو امام طبرانی نے ''کبیر'' اور ''اوسط'' میں روایت کیا ہے' اس میں روح بن صلاح نام کا ایک راوی ہے' امام حبان اور امام حاکم نے اس کی توثیق کی ہے' اور اس میں ضعف ہے' اور اس کے باقی راوی حدیث صحیح کے راوی ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۹ ص ۲۵۷ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

اس حدیث کو علامہ نور الدین سمہودی نے بھی ذکر کیا ہے۔

(وفاء الوفاء ج ۴ ص ۸۹۹۔ ۸۹۸ ‘مطبوعہ دار احیاء التراث العربی‘ بیروت)

شیخ ناصر الدین البانی نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ (توسل ص ۱۰۲ ‘مطبوعہ مکتب اسلامی‘ بیروت)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کرنا نہ صرف حضرت آدم علیہ السلام کی بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی سنت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خود اپنے وسیلہ سے دعا کرنے کی ہدایت دینا

انبیاء علیہم السلام اور بزرگان دین کے وسیلہ سے دعا کرنے کی اصل یہ حدیث ہے:

حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا‘ اس نے عرض کیا: آپ اللہ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری آنکھیں ٹھیک کر دے‘ آپ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو میں اس کام کو موخر کر دوں اور یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا اور اگر تم چاہو تو (ابھی) دعا کر دوں‘ اس نے کہا: آپ دعا کر دیجئے‘ آپ نے فرمایا: تم اچھی طرح وضو کرو‘ دو رکعت نماز پڑھو اس کے بعد یہ دعا کرو: ”اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور محمد نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں‘ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کے وسیلہ سے اس حاجت میں اپنے رب کی طرف متوجہ ہوا ہوں تاکہ میری یہ حاجت پوری ہو‘ اے اللہ! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے لیے شفاعت کرنے والا بنا دے۔

(سنن ابن ماجہ ص ۹۹ ‘مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب‘ کراچی)

اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ (جامع ترمذی ص ۵۱۵ ‘مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب‘ کراچی)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۱۳۸ ‘مطبوعہ مکتب اسلامی‘ بیروت‘ ۱۳۹۸ھ)

اس حدیث کو امام حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔ (مستدرک ج ۱ ص ۵۱۹ ‘مطبوعہ دار الباز للنشر والتوزیع‘ مکہ مکرمہ)

اس حدیث کو امام ابن عساکر نے بھی روایت کیا ہے۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۳ ص ۲۰۴ ‘مطبوعہ دار الفکر‘ دمشق)

امام ابن ماجہ‘ امام ترمذی‘ امام احمد اور امام حاکم نے اس حدیث کو عمارہ بن خزیمہ بن ثابت کی سند سے روایت کیا ہے اور امام بیہقی نے اس حدیث کو اس سند کے علاوہ ابوامامہ بن سہل بن حنیف کی سند سے بھی روایت کیا ہے اس روایت میں یہ اضافہ ہے:

قال عثمان: فواللہ ما تفرقنا ولا طال الحدیث حتیٰ دخل الرجال و کانہ لم یکن بہ ضر قط. (امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ‘ دلائل النبوۃ ج ۶ ص ۱۶۷ ‘مطبوعہ دار الکتاب العلمیہ‘ بیروت)

حضرت عثمان بن حنیف نے کہا: بہ خدا! ابھی ہم اس مجلس سے اٹھے نہیں تھے اور نہ ابھی سلسلہ گفتگو دراز ہوا تھا کہ وہ (نابینا) شخص اس حال میں داخل ہوا کہ اس کی آنکھ میں کوئی تکلیف نہیں تھی۔

امام ابن السنی نے بھی اس حدیث کو ابوامامہ بن سہل بن حنیف کی سند سے روایت کیا ہے‘ جس میں مذکورہ الصدر اضافہ ہے۔ (عمل الیوم واللیلہ ص ۲۰۲ ‘مطبوعہ مجلس الدائرۃ المعارف‘ دکن‘ ۱۳۱۵ھ)

علامہ نووی نے اس حدیث کو امام ابن ماجہ اور امام ترمذی کے حوالوں سے بیان کیا اور اس میں یا محمد کے الفاظ ہیں‘ علامہ نووی نے لکھا ہے کہ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح لکھا ہے۔ امام نسائی نے اس حدیث کو سنن کبریٰ (ج ۶ ص ۱۶۹ ‘مطبوعہ دار الکتب العلمیہ‘ بیروت‘ ۱۴۱۱ھ) میں روایت کیا ہے۔

امام محمد جزری نے اس حدیث کو امام ترمذی‘ امام حاکم اور امام نسائی کے حوالوں سے ذکر کیا اور اس میں بھی یا محمد کے الفاظ ہیں۔ (الاذکار ص ۱۶۷ ‘مطبوعہ دار الفکر‘ بیروت‘ ۱۳۷۵ھ)

قاضی شوکانی ''حصن حصین'' کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام ترمذی' امام حاکم نے ''مستدرک'' میں اور نسائی نے روایت کیا ہے جیسا کہ مصنف رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے' امام طبرانی نے اس حدیث کی تمام اسانید بیان کرنے کے بعد کہا: یہ حدیث صحیح ہے' امام ابن خزیمہ نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا' سوان ائمہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے' البتہ نسائی کی روایت میں یہ تفرد ہے کہ اس میں یہ ذکر بھی ہے: اس نے دو رکعت نماز پڑھی' اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ پیش کرنے کے جواز کی دلیل ہے' اس کے ساتھ یہ اعتقاد لازم ہے کہ حقیقۃً دینے والا اور منع کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے' جو وہ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور جو وہ نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ (تحفۃ الذاکرین ص ۱۳۸۔ ۱۳۷' مطبوعہ مصطفیٰ البابی واولادہ' مصر' ۱۳۵۰ھ)

حضرت عثمان بن حنیف کی یہ حدیث جس کو بکثرت محدثین نے اپنی اپنی تصانیف میں صحت سند کی صراحت کے ساتھ روایت کیا ہے اس مطلوب پر قوی دلیل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کرنا اور آپ سے دعا کی درخواست کرنا جائز اور مستحسن ہے اور چونکہ آپ کی ہدایات قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے حجت ہیں' اس لیے آپ کے وصال کے بعد بھی آپ کے وسیلہ سے دعا کرنا اور آپ سے دعا کی درخواست کرنا جائز ہے اور بالخصوص آپ کے وصال کے بعد آپ کے توسل سے دعا کے جواز پر دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک شخص کو اس کی قضاء حاجت کے لیے یہ دعا تعلیم کی' اس حدیث کو امام طبرانی اور امام بیہقی نے اپنی اپنی تصانیف میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے' جیسا کہ عنقریب ہم بیان کریں گے۔ یہاں تک جو ہم نے احادیث بیان کی ہیں ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ظاہرہ میں آپ کے توسل پر دلیل ہے' اب ہم ایسی احادیث پیش کر رہے ہیں جن میں آپ کی وفات کے بعد آپ کے توسل پر دلیل ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں صحابہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کرنا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک سال قحط پڑ گیا تو حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پر حاضر ہوئے اور عرض کیا: اپنی امت کے لیے بارش کی دعا کیجئے۔

حافظ ابن ابی شیبہ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

مالک الدار' جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وزیر خوراک تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں (ایک بار) لوگوں پر قحط آ گیا' ایک شخص (حضرت بلال بن حارث مزنی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر گیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اپنی امت کے لیے بارش کی دعا کیجئے کیونکہ وہ (قحط سے) ہلاک ہو رہی ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا: عمر کے پاس جاؤ' ان کو سلام کہو اور یہ خبر دو کہ تم پر یقیناً بارش ہوگی' اور ان سے کہو: تم پر سوجھ بوجھ لازم ہے' تم پر سوجھ بوجھ لازم ہے' پھر وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان کو یہ خبر دی' حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے اور کہا: اے اللہ! میں صرف اسی چیز کو ترک کرتا ہوں جس میں میں عاجز ہوں۔

(المصنف ج ۱۲ ص ۳۲' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ)

نیز حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

حافظ ابوبکر بیہقی اپنی سند کے ساتھ مالک سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب کے زمانہ میں (ایک بار) قحط

واقع ہوا' ایک شخص (حضرت بلال بن حارث مزنی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! اپنی امت کے لیے بارش کی دعا کیجئے' کیونکہ وہ (قحط سے) ہلاک ہو رہی ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا: عمر کے پاس جاؤ اور ان کو میری طرف سے سلام کہو' اور ان کو یہ خبر دو کہ تم پر یقیناً بارش ہوگی اور ان سے کہو کہ تم سوجھ بوجھ سے کام لو' اس شخص نے جا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر دی' حضرت عمر نے کہا: اے میرے رب! میں صرف اس چیز کو ترک کرتا ہوں جس سے میں عاجز ہوں۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۹۲-۹۱ مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

حافظ ابو عمرو بن عبد البر[1] اور حافظ ابن کثیر نے بھی اس روایت کو ذکر کیا ہے۔

(الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۳۹۰-۳۸۹' مطبوعہ دار الکتاب العربیہ' بیروت' ۱۴۰۰ھ)

علم حدیث میں حافظ ابن کثیر کی شخصیت موافقین اور مخالفین سب کے نزدیک مسلم ہے اور حافظ ابن کثیر نے امام بیہقی کی اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے اور اس روایت میں یہ تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ نے آپ کی قبر انور پر جا کر آپ سے بارش کی دعا کے لیے درخواست کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ واقعہ اور اپنا خواب بیان کیا اور حضرت عمر نے اس کو مقرر رکھا اور اس پر انکار نہیں کیا' اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی وصال کے بعد صاحب قبر سے دعا کی درخواست کرنا جائز ہے۔

اس حدیث کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

امام ابن ابی شیبہ نے سند صحیح کے ساتھ حضرت عمر کے خازن مالک الدار سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں (ایک بار) قحط واقع ہوا' ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اپنی امت کے لیے بارش کی دعا کیجئے' کیونکہ وہ ہلاک ہو رہی ہے' پھر اس شخص کو خواب میں آپ کی زیارت ہوئی اور یہ کہا گیا کہ عمر کے پاس جاؤ' الحدیث۔ سیف نے ''فتوح'' میں روایت کیا ہے کہ جس شخص نے یہ خواب دیکھا تھا وہ یکے از صحابہ حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ تھے۔ (فتح الباری ج ۲ ص ۴۹۶-۴۹۵ مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

اس حدیث کو حافظ ابن کثیر اور حافظ ابن حجر عسقلانی دونوں نے سنداً صحیح قرار دیا ہے اور ان دونوں کی تصحیح کے بعد کسی تردد کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور نہ کسی کا انکار درخور اعتناء ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں صحابہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کرنا

حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنے کسی کام سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس جاتا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے' اور نہ اس کے کام کی طرف دھیان دیتے تھے' ایک دن اس شخص کی حضرت عثمان بن حنیف سے ملاقات ہوئی' اس نے حضرت عثمان بن حنیف سے اس بات کی شکایت کی' حضرت عثمان نے اس سے کہا: تم وضو خانہ جا کر وضو کرو' پھر مسجد میں جاؤ اور وہاں دو رکعت نماز پڑھو' پھر یہ کہو: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور ہمارے نبی' نبی رحمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں' اے محمد! میں آپ کے واسطے سے آپ کے رب عزوجل کی طرف متوجہ ہوا ہوں تاکہ وہ میری حاجت روائی کرے اور اپنی حاجت کا ذکر کرنا' پھر میرے پاس آنا حتیٰ کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں' وہ شخص گیا اور اس نے حضرت عثمان بن حنیف کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل

[1] حافظ ابو عمرو یوسف بن عبد اللہ عبد البر قرطبی مالکی متوفی ۴۶۳ھ' الاستیعاب علیٰ ہامش الاصابہ ج ۲ ص ۴۶۴' مطبوعہ دار الفکر' بیروت

کیا' پھر وہ حضرت عثمان بن عفان کے پاس گیا' دربان نے ان کے لیے دروازہ کھولا اور ان کو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس لے گیا' حضرت عثمان نے اس کو اپنے ساتھ مسند پر بٹھایا اور پوچھا: تمہارا کیا کام ہے؟ اس نے اپنا کام ذکر کیا' حضرت عثمان نے اس کا کام کر دیا اور فرمایا: تم نے اس سے پہلے اب تک اپنے کام کا ذکر نہیں کیا تھا اور فرمایا: جب بھی تمہیں کوئی کام ہو تو تم ہمارے پاس آجانا' پھر وہ شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس چلا گیا اور جب اس کی حضرت عثمان بن حنیف سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو جزاء خیر دے' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میری طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے اور میرے معاملہ میں غور نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ آپ نے ان سے میری سفارش کی' حضرت عثمان بن حنیف نے کہا: بخدا! میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کوئی بات نہیں کی' لیکن ایک مرتبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھا' آپ کے پاس ایک نابینا شخص آیا اور اس نے اپنی نابینائی کی آپ سے شکایت کی' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اس پر صبر کرو گے؟ اس نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے راستہ دکھانے والا کوئی نہیں ہے اور مجھے بڑی مشکل ہوتی ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: تم وضو خانے جاؤ اور وضو کرو' پھر دو رکعت نماز پڑھو' پھر ان کلمات سے دعا کرو' حضرت عثمان بن حنیف نے کہا: ابھی ہم الگ نہیں ہوئے تھے اور نہ ابھی زیادہ باتیں ہوئی تھیں کہ وہ نابینا شخص آیا درآں حالیکہ اس میں بالکل نابینائی نہیں تھی۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

حافظ زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی منذری متوفی ۶۵۶ھ نے ''الترغیب والترہیب'' (ج ۱ ص ۲۷۶-۴۷۴' مطبوعہ دارالحدیث' قاہرہ' ۱۴۰۷ھ) میں اور حافظ الہیثمی نے مجمع الزوائد (ج ۲ ص ۲۷۹' مطبوعہ بیروت) میں اس حدیث کو بیان کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

شیخ ابن تیمیہ کے حوالے سے حضرت عثمان بن حنیف کی روایت کی تائید' توثیق اور تصحیح

امام طبرانی نے اس حدیث کو روایت کر کے کہا: اس حدیث کو شعبہ نے ابو جعفر سے روایت کیا ہے اور شعبہ سے اس حدیث کو صرف عثمان بن عمر نے روایت کیا ہے اور وہ اس سے روایت کرنے میں منفرد ہے (یعنی اس کا کوئی متابع نہیں ہے اور یہ حدیث غریب ہے) اور حدیث صحیح ہے' شیخ ابن تیمیہ نے امام طبرانی پر اعتراض کیا کہ اس حدیث کو شعبہ سے روایت کرنے میں صرف عثمان بن عمر منفرد نہیں ہے بلکہ روح بن عبادہ نے بھی اس حدیث کو شعبہ سے روایت کیا ہے اور یہ اسناد صحیح ہے' اس کا خلاصہ یہ ہے امام طبرانی کی یہ روایت دو صحیح سندوں سے مروی ہے' شیخ ابن تیمیہ کی اصل عبارت یہ ہے:

امام طبرانی نے کہا: اس حدیث کو شعبہ نے ابو جعفر سے روایت کیا ہے اور اس کا نام عمر بن ابی یزید ہے اور وہ ثقہ ہے' عثمان بن ابی عمر' شعبہ سے اس روایت میں منفرد ہے۔ ابو عبداللہ مقدسی نے کہا: اور حدیث صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں کہ امام طبرانی نے اپنے مبلغ علم کے اعتبار سے عثمان بن ابی عمر کو منفرد کہا ہے' ان کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ روح بن عبادہ نے بھی شعبہ سے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور یہ اسناد صحیح ہے' اس سے معلوم ہوا کہ عثمان بن ابی عمر اس روایت میں منفرد نہیں ہے۔ (مجموع الفتاویٰ ج ۱ ص ۱۹۵-۱۹۴' مطبوعہ دارالجیل' ریاض' ۱۴۱۸ھ)

طبرانی کی روایت مذکورہ کا صحاح کی دوسری روایت سے تعارض کا جواب

ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عثمان بن حنیف کی اس روایت کو امام ترمذی' امام ابن ماجہ' امام احمد اور امام ابن سنی نے روایت کیا اور اس میں حضرت عثمان کے زمانہ خلافت میں وسیلہ کے ساتھ دعا کا ذکر نہیں ہے' اس کے برخلاف امام طبرانی اور امام بیہقی نے حضرت عثمان بن حنیف کی اس روایت میں حضرت عثمان کے زمانہ خلافت میں بھی حضور سے توسل کرنے کا ذکر کیا

ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایک حدیث کو بعض ائمہ اختصار کے ساتھ روایت کرتے ہیں اور بعض ائمہ تفصیل کے ساتھ روایت کرتے ہیں' اعتراض کا محل یہ تھا کہ اس روایت کی سند صحیح نہ ہوتی یا ضعیف ہوتی اور جب شیخ ابن تیمیہ نے خود بیان کیا کہ طبرانی کی مفصل حدیث دو صحیح سندوں کے ساتھ مروی ہے تو پھر اعتراض کی کب گنجائش ہے؟

امام بیہقی نے پہلے دو سندوں کے ساتھ اس حدیث کو اختصاراً روایت کیا (دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۱۶۷۔ ۱۶۶) پھر اس حدیث کو روح بن قاسم عن ابی جعفر مدینی عن ابی امامہ بن سہل بن حنیف کی سند سے تفصیل کے ساتھ روایت کیا جیسا کہ امام طبرانی نے روایت کیا ہے اس کے بعد مزید یہ کہا:

اس حدیث کو ہشام دستوائی نے از ابوجعفر از ابوامامہ بن سہل از عم خود روایت کیا ہے' ابوامامہ کے چچا حضرت عثمان بن حنیف ہیں۔ (دلائل النبوۃ ج ۶ ص ۱۶۸' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت)

امام بیہقی کی اس مفصل روایت کا اور اس دوسری سند کا شیخ ابن تیمیہ نے بھی ذکر کیا ہے' لکھتے ہیں:

امام بیہقی نے اس سند کے ساتھ قصہ کو روایت کیا ہے اور اس سے آپ کے وصال کے بعد آپ سے توسل پر استدلال کیا جاتا ہے' بشرطیکہ یہ روایت صحیح ہو۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج اص ۲۶۸' مطبوعہ بامر فہد بن عبدالعزیز آل السعود)

توسل بعد از وصال پر شیخ ابن تیمیہ کے اعتراضات اور مصنف کے جوابات

شیخ ابن تیمیہ نے یہ تو کہا ہے کہ اگر اس حدیث کی سند صحیح ہو تو اس حدیث سے وفات کے بعد وسیلہ ثابت ہے' لیکن انہوں نے اس حدیث کی سند پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور اس میں کوئی ضعف نہیں نکال سکے' علاوہ ازیں امام بیہقی کی روایت بیان کرنے کے بعد انہوں نے اسی روایت کو امام طبرانی کے حوالے سے بیان کیا اور اس کا ایک متابع بھی بیان کیا ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ یہ دونوں سندیں صحیح ہیں' جیسا کہ ہم باحوالہ بیان کر چکے ہیں' لہٰذا جب امام طبرانی کی روایت صحیح ہے اور اس روایت کی دوسری سند بھی صحیح ہے تو شیخ ابن تیمیہ کے اپنے اقرار کے مطابق وفات کے بعد وسیلہ ثابت ہو گیا اور یہ واضح ہو گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ سے دعا کی درخواست کرنا اور آپ کو یا محمد کے صیغہ سے ندا کرنا صحابہ کرام کے نزدیک جائز تھا' جبھی حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو یہ دعا تلقین کی کہ اے محمد! میں آپ کے وسیلہ سے آپ کے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ وہ میری حاجت پوری کر دے۔

شیخ ابن تیمیہ نے اس بحث میں جو آخری اعتراض کیا ہے وہ یہ ہے:

حافظ ابوبکر بن خیثمہ نے اپنی تاریخ میں اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا: میری بینائی چلی گئی ہے' آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دعا کیجئے' آپ نے فرمایا: جا کر وضو کرو اور دو رکعت نماز پڑھو' پھر کہو: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے نبی محمد نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں' اے محمد! میں اپنے رب کے حضور اپنی بصارت لوٹانے کے لیے آپ کی شفاعت طلب کرتا ہوں' اے اللہ! میرے حق میں میری شفاعت کو قبول کر اور میری بصارت لوٹانے میں میرے نبی کی شفاعت قبول فرما' اور اگر تمہیں کوئی اور کام ہو تو پھر اسی طرح کرنا' پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی بصارت لوٹا دی۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج اص ۲۷۵' مطبوعہ بامر فہد بن عبدالعزیز آل السعود)

اس روایت پر شیخ ابن تیمیہ نے حسب ذیل اعتراضات کیے ہیں:

(۱) ''اگر تمہیں کوئی اور کام ہو تو اسی طرح کرو'' یہ حضرت عثمان بن حنیف کے الفاظ ہیں' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نہیں ہیں۔

(۲) دوسرے راویوں کی روایت میں یہ الفاظ نہیں ہیں (جیسا کہ گزر چکا ہے) اور اگر بالفرض یہ الفاظ ثابت ہوں تب بھی یہ دلیل نہیں ہے' کیونکہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ دعا کے بعض الفاظ کافی ہیں' کیونکہ انہوں نے مشروع دعا کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ دعا کے بعض الفاظ کہنے کا حکم دیا ہے۔

(۳) حضرت عثمان بن حنیف نے یہ گمان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی اس طرح (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے) دعا کرنا جائز ہے' حالانکہ حدیث کے الفاظ اس کے خلاف ہیں' کیونکہ نابینا صحابی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ آپ اس کے لیے دعا کریں اور اس کو یہ یقین تھا کہ آپ اس کے لیے دعا کریں گے اور آپ نے اس کو حکم دیا تھا کہ وہ دعا میں یہ کہے کہ اے اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما! اور اس طریقہ سے یہ دعا اس وقت صحیح ہوگی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے دعا کریں اور اس کی شفاعت کریں اور جس کو آپ کی دعا کرنے اور آپ کے شفاعت کرنے کا علم نہیں ہے' اس کا اس طریقہ سے دعا کرنا صحیح نہیں ہے' اس طریقہ سے دعا کرنا اور شفاعت طلب کرنا آپ کی حیات دنیاوی میں ہی درست تھا اور یا قیامت کے دن درست ہوگا جب آپ شفاعت فرمائیں گے۔ (فتاوی ابن تیمیہ ج ۱ ص ۲۷۶۔ ۲۷۴' مطبوعہ بامر فہد بن عبدالعزیز آل السعود)

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ ہوں بلکہ حضرت عثمان بن حنیف ہی کے ہوں تب بھی کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ کسی چیز کے جائز ناجائز ہونے میں شیخ ابن تیمیہ کی بہ نسبت صحابی رسول کی فہم اور ان کے اجتہاد پر اعتماد کرنا زیادہ قرین قیاس ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ حافظ ابن ابی خیثمہ کی اس روایت سے ہمارا استدلال نہیں ہے' اگر اس پر شیخ کو اعتراض ہے تو اس روایت کو ہم چھوڑ دیتے ہیں' ہمارا استدلال تو امام طبرانی کی روایت ہے جس کے متعلق خود شیخ ابن تیمیہ نے تصریح کی ہے کہ یہ دو صحیح سندوں سے مروی ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس درخواست کی طرف متوجہ کر دیتا ہے یا اس درخواست پر مطلع کر دیتا ہے' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری دعا کی قبولیت کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور شفاعت کرتے ہیں اور اس میں کون سا شرعی یا عقلی استبعاد ہے؟

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر میری امت کے اچھے اور برے تمام اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۰۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کے پیش نظر جب آپ کا کوئی امتی آپ سے دعا کی درخواست کرے گا تو آپ کو اس کا علم ہو جائے گا اور آپ اس کی شفاعت فرمائیں گے' کیونکہ آپ نے خود اپنے وسیلہ سے دعا کرنے اور دعا کی درخواست کرنے کی ہدایت دی ہے اور اس ہدایت کو عام رکھا ہے اور اس میں حیات یا بعد از وفات کی قید نہیں لگائی' اس لیے شیخ ابن تیمیہ کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ''اور اس طریقہ سے دعا اس وقت صحیح ہوگی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے دعا کریں اور اس کی شفاعت کریں اور جس کو آپ کے دعا کرنے اور آپ کے شفاعت کرنے کا علم نہیں ہے اس کا اس طریقہ سے دعا کرنا صحیح نہیں ہے'' کیونکہ حیات اور ممات

میں وسیلہ کے جواز اور عدم جواز کا فرق علم کے ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے ہو سکتا تھا اور آپ کو ہر دو صورت میں علم حاصل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام مسلمانوں کے لیے قیامت تک کے لیے حجت ہیں اور آپ کے افعال مسلمانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ ہیں' اگر آپ کا کوئی حکم صرف آپ کی حیات مبارکہ کے ساتھ مخصوص ہو اور بعد کے لوگوں کے لیے اس کا کرنا جائز ہو تو آپ پر لازم ہے کہ آپ یہ بیان فرمائیں کہ یہ حکم میری زندگی کے ساتھ خاص ہے اور بعد کے لوگوں کے لیے اس حکم پر عمل کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بردہ بن نیار کو ایک شش ماہہ بکرے کی قربانی کرنے کا حکم دیا اور فرمادیا: تمہارے بعد کسی کے لیے یہ عمل جائز نہیں ہے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت براء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بردہ نے نماز عید سے پہلے قربانی کرلی' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے بدلہ میں اور قربانی کرو' انہوں نے کہا: میرے پاس صرف چھ ماہ کا ایک بکرا ہے جو سال کے بکرے سے فربہ ہے آپ نے فرمایا: اس کے بدلہ میں اس کی قربانی کردو' اور تمہارے بعد کسی اور کے لیے شش ماہہ بکرے کی قربانی جائز نہیں ہوگی۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۳۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ استثناء اس لیے بیان فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال اور افعال مسلمانوں کے حق میں قیامت تک کے لیے حجت ہیں اگر آپ یہ استثناء نہ فرماتے تو چھ ماہ کے بکرے کی قربانی سب کے لیے قیامت تک جائز ہو جاتی' شیخ ابن تیمیہ کہتے ہیں: وفات کے بعد کسی بزرگ سے دعا کی درخواست کرنا شرک کی طرف لے جاتا ہے:

ہر چند کہ انبیاء اور صالحین اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ وہ زندوں کے لیے دعا کرتے ہیں اور بے شک اس کی تائید میں احادیث بھی ہیں' پھر بھی کسی شخص کے لیے ان سے دعا کو طلب کرنا جائز نہیں ہے اور پہلے لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کیا کیونکہ یہ شرک کا سبب ہے' اور اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کا ذریعہ ہے' اس کے برخلاف اگر ان کی زندگی میں ان سے دعا طلب کی جائے تو یہ شرک نہیں ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۱ ص ۳۳۰' مطبوعہ بامر فہد بن عبدالعزیز)

شیخ ابن تیمیہ کا یہ قاعدہ باطل ہے' کیونکہ وفات کے بعد کسی سے دعا کی درخواست کرنا شرک کا سبب ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس نابینا صحابی سے فرمادیتے کہ اس طریقہ سے دعا کرنا صرف میری زندگی میں جائز ہے اور میرے وصال کے بعد اس طریقہ سے دعا کرنا جائز نہیں ہے' بلکہ شرک کا سبب ہے' کیونکہ آپ کی بعثت کا مقصد ہی شرک کی بیخ کنی کرنا تھا اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی استثناء کے نابینا صحابی کو دعا کا یہ طریقہ تعلیم کیا تو معلوم ہوا کہ قیامت تک اس طریقہ سے دعا کرنا جائز ہے' اور صحابی رسول حضرت عثمان بن حنیف نے اس حدیث سے یہی سمجھا تھا' اسی وجہ سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی ایک شخص کو دعا کا یہ طریقہ بتلایا اور ہمارے لیے صحابی رسول کے طریقہ کی اتباع کرنا' شیخ ابن تیمیہ کے افکار کی اتباع کرنے سے بہتر ہے۔

توسل بعد از وصال کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا نظریہ

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

کاش میری عقل ان لوگوں کے پاس ہوتی' جو لوگ اولیاء اللہ سے استمداد اور ان کی امداد کا انکار کرتے ہیں' یہ اس کا کیا مطلب سمجھتے ہیں؟ جو کچھ ہم سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ دعا کرنے والا' اللہ کا محتاج ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے اور اس سے اپنی حاجت کو طلب کرتا ہے اور یہ عرض کرتا ہے کہ اے اللہ! تو نے اپنے اس بندہ مکرم پر جو رحمت فرمائی ہے اور اس پر جو لطف و کرم

کیا ہے اس کے وسیلہ سے میری اس حاجت کو پورا فرما' کہ تو دینے والا کریم ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اس اللہ کے ولی کو ندا کرتا ہے اور اس کو مخاطب کر کے یہ کہتا ہے کہ اے بندہ خدا اور اے اللہ کے ولی! میری شفاعت کریں اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ وہ میرا سوال اور مطلوب مجھے عطا کرے اور میری حاجت برلائے' سو مطلوب کو دینے والا اور حاجت کو پورا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے' اور یہ بندہ درمیان میں صرف وسیلہ ہے' اور قادر' فاعل اور اشیاء میں تصرف کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے' اور اولیاء اللہ' اللہ تعالیٰ کے فعل' سطوت' قدرت اور غلبہ میں فانی اور ہالک ہیں اور ان کو اب قبر میں افعال پر قدرت اور تصرف حاصل ہے اور نہ اس وقت قدرت اور تصرف حاصل تھا' جب وہ زندہ تھے۔

اور امداد و استمداد کا جو معنی میں نے ذکر کیا ہے اگر موجب شرک اور غیر اللہ کی طرف توجہ کو مستلزم ہوتا جیسا کہ منکر کا زعم فاسد ہے تو چاہیے یہ تھا کہ صالحین سے طلب دعاء اور توسل زندگی میں بھی ناجائز ہوتا حالانکہ یہ بجائے ممنوع ہونے کے بالاتفاق جائز اور مستحسن و مستحب ہے' اور اگر منکر یہ کہیں کہ موت کے بعد اولیاء اللہ اپنے مرتبہ سے معزول ہو جاتے ہیں اور زندگی میں جو فضیلت و کرامت انہیں حاصل تھی وہ باقی نہیں رہی تو اس پر کیا دلیل ہے؟

اور اگر یوں کہیں کہ بعد موت کے وہ ایسی آفات و بلیات میں مبتلا ہوئے کہ انہیں دعا وغیرہ کی فرصت نہ رہی تو یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے اور نہ اس پر دلیل ہے کہ اولیاء کے لیے ابتلا قیامت تک رہتا ہے' زیادہ سے زیادہ جو کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر اہل قبر سے استمداد سود مند نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اولیاء جذب و استغراق کی کیفیت میں ہوں اور عالم لاہوت کے مشاہدہ میں اس طرح منہمک ہوں کہ اس دنیا کے حالات کی طرف توجہ اور شعور نہ رہے تو وہ اس دنیا میں تصرف نہ کریں جیسا کہ دنیا میں بھی اولیاء اللہ کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ ہاں اگر اولیاء اللہ کے حق میں زائرین کا یہ اعتقاد ہو کہ وہ مدد کرنے میں مستقل ہیں اور اللہ کی جانب میں توجہ کیے بغیر بطور خود ذاتی قدرت سے امداد کرتے ہیں' جیسے بعض جہلاء کا عقیدہ ہے کہ وہ قبر کو بوسہ دیتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں' یہ تمام افعال ممنوع اور حرام ہیں اور ناواقف عوام کے افعال کا کوئی اعتبار نہیں' اور وہ خارج از بحث ہیں اور عارف بشریعت و عالم بہ احکام دین ان تمام منکرات سے سخت بیزار ہیں اور مشائخ اور اہل کشف سے ارواح کاملہ سے استفادہ کے بارے میں جو کچھ مروی ہے وہ حصر سے خارج ہے اور ان کی کتابوں میں مشہور اور مذکور ہے' حاجت نہیں کہ ہم اس کا ذکر کریں اور ممکن ہے کہ وہ منکر متعصب کو فائدہ نہ دے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس بدعقیدگی سے محفوظ رکھے۔ (اشعۃ اللمعات ج ۳ ص ۴۰۲-۴۰۱ مطبوعہ مطبع تیج کمار' لکھنؤ)

توسل بعد از وصال کے متعلق علامہ آلوسی کا نظریہ

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور آپ کے وصال کے بعد آپ کی عزت اور وجاہت کے وسیلہ سے اللہ سے دعا کرنے میں میرے نزدیک کوئی حرج نہیں ہے' اور آپ کی وجاہت سے یہاں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت مراد ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کی آپ سے وہ کامل محبت جس کا یہ تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا کو مسترد نہ کرے اور آپ کی شفاعت کو قبول فرمائے' اور جب کوئی شخص دعا میں کہتا ہے: اے اللہ! میں تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وجاہت کے وسیلہ سے دعا کرتا ہوں کہ تو میری حاجت کو پورا فرما' تو اس دعا کا یہ معنی ہے اے اللہ! میں اپنی اس حاجت کے پورا ہونے میں تیری محبت کو وسیلہ بناتا ہوں اور اس دعا میں اور تمہارے اس قول میں کوئی فرق نہیں ہے کہ اے اللہ! میں تیری رحمت کو وسیلہ بناتا ہوں کہ تو میرا یہ کام کر دے' بلکہ میں یہ کہنا بھی جائز سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص یہ کہے کہ اے اللہ! میں تجھ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وجاہت کی قسم دیتا ہوں کہ تو یہ کام کر دے۔

وجاہت اور حرمت کے ساتھ سوال کرنے میں ایک جیسی بحث ہے' توسل اور ذات شخص کی قسم دینے میں یہ بحث جاری نہیں ہوگی' ہاں وجاہت اور حرمت کے وسیلہ سے دعا کرنا کسی صحابی سے منقول نہیں ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ صحابہ وسیلہ کے ساتھ دعا کرنے سے اس لیے اجتناب کرتے تھے کہ لوگوں کے ذہنوں میں کوئی بدعقیدگی جگہ نہ پکڑے' کیونکہ ان کا زمانہ بتوں کے ساتھ توسل کرنے کے قریب تھا' اس کے بعد ائمہ طاہرین نے بھی صحابہ کی اقتداء میں وسیلہ کے ساتھ دعا نہیں کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی اس وقت کی عمارت کو منہدم کر کے بناء ابراہیم پر اس کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہتے تھے' لیکن چونکہ آپ کی قوم تازہ تازہ کفر سے نکلی تھی' اس لیے آپ نے فتنہ پیدا ہونے کے خدشہ سے اپنے ارادہ کو ترک کر دیا جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے' میں نے وجاہت سے توسل اور قسم دینے کا جواز اور اس کی توجیہ اس لیے بیان کی' تاکہ عام مسلمانوں کو اس دعا میں حرج نہ ہو' کیونکہ بعض لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وجاہت کے وسیلہ سے دعا کرنے پر گمراہی کا حکم لگانے کا دعویٰ کرتے ہیں' اس تقریر سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس طرح وسیلہ سے دعا کرنا ان دعاؤں سے افضل ہے' جو قرآن مجید اور احادیث میں مذکور ہیں اور جن دعاؤں پر صحابہ کرام کاربند رہے اور اخیار تابعین نے جس طریقہ کو اپنایا' یقیناً دعا کا یہی طریقہ زیادہ اچھا' زیادہ جامع' زیادہ نفع آور اور زیادہ سلامتی والا ہے۔ (روح المعانی ج ۶ ص ۱۲۸' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

توسل بعد از وصال کے متعلق غیر مقلد عالم شیخ وحید الزمان کا نظریہ

شیخ وحید الزمان لکھتے ہیں:

جب دعا میں غیر اللہ کے وسیلہ کا جواز ثابت ہے تو اس کو زندوں کے ساتھ خاص کرنے پر کیا دلیل ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو حضرت عباس کے وسیلہ سے دعا کی تھی' وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے ممانعت پر دلیل نہیں ہے' انہوں نے حضرت عباس کے وسیلہ سے اس لیے دعا کی تاکہ حضرت عباس کو لوگوں کے ساتھ دعا میں شریک کریں' اور انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں' اسی طرح شہداء اور صالحین بھی زندہ ہیں' ابن عطاء نے ہمارے شیخ ابن تیمیہ کے خلاف دعویٰ کیا' پھر اس کے سوا اور کچھ ثابت نہیں کیا کہ بطور عبادت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استعانت کرنا جائز نہیں ہے' ہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ پیش کرنا جائز ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عثمان بن حنیف نے اس شخص کو آپ کے وسیلہ سے دعا تعلیم کی جو حضرت عثمان کے پاس جاتا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے تھے۔ اس دعا میں یہ الفاظ تھے: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور ہمارے نبی محمد نبی رحمت کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اس حدیث کو امام بیہقی نے سند متصل کے ساتھ ثقہ راویوں سے روایت کیا ہے' کاش میری عقل ان منکرین کے پاس ہوتی! جب کتاب اور سنت کی تصریح سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اعمال صالحہ کا وسیلہ پیش کرنا جائز ہے تو صالحین کے وسیلہ کو بھی اس پر قیاس کیا جائے گا اور امام جزری نے "حصن حصین" کے آداب دعا میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انبیاء اور صالحین کا وسیلہ پیش کرنا چاہیے' اور ایک اور حدیث میں ہے: یا محمد! میں آپ کے وسیلہ سے اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں' اسید نے کہا کہ یہ حدیث حسن ہے موضوع نہیں ہے' امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے' ایک حدیث میں ہے: میں تیرے نبی محمد اور موسیٰ کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں' اس کو علامہ ابن اثیر نے "نہایہ" میں اور علامہ طاہر پٹنی نے "مجمع بحار الانوار" میں ذکر کیا ہے' اور امام حاکم' امام طبرانی اور امام بیہقی نے ایک حدیث میں حضرت آدم کی اس دعا کو روایت کیا ہے: اے اللہ! میں تجھ سے بحق محمد سوال کرتا ہوں' اور ابن منذر نے روایت کیا ہے: اے اللہ! تیرے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جو وجاہت اور عزت ہے میں اس کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں' علامہ سبکی نے کہا ہے کہ وسیلہ پیش کرنا' مدد طلب کرنا اور شفاعت طلب کرنا مستحسن ہے' علامہ

قسطلانی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر آہ وزاری کرنے کا متقدمین اور متاخرین میں سے کسی نے انکار نہیں کیا تھا حتیٰ کہ ابن تیمیہ آیا اور اس نے انکار کیا' قاضی شوکانی نے کہا کہ انبیاء میں سے کسی نبی' اولیاء میں سے کسی ولی اور علماء میں سے کسی عالم کا بھی وسیلہ پیش کرنا جائز ہے' جو شخص قبر پر جا کر زیارت کرے یا فقط اللہ سے دعا کرے اور اس میت کے وسیلہ سے دعا کرے کہ اللہ میں تجھ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ تو مجھے فلاں بیماری سے شفاء دے اور میں اس نیک بندے کے وسیلہ سے تجھ سے سوال کرتا ہوں تو اس دعا کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے۔ قاضی شوکانی کا کلام ختم ہوا۔

(ہدیۃ المھدی ص ۴۹' مطبوعہ میور پریس' دہلی' ۱۳۲۵ھ)

توسل بعد از وصال کے متعلق غیر مقلد عالم قاضی شوکانی کا نظریہ

غیر مقلد عالم شیخ مبارکپوری ''الدر النضید'' سے قاضی شوکانی کی عبارت نقل کرتے ہیں:

انبیاء اور صالحین کے توسل سے منع کرنے والے قرآن مجید کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں: ہم ان کی صرف اس لیے عبادت کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔ (الزمر: ۳) اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت نہ کرو۔ (جن: ۱۸) اسی کو (معبود سمجھ کر) پکارنا برحق ہے' اور جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو (معبود سمجھ کر) پکارتے ہیں جو ان کو کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ (الرعد: ۱۴) ان آیات سے استدلال صحیح نہیں ہے' کیونکہ سورہ زمر کی آیت نمبر ۳ میں یہ تصریح ہے کہ مشرکین بتوں کی عبادت کرتے تھے اور جو شخص مثلاً کسی عالم کے وسیلہ سے دعا کرتا ہے وہ اس کی عبادت نہیں کرتا بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس عالم کے علم کی وجہ سے اس کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت اور وجاہت ہے' وہ اس وجہ سے اس کے وسیلہ سے دعا کرتا ہے' اسی طرح سورہ جن کی آیت نمبر ۱۸ میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کر کے پکارنے (یا عبادت کرنے) سے منع کیا ہے' مثلاً کوئی شخص کہے: میں اللہ اور فلاں کی عبادت کرتا ہوں' اور جو شخص مثلاً کسی عالم کے وسیلہ سے دعا کرتا ہے وہ صرف اللہ سے دعا کرتا ہے اور اللہ کے بعض نیک بندوں کے اعمال صالحہ کا وسیلہ پیش کرتا ہے' جیسا کہ ایک غار میں تین شخص تھے اور اس غار کے منہ پر ایک چٹان گر گئی تو انہوں نے اپنے اعمال صالحہ کے وسیلہ سے دعا کی' اسی طرح سورہ رعد کی آیت نمبر ۱۴ میں ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو ان لوگوں کو (معبود سمجھ کر) پکارتے تھے جو ان کو کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے اور اپنے رب کو نہیں پکارتے تھے جو ان کی دعا قبول کرتا ہے اور جو شخص مثلاً کسی عالم کے وسیلہ سے دعا کرتا ہے' وہ صرف اللہ سے دعا کرتا ہے اور کسی اور سے دعا نہیں کرتا' اللہ کے بغیر نہ اللہ کے ساتھ۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۴ ص ۲۸۳' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

انبیاء علیہم السلام اور بزرگان دین سے براہ راست استمداد کے متعلق احادیث

انبیاء علیہم السلام اور بزرگان دین سے براہ راست مدد طلب کرنے کی اصل یہ حدیث ہے:

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کراماً کاتبین کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے مقرر کیے ہیں جو درختوں سے گرنے والے پتوں کو لکھ لیتے ہیں' جب تم میں سے کسی شخص کو سفر میں کوئی مشکل پیش آئے تو وہ یہ ندا کرے: اے اللہ کے بندو! تم پر اللہ رحم فرمائے میری مدد کرو۔ (المصنف ج ۱۰ ص ۳۹۰' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ)

حافظ ابوبکر دینوری معروف بابن السنی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کسی ایک شخص کی سواری ویران زمین میں بھاگ جائے تو وہ یہ ندا کرے: اے اللہ کے نیک بندو! اس کو روک لو' اے اللہ کے نیک بندو

اس کو روک لو کیونکہ زمین میں اللہ عزوجل کے کچھ روکنے والے ہیں جو اس کو روک لیتے ہیں۔

(عمل الیوم واللیلۃ ص ۱۶۲ مطبوعہ مطبع مجلس الدائرۃ المعارف حیدر آباد دکن ۱۳۱۵ھ)

امام بزار اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کراماً کاتبین کے سوا اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جو درخت سے گرنے والے پتوں کو لکھ لیتے ہیں جب تم میں سے کسی شخص کو جنگل کی سرزمین میں کوئی مشکل پیش آئے تو وہ یہ ندا کرے: اے اللہ کے نیک بندو! میری مدد کرو۔

(کشف الاستار عن زوائد البزار ج ۴ ص ۳۴ مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ بیروت)

حافظ الہیثمی بیان کرتے ہیں:

حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص کسی چیز کو گم کر دے درآں حالیکہ وہ کسی اجنبی جگہ پر ہو تو اس کو یہ کہنا چاہیے کہ اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو کیونکہ اللہ کے کچھ ایسے بندے ہیں جن کو ہم نہیں دیکھتے۔ یہ امر مجرب ہے اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا اور اس کے بعض راویوں کے ضعف کے باوجود ان کی توثیق کی گئی ہے البتہ یزید بن علی نے حضرت عتبہ کو نہیں پایا۔

(مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۳۲ مطبوعہ دار الکتب العربی بیروت ۱۴۰۲ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کراماً کاتبین کے سوا اللہ کے فرشتے ہیں جو درخت سے گرنے والے پتوں کو لکھ لیتے ہیں جب کسی ویران زمین پر کسی کو مشکل پیش آئے تو وہ یہ ندا کرے: اے اللہ کے نیک بندو! میری مدد کرو۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۳۲ مطبوعہ دار الکتب العربی بیروت ۱۴۰۲ھ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کسی ایک کی سواری ویران زمین میں بھاگ جائے تو وہ یہ ندا کرے: اے اللہ کے نیک بندو! روک لو اے اللہ کے نیک بندو! روک لو اے اللہ کے نیک بندو روک لو کیونکہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے روکنے والے ہیں جو اس کو عنقریب روک لیں گے اس کو امام ابو یعلیٰ اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور طبرانی کی روایت میں یہ اضافہ ہے: وہ اس کو تمہارے لیے روک لیں گے۔

(مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۳۲ مطبوعہ دار الکتب العربی بیروت ۱۴۰۲ھ)

رجال غیب (ابدال) سے استمداد کے متعلق فقہاء اسلام کے نظریات

علامہ نووی امام ابن السنی کی کتاب سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

مجھ سے میرے بعض اساتذہ نے بیان کیا جو بہت بڑے عالم تھے کہ ایک مرتبہ ریگستان میں ان کی سواری بھاگ گئی ان کو اس حدیث کا علم تھا انہوں نے یہ کلمات کہے: (اے اللہ کے بندو! روک لو) اللہ تعالیٰ نے اس سواری کو اسی وقت روک دیا۔ (علامہ نووی فرماتے ہیں:) ایک مرتبہ میں ایک جماعت کے ساتھ سفر میں تھا اس جماعت کی ایک سواری بھاگ گئی وہ اس کو روکنے سے عاجز آ گئے میں نے یہ کلمات کہے تو بغیر کسی اور سبب کے صرف ان کلمات کی وجہ سے وہ سواری اسی وقت رک گئی۔

(کتاب الاذکار ص ۲۰۱ مطبوعہ دار الفکر بیروت طبع رابع ۱۳۷۵ھ)

ملا علی قاری نے بھی علامہ نووی کی عبارت کو نقل کیا ہے۔

(الحرز الثمین شرح حصن حصین علی ہامش الدر الغالی ص ۳۷۸ مطبوعہ المطبعۃ المنیریہ مکہ مکرمہ ۱۳۰۴ھ)

شیخ شوکانی نے بھی علامہ نووی کی اس عبارت کو نقل کیا ہے۔

(تحفۃ الذاکرین بعدۃ الحصن الحصین ص ۱۵۵ مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی واولادہ مصر ۱۳۵۰ھ)

ملا علی قاری ''یا عباد اللہ'' کی شرح میں لکھتے ہیں:

''اے اللہ کے بندو!'' اس سے مراد فرشتے ہیں یا مسلمان جن یا اس سے مردان غیب مراد ہیں جن کو ابدال کہتے ہیں (یعنی اولیاء اللہ)۔ (الحرز الثمین علی ہامش الدر الثمین ص ۳۷۸ مطبوعہ المطبعۃ المیریہ مکہ مکرمہ ۱۳۰۴ھ)

شیخ محمد بن جزری نے ''حصن حصین'' میں اس حدیث کو طبرانی' ابویعلیٰ' ابن السنی' بزار اور ابن ابی شیبہ کے حوالوں سے درج کیا ہے' ان تمام روایات کو درج کرنے کے بعد ملا علی قاری لکھتے ہیں:

بعض ثقہ علماء نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اور مسافروں کو اس کی ضرورت پڑتی ہے اور مشائخ سے مروی ہے کہ یہ امر مجرب ہے۔ (الحرز الثمین علی ہامش الدر الثمین ص ۳۷۹ مطبوعہ المطبعۃ المیریہ مکہ مکرمہ ۱۳۰۴ھ)

شیخ شوکانی' حضرت ابن عباس کی روایت میں لکھتے ہیں:

مجمع الزوائد میں ہے کہ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں' اس حدیث میں ان لوگوں سے مدد حاصل کرنے پر دلیل ہے جو نظر نہ آتے ہوں' جیسے فرشتے اور صالح جن' اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے' جیسا کہ جب سواری کھسک جائے یا بھاگ جائے تو انسانوں سے مدد حاصل کرنا جائز ہے۔ (تحفۃ الذاکرین ص ۱۵۶۔ ۱۵۵ مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی واولادہ مصر ۱۳۵۰ھ)

امام ابن اثیر اور حافظ ابن کثیر کے حوالوں سے عہد صحابہ میں ندائے یا محمداہ کا رواج

عہد صحابہ اور تابعین میں مسلمانوں کا یہ شعار تھا کہ وہ شدائد اور ابتلاء کے وقت ''یا محمداہ'' کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ندا کرتے تھے۔

جنگ یمامہ میں جب مسیلمہ کذاب اور مسلمانوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی' اس کا نقشہ کھینچنے کے بعد علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں:

پھر حضرت خالد بن ولید نے (دشمن کو) للکارا اور للکارنے والوں کو دعوت (قتال) دی' پھر مسلمانوں کے معمول کے مطابق یا محمداہ کہہ کر نعرہ لگایا' پھر وہ جس شخص کو بھی للکارتے اس کو قتل کر دیتے تھے۔

(الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۲۴۶ مطبوعہ دار الکتاب العربیہ' بیروت)

حافظ ابن کثیر بھی جنگ کے اس منظر کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

پھر حضرت خالد نے مسلمانوں کے معمول کے مطابق نعرہ لگایا اور اس زمانہ میں ان کا معمول یا محمداہ کا نعرہ لگانا تھا۔

(البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۲۴ مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

حافظ ابن اثیر اور ابن کثیر نے یہ تصریح کی ہے کہ عہد صحابہ اور تابعین میں شدائد اور ابتلاء کے وقت یا محمداہ کہنے کا معمول تھا' ندائے غائب کے منکرین کے ہاں حافظ ابن کثیر کی بہت پذیرائی ہے اور ان کا یہ لکھنا کہ عہد صحابہ و تابعین میں یا محمداہ کہنے کا معمول تھا' ان کے خلاف قوی حجت ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ''المطالب العالیہ'' میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر عیسیٰ میری قبر پر کھڑے ہو کر ''یا محمد'' کہیں تو میں ان کو ضرور جواب دوں گا۔ (المطالب العالیہ ج ۴ ص ۳۴۹ مطبوعہ مکہ مکرمہ)

ندائے یا محمد اور توسل میں علماء دیو بند کا موقف

شیخ رشید احمد گنگوہی ''یارسول اللہ انظر حالنا' یا نبی اللہ اسمع قالنا'' کے جواز یا عدم جواز کی بحث میں لکھتے ہیں:

یہ خود معلوم آپ کو ہے کہ ندا غیر اللہ تعالیٰ کو دور سے شرک حقیقی جب ہوتا ہے کہ ان کو عالم سامع مستقل عقیدہ کرے ورنہ شرک نہیں' مثلاً یہ جانے کہ حق تعالیٰ ان کو مطلع فرما دیوے گا یا باذنہ تعالیٰ انکشاف ان کو ہو جاوے گا یا باذنہ تعالیٰ ملائکہ پہنچا دیویں گے جیسا کہ درود کی نسبت وارد ہے' یا محض شوقیہ کہنا ہو محبت میں یا عرض حال محل تحسر و حرمان میں' ایسے مواقع میں اگرچہ کلمات خطابیہ بولتے ہیں لیکن ہرگز نہ مقصود اسماع ہوتا ہے نہ عقیدہ' پس ان ہی اقسام سے کلمات مناجات واشعار بزرگان کے ہوتے ہیں کہ فی حد ذاتہ نہ شرک ہیں نہ معصیت مگر ہاں بہ وجہ موہم ہونے کے ان کلمات کا مجامع میں کہنا مکروہ ہے کہ عوام کو ضرر ہے اور فی حد ذاتہ ابہام بھی ہے' لہٰذا نہ ایسے اشعار کا پڑھنا منع ہے اور نہ اس کے مولف پر طعن ہو سکتا ہے۔ (الی قولہ) مگر اسی طرح پڑھنا اور پڑھوانا کہ اندیشہ عوام کا ہو بندہ پسند نہیں کرتا گو اس کو معصیت بھی نہیں کہہ سکتا مگر خلاف مصلحت وقت کے جانتا ہے۔

(فتاویٰ رشیدیہ کامل ص ۲۸' مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی)

گویا یا محمد یارسول اللہ کے نعروں سے علماء دیو بند کا منع کرنا ذاتی ناپسندیدگی کی وجہ سے ہے کوئی حکم شرعی نہیں ہے۔ شیخ گنگوہی سے سوال کیا گیا:

سوال: اشعار اس مضمون کے پڑھنے: ''یارسول کبریا فریاد ہے' یا محمد مصطفیٰ فریاد ہے' مدد کر بہر خدا حضرت محمد مصطفیٰ' میری تم سے ہر گھڑی فریاد ہے'' کیسے ہیں؟

جواب: ایسے الفاظ پڑھنے محبت میں اور خلوت میں بایں خیال کہ حق تعالیٰ آپ کی ذات کو مطلع فرما دیوے یا محض محبت سے بلاکسی خیال سے جائز ہیں اور بعقیدہ عالم الغیب اور فریاد رس ہونے کے شرک ہیں اور مجامع میں منع ہیں کہ عوام کے عقائد کو فاسد کرتے ہیں' لہٰذا مکروہ ہوں گے۔ (فتاویٰ رشیدیہ کامل ص ۹۵' مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی)

عام مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب نہیں سمجھتے' عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے' البتہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی صفت عطا فرمائی ہے جس سے آپ پر حقائق غیبیہ منکشف ہو جاتے ہیں جس طرح ہم کو ایسی صفت عطا فرمائی ہے جس سے ہم پر عالم شہادت کے واقعات منکشف ہو جاتے ہیں' نہ ہم بذاتہ شہادت (عالم ظاہر) کے عالم ہیں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذاتہ غیب کے عالم ہیں۔ ہم پر اللہ تعالیٰ نے عالم شہادت منکشف کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ عزوجل نے عالم غیب بھی منکشف کیا۔ یہی عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور شیخ گنگوہی کی تصریح کے مطابق یہ شرک اور معصیت نہیں ہے بلکہ جائز ہے' علماء اہل سنت اپنی تقاریر اور تصانیف میں عوام کو یہ فرق ہمیشہ سے ہر دور میں بتاتے رہتے ہیں اور عام مسلمان اس فرق کو جانتے ہیں' اس لیے عوام کے جلسوں میں بھی اس قسم کے اشعار پڑھنا جائز ہیں کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک مانتا ہے اور اس کی عبادت بجالاتا ہے اس کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مستقل سامع یا مستقل عالم گردانتا ہے' البتہ ذاتی ناپسندیدگی کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

شیخ رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں:

اور اولیاء کی نسبت بھی یہ عقیدہ ایمان ہے کہ حق تعالیٰ جس وقت چاہے ان کو علم و تصرف دیوے اور عین حالت تصرف میں حق تعالیٰ ہی مصرف ہے' اولیاء ظاہر میں مصرف ہی معلوم ہوتے ہیں' عین حالت کرامت و تصرف میں حق تعالیٰ ہی ان کے واسطے سے کچھ کرتا ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ کامل ص ۴۹' مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی)

شیخ محمود الحسن "ایاک نستعین" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے' ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔

(حاشیۃ القرآن الحکیم ص ٢ 'مطبوعہ تاج کمپنی' کراچی)

مفتی محمد شفیع دیوبندی لکھتے ہیں:

اور حقیقی طور پر اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا نہ سمجھے اور کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرے' کسی نبی یا ولی وغیرہ کو وسیلہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا اس کے منافی نہیں۔ (معارف القرآن 'مطبوعہ ادارۃ المعارف' کراچی' ١٣٩٧ھ)

شیخ رشید احمد گنگوہی اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ دعا میں بحق رسول و ولی اللہ کہنا ثابت ہے یا نہیں' بعض فقہاء ومحدثین منع کرتے ہیں' اس کا کیا سبب ہے؟

جواب: بحق فلاں کہنا درست ہے' اور معنی یہ ہیں کہ جو تو نے اپنے احسان سے وعدہ فرمالیا ہے اس کے ذریعہ سے مانگتا ہوں مگر معتزلہ اور شیعہ کے نزدیک حق تعالیٰ پر حق لازم ہے اور وہ بحق فلاں کے یہی معنی مراد رکھتے ہیں' سو اس واسطے معنی موہم اور مشابہ معتزلہ ہو گئے تھے' لہٰذا فقہاء نے اس لفظ کا بولنا منع کردیا ہے تو بہتر ہے کہ ایسا لفظ نہ کہے کہ جو رافضیوں کے ساتھ تشابہ ہو جاوے فقط۔ (فتاویٰ رشیدیہ ص ٩٣ 'مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی)

شیخ محمد سرفراز خاں صفدر لکھتے ہیں:

یہاں ہم صرف "المہند" کی عبارت پر اکتفاء کرتے ہیں جو علماء دیوبند کے نزدیک ایک اجماعی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

جواب: ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک دعاؤں میں انبیاء و اولیاء و صدیقین کا توسل جائز ہے' ان کی حیات میں یا بعد وفات کے بایں طور کہے کہ یا اللہ! میں بوسیلہ فلاں بزرگ کے تجھ سے دعا کی قبولیت اور حاجت برائی چاہتا ہوں' اسی جیسے اور کلمات کہے' چنانچہ اس کی تصریح فرمائی ہے ہمارے مولانا محمد اسحاق دہلوی ثم المکی نے' پھر مولانا رشید احمد گنگوہی نے بھی اپنے فتاویٰ میں اس کو بیان فرمایا ہے جو چھپا ہوا آج کل لوگوں کے ہاتھ میں موجود ہے اور یہ مسئلہ اس کی پہلی جلد کے صفحہ نمبر ٩٣ پر مذکور ہے' جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ (انتہی المہند ص ١٢'١٣) (تسکین الصدور ص ٣١٣ 'مطبوعہ ادارہ نصرۃ العلوم' گوجرانوالہ)

شیخ اشرف علی تھانوی' امام طبرانی اور امام بیہقی کے حوالوں سے حضرت عثمان بن حنیف کی روایت ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

(ف) اس سے توسل بعد الوفات بھی ثابت ہوا اور علاوہ ثبوت بالروایۃ کے درایۃً بھی ثابت ہے کیونکہ روایت اول کے ذیل میں جو توسل کا حاصل بیان کیا گیا ہے' وہ دونوں حالتوں میں مشترک ہے۔ (نشر الطیب ص ٢٥٣ 'مطبوعہ تاج کمپنی' کراچی)

حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر حاضر ہو کر بارش کی دعا کے لیے درخواست کی تھی اس کے متعلق شیخ محمد سرفراز خاں صفدر لکھتے ہیں:

اس روایت کے سب راوی ثقہ ہیں اور حافظ ابن کثیر' حافظ ابن حجر اور علامہ سمہودی وغیرہ اس روایت کو صحیح کہتے ہیں' امام ابن جریر اور حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ١٧ھ اور ١٨ھ کی ابتداء کا ہے' (تاریخ طبری ج ٤ ص ٩٨' البدایہ والنہایہ ج ٧ ص ٩١) اور مورخ عبدالرحمان بن محمد بن خلدون (المتوفی ٨٠٨ھ) فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ١٨ھ کا ہے۔

(ابن خلدون ج ٢ ص ٩٦٩)

یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات سے تقریباً سات آٹھ سال بعد پیش آیا' اس وقت بکثرت حضرات صحابہ کرام موجود تھے۔ خواب دیکھنے والے کوئی مجہول شخص نہیں تھے' بلکہ جلیل القدر صحابی حضرت بلال بن حارث مزنی (المتوفی ٦٠ھ) رضی اللہ عنہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس حاضر ہو کر طلب دعا اور سوال شفاعت شرک نہیں ورنہ یہ جلیل القدر صحابی یہ کارروائی ہرگز نہ کرتے۔

یہ معاملہ نرے خواب کا نہیں ہے بلکہ اس سچے خواب کو خلیفہ راشد حضرت عمر کی تائید و تصویب حاصل ہے اور اس کارروائی کا حکم پہلے تو ''علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المہدیین'' کے تحت سنیت کا ہوگا ورنہ استحباب اور اقل درجہ جواز سے کیا کم ہوگا۔ (تسکین الصدور ص ٣٥٢۔٣٤٩ ملخصاً' مطبوعہ ادارہ نصرۃ العلوم' گوجرانوالہ)

نیز شیخ محمد سرفراز خاں صفدر لکھتے ہیں:

علاوہ ازیں متعدد کتابوں میں آپ کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر طلب دعا کا تذکرہ ہے' چنانچہ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ایک جماعت نے عتبی سے یہ مشہور حکایت نقل کی ہے جس جماعت میں شیخ ابو منصور الصباغ بھی ہیں' انہوں نے اپنی کتاب ''الشامل'' میں بیان کیا ہے کہ عتبی فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس بیٹھا ہوا تھا' کہ ایک اعرابی آیا اور اس نے کہا: السلام علیک یا رسول اللہ! میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا ہے ''اور اگر بے شک وہ لوگ جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا تیرے پاس آتے پس وہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے اور ان کے لیے رسول بھی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا تو وہ ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے'' اس لیے میں اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کے لیے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارشی پیش کرنے آیا ہوں۔ اس کے بعد اس نے درد دل سے چند اشعار پڑھے اور جذبہ محبت کے پھول نچھاور کر کے چلا گیا' اور اسی واقعہ کے آخر میں مذکور ہے کہ خواب میں اس کو کامیابی کی بشارت بھی مل گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عتبی! جا کر اعرابی سے کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ١ ص ٥٢٠) یہ واقعہ امام نووی نے ''کتاب الاذکار'' ص ١٨٥' طبع مصر میں اور علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفی الحنفی المتوفی ٧١٠ھ نے اپنی تفسیر ''مدارک'' ج ١ ص ٣٩٩ میں اور علامہ تقی الدین سبکی نے ''شفاء السقام'' ص ٤٦ میں اور شیخ عبدالحق نے ''جذب القلوب'' ص ١٩٥ میں اور علامہ بحر العلوم عبدالعلی نے ''رسائل الارکان'' ص ٣٨٠ طبع لکھنؤ میں نقل کیا ہے' اور علامہ علی بن عبدالکافی السبکی اور علامہ سمہودی لکھتے ہیں کہ

عتبی کی حکایت اس میں مشہور ہے اور تمام مذاہب کے مصنفین نے مناسک کی کتابوں میں اور مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے اور سب نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے' اسی طرح دیگر متعدد علماء نے قدیماً و حدیثاً اس کو نقل کیا ہے اور حضرت تھانوی لکھتے ہیں کہ مواہب میں بسند امام ابو منصور صباغ اور ابن النجار اور ابن عساکر اور ابن الجوزی رحمہم اللہ تعالیٰ نے محمد بن حرب ہلالی سے روایت کیا ہے کہ میں قبر مبارک کی زیارت کر کے سامنے بیٹھا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور زیارت کر کے عرض کیا کہ یا خیر الرسل! اللہ تعالیٰ نے آپ پر ایک سچی کتاب نازل فرمائی جس میں ارشاد ہے: ''وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا'' (النساء: ٦٤) اور میں آپ کے پاس اپنے گناہوں سے استغفار کرتا ہوا اور اپنے رب کے حضور میں آپ کے وسیلہ سے شفاعت چاہتا ہوا آیا ہوں' پھر دو شعر پڑھے' اور اس محمد بن حرب کی وفات ٢٢٨ھ میں ہوئی ہے' اھ۔ غرض زمانہ خیر القرون کا تھا اور کسی سے اس وقت نکیر منقول نہیں' بس حجت ہو گیا۔ (نشر الطیب ص ٢٥٣) اور حضرت مولانا نانوتوی یہ آیت کریمہ لکھ کر فرماتے ہیں: ''کیونکہ اس میں کسی کی تخصیص نہیں آپ کے ہم عصر ہوں یا بعد کے امتی ہوں' اور تخصیص ہو تو کیونکر ہو آپ کا وجود تربیت تمام امت کے لیے یکساں رحمت ہے کہ پچھلے امتیوں کا آپ کی خدمت

میں آنا اور استغفار کرنا اور کرانا جب ہی متصور ہے کہ قبر میں زندہ ہوں' اھ (آب حیات ص ۴۰) اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی یہ سابق واقعہ ذکر کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ پس ثابت ہوا کہ اس آیت کریمہ کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی باقی ہے۔ (اعلاء السنن ج ۱۰ ص ۳۳۰) ان اکابر کے بیان سے معلوم ہوا کہ قبر پر حاضر ہو کر شفاعت مغفرت کی درخواست کرنا قرآن کریم کی آیت کے عموم سے ثابت ہے' بلکہ امام سبکی فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس معنی میں صریح ہے۔ (شفاء السقام ص ۱۲۸) اور خیر القرون میں یہ کارروائی ہوئی مگر کسی نے انکار نہیں کیا جو اس کے صحیح ہونے کی واضح دلیل ہے۔

(تسکین الصدور ص ۳۶۵-۳۶۲ ملخصا' مطبوعہ ادارہ نصرۃ العلوم' گوجرانوالہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر حاضر ہو کر دعا کی درخواست کرنے کو ناجائز ثابت کرنے کے لیے شیخ ابن تیمیہ' شیخ ابن قیم اور شیخ ابن الہادی وغیرہم کی ایک یہ دلیل ہے کہ حضرات صحابہ کرام' ائمہ دین اور سلف صالحین سے ایسی کارروائی ثابت نہیں' اگر یہ جائز ہوتی تو وہ ضرور ایسا کرتے' اس کے جواب میں شیخ محمد سرفراز خان صفدر لکھتے ہیں:

یہ ان حضرات کا ایک علمی مغالطہ ہے کیونکہ قبر کے پاس حاضر ہو کر سفارش کرانا اور طلب دعا' نہ تو فرض و واجب ہے اور نہ سنت مؤکدہ' تاکہ یہ حضرات اس پر خواہ مخواہ ضرور عمل کر کے دکھاتے اور اس کارروائی کے نہ کرنے پر وہ ملامت کیے جاتے' اس کارروائی کے مقر اس کو صرف جائز ہی کہتے ہیں اور جواز کے اثبات کے لیے حضرت بلال بن الحارث کا یہ فعل جس کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات صحابہ کرامؓ نے تائید کی ہے کیا کم ہے؟ اگر حضرت ابن عمر صحابی ہیں جنہوں نے ایسا نہیں کیا تو یقین جانئے کہ بلال بن الحارث اور ان کی اس کارروائی کے مصدقین بھی صحابہ ہی ہیں' اگرچہ حافظ ابن تیمیہ یہ کارروائی تسلیم نہیں کرتے لیکن اس کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کارروائی بعض متاخرین سے ثابت ہے۔ (ملخصا' قاعدہ جلیلہ ص ۷۲)

(تسکین الصدور ص ۳۵۴ ملخصا' مطبوعہ ادارہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)

خلاصہ یہ ہے کہ تمام اکابر اور اصاغر علماء دیوبند کے نزدیک یا رسول اللہ کہنا جائز ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر مقربین کے وسیلہ سے دعا کرنا اور ان سے دعا کی درخواست کرنا بھی جائز ہے' بلکہ سنت اور مستحب ہے اور ہم بھی اس سے زیادہ نہیں کہتے۔

ندائے غیر اللہ اور توسل کے متعلق مصنف کا موقف

انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام سے استمداد کے متعلق جو ہم نے احادیث اور فقہاء اسلام کی عبارات نقل کی ہیں اس سے ہمارا صرف یہ منشاء ہے کہ عام مسلمان جو شدائد اور ابتلاء میں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر پکارتے ہیں' ان کا یہ پکارنا شرک نہیں ہے اور اس نداء کو شرک کہنا شدید ظلم اور زیادتی ہے کیونکہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہر حال اللہ کی مخلوق اور اس کا مقرب بندہ گردانتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ حقیقی کارساز صرف اللہ تعالیٰ ہے اور انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کا ہر فعل اور ہر تصرف اللہ تعالیٰ کے اذن' اس کی مشیت اور اس کی دی ہوئی قدرت کے تابع ہے' انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام ہوں یا عام انسان' اس کائنات میں جس سے بھی جو فعل صادر ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت سے صادر ہوتا ہے' اور اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی انسان کو کسی شے پر ذرہ برابر بھی قدرت نہیں ہے' اور اس اعتقاد کے ساتھ ندائے غیر اللہ کو علماء دیوبند بھی جائز کہتے ہیں' جیسا کہ شیخ گنگوہی کے حوالے سے گزر چکا ہے۔

اس اعتقاد کے ساتھ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام سے استمداد اور استغاثہ کرنا ہر چند کہ جائز ہے لیکن افضل' احسن اور اولیٰ یہی ہے کہ ہر حال میں اور ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے اور اسی سے استمداد اور استعانت کی جائے' امام

ترمذی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن ایک سواری پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا' آپ نے فرمایا: اے بیٹے! میں تم کو چند باتوں کی تعلیم دیتا ہوں' تم اللہ کو یاد رکھو اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے گا' تم اللہ کو یاد رکھو' تم اللہ کو سامنے پاؤ گے' جب تم سوال کرو تو اللہ تعالیٰ سے کرو اور جب تم مدد طلب کرو تو اللہ تعالیٰ سے کرو اور جان لو کہ اگر تمام امت تم کو نفع پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے تو وہ تم کو صرف اسی چیز کا نفع پہنچا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے تمہارے لیے لکھ دیا ہے' اگر تمام لوگ تم کو نقصان پہنچانے کے لیے جمع ہو جائیں تو وہ تم کو صرف اسی چیز کا نقصان پہنچا سکتے ہیں جو اللہ نے لکھ دیا ہے' قلم اٹھالئے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(جامع ترمذی ص ۳۶۱' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام ابویعلی[1]' امام ابن سنی[2] اور امام ابن عبدالبر[3] نے بھی روایت کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم اور تلقین کے پیش نظر مسلمانوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کریں اور اسی سے مدد چاہیں' اور دعا میں مستحسن طریقہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا مانگیں' زیادہ محفوظ اور زیادہ سلامتی اس میں ہے کہ وہ دعائیں مانگی جائیں جو قرآن مجید اور احادیث میں مذکور ہیں' تاکہ دعاؤں میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سایہ فگن رہے' اگر کسی خاص حاجت میں دعا مانگی ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے مانگنی چاہیے۔

ہمارے فاضل معاصر علامہ محمد عبدالحکیم صاحب شرف قادری ثم نقشبندی لکھتے ہیں:

البتہ یہ ظاہر ہے کہ جب حقیقی حاجت روا' مشکل کشا اور کارساز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو احسن اور اولیٰ یہی ہے کہ اسی سے مانگا جائے اور اسی سے درخواست کی جائے اور انبیاء و اولیاء کا وسیلہ اس کی بارگاہ میں پیش کیا جائے' کیونکہ حقیقت' حقیقت ہے اور مجاز' مجاز ہے' یا بارگاہ انبیاء و اولیاء سے درخواست کی جائے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کریں کہ ہماری مشکلیں آسان فرمادے اور حاجتیں برلائے' اس طرح کسی کو غلط فہمی بھی پیدا نہیں ہوگی اور اختلافات کی خلیج بھی زیادہ وسیع نہیں ہوگی۔

(ندائے یارسول اللہ ص ۱۲' مطبوعہ مرکزی مجلس رضا' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ نداء غیر اللہ اعتقاد مذکور کے ساتھ ہر چند کہ جائز ہے' لیکن افضل' اولیٰ اور احسن یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے اور اسی سے استمداد اور استعانت کی جائے جیسا کہ حدیث مذکور کا تقاضا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام سے استمداد' نداء اور توسل کے متعلق میں نے بہت طویل بحث کی ہے کیونکہ ہمارے زمانہ میں اس مسئلہ میں جانبین سے غلو کیا جاتا ہے' شیخ ابن تیمیہ' ابن القیم اور ابن الہادی کے پیروکار اور علماء نجد' غیر اللہ سے استمداد اور وصال کے بعد ان کے توسل سے دعا مانگنے کو ناجائز اور شرک کہتے ہیں اور بعض غالی اور ان پڑھ عوام' اللہ سے دعا مانگنے کے بجائے ہر معاملہ میں غیر اللہ کی دہائی دیتے ہیں' انہی کو پکارتے ہیں اور انہی کی نذر مانتے ہیں' سو میں نے چاہا کہ قرآن مجید' احادیث صحیحہ' آثار صحابہ اور فقہاء اسلام کی عبارات کی روشنی میں حق کو واضح کروں' تاکہ بلاوجہ کسی مسلمان کو مشرک کہا جائے نہ اللہ تعالیٰ سے دعا اور استعانت کا رابطہ منقطع کیا جائے اور نہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کی تعظیم و تکریم میں کوئی

[1] امام ابویعلی احمد بن علی بن المثنی الموصلی ۳۰۷ھ' مسند ابویعلی موصلی ج ۳ ص ۸۵ ـ ۸۲' مطبوعہ موسسۃ علوم القرآن' بیروت

[2] حافظ ابوبکر احمد بن محمد بن اسحاق دینوری المعروف بابن سنی متوفی ۳۶۴ھ' عمل الیوم واللیلۃ ص ۱۳۶

[3] حافظ ابوعمرو ابن عبدالبر مالکی متوفی ۴۶۳ھ' تمہید ج ۴ ص ۱۱۱' مطبوعہ مکتبہ قدوسیہ' لاہور' ۱۴۰۴ھ

کمی کی جائے۔

الٰہ العٰلمین! ان سطور میں اثر آفرینی پیدا فرما' اور جانبین سے غلو کرنے والوں کو اعتدال کی راہ اور صراط مستقیم پر گامزن فرما' مجھے اس کتاب کے مکمل کرنے کی توفیق مرحمت فرما' اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما' اس کتاب کو میری بخشش کا ذریعہ بنادے اور اس کو میرے لیے صدقہ جاریہ کردے۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین و الصلوۃ و السلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین قائد المرسلین شفیع المذنبین و علی الہ الطیبین الطاھرین و اصحابہ الکاملین الراشدین وازواجہ امھات المومنین و اولیاء امتہ الواصلین و علماء ملتہ الراسخین و الائمۃ و المجتھدین المحدثین و المفسرین و سائر المسلمین اجمعین الی یوم الدین۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ہم کو سیدھے راستہ پر چلاO (الفاتحہ: ۵)

ہدایت کا لغوی معنی اور اس کی اقسام

''اھد'' کا لفظ ''ھدایۃ'' سے مشتق ہے' علامہ راغب اصفہانی ''ھدایۃ'' کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جو چیز مطلوب تک پہنچادے اس کی طرف ملائمت اور نرمی سے رہنمائی کرنا ہدایت ہے' فلاں شخص کو ہدایت دی یعنی اس کی رہنمائی کی' اللہ تعالیٰ نے انسان کو چار قسم کی ہدایت دی ہے۔

(۱) عقل اور شعور کی ہدایت اور بدیہیات کا علم ہر شخص کو عطا فرمایا ہے:

اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی O (طٰہٰ: ۵۰) — جس نے ہر چیز کو اس کی (مخصوص) بناوٹ عطا فرمائی پھر ہدایت دیO

(۲) انبیاء علیہم السلام کی زبانوں سے اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ ہدایت عطا فرمائی:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا۔ (الانبیاء: ۷۳) — اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا' وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔

(۳) توفیق الٰہی جو ہدایت یافتہ لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے:

وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ O (محمد: ۱۷) — اور جن لوگوں کو ہدایت کی توفیق مل گئی (یعنی جنہوں نے ہدایت قبول کی) اللہ نے ان کی ہدایت کو زیادہ کردیا اور انہیں ان کا تقویٰ عطا فرمایاO

(۴) آخرت میں جنت کی طرف پہنچانا:

قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا۔ (الاعراف: ۴۳) — جنتی کہیں گے: اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں جس نے ہم کو یہاں تک پہنچایا۔

یہ چاروں ہدایتیں ترتیب وار ہیں کیونکہ جس چیز کو ہدایت کی پہلی قسم (عقل وشعور) حاصل نہیں ہے اس کو باقی اقسام بھی حاصل نہیں ہوں گی بلکہ وہ مکلّف بھی نہیں ہے' جیسے حیوانات' اور جس کو دوسری قسم کی ہدایت حاصل نہیں ہوئی اس کو باقی دو قسمیں بھی حاصل نہیں ہوں گی (اس میں اشکال ہے) اور جس کو تیسری قسم حاصل نہیں ہوئی جیسے کفار اس کو چوتھی قسم حاصل نہیں ہوگی اور جس کو چوتھی قسم حاصل ہوگی اس کو پہلی تین قسمیں حاصل ہوچکی ہوں گی۔

(المفردات ص ۵۳۹-۵۳۸' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران ۱۳۴۲ھ)

ہدایت کی اقسام کی مزید تفصیل

اس تفصیل میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہدایت کی پہلی قسم وجدان ہے جو انسان کو مبدء ولادت میں عطا کیا جاتا ہے' جب اس کو بھوک اور پیاس کا ادراک ہوتا ہے' جب وہ غذا کی طلب کے لیے روتا اور چلاتا ہے' اور دوسری قسم حواس کی ہدایت ہے اور یہ قسمیں انسان اور حیوان میں مشترک ہیں' اور تیسری قسم عقل کی ہدایت ہے جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے' عقل کی ہدایت سے انسان حواس کی اصلاح کرتا ہے مثلاً صفراوی مزاج والا میٹھی چیزوں کو کڑوا محسوس کرتا ہے تو عقل ہدایت دیتی ہے کہ یہ میٹھی چیز ہے' ہدایت کی چوتھی قسم دین اور شریعت کی ہدایت ہے' اور ہدایت کی پانچویں قسم توفیق ہے۔

وجدان' حواس اور عقل کی ہدایت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ (البلد: ۱۰۔۸)
کیا ہم نے اس کی دو آنکھیں ○ زبان اور ہونٹ نہیں بنائے ○ اور ہم نے اسے (نیکی اور بدی) دونوں واضح راستے دکھا دیئے ○

اور دین اور شریعت کی ہدایت کے متعلق فرمایا:

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى . (حٰم السجدۃ: ۱۷)
اور رہے ثمود کے لوگ تو ہم نے ان کو ہدایت دی سو انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر پسند کرلیا۔

اور ہدایت کی توفیق کے متعلق فرمایا:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ (الفاتحہ: ۵)
ہم کو سیدھے راستے پر چلا ○

اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی ذات کا دیدار' اس کی رضا اور جنت الفردوس کی ہدایت ہے' اس ہدایت کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہم کو وجدان' عقل اور شعور (حواس سے ادراک) کی ہدایت عطا فرمائی' پھر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کے واسطے سے ہم کو دین اور شریعت کی ہدایت میسر کی' اب ہم دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہم کو دین اور شریعت پر چلا اور اس کی توفیق مرحمت فرما تاکہ ہم کو جنت کی ہدایت حاصل ہوسکے۔

اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کا فرق

ہدایت کا ایک معنیٰ "ایصال الی المطلوب الخیر" (نیک مطلوب تک پہنچانا) ہے اور دوسرا معنیٰ "ارشاد" اور "اراءۃ الطریق" (راستہ دکھانا) ہے' مطلوب خیر تک پہنچانا یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے' اس کو ہدایت یافتہ بنانا اور باطن میں ہدایت دینے سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور "راستہ دکھانا" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب ہے' اس کو ہدایت نافذ کرنے اور ظاہراً ہدایت دینے سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہدایت کی نسبت کی گئی ہے اس سے مراد راستہ دکھانا ہے اور جہاں آپ سے ہدایت دینے کی نفی کی گئی اس سے مراد ہدایت یافتہ بنانا ہے' مثلاً قرآن مجید میں ہے:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ (القصص: ۵۶)
بے شک آپ اس کو ہدایت یافتہ نہیں بناتے جس کو آپ چاہیں' لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت یافتہ بنا دیتا ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ (البقرہ: ۲۷۲)
انہیں ہدایت یافتہ بنانا آپ کے ذمہ نہیں لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت یافتہ بنا دیتا ہے۔

ہدایت یافتہ بنانا' مطلوب خیر تک پہنچانا اور باطن میں ہدایت دینا یہ آپ کا منصب نہیں ہے' آپ کا منصب اللہ کی ہدایت

کو نافذ کرنا' ظاہراً ہدایت دینا اور راستہ دکھانا ہے اسی اعتبار سے فرمایا:

وَاِنَّكَ لَتَهۡدِيۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۙ — اور بے شک آپ ضرور صراط مستقیم دکھاتے ہیں O

(الشوریٰ: ۵۲)

صراط مستقیم کا لغوی اور شرعی معنی

دو نقطوں کو ملانے والے سب سے چھوٹے خط کو لغت میں صراط مستقیم کہتے ہیں اور شریعت میں صراط مستقیم سے مراد وہ عقائد ہیں جو سعادت دارین تک پہنچاتے ہیں' یعنی وہ دین اسلام جس کو دے کر تمام انبیاء اور رسل کو مبعوث کیا گیا اور ان تمام کی نبوات اور رسالات کو حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت پر ختم کر دیا گیا' جس دین سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح معرفت ہو اور تمام احکام شرعیہ کا علم ہو وہ صراط مستقیم ہے۔ یہ صراط مستقیم کا خاص معنی ہے' اور اس کا عام معنی یہ ہے:

تمام اخلاق' اعمال اور امور میں افراط اور تفریط کے درمیان متوسط طریقہ۔

خواص مسلمین کے نزدیک صراط مستقیم کا معنی یہ ہے:

کفر' فسق' جہل' بدعت اور ہوائے نفسانیہ کے جہنم کی پشت پر علم' عمل' خلق اور حال کے اعتبار سے شریعت پر استقامت کا پل۔

اس معنی میں صراط مستقیم سے ذہن آخرت کے پل صراط کی طرف متوجہ ہوتا ہے' پل صراط کے متعلق احادیث میں ہے کہ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اور شریعت پر استقامت بھی بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے' مثلاً ہمارے ہاں عام طور پر دیور اور بھابھی میں پردہ نہیں ہوتا' حالانکہ شریعت میں ان کے درمیان پردہ کی سخت تاکید ہے' سرکاری ملازمتیں رشوت' سود اور بے ایمانی کی آمدنی کے بغیر ممکن نہیں' یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم مخلوط طریقہ تعلیم کے بغیر ناممکن ہے' دکاندار اور ٹھیلے والے پولیس کو بھتہ دیئے بغیر اپنا کاروبار نہیں چلا سکتے' نجی اداروں اور دفاتر میں مردوں اور عورتوں کا مخلوط اسٹاف ہوتا ہے' استقبالیہ اور معلوماتی کاؤنٹر پر بے پردہ خواتین سے گفتگو کرنی پڑتی ہے' سرکاری ٹینڈرز پر کوئی ٹھیکہ رشوت کے بغیر منظور نہیں ہو سکتا' پولیس اور دیگر سرکاری محکموں میں کوئی شخص رشوت میں ملوث ہوئے بغیر ملازمت نہیں کر سکتا' غرضیکہ پورا معاشرہ شریعت کی خلاف ورزیوں اور اخلاقی پستیوں میں ڈوبا ہوا ہے' ایسے معاشرہ میں اگر کوئی شخص شریعت پر مستقیم رہنا چاہے تو یہ صراط مستقیم بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اور جو اس صراط مستقیم پر آسانی سے گزر گیا وہ آخرت کی پل صراط سے بھی آسانی سے گزر جائے گا۔

اور عوام مسلمین کے اعتبار سے صراط مستقیم کا یہ معنی ہے:

اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو ماننا اور اس پر عمل کرنا اور ہر اس کام سے رکنا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔

خواص جب ''اھدنا الصراط المستقیم'' کہتے ہیں تو اس کا معنی یہ ہے: اے اللہ! ہمیں ''سیر الی اللہ'' کے بعد ''سیر فی اللہ'' عطا فرما اور ہم پر اپنے جمال اور جلال کی صفات غیر متناہیہ منکشف کر دے اور جب عوام ''اھدنا الصراط المستقیم'' کہتے ہیں تو اس کا معنی ہے: اے اللہ! ہمیں اپنے تمام احکام پر عمل کی توفیق عطا فرما۔

کیا نمازی کا صراط مستقیم کی دعا کرنا تحصیل حاصل ہے؟

اس جگہ ایک مشہور سوال یہ ہے کہ جب نمازی نماز میں کہتا ہے: ''اھدنا الصراط المستقیم'' سو وہ تو خود صراط مستقیم

کی ہدایت پر ہے اگر صراط مستقیم پر نہ ہوتا تو نماز کیسے پڑھتا لہٰذا یہ تحصیل حاصل ہے۔ اس کے دو جواب ہیں:

(۱) اس دعا کا معنی یہ ہے کہ اے اللہ مجھ کو صراط مستقیم کی ہدایت پر قائم اور ثابت رکھ اور اس میں دوام عطا فرما۔ یہ معنی عوام مسلمین کے اعتبار سے ہے اور اس کی تائید قرآن مجید کی اس آیت میں ہے:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا. (آل عمران: ۸) اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر۔

اور اس حدیث میں بھی اس کی تائید ہے: امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

عن انس قال کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یکثر ان یقول یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک.

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہ کثرت یہ کہتے تھے: اے دلوں کے پلٹنے والے! میرے دل کو بھی اپنے دین پر قائم اور ثابت رکھ۔

(جامع ترمذی ص ۳۱۲ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کراچی)

(۲) اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی معرفت کے درجات غیر متناہی ہیں اور نمازی معرفت کے جس درجہ میں ہے وہ اس سے اگلے مقام کی معرفت کی دعا کرتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ میری ہدایت میں ترقی عطا فرما۔ یہ خواص مسلمین کے اعتبار سے ہے اور اس کی تائید ان آیات میں ہے:

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى. (مریم: ۷۶) اور ہدایت یافتہ لوگوں کی ہدایت میں اللہ تعالیٰ زیادتی فرماتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ ۝ (محمد: ۱۷) اور ہدایت یافتہ لوگوں کی ہدایت کو اللہ نے زیادہ کیا اور انہیں ان کا تقویٰ عطا فرمایا۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ (الضحیٰ: ۴) اور بے شک آپ کی ہر بعد کی گھڑی پہلی گھڑی سے بہتر ہے۔

جمع کے صیغہ سے دعا کرنے کی وجہ اور ربط آیات

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں جمع کے صیغہ سے دعا کی تعلیم ہے "ہم کو سیدھے راستہ پر چلا" واحد کا صیغہ کیوں نہیں ہے؟ "مجھ کو سیدھے راستہ پر چلا" اس کا جواب یہ ہے کہ جب نمازی تمام مسلمانوں کے لیے دعا کرے گا تو ان میں کچھ اللہ کے مقرب اور مقبول بندے بھی ہوں گے جن کے حق میں اللہ تعالیٰ دعا کو قبول فرمائے گا اور یہ اس کے کرم عمیم سے بعید ہے کہ وہ بعض کے حق میں دعا قبول کرے اور باقی بعض کے حق میں دعا کو مسترد کر دے۔

ان آیات میں ربط اس طرح ہے کہ جب بندوں نے کہا: اے پروردگار! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں تو گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہاری مہمات یا عبادات میں میں تمہاری کیسے مدد کروں؟ پس بندوں نے کہا: ہمیں دین اسلام پر چلا اور چونکہ دین اسلام پر چلنا اللہ کی خاص نعمت ہے اس لیے فرمایا:

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا ۝ (الفاتحہ: ۷)

جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے وہ گزشتہ امتوں میں سے انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین ہیں۔ امام ابن جریر

نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ہمیں ان لوگوں کے راستہ پر چلا جن پر تو نے اپنی اطاعت اور عبادت کا انعام کیا ہے جو ملائکہ' انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین ہیں' جنہوں نے تیری اطاعت اور عبادت کی۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۵۹۔ ۵۸' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے انعام یافتہ لوگوں کا اجمالاً ذکر کیا ہے اور اس کی تفصیل ان آیتوں میں ہے:

انعام یافتہ لوگوں کا بیان

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ. (النساء: ۶۹)

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا جو انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا (مریم: ۵۸)

جن لوگوں پر اللہ نے انعام کیا وہ اولاد آدم میں سے انبیاء ہیں اور ان لوگوں (کی نسل) سے جن کو ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا' اور ابراہیم اور یعقوب کی نسل سے اور ان میں سے جن کو ہم نے ہدایت دی اور ان کو منتخب کر لیا' جب ان پر رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ سجدہ کرتے ہیں اور روتے ہوئے گر پڑتے ہیں O

انعام یافتہ لوگوں کے راستوں کا بیان

ان انعام یافتہ نفوس قدسیہ کے راستہ پر چلنے کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بالکلیہ اطاعت الٰہی اور اس کی قضاء پر راضی ہونے میں جذب کر لے' اور ایسا ہو جائے کہ اگر اس کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دے تو اس کی اس طرح اطاعت کرے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی' اور اگر خود اس کو ذبح ہونے کا حکم دیا جائے تو اپنے آپ کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح ذبح کے لیے تیار پائے' اور اگر کسی بڑے منصب پر فائز ہونے کے بعد اس کو کسی سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح طلب علم کے لیے روانہ ہو جائے' اور اپنی بڑائی کو عار نہ بنائے اور اگر اس کو یہ حکم دیا جائے کہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے خواہ اس راہ میں اس کو آرے سے چیر دیا جائے تو حضرت یحییٰ اور زکریا کی طرح قتل ہو جائے اور اف نہ کرے' سخت موذی بیماریوں میں مبتلا کیا جائے تو حضرت ایوب علیہ السلام کی طرح صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے' اگر قاضی اور حاکم بنے تو عدل اور انصاف کے سامنے جھکنے میں عار محسوس نہ کرے اور اگر اس کے بیٹے کا کیا ہوا فیصلہ اس کے کیے ہوئے فیصلہ کے مقابلہ میں صحیح ہو تو قبول حق کے راستہ میں انانیت کو نہ آنے دے' جیسے حضرت داؤد نے اپنے کیے ہوئے فیصلہ کے مقابلہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کو راجح قرار دیا تھا' اور سلطنت اور شاہی ملے تو حکومت کے رعب اور دبدبہ میں اللہ کی یاد' عبادت و ریاضت اور شب بیداری کو نہ بھولے' جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اتنی عظیم الشان حکومت ملنے کے باوجود اطاعت الٰہی سے غافل نہ تھے اور رکوع اور سجدوں میں راتیں گزارتے تھے اور اگر قضاء الٰہی سے کسی بلا اور مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو شکوہ و شکایت نہ کرے بلکہ اپنے قصور نفس کا اعتراف کرے اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل میں مصروف رہے جیسے حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں گرفتار ہو کر بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل کرتے رہے' اگر نوجوان' حسین و جمیل اور پیارا بیٹا گم ہو جائے تو حرف شکایت زبان پر نہ لائے اور حضرت یعقوب کی طرح صبر جمیل کرے' اور

اگر کوئی بااختیار و اقتدار حسین و جمیل عورت کسی جوان مرد کو گناہ کی دعوت دے تو قید خانے میں جانا منظور کر لے اور گناہ سے دامن بچائے رکھے اور جب قید خانہ میں جائے تو وہاں بھی دعوت و ارشاد کو نہ بھولے اور وہاں کے قیدیوں کو اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت کی دعوت دے اور یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا اسوہ اور نمونہ ہے اور ان کا راستہ ہے۔

یہ سابق انعام یافتہ لوگوں کی سیرتوں کا اجمالی بیان ہے اور سب سے زیادہ انعام حضرت سید المرسلین و سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا گیا ہے اور ان کی سیرت تمام انبیاء سابقین کی سیرتوں کی جامع 'کامل اتم اور اکمل ہے اور یہ سارا قرآن انہی کی سیرت کا بیان ہے اور اس کی تفصیل آپ کی احادیث اور سنت میں ہے' اس لیے قرآن اور سنت ہی دراصل صراط مستقیم ہے' اس لیے جو شخص انعام یافتہ نفوسِ قدسیہ کی صراط مستقیم پر چلنا چاہتا ہو وہ قرآن اور سنت کو دانتوں سے پکڑ لے اور ان پر پورا پورا عمل کرے۔

''مغضوب'' کا معنی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں: غضب کا معنی ہے: انتقام کے ارادے سے دل کے خون کا کھولنا اور جوش میں آنا' اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غضب سے بچو کیونکہ یہ ایک انگارہ ہے جو بنو آدم کے دلوں میں دہکتا ہے کیا تم غضبناک شخص کی گردن کی پھولی ہوئی رگوں اور اس کی سرخ آنکھوں کو نہیں دیکھتے' اور جب اس لفظ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے صرف انتقام مراد ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ . (النساء: ۹۳) اور اللہ (مومن کے قاتل سے) انتقام لے گا اور اس کو اپنی رحمت سے دور کرے گا۔

''المغضوب علیہم'' کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے یہود مراد ہیں۔

(المفردات ص ۳۶۱' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران' ۱۳۴۲ھ)

''المغضوب علیہم'' کی ماثور تفسیر

امام ابن جریر نے متعدد اسانید کے ساتھ حضرت عدی بن حاتم' حضرت ابن عباس' حضرت ابن مسعود اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ ''المغضوب علیہم'' سے مراد یہود ہیں۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۶۲۔۶۱' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

مغضوب کا معنی بیان کرنے میں بعض علماء کی لغزش

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ''المغضوب علیہم'' کے ترجمہ میں لکھا ہے ''اور جو معتوب نہیں ہوئے''۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۵' مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن' لاہور)

ہمارے شیخ علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ العزیز اس پر تعاقب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک معاصر نے ''غیر المغضوب علیہم'' کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھا ''جو معتوب نہیں ہوئے'' یہاں ''مغضوب'' کا ترجمہ ''معتوب'' صحیح نہیں' عہد رسالت سے لے کر آج تک کسی نے یہ ترجمہ نہیں کیا' بلکہ ادنیٰ تامل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غضب سے عتاب مراد لینا مراد الٰہی کے قطعاً خلاف ہے' اس لیے کہ اللہ کا غضب انہی لوگوں کے ساتھ ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے ارادہ انتقام متعلق فرمایا۔ رہا ''عتاب'' تو فی الجملہ وہ رسولوں کی طرف بھی متوجہ ہوا۔ صحیحین کی متفق علیہ حدیث میں

ہے۔ "عتب اللّٰہ علیہ" "اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عتاب فرمایا۔" (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۳، صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۶۹) بلکہ سورہ "عبس و تولی" کی تفسیر میں یہ حدیث وارد ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم کی آمد پر فرمایا: "مرحبا بمن عاتبنی فیہ ربی" "جس کی وجہ سے مجھ پر عتاب ہوا اس کو خوش آمدید" (تفسیر کبیر ج ۸ ص ۲۷۰، روح المعانی ج ۳۰ ص ۳۹، ابن جریر ج ۳۰ ـ ۲۹ ـ ۲۸، ارشاد الساری ج ۷ ص ۴۱۱) جس سے ظاہر ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی عتاب متوجہ ہوا۔ اگر "مغضوب" کا ترجمہ "معتوب" صحیح مان لیا جائے تو معاذ اللہ حبیب و کلیم علیہما الصلوٰۃ والتسلیم بھی "مغضوب علیھم" میں شامل ہو جائیں گے۔ واضح رہے کہ غضب جو اللہ کی صفت ہے اس کی بنیاد صرف عقوبت اور ارادۂ انتقام ہے اور اس عتاب کا مبنیٰ مودت و محبت ہے۔ اہل لغت نے عتاب کے معنے "مخاطبۃ الادلال" لکھے ہیں یعنی محبوب کی لاپروائی یا بے توجہی پر محبت بھری خفگی کا اظہار۔ صاحب "لسان العرب" اور "صاحب تاج العروس" نے اس معنی پر بطور شاہد یہ شعر نقل کیے:

اعاتب ذا المودۃ من صدیق اذا ما رابنی منہ اجتناب

اذا ذھب العتاب فلیس ود ویبقی الود ما بقی العتاب

(لسان العرب ج ۱ ص ۵۷۷، تاج العروس ج ۱ ص ۳۶۵)

"محبت والے دوست کے ساتھ میں عتاب سے پیش آتا ہوں' جب مجھے اس کی کنارہ کشی کا اندیشہ ہو' جب عتاب گیا تو محبت بھی نہ رہی کہ محبت اسی وقت تک رہتی ہے جب تک عتاب باقی رہے" یعنی عتاب سے پیش آنا محبت کی نشانی ہے۔ اگر کہا جائے کہ اردو لغت کی کتابوں میں "غضب" کے معنی عتاب اور "عتاب" کے معنی غضب اور "مغضوب" کے معنی "زیر عتاب" لکھے ہیں تو عرض کروں گا کہ ہر زبان کے علماء لغت کی طرح اُردو لغت والوں نے بھی اپنی اُردو زبان کے استعمالات و محاورات کو اُردو لغت کی کتابوں میں جمع کر دیا' مگر قرآن مجید "اردو" میں نہیں بلکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ ہر زبان کے محاورات و استعمالات اس کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں اس لئے اردو استعمالات پر عربی استعمالات کا قیاس درست نہیں' بالخصوص قرآنی استعمالات میں غضب اللہ سے عتاب مراد لینا یا مغضوب کا ترجمہ معتوب کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔

(التبیان ج ۱ ص ۳۳ ـ ۳۲ مطبوعہ کاظمی پبلیکیشنز' ملتان' ۱۹۹۳ء)

"ضالین" کے معانی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

ضلال کے معنی ہیں: طریق مستقیم سے عدول اور اعراض کرنا' اس کی ضد ہدایت ہے' قرآن مجید میں ہے:

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ (بنی اسرائیل: ۱۵)

جس نے ہدایت قبول کی تو اس نے اپنے ہی نفع کے لیے ہدایت قبول کی اور جو گمراہ ہوا تو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر پڑا۔

صحیح راستہ سے ہر انحراف کو ضلال کہتے ہیں خواہ وہ انحراف عمداً ہو یا سہواً' کم ہو یا زیادہ' کیونکہ جو صحیح راستہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے اس پر چلنا بہت دشوار ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مستقیم رہو اور تم ہرگز اس کا احاطہ نہ کر سکو گے' بعض حکماء نے کہا: ہمارے صحت اور صواب پر ہونے کی ایک وجہ ہے اور ہمارے ضلال پر ہونے کی بہت سی وجوہ ہیں' بعض صالحین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی تو پوچھا: آپ نے یہ کیوں فرمایا تھا کہ مجھے سورہ ھود اور اس کی نظائر نے بوڑھا کر دیا! ان میں سے کس آیت نے آپ کو بوڑھا کر دیا' فرمایا: "فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ" جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اس طرح

مستقیم رہو۔" (ہود: ١١٢) اور جب کہ ضلال کا معنی ہے: طریق مستقیم کو ترک کرنا' خواہ یہ ترک کرنا عمداً ہو یا سہواً' کم ہو یا زیادہ تو ضلال کا استعمال متعدد وجوہ سے ہوتا ہے' یہ لفظ انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور کفار کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اگرچہ دونوں کی ضلالت میں بہت زیادہ فرق ہے' حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق ان کے بیٹوں نے کہا:

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ ○

وہ بولے: اللہ کی قسم! یقیناً آپ اسی اپنی پرانی محبت میں ہیں ○ (یوسف: ٩٥)

حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ حضرت یعقوب کو شدید محبت تھی اور یوسف کے بھائیوں کے خیال میں یہ بے جا محبت تھی اس لیے انہوں نے اس محبت کو ضلال کے ساتھ تعبیر کیا۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں بالکل وارفتہ ہو گئے تھے تو آپ کو امت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے فرمایا:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ○ (الضحیٰ: ٧)

اور آپ کو (اپنی محبت میں) وارفتہ پایا تو (امت کی طرف) راہ دی ○

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ ○

موسیٰ نے کہا: میں نے وہ کام اس وقت کیا جب میں بے خبروں میں سے تھا ○ (الشعراء: ٢٠)

اس میں یہ تنبیہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبطی کا قتل سہواً ہوا تھا۔ ضلال نسیان کے معنی میں بھی مستعمل ہے:

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰی ؕ

کہ ان دو میں سے کوئی ایک (عورت) بھول جائے تو ان میں سے دوسری اس کو یاد دلا دے۔ (البقرہ: ٢٨٢)

علم اور عمل کے اعتبار سے ضلال کے دو اور معنی ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت' اس کی وحدانیت اور نبوت اور رسالت میں کوئی شخص صحیح راہ سے بھٹک جائے' اس معنی کا استعمال اس آیت میں ہے:

وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ○ (النساء: ١٣٦)

جو شخص اللہ' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں' اس کے رسولوں اور روز قیامت کے ساتھ کفر کرے تو بے شک وہ گمراہ ہو گیا (سیدھی راہ سے) بہت دور جا پڑا ○

دوسرا معنی ہے: عبادات اور احکام شرعیہ میں صحیح راہ سے بھٹک جانا' اس معنی کا استعمال اس آیت میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ○ (النساء: ١٦٧)

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا یقیناً وہ گمراہ ہو گئے (سیدھی راہ سے) بہت دور جا پڑے ○

ضلال غفلت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے:

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی ○ (طٰہٰ: ٥٢)

(موسیٰ نے کہا: پچھلی قوموں کا) علم میرے رب کے پاس ایک کتاب (لوح محفوظ) میں ہے' میرا رب نہ غافل ہوتا ہے نہ بھولتا ہے ○

زیر بحث آیت میں ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں۔ (المفردات ص ٢٩٨۔٢٩٧' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے ضالین کی منقول تفسیر

امام ابن جریر لکھتے ہیں:

حضرت ابن مسعود اور کئی اصحاب رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الضالین'' سے مراد نصاریٰ ہیں۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۶۴ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

ہر وہ شخص جو سیدھے راستہ سے انحراف کرے اس کو عرب ضال کہتے ہیں' اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کو ضالین فرمایا' کیونکہ انہوں نے سیدھے راستہ سے انحراف کر کے غلط راستہ اختیار کر لیا۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہود نے بھی تو طریق مستقیم سے انحراف کر کے غیر طریق مستقیم اختیار کر لیا' پھر کیا وجہ ہے کہ ان کو مغضوب کی صفت کے ساتھ مخصوص کیا اور نصاریٰ کو ضالین کی صفت کے ساتھ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں ہی ضالین ہیں لیکن نصاریٰ نبی کی محبت میں گمراہ ہوئے اور نبی کو خدا کا بیٹا کہا' اور یہود نبی سے بغض میں گمراہ ہوئے کیونکہ انہوں نے کئی نبیوں کو قتل کر ڈالا' اس لیے یہود پر اللہ تعالیٰ کا غضب زیادہ ہے اور ان کو مغضوب فرمایا۔

جن لوگوں تک اسلام کا پیغام نہیں پہنچا آیا وہ شریعت کے مکلف ہیں یا نہیں؟

ضالین کا مصداق وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی بالکل معرفت حاصل نہیں ہوئی' یا ان کو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل نہیں ہوئی' اول الذکر وہ لوگ ہیں جن کو نبوت کا پیغام نہیں پہنچا' اور ثانی الذکر وہ لوگ ہیں جن کو پیغام نبوت پہنچا لیکن ان پر حق اور باطل اور صواب اور خطا میں اشتباہ ہو گیا' اور جن لوگوں کے زمانہ میں نبی مبعوث نہیں ہوا' وہ اصحاب فترت ہیں' وہ کسی شریعت کے مکلف ہیں نہ آخرت میں ان کو عذاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۵) — اور جب تک رسول کو نہ بھیج دیں' ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں ۝

جمہور کی رائے یہی ہے' لیکن علماء کی ایک جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ شریعت کا مکلف ہونے کے لیے صرف عقل کافی ہے' سو جس شخص کو عقل دی گئی ہے اس پر لازم ہے کہ آسمانوں اور زمین کی نشانیوں میں غور و فکر کرے اور ان کے خالق کی معرفت حاصل کرے اور جس طرح اس کی عقل ہدایت دے اس کے مطابق خالق کی تعظیم اور عبادت کرے اور نعمتوں پر اس کا شکر بجا لائے۔

علامہ محب اللہ بہاری لکھتے ہیں:

جو شخص دور دراز کے پہاڑوں میں بلوغت کی عمر پالے اور اس کو پیغام نہ پہنچے اور وہ عقائد صحیحہ کا معتقد نہ ہو اور احکام شرعیہ پر عمل نہ کرے تو معتزلہ اور بعض احناف کے نزدیک اس کو آخرت میں عذاب ہوگا' کیونکہ جن امور کا عقل ادراک کر سکتی ہے اس نے ان کے تقاضوں پر عمل نہیں کیا' اور اشاعرہ اور جمہور احناف کے نزدیک اس کو آخرت میں عذاب نہیں ہوگا' کیونکہ انسان احکام کا مکلف شریعت سے ہوتا ہے اور فرض یہ کیا گیا ہے کہ اس کو شریعت کی دعوت نہیں پہنچی۔

(مسلم الثبوت مع شرحہ لخیر آبادی ص ۶۲ 'مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ' کوئٹہ)

آمین کا معنی

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

یہ وہ کلمہ ہے جو دعا کے بعد کہا جاتا ہے' یہ اسم اور فعل سے مرکب ہے اور اس کا معنی ہے: ''اللهم استجب لی۔ اے

اللہ! میری دعا کو قبول فرما'' اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے حامیوں کے لیے دعا ضرر کی اور فرمایا:

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ. اے ہمارے رب! ان کے اموال کو تباہ و برباد کر دے (یونس: ۸۸) اور ان کے دلوں کو سخت کر دے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا کی تو حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا: آمین۔

ایک قول یہ ہے کہ آمین کا معنی ہے: اسی طرح ہوگا۔ زجاج نے کہا ہے: اس میں دو لغتیں ہیں: امین اور آمین۔ ابو العباس نے کہا ہے کہ آمین عاصین کی طرح جمع کا صیغہ ہے' لیکن یہ صحیح نہیں ہے' کیونکہ حسن سے منقول ہے کہ آمین اللہ عزوجل کے اسماء میں سے ایک اسم ہے' مجاہد نے بھی کہا ہے کہ یہ اللہ کا ایک اسم ہے' اور یہ یا اللہ کے معنی میں ہے اور اس کے بعد ''استجب'' مقدر ہے' ازہری نے کہا: یہ قول صحیح نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آمین رب العالمین کی اپنے بندوں پر مہر ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کی آفات اور بلیات کو آمین سے دور کر دیتا ہے جیسے جب کسی لفافے پر مہر لگا دی جائے تو اس مہر کی وجہ سے اس میں فاسد اور ناپسندیدہ چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ امین جنت میں ایک درجہ ہے' ابوبکر نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ آمین کہنے والے کو جنت میں ایک درجہ ملے گا۔ (لسان العرب ج ۱۳ ص ۲۷۔۲۶' مطبوعہ نشر ادب الحوذہ' قم' ایران' ۱۴۰۵ھ)

نماز میں آمین کہنے کے متعلق مذاہب اربعہ

علامہ شمس الدین محمد بن ابی العباس الرملی الشافعی لکھتے ہیں:

سورہ فاتحہ یا اس کے قائم مقام کسی دعا کے بعد کچھ وقفہ سے آمین کہنا سنت ہے' خواہ وہ نماز میں ہو یا غیر نماز میں' لیکن نماز میں یہ بہت زیادہ مستحب ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سورہ فاتحہ کی قراءت سے فارغ ہوتے تو بلند آواز کے ساتھ آمین کہتے اور الف کو کھینچ کر (دراز کر کے) آمین کہتے۔

(نہایۃ المحتاج ج ۱ ص ۴۸۹۔۴۸۸' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۴ھ)

علامہ محمد بن عبد اللہ خرشی مالکی لکھتے ہیں:

''ولا الضالین'' کے بعد آہستہ آواز کے ساتھ آمین کہنا مستحب ہے' سری نماز میں صرف امام آمین کہے اور جہری نماز میں امام اور مقتدی دونوں پست آواز کے ساتھ آمین کہیں کیونکہ آمین دعا ہے اور دعا میں اصل یہ ہے کہ پست آواز کے ساتھ کی جائے۔ (الخرشی علی مختصر خلیل ج ۱ ص ۲۸۲' مطبوعہ دار صادر' بیروت)

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

سنت یہ ہے کہ جہری نمازوں میں امام اور مقتدی جہراً آمین کہیں اور سری نمازوں میں دونوں سراً آمین کہیں۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک آمین آہستہ کہیں' ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ آواز بلند آمین کہی اور آپ نے امام کے آمین کہنے کے وقت آمین کہنے کا حکم دیا' اگر امام نے بلند آواز سے آمین نہ کہی تو امام کی آمین پر مقتدی کی آمین نہیں ہو سکے گی۔ (المغنی ج ۱ ص ۲۹۰' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

امام اور مقتدی پست آواز سے آمین کہیں خواہ سراً ہو یا جہراً اور جس حدیث میں یہ ہے کہ جب امام آمین کہے تو آمین کہو' یہ

پست آواز سے آمین کہنے کے منافی نہیں ہے' کیونکہ یہ معلوم اور متعین ہے کہ'' ولا الضالین '' کے بعد آمین کہی جاتی ہے' اس لیے مقتدی کا آمین کہنا' امام سے سننے پر موقوف نہیں ہے' کیونکہ سورہ فاتحہ کے اخیر میں آمین کہی جاتی ہے' حدیث میں ہے: جب امام'' ولا الضالین '' کہے تو آمین کہو۔ (در مختار مع حاشیۃ الطحطاوی' ج ۱ ص ۲۲۰۔۲۱۹' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت)

آمین کہنے کی فضیلت میں احادیث

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص آمین کہتا ہے تو آسمان میں فرشتے (بھی) آمین کہتے ہیں' پس جب ایک فریق کی آمین دوسرے کے موافق ہو جائے تو اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام مسلم (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۶)' امام ابوداؤد (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۱۳۵)' امام نسائی (سنن نسائی ج ۱ ص ۱۴۷)' امام مالک (موطا امام مالک ص ۶۹) اور امام احمد (مسند احمد ج ۲ ص ۴۵۹) نے بھی روایت کیا ہے۔

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے لیے پس پشت دعا کرتا ہے تو وہ قبول ہوتی ہے' جب بھی وہ اپنے بھائی کے لیے خیر کی دعا کرتا ہے تو اس کے پاس کھڑا ہوا ایک فرشتہ آمین کہتا ہے اور وہ فرشتہ اس کے لیے بھی وہی دعا کرتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ ص ۲۰۸' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۱ ص ۱۹۵' ج ۶ ص ۴۵۲' مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہود تم سے کسی چیز پر اتنا حسد نہیں کرتے جتنا وہ تم سے آمین پر حسد کرتے ہیں سو تم بہ کثرت آمین کہا کرو۔

(سنن ابن ماجہ ص ۶۱' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

آمین بالجہر کے متعلق احادیث

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' ولا الضالین '' پڑھتے تو بہ آواز بلند فرماتے: آمین۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۱۳۵۔۱۳۴' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور)

امام ترمذی نے اس حدیث کو اسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے' اس میں'' رفع بھا صوتہ '' کی بجائے'' مدبھا صوتہ '' (آمین کو مد کے ساتھ پڑھا) ہے۔ (جامع ترمذی ص ۶۳' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

نیز امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز پڑھی تو آپ نے بہ آواز بلند آمین کہی۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۱۳۵' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۶ھ)

امام نسائی روایت کرتے ہیں:

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز پڑھی' آپ

نے اللہ اکبر کہہ کر کانوں کے بالمقابل رفع یدین کیا' پھر آپ نے سورہ فاتحہ پڑھی اور اس سے فارغ ہو کر بہ آواز بلند آمین کہی۔
(سنن نسائی ج ا ص ۱۴۰ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے آمین کہنا ترک کر دیا ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ''ولا الضالین'' پڑھتے تھے تو آمین کہتے تھے جس کو صف اول والے سنتے تھے' پھر آمین کی آواز سے مسجد گونج اٹھتی تھی۔
(سنن ابن ماجہ ص ۶۱ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے لیکن اس میں یہ نہیں ہے کہ آمین سے مسجد گونج اٹھتی تھی۔
(سنن ابوداؤد ج ا ص ۱۳۵ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

فقہاء احناف اور فقہاء مالکیہ کے نزدیک یہ تمام احادیث ابتداء اسرار اور تعلیم پر محمول ہیں۔

آمین بالسر کے متعلق احادیث

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب قرآن پڑھنے والا ''غیر المغضوب علیھم ولا الضالین'' کہے اور اس کے پیچھے (نمازی) آمین کہے اور اس کا قول آسمان والوں کے موافق ہو جائے تو اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ (صحیح مسلم ج ا ص ۱۷۶ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث سے وجہ استدلال یہ ہے کہ فرشتوں کی موافقت جہر سے نہیں اخفاء سے حاصل ہوگی۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ''غیر المغضوب علیھم ولا الضالین'' پڑھا پھر کہا: آمین اور پست آواز سے کہا۔ (جامع ترمذی ص ۳۴ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حافظ زیلعی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد' امام ابوداؤد طیالسی اور امام ابویعلی موصلی نے اپنی مسانید میں' امام طبرانی نے اپنی معجم میں اور امام دارقطنی نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ (نصب الرایہ ج ا ص ۳۶۹ 'مطبوعہ مجلس علمی' سورت' ہند' ۱۳۵۷ھ)

امام بغوی روایت کرتے ہیں:

شعبہ نے سلمہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین کو آہستہ کہا۔
(شرح السنۃ ج ۲ ص ۲۰۸ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

ہر چند کہ امام بغوی نے اس کے مقابلہ میں سفیان کی روایت کو زیادہ صحیح کہا ہے جس میں ''مدبھا صوتہ'' ہے ''آمین کو کھینچ کر پڑھا'' لیکن مد کے ساتھ پڑھنا آہستہ پڑھنے کے خلاف نہیں ہے' نیز شعبہ کی روایت کو بھی انہوں نے صحیح کہا ہے ضعیف نہیں قرار دیا۔

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

حضرت ابووائل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما (نماز میں) ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم'' اور آمین کو بلند آواز کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔
(جامع الاحادیث الکبیر ج ۷ ص ۲۹۷ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۱۴ھ)

''آمین'' قرآن مجید کا جز نہیں ہے

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

اس پر اجماع ہے کہ آمین قرآن مجید کا جز نہیں ہے' اسی وجہ سے سورہ فاتحہ اور آمین کے درمیان تھوڑا سا وقفہ کیا جاتا ہے' مجاہد سے یہ منقول ہے کہ آمین سورت کا جز ہے لیکن یہ قطعاً باطل قول ہے' مصحف عثمان اور دیگر مصاحف میں آمین کو نہیں لکھا جاتا' اور متعدد علماء نے یہ کہا کہ آمین کو قرآن کا جز ماننا کفر ہے۔ (روح المعانی ج ۱ ص ۹۷' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

فاتحہ خلف الامام میں فقہاء شافعیہ کا نظریہ

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس شخص کی نماز (کامل) نہیں ہوتی جو سورہ فاتحہ کو نہ پڑھے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۶۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی لکھتے ہیں:

اس حدیث سے نماز میں سورہ فاتحہ کی قراءت کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور اس سورت کا نماز میں پڑھنا متعین ہے' اس کے سوا کوئی دوسری سورت اس سے کفایت نہیں کرتی الا یہ کہ کوئی شخص اس کی قراءت سے عاجز ہو' یہ امام مالک' امام شافعی' جمہور فقہاء صحابہ' تابعین اور بعد کے علماء کا مذہب ہے' اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور ایک قلیل جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ نماز میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب نہیں ہے' بلکہ قرآن مجید کی کسی ایک آیت کا پڑھنا واجب ہے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو کچھ تم آسانی سے پڑھ سکو وہ پڑھو۔ (علامہ نووی نے یہ صحیح نہیں لکھا' امام ابوحنیفہ کے نزدیک نماز میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا فرض نہیں ہے کیونکہ فرضیت قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ دلیل سے حاصل ہوتی ہے اور اس حدیث کی بنا پر امام ابوحنیفہ نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کو واجب کہتے ہیں' امام اعظم کا مذہب ہم ان شاء اللہ عنقریب بیان کریں گے۔ سعیدی غفرلہ)

جمہور کی دلیل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ام القرآن (سورۃ فاتحہ) کے بغیر نماز (کامل) نہیں ہوتی۔ اگر انہوں نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ نماز کامل نہیں ہوتی تو یہ خلاف ظاہر ہے (بلکہ یہی ظاہر ہے کیونکہ حدیث میں ہے: جس نے سورہ فاتحہ کو نہیں پڑھا اس کی نماز ناقص ہے' یہ کلمہ آپ نے تین بار فرمایا اور ناقص کے مقابلہ میں کامل ہے' اگر سوۃ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہوتا تو آپ فرماتے: جس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز باطل ہے' اور اس کی تائید حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے: وہ نماز کافی نہیں ہوتی جس میں سورہ فاتحہ کی قراءت نہ کی جائے' اس حدیث کو امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں سند صحیح کے ساتھ بیان کیا ہے' اور ابو حاتم بن حبان نے بھی بیان کیا ہے' اور جس حدیث میں ہے: جو کچھ تم آسانی سے پڑھ سکو وہ پڑھو' وہ سورہ فاتحہ پڑھنے پر محمول ہے کیونکہ اس کا پڑھنا آسان ہے۔ (یہ جواب صحیح نہیں ہے کیونکہ حدیث میں لفظ ''ما'' ہے جو عام ہے۔ سعیدی غفرلہ)

اس حدیث میں امام شافعی اور ان کے موافقین کے مذہب پر دلیل ہے' جو یہ کہتے ہیں کہ امام' مقتدی اور منفرد سب پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے' مقتدی پر سورۃ فاتحہ پڑھنے کے وجوب کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا: ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو کیا کریں؟ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: سورۃ فاتحہ کو دل میں پڑھو' اس کا معنی ہے: اس کو چپکے چپکے پڑھو جس کو تم خود سنو اور بعض مالکیہ وغیرہم نے جو اس کا یہ محمل بیان کیا ہے کہ سورۃ فاتحہ کے معانی میں تدبر کرو یہ غیر مقبول ہے' کیونکہ قراءت کا اطلاق صرف زبان کی اس حرکت پر ہوتا ہے جو سنائی دے' اسی وجہ سے اس پر اتفاق ہے کہ جنبی اور

حائض اگر زبان کی حرکت کے بغیر قرآن مجید کے معانی میں تدبر کریں تو اس پر قراءت کا اطلاق نہیں ہوگا۔
(شرح مسلم ج ۱ ص ۱۷۰ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی '۱۳۷۵ھ)

علامہ نووی کا یہ جواب بھی صحیح نہیں ہے' زبان کی جو حرکت سنائی دے خواہ آہستہ یا زور سے وہ قراءت لفظی ہے قراءت نفسی نہیں ہے' قراءت نفسی کا معنی یہی ہے کہ الفاظ کے معانی میں تدبر کیا جائے' جیسا کہ علامہ نووی نے بعض مالکیہ سے نقل کیا ہے اور اگر جنبی قرآن کے معنی میں تدبر کرے تو اس کو قراءت نفسی کہہ سکتے ہیں۔

فاتحہ خلف الامام میں فقہاء حنبلیہ کا نظریہ

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

صحیح مذہب یہ ہے کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے' یہ امام مالک' امام اوزاعی اور امام شافعی کا مذہب ہے' امام احمد سے ایک روایت ہے کہ نماز کی صرف دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے' نخعی' ثوری اور امام ابوحنیفہ سے بھی اسی طرح روایت ہے' کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پہلی دو رکعتوں میں قراءت کرو اور دوسری دو رکعتوں میں تسبیح کرو' نیز اگر باقی رکعات میں قراءت واجب ہوتی تو جہری نمازوں میں ان میں جہر سے قراءت واجب ہوتی' حسن بصری سے روایت ہے کہ اگر ایک رکعت میں قراءت کر لی تو کافی ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ (المزمل: ۲۰) تو قرآن سے جتنا (تم پر) آسان ہو پڑھ لیا کرو۔

اور امام مالک سے ایک روایت یہ ہے کہ اگر تین رکعات میں قراءت کر لی تو کافی ہے کیونکہ وہ نماز کا اکثر حصہ ہیں' ہماری دلیل یہ ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے: حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی پہلی دو رکعات میں سورۂ فاتحہ اور کوئی اور سورت پڑھتے تھے' پہلی رکعت میں زیادہ قراءت کرتے اور دوسری میں کم' اور کبھی ہم کو قراءت سناتے تھے' اور دوسری دو رکعت میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے' نیز امام بخاری اور امام مسلم کی روایت ہے: اس طرح نماز پڑھو' جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو' اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز (کامل) نہیں ہوتی' اور حضرت ابوسعید اور حضرت عبادہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ ہم ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کو پڑھیں' نیز جس شخص نے اچھی طرح نماز پڑھی تھی اس کو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی پہلی رکعت سکھائی تو اس کو فرمایا: تمام رکعات اس طرح پڑھو اور یہ حکم تمام رکعات میں قراءت کو بھی شامل ہے' حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس شخص نے ایک رکعت نماز پڑھی اور اس میں قراءت نہیں کی تو اس کی یہ نماز صرف امام کے پیچھے ہو سکتی ہے۔ (اس سے یہ معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض نہیں ہے۔ سعیدی غفرلہ) اس حدیث کو امام مالک نے موطا میں روایت کیا ہے' اور اس سے پہلے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر بیان کیا گیا ہے اس کی سند میں حارث اعور ہے اور اس کو شعبی نے کذاب کہا ہے' نیز حضرت عمر اور حضرت جابر نے اس کی مخالفت کی ہے۔ (المغنی ج ۱ ص ۲۸۸ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

نیز علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

امام کے لیے مستحب یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد کچھ دیر خاموش رہے اور آرام کرے تاکہ اس وقفہ میں مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ لیں تاکہ مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھنے میں امام کے ساتھ کھینچا تانی نہ کریں' یہ امام اوزاعی' امام شافعی اور اسحاق کا مذہب ہے' امام مالک اور اصحاب رائے نے اس کو مکروہ کہا ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ نے روایت

کیا ہے کہ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سکتے یاد رکھے ہیں ایک سکتہ تکبیر تحریمہ کے بعد اور ایک سکتہ "غیر المغضوب علیهم ولا الضالین" کی قراءت کے بعد عمران نے اس کا انکار کیا اور ان دونوں نے حضرت ابی بن کعب کو خط لکھا انہوں نے جواب دیا کہ سمرہ کو یہ حدیث محفوظ ہے اور ابو سلمہ بن عبد الرحمن نے کہا: امام کے لیے دو سکتے ہیں ان میں سورۂ فاتحہ کی قراءت کو غنیمت جانو ایک سکتہ نماز کے شروع کے وقت ہے اور ایک سکتہ جب وہ "ولا الضالین" کہے عروہ بن زبیر نے کہا: میں امام کے ان دو سکتوں کو غنیمت جانتا ہوں جب وہ "غیر المغضوب علیهم ولا الضالین" کہتا ہے تو میں اس وقت سورۂ فاتحہ پڑھ لیتا ہوں اور جب وہ سورت ختم کرتا ہے تو میں رکوع سے پہلے قراءت کر لیتا ہوں یہ روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ان کے نزدیک معروف تھا۔

(المغنی ج ۱ ص ۲۹۱ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۰۵ ھ)

فاتحہ خلف الامام میں فقہاء مالکیہ کا نظریہ

علامہ وشتانی ابی مالکی لکھتے ہیں:

قاضی عیاض مالکی نے بیان کیا ہے کہ اشہب مالکی ابن وہب مالکی اور کوفیوں کا قول یہ ہے کہ امام کے پیچھے کسی حال میں قراءت نہ کی جائے صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز ناقص ہے۔ ان سے کہا گیا کہ بعض اوقات ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں؟ حضرت ابو ہریرہ نے کہا: اس وقت اپنے دل میں پڑھو۔ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جب امام قراءت کرے تو اس کے معانی میں تدبر کرو تابعین کی ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ امام کے پیچھے کسی حال میں قراءت نہ کی جائے وہ کہتے ہیں کہ صرف ہونٹ ہلائے جائیں اور خود کو بھی آواز نہ آئے اور جس نے خود کو سنایا اس نے اچھا کیا امام مالک اور ان کے عام اصحاب اور بہت سے متقدمین نے یہ کہا ہے: مقتدی امام کے ساتھ سری نمازوں میں پڑھے اور جہری نمازوں میں نہ پڑھے امام احمد نے یہ کہا ہے کہ امام کے پیچھے سری اور جہری دونوں نمازوں میں سورہ فاتحہ پڑھے امام شافعی کے اس میں تین قول ہیں ایک قول کوفیین کی طرح ہے ایک قول امام احمد کی مثل ہے اور ایک قول جمہور صحابہ اور تابعین کی مثل ہے امام احمد اور داؤد ظاہری کے نزدیک سورہ فاتحہ کا سری نمازوں میں پڑھنا فرض ہے ہمارے نزدیک اس میں اختلاف ہے ایک قول سنت ہے اور ایک قول مستحب ہے۔ (اکمال اکمال المعلم ج ۲ ص ۱۵۰۔ ۱۴۹ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

فاتحہ خلف الامام میں فقہاء احناف کا نظریہ

علامہ مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

مقتدی امام کے پیچھے قراءت نہ کرے ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کا امام ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔ (سنن ابن ماجہ و طحاوی) اور اس پر صحابہ کا اجماع ہے یہ رکن امام اور مقتدی دونوں کے درمیان مشترک ہے لیکن مقتدی کا کام یہ ہے کہ وہ خاموش رہے اور سنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جب امام قراءت کرے تو خاموش رہو امام محمد سے ایک روایت یہ ہے کہ احتیاطاً قراءت کرنا مستحسن ہے اور امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک امام کے پیچھے قراءت کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس پر وعید ہے۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام حنفی لکھتے ہیں:

قرآن مجید میں تمام نمازیوں کو قراءت کرنے کا حکم دیا گیا ہے "فاقرء وا ماتیسر منه. جس قدر قرآن مجید آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھو" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی حکم ہے کہ کوئی نماز قرآن مجید پڑھے بغیر نہیں ہو سکتی" لیکن جب حدیث

صحیح میں وارد ہے: جس شخص کا امام ہو تو امام کی قراءت اس شخص کی قراءت ہے' تو اس آیت اور حدیث کے عموم کی تخصیص کرنا واجب ہے جیسا کہ ائمہ ثلاثہ کا قاعدہ ہے' اس لیے مقتدی اس حکم کے عموم سے خارج ہے' نیز اس پر اجماع ہے کہ رکوع میں نماز کو پانے والا نماز کی رکعت کو پالیتا ہے حالانکہ اس رکعت میں اس نے قراءت نہیں کی ہے' اس سے معلوم ہوا کہ مدرک رکوع بھی قراءت کے عمومی حکم سے خارج ہے' اسی طرح جس حدیث میں ہے: اللہ اکبر کہو پھر تم کو جس قدر قرآن یاد ہے پڑھو' یہ بھی مقتدی کے غیر پر محمول ہے تا کہ دلائل میں تطبیق ہو' بلکہ یہ کہا جائے گا کہ مقتدی کے لیے بھی شرعاً قراءت ثابت ہے' کیونکہ امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے' اگر مقتدی نے قراءت کی تو ایک نماز میں دو قراءتیں ہو جائیں گی' یہ حدیث متعدد اسانید سے حضرت جابر بن عبد اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے' امام دار قطنی' امام بیہقی اور امام ابن عدی نے کہا ہے کہ اس حدیث کا مرفوع ہونا ضعیف ہے' اور صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے' متعدد راویوں نے اس حدیث کو ارسال سے بیان کیا ہے' ایک سند سے امام ابوحنیفہ نے بھی اس کو مرسلاً روایت کیا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اکثر اہل علم کے نزدیک حدیث مرسل حجت ہے اور اس سے صرف نظر کر کے ہم یہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے سند صحیح کے ساتھ اس حدیث کو مرفوعاً بھی روایت کیا ہے' امام محمد بن الحسن نے اپنی ''موطا'' میں روایت کیا ہے از ابوحنیفہ' از ابوالحسن موسیٰ بن ابی عائشہ از عبد اللہ بن شداد از جابر رضی اللہ عنہ از نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' آپ نے فرمایا: جس شخص نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو بے شک امام کی قراءت اس شخص کی قراءت ہے' اس حدیث کو سفیان' شریک' جریر اور ابوالزبیر نے اپنی اپنی اسانید صحیحہ کے ساتھ اپنی اپنی مسانید میں مرفوعاً روایت کیا ہے اور سفیان کی سند امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے' اس لیے مخالفین کا اس حدیث کو مرسل قرار دینے پر اصرار کرنا باطل ہے' کیونکہ اگر ثقہ راوی کسی حدیث میں منفرد ہو تو اس کو قبول کرنا واجب ہے اور رفع ارسال پر زیادتی ہے اور ثقہ اگر منفرد ہو تب بھی اس کی زیادتی مقبول ہوتی ہے' چہ جائیکہ یہاں چار سے زائد ثقہ راوی اس حدیث کو مرفوعاً روایت کر رہے ہیں اور ثقہ راوی کبھی حدیث کی ایک سند کو ارسال سے بیان کرتا ہے اور کبھی اتصال سے' امام ابو عبد اللہ حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی' آپ کے پیچھے ایک شخص قراءت کر رہا تھا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی اس کو نماز میں قراءت سے روکتے رہے' جب وہ شخص نماز سے فارغ ہوا تو اس نے صحابہ سے کہا: کیا تم مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز میں قراءت کرنے سے منع کرتے ہو؟ وہ دونوں تکرار کرنے لگے' حتیٰ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا گیا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قراءت اس شخص کی قراءت ہوتی ہے' امام ابوحنیفہ نے ایک روایت سے بیان کیا ہے کہ ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص نے قراءت کی تو اس کو ایک صحابی نے منع کیا' الحدیث' اس سے معلوم ہوا کہ حدیث کی اصل یہ واقعہ ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کبھی پورا واقعہ بیان کیا اور کبھی صرف اس کا حکم بیان کر دیا اور کبھی امام کے پیچھے قراءت کی ممانعت کو بیان کر دیا۔

اس حدیث کے معارض یہ روایت ہے: مجھ سے قرآن کیوں کھینچا جا رہا تھا' اگر کسی مقتدی نے ضرور قرآن پڑھنا ہو تو وہ صرف سورہ فاتحہ پڑھے' اسی طرح امام داؤد اور امام ترمذی نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے فجر کی نماز پڑھ رہے تھے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید پڑھا تو آپ پر قرآن پڑھنا دشوار ہوا' جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: شاید تم اپنے امام کے پیچھے قرآن پڑھ رہے تھے! ہم نے کہا: ہاں! یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سوا سورہ فاتحہ کے اس طرح نہ کرو کیونکہ جو سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس حدیث میں امام کے پیچھے قرآن مجید پڑھنے سے منع کیا ہے اس کی سند زیادہ قوی ہے اور اس

ہیں ممانعت علی الاطلاق ہے اس لیے قوت سند اور عموم کی وجہ سے وہ حدیث ان احادیث پر مقدم ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث دیگر احادیث سے موید ہے ہر چند کہ ان کی اسانید ضعیف ہیں اور صحابہ کے مذاہب سے بھی موید ہے حتیٰ کہ صاحب ''ہدایہ'' نے یہ کہا کہ امام کے پیچھے قراءت نہ کرنے پر اجماع صحابہ ہے وہ احادیث حسب ذیل ہیں:

(۱) امام مالک نے اپنی ''موطا'' میں از نافع از ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کیا: جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قراءت اس کے لیے کافی ہے اور جب وہ تنہا نماز پڑھے تو قراءت کرے اور حضرت ابن عمر امام کے پیچھے قراءت نہیں کرتے تھے۔

(۲) امام دارقطنی نے اس حدیث کو مرفوعاً بیان کیا ہے اور یہ کہا کہ اس کا مرفوع ہونا راوی کا وہم ہے لیکن یہ حکماً مرفوع ہے کیونکہ حضرت ابن عمر کا یہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع پر محمول ہے۔

(۳) امام ابن عدی نے ''کامل'' میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کا امام ہو تو امام کی قراءت اس شخص کی قراءت ہے اس حدیث کی سند میں اسماعیل ضعیف راوی ہے اس کا کوئی متابع نہیں ہے۔

امام ابن عدی کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ اسماعیل کا متابع ہے نضر بن عبداللہ امام طبرانی نے ''معجم اوسط'' میں نضر بن عبداللہ از حسن اس حدیث کو روایت کیا ہے اور حسن سے سنداً اور متناً بھی روایت ہے امام طبرانی نے اس حدیث کو حضرت ابن عباس سے بھی مرفوعاً روایت کیا ہے لیکن اس میں کلام ہے۔

(۴) امام طحاوی نے ''شرح معانی الآثار'' میں اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مقاسم نے حضرت عبداللہ بن عمر حضرت زید بن ثابت اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے سوال کیا تو انہوں نے کہا: کسی نماز میں بھی امام کے پیچھے قراءت نہ کرو۔

(۵) امام محمد بن حسن نے اپنی ''موطا'' میں اپنی سند کے ساتھ ابووائل سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے امام کے پیچھے قراءت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا: خاموش رہو نماز میں صرف ایک شغل ہے اور تمہارے لیے امام کافی ہے اور اسی کتاب میں حضرت سعد کے بعض بیٹوں سے روایت کیا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے قراءت کرے اس کے منہ میں انگارے ڈال دوں اس کو امام عبدالرزاق نے بھی روایت کیا ہے مگر ان کی روایت میں ہے: میں اس کے منہ میں پتھر ڈال دوں۔

(۶) امام محمد نے اپنی ''موطا'' میں اپنی سند کے ساتھ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: جو شخص امام کے پیچھے قراءت کرتا ہے کاش! اس کے منہ میں پتھر ہوتے اس اثر کو امام عبدالرزاق نے بھی روایت کیا ہے۔

(۷) امام طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ ابوجمرہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس سے پوچھا: کیا میں امام کے ہوتے ہوئے قراءت کروں؟ انہوں نے کہا: نہیں۔

(۸) امام ابن ابی شیبہ نے اپنی ''مصنف'' میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ امام کے پیچھے قراءت نہ کرو خواہ جہری نماز ہو یا سری۔

(۹) امام عبدالرزاق نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس شخص نے امام کے پیچھے قراءت کی اس نے

فطرت میں خطا کی۔

(۱۰) امام نسائی نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: کیا ہر نماز میں قراءت ہے؟ فرمایا: ہاں! انصار کے ایک شخص نے کہا: قراءت واجب ہوگئی' حضرت ابو درداء کہتے ہیں: میں نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا: جب امام کسی قوم کو نماز پڑھائے تو اس کی قراءت قوم کے لیے کافی ہے۔ اگر مؤخر الذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہ ہو بلکہ حضرت ابو درداء کا کلام ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پہلے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کریں کہ ہر نماز میں قراءت ہے' پھر امام کی قراءت کو مقتدی کی قراءت قرار دیں' یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان کو یہ علم ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی کی قراءت کو امام کی قراءت قرار دیا ہے۔

اسی (۸۰) کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے امام کے پیچھے قراءت کی ممانعت منقول ہے' ان میں حضرت علی المرتضیٰ' حضرت عبد اللہ بن مسعود' حضرت عبد اللہ بن عمر' حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے اسماء شامل ہیں' اور محدثین نے ان تمام صحابہ کے اسماء کو ضبط کیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ یہ کہتے ہیں کہ قراءت نماز کا ایک رکن ہے اور اس میں امام اور مقتدی دونوں مشترک ہیں' ہم کہتے ہیں کہ دونوں مشترک ہیں لیکن مقتدی کا حصہ قرآن مجید سننا اور خاموش رہنا ہے' کیونکہ قراءت سے مطلوب تدبر اور تفکر ہے اور اس پر عمل کرنا ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ . (ص: ۲۹) یہ (قرآن مجید) مبارک کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمائی ہے تاکہ وہ اس کی آیات میں غور کریں۔

اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوگا جب وہ قرآن مجید کو سنیں گے' جیسے جمعہ کا خطبہ' وعظ اور تذکیر کے لیے مشروع کیا گیا ہے تو اس کا سننا واجب ہے تاکہ اس کا فائدہ حاصل ہو' یہ نہیں کہ ہر شخص اپنے نفس کو خطبہ دینے لگے' اس کے برخلاف باقی ارکان خشوع کے لیے مشروع کیے گئے ہیں اور خشوع رکوع اور سجود سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ وجہ تو صرف جہری نماز میں درست ہو سکتی ہے اور قراءت خلف الامام کا اختلاف تو سری نماز میں بھی ہے' اس میں یہ فائدہ کس طرح حاصل ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو چیزوں کا حکم دیا گیا ہے' سننے کا اور خاموش رہنے کا:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ (الاعراف: ۲۰۴) اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ○

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔

امام مسلم نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۴' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی)

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید اور احادیث میں دو چیزوں کا حکم ہے' سننے کا اور خاموش رہنے کا اور جب امام زور سے قراءت نہ کرے اور اس کے لیے سننا ممکن نہ ہو تو اس کے لیے خاموش رہنا تو ممکن ہے' "محیط" میں مذکور ہے کہ مقتدی سے قراءت ساقط نہیں ہوئی لیکن امام کی قراءت اس کی قراءت ہے' حتیٰ کہ وہ امام کے ساتھ قیام میں شریک ہو جائے جو قراءت کا محل ہے' دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم یہ نہیں مانتے کہ مقتدی کے لیے بھی قراءت رکن ہے کیونکہ اگر مقتدی کو رکعت فوت ہونے کا خوف ہو (اور وہ رکوع میں مل جائے) تو اس کی نماز جائز ہے' خواہ وہ بالکل قراءت نہ کرے اور اس کے جواز پر اجماع ہے' مثلاً جب

ایک شخص امام کو رکوع میں پائے اور اگر مقتدی کے لیے بھی قراءت رکن ہوتی تو اس عذر کی وجہ سے اس سے قراءت ساقط نہ ہوتی' جیسے رکوع اور سجود اس سے ساقط نہیں ہوتے' اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کیا رکوع کے فوت ہونے کے خدشہ سے قیام ساقط نہیں ہوتا؟ تو ہم کہیں گے: نہیں کیونکہ اگر کوئی شخص رکوع کی حالت میں اللہ اکبر کہے تو یہ جائز نہیں ہے' بلکہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کھڑا ہو کر اللہ اکبر کہے' البتہ قیام کا امتداد رکوع کے فوت ہونے کے خدشہ کی وجہ سے اس سے ساقط ہو جاتا ہے اور قیام کا فرض ادنیٰ قیام سے حاصل ہو جاتا ہے جیسے رکوع مطلقاً جھکنے سے حاصل ہو جاتا ہے۔

(فتح القدیر ج ۱ ص ۲۹۷ ـ ۲۹۴ ملخصاً وموضحاً' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

امام دار قطنی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے امام کی پشت سیدھی ہونے سے پہلے امام کو رکوع میں پالیا اس نے نماز (کی رکعت) کو پالیا۔ (سنن دار قطنی ج ۱ ص ۳۴۷' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

''شرح صحیح مسلم'' جلد اول میں ہم نے قراءت خلف الامام کے موضوع پر مزید دلائل تحریر کیے ہیں۔

۱۰ رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ کو میں نے تفسیر تبیان القرآن کا مقدمہ لکھنا شروع کیا' اور اس دوران سفر حج کی تیاریوں میں بھی مصروف رہا' سفر حج سے پہلے میں نے یہ مقدمہ مکمل کر لیا' اللہ تعالیٰ کا بے حد کرم ہے کہ اس نے مجھے حج اکبر عطا فرمایا' چالیس روز حرمین طیبین میں بسر ہوئے۔ تقریباً ایک ماہ سفر کی تھکاوٹ اتارنے میں گزرا اور آج تیس صفر ۱۴۱۵ھ کو سورہ فاتحہ کا ترجمہ اور اس کی تفسیر مکمل ہوگئی۔ فالحمد للہ۔

الٰہ العٰلمین! جس طرح آپ نے مجھے سورہ فاتحہ کا ترجمہ اور تفسیر مکمل کرنے کی توفیق' ہدایت اور سعادت عطا کی ہے' اسی طرح باقی قرآن مجید کا ترجمہ اور اس کی تفسیر کی بھی توفیق' ہدایت اور سعادت سے سرفراز فرمائیں اور اس تفسیر کو موافقین کے لیے استقامت' مخالفین کے لیے ہدایت اور میرے لیے نجات کا ذریعہ اور صدقہ جاریہ بنائیں' مجھے' میرے والدین' احباب اور میرے قارئین کو دنیا اور آخرت کی ہر بلا اور عذاب سے محفوظ رکھیں اور دارین کی سعادتوں کو ہمارے لیے مقدر کر دیں۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین شفیع المذنبین قائد الغر المحجلین وعلی الہ الطیبین الطاھرین وعلی اصحابہ الکاملین الراشدین وعلی اولیاء امتہ وعلماء ملتہ اجمعین۔

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ

(۲)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البقرہ

سورہ بقرہ کا اجمالی تعارف

سورہ بقرہ قرآن مجید کی سب سے طویل سورت ہے' اور یہ مدنی سورت ہے' علامہ واحدی نیشاپوری نے لکھا ہے کہ عکرمہ نے بیان کیا ہے کہ مدینہ میں جو سورت سب سے پہلے نازل ہوئی وہ سورۃ البقرۃ ہے۔(اسباب النزول ص ۱۱)

مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی تمام سورتوں میں مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی نظام حیات' عبادات' سیاسیات' معاشیات' اقتصادیات' اور عمرانیات کے اصول اور احکام بیان کیے گئے ہیں' اس کے برخلاف مکی سورتوں میں اعتقادیات اور اخلاقیات پر زیادہ زور دیا گیا ہے' کیونکہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی اپنی ریاست قائم ہو چکی تھی' اور نظام مملکت کو چلانے کے لیے جن اصول اور قواعد کی ضرورت ہوتی ہے اور مسلمانوں کی تمدنی زندگی کی فوز و فلاح اور عبادات کے اجتماعی نظام کے لیے جن ہدایات کی احتیاج ہو سکتی ہے وہ سب ان مدنی سورتوں میں نازل کی گئیں۔

عقائد اسلامیہ کی اساس ایمان بالغیب ہے' اور بغیر دیکھے اللہ تعالیٰ کو واحد لاشریک ماننا ہے' اس کے تمام رسولوں پر ایمان لانا ہے اور تمام آسمانی کتابوں کو ماننا ہے' جزاء اور سزا کا اقرار کرنا ہے اور اعمال صالحہ میں ہمہ گیر اور ہمہ جہت عبادت نماز کو قائم کرنا ہے اور طبقاتی منافرت کا سدباب کرنے کے لیے اہم عبادت زکوٰۃ کو ادا کرنا ہے' اس لیے سورہ بقرہ ایمان بالغیب' اقامت صلوٰۃ اور اداء زکوٰۃ کے بیان سے شروع ہوتی ہے' پھر آگے چل کر اس سورت میں شریعت اسلامیہ کو وضاحت سے بیان کیا ہے اور عبادات اور معاملات کی تفصیل کی گئی ہے اور اقامت صلوٰۃ اور اداء زکوٰۃ کے علاوہ تحویل قبلہ' توحید پر دلائل' ماہ رمضان کے روزوں' بیت اللہ کے حج' جہاد فی سبیل اللہ' انفاق فی سبیل اللہ' والدین اور قرابت داروں کے حقوق' زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف' یتیموں کی کفالت' عائلی زندگی کے اصول اور احکام میں نکاح' طلاق' رضاع' عدت اور ایلاء کو بیان کیا گیا ہے' قسم کھانے کا شرعی حکم' جادو کا حرام ہونا' قتل ناحق کی ممانعت' قاتل پر قصاص کو واجب کرنا' ناجائز طریقوں سے لوگوں کا مال کھانے کی ممانعت' شراب' جوئے اور سود کی حرمت' ایام حیض میں عمل ازدواج کی ممانعت' عورتوں سے عمل معکوس کرنے کی تحریم کو بیان کیا ہے۔

اسی سورت میں ایک آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات' اس کی وحدت اور اس کی اہم صفات کا بیان ہے اور یہ آیت الکرسی ہے۔(البقرہ: ۲۵۴) اسی سورت میں وہ آیت ہے جو قرآن مجید کی سب سے طویل آیت ہے' اس کو آیت مداینہ کہتے ہیں' اس آیت میں قرض دینے' قرض کو لکھنے اور کاروباری معاملات میں مردوں اور عورتوں کو گواہ بنانے' رہن رکھنے' امانت ادا کرنے اور گواہی چھپانے کی ممانعت کو بیان کیا ہے۔(البقرہ: ۲۸۲) اسی سورت میں ایک ایسی آیت ہے جو قرآن مجید کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ہے۔

اور وہ آیت ہے:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (البقرہ: ۲۸۱)

اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے' پھر ہر شخص کے کیے ہوئے عمل کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا○

مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں صرف مشرکین تھے' اس لیے مکی سورتوں میں صرف توحید اور آخرت پر ایمان لانے پر زور دیا ہے۔ مدینہ میں پہنچ کر جب مختلف قبائل نے اسلام قبول کر لیا اور انصار کی وجہ سے مدینہ میں مسلمانوں کی ریاست قائم ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے قانون' سیاست' معیشت' معاشرت اور تمدن اور ثقافت کے متعلق بھی اصول اور ہدایات نازل فرمائیں' یہاں مسلمانوں کا مقابلہ یہود سے تھا' حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گزرے ہوئے تقریباً ۱۹ صدیاں گزر چکی تھیں اور اس عرصہ میں یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم اور تورات کو بالکل مسخ کر دیا تھا' اور تورات میں لفظی اور معنوی تحریف ہو چکی تھی' مدینہ منورہ میں یہود کے علاوہ منافقین بھی تھے' یہ منافقین کئی قسم کے تھے' سورہ بقرہ میں کفار و مشرکین' یہود و نصاریٰ اور منافقین سب کے متعلق آیات نازل کی گئی ہیں۔

سورہ فاتحہ میں اس دعا کی تعلیم دی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کی جائے اور اس دعا کی استجابت کے طور پر سورہ بقرہ میں مسلمانوں کے لیے صراط مستقیم بیان کی گئی ہے اور کامل مومنوں کی صفات بیان کی گئی ہیں اور ان کے مخالف کفار اور مشرکین کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں' اس سورت کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا اور آخرت کی سعادت کا مبنیٰ دین اسلام کی اتباع اور شریعت اسلام پر استقامت ہے' اس سورت کا خاتمہ اللہ تعالیٰ سے اس دعا پر ہے کہ وہ مشکل اور دشوار احکام ہم سے اٹھا لے اور کفار کے مقابلہ میں ہم کو فتح اور نصرت عطا فرمائے اور اپنے فضل اور احسان سے ہم کو ایمان اور اسلام پر ثابت قدم رکھے۔

سورہ بقرہ کی وجہ تسمیہ

سورہ بقرہ کا نام بقرہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں بقرہ (گائے) کا ذکر ہے' قرآن مجید کی تمام سورتوں کے نام توقیفی ہیں اور ادنیٰ مناسبت سے رکھے گئے ہیں۔ بعض احادیث سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس سورت کو سورہ بقرہ کہنا منع ہے۔ حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں: امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں سند ضعیف کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورہ بقرہ نہ کہو' نہ سورہ آل عمران اور نہ سورہ نساء' اسی طرح پورا قرآن' لیکن یوں کہو کہ یہ وہ سورت ہے جس میں بقرہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور یہ وہ سورت ہے جس میں آل عمران کا ذکر کیا جاتا ہے' اسی طرح پورے قرآن کی سورتوں کے متعلق کہو' اور امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں سند صحیح کے ساتھ حضرت ابن عمر کا یہ قول روایت کیا ہے کہ سورہ بقرہ نہ کہو لیکن یہ کہو کہ یہ وہ سورت ہے جس میں بقرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۱۸' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں اس طرح سورتوں کا نام رکھنے سے منع کیا گیا تھا' کیونکہ کفار ان سورتوں کا نام لے کر ان کا مذاق اڑاتے تھے' پھر جب اسلام کا غلبہ ہو گیا اور قرآن کریم کا نور ہر طرف پھیل گیا تو یہ ممانعت منسوخ ہو گئی کیونکہ بہ کثرت احادیث اور آثار میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سورت پر سورہ بقرہ کا اطلاق کیا ہے۔

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام ابن ابی شیبہ نے ''مصنف'' میں' امام احمد' امام مسلم' امام ابوداؤد' امام ترمذی' امام نسائی' امام ابن ماجہ اور امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ اور امام بیہقی نے اپنی سنن میں اپنی اپنی اسانید کے ساتھ روایت کیا ہے: حضرت حذیفہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رمضان کی ایک شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی' آپ نے بقرہ شروع کی' میں نے دل میں

کہا: شاید آپ پوری سورت ایک رکعت میں پڑھیں گے' پھر آپ نے نساء شروع کی اور اس کو پڑھا' پھر آپ نے آل عمران شروع کی اور اس کو آہستہ آہستہ پڑھا' جب آپ ایسی آیت پڑھتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو آپ سبحان اللہ پڑھتے اور جب آپ سوال کی آیت پڑھتے تو سوال کرتے اور جب تعوذ کی آیت پڑھتے تو اعوذ باللہ پڑھتے۔

امام احمد' امام ابن الضریس اور امام بیہقی نے اپنی اپنی سندوں کے ساتھ حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ میں ایک شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہی تھی' آپ نے بقرہ' آل عمران اور نساء کو پڑھا' جب آپ بشارت والی آیت کو پڑھتے تو دعا کرتے اور جب آپ ڈرانے والی آیت کو پڑھتے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرتے۔

امام ابوداؤد' امام ترمذی نے "شمائل" میں' امام نسائی اور امام بیہقی نے اپنی اپنی سندوں کے ساتھ حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی' آپ نے سورہ بقرہ پڑھی' آپ جب بھی کسی رحمت کی آیت کو پڑھتے تو ٹھہر کر سوال کرتے اور جب بھی کسی عذاب کی آیت کو پڑھتے تو رک کر اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرتے' پھر آپ نے جتنا قیام کیا تھا اتنا ہی رکوع کرتے اور رکوع میں یہ پڑھتے: "سبحان ذی الجبروت والملکوت والکبریاء والعظمة" پھر اتنا ہی لمبا سجدہ کرتے اور سجدہ میں بھی یہی کلمات فرماتے' پھر کھڑے ہوکر آپ نے آل عمران پڑھی' پھر ایک ایک سورت پڑھی۔

امام ابوعبیدہ' امام احمد' امام حمید بن زنجویہ نے "فضائل القرآن" میں' امام ابن الضریس' امام ابن حبان' امام طبری' امام ابوذر ھروی نے "فضائل قرآن" میں' امام حاکم اور امام بیہقی نے اپنی سنن میں اپنی اپنی اسانید کے ساتھ حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن پڑھا کرو کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے اصحاب کی شفاعت کرنے والا ہوگا' زہراوین (یعنی) سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران پڑھا کرو کیونکہ یہ قیامت کے دن بادلوں کی طرح آئیں گی' یا صف باندھے ہوئے پرندوں کی طرح آئیں گی' اور اپنے پڑھنے والوں کی شفاعت کریں گی' سورہ بقرہ پڑھا کرو' کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے اور اس کا ترک کرنا حسرت ہے اور بدکار لوگ اس کو پڑھنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔

(الدرالمنثور ج ۱ ص ۱۸' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی النجفی' ایران)

ان احادیث اور آثار میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے سورہ بقرہ' سورہ آل عمران وغیرہ فرمایا ہے' اس سے واضح ہوا کہ سورہ بقرہ کہنا جائز ہے' نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تلاوت کے آداب میں سے یہ ہے کہ مثلاً رحمت کی آیت پڑھی جائے تو اللہ سے رحمت کے حصول کی دعا کی جائے اور عذاب کی آیت پڑھی جائے تو اللہ تعالیٰ سے عذاب سے پناہ طلب کی جائے' اور رات کی نفل نمازوں میں اس طرح قرآن مجید پڑھنا جائز ہے اور آپ کی سنت ہے۔

سورہ بقرہ کے محل نزول اور آیات اور حروف کی تعداد کا بیان

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

سورہ بقرہ مدنی ہے' یہ کافی عرصہ تک نازل ہوتی رہی ہے' یہ مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی سب سے پہلی سورت ہے' اس کی ایک آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور وہ ہے: "وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ" (البقرہ: ۲۸۱)۔

یہ آخری آیت ہے جو آسمان سے نازل ہوئی۔ یہ حجۃ الوداع میں یوم نحر (عیدالاضحیٰ) کو منیٰ میں نازل ہوئی ہے' اور سود کی حرمت کی آیات بھی قرآن مجید کی آخری آیتوں میں سے ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۱۵۲' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران)

یہ قرآن مجید کی سب سے طویل سورت ہے' جیسے سب سے قصیر سورت سورہ کوثر ہے' اور اس میں آیت مداینہ (البقرہ:

۲۸۲) ہے جو قرآن مجید کی سب سے طویل آیت ہے جیسے والضحیٰ اور والفجر قرآن مجید کی سب سے قصیر آیات ہیں۔
حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:
بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ سورت ایک ہزار خبر' ایک ہزار امر اور ایک ہزار نہی پر مشتمل ہے' اور شمار کرنے والوں نے بتایا ہے کہ اس سورت میں دو سو ستاسی آیات ہیں' چھ ہزار اسی کلمات ہیں اور پچیس ہزار پانچ سو حروف ہیں۔
(تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۷۱ - ۷۰ مطبوعہ ادارہ اندلس' بیروت' ۱۳۸۵ھ)

سورہ بقرہ کے فضائل میں احادیث اور آثار

امام مسلم روایت کرتے ہیں:
نواس بن سلیمان کلابی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن قرآن مجید اور اس پر عمل کرنے والوں کو لایا جائے گا' ان کے آگے سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران ہوں گی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سورتوں کی تین مثالیں بیان فرمائیں جن کو میں آج تک نہیں بھولا' فرمایا: وہ ایسی ہیں جیسے وہ بادل ہوں' یا دو سیاہ سائبان ہوں جن کے درمیان نور ہو' یا صف باندھے ہوئے پرندوں کی دو قطاریں ہوں' وہ سورتیں اپنے پڑھنے والوں کی وکالت اور حمایت کریں گی۔
یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک مخلوق پیدا فرمائے گا جو بادل' سائبان یا پرندوں کی قطاروں کی طرح ہوں گی اور قرآن پڑھنے والوں اور قرآن پر عمل کرنے والوں پر سایہ کریں گی۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے' ناگاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آواز سنی' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سر اوپر اٹھایا' حضرت جبرائیل نے کہا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جس کو صرف آج کھولا گیا ہے اور آج سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا' پھر اس سے ایک فرشتہ نازل ہوا' حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا: یہ فرشتہ جو آج نازل ہوا ہے آج سے پہلے کبھی نازل نہیں ہوا' اس فرشتے نے سلام کیا اور کہا: آپ کو ان دو نوروں کی بشارت ہو جو آپ کو دیئے گئے ہیں اور آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے' ایک سورہ فاتحہ اور دوسرا سورہ بقرہ کا آخری حصہ' ان میں سے آپ جو حرف بھی پڑھیں گے آپ کو اس کا مصداق مل جائے گا۔
حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص رات کو سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھے گا وہ اس کو کافی ہوں گی۔
یعنی ناگہانی مصائب اور شیطان کی فتنہ انگیزیوں سے اس کی حفاظت کریں گی۔
حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو المنذر! کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے نزدیک کتاب اللہ کی سب سے عظیم آیت کون سی ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ہی جانتا ہے' آپ نے فرمایا: تمہارے نزدیک کتاب اللہ کی سب سے عظیم آیت کون سی ہے؟ میں نے عرض کیا: "اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم" (آیت الکرسی) آپ نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اے ابو المنذر! تمہیں یہ علم مبارک ہو۔
(صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۷۱ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)
آیت الکرسی کی ایک وجہ فضیلت یہ ہے کہ اس میں اسم ظاہر' اسم صفت اور اسم ضمیر کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا سترہ مرتبہ ذکر ہے اور کسی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ کا اتنی بار ذکر نہیں ہے۔

امام نسائی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ' شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔

حضرت ابوسعید خدری بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ بہت خوش الحانی سے قرآن مجید پڑھتے تھے' وہ کہتے ہیں کہ ایک رات میں سورہ بقرہ پڑھ رہا تھا' اس وقت میرا گھوڑا بندھا ہوا تھا اور میرا بیٹا یحییٰ میرے قریب لیٹا ہوا تھا' وہ اس وقت کم سن بچہ تھا' اچانک وہ گھوڑا اچھلنے لگا' میں کھڑا ہو گیا' مجھے اس وقت صرف اپنے بیٹے یحییٰ کے متعلق تشویش تھی' پھر گھوڑا پر سکون ہو گیا' اور میں نے وہ سورت پڑھنی شروع کر دی' گھوڑا پھر اچھلنے لگا' میں پھر کھڑا ہو گیا اور مجھے صرف اپنے بیٹے یحییٰ کی فکر تھی' میں نے پھر پڑھنا شروع کیا اور گھوڑے نے پھر اچھلنا شروع کیا' اچانک میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آسمان سے ایک سائبان کی طرح کوئی چیز اتر رہی ہے جس میں روشن چراغ ہیں' میں خوفزدہ ہوا اور صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' اور آپ سے یہ واقعہ بیان کیا' آپ نے فرمایا: اے ابو یحییٰ! پڑھو' میں نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب میں نے پڑھا تو گھوڑا اچھلنے لگا اور مجھے اپنے بیٹے کی فکر تھی' آپ نے فرمایا: اے ابن حضیر! پڑھو' وہ کہتے ہیں: میں نے پڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سر کے اوپر سائبان کی مثل کوئی چیز تھی اور اس میں چراغ روشن تھے' میں خوفزدہ ہو گیا' آپ نے فرمایا: یہ فرشتے ہیں جو تمہاری آواز کی وجہ سے قریب آئے ہیں۔ اگر تم صبح تک پڑھتے رہتے تو لوگ ان کو دیکھ لیتے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ صدقہ کی کھجوروں کی حفاظت کر رہے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کوئی ہاتھ کھجوریں لے رہا ہے' انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا' آپ نے فرمایا: تم اس کو پکڑنا چاہتے ہو تو یہ کہو:

سبحان ہے وہ ذات جس نے تجھ کو (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مسخر کر دیا۔

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ ناگاہ وہ ایک جن تھا جو میرے سامنے کھڑا ہوا تھا' میں نے اس کو پکڑ لیا تا کہ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آؤں' اس نے کہا: میں نے فقراء جن کے لیے یہ کھجوریں لی تھیں اور میں دوبارہ ہرگز نہیں آؤں گا' حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں: وہ پھر آیا' میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا' آپ نے فرمایا: تم اس کو پکڑنا چاہتے ہو؟ میں نے عرض کیا: ہاں! آپ نے فرمایا: کہنا: سبحان ہے وہ جس نے تجھ کو (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مسخر کر دیا' پھر دوبارہ جب میں نے اس کو پکڑ لیا اور اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جانے لگا تو اس نے عہد کیا کہ وہ آئندہ نہیں آئے گا' تیسری بار پھر ایسا ہی ہوا تو میں نے انہی کلمات کی برکت سے اس کو پکڑا اور کہا کہ تم مجھ سے عہد کرتے ہو اور جھوٹ بولتے ہو اور پھر آ جاتے ہو' اس دفعہ میں تم کو ضرور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جاؤں گا' اس نے کہا: تم مجھے چھوڑ دو' میں تم کو ایسے کلمات سکھاتا ہوں کہ اگر تم وہ کلمات پڑھ لو تو کوئی مذکر یا مونث جن تمہارے قریب نہیں آ سکے گا' میں نے پوچھا: وہ کلمات کیا ہیں؟ اس نے کہا: ہر صبح اور شام کو آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرو' میں نے اس کو چھوڑ دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کا ذکر کیا' آپ نے مجھ سے فرمایا: کیا تم کو نہیں معلوم ان کلمات (آیت الکرسی) کی یہی تاثیر ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہماری (دوسرے) لوگوں پر تین وجہ سے فضیلت ہے' تمام روئے زمین ہمارے لیے مسجد بنا دی گئی ہے اور اس کی مٹی ہمارے لیے ذریعہ طہارت بنا دی گئی ہے' اور ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح ہیں اور ہم کو یہ آیات دی گئی ہیں' سورہ بقرہ کی آخری آیات جو عرش کے نیچے سے نازل ہوئی ہیں' جو مجھ سے پہلے کسی کو دی گئی ہیں اور نہ میرے بعد کسی کو دی جائیں گی۔

(السنن الکبریٰ ج ۵ ص ۱۵۔ ۱۳ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۱ھ)

حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

امام دارمی کعب سے روایت کرتے ہیں کہ جس شخص نے بقرہ اور آل عمران کو پڑھا' قیامت کے دن وہ سورتیں کہیں گی: اے ہمارے رب! اس سے مواخذہ نہ کر۔

امام ابو عبید نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کسی گھر میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے تو شیطان اس گھر سے نکل جاتا ہے۔

امام دارمی' امام طبرانی' امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ اور امام بیہقی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہر چیز کا ایک کوہان ہوتا ہے اور قرآن کا کوہان سورہ بقرہ ہے۔ جب کسی گھر میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے تو شیطان گوز مارتا ہوا بھاگ جاتا ہے۔

امام وکیع' امام حارث بن ابی اسامہ' امام محمد بن نصر اور امام ابن الضریس نے سند صحیح کے ساتھ حسن بصری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن مجید میں افضل سورہ بقرہ ہے اور اس میں ایک آیت سب سے عظیم ہے' وہ آیت الکرسی ہے اور جس گھر میں سورہ بقرہ پڑھی جائے شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۲۰۔ ۱۹ مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی النجفی' ایران)

۞۞۞۞۞

سورۃ البقرہ مدنیۃ — آیاتہا ۲۸۶ — رکوعاتہا ۴۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البقرہ مدنی ہے اللہ ہی کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے اس میں دو سو چھیاسی آیات اور چالیس رکوع ہیں

الٓمّٓ ۚ ﴿۱﴾ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚ فِیۡہِ ۚ ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ﴿۲﴾

الف لام میم O (یہ) وہ عظیم الشان کتاب ہے جس (کے کلام اللہ ہونے) میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے یہ ان متقین کے لیے ہدایت ہے O

الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا

جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کو قائم رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے

رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ

(ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں O اور یہ لوگ اس (کلام) پر ایمان لاتے ہیں جو آپ کی طرف نازل

اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ وَ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ؕ﴿۴﴾

کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا اور یہی لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں O

اُولٰٓئِکَ عَلٰی ہُدًی مِّنۡ رَّبِّہِمۡ ٭ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۵﴾

وہی (کامل متقی) اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں O

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الف' لام' میم O (البقرہ: ۱)

اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو ان حروف مقطعات کے ساتھ شروع فرمایا تاکہ قرآن مجید کے وصف اور اس کے اعجاز پر تنبیہ ہو اور اس چیلنج کی طرف اشارہ ہو کہ کوئی انسان قرآن مجید کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثل بھی نہیں لا سکتا' اور یہ اللہ کا کلام ہے جس کے مشابہ کسی بشر کا کلام نہیں ہے' گویا اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کیا کہ یہ قرآن عربوں کی لغت اور ان کے حروف تہجی مثل الف' لام' میم سے مرکب ہو کر نازل ہوا ہے' اگر یہ کسی انسان کا کلام ہے تو انہی حروف سے ایک کلام بنا کر تم بھی لے آؤ کیونکہ یہ ان حروف ہجاء سے مرکب ہے جن سے ہر اہل زبان عرب کلام کرتا ہے' اس کے باوجود جب تم اس کلام کی نظیر لانے سے ہمیشہ عاجز رہے تو پھر مان لو کہ یہ انسان کا نہیں اللہ کا کلام ہے۔

حروف مقطعات کے علم کی تحقیق

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا "الم" اور اس کی مثل دیگر حروف مقطعات کا معنی کسی کو معلوم ہے یا نہیں! ایک قول یہ ہے کہ ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے' خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ سے اس قسم کی روایات منقول ہیں۔

علامہ بیضاوی لکھتے ہیں:

خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ کی مراد یہ ہے کہ یہ حروف مقطعات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان

اسرار اور رموز ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کو ان حروف مقطعات پر مطلع کرنے کا قصد نہیں کیا گیا' اور یہ نہیں ہو سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان حروف کے معانی کا علم نہ ہو ورنہ لازم آئے گا کہ غیر مفید کلام کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا گیا اور یہ بہت بعید ہے۔ (انوار التنزیل مع الخفاجی' ج ۱ ص ۱۷۸ 'مطبوعہ دار صادر' بیروت' ۱۲۸۳ھ)

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

ظن غالب یہ ہے کہ حروف مقطعات کا علم مخفی ہے' علماء اس کی تاویل سے عاجز ہیں' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی قول ہے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہر کتاب کے اسرار ہوتے ہیں اور قرآن مجید کے اسرار اوائل سور ہیں' امام شعبی نے کہا: اللہ تعالیٰ کے اسرار کا کھوج نہ لگاؤ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کی معرفت صرف اولیاء کرام کو ہے جو وارث علم رسول ہیں' ان کو اسی دربار سے معرفت حاصل ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ حروف خود ان کو اپنا معنی بتا دیتے ہیں' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں میں سنگریزوں نے تسبیح کا نطق کیا' اور گوہ اور ہرن نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کلام ہوئے۔ بعض علماء نے کہا: اگر ان حروف کا کوئی معنی نہ ہو تو یہ مہمل ہوں گے' یہ قول صحیح نہیں ہے' کیونکہ اگر یہ مراد ہو کہ تمام لوگوں کو ان حروف کا معنی معلوم ہو تو یہ ضروری نہیں اور اگر یہ مراد ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا معنی معلوم ہو تو کوئی مومن اس میں شک نہیں کر سکتا اور ہر صاحب ایمان کا یہ ایمان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حروف کے معنی معلوم ہیں۔

(روح المعانی ج ۱ ص ۱۰۱۔ ۱۰۰ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

حروف مقطعات متشابہات میں سے ہیں اور فقہاء شافعیہ اور حنفیہ کا اس پر اجماع ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دیا۔

ملا جیون لکھتے ہیں:

متشابہ کا حکم یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اس کی مراد حق ہے' اگرچہ قیامت سے پہلے ہم کو وہ مراد معلوم نہیں ہے اور قیامت کے بعد متشابہ ہر ایک پر منکشف ہو جائے گا اور یہ امت کے حق میں ہے اور بہر حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متشابہات کا قطعی طور پر علم ہے' ورنہ آپ کو ان سے خطاب کرنے کا فائدہ باطل ہو جائے گا اور یہ مہمل کلام سے خطاب کرنے کی طرح ہوگا جیسے حبشی کے ساتھ عربی میں گفتگو کی جائے اور یہ تقریر ہمارے نزدیک ہے اور امام شافعی کے نزدیک تمام "راسخین فی العلم" کو متشابہات کا علم ہے۔ (نور الانوار ص ۹۳ 'مطبوعہ ایچ۔ ایم سعید اینڈ کمپنی' کراچی)

قاضی ثناء اللہ مظہری نقشبندی لکھتے ہیں:

میرے نزدیک حق یہ ہے کہ حروف مقطعات متشابہات میں سے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اسرار ہیں' ان حروف سے عام لوگوں کو سمجھانے کا قصد نہیں کیا گیا بلکہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حروف سے افہام مقصود تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کامل متبعین میں سے جن کو چاہیں ان کا معنی سمجھا دیں (الی قولہ)' علامہ سجاوندی نے کہا ہے کہ یہ حروف مقطعات اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اسرار ہیں اور کبھی محبین کے درمیان کچھ کلمات بہ طور معمہ ہوتے ہیں' ان میں یہ اشارہ ہوتا ہے کہ ان کلمات کو محرمان راز کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

ایک قول یہ ہے کہ حروف مقطعات اور متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے ساتھ مخصوص کر لیا ہے' ان کا علم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا ہے اور نہ آپ کے متبعین کو' یہ قول بہت بعید ہے' کیونکہ خطاب افہام کے لیے ہوتا ہے' اگر ان حروف سے افہام نہ ہو تو ان سے خطاب کرنا مہمل کلمات سے خطاب کرنے کی طرح ہوگا' یا جیسے عربی کے ساتھ ہندی میں خطاب کیا جائے'

نیز پورا قرآن بیان اور ہدایت نہیں رہے گا(کیونکہ جب ان الفاظ کا کوئی مفہوم حاصل نہ ہو تو ان سے ہدایت کیسے حاصل ہوگی) اور اللہ تعالیٰ نے جو یہ وعدہ فرمایا ہے:

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ؕ (القیامہ:۱۹) پھر اس قرآن کا بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے O

اس وعدہ کا خلاف لازم آئے گا' (اسی طرح ''الرحمان علم القران'' کا بھی خلاف لازم آئے گا' کیونکہ حروف مقطعات بھی قرآن ہیں اور رحمان نے ان کو نہیں سکھایا) اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن خواہ محکم ہو یا متشابہ' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا بیان واجب اور ضروری ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں ''راسخین فی العلم'' سے ہوں اور میں ان علماء سے ہوں جن کو ان کی تاویل کا علم ہے' اسی طرح مجاہد سے مروی ہے' حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر حروف مقطعات کی تاویل کو ظاہر فرمادیا ہے اور ان کے اسرار کو بیان کر دیا ہے' لیکن عام لوگوں کے لیے ان کا بیان ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کا بیان کرنا ان کے اسرار الٰہیہ ہونے کے منافی ہے۔ (تفسیر مظہری ج ا ص ۱۵۔۱۴' مطبوعہ بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ)

شیخ محمود الحسن لکھتے ہیں:

ان حروف کو مقطعات کہتے ہیں' ان کے اصلی معنی تک اوروں کی رسائی نہیں بلکہ یہ بھید ہے اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان جو بہ وجہ مصلحت و حکمت ظاہر نہیں فرمایا۔ (حاشیۃ القرآن ص ۳' مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی)

ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ اکثر علماء ان حروف مقطعات کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اسرار قرار دیتے ہیں اور بعض علماء نے ان حروف کی تاویلات کی ہیں' علامہ بیضاوی لکھتے ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ حروف مقطعات ان سورتوں کے اسماء ہیں' ایک قول یہ ہے کہ یہ تنبیہ کے لیے حروف زائدہ ہیں' ایک قول یہ ہے کہ ان حروف سے ان کلمات کی طرف اشارہ ہے جو ان حروف سے مرکب ہیں جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الف سے مراد آلاء اللہ (اللہ تعالیٰ کی نعمتیں) ہیں اور لام سے مراد اللہ کا لطف ہے اور میم سے مراد اس کا ملک ہے' اور حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ ''الر' حم'' اور ''ن'' اس کے مجموعہ سے ''الرحمٰن'' مراد ہے اور یہ روایت بھی ہے کہ ''الم'' سے مراد ہے: ''انا اللہ اعلم'' (میں اللہ ہی خوب جانتا ہوں) اور باقی سورتوں کے شروع میں جو حروف مقطعات ہیں ان سے بھی اسی طرح کے کلمات مراد ہیں' حضرت ابن عباس سے یہ روایت بھی ہے کہ الف سے اللہ کی طرف' لام سے جبریل کی طرف اور میم سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ قرآن اللہ نے لسان جبریل سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا' یا ان حروف سے بعض اقوام کی مدتوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہود آئے تو آپ نے ان پر ''الم'' البقرہ کی تلاوت کی' انہوں نے حساب کر کے کہا: ہم اس دین میں کیسے داخل ہوں جس کی مدت اکہتر سال ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے' انہوں نے کہا: اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ تو آپ نے پڑھا: ''المص' الر' المر'' وہ کہنے لگے: آپ نے ہم پر حساب مشتبہ کر دیا' اس کے علاوہ بھی تاویلات ہیں۔

(انوار التنزیل علی ہامش الخفاجی ج ا ص ۱۷۴۔۱۷۰' ملخصاً مطبوعہ دار صادر بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (یہ) وہ عظیم الشان کتاب ہے جس (کے کلام اللہ ہونے) میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔

(البقرہ:۲)

سورہ فاتحہ کے بعد سورہ بقرہ لانے کی مناسبت یہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں اللہ کے بندوں نے اللہ سے صراط مستقیم کی ہدایت کا

سوال کیا تھا جو انعام یافتہ لوگوں کا راستہ ہو' گمراہ اور مغضوب لوگوں کا راستہ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس ہدایت کا تم نے سوال کیا ہے وہ اس کتاب میں ہے اور اس میں انعام یافتہ لوگوں کی صفات بیان کیں کہ وہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں' غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم رکھتے ہیں' اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال سے خرچ کرتے ہیں' اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ پر جو کتاب نازل کی گئی اور آپ سے پہلے جو کتابیں نازل کی گئیں ان سب پر یقین رکھتے ہیں اور یہی لوگ دنیا میں ہدایت یافتہ ہیں اور آخرت میں فوز وفلاح پانے والے ہیں' پھر گمراہ اور مغضوب لوگوں کی نشانیاں بیان کیں کہ ان لوگوں پر تبلیغ دین کا کوئی اثر نہیں ہوتا' یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں' یہ کلمہ حق کو سننے کے لیے بہرے ہیں' اعتراف حق کے لیے گونگے ہیں' آیات اللہ کو بہ غور دیکھنے سے اندھے ہیں' ان کی آنکھوں پر بغض اور عناد کی پٹی بندھی ہوئی ہے اور یہ حق وصداقت کی طرف رجوع نہیں کریں گے۔

عربی قواعد کے مطابق ''ذالك'' کسی بعید چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لیے آتا ہے اور یہاں کتاب کی طرف اشارہ ہے جو قریب ہے لیکن یہاں بعد رتبہ کو بعد مسافت کے قائم مقام کیا گیا ہے' اس لیے اس کا معنی ہے: وہ عظیم الشان کتاب۔

کتاب کا لغوی اور اصطلاحی معنی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

کتب کا معنی ہے چمڑے کے دو ٹکڑوں کو سی کر ایک دوسرے کے ساتھ ملا دینا' اور عرف میں اس کا معنی ہے: بعض حروف کو لکھ کر بعض دوسرے حروف کے ساتھ ملانا' اور کبھی صرف ان ملائے ہوئے حروف پر بھی کتاب کا اطلاق ہوتا ہے' اسی اعتبار سے اللہ کے کلام کو کتاب کہا جاتا ہے اگر چہ وہ لکھا ہوا نہیں ہے' قرآن مجید میں ہے: ''الٓمٓ ذالك الكتاب'' کتاب اصل میں مصدر ہے' پھر مکتوب کا نام کتاب رکھ دیا گیا' نیز کتاب اصل میں لکھے ہوئے صحیفہ کا نام ہے' قرآن مجید میں ہے:

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ. (النساء: ۱۵۳)

اہل کتاب آپ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے کوئی صحیفہ نازل کر دیں۔

فرض اور تقدیر کے معنی میں کتاب کا لفظ مستعمل ہے' قرآن مجید میں ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ. (البقرہ: ۱۸۳)

اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا. (التوبہ: ۵۱)

آپ کہیے: ہمیں صرف وہی چیز پہنچے گی' جو ہمارے لیے اللہ نے مقدر کر دی ہے۔

کتاب کا لفظ بنانے اور شمار کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے' قرآن مجید میں ہے:

فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ○ (آل عمران: ۵۳)

سو گواہی دینے والوں کے ساتھ ہمارا شمار کر لے ○

اللہ کی طرف سے حجت ثابتہ کے معنی میں بھی کتاب کا لفظ مستعمل ہے' قرآن کریم میں ہے:

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ. (الزخرف: ۲۱)

کیا ہم نے اس (قرآن) سے پہلے انہیں کوئی حجت ثابتہ دی ہے؟

فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ (الصافات: ۱۵۷)

تم اپنی حجت ثابتہ لے آؤ اگر تم سچے ہو ○

کتاب کا لفظ حکم کے معنی میں بھی وارد ہے' قرآن مجید میں ہے:

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۝ (الانفال: ۶۸) اگر پہلے (معاف کر دینے کا) حکم اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو (کافروں سے) جو (فدیہ کا مال) تم نے لیا تھا' تمہیں اس میں ضرور بڑا عذاب پہنچتا۝

قرآن مجید میں جہاں اہل کتاب کا لفظ آتا ہے تو اس کتاب سے تورات' انجیل یا یہ دونوں کتابیں مراد ہوتی ہیں۔

(المفردات ص ۴۲۵ ـ ۴۲۳ 'مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

کتاب کا اصطلاحی معنی یہ ہے: وہ صحیفہ جو ایسے متعدد مسائل کا جامع ہو جو جنساً متحد ہوں اور نوعاً اور صنفاً مختلف ہوں اور وہ صحیفہ ابواب اور فصول پر منقسم ہو' جیسے کتاب الطہارۃ' کتاب الزکوٰۃ وغیرہ۔

اس آیت میں کتاب سے مراد آسمانی صحیفہ ہے یعنی قرآن مجید۔

''ریب'' کا معنی

علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

''ریب'' کا معنی حاجت ہے' حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے کچھ یہودی گزرے' بعض نے کہا: ان سے سوال کرو' اور بعض نے کہا: ''ما رابکم الیہ'' تمہیں ان سے سوال کی کیا حاجت ہے؟ اور ریب کا معنی شک اور تہمت بھی ہے' ابن الاثیر نے کہا ہے کہ ریب اس شک کو کہتے ہیں جس میں تہمت کا عنصر شامل ہو' حدیث میں ہے: جس چیز میں ریب ہو اس کو چھوڑ دو اور اس کو اختیار کرو جس میں ریب نہ ہو' حضرت ابوبکر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وصیت کی: ''علیک بالرائب من الامور'' جس چیز میں بالکل شبہ نہ ہو اس کو لازم کرلو' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کے بارے میں فرمایا: ''یریبنی ما یریبھا'' جو چیز (حضرت) فاطمہ کو بے قرار کرتی ہے' وہ مجھے بے قرار کرتی ہے' اور ''تہذیب'' میں ہے: شک مع تہمت کو ''ریب'' کہتے ہیں۔ (تاج العروس ج ۱ ص ۲۸۳ ـ ۲۸۲ 'مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

قرآن مجید میں ''ریب'' کی نفی اور اثبات کا محمل

شک کی حقیقت ہے: کسی چیز کا دل میں کھٹکنا اور دل کا مضطرب ہونا' شک کی ضد طمانیت ہے' آیت کا معنی یہ ہے کہ اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں' اس کی ہدایت اور ارشاد میں' فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے اس کے معجز اور بے مثال ہونے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ (البقرہ: ۲۳) اور جو کلام ہم نے اپنے عبد (مقدس) پر نازل کیا ہے' اگر تم کو اس (کے منزل من اللہ ہونے) میں شک ہے تو اس جیسی کوئی سورت (بنا کر) لے آؤ۔

اس آیت سے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کو اس میں شک تھا' اور پہلی آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ فی نفسہ قرآن مجید فصاحت وبلاغت کے ایسے مرتبہ پر ہے کہ اس کے منزل من اللہ ہونے میں کوئی تردد نہیں ہے' اور جو شخص بھی کھلے ہوئے ذہن اور بصیرت کی آنکھوں سے اس کو پڑھے گا یا بہ غور اس کلام کو سنے گا اس کو اس کے کلام اللہ ہونے میں کوئی شک اور شبہ نہیں ہوگا' اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی شخص اس میں شک نہیں کرتا بلکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے واضح اور روشن دلائل کی وجہ سے یہ شک کا محل نہیں ہے اور اس میں تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے' اس کے

باوجود اگر کفار اور مشرکین اس میں شک کرتے ہیں تو اس کی وجہ ان کی بصیرت سے محرومی ہے' خواہش نفس کی اتباع' تکبر اور ہٹ دھرمی ہے' اور اپنے آباء واجداد کی اندھی تقلید ہے' انہوں نے اپنے دماغ کے دریچے بند کر لیے ہیں اور وہ کسی نئی فکر کو اپنے ذہن میں آنے نہیں دیتے۔ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ "فیہ" "ریب" کی صفت ہے اور "للمتقین" اس کی خبر ہے اور معنی یہ ہے کہ متقین کے لیے اس میں کوئی شک نہیں ہے اور جن لوگوں نے شک کیا ہے وہ متقین نہیں ہیں' کفار اور مشرکین ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ (کتاب) متقین کے لیے ہدایت ہے O (البقرہ: ۲)

آیا قرآن مجید تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے یا صرف متقین کے لیے؟

اس جگہ فرمایا کہ قرآن مجید متقین کے لیے ہدایت ہے' اور ایک اور جگہ فرمایا ہے کہ یہ تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ. (البقرہ: ۱۸۵) رمضان کے مہینہ میں قرآن کو نازل کیا گیا ہے درآں حالیکہ وہ تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔

قرآن مجید کی صراط مستقیم پر دلالت ہے اور متقین کو قرآن مجید کے احکام پر عمل کی توفیق بھی نصیب ہوتی ہے' وہ قرآن مجید کے انوار سے مستنیر اور مستفید ہوتے ہیں اور قرآن مجید میں تدبر اور تفکر کرنے سے ان کے دماغ کی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور غیر متقین کے لیے بھی قرآن کریم ہدایت ہے' نیکی اور دنیا کی خیر کی طرف رہنمائی ہے' اگرچہ وہ اس کی ہدایت کو قبول نہیں کرتے اور اس کے احکام پر عمل کر کے اپنی دنیا اور آخرت کو روشن نہیں کرتے' اور جن کفار اور مشرکین نے قرآن مجید کی ہدایت کو قبول نہیں کیا' اس سے قرآن مجید کے ہدایت ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا' اگر اندھا آفتاب کو نہ دیکھے تو اس سے آفتاب کے روشن ہونے میں کیا فرق پڑتا ہے! اور صفراوی مزاج والا اگر شہد کی شیرینی محسوس نہ کرے تو اس سے شہد کی مٹھاس میں کیا کمی ہوتی ہے!

قرآن مجید میں جہاں فرمایا ہے کہ یہ تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے اس سے مراد یہ ہے کہ فی نفسہٖ قرآن مجید کی ہدایت تمام انسانوں کے لیے ہے اور یہاں جو فرمایا ہے کہ یہ متقین کے لیے ہدایت ہے اس سے مراد یہ ہے کہ نتیجۃً اور مآل کار یہ متقین ہی کے لیے ہدایت ہے کیونکہ اس ہدایت سے وہی فیضیاب ہوتے ہیں' دوسرا جواب یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں تعارض نہیں ہے کیونکہ حقیقت میں انسان وہی ہیں جو متقی ہیں اور رہے غیر متقی تو وہ اس آیت کا مصداق ہیں:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ O (الاعراف: ۱۷۹)

اور بے شک ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے جن اور انسان پیدا کیے' ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں' ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں' وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے (بھی) زیادہ گمراہ ہیں' وہی غافل ہیں O

اس کا تیسرا جواب یہ ہے کہ ہر چند کہ قرآن تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے لیکن چونکہ متقی انسانوں کے اعلیٰ افراد ہیں' اس لیے ان ہی کا تشریفاً اور تکریماً ذکر کیا گیا ہے۔

تقویٰ کا صیغہ اور اس کا لغوی معنی

علامہ زبیدی حنفی لکھتے ہیں:

ابن سیدہ نے کہا ہے کہ "تقوی" اصل میں "وقوی" تھا' یہ فعلی کے وزن پر اسم (حاصل بالمصدر) ہے اور "وقیت"

سے بنا ہے واؤ کو تا سے بدل دیا' یہ ''تقوی'' ہو گیا اسی طرح ''تقاۃ'' اصل میں ''وقاۃ'' ہے اور ''تجاہ'' اور ''تراث'' اصل میں ''وجاہ'' اور ''وراث'' ہیں ''وقاہ یقیہ'' کا معنی ہے: کسی چیز کو اذیت سے محفوظ رکھنا اور اس کی حمایت اور حفاظت کرنا' قرآن مجید میں ہے: ''مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ '' (الرعد: ۳۴) ''انہیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں ہے''۔

(تاج العروس ج ۱۰ ص ۳۹۶' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ' مصر ۱۳۰۶ھ)

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

تقویٰ کا معنی ہے: کسی ڈرانے والی چیز سے نفس کو بچانا اور اس کی حفاظت کرنا' اور کبھی خوف کو بھی تقویٰ کہتے ہیں اور اس کا شرعی معنی ہے: گناہ کی آلودگی سے نفس کی حفاظت کرنا' اور یہ ممنوعہ کاموں کے ترک سے حاصل ہوتا ہے' اور کامل تقویٰ تب حاصل ہوتا ہے جب بعض مباحات کو بھی ترک کر دیا جائے جیسا کہ حدیث میں ہے: حلال ظاہر ہے اور حرام ظاہر ہے اور ان کے درمیان کچھ مشتبہات ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے' سو جو شخص مشتبہات سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا' الحدیث۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۳' طبع کراچی) تقویٰ کے کئی مراتب ہیں جو حسب ذیل آیات سے ظاہر ہوتے ہیں:

فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (الاعراف: ۳۵) پس جو لوگ گناہوں سے باز رہے اور انہوں نے نیکیاں کیں' تو ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۝

اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ۔ (آل عمران: ۱۰۲) اور اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۔ (الزمر: ۷۳) اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے وہ جنت کی طرف گروہ در گروہ بھیجے جائیں گے۔

(المفردات ص ۵۳۱۔ ۵۳۰' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران' ۱۳۴۲ھ)

تقویٰ کا اصطلاحی معنی

علامہ میر سید شریف نے تقویٰ کی حسب ذیل تعریفات لکھی ہیں:

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر کے نفس کو عدم اطاعت کے عذاب سے بچانا تقویٰ ہے' اللہ تعالیٰ کی معصیت کے عذاب سے نفس کو بچانا تقویٰ ہے' اللہ تعالیٰ کے ماسوا سے خود کو محفوظ کرنا تقویٰ ہے' آداب شریعت کی حفاظت کرنا تقویٰ ہے' ہر وہ کام جو تم کو اللہ سے دور کر دے اس سے خود کو باز رکھنا تقویٰ ہے' حظوظ نفسانیہ کو ترک کرنا اور ممنوعات سے دور رہنا تقویٰ ہے' تم اپنے نفس میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہ دیکھو یہ تقویٰ ہے' تم اپنے آپ کو کسی سے بہتر گمان نہ کرو یہ تقویٰ ہے' ماسوی اللہ کو ترک کرنا تقویٰ ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قولاً اور فعلاً اقتداء کرنا تقویٰ ہے۔ (کتاب التعریفات ص ۲۹' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ ۱۳۰۶ھ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

تقویٰ کا معنی ہے: کسی ناپسندیدہ چیز سے خود کو بچانے کے لیے' اپنے اور اس چیز کے درمیان کوئی آڑ بنا لینا' اور متقی وہ شخص ہے جو اپنے نیک اعمال اور پر خلوص دعاؤں سے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا لے' زر بن حبیش کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک دن فرمایا: لوگ بہت ہیں لیکن ان میں بہتر وہ ہیں جو تائب ہوں یا متقی ہوں' پھر ایک دن کہا: لوگ بہت ہیں لیکن ان میں بہتر وہ ہیں جو عالم ہوں یا متعلم ہوں' ابو یزید بسطامی نے کہا: متقی وہ ہے جس کا ہر قول اور ہر عمل اللہ کے لیے ہو' ابو سلیمان دارانی نے کہا: متقی وہ ہے جس کے دل سے شہوات کی محبت نکال لی گئی ہو' ایک قول یہ ہے کہ

متقی وہ ہے جو شرک سے بچے اور نفاق سے بری ہو ابن عطیہ نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ فاسق بھی اسی طرح ہوتا ہے' حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے تقویٰ کے متعلق سوال کیا' انہوں نے کہا: کیا آپ نے کانٹوں والا راستہ دیکھا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں! پوچھا: پھر آپ نے کیا کیا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے پائینچے اوپر اٹھائے اور ان سے بچ کر نکلا' حضرت ابی بن کعب نے کہا: یہی تقویٰ ہے' حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: تقویٰ ہر قسم کی خیر کا جامع ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اولین اور آخرین کو وصیت کی ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۱۶۲۔۱۶۱' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

امام رازی لکھتے ہیں:

متقی وہ شخص ہے جو عبادات کو انجام دے اور ممنوعات سے بچے اس میں اختلاف ہے کہ گناہ صغیرہ سے بچنا بھی تقویٰ میں داخل ہے یا نہیں' حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک متقین کے درجہ کو نہیں پا سکتا جب تک ان چیزوں کو ترک نہ کردے جن میں حرج نہ ہو اس خوف سے کہ شاید ان میں حرج ہو' حضرت ابن عباس نے فرمایا: متقی وہ لوگ ہیں جو عذاب سے بچنے کے لیے خواہش نفس پر عمل نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ سے رحمت کی امید رکھتے ہیں۔

امام رازی فرماتے ہیں: یہاں تقویٰ سے مراد خوف خدا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نساء اور سورہ حج کی ابتداء میں فرمایا:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ (النساء: ۱' الحج: ۱) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔

حسب ذیل آیات میں بھی تقویٰ سے مراد خوف خدا ہے:

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (الشعراء: ۱۰۶) جب ان کے ہم قوم نوح نے ان سے کہا: کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ ۝

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (الشعراء: ۱۲۴) جب ان کے ہم قوم ہود نے ان سے کہا: کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ ۝

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (الشعراء: ۱۴۲) جب ان کے ہم قوم صالح نے ان سے کہا: کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ ۝

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (الشعراء: ۱۶۱) جب ان کے ہم قوم لوط نے ان سے کہا: کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ ۝

اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (الشعراء: ۱۷۷) جب شعیب نے ان سے کہا: کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ ۝

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ (العنکبوت: ۱۶) اور ابراہیم نے جب اپنی قوم سے کہا: اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو۔

اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ۔ (آل عمران: ۱۰۲) اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

ہر چند کہ تقویٰ خشیت الٰہی کا نام ہے لیکن قرآن مجید میں تقویٰ توحید پر ایمان' توبہ' طاعت' ترک معصیت اور اخلاص کے لیے بھی استعمال ہوا ہے:

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى ۔ (الفتح: ۲۶) اور اللہ نے انہیں کلمہ توحید پر مستحکم کردیا۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا (الاعراف: ۹۶) — اور اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور تو بہ کرتے۔

اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ○ (النحل: ۲) — لوگوں کو ڈراؤ کہ میرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں سو میری اطاعت کرو ○

وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (البقرہ: ۱۸۹) — اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو اور اللہ کی نافرمانی نہ کرو۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ○ (الحج: ۳۲) — اور جس نے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی تعظیم کی تو یہ دلوں کے اخلاص سے ہے ○

تقویٰ کا مقام بہت عظیم اور بلند ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا (النحل: ۱۲۸) — بے شک اللہ متقین کے ساتھ ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (الحجرات: ۱۳) — بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے مکرم وہ ہے‘ جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص یہ چاہتا ہو کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ مکرم ہو وہ اللہ سے ڈرے‘ اور حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا: معصیت پر اصرار نہ کرنا‘ اور عبادت پر مغرور نہ ہونا‘ تقویٰ ہے‘ ابراہیم بن ادھم نے کہا: تقویٰ یہ ہے کہ تمہاری زبان پر مخلوق کا عیب نہ ہو‘ فرشتے تمہارے افعال میں عیب نہ پائیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے دل میں کوئی عیب نہ دیکھے‘ علامہ واقدی نے کہا: تقویٰ یہ ہے کہ جس طرح تم اپنے ظاہر کو مخلوق کے لیے مزین کرتے ہو‘ اس طرح اپنے باطن کو اللہ کے لیے مزین کرو‘ ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو وہاں نہ دیکھے جہاں اس نے منع کیا ہے‘ اور ایک قول یہ ہے کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اپنائے اور دنیا کو پس پشت ڈال دے‘ اپنے نفس کو اخلاص اور وفا کا پابند کرے اور حرام اور جفا سے اجتناب کرے وہی متقی ہے اور اگر " " کے سوا متقین کی فضیلت میں اور کوئی آیت نہ ہوتی تو یہی آیت کافی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں " " فرمایا ہے اور اس کے بعد " " فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حقیقت میں انسان وہی ہے جو متقی ہو۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۶۲-۱۶۱‘ مطبوعہ دارالفکر‘ بیروت‘ ۱۳۹۸ھ)

تقویٰ اور متقین کے متعلق احادیث

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت عطیہ سعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک متقین میں سے شمار نہیں ہوگا جب تک کہ وہ بے ضرر چیز کو اس خوف سے نہ چھوڑ دے کہ شاید اس میں ضرر ہو۔ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

(جامع ترمذی ص ۳۵۳‘ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب‘ کراچی)

حضرت میمون بن مہران نے کہا: بندہ اس وقت تک متقی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنا اس طرح حساب نہ کرے‘ جس طرح اپنے شریک کا محاسبہ کرتا ہے کہ اس کا کھانا کہاں سے آیا اور اس کے کپڑے کہاں سے آئے۔

(جامع ترمذی ص ۳۵۴‘ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب‘ کراچی)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک دوسرے سے حسد نہ کرو' تناجش (کسی کو پھنسانے کے لیے زیادہ قیمت لگانا) نہ کرو' ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو' ایک دوسرے سے روگردانی نہ کرو' کسی کی بیع پر بیع نہ کرو' اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ' مسلمان' مسلمان کا بھائی ہے' اس پر ظلم نہ کرے' اس کو رسوا نہ کرے' اس کو حقیر نہ جانے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے تین بار فرمایا: تقویٰ یہاں ہے' کسی شخص کے برے ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو برا جانے' ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر مکمل حرام ہے' اس کا خون اس کا مال اور اس کی عزت۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۱۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے " " کی تفسیر میں فرمایا: " "۔ (جامع ترمذی ص ۴۰۷' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام دارمی روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا رب یہ فرماتا ہے کہ میں ہی اس بات کا مستحق ہوں کہ مجھ سے ڈرا جائے' سو جو شخص مجھ سے ڈرے گا تو میری شان یہ ہے کہ میں اس کو بخش دوں۔

(سنن دارمی ج ۲ ص ۲۱۲' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے ایک ایسی آیت کا علم ہے کہ اگر لوگ صرف اسی آیت پر عمل کر لیں تو وہ ان کے لیے کافی ہو گی' جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۲۱۳' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام احمد روایت کرتے ہیں:

ابونضرہ بیان کرتے ہیں کہ جس شخص نے ایام تشریق کے وسط میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطبہ سنا اس نے یہ حدیث بیان کی' آپ نے فرمایا: اے لوگو! سنو! تمہارا رب ایک ہے' تمہارا باپ ایک ہے' سنو! کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے نہ عجمی کو عربی پر فضیلت ہے نہ گورے کو کالے پر فضیلت ہے نہ کالے کو گورے پر فضیلت ہے' مگر فضیلت صرف تقویٰ سے ہے۔

(مسند احمد ج ۵ ص ۴۱۱' مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شاید اس سال کے بعد تم مجھ سے ملاقات نہیں کرو گے' حضرت معاذ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق کے صدمہ میں رونے لگے' پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: میرے سب سے زیادہ قریب متقی ہوں گے خواہ وہ کوئی ہوں اور کہیں ہوں۔

(مسند احمد ج ۵ ص ۲۳۵' مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

تقویٰ کے مراتب

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ قرآن مجید کا متقین کے لیے ہدایت ہونا تحصیل حاصل ہے کیونکہ متقین تو خود ہدایت یافتہ ہیں' اس کے کئی جواب ہیں' پہلا جواب یہ ہے کہ متقین سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ تقویٰ حاصل کرنے کا ارادہ کریں سو یہ کتاب ان کے لیے ہدایت ہے' دوسرا جواب یہ ہے کہ ہدایت سے مراد ہدایت پر دوام اور ثبات ہے یعنی اس کتاب کے مطالعہ اور اس پر عمل کرنے سے متقین کو ہدایت پر دوام اور ثبات حاصل ہوگا' تیسرا جواب یہ ہے کہ تقویٰ کے کئی مراتب ہیں: (۱) نفس کی کفر

اور شرک سے حفاظت کرنا' (ب) نفس کی گناہ کبیرہ سے حفاظت کرنا (ج) نفس کی گناہ صغیرہ سے حفاظت کرنا (د) نفس کی خلاف سنت سے حفاظت کرنا (ہ) نفس کی خلاف اولی سے حفاظت کرنا (و) نفس کی ماسوی اللہ سے حفاظت کرنا' سو جو شخص تقویٰ کے کسی ایک مرتبہ پر فائز ہو یہ کتاب اس کے لیے تقویٰ کے اگلے مرتبہ کے لیے ہدایت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ (البقرہ: ۳)

متقین کی تین صفات بیان کی ہیں' ایمان بالغیب' اقامت صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ' پہلی صفت ایمان بالغیب ہے' جس کا اس آیت میں بیان ہے' اس آیت کریمہ کی تفسیر کے جاننے کے لیے ایمان اور غیب کو سمجھنا ضروری ہے' ہم پہلے ایمان کی تشریح اور تحقیق کریں گے اور اس کے بعد غیب پر مفصل گفتگو کریں گے۔

ایمان کے لغوی معنی کی تفصیل اور تحقیق

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

ایمان امن سے ماخوذ ہے اور امن کا معنی ہے: نفس کا مطمئن ہونا اور خوف کا زائل ہونا' امن' امانت اور امان اصل میں مصادر ہیں' امان انسان کی حالت امن کو کہتے ہیں' انسان کے پاس جو چیز حفاظت کے لیے رکھی جائے اس کو امانت کہتے ہیں' قرآن مجید میں ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ (الانفال: ۲۷)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو' اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو۔

نیز قرآن مجید میں ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ (الاحزاب: ۷۲)

بے شک ہم نے آسمانوں' زمینوں اور پہاڑوں پر اپنی امانت پیش کی۔

اور قرآن مجید میں ہے:

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (آل عمران: ۹۷)

اور جو حرم میں داخل ہوا وہ بے خوف ہو گیا۔

یعنی وہ دوزخ سے بے خوف ہو گیا' یا وہ دنیا کی مصیبتوں سے بے خوف ہو گیا' اس کا معنی ہے کہ حرم میں اس سے قصاص لیا جائے گا نہ اس کو قتل کیا جائے گا۔

ایمان کا استعمال کبھی اس شریعت کو ماننے کے لیے کیا جاتا ہے جس کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پاس سے لے کر آئے' اس استعمال کے مطابق قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ (البقرہ: ۶۲)

بے شک اسلام قبول کرنے والے' یہودی' عیسائی اور ستارہ پرست۔

ایمان کے ساتھ ہر اس شخص کو متصف کیا جاتا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں داخل ہو دراں حالیکہ وہ اللہ تعالیٰ کا اور آپ کی نبوت کا اقرار کرتا ہو۔

اور کبھی ایمان کا استعمال بر سبیل مدح کیا جاتا ہے اور اس سے مراد ذہن کا بہ طور تصدیق حق کو ماننا اور قبول کرنا ہے اور اس کا تحقق دل کے ماننے' زبان سے اقرار کرنے اور اعضاء کے عمل کرنے سے ہوتا ہے' اس اعتبار سے ایمان کا اطلاق قرآن مجید کی اس آیت میں ہے:

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصِّدِّیۡقُوۡنَ ٭ وَالشُّہَدَآءُ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ وَنُوۡرُہُمۡ ؕ (الحدید: ۱۹) اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر (کامل) ایمان لائے وہی اپنے رب کی بارگاہ میں صدیق اور شہید ہیں' ان کے لیے ان کا اجر اور ان کا نور ہے۔

تصدیق بالقلب' اقرار باللسان اور عمل بالارکان میں سے ہر ایک پر ایمان کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ تصدیق بالقلب پر ایمان کا اطلاق قرآن مجید کی اس آیت میں ہے:

اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡاِیۡمَانَ (المجادلہ: ۲۲) وہ لوگ جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت فرمادیا۔

دل میں صرف تصدیق ہوتی ہے اس لیے اس آیت سے مراد صرف تصدیق ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت میں بھی ایمان کا اطلاق تصدیق پر کیا گیا ہے:

وَمَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَلَوۡ کُنَّا صٰدِقِیۡنَ ○ (یوسف: ۱۷) اور آپ ہماری بات کی تصدیق کرنے والے نہیں ہیں خواہ ہم سچے ہوں ○

اور اعمال صالحہ پر ایمان کا اطلاق قرآن مجید کی اس آیت میں ہے:

وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ ؕ (البقرہ: ۱۴۳) اور اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ (تحویل قبلہ سے پہلے تمہاری پڑھی ہوئی) تمہاری نمازوں کو ضائع کردے۔

جب جبرائیل علیہ السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ' اس کے فرشتوں' اس کے صحیفوں' اس کے رسولوں' قیامت اور ہر اچھی اور بری چیز کو تقدیر کے ساتھ وابستہ ماننا ایمان ہے' اس حدیث میں چھ چیزوں کے ماننے پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے' یہ حدیث صحیح بخاری' صحیح مسلم اور حدیث کی دوسری مشہور کتابوں میں ہے۔ (المفردات ص ۲۶۔۲۵' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

ایمان تصدیق ہے' علامہ زمخشری نے ''اساس'' میں اسی پر اعتماد کیا ہے' اور اہل علم میں سے اہل لغت وغیرہ کا اسی پر اتفاق ہے' علامہ سعد الدین تفتازانی نے کہا ہے کہ ایمان کا حقیقی معنی تصدیق ہے' اور ''کشاف'' میں لکھا ہے کہ کسی شخص پر ایمان لانے کا معنی یہ ہے کہ اس کو تکذیب سے مامون اور محفوظ رکھا جائے' بعض محققین نے کہا ہے کہ ایمان کا معنی تصدیق ہو تو یہ بنفسہ متعدی ہوتا ہے' اور جب اس کا معنی اذعان (ماننا اور قبول کرنا) ہو تو لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے اور جب اس کا معنی اعتراف ہو' تب بھی لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے' ازہری نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے بندے کو جس امانت پر امین بنایا ہے اس میں صدق کے ساتھ داخل ہونا ایمان ہے' اگر بندہ جس طرح زبان سے تصدیق کرتا ہے اسی طرح دل سے بھی تصدیق کرے تو وہ مومن ہے اور جو صرف زبانی اقرار کرے اور دل سے تصدیق نہ کرے وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت کو ادا نہیں کر رہا' وہ منافق ہے اور جس کا یہ زعم ہے کہ تصدیق بالقلب کے بغیر صرف زبان سے اظہار کرنا ایمان ہے وہ یا منافق ہوگا یا جاہل (علامہ زبیدی کہتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ کبھی صرف زبانی اقرار پر بھی ایمان کا اطلاق کیا جاتا ہے' جیسا کہ قرآن مجید کی اس آیت میں ہے:

ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ (المنافقون: ۳) یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ (زبان سے) ایمان لائے پھر انہوں نے (دل کا) کفر (ظاہر) کیا تو ان کے دلوں پر مہر کردی گئی۔

اور اس آیت میں بھی زبانی اظہار پر ایمان کا اطلاق ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا ثُمَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا ثُمَّ ازۡدَادُوۡا كُفۡرًا. (النساء: ۱۳۷) بے شک جو لوگ زبان سے ایمان لائے پھر دل سے کافر ہوئے' پھر (زبان سے) ایمان لائے' پھر کافر ہوئے' پھر وہ کفر میں اور بڑھ گئے۔

زجاج نے کہا ہے: کبھی ایمان کا اطلاق اظہار خشوع پر کیا جاتا ہے اور کبھی شریعت کے قبول کرنے پر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے ہیں اس پر اعتقاد رکھنے اور دل سے اس کی تصدیق کرنے پر ایمان کا اطلاق کیا جاتا ہے' امام راغب نے کہا ہے کہ ایمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کا نام ہے اور کبھی بہ طور مدح حق کی تصدیق کرنے اور ماننے کو ایمان کہتے ہیں' ایمان تصدیق' اقرار اور عمل سے متحقق ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ بھی ایمان کا اطلاق کیا جاتا ہے' مومن اللہ تعالیٰ کی صفت ہے' جس کا معنی ہے: مخلوق کو ظلم سے امن دینے والا' یا اپنے اولیاء کو عذاب سے امن میں رکھنے والا' منذری نے ابو العباس سے روایت کیا ہے کہ جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ امتوں سے اپنے رسولوں کی تبلیغ کے متعلق سوال کرے گا اور وہ امتیں انبیاء کی تکذیب کریں گی اور اللہ تعالیٰ کے مسلمان بندے انبیاء کی تصدیق کریں گے پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو لایا جائے گا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی تصدیق کریں گے اور اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کی تصدیق کرے گا اور اسی تصدیق کی وجہ سے اللہ کا نام مومن ہے' ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کیے ہوئے وعدہ کو پورا کرتا ہے اور وہ اس اعتبار سے مومن ہے' ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کو عذاب سے امان میں رکھے گا اس وجہ سے وہ مومن ہے' یہ علامہ ابن اثیر کا قول ہے۔

(تاج العروس ج ۹ ص ۱۲۵' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

ایمان کی تعریف میں اہل قبلہ کے مذاہب

ایمان کی تعریف میں اہل قبلہ کے مذاہب کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) جمہور متکلمین کے نزدیک صرف تصدیق بالقلب کا نام ایمان ہے۔

(۲) امام ابومنصور ماتریدی کا مذہب ہے کہ ایمان صرف تصدیق بالقلب کا نام ہے اور اقرار اجراء احکام مسلمین کے لیے شرط ہے۔ یہ دونوں تعریفیں نفس ایمان کی ہیں۔

(۳) امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ایمان کے دو جز ہیں' اقرار اور تصدیق' لیکن اکراہ کے وقت اقرار ساقط ہو سکتا ہے۔

(۴) ائمہ ثلاثہ اور محدثین کے نزدیک ایمان کے تین جز ہیں' تصدیق' اقرار اور اعمال صالحہ' لیکن اعمال کے ترک کرنے سے انسان ایمان سے خارج ہوتا ہے اور نہ کفر میں داخل ہوتا ہے بلکہ فاسق ہو جاتا ہے' یہ تعریف ایمان کامل کی ہے۔

(۵) معتزلہ میں سے واصل بن عطاء' ابوالہذیل اور قاضی عبدالجبار کا یہ نظریہ ہے کہ تصدیق' اقرار اور اعمال کے مجموعہ کا نام ایمان ہے اور اعمال میں واجب اور مستحب داخل ہیں اور عمل کے ترک کرنے سے انسان ایمان سے نکل جاتا ہے لیکن کفر میں داخل نہیں ہوتا' عمل کی نفی سے وہ ایمان سے خارج ہو گیا اور تکذیب نہ کرنے کی وجہ سے وہ کفر میں داخل نہیں ہوا۔

(۶) ابوعلی جبائی معتزلی اور ابوہاشم معتزلی کا یہ مسلک ہے کہ فقط اعمال واجبہ کا نام ایمان ہے' باقی تفصیل حسب سابق ہے۔

(۷) نظام معتزلی کا مذہب ہے: جس کام پر وعید ہے اس کے ترک کرنے کا نام ایمان ہے۔

(۸) خوارج کا مذہب ہے: تصدیق' اقرار اور اعمال کے مجموعہ کا نام ایمان ہے اور انسان معصیت کے ارتکاب سے کافر

ہو جاتا ہے خواہ معصیت صغیرہ ہو یا کبیرہ۔

(۹) کرامیہ کا یہ قول ہے کہ فقط زبان سے اقرار کرنا ایمان ہے۔

(۱۰) غیلان بن مسلم دمشقی اور فضل رقاشی کا یہ نظریہ ہے کہ اقرار بہ شرط معرفت کا نام ایمان ہے۔

(۱۱) جہم بن صفوان کا یہ نظریہ ہے کہ فقط معرفت بالقلب کا نام ایمان ہے۔

(۱۲) مرجئہ کے نزدیک ایمان صرف تصدیق کا نام ہے اور اعمال کی کوئی ضرورت نہیں۔

نفس ایمان اور ایمان کامل کا بیان

علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں:

امام شافعی سے منقول ہے کہ ایمان تصدیق' اقرار اور عمل کا نام ہے' جس کی تصدیق میں خلل ہو وہ منافق ہے' جس کے اقرار میں خلل ہو وہ کافر ہے اور جس کے عمل میں خلل ہو وہ فاسق ہے' وہ دوزخ کے دائمی عذاب سے نجات پالے گا' اور جنت میں داخل ہو جائے گا' امام رازی نے کہا: اس مسلک پر یہ قوی اشکال ہے کہ جب اعمال ایمان کا جز ہیں اور جز کی نفی سے کل کی نفی ہو جاتی ہے تو بے عمل شخص مومن کیسے ہوگا؟ اور وہ کیسے دوزخ سے خارج اور جنت میں داخل ہوگا؟ اس اشکال کا یہ جواب ہے کہ شارع کے کلام میں ایمان کبھی اصل ایمان کے معنی میں ہوتا ہے اور اصل ایمان میں اعمال کا اعتبار نہیں ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر' اس کے فرشتوں پر' اس سے ملاقات پر' اس کے رسولوں پر اور مرنے کے بعد اٹھنے پر ایمان لاؤ' اور اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' اور نماز قائم کرو اور فرض زکوۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔ (صحیح مسلم)

اور کبھی شارع کے کلام میں ایمان' ایمان کامل کے معنی میں ہوتا ہے جس میں اعمال داخل ہوتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد عبدالقیس سے فرمایا:

کیا تم جانتے ہو کہ اللہ وحدہ پر ایمان لانا کیا ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے' آپ نے فرمایا: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں' محمد اللہ کے رسول ہیں' اور نماز قائم کرنا' زکوۃ ادا کرنا' رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت سے خمس ادا کرنا۔ (صحیح مسلم)

پہلی حدیث میں ایمان اصل ایمان یا نفس ایمان کے معنی میں ہے اور اس دوسری حدیث میں ایمان' ایمان کامل کے معنی میں ہے' اور جن احادیث میں اعمال کی نفی سے ایمان کی نفی کی گئی ہے ان میں ایمان سے مراد ایمان کامل ہے اور جن احادیث میں عمل کی نفی کے باوجود ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے اور جنت کی بشارت دی گئی ہے ان میں ایمان سے مراد نفس ایمان ہے' اس کی مثال یہ ہے:

جس وقت زانی زنا کرتا ہے اس وقت وہ مومن نہیں ہوتا۔ (صحیح مسلم)

اس حدیث میں ایمان کامل کی نفی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

جس شخص نے بھی "لا الہ الا اللہ" کہا' پھر اسی پر مر گیا' وہ جنت میں داخل ہو جائے گا' میں نے کہا: خواہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو! آپ نے فرمایا: خواہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو۔ (صحیح مسلم)

اس حدیث میں نفس ایمان مراد ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف لفظی ہے کیونکہ اس کا رجوع ایمان کی تفسیر کی طرف ہے اور ایمان کا کون سا معنی منقول شرعی ہے اور کون سا معنی مجاز ہے اس میں اختلاف ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس ایمان کی وجہ سے دوزخ میں دخول سے نجات ملتی ہے وہ ایمان کامل ہے اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور جس ایمان کی وجہ سے دوزخ کے خلود سے نجات ملتی ہے وہ نفس ایمان ہے اس میں اہل سنت کا اتفاق ہے اور خوارج اور معتزلہ کا اس میں اختلاف ہے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ سلف اور امام شافعی نے جو اعمال کو ایمان کا جز کہا ہے اس ایمان سے ان کی مراد ایمان کامل ہے نہ کہ نفس ایمان یا اصل ایمان مراد ہے اور جب وہ کسی بے عمل یا بدعمل شخص پر مومن کا اطلاق کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد نفس ایمان ہوتی ہے نہ کہ ایمان کامل وہ کہتے ہیں کہ اس شخص میں ہر چند کہ ایمان کامل نہیں ہے لیکن وہ نفس ایمان کی وجہ سے نجات پا جائے گا۔ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۰۳۔ ۱۰۲ ملخصاً مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۸ھ)

مومن ہونے کے لیے فقط جاننا اور سمجھنا کافی نہیں ہے بلکہ ماننا ضروری ہے

علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں:

ایمان کی تعریف میں جو تصدیق بالقلب معتبر ہے اس سے مراد علم معرفت اور جاننا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کی تصدیق کرنا اور آپ کو مخبر صادق ماننا ہے کیونکہ بعض کفار بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو جانتے تھے لیکن وہ مومن نہیں تھے قرآن مجید میں ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ (البقرہ: ۱۴۶) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس نبی کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حکایت کی ہے انہوں نے فرعون سے فرمایا:

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىٕرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ○ (بنی اسرائیل: ۱۰۲) موسیٰ نے فرمایا: یقیناً تو جانتا ہے کہ ان (چمکتی ہوئی نشانیوں) کو آسمانوں اور زمینوں کے رب نے ہی اتارا ہے جو آنکھیں کھولنے والی ہیں اور اے فرعون! میں گمان کرتا ہوں کہ تو ہلاک ہونے والا ہے○

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا کفار اور فرعون کو علم تھا اس کے باوجود وہ کافر تھے اور وہ مومن نہیں تھے نیز اس سے واضح ہوا کہ ایمان کے تحقق کے لیے صرف جاننا کافی نہیں ہے ماننا ضروری ہے یعنی اپنے قصد اور اختیار سے مخبر کی طرف صدق کو منسوب کرے اور اسے اس کی دی ہوئی خبروں میں صادق قرار دے۔

(عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۰۵۔ ۱۰۴ ملخصاً مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۸ھ)

شیخ اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

ایمان سچا سمجھنے کو کہتے ہیں عمل کرنا دوسری بات ہے پس جتنی کتابیں اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء علیہم السلام پر نازل کی ہیں سب کو سچا سمجھنا فرض اور شرط ایمان ہے۔ (بیان القرآن ص ۳ مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور)

جیسا کہ باحوالہ تفصیل اور تحقیق سے واضح ہو گیا ہے ایمان سچا سمجھنے یا سچا جاننے کو نہیں کہتے بلکہ ایمان سچا ماننے کو کہتے ہیں اس لیے ایمان کی یہ تعریف صحیح نہیں ہے شیخ محمود الحسن نے بھی "یومنون بالغیب" کی تفسیر میں اسی طرح لکھا ہے: یعنی جو

چیزیں ان کے عقل وحواس سے مخفی ہیں (جیسے دوزخ' جنت' ملائکہ وغیرہ) ان سب کو اللہ اور رسول کے ارشاد کی وجہ سے حق اور یقینی سمجھتے ہیں۔ (شیخ محمود الحسن متوفی ۱۳۳۹ھ حاشیۃ القرآن ص ۳' مطبوعہ العربیۃ السعودیہ) شیخ محمود الحسن کی بھی یہ عبارت صحیح نہیں ہے' اللہ اور اس کے رسول کے ارشاد کی وجہ سے کسی خبر کو حق اور یقینی ماننا ایمان ہے' اس کو حق اور یقینی سمجھنا ایمان نہیں ہے' کیونکہ بعض کفار ان خبروں کو حق اور یقینی سمجھتے تھے لیکن عناداً مانتے نہیں تھے' البتہ انہوں نے اس کے بعد یہ جملہ لکھا ہے: ان امور غائبانہ کا منکر ہدایت سے محروم ہے۔ یہ جملہ صحیح ہے' لیکن ان دونوں شیوخ نے ایمان کی تعریف صحیح نہیں لکھی۔

ایمان کی حقیقت میں فقط تصدیق کے معتبر ہونے پر قرآن مجید سے استشہاد

ہم نے ذکر کیا تھا کہ محققین کا مذہب یہ ہے کہ ایمان کی حقیقت فقط تصدیق بالقلب ہے' اس پر محققین نے حسب ذیل دلائل پیش کیے ہیں' قرآن مجید میں ہے:

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ. (المجادلہ: ۲۲) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت فرما دیا۔

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ. (المائدہ: ۴۱) انہوں نے اپنے منہ سے کہا: ہم ایمان لائے ہیں' حالانکہ ان کے دل مومن نہیں۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ. (الحجرات: ۱۴) دیہات کے لوگوں نے کہا: ہم ایمان لائے' آپ فرمائیں: تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو: ہم نے اطاعت کی ہے' اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

ان آیات میں ایمان کا محل قلب کو قرار دیا ہے اور قلب میں تصدیق ہوتی ہے' اقرار کا محل زبان اور اعمال کا تعلق باقی اعضاء سے ہوتا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ ایمان صرف تصدیق بالقلب کا نام ہے۔

ایمان کی حقیقت میں فقط اقرار کے غیر معتبر ہونے پر قرآن مجید سے استشہاد

صرف اقرار باللسان کے ایمان نہ ہونے پر قرآن مجید کی یہ آیت دلیل ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۞ (البقرہ: ۸) اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لے آئے' حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں ۞

زبان سے اقرار کے باوجود ان لوگوں کو اس لیے مومن نہیں قرار دیا گیا کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کی تصدیق نہیں کی تھی' نیز قرآن مجید میں ہے:

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۞ (المنافقون: ۱) جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں' اور اللہ جانتا ہے کہ یقیناً ضرور آپ اللہ کے رسول ہیں' اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک منافق ضرور جھوٹے ہیں ۞

ایمان کی حقیقت میں اعمال کے غیر معتبر ہونے پر قرآن مجید سے استشہاد

اعمال ایمان میں داخل نہیں ہیں' اس پر قرآن مجید کی حسب ذیل آیات دلیل ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام

الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۙ (الکہف: ۱۰۷) کے ان کے لیے جنت الفردوس کی مہمانی ہے O

اس آیت میں اعمال کا ایمان پر عطف کیا گیا ہے اور عطف میں اصل تغایر ہے' اس سے معلوم ہوا کہ اعمال ایمان کا غیر ہیں اور ایمان میں داخل نہیں ہیں اور قرآن مجید میں ایسی بہت آیات ہیں:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ (النحل: ۹۷)

جس نے نیک عمل کیے خواہ مرد ہو یا عورت بہ شرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو ضرور پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھیں گے۔

اس آیت میں اعمال کو مشروط اور ایمان کو شرط قرار دیا ہے اور مشروط شرط سے خارج ہوتا ہے' اس سے واضح ہو گیا کہ اعمال ایمان سے خارج ہیں' اور اسی نہج پر یہ آیات ہیں:

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ ۔ (النساء: ۱۲۴)

اور جس نے نیک کام کیے خواہ مرد ہو یا عورت' بہ شرطیکہ وہ مومن ہو تو وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا O (طٰہٰ: ۱۱۲)

اور جس نے نیک کام کیے بہ شرطیکہ وہ مومن ہو تو اس کو ظلم کا خوف ہوگا نہ کسی نقصان کا O

وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ O (الانفال: ۱)

اور اپنے باہمی معاملات درست رکھو' اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو' بہ شرطیکہ تم مومن ہو O

قرآن مجید میں مرتکب کبیرہ پر بھی مومن کا اطلاق کیا گیا ہے' اگر نیک اعمال ایمان کا جز ہوتے تو معصیت کبیرہ کرنے والے پر مومن کا اطلاق نہ کیا جاتا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ؕ (البقرہ: ۱۷۸)

اے ایمان والو! تم پر ان کا بدلہ فرض کیا گیا ہے جن کو ناحق قتل کیا گیا ہے۔

قصاص قاتل پر فرض کیا جاتا ہے اور اس آیت میں قاتل پر مومن کا اطلاق کیا گیا ہے' اور قتل کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ (الحجرات: ۹)

اور اگر ایمان والوں کی دو جماعتیں آپس میں قتال کریں تو ان میں صلح کرا دو۔

جب دو جماعتیں قتال کریں گی تو ان میں سے ایک حق پر اور دوسری باطل پر ہوگی اور اس آیت میں دونوں جماعتوں پر مومنوں کا اطلاق کیا گیا ہے:

وَتُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ (النور: ۳۱)

اے مومنو! تم سب اللہ کی طرف توبہ کرو۔

توبہ معصیت پر واجب ہوتی ہے۔ اس آیت میں مومنین کو توبہ کا حکم دیا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ معصیت ایمان کے منافی نہیں ہے' اور اسی نہج پر یہ آیت ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ (التحریم: ۸)

اے ایمان والو! اللہ کی طرف خالص توبہ کرو۔

ایمان میں کمی اور زیادتی کے ثبوت پر قرآن مجید سے استشہاد

ائمہ ثلاثہ اور محدثین اور دیگر اسلاف جو یہ کہتے ہیں کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں اور ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے وہ

قرآن مجید کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں:

وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا. (الانفال: ۲)

اور جب ان پر اللہ کی آیات پڑھی جائیں تو وہ ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیں۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○ (التوبہ: ۱۲۴)

اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سورت نے تم میں کس کے ایمان کو زیادہ کر دیا ہے؟ سو جو ایمان والے ہیں تو اس سورت نے ان کے ایمان کو زیادہ کر دیا اور وہ خوش ہوتے ہیں○

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ. (آل عمران: ۱۷۳)

لوگوں نے ان سے کہا: بے شک لوگوں نے (تم سے مقابلہ کے لیے بڑے لشکر) جمع کر لیے ہیں سو تم ان سے ڈرو' تو ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ○ۭ (الاحزاب: ۲۲)

اور جب مسلمانوں نے (کافروں کے) لشکر دیکھے (تو) کہنے لگے: یہ وہ ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ فرمایا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا تھا' اور اس سے ان کا ایمان اور اسلام زیادہ ہی ہوا○

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى. (محمد: ۱۷)

اور جن لوگوں نے ہدایت کو قبول کیا اللہ نے ان کی ہدایت کو اور زیادہ کر دیا۔

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ○ۖ (الکہف: ۱۳)

بے شک کچھ جوان اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت کو زیادہ کر دیا○

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ۭ. (الکہف: ۱۳)

اور جن لوگوں نے ہدایت پائی' اللہ ان کی ہدایت کو زیادہ کر دیتا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا. (المدثر: ۳۱)

اور ہم نے (دوزخ کے فرشتوں کی تعداد) صرف اس لیے مقرر کی ہے کہ کافروں کی آزمائش ہو' اہل کتاب یقین کر لیں اور ایمان والوں کا ایمان اور زیادہ ہو جائے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ۭ. (الفتح: ۴)

وہی ذات ہے جس نے ایمان والوں کے دلوں میں سکون نازل فرمایا تا کہ ان کے ایمان میں اور ایمان کی زیادتی ہو۔

ایمان میں کمی اور زیادتی کے ثبوت پر احادیث سے استشہاد

ائمہ ثلاثہ' محدثین اور دیگر اسلاف جن کے نزدیک اعمال ایمان میں داخل ہیں اور ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے' انہوں نے بہ کثرت احادیث سے استدلال کیا ہے' جن میں سے بعض احادیث یہ ہیں:

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان کے ساٹھ اور کچھ حصے ہیں' اور حیاء بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ (کے ضرر) سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں' اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کے منع کیے ہوئے کاموں کو ترک کر دے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے حتیٰ کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز کو قائم کریں اور زکوٰۃ کو ادا کریں' اور جب وہ یہ کریں گے تو مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کر لیں گے ماسوا اس کے جو اسلام کا حق ہو اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اللہ وحدہ پر ایمان لانے کا معنی جانتے ہو؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے' آپ نے فرمایا: یہ شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا اور مالِ غنیمت میں سے خمس ادا کرنا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

ان احادیث میں ایمان کے متعدد اجزاء بیان کیے گئے ہیں اور جو شخص ان اجزاء میں سے کسی جز پر عمل کو ترک کرے گا اس کا ایمان اس شخص سے کم ہوگا' جو ان تمام اجزاء پر عمل کرے گا۔

ایمان میں کمی اور زیادتی کے دلائل کا جواب

مذکور الصدر آیات اور احادیث سے ائمہ ثلاثہ اور محدثین نے اس پر استدلال کیا ہے کہ اعمال ایمان کا جز ہیں اور ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے' اگر اعمال کم ہوں گے تو ایمان زیادہ ہوگا۔

ان تمام آیات اور احادیث کا جواب یہ ہے کہ تمام آیات اور احادیث ایمان کامل پر محمول ہیں اور ایمان کامل میں اعمال داخل ہیں' اور نفس ایمان میں اعمال داخل نہیں ہیں اور ان آیات اور احادیث میں نفس ایمان بالاتفاق مراد نہیں ہے۔

امام رازی نے کہا: یہ بحث لفظی ہے کیونکہ اگر ایمان سے مراد تصدیق ہو تو وہ کمی زیادتی کو قبول نہیں کرتا اور اگر اس سے مراد عبادات ہوں تو وہ کمی اور زیادتی کو قبول کرتا ہے' پھر امام نے کہا: عبادات تصدیق کی تکمیل کرتی ہیں' اور جن دلائل کا یہ تقاضا ہے کہ ایمان کمی اور زیادتی کو قبول نہیں کرتا' ان سے مراد اصل ایمان اور نفس ایمان ہے اور جن دلائل کا یہ تقاضا ہے کہ ایمان کمی اور زیادتی کو قبول کرتا ہے ان سے مراد ایمان کامل ہے' جس میں اعمال داخل ہیں۔

بعض متاخرین نے یہ کہا ہے: حق یہ ہے کہ ایمان کمی اور زیادتی کو قبول کرتا ہے' خواہ ایمان تصدیق اور اعمال کا مجموعہ ہو یا فقط تصدیق کا نام ہو کیونکہ تصدیق بالقلب وہ اعتقاد جازم ہے جو قوت اور ضعف کو قبول کرتا ہے' کیونکہ جس شخص کو ہم قریب سے دیکھتے ہیں اس کی ہمیں اس سے زیادہ تصدیق ہوتی ہے جس کو ہم دور سے دیکھتے ہیں۔

بعض محققین نے یہ کہا کہ حق یہ ہے کہ تصدیق دو وجہوں سے کمی اور زیادتی کو قبول کرتی ہے' پہلی وجہ تو یہ ہے کہ تصدیق کیفیت نفسانیہ ہے' جیسے خوشی' غم اور غصہ وغیرہ کیفیاتِ نفسانیہ ہیں اور ان میں قوت' ضعف اور کمی اور زیادتی ہوتی ہے' اسی طرح تصدیق میں بھی کمی اور زیادتی ہوتی ہے' اور اگر ایسا نہ ہو تو لازم آئے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام افراد امت کا ایمان

برابر ہو اور یہ اجماعاً باطل ہے اور دوسری وجہ ہے تصدیق تفصیلی' کیونکہ انسان کو جس جس چیز کے متعلق علم ہوتا جائے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو لے کر آئے ہیں' اس کا ایمان اس کے ساتھ متعلق ہوتا جائے گا' اور ایمان زیادہ ہوتا جائے گا۔

بعض علماء نے اس تفصیل میں یہ کہا ہے کہ پہلے انسان اجمالی طور پر تمام شریعت پر ایمان لاتا ہے' پھر جیسے جیسے اس کو احکام شرعیہ کی تفصیل کا علم ہوتا جاتا ہے وہ ان سب پر ایمان لاتا جاتا ہے اور یوں اس کا ایمان زیادہ ہوتا ہے اور بعض محققین نے یہ کہا ہے کہ زیادہ غور و فکر کرنے اور کثرت دلائل سے ایمان زیادہ ہوتا ہے' یہی وجہ ہے کہ صدیقین اور علماء راسخین کا ایمان دوسروں کی بہ نسبت زیادہ قوی ہوتا ہے' یہی وجہ ہے کہ تشکیک اور مغالطہ آفرینی سے ان کا ایمان متزلزل نہیں ہوتا۔

(عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۰۹۔۱۰۸ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ 'مصر' ۱۳۴۸ھ)

آیا اسلام اور ایمان متغایر ہیں یا متحد

علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں:

ایک بحث یہ ہے کہ آیا اسلام اور ایمان متغایر ہیں یا متحد ہیں' پس ہم کہتے ہیں کہ لغت میں اسلام کا معنی ہے: انقیاد (اطاعت) اور اذعان (ماننا اور تسلیم کرنا) اور اسلام کا شرعی معنی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مان کر اللہ کی اطاعت کرنا' کلمہ شہادت پڑھنا' واجبات پر عمل کرنا اور ممنوعات کو ترک کرنا کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' نماز قائم کرو' زکوٰۃ مفروضہ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو' اور اسلام کا اطلاق دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بھی کیا جاتا ہے جیسے کہتے ہیں: دین یہودیت' دین نصرانیت' اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۔ (آل عمران: ۱۹) اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ذاق طعم الاسلام من رضی باللہ ربا وبالاسلام دینا۔ جس شخص نے اللہ کو رب مان لیا' اور اسلام کو دین مان لیا' اس نے اسلام کا ذائقہ چکھ لیا۔

پھر اس میں علماء کا اختلاف ہے' محققین کا مذہب یہ ہے کہ ایمان اور اسلام متغائر ہیں اور یہی صحیح ہے' اور بعض محدثین' متکلمین اور جمہور معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ ایمان اور اسلام شرعاً مترادف ہیں' علامہ خطابی نے کہا: ایمان اور اسلام مطلقاً متحد یا متغائر نہیں ہیں' کیونکہ مسلم بعض اوقات مسلم ہوتا ہے' اور بعض اوقات مسلم نہیں ہوتا' (یعنی بعض اوقات اسلام کے احکام کی پیروی کرتا ہے اور بعض اوقات نہیں کرتا) اور مومن ہر وقت مومن ہوتا ہے' (یعنی ہر وقت انقیاد باطن کرتا ہے) لہٰذا ہر مسلم مومن ہوتا ہے' اور ہر مومن مسلم نہیں ہوتا۔

ایمان کی اصل تصدیق ہے اور اسلام کی اصل استسلام اور انقیاد (اطاعت) ہے' بسا اوقات انسان ظاہر میں اطاعت گزار ہوتا ہے اور باطن میں اطاعت گزار نہیں ہوتا' اور کبھی باطن میں صادق ہوتا ہے اور ظاہر میں اطاعت گزار نہیں ہوتا' میں کہتا ہوں کہ اس کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام اور ایمان میں عموم' خصوص مطلق کی نسبت ہے' جیسا کہ بعض فضلاء نے اس کی تصریح کی ہے' اور تحقیق یہ ہے کہ ان میں عموم' خصوص من وجہ کی نسبت ہے' کیونکہ کبھی ایمان بغیر اسلام کے ہوتا ہے' مثلاً کوئی شخص کسی پہاڑ کی چوٹی پر اپنی عقل سے اللہ کی معرفت حاصل کرے اور کسی نبی کی دعوت پہنچنے سے پہلے اللہ کے وجود' اس کی وحدت اور اس کی تمام صفات کی تصدیق کرے' اسی طرح کوئی شخص تمام ضروریات دین پر ایمان لے آئے اور اقرار اور عمل

کرنے سے پہلے اچانک مرجائے تو یہ مومن ہے اور مسلم نہیں ہے' کیونکہ اس نے باطنی اور ظاہری اطاعت نہیں کی اور منافقین ظاہری اطاعت کرتے تھے اور باطنی اطاعت نہیں کرتے تھے تو وہ مسلم تھے مومن نہیں تھے اور صحابہ کرام' تابعین اور بعد کے مسلمان مومن بھی ہیں اور مسلم بھی ہیں' لہٰذا ایمان اور اسلام مفہوماً متغائر اور مصداقاً متحد ہیں۔

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

ایمان اور اسلام واحد ہیں' کیونکہ اسلام خضوع اور انقیاد ہے' یعنی احکام کو قبول کرنا اور ماننا' اور یہ ایمان کی حقیقت ہے اور اس کی تائید قرآن مجید کی ان آیات سے ہوتی ہے:

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (الذاریات: ۳۶-۳۵)

اس بستی میں جو مومنین تھے ہم نے ان سب کو نکال لیا ۝ تو ہم نے اس میں مسلمین کے ایک گھر کے سوا (اور کوئی گھر) نہ پایا ۝

اگر اسلام ایمان کا غیر ہو تو اس آیت میں مومنین سے مسلمین کا استثناء صحیح نہیں ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ شریعت میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ فلاں شخص مومن ہے اور مسلم نہیں ہے یا مسلم ہے اور مومن نہیں ہے' ایمان اور اسلام کے اتحاد سے ہماری یہی مراد ہے (یعنی ان دونوں کا مصداق واحد ہے' خواہ مفہوم متغائر ہو) اور مشائخ کے کلام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایمان اور اسلام کو مصداق کے لحاظ سے واحد اور مفہوم کے لحاظ سے متغائر مانتے ہیں' جیسا کہ کفایہ میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی خبروں' اس کے اوامر اور نواہی کی تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے اور انقیاد اور خضوع (طاعت) کا نام اسلام ہے اور جب تک انسان اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کی تصدیق نہیں کرے گا انقیاد متحقق نہیں ہوگا' اس لیے ایمان اسلام سے مصداق کے لحاظ سے الگ نہیں ہوتا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ قرآن مجید میں ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا . (الحجرات: ۱۴)

دیہاتیوں نے کہا: ہم ایمان لائے' آپ فرمائیں: تم ایمان نہیں لائے' ہاں! یہ کہو کہ ہم اسلام لائے (مطیع ہوئے ہیں)۔

اس آیت میں ایمان کے بغیر اسلام کے تحقق کی تصریح ہے' ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ شریعت میں جو اسلام معتبر ہے وہ ایمان کے بغیر متحقق نہیں ہوتا' اور اس آیت میں اسلام کا شرعی معنی مراد نہیں ہے بلکہ لغوی معنی مراد ہے یعنی تم ظاہری اطاعت کر رہے ہو باطنی اطاعت نہیں کر رہے' جیسے کوئی شخص بغیر تصدیق کے کلمہ شہادت پڑھ لے۔

اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

اسلام یہ ہے کہ تم یہ گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور یہ کہ (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور اگر تم کو استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔

(بخاری' مسلم)

اس حدیث میں دلیل ہے کہ اسلام اعمال کا نام ہے نہ کہ تصدیق قلبی کا' اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں اسلام سے مراد اسلام کے ثمرات اور اس کی علامات ہیں' جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عبدالقیس کے وفد سے فرمایا:

کیا تم جانتے ہو کہ فقط اللہ پر ایمان لانے کا کیا معنی ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے' آپ نے فرمایا: یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت میں سے خمس ادا کرنا۔ (بخاری)

اس حدیث میں بھی ایمان سے مراد ایمان کی علامات اور اس کے ثمرات ہیں۔

غیب کا معنی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

جس چیز کا حواس (خمسہ) سے ادراک نہ کیا جاسکے اور نہ اس کو ابتداءً عقل سے معلوم کیا جاسکے' وہ غیب ہے' اس کا علم صرف انبیاء علیہم السلام کے خبر دینے سے ہوتا ہے۔ (المفردات ص ٣٦٧' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویۃ' ایران' ١٣٤٢ھ)

علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

جو چیز تم سے غائب ہو وہ غیب ہے' ابو اسحاق زجاج نے ''یؤمنون بالغیب'' کی تفسیر میں کہا ہے: جو چیز متقین سے غائب تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس کی خبر دی وہ غیب ہے' جیسے مرنے کے بعد اٹھنا' جنت' دوزخ' اور ہر وہ چیز جو ان سے غائب تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس کی خبر دی وہ غیب ہے۔

(تاج العروس ج ١ ص ٤٢١' مطبوعہ المطبعۃ الخیریۃ' مصر' ١٣٠٦ھ)

آیت مذکورہ میں غیب کا مصداق

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

اس جگہ غیب کے مصداق میں مفسرین کا اختلاف ہے' ایک گروہ نے کہا: اس آیت میں غیب سے مراد اللہ سبحانہ ہے' ابن العربی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے' دوسرے مفسرین نے کہا: اس سے مراد قضاء و قدر ہے' ایک جماعت نے کہا: اس سے مراد قرآن اور قرآن میں مذکور غیوب ہیں' بعض علماء نے کہا: ہر ایسی چیز جس کی طرف عقل کی رسائی نہیں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی ہے وہ غیب ہے مثلاً علامات قیامت' عذاب قبر' حشر' نشر' صراط' میزان اور جنت' دوزخ وغیرہ' ابن عطیہ نے کہا: یہ اقوال متعارض نہیں ہیں' بلکہ ان سب پر غیب کا اطلاق ہوتا ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ١ ص ١٦٣' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ١٣٨٧ھ)

آیت مذکورہ میں مومنین بالغیب کا مصداق

علامہ سمرقندی لکھتے ہیں:

اس سے مراد صحابہ کرام اور ان کے قیامت تک کے متبعین ہیں کیونکہ وہ قرآن کے غیب کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے' اور اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام قرار دیتے ہیں' حارث بن قیس نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا: اے اصحاب محمد! ہم آپ کو اس لیے افضل سمجھتے ہیں کہ آپ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کیا ہے' حضرت ابن مسعود نے فرمایا: ہم تم کو اس لیے افضل سمجھتے ہیں کہ تم آپ پر بن دیکھے ایمان لائے ہو اور افضل ایمان' ایمان بالغیب ہے' پھر حضرت عبداللہ نے یہ آیت پڑھی: ''الذین یؤمنون بالغیب''۔

(تفسیر سمرقندی ج ١ ص ٩٠' مطبوعہ مکتبہ دار الباز' مکہ مکرمہ' ١٤١٣ھ)

امام احمد بن حنبل روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے مجھ کو دیکھا اس کے لیے ایک سعادت ہے' اور جس نے مجھے نہیں دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا' اس کے لیے سات سعادتیں ہیں۔

(مسند احمد ج ۵ ص ۲۶۴' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے وہ لوگ ہیں جو میرے بعد ہوں گے' ان میں سے ایک شخص کی یہ خواہش ہوگی کہ کاش وہ اپنے (سارے) اہل اور مال کے بدلہ میں میری زیارت کر لے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۷۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

آیا مخلوق کے علم پر علم غیب کا اطلاق جائز ہے یا نہیں؟

اس آیت میں متقین کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں یعنی جنت دوزخ وغیرہ کی تصدیق کرتے ہیں اور تصدیق علم کی قسم ہے' اس کا معنی ہے: وہ غیب کا علم رکھتے ہیں' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے متقین کے علم پر علم غیب کا اطلاق فرمایا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ اس غیب سے مراد الغیب المطلق (جمیع معلومات الٰہیہ) نہیں ہے بلکہ غیب کے وہ افراد مراد ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے متقین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے خبر دی ہے۔ ہمارا مدعا صرف اتنا ہے کہ مخلوق کی طرف علم غیب کا اسناد عقلاً جائز ہے شرک نہیں ہے بہ شرطیکہ اس سے مراد مخصوص غیب ہو' "الغیب المطلق" (تمام معلومات کا علم) نہ ہو۔

علامہ زمخشری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

غیب سے مراد وہ مخفی چیز ہے جس کا ابتداءً صرف اللہ تعالیٰ کو علم ہوتا ہے اور ہم کو اس میں سے صرف ان ہی چیزوں کا علم ہوتا ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم دیا ہے یا جن کے علم پر دلیل قائم ہے' اس لیے مطلقاً یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ فلاں شخص کو غیب کا علم ہے اور یہاں غیب سے مراد صانع اور اس کی صفات' امور نبوت' حشر ونشر اور حساب وغیرہ ہیں۔

(کشاف ج ۱ ص ۱۷' مطبوعہ مطبعہ بہیہ' مصر' ۱۳۴۳ھ)

امام رازی لکھتے ہیں:

رہا وہ غیب جس کے حصول پر دلیل قائم ہے تو یہ کہنا ناجائز نہیں کہ ہمیں اس غیب کا علم ہے جس کے حصول پر ہمارے لیے دلیل قائم ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۶۹' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

متعدد مفسرین نے "وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا" (الکہف: ۶۵) کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت خضر کو غیب کا علم تھا۔

علامہ سیوطی شافعی لکھتے ہیں:

حضرت خضر ایک مرد تھے جو علم الغیب جانتے تھے۔ (الدر المنثور ج ۴ ص ۲۳۱' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر کو علم الغیب سے علم عطا فرمایا تھا۔

(زاد المسیر ج ۵ ص ۱۶۹' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

ہم نے ان کو اپنا علم لدنی سکھایا' یعنی علم الغیب۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۱۱ ص ۱۶' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ھ)

علامہ ابوسعود حنفی نے اس علم کے متعلق لکھا ہے۔
یہ غیوب کا علم ہے۔ (تفسیر ابوسعود علی حامش الکبیر ج ۶ ص ۵۲۶ 'مطبوعہ دارالفکر بیروت '۱۳۹۸ھ)
علامہ آلوسی حنفی نے بھی لکھا ہے: یہ غیوب کا علم ہے۔ (روح المعانی ج ۱۵ ص ۳۲۰ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)
ان کے علاوہ علامہ ابن جریر طبری' علامہ ابوحیان اندلسی' علامہ شوکانی ظاہری' علامہ اسماعیل حقی حنفی' علامہ بیضاوی شافعی اور نواب صدیق حسن خاں بھوپالی ظاہری نے بھی اس آیت کی تفسیر میں اسی طرح لکھا ہے۔
ان کے علاوہ بعض دیگر مستند علماء نے مخلوق کی طرف علم غیب کی اضافت کو جائز لکھا ہے۔
علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:
فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کسی شخص نے قرآن مجید کو سازوں کے ساتھ پڑھا' یا اس سے پوچھا گیا: تم غیب جانتے ہو؟ اور اس نے کہا: ہاں! تو یہ کفر ہے اور جو شخص سفر کے لیے نکلا' اور کوا بول پڑا اور وہ لوٹ آیا تو اس کے کفر میں اختلاف ہے' میں کہتا ہوں کہ صحیح یہ ہے کہ ان تینوں مسئلوں میں کفر نہیں ہے۔ (روضۃ الطالبین ج ۷ ص ۲۸۶ 'مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت '۱۴۰۵ھ)
علامہ ابن حجر مکی شافعی لکھتے ہیں:
اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں جو کہتا ہوں کہ مومن کو غیب کا علم ہے' اس سے میری مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اولیا کو بعض غیوب کا علم عطا فرماتا ہے تو اس کا یہ قول مقبول ہوگا کیونکہ یہ عقلاً جائز ہے اور نقلاً واقع ہے' یہ ان جملہ کرامات سے ہے جو شمار سے باہر ہیں۔ بعض اولیاء کو خطاب (الہام) کے ذریعہ غیب کا علم ہوتا ہے' بعض کو کشف حجاب کے ذریعہ غیب کا علم ہوتا ہے' اور بعض اولیاء اللہ کے لیے لوح محفوظ کو منکشف کر دیا جاتا ہے اور وہ اس کو دیکھ لیتے ہیں' اور اس پر دلیل کے لیے یہ کافی ہے کہ حضرت خضر بعض کے نزدیک ولی تھے (اگرچہ تحقیق یہ ہے کہ وہ نبی تھے) اور قرآن مجید نے ان کے علم غیب کو بیان کیا ہے' اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کے حمل کے متعلق خبر دی کہ ان کے ہاں لڑکا ہوگا' اور اسی طرح ہوا' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر عجم میں ساریہ اور اس کا لشکر منکشف ہو گیا' اور انہوں نے جمعہ کے دن دوران خطبہ کہا: اے ساریہ! پہاڑ کی اوٹ میں ہو جا" "رسالہ قشیری" اور "عوارف المعارف" میں بعض اولیاء کے غیب کی خبر دینے کے بہت واقعات ہیں۔
(فتاوی حدیثیہ ص ۲۶۷ 'مطبوعہ مطبعہ مصطفی البابی واولادہ مصر '۱۳۵۶ھ)

ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں:
شیخ اکبر ابوعبداللہ نے اپنی کتاب "معتقد" میں لکھا ہے: ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ بندہ اپنے احوال میں ترقی کرتا ہوا مقام روحانیت سے واصل ہو جاتا ہے' پھر اس کو غیب کا علم ہوتا ہے۔ (مرقات ج ۱ ص ۶۲ 'مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان '۱۳۹۰ھ)
علامہ شامی لکھتے ہیں:
جس شخص نے ایک معاملہ میں یا چند معاملات میں علم غیب کا دعویٰ کیا اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی' علامہ نووی نے "روضۃ الطالبین" میں جو تکفیر کی نفی کی ہے اس کا یہی محمل ہے اور جس نے تمام معاملات میں علم کا دعویٰ کیا اس کی تکفیر کی جائے گی اور جن فقہاء نے علم غیب کے مدعی کی تکفیر کی ہے اس کا یہی محمل ہے۔ (رسائل ابن عابدین ج ۲ ص ۳۱۱ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور '۱۳۹۶ھ)
نیز علامہ شامی لکھتے ہیں:
علامہ ابن حجر مکی نے کہا ہے کہ قرآن مجید کی جن آیتوں میں اللہ کے غیر سے علم غیب کی نفی کی گئی ہے وہ اس کے منافی نہیں ہیں' کیونکہ انبیاء اور اولیاء کا علم اللہ تعالیٰ کے اعلام (خبر دینے) سے ہے' اور ہمارا علم ان کے اعلام سے ہے' اور یہ اللہ تعالیٰ کے

اس علم کا غیر ہے جس کے ساتھ وہ منفرد ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم اس کی صفات قدیمہ ازلیہ دائمہ ابدیہ میں سے ایک صفت ہے جو علامات حدوث' تغیر اور نقص سے منزہ ہے بلکہ وہ علم واحد ہے جس سے اس کو تمام کلیات اور جزئیات اور ''ما کان وما یکون'' کا علم ہے (صفت واحدہ امور غیر متناہیہ کے لیے منشاء انکشاف ہے) اور مخلوق کا علم اس طرح نہیں ہے' اور جب یہ معلوم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے جس علم کے ساتھ اپنی مدح کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس کے علم میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور اس کے سوا کوئی غیب کو نہیں جانتا وہ یہی علم ہے اور اللہ کے علاوہ اگر کسی کو غیب کا علم ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کے اعلام اور اس کی اطلاع سے چند جزئیات کا علم ہے' اور اس وقت مطلقاً یہ نہیں کہا جائے گا کہ ان کو غیب کا علم ہے' کیونکہ ان کے پاس ایسی کوئی صفت نہیں ہے جس کے ساتھ وہ مستقلاً علم غیب کو حاصل کرنے پر قادر ہوں' نیز ان کو از خود علم نہیں ہوتا' ان کو علم دیا جاتا ہے' اور وہ غیب مطلق کو نہیں جانتے اور ان کو جس چیز کا علم دیا جاتا ہے' اس میں فرشتے اور دوسرے بھی ان کے شریک ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا انبیاء اور اولیا کو بعض غیوب کی خبر دینا کسی وجہ سے محال کو مستلزم نہیں ہے' اس لیے اس کا انکار کرنا عناد کے سوا کچھ نہیں۔

(رسائل ابن عابدین ج ۲ ص ۲۱۳' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۳۹۶ھ)

اور علامہ شامی لکھتے ہیں:

حاصل بحث یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ''الغیب المطلق'' کے علم کے ساتھ منفرد ہے جو تمام معلومات کے ساتھ متعلق ہے' اور وہ اپنے رسولوں کو ان بعض غیوب پر مطلع فرماتا ہے جو ان کی رسالت کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں' ان کو یہ اطلاع وحی صریح کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے جو واضح اور جلی ہوتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہوتا' اور یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ وہ اپنے بعض اولیاء کو بھی بعض غیوب سے مطلع فرمائے اور یہ اطلاع انبیاء علیہم السلام کی اطلاع سے کم مرتبہ کی ہوتی ہے' بہرحال اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو غیب مختص ہے وہ الغیب المطلق ہے اور بندہ جس غیب کا مدعی ہوتا ہے وہ غیب حقیقی نہیں ہوتا' کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اعلام اور اس کی اطلاع سے ہوتا ہے۔ (رسائل ابن عابدین ج ۲ ص ۲۱۳' سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۳۹۶ھ)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

علم جب کہ مطلق بولا جائے خصوصاً جب کہ غیب کی طرف مضاف ہو تو اس سے مراد علم ذاتی ہوتا ہے' اس کی تشریح ''حاشیہ کشاف'' پر میر سید شریف رحمۃ اللہ علیہ نے کردی ہے اور یہ یقیناً حق ہے' کوئی شخص کسی مخلوق کے لیے ایک ذرہ کا بھی علم ذاتی مانے یقیناً کافر ہے۔ (الملفوظ ج ۳ ص ۴۷-۴۶' مطبوعہ نوری کتب خانہ' لاہور)

علامہ میر سید شریف نے ''حاشیہ کشاف'' پر لکھا ہے:

غیر اللہ کی طرف مطلقاً علم غیب کی نسبت کرنا اس لیے جائز نہیں کہ اس سے متبادر ہوتا ہے کہ وہ شخص ابتداءً اور از خود علم غیب رکھتا ہے' لیکن جب مقید کر کے یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو علم غیب دیا ہے' یا اللہ تعالیٰ نے اس کو غیب پر مطلع کیا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ (حاشیہ کشاف بر کشاف ج ۱ ص ۱۲۸' مطبوعہ مصر)

نیز امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

علم غیب میں عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب عطا فرمایا (الی قولہ) برابری تو درکنار میں نے اپنی کتابوں میں تصریح کردی ہے کہ اگر تمام اولین وآخرین کا علم جمع کیا جائے تو اس علم کو علم الٰہی سے وہ نسبت ہرگز نہیں ہو سکتی جو ایک قطرہ کے کروڑویں حصہ کو کروڑ سمندر سے ہے کہ یہ نسبت متناہی کی متناہی کے ساتھ ہے اور وہ (علم الٰہی) غیر متناہی ہے' غیر متناہی کو متناہی سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ (الملفوظ ج ۱ ص ۴۶' مطبوعہ نوری کتب خانہ' لاہور)

قرآن مجید میں ہے:

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ. (الجن: ۲۶)

وہ عالم الغیب ہے تو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا ۝ مگر جن کو اس نے پسند فرمالیا ہے جو اس کے (سب) رسول ہیں۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف اپنے رسولوں کو غیب پر مطلع فرماتا ہے' اور اولیاء کو غیب پر مطلع نہیں فرماتا اور یہ کرامات اولیاء کے خلاف ہے' علامہ تفتازانی اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ''الغیب'' سے مراد عموم نہیں ہے (''الغیب المطلق'' مراد نہیں ہے) بلکہ ''مطلق الغیب'' مراد ہے (یعنی غیر رسول سے ہر غیب کی نفی مراد نہیں ہے) یا غیب سے مراد غیب خاص ہے اور وہ وقت وقوع قیامت ہے' جیسا کہ سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے' اور یہ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض رسل ملائکہ یا رسل بشر کو وقت وقوع قیامت پر مطلع فرمائے (گویا کہ اولیاء کرام کو وقت وقوع قیامت پر مطلع نہیں فرماتا اور باقی غیوب میں سے جس قدر چاہے مطلع فرماتا ہے) اور اگر اس استثناء کو منقطع قرار دیا جائے تو پھر کوئی اشکال نہیں ہے' کیونکہ جب اسم جنس مضاف ہو تو وہ بہ منزلہ معرف باللام ہوتا ہے' یا یہ کلام سلب عموم کے لیے ہے' یعنی اللہ تعالیٰ اپنے ہر غیب پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا اور یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض کو بعض غیوب پر مطلع فرمائے' اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ بہ طریقہ وحی صرف رسولوں کو غیب پر مطلع فرماتا ہے تب بھی کوئی اشکال نہیں (کیونکہ اولیاء کو بہ طریقہ الہام غیب پر مطلع فرماتا ہے)۔ خلاصہ یہ ہے کہ مخالفین کا استدلال اس پر قائم ہے کہ یہ کلام عموم السلب کے لیے ہو یعنی اللہ تعالیٰ اپنے غیب میں سے کسی چیز کو کسی فرد پر ظاہر نہیں فرماتا اور یہ لازم نہیں ہے۔

(شرح مقاصد ج ۵ ص ۷۷۔۷۶' مطبوعہ منشورات الشریف' ایران' ۱۴۰۹ھ)

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

حق کی آنکھ سے کل کا مشاہدہ کرنا غیب ہے' کبھی قرب نوافل کی وجہ سے بندہ پر کرم ہوتا ہے اور حق سبحانہ اس کی آنکھ ہو جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے کان ہو جاتا ہے جس سے سنتا ہے اور قرب فرائض کے بعد وہ اور ترقی کرتا ہے' پھر وہاں ایسا نور ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے غیب شہود ہو جاتا ہے اور جو چیزیں ہمارے سامنے سے غائب ہوں وہ اس کے سامنے حاضر ہو جاتی ہیں' اس کے باوجود جو شخص اس مقام پر واصل ہو' ہمیں اس کے حق میں کہنا جائز نہیں قرار دیتا کہ اس کو غیب کا علم ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ. (النمل: ۶۵)

فرما دیجئے اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی بھی (بہ ذات خود) غیب کو نہیں جانتا۔

(روح المعانی ج ۱ ص ۱۱۴' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

نیز علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

حق یہ ہے کہ جس علم کی اللہ تعالیٰ کے غیر سے نفی ہے یہ وہ علم ہے جو بہ ذاتہٖ ہو اور بلا واسطہ ہو اور جو علم خواص کو حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ عزوجل کے افاضہ کرنے کی وجہ سے ہے' اس لیے یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ انہوں نے بہ ذاتہٖ اور بلا واسطہ غیب کو جان لیا' بلکہ یہ کفر ہے' اس لیے یہ کہا جائے گا کہ ان پر غیب ظاہر کیا گیا ہے یا وہ غیب پر مطلع کیے گئے' ہر چند کہ عقلاً یہ کہنا جائز ہے کہ

انہیں غیب کا علم دیا گیا سو انہیں غیب کا علم ہے یا وہ غیب جانتے ہیں لیکن اس کا استعمال شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ اس میں قرآن مجید کی ظاہر آیات سے تصادم اور تعارض ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ" اور اس میں سوء ادب بھی ہے۔

(روح المعانی ج ۱۱ ص ۲۰ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

خلاصہ بحث

اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو علی حسب المراتب غیب کی خبروں پر مطلع فرمایا ہے لیکن غیب مطلق (یعنی تمام معلومات کا احاطہ کاملہ) یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اسی کو غیب مطلق کا علم ہے' اور غیب کی جن خبروں پر اللہ نے اپنے خواص کو مطلع فرمایا ہے' ان کے اعتبار سے ان بندوں کو غیب کا علم ہے' لیکن اس کو علم الغیب کہنا درست نہیں ہے کیونکہ ان کو ایسی صفت حاصل نہیں ہے جس سے ان پر ہر غیب منکشف ہو' یہ علامہ شامی کی بیان کردہ توجیہ ہے' اور علامہ آلوسی کی توجیہ یہ ہے کہ اگرچہ ان کو بعض غیوبات پر مطلع کیا گیا لیکن ظاہر آیات سے تعارض کی بناء پر یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ان کو غیب کا علم ہے' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کو غیب پر مطلع کیا گیا ہے یا ان پر غیب ظاہر کیا گیا ہے' اور امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ کی تحقیق ہے کہ مطلقاً علم غیب بولا جائے تو اس سے علم ذاتی مراد ہوتا ہے' اس لیے یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ فلاں شخص کو علم غیب ہے' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض غیوب کو ظاہر فرمایا' آپ کو بعض غیوب پر مطلع کیا گیا یا آپ کو غیب کی خبریں دی گئیں' اور جن علماء اور فقہاء کی عبارات میں مخلوق کی طرف علم غیب کا اسناد کیا گیا ہے' وہاں چونکہ غیب سے مراد غیب مطلق نہیں ہے اس لیے وہ عبارات عقلاً جائز ہیں اور کفر و شرک نہیں ہیں لیکن ایسا کہنا شرعاً مستحسن نہیں ہے۔

جس غیب کی خبر دے دی جائے آیا وہ غیب رہا یا نہیں؟

ایک عام سوال یہ کیا جاتا ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کو غیب کی خبر دے دی گئی تو پھر وہ غیب نہ رہا' اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ غیب ایک امر اضافی ہے سو جن لوگوں کو اس کی خبر نہیں دی گئی ان کے اعتبار سے وہ غیب ہے' جیسے اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز غائب نہیں' سو اللہ تعالیٰ کا عالم الغیب ہونا بھی اضافی ہے یعنی جو چیز ہمارے اعتبار سے غیب ہے وہ اس کا عالم ہے' لیکن یہ سوال و جواب غیب کے لغوی معنی کے اعتبار سے ہیں' غیب کے اصطلاحی معنی کے اعتبار سے یہ سوال وارد نہیں ہوتا' کیونکہ غیب کا اصطلاحی معنی ہے' جو چیز حواس خمسہ (عادیہ) اور بداہت عقل سے معلوم نہ ہو سکے' اور جس غیب کی خبر دے دی جائے وہ پھر بھی غیب ہے کیونکہ اس کو حواس خمسہ اور بداہت عقل سے معلوم نہیں کیا جا سکتا' مثلاً ہم کو جنت' دوزخ اور قیامت کی خبر دے دی گئی لیکن یہ چیزیں پھر بھی غیب ہیں کیونکہ ہم ان کو حواس خمسہ سے معلوم نہیں کر سکتے نہ بداہت عقل سے جان سکتے ہیں' اگر یہ سوال کیا جائے کہ صاحب قوت قدسیہ تو ان مغیبات کا مشاہدہ کر لیتا ہے' اس کے لیے یہ چیزیں غیب نہ رہیں' اس کا جواب یہ ہے کہ یہ چیزیں اس کے لیے بھی غیب ہیں' کیونکہ وہ بھی اپنے حواس خمسہ عادیہ سے ان چیزوں کو نہیں جان سکتا' اس نے ان کو غیر معمولی اور غیر عادی قوتوں سے جانا ہے' اور اللہ تعالیٰ کو عالم الغیب اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ جو چیز انسان کے حواس خمسہ (عادیہ) اور اس کی بداہت عقل سے معلوم نہ کی جا سکے' وہ اس کا عالم ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ حواس خمسہ اور عقل سے پاک اور منزہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور نماز قائم رکھتے ہیں۔ (البقرہ: ۳)

ایمان بالغیب کے بعد اس آیت میں متقین کی دوسری صفت بیان کی ہے کہ وہ نماز کو قائم رکھتے ہیں۔

صلوٰۃ کا لغوی معنی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

صلوٰۃ' عبادات مخصوصہ (نماز) کا نام ہے' اس کی اصل دعا ہے اور چونکہ اس عبادت کا ایک جز دعا ہے' اس لیے کل کو جز کا نام دے دیا گیا' کوئی شریعت صلوٰۃ سے خالی نہیں رہی' اگرچہ اس کی ہیئت مختلف شریعتوں میں مختلف تھی' عبادت کی جگہ کو بھی صلوٰۃ کہتے ہیں' اس لیے کلیسا پر بھی صلوٰۃ کا اطلاق کیا جاتا ہے' قرآن مجید میں ہے:

لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ. (الحج: ۴۰) — تو ضرور گرادی جاتیں راہبوں کی خانقاہیں' گرجے' کلیسے اور مسجدیں۔

(المفردات ص ۲۸۶ـ۲۸۵' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

اقامت صلوٰۃ کے معانی اور محامل

قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ جب کسی چیز کو اس کے تمام حقوق وفرائض اور اس کے تمام ظاہری اور باطنی آداب کے ساتھ ادا کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس کو اقامت کے ساتھ تعبیر فرماتا ہے' قرآن مجید میں ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ. (المائدہ: ۶۶) — اور اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم رکھتے اور اس (کلام) کو (قائم رکھتے) جو ان کے رب کی طرف سے ان کے لیے نازل کیا گیا ہے تو وہ ضرور اپنے اوپر سے کھاتے اور اپنے پاؤں تلے سے (کھاتے)۔

اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ. (الشوریٰ: ۱۳) — اسی دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ. (البقرہ: ۲۲۹) — اگر تم کو یہ خوف ہو کہ وہ دونوں (میاں' بیوی) اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو عورت کے بدل خلع میں ان پر کوئی حرج نہیں ہے۔

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝ (الرحمان: ۹) — اور انصاف کے ساتھ وزن کو قائم رکھو اور تولنے میں کمی نہ کرو ۝

اس اعتبار سے اقامت صلوٰۃ کا معنی یہ ہے کہ نماز کی تمام شرائط پوری کی جائیں' اس کے تمام فرائض' واجبات' سنن اور مستحبات کے ساتھ نماز کی تمام ظاہری حدود پوری کی جائیں' اور نماز میں ادھر ادھر کی سوچ و بچار نہ ہو' اور نماز کے دوران دنیاوی منصوبوں اور دنیاوی خیالات میں منہمک اور مستغرق نہ ہو' وہ صرف یہ سوچے کہ وہ اللہ کے دربار میں کھڑا ہے اور اس سے مناجات کررہا ہے' فقط اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور دوران نماز اس کا ڈر اور خوف دامن گیر رہے' یہ نماز کی باطنی حدود ہیں اور اسی کا نام خشوع ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ (المومنون: ۲) — وہ لوگ جو اپنی نمازیں خشوع سے پڑھتے ہیں ۝

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

ثم قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم — پھر حضرت عثمان بن عفان کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

من توضأ نحو وضوئی هذا ثم صلی رکعتین لا یحدث فیهما نفسه غفر له ما تقدم من ذنبه.
(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۸ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

نے فرمایا: جس نے میرے اس طریقہ سے وضو کیا پھر اس طرح دو رکعت نماز پڑھی کہ اس میں اپنے دنیاوی کاموں کے منصوبے بنائے اور نہ ان میں سوچ بچار کی تو اس کے پچھلے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

عن انس قال قال النبی صلی الله علیه وسلم ان احدکم اذا صلی یناجی ربه الحدیث..
(صحیح بخاری ج ۱ ص ۷۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو وہ اپنے رب سے چپکے چپکے ہمکلام ہوتا ہے۔

نیز "اقام العود" کا معنی ہے: گیلی لکڑی کی کجی کو آگ کی گرمی پہنچا کر سیدھا کرنا' اس لحاظ سے "اقامت صلوۃ" کا معنی ہے: ہر قسم کی کمی اور کجی سے افعال نماز کی حفاظت کرنا' قرآن مجید میں ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ○ (المومنون: ۹)

اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں ○

"اقام" کا معنی کسی چیز کو دائما کرنا بھی ہے' اس لحاظ سے "اقامت صلوۃ" کا معنی ہے: نماز کو پابندی کے ساتھ ہمیشہ پڑھنا' قرآن مجید میں ہے:

الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ○
(المعارج: ۲۳)

وہ لوگ جو نمازوں کو پابندی سے ہمیشہ پڑھتے ہیں ○

"اقام الامر" کا معنی کسی چیز کو شوق کی فراوانی' پوری توجہ اور دلچسپی سے کرنا بھی ہے' اس لحاظ سے "اقامت صلوۃ" کا معنی ہے: نماز کو اس کے وقت پر پوری توجہ' شوق اور انہماک سے پڑھنا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سستی اور غفلت کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کی مذمت فرمائی ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ○ (الماعون: ۵۔۴)

خرابی ہے ان نمازیوں کے لیے ○ جو اپنی نماز سے غافل ہیں ○

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ (النساء: ۱۴۲)

اور جب منافق نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں (محض) لوگوں کو دکھانے کے لیے اور صرف تھوڑا سا اللہ کا ذکر کرتے ہیں ○

خلاصہ یہ ہے کہ نماز قائم کرنے کا معنی ہے: نماز کو اس کے ظاہری اور باطنی آداب کے ساتھ پڑھنا' ہر قسم کی کمی اور کجی سے نماز کی حفاظت کرنا' نماز کو پابندی اور دوام کے ساتھ پڑھنا اور نماز کو اپنے وقت پر شوق اور توجہ سے پڑھنا۔

بہ تدریج نمازوں کی فرضیت کی کیفیت کا بیان

علامہ حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

بعثت سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی مخصوص نبی کی شریعت پر عمل نہیں کرتے تھے' بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یا کسی اور نبی کی شریعت میں سے جو چیز آپ کے کشف (یا اجتہاد) کے مطابق ہوتی تھی' آپ اس پر عمل کرتے تھے اور حدیث صحیح میں ہے کہ آپ غار حرا میں عبادت کرتے تھے۔ (بخاری) (الدر المختار علی رد المحتار ج ۱ ص ۲۳۹ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ)

علامہ شامی لکھتے ہیں:

غار حرا میں آپ کی عبادت کئی انواع پر مشتمل تھی' لوگوں سے تخلیہ' اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور غور وفکر' اور بعض علماء نے کہا کہ غار حراء میں آپ کی عبادت صرف تفکر تھی۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۲۳۹' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ سہیلی لکھتے ہیں کہ امام ابونعیم نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے:

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی تو حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور وضو کی تعلیم دی' حضرت جبریل وضو کرتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو وضو کرتے ہوئے دیکھتے رہے' پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح وضو کیا' پھر جبریل علیہ السلام نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اقتداء میں نماز پڑھی۔ (الروض الانف ج ۱ ص ۱۶۳' مطبوعہ مکتبہ فاروقیہ' ملتان)

اس طرح پہلی وحی کے ساتھ نماز کی ابتداء ہوگئی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ شب معراج سے پہلے صرف رات کی ایک نماز فرض تھی اور اس میں وقت کی کوئی تحدید نہیں تھی' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ (المزمل: ۴۔۱)

اے چادر لپیٹنے والے! ۝ رات کو نماز میں قیام کریں مگر تھوڑی رات ۝ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کردیں ۝ یا اس پر کچھ بڑھا دیں اور (حسب عادت) ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھیں ۝

علامہ حربی نے کہا ہے کہ پہلے دو نمازیں فرض تھیں' دو رکعت صبح (طلوع آفتاب سے پہلے) کی نماز فرض تھی اور دو رکعت شام (غروب آفتاب سے پہلے) کی نماز فرض تھی' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝ (آل عمران: ۴۱) صبح اور شام کو اللہ کی تسبیح کیجئے ۝

اور امام شافعی نے بعض اہل علم سے نقل کیا ہے کہ پہلے پوری رات کی نماز فرض تھی' پھر حسب ذیل آیت سے پوری رات کا قیام منسوخ ہوگیا اور رات کے بعض حصہ کا قیام فرض ہوگیا:

عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ (المزمل: ۲۰)

اللہ کو علم ہے (اے مسلمانو!) تم پوری رات کا ہرگز احاطہ نہ کرسکو گے تو وہ رحمت سے تم پر متوجہ ہوا' سو اس میں سے جتنا آسان ہو' پڑھ لیا کرو۔

اور جب شب اسراء کو پانچ نمازیں فرض ہوئیں تو رات کے حصہ کے قیام کی فرضیت منسوخ ہوگئی۔

(فتح الباری ج ۱ ص ۴۶۵' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

علامہ سہیلی لکھتے ہیں:

معراج ہجرت سے ڈیڑھ سال پہلے ہوئی' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ پہلے نماز دو دو رکعت فرض ہوئی تھی' پھر سفر میں یہ تعداد برقرار رہی اور حضر میں رکعات کی تعداد بڑھا دی گئی' ہجرت کے ایک سال بعد یہ تعداد بڑھائی گئی تھی۔

(الروض الانف ج ۱ ص ۱۶۳۔۱۶۲' مطبوعہ مکتبہ فاروقیہ' ملتان)

عبادات میں نماز کی جامعیت

نماز اسلام کی تمام عبادات کی جامع ہے' نماز میں توحید و رسالت کی گواہی ہے' راہ خدا میں مال خرچ کرنا ہے' قبلہ کی طرف منہ کرنا ہے' دوران نماز کھانے پینے کو ترک کرنا اور نفسانی خواہشوں سے باز رہنا ہے اور ان امور میں زکوٰۃ' حج اور روزہ

کی طرف اشارہ ہے' قرآن کریم کی تلاوت ہے' اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح اور اس کی تعظیم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام اور آپ کی تکریم ہے' آخر میں سلام کے ذریعہ مسلمانوں کی خیر خواہی ہے' اپنے اور دوسرے مسلمانوں کے لیے دعا ہے' اخلاص ہے' خوف خدا ہے' تمام برے کاموں سے بچنا ہے' شیطان سے' نفس کی خواہشوں سے اور اپنے بدن سے جہاد ہے' اعتکاف ہے' اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان ہے' اپنے گناہوں کا اعتراف اور استغفار ہے' اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے' مراقبہ ہے' مجاہدہ ہے' مشاہدہ ہے اور مومن کی معراج ہے۔

قرآن کریم میں نوے سے زیادہ مرتبہ نماز کا ذکر کیا گیا ہے' اسلام میں سب سے پہلی عبادت نماز ہے' یہ صرف نماز کی خصوصیت ہے کہ وہ امیر و غریب' بوڑھے اور جوان' مرد اور عورت' صحت مند اور بیمار ہر ایک پر یکساں فرض ہے' یہی وہ عبادت ہے جو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتی' اگر کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھو' اگر بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتے تو لیٹ کر پڑھو' اگر قیام نہیں کر سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو' حالت جنگ یا سفر میں اگر سواری سے اتر نہیں سکتے تو سواری پر پڑھو' بہر حال نماز کسی حال میں مسلمان سے ساقط نہیں ہوتی۔

قرآن مجید اور احادیث میں نماز پڑھنے کی تاکید

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (الروم: ۳۱)

اور نماز قائم رکھو اور تم مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ ۝

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ (المدثر: ۴۲۔۴۳)

(جنتی مجرموں سے سوال کریں گے:) تم کو کس چیز نے دوزخ میں داخل کر دیا؟ ۝ وہ کہیں گے: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے ۝

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی شخص اور اس کے کفر اور شرک کے درمیان (فرق) نماز کو ترک کرنا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۶۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ ھ)

یعنی نماز کو ترک کرنا کافروں اور مشرکوں کا کام ہے۔

امام نسائی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ سے قیامت کے دن سب سے پہلے جس چیز کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے' اگر وہ مکمل ہوئی تو مکمل لکھی جائے گی اور اگر اس میں کچھ کمی ہوئی تو کہا جائے گا: دیکھو کیا اس کی کچھ نفلی نمازیں ہیں جن سے اس کے فرض کی کمی کو پورا کر دیا جائے' پھر باقی اعمال کا اسی طرح حساب لیا جائے گا۔

(سنن نسائی ج ۱ ص ۸۲ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۳۲۸ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ ھ)

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس دین میں نماز نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۲۱۸ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ ھ)

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات سال کی عمر میں اپنے بچوں کو نماز پڑھنے کا حکم دو اور دس سال کی عمر میں ان کو مار مار کر ان سے نماز پڑھواؤ اور ان کے بستر الگ الگ کر دو۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۷۱ مطبوعہ مطبع مجتبائی 'پاکستان' لاہور '۱۴۰۵ھ)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۱۸۷ '۱۸۰ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جس مرض میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس میں آپ بار بار فرماتے تھے: نماز اور غلام۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۱۷ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام محمد بن سعد روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نزع روح کے وقت جب اپنی جان کی سخاوت فرما رہے تھے تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے: نماز اور غلام۔ (الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۲۵۳ 'مطبوعہ دار صادر' بیروت)

امام احمد روایت کرتے ہیں:

ابوعثمان بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا' انہوں نے ایک خشک شاخ پکڑ کر اس کو ہلایا حتیٰ کہ اس کے پتے گرنے لگے' پھر انہوں نے کہا: اے ابوعثمان! کیا تم مجھ سے سوال نہیں کرو گے کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے کہا: آپ نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کیا تھا' میں آپ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا' آپ نے ایک خشک شاخ کو پکڑ کر اسے ہلایا حتیٰ کہ اس کے پتے جھڑنے لگے' آپ نے فرمایا: اے سلمان! کیا تم مجھ سے سوال نہیں کرو گے کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ نے فرمایا: جب مسلمان اچھی طرح وضو کرتا ہے اور پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں' جس طرح اس درخت کے پتے گر رہے ہیں' پھر آپ نے یہ آیت پڑھی:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ ۚ (ھود: ۱۱۴)

اور دن کے دونوں کناروں اور رات کے کچھ حصوں میں نماز کو قائم رکھو' بے شک نیکیاں' برائیوں کو مٹا دیتی ہیں' یہ ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو نصیحت قبول کرنے والے ہیں O

(مسند احمد ج ۵ ص ۴۳۹_۴۳۸_۴۳۷ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

اس حدیث کو امام دارمی[1] اور امام طبرانی[2] نے بھی روایت کیا ہے:

حافظ الہیثمی لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور امام طبرانی نے اس حدیث کو "معجم اوسط" اور "معجم کبیر" میں روایت کیا ہے' امام احمد کی سند میں ایک راوی علی بن زید ہے' اس کی روایت سے استدلال میں اختلاف ہے' اور اس کی سند کے بقیہ راوی صحیح ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۱ ص ۲۹۸ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' ۱۴۰۲ھ)

---

[1] امام عبداللہ بن عبدالرحمان دارمی متوفی ۲۵۵ھ' سنن دارمی ج ۱ ص ۱۴۸ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان

[2] امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ' معجم کبیر ج ۶ ص ۲۵۷ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

ابو وائل بیان کرتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب بندہ نماز پڑھتا ہے تو اس کے سر کے اوپر اس کے گناہ جمع ہو جاتے ہیں اور جب وہ سجدہ کرتا ہے تو گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جس طرح درخت کے پتے جھڑتے ہیں' اس حدیث کو امام ابن زنجویہ نے روایت کیا ہے۔ (جامع الاحادیث الکبیر ج ۱۹ ص ۵۱۸ ـ ۵۱۷ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۱۴ھ)

امام ابن عساکر حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص وضو کرے اور تین بار اپنے ہاتھوں کو دھوئے اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں کے ہر گناہ کو مٹا دیتا ہے' اور جو کلی کرے اور ناک میں پانی ڈالے تو اللہ تعالیٰ اس کی زبان اور ہونٹوں کے ہر گناہ کو مٹا دیتا ہے' اور جو اچھی طرح وضو کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھے وہ گناہوں سے اس طرح صاف ہو جاتا ہے جس طرح اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہو' راوی نے پوچھا: آپ نے اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے؟ فرمایا: ایک' دو' تین' چار' پانچ' چھ بار نہیں' بے شمار مرتبہ سنا ہے۔

(مختصر تاریخ دمشق ج ۴ ص ۲۰۰ 'مطبوعہ دارالفکر' دمشق ۱۴۰۴ھ)

تارک نماز کے متعلق فقہاء اسلام کے نظریات

قاضی ابن رشد مالکی لکھتے ہیں:

جو شخص نماز کی فرضیت کا انکار نہ کرتا ہو' لیکن نماز کا تارک ہو اور کہنے کے باوجود بھی نماز نہ پڑھتا ہو' اس کے متعلق امام احمد' اسحاق' اور ابن المبارک نے یہ کہا ہے کہ وہ کافر ہو گیا اور اس کو قتل کرنا واجب ہے' اور امام مالک اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ اس شخص کو حداً قتل کر دیا جائے اور امام ابوحنیفہ اور اہل ظاہر کا مذہب یہ ہے کہ اس کو قید کیا جائے اور اس پر تعزیر لگائی جائے حتیٰ کہ وہ نماز پڑھنے لگے۔

اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں احادیث مختلف ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کو تین وجوہ کے سوا اور کسی وجہ سے قتل کرنا جائز نہیں ہے' ایمان کے بعد کفر کرے یا شادی شدہ شخص زنا کرے یا کسی شخص کو بغیر بدلہ کے قتل کرے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

یہ حدیث امام ابوحنیفہ کی دلیل ہے۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارے اور ان کے درمیان (سلامتی کا) عہد نماز ہے' سو جس شخص نے نماز کو ترک کیا اس نے کفر کیا (ترمذی ونسائی) اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ اور کفر اور شرک کے درمیان (فرق) نماز کا ترک کرنا ہے۔ (صحیح مسلم)

یہ حدیثیں امام احمد' اسحاق اور ابن المبارک کی دلیل ہیں جو تارک نماز کو کافر قرار دیتے ہیں اور اس کے کفر کی وجہ سے اس کے قتل کو واجب قرار دیتے ہیں اور امام ابوحنیفہ اس حدیث کو تغلیظ اور زجر وتوبیخ پر محمول کرتے ہیں اور یہ تاویل کرتے ہیں کہ نماز کو ترک کرنا' کافروں کا فعل ہے اور یہ صورۃً کفر ہے حقیقۃً کفر نہیں ہے اور امام مالک اور امام شافعی جو تارک نماز کے حداً قتل کرنے کو واجب کہتے ہیں ان کا قول ضعیف ہے اور اس کی کوئی دلیل نہیں ہے البتہ ایک ضعیف قیاس ہے کہ سب سے بڑا حکم نماز کا ہے اور سب سے بڑی نہی قتل ہے' اور امام احمد وغیرہ جو تارک صلوٰۃ کو کافر کہتے ہیں یہ قول خارجیوں کے مذہب کے مشابہ ہے جو گناہوں کی وجہ سے مومن کی تکفیر کرتے ہیں۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۶۶ ـ ۶۵ 'ملخصاً مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

تارک نماز کے متعلق فقہاء حنبلیہ کا نظریہ

علامہ مرداوی حنبلی لکھتے ہیں:

اگر کسی شخص نے نماز کی فرضیت کا انکار کیے بغیر سستی سے نماز کو ترک کیا تو اس کو نماز پڑھنے کی دعوت دی جائے' اگر وہ نماز کا وقت تنگ ہونے تک نہ پڑھے تو اس کو قتل کرنا واجب ہے' یہی مذہب ہے اور اسی پر جمہور اصحاب کا عمل ہے' ابواسحاق بن شاقلا نے کہا: اگر اس نے ایک نماز نہیں پڑھی حتیٰ کہ دوسری نماز کا وقت بھی نکل گیا تو اس کو قتل کرنا واجب ہے' یہ قول حسن ہے اور ایک روایت یہ ہے کہ وہ تین نمازیں ترک کرے اور چوتھی کا وقت تنگ ہو جائے تو اس کو قتل کرنا واجب ہے اور ایک روایت میں تین دن کی نمازوں کا ذکر ہے۔ (الانصاف ج ۱ ص ۴۰۱ 'ملخصاً مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۳۷۴ھ)

نماز پڑھنے کی دعوت امام یا اس کے نائب کی طرف سے دی جائے گی' اگر دعوت سے پہلے اس نے کثیر نمازیں بھی ترک کی ہوں تو اس کو قتل کرنا واجب نہیں ہے' اس کی توبہ نماز پڑھنا ہے۔

(الانصاف ج ۱ ص ۴۰۲ 'ملخصاً مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۳۷۴ھ)

آیا اس کو قتل حداً کیا جائے گا یا کفراً؟ اس میں دو روایتیں ہیں' ایک روایت یہ ہے کہ اس کو کفر کی وجہ سے قتل کیا جائے گا اور یہی مذہب ہے اور اکثر فقہاء کا مختار ہے اور دوسری روایت یہ ہے کہ اس کو حداً قتل کیا جائے گا اور یہ بعض فقہاء کا مختار ہے' اور مذہب حنبلیہ کے مطابق اس کا حکم کفار کا حکم ہے' اس کو غسل دیا جائے گا نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی نہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا' وہ کسی کا وارث ہوگا نہ اس کا کوئی وارث ہوگا' اور وہ مرتد کی مثل ہے۔

(الانصاف ج ۱ ص ۴۰۵ - ۴۰۴ 'ملخصاً مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۳۷۴ھ)

نماز کے علاوہ اور کسی عبادت کو سستی سے ترک کیا تو یہ کفر نہیں ہے۔

(الانصاف ج ۱ ص ۴۰۳ 'ملخصاً' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۳۷۴ھ)

فقہاء حنبلیہ کا تارک نماز کو کافر قرار دینا صحیح نہیں ہے اور یہ مذہب خارجیوں کے مذہب کے مشابہ ہے' ایمان کی بحث میں ہم خارجیوں کے مذہب کا رد کر چکے ہیں۔

تارک نماز کے متعلق فقہاء شافعیہ کا نظریہ

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی لکھتے ہیں:

جس شخص نے نماز کی فرضیت کا انکار کیا وہ مرتد ہے اور اس پر مرتدین کے احکام جاری ہوں گے۔

جس شخص نے کسی عذر کی وجہ سے نماز کو ترک کیا مثلاً نیند یا نسیان کی وجہ سے تو اس پر فقط قضا ہے اور اس کے لیے وقت میں وسعت ہے۔ جس شخص نے بغیر کسی عذر کے سستی کی وجہ سے نماز کو ترک کیا تو صحیح قول یہ ہے کہ اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی اور شاذ قول یہ ہے کہ وہ منکر نماز کی طرح مرتد ہے۔

صحیح قول کی بناء پر نماز کے تارک کو حداً قتل کیا جائے گا' اس کو کب قتل کیا جائے؟ صحیح قول یہ ہے کہ جب وہ ایک نماز کو ترک کر دے اور اس کا وقت تنگ ہو جائے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا' دوسرا قول یہ ہے کہ جب دوسری نماز کا وقت تنگ ہو جائے' تیسرا قول یہ ہے کہ جب چوتھی نماز کا وقت تنگ ہو جائے' چوتھا قول یہ ہے کہ جب وہ چار نمازیں ترک کر دے' پانچواں قول یہ ہے کہ جب وہ سستی کی وجہ سے نمازیں ترک کرنے کا عادی ہو جائے لیکن مذہب پہلا قول ہے۔

صحیح یہ ہے کہ اس کو مرتد کی طرح تلوار سے قتل کیا جائے گا۔

(روضۃ الطالبین ج ۱ ص ۶۶۸۔۶۶۹ ملخصاً مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۴۰۵ھ)

جب تارک نماز کو قتل کیا جائے تو اس کو غسل دیا جائے گا' کفن پہنایا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا اور مسلمانوں کی طرح اس کی قبر بنائی جائے گی جیسا کہ باقی مرتکبین کبیرہ کے لیے کیا جاتا ہے' اور ایک قول یہ ہے کہ اس کو نہ غسل دیا جائے گا نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی نہ اس کو کفن پہنایا جائے گا اور اس کی قبر مٹادی جائے گی۔ (روضۃ الطالبین ج ۱ ص ۶۳۴ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۴۰۵ھ)

علامہ شمس الدین محمد بن ابی العباس رملی نے بھی تارک نماز کے متعلق یہی تفصیل لکھی ہے۔

(نہایۃ المحتاج ج ۲ ص ۴۲۸ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۴ھ)

نیز علامہ نووی لکھتے ہیں:

تارک نماز کو حداً قتل کرنے کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ (التوبہ: ۵)

تم مشرکین کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو ان کو گرفتار کرو اور ان کا محاصرہ کرو اور ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ بیٹھو سو اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز کو قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔

نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے لوگوں سے قتال (جنگ) کرنے کا حکم دیا گیا ہے حتیٰ کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دیں' نماز قائم کریں' زکوٰۃ ادا کریں' جب وہ ایسا کریں گے' تو مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کرلیں گے۔ (صحیح بخاری و مسلم) اور حدیث میں ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے نمازیوں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ (سنن ابوداؤد)

اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ جو شخص نماز قائم نہ کرے اس کو قتل کرنے کا حکم ہے' اور پہلی حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ جو نماز نہ پڑھے اس سے قتال کرنے کا حکم ہے اور دوسری حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ جو تارک نماز ہو اس کو قتل کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔

(شرح المہذب ج ۳ ص ۱۷ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

فقہاء شافعیہ کے دلائل کے جوابات

اس آیت سے علامہ نووی نے جو استدلال کیا ہے' فقہاء احناف نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں' پہلا جواب یہ ہے کہ ان کا استدلال مفہوم مخالف سے ہے اور فقہاء احناف کے نزدیک مفہوم مخالف سے استدلال صحیح نہیں ہے' دوسرا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اگر وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر وہ نماز نہ پڑھیں تو ان کا راستہ نہ چھوڑو اور راستہ نہ چھوڑنے کو قتل کرنا لازم نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کو گرفتار کرکے ان کو قید کیا جائے یا مارا پیٹا جائے' تیسرا جواب یہ ہے کہ اگر راستہ نہ چھوڑو کا مطلب قتل کرنا ہو تو پھر تارک نماز کی طرح تارک زکوٰۃ کو بھی حداً قتل کرنا واجب ہونا چاہیے کیونکہ اس آیت میں دونوں کا ذکر ہے حالانکہ امام شافعی تارک زکوٰۃ کو قتل کرنے کے قائل نہیں ہیں' چوتھا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے' مسلمان تارک نماز کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا اور بحث اسی میں ہے۔

علامہ نووی نے ''صحیح بخاری'' اور ''صحیح مسلم'' کے حوالے سے جو حدیث ذکر کی ہے اس میں بھی مفہوم مخالف سے

استدلال ہے' علاوہ ازیں اس میں تارک نماز سے قتال اور جنگ کرنے کا حکم دیا ہے اس کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا' اور تیسرا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں نماز اور زکوٰۃ دونوں کا ذکر ہے' اس لیے شافعیہ کا تارک نماز اور تارک زکوٰۃ میں فرق کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔

علامہ نووی نے ''سنن ابوداؤد'' کی جس حدیث سے استدلال کیا ہے اس میں بھی مفہوم مخالف سے استدلال ہے' علاوہ ازیں اس حدیث کے متعلق علامہ نووی نے خود لکھا ہے: یہ حدیث ضعیف ہے' اس میں ایک مجہول راوی ہے۔

(شرح المہذب ج ۳ ص ۱۳' مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

تارک نماز کے متعلق فقہاء مالکیہ کا نظریہ

علامہ حطاب مالکی لکھتے ہیں:

جس شخص نے کئی نمازیں عمداً ترک کیں حتیٰ کہ ان کا وقت نکل گیا' اگر وہ ان کے متعلق سوال کرے تو اس سے کہا جائے گا کہ وہ استغفار کرے اور جس شخص کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ سستی اور لاپرواہی کی وجہ سے نمازوں کو ترک کرتا ہے' اسے نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے گا اور اگر اس نے نماز نہیں پڑھی تو اس کو دھکا دیا جائے گا اور مارا پیٹا جائے گا' اگر اس کے بعد بھی اس نے نماز نہیں پڑھی تو اس کو حداً قتل کر دیا جائے گا نہ کہ کفراً' بہ شرطیکہ وہ نماز کی فرضیت کا اقرار کرتا ہو اور منکر نہ ہو' ابن التلمسانی نے اپنی شرح میں ابن العربی سے نقل کیا ہے کہ روزہ بھی نماز کی طرح ہے' اس کے تارک کو بھی قتل کیا جائے گا'' ذخیرہ'' میں لکھا ہے کہ امام مالک کے نزدیک روزہ اور نماز کا تارک قتل کیا جائے گا اور امام شافعی اور عراقیین کے نزدیک تارک زکوٰۃ کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ زکوٰۃ جبراً لی جا سکتی ہے۔ (مواہب الجلیل ج ۱ ص ۴۲۰-۴۲۱' مکتبۃ النجاح' لیبیا)

علامہ خرشی مالکی لکھتے ہیں:

اگرچہ تارک نماز یہ کہے کہ میں نماز پڑھوں گا اور بدستور ترک کرتا رہے اور نماز شروع نہ کرے' پھر بھی اس کو قتل کر دیا جائے گا کیونکہ مذہب کے نزدیک قولاً اور فعلاً امتناع اور صرف فعلاً امتناع میں کوئی فرق نہیں ہے' اس کو نماز کے ترک کی وجہ سے قتل کیا جائے گا اور نماز کا ترک محقق ہے۔ (الخرشی علی مختصر خلیل ج ۱ ص ۲۲۷' مطبوعہ دار صادر' بیروت)

علامہ دردیر مالکی لکھتے ہیں:

تارک نماز کو تلوار سے حداً قتل کیا جائے گا' اس کی نماز جنازہ کوئی فاضل عالم نہیں پڑھائے گا اور اس کی قبر قائم رکھی جائے گی اس کو ہموار نہیں کیا جائے گا۔ (الشرح الکبیر علی حاشیۃ الدسوقی ج ۱ ص ۱۹۰-۱۹۱' مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

فقہاء مالکیہ کا جواب بھی وہی دلائل ہیں جن کو ہم نے فقہاء شافعیہ کے رد میں ذکر کیا ہے کیونکہ مالکیہ اور شافعیہ دونوں اس کے قائل ہیں کہ تارک نماز کو حداً قتل کر دیا جائے گا اور بقول قاضی ابن رشد مالکی اس نظریہ پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

تارک نماز کے متعلق فقہاء احناف کا نظریہ

علامہ محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

جو شخص نماز کی فرضیت کا انکار کرے وہ کافر ہے' اور جو شخص نماز کو عمداً سستی سے ترک کرے وہ فاسق ہے' اس کو قید کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ نماز پڑھنے لگے' کیونکہ بندہ کو بندوں کے حق کے بدلہ میں قید کیا جاتا ہے تو اللہ کے حق کے بدلہ میں بندہ کو قید کرنے کا زیادہ حق ہے' ایک قول یہ ہے کہ اس کو اس حد تک مارا جائے کہ اس کا خون بہنے لگے۔

(الدرالمختار علی ردالمحتار ج ۱ ص ۲۳۵' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

امام محبوبی نے کہا ہے کہ تارک نماز کو مارا جائے' اور "حلیہ" میں لکھا ہے کہ یہی مذہب ہے اور کہا: بشمول زہری ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ تارک نماز کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس پر تعزیر لگائی جائے گی اور اس کو قید میں رکھا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے یا توبہ کرے۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۲۳۵ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

فقہاء احناف کے موقف پر دلیل

فقہاء احناف تارک نماز کو فاسق کہتے ہیں اور اس کو حداً یا کفراً قتل کرنے کے قائل نہیں ہیں' ان کے موقف پر یہ حدیث صراحۃً دلالت کرتی ہے' امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں' جس نے اچھی طرح ان کا وضو کیا اور ان نمازوں کو ان کے وقت میں پڑھا اور ان کے رکوع اور خشوع کو مکمل کیا' تو اللہ تعالیٰ نے (اپنے کرم سے) اس کو بخشنے کا ذمہ لیا ہے اور جس نے ایسا نہیں کیا تو اس کا اللہ تعالیٰ پر کوئی ذمہ نہیں' اگر وہ چاہے تو اس کو بخش دے اور چاہے تو اس کو عذاب دے۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۶۱ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۵ ص ۳۲۲۔۳۱۷ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

اس حدیث کو حافظ سیوطی نے امام ابوداؤد اور امام بیہقی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔

(الجامع لاحادیث الکبیر ج ۴ ص ۲۹۰ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۱۴ھ)

علامہ نووی اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام ابوداؤد اور دیگر ائمہ حدیث نے اسانید صحیحہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (شرح المہذب ج ۱ ص ۱۷ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں O (البقرہ: ۳)

اس آیت میں متقین کی تیسری صفت بیان کی گئی ہے۔

رزق کا لغوی معنی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

رزق کا معنی ہے: عطا' خواہ دنیاوی عطا ہو یا اخروی اور رزق کا معنی نصیب ہے' جو غذا پیٹ میں جائے اس کو بھی رزق کہتے ہیں' علم دینے کو بھی رزق کہتے ہیں۔ (المفردات ص ۱۹۴ 'مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

رزق کا اصطلاحی معنی

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

رزق وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ جاندار تک پہنچائے اور وہ اس کو کھائے اور پیئے خواہ وہ حلال ہو یا حرام۔

(شرح عقائد ص ۷۴ 'مطبوعہ سکندر علی تاجران کتب' کراچی' ۳۸)

علامہ میر سید شریف لکھتے ہیں:

رزق وہ ہے جس کو اللہ جاندار تک پہنچائے' وہ اس کو کھائے اور رزق' حلال اور حرام دونوں کو شامل ہے اور معتزلہ کے نزدیک رزق اس چیز کو کہتے ہیں جو بندہ کی ملکیت میں ہو اور وہ اس کو کھائے' اس وجہ سے حرام رزق نہیں ہے کیونکہ وہ اس کی ملکیت میں نہیں ہوتا۔ (التعریفات ص ۴۹۔۴۸ 'مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

حرام کے رزق نہ ہونے پر معتزلہ کے دلائل

معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف رزق کی اضافت کی ہے اس آیت میں فرمایا ہے: اس میں سے جو ہم نے ان کو دیا ہے وہ خرچ کرتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ ○ بے شک اللہ ہی بڑا رزاق اور بڑی زبردست قوت والا ہے ○ (الذاریات: ۵۸)

اگر حرام بھی رزق ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بندوں تک حرام چیزوں کا پہنچانے والا ہے' اور یہ قبیح کام ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں ہے' نیز اگر اللہ تعالیٰ نے بندوں تک حرام چیز پہنچائی اور بندوں نے اس کو کھالیا تو پھر بندوں سے مواخذہ کرنا کس طرح صحیح ہوگا! اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رزق میں سے خرچ کرنے پر بندوں کی مدح فرمائی ہے' اگر حرام بھی رزق ہو تو حرام کو راہ خدا میں خرچ کرنا کب لائق تعریف ہوگا! اور کفار نے جب بعض رزق کو حرام کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی اور فرمایا:

قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ (یونس: ۵۹) آپ کہیے کہ تم بتاؤ تو سہی اللہ نے تمہارے لیے جو رزق اتارا تو تم نے اس میں سے کچھ حرام کرلیا اور کچھ حلال!

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رزق کا حرام کو شامل ہونا صحیح نہیں ہے' اس لیے رزق کی صحیح تعریف یہ ہے: کسی چیز سے نفع حاصل کرنے کے لیے اس کو جاندار تک پہنچانا اور دوسرے کو اس سے نفع اٹھانے سے روکنا' یعنی جس کو جو رزق دیا جائے اس سے نفع اٹھانا اسی کے ساتھ خاص ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ اس چیز کا مالک ہو اور اب حرام چیز رزق نہیں ہوگی' کیونکہ حرام چیز کا انسان مالک نہیں ہوتا۔

معتزلہ کے دلائل کے جوابات

اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام قبیح نہیں ہے' ہر چند کہ رزق' حلال اور حرام دونوں کو شامل ہے پھر بھی اللہ تعالیٰ کا رزاق ہونا اور اس کی طرف رزق کی نسبت میں کوئی حرج نہیں ہے' دیکھئے اللہ تعالیٰ خیر اور شر دونوں کا خالق ہے اور یہ معتزلہ کو بھی تسلیم ہے تو کیا اللہ کو خالق کہنے میں کوئی حرج ہے' البتہ خصوصیت کے ساتھ شر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا جائز نہیں ہے' اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ ہر چیز کا خالق ہے یا وہ عرش اور کرسی کا خالق ہے' البتہ خصوصاً یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ کتوں اور خنزیر کا خالق ہے یا شیاطین کا خالق ہے۔ اسی طرح خصوصیت سے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ حرام چیزوں کا رازق ہے۔

معتزلہ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر رزق' حرام کو شامل ہو تو پھر مال حرام کھانے پر بندوں سے مواخذہ کیوں ہوگا؟ اس کا جواب واضح ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مال حرام کھانے سے بندوں کو منع کیا ہے اس لیے اس حکم کی خلاف ورزی کی وجہ سے بندوں سے مواخذہ ہوگا۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اس آیت میں رزق میں سے خرچ کرنے پر اللہ تعالیٰ نے متقین کی تعریف فرمائی ہے' اگر رزق حرام کو بھی شامل ہے تو یہ کیسے لائق تعریف ہوگا' اس کا جواب یہ ہے کہ متقین اللہ کے رزق میں سے خالص حلال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور یہی وصف قابل تعریف ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ (البقرہ: ۲۶۷) اے ایمان والو! اللہ کی راہ میں اپنی حلال اور پاک کمائی سے خرچ کرو۔

رہا یہ سوال کہ اس آیت میں رزق سے رزق حلال مراد لینے پر کیا دلیل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے متقین کی مدح فرمائی ہے اور مدح اسی وقت ہوگی جب وہ رزق حلال کو اللہ کی راہ میں خرچ کریں گے۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ مشرکین نے بعض رزق کو حرام کرلیا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت فرمائی' اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی مذمت اس وجہ سے کی ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیا اس کو انہوں نے از خود حرام کرلیا جیسے انہوں نے بحیرہ' سائبہ وغیرہ کو از خود حرام کرلیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِیْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِیْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ (المائدہ: ١٠٣)

اللہ تعالیٰ نے (جانوروں میں سے) کسی کو بحیرہ بنایا ہے[1] نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام۔

حرام کے رزق ہونے پر اہل سنت کے دلائل

اہل سنت کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کے رزق کو از راہ کرم اپنے ذمہ لیا ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ھود: ٦)

اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمہ (کرم) پر ہے۔

فرض کیجئے ایک شخص نے ساری عمر حرام کھایا ہے' اب اگر حرام کو رزق میں شامل نہ کیا جائے تو لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو رزق نہیں دیا اور یہ اس آیت کے خلاف ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام پر بھی رزق کا اطلاق فرمایا ہے' امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھے کہ عمرو بن مرہ آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! اللہ نے میری تقدیر میں شقاوت لکھ دی ہے اور میرا خیال ہے کہ میرے پاس سوائے اپنے ہاتھ میں دف (ڈھول) بجانے کے کمائی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے' آپ مجھے اس قسم کے گانے کی اجازت دیں جس میں بے حیائی کے کلمات نہ ہوں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تجھے اجازت نہیں دوں گا اور نہ تجھے عزت دے کر تیری آنکھیں ٹھنڈی کروں گا' اے خدا کے دشمن! اللہ نے تجھے پاک اور حلال رزق دیا اور تو نے اللہ کے حلال کئے ہوئے رزق کے بدلہ میں اللہ کے رزق میں سے حرام کو اختیار کرلیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے عمرو بن مرہ سے فرمایا:

اگر میں تجھے پہلے منع کرچکا ہوتا (اور تو اس کے بعد اجازت طلب کرتا) تو میں تجھے سزا دیتا' میرے پاس سے اٹھ جا اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کر اور اگر تو نے اس کے بعد گایا بجایا' تو میں تجھے سخت دردناک سزا دوں گا' اور تیرا سر مونڈ دوں گا اور تجھ کو مثلہ (ناک' کان یا دیگر اعضا کاٹنا) کروں گا اور تجھے تیرے گھر سے نکال دوں گا' اور تیرے مال' اسباب کو مدینہ کے جوانوں کے لوٹنے کے لیے مباح کردوں گا' یہ سن کر عمرو وہاں سے اس قدر ذلت اور رسوائی کے ساتھ اٹھا جسے اللہ ہی جانتا ہے' جب وہ پیٹھ

---

[1] جس جانور کا دودھ بتوں کے نام کردیا جائے اور کوئی اس کو استعمال نہ کرے وہ بحیرہ ہے' جو جانور بتوں کے نام پر ہمارے زمانہ کے سانڈ کی طرح چھوڑ دیا جائے وہ سائبہ ہے' جو اونٹنی مسلسل مادہ بچے جنے اس کو بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا اس کو وصیلہ کہتے تھے' جو نر اونٹ ایک خاص عدد سے جفتی کرچکا ہو اس کو بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا اس کو حام کہتے تھے مشرکین نے ان چاروں جانوروں کے استعمال کو لوگوں پر حرام کردیا تھا۔

پھیر کر چلا گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہی لوگ نافرمان ہیں' ان میں سے جو شخص بغیر توبہ کے مر گیا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن اسی طرح ننگا اور مخنث اٹھائے گا جس طرح دنیا میں وہ لوگوں سے اپنا ستر نہیں چھپاتا تھا' جب بھی کھڑا ہوگا تو مدہوش ہو کر گر پڑے گا۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۸۷ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے عبرت کا مقام ہے جو سازوں کے ساتھ گانے میں مشغول رہتے ہیں۔

آیا اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بالخصوص زکوٰۃ مراد ہے یا عام خرچ کرنا؟

اس آیت میں جو فرمایا ہے: اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں' یہاں پر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے کیا مراد ہے؟ امام ابن جریر روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے اموال کی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس سے اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا مراد ہے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۸۱ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اولیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس قدر ظاہری اور باطنی نعمتیں دی ہیں ان سب کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا مراد لیا جائے' سو متقین وہ ہیں جو ضرورت مندوں پر مال خرچ کرتے ہیں' اہل وعیال' قرابت داروں اور عام لوگوں کی مدد کرتے ہیں' زبان کو خدا کی راہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ خرچ کرتے ہیں' ہاتھ پیروں کی طاقت سے کمزوروں کے کام آتے ہیں' خدا کی دی ہوئی عقل سے کم عقلوں کو مشورے دیتے ہیں' تقویٰ اور پرہیز گاری کے اثر سے ان کو جو روحانیت حاصل ہے اس سے لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ نے جو علم دیا ہے اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔

علامہ خفاجی لکھتے ہیں کہ حافظ ابن عساکر نے اپنی ''تاریخ'' میں اور امام طبرانی نے ''معجم اوسط'' میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جس علم کو حاصل کرنے کے بعد اس کو بیان نہ کیا جائے وہ اس خزانے کی طرح ہے جس کو خرچ نہ کیا جائے۔ (عنایۃ القاضی ج ۱ ص ۲۳۱ 'مطبوعہ دار صادر' بیروت' ۱۲۸۳ھ)

راہ خدا میں کل مال خرچ کرنے کی شرعی حیثیت

اس آیت میں ''من'' ''تبعیضیہ'' ہے' یعنی کل مال سے اللہ کی راہ میں بعض مال کو خرچ کرنا مراد ہے' کیونکہ جو شخص تنگی اور فقر پر صبر نہ کر سکے اس کے لیے کل مال کو صدقہ کرنا جائز نہیں ہے اور جو شخص مال نہ ہونے پر صبر کر سکتا ہو اس کے لیے کل مال کا صدقہ کرنا جائز ہے جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا کل اثاثہ لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار نہیں فرمایا کیونکہ آپ کو ان کے صبر کا علم تھا اور ان کے دل میں جو ایمان اور توکل علی اللہ کی قوت تھی آپ اس پر مطلع تھے' حسن بن سہل سے کہا گیا: اسراف میں کوئی خیر نہیں ہے تو انہوں نے کہا: خیر میں کوئی اسراف نہیں ہے' یعنی خدا کی راہ میں اگر سب کچھ دے دیا جائے تو اسراف نہیں ہے' لیکن یہ مرتبہ اور مقام کے اعتبار سے ہے۔

امام رازی لکھتے ہیں:

شقیق بن ابراہیم بلخی بھیس بدل کر عبداللہ بن مبارک کے پاس گئے' پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟ انہوں نے کہا: بلخ سے' پوچھا: کیا تم شقیق کو جانتے ہو' کہا: ہاں! پوچھا: ان کے اصحاب کا کیا طریقہ ہے؟ کہا: جب انہیں کچھ نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں اور مل جاتا ہے تو شکر کرتے ہیں' عبداللہ بن مبارک نے کہا: یہ تو ہمارے ہاں کتوں کا طریقہ ہے' شقیق نے پوچھا: پھر کاملین کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؟ عبداللہ بن مبارک نے کہا: کاملین وہ ہیں جنہیں کچھ نہ ملے تو شکر ادا کرتے ہیں اور مل جائے تو دوسروں کو دے دیتے ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ۵ ص ۱۹۹ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یہ لوگ اس (کلام) پر ایمان لاتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا' اور یہی لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں O (البقرہ: ۴)

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں متقین کی چوتھی صفت کا بیان ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا عطف متقین پر ہو یعنی یہ کتاب ان کے لیے ہدایت ہے جنہوں نے اپنے آپ کو شرک سے بچایا اور ان کے لیے بھی ہدایت ہے جو اہل کتاب سے ایمان لائے۔

''انزال'' کا معنی اور اس کی کیفیت

''انزال'' کے معنی ہیں: کسی چیز کو اوپر کی طرف سے نیچے کی طرف منتقل کرنا' ''انزال'' اعیان کا ہوتا ہے اور یہاں وحی کا ''انزال'' مراد ہے جو از قبیل معانی ہے اور معانی کا ''انزال'' ان ذوات کے واسطے سے ہوتا ہے جن ذوات کے ساتھ وہ معانی قائم ہوتے ہیں' وحی چونکہ اللہ کی جانب سے مخلوق کی طرف آتی ہے جو جانب علو میں ہے اس لیے اس کو ''انزال'' کہا گیا ہے' اللہ کا کلام اس کے رسولوں پر نازل ہوتا ہے اور اس کی صفت یہ ہے کہ یا تو حضرت جبرائیل اللہ تعالیٰ سے اپنی نورانیت اور تجرد سے قریب ہوتے ہیں اور اللہ کا کلام حاصل کرتے ہیں اور یا لوح محفوظ سے اس کلام کو حاصل کرتے ہیں اور پھر اس کلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں۔

''ما انزل الیك وما انزل من قبلك'' کی تفصیل

''ما انزل الیك'' سے مراد وہ وحی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے یعنی قرآن کریم' اور وہ وحی بھی مراد ہے جس کی تلاوت نہیں کی جاتی یعنی سنت' جیسے نماز کی رکعات کی تعداد اور اس کی ہیئت مخصوصہ' زکوٰۃ' عشر اور قربانی کی مقدار اور کیفیت' روزہ اور حج کے احکام اور جنایات حدود کی تفصیلات' یہ تمام امور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہیں' قرآن مجید میں ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۔ (النحل: ۴۴)

اور ہم نے آپ کی طرف قرآن نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کو بیان کریں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔

غرضیکہ اس سے مراد پوری شریعت پر ایمان لانا ہے۔

''وما انزل من قبلك'' سے تورات' انجیل اور کتب سماویہ مراد ہیں' ان کتابوں پر اجمالی ایمان لانا ضروری ہے' بایں طور کہ یہ کتابیں اللہ کی طرف نازل کی گئی ہیں اور جو کلام آپ پر نازل کیا گیا ہے اس پر اجمالی ایمان لانا فرض عین ہے اور اس پر تفصیلاً ایمان لانا فرض کفایہ ہے کیونکہ قرآن اور سنت کے ہر ہر جز پر تفصیلاً ایمان لانا اگر ہر شخص پر فرض عین ہو تو لازم آئے گا کہ تمام مسلمان روزگار حیات کی تمام ذمہ داریوں کو ترک کر کے صرف پڑھنے پڑھانے پر لگ جائیں اور اس سے حرج اور فساد معاش لازم آئے گا' اس لیے جو کلام آپ پر نازل کیا گیا ہے اس پر تفصیلاً ایمان لانا فرض کفایہ ہے۔

ختم نبوت پر دلیل

اس آیت میں یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ جو وحی آپ نازل ہوئی اس پر ایمان لایا جائے اور جو وحی آپ سے پہلے نازل ہوئی ہے اس پر ایمان لایا جائے' اور اگر آپ کے بعد بھی وحی کا نزول ممکن ہوتا تو بعد میں آنے والی وحی پر بھی ایمان لانا ضروری قرار دیا جاتا' اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نزول وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور آپ کے اوپر نبوت ختم ہو گئی' آپ کے بعد کوئی نبی اور رسول مبعوث نہیں ہو گا' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے قرب قیامت میں نازل ہونا اس

کے منافی نہیں ہے کیونکہ وہ مبعوث نہیں ہوں گے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک امتی کی حیثیت سے آئیں گے اور ہمارے رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی اتباع کریں گے اور ہمارے امام کی اقتداء میں نماز پڑھیں گے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس وقت تمہاری کیا شان ہوگی جب تم میں ابن مریم نازل ہوں گے اور امام تم میں سے ہوگا۔ (صحیح بخاری ج ا ص ۴۹۰ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

دار آخرت اور یقین کا معنی

دار آخرت سے مراد اعمال کا دار الجزاء ہے اور اس پر ایمان لانا حساب میزان صراط جنت اور نار پر ایمان لانے کو مستلزم ہے بلکہ ہر اس چیز پر ایمان لانے کو مستلزم ہے جس کا ذکر قرآن اور سنت میں وارد ہے۔

یقین اس جازم تصدیق کو کہتے ہیں جس میں کوئی شک اور شبہ نہ ہو اور وہ جزم واقع کے مطابق ہو اور تشکیک مشکک سے زائل نہ ہو سکے اس کی تین قسمیں ہیں: علم الیقین عین الیقین اور حق الیقین ہمیں جو اللہ رسول اور آخرت پر یقین ہے وہ علم الیقین ہے علم الیقین نظر اور استدلال سے حاصل ہوتا ہے عین الیقین مشاہدہ سے اور حق الیقین تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا علم یقین کے ساتھ متصف نہیں ہوتا کیونکہ اس کا علم استدلالی نہیں ہے۔

آخرت پر یقین کا اظہار اعمال کے آثار سے ہوتا ہے جو شخص جھوٹی گواہی دیتا ہو شراب پیتا ہو لوگوں کے حقوق پامال کرتا ہو نماز اور روزہ کا تارک ہو اس کے آخرت پر یقین کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہے قرآن مجید میں آخرت اور قیامت پر بہت زور دیا گیا ہے کیونکہ صالحیت اور نیکی کی بنیاد آخرت اور قیامت پر یقین ہے جب انسان کو محاسبہ کا خطرہ نہ ہو تو وہ عیش پرستی کا دلدادہ اور ظلم اور سرکشی پر دلیر ہو جاتا ہے اس لیے قرآن مجید نے انسان کو بار بار یاد دلایا ہے کہ موت کے بعد اس کی دوسری زندگی شروع ہوگی اور اس دار العمل کے بعد دار الجزاء ہے تاکہ انسان خوف آخرت سے گناہوں سے باز رہے اور نیکیوں کے لیے کوشاں رہے۔

اس آیت میں حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ متقین یا مومنین اہل کتاب ہی آخرت پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ جو اہل کتاب غیر مومن ہیں ان کا آخرت پر صحیح ایمان نہیں ہے ان کا زعم ہے کہ جنت میں صرف یہودی یا عیسائی ہی داخل ہوں گے اور ان کا زعم ہے کہ ان کو صرف چند ایام کے لیے دوزخ کا عذاب ہوگا اور ان کا اس میں اختلاف ہے کہ جنت کی نعمتیں دنیا جیسی ہیں اور آیا جنت دائمی ہے یا نہیں لہٰذا آخرت کے متعلق ان کا اعتقاد صحت سے بہت دور ہے چہ جائیکہ وہ درجہ یقین پر ہو کیونکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یقین اس جزم کو کہتے ہیں جو واقع کے مطابق ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہی (کامل متقی) اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں O (البقرہ: ۵)

یہ متقین کی پانچویں صفت ہے۔

اس آیت میں دونوں جگہ ''اولٰئك'' سے متقین کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی پانچ صفات بیان کی ہیں یعنی جو متقین غیب پر ایمان لاتے ہیں نماز قائم رکھتے ہیں راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں قرآن مجید اور اس سے پہلی کتب سماویہ پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں وہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ ان کے ہدایت یافتہ ہونے اور فلاح پانے کا سبب یہ مذکورہ اوصاف ہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان مذکورہ اوصاف کا نتیجہ فلاح کامل ہے۔

فلاح کے معنی کسی چیز کو پھاڑنا اور کاٹنا ہے' کسان کو اس لیے فلاح کہتے ہیں کہ وہ ہل چلا کر زمین کو پھاڑتا ہے' اور جو شخص محنت اور جدوجہد کرنے کے بعد کسی مطلوب کو حاصل کر لیتا ہے اس کو بھی مفلح کہتے ہیں گویا کہ اس پر غور و فکر کی راہیں کھل گئیں اور بند نہیں ہوئیں۔

معتزلہ اور خوارج نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ فلاح' کامل متقی کے لیے بیان کی گئی' اس سے لازم آیا کہ فاسق ہمیشہ جہنم میں رہے گا' اس کا جواب یہ ہے کہ کامل فلاح کامل متقی کے لیے ہے اور نفس فلاح فاسق مومن کو بھی حاصل ہوگی کیونکہ وہ بھی مآل کار جنت میں چلا جائے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ

بے شک جو لوگ کفر میں راسخ ہو چکے ہیں' ان کے حق میں برابر ہے' خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں

لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ

وہ ایمان نہیں لائیں گے O اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے' اور ان کی آنکھوں پر

أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٧﴾

ع ۱

پردہ (پڑا ہوا) ہے اور ان کے لیے بڑا (سخت) عذاب ہے O

قرآن مجید میں پہلے مومنین اور متقین کی پانچ صفات بیان کیں' اس کے بعد غیر مومنین کی صفات بیان کیں' غیر مومنین میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اپنے کفر کا علی الاعلان اظہار کیا' مذکور الصدر دو آیتیں ان ہی کے متعلق ہیں' اور بعض وہ ہیں جنہوں نے علی الاعلان کفر کے اظہار کی جرأت نہیں کی' انہوں نے بہ ظاہر مسلمانوں سے موافقت کی اور در پردہ کافر رہے' ان کو قرآن کی اصطلاح میں منافق کہا گیا ہے' اس کے بعد آنے والی تیرہ آیتوں میں منافقین کے احوال بیان کیے گئے ہیں اور ان کی مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کے بعد کفار کا بیان اس لیے شروع کیا ہے کہ شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے' کیونکہ کفر ایمان کی ضد ہے' کفار دائمی معذب ہیں اور مومن عذاب سے نجات پانے والے ہیں۔

کفر کا لغوی معنی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

لغت میں کفر کا معنی ہے: کسی شے کو چھپانا' رات کو کافر کہتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں کو چھپا لیتی ہے' کسان کو کافر کہتے ہیں کیونکہ وہ بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے' جو شخص نعمت کو چھپائے اور اس کا شکر ادا نہ کرے اس کے فعل کو کفر اور کفران کہتے ہیں' سب سے بڑا کفر وحدانیت یا شریعت یا نبوت کا انکار کرنا ہے' قرآن مجید میں کفر کا لفظ کفران نعمت اور کفر باللہ دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

لِيَبْلُوَنِي ءَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ ۖ وَمَن شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ O (النمل: ۴۰)

تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری' اور جس نے شکر کیا تو وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے شکر کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی تو بے شک میرا رب بے پرواہ بزرگی والا ہے O

اس آیت میں کفر کا لفظ کفران نعمت اور ناشکری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ (البقرہ: ۴۱) اور تم سب سے پہلے اس کے منکر نہ ہو۔

اس آیت میں کفر' کفر بالقرآن کے معنی میں ہے' جب کافر کا لفظ مطلقاً بولا جائے تو اس سے متعارف وہ شخص ہے' جو وحدانیت یا شریعت یا نبوت یا ان تینوں کا انکار کرے۔ (المفردات ص ۴۳۳۔ ۴۳۲' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران' ۱۳۴۲ھ)

دیگر مفردات کے لغوی معانی

''انذار'' کا معنی ہے: کسی خطرہ سے خبردار کرنا' ''ختم'' کا معنی ہے: کسی چیز کو اس طرح چھپا دینا اور ڈھانپ دینا کہ اس میں دوسری چیز کسی طرف سے داخل نہ ہو سکے' قلوب سے مراد عقول ہیں یعنی ان کی عقول کو اس طرح ڈھانپ دیا ہے کہ ان میں ایمان اور نور داخل نہیں ہو سکتا' اس میں استعارہ تصریحیہ ہے' ان کے قلوب (عقول) کو اس ظرف کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس پر مہر لگا دی گئی ہو' ''سمع'' سے مراد کان ہیں اور ''ابصار'' کا معنی آنکھیں ہیں جن سے رنگ' شکل اور دیگر مبصرات کا ادراک کیا جاتا ہے' ''غشاوۃ'' کا معنی ہے: پردہ' مقصود یہ ہے کہ یہ کفار اللہ کی آیات کو دیکھنے سے از خود اور دانستہ اندھے بن گئے ہیں' عذاب کے معنی ہیں: عبرتناک سزا' عذاب زائل کرنے کو بھی کہتے ہیں اور سزا آرام اور لذت کو زائل کرتی ہے اس لیے اس کو عذاب کہتے ہیں۔

شان نزول

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس کی رائے یہ ہے کہ آیت ان یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ میں ایک محلہ بنالیا تھا' یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرتے تھے اور کفر پر مر گئے۔ ان کی مذمت میں یہ آیات نازل ہوئیں' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر حریص تھے کہ سب لوگ ایمان لے آئیں' اور ہدایت میں آپ کی اتباع کریں' تب اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ خبر دی کہ وہی لوگ ایمان لائیں گے جن کے لیے ازل میں ایمان لانا مقدر ہو چکا ہے اور وہی لوگ گمراہ رہیں گے جن کے لیے ازل میں شقاوت لکھی جا چکی ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' اس سے وہ کفار مراد ہیں جو بدر میں قتل کیے گئے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۸۴' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ بیضاوی لکھتے ہیں:

اس آیت سے معین کافر مراد ہیں مثلاً ابولہب' ابوجہل' ولید بن مغیرہ اور علماء یہود۔

(انوار التنزیل ص ۱۳ (درسی) مطبوعہ مطبع سعیدی' کراچی)

اللہ تعالیٰ کے کلام کے قدیم ہونے پر معتزلہ کا اعتراض اور اس کا جواب

معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ پہلے ابولہب وغیرہ نے کفر کیا' پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ انہوں نے کفر کیا ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ کا یہ کلام ان کے کفر کے بعد حادث ہوا' لہٰذا قرآن حادث ہے' اہل سنت اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ پھر اللہ تعالیٰ کا علم بھی حادث ہونا چاہیے کیونکہ جب انہوں نے کفر کیا تب ہی اللہ کو ان کے کفر کرنے کا علم ہوا اور اگر ان کے کفر کرنے سے پہلے یہ علم ہو کہ انہوں نے کفر کر لیا ہے تو یہ واقع کے خلاف ہے اور اگر پہلے یہ علم تھا کہ وہ کفر کریں گے اور پھر یہ علم ہوا کہ انہوں نے کفر کر لیا ہے تو اس کے علم میں تغیر آ گیا اور ہر متغیر حادث ہوتا ہے تو اس طرح اللہ کا علم بھی حادث ہو جائے گا حالانکہ معتزلہ کے

نزدیک بھی اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ازل میں ''لابشرط شئی'' کے مرتبہ میں ہے اور اس میں ماضی' حال اور استقبال کی اضافات نہیں ہیں اور ان اضافات کے تغیر سے اصل صفت علم میں تغیر پیدا نہیں ہوتا' مثلاً ازل میں اللہ تعالیٰ کو ابولہب کے کفر کا علم ہے' پھر جب اس کا ماضی سے تعلق ہوگا تو اس کی اور تعبیر ہوگی' حال سے تعلق ہوگا تو اور تعبیر ہوگی اور مستقبل سے تعلق ہوگا تو اور تعبیر ہوگی یعنی ابولہب کفر کرے گا' وہ کفر کر رہا ہے' وہ کفر کر چکا ہے' یہ تغیر متعلق میں ہے اصل صفت میں تغیر نہیں ہے' اس کی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص ایک ستون کے گرد گھوم رہا ہے تو کبھی وہ ستون اس کے سامنے ہوگا' کبھی پیچھے' کبھی دائیں' کبھی بائیں لیکن یہ ان اوضاع اور نسبتوں میں تغیر ہے اس شخص کی ذات میں تغیر نہیں ہے' اسی طرح اللہ کے علم کا تعلق جب مختلف زمانوں میں ہوگا تو ان تعلقات میں تغیر ہوگا' نفس علم میں تغیر نہیں ہوگا' اسی طرح اللہ کا کلام نفسی بھی ازل میں ''لابشرط شئی'' کے مرتبہ میں ہے اور اس کا تعلق جب زمانہ کے ساتھ ہوتا ہے تو اس تعلق میں اختلاف ہوتا ہے مثلاً ابولہب کفر کرے گا' ابولہب نے کفر کرلیا' وغیرہ اور اس کی صفت کلام جو کلام نفسی ہے اس میں کوئی تغیر اور اختلاف نہیں ہوتا' قرآن مجید میں جہاں بھی ماضی کے صیغے واقع ہوئے ہیں معتزلہ ان سے اسی طرح استدلال کرتے ہیں اور ان کا یہی جواب ہے' یہ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو صفت کلام ہے وہ کلام نفسی ہے اور جن الفاظ کو ہم پڑھتے ہیں وہ کلام لفظی ہیں اور قدیم کلام نفسی ہے' ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت اور اس پر بحث اپنے مقام پر آئے گی۔

اللہ تعالیٰ نے جس ممکن کے عدم وقوع کی خبر دی ہے اس کے ساتھ مکلف کرنے کی تحقیق

اللہ تعالیٰ نے ابولہب اور دیگر جن کفار کے متعلق خبر دی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے ان کا ایمان لانا ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے' ان کا ایمان لانا ممکن بالذات اس لیے ہے کہ وہ ایمان لانے کے مکلف ہیں اور ممتنع لذاتہ کے ساتھ مکلف کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ انسان کی وسعت میں نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ (البقرہ: ۲۸۶) اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کرتا۔

اور ممتنع بالغیر اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے' اب اگر وہ ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ کی خبر کاذب ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ کی خبر کا کاذب ہونا محال بالذات ہے' لہٰذا ابولہب وغیرہ کا ایمان لانا محال بالذات کو مستلزم ہے اور جو ممکن محال بالذات کو مستلزم ہو' وہ ممکن بالذات ممتنع بالغیر ہوتا ہے' اس لیے ابولہب وغیرہ کا ایمان لانا ممکن بالذات ممتنع بالغیر ہے۔

محال بالذات کے ساتھ مکلف کرنے پر علامہ بیضاوی کی دلیل اور اس کا جواب

علامہ بیضاوی نے یہ کہا ہے کہ تکلیف بالمحال عقلاً جائز ہے لیکن تتبع اور استقراء (جستجو اور تفتیش) سے یہ ثابت ہے کہ تکلیف بالمحال واقع نہیں ہے' جواز عقلی پر انہوں نے یہ دلیل دی ہے کہ اگر ابولہب مثلاً ایمان لانے کا مکلف ہو تو وہ پورے قرآن پر ایمان لانے کا مکلف ہوگا اور پورے قرآن میں ''لایؤمنون'' بھی ہے یعنی وہ ایمان نہیں لائے گا اور اس کی تصدیق تب ہوگی جب وہ ایمان نہ لائے تو وہ ایمان لانے اور ایمان نہ لانے کا مکلف ہوا' اور یہ اجتماع نقیضین ہے جو محال بالذات ہے' لہٰذا ثابت ہوا کہ ابولہب محال بالذات کا مکلف ہے' لیکن علامہ بیضاوی کی اس تقریر کا تقاضا یہ ہے کہ محال بالذات کے ساتھ مکلف کرنا صرف عقلاً جائز ہی نہیں بلکہ واقع بھی ہے اور یہ خود ان کی تصریح کے خلاف ہے۔

اس تقریر کا جواب یہ ہے کہ ابولہب مثلاً ایمان لانے کا فی نفسہ مکلف ہے اس سے قطع نظر کرکے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے

متعلق "لا یؤمنون" فرمایا ہے اور اس آیت سے صرف نظر کر کے فی نفسہ اس کا ایمان لانا ممکن بالذات ہے اور وہ اسی اعتبار سے ایمان لانے کا مکلف ہے' اور کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے کی خبر دینے سے وہ چیز نفس امکان سے خارج نہیں ہوتی مثلاً فرض کیجئے اللہ تعالیٰ کو زید کے متعلق علم ہے کہ وہ نماز نہیں پڑھے گا' اب زید کا نماز پڑھنا محال ہوگا' کیونکہ اگر وہ نماز پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ کا علم جہل سے بدل جائے گا اور اللہ تعالیٰ کا جہل محال بالذات ہے' تو اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ زید کو نماز پڑھنے کا مکلف کرنا محال کا مکلف کرنا ہے کیونکہ اس کے نماز پڑھنے کا محال ہونا اللہ تعالیٰ کے علم کے اعتبار سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم سے قطع نظر فی نفسہ اس کا نماز پڑھنا ممکن ہے اور وہ اسی اعتبار سے نماز پڑھنے کا مکلف ہے' خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کے عدم وقوع کی خبر دی یا اس کو جس چیز کے عدم وقوع کا علم ہے اس کے وقوع کا مکلف کرنا ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے اور اس کے ساتھ مکلف کرنا جائز ہے اور اس چیز کا واقع ہونا محال بالغیر ہے کیونکہ وہ اللہ کے کذب یا اس کے جہل کو مستلزم ہے اور یہ دونوں محال بالذات ہیں۔ یہ واضح رہے کہ اشاعرہ کے نزدیک محال بالذات کا مکلف کرنا صحیح ہے اور ماتریدیہ کے نزدیک محال بالذات کا مکلف کرنا صحیح نہیں ہے اور اکثر شوافع اشاعرہ ہیں اور اکثر احناف ماتریدیہ ہیں۔

جن کا ایمان نہ لانا مقدر ہو چکا ہے ان کو تبلیغ کرنے کی وجہ

اگر یہ سوال ہو کہ جب یہ کفار تبلیغ کے باوجود اسلام قبول نہیں کریں گے تو پھر ان کو تبلیغ کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان کو تبلیغ نہ کی جائے تو ممکن ہے وہ قیامت کے دن یہ عذر پیش کریں کہ ہم کو تبلیغ ہی نہیں کی گئی' ہم اسلام کیسے لاتے؟ لہٰذا ان پر حجت تمام کرنے کے لیے ان کو تبلیغ کی گئی' دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں ان کو تبلیغ کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہر حال ثواب حاصل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "سواء علیهم. ان کے لیے برابر ہے" یہ نہیں فرمایا: "سواء علیك. آپ کے حق میں برابر ہے" جیسا کہ بت پرستوں کے متعلق فرمایا:

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ○ (الاعراف: ۱۹۳)

اور (اے مشرکو!) اگر تم اپنے بتوں کو اپنی ہدایت کے لیے پکارو تو وہ تمہارے پیچھے نہ آسکیں گے' (لہٰذا) تمہارے لیے برابر ہے کہ تم ان کو پکارو یا چپ رہو ○

اگر اس آیت سے معین کفار مراد ہوں جیسا کہ حضرت انس کی روایت ہے یا جس طرح علامہ بیضاوی نے نقل کیا ہے[۱] کہ اس سے ابولہب' ابوجہل' وغیرہ مراد ہیں تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ جن کے ایمان نہ لانے کی آپ نے پہلے خبر دے دی ہے وہ بہر حال ایمان نہ لاسکے اور کفر پر ہی مرے۔

جب کفار کے دلوں پر مہر لگادی گئی تو پھر ان سے مواخذہ کیوں؟

اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تو ان کے لیے اسلام کے دلائل پر غور و فکر کرنا اور اس کو سننا اور دیکھنا ممکن نہ رہا تو اس صورت میں اگر وہ ایمان نہ لائے تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کفار اپنے باپ دادا کی اندھی تقلید میں راسخ ہو گئے' کفر اور معصیت سے والہانہ محبت کرنے لگے اور ایمان اور عبادت الٰہی کو بہت برا جاننے لگے اور اسلام کے دلائل میں غور و فکر کرنے سے اعراض اور امتناع پر ڈٹے رہے اور اپنی بے جا ضد اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس سرکشی اور ہٹ دھرمی کی سزا میں ان کے دلوں اور دماغوں کو ایسا بنا دیا کہ وہ قبول حق کے قابل نہ رہے اور کان حق کی سماعت سے عاری ہو گئے' اس کیفیت کو

[۱] امام ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں اسی طرح روایت کیا ہے۔ منہ

اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگانے کے ساتھ تعبیر فرمایا' اور انسان کی آنکھ خارج میں اور اپنے نفس میں جس صلاحیت سے دلائل توحید دیکھتی ہے ان کی آنکھوں سے وہ صلاحیت سلب کر لی اور اس کو ان کی آنکھوں پر پردہ کے ساتھ تعبیر فرمایا' ورنہ حسی طور پر ان کے دلوں اور کانوں پر کوئی مہر تھی اور نہ ان کی آنکھوں پر کوئی پردہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے کفار کی مسلسل ہٹ دھرمی اور عناد کی سزا میں ان سے قبول حق کی استعداد سلب کر لی' اس کو اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل آیتوں میں طبع' اغفال اور اقساء سے تعبیر فرمایا ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ. (النحل: ۱۰۸)

یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا. (الکہف: ۲۸)

اور آپ اس کی اطاعت نہ کریں جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ. (المائدہ: ۱۳)

تو ان کی (اتنی بڑی) عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی سرکشی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے بہ طور سزا ان کے دلوں اور کانوں کو قبول حق کے قابل نہ رہنے دیا' اس کی دلیل حسب ذیل آیات ہیں:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ (النساء: ۱۵۶۔۱۵۵)

پھر ان کے عہد توڑنے' اللہ کی آیات کا انکار کرنے' انبیاء (علیہم السلام) کو ناحق قتل کرنے اور یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں' (یہ غلاف نہیں) بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگادی تو ان میں سے ایمان نہیں لائیں گے مگر تھوڑے ۝ اور ان کے کفر اور مریم پر بہت بڑا بہتان باندھنے کی وجہ سے بھی ۝

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ. (الانفال: ۲۳)

اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو ان کو ضرور سنا دیتا۔

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (المطففین: ۱۴)

ہرگز نہیں! بلکہ ان کے کرتوتوں نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ۝

امام ابن ماجہ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مومن کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نشان ہو جاتا ہے' پس اگر وہ توبہ کرے' اس گناہ سے باز آئے اور استغفار کرے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر وہ زیادہ گناہ کرے تو وہ سیاہ نشان زیادہ ہو جاتے ہیں اور یہی وہ زنگ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے: "كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝" (المطففین: ۱۴)۔

(سنن ابن ماجہ ص ۳۱۳' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۷' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

حافظ سیوطی نے اس حدیث کو امام احمد' امام عبد بن حمید' امام حاکم' امام ترمذی (موخر الذکر اماموں نے اس حدیث کو صحیح سند سے روایت کیا ہے) امام نسائی' امام ابن ماجہ' امام ابن جریر' امام ابن حبان' امام ابن المنذر' امام ابن مردویہ اور امام بیہقی کی ''شعب الایمان'' کے حوالوں سے ذکر کیا ہے۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۳۲۵ 'مطبوعہ مکتبہ آیت اللہ العظمی' ایران)

ہر چند کہ اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ معصیت سے مومن کے دل پر زنگ چڑھ جاتا ہے' اور اگر معصیت سے توبہ نہ کی جائے تو وہ زنگ اور زیادہ ہو جاتا ہے تاہم اس حدیث سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب معصیت سے دل پر زنگ چڑھ جاتا ہے اور معصیت پر اصرار سے وہ زنگ زیادہ ہو جاتا ہے تو کفر اور اس پر اصرار اور ہٹ دھرمی سے تو دل بہ طریق اولیٰ مکمل طور پر سیاہ اور تاریک ہو جاتا ہے اور دل کی یہ سیاہی اور تاریکی کفار کی اپنی شامت اعمال کی وجہ سے ہے' اللہ کا ان پر کوئی ظلم اور جور نہیں ہے۔

قلب کی تعریف

قلب گوشت کا ایک صنوبری عضو ہے' جس کا کام خون کو تمام جسم میں پہنچانا ہے' دل کے پھیلنے اور سکڑنے سے پورے جسم میں خون گردش کرتا ہے' اور جب طب اور میڈیکل سائنس کی زبان میں دل کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے یہی معنی مراد ہوتا ہے اور ادب اور روزمرہ گفتگو میں دل کے لفظ سے عقل کا ارادہ کیا جاتا ہے کیونکہ سوچ و بچار' غور و فکر اور علم اور ادراک کا محل عقل ہے اور قرآن طب اور میڈیکل سائنس کی کتاب نہیں ہے بلکہ رشد و ہدایت کی کتاب ہے اور اس میں عرب کے عام رواج اور اسلوب کلام کے مطابق خطاب کیا گیا ہے' اس لیے قرآن کی زبان میں قلب سے عقل ہی مراد ہوتی ہے' اس پر مزید تفصیل کے لیے ''شرح صحیح مسلم'' جلد رابع کا مطالعہ فرمائیں'' فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَآ '' (الحج: ۴۶) کی تفسیر میں ہم اس پر ان شاء اللہ سیر حاصل بحث کریں گے۔

علامہ بیضاوی لکھتے ہیں:

اور قلب سے مراد علم کا محل ہے اور کبھی قلب کا اطلاق کیا جاتا ہے اور اس سے عقل اور معرفت مراد ہوتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ. (ق: ۳۷) — بے شک اس قرآن میں اس شخص کے لیے نصیحت ہے جس کے پاس عقل اور معرفت ہو۔

(انوار التنزیل ص ۲۵ (درسی) مطبوعہ مطبع سعیدی' کراچی)

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ

اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لے آئے' حالانکہ وہ

وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ ⑧ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا

مومن نہیں ہیں○ وہ (بہ زعم خویش) اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے ہیں' اور (درحقیقت) وہ صرف

يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ⑨ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ

اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے○ ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری

وقف لازم

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًاۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌۢ ۙ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾

کو زیادہ کر دیا' اور ان کے لیے درد ناک عذاب ہے' کیونکہ وہ جھوٹ بولتے تھےo

اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو قرآن مجید کے بیان سے شروع کیا اور یہ فرمایا: یہ کتاب متقین کے لیے ہدایت ہے' پھر تین آیتوں میں متقین کی پانچ صفات بیان کیں' اس کے بعد دو آیتوں میں کفار کا بیان کیا جو متقین کی ظاہراً اور باطناً ضد ہیں' پھر اس کے بعد اب تیرہ آیتوں میں منافقین کا بیان فرمایا ہے جو کفر اور ایمان کے درمیان مذبذب تھے' یہ زبان سے ایمان لائے اور دل سے ایمان نہیں لائے' یہ کفر کی بدترین قسم ہے' اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض ہے' کیونکہ انہوں نے کفر پر ایمان کا ملمع چڑھایا' دھوکہ اور فریب سے کام لیا اور درپردہ مسلمانوں کے ساتھ استہزاء کیا' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے خبث' جہل ان کے فریب اور ان کی ہٹ دھرمی کا طویل بیان فرمایا' ان کی کئی مثالیں بیان فرمائیں اور یہ اعلان فرمایا کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں رہیں گے۔

''ومن الناس'' میں جن لوگوں کا ذکر فرمایا ہے یہ منافقین کی وہ جماعت ہے جو نزول قرآن کے زمانہ میں تھی' ان میں بڑا منافق عبداللہ بن ابی بن سلول تھا' ان میں اکثر یہودی تھے جو مطلب برآری کے لیے وقتی طور پر بہ ظاہر مسلمان ہو گئے تھے۔

''الیوم الاخر'' سے مراد حشر سے لے کر غیر متناہی مدت ہے یا روز حشر سے لے کر جنتیوں کے جنت میں اور دوزخیوں کے دوزخ میں جانے کا زمانہ مراد ہے۔

منافقین نے خصوصیت سے یہ کہا کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور آخرت پر ایمان لائے' کیونکہ یہودیوں کا درحقیقت اللہ پر ایمان تھا نہ آخرت پر' اللہ پر ایمان اس لیے نہیں تھا کہ وہ کہتے تھے کہ عزیز اللہ کا بیٹا ہے' اس لیے وہ مشرک تھے اور آخرت پر اس لیے ایمان نہیں تھا کہ ان کا اعتقاد تھا کہ جنت میں یہودیوں کے سوا اور کوئی داخل نہیں ہوگا' اس لیے انہوں نے ملمع کاری کے لیے اللہ اور آخرت پر ایمان کا ذکر کیا تا کہ مسلمان یہ سمجھیں کہ وہ یہودیت سے تائب ہو کر خالص مسلمان ہو گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا: وہ مومن نہیں ہیں' یعنی وہ ان سچے اور مخلص مسلمانوں میں داخل نہیں ہیں' جن کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خلوت اور جلوت پر مطلع ہے' کیونکہ منافقین بعض ظاہری عبادات کر لیتے تھے اور یہ زعم کرتے تھے کہ ان سے ان کا رب راضی ہو جائے گا' اس کے بعد حرص' طمع' شر اور فساد اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت اور دسیسہ کاری میں مشغول رہتے تھے جیسا کہ اس کے بعد کی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے فتنہ اور فساد کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

منافقین کے اللہ اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے سلسلہ میں اعتراضات کے جوابات

''یخادعون'' کا لفظ ''خدع'' سے بنا ہے' ''خدع'' کا معنی ہے: کسی شخص کے ساتھ کیے ہوئے مکر و فریب یا سازش کو مخفی رکھ کر اس سے خیر خواہی اور ہمدردی کا اظہار کرنا' جس کا خلاصہ ہے: اس کو دھوکہ دینا' اور ''یخادعون'' چونکہ باب ''مفاعلہ'' سے ہے' اس لیے اس کا معنی ہے: ہر فریق کا دوسرے فریق کو دھوکہ دینا۔

منافقوں کا مسلمانوں کو دھوکہ دینا یہ تھا کہ وہ مسلمانوں پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ مومن ہیں اور اپنے کفر کو مخفی رکھتے تا کہ مسلمانوں کے خفیہ منصوبوں پر مطلع ہوں اور پھر اس کی خبر مسلمانوں کے دشمنوں یہودیوں اور مشرکوں تک پہنچا دیں۔

اس آیت میں یہ فرمایا کہ منافقین اللہ اور مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں' مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی تو وضاحت ہو گئی' اب سوال یہ ہے کہ اللہ کو دھوکہ دینا کس طرح صحیح ہوگا' کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں ہوتی اور نہ وہ خود اللہ کو دھوکہ دینے کا قصد

کرتے تھے اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں لفظ اللہ سے پہلے لفظ رسول بہ طور مضاف محذوف ہے اور یہ مجاز بالحذف ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ دیتے تھے دوسرا جواب یہ ہے کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نائب اور خلیفہ ہیں' اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاملہ کیا جائے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے' اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ دینا اللہ کو دھوکہ دینا ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اس کو واضح فرمایا ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (النساء: ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت عقبہ ثانیہ میں ستر انصار سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلہ میں خریدا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ (التوبہ: ۱۱۱) بے شک اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ (الفتح: ۱۰) بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔

سو جس طرح آپ کی اطاعت کرنا' اللہ کی اطاعت کرنا' آپ کا خریدنا' اللہ کا خریدنا ہے اور آپ سے بیعت کرنا اللہ سے بیعت کرنا ہے اسی طرح آپ کو دھوکہ دینا اللہ کو دھوکہ دینا ہے اور یہ ''مجاز فی النسبۃ الایقاعیہ'' ہے۔

دوسرا سوال یہاں پر یہ ہے کہ ''یخادعون'' ''باب'' ''مفاعلہ'' سے ہے اور اب اس باب کے اعتبار سے اس کا معنی ہے: ہر ایک کا دوسرے کو دھوکہ دینا' منافقین تو اللہ کو اور مسلمانوں کو دھوکہ دیتے تھے' اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ کہنا کس طرح درست ہوگا کہ وہ منافقین کو دھوکہ دیتا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں استعارہ تمثیلیہ[1] ہے یعنی منافقین کی اللہ کے سامنے ایمان کو ظاہر کرنے اور کفر کو مخفی رکھنے کی کارروائی اور اس کی سزا میں اللہ کی منافقوں پر مسلمانوں کے احکام جاری کرنے کی کارروائی (حالانکہ وہ اس کے نزدیک بدترین کافر ہیں) کی مثال ایسے ہے جیسے دو شخص ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کی کارروائی کرتے ہیں' دوسرا جواب یہ ہے کہ ''یخادعون'' ''یخدعون'' کے معنی میں ہے اور اس کو مبالغۃً ''یخادعون'' کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے۔

شعور کا معنی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ صرف اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے' عقل سے جو ادراک کیا جائے اس کو علم کہتے ہیں اور حواس سے جو ادراک کیا جائے اس کو شعور کہتے ہیں۔ (البقرہ: ۹)

مرض کی تعریف اور منافقین کے مرض کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری کو زیادہ کر دیا۔ (البقرہ: ۱۰)

انسان کے بدن کو ایسی چیزیں عارض ہوں جن سے اس کے مزاج اور اعتدال میں فرق واقع ہو اور اس کی کارکردگی متاثر ہو جائے' اس کو مرض کہتے ہیں' عوارض جسمانیہ میں مرض حقیقت ہے اور عوارض نفسانیہ مثلاً حسد' بغض' برائی سے محبت وغیرہ میں مرض مجاز ہے' منافقین کا مرض نفسانی تھا' کیونکہ جب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تھے مدینہ میں یہودیوں کی ریاست جاتی رہی تھی' اس غم میں ان کا دل جلتا رہتا تھا اور یہی جلنا اور حسد کرنا ان کا مرض تھا' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

---

[1] ایک مرکب سے جو حالت یا کیفیت منتزع ہوتی ہے اس کو اس حالت یا کیفیت سے تشبیہ دینا جو دوسرے مرکب سے منتزع ہو رہی ہو۔

اقتدار دن بدن بڑھ رہا تھا' اس سے ان کا مرض بڑھ رہا تھا' یا بار بار وحی نازل ہونے اور ان کو دن بہ دن زیادہ احکام کا مکلف کرنے سے ان کا مرض بڑھ رہا تھا۔

جھوٹ کی تعریف' اس کا شرعی حکم اور منافقین کے جھوٹ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے کیونکہ وہ جھوٹ بولتے تھے ○ (البقرہ: ۱۰)

منافقین کا جھوٹ یہ تھا کہ ان کے دل میں کفر تھا اور زبان سے "امنا" (ہم ایمان لائے) کہہ کر جھوٹ بولتے تھے' جو خبر واقع کے مطابق نہ ہو وہ جھوٹ ہے' جھوٹ بولنا حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹ بولنے پر دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے۔

جھوٹ بولنے کی ممانعت اور اس کے عذاب کے متعلق احادیث

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاؤ' کیونکہ جھوٹ فجور (گناہ) تک پہنچاتا ہے اور فجور دوزخ تک پہنچاتا ہے' ایک شخص جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹ کے مواقع تلاش کرتا ہے' حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کو کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۳۲۵' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت حفص بن عاصم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو بیان کردے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آخر زمانہ میں ایسے دجال اور کذاب ہوں گے جو تم سے ایسی احادیث بیان کریں گے جو تم نے سنی ہوں گی نہ تمہارے باپ دادا نے' تم ان سے دور رہو' وہ تم سے دور رہیں' کہیں وہ تم کو گمراہ نہ کردیں اور فتنے میں مبتلا نہ کردیں۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس وقت تک بندہ کا ایمان مکمل نہیں ہوگا' جب تک کہ وہ جھوٹ کو ترک نہ کردے حتیٰ کہ مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولے اور ریا کو ترک کردے خواہ وہ اس میں صادق ہو۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۳۶۴' ۳۵۲' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا: میں نے رات کو خواب میں دیکھا ہے کہ جبرائیل اور میکائیل میرے پاس آئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ارض مقدسہ میں لے گئے' میں نے دیکھا وہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا آدمی اس کے پاس کھڑا ہوا تھا جس کے ہاتھ میں لوہے کا آنکڑا تھا' اس نے وہ آنکڑا اس کی باچھ میں داخل کیا اور آنکڑے سے اس کی باچھ کو کھینچ کر گدی تک پہنچا دیا' پھر وہ آنکڑا دوسری باچھ میں داخل کیا اور اس باچھ کو گدی تک پہنچا دیا' اتنے میں پہلی باچھ مل گئی اور اس نے پھر اس میں آنکڑا ڈال دیا' (الی قولہ) جبرئیل نے کہا: جس شخص کی باچھ پھاڑ کر گدی تک پہنچائی جارہی تھی یہ وہ شخص ہے جو جھوٹ بولتا تھا' پھر اس سے وہ جھوٹ نقل ہو کے ساری دنیا میں پھیل جاتا

تھا اس کو قیامت تک اسی طرح عذاب دیا جاتا رہے گا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۸۵ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

جھوٹ بولنے کی رخصت کے مواقع

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ کذب حرام ہے لیکن حلال اور حرام کرنے کے احکام شارع کے اختیار میں ہیں اللہ تعالیٰ جس چیز کو چاہے حلال کر دے اور جس چیز کو چاہے حرام کر دے اللہ اور اس کے رسول نے کذب کو حرام قرار دیا ہے لیکن بعض مواقع پر اللہ اور اس کے رسول نے کذب کی اجازت دی ہے۔ امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

عن اسماء بنت یزید قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یحل الکذب الا فی ثلاث یحدث الرجل امرء تہ یرضیھا والکذب فی الحرب والکذب لیصلح بین الناس.

(جامع ترمذی ص ۲۸۷ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی)

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین صورتوں کے سوا جھوٹ بولنا جائز نہیں ہے: (۱) ایک شخص اپنی بیوی کو راضی کرنے کے لیے جھوٹ بولے (۲) جنگ میں جھوٹ بولنا (۳) لوگوں میں صلح کرانے کے لیے جھوٹ بولنا۔

جان' مال اور عزت بچانے کے لیے جھوٹ بولنے کی اجازت

علامہ شامی ''احیاء العلوم'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ہر وہ نیک مقصد جس کو صدق اور کذب دونوں سے حاصل کیا جا سکتا ہو اس میں جھوٹ بولنا حرام ہے اور اگر کسی نیک مقصد کو صرف جھوٹ بولنے سے حاصل کیا جا سکتا ہو اور وہ مقصد مباح ہو تو اس کے لیے جھوٹ بولنا مباح ہے اور اگر کسی نیک مقصد کو صرف جھوٹ بولنے سے حاصل کیا جا سکتا ہو اور وہ مقصد واجب ہو تو اس کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہے' مثلاً کسی شخص نے دیکھا کہ ایک ظالم کسی بے گناہ مسلمان کو قتل کر رہا ہے یا ایذاء پہنچا رہا ہے اور وہ جھوٹ بول کر اس کو بچا سکتا ہے تو اس صورت میں جھوٹ بولنا واجب ہے' اسی طرح اگر ظالم اس سے کسی مسلمان کی امانت چھیننا چاہتا ہے تو اس کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہے' اسی طرح لڑائی میں صلح کرانے کے لیے اور کسی مظلوم کی دلجوئی کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے' اسی طرح اگر کسی شخص نے چھپ کر زنا کیا یا شراب پی یا حاکم اس کے متعلق سوال کرے تو اس کے لیے یہ کہنا جائز ہے کہ یہ کام میں نے نہیں کیا' کیونکہ یہ کام ہر چند کہ بے حیائی ہے لیکن اس کا اظہار کرنا ایک اور بے حیائی ہے' اسی طرح اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کا راز بتانے سے انکار کرے' اور یہ دیکھنا چاہیے کہ جھوٹ بولنے پر جو خرابی مترتب ہو رہی ہے آیا وہ سچ پر مترتب ہونے والی خرابی سے زیادہ ہے یا نہیں' اگر جھوٹ بولنے سے زیادہ خرابی مترتب ہو تو جھوٹ نہ بولے ورنہ جھوٹ بول سکتا ہے۔ اگر جھوٹ بولنے سے انسان کا اپنا حق ضائع ہوتا ہے تو عزیمت یہ ہے کہ جھوٹ نہ بولے' اگر دوسرے مسلمان کا حق ضائع ہوتا ہے تو پھر اس پر واجب ہے کہ وہ جھوٹ بولے اور دوسرے مسلمان کے حق کی حفاظت کرے[1]۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان کا اپنی جان' مال اور عزت بچانے کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے اور دوسرے مسلمان کی جان' مال اور عزت بچانے کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہے۔

شعر اور مبالغہ میں جھوٹ کا جواز

کسی بات میں مبالغہ کرنا جھوٹ نہیں ہے جیسا کہ کوئی شخص کہے: میں تمہارے پاس ہزار بار گیا ہوں' یعنی بار بار گیا ہوں' مبالغہ کے جواز پر اس حدیث صحیح میں دلیل ہے: ''اما ابو جھم فلا یضع عصاہ عن عاتقہ''۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۸۳ مطبوعہ

[1] علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ' رد المختار ج ۵ ص ۲۷۷ مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ استنبول ۱۳۲۷ھ

اصح المطابع ' کراچی) '' لیکن ابوجہم تو اپنے کندھے سے لاٹھی اتارتا ہی نہیں '' یعنی وہ بیوی کو بہت مارتا ہے' اسی طرح شعر میں بھی جھوٹ جائز ہے جبکہ اس کو مبالغہ پر نہ محمول کیا جا سکے' جیسا کہ یہ شعر ہے:

انا ادعوك ليلا ونهارا ولا اخلى مجلسا عن شكرك

'' میں دن رات تمہارے لیے دعا کرتا ہوں' اور ہر مجلس میں تمہارا شکر ادا کرتا ہوں ''۔

علامہ رافعی اور علامہ نووی نے ان دونوں صورتوں کو جائز لکھا ہے۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۲۷۷ ' مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ استنبول' ۱۳۲۷ھ)

ہر چند کہ علامہ شامی نے علامہ رافعی اور علامہ نووی کے حوالے سے شعر میں بغیر مبالغہ کے بھی جھوٹ بولنا جائز لکھا ہے لیکن ہمارے نزدیک' اگر مبالغہ نہ ہو تو پھر شعر میں جھوٹ بولنا جائز نہیں ہے' کیونکہ مبالغہ کے لیے تو حضرت ابوجہم کی حدیث اصل ہے اور شعر میں جھوٹ کے جواز پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

تعریض اور توریہ میں جھوٹ بولنے کا جواز

جمہور فقہاء اسلام نے تعریض اور توریہ کے طور پر جھوٹ بولنا جائز لکھا ہے بلکہ بعض فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ تعریض اور توریہ میں اس قدر وسعت ہے کہ اگر تعریض اور توریہ سے کام لیا جائے تو پھر حقیقۃً جھوٹ بولنے کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی' اس پر دلائل دینے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ تعریض اور توریہ کی تعریفات ذکر کر دیں تاکہ عام قارئین اس بحث سے مستفید ہو سکیں۔

تعریض کا لغوی معنی ہے: دوسرے پر ڈھال کر بات کرنا۔ (المنجد)

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں: تعریض' تصریح نہ کرنے کو کہتے ہیں اور معاریض کا معنی ایک چیز کا دوسری چیز سے توریہ (کنایہ) کرنا ہے' حضرت عمران بن حصین بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معاریض میں جھوٹ سے بچنے کی گنجائش ہے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: معاریض مسلمان کو جھوٹ سے مستغنی کر دیتی ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مجھے معاریض سرخ اونٹوں سے زیادہ پسند ہیں۔ اگر کسی عورت کو اس کی عدت میں نکاح کا پیغام دینا ہو تو اس کی تصریح نہ کرے اور تعریضاً کہے: تم بہت خوبصورت ہو' یا کہے: '' مجھے نکاح کی ضرورت ہے۔ حدیث میں ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے فرمایا: '' ان وسادك لعريض '' تمہارا تکیہ بہت چوڑا ہے'' اور تکیہ سے ان کی نیند کا ارادہ کیا یعنی تم بہت سوتے ہو' حدیث میں ہے:

من عرض عرضنا له ومن مشى على الكلا القيناه في النهر

جو شخص تعریض کرے گا تو ہم بھی اس کے ساتھ تعریض کریں گے اور جو شخص دریا کے کنارے چلے گا ہم اس کو دریا میں ڈال دیں گے۔

اس کی تفسیر یہ ہے کہ جو شخص کسی مسلمان پر تعریضاً تہمت لگائے گا تو ہم اس کو تعریضاً سزا دیں گے یعنی ایسی سزا دیں گے جو حد سے کم ہو گی اور جو شخص کسی پر صراحۃً تہمت لگائے گا اور تہمت کی کشتی پر سوار ہو کر دریا میں چلے گا ہم اس پر حد جاری کریں گے اور اس کو '' حد '' کے دریا میں ڈبو دیں گے۔ (لسان العرب ج ۷ ص ۱۸۴۔ ۱۸۳ ' مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ' قم ایران' ۱۴۰۵ھ)

علامہ تفتازانی تعریض کی تعریف میں لکھتے ہیں: کلام کو ایک ایسی جانب پھیرنا جو مقصود پر دلالت کرے' تعریض ہے' یعنی جب اشارہ ایک جانب کیا جائے اور مراد دوسری جانب ہو تو یہ تعریض ہے۔ (مختصر المعانی ص ۲۴۱۔ ۲۴۰ ' مطبوعہ میر محمد کتب خانہ' کراچی)

خلاصہ یہ ہے کہ جب کلام میں صراحۃً ایک شخص کی طرف کسی فعل کا اسناد ہو اور اشارہ اور مراد کوئی دوسرا شخص ہو تو یہ تعریض

ہے مثلاً کوئی بڑا افسر دیر سے دفتر میں آتا ہو جس سے لوگوں کے کاموں میں دشواری ہوتی ہو اور اس کو صراحۃً تنبیہ کرنا اس کے وقار اور مرتبہ کے خلاف ہو تو کوئی شخص اس سے کہے کہ دفتر کا سٹاف یا کلرک وغیرہ دیر سے دفتر آتے ہیں اور اس سے بڑا حرج ہوتا ہے۔

توریہ کا معنی چھپانا اور کنایہ کرنا ہے۔ علامہ زبیدی لکھتے ہیں: ''ورى الخبر تورية'' کا معنی ہے: اصل خبر کو چھپا کر کچھ اور ظاہر کیا' حدیث میں ہے کہ جب آپ سفر کا ارادہ کرتے تو سفر کو چھپا کر یہ وہم ڈالتے کہ آپ کسی اور چیز کا ارادہ کر رہے ہیں۔

(تاج العروس ج ۱۰ ص ۳۸۹' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

علامہ تفتازانی توریہ کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ توریہ کو ایہام بھی کہتے ہیں اور اس کی تعریف یہ ہے کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوں: قریب اور بعید' اور بولنے والا کسی خفی قرینہ کی بناء پر اس لفظ کا بعید معنی مراد لے اور مخاطب اس سے قریب سمجھے۔

(مختصر المعانی ص ۴۵۷' مطبوعہ میر محمد کتب خانہ' کراچی)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف تین (ظاہری) جھوٹ بولے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۷۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث میں توریہ پر جھوٹ کا اطلاق کیا گیا ہے کیونکہ وہ ظاہراً اور صورۃً جھوٹ ہوتا ہے حقیقۃً جھوٹ نہیں ہوتا۔

قرآن اور حدیث میں تعریض اور توریہ کی بہ کثرت مثالیں ہیں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ ○ (الصّٰفّٰت: ۸۹) حضرت ابراہیم نے کہا: میں بیمار ہوں ○

سقیم کا قریب معنی ہے: جسمانی بیمار اور بعید معنی ہے: روحانی بیمار' حضرت ابراہیم جسمانی بیمار نہ تھے انہوں نے اس لفظ سے توریہ کر کے روحانی بیماری مراد لی' یعنی قوم کی بت پرستی کی وجہ سے ان کی روح بیمار تھی یا مستقبل میں بیمار ہونا مراد لیا۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا یٰٓاِبْرٰهِیْمُ ○ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا یَنْطِقُوْنَ ○ (الانبیاء: ۶۲-۶۳)

انہوں نے کہا: اے ابراہیم! کیا آپ نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کام کیا ہے؟ ○ ابراہیم نے کہا: بلکہ ان کے اس بڑے (بت) نے یہ کام کیا ہے' اگر یہ بولتے ہیں تو تم ان سے پوچھ لو ○

اس آیت میں ''كبيرهم هذا'' کا قریب معنی ہے: اس بڑے بت نے' اور اس کا بعید معنی ہے: قوم کے اس بڑے شخص نے' لوگوں نے یہی سمجھا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ اس بڑے بت نے باقی بتوں کو توڑا ہے' حالانکہ آپ کی مراد یہ تھی کہ قوم کے اس بڑے شخص یعنی خود حضرت ابراہیم نے ان بتوں کو توڑا ہے اور آپ نے اس بڑے بت کی طرف اسناد کا ایہام اس لیے کیا ہے کہ ان کی قوم خود کہے کہ یہ بت تو ہل جل بھی نہیں سکتے' بتوں کو کس طرح توڑ سکتے ہیں اور ان کے خلاف حجت قائم ہو جائے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابراہیم اور حضرت سارہ ایک ظالم بادشاہ کے ملک میں گئے' اس بادشاہ کو بتایا گیا کہ اس ملک میں ایک شخص آیا ہے' اس کے ساتھ ایک عورت ہے جو تمام لوگوں سے زیادہ خوبصورت ہے' بادشاہ نے حضرت ابراہیم کو بلوایا اور پوچھا کہ یہ عورت کون ہے؟ حضرت ابراہیم نے کہا: یہ میری بہن ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۷۴ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی ۱۳۸۱ھ)

''اخت'' کے دو معنی ہیں' قریب معنی ہے: نسبی بہن اور بعید معنی ہے: دینی بہن' بادشاہ نے اس لفظ سے نسبی بہن سمجھا اور حضرت ابراہیم نے دینی بہن کا ارادہ کیا اور یہ توریہ ہے۔

نیز امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ کی خدمت میں آ کر ایک شخص نے سواری طلب کی' آپ نے فرمایا: میں تم کو اونٹ کے بچہ پر سوار کروں گا' اس شخص نے کہا: یا رسول اللہ! میں اونٹ کے بچے کا کیا کروں گا' آپ نے فرمایا: جو اونٹ پیدا ہوتا ہے وہ اونٹ کا بچہ ہی ہوتا ہے۔ (الادب المفرد ص ۷۷ 'مطبوعہ مکتبہ اثریہ' سانگلہ ہل)

اس حدیث کو امام ابوداؤد[1] اور امام ترمذی نے بھی روایت کیا۔[2]

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا بیٹا فوت ہو گیا' انہوں نے (بیوی سے) کہا: لڑکے کی طبیعت کیسی ہے؟ حضرت ام سلیم نے کہا: وہ پر سکون ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کو آرام مل گیا اور حضرت ابوطلحہ نے ان کی بات کو سچ سمجھا۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۱۷ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ام سلیم نے جو کہا کہ ''بیٹا پر سکون ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کو راحت مل گئی'' اس کا قریب معنی یہ تھا کہ اس کو بیماری سے شفا مل گئی ہے اور بعید معنی یہ تھا کہ وہ فوت ہو گیا اور اس کو ابدی راحت مل گئی ہے' حضرت ام سلیم نے اس معنی کا ارادہ کیا تھا کیونکہ حضرت ابوطلحہ اسی وقت سفر سے آئے تھے اور وہ ان کو آتے ہی کوئی تکلیف دہ بات سنانا نہیں چاہتی تھیں اس لئے انہوں نے صراحۃً یہ نہیں کہا کہ وہ فوت ہو گیا اور توریہ سے کلام کیا۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ ہم سے خوش طبعی کرتے ہیں' آپ نے فرمایا: میں حق کے سوا اور کچھ نہیں کہتا۔ (جامع ترمذی ص ۲۹۳۔ ۲۹۲ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔ (الادب المفرد ص ۷۷ 'مطبوعہ مکتبہ اثریہ' سانگلہ ہل)

توریہ کے سلسلے میں فقہاء کی رائے

علامہ شامی لکھتے ہیں: غرض صحیح کے لیے توریہ اور تعریض جائز ہے مثلاً مزاح میں' جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں کوئی بڑھیا نہیں جائے گی (یعنی بڑھیا بہ حیثیت بڑھیا نہیں جائے گی بلکہ جوان ہو کر جائے گی)' نیز فرمایا: تیرے شوہر کی آنکھ میں سفیدی ہے' نیز فرمایا: ہم تم کو اونٹ کے بچہ پر سوار کریں گے (کیونکہ ہر اونٹ کسی اونٹ کا بچہ ہوتا ہے)۔

(ردالمحتار ج ۵ ص ۲۷۸ 'مطبوعہ مطبع عثمانیہ' استنبول' ۱۳۲۷ھ)

خلاصہ بحث

قرآن مجید کی آیات' احادیث' آثار صحابہ اور فقہاء کی تصریحات سے یہ واضح ہو گیا کہ جس جگہ کسی مصلحت سے جھوٹ بولنا پڑے تو صراحۃً جھوٹ بولنے کے بجائے توریہ اور تعریض سے کام لینا چاہیے تاہم بعض مواقع پر صراحۃً جھوٹ بولنے کی بھی

---

[1] امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ 'سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۳۲۶ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ

[2] امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی ص ۲۹۲ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

گنجائش ہے جیسا کہ ہم نے امام غزالی اور علامہ شامی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ مسلمان کے لیے اپنی جان' مال اور عزت بچانے کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے لیکن یہ رخصت ہے اور عزیمت اس کے برعکس ہے اور دوسرے مسلمان کی جان' مال اور عزت بچانے کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہے اور ان مواقع پر بھی توریہ مستحسن ہے۔

فقہاء کرام نے اپنی جان اور دوسرے مسلمان کی جان بچانے کے سلسلے میں جو جواز اور وجوب کا فرق کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے معاملہ میں تو رخصت کو چھوڑ کر عزیمت پر عمل کر سکتا ہے لیکن دوسرے شخص کے معاملہ میں اس کو یہ اختیار نہیں ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ

اور جب ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد نہ کرو تو انہوں نے کہا: ہم تو صرف

مُصْلِحُونَ ﴿١١﴾ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ﴿١٢﴾

اصلاح کرنے والے ہیں O سنو بے شک یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں لیکن ان کو شعور نہیں ہے O

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ

اور جب ان سے کہا گیا: اس طرح ایمان لاؤ جس طرح اور لوگ ایمان لائے ہیں' تو انہوں نے کہا: کیا ہم اس طرح

كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا

ایمان لائیں جس طرح بے وقوف ایمان لائے ہیں؟ سنو یہی لوگ بے وقوف ہیں

يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾

لیکن ان کو علم نہیں ہے O

منافقین اپنے افساد کو اصلاح کیوں کہتے تھے؟

منافقین کا فساد یہ تھا کہ وہ کفار سے تعاون کر کے اور مسلمانوں کے راز ان پر ظاہر کر کے جنگ کی آگ بھڑ کاتے تھے اور فتنوں کو جگاتے تھے کیونکہ جنگ کے نتیجہ میں زمین پر لہلہاتے ہوئے کھیت اجڑ جاتے تھے' مال اور مویشی ہلاک ہو جاتے تھے اور انسانوں کا قتل ہوتا تھا' یا ان کا فساد یہ تھا کہ وہ زمین پر اللہ کی نافرمانی کرتے تھے اور شریعت کے ساتھ استہزاء کرتے تھے اور اس کے نتیجہ میں زمین پر خوں ریزی ہوتی تھی اور فتنہ اور فساد ہوتا تھا اور چونکہ منافقین کے دلوں میں بیماری تھی' اس لیے وہ اپنے فساد کرنے کو اصلاح اور اپنی شر انگیزی کو کار خیر گمان کرتے تھے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَفَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا ۖ (الفاطر: ۸) تو کیا جس شخص کے لیے اس کا برا کام مزین کر دیا گیا تو اس نے اس کو اچھا سمجھا۔

منافقین کا مقصد یہ تھا کہ ہم تو فساد کرنے سے بہت دور ہیں' کیونکہ ہم اپنے علماء اور پیروں کی پیروی کرتے ہیں' جنہوں

نے انبیاء علیہم السلام سے تعلیم حاصل کی ہے تو ہم ان کے طریقہ کو کیسے چھوڑیں اور اپنے گلے میں ایک نئے دین کا قلادہ کیسے ڈال لیں؟ اور ہم مسلمانوں کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکا کر ان کو کمزور کررہے ہیں تاکہ یہ نیا دین پھلنے پھولنے نہ پائے' لہٰذا لوگوں کو اس نئے دین سے دور رکھنے کی ہماری یہ کوشش لوگوں کی اصلاح اور ان کی خیر خواہی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

عہد رسالت سے لے کر آج تک افساد کو اصلاح کا نام دینے کا تسلسل

ہر زمانہ میں مفسدین کا یہی حال رہا ہے' جو لوگ دین میں نئی نئی بدعات پیدا کرتے ہیں اور نئے نئے مذاہب ایجاد کرتے ہیں اور الحاد اور بے دینی کی تحریکات چلاتے ہیں' وہ اپنی مخترعہ بدعات' مذاہب اور تحریکات کو نہایت خوش نما اور خوبصورت نام دے دیتے ہیں' جیسے محبت اہل بیت کے نام پر تعزیہ داری' ماتم اور سب صحابہ کی بدعات نکل آئیں ہیں اور توحید کے نام پر انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کی شان اور عظمت کو کم کیا جاتا ہے اور جب ان لوگوں کا محاسبہ کیا جائے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کر رہے ہیں' اہل بیت کی عظمت اجاگر کررہے ہیں اور شرک کو مٹا رہے ہیں' اسی طرح بعض غیر معتدل لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت کے اظہار میں غلو کرتے ہیں' نماز' روزہ اور دیگر فرائض باقاعدگی سے ادا نہیں کرتے اور عید میلاد کے جلوس کو باقاعدہ میلوں ٹھیلوں کی طرح نکالتے ہیں۔ (تاہم سب جلوس ایسے نہیں ہوتے' میں نے برطانیہ میں کئی بار میلاد کے جلوسوں میں شرکت کی جن میں نعت خوانی اور ذکر ہوتا ہے' کوئی غیر شرعی بات نہیں ہوتی' صبح سے جلوس نکلتا ہے اور ظہر سے پہلے ختم ہو جاتا ہے اور تمام شرکاء جلوس باجماعت ظہر کی نماز پڑھتے ہیں اور پھر جلسہ ہوتا ہے' جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور آپ کی سیرت کا بیان ہوتا ہے اور عصر سے پہلے جلسہ ختم ہو جاتا ہے اور سب شرکاء جلسہ عصر کی نماز باجماعت ادا کرتے ہیں' کاش پاکستان کے شہروں میں بھی ایسا ہو!) اسی طرح بعض غیر معتدل مقرر اور شاعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کو اللہ تعالیٰ سے بڑھا کر بیان کرتے ہیں' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت قتادہ بن نعمان کی نکلی ہوئی آنکھ کو دوبارہ لگا دیا اور آپ کے دست اقدس کی برکت سے اس سے زیادہ نظر آنے لگا تو اس میں یہ نکتہ آفرینی کرتے ہیں کہ خدا کی دی ہوئی آنکھ سے اتنا نظر نہیں آتا تھا جتنا مصطفیٰ کی دی ہوئی آنکھ سے نظر آتا تھا' حالانکہ دونوں آنکھیں خدا کی دی ہوئی ہیں' فرق یہ ہے کہ پہلی آنکھ ماں باپ کے واسطے سے ملی ہے اور دوسری آنکھ سرکار کے ہاتھوں سے ملی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ان سے کہا گیا: اس طرح ایمان لاؤ' جس طرح اور لوگ ایمان لائے ہیں تو انہوں نے کہا: کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بے وقوف ایمان لائے ہیں؟ (البقرہ: ۱۳)

ایمان لانے کے لیے صحابہ کرام کے ایمان کا معیار ہونا

علامہ ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ''جس طرح اور لوگ ایمان لائے ہیں'' اس سے مراد اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں' اور منافقین نے جو کہا: جس طرح بے وقوف ایمان لائے ہیں' اس سے ان کی مراد بھی اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں' یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۹۹' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ قرطبی نے لکھا ہے: اس سے حضرت عبد اللہ بن سلام اور ان کے اصحاب مراد ہیں۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۲۰۵' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

علامہ سیوطی نے ان اقوال کو نقل کرنے کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ ''تاریخ ابن عساکر'' میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اس سے مراد حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم ہیں۔

(درمنثور ج ۱ ص ۳۱۔ ۳۰ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

شیعہ مفسر شیخ فضل بن حسن طبرسی لکھتے ہیں: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر نازل شدہ کتاب کی اس طرح تصدیق کرو جس طرح آپ کے اصحاب نے اس کی تصدیق کی ہے' اور ایک قول یہ ہے کہ (حضرت) عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھ جو دوسرے یہودی ایمان لائے تھے' ان کی طرح آپ کی تصدیق کرو۔

(مجمع البیان ج ۱ ص ۱۳۹ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۴۱۱ھ)

ان تفاسیر سے معلوم ہوا کہ ایمان لانے کے لیے صحابہ کرام کا ایمان معیار ہے۔

زندیق کی توبہ کی قبولیت پر دلیل

اس آیت سے زندیق کی توبہ کے مقبول ہونے پر استدلال کیا گیا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے نفاق کی خبر دی اور ان کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ظاہر اسلام کے قبول کرنے کا حکم دیا اور اللہ تعالیٰ کو ان کے فاسد عقائد کا جو علم تھا اس کے مطابق ان کے ساتھ کفار کا معاملہ کرنے کا حکم نہیں دیا' اور یہ ثابت ہے کہ یہ آیات مدینہ منورہ میں کفار سے قتال کی مشروعیت کے بعد نازل ہوئی ہیں' نیز ''صحیح بخاری'' میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا حتیٰ کہ وہ ''لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ'' کی گواہی دیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں' جب وہ ایسا کریں گے تو وہ اپنی جانوں اور مالوں کو مجھ سے محفوظ کرلیں گے' البتہ اسلام کا حق لیا جائے گا اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے[1] اور منافقین بہ ظاہر کلمہ پڑھتے تھے' نماز پڑھتے تھے اور زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کو ایمان لانے کا حکم دیا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ منافق کا ایمان لانا اور اس کی توبہ مقبول ہے' اسی پر زندیق کو قیاس کیا گیا ہے۔ اب ہم پہلے زندیق اور ملحد کی تعریفیں ذکر کریں گے' پھر ان کا شرعی حکم بیان کریں گے۔

زندیق کی تحقیق اور اس کا شرعی حکم

علامہ تفتازانی نے کافروں کی حسب ذیل اقسام لکھی ہیں:

کافر: جو شخص ظاہراً ایمان نہ لائے' منافق: جو شخص بہ ظاہر ایمان لائے اور حقیقت میں کافر ہو' مرتد: جو شخص اسلام لانے کے بعد اسلام سے رجوع کر کے کفر کو قبول کرلے' مشرک: جو شخص متعدد خدا مانے' کتابی: جو شخص ادیان سابقہ منسوخہ کا معتقد ہو جیسے یہودی اور عیسائی' دہری: جو شخص دہر کو قدیم مانے اور حوادث کی نسبت دہر کی طرف کرے' معطل: جو شخص اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم نہ کرے' زندیق: جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اعتراف کرتا ہو' شعائر اسلام کا اظہار کرتا ہو اور اس کے دل میں کفریہ عقائد ہوں۔ (شرح المقاصد ج ۵ ص ۲۲۷ 'مطبوعہ منشورات الشریف الرضی' ایران' ۱۴۰۹ھ)

ملحد: جو شخص شریعت مستقیمہ سے کفر کی کسی جہت کی طرف میلان کرے' اس میں وجود باری کو ماننے کی شرط ہے نہ نبوت کے ماننے کی شرط ہے' نہ کفر کو چھپانے کی شرط ہے' نہ پہلے اسلام کو ماننے کی شرط ہے' یہ کفر کی تمام اقسام سے عام ہے۔

(ردالمحتار ج ۳ ص ۲۹۶)

[1] امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ' صحیح بخاری ج ۱ ص ۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ

علامہ سید احمد طحطاوی حنفی زندیق کے متعلق لکھتے ہیں:

''فتاویٰ قاری الھدایہ'' میں لکھا ہے کہ زندیق وہ شخص ہے جو دہر کے قدیم ہونے کا معتقد ہو خالق اور آخرت پر ایمان نہ لائے اور اس کا اعتقاد ہو کہ اموال اور محرمات مشترک ہیں' اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھا ہے کہ زندیق وہ شخص ہے جو خدا کا قائل ہو نہ آخرت کا اور نہ کسی چیز کو حرام سمجھتا ہو' یہ علامہ ہیری سے منقول ہے' اور ''فتح القدیر'' میں ہے کہ زندیق کسی دین کا قائل نہیں ہوتا' اور ''حاشیہ ابی سعود'' میں ''ملتقطات'' سے منقول ہے کہ زندیق کی تین قسمیں ہیں: (۱) زندیق اصلی' یہ وہ عجمی شخص ہے جو اپنے سابق شرک پر قائم ہو (۲) زندیق غیر اصلی وہ شخص ہے جو پہلے مسلمان ہو اور پھر زندیق ہو جائے' اس پر اسلام پیش کیا جائے گا' اگر یہ مسلمان ہو گیا تو فبہا ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے گا' کیونکہ یہ مرتد ہے (۳) جو شخص پہلے ذمی ہو اور پھر زندیق ہو جائے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا کیونکہ کفر ملت واحدہ ہے اور ظاہر یہ ہے کہ زندیق کی توبہ مقبول ہے اور توبہ اس سے قتل کو ساقط کر دیتی ہے۔ (حاشیۃ الطحطاوی علی الدرالمختار ج ۲ ص ۴۸۵' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۵ھ)

علامہ طحطاوی نے زندیق کی جتنی تعریفیں لکھی ہیں یہ سب اس کے لغوی معنی ہیں' اصطلاح شرع میں اس کا وہی معنی ہے جو علامہ تفتازانی نے لکھا ہے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

علامہ ابن کمال پاشا نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ لغت میں زندیق اس شخص کو کہتے ہیں جو خالق کی نفی کرے' اور جو متعدد خداؤں کا قائل ہو' اور جو اللہ کی حکمت کا انکار کرے' اور اصطلاح شرع میں زندیق وہ شخص ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اعتراف کرے اور کفر کو مخفی رکھے جیسا کہ ''شرح مقاصد'' میں ہے' زندیق کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ اپنی گمراہی کی طرف دعوت نہیں دیتا تو پھر اس کی تین قسمیں ہیں (زندیق اصلی' غیر اصلی اور وہ زندیق جو پہلے ذمی ہو' ان کی تفصیل علامہ طحطاوی کی عبارت میں گزر چکی ہے) اور اگر زندیق اپنی گمراہی کی طرف لوگوں کو دعوت دے تو اگر اس نے گرفتار ہونے سے پہلے اپنے اختیار سے توبہ کر لی ہے تو اس کی توبہ قبول ہوگی ورنہ اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی اور اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ زندیق تو اپنے کفر کو مخفی رکھتا ہے' وہ اپنی گمراہی کی طرف کیسے لوگوں کو دعوت دے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنے کفر پر اسلام کا ملمع چڑھا کر اور اپنے عقائد فاسدہ کو عقائد صحیحہ کی صورت میں پیش کر کے لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے گا (جیسے ہمارے زمانہ میں مرزائی ہیں)۔ (ردالمختار ج ۳ ص ۲۹۶' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سنو یہی لوگ بے وقوف ہیں لیکن ان کو علم نہیں ہے ○ (البقرہ: ۱۳)

صحابہ کرام پر سب و شتم کی مذمت اور رد

منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو جاہل کہا' تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کیا اور ان کی زیادہ جہالت بیان کی کہ وہ نہ صرف جاہل ہیں بلکہ ان کو اپنی جہالت کا علم بھی نہیں اور اس آیت میں قصر قلب ہے اور کئی وجہ سے تاکید ہے' قصر قلب کا تقاضا یہ ہے کہ اصحاب رسول جاہل نہیں ہیں بلکہ یہی جاہل ہیں اور اپنی جہالت سے بھی جاہل ہیں اور خود کو عالم سمجھ رہے ہیں اور اس جملہ کو اللہ تعالیٰ نے ''الا' ان'' اور اسمیت جملہ سے موکد فرمایا جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ جہالت میں رہیں گے اور ان کو اپنی جہالت کا علم نہیں ہوگا' اور ایسی جہالت زیادہ لائق مذمت ہے' کیونکہ جس شخص کو کسی چیز کا پتا نہ ہو اس میں صرف ایک جہالت ہے' اور وہ بسا اوقات معذور ہوتا ہے اور جب اس کو اس چیز کا پتا چل جائے یا اس کو مسئلہ بتا دیا جائے تو اس کی جہالت زائل ہو جاتی ہے اور اس کو ہدایت سے نفع پہنچتا ہے اور جو شخص جاہل ہو اور وہ اپنی جہالت سے بھی جاہل ہو اس

میں دو جہالتیں ہیں: ایک مسئلہ سے جہالت دوسری اپنی جہالت سے جہالت اس کو جہل مرکب کہتے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کو سب و شتم کرنا اللہ کو بہت ناگوار ہے' منافقین نے ایک بار صحابہ کو جاہل کہا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ آیت نازل کر دی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ جاہل نہیں بلکہ ان کو جاہل کہنے والے خود جاہل ہیں اور اپنی جہالت سے بھی جاہل ہیں اور ان کا جہل دائمی ہے' اللہ تعالیٰ نے صحابہ کی جہل سے براءت کی اور ان کو جاہل کہنے والوں کی مذمت کی' منافقوں نے تو ایک بار صحابہ کو جاہل کہا تھا لیکن جب تک قرآن مجید پڑھا جاتا رہے گا یہ کہا جاتا رہے گا کہ منافق جاہل ہیں اور دائمی جہل میں گرفتار ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ پر سب و شتم کرنے والوں کا رد کرنا چاہیے اور صحابہ کا دفاع کرنا چاہیے کہ یہ سنت الٰہیہ ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى

اور جب یہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے' اور جب یہ اپنے شیطانوں کے ساتھ تنہائی میں

شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہیں' ہم تو ان کے ساتھ مذاق کرتے ہیں O

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾

اللہ ان کو ان کے مذاق کی سزا دے رہا ہے اور ان کو ڈھیل دے رہا ہے' یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹک رہے ہیں O

ان شیاطین کا بیان جن سے منافق خلوت میں ملتے تھے

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ بعض یہودی (یعنی منافق) جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے ملاقات کرتے تو کہتے: ہم تمہارے دین پر ہیں' اور جب اپنے اصحاب سے تنہائی میں ملتے جو کافروں کے سردار تھے' تو کہتے: یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہیں' ہم تو صرف مذاق کرتے ہیں۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۱۰۱ 'مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ خازن اس آیت کے شان نزول میں لکھتے ہیں:

روایت ہے کہ عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ سامنے سے صحابہ کرام ان کی طرف آ رہے ہیں' اس نے اپنی قوم سے کہا: دیکھو میں ان بے وقوفوں کو کس طرح تم سے واپس کرتا ہوں' اس نے حضرت ابوبکر کا ہاتھ پکڑ کر کہا: مرحبا! اے بنو تیم کے سردار! شیخ الاسلام' غار میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رفیق' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اپنی جان اور مال کو خرچ کرنے والے' پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: مرحبا! اے بنو عدی کے سردار! فاروق' اللہ کے دین میں قوی' اپنی جان اور مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے' پھر حضرت علی کا ہاتھ پکڑ کر کہا: مرحبا! اے رسول اللہ کے عم زاد! آپ کے داماد' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام بنو ھاشم کے سردار' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ابی! اللہ سے ڈر' نفاق نہ کر' منافق اللہ کی بدترین مخلوق ہیں' عبد اللہ بن ابی نے کہا: اے ابو الحسن! ذرا ٹھہریے' خدا کی قسم! میں نے یہ باتیں از راہ نفاق نہیں کہیں' ہمارا ایمان آپ ہی کی طرح ہے' پھر صحابہ کرام کے جانے کے بعد عبد اللہ بن ابی نے اپنے ساتھیوں سے کہا: تم نے دیکھا

میں نے ان کو کیسے بے وقوف بنایا! (معاذ اللہ) صحابہ کرام نے واپس آکر یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر خازن ج ۱ ص ۳۰۔ ۲۹ مطبوعہ دار الکتب العربیہ پشاور)

علامہ خفاجی نے اس روایت پر حسب ذیل تبصرہ کیا ہے:

اس حدیث کو واحدی نے اپنی سند کے ساتھ روایت ہے' حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی سند بیان کر کے کہا کہ یہ حدیث منکر ہے اور کہا: یہ سلسلۃ الذھب نہیں ہے بلکہ سلسلۃ الکذب ہے (یعنی جھوٹی سند ہے) اور اس حدیث کے موضوع ہونے کے آثار ظاہر ہیں' کیونکہ محدثین کی تصحیح کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ آتے ہی شروع میں سورہ بقرہ نازل ہوئی تھی اور ہجرت کے دوسرے سال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہ سے شادی ہوئی تھی' اور اس حدیث میں ہے کہ عبد اللہ بن ابی نے حضرت علی کو رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا داماد کہا۔

(عنایۃ القاضی ج ۱ ص ۳۳۹ مطبوعہ دار صادر' بیروت' ۱۲۸۳ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جب یہ اپنے شیاطین سے خلوت میں ملتے ہیں۔ (البقرہ: ۱۴)

علامہ ابو اللیث سمرقندی نے لکھا ہے کہ شیاطین سے مراد یہود کے پانچ قبیلے ہیں: کعب بن اشرف مدینہ میں' ابو بردہ اسلمی بنو اسلم میں' ابو السوداء شام میں' عبد الدار جہینہ میں سے اور عوف بن مالک بنو اسد سے' ابو عبیدہ نے کہا: ہر وہ شخص جو گمراہ اور سرکش ہو وہ شیطان ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ ان کے ساتھ استہزاء فرماتا ہے۔ (البقرہ: ۱۵)

اللہ تعالیٰ کے استہزاء کی توجیہ

علامہ راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ قصداً مذاق کرنے کو استہزاء کہتے ہیں اور استہزاء کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ہو تو اس کا معنی استہزاء کی جزا دینا ہے' یعنی اللہ تعالیٰ ان کو ایک مدت تک مہلت دیتا ہے' پھر اچانک ان کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے' اس کو استہزاء اس لیے فرمایا ہے کہ منافقین اس دھوکے میں تھے کہ وہ مسلمانوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کیونکہ ان کے نفاق اور سرکشی کے باوجود ان پر مسلمانوں کے احکام جاری کیے گئے اور ان سے مواخذہ نہیں کیا گیا لیکن حقیقت میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے نفاق کا علم تھا اور آخرت میں ان کے ساتھ صورۃً استہزاء کیا جائے گا۔

حافظ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

امام ابن المنذر نے ابو صالح سے روایت کیا ہے کہ دوزخ میں دوزخیوں سے کہا جائے گا کہ دوزخ سے نکلو اور دوزخ کے دروازے کھول دیئے جائیں گے' جب وہ دوزخ کے کھلے ہوئے دروازے دیکھیں گے تو وہ دوزخ سے نکلنے کے لیے بھاگیں گے اور مومن جنت میں اپنے تختوں پر بیٹھے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے ہوں گے اور جب کفار دروازوں کے قریب پہنچیں گے تو وہ دروازے بند ہو جائیں گے اور مومن ان پر ہنسیں گے[1] جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۝ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (المطففین: ۳۶۔ ۳۴)

تو آج (قیامت کے دن) ایمان والے کافروں پر ہنستے ہیں ۝ وہ (عالی شان) تختوں پر بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں ۝ کہ کافروں کو ان کے کیے ہوئے کاموں کا کیا بدلہ ملا ہے ۝

اللہ تعالیٰ نے منافقین کے استہزاء کی جزاء (سزا) کو استہزاء صورۃً فرمایا ہے' حقیقت میں یہ استہزاء نہیں ہے اس کی نظیر یہ

---

[1] حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ' در منثور ج ۱ ص ۳۱ مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران

آیت ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ (الشوریٰ: ۴۰)　　اور برائی کا بدلہ اسی کی مثل برائی ہے۔

حالانکہ برائی کا بدلہ حقیقت میں عدل و انصاف ہوتا ہے' برائی نہیں ہوتی لیکن کسی چیز کا بدلہ صورۃً اسی کی مثل ہوتا ہے اس لیے اس کو برائی فرمایا' اسی طرح منافقین کے استہزاء کا بدلہ حقیقۃً استہزاء نہیں صورۃً مماثل ہونے کی وجہ سے اس کو استہزاء فرمایا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلہ میں خریدا' سو ان کی تجارت نفع بخش نہ ہوئی اور

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ﴿۱۶﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ

نہ یہ ہدایت یافتہ تھےO ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی اور جب

فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِیْ

اس کا ماحول روشن ہو گیا تو اللہ نے ان کا نور بصارت سلب کر لیا اور ان کو

ظُلُمٰتٍ لَّا یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ۙ

اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ نہیں دیکھتےO بہرے ہیں' گونگے ہیں اندھے ہیں پس وہ (ہدایت کی طرف) رجوع نہیں کریں گےO

اس جگہ خرید و فروخت کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے' بلکہ مراد یہ ہے کہ انہوں نے ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی کو اختیار کرلیا' ان کے سامنے قرآن کریم اور رسول اللہ کی پیش کردہ ہدایت بھی تھی اور اس کے مقابلہ میں یہودیت کے عارضی منافع بھی تھے لیکن انہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو اختیار کرلیا' اس تجارت میں ان کا راس المال بھی ضائع ہوگیا کیونکہ ان کی فطرت میں ہدایت کو قبول کرنے کی جو استعداد اور صلاحیت تھی وہ بھی ضائع ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی اور جب اس کا ماحول روشن ہوگیا تو اللہ نے ان کا نور بصارت سلب کرلیا۔ (البقرہ: ۱۷)

منافقین کے احوال کی پہلی مثال

علامہ ابن جریر لکھتے ہیں:

قتادہ نے بیان کیا ہے کہ جب منافق ''لا الٰہ الا اللہ'' کہتا ہے تو اس کے لیے دنیا میں روشنی ہوجاتی ہے' وہ مسلمانوں سے اپنی جان و مال کو محفوظ کرتا ہے' زکوٰۃ' صدقات اور مال غنیمت کے فوائد حاصل کرتا ہے اور مسلمانوں میں نکاح کرتا ہے اور ان کا وارث ہوتا ہے اور جب اس کو موت آتی ہے تو اسلام کے تمام ثمرات اور فوائد ختم ہوجاتے ہیں کیونکہ وہ دل سے مسلمان نہ تھا۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۱۱۱ - ۱۱۰' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان کو ظلمات (اندھیروں) میں چھوڑ دیا۔ (البقرہ: ۱۷)

ظلمت اس چیز کو کہتے ہیں جو دیکھنے سے منع کرتی ہے‘ منافقوں کے لیے کئی ظلمات ہیں‘ ظلمت کفر‘ ظلمت نفاق اور ظلمت یوم قیامت‘ جس دن مومنوں کا نور ان کے آگے اور ان کی دائیں جانب چمک رہا ہوگا‘ اور منافقوں کے سامنے اندھیرا ہوگا‘ یا اس سے مراد ہے گمراہی کی ظلمت‘ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی ظلمت اور دائمی عتاب کی ظلمت۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مثال بیان کی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے ایک طرح کی ہدایت مہیا کی اور انہوں نے اس کو ضائع کردیا اور جنت کو حاصل نہیں کیا‘ اس آیت کے عموم میں یہ منافق بھی داخل ہیں کیونکہ انہوں نے کلمہ پڑھا لیکن کفر کو مخفی رکھنے اور اپنے شیطانوں کی موافقت کرنے کی وجہ سے اس کو ضائع کردیا‘ اس آیت کے عموم میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو ایمان لانے کے بعد مرتد ہوگئے اور اس آیت میں وہ بھی داخل ہیں جو مقام ارادت (یہ احوال سالک کی ابتداء ہے جس سے وہ نفسانی خواہشوں کو ترک کرتا ہے‘ راضی بہ رضاء الٰہی رہتا ہے تو اس پر انوار الٰہیہ کا فیضان ہوتا ہے) پر فائز ہوتے ہیں اور اس سے اگلے مقام‘ مقام محبت کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں تو مقام ارادت کا نور بھی جاتا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بہرے ہیں‘ گونگے ہیں اندھے ہیں‘ پس وہ (ہدایت کی طرف) رجوع نہیں کریں گے O (البقرہ: ۱۸)

یعنی حق کو سننے سے بہرے ہیں‘ حق بولنے سے گونگے ہیں اور حق دیکھنے سے اندھے ہیں‘ اللہ تعالیٰ نے کان اس لیے دیئے ہیں کہ وہ حق کو سنیں‘ سو جس نے حق کو نہیں سنا‘ وہ خواہ کان رکھتا ہو اللہ کے نزدیک بہرا ہے‘ اور زبان کلمہ حق بولنے کے لیے دی ہے‘ سو جس نے کلمہ حق نہیں بولا وہ خواہ زبان رکھتا ہو وہ اللہ کے نزدیک گونگا ہے اور جس نے حق کو نہیں دیکھا وہ خواہ آنکھیں رکھتا ہے وہ اللہ کے نزدیک اندھا ہے‘ یہ لوگ اب اس ہدایت کی طرف نہیں لوٹیں گے جس کو ضائع کرچکے ہیں اور اس گمراہی کو ترک نہیں کریں گے جس کو اختیار کرچکے ہیں۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ

یا ان کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جو آسمان سے برسنے والی بارش میں (گھرے ہوئے) ہوں اس بارش میں تاریکیاں‘ کڑک

اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ

اور چمک ہو وہ کڑک (سن کر) جان کے خوف سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں اور اللہ کافروں کو

بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ

گھیرے ہوئے ہے O لگتا ہے کہ بجلی ان کی بصارت اچک لے گی‘ جب بھی ان کے لیے بجلی

مَّشَوْا فِيْهِ ڎ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ

چمکتی ہے تو وہ اس میں چلنے لگتے ہیں‘ اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں‘ اور

بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ ع

ع ۲ / ۲

اگر اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت کو سلب کرلیتا‘ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے O

منافقین کے احوال کی دوسری مثال

امام ابن جریر طبری اس آیت کے شان نزول میں اپنی اسانید کے ساتھ حضرت ابن عباس' حضرت ابن مسعود وغیرہما سے روایت کرتے ہیں:

اہل مدینہ سے دو منافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے مشرکین کی طرف بھاگے' تو ان کو اس بارش نے آلیا جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے' اس میں شور' گرج اور کڑک تھی اور بجلی چمک رہی تھی اور جب بھی بجلی زور سے کڑکتی تو وہ موت کے ڈر سے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیتے اور جب بجلی چمکتی تو وہ اس کی روشنی میں چلتے اور جب اندھیرا چھا جاتا تو کھڑے رہ جاتے' وہ کہنے لگے کہ کاش صبح ہو جائے تو ہم پھر (سیدنا حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس چلے جائیں' پھر جب صبح ہوئی تو وہ آپ کے پاس آئے اور خلوص دل سے اسلام لے آئے اور انہوں نے نیکی کے ساتھ اسلام کے احکام پر عمل کیا' اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے منافقوں کی مثال ان دو منافقوں کے ساتھ دی ہے جو مدینہ سے نکلے تھے۔

منافق جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوتے تو وہ اس خوف سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے کہ مبادا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے متعلق کوئی کلام نازل ہوا ہو یا ان کی کوئی بات پکڑی گئی ہو اور ان کو قتل کرنے کا حکم دیا جائے' جس طرح بارش میں گھرے ہوئے ان دو منافقوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں' اور جب فتوحات اسلام کی وجہ سے ان کو بہت زیادہ مال غنیمت ملا اور ان کے ہاں اولاد ہوئی تو وہ اسلام پر کچھ قائم ہوئے اور کہنے لگے کہ (سیدنا حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم کا) دین حق ہے' جس طرح وہ دو منافق بجلی کی روشنی میں چل پڑتے تھے' اور جب کسی مصیبت کی وجہ سے ان کا مال اور اولاد ہلاک ہو جاتے' پھر کفر کی طرف لوٹ جاتے اور کہتے کہ یہ دین (سیدنا حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وجہ سے ہے' جس طرح جب بجلی چمکتی اور اندھیرا چھا جاتا تو وہ دو منافق کھڑے رہ جاتے تھے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۱۱۹' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

دونوں مثالوں کا تجزیہ

پہلی مثال ان لوگوں کی ہے جو دل میں قطعی منکر تھے اور کسی دنیاوی غرض اور مصلحت کی وجہ سے مسلمان بن گئے تھے اور یہ دوسری مثال ان منافقین کی ہے جو شک اور تذبذب میں مبتلا تھے' زکوٰۃ اور مال غنیمت کو تو دلی رغبت سے قبول کرتے لیکن اسلام کی خاطر جہاد کی آزمائشوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

آیا عہد رسالت کے بعد منافقوں کا وجود ہے یا نہیں؟

منافقوں کا وجود صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ظاہری ہی میں ممکن تھا' یہ آپ ہی کا منصب تھا کہ آپ وحی الٰہی سے یہ بتائیں کہ فلاں شخص منافق ہے' اور اب جب کہ وحی منقطع ہو چکی ہے تو اب کسی شخص کے متعلق یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ وہ منافق ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی شخص قطعی طور پر کسی کے دل کے حال پر مطلع نہیں ہو سکتا' لہٰذا جو شخص اسلام کو ظاہر کرے گا وہ مسلمان ہے' اور جو کفر کو ظاہر کرے گا وہ کافر ہے اور جو اسلام سے کفر کی طرف لوٹ جائے گا وہ مرتد ہے اور جو شخص اپنے کفریہ عقائد پر اسلام کا ملمع چڑھائے گا وہ زندیق ہے' اور حقیقی منافق کوئی نہیں ہے' البتہ جو شخص بے عمل ہو اس کو عمل کے اعتبار سے منافق کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یقیناً اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے O (البقرہ: ۲۰)

شے کے معنی میں اہل سنت اور معتزلہ کا اختلاف

شے کے معنی میں معتزلہ اور اہل سنت کا اختلاف ہے' معتزلہ کے نزدیک شے کا معنی ہے: جس کا موجود ہونا صحیح ہو' یہ معنی واجب اور ممکن دونوں کو شامل ہے' معتزلہ کے نزدیک شے کی دوسری تعریف یہ ہے کہ جس چیز کا معلوم ہونا صحیح ہو یا جس چیز کی خبر دینا صحیح ہو اور یہ معنی واجب' ممکن اور ممتنع تینوں کو شامل ہے اور جب کہ واجب اور ممتنع تحت قدرت نہیں ہیں' اس لیے ہر تقدیر پر معتزلہ کو شے کے ساتھ ممکن کی قید لگانی پڑے گی یعنی اللہ ہر شے ممکن پر قادر ہے' اہل سنت کے نزدیک شے موجود کے ساتھ خاص ہے' کیونکہ شے مصدر ہے' اگر یہ بہ معنی اسم فاعل ہے یعنی ''شاء'' تو اس وقت یہ واجب کو بھی شامل ہوگا جیسا کہ اس آیت میں ہے:

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۟ — آپ کہیے: سب سے بڑی گواہی کس کی ہے؟ آپ کہیے: اللہ۔ (الانعام: ۱۹)

شے کا دوسرا معنی ہے: ''مشیء وجودہ'' جس کا وجود چاہا گیا ہو' یہ اس وقت بہ معنی مفعول ہے' اس کا معنی ہے: جو موجود ہو خواہ حال میں خواہ استقبال میں' ''ان اللہ خالق کل شیء. اللہ تعالیٰ ہر شے کا خالق ہے'' اور ''ان اللہ علی کل شیء قدیر'' میں شے بہ معنی موجود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر موجود پر قادر ہے خواہ وہ اب موجود ہو یا مستقبل میں۔

(انوار التنزیل ص ۳۸' (ورقی) مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی)

اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب کا محال ہونا

بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب کے امکان کے قائل ہیں' وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے اور کذب بھی ایک شے ہے' لہٰذا اللہ تعالیٰ کذب پر بھی قادر ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ شے کا معنی موجود ہے خواہ حال میں یا استقبال میں' اگر تم اس آیت سے اللہ تعالیٰ کے کذب پر استدلال کرتے ہو تو صرف کذب کا امکان لازم نہیں آئے گا بلکہ یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ حال یا استقبال میں بالفعل کاذب ہو (معاذ اللہ) اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

مخالفین کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ زید کو اپنے کذب پر قدرت ہے' اب اگر خدا کو اپنے کذب پر قدرت نہ ہو تو زید کی قدرت خدا کی قدرت سے بڑھ جائے گی۔ اس کا جواب (بہ طور نقض اجمالی) یہ ہے کہ اس طرح تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ زید کو اپنے عدم پر قدرت ہے مثلاً وہ خودکشی کر لے' اب اگر خدا کو اپنے عدم پر قدرت نہ ہو تو زید کی قدرت خدا سے بڑھ جائے گی تو خدا کا معدوم ہونا بھی ممکن ہو گیا' اور جس کا عدم ممکن ہوتا ہے وہ ممکن ہوتا ہے واجب نہیں ہوتا' اور اس کا دوسرا جواب (بہ طور نقض تفصیلی) یہ ہے کہ زید کی قدرت کا خدا کی قدرت سے بڑھنا تب لازم آئے گا کہ جس پر زید کو قدرت ہے بعینہٖ اسی چیز پر خدا کو قدرت نہ ہو' اور یہاں اس طرح لازم نہیں آتا کیونکہ زید کو اس پر قدرت ہے کہ زید جھوٹ بولے اور اس پر خدا کو بھی قدرت ہے کہ زید سے جھوٹا کلام صادر کرائے بلکہ اصل میں خدا ہی کی قدرت ہے کہ زید کی قدرت تو مجازاً ہے' اور جس پر خدا کو قدرت نہیں ہے کہ خدا سے جھوٹ صادر ہو اس پر زید کو کب قدرت ہے! مغالطہ کی وجہ یہ ہے کہ معترض نے دونوں جگہ اپنے اپنے لفظ کو دیکھا' زید کو اپنے کذب پر قدرت اور خدا کو اپنے کذب پر قدرت اور یہ نہیں غور کیا کہ زید کو اپنے کذب پر قدرت کا معنی ہے زید سے کذب کا صدور ہو' اور خدا کو اپنے کذب پر قدرت کا معنی ہے: خدا سے کذب کا صدور ہو!

اللہ تعالیٰ کی قدرت کے معنی کی تحقیق اور اس کے کذب کے محال ہونے پر دلائل

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

قادر وہ شخص ہے جو اگر چاہے تو کوئی کام کرے اور اگر چاہے تو وہ ترک کر دے اس کا معنی یہ ہے کہ اس کو فعل اور ترک فعل کا اختیار ہو اور یہ اس کے لیے ممکن ہو یعنی اگر اس کے لیے فعل کا داعی اور محرک ہو تو اس کے لیے فعل کرنا ممکن ہو اور اگر اس کے لیے ترک کا باعث اور محرک ہو تو اس کے لیے ترک کرنا ممکن ہو۔

(شرح المقاصد ج ۴ ص ۸۹ مطبوعہ منشورات الشریف الرضی ایران ۱۴۰۹ھ)

علامہ میر سید شریف لکھتے ہیں:

قدرت وہ صفت ہے جس کی وجہ سے کسی زندہ شخص کے لیے اپنے ارادہ سے کسی فعل کا کرنا یا اس کا ترک کرنا ممکن ہوتا ہے۔ (التعریفات ص ۷۴ مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۰۶ھ)

عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ اشکال ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کذب ظلم جہل اور دیگر برائیوں پر قادر نہ ہو تو یہ اس کے علی الاطلاق قادر ہونے کے منافی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اشکال اس وقت لازم آتا ہے جب اللہ تعالیٰ کذب ظلم اور جہل وغیرہ کا ارادہ کرتا اور ان کو وجود میں نہ لاسکتا لیکن اللہ تعالیٰ کذب اور ظلم وغیرہ کا ارادہ نہیں کرتا کیونکہ اللہ تعالیٰ سبحان ہے اور اس کے سبحان اور قدوس ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے لیے برائی کا ارادہ کرنا محال ہو اس لیے کذب پر قادر نہ ہونے سے اس کا عجز لازم نہیں آتا عجز اس وقت ہوتا جب وہ کذب اور ظلم کا ارادہ کرتا اور ان کو وجود میں نہ لاسکتا دوسرا جواب یہ ہے کہ عجز اس وقت ہوتا جب کسی فعل کا ہونا ممکن ہوتا اور پھر اس فعل کو وجود میں نہ لایا جاسکتا سو جس طرح دوسرے خدا کو پیدا کرنا ممکن نہیں ہے اللہ تعالیٰ کے ولد کا ہونا ممکن نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی زوجہ کا ہونا ممکن نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا پیدا ہونا یا اس کا مرنا ممکن نہیں ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا جھوٹ بولنا اور اس کا ظلم کرنا ممکن نہیں ہے اور چونکہ یہ تمام امور ممکن نہیں ہیں اس لیے ان پر اللہ تعالیٰ کے قادر نہ ہونے سے اس کا عجز لازم نہیں آتا۔

رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کذب کیوں ممکن نہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت قدیم ہے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت حادث ہو تو وہ محل حوادث ہوگا اور محل حوادث خود حادث ہوتا ہے اور جب کذب قدیم ہوگا تو پھر اللہ تعالیٰ صدق سے متصف نہیں ہوسکتا کیونکہ صدق تو کذب کی نقیض ہے لہٰذا اگر صفت کذب کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ صدق سے متصف ہو تو اجتماع نقیضین لازم آئے گا اور یہ محال ہے اور اللہ تعالیٰ صدق سے متصف ہے کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا۝ (النساء: ۸۷) اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون صادق ہے۝

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صادق ہے اور اس کا صدق قدیم ہے اور کذب صدق کے زوال کا نام ہے اور اس کا صدق زائل نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ قدیم ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کاذب ہو نہیں سکتا صدق جا نہیں سکتا اور کذب آ نہیں سکتا۔

نیز ہم اس سے پہلے علامہ بیضاوی کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں کہ "ان اللہ علی کل شیء قدیر" کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ ہر اس چیز پر قادر ہے جس کو وہ موجود کرنے کا ارادہ فرمائے اور اللہ تعالیٰ اس چیز کا ارادہ فرمائے گا جو اس کے سبحان اور قدوس ہونے کے خلاف نہ ہو کذب اور ظلم میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے تحت آسکیں اس لیے وہ اس کی قدرت کے تحت نہیں ہیں جیسے بالاتفاق اللہ تعالیٰ کے شریک کو پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کی قدرت کے تحت نہیں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا' اس امید پر کہ

قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا

تم متقی (پرہیزگار) بن جاؤO جس نے تمہارے نفع کے لیے زمین کو فرش

وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ

اور آسمان کو چھت بنایا' اور آسمان سے پانی نازل کیا اور پانی سے تمہارے رزق کے لیے کچھ

الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

پھل پیدا کیے' لہٰذا تم اللہ کے لیے شرکاء نہ بناؤ جب کہ تم جانتے ہوO

ربط آیات اور التفات کے فوائد

اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کے شروع سے یہاں تک مومنین' کفار اور منافقین کا ذکر فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کے خواص کا ذکر فرمایا کہ مومنین نے قرآن مجید کی ہدایت سے نفع اٹھایا' غیب پر ایمان لائے' نماز پڑھی اور خدا کی راہ میں مال خرچ کیا' اور دنیا اور آخرت میں فلاح پائی' کفار نے کفر پر اصرار کیا' اور ان کی ضد اور عناد کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی اور ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے' اور منافقین نے اپنے کفر کو مخفی رکھا اور اپنے زعم میں خدا' رسول اور مومنوں کو دھوکا دیا' پھر ان کی خصوصیات کے متعلق دو بلیغ مثالیں بیان فرمائیں' اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان تمام گروہوں کو اے لوگو! فرما کر خطاب کیا' اور ان سب کو عبادت کرنے کا حکم دیا۔ پہلے ان کا غائب کے صیغوں کے ساتھ ذکر فرمایا اور پھر ان سے بالمشافہ خطاب فرمایا تاکہ سننے والوں کا ذہن بیدار اور متوجہ رہے اور ان کی رغبت اور شوق میں اضافہ ہو اور اس پر تنبیہ ہو کہ عبادت ایک مہتم بالشان فعل ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں سے مخاطب ہو کر ان کو عبادت کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ خطاب کی لذت سے عبادت کی مشقت اور کلفت جاتی رہے۔ ہم اس سے پہلے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں عبادت کا معنی بیان کر چکے ہیں' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اعتقاد الوہیت کے ساتھ کسی کی تعظیم اور اطاعت کرنا' یا نفس کی خواہش کے خلاف اپنے رب کی تعظیم کے لیے مکلف کا کوئی کام کرنا عبادت ہے۔

باوجود اللہ تعالیٰ کے قرب کے ''یایھا الناس'' سے ندا کرنے کی توجیہ

عربی زبان میں بعید شخص اور دور والے کو ندا کرنے کے لیے ''یـا'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور قریب والے اور نزدیک شخص کو ندا کرنے کے لیے ''ای'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور بعض اوقات قریب شخص کو بعید کے قائم مقام کر کے اس کو بھی ''یا'' کے ساتھ ندا کی جاتی ہے' کبھی کسی کی عظمت کی وجہ سے بعد رتبہ کو بعد مقام کے مرتبہ میں نازل کرتے ہیں جیسے دعا کرنے والا ''یا اللہ'' کہتا ہے اور کبھی کسی غفلت کی وجہ سے اس کو بعید قرار دیتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''یایھا الناس'' اور کبھی اس اعتبار سے کہ واجب اور قدیم کے مقابلہ میں ممکنات اپنے حدوث اور امکان کی وجہ سے انتہائی پستی اور بعد میں ہیں جیسے

قرآن مجید میں ''یا سماء' یا ارض' یا جبال' یا نار'' وغیرہ کی ندا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام لوگوں سے ان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ''یایھا الناس'' فرمایا' اس لیے کہ تمام لوگ اپنی غفلت یا اپنے امکان اور حدوث کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے بعید ہیں۔

''یایھا الناس'' سے سورہ بقرہ کے مدنی ہونے پر اعتراض کا جواب

علامہ خفاجی لکھتے ہیں:

امام بزاز نے اپنی ''مسند'' میں' امام حاکم نے ''مستدرک'' میں اور امام بیہقی نے ''دلائل النبوۃ'' میں اپنی اپنی سندوں سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس سورت میں ''یایھا الناس'' ہو وہ مکی ہے اور جس سورت میں ''یایھا الذین امنوا'' ہو وہ مدنی ہے' اس لحاظ سے یہاں پر یہ اشکال ہے کہ یہ سورت مدنی ہے اور اس میں ''یایھا الناس'' سے خطاب ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ جس سورت میں فقط ''یایھا الناس'' ہو وہ مکی ہوتی ہے اور اس سورت میں ''یایھا الناس'' کے علاوہ ''یایھا الذین امنوا'' سے بھی متعدد جگہ خطاب ہے' نیز ایک اور قاعدہ یہ ہے کہ جس سورت میں منافقین کا ذکر ہو وہ سورت مدنی ہوتی ہے' لہٰذا روایت اور درایت کے لحاظ سے اس سورت کا مدنی ہونا متعین ہے اور علامہ بیضاوی وغیرہ کا اس قاعدہ پر اعتراض کرنا عدم تدبر پر مبنی ہے۔ (عنایۃ القاضی ج ۲ ص ۱ ملخصا' مطبوعہ دار صادر' بیروت' ۱۲۸۳ھ)

مومنین' کفار اور منافقین کے لیے عبادت کے حکم کا الگ الگ معنی

اس آیت میں مومنین' کفار اور منافقین کو عبادت کرنے کا حکم دیا ہے' مومنین کو عبادت کے حکم کا یہ معنی ہے کہ وہ زیادہ عبادت کریں یا دائماً عبادت کریں' اور عبادت پر ثابت قدم رہیں' اور منافقین کو عبادت کے حکم کا معنی یہ ہے کہ وہ نفاق کو ترک کر کے اخلاص سے عبادت کریں اور کفار کو عبادت کے حکم کا معنی یہ ہے کہ وہ ایمان لانے کے بعد عبادت کو شروع کریں' کیونکہ جو کام کسی چیز پر موقوف ہو تو اس کام کا حکم دینا اس کو مستلزم ہے کہ پہلے اس چیز کو حاصل کرو' پھر اس کام کو کرو' جس طرح کسی شخص کو نماز کا حکم دینا اس کو مستلزم ہے کہ وہ پہلے وضو کرے اور پھر نماز پڑھے' اسی طرح کفار کو عبادت کا حکم دینا اس کو مستلزم ہے کہ وہ پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لائیں اور پھر اس کی عبادت کریں۔

کفار کے فروع کے مکلف ہونے میں علماء بخارا اور علماء شافعیہ کا اختلاف اور صحیح موقف کا بیان

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کفار فروع (مثلاً نماز' زکوٰۃ' روزہ وغیرہ) کے مکلف فقط اعتقاد میں ہیں' یا اداء اور اعتقاد دونوں کے مکلف ہیں' بخارا کے علماء احناف کا مسلک یہ ہے کہ وہ صرف حق اعتقاد میں مکلف ہیں یعنی کفار پر یہ ضروری ہے کہ وہ نماز' روزہ وغیرہ کی فرضیت کا اعتقاد رکھیں اور جب تک وہ ایمان نہ لائیں ان پر ان عبادات کا ادا کرنا فرض نہیں ہے' اور عراق کے علماء احناف اور علماء شافعیہ کا یہ مسلک ہے کہ کفار نماز' روزہ وغیرہ کی فرضیت پر ایمان لانے اور ان کو ادا کرنے دونوں کے مکلف ہیں اور ان کو ادا نہ کرنے کی وجہ سے ان کو عذاب ہوگا' امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے ان میں سے کسی جانب تصریح نہیں کی' البتہ امام محمد کی بعض عبارات سے عراقی علماء کے نظریہ کی تائید ہوتی ہے اور قرآن مجید کی ان آیات کا بھی بہ ظاہر یہی تقاضا ہے:

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (حٰم السجدۃ: ۶-۷)

اور عذاب ہے مشرکوں کے لیے ۝ جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور وہی آخرت کے منکر ہیں ۝

علماء بخارا اس آیت کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ مشرکین کو زکوٰۃ کی فرضیت کا اعتقاد نہ رکھنے کی وجہ سے عذاب ہوگا' فریقین

کے اس اختلاف کا بہ غور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علماء بخارا کا نظریہ صحیح ہے کیونکہ اگر کفار اپنے کفر کے زمانہ میں نماز اور روزہ وغیرہ کے ادا کرنے کے مکلف ہوں تو اسلام قبول کرنے کے بعد ان پر نمازوں اور روزوں کی قضاء لازم ہونی چاہیے حالانکہ عہد رسالت میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو اسلام قبول کرنے کے بعد زمانہ کفر میں چھوڑی ہوئی نمازوں اور روزوں کا مکلف کیا ہو۔

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ عراقیوں کا قول ہی معتمد ہے جو کہتے ہیں کہ کفار اعتقاد اور اداء دونوں کے مخاطب ہیں۔

(ردالمحتار ج ۳ ص ۱۲۳ 'داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔ (البقرہ: ۲۱)

اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کا اعتراف

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمام انسانوں کو یہ تسلیم ہے کہ ان کو اور ان سے پہلے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کفار نے بھی اس کا اعتراف کر لیا تھا کہ ان کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے' قرآن مجید میں ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ○

اور اگر آپ ان سے یہ سوال کریں کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے' سو یہ کہاں بھٹک رہے ہیں ○ (الزخرف: ۸۷)

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ○

اور اگر آپ ان سے سوال کریں کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے' سو یہ کہاں بھٹک رہے ہیں ○ (العنکبوت: ۶۱)

اور اگر کوئی کافر اور مشرک اس کا اعتراف نہ کرے کہ ان کا اور ان سے پہلے لوگوں کا بلکہ کائنات کا پیدا کرنے والا اللہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں بے شمار ایسے دلائل رکھے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے خالق اور اس کے رب ہونے پر دلالت کرتے ہیں' جو شخص ذرا سا بھی غور وفکر کرے گا' اس کو اللہ تعالیٰ کے خالق اور رب ہونے میں کوئی شک نہیں رہے گا' ہم ان میں سے کچھ دلائل کا ذکر کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے خالق اور لاشریک ہونے پر دلائل

اس کائنات کا خالق انسان نہیں ہو سکتا کیونکہ انسان کا پیدا ہونا اور مرنا ہمارے سامنے ہے' جمادات' نباتات' حیوانات' دریا اور سمندر وغیرہ خالق نہیں ہو سکتے' کیونکہ ان کا بھی پیدا ہونا' فنا ہونا اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف متغیر ہونا ہماری نظر میں ہے' سورج' چاند اور ستارے وغیرہ خالق نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کا ایک مقررہ نظام کے تحت گردش کرنا ہمارے مشاہدہ میں ہے اور ان کا ایک مقررہ نظام کے تابع ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ کسی زبردست اور قاہر نظام کے بنائے ہوئے نظام کے پابند ہیں اور جب اس سلسلہ کائنات میں سے کوئی چیز بھی اس کائنات کی خالق اور رب نہیں ہے تو ضرور اس کائنات کے علاوہ کوئی قادر وقیوم ہستی ہے' جو اس سلسلہ ممکنات اور حوادث کی غیر ہے جو واجب اور قدیم ہے' جس نے اس کائنات کو بنایا ہے اور وہ اللہ ہی ہے کیونکہ اسی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ اس پوری کائنات کو بنانے والا اور عدم سے وجود میں لانے والا ہے' اسی نے دنیا والوں کے پاس انبیاء اور رسل بھیجے اور کتابیں نازل کیں اور نبیوں اور کتابوں کے واسطے سے اپنی ذات کا عرفان کرایا اور یہ پیغام بھیجا کہ سب انسان اس کی مخلوق ہیں اور سب پر اس کی عبادت لازم ہے' اللہ کے سوا اور کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو اس

کائنات سے الگ اور مغایر ہو اور اس نے اس کائنات کو بنانے اور اپنے رب ہونے کا دعویٰ کیا ہو یا کسی نبی اور رسول کو بھیجا ہو یا اپنی حجت قائم کرنے کے لیے کوئی کتاب نازل کی ہو اور جب اس کائنات کے اندر کوئی چیز بھی اس کائنات کی خالق نہیں ہے اور اس کائنات سے باہر اللہ کے سوا اور کوئی اس کائنات کی تخلیق کا دعویٰ دار نہیں ہے اور بغیر کسی کے بنائے یہ کائنات بن نہیں سکتی تو پھر اللہ کا یہ دعویٰ کیوں نہ مانا جائے کہ وہی اس کائنات کا خالق اور رب ہے اور وہی عبادت کا مستحق ہے' واحد لاشریک ہے۔

علاوہ ازیں اس کائنات کے اندر بھی کسی جن' انسان[1]' فرشتے' پتھر کے تراشے ہوئے بت یا کسی درخت یا ستارے نے کبھی از خود یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ اس کائنات کا بنانے والا ہے' سورج کے سامنے زمین کی گردش سے لیل ونہار اسی کے حکم سے بنتے ہیں' اسی کے حکم سے بارش نازل ہوتی ہے' کسی چیز نے آج تک از خود اس پوری کائنات کے خالق ہونے کا دعویٰ نہیں کیا' اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس سلسلہ میں ممکنات اور حوادث میں سے کوئی چیز بھی اس کائنات کی خالق نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کوئی چیز اس کی تخلیق کی مدعی ہے تو پھر اس کائنات کا خالق ضرور اس کائنات کا غیر اور اس سے الگ کوئی ہستی ہے جو اس کائنات کی طرح حادث اور ممکن نہیں' قدیم اور واجب ہے' اور جب اس کائنات کے اندر اور باہر اللہ کے سوا اور کوئی اس کی تخلیق کا دعویٰ دار نہیں ہے تو پھر اللہ کو اس کائنات کا خالق اور رب کیوں نہ مانا جائے اور اس کو واحد اور لاشریک کیوں نہ تسلیم کیا جائے!

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ ساری کائنات بغیر کسی بنانے والے کے از خود بن گئی ہے تو یہ بات بالکل بداہت کے خلاف ہے' مٹی کے تیل کا ایک چراغ بھی از خود نہیں جلتا تو آسمانوں پر یہ اربوں ستارے خود بہ خود کیسے روشن ہو گئے؟ ایک گلاس پانی بھی خود بہ خود مہیا نہیں ہوتا تو زمین کے نیچے چشمے خود بہ خود کیسے رواں ہو گئے اور اتنا بڑا سمندر کیسے وجود میں آ گیا اور یہ زمین و آسمان کیسے خود بہ خود بن گئے' پھولوں میں رنگ اور خوشبو' پھلوں میں ذائقہ اور ایک مربوط اور مقرر نظام کے تحت اس کائنات کا چلنا کیسے خود بہ خود ہو گیا!

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

أَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ أَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝ (الطور: ۳۶-۳۵)

کیا وہ کسی شے کے بغیر پیدا کیے گئے ہیں یا وہ (خود) خالق ہیں؟ ۝ کیا انہوں نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے؟ بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے ۝

نیز اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَأَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝ أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ أَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۗ ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ أَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَ

(بھلا بتاؤ تو سہی!) آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور تمہارے لیے آسمان سے پانی کس نے نازل کیا ہے؟ ہم نے ہی اس پانی سے خوشنما باغ اگائے' تمہارے لیے ممکن نہ تھا کہ تم ان (باغوں) کے درخت اگاتے' کیا (اس تخلیق میں) اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو راہ راست سے انحراف کر رہے ہیں ۝ (بھلا بتاؤ تو

[1] فرعون وغیرہ نے اپنی ربوبیت یعنی لوگوں کے پالنے کا دعویٰ کیا' پوری کائنات کے بنانے کا دعویٰ نہیں کیا' وہ اپنی پرستش کرانے اور مستحق عبادت ہونے کے خواہاں اور مدعی تھے اور ان کے مرنے کے بعد ان کے دعویٰ کا جھوٹا ہونا ظاہر ہو گیا۔

يَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ○ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ (النمل: ۶۴_۶۰)

بہی!) زمین کو ٹھہرنے اور قرار کی جگہ کس نے بنایا؟ اور زمین کے درمیان دریا کس نے پیدا کیے؟ اور زمین (کے قرار) کے لیے مضبوط پہاڑ کس نے پیدا کیے؟ اور دو سمندروں کے درمیان آڑ کس نے پیدا کی؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ (نہیں) بلکہ اکثر لوگ علم نہیں رکھتے○ (بتاؤ) جب بے قرار شخص اس کو پکارتا ہے تو اس کی پکار کا کون جواب دیتا ہے؟ اور اس سے تکلیف کو کون دور کرتا ہے؟ اور تمہیں زمین پر (پہلے لوگوں کا) نائب کون بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو○ (بتاؤ) تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں کون راہ دکھاتا ہے؟ اور اس کی رحمت کی خوشخبری دینے والی ہواؤں کو کون بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ جن چیزوں کو یہ اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں اللہ ان سے بری اور برتر ہے○ (بتاؤ) ابتداءً مخلوق کو کس نے بنایا تھا؟ اور اس کو دوبارہ کون لوٹائے گا؟ اور تم کو آسمان اور زمین سے کون رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ آپ کہیے: اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لے آؤ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا ہے' اس امید پر کہ تم متقی بن جاؤ۔ (البقرہ: ۲۱)

''لعلکم تتقون'' میں امید کی نسبت بندوں کی طرف ہے

عربی میں ''لــعــل'' کا لفظ امید کے لیے آتا ہے' اردو میں اس کا معنی ''شاید'' کیا جاتا ہے اور یہ اس شخص کے کلام میں متصور ہے جس کو مستقبل کا علم نہ ہو اور اللہ تعالیٰ تو علام الغیوب ہے' اس لیے یہاں اس لفظ کا معنی یہ نہیں ہے کہ اللہ کو امید ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم یہ امید رکھو کہ عبادت کرنے سے تم متقی بن جاؤ گے' دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں ''لعل'' بہ معنی ''کی'' ہے' یعنی تمہیں عبادت کرنے کا حکم دینے کی حکمت یہ ہے کہ تم متقی بن جاؤ اور فوز و فلاح دارین حاصل کرلو۔

انسان عبادت پر غرور کرے نہ عبادت کی وجہ سے خود کو اجر کا مستحق سمجھے

تقویٰ کا اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے بری ہو جائے' اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو چھوڑ کر غاروں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرے' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام فرائض' حقوق اور ذمہ داریوں کو اللہ کی وجہ سے پورا کرے' اور ہر کام میں اس کی نیت اللہ کی اطاعت اور اس کی خوشنودی رہے اور یہ تقویٰ ہی سالکین کے درجہ کی انتہاء ہے' اسی کو فنافی اللہ کا مرتبہ کہتے ہیں۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ عبادت سے اصل مقصود تقویٰ کا حصول ہے' اور یہ کہ انسان کو اپنی عبادت سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے بلکہ مکمل عبادت کرنے کے بعد بھی یہ یقین نہ کرے کہ وہ متقی ہو گیا

ہے' بلکہ یہ امید رکھے کہ شاید متقی ہو گیا ہو' اور اپنے آپ کو خوف اور رجا کے درمیان رکھے' اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی گرفت سے ڈرتا رہے اور اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو اور اپنی بخشش اور مغفرت کی امید رکھے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ . (السجدہ: ۱۶)

ان کے پہلو خواب گاہوں سے دور رہتے ہیں' وہ خوف اور امید سے اپنے رب کو پکارتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ . (بنو اسرائیل: ۵۷)

جن نیک بندوں کی (یہ کافر) پرستش کرتے ہیں' وہ خود اپنے رب کی طرف وسیلہ تلاش کرتے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب ہے (کہ اس کی دعا سے خدا کا قرب حاصل ہو) وہ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ شب بیدار' تہجد گزار اور اللہ کے مقرب بندوں کا بھی یہ حال ہے کہ وہ خوف اور طمع کے درمیان ہیں' اپنی عبادت پر بھروسہ یا گھمنڈ نہیں کرتے بلکہ اس کی رحمت اور فضل کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں' جب اس کے شب بیدار اور مقرب بندوں کا یہ حال ہے تو عام فرائض اور نوافل ادا کرنے والوں کا کیا حال ہونا چاہیے!

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

عن ابی ھریرۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال لن ینجی احدا منکم عملہ قال رجل ولا ایاک یا رسول اللہ قال ولا ایای الا ان یتغمدنی اللہ منہ برحمۃ ولکن سددوا۔

(امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۷۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کسی شخص کو اس کا عمل ہرگز نجات نہیں دے گا' ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کو بھی نہیں! آپ نے فرمایا: مجھ کو بھی نہیں' البتہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے گا' لیکن تم نیک اعمال کی کوشش جاری رکھو۔

اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے' بلکہ یہ تمام جہان اس کی ملک ہے اور دنیا اور آخرت اس کی سلطنت ہے اور وہ اپنی سلطنت میں جو چاہے کرے۔ اگر وہ تمام نیکوکاروں اور صالحین کو عذاب دے اور جہنم میں داخل کر دے تو یہ اس کا عین عدل ہوگا' اور اگر وہ ان پر کرم فرمائے' ان کو نعمتوں سے نوازے اور جنت میں داخل کر دے تو یہ اس کا فضل ہے' اور اگر وہ کافروں کو بھی جنت میں داخل کر دیتا تو وہ اس کا مالک تھا' لیکن اس نے خبر دی ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گا بلکہ مومنین کو بخش دے گا اور ان کو جنت میں داخل کرے گا اور یہ اس کا فضل ہے' اور کافروں کو عذاب دے گا اور ان کو ہمیشہ جہنم میں رکھے گا اور یہ اس کا عدل ہے اور اللہ تعالیٰ کی خبر کا جھوٹا ہونا محال ہے۔ اس خیال میں نہیں رہنا چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے جنت کا وعدہ کر لیا ہے تو وہ بہر حال جنتی ہیں' اور اس وجہ سے عذاب سے بے خوف نہیں ہونا چاہیے' کیا پتا خاتمہ ایمان پر ہو یا نہ ہو' اور اگر خاتمہ ایمان پر ہو بھی گیا تو کیا پتا کہ ابتدائی مرحلہ میں نجات ہو جائے گی یا اپنی تقصیرات پر گرفت اور عذاب کے بعد نجات ہوگی' اس لیے ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جس نے تمہارے نفع حاصل کرنے کے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا۔ (البقرہ: ۲۲)

زمین کا گول ہونا اور اس کا گردش کرنا' اس کے فرش ہونے کے منافی نہیں ہے

پانی کی طبیعت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مٹی کے اوپر ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے زمین کے بعض حصوں کو پانی سے الگ کر دیا' اور زمین کو سختی اور نرمی کے درمیان متوسط رکھا تا کہ وہ فرش کی طرح ہو جائے اور لوگوں کا اس پر بیٹھنا اور لیٹنا ممکن ہو' اور زمین کا فرش ہونا اس کے گول ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ جو بہت عظیم اور جسیم کرہ ہو وہ بہ ظاہر ایک مسطح جسم معلوم ہوتا ہے' اسی طرح زمین کا گردش کرنا بھی اس کے فرش ہونے کے خلاف نہیں ہے' جیسے لوگ بحری جہاز میں سفر کرتے ہیں' جہاز حرکت کر رہا ہوتا ہے اور وہ اس پر بستر بچھا کر سو جاتے ہیں' قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ ۔ بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کو اپنی جگہ (محور) سے ہٹنے سے روکتا ہے۔ (الفاطر: ۴۱)

بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ مطلب نکالا ہے کہ زمین ساکن ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو روکا ہوا ہے' اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے' بلکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان اپنے محور پر گردش کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنے محور سے ہٹنے نہیں دیتا۔ اب جبکہ سائنٹفک طریقہ سے زمین کی گردش ثابت ہو چکی ہے تو علم اور سائنس کے خلاف قرآن مجید کی تفسیر کرنے سے خدشہ ہے کہ سائنس کے طلباء اور ماہرین قرآن مجید کا انکار کر دیں اور اس ترقی یافتہ دور میں پرانی لکیروں کو پیٹتے رہنے میں دین کی کوئی خدمت نہیں ہے۔

آسمان کیا ہے؟ اس کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں' سائنس دان ابھی چاند تک ہی پہنچ پائے ہیں' چاند زمین سے پونے دو لاکھ میل کی مسافت پر ہے' آسمان تو چاند' سورج اور سیاروں سے بہت دور ہے' قدیم یونانی فلسفیوں کا خیال تھا کہ چاند پہلے آسمان میں مرکوز ہے' لیکن تحقیق اور مشاہدہ سے یہ بات غلط ثابت ہو گئی ہے' قرآن مجید نے آسمان کی حقیقت اور ماہیت کے متعلق کوئی چیز نہیں بتائی اور نہ یہ قرآن کا موضوع ہے۔ قرآن مجید عقائد اور اعمال کی اصلاح کے لیے رشد و ہدایت کی کتاب ہے' اشیاء کی حقیقت اور ماہیت اور اس کے طبعی خواص بیان کرنا قرآن مجید کا موضوع نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور آسمان سے پانی نازل کیا اور پانی سے تمہارے رزق کے لیے کچھ پھل پیدا کئے۔ (البقرہ: ۲۲)

پھلوں کو بتدریج پیدا کرنے کی حکمت

پھل اور زمین سے پیدا ہونے والی تمام غذائی اجناس صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی مشیت سے پیدا ہوتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا ظاہری سبب مٹی میں آلودہ پانی کو بنایا ہے جس طرح نطفہ کو جاندار کی پیدائش کا مادہ بنایا ہے' اللہ تعالیٰ نے زمین میں قوت قابلہ رکھی ہے اور پانی میں قوت فاعلہ رکھی ہے اور ان دونوں قوتوں کے اجتماع سے زرعی اجناس پیدا ہوتی ہیں' اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر تھا کہ مٹی اور پانی کے بغیر پھلوں کو پیدا کر دیتا جس طرح خود مٹی اور پانی کو کسی سبب کے بغیر پیدا کیا ہے لیکن ان کو بتدریج پیدا کرنے میں نظر غائر سے دیکھنے والوں کے لیے ایسی حکمتیں ہیں جو ان کو دفعۃً پیدا کرنے میں نہیں ہیں' جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے لیے یہ سبب بنایا ہے کہ مرد عورت کے رحم میں تخم ریزی کرے اور نو ماہ کی طویل مدت کے بعد ایک بچہ کی شکل میں انسان کی پیدائش عمل میں آئے تا کہ بہ ظاہر انسان کی سعی اور جد وجہد بھی اس پیدائش کے حصول میں شامل ہو اور اسی وجہ سے انسان اپنے بچہ سے محبت کرتا ہے اور اس کی پرورش کرتا ہے' اسی طرح ہل چلا کر زمین کو قابل کاشت بنانے اور اس میں پانی پہنچانے سے زرعی پیداوار میں انسان کی سعی اور عمل کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے اور اس سعی اور عمل پر بے شمار ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔

علامہ بیضاوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا باطنی معنی یہ ہے کہ اس آیت میں انسان کے بدن کو زمین سے تشبیہ دی ہے اور روح کو آسمان سے تشبیہ دی ہے' اور عقل کو پانی سے تشبیہ دی ہے اور انسان کو عقل اور حواس کے استعمال کرنے اور قوت بدنیہ اور روحانیہ کے امتزاج کے واسطے سے جو علمی اور عملی کمالات عطا کیے ہیں ان کو ان پھلوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ ہر آیت کا ایک ظاہری معنی ہے اور ایک باطنی معنی ہے اور ہر حد کے لیے ایک مطلع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لہٰذا تم اللہ کے لیے شرکاء نہ بناؤ جب کہ تم جانتے ہو O (البقرہ: ۲۲)

اللہ تعالیٰ کے لاشریک ہونے کا بیان

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تمہارے نزدیک اللہ تعالیٰ کی یہ بڑی بڑی نعمتیں متحقق ہو چکی ہیں اور تمہارے علم میں اللہ تعالیٰ کی توحید کے دلائل آچکے ہیں تو پھر علم کے باوجود اللہ تعالیٰ کا شریک نہ بناؤ' کیونکہ تم غور وفکر کی اہلیت رکھتے ہو اور تم ادنیٰ تامل سے یہ جان سکتے ہو کہ انسانوں کو اور زمین و آسمان کو پیدا کرنا اور زرعی اجناس کو اگانا یہ ایسا کام ہے' جس کو اس کائنات میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتا اور ممکنات میں سے کسی ممکن کی قدرت میں ان کو پیدا کرنا نہیں ہے تو ضرور ان کا پیدا کرنے والا اس کائنات اور ممکنات کا غیر ہے جو واجب اور قدیم ہے اور وہ اللہ ہی ہے' اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ جن شرکاء کی تم پرستش کرتے ہو وہ انسانوں' آسمانوں اور زمین اور زرعی اجناس کے اگانے پر قدرت نہیں رکھتے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآىٕكُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ (الروم: ۴۰)

اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا' پھر تم کو رزق دیا' پھر تم پر موت طاری کرے گا' پھر تم کو (دوبارہ) زندہ کرے گا' کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی (شریک) ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کوئی کام کر سکے؟

اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی نے اس کائنات کی تخلیق کا دعویٰ نہیں کیا تو معلوم ہو گیا کہ اس کائنات کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے' وہ تنہا خالق ہے' واجب اور قدیم ہے اور قادر مختار ہے اور صرف وہی عبادت کا مستحق ہے۔ اس آیت میں ''انداد'' کی نفی کی ہے' ''انداد'' ''ند'' کی جمع ہے' ''ند'' اس مخالف کو کہتے ہیں جو جوہر ذات میں کسی شخص کے مساوی ہو' اور ایک جنس کے تحت جو دو ایسے افراد ہوں جو آپس میں مخالف ہوں اور جمع نہ ہو سکیں ان کو ضد کہتے ہیں' اللہ تعالیٰ کا کوئی ''ند'' نہیں ہے' کیونکہ کوئی اس کی ذات کے مساوی نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی ضد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اوپر کوئی جنس نہیں ہے۔

متکلمین نے اللہ تعالیٰ کے شریک نہ ہونے پر برہان تمانع سے استدلال کیا ہے' اس کی تقریر یہ ہے کہ اگر دو خدا فرض کیے جائیں اور ان میں سے ایک زید کے متحرک ہونے کا ارادہ کرے اور دوسرا اسی وقت اس کے ساکن ہونے کا ارادہ کرے تو بہ یک وقت زید متحرک ہو اور ساکن بھی یہ اجتماع ضدین ہونے کی وجہ سے محال ہے تو ان دونوں میں سے کسی ایک کا ارادہ پورا ہوگا' اور جس کا ارادہ پورا ہوگا وہی خدا ہے' اور جس کا ارادہ پورا نہ ہو سکے گا وہ عاجز ہوگا' اور عاجز خدا نہیں ہو سکتا' لہٰذا فرض کیا تھا خدا دو ہیں' لازم آیا کہ ایک خدا ہے' اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ وہ دونوں اتفاق کر لیتے ہیں اور ایک دوسرے کے ارادہ کی مخالفت نہیں کرتے تو ہم کہیں گے کہ ان میں اختلاف کرنا ممکن تو ہے اور اس امکان کی تقدیر پر جس کا ارادہ پورا ہوگا وہی خدا ہوگا' نیز جب وہ اتفاق کریں گے تو ایک دوسرے کی موافقت کرے گا اور موافقت کرنے والا تابع اور دوسرا متبوع ہوگا اور تابع خدا نہیں ہوتا' غرضیکہ جب بھی دو خدا فرض کریں گے لازم آئے گا کہ دو خدا نہیں ہیں' ان میں سے ایک خدا ہے۔

منطقیوں نے اس طرح دلیل دی ہے کہ اگر دو خدا فرض کریں تو وہ دونوں واجب ہوں گے اور وجوب ان میں مابہ الاشتراک ہوگا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے ممتاز ہوں گے کیونکہ اثنینیت بلا امتیاز باطل ہے تو ان میں ایک مابہ الامتیاز بھی ہوگا' لہٰذا ہر ایک خدا دو چیزوں سے مرکب ہوگا مابہ الاشتراک اور مابہ الامتیاز سے' اور جو مرکب ہو وہ اپنے اجزاء کی طرف محتاج اور حادث ہوتا ہے' اور محتاج اور حادث خدا نہیں ہوتا۔

ایک اور دلیل یہ ہے کہ ہر کثرت وحدت کی تابع ہوتی ہے' مثلاً کئی وزیر ہوں تو ان پر ایک وزیر اعلیٰ ہوتا ہے' کئی وزیر اعلیٰ ہوں تو ان پر ایک وزیر اعظم ہوتا ہے' کئی کانسٹیبل ہوں تو ان پر ایک ہیڈ کانسٹیبل ہوتا ہے' کئی ڈائریکٹر ہوں تو ان کا ایک چیئرمین ہوتا ہے۔ اگر سب وزیر ہوں اور ان کے اوپر کوئی وزیر اعلیٰ نہ ہو تو وزارت کا نظام فاسد ہو جائے گا' اگر کئی ماسٹر ہوں اور ان کے اوپر کوئی ہیڈ ماسٹر نہ ہو تو اسکول کا نظام فاسد ہو جائے گا' لہٰذا جب تک کثرت کے اوپر کوئی وحدت نہ ہو اس کثرت کا نظام فاسد ہو جاتا ہے' تو اس کائنات کی کثرت کے اوپر اگر اللہ کی وحدت نہ ہوتی تو اس کا نظام فاسد ہو جاتا اور اس نظام کا قائم رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کسی وحدت کے تابع ہے۔

اسی کے قریب یہ دلیل ہے کہ کسی ملک میں مساوی طاقت اور اختیار کے دو حکمران نہیں ہوتے۔ جہاں پارلیمانی نظام ہے وہاں صرف ایک بااختیار وزیر اعظم ہوتا ہے اور جہاں صدارتی نظام ہے وہاں صرف ایک بااختیار صدر ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک میں دو مساوی اختیار کے حکمران ہوں تو وہاں کا نظام چل نہیں سکتا' ان میں اختلاف اور ٹکراؤ ہوگا اور ان میں سے کسی کی بھی حکومت قائم نہ رہ سکے گی تو جب ایک ملک کے دو صدر یا دو وزیر اعظم نہیں ہو سکتے تو اس کائنات کے دو خدا کیسے ہو سکتے ہیں!

شرک کی تعریف

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

الاشراک هو اثبات الشريك في الالوهية بمعنى وجوب الوجود كما للمجوس او بمعنى استحقاق العبادة كما لعبدة الاصنام.

شرک یہ ہے کہ کسی کو الوہیت میں شریک مانا جائے' خواہ کسی کو اللہ کے سوا واجب الوجود مانا جائے جیسا کہ مجوس مانتے ہیں یا کسی کو عبادت کا مستحق مانا جائے جیسا کہ بت پرست مانتے ہیں۔

(شرح العقائد ص ۶۱' مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی)

خلاصہ یہ ہے کہ شرک کا مدار صرف دو چیزوں پر ہے' وجوب وجود اور استحقاق عبادت' اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو واجب الوجود یا مستحق عبادت مانے تو یہ شرک ہے ورنہ نہیں۔

علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

"وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ" (النحل: ۱۰۰) کی تفسیر میں ابوالعباس نے کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ شیطان کی عبادت بھی کرتے ہیں' اسی وجہ سے یہ مشرک ہو گئے۔

(تاج العروس ج ۷ ص ۱۴۸' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

کیا چیز شرک ہے اور کیا چیز شرک نہیں ہے

اگر کوئی شخص کسی کی کوئی صفت مستقل بالذات مانے تو یہ بھی اس کو واجب الوجود ماننا ہے' لہٰذا جو شخص کسی نبی علیہ السلام یا کسی ولی کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ ان کے سننے یا دیکھنے کی صفت مستقل ہے یعنی وہ اپنی ذاتی طاقت سے سنتے یا دیکھتے ہیں یا ان کا علم ذاتی ہے یا ان کی قدرت ذاتی ہے تو یہ شرک ہے اور اگر یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت سے وہ سنتے ہیں اور

دیکھتے ہیں اور ان کا علم اور قدرت اللہ کی عطا سے ہے تو یہ شرک نہیں ہے۔

"یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئا للہ" پڑھنے کے متعلق شیخ رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں:

اور جو شیخ قدس سرہ کو متصرف بالذات اور عالم غیب بالذات خود جان کر پڑھے گا وہ شرک ہے اور اس عقیدہ سے پڑھنا کہ شیخ کو حق تعالیٰ اطلاع کر دیتا ہے اور باذنہ تعالیٰ شیخ حاجت براری کر دیتے ہیں تو یہ شرک نہ ہوگا۔

(فتاویٰ رشیدیہ کامل مبوب ص ۵۰ 'مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی)

"یارسول اللہ انظر حالنا" کہنے کے متعلق شیخ رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں:

یہ خود آپ کو معلوم ہے کہ نداء غیر اللہ تعالیٰ کو کرنا دور سے شرک حقیقی جب ہوتا ہے کہ ان کو عالم سامع مستقل اعتقاد کرے ورنہ شرک نہیں' مثلاً یہ جانے کہ حق تعالیٰ ان کو مطلع فرما دیوے گا' یا باذنہ تعالیٰ انکشاف ان کو ہو جاوے گا یا باذنہ تعالیٰ ملائکہ پہنچا دیویں گے جیسا درود کی نسبت وارد ہے یا محض شوقیہ کہتا ہو محبت میں یا عرض حال محل تحسر و حرمان میں کہ ایسے مواقع میں اگرچہ کلمات خطابیہ بولتے ہیں لیکن ہرگز نہ مقصود اسماع ہوتا ہے نہ عقیدہ' پس انہی اقسام سے کلمات مناجات واشعار بزرگان کے ہوتے ہیں کہ فی حد ذاتہ نہ شرک نہ معصیت۔ (فتاویٰ رشیدیہ کامل مبوب ص ۶۸ 'مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی)

اہل قبور سے استعانت کے متعلق شیخ گنگوہی لکھتے ہیں:

استعانت کے تین معنی ہیں: ایک یہ کہ حق تعالیٰ سے دعا کرے کہ بحرمت فلاں میرا کام کر دے یہ باتفاق جائز ہے' خواہ عند القبر ہو خواہ دوسری جگہ اس میں کسی کو کلام نہیں' دوسرے یہ کہ صاحب قبر سے کہے کہ تم میرا کام کر دو یہ شرک ہے خواہ قبر کے پاس کہے خواہ قبر سے دور کہے[1] اور بعض روایات میں جو آیا ہے "اعینونی عباد اللہ" تو وہ فی الواقع کسی میت سے استعانت نہیں بلکہ عباد اللہ جو صحرا میں موجود ہوتے ہیں ان سے طلب اعانت ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو اسی کام کے واسطے وہاں مقرر کیا ہے تو وہ اس باب سے نہیں ہے' اس سے حجت جواز پر لانا جہل ہے معنی حدیث سے' تیسرے یہ کہ قبر کے پاس جا کر کہے کہ اے فلاں! تم میرے واسطے دعا کرو کہ حق تعالیٰ میرا کام کر دیوے' اس میں اختلاف علماء کا ہے' مجوز سماع موتیٰ اس کے جواز کے مقر ہیں اور مانعین سماع منع کرتے ہیں' سو اس کا فیصلہ اب کرنا محال ہے مگر انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کو خلاف نہیں' اسی وجہ سے ان کو مستثنیٰ کیا ہے اور دلیل جواز یہ ہے کہ فقہاء نے بعد سلام کے وقت زیارت قبر مبارک کے شفاعت مغفرت کا عرض کرنا لکھا ہے' پس یہ جواز کے واسطے کافی ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ کامل مبوب ص ۱۱۲ 'مطبوعہ سعید اینڈ سنز' کراچی)

یہاں تک ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو واجب الوجود مانا جائے یا کسی غیر اللہ کی کوئی صفت مستقل بالذات مانی جائے تو یہ شرک ہے ورنہ شرک نہیں ہے' لہٰذا عطائی علم' عطائی قدرت اور عطائی اختیارات ماننا شرک نہیں ہے اور اس عقیدہ سے یارسول اللہ کہنا جائز ہے جیسا کہ علماء دیوبند کے سب سے بڑے عالم شیخ رشید احمد گنگوہی کے حوالوں سے گزر چکا ہے۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر غیر اللہ کی تعظیم بہ طور عبادت کی جائے تو یہ شرک ہے اور اگر بہ طور عبادت تعظیم نہ کی جائے تو یہ شرک نہیں ہے۔

علامہ محمد حصکفی لکھتے ہیں:

---

[1] شیخ گنگوہی اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ جو شخص شیخ کو متصرف بالذات اور عالم الغیب کے عقیدہ کے ساتھ "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئا للہ" کہے تو شرک ہے' یہی قید یہاں بھی ملحوظ ہونی چاہیے کہ جو شخص صاحب قبر کو متصرف بالذات سمجھ کر یہ کہے "تم میرا کام کر دو" تو یہ شرک ہے۔ منہ

اگر کوئی شخص غیر اللہ کی تعظیم کے لیے جانور ذبح کرے تو یہ حرام ہے اور اس کے کفر ہونے میں دو قول ہیں "مصید المدیہ" میں لکھا ہے کہ یہ مکروہ ہے اور کفر نہیں ہے' کیونکہ ہم کسی مسلمان کے متعلق یہ گمان نہیں کرتے کہ وہ اس ذبح سے کسی آدمی کا تقرب حاصل کرے گا۔ (الدر المختار علی هامش رد المختار ج ۵ ص ۱۹۷۔ ۱۹۶ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۷ھ)

علامہ شامی تقرب کی شرح میں لکھتے ہیں:

یعنی جو تقرب بہ طور عبادت ہو' کیونکہ اسی تقرب سے تکفیر کی جائے گی' اور یہ مسلمان کے حال سے بہت بعید ہے (کہ وہ کسی شخص کا تقرب بہ طور عبادت حاصل کرنے کے لیے جانور ذبح کرے گا) اس لیے ظاہر ہے کہ اس نے دنیا کے حصول کے لیے جانور ذبح کیا ہے' یا اس سے اظہار محبت کے لیے جانور ذبح کیا ہے' لیکن جب کہ اس ذبح میں غیر اللہ کی تعظیم شامل ہے' تو اس کا بسم اللہ اللہ اکبر پڑھنا حکماً خالص اللہ کے لیے نہیں ہے' اس لیے یہ فعل حرام ہوگا' جیسے کوئی شخص ذبح کے وقت کہے: بسم اللہ و بسم فلاں' تو یہ فعل حرام ہے' لیکن کسی چیز کے حرام ہونے اور اس کے کفر ہونے میں کوئی تلازم نہیں ہے۔

(رد المختار ج ۵ ص ۱۹۷ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۷ھ)

نیز علامہ محمد حصکفی لکھتے ہیں:

بعض لوگ علماء اور مشائخ کے سامنے زمین کو بوسہ دیتے ہیں' یہ فعل حرام ہے' اس فعل کا کرنے والا اور اس پر راضی ہونے والا دونوں گنہگار ہیں کیونکہ یہ بت پرستوں کی عبادت کے مشابہ ہے اور آیا اس پر تکفیر کی جائے گی؟ اگر یہ فعل بہ طور عبادت اور تعظیم ہو تو یہ کفر ہے اور اگر یہ فعل صرف بہ طور تعظیم ہو تو پھر یہ کفر نہیں ہے' لیکن گناہ کبیرہ ہے۔

(در مختار ج ۵ ص ۲۴۶ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۷ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ کسی شخص کی کسی صفت کو مستقل بالذات سمجھنا شرک ہے اور کسی شخص کی تعظیم بہ طور عبادت کرنا شرک ہے' اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تعظیماً قیام کرنا اور یا رسول اللہ کہنا شرک نہیں ہے اور اسی نوع کے دوسرے افعال جو آپ کی تعظیم اور محبت کی جہت سے کیے جاتے ہیں شرک نہیں ہیں۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ

اور اگر تم کو اس کتاب (کے کلام الٰہی ہونے) میں شک ہے' جس کو ہم نے اپنے (محبوب) بندے پر نازل کیا ہے تو اس کی

مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ

مانند کوئی اور سورت (بنا کر) لے آؤ' اور اللہ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو' اگر

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا

تم سچے ہو O سو اگر تم نہ کر سکے اور تم ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے بچو جس کا

النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے' جس کو کافروں کے لیے تیار کیا گیا ہے O

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو مخاطب فرما کر اپنے خالق‘ رب اور وحدہ لاشریک ہونے پر دلیل قائم کی تھی اور اب اس پر دلیل قائم کی ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کلام کو اس نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا اور اس میں آپ کی رسالت پر دلیل ہے‘ کیونکہ عرب اپنی فصاحت و بلاغت پر بہت فخر کرتے تھے اور اپنے مقابلہ میں باقی دنیا کو عجم کہتے تھے‘ اس کے باوجود وہ قرآن مجید کی کسی چھوٹی سورت کی مثال لانے سے بھی عاجز رہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی سورت لانے کے بجائے جنگ و جدال کے درپے ہوئے اور اس سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعویٰ کا سچا ہونا ظاہر ہو گیا کہ ان پر اللہ کا کلام نازل ہوا ہے‘ اور جس طرح پہلی آیتوں میں یہ بتایا گیا تھا کہ آسمان سے پانی نازل کرنا اور اس سے زرعی اجناس کو اگانا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور کوئی یہ کام نہیں کر سکتا‘ اور یہ اس کے خالق ہونے کی دلیل ہے‘ اسی طرح ان آیتوں میں یہ بتایا ہے کہ ایسا فصیح و بلیغ کلام اور جو کلام غیب کی خبروں اور علوم و معارف پر بھی مشتمل ہو وہ صرف قرآن کریم ہے اور کوئی شخص اس کلام کی نظیر نہیں لا سکتا اور یہ آیتیں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر دلیل ہیں۔

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مکی سورتوں میں قرآن مجید کی نظیر لانے کا چیلنج کیا تھا ارشاد فرمایا:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۸۸)

فرمائیے: اگر تمام انسان اور جن اس قرآن کی مثل لانے پر جمع ہو جائیں تو وہ اس کی مثل نہیں لا سکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں ۝

اور جب وہ اس پورے قرآن کی مثل لانے سے عاجز رہے تو اللہ تعالیٰ نے چیلنج میں تخفیف کر کے فرمایا:

فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ. (ھود: ۱۳)

سو تم اس کی مثل دس سورتیں لے آؤ۔

اور جب وہ اس کی مثل دس سورتیں بھی نہ لا سکے تو اور تخفیف کر کے فرمایا:

قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ. (یونس: ۳۸)

آپ کہیے: تم اس کی مثل کوئی ایک سورت لے آؤ۔

اور جب وہ کوئی ایک سورت بھی نہ لا سکے تو فرمایا:

فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖ. (الطور: ۳۴)

یہ (منکر) اس کی مثل ایک بات (آیت) ہی لے آئیں۔

یہ تمام مکی سورتوں کی آیتیں ہیں جن میں قرآن مجید کی مثل لانے کا چیلنج کیا گیا ہے‘ اور اب اس مدنی سورت میں اس چیلنج کا دوبارہ ذکر کیا گیا ہے‘ تاکہ باقی کفار اور مشرکین کے سامنے بھی قرآن مجید کا معجز اور حجت ہونا ظاہر ہو جائے۔

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل

ان آیتوں میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کئی وجوہ سے دلیل ہے:

مشرکین عرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت مخالف اور معاند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو قرآن مجید کی سورتوں جیسی ایک سورت لانے کا چیلنج دیا اور اللہ تعالیٰ نے پیش گوئی بھی کر دی کہ وہ اس کی مثل نہیں لا سکتے‘ یہ قرآن ان کی لغت میں نازل ہوا تھا‘ اگر اس کی مثل لانا ان کے لیے ممکن ہوتا تو وہ اس کی مثل ضرور لے آتے کیونکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کو باطل کرنا اور آپ کے اصحاب کو آپ سے متنفر کرنا ان کا انتہائی مقصود تھا‘ اور جب وہ اس کی مثل لانے سے عاجز رہے تو ظاہر ہو گیا کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اس سے معارضہ کرنا مخلوق کی قدرت میں نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ قیامت تک باقی رہے گا۔ انبیاء سابقین علیہم السلام کو اپنے اپنے زمانے میں معجزات دیئے گئے مثلاً حضرت موسیٰ کو ید بیضاء دیا گیا اور ان کو عصا دیا گیا جو ان کے ہاتھ میں اژدھا بن جاتا تھا‘ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام مادر زاد اندھوں کو بینائی عطا کرتے اور برص کے

مریضوں کو شفاء دیتے اور مردوں کو زندہ کرتے مگر ان کے یہ معجزات صرف ان کی حیات اور ان کے زمانہ میں قائم اور حجت تھے اور جب یہ انبیاء علیہم السلام ظاہری نگاہوں سے رخصت ہوئے تو یہ معجزات بھی ان کے ساتھ رخصت ہو گئے' اس کے برخلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی قرآن مجید اسی طرح معجزہ ہے' اب سے چودہ سو سال پہلے بھی قرآن مجید کی نظیر کوئی نہیں لا سکا تھا اور نہ اب تک لا سکا ہے' حالانکہ قرآن مجید کے مخالفین کی تعداد دن بہ دن زیادہ ہو رہی ہے اور علوم وفنون بھی روز افزوں ترقی پر ہیں' تو اگر کسی شخص کے لیے قرآن مجید کی نظیر لانا ممکن ہوتا تو وہ اب تک لا چکا ہوتا۔ اگر کسی یہودی یا عیسائی کو اپنے دین کے متعلق تردد ہو تو اس کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں جو اس کو اپنے نبی کی نبوت کے متعلق مطمئن کر سکے' اس کے برخلاف اگر کسی مسلمان کو اپنے دین کے متعلق بالفرض تردد ہو تو اس کو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے متعلق یقین اور اطمینان پہنچانے کے لیے قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتیں موجود ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ موافقین اور مخالفین سب کا اس پر اتفاق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر بہت دور رس تھی' آپ بہت معاملہ فہم اور انتہائی دانش مند تھے' آپ کی رائے بہت صائب اور فکر بہت صحیح تھی' پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ نبوت کا دعویٰ کرتے اور اپنی نبوت کی دلیل ایسے کلام کو قرار دیتے جس کی مثل پیش کرنے پر ہر عرب قادر ہوتا اور اس سے آپ کے دعویٰ کا کذب اور بطلان ظاہر ہوتا (العیاذ باللہ) ظاہر ہے کہ آپ ایسا غیر معمولی ذہین شخص اس قسم کا کمزور چیلنج نہیں کر سکتا تھا' اس سے معلوم ہوا کہ جس کلام کی نظیر لانے کا آپ نے چیلنج کیا تھا وہ اللہ کا کلام ہے اور اس کلام کی نظیر لانا کسی انسان کی قدرت میں نہیں ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: '' ولن تفعلوا. تم اس کلام کی مثل ہرگز نہ لا سکو گے'' یہ اللہ تعالیٰ کی پیش گوئی ہے اور اس آیت میں غیب کی خبر ہے اور بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ پیش گوئی درست تھی اور غیب کی یہ خبر صادق تھی اور اب تو چودہ صدیاں گزر چکی ہیں' اسلام کے مخالفین بہ کثرت ہیں لیکن آج تک کوئی شخص قرآن مجید کی کسی آیت کی نظیر نہیں پیش کر سکا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ کے سوا اپنے شہداء (مددگاروں) کو بھی لے آؤ اگر تم سچے ہو۔ (البقرہ: ٢٣)

شہید کا معنی

شہداء' شہید کی جمع ہے' اس کا معنی ہے: حاضر' گواہی دینے والا' مددگار' اور امام' اللہ کی راہ میں قتل کیے جانے والے کو بھی شہید کہتے ہیں' کیونکہ اس کے قتل ہوتے ہی اس کے سامنے اس کا اجر اور سعادت حاضر ہو جاتی ہے یا اس کے سامنے حوریں حاضر ہو جاتی ہیں' یا اس کی عزت افزائی اور اس کو بشارت دینے کے لیے فرشتے حاضر ہو جاتے ہیں' قرآن مجید میں ہے:

تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ (حم السجدۃ: ٣٠)

ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ خوف کرو نہ غم کرو' اور اس جنت کے ساتھ خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا ○

اور اس شہید سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کفار سے لڑتا ہوا شہید ہوا' یہ دنیا اور آخرت کے حق میں شہید ہے' اور جو شخص دین کی سربلندی کے لیے لڑتا ہوا قتل نہیں ہوا بلکہ اپنی جان' مال یا عزت کی حفاظت کرتا ہوا قتل ہو گیا یا ظلماً قتل کیا گیا وہ دنیا کے اعتبار سے شہید ہے' اور جو شخص غرق ہوا یا پیٹ کی بیماری میں فوت ہوا وہ آخرت کے اعتبار سے شہید ہے۔ اول الذکر دونوں قسم کے شہیدوں کو غسل دیا جائے گا نہ کفن پہنایا جائے گا' ان کو بغیر غسل کے انہی کپڑوں میں دفن کیا جائے گا اور ان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ قرآن کی سورت کی مثل لانے کے لیے تم انسانوں‘ جنوں اور خود ساختہ معبودوں کو بلاؤ اور ان سے مدد حاصل کرلو اللہ کے سوا اس کلام کی مثل اور کوئی نہیں لاسکتا‘ یا اللہ کے سوا اور گواہوں کو بلاؤ جو یہ گواہی دیں کہ تمہارا بنایا ہوا کلام اللہ کے کلام کی مثل ہے‘ یا شہداء سے مراد وہ غیر اللہ ہیں جن کو تم نے اپنا کارساز بنا کر رکھا ہے یا شہداء سے مراد وہ خود ساختہ معبود ہیں جن کے متعلق تمہارا عقیدہ ہے کہ وہ قیامت کے دن تمہارے حق میں گواہی دیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو اگر تم نہ کر سکے اور تم ہرگز نہ کرسکو گے تو اس آگ سے بچو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ (البقرہ: ۲۴)

دوزخ میں جلنے والے پتھروں کا بیان

ان پتھروں سے مراد وہ بت ہیں جن کو بنا کر انہوں نے ان کی پرستش کی‘ قرآن مجید میں ہے:

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ (الانبیاء: ۹۸) بے شک تم اور اللہ کے سوا تم جن (بتوں) کی عبادت کرتے ہو وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں۔

بتوں کو اس لیے آگ میں ڈالا جائے گا تاکہ مشرکین کی زیادہ ذلت اور رسوائی ہو اور یہ واضح ہو کہ جن بتوں کو وہ اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے وہ خود اپنے آپ کو عذاب سے نہیں بچا سکتے‘ یا اس لیے کہ ان کے جرم اور شرک کا منشاء یہ بت تھے‘ اس لیے ان بتوں کو عذاب دیا جائے گا جس طرح جو شخص سونے چاندی کی محبت کی وجہ سے ان کی زکوٰۃ نہ نکالے سونا چاندی تپا کر ان سے اس کی پیشانی‘ پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا‘ قرآن مجید میں ہے:

يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ (التوبہ: ۳۵) جس دن وہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا‘ پھر اس سے ان کی پیشانیوں‘ ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو داغا جائے گا۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ان کو یہ بشارت دے دیجئے کہ ان کے لیے ایسے باغات

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا

ہیں جن کے نیچے دریا بہہ رہے ہیں‘ جب بھی ان کو ان باغات سے کوئی پھل کھانے کے لیے دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ

الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ

یہ وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا‘ اور ان کو صورۃً ملتے جلتے پھل دیئے جائیں گے‘ اور ان کے لیے ان باغات میں پاکیزہ

مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

ازواج ہوں گی اور وہ ان باغات میں ہمیشہ رہیں گے O

نجات کا مدار اللہ کے فضل پر ہے نہ کہ اعمال پر

قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ ترہیب کے بعد ترغیب اور ڈرانے کے بعد خوشخبری کا ذکر فرماتا ہے اس سے پہلے کفار کو دوزخ کے دائمی عذاب سے ڈرایا تھا اور اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو امر فرمایا ہے کہ آپ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو جنت ' جنت کے پھلوں ' پاکیزہ بیویوں اور ان نعمتوں کے دوام کی خوشخبری دے دیں' ان چار نعمتوں کا خصوصیت کے ساتھ اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ انسان بنیادی طور پر رہائش ' طعام اور نکاح کو چاہتا ہے' اس کی رہائش کے لیے جنت کی' طعام کے لیے جنت کے پھلوں کی اور نکاح کے لیے پاکیزہ بیویوں یعنی حوروں کی خوشخبری دی اور اگر کسی نعمت کے ساتھ اس کے زوال کا بھی خدشہ اور خطرہ لاحق ہو تو پھر انسان اس نعمت سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتا اور حالت عیش میں بھی وہ فکر مند رہتا ہے' اس لیے مومنوں کو یہ بشارت بھی دی کہ یہ نعمتیں دائمی ہیں اور کبھی فنا نہیں ہوں گی' اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خوشخبری کے سنانے کا حکم دیا ہے اور آپ کے وصال کے بعد ہر زمانہ کے علماء اور مبلغین کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو یہ خوشخبری سنائیں۔

یہ خوشخبری سنانے کا حکم ان لوگوں کے لیے دیا گیا ہے جو ایمان لائے ہوں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہوں' اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس بشارت کا استحقاق ان دونوں کا مجموعہ ہے۔ ایمان بنیاد کی طرح ہے اور نیک اعمال اس پر بنی ہوئی عمارت کی طرح ہیں اور جس بنیاد پر عمارت نہ ہو وہ رہائش کے لیے کافی نہیں ہوتی' اسی لیے قرآن مجید میں ان دونوں کا اکثر و بیشتر ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اپنے ایمان اور اعمال صالحہ کے اعتبار سے ان نعمتوں کے مستحق ہوں گے لیکن یہ استحقاق اس اعتبار سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے نیک عمل کرنے والے مومنوں اور اس پر برقرار رہنے والوں سے ان نعمتوں کا وعدہ کر لیا ہے' یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنے نیک اعمال کی وجہ سے ان نعمتوں کے مستحق ہوتے ہیں کیونکہ انسان بالغ ہونے کے بعد نیک عمل شروع کرتا ہے اور اس کے ہر لقمہ بلکہ ہر سانس کے ساتھ اللہ کی غیر متناہی نعمتیں وابستہ ہیں' سو اس کی ساری عمر کی عبادتیں تو ان نعمتوں کے برابر بھی نہیں ہیں جو وہ اس دنیا میں حاصل کر چکا ہے تو اب وہ اخروی نعمتوں کا مطالبہ کون سی عبادتوں کے عوض کرے گا' اس کے لیے تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس سے اپنی پچھلی نعمتوں کا حساب نہ مانگے' اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کسی شخص کو بھی اس کا عمل جنت میں ہرگز نہیں داخل کرے گا' عرض کیا گیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو بھی نہیں؟ فرمایا: مجھ کو بھی نہیں' مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے گا۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۷۷ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

جنت کا معنی' قرآن اور حدیث میں جنت کی ترغیب اور اس کی طلب کا بیان

علامہ راغب اصفہانی جنت کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جن'' کا اصل میں معنی ہے: کسی چیز کو حواس سے چھپا لینا' قرآن مجید میں ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ . (الانعام: ۷۶) جب رات نے ان کو چھپا لیا۔

جنان' قلب کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی حواس سے مستور ہوتا ہے' جنین' پیٹ میں بچہ کو کہتے ہیں وہ بھی مستور ہوتا ہے' مجن اور جنہ ڈھال کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی حملہ آور کے حملہ سے چھپاتی ہے اور جن بھی حواس سے مستور ہوتے ہیں' اور جنت اس باغ کو کہتے ہیں جس میں بہت زیادہ گھنے درخت ہوں اور درختوں کے گھنے پن اور زیادہ ہونے کی وجہ سے زمین چھپ گئی ہو اور دارالجزاء کا نام جنت اس لیے ہے کہ اس کو زمین کی جنت (گھنے باغ) کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اگرچہ دونوں جنتوں میں

بہت فرق ہے یا اس کو اس وجہ سے جنت کہا گیا ہے کہ اس کی نعمتیں ہم سے مستور ہیں' قرآن مجید میں ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ ۚ سو کسی کو معلوم نہیں کہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا چیز پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ (السجدہ: ۱۷)

حضرت ابن عباس نے فرمایا: جمع کے صیغہ سے ''جنات'' اس لیے فرمایا ہے کہ جنتیں سات ہیں: (۱) جنت الفردوس (۲) جنت عدن (۳) جنت النعیم (۴) دار الخلد (۵) جنت الماویٰ (۶) دار السلام (۷) علیین۔

(المفردات ص ۹۸ 'مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران' ۱۳۴۲ھ)

بعض صوفیاء اور قرب الٰہی کے مدعی جنت کو بہت کم درجہ کی اور گھٹیا چیز قرار دیتے ہیں' اور بعض کہتے ہیں کہ ہم کو جنت نہیں رضائے مولیٰ چاہیے اور یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جس چیز کی تعریف و توصیف کی ہے اور اس کو طلب کرنے کا حکم دیا ہے اس کو کم درجہ اور گھٹیا کہنے سے اللہ کیسے راضی ہوگا' بعض کہتے ہیں کہ ہم کو جنت نہیں مدینہ چاہیے اور جنت کو ادنیٰ اور مدینہ کو اعلیٰ قرار دیتے ہیں حالانکہ مدینہ کی افضلیت اس وجہ سے ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن ہے اور جس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب آرام فرمارہے ہیں وہ بھی جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے' اور آخرت میں بھی آپ کی قیام گاہ جنت ہوگی تو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن ہونا وجہ محبت ہے تو آپ کا مسکن دنیا میں بھی جنت ہے اور آخرت میں بھی جنت ہے تو اول آخر جنت ہی کو محبوب ہونا چاہیے' اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں جنت کی قدر و منزلت پیدا فرمائے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَسَارِعُوٓا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَٰوَٰتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ۝ اپنے رب کی مغفرت اور ایسی جنت کی طرف جلدی کرو جس کی چوڑائی آسمان اور زمین ہیں' اس کو متقین کے لیے تیار کیا گیا ہے ۝ (آل عمران: ۱۳۳)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ چیزیں تیار کی ہیں جن کو کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال آیا ہے اور اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو: ''فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین. سو کسی کو معلوم نہیں کہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا چیز پوشیدہ رکھی گئی ہے۔'' (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۶۰ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو پہلا گروہ جنت میں داخل ہوگا ان کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوگا' نہ وہ اس میں تھوکیں گے' نہ ناک سے ریزش آئے گی' نہ فضلہ خارج ہوگا' ان کے برتن جنت میں سونے کے ہوں گے اور کنگھے سونے اور چاندی کے ہوں گے اور اس میں عود کی خوشبو ہوگی' ان کا پسینہ مشک کی طرح خوشبودار ہوگا' ہر جنتی کو دو بیویاں ملیں گی' ان کی پنڈلیوں کا مغز گوشت کے پار سے نظر آئے گا' یہ ان کے حسن کی جھلک ہے' ان کے دلوں میں اختلاف اور بغض نہیں ہوگا' سب کے دل ایک طرح کے ہوں گے اور وہ صبح و شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کریں گے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۶۰ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں چابک جتنی جگہ بھی دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۶۱۔ ۴۶۰ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے میں ایک سوار سو سال تک چلتا رہے گا اور اگر تم چاہو تو یہ پڑھو: "وظل ممدود"۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۱۱ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۝ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ۝ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ۝ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۝ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ۝ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۝ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ۝ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ۝ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۝ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۝ عُرُبًا اَتْرَابًا ۝ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ (الواقعہ: ۳۸۔ ۲۷)

اور دائیں طرف والے کیا ہی خوب ہیں دائیں طرف والے ۝ وہ بے کانٹوں کی بیریوں میں رہیں گے ۝ اور تہ بہ تہ کیلوں میں ۝ اور پھیلی ہوئی لمبی چھاؤں میں ۝ اور (ہمیشہ) چھلکتے ہوئے پانی میں ۝ اور بہت سے (لذیذ) پھلوں میں ۝ جو نہ ختم ہوں گے نہ روکے ہوئے ہوں گے ۝ اور اونچے بستروں میں ۝ بے شک ہم نے (ان حوروں کو) خصوصیت سے بنایا ۝ سو ہم نے ان کو کنواریاں بنایا ۝ اپنے شوہروں سے محبت کرنے والیاں اور ہم عمر ۝ یہ دائیں طرف والوں کے لیے ہوں گی ۝

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک جنت میں سو درجات ہیں' اور ہر دو درجوں میں آسمان اور زمین جتنا فاصلہ ہے اور فردوس سب سے اعلیٰ درجہ ہے اور ان درجوں کے وسط میں ہے اور اس کے اوپر رحمٰن کا عرش ہے اور وہیں سے جنت کے دریا جاری ہوتے ہیں' پس جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو۔ (جامع ترمذی ص ۳۶۲ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے دریا بہہ رہے ہیں۔ (البقرہ: ۲۵)

"بحر" کا معنی ہے: سمندر' "نھر" کا معنی ہے: دریا اور "جدول" نہر کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان باغات کے نیچے سے دریا بہتے ہیں' اس کا معنی یہ ہے کہ دریا کے دونوں کناروں پر درخت لگے ہوئے ہیں' یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں کوئی لمبی نہر زمین میں کھودی ہوئی ہے' مسروق سے امام ابن جریر' امام ابن مبارک اور امام بیہقی نے اس اثر کو روایت کیا ہے۔

(عنایۃ القاضی ج ۲ ص ۲۶ مطبوعہ دار صادر' بیروت' ۱۲۸۳ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جب بھی ان کو ان باغات سے کھانے کے لیے کوئی پھل دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا۔ (البقرہ: ۲۵)

حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جنتی کو ایک پیالہ دیا جائے گا' وہ اس میں سے کھائے گا' پھر اس کو دوسرا اسی طرح کا پیالہ دیا جائے گا تو وہ کہے گا: یہ تو پہلے کی طرح ہے تو فرشتے کہیں گے: تم کھاؤ ان کا رنگ ایک ہے اور ذائقہ مختلف ہے' اور امام ابن جریر نے موقوفاً روایت کیا ہے اور حاکم نے "مستدرک" میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اہل جنت میں سے کوئی شخص پھل توڑے گا اور ابھی وہ پھل اس کے منہ تک نہیں پہنچے گا کہ اس درخت پر اس کے بدلہ دوسرا پھل لگ جائے گا تو وہ کہے گا کہ یہ تو اسی طرح ہے' اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جنت کے پھل شکل و صورت میں دنیا کے پھلوں کی طرح ہوں تاکہ جنتی ان کی طرف راغب ہوں کیونکہ جب انسان کوئی نئی چیز دیکھتا ہے تو اس سے متوحش ہوتا ہے اور اس وقت جنتی کہیں گے: یہ ایسے ہی پھل ہیں جیسے ہم کو دنیا میں دیئے گئے تھے حالانکہ وہ صرف صورت میں دنیا کے پھلوں کی طرح ہوں گے ذائقہ

مختلف ہوگا' اور اس میں یہ حکمت ہے کہ ان کو بہت تعجب اور خوشی ہوگی کہ صورۃً مماثل ہونے کے باوجود ان کا ذائقہ کس قدر مختلف ہے۔ اس آیت کا ایک محمل یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کو اللہ کی عبادت اور اس کی معرفت سے جو لذت دنیا میں حاصل ہوتی تھی اسی جنس کی لذت جنت میں بھی ذکر الٰہی اور اس کی معرفت سے حاصل ہوگی لیکن جنت میں یہ لذت بہت زیادہ ہوگی' اس کو پھلوں سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ جس طرح پھلوں سے حواس کو لذت حاصل ہوتی ہے' اسی طرح معرفت الٰہی سے روح کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ (عنایۃ القاضی ج ۲ ص ۷۳' مطبوعہ دار صادر' بیروت' ۱۲۸۳ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان کے لیے ان باغات میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ (البقرہ: ۲۵)

جنتی عورتوں اور حوروں کی پاکیزگی' حسن و جمال اور ان کے ساتھ نکاح کی کیفیت کا بیان

امام ابن جریر اپنی اسانید کے ساتھ روایت کرتے ہیں' حضرت ابن عباس نے فرمایا: وہ نجاست سے پاک ہوں گی' مجاہد سے روایت ہے کہ وہ بول اور براز اور منی سے پاک ہوں گی اور مجاہد ہی سے روایت ہے کہ حیض سے' بول اور براز سے' ناک کی ریزش سے' تھوک سے' منی سے اور بچہ جننے سے پاک ہوں گی' قتادہ سے روایت ہے کہ گناہ سے پاک ہوں گی۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۱۳۷' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام احمد اور امام ترمذی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ادنیٰ درجہ کا جنتی شخص وہ ہوگا جس کے اسی ہزار خادم اور بہتر بیویاں ہوں گی۔ (حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ' درمنثور ج ۱ ص ۳۹' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران) (دو دنیا کی عورتیں ہوں گی اور ستر آخرت کی۔ ابن عساکر)

امام ابن ابی شیبہ' امام احمد' امام نسائی' امام عبد بن حمید' امام ابن المنذر اور امام ابن ابی حاتم اپنی اپنی اسانید سے روایت کرتے ہیں کہ اہل کتاب میں سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا: اے ابو القاسم! آپ یہ گمان کرتے ہیں کہ اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے' آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! ایک جنتی شخص کو کھانے' پینے' جماع اور شہوت سے سو دنیاوی آدمیوں کی قوت دی جائے گی' اس نے کہا: جو شخص کھاتا پیتا ہے وہ رفع حاجت بھی کرتا ہے اور جنت پاک جگہ ہے وہاں نجاست نہیں ہوتی' آپ نے فرمایا: ان کی رفع حاجت ایک پسینہ نکلنے سے ہوگی جس سے مشک کی سی خوش بو آئے گی اور پسینہ آنے کے بعد ان کا پیٹ خالی ہو جائے گا۔

(درمنثور ج ۱ ص ۴۰' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

امام طبرانی حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ پیشاب اور جنابت (جماع کے وقت منی کا خروج) ایک پسینہ ہوگا جو ان کے بالوں کے نیچے سے لے کر پیروں تک سے نکلے گا اور اس سے مشک کی خوشبو آئے گی۔

(درمنثور ج ۱ ص ۴۰' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

حافظ نور الدین الہیثمی بیان کرتے ہیں:

امام طبرانی اور امام بزار نے حضرت سعید بن عامر بن حذیم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر اہل جنت کی ازواج میں سے کوئی عورت جھانکے تو تمام روئے زمین مشک کی خوشبو سے بھر جائے اور سورج اور چاند کی روشنی ماند پڑ جائے۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۴۱۷' مطبوعہ دار الکتاب العربی' ۱۴۰۲ھ)

امام طبرانی روایت کرتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں' میں نے عرض کیا:

یارسول اللہ! قرآن مجید میں ہے: "حور عین" اس کی تفسیر فرمائیے؟ آپ نے فرمایا: وہ گورے رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں والی ہوں گی اور ان کی اتنی گھنی پلکیں ہوں گی جیسے گدھ کے پر' میں نے کہا: یارسول اللہ! قرآن کی آیت "کانهن الیاقوت والمرجان" کی تفسیر فرمائیں' آپ نے فرمایا: جیسے صدف میں موتی صاف اور شفاف ہوتا ہے' جس کو کسی نے چھوا نہ ہو' وہ اس طرح صاف اور ان چھوئی ہوں گی' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! "فیهن خیرات حسان" کی تفسیر فرمائیں' آپ نے فرمایا: ان کی صورت حسین اور سیرت جمیل ہوگی' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! "کانهن بیض مکنون" کی تفسیر فرمائیں' فرمایا: ان کی کھال اس طرح باریک ہوگی جیسے انڈے کے چھلکے کے اندر لپٹی ہوئی کھال باریک ہوتی ہے' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! "عربا اترابا" کی تفسیر فرمائیں' آپ نے فرمایا: جو عورتیں دنیا میں بوڑھی ہو کر فوت ہوں گی' ان کے بال سفید ہو چکے ہوں گے اور وہ کمزور ہو چکی ہوں گی' اللہ تعالیٰ ان کو بڑھاپے کے بعد دوشیزہ بنا کر اٹھائے گا اور وہ اپنے شوہروں سے محبت کرنے والی ہوں گی اور سب ایک عمر کی ہوں گی' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آیا دنیا کی عورتیں افضل ہوں گی یا حورعین افضل ہوں گی؟ آپ نے فرمایا: دنیا کی عورتیں' حورعین سے اس طرح افضل ہوں گی جس طرح ظاہر باطن سے افضل ہوتا ہے' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس کی وجہ؟ آپ نے فرمایا: اس کی فضیلت کا سبب ان کے روزے اور ان کی نمازیں ہیں' اللہ تعالیٰ ان کے چہروں میں نور پیدا کر دے گا' ان کا جسم ریشم کی طرح ہوگا' رنگ گورا ہوگا' کپڑے سبز ہوں گے' سنہرے زیورات ہوں گے' ان کی انگیٹھی موتی کی ہوگی اور ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی' وہ کہیں گی: سنو! ہم دائمی ہیں' کبھی نہیں مریں گی' سنو! ہم ہمیشہ نعمت میں ہیں' کبھی مغموم نہیں ہوں گی' ہم قیام کرنے والیاں ہیں' کبھی سفر نہیں کریں گی' ہم خوش ہونے والیاں ہیں' کبھی ناراض نہیں ہوں گی' اس کو مبارک ہو جس کے لیے ہم ہیں اور وہ ہمارے لیے ہے' میں نے عرض کیا: ہماری بعض عورتیں دنیا میں دو خاوندوں سے (یکے بعد دیگرے) نکاح کرتی ہیں' بعض تین سے اور بعض چار سے' تو وہ عورت جنت میں کس خاوند کے نکاح میں ہوگی؟ آپ نے فرمایا: اے ام سلمہ! اس عورت کو اختیار دیا جائے گا اور جس خاوند کا اخلاق دنیا میں سب سے اچھا ہوگا وہ اس کو اختیار کرے گی' وہ کہے گی: اے میرے رب! میرے اس خاوند کا اخلاق سب سے اچھا تھا' میرا اس کے ساتھ نکاح کر دے۔ اے ام سلمہ! دنیا اور آخرت کی خیر اچھے اخلاق کے ساتھ وابستہ ہے۔ (المعجم الکبیر ج ۲۳ ص ۳۶۸۔ ۳۶۷ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

جس عورت نے دنیا میں متعدد نکاح کیے ہوں' وہ آخرت میں کس خاوند کے نکاح میں ہوگی؟

جس عورت نے متعدد نکاح کیے ہوں تو ایک صورت یہ ہے کہ ہر خاوند نے اس کو طلاق دے دی ہو اور جب وہ فوت ہو تو وہ کسی خاوند کے نکاح میں نہ ہو' اس صورت میں اس کو جنت میں اختیار دیا جائے گا کہ جس خاوند کے اخلاق سب سے اچھے ہوں' وہ اس سے نکاح کرے جیسا کہ حضرت ام سلمہ کی مذکور الصدر حدیث میں ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے متعدد نکاح کیے ہوں اور آخری خاوند نے اس کو طلاق نہ دی ہو اور وہ اس کے نکاح میں فوت ہوئی ہو' اس صورت میں وہ جنت میں آخری خاوند کے نکاح میں ہوگی جیسا کہ حضرت ابوداؤد اور حضرت حذیفہ کی حدیث میں ہے۔

(فتاویٰ حدیثیہ ص ۲۱ مطبوعہ مصطفیٰ البابی واولادہ' مصر' ۱۳۵۶ھ)

جن مردوں اور عورتوں کا دنیا میں نکاح نہیں ہوا ان کا جنت میں نکاح ہو جائے گا

علامہ ابن حجر مکی لکھتے ہیں:

جو کم سن بچہ حشر میں دنیاوی عمر اور جسامت پر اٹھایا جائے گا' جنت میں دخول کے وقت اس کی جسامت بڑھا دی جائے گی اور وہ بالغوں کی طرح جنت میں داخل ہوگا اور اس کا دنیاوی عورتوں اور حوروں کے ساتھ نکاح کر دیا جائے گا۔

(فتاوی حدیثیہ ص ۱۵۶ مطبوعہ مصطفی البابی واولادہ مصر ۱۳۵۶ھ)

اس عبارت کی وضاحت یہ ہے کہ جس طرح بعض کم سن بچے فوت ہوتے ہیں اسی طرح بعض کم سن بچیاں فوت ہو جاتی ہیں اور یہ دونوں بالغوں کی طرح جنت میں داخل ہوں گے اور ان کا ایک دوسرے سے نکاح کر دیا جائے گا۔

اسی طرح بعض مردوں کا ساری زندگی نکاح نہیں ہوتا اور وہ تجرد کی زندگی گزارتے ہیں اور بعض عورتیں بھی بغیر نکاح کے بوڑھی ہو جاتی ہیں ان کا بھی جنت میں ایک دوسرے سے نکاح کر دیا جائے گا۔

جنت میں ناپاک اور ناجائز خواہشیں نہیں ہوں گی

بعض لوگ یہ بے ہودہ سوال کرتے ہیں کہ مردوں کو تو حوریں ملیں گی عورتوں کو جنت میں کیا ملے گا! بعض کہتے ہیں کہ جنت میں ان کو غلام ملیں گے' بعض کہتے ہیں کہ جب مردوں کو کئی حوریں اور بیویاں ملیں گی تو عورتوں کو بھی کئی کئی خاوند ملنے چاہئیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی بے ہودہ اور ناپاک خواہشوں کا منبع شیطان ہے اور چونکہ شیطان جنت میں نہیں ہوگا اس لیے یہ ناپاک خواہشیں بھی جنت میں نہیں ہوں گی' جب کوئی شخص یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کے کئی باپ ہوں تو اس کو یہ بھی نہیں سوچنا چاہیے کہ ایک عورت کے کئی خاوند ہوں۔

قرآن مجید میں ہے:

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ اور تمہارے لیے جنت میں ہر وہ چیز ہے جس کی تم خواہش کرو اور جس کی تم طلب کرو ۝ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۱)

جنت میں انسان کی ہر خواہش پوری ہوگی لیکن ناپاک اور ناجائز خواہشیں وہاں اس کے دل میں نہیں پیدا ہوں گی۔ فرض کیجئے کوئی شخص یہ خواہش کرے کہ شیطان کو جنت میں داخل کر کے اس کو نبیوں اور رسولوں سے اونچا مقام دے دیا جائے' حالانکہ یہ محال ہے تو اس کا یہی جواب ہے کہ اس قسم کی لغو' ناپاک اور ناجائز خواہشوں کا منبع شیطان ہے اور جب وہ جنت میں نہیں ہوگا تو ایسی لغو اور ناجائز خواہشیں بھی جنت میں نہیں ہوں گی۔

جنت کی عظمت اور کرامت کے متعلق میں نے بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے کیونکہ ہمارے زمانہ میں جھوٹے صوفی اور بناوٹی محب رسول' جنت کا بہت حقارت سے ذکر کرتے ہیں اور جنت طلب کرنے والوں کی مذمت کرتے ہیں اور ان کی تضحیک کرتے ہیں۔ اے بار الٰہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے ہم کو جنت الفردوس عطا فرما۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ

بے شک اللہ (ہدایت کے سلسلہ میں) کسی بھی مثال کے بیان کو ترک نہیں کرتا خواہ مچھر کی مثال ہو یا اس سے بھی زیادہ حقیر چیز کی'

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا

رہے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ مثال ان کے رب کی طرف سے برحق ہے' اور رہے وہ لوگ

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ

جنہوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ اس (حقیر) مثال سے اللہ نے کیا ارادہ کیا ہے؟ وہ اس (مثال کے بیان) سے بہت لوگوں

وقف لازم

بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ﴿۲۶﴾

کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہت لوگوں کو اس سے ہدایت دیتا ہے اور وہ صرف فاسقوں کو ہی اس سے گمراہی میں مبتلا کرتا ہے O

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَ يَقْطَعُوْنَ

جو اللہ سے خوب پکا عہد کرنے کے بعد اس کو توڑتے ہیں' اور جن چیزوں کو اللہ نے ملانے کا

مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ

حکم دیا ہے ان کو کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں' وہی لوگ

هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

نقصان اٹھانے والے ہیں O

امام ابن جریر طبری نے حضرت ابن عباس' حضرت ابن مسعود اور کئی صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے منافقین کی دو مثالیں بیان کیں (آگ جلانے والے کی' اور بارش میں گھرے ہوئے شخص کی) تو منافقین نے کہا: اللہ کا مرتبہ اس سے بلند ہے کہ وہ مثالیں بیان کرے' اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں' سیاق و سباق کے یہی شان نزول مناسب ہے' نیز امام ابن جریر طبری نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکھی اور مکڑی کی جو مثالیں دی تھیں ان پر مشرکین نے اعتراض کیا کہ اللہ کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ مکھی اور مکڑی کی مثالیں بیان کرے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۱۳۸' مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بتوں کی حقارت بیان کرنے کے لیے ان کو مکھی اور مکڑی سے تشبیہ دی ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۖۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ (العنکبوت: ۴۱)

جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے مددگار بنا لیے ان کی مثال مکڑی کی مثال ہے' جس نے (جالے کا) گھر بنایا' اور بے شک سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے۔

وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ O (الحج: ۷۳)

اور اگر مکھی ان بتوں سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے' طالب اور مطلوب دونوں کمزور ہیں O

پہلی مثال میں بتوں کی عبادت کا کمزور ہونا بتایا ہے کہ وہ مکڑی کے جالے کی مثل ہے' اور دوسری مثال میں بتوں کی خست اور حقارت بتائی ہے کہ اگر بتوں سے مکھی کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اس کو چھڑا نہیں سکتے۔

علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں: ان مثالوں پر منافقوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ کیا (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رب کو حیا نہیں آتی کہ وہ مکھی اور مکڑی ایسی چھوٹی اور حقیر چیزوں کی مثالیں بیان کرتا ہے' تب ان کے رد میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

(عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۷۷' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' ۱۳۴۸ھ)

مثال بیان کرنے کا قاعدہ

مثال دینے کا قاعدہ یہ ہے کہ جس کی وجہ سے مثال دی گئی ہے اس وجہ سے وہ مثال ممثل لہ کے موافق ہو' اگر کسی چیز کی عظمت بیان کرنا مقصود ہو تو عظیم چیز سے مثال دی جائے گی اور اگر کسی چیز کی خست بیان کرنا مقصود ہو تو حقیر چیز سے مثال دی جائے گی' کیونکہ مثال کے ذریعہ ممثل لہ (مقصود) کے معنی کو منکشف کیا جاتا ہے اور امر معقول کو محسوس اور مشاہد کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ مسئلہ سمجھ آجائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک اللہ (ہدایت کے سلسلہ میں) کسی بھی مثال کے بیان کو ترک نہیں کرتا۔ (البقرہ: ۲۶)

حیا کا معنی اور قرآن اور حدیث میں اللہ کی طرف حیا کی نسبت کا محمل

برا کام کرتے وقت لوگوں کی ملامت اور مذمت کے خوف سے انسان کا منقبض ہونا (سمٹنا' سکڑنا) اس کو حیا کہتے ہیں' یہ بے باکی اور بزدلی کی ایک درمیانی کیفیت ہے' بے باک شخص دلیری کے ساتھ برے کام کرتا ہے اور بزدل شخص مطلقاً کوئی کام نہیں کرسکتا' برا ہو یا اچھا' حیا کا یہ معنی اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ وہ کسی کی ملامت سے متاثر ہو' اس لیے یہاں حیا کا لازمی معنی مراد ہے' حیا کی وجہ سے انسان کسی کو دیکھ کر برا کام ترک کردیتا ہے' اس لیے حیا کو ترک کرنا لازم ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے جب حیا کا لفظ استعمال ہو تو اس سے ترک کرنا ہی مراد ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ترک کا لفظ استعمال کیوں نہیں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بر بناء مشاکلت ہے کیونکہ منافقوں نے کہا تھا: کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کو حیا نہیں آتی کہ وہ مکھی اور مکڑی کی مثالیں دیتا ہے! تو ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حق واضح کرنے کے لیے کسی بھی مثال دینے سے حیا نہیں فرماتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف حیا کی نسبت کی ہے: علامہ علی متقی ھندی' امام ابن النجار کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

عن انس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یستحی من عبدہ وامتہ یشیبان فی الاسلام ان یعذبھما۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا جو بندہ اور بندی اسلام میں بوڑھے ہوجائیں اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دینے سے حیا فرماتا ہے۔

(کنز العمال ج ۱۵ ص ۶۷۲' مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

حافظ سیوطی' امام ابن النجار کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو بوڑھا شخص صحیح عمل کرتا ہو اور پابندی سے سنت پر عمل کرتا ہو' اللہ تعالیٰ کو اس سے حیا آتی ہے کہ وہ کوئی سوال کرے اور اللہ اس کو نہ دے۔

(جامع الاحادیث الکبیر ج ۲ ص ۳۰۹' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۴ھ)

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی اللہ کا بندہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھے تو اللہ کو اس سے حیا آتی ہے کہ وہ اپنی کسی حاجت کا سوال کرے اور اس کے پورا ہونے سے پہلے لوٹ جائے۔

(جامع الاحادیث الکبیر ج ۲ ص ۳۰۹' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۴ھ)

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک تمہارا رب حیادار' کریم ہے' جب بندہ اس کی طرف دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ ان کو خالی لوٹانے سے حیا فرماتا ہے۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۰۹ مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث کو امام ترمذی[1]، امام ابن ماجہ[2] اور امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔[3]

حافظ سیوطی نے بھی اس حدیث کو متعدد حوالوں سے ذکر کیا ہے۔

(جامع الاحادیث الکبیر ج ۲ ص ۲۷۲ مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۱۴ھ)

یہاں پر غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مالک اور مولیٰ ہو کر بندوں کی بات ٹالنے اور ان کی دعا مسترد کرنے سے حیا فرماتا ہے تو جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کسی کام کا حکم دے تو اس کے حکم پر عمل نہ کرنے سے بندوں کو کس قدر حیا کرنی چاہیے' غالباً اسی نکتہ پر متنبہ کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے لیے ترک کرنے کے بجائے حیا کرنے کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ اس (مثال کے بیان) سے بہت لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہت لوگوں کو اس سے ہدایت دیتا ہے۔ (البقرہ: ۲۶)

اللہ تعالیٰ کے گمراہ کرنے کی توجیہ

کفار اور منافقین نے جو یہ سوال کیا تھا کہ اللہ نے ان مثالوں کے بیان کرنے سے کیا ارادہ کیا ہے؟ اس آیت میں اس کا جواب ہے' یعنی جن لوگوں پر جہالت غالب ہے اور جو ضد اور ہٹ دھرمی سے باز نہیں آتے وہ جب ان مثالوں کو سنیں گے تو ضد اور عناد کی وجہ سے ان مثالوں پر غور وفکر نہیں کریں گے اور فوراً ان کا انکار کر دیں گے' لہٰذا ان مثالوں کا بیان کرنا ان کے حق میں گمراہی کا موجب ہوا اور جن لوگوں کی عادت یہ ہے کہ وہ ضد اور ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیتے' کھلے ہوئے ذہن سے سوچتے ہیں اور غور وفکر کرتے ہیں وہ جب ان مثالوں کو سنیں گے تو ہدایت پا جائیں گے' کلیات اور باریک چیزوں کی وضاحت مثال سے ہی ہوتی ہے اور جو شخص ان مثالوں پر غور وفکر کرتا ہے وہ ہدایت پا لیتا ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ○ (العنکبوت: ۴۳)

اور ان مثالوں کو ہم لوگوں کے لیے بیان فرماتے ہیں' اور ان کو صرف عالم ہی سمجھتے ہیں ○

ایک سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ کثیر کو گمراہ کرتا ہے اور کثیر کو ہدایت دیتا ہے' حالانکہ گمراہ تو کثیر ہیں اور ہدایت یافتہ قلیل ہیں' اس کا جواب یہ ہے کہ گمراہ عدداً کثیر ہیں اور ہدایت یافتہ اپنے مرتبہ اور شرف کے اعتبار سے کثیر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور وہ صرف فاسقوں کو ہی اس سے گمراہی میں مبتلا کرتا ہے ○ (البقرہ: ۲۶)

فسق کی تعریف اور اس کی اقسام

فسق کا معنی ہے: اعتدال اور طریق مستقیم سے خروج' اور شریعت میں گناہ کبیرہ کرنے والے کو فاسق کہتے ہیں۔ اس کے تین مراتب ہیں: (۱) تغابی: جو شخص کبھی کبھی گناہ کبیرہ کرے اور اس کو برا جانتا ہو (فرض کا ترک اور حرام کا ارتکاب گناہ کبیرہ ہے) (۲) انہماک: جو شخص گناہ کبیرہ کا عادی ہو اور اس کو اس کا کوئی خوف نہ ہو (۳) جحود: جو شخص گناہ کبیرہ کو اچھا اور صحیح سمجھ کر کرے' پس جو شخص اس درجہ میں پہنچ جائے اس کا ایمان جاتا رہتا ہے اور وہ کافر ہو جاتا ہے' اور جب تک وہ تغابی اور انہماک

---

[1] امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی ص ۵۱۲' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[2] امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ' سنن ابن ماجہ ص ۲۷۵' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[3] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۵ ص ۴۳۸' ج ۶ ص ۲۱۴' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

کے درجہ میں ہوتا ہے وہ ایمان سے نہیں نکلتا کیونکہ اس کے دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق قائم رہتی ہے اور اسی تصدیق کا نام ایمان ہے۔

یہاں فاسق سے مراد وہ منافقین ہیں جو فسق کے تیسرے درجہ میں پہنچ چکے تھے اور اللہ تعالیٰ نے گمراہ کرنے کو جو فاسقوں میں منحصر کر دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس فسق نے ہی ان کو گمراہی تک پہنچایا' کیونکہ مسلسل حق کا انکار کرنے اور باطل پر اصرار کرنے کی وجہ سے وہ ایسے معاند اور ہٹ دھرم ہو گئے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بیان کی ہوئی مثالوں پر غور نہیں کیا اور یہ نہیں سمجھا کہ مکھی اور مکڑی کی مثالیں دے کر اللہ تعالیٰ نے بتوں کی خست اور حقارت کو بیان کیا ہے اور ان کی جہالت اور گمراہی اور پختہ ہو گئی اور اس طرح ان مثالوں کا مذاق اڑانے اور انکار کرنے سے ان فاسقوں کی گمراہی اور زیادہ راسخ ہو گئی اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ صرف فاسقوں کو ہی اس سے گمراہ کرتا ہے O

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو اللہ سے خوب پکا عہد کرنے کے بعد اس کو توڑتے ہیں۔ (البقرہ: ۲۷)

عہد موثق کا معنی اور اس کی اقسام

پکے عہد کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی رعایت اور حفاظت کی جائے جیسے قسم اور وصیت کی رعایت اور حفاظت کی جاتی ہے' اس عہد سے مراد وہ عہد ہے جو لوگوں کو عقل دینے کی صورت میں لیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں اپنی ذات اور صفات پر دلائل قائم کیے ہیں اور نشانیاں رکھی ہیں اور عقل میں یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ان نشانیوں سے صاحب نشان تک پہنچ سکتی ہے۔ اس عہد کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ O (الاعراف: ۱۷۲)

اور یاد کیجئے جب آپ کے رب نے بنو آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بنایا (فرمایا:) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں؟ ہم نے گواہی دی (یہ گواہی اس لیے لی ہے) کہ (کہیں) قیامت کے دن تم یہ (نہ) کہنے لگو کہ ہم اس سے بے خبر تھے O

دوسرا عہد وہ ہے کہ جو نبیوں اور رسولوں کے واسطوں سے ان کی امتوں سے لیا گیا اور وہ یہ عہد تھا کہ جب ان کے پاس وہ عظیم رسول آجائیں جن کی پچھلی کتابوں میں تصدیق ہے اور معجزات سے ان کی رسالت ثابت ہو جائے تو یہ سب اس عظیم رسول کی اتباع کریں گے اور ان کی کتابوں میں اس کی نبوت کا جو بیان ہے اس کو نہیں چھپائیں گے اور اس کی مخالفت نہیں کریں گے' اور اس عہد کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ O (آل عمران: ۱۸۷)

اور یاد کرو! جب اللہ نے اہل کتاب سے یہ عہد لیا کہ تم یہ عہد لوگوں سے ضرور بیان کرو گے اور اس کو نہیں چھپاؤ گے' سو انہوں نے اس عہد کو پس پشت پھینک دیا اور اس عہد کے بدلہ میں حقیر معاوضہ لے لیا' تو یہ کیسی بری چیز کو خرید رہے ہیں O

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کی فطرت میں جو ہدایت رکھی تھی اس کو انہوں نے غور و فکر سے کام نہ لے کر ضائع کر دیا' اور ان کے نبیوں اور رسولوں نے جو ان سے آخری نبی کی پیروی کا عہد لیا تھا' انہوں نے اپنے تعصب اور عناد کی

وجہ سے اس عہد کو بھی توڑ دیا۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جن چیزوں کو اللہ نے ملانے کا حکم دیا ہے' ان کو کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں اور یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں O (البقرہ: ۲۷)

منافقین کا شر اور فساد

اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ حکم دیا تھا کہ رشتے داروں سے تعلق جوڑیں یہ توڑتے تھے اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ مسلمانوں سے محبت کریں یہ ان سے اعراض کرتے تھے اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ نبیوں میں ایمان لانے کے لحاظ سے فرق نہ کریں یہ فرق کرتے تھے فرض نماز کو جماعت سے پڑھنے کا حکم تھا یہ ترک کرتے تھے اور ہر وہ کام جس میں خیر ہو اس کو ترک کر کے شر کو اختیار کرتے تھے اور زمین میں ان کا فساد یہ تھا کہ لوگوں کو ایمان لانے سے روکتے تھے اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے اور جن چیزوں کے وصل سے امن عالم قائم ہے ان میں فصل کرتے تھے۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ

تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو؟ حالانکہ تم مردہ تھے' اس نے تم کو زندہ کیا' پھر وہ

يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِي خَلَقَ

تم پر موت طاری کرے گا' پھر تم کو زندہ کرے گا' پھر اس کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے O (اللہ) وہی ہے جس نے

لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ

تمہارے نفع کے لیے زمین میں سب چیزوں کو پیدا کیا' پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے سات

سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۲۹﴾

ہموار آسمان بنا دیئے' اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے O

اس آیت میں کفار کو مخاطب کر کے یہ بتایا کہ تم کس طرح اللہ کے ساتھ کفر کر سکتے ہو' حالانکہ پہلے تم نطفہ کی شکل میں بہ ظاہر مردہ تھے' پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے جسم میں روح پھونک کر تم کو زندہ کیا' پھر جب تمہاری مدت حیات پوری ہو جائے گی تو پھر تم پر موت طاری کرے گا' پھر قبر میں سوال و جواب کے وقت یا صور پھونکنے کے وقت تم کو دوبارہ زندہ کرے گا' پھر حشر کے بعد تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے' اور اللہ تم کو تمہارے اعمال کی جزا دے گا اور جب تم کو اپنے ان احوال کا علم ہے تو پھر تمہارا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا کس قدر تعجب خیز ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کفار کو یہ علم تھا کہ وہ پہلے مردہ تھے' پھر ان کو زندہ کیا گیا اور پھر ان پر موت آئے گی' لیکن موت کے بعد دوبارہ زندگی کے تو وہ قائل نہ تھے تو اس حیات کو ان کے خلاف بہ طور حجت پیش کرنا کس طرح درست ہوگا' اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ حیات بعد الموت پر دلائل بالکل ظاہر ہیں اس لیے ان دلائل کے ظہور کو کفار کے علم کے قائم مقام کیا گیا ہے' علاوہ ازیں اس آیت میں بھی حیات بعد الموت پر دلیل ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ان کو مردہ حالت میں زندگی کی طرف

منتقل کیا تو دوبارہ ان پر موت طاری کر کے انہیں زندہ کرنا اس کے لیے کب مشکل ہو سکتا ہے!

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ موت طاری کرنے کو کس طرح نعمتوں میں سے شمار کیا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ موت دوسری حیات کی طرف پہنچاتی ہے اور وہی حقیقی حیات ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں مومنوں سے خطاب ہو کہ پہلے تم مردہ تھے یعنی جاہل تھے پھر تم کو زندہ کیا یعنی علم اور ایمان سے سرفراز کیا' پھر تم پر معروف موت طاری کی جائے گی اور تم کو حقیقی حیات دے دی جائے گی اور تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر تم کو ایسا اجر و ثواب دیا جائے گا' جس کو کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ اس کا کسی دل میں خیال آیا ہے۔

حیات اور موت کا معنی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

حیات کے متعدد معنی ہیں:

(۱) نباتات میں جو نشوونما کی قوت ہے اس کو حیات کہتے ہیں' قرآن مجید میں ہے:

اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ (الحدید: ۱۷) — بے شک اللہ ہی زمین کے مردہ ہونے کے بعد اس کو زندہ فرماتا ہے۔

(۲) حیوانات میں جو احساس اور حرکت بالارادہ کی قوت ہے اس کو حیات کہتے ہیں:

وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ۚ (الفاطر: ۲۲) — اور زندہ اور مردہ برابر نہیں ہو سکتے۔

(۳) عمل اور عقل کی قوت کو حیات کہتے ہیں:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ (الانعام: ۱۲۲) — اور کیا وہ شخص جو مردہ تھا' پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کو روشنی دی جس سے وہ چلتا ہے۔

(۴) حیات اخرویہ ابدیہ جس کو عقل اور علم سے حاصل کیا جاتا ہے:

اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ (الانفال: ۲۴) — اللہ اور رسول جب تمہیں ابدی زندگی دینے والی چیز کی طرف بلائیں تو فوراً حاضر ہو جاؤ۔

(۵) جس حیات کے ساتھ اللہ تعالیٰ متصف ہے' اور اللہ تعالیٰ کے حی ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس کے لیے موت ممکن نہیں ہے اور وہ عالم اور قادر ہے۔ حیات کے معنی کے مقابلہ میں موت کا معنی ہے' زمین کا بے آب و گیاہ ہونا اور بنجر ہونا زمین کی موت ہے' حس اور حرکت ارادیہ کی قوت کا ختم ہو جانا جانداروں اور حیوانوں کی موت ہے' عمل اور عقل کی قوت کا ختم ہو جانا انسانوں کی موت ہے۔ (المفردات ۱۳۹۔ ۱۳۸' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اللہ) وہی ہے جس نے تمہارے نفع کے لیے زمین میں سب چیزوں کو پیدا کیا' پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے سات ہموار آسمان بنا دیئے۔ (البقرہ: ۲۹)

زمین اور آسمان کی تخلیق کی ترتیب

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ زمین کو پہلے بنایا گیا یا آسمان کو' جو علماء پہلے زمین کی تخلیق کے قائل ہیں ان کا استدلال اس آیت سے ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین کو پیدا کرنے کے بعد آسمان کی طرف متوجہ ہوا' اور حسب ذیل آیات سے بھی ان کا استدلال ہے:

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ۝ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ ۝ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰى فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖۗ وَحِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ (حٰمٓ السجدۃ: ۱۲-۹)

آپ کہیے: کیا تم واقعی اس ذات کے ساتھ کفر کرتے ہو جس نے دو دن میں زمین کو بنایا اور تم اس کے لیے شریک بناتے ہو؟ وہ (عظیم) رب ہے تمام جہانوں کا ○ اور اس نے زمین میں بھاری پہاڑوں کو گاڑ دیا اور اس میں برکت رکھی اور زمین میں رہنے والوں کی غذا بھی چار دنوں میں مقدر کی؛ جو طلب کرنے والوں کے لیے مساوی ہے ○ پھر آسمان کی طرف قصد کیا درآں حالیکہ وہ دھواں تھا' پھر آسمان اور زمین سے فرمایا: تم دونوں خوشی یا ناخوشی سے حاضر ہو؛ ان دونوں نے کہا: ہم خوشی سے حاضر ہوئے ○ پھر دو دن میں سات آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اس کے موافق حکم بھیجا' اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے مزین کیا اور اس کی حفاظت کی؛ یہ بہت زبردست ذات اور بڑے علم والے کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے ○

یہ آیتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کیا گیا ہے اور امام ابن جریر طبری نے قتادہ سے یہ نقل کیا کہ آسمان کو پہلے بنایا گیا ہے اور پھر زمین کو بنایا گیا ہے' ان کا استدلال قرآن مجید کی ان آیات سے ہے:

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا ۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝ وَاَغْطَشَ لَیْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ (النازعات: ۳۰-۲۷)

آیا تمہاری تخلیق زیادہ سخت ہے یا آسمان کی؟ (اللہ نے) آسمان کو بنایا ○ اس کی چھت بلند کی' پھر اس کو ہموار کیا ○ اور اس کی رات تاریک کی اور اس کے دن کی روشنی کو ظاہر کیا ○ اور اس کے بعد زمین کو پھیلایا ○

اس آیت سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین کو آسمان کے بعد پیدا کیا گیا ہے لیکن جمہور علماء اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ زمین کی تخلیق پہلے کی گئی تھی جیسا کہ سورہ البقرہ اور سورہ حم السجدۃ سے واضح ہوتا ہے اور زمین کو پھیلانے کا عمل آسمان کی تخلیق کے بعد کیا گیا جیسا کہ سورۃ النازعات سے واضح ہوتا ہے۔

اباحت کے اصل ہونے کی تحقیق

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے تمہارے نفع کے لیے زمین میں سب چیزوں کو پیدا کیا۔ اس آیت میں لام انتفاع کے لیے ہے سبب اور تعلیل کے لیے نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کسی فعل کی کوئی علت نہیں ہوتی۔ (بیضاوی) اس آیت سے جمہور فقہاء اور اصولیین نے یہ استدلال کیا ہے کہ احکام شرعیہ کے وارد ہونے سے پہلے اصل میں سب اشیاء مباح ہیں' پھر جب احکام شرعیہ وارد ہوئے تو بعض کام واجب ہو گئے اور بعض کام حرام ہو گئے مثلاً شراب نوشی اور کتوں کے ساتھ اشتغال اور تصویریں بنانا پہلے مباح تھا اور جب شریعت میں ان سے ممانعت وارد ہو گئی تو یہ کام حرام ہو گئے' اسی طرح والدین کی اطاعت کرنا پہلے مباح تھا' جب شریعت نے اس کا حکم دے دیا تو یہ واجب ہو گیا' اور جن مشرکوں نے حکم شرع کے بغیر از خود کسی چیز کو حرام کر لیا جس طرح مشرکوں نے سائبہ' بحیرہ وغیرہ جانوروں کو حرام کر دیا تھا' ان کا دودھ پینا' ان پر سواری کرنا

اور ان کا گوشت کھانا سب کچھ حرام کرلیا تھا' تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت میں یہ آیات نازل فرمائیں:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ (النحل: ۱۱۶)

اور جن چیزوں کے متعلق تمہاری زبانیں جھوٹ بولتی ہیں ان کے متعلق نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام تاکہ تم اللہ پر بہتان باندھو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ○ (یونس: ۵۹)

آپ کہیے کہ بتاؤ کہ اللہ نے تمہارے لیے جو رزق اتارا تو تم نے کچھ اس میں حرام کرلیا اور کچھ حلال' آپ کہیے کہ آیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دی تھی یا تم اللہ پر بہتان باندھتے ہو○

ان آیات سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کو از خود حرام کرنا صحیح نہیں ہے' جب تک اللہ اور رسول کسی چیز سے منع نہ کریں وہ چیز حلال ہے' اسی طرح حدیث میں ہے:

عن سلمان قال سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن السمن والجبن والفراء فقال الحلال ما احل الله فى كتابه والحرام ما حرم الله فى كتابه وما سكت عنه فهو مما عفا عنه[1]

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھی' پنیر اور پوستین (کھال کی قمیص' جبہ) کے متعلق سوال کیا گیا' آپ نے فرمایا: جو چیز حلال ہے اس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کردیا اور جو چیز حرام ہے اس کو اپنی کتاب میں حرام کردیا اور جس کے متعلق اللہ نے سکوت کیا اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔

اس حدیث کو امام ابن ماجہ[2] اور امام ابوداؤد[3] نے بھی روایت کیا ہے۔

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

اکثر مالکیہ نے اس مسئلہ میں توقف کیا ہے' اس کا معنی یہ ہے کہ اس حال میں ان کے نزدیک کوئی حکم نہیں ہے اور جب شریعت وارد ہوگی تو جو حکم چاہے گی وہ نافذ کرے گی' اور عقل کسی چیز کو واجب یا حرام نہیں کرسکتی' عقل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اشیاء کی اس طرح معرفت حاصل کرے جس طرح وہ ہیں۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۲۵۲ - ۲۵۱' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

علامہ بیضاوی شافعی لکھتے ہیں:

اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ تمام اشیاء نافعہ مباح ہیں۔ (انوار التنزیل (درسی) ص ۵۷' مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی)

علامہ شامی حنفی لکھتے ہیں:

''تحریر ابن ھمام'' میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ جمہور حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک احکام میں اصل اباحت ہے'' ''ھدایہ'' اور

---

1. امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی ص ۲۹۴' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی
2. امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ' سنن ابن ماجہ ص ۲۴۱' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی
3. امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ' سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۸۳' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ

''خانیہ'' میں بھی اسی طرح لکھا ہے ''شرح تحریر'' میں لکھا ہے کہ معتزلہ بصرہ' کثیر شافعیہ اور اکثر حنفیہ کا یہی قول ہے' امام محمد نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ کیونکہ انہوں نے کہا کہ جس شخص سے کسی نے یہ کہا کہ تم مردار کھاؤ یا شراب پیو ورنہ تم کو قتل کر دیا جائے گا' اور اس نے اس طرح نہیں کیا حتیٰ کہ اس کو قتل کر دیا گیا تو مجھے خدشہ ہے کہ وہ گنہ گار ہوگا' کیونکہ مردار کا کھانا اور شراب کا پینا صرف شریعت کی ممانعت کی وجہ سے حرام کیا گیا ہے۔ امام محمد نے اس عبارت میں اباحت کو اصل قرار دیا ہے اور حرمت کو شرعی ممانعت کی وجہ سے عارضی قرار دیا ہے۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۷۷۔ ۷۱' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

قرآن' سنت اور فقہاء کرام کی آراء کے مطابق احکام میں اصل اباحت ہے اور قرآن اور سنت میں جن کاموں کو فرض' واجب' حرام یا مکروہ نہیں قرار دیا گیا ان کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے' اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر مشاہیر اسلام کے فضائل اور سیرت کی مجالس کو منعقد کرنا' اور آپ کے میلاد پر خوشی کا اظہار کرنا' صدقہ' خیرات اور دیگر عبادات کا ثواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم' بزرگان دین اور اپنے رشتہ داروں کو پہنچانا' انفرادی اور اجتماعی طور پر صلوٰۃ وسلام پڑھنا' تراویح میں باجماعت قرآن مجید کو ختم کرنا' وسیع وعریض مساجد بنانا' لائبریریاں قائم کرنا' مصحف (قرآن) پر سورتوں کا نام اور آیتوں کی تعداد لکھنا' پاروں کے حساب سے قرآن مجید کو تقسیم کرنا' مسجدوں میں محراب اور منبر بنانا' وعظ ونصیحت کے لیے جلسے منعقد کرنا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے ایام میں جلوس نکالنا اور ان کے ذکر کی مجلسیں قائم کرنا' دینی مدارس کے سالانہ جلسے کرنا' دورہ حدیث پڑھانا اور ختم بخاری کرنا اور ایسے بہت سے دینی امور جن سے دین کے شعار اور اس کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے ہر چند کہ شریعت میں ان کے کرنے کا حکم ہے نہ ان کے کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ تمام کام اپنی اصل پر مباح ہیں لیکن ان کو فرض اور واجب اعتقاد نہ کیا جائے نہ ان کے ساتھ فرض اور واجب کا معاملہ کیا جائے' ان کاموں کو لازم سمجھا جائے نہ ان کے نہ کرنے والوں پر ملامت کی جائے اور نہ ان پر طنز وتشنیع کی جائے۔ جب کسی مباح کام کو فرض اور واجب کا درجہ دے دیا جاتا ہے تو وہیں سے بدعت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے O (البقرہ: ۲۹)

حشر اجساد پر دلیل

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے حشر اجساد پر دلیل قائم کی ہے' مشرکوں کو یہ اشکال ہوتا تھا کہ مرنے کے بعد انسانوں کے اجسام بوسیدہ ہو جاتے ہیں اور پھر مٹی میں مل جاتے ہیں' پھر مختلف زلزلوں' آندھیوں اور طوفانوں میں یہ ذرات بکھر کر منتشر ہو جاتے ہیں اور دوسرے ذرات کے ساتھ خلط ملط ہو جاتے ہیں' ایک ہی انسان کا جسم ذرات میں بکھر کر آندھیوں اور ہواؤں کے ذریعہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے اور اسی طرح کے دوسرے ذرات سے مختلط ہو جاتا ہے تو اب مثلاً ایک انسان کے تمام ذرات کو مختلف مقامات سے یکجا کرنا اور دوسرے ذرات سے ممتاز اور الگ کرنا ان کے خیال میں بہت بعید تھا' اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بتلا دیا کہ یہ اس کے لیے بعید ہوگا جس کو علم نہ ہو' اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے اور اس کے لیے ان منتشر ذرات کو پھر سے جمع کر دینا کچھ مشکل نہیں اور جب وہ تم کو اور تم سے کہیں بڑی چیزوں آسمان اور زمین کو بنا چکا ہے تو پھر دوبارہ تم کو پیدا کرنا اس کے لیے کب مشکل ہے بلکہ زیادہ آسان ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ

اور یاد کیجئے جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا: میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں'

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ

فرشتوں نے کہا: کیا آپ ایسے شخص کو نائب بنائیں گے جو زمین میں فساد اور خونریزی کرے گا؟ حالانکہ ہم آپ کی حمد کے ساتھ تسبیح

بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ

کرتے ہیں اور آپ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں، فرمایا: بے شک میں ان چیزوں کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے O اور اللہ نے

اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰۗىِٕكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ

آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے، پھر ان چیزوں کو فرشتوں پر پیش کر کے فرمایا: اگر تم سچے ہو تو

بِاَسْمَاۗءِ هٰٓؤُلَاۗءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ

مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ O فرشتوں نے کہا: تو پاک ہے ہمیں صرف انہی چیزوں

اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ

کا علم ہے جن کی تو نے ہمیں تعلیم دی ہے، بے شک تو ہی سب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے O فرمایا: اے آدم! ان کو ان سب چیزوں کے

بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ

نام بتاؤ، جب آدم نے ان سب چیزوں کے نام ان کو بتا دیئے تو فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں ہی

اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ

آسمانوں اور زمین کا غیب جاننے والا ہوں، اور جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو تم چھپاتے

تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

تھے وہ سب جانتا ہوں O

ربط آیات

جس طرح اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا' تاکہ انسان ان نعمتوں کا اعتراف کرے اور کفر اور معصیت سے باز آئے اللہ پر ایمان لائے اور اس کی اطاعت کرے' اسی طرح ان آیات میں یہ بتایا ہے کہ انسان کے مورث اعلیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کن نعمتوں سے نوازا' حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ اور نائب بنایا' ان کو اپنی صورت پر پیدا کیا' ان کو کائنات کی تمام اشیاء کے اسماء کا علم عطا فرمایا اور ان کو مسجود ملائکہ بنایا' ان کو پہلے جنت میں رکھا' پھر ان کو خلافت جاری کرنے کے لیے زمین پر بھیجا اور یہ حضرت آدم پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں' ان کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی اولاد

اپنے سورث اعلیٰ پر کی گئی ان نعمتوں کا شکر بجالائے' اچھی طرح سے اس کی اطاعت کرے اور کفر اور معصیت سے دور رہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یاد کیجئے جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا: میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں۔ (البقرۃ: ۳۰)

ملائکہ کی حقیقت' ان کی خصوصیت اور ان کے فرائض منصبی کا بیان

علامہ بیضاوی لکھتے ہیں:

''ملائکۃ'' کا لفظ ''ملاک'' کی جمع ہے' یہ ''الوکۃ'' سے بنا ہے' جس کا معنی رسالت (پیغام پہنچانا) ہے کیونکہ ملائکہ اللہ تعالیٰ اور لوگوں کے درمیان واسطہ ہیں' ان میں سے بعض حقیقۃً رسول ہیں مثلاً جو فرشتے خود ان کے لیے رسول ہیں' ان کی حقیقت میں عقلاء کا اختلاف ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ جوہر ہیں جو قائم بذاتہ ہے' اکثر مسلمانوں کا یہ نظریہ ہے کہ یہ اجسام لطیفہ ہیں جو مختلف شکلوں میں متشکل ہونے پر قادر ہیں' کیونکہ انبیاء کرام ان کو اسی طرح دیکھتے تھے' ان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہیں جو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق رہتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ○ (الانبیاء: ۲۰) وہ رات اور دن اس کی تسبیح کرتے ہیں اور تھکتے نہیں ہیں ○

ان فرشتوں کو علیین اور ملائکہ مقربین کہا جاتا ہے' اور دوسری قسم وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام کی تدبیر کرتے ہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی سرمو مخالفت یا نافرمانی نہیں کرتے' قرآن مجید میں ہے:

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○ (التحریم: ۶) وہ اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے ○

ان فرشتوں کو ''المدبرات امرا'' کہا جاتا ہے' ان میں سے بعض فرشتے آسمانوں کے تکوینی نظام کی تدبیر کرتے ہیں اور بعض زمین کے تکوینی نظام کی تدبیر کرتے ہیں۔ (انوار التنزیل (درسی) ص ۵۹' مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی)

محمد رشید رضا لکھتے ہیں:

سلف صالحین نے فرشتوں کے متعلق یہ کہا ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں' اللہ تعالیٰ نے ان کے وجود کی اور ان کے بعض کاموں کی خبر دی ہے' جس پر ہمیں ایمان لانا واجب ہے اور یہ ایمان لانا ان کی حقیقت کے جاننے پر موقوف نہیں ہے' اس لیے ہم ان کی حقیقت کا علم اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔ جب شریعت میں یہ وارد ہے کہ فرشتوں کے پر ہیں تو ہم اس پر ایمان لاتے ہیں لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ان پروں کی کیفیت کا علم نہیں ہے' اور جب شریعت میں یہ وارد ہے کہ فرشتے سمندروں اور سبزہ زاروں پر مقرر کیے گئے ہیں تو ہم اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس کائنات میں اس عالم محسوس سے زیادہ لطیف ایک اور عالم ہے اور اس عالم میں فرشتے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اور عقل کے نزدیک یہ جائز ہے اور وحی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ (المنار ج ۱ ص ۲۵۴' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت)

فرشتے جو محیر العقول کارنامے انجام دیتے ہیں اور ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں آسمان سے زمین پر پہنچ جاتے ہیں اور آسمانوں کی خبریں زمین تک پہنچاتے ہیں سائنس کی ترقی اور کمپیوٹر کے اس دور میں اس کا سمجھنا آسان ہو گیا' جب خلائی سیاروں اور برقی لہروں کے ذریعہ ایک براعظم سے دوسرے بعید براعظم تک ایک آن میں آواز اور تصویر پہنچ سکتی ہے اور چاند سے زمین پر ٹیلی فون سے گفتگو ہو سکتی ہے تو فرشتوں کے تصرفات اور نظام عالم میں ان کی تدبیروں کا واقع ہونا اب بعید از فہم

نہیں رہا۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

کبھی فرشتے ایسے بدنوں میں ظاہر ہوتے ہیں جن کو ہر خاص اور عام دیکھ لیتا ہے' درآں حالیکہ وہ اپنی اصل صورت پر بھی قائم رہتے ہیں' حتیٰ کہ کہا گیا ہے کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوتے تھے تو اسی وقت سدرۃ المنتہیٰ میں بھی موجود ہوتے تھے اور کامل ولی اللہ بھی اسی طرح بیک وقت کئی جگہ موجود ہوتا ہے اور ہر چند کہ یہ چیز بہ ظاہر عقل سے بعید ہے' لیکن میرا اس پر ایمان ہے۔

(روح المعانی ج ۱ ص ۲۱۹ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

حسب ذیل آیات میں فرشتوں کی بعض خصوصیات اور افعال کو بیان کیا گیا ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ (الحج: ۷۵)

اللہ ہی فرشتوں اور انسانوں میں سے رسولوں کو چن لیتا ہے۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۘ (النازعات: ۵۔۱)

ان فرشتوں کی قسم جو نہایت سختی سے (کافر کی جان) کھینچتے ہیں ○ اور جو بہت نرمی سے (مومن کی جان کی گرہ) کھولتے ہیں ○ اور جو (زمین و آسمان میں) سرعت سے تیرتے پھرتے ہیں ○ اور جو (احکام الٰہیہ کی اطاعت میں) پوری قوت سے آگے بڑھتے ہیں ○ اور جو (امور تکوینیہ اور نظام عالم کی) تدبیر کرتے ہیں ○

فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ (الذاریات: ۴)

اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو کام تقسیم کرنے والے ہیں ○

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ (حٰم السجدۃ: ۳۰)

بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے' پھر وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہے' ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کرو' اور اس جنت کے ساتھ خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ○

وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ○ (الزخرف: ۸۰)

اور ہمارے فرشتے ان کے پاس لکھ رہے ہیں ○

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ○ (الانفطار: ۱۲۔۱۰)

اور بے شک ضرور تم پر نگہبان (مقرر) ہیں ○ معزز فرشتے لکھنے والے ○ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو ○

خلیفہ کی تعریف اور اس کی اقسام

خلیفہ' نائب یا قائم مقام کو کہتے ہیں' جب اصل شخص خود کار حکومت انجام نہ دے سکے تو اس کا خلیفہ مقرر کیا جاتا ہے' مثلاً اصل شخص کہیں چلا جائے تو عارضی طور پر اس کی جگہ کام کرنے کے لیے خلیفہ مقرر کرتے ہیں یا اصل شخص فوت ہو جائے تو اس کی جگہ خلیفہ مقرر کیا جاتا ہے' اللہ تعالیٰ کہیں جانے یا فوت ہونے سے پاک ہے تو پھر اس کو خلیفہ کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خلیفہ کی ضرورت نہ تھی بلکہ بندوں کو ضرورت تھی کیونکہ انسان اپنی مادی کثافت اور عدم قرب کے حجابات کی وجہ

سے اللہ تعالیٰ سے براہ راست فیض حاصل نہیں کر سکتا تھا اور اس سے احکام وصول نہیں کر سکتا تھا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اور انسانوں کے درمیان ایک خلیفہ بنایا اور اس کا نام نبی اور رسول رکھا' اور انبیاء علیہم السلام کو ایسی صلاحیت اور استعداد عطا فرمائی کہ وہ فرشتوں کے واسطے سے یا بلاواسطہ اللہ تعالیٰ سے احکام حاصل کر سکیں۔ عام انبیاء اور مرسلین کی طرف فرشتے بھیجے جاتے ہیں اور مقربین سے اللہ تعالیٰ خود بھی کلام فرماتا ہے' جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے میقات میں کلام فرمایا اور ہمارے نبی حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج کلام فرمایا۔

خلیفہ کا ایک معنی یہ ہے: جو اللہ کا نائب ہو اور اس کا خلیفہ ہو اور اللہ سے احکام حاصل کر کے بندوں تک پہنچائے' یہ معنی نبی اور رسول کے مترادف ہے' خلیفہ کا دوسرا معنی یہ ہے کہ جو نبی اور رسول کا نائب اور اس کا خلیفہ ہو اور نبی کی بیان کی ہوئی شریعت کو لوگوں پر نافذ کرے اور منہاج نبوت پر حکومت چلائے' قرآن مجید میں ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ (النور: ۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کیے' ان سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمالیا ہے کہ وہ ان کو ضرور بہ ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا' جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا۔

اس آیت میں خلیفہ کا یہی دوسرا معنی مراد ہے' اس معنی میں خلیفہ کے تقرر میں اہل سنت اور اہل تشیع کا اختلاف ہے' شیعہ علماء کے نزدیک خلیفہ کے تقرر کے لیے نبی اور رسول کی نص صریح ضروری ہے' جب کہ اہل سنت کے نزدیک نص' اہل اجتہاد کے اجماع اور ارباب حل وعقد کے انتخاب سے خلیفہ کا تقرر کرنا جائز ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خلیفۃ اللہ صرف اللہ کا نبی ہوتا ہے اور خلیفہ رسول لوگوں کے مقرر کرنے سے مقرر ہوتا ہے۔

آیت مذکورہ میں خلیفہ کے مصداق کا بیان

اس آیت میں خلیفہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں' یا حضرت آدم اور ان کی اولاد مراد ہیں' کیونکہ حضرت آدم' اللہ کے خلیفہ تھے اور ان کے بعد آنے والی ان کی اولاد لغوی معنی کے اعتبار سے ان کی خلیفہ تھی یعنی بعد میں آنے والے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب کے لیے چار الفاظ استعمال فرمائے ہیں' اس آیت میں خلیفہ فرمایا اور اس کے بعد اسی آیت میں اس کو آدم فرمایا:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا . (البقرہ: ۳۰)

اور اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیے۔

اس کو بشر سے تعبیر فرمایا:

اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝ (ص: ۷۱)

(جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا:) میں مٹی سے بشر بنانے والا ہوں ۝

اس کو انسان بھی فرمایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ (الحجر: ۲۶)

اور بے شک ہم نے انسان کو بجنے والی سیاہ مٹی سے پیدا کیا ۝

اللہ کے نائب ہونے کے اعتبار سے آپ کو خلیفہ فرمایا' گندمی رنگ کی وجہ سے آدم فرمایا' جسم کی ظاہری وضع' چہرے مہرے اور کھال کی ساخت کے اعتبار سے بشر فرمایا اور حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے انسان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف مشورہ کی نسبت کا شرعی حکم

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے جو فرمایا تھا: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں' یہ فرشتوں سے مشورہ نہیں تھا' کیونکہ مشورہ کا معنی ہے: کسی شخص کا دوسرے شخص کی طرف رجوع کر کے ایک رائے کو حاصل کرنا۔ (علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ المفردات ص ۲۷۰' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ) اور اللہ تعالیٰ اپنے کام میں کسی کی رائے حاصل کرنے سے پاک اور بری ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنی تخلیق کی پیشگی خبر دی تھی تاکہ فرشتے اس خبر پر اپنی رائے کا اظہار کریں اور اللہ تعالیٰ ان کی رائے کے متعلق اپنا حکم اور اپنی حکمتوں کو بیان فرمائے' اس لیے علامہ بیضاوی کا اس آیت کو مشورہ کی تعلیم پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فرشتوں نے کہا: کیا آپ ایسے شخص کو نائب بنائیں گے جو زمین میں فساد اور خون ریزی کرے گا؟ حالانکہ ہم آپ کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور آپ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں' فرمایا: بے شک میں ان چیزوں کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے O (البقرہ: ۳۰)

حضرت آدم کے خلیفہ بنانے پر فرشتوں کے سوال کرنے کا محمل

اگر حضرت آدم کے متعلق فرشتوں نے یہ کہا تھا کہ وہ فساد اور خون ریزی کریں گے تو اس کی تاویل یہ ہے کہ چونکہ حضرت آدم اپنی اولاد کی اصل اور منشاء ہیں اور اولاد آدم میں سے بعض لوگ فتنہ' فساد اور خون ریزی کریں گے اس لیے فرشتوں نے ان کی طرف ان کاموں کا اسناد کر دیا اور اگر فرشتوں نے حضرت آدم کی اولاد کے متعلق یہ کہا تھا تو پھر تو کسی تاویل کی ضرورت نہیں' کیونکہ حضرت آدم کی اولاد میں سے بعض فساق نے بہر حال یہ کام کیے۔

فرشتوں کا یہ قول اللہ تعالیٰ کی اس خبر یا اطلاع پر اعتراض یا انکار اور بنو آدم کی غیبت نہیں ہے کیونکہ فرشتے معصوم ہیں بلکہ یہ اس پر اظہار تعجب ہے کہ زمین کی آبادکاری اور اصلاح کے لیے فسادیوں اور خون ریزوں کو خلیفہ بنایا جائے گا یا فرشتوں جیسے اطاعت گزاروں کو چھوڑ کر نافرمانوں کو خلیفہ بنایا جائے گا! یا فرشتے اس سوال کے ذریعہ اس حکمت کو جاننا چاہتے تھے جس کی بناء پر ان مفسدوں کے فساد سے صرف نظر کر کے ان کو خلیفہ بنایا جائے گا' جیسے استاذ کی تقریر پر متعلم کو کوئی شبہ پیدا ہو تو وہ اس شبہ کے ازالہ کے لیے استاذ سے سوال کرتا ہے' اس لیے فرشتوں کا یہ سوال اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر انکار ہے نہ بنو آدم کی غیبت اور عیب جوئی ہے' فرشتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ○ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ○ (الانبیاء: ۲۷-۲۶)	بلکہ وہ (فرشتے) عزت والے بندے ہیں O کسی بات میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور وہ اسی کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں O

باقی رہا یہ کہ فرشتوں کو کیسے علم ہوا کہ بعض بنو آدم فساد اور خون ریزی کریں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے مطلع فرمایا تھا' یا انہوں نے لوح محفوظ میں صرف اتنا مطالعہ کر لیا تھا کہ بنو آدم فساد کریں گے اور بنو آدم کے شرف اور فضیلت کے مطالعہ سے ان کو روک دیا گیا تھا' کیونکہ وہ اس کا بھی مطالعہ کر لیتے تو پھر ان کو کوئی شبہ نہ رہتا' یا ان کی عقول میں یہ مرتکز تھا کہ معصوم ہونا صرف ان کا خاصہ ہے' اس لیے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کے سوا باقی مخلوق گناہ کرے گی یا اس لیے کہ اس سے پہلے زمین پر جن فساد کر چکے تھے تو انہوں نے انسان کو بھی جنوں پر قیاس کیا۔

حضرت آدم کو خلیفہ بنانے کی وجہ اور فرشتوں کے شبہ کا ازالہ

فرشتوں نے جو کہا: ہم تیری تسبیح 'حمد اور تقدیس کرتے ہیں' اس سے خود ستائی' خود نمائی' عجب اور تفاخر مقصود نہیں تھا بلکہ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ جس کو خلیفہ بنایا گیا ہے اس میں تین قوتیں ہیں' قوت شہوانیہ' قوت غضبیہ اور قوت عقلیہ' پہلی دو قوتوں کے لحاظ سے وہ فتنہ اور فساد کرے گا اور ان دو قوتوں کے اعتبار سے تو اس کو پیدا ہی نہیں کرنا چاہیے چہ جائیکہ اس کو خلیفہ بنایا جائے اور رہی قوت عقلیہ تو وہ فرشتوں کو بھی حاصل ہے اور ان کو اس لیے ترجیح ہے کہ ان میں شہوت اور غضب نہیں ہے جو فتنہ اور فساد کی موجب ہو تو پھر راجح کو چھوڑ کر مرجوح کو خلیفہ بنانے کی کیا حکمت ہے؟ اور اس میں حکمت یہ تھی کہ شہوت کو جب اعتدال میں رکھا جائے تو وہ قابل تعریف صفت ہے جس کو عفت کہتے ہیں اور غضب کو جب اعتدال میں رکھا جائے تو وہ بھی قابل ستائش وصف ہے اور اس کو شجاعت کہتے ہیں اور جب ان دو قابل تعریف وصفوں کے ساتھ قوت عقلیہ بھی ہو تو ان قوتوں کا حامل اس سے یقیناً افضل ہے جو صرف قوت عقلیہ کا حامل ہو اور اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے قول میں اجمالی اشارہ فرمایا: بے شک میں ان چیزوں کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے' اور اگر یہ سوال ہو کہ بنو آدم میں نیک اور صالح افراد کم ہیں اور شریر اور فاسق زیادہ ہیں اس وجہ سے بنو آدم کو پیدا نہیں کرنا چاہیے تھا' تو اس کا جواب یہ ہے کہ نیک اور صالح افراد میں خیر کثیر ہے اور فاسق اور فاجر افراد اگرچہ زیادہ ہیں لیکن نیک اور صالح افراد کی خیر کی عظمت اور شرف کے مقابلہ میں ان کا شر قلیل ہے اور شر قلیل کی وجہ سے خیر کثیر کو ترک نہیں کیا جاتا' اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ جن میں خیر غالب ہے ان کو پیدا کیا جائے' پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر حضرت آدم کی فضیلت علمی بیان کی اور یہ ظاہر فرمایا کہ خلیفہ بننے کے اہل حضرت آدم ہی ہیں نہ کہ فرشتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے' پھر ان چیزوں کو فرشتوں پر پیش کر کے فرمایا: اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤO (البقرہ: ۳۱)

آدم کی لفظی تحقیق اور حضرت آدم کی تخلیق کے مراحل

محی الدین درویش لکھتے ہیں:

آدم اسم علم ہے اور عجمی ہے جیسے آذر' عابر اور عاذر ہے' اور یہ علمیت اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے' اور جن لوگوں نے یہ کہا کہ یہ ''ادمۃ'' (گندم گوں رنگ) سے مشتق ہے یا ''ادیم الارض'' (زمین کی سطح) سے مشتق ہے' ان کا قول صحیح نہیں ہے کیونکہ اشتقاق عربی زبان کا خاصہ ہے' عجمی لفظ کا مادہ اشتقاق عربی الفاظ کیسے ہو سکتے ہیں۔

(اعراب القرآن وبیانہ ج ۱ ص ۸۰ 'مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت' ۱۴۱۲ھ)

حافظ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

امام فریابی' امام ابن سعد' امام ابن جریر' امام ابن ابی حاتم' امام حاکم اور امام بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم کو آدم اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کو ادیم ارض (زمین کی سطح) سے بنایا گیا ہے' سرخ' سفید اور سیاہ مٹی سے' اسی طرح لوگوں کے رنگ مختلف ہیں' سرخ' سفید' اور سیاہ' پاک اور نجس۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۴۹ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

امام عبد بن حمید نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو ادیم ارض سے پیدا کیا' سرخ' سفید اور سیاہ مٹی سے۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۴۹ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

امام ابن سعد' امام ابو یعلیٰ' امام ابن مردویہ اور امام بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر اس کو کیچڑ (گیلی مٹی) کر دیا' پھر اس کو چھوڑ دیا' حتیٰ کہ سیاہ گارا ہو گئی' پھر اللہ تعالیٰ نے اس سے آدم کا پتلا بنایا اور ان کی صورت بنائی' پھر اس کو چھوڑ دیا حتیٰ کہ وہ خشک ہو کر بجنے والی مٹی کی طرح ہو گیا' ابلیس اس پتلے کے پاس سے گزر کر کہتا تھا کہ یہ کسی امر عظیم کے لیے بنایا گیا ہے' پھر اللہ تعالیٰ نے اس پتلے میں اپنی پسندیدہ روح پھونک دی' اس روح کا اثر سب سے پہلے ان کی آنکھوں اور نتھنوں میں ظاہر ہوا' ان کو چھینک آئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو الحمد للہ کہنے کا القاء کیا' انہوں نے الحمد للہ کہا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یرحمک اللہ' پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! اس جماعت کے پاس جاؤ اور ان سے بات کرو' دیکھو یہ کیا کہتے ہیں' حضرت آدم ان (فرشتوں) کے پاس گئے اور کہا: السلام علیکم' انہوں نے کہا: وعلیک السلام ورحمۃ اللہ' پھر حضرت آدم اللہ کے پاس گئے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انہوں نے کیا کہا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو خوب علم ہے' حضرت آدم نے کہا: اے رب! میں نے ان کو سلام کیا' انہوں نے کہا: وعلیک السلام ورحمۃ اللہ' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! یہ تمہارا اور تمہاری اولاد کے سلام کرنے کا طریقہ ہے۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۴۸' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

امام احمد' امام بخاری اور امام مسلم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو پیدا کیا تو ان کا طول ساٹھ ذراع (تمیں انگریزی گز) تھا اور فرمایا: جاؤ فرشتوں کی اس جماعت کو سلام کرو' اور سنو وہ کیا جواب دیتے ہیں اور یہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہوگا' حضرت آدم نے جا کر کہا: السلام علیکم' فرشتوں نے کہا: السلام علیک ورحمۃ اللہ' انہوں نے رحمۃ اللہ کا لفظ زیادہ کہا' سو جو شخص بھی آدم کی صورت پر جنت میں داخل ہوگا اس کا طول ساٹھ ذراع ہوگا' پھر یہ طول بہ تدریج کم ہوتا رہا حتیٰ کہ اب اتنا طول رہ گیا۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۴۸' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

حضرت آدم کو تمام اسماء کی تعلیم کا بیان

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضرت آدم نے ان چیزوں کے نام اللہ تعالیٰ کی تعلیم دینے کی وجہ سے بتائے' اگر فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتا دیئے جاتے تو وہ بھی ان چیزوں کے نام بتا دیتے' اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کا خمیر مختلف اجزاء اور متضاد قوتوں کو ملا کر بنایا تھا اس وجہ سے وہ معقولات' محسوسات' متخیلات اور موہومات کے ادراک کی صلاحیت رکھتے تھے اور فرشتوں میں یہ صلاحیت نہیں تھی' اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اشیاء کے حقائق' خواص' اسماء' علوم کے قواعد اور مختلف صنعتوں کے قوانین تعلیم فرمائے' پھر فرشتوں کو عاجز کرنے اور اہلیت خلافت سے ان کے عجز کو ظاہر کرنے کے لیے ان کو حکم دیا کہ ان چیزوں کے نام بتاؤ' اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ معصوم ہونے کی وجہ سے صرف تم خلافت کے اہل ہو' ہر چند کہ فرشتوں نے صراحتہً یہ دعویٰ نہیں کیا تھا لیکن ان کے کلام سے یہ دعویٰ مترشح ہوتا تھا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى

اور جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا: آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سجدہ کیا' اس نے انکار کیا

وَاسْتَكْبَرَ ڎ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ

اور تکبر کیا اور کافر ہو گیا ○ اور ہم نے فرمایا: اے آدم! تم اور تمہاری

وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا

بیوی جنت میں رہو اور اس جنت میں سے جہاں سے چاہو خوب کھاؤ اور اس درخت کے قریب

هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ

نہ جانا ورنہ تم حد سے بڑھنے والوں میں شمار ہو گے O پس شیطان نے انہیں

عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ

اس درخت کے ذریعے لغزش میں مبتلا کیا اور جہاں وہ رہتے تھے وہاں سے ان کو نکال دیا ہم نے فرمایا: تم (سب) نیچے اترو،

لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى

تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہوں گے اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت مقرر تک ٹھکانا اور فائدہ اٹھانا ہے O پھر آدم نے

اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی بے شک وہی بہت توبہ قبول فرمانے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے O

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ

ہم نے فرمایا: تم سب جنت سے اتر جاؤ، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئی تو جس نے میری ہدایت

هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

کی پیروی کی تو انہیں کوئی ڈر ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے O اور جن لوگوں نے کفر کیا اور

وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

ہماری آیات کی تکذیب کی وہی لوگ دوزخی ہیں وہ ہمیشہ اس دوزخ میں رہیں گے O

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا: آدم کو سجدہ کرو۔ (البقرہ: ۳۴)

حضرت آدم کو فرشتوں کے سجدہ کرنے کی وجہ

جب حضرت آدم کی فرشتوں پر فضیلت علمی ظاہر ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے حضرت آدم کی فضیلت علمی کا اعتراف کرانے کے لیے انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ ایک اور آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کا جسم بناتے ہی فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دے دیا تھا:

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ — سو جب میں اس کو پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی

سٰجِدِیْنَ ○ (الحجر: ۲۹) پسندیدہ روح پھونک دوں تو تم اس کے لیے سجدہ کرتے ہوئے گر جانا ○

اس آیت کے اعتبار سے فرشتوں کا امتحان ہے اور حضرت آدم کی فضیلت کا اظہار اور فرشتوں کی اطاعت گزاری کا بیان ہے۔

سجدہ کا لغوی اور شرعی معنی

علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے لکھا ہے کہ سجدہ کا معنی ہے: سر نیچے کیا اور جھک گیا۔

(قاموس ج ۱ ص ۵۷۹ 'داراحیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۲ھ)

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

سجدہ کا لغوی معنی ہے: تذلل کے ساتھ جھکنا' سجدہ کو اللہ کی عبادت سے تعبیر کرتے ہیں' سجدہ کی دو قسمیں ہیں: ایک سجدہ اختیاری ہے اور دوسرا سجدہ تسخیر ہے' سجدہ اختیاری باعث ثواب ہے' قرآن مجید میں ہے:

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ○ (النجم: ۶۲) سو اللہ کے لیے سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو ○

اور سجدہ تسخیر' انسان' حیوان اور نباتات سب ادا کرتے ہیں: (المفردات ص ۲۲۳ 'مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران' ۱۳۴۲ھ)

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا. (الرعد: ۱۵) اور جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب خوشی یا مجبوری سے اللہ ہی کو سجدہ کررہے ہیں۔

سجدہ کے شرعی معنی کے متعلق علامہ بیضاوی لکھتے ہیں: عبادت کے قصد سے پیشانی کو زمین پر رکھنا سجدہ ہے۔

(انوار التنزیل (درسی) ۶۲ 'مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی)

پیشانی کو زمین پر رکھنا ہاتھوں کو اور گھٹنے یا پیروں میں سے کسی ایک کے زمین پر رکھنے پر موقوف ہے' اس لیے سجدہ کا رکن پیشانی' ہاتھوں اور گھٹنوں اور پیروں میں سے کسی ایک کو زمین پر رکھنا ہے' اور سنت کے مطابق سجدہ سات اعضاء پر ہوتا ہے: چہرہ' دونوں گھٹنے' دونوں ہاتھ اور دونوں پیر' بعض علماء نے جو یہ لکھا ہے کہ پیروں کی انگلیاں اٹھ جائیں یا مڑ جائیں تو سجدہ نہیں ہوتا یہ صحیح نہیں ہے' اس کی پوری تفصیل اور تحقیق ''شرح مسلم'' جلد اول میں بیان کی گئی ہے۔

فرشتوں کو جس سجدہ کا حکم دیا گیا تھا اس سے یا تو شرعی سجدہ مراد ہے' اس صورت میں سجدہ اللہ تعالیٰ کو تھا اور حضرت آدم کو ان کی عزت افزائی کے لیے قبلہ بنایا گیا تھا' اور یا یہ لغوی سجدہ تھا یعنی سجدہ تعظیم' اور فرشتوں کو حضرت آدم کی تعظیم اور تحیت کے لیے تواضعاً جھک جانے کا حکم دیا گیا تھا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی تواضعاً سجدہ کر کے تعظیم کی تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تو ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سجدہ کیا' اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافر ہو گیا ○ (البقرہ: ۳۴)

تکبر کا معنی اور ابلیس کے تکبر کا بیان

تکبر کا معنی ہے: کوئی شخص اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ بڑا خیال کرے اور استکبار کا معنی اپنے لیے بڑائی طلب کرنا ہے۔

امام مسلم اپنی سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے دل میں رائی کے دانہ برابر بھی تکبر ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ ایک شخص نے کہا: ایک آدمی یہ پسند کرتا ہے کہ

اس کا لباس اچھا ہو اس کے جوتے اچھے ہوں' آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال سے محبت کرتا ہے' تکبر (کا معنی ہے) حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۶۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

ابلیس کا تکبر یہ تھا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا انکار کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو حقیر جانا' اور ان کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔

ابلیس نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو برا جانا' کیونکہ اس کے خیال میں وہ حضرت آدم سے افضل تھا اور افضل کو مفضول کی تعظیم کا حکم دینا قبیح اور برا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو برا جاننا کفر ہے' حسب ذیل آیات میں اس کے کفر کی وجہ صراحۃً بیان کی گئی ہے:

قَالَ يٰۤاِبۡلِيۡسُ مَا مَنَعَكَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَىَّ ؕ اَسۡتَكۡبَرۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡعَالِيۡنَ ۝ قَالَ اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ ؕ خَلَقۡتَنِىۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ ۝ (ص: ۷۵۔ ۷۶)

اللہ نے فرمایا کہ اے ابلیس! تجھے اس کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا؟ آیا تو نے اب تکبر کیا ہے یا تو پہلے سے ہی متکبرین میں سے تھا؟ O اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں' تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا O

ابلیس کا معنی اور اس کے فرشتہ یا جن ہونے کی تحقیق

محی الدین درویش لکھتے ہیں:

لفظ ابلیس میں اختلاف ہے کہ آیا یہ مشتق ہے یا نہیں؟ صحیح قول یہ ہے کہ عجمی علم ہے اور اسی وجہ سے یعنی علمیت اور عجمیت کی وجہ سے یہ غیر منصرف ہے اور اگر یہ "ابلاس" (بمعنی مایوس ہونے) سے مشتق ہوتا تو منصرف ہوتا۔

(اعراب القرآن وبیانہ ج ۱ ص ۸۳ 'مطبوعہ مطبع دار ابن کثیر بیروت' ۱۴۱۲ھ)

محمد صافی نے بھی یہی لکھا ہے۔ (اعراب القرآن وصرفہ وبیانہ ج ۱ ص ۱۰۳ 'مطبوعہ انتشارات مدین ایران' ۱۴۱۳ھ)

جرجانی نے کہا ہے کہ یہ علم ہے اور علامہ قرطبی نے اس کو مشتق لکھا ہے۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

جمہور کے قول کے مطابق ابلیس فرشتوں میں سے تھا' حضرت ابن عباس' حضرت ابن مسعود' ابن جریج' ابن المسیب اور قتادہ وغیرہم کا یہی مختار ہے' امام ابوالحسن اشعری کا بھی یہی نظریہ ہے' امام ابن جریر طبری نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ابلیس کا نام عزازیل تھا اور یہ معزز فرشتوں میں تھا اور چار پروں والا تھا' اس کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس کر دیا گیا' قتادہ سے روایت ہے کہ یہ فرشتوں کی عمدہ قسم میں شامل ہوتا تھا' سعید بن جبیر نے کہا: کچھ ملائکہ نار (آگ) سے پیدا کیے گئے تھے' ابلیس بھی انہی میں سے تھا اور باقی ملائکہ کو نور سے پیدا کیا گیا۔

ابن زید' حسن اور قتادہ نے کہا کہ ابلیس ابوالجن ہے جیسا کہ حضرت آدم ابوالبشر ہیں اور وہ فرشتہ نہیں ہے' اور اس کا نام حارث ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے' شہر بن حوشب اور بعض اصولیین نے یہ کہا کہ ابلیس ان جنوں میں سے تھا جو زمین پر رہتے تھے' فرشتوں نے ان سے قتال کیا اور کم عمری میں اس کو قید کر لیا' اس نے فرشتوں کے ساتھ عبادت کی' اس وجہ سے اس کو فرشتوں کے ساتھ مخاطب کیا گیا' اس قول کو امام ابن جریر نے حضرت ابن مسعود سے نقل کیا ہے' اس بناء پر یہ استثناء منقطع ہوگا۔

جن صحابہ اور ائمہ کا یہ نظریہ ہے کہ ابلیس فرشتہ نہیں جن تھا ان کی دلیل یہ ہے کہ ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کی تھی اور فرشتے اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی نہیں کرتے:

لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۝ (التحریم: ۶) — وہ اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۝

اور اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ ابلیس جن تھا:

فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖؕ (الکہف: ۵۰) — ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سجدہ کیا' وہ جنوں میں سے تھا سواس نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔

ثعلبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ابلیس فرشتوں کے اس قبیلہ میں سے تھا جس کو جن کہا جاتا ہے' ان کو دھوئیں والی آگ سے پیدا کیا گیا تھا' اور فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا تھا' اس کا نام سریانی زبان میں عزازیل اور عربی زبان میں حارث ہے' یہ جنت کے خازنوں میں سے تھا اور آسمان دنیا کے فرشتوں کا سردار تھا' آسمان اور زمین پر اس کی سلطنت تھی' علم اور عبادت میں اس کی کوشش سب فرشتوں سے زیادہ تھی' آسمان سے زمین تک کے معاملات کا یہ محافظ اور منتظم تھا' ان امور کی وجہ سے یہ اپنا شرف اور مرتبہ سب سے زیادہ سمجھتا تھا' اس زعم نے اس کو کفر پر برانگیختہ کیا' سواس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی' اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کو شیطان رجیم اور راندہ درگاہ قرار دیا۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۲۹۵۔ ۲۹۴' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

جمہور مفسرین یہ کہتے ہیں کہ ابلیس ملائکہ میں سے تھا' ان کی دلیل سورہ بقرہ کی یہ آیت ہے: اور جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا: آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا' ابلیس کو سجدہ کا حکم اسی وقت ہوگا جب وہ فرشتہ ہو کیونکہ اس آیت میں سجدہ کا حکم فرشتوں کو دیا گیا ہے اور جو علماء یہ کہتے ہیں کہ ابلیس فرشتہ نہیں تھا وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابلیس جن تھا لیکن وہ فرشتوں کے درمیان چھپا رہتا تھا اس لیے بطور تغلیب وہ بھی فرشتوں میں داخل تھا' دوسرا جواب یہ ہے کہ جنوں کو بھی سجدہ کرنے کا حکم تھا لیکن فرشتوں کے ذکر کے بعد ان کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی' کیونکہ جب اکابر کو کسی کی تعظیم کرنے کا حکم دیا جائے تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اصاغر کو اس کی تعظیم کا بطریق اولیٰ حکم ہے۔

امام ابن جریر طبری' علامہ قرطبی' امام رازی' قاضی بیضاوی' علامہ ابوالحیان اندلسی اور علامہ آلوسی وغیرہ کی تحقیق یہ ہے کہ ابلیس ملائکہ میں سے تھا' اس کے برخلاف علامہ سیوطی' علامہ نسفی' علامہ زمخشری' بعض دیگر مفسرین اور متکلمین کی تحقیق یہ ہے کہ ابلیس جن تھا اور قرآن مجید کی ظاہر آیات اسی کے موافق ہیں' علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

ابلیس جن تھا' اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی لیکن چونکہ وہ فرشتوں کی طرح عبادت گزار تھا اور ان میں چھپا رہتا تھا' اس لیے اس کو بھی تغلیبا فرشتوں میں شامل کر کے سجدہ کا حکم دیا گیا تھا۔

(شرح عقائد ص ۹۹' مطبوعہ محمد سعید تاجران کتب' کراچی)

ابلیس کے جن ہونے پر حسب ذیل دلائل قائم کیے گئے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "كَانَ مِنَ الْجِنِّ" (الکہف: ۵۰) اس آیت میں ابلیس کے جن ہونے کی تصریح ہے۔

(۲) فرشتوں کی نسل نہیں چلتی اور ابلیس کی نسل ہے کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ (الکہف: ۵۰) — کیا تم شیطان اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہیں؟

حضرت ابن عباس کی طرف جو یہ منسوب ہے کہ فرشتوں کی ایک نوع میں توالد ہوتا ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔
(نبراس ص ۳۱۱)

(۳) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ'' (التحریم: ۶) فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے' اور ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔

(۴) امام مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا۔ (امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم ج ۲ ص ۴۱۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ) اور قرآن مجید میں تصریح ہے کہ شیطان کو نار سے پیدا کیا گیا ہے۔

جو علماء ابلیس کو فرشتہ قرار دیتے ہیں وہ ان تین آیات اور اس حدیث میں تاویل کرتے ہیں' اور جو ابلیس کو جن قرار دیتے ہیں وہ صرف ''فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ'' (البقرہ: ۳۴) میں تاویل کرتے ہیں یا اس استثناء کو منقطع قرار دیتے ہیں اور زیادہ آیتوں میں تاویل کرنے کی بہ نسبت ایک آیت میں تاویل کرنا اولیٰ ہے۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ امام طبرانی نے ''معجم اوسط'' میں حضرت عمر سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے' اس میں ہے: حضرت جبرائیل رو رہے تھے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے جبرائیل! اللہ نے تمہیں اتنا بڑا مقام دیا ہے اور پھر بھی تم رو رہے ہو؟ حضرت جبرائیل نے کہا: میں کیوں نہ روؤں' میں رونے کا زیادہ حقدار ہوں' ہوسکتا ہے اللہ کے علم میں میرا یہ مقام نہ ہو جس پر میں فائز ہوں اور ہوسکتا ہے کہ مجھے اس طرح آزمائش میں ڈالا گیا ہو جس طرح ابلیس کو آزمائش میں ڈالا گیا تھا' بے شک وہ بھی فرشتوں میں سے تھا۔ (جامع الاحادیث الکبیر ج ۱۲ ص ۲۱' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۱۴ھ)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا' اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا ایک راوی متروک ہے جیسا کہ اس حدیث کے آخر میں لکھا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابلیس کے جن یا فرشتہ ہونے میں اختلاف ہے لیکن اس کے جن ہونے پر زیادہ دلائل قائم ہیں اور فرشتہ ہونے پر صرف اس آیت میں استثناء متصل سے استدلال کیا گیا ہے اور اس استثناء میں یا تاویل کی جائے گی یا اس کو استثناء منقطع پر محمول کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے فرمایا: اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ (البقرہ: ۳۵)

حضرت حوا کی خلقت کا بیان

قرآن مجید میں حضرت حواء کو پیدا کرنے کا ذکر ہے:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ (الاعراف: ۱۸۹)

(اللہ) وہی ہے جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی ذات سے اس کی بیوی کو بنایا تاکہ اس کی طرف سکون حاصل کرے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورتوں کے ساتھ خیر خواہی اور اچھا سلوک کرو' کیونکہ عورت کو پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اور پسلی میں سب سے زیادہ ٹیڑھا پن اس کے اوپر والے حصے میں ہوتا ہے' اگر تم اس کو سیدھا کرو گے تو اس کو توڑ دو گے اور اگر اس کو چھوڑ دو گے تو وہ ٹیڑھی رہے گی' سو عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کرو۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۶۹ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن مسعود اور دیگر کئی صحابہ رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ پھر ابلیس کو جنت سے نکال دیا گیا اور اس پر لعنت کی گئی اور حضرت آدم کو جنت میں رکھا گیا' حضرت آدم جنت میں تنہا تھے اور ان کو وحشت ہوتی تھی' ان کی بیوی نہیں تھی جس سے ان کو سکون ملے' ایک دن وہ سو گئے' جب وہ بیدار ہوئے تو ان کے سرہانے ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی' جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کی پسلی سے پیدا کیا تھا' حضرت آدم نے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے کہا: عورت' پوچھا: تم کو کیوں پیدا کیا گیا ہے' کہا: تاکہ تم کو مجھ سے سکون ملے' فرشتوں نے حضرت آدم سے پوچھا: اے آدم! اس کا نام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: حوا' پوچھا: آپ نے اس کا نام حواء کیوں رکھا؟ فرمایا: اس لیے کہ یہ حی (زندہ شخص) سے پیدا کی گئی ہے! تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور اس جنت میں سے جہاں سے چاہو خوب کھاؤ۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۱۸۲ مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

آیا حضرت آدم کو جنت الخلد میں رکھا گیا تھا یا زمین کے کسی باغ میں؟

علامہ ابن عطیہ لکھتے ہیں:

جنت اس باغ کو کہتے ہیں جس کے گرد باڑ ہو' جس جنت میں حضرت آدم کو رکھا گیا تھا اس میں اختلاف ہے آیا وہ جنت الخلد تھی یا ان کے لیے کوئی باغ تیار کیا گیا تھا' جو یہ کہتے ہیں کہ وہ جنت الخلد نہیں تھی ان کی دلیل یہ ہے کہ جو جنت الخلد میں داخل ہو جائے وہ اس سے نکلتا نہیں ہے اور یہ محال ہے' البتہ احادیث میں یہ ہے کہ جو بہ طور ثواب کے جنت میں داخل ہوا وہ اس سے نہیں نکلے گا اور جو حضرت آدم کی طرح ابتداء جنت میں داخل ہو اس کا جنت سے نکلنا محال نہیں ہے اور اس کے متعلق احادیث میں یہ نہیں ہے کہ وہ نہیں نکلے گا۔ (المحرر الوجیز ج ۱ ص ۱۸۲ مطبوعہ مکہ مکرمہ' ۱۳۹۵ھ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

معتزلہ اور قدریہ کا یہ نظریہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت الخلد میں رہنے کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ ان کو عدن کے ایک باغ میں رہنے کا حکم دیا تھا' ان کی دلیل یہ ہے کہ جنت الخلد میں ابلیس نہیں جا سکتا کیونکہ جنت الخلد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۝ (الواقعہ: ۲۵)	وہ اس میں کوئی بے ہودہ بات سنیں گے نہ گناہ کی بات ۝
لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ۝ (النبا: ۳۵)	وہ اس میں کوئی بے ہودہ بات سنیں گے نہ جھوٹی بات ۝
لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝ (الحجر: ۴۸)	انہیں وہاں کوئی تکلیف پہنچے گی نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے ۝

وہ کہتے ہیں کہ ابلیس نے جنت میں جھوٹ بولا اور بے ہودہ بات کی اور آدم اور حواء کو ان کی معصیت کی وجہ سے جنت سے نکالا گیا' اس کا جواب یہ ہے کہ جنت کی یہ صفت اس وقت ہوگی جب قیامت کے بعد لوگ بہ طور جزاء کے جنت میں داخل ہوں گے اور یہ جنت دار الخلد ان لوگوں کے لیے ہوگی جن کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ زندہ رکھنا چاہے گا اور جن کے لیے موت مقدر کر دی گئی ہے وہ جنت میں داخل ہونے کے بعد اس سے نکل آئیں گے' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج جنت میں گئے اور پھر باہر آئے اور حضرت آدم کے معروف جنت میں داخل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا: آپ وہ آدم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور آپ میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی اور اپنے

فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور آپ کو اپنی جنت میں رکھا' پھر آپ نے اپنی خطا کی وجہ سے لوگوں کو زمین پر اتارا۔ (صحیح مسلم ج ۲ص ۳۳۵) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو دارالخلد میں رکھا تھا۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱ص ۳۰۲' مطبوعہ ایران' ۱۳۸۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اس جنت میں سے جہاں سے چاہو خوب کھاؤ اور اس درخت کے قریب نہ جانا' ورنہ تم حد سے بڑھنے والوں میں شمار ہو گے O (البقرہ: ۳۵)

شجر ممنوع کا بیان

علامہ ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

اس درخت کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ یہ زیتون کا درخت تھا' ایک روایت یہ ہے کہ یہ گندم کا درخت تھا اور ایک روایت یہ ہے کہ یہ انگور کا درخت تھا۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حضرت حواء کو کسی معین درخت کے پھل کھانے سے منع کیا تھا' اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ صراحت نہیں کی کہ وہ کون سا درخت ہے' اس درخت کا نام ذکر کیا اور نہ اس کی طرف کوئی اشارہ کیا' اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے درختوں میں سے کسی خاص درخت کا پھل کھانے سے حضرت آدم اور حضرت حوا کو منع کیا تھا باقی تمام درختوں سے منع نہیں کیا تھا' ہمارے پاس اس کے علم کی کوئی سبیل نہیں ہے کہ وہ کونسا درخت تھا' اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کا کوئی ذکر کیا ہے نہ سنت صحیحہ میں اس کی کوئی تعیین ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں کہ یہ گندم کا درخت تھا' یا زیتون کا درخت تھا یا انگور کا درخت تھا اور اگر یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کون سا درخت تھا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے O (البقرہ: ۳۵)

آیا شجر ممنوع سے کھانا معصیت تھا یا نہیں؟

اب سوال یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس درخت سے کھایا اور اس درخت کے قریب گئے تو کیا وہ ظالموں میں سے ہو گئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قصد اور ارادہ سے درخت کے قریب جانے سے منع فرمایا ہے' کیونکہ جب کسی کام سے منع کیا جائے تو اس کا محمل یہی ہوتا ہے کہ اس کام کو قصد اور ارادہ سے نہ کیا جائے اور گناہ کی بھی یہی تعریف ہے کہ قصداً اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جائے اور جو کام نسیان اور خطاء سے سرزد ہو گیا وہ گناہ نہیں ہوتا' سو اب یہ دیکھنا ہے کہ حضرت آدم نے اس درخت سے قصداً کھایا یا بھول کر' تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا O (طٰہٰ: ۱۱۵)

اور بے شک اس سے پہلے ہم نے آدم سے عہد لیا تھا (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائیں) پس وہ بھول گئے' اور ہم نے ان کا قصد نہیں پایا O

اور جب آدم علیہ السلام نے بھول سے اس درخت سے کھایا تو نہ ان سے معصیت سرزد ہوئی اور نہ وہ ظالموں میں سے ہوئے۔

اب اگر یہ سوال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے: آدم نے معصیت کی:

وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ (طٰہٰ: ۱۲۱)

آدم نے اپنے رب کی معصیت کی سو وہ (جنت کی سکونت سے) بے راہ ہو گئے O

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چند کہ حضرت آدم بھول کر درخت کے قریب گئے تھے اور ان کا یہ فعل حقیقت میں معصیت نہیں تھا لیکن یہ فعل اپنی ظاہری صورت کے اعتبار سے معصیت تھا' اور اس آیت میں ان کے اس فعل کو ظاہر اور صورت کے اعتبار سے معصیت فرمایا ہے۔ اس آیت سے مقصود تو یہ تھا کہ حضرت آدم اس درخت سے نہ کھائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اس درخت کے قریب نہ جانا' اس سے معلوم ہوا کہ جو کام ممنوع ہو اس کے مبادی اور مقدمات بھی ممنوع ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس شیطان نے انہیں اس درخت کے ذریعے لغزش میں مبتلا کیا اور جہاں وہ رہتے تھے وہاں سے ان کو نکال دیا۔ (البقرۃ: ۳۶)

شجر ممنوع سے کھانے کے لیے ابلیس کی وسوسہ اندازی کا بیان

اللہ تعالیٰ نے شیطان کے وسوسہ کا حسب ذیل آیتوں میں بیان فرمایا ہے:

فَوَسْوَسَ اِلَیْهِ الشَّیْطٰنُ قَالَ یٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا یَبْلٰی ○ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۔ (طٰہٰ: ۱۲۱۔ ۱۲۰)

پھر شیطان نے آدم کی طرف وسوسہ کیا' کہا: اے آدم! کیا تمہیں (جنت میں) ہمیشہ رہنے کا درخت بتادوں اور ایسی بادشاہت جو کبھی کمزور نہ ہو؟ ○ تو (آدم وحوا) دونوں نے اس درخت سے کھالیا' سو ان کی ستر گاہیں کھل گئیں اور وہ دونوں جنت کے پتوں سے اپنا جسم چھپانے لگے۔

وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَیْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِیْنَ ○ وَقَاسَمَهُمَاۤ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ۙ (الاعراف: ۲۱۔ ۲۰)

اور شیطان نے کہا: تم دونوں کو تمہارے رب نے اس درخت سے صرف اس لیے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے بن جاؤ یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ ○ اور ان دونوں سے قسم کھا کر کہا کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں ○

حضرت آدم نے اجتہاد کیا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم کوئی جھوٹی نہیں کھا سکتا اور انہوں نے یہ اجتہاد کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تنزیہاً منع کیا ہے اور یہ بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ نے تحریماً منع فرمایا تھا' یا انہوں نے یہ اجتہاد کیا کہ اللہ تعالیٰ نے خاص اس درخت سے منع فرمایا ہے' میں اس نوع کے کسی اور درخت سے کھالیتا ہوں' دونوں صورتوں میں ان کے اجتہاد کو خطاء لاحق ہوئی اور وہ یہ بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نوع شجر سے منع کیا تھا اور یہ واضح رہے کہ اجتہادی خطاء اور نسیان عصمت کے منافی نہیں ہے اور باقی رہا ان کا عرصہ دراز تک توبہ اور استغفار کرنا تو یہ ان کا کمال تواضع اور انکسار ہے۔

ایک اور سوال یہاں پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو جنت سے نکال دیا تھا تو وہ حضرت آدم کو وسوسہ ڈالنے کے لیے جنت میں کیسے پہنچ گیا؟

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ ۙ (الحجر: ۳۴) فرمایا: تو جنت سے نکل جا' سو بے شک تو مردود ہے ○

مفسرین نے اس کی متعدد توجیہات کی ہیں' ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزت اور کرامت کے ساتھ جنت میں اس کے دخول کو منع فرمایا تھا اور وہ چوروں کی طرح چھپ کر گیا اور کسی اور صورت میں متمثل ہو کر حضرت آدم سے یہ گفتگو کی اور ان کو وسوسہ ڈالا' یا وہ جنت کے دروازہ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور وہاں سے حضرت آدم کو آواز دے کر بلایا' یا وہ کسی جانور کی صورت میں جنت میں چلا گیا اور جنت کے محافظ اس کو نہ پہچان سکے' یا وہ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں گیا یا اس نے اپنے بعض چیلوں کو یہ پیغام دے کر جنت میں بھیجا۔

امام ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

حضرت ابن مسعود' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم سے فرمایا: اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور جنت میں سے جہاں سے چاہو خوب کھاؤ اور اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم دونوں حد سے بڑھنے والوں میں سے ہو جاؤ گے' اس وقت ابلیس نے ان دونوں کے پاس جنت میں جانے کا ارادہ کیا' جنت کے محافظوں نے اس کو جانے نہیں دیا' اس وقت سانپ اونٹ کی طرح ایک چوپایہ تھا اور بہت حسین جانور تھا' ابلیس نے اس سے کہا: وہ اس کو اپنے منہ میں رکھ کر جنت میں لے جائے' سو سانپ ابلیس کو اپنے منہ میں رکھ کر چلا گیا اور جنت کے محافظوں کو پتا نہ چلا' پھر ابلیس نے حضرت آدم سے کہا: کیا میں تم کو ایسا درخت نہ بتاؤں' جس کو کھانے کے بعد تم دونوں فرشتوں کی طرح ہو جاؤ گے یا ہمیشہ زندہ رہنے والے ہو جاؤ گے اور تمہیں کبھی موت نہیں آئے گی اور قسم کھا کر کہا کہ وہ ان کی خیر خواہی کر رہا ہے حالانکہ اس کا ارادہ یہ تھا کہ ان کا ستر کھل جائے' حضرت آدم نے انکار کیا تو حضرت حواء نے آگے بڑھ کر اس درخت سے کھا لیا اور حضرت آدم سے کہا: اے آدم! اسے کھالو' دیکھو میں نے کھایا ہے مجھے کچھ نہیں ہوا' جب حضرت آدم نے اس کو کھا لیا تو ان دونوں کی شرم گاہیں کھل گئیں اور وہ درخت کے پتوں سے اپنے اپنے جسموں کو ڈھانپنے لگے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۱۸۷' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ ابن حیان اندلسی نے کہا ہے کہ ایک قول یہ ہے کہ ابلیس نے زمین سے ہی حضرت آدم کو بہ طریق وسوسہ خطاب کیا تھا اور وہ دھتکارے جانے کے بعد زمین سے آسمان کی طرف نہیں گیا۔ (البحر المحیط ج ۱ ص ۳۱۱' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۲ھ)

حضرت آدم علیہ السلام نے شجر ممنوع سے پھل کھایا اور اس کے نتیجہ میں ان کا ستر کھل گیا اور ان کو جنت سے زمین پر بھیج دیا گیا' پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی' جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہاں یہ بحث کی جاتی ہے کہ آیا ان کا شجر ممنوع سے کھانا ان کی عصمت کے منافی ہے یا نہیں' اس لیے ہم عصمت کا اصطلاحی معنیٰ' عصمت انبیاء میں مذاہب' عصمت انبیاء پر دلائل اور بہ ظاہر عصمت کے منافی امور کا جواب اور قصہ آدم کے تفصیلی جوابات ذکر کریں گے' ہم نے اس موضوع پر ''شرح صحیح مسلم'' جلد سابع (۷) میں بہت تفصیل اور تحقیق سے گفتگو کی ہے' تاہم یہاں بھی ہم ضروری امور کا ذکر کریں گے۔ فنقول وباللّٰہ التوفیق وبہ الاستعانۃ یلیق.

عصمت انبیاء کا اصطلاحی معنیٰ

علامہ میر سید شریف جرجانی لکھتے ہیں:

ہمارے نزدیک عصمت کا معنیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام میں گناہ پیدا نہ کرے اور حکماء کے نزدیک عصمت ایک ملکہ (صفت راسخہ' صفت نفسانیہ) ہے جو معاصی کی قباحت اور عبادت کی فضیلت کے علم کی وجہ سے ان کو گناہوں سے روکتی ہے اور عبادت پر برانگیختہ کرتی ہے اور اوامر اور نواہی کی مسلسل وحی کی وجہ سے یہ صفت اور راسخ ہو جاتی ہے' اور انبیاء علیہم السلام سے جو سہواً اور بعض کے نزدیک عمداً صغائر صادر ہوتے ہیں یا وہ کسی اولیٰ اور افضل کام کو ترک کر دیتے ہیں' اس سے ان کی عصمت پر اعتراض نہیں ہوگا' کیونکہ صفات نفسانیہ ابتداءً غیر راسخ ہوتی ہیں' پھر بتدریج راسخ ہو جاتی ہیں (اور راسخ ہونے کے بعد وہ صفات ملکیہ کہلاتی ہیں) اور ایک قوم (علماء شیعہ) نے عصمت کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ کسی انسان کی روح یا اس کے بدن میں ایسی خاصیت ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس سے گناہوں کا صدور ممتنع ہوتا ہے' یہ تعریف اس لیے باطل ہے کہ اگر ان سے گناہوں کا صدور محال ہو تو وہ گناہوں کے ترک پر دنیا میں مدح اور آخرت میں ثواب کے مستحق نہ ہوں' کیونکہ جو چیز محال

ہو اس کے ترک سے تعریف ہوتی ہے نہ ثواب' کیونکہ اس کا کرنا قدرت اور اختیار میں نہیں ہے' نیز اس پر اجماع منعقد ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو گناہوں کے ترک سے ثواب ہوتا ہے اور وہ گناہوں کے ترک کرنے کے مکلف ہیں اور اگر ان سے گناہوں کا صدور محال ہوتا تو ان کو مکلف نہ کیا جاتا نہ ثواب دیا جاتا کیونکہ محال کو ترک کرنے کا مکلف نہیں کیا جاتا نہ اس پر ثواب دیا جاتا ہے' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ کہیے کہ میں تمہاری مثل بشر ہوں' میری طرف وحی کی جاتی ہے' یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جو امور بشریت کی طرف راجع ہیں آپ ان میں تمام بشروں کی مثل ہیں اور آپ کا امتیاز صرف وحی سے ہے' اس لیے جس طرح اور بشروں سے گناہوں کا صدور محال نہیں ہے' انبیاء علیہم السلام سے بھی گناہوں کا صدور محال نہیں ہوگا۔

(شرح المواقف ج ۸ ص ۲۸۱۔ ۲۸۰' مطبوعہ منشورات الشریف ایران' ۱۴۱۲ھ)

انبیاء علیہم السلام اور عام بشروں میں صرف وحی کے لحاظ سے ہی فرق نہیں ہوتا بلکہ خصوصیات کے لحاظ سے بھی فرق ہوتا ہے' ان کی بشریت مادی کثافتوں سے منزہ ہوتی ہے اور کمال قرب الٰہی کی وجہ سے ان کا قلب انوار الٰہیہ کی جلوہ گاہ ہوتا ہے اور جس قدر خوف خدا ان کو ہوتا ہے مخلوق میں سے کسی کو نہیں ہوتا۔

علماء شیعہ میں سے شیخ طوسی[1] اور شیخ طبرسی[2] نے یہ تصریح کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں صغیرہ اور کبیرہ گناہ محال ہیں۔

علماء اہل سنت کے نزدیک انبیاء علیہم السلام گناہوں پر قدرت اور اختیار کے باوجود خوف خدا کے غلبہ سے گناہوں سے باز رہتے ہیں۔ صغیرہ اور کبیرہ عمداً نہیں کرتے' البتہ نسیان یا اجتہادی خطاء سے ان سے بعض اوقات صغیرہ کا صدور ہو جاتا ہے یا تبلیغی مصلحت کی وجہ سے وہ کسی افضل اور اولیٰ کام کو ترک کر دیتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر دلائل

انبیاء علیہم السلام کے معصوم ہونے پر حسب ذیل دلائل ہیں:

(۱) اگر انبیاء علیہم السلام سے (العیاذ باللہ) گناہ صادر ہو تو ان کی اتباع حرام ہوگی' حالانکہ ان کی اتباع کرنا واجب ہے کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ (آل عمران: ۳۱)

آپ فرما دیجئے: اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو' اللہ تمہیں محبوب بنا لے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔

(۲) جس شخص سے گناہ صادر ہوں اس کی شہادت کو بلا تحقیق قبول کرنا جائز نہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا (الحجرات: ۶)

اے ایمان والو! اگر فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔

اور اس پر امت کا اجماع ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شہادت کو بلا تحقیق قبول کرنا واجب ہے۔

(۳) فاسق نبوت کا اہل نہیں ہے' قرآن مجید میں ہے:

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (البقرہ: ۱۲۴)

اللہ نے فرمایا: ظالموں کو میرا عہد نہیں پہنچتا ۝

---

[1] شیخ ابوجعفر محمد حسن طوسی متوفی ۴۶۰ھ' التبیان ج ۱ ص ۱۵۹' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

[2] شیخ ابوعلی فضل بن حسن طبرسی متوفی ۵۴۸ھ' مجمع البیان ج ۱ ص ۱۹۵' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۴۰۹ھ

(۴) اگر نبی سے گناہ صادر ہوں تو ان کو (العیاذ باللہ) ملامت کرنا جائز ہوگا اور اس سے نبی کو ایذاء پہنچے گی اور انبیاء علیہم السلام کو ایذاء پہنچانا حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ. (الاحزاب: ۵۷)

بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذاء پہنچاتے ہیں' ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت ہے۔

(۵) انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاذْكُرْ عِبَادَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ ○ إِنَّا أَخْلَصْنَاهُمْ. (ص: ۴۶-۴۵)

اور ہمارے بندوں ابراہیم' اسحاق اور یعقوب کو یاد کیجئے جو قوت اور نگاہ بصیرت والے ہیں ○ ہم نے ان کو مخلص کر دیا۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مخلصین کو شیطان گمراہ نہیں کر سکتا:

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ○ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ○ (ص: ۸۳-۸۲)

ابلیس نے کہا: تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کردوں گا ○ سوا تیرے مخلص بندوں کے ○

(۶) گناہ گار لائق مذمت ہے اور اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی عزت افزائی کی ہے:

وَإِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ ؕ (ص: ۴۷)

اور بے شک وہ (سب) ہماری بارگاہ میں ضرور پسندیدہ بندوں میں سے ہیں ○

(۷) انبیاء علیہم السلام لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں' اگر وہ خود گناہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان پر ناراض ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ○ (الصف: ۳)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات سخت ناراضگی کی موجب ہے کہ تم وہ بات کہو جو خود نہیں کرتے ○

حالانکہ اللہ تعالیٰ انبیاء سے راضی ہے' ارشاد ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ○ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ. (الجن: ۲۷-۲۶)

وہ عالم الغیب ہے تو وہ اپنے غیب پر کسی کو (بذریعہ وحی) مطلع نہیں فرماتا ○ بجز ان کے جن سے وہ راضی ہے جو اس کے (سب) رسول ہیں۔

اس آیت میں واضح فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ سب رسولوں سے راضی ہے' اور نیکی کا حکم دے کر خود عمل نہ کرنے والے سے وہ راضی نہیں ہے۔

(۸) اگر معاذ اللہ انبیاء علیہم السلام سے گناہوں کا صدور ہوتا تو وہ مستحق عذاب ہوتے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ؕ (الجن: ۲۳)

اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو لاریب اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا ○

اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ انبیاء علیہم السلام جہنم سے محفوظ اور مامون ہیں اور ان کا مقام جنت خلد ہے۔

(۹) انبیاء علیہم السلام فرشتوں سے افضل ہیں اور فرشتوں سے گناہ صادر نہیں ہوتے تو انبیاء علیہم السلام سے بطریق اولیٰ گناہ صادر نہیں ہوں گے' فرشتوں سے افضلیت کی دلیل یہ ہے کہ فرشتے عالمین میں داخل ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم

السلام کو تمام عالمین پر فضیلت دی ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَۙ (آل عمران: ٣٣)

بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم' نوح' آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں پر فضیلت دی ہے O

(١٠) اگر انبیاء علیہم السلام معصیت کریں تو ہم پر معصیت کرنا واجب ہوگی کیونکہ ان کی اتباع واجب ہے اور دوسرے دلائل سے ہم پر معصیت کرنا حرام ہے' سو لازم آئے گا کہ ہم پر معصیت کرنا واجب بھی ہو اور حرام بھی ہو اور یہ اجتماع ضدین ہے۔

عصمت انبیاء کے متعلق فقہاء اسلام کے نظریات اور مذاہب

امام رازی نے عصمت انبیاء کے متعلق حسب ذیل اقوال نقل کیے ہیں:

(١) حشویہ کا مذہب ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے عمداً گناہ کبیرہ کا صدور جائز ہے۔

(٢) اکثر معتزلہ کا مذہب ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے عمداً گناہ کبیرہ کا صدور جائز نہیں' البتہ عمداً گناہ صغیرہ کا صدور جائز ہے' البتہ ان صغائر کا صدور جائز نہیں جن سے لوگ متنفر ہوں۔

(٣) جبائی کا مذہب ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے عمداً کبائر اور صغائر دونوں کا صدور جائز نہیں' البتہ تاویلاً جائز ہے۔

(٤) انبیاء علیہم السلام سے بغیر سہو اور خطا کے کوئی گناہ صادر نہیں ہوتا' لیکن ان سے سہو اور خطاء پر بھی مواخذہ ہوتا ہے۔

(٥) رافضیوں کا مذہب ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے کسی گناہ کا صدور ممکن نہیں ہے صغیرہ نہ کبیرہ' سہواً نہ عمداً تاویلاً نہ خطاء۔

(تفسیر کبیر ج ١ ص ٣٠١' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ١٣٩٨ھ)

مذکور الصدور اقوال نقل کرنے کے بعد امام رازی اپنا مختصر بیان کرتے ہیں:

عصمت انبیاء کے متعلق محققین کا مذہب

امام رازی لکھتے ہیں:

ہمارے نزدیک مختار یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے زمانہ نبوت میں یقینی طور پر کوئی گناہ صادر نہیں ہوتا' کبیرہ نہ صغیرہ۔

(تفسیر کبیر ج ١ ص ٣٠٢' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ١٣٩٨ھ)

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

ہمارا مذہب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اعلان نبوت کے بعد گناہ کبیرہ مطلقاً نہیں کرتے' اور صغائر عمداً نہیں کرتے' البتہ ان سے سہواً صغیرہ کا صدور ہو جاتا ہے' لیکن وہ اس پر اصرار نہیں کرتے اور نہ وہ اس پر برقرار رکھے جاتے ہیں بلکہ ان کو تنبیہ کی جاتی ہے اور وہ متنبہ ہو جاتے ہیں۔ (شرح المقاصد ج ٢ ص ١٩٣' مطبوعہ دار المعارف النعمانیہ' ١٤٠١ھ)

میر سید شریف جرجانی حنفی لکھتے ہیں:

ہمارے نزدیک مختار یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنے زمانہ نبوت میں مطلقاً گناہ کبیرہ سے اور عمداً صغیرہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ (شرح مواقف ص ٦٨٩' مطبوعہ مطبع منشی نولکشور' لکھنؤ)

انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر اعتراضات کا اجمالی جواب

انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا اجمالی جواب یہ ہے کہ کچھ روایات میں انبیاء علیہم السلام کی طرف بعض ایسے واقعات منسوب ہیں جو عصمت کے خلاف ہیں' یہ تمام واقعات اخبار احاد سے مروی ہیں' اور یہ

روایات ضعیف اور ساقط الاعتبار ہیں اور قرآن مجید کی بعض آیات میں جو انبیاء علیہم السلام کی طرف عصیان' غوایت اور ذنب کی نسبت ہے' وہ سہو' نسیان' ترک اولیٰ یا اجتہادی خطاء پر محمول ہے اور انبیاء علیہم السلام کا توبہ اور استغفار کرنا ان کی کمال تواضع' انکسار اور امتثال امر پر محمول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ہم نے فرمایا: تم (سب) نیچے اتر و' تم میں سے بعض' بعض کے دشمن ہوں گے اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت مقرر تک ٹھکانا اور فائدہ اٹھانا ہے O (البقرہ: ۳۶)

حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے کی حکمتوں کا بیان

اس آیت میں حضرت آدم اور حوا کو خطاب ہے' کیونکہ قرآن مجید میں تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ خطاب ہے'' اھْبِطَا مِنْهَا '' (طٰہٰ: ۱۲۳) اور یہاں جمع کے صیغہ کے ساتھ خطاب ہے'' اس میں حضرت آدم کی پشت میں جو ان کی ذریت ہے اس کو بھی خطاب ہے یا حضرت آدم' حواء اور ابلیس کو خطاب ہے' ہر چند کہ ابلیس کو پہلے بھی نکال دیا تھا لیکن جب وہ چوری سے چھپ کر وسوسہ ڈالنے کے لیے داخل ہوا تو اس کو دوبارہ نکال دیا۔

منکرین عصمت یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ اگر حضرت آدم علیہ السلام نے گناہ نہیں کیا تھا تو ان کو سزا کیوں ملی اور ان کو جنت سے کیوں نکالا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے کا حکم دینا' ان کے حق میں سزا نہیں ہے' بلکہ یہ ان کے مقصد تخلیق کی تکمیل ہے' کیونکہ ان کو زمین پر خلافت الٰہی کے لیے پیدا کیا گیا تھا' بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ آدم اور ابلیس کے معرکہ میں ابلیس کامیاب ہو گیا اور اس نے ان کو جنت سے نکلوا دیا' یہ بات بھی بالکل غلط ہے کیونکہ شیطان تو حضرت آدم کے جنت میں عارضی قیام کو بھی نہیں برداشت کر سکا تھا اور وہ اب دنیا میں آ کر اور فرائض نبوت اور کار خلافت کو انجام دے کر دائمی قیام کے لیے جنت میں جائیں گے اور شیطان تو ان کے تنہا وجود کو جنت میں برداشت نہیں کر سکا تھا اور حضرت آدم دنیا میں آنے کے بعد اپنی بے شمار ذریت کے ساتھ جنت میں جائیں گے اور شیطان لعنتی ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا' اس لیے حضرت آدم کا دنیا میں آنا ایک بہت بڑی کامیابی کا پیش خیمہ تھا اور شیطان کی ناکامی اور نامرادی کا مقدمہ تھا' سو اس معرکہ میں حضرت آدم علیہ السلام ہی کامیاب تھے اور ابلیس خائب و خاسر ہوا۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر حضرت آدم شجر ممنوع سے نہ کھاتے تو ہم جنت میں ہی رہتے' ان کے شجر ممنوع سے کھانے کی وجہ سے ہمیں بھی جنت سے آنا پڑا' اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کیسے جنت میں رہتے اور آپ کا کیا استحقاق تھا؟ جنت تو پاک لوگوں کی جگہ ہے' حضرت آدم کی پشت میں پاک لوگ بھی تھے اور ناپاک لوگ بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو دنیا میں بھیجا کہ اپنی پشت سے تمام ذریت کو نکال کر زمین پر چھوڑ آؤ' پھر جو پاک لوگ ہوں گے وہ جنت میں چلے جائیں گے اور جو ناپاک ہوں گے ان کو دوزخ میں بھیج دیا جائے گا اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حضرت آدم کی پشت میں ان ناپاک لوگوں کا وجود ان کے جنت سے آنے کا سبب تھا اور حقیقت یہ ہے کہ چونکہ حضرت آدم کو زمین کی خلافت کے لیے بنایا گیا تھا اس لیے انہوں بہر حال زمین میں آنا تھا' شجر ممنوع سے کھانا سبب نہ ہوتا تو کوئی اور سبب ہوتا' نیز انبیاء علیہم السلام بعض اوقات اپنے مخالفین کے شر کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہجرت کرتے ہیں لیکن وہ پھر دوبارہ کامیاب و کامران ہو کر اس جگہ لوٹتے ہیں' جیسے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے شر کی وجہ سے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی اور پھر مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ حضرت موسیٰ نے مصر سے مدین کی طرف ہجرت کی اور پھر مصر میں فاتحانہ لوٹے' حضرت عیسیٰ نے زمین سے آسمان کی طرف ہجرت کی اور پھر زمین پر آئیں گے اور حضرت آدم علیہ السلام نے جنت سے زمین کی طرف ہجرت کی اور پھر جنت میں فاتحانہ داخل ہوں گے' اور اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ (آل عمران: ۵۹) بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے اسے مٹی سے بنایا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا زمین پر آنا متعدد حکمتوں کی وجہ سے ہے اور ان کی فضیلت کا موجب ہے' کوئی سزا نہیں ہے۔

علامہ ابوجعفر طبری لکھتے ہیں:

حضرت آدم کے آسمانوں اور جنت میں ٹھہرنے کی مدت دنیاوی سالوں کے اعتبار سے تینتالیس سال ہے اور حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ یہ مدت پانچ سو سال ہے' حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت آدم کو ہند میں اور حضرت حواء کو جدہ میں اتارا گیا' حضرت آدم ان کی طلب میں گئے اور میدان عرفات میں دونوں کی ملاقات ہوئی' اور حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت آدم اور حواء جنت کی نعمتوں کے چلے جانے پر دو سو سال تک روتے رہے' چالیس دن تک کھانا کھایا نہ پانی پیا اور حضرت آدم علیہ السلام ایک سو سال تک حضرت حواء سے مقارب نہیں ہوئے۔ زمین پر آنے کے بعد اولاد آدم اور ابلیس اور اولاد آدم اور سانپ میں اس وقت سے دشمنی چلی آرہی ہے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۸۹۔ ۸۱۔ ۸۰ 'مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی' بے شک وہی بہت توبہ قبول فرمانے والا اور بے حد رحم فرمانے والا ہے ۝ (البقرہ: ۳۷)

حضرت آدم کی توبہ کے کلمات اور سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے توسل

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت آدم نے کہا: اے رب! کیا تو نے مجھے اپنے دست قدرت سے پیدا نہیں کیا؟ فرمایا: کیوں نہیں! کہا: کیا تو نے مجھ میں اپنی پسندیدہ روح نہیں پھونکی؟ فرمایا: کیوں نہیں! کہا: کیا تو نے مجھے اپنی جنت میں نہیں رکھا؟ فرمایا: کیوں نہیں! عرض کیا: اے رب! کیا تیری رحمت غضب پر غالب نہیں ہے؟ فرمایا: کیوں نہیں! عرض کیا: یہ بتا کہ اگر میں توبہ کروں اور اصلاح کروں تو کیا تو مجھے اپنی جنت کی طرف لوٹا دے گا؟ فرمایا: ہاں! قتادہ اور حسن نے کہا: وہ کلمات یہ ہیں:

رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (الاعراف: ۲۳) اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے ۝

(جامع البیان ج ۱ ص ۱۹۳ 'مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

حافظ ابن کثیر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

مجاہد نے بیان کیا کہ وہ کلمات یہ ہیں: (ترجمہ) اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں' تیری تسبیح اور حمد کے ساتھ میں کہتا ہوں: اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا' سو مجھے بخش دے' تو سب سے اچھا بخشنے والا ہے' اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں' تیری تسبیح اور حمد کے ساتھ میں کہتا ہوں: میں نے اپنی جان پر ظلم کیا' تو مجھ پر رحم فرما' بے شک تو سب سے اچھا رحم فرمانے والا ہے' اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں' تیری تسبیح اور حمد کے ساتھ کہتا ہوں' اے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا' تو

میری توبہ قبول فرما' بے شک تو بہت توبہ قبول کرنے والا ہے اور بے حد رحیم ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۴۲' مطبوعہ ادارہ اندلس' بیروت' ۱۳۸۵ھ)

امام طبرانی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب آدم علیہ السلام نے (صورۃ) گناہ کرلیا تو انہوں نے سر اٹھا کر عرش کی طرف دیکھا اور عرض کیا: میں محمد کے حق (وسیلہ) سے سوال کرتا ہوں کہ تو میری مغفرت فرما' اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی: محمد کون ہیں؟ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: تیرا نام برکت والا ہے' جب تو نے مجھے پیدا کیا تو میں نے سر اٹھا کر عرش کی طرف دیکھا تو اس میں لکھا ہوا تھا: ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' تو میں نے جان لیا کہ تیرے نزدیک اس شخص سے زیادہ بلند مرتبہ کوئی شخص نہیں ہوگا جس کا نام تو نے اپنے نام کے ساتھ لکھا ہے' تب اللہ عزوجل نے ان کی طرف یہ وحی کی: اے آدم علیہ السلام! وہ تمہاری اولاد میں سے تمام نبیوں کے آخر ہیں اور ان کی امت تمہاری اولاد کی امتوں میں سے آخری امت ہے اور اگر وہ نہ ہوتے اے آدم! تو میں تم کو پیدا نہ کرتا۔

(المعجم الصغیر ج ۲ ص ۸۳' مطبوعہ مکتبہ سلفیہ' مدینہ منورہ' ۱۳۸۸ھ)

اس حدیث کو امام بیہقی[1]' امام ابن جوزی[2] اور امام حاکم[3] نے بھی اپنی اپنی اسانید کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حافظ نور الدین الہیثمی[4]' حافظ جلال الدین سیوطی[5]' شیخ ابن تیمیہ[6] نے بھی اس حدیث کو بیان کیا ہے۔

حافظ ابن کثیر نے اس حدیث کو حاکم' بیہقی اور ابن عساکر کے حوالے سے لکھا ہے اور اس کے اخیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم علیہ السلام! تم نے سچ کہا' یہ مجھے مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہیں اور جب تم نے ان کے وسیلہ سے سوال کیا ہے تو میں نے تم کو بخش دیا اور اگر محمد نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا نہ کرتا۔

(البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۸۱' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۳ھ)

''شرح صحیح مسلم'' جلد سابع میں ہم نے اس حدیث کے مزید حوالہ جات بیان کئے ہیں۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

ایک جماعت نے کہا ہے کہ حضرت آدم نے عرش کے پائے پر ''محمد رسول اللہ'' لکھا ہوا دیکھا تو آپ کے وسیلہ سے دعا کی' اور کلمات سے یہی کلمات مراد ہیں' یعنی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کرنا۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۳۲۴' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ھ)

خواجہ عبداللہ انصاری لکھتے ہیں:

روایت ہے کہ حضرت آدم نے عرش پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا دیکھا تھا' جب ان سے لغزش ہوگئی تو انہوں نے

---

[1] امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' دلائل النبوۃ ج ۵ ص ۴۸۹' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت

[2] امام عبدالرحمان جوزی متوفی ۵۹۷ھ' الوفاء ص ۳۳' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' فیصل آباد

[3] امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ' المستدرک ج ۲ ص ۶۱۵' مطبوعہ دار الباز' مکہ مکرمہ

[4] حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ' مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۵۳' مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت' ۱۴۰۲ھ

[5] حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ' الدر المنثور ج ۱ ص ۵۸' مطبوعہ آیۃ اللہ العظمی' قم' ایران

[6] شیخ ابوالعباس تقی الدین احمد بن تیمیہ حنبلی متوفی ۷۲۸ھ' فتاوی ابن تیمیہ ج ۲ ص ۹۶' مطبوعہ السعودیہ العربیہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کی اور کہا: اے اللہ! مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وسیلہ سے معاف فرما' رب العالمین نے فرمایا: تم نے ان کو کیسے پہچانا جو ان کے وسیلہ سے دعا کی؟ عرض کیا: جب میں نے عرش پر تیرے نام کے ساتھ ان کا نام لکھا ہوا دیکھا تو جان لیا کہ یہ بندہ تجھے بہت محبوب ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے تمہیں بخش دیا۔

(کشف الاسرار وعدۃ الابرار ج ۱ ص ۱۵۶۔ ۱۵۵ 'مطبوعہ سپہر طہران' ۱۳۷۱ھ 'الطبع الخامس)

علامہ ثعالبی[1]' علامہ اسماعیل حقی[2] اور علامہ آلوسی[3] نے بھی اس روایت کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ حضرت آدم نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کی۔

حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

امام ابن المنذر' محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت آدم سے لغزش ہو گئی تو ان کو بہت رنج ہوا' اور شدید ندامت ہوئی' تو حضرت جبرائیل آپ کے پاس آئے اور کہا: اے آدم! کیا میں آپ کو توبہ کا دروازہ بتاؤں جس سے اللہ تعالیٰ آپ کی توبہ قبول کرلے؟ حضرت آدم نے کہا: کیوں نہیں! کہا: آپ اللہ تعالیٰ سے مناجات کریں اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کریں' آپ نے کہا: اے جبرائیل! میں کیا کہوں؟ انہوں نے کہا: آپ کہیے (ترجمہ:) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اس کا کوئی شریک نہیں' اس کا ملک ہے اور اس کے لیے حمد ہے' وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے' وہ زندہ ہے اور اس کو موت نہیں آئے گی' تمام اچھائیاں اس کی قدرت میں ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے' اس کے بعد آپ اپنی خطاء پر توبہ کریں اور کہیں: اے اللہ! تو سبحان ہے اور تیری حمد ہے' تیرے سوا کوئی معبود نہیں' اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور برا کام کیا' تو مجھے بخش دے کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو نہیں بخشے گا۔ اے اللہ! میں تجھ سے تیرے بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وجاہت کے وسیلہ سے اور ان کی تیرے نزدیک کرامت کے واسطے سے سوال کرتا ہوں کہ تو میری خطا کو بخش دے' حضرت آدم نے اسی طرح دعا کی' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! تم کو یہ دعا کس نے تعلیم کی؟ حضرت آدم نے کہا: اے رب! جب تو نے مجھ میں روح پھونکی اور میں ہموار بشر کی صورت میں کھڑا ہوا تو میں نے عرش پر یہ لکھا ہوا دیکھا: "بسم اللہ الرحمن لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ محمد رسول اللہ" اور جب میں نے دیکھا کہ تیرے نام کے ساتھ کسی مقرب فرشتے کا نام لکھا ہے' نہ کسی نبی مرسل کا تو میں نے جان لیا کہ یہ تیرے نزدیک تیری مخلوق میں سب سے مکرم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم نے سچ کہا اور میں نے تمہاری خطا کو بخش دیا' پھر حضرت آدم نے اپنے رب کی حمد و ثنا کی اور اس کا شکر ادا کیا اور بہت خوش ہو کر لوٹے اور فرشتوں نے فوج در فوج آکر حضرت آدم کو مبارک باد دی۔ (الدرالمنثور ج ۱ ص ۶۰ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ 'ایران)

(حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت جبریل کی تعلیم کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خود بھی عرش پر لکھا ہوا دیکھا تھا اس لیے اسی کا حوالہ دیا)۔

توبہ کا لغوی اور شرعی معنی

توبہ کا لغوی معنی ہے: رجوع کرنا' اور بندہ کی توبہ یہ ہے کہ وہ معصیت سے طاعت کی طرف اور غفلت سے اللہ کو یاد کرنے کی طرف رجوع کرے' اللہ کے توبہ قبول کرنے کا معنی یہ ہے کہ وہ دنیا میں بندہ کے گناہ پر پردہ رکھے بایں طور کہ کوئی شخص اس

---

[1] علامہ عبدالرحمان بن محمد بن مخلوف ثعالبی متوفی ۸۷۵ھ 'تفسیر الثعالبی ج ۱ ص ۵۳ 'مطبوعہ موسسۃ الاعلمی للمطبوعات' بیروت

[2] علامہ اسماعیل حقی حنفی متوفی ۱۱۳۷ھ 'روح البیان ج ۱ ص ۱۱۳ 'مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ' کوئٹہ

[3] علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ 'روح المعانی ج ۱ ص ۲۳۷ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت

کے گناہ پر مطلع نہ ہو اور آخرت میں اس کو سزا نہ دے خلاصہ یہ ہے کہ وہ عذاب دینے سے مغفرت کی طرف رجوع کرے۔

توبہ کا شرعی معنی یہ ہے کہ گناہ کو برا جان کر فی الفور ترک کردے اس سے جو تقصیر ہوئی ہے اس پر نادم ہو آئندہ اس گناہ کو نہ کرنے کا عزم مصمم کرے اور جو گناہ اس سے ہو گیا اس کا تدارک اور تلافی کرے (مثلاً فوت شدہ نمازوں اور روزوں کو قضا کرے) اور اگر اس گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہے تو پھر توبہ کے قبول ہونے کی ایک زائد شرط یہ ہے کہ وہ صاحب حق کو اس کا حق واپس کرے یا اس سے معاف کرائے اور اگر اس کے ذمہ حقوق اللہ ہیں تو وہ نوافل اور فرض کفایہ میں مشغول ہونے کے بجائے ان فوت شدہ فرائض کو ادا کرے کیونکہ جس شخص کی نمازیں اور روزے قضا ہوں اور وہ نوافل میں مشغول ہو تو وہ نفل ادا کرنے کے حال میں بھی فسق سے خارج نہیں ہوگا۔

قرآن مجید اور سنت میں توبہ کا بیان

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ (التحریم: ۸)

اے ایمان والو! اللہ کی طرف خالص توبہ (رجوع) کرو۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓىِٕكَ یَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۝ وَلَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ (النساء: ۱۸۔ ۱۷)

اللہ پر توبہ (کا قبول کرنا) صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو (عذاب الٰہی سے) جہالت کی بناء پر گناہ کر بیٹھیں پھر جلدی سے توبہ کرلیں تو یہ وہ لوگ ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے اور اللہ بہت جاننے والا اور بہت حکمت والا ہے ۝ اور توبہ (کا قبول ہونا) ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو (مسلسل) گناہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئے تو کہتا ہے: میں نے اب توبہ کی اور نہ یہ (قبول توبہ) ان لوگوں کے لیے ہے جو کفر کی حالت میں مرجاتے ہیں۔

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہ کی توبہ یہ ہے کہ توبہ کے بعد دوبارہ گناہ نہ کرے۔ (مسند احمد ج ۱ ص ۴۴۶ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۳۹۸ھ)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت معقل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ندامت توبہ ہے۔

(سنن ابن ماجہ ص ۳۱۳ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔

(مسند احمد ج ۱ ص ۴۲۳۔ ۴۲۳۔ ۳۷۶ ج ۶ ص ۲۶۴ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم خطائیں کرو حتیٰ کہ تمہاری خطاؤں سے آسمان بھر جائے پھر تم توبہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول فرمالے گا۔

(سنن ابن ماجہ ص ۳۱۳ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص گناہ سے توبہ کرلے وہ اس شخص کی مثل ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو۔ (سنن ابن ماجہ ص ۳۱۳ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بنی آدم خطا کار ہے اور خطا کاروں میں سب سے اچھے توبہ کرنے والے ہیں۔

اس حدیث کو امام دارمی[1] اور امام احمد[2] نے بھی روایت کیا ہے۔

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ غرغرہ موت (جب سانس اکھڑنے لگتا ہے) سے پہلے پہلے بندہ کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ ص ۳۱۳ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے استغفار کرلیا اس نے اصرار نہیں کیا خواہ وہ ایک دن میں ستر مرتبہ گناہ کرے۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۱۲ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند قوی نہیں ہے۔

(جامع ترمذی ص ۵۱۲ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت' کراچی)

ستر مرتبہ سے مراد کثرت ہے' یعنی اگر ایک دن میں انسان کئی بار گناہ کرے اور ہر گناہ کے بعد نادم ہو اور صحیح نیت سے توبہ کرے' اور شامت نفس سے پھر گناہ کر بیٹھے اور پھر نادم ہو اور توبہ کرے اور بار بار ایسا ہوتا رہے تو یہ گناہ پر اصرار نہیں ہے' اصرار اس وقت ہوتا ہے جب معصیت پر نادم اور تائب نہ ہو اور بغیر ندامت اور توبہ کے گناہ پر گناہ کرتا چلا جائے' صغیرہ گناہ پر اصرار اس کو کبیرہ بنادیتا ہے' مجھ سے علماء کی مجلس میں ایک محترم فاضل نے سوال کیا تھا کہ صغیرہ کے بعد دوبارہ صغیرہ کا ارتکاب کرنا اسی کی مثل اور اسی درجہ کی معصیت ہے' یہ کبیرہ کیوں ہوجاتا ہے؟ میں نے جواب دیا: جب انسان صغیرہ کے ارتکاب کے بعد بغیر توبہ اور استغفار اور بغیر ندامت کے دوبارہ اسی معصیت کو کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ معصیت کو بہت خفیف اور معمولی جانتا ہے اور کسی بھی معصیت کو ہلکا سمجھنا کبیرہ گناہ ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ صغیرہ گناہ کے بعد اس پر اصرار کرنا یعنی اس پر نادم اور تائب ہونے بغیر دوبارہ اسی گناہ کا ارتکاب کرنا اس گناہ کو کبیرہ بنادیتا ہے' امام ابن عساکر روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہ کبیرہ استغفار کے بعد کبیرہ نہیں رہتا (یعنی مٹ جاتا ہے) اور صغیرہ پر اصرار کرنے کے بعد وہ گناہ' صغیرہ نہیں رہتا (یعنی کبیرہ ہوجاتا ہے)۔

(مختصر تاریخ دمشق ج ۴ ص ۴۸ 'مطبوعہ دارالفکر' دمشق' ۱۴۰۴ھ)

نیز امام ابن عساکر روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے استغفار کرنے کو لازم کرلیا' اللہ تعالیٰ اس کی ہر پریشانی کا حل بنادے گا' اور ہر تنگی سے اس کے لیے کشادگی کردے گا اور اس کو وہاں

---

[1] امام عبداللہ بن عبدالرحمان دارمی متوفی ۲۵۵ھ' سنن دارمی ج ۲ ص ۳۰۳ 'مطبوعہ نشر السنہ' ملتان

[2] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۳ ص ۱۹۸ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

سے رزق دے گا جہاں اس کا وہم و گمان نہ ہوگا۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۳ ص ۱۵۴ مطبوعہ دارالفکر دمشق ۱۴۰۴ھ)

اس لیے مسلمان کو چاہیے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے توبہ اور استغفار کرتا رہے اور یہ پڑھا کرے:

"رب اغفر وارحم وانت خیر الراحمین" یا یہ پڑھا کرے: "اللھم اغفرلی وتب علی انک انت التواب الرحیم"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ہم نے فرمایا: تم سب جنت سے اتر جاؤ' پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئی تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو انہیں کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے O (البقرہ: ۳۸)

دوبارہ نیچے اترنے کا حکم دینے کی حکمت

اس آیت پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ اس سے پہلی آیت میں بھی یہ فرمایا تھا کہ تم (سب) نیچے اتر جاؤ اور دوبارہ پھر وہی حکم دیا ہے اور یہ تکرار ہے جو بلاغت کے منافی ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تکرار نہیں ہے بلکہ تاکید ہے' اور دونوں آیتوں سے مقصود مختلف ہے' پہلی آیت سے مقصود یہ تھا کہ تم دارالبقاء سے دارالبلاء کی طرف منتقل ہو جاؤ جہاں تم ایک دوسرے سے عداوت رکھو گے اور تمہیں دوام نہیں ہوگا' اور دوسری آیت سے مقصود یہ ہے کہ تم دارالجزاء سے دارالتکلیف کی طرف منتقل ہو جاؤ جہاں تمہیں احکام شرعیہ کا مکلف کیا جائے گا' جو ان پر عمل کرے گا وہ نجات پائے گا اور جو مخالفت کرے گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ ایک قول یہ ہے کہ پہلی آیت سے مقصود ہے جنت سے آسمان دنیا کی طرف اترنا اور دوسری آیت سے مقصود ہے آسمان دنیا سے زمین کی طرف اترنا لیکن اس توجیہ پر یہ اعتراض ہے کہ دوسری آیت میں "منھا" کی ضمیر جنت کی طرف راجع ہے' لہٰذا اس آیت میں بھی جنت سے زمین کی طرف اترنا مراد ہے۔

علامہ ابو اللیث سمرقندی نے لکھا ہے کہ اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ معصیت نعمت کو زائل کر دیتی ہے' کیونکہ حضرت آدم کو ان کی (ظاہری) معصیت کی وجہ سے جنت سے زمین پر بھیج دیا گیا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم میں اس وقت تک تغیر نہیں کرتا یعنی ان کو نعمت دے کر واپس نہیں لیتا جب تک کہ وہ خود اپنے اندر تغیر نہ کریں یعنی اطاعت اور شکر کے بجائے معصیت اور کفران نعمت کو اختیار نہ کریں۔ (تفسیر سمرقندی ج ۱ ص ۱۱۳ مطبوعہ مکتبہ دارالباز' مکہ مکرمہ' ۱۴۱۳ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئی۔ الخ

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی نبی یا رسول کو بھیجے اور کوئی کتاب یا صحیفہ نازل کرے تو جو لوگ ان کی دی ہوئی ہدایت کی پیروی کریں گے' ان کو اپنے مستقبل (آخرت) کے متعلق کوئی خوف ہوگا نہ وہ اپنے ماضی پر پشیمان اور غمگین ہوں گے' واضح رہے کہ اس آیت میں مطلقاً خوف کی نفی نہیں کی ہے' کیونکہ اللہ کے نیک بندوں کو بہرحال خدا کا خوف ہوگا اور جو شخص جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ کا مقرب ہے اس کو اتنا زیادہ اللہ تعالیٰ کا خوف ہے' یہاں وہ خوف مراد ہے جو باعث ضرر ہو کیونکہ عربی قواعد کے مطابق "علی" ضرر کے لیے آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا خوف نفع کا باعث ہے۔

پھر اس آیت کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کی تکذیب کی وہی لوگ دوزخی ہیں وہ ہمیشہ اس دوزخ میں رہیں گے O

عصمت آدم پر حشویہ کے اعتراضات اور ان کے جوابات

فرقہ حشویہ نے حضرت آدم کے قصہ سے یہ استدلال کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم نہیں ہوتے' ان کے دلائل اور جوابات حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت آدم علیہ السلام کو شجر ممنوع کے قریب جانے سے منع کیا تھا انہوں نے اس درخت سے کھایا' اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم نے اس نہی کو تنزیہہ پر محمول کیا یا وہ کھاتے وقت اس نہی کو بھول گئے۔

(۲) حضرت آدم علیہ السلام نے خود کہا: ہم نے ظلم کیا' اور ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہیں' اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے تو اضعاً و انکساراً ایسا کہا۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آدم نے معصیت کی اور وہ بے راہ ہوئے' اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ظاہری اور صوری معصیت ہے' حقیقت میں معصیت نہیں ہے کیونکہ حضرت آدم بھول گئے تھے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

(۴) حضرت آدم کو توبہ کی تلقین کی گئی اور بندہ کی توبہ یہ ہے کہ وہ گناہ پر نادم ہو اور طاعت کی طرف رجوع کرے' اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم اپنی اس غفلت پر نادم تھے جس کے باعث وہ اللہ تعالیٰ کے منع کرنے کو بھول گئے اور اسی غفلت پر روتے رہے اور توبہ کرتے رہے اور یہی انبیاء علیہم السلام کی توبہ ہوتی ہے' اور گناہ پر نادم ہونا عام انسانوں کی توبہ ہے۔

(۵) اگر آدم علیہ السلام نے گناہ نہیں کیا تھا تو اس درخت سے کھاتے ہی ان کا لباس کیوں اتر گیا اور انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا کر زمین پر کیوں بھیجا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی غفلت پر عتاب تھا اور غفلت گناہ نہیں ہے اور عتاب سزا نہیں ہے' دوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ یہ سبب پر مسبب کا ترتب ہو یعنی اللہ تعالیٰ نے اس درخت سے کھانے کو لباس کے اترنے اور زمین پر جانے کا سبب بنایا ہو جیسے کوئی بھولے سے زہر کھالے تو وہ پھر بھی مر جائے گا کیونکہ زہر کھانا موت کا سبب ہے۔

(۶) جب شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ اس درخت کے پھل کھانے سے وہ جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہو جائیں گے اور اس کے بعد انہوں نے اس درخت سے کھایا تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے بھولے سے کھالیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان کے اس وسوسہ کے فوراً بعد انہوں نے پھل نہیں کھایا لیکن اس کے کہنے سے ان کی طبیعت میں اس پھل کی طرف میلان پیدا ہو گیا' اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو اس پھل کے کھانے سے روکتے رہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی معصیت نہ ہو' پھر ایک بار وہ اس حکم کو بھول گئے اور غلبہ میلان کی وجہ سے اس کو کھالیا یا انہوں نے اپنے اجتہاد سے اس نہی کو تنزیہہ پر محمول کیا یا اس نہی کو اس معین درخت سے متعلق سمجھا اور اس نوع کے کسی اور درخت سے کھالیا۔

حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقت میں خلیفہ اعظم ہونا

عالم اجسام اور ظاہر میں حضرت آدم علیہ السلام ہی پہلے انسان اور اللہ کے خلیفہ ہیں لیکن حقیقت میں اول خلق اور اللہ کے خلیفہ اعظم سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جیسا کہ حسب ذیل احادیث میں اس کی تصریح ہے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کے لیے نبوت کب ثابت ہوئی؟ آپ نے فرمایا: اس وقت آدم روح اور جسم کے درمیان تھے' یہ حدیث حسن' صحیح' غریب ہے۔

(جامع ترمذی ص ۵۱۹' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام محمد بن سعد اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن شقیق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ! آپ نبی کب بنے تھے؟ لوگوں

نے کہا: چپ کرو، چپ کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، جس وقت آدم روح اور جسم کے درمیان تھے میں اس وقت نبی تھا۔ (الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۱۴۸ مطبوعہ دار صادر، بیروت، ۱۳۸۸ھ)

اس حدیث کو امام ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے۔ (المصنف ج ۱۴ ص ۲۹۲ مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی، ۱۴۰۶ھ)

امام ابن جوزی روایت کرتے ہیں:

حضرت میسرۃ الفجر بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کب نبی بنے تھے؟ فرمایا: جس وقت آدم روح اور جسم کے درمیان تھے۔ (الوفاء ج ۱ ص ۳۳ مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ فیصل آباد)

اس حدیث کو امام حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کو امام بخاری اور امام مسلم نے روایت نہیں کیا۔ (المستدرک ج ۲ ص ۶۰۹ مطبوعہ مکتبہ دار الباز، مکہ مکرمہ)

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن شقیق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ کب نبی بنائے گئے تھے؟ فرمایا: جس وقت آدم روح اور جسم کے درمیان تھے۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۶۶ مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۳۹۸ھ)

امام احمد نے عبداللہ بن شقیق کی روایت کو ایک اور سند سے بھی بیان کیا ہے اور اس حدیث کو حضرت میسرہ کی سند سے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۵ ص ۵۹، ۳۷۹ مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۳۹۸ھ)

حافظ الہیثمی حضرت میسرہ الفجر کی اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام احمد اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۲۳ مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۰۲ھ)

حافظ سیوطی حضرت میسرۃ الفجر کی اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام ابونعیم نے "حلیۃ الاولیاء" میں روایت کیا ہے اور امام طبرانی نے اس حدیث کو حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ (جامع الاحادیث الکبیر ج ۶ ص ۴۶۳ مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۴ھ)

امام رازی لکھتے ہیں کہ فرشتوں کو جو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ حضرت آدم کو سجدہ کریں اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت حضرت آدم علیہ السلام کی پیشانی میں حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نور تھا۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۲۰۲ مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۹۸ھ)

اور علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی حقیقت میں خلیفہ اعظم ہیں اور زمینوں اور آسمانوں کی بلندیوں میں وہی خلیفہ اور پہلے امام ہیں اور اگر وہ نہ ہوتے تو آدم پیدا کیے جاتے اور نہ کوئی اور چیز پیدا کی جاتی۔

(روح المعانی ج ۱ ص ۲۱۸ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

نیز علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

سادات صوفیہ کا مسلک ہے کہ فرشتوں میں سے عالین کو سجدہ کرنے کا حکم نہ تھا اور ان آیات میں جن فرشتوں سے اللہ تعالیٰ نے خطاب فرمایا اور جن کو سجدہ کا حکم دیا اور جنہوں نے سجدہ کیا وہ سب عالین کے ماسوا تھے، کیونکہ جو فرشتے عالین ہیں وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ذات میں مستغرق رہتے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اور کسی چیز کا شعور نہیں ہوتا، اور اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے:

أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ ○ (ص: ۷۵) — تو نے تکبر کیا ہے یا تو عالین میں سے تھا؟ ○

اور عالین میں سے ہی ایک فرشتہ ہے جس کا نام روح، قلم اعلیٰ اور عقل اول رکھا گیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا آئینہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا ظہور صرف اس فرشتے میں ہوتا ہے اور باقی تمام مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی صرف صفات کا ظہور ہوتا ہے اور وہ فرشتہ دنیاوی اور اخروی عالم کا قطب ہے اور جنت اور دوزخ والوں کا قطب ہے اور کثیب اور اعراف والوں کا قطب ہے اور تمام مخلوقات کا مدار اس فرشتہ پر ہے اس فرشتہ کو حضرت آدم کی تخلیق اور ان کے مرتبہ کا علم تھا کیونکہ اسی نے لوح میں ماکان وما یکون کو لکھا تھا اور قلم نے جو کچھ لکھا اس کا لوح کو علم ہے اور اس فرشتہ کا اپنے تمام کمالات کے ساتھ حقیقت محمدیہ میں ظہور ہوا جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہے:

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ (الشوریٰ: ۵۲) — اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے امر سے روح کی وحی ہے۔

اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں افضل علی الاطلاق ہیں بلکہ وہی ساتوں آسمانوں میں حقیقت میں خلیفہ ہیں۔ (روح المعانی ج ۱ ص ۱۲۰ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

اسی سبب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وما من نبی یومئذ ادم فمن سواہ الا تحت لوائی. (جامع ترمذی ص ۵۲۰ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی) — آدم ہوں یا ان کے ماسوا حشر کے دن ہر نبی میرے جھنڈے کے نیچے ہوگا۔

جس دن اللہ کے حضور کسی نبی کو شفاعت کا حوصلہ نہیں ہوگا اور صرف آپ ہی مقام محمود پر فائز ہوں گے' آپ ہی کوثر کے ساقی ہوں گے اور آپ ہی شفاعت کبریٰ فرمائیں گے اور ساری خلقت کا آپ ہی کی طرف رجوع ہوگا اس دن آپ کے خلیفۃ اللہ الاعظم ہونے کا ظہور تام ہوگا۔

بشر اور فرشتے کے درمیان افضلیت کا بیان

فرشتے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں' قرآن اور حدیث سے ان کا وجود ثابت ہے' "صحیح مسلم" میں ہے کہ فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا ہے۔ (ج ۲ ص ۴۱۳) تاہم ہمیں ان کی حقیقت کا علم نہیں ہے' وہ معصوم ہیں' ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے' اس میں اختلاف ہے کہ بشر افضل ہے یا فرشتہ' بعض علماء نے کہا: فرشتے افضل ہیں کیونکہ قرآن مجید میں ہے: ابلیس نے حضرت آدم سے کہا: تم اس شجر سے کھالو تو فرشتہ ہو جاؤ گے' اور زلیخا کی مہمان عورتوں نے جب حضرت یوسف کو دیکھا تو بے ساختہ کہا: یہ بشر نہیں ہے یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے' اور بعض علماء نے کہا کہ نوع بشر نوع ملائکہ سے افضل ہے اور اللہ تعالیٰ نے نوع بشر کے ایک فرد کو تمام فرشتوں سے سجدہ کرایا' فرشتے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں اور ان کا اس اطاعت میں کوئی مزاحم نہیں ہے اور بشر کے اندر اللہ تعالیٰ نے بھوک' پیاس' شہوت اور غضب کو رکھا ہے اور وہ ان کی مزاحمت کے باوجود اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے' بعض علماء نے کہا: فرشتوں کو نور سے بنایا ہے اور بشر کو مٹی سے بنایا ہے اور نور مٹی سے افضل ہے اس لیے فرشتے جوہر ذات کے اعتبار سے بشر سے افضل ہیں لیکن اس پر کون سی شرعی دلیل ہے کہ نور مٹی سے افضل ہے؟ بلکہ ہم کہتے ہیں کہ مٹی نور سے افضل ہے کیونکہ وہ انبیاء علیہم السلام کا مبداء خلقت ہے اور بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ خواص بشر (حضرات انبیاء علیہم السلام) خواص ملائکہ اور عام ملائکہ سے افضل ہیں اور خواص ملائکہ (رسل ملائکہ) عوام بشر سے افضل

ہیں اور عوام بشر (نیک مسلمان اس میں کفار اور فساق داخل نہیں ہیں) عوام ملائکہ سے افضل ہیں بہر حال تفضیل کا یہ مسئلہ ظنی ہے اور اس میں کسی جانب قطعیت نہیں ہے اس لیے بعض علماء نے اس مسئلہ میں توقف کیا ہے۔

قصہ آدم و ابلیس میں حکمتیں اور نصیحتیں

(۱) اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض علوم اور حکمتوں پر کسی کو مطلع نہیں فرمایا حتیٰ کہ فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ حضرت آدم کو خلیفہ بنانے میں کیا حکمت ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے مٹی جس کو عام لوگ حقیر جانتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس مٹی سے انسان بنایا اور اس کو علوم و معارف سے نوازا اور اس کو اتنی عزت دی کہ سارے فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا۔

(۳) انسان اتنی عزت و کرامت کے باوجود ضعیف البنیان ہے وہ بھول گیا اور شجر ممنوع سے کھالیا۔

(۴) اپنی تقصیر پر نادم ہونا اور اللہ سے توبہ کرنا بلند درجات کے حصول کی دلیل ہے اپنا قصور ماننا آدم کا طریقہ ہے اور نہ ماننا اور اکڑنا ابلیس کا طریقہ ہے۔

(۵) معصیت سے نعمت زائل ہو جاتی ہے اور شکر سے نعمت میں زیادتی ہوتی ہے۔

(۶) جنت پیدا کی جا چکی ہے اور وہ جانب علو میں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم سب اس جنت سے نیچے اتر جاؤ۔

(۷) انسان خلوص دل سے تائب ہو تو اس کی توبہ مقبول ہوتی ہے۔

(۸) حضرت آدم نے بھول سے شجر ممنوع سے کھایا اس کے باوجود تواضعاً توبہ کی اور کہا: ہم نے ظلم کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سر پر تاج خلافت رکھا' شیطان نے عمداً نافرمانی کی اور اللہ تعالیٰ سے کہا: اے رب! تو نے مجھے گمراہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے گلے میں لعنت کا طوق ڈال دیا۔

(۹) ابلیس آدم اور اولاد آدم کا دشمن ہے اور ان کو زک دینے کی تاک میں لگا رہتا ہے۔

(۱۰) حضرت حوا کے توبہ کرنے کا الگ سے ذکر نہیں فرمایا کیونکہ عورتوں کے احکام مردوں کے احکام کے تابع ہوتے ہیں۔

(۱۱) جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ نجات یافتہ ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کا کفر اور نافرمانی کرے گا وہ عذاب میں ہلاک ہوگا۔

(۱۲) ہدایت ربانی بھیجنے کا سلسلہ حضرت آدم سے شروع ہوا اور حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا

اے بنو اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی' اور تم میرا عہد

بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ

پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا' اور تم مجھ سے ہی ڈرو ○ اور اس (قرآن) پر ایمان لاؤ جس کو میں نے نازل

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ

کیا ہے جو اس (کتاب) کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے' اور تم سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو اور تھوڑی قیمت کے بدلہ

ثَمَنًا قَلِيْلًا ؗ وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ

میں میری آیتوں کو فروخت نہ کرو اور مجھ ہی سے ڈرو O اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور

تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ

دیدہ دانستہ حق کو نہ چھپاؤ O اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو

وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ

اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو O کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؛

اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَ اسْتَعِيْنُوْا

حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو؛ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ O اور صبر اور

بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ لا الَّذِيْنَ

نماز (کے ذریعہ) سے مدد حاصل کرو اور بے شک نماز ضرور دشوار ہے سوا ان لوگوں کے جو (اللہ کی طرف) جھکنے والے ہیں O جو یہ

يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع

یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں O

ربط آیات

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے توحید‘ رسالت اور حشر ونشر پر دلائل قائم فرمائے‘ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی عام نعمتوں کو ذکر فرمایا جن سے ہر انسان مستفید ہوا اور ان نعمتوں کا وجود اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کا کوئی موجد ہے جو حکیم اور حمید ہے اور وحدہ لاشریک ہے‘ ان نعمتوں کا سابقہ آسمانی کتابوں میں ذکر تھا‘ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کے ذکر کو نازل فرمایا اور سب کو معلوم تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کتابوں کو نہیں پڑھا‘ اور نہ کسی عالم کی صحبت اختیار کی اور پھر آپ نے وہ مضامین اور گزشتہ امتوں کی خبریں اور واقعات بیان کیے جو آسمانی کتابوں میں موجود ہیں اور غیب کی خبریں دیں اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ آپ کا خود ساختہ کلام نہیں ہے بلکہ اللہ کا کلام ہے جو اس نے آپ کے قلب پر نازل فرمایا ہے‘ نیز اس بیان میں حشر ونشر پر بھی دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اور آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور جب وہ ان سب کو ابتداءً پیدا کرنے پر قادر ہے تو فنا کے بعد دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے‘ پھر اللہ تعالیٰ نے اہل علم اور اہل کتاب کو خطاب کیا اور ان سے فرمایا کہ وہ ان نعمتوں کو یاد کریں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کی ہیں اور اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کریں اور دلائل کے مطابق حق کی پیروی کریں اور ان کو چاہیے کہ وہ سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید پر سب سے پہلے ایمان لائیں اور ان کے احکام پر عمل کریں اور آخرت کو نہ بھولیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے بنو اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی اور تم میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ (البقرہ: ۴۰)

بنو اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان اور ان نعمتوں کے یاد دلانے کی وجہ

اسرائیل عبرانی زبان کا لفظ ہے اس کا معنی ہے: اللہ کا برگزیدہ بندہ یا عبد اللہ یا امیر اور مجاہد اور یہ حضرت یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم خلیل اللہ کا لقب ہے۔ انسان پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ (ابراہیم: ۳۴) اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو شمار نہ کر سکو گے۔

عام نعمتوں کے علاوہ جو نعمتیں بالخصوص اولاد اسرائیل کو عطا فرمائیں وہ یہ ہیں کہ ان کو آل فرعون سے نجات دی' ان میں سے انبیاء بنائے' ان پر من وسلویٰ نازل کیا' ایک پتھر سے ان کے لیے بارہ چشمے رواں کر دیئے اور ان کو تورات کا امین بنایا جس میں سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا بیان ہے اور آپ کی نبوت اور رسالت کا ذکر ہے۔ ہر چند کہ یہ نعمتیں اس زمانہ کے یہود کے آباء واجداد کو عطا کی گئی تھیں لیکن آباء واجداد کو دی گئی نعمتیں ان کی اولاد کے حق میں بھی نعمتیں ہوتی ہیں کیونکہ ان نعمتوں سے ان کو عظمت اور فضیلت حاصل ہوتی ہے اور خصوصاً یہ نعمتیں ان کی بقاء کا سبب ہیں' اگر فرعون بنو اسرائیل کی نسل کشی جاری رکھتا یا فرعون کے ساتھ بنو اسرائیل کو بھی سمندر میں غرق کر دیا جاتا تو آج دنیا میں یہودیوں کا وجود نہ ہوتا اور وہ کب کے صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہوتے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ نعمتیں اس لیے یاد دلائی ہیں کہ وہ غور وفکر کریں اور جب کوئی شخص کسی کی بہ کثرت نعمتوں کو یاد کرتا ہے تو اس کو اس کی مخالفت سے حیا آتی ہے' سو یہودیوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت سے باز آنا چاہیے' اور تورات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جن صفات کا ذکر ہے ان کو چھپانا نہیں چاہیے اور تورات کی وساطت سے یہودیوں نے اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا تھا اس کو پورا کرنا چاہیے اور وہ عہد یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کریں گے' اور اللہ تعالیٰ کے احکام میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ وہ حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے تو اللہ بھی ان سے کیا ہوا عہد پورا کرے گا' اور ان کو جنت میں داخل کر دے گا۔

بنو اسرائیل اور اللہ تعالیٰ کے مابین عہد کا بیان

اور یہ اللہ تعالیٰ کا انتہائی کرم اور اس کا فضل ہے کہ اس نے برابر کا معاملہ کرنے کا فرمایا کہ تم مجھ سے کیا ہوا عہد پورا کرو میں تم سے کیا ہوا عہد پورا کروں گا' ورنہ کہاں بندہ کہاں خدا' بندہ اس کا حکم بجا لائے تو اس کا کام ہی بندگی کرنا ہے اور اس اطاعت پر جو اس نے جنت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا وہ محض اس کا کرم اور فضل ہے کسی کا اس پر کوئی استحقاق نہیں ہے۔

یہودیوں کا اللہ سے عہد اور اللہ کا ان سے عہد یہ ہے کہ وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے کا عہد پورا کریں تو اللہ تعالیٰ ان سے سخت اور مشکل احکام کا بوجھ اتارنے کا عہد پورا کرے گا اور ان کو جنت میں داخل کرے گا اور عام لوگوں سے عہد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں تو دنیا میں ان کی جان اور مال محفوظ رہے گا اور آخرت میں وہ دائمی عذاب سے محفوظ رہیں گے' اور جو فرائض اور واجبات کو ادا کریں گے اور کبیرہ گناہوں سے اجتناب کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت سے نوازے گا اور جو صراط مستقیم پر ثابت قدم رہیں گے وہ ابتداءً جنت میں چلے جائیں گے اور جو بحر توحید میں اس طرح مستغرق رہیں گے کہ وہ اپنی ذات سے بھی غافل ہو جائیں انہیں اللہ تعالیٰ کا دیدار' اس کا قرب اور اس کی رضا حاصل ہوگی اور اس آیت کے آخر میں فرمایا ہے کہ اس عہد کے معاملہ میں خاص مجھ سے ڈرنا کیونکہ عہد شکنی کی صورت میں اللہ کے قہر

اور غضب کا سامنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس (قرآن) پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کیا ہے' جو اس (کتاب) کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے۔ (البقرہ: ۴۱)

قرآن مجید کس چیز میں تورات کا مصدق ہے؟ ہر نبی کے زمانہ میں اس کی شریعت پر عمل ۔۔۔ اور حضور کی رسالت کا عموم

اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تورات میں یہودیوں نے جو تحریف کردی ہے قرآن مجید ان تحریفات کا بھی مصدق ہے' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید اس کا مصدق ہے کہ تورات بھی ایک آسمانی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور تورات میں انبیاء سابقین کے صحیح واقعات' علاء یہود سے لیے ہوئے عہود' اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کا حکم' لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کا ارشاد' اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بے حیائی کے کاموں سے ممانعت' ان امور میں قرآن مجید تورات کا مصدق ہے اور چونکہ ہر نبی کی شریعت الگ ہوتی ہے اور اس نبی کے زمانہ اور اس کے تقاضوں کے اعتبار سے احکام وضع کیے جاتے ہیں' اس لیے قرآن مجید بعض جزوی احکام شرعیہ میں تورات کا مخالف ہے' لیکن یہ مخالفت اصول دین میں نہیں ہے بلکہ فروعی احکام میں اس زمانہ کی خصوصیات کے لحاظ سے ہے مثلاً وضو' نماز' روزہ اور حلال اور حرام چیزوں کی تعداد اور کیفیات میں اختلاف ہے اور اگر قرآن اس زمانہ میں نازل ہوتا تو اس میں وہی تورات کے احکام ہوتے اور اگر تورات اب نازل ہوتی تو اس میں وہی قرآن مجید کے احکام ہوتے' اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے' امام احمد اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل کتاب سے کوئی مسئلہ معلوم نہ کرو' کیونکہ وہ تم کو ہرگز ہدایت نہیں دیں گے' وہ خود گمراہ ہو چکے ہیں (ان سے سوال کرکے) یا تو تم کسی باطل کی تصدیق کرو گے' یا حق کی تکذیب کرو گے۔ بے شک اگر موسیٰ اس وقت زندہ ہوتے تو ان کے لیے میری اتباع کے سوا اور کچھ جائز نہ ہوتا۔ (مسند احمد ج ۳ ص ۳۳۸' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

امام ابو یعلیٰ نے بھی اس حدیث کو ان ہی الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(مسند ابو یعلیٰ ج ۲ ص ۴۲۷۔ ۴۲۶' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

حافظ الہیثمی لکھتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب کو بعض اہل کتاب سے ایک کتاب ملی' وہ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آئے اور اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا' آپ غضب ناک ہوئے اور فرمایا: اے ابن الخطاب! کیا تم اس میں متحیر ہو؟ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! میں تمہارے پاس صاف صاف دین لایا ہوں' تم ان سے جب بھی کسی چیز کے متعلق سوال کرو گے یہ تم کو سچی خبر دیں گے تو تم اس کی تکذیب کرو گے اور جھوٹی خبر دیں گے تو تم اس کی تصدیق کرو گے' اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! اگر موسیٰ تمہارے اس زمانہ میں زندہ ہوتے تو ان کے لیے میری پیروی کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس حدیث کو امام احمد' امام ابو یعلیٰ اور امام بزار نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں مجالد بن سعید ایک ضعیف راوی ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۷۴' مطبوعہ دار الکتب العربی' ۱۴۰۲ھ)

امام احمد اور امام ابو یعلیٰ کی روایت کا متن وہ ہے جس کو ہم نے اس سے پہلے ان کے حوالوں سے نقل کیا ہے اور دوسری روایت کا متن غالباً ''مسند بزار'' میں ہے ابھی تک ''مسند بزار'' مکمل نہیں چھپی' ہمارے پاس اس کی ابتدائی تین جلدیں ہیں' ان میں یہ روایت نہیں ہے۔

اس حدیث کی ایک تقریر تو یہ ہے کہ ہر نبی کی شریعت اس کے زمانہ میں واجب العمل ہے حتیٰ کہ اگر متاخر نبی متقدم کے زمانہ میں مبعوث ہوتا یا متقدم نبی متاخر کے زمانہ میں مبعوث ہوتا تو اس کی بعینہ وہی شریعت ہوتی' علامہ بیضاوی کی تفسیر اسی تقریر کے مطابق ہے' اور اس حدیث کی دوسری تقریر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو شامل ہے اور یہ آپ کی خصوصیت ہے' اس لیے انبیاء سابقین میں سے جو نبی بھی آپ کے زمانہ میں زندہ ہوتا تو اس کے لیے آپ کی اتباع کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا اور آپ کی رسالت کے عموم کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی شریعت کے بغیر کوئی عمل جائز نہ ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی شریعت تمام شریعتوں سے اکمل ہے اور آپ کی رسالت کے عموم پر یہ آیت دلیل ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ○ (آل عمران: ۸۱)

اور (یاد کیجئے) جب اللہ نے (سب) نبیوں سے یہ عہد لیا کہ میں تم کو جو کتاب اور حکمت دوں' پھر تمہارے پاس عظیم رسول آجائیں جو اس کی تصدیق کرنے والے ہوں جو تمہارے پاس (کتاب اور حکمت) ہے تو ضرور ضرور تم اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا' فرمایا: کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری عہد قبول کیا؟ سب نے کہا: ہم نے اقرار کیا' فرمایا: پس گواہ رہنا اور میں خود تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں○

اگر یہ تمام نبی ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوتے تو ان سب پر لازم تھا کہ یہ آپ پر ایمان لاتے اور آپ کی نصرت کرتے' سو یہ تمام نبی حکماً اور تقدیراً آپ کی امت ہیں اور ہم تحقیقاً آپ کی امت ہیں اور آپ کی رسالت سب کو عام ہے' یہی وجہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر انبیاء علیہم السلام پر اپنی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وارسلت الی الخلق کافۃ وختم بی النبیون.

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۹۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

مجھے تمام مخلوق کا رسول بنایا گیا ہے اور مجھ پر نبوت ختم کر دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور تم سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو۔ (البقرہ: ۴۱)

اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہودیوں سے پہلے تو مشرکین قرآن مجید کا انکار کر چکے تھے تو یہود کس طرح اس کے سب سے پہلے منکر ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مراد یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے تم سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو' دوسرا جواب یہ ہے کہ اس میں یہ تعریض ہے کہ چونکہ یہ کتاب تمہاری کتاب کی مصدق ہے تو تم کو سب سے پہلے اس پر ایمان لانا چاہیے تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور تھوڑی قیمت کے بدلہ میں میری آیتوں کو فروخت نہ کرو اور مجھ ہی سے ڈرو○ (البقرہ: ۴۱)

تعلیم قرآن پر اجرت لینے کی تحقیق

''شراء'' کا لفظ لغت اضداد سے ہے اور یہ خریدنے اور فروخت کرنے دونوں معنوں میں آتا ہے اور یہاں اس سے مراد ''استبدال'' ہے کیونکہ یہودی علماء دنیاوی فوائد کی وجہ سے قرآن پر ایمان نہیں لاتے تھے اور انہوں نے دنیاوی فوائد کے

بدلہ میں قرآن پر ایمان نہ لانے کو اختیار کر لیا تھا اور ان کے یہ دنیاوی فوائد اگرچہ ان کے نزدیک بہت زیادہ تھے لیکن قرآن مجید پر ایمان لانے سے ان کو جو اخروی فوائد حاصل ہوتے ان کے مقابلہ میں یہ بہت قلیل اور حقیر تھے' یہ علماء اپنی قوم کے رئیس تھے اور ان کی قوم ان کو تحفے اور ہدیے پیش کرتی تھی اور ان کو یہ خوف تھا کہ اگر وہ قرآن پر ایمان لائے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی تو ان کو وہ نذرانے نہیں ملیں گے' اس لیے انہوں نے ان ہدیوں اور نذرانوں کو آخرت پر ترجیح دی' ایک قول یہ ہے کہ وہ رشوت لے کر حق چھپاتے تھے۔

امام ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے تم کو جو اپنی کتاب اور آیات کا علم دیا ہے تم اس علم کو دنیا کے قلیل مال کے عوض فروخت نہ کرو کیونکہ وہ لوگوں سے تورات میں حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ذکر کو چھپاتے تھے حالانکہ تورات میں لکھا ہوا تھا کہ وہ نبی امی ہیں جن کا ذکر تورات اور انجیل میں ہے اور وہ اپنے پیروکاروں پر اپنی ریاست اور ان سے نذرانے لینے کے لالچ میں اس کو چھپاتے تھے حالانکہ اس کے عوض میں ان کو ساری دنیا بھی مل جاتی تو وہ قلیل تھی۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۲۰۱۔ ۲۰۰ 'مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اس آیت سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز نہیں ہے' لیکن واضح رہے کہ اس آیت میں اجرت لینے سے منع نہیں کیا بلکہ دنیاوی متاع کے بدلہ میں اللہ کی آیات کو چھپانے سے منع کیا ہے۔

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

''صحیح بخاری'' میں ہے کہ جس چیز پر تمہیں سب سے زیادہ اجرت لینے کا حق ہے وہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس حدیث میں قرآن مجید پر اجرت لینے کی صاف تصریح ہے اور اسی پر اعتماد کرنا چاہیے' اور اس آیت کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کے مخاطب بنو اسرائیل ہیں اور یہ ہم سے پہلے کی شریعت ہے اور یہ ہم پر حجت نہیں ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۳۳۶۔ ۳۳۵ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

جب خصوصیت مورد اور عام الفاظ میں تعارض ہو تو اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے لیکن بعض اوقات قرائن کی وجہ سے خصوصیت مورد کا اعتبار کیا جاتا ہے اور یہاں دلیل کی وجہ سے خصوصیت مورد متعین ہے' علامہ قرطبی کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہم سے پہلے کی شریعت ہے۔

ہمارے نزدیک تعلیم قرآن' حج' امامت' اذان اور دیگر عبادات پر اجرت لینا جائز ہے اور اس کی اصل یہ حدیث ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن چیزوں پر تم اجر لیتے ہو ان میں اجر کی سب سے زیادہ حقدار اللہ کی کتاب ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۰۴' ج ۲ ص ۸۵۴ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۵ھ)

یہ حدیث تعلیم قرآن پر اجرت لینے کے باب میں نص صریح ہے' بعض علماء نے اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ اس حدیث میں دم کرنے پر اجرت لینے کا جواز ہے' اس سے تعلیم قرآن پر اجرت لینے کا جواز لازم نہیں آتا' لیکن یہ تاویل اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس حدیث میں الفاظ عام ہیں اور خصوصیت مورد کے مقابلہ میں عموم الفاظ کو ترجیح دی جاتی ہے' اور جن احادیث میں ممانعت ہے وہ سب سنداً ضعیف ہیں جو اس حدیث صحیح سے معارضہ کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔

(فتح الباری ج ۴ ص ۴۵۴۔ ۴۵۳ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' ۱۴۰۱ھ)

اس مسئلہ پر دوسری دلیل یہ ہے کہ خلفاء راشدین پانچ وقت کی نمازیں اور جمعہ پڑھاتے تھے' وعظ و نصیحت کرتے تھے'

مقدمات کے فیصلے کرتے تھے' مسلمانوں کے اندرونی اور بیرونی مسائل کے حل کے لیے کوشاں رہتے تھے اور جہاد کا انتظام کرتے اور ان تمام خدمات کے عوض ان کو بیت المال سے وظیفہ دیا جاتا تھا' اور اخیار امت کا یہ تعامل اس مسئلہ پر واضح دلیل ہے کہ تعلیم قرآن' امامت' خطابت اور دیگر عبادات پر اجرت لینا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ خلفاء راشدین کی سنت ہے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے تو انہوں نے فرمایا: میری قوم کو معلوم ہے کہ میرا کسب (تجارت) میرے اہل وعیال کی کفالت کے لیے ناکافی نہیں تھا اور اب میں مسلمانوں کے معاملات میں مشغول ہو گیا ہوں' اب ابوبکر کے اہل وعیال بیت المال کے مال سے کھائیں گے اور ابوبکر مسلمانوں کے لیے کسب کرے گا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۷۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ بدرالدین عینی حنفی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

امام ابن سعد نے ثقہ راویوں کی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا دیا گیا تو وہ اپنے معمول کے مطابق سر پر کپڑوں کی گٹھڑی رکھ کر بازار میں تجارت کے لیے چلے گئے' راستہ میں حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہما سے ملاقات ہوئی' انہوں نے کہا: یہ آپ کیا کر رہے ہیں' حالانکہ آپ مسلمانوں کے ولی مقرر ہو چکے ہیں؟ حضرت ابوبکر نے کہا: اگر میں تجارت نہ کروں تو پھر اپنے عیال کو کہاں سے کھلاؤں گا؟ انہوں نے کہا: ہم آپ کے لیے وظیفہ مقرر کرتے ہیں' پھر انہوں نے ہر روز کے لیے نصف بکری مقرر کر دی۔

میمون سے روایت ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو مسلمانوں نے آپ کا دو ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا' حضرت ابوبکر نے فرمایا: میرے اہل وعیال کا خرچ زیادہ ہے' مجھے اس سے زیادہ کی ضرورت ہے' پھر مسلمانوں نے پانچ سو درہم کا اضافہ کر دیا۔ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۱۸۵' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

نیز علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں:

''صحیح بخاری'' کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کسی عامل کے اوپر کوئی اور عامل نہ ہو تو وہ اپنی ضرورت کے مطابق بیت المال سے وظیفہ لے سکتا ہے اور ہر وہ شخص جس کو مسلمانوں کے اعمال کی کوئی ذمہ داری سونپی جائے اس کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا جائے' کیونکہ اس کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات کے لیے رقم کی احتیاج ہوتی ہے کیونکہ اگر اس کو کوئی وظیفہ نہیں دیا جائے گا تو وہ بلاعوض مسلمانوں کے کسی کام پر تیار نہیں ہوگا اور اس سے مسلمانوں کے اجتماعی مفادات اور مصالح ضائع ہو جائیں گے' اسی بنا پر ہمارے اصحاب نے یہ کہا ہے کہ قاضی کو وظیفہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور قاضی شریح رضی اللہ عنہ قضاء کا وظیفہ لیا کرتے تھے' امام بخاری نے رزق الحکام کے باب میں اس کا ذکر کیا ہے' پھر اگر قاضی ضرورت مند ہو تو بیت المال سے اس کی کفالت واجب ہے اور اگر اس کے پاس اتنی دولت ہو کہ وہ وظیفہ سے مستغنی ہو تو پھر اس کا بیت المال سے وظیفہ نہ لینا افضل ہے اور ایک قول یہ ہے کہ پھر بھی اس کا وظیفہ لینا زیادہ صحیح ہے تاکہ وہ قضاء کے معاملہ اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں سستی نہ کرے' کیونکہ جب وہ اپنے کام کا کوئی وظیفہ نہیں لے گا تو قضاء کی ذمہ داریوں کو توجہ اور باقاعدگی سے پورا نہیں کرے گا۔ (عمدۃ القاری ج ۲۴ ص ۱۸۹' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

علامہ عینی نے قاضی کو وظیفہ دینے کی جو وجوہات بیان کی ہیں وہ تمام وجوہات تعلیم قرآن' امامت اور اذان وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہیں۔

علامہ آلوسی حنفی "ولا تشتروا بایاتی ثمنا قلیلا" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

بعض اہل علم نے اس آیت سے قرآن مجید اور دیگر علوم کی تعلیم کی اجرت کے عدم جواز پر استدلال کیا ہے اور اس مسئلہ میں بعض احادیث بھی مروی ہیں جو صحیح نہیں ہیں حالانکہ حدیث میں یہ ہے کہ صحابہ نے عرض کیا: کیا ہم تعلیم قرآن پر اجرت لیں؟ آپ نے فرمایا: جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں سب سے بہتر کتاب اللہ ہے' اور اس کے جواز کے سلسلہ میں علماء کے بکثرت اقوال منقول ہیں اگرچہ بعض علماء نے اس کو مکروہ بھی کہا ہے' اور اس آیت میں اس کی کراہت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۲۵۵' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت)

اگر یہ کہا جائے کہ عالم دین پر دینی علوم کی تعلیم دینا اور فرائض کی جماعت کرانا فرض ہے اور فرض کا اجر اللہ کے ذمہ ہے (اس کے وعدہ کی بناء پر جو اس نے محض اپنے فضل سے کیا ہے) بندوں کے ذمہ نہیں ہے' تو میں کہوں گا کہ یہ صحیح اور برحق ہے لیکن عالم دین پر یہ کب ضروری ہے کہ وہ مثلاً جامعہ نعیمیہ میں جا کر تعلیم دے اور وہاں نماز پڑھائے' اور اس پر یہ کب ضروری ہے کہ وہ آٹھ سے بارہ بجے تک چار گھنٹے پڑھائے' اسی طرح اس پر مثلاً ظہر کی نماز پڑھانا ضروری ہے' یہ کب ضروری ہے کہ وہ ڈیڑھ بجے ظہر کی نماز پڑھائے' نیز یہ کب ضروری ہے کہ مدرسہ کے متعین کردہ نصاب کے عین مطابق پڑھائے' پھر اس پر یہ کب ضروری ہے کہ وہ فلاں فلاں طالب علم کو پڑھائے اور فلاں فلاں لوگوں کو نماز پڑھائے؟

اس لیے جب کوئی ادارہ کسی عالم دین کو مخصوص مدرسہ کے مخصوص نصاب کے مطابق مخصوص طلبہ کو تعلیم دینے کا پابند کرے گا یا مخصوص مسجد کے مخصوص اوقات میں مخصوص لوگوں کو نماز پڑھانے یا اذان دینے کا پابند کرے گا تو وہ معاوضہ ان خصوصیات اور تقییدات کے مقابلہ میں ہوگا' نفس عبادات کا معاوضہ نہیں ہوگا اور نہ کسی عالم کو یہ خیال کرنا چاہیے کہ وہ ان عبادات کا معاوضہ لے رہا ہے' عالم کو جس جگہ جس وقت اور جن لوگوں کا پابند کیا جاتا ہے' وہ اسی جگہ' اس وقت اور ان لوگوں کی پابندی کرنے کا معاوضہ لیتا ہے۔

اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان دینی فرائض کو ادا کرنے میں عالم دین جو وقت صرف کرتا ہے' وہ معاوضہ اس وقت کا ہوتا ہے ان عبادات کا معاوضہ نہیں ہوتا' یا ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں اس کی جو توانائی خرچ ہوتی ہے یہ معاوضہ اس توانائی کا ہے ان عبادات کا معاوضہ نہیں ہے یا جس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں اس وقت کوئی اور ذریعہ معاش اختیار کرتا تو وہ میری ضروریات کا کفیل ہوتا' اب مسلمانوں کے ان امور کی انجام دہی کی وجہ سے وہ اس کار معاش کو اختیار نہیں کر سکا' لہٰذا اس کے بدلہ میں اس کی ضروریات کا خرچ قوم یا کسی قومی ادارہ پر واجب ہوگا۔

امام مالک اور امام شافعی نے اور ایک قول میں امام احمد نے عبادات پر معاوضہ لینے کو جائز کہا ہے۔

ہر چند کہ متقدمین فقہاء احناف نے اسلامی فرائض کی بجا آوری پر اجرت لینے سے منع کیا تھا' لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت علماء کے لیے بیت المال سے وظائف مقرر کیے جاتے تھے لیکن اب جبکہ امراء اور سلاطین نے علماء کی کفالت ترک کر دی ہے تو اب علماء کا اپنے فرائض منصبی پر اجرت لینا جائز ہے اور متاخرین فقہاء احناف نے بھی اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے' علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

امام خیر اخزی نے کہا ہے کہ ہمارے زمانہ میں امام' مؤذن اور معلم کا اجرت لینا جائز ہے' اسی طرح "روضہ" اور "ذخیرہ" میں ہے۔ (بنایہ شرح ہدایہ ج ۳ ص ۶۵۵' مطبوعہ ملک سنز' فیصل آباد)

علامہ ابوالحسن مرغینانی لکھتے ہیں:

ہمارے بعض مشائخ نے اس زمانہ میں تعلیم قرآن کی اجرت دینے کو مستحسن قرار دیا ہے' کیونکہ امور دینیہ میں لوگوں پر سستی غالب ہوگئی ہے' اور اجرت نہ دینے میں حفظ قرآن کے ضائع ہونے کا خدشہ ہے' فتویٰ اسی قول پر ہے۔

(ہدایہ آخرین ص ۳۰۳' مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ' ملتان)

علامہ بابرتی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس زمانہ میں تعلیم قرآن پر اجرت دینا جائز ہے اور فقہاء نے اس کے لیے مدت اور اجرت کے مقرر کرنے کو بھی جائز کہا ہے اور اگر مدت مقرر نہ کی گئی ہو تو اجرت مثلی دینے کے وجوب کا فتویٰ دیا ہے۔

فقہاء نے کہا ہے کہ متقدمین نے تعلیم قرآن مجید کی اجرت لینے سے اس لیے منع فرمایا تھا کہ پہلے معلمین کے لیے بیت المال سے وظائف مقرر تھے' اس لیے معلمین اپنی ضروریات اور معاش میں مستغنی تھے' نیز اس زمانہ میں محض ثواب کے لیے قرآن مجید کی تعلیم دینے کا بھی رجحان تھا اور اب یہ بات باقی نہیں رہی' امام ابوعبد اللہ الخیزاخزی نے کہا کہ اس زمانہ میں امام' مؤذن اور معلم کے لیے بھی اجرت لینا جائز ہے۔ (عنایہ علی ہامش فتح القدیر ج ۸ ص ۴۰' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر)

علامہ علاؤ الدین الحصکفی لکھتے ہیں:

اس زمانہ میں اجرت پر قرآن مجید کی تعلیم دینے' فقہ پڑھانے' امامت کرنے اور اذان دینے کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے' اور اجرت پر تعلیم دلوانے والے کو مقررہ اجرت دینے پر مجبور کیا جائے گا اور اگر پہلے اجرت طے نہ کی گئی ہو تو اس کو اجرت مثلی دینے پر مجبور کیا جائے گا۔ (درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۵ ص ۳۹' مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ' استنبول)

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں:

علامہ ابن الشحنہ نے کہا ہے کہ فقہاء مدارس سے جو وظیفہ لیتے ہیں وہ اجرت نہیں ہے کیونکہ اس میں اجارہ کی شرائط نہیں پائی جاتیں' اور نہ یہ صدقہ ہے کیونکہ غنی بھی یہ وظیفہ لیتے ہیں' بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء درس کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں' اس لیے یہ ان کی اعانت ہے' حتیٰ کہ اگر وہ کسی کام یا مشغولیت کی وجہ سے درس میں نہ آسکیں' پھر بھی ان کا وظیفہ لینا جائز ہے۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۲۹' مطبوعہ مطبعہ علمیہ' مصر' ۱۳۱۱ھ)

اب ایک نقطہ بحث طلب رہ گیا ہے کہ اگر علماء ان عبادات پر اجرت لیں تو کیا ان کو آخرت میں اجر ملے گا یا نہیں' میرا یہ گمان ہے کہ اگر علماء اس معاوضہ کو اپنی عبادات کا معاوضہ سمجھ کر لیتے ہیں تو پھر وہ اجر اخروی کے مستحق نہیں ہیں اور اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ عبادات تو محض للہ فی اللہ ہیں' وہ محض پابندی اوقات کا معاوضہ لیتے ہیں تو پھر ان کو اجر اخروی کی امید رکھنی چاہیے۔

اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث اور جانبین کے دلائل پر تبصرہ ہم نے ''شرح صحیح مسلم'' کی ساتویں جلد میں کیا ہے۔

قرآن خوانی کے نذرانوں کے جواز کا بیان

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ میت کو ثواب پہنچانے کے لیے جو قرآن خوانی کی جاتی ہے اس میں پڑھنے والے چونکہ پیسوں کے عوض قرآن مجید پڑھتے ہیں اس لیے ان کو اس پڑھنے کا اجر نہیں ملتا' اور جب ان کو خود اجر نہیں ملتا تو یہ میت کو کس چیز کا اجر پہنچائیں گے' اور تعلیم قرآن کی اجرت کے لیے جو تاویلات کی جاتی ہیں کہ یہ ضرورت کی وجہ سے ہیں اور قرآن خوانی میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ممانعت بعض احادیث کی وجہ سے بیان کی جاتی ہے' ''شرح صحیح مسلم'' جلد سابع کے آخر میں میں نے تفصیل کے ساتھ ان احادیث کا ضعف اور محمل بیان کیا ہے اور جواز کے لیے ''صحیح بخاری'' کی وہ حدیث کافی ہے جس میں یہ

ذکر ہے کہ صحابہ نے سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کرنے کی اجرت لی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر یہ فرمایا کہ جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں اجرت کی سب سے زیادہ مستحق کتاب اللہ ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۰۴)

ثانیاً ہمارے عرف میں قرآن خوانی سے پہلے اجرت طے نہیں کی جاتی' پڑھنے والے بغیر کسی مطالبہ کے قرآن مجید پڑھتے ہیں اور پڑھوانے والے حسب توفیق کچھ خدمت کر دیتے ہیں اور اگر وہ کچھ نہ دیں تو کوئی ان سے مطالبہ نہیں کرتا اور یہ کہنا کہ پڑھنے والے پیسوں کی نیت سے پڑھتے ہیں' بلاوجہ دوسروں کے حق میں بدگمانی کرنا ہے' نیت کا حال اللہ کے سوا اور کسی کو معلوم نہیں' تاہم اگر یہ اصرار کیا جائے کہ نہیں وہ پیسوں ہی کی وجہ سے پڑھتے ہیں تو جن تاویلات کی وجہ سے تعلیم قرآن' امامت' اذان' خطابت اور تدریس کا معاوضہ جائز ہے وہی تاویلات یہاں بھی جاری ہو جائیں گی اور ضرورت کا فرق اس وقت مفید ہوتا جب احادیث صحیحہ سے اس کی ممانعت ہوتی' اس کے برعکس بخاری کی حدیث صحیح سے اس کا جواز ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور دیدہ دانستہ حق کو نہ چھپاؤ O (البقرہ: ۴۲)

یہود کی تلبیس اور کتمان حق کا بیان

امام ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

''لبس'' کا معنی ہے: اختلاط' یعنی حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ' ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہیں اور یہ حق تھا اور وہ اس حق کے ساتھ اپنی اس باطل تاویل کو ملاتے تھے کہ آپ ان کی طرف مبعوث نہیں ہیں بلکہ ان کے غیر کی طرف مبعوث ہیں' اور یہ باطل ہے کیونکہ آپ تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس آیت کا معنی ہے: سچ کو جھوٹ کے ساتھ نہ ملاؤ۔

ابن زید نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ حق سے مراد تورات ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تھا اور باطل سے مراد وہ تحریفات ہیں جن کو وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۲۰۲' مطبوعہ دار المعرفہ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس نے حق کو چھپانے کی تفسیر میں فرمایا: یہود حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو چھپاتے تھے' حالانکہ ان کو یہ علم تھا کہ آپ اللہ کے برحق نبی ہیں اور آپ وہی نبی ہیں جن کے مبعوث ہونے کا ذکر تورات میں کیا گیا ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۳۴۲' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

اس آیت سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ عالم پر حق کا اظہار کرنا واجب ہے اور حق کو چھپانا حرام ہے' سورہ بقرہ: ۱۵۹ میں حق کو چھپانے پر لعنت کی گئی ہے۔ امام ابوداؤد' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص سے کسی چیز کے علم کے متعلق سوال کیا گیا اور اس نے اس کو چھپایا قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۹' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو۔ (البقرہ: ۴۳)

زکوۃ کا لغوی اور شرعی معنی اور اس کے وجوب کی شرائط کا بیان

سورہ بقرہ: ۳ میں نماز کا معنی' نماز قائم کرنے کی تفسیر اور نماز کی تاکید اور اس کے فوائد کے متعلق تفصیل سے لکھ دیا گیا ہے' زکوۃ کا لغت میں معنی ہے: کسی چیز کا بڑھنا اور پاکیزہ ہونا' اور اس کا شرعی معنی یہ ہے:

نصاب کے مطابق جس مال پر ایک سال گزر گیا ہو اس مال میں سے چالیسویں حصہ کا کسی غیر ہاشمی فقیر کو اللہ کی رضا کے

لیے مالک بنا دینا۔ (درمختار علی ھامش ردالمحتار ج ۲ ص ۳۔ ۲ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

زکوٰۃ مسلمان، عاقل، بالغ اور آزاد شخص پر فرض ہوتی ہے اور اس کی فرضیت کا سبب ایسا مال ہے جو نصاب کے مطابق ہو اور اس پر ایک سال گزر گیا ہو اور اس مال پر کسی مخلوق کا قرض نہ ہو، اگر اس مال پر اللہ کا حق ہو مثلاً اس کے ذمہ پچھلی زکوٰۃ ہو، نذر یا کفارہ کی ادائیگی ہو یا حج ہو تو وہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے مانع نہیں ہے، البتہ وہ مال اس کی حاجات اصلیہ سے زائد ہو، حاجات اصلیہ میں اس کے اور اس کے بیوی اور بچوں یا اس کے بوڑھے ماں باپ کے کھانے، پینے، علاج، کپڑوں اور رہائش کے اخراجات شامل ہیں اور اسی طرح جو اس نے کسی کا قرضہ ادا کرنا ہے وہ بھی اس میں شامل ہے، ان چیزوں کے اخراجات منہا کرنے کے بعد جو رقم اس کے پاس بچے اور نصاب کو پہنچ جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، فقہاء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ چاندی کا نصاب دو سو درہم یا پانچ اوقیہ چاندی ہے جو ساڑھے باون تولے یا ۶۱۲.۳۶ گرام کے برابر ہے اور سونے کا نصاب چالیس دینار یا بیس مثقال ہوتا ہے، جو ساڑھے سات تولے یا ۸۷.۴۸ گرام کے برابر ہے۔ کرنسی نوٹوں اور مال تجارت کو چاندی کے نصاب کے تابع کیا جائے گا۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو ○ (البقرہ: ۴۳)

باجماعت نماز پڑھنے کے فوائد

اس کا معنی ہے: نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھو، رکوع نماز کا ایک جز ہے اور یہاں جز کا کل پر اطلاق کیا گیا ہے، اور خصوصیت سے رکوع کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع نہیں ہے اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو، اس کا مطلب ہے جماعت کے ساتھ نماز پڑھو اور یہ اس لیے فرمایا ہے کہ یہودی الگ الگ نماز پڑھتے تھے تو ان کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم دیا تاکہ ان کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے فوائد حاصل ہوں۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے حسب ذیل فوائد ہیں:

(۱) تنہا نماز پڑھنے کی بہ نسبت جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے ستائیس درجہ زیادہ ثواب ہوتا ہے۔

(۲) ہو سکتا ہے تنہا نماز پڑھنے والے کی نماز قبول نہ ہو اور جماعت میں کوئی ایسا مقبول بارگاہ ہو جس کی وجہ سے سب کی نماز قبول ہو جائے۔

(۳) بعض لوگ قراءت صحیح نہیں کرتے یا طمانیت اور اعتدال سے رکوع اور سجود نہیں کرتے، تنہا نماز پڑھیں گے تو ان کی نماز ناقص یا باطل ہوگی اور جماعت کے ساتھ نماز صحیح ادا ہو جائے گی۔

(۴) جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے کسی شخص پر بے نمازی ہونے کی تہمت نہیں لگائی جائے گی اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ کون شخص اللہ کا فرمانبردار ہے اور کون شخص نافرمان ہے۔

(۵) اس سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں تقویت ملے گی، وہ ایک دوسرے کے دکھ، درد، صحت اور بیماری، خوشی اور غمی اور خوشحالی اور افلاس پر مطلع ہو سکیں گے اور ایک دوسرے کے کام آنے کے مواقع میسر آئیں گے۔

جماعت کے شرعی حکم میں مذاہب فقہاء

جو علماء جماعت کے وجوب کے قائل ہیں وہ اس آیت میں امر کو وجوب پر محمول کرتے ہیں اور جو وجوب کے قائل نہیں ہیں وہ اس امر کو استحباب پر محمول کرتے ہیں۔

علامہ ابن ہمام حنفی لکھتے ہیں:

داؤد ظاہری، عطاء، ابوثور، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کے نزدیک جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض عین ہے، ایک قول یہ ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے، ''غایت'' میں مذکور ہے کہ ہمارے عامہ مشائخ کے نزدیک جماعت واجب ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ سنت موکدہ ہے جو واجب کے قریب ہے۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۳۰۰)

علامہ محمد بن علی بن محمد حصکفی لکھتے ہیں:

مردوں کے حق میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا سنت مؤکدہ ہے، زاہدی نے کہا کہ تاکید سے مراد وجوب ہے، مگر جمعہ اور عید میں جماعت شرط ہے، اور تراویح میں جماعت سنت کفایہ ہے اور رمضان کے وتر میں جماعت مستحب ہے اور غیر رمضان اور نوافل میں بہ طور تداعی کے جماعت مکروہ تنزیہی ہے (بہ شرطیکہ دائماً ہو) محلّہ کی مسجد میں اذان اور اقامت کے ساتھ جماعت کا تکرار کرنا مکروہ ہے (اذان اور اقامت کے بغیر ہیئت تبدیل کر کے تکرار جماعت جائز ہے) راستہ کی مسجد میں یا جس مسجد میں کوئی امام معین نہ ہو اور نہ مؤذن ہو وہاں جماعت کا تکرار مکروہ نہیں ہے۔ (درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۱ ص ۳۷۱ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

جمعہ میں جماعت فرض عین ہے اور باقی فرائض میں جماعت کے بارے میں اختلاف ہے، زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ فرض کفایہ ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ سنت ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ فرض عین ہے۔

(روضۃ الطالبین ج ۱ ص ۳۴۳ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۰۵ھ)

علامہ مرداوی حنبلی لکھتے ہیں:

مردوں پر پانچ وقتوں کی نماز کے لیے جماعت واجب ہے، شیخ تقی الدین وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے۔

(الانصاف ج ۲ ص ۲۱۰ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۳۷۲ھ)

علامہ خرشی مالکی لکھتے ہیں:

فرض نمازوں کے لیے یا قضا نمازوں کے لیے جماعت سنت موکدہ ہے اور جمعہ کے سوا کسی نماز میں جماعت واجب نہیں ہے۔ (الخرشی علی مختصر خلیل ج ۲ ص ۱۷ مطبوعہ دار صادر بیروت)

رکوع کا معنی نماز میں رکوع کرنا بھی ہے اور خضوع اور خشوع بھی ہے، اس لیے یہ لفظ جماعت کے لیے قطعی الدلالۃ نہیں ہے اور اس سے جماعت کی فرضیت پر استدلال کرنا ضعیف ہے۔ حسب ذیل احادیث سے جماعت کے سنت موکدہ ہونے پر استدلال کیا گیا ہے:

امام مسلم روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک نابینا شخص آیا اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کوئی شخص مسجد میں لے جانے والا نہیں ہے، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت طلب کی، آپ نے اس کو اجازت دے دی، جب وہ چلا گیا تو آپ نے پھر اس کو بلایا اور فرمایا: تم اذان کی آواز سنتے ہو؟ اس نے کہا: ہاں، آپ نے فرمایا: تو پھر نماز کے لیے جاؤ۔[1]

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۳۲ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتبان بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ کو ان کے نابینا ہونے کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت دے دی تھی اس لیے اس حدیث میں امر استحباب پر محمول ہے اور اس کا وجوب منسوخ ہے، یعنی جماعت کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے مسجد میں جاؤ ہر چند کہ یہ تم پر واجب نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہماری رائے یہ تھی کہ نماز کی جماعت صرف وہ شخص چھوڑتا ہے جو ایسا منافق ہو جس کا نفاق معلوم ہو یا وہ بہت بیمار ہو؛ بے شک ایک بیمار آدمی دو آدمیوں کے درمیان سہارے سے چل کر نماز پڑھنے کے لیے جاتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سنن الھدیٰ کی تعلیم دی اور سنن الھدیٰ میں سے یہ ہے کہ جس مسجد میں اذان دی گئی ہو اس میں نماز پڑھی جائے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۳۲ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جس آدمی کو اس سے خوشی ہو کہ کل وہ اللہ سے حالت اسلام میں ملاقات کرے' اسے چاہیے کہ جب ان نمازوں کی اذان دی جائے تو وہ ان کی حفاظت کرے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کے لیے سنن الہدیٰ کو شروع کیا ہے اور ان کو جماعت سے پڑھنا سنن الہدیٰ میں سے ہے' اور اگر تم نے گھروں میں نماز پڑھی جیسا کہ فلاں تارک جماعت اپنے گھر میں نماز پڑھتا ہے تو تم اپنے نبی کی سنت کو ترک کر دو گے اور اگر تم نے اپنے نبی کی سنت کو ترک کیا تو تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۳۲ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

ان احادیث میں یہ تصریح ہے کہ جماعت سے نماز پڑھنا سنت موکدہ ہے' اور اس کو فرض عین یا فرض کفایہ کہنا ضعیف قول ہے۔ عورتوں کا مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا اگرچہ فی نفسہ جائز ہے مگر ان کا گھروں میں نماز پڑھنا زیادہ افضل ہے' ''شرح صحیح مسلم'' کی پانچویں جلد میں اس کی بحث ہے۔ نماز عبادات بدنیہ میں سب سے افضل ہے اور زکوٰۃ عبادات مالیہ میں سب سے افضل ہے' اس لیے ان دونوں کو ساتھ ذکر کیا ہے' امام رازی نے کہا ہے کہ یہود زکوٰۃ نہیں دیتے تھے اس لیے زکوٰۃ کا ذکر کیا اور وہ جماعت سے نماز نہیں پڑھتے تھے اس لیے باجماعت نماز پڑھنے کا ذکر کیا۔

امام شافعی وغیرہ جو اس کے قائل ہیں کہ کفار فروع کے مخاطب ہوتے ہیں وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ یہود کافر تھے اور ان کو نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے اور جو اس کے قائل نہیں ہیں وہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ وہ ایمان لانے کے بعد نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور یا یہ حکم مسلمانوں کو ہے۔

ہم نے جماعت کے سنت موکدہ ہونے کے متعلق تفصیل سے گفتگو کی ہے' ہمارے زمانہ میں نوافل کی جماعت' عورتوں کی عورتوں کے لیے امامت اور سمجھ دار نابالغ لڑکے کی تراویح میں امامت کے متعلق کافی بحث کی جاتی ہے اس لیے ہم یہاں اس مسئلہ کی تحقیق کر رہے ہیں۔ فنقول و باللہ التوفیق.

نوافل کی جماعت کی تحقیق

فقہاء احناف کے نزدیک چار سے کم افراد کی جماعت کرنا مطلقاً جائز ہے اور اگر چار سے زیادہ افراد ہوں اور دوام کے ساتھ نوافل کی جماعت کی جائے تو مکروہ تنزیہی ہے اور اگر کبھی کبھی نوافل کی جماعت کی جائے تو پھر مکروہ تنزیہی بھی نہیں ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

''مختصر قدوری'' میں یہ لکھا ہے کہ نوافل کی جماعت جائز نہیں ہے' اس سے مراد جواز کی نفی نہیں ہے' بلکہ فقہاء نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نوافل کی جماعت مکروہ ہے کیونکہ ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ''قدوری'' سے نقل کیا ہے کہ نوافل کی جماعت مکروہ نہیں ہے اور اس کی تائید ''حلیہ'' میں مذکور ہے کہ امام طحاوی نے منصور بن مخرمہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رات میں دفن کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے وتر نہیں پڑھے' پھر وہ کھڑے ہو گئے اور ہم نے ان کے پیچھے صف باندھی' حضرت عمر نے ہم کو تین رکعت وتر کی نماز پڑھائی اور صرف آخر میں سلام پھیرا' پھر صاحب ''الحلیہ'' نے کہا کہ ظاہر یہ ہے کہ نوافل کی جماعت غیر مستحب ہے' اگر یہ جماعت کبھی کبھی ہو جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

وتر کی جماعت کرائی تھی تو یہ مباح غیر مکروہ ہے اور اگر دائما ہو تو پھر یہ بدعت مکروہ ہے کیونکہ یہ منقول کے خلاف ہے اور ''مختصر قدوری'' میں جو اس کو ناجائز یعنی مکروہ لکھا ہے وہ دوام پر محمول ہے اور دیگر کتابوں میں جو اس کے خلاف لکھا ہے وہ اس صورت پر محمول ہے جب نوافل کی جماعت احیانا (کبھی کبھی) ہو علامہ شامی فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: صاحب ''الحلیہ'' کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ''البدائع'' میں مذکور ہے کہ تراویح کے سوا نوافل کی جماعت سنت نہیں ہے (بدائع الصنائع ج ۱ ص ۲۹۸) کیونکہ سنیت کی نفی کراہت کو مستلزم نہیں ہے ہاں! اگر دائما نوافل کی جماعت کی جائے تو پھر یہ مکروہ ہے اور علامہ خیر الدین رملی نے ''البحر الرائق'' کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ کراہت کی علت دوام ہے اور ''نہایہ'' میں مذکور ہے کہ وتر من وجہ نفل ہیں کیونکہ وتر کی ہر رکعت میں قراءت واجب ہے اور وتر بغیر اذان اور اقامت کے ادا کیے جاتے ہیں اور نفل جماعت کے ساتھ غیر مستحب ہیں کیونکہ رمضان کے علاوہ صحابہ نے وتر جماعت کے ساتھ نہیں پڑھے اس عبارت میں یہ تصریح ہے کہ نوافل کی جماعت مکروہ تنزیہی ہے۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۴۷۶ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ)

علامہ بخاری لکھتے ہیں:

اگر امام کے سوا تین نمازی ہوں تو نوافل کی جماعت بالاتفاق مکروہ نہیں ہے اور چار میں مشائخ کا اختلاف ہے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ بھی مکروہ نہیں ہے۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص ۱۵۴ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

امام کے سوا تین آدمیوں تک تو اجازت ہی ہے چار کی نسبت کتب حنفیہ میں کراہت لکھتے ہیں یعنی کراہت تنزیہہ جس کا حاصل خلاف اولی ہے نہ کہ گناہ و حرام جیسا کہ ہم نے اپنے فتاویٰ میں بیان کیا ہے۔ (فتاوی رضویہ ج ۳ ص ۴۸۵۔ ۴۸۰) مگر مسئلہ مختلف فیہ ہے اور بہت اکابرین سے جماعت نوافل بالتداعی ثابت ہے اور عوام فعل خیر سے منع نہ کیے جائیں گے علماء امت و حکماء ملت نے ایسی ممانعت سے منع فرمایا ہے۔ (امام احمد رضا قادری متوفی ۱۳۴۰ھ فتاوی رضویہ ج ۳ ص ۵۰۰ مطبوعہ لائل پور)

علامہ نور اللہ بصیر پوری نے لکھا ہے کہ کبھی کبھی نوافل کی جماعت کرنا مکروہ تنزیہی بھی نہیں ہے۔

(فتاوی نوریہ ج ۱ ص ۲۷۲ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۳ء)

خواتین کی امامت کی تحقیق

جماعت کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ عورتوں کی جماعت ہے امام شافعی کے نزدیک عورت کا عورتوں کو نماز پڑھانا اور ان کا باجماعت نماز پڑھنا جائز ہے امام احمد کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں ایک قول یہ ہے کہ عورتوں کی جماعت مستحب ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ غیر مستحب ہے امام مالک کے نزدیک عورتوں کا عورت کی اقتداء میں نماز پڑھنا ناجائز ہے امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت کا عورتوں کے لیے امام ہونا مکروہ تحریمی ہے ہر چند کہ امام احمد اور امام شافعی کے نزدیک عورت کا عورتوں کے لیے امام ہونا جائز ہے لیکن انہوں نے یہ تصریح کی ہے کہ عورتوں کا مردوں کے لیے امام ہونا ناجائز ہے اور مردوں کے لیے عورت کی امامت کے باطل ہونے پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے عورت کی امامت کے جواز کے سلسلہ میں جو احادیث ہیں پہلے ہم ان کا ذکر کریں گے پھر فقہاء کے مذاہب کو بیان کریں گے۔ فنقول و باللہ التوفیق.

خواتین کی امامت کے متعلق احادیث

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

عبدالرحمان بن خلاد بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ورقہ سے ملنے ان کے گھر جاتے تھے آپ

نے ان کے لیے ایک موذن مقرر کیا تھا جو ان کے لیے اذان دیتا تھا اور آپ نے حضرت ام ورقہ کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو نماز پڑھائیں۔ عبدالرحمان کہتے ہیں: میں نے ان کے موذن کو دیکھا' وہ ایک بوڑھا شخص تھا۔
(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۸۸۔ ۸۷ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

ولید بن جمیع بیان کرتے ہیں کہ میری دادی نے حضرت ام ورقہ بنت عبداللہ بن الحارث رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' ام ورقہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات کے لیے جاتے تھے اور آپ نے ان کا نام شہیدہ رکھا تھا' حضرت ام ورقہ نے قرآن حفظ کیا تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ بدر کے لیے گئے تو حضرت ام ورقہ نے عرض کیا: مجھے بھی اپنے ساتھ جانے کی اجازت دیں' میں زخمیوں کی دوا دارو کروں گی اور مریضوں کی دیکھ بھال کروں گی' شاید اللہ تعالیٰ میرے لیے بھی شہادت مقدر کر دے' آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے شہادت مقدر کر دی ہے' اور آپ نے ان کا نام شہیدہ رکھ دیا' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے گھر والوں کو نماز پڑھائیں' انہوں نے اپنی ایک باندی اور ایک غلام کو مدبر کر دیا تھا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ان دونوں نے حضرت ام ورقہ کو قتل کر دیا' وہ دونوں قتل کر کے بھاگ گئے اور پکڑے گئے' اور ان کو پھانسی دی گئی اور یہ پہلے لوگ تھے جن کو مدینہ میں پھانسی دی گئی' اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا کہ چلو ہم شہیدہ کی زیارت کریں۔
(سنن کبریٰ ج ۳ ص ۱۳۰ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام حاکم روایت کرتے ہیں:

حضرت ام ورقہ انصاریہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: چلو شہیدہ کے پاس جائیں اور ہم ان کی زیارت کریں اور آپ نے یہ حکم دیا تھا کہ ان کے لیے اذان دی جائے اور اقامت کہی جائے اور وہ اپنے گھر والوں کو فرض نمازیں پڑھائیں' مسلم بن ولید بن جمیع نے اس سے استدلال کیا ہے' میں اس مسئلہ میں اس حدیث کے سوا اور کسی حدیث متصل کو نہیں جانتا' اور ہم نے حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ وہ اذان دیتی تھیں' اقامت کہتی تھیں اور عورتوں کو نماز پڑھاتی تھیں۔ (المستدرک ج ۱ ص ۲۰۳ 'مطبوعہ مکتبہ دارالباز' مکہ مکرمہ)

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

رائطہ حنفیہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرض نمازوں میں عورتوں کی امامت کی اور ان کے وسط میں کھڑی ہوئیں۔ (سنن کبریٰ ج ۳ ص ۱۳۱ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

عطاء بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اذان دیتی تھیں' اقامت کہتی تھیں اور عورتوں کی امامت کرتی تھیں اور ان کے وسط میں کھڑی ہوتی تھیں۔ (سنن کبریٰ ج ۳ ص ۱۳۱ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

حجیرہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں کی امامت کی اور ان کے وسط میں کھڑی ہوئیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ عورت عورتوں کی امامت کرے اور ان کے وسط میں کھڑی ہو۔
(سنن کبریٰ ج ۳ ص ۱۳۱ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام دار قطنی روایت کرتے ہیں:

حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں امامت کرتی تھیں اور آپ نے

ان کو اجازت دی تھی کہ وہ اپنے گھر والوں کو نماز پڑھائیں۔ (سنن دار قطنی ج ۱ص ۴۰۳ مطبوعہ نشر السنہ ملتان)

رائطہ حنفیہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرض نماز میں ہماری امام ہوئیں اور ہمارے درمیان کھڑی ہوئیں۔ (سنن دار قطنی ج ۱ص ۴۰۴ مطبوعہ نشر السنہ ملتان)

حجیرہ بنت حصین بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ہمیں عصر کی نماز پڑھائی اور ہمارے درمیان کھڑی ہوئیں۔ (سنن دار قطنی ج ۱ص ۴۰۴ مطبوعہ نشر السنہ ملتان)

خواتین کی امامت کے متعلق فقہاء حنبلیہ کا نظریہ

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

آیا عورت کا عورتوں کو نماز پڑھانا مستحب ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ یہ مستحب ہے حضرت عائشہ حضرت ام سلمہ عطاء ثوری اوزاعی امام شافعی اسحاق اور ابوثور سے روایت ہے کہ عورت عورتوں کی امامت کرائے اور امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ یہ غیر مستحب ہے اصحاب رائے (فقہاء احناف) نے اس کو مکروہ کہا ہے لیکن اگر وہ پڑھیں گی تو نماز ہو جائے گی۔ شعبی نخعی اور قتادہ نے کہا ہے کہ نوافل میں عورتوں کا امامت کرانا جائز ہے فرائض میں جائز نہیں ہے حسن بصری اور سلیمان بن یسار نے کہا ہے کہ عورت فرض میں امامت کرائے نہ نفل میں امام مالک نے کہا ہے کہ عورت کسی شخص کی کسی نماز میں امامت نہ کرے کیونکہ عورت کا اذان دینا مکروہ ہے اور اذان کی تعریف ہے: جماعت کی دعوت دینا اور جب اس کے لیے جماعت کی دعوت دینا مکروہ ہے تو جماعت کرانا بھی مکروہ ہے اور ہماری دلیل حضرت ام ورقہ کی حدیث ہے۔ (المغنی ج ۲ص ۱۷ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۰۵ھ)

علامہ مرداوی حنبلی لکھتے ہیں:

ہمارا مذہب یہ ہے کہ عورتوں کا مردوں کی امامت کرنا مطلقاً جائز نہیں ہے۔

(الانصاف ج ۲ص ۲۶۳ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۳۷۶ھ)

خواتین کی امامت کے متعلق فقہاء شافعیہ کا نظریہ

علامہ یحییٰ بن شرف نووی لکھتے ہیں:

اگر عورت مردوں کو نماز پڑھائے تو مردوں کی نماز باطل ہو جائے گی اور اگر عورت عورتوں کو نماز پڑھائے تو جمعہ کی نماز کے سوا یہ تمام نمازوں میں صحیح ہے اور جمعہ کی نماز میں دو قول ہیں زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ نماز نہیں ہوگی اور دوسرا قول یہ ہے کہ نماز ہو جائے گی۔ (شرح المہذب ج ۴ص ۲۵۵ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

خواتین کی امامت کے متعلق فقہاء مالکیہ کا نظریہ

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

امام بخاری نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو بادشاہ بنالیا ہے تو آپ نے فرمایا: وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے اپنے معاملات کا والی عورت کو بنادیا اور امام ابوداؤد نے عبدالرحمان خلاد سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ورقہ کی زیارت کے لیے ان کے گھر جاتے تھے اور آپ نے ان کے لیے ایک موذن مقرر کیا تھا جو ان کے لیے اذان دیتا تھا اور آپ نے حضرت ام ورقہ کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو نماز پڑھائیں عبدالرحمان کہتے ہیں کہ میں نے ان کے موذن کو دیکھا وہ ایک بوڑھا شخص تھا

امام شافعی نے کہا: جو مرد عورت کے پیچھے نماز پڑھے وہ اپنی نماز دہرائے۔
میں کہتا ہوں کہ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ عورت کی امامت مطلقاً صحیح نہیں ہے مردوں کے لیے نہ عورتوں کے لیے امام مالک نے کہا: عورت کسی صورت میں امام نہ بنے اور اکثر فقہاء کا بھی قول ہے۔
(الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۳۵۶۔ ۳۵۵ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

علامہ عبدری مالکی لکھتے ہیں:
ہمارے نزدیک عورت کی امامت صحیح نہیں ہے اور جو شخص بھی عورت کی اقتداء میں نماز پڑھے وہ اپنی نماز دہرائے خواہ وقت نکل جائے۔ (التاج والاکلیل ج ۲ ص ۹۲ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ)

خواتین کی امامت کے متعلق فقہاء احناف کا نظریہ

علامہ المرغینانی الحنفی لکھتے ہیں:
تنہا عورتوں کا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا مکروہ (تحریمی) ہے کیونکہ یہ فعل حرام کے ارتکاب سے خالی نہیں ہے اور وہ امام کا صف کے درمیان میں کھڑا ہونا ہے جیسے برہنہ لوگ کھڑے ہوتے ہیں اس لیے یہ فعل مکروہ ہے اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو جو عورت امام بنے وہ صف کے درمیان میں کھڑی ہو کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی طرح کیا تھا اور حضرت عائشہ کا عورتوں کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھانا ابتداء اسلام پر محمول ہے۔ (ہدایہ اولین ص ۱۲۳ مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ ملتان)

علامہ ابن ہمام حنفی لکھتے ہیں:
''مبسوط'' میں اسی طرح لکھا ہے علامہ سروجی نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ توجیہ بعید ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعلان نبوت کے بعد مکہ میں تیرہ سال رہے جیسا کہ امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے پھر آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا اور ہجرت کے ایک سال بعد مدینہ منورہ میں حضرت عائشہ کی رخصتی ہوئی اس وقت ان کی عمر نو سال تھی اور وہ نو سال آپ کے پاس رہیں اور نماز میں امامت انہوں نے بلوغت کے بعد ہی کی ہوگی تو یہ ابتداء اسلام کب ہے؟ لیکن یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ جب عورتوں نے مسجد میں جاکر آپ کی اقتداء میں نماز پڑھنا شروع کر دیا تو یہ فعل منسوخ ہو گیا لیکن ''مستدرک'' میں یہ روایت ہے کہ حضرت عائشہ اذان دیتی تھیں اقامت کہتی تھیں اور عورتوں کی امامت کرتی تھیں اور عورتوں کے درمیان کھڑی ہوتی تھیں اور امام محمد نے ''کتاب الآثار'' میں امام ابوحنیفہ کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رمضان کے مہینہ میں امامت کرتی تھیں اور عورتوں کے وسط میں کھڑی ہوتی تھیں۔ (کتاب الآثار ص ۴۳ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی) اور یہ بات معلوم ہے کہ تراویح کی جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مروج ہوئی ہے اور ''سنن ابوداؤد'' میں ہے کہ حضرت ام ورقہ انصاریہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو نماز پڑھائیں اور ان کے لیے ایک مؤذن مقرر کیا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت ام ورقہ کو ان کے ایک غلام اور باندی نے چادر سے ان کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا اور وہ زبان رسالت کی پیشگوئی کے مطابق شہیدہ ہوگئیں۔ عبدالرحمان نے کہا: میں نے ان کے مؤذن کو دیکھا تھا وہ بوڑھا شخص تھا یہ تمام روایات دعویٰ نسخ کی نفی کرتی ہیں ''سنن ابوداؤد'' کی روایت کی سند میں ولید بن جمیع اور عبدالرحمان بن خالد انصاری پر ابن القطان نے یہ اعتراض کیا ہے کہ ان دونوں کا حال معلوم نہیں لیکن امام ابن حبان نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے۔
ان حدیثوں کے جواب میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ورقہ کو جو نماز پڑھانے کی اجازت

دی تھی اس سے اس اجازت کا دوام اور استمرار لازم نہیں آتا اس لیے ہو سکتا ہے کہ بعد میں یہ اجازت منسوخ ہوگئی ہو اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو رمضان میں امامت کرتی تھیں تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ تراویح کی امامت کرتی تھیں' اور ''مصنف عبدالرزاق'' میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول روایت کیا گیا ہے کہ عورت عورتوں کی امامت کرے اور ان کے وسط میں کھڑی ہو۔ (المصنف ج ۳ ص ۱۴۰) اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابن عباس کو ناسخ کا علم نہ ہوا ہو' لیکن اس کے باوجود یہ سوال قائم رہے گا کہ وہ کون سا ناسخ ہے جس نے ان احادیث کو منسوخ کر دیا؟ بعض علماء نے یہ ذکر کیا ہے کہ ''سنن ابوداؤد'' اور ''صحیح ابن خزیمہ'' وغیرھما میں یہ حدیث ہے کہ عورت کا اپنی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا حجرہ میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے' اور کوٹھڑی در کوٹھڑی میں نماز پڑھنا کوٹھڑی میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے' اور یہ بات معلوم ہے کہ بالکل اندرونی کوٹھڑی جماعت کی گنجائش نہیں رکھتی' اس حدیث کو بعض علماء نے حضرت عائشہ' حضرت ام ورقہ اور حضرت ابن عباس کی احادیث کا ناسخ قرار دیا ہے' لیکن اس حدیث کا ناسخ ہونا واضح نہیں ہے' اور اگر اس کو ناسخ مان بھی لیا جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ عورت کا امامت کرنا اب مسنون نہیں ہے اور یہ کراہت تحریم کو مستلزم نہیں ہے' بلکہ اس سے زیادہ سے زیادہ اس فعل کا مکروہ تنزیہی یا خلاف اولیٰ ہونا لازم آئے گا اور ہم پر یہ لازم نہیں ہے کہ ہم اس کو مکروہ تحریمی ثابت کریں' ہمارا مقصود تو حق کی اتباع کرنا ہے خواہ وہ کسی جگہ ہو۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۳۰۷۔ ۳۰۶' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر)

علامہ ابن ہمام نے اس عبارت سے یہ اشارہ کیا ہے کہ اس مسئلہ میں امام احمد اور امام شافعی کا قول صحیح ہے' کیونکہ وہ احادیث کے موافق ہے اور امام مالک نے حضرت ابوبکرۃ کی جس حدیث سے استدلال کیا ہے وہ نظام مملکت کی ولایت سے متعلق ہے' نماز کی امامت سے نہیں ہے' نیز احادیث صحیحہ سے عورت کا عورتوں کی نماز میں امامت کرنا ثابت ہے' اور اس کا ناسخ متعین اور متحقق نہیں ہے اور احادیث رسول اقوال فقہاء پر مقدم ہیں۔

سمجھ دار نابالغ لڑکے کی امامت

نابالغ اور سمجھ دار لڑکے کی امامت میں ائمہ کا اختلاف ہے' امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کی امامت مطلقاً جائز نہیں ہے فرائض میں نہ نوافل میں' البتہ مشائخ احناف کا اس میں اختلاف ہے۔ بلخ کے مشائخ نابالغ حافظ قرآن کی تراویح میں امامت کو جائز کہتے ہیں۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۳۱۱۔ ۳۰۹) علامہ کاسانی حنفی نے لکھا ہے جو بچہ سمجھ دار ہو وہ تراویح میں بچوں کی امامت کی صلاحیت رکھتا ہے' اور بالغوں کے متعلق اُس کی امامت میں مشائخ کا اختلاف ہے اور جو بچہ ناسمجھ ہو وہ امامت کا بالکل اہل نہیں ہے کیونکہ وہ نماز کے لائق نہیں ہے۔ (بدائع الصنائع ج ۱ ص ۱۵۷)

امام مالک کے نزدیک بھی نابالغ کا بالغوں کو نماز پڑھانا جائز نہیں ہے (الجامع الاحکام القرآن للقرطبی ج ۱ ص ۳۵۳) اور امام احمد کے نزدیک فرائض میں نابالغ کی امامت جائز نہیں ہے اور نوافل میں اُن کے دو قول ہیں (المغنی ج ۲ ص ۳۲۔ ۳۱) اور امام شافعی کے نزدیک نابالغ سمجھدار لڑکے کی امامت مطلقاً جائز ہے' خواہ فرض ہو یا نفل۔ (شرح المہذب ج ۴ ص ۲۴۹)

مانعین کی دلیل یہ ہے کہ بالغ کی نماز فرض ہے اور نابالغ کی نماز نفل ہے اور متنفل کی اقتداء میں مفترض کی نماز نہیں ہوتی' کیونکہ امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امام ضامن ہے (جامع ترمذی ص ۵۷) یعنی امام کی نماز مقتدی کی نماز کو متضمن اور شامل ہوتی ہے اور فرض نفل کو شامل ہوتا ہے' نفل فرض کو شامل نہیں ہوتا' اور مجوزین کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے نابالغ کا بالغوں کو نماز پڑھانا ثابت ہے' خاص طور سے جب کہ نابالغ کو بالغوں سے زیادہ قرآن یاد ہو' وہ حافظ قرآن ہو اور اچھا قاری ہو کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو امام بنانے پر زور دیا

ہے جس کو قرآن زیادہ یاد ہو۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو لوگوں میں سب سے زیادہ قرآن یاد ہو اس کو امام بناؤ' اگر قراءت میں سب برابر ہوں' تو جس نے پہلے ہجرت کی ہو اور اگر ہجرت میں سب برابر ہوں تو جو عمر میں بڑا ہو اور کوئی شخص کسی کی ولایت اور اس کے گھر میں نماز نہ پڑھائے اور نہ اس کی مسند نشست پر بیٹھے سوا اس کے کہ وہ اس کو اجازت دے دے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۳۶ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام نسائی کی روایت میں ہے کہ اگر سب ہجرت میں برابر ہوں تو جو سنت کا زیادہ عالم ہو اس کو امام بناؤ۔

(سنن نسائی ج ۱ ص ۱۲۶ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حافظ الہیثمی بیان کرتے ہیں:

امام بزار نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب تم سفر کرو تو جس شخص کو تم میں سب سے زیادہ قرآن یاد ہو اس کو امام بناؤ خواہ وہ تم میں سب سے چھوٹا ہو' اور جو شخص تمہارا امام ہوگا وہی تمہارا امیر ہوگا

(مجمع الزوائد ج ۲ ص ۶۴ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگوں کی گزرگاہ میں رہتے تھے' ہمارے پاس سے سوار گزرتے رہتے تھے' ہم ان سے پوچھتے رہتے تھے کہ لوگوں کو کیا ہوا ہے؟ لوگوں کو کیا ہوا ہے؟ اور یہ شخص کون ہے؟ لوگ بتاتے کہ وہ شخص یہ کہتے ہیں کہ ان کو اللہ نے بھیجا ہے اور ان کی طرف یہ یہ وحی کی ہے' میں ان سے اس کلام کو سن کر یاد کرتا رہتا' گویا کہ وہ کلام میرے دل میں راسخ ہو گیا' اور عرب اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے' وہ کہتے تھے کہ اس شخص کو اس کی قوم کے ساتھ چھوڑ دو' اگر وہ ان پر غالب آ گیا تو پھر وہ سچا نبی ہوگا' جب مکہ فتح ہو گیا تو سب لوگوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی' اور میرے والد اپنی قوم میں سب سے پہلے اسلام لے آئے' جب وہ آئے تو انہوں نے کہا کہ بہ خدا! میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے آیا ہوں وہ برحق ہیں' آپ نے فرمایا ہے: فلاں فلاں وقت میں نماز پڑھا کرو' اور جب نماز کا وقت آئے تو تم میں سے ایک شخص اذان دے اور جس کو تم میں سب سے زیادہ قرآن یاد ہو وہ امامت کرے' جب انہوں نے تلاش کیا تو مجھ سے زیادہ کسی کو قرآن یاد نہیں تھا' کیونکہ میں سواروں سے سن کر قرآن یاد کرتا تھا تو انہوں نے مجھے امام بنا دیا' اس وقت میری عمر چھ یا سات سال کی تھی' میں نے ایک چھوٹی سی چادر کا تہبند باندھا ہوا تھا' جب میں سجدہ میں جاتا تو وہ سمٹ کر اوپر آ جاتا' قبیلہ کی ایک عورت نے کہا: تم اپنے قاری کی شرم گاہ ہم سے کیوں نہیں چھپاتے! تب لوگوں نے مجھے ایک قمیص خرید کر دی' مجھے اس قمیص سے اس وقت سب سے زیادہ خوشی ہوئی۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۱۶۔ ۶۱۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام نسائی[1] اور امام احمد[2] نے بھی روایت کیا ہے۔

امام ابو حنیفہ' امام مالک اور امام احمد کا مذہب قیاس کے زیادہ قریب ہے اور امام شافعی کا مذہب احادیث کے زیادہ قریب

---

[1] امام احمد شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ' سنن نسائی ج ۱ ص ۱۲۵ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[2] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۵ ص ۷۱' ۳۰ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

ہے ہمارے زمانہ میں بچے جلد قرآن مجید حفظ کر لیتے ہیں اگر وہ تراویح میں قرآن مجید نہ سنائیں یا نہ سنیں تو قرآن مجید بھول جائے گا اس لیے اگر بلخ کے مشائخ احناف کے قول پر عمل کرتے ہوئے نابالغ حافظ کو تراویح میں امام بنا دیا جائے تو قرآن مجید کی حفاظت اور ان احادیث کے پیش نظر مناسب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو! کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟O (البقرہ: ۴۴)

یہود کی بے عملی کا بیان

بھولنے سے مراد یہاں چھوڑ دینا ہے' کیونکہ کوئی شخص اپنے آپ کو نہیں بھولتا' یعنی تم خود نیکی پر عمل نہیں کرتے اور دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو' یہاں نیکی کے حکم میں کئی اقوال ہیں۔

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ تم لوگوں کو تورات کے عہد اور نبوت کے ساتھ کفر کرنے سے روکتے ہو اور خود تم تورات میں کیے ہوئے عہد سے کفر کرتے ہو' میرے رسولوں کی تصدیق نہیں کرتے' مجھ سے کیے ہوئے عہد کو توڑتے ہو اور میری کتاب میں مذکور احکام کا انکار کرتے ہو۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ تم لوگوں کو (سیدنا حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل ہونے کا اور نماز پڑھنے کا حکم دیتے ہو اور خود اس پر عمل نہیں کرتے۔

سدی سے روایت ہے کہ تم لوگوں کو اللہ سے ڈرنے اور اس کی اطاعت کا حکم دیتے ہو اور خود اس کی معصیت کرتے ہو۔

(جامع البیان ج ١ ص ٢٠٢' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ١٤٠٩ھ)

بے عمل علماء کے عذاب کا بیان

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام ابن ابی شیبہ نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ جنت میں سے کچھ لوگ دوزخیوں کو دیکھ کر کہیں گے: تم کیسے دوزخ میں ہو' حالانکہ ہم تمہاری تعلیم پر عمل کر کے جنت میں پہنچ گئے؟ وہ کہیں گے کہ ہم کہتے تھے اور عمل نہیں کرتے تھے۔

اس حدیث کو طبرانی' خطیب اور ابن عساکر نے سند ضعیف سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔

امام طبرانی' خطیب اور اصبہانی نے حضرت جندب بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس عالم کی مثال جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دے اور اس پر عمل نہ کرے اس چراغ کی طرح ہے جو لوگوں کو روشنی دیتا ہے اور خود کو جلاتا رہتا ہے۔ امام اصفہانی نے ''ترغیب'' میں سند ضعیف سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوامامہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عالم سوء کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور اس کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا اور جس طرح گدھا چکی کے ساتھ گردش کرتا ہے اس طرح اس کی انتڑیاں دوزخ میں گردش کر رہی ہوں گی۔

امام احمد بن حنبل نے ''کتاب الزھد'' میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جو آدمی نہیں جانتا اس کے لیے ایک عذاب ہے اور اگر اللہ چاہتا تو اس کو علم دے دیتا' اور اس شخص کے لیے سات عذاب ہیں جو جانتا ہے اور پھر اس پر عمل نہیں کرتا۔ (الدر المنثور ج ١ ص ٦٥' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

آیا نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لیے خود نیک ہونا ضروری ہے؟

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے علماء نے تین شرطیں ذکر کی ہیں' اول مکلف ہونا' ثانی ایمان' ثالث عدل یعنی اس کا نیک ہونا۔ بعض علماء نے چوتھی شرط بھی ذکر کی ہے کہ امام کی طرف سے اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اجازت ہو' لیکن امام غزالی اور دیگر محققین نے اس شرط کو مسترد کر دیا ہے' باقی رہی تیسری شرط یعنی نیکی کا حکم دینے کے لیے خود نیک ہونے کی شرط تو اس کے متعلق بھی علماء نے کافی بحث کی ہے۔

امام غزالی لکھتے ہیں:

بعض علماء نے امر بالمعروف کے لیے عدالت کو شرط قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ فاسق کا کسی کو نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا جائز نہیں ہے' انہوں نے قرآن مجید کی ان آیات سے استدلال کیا ہے:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ — کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ (البقرہ: ٤٤)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ (الصف: ٣-٢) — اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو خود نہیں کرتے ہو؟ ○ اللہ کو سخت ناراض کرنے والی بات یہ ہے کہ تم وہ بات کہو جو خود نہیں کرتے ○

عدالت کی شرط پر ان احادیث سے بھی استدلال کیا گیا ہے:

امام احمد' امام ابویعلیٰ' امام طبرانی اور امام ابونعیم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معراج کی شب میں ایک قوم کے پاس سے گزرا جن کے ہونٹوں کو آگ کی قینچیوں سے کاٹا جا رہا تھا' میں نے پوچھا: تم لوگ کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور خود نیکی نہیں کرتے تھے اور لوگوں کو برائی سے روکتے تھے اور خود برے کام کرتے تھے' اور امام ابونعیم نے "حلیہ" میں مالک بن دینار سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اللہ نے وحی کی: اپنے آپ کو نصیحت کرو' اگر تم نے خود نصیحت پر عمل کر لیا تو پھر لوگوں کو نصیحت کرو ورنہ مجھ سے حیا کرو۔

عدالت کی شرط پر قیاس سے بھی استدلال کیا گیا ہے کیونکہ غیر کا ہدایت حاصل کرنا خود ہدایت یافتہ ہونے کی فرع ہے اور غیر کو مستقیم کرنا خود مستقیم ہونے کی فرع ہے اور غیر کی اصلاح خود صالح ہونے کی فرع ہے تو جو شخص خود نیک نہ ہو دوسرے کو کب نیک کر سکتا ہے۔

یہ مذکورہ دلائل بہ اعتبار ظاہر ہیں اور تحقیق یہ ہے کہ فاسق بھی امر بالمعروف کر سکتا ہے' کیونکہ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا امر بالمعروف کے لیے تمام گناہوں سے معصوم ہونا ضروری ہے؟ اگر یہ شرط لگائی جائے تو ایک تو یہ اجماع کے خلاف ہے' دوسری بات یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام بھی معصوم نہیں تھے چہ جائیکہ بعد کے لوگ! اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی شخص تبلیغ کر سکتا ہے نہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر سکتا ہے' حالانکہ قرآن مجید اور احادیث میں امت مسلمہ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مکلف کیا گیا ہے اور اگر وہ یہ کہیں کہ امر بالمعروف کے لیے کبیرہ گناہوں سے پاک ہونا ضروری ہے اور مرتکب کبیرہ کے لیے یہ جائز نہیں ہے حتیٰ کہ جو شخص ریشم کا لباس پہنے ہوئے ہو اُس کے لیے زنا اور شراب نوشی سے روکنا جائز نہیں ہے' تو ہم پوچھتے ہیں کہ آیا ریشم پہننے والے کے لیے کفار کے خلاف جہاد کرنا اور اُن کو کفر سے روکنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ نہیں تو یہ اجماع کے خلاف ہے' کیونکہ اسلام کے ہر دور میں نیک اور بد لوگ لشکر اسلام میں شامل ہو کر کفار کے

خلاف جہاد کرتے رہے ہیں' اگر وہ کہیں کہ ہاں یہ جائز ہے تو پھر ثابت ہو گیا کہ مرتکب کبیرہ کے لیے تبلیغ اسلام کرنا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا جائز ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر مرتکب کبیرہ کے لیے تبلیغ جائز ہو تو لازم آئے گا کہ ایک شخص کسی ایسی عورت سے زنا بالجبر کر رہا ہو جس نے اپنا منہ چھپایا ہوا ہو' دوران زنا وہ عورت خود اپنا منہ کھول دے اور وہ شخص اس سے کہے: تو نے غیر محرم کے سامنے چہرہ کیوں کھولا؟ زنا کرانے میں تو تو مجبور تھی چہرہ دکھانے میں تو مجبور نہیں تھی! تو یہ ایسی تبلیغ ہے جس کو ہر عقل مند برا سمجھے گا اور اس سے نفرت کرے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات حق بالطبع برا لگتا ہے اور باطل بالطبع اچھا لگتا ہے اور اتباع دلیل کی' کی جاتی ہے وہمی اور خیالی نفرت کی نہیں کی جاتی' اس حال میں اُس عورت کو منہ چھپانے کا حکم دینا کیا حرام ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ حرام نہیں ہے کیونکہ نامحرم کے سامنے منہ کھولنا معصیت ہے اور معصیت سے روکنا حق ہے' باقی رہا یہ کہ طبیعت ان کاموں سے متنفر ہوتی ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شخص زیادہ اہم چیز (زنا سے اجتناب) کو ترک کر کے کم درجہ کی اہم چیز میں مشغول ہو گیا' جیسے طبیعت ان کاموں سے متنفر ہوتی ہے کہ ایک آدمی ہمیشہ سود کھاتا ہو اور کسی غصب شدہ چیز کو کھانے سے احتراز کرے' یا جو شخص جھوٹی گواہی دیتا ہو اور وہ غیبت سے احتراز کرے اور اس طبعی تنفر سے یہ لازم نہیں آتا کہ غصب شدہ طعام کھانا حرام نہ ہو یا غیبت کو ترک کرنا واجب نہ ہو۔

(احیاء علوم الدین علی ہامش اتحاف السادۃ المتقین ج ۷ ص ۱۷۔ ۱۴' ملخصاً' مطبوعہ مصر' ۱۳۱۱ھ)

امام رازی اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مکلف کو دو چیزوں کا حکم دیا گیا ہے' ایک معصیت کو ترک کرنا' دوسرا غیر کو معصیت سے منع کرنا' اور ایک حکم پر عمل نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دوسرے حکم پر بھی عمل نہ کرے' اور اللہ تعالیٰ کا جو یہ ارشاد ہے کہ "تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو" اس آیت کے دو محمل ہیں' ایک یہ کہ مطلقاً اپنے آپ کو بھلانے یعنی خود عمل نہ کرنے سے منع کیا ہے' دوسرا محمل یہ ہے کہ جس وقت وہ خود عمل نہ کر رہا ہو اس وقت دوسروں کو اس کا حکم دینے سے منع کیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس آیت کا پہلا محمل مراد ہے نہ کہ دوسرا۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۳۲۶' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۳۹۸ھ)

ہمارے نزدیک ان آیات اور احادیث کا منشاء یہ ہے کہ انسان کا نیکی پر عمل نہ کرنا اور برائی سے اجتناب نہ کرنا عقلاً برا ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب کا موجب ہے لیکن اس وقت زیادہ برا ہے اور زیادہ غضب اور عذاب کا موجب ہے جب وہ دوسروں کو نیکی کا حکم دے رہا ہو اور ان کو برائی سے روک رہا ہو تو جو چیز قبیح ہے اور غضب اور عذاب کا موجب ہے وہ خود عمل نہ کرنا ہے نہ کہ دوسروں کو عمل کی تبلیغ کرنا' کسی دنیاوی طمع کی بناء پر برائی سے نہ روکنا مداہنت ہے اور کسی دینی منفعت کی وجہ سے خاموش رہنا مدارات ہے اور کفار سے موالات (دوستی رکھنا) حرام ہے اور ان سے صرف معاملات مثلاً بیع و شراء کرنا جائز ہے۔

بے علم کے وعظ' تقریر اور اس کے مرید کرنے کا شرعی حکم

تقریر اور وعظ کرنے کے لیے علم دین کا حاصل کرنا شرعاً واجب ہے' اور بے علم آدمی کا تقریر اور وعظ کرنا مکروہ تحریمی ہے' اور اس پر اصرار کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے' عالم کا معیار یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کی آیات کا ترجمہ کر سکے' احادیث کی عربی عبارات صحیح صحیح پڑھ سکے اور سمجھ سکے' علم کلام اور علم فقہ کی عبارات کو پڑھ اور سمجھ سکے' محض اردو کی کتابوں کو پڑھ کر وعظ کرنا اور لوگوں کو مسائل بتلانا شرعاً حرام ہے' البتہ اگر علماء اور منتہی طلباء کسی محقق عالم دین (مثلاً اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری' صدر الشریعہ

مولانا امجد علی' صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین اور غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمہم اللہ) کی اردو تصانیف سے مطالعہ اور استفادہ کر کے بیان کریں تو یہ جائز ہے' لیکن جو شخص علوم عربیہ سے بالکل جاہل ہو اس کے لیے اردو کی کتابیں پڑھ کر وعظ کرنا قطعاً حرام ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ○ (العنکبوت: ۴۳)

اور ہم ان مثالوں کو لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں' اور ان کو صرف عالم ہی سمجھ سکتے ہیں ○

اس آیت سے یہ معلوم ہو گیا کہ جو شخص قرآن مجید کی آیات کا ازخود ترجمہ نہ کر سکے اور اس کے لطائف اور دقائق کو نہ سمجھ سکے وہ عالم نہیں ہے۔ امام رازی عالم کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

نظری اور دقیق مسائل کو عالم ہی سمجھتا ہے' جب اس کے سامنے کوئی ظاہر امر پیش کیا جائے تو وہ اس کی کنہ کا ادراک کر لیتا ہے' جو چیز دقیق ہو اس کو جاننے کے لیے عالم ہونا ضروری ہے' اللہ تعالیٰ نے جو مثالیں بیان کی ہیں ان کی حقیقت اور ان کے تمام فوائد کو صرف علماء سمجھ سکتے ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۹۳ "ملخصاً" مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علامہ خفاجی حنفی لکھتے ہیں:

اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص صفت علم میں کامل ہو۔ (عنایۃ القاضی ج ۷ ص ۱۰۴' مطبوعہ دار صادر' بیروت' ۱۲۸۳ھ)

علامہ مراغی لکھتے ہیں:

ان مثالوں کے مغز کو اور ان کی تاثیر کی معرفت کو صرف ماہر علماء ہی جان سکتے ہیں اور ان مثالوں سے کثیر فوائد کو علماء ہی مستنبط کر سکتے ہیں جو غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ (تفسیر المراغی ج ۲۰ ص ۱۴۴' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت)

ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے لکھا ہے کہ قرآن مجید کی مثالوں کو وہی سمجھ سکتے ہیں جن کو علم سے وافر حصہ ملا ہو اور وہ قضایا اور مسائل میں منہمک رہتے ہوں۔ (التفسیر المنیر ج ۲۰' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۱۱ھ)

اس آیت اور اس کی تفسیر سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ عالم اس شخص کو کہتے ہیں جو قرآن مجید کا ترجمہ کر سکے' اس کے معانی کے دقائق کو سمجھ سکے اور اس کے فوائد کو مستنبط کر سکے۔

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کتاب اللہ میں اپنی رائے سے کہا اس نے خطا کی اگرچہ اس نے صحیح کہا ہو۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۸' مطبوعہ مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے بغیر علم کے قرآن سے کچھ بیان کیا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے' امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(جامع ترمذی ص ۴۱۹' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

قرآن مجید کی تفسیر کے لیے پندرہ علوم ضروری ہیں: لغت' نحو' تصریف' اشتقاق' معانی' بیان' بدیع' قراءات' اسباب نزول والقصص' ناسخ اور منسوخ' فقہ' احادیث' اصول حدیث اور اصول فقہ' اصول تفسیر۔ (مرقات ج ۱ ص ۲۹۲' مطبوعہ مکتبہ امدادیہ' ملتان' ۱۳۹۰ھ)

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تفسیر لکھنے کے لیے یہ علوم ضروری ہیں بلکہ یہ اصول عام ہے' وہ زبانی کسی آیت کی تشریح

کرے یا اس کو لکھے اس کے لیے ان علوم کا جاننا ضروری ہے الایہ کہ وہ کسی معتبر تفسیر سے پڑھ کر سنائے (خواہ وہ کسی زبان میں ہو) یا اس کو ضبط کر کے اس کے حوالے سے بیان کرے۔ اس وضاحت سے یہ معلوم ہو گیا کہ غیر عالم کے لیے وعظ اور تقریر کرنا جائز نہیں ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب علم کو اٹھائے گا تو اس کو لوگوں کے سینوں سے نہیں نکالے گا' لیکن علماء کو اٹھانے کے ذریعہ سے علم کو اٹھالے گا حتیٰ کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے' ان سے سوال کیا جائے گا اور وہ بغیر علم کے فتویٰ (جواب) دیں گے' سو وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام ابن عساکر نے بھی حضرت عبد اللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے۔

(مختصر تاریخ دمشق ج ۳ ص ۱۵۷۔ ۱۱' مطبوعہ دار الفکر' دمشق' ۱۴۰۴ھ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سیادت (منصب) حاصل کرنے سے پہلے علم حاصل کرو۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام دارمی روایت کرتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس شخص کو اس کی قوم نے فقہ کی وجہ سے امیر بنایا اس میں اس کی بھی حیات ہے اور اس کی قوم کی بھی' اور جس شخص کو اس کی قوم نے بغیر فقہ کے امیر بنایا اس میں اس کی بھی ہلاکت ہے اور اس کی قوم کی بھی۔

(سنن دارمی ج ۱ ص ۶۹' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

ابو البختری روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک شخص وعظ کر کے لوگوں کو ڈرا رہا تھا' آپ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ شخص لوگوں کو وعظ کر رہا ہے' آپ نے فرمایا: یہ شخص لوگوں کو وعظ نہیں کر رہا لیکن یہ دراصل یہ کہہ رہا ہے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں مجھ کو پہچان لو (یعنی وعظ سے اس کا مقصد خود نمائی ہے)' آپ نے اس کو بلا کر دریافت کیا: کیا تم قرآن مجید میں ناسخ اور منسوخ کو جانتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں! آپ نے فرمایا: ہماری مسجد سے نکل جاؤ اور اس میں وعظ نہ کرو' ایک روایت میں ہے' آپ نے پوچھا: تم ناسخ اور منسوخ کو جانتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں' آپ نے فرمایا: تم ہلاک ہو گئے' تم ہلاک ہو گئے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس روایت کی مثل منقول ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۶۲' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ھ)

ان احادیث اور آثار سے یہ واضح ہو گیا کہ بے علم شخص کا وعظ کرنا جائز نہیں ہے۔ اس مسئلہ کو مزید منقح کرنے کے لیے ہم امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ کا حوالہ پیش کر رہے ہیں' ان سے سوال کیا گیا:

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ اس زمانہ میں بہت لوگ اس قسم کے ہیں کہ تفسیر و حدیث بے خواندہ و بے اجازت اساتذہ برسر بازار و مسجد بطور وعظ و نصائح کے بیان کرتے ہیں حالانکہ معنی و مطلب میں کچھ مس نہیں فقط اردو کتابیں دیکھ کے کہتے ہیں' ان کا کہنا اور بیان کرنا ان لوگوں کے لیے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حرام ہے اور ایسا وعظ سننا بھی حرام' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "من قال فی القران بغیر علم فلیتبوا مقعدہ من النار" (جو شخص بغیر علم کے قرآن سے کچھ بیان کرے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے) والعیاذ باللہ (ترمذی)

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ۲۲۳ 'مطبوعہ ادارہ تحقیقات امام احمد رضا' کراچی' ۱۹۸۸ء' مکتبہ رضویہ ج ۱/ ۱۰ ص ۱۸۸)

علماء اور مرشدین کے لیے جس قدر علم ضروری ہے اس کے متعلق امام بیہقی لکھتے ہیں:

امام شافعی نے فرمایا: عوام کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تمام فرائض' واجبات' سنن اور آداب اور تمام محرمات اور مکروہات کا علم حاصل کریں اور خواص کے لیے ضروری ہے کہ وہ احکام شرعیہ کی تمام فروعات' قرآن مجید کی صریح عبارات' دلالت' اشارات اور اقتضاء نصوص کا علم حاصل کریں' قیاس اور اس کی شرائط کا علم حاصل کریں اور ایسی مہارت حاصل کریں کہ ہر پیش آمدہ مسئلہ کا حل کتاب اور سنت سے بتایا جاسکے' ہر شخص کے لیے اتنی مہارت حاصل کرنا ضروری نہیں لیکن مسلمانوں میں سے چند افراد کے لیے اتنا علم حاصل کرنا ضروری ہے' ورنہ سب گنہ گار ہوں گے۔

(شعب الایمان ج ۲ ص ۲۵۳ 'ملخصاً' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۰ھ)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ نے شیخ طریقت کی چار شرطیں لکھی ہیں' ان کے بغیر اس کا بیعت لینا جائز نہیں ہے:

(۱) مسلمان ہو اور اس کا عقیدہ صحیح ہو۔

(۲) عقائد کے دلائل اور تمام احکام شرعیہ کا عالم ہو' حتیٰ کہ ہر پیش آمدہ مسئلہ کا حل بیان کرسکتا ہو۔

(۳) علم کے مطابق عمل کرتا ہو' فرائض' واجبات اور سنن اور مستحباب پر دائمی عمل کرتا ہو اور تمام محرمات اور مکروہات سے بچتا ہو۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کی نسبت متصل ہو اور اس کے مشائخ کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہو۔

ہمارے زمانہ میں بے علم لوگ وعظ کرتے ہیں اور لوگوں سے بیعت لیتے ہیں' یہ لوگ اپنی بے علمی کا عیب چھپانے کے لیے علماء کی تنقیص کرتے ہیں' ان کو منافق اور بے عمل کہتے ہیں اور سادہ لوح عوام علماء کو چھوڑ کر بے علم واعظین اور بے علم مرشدین کے حلقہ ارادت میں کثرت سے شامل ہو رہے ہیں' ہم اس جہالت اور تعصب سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔

(فتاویٰ افریقیہ ص ۱۲۷۔ ۱۲۶ 'ملخصاً' مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی' کراچی)

بے علم کا اپنے آپ کو مولوی اور عالم کہنا' وعظ کرنا اور مرید کرنا' اس کے متعلق امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

یونہی اپنے آپ کو بے ضرورت شرعی مولوی صاحب لکھنا بھی گناہ ومخالف حکم قرآن عظیم ہے' قال اللہ تعالیٰ "هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِىْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى" (النجم: ۳۲) اللہ تمہیں خوب جانتا ہے کہ جب اوس نے تمہیں زمین سے اوٹھان دی اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں چھپے تھے تو اپنی جانوں کو آپ اچھا نہ کہو' خدا خوب جانتا ہے جو پرہیز گار ہے' اور فرماتا ہے: "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىْ مَنْ يَّشَآءُ" (النساء: ۴۹) کیا تو نے دیکھا ان لوگوں کو جو آپ اپنی جان کو ستھرا بتاتے ہیں بلکہ خدا ستھرا کرتا ہے جسے چاہے' حدیث میں ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "من قال انا عالم فهو جاهل" جو اپنے آپ کو عالم کہے وہ جاہل ہے۔" رواہ الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمر رضی اللہ تعالٰی عنہما بسند حسن "ہاں! اگر کوئی شخص حقیقت میں عالم دین ہو اور لوگ اس کے فضل سے ناواقف اور یہ اس نیک نیت سے کہ وہ آگاہ ہو کر فیض لیں' ہدایت پائیں' اپنا عالم ہونا ظاہر کرے تو مضائقہ نہیں جیسے سیدنا یوسف علی نبینا الکریم وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا تھا: "انی حفیظ علیم" پھر یہ بھی سچے عالموں کے لیے ہے۔ زید جاہل کا اپنے آپ کو مولوی صاحب کہنا دونا گناہ ہے کہ اس کے ساتھ جھوٹ اور جھوٹی تعریف کا پسند کرنا بھی شامل ہوا' قال اللہ عزوجل "لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ

يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ '' (آل عمران: ۱۸۸) ہرگز نہ جانیو تو انہیں جو اتراتے ہیں اپنے کام پر اور دوست رکھتے ہیں اسے کہ تعریف کیے جائیں اس بات سے جو انہوں نے نہ کی تو ہرگز نہ جانیو انہیں عذاب سے پناہ کی جگہ میں اور ان کے لیے دکھ کی مار ہے۔ ''معالم شریف'' میں عکرمہ تابعی شاگرد عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ''يفرحون باضلالهم الناس و بنسبته الناس اياهم الى العلم وليسوا باهل العلم. خوش ہوتے ہیں لوگوں کو بہکانے پر اور اس پر کہ لوگ انہیں مولوی کہیں حالانکہ مولوی نہیں'' جاہل کی وعظ گوئی بھی گناہ ہے' وعظ میں قرآن مجید کی تفسیر ہوگی یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث یا شریعت کا مسئلہ اور جاہل کو ان میں کسی چیز کا بیان جائز نہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''من قال فى القران بغير علم فليتبوا مقعده من النار. جو بے علم قرآن کی تفسیر بیان کرے وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے'' رواه الترمذى و صححه عن ابن عباس رضى الله تعالىٰ عنهما۔ احادیث میں اسے صحیح وغلط و ثابت وموضوع کی تمیز نہ ہوگی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''من يقل على مالم اقل فليتبوا مقعده من النار'' (جو مجھ پر وہ بات کہے جو میں نے نہ فرمائی وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے) رواه البخارى فى صحيحه عن سلمة بن الاكوع رضى الله تعالىٰ عنهٗ اور فرماتے ہیں' صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ''افتوا بغير علم فضلوا و اضلوا. بے علم مسئلہ بیان کیا سو آپ بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا'' رواه الائمة احمد و الشيخان و الترمذى و ابن ماجة عن عبدالله بن عمرو رضى الله تعالىٰ عنهما۔ دوسری حدیث میں آیا' حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''من افتى بغير علم لعنته ملئكة السماء و الارض. جو بے علم فتویٰ دے اسے آسمان وزمین کے فرشتے لعنت کریں'' رواه ابن عساكر عن امير المومنين على كرم الله وجهه۔ جاہل کا پیر بننا' لوگوں کو مرید کرنا' چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا' چھوٹا منہ بڑی بات ہے' پیر ہادی ہوتا ہے اور جاہل کی نسبت ابھی حدیثوں سے گزرا کہ ہدایت نہیں کرسکتا' نہ قرآن سے نہ حدیث سے نہ فقہ سے

ع   کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

(امام احمد رضا قادری متوفی ۱۳۴۰ھ فتاویٰ رضویہ ج ۱/ ۱۰ ص ۹۶۔ ۹۵ مطبوعہ مکتبہ رضویہ' کراچی)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا۔

مسئلہ: از اجمیر مقدس محلہ لاکھی کوٹھڑی اور پری گلی نزد پیر زادگان مسئولہ کمال الدین ۸ شوال ۲۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک اپنے کو عوام پر مولوی ظاہر کرے' جس نے نہ تو کسی مدرسہ میں تعلیم با قاعدہ حاصل کی ہو اور نہ جس نے کوئی سند منشی عالم فاضل کی حاصل کی اور خود ساختہ استفتاء پر خود ہی جواب تحریر کردے اور طلباء و مدرسین سے دستخط کرائے اور جس سے اپنی ذات کا متمتع ہونا مقصود ہو اور جو جید عالم و مولوی صاحبان و قاضی صاحب پر شہرت حاصل کرنے اور زر حاصل کرنے کی غرض سے جابجا حملہ کرے اور جو مدت تک قاضی صاحب کے پیچھے نماز ادا کرتا رہا ہو اور چند روز سے قاضی صاحب کے پیچھے نماز ادا نہیں کرتا ہے اور صدہا علماء قاضی صاحب کے پیچھے نماز ادا کرتے رہے ہیں۔ بينوا توجروا.

الجواب: سند حاصل کرنا تو کچھ ضرور نہیں ہاں باقاعدہ تعلیم پانا ضرور ہے مدرسہ میں ہو یا کسی عالم کے مکان پر اور جس نے بے قاعدہ تعلیم پائی وہ جاہل محض سے بدتر نیم ملا خطرہ ایمان ہوگا' ایسے شخص کو فتویٰ نویسی پر جرأت حرام ہے' حدیث میں ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''من افتى بغير علم لعنته ملائكة السماء و الارض. جو بے علم فتویٰ دے اس پر آسمان وزمین کے فرشتوں کی لعنت ہے'' اور اگر فتویٰ سے اگرچہ صحیح ہو وجہ اللہ مقصود نہیں بلکہ اپنا کوئی دنیاوی نفع منظور ہے تو یہ دوسرا سبب

لعنت ہے کہ آیات اللہ کے عوض ثمن قلیل حاصل کرنے پر فرمایا: " اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (آل عمران: ۷۷) ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور اللہ ان سے کلام نہ فرمائے گا اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف نظر رحمت کرے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے" اور علمائے دین کی توہین کرنے والا منافق ہے' حدیث میں ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: " ثلثة لا یستخف بحقهم الا منافق بین النفاق ذو العلم و ذوا الشیبة فی الاسلام و امام مقسط. تین شخصوں کا حق ہلکا نہ جانے گا مگر جو منافق کھلا منافق ہو' (۱) عالم' (۲) اور وہ جسے اسلام میں بڑھاپا آیا اور (۳) سلطان اسلام عادل۔ تحصیل زر کے لیے علماء و مسلمین پر بے جا حملہ کرنے والا ظالم ہے اور ظلم قیامت کے دن ظلمات۔ قاضی مذکور جیسے امام کے پیچھے بلاوجہ شرعی نماز ترک کرنا تفریق جماعت یا ترک جماعت ہے اور دونوں حرام و ناجائز۔ واللہ تعالیٰ اعلم (فتاویٰ رضویہ ج ۲/ ۱۰ص ۳۰۸' مطبوعہ مکتبہ رضویہ' کراچی)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے اس جواب سے یہ ظاہر ہو گیا کہ بے علم کا وعظ کرنا اور لوگوں کو بیعت کرنا جائز نہیں ہے اور علماء دین کی توہین کرنا نفاق ہے جیسا کہ جاہل پیروں کا عام وطیرہ ہے' وہ علماء دین کی تخفیف کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور صبر اور نماز (کے ذریعہ) سے مدد حاصل کرو۔ (البقرہ: ۴۵)

اللہ تعالیٰ نے ان کو گمراہ رہنے اور گمراہ کرنے سے منع فرمایا' اور یہ ان کے لیے دشوار امر تھا' کیونکہ گمراہی ان کی طبیعت میں رچ اور بس چکی تھی' اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے مرض کا علاج بتلا دیا کہ وہ صبر کریں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ روزے رکھیں۔

صبر کے معانی

صبر کا معنی ہے: کسی چیز کو تنگی میں روکنا' نیز کہتے ہیں کہ نفس کو عقل اور شریعت کے تقاضوں کے مطابق روکنا صبر ہے۔ مختلف مواقع اور محل استعمال کے اعتبار سے صبر کے مختلف معانی ہیں' مصیبت کے وقت نفس کے ضبط کرنے کو صبر کہتے ہیں' اس کے مقابلہ میں جزع اور بے قراری ہے' اور جنگ میں نفس کے ثابت قدم رہنے کو بھی صبر کہتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں بزدلی ہے' حرام کاموں کی تحریک کے وقت حرام کاموں سے رکنے کو بھی صبر کہتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں فسق ہے' عبادت میں مشقت جھیلنے کو بھی صبر کہتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں معصیت ہے' قلیل روزی پر قناعت کو بھی صبر کہتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں حرص ہے' دوسروں کی ایذا رسانی برداشت کرنے کو بھی صبر کہتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں انتقام ہے۔

صبر کے متعلق احادیث

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام ابن ابی حاتم نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ صبر کی دو قسمیں ہیں' مصیبت کے وقت صبر اچھا ہے' اور اس سے بھی اچھا صبر ہے اللہ کے محارم سے صبر کرنا (یعنی نفس کو حرام کاموں سے روکنا)۔

امام ابن ابی الدنیا' ابو الشیخ اور دیلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صبر کی تین قسمیں ہیں' مصیبت پر صبر کرنا' اطاعت پر صبر کرنا' اور معصیت سے صبر کرنا۔

امام احمد' امام عبد بن حمید' امام ترمذی' امام ابن مردویہ اور امام بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ میں سواری پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا' آپ نے فرمایا: اے بیٹے! کیا میں تم کو ایسے کلمات نہ سکھاؤں جن سے اللہ تمہیں نفع دے' میں نے کہا: کیوں نہیں! آپ نے فرمایا: اللہ کو یاد رکھو' اللہ تمہیں یاد رکھے گا' اللہ کو یاد رکھو تم اس کو اپنے

سامنے پاؤ گے اللہ تعالیٰ کو آسانی میں یاد رکھو وہ تم کو مشکل میں یاد رکھے گا' اور جان لو کہ جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے وہ تم سے ٹلنے والی نہیں تھی اور جو مصیبت تم سے ٹل گئی ہے وہ تمہیں پہنچنے والی نہیں تھی اور اللہ نے تمہیں جس چیز کے دینے کا ارادہ نہیں کیا تمام مخلوق بھی جمع ہو کر تمہیں وہ چیز نہیں دے سکتی اور جو چیز اللہ تمہیں دینا چاہے تو سب مل کر اس کو روک نہیں سکتے' قیامت تک کی تمام باتیں لکھ کر قلم خشک ہو گیا ہے' جب تم سوال کرو تو اللہ سے کرو اور جب تم مدد چاہو تو اللہ سے چاہو اور جب تم کسی کا دامن پکڑو تو اللہ کا دامن پکڑو' اور شکر کرتے ہوئے اللہ کے لیے عمل کرو اور جان لو کہ ناگوار چیز پر صبر کرنے میں خیر کثیر ہے اور صبر کے ساتھ نصرت ہے' اور تکلیف کے ساتھ کشادگی ہے اور مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ امام بیہقی نے حضرت ابوالحویرث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے لیے خوشی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بہ قدر حاجت رزق دیا اور اس نے اس پر صبر کیا۔

امام بخاری نے ''الادب المفرد'' میں اور امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مسلمان لوگوں سے مل جل کر رہتا ہے اور ان کی ایذاء پر صبر کرتا ہے وہ اس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگوں سے مل جل کر نہیں رہتا اور ان کی ایذاء پر صبر نہیں کرتا۔

امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایمان کے دو حصے ہیں' نصف صبر ہے اور نصف شکر ہے۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۶۷۔ ۶۵ ملتقطاً' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

نماز سے مدد حاصل کرنے کا بیان

جب وہ روزہ رکھ کر اپنے نفس کو صاف کر لیں گے تو ان کی دعاؤں کا قبول ہونا زیادہ متوقع ہوگا اور نماز سے مدد حاصل کرنے کی بھی یہی صورت ہے' کیونکہ نماز کی صورت میں متعدد عبادات حاصل ہو جاتی ہیں' مثلاً اعتکاف' قرآن مجید کا پڑھنا' تسبیح اور استغفار وغیرہ اور نماز میں اللہ تعالیٰ سے مناجات ہے اور نماز سے بندہ کے گناہ ڈھل جاتے ہیں اور انسان دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھتا ہے تو جب وہ گناہوں سے پاک صاف ہو کر تسبیح اور استغفار کے بعد دن میں پانچ مرتبہ اللہ تعالیٰ سے مناجات کرے گا تو اس کی دعا کا قبول ہونا زیادہ متوقع ہے۔

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام احمد' امام ابن جریر اور امام ابوداؤد نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی چیز سے خوف یا دہشت لاحق ہوتی تو آپ نماز پڑھتے۔

امام ابن ابی الدنیا اور امام ابن عساکر نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب کسی رات کو آندھی آتی تو آندھی رکنے تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں پناہ لیتے اور جب سورج گرہن لگتا یا چاند گرہن لگتا تو نماز پڑھتے۔

امام سعید بن منصور' امام ابن المنذر' امام حاکم اور امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک سفر میں ان کو ان کے بیٹے کی موت کی خبر دی گئی' وہ سواری سے اترے' دو رکعت نماز پڑھی اور ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھا اور کہا: ہم نے اللہ کے حکم پر عمل کیا ہے کہ ''صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو''۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۶۷' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک نماز ضرور دشوار ہے سوا ان لوگوں کے جو (اللہ کے لیے) خشوع کرنے والے ہیں O (البقرہ: ۴۵)

خشوع کا معنی

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

نفس کی وہ حالت جس کا اثر ظاہری اعضاء میں سکون اور تواضع سے ظاہر ہوتا ہے اس کو خشوع کہتے ہیں' قتادہ نے کہا: دل میں خوف اور نماز میں نظر نیچی رکھنے کو خشوع کہتے ہیں' زجاج نے کہا: جس پر ذلت کے آثار دکھائی دیں وہ خشوع کرنے والا ہے' ابراہیم نخعی نے کہا: سوکھی روٹی کھانے' سخت اور موٹے کپڑے پہننے اور سر جھکانے سے خشوع نہیں ہوتا' خشوع یہ ہے کہ حق بات میں تمہارے نزدیک معزز اور حقیر برابر ہوں' اور اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی تم پر فرض کی ہے اس کی اطاعت میں جھک جاؤ۔ حضرت عمر بن الخطاب نے ایک شخص کو سر جھکائے دیکھا تو فرمایا: سر اٹھاؤ' خشوع صرف تمہارے دل میں ہے' حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا: خشوع دل میں ہوتا ہے اور یہ کہ مسلمانوں کے لیے تمہارے ہاتھ ملائم ہوں' اور نماز میں ادھر ادھر التفات نہ کرو' جس نے اپنے دل سے زیادہ خشوع کو ظاہر کیا اس نے نفاق کو ظاہر کیا۔ سہل بن عبداللہ نے کہا: خشوع اس وقت ہوگا جب خوف خدا سے تمہارے بدن کا ہر رونگٹا کھڑا ہو جائے' قرآن مجید میں ہے:

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ (الزمر: ۲۳)

(قرآن سننے سے) ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

سلف صالحین اپنے خشوع کے اثرات کو چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسا خشوع محمود ہے اور خشوع مذموم یہ ہے جیسے جاہل لوگ تکلف سے روتے ہیں اور سر جھکاتے ہیں تاکہ لوگ ان کو نیک اور بزرگ جانیں' یہ نفس کا فریب اور شیطان کا گمراہ کرنا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۳۷۵۔ ۳۷۴' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین اور جو لوگ فسق و فجور میں ڈوبے ہوئے اور آخرت کے منکر ہیں ان پر نماز کا پڑھنا دشوار ہے اور جو مخلص مومنین ہیں اور اطاعت گزار ہیں' اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کے دیدار کے مشتاق ہیں ان پر نماز آسان ہے' اس کسوٹی پر اپنے آپ کو پرکھ کر دیکھنا چاہیے اور اگر ہمیں نماز پڑھنا گراں اور دشوار معلوم ہو تو پھر ہمیں اپنے ایمان اور آخرت پر یقین کا جائزہ لینا چاہیے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ

اے بنو اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی اور یہ کہ میں نے تم کو (اس زمانہ کے) لوگوں

فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ

پر فضیلت دی تھی O اور اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی شخص کا بدلہ نہ ہو سکے گا'

عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا

اور نہ کسی شخص کی (بلا اذن الٰہی) شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ کسی شخص سے فدیہ

عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی O

اس آیت کو دوبارہ ذکر کیا ہے تاکہ بنو اسرائیل کو نعمتیں یاد دلانے کی تاکید ہو اور اس میں یہ تنبیہ ہے کہ بنو اسرائیل اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا حق ادا کرنے سے غافل ہیں اس آیت میں فرمایا ہے کہ میں نے تم کو تمام عالمین پر فضیلت دی تھی' اس پر یہ سوال ہے کہ تمام عالمین میں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت بھی داخل ہے حالانکہ یہود ان سے افضل نہیں ہیں' اس کا جواب یہ ہے کہ عالمین سے مراد ان کے زمانہ کے لوگ ہیں قیامت تک کے لوگ مراد نہیں ہیں۔ اس تاویل کی اس لیے ضرورت ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو خیر امت قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ. (آل عمران: ۱۱۰)

تم ان امتوں میں سب سے بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہیں۔

ہر چند کہ اس آیت کے مخاطب سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بنو اسرائیل ہیں مگر اس سے مراد ان کے آباء واجداد ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان کے بعد تھے' جنہوں نے اپنے دین میں کوئی تغیر اور تبدل کیا تھا اور نہ تورات میں کوئی تحریف کی تھی' اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت نعمتیں عطا فرمائی تھیں' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○ (المائدہ: ۲۰)

اور یاد کیجئے جب موسیٰ نے اپنی امت سے کہا: اے میری امت! اللہ کی وہ نعمتیں یاد کرو جو اس نے تم کو عطا کیں' جب اس نے تم میں انبیاء بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو (اس زمانہ میں) سارے جہانوں میں سے کسی کو نہیں دیا تھا○

یہ نعمتیں ان مخاطبین کے حق میں اس لیے نعمتیں ہیں کہ آباء واجداد کی فضیلتیں اولاد کے حق میں بھی موجب شرف ہوتی ہیں۔

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان یہودیوں کو اپنی نعمتیں یاد دلا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ ان کو عذاب آخرت سے ڈرا کر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اے بنو اسرائیل! اگر تم نے اللہ کی نعمتوں اور اس کی دی ہوئی فضیلتوں کے تقاضوں کو پورا نہ کیا اور حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تو تم اللہ کے عذاب سے کسی طرح بچ نہیں سکو گے' سزا سے بچنے کی چار صورتیں ہیں' ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ مجرم کے بدلہ میں اس شخص کو سزا دی جائے' دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص مجرم کی سفارش کردے' تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص مجرم کی طرف سے تاوان یا فدیہ ادا کرے اور چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص دباؤ اور زور ڈال کر مجرم کی مدد کرے اور اس کو عذاب سے چھڑا لے' ان چاروں صورتوں میں سے کسی صورت سے بھی مجرم کو اللہ کے عذاب سے چھڑایا نہیں جا سکتا۔

شفاعت کی تحقیق

اس آیت سے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مجرموں کی شفاعت جائز نہیں ہے' خوارج اور معتزلہ کا یہی مذہب ہے' شیخ ابن تیمیہ اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا بھی یہی نظریہ ہے' شیخ اسماعیل دہلوی کا بھی یہی مذہب ہے اور ان کے متبعین کا بھی یہی نظریہ ہے اور اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ اللہ کے اذن سے انبیاء علیہم السلام' ملائکہ' اولیاء کرام' علماء' حفاظ قرآن اور صالح مومنین گنہ گاروں کی شفاعت کریں گے' یہ شفاعت گناہ کبیرہ کرنے والوں کی مغفرت اور تخفیف عذاب کے لیے ہوگی اور

صالحین کے لیے ترقی درجات کی شفاعت ہوگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بعض کفار کے لیے بھی تخفیف عذاب کی شفاعت کریں گے' شفاعت کبریٰ اور شفاعت کی بعض دیگر اقسام ہمارے نبی سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہیں' اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفاعت بالوجاہت بھی عطا فرمائی ہے۔

ہم نے ''شرح صحیح مسلم'' جلد ثانی میں مسئلہ شفاعت پر تفصیل سے بحث کی ہے' شفاعت کا معنیٰ' منکرین شفاعت کے مذاہب' ان کے دلائل اور ان کے جوابات بیان کیے ہیں اور شفاعت کے ثبوت میں قرآن مجید کی پچاس سے زیادہ آیات اور چالیس احادیث ذکر کی ہیں اور مسئلہ شفاعت پر اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں اور شفاعت کی ۴۹ اقسام ذکر کی ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص اقسام کا بیان کیا ہے' اس مسئلہ کو تفصیل سے جاننے کے لیے اس مقام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اس جگہ ہم شفاعت کے ثبوت میں قرآن مجید کی چند آیات اور بعض احادیث ذکر کریں گے۔

فنقول و باللہ التوفیق و بہ الاستعانۃ یلیق.

شفاعت پر قرآن کریم سے دلائل

انبیاء علیہم السلام کی شفاعت

حضرت نوح علیہ السلام:

(۱) رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا. (نوح: ۲۸)
اے میرے رب! میری' میرے والدین کی اور جو مومن میرے گھر میں داخل ہوں ان کی مغفرت فرما۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام:

(۲) رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ○ (ابراہیم: ۴۱)
اے ہمارے رب! روز حشر میری' میرے والدین کی اور تمام مومنوں کی مغفرت فرما ○

(۳) سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۖ إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ○ (مریم: ۴۷)
میں عنقریب اپنے رب سے تیری شفاعت کروں گا' وہ مجھ پر مہربان ہے ○

(۴) إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ. (الممتحنہ: ۴)
مگر ابراہیم کا قول اپنے باپ کے لیے کہ میں تیری شفاعت کروں گا۔

(۵) فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○ (ابراہیم: ۳۶)
جو میرا پیروکار ہے' وہ میرا ہے اور جس نے میرے کہنے پر عمل نہیں کیا تو اس کے لیے تو بخشنے والا اور مہربان ہے ○

حضرت موسیٰ علیہ السلام:

(۶) رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ. (الاعراف: ۱۵۱)
اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی کو معاف فرما اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر دے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام:

(۷) سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ○ (یوسف: ۹۸)
میں عنقریب اپنے رب سے تمہاری شفاعت کروں گا' لاریب وہ بخشنے والا مہربان ہے ○

حضرت یوسف علیہ السلام:

(٨) لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ .
(یوسف: ۹۲)

آج تم پر کوئی ملامت نہیں اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

(٩) اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ O (المائدہ: ۱۱۸)

اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو بخش دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے O

حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے طلب شفاعت:

(١٠) وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا O (النساء: ۶۴)

اور اگر یہ لوگ گناہ کر کے اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو آپ کی بارگاہ میں حاضری دیں اپنے گناہوں پر اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں اور آپ ان کی شفاعت کر دیں تو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں O

(١١) وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ .
(محمد: ۱۹)

اور اپنے (بہ ظاہر) خلاف اولیٰ کاموں اور مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے لیے مغفرت طلب کیجئے۔

(١٢) فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ . (آل عمران: ۱۵۹)

ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لیے شفاعت کیجئے۔

صالحین کی شفاعت مومنین کے لیے:

(١٣) رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ .
(الحشر: ۱۰)

اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما اور ہم سے پہلے گزرے ہوئے ہمارے مسلمان بھائیوں کی۔

فرشتوں کی شفاعت:

(١٤) اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا .
(المومن: ۷)

وہ فرشتے جو عرش الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے اردگرد ہیں وہ اپنے رب کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے لیے بخشش طلب کرتے ہیں۔

(١٥) يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا O (النبا: ۳۸)

جس دن جبرئیل اور عام فرشتے صف باندھے کھڑے ہوں گے اس دن اللہ تعالیٰ کے حضور وہی بات کر سکے گا جس کو رحمٰن اجازت دے گا اور وہ صحیح بات کرے گا O

(١٦) وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى . (الانبیاء: ۲۸)

اور فرشتے اسی کی شفاعت کریں گے جس کی شفاعت پر اللہ تعالیٰ راضی ہوگا۔

(١٧) فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ O (المومن: ۷)

اے اللہ! ان لوگوں کو معاف کر جنہوں نے توبہ کی اور تیری راہ پر چلے اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچا O

(١٨) رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ

اے ہمارے رب! مسلمانوں کو دائمی جنت میں داخل فرما جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور جو ان کے آباء ازواج

الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (المؤمن: ۸) اور اولاد میں سے صالح ہوں ان کو بھی جنت میں داخل فرما اے رب! تو غالب اور حکمت والا ہے ۝

(۱۹) وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (المؤمن: ۹) اے اللہ! ان لوگوں کو گناہوں کے عذاب سے بچا اور جس شخص کو تو نے اس دن گناہوں کے عذاب سے بچا لیا اس پر تو نے رحم کیا اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے ۝

کفار کا شفاعت سے محروم ہونا' شفاعت کا ان کے لیے نفع آور نہ ہونا اور ان کا کوئی مددگار نہ ہونا اور اس محرومی پر ان کی حسرت (اگر مسلمانوں کو بھی کسی کی نصرت اور شفاعت حاصل نہ ہو تو کفار کے لیے یہ محرومی باعث حسرت نہ ہوتی کیونکہ وہ دیکھیں گے کہ مسلمان بھی اس محرومی میں ان کے ساتھ ہیں)۔

(۲۰) فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ۝ (المدثر: ۴۸) کفار کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت نفع نہ دے گی ۝

(۲۱) فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَاۗءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ ۔ (الاعراف: ۵۳) تو کیا ہماری شفاعت کرنے والے کوئی ہیں؟

(۲۲) فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ۝ (الشعراء: ۱۰۰) جو ہماری شفاعت کریں ۝

(۲۳) لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۔ (الانعام: ۵۱) اللہ سے ہٹ کر کفار کا کوئی مددگار ہے نہ کوئی شفاعت کرنے والا۔

(۲۴) مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ۝ (المؤمن: ۱۸) کفار کے لیے کوئی ایسا مددگار اور شفاعت کرنے والا نہ ہوگا جس کی بات مانی جائے ۝

شفاعت پر احادیث سے دلائل

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز دیکھوں گا۔ اللہ تعالیٰ جب تک چاہے گا مجھے سجدہ میں رکھے گا' پھر مجھ سے کہا جائے گا: اپنا سر اٹھاؤ' مانگو ملے گا' شفاعت کرو قبول ہوگی' پھر میں اپنے رب کی وہ حمد کروں گا جو اللہ تعالیٰ مجھے اس وقت تعلیم کرے گا' پھر میں شفاعت کروں گا' پھر میرے لیے ایک حد مقرر کی جائے گی' پھر میں گنہگاروں کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دوں گا' پھر میں دوبارہ سجدہ کروں گا اور پھر شفاعت کروں گا (تین یا چار بار) حتیٰ کہ جہنم میں صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جن کو قرآن نے روک لیا ہے۔ قتادہ کہتے تھے: جن پر جہنم کا دوام واجب ہو چکا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۷۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن میری شفاعت حاصل کرنے میں سب سے زیادہ کامیاب شخص وہ ہوگا جس نے خلوص دل سے کلمہ پڑھا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۰ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئیں ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ ایک ماہ کی مسافت کے رعب سے میری مدد کی گئی' تمام روئے زمین کو

میرے لیے مسجد اور آلہ تیمم بنا دیا' لہٰذا میری امت سے جو شخص نماز کا وقت پائے نماز پڑھ لے اور میرے لیے مال غنیمت حلال کر دیا گیا جو مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہ تھا' مجھے شفاعت عطا کی گئی' پہلے نبی ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے اور مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۹۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں لوگوں میں سب سے پہلے جنت کی شفاعت کروں گا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نبی کی ایک دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور ہر ایک نے اس دعا کو دنیا میں خرچ کر لیا اور میں نے اس دعا کو قیامت کے دن اپنی امت کی شفاعت کے لیے بچا کر رکھا ہے اور یہ ان شاء اللہ میری امت کے ہر اس فرد کو حاصل ہو گی جو شرک سے پاک رہے گا۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم میں ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول تلاوت فرمایا: ''رب انھن اضللن'' اور عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول تلاوت فرمایا: اے اللہ! اگر تو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو' تو غالب اور حکیم ہے' پھر آپ نے ہاتھ بلند کیے اور عرض کیا: اے اللہ! میری امت' میری امت'' پھر آپ پر گریہ طاری ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبرائیل! محمد کے پاس جاؤ اور پوچھو (حالانکہ وہ خوب جانتا ہے) '' کیوں روتے ہو؟'' پھر جبرائیل آپ کے پاس آئے اور آپ سے دریافت کیا' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں خبر دی' پھر جبرائیل نے جا کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا حالانکہ وہ خوب جانتا ہے' اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اور فرمایا: جا کر کہو: ہم تم کو تمہاری امت کے بارے میں راضی کر دیں گے اور رنجیدہ نہیں ہونے دیں گے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کے چچا ابوطالب کا ذکر کیا گیا' آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میری شفاعت سے اس کو فائدہ پہنچے گا (عذاب میں تخفیف ہو گی)۔

(جامع ترمذی ص ۳۵۱' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اپنی امت کے گناہ کبیرہ کرنے والوں کی شفاعت کروں گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں سے ایک شخص (اویس قرنی یا عثمان) کی شفاعت کے سبب سے بنو تمیم کے افراد سے زیادہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں سے کچھ لوگ ایک گروہ کی شفاعت کریں گے' کچھ ایک قبیلہ کی' کچھ ایک جماعت کی اور کچھ ایک شخص کی حتیٰ کہ وہ سب جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ (جامع ترمذی ص ۳۵۱' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس اللہ کا پیغام آیا اور مجھے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا کہ اللہ میری آدھی امت کو جنت میں داخل کر دے' یا میں شفاعت کروں۔ میں نے شفاعت کو اختیار

کرلیا اور یہ شفاعت ہر اس مسلمان کو حاصل ہوگی جو شرک پر نہیں مرے گا۔ (جامع ترمذی ص ۳۵۱ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں سے جس شخص کے دو پیش رو (فوت شدہ کم سن بچے) ہوں وہ اس شخص کو جنت میں لے جائیں گے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: آپ کی امت میں سے جس شخص کا ایک پیش رو ہو؟ فرمایا: اے صاحب خیرات! اس کو وہ ایک پیش رو ہی لے جائے گا۔ عرض کیا: جس کا کوئی پیش رو نہ ہو؟ فرمایا: "جس کا کوئی نہیں ہوگا اس کا "میں" ہوں گا کیونکہ میری امت کو میری جدائی سے بڑھ کر کسی کی جدائی سے تکلیف نہیں پہنچی۔ (جامع ترمذی ص ۱۷۲ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم موذن سے اذان سنو تو وہ کلمات دہراؤ' پھر مجھ پر درود شریف پڑھو' کیونکہ جو مجھ پر ایک صلوٰۃ بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس صلوات نازل فرماتا ہے پھر میرے لیے وسیلہ (مقام رفیع) کی دعا کرو' کیونکہ وہ جنت میں ایک مرتبہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے صرف ایک بندہ کو ملے گا اور مجھے امید ہے کہ وہ بندہ میں ہوں گا' جس شخص نے میرے لیے وسیلہ کی دعا کی اس پر میری شفاعت واجب ہوگئی۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۶۶ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام دار قطنی روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اس کے حق میں میری شفاعت واجب ہوگئی۔ (سنن دار قطنی ج ۲ ص ۲۷۸ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ

اور یاد کرو جب ہم نے تمہیں آل فرعون سے نجات دی جو تم کو بدترین عذاب پہنچاتے تھے

يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِىْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ

تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑتے تھے' اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے

مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ

عظیم آزمائش تھی O اور جب ہم نے تمہارے لیے سمندر کو چیر دیا' پھر ہم نے تم کو

اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى

نجات دی اور ہم نے آل فرعون (فرعون اور اس کے متبعین) کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے O اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ

اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا' پھر اس کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظالم تھے O

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا

پھر اس کے بعد ہم نے تم کو معاف کیا تاکہ تم (ہمارا) شکر ادا کرو O اور جب ہم نے

مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى

موسیٰ کو کتاب دی اور حق اور باطل میں فرق کرنے والا (معجزہ) دیا' تاکہ تم ہدایت پاؤ O اور جب موسیٰ نے

لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ

اپنی امت سے کہا: اے میری امت! بے شک تم نے بچھڑے کو (معبود) بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے'

فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ

پس تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف توبہ کرو' سو تم ایک دوسرے کو قتل کرو' تمہارے خالق کے نزدیک یہ تمہارے

بَارِئِكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

لیے زیادہ بہتر ہے' تو اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی' بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے O

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یاد کرو جب ہم نے تمہیں آل فرعون سے نجات دی جو تم کو بدترین عذاب پہنچاتے تھے۔

(البقرہ: ۴۹)

بنو اسرائیل پر فرعون کے عذاب کا بیان

سورہ بقرہ کی آیت ۴۹ سے لے کر آیت ۶۰ تک اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل پر کی گئی دس نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے' ان میں پہلی نعمت' بنو اسرائیل کو فرعون کے مظالم اور اس کے عذاب سے نجات عطا فرمانا ہے۔

امام ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

امام ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ فرعون بنو اسرائیل کو عذاب دیتا تھا' ان سے طرح طرح کے کام لیتا تھا' بعض سے مکان بنواتا' بعض سے کاشتکاری کراتا' بعض سے مزدوری لیتا اور جن سے کوئی کام نہ لیتا ان سے جزیہ لیتا تھا۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۲۲۳' مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

سدی نے بیان کیا ہے کہ فرعون نے خواب دیکھا کہ بیت المقدس سے ایک آگ نمودار ہوئی اور مصر کے مکانوں کو لپیٹ میں لیتی ہوئی آئی اور قبطیوں کو جلا ڈالا اور بنو اسرائیل کو چھوڑ دیا' اس نے جادوگروں اور کاہنوں کو بلایا اور اس خواب کی تعبیر معلوم کی' انہوں نے کہا: جس شہر سے بنو اسرائیل آئے ہیں یعنی بیت المقدس سے' وہاں ایک شخص پیدا ہوگا جس کے ہاتھ سے مصر کے لوگ مارے جائیں گے' تب فرعون نے یہ حکم دیا کہ بنو اسرائیل کے ہاں جو لڑکا پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے اور جو لڑکی پیدا ہو اس کو چھوڑ دیا جائے' اس نے قبطیوں سے کہا: تمہارے جو غلام باہر کام کرتے ہیں ان کو بلا لو اور ان کی جگہ بنو اسرائیل سے کام لو اور ان سے پیچ اور رذیل کام لو جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ (القصص: ۴)	بے شک فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس نے (اپنے) اہل زمین میں الگ الگ گروہ کر کے ان میں ایک گروہ (بنو اسرائیل) کو کمزور کر رکھا تھا' ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتا۔

بنو اسرائیل کے بیٹے مارے جا رہے تھے' اور بنو اسرائیل کے بوڑھے قضاء الٰہی سے مر رہے تھے' ان میں سے کوئی بچہ بڑا نہیں ہوتا تھا' تب قبطیوں نے کہا کہ بنو اسرائیل کے بچے بڑے نہیں ہو رہے اور بوڑھے مر رہے ہیں' اس طرح ان میں کوئی مرد باقی نہیں رہے گا' پھر ہمارے کام کون کرے گا؟ تب فرعون نے یہ حکم دیا کہ ایک سال بنو اسرائیل کے بیٹے ذبح کر دیئے جائیں اور ایک سال چھوڑ دیئے جائیں' جس سال وہ ذبح نہیں کرتے تھے اس سال حضرت ہارون پیدا ہوئے اور ان کو چھوڑ دیا گیا اور جس سال بچوں کو ذبح کیا جاتا تھا اس سال حضرت موسیٰ پیدا ہوئے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۲۱۵ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

فرعون کا نام

فرعون مصر کے بادشاہ کا لقب ہے جیسے روم کے بادشاہ کا لقب قیصر ہے اور فارس کے بادشاہ کا لقب کسریٰ ہے اور یمن کے بادشاہ کا لقب تبع ہے اور حبشہ کے بادشاہ کا لقب نجاشی ہے' ترک کے بادشاہ کا لقب خاقان ہے' مسلمانوں کے بادشاہ کا لقب سلطان' ہندوؤں کے بادشاہ کا لقب راجا اور انگلستان کے بادشاہ کا لقب جارج ہے' فرعون کا لفظ عجمہ اور علمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

امام ابن جریر طبری نے امام ابن اسحاق کے حوالے سے لکھا ہے کہ قرآن میں جس فرعون کا ذکر ہے اس کا نام ولید بن مصعب بن الریان تھا۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۲۱۳ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

آل کا لغوی معنی

علامہ زبیدی حنفی لکھتے ہیں:

کسی شخص کے اہل (بیوی) اور اس کے عیال (اولاد) کو اس شخص کی آل کہتے ہیں' اور اس شخص کے متبعین اور احباء کو بھی آل کہتے ہیں' حدیث میں ہے: سلمان ہمارے آل بیت سے ہے' قرآن مجید میں ہے: ''كداب ال فرعون'' اس میں آل فرعون سے مراد اس کے متبعین ہیں' اور نبی صلی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: صدقہ محمد اور آل محمد کے لیے جائز نہیں ہے۔ امام شافعی نے کہا: اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل ہی وہ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے اور صدقہ کے بدلہ میں ان کو خمس دیا گیا' اور یہ بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب ہیں' نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: آپ کی آل کون ہیں؟ فرمایا: آل علی' آل جعفر' آل عقیل اور آل عباس' حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: آل محمد کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: ہر تقی (متقی)۔

آل کا استعمال غالباً اشراف میں ہوتا ہے' اس لیے آل اسکاف (موچیوں کی آل) نہیں کہا جائے گا اگرچہ اہل اسکاف کہا جاتا ہے' نیز اس کی اضافت اعلام ناطقین کی طرف ہوتی ہے نکرہ' زمان اور مکان کی طرف اس کی اضافت نہیں ہوتی' اس لیے آل رجل' آل زمان یا آل مکان نہیں کہا جائے گا' اس کی اصل اہل ہے اور اس کی تصغیر اہیل آتی ہے۔

(تاج العروس ج ۷ ص ۲۱۶ 'مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

امام ابن جریر طبری نے لکھا ہے کہ آل فرعون سے مراد فرعون کے اہل دین اور اس کے متبعین ہیں۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۲۱۲ مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت ۱۴۰۹ھ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کے مصداق کی تحقیق

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کے متعلق تین قول ہیں: آپ کے متبعین اور آپ کی ازواج اور آپ کی ذریت اور مومنین میں سے آپ کے نسبی قرابت دار اور یہ آل علی آل جعفر آل عقیل آل عباس اور آل حارث بن عبد المطلب ہیں۔ (ہدایہ اولین ص ۲۰۶)

آل سے آپ کے متبعین ہونے پر دلیل یہ ہے کہ قرآن میں جہاں آل فرعون کا لفظ آیا ہے اس سے فرعون کے متبعین اور اس کے اہل دین مراد ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام سے ان کے بیٹے کے متعلق فرمایا:

اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ٘ — بے شک وہ آپ کے اہل سے نہیں ہے' بے شک اس کے عمل نیک نہیں ہیں۔ (ہود: ۴۶)

یہی وجہ ہے کہ ابوجہل اور ابولہب کو آپ کی آل اور اہل نہیں قرار دیا جاتا حالانکہ آپ کے اور ان کے درمیان نسبی قرابت داری ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہ آواز بلند فرماتے ہوئے سنا ہے کہ سنو! فلاں شخص کی آل میرے ولی نہیں ہیں' میرا ولی اللہ ہے اور نیک مومن میرے ولی ہیں۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۵ مطبوعہ مطبع نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۸۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام بیہقی اپنی سند کے ساتھ امام عبد الرزاق سے روایت کرتے ہیں:

ایک شخص نے ثوری سے پوچھا: آل محمد کون ہیں؟ ثوری نے کہا: اس میں لوگوں کا اختلاف ہے' بعض نے کہا: اہل بیت ہیں اور بعض نے کہا: جو آپ کی اطاعت کرے اور آپ کی سنت پر عمل کرے وہ آپ کی آل ہے' امام بیہقی نے کہا: امام عبد الرزاق کا بھی یہی قول ہے اور یہی رائے حق کے مشابہ ہے' کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح سے فرمایا کہ کشتی میں ہر جوڑے میں سے دو کو اور اپنے اہل کو سوار کرو' حضرت نوح نے عرض کیا: میرا بیٹا بھی میرے اہل سے ہے' تیرا وعدہ حق ہے اور تو احکم الحاکمین ہے' فرمایا: اے نوح! بے شک تمہارا بیٹا تمہارے اہل سے نہیں ہے' اس کے عمل نیک نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شرک کی وجہ سے حضرت نوح کے بیٹے کو ان کے اہل سے نکال دیا۔ (سنن کبریٰ ج ۲ ص ۱۵۲ مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

نیز امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل آپ کی امت ہے۔

(سنن کبریٰ ج ۲ ص ۱۵۲ مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام طبرانی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟ فرمایا: ہر متقی شخص۔ (معجم الصغیر ج ۱ ص ۱۱۵ مطبوعہ مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ' ۱۳۸۸ھ)

حافظ الہیثمی نے اس حدیث کو درج کر کے لکھا ہے: اس میں نوح بن ابی مریم ایک ضعیف راوی ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۲۶۹ مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

امام بیہقی نے اس حدیث کو ایک اور سند سے روایت کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں ابوھرمز بصری ایک ضعیف راوی ہے۔
(سنن کبریٰ ج ۲ ص ۱۵۲ 'مطبوعہ نشر السنہ' ملتان)

قاضی عیاض مالکی نے بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے۔ (الشفاء ج ۲ ص ۶۶ 'مطبوعہ عبد التواب اکیڈمی' ملتان)

حافظ سیوطی نے اس حدیث کو امام ابن مردویہ' طبرانی اور بیہقی کے حوالوں سے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے۔
(الدر المنثور ج ۳ ص ۱۸۳ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

ہر چند کہ اس حدیث کی سند میں ایک ضعیف راوی ہے لیکن یہ تعدد اسانید کی وجہ سے حسن لغیرہ ہوگئی اور فضائل اور مناقب میں حدیث ضعیف کا بھی اعتبار کیا جاتا ہے' نیز اس حدیث کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوگ اپنے اپنے صدقات لے کر آتے تو آپ فرماتے: اے اللہ! آل فلاں پر صلوٰۃ نازل فرما' سو میرے والد آپ کے پاس اپنا صدقہ لے کر آئے تو آپ نے فرمایا: اے اللہ! آل ابی اوفی پر صلوٰۃ نازل فرما۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۰۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث سے وجہ استدلال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر صلوٰۃ پڑھی جاتی ہے اور آپ کا آل ابی اوفی پر صلوٰۃ پڑھنا اس کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ بھی آپ کی آل میں ہیں۔

نیز امام حاکم روایت کرتے ہیں:

حضرت مصعب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیک مسلمان ہمارے اہل بیت سے ہیں۔ (المستدرک ج ۳ ص ۵۹۸ 'مطبوعہ دار الباز' مکہ مکرمہ)

اس حدیث میں بھی اس پر دلالت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر متبع اور صالح مومن آپ کی آل سے ہے۔

آل کے متعلق دوسرا قول ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت اور آپ کی ازواج' اس کی دلیل یہ حدیث ہے' امام مسلم روایت کرتے ہیں:

ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم آپ پر کس طرح صلوٰۃ پڑھیں؟ آپ نے فرمایا: تم کہو: اے اللہ! محمد پر صلوٰۃ نازل فرما اور آپ کی ازواج اور آپ کی ذریت پر' جیسا کہ تو نے آل ابراہیم پر صلوٰۃ نازل فرمائی ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث میں آپ نے آل کی جگہ ازواج اور ذریت کا ذکر فرمایا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی ازواج اور آپ کی ذریت بھی آپ کی آل ہیں۔

علامہ نووی لکھتے ہیں کہ اس میں اختلاف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کون ہیں؟ ازہری اور دیگر محققین کا مختار یہ ہے کہ تمام امت آپ کی آل ہے' دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہل بیت (ازواج) اور آپ کی ذریت ہے۔
(شرح مسلم ج ۱ ص ۱۷۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

آل کے متعلق تیسرا قول ہے: مومنین میں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی قرابت دار یعنی بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب آپ کی آل ہیں' اس پر دلیل یہ حدیث ہے: امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت حسن بن ابی طالب رضی اللہ عنہما نے صدقہ کی ایک کھجور اپنے منہ

میں رکھ لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھوڑ دو' چھوڑ دو اس کو پھینک دو' کیا تم کو علم نہیں کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے؟
(صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۴۴ ۔ ۳۴۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حضرت عبداللہ بن حارث بن نوفل ہاشمی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ صدقات لوگوں کا میل ہیں یہ محمد اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال نہیں ہیں۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۴۵ ۔ ۳۴۴ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ہم نے تمہارے لیے سمندر کو چیر دیا' پھر ہم نے تم کو نجات دی۔ (البقرہ: ۵۰)

بنو اسرائیل کے لیے سمندر چیرنے کا بیان

امام ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

عمرو بن میمون بیان کرتے ہیں: جب حضرت موسیٰ بنو اسرائیل کو لے کر مصر سے جانے لگے تو فرعون کو اس کی خبر پہنچ گئی' اس نے کہا: ابھی رہنے دو' صبح مرغ کی اذان کے ساتھ ان کا پیچھا کریں گے' اس رات مرغ نے اذان نہیں دی' جب صبح ہوئی تو فرعون نے ایک بکری ذبح کرائی اور کہا: جب میں اس کی کلیجی کھانے سے فارغ ہوں تو یہاں چھ لاکھ قبطی جمع ہو جائیں' پھر چھ لاکھ قبطیوں کے ساتھ فرعون نے بنو اسرائیل کا پیچھا کیا' ادھر حضرت موسیٰ جب سمندر کے کنارے پہنچے تو ان کے اصحاب میں سے یوشع بن نون نے کہا: اے موسیٰ! آپ کے رب نے کس طرف سے نکلنے کا حکم دیا تھا؟ حضرت موسیٰ نے اپنے سامنے سمندر کی طرف اشارہ کیا۔ یوشع نے اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا حتیٰ کہ جب وہ سمندر کی گہرائی میں پہنچا تو پھر لوٹ آئے اور پھر پوچھا کہ آپ کے رب نے کہاں سے نکلنے کا حکم دیا تھا؟ تین بار اس طرح ہوا' پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی طرف یہ وحی کی کہ اپنے عصا کو سمندر پر ماریں' جب حضرت موسیٰ نے سمندر پر عصا مارا تو وہ بارہ حصوں میں منقسم ہو کر پھٹ گیا حتیٰ کہ حضرت موسیٰ بنو اسرائیل کے بارہ گروہوں کے ساتھ اس سے پار گزر گئے۔ بعد میں جب فرعون اور اس کے ساتھ قبطی اس سے گزرنے لگے تو سمندر آپس میں مل گیا اور فرعون اور قبطی غرق ہو گئے۔ یہ سمندر بحر قلزم تھا' قتادہ نے کہا ہے کہ بنو اسرائیل چھ لاکھ تھے اور قبطی بارہ لاکھ تھے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۲۱۹ ۔ ۲۱۸ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا' پھر اس کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ (البقرہ: ۵۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نام ونسب کا بیان

امام رازی لکھتے ہیں:

لفظ موسیٰ عبرانی زبان کا لفظ ہے' اور دو کلموں سے مل کر بنا ہے' مو کا معنی ہے: پانی اور سا کا معنی ہے: درخت' حضرت موسیٰ کو ان کی ماں نے فرعون کے خوف سے تابوت میں رکھ دیا تھا اور اس تابوت کو سمندر میں ڈال دیا' سمندر کی موجیں اس تابوت کو فرعون کے گھر کے قریب درختوں کے جھنڈ میں لے آئیں' فرعون کی بیوی آسیہ کو وہ تابوت ملا' اس نے اس تابوت سے بچہ نکال لیا اور چونکہ یہ بچہ اسے پانی اور درختوں میں ملا تھا تو اس جگہ کی مناسبت سے اس کا نام موسیٰ رکھ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام ونسب یہ ہے: "موسیٰ بن عمران بن یصھر بن قاعث بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام"
(تفسیر کبیر ج ۱ ص ۳۴۳ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

تورات کا نزول اور بنو اسرائیل کی گئو سالہ پرستی

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

امام ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کر دیا اور حضرت موسیٰ اور بنو اسرائیل کو اس سے نجات دے دی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ فرمایا' پھر ان کو دس مزید راتوں سے پورا کیا۔ ان راتوں میں حضرت موسیٰ نے اپنے رب سے ملاقات کی' اور حضرت ہارون کو بنو اسرائیل پر خلیفہ بنایا اور کہا: میں اپنے رب کے پاس جلدی میں جا رہا ہوں' تم میرے خلیفہ بنو اور مفسدوں کی پیروی نہ کرنا' حضرت موسیٰ اپنے رب سے ملاقات کے شوق میں جلدی چلے گئے' حضرت ھارون قائم مقام ہوئے اور سامری بھی ان کے ساتھ رہا۔

ابوالعالیہ نے بیان کیا ہے: یہ مدت ایک ماہ ذوالقعدہ اور دس دن ذوالحجہ کے تھے' اس مدت میں حضرت موسیٰ اپنے اصحاب کو چھوڑ کر چلے گئے اور حضرت ہارون کو ان پر خلیفہ بنایا اور طور پر چالیس راتیں ٹھہرے اور ان پر زمرد کی الواح میں تورات نازل کی گئی' اللہ تعالیٰ نے ان کو قریب کر کے سرگوشی کی اور ان سے ہم کلام ہوا' اور حضرت موسیٰ نے قلم کے چلنے کی آواز سنی اور ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ ان چالیس راتوں میں وہ بے وضو نہیں ہوئے حتیٰ کہ طور سے واپس آئے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۲۲۲' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

امام رازی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے جب فرعون کو غرق کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تورات کے نازل کرنے کا وعدہ فرمایا تو موسیٰ علیہ السلام' حضرت ہارون کو خلیفہ بنا کر طور پر چلے گئے' بنو اسرائیل کے پاس قبطیوں کے وہ کپڑے اور زیورات تھے جو آنے سے پہلے قبطیوں سے انہوں نے عاریۃً لیے تھے' حضرت ہارون علیہ السلام نے ان سے فرمایا: یہ کپڑے اور زیورات تمہارے لیے جائز نہیں ہیں ان کو جلا دو' انہوں نے ان کو جمع کر کے آگ لگا دی' جب حضرت موسیٰ سمندر میں جا رہے تھے تو سامری نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ایک گھوڑی پر جاتے ہوئے دیکھا تھا' اس نے اس گھوڑی کے سم کے نیچے سے خاک کی ایک مٹھی اٹھالی تھی' سامری کے پاس جو سونا اور چاندی تھی اس نے اس کو پگھلا کر اس کا ایک بچھڑا بنالیا اور اس میں وہ مٹی ڈال دی' اس کے اثر سے اس مجسمہ سے بچھڑے کی سی آواز نکلنے لگی' پھر سامری نے بنو اسرائیل سے کہا: یہ تمہارا اور حضرت موسیٰ کا خدا ہے اور وہ قوم اس گوسالہ کی پرستش کرنے لگی' حضرت ہارون اور بارہ ہزار دیگر افراد کے علاوہ سب نے گوسالہ پرستی کی۔

(تفسیر کبیر ج ۱ ص ۳۲۳' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان دی۔ (البقرہ: ۵۳)

کتاب سے مراد تورات ہے اور اس کے نزول کا واقعہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے' اور فرقان سے مراد حضرت موسیٰ کے معجزات ہیں' جن میں عصا تھا' اور ید بیضا' اور بھی کئی معجزات تھے جن کو نو آیات بینات سے تعبیر فرمایا ہے' ان سب کی تفصیل ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب موسیٰ نے اپنی امت سے کہا: اے میری امت! بے شک تم نے بچھڑے کو (معبود) بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ (البقرہ: ۵۴)

بنو اسرائیل کی قبولیت توبہ کا بیان

اس آیت کے پس منظر اور پیش منظر کو اللہ تعالیٰ نے سورہ طٰہٰ میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے' اس کا ترجمہ اس طرح ہے: (ہم نے طور پر موسیٰ سے فرمایا:) اے موسیٰ! آپ نے لوگوں کو چھوڑ کر آنے میں کیوں جلدی کی؟ حضرت موسیٰ نے کہا: وہ لوگ میرے پیچھے آ رہے ہیں' اور اے میرے رب! میں تجھے راضی کرنے کے لیے تیری بارگاہ میں جلدی حاضر ہوا' فرمایا: ہم

نے آپ کے بعد آپ کی امت کو آزمائش میں ڈال دیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا' سو حضرت موسیٰ نہایت غم و غصہ کی حالت میں واپس ہوئے' اور فرمایا: میری امت! کیا تم سے تمہارے رب نے (تورات عطا کرنے کا) اچھا وعدہ نہیں کیا تھا' پھر کیا تم پر بہت طویل مدت گزر گئی تھی یا تم نے یہ چاہا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب نازل ہو کیونکہ تم نے میرے وعدہ کی خلاف ورزی کی ہے' انہوں نے کہا: ہم نے اپنے اختیار سے آپ سے وعدہ خلافی نہیں کی' لیکن ہم پر قوم فرعون کے بھاری زیور کا بوجھ تھا' ہم نے ان زیورات کو آگ میں ڈال دیا اور سامری نے بھی اپنے حصہ کے زیورات کو آگ میں ڈال دیا' پھر اس نے ان کے لیے بچھڑے کا بے جان جسم نکالا جو بیل کی سی آواز نکالتا تھا' لوگوں نے کہا: یہی موسیٰ کا معبود ہے اور تمہارا معبود ہے' موسیٰ تو بھول گئے' کیا یہ لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ وہ بچھڑا تو ان کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا تھا اور نہ وہ ان کے لیے کسی نفع اور نقصان کا مالک تھا' اور بے شک ہارون نے پہلے ہی ان سے کہہ دیا تھا کہ اے میری قوم! اس بچھڑے کے ذریعہ تم آزمائش میں ڈالے گئے ہو' اور بے شک تمہارا رب رحمٰن ہے' سو تم میری اتباع کرو اور میرا کہا مانو' انہوں نے کہا: ہم تو اسی کی پوجا پر جمے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ ہمارے پاس لوٹ کر نہ آئیں' (موسیٰ نے واپس آ کر) کہا: اے ہارون! جب آپ نے انہیں گمراہ ہوتے ہوئے دیکھا تو آپ کو کیا چیز مانع تھی کہ آپ نے میری اتباع نہ کی؟ کیا آپ نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟ (ہارون نے) کہا: اے میری ماں کے بیٹے! میری داڑھی اور میرے سر (کے بالوں) کو نہ پکڑیئے' بے شک مجھے یہ ڈر تھا کہ (اگر میں نے ان کو سختی سے روکا) تو آپ کہیں گے کہ تم نے بنو اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی' اور میرے حکم کا انتظار نہ کیا' (موسیٰ نے سامری سے) فرمایا: اے سامری! تیرا کیا بیان ہے؟ اس نے کہا: میں نے وہ چیز دیکھی جو دوسروں نے نہ دیکھی تھی (مجھے گھوڑی پر جبرائیل سوار نظر آئے) تو میں نے رسول (جبرائیل) کی سواری کے نقش قدم (کی مٹی) سے ایک مٹھی بھر لی' پھر میں نے اس کو (بچھڑے کے مجسمہ میں) ڈال دیا اور میرے دل میں اسی طرح بات آئی تھی' فرمایا: تو (اب) دفع ہو جا' بے شک اب زندگی بھر تیری یہ سزا ہے کہ تو کہتا پھرے کہ (خبردار مجھے) نہ چھونا' اور تیرے لیے (عذاب کا) وعدہ ہے جو ہرگز تجھ سے نہیں ٹلے گا' اور اپنے اس معبود کو دیکھ جس کی پوجا میں تو جما بیٹھا تھا' ہم اس کو ضرور جلا کر بھسم کر دیں گے' پھر اس (کی راکھ) کو (اڑا کر) دریا میں بہا دیں گے' تمہارا معبود صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں' جس نے اپنے علم سے ہر چیز کا احاطہ کر لیا' اسی طرح ہم آپ کو گزشتہ واقعات کی خبریں بیان فرماتے ہیں اور ہم نے آپ کو اپنے پاس سے ذکر (قرآن) عطا فرمایا ہے۔

(طٰہٰ: ۹۹-۸۳)

امام ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

سدی نے بیان کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس گئوسالہ کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور اس کو جلا کر اس کے ذرات کو سمندر میں بہا دیا[1] پھر حضرت موسیٰ نے فرمایا: اس سمندر سے پانی پیو تو جو اس بچھڑے سے محبت کرتا تھا اس کی مونچھوں پر اس سونے کے ذرات لگ گئے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ان کے کفر کی وجہ سے بچھڑا ان کے دلوں میں پلایا گیا تھا' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد جب بنو اسرائیل کو اپنی گمراہی کا یقین ہو گیا تو انہوں نے کہا کہ اگر ہم پر ہمارا رب رحم نہ فرمائے اور ہماری مغفرت نہ فرمائے تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی حال میں بنو اسرائیل کی توبہ قبول کرنے سے انکار کر دیا' پس موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: اے میری امت! تم نے بچھڑے کی عبادت کر کے اپنی جانوں پر

[1] بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہ مجسمہ گوشت پوست اور ہڈیوں میں تبدیل ہو گیا تھا' حضرت موسیٰ نے اس کو ذبح کر کے جلا دیا' اور بعض نے کہا: وہ اسی طرح سونے اور چاندی کا مجسمہ تھا' اس کو آلات سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ریزہ ریزہ کر دیا۔ منہ

ظلم کیا ہے تم اپنے خالق کی طرف توبہ کرو اور تم ایک دوسرے کو قتل کرو پھر انہوں نے دو صفیں بنائیں۔ ایک صف میں بچھڑے کی عبادت کرنے والے کھڑے ہوئے اور دوسری صفت میں وہ کھڑے ہوئے جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی اور انہوں نے گئو سالہ پرستوں کو قتل کیا اور ستر ہزار افراد قتل کر دیئے گئے[۱] پھر حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے دعا کی کہ اے رب! اس طرح تو سارے بنو اسرائیل ہلاک ہو جائیں گے' اے رب! بقیہ کو معاف فرما دے' تب انہیں ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا' جو قتل ہو گئے وہ شہید قرار پائے اور جو بچ گئے ان کا کفارہ ہو چکا تھا۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۲۲۷ مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت ۱۴۰۹ھ)

یہ بنو اسرائیل کی توبہ تھی اور ہمارے لیے توبہ یہ ہے کہ گناہوں پر اشک ندامت بہائیں' گناہ کو فوراً ترک کر دیں اور اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کر لیں کہ دوبارہ اس گناہ کو نہیں کریں گے اور اس گناہ کے ذریعہ جو حق ضائع ہوا ہے اس کی تلافی کر لیں۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً

اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ ہم اللہ کو اپنے سامنے دیکھ لیں' سو تم

فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

کو ایک کڑک نے پکڑ لیا اور تم (اس منظر کو) دیکھ رہے تھے O پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد

مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا

تمہیں دوبارہ زندہ کیا تاکہ تم شکر ادا کرو O اور ہم نے تم پر بادل کو سایہ فگن کیا اور تم پر

عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا

من وسلویٰ کو نازل کیا' ہم نے تم کو جو پاک چیزیں دی ہیں ان سے کھاؤ' اور (ہماری حکم عدولی کر کے) انہوں نے

ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا

ہم پر ظلم نہیں کیا' البتہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے O اور جب ہم نے کہا: اس شہر میں

هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا

داخل ہو اور اس میں تم جہاں سے چاہو بلا روک ٹوک کھاؤ اور دروازہ میں جھکتے ہوئے داخل

الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ

ہونا اور یہ کہو "حطۃ" (ہمارے گناہ معاف فرما) تو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے' اور عنقریب نیکی

[۱] امام ابن جریر نے لکھا ہے کہ ستر ہزار افراد بلا امتیاز قتل کیے گئے اور علامہ خازن نے لکھا ہے کہ بری نے مجرم کو قتل کیا۔

(خازن ج ۱ ص ۵۴) منہ

سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ

کرنے والوں کو زیادہ اجر دیں گے O سو جو قول کہنے کے لیے ان سے کہا گیا تھا اس کو ظالموں نے بدل دیا

الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ

پس ہم نے ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کیا

السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع

کیونکہ وہ فسق کرتے تھے O

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ (البقرہ: ۵۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معذرت کے لیے ستر بنو اسرائیل کو طور پر لے جانا

امام محمد بن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

امام محمد بن اسحٰق نے بیان کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کی طرف لوٹے اور بچھڑے کی عبادت کرنے پر بنو اسرائیل کو ملامت کی اور بچھڑے کو جلا کر اس کے ذرات کو سمندر میں ڈال دیا' پھر حضرت موسیٰ نے اپنی امت میں سے انتہائی نیک افراد جن کی تعداد ستر تھی' سے فرمایا: تم میرے ساتھ اللہ سے ملاقات کے لیے چلو اور اپنی اس گئو سالہ پرستی پر اللہ تعالیٰ سے معذرت کرو' جب حضرت موسیٰ ان کو لے کر پہاڑ طور پر گئے تو انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہا: آپ اپنے رب سے یہ سوال کریں کہ ہم بھی اپنے رب کا کلام سن لیں' حضرت موسیٰ نے فرمایا: اچھا' حضرت موسیٰ جب پہاڑ کے قریب پہنچے تو ایک بادل آیا اور اس نے پورے پہاڑ کو ڈھانپ لیا' حضرت موسیٰ اس بادل میں داخل ہو گئے اور قوم سے کہا: تم قریب آجاؤ' جب حضرت موسیٰ اپنے رب سے ہم کلام ہوتے تو ان کی پیشانی پر بہت چمکدار نور ظاہر ہوتا جس کو دیکھنے کی کوئی انسان تاب نہیں لا سکتا تھا' تو وہ اپنی پیشانی پر نقاب ڈال لیتے تھے' جب قوم اس بادل کے اندر داخل ہوئی تو سجدہ میں گر گئی' حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ سے کلام کر رہے تھے اور وہ سن رہے تھے' جب موسیٰ علیہ السلام فارغ ہوئے اور بادل چھٹ گیا' تو یہ لوگ حضرت موسیٰ سے کہنے لگے: ہم ہرگز اللہ پر ایمان نہ لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو بالکل ظاہر عیاں اور بیاں دیکھ نہ لیں' اسی وقت ان پر بجلی کی ایک کڑک آپڑی اور وہ سب مر گئے' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور عرض کیا: اے اللہ! اگر تو چاہتا تو ان کو پہلے ہی ہلاک کر دیتا' جب میں اپنی قوم کے پاس جاؤں گا تو میری کیسے تصدیق کریں گے کہ وہ کڑک سے ہلاک ہو گئے اور آئندہ مجھ پر کب اعتماد کریں گے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام مسلسل دعا کرتے رہے' بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان میں روحیں لوٹا دیں' پھر بنو اسرائیل نے جو بچھڑے کی پرستش کی تھی اس پر توبہ کی مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب تک کہ یہ ایک دوسرے کو قتل نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول نہیں فرمائے گا۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۲۳۲۔ ۲۳۱ مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اللہ تعالیٰ کے دیدار کو طلب کرنا جائز ہے لیکن بنو اسرائیل نے چونکہ سرکشی اور عناد سے دیدار طلب کیا تھا اس لیے ان پر بجلی کی کڑک کا عذاب ہوا۔ اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو دیکھنا جائز ہے اور آخرت میں مسلمان اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے معتزلہ اس کے منکر ہیں' سورہ اعراف: ۱۴۳ میں ان شاء اللہ اس کی مفصل بحث آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کیا۔ (البقرہ: ۵۶)

ستر اسرائیلیوں کا دوبارہ زندہ ہونا ان کے مکلف ہونے کے منافی نہیں

ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ہے:

قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ. وہ کہیں گے: اے رب! تو نے ہمیں دوبار موت دی اور دوبار تو نے ہمیں زندہ فرمایا۔ (المؤمن: ۱۱)

پہلے انسان بے جان مٹی کی صورت میں یا بے جان نطفہ کی صورت میں تھا پھر اس کو زندہ کیا' پھر اس پر طبعی موت آئی اور اس کو پھر آخرت میں زندہ کیا' اس طرح ہر انسان کے لیے دو موتیں اور دو حیاتیں ہیں اور ان بنو اسرائیل کے لیے تین موتیں اور تین حیاتیں ہو گئیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عام عادت جاریہ یہی ہے کہ ہر شخص پر دو بار موت آتی ہے لیکن کبھی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے اظہار کے لیے اپنی عادت کے خلاف بھی کرتا ہے' جیسا کہ عام عادت یہ ہے کہ انسان کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کرتا ہے لیکن حضرت عیسیٰ کو بغیر مرد کے' حضرت حوا کو بغیر عورت کے اور حضرت آدم کو مرد اور عورت دونوں کے بغیر پیدا کر دیا' اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کی مدت عمر علم الٰہی میں پوری ہو چکی تھی ان کو دنیا میں دوبارہ زندگی نہیں دی جاتی' اور جن لوگوں کی مدت عمر علم الٰہی میں ابھی باقی تھی اور بہ طور سزا یا کسی دوسری حکمت کی وجہ سے ان پر اجل سے پہلے موت طاری کی گئی ان کو مرنے کے بعد دنیا میں دوبارہ زندگی عطا کی جاتی ہے اور ان ستر بنو اسرائیل پر موت کے بعد حیات طاری کرنا اسی قبیل سے تھا' اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نبیوں کی دعا سے مردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ان ستر بنو اسرائیل کو زندہ کرنے کے بعد ان کو پھر مکلف کیا گیا حالانکہ مرنے کے بعد انہوں نے احوال آخرت کو دیکھ لیا تھا اور ان پر غیب مشاہد ہو چکا تھا' اور اگر ان کو مکلف کرنا جائز ہے تو عام لوگوں کو مرنے کے بعد زندہ کر کے دوبارہ مکلف کرنا کیوں جائز نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دوبارہ مکلف نہ کرنے کی وجہ صرف مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان احوال آخرت کا مشاہدہ کر لیتا ہے' جنت کی راحت یا دوزخ کے عذاب کو جان لیتا ہے اور اب آخرت پر ایمان اس کے نزدیک بدیہی اور ضروری ہو جاتا ہے اور اس میں عقل کی آزمائش اور امتحان کا کوئی دخل نہیں رہتا' اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ ان ستر بنو اسرائیل نے مرنے کے بعد احوال آخرت کا مشاہدہ نہ کیا ہو اور عام لوگوں پر موت کے بعد جو واردات مرتب ہوتی ہیں وہ ان پر مرتب نہ ہوئی ہوں' اس لیے ان کو دوبارہ مکلف کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بنو اسرائیل کی خصوصیت ہو کیونکہ بنو اسرائیل کو ایسی نشانیاں دکھائی گئیں جن کے بعد عقل کی آزمائش کا دخل نہیں رہتا' اس کے باوجود ان کو مکلف کیا گیا' مثلاً انہوں نے دیکھا کہ پہاڑ ان کے اوپر ہوا میں معلق ہو گیا ہے' اسی طرح چالیس سال تک بادل کا ان پر سایا کرنا' ان پر من اور سلویٰ کا نازل ہونا' نیز حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے بھی عذاب کے آثار دیکھ لیے تھے اور اس کے بعد وہ ایمان لائے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے تم پر بادل کو سایہ فگن کیا اور تم پر من اور سلویٰ کو نازل کیا۔ (البقرہ: ۵۷)

میدان تیہ میں بنو اسرائیل کی سرگردانی کا پس منظر و پیش منظر اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

بنو اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ جبارین کے شہر میں داخل ہوں اور ان کے خلاف جہاد کریں انہوں نے حضرت موسیٰ

سے کہا: آپ اور آپ کا رب ان سے جنگ کریں' ہم یہیں بیٹھے رہیں گے'ان کی اس گستاخی کی سزا کے طور پر ان کو میدان تیہ میں چالیس سال تک سرگرداں رکھا گیا' میدان تیہ مصر اور شام کے درمیان پانچ چھ فرسخ (ایک فرسخ تین شرعی میل کا ہوتا ہے) کا ایک وسیع وعریض میدان ہے۔اس کی تفصیل اور پس منظر اس طرح ہے:

بنی اسرائیل کا اصل وطن ملک شام تھا۔حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں یہ لوگ مصر آ کر مقیم ہوئے۔فرعون مصر کی غلامی کا دور بھی ان لوگوں نے مصر میں گزارا' بالآخر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے انہیں نجات عطا فرمائی' فرعون سمندر میں غرق ہوا اور بنی اسرائیل نے اطمینان کا سانس لیا۔اس دوران ملک شام پر قوم عمالقہ قابض ہو چکی تھی' فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ عمالقہ سے جہاد کر کے ان سے اپنا وطن آزاد کرائیں۔بنی اسرائیل جہاد کے لیے ملک شام کی طرف روانہ ہوئے' جب یہ عمالقہ کی حدود کے قریب پہنچے تو ان کی قوت اور طاقت کا حال سن کر ہمت ہار بیٹھے اور جہاد سے منہ موڑ کر واپس لوٹے' اللہ تعالیٰ نے ان کے اس جرم کی سزا یوں دی کہ وہ اپنے گھروں تک جانے کی فکر میں دن بھر سفر کرتے' رات بسر کرنے کے بعد صبح کو اپنے آپ کو وہیں پاتے جہاں سے گزشتہ صبح انہوں نے سفر کا آغاز کیا ہوتا' اسی پریشان حالی کے عالم میں چالیس سال انہوں نے میدان تیہ میں گزار دیے۔اس وادی میں نہ کوئی سایا دار درخت تھا اور نہ ہی کوئی عمارت' نہ پینے کے لیے پانی نہ کھانے کے لیے کوئی چیز' نہ ضروریات زندگی کے دیگر لوازمات' اس بے سروسامانی کے عالم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ان کے لیے سب سامان مہیا ہو گئے۔اللہ تعالیٰ نے دھوپ سے بچاؤ اور سایا کے حصول کے لیے بادل بطور سائبان نازل فرما دیا' کھانے کے لیے من وسلویٰ بھیج دیا' من وسلویٰ کے بارے میں مختلف اقوال ہیں' صحیح قول یہی ہے کہ من سے مراد ترنجبین ہے جو ایک نفیس شیریں ذائقہ دار مادہ تھا جو شبنم کی طرح صبح کے وقت آسمان سے اترتا اور کثیر مقدار میں چھوٹے چھوٹے درختوں پر منجمد ہو جاتا تھا۔

سلویٰ کے بارے میں بھی متعدد اقوال ہیں' صحیح قول یہی ہے کہ وہ بٹیر تھا' بعض نے کہا کہ وہ بھنا ہوا اترتا تھا اور بعض کا قول ہے کہ بکثرت زندہ پرندے ان کے پاس جمع ہو جاتے تھے' وہ انہیں زندہ پکڑ لیتے اور ذبح کرتے تھے' الغرض من وسلویٰ ان کی شیریں اور نمکین غذائیں تھیں جنہیں کھاتے تھے' حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے پتھر پر عصا مارا اور اس سے پانی کے چشمے جاری ہو گئے۔تاریکی دور کرنے کے لیے عمودی شکل میں ایک روشنی ظاہر ہو جاتی تھی۔لباس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ اس طرح دکھایا کہ نہ ان لوگوں کے کپڑے میلے ہوتے نہ پھٹتے اور ان کے بچوں کے جسم کے ساتھ ساتھ بچوں کا لباس بھی بڑھتا رہتا تھا۔(الجامع لاحکام القرآن ج ا ص ۴۰۸۔ ۴۰۶ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ہم نے کہا: اس شہر میں داخل ہو اور اس میں تم جہاں سے چاہو بلا روک ٹوک کھاؤ اور دروازے میں جھکتے ہوئے داخل ہونا اور یہ کہو: ''حطۃ'' (ہمارے گناہ معاف فرما)۔(البقرہ:۵۸)

بنو اسرائیل کا ''حطۃ'' کو ''حنطۃ'' کہنا

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

جمہور کے قول کے مطابق اس شہر سے مراد بیت المقدس ہے' ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد اریحا ہے' ابن کیسان نے کہا: اس سے مراد شام ہے اور ضحاک نے کہا: اس سے مراد رملہ ہے یعنی اردن اور فلسطین۔اس آیت میں ایک اور نعمت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو میدان تیہ سے نجات دی اور بیت المقدس میں داخل ہونے کا موقع عنایت فرمایا' اس کی تفصیل اس طرح ہے:

جیسا کہ پچھلی آیت میں بیان فرمایا ہے بنو اسرائیل چالیس سال تک میدان تیہ میں سرگرداں رہے اس عرصہ میں پہلے حضرت ہارون کی اور پھر حضرت موسیٰ علیہما السلام کی وفات ہوگئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام نے قوم عمالقہ سے جہاد کیا اور جو بنو اسرائیل زندہ بچ گئے تھے انہوں نے حضرت یوشع بن نون کا ساتھ دیا' اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح عطا فرمائی اور چالیس سال بعد بنو اسرائیل کو میدان تیہ سے نجات حاصل ہوئی' جب بیت المقدس میں فاتحانہ شان سے داخل ہونے کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بیت المقدس کے دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور حطۃ (ہمارے گناہوں کو معاف فرما) کہتے ہوئے داخل ہونا' مگر یہ لوگ اللہ کے حکم کے برخلاف سرین کے بل گھسٹتے ہوئے اور ''حنطۃ'' یا ''حنطۃ فی شعرۃ'' (گندم' گندم بالی میں) کہتے ہوئے داخل ہوئے اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ ان کو گندم چاہیے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۴۱۱۔ ۴۰۹ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو جو قول کہنے کے لیے ان سے کہا گیا تھا اس کو ظالموں نے بدل دیا' پس ہم نے ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔ (البقرہ: ۵۹)

بنو اسرائیل پر طاعون کا عذاب

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ابن زید نے بیان کیا کہ جب بنو اسرائیل سے کہا گیا کہ دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہوں اور وہ سرین کے بل داخل ہوئے اور حطۃ کی جگہ انہوں نے حنطۃ کہا تو طاعون کی وبا کی شکل میں ان پر آسمانی عذاب آیا جس سے ان کے تمام بڑے لوگ ہلاک ہوگئے اور ان کے بیٹے بچ گئے اور بنو اسرائیل میں جس فضل اور عبادت کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ان کے بیٹوں میں تھا اور ان کے تمام آباء واجداد طاعون کی اس وبا میں ہلاک ہوگئے تھے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۲۴۴ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ ھ)

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ اس طاعون سے ستر ہزار بنو اسرائیل ہلاک ہوئے تھے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۴۱۱ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ ھ)

طاعون کے متعلق احادیث

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام احمد' امام ابن جریر' امام مسلم' امام نسائی اور امام ابن ابی حاتم' حضرت سعید بن مالک' حضرت اسامہ بن زید اور حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ طاعون گندگی ہے اور تم سے پہلے جن لوگوں کو عذاب دیا گیا ان کا بچا ہوا عذاب ہے' اگر کسی علاقہ میں طاعون پھیلے اور تم وہاں ہو تو تم وہاں سے مت نکلو اور اگر تم کو یہ خبر پہنچے کہ فلاں علاقہ میں طاعون ہے تو تم وہاں نہ جاؤ۔

(الدرالمنثور ج ۱ ص ۷۲ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

اس حدیث کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۵۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ ھ)

نیز امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے متعلق دریافت کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ عذاب ہے' اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے اس کو بھیج دیتا ہے' اللہ تعالیٰ نے اس کو مومنین کے لیے رحمت بنا دیا' جس بندہ کے شہر میں طاعون واقع ہو اور وہ صبر کے ساتھ وہیں ٹھہرا رہے اور اس کا ایمان ہو کہ اس کو وہی مصیبت

پہنچے گی جو اس کی تقدیر میں ہے تو اس کو ایک شہید کا اجر ہوگا۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۵۳۔ ۸۵۲ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طاعون ہر مسلمان کے لیے شہادت ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۹۷ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی ۱۳۸۱ھ)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: اے مہاجرین کی جماعت! پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ جب تم ان میں مبتلا ہو گے (اور میں اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تم ان میں مبتلا ہو) تو تم پر مختلف عذاب نازل ہوں گے، جب قوم علانیہ بدکاری کرنے لگے تو اس میں طاعون پھیل جاتا ہے اور ایسے دردوں والی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں جو ان سے پہلے لوگوں میں نہیں تھیں، اور جو قوم ناپ اور تول میں کمی کرتی ہے اس میں قحط سالی، سخت مشقت اور ظالم حکومت نازل کی جاتی ہے، اور جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے وہ بارش سے محروم کر دیے جاتے ہیں، اور اگر جانور نہ ہوتے تو ان پر بارش بالکل نہ ہوتی، اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے عہد شکنی کرتے ہیں ان پر ان کے دشمنوں کو مسلط کر دیا جاتا ہے جو ان کے بعض اموال کو لوٹ لیتے ہیں اور جو ائمہ اور حکمران کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے وہ آپس کی جنگوں کے خوف میں مبتلا رہیں گے۔ (سنن ابن ماجہ ص ۲۹۰ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

طاعون کے متعلق قدیم علماء اور جدید میڈیکل سائنس کی تحقیق

علامہ نووی لکھتے ہیں:

طاعون جسم میں نکلنے والی گلٹیاں ہیں، یہ گلٹیاں، کہنیوں، بغلوں، ہاتھوں، انگلیوں اور سارے بدن میں نکلتی ہیں، اس کے ساتھ سوجن ہوتی ہے اور سخت درد ہوتا ہے، یہ گلٹیاں جلن کے ساتھ نکلتی ہیں اور ان کی جگہ سیاہ، سرخ یا سبز ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے طبیعت میں گھبراہٹ ہوتی ہے۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۲۲۸ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی ۱۳۷۵ھ)

جدید میڈیکل سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ طاعون کی بیماری کی اصل وجہ ایک خورد بینی جرثومہ یرسیمیا پیسٹس (YARISIMIAPASTIS) ہے، جو ایک پسو نما کیڑے میں پرورش پاتا ہے، یہ پسو زیادہ تر چوہوں اور چوہوں کی اقسام کے جانوروں میں پائے جاتے ہیں اور یہ چوہے کی کھال کے ساتھ مضبوطی سے چپٹے ہوتے ہیں۔ جب یہ چوہے طاعون زدہ پسو کو سوار کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں، یا مر جاتے ہیں تو پسو دوسرے جانوروں یا انسانوں میں منتقل ہو جاتے ہیں اور بیماری کا باعث بنتے ہیں، بیماری زیادہ تر ان ہی پسوؤں کے کاٹنے سے جنم لیتی ہے، اس کے علاوہ یہ بیماری دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے، اس میں ہوا کے ذریعے جرثومہ کی بیمار آدمی سے تندرست آدمی تک منتقلی یا جرثومہ کا کسی اور جانور میں منتقل ہونا اور بعد ازاں بیماری کی وجہ بننا شامل ہے۔

طاعون کی علامت دو طرح سے نمودار ہوتی ہے

(۱) غدودی طاعون: یہ پسوؤں کے کاٹنے سے ہوتا ہے، اس میں مرض بڑھتے ہوئے غدودوں کے ساتھ آتا ہے، ساتھ ساتھ اس کو بخار، سر میں درد، سستی اور پیٹ کی تکلیف وغیرہ بھی ہوتی ہے، غدودوں کا سائز ایک سم سے دس سم تک ہوتا ہے، یہ غدود زیادہ تر چڈھوں کے حصہ میں پائے جاتے ہیں، اس کے علاوہ بغل اور گردن میں بھی پائے جا سکتے ہیں، یہ بالائی کھال اور زیریں حصہ سے جڑے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ ہلائے جا سکتے ہیں، بالائی کھال زیادہ تر سرخ ہو جاتی ہے غدودوں کے ظاہر ہونے سے پہلے بخار اور کپکپی طاری ہو جاتی ہے، غدودوں کے ظہور کے ساتھ متلی، الٹی اور دست کی علامات بھی ہو سکتی ہیں، اگر

اس مرحلہ پر علاج نہ کیا جائے تو یہ جرثومے سارے جسم میں پھیل جاتے ہیں اور موت کا باعث ہوتے ہیں۔

(۲) نیمونی طاعون: یہ طاعون ہوا کے ذریعہ بیمار سے تندرست میں منتقل ہوتے ہیں' اس قسم کے طاعون میں پھیپھڑے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور مریض میں نمونیہ کی علامات ہوتی ہیں' اس میں بخار' کھانسی اور سانس کا تیز چلنا شامل ہوتا ہے' اگر بروقت علاج نہ ہو تو بیماری شدت اختیار کر لیتی ہے' جس سے سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ تھوک میں خون آنے لگتا ہے اور بالآخر پھیپھڑے کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ مرض کی تشخیص میں لیبارٹری کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ زیادہ تر تشخیص مرض کی علامات اور وبائی شکل میں موجودگی سے ہی ہو جاتی ہے۔

طاعون کا علاج

مرض کا علاج فوری طور پر اینٹی بائیوٹک (ANTIBIOTICES) سے کیا جاتا ہے' جس میں ٹیٹرا سائیکلین (TETRACYCLINE) اسٹرپٹو مائی سین (STREPTOMYCIN) اور کلورومائی سی ٹن (CLORUOMYCTIN) شامل ہیں۔ جب طاعون کی وبا پھیل جائے تو مادی اسباب بھی اختیار کرنا چاہئیں' شہر کو گندگی اور چوہوں سے صاف کیا جائے اور فوراً کسی قابل ڈاکٹر کے مشورہ سے علاج کیا جائے اور باقی صحت مند افراد کو مریض سے الگ رکھا جائے اور روحانی اسباب بھی اختیار کرنے چاہئیں۔ اپنے اپنے گناہوں کو فوراً ترک کر دیا جائے اور ان پر توبہ اور استغفار کیا جائے۔

علامہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ ارواح خبیثہ کی تاثیرات سے بھی طاعون ہو جاتا ہے اور اس کو دفع کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بہ کثرت ذکر کیا جائے اور اللہ تعالیٰ سے گڑ گڑا کر دعا کی جائے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ارواح طیبہ کا نزول ہوتا ہے اور وہ ارواح خبیثہ کے شر کو دور کر دیتی ہے۔ (زاد المعاد ج ۳ ص ۷۶-۷۵' مطبوعہ مصطفیٰ البابی واولادہ مصر' ۱۳۶۹ھ)

وَاِذِ اسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی لِقَوۡمِهٖ فَقُلۡنَا اضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ ؕ

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا تو ہم نے فرمایا: اپنا عصا اس پتھر پر مارو

فَانۡفَجَرَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَيۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ

تو اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے' بے شک ہر گروہ نے اپنے پانی پینے کی جگہ

مَّشۡرَبَهُمۡ ؕ كُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ اللّٰهِ وَلَا تَعۡثَوۡا فِی

کو جان لیا' اللہ کے رزق سے کھاؤ اور پیو اور زمین

الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ۝۶۰ وَاِذۡ قُلۡتُمۡ يٰمُوۡسٰی لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰی

میں فساد کرتے ہوئے نہ پھرو ○ اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز ایک (قسم کے) کھانے پر صبر

طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ

نہیں کریں گے' سو آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ (من اور سلویٰ کی بجائے) ہمیں زمین کی

مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ

اُگائی ہوئی چیزیں سبزی، ککڑی، گندم، مسور اور پیاز نکال کر دے، فرمایا:

اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا

کیا تم اچھی چیز کے بدلہ میں ادنیٰ چیز مانگتے ہو؟ شہر میں چلے جاؤ، وہاں تم کو

مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ

وہ چیزیں مل جائیں گی جن کا تم نے سوال کیا، اور ان پر ذلت اور بدحالی

وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا

ڈال دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں آ گئے، یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ

یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ

کی آیات کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ اس لیے (بھی) ہوا کہ وہ نافرمان تھے اور

بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ۟ ع (۶۱)

حد سے تجاوز کرتے تھے O

ع ۲

زمین سے پانی نکالنے میں حضرت موسیٰ کا معجزہ اور اس کے مقابلہ میں ہمارے نبی کا معجزہ

میدان تیہ میں جب بنو اسرائیل کو پیاس لگی تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے پانی کے لیے دعا کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس چٹان پر عصا مارا تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، وہ چٹان اب بھی جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے، ایک عیسائی محقق نے انیسویں صدی کے وسط میں بائبل کے مقامات مقدسہ کی جغرافیائی تحقیق کے لیے فلسطین کا سفر کیا اور اس چٹان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے اور آگے کی طرف جھکی ہوئی ہے۔

ایک پتھر پر عصا مارنا اور اس سے پانی کے چشموں کا پھوٹ پڑنا حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے۔ اس پتھر نے زمین کی اندرونی تہوں سے پانی کھینچ لیا تھا، یا اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اس پتھر میں پانی پیدا کر دیا، چٹان پر لاٹھی مار کر پانی نکالنا خلاف عادت کام ہے لیکن بہت زیادہ بعید نہیں ہے کیونکہ زمین کے نیچے پانی ہوتا ہے اور آلات کے ذریعہ زمین کو کھود کر پانی نکالا جا سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ یہ تھا کہ انہوں نے آلات کے بغیر لاٹھی کی ایک ضرب سے بارہ چشمے جاری کر دیئے، لیکن ہمارے نبی حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ اس سے بڑھ کر ہے کیونکہ آپ نے ہاتھ کی انگلیوں سے پانی کو جاری کر دیا اور وہاں سے پانی نکالا جہاں عادتاً پانی ہوتا نہیں ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حدیبیہ کے دن لوگوں کو پیاس لگی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چمڑے کا ایک چھوٹا سا برتن تھا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تو سب لوگ ٹوٹ پڑے' آپ نے پوچھا: تمہیں کیا ہوا؟ انہوں نے کہا: ہمارے پاس وضوء کے لیے پانی ہے اور نہ پینے کے لیے' صرف یہی پانی ہے جو آپ کے پاس ہے' آپ نے اس برتن پر اپنا ہاتھ رکھا تو آپ کی انگلیوں کے درمیان سے چشموں کی طرح پانی ابلنے لگا' ہم سب نے اس سے پانی پیا اور ہم سب نے وضوء کیا' راوی نے پوچھا: حدیبیہ کے دن آپ لوگوں کی کتنی تعداد تھی؟ حضرت جابر نے کہا: ہم لوگ پندرہ سو تھے لیکن اگر ہم ایک لاکھ بھی ہوتے تو ہمیں وہ پانی کافی ہو جاتا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۰۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت جابر نے پندرہ سو صحابہ کے وضو کرنے کا ذکر کیا ہے' یہ حدیبیہ کا واقعہ ہے' قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے تین سو صحابہ کے وضوء کرنے کو روایت کیا ہے' یہ مدینہ منورہ میں مقام زوراء کا واقعہ ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۰۴) حسن بصری نے حضرت انس سے ستر صحابہ کے وضو کا واقعہ روایت کیا ہے' یہ کسی سفر کا واقعہ ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۰۵) حمید نے حضرت انس سے اسی صحابہ کے وضو کرنے کو روایت کیا ہے' یہ مدینہ منورہ میں مسجد کے قریب کسی جگہ کا واقعہ ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۰۵)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک انگلیوں کے درمیان سے چشمے پھوٹنے کا معجزہ متعدد بار سفر اور حضر میں رونما ہوا' اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے کئی درجے افضل ہے۔

یہودیوں کے نبیوں کو قتل کرنے پر تورات کی شہادت

جب بنو اسرائیل نے من اور سلویٰ کی بجائے زمین کی پیداوار میں سے گندم اور مسور کی دال وغیرہ کو طلب کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تعجب اور سرزنش کرتے ہوئے فرمایا: تم اس کامل اور لذیذ غذا کے بدلہ میں ادنیٰ درجہ کی چیزیں مانگ رہے ہو' تم کسی بھی زرعی زمین میں چلے جاؤ' وہاں تم کو مطلوبہ اجناس مل جائیں گی' لیکن بنو اسرائیل نے جو کفران نعمت کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات کا مذاق اڑایا اور انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا' کیونکہ انہوں نے اشعیا' زکریا اور یحییٰ علیہم السلام وغیرہم کو بلاوجہ قتل کیا تھا' اس کی سزا میں ان پر دنیا میں ذلت اور خواری مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی لعنت کے مستحق ہوئے اور اخروی عذاب دائم اس کے علاوہ ہے۔

بنو اسرائیل نے انبیاء علیہم السلام کو جو ایذا پہنچائی اور قتل کیا اس کی شہادت تورات سے حسب ذیل ہے:

اور اخی اب نے سب کچھ کیا جو انبیاء نے کیا تھا اور یہ بھی کہ اس نے سب نبیوں کو تلوار سے قتل کر دیا۔

(۱۔ سلاطین' باب: ۱۹' آیت ۱' پرانا عہد نامہ ص ۳۵۳' مطبوعہ لاہور)

اور شاہ اسرائیل نے کہا: میکایا (یہ نبی تھے۔ سعیدی غفرلہ) کو لے کر اسے شہر کے ناظم امون اور یوآس کے پاس لوٹا لے جاؤ اور کہنا: بادشاہ یوں فرماتا ہے کہ اس شخص کو قید خانہ میں ڈال دو اور اسے مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا جب تک میں سلامت نہ آؤں۔ (۱۔ سلاطین' باب: ۲۲ آیت ۲۷۔ ۲۶' پرانا عہد نامہ ص ۳۵۸' مطبوعہ لاہور)

تب خدا کی روح یہویدع کاہن کے بیٹے زکریا پر نازل ہوئی' سو وہ لوگوں سے بلند جگہ پر کھڑا ہو کر کہنے لگا: خدا یوں فرماتا ہے کہ تم کیوں خداوند کے حکموں سے باہر جاتے ہو کہ یوں خوش حال نہیں رہ سکتے؟ چونکہ تم نے خداوند کو چھوڑا ہے اس نے بھی تم کو چھوڑ دیا۔ تب انہوں نے اس کے خلاف سازش کی اور بادشاہ کے حکم سے خداوند کے گھر کے صحن میں اسے سنگسار کر دیا۔

(۲۔ تواریخ' باب ۲۴' آیت ۲۱۔ ۲۰' پرانا عہد نامہ ص ۴۳۶' مطبوعہ لاہور)

یرمیاہ نبی کے متعلق لکھا ہے:

اور جب یرمیاہ قید خانہ کے صحن میں بند تھا خداوند کا یہ کلام اس پر نازل ہوا۔ یرمیاہ باب ۳۹ آیت: ۱۹

وہ کلام جو خداوند کی طرف سے یرمیاہ پر نازل ہوا اس کے بعد کہ جلوداروں کے سردار نبوزرادان نے اس کو رامہ سے روانہ کر دیا' جب اس نے اسے ہتھکڑیوں سے جکڑا ہوا ان سب اسیروں کے درمیان پایا جو یروشلم اور یہوداہ کے تھے جن کو اسیر کر کے بابل کو لے جا رہے تھے۔ (یرمیاہ باب: ۴۰ آیت: ۱' پرانا عہد نامہ ص ۷۵۶' مطبوعہ لاہور)

حضرت یحییٰ کے متعلق لکھا ہے:

وہ فی الفور بادشاہ کے پاس جلدی سے اندر آئی اور اس سے عرض کی کہ میں چاہتی ہوں کہ یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر ایک تھال میں ابھی مجھے منگوا دے O بادشاہ بہت غمگین ہوا مگر اپنی قسموں اور مہمانوں کے سبب سے اس سے انکار نہ کرنا چاہا O پس بادشاہ نے فی الفور ایک سپاہی کو حکم دے کر بھیجا کہ اس کا سر لائے' اس نے قید خانہ میں جا کر اس کا سر کاٹا اور ایک تھال میں لا کر لڑکی کو دیا اور لڑکی نے اپنی ماں کو دیا۔ (مرقس باب: ۶ آیت: ۲۹۔ ۳۱' نیا عہد نامہ ص ۴۰' مطبوعہ لاہور)

یہودیوں پر ذلت مسلط کیے جانے کے باوجود اسرائیل کی حکومت کی توجیہ

یہودیوں پر ذلت اور مسکنت جو ڈالی گئی ہے' اس سے مراد یہ ہے کہ ان کو ذلیل اور غیروں کا محتاج رکھا گیا ہے۔ اگرچہ یہودی مال دار ہیں لیکن یہ بہت خسیس اور بخیل ہیں' یہ مال جمع کرنے کی حرص میں ہمیشہ ذلت' خواری اور بدحالی کی زندگی گزارتے ہیں' ہر چند کہ یہودیوں کی اسرائیل میں حکومت قائم ہو چکی ہے لیکن وہ اس حکومت کے قیام میں اور اپنی اقتصادیات' سیاست اور فوجی قوت میں بڑی طاقتوں خصوصاً امریکہ کے محتاج ہیں' قرآن مجید میں ہے:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ۔ (آل عمران: ۱۱۲)

یہ جہاں کہیں بھی رہیں ان پر خوار ہونا لازم کر دیا گیا ہے بجز اس کے کہ یہ (کبھی) اللہ کی رسی اور (کبھی) لوگوں کی رسی کا سہارا لیں۔

اور آج کل جو ان کی حکومت قائم ہے وہ برطانیہ اور امریکہ کی رسی کے سہارے ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ

بے شک ایمان والے (مسلمان) یہودی' عیسائی اور صابئین' جو بھی اللہ

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ

اور آخرت پر ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے تو ان کے

اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے' اور نہ ان پر خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے O

صابئین کے دین کی تحقیق

صابئین کا لفظ صباء سے بنا ہے' علامہ ابن جریر اس کے متعلق لکھتے ہیں:

جو شخص ایک دین کو ترک کر کے دوسرے دین کو اختیار کر لے اس کو لغت میں صابئی کہتے ہیں' مجاہد نے کہا: صابئی وہ لوگ ہیں جن کا کوئی دین نہ ہو۔ مجاہد سے ایک اور روایت ہے کہ صابئی' مجوس اور یہود کے درمیان ایک قوم ہے' ان کا ذبیحہ کھانا اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے' حسن بصری سے روایت ہے کہ صابئی فرشتوں کی پرستش کرتے ہیں' ابوالعالیہ نے کہا: صابئین اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے جو زبور کو پڑھنے والا ہے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۲۵۳۔ ۲۵۲' مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

اسحاق نے کہا: صابئین اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے' امام ابوحنیفہ نے کہا: ان کا ذبیحہ کھانے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں[1]۔

خلیل نے کہا: ان کا دین دین نصاریٰ کے مشابہ ہے' جنوب کی ہوا کی طرف ان کا قبلہ ہے اور ان کا زعم یہ ہے کہ یہ حضرت نوح کے دین پر ہیں' حضرت ابن عباس نے کہا: ان کا ذبیحہ نہ کھایا جائے۔ ہمارے علماء نے جو ان کے متعلق بیان کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ صابئی موحد ہیں اور ستاروں کی تاثیر کا اعتقاد رکھتے ہیں' اسی وجہ سے ابوسعید اصطخری نے ان کی تکفیر کی ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۴۳۵۔ ۴۳۴' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

علامہ بیضاوی نے ان اقوال کے علاوہ یہ قول نقل کیا ہے کہ صابئی ستارہ پرست ہیں۔

(انوار التنزیل (درسی) ص ۷۹' مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی)

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

صابئین کے کئی فرقے ہیں' روم کے صابئی ستارہ پرست ہیں' ھند کے صابئی بت پرست ہیں' امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صابئی بت پرست نہیں ہیں' یہ ستاروں کی اس طرح تعظیم کرتے ہیں جس طرح ہم کعبہ کی تعظیم کرتے ہیں' ایک قول یہ ہے کہ یہ موحد ہیں اور ستاروں کی تاثیر کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ (روح المعانی ج ۱ ص ۲۷۹' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

علامہ شامی لکھتے ہیں:

صابئہ کا ذبیحہ حلال ہے کیونکہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اقرار کرتے ہیں (قہستانی) اور بدائع میں مذکور ہے' ان کی کتاب زبور ہے اور ہوسکتا ہے کہ ان کے کئی فرقے ہوں۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۱۸۸' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۷)

اغلب یہی ہے کہ صابئین کے کئی فرقے ہیں' ان کے متعلق جتنے اقوال ہیں' ان کے اتنے ہی فرقے ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے جس فرقے کے متعلق کہا کہ ان کا ذبیحہ جائز ہے وہ حکماً اہل کتاب ہیں' تمام صابئین کے متعلق امام اعظم کا یہ فتویٰ نہیں ہے۔

ایمان لائے ہوئے لوگوں کے ایمان لانے کی توجیہ

اس آیت میں دوسری تحقیق طلب بات یہ ہے کہ بے شک جو لوگ ایمان لائے یہودی' عیسائی اور صابئی ان میں سے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے ان کو کوئی غم اور خوف نہیں ہوگا' تو جو ایمان لا چکے ہیں' ان کے متعلق یہ کہنا کس طرح درست ہوگا ان میں سے جو ایمان لائے' کیونکہ ایمان لائے ہوئے لوگوں کا پھر ایمان لانا تحصیل حاصل ہے۔ اس سوال کے متعدد جوابات ہیں:

[1] علامہ ابواللیث سمرقندی حنفی نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک ان کا ذبیحہ کھانا اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ فرشتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ (تفسیر سمرقندی ج ۱ ص ۱۲۵) منہ

(۱) ''ان الذین امنوا'' سے مراد یہ ہے کہ جو زبان سے ایمان لائے اور ''من امن باللّٰہ'' سے مراد ہے: دل سے ایمان لائیں یعنی جو لوگ صرف زبان سے ایمان لائے ہیں جیسے منافقین ان میں سے جو دل سے ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں تو ان کو کوئی خوف اور غم نہیں ہوگا' اس آیت کی نظیر یہ آیت ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ . اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

(النساء: ۱۳٦)

یعنی جو صرف زبان سے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں وہ دل سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں۔

(۲) ''ان الذین امنوا'' سے مراد یہ ہے کہ جو ماضی میں اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور ''من امن باللّٰہ'' سے مراد یہ ہے کہ وہ مستقبل میں بھی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے میں برقرار اور ثابت قدم رہیں۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ''ان الذین امنوا'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان رکھتے تھے اور یہود اور نصاریٰ نے جو دین میں باطل چیزیں داخل کر لی ہیں ان سے بری تھے' مثلاً قس بن ساعدہ' بحیرہ راہب' حبیب النجار' زید بن عمرو بن نفیل' ورقہ بن نوفل' سلمان فارسی اور نجاشی کا وفد' گویا کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: جو لوگ بعثت محمد سے پہلے ایمان لائے تھے' اور یہود و نصاریٰ میں سے جو ادیان باطلہ پر ہیں' ان میں سے جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آیا اس کو آخرت میں خوف اور غم نہیں ہوگا۔

(تفسیر کبیر ج ۱ ص ۳٦۹' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

آیا اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے سے موجودہ یہودیوں اور عیسائیوں کی نجات ہو جائے گی؟

اس آیت سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ نجات کے لیے مسلمان ہونا اور حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ مسلمان' یہودی' عیسائی اور صابئی جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئیں اور نیک کام کریں' ان کو آخرت میں خوف اور غم نہیں ہوگا اور موجودہ یہودی اور عیسائی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' لہٰذا ان میں سے جو بھی نیک کام کرنے والے ہیں ان سب کی نجات ہوگی۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ''من امن باللّٰہ'' کا معنی ہے کہ اللہ پر صحیح ایمان لائیں اور اللہ پر ایمان اسی وقت صحیح ہوگا جب اللہ تعالیٰ کے ہر قول اور اس کے ہر حکم کو مان لیا جائے اور جب تک سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول اور آپ کو خاتم النبیین نہ مان لیا جائے' اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں ہوگا' کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ . (الفتح: ۲۹) محمد اللہ کے رسول ہیں۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ . (الاحزاب: ۴۰) محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں' لیکن وہ اللہ کے رسول اور سب نبیوں کے آخر ہیں۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ جب تک سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول اور آخری نبی نہ مان لیا جائے' اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا صحیح نہیں ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ . (آل عمران: ۱۹) بے شک اللہ کے نزدیک اسلام ہی دین ہے۔

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ○ (التوبہ: ۳۳)

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو ہر دین پر غالب کر دے' خواہ مشرکین پسند نہ کریں ○

وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ وَهُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ○ (آل عمران: ۸۵)

اور جس نے اسلام کے سوا کسی اور دین کو طلب کیا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا' اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا ○

ان آیات سے معلوم ہوا کہ جب تک کوئی یہودی' عیسائی یا صابئی اپنے مذہب کو ترک کر کے اسلام کو قبول نہیں کرے گا اس کا اللہ پر ایمان نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ اس کے نزدیک اسلام کے سوا اور کوئی دین قابل قبول نہیں ہے۔

نیز یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ کسی ایک آیت یا کسی ایک حدیث کو دیکھ کر کوئی نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے' جب تک کہ اس موضوع سے متعلق تمام آیات اور احادیث کا مطالعہ نہ کر لیا جائے' کیونکہ بعض آیات مجمل ہوتی ہیں اور ان کی تفصیل دوسری آیات میں ہوتی ہے' بعض آیات بہ ظاہر متعارض ہوتی ہیں اور ان میں کسی دقیق وجہ سے تطبیق ہوتی ہے' اور بعض آیات منسوخ اور بعض ناسخ ہوتی ہیں' بعض آیات عام ہوتی ہیں اور بعض دوسری آیات ان کے لیے مخصص ہوتی ہیں اور یہی حال احادیث کا ہے' اس لیے کسی ایک آیت یا کسی ایک حدیث کو دیکھ کر نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے۔

نجات کے لیے صرف دین کی طرف منسوب ہونا کافی نہیں ہے

علامہ رشید رضا لکھتے ہیں:

امام ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت کیا ہے کہ مسلمان' یہود اور نصاریٰ آپس میں ملے' یہود نے مسلمانوں سے کہا: ہم تم سے بہتر ہیں' ہمارا دین تم سے پہلے ہے اور ہماری کتاب تم سے پہلے ہے اور ہمارے نبی تمہارے نبی سے پہلے ہیں' اور ہم ہی دین ابراہیم پر ہیں اور جنت میں صرف یہودی ہی داخل ہوں گے' نصاریٰ نے بھی اسی طرح کہا' مسلمانوں نے کہا: ہماری کتاب تمہاری کتاب کے بعد ہے' اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے نبی کے بعد ہیں اور ہمارا دین تمہارے دین کے بعد ہے اور تم کو اپنے دین کے ترک کرنے اور ہمارے دین کی اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے' اس لیے ہم تم سے بہتر ہیں' ہم ہی حضرت ابراہیم' حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق کے دین پر ہیں اور جنت میں وہی شخص داخل ہوگا جو ہمارے دین پر ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

لَیۡسَ بِاَمَانِیِّکُمۡ وَلَاۤ اَمَانِیِّ اَهۡلِ الۡکِتٰبِ ؕ مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا یُّجۡزَ بِهٖ ۙ وَلَا یَجِدۡ لَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیۡرًا ○ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ وَلَا یُظۡلَمُوۡنَ نَقِیۡرًا ○ (النساء: ۱۲۳۔ ۱۲۴)

تمہاری خواہشوں پر (کچھ موقوف ہے) نہ اہل کتاب کی امیدوں پر' جو برا کام کرے گا اسے اس کی سزا دی جائے گی' اور وہ اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور مددگار نہ پائے گا ○ اور جو حالت ایمان میں نیک کام کریں گے' خواہ مرد ہو یا عورت تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا ○

(المنار ج ۱ ص ۳۳۶' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت)

خلاصہ یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ کا یہ دعویٰ کرنا باطل ہے کہ جنت ان کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ کسی مسلمان کا محض زبانی ایمان کا دعویٰ کرنا کافی ہے بلکہ جو اللہ اور اس کے رسول پر صحیح ایمان کے ساتھ نیک عمل کرے گا وہ جنتی ہوگا' اسی نہج پر یہ آیت

ہے کہ جو لوگ محض زبان سے اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہودی، عیسائی اور صابئی ان کا محض زبان سے اسلام کا دعویٰ کرنا یا کسی کا یہودی ہونا یا کسی کا عیسائی ہونا یا کسی کا صابئی ہونا نجات کا سبب نہیں ہے، نجات کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ پر صحیح ایمان لائیں اور آخرت کو مانیں بایں طور کہ حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی مانیں اور پچھلے تمام ادیان کو منسوخ مانیں اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کی پیروی کریں اور ان کو آخرت میں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ۖ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ

اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور ہم نے (پہاڑ) طور کو تم پر اٹھا لیا کہ ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے

بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ

اس کو مضبوطی سے لو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو اس امید سے یاد کرو کہ تم پرہیزگار بن جاؤ O اس (عہد) کے بعد

بَعْدِ ذَٰلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ

پھر تم نے اعراض کیا، سو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور

مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي

نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے O اور بے شک تم ان لوگوں کو جانتے ہو جنہوں نے تم میں سے

السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا

ہفتہ کے دن حد سے تجاوز کیا تھا، پس ہم نے ان سے کہا: تم دھتکارے ہوئے بندر بن جاؤ O سو ہم نے اس (واقعہ) کو

لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ﴿۶۶﴾

اس زمانے کے لوگوں اور بعد کے لوگوں کے لیے عبرت بنا دیا اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت بنا دیا O

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا۔ (البقرہ: ۶۳)

عہد اور میثاق کا معنی

عہد کا معنی ہے: کسی شے کی حفاظت کرنا اور ہر حال میں اس کی رعایت کرنا، جس عقد کی رعایت لازم ہو اس کو بھی عہد کہتے ہیں، ہماری عقلوں میں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اقرار ہے اس کو بھی عہد کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو ہمیں کتاب اور سنت کے ذریعے احکام دیے ہیں اور ہم نے ان کی اطاعت کا اقرار کیا ہے، اس کو بھی عہد کہتے ہیں اور جس چیز کو شریعت نے لازم نہیں کیا تھا لیکن ہم نے از خود نذر مان کر اس کو لازم کر لیا اس کو بھی عہد کہتے ہیں، جو کفار مسلمانوں کے عہد میں داخل ہوں ان کو ذو عہد اور معاہد کہتے ہیں۔ عاقدین کے درمیان جس عقد کو حفاظت کے لیے لکھا جاتا ہے اس کو عہدہ اور وثیقہ کہتے ہیں۔

(المفردات ص ۳۵۰، مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران، ۱۳۴۲ھ)

وثاقت کے معنی ہیں: کسی چیز کو مضبوط کرنا' رسی سے باندھنا' میثاق اس عقد کو کہتے ہیں جس کو قسم اور اقرار کے ذریعہ مؤکد کیا گیا ہو۔ (المفردات ص ۵۱۲۔ ۵۱۱' المکتبۃ المرتضویہ ایران' ۱۳۴۲ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے (پہاڑ) طور کو تم پر اٹھالیا۔ الخ (البقرہ: ۶۳)

کتابوں کو نازل کرنے سے مقصود عمل ہے

اس آیت میں جو طور کا لفظ ہے اس کے مصداق میں اختلاف ہے' حضرت ابن عباس نے کہا: اس سے مراد وہ پہاڑ ہے' جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا' مجاہد اور قتادہ نے کہا: اس سے غیر معین پہاڑ مراد ہے' مجاہد نے کہا: سریانی زبان میں طور پہاڑ کو کہتے ہیں۔

جب حضرت موسیٰ بنو اسرائیل کے پاس تورات کی الواح لے کر آئے اور فرمایا: ان کو لو اور ان کی اطاعت کا اقرار کرو' تو انہوں نے کہا: جب تک اللہ تعالیٰ آپ کی طرح ہم سے کلام نہیں کرے گا ہم یہ اقرار نہیں کریں گے' پھر وہ بجلی کی ایک کڑک کے ذریعہ ہلاک کیے گئے' اور پھر زندہ کیے گئے۔ حضرت موسیٰ نے ان سے پھر تورات کے قبول کرنے کے لیے فرمایا' انہوں نے پھر انکار کیا' تب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ فلسطین کے پہاڑوں میں سے ایک فرسخ لمبے پہاڑ کو اکھاڑ کر سائبان کی طرح ان پر معلق کر دیں' ان کے پیچھے سمندر تھا اور ان کے سامنے سے آگ آرہی تھی' ان سے کہا گیا کہ قسم کھا کر اقرار کرو کہ تم تورات کے احکام پر عمل کرو گے ورنہ یہ پہاڑ تم پر گر جائے گا' تب انہوں نے تورات پر عمل کرنے کا پختہ عہد کیا اور توبہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ میں گر گئے' انہوں نے کروٹ کے بل سجدہ کیا تھا اور مارے خوف کے پہاڑ کی طرف دیکھ رہے تھے' جب اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا تو انہوں نے کہا: اس سجدہ سے افضل کوئی سجدہ نہیں ہے' جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول کیا اور جس کی وجہ سے اپنے بندوں پر رحم فرمایا' پھر انہیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ کروٹ کے بل یعنی ایک شق پر سجدہ کیا کریں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کو خوب کوشش سے لو' اور جو کچھ اس میں ہے' اس کو یاد کرو' یعنی اس میں تدبر اور غور و فکر کرو اور اس کے احکام کو ضائع نہ کرو' کیونکہ کتابوں کو نازل کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کے مقتضیٰ پر عمل کیا جائے' یہ نہیں کہ ان کے معنی پر غور و فکر کیے بغیر ان کی صرف تلاوت کر لی جائے۔ امام نسائی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ لوگوں میں سب سے بدتر فاسق وہ ہے جو قرآن پڑھتا ہے اور اس کے کسی حکم کی طرف رجوع نہیں کرتا' اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلا دیا ہے کہ قرآن مجید پڑھنے سے مقصود عمل ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۴۳۷۔ ۴۳۶' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

کیا بنو اسرائیل کے سروں پر پہاڑ کو معلق کر کے ان سے تورات کو قبول کرانا' ان کے اختیار کے منافی نہیں تھا؟

اس مقام پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ جب پہاڑ ان کے سروں پر معلق کر دیا گیا تو پھر ان کا تورات کو قبول کرنا جبر سے ہوا' اور جبر کے ساتھ کسی کا ایمان لانا مقبول نہیں ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جبر نہیں ہے' جبر وہ ہوتا ہے' جس میں انسان کا اختیار نہ ہو' اور اس میں ان کا اختیار تھا' وہ چاہتے تو پہاڑ کے نیچے رہنا قبول کر لیتے اور چاہتے تو تورات کو قبول کر لیتے' سو انہوں نے جان بچانے کے لیے تورات کو قبول کر لیا' البتہ یہ اکراہ ہے' اکراہ وہ ہوتا ہے' جس میں جان سے مارنے کی دھمکی دے کر کوئی کام کرایا جائے' اور ہوسکتا ہے کہ ان کی شریعت میں اکراہ کے ساتھ ایمان جائز ہو۔ ہماری شریعت میں بھی ابتداءً دین میں اکراہ ممنوع تھا' بعد میں جب کفار اور مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا اور جب کافروں سے یہ کہا گیا کہ یا وہ اسلام قبول کر لیں' یا جزیہ دیں

ورنہ ان کو قتل کر دیا جائے گا تو پھر دین میں اکراہ کی ممانعت منسوخ ہو گئی۔

(عنایۃ القاضی ج ۲ ص ۱۷۴-۱۷۳ مطبوعہ دار صادر بیروت ۱۹۸۳ء)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک تم ان لوگوں کو جانتے ہو جنہوں نے تم میں سے ہفتہ کے دن حد سے تجاوز کیا تھا' پس ہم نے ان سے کہا: تم دھتکارے ہوئے بندر بن جاؤ۔ (البقرہ: ۶۵)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ یہ قوم حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ''ایلہ'' میں آباد تھی' یہ شہر مدینہ اور شام کے درمیان ساحل سمندر پر واقع تھا' اس جگہ کے سمندر میں سال کے ایک مہینہ میں اتنی کثرت سے مچھلیاں آتی تھیں کہ پانی دکھائی نہیں دیتا تھا اور باقی مہینوں میں ہفتہ کے دن اس میں بہت مچھلیاں آتی تھیں' ان لوگوں نے مختلف جگہ حوض کھودے اور سمندر سے نالیاں نکال کر ان حوضوں سے ملا دیں' ہفتہ کے دن ان حوضوں میں مچھلیاں چلی جاتیں اور وہ اتوار کے دن ان کا شکار کر لیتے۔ بنو اسرائیل کا ہفتہ کے دن مچھلیوں کو حوضوں میں مقید کر لینا' یہی ان کا حد سے تجاوز کرنا تھا' وہ ایک بڑے لمبے عرصے تک اس نافرمانی میں مشغول رہے' نسل در نسل ان کی اولاد بھی اس میں ملوث رہی' خدا کا خوف رکھنے والے کچھ لوگ منع کرتے تھے' کچھ اس کو برا جانتے تھے اور اس خیال سے منع نہیں کرتے تھے کہ یہ باز آنے والے نہیں ہیں' نافرمان لوگ کہتے تھے کہ ہم اتنے بڑے عرصہ سے یہ کام کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان مچھلیوں میں اضافہ فرما رہا ہے' مانعین کہتے تھے کہ تم دھوکے میں نہ آؤ' ہو سکتا ہے تم پر عذاب نازل ہو جائے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۳۷۲ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ)

اس شہر میں رہنے والے ستر ہزار نفوس تھے اور ان کو منع کرنے والے بارہ ہزار تھے' جب مجرموں نے ان کی نصیحت قبول کرنے سے انکار کر دیا' تو مانعین نے کہا: بخدا! ہم ایک علاقہ میں نہیں رہیں گے' انہوں نے شہر کے درمیان ایک دیوار کھینچ دی اور ان سے الگ رہنے لگے اور کئی سال اسی طرح گزر گئے' پھر معصیت پر ان کے مسلسل اصرار کی وجہ سے حضرت داؤد علیہ السلام نے ان پر لعنت کی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا غضب نازل فرمایا' ایک دن منع کرنے والے اپنے دروازے سے نکلے تو دیکھا کہ مجرمین میں سے کوئی نہیں نکلا' جب کافی دیر ہو گئی تو وہ دیوار پھاند کر گئے' دیکھا تو وہ تمام لوگ بندر بن چکے تھے' ایک قول یہ ہے کہ جوان بندر بن گئے تھے اور بوڑھے خنزیر بن گئے تھے' وہ دوسروں کو پہچان رہے تھے اور دوسرے ان کو نہیں پہچان رہے تھے' وہ تین دن اس حال میں روتے رہے' پھر سب ہلاک ہو گئے اور کوئی مسخ شدہ شخص تین دن سے زیادہ نہیں رہا اور نہ ان کی نسل چلی۔ (تفسیر خازن ج ۱ ص ۶۰ مطبوعہ دار الکتب العربیہ پشاور)

اس واقعہ کے بیان میں ہمارے نبی سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کا اظہار ہے' کیونکہ آپ امی تھے' آپ نے اعلان نبوت سے پہلے نہ کسی چیز کو پڑھا تھا نہ لکھا تھا اور نہ علماء اہل کتاب کی مجلس میں رہے تھے' اس کے باوجود آپ نے اس واقعہ کو بیان فرمایا جو ان کے علماء کے درمیان معروف تھا اور ان کی کتابوں میں لکھا ہوا تھا' اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے جو کچھ بیان فرمایا وہ وحی الٰہی ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو ہفتہ کے دن شکار کرنے سے منع کر دیا تھا تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ سمندر میں ہفتہ ہی کے دن بہ کثرت مچھلیاں آتی تھیں' اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش تھی اور بنو اسرائیل کا امتحان تھا کہ وہ مچھلیوں کی بہتات دیکھ کر پھسل جاتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے پر جمے رہتے ہیں' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ○ (العنکبوت: ۲)	کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ (محض) اس کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کی

آزمائش نہیں کی جائے گی؟ O

اس امتحان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ فرمانبرداروں اور نافرمانوں کو متمیز کردیتا ہے۔

موجودہ بندروں کے مسخ شدہ اسرائیلی ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق

ایک بحث یہ ہے کہ موجودہ بندر اور خنزیر آیا انہی بنو اسرائیل کی نسل سے ہیں جن کو مسخ کردیا تھا یا وہی بندر اور خنزیر ہیں جو شروع سے نسل در نسل چلے آرہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تمام مسخ شدہ بنو اسرائیل تین دن بعد مر گئے تھے۔ امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس کی ایک طویل روایت ذکر کی ہے اس میں ہے:

جن لوگوں نے ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار کیا تھا' ان کی معصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو مسخ کرکے بندر بنادیا' وہ زمین میں صرف تین دن زندہ رہے' انہوں نے کچھ کھایا' نہ پیا' نہ ان کی نسل چلی' اور اللہ تعالیٰ نے بندروں' خنزیروں اور باقی تمام مخلوق کو چھ دنوں میں پیدا کیا تھا جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو بندروں کی صورت میں مسخ کردیا اور وہ جس کے ساتھ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۲۶۱' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

تقریباً تمام علماء اسلام' محدثین' مفسرین اور متکلمین کا اس پر اتفاق ہے' البتہ علامہ ابن العربی مالکی نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے' وہ لکھتے ہیں:

ہمارے علماء نے کہا: اس میں اختلاف ہے کہ جن کو مسخ کیا گیا تھا ان کی ان کے بعد نسل چلی یا نہیں۔ بعض نے یہ کہا: ان کی نسل نہیں چلی اور بعض نے کہا: ان کی نسل چلی ہے اور اس کی دو دلیلیں ہیں' پہلی دلیل یہ ہے کہ حدیث صحیح میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گوہ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ایک امت مسخ کی گئی تھی اور مجھے خدشہ ہے کہ گوہ اسی امت سے ہے۔

(احکام القرآن ج ۲ ص ۳۳۲' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۰۸ھ)

اس حدیث کو امام مسلم نے حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۵۲۔ ۱۵۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام ابوداؤد نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

حضرت ثابت بن ودیعہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک لشکر میں تھے' ہم نے بہت سی گوہ شکار کیں' میں نے ان میں سے ایک گوہ بھون کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھ دی' آپ ایک لکڑی سے اپنی انگلیاں گنتے رہے' پھر آپ نے فرمایا: بنو اسرائیل کے ایک گروہ کو مسخ کرکے زمین میں چلنے والا جانور بنادیا تھا' میں نہیں جانتا وہ کون سا جانور تھا' پھر آپ نے گوہ نہیں کھائی اور نہ اس سے منع فرمایا۔

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۷۶' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

امام نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ (سنن نسائی ج ۲ ص ۱۹۸۔ ۱۹۷' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام ابن ماجہ نے اس حدیث کو ثابت بن زید انصاری سے روایت کیا ہے' اس میں مذکور ہے: آپ نے گوہ کے متعلق فرمایا: بنو اسرائیل کے ایک گروہ کو مسخ کرکے زمین میں چلنے والا جانور بنادیا تھا' میں (از خود) نہیں جانتا شاید کہ وہ یہی جانور ہو۔

(سنن ابن ماجہ ص ۲۳۳' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۳ ص ۶۶۔ ۱۹۔ ۵' مطبوعہ کتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

حافظ الہیثمی بیان کرتے ہیں:

حضرت عبدالرحمان بن حسنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے' ہم ایسی جگہ ٹھہرے جہاں گوہ بہت تھیں' ہم نے ان کو ذبح کیا اور جس وقت ہم پتیلیوں میں ان کو پکا رہے تھے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: اسرائیل کا ایک گروہ گم ہوگیا تھا اور مجھے ڈر ہے کہ وہ یہی گوہ ہیں۔ان دیگچیوں کو الٹ دو' تو ہم نے بھوکے ہونے کے باوجود دیگچیوں کو الٹ دیا' اس حدیث کو امام احمد' امام طبرانی (نے معجم کبیر میں)' امام ابویعلی اور امام بزار نے روایت کیا ہے اور ان تمام ائمہ کی اسانید صحیح ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۴ ص ۳۷' مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت' ۱۴۰۲ھ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوہوں کے متعلق بھی اسی قسم کے خدشہ کا اظہار فرمایا ہے' امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بنو اسرائیل کا ایک گروہ گم ہوگیا تھا' یہ معلوم نہیں ہوا کہ وہ کہاں ہے اور میرا گمان ہے کہ وہ (مسخ شدہ) چوہے ہیں' کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب چوہوں کے سامنے اونٹ کا دودھ رکھا جائے تو وہ اس کو نہیں پیتے اور جب ان کے سامنے بکری کا دودھ رکھا جائے تو وہ اس کو پی لیتے ہیں' دوسری روایت میں ہے: چوہا مسخ شدہ ہے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۴۱۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کو امام عبدالرزاق[1]' امام احمد[2] اور امام طبرانی[3] نے بھی روایت کیا ہے۔

یہ دو حدیثیں جو بہ کثرت اسانید صحیحہ کے ساتھ مروی ہیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غلبہ حال کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ گوہ اور چوہے بنو اسرائیل کی مسخ شدہ نسل ہیں' اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اندیشہ اس وقت تھا جب آپ کو وحی کے ذریعہ یہ قطعی طور پر معلوم نہیں ہوا تھا کہ جن لوگوں کو مسخ کر دیا جائے ان کی نسل نہیں چلتی' اس کی نظیر یہ ہے کہ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ تھا کہ شاید دجال آپ کے زمانہ میں ظاہر ہو جائے لیکن بعد میں آپ کو وحی کے ذریعہ قطعی طور پر بتا دیا گیا کہ دجال کا ظہور قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے زمانہ میں ہوگا' پھر آپ کا اندیشہ زائل ہوگیا۔مسخ شدہ لوگوں کے فوراً ہلاک ہونے اور ان کی نسل نہ چلنے کے متعلق یہ صریح حدیث ہے' امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا بندر اور خنزیر مسخ شدہ لوگ ہیں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل نے کسی قوم کو ہلاک کر کے یا کسی قوم کو عذاب دے کر اس کی نسل نہیں چلائی اور بندر اور خنزیر تو ان سے پہلے بھی ہوتے تھے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۳۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کو امام ابویعلی نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند ابویعلی ج ۵ ص ۱۳۲' مطبوعہ دارالمامون تراث' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

یہ حدیث زیر بحث مسئلہ میں صاف تصریح ہے کہ موجودہ بندر اور خنزیر مسخ شدہ بنو اسرائیل نہیں ہیں۔

علامہ ابن العربی نے اپنے نظریہ پر جو دوسری دلیل قائم کی ہے وہ یہ ہے:

امام بخاری نے عمرو بن میمون سے روایت کیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں دیکھا کہ بندر ایک بندریا کو رجم کر رہے تھے' حدیث کی عبارت یہ ہے کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں دیکھا کہ ایک بندریا نے زنا کیا تھا' اس کے گرد دوسرے بندر جمع ہو گئے جنہوں نے اس کو سنگسار کیا' میں نے بھی اس کو سنگسار کیا' یہ حدیث "صحیح بخاری" کے بعض نسخوں میں ہے اور بعض میں نہیں ہے۔

---

[1] امام عبدالرزاق بن ہمام متوفی ۲۱۱ھ' المصنف ج ۴ ص ۴۴۷' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۰ھ

[2] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۲ ص ۴۱۱' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

[3] امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ' معجم صغیر ج ۲ ص ۴۴' مطبوعہ مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ' ۱۳۸۸ھ

علامہ ابن العربی نے کہا: اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا جانوروں میں بھی بنو اسرائیل کی شریعت کے احکام معروف تھے حتیٰ کہ وہ نسل در نسل ان احکام کے وارث چلے آرہے تھے؟ تو ہم کہیں گے کہ ہاں! اسی طرح ہے' حتیٰ کہ جب یہود نے رجم کے حکم کو تبدیل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر کیا کہ مسخ شدہ اسرائیلیوں (بندروں) میں بھی رجم موجود ہے تاکہ ان کے انکار کے خلاف یہ قوی حجت ہو کہ رجم کا حکم ان کی کتابوں میں ہے' ان کے علماء میں معروف ہے اور حتیٰ کہ یہ حکم مسخ شدہ اسرائیلیوں میں بھی موجود ہے۔ (احکام القرآن ج ۲ ص ۱۳۲' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۰۸ھ)

علامہ قرطبی' علامہ ابن العربی کی اس دلیل کے جواب میں لکھتے ہیں:

امام حمیدی نے کہا: ہم نے اس حدیث کو ''صحیح بخاری'' کے نسخوں میں تلاش کیا تو یہ بخاری کے تمام نسخوں میں نہیں ہے' یہ حدیث ''صحیح بخاری'' کے بعض نسخوں میں ہے' فربری کی روایت سے یہ حدیث نہیں ہے' ہوسکتا ہے کہ بعد میں کسی نے اس حدیث کو ''صحیح بخاری'' میں ملا دیا ہو اور یہ حدیث الحاقی ہو' امام بخاری نے ''تاریخ کبیر'' میں اپنی سند کے ساتھ عمرو بن میمون سے روایت کیا ہے کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں دیکھا' ایک بندریا کے گرد بہت سے بندر جمع ہو کر اس کو پتھر مار رہے تھے' سو میں نے بھی ان کے ساتھ اس کو پتھر مارے۔ اس میں یہ لفظ نہیں ہے کہ اس نے زنا کیا تھا' تو اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس سے امام بخاری کا مقصود صرف اتنا ہے کہ عمرو بن میمون نے جاہلیت کا زمانہ پایا ہے اور ان کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ انہوں نے زمانہ جاہلیت میں کیا گمان کیا تھا۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۴۴۲۔ ۴۴۱' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

ہمارے پاس جو ''صحیح بخاری'' کے معروف نسخے ہیں' ان سب میں یہ حدیث موجود ہے' امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے:

عمرو بن میمون بیان کرتے ہیں کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندریا دیکھی جس نے زنا کیا تھا' اس کے گرد دوسرے بندر جمع تھے جو اس کو سنگسار کر رہے تھے' میں نے بھی ان کے ساتھ مل کر اس کو سنگسار کیا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

اسماعیلی نے اس حدیث کو تفصیل سے روایت کیا ہے' انہوں نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا کہ عمرو بن میمون نے کہا کہ میں یمن میں اپنی بکریاں چرا رہا تھا' میں نے ایک بلند جگہ سے دیکھا کہ ایک بندر' بندریا کے ساتھ آیا اور اس کے ہاتھ کے اوپر سر رکھ کر سو گیا' پھر ایک اور بندر آیا اور اس نے بندریا کو اشارہ کیا' بندریا نے چپکے سے بندر کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالا اور اس بندر کے ساتھ چلی گئی اور اس بندر نے اس کے ساتھ جنسی عمل کیا' بندریا پھر جا کر چپکے سے اسی بندر کے ساتھ لیٹ گئی' جب وہ بندر بیدار ہوا تو اس نے اس بندریا کو سونگھا اور غضب ناک ہو کر چیخا' پھر بہت جلد بہت سے بندر جمع ہو گئے۔ بندر نے اس بندریا کی طرف اشارہ کیا' بندروں نے دائیں بائیں دیکھا اور اس بندر کو پکڑ لائے اور ان دونوں کو سنگسار کر دیا۔ اس وقت میں نے پہلی بار غیر بنو آدم میں رجم کو دیکھا۔ علامہ ابن التین نے کہا کہ شاید یہ بندر ان لوگوں کی نسل سے تھے جن کو مسخ کر دیا گیا تھا' اور ان میں یہ حکم باقی تھا' پھر انہوں نے کہا کہ ممسوخ کی نسل نہیں چلتی' کیونکہ ''صحیح مسلم'' میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس قوم کو ہلاک کیا یا عذاب دیا اس کی نسل نہیں چلائی' اور ان بندروں کے رجم کرنے کا یہ جواب ہے کہ جب بنو اسرائیل کو مسخ کر کے بندر بنایا تھا تو ہوسکتا ہے کہ اصلی بندر بھی ان کے ساتھ آ کر رہنے لگے ہوں' اور انہوں نے بنو اسرائیل کے بعض افعال دیکھ کر یاد کر لیے ہوں' باقی جانوروں کی بہ نسبت بندر بہت ذہین جانور ہے اور اس میں شدید غیرت

ہوتی ہے اور ایک بندر اپنی بندریا کے قریب دوسرے بندر کو نہیں جانے دیتا۔

علامہ ابن عبدالبر نے عمرو بن میمون کی اس روایت کو بہت عجیب وغریب قرار دیا ہے اور کہا: اس میں غیر مکلف کے فعل کو زنا کہا ہے اور جانوروں پر حد کا ذکر ہے اور یہ اہل علم کے نزدیک ناقابل یقین ہے اور اگر بالفرض یہ روایت صحیح ہے تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ بندروں کی صورت میں یہ جن تھے اور جن مکلف ہیں' تاہم یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ فعل صورۃً زنا تھا' اسی طرح یہ صورۃً رجم تھا حقیقۃً یہ زنا اور رجم نہیں تھا۔

امام حمیدی نے ''الجمع بین الصحیحین'' میں نہایت عجیب بات کہی اور انہوں نے یہ زعم کیا کہ یہ حدیث ''صحیح بخاری'' کے بعض نسخوں میں ہے' صرف ابو مسعود نے اس کا اطراف میں ذکر کیا ہے' اور یہ ''صحیح بخاری'' کے نسخوں میں اصلاً نہیں ہے اور یہ امام بخاری کی کتاب میں الحاقی حدیث ہے' ان کا یہ قول مردود ہے کیونکہ یہ حدیث بخاری کے ان تمام معظم اصول میں موجود ہے جس سے ہم واقف ہیں' اور حافظ ابوذر کا اس حدیث کو تین اماموں کی روایت کے ساتھ فربری سے نقل کرنا کافی ہے' اسی طرح اسماعیلی اور ابونعیم نے بھی اس کو اپنی اپنی مستخرج میں ذکر کیا ہے اور ابو مسعود نے اطراف میں' البتہ نسفی کی روایت میں یہ حدیث نہیں ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ فربری کی روایت میں نہ ہو' کیونکہ فربری کی روایت سے نسفی کی روایت کی بہ نسبت بہت احادیث زیادہ ہیں' اور یہ کہنا کہ ''صحیح بخاری'' میں کوئی الحاقی حدیث ہے علماء کے اجماع کے خلاف ہے' کیونکہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اس کتاب میں درج تمام احادیث صحیح ہیں' اور جب کسی ایک حدیث میں یہ مان لیا جائے کہ وہ الحاقی ہوسکتی ہے تو ہر حدیث میں یہ احتمال قائم ہوگا' پھر یہ کتاب قابل اعتماد نہیں رہے گی۔

(فتح الباری ج ۷ ص ۱۶۱۔ ۱۶۰ 'مطبوعہ دارنشر الکتب الاسلامیہ لاہور' ۱۴۰۱ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ''الاصابہ'' میں بھی اس حدیث کو درج کیا ہے اور علامہ ابن عبدالبر کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ وہ بندر جن تھے اور امام حمیدی نے جو اس حدیث کو الحاقی قرار دیا ہے اس پر رد کیا ہے۔ (الاصابہ ج ۳ ص ۱۱۸ 'مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۳۹۰ھ)

تناسخ اور تماسخ کا بیان

کفار کے بعض فرقے مثلاً آریہ' قیامت اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کے منکر ہیں' وہ کہتے ہیں کہ انسان کی روحیں اپنے اعمال کی جزا اور سزا پانے کے لیے ہمیشہ سے آواگون کے چکر میں ہیں اور ہر شخص موت کے بعد اپنے اعمال کے مطابق دوسرا جنم لیتا ہے' اچھا انسان مرنے کے بعد اچھا اور برا انسان مرنے کے بعد برا جنم لیتا ہے' بنو اسرائیل کو جو مسخ کر کے بندر بنادیا گیا تھا اس سے بھی وہ آواگون پر استدلال کرتے ہیں' ہمارے شیخ حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ العزیز نے اپنے زمانہ تعلیم میں پنڈت رام چند سے مناظرہ کیا' اس نے اس آیت سے تناسخ پر استدلال کیا' آپ نے فرمایا: تناسخ میں مرنے کے بعد روح دوسرے جسم میں منتقل ہوتی ہے اور یہاں بنو اسرائیل مرے نہیں تھے زندگی میں ہی ان کی شکلیں مسخ کردی گئی تھیں' سو یہ تناسخ نہیں ہے تماسخ ہے' اس نے کہا: اب تو میں جارہا ہوں آئندہ سال اسی جگہ پھر ملوں گا' آپ نے فرمایا: زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں' یہ بتاؤ کہ اگر تم مر گئے تو کس جون میں آکر مجھ سے ملاقات کرو گے؟ وہ اس جواب سے بہت خوش ہوا اور انعام میں آپ کو اپنی گھڑی دے گیا۔

حیلہ کی تحقیق

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

بعض علماء نے اس آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ ناجائز کاموں کو کسی حیلہ سے جائز کرنا باطل ہے' امام مالک کا بھی

مذہب ہے ان کے نزدیک کسی صورت میں بھی حیلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ علامہ کواشی نے کہا: اکثر علماء کے نزدیک حیلہ کرنا جائز ہے بہ شرطیکہ اس کی وجہ سے کسی باطل چیز کو حاصل نہ کیا جائے اور نہ کسی کا حق باطل کیا جائے' اور یہود نے ہفتہ کے دن مچھلیوں کے شکار کا حیلہ نہیں کیا تھا بلکہ جب انہوں نے ہفتہ کے دن مچھلیوں کو حوضوں میں قید کر لیا تو ان کا مچھلیوں کو قید کرنا ہی ان کا شکار کرنا تھا تو انہوں نے بعینہٖ حرام کا ارتکاب کیا تھا اور اس کے لیے کوئی حیلہ نہیں کیا تھا۔

(روح المعانی ج ۱ ص ۲۸۳ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

اسی طرح جب یہود پر چربی کو حرام کیا گیا تو انہوں نے اس کو پگھلا کر فروخت کرنا شروع کر دیا' یہ بھی حیلہ نہیں تھا بلکہ بعینہٖ حرام کا ارتکاب تھا' اسی لیے آپ نے ان کے اس فعل پر لعنت کی۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۹۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

قرآن اور سنت میں حیلہ کا ثبوت

حیلہ کی اصل قرآن مجید کی اس آیت میں ہے:

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ (ص: ۴۴) اور (اے ایوب! آپ) اپنے ہاتھ میں تنکوں کی ایک جھاڑو لے لیں' پھر اس سے ماریں اور اپنی قسم نہ توڑیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام کسی وجہ سے اپنی بیوی سے ناراض ہو گئے اور یہ قسم کھالی کہ وہ صحت یاب ہونے کے بعد اپنی بیوی کو سو کوڑے ماریں گے' صحت یاب ہونے کے بعد ان کو یہ پریشانی ہوئی کہ اگر میں قسم پوری کرتا ہوں تو میری خدمت گزار بیوی کو اذیت پہنچے گی اور اگر نہیں مارتا تو قسم ٹوٹ جائے گی' تب اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ حیلہ بتایا کہ وہ سو تنکوں کی ایک جھاڑو لے کر ان کو ماریں' اس طرح آپ کی قسم بھی پوری ہو جائے گی اور آپ کی بیوی بھی اذیت پہنچنے سے محفوظ رہے گی۔

حیلہ کے جواز کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت یوسف اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے تو ان کے شاہی کارندے نے شاہی پیمانہ بنیامین کے سامان میں رکھ دیا اور اس ملک کا قانون یہ تھا کہ جس شخص کے پاس سے مال مسروقہ برآمد ہو تو بہ طور سزا اس شخص کو مالک کے حوالہ کر دیا جاتا تھا' سو جب بنیامین کے سامان سے وہ شاہی پیمانہ برآمد ہوا تو ان کو حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالہ کر دیا گیا' قرآن مجید میں ہے:

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ (یوسف: ۷۶) اسی طرح ہم نے یوسف کو تدبیر بتائی' وہ اپنے بھائی کو شاہی قانون کی وجہ سے نہیں لے سکتے تھے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔

احادیث میں بھی حیلہ کا ثبوت ہے' امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

انصار میں سے ایک شخص بیمار ہو گیا حتیٰ کہ وہ بہت کمزور ہو گیا اور اس کی کھال ہڈیوں سے چپک گئی' اس کے پاس انصار کی ایک باندی آئی جس پر وہ فریفتہ ہو گیا اور ہشاش بشاش ہو گیا اور اس نے جنسی عمل کر لیا' پھر جب اس کے قبیلہ کے لوگ اس کے پاس عیادت کے لیے آئے تو اس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میرے متعلق حکم معلوم کرو کیونکہ میں نے اس باندی سے جماع کر لیا ہے' صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کا ذکر کیا اور کہا: ہم نے اس جتنا بیمار شخص اور کوئی نہیں دیکھا' اگر ہم اس کو اٹھا کر آپ کے پاس لائیں تو اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی' اس کی ہڈیوں پر کھال لپٹی ہوئی ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ایک گچھا لے آؤ اور اس پر اس کی ایک ضرب مارو۔

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۵۸ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

امام ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' اس میں ہے کہ پتلی پتلی سو

شاخوں کا ایک گچھا لے آؤ اور اس پر اس کی ایک ضرب مارو۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۸۵ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام احمد[1] نے بھی اس حدیث کو حضرت سعد بن عبادہ سے اسی طرح روایت کیا ہے' امام ابن عساکر[2] نے بھی اس حدیث کو حضرت سعد بن عبادہ سے روایت کیا ہے' اور امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر کا عامل مقرر کیا' وہ آپ کے پاس عمدہ کھجوریں لے آیا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا خیبر کی ساری کھجوریں اسی طرح ہیں؟ اس نے کہا: نہیں' بہ خدا! یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم دو صاع (ایک صاع تقریباً چار کلو گرام کا پیمانہ ہے) کھجوریں دے کر یہ ایک صاع لیتے ہیں' یا تین صاع کھجوریں دے کر دو صاع یہ کھجوریں لیتے ہیں' آپ نے فرمایا: اس طرح نہ کرو' سب کھجوروں کو دراہم کے بدلہ میں بیچو اور عمدہ کھجوروں کو دراہم کے بدلہ میں خرید لو۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۹۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث میں آپ نے سود سے بچنے کا حیلہ بیان فرمایا ہے۔

حیلہ کی تعریف اور اس کی اقسام

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

کسی خفیہ طریقہ سے مقصود کے حاصل کرنے کو حیلہ کہتے ہیں' علماء کے نزدیک اس کی کئی اقسام ہیں:

(۱) اگر جائز طریقہ سے کسی حق (خواہ اللہ کا حق ہو جیسے زکوٰۃ یا بندہ کا حق ہو) باطل کیا جائے یا کسی باطل (مثلاً سود' رشوت اور پگڑی وغیرہ) کو حاصل کیا جائے تو یہ حیلہ حرام ہے۔

(۲) اگر جائز طریقہ سے کسی حق کو حاصل کیا جائے یا کسی باطل یا ظلم کو دفع کیا جائے تو یہ حیلہ مستحب یا واجب ہے۔

(۳) اگر جائز طریقہ سے کسی ضرر سے محفوظ رہا جائے تو یہ حیلہ مستحب یا مباح ہے۔

(۴) اگر جائز طریقہ سے کسی مستحب کو ترک کرنے کا حیلہ کیا جائے تو یہ مکروہ ہے۔

(فتح الباری ج ۱۲ ص ۳۲۶ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

فقہاء کے بیان کیے ہوئے بعض حیلے

علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا: میں نے قسم کھائی ہے کہ اگر میں نے اپنے بھائی سے بات کی تو میری بیوی کو تین طلاقیں ہوں' حضرت عمر نے فرمایا: اپنی بیوی کو ایک طلاق بائن دے دو اور اپنے بھائی سے کلام کر لو اور بیوی سے پھر دوبارہ نکاح کر لو۔ (المبسوط ج ۳۰ ص ۲۰۹ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے' اگر کوئی شخص کسی کا مثلاً ہزار روپے کا مقروض ہے اور اس نے ہزار روپے زکوٰۃ میں نکالنے ہیں تو وہ اپنا قرض کس طرح وصول کرے؟ علامہ محمد حصکفی لکھتے ہیں:

جواز کا حیلہ یہ ہے کہ وہ اپنے مقروض کو جو صاحب نصاب نہ ہو اپنی زکوٰۃ دے اور اس کو مالک بنا دے' پھر اس مقروض سے اپنا قرض وصول کرے اور اگر نہ دے تو اس سے چھین لے کیونکہ وہ اپنا بعینہٖ قرض حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے' اور اگر زکوٰۃ کی رقم سے کسی غریب آدمی کا کفن بنانا ہو تو کسی غریب کو کفن کی رقم زکوٰۃ میں دے دے' پھر وہ شخص اس کو کفن پہنا دے

[1] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۵ ص ۲۲۲ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

[2] امام ابوالقاسم حسن بن علی الشافعی ابن عساکر متوفی ۵۷۱ھ' مختصر تاریخ دمشق ج ۹ ص ۲۲۸ 'مطبوعہ دار الفکر' دمشق' ۱۴۰۴ھ

اس میں دونوں کو ثواب ملے گا' مسجد کی تعمیر میں بھی زکوٰۃ کی رقم اسی طرح لگائی جا سکتی ہے۔

(درمختار ج ۲ ص ۱۲ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

نیز علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

زکوٰۃ کی رقم کو مسجد' سرائے' سبیل وغیرہ پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے اور اس کا حیلہ یہ ہے کہ یہ رقم کسی غریب آدمی کو دے دے' پھر اس کو کہے کہ وہ رقم ان نیک کاموں میں اپنی طرف سے خرچ کرے۔

(درمختار ج ۲ ص ۹۳ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ شامی لکھتے ہیں:

زکوٰۃ ادا کرنے والے کو زکوٰۃ کا ثواب مل جائے گا اور اس غریب شخص کو ان عبادات میں رقم خرچ کرنے کا ثواب مل جائے گا۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۱۲ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

نیز علامہ شامی لکھتے ہیں:

حافظ سیوطی نے ''جامع صغیر'' میں یہ حدیث بیان کی ہے کہ اگر صدقہ سو ہاتھوں سے منتقل ہوتا ہوا کسی شخص کو ملے تو ہر شخص کو اتنا ثواب ہوگا جتنا پہلے شخص کو ثواب ملے گا اور کسی کے ثواب میں کمی نہیں ہوگی۔

(فیض القدیر شرح جامع صغیر ج ۵ ص ۳۳۲ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۱ھ)

علامہ مناوی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو خطیب بغدادی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' اس کی سند میں بشیر بلخی ضعیف راوی ہے۔

اسی اصل پر فقہاء نے حیلہ اسقاط کو جائز کہا ہے۔

حیلہ اسقاط کی تحقیق

علامہ شرنبلالی لکھتے ہیں:

نماز' روزہ' دیگر کفارات اور جنایات کو میت سے ساقط کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان تمام حقوق مالیہ کا ایک اندازہ کرلیا جائے اور اس کے تہائی مال سے اس رقم کو صدقہ کردیا جائے بہ شرطیکہ اس نے وصیت کی ہو' اگر اس نے وصیت نہ کی ہو اور کوئی وارث یا کوئی اور شخص اپنی طرف سے بہ طور احسان میت کی طرف سے صدقہ کردے تو جائز ہے اور اگر اتنی رقم نہ ہو سکی ہو مثلاً کل رقم ایک لاکھ ہے اور وارث کے پاس ہزار روپے ہیں تو سو آدمی بیٹھ جائیں اور وہ ایک شخص کو ہزار روپے میت کا ذمہ ساقط کرنے کی نیت سے دے' وہ دوسرے شخص کو اسی نیت سے ہزار روپے دے حتیٰ کہ جو ننانوے واں شخص ہے وہ سوویں شخص کو اسی نیت سے ہزار روپے دے دے یا وارث اور فقیر ایک دوسرے کو سو بار دیں تو میت کی طرف سے ایک لاکھ روپے کے حقوق ساقط ہو جائیں گے اور ان سو آدمیوں میں سے ہر شخص کو ایک ہزار روپے صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔

(مراقی الفلاح ص ۲۶۲۔ ۲۶۱ 'ملخصاً وموضحاً مطبوعہ مطبع مصطفی البابی واولادہ' مصر' ۱۳۵۶ھ)

علامہ محمد حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

اگر کوئی شخص فوت ہوگیا اور اس کی کئی فوت شدہ نمازیں ہیں تو وہ ان کے کفارہ کی وصیت کرے' اور ہر نماز کے لیے نصف صاع (دو کلو گرام) گندم کفارہ دے' اسی طرح وتر اور ہر روزہ کا کفارہ ہے' یہ کفارہ اس کے تہائی مال سے دیا جائے گا' اگر اس نے مال نہیں چھوڑا تو اس کا وارث مثلاً نصف صاع گندم (یا اس کی قیمت) قرض لے لے' وہ یہ گندم ایک فقیر کو میت کی طرف

سے نماز کے فدیہ میں صدقہ کرے‘ پھر وہ فقیر دوبارہ اس وارث کو یہ گندم صدقہ کر دے اور اسی طرح بار بار یہ دور کرتے رہیں حتیٰ کہ میت کی تمام نمازوں اور روزوں کا فدیہ ادا ہو جائے۔ (درمختار ج ۱ ص ۴۹۲‘ علی ہامش ردالمحتار‘ دار احیاء التراث العربی بیروت‘ ۱۴۰۷ھ)

علامہ شامی لکھتے ہیں:

اقرب یہ ہے کہ میت کی نمازوں کا اندازہ کر کے اس کے حساب سے قرض لے‘ مرد پر بارہ سال اور عورت پر نو سال کی عمر میں نماز فرض ہو جاتی ہے تو ان کی عمر کی قضا نمازوں کا اندازہ کرے اور چھ ماہ یا ایک سال کی نمازوں کے فدیہ کی رقم ادھار لے پھر وہ رقم فقیر کو صدقہ کرے اور فقیر پھر وارث کو یہ رقم صدقہ کر دے یا کسی اور فقیر کو صدقہ کر دے (اور اگر ایک سال کے فدیہ کی رقم قرض لی تھی اور نمازیں دس سال کی ہیں تو وارث اور فقیر ایک دوسرے کو دس بار دیں یا دس فقیروں میں اس رقم کو بار بار دیں اور بعد میں یہ رقم قرض خواہ کو واپس کر دیں)۔ اسی طرح سے میت کے روزوں اور اس کے دوسرے مالی حقوق کی طرف سے بھی فدیہ دیا جائے۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۴۹۳ - ۴۹۲‘ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت‘ ۱۴۰۷ھ)

ہمارے دیہاتوں میں یہ رواج ہے کہ میت کی فوت شدہ نمازوں اور دیگر حقوق مالیہ کا حساب کیے بغیر چند آدمی بیٹھ کر ایک قرآن مجید اور چند روپوں کا آپس میں دور کرتے ہیں‘ اس سے تمام نمازوں اور دیگر مالی حقوق کا فدیہ ادا نہیں ہوتا‘ بلکہ قرآن مجید کی قیمت اور دوسرے روپوں کا جتنی بار دور کیا جاتا ہے اس کے حساب سے فقط اتنی نمازوں کا فدیہ ادا ہو گا۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: بے شک اللہ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے‘

قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ

انہوں نے کہا: کیا آپ ہمارے ساتھ مذاق کرتے ہیں؟ موسیٰ نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں

الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ

جاہلوں سے ہو جاؤں ○ انہوں نے کہا: آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں یہ بیان کرے کہ وہ (گائے)

اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ

کیسی ہے؟ موسیٰ نے کہا: بے شک وہ فرماتا ہے کہ بالتحقیق وہ گائے نہ بوڑھی ہے نہ بچھیا‘ ان کے درمیان متوسط عمر کی ہے‘

ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ

سو تم کو جو حکم دیا جاتا ہے اس کو بجا لاؤ ○ انہوں نے کہا: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں

لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ

یہ بیان کرے کہ اس کا رنگ کیسا ہے؟ موسیٰ نے کہا: بے شک اللہ فرماتا ہے: بالتحقیق وہ چمکدار زرد رنگ کی گائے ہے‘

تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا

دیکھنے والوں کو اچھی لگتی ہے O انہوں نے کہا: آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں یہ بیان کرے کہ

هِیَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا ؕ وَ اِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾

اس کے اوصاف کیسے ہیں؟ بے شک گائے ہم پر مشتبہ ہوگئی ہے اور بے شک اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور ہدایت پا جائیں گے O

قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِی

موسیٰ نے کہا: بے شک اللہ فرماتا ہے: بالتحقیق وہ ایسی گائے ہے جو نہ محنت کرنے والی ہے کہ زمین میں ہل چلاتی ہو اور نہ وہ

الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِیَةَ فِیْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ

کھیتی میں پانی دیتی ہے، وہ صحیح سالم اور بے داغ ہے، وہ پکار اٹھے کہ اب آپ نے ٹھیک بات بتائی ہے؛

فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع

پھر انہوں نے اس گائے کو ذبح کیا اور وہ یہ کام کرنے والے نہ تھے O

بنو اسرائیل کے گائے ذبح کرنے کا بیان

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ ابوالعالیہ سے روایت کرتے ہیں:

بنو اسرائیل میں ایک مال دار شخص تھا (علامہ قرطبی نے کہا: اس کا نام عامیل تھا) اس کی اولاد نہ تھی، اس کا وارث اس کا ایک رشتہ دار تھا (سدی کی روایت میں ہے: وہ اس کا بھتیجا تھا) اس نے اس مالدار شخص کو قتل کر دیا تاکہ اس کا وارث ہو، اور اس کی لاش لوگوں کے راستہ میں ڈال دی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جا کر کہا: میرا رشتہ دار قتل کر دیا گیا اور میرے نزدیک آپ کے سوا اور کوئی شخص نہیں جو اس کے قاتل کا نام بتا سکے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں میں اعلان کیا کہ جس شخص کو بھی اس کے قاتل کا علم ہو وہ ہمارے پاس آ کر بیان کرے، جب کوئی شخص نہ آیا تو وہ قاتل پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور کہا: آپ اللہ کے نبی ہیں، آپ اللہ سے سوال کریں کہ وہ ہمیں قاتل بتلا دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک گائے ذبح کریں، ان کو اس پر تعجب ہوا کہ قاتل بتلانے میں اور گائے کے ذبح کرنے میں کیا مناسبت ہے، اس لیے انہوں نے کہا: آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں، حضرت موسیٰ نے کہا: میں جاہل ہونے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، انہوں نے کہا: آپ اللہ سے معلوم کریں کہ وہ کیسی گائے ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا، پھر کہا: اللہ سے دعا کریں کہ فرمائے اس کا رنگ کیسا ہو؟ کہا: اللہ فرماتا ہے: وہ شوخ زرد رنگ کی گائے ہو جو دیکھنے والوں کو اچھی لگتی ہو، انہوں نے پھر کہا: معلوم کریں اس کی صفت کیسی ہو؟ یہ گائے ہم پر مشتبہ ہوگئی ہے اور ان شاء اللہ ہم ہدایت پا جائیں گے۔ فرمایا: وہ گائے محنت کے کام نہ کرتی ہو نہ ہل چلاتی ہو نہ کھیتوں کو پانی دیتی ہو اور وہ صحیح سالم اور بے داغ ہو، انہوں نے کہا: اب آپ نے پوری بات بتائی ہے، پھر انہوں نے اس گائے کو ذبح کیا اور وہ یہ کام کرنے والے نہ تھے۔

جس وقت ان لوگوں کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اگر یہ اسی وقت کسی بھی گائے کو ذبح کر دیتے تو کافی تھا' لیکن انہوں نے سوالات کر کے گائے میں قیودات لگوائیں تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی اور اگر یہ آخر میں ان شاء اللہ نہ کہتے تو یہ اس گائے کی طرف کبھی بھی ہدایت نہ پاتے' جس گائے کا انہوں نے تعین کیا تھا وہ صرف ایک بوڑھی عورت کے پاس تھی جس کے یتیم بچے تھے' جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ اس گائے کے علاوہ اور کسی گائے کو ذبح نہیں کریں گے تو اس نے اس گائے کی قیمت بہت بڑھا دی (سدی کی روایت میں ہے: اس عورت نے اس کے وزن سے دس گنا زیادہ سونا طلب کیا۔ طبری ج ۱ ص ۳۱۹) وہ حضرت موسیٰ کے پاس گئے اور کہا: وہ عورت بہت زیادہ قیمت مانگ رہی ہے' حضرت موسیٰ نے فرمایا: تم نے خود اپنے اوپر سختی کی ہے' اب اس کی منہ مانگی قیمت دو' انہوں نے وہ قیمت ادا کر کے گائے کو خریدا اور اس کو ذبح کیا' حضرت موسیٰ نے حکم دیا کہ اس کی ہڈی لے کر مقتول کے جسم پر مارو' جب مقتول پر گائے کی ہڈی ماری گئی تو وہ زندہ ہو گیا اور اس نے قاتل کا نام بتا دیا اور پھر مر گیا' اور قاتل وہی شخص تھا جس نے اس کے قاتل کا مطالبہ کیا تھا' اس کو اس برے عمل کی پاداش میں قتل کر دیا گیا۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۳۱۸۔ ۲۹۷' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں:

اس مقتول کا نام عامیل تھا' عطاء اور سدی نے کہا کہ اس کا قاتل اس کا چچا زاد بھائی تھا' ایک قول یہ ہے کہ وہ اس کا بھائی تھا اور ایک قول یہ ہے کہ وہ اس کا بھتیجا تھا' نیز عطاء نے کہا ہے کہ عامیل کے عقد میں اس کی چچا زاد تھی اور وہ بنو اسرائیل میں سب سے حسین عورت تھی' قاتل نے اس لیے قتل کیا کہ وہ اس عورت سے بعد میں نکاح کرے۔

(البحر المحیط ج ۱ ص ۴۰۳' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

بنو اسرائیل کی گائے کا بیان

بنو اسرائیل نے جس گائے کو ذبح کیا تھا اس کے متعلق حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

امام ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بنو اسرائیل میں ایک نوجوان ایک دکان میں کچھ چیزیں فروخت کرتا تھا' اس کا باپ بوڑھا آدمی تھا' ایک دن ایک اور شہر سے ایک شخص آیا اور اس سے کچھ سودا طلب کیا' اور اس کی قیمت دے دی' وہ اس کے ساتھ دکان کھولنے گیا' تاکہ اس کو وہ چیز دے دے' چابی اس کے والد کے پاس تھی اور وہ دکان کے سائے میں سو رہا تھا' اس شخص نے کہا: اس کو جگا دو' اس لڑکے نے کہا: وہ سویا ہوا ہے اور میں اس کو بیدار نہیں کروں گا' اس شخص نے اس کو جگانے کے لیے دگنی قیمت پیش کی' اس لڑکے نے انکار کر دیا' حتیٰ کہ وہ شخص چلا گیا' اس لڑکے نے جو اپنے باپ کے ساتھ نیکی کی تھی اللہ تعالیٰ نے اسکی یہ جزا دی کہ ان کی گائے سے وہ گائے پیدا ہوئی جس کی بنو اسرائیل کو تلاش تھی' بنو اسرائیل اس گائے کو خریدنا چاہتے تھے اور وہ لڑکا راضی نہ ہوتا تھا' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اس کو راضی کر کے گائے خریدو' بالآخر اس کی قیمت یہ طے کی گئی کہ اس کے وزن کے برابر سونا دیا جائے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۷۶' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

امام ابن جریر نے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۳۱۹۔ ۳۱۸' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

گائے ذبح کرنے کے واقعہ سے استنباط شدہ مسائل

بنو اسرائیل کے گائے کو ذبح کرنے کے واقعہ سے حسب ذیل مسائل معلوم ہوئے:

(۱) بنو اسرائیل کو اس حکم میں جو بھی اشکال ہوا اس کے حل کے لیے انہوں نے حضرت موسیٰ سے دعا کی درخواست کی' از خود

دعا نہیں کی نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا: تم خود دعا کرلو اس سے وسیلہ اور مقربین سے دعا کرانے کا ثبوت ہے۔

(۲) مذاق کرنا جاہلوں کا کام ہے البتہ مزاح اور چیز ہے یعنی کوئی نکتہ افروز بات کرنا جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے حکم پر بے چون و چرا عمل کرنا چاہیے اور اس میں حیل و حجت نہیں نکالنی چاہیے۔

(۴) اگر کوئی شخص اپنے اوپر سختی کرے تو اللہ بھی اس پر سختی کرتا ہے بنو اسرائیل نے بے جا سوالات کر کے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی اس میں قیودات لگائیں۔

(۵) جو شخص ماں باپ کا ادب اور ان کی فرماں برداری کرے اللہ اس کو اچھی جزا دیتا ہے۔

(۶) ان شاء اللہ کہنے کی برکت سے کام ہو جاتا ہے کیونکہ جب تک انہوں نے ان شاء اللہ نہیں کہا گائے کی طرف ہدایت نہیں پائی تھی۔

(۷) انسان کو اپنی چیز کی قیمت مقرر کرنے کا اختیار ہے حتیٰ کہ ایک گائے کی قیمت اس کے ہم وزن سونا بھی ہو سکتی ہے۔

(۸) شوخ زرد رنگ اللہ کا پسندیدہ رنگ ہے۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ

اور یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا تھا' پھر تم ایک دوسرے کو اس قتل میں ملوث کرنے لگے اور اللہ اس چیز کو ظاہر کرنے والا

تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ

تھا جس کو تم چھپاتے تھے ○ سو ہم نے کہا: اس گائے کے ایک ٹکڑے کو اس مقتول پر مارو اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ فرمائے گا

الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ

اور وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو ○ پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے

مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ

سو وہ پتھروں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت ہیں' اور بے شک بعض پتھروں سے

مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ

دریا پھوٹ پڑتے ہیں' اور بے شک بعض پتھر پھٹتے ہیں تو ان سے پانی

فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ

نکل آتا ہے' اور بے شک بعض پتھر اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں'

اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں ہے O

گائے کا ایک عضو مقتول پر مارنے سے اس کا زندہ ہونا

ان آیات میں بھی اسی قصہ کو بیان فرمایا ہے جس واقعہ کا اس سے پہلی آیات میں ذکر تھا' اس کا تحقق پہلے ہوا تھا اور اس کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے تا کہ بنو اسرائیل کو ان کی خودسری' ہٹ دھرمی اور شقاوت پر دوبارہ سرزنش کی جائے' اگر یہ سوال کیا جائے کہ قتل تو ایک شخص نے کیا تھا اور اس آیت میں تمام بنو اسرائیل کی طرف اس کا اسناد کیا گیا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ عرب کا اسلوب ہے کہ قبیلہ کے ایک فرد نے فعل کیا ہو تو پورے قبیلہ کی طرف اس کی نسبت کر دیتے ہیں' بنو اسرائیل قاتل کو مخفی رکھنا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کرنا چاہتا تھا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک گائے ذبح کرو جس کی تفصیل اس سے پہلی آیات میں ذکر کی جا چکی ہے' اور فرمایا: اس گائے کے کسی عضو کو اسی مقتول پر مارو' اس عضو میں مختلف اقوال ہیں مثلاً زبان' دم' کان' ہڈی اور دل وغیرہ' جب گائے کے عضو کو مقتول پر مارا گیا تو اس کی رگوں سے خون بہنے لگا اور اس نے کہا: مجھے میرے بھتیجے نے قتل کیا ہے۔

گائے ذبح کرا کر مقتول کو زندہ کرنے کی حکمت

رہا یہ سوال کہ اس مقتول کو اس طرح کیوں زندہ کیا گیا؟ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کی دعا سے ویسے ہی زندہ فرما دیتا' آخر اس سے پہلے بھی تو ستر اسرائیلیوں کو زندہ فرمایا تھا' اس کا جواب یہ ہے کہ مقتول کو زندہ کرنے کے سلسلہ میں مشقت کا کچھ بار اللہ تعالیٰ بنو اسرائیل پر ڈالنا چاہتا تھا' اور ان کی کج بحثی اور حیلہ جوئی کو دکھانا چاہتا تھا اور اس ذریعہ سے ایک صالح اور ماں باپ کے فرمانبردار لڑکے کو فائدہ پہنچانا چاہتا تھا' اور یہ بتلانا چاہتا تھا کہ کسی چیز کو طلب کرنے سے پہلے کسی عبادت سے تقرب حاصل کرنا مستحسن ہے' اور حصول ثواب کا ذریعہ ہے' نیز ان کے سوالات کرنے کی وجہ سے گائے میں قیودات لگا کر سختی کی گئی تا کہ دوسروں کو عبرت ہو کہ اللہ کے حکم پر حیل و حجت کے بغیر عمل کرنا چاہیے اور یہ کہ اللہ کے حکم سے جو جانور ذبح کیا جائے وہ بہت قیمتی' صحیح سالم' بے داغ اور حسین و جمیل ہونا چاہیے اور اس میں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ قاتل مقتول کا وارث نہیں ہوتا' لیکن اگر عادل نے باغی کو قتل کیا یا کسی حملہ آور کو مدافعت میں قتل کیا تو وہ اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو (قیامت کے دن) زندہ فرمائیگا' ہر چند کہ یہ آیت بنو اسرائیل سے خطاب کے سلسلہ میں ہے لیکن اس میں ان لوگوں کی تعریض ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مر کر دوبارہ اٹھنے کا انکار کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ (البقرہ: ۷۴)

اس میں مردہ کو زندہ کرنے کی طرف اشارہ ہے' یا اس کے کلام کرنے کی طرف اشارہ ہے یا اس سے پہلے جن نشانیوں کا ذکر ہوا ان کی طرف اشارہ ہے' یعنی پتھر سے پانی کے چشموں کا جاری کرنا' ان پر پہاڑ معلق کر دینا' یا ہفتہ کے دن شکار کرنے والوں کو بندر اور خنزیر بنا دینا۔ ان نشانیوں کو دیکھنے کے بعد ان کے دل کی سختی کا یہ عالم تھا کہ جب مقتول نے زندہ ہو کر بتایا کہ فلاں شخص اس کا قاتل ہے تو انہوں نے کہا: یہ جھوٹ ہے۔ علاوہ ازیں ان نشانیوں کے دیکھنے کے باوجود اپنی ہٹ دھرمی اور نافرمانیوں سے باز نہیں آئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک بعض پتھروں سے دریا پھوٹ پڑتے ہیں اور بے شک بعض پتھر پھٹتے ہیں تو ان سے پانی نکل آتا ہے اور بے شک بعض پتھر اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ (البقرہ: ۷۴)

پتھروں' درختوں اور جانوروں کا ادراک اور ان کا آپ کی رسالت کی گواہی دینا

اس آیت میں اثر پذیری کے اعتبار سے پتھروں کی تین قسمیں بتائی ہیں' ایک قسم وہ ہے جس سے دریا پھوٹ پڑتے ہیں' ان میں سب سے زیادہ اثر پذیری ہے' دوسری قسم میں اس سے کم اثر پذیری ہے جن سے پانی نکل آتا ہے' اور سب سے کم اثر پذیری ان پتھروں میں ہے جو خوف خدا سے گر پڑتے ہیں۔ بنو اسرائیل میں اتنی اثر پذیری بھی نہیں ہے' اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پتھروں میں بھی ادراک ہوتا ہے' جس کی وجہ سے ان میں خدا کا خوف ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی اس پر دلالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پتھروں اور پہاڑوں میں ایک قسم کا ادراک پیدا کیا ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ (الحشر: ۲۱) — اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تم ضرور اس کو جھکتا ہوا اور اللہ کے خوف سے پھٹتا ہوا دیکھتے۔

يٰجِبَالُ اَوِّبِىْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ (سبا: ۱۰) — اے پہاڑ! اور پرندو! تم داؤد کے ساتھ تسبیح کرو۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس اور حضرت انس رضی اللہ عنہم روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احد پہاڑ کے متعلق فرمایا: احد پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۰۱۔ ۲۰۰' ج ۲ ص ۵۸۵ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں مکہ میں ایک پتھر کو پہچانتا ہوں جو اعلان نبوت سے پہلے مجھ پر سلام عرض کرتا تھا' میں اب بھی اس کو پہچانتا ہوں۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۴۵ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کو امام طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔ (معجم صغیر ج ۱ ص ۹۲ مطبوعہ مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ' ۱۳۸۸ھ)

امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حجر اسود اور رکن یمانی کو اس حال میں اٹھائے گا کہ ان کی دو آنکھیں' زبان اور دو ہونٹ ہوں گے' اور جس نے ان کی پوری تعظیم کی وہ اس کے حق میں گواہی دیں گے۔ (معجم کبیر ج ۱۱ ص ۱۴۶ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

حافظ الہیثمی بیان کرتے ہیں:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سات یا نو کنکریاں اپنے ہاتھ میں لیں تو وہ تسبیح کرنے لگیں' شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ان کی آواز سنائی دیتی تھی الحدیث۔ اس حدیث کو امام بزار نے دو سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے اور ایک سند کے راوی ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۹۹ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مجھ پر وحی کی گئی تو میں جس پتھر یا درخت کے پاس سے گزرتا تھا وہ کہتا تھا: السلام علیک یا رسول اللہ! اس حدیث کو امام بزار نے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا۔

(مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۶۰۔ ۱۵۹ مطبوعہ دارالکتاب العربی ۱۴۰۲ھ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باہر نکلا' آپ جس پتھر یا درخت کے پاس سے گزرتے تھے وہ آپ کو سلام عرض کرتا تھا۔ حافظ الہیثمی نے کہا: اس حدیث کو امام طبرانی نے ''معجم اوسط'' میں روایت کیا ہے' اس کی سند میں ایک راوی کا مجھے علم نہیں' باقی راوی ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۶۰ مطبوعہ دارالکتاب العربی' ۱۴۰۲ھ)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کے کسی راستہ میں جارہا تھا کہ آپ کے سامنے جو بھی پہاڑ یا درخت آتا وہ کہتا: السلام علیک یا رسول اللہ! (جامع ترمذی ص ۵۱۲ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے پتھروں کے علاوہ درختوں میں بھی ادراک پیدا کیا ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے منبر بنا کرلایا گیا تو جس کھجور کے ستون کے ساتھ آپ ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے وہ اس طرح چیخ مار کر رو رہا تھا جیسے اونٹنی اپنے بچے کے فراق میں روتی ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۲۵ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ سامنے سے ایک اعرابی آرہا تھا' جب وہ قریب آیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: تم کہاں جارہے ہو؟ اس نے کہا: اپنے اہل کے پاس' آپ نے فرمایا: کیا تم کوئی خیر حاصل کرو گے؟ اس نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: تم یہ گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ وحدہ لاشریک ہے اور محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں' اس نے کہا: آپ کے اس قول پر کون گواہ ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ درخت' وہ درخت وادی کے کنارے تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخت کو بلایا تو وہ زمین کو پھاڑتا ہوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہو گیا' آپ نے اس سے تین مرتبہ اپنی رسالت پر شہادت طلب کی اور اس نے اسی طرح شہادت دی جس طرح آپ نے کلمہ شہادت پڑھا تھا' پھر وہ درخت اپنی جگہ واپس چلا گیا' وہ اعرابی اپنی قوم کی طرف چلا گیا اور اس نے کہا: اگر قوم نے میری بات مان لی تو میں ان کو لے کر آؤں گا ورنہ خود حاضر ہوں گا۔

(معجم کبیر ج ۱۲ ص ۴۳۰ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت)

اس حدیث کو امام ابویعلیٰ نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند ابویعلیٰ ج ۵ ص ۲۵۸ مطبوعہ دارالمامون تراث' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

حافظ الہیثمی لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام بزار نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۹۲ مطبوعہ دارالکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

جانوروں کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ادراک تھا' امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ ایک محفل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں بنوسلیم کا ایک اعرابی آیا' اس نے ایک گوہ شکار کر کے اپنی آستین میں رکھی ہوئی تھی' اس نے جب یہ جماعت دیکھی تو لوگوں سے پوچھا: اس جماعت کا امیر کون ہے؟ لوگوں نے بتایا: وہ شخص ہیں جو خود کو نبی گمان کرتے ہیں' وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگا: اے محمد! تم سے بڑھ کر جھوٹا کوئی نہیں ہے اور میرے نزدیک تم سے بڑھ کر

مبغوض کوئی نہیں ہے اور اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ میری قوم مجھ کو جلد باز کہے گی تو میں تم کو قتل کر دیتا اور اس پر سب لوگ خوش ہوتے' حضرت عمر نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ کو اجازت دیں میں اس کو قتل کر دوں! رسول اللہ نے فرمایا: تم کو معلوم نہیں کہ نبی بردبار ہوتا ہے! اس اعرابی نے کہا: اگر یہ گوہ آپ پر ایمان لے آئے تو لات اور عزیٰ کی قسم! میں آپ پر ایمان لے آؤں گا اور اس نے آستین سے گوہ نکال کر رسول اللہ کے سامنے پھینک دی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوہ سے کہا: اے گوہ! اس نے فصیح عربی میں کہا: اے رب العلمین کے رسول! لبیک میں حاضر ہوں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کس کی عبادت کی جاتی ہے؟ اس نے کہا: جس کا آسمان میں عرش ہے اور زمین میں اس کی سلطنت ہے' سمندر میں جس کی سبیل ہے' جنت میں جس کی رحمت ہے اور دوزخ میں جس کا عذاب ہے' آپ نے فرمایا: اے گوہ! میں کون ہوں؟ اس نے کہا: آپ رب العلمین کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں' جس نے کی آپ کی تصدیق کی وہ کامیاب ہے اور جس نے آپ کی تکذیب کی وہ ناکام ہے' پھر اس اعرابی نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے برحق رسول ہیں' بے شک جس وقت میں آیا تھا تو میرے نزدیک آپ سے بڑھ کر مبغوض کوئی نہیں تھا اور اب میرے نزدیک آپ سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں ہے۔ (معجم صغیر ج ۲ ص ۶۵ ۔ ۶۴ 'مطبوعہ مکتبہ سلفیہ' مدینہ منورہ' ۱۳۸۸ھ)

حافظ الہیثمی لکھتے ہیں:

محمد بن علی بن ولید بصری کے علاوہ اس کی سند کے باقی راوی صحیح ہیں' اس حدیث کا مدار اسی پر ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۹۴ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحراء میں تھے کہ کسی آواز دینے والے نے آواز دی: یا رسول اللہ! آپ نے مڑ کر دیکھا تو کوئی نظر نہیں آیا' آپ پھر متوجہ ہوئے تو ایک ہرنی بندھی ہوئی تھی' اس نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے قریب آئیں' آپ اس کے قریب گئے اور فرمایا: تمہیں کیا کام ہے؟ اس نے کہا: اس پہاڑ میں میرے دو بچے ہیں' آپ مجھے کھول دیں تاکہ میں جا کر انہیں دودھ پلا آؤں' پھر میں آپ کے پاس واپس آ جاؤں گی' آپ نے فرمایا: تم ایسا کرو گی؟ اس نے کہا: اگر میں ایسا نہ کروں تو اللہ مجھے اس اونٹنی کے عذاب میں مبتلا کرے جس کے بچے گم ہو گئے ہوں' آپ نے اس کو کھول دیا' وہ گئی' جا کر اس نے اپنے بچوں کو دودھ پلایا' پھر واپس آ گئی اور آپ نے اس کو باندھ دیا' اعرابی بیدار ہوا تو اس نے پوچھا: یا رسول اللہ! کوئی کام ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اس ہرنی کو کھول دو' وہ چھلانگیں لگاتی ہوئی گئی اور کہہ رہی تھی: میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔

(معجم کبیر ج ۲۳ ص ۳۳۲ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے: اس حدیث کی سند میں ایک ضعیف راوی ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۹۵ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ

(اے مسلمانو!) کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہودی) تمہاری خاطر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان کا ایک فریق اللہ کا

يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ

کلام سنتا تھا پھر اس کو سمجھنے کے باوجود اس میں دانستہ

وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ

تبدیلی کر دیتا تھا○ اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے

وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ

اور جب یہ ایک دوسرے کے ساتھ تنہائی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: کیا تم ان (مسلمانوں) کو وہ (حق)

اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾

باتیں بتا دیتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تا کہ وہ ان باتوں کو تمہارے رب کے سامنے حجت بنائیں؛ کیا تم عقل نہیں رکھتے؟○

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾

کیا وہ (یہودی) نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جس کو وہ چھپاتے ہیں اور جس کو ظاہر کرتے ہیں○

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ

اور ان میں سے بعض ان پڑھ ہیں جو زبانی پڑھنے کے سوا (اللہ کی) کتاب کا علم نہیں رکھتے اور وہ صرف

اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ق

ظن (گمان) کرتے ہیں ○ پس عذاب ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں؛

ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ

پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے تاکہ اس کے بدلہ میں تھوڑی قیمت لیں؛ سو ان کے لیے

فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

عذاب ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور جو کچھ انہوں نے کمایا اس کے سبب سے ان کو عذاب ہو گا○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے مسلمانو!) کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہودی) تمہاری خاطر ایمان لے آئیں گے؟

(البقرہ: ۷۵)

آیات مذکورہ کا شان نزول

جب کسی چیز کی بہت زیادہ رغبت ہوتی ہے اور انسان اس کے حصول کی قوی امید کر لیتا ہے تو اس کو طمع کہتے ہیں' ہم نے اس کا ترجمہ توقع کیا ہے۔ علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں: اس آیت کے شان نزول میں دو قول ہیں:

(۱) یہ آیت ان انصار کے متعلق نازل ہوئی ہے جو یہود کے حلیف تھے' وہ ان کے پڑوسی بھی تھے اور ان کے درمیان رضاعت بھی تھی' وہ یہ چاہتے تھے کہ یہ یہودی مسلمان ہو جائیں۔

(۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان یہ خواہش رکھتے تھے کہ ان کے زمانہ میں جو یہودی ہیں وہ مسلمان ہو جائیں کیونکہ وہ اہل کتاب تھے اور ان کے پاس شریعت تھی' حضور ان کے ساتھ نرمی کرتے تھے اور ان کی وجہ سے دوسروں پر سختی کرتے تھے تاکہ وہ یہودی مسلمان ہو جائیں۔ (البحر المحیط ج ۱ ص ۴۳۷ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حالانکہ ان کا ایک فریق اللہ کا کلام سنتا تھا' پھر اس کو سمجھنے کے باوجود اس میں دانستہ تبدیلی کر دیتا تھا O (البقرہ: ۷۵)

بنو اسرائیل کی تحریف کا بیان

اس آیت میں جو یہ فرمایا ہے کہ ایک فریق اللہ کا کلام سنتا تھا اس کی تفسیر میں دو قول ہیں' ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے بلاواسطہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تھا اور پھر اس میں تبدیلی کی اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس کلام اللہ سے مراد تورات ہے' جس میں وہ تحریف کرتے تھے۔ پہلے قول کے متعلق امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

امام محمد بن اسحٰق بیان کرتے ہیں کہ مجھے بعض اہل علم سے یہ حدیث پہنچی ہے کہ بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ! اللہ تعالیٰ کے دیدار اور ہمارے درمیان کڑک حائل ہو گئی لیکن جب اللہ تعالیٰ آپ سے ہم کلام ہو تو آپ ہمیں اس کا کلام سنا دیں' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی' اللہ تعالیٰ نے اس کو قبول فرمالیا' حضرت موسیٰ نے ان سے فرمایا کہ تم غسل کرو' صاف کپڑے پہنو اور روزے رکھو' پھر وہ ان کو لے کر طور پر آئے' جب بادل نے ان کو ڈھانپ لیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا: سجدہ میں گر جائیں' وہ سجدہ میں گر گئے' حضرت موسیٰ نے اپنے رب سے کلام کیا اور انہوں نے اس کلام کو سنا' اللہ تعالیٰ نے بعض چیزوں کا امر کیا اور بعض چیزوں سے منع کیا' انہوں نے اس کو سن کر سمجھ لیا' جب بنو اسرائیل کے پاس پہنچے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس چیز کا حکم دیا ہے اور اس چیز سے منع کیا ہے' تو ان لوگوں نے اس میں تحریف کر دی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بتائے ہوئے احکام کو بدل دیا۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۲۹۱ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

امام ابن جوزی اس روایت پر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بعض اہل علم نے اس روایت کا شدید انکار کیا ہے' ان میں سے امام ترمذی صاحب ''نوادر الاصول'' بھی ہیں' انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کے کلام کو بلاواسطہ سننا صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت ہے' ورنہ ان میں اور حضرت موسیٰ میں کیا فرق رہے گا؟ اس قسم کی احادیث کو کلبی نے روایت کیا ہے اور وہ جھوٹا شخص ہے۔

(زاد المسیر ج ۱ ص ۱۰۲۔ ۱۰۳ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

دوسرے قول کے متعلق امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ابن زید نے کہا: اس کلام اللہ سے مراد تورات ہے' بنو اسرائیل اس میں تحریف کر کے اس کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتے تھے اور حق کو باطل اور باطل کو حق بیان کرتے تھے۔ جب ان کے پاس صاحب حق رشوت لے کر آتا تو کتاب سے اس

کی منشاء کے مطابق مسئلہ بیان کرتے اور جب باطل پر قائم کوئی شخص ان کے پاس رشوت لے کر آتا تو کتاب سے اس کی مرضی کے مطابق حکم بیان کرتے' اور جب کوئی شخص رشوت لے کر نہ آتا تو پھر کتاب سے صحیح حکم نکال کر بیان کر دیتے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۲۹۱ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ ابن جریر فرماتے ہیں: زیادہ صحت کے قریب یہ ہے کہ تورات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات مذکور تھیں ان میں دانستہ تحریف کرتے تھے اور آپ کی صفات کو تبدیل کر کے بیان کرتے تھے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۲۹۲ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ تورات میں مذکور تھا کہ آپ کا گورا رنگ ہے اور متوسط قد ہے اور جب ان سے آخری نبی کی صفات پوچھی جاتیں تو یہ کہتے: ان کا سانولا رنگ ہے اور لمبا قد ہے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۲۹۸ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے۔ (البقرہ: ۷۶)

یہود کے نفاق کا بیان

علامہ ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب منافقین یہود حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے ملتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور ابوالعالیہ اور قتادہ نے بیان کیا کہ جب یہ آپس میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تمہاری کتاب میں جو (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صفات بیان کی گئی ہیں وہ تم مسلمانوں کے سامنے کیوں بیان کرتے ہو' وہ اس بیان کو تمہارے خلاف حجت بنالیں گے کہ جب یہ وہی آنے والے نبی ہیں تو تم ان پر ایمان کیوں نہیں لائے؟ (جامع البیان ج ۱ ص ۲۹۲ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان میں سے بعض ان پڑھ ہیں جو زبانی پڑھنے کے سوا (اللہ کی) کتاب کا علم نہیں رکھتے۔

(البقرہ: ۷۸)

''امی'' اور ''امنیہ'' کا معنی

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں کئی گمراہ فرقوں کا بیان فرمایا ہے' پہلے اس فرقہ کا بیان کیا جو اللہ کے کلام میں تحریف کرتا ہے' پھر دوسرے فرقہ کا بیان کیا جو منافقین ہیں' پھر تیسرے فرقہ کا بیان کیا جو مجادلین (بحث میں ضد سے کام لینے والے) تھے اور یہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کے سامنے تورات کی ایسی آیات بیان کرو جو خود تمہارے خلاف حجت ہوں' اس کے بعد اب چوتھے فرقہ کا بیان کیا جو عوام اور ناخواندہ لوگ ہیں' ان کو اللہ تعالیٰ نے امیین فرمایا' امی وہ شخص ہے جو لکھتا ہو نہ پڑھتا ہو یعنی جس طرح ماں کے بطن سے ناخواندہ پیدا ہوا تھا اسی حالت پر ہو اور کسی سے علم حاصل نہ کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ کتاب کا علم نہیں رکھتے ماسوا ''امانی'' کے' ''امانی'' ''امنیہ'' کی جمع ہے' ''امنیہ'' کا ایک معنی ہے: پڑھنا' یعنی یہ عام ان پڑھ لوگ صرف زبانی تورات کو پڑھ لیتے ہیں' اس کا معنی نہیں جانتے' جیسے ہمارے برصغیر میں عام خواندہ لوگ قرآن مجید کی عبارت کو معنی سمجھے بغیر پڑھتے ہیں' اور اس کا دوسرا معنی ہے: تمنا اور آرزو' یعنی ان کی صرف تمنائیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دے گا اور ان پر رحم فرمائے گا اور ان گناہوں پر گرفت نہیں فرمائے گا' اور ان کے آباء و اجداد میں جو انبیاء ہیں وہ ان کی شفاعت کریں گے' یا ان کے علماء کی جو تمنائیں تھیں کہ دوزخ کی آگ ان کو صرف چند دن جلائے گی' یا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ سوائے ان جھوٹی اور من گھڑت باتوں کے کتاب کا علم نہیں رکھتے جو انہوں نے اپنے علماء سے سن لی ہیں اور ان کو بہ طور تقلید کے مانتے

چلے آرہے ہیں لیکن یہاں ''امنیہ'' کو تمنا کے معنی پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس کے بعد کی آیت میں ان کی اس تمنا کا ذکر آرہا ہے کہ ان کو صرف چند دن آگ جلائے گی۔ ہم نے ''شرح صحیح مسلم'' کی پانچویں جلد میں اسی کا معنی زیادہ تفصیل اور تحقیق سے بیان کیا ہے اور سورہ اعراف میں ان شاء اللہ اس پر مکمل بحث کریں گے اسی طرح ان شاء اللہ سورہ حج میں ''امنیہ'' کے معنی پر بحث کریں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس عذاب ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ (البقرہ: ۷۹)

ویل کا معنی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

اصمعی نے کہا: ''ویل'' بری چیز ہے اور اس کا استعمال حسرت کے موقع پر ہوتا ہے اور ''ویح'' کا استعمال ترحم کے طور پر ہوتا ہے۔ (المفردات ص ۵۳۵' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران' ۱۳۴۲ھ)

امام ابن جریر طبری اپنی اسانید کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس نے فرمایا: ''فویل لھم'' کا معنی ہے: ان پر عذاب ہو' ابو عیاض نے کہا: ویل اس پیپ کو کہتے ہیں جو جہنم کی جڑ میں گرتی ہے' حضرت عثمان بن عفان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ ویل' جہنم میں ایک پہاڑ ہے اور حضرت ابو سعید نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ ویل جہنم میں ایک وادی ہے' کافر اس کی گہرائی تک پہنچنے سے پہلے چالیس سال تک گرتا رہے گا۔ ان احادیث اور آثار کے اعتبار سے ویل کا معنی یہ ہے کہ جو یہودی اپنی طرف سے لکھ کر کتاب اللہ میں تحریف کرتے ہیں ان کو جہنم کی گہرائی میں اہل جہنم کی پیپ پینے کا عذاب ہوگا۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۳۰۰۔ ۲۹۹' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

ابو العالیہ نے کہا کہ یہود سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں تحریف کرتے تھے اور دنیاوی مال کی وجہ سے اس میں تبدیلی کرتے تھے' حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہود نے اپنی خواہش کے مطابق تورات میں احکام لکھ دیئے اور جو احکام ان کو ناپسند تھے ان کو انہوں نے تورات سے مٹا دیا' نیز انہوں نے تورات سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مٹا دیا' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر غضب فرمایا۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۳۰۱۔ ۳۰۰' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ

اور انہوں نے کہا: گنتی کے چند دنوں کے سوا ان کو ہرگز آگ نہیں چھوئے گی' آپ کہیے: آیا تم نے اللہ سے کوئی

عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى

عہد لے لیا جس کی اللہ ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا یا تم اللہ کے متعلق وہ بات کہتے ہو

اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸۰﴾ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ

جس کا تمہیں علم نہیں ہے؟ O کیوں نہیں! جنہوں نے برا کام کیا اور اُن کی برائی نے اُن کو (پوری طرح)

بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

گھیر لیا وہ جہنمی ہیں، اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے O

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ جنتی ہیں،

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

وہی اس میں ہمیشہ رہیں گے O

۹ ع ۱۱/۹

عذاب یہود کے مزعومہ چند دنوں کا بیان

یہودی کہتے تھے: ان کو صرف چند دن عذاب ہوگا اور ان چند دنوں کے متعلق دو قول ہیں' ایک قول یہ ہے:

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے دشمن یہودیوں نے کہا: اللہ تعالیٰ ہمیں جہنم میں صرف قسم پوری کرنے کے لیے داخل کرے گا اور یہ چالیس دن کی مدت ہے' جس میں ہم نے بچھڑے کی پرستش کی تھی۔

اور دوسرا قول یہ ہے:

مجاہد نے بیان کیا کہ یہود یہ کہتے تھے کہ دنیا کی مدت ہزار سال ہے اور ہمیں ہر ہزار کے مقابلہ میں ایک سال عذاب دیا جائے گا یعنی کل سات سال عذاب دیا جائے گا۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۳۰۳۔ ۳۰۲' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیوں نہیں' جنہوں نے برا کام کیا اور ان کی برائی نے اُن کو (پوری طرح) گھیر لیا وہ جہنمی ہیں۔

(البقرہ: ۸۱)

بلاتوبہ مرتکب کبیرہ مرنے والے کے دائمی عذاب پر معتزلہ کا استدلال اور اس کا جواب

معتزلہ اور خوارج نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ جس مسلمان نے گناہ کبیرہ کیا اور بغیر توبہ کے مر گیا وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا' لیکن ان کا یہ استدلال دو وجہوں سے باطل ہے:

اول تو اس وجہ سے کہ امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس آیت میں ''سیئہ'' (برائی) سے مراد کفر ہے اور ابووائل' مجاہد اور قتادہ سے مروی ہے کہ ''سیئہ'' سے مراد اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا ہے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۳۰۵۔ ۳۰۴' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اور جو شخص مشرک ہو وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا' دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ برائی اس کا احاطہ کرلے اور احاطہ اس وقت ہوگا جب اس کے دل سے بھی تصدیق نکل جائے اور اس میں ایمان اور خیر مطلقاً نہ رہے اور ایسا شخص کافر ہے اور وہ جہنم میں ہمیشہ رہے گا۔

اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان بغیر توبہ کے مر گیا تو اس کی بخشش ہوسکتی ہے اور ان کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ (النساء: ۴۸)
بے شک اللہ اپنے ساتھ شرک کیے جانے کو نہیں بخشے گا اور جو (گناہ) اس سے کم ہو اس کو جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس مسلمان نے شرک نہیں کیا خواہ اس نے کوئی گناہ کیا ہو توبہ کی ہو یا نہ کی ہو اللہ چاہے گا تو اس کو بخش دے گا۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللّٰهَ قف
اور یاد کرو جب ہم نے بنو اسرائیل سے یہ پختہ عہد لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِينِ
اور ماں باپ' رشتہ داروں' یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ط
نیکی کرنا اور لوگوں سے اچھی باتیں کرنا' اور نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرنا'

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۸۳﴾
پھر تم میں سے چند لوگوں کے علاوہ تم سب (اس عہد سے) منحرف ہو گئے اور تم (ہو ہی) منہ موڑنے والے O

ربط آیات

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ بنو اسرائیل نے برے کام کیے اور برے کاموں نے ان کا احاطہ کر لیا' اب اللہ تعالیٰ اس کی تفصیل بیان فرما رہا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے پختہ عہد کیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور ماں باپ' رشتہ داروں' یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کریں گے' لوگوں سے اچھی باتیں کریں گے' نماز قائم کریں گے اور زکوۃ دیں گے' پھر چند اشخاص کے سوا باقی سب نے اس عہد کی خلاف ورزی کی۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کی عبادت کرنا' نماز قائم کرنا' اور زکوۃ ادا کرنا' ماں باپ' رشتہ داروں' یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور لوگوں سے اچھی باتیں کرنا' یہ اس قسم کی عبادات ہیں جو ہر نبی کے دور میں مشترک رہی ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کو اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کا اپنی عبادت کے ساتھ متصلاً ذکر کیا ہے' اس لیے ہم یہاں اس کی کچھ تفصیل ذکر کر رہے ہیں اور اس کے بعد رشتہ داروں' یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کا بھی بیان کریں گے' ان شاء اللہ۔

والدین کی اطاعت پر ثواب کے متعلق احادیث

حافظ منذری بیان کرتے ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: اللہ کو سب

سے زیادہ کون سا عمل پسند ہے؟ آپ نے فرمایا: نماز کو وقت پر پڑھنا' میں نے پوچھا: پھر کون سا عمل؟ فرمایا: ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔ (بخاری' مسلم)

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص نے آ کر جہاد کی اجازت طلب کی' آپ نے فرمایا: کیا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے کہا: ہاں! فرمایا: ان کی خدمت میں جہاد کرو۔ (بخاری' مسلم' ابوداؤد' نسائی)

(۳) معاویہ بن جاہمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت جاہمہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے جہاد کا ارادہ کیا ہے' میں آپ کے پاس مشورہ کے لیے آیا ہوں' آپ نے فرمایا: کیا تمہاری ماں (زندہ) ہے؟ اس نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: اس کے ساتھ چمٹے رہو' کیونکہ جنت اس کے پیر کے پاس ہے۔
(ابن ماجہ' نسائی' حاکم' حاکم نے کہا: اس کی سند صحیح ہے)

اس حدیث کو سند جید کے ساتھ طبرانی نے روایت کیا ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور آپ سے جہاد کے متعلق مشورہ کیا' آپ نے فرمایا: تمہارے ماں باپ ہیں؟ میں نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: ان کے پیروں کے ساتھ چمٹے رہو' جنت ان کے پیروں کے نیچے ہے۔

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا: میں جہاد کی خواہش رکھتا ہوں اور مجھے اس پر قدرت نہیں ہے' آپ نے فرمایا: کیا تمہارے والدین میں سے کوئی ایک ہے؟ اس نے کہا: میری ماں ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کے ساتھ نیکی کرنے کی زیادہ کوشش کرو' جب تم یہ کرلو گے تو تم حج کرنے والے' عمرہ کرنے والے اور جہاد کرنے والے ہو گے۔ اس حدیث کو ابویعلیٰ اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور دونوں کی سند عمدہ ہے۔

(۵) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا اور حضرت عمر اس کو ناپسند کرتے تھے' انہوں نے مجھ سے کہا: اس کو طلاق دے دو' میں نے انکار کیا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو طلاق دے دو۔ (ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' ابن حبان)

(۶) حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے اس کے لیے طوبیٰ (جنت کا ایک سایادار درخت) ہے' اور اللہ تعالیٰ اس کی عمر میں زیادتی کرتا ہے۔
(ابویعلیٰ' طبرانی' حاکم' اصبہانی' حاکم نے کہا: اس کی سند صحیح ہے)

(۷) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی ناک خاک آلودہ ہو' اس کی ناک خاک آلودہ ہو' اس کی ناک خاک آلودہ ہو' پوچھا: کس کی؟ یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: جس نے اپنے والدین یا ان میں سے کسی ایک کا بڑھاپا پایا' اس کے باوجود وہ جنت میں داخل نہیں ہوا۔ (مسلم)

(۸) حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر چڑھتے ہوئے فرمایا: آمین' آمین' آمین' آپ نے فرمایا: میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: اے محمد! جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے ایک کو پایا اور ان کے ساتھ نیکی کیے بغیر مر گیا' وہ دوزخ میں جائے اور اللہ اس کو (اپنی رحمت سے) دور کر دے' کہیے آمین تو میں نے کہا: آمین' پھر کہا: یا محمد! جس نے رمضان کا مہینہ پایا اور مر گیا اور اس کی مغفرت نہیں ہوئی (یعنی اس

نے روزے نہیں رکھے) وہ دوزخ میں داخل کیا جائے اور اللہ اس کو (اپنی رحمت سے) دور کر دے' کہیے آمین تو میں نے کہا: آمین' اور جس کے سامنے آپ کا ذکر کیا جائے اور وہ آپ پر درود نہ پڑھے وہ دوزخ میں جائے اور اللہ اس کو (اپنی رحمت سے) دور کر دے' کہیے آمین' تو میں نے کہا: آمین' (اس حدیث کو امام طبرانی نے دو سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے جن میں سے ایک سند حسن ہے' امام ابن حبان نے اس کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور اس کو امام حاکم نے بھی روایت کیا ہے)۔

(۹) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمی سفر کر رہے تھے۔ ان کو بارش نے آلیا' انہوں نے پہاڑ کے اندر ایک غار میں پناہ لی' غار کے منہ پر پہاڑ سے ایک چٹان ٹوٹ کر آ گری اور غار کا منہ بند ہو گیا' پھر انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: تم نے جو نیک عمل اللہ کے لیے کیے ہوں ان کے وسیلہ سے اللہ سے دعا کرو' شاید اللہ غار کا منہ کھول دے' ان میں سے ایک نے کہا: اے اللہ! میرے ماں باپ بوڑھے تھے اور میری ایک چھوٹی بچی تھی' میں جب شام کو آتا تو بکری کا دودھ دوہ کر پہلے اپنے ماں باپ کو پلاتا' پھر اپنی بچی کو پلاتا' ایک دن مجھے دیر ہو گئی' میں حسب معمول دودھ لے کر ماں باپ کے پاس گیا' وہ سو چکے تھے' میں نے ان کو جگانا ناپسند کیا اور ان کے دودھ دینے سے پہلے اپنی بچی کو دودھ دینا ناپسند کیا' بچی رات بھر بھوک سے میرے قدموں میں روتی رہی اور میں صبح تک دودھ لے کر ماں باپ کے سرہانے کھڑا رہا۔ اے اللہ! تجھے خوب علم ہے کہ میں نے یہ فعل صرف تیری رضا کے لیے کیا تھا' تو ہمارے لیے اتنی کشادگی کر دے کہ ہم آسمان کو دیکھ لیں' اللہ عزوجل نے ان کے لیے کشادگی کر دی حتیٰ کہ انہوں نے آسمان کو دیکھ لیا۔ (بخاری' مسلم' ابن حبان)

(۱۰) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ کون مستحق ہے؟ فرمایا: تمہاری ماں' اس نے پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: تمہاری ماں' اس نے پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: تمہاری ماں' اس نے پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: تمہارا باپ۔ (بخاری و مسلم)

(۱۱) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی رضا والد کی رضا میں ہے اور اللہ کی ناراضگی باپ کی ناراضگی میں ہے۔ (ترمذی' ابن حبان' حاکم' طبرانی)

(۱۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور کہا: یا رسول اللہ! میں نے بہت بڑا گناہ کر لیا ہے' کیا اس کی کوئی توبہ ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا تمہاری ماں ہے؟ اس نے کہا: نہیں' فرمایا: کیا تمہاری خالہ ہے؟ اس نے کہا: ہاں! فرمایا: اس کے ساتھ نیکی کرو۔ (ترمذی' ابن حبان' حاکم)

(۱۳) حضرت ابواسید مالک بن ربیعہ ساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ بنو سلمہ کا ایک شخص آیا' کہنے لگا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں ماں باپ کی موت کے بعد ان کے ساتھ نیکی کر سکتا ہوں؟ فرمایا: ہاں! ان کی نماز جنازہ پڑھو' ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو' کسی کے ساتھ ان کے کیے ہوئے وعدہ کو پورا کرو' ان کے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرو' ان کے دوستوں کی عزت کرو۔ (ابوداؤد' ابن ماجہ' ابن حبان)

(الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۲۲۳۔ ۲۱۴ ملتقطاً' مطبوعہ دارالحدیث' القاہرہ' ۱۴۰۷ھ)

ان احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب عمل ہے' اس کا ثواب جہاد کے برابر بلکہ اس سے بڑھ کر ہے اور اس کا اجر حج اور عمرہ کے مساوی ہے' ماں باپ کے قدموں میں رہنا جنت کی طرف پہنچاتا ہے'

اس سے عمر زیادہ ہوتی ہے' دعا قبول ہوتی ہے' دوزخ سے نجات ملتی ہے' مغفرت ہوتی ہے اور ان کو راضی کرنے سے اللہ راضی ہوتا ہے۔

ماں باپ کی نافرمانی پر عذاب کے متعلق احادیث

حافظ منذری بیان کرتے ہیں:

(۱) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا: کیا میں تم کو سب سے بڑا گناہ نہ بتاؤں؟ ہم نے کہا: کیوں نہیں! یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شریک کرنا' ماں باپ کی نافرمانی کرنا' آپ ٹیک لگائے ہوئے تھے' پھر بیٹھ گئے اور فرمایا: سنو اور جھوٹ اور جھوٹی گواہی' آپ بار بار یہ فرماتے رہے حتیٰ کہ ہم نے کہا: کاش آپ سکوت فرماتے۔ (بخاری' مسلم' ترمذی)

(۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخصوں کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر (رحمت) نہیں فرمائے گا' ماں باپ کا نافرمان' عادی شرابی' کوئی چیز دے کر احسان جتلانے والا' اور تین آدمی جنت میں داخل نہیں ہوں گے' ماں باپ کا نافرمان' دیوث (اپنی بیوی کی بدکاری پر علم کے باوجود خاموش رہنے والا) اور جو عورت مردوں کی مشابہت کرے۔

(نسائی' بزار ان دونوں کی سند حسن ہے۔ حاکم نے کہا: اس کی سند صحیح ہے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں اس کا پہلا حصہ روایت کیا ہے)

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانچ سو میل کی مسافت سے جنت کی خوشبو آئے گی' اپنے کام کا احسان جتانے والے کو' ماں باپ کے نافرمان کو اور عادی شرابی کو یہ خوشبو نصیب نہیں ہوگی۔

(طبرانی)

(۴) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمیوں کا اللہ تعالیٰ کوئی فرض قبول کرے گا نہ نفل' ماں باپ کا نافرمان' احسان جتانے والا اور تقدیر کو جھٹلانے والا۔ (کتاب السنۃ)

(۵) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین پر لعنت کرے' عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! کوئی شخص اپنے والدین پر کیسے لعنت کرے گا؟ فرمایا: وہ کسی شخص کے باپ کو گالی دے گا تو وہ اس کے باپ کو گالی دے گا' وہ کسی کی ماں کو گالی دے گا تو وہ اس کی ماں کو گالی دے گا۔ (بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی)

(۶) حضرت عمرو بن مرہ جہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور اس نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں اور پانچ نمازیں پڑھتا ہوں' اپنے مال کی زکوٰۃ دیتا ہوں' رمضان کے روزے رکھتا ہوں' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اس عمل پر فوت ہوگیا' وہ قیامت کے دن نبیوں' صدیقوں اور شہداء کے ساتھ ہوگا' پھر آپ نے دونوں انگلیاں کھڑی کر کے فرمایا: بہ شرطیکہ اس نے ماں باپ کی نافرمانی نہ کی ہو۔ (احمد' طبرانی' ان دونوں نے دو سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے اور ان میں سے ایک سند صحیح ہے' ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اس کو اپنی صحیح میں اختصار کے ساتھ روایت کیا ہے)۔

(۷) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سات آسمانوں کے اوپر سے لعنت بھیجتا ہے' اور ان میں سے ہر ایک پر تین بار لعنت بھیجتا ہے' اور ہر ایک کو ایسی لعنت بھیجتا ہے جو اس کو کافی ہے'

قوم لوط کا عمل کرنے والا ملعون ہے' قوم لوط کا عمل کرنے والا ملعون ہے' قوم لوط کا عمل کرنے والا ملعون ہے' غیر اللہ کے لیے ذبح کرنے والا ملعون ہے' اپنے ماں باپ کی نافرمانی کرنے والا ملعون ہے۔ (طبرانی' حاکم نے کہا: اس کی سند صحیح ہے)

(۸) حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا: ایک جوان آدمی قریب المرگ ہے' اس سے کہا گیا کہ لا الہ الا اللہ پڑھو تو وہ نہیں پڑھ سکا' آپ نے فرمایا: وہ نماز پڑھتا تھا؟ اس نے کہا: ہاں! پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور ہم بھی آپ کے ساتھ اٹھے' آپ اس جوان کے پاس گئے اور فرمایا: کہو لا الہ الا اللہ' اس نے کہا: مجھ سے نہیں پڑھا جارہا' آپ نے اس کے متعلق پوچھا' کسی نے کہا: یہ اپنی والدہ کی نافرمانی کرتا تھا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: اس کی والدہ زندہ ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: اس کو بلاؤ' وہ آئی' آپ نے پوچھا: یہ تمہارا بیٹا ہے' اس نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: یہ بتاؤ اگر آگ جلائی جائے اور تم سے یہ کہا جائے کہ اگر تم شفاعت کرو تو اس کو چھوڑ دیتے ہیں ورنہ اس کو آگ میں ڈال دیتے ہیں تو کیا تم اس کی شفاعت کرو گی؟ اس نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس وقت میں اس کی شفاعت کروں گی' آپ نے فرمایا: تب تم اللہ کو گواہ کرو' اور مجھ کو گواہ کر کے کہو کہ تم اس سے راضی ہو گئی ہو' اس عورت نے کہا: اے اللہ! میں تجھ کو گواہ کرتی ہوں اور تیرے رسول کو گواہ کرتی ہوں کہ میں اپنے بیٹے سے راضی ہوں' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لڑکے! اب کہو: ''لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ واشھد ان محمد اعبدہ ورسولہ'' تو اس لڑکے نے کلمہ پڑھا' پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا شکر ہے جس نے اس کو میری وجہ سے آگ سے نجات دی۔

(طبرانی' احمد) (الترغیب والترھیب ج ۳ ص ۲۲۳-۲۲۴ ملتقطاً' مطبوعہ دار الحدیث القاہرہ' ۱۴۰۷ھ)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ماں باپ کی نافرمانی گناہ کبیرہ ہے' اس کی وجہ سے انسان جہنم میں جا گرتا ہے' محشر میں جنت کی خوشبو سے محروم رہتا ہے' ماں باپ کے نافرمان کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا' موت سے پہلے اس کو دنیا میں فقر اور ذلت اور مہلک بیماریوں کی سزا ملتی ہے۔ اس پر اللہ اور اس کے رسول کی اور فرشتوں کی لعنت ہے' ماں باپ کے نافرمان کا خاتمہ خراب ہوتا ہے' اس کی بصیرت سلب ہو جاتی ہے اور ایمان جاتا رہتا ہے اور وہ مرتے وقت کلمہ شہادت نہیں پڑھ سکتا۔ اے اللہ! ہم پر ہمارے والدین کو راضی رکھ اور ان کو ہماری طرف سے بہترین جزاء عطا فرما!

رشتہ داروں' یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق احادیث

حافظ منذری بیان کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی کی جائے اور اس کی عمر میں زیادتی کی جائے وہ رشتہ داروں سے تعلق جوڑے۔ (بخاری' مسلم)

(الترغیب والترھیب ج ۳ ص ۳۳۴' مطبوعہ دار الحدیث القاہرہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر جمعرات کو جمعہ کی شب بنو آدم کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں' جو شخص رشتہ داروں سے تعلق توڑنے والا ہو اس کا عمل قبول نہیں ہوتا' اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ (الترغیب والترھیب ج ۳ ص ۳۴۳' مطبوعہ دار الحدیث القاہرہ)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے' آپ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو ملا کر اشارہ کیا۔ (بخاری' ابوداؤد' ترمذی)

(الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۳۴۶ مطبوعہ دارالحدیث القاہرہ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ گھروہ ہے جس میں یتیم عزت کے ساتھ رہتا ہو۔ (طبرانی واصبہانی) (الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۳۴۸ مطبوعہ دارالحدیث القاہرہ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیوہ اور مسکین کی پرورش کے لیے جدوجہد کرنے والا' اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مثل ہے اور میرا گمان ہے آپ نے فرمایا: اس شخص کی مثل ہے جو اکتائے بغیر قیام کرے اور مسلسل روزے رکھے۔ (بخاری' مسلم' ابن ماجہ) (الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۳۵۱ مطبوعہ دارالحدیث القاہرہ)

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ لَا تَسۡفِکُوۡنَ دِمَآءَکُمۡ وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ

اور جب ہم نے تم سے یہ پختہ عہد لیا کہ تم ایک دوسرے کا خون نہ بہانا' اور نہ ایک دوسرے کو اپنے گھروں سے

اَنۡفُسَکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ

نکالنا' پھر تم نے (اس کا) اقرار کیا' (اور اس عہد پر) تم خود بھی گواہی دیتے ہو O پھر تم

اَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ وَتُخۡرِجُوۡنَ فَرِیۡقًا مِّنۡکُمۡ

ہی وہ لوگ ہو جو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو' اور تم اپنے ایک فریق کو ان کے گھروں سے

مِّنۡ دِیَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَیۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ؕ وَاِنۡ

نکالتے ہو اور تم ان کے خلاف گناہ اور سرکشی میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو' اور اگر وہ

یَّاۡتُوۡکُمۡ اُسٰرٰی تُفٰدُوۡهُمۡ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیۡکُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ ؕ

قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو تم ان کا فدیہ دیتے ہو' حالانکہ ان کو (گھروں سے) نکالنا (بھی تو) تم پر حرام کیا گیا تھا'

اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَتَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا

کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لاتے ہو اور بعض حصہ کا کفر کرتے ہو؟ سو تم

جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوةِ

میں سے جو لوگ یہ کام کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو گی کہ وہ دنیا کی زندگی میں

الدُّنۡیَا ۚ وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَمَا

رسوا ہوں' اور قیامت کے دن وہ زیادہ شدید عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے' اور

اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَيٰوةَ

اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے ○ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت

الدُّنۡيَا بِالۡاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ

کے بدلہ میں خرید لیا' سو نہ ان سے عذاب کم کیا جائے گا اور نہ ان کی

يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۸۶﴾

مدد کی جائے گی ○

ع ۱۰
۱۲

یہود مدینہ کا ایک دوسرے کو قتل کر کے میثاق توڑنے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے تورات میں بنو اسرائیل سے یہ پختہ عہد لیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل نہیں کریں گے اور نہ ایک دوسرے کو گھروں سے نکالیں گے' نسل در نسل یہ عہد و میثاق مدینہ میں آباد یہودیوں میں بھی منتقل ہوا' مدینہ میں اوس اور خزرج 'مشرکوں کے دو قبیلے تھے جو کسی شریعت کے پیروکار تھے نہ کسی چیز کے حرام اور حلال ہونے کے قائل تھے' یہ دونوں قبیلے ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے۔ مدینہ میں رہنے والے یہود بھی دو حصوں میں بٹ گئے تھے' بنو قینقاع' خزرج کے حلیف تھے اور بنو نضیر اور بنو قریظہ اوس کے حلیف تھے۔ جب اوس اور خزرج میں جنگ ہوتی تو بنو قینقاع خزرج کا ساتھ دیتے اور بنو نضیر اور بنو قریظہ اوس کا ساتھ دیتے اور اس جنگ میں یہود ایک دوسرے کو قتل کرتے اور گھروں سے نکال دیتے اور جب جنگ ختم ہو جاتی تو بنو نضیر اور بنو قریظہ کے جو لوگ خزرج کی قید میں ہوتے ان کو بنو قینقاع فدیہ دے کر چھڑا لیتے اور بنو قینقاع کے جو لوگ اوس کی قید میں ہوتے ان کو بنو قریظہ اور بنو نضیر فدیہ دے کر چھڑا لیتے' اور جب ان سے کہا جاتا کہ تم فریق مخالف کے قیدیوں کو فدیہ دے کر کیوں چھڑا رہے ہو؟ تو کہتے کہ ہمیں تورات میں یہ حکم دیا گیا کہ قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑائیں' پھر ان سے کہا جاتا کہ تورات میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ تم ایک دوسرے کو قتل نہ کرو اور اور گھروں سے نہ نکالو تو تم اس کی مخالفت کیوں کرتے ہو؟ تو کہتے کہ ہم اپنے حلیف سے کیے ہوئے عہد کی پاس داری کرتے ہیں' یعنی مشرکوں سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرتے تھے اور خدا سے کیے ہوئے عہد کو توڑتے تھے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۳۱۴' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ ھ)

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ وَقَفَّيۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ بِالرُّسُلِ

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی' اور ان کے بعد لگاتار رسول بھیجے'

وَاٰتَيۡنَا عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ الۡبَيِّنٰتِ وَاَيَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ

اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح دلیلیں دیں' اور ہم نے روح القدس (جبریل) سے

أَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُولٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ

ان کی تائید کی' تو کیا ہر بار (ایسا نہیں ہوا) کہ جب بھی رسول تمہارے پاس ایسا پیغام لے کر آیا جو تمہاری مرضی کا

فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿٨٧﴾ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ

نہ تھا تو تم نے تکبر کیا' (رسولوں کے) ایک گروہ کی تم تکذیب کرتے تھے اور ایک گروہ کو تم قتل کرتے تھے O اور (یہود نے) کہا: ہمارے دلوں

بَل لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾

پر غلاف ہیں' بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر لعنت فرمائی ہے' سو ان میں سے بہت تھوڑے ایمان لاتے ہیں O

عیسیٰ' مریم اور روح القدس کے معنی

عیسیٰ اور یسوع عبرانی زبان کے الفاظ ہیں' ان کا معنی ہے: سید یا برکت والا' مریم بھی عبرانی زبان کا لفظ ہے' اس کا معنی ہے: خادم' کیونکہ ان کی ماں نے یہ نذر مانی تھی کہ ان کو بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گی' بینات سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں' مثلاً مردوں کو زندہ کرنا' پیدائشی نابینا کو بینا کرنا' برص زدہ لوگوں کو ٹھیک کرنا' روح القدس سے مراد ہے پاکیزہ روح' حضرت جبریل کو روح القدس کہتے ہیں' قدس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور روح کی اضافت تشریف کے لیے ہے یعنی اللہ کی پسندیدہ روح' قرآن مجید میں حضرت جبریل کو روح القدس بھی فرمایا ہے اور الروح الامین بھی فرمایا ہے:

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (النحل: ١٠٢)
آپ کہیے کہ اس قرآن کو حق کے ساتھ روح القدس نے آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ (الشعراء: ١٩٣)
اس (قرآن) کو الروح الامین (جبریل) نے نازل کیا ہے O آپ کے قلب پر تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں O

''غلف'' کے معنی ہیں: ڈھانپنے والی چیز' پردے۔

انبیاء کرام سے یہود کے عناد رکھنے کا بیان

ان آیات میں یہودیوں کے دل کی سختی بیان فرمائی ہے' اور یہ کہ وہ مادہ پرست اور نفسانی خواہشوں پر چلنے والے تھے' اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان میں بار بار رسول بھیجے' امام رازی نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت تک یکے بعد دیگرے مسلسل رسول آتے رہے' علامہ ابوالحیان اندلسی نے لکھا ہے کہ جب تک حضرت یوشع کو نبی نہیں بنا دیا گیا اس وقت تک حضرت موسیٰ فوت نہیں ہوئے' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع' حضرت شمویل' حضرت شمعون' حضرت داؤد' حضرت سلیمان' حضرت شعیا' حضرت ارمیا' حضرت عزیر' حضرت حزقیل' حضرت الیاس' حضرت الیسع' حضرت یونس' حضرت زکریا' حضرت یحییٰ اور بہت سے رسول آئے۔ امام ابن جریر طبری نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جو رسول بھی مبعوث ہوا وہ بنو اسرائیل کو تورات پر ایمان لانے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا حکم دیتا تھا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وقفینا'' یعنی ایک رسول کے بعد دوسرا رسول اسی منہاج اور اسی شریعت پر بھیجا' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت بعض احکام میں تورات سے مختلف تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے

ان کو معجزات عطا فرمائے' وہ مردوں کو زندہ کرتے' مٹی سے پرندے کی شکل کا ایک جانور بنا دیتے' اس میں پھونک مارتے تو وہ اللہ کے اذن سے پرندہ بن جاتا' بیماروں کو تندرست کر دیتے' غیب کی خبریں دیتے' ان کے صدق کی تائید میں حضرت جبریل ان کے ساتھ رہتے تھے۔ بنو اسرائیل ان سے بہت حسد اور بغض رکھتے تھے کیونکہ ان کے بعض احکام تورات کے خلاف تھے' قرآن مجید میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنو اسرائیل سے فرمایا:

وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ ۔ اور (میں اس لیے آیا ہوں) کہ تمہارے لیے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کی گئی تھیں۔ (آل عمران: ۵۰)

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب بھی کوئی رسول ایسی شریعت لے کر آتا جو ان کی خواہش کے خلاف ہوتی تو وہ اس کا کفر کرتے اور اس کے خلاف مہم چلاتے اور بغاوت کرتے' ان میں سے بعض رسولوں کی تو انہوں نے تکذیب کی جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بعض رسولوں کو انہوں نے قتل کر دیا جیسے حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہما السلام' اور ان آیات میں ہمارے نبی حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی جا رہی ہے کہ اگر بنو اسرائیل نے آپ کی تکذیب کی' اور آپ پر ایمان نہیں لائے تو اس میں کسی تعجب اور غم اور افسوس کی بات نہیں ہے کیونکہ نبیوں سے عناد رکھنا اور ان کی تکذیب کرنا ان کی سرشت اور عادت ہے' ان آیات میں تمام یہودیوں سے خطاب کیا گیا ہے حالانکہ اس زمانہ کے یہودیوں نے انبیاء سابقین کی تکذیب یا ان کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ یہ کام ان کے اسلاف اور آباء واجداد نے کیا تھا' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے یہودی اپنے پہلوں کے ان کاموں پر راضی تھے اور ان سے براءت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

یہود کے قبیح اقوال میں سے ایک قبیح قول یہ تھا کہ انہوں نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں' اس لیے آپ کی بات ہمارے دلوں میں نہیں اترتی اور نہ ہم اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا: یہ بات نہیں ہے' تمہارے دلوں میں بھی غور وفکر کرنے اور حق بات کو قبول کرنے کی استعداد رکھی گئی تھی' لیکن تم نے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بغض اور عناد رکھا' ان کی تکذیب کی اور ان کو قتل کیا اس سبب سے بہ طور سزا اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنی رحمت سے دور کر دیا اور یہ تم پر اللہ تعالیٰ کا ظلم نہیں ہے بلکہ تم نے خود ایسے قبیح کام کیے جس کے نتیجے میں تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری اور لعنت کے مستحق ہوئے' اسی وجہ سے یہود میں سے بہت کم لوگ ایمان لانے والے ہیں۔

آیات مذکورہ سے مسائل کا استنباط

ان آیات سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ کے احکام سے اعراض کرے یا ان کا انکار کرے یا تکبر کی وجہ سے ان کو قبول نہ کرے وہ اللہ کی رحمت سے دور کر دیا جاتا ہے اور لعنت اور عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے' اللہ تعالیٰ کا بنو اسرائیل میں لگاتار انبیاء اور رسل کو مبعوث فرمانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کی اصلاح اور ہدایت کی متقاضی تھی' لیکن انہوں نے خود ہدایت کے بجائے گمراہی کا راستہ اختیار کر لیا' ہمارے نبی سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کو ختم کر دیا ہے' اس لیے اب اصلاح اور ہدایت کے لیے کوئی نبی مبعوث نہیں ہو سکتا' البتہ ہر دور میں علماء ربانیین' مجتہدین اور مجددین پیدا ہوتے رہتے ہیں جو بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کرتے ہیں' اور بدلتے ہوئے حالات اور عصری تقاضوں اور نت نئے مسائل کے لیے قرآن اور سنت سے حل پیش کرتے ہیں اور مسلمانوں کی رہنمائی کرتے ہیں' اور ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا' بنو اسرائیل کو جو رحمت سے دور کیا گیا اس کا سبب ان کا کفر تھا' یہود اپنی جن برائیوں کو تورات میں چھپاتے تھے اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دے دی' اس میں آپ کے علم غیب

کا ثبوت ہے اور آپ کی نبوت کے صدق پر دلالت ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آئی جو اس آسمانی کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جو ان کے پاس ہے

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ

اور وہ اس سے پہلے (اس نبی کے وسیلہ سے) کفار کے خلاف فتح کی دعا کرتے تھے

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى

اور جب ان کے پاس وہ آ گئے جن کو وہ جان اور پہچان چکے تھے تو انہوں نے ان کے ساتھ کفر کیا' سو کافروں

الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا

پر اللہ کی لعنت ہو O کیسی بری چیز ہے وہ جس کے معاوضہ میں انہوں نے اپنی جانوں کو فروخت کیا ہے

بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ

کہ وہ اس کتاب کا کفر کریں جس کو اللہ نے نازل کیا ہے' اس پر سرکشی کرتے ہوئے کہ اللہ اپنے فضل سے

يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ

اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے (کتاب) نازل فرماتا ہے' وہ غضب در غضب میں آ گئے' اور کافروں کے لیے

عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٩٠﴾

ذلیل وخوار کرنے والا عذاب ہے O

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کا قبول ہونا

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ یہود' اوس اور خزرج کے خلاف جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کرنے کی دعا کرتے تھے' جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو عرب میں مبعوث کر دیا تو جو کچھ وہ آپ کے متعلق کہتے تھے اس کا انہوں نے انکار کر دیا' ایک دن حضرت معاذ بن جبل اور حضرت بشر بن البراء بن معرور رضی اللہ عنہما نے ان سے کہا: اے یہود! اللہ سے ڈرو اور اسلام لے آؤ' جب ہم مشرک تھے تو تم ہمارے خلاف سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے فتح کی دعا کرتے تھے' تم ہم کو یہ خبر دیتے تھے کہ وہ نبی مبعوث ہونے والے ہیں اور تم اس نبی کی وہی صفات بیان کرتے تھے جو آپ میں موجود ہیں' اس کے جواب میں بنو نضیر کے سلام بن مشکم نے کہا: وہ کوئی ایسی چیز

لے کر نہیں آئے جس کو ہم پہچانتے ہوں اور یہ وہ نبی نہیں ہیں جن کا ہم تم سے ذکر کیا کرتے تھے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۳۲۵ مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت ۱۴۰۹ھ)

حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

امام ابونعیم نے "دلائل النبوۃ" میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بنو قریظہ اور بنو نضیر کے یہود کفار کے خلاف جنگ میں اللہ تعالیٰ سے یوں فتح کی دعا کرتے تھے: اے اللہ! ہم نبی امی کے وسیلہ سے تجھ سے نصرت طلب کرتے ہیں' تو ہماری مدد فرما' تو ان کی مدد کی جاتی اور جب وہ نبی آگئے جن کو وہ پہچانتے تھے تو انہوں نے ان کا کفر کیا۔ امام ابونعیم نے ایک اور سند کے ساتھ حضرت ابن عباس کی روایت میں اس طرح دعا کا ذکر کیا ہے:

اے اللہ! اپنے اس نبی کے وسیلہ سے ہماری مدد فرما اور اس کتاب کے وسیلہ سے جو تو ان پر نازل کرے گا' تو نے وعدہ کیا ہے کہ تو ان کو آخر زمانہ میں مبعوث فرمائے گا۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۸۸ مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی ایران)

خلاصہ آیات اور استنباط مسائل

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو یہودی تھے وہ یہ جانتے تھے کہ تورات میں حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی ہی بشارت دی گئی ہے' لیکن وہ حسد اور سرکشی کی وجہ سے ایمان نہیں لائے اور ان کو یہ ڈر تھا کہ اگر وہ آپ پر ایمان لے آئے تو ان کو جو نذرانے ملتے تھے اور وہ مجرموں سے جو رشوتیں وصول کرتے تھے وہ بند ہو جائیں گی اور عام یہودیوں پر جو علماء یہود کی ریاست تھی وہ ختم ہو جائے گی اور وہ اس کو ناپسند کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس پر وحی نازل کر دے' ان کی خواہش تھی کہ بنو اسرائیل ہی میں سے وہ نبی مبعوث ہو' انہوں نے پہلے نبیوں کا بھی انکار کیا اور اب ہمارے نبی کو نہ مان کر نیا انکار کیا' اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان کو ذلت کی زندگی دی اور آخرت میں ان کو ذلیل کرنے والے عذاب کا مستحق قرار دیا۔ ان آیات میں مقربین کے وسیلہ سے دعا کا ثبوت ہے اور بالخصوص ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کرنے کا ثبوت ہے اور یہ کہ آپ کے وسیلہ سے دعا قبول ہوتی ہے' اور یہ کہ آپ کی بعثت سے پہلے ہی آپ کی آمد کا شہرہ تھا اور آپ کے نام کے وسیلہ سے حاجت روائی ہوتی تھی' بنو اسرائیل حسد اور سرکشی کی وجہ سے آپ پر ایمان نہ لائے' اس سے معلوم ہوا کہ حسد اور سرکشی حرام ہے' اور حسد کی وجہ سے انسان اللہ کی نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے' کیونکہ حسد کرنے کی وجہ سے بنو اسرائیل دولت ایمان سے محروم رہے' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کو ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا' اس سے معلوم ہوا کہ ذلت اور اہانت والا عذاب کفار کے ساتھ خاص ہے' اگر بعض گنہگاروں کو عذاب ہوا تو وہ ذلت اور اہانت کا عذاب نہیں ہوگا بلکہ وہ ان کی طہارت اور پاکیزگی کا سبب ہوگا۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ان تمام کتابوں پر ایمان لاؤ جن کو اللہ نے نازل کیا تو کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل کیا

عَلَیْنَا وَیَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ

گیا ہے اور اس کے ماسوا کا کفر کرتے ہیں' حالانکہ وہ حق ہے اور جو (اصل) کتاب ان کے پاس ہے اس کی تصدیق کرنے والا ہے'

قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ

آپ کہیے: اگر تم (تورات پر) ایمان لانے والے ہو تو اس سے پہلے انبیاء کو کیوں

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ

قتل کرتے تھے؟ O اور بے شک تمہارے پاس موسیٰ واضح دلائل لے کر آئے پھر تم نے اس کے بعد

الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ

بچھڑے کو (معبود) بنا لیا اور تم ظالم تھے O اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا

وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ

اور (پہاڑ) طور کو تم پر اٹھایا' (اور فرمایا:) جو ہم نے تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی سے لو اور سنو'

قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ

انہوں نے کہا: ہم نے سنا اور نافرمانی کی' اور ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں بچھڑا بسا

بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

دیا گیا تھا' آپ کہیے: اگر تم (تورات پر) ایمان لانے والے ہو تو یہ کیسی بُری چیز ہے جس کا تمہیں

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

تمہارا ایمان حکم دیتا ہے O

تورات پر یہود کے دعویٰ ایمان کا رد اور ابطال

جب مدینہ کے یہودیوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی نازل کی ہوئی تمام کتابوں پر ایمان لاؤ تو انہوں نے کہا: ہم صرف تورات پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل کی گئی ہے اور قرآن پر ایمان لانے سے انکار کر دیا' اللہ تعالیٰ ان کا رد فرماتا ہے کہ قرآن حق ہے اور اس (اصل) تورات کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے اور دونوں اللہ کے کلام ہیں تو جب تمہارا تورات پر ایمان ہے تو قرآن کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ وہ بھی تورات کی طرح اللہ کی کتاب ہے اور تمہاری کتاب کا مصدق بھی ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تمام کتابوں پر ایمان لایا جائے' پھر اللہ تعالیٰ ان پر دوسری حجت قائم فرماتا ہے کہ اگر تم تورات پر ایمان لانے والے ہو تو تم انبیاء علیہم السلام کو قتل کیوں کرتے تھے؟ اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کی طرف قتل کی نسبت کی ہے حالانکہ قتل ان سے پہلے کے

یہودیوں نے کیا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ان کے اس فعل پر راضی تھے اور اس کو اللہ کے حکم کی مخالفت اور معصیت نہیں کہتے تھے اور نہ اس سے انہوں نے براءت کا اظہار کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک تمہارے پاس موسیٰ آیات بینات لے کر آئے پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو (معبود) بنالیا اور تم ظالم تھے O (البقرہ: ۹۲)

ان آیات بینات سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو نزول تورات کی میعاد سے پہلے نازل ہوئی تھیں' قرآن مجید میں ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ. اور بے شک ہم نے موسیٰ کو نو روشن نشانیاں دیں۔

(بنی اسرائیل: ۱۰۱)

وہ نو نشانیاں یہ تھیں: عصاء موسیٰ علیہ السلام' ید بیضاء' حضرت موسیٰ کی زبان کی لکنت کو دور کرنا' بنو اسرائیل کے لیے سمندر کو چیرنا' ٹڈی دل کی صورت میں عذاب' طوفان' بدن کے کپڑوں میں جوؤں کا پیدا کرنا' مینڈکوں کا عذاب کہ ہر کھانے کی چیز میں مینڈک آجاتے تھے اور خون کا عذاب کہ ہر برتن میں خون آجاتا تھا' لیکن ان نشانیوں کے باوجود ان کے شرک اور بت پرستی میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور انہوں نے اللہ کی نعمتوں پر شکر کرنے کے بجائے بچھڑے کی پرستش کرنی شروع کر دی' اسی کو اللہ تعالیٰ نے ظلم فرمایا ہے' کیونکہ کسی مستحق شخص کا حق دوسرے کو دے دینا ظلم ہے اور اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہوگا کہ اللہ کا حق دوسرے کو دے دیا جائے اور عبادت کا مستحق اللہ تعالیٰ ہے اور جب اللہ کو چھوڑ کر بچھڑے کی عبادت کی جائے تو یہ کتنا بڑا ظلم ہے اور اس میں یہود پر تیسرا رد ہے کہ اگر تم تورات پر ایمان لانے والے تھے تو تم بچھڑے کی عبادت کیوں کرتے تھے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور (پہاڑ) طور کو تم پر اٹھایا۔ (البقرہ: ۹۳)

اس میں یہود پر چوتھا رد ہے کہ اگر تمہارا تورات پر ایمان تھا تو تورات کے احکام منوانے کے لیے تم پر پہاڑ طور کیوں اٹھایا گیا؟ اور جب تم سے کہا گیا کہ تورات کے احکام قبول کرو اور سنو تو تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی' کیا تورات پر ایمان لانے کے یہی تقاضے ہیں! یہ سب پہلے یہودیوں کے کرتوت تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو ان کا اس لیے مخاطب قرار دیا ہے کہ انہوں نے اپنے پہلوں کے ان کاموں سے نفرت اور براءت ظاہر نہیں کی تھی۔

قرآن مجید کے احکام پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کتاب پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کے تمام احکام اور تمام تقاضوں پر عمل کیا جائے اور ان آیات میں بار بار یہی فرمایا گیا ہے کہ اگر تمہارا تورات پر ایمان تھا تو تم اس کے احکام کی خلاف ورزی کیوں کرتے تھے؟ آج ہم بھی قرآن مجید پر ایمان لانے کے دعویٰ دار ہیں لیکن قرآن مجید پر عمل نہیں کرتے تو جو بات یہود سے کہی گئی ہے وہی ہم پر صادق آرہی ہے۔ قرآن نے ہمیں نماز پڑھنے' روزے رکھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے اور ہماری بھاری اکثریت اس پر عمل نہیں کرتی۔ قرآن نے ہمیں ناجائز طریقہ سے مسلمانوں کا مال کھانے سے منع کیا اور ہم رشوت' اسمگلنگ' ملاوٹ' مصنوعی اشیاء' بلیک مارکیٹنگ' چور بازاری' لوٹ مار اور ڈاکوں سے دوسرے مسلمانوں کا مال کھا رہے ہیں' قرآن نے ہمیں قتل ناحق سے منع کیا اور ہم مسلمانوں کا خون بہانے سے باز نہیں آتے' قرآن نے ہماری عورتوں کو گھروں میں رہنے کا حکم دیا' اور بوقت ضرورت پردے کے ساتھ نکلنے کا حکم دیا لیکن ہمارے معاشرہ کے ہر طبقہ میں عورت بے پردہ بناؤ سنگھار کر کے اجنبی مردوں کے سامنے رہتی ہے اور بے حیائی کی راہیں کھلتی ہیں' یہود کے متعلق بار بار فرمایا کہ ان پر اللہ کا غضب بالائے غضب ہے اور وہ جہاں بھی ہوں ان پر اللہ کی لعنت ہے اور آج ان یہودیوں کو اللہ نے مسلمانوں پر مسلط کر دیا اور

یہودیوں نے مسلمانوں کے علاقے چھین لیے اور بار بار مسلمان یہودیوں سے شکست کھا رہے ہیں تو سوچنا چاہیے کہ جو قوم اس لعنتی اور مغضوب قوم سے پیہم شکست کھا رہی ہے وہ خود کس قدر اللہ کے غضب میں ڈوبی ہوئی اور رحمت سے دور ہوگی۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ

آپ کہیے کہ اگر دار آخرت اللہ کے نزدیک اور لوگوں کے بجائے خصوصیت سے تمہارے لیے

دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَ

ہے تو اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو ○ اور

لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

جو اعمال وہ پہلے کر چکے ہیں ان کی وجہ سے وہ موت کی ہرگز تمنا نہیں کریں گے اور اللہ ظالموں کو خوب

بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ

جاننے والا ہے ○ اور آپ ضرور دیکھیں گے کہ وہ اور لوگوں سے اور مشرکین سے بھی زیادہ زندگی کے دلدادہ ہیں؛

وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ

ان میں سے ہر ایک شخص یہ خواہش رکھتا ہے کہ کاش اس کی عمر ہزار

سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ

سال ہو؛ اور یہ عمر اسے دی جائے تو یہ اس کو عذاب سے دور کرنے والی نہیں ہے؛

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس کو اللہ خوب دیکھنے والا ہے ○

منزل۱ — عندنا الموت خوریں ۱۲ — ع۱۰

یہودیوں کے اس دعوی کا رد کہ جنت کے صرف وہی مستحق ہیں

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اور یہود اور ان کے علماء کے خلاف حجت قائم کی ہے کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ تمہارا دین برحق ہے اور آخرت میں صرف تم ہی جنت کے مستحق ہو تو تم دنیا کی مشقتوں اور تکلیفوں سے نجات حاصل کرنے اور آخرت میں جنت اور اس کی نعمتوں کو پانے کے لیے موت کی تمنا کرو تاکہ معلوم ہو جائے کہ کس کا دین سچا ہے' لیکن انہوں نے موت کی تمنا نہیں کی کیونکہ آخرت کی تو ویسے ہی ان کو امید نہ تھی کہیں دنیا بھی ہاتھ سے جاتی نہ رہے' مشرکین جو مرنے کے بعد دوسری زندگی پر یقین نہیں رکھتے' اصل میں ان کو دنیا میں لمبی عمر کی تمنا ہونی چاہیے کیونکہ ان کے لیے جو کچھ ہے یہی دنیا ہے' لیکن یہ یہودی جو دنیا کے بعد آخرت اور جنت کے دعویٰ دار تھے ان مشرکوں

سے بھی زیادہ لمبی عمر کی خواہش رکھتے تھے حتیٰ کہ ان میں سے کوئی کوئی ہزار سال کی زندگی کی تمنا کرتا تھا' اور موت کی تمنا کرنے کے بجائے لمبی زندگی کی خواہش کرنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دخول جنت کے متعلق ان کا دعویٰ جھوٹا ہے' قرآن مجید میں فرمادیا کہ وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر وہ ایک دن بھی موت کی تمنا کرتے تو روئے زمین پر کوئی یہودی زندہ نہ رہتا اور صفحۂ ہستی سے یہودیت مٹ جاتی۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۴۳۷۔ ۴۳۶ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

قرآن مجید کی صداقت اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل

اس آیت میں قرآن مجید کی حقانیت اور ہمارے نبی سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل ہے' کیونکہ قرآن مجید نے یہ پیش گوئی کی کہ یہودی موت کی تمنا ہرگز نہیں کریں گے' اگر یہودی سچے تھے تو وہ موت کی تمنا کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر کہتے: لو ہم نے موت کی تمنا کر لی ہے' اور یوں قرآن جھوٹا ہو جاتا اور آپ کی نبوت باطل ہو جاتی۔ یہ بڑی نازک اور خطرناک پیش گوئی تھی' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے متعلق پیش گوئی کی کہ وہ موت کی تمنا نہیں کر سکتے' کبھی نہیں کریں گے' ان کے لیے بڑا آسان تھا کہ آپ کے دعویٰ نبوت کو باطل کرنے کے لیے موت کی تمنا کر لیتے لیکن ایسا نہ ہوسکا اور آپ کی نبوت کا صدق اور قرآن مجید کی حقانیت ظاہر ہوگئی۔ جھوٹا نبی کبھی ایسی پیش گوئی کی جرات نہیں کر سکتا جس کو باطل کرنا مخالف کے اختیار میں ہو اور اس کے تمنا کرنے پر موقوف ہو۔ جھوٹے نبی کی کوئی پیش گوئی پوری نہیں ہوتی' مرزا غلام احمد نے محمدی بیگم سے نکاح کی پیش گوئی کی لیکن اس کا نکاح مرزا سلطان محمد سے ہوگیا' پھر اس نے پیش گوئی کی کہ سلطان محمد ڈھائی سال بعد مر جائے گا اور محمدی بیگم اس کے نکاح میں آجائے گی لیکن غلام احمد مر گیا اور مرزا سلطان محمد اس کے بعد تادیر زندہ رہا' اس طرح اس نے ایک بیمار عیسائی پادری آتھم کے متعلق پیش گوئی کی وہ ۵ ستمبر ۱۸۹۴ء کو مر جائے گا لیکن وہ اس تاریخ کو نہیں مرا بلکہ تندرست ہوگیا۔

حصول شہادت کے لیے موت کی تمنا کا استحباب اور مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا کی ممانعت

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگر یہودی مسلمانوں سے یہ کہیں کہ اگر تم اسلام کے دین حق ہونے اور دخول جنت کے مدعی ہو تو تم موت کی تمنا کرو' حالانکہ تم موت کی تمنا نہیں کرتے بلکہ تمہارے نبی نے موت کی تمنا کرنے سے منع کیا ہے؟

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ اس اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں:

ہم کہتے ہیں کہ سیدنا محمد علیہ السلام اور یہودیوں کے درمیان فرق ہے' کیونکہ سیدنا محمد یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے احکام شرعیہ کی تبلیغ کے لیے مبعوث کیا گیا ہے اور یہ مقصود ابھی تک حاصل نہیں ہوا' اس لیے میں قتل کیے جانے پر راضی نہیں ہوں' اور تمہارا معاملہ اس طرح نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۶۰۷' داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۱۵ھ)

امام رازی کا یہ جواب صحیح نہیں ہے کیونکہ اس طرح یہودی بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ابھی تورات کی تعلیمات کو پوری دنیا میں پھیلانا ہے اور یہ مقصد ابھی تک حاصل نہیں ہوا' اس لیے ہم قتل کیے جانے پر راضی نہیں ہیں۔

اور میں اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی تائید سے اس کے جواب میں یہ کہتا ہوں:

اس کا جواب یہ ہے کہ اول ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ صرف ہمارے نبی کے پیروکار جنت میں جائیں گے' بلکہ ہر نبی کے سچے پیروکار جنت میں جائیں گے' دوسرا جواب یہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی مشکلات اور مصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا کرنے سے منع کیا ہے اور اللہ سے ملاقات' جنت اور شہادت کے حصول کے لیے موت کی تمنا کی ہے۔

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے! میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں۔ (صحیح بخاری ج ۱ص ۳۹۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دعا کی: اے اللہ! مجھے اپنی راہ میں شہادت عطا فرما اور اپنے رسول کے شہر میں میری موت واقع کر۔ (صحیح بخاری ج ۱ص ۲۵۴' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو بھی مرنے کے بعد ثواب مل جائے وہ دنیا میں واپس جانا نہیں چاہتا سوا شہید کے' کیونکہ شہادت کی فضیلت دیکھنے کے بعد وہ دوبارہ دنیا میں جا کر خدا کی راہ میں مرنا چاہتا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ص ۳۹۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام مسلم اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ کے ساتھ ملاقات سے محبت رکھتا ہے اللہ بھی اس کے ساتھ ملاقات سے محبت رکھتا ہے اور جو اللہ سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ص ۳۴۳' مطبوعہ نور محمد اصح' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

ان احادیث میں اس چیز کی تصریح ہے کہ اللہ سے ملاقات' جنت اور شہادت کے لیے موت کی تمنا صحیح ہے' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اور صحابہ نے یہ تمنا کی ہے' البتہ دنیا کی مشکلات اور مصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا کرنا ممنوع ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص کسی مصیبت آنے کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے اور اگر اس نے ضرور تمنا کرنی ہو تو یوں کہے: اے اللہ! جب تک میرے لیے زندگی بہتر ہے مجھے زندہ رکھ اور جب میرے لیے موت بہتر ہو تو مجھے وفات دے دے۔

(صحیح مسلم ج ۲ص ۳۴۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ

آپ کہیے کہ جو شخص جبریل کا دشمن ہے (تو ہوا کرے)' پس بے شک اسی جبریل نے اللہ کے حکم سے آپ

بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى

کے دل پر (قرآن) نازل کیا جو ان (آسمانی کتابوں) کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس (کے نزول) سے پہلے موجود ہیں اور وہ مومنین

لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ

کے لیے ہدایت اور بشارت ہے ○ جو شخص اللہ کا' اس کے فرشتوں کا' اس کے رسولوں کا

وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدْ

اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ کافروں کا دشمن ہے O اور بے شک (اے رسول!)

اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

ہم نے آپ کی طرف واضح آیتیں نازل کی ہیں اور ان آیتوں کا صرف فاسق ہی انکار کرتے ہیں O

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جب بھی یہ کوئی عہد کرتے ہیں تو ان کا ایک گروہ اس عہد کو پس پشت ڈال دیتا ہے بلکہ ان میں سے اکثر

لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ

ایمان نہیں لاتے O اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ عظیم رسول آئے جو اس (آسمانی کتاب) کی تصدیق

لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ

کرنے والے ہیں جو ان کے پاس ہے تو اہل کتاب کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب (تورات) کو اس

اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

طرح اپنے پس پشت پھینک دیا گویا انہیں کچھ علم ہی نہیں ہے O

یہود کا جبریل کو اپنا دشمن کہنا

تمام اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیتیں بنو اسرائیل کے اس قول کے جواب میں نازل ہوئیں کہ جبریل ہمارا دشمن ہے اور میکائیل ہمارا دوست ہے امام ابو جعفر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ یہودیوں کی ایک جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہم آپ سے چار ایسی چیزوں کے متعلق سوال کرتے ہیں جن کا جواب نبی کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم جو چاہو سوال کرو لیکن اس کی ضمانت دو کہ اگر تم ان جوابات کا صدق پہچان لو تو پھر تم اسلام کو قبول کرو گے' انہوں نے اس کا وعدہ کر لیا' انہوں نے سوال کیا کہ تورات نازل ہونے سے پہلے حضرت یعقوب نے کون سے طعام کو اپنے اوپر حرام کیا تھا؟ آپ نے فرمایا: میں تم کو اس ذات کی قسم دیتا ہوں جس نے تورات کو نازل کیا ہے! کیا تم کو معلوم ہے کہ حضرت یعقوب سخت بیمار ہو گئے اور جب ان کی بیماری طول پکڑ گئی تو انہوں نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بیماری سے صحت دے دی تو میں اپنا پسندیدہ طعام اور مشروب اپنے اوپر حرام کرلوں گا' اور ان کا پسندیدہ طعام اونٹ کا گوشت تھا (ابو جعفر نے کہا: میرا گمان ہے کہ ان کا پسندیدہ مشروب اونٹنیوں کا دودھ تھا) انہوں نے کہا: ہاں! ان کا دوسرا سوال تھا کہ مرد کا پانی کیسا ہے اور عورت کا پانی کیسا ہے؟ اور مذکر اور مونث کیسے بنتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں جس کے سوا

کوئی معبود نہیں ہے اور جس نے موسیٰ پر تورات نازل کی! کیا تم کو معلوم ہے کہ مرد کا پانی سفید اور گاڑھا ہوتا ہے اور عورت کا پانی پتلا اور زرد ہوتا ہے اور جس کا پانی غالب ہو بچہ اسی (جنس) کا ہوتا ہے اور اللہ کے اذن سے اس کی مشابہت ہوتی ہے' انہوں نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: اے اللہ! تو گواہ ہو جا' ان کا تیسرا سوال تھا: اس نبی امی کی نیند کیسی ہے؟ آپ نے فرمایا: تم کو اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ پر تورات نازل کی! کیا تم کو معلوم ہے کہ اس نبی امی کی آنکھیں سوتی ہیں اور اس کا دل نہیں سوتا؟ انہوں نے کہا: بہ خدا ہاں! آپ نے فرمایا: اے اللہ! گواہ ہو جا' انہوں نے کہا: اب آپ ہمیں یہ بتائیں کہ فرشتوں میں سے آپ کا دوست کون ہے؟ اور آپ کے دین قبول کرنے یا نہ کرنے کا مدار اس سوال کے جواب پر ہے' آپ نے فرمایا: میرا دوست جبریل ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی بھیجا اس کے وہی دوست تھے' انہوں نے کہا: اب ہم آپ کو چھوڑتے ہیں' اگر کوئی اور فرشتہ آپ کا دوست ہوتا تو ہم آپ کی اتباع کر لیتے اور آپ پر ایمان لے آتے' آپ نے فرمایا: تم جبریل کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ انہوں نے کہا: وہ ہمارا دشمن ہے' پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۳۳۲۔ ۳۳۱ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اس حدیث کو امام احمد[1] اور امام طبرانی[2] نے بھی روایت کیا ہے اور حافظ سیوطی نے اس کا امام طیالسی' ابونعیم' بیہقی اور ابن ابی حاتم کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ (در منثور ج ۱ ص ۹۰۔۸۹ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

نیز امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر بن الخطاب یہود کے پاس گئے' جب انہوں نے حضرت عمر کو دیکھا تو ان کو خوش آمدید کہا' حضرت عمر نے فرمایا: میں کوئی تم سے محبت یا تمہاری طرف رغبت کی وجہ سے نہیں آیا ہوں' لیکن میں تمہاری باتیں سننے کے لیے آیا ہوں' پھر دونوں نے ایک دوسرے سے سوالات کیے اور بحث کی' یہودیوں نے پوچھا: آپ کے نبی کا دوست کون ہے؟ حضرت عمر نے کہا: جبریل' انہوں نے کہا: وہ تو ہمارا دشمن ہے' وہ آسمان سے آکر (سیدنا حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارے راز بتا دیتا ہے' وہ جب بھی آتا ہے جنگ اور قحط سالی لے کر آتا ہے' البتہ ہمارے نبی کا دوست میکائیل ہے' وہ جب بھی آتا ہے صلح' خوشحالی اور غلہ کی فراوانی کے ساتھ آتا ہے' حضرت عمر نے کہا: تو تم جبریل کو پہچانتے ہو اور (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کرتے ہو' پھر حضرت عمر وہاں سے اٹھ گئے اور پھر یہ آیت نازل ہوئی: کہئے: جو شخص جبریل کا دشمن ہے (تو ہوا کرے)۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۳۳۳ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

امام نسائی روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو عبداللہ بن سلام (ایک یہودی عالم) آپ کے پاس آئے اور کہا: میں آپ سے تین چیزوں کے متعلق سوال کرتا ہوں جن کو نبی کے سوا اور کوئی نہیں جانتا' قیامت کی پہلی علامت کیا ہے؟ جنتی سب سے پہلے کیا چیز کھائیں گے؟ بچہ ماں یا باپ میں سے کس پر ہوتا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے ابھی جبریل نے ان چیزوں کی خبر دی ہے' عبداللہ نے کہا: فرشتوں میں جبریل یہود کا دشمن ہے (صحیح بخاری میں ہے: تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ''قل من کان عدوا لجبریل'' الآیہ) آپ نے فرمایا: قیامت کی سب سے پہلی علامت یہ ہے کہ ایک آگ ظاہر ہوگی جو لوگوں کو مشرق سے لے کر مغرب کی طرف جمع کرے گی' اور

---

[1] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۱ ص ۲۷۸ ' ۲۷۴' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

[2] امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ' معجم کبیر ج ۱۲ ص ۱۹۱۔ ۱۹۰ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت

جس چیز کو جنتی سب سے پہلے کھائیں گے وہ مچھلی کی کلیجی ہوگی اور بچہ کا معاملہ یہ ہے کہ جب مرد کا پانی غالب ہو تو وہ بچے کو کھینچ لیتا ہے اور جب عورت کا پانی غالب ہو تو وہ بچہ کو کھینچ لیتا ہے' عبداللہ بن سلام نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں' یہود بہتان لگانے والے ہیں اگر میرے متعلق پوچھنے سے پہلے آپ نے ان کو میرے مسلمان ہونے کے متعلق بتا دیا تو مجھ پر بہتان باندھیں گے۔ جب یہود آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: تمہارے نزدیک عبداللہ بن سلام کیسا شخص ہے؟ انہوں نے کہا: وہ ہم سب سے اچھا ہے اور اس کا باپ بھی سب سے اچھا تھا' آپ نے فرمایا: یہ بتاؤ اگر عبداللہ بن سلام اسلام لے آئے؟ انہوں نے کہا: اللہ اس کو اسلام سے اپنی پناہ میں رکھے' تب حضرت عبداللہ بن سلام نے آ کر کہا: اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمدا رسول اللہ' وہ کہنے لگے: یہ ہم میں سب سے برا آدمی ہے اور اس کا باپ بھی سب سے برا تھا' اور ان کی مذمت کی' حضرت عبداللہ نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے اسی بات کا خوف تھا۔ (سنن کبریٰ ج ۱ ص ۲۸۷۔ ۲۸۶ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۱ھ)

اس حدیث کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۴۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

جبریل کو دشمن کہنے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب

ان آیتوں کی تفسیر یہ ہے کہ اے نبی! ان سے کہیے کہ جو شخص جبریل کا دشمن ہوگا وہ اللہ کی وحی کا دشمن ہوگا کیونکہ تورات اور قرآن دونوں وحی کے ذریعہ نازل ہوئے ہیں اور قرآن مجید' تورات' زبور اور انجیل کا مصدق ہے اور یہ تمام آسمانی کتابیں اللہ کی توحید' عبادات اور اخلاق حسنہ کی دعوت دیتی ہیں اور یہی گمراہی سے ہدایت دیتی ہیں اور ان پر عمل کرنے والوں کو جنت کی بشارت دیتی ہیں' پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی تاکید کے لیے فرمایا: جو شخص جبریل کا دشمن ہوگا وہ اللہ کا دشمن ہوگا کیونکہ جبریل کو اللہ تعالیٰ بھیجنے والا ہے اور جو جبریل کا دشمن ہوگا وہ سارے فرشتوں کا دشمن ہوگا کیونکہ سارے فرشتے جبریل کے موافق ہیں' اور جو جبریل کا دشمن ہوگا وہ سب رسولوں کا دشمن ہوگا کیونکہ جبریل تمام رسولوں کا ولی اور موید ہے اور جو جبریل کا دشمن ہوگا وہ میکائیل کا بھی دوست نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے موافق ہیں' دونوں رسل ملائکہ میں سے ہیں اور دونوں مقرب فرشتے ہیں اور جو ان کا دشمن ہے وہ سن لے کہ اللہ کافروں کا دشمن ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو شخص اللہ کا' اس کے فرشتوں کا' اس کے رسولوں کا' اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ کافروں کا دشمن ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک (اے رسول!) ہم نے آپ کی طرف واضح آیتیں نازل کی ہیں' اور ان آیتوں کا صرف فاسق ہی انکار کرتے ہیں O (البقرہ: ۹۹)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ (ایک یہودی عالم) ابن صوریا القطیونی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے محمد! آپ ایسی کوئی چیز لے کر نہیں آئے جس کو ہم جانتے پہچانتے ہوں' اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کوئی آیت بینہ (واضحہ) نازل نہیں فرمائی تاکہ ہم آپ کی اتباع کریں' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ بے شک ہم نے آپ کی طرف واضح آیتیں نازل کی ہیں۔ الآیۃ (جامع البیان ج ۱ ص ۳۵۰ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر واضح آیات نازل فرمائیں جن سے وہ تمام علوم اور اسرار ظاہر ہو گئے جن کو علماء یہود

چھپایا کرتے تھے' اور جس شخص نے تورات کا مطالعہ نہ کیا ہو وہ ان پر مطلع نہیں ہو سکتا تھا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا کہ تورات کے اصل احکام کیا تھے اور علماء یہود نے ان میں کیا تحریف کر دی' سو جو شخص حسد اور بغض کا شکار ہو کر اپنی فطرت سلیمہ کو نہ کھو چکا ہو اس کے لیے آپ کی نبوت کا صدق بالکل واضح تھا کیونکہ جس شخص نے نہ کسی کتاب کو پڑھا ہو نہ کسی عالم کی مجلس میں بیٹھا ہو وہ بغیر اللہ کی وحی کے ان مخفی چیزوں کو کیسے جان سکتا ہے اور کیسے بیان کر سکتا ہے!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جب بھی یہ کوئی عہد کرتے ہیں تو ان کا ایک گروہ اس عہد کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔(البقرہ: ۱۰۰)

یہودیوں کا آپ پر ایمان لانے کے عہد کو توڑنا

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور آپ نے یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے کیا کیا عہد و میثاق لیے ہیں تو ایک یہودی عالم مالک بن صیف نے کہا: خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق ہم سے کوئی عہد نہیں لیا اور نہ ہم سے کوئی میثاق لیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جب بھی یہ کوئی عہد کرتے ہیں تو ان کا ایک گروہ اس عہد کو پس پشت ڈال دیتا ہے بلکہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے۔(جامع البیان ج ۱ ص ۳۵۱' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے بار بار یہ عہد لیا تھا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانا' لیکن انہوں نے اس عہد اور میثاق کا انکار اور کفر کیا' اور اللہ تعالیٰ نے تورات میں آپ کی صفات کو بیان کیا تھا جس کو انہوں نے چھپایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ عظیم رسول آئے جو اس (آسمانی کتاب) کی تصدیق کرنے والے ہیں جو ان کے پاس ہے تو اہل کتاب کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پس پشت پھینک دیا گویا انہیں کچھ علم ہی نہیں O

(البقرہ: ۱۰۱)

جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور آپ دین کے عام اصولوں اور عقائد میں تورات کی تصدیق کرتے تھے' مثلاً اللہ تعالیٰ کی توحید' قیامت' جزا و سزا' رسولوں کی تصدیق اور تقدیر پر ایمان وغیرہ تو وہ قرآن پر ایمان نہ لائے اور قرآن پر ایمان نہ لانا اس کو مستلزم ہے کہ ان کا مکمل تورات پر ایمان نہ ہو' اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہوں نے اللہ کی کتاب (تورات) کو پس پشت ڈال دیا' انہوں نے مکمل تورات کو ترک نہیں کیا تھا بلکہ تورات کے صرف اس حصہ کو ترک کیا تھا جس میں یہ بشارت دی گئی تھی کہ اولاد اسماعیل سے ایک نبی آنے والا ہے اور یہ بشارت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی پر منطبق نہیں ہوتی تھی۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ

اور انہوں نے اس (جادو کے کفریہ کلمات) کی پیروی کی جس کو سلیمان کے دور حکومت میں شیطان پڑھا کرتے تھے' اور

سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ق

سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا' البتہ شیاطین ہی کفر کرتے تھے' وہ لوگوں کو جادو (کے کفریہ کلمات) سکھاتے تھے'

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا

اور انہوں نے اس (جادو) کی پیروی کی جو شہر بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اتارا گیا تھا' اور وہ

يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ

(فرشتے) اس وقت تک کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک کہ یہ نہ کہتے: ہم تو صرف آزمائش ہیں تو تم کفر نہ کرو'

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ

وہ ان سے اس چیز کو سیکھتے جس کے ذریعہ وہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان علیحدگی کر دیتے'

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ

اور اللہ کی اجازت کے بغیر وہ اس (جادو) سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے' وہ اس چیز کو سیکھتے تھے جو ان کو

مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ

نقصان پہنچائے اور ان کو نفع نہ دے' اور بے شک وہ خوب جانتے تھے کہ جس نے اس (جادو) کو خرید لیا

فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ قف وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ

اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں' اور کیسی بری چیز ہے وہ جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنے آپ کو فروخت کر ڈالا ہے'

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ

کاش یہ جان لیتے ○ اور اگر یہ ایمان لے آتے اور متقی بنتے تو اللہ کے پاس سے ثواب

مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع

بہت بہتر ہے' کاش یہ جان لیتے ○

۱۲ ع ۷ ۱۲

حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت کی تحقیق

مدینہ کے یہود حضرت سلیمان علیہ السلام کو ساحر اور جادوگر کہتے تھے اور جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام کا نبیوں میں ذکر فرماتے تو وہ اس پر طعن اور تشنیع کرتے اور کہتے کہ دیکھو ان کو کیا ہوا ہے کہ یہ سلیمان کا نبیوں میں ذکر کرتے ہیں حالانکہ سلیمان محض جادوگر تھے' امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

سدی نے بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور حکومت میں شیاطین آسمان پر گھات لگا کر بیٹھ جاتے اور بیٹھ کر فرشتوں کا کلام کان لگا کر سنتے کہ زمین میں کون کب مرے گا' بارش کب ہوگی اور اس قسم کی دیگر باتیں' پھر آ کر کاہنوں کو وہ

باتیں بناتے' کاہن لوگوں کو وہ باتیں بتاتے' اور وہ باتیں اس طرح واقع ہو جاتیں' ان کے ساتھ بہت سے جھوٹ ملا کر لوگوں نے وہ باتیں کتاب میں لکھ لیں' اور بنو اسرائیل میں یہ مشہور ہو گیا کہ جنات کو غیب کا علم ہے' حضرت سلیمان نے ان کتابوں کو تلاش کروا کر منگوایا اور ایک صندوق میں رکھ کر اپنی کرسی کے نیچے دفن کر دیا اور شیاطین میں سے جو بھی ان کی کرسی کے قریب جاتا وہ جل جاتا' اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے اعلان کر دیا کہ میں نے جس شخص کے متعلق بھی یہ سنا کہ وہ کہتا ہے کہ شیاطین غیب جانتے ہیں میں اس کی گردن اڑا دوں گا' سلیمان علیہ السلام فوت ہو گئے اور وہ علماء بھی گزر گئے جن کو یہ واقعہ معلوم تھا اور پشت ہا پشت گزر گئیں تو ایک دن وہ شیطان انسان کی صورت بن کر بنو اسرائیل کی ایک جماعت کے پاس گیا' اور کہا: میں تم کو ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ دکھاتا ہوں' اس نے ان سے کہا: اس کرسی کے نیچے زمین کھودو' انہوں نے کھودا تو وہ کتابیں نکل آئیں' شیطان نے کہا: سلیمان اس جادو کی وجہ سے انسانوں' جنوں اور پرندوں پر حکومت کرتے تھے' پھر بنو اسرائیل میں نسل در نسل یہ مشہور ہو گیا کہ سلیمان جادوگر تھے' حتیٰ کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور آپ نے حضرت سلیمان کا انبیاء علیہم السلام میں ذکر کیا تو بنو اسرائیل نے اس پر اعتراض کیا اور کہا: سلیمان تو جادوگر تھے' اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیت نازل فرمائی: اور انہوں نے اس کی پیروی کی جس کو سلیمان کے دور حکومت میں شیطان پڑھا کرتے تھے اور سلیمان نے (جادو کر کے) کوئی کفر نہیں کیا' البتہ شیاطین ہی کفر کرتے تھے' وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۳۵۳' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

نیز امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

جب شیاطین (جنوں) کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا علم ہوا تو انہوں نے سحر کی مختلف اصناف اور اقسام کو لکھ کر ایک کتاب میں مدون کیا اور اس کے اوپر یہ نام لکھ دیا کہ یہ سلیمان بن داؤد کے دوست آصف بن برخیا کی تحریر ہے اور اس میں علم کے خزانوں کے ذخیرے ہیں' پھر اس کتاب کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی کے نیچے دفن کر دیا' پھر بعد میں بنو اسرائیل کی باقی ماندہ قوم نے اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی کے نیچے سے نکال لیا' جب انہوں نے اس کتاب کو پڑھا تو انہوں نے کہا کہ سلیمان بن داؤد کی حکومت اس کتاب کی وجہ سے تھی' پھر انہوں نے خود بھی جادو سیکھا اور لوگوں کو بھی جادو سکھایا اور اس طرح جادو پھیلا دیا' اور جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیمان بن داؤد کا انبیاء اور مرسلین میں ذکر کیا تو مدینہ کے یہودیوں نے کہا: کیا تم (حضرت سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر تعجب نہیں کرتے کہ وہ سلیمان کا انبیاء میں ذکر کرتے ہیں حالانکہ وہ صرف ایک جادوگر تھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیت نازل کی: اور انہوں نے اس کی پیروی کی جس کو سلیمان کے دور حکومت میں شیطان پڑھا کرتے تھے اور سلیمان نے (جادو کر کے) کوئی کفر نہیں کیا' البتہ شیاطین ہی کفر کرتے تھے وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۳۵۴' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی ان دونوں روایتوں کو طبری کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔

(فتح الباری ج ۱۰ ص ۲۲۳' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

امام ابن جوزی نے ان آیتوں کے شان نزول میں مزید چار قول نقل کیے ہیں:

(۱) ابو صالح نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت سلیمان کے ہاتھ سے ان کی سلطنت نکل گئی تو شیاطین (جنوں) نے سحر کو لکھ کر ان کی جائے نماز کے نیچے دفن کر دیا اور جب ان کی وفات ہوئی تو اس کو نکال لیا اور کہا: ان کی سلطنت اس سحر کی وجہ سے تھی' مقاتل کا بھی یہی قول ہے۔

(۲) سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آصف بن برخیا حضرت سلیمان کے احکام لکھ لیا کرتے تھے

اور ان کو ان کی کرسی کے نیچے دفن کر دیا کرتے تھے' جب حضرت سلیمان فوت ہو گئے تو اس کتاب کو شیطانوں نے نکال لیا اور ہر دو سطور کے درمیان سحر اور جھوٹ لکھ دیا اور بعد میں اس کو حضرت سلیمان کی طرف منسوب کر دیا۔

(۳) عکرمہ نے کہا: شیطانوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد سحر کو لکھا اور اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا۔

(۴) قتادہ نے کہا: شیطانوں نے جادو کو ایجاد کیا' حضرت سلیمان نے اس پر قبضہ کر کے اس کو اپنی کرسی کے نیچے دفن کر دیا تاکہ لوگ اس کو نہ سیکھیں' جب حضرت سلیمان علیہ السلام فوت ہو گئے تو شیطانوں نے اس کو نکال لیا' اور لوگوں کو سحر کی تعلیم دی اور کہا: یہی سلیمان کا علم ہے۔ (زاد المسیر ج ۱ ص ۱۲۱' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

سحر کے لغوی معنی

علامہ فیروز آبادی نے لکھا ہے کہ جس چیز کا ماخذ لطیف اور دقیق ہو وہ سحر ہے۔

(قاموس ج ۲ ص ۹۶' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۲ھ)

علامہ جوہری نے بھی یہی لکھا ہے۔ (الصحاح ج ۲ ص ۶۷۹' مطبوعہ دار العلم' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

''تہذیب'' میں مذکور ہے کہ کسی چیز کو اس کی حقیقت سے دوسری حقیقت کی طرف پلٹ دینا سحر ہے' کیونکہ جب ساحر کسی باطل کو حق کی صورت میں دکھاتا ہے اور لوگوں کے ذہن میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ وہ چیز اپنی حقیقت کے مغائر ہے تو یہ اس کا سحر ہے۔ (تاج العروس ج ۳ ص ۲۵۸' ملخصاً' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

سحر وہ عمل ہے جس میں شیطان کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے اور اس کی مدد سے کوئی کام کیا جاتا ہے' نظر بندی کو بھی سحر کہتے ہیں' ایک چیز کسی صورت میں دکھائی دیتی ہے' حالانکہ وہ اس کی اصلی صورت نہیں ہوتی (جیسے دور سے سراب پانی کی طرح دکھائی دیتا ہے یا جیسے تیز رفتار سواری پر بیٹھے ہوئے شخص کو درخت اور مکانات دوڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں)' کسی چیز کی کیفیت کے پلٹ دینے کو بھی سحر کہتے ہیں' کوئی شخص کسی بیمار کو تندرست کر دے یا کسی کے بغض کو محبت سے بدل دے تو کہتے ہیں: اس نے اس پر سحر (جادو) کر دیا۔ (لسان العرب ج ۴ ص ۳۴۸' ملخصاً' مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ' قم ایران' ۱۴۰۵ھ)

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

سحر کا کئی معانی پر اطلاق کیا جاتا ہے:

(۱) نظر بندی اور تخیلات جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی' جیسے شعبدہ باز اپنے ہاتھ کی صفائی سے لوگوں کی نظریں پھیر دیتا ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْیُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ (الاعراف: ۱۱۶)

تو جب انہوں نے (لاٹھیاں اور رسیاں) ڈالیں تو لوگوں کی آنکھوں پر سحر کر دیا اور ان کو ڈرایا۔

لوگوں کو ان جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑتے ہوئے سانپوں کی شکل میں دکھائی دینے لگیں اور وہ ڈر گئے:

فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی ○ (طٰہٰ: ۶۶)

تو اچانک ان کے جادو سے موسیٰ کو خیال ہوا کہ ان کی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں ○

(۲) شیطان کا تقرب حاصل کر کے اس کی مدد سے کوئی غیر معمولی کام (عام عادت کے خلاف) کرنا۔
قرآن مجید میں ہے:
وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ (البقرہ: ۱۰۲) — البتہ شیطانوں نے کفر کیا تھا لوگوں کو سحر (جادو) سکھاتے تھے۔

(۳) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جادو سے کسی چیز کی ماہیت اور صورت بدل دی جاتی ہے' مثلاً انسان کو گدھا بنا دیا جاتا ہے' لیکن اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

(۴) کسی چیز کو کوٹ کر اور پیس کر باریک کرنے کو بھی سحر کہتے ہیں' اسی لیے معدہ کے فعل ہضم کو سحر کہتے ہیں اور جس چیز میں کوئی معنوی لطافت اور باریکی ہو اس کو بھی سحر کہتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے: بعض بیان سحر ہوتے ہیں۔
(المفردات ص ۲۲۶ 'مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

سحر کا شرعی معنی

علامہ بیضاوی لکھتے ہیں:
جس کام کو انسان خود نہ کر سکے اور وہ شیطان کی مدد اور اس کے تقرب کے بغیر پورا نہ ہو اور اس کام کے لیے شیطان کے شر اور خبث نفس کے ساتھ مناسبت ضروری ہو اس کو سحر کہتے ہیں' اس تعریف سے سحر' معجزہ اور کرامت سے ممتاز ہو جاتا ہے' مختلف حیلوں' آلات' دواؤں اور ہاتھ کی صفائی سے جو عجیب و غریب کام کیے جاتے ہیں' وہ سحر نہیں ہیں اور نہ وہ مذموم ہیں' ان کو مجازاً سحر کہا جاتا ہے کیونکہ ان کاموں میں بھی دقت اور باریکی ہوتی ہے اور لغت میں سحر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے صدور کا سبب دقیق اور مخفی ہو۔ (انوار التنزیل (درسی) ص ۹۶۔ ۹۵ 'مطبوعہ ایچ۔ ایم۔ سعید اینڈ کمپنی' کراچی)

سحر کے تحقق میں مذاہب' سحر کے دلائل اور ان پر اعتراضات کے جوابات

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:
کسی خبیث اور بدکار شخص کے مخصوص عمل کے ذریعہ کوئی غیر معمولی اور عام عادت کے خلاف کام یا چیز صادر ہو اس کو سحر کہتے ہیں' اور یہ باقاعدہ کسی استاذ کی تعلیم سے حاصل ہوتا ہے' اس اعتبار سے سحر معجزہ اور کرامت سے ممتاز ہے' سحر کسی شخص کی طبیعت یا اس کی فطرت کا خاصہ نہیں ہے اور یہ بعض جگہوں' بعض اوقات اور بعض شرائط کے ساتھ مخصوص ہے' جادو کا معارضہ کیا جاتا ہے اور اس کو کوشش سے حاصل کیا جاتا ہے' سحر کرنے والا فسق کے ساتھ ملعون ہوتا ہے' ظاہری اور باطنی نجاست میں ملوث ہوتا ہے اور دنیا اور آخرت میں رسوا ہوتا ہے' اہل حق کے نزدیک سحر عقلاً جائز ہے اور قرآن اور سنت سے ثابت ہے' اسی طرح نظر لگنا بھی جائز اور ثابت ہے۔

معتزلہ نے کہا: سحر کی کوئی حقیقت نہیں ہے' یہ محض نظر بندی ہے اور اس کا سبب' کرتب' ہاتھ کی صفائی اور شعبدہ بازی ہے' ہماری دلیل یہ ہے کہ سحر فی نفسہ ممکن ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو پیدا کرنے پر قادر ہے اور اس کا خالق ہے اور ساحر صرف فاعل اور کاسب ہے اور اس کے وقوع اور تحقق پر تمام فقہاء اسلام کا اجماع ہے۔ اس کا ثبوت قرآن مجید کی ان آیات میں ہے:

(ترجمہ) البتہ شیاطین ہی کفر کرتے تھے' وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور انہوں نے (یہودیوں نے) اس (جادو) کی پیروی کی جو شہر بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اتارا گیا تھا اور وہ فرشتے اس وقت تک کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک کہ یہ نہ کہتے: ہم تو صرف آزمائش ہیں تو تم کفر نہ کرو' وہ ان سے اس چیز کو سیکھتے تھے جس کے ذریعہ وہ مرد اور اس کی

بیوی میں علیحدگی کر دیتے' اور اللہ کی اجازت کے بغیر وہ اس جادو سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے' وہ اس چیز کو سیکھتے تھے جو ان کو نقصان پہنچائے اور ان کو نفع نہ دے (البقرہ: ۱۰۳۔ ۱۰۲) اور قرآن مجید میں ہے:

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۙ (الفلق: ۴) آپ کہیے کہ میں گرہوں میں (جادو کی) بہت پھونک مارنے والی عورتوں کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں O

اگر جادو کی کوئی حقیقت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے شر سے پناہ طلب کرنے کا حکم نہ دیتا۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ سحر ایک حقیقت ثابتہ ہے' سحر کے ذریعہ نقصان پہنچ جاتا ہے' مرد اور اس کی بیوی میں علیحدگی ہو جاتی ہے۔

اسی طرح جمہور مسلمین کا اس پر اتفاق ہے کہ سورہ فلق اس وقت نازل ہوئی جب ایک یہودی لبید بن اعصم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کر دیا تھا جس کے نتیجہ میں آپ تین راتیں بیمار رہے۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا گیا' حتیٰ کہ آپ یہ خیال کرتے تھے کہ آپ نے کوئی کام کیا ہے' حالانکہ آپ نے وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا حتیٰ کہ آپ ایک دن میرے پاس تشریف فرما تھے' آپ نے اللہ تعالیٰ سے بار بار دعا کی' پھر آپ نے فرمایا: اے عائشہ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے جو پوچھا تھا وہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بتا دیا' میں نے پوچھا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کیا بات ہے؟ آپ نے فرمایا: میرے پاس دو آدمی آئے' ایک میرے سرہانے بیٹھ گیا اور ایک میرے پاؤں کی جانب' پھر ایک نے دوسرے سے کہا: اس شخص کو کیا درد ہے؟ اس نے کہا: ان پر جادو کیا گیا ہے' پوچھا: جادو کس نے کیا ہے؟ کہا: لبید بن اعصم یہودی نے جو بنو زریق سے ہے' پوچھا: کس چیز میں جادو کیا ہے؟ کہا: ایک کنگھی میں اور نر کھجور کے غلاف میں لپٹے ہوئے خوشہ میں ہے' پوچھا: وہ کہاں ہے؟ کہا: وہ ذی اروان کے کنویں میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ اس کنویں پر گئے' آپ نے اس میں جھانک کر دیکھا' اس کنویں کے پاس ایک کھجور کا درخت تھا' پھر آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس واپس گئے اور فرمایا: بہ خدا! اس کنویں کا پانی گوندھی ہوئی مہندی کے پانی کی طرح ہے اور گویا اس کھجور کے خوشے شیاطین کے سر ہیں' میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ نے اس کو کنویں سے نکال کیوں نہ لیا؟ آپ نے فرمایا: نہیں' مجھ کو تو اللہ نے شفا دے دی' اور مجھے یہ خدشہ ہے کہ اس کے نکالنے سے لوگوں کو ضرر پہنچے گا' پھر آپ نے اس کنویں کو دفن کرنے (بند کرنے) کا حکم دیا۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۵۸)

اسی طرح روایت ہے کہ ایک باندی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر سحر کیا' اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما پر سحر کیا گیا تو ان کی کلائی ٹیڑھی ہو گئی۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر جادو کا اثر ثابت ہوتا تو جادوگر تمام انبیاء اور صالحین کو نقصان پہنچاتے اور وہ جادو کے ذریعہ اپنے لیے ملک اور سلطنت کو حاصل کر لیتے' نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر کیسے ہو سکتا ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ (المائدہ: ۶۷) اور اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی O (طٰہٰ: ۶۹) اور ساحر جہاں بھی جائے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا O

کہا جاتا ہے کہ سحر ہر زمانہ اور ہر وقت میں نہیں پایا جاتا' اور نہ ہر علاقہ اور ہر جگہ میں پایا جاتا ہے' اور نہ سحر کا اثر ہر وقت ہو سکتا ہے اور نہ ہر معاملہ میں جادوگر کا تسلط ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو محفوظ رکھے گا اس کا

مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کو لوگوں کے ہلاک کرنے سے محفوظ رکھے گا' یا آپ کی نبوت میں خلل ڈالنے سے محفوظ رکھے گا' اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جادوگر آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا یا آپ کے بدن میں کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے:

اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَیْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا ۝ (بنو اسرائیل: ۴۸ ـ ۴۷)

جب کہ ظالم یہ کہتے ہیں کہ تم صرف اس شخص کی پیروی کرتے ہو جس پر جادو کیا ہوا ہے ۝ دیکھئے انہوں نے آپ کے لیے کیسی مثالیں بیان کی ہیں' تو وہ اس طرح گمراہ ہو چکے کہ اب صحیح راستہ پر نہیں آ سکتے ۝

کفار نے کہا کہ آپ پر جادو کیا ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو گمراہی فرمایا' اس سے معلوم ہوا کہ آپ پر جادو کا اثر نہیں ہو سکتا' اور ''صحیح بخاری'' میں یہ حدیث ہے کہ آپ پر جادو کا اثر ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کی مراد یہ تھی کہ جادو کے اثر سے آپ کی عقل زائل ہو گئی ہے اور آپ کا دعویٰ نبوت کرنا اور وحی الٰہی کو بیان کرنا اسی جادو کے اثر سے ہے' اور اسی جادو کے اثر کی وجہ سے آپ نے عربوں کے دین کو ترک کر دیا' اور حدیث میں جادو کے جس اثر کا بیان ہے اس کا اثر آپ کی عقل پر نہیں تھا بلکہ آپ کے حواس پر تھا' آپ نے کوئی کام نہیں کیا ہوتا تھا اور آپ خیال کرتے تھے کہ آپ نے وہ کام کر لیا ہے اور جس طرح آپ پر بیماری کا طاری ہونا' آپ کا سواری سے گرنا' جسم سے خون کا نکلنا عوارض بشریہ کی وجہ سے تھا اور نبوت کے منافی نہیں تھا اسی طرح آپ پر جادو کا اثر ہونا عوارض بشریہ سے تھا اور یہ آپ کی نبوت کے منافی نہیں تھا اور اس میں حکمت یہ تھی کہ سحر زدگی کے لیے بھی آپ کی زندگی میں نمونہ ہو۔ اس کی مکمل تحقیق بنی اسرائیل: ۴۸۔ ۴۷ کی تفسیر میں ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے:

یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی ۝ (طٰہٰ: ۶۶)

حضرت موسیٰ کو خیال ہوا کہ ان کے جادو کی وجہ سے ان کی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں ۝

اس سے معلوم ہوا کہ جادو کی کوئی حقیقت نہیں ہے' یہ صرف نظر بندی ہے اور کسی کے ذہن میں خیال ڈالنا ہے' ہم کہتے ہیں کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ فرعون کے جادوگروں کا سحر یہی تخییل اور نظر بندی تھا لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے علاوہ جادو کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اسی طرح نظر لگنا بھی ثابت ہے کیونکہ بعض انسانوں میں ایسی خاصیت ہوتی ہے کہ جب وہ کسی چیز کی تعریف اور تحسین کرتے ہیں تو اس چیز پر کوئی آفت آ جاتی ہے' اور یہ چیز مشاہدات میں سے ہے' اور اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نظر حق ہے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۲۰ 'مطبوعہ کراچی)

(شرح المقاصد ج ۵ ص ۸۱ ـ ۷۹ 'ملخصاً و مفصلاً' مطبوعہ منشورات الشریف الرضی' ۱۴۰۹ھ)

علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

سحر میں اختلاف ہے' ایک قول یہ ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے' یہ صرف تخییل ہے' علامہ استرابازی شافعی' علامہ ابوبکر رازی حنفی' اور علامہ ابن حزم ظاہری کی یہی رائے ہے۔ علامہ نووی نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ سحر کی حقیقت ہے' جمہور کے نزدیک یہ قطعی ہے' عام علماء کی یہی رائے ہے۔ کتاب' سنت صحیحہ مشہورہ کی اسی پر دلالت ہے' البتہ اس میں اختلاف ہے کہ سحر سے انقلاب حقائق ہو جاتا ہے یا نہیں۔ جو کہتے ہیں کہ سحر صرف تخییل ہے وہ اس کا انکار کرتے ہیں' اور جو کہتے ہیں کہ اس کی

حقیقت ہے ان کا اس میں اختلاف ہے کہ جادو کی تاثیر صرف کسی چیز کے مزاج میں ہوتی ہے مثلاً صحت مند کو بیمار کرنا' یا اس سے کسی چیز کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے' مثلاً پتھر کو حیوان بنا دینا' جمہور یہ کہتے ہیں کہ اس کا اثر صرف مزاج میں ہوتا ہے' اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اس سے حقیقت بدل جاتی ہے۔ علامہ مازری نے کہا ہے کہ سحر' معجزہ اور کرامت میں یہ فرق ہے کہ سحر بعض اقوال اور افعال خبیثہ سے مکمل ہوتا ہے اور کرامت میں اس کی احتیاج نہیں ہوتی بلکہ وہ عموماً اتفاقاً صادر ہوتی ہے اور معجزہ میں چیلنج ہوتا ہے' امام الحرمین نے یہ نقل کیا ہے کہ سحر صرف فاسق سے صادر ہوتا ہے' اور کرامت کا ظہور فاسق سے نہیں ہوتا۔

(فتح الباری ج ۱۰ ص ۲۲۳۔ ۲۲۲' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

سحر کے شرعی حکم کی تحقیق

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات ہلاک کرنے والے کاموں سے بچو' صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کون سے کام ہیں؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شریک کرنا' جادو کرنا' جس کو قتل کرنے سے اللہ نے منع کیا ہے اس کو ناحق قتل کرنا' سود کھانا' یتیم کا مال کھانا' میدان جہاد سے پیٹھ پھیر کر بھاگنا' اور مسلمان پاک دامن عورت کو زنا کی تہمت لگانا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۸۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۶۴' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ فی نفسہ جادو کرنا' حرام اور گناہ کبیرہ ہے' اگر جادو کے عمل میں شرکیہ اقوال یا افعال ہوں تو پھر جادو کرنا کفر ہے اور جادو کے سیکھنے اور سکھانے میں فقہاء کے مختلف نظریات ہیں۔

سحر کے شرعی حکم کے متعلق فقہاء شافعیہ کا نظریہ

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

جادو کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سات ہلاک کرنے والے کاموں میں شمار کیا ہے' اس کا سیکھنا اور سکھانا بھی حرام ہے' اگر جادو کرنے والے کے قول یا فعل میں کوئی چیز کفر کی مقتضی ہو تو جادو کرنا کفر ہے' ورنہ نہیں بلکہ گناہ کبیرہ ہے' اسی طرح جادو کے سیکھنے یا سکھانے میں کوئی قول یا فعل کفر کا مقتضی ہو تو کفر ہے ورنہ گناہ کبیرہ ہے' ہمارے نزدیک جادوگر کو قتل نہیں کیا جائے گا' اس سے توبہ طلب کی جائے گی' اگر اس نے توبہ کر لی تو اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی۔

علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی نے بھی یہی لکھا ہے۔ (فتح الباری ج ۱۰ ص ۲۲۴' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

نیز علامہ نووی نے لکھا ہے کہ ہمارے بعض اصحاب نے یہ کہا ہے کہ جادو کا سیکھنا جائز ہے تا کہ انسان کو جادو کی معرفت ہو اور وہ جادو کے ضرر سے بچ سکے اور جادوگر کا رد کر سکے' اور ان کے نزدیک جادو کی ممانعت جادو کرنے پر محمول ہے' جادو سیکھنے پر نہیں۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۶۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

سحر کے شرعی حکم کے متعلق فقہاء مالکیہ کا نظریہ

علامہ دردیر مالکی لکھتے ہیں:

علامہ ابن العربی نے سحر کی یہ تعریف کی ہے کہ یہ وہ کلام ہے جس میں غیر اللہ کی تعظیم کی جاتی ہے اور اس کی طرف حوادث کائنات کو منسوب کیا جاتا ہے' امام رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ جادو کا سیکھنا اور سکھانا کفر ہے خواہ اس سے جادو کا عمل نہ کیا جائے' کیونکہ شیاطین کی تعظیم کرنا اور حوادث کی نسبت اس کی طرف کرنا یہ ایسا کام ہے کہ کوئی عاقل مسلمان یہ کہنے کی جرات

نہیں کر سکتا کہ یہ فعل کفر نہیں ہے' اگر جادو کا توڑ اسی کی مثل جادو سے کیا جائے تو یہ بھی کفر ہے' جادو کے توڑ کے لیے کسی کو کرایہ پر لینا جائز ہے' بہ شرطیکہ جادو سے یہ توڑ نہ کیا جائے' جادو کے ذریعہ احوال اور صفات میں تغیر ہو جاتا ہے اور حقائق بدل جاتے ہیں' اگر یہ کام آیات قرآنیہ اور اسماء الٰہیہ سے ہو جائیں تو پھر یہ کفر نہیں ہے' البتہ اگر جادو کے ذریعہ دو آدمیوں کے درمیان عداوت پیدا کی جائے یا کسی کی جان اور مال کو نقصان پہنچایا جائے تو یہ حرام ہے' اگر کوئی شخص علی الاعلان جادو کرتا ہو تو اس کو قتل کر دیا جائے گا اور اس کا مال فئی ہے (یعنی لوٹ لیا جائے گا) بہ شرطیکہ وہ توبہ نہ کرے۔

(الشرح الکبیر ج ۴ ص ۳۰۲' مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

علامہ دسوقی مالکی نے بھی یہی لکھا ہے۔ (حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ج ۴ ص ۳۰۲' مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

علامہ خرشی مالکی[1]' علامہ علی مالکی[2]' علامہ خطاب مالکی[3] اور علامہ العبدری[4] نے بھی یہی لکھا ہے۔

سحر کے شرعی حکم کے متعلق فقہاء حنبلیہ کا نظریہ

امام ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

جادو کا سیکھنا اور سکھانا حرام ہے اور ہمارے علم کے مطابق اس میں اہل علم کا اتفاق ہے' جادو کے سیکھنے اور جادو کے عمل کی وجہ سے ساحر کی تکفیر کی جائے گی' خواہ وہ جادو کے حرام ہونے کا اعتقاد رکھتا ہو یا اس کے مباح ہونے کا اور امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی' کیونکہ امام احمد نے فرمایا: عراف' کاہن اور ساحر کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ ان کے ان افعال پر ان سے توبہ طلب کی جائے' کیونکہ میرے نزدیک وہ حکماً مرتد ہیں' اگر وہ توبہ کرلیں تو ان کو چھوڑ دیا جائے۔ راوی نے پوچھا: اگر توبہ نہ کرے تو اس کو قتل کیا جائے گا؟ تو کہا: نہیں بلکہ اس کو قید میں رکھا جائے گا حتیٰ کہ وہ توبہ کرلے' راوی نے پوچھا: اس کو قتل کیوں نہیں کیا جائے گا؟ کہا: جب تک وہ نماز پڑھتا ہے تو اس کی توبہ اور رجوع کی توقع ہے۔ امام احمد کا یہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے کہ ساحر کافر نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وما کفر سلیمان. سلیمان نے کفر نہیں کیا" یعنی انہوں نے جادو نہیں کیا حتیٰ کہ ان کی تکفیر کی جائے' اور فرشتوں نے کہا: "انما نحن فتنة فلا تکفر. ہم تو محض آزمائش ہیں تو تم جادو سیکھ کر کفر نہ کرو"۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ جادو کرنا کفر ہے' اور حضرت علی نے فرمایا: ساحر کافر ہے۔

حضرت عمر' حضرت عثمان بن عفان' حضرت ابن عمر' حضرت حفصہ' حضرت جندب بن عبداللہ' حضرت حبیب بن کعب' حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے کہ ساحر کو بہ طور حد کے قتل کر دیا جائے گا' امام ابوحنیفہ اور مالک کا بھی یہی قول ہے' امام شافعی کا اس میں اختلاف ہے' ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان کو قتل کرنا صرف تین وجہوں سے جائز ہے' ایمان لانے کے بعد کفر کرے' شادی کرنے کے بعد زنا کرے' یا ناحق قتل کرے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم) ساحر نے ان میں سے کوئی کام نہیں کیا' اس لیے اس کو قتل نہیں کیا جائے گا' اس کا جواب یہ ہے کہ سحر کرنا بھی ارتداد ہے' نیز حضرت جندب بن

---

1. علامہ محمد بن عبداللہ علی الخرشی المتوفی ۱۱۰۱ھ' الخرشی علی مختصر الخلیل ج ۸ ص ۶۳' مطبوعہ دار صادر' بیروت
2. علامہ علی بن احمد الصعیدی العدوی المالکی' حاشیۃ العدوی علی الخرشی ج ۸ ص ۶۳' مطبوعہ دار صادر' بیروت
3. علامہ ابوعبداللہ محمد بن الحطاب المالکی' المتوفی ۹۵۴ھ' مواہب الجلیل ج ۶ ص ۲۸۰۔ ۲۷۹' مطبوعہ مکتبۃ النجاح' لیبیا
4. علامہ ابوعبداللہ محمد بن یوسف العبدری المتوفی ۸۹۷ھ' التاج والاکلیل علی ہامش مواہب الجلیل ج ۶ ص ۲۸۰۔ ۲۷۹' مطبوعہ مکتبۃ النجاح' لیبیا

عبداللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ساحر کی حد اس کو تلوار سے مارنا ہے (ابن المنذر) اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا: ہر ساحر کو قتل کردو۔ (المغنی ج ۹ ص ۳۱۔ ۳۳ مطبوعہ دارالفکر بیروت)

علامہ مرداوی حنبلی لکھتے ہیں:

ساحر کی تکفیر کی جائے گی اور اس کو قتل کیا جائے گا' یہی مذہب ہے اور یہی جمہور اصحاب کا نظریہ ہے' ایک روایت یہ ہے کہ اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی اور جو شخص دواؤں اور دھوئیں سے شعبدہ بازی کرتا ہو اس کو صرف تعزیر دی جائے گی۔

(الانصاف ج ١٠ ص ٣٥٠ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ١٣٧٤ھ)

سحر کے شرعی حکم کے متعلق فقہاء احناف کا نظریہ

علامہ ابن ہمام حنفی لکھتے ہیں:

سحر کی حقیقت ہے اور جسم کو تکلیف پہنچانے میں اس کی تاثیر ہے' جادو کو سکھانا بالاتفاق حرام ہے' اور اس کی اباحت کا اعتقاد کرنا کفر ہے' ہمارے بعض اصحاب' امام مالک اور امام احمد کا یہ مذہب ہے کہ جادو کا سیکھنا اور جادو کا کرنا کفر ہے' خواہ اس کے حرام ہونے کا اعتقاد رکھے یا نہ رکھے' اس کو قتل کردیا جائے گا' حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت ابن عمر' حضرت جندب بن عبداللہ' حبیب بن کعب' قیس بن سعد اور عمر بن عبدالعزیز نے ساحر سے توبہ طلب کیے بغیر اس کے قتل کا فتویٰ دیا' حضرت جندب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ساحر کی حد یہ ہے کہ اس کو تلوار سے مار دیا جائے' امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ جب تک ساحر جادو کے مباح ہونے کا اعتقاد نہ رکھے اس کو کافر کہا جائے نہ اس کو قتل کیا جائے' ساحر کو کافر قرار دینے نہ دینے میں امام شافعی کے مذہب پر عمل کرنا واجب ہے' البتہ اس کو قتل کرنا واجب ہے' جس شخص کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کوشش کرکے جادو کرتا ہے' اس سے توبہ طلب کیے بغیر اس کو قتل کردیا جائے۔

(فتح القدیر ج ۵ ص ۳۳۳۔ ۳۳۲ مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر)

علامہ شامی حنفی لکھتے ہیں:

خلاصہ یہ ہے کہ ساحر جب تک کسی کفریہ امر کا اعتقاد نہ کرے اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی' "النہر الفائق" میں اسی پر اعتماد کیا ہے' اور علامہ حصکفی نے بھی اسی کی اتباع کی ہے اور ساحر کو مطلقاً قتل کردیا جائے گا' "فتاویٰ قاضی خاں" میں مذکور ہے کہ جو شخص کسی آدمی اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کے لیے کوئی عمل کرے' وہ مرتد ہے اور اس کو قتل کردیا جائے بہ شرطیکہ وہ تفریق میں اس عمل کی تاثیر کا اعتقاد رکھتا ہو' اور جو شخص لوگوں کو ضرر پہنچانے کے لیے سحر کرتا ہو اس کو قتل کردیا جائے گا' اور جو ساحر تجربہ کے لیے سحر کرتا ہو اور اس پر اعتقاد نہ رکھتا ہو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: جس شخص کا سحر کرنا اس کے اقرار یا گواہی سے ثابت ہو اس کو قتل کردیا جائے گا اور اس سے توبہ نہیں طلب کی جائے گی' اس میں مسلمان' ذمی' آزاد اور غلام برابر ہیں' ساحر سے مراد وہ شخص نہیں ہے جو معوذات سے جادو کو دور کرتا ہو' نہ طلسم کرنے والا مراد ہے (شعبدہ باز)۔ علامہ ابن ہمام نے جو ہمارے بعض اصحاب سے سحر کا حکم کفر نقل کیا ہے وہ اس پر مبنی ہے کہ سحر کا تحقق کلمات کفریہ کہنے پر موقوف ہے۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۲۹۶۔ ۲۹۵ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ حصکفی حنفی نے لکھا ہے کہ اگر پکڑے جانے سے پہلے جادوگر نے توبہ کرلی تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی اور قتل نہیں کیا جائے گا ورنہ توبہ قبول نہیں ہوگی اور قتل کیا جائے گا۔ (درمختار علی ہامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۹۶ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

نیز علامہ شامی لکھتے ہیں:

سحر کی ایک قسم بعض مخصوص کلمات سے ہوتی ہے اور یہ حواس خمسہ میں ادراک کو واجب کرتی ہے' اس کو سیمیا کہتے ہیں' دوسری قسم ہیمیا ہے جو کھانے' پینے کی چیز میں تخییل واقع کرتی ہے' اور تیسری قسم وہ ہے جس سے بعض اشیاء کے احوال میں تاثیر ہوتی ہے' سحر کی اور بھی قسمیں ہیں لیکن سحر کی ہر قسم کفر نہیں ہے' کیونکہ کسی کو ضرر پہنچانے کی وجہ سے تکفیر نہیں کی جاتی بلکہ کسی کفریہ امر کی وجہ سے تکفیر کی جاتی ہے' مثلاً ستاروں میں الوہیت کا اعتقاد رکھا جائے یا قرآن مجید کی اہانت کی جائے یا کوئی کفریہ کلمہ کہا جائے' لیکن ساحر کی تکفیر نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو قتل بھی نہ کیا جائے' اس لیے جو شخص سحر کے ذریعہ لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے اس کو قتل کر دیا جائے گا جیسا کہ ڈاکوؤں کے ضرر پہنچانے کی وجہ سے ان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۳۱' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ساحر کافر ہے اور اس کی توبہ قبول نہیں ہے' لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

(التفسیر المنیر ج ۱ ص ۲۵۲ ۔ ۲۵۱' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۱۱ھ)

مذاہب اربعہ کا خلاصہ اور تجزیہ

امام مالک اور امام احمد کے نزدیک ساحر مطلقاً کافر ہے اور امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک ساحر مطلقاً کافر نہیں ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ امام مالک اور امام احمد کے نزدیک سحر کفریہ عقائد اور کفریہ اقوال اور افعال کے بغیر متحقق نہیں ہوتا' اس لیے وہ سحر کو مطلقاً کفر کہتے ہیں' اور امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک سحر عام ہے' یہ کفر کے بغیر بھی ہو سکتا ہے' اس لیے سحر مطلقاً کفر نہیں ہے' البتہ جس سحر میں کفر کا دخل ہو وہ ان کے نزدیک بلاشبہ کفر ہے جیسا کہ ان کی عبارات سے واضح ہے' اور اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ سحر حرام ہے اور گناہ کبیرہ ہے اور اس کا سیکھنا اور سکھانا بھی حرام ہے' البتہ بعض شافعیہ سے یہ منقول ہے کہ دفع ضرر کے لیے جادو کا سیکھنا جائز ہے' اور امام مالک' امام احمد اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کے نزدیک ساحر کو حداً قتل کرنا واجب ہے اور وہ ڈاکو کے حکم میں ہے' امام شافعی کے نزدیک ساحر کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان یہودیوں نے اس (جادو) کی پیروی کی جو شہر بابل میں ہاروت اور ماروت پر اتارا گیا تھا۔

(البقرہ: ۱۰۲)

ہاروت اور ماروت پر سحر کو نازل کرنے کی حکمت

ہاروت اور ماروت دو فرشتے ہیں' ان کے متعلق علماء اسلام میں اختلاف ہے' محققین کا یہ نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس لیے بھیجا تھا تاکہ وہ لوگوں کو جادو کی حقیقت بتائیں اور لوگوں پر یہ واضح کریں کہ لوگ جو سحر کے نام سے مختلف حیلوں اور شعبدوں سے عجیب و غریب کام کرتے ہیں وہ سحر نہیں ہے' وہ لوگوں پر جادو کی حقیقت واضح کرنے کے لیے جادو کی تعلیم دیتے تھے اور جادو پر عمل کرنے سے روکتے تھے' بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی آزمائش کے لیے سحر کو نازل کیا' جس نے سحر سیکھ کر اس پر عمل کیا وہ کافر ہو گیا' اور جس نے سحر کو نہیں سیکھا یا جادو کے ضرر سے بچنے کے لیے اور جادو کی حقیقت جاننے کے لیے اس کو سیکھا اور اس پر عمل نہیں کیا وہ اپنے ایمان پر سلامت رہا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب جادو حرام ہے اور گناہ کبیرہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے جادو سکھانے کے لیے فرشتوں کو کیوں نازل کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر اور شر ہر چیز کا خالق ہے' زہر کھانا اور کھلانا حرام ہے' کتے اور خنزیر کو کھانا حرام ہے' شراب پینا حرام ہے' چوری' قتل' زنا کرنا حرام ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان تمام چیزوں اور تمام کاموں کو پیدا کیا ہے اور انسان کو ان تمام چیزوں کے ترک کرنے اور ان سے باز رہنے کا حکم دیا ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ابتلاء اور آزمائش کے لیے فرشتوں کو

جادو کی تعلیم دینے کے لیے بھیجا تاکہ ظاہر ہو جائے کہ کون جادو پر عمل کرنے سے باز رہتا ہے اور کون جادو سیکھ کر اس پر عمل کرتا ہے۔

ہاروت اور ماروت کی معصیت کی روایت

ہاروت اور ماروت اللہ تعالیٰ کے دو مقرب فرشتے ہیں اور ان کا واقعہ صرف اسی قدر ہے جس کو ہم نے بیان کر دیا ہے' بعض روایات میں ان کے متعلق یہ مذکور ہے کہ انہوں زمین پر آ کر گناہ کیا' ان تمام روایات کو محققین علماء نے مسترد کر دیا ہے' ہم پہلے وہ روایات بیان کرتے ہیں' پھر ان کے مردود ہونے پر دلائل کو پیش کریں گے' پھر ان کے متعلق محققین کی تصریحات کو بیان کریں گے۔ فنقول و باللہ التوفیق و بہ الاستعانۃ یلیق.

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے لیے آسمان سے جھری کی' جب انہوں نے بنو آدم کو گناہوں کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا' تو انہوں نے کہا: اے رب! یہ وہ بنو آدم ہیں جن کو تو نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور اپنے فرشتوں سے ان کو سجدہ کرایا اور وہ گناہوں کا ارتکاب کر رہے ہیں! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر ان کی جگہ تم ہوتے تو تم بھی ان کی طرح عمل کرتے' انہوں نے کہا: تو سبحان ہے' ہم ایسا نہیں کر سکتے' پھر ان سے کہا گیا کہ تم دو فرشتوں کو منتخب کر لو' تو انہوں نے ہاروت اور ماروت کو منتخب کر لیا' انہیں زمین پر بھیج دیا گیا اور ان کے لیے زمین پر ہر چیز حلال کر دی گئی اور شرک' چوری' زنا' شراب نوشی اور قتل ناحق سے منع کر دیا' وہ زمین پر آ کر رہنے لگے' وہاں انہوں نے بیذخت نام کی ایک عورت دیکھی جو بہت حسین تھی' وہ اس پر فریفتہ ہو گئے' انہوں نے اس سے زنا کا ارادہ کیا' اس نے کہا: پہلے تم اللہ کے ساتھ شرک کرو' شراب پیو' قتل ناحق کرو اور اس بت کو سجدہ کرو' شروع میں انہوں نے انکار کیا لیکن جب وہ عورت اس کے بغیر راضی نہ ہوئی تو انہوں نے یہ سب کام کر لیے' اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ منظر دکھایا' فرشتوں نے کہا: تو سبحان ہے اور تجھ کو خوب علم ہے' پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان[1] بن داؤد علیہما السلام کے ذریعہ ان کو یہ پیغام دیا کہ وہ دنیا اور آخرت کے عذاب میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیں' انہوں نے دنیا کے عذاب کو اختیار کر لیا' سو ان کو بابل (دنباوند یا عراق یا کوفہ کی ایک بستی) میں عذاب دیا جا رہا ہے۔ (مجاہد نے بیان کیا کہ وہ لوہے کی زنجیروں کے ساتھ لٹکے ہوئے ہیں (ص ۳۶۵) اور ان کے ٹخنوں کو ان کی گردنوں کے ساتھ بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۳۶۳' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ فارس میں زہرہ نام کی ایک حسین عورت تھی' ہاروت اور ماروت نے اس سے اپنی خواہش پوری کرنا چاہی' اس نے کہا: مجھے وہ کلام سکھاؤ جس کو پڑھ کر میں آسمان پر چلی جاؤں' انہوں نے اس کو وہ کلام سکھایا' وہ اس کو پڑھ کر آسمان پر چلی گئی اور وہاں اس کو مسخ کر کے زہرہ ستارہ بنا دیا گیا۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۳۶۳' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

---

[1] حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام ابن اسحٰق کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہاروت اور ماروت کا قصہ حضرت نوح کے زمانہ سے پہلے کا ہے اور سحر نوح علیہ السلام سے پہلے موجود تھا' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ قوم نوح نے ان کو ساحر گمان کیا اور قوم فرعون سے پہلے سحر موجود تھا' وہ بھی حضرت سلیمان سے پہلے تھی۔ (فتح الباری ج ۱۰ ص ۲۲۳) اور طبری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کا ہے' واللہ اعلم۔ ۱۲

ھاروت اور ماروت کی معصیت کی روایت کا قرآن مجید سے بطلان

زہرہ ستارہ تو آسمان پر شروع سے موجود ہے اس لیے یہ روایت عقلاً باطل ہے اور ھاروت اور ماروت کے گناہ کا جو ذکر ہے یہ قرآن مجید کی ان آیات کے خلاف ہے جن میں فرشتوں کی عصمت کو بیان فرمایا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَّا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○ (التحریم: ۶۶)

وہ (فرشتے) اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کام کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے ○

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ○ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ○ (الانبیاء: ۲۷-۲۶)

بلکہ (سب فرشتے) ان کے مکرم بندے ہیں ○ اس (کی اجازت) سے پہلے بات نہیں کرتے اور وہ اسی کے حکم پر کاربند رہتے ہیں ○

وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○ (النحل: ۵۰-۴۹)

وہ (فرشتے) تکبر نہیں کرتے ○ اپنے اوپر اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے ○

وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ○ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ○ (الانبیاء: ۲۰-۱۹)

اور جو اس کے پاس (فرشتے) ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور نہ وہ تھکتے ہیں ○ رات اور دن اس کی تسبیح کرتے ہیں (اور ذرا) سستی نہیں کرتے ○

ھاروت اور ماروت کی معصیت کی روایت پر بحث و نظر

حافظ ابن کثیر شافعی لکھتے ہیں:

ھاروت اور ماروت کے قصہ میں بہت سے مفسرین نے لکھا ہے کہ زہرہ ایک عورت تھی' انہوں نے اس سے اپنی خواہش پوری کرنی چاہی' اس نے کہا: پہلے مجھے اسم اعظم سکھاؤ' وہ یہ اسم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی اور ستارہ بن گئی' میرا گمان ہے کہ اس قصہ کو اسرائیلیوں نے وضع کیا ہے' ہر چند کہ اس کو کعب الاحبار نے روایت کیا ہے اور ان سے متقدمین کی ایک جماعت نے بہ طور حدیث بنی اسرائیل کے نقل کیا ہے' امام احمد اور امام ابن حبان نے اس کو اپنی صحیح میں اپنی سندوں کے ساتھ حضرت ابن عمر سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور اس میں بہت طویل قصہ ہے' اور امام عبدالرزاق نے اس کو اپنی سند کے ساتھ کعب احبار سے روایت کیا ہے اور اس کی سند زیادہ صحیح ہے' امام حاکم نے "مستدرک" میں اور امام ابن ابی حاتم نے اس کو اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۳۸-۳۷' مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

نیز حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

ھاروت اور ماروت کے قصہ میں تابعین کی ایک جماعت مثلاً مجاہد' سدی' حسن بصری' قتادہ' ابوالعالیہ' زہری' ربیع بن انس' مقاتل بن حیان وغیرہم نے روایات ذکر کی ہیں اور بہت سے متقدمین اور متاخرین مفسرین نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور اس کا مرجع بنی اسرائیل ہیں' کیونکہ اس قصہ میں معصوم نبی صلی اللہ علیہ وسلم صادق اور مصدوق سے کوئی حدیث مرفوع صحیح متصل الاسناد مروی نہیں ہے' اور قرآن مجید نے ھاروت اور ماروت کا بغیر کسی تفصیل کے اجمالاً ذکر کیا ہے' سو ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو قرآن میں اللہ تعالیٰ کی مراد ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۳۸' مطبوعہ ادارہ اندلس' بیروت' ۱۳۸۵ھ)

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

یہ تمام روایات ضعیف ہیں' حضرت ابن عمر وغیرہ سے بہت بعید ہے کہ وہ ایسی روایت کریں' ان میں سے کوئی روایت صحیح

نہیں ہے' فرشتے اللہ کے سفیر اور اس کی وحی پر امین ہیں' وہ اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے' وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے' ہر چند کہ عقلاً فرشتوں سے معصیت ممکن ہے اور ان میں شہوت کا پیدا ہونا ممکن ہے اور ہر ممکن اللہ کی قدرت میں ہے' لیکن یہ ممکن بغیر کسی صحیح حدیث کے ثابت نہیں ہو سکتا اور اس قصہ میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے' اور اس کے صحیح نہ ہونے پر یہ دلیل ہے کہ جب اللہ نے سات آسمانوں کو پیدا کیا اس وقت اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں ان سات سیاروں کو پیدا کیا' زحل' مشتری' بہرام' عطارد' زہرہ' شمس اور قمر' اور اس روایت میں یہ بیان کیا ہے کہ وہ عورت زہرہ ستارہ بن گئی۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۵۲ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

قاضی ابوبکر بن العربی نے لکھا ہے کہ فرشتوں سے معصیت ممکن ہے' اور قرآن مجید کی جن آیات میں بہ طریق عموم فرشتوں کی عصمت بیان کی گئی ہے ان میں تخصیص ہو سکتی ہے کیونکہ علم اصول میں مقرر ہے کہ عام میں تخصیص ہو سکتی ہے۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۴۷ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۰۸ھ)

قاضی ابوبکر کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید کا عموم قطعی ہے' اور اس کے عموم کا ناسخ اور مخصص بھی اس کے مساوی ہونا چاہیے' اس لیے اس عموم کا مخصص یا تو قرآن مجید ہو سکتا ہے یا حدیث صحیح متواتر' اور ان روایات میں سے تو ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے چہ جائیکہ احادیث صحیحہ متواترہ ہوں۔

امام رازی لکھتے ہیں:

یہ تمام روایات فاسد' مردود اور غیر مقبول ہیں' کتاب اللہ میں ان میں سے کسی پر دلالت نہیں ہے' اور قرآن مجید میں فرشتوں کی عصمت بیان کی گئی ہے' یہ روایات اس کی مخالف ہیں' نیز ان روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ھاروت اور ماروت کو عذاب دنیا اور عذاب آخرت میں اختیار دیا گیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ تاحیات شرک کرنے والے کو بھی توبہ اور عذاب آخرت کے درمیان اختیار دیتا ہے' سو یہ روایات اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کے بھی خلاف ہیں' اور ان بعض روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ وہ حالت عذاب میں لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور جادو کی دعوت دیتے تھے اور یہ غیر معقول ہے' رہا یہ امر کہ ان فرشتوں کو کیوں نازل کیا گیا تھا؟ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں بہت جادوگر ہو گئے تھے جو جادو سے عجیب وغریب کام کرتے اور نبوت کا دعویٰ کرتے اور لوگوں کو اس کے معارضہ کا چیلنج کرتے' تب اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو جادو سکھانے کے لیے بھیجا تا کہ مومنین جھوٹے نبیوں کا جادو سے معارضہ کر سکیں۔

(تفسیر کبیر ج ۱ ص ۴۲۹ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

امام رازی کی بیان کردہ یہ وجہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جادو کا معارضہ کرنا جادو کرنے پر موقوف ہے حالانکہ لوگوں کو جادو کرنے سے وہ فرشتے منع کرتے تھے' البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ جادو کی حقیقت جاننے کے بعد لوگوں پر یہ بات کھل گئی تھی کہ جھوٹے نبی جو کچھ عجیب وغریب کام دکھا رہے ہیں یہ جادو ہے معجزہ نہیں ہے' اس لیے اس زمانہ میں جادو کا سیکھنا اور سکھانا صحیح تھا۔

علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں:

ان روایات میں سے کوئی چیز صحیح نہیں ہے' اور فرشتے معصوم ہیں' وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے' اور فرشتوں کو جادو سکھانے کے لیے اس لیے بھیجا گیا تھا کہ جس جادو سے اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور اس کے دوستوں میں تفرقہ ہو جائے وہ اس زمانہ میں مباح یا مستحب تھا۔ (البحر المحیط ج ۱ ص ۵۲۸ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

قاضی بیضاوی شافعی لکھتے ہیں:

یہ روایات یہود سے نقل کی گئی ہیں اور یہ ہو سکتا ہے کہ متقدمین کی رموز ہوں جن کا حل کرنا اہل علم پر مخفی نہیں ہے' ایک قول یہ ہے کہ ھاروت اور ماروت دو آدمی تھے جن کو ان کی غیر معمولی نیکیوں کی وجہ سے فرشتہ کہا گیا۔

(انوار التنزیل (درسی) ص ۹۶ 'مطبوعہ ایچ۔ ایم سعید اینڈ کمپنی کراچی)

علامہ شہاب الدین خفاجی لکھتے ہیں:

قاضی بیضاوی نے جو یہ کہا ہے کہ یہ رموز متقدمین ہیں' اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ فرشتہ بہ حیثیت فرشتہ گناہوں سے معصوم ہے اور جب اس کی حقیقت بدل دی جائے اور اس کو آدمی کے خواص اور اس کی قوتوں سے مرکب کر دیا جائے تو پھر اس کا گناہ کرنا قرآن مجید کی آیات کے مخالف نہیں ہے' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس قصہ میں تمثیل بیان کی گئی ہو اور ھاروت و ماروت سے مراد انسان کا بدن اور زہرہ سے مراد اس کی روح ہو' بدن نے روح کو گناہ پر ابھارا اور جب روح اس پر متنبہ ہوئی تو وہ آسمان پر چلی گئی اور اگر یہ کہا جائے کہ ھاروت اور ماروت دو آدمی تھے جن کو ان کی غیر معمولی عبادت کی وجہ سے فرشتہ کہا گیا تو پھر کوئی اشکال نہیں ہے۔ (عنایۃ القاضی ج ۲ ص ۲۱۹ 'مطبوعہ دار صادر' بیروت' ۱۲۸۳ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک وہ خوب جانتے تھے کہ جس نے اس (جادو) کو خرید لیا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے' اور کیسی بری چیز ہے وہ جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنے آپ کو فروخت کر ڈالا ہے' کاش! یہ جان لیتے O (البقرہ: ۱۰۲)

علم کے تقاضوں پر عمل نہ کرنا حکماً جہل ہے

اس آیت کے اول میں یہ فرمایا ہے کہ وہ جادو کی برائی جانتے تھے اور آخر میں فرمایا ہے کہ وہ جان لیتے' یعنی وہ نہیں جانتے اور بہ ظاہر یہ تناقض ہے کہ وہ جانتے بھی تھے اور نہیں بھی جانتے تھے' اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو جادو کی برائی کا علم تھا لیکن چونکہ وہ علم کے تقاضے پر عمل نہیں کرتے تھے اور جادو کرتے تھے اس لیے ان کے علم کو عدم علم کے قائم مقام کر کے فرمایا: کاش وہ جان لیتے' اس سے یہ معلوم ہوا کہ جو عالم علم کے مطابق عمل نہ کرے وہ بہ منزلہ جاہل ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مرضی اور مشیت کا فرق

"کاش وہ جان لیتے" اس سے یہ وہم نہ کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ وہ علم کے تقاضوں پر عمل کریں لیکن اللہ کا چاہا پورا نہیں ہوا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہر چاہا ہوا پورا ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ کی ایک مشیت ہے اور ایک مرضی ہے' اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف تو ہو سکتا ہے لیکن اس کی مشیت کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا' یہودیوں کا ایمان لانا اور ان کا جادو نہ کرنا' اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی' اس کی مشیت نہیں تھی' اللہ تعالیٰ کفر اور بدعملی پر راضی نہیں لیکن دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی مشیت سے ہوتا ہے۔ "کاش وہ جان لیتے" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جادو کرنا اور علم کے خلاف عمل کرنا اللہ کی مرضی کے خلاف تھا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا

اے ایمان والو! (اپنے رسول سے) راعنا نہ کہو انظرنا کہو اور ابتداءً (غور سے)

وَاسْمَعُوْا ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ

سنا کرو اور کافروں کے لیے درد ناک عذاب ہے O کافروں میں سے اہل کتاب اور

کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ

مشرکین یہ نہیں پسند کرتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی خیر (وحی) نازل

عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ

کی جائے اور اللہ جس کو چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص

مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

کر لیتا ہے' اور اللہ بڑے فضل والا ہے O

''راعنا'' کہنے کی ممانعت اور ''انظرنا'' کہنے کا حکم

ان آیات میں یہود کے ایک اور عناد اور حسد کو بیان فرمایا ہے' وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کرتے ہوئے ایسا لفظ استعمال کرتے تھے جس سے گستاخی کا پہلو نکلتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس لفظ کے استعمال کرنے سے منع فرما دیا۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ''راعنا'' کہتے تھے' یعنی ہماری رعایت فرمائیے اور ہماری طرف التفات اور توجہ فرمائیے' جب کوئی بات سمجھ نہ آتی تو وہ اس موقع پر کہتے تھے: ''راعنا' ہماری رعایت فرمائیں'' یہود کی لغت میں یہ لفظ بددعا کے لیے تھا' اور اس کا معنی تھا: سنو تمہاری بات نہ سنی جائے' انہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور کہنے لگے کہ پہلے ہم ان کو تنہائی میں بددعا دیتے تھے اور اب لوگوں میں اور برسر مجلس ان کو بددعا دینے کا موقع ہاتھ آ گیا ہے' تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ''راعنا'' کہتے تھے اور آپس میں ہنستے تھے' حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو یہود کی لغت کا علم تھا' انہوں نے جب ان سے یہ لفظ سنا تو انہوں نے کہا: تم پر اللہ کی لعنت ہو' اگر میں نے آئندہ تم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ لفظ کہتے ہوئے سنا تو میں تمہاری گردن اڑا دوں گا' یہود نے کہا: کیا تم لوگ یہ لفظ نہیں کہتے؟ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں سے کہا گیا (جب کوئی بات سمجھ نہ آئے تو) تم ''راعنا'' نہ کہو بلکہ ''انظرنا'' کہو (ہم پر نظر رحمت اور مہربانی فرمائیں) تاکہ یہود کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ صحیح لفظ کو غلط معنی میں استعمال کریں اور پہلے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات غور سے سن لیا کرو تاکہ یہ نوبت نہ آئے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۵۷' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

قرآن مجید میں ایک اور مقام پر بھی ''راعنا'' کہنے سے منع فرمایا ہے:

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا O (النساء: ۴۶)

بعض یہود اللہ کے کلمات کو اس کے سیاق اور سباق سے بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم نے سنا اور نافرمانی کی' (اور آپ سے کہتے ہیں:) سنیے درآں حالیکہ آپ کی بات نہ سنی گئی ہو' اور دین میں طعن کرنے کے لیے اپنی زبانوں کو موڑ کر ''راعنا'' کہتے ہیں' اور اگر وہ یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اور آپ ہماری بات سنیں اور ہم پر نظر (کرم) فرمائیں تو یہ (ان)

(ان کے حق میں) بہت اچھا اور بہت درست ہوتا' لیکن اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت فرمادی' تو صرف قلیل لوگ ایمان لائیں گے O

امام ابن جریر نے ابن زید سے روایت کیا ہے کہ وہ زبان موڑ کر "راعنا" کی جگہ "راعن" کہتے تھے اور "راعن" کے معنی خطا ہیں تو وہ اس لفظ میں تحریف کر کے آپ کو خطا کرنے والا کہتے تھے۔ (امام محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ' جامع البیان ج ۱ ص ۳۷۴' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ) سو اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمائی اور اس کا سدباب کرنے کے لیے مسلمانوں کو "راعنا" کہنے سے منع فرمادیا۔

اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر کسی صحیح کام سے کسی بڑی برائی کا راستہ نکلتا ہو تو اس بڑی برائی کے سدباب کے لیے اس صحیح کام کو بھی ترک کردیا جائے گا۔ قرآن مجید اور احادیث میں اس کی بہت نظائر ہیں' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ (الانعام: ۱۰۸)

اور تم مشرکین کے معبودوں کو برا نہ کہو ورنہ وہ عداوت اور جہالت سے اللہ کو برا کہیں گے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو آپ کی کسی زوجہ نے ذکر کیا کہ میں نے حبشہ کے ملک میں عیسائیوں کی ایک عبادت گاہ دیکھی ہے جس کا نام ماریہ ہے' حضرت ام سلمہ اور حضرت ام حبیبہ حبشہ سے آئی تھیں' انہوں نے اس عبادت گاہ کی خوبصورتی اور اس کی تصویروں کو بیان کیا' آپ نے سر اٹھا کر فرمایا: جب ان میں کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا تو وہ اس کی قبر پر ایک مسجد بنا دیتے اور اس میں یہ تصویریں بنا دیتے' یہ لوگ اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۷۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

عیسائیوں کے پہلے لوگوں نے نیک انسانوں کی تصویریں اس لیے بنائی تھیں کہ لوگ ان کی تصویروں کو دیکھ کر ان کے نیک اعمال کو یاد کریں' اور ان کی طرح نیکی کرنے کی کوشش کریں اور ان کی قبروں کے پاس اللہ کی عبادت کریں' جب کافی زمانہ گزر گیا اور بعد میں لوگوں کے عقائد اور اعمال میں فساد ظاہر ہوا اور بعد کے لوگ ان تصویروں کی غرض سے ناواقف ہو گئے' تو شیطان نے ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ تمہارے آباء واجداد ان تصویروں کی عبادت کرتے تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سدباب کے لیے تصویریں بنانے سے مطلقاً منع فرمادیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ یہود اور نصاریٰ انبیاء کی قبروں کو سجدہ کرتے تھے اور ان کی تعظیم کے لیے ان کی قبروں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور انہوں نے ان کی قبروں کو بت بنالیا تھا' اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر لعنت کی اور مسلمانوں کو اس فعل سے منع فرمایا' البتہ جو شخص کسی نیک مسلمان کے قرب میں مسجد بنائے اور اس کے قرب سے برکت حاصل کرنے کا قصد کرے اور اس قبر کی تعظیم کا قصد نہ کرے اور نہ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہے۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۵۲۵' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

اس آیت سے دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ جس لفظ میں توہین کا معنی نکلتا ہو اس لفظ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں استعمال کرنا ناجائز ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کفر ہے' ہم اس مقام پر اس مسئلہ کی تحقیق کر رہے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والے کے شرعی حکم کی تحقیق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنا بالاجماع کفر ہے اور توہین کرنے والا بالاتفاق واجب القتل ہے اور اس کی توبہ قبول کرنے میں ائمہ مذاہب کے مختلف اقوال ہیں خواہ توہین کا تعلق آپ کی ذات کے ساتھ ہو یا آپ کے نسب کے ساتھ ہو‘ آپ کے دین کے ساتھ ہو یا آپ کی کسی صفت کے ساتھ ہو اور یہ اہانت خواہ صراحۃً ہو یا کنایۃً ہو‘ تعریضاً ہو یا تلویحاً ہو‘ اسی طرح کوئی شخص آپ کو بددعا کرے‘ آپ پر لعنت کرے یا آپ کا برا چاہے‘ آپ کے عوارض بشریہ یا آپ سے متعلق اشیاء یا اشخاص کا آپ کی طرف نسبت کرتے ہوئے بطریق طعن یا مذمت ذکر کرے‘ غرض جس شخص سے کوئی ایسا کلام صادر ہو جس سے آپ کی اہانت ظاہر ہو وہ کفر ہے اور اس کا قائل واجب القتل ہے۔

قاضی عیاض لکھتے ہیں:

محمد بن سحنون نے کہا ہے کہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کرنے والا اور آپ کی تنقیص (آپ کی شان میں کمی) کرنے والا کافر ہے اور اس پر عذاب الٰہی کی وعید جاری ہے اور امت کے نزدیک اس کا حکم قتل کرنا ہے اور جو شخص اس کے کفر اور عذاب میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔ (الشفاء ج ۲ ص ۱۹۰‘ مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی‘ ملتان)

بعض فقہاء حنفیہ کا قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والے کی توبہ قبول نہیں ہوگی‘ علامہ علائی لکھتے ہیں:

جو شخص کسی نبی کو گالی دینے سے کافر ہو گیا اس کو بطور حد قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ مطلقاً قبول نہیں ہے (خواہ خود توبہ کرے یا اس کی توبہ پر گواہی ہو) اور اگر اس نے اللہ تعالیٰ کو گالی دی تو اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور نبی کو گالی دینا بندے کا حق ہے اور جو شخص اس کے عذاب اور کفر میں شک کرے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا۔

(درمختار علی الرد ج ۳ ص ۴۰۰‘ مطبوعہ مطبع عثمانیہ‘ استنبول)

علامہ شامی حنفی عدم قبول توبہ کی تشریح کرتے ہیں:

کیونکہ حد توبہ سے ساقط نہیں ہوتی اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ حکم دنیا کے ساتھ خاص ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی توبہ مقبول ہوگی اسی طرح ''البحر الرائق'' میں ہے۔ (ردالمحتار ج ۳ ص ۴۰۰‘ مطبوعہ مطبع عثمانیہ‘ استنبول)

بعض فقہاء شافعیہ کا بھی یہی قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والے کی توبہ مطلقاً قبول نہیں ہے۔ علامہ عسقلانی لکھتے ہیں:

علامہ ابن منذر نے نقل کیا ہے کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ جس شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صراحۃً گالی دی اس کو قتل کرنا واجب ہے اور ائمہ شافعیہ میں سے علامہ ابوبکر فاسی نے ''کتاب الاجماع'' میں لکھا ہے کہ جس شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قذف صریح کے ساتھ گالی دی اس کے کفر پر علماء کا اتفاق ہے‘ اگر وہ توبہ کرے گا تب بھی اس سے قتل ساقط نہیں ہوگا کیونکہ یہ حد قذف ہے اور حد قذف توبہ سے ساقط نہیں ہوتی۔ (فتح الباری ج ۱۲ ص ۲۸۱‘ مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ‘ لاہور)

احناف اور شوافع کا ایک قول یہ ہے کہ جس شخص نے رسول اللہ کو گالی دی اس کو قتل کیا جائے گا‘ خواہ اس نے توبہ کر لی ہو‘ امام مالک کی مشہور روایت اور حنابلہ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے اور جمہور احناف اور شوافع کا مذہب ہے کہ توبہ کے بعد اس کو قتل نہیں کیا جائے گا جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو گالی دی وہ کافر ہو گیا خواہ مذاق سے خواہ سنجیدگی سے اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ سے استہزاء کیا یا

اس کی ذات سے یا اس کے رسولوں سے یا اس کی کتابوں سے وہ کافر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ (التوبہ: ۶۵-۶۶)

اور اگر آپ ان سے پوچھیں تو یہ کہیں گے: ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے' آپ کہیے: کیا تم اللہ تعالیٰ اس کی آیات اور اس کے رسول کا استہزاء کر رہے تھے؟ ۝ اب عذر نہ پیش کرو کیونکہ تم ایمان لانے کے بعد یقیناً کافر ہو چکے ہو۔

(المغنی ج ۹ ص ۳۳ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

مشہور آزاد محقق شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

محمد بن سحنون فرماتے ہیں: علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والا اور آپ کی تنقیص کرنے والا کافر ہے' اس کے متعلق عذاب الٰہی کی وعید ہے اور امت کے نزدیک اس کا حکم قتل ہے اور جو شخص اس کے کفر اور اس کے عذاب میں شک کرے وہ بھی کافر ہے اور اس مسئلہ میں تحقیق یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والا کافر ہے اور اس کو بالاتفاق قتل کیا جائے گا اور یہی ائمہ اربعہ وغیرہ کا مذہب ہے' اسحاق بن راہو یہ وغیرہ نے اس اجماع کو بیان کیا ہے اور اگر گالی دینے والا ذمی ہو تو امام مالک اور اہل مدینہ کے نزدیک اس کو بھی قتل کیا جائے گا اور عنقریب ہم ان کی عبارت نقل کریں گے' اور امام احمد اور محدثین کا بھی یہی مذہب ہے' امام احمد نے متعدد مقامات پر اس بات کی تصریح کی ہے' حنبل کہتے ہیں: میں نے ابوعبداللہ (امام احمد) سے سنا وہ فرماتے تھے: جس شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی یا آپ کی تنقیص کی خواہ مسلمان ہو یا کافر اس کو قتل کرنا واجب ہے اور میری رائے یہ ہے کہ اس کو قتل کیا جائے اور اس کی توبہ نہ قبول کی جائے۔

(الصارم المسلول ص ۴ مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

قاضی عیاض مالکی لکھتے ہیں:

جان لو کہ امام مالک' ان کے اصحاب' سلف صالحین اور جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس نے گالی دی اور اس کے بعد توبہ کر لی تو اس کو بہ طور حد قتل کیا جائے گا نہ بہ طور کفر' شیخ ابوالحسن قابسی رحمہ اللہ نے فرمایا: جب کسی شخص نے آپ کو گالی دینے کا اقرار کیا اور اس کے بعد توبہ کر لی اور توبہ کا اظہار کر دیا تو اس کو گالی کے سبب سے قتل کیا جائے گا کیونکہ یہ اس کی حد ہے' ابومحمد بن ابی زید نے بھی یہی کہا ہے' البتہ اس کی توبہ اس کو آخرت میں نفع دے گی اور وہ عند اللہ مومن قرار پائے گا۔

(الشفاء ج ۲ ص ۲۲۳ - ۲۲۴ 'مطبوعہ ملتان)

علامہ شامی لکھتے ہیں:

جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی ہو اس کی توبہ قبول نہ کرنا امام مالک کا مشہور مذہب ہے' اور امام احمد بن حنبل کا مشہور مذہب بھی یہی ہے اور ایک روایت ان سے یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی' لہٰذا ان کا مذہب امام مالک کی طرح ہے' امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ اس کا حکم مرتد کی طرح ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ مرتد کی توبہ قبول کی جاتی ہے جیسا کہ نتف وغیرہ سے منقول ہے' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والے کا یہ حکم ہے تو حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما یا ان میں سے کسی ایک کو گالی دینے والے کا حکم بطریق اولیٰ یہی ہو گا کہ اس کی توبہ قبول کر لی جائے۔

بہر حال یہ بات ظاہر ہو گئی کہ احناف اور شوافع کا مذہب یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور امام مالک سے بھی یہ ایک ضعیف روایت سے ثابت ہے۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۲۹۴ - ۲۹۱ 'مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ' استنبول)

خلاصہ یہ ہے کہ امام مالک اور امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ گستاخ رسول کی (دنیاوی احکام میں) توبہ قبول نہیں ہوگی اور اس کو قتل کیا جائے گا اور ایک قول یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول کرلی جائے گی اور امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول کرلی جائے گی اور ایک قول یہ ہے کہ (دنیاوی احکام میں) اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی اور اس کو ہر حال میں قتل کیا جائے گا۔

گستاخانہ کلام میں تاویل کی گنجائش

عام طور پر مشہور یہ ہے کہ جس کلام میں ننانوے احتمال کفر کے ہوں اور ایک احتمال اسلام کا ہو اس کلام کو اسلام پر محمول کیا جائے گا اور قائل کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ علامہ علائی لکھتے ہیں:

''درر'' وغیرہ میں ہے کہ جب کسی مسئلہ میں کچھ وجوہ کفر کو واجب کرتی ہوں اور ایک وجہ کفر سے روکتی ہو تو مفتی پر واجب ہے کہ اس کو ''منع عن الکفر'' پر محمول کرے بشرطیکہ قائل کی نیت بھی وہی ہو ورنہ مفتی کے ''منع عن الکفر'' پر محمول کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ (درمختار علی الردج ۳ ص ۲۹۹ 'مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ' استنبول)

علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں:

''خلاصہ'' وغیرہ میں ہے کہ جب کسی مسئلہ میں متعدد وجوہ سے کفر لازم ہو اور ایک وجہ کفر سے روکتی ہو تو مفتی پر لازم ہے کہ اس وجہ کی طرف میلان کرے جو کفر سے روکتی ہو کیونکہ مسلمان کے ساتھ حسن ظن رکھنا چاہیے اور ''بزازیہ'' میں ہے: البتہ جب قائل خود اس احتمال کا التزام کرے جس وجہ سے تکفیر ہو تب تاویل سے فائدہ نہیں ہوگا اور ''تاتارخانیہ'' میں ہے: جس کلام میں کئی احتمال ہوں اس پر تکفیر نہیں کی جائے گی کیونکہ کفر انتہائی سزا ہے جو انتہائی جرم کا تقاضا کرتی ہے اور جب دوسرا احتمال موجود ہو تو یہ انتہائی جرم نہیں ہے۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۲۵ 'مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ' کوئٹہ)

علامہ شامی اور علامہ ابن نجیم کی ان عبارات سے واضح ہوگیا کہ جس لفظ یا جس جملہ میں متعدد احتمالات ہوں اور ان احتمالات میں سے کچھ کفریہ ہوں اور کچھ غیر کفریہ اس وقت یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مفتی کو چاہیے کہ وہ قائل کے کلام کو غیر کفریہ معنی پر محمول کرے لیکن اگر کسی کلام کے متعدد احتمالات نہ ہوں بلکہ صرف ایک معنی ہو اور وہ معنی خدانخواستہ کفریہ ہو تو اب مفتی کے لیے قائل کی تکفیر کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں۔

گستاخانہ کلام میں توہین کی نیت کی بحث

ایک بحث یہ ہے کہ کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ کلمہ بولتا ہے اور جب اس کی تکفیر کی جائے تو وہ اپنے دفاع میں کہتا ہے کہ اس کلمہ سے میری نیت یہ نہیں تھی آیا اس کا یہ جواب صحیح ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں تحقیق ہے کہ جس لفظ کے متعدد معنی ہوں اس کے متعلق قائل یہ کہہ سکتا ہے کہ میری نیت میں فلاں گستاخانہ معنی نہیں تھا بلکہ فلاں معنی ہے لیکن جس لفظ کا از روئے لغت یا عرف یا شرع کے اعتبار سے صرف ایک ہی معنی ہو اور وہ معنی خدانخواستہ گستاخانہ اور کفریہ ہو تو اب قائل کی نیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اور اس کی تکفیر کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا۔ دیکھئے ''انت طالق'' (تم کو طلاق) کا لفظ عرف اور شرع میں طلاق کے لیے معین ہے' اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ''انت طالق'' کہہ دے تو اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوجائے گی' اب اگر وہ یہ کہے کہ طالق سے میری نیت لغوی معنی تھا یعنی وہ کھلی ہوئی ہے بندھی ہوئی نہیں ہے یا میں نے یہ کلمہ یونہی کہہ دیا تھا' میری نیت اس کلمہ سے طلاق دینا نہیں تھی تو اس کی نیت کا اعتبار نہیں ہوگا کیونکہ لفظ صریح میں نیت کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ''انت امی'' (تو میری ماں کی مثل ہے) کہتا ہے تو یہ لفظ کیونکہ طلاق کے لیے

معین نہیں ہے اس میں اس کی نیت کا اعتبار ہوگا' اگر وہ طلاق کا ارادہ کرتا ہے تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر عزت اور کرامت کا ارادہ کرتا ہے تو اس معنی کا اعتبار ہوگا اور طلاق نہیں ہوگی! اسی طرح فقہاء نے لکھا ہے کہ کوئی شخص کسی کو ولد الحرام یا حرام زادہ کہتا ہے تو اس پر تعزیر لگائی جائے گی اور اگر قائل یہ کہے کہ حرام سے میری نیت ناجائز اولاد نہیں' بلکہ حرمت اور کرامت تھی یا میری نیت اس شخص کی اہانت نہیں تھی تو اس کی نیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا' کیونکہ عرف میں یہ الفاظ ناجائز اولاد کے لیے معین ہیں' اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کو غصہ میں یا کافر کہہ دے تو اس کو تعزیر لگائی جائے گی اور اگر قائل کہے کہ میری نیت کافر بالطاغوت تھی تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ عرف میں کافر' کافر باللہ کے لیے معین ہے۔ ان تصریحات کے پیش نظر جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایسا کلام کہتا ہے جو عرف میں توہین کے لیے متعین ہو تو اس کی تکفیر کی جائے گی خواہ اس نے توہین کی نیت نہ کی ہو۔ علامہ شامی لکھتے ہیں:

جو چیز توہین کی دلیل ہو اس پر تکفیر کی جائے گی خواہ اس نے توہین کی نیت نہ کی ہو۔

(ردالمحتار ج ۳ ص ۲۹۲' مطبوعہ مطبع عثمانیہ استنبول' ۱۳۲۷ھ)

ایک شخص سے کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کی قسم! تو اس نے کہا: اللہ' رسول اللہ کے ساتھ ایسا ایسا کرے اور بہت قبیح کلام ذکر کیا۔ اس سے کہا گیا کہ اے اللہ کے دشمن! تم کیا کہہ رہے ہو؟ تو اس نے اس سے بھی زیادہ شدید قبیح کلام کیا' پھر کہا کہ میں نے رسول اللہ سے بچھو کی نیت کی ہے (یعنی بچھو بھی اللہ کا بھیجا ہوا ہے) ابن ابی سلیمان نے کہا: اس کو قتل کرنے میں میں بھی تمہارے ساتھ اس کے خلاف شہادت دیتا ہوں اور اس کے ثواب میں شریک ہوں اور حبیب بن ربیع نے کہا: لفظ صریح میں تاویل کا دعویٰ قبول نہیں کیا جاتا۔ (الشفاء ج ۲ ص ۱۹۱' مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی' ملتان)

قاضی عیاض کی اس عبارت کی تشریح کرتے ہوئے ملا علی قاری[1] اور علامہ خفاجی[2] نے بھی اس بات کو مقرر رکھا ہے کہ صریح لفظ میں تاویل قبول نہیں ہوتی' اسی طرح علامہ وشتانی مالکی[3] نے بھی شرح مسلم میں کہا ہے کہ لفظ صریح تاویل کو قبول نہیں کرتا' نیز قاضی عیاض نے تصریح کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں توہین آمیز کلمات کہے جائیں تو توہین کا قصد ہو یا نہ ہو قائل کی تکفیر کی جائے گی۔ قاضی عیاض لکھتے ہیں:

جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی بات کہے اور اس کا قصد نہ گالی دینے کا ہو نہ آپ کی توہین کا اور نہ وہ اس کا اعتقاد کرتا ہو لیکن وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایسا کفریہ کلمہ کہے جس میں لعنت ہو یا گالی ہو یا آپ کی تکذیب ہو یا آپ کی طرف کسی ایسی چیز کی اضافت کرے جو ناجائز ہو یا اس چیز کی نفی کرے جو آپ کے لیے واجب ہو' یا وہ بات کہے جو آپ کے حق میں نقص ہو یا آپ کی طرف گناہ کبیرہ کی نسبت کرے یا تبلیغ رسالت میں مداہنت کی نسبت کرے یا آپ کے مرتبہ اور شرف نسب یا آپ کے علم کی عظمت اور آپ کے زہد میں کمی کرے یا آپ کے جو اوصاف مشہور اور متواتر ہیں ان کی تکذیب کرے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی نازیبا بات کہے جو از قسم گالی ہو اگرچہ اس کے حال سے یہ ظاہر ہو کہ وہ آپ کی توہین کا قصد نہیں کرتا نہ اس پر اعتقاد کرتا ہے یا اس نے جہالت کی وجہ سے کہا ہو یا رنج اور قلق کی بناء پر یا نشہ کی وجہ سے کہا ہو یا سبقت لسانی سے ایسا کہا ہو' یا یونہی بے سوچے سمجھے یا جوش غضب سے ایسا کہہ دیتا ہے تو ایسے شخص کا بلاتوقف یہ حکم ہے۔

[1] ملا علی قاری ہروی حنفی متوفی ۱۰۱۴ھ' شرح شفاء علی ہامش نسیم الریاض ج ۴ ص ۳۳۵' مطبوعہ دارالفکر' بیروت

[2] علامہ شہاب الدین خفاجی حنفی متوفی ۱۰۶۹ھ' نسیم الریاض ج ۴ ص ۳۳۵' مطبوعہ دارالفکر بیروت

[3] علامہ وشتانی مالکی متوفی ۸۲۸ھ' اکمال اکمال المعلم ج ۳ ص ۱۹۲' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت

کہ اس کو قتل کر دیا جائے کیونکہ جہالت تکفیر میں عذر نہیں ہے نہ سبقت لسانی کا دعویٰ نہ مذکور الصدر اسباب میں سے کوئی اور سبب جبکہ اس کی عقل صحیح ہو سوا اس شخص کے جس کو ان کلمات کے کہنے پر مجبور کیا گیا ہو اور اس کے دل میں ایمان ہو۔

(الشفاء ج ۲ ص ۲۰۲۔ ۲۰۳ مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی ملتان)

قاضی عیاض رحمہ اللہ کی اس عبارت سے واضح ہو گیا کہ جس شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات یا آپ کی صفات مثلاً کمال علم یا کمال قدرت کے متعلق کوئی نازیبا بات کہی خواہ اس کا قصد اور نیت' توہین نہ ہو اور نہ وہ اس کا اعتقاد رکھتا ہو بلکہ وہ آپ کے کمالات کا قائل ہو پھر بھی اس نازیبا بات کی وجہ سے وہ کافر ہو جائے گا اور اس کو قتل کرنا واجب ہے۔ ملا علی قاری حنفی [1] اور علامہ شہاب الدین خفاجی حنفی [2] نے بھی اس عبارت کو مقرر رکھا ہے۔

شیخ رشید احمد گنگوہی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

سوال نمبر ۳۴: شاعر جو اپنے اشعار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صنم یا بت یا آشوب ترک فتنہ عرب باندھتے ہیں اس کا کیا حکم ہے۔ بینوا توجروا۔

جواب: یہ الفاظ قبیح بولنے والا اگر چہ معنی حقیقیہ بہ معانی ظاہرہ خود مراد نہیں رکھتا' بلکہ معنی مجازی مقصود لیتا ہے مگر تاہم ایہام گستاخی' اہانت' واذیت ذات پاک حق تعالیٰ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خالی نہیں' یہی سبب ہے کہ حق تعالیٰ نے لفظ ''راعنا'' سے صحابہ کو منع فرمایا ''انظرنا'' کا لفظ عرض کرنا ارشاد کیا حالانکہ مقصود صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ہرگز وہ معنی کہ جو یہود مراد لیتے تھے نہ تھی' مگر ذریعہ شوخی یہود کا اور موہم اذیت و گستاخی جناب رسالت کا تھا لہٰذا حکم ہوا ''لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا'' اور علیٰ ہذا حضرات صحابہ کا پکار کر بولنا مجلس شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں بہ وجہ اذیت و گستاخی معاذ اللہ نہ تھا بلکہ حسب عادت وطبع تھا مگر چونکہ اذیت و بے اعتنائی شان والا کا اس میں ایہام تھا یہ حکم ہوا:

''یایها الذین امنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجهروا له بالقول کجهر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لاتشعرون'' کیا صاف حکم ہے کہ اگر چہ تمہارا قصد گستاخی نہیں مگر اس فعل سے حبط اعمال تمہارے ہو جاویں گے اور تم کو خبر بھی نہ ہوگی' اور ایسا ہی حدیث میں ہے: ''تکنی بکنیة ابی القاسم'' آپ کی حیات شریف میں منع ہو گئی تھی بہ وجہ اذیت ذات سرور عالم کے کہ کوئی کسی کو اگر پکارے گا تو آپ یہ سمجھ کر کہ مجھ کو ارادہ کرتا ہے التفات فرمائیں گے حالانکہ نادی ہرگز اذیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کرتا تھا اور ابن ماجہ نے روایت کیا کہ اشعث بن قیس کندی جب آئے تو انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ ہم میں سے نہیں ہیں؟ اور یہ عرض والغیب عند اللہ بایں وجہ تھی کہ سب عرب از قریش تا کندہ بنو اسماعیل ہیں' تو آپ نے فرمایا: ہمارے ماموؤں کو تہمت زنا مت لگا اور ہمارے نسب کی نفی ہمارے باپوں سے مت کر' ہم اولاد نضر ہیں' دیکھو اس لفظ میں فقط ایہام بعید کو کس قدر آپ نے نفی کر کے نہی فرمایا اور کلام کا ادب' تلقین کیا' وعلی هذا خبثت نفسی'' کو منع فرمایا اور ''لقست نفسی'' کی اجازت دی کہ وہ بہ ظاہر سخت لفظ ہے گو معنی ایک ہیں' الحاصل ان الفاظ میں گستاخی اور اذیت ظاہرہ ہے' پس ان الفاظ کا بکنا کفر ہوگا: ''ان الذین یؤذون اللہ ورسوله لعنهم اللہ فی الدنیا والاخرة واعدلهم عذابا مهینا''۔

(اس کے بعد شیخ گنگوہی نے قاضی عیاض کی عبارت پیش کی ہے جس کا ترجمہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں۔)

[1] ملا علی قاری ہروی حنفی متوفی ۱۰۱۴ھ' شرح شفاء علی ہامش نسیم الریاض ج ۴ ص ۳۸۸۔ ۳۸۷' مطبوعہ دار الفکر' بیروت

[2] علامہ شہاب الدین خفاجی حنفی متوفی ۱۰۶۹ھ' نسیم الریاض ج ۴ ص ۳۸۸۔ ۳۸۷ مطبوعہ دار الفکر بیروت

پس ان کلمات کفر کے لکھنے والے کو منع کرنا شدید چاہیے اور مقدور ہو اگر باز نہ آوے تو قتل کرنا چاہیے کہ موذی و گستاخ شان جناب کبریا تعالیٰ اور اس کے رسول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ
(فتاویٰ رشیدیہ کامل مبوب ص ۷۲۔۷۱ 'مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی)

شیخ گنگوہی نے اپنے اس طویل فتویٰ میں اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ جو کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں موجب اہانت ہو اس کا کہنے والا کافر ہے خواہ کہنے والا اس کفریہ معنی کا ارادہ نہ کرے اور نہ ہی اس کی نیت توہین کی ہو اور اس نقطہ پر استدلال کرنے کے لیے شیخ گنگوہی نے بھی قاضی عیاض کی اسی عبارت سے استدلال کیا ہے' جس کا ترجمہ ہم پیش کر چکے ہیں۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ط

جو آیت ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا جس آیت کو ہم ذہنوں سے محو کر دیتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل آیت لے آتے ہیں'

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۰۶)

(اے مخاطب!) کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے؟ O

نسخ کی تحقیق

یہود مسلمانوں سے حسد اور بغض رکھتے اور ان پر اعتراض کرنے اور دین اسلام میں طعن کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے' جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا قبلہ بدلا اور مسلمان مسجد اقصیٰ کے بجائے مسجد حرام کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے تو یہود نے کہا کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے اصحاب کو پہلے ایک حکم دیتے ہیں اور پھر اس سے منع کر دیتے ہیں' سو یہ قرآن ان ہی کا بنایا ہوا ہے' اس لیے اس کے احکام متضاد ہیں' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ ہم جس آیت کو منسوخ یا محو کرتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی دوسری آیت لے آتے ہیں۔

ہم نے اس جلد کے مقدمہ میں نسخ کا معنی' نسخ میں مذاہب' نسخ کی اقسام' آیات منسوخہ کی تعداد اور نسخ کی حکمتوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے' تاہم اس جگہ چند مزید نکات بیان کر رہے ہیں۔

نسخ کے دو معنی

لغت میں نسخ کے دو معنی ہیں' ایک معنی لکھنا اور نقل کرنا' اس اعتبار سے تمام قرآن منسوخ ہے' یعنی لوح محفوظ سے آسمان دنیا کے بیت العزت کی طرف نقل کیا گیا ہے' قرآن مجید میں نسخ کا لفظ لکھنے اور نقل کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے:

اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ O (الجاثیہ: ۲۹) بے شک ہم لکھتے رہے جو کچھ تم کرتے تھے O

نسخ کا دوسرا معنی ہے: کسی چیز کو باطل اور زائل کرنا' اور اس کی دو قسمیں ہیں:

(ا) کسی چیز کو زائل کر کے دوسری چیز کو اس کے قائم مقام کر دیا جائے جیسے عرب کہتے ہیں کہ بڑھاپے نے جوانی کو منسوخ کر دیا یعنی جوانی کے بعد بڑھاپا آ گیا' اور زیر بحث آیت میں ہے: ہم جس آیت کو منسوخ کرتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی دوسری آیت لے آتے ہیں۔ اس کی تعریف یہ ہے: دلیل شرعی سے کسی حکم شرعی کو زائل کرنا۔

(ب) کسی چیز کا قائم مقام کیے بغیر اس کو زائل کر دیا جائے' جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم اس کو محو کر دیتے ہیں یعنی ہم تمہارے

ذہنوں اور دلوں سے اس آیت کو نکال دیتے ہیں' پس وہ آیت یاد آتی ہے نہ اس کو پڑھا جاتا ہے' اس کی تائید ان روایات سے ہوتی ہے:

علامہ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام عبدالرزاق نے ''مصنف'' میں' امام طیالسی اور امام سعید بن منصور نے' امام عبداللہ بن احمد نے ''زوائد مسند'' میں' امام نسائی اور امام ابن منذر نے' اور ابن الانباری نے ''مصاحف'' میں' امام دار قطنی نے' امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ' امام ابن مردویہ نے اور امام الضیاء نے ''المختارۃ'' میں زر بن حبیش سے روایت کیا ہے کہ مجھ سے حضرت ابی بن کعب نے کہا: تم سورہ احزاب میں کتنی آیات پڑھتے ہو؟ میں نے کہا: تہتر آیات' حضرت ابی بن کعب نے کہا: مجھے یاد ہے کہ سورہ احزاب سورہ بقرہ کے برابر یا اس سے بھی بڑی تھی' اور ہم نے اس میں یہ آیت پڑھی تھی کہ جب بوڑھا مرد یا بوڑھی عورت زنا کریں تو ان کو رجم کردو' یہ اللہ کی طرف سے عبرت والی سزا ہے اور اللہ عزیز اور حکیم ہے' پھر ان میں سے جو آیتیں محو کردی گئیں وہ محو کردی گئیں۔

امام بخاری نے اپنی ''تاریخ'' میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورہ احزاب پڑھی تھی' مجھے اس کی ستر آیتیں بھلا دی گئی ہیں جن کو اب میں نہیں پاتا۔

امام ابوعبید' امام ابن الانباری اور امام ابن مردویہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سورہ احزاب میں دو سو آیتیں پڑھی جاتی تھیں اور جب حضرت عثمان نے مصاحف کو لکھا تو وہ صرف اتنی آیات لکھنے پر قادر ہوئے جواب ہیں۔ (درمنثور ج ۵ ص ۱۸۰۔۱۷۹' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

نسخ اور بداء کا فرق

یہود نے نسخ کا انکار کیا ہے اور ان کے خلاف یہ دلیل ہے کہ تورات میں مذکور ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت میں خون کے سوا ہر چیز حلال تھی' پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بہت سے حیوان حرام کردیئے اور حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہن کا بھائی سے نکاح جائز تھا' اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں اللہ نے اس کو حرام کردیا' اور پہلے حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کریں' پھر اس حکم کو منسوخ کردیا' اور پہلے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ بچھڑے کی پرستش کرنے والوں کو قتل کریں اور ستر ہزار اسرائیلیوں کے قتل کے بعد اس حکم کو منسوخ کردیا اور یہ بداء نہیں ہے' بلکہ ایک عبارت سے دوسری عبارت کی طرف اور ایک حکم سے دوسرے حکم کی طرف منتقل کرنا ہے اور اس میں کوئی مصلحت ہوتی ہے' اور کسی حکم کا اظہار ہوتا ہے' بداء اس وقت ہوتا جب حکم دینے والے کو اس حکم کے انجام کا علم نہ ہوتا اور جس کو اپنے حکم کے نتیجہ کا علم ہو اور وہ مصلحت کے تبدیل ہونے سے اپنے احکام تبدیل کرتا ہو وہ بداء نہیں ہوتا جیسے ماہر ڈاکٹر کو مریض کے احوال کا علم ہوتا ہے' اور وہ نسخہ بدل بدل کر دوائیں لکھتا ہے' اللہ تعالیٰ کے احکام اور خطابات تبدیل ہوتے ہیں اور علم اور ارادہ میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔

یہود نے نسخ اور بداء کو ایک چیز قرار دیا' اسی وجہ سے انہوں نے بداء کو ناجائز کہا' نحاس نے کہا: نسخ اور بداء میں فرق یہ ہے کہ نسخ میں عبارت کے ایک حکم کو دوسرے حکم سے بدل دیا جاتا ہے' مثلاً پہلے کوئی چیز حلال تھی' پھر اس کو حرام کردیا یا اس کے برعکس اور بداء اس کو کہتے ہیں کہ آدمی ایک کام کا ارادہ کرے' پھر اس کو ترک کردے' مثلاً ایک شخص کہے: فلاں آدمی کے پاس جاؤ' پھر اس کو خیال آئے کہ اس کے پاس نہ جانا بہتر ہے تو وہ اپنے اس قول سے رجوع کرکے کہے: وہاں مت جاؤ' اور یہ انسانوں کو عارض ہوتا ہے کیونکہ ان کا علم ناتمام ہے اور مآل کار کو محیط نہیں ہے' مثلاً کوئی شخص کہے: اس سال فلاں چیز کی کاشت کرو' پھر اس کو خیال آئے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے اور کہے: یہ کاشت نہ کرو تو یہ بداء ہے' اور اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب ہے اس کے حق

میں یہ متصور نہیں ہے۔

علماء شیعہ اللہ تعالیٰ کے حق میں بداء کے قائل ہیں' شیخ کلینی روایت کرتے ہیں:

ابو عبداللہ علیہ السلام نے اس آیت "یمحو اللّٰہ ما یشاء ویثبت" کے متعلق فرمایا: اللہ اسی چیز کو مٹاتا ہے جو ثابت تھی اور اسی چیز کو ثابت کرتا ہے جو نہیں تھی۔ (الاصول من الکافی ج ۱ ص ۱۴۶ 'مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ' تہران)

شیخ طباطبائی اس حدیث کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

بداء ان اوصاف میں سے ہے جن کے ساتھ ہمارے افعال اختیاریہ متصف ہوتے ہیں' کیونکہ ہم کسی مصلحت کے علم کی وجہ سے کسی فعل کو اختیار کرتے ہیں' پھر ہمیں کسی اور مصلحت کا علم ہوتا ہے جو پہلی مصلحت کے خلاف ہوتی ہے' پھر ہم پہلے ارادہ کے خلاف ارادہ کرتے ہیں کیونکہ جو چیز ہم سے پہلے مخفی تھی وہ اب ظاہر ہوئی ہے اور اسی کو بداء کہتے ہیں کیونکہ بداء کا معنی ظہور ہے' (الی قولہ) یہ بات معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام موجودات اور حوادث کا واقع کے مطابق علم ہے اور اس علم میں مطلقاً بداء نہیں ہے' اور اللہ تعالیٰ کا ایک علم وہ ہے جو اشیاء کے مبادی' اس کے مقتضیات اور شرائط اور اس کے موانع کے عدم کے ساتھ متعلق ہے (مثلاً فلاں چیز ہو اور فلاں چیز نہ ہو تو فلاں چیز ہو گی جیسے بارش ہو اور سیلاب نہ آئے تو فصل اچھی ہو گی) اور اس علم میں یہ ممکن ہے کہ جس چیز کا ہونا اللہ کے نزدیک ظاہر تھا وہ کسی شرط کے عدم یا کسی مانع کے وجود کی وجہ سے نہ ہو اور پھر اللہ کو معلوم ہو کہ وہ چیز نہیں ہو گی' اور اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا: "یمحو اللّٰہ مایشاء ویثبت" اس سے یہی مراد ہے۔

(حاشیہ الاصول من الکافی ج ۱ ص ۱۴۶ 'مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ' تہران)

شیخ طباطبائی نے علم کی جو دوسری قسم بیان کی ہے وہ مخلوق کا علم تو ہو سکتا ہے خالق اور عالم الغیب کی شان کے لائق یہ علم نہیں ہے' کیونکہ یہ علم نہیں ہے حقیقۃً جہل ہے' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی چیز کے ہونے کی شرط یا مانع کے عدم کا اللہ کو پہلے علم نہ ہو اور اس پر یہ چیز بعد میں ظاہر ہو اور بداء کہلائے! اور اس آیت سے مراد تقدیر معلق ہے مثلاً کسی شخص کی عمر چالیس سال لکھ دی' پھر اس نے کوئی نیکی کی یا کسی نے دعا کی تو اس کی عمر بڑھا کر پچاس سال کر دی اور چالیس سال کو مٹا دیا اور اگر نیکی نہیں کی یا کسی نے دعا نہیں کی تو چالیس سال کو برقرار رکھا' لیکن یہ اس کا علم نہیں ہے' اس کو لوح محفوظ میں اس لیے لکھا ہے کہ نیکی اور دعا کی فضیلت ظاہر ہو۔

خبر کے منسوخ ہونے یا نہ ہونے کا اختلاف

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اخبار میں نسخ واقع ہوتا ہے یا نہیں' جمہور کا موقف ہے کہ نسخ صرف اوامر اور نواہی (احکام) کے ساتھ مخصوص ہے' خبر منسوخ نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کی خبر دی ہے اگر وہ منسوخ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب لازم آئے گا اور یہ محال ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اگر خبر کسی حکم شرعی کو متضمن ہو تو اس کا منسوخ ہونا جائز ہے اور اس کی مثال یہ آیت ہے:

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۗ (النحل: ۶۷)

اور کھجور اور انگور کے بعض پھل ہیں جن سے تم سکر اور اچھا رزق بناتے ہو۔

"سکر" کا ایک معنی ہے: سرکہ اور میٹھا مشروب' اور سکر کا دوسرا معنی ہے: نشہ آور مشروب' اگر اس کا معنی سرکہ یا میٹھا مشروب ہو تو پھر اس کا نسخ سے کوئی تعلق نہیں ہے' لیکن ابن جبیر' نخعی' شعبی اور ابو ثور کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نشہ آور مشروب اور خمر ہے' اور یہ آیت مکی ہے اور خمر (انگور کی شراب) کے حرام ہونے سے پہلے نازل ہوئی ہے' یہ آیت اس حکم شرعی کو

متضمن ہے کہ خمر حلال ہے اور سورہ مائدہ میں جو مدینہ منورہ میں نازل ہوئی خمر کو حرام کر دیا گیا۔ بہر حال اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر خبر کسی حکم شرعی کو متضمن ہو تو اس پر نسخ وارد ہو سکتا ہے۔

نسخ اور تخصیص کا فرق

جب عام میں تخصیص کی جاتی ہے تو اس تخصیص پر بھی نسخ کا گمان کیا جاتا ہے' حالانکہ تخصیص نسخ نہیں ہے کیونکہ نسخ کی تعریف ہے: دلیل شرعی سے کسی حکم شرعی کا اٹھا دینا' اور تخصیص کی تعریف ہے: عام کو اس کے بعض افراد میں منحصر کر دینا' ہر چند کہ دونوں کی تعریفیں الگ الگ ہیں لیکن ان دونوں میں قوی مشابہت ہے' کیونکہ نسخ میں حکم کو بعض زمانہ کے ساتھ خاص کر دیا جاتا ہے اور تخصیص میں بعض افراد سے حکم کو ساقط کر دیا جاتا ہے' اس کے باوجود ان دونوں میں حسب ذیل وجوہ سے فرق ہے:

(۱) تخصیص کے بعد عام مجاز ہے کیونکہ عام کے لفظ کو کل افراد کے لیے وضع کیا گیا ہے اور اس کا قرینہ مخصص ہے اور یہ مجاز کی علامت ہے' اور جو نص منسوخ ہو گی وہ اسی طرح حقیقت ہے اور وہ اپنے مدلول کے لحاظ سے تمام زمانوں کو شامل ہے' البتہ ناسخ نے اس پر دلالت کی کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں وقت تک اس حکم پر عمل کرانے کا ارادہ کیا ہے۔

(۲) تخصیص سے جو افراد خارج ہو گئے وہ لفظ عام سے مراد نہیں ہوتے اور جو حکم منسوخ ہو گیا وہ اس لفظ سے مراد ہوتا ہے۔

(۳) جو نص منسوخ ہو جائے اس سے استدلال کرنا باطل ہے اور تخصیص کے بعد بھی عام اپنے باقی ماندہ افراد میں حجت ہوتا ہے۔

(۴) نسخ صرف کتاب اور سنت سے ہوتا ہے اور تخصیص حس اور عقل سے بھی ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت ھود نے قوم عاد سے فرمایا:

بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ۙ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا . (الاحقاف: ۲۵۔ ۲۴)

بلکہ یہ وہ (عذاب) ہے جس کو تم نے جلدی طلب کیا ہے ایک آندھی ہے جس میں دردناک عذاب ہے ۝ یہ آندھی ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے برباد کر دے گی۔

ہر چیز کے عموم میں زمین اور آسمان بھی شامل ہیں اور حس ان کی مخصص ہے کیونکہ اس آندھی سے زمین اور آسمان برباد نہیں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہدہد نے بلقیس کے متعلق بیان کیا:

وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ۝ (النمل: ۲۳)

اور اس کو ہر چیز دی گئی ہے اور اس کا بہت بڑا تخت ہے ۝

ظاہر ہے کہ بلقیس کے پاس ہر چیز نہیں تھی اور حس اس کی مخصص ہے کہ اس کے پاس حضرت سلیمان اور ان کے درباری نہیں تھے اور موجودہ دور کی ایجادات بلقیس کے پاس نہیں تھیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (البقرہ: ۲۰)

بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۝

اس کے عموم کی عقل مخصص ہے کیونکہ واجب اور محال اللہ کی قدرت میں نہیں ہیں یعنی اپنا شریک بنانا اور اپنے آپ کو معدوم کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں نہیں ہیں۔

(۵) جمہور کے نزدیک خبر میں نسخ نہیں ہوتا' اور تخصیص خبر میں بھی ہوتی ہے۔

نسخ اور تقیید کا فرق

بعض عبارات میں کسی خبر کو مطلق بیان کیا جاتا ہے' اور بعض دوسری عبارات میں اس خبر کی تقیید بیان کر دی جاتی ہے' اس تقیید کو بھی بعض علماء نسخ گمان کر لیتے ہیں حالانکہ یہ اطلاق اور تقیید کے باب سے ہے نسخ نہیں ہے' اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن

مجید میں ہے:

أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۚ (البقرہ: ۱۸۶) جب کوئی شخص دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔

بہ ظاہر اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم مطلق ہے اور اللہ تعالیٰ ہر دعا کرنے والے کی دعا کو ہر حال میں قبول فرماتا ہے لیکن ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے دعا کے قبول کرنے کو اپنی مشیت کے ساتھ مقید کر دیا ہے:

بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَآءَ (الانعام: ۴۱) بلکہ تم اسی سے دعا کرو تو وہ اگر چاہے تو اس مصیبت کو دور کر دے گا جس کے لیے تم اس سے دعا کرتے ہو۔

عرف اور تعامل کا بدلنا نسخ نہیں ہے

ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ احکام شرعیہ میں نسخ صرف کتاب اور سنت سے ہوتا ہے' اور فقہاء کا جو یہ قاعدہ ہے کہ زمانہ کے اختلاف سے احکام مختلف ہو جاتے ہیں اور تعامل اور عرف کے بدل جانے سے احکام بدل جاتے ہیں' اس کو نسخ نہیں کہتے' یہ مجتہدین کا اختلاف ہے' مثلاً متقدمین تعلیم قرآن' امامت' اذان' خطبہ اور تدریس کی اجرت کو ناجائز کہتے تھے' لیکن متاخرین نے اس کو جائز کہا' اسی طرح مفقود الخبر کے متعلق متقدمین پہلے امام اعظم کے قول پر یہ کہتے تھے کہ اس کی بیوی نوے سال تک انتظار کرے' پھر اس کو مردہ قرار دے کر اس کی بیوی کو نکاح ثانی کی اجازت دی جائے گی لیکن متاخرین فقہاء احناف امام مالک کے قول پر اس کو صرف چار سال تک انتظار کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اسی طرح پہلے صاع وغیرہ کے اعتبار سے خرید و فروخت ہوتی تھی اب کلوگرام کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

قرآن مجید کی آیات منسوخہ کی تعداد میں اختلاف کا منشاء

بعض متقدمین علماء نے نسخ کا بہت عام معنی مراد لیا اور مطلقاً ازالہ کو نسخ قرار دیا' ان کے نزدیک کسی تلاوت کا ازالہ بھی نسخ ہے' اور کسی حکم شرعی کا بدل جانا بھی نسخ ہے' عام کی تخصیص بھی نسخ ہے' استثناء بھی نسخ ہے' مطلق کی تقیید بھی نسخ ہے' کسی آیت میں بیان کیے گئے وصف کا ازالہ بھی نسخ ہے' اس لیے ان کے نزدیک آیات منسوخہ کی تعداد پانچ سو تک پہنچ گئی اور محققین علماء نے یہ کہا کہ نسخ صرف دلیل شرعی سے حکم شرعی کے زائل کرنے کو کہتے ہیں' اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پہلے کسی حکم کو بیان کرتے ہیں' اللہ اور اس کے رسول کے علم میں وہ حکم کسی مصلحت کی وجہ سے کسی خاص وقت کے لیے ہوتا ہے لیکن چونکہ اس حکم کے ساتھ اس مدت کو بیان نہیں کیا جاتا' اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حکم دائمی ہے' اور جب اللہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم کو زائل کر دیتے ہیں تو اس پہلے حکم کو منسوخ سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس ناسخ کے ذریعہ اللہ یا اس کا رسول اس پہلے حکم کی مدت بیان فرماتے ہیں کہ جس حکم کو تم دائمی سمجھ رہے تھے وہ دراصل اس مدت تک کے لیے تھا' خلاصہ یہ ہے کہ نسخ سابق حکم شرعی کی مدت کا بیان ہے' اور ہمارے نزدیک قرآن مجید کی صرف بارہ آیات منسوخ ہیں' ان کو ہم نے اس کتاب کے مقدمہ میں تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَمَا لَكُمْ

(اے مخاطب!) کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمینوں کا ملک اللہ ہی کے لیے ہے؟ (اے مسلمانو!) اللہ کے سوا

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ

تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں ہے O کیا تم (بھی) اپنے رسول سے

تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ

ایسے (الٹے) سوال کرنا چاہتے ہو جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے سوال کیے گئے تھے؟ اور جس نے ایمان

الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ كَثِيْرٌ

کو کفر سے بدلا وہ سیدھے راستہ سے گمراہ ہو گیا O بہت سے

مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ

اہل کتاب نے ان پر حق واضح ہو جانے کے باوجود اپنے حسد کی وجہ سے یہ چاہا

حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ

کہ کاش وہ ایمان کے بعد تم کو پھر کفر کی طرف لوٹا دیں،

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى

سو تم (ان کو) معاف کرو اور درگزر کرو حتیٰ کہ اللہ اپنا (کوئی اور) حکم صادر فرمائے بے شک اللہ ہر چیز پر

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا

قادر ہے O اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور جو

تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

نیک کام تم اپنے لیے پہلے بھیجو گے ان کو اللہ کے پاس پاؤ گے بے شک اللہ تمہارے

بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ

کاموں کو دیکھنے والا ہے O اور اہل کتاب نے کہا: جنت میں صرف

كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ

یہودی یا عیسائی جائیں گے یہ ان کی (باطل) تمنائیں ہیں، آپ کہیے: اگر تم سچے ہو

إِن كُنتُمْ صَـٰدِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُۥ لِلَّهِ وَهُوَ

تو دلیل پیش کرو O کیوں نہیں! جس نے اللہ کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیا اور وہ

مُحْسِنٌ فَلَهُۥٓ أَجْرُهُۥ عِندَ رَبِّهِۦ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا

نیکی کرنے والا بھی ہے تو اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے' اور (آخرت میں) ان کو نہ خوف ہو گا اور

هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾ ع

نہ وہ غمگین ہوں گے O

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے مخاطب!) کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمینوں کا ملک اللہ ہی کے لیے ہے؟ (البقرہ: ۱۰۷)

ربط آیات

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب نہیں ہے' بلکہ اس میں عام مخاطب یا عام مسلمانوں سے خطاب ہے' کیونکہ اس آیت کے دوسرے جز میں فرمایا ہے: اللہ کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نسخ پر دلیل قائم کی ہے کہ اللہ تعالیٰ مالک اور حاکم ہے' اور جو مالک اور حاکم ہو وہ اپنے محکوم اور مملوک لوگوں کی مصلحتوں اور ان کے احوال کی رعایتوں سے واقف ہوتا ہے' اس لیے وہ ان کی رعایتوں اور مصلحتوں کے اعتبار سے احکام بدلتا رہتا ہے' کبھی ایک مصلحت کے اعتبار سے ایک حکم نافذ کرتا ہے' اور مصلحت کے پورا ہونے کے بعد اس حکم کو منسوخ کر کے دوسرے حال کے اعتبار سے دوسرا حکم نازل کرتا ہے' دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا مالک ہے اور مالک اپنی مملوک میں جو حکم چاہے نازل کرے' اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔ ولی کا معنی ہے: قریب اور دوست' اور نصیر کا معنی ہے: مددگار' کبھی دوست مددگار ہوتا ہے اور کبھی دوست ہوتا ہے اور مددگار نہیں ہوتا اور کبھی اجنبی مدد کرتا ہے اور وہ دوست نہیں ہوتا' ان میں عام خاص من وجہ کی نسبت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا تم (بھی) اپنے رسول سے ایسے (لایعنی) سوال کرنا چاہتے ہو جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے سوال کیے گئے تھے؟ (البقرہ: ۱۰۸)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کی ممانعت کا محمل

اس آیت میں کن سائلین کی طرف خطاب متوجہ ہے؟ اس میں تین قول ہیں' ایک قول یہ ہے کہ سوال کرنے والے یہود تھے اور یہی سیاق اور سباق کے مناسب ہے' دوسرا قول ہے: یہ آیت مشرکین مکہ کے سوالوں کے رد میں ہے اور تیسرا قول ہے کہ مسلمانوں کے سوال کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی' امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رافع بن حریملہ اور وھب بن زید (یہودیوں) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہمارے پاس ایسی کتاب لے کر آئیں جو آسمان سے نازل ہو اور ہم اس کو پڑھیں' اور ہمارے لیے دریا جاری کر دیں' پھر ہم آپ کی اتباع اور تصدیق کریں گے' تب یہ آیت نازل ہوئی۔

مجاہد نے بیان کیا کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کہ وہ ان کے لیے پہاڑ صفا کو سونے کا بنا دیں۔

ابوالعالیہ نے بیان کہ ایک مسلمان شخص نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کاش ہمارے کفارات' بنو اسرائیل کے کفارات کی طرح ہوتے! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم کو جو کفارے عطا فرمائے ہیں وہ بنی اسرائیل کے کفاروں سے بہت بہتر ہیں' جب ان میں کوئی شخص گناہ کرتا تھا تو اس کے دروازہ پر وہ گناہ اور اس کا کفارہ لکھا ہوا ہوتا تھا' اگر وہ کفارہ دے دیتا تو اسے دنیا میں ذلت اٹھانی پڑتی اور اگر کفارہ نہ دیتا تو اس کے لیے آخرت میں رسوائی ہوتی' اور تمہارے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس شخص نے کوئی برائی کی یا اپنی جان پر ظلم کیا' پھر اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کو بہت بخشنے والا بڑا رحم کرنے والا پائے گا' اور فرمایا: دن کی پانچ نمازیں اور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کا وقفہ ان کے درمیان میں ہونے والے گناہوں کا کفارہ ہیں' اور جس شخص نے کسی نیکی کا قصد کیا اور اس نیکی کو نہیں کیا تو اس کی ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور اگر وہ نیکی کرے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اللہ کے غضب میں وہی ہلاک ہوتا ہے جو اپنے آپ کو کسی بڑے گناہ میں مبتلا کر لیتا ہے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۳۸۶۔ ۳۸۵' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: کیا تم (بھی) اپنے رسول سے ایسے (لایعنی) سوال کرنا چاہتے ہو جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے سوال کیے گئے تھے۔ اس آیت کے بعد فرمایا ہے: جس نے ایمان کو کفر سے بدلا یعنی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو اختیار کیا وہ سیدھے راستہ سے گمراہ ہو گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے کوئی ایسا سوال کیا تھا جو کفر تھا' یہودیوں نے ایک مکمل کتاب لانے کا مطالبہ کیا تھا اور مشرکین نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ صفا کو سونے کا بنا دیں اور نبوت پر کسی دلیل کا مطالبہ کرنا کفر نہیں ہے' لیکن ان کا یہ سوال چونکہ بہ طور عناد اور سرکشی تھا اس وجہ سے اس کو کفر فرمایا جیسے بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا تھا کہ جب تک ہم خدا کو دیکھ نہ لیں ایمان نہیں لائیں گے' امام ابن جریر نے مسلمانوں کا جو سوال نقل کیا ہے کہ ہمارے لیے بنو اسرائیل کے کفاروں کی مثل کفارے ہوں' یہ کفر نہیں ہے' امام رازی نے نقل کیا ہے کہ بعض مسلمانوں نے کہا تھا کہ ہمارے لیے بھی ایک خدا بنا دیا جائے جس پر ہم چڑھاوے چڑھائیں' تب یہ آیت نازل ہوئی اور یہ سوال کرنا یقیناً کفر ہے' تاہم زیادہ قوی قول یہ ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے متعلق نازل ہوئی ہے' سرکشی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے یا بلا ضرورت اور لایعنی سوالات کرنا ممنوع ہے لیکن کوئی مسئلہ معلوم کرنے کے لیے' یا کسی چیز کی وضاحت کے لیے سوال کرنا جائز ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاعلمی کا علاج سوال کرنا ہے' صحابہ کرام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسائل دینیہ معلوم کرتے تھے اور آپ ان کو جوابات دیتے تھے' قرآن مجید میں ہے:

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اگر تم کو علم نہ ہو تو علم والوں سے سوال کرو ۝

(النحل: ۴۳)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بہت سے اہل کتاب نے ان پر حق واضح ہو جانے کے باوجود اپنے حسد کی وجہ سے یہ چاہا کہ کاش وہ ایمان کے بعد تم کو پھر کفر کی طرف لوٹا دیں۔ (البقرہ: ۱۰۹)

امام رازی اس آیت کے شان نزول میں لکھتے ہیں:

جب مسلمان جنگ احد میں شکست کھا گئے تو فنحاص بن عاز اور زید بن قیس اور دیگر یہودی' حضرت حذیفہ بن یمان اور عمار بن یاسر کے پاس گئے اور کہا: تم نے دیکھا تم پر کیسی مصیبت آئی ہے' اگر تم حق پر ہوتے تو تم پر یہ مصیبت نہ آتی' اب تم ہمارے دین میں داخل ہو جاؤ' وہ تمہارے لیے بہتر اور افضل ہے اور ہمارا دین سیدھا راستہ ہے' حضرت عمار نے پوچھا: تمہارے ہاں عہد شکنی کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا: وہ بہت بڑا گناہ ہے! انہوں نے کہا: میں نے عہد کیا ہے کہ میں تاحیات

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کفر نہیں کروں گا' یہود نے کہا: وہ اپنا آبائی دین ترک کر چکے ہیں؟ حضرت حذیفہ نے کہا: میں اس پر راضی ہوں کہ میرا رب اللہ ہے' اسلام میرا دین ہے' قرآن میرا امام ہے' کعبہ قبلہ ہے اور سب مسلمان بھائی ہیں' پھر وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ آپ کو سنایا' آپ نے فرمایا: تم نے درست کہا' اور تم کامیاب ہو گئے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۴۳۹' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۳۹۸ھ)

حسد کی تحقیق

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہود حسد کی وجہ سے مسلمانوں کو ان کے دین سے لوٹانا چاہتے تھے' اس لیے ہم یہاں حسد کی تحقیق کریں گے' حسد کا معنی' حسد کے متعلق احادیث' حسد کے مراتب' حسد کے اسباب' اور حسد کو زائل کرنے کے طریقے بیان کریں گے۔ فنقول و باللہ التوفیق و به الاستعانة یلیق.

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

جس مستحق شخص کے پاس نعمت ہو اس سے نعمت کے زوال کی تمنا کو حسد کہتے ہیں' روایت ہے کہ مومن رشک کرتا ہے اور منافق حسد کرتا ہے' قرآن مجید میں ہے: ''من شر حاسد اذا حسد. جب حاسد حسد کریں تو میں ان کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں''۔ (المفردات ص ۱۱۸' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران' ۱۳۴۲ھ)

صاحب نعمت کے پاس نعمت دیکھ کر یہ تمنا کرنا کہ اس کے پاس یہ نعمت رہے اور ہمیں بھی اس کی مثل مل جائے یہ رشک ہے۔

حسد کے متعلق احادیث اور آثار

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ سوکھی لکڑیوں اور گھاس کو کھا جاتی ہے۔

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۳۱۶' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ (سنن ابن ماجہ ص ۳۱۰' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام نسائی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی بندے کے دل میں احسان اور حسد جمع نہیں ہوتے۔ (سنن نسائی ج ۲ ص ۴۳' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

ان دونوں حدیثوں کو امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ (شعب الایمان ج ۵ ص ۲۶۷۔ ۲۶۶' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت)

امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت حارثہ بن نعمان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں میری امت کو لازم ہیں' بدفالی' حسد اور بدگمانی' ایک شخص نے پوچھا: یا رسول اللہ جس شخص میں یہ خصلتیں ہوں وہ ان کا کس طرح تدارک کرے؟ آپ نے فرمایا: جب تم حسد کرو تو اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو' اور جب بدگمانی کرو تو اس پر جمے نہ رہو اور جب تم کسی کام کی بدفالی نکالو تو وہ کام کر گزرو۔ (معجم کبیر ج ۳ ص ۲۲۸' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت)

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

بشر بن حارث بیان کرتے ہیں کہ رشتہ داروں میں عداوت ہوتی ہے' پڑوسیوں میں حسد ہوتا ہے اور بھائیوں میں منفعت

ہوتی ہے۔ (شعب الایمان ج ۵ ص ۲۷۳ 'دارالکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۰ھ)

احنف بن قیس نے کہا: پانچ چیزیں ایسی ہیں جس طرح ان کو میں بیان کرتا ہوں' حاسد کے لئے کوئی راحت نہیں ہے' جھوٹے کی کوئی مروت نہیں ہے' حاکم کی وفا نہیں' بخیل کا کوئی حیلہ نہیں اور بد خلق کی کوئی سیاست نہیں ہے۔
(شعب الایمان ج ۵ ص ۲۷۳ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۰ھ)

امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت ضمرہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تک لوگ حسد نہیں کریں گے وہ خیریت سے رہیں گے۔ (معجم کبیر ج ۸ ص ۳۰۹ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

حافظ منذری نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔ (الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۵۴۷ 'مطبوعہ دارالحدیث' قاہرہ)

حافظ منذری بیان کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: حسد کرنے والا' چغلی کرنے والا اور کہانت[1] کرنے والا میرے طریقہ پر نہیں ہے' اور نہ میں ان کے طریقہ پر ہوں' اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پہلی امتوں کی بعض بیماریاں تم میں سرایت کر گئی ہیں' حسد اور بغض' بغض مونڈنے والا ہے' میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بالوں کو مونڈتا ہے' لیکن وہ دین کو مونڈتا ہے' اس حدیث کو امام بزار نے جید سند کے ساتھ اور امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے آپ نے فرمایا: ابھی تمہارے پاس اہل جنت میں سے ایک شخص آئے گا' پھر ایک شخص آیا جس کی ڈاڑھی سے وضوء کا پانی ٹپک رہا تھا' اور اس کے بائیں ہاتھ میں اس کی جوتیاں تھیں' دوسرے دن پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا اور پھر وہی شخص آیا' تیسرے دن پھر آپ نے یہی فرمایا اور پھر وہی شخص آیا' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تین دن اس شخص کے ساتھ رہے تاکہ اس کا وہ عمل معلوم کریں جس کی وجہ سے آپ نے اس کو تین بار جنت کی بشارت دی تھی' حضرت عبداللہ بن عمر نے دیکھا' وہ شخص رات کے قیام کے لئے نہیں اٹھتا تھا' البتہ اللہ کا نام لے کر سوتا اور صبح اللہ کا نام لے کر اٹھتا تھا' حضرت عبداللہ نے کہا: میں نے اس کی زبان سے خیر کے سوا کسی کا ذکر نہیں سنا' جب تین دن گزر گئے تو میں نے اس سے پوچھا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین مرتبہ تمہارے متعلق جنت کی بشارت سنی ہے اور میں نے تم کو کوئی غیر معمولی نیکی کرتے ہوئے نہیں دیکھا' آخر وہ کیا عمل ہے جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت دی ہے؟ اس نے کہا: بس وہی عمل ہے جو آپ نے دیکھا' جب حضرت عبداللہ جانے لگے تو اس نے آپ کو آواز دی اور کہا: وہ عمل میرے دل میں کسی مسلمان کے خلاف کینہ نہیں ہے اور جس کسی مسلمان کو اللہ نے کوئی نعمت دی ہو میں اس پر حسد نہیں کرتا۔ حضرت عبداللہ نے کہا: اسی نیکی کی وجہ سے تم اس مرتبہ کو پہنچے ہو' اس حدیث کو امام احمد نے امام بخاری کی شرط کے مطابق روایت کیا ہے اور اس کو امام مسلم' امام نسائی' امام ابویعلی اور امام بزار نے بھی روایت کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ آپ سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! سب سے افضل کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا: جو مخموم القلب اور راست گو ہو' صحابہ نے کہا: راست گو کو تو ہم جانتے ہیں مخموم القلب کا کیا معنی

---

[1] کہانت کا معنی ہے: خبریں سن کر اور اس میں اپنی طرف سے کچھ ملا کر لوگوں کو غیب کی خبریں دینا۔

ہے؟ آپ نے فرمایا: جو شخص متقی ہو' صاف دل ہو' اس نے کوئی گناہ اور سرکشی نہ کی ہو' وہ کسی سے کینہ رکھتا ہو نہ حسد رکھتا ہو' اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے سند صحیح کے ساتھ اور امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے ابدال زیادہ نمازوں' روزوں اور صدقات کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہوں گے لیکن وہ اللہ کی رحمت' نفس کی سخاوت اور (حسد اور بغض سے) سینے صاف رکھنے کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے' اس حدیث کو امام ابن ابی الدنیا نے ''کتاب الاولیاء'' میں مرسلاً روایت کیا ہے۔ (الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۵۵۱۔ ۵۴۷ ملتقطاً مطبوعہ دارالحدیث قاہرہ' ۱۴۰۷ھ)

حسد کے مراتب

حسد کے چار درجات ہیں:

(۱) کسی شخص میں کوئی نعمت دیکھ کر انسان یہ چاہے کہ خواہ اس کو وہ نعمت نہ ملے لیکن اس شخص سے زائل ہو جائے' یہ انتہائی حسد ہے۔

(۲) دوسرے شخص سے وہ نعمت زائل ہو جائے اور اس کو مل جائے۔

(۳) وہ بعینہٖ اس نعمت کی خواہش نہ کرے بلکہ یہ چاہے کہ اس کو بھی اس جیسی نعمت مل جائے اور اگر اس کو ایسی نعمت نہ ملے تو دوسرے شخص سے وہ نعمت زائل ہو جائے تاکہ دونوں میں فرق نہ رہے۔

(۴) اس کو اس جیسی نعمت مل جائے لیکن اگر اس کو نہ ملے تو دوسرے شخص سے زائل نہ ہو' دنیاوی نعمتوں میں اس قسم کی خواہش مباح اور اخروی نعمتوں میں یہ خواہش مستحسن ہے۔

کسی شخص میں دنیاوی نعمت دیکھ کر اس کی تمنا کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ (النساء: ۳۲) اور اس کی تمنا نہ کرو جس کے ساتھ اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

اور کسی شخص میں اخروی نعمت (کثرت عبادت اور تقویٰ) دیکھ کر اس کو طلب کرنے کی اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے:

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ؕ (المطففین: ۲۶) اور رغبت کرنے والوں کو اسی (نیک لوگوں) میں رغبت کرنی چاہیے O

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صرف دو شخصوں پر حسد کرنا جائز ہے' ایک اس شخص پر جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن عطا فرمایا اور وہ دن رات قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہو' سو وہ آدمی یہ تمنا کرے کہ کاش مجھے بھی قرآن دیا جاتا تو میں بھی اس کی طرح دن رات قرآن مجید کی تلاوت کرتا' دوسرے اس شخص پر جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہو اور وہ شخص حق کے راستے میں اس مال کو خرچ کرتا ہو' سو آدمی یہ تمنا کرے کہ کاش مجھے بھی مال دیا جاتا تو میں بھی اس کی طرح مال خرچ کرتا' [۱] اس حدیث میں حسد سے مراد حسد کا یہی چوتھا مرتبہ ہے۔

حسد کے اسباب

(۱) عداوت اور بغض حسد کا سبب ہے' جب انسان کسی سے عداوت رکھتا ہے تو وہ اس کو ذلیل کرنا چاہتا ہے' اگر وہ اس کو ذلیل

---

۱ امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ' صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۷۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی' ۱۳۸۱ھ

نہ کر سکے تو یہ چاہتا ہے کہ اس کے پاس جو نعمتیں ہیں وہ اس سے زائل ہو جائیں۔

(۲) تکبر بھی حسد کا سبب ہے' ایک انسان اپنے معاصروں پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا ہے' اور اس کو فوقیت ملنے کے بجائے اس کے کسی معاصر کو عزت اور بڑائی مل جاتی ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کو وہ عزت نہیں ملی تو اس کے معاصر سے بھی وہ عزت زائل ہو جائے تا کہ اگر اس کو فوقیت نہیں ملی تو اس کے معاصروں کو بھی نہ ملے۔

(۳) لوگ کسی شخص کو کم درجہ کا خیال کرتے ہوں اور اچانک اس کو کوئی منصب مل جائے تو وہ اس سے حسد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس سے یہ منصب زائل ہو جائے' مکہ کے سرداروں کے ایمان نہ لانے کا یہی سبب تھا' وہ کہتے تھے کہ ایک یتیم شخص ہم سے کیسے بڑھ گیا' ہم اس کے آگے اپنا سر کیسے جھکائیں' اللہ تعالیٰ ان کے قول کو نقل کر کے فرماتا ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ○ (الزخرف: ۳۱)

انہوں نے کہا: یہ قرآن ان دو شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اتارا گیا○

(۴) جب کئی شخص کسی ایک مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہوں اور ان میں سے کوئی ایک کامیاب ہو جائے تو باقی لوگ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔

(۵) اپنا تفرد اور تسلط چاہنا بھی حسد کا سبب ہے مثلاً کوئی شخص کسی فن میں کمال حاصل کر کے یگانہ روزگار ہو پھر اس کو معلوم ہو کہ کوئی اور شخص بھی اس کی طرح صاحب کمال ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا کمال زائل ہو جائے تا کہ اس کا تسلط و تفرد برقرار رہے۔

حسد کو زائل کرنے کا علاج

حسد کو زائل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان تقدیر پر اپنے ایمان کو مستحکم کرے اور جو نعمتیں اس کو مل گئی ہیں ان پر راضی رہے اور ان کا شکر ادا کرے اور جو نعمتیں اس کو نہیں ملیں ان پر صبر کرے اور دوسرے شخص میں ان نعمتوں کو دیکھ کر ملول نہ ہو اور ان نقصانوں پر غور کرے جو اس کو حسد کی صورت میں پیش آئیں گے:

(ا) حسد کی وجہ سے انسان اللہ کے حکم اور اس کی تقسیم کو ناپسند کرتا ہے۔

(ب) انسان جب کسی مسلمان کے پاس زیادہ نعمتیں دیکھ کر حسد کرتا ہے تو وہ اولیاء اللہ کے زمرہ سے خارج ہو کر ابلیس کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے' کیونکہ سب سے پہلے حسد کرنے والا ابلیس تھا جس نے حضرت آدم علیہ السلام پر حسد کیا تھا۔

(ج) حسد کرنے والا شخص ہمیشہ جلتا اور کڑھتا رہتا ہے اور جیسے جیسے دوسرے شخص پر زیادہ نعمتیں ہوتی ہیں اس کی جلن بڑھتی جاتی ہیں۔

(د) حسد کرنے والا شخص لوگوں کے نزدیک مذموم اور اللہ کے نزدیک ملعون ہوتا ہے۔

(ھ) حاسد ہمیشہ یہ تمنا کرتا ہے کہ جس سے وہ حسد کرتا ہے اس سے نعمت زائل ہو جائے' اگر وہ عالم ہے تو غلط مسئلہ بتائے اور پکڑا جائے یا کسی مصیبت کا شکار ہو' لوگوں میں رسوا ہو' سخت بیمار ہو یا مر جائے اور جو شخص کسی کا برا چاہتا ہے وہ خود اس برائی میں پڑ جاتا ہے۔

حسد کرنے والے کو چاہیے کہ وہ ایسے کام کرے جو حسد کے تقاضوں کے خلاف ہوں' اگر حسد کی وجہ سے وہ اس کی برائی کرنا چاہتا ہو تو اس کی تعریف کرے' اگر حسد کی وجہ سے وہ اس کے سامنے اپنی بڑائی کا اظہار کرنا چاہتا تھا تو اس کے سامنے

تواضع کرے‘ اگر وہ اس سے کسی بھلائی اور فیض کو منقطع کرنا چاہتا تھا تو اس کو خیر اور نفع پہنچائے‘ وہ اس سے جن نعمتوں کے زوال کی تمنا کرتا تھا اس کے لیے ان نعمتوں میں زیادتی کی دعا کرے۔

جب حسد کرنے والا حسد کے نقصانات پر غور کرے گا اور اس کی تلافی کیلئے محسود کا بھلا چاہے گا تو اس سے حسد زائل ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو تم (ان کو) معاف کرو اور درگزر کرو حتیٰ کہ اللہ اپنا (کوئی اور) حکم صادر فرمائے۔ (البقرہ: ۱۰۹)

کافروں اور مشرکوں کی زیادتی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا درگزر کرنا

کافروں اور مشرکوں سے جہاد کا حکم نازل ہونے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ایذا رسانیوں کو برداشت کیا کرتے تھے اور درگزر فرماتے تھے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فدک کی بنی ہوئی ایک موٹی چادر اوڑھ کر دراز گوش پر سوار ہو کو بنو خزرج کے امیر حضرت سعد بن عبادہ کی عیادت کے لئے جا رہے تھے اور حضرت اسامہ آپ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے‘ یہ جنگ بدر سے پہلے کا واقعہ ہے‘ آپ ایک مجلس کے پاس سے گزرے جس میں عبد اللہ بن ابی ابن سلول بیٹھا ہوا تھا‘ یہ اس وقت تک اسلام نہیں لایا تھا‘ اس مجلس میں مسلمانوں‘ مشرکوں‘ بت پرستوں اور یہودیوں کے بہت سے لوگ تھے اور مسلمانوں میں حضرت عبد اللہ بن رواحہ بھی تھے‘ جب اس مجلس کو آپ کی سواری کے گرد و غبار نے ڈھانپ لیا تو عبد اللہ بن ابی نے اپنی ناک پر چادر رکھ لی‘ پھر کہا: ہم پر گرد نہ ڈالو‘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں سلام کر کے توقف کیا‘ اور ان کو اللہ کی (عبادت کی) دعوت دی اور ان پر قرآن پڑھا‘ عبد اللہ بن ابی ابن سلول نے کہا: اے شخص! اس کلام سے اچھی کوئی چیز نہیں ہے‘ اگر یہ حق ہے تو تم ہمیں ہماری مجلس میں ایذا نہ دو اور اپنی سواری پر واپس چلے جاؤ‘ اور جو تمہارے پاس آئے اس کو سناؤ‘ حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے کہا: کیوں نہیں! یا رسول اللہ! آپ ہماری مجلس میں ٹھہریں‘ ہم اس کو پسند کرتے ہیں‘ پھر مسلمان‘ مشرک اور یہود ایک دوسرے کو برا کہنے لگے‘ حتیٰ کہ وہ لڑنے کے قریب ہو گئے‘ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ٹھنڈا کرتے رہے حتیٰ کہ وہ خاموش ہو گئے‘ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے‘ اور حضرت سعد بن عبادہ کے پاس پہنچے‘ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے سعد! کیا تم نے نہیں سنا کہ ابو حباب (عبد اللہ بن ابی) نے کیا کہا ہے؟ اس نے یہ یہ کہا ہے‘ حضرت سعد بن عبادہ نے کہا: یا رسول اللہ! اس کو معاف کر دیجئے اور اس سے درگزر کیجئے‘ اس ذات کی قسم جس نے آپ پر کتاب نازل کی ہے! بے شک اللہ نے آپ پر جو کتاب نازل کی ہے وہ حق ہے‘ اس شہر کے لوگوں نے اس پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ عبد اللہ بن ابی کو سرداری کا تاج پہنائیں گے اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق دے کر بھیجا اور اس کو یہ موقع نہیں دیا تو وہ غضبناک ہو گیا‘ اسی وجہ سے اس نے وہ سب کیا جو اس نے کیا اور آپ نے دیکھا‘ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو معاف کر دیا‘ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب‘ اللہ کے حکم کے بہ موجب اہل کتاب اور یہودیوں کو معاف کر دیتے تھے اور ان کی ایذاء پر صبر کرتے تھے[1]۔ اس حدیث کو امام مسلم[2] اور امام احمد[3] نے بھی روایت کیا ہے۔

---

[1] امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ‘ صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۵۶۔ ۶۵۵‘ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع‘ کراچی‘ ۱۳۸۱ھ

[2] امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ‘ صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۱۰۔ ۱۰۹‘ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع‘ کراچی‘ ۱۳۷۵ھ

[3] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ‘ مسند احمد ج ۵ ص ۲۰۳‘ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت‘ ۱۳۹۸ھ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَتُبْلَوُنَّ فِیْۤ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًى كَثِیْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ○ (آل عمران: ۱۸۶)

بے شک تمہارے مال اور جان میں ضرور تمہاری آزمائش ہوگی اور اہل کتاب اور مشرکین سے تم ضرور بہت سی دل آزار باتیں سنو گے' اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حتیٰ کہ اللہ اپنا (کوئی اور) حکم صادر فرمائے۔

عفو اور درگزر کا منسوخ ہونا

اللہ تعالیٰ نے یہود کے حسد اور ان کی ریشہ دوانیوں پر اور اسی طرح مشرکین کی ایذا رسانیوں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معاف کرنے اور درگزر کرنے کا حکم دیا اور یہ حکم دائمی نہیں تھا بلکہ ایک وقت مقرر تک کیلئے تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حتیٰ کہ اللہ اپنا (کوئی اور) حکم صادر فرمائے۔ مشرکین اور یہودیوں سے درگزر کرنے کا حکم اس وقت تک کیلئے تھا جب تک کہ اللہ تعالیٰ نے قتال کا حکم نہیں دیا تھا۔ بعد میں اللہ نے یہ حکم دیا کہ یا تو وہ اسلام قبول کریں یا مسلمانوں کے تابع ہو کر رہیں اور جزیہ دیں' علماء نے بیان کیا کہ یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے:

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ○ (التوبہ: ۲۹)

جو اہل کتاب اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہ لائیں' اور اللہ اور اس کے رسول کے حرام کئے ہوئے کو حرام نہ کہیں اور نہ دین حق کی اطاعت کریں ان سے قتال کرتے رہو حتیٰ کہ وہ مغلوب ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں ○

اس آیت میں اہل کتاب سے قتال کا حکم ہے اور درج ذیل آیت میں مشرکین سے قتال کا حکم ہے:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ، (التوبہ: ۵)

سو مشرکین کو تم جہاں پاؤ انہیں قتل کردو۔

ایک سوال یہ ہے کہ جب کافروں اور مشرکوں سے درگزر کرنے کا حکم دائمی نہیں تھا بلکہ ایک خاص وقت تک تھا تو قتال کا حکم آنے کے بعد اس پہلے حکم کو منسوخ کیوں کہا جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ اس حکم میں مدت کو بیان نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کو مبہم رکھا گیا تھا اس لئے اس کو منسوخ کہا جاتا ہے۔

شخصی معاملے میں زیادتی سے درگزر کرنا اور دین کے معاملہ میں رعایت نہ کرنا

معاف کرنے اور درگزر کرنے کیلئے اسی سے کہا جاتا ہے جو سزا دینے اور بدلہ لینے پر قادر ہو اس میں یہ اشارہ ہے کہ مسلمان تعداد میں کم ہونے کے باوجود ایمان کی طاقت سے اس قدر قوی تھے کہ وہ یہودیوں اور مشرکوں کو سزا دے سکتے تھے' لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کی وجہ سے ان کو عفو اور درگزر کا حکم دیا۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس آیت میں بنو قریظہ اور بنو نضیر سے درگزر کرنے کا حکم ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے بنو قریظہ کو قتل کرنے اور بنو نضیر کو جلاوطن کرنے کا حکم دیا۔ بعض علماء نے یہ کہا کہ اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ کس کو معاف کرو اور کس سے درگزر کرو' اس میں یہ اشارہ ہے کہ مسلمانوں کا عام حال یہ ہونا چاہیے کہ وہ تمام جاہلوں اور زیادتی کرنے والوں کو معاف کر دیں اور ان سے درگزر کر لیں' ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک طریقہ یہ تھا کہ اگر آپ کی ذات کے ساتھ کوئی شخص زیادتی کرتا تو معاف کر دیتے لیکن اگر کوئی شخص اللہ کی حرمت اور اس کے احکام کے خلاف کوئی کام کرتا تو پھر آپ کوئی رعایت نہیں کرتے تھے' امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شرم و حیا کے منافی بات نہیں کرتے تھے نہ بازاروں میں زور سے بولتے تھے اور برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ معاف کر دیتے تھے اور درگزر کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کسی زیادتی کا بدلہ لیتے ہوئے نہیں دیکھا' بہ شرطیکہ حدود اللہ کی خلاف ورزی نہ کی جائے' اور جب کوئی حدود اللہ کی خلاف ورزی کرتا تو آپ اس پر سب سے زیادہ غضب کرنے والے تھے' اور جب بھی آپ کو دو کاموں میں سے ایک کام کا اختیار دیا جاتا تو آپ ان میں سے آسان کو اختیار کرتے بہ شرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کسی کو نہیں مارا' کسی خادم کو مارا نہ کسی عورت کو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نفس کے لئے تین چیزوں کو ترک کر دیا تھا' ضد بحث کرنا' اپنے لئے بڑائی چاہنا اور غیر متعلقہ باتوں میں پڑنا' اور لوگوں کے لئے بھی تین چیزوں کو ترک کر دیا تھا' کسی کی مذمت نہیں کرتے تھے' کسی کا عیب بیان نہیں کرتے تھے' اور کسی کے عیوب کا کھوج نہیں لگاتے تھے' صرف انہی امور میں کلام فرماتے جن میں ثواب کی امید ہوتی۔ (جامع ترمذی ص ۵۹۶' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

آج ہماری زندگی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بالکل برعکس گزر رہی ہے' اللہ تعالیٰ اصلاح فرمائے اور ہمارے گناہوں کو معاف فرمائے۔

آخرت کے لئے نیکیوں کا بھیجنا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور جو نیک کام تم اپنے لئے پہلے بھیجو گے ان کو اللہ کے پاس پاؤ گے۔ (البقرہ: ۱۱۰)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

حدیث میں ہے: جب انسان مر جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس نے کیا چھوڑا اور فرشتے کہتے ہیں کہ اس نے کیا بھیجا؟

امام نسائی روایت کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ کون شخص ہے جس کو اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہے؟ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! ہم میں سے ہر شخص کو اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص اپنے مال کی بہ نسبت اپنے وارث کے مال کو ہی محبوب رکھتا ہے! تمہارا مال وہ ہے جس کو تم نے (آخرت کے لئے) بھیج دیا اور تمہارے وارث کا مال وہ ہے جس کو تم نے رکھ چھوڑا ہے[1] اس حدیث کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے اور اس میں ہے: انسان کا مال وہی ہے جو اس نے (آخرت کے لئے) بھیج دیا اور جو اس نے رکھ چھوڑا ہے وہ اس کے وارث کا مال ہے' حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بقیع الغرقد (مدینہ کا قبرستان) کے پاس سے گزرے تو انہوں نے کہا: "السلام علیکم اھل القبور!" ہمارے پاس یہ خبریں ہیں کہ تمہاری بیویوں نے دوسری شادیاں کر لیں' تمہارے مکانوں میں اور لوگ رہنے لگے اور تمہارے اموال تقسیم کر دیئے گئے' تو غیب سے ایک آواز آئی: اے ابن الخطاب! ہمارے پاس یہ خبریں ہیں کہ ہم نے آخرت کے لئے جو صدقات بھیجے تھے وہ ہم نے پا لئے اور ہم نے آخرت کے لئے جو خرچ کیا تھا' ہمیں اس کا نفع مل گیا اور ہم نے جو دنیا میں چھوڑ دیا تھا اس کا ہم نے نقصان اٹھایا۔

[1] سنن نسائی ج ۲ ص ۱۲۸' مطبوعہ نور محمد' کراچی' مسند احمد ج ۱ ص ۳۸۲' مطبوعہ بیروت

(الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۷۳ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ کون سے صدقہ کا زیادہ اجر ہے؟ آپ نے فرمایا: تم اس وقت صدقہ کرو جب تم تندرست اور بخیل (ضرورت مند) ہو تم کو تنگ دستی کا اندیشہ ہو اور تم کو غنی ہونے کی امید ہو صدقہ کرنے کو موخر نہ کرتے رہو حتیٰ کہ جب تمہاری روح حلق تک آجائے تو کہو: فلاں کو اتنا دے دو فلاں کو اتنا دے دو (اب تم کہو یا نہ کہو) فلاں فلاں کو تو اب مل ہی جائے گا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۹۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام نسائی روایت کرتے ہیں:

مطرف اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کو مال کی کثرت نے عبادت سے غافل کر دیا حتیٰ کہ تم نے قبروں کو دیکھ لیا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابن آدم کہتا رہتا ہے کہ یہ میرا مال ہے' یہ میرا مال ہے حالانکہ تمہارا مال تو صرف وہ ہے جس کو تم نے کھالیا اور فنا کر دیا یا کپڑے پہن کر بوسیدہ کر دیئے یا صدقہ کر کے آخرت کے لئے روانہ کر دیا (یعنی اس کے علاوہ جو مال ہے وہ تمہارا نہیں ہے تمہارے وارثوں کا ہے)۔

(سنن نسائی ج ۲ ص ۱۲۸ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ گھر والوں نے ایک بکری ذبح کی' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: اس میں کچھ باقی ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: اس کی صرف ایک دستی باقی ہے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ایک دستی کے سوا وہ سب باقی ہے جس کو تم نے تقسیم کر دیا۔ (جامع ترمذی ص ۳۵۵ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۶ ص ۵۰ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اہل کتاب نے کہا: جنت میں صرف یہودی یا عیسائی جائیں گے' یہ ان کی باطل تمنائیں ہیں۔ (البقرہ: ۱۱۱)

یعنی یہود نے کہا: صرف یہودی جنت میں جائیں گے اور عیسائیوں نے کہا: صرف عیسائی جنت میں جائیں گے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہیے: تم اگر سچے ہو تو اس پر دلیل لاؤ' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا: کیوں نہیں' جس نے اپنا چہرہ اللہ کے لیے جھکا دیا اور وہ نیکی کرنے والا ہے تو اس پر کوئی غم اور خوف نہیں ہے۔ تمام اعضاء میں سے صرف چہرہ کو خاص کیا ہے کیونکہ وہ اشرف الاعضاء ہے اور حواس' فکر اور تخیل کا معدن ہے' جب اللہ کے لیے چہرہ جھک جائے گا تو باقی جسم بہ طریق اولیٰ جھک جائے گا' دوسری وجہ یہ ہے کہ ذات سے چہرہ کو تعبیر کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ (القصص: ۸۸) اللہ کے چہرہ (ذات) کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔

وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝ (الرحمٰن: ۲۷) اور آپ کے رب کا چہرہ (ذات) باقی ہے جو عظمت اور بزرگی والا ہے ۝

تیسری وجہ یہ ہے کہ نماز میں افضل رکن سجدہ ہے اور وہ چہرہ زمین پر رکھنے سے ادا ہوتا ہے' اس لیے انسان کو چہرہ سے تعبیر

فرمایا۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى

اور یہود نے کہا کہ نصاریٰ کا دین کچھ نہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ

لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ

یہود کا دین کچھ نہیں' حالانکہ وہ (دونوں آسمانی) کتاب پڑھتے ہیں' اسی طرح

قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ

بے علم لوگ (مشرکین) ان کی مثل باتیں کرتے ہیں' سو اللہ قیامت کے دن ان کے درمیان

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اس چیز میں فیصلہ فرمادے گا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے O

یہود ونصاریٰ کا فرقوں میں بٹنا

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب نجران کے عیسائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہود آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان سے بحث کرنا شروع کر دی' رافع بن حریملہ یہودی نے کہا: تمہارا دین کچھ نہیں اور حضرت عیسیٰ کی نبوت کا انکار کیا اور انجیل کا کفر کیا' اور نجران کے عیسائیوں میں سے ایک شخص نے کہا: تمہارا دین کچھ نہیں اور حضرت موسیٰ کا انکار کیا اور تورات کا کفر کیا' تب یہ آیت نازل ہوئی۔

قتادہ نے کہا: متقدمین عیسائی صحیح دین پر تھے' بعد میں انہوں نے دین میں بدعتیں نکالیں اور فرقوں میں بٹ گئے' اسی طرح متقدمین یہودی صحیح دین پر تھے' بعد میں انہوں نے دین میں بدعتیں نکالیں اور مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔

اس آیت میں جن بے علم لوگوں کا ذکر ہے ان کے متعلق عطاء نے کہا کہ یہ تورات اور انجیل کے نزول سے پہلے کے لوگ ہیں اور بعض نے کہا: اس سے مراد مشرکین عرب ہیں' چونکہ یہ اہل کتاب نہیں تھے اس لیے ان کو جاہل فرمایا۔

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے اختلاف میں اپنا فیصلہ سنائے گا' اور حق باطل سے ممتاز ہو جائے گا' اہل حق ثواب پائیں گے اور اہل باطل کو عذاب ہوگا۔ (جامع البیان ج ا ص ۳۹۶۔ ۳۹۳' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

ملت اسلامیہ کا بیان اور اسلامی فرقوں کی تحقیق

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہود اکہتر یا بہتر فرقوں میں بٹ گئے' اسی طرح نصاریٰ' اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹے گی' اور حضرت ابن عمر کی روایت میں ہے: یہ سب جہنم میں جائیں گے سوائے ایک ملت کے' صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کون سی ملت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔ (جامع ترمذی ص ۳۷۹۔ ۳۷۸ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

اس حدیث کو امام ابوداؤد (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۷۵) امام ابن ماجہ (سنن ابن ماجہ ص ۲۸۷) امام احمد (مسند احمد ج ۲ ص ۳۳۲) امام دارمی (سنن دارمی ج ۲ ص ۱۵۸) امام طبرانی (المعجم الصغیر ج ۱ ص ۲۵۶) امام حاکم (المستدرک ج ۳ ص ۵۴۷) اور امام ابن عساکر (تہذیب تاریخ دمشق ج ۲ ص ۱۲۴) نے بھی روایت کیا ہے۔

حافظ الہیثمی (مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۸۹) علامہ علی متقی (کنز العمال ج ۱۱ ص ۱۱۵۔ ۱۱۴) اور علامہ زبیدی (اتحاف السادۃ المتقین ج ۸ ص ۱۴۱۔ ۱۴۰) نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔

علامہ طیبی لکھتے ہیں:

"سنن ابوداؤد" کی صحیح روایت میں ہے: عنقریب میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے، بہتر فرقے جہنم میں ہوں گے اور ایک فرقہ جنت میں ہوگا۔ (شرح الطیبی ج ۱ ص ۳۳۷ مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۳ھ)

شیخ ابن القیم الجوزیہ لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان فرقوں کو میری امت فرمایا ہے، اس میں یہ دلیل ہے کہ یہ تمام فرقے دین سے خارج نہیں ہیں، اور اس میں یہ دلیل ہے کہ جو فرقہ کسی تاویل سے کوئی نظریہ رکھے وہ ملت سے خارج نہیں ہوگا، خواہ اس نے تاویل میں خطا کی ہو۔ (تہذیب ابن القیم مع مختصر سنن ابوداؤد ج ۷ ص ۴ مطبوعہ دارالمعرفۃ، بیروت)

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

جو لوگ ضروریات دین پر متفق ہوں مثلاً حدوث عالم، حشر اجسام، اور ان کے مشابہ امور (روزمرہ کی پانچ نمازیں، ماہ رمضان کے روزے، زکوٰۃ اور حج بیت اللہ) اور اس کے ماسوا اصول میں مختلف ہوں مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفات (اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان سات صفات پر اتفاق ہے، حیات، علم، قدرت، سمع، بصر، کلام، ارادہ اور ماتریدیہ ایک زائد صفت "تخلیق" کے بھی قائل ہیں اور معتزلہ صفات کی نفی کرتے ہیں، اور حکماء کہتے ہیں کہ صفات اللہ کی ذات کا عین ہیں) اعمال کا مخلوق ہونا (معتزلہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے، اور اہل سنت کے نزدیک انسان کے اعمال کو اللہ خلق کرتا ہے) اللہ کے ارادہ کا عموم، اللہ کے کلام کا قدیم ہونا (معتزلہ کے نزدیک اللہ کا کلام حادث ہے) اللہ کے دکھائی دینے کا جواز، (معتزلہ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے) اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ ان امور میں حق صرف ایک ہی ہے، اور جو شخص اس حق کے خلاف اعتقاد رکھتا ہو آیا اس کی تکفیر کی جائے گی یا نہیں؟ اور اس بات میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ اہل قبلہ میں سے جو شخص عالم کے قدیم ہونے کا قائل ہو، حشر اجسام کو نہ مانتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے لیے جزئیات کے علم کا قائل نہ ہو اور اسی طرح کی دیگر ضروریات دین کا قائل نہ ہو خواہ وہ شخص ساری عمر عبادت کرتا رہا ہو وہ قطعاً کافر ہے، اور ہم نے جو ذکر کیا ہے کہ باقی اصول میں اختلاف کرنے والا کافر نہیں ہے، یہ امام اشعری اور دیگر اصحاب کا مذہب ہے، امام شافعی نے فرمایا: میں اہل بدعت میں سے کسی کی شہادت کو رد نہیں کرتا، ماسوا خطابیہ کے، کیونکہ وہ جھوٹ کو جائز سمجھتے ہیں، اور "منتقیٰ" میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انہوں نے اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کی، اور اسی پر اکثر فقہاء کا اعتقاد ہے (الیٰ قولہ) استاذ ابواسحٰق اسفرائنی نے کہا: جو ہماری تکفیر کرے گا ہم اس کی تکفیر کریں گے اور جو ہماری تکفیر نہیں کرے گا، ہم اس کی تکفیر نہیں کریں گے، اور امام رازی کا مختار یہ ہے کہ وہ اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے، ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر اسلام کا صحیح ہونا ان اصول میں حق کے اعتقاد پر موقوف ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفاء راشدین ایمان لانے والے سے ان چیزوں (مثلاً صفات، رویت،

خلق اعمال) پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتے اور اس کے عقائد کے متعلق تفتیش کرتے کہ ان امور کے متعلق اس کا کیا عقیدہ ہے اور ان اصول میں حق بات پر اس کو تنبیہ کرتے حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔

(شرح المقاصد ج ۵ ص ۲۲۹۔ ۲۲۸ مطبوعہ منشورات الشریف ایران ۱۴۰۵ھ)

علامہ محمد بن علی بن محمد حصکفی لکھتے ہیں:

اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کی جائے گی حتیٰ کہ خوارج کی بھی تکفیر نہیں کی جائے گی جو ہمارے قتل کو اور ہمارے مال کو مباح سمجھتے ہیں اور اصحاب رسول کو برا کہنا جائز سمجھتے ہیں اور اللہ کی صفات اور اس کے دکھائی دینے کا انکار کرتے ہیں کیونکہ ان کے یہ عقائد کسی تاویل اور شبہ پر مبنی ہیں ماسوا خطابیہ کے ان سب کی شہادت مقبول ہے اور ہمارے بعض علماء نے ان کی تکفیر کی ہے (علامہ شامی نے لکھا ہے کہ معتمد مذہب تکفیر کے خلاف ہے) اور اگر اس نے ضروریات دین میں سے کسی چیز کا انکار کیا تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔ (درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۱ ص ۳۷۷ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ)

علامہ شامی لکھتے ہیں:

علامہ ابن ہمام نے "التحریر" کے اواخر میں لکھا ہے کہ معتزلہ جو اللہ تعالیٰ کی صفات عذاب قبر شفاعت اور اللہ کے دیدار کا انکار کرتے ہیں ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ ان امور میں قرآن حدیث اور عقل سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ اہل قبلہ کی تکفیر منع ہے اور ان کی شہادت قبول کرنے پر اجماع ہے اور جو شخص بغیر دلیل کے محض ہٹ دھرمی سے کسی معصیت قطعیہ کو حلال سمجھے وہ کافر ہے برخلاف اس کے جو دلیل شرعی سے ایسا سمجھے اور بدعتی کو اس کی دلیل میں خطا لاحق ہوئی وہ ہٹ دھرمی سے ایسا نہیں کرتا۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۳۷۷ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ)

نیز علامہ شامی لکھتے ہیں:

جو شخص عناد (بغیر دلیل کے) کی وجہ سے ادلہ قطعیہ کا انکار کرے گا جن میں کوئی شبہ نہ ہو مثلاً جو شخص حشر اور حدوث عالم کا انکار کرے گا وہ قطعاً کافر ہے اور جو شخص کسی شبہ کی وجہ سے کسی عقیدہ ثابتہ کا انکار کرے جیسے معتزلی اللہ کی جلالت اور عظمت کی وجہ سے اس کے دیدار کا انکار کرتا ہے تو وہ کافر نہیں ہے کیونکہ اس کا انکار ایک شبہ پر مبنی ہے خواہ وہ شبہ فاسد ہے اور ہر وہ شخص جو ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہے اور اس کی بدعت کسی شبہ پر مبنی ہے اس کو کافر نہیں کہا جائے گا البتہ جو حشر حدوث عالم اور دیگر ضروریات دین کا انکار کرے اس کے کفر میں شک نہیں ہے۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۳۷۷ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ)

ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث میں اس امت کے تہتر فرقوں کا ذکر ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ اس سے مراد امت دعوت ہے یا امت اجابت امت دعوت سے مراد تمام دنیا کے لوگ ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی اور امت اجابت سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کر لیا اکثر علماء کی رائے یہی ہے کہ اس سے مراد امت اجابت ہے ترمذی کی روایت میں ہے صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! وہ کون سی ملت ہے؟ آپ نے فرمایا: جس (طریقہ) پر میں اور میرے صحابہ ہیں اور یہ نجات پانے والے اہل سنت و جماعت ہیں اور باقی فرقے بدعتی ہیں۔ "شرح مواقف" میں مذکور ہے کہ اصل میں کل آٹھ فرقے ہیں اور باقی ان کی فرع ہیں:

(۱) معتزلہ: یہ اس کے قائل ہیں کہ انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے یہ نیک لوگوں کے لئے ثواب اور بدکاروں کے لئے عذاب کے وجوب کے قائل ہیں اور رویت باری اور شفاعت کا انکار کرتے ہیں پھر ان کے بیس فرقے ہیں۔

(۲) شیعہ: یہ حضرت علی کی محبت میں افراط کرتے ہیں' خلفاء ثلاثہ کی خلافت کا انکار کرتے ہیں اور صحابہ کرام پر لعنت اور سب و شتم کرتے ہیں' ان کے بائیس فرقے ہیں۔

(۳) خوارج: یہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کو کافر کہتے ہیں' گناہ کبیرہ بلکہ صغیرہ کے مرتکب کو بھی کافر کہتے ہیں' ان کے بیس فرقے ہیں۔

(۴) مرجئہ: ان کے نزدیک ایمان لانے کے بعد گناہ کرنے میں کوئی حرج نہیں' ان کے پانچ فرقے ہیں۔

(۵) نجاریہ: یہ اللہ کے کلام کو حادث مانتے ہیں اور اس کی صفات کو نہیں مانتے' البتہ انسان کے افعال کو مخلوق مانتے ہیں' ان کے تین فرقے ہیں۔

(۶) جبریہ: جو انسان کو مجبور محض کہتے ہیں' ان کا ایک فرقہ ہے۔

(۷) مشبہ: یہ اللہ تعالیٰ کو جسم مانتے ہیں۔

(۸) فرقہ ناجیہ: اور یہ اہل سنت و جماعت ہیں۔

ملا علی قاری نے باطل فرقوں میں شیعہ کے علاوہ جتنے فرقے ذکر کیے ہیں یہ سب مردہ مذاہب ہیں' اب دنیا میں ان کا کوئی ماننے والا نہیں ہے' البتہ کچھ نئے مذاہب وجود میں آ گئے ہیں جیسے شیخ ابوسلیمان بن داؤد علی ظاہری متوفی ۲۷۰ھ کے پیروکار' یہ عرف میں غیر مقلدین کہلاتے ہیں' یہ ائمہ کی تقلید کو شرک کہتے ہیں اور عقائد اور افکار میں شیخ ابو العباس احمد بن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ' کے متبع ہیں خصوصاً انکار توسل میں' اور شیخ محمد بن عبد الوھاب نجدی متوفی ۱۲۰۶ھ' کے پیروکار' یہ انبیاء علیہم السلام کی حیات بعد الوفات' ان سے توسل' استمداد اور شفاعت کے قائل نہیں اور ان کے قائل کو مشرک کہتے ہیں' یہ عرف عام میں وہابیہ کہلاتے ہیں' موجودہ غیر مقلدین کے بھی یہی عقائد ہیں لیکن وہابیہ حنبلی المذہب ہیں' اور شیخ محمد قاسم نانوتوی متوفی ۱۲۹۷ھ' کے پیروکار یہ حنفی المذہب ہیں لیکن عقائد اور نظریات میں شیخ محمد بن عبد الوھاب نجدی متوفی ۱۲۰۶ھ' اور شیخ محمد اسماعیل دہلوی متوفی ۱۲۴۶ھ' کے تابع ہیں' ان کے عقائد اور نظریات کا مطالعہ ''تقویت الایمان'' اور ''صراط مستقیم'' نامی کتابوں سے کیا جا سکتا ہے' اور سید ابو الاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ' کے پیروکار' ان کے متبعین جماعت اسلامی کے نام سے موسوم ہیں' ان کے عقائد اور افکار بھی شیخ اسماعیل دہلوی کے تابع ہیں' اور عبد اللہ چکڑالوی یہ شخص مطلقاً احادیث کی حجیت کا منکر تھا' اس کے پیروکار بہت کم ہیں اور غلام احمد پرویز کے پیروکار یہ بھی مطلقاً احادیث کی حجیت کا منکر تھا' لیکن بعض احادیث سے استدلال بھی کرتا تھا' اس کے علاوہ قادیانی' بہائی' ذکری' دیندار جماعت وغیرہ بھی ہیں لیکن ہم ان کو اسلام کے فرقوں میں شمار نہیں کرتے کیونکہ انہوں نے ایک الگ نبی مان کر اپنے آپ کو امت اجابت سے نکال لیا ہے۔

اس حدیث میں ہے: ایک ملت کے سوا سب جہنم میں جائیں گے' اس کی تشریح میں ملا علی قاری لکھتے ہیں:

ان باطل فرقوں میں سے جو حد کفر کو پہنچ گئے وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور جو فرقے بدعات سیئہ کے معتقد ہیں اور انہوں نے کسی کفر کا ارتکاب نہیں کیا وہ دوزخ میں داخل ہونے کے مستحق ہیں الا یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے۔

(مرقات ج ۱ ص ۲۴۸' مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان' ۱۳۹۰ھ)

ہماری رائے یہ ہے کہ جن مسائل اعتقادیہ میں ان فرقوں کو شبہات واقع ہوئے اور انہوں نے دلائل سے اپنی رائے کو حق سمجھا' اور ان شبہات کو دور کرنے کے لئے علماء اہل سنت نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ ان تک نہیں پہنچ سکے وہ اس حکم میں داخل نہیں ہیں یا جن لوگوں تک وہ دلائل پہنچ گئے لیکن ان دلائل سے ان کا شرح صدر نہیں ہو سکا اور ہنوز ان کے شبہات باقی

رہے وہ بھی معذور ہیں لیکن جن لوگوں پر حجت تمام ہوگئی اور وہ محض کج بحثی اور ہٹ دھرمی سے اپنے باطل موقف پر ڈٹے رہے تو اگر ان کا موقف کسی کفر کو مستلزم ہے تو وہ دائماً دوزخ میں رہیں گے اور اگر ان کا موقف کسی گمراہی کو مستلزم ہے تو وہ دوزخ میں دخول کے مستحق ہیں الا یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادے، مثلاً جو شیعہ حضرت علی کی الوہیت کے معتقد ہیں یا جو وحی لانے میں حضرت جبرائیل کی خطاء کے قائل ہیں یا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر قذف (تہمت) لگاتے ہیں یا جو حضرت ابوبکر کی صحابیت کا انکار کرتے ہیں یا جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد تین یا چھ صحابہ کے علاوہ سب صحابہ مرتد ہو گئے تھے یہ سب کافر ہیں اور جو خلفاء ثلاثہ کو مفضول کہتے ہیں یا ان پر سب کرتے ہیں (گالی دیتے ہیں) وہ کافر نہیں ہیں لیکن وہ بدترین فسق اور گمراہی میں مبتلا ہیں اسی طرح جن لوگوں نے اپنی کتابوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں صریح کفریہ عبارات لکھیں وہ کافر ہیں اور جو لوگ ان عبارات پر مطلع ہو گئے اور ان پر وجہ کفر منکشف ہوگئی لیکن وہ مذہبی تعصب اور ہٹ دھرمی سے ان عبارات کو صحیح کہتے ہیں وہ بھی کافر ہیں لیکن جو لوگ ان عبارات پر مطلع نہیں ہیں یا ان پر وجہ کفر منکشف نہیں ہوئی اس لئے وہ تکفیر نہیں کرتے تاہم اس قاعدہ سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کی تکفیر پر پوری ملت اسلامیہ کا اجماع ہے جیسے مرزائیہ کا قادیانی گروپ اور لاہوری گروپ یا اور کوئی ایسا فرقہ جس کی تکفیر پر پوری ملت اسلامیہ متفق ہو اور اس کی تکفیر واضح اور غیر مشتبہ ہو[1] اور بعض اعتقادی مسائل میں شبہ کی وجہ سے اختلاف کرتے ہیں مثلاً علم غیب اور تصرف میں ذاتی اور عطائی کا فرق نہیں کرتے یا بدعت حسنہ کا انکار کرتے ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نور کا اطلاق نہیں کرتے یا استمداد اور ندائے غیر اللہ کو ناجائز کہتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کی وسعت' آپ کے معجزانہ تصرفات اور آپ کی علمی' روحانی اور بعض مواقع پر حسی نورانیت کے قائل ہیں' آپ کی حیات کے معتقد ہیں اور قبر انور پر آپ سے شفاعت طلب کرنے اور یا رسول اللہ کہنے کے معتقد ہیں' ان پر کفر کا حکم نہیں ہے' ان مسائل میں اختلاف محض فروعی ہے جیسے بعض امور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ناجائز ہیں اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہیں یا اس کے برعکس۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۳ ص ۲۵۳' مطبوعہ سنی دارالاشاعت لائل پور)

شریعت' طریقت اور حقیقت کا بیان

ملا علی قاری لکھتے ہیں:

ملت اسلامیہ کے ظاہر کو شریعت' باطن کو طریقت اور اس کے خلاصہ کو حقیقت کہتے ہیں' شریعت بدن کا حصہ ہے' طریقت قلب کا حصہ ہے اور حقیقت روح کا حصہ ہے' شریعت میں احکام کی اطاعت ہے' طریقت میں علم اور معرفت ہے اور حقیقت

---

[1] امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ان کے کفر میں شک ہی کرے تو خود کافر' جب کہ ان کے خبث اقوال پر مطلع ہو۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۳ ص ۲۵۳' مطبوعہ سنی دارالاشاعت' لائل پور)

علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ہم کسی دیوبندی یا لکھنؤ والے کو کافر نہیں کہتے' ہمارے نزدیک صرف وہی لوگ کافر ہیں جنہوں نے معاذ اللہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم و محبوبان ایزدی کی شان میں صریح گستاخیاں کیں اور باوجود تنبیہ شدید کے انہوں نے گستاخیوں سے توبہ نہیں کی' نیز وہ لوگ جو ان کی گستاخیوں کو حق سمجھتے ہیں اور گستاخیاں کرنے والوں کو اہل حق' مومن' اپنا مقتداء اور پیشوا مانتے ہیں اور بس! ان کے علاوہ ہم نے کسی مدعی اسلام کی تکفیر نہیں کی' ایسے لوگ جن کی ہم نے تکفیر کی ہے اگر ان کو ٹٹولا جائے تو وہ بہت قلیل اور معدود افراد ہیں' ان کے علاوہ نہ کوئی دیوبند کا رہنے والا کافر ہے نہ بریلی' نہ ندوی' ہم سب مسلمانوں کو مسلمان سمجھتے ہیں۔

(مقالات کاظمی ج ۲ ص ۲۵۹۔ ۲۵۸)

میں مشاہدہ ربوبیت ہے' اگر شریعت' حقیقت سے مؤید نہ ہو تو وہ غیر مقبول ہے' اور اگر حقیقت شریعت سے مقید نہ ہو تو وہ غیر معتبر ہے' شریعت احکام کی اطاعت ہے اور حقیقت قضاء وقدر کا مشاہدہ ہے۔ (المرقات ج ۱ ص ۲۴۸ 'مطبوعہ مکتبہ امدادیہ' ملتان' ۱۳۹۰ھ)

ایک قول یہ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال شریعت ہیں' آپ کے افعال طریقت ہیں اور آپ کے احوال حقیقت ہیں' اور تحقیق یہ ہے کہ تمام فرائض' واجبات' سنن اور مستحبات پر عمل کرنا' اور تمام محرمات اور مکروہات سے بچنا شریعت ہے' اور شیخ طریقت نے جو اوراد اور وظائف بتائے اور سلوک کے لئے جو ہدایات دیں ان پر عمل کرنا طریقت ہے اور جب دل تجلیات الٰہیہ کے لئے آئینہ ہو جائے اور نیند اور بیداری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رابطہ ہو جائے تو یہ حقیقت ہے' بعض علماء نے کہا ہے کہ جسم کے اعضاء کو گناہوں سے روکنا شریعت ہے اور دل کو گناہوں کی خواہشوں اور ذہن کو اس کے تصورات سے روکنا طریقت ہے اور جب یہ حالت ہو کہ بغیر کسی کوشش اور کسب کے دل و دماغ میں گناہ کی خواہش اور تصورات نہ آئیں تو یہ حقیقت ہے اور یہ بہت عمدہ قول ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَ

اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہے جو اللہ کی مساجد میں اس کے نام کے ذکر سے منع کرے اور

سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ

ان کو ویران کرنے کی کوشش کرے' یہ لوگ بغیر خوف کے مسجدوں میں داخل ہونے کے لائق نہیں'

اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ

ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا

عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ

عذاب ہے ○ اور مشرق اور مغرب اللہ ہی کے لیے ہیں' تم جہاں کہیں بھی منہ کرو گے

اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

وہیں اللہ کی طرف منہ کرو گے' بے شک اللہ بڑی وسعت والا' بہت علم والا ہے ○

آیت مذکورہ کے شان نزول کی تحقیق

اس آیت کے شان نزول میں دو قول ہیں' راجح قول یہ ہے:

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: مجاہد نے بیان کیا ہے کہ اس سے مراد نصاریٰ ہیں جو بیت المقدس میں گندگی پھینکتے تھے اور لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے سے منع کرتے تھے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد اللہ کے دشمن نصاریٰ ہیں جنہوں نے یہود کے بغض کی وجہ سے بخت نصر بابلی مجوسی کی بیت المقدس کو ویران کرنے میں مدد کی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد مشرکین ہیں' ابن زید نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کرنے کے قصد سے (چودہ سو اصحاب کے

ساتھ) مکہ مکرمہ روانہ ہوئے تو حدیبیہ کے مقام پر مشرکین نے آپ کو روک لیا اور عمرہ کرنے کے لئے مسجد حرام میں جانے نہیں دیا اور انہوں نے کہا: جن لوگوں نے ہمارے آباء و اجداد کو جنگ بدر میں قتل کیا تھا ہم ان کو مسجد حرام میں حج اور عمرہ کیلئے نہیں جانے دیں گے' تب یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے نام کے ذکر سے روکنے والوں سے بڑھ کر اور کون ظالم ہوگا' کیونکہ حج اور عمرہ سے روکنا' مسجد حرام میں اللہ کے ذکر سے روکنا اور اس کو ویران کرنا ہے' علامہ ابن جریر نے کہا ہے کہ اس آیت کے شان نزول میں پہلا قول راجح ہے کہ نصاریٰ نے بخت نصر کی مدد سے بنو اسرائیل کے مومنوں کو بیت المقدس میں نماز پڑھنے سے منع کر دیا تھا' اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس آیت کے سیاق اور سباق میں یہود اور نصاریٰ کے برے افعال کا بیان کیا جا رہا ہے' مشرکین کی برائیوں کا بیان نہیں ہے' دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر چند کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوم حدیبیہ میں عمرہ کرنے سے روکا تھا' لیکن ان کا مقصد مسجد حرام کو ویران اور برباد کرنا نہیں تھا' بلکہ مسجد حرام کی تعمیر کرنے والے اور اس پر فخر کرنے والے تھے' اس لئے آیت کا روئے سخن بخت نصر مجوسی کی طرف ہی متوجہ ہے جو بیت المقدس کو ویران اور برباد کرنے کے لئے اس میں گندگی اور مردار ڈال دیتا تھا اور بنو اسرائیل کے مومنوں کو اس میں نماز پڑھنے سے منع کرتا تھا' اور یہودیوں سے بغض کی وجہ سے نصاریٰ اس کے شریک تھے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۳۹۸۔ ۳۹۶ ملخصاً مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

ذکر بالجہر کی تحقیق

اس آیت میں یہ دلیل بھی ہے کہ مسجدوں میں جہر متوسط کے ساتھ ذکر کرنا جائز ہے' البتہ اس قدر گلا پھاڑ کر چلانا نہیں چاہیے جو مسجد کے احترام اور وقار کے بھی خلاف ہے اور اس سے دوسرے نمازیوں کی عبادت میں بھی خلل پڑتا ہے' اور ان کا ذہن الجھتا ہے' مسجد میں فرض نماز کے بعد ذکر بالجہر کے مشروع اور مسنون ہونے پر یہ دلیل ہے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ فرض نماز سے فارغ ہونے کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں معروف تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب اللہ اکبر کی آواز آتی تو میں جان لیتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو گئے ہیں۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۱۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

ابو الزبیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن الزبیر ہر نماز کے سلام پھیرنے کے بعد کہتے تھے: لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ (الی قولہ) اور حضرت ابن الزبیر بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر نماز کے بعد لا الہ الا اللہ آخر تک پڑھتے تھے[1]۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر کا یہ کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد لا الہ الا اللہ آخر تک پڑھتے تھے اس پر محمول ہے کہ آپ یہ ذکر بلند آواز کے ساتھ کرتے تھے' جب ہی حضرت ابن الزبیر نے اس ذکر کو سنا اور یاد کر لیا' اگر آپ یہ ذکر آہستہ کرتے تو حضرت ابن الزبیر کیسے سنتے' اس وجہ سے امام ولی الدین تبریزی متوفی ۷۴۲ھ نے ''مشکوٰۃ'' میں اس حدیث کے الفاظ ''یقول بصوته الاعلیٰ. آپ بلند آواز سے ذکر فرماتے تھے'' لکھا ہے (مشکوٰۃ ص ۸۸) جب کہ ''صحیح مسلم'' میں یہ الفاظ نہیں ہیں لیکن حضرت ابن الزبیر کا ان الفاظ کو سننا اس وقت متصور ہو سکتا ہے جب آپ بلند آواز سے ذکر فرمائیں' اس لحاظ سے اس کو روایت بالمعنی کہا جا سکتا ہے لیکن یہ امام تبریزی کا وہم نہیں ہے جیسا کہ ''حکم الذکر بالجہر'' کے مولف کو وہم ہوا ہے۔

---

[1] امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۱۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ

ہم نے لکھا ہے کہ متوسط جہر کے ساتھ ذکر کرنا صحیح ہے' اور گلا پھاڑ کر اور چلا کر ذکر کرنا جس سے نمازیوں کی عبادت میں خلل ہو مکروہ ہے' اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو موسیٰ عبد اللہ بن قیس الاشعری المتوفی ۵۰ ھ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ خیبر سے نکلے تو لوگ ایک میدان میں پہنچے اور انہوں نے بلند آواز سے اللہ اکبر اللہ اکبر کہنا شروع کر دیا' اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی جانوں پر نرمی کرو' بے شک تم بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے' تم اس کو پکار رہے ہو جو سننے والا اور قریب ہے' اور وہ تمہارے ساتھ ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۰۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ خیر الدین رملی نے لکھا ہے: اس حدیث میں اس جہر سے منع فرمایا ہے جو بہت شدید اور مضر ہو۔
(فتاویٰ خیریہ علی هامش الحامدیہ ج ۲ ص ۲۸۲' مطبوعہ مکتبہ حبیبیہ' کوئٹہ)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

بعض احادیث سے ذکر بالجہر کی تائید ہوتی ہے اور بعض سے ذکر خفی کی' ان میں تطبیق اس طرح ہے کہ یہ اشخاص اور احوال کے اختلاف پر محمول ہیں اور جس حدیث میں ہے کہ سب سے بہتر ذکر خفی ہے وہ اس کے معارض نہیں ہے' کیونکہ ذکر خفی اس وقت بہتر ہے جب جہر سے ریا کا خدشہ ہو یا کسی کی نیند یا عبادت میں خلل کا اندیشہ ہو اور جب یہ موانع نہ ہوں تو بعض علماء نے کہا کہ جہر افضل ہے کیونکہ اس کا نفع سننے والوں تک پہنچتا ہے اور اس کے قلب کو بیدار کرتا ہے' اس کو غور و فکر کا موقع ملتا ہے' اس کی نیند دور ہوتی ہے اور اس کی فرحت زیادہ ہوتی ہے' اور علامہ حموی نے امام شعرانی سے نقل کیا ہے کہ تمام اگلے اور پچھلے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مساجد وغیرہ میں جماعت کے ساتھ ذکر بالجہر مستحب ہے ماسوا اس کے جب ان کے جہر سے سونے والے یا نماز پڑھنے والے یا قرآن پڑھنے والے کو تشویش اور خلل ہو۔
(ردالمحتار ج ۱ ص ۴۴۴' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اس بحث کو زیادہ تفصیل سے جاننے کے لئے ہمارا رسالہ ''ذکر بالجہر'' ملاحظہ فرمائیں۔

مسجد میں کافر کے دخول کے متعلق مذاہب ائمہ

اس آیت میں ہے: یہ لوگ بغیر خوف کے مسجدوں میں داخل ہونے کے لائق نہیں۔

علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

مسجد میں مشرک کے دخول کے متعلق کئی مذاہب ہیں' فقہاء احناف کے نزدیک مسجد میں مشرک کا دخول مطلقاً جائز ہے' امام مالک کے نزدیک مطلقاً منع ہے اور امام شافعی کے نزدیک مسجد حرام میں مشرک کا داخلہ منع ہے اور باقی مساجد میں جائز ہے۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۵۶۰' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

مسجد حرام میں ذمیوں کا داخلہ کسی صورت میں جائز نہیں اور غیر حرم کی مساجد کے متعلق دو روایتیں ہیں' ایک روایت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اجازت کے بغیر ان کا مساجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے اور دوسری روایت یہ ہے کہ کسی صورت میں بھی کافروں کا مسجد میں دخول جائز نہیں ہے۔ (المغنی ج ۹ ص ۲۸۷۔ ۲۸۶' ملخصا' مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

حرم اور غیر حرم کسی مسجد میں بھی کافروں کا داخل ہونا جائز نہیں ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۰۴ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ)

علامہ محمد حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

فقہاء احناف نے مساجد میں مشرکین کے گزرنے کو جائز کہا ہے خواہ وہ جنبی ہوں۔

(درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۵ ص ۲۴۸ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

اس بحث کو تفصیل کے ساتھ ان شاء اللہ ہم سورہ توبہ کی تفسیر میں لکھیں گے اور ''شرح صحیح مسلم'' جلد ثانی اور جلد سابع میں ہم نے اس بحث کو تفصیل سے ذکر کیا ہے' فقہاء کے دلائل اور مذہب احناف کی ترجیح کو جاننے کے لئے اس کا مطالعہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور مشرق اور مغرب اللہ ہی کے لئے ہیں' تم جہاں کہیں بھی منہ کرو گے وہیں اللہ کی طرف منہ کرو گے۔ الآیہ (البقرہ: ۱۱۵)

''وللّٰہ المشرق والمغرب'' کے شان نزول کا بیان

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ سب سے پہلے جس چیز کو قرآن مجید نے منسوخ کیا وہ قبلہ ہے' اور اس کا بیان یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو مدینہ میں زیادہ تر یہودی تھے' اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا' یہود اس سے بہت خوش ہوئے' آپ سولہ مہینے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ آپ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں' آپ اس کی دعا کر رہے تھے اور مسجد حرام کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: (ترجمہ) ''بے شک ہم آسمان کی طرف آپ کے چہرہ کے پھرنے کو دیکھ رہے ہیں (الی قولہ) تم اپنے چہروں کو مسجد حرام کی طرف پھیر لو'' اس وقت یہود نے یہ اعتراض کیا کہ ان کو ان کے پہلے قبلہ کی طرف سے کس نے پھیر دیا؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

اور مشرق اور مغرب اللہ ہی کے لیے ہیں' تم جہاں کہیں بھی منہ کرو گے وہیں اللہ کی طرف منہ کرو گے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۴۰۰ - ۳۹۹ مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اس آیت کے شان نزول میں دوسرا قول یہ ہے:

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سفر میں جس طرف سواری کا منہ ہوتا اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لیتے اور وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: تم جہاں کہیں بھی منہ کرو گے وہیں اللہ کی طرف منہ کرو گے' اور حضرت ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر نفل پڑھتے' جس طرف سواری کا منہ ہوتا تھا اور اشارہ سے رکوع اور سجدہ فرماتے تھے۔

حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے تھے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے' وہ سخت سیاہ اندھیری رات تھی' ہم ایک جگہ ٹھہرے' اور ہر شخص نے اپنی اپنی سجدہ گاہ کی طرف پتھر رکھے اور نماز پڑھی' صبح کو معلوم ہوا کہ سب نے غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے' ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم نے اس رات غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: مشرق اور مغرب اللہ ہی کے لئے ہیں' تم جہاں کہیں بھی منہ کرو گے وہیں اللہ ہی کی طرف منہ کرو گے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۴۰۱ ـ ۴۰۰ 'مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

چلتی ہوئی ٹرین میں فرض نماز پڑھنے کا جواز

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ سفر میں سواری پر نفل پڑھنا جائز ہیں خواہ سواری کا منہ کسی طرف ہو' اور فرض نماز سواری پر بلا عذر پڑھنا جائز نہیں ہے کیونکہ قبلہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے اور بلا عذر فرض ساقط نہیں ہوتا' اور اگر عذر ہو تو پھر جائز ہے' اور اگر راستہ میں کیچڑ ہو اور سواری سے نیچے اتر کر نماز پڑھنے سے کپڑے کیچڑ میں ملوث ہوں تو سواری پر فرض نماز پڑھنا جائز ہے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

یعلیٰ بن مرہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سفر میں تھے کہ نماز کا وقت آ گیا' آسمان سے بارش ہو رہی تھی اور نیچے زمین پر کیچڑ تھی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری پر اذان دی اور اقامت کہی' پھر آپ اپنی سواری پر آگے بڑھ گئے اور صحابہ کرام آپ کے پیچھے سواریوں پر تھے' آپ نے سواری پر انہیں اشارہ سے نماز پڑھائی' آپ سجدہ میں رکوع سے زیادہ جھکتے تھے' حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے بھی کیچڑ کی وجہ سے سواری پر نماز پڑھی۔ (جامع ترمذی ص ۸۶ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

علامہ قاضی خاں اوز جندی لکھتے ہیں:

بغیر عذر کے سواری پر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے' اعذار یہ ہیں: چوپایہ (سواری) سے اترنے میں اسے اپنی جان یا چوپایہ کی جان کا درندہ سے یا چور سے خطرہ ہو یا زمین پر کیچڑ ہو اور خشک جگہ نہ پائے یا چوپایہ سرکش ہو' اس سے اترنے کے بعد بغیر مددگار کے اس پر سوار نہ ہو سکتا ہو' اور مددگار میسر نہ ہو' ان احوال میں چوپایہ پر نماز جائز ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (ترجمہ) اگر تمہیں خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر نماز پڑھو۔ (البقرہ: ۲۳۹) اور سواری سے اترنے پر قادر ہونے کے بعد اس پر نماز کا دہرانا لازم نہیں ہے' جیسا کہ مریض سواری پر اشاروں کے ساتھ نماز پڑھتا ہے خواہ چوپایہ اس وقت چل رہا ہو۔

(فتاویٰ قاضی خاں علیٰ ہامش الہندیہ ج ۱ ص ۱۷۰ 'مطبوعہ مطبع بولاق مصر' الطبعۃ الثانیۃ' ۱۳۱۰ھ)

''فتاویٰ عالمگیری'' میں کچھ مزید عذر بیان کیے گئے ہیں:

بغیر عذر کے چوپایہ پر فرض نماز جائز نہیں ہے اور اعذار یہ ہیں: چوپایہ سے اترنے میں اس کو اپنی جان یا اپنے کپڑوں یا سواری کی جان کا چور' درندہ یا دشمن سے خطرہ ہو یا چوپایہ سرکش ہو اور اترنے کے بعد بغیر مددگار کے اس پر سوار نہ ہو سکتا ہو' یا بوڑھا ہو اور خود سے سوار نہ ہو سکتا ہو اور سوار کرانے والا نہ پائے' یا زمین پر کیچڑ ہو اور خشک جگہ نہ ہو' ''محیط'' میں اسی طرح ہے اور اترنے پر قادر ہونے کے بعد اس پر اعادہ لازم نہیں ہے' اسی طرح ''سراج وہاج'' میں ہے۔

(عالمگیری ج ۱ ص ۱۴۳ 'مطبوعہ مطبع کبریٰ بولاق مصر' الطبعۃ الثانیۃ' ۱۳۱۰ھ)

قاضی خان اور عالمگیری کے علاوہ یہ اعذار علامہ کاسانی[1]' علامہ ابن ہمام[2]' علامہ بابرتی[3]' علامہ خوارزمی[4]' علامہ حلبی[5]'

---

1. ملک العلماء علاؤ الدین بن مسعود کاسانی متوفی ۵۸۷ھ' بدائع الصنائع ج ۱ ص ۱۰۹ ـ ۱۰ 'مطبوعہ ایچ ۔ ایم سعید' کراچی' ۱۴۰۰ھ
2. علامہ کمال الدین ابن ہمام متوفی ۸۶۱ھ' فتح القدیر ج ۱ ص ۴۰۳ 'مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر
3. علامہ محمد بن محمود بابرتی متوفی ۷۸۶ھ' عنایہ علیٰ ہامش فتح القدیر ج ۱ ص ۴۰۳ 'مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر
4. علامہ جلال الدین خوارزمی کفایہ مع فتح القدیر ج ۱ ص ۴۰۳ 'مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر
5. علامہ ابراہیم حلبی متوفی ۹۵۶ھ' غنیۃ المستملی ص ۲۷۰ ـ ۲۶۹ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' دہلی' ۱۳۲۳ھ

علامہ شامی[1]، علامہ ابن نجیم[2]، علامہ حصکفی[3]، علامہ شرنبلالی[4]، علامہ طحطاوی[5]، علامہ شبلی[6]، علامہ ابن بزاز کردری[7] اور مولانا امجد علی[8] نے بھی بیان کیے ہیں۔

جب کوئی تیز رفتار ایکسپریس ٹرین نماز کے پورے وقت میں کسی سٹیشن پر نہ رکے تو چلتی ٹرین میں فرض نماز پڑھنا جائز ہے بلکہ فرض ہے کیونکہ قرآن مجید (البقرہ: ٢٣٩) سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر جان جانے کا خطرہ ہو تو سواری پر نماز پڑھی جا سکتی ہے اور چلتی ٹرین سے نیچے اتر کر نماز پڑھنے میں یقیناً جان کا خطرہ ہے، ہمارے فقہاء نے اس سے کم تر خطرہ میں سواری پر فرض نماز پڑھنے کو جائز لکھا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ اس میں نماز کا اعادہ نہیں ہے، جب کیچڑ میں لتھڑنے کے اندیشہ سے اور قافلہ سے کٹ جانے کے خدشہ سے چلتی سواری پر نماز جائز ہے تو جان کے خطرہ کی وجہ سے تیز رفتار دوڑتی ہوئی ٹرین میں فرض نماز پڑھنا بطریق اولیٰ جائز ہوگا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ

اور انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے، وہ اس سے پاک ہے، بلکہ تمام آسمان

وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿١١٦﴾ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

اور زمینیں اسی کی ملکیت میں ہیں، سب اسی کے مطیع ہیں ○ (وہ) آسمانوں اور زمینوں کو ابتداءً پیدا کرنے والا ہے،

وَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿١١٧﴾ وَ

اور جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اس کے لیے صرف یہ فرماتا ہے: "ہو جا" تو وہ ہو جاتی ہے ○ اور

قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْلَا یُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَةٌ ؕ

جاہلوں (مشرکوں) نے کہا: اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ

ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح ان کے قول کی مثل کہا تھا، ان کے دل ایک دوسرے کے

[1] علامہ ابن عابدین شامی متوفی ١٢٥٢ھ، ردالمحتار ج ١ ص ٦٥٥، مطبوعہ مطبع عثمانیہ استنبول، ١٣٢٧ھ
[2] علامہ زین الدین ابن نجیم متوفی ٩٧٠ھ، البحر الرائق ج ٢ ص ٦٣، مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ
[3] علامہ علاؤ الدین حصکفی متوفی ١٠٨٨ھ، درمختار علی ہامش الردج ١ ص ٦٥٦، مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ استنبول، ١٣٢٧ھ
[4] علامہ حسن بن عمار شرنبلالی متوفی ١٠٦٩ھ، مراقی الفلاح علی ہامش الطحطاوی ص ٢٢٣، مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی مصر، الطبعۃ الثانیۃ
[5] علامہ احمد بن محمد الطحطاوی متوفی ١٢٣١ھ، حاشیۃ الطحطاوی ص ٢٢٣، مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی مصر، الطبعۃ الثانیۃ، ١٣٥٦ھ
[6] شیخ شبلی حاشیۃ الشبلی علی تبیین الحقائق ج ١ ص ١٧٧، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان
[7] علامہ محمد ابن بزاز کردری متوفی ٨٢٧ھ، فتاوی بزازیہ علی ہامش الہندیہ ج ٤ ص ٧٠، مطبوعہ مطبع کبریٰ بولاق مصر، الطبعۃ الثانیۃ
[8] مولانا امجد علی متوفی ١٣٦٧ھ، بہار شریعت ج ٤ ص ١٩، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کراچی

قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ

مشابہ ہو گئے ہیں' بے شک یقین کرنے والے لوگوں کے لیے ہم نے نشانیاں بیان فرما دی ہیں O بے شک ہم نے آپ کو حق

بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّ لَا تُسْــٴَـلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ﴿۱۱۹﴾

کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا (بنا کر) بھیجا ہے' اور جہنمیوں کے متعلق آپ سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا O

اللہ تعالیٰ کی اولاد نہ ہونے پر دلائل

یہودیوں نے کہا تھا کہ حضرت عزیر' اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائیوں نے کہا تھا کہ حضرت مسیح' اللہ کے بیٹے ہیں اور مشرکوں نے کہا تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں' اس سے پہلی آیات میں یہود و نصاریٰ اور مشرکوں کے مذموم عقائد' اقوال اور افعال کا بیان کیا گیا ہے' ان کے مذموم اقوال میں سے ایک قول یہ تھا کہ اللہ اولاد رکھتا ہے' اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کی ملکیت ہے' اور اولاد باپ کی ملکیت نہیں ہوتی' نیز اولاد باپ کی مثل اور اس کی جنس سے ہوتی ہے' اگر الٰہ کی اولاد ہوتی تو وہ بھی اللہ کی طرح واجب' قدیم اور الٰہ ہوتی' جب کہ متعدد واجب اور قدیم نہیں ہو سکتے نہ متعدد ہو سکتے ہیں کیونکہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی مملوک اور اس کی مطیع ہے اور واجب' قدیم اور الٰہ کسی کا مملوک اور مطیع نہیں ہو سکتا' ہم نے سورہ بقرہ کی آیت: ۲۲ میں واجب اور قدیم کے تعدد کے باطل ہونے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے ثبوت میں بہت دلائل پیش کیے ہیں۔

میری ایک دفعہ ایک عیسائی پادری سے گفتگو ہوئی' میں نے کہا: تم اللہ کو باپ اور حضرت عیسیٰ کو ان کا بیٹا کہتے ہو' جب اللہ کی کوئی بیوی نہیں ہے تو اس کا بیٹا کیسے ہوگا؟ اس نے کہا: ہم عیسیٰ کو جسمانی طور پر اللہ کا بیٹا نہیں کہتے نہ اللہ کو جسمانی باپ مانتے ہیں بلکہ باپ میں جو شفقت کا معنی ہے اس لحاظ سے اللہ کو باپ' اور مسیح کو اس کا بیٹا کہتے ہیں' میں نے کہا: پھر تم اللہ کو رحیم اور رحمان کہو' باپ کا لفظ جسم کی صفت ہے' وہ اللہ کی شان کے لائق نہیں' اس سے اللہ کی ذات میں نقص کا وہم ہوتا ہے۔ اس نے کہا: اللہ کے ہاں کہنے والے کے خلوص کو دیکھا جاتا ہے' ان علمی لطائف اور باریکیوں کو نہیں دیکھا جاتا' میں نے کہا: تم علمی باریکیاں اور لطائف کو نہیں جانتے' حضرت عیسیٰ تو عالم تھے' تمہاری کتاب کے مطابق انہوں نے اللہ تعالیٰ کو باپ کیوں کہا؟ اس پر وہ مبہوت اور لاجواب ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (وہ) آسمانوں اور زمینوں کو ابتداءً پیدا کرنے والا ہے۔ (البقرہ: ۱۱۷)

ابداع اور بدعت کا معنی

اللہ تعالیٰ نے "بدیع" فرمایا ہے یہ لفظ "بدع" سے بنا ہے' علامہ راغب اصفہانی اس کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کسی صنعت کو کسی کی اقتداء اور پیروی کیے بغیر بنانا' (یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی چیز کو بغیر مثال اور نمونہ کے بنانا) جو نیا کنواں کھودا ہوا اس کو "رکیتہ بدیع" کہتے ہیں اور جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اس کا معنی ہے: کسی چیز کو بغیر آلہ' بغیر مادہ اور بغیر زمان و مکان کے بنانا' قرآن مجید میں ہے: "بدیع السموات والارض. آسمانوں اور زمینوں کو بغیر آلہ' بغیر مادہ اور بغیر نمونہ کے بنانے والا" اور مذہب میں بدعت کا معنی ہے: کسی ایسے قول کو وارد کرنا جس کے قائل اور فاعل

نے صاحب شریعت کی اتباع نہ کی ہو اور نہ اس کو سابقہ شرعی مثالوں اور شرعی قواعد سے مستنبط کیا ہو اس کے متعلق حدیث میں ہے: (دین میں) ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں ہے۔

(المفردات ص ۳۹ 'مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران' ۱۳۴۲ھ)

بدعت کی تعریف اور اس کی اقسام

علامہ جزری لکھتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قیام رمضان (تراویح کی جماعت) کے متعلق فرمایا: ''نعم البدعة هذه. یہ کیا اچھی بدعت ہے''۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۶۹) بدعت کی دو قسمیں ہیں' ایک بدعت ہدایت ہے اور ایک بدعت ضلال ہے' جو چیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہو وہ مذموم اور واجب الانکار ہے' اور جو چیز کسی ایسے عموم کے تحت داخل ہو جس کو اللہ اور اس کے رسول نے پسند فرمایا ہو اور اس کی طرف رغبت دلائی ہو وہ مستحسن ہے اور لائق تعریف ہے' اور جس چیز کا پہلے کوئی نمونہ نہ ہو جیسے جود وسخا کی اقسام اور نیک کام وہ افعال محمودہ ہیں' اور یہ جائز نہیں ہے کہ وہ شریعت کے خلاف ہوں' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے نیک کاموں کے ایجاد کے لئے ثواب بیان کیا ہے' آپ نے فرمایا: جس نے کسی نیک کام کو ایجاد کیا اس کو خود بھی اس نیکی کا اجر ملے گا اور اس نیکی پر عمل کرنے والوں کا اجر بھی ملے گا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۲۷' مسند احمد ج ۴ ص ۳۵۷) اور جو کسی برے کام کو ایجاد کرے اس کے لئے عذاب کو بیان کیا ہے' آپ نے فرمایا: جس نے کسی برے کام کو ایجاد کیا اس کو اپنی برائی کا بھی گناہ ہوگا اور اس برائی پر عمل کرنے والوں کا بھی گناہ ہوگا اور یہ اس وقت ہوگا جب وہ کام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہو' اور بدعت ہدایت میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا (تراویح کی جماعت کے لئے) یہ فرمانا ہے: ''نعم البدعة هذه'' جب کہ تراویح کی جماعت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لئے سنت نہیں قرار دیا' آپ نے تین راتیں تراویح پڑھیں' پھر اس کو ترک کر دیا' آپ نے اس کی حفاظت نہیں کی اور نہ مسلمانوں کو اس کیلئے جمع کیا اور نہ یہ حضرت ابوبکر کے زمانہ میں تھی' صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تراویح کی جماعت کو قائم کیا اور لوگوں کو اس کی ترغیب دی' اس اعتبار سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو بدعت فرمایا اور چونکہ یہ نیک کاموں میں سے ہے اور لائق تعریف عمل ہے اس لئے اس کی مدح کی اور فرمایا: کیا ہی اچھی بدعت ہے! حضرت عمر نے اس کو بدعت کہا لیکن درحقیقت یہ سنت ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے تحت داخل ہے: تم پر میری سنت اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنا لازم ہے۔ (جامع ترمذی ص ۳۸۳' سنن ابن ماجہ ص ۵' سنن دارمی ص ۴۳' مسند احمد ج ۴ ص ۱۲۷۔ ۱۲۶) نیز آپ نے فرمایا: ابوبکر اور عمر جو میرے بعد ہیں ان کی اتباع کرو۔ (طبرانی بحوالہ مجمع الزوائد ج ۹ ص ۵۳) اسی تاویل کے مطابق اس حدیث کو محمول کیا جائے گا جس میں ہے: ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۸۵) اس سے مراد وہ بدعت ہے جو اصول شریعت کے مخالف ہو اور سنت کے موافق نہ ہو' بدعت کا زیادہ استعمال بدعت مذمومہ میں ہی ہوتا ہے۔

(نہایہ ج ۱ ص ۱۰۷۔ ۱۰۶' مطبوعہ مؤسسہ مطبوعاتی' ایران' ۱۳۶۴ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی لکھتے ہیں:

بدعت کی پانچ اقسام ہیں' واجبہ' مستحبہ' محرمہ' مکروہہ اور مباحہ' بدعت واجبہ کی مثال ہے متکلمین کے وہ دلائل جو انہوں نے ملحدوں اور بدعتیوں کے رد پر قائم کئے ہیں اور اس کی امثال' بدعت مستحبہ کی مثال ہے: علم کی کتابوں کو تصنیف کرنا' دینی مدارس اور سرائے وغیرہ بنانا' بدعت مباحہ کی مثال ہے: لباس اور طعام میں وسعت کو اختیار کرنا' بدعت حرام اور مکروہ ظاہر ہیں'

میں نے ''تہذیب الاسماء واللغات'' میں اس کی تفصیل کی ہے۔ (شرح مسلم ج ۱ص ۲۸۵ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

علامہ نووی نے جس تفصیل کا حوالہ دیا ہے اس کے متعلق انہوں نے ''تہذیب الاسماء واللغات'' میں لکھا ہے:

بدعت واجبہ کی بعض مثالیں یہ ہیں: علم نحو کا پڑھنا جس پر قرآن اور حدیث کا سمجھنا موقوف ہے' قرآن اور حدیث کے معانی جاننے کے لئے علم لغت کو حاصل کرنا' علم فقہ کو مرتب کرنا' سند حدیث میں جرح اور تعدیل کا علم حاصل کرنا' تاکہ صحیح اور ضعیف حدیث میں امتیاز حاصل ہو سکے' بدعت محرمہ کی بعض مثالیں یہ ہیں: قدریہ' جبریہ' مرجئہ اور مجسمہ کے نظریات (اسی طرح شیعہ' وہابیہ اور منکرین حدیث کے نظریات) اور ان لوگوں پر رد کرنا بدعت واجبہ میں داخل ہے۔ بدعت مستحبہ کی بعض مثالیں یہ ہیں: سرائے اور مدارس بنانا' ہر وہ اصلاحی اور فلاحی کام جو عہد رسالت میں نہیں تھا' تراویح کی جماعت' تصوف کی دقیق ابحاث' بدعقیدہ فرقوں سے مناظرے کرنا اور جلسے منعقد کرنا (قرآن مجید کے اعراب' مصحف شریف میں سورتوں کے نام' آیات کی تعداد اور رکوعات کا لکھنا' قرآن مجید اور ''صحیح بخاری'' کو پاروں میں تقسیم کرنا اور مسجد میں محراب بنانا وغیرہ) بدعت مکروہہ' مساجد کو مزین کرنا' مصحف کو سجانا (عصر کے بعد التزام سے مصافحہ کرنا' کسی مستحب کام کے ساتھ واجب اور لازم کا معاملہ کرنا' کسی مستحب کام پر ملامت کرنا) بدعت مباحہ کی بعض مثالیں یہ ہیں: کھانے اور لباس میں وسعت کو اختیار کرنا' سبز چادریں اوڑھنا' کھلی آستینوں کی قمیص پہننا وغیرہ۔ (تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ص ۲۳۔ ۲۲ 'مطبوعہ موسستہ مطبوعات' ایران' ۱۳۶۴ھ)

علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی نے بھی بدعت کی پانچ اقسام ذکر کی ہیں۔

(فتح الباری ج ۴ص ۲۵۳ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

علامہ قرطبی مالکی نے تفصیل سے بدعت کی دو قسمیں ذکر کی ہیں' بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ جس طرح علامہ جزری نے ذکر کیا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۲ص ۸۷۔۸۶ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران)

علامہ ابن عابدین شامی حنفی نے بھی علامہ نووی کی ''تہذیب الاسماء'' علامہ مناوی کی ''شرح الجامع الصغیر'' اور برکلی کی ''الطریقۃ المحمدیہ'' کے حوالے سے بدعت کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں اور بدعت سیئہ کی یہ تعریف کی ہے: جو نیا عقیدہ یا نیا عمل یا نیا حال کسی شبہ یا کسی استحسان کی وجہ سے اختراع کیا گیا ہو اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے خلاف ہو اور اس کو صراط مستقیم اور دین قویم بنالیا گیا ہو۔ (رد المحتار ج ۱ص ۳۷۷۔ ۳۷۶ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علماء دیوبند کے مشہور عالم شیخ شبیر احمد عثمانی نے بھی علامہ نووی کے حوالے سے بدعت کی پانچ مشہور اقسام لکھی ہیں۔

(فتح الملہم' ج ۲ص ۴۰۶ مطبوعہ مکتبۃ الحجاز' کراچی)

مشہور غیر مقلد عالم شیخ وحید الزماں نے چار قسمیں لکھی ہیں' بدعت مباحہ' بدعت مکروہہ' بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ۔

(ہدیۃ المہدی ص ۱۱۷ 'مطبوعہ میور پریس' دہلی' ۱۳۲۵ھ)

اور مشہور نجدی عالم شیخ محمد بن علی شوکانی نے ''فتح الباری'' سے نقل کر کے بدعت کی پانچ اقسام لکھی ہیں۔

(نیل الاوطار ج ۳ص ۲۲۵ 'مطبوعہ مکتبۃ الکلیات الازہریہ' ۱۳۹۸ھ)

بدعت اور سنت باہم متقابل ہیں' ہم نے بدعت کی تعریف اور اقسام لکھی ہیں تو یہاں پر اختصار کے ساتھ سنت کی تعریف اور اس کی اقسام بھی لکھ رہے ہیں۔

سنت کی تعریف' اس کی اقسام اور اس کا شرعی حکم

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

سنت کا معنی ہے: طریقہ اور سنت النبی کا معنی ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ۔
(المفردات ص ۲۴۵، مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ۱۳۴۲ھ)

علامہ ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:

سنت کا لغوی معنی ہے: طریقہ اور سیرت' اور اس کا شرعی معنی ہے: جس کام کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہو یا اس سے منع کیا ہو یا اس کو قولاً یا فعلاً مستحب قرار دیا ہو۔ (نہایہ ج ۲ ص ۴۰۹، مطبوعہ مؤسسۃ مطبوعات ایران ۱۳۶۴ھ)

علامہ میر سید شریف لکھتے ہیں:

سنت کا شرعی معنی ہے: بغیر فرضیت اور وجوب کے جو طریقہ دین میں رائج کیا گیا ہو' جس کام کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دائماً کیا ہو اور کبھی کبھی ترک بھی کیا ہو وہ سنت ہے' اگر یہ دوام بہ طور عبادت ہو تو یہ سنن الھدیٰ ہیں اور اگر یہ دوام بہ طور عادت ہو تو یہ سنن الزوائد ہیں' سنت الھدیٰ وہ ہے جس کو قائم کرنا دین کی تکمیل کیلئے ہو اور اس کا ترک کرنا کراہت یا اساءت ہے اور سنن الزوائد وہ ہیں جن پر عمل کرنا مستحسن ہے اور ان کا ترک کراہت نہیں ہے' اور نہ اساءت ہے جیسے اٹھنے' بیٹھنے' کھانے' پینے اور لباس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت' سنن ھدیٰ کو سنت مؤکدہ کہتے ہیں جیسے اذان اور اقامت' سنت مؤکدہ کا مطالبہ واجب کی طرح ہے مگر واجب کے ترک پر سزا کا استحقاق ہے اور اس کے (احیاناً) ترک پر عقاب نہیں ہے۔
(کتاب التعریفات ص ۵۲۔ ۵۳، مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۰۶ھ)

علامہ ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں:

بغیر لزوم کے دین میں جو طریقہ دائماً رائج کیا گیا ہو وہ سنت ہے' اور اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ اس کے کرنے میں ثواب ہے اور اس کے (احیاناً) ترک کرنے پر عتاب اور ملامت ہے اور سزا نہیں ہے' نیز علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس فعل کو دائماً کیا ہو اور کبھی ترک نہ کیا ہو وہ سنت مؤکدہ کی دلیل اور علامت ہے جیسے رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف ہے' آپ نے اس کو کبھی ترک نہیں فرمایا' اور جس فعل کو آپ نے کبھی کبھی ترک فرمایا وہ سنت غیر مؤکدہ کی دلیل اور علامت ہے' اور جس فعل کو آپ نے دائماً کیا ہو' کبھی ترک نہ فرمایا ہو اور اس کے ترک پر انکار فرمایا ہو' وہ وجوب کی دلیل اور علامت ہے۔
(البحر الرائق ج ۱ ص ۱۷، مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ' کوئٹہ)

ڈاڑھی میں قبضہ کی بحث

بعض علماء ڈاڑھی میں قبضہ کو واجب کہتے ہیں' لیکن یہ صحیح نہیں ہے' کیونکہ وجوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر سے ثابت ہوتا ہے اور کسی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ آپ نے قبضہ تک ڈاڑھی رکھنے کا امر فرمایا ہو۔ بعض علماء وجوب پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دائماً قبضہ تک ڈاڑھی رکھی اور کبھی اس کا ترک نہیں کیا اور یہ وجوب کی دلیل ہے' ہم کہتے ہیں کہ صرف دوام سے وجوب ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ نے اس فعل کے ترک پر انکار بھی فرمایا ہو جیسا کہ علامہ ابن نجیم نے فرمایا ہے اور علامہ ابن ہمام کی بھی یہی تحقیق ہے' اور کسی حدیث میں یہ منقول نہیں ہے کہ آپ نے قبضہ سے کم ڈاڑھی رکھنے پر انکار فرمایا ہو' نیز آپ وضوء میں ہمیشہ دائیں جانب سے ابتداء کرتے تھے اور یہ بالاتفاق واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے' ہمارا موقف یہ ہے کہ نفس ڈاڑھی رکھنا واجب ہے اور منڈانا حرام ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈاڑھی منڈانے والے مجوسی پر انکار فرمایا (المصنف ج ۸ ص ۳۷۹) نیز ڈاڑھی رکھنا اسلام اور مسلمانوں کا شعار ہے' البتہ قبضہ تک ڈاڑھی رکھنا واجب نہیں ہے' لیکن ڈاڑھی کی اتنی مقدار رکھنا ضروری ہے جس پر عرف میں ڈاڑھی کا اطلاق آسکے'

کیونکہ احکام میں عرف کا اعتبار ہے' علامہ شامی نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کی شرعاً مقدار معین نہ ہو اس میں مبتلابہ کی رائے کا اعتبار ہوتا ہے۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۱۲۸' مطبوعہ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

خشخشی ڈاڑھی یا فرنچ کٹ ڈاڑھی سے یہ تقاضا پورا نہیں ہوتا' یہ ایک فنی بحث ہے ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ لمبی اور دراز ڈاڑھی رکھی جائے جو سینہ کے بالائی حصہ کو بھر لے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈاڑھی لمبی تھی جو سینہ مبارک کو بھر لیتی تھی۔

کیا ترک سنت کی سزا شفاعت سے محرومی ہے؟

علامہ سید طحطاوی لکھتے ہیں:

''قنیہ'' میں مذکور ہے کہ سنت (موکدہ) کا تارک فاسق ہے (صحیح یہ ہے کہ فرض کا تارک اور حرام کا مرتکب فاسق ہے۔ سعیدی غفرلہ) اور اس کا منکر بدعتی ہے اور ''تلویح'' میں مذکور ہے کہ سنت موکدہ کو ترک کرنا حرام کے قریب ہے اور اس کا تارک شفاعت سے محروم ہونے کا مستحق ہے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جس نے میری سنت کو ترک کیا وہ میری شفاعت کو نہیں پائے گا' اور شیخ زین نے ''شرح المنار'' میں لکھا ہے کہ سنت موکدہ کے ترک سے گنہ گار ہوگا لیکن یہ گناہ ترک واجب کے گناہ سے کم ہوگا۔ (حاشیۃ مراقی الفلاح ص ۲۹' مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی واولادہ' مصر' ۱۳۵۶ھ)

علامہ طحطاوی نے ''تلویح'' کے حوالہ سے اس حدیث کو ذکر کیا ہے: جس نے میری سنت کو ترک کیا وہ میری شفاعت کو نہیں پائے گا' یہ حدیث کی کسی کتاب میں نہیں ہے' اور یہ حدیث احادیث صحیحہ کے خلاف ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: گناہ کبیرہ کرنے والوں کے لئے میری شفاعت ہے[1] اور سنت کا ترک گناہ کبیرہ نہیں ہے' فرض کا ترک یا حرام کا ارتکاب گناہ کبیرہ ہے اور واجب کا ترک اور مکروہ تحریمی کا ارتکاب گناہ صغیرہ ہے اور سنت کے ترک کا گناہ ترک واجب کے گناہ سے بھی کم درجہ کا ہے' اگر بالفرض یہ حدیث ہو تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ جو سنت موکدہ کو بہ طور تخفیف یا بہ طور انکار ترک کرے' علامہ شامی نے ابن الحاج کی ''شرح تحریر'' کے حوالے سے لکھا ہے: جو شخص بلا عذر سنت موکدہ کو بہ طور اصرار ترک کرے وہ ملامت کئے جانے اور عذاب کا مستحق ہوگا لیکن سنت موکدہ کے ترک کا گناہ ترک واجب کے گناہ سے کم ہے (اور اگر کبھی کبھی سنت موکدہ کو ترک کرے تو وہ صرف ملامت کا مستحق ہے)۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۴۵۲' ۷' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

''کن فیکون'' کی تحقیق

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اس کے لئے صرف یہ فرماتا ہے: ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے O (البقرہ: ۱۱۷)

اس آیت پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس چیز کو یہ خطاب (ہو جا) اس چیز کے وجود میں آنے سے پہلے ہے یا اس چیز کے وجود میں آنے کے بعد ہے' اگر اس چیز کے وجود میں آنے سے پہلے اس کو خطاب ہے تو یہ خطاب بالمعدوم ہے اور یہ باطل ہے اور اگر اس کے وجود میں آنے کے بعد اس کو خطاب ہے تو یہ تحصیل حاصل ہے اور یہ بھی باطل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ ''کن'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے اس کو فوراً پیدا کر دیتا ہے اور جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے وہ اس کے لئے تفکر' تدبر' معائنہ اور تجربہ کا محتاج نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ لفظ ''کن'' سرعت تخلیق سے استعارہ ہے۔

---

[1] امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی ص ۳۵۱' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ ازل میں اللہ تعالیٰ کو تمام اشیاء کا علم تھا' اللہ تعالیٰ جس چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی صورت علمیہ کی طرف متوجہ ہو کر فرماتا ہے: ''کن'' یعنی خارج میں موجود ہو جا تو وہ چیز ہو جاتی ہے' پس تحصیل حاصل لازم آئی نہ خطاب بالمعدوم۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر لفظ ''کن'' سرعت تخلیق سے استعارہ ہے تو پھر زمین اور آسمان کی پیدائش چھ دنوں میں کس طرح ہوئی اور انسان کی پیدائش نو ماہ میں کیوں ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس چیز کی پیدائش کے لئے اللہ تعالیٰ نے تدریج مقدر کی ہے اور اس تدریج کے لئے جتنا عرصہ مقرر کیا ہے وہ اس عرصہ کے بعد فوراً ہو جاتی ہے' خلاصہ یہ ہے کہ وہ جس چیز کو جب اور جتنے وقت میں پیدا کرنا چاہے وہ اس وقت میں علی الفور پیدا ہو جاتی ہے' بعض چیزوں کو وہ مادہ سے پیدا کرتا ہے اور بعض چیزوں کو وہ بغیر مادہ کے پیدا کرتا ہے جیسے نفس مادہ کو یا روح کو' لیکن وہ اپنی تخلیق میں مادہ کا محتاج ہے نہ وقت کا محتاج ہے' نہ منصوبہ بندی اور تجربہ کا محتاج ہے' وہ جس چیز کو جب چاہتا ہے' جیسے چاہتا ہے' جتنے عرصہ میں چاہتا ہے فوراً پیدا کر دیتا ہے' یہی ''کن فیکون'' کا مطلب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جاہلوں (مشرکوں) نے کہا: اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ اس سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح کہا تھا۔ (البقرہ: ۱۱۸)

مشرکین کے فرمائشی معجزات اور مطالبات پورا نہ کرنے کی وجوہ

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرکوں نے کہا: اللہ ہم سے کلام کر کے ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے متعلق کیوں نہیں بتاتا تا کہ ہمیں یقین ہو جائے کہ وہ نبی ہیں اور ہم ان پر ایمان لے آئیں' یا ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی کیوں نہیں آتی جو ان کی نبوت پر دلالت کرے' اس سے پہلے یہود اور نصاریٰ یا پچھلی امتوں کے کافروں نے بھی اسی طرح کہا تھا' سرکشی' ہٹ دھرمی' بے ہودہ مطالبوں اور ایمان نہ لانے میں ان کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئے ہیں' ایمان لانے والوں کے لئے تو ہم نشانیاں بیان کر چکے ہیں۔

جاہل اور مشرک نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کے مطالبات کرتے تھے:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۟

(بنو اسرائیل: ۹۳ - ۹۰)

اور انہوں نے کہا: ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ آپ ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دیں O یا آپ کے لئے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو' پھر آپ اس کے درمیان بہتی ہوئی نہریں جاری کر دیں O یا جیسے آپ نے کہا ہے آپ ہم پر آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دیں یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے بے حجاب لے آئیں O یا آپ کے لئے سونے (کی دھات) کا گھر ہو' یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں' اور ہم آپ کے چڑھنے پر بھی ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ آپ ہم پر ایک کتاب نازل کریں جس کو ہم پڑھیں' آپ کہہ دیجئے: میرا رب (ایسے لایعنی مطالبات کو پورا کرنے سے) پاک ہے' میں تو صرف بشر رسول ہوں O

جس طرح مشرکین مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان لانے کیلئے بے سروپا مطالبات کئے تھے اسی طرح اس سے پہلے یہودیوں نے بھی حضرت موسیٰ سے ایسے ہی مطالبات کئے تھے' انہوں نے میدان تیہ میں کہا: ہم ایک قسم کے کھانے پر صبر نہیں کریں گے' انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہا: ہمارے لئے بھی ایسا خدا بنا دو جیسا ان لوگوں کا خدا ہے' اور انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہا: ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم خدا کو بالکل ظاہر نہ دیکھ لیں!

اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے ان مطالبات کو جو پورا نہیں کیا اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) جب اللہ تعالیٰ نے اپنی الوہیت اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایک نشانی پیش کر دی تو وہ ایک مکلف اور انصاف پسند شخص کے ایمان لانے کیلئے کافی ہے اور وہ نشانی قرآن مجید ہے' جس کی نظیر لانے سے آج تک ساری دنیا عاجز ہے اور جو شخص کج بحث' کٹ حجت اور ہٹ دھرم ہو اس کے لئے ہزاروں نشانیاں بھی ناکافی ہیں' اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک یقین کرنے والے لوگوں کے لئے ہم نے نشانیاں بیان فرما دی ہیں۔

اس کی نظیر یہ آیت ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ (العنکبوت: ۵۱۔ ۵۰)

اور کافروں نے کہا: ان پر ان کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں نازل کی گئیں؟ آپ کہئے کہ نشانیاں تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو صرف واضح طور پر ڈرانے والا ہوں ○ کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر ایک (عظیم) کتاب نازل کی ہے' جس کو ان پر تلاوت کیا جاتا ہے۔

(۲) اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ ہوتا کہ ان فرمائشی معجزات کو نازل کرنے سے ایمان لے آئیں گے تو اللہ تعالیٰ ان معجزات کو نازل فرما دیتا لیکن اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ اگر وہ ان کے مطالبات پورے بھی کر دے تب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے بلکہ اور ضد بحث کریں گے' اس کی نظیر یہ آیت ہے:

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ (الانفال: ۲۳)

اور اگر اللہ ان میں کوئی خیر جانتا تو ان کو ضرور سنا دیتا' اور اگر ان کو (ان کے اس حال میں) سنا دیتا تو وہ ضرور اعراض کرتے ہوئے پیٹھ موڑ لیتے ○

(۳) جس قسم کے معجزات کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا ان کو پورا کرنے کے بعد عقل کی آزمائش اور ایمان بالغیب کی کوئی گنجائش نہ رہتی اور یہ چیز اللہ کی حکمت کے خلاف ہے کہ ایمان لانے میں عقل کے امتحان کا کوئی دخل نہ ہو اور غیب پر ایمان نہ ہو' کیونکہ جب سب لوگ فرشتوں کو بھی دیکھ لیتے اور خدا کو بھی دیکھ لیتے تو پھر ایمان بالغیب نہ رہتا۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی یہ سنت جاریہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی معجزہ کی فرمائش کرے اور پھر اس کے بعد ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو ہلاک اور ملیا میٹ کرنے کے لئے آسمانی عذاب نازل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے اور اللہ وعدہ کر چکا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے آسمانی عذاب نہیں آئے گا' اب اگر ان کے مطالبات پورے ہونے کے بعد یہ ایمان نہ لاتے اور اللہ تعالیٰ عذاب نازل نہ کرتا تو یہ اس کی سنت کے خلاف تھا اور عذاب نازل کر دیتا تو یہ اس کے وعدہ کے خلاف تھا۔

(۵) جس قدر کثرت کے ساتھ یہ معجزات کا مطالبہ کر رہے تھے اگر اتنے کثیر معجزات آ جاتے تو پھر معجزہ معجزہ نہ رہتا بلکہ عادت اور معمول کے مطابق ایک کام ہو جاتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک ہم نے آپ کو حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا (بنا کر) بھیجا ہے اور جہنمیوں کے متعلق آپ سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گاO (البقرہ: ۱۱۹)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کریمین کے ایمان کی بحث

جب کفار نے ضد اور عناد سے اپنے فرمائشی معجزات کے مطالبہ پر اصرار کیا اور ایمان نہیں لائے' جب کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق پر نشانیاں نازل کر دی تھیں' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ایمان نہ لانے پر رنج اور افسوس ہوا' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ آپ کا کام تو صرف ایمان لانے والوں کو بشارت دینا اور ایمان نہ لانے والوں کو دوزخ سے ڈرانا ہے' پھر بھی اگر کوئی ایمان نہیں لاتا تو آپ سے ان دوزخیوں کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔

علامہ ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

محمد بن کعب قرظی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میرے ماں باپ کے ساتھ کیا کیا گیا۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۴۰۹ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث معضل الاسناد اور ضعیف ہے اور حجت نہیں ہے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۱۱۱ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ ہم نے کتاب (التذکرہ) میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ماں باپ کو زندہ کیا اور وہ آپ پر ایمان لے آئے۔ (الجامع الاحکام القرآن ج ۲ ص ۹۳ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران)

علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

حضرت سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے نجات یافتہ ہونے کے متعلق متعدد مسالک ہیں:

مسلک اول: آپ کے والدین کریمین آپ کی بعثت سے پہلے فوت ہو گئے تھے اور جو بعثت سے پہلے فوت ہو گئے تھے ان کو عذاب نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًاO (بنی اسرائیل: ۱۵)   اور ہم عذاب دینے والے نہیں جب تک رسول نہ بھیج دیںO

یہ آیت ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے جن کو کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی اور ابوین کریمین کو کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی' انبیاء سابقین کا زمانہ اس سے بہت بعید تھا کیونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے اور ان کے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان زمانہ فترت (انقطاع نبوت) چھ سو سال ہے' پھر وہ زمانہ جاہلیت میں تھے اور اس وقت شرق اور غرب میں جہالت پھیل چکی تھی' دنیا کے چند علاقوں میں گنتی کے علماء اہل کتاب تھے' اس کے علاوہ شریعت کی معرفت کے ذرائع معدوم ہو چکے تھے اور آپ کے والدین شریفین نے کہیں سفر نہیں کیا صرف آپ کے والد گرامی ایک بار مدینہ منورہ گئے اور انہوں نے زیادہ عمر نہیں پائی' جب حضرت آمنہ امید سے ہوئیں تو اس وقت حضرت عبداللہ کی عمر اٹھارہ سال تھی' اس وقت آپ مدینہ گئے اور وہیں وفات پائی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چھ سال کی تھی تو حضرت آمنہ غالباً اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لیے مدینہ گئیں اور وہیں فوت ہو گئیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور حضرت

ابراہیم علیہ السلام کے درمیان تین ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ تھا۔

مسلک ثانی: آپ کے ابوین کریمین سے شرک صادر نہیں ہوا' بلکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تھے جیسے اور بھی کئی عرب تھے' مثلاً زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ بن نوفل وغیرہما' امام فخر الدین رازی نے اپنی کتاب ''اسرار التنزیل'' میں لکھا ہے: آزر حضرت ابراہیم کے والد نہیں چچا تھے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء واجداد کافر نہیں تھے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ○ جو آپ کو دیکھتا ہے جب آپ کھڑے ہوتے ہیں ○

(الشعراء: ۲۱۹) اور دیکھتا ہے سجدہ کرنے والوں میں آپ کے پلٹنے کو ○

یعنی آپ کا نور ہمیشہ سجدہ کرنے والوں میں ایک دوسرے سے منتقل ہوتا رہا' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ . (التوبہ: ۲۸) سب مشرکین محض نجس ہیں۔

اور آپ نے فرمایا: میں ہمیشہ طاہرین کی پشتوں سے طاہرات کے رحموں میں منتقل ہوتا رہا' اس لیے واجب ہے کہ آپ کے آباء واجداد میں سے کوئی مشرک نہ ہو' (امام رازی کا کلام ختم ہوا) نیز احادیث سے ثابت ہے کہ آپ کے تمام آباء اپنے زمانہ میں سب سے افضل اور خیر تھے کیونکہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ہر قرن میں بنو آدم کے خیر قرن سے مبعوث ہوا ہوں حتیٰ کہ وہ قرن جس میں میں مبعوث ہوا' اور امام بیہقی نے ''دلائل النبوۃ'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب بھی لوگوں کے دو فرقے ہوئے اللہ تعالیٰ نے مجھے ان میں سے خیر میں رکھا' میں اپنے ماں باپ سے پیدا کیا گیا اور مجھے زمانہ جاہلیت کی کسی چیز نے نہیں چھوا' حضرت آدم سے لے کر میرے والدین تک میں (ہمیشہ) نکاح سے پیدا ہوا' زنا سے پیدا نہیں ہوا' میں تم سے خیر (افضل) ہوں اور میرے باپ تمہارے باپ سے خیر ہیں' اور امام عبدالرزاق نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہر دور میں روئے زمین پر کم از کم سات مسلمان ضرور رہے ہیں' اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین اور زمین والے ہلاک ہو جاتے' اس حدیث کی سند امام بخاری اور امام مسلم کی شرط کے مطابق ہے۔

اور مومن اور کافر میں مومن خیر ہے' قرآن مجید میں ہے:

وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ . (البقرہ: ۲۲۱) اور غلام مومن مشرک سے خیر ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء ہر زمانہ کے لوگوں میں خیر تھے اور خیر مومن ہے' اور ہر زمانہ میں مومن تھے تو ثابت ہوا کہ آپ کے تمام آباء ہر زمانہ میں مومن تھے۔

مسلک ثالث: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ابوین کریمین کو زندہ کیا حتیٰ کہ وہ آپ پر ایمان لے آئے' امام ابن شاہین' حافظ ابوبکر خطیب بغدادی' علامہ سہیلی' علامہ قرطبی' محب طبری اور علامہ ناصر الدین وغیرہ کا یہی مسلک ہے' انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جس کو امام ابن شاہین نے ''الناسخ والمنسوخ'' میں' خطیب بغدادی نے ''السابق واللاحق'' میں' امام دارقطنی اور امام ابن عساکر نے ''غرائب'' میں سند ضعیف کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کیا' پھر میرے ساتھ ایک گھاٹی پر حجون میں آئے دراں حالیکہ آپ غمزدہ تھے اور رو رہے تھے' آپ کافی دیر ٹھہرے رہے' پھر میرے پاس لوٹے' اس وقت آپ خوش تھے اور مسکرا رہے تھے' آپ نے فرمایا: میں اپنی والدہ کی قبر پر گیا تھا' میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ ان کو زندہ کر دے' اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا' وہ مجھ پر ایمان لائیں' پھر اللہ نے ان کو لوٹا دیا' یہ حدیث محدثین کے اتفاق سے ضعیف ہے' بلکہ ایک قول یہ ہے کہ موضوع ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ

یہ ضعیف ہے یہ موضوع نہیں ہے میں نے اس پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے' علامہ سہیلی نے ''الروض الانف'' میں ایک سند سے روایت کیا ہے جس میں مجہول راوی ہیں' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے دعا کی کہ وہ آپ کے والدین کو زندہ کر دے' اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا' وہ آپ پر ایمان لے آئے' پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر موت طاری کر دی' اس کے بعد علامہ سہیلی نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کی رحمت اور قدرت اس سے عاجز نہیں ہے' اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس لائق ہیں کہ وہ ان کو اس خصوصیت کے ساتھ اپنے فضل و کرم سے نوازے۔

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ ابوین کریمین کو زندہ کرنے کی حدیث اور ان کے لیے استغفار کی ممانعت میں کوئی تعارض نہیں ہے (کیونکہ غیر معصوم کے لیے استغفار کرنا ان کے حق میں معصیت کا وہم پیدا کرتا ہے)' علامہ قرطبی نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بے شمار ہیں اور ابوین کریمین کو زندہ کرنا عقلاً و شرعاً محال نہیں ہے' کیونکہ قرآن مجید میں بنو اسرائیل کے مقتول کو زندہ کرنے اور اپنے قاتل کی خبر دینے کا ذکر ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ قاضی ابوبکر بن العربی مالکی سے کسی نے پوچھا کہ جو شخص یہ کہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والد دوزخ میں ہیں' اس کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا: وہ ملعون ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ترجمہ) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں اللہ ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت فرماتا ہے (الاحزاب: ۵۷) اور آپ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ایذا ہوگی کہ آپ کے والد کو جہنمی کہا جائے (صحیح مسلم کی جس حدیث میں ہے: میرا باپ اور تمہارا باپ جہنم میں ہے اس میں باپ کا اطلاق چچا پر ہے اور اس سے مراد ابو طالب ہے)۔ علامہ باجی نے بھی ''المنتقی'' میں اسی طرح لکھا ہے۔ امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں حضرت طلق بن علی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں اپنے والدین یا ان میں سے کسی ایک کو پالیتا' میں عشاء کی نماز میں ہوتا اور وہ مجھے یا محمد کہہ کر پکارتے تو میں لبیک کہتا۔ (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۳۳۔ ۲۴۲ ملخصاً مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ فیصل آباد)

علامہ شامی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ عزت دی کہ آپ کے والدین کریمین کو زندہ کیا اور وہ آپ پر ایمان لے آئے' جیسا کہ اس حدیث میں ہے جس کو علامہ قرطبی اور حافظ ناصر الدین نے صحیح قرار دیا ہے' اور انہوں نے خلاف قاعدہ موت کے بعد ایمان کا نفع پایا' اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عزت دی ہے جیسے بنو اسرائیل کے مقتول کو زندہ کیا' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مردوں کو زندہ کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اللہ نے مردوں کی ایک جماعت کو زندہ کیا۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۲۹۰ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

نیز علامہ شامی لکھتے ہیں: احادیث صحیحہ میں ہے کہ ابو طیبہ اور حضرت ابن الزبیر نے آپ کے اس خون کو پی لیا جو آپ نے ان کو پھینکنے کے لیے دیا تھا' آپ نے فرمایا: میرا خون جس خون کے ساتھ مل گیا اس کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی تو جس کے شکم میں اس کے خون اور دودھ سے آپ کی پرورش ہوتی رہی اور جو آپ کی خلقت کی اصل ہیں وہ دوزخ سے کیونکر نہ محفوظ ہوں گے۔ (تنقیح الفتاوی الحامدیہ ج ۲ ص ۳۶۵ مطبوعہ مکتبہ حبیبیہ' کوئٹہ)

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ

اور یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے حتیٰ کہ آپ ان کی ملت کی

مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ

پیروی کریں، آپ کہیے کہ اللہ کی (دی ہوئی) ہدایت ہی (حقیقت میں) ہدایت ہے' اور (اے مخاطب!) جب کہ

أَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ

تیرے پاس علم آ چکا ہے اس کے بعد (بھی) تو نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی تو تجھے اللہ کے عذاب سے بچانے کے لیے

مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِينَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ

نہ کوئی دوست ہو گا اور نہ کوئی مددگار O جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے' وہ اس کی اس طرح

حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ أُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ

تلاوت کرتے ہیں جو تلاوت کرنے کا حق ہے' وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں' اور جو اس کا کفر کرتے ہیں

فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع

سو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں O

یہود و نصاریٰ کی عدم اطاعت کی خبر کا قرب قیامت میں ان کے ایمان لانے کی آیت سے تعارض ......

اور اس کا جواب

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتا دیا تھا کہ اگر یہود و نصاریٰ آپ کی مسلسل تبلیغ کے باوجود ایمان نہیں لاتے تو آپ پریشان نہ ہوں اور غم نہ کریں' یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں اور نہ آپ سے ان کے متعلق باز پرس ہوگی' مدینہ منورہ میں آنے کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھیں تو اس سے یہود کو یہ امید ہو چلی تھی کہ شاید نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے محرف شدہ دین میں ان کی موافقت کرلیں' اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے اور یہود و نصاریٰ کے ایمان لانے کی توقع کو منقطع کرتے ہوئے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک آپ ان کی ملت یعنی ان کے تحریف شدہ دین کی پیروی نہ کرلیں اور ظاہر ہے کہ یہ محال ہے' پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ان کو بتا دیں کہ حقیقت میں ہدایت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے دی ہے یعنی ان کا محرف شدہ دین ہدایت نہیں ہے' ملت کا معنی ہم "مالك يوم الدين" کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

اب اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس آیت میں فرمایا ہے کہ یہود و نصاریٰ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور سورہ نساء میں فرمایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے تمام اہل کتاب ایمان لے آئیں گے اور یہ کھلا ہوا تعارض ہے' وہ آیت یہ ہے:

وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ (النساء: ۱۵۹)

اور عیسیٰ بن مریم کی موت سے پہلے اہل کتاب میں سے ہر شخص ان پر ایمان لے آئے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سورہ بقرہ میں یہود و نصاریٰ کے حسد اور بغض کی وجہ سے ان کے ایمان لانے کی نفی فرمائی ہے اور قرب قیامت میں نزول مسیح کے وقت جب یہود و نصاریٰ حضرت عیسیٰ کو دین اسلام اور حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پیروی کرتے ہوئے دیکھیں گے تو ان کا حسد اور بغض زائل ہو جائے گا اور ان پر آپ کی حقانیت واضح ہو جائے گی اور وہ سب آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

بعض آیات میں بہ ظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور حقیقت میں مسلمانوں سے خطاب ہونا

اس کے بعد فرمایا ہے: اگر آپ نے وحی نازل ہونے کے بعد بھی بہ فرض محال یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی پیروی کی تو آپ کو (معاذ اللہ) اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکے گا' اس آیت میں مسلمانوں سے تعریضاً خطاب ہے' تعریض اس کو کہتے ہیں کہ صراحۃً اور بہ ظاہر کسی سے خطاب ہو اور حقیقتاً دوسروں سے خطاب ہو' اسی طرح اس آیت میں بھی بہ ظاہر صراحۃً تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اور تعریض عام مسلمانوں سے ہے' یعنی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کی اتباع کرنا محال ہے' پھر بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ وعید سنائی ہے تو عام مسلمانوں کی طرف یہ وعید بہ طریق اولیٰ متوجہ ہے۔

اس کی نظیر یہ آیت ہے:

لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ . (الزمر: ٦٥) اگر (بہ فرض محال) آپ نے (بھی) شرک کیا تو آپ کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

اس آیت میں بھی عام مسلمانوں کو تعریض ہے' بہ ظاہر صراحۃً خطاب آپ سے ہے اور مراد عام مسلمان ہیں' یعنی اگر چہ آپ کا شرک کرنا محال ہے پھر بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس محال کی تقدیر پر جب یہ وعید سنائی ہے تو اگر عام مسلمان شرک کریں تو ان کی طرف یہ وعید بہ طریق اولیٰ متوجہ ہو گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی اس طرح تلاوت کرتے ہیں جو تلاوت کرنے کا حق ہے' وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ (البقرہ: ۱۲۱)

تورات اور انجیل کی تلاوت کا ناجائز ہونا اور قرآن مجید کی تلاوت کے آداب

اس میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں ان لوگوں سے مراد اہل کتاب ہیں یا مسلمان' ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب ہیں کیونکہ اس سے پہلی آیات میں بھی اہل کتاب کا ذکر ہے اور پہلے اہل کتاب میں ان لوگوں کی مذمت کی تھی جنہوں نے تورات میں تحریف کی اور کج بحثی اور ہٹ دھرمی کا اظہار کیا' اور اب ان اہل کتاب کا ذکر ہے جنہوں نے تحریف نہیں کی' تورات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانیاں پڑھ کر آپ پر ایمان لے آئے' جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ' اور تورات کی تلاوت کرنا جس طرح تلاوت کرنے کا حق ہے' اس سے مراد یہ ہے کہ اس کو بغیر تحریف کے پڑھنا' یا اس کو پڑھ کر اس کے احکام پر عمل کرنا' دوسرا قول یہ ہے کہ ان لوگوں سے مراد مسلمان ہیں اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ جو کتاب کی اس طرح تلاوت کرتے ہیں جو تلاوت کرنے کا حق ہے' اس آیت میں کتاب کی تلاوت کرنے کی تعریف کی ہے اور اس پر برانگیختہ کیا ہے اور یہ صفت صرف قرآن مجید کی ہے' تورات اور انجیل کی نہیں ہے' کیونکہ ان کی تلاوت اب جائز نہیں ہے' حافظ الہیثمی نے امام بزار کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تورات پڑھ رہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو گیا اور آپ نے فرمایا: اگر اب موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لیے میری اتباع کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

(مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۷۰ مطبوعہ دارالکتاب العربی ۱۴۰۲ھ)

اس لیے متعین ہو گیا کہ یہاں کتاب سے مراد قرآن مجید ہے اور اس کی تلاوت کا حق یہ ہے کہ:

(۱) قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے اس کے معانی میں غور و فکر کرنا۔

(۲) اگر جنت یا آیت رحمت کو پڑھے تو اس کو طلب کرے۔ عذاب کی آیت پڑھے تو اس سے پناہ مانگے' اگر نیک لوگوں کی صفات پڑھے تو ان کو اپنانے کی دعا کرے' برے لوگوں کا ذکر پڑھے تو ایسے اعمال سے محفوظ رہنے کی دعا کرے' احکام کی آیات پڑھے تو ان پر عمل کرنے کی توفیق طلب کرے۔

(۳) قرآن مجید کی تلاوت اس طرح کرے کہ اس کے تقاضوں پر عمل کرے۔

(۴) قرآن مجید کو خشوع اور خضوع سے پڑھے' آیات غضب کو پڑھ کر اس پر خوف طاری ہو اور اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں' اپنے گناہوں پر اشک ندامت بہائے۔

(۵) قرآن مجید کی محکم آیات پر عمل کرے' متشابہات پر ایمان لائے اور ان کا معنی اور مراد اللہ تعالیٰ کی طرف مفوض کر دے۔

قرآن مجید کی تلاوت کے آداب کا ہم نے اس کتاب کے مقدمہ میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ

اے بنو اسرائیل! میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی ہیں' اور

اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ

بے شک میں نے تم کو (تمہارے زمانہ میں) تمام جہانوں پر فضیلت دی ہے O اور اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص

نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا

کسی شخص کی طرف سے کوئی بدلہ نہیں دے سکے گا' اور نہ کسی شخص سے کوئی فدیہ (تاوان) قبول کیا جائے گا اور نہ کسی

شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ

شخص کو (بلا اذن) کسی کی شفاعت نفع دے گی' اور نہ ان کی مدد کی جائے گی O اور جب کئی باتوں میں ابراہیم کی ان کے رب نے آزمائش

بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ

کی تو انہوں نے ان (سب) کو پورا کر دیا' اللہ نے فرمایا: بے شک میں تم کو (تمام) لوگوں کا امام بنانے والا ہوں' (ابراہیم نے) کہا:

وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور میری اولاد سے بھی' اللہ نے فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا O

نسبت ابراہیم کی وجہ سے یہود و نصاریٰ اور مشرکین پر دین اسلام کا حجت ہونا

پہلی دو آیتوں کی تفسیر سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۴۸٬۴۷ میں گزر چکی ہے٬ تیسری آیت میں ارشاد ہے:

اور جب کئی باتوں میں ابراہیم کی ان کے رب نے آزمائش کی۔ (البقرہ: ۱۲۴)

اللہ تعالیٰ نے پہلے تفصیل سے بنو اسرائیل پر کیے گئے انعامات کو بیان فرمایا٬ پھر یہ بیان فرمایا کہ انہوں نے اپنے دین اور اعمال میں کیا کیا بدعات اور خرابیاں پیدا کیں٬ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ شروع فرمایا٬ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے شخص ہیں کہ تمام ادیان اور مذاہب کے پیروکار ان کی فضیلت کا اعتراف کرتے ہیں اور مشرکین مکہ بھی اس پر فخر کرتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیم کی اولاد سے ہیں اور خدام حرم ہیں٬ اور یہود و نصاریٰ بھی ان کی فضیلت کا اعتراف کرتے تھے اور ان کی اولاد سے ہونے کا شرف ظاہر کرتے تھے٬ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا جس سے حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کے دین کا ان سب پر حجت ہونا لازم آتا ہے اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔

(۱) حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی خصوصیت حج بیت اللہ ہے٬ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ بیت اللہ کا حج حضرت ابراہیم کی یادگار ہے اور اس کا داعی صرف اسلام ہے٬ اس لیے جو حضرت ابراہیم کو ماننے والے ہیں ان پر دین اسلام کو ماننا واجب ہے۔

(۲) جب کعبہ کو قبلہ بنا دیا گیا تو یہود نے اس کا برا منایا٬ اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت قائم کرتے ہوئے فرمایا کہ تم حضرت ابراہیم کو ماننے والے ہو اور یہ کعبہ ان ہی کا بنایا ہوا ہے تو اس کے قبلہ بنائے جانے پر تو تمہیں ناراض ہونے کی بجائے خوش ہونا چاہیے۔

(۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جن کلمات سے آزمائش کی گئی اس کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ ان کا تعلق بدن کی صفائی اور پاکیزگی سے تھا اور یہ طہارت صرف دین اسلام میں ہے٬ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ دین اسلام کو مانیں۔

(۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سورج٬ چاند اور ستاروں کی خدائی کا انکار کیا اور بت پرستی کا رد کیا اور اسلام بھی اسی کا داعی ہے۔

(۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے حکم سے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے لگے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بیٹے کی جگہ مینڈھے کو ذبح کرادیا٬ اور اس تاریخ کو سنت ابراہیم کے مطابق قربانی کرنا صرف دین اسلام میں ہے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟ فرمایا: تمہارے باپ ابراہیم کی سنت ہے۔

(سنن ابن ماجہ ۲۲۶)

ان کلمات کا بیان جن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کی گئی

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جن کلمات سے آزمائش کی گئی ان کے متعلق متعدد اقوال ہیں٬ ایک قول یہ ہے:

عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیس کلمات سے آزمائش کی گئی جن میں سے دس کا ذکر سورہ توبہ میں٬ دس کا ذکر سورہ احزاب میں اور دس کا ذکر سورہ مومنون میں ہے٬ سورہ توبہ میں جن دس

کلمات کا ذکر ہے وہ یہ ہیں:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (التوبۃ: ۱۱۲)

توبہ کرنے والوں' عبادت کرنے والوں' حمد کرنے والوں' روزہ رکھنے والوں' رکوع کرنے والوں' سجدہ کرنے والوں' نیکی کا حکم دینے والوں' برائی سے روکنے والوں' اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والوں' اور ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجئے ۝

سورہ احزاب میں ان دس کلمات کا ذکر ہے:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (الاحزاب: ۳۵)

بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں' اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں' اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں' اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں' اور اللہ کا بہت ذکر کرنے والے مرد اور اللہ کا بہت ذکر کرنے والی عورتیں' اللہ نے ان سب کے لیے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے ۝

اور سورہ مومنون میں جن دس کلمات کا ذکر ہے وہ یہ ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ (المومنون: ۹-۱)

بے شک ایمان والے کامیاب ہوئے ۝ جو اپنی نماز خشوع سے پڑھتے ہیں ۝ اور جو بے ہودہ باتوں سے اعراض کرتے ہیں ۝ اور جو زکوۃ دیتے ہیں ۝ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ۝ ماسوا اپنی بیویوں اور باندیوں کے' بے شک اس میں ان پر کوئی ملامت نہیں ۝ اور جو اس کے سوا کسی اور کو طلب کرے تو وہی لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں ۝ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں ۝ اور جو اپنی نماز کی (قضا ہونے سے) حفاظت کرتے ہیں ۝

اور طاؤس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دس کلمات سے آزمائش کی گئی' پانچ کا تعلق سر کی طہارت سے اور پانچ کا تعلق باقی جسم کی طہارت سے ہے' وہ دس کلمات یہ ہیں:

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ دس چیزیں فطرت سے ہیں (سنت ہیں): مونچھیں کم کرنا' ڈاڑھی بڑھانا' مسواک کرنا' ناک میں پانی ڈالنا' ناخن تراشنا' انگلیوں کے جوڑ دھونا' بغل کے بال نوچنا' زیر ناف بالوں کو مونڈنا' استنجاء کرنا' راوی نے کہا: میں دسویں چیز بھول گیا البتہ وہ کلی کرنا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۲۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

ان دس چیزوں کی مکمل تشریح ہم نے شرح صحیح مسلم جلد اول میں کر دی ہے۔

اور حنش نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان کلمات کی تفسیر میں جسمانی طہارت کے علاوہ مناسک حج کا بھی ذکر کیا ہے اور ان میں طواف' سعی' رمی جمار اور وقوف عرفات کا ذکر کیا ہے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۴۱۵۔ ۴۱۴ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک میں تم کو (تمام) لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ (البقرہ: ۱۲۴)

امام کا لغوی معنی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

امام اس کو کہتے ہیں جس کی اقتداء کی جائے' خواہ وہ انسان ہو جس کے قول اور فعل کی اطاعت اور اتباع کی جائے' یا کتاب ہو جس میں مذکور احکام کی اطاعت کی جائے' اور خواہ وہ امام حق ہو یا باطل' قرآن مجید میں ہے:

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ ۚ (بنو اسرائیل: ۷۱) جس دن ہم تمام لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے۔

اس آیت میں امام سے مراد وہ شخص ہے جس کی اقتداء کی گئی ہو' خواہ وہ حق ہو یا باطل' اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد کتاب ہے۔

نیز قرآن مجید میں ہے:

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ ○ (یٰس: ۱۲) اور ہم نے ایک روشن کتاب میں ہر چیز کا احاطہ کر لیا ہے○

اس آیت میں امام سے مراد لوح محفوظ ہے۔ (المفردات ص ۲۴ 'مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

اہل سنت کے نزدیک امام کا شرعی معنی

جب امام کا لفظ مطلقاً بولا جائے تو اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی منہاج نبوت پر امور دین میں پیروی کی جائے' اور اس کا مصداق انبیاء علیہم السلام' خلفاء راشدین' قضاۃ' فقہاء' ائمہ اور نماز کے امام ہیں' انبیاء علیہم السلام اس لیے امام ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے امور دین میں ان کی اتباع اور اقتداء لازم کر دی ہے اور خلفاء راشدین اس لیے امام ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اقتداء لازم کر دی ہے' حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری سنت کی پیروی کرو اور میرے خلفاء راشدین کی پیروی کرو[1] اور قضاۃ' فقہاء' ائمہ مجتہدین' اور ائمہ تفسیر و حدیث بھی امام ہیں کیونکہ یہ سب اولی الامر میں داخل ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اولی الامر کی اطاعت کو بھی لازم کر دیا ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (النساء: ۵۹) اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے صاحبان امر ہیں۔

[1] امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ 'سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۷۹ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ

اور نماز کے امام کو اس لیے امام کہا جاتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: امام کو اس لیے امام بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے' جب وہ قیام کرے تو قیام کرو' جب وہ رکوع کرے تو رکوع کرو اور جب وہ سجدہ کرے تو سجدہ کرو۔[1] انبیاء علیہم السلام کا امامت میں سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے' پھر خلفاء راشدین ہیں' پھر علماء' فقہاء' ائمہ مجتہدین' عادل قاضی اور نماز کے امام ہیں' اور جب امام سے مراد امام باطل ہو تو اس کے ساتھ کوئی ایسا قرینہ ہوتا ہے جس سے اس پر دلالت ہو کہ یہاں امام باطل مراد ہے' قرآن مجید میں ہے:

فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ (التوبہ: ۱۲) کفر کے اماموں سے قتال کرو۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ (القصص: ۴۱) اور ہم نے ان کو ایسا امام بنایا کہ وہ لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے ہیں۔

ہر چند کہ امام کا اطلاق' خلفاء راشدین' فقہاء' ائمہ مجتہدین اور ائمہ مساجد پر بھی ہوتا ہے لیکن اس جگہ امام سے مراد نبی ہے' کیونکہ اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خطاب ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ خطاب بہ طور امتنان اور احسان ہے' اس لیے ضروری ہے کہ اس سے امامت کا اعلیٰ درجہ مراد لیا جائے اور وہ نبوت ہے' دوسری وجہ یہ ہے کہ الناس میں لام استغراق ہے اور اس کا معنی ہے: میں تم کو تمام لوگوں کا امام بنانے والا ہوں' اور جو تمام لوگوں کا امام ہو وہ نبی ہوتا ہے' تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں امام سے مراد امام معصوم ہے کیونکہ جب حضرت ابراہیم نے کہا: اور میری اولاد سے بھی' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا' اور امام معصوم صرف نبی ہوتا ہے' اس لیے اس آیت میں امام سے مراد نبی ہے۔

تمام مسلمانوں کے امیر کو بھی امام کہتے ہیں' اس کی تعریف یہ ہے: جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب اور خلیفہ ہو اور اس کو دین اور دنیا کے تمام امور میں ریاست عامہ حاصل ہو' علامہ تفتازانی نے لکھا ہے کہ امت کے لیے ایک امام ضروری ہے جو دین کے احکام کو زندہ کرے' سنت کو قائم کرے' مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے اور حق داروں کو ان کے حقوق پہنچائے' امام کے تقرر کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ مکلف ہو' مسلمان ہو' نیک ہو' آزاد ہو' مرد ہو' مجتہد ہو' بہادر ہو' صاحب رائے ہو' سمیع' بصیر اور ناطق ہو' اور قرشی ہو' اس کے لیے ہاشمی ہونا' معصوم ہونا اور سب سے افضل ہونا ضروری نہیں ہے۔

(شرح المقاصد ج ۵ ص ۲۳۳۔ ۲۳۲' مطبوعہ منشورات الرضی' ایران' ۱۴۰۹ھ)

اہل تشیع کے نزدیک امامت کا شرعی معنی اور بحث ونظر

محققین شیعہ کی کتاب ''تفسیر نمونہ'' میں لکھا ہے:

دنیاوی حکومت یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی حدود کو جاری کرنا' اور دینی تربیت یعنی لوگوں کے ظاہر و باطن کو شریعت کے مطابق اور پاک اور صاف بنانا ان دونوں منصبوں کا مجموعہ امامت ہے' اور یہ مرتبہ رسالت اور نبوت سے بلند تر ہے' کیونکہ رسالت اور نبوت سے صرف اللہ کے احکام کی تبلیغ کی جاتی ہے' ڈرایا جاتا ہے اور خوشخبری دی جاتی ہے' اور امامت میں اس کے ساتھ ساتھ ظاہر اور باطن کی تربیت بھی کی جاتی ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ امامت کا معنی صرف اراءت طریق (نیکی کا راستہ دکھانا) نہیں ہے بلکہ اس کا معنی ایصال بہ مطلوب (صالح مومن بنا دینا) ہے۔ امام کا یہ منصب بارہ اماموں پر صادق آتا ہے' اور بعض بزرگ انبیاء علیہم السلام کو بھی امامت کا یہ منصب حاصل ہے۔

نبوت کا معنی ہے: اللہ کی وحی کو حاصل کرنا' رسالت کا معنی ہے: وحی الٰہی کی تبلیغ کرنا اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بندوں تک

[1] امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ' صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ

پہنچانا' اور امامت کا معنی ہے: دنیا میں احکام الٰہی کو جاری کرنا اور خلق خدا کے ظاہر اور باطن کو نیک بنانا' خلاصہ یہ ہے کہ نبوت اور رسالت کا منصب اراءت طریق ہے اور امامت کا مرتبہ ایصال بہ مطلوب ہے۔

(تفسیر نمونہ ج ۱ ص ۴۴۱ - ۴۳۸ مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ ایران' ۱۳۶۹ھ)

علماء شیعہ کا یہ کہنا کہ امامت کا منصب ایصال بہ مطلوب ہے' اس لیے صحیح نہیں ہے کہ پھر اماموں کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے اپنے زمانوں میں سب لوگوں کو مومن بنا دیتے اور کوئی کافر' مشرک اور فاسق و فاجر باقی نہ رہتا' "تفسیر نمونہ" میں اس کا یہ جواب لکھا ہے کہ ائمہ لوگوں کو جبراً مسلمان نہیں بناتے بلکہ ان کو ان کے اختیار سے مسلمان کرتے ہیں جیسے سورج موجودات کی تربیت کرتا ہے یا بارش زمین کو زندہ کرتی ہے' پھر بھی بہت سی زمینیں مردہ ہیں۔ (تفسیر نمونہ ج ۱ ص ۴۴۵)

اس جواب سے ان کو نجات نہیں ملے گی' یہ جواب اس وقت صحیح ہوتا جب ائمہ کا منصب صرف اراءت طریق یعنی راستہ دکھانا ہوتا خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے' لیکن اس کے برعکس شیعہ کہتے ہیں کہ ائمہ کا منصب ایصال بہ مطلوب ہے اور ظاہر اور باطن میں ہدایت کو پہنچانا ہے تو کیوں نہ ائمہ نے کافروں اور فاسقوں کے باطنوں میں انقلاب برپا کیا اور ان کے دلوں کی کجی کو سیدھا کیا اور کیوں نہ ان کو مسلمان اور صالح بنایا' اس اعتراض سے ان کی جان نہیں چھوٹ سکتی حتیٰ کہ شیعہ یہ اقرار کر لیں کہ ایصال بہ مطلوب صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور انبیاء علیہم السلام اور ائمہ دونوں کا منصب اراءت طریق یعنی راستہ دکھانا ہے' ائمہ کو انبیاء سے بڑھانے کے شوق میں شیعہ نے یہ کہا کہ انبیاء اور مرسلین صرف اراءت طریق کرتے ہیں اور ائمہ ایصال بہ مطلوب کرتے ہیں۔

امامت کو نبوت اور رسالت سے بڑھانے کے لیے شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کو نبوت کے بعد امامت ملی' اس سے معلوم ہوا کہ امامت کا مرتبہ نبوت سے زیادہ ہے' یہ کہنا بھی غلط ہے' اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام بنانے سے شیعہ کی اختراعی امامت مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بعد میں آنے والے تمام انبیاء اور مرسلین کا مبدا اور باپ بنا دیا اور بعد کے تمام انبیاء آپ کی نسل سے مبعوث ہوئے۔

علماء شیعہ کا بارہ اماموں کو انبیاء اور رسل سے افضل اور بلند تر قرار دینا صریح کفر ہے اور بداہۃً باطل ہے' قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝ (آل عمران: ۳۳)

بے شک اللہ نے آدم' نوح' آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہان والوں پر بزرگی دی ہے ۝

آل ابراہیم اور آل عمران میں ان کی اولاد میں سے انبیاء مراد ہیں' خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم سے لے کر حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام نبیوں کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی ہے اور تمام جہان والوں میں وہ ائمہ بھی داخل ہیں جو نبی نہیں ہیں' پس ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام ان سے افضل ہیں' نیز قرآن مجید میں ہے:

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَیْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ وَ زَكَرِیَّا وَ یَحْیٰى وَ عِیْسٰى وَ اِلْیَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ الْیَسَعَ وَ یُوْنُسَ وَ لُوْطًا ؕ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝

اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب عطا کیے' اور ہم نے سب کو ہدایت دی' اور اس سے پہلے ہم نے نوح کو ہدایت دی' اور ان کی اولاد سے داؤد' سلیمان' ایوب' یوسف' موسیٰ اور ہارون کو ہدایت دی' اور ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں ۝ اور زکریا' یحییٰ' عیسیٰ اور الیاس' یہ سب صالحین میں سے

ہیں O اور اسماعیل الیسع یونس اور لوط (کو بھی ہم نے ہدایت دی) اور ہم نے سب کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی O (الانعام: ۸۶۔۸۴)

اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے از حضرت نوح تا آخر تمام نبیوں کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی ہے اور تمام جہان والوں میں غیر نبی ائمہ بھی ہیں' لہٰذا غیر نبی اماموں کا انبیاء اور رسل سے افضل ہونا باطل ہو گیا۔

امام کے معصوم ہونے پر علماء شیعہ کے دلائل اور بحث ونظر

ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں:

تمام علماء امامیہ کا اس پر اجماع ہے کہ امام تمام گناہوں سے از اول عمر تا آخر معصوم ہوتا ہے خواہ وہ گناہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ' سہواً ہوں یا عمداً اور اس پر حسب ذیل دلائل ہیں:

(۱) امام کو مقرر کرنے کا سبب یہ ہے کہ رعیت سے گناہوں کا صدور جائز ہے' اس لیے کوئی ایسا شخص ہونا چاہیے جو ان کو گناہوں سے باز رکھے' اگر امام سے بھی گناہ کا صدور جائز ہو تو اس کے لیے ایک اور امام کی ضرورت ہوگی اور اگر اس سے بھی گناہ کا صدور جائز ہو تو اس کے لیے پھر ایک اور امام کی ضرورت ہوگی اور اس سے تسلسل لازم آئے گا اور وہ باطل ہے اور جو باطل کو مستلزم ہو وہ بھی باطل ہوتا ہے' لہٰذا امام کا معصوم نہ ہونا باطل ہے۔ یہ دلیل اس لیے صحیح نہیں ہے کہ امت کو گناہوں سے باز رکھنے کے لیے نبی کا وجود کافی ہے اور نبی معصوم ہوتا ہے اور نبی کی وفات کے بعد اس کی تعلیمات کافی اور وافی ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے کسی اور امام معصوم کی ضرورت نہیں ہے' اگر امام معصیت کرے گا تو امت کے علماء اور فقہاء قرآن اور حدیث سے اس کی معصیت کی نشان دہی کریں گے اور اگر وہ معصیت پر اصرار کرے گا تو وہ اس کو بشرط استطاعت معزول کر دیں گے۔

(۲) قرآن مجید اور احادیث میں تمام احکام کی تفصیل نہیں ہے' اور غیر معصومین کا اجماع حجت نہیں ہے' لہٰذا شریعت کی حفاظت کے لیے اور احکام کی تفصیل کے لیے امام معصوم کا ہونا ضروری ہے' کیونکہ اگر امام معصوم نہ ہو تو اس کی بتائی ہوئی تفصیل پر اعتماد نہیں ہوگا۔

یہ دلیل بھی صحیح نہیں ہے' کیونکہ اجماع علماء حجت ہے' اگرچہ انفرادی طور پر ہر عالم کی رائے غلط ہو سکتی ہے' لیکن جب کسی زمانہ کے تمام علماء کسی رائے پر متفق ہو جائیں تو وہ حجت ہوگا' کیونکہ کل اور جز کے احکام متغایر ہوتے ہیں' نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ایک سے دو بہتر ہیں' دو سے تین بہتر ہیں' تین سے چار بہتر ہیں' تم جماعت کے ساتھ لازم رہو' کیونکہ اللہ عزوجل میری امت کو صرف ہدایت پر ہی مجتمع کرے گا۔ (مسند احمد ج ۱ ص ۱۴۵' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

نیز فرمایا: میں نے اللہ عزوجل سے یہ سوال کیا کہ وہ میری امت کو گمراہی پر جمع نہ کرے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عطا کر دیا۔

(مسند احمد ج ۶ ص ۳۹۶' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

اور امام ابن ماجہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی[1] اور امام بخاری حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ امت ہمیشہ اللہ کے دین پر قائم رہے گی' کسی کی مخالفت اس کو ضرر نہیں پہنچا سکے گی حتیٰ کہ قیامت آ جائے گی[2] نیز

[1] امام ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ' سنن ابن ماجہ ص ۲۸۳' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[2] امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ' صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ

اجتہادی مسائل میں صرف ظن غالب پر عمل کر لینا کافی ہے' خود شیعہ حضرات تمام فروعی مسائل میں ہر دور میں زندہ مجتہد کے اجتہاد اور اس کے فتویٰ پر عمل کرتے ہیں' امام غائب کے انتظار میں نہیں بیٹھے رہتے' ملا باقر مجلسی نے لکھا ہے کہ امام حسن عسکری کا ۲۶۰ھ میں انتقال ہوا تھا' اس وقت امام محمد بن الحسن جن کو قائم' امام غائب اور امام منتظر کہتے ہیں' ان کی عمر پانچ سال تھی' وہ اس وقت سے غائب ہیں[1] تو گویا ۲۶۵ھ سے تمام شیعہ کسی امام معصوم کے بغیر احکام شرعی پر عمل کر رہے ہیں' لہٰذا ثابت ہوا کہ حفاظت شریعت کے لیے کسی امام معصوم کی ضرورت نہیں ہے۔

(۴) اگر امام سے خطاء واقع ہو تو لوگ اس کو ملامت کریں گے اور یہ اس کی اطاعت کے وجوب کے منافی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ. اللہ کی اطاعت کرو' اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے صاحبان امر ہیں۔ (النساء: ۵۹)

یہ دلیل بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مستقل ہے' اور صاحبان امر کی اطاعت اسی وقت واجب ہے جب وہ اللہ اور رسول کے احکام کے مطابق حکم دیں' امام مسلم' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان شخص پر خوشی اور ناخوشی میں سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے' ماسوا اس کے کہ اس کو معصیت کا حکم دیا جائے' اگر اس کو معصیت کا حکم دیا جائے تو اس پر سننا اور اطاعت کرنا لازم نہیں ہے[2] اگر امام سے معصیت صادر ہو تو اس کو امام بنانے کی غرض فوت ہو جائے گی کیونکہ اس کو امام بنانے کی غرض یہ تھی کہ تمام امت اس کے اقوال اور افعال کی پیروی کرے۔ (حیات القلوب ج ۳ ص ۱۵' مطبوعہ کتاب فروشے اسلامیہ تہران)

یہ دلیل بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ تمام امت پر جس کے تمام اقوال اور افعال کی پیروی لازم ہے وہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور امام کا کام صرف اللہ تعالیٰ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کرانا ہے' نیز امام محمد بن حسن تو ۲۶۵ھ کے بعد غائب ہو گئے تھے' تو ۲۶۵ھ کے بعد سے لے کر اب تک کون سے امام معصوم کے تمام اقوال اور افعال کی پیروی لازم ہے؟

علماء شیعہ کے نزدیک اللہ اور رسول کی تصریح سے امام کا تقرر اور بحث ونظر

ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں:

علماء امامیہ کا اس پر اجماع ہے کہ امام اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مخصوص ہونا چاہیے' اور اس پر حسب ذیل دلائل ہیں۔

(۱) امام کا معصوم ہونا ضروری ہے' اور اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کون معصوم ہے' لہٰذا وہی امام کا تقرر کر سکتا ہے۔
یہ دلیل امام کے معصوم ہونے پر مبنی ہے اور ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ امام کا معصوم ہونا ضروری نہیں ہے۔

(۲) تتبع اور استقراء سے معلوم ہے کہ اگر کوئی قاہر حاکم نہ ہو جو لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی اور فساد سے نہ روکے تو خلق خدا فساد کرتی ہے' اس لیے شریعت کے مطابق اصلاح کے لیے ہر زمانہ میں امام معصوم کا تقرر کرنا لازم ہے' اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرے تو لازم آئے گا کہ وہ فساد سے راضی ہے اور یہ محال ہے۔

---

[1] ملا محمد باقر بن محمد تقی مجلسی متوفی ۱۱۱۰ھ' جلاء العیون (مترجم) ج ۲ ص ۷۹۹' مطبوعہ لاہور

[2] امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۲۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ

یہ دلیل اس لیے صحیح نہیں ہے کہ فساد کو روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا اور ان پر شریعت نازل کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت قیامت تک کے لیے ہے' اور خلفاء راشدین اور ہر زمانہ میں علماء ربانیین اس شریعت پر عمل کرانے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں اور اس جدوجہد کے نتیجہ میں فساد کا ختم ہونا لازم نہیں ہے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں منافقین فساد کرتے رہے' حضرت علی کے دور میں خارجی فساد کرتے رہے' اور اسی طرح باقی گیارہ اماموں کے دور میں فساد ہوتا رہا' نیز ہم پوچھتے ہیں کہ اگر ہر زمانہ میں اللہ کی طرف سے امام معصوم منصوص ہوتا ہے جو شریعت پر عمل کرائے اور فساد دور کرے تو امام حسن عسکری متوفی ۲۶۵ھ' کے بعد کون فساد کو دور کرا رہا ہے؟ کیونکہ امام محمد بن حسن تو ساڑھے گیارہ سو سال سے غائب ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر جو شفقت ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کا کوئی خلیفہ ہو اور مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت امیر المومنین (علی) علیہ السلام کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کی امامت کی تصریح نہیں کی۔

یہ صراحۃً غلط ہے' اس کے برعکس مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت کی تصریح کی ہے۔ امام مسلم روایت کرتے ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری کے ایام میں فرمایا: میرے لیے اپنے باپ ابوبکر اور اپنے بھائی کو بلاؤ' حتیٰ کہ میں ان کو ایک مکتوب لکھ دوں' کیونکہ مجھے یہ خدشہ ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے گا اور کہے گا کہ میں ہی زیادہ (خلافت کا) حق دار ہوں اور اللہ اور مسلمان ابوبکر کے سوا ہر ایک کا انکار کر دیں گے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۴۶' ج ۲ ص ۱۰۷۲۔۱۰۷۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب غزوات میں تشریف لے جاتے تو کسی کو اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کر کے جاتے اس لیے ضروری ہوا کہ وفات کے وقت بھی آپ کسی کو مقرر کرتے۔

(حیات القلوب ج ۳ ص ۱۲۔ ۱۱' مطبوعہ کتاب فروشے اسلامیہ' تہران)

ہاں! لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ آپ حضرت علی کو مقرر کرتے' آپ نے ایام مرض میں حضرت ابوبکر کو نمازوں کا امام مقرر کیا اور حضرت عائشہ سے حضرت ابوبکر کے لیے امر خلافت لکھنے کا اظہار کیا' ان تمام دلائل سے متعین ہے کہ آپ کے نزدیک آپ کے بعد حضرت ابوبکر ہی خلیفہ ہونے تھے۔

علماء شیعہ کے نزدیک امام کو مقرر کرنے کا اللہ پر وجوب اور بحث ونظر

ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا بندوں پر لطف کرنا اور ان کے حق میں زیادہ بہتر کام کو کرنا واجب ہے' اور مسلمانوں کے لیے امام کا وجود اللہ کا لطف ہے۔

یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر بندوں کے حق میں زیادہ بہتر کام کرنا اللہ پر واجب ہو تو بندوں کے حق میں تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ بغیر امام کے از خود نیک کام کریں' کیونکہ کسی کے نیک بنانے کے بعد نیک بننے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ انسان از خود نیک ہو' اور صحیح بات یہ ہے کہ اللہ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔

(۲) تحریف' تغییر' زیادتی اور کمی سے حفاظت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا کوئی محافظ ضروری ہے' اور قرآن مجید میں جو احکام مجمل ہیں ان کی تفصیل کے لیے اور استنباط احکام کے لیے امام ضروری ہے' اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات کے وقت کاغذ اور قلم طلب کیا تھا تاکہ آپ امت کے لیے ایسا مکتوب لکھ دیں جس کے بعد امت ہرگز گمراہ نہ ہو سکے' لیکن ایک شخص نے کہا: ہمیں قرآن کافی ہے' حالانکہ وہ شخص قرآن مجید کی ایک آیت کی بھی تفسیر نہیں جانتا تھا' اور امام باقر نے معتبر سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ڈرانے والے تھے اور ہدایت دینے والے حضرت علی تھے' کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (الرعد: ۷) آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کا ایک ہدایت دینے والا ہے ۝

اور سند صحیح کے ساتھ امام باقر سے منقول ہے کہ اس آیت میں ھادی سے مراد امام ہے یعنی ہر زمانہ میں اللہ کی طرف سے لوگوں کا ایک امام ہوگا جو ان کو ہدایت دے گا اور حلال اور حرام بیان کرے گا۔

(حیات القلوب ج ۳ ص ۴۔ ۳ ملخصاً' مطبوعہ کتاب فروشے اسلامیہ' تہران)

یہ دلیل کئی مغالطہ آفرینیوں پر مبنی ہے' قرآن مجید کی حفاظت کا خود اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا ہے' اس کے لیے الگ محافظ کی ضرورت نہیں ہے' اور قرآن مجید کے احکام کی تفصیل اور استنباط مسائل کے لیے احادیث اور ائمہ مجتہدین کافی ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کاغذ اور قلم لانے کا حکم فرمایا تھا یہ حتمی حکم نہیں تھا ورنہ آپ کو کاغذ اور قلم منگوانے سے کون روک سکتا تھا' اور حضرت عمر کا منع کرنا صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حالت مرض میں زحمت نہ دینے کے لیے آپ کی محبت کے پیش نظر تھا' دین مکمل ہو چکا تھا اور تکمیل دین کی آیت نازل ہو چکی تھی' اگر حضرت عمر کا جواب غلط تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مسترد کر دیتے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان نہیں ہے کہ آپ کے سامنے کوئی غلط بات کہی جائے اور آپ اس پر سکوت فرمائیں' اور کاغذ اور قلم منگوانے سے یہ کب لازم ہے کہ آپ امام کو نامزد کرنے کے متعلق لکھوانا چاہتے تھے اور اگر امام ہی کے متعلق لکھوانا چاہتے تھے تو یہ کب لازم ہے کہ حضرت علی کو امام لکھوانا چاہتے تھے بلکہ آپ حضرت ابوبکر کے متعلق لکھوانا چاہتے تھے جیسا کہ ہم "صحیح مسلم" سے حضرت عائشہ کی روایت نقل کر چکے ہیں۔ حدیث قرطاس کی مکمل بحث ہم نے "شرح صحیح مسلم" جلد رابع میں کر دی ہے' اور رہا یہ کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ڈرانے والے تھے ھادی حضرت علی تھے قرآن مجید کی معنوی تحریف ہے' سیاق و سباق کے ساتھ یہ آیت اور اس کا صحیح ترجمہ اس طرح ہے:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (الرعد: ۷) اور کافر کہتے ہیں: ان پر ان کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ نازل ہوئی؟ (یہ آپ کا کام نہیں) آپ تو صرف (عذاب سے) ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کو ہدایت دینے والے ہیں ۝

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عذاب سے ڈرانے کے ساتھ ہدایت بھی دیتے تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (الشوریٰ: ۵۲) اور بے شک آپ ضرور صراط مستقیم کی ہدایت دیتے ہیں ۝

اس سے بڑا اور کیا ظلم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف ڈرانے والا اور آپ کے مقابلہ میں حضرت علی کو ہدایت دینے والا کہا جائے۔

اہل تشیع کے بارہ اماموں کا بیان

ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں:

شیعہ ان لوگوں کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ مانتے ہیں' اور امامیہ اور اثناء عشریہ ان لوگوں کو کہتے ہیں جو قائم حضرت مہدی تک بارہ اماموں کو مانتے ہیں اور ان کو امام اور اللہ اور رسول کا خلیفہ جانتے ہیں اور امام کے لیے معصوم ہونے کو شرط مانتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی (۱) متوفی ۴۰ھ کو امام اور خلیفہ مانتے ہیں اور ان کے بعد حضرت حسن بن علی (۲) متوفی ۴۹ھ' اور ان کے بعد حضرت حسین (۳) متوفی ۶۱ھ' ان کے بعد حضرت زین العابدین (۴) متوفی ۹۵ھ' ان کے بعد حضرت محمد باقر (۵) متوفی ۱۱۴ھ' ان کے بعد حضرت جعفر بن محمد الصادق (۶) متوفی ۱۴۰ھ' ان کے بعد حضرت علی بن موسیٰ بن جعفر کاظم (۷) متوفی ۱۸۳ھ' ان کے بعد حضرت علی بن موسیٰ الرضا (۸) متوفی ۲۰۳ھ' ان کے بعد حضرت محمد علی تقی (۹) متوفی ۲۲۰ھ' ان کے بعد حضرت علی بن محمد نقی (۱۰) متوفی ۲۵۴ھ' ان کے بعد حضرت حسن بن علی عسکری (۱۱) متوفی ۲۶۰ھ' اور ان کے بعد حجت' ابن الحسن مہدی (۱۲) کو امام منتظر مانتے ہیں۔ یہ پانچ سال کی عمر میں غائب ہو گئے تھے اور تا حال غائب ہیں۔ (حق الیقین ج ۱ ص ۲۷۹ 'مطبوعہ کتاب فروشے اسلامیہ' تہران' ۱۳۵۷ھ)

امام غائب کا نام محمد بن الحسن ہے لیکن اہل تشیع کے نزدیک ان کے ظہور سے پہلے ان کا نام لینے کی اجازت نہیں ہے' وہ مخالفین اور دشمنوں کے خوف سے روپوش ہیں۔ ہم نے ان تمام ائمہ کے سنین وفات ملا باقر مجلسی کی جلاء العیون سے اخذ کیے ہیں' حق الیقین میں صرف ان کے اسماء لکھے ہیں' سنین وفات نہیں ہیں۔

اہل سنت کے نزدیک امامت کو منعقد کرنے کے طریقے

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں: امامت کو منعقد کرنے کے حسب ذیل طریقے ہیں:

(۱) علماء اور روساء میں سے ارباب حل وعقد کسی شخص کو امام منتخب کرلیں' اس میں عدد کی شرط نہیں ہے اور نہ یہ شرط ہے کہ تمام شہروں کے لوگ اس کی امامت پر اتفاق کریں۔

(۲) امام کسی شخص کو اپنا ولی عہد اور خلیفہ نامزد کردے' اور اگر وہ اس کام کے لیے ایک مجلس شوریٰ بنادے اور وہ اپنے اتفاق سے کسی شخص کو خلیفہ بنادیں تو یہ بھی صحیح ہے' اگر امام خلافت سے دستبردار ہو جائے تو یہ اس کی موت کے قائم مقام ہے' پھر امامت ولی عہد کی طرف منتقل ہو جائے گی۔

(۳) کوئی شخص غلبہ اور طاقت سے حکومت پر قبضہ کرلے جب کہ وہ بیعت لینے اور خلافت کی تمام شرائط کا جامع ہو' وہ لوگوں کو اپنی طاقت سے مقہور کرے تو اس کی خلافت منعقد ہو جائے گی' اسی طرح اگر وہ شخص فاسق یا جاہل ہو تو اظہر قول کے مطابق پھر بھی اس کی امامت منعقد ہو جائے گی' الا یہ کہ وہ اپنے افعال سے معصیت کرے (یہ استثناء محل نظر ہے کیونکہ فاسق مرتکب معصیت ہی کو کہتے ہیں' بہ ظاہر یہ علامہ تفتازانی کا تسامح ہے)۔

(شرح المقاصد ج ۵ ص ۲۳۳ 'مطبوعہ منشورات الشریف الرضی' ایران' ۱۴۰۹ھ)

امامت کے مسائل

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

امام عادل ہو یا ظالم جب تک وہ احکام شرع کی مخالفت نہ کرے اس کی اطاعت کرنا واجب ہے اور اظہر قول کے مطابق ایک وقت میں دو اماموں کو مقرر کرنا جائز نہیں ہے' ایک شخص طاقت اور غلبہ سے امام بنا' پھر دوسرے شخص نے طاقت اور غلبہ

سے اس کو معزول کر دیا تو اب یہ امام ہو جائے گا' کسی شخص کو بغیر کسی سبب کے امامت سے معزول کرنا جائز نہیں ہے' اور اگر لوگ اس کو معزول کریں تو یہ عزل نافذ نہیں ہوگا' اگر وہ حکومت چلانے سے عاجز ہو جائے تو پھر معزول ہو جائے گا' فسق اور بے ہوش ہونے سے امام معزول نہیں ہوتا' جنون' اندھا ہونے' بہرا اور گونگا ہونے اور جس مرض سے وہ تمام علوم بھول جائے ان عوارض سے وہ معزول ہو جائے گا۔

(بہرا ہونا پہلے لاینحل مسئلہ تھا' اب ہیئرنگ ایڈ (آلہ سماعت) کی ایجاد کی وجہ سے یہ لاینحل مسئلہ نہیں ہے اس لیے اب اس کو مستثنیٰ کرنا لازم ہے البتہ جس شخص میں بالکل سماعت نہ ہو اس کا معاملہ الگ ہے۔)

(شرح المقاصد ج ۵ ص ۲۳۲۔ ۲۳۳ مطبوعہ منشورات الشریف الرضی ایران' ۱۴۰۹ھ)

امامت کے وجوب پر دلائل

امام مقرر کرنے کے وجوب پر حسب ذیل دلائل ہیں:

(۱) امام مقرر کرنے کے وجوب پر اجماع ہے حتیٰ کہ صحابہ نے اس معاملہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین پر مقدم رکھا۔

(۲) حدود کو قائم کرنا' احکام شرع کو نافذ کرنا اور مسلمانوں کے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا واجب ہے' اور یہ امور امام پر موقوف ہیں اور واجب کا موقوف علیہ بھی واجب ہوتا ہے۔

(۳) عدل و انصاف کو قائم کرنا' ظلم و جور کو دور کرنا' اور معاش اور معاد کی اصلاح کرنا واجب ہے اور یہ امور امام پر موقوف ہیں۔

(۴) کتاب و سنت سے امام کی اطاعت واجب ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ امام کو مقرر کرنا واجب ہو۔

امام کو مقرر کرنے کے وجوب پر اس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (النساء: ۵۹) اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے صاحبان امر ہیں۔

اور اس حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے' امام مسلم حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من مات وليس في عنقه بيعة مات ميتة جاهلية. جو شخص کسی کی بیعت کیے بغیر مرا وہ جاہلیت کی موت مرا۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۲۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

کیا اب امام نہ بنانے کی وجہ سے پوری امت گمراہ ہے؟

واضح رہے کہ امام اس کو کہتے ہیں جو روئے زمین کے تمام اسلامی ملکوں کا واحد امیر ہو' جیسے خلفاء راشدین' خلفاء بنو امیہ اور خلفاء بنو عباس تھے اور امامت کی شرائط مذکورہ بھی اسی کے لیے ہیں اور جو صرف کسی ایک ملک کا امیر ہو اس کو سلطان کہتے ہیں جیسے آج کل اسلامی ممالک کے امراء ہیں' ان میں سے بعض بادشاہ ہیں' بعض منتخب صدر ہیں اور بعض مطلق العنان آمر ہیں جنہوں نے طاقت سے اقتدار پر قبضہ کیا' نہ یہ امام ہیں نہ ان کے لیے امامت کی شرائط ضروری ہیں۔

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

اگر امام کا مقرر کرنا واجب ہو تو لازم آئے گا کہ اکثر زمانوں میں تمام مسلمانوں نے اس واجب کو ترک کیا ہو' کیونکہ صفات مذکورہ کا حامل ان زمانوں میں نہیں رہا' خصوصاً خلافت عباسیہ کے ختم ہونے کے بعد' نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

ارشاد ہے: میرے بعد امت میں خلافت تیس سال رہے گی' پھر اس کے بعد ملوکیت ہو جائے گی۔ (جامع ترمذی ص ۳۲۳ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تیس سال پورے ہو گئے' حضرت معاویہ اور ان کے بعد کے حکمران ملوک اور امراء تھے' ائمہ اور خلفاء نہ تھے' اور تمام مسلمان ترک واجب پر متفق نہیں ہو سکتے' کیونکہ واجب کو ترک کرنا معصیت اور گمراہی ہے اور پوری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ پوری امت کا گمراہ ہونا تب لازم آتا جب وہ قدرت اور اختیار سے اس واجب کو ترک کرتی نہ کہ عجز اور اضطرار سے (اور خلافت عباسیہ ساتویں صدی ہجری میں ختم ہو گئی تھی' اور اسلامی حکومتیں مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئی تھیں' اس وقت چالیس سے زیادہ اسلامی ملک ہیں' اور ان سب کا کسی ایک امت کے ماتحت ہونا بہ ظاہر ممکن نہیں ہے' اس لیے اس دور کے مسلمان امام کے قائم نہ کرنے میں معذور ہیں۔ ہم نے اس مسئلہ کی مفصل اور مکمل تحقیق ''شرح صحیح مسلم'' جلد خامس میں کی ہے) اور یہ حدیث ہر چند کہ خبر واحد ہے' تاہم اس کا محمل یہ ہے کہ خلافت کاملہ یا پے در پے خلافت متصلاً تیس سال تک رہے گی' کیونکہ اس کے بعد بنوامیہ اور بنوعباس میں خلفاء رہے ہیں۔

(شرح المقاصد ج ۵ ص ۲۳۹۔ ۲۳۸ 'مطبوعہ منشورات الشریف الرضی' ایران' ۱۴۰۹ھ)

فاسق کی امامت امت میں فقہاء حنبلیہ کا نظریہ

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

خلاصہ یہ ہے کہ تمام مسلمان جس کی امامت اور بیعت پر متفق ہو جائیں اس کی امامت ثابت ہو جائے گی' امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے دل سے کسی مسلمان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا وہ اس کی حتیٰ المقدور اطاعت کرے' اور اگر کوئی دوسرا شخص اس سے امامت میں نزاع کرے تو اس دوسرے کی گردن اڑا دو' اور حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب میری امت کسی ایک شخص کی امامت پر مجتمع ہو' پھر کوئی دوسرا شخص اس کے خلاف خروج کرے تو اس کی گردن اڑا دو' خواہ وہ کوئی شخص ہو' اور صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہے کہ باغیوں سے قتال کیا جائے گا اور اسی کے حکم میں اس شخص کی امامت ہے' جس کو امام اول نے امام مقرر کر دیا ہو جیسے حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو امام بنایا تھا' اور اگر کوئی شخص امام کے خلاف خروج کرے اور اپنی طاقت سے اس کو زیر کرے اور اپنی تلوار سے مسلمانوں کو مغلوب کرے حتیٰ کہ وہ اس کی اطاعت کا اقرار کر لیں تو اب وہ امام ہو جائے گا اور اس سے قتال کرنا اور اس کے خلاف خروج کرنا حرام ہوگا کیونکہ عبدالملک بن مروان نے حضرت ابن الزبیر کے خلاف خروج کیا' ان کو قتل کر دیا اور تمام ممالک اور ان کے باشندوں پر غلبہ حاصل کر لیا اور سب نے طوعاً و کرھاً اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی' اب وہ امام ہو گیا اور اس کے خلاف خروج حرام ہو گیا۔ (المغنی ج ۹ ص ۵ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

فاسق کی امامت امت میں فقہاء مالکیہ کا نظریہ

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

علماء کی ایک جماعت نے ''لاینال عھدی الظالمین. میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا'' سے یہ استدلال کیا ہے کہ امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ صالح ہو اور نظام سلطنت کو قائم کر سکتا ہو' اور امام مسلم نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اس بات پر بیعت لی کہ جو شخص امامت کا اہل ہوگا ہم اس سے نزاع نہیں کریں گے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۲۵) اور فاسق اور ظالم امامت کے اہل نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''لا ینال عھدی

الظالمین'' اسی وجہ سے حضرت ابن الزبیر اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم نے خروج کیا اور عراق کے صالحین اور علماء نے حجاج کے خلاف خروج کیا' اور اہل مدینہ نے بنو امیہ کے خلاف خروج کیا جس کے نتیجہ میں واقعہ حرہ برپا ہوا۔

اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ظالم امام کی اطاعت پر صبر کرنا اس کے خلاف خروج کرنے سے زیادہ بہتر ہے' کیونکہ اس کے خلاف خروج کرنے میں امن کو خوف سے بدلنا ہے' خون بہانا ہے' مسلمانوں پر لوٹ مار کا دروازہ کھولنا ہے اور زمین میں فساد کرنا ہے' بعض معتزلہ اور خوارج کا مذہب اس کے برعکس ہے کہ ظالم امام کے خلاف خروج کرنا زیادہ بہتر ہے۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے کہ ظالم نہ نبی ہو سکتا ہے' نہ خلیفہ' نہ حاکم' نہ مفتی' نہ نماز کا امام اور نہ اس کی حدیث کی روایت قبول کی جائے گی' نہ احکام میں اس کی شہادت قبول کی جائے گی' البتہ وہ فسق کی وجہ سے از خود معزول نہیں ہوگا' حتیٰ کہ ارباب حل وعقد اس کو معزول کر دیں' اور اس کے دیئے ہوئے سابقہ احکام میں سے جو صحیح ہوں گے وہ بدستور نافذ رہیں گے' امام مالک نے یہ تصریح کی ہے کہ باغیوں اور خوارج کے احکام میں جو احکام کسی بھی اجتہاد کے اعتبار سے صحیح ہوں ان کو باقی رکھا جائے گا' جب تک کہ وہ نصوص کے مخالف نہ ہوں یا اجماع کے منافی نہ ہوں کیونکہ ان پر صحابہ کا اجماع ہے کہ ایام صحابہ میں خوارج نے خروج کیا اور ان کے احکام کو باقی رکھا گیا' انہوں نے جو مسلمانوں سے زکوٰۃ لی تھی اور جو حدود قائم کی تھیں ان کو باطل نہیں قرار دیا گیا۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۰۹۔ ۱۰۸ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

فاسق کی امامت امت میں فقہاء شافعیہ کا نظریہ

علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی لکھتے ہیں:

جس چیز پر علماء کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ اگر مسلمان بغیر فتنہ اور ظلم کے امیر کو معزول کرنے پر قادر ہوں تو ان پر اس کا معزول کرنا واجب ہے' ورنہ ان پر صبر کرنا واجب ہے' بعض علماء سے یہ منقول ہے کہ ابتداءً فاسق کو کسی منصب کا امیر بنانا جائز نہیں ہے' اور اگر کوئی امیر پہلے نیک تھا بعد میں فاسق ہو گیا تو اس کے خلاف خروج کرنے میں اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس کے خلاف خروج کرنے سے منع کیا جائے گا الا یہ کہ اس سے کفر صادر ہو' پھر اس کے خلاف خروج کرنا واجب ہے۔

(فتح الباری ج ۱۳ ص ۸ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تک تم کسی امام سے علی الاعلان کسی ایسے کفر کو نہ دیکھ لو جس پر تمہارے پاس اللہ کی طرف سے دلیل ہو' اس وقت تک اس کے خلاف خروج نہ کرو۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۲۵) اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ امراء اور حکام کی امارت اور حکومت میں ان کی مخالفت نہ کرو اور ان پر اعتراض نہ کرو' ہاں! اگر تم ان میں کوئی ایسی برائی دیکھو جس کا برا ہونا قواعد اسلام سے یقینی طور پر ثابت ہو تو ان پر انکار کرو' اور تم جہاں کہیں بھی ہو حق کو بیان کرو' لیکن ان کے خلاف خروج کرنا اور ان سے قتال کرنا یہ اجماع مسلمین سے حرام ہے' خواہ وہ امراء فاسق اور ظالم ہوں' اور اس کی تائید میں بہ کثرت احادیث وارد ہیں' اور اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ سلطان فسق سے معزول نہیں ہوتا' اور ہماری فقہ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ وہ فسق سے معزول ہو جاتا ہے تو یہ غلط ہے اور اجماع کے خلاف ہے' اس کے معزول نہ ہونے اور اس کے خلاف خروج کے حرام ہونے کی علماء نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس سے فتنہ اور فساد ہوگا اور مسلمانوں کا خون بہے گا' لہٰذا فاسق کو اس کے منصب پر باقی رکھنے کی بہ نسبت اس کو معزول کرنے میں فساد زیادہ ہے' قاضی عیاض مالکی نے کہا کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ کافر کی امامت منعقد نہیں ہوتی' اور اگر اس سے بعد میں کفر صادر ہو تو وہ معزول ہو جائے گا' اور اگر وہ نمازوں کو ترک کرے

یا نماز کی طرف دعوت دینے کو ترک کرے یا بدعت کا ارتکاب کرے تو اس کا بھی یہی حکم ہے اور بعض بصریوں نے کہا: فاسق کی امامت منعقد ہو جائے گی اور اس کو برقرار رکھا جائے گا کیونکہ وہ تاویل کرنے والا ہے' قاضی عیاض نے کہا: اگر امام پر بعد میں کفر طاری ہو یا وہ شریعت میں تغیر کرے یا کسی بدعت کا ارتکاب کرے تو وہ امامت کے منصب سے خارج ہو جائے گا اور اس کی اطاعت ساقط ہو جائے گی' اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں' اس کو معزول کر دیں اور کسی امام عادل کو مقرر کریں بہ شرطیکہ یہ ممکن ہو بدعتی کو معزول کرنا واجب نہیں ہے' ہاں! اگر وہ اس پر قادر ہوں تو پھر واجب ہے' اور اگر ان کا اس (کافر کو معزول کرنے) سے عاجز ہونا یقینی ہو تو وہ اس سرزمین سے ہجرت کر جائیں اور اپنے دین کو بچائیں' قاضی عیاض نے کہا: فاسق کی امامت ابتداءً منعقد نہیں ہوتی' اور اگر خلیفہ بعد میں فسق کرے تو بعض نے کہا: اس کو معزول کرنا واجب ہے بہ شرطیکہ اس سے فتنہ اور جنگ نہ ہو' اور جمہور اہل سنت کے فقہاء' محدثین اور متکلمین نے یہ کہا کہ امام اور خلیفہ ظلم اور فسق سے معزول نہیں کیا جائے گا اور اس کے خلاف خروج جائز نہیں ہے' بعض علماء نے یہ کہا کہ اس پر اجماع ہے' اس پر یہ اعتراض ہے کہ حضرت حسن' حضرت ابن الزبیر اور اہل مدینہ نے بنو امیہ کے خلاف خروج کیا اور قرن اول کے مسلمانوں نے حجاج کے خلاف خروج کیا' اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے اس مسئلہ میں اختلاف تھا' بعد میں اس پر اجماع ہو گیا کہ امام اور خلیفہ اگر خلافت کے بعد فسق کرے تو اس کے خلاف خروج سے منع کیا جائے گا۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۱۲۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

فاسق کی امامت امت میں فقہاء احناف کا نظریہ

علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں:

اس آیت ''لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ۝'' (البقرہ: ۱۲۴) سے ثابت ہوتا ہے کہ فاسق کا نبی ہونا جائز ہے نہ نبی کا خلیفہ ہونا جائز ہے نہ قاضی نہ مفتی' نہ حدیث کی روایت کرنا' نہ کسی معاملہ میں شہادت دینا' اور اس کے لیے ہر وہ منصب ناجائز ہے جس کی رو سے دوسروں پر اس کی کوئی چیز لازم ہو اور یہ آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ نماز کے ائمہ نیک اور صالح ہونے چاہئیں نہ کہ فاسق اور ظالم' کیونکہ اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امور دین میں امامت کے منصب کے لیے عادل اور صالح ہونا ضروری ہے۔

بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں فاسق کا امام اور خلیفہ ہونا جائز ہے اور یہ کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک فاسق حاکم اور قاضی تو نہیں بن سکتا' امام اور خلیفہ ہو سکتا ہے' متکلمین میں سے زرقان نے اس کو ذکر کیا اور یہ بالکل جھوٹ اور باطل ہے' امام ابوحنیفہ کے نزدیک خلیفہ اور قاضی دونوں کے لیے عادل اور صالح ہونا شرط ہے اور فاسق کے لیے دونوں منصب جائز نہیں ہیں' امام ابوحنیفہ کی طرف اس چیز کی نسبت کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہوگی حالانکہ بنو امیہ کے ایام میں ابن ھبیرہ نے امام ابوحنیفہ کو قضاء کے عہدہ کے لیے مجبور کیا لیکن آپ نے اس منصب کو قبول نہیں کیا' اس نے آپ کو قید کر لیا اور وہ ہر روز آپ کو کوڑے مارتا تھا لیکن آپ نے اس کو قبول نہیں کیا' حتیٰ کہ جب آپ کی جان کا خوف ہوا تو فقہاء نے یہ کہا: آپ اس کا کوئی اور کام قبول کر لیں تو آپ نے گھاس کے گٹھوں کا گننا قبول کر لیا' تب اس نے آپ کو رہا کیا' پھر بنو عباس کے دور میں خلیفہ منصور نے آپ کو قضا کے عہدہ کو قبول کرنے کا حکم دیا' آپ نے پھر انکار کیا' اس نے بھی آپ کو قید کر لیا' حتیٰ کہ آپ نے مضافات شہر سے بغداد میں آنے والی اینٹوں کے گننے کو قبول کر لیا' ظالم اور فاسق ائمہ کے متعلق امام ابوحنیفہ کا مذہب مشہور تھا' زید بن علی امامت کے مدعی تھے اور وہ اس منصب کے لیے موزوں تھے' امام ابوحنیفہ ان کی مالی امداد کرتے تھے اور ان کی نصرت کرنے اور ان کی حمایت میں قتال کرنے کا خفیہ طور پر فتویٰ دیتے تھے۔ اسی طرح عبداللہ بن حسن کے دو صاحبزادوں

محمد اور ابراہیم کی بھی انہوں نے تائید کی' امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ جب قاضی فی نفسہ عادل اور صالح ہو تو اس کا ظالم امام کی طرف سے منصب قضا کو قبول کرنا جائز ہے' یہ صحیح مذہب ہے' لیکن اس سے لازم نہیں آتا کہ امام ابو حنیفہ فاسق کی امامت کو جائز کہتے ہیں کیونکہ جب قاضی خود صالح ہوگا اور اس کو اقتدار حاصل ہوگا تو وہ احکام شرعیہ کو نافذ کر سکے گا۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۷۱۔۶۹ 'ملخصاً' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور)

علامہ جصاص کے ذکر کردہ قاعدہ سے تو یہ لازم آتا ہے کہ امام اعظم قضاء کے عہدہ کو قبول کر لیتے۔

علامہ ابن ہمام حنفی لکھتے ہیں:

امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ مرد ہو' نیک ہو' قادر ہو' صاحب رائے ہو اور بہادر ہو تاکہ قصاص لینے میں' حدود قائم کرنے میں' میدان جنگ میں اور لشکر تیار کرنے میں بزدلی نہ کرے اور وہ قریشی ہو' اور اس کا ہاشمی ہونا اور معصوم ہونا شرط نہیں ہے' بعض علماء نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ وہ اصول دین اور فروع میں اجتہاد کر سکتا ہو اور بعض کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے' اور ائمہ حنفیہ کے نزدیک امامت کی صحت کے لیے عدالت (نیک ہونا اور فاسق نہ ہونا) شرط نہیں ہے' اس لیے فاسق کو بھی امام بنانا جائز ہے لیکن یہ مکروہ ہے' اور جب نیک شخص کو امام بنایا جائے اور وہ بعد میں فاسق ہو جائے تو وہ معزول نہیں ہوگا لیکن وہ معزول کیے جانے کا مستحق ہوگا بہ شرطیکہ اس میں فتنہ نہ ہو' اس کو نیکی کی دعوت دی جائے اور اس کے خلاف خروج کرنا واجب نہیں ہے' اسی طرح فقہاء احناف نے امام ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے اور تمام ائمہ احناف نے بالاتفاق اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے بعض بنو امیہ کی اقتداء میں نمازیں پڑھی ہیں اور ان کے دیئے ہوئے عہدے قبول کیے ہیں لیکن اس توجیہ پر یہ اعتراض ہے کہ یہ بنو امیہ امام نہ تھے بلکہ ملوک تھے' انہوں نے غلبہ سے ملک پر قبضہ کر لیا تھا' اور متغلب کے دیئے ہوئے عہدوں کو ضرورت کی بناء پر قبول کرنا جائز ہے' اور کسی کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ نیک ہو (کیونکہ امام ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہر امام کے ماتحت تم پر جہاد کرنا واجب ہے خواہ وہ نیک ہو یا بد اور ہر مسلمان کی نماز جنازہ پڑھنا تم پر واجب ہے خواہ وہ نیک ہو یا بدکار' اور گناہ کبیرہ کرتا ہو)۔

(سنن ابو داؤد ج ۱ ص ۳۴۳ 'مسایرہ ص ۲۹۲) (المسامرۃ مع المسایرہ ج ۱ ص ۲۹۲۔ ۲۸۶ 'مطبوعہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ' مکران)

علامہ ابن ہمام نے امام کے متعلق جو نیک ہونے کی شرط لگائی ہے اس کے متعلق علامہ کمال بن ابی شریف لکھتے ہیں:

علامہ ابن ہمام نے امام کے لیے ورع (نیک) کی شرط لگانے میں حجۃ الاسلام امام غزالی (شافعی) کی اتباع کی ہے اور اس سے مقصود فاسق سے احتراز کرنا ہے کیونکہ وہ بسا اوقات خواہش نفس کی پیروی میں بیت المال کا غلط استعمال کرے گا اور مسلمانوں کے حقوق ضائع ہو جائیں گے۔ (المسامرہ ج ۱ ص ۲۸۷ 'مطبوعہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ' مکران)

علامہ محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

امام کے لیے یہ شرائط ہیں: مرد ہو' عاقل بالغ ہو' قادر ہو' قرشی ہو' ہاشمی' علوی یا معصوم ہونے کی شرط نہیں ہے' فاسق کو امام بنانا مکروہ ہے' اگر فتنہ نہ ہو تو وہ فسق کی وجہ سے معزول کر دیا جائے گا اور اس کو نیکی کی دعوت دینا واجب ہے اور جو طاقت سے غلبہ حاصل کر لے اس کی سلطنت صحیح ہے۔ (درمختار ج ۱ ص ۳۶۹۔۳۶۸ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

علامہ حصکفی نے یہ اشارہ کیا ہے کہ امام کے لیے عدالت (نیک ہونے) کی شرط نہیں ہے اور علامہ ابن ہمام نے "مسایرہ" میں امام غزالی کی اتباع میں عدالت کی شرط لگائی ہے۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۳۶۸ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابوالبرکات نسفی حنفی زیر بحث آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت سے معتزلہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ فاسق امام بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا' ہم اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں ظالم سے مراد کافر ہے' یعنی کافر مسلمانوں کا امام نہیں بن سکتا۔

(مدارک التنزیل علی ھامش الخازن ج ۱ ص ۸۷' مطبوعہ دار الکتب العربیہ' پشاور)

علامہ نسفی حنفی کی اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ ائمہ احناف کے نزدیک فاسق امام بن سکتا ہے' علامہ ابن ہمام' علامہ حصکفی علامہ شامی اور صاحب فتاویٰ تاتار خانیہ نے بھی یہی لکھا ہے اور اس مذہب کو امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کیا ہے' اس کے برعکس علامہ ابوبکر جصاص نے یہ لکھا ہے کہ یہ جھوٹ اور افتراء ہے' امام ابوحنیفہ کے نزدیک فاسق کی امامت جائز نہیں ہے' اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ نے اہل بیت میں سے امامت کا دعویٰ کرنے والوں کی خفیہ طور پر مدد کی اور ابن ہبیرہ اور خلیفہ منصور نے ان کو قضا کی جو پیش کش کی تھی اس کو قبول نہیں کیا' واللہ تعالیٰ اعلم۔

فاسق کی امامت نماز میں ائمہ مالکیہ کا نظریہ

جو شخص علی الاعلان گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہو (گناہ صغیرہ پر اصرار بھی گناہ کبیرہ ہے مثلاً بغیر ندامت اور توبہ کے مسلسل ڈاڑھی منڈانا) مثلاً شراب پینا' قتل کرنا' نماز' روزہ' زکوٰۃ اور دیگر فرائض کو ترک کرنا' فرائض قطعیہ کا ترک اور حرام قطعی کا ارتکاب فسق قطعی ہے اور ڈاڑھی منڈانا فسق ظنی ہے۔

فاسق کی امامت کے متعلق فقہاء مالکیہ کے مختلف اقوال ہیں: علامہ خلیل مالکی نے لکھا ہے کہ فاسق کی اقتداء میں نماز باطل ہے۔ (مختصر خلیل مع الخرشی ج ۲ ص ۲۲' مطبوعہ دار صادر' بیروت)

علامہ خرشی مالکی نے لکھا ہے کہ معتمد قول یہ ہے کہ فاسق کی امامت صحیح اور اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

(الخرشی علی مختصر خلیل ج ۲ ص ۲۳' مطبوعہ دار صادر' بیروت)

علامہ عدوی مالکی نے لکھا ہے کہ فاسق کی اقتداء حرام ہے۔ (حاشیۃ العدوی علی الخرشی ج ۲ ص ۲۲' مطبوعہ دار صادر' بیروت)

فاسق کی امامت نماز میں ائمہ حنبلیہ کا نظریہ

فقہاء حنبلیہ کا مذہب یہ ہے کہ فاسق کی امامت ناجائز ہے اور ایک روایت یہ ہے کہ کراہت کے ساتھ اس کی امامت جائز ہے۔

علامہ مرداوی حنبلی لکھتے ہیں:

فاسق کی امامت جائز نہیں ہے اور یہی مذہب ہے' خواہ اس کا فسق از روئے اعتقاد ہو یا از روئے افعال' اکثر اصحاب اور مشائخ کا یہی مختار ہے' زرکشی نے کہا: یہی مشہور ہے' ابن ابی موسیٰ' قاضی' شیرازی اور ایک جماعت کا یہی مختار ہے' "مسبوک الذہب' رعایتین' حاوی صغیر' اور مجمع البحرین میں لکھا ہے کہ صحیح روایت کے مطابق فاسق کی امامت جائز نہیں' ابن عقیل وغیرہ نے "التذکرۃ" میں اسی پر اعتماد کیا ہے" "وجیز" میں لکھا ہے کہ فاسق کی امامت جائز نہیں "الفروع" اور "المستوعب" وغیرھما میں اسی قول کو مقدم کیا ہے۔ شیخ تقی الدین نے کہا ہے کہ صاحب ھوا (بدمذہب) بدعتی اور فاسق کے پیچھے قدرت کے باوجود نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ کراہت کے ساتھ فاسق کی امامت جائز ہے اور ایک روایت یہ ہے کہ نفل میں جائز ہے' البتہ جو از روئے اعتقاد کے فاسق ہو اس کی اقتداء کسی حال میں جائز نہیں' اور مذہب مختار کے مطابق جو شخص فاسق کی اقتداء میں نماز

پڑھے اس کو دہرانا لازم ہے' خواہ اس کو نماز کے وقت اس کے فسق کا علم ہو یا بعد میں پتا چلے خواہ اس کا فسق ظاہر ہو یا نہ' یہی صحیح مذہب ہے۔ (الانصاف ج ۲ ص ۲۵۳۔ ۲۵۲ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۳۷۴ھ)

فاسق کی امامت نماز میں ائمہ شافعیہ کا نظریہ

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

فاسق کی اقتداء میں نماز مکروہ ہے' اور جس کی بدعت کفر کی حد تک نہیں پہنچی اس کے پیچھے بھی نماز مکروہ ہے اور جس کی بدعت حد کفر تک پہنچی ہے اس کی اقتداء میں نماز جائز نہیں ہے' صاحب ''الافصاح'' نے کہا: جو شخص خلق قرآن کا قائل ہو یا جو اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرے وہ کافر ہے' امام ابو حامد اور ان کے متابعین کا یہی مذہب ہے اور معتزلہ کی تکفیر کی جاتی ہے اور خوارج کی تکفیر نہیں کی جاتی' اور ہمارے بہت سے اصحاب اہل بدعت کی اقتداء میں جواز نماز کے قائل ہیں اور ان کی تکفیر نہیں کرتے' صاحب ''العدۃ'' نے کہا: امام شافعی کا ظاہر مذہب یہی ہے۔

(علامہ نووی فرماتے ہیں:) میں کہتا ہوں کہ صاحب ''العدۃ'' کا قول ہی صحیح اور صواب ہے' کیونکہ امام شافعی نے فرمایا: میں خطابیہ کے سوا تمام اہل اھواء کی شہادت کو قبول کرتا ہوں' کیونکہ خطابیہ اپنی موافقت میں جھوٹی گواہی کو جائز کہتے ہیں' اور تمام سلف اور خلف معتزلہ وغیرہ کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے ہیں اور ان کے ساتھ مناکحت' میراث اور مسلمانوں کے تمام معاملات کرتے رہے ہیں اور ہمارے جن علماء اور محققین نے معتزلہ کی تکفیر کی ہے اس تکفیر کی حافظ ابوبکر بیہقی نے یہ تاویل کی ہے کہ کفر' کفران نعمت کے معنی میں ہے' ملت اسلامیہ سے خروج کے معنی میں نہیں ہے۔

(روضۃ الطالبین ج ۱ ص ۳۷۰۔ ۴۵۹ مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ ابو العباس رملی شافعی لکھتے ہیں:

آزاد فاسق کی بہ نسبت نیک غلام کی اقتداء میں نماز پڑھنا اولیٰ ہے' کیونکہ امام حاکم نے روایت کیا ہے: اگر تم کو یہ پسند ہو کہ تمہاری نماز قبول ہو تو تم میں بہتر لوگ تمہاری امامت کریں' اور فاسق کی امامت صحیح ہے کیونکہ حضرت ابن عمر حجاج کی اقتداء میں نماز پڑھتے تھے' اور امام شافعی نے کہا: اس کا فاسق ہونا کافی ہے اور فاسق کی اقتداء اور جس کی بدعت کفر تک نہ پہنچی ہو اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ (نہایۃ المحتاج ج ۲ ص ۱۸۰۔ ۱۷۹ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۴ھ)

علامہ شبراملسی قاہری اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

اگر فاسق اور بدعتی کے سوا جماعت نہ مل سکے تو پھر اس کی اقتداء مکروہ نہیں ہے' فاسق کا از خود امام بننا مکروہ ہے' اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جہاں نیک لوگ ہوں وہاں لوگ اس کی اقتداء کر لیں تو ان کی اقتداء مکروہ نہیں ہے' فاسق کی امامت مکروہ ہے' (الیٰ قولہ) خلاصہ یہ ہے کہ حرمت یا کراہت فاسق کے حق میں ہے اور جو مقتدی فاسق کو مکروہ جانتے ہوں ان کا اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ (حاشیۃ ابی الضیاء علی نہایۃ المحتاج ج ۲ ص ۱۸۰ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۴ھ)

فاسق کی امامت نماز میں ائمہ احناف کا نظریہ

فاسق کی اقتداء میں نماز پڑھنے کے متعلق فقہاء احناف کا اختلاف ہے' بعض علماء کے نزدیک اس کی اقتداء میں نماز مکروہ تحریمی اور واجب الاعادہ ہے اور بعض فقہاء کے نزدیک اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا جائز ہے اور مکروہ تنزیہی ہے۔

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

جو شخص از روئے عمل کے فاسق ہو مثلاً زانی اور شرابی ہو تو ابن الحبیب نے یہ زعم کیا کہ جس نے شرابی کی اقتداء میں نماز

پڑھی وہ ہمیشہ نماز دہرائے الا یہ کہ وہ امام حاکم ہو اور ایک روایت میں ہے کہ فاسق کی اقتداء میں نماز صحیح ہے۔
(عمدۃ القاری ج ۵ ص ۲۳۲ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

علامہ زیلعی حنفی فرماتے ہیں:
فاسق کو جب امامت سے ہٹانا مشکل ہو تو جمعہ اس کے پیچھے پڑھ لے اور جمعہ کے علاوہ نمازیں کسی اور مسجد میں پڑھے۔
(تبیین الحقائق ج ۱ ص ۱۳۵ 'مطبوعہ مکتبہ امدادیہ' ملتان)

علامہ شرنبلالی حنفی لکھتے ہیں:
فاسق عالم کی امامت مکروہ (تحریمی) ہے' کیونکہ وہ احکام دین کا اہتمام نہیں کرتا اس لیے اس کی اہانت شرعاً واجب ہے' لہٰذا اس کو امام بنا کر اس کی تعظیم نہ کی جائے اور اگر اس کو امامت سے ہٹانا دشوار ہو تو جمعہ اور باقی نمازوں کے لیے کسی اور مسجد میں جائے اور اگر صرف وہی جمعہ پڑھاتا ہو تو اس کی اقتداء میں پڑھ لے۔
(مراقی الفلاح ص ۱۸۱ 'مطبوعہ مطبعہ مصطفیٰ البابی واولادہ' مصر' ۱۳۵۶ھ)

اس عبارت کی شرح میں علامہ طحطاوی لکھتے ہیں:
اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ فاسق کی امامت اور اس کی اقتداء مکروہ تحریمی ہے۔
(حاشیہ مراقی الفلاح ص ۱۸۱ 'مطبوعہ مطبعہ مصطفیٰ البابی واولادہ' مصر' ۱۳۵۶ھ)

علامہ حلبی حنفی لکھتے ہیں:
اگر لوگوں نے فاسق کو امام بنایا تو گنہ گار ہوں گے کیونکہ فاسق کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے۔
(غنیۃ المستملی ص ۴۷۹ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' دہلی)

علامہ ابن بزاز کردری لکھتے ہیں:
جو شخص سود خوری میں معروف ہو اس کی اقتداء میں نماز مکروہ ہے' فاسق جمعہ پڑھاتا ہو اور اس کو منع کرنا دشوار ہو تو بعض علماء نے کہا: اس کی اقتداء میں جمعہ پڑھ لے اور اس کی امامت میں جمعہ کو ترک نہ کرے۔
(فتاویٰ بزازیہ علی ہامش الہندیہ ج ۴ ص ۵۵ 'مطبوعہ مطبع کبری امیریہ بولاق' مصر' ۱۳۱۰ھ)

ان علماء کے علاوہ دوسرے فقہاء احناف نے فاسق کی اقتداء میں نماز کو کراہت کے ساتھ جائز لکھا ہے یعنی یہ کراہت تنزیہی ہے کیونکہ کراہت تحریمی جواز کے ساتھ جمع نہیں ہوتی۔

شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں:
امام محمد فرماتے ہیں: نابینا' دیہاتی' غلام' ولد زنا اور فاسق کی امامت جائز ہے اور ان کے علاوہ دوسروں کی امامت میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے (الی قولہ) اس کے بعد علامہ سرخسی فرماتے ہیں کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ فاسق کو امامت کے لیے مقدم کرنا جائز ہے اور مکروہ (تنزیہی) ہے' امام مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ فاسق کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے کیونکہ وہ احکام دین کا اہتمام نہیں کرتا اور اس کی شہادت مردود ہوتی ہے' ہماری دلیل مکحول کی یہ حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر امیر کے ساتھ جہاد واجب ہے اور ہر امام کے پیچھے نماز واجب ہے اور ہر میت کے اوپر نماز واجب ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نیک اور بد کے پیچھے نماز پڑھو۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۳۴۳) (المبسوط ج ۱ ص ۴۰ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۸ھ)
علامہ مرغینانی صاحب "ہدایہ" نے بھی فاسق کی اقتداء میں نماز پڑھنے کو جائز کہا ہے اور اسی حدیث سے استدلال کیا ہے۔

(ہدایہ اولین ص ۱۲۲ مطبوعہ شرکت علمیہ ملتان)

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

اس پر یہ اعتراض ہے کہ یہ حدیث مکحول سے مروی ہے اور ان کا حضرت ابوہریرہ سے سماع نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے اور ہمارے نزدیک حدیث مرسل مقبول ہوتی ہے' اس پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ حدیث متعدد سندوں سے مروی ہے اور اس کی ہر سند میں ضعیف راوی ہیں' اس کا جواب یہ ہے کہ جو حدیث متعدد ضعیف طریقوں سے مروی ہو وہ محققین کے نزدیک درجہ ''حسن'' کو پہنچ جاتی ہے۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۳۰۵ مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

مصنف یہ کہتا ہے کہ اس مسئلہ میں حدیث متصل بھی موجود ہے۔

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عدی بن خیار بیان کرتے ہیں کہ وہ حضرت عثمان کے پاس اس وقت گئے جب باغیوں نے ان کا محاصرہ کیا ہوا تھا' عدی نے کہا: آپ عام مسلمانوں کے امام ہیں اور آپ پر وہ افتاد پڑی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں' اب ہمیں فتنہ کرنے والا (باغی) امام نماز پڑھاتا ہے اور ہم اس میں گناہ سمجھتے ہیں' حضرت عثمان نے فرمایا: نماز لوگوں کے اعمال میں سے اچھا عمل ہے' جب لوگ اچھا کام کریں تو تم ان کے ساتھ اچھا کام کرو اور جب وہ برا کام کریں تو تم ان کی برائی سے اجتناب کرو۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۹۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کی شرح میں علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ جن کی اقتداء میں نماز مکروہ ہے' ان کے پیچھے نماز پڑھ لینا جماعت کو ترک کرنے سے اولیٰ ہے (الیٰ قولہ) اور ''محیط'' میں لکھا ہے کہ اگر فاسق یا بدعتی کے پیچھے نماز پڑھی تو جماعت کا ثواب مل جائے گا' البتہ متقی کے پیچھے نماز پڑھنے کا ثواب نہیں ملے گا' اور ''مبسوط'' میں ہے کہ بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ (تنزیہی) ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۵ ص ۲۳۲ مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

حدیث مکحول بیان کرنے کے بعد علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

(اور فاسق کی اقتداء میں نماز کا جواز اس لیے ہے کہ) صحابہ اور تابعین حجاج کی اقتداء میں جمعہ اور دوسری نمازیں پڑھنے سے احتراز نہیں کرتے تھے حالانکہ وہ اپنے زمانہ کا بدترین فاسق شخص تھا' حسن نے کہا: اگر ہر امت اپنے اپنے خبیثوں کو لے کر آئے اور ہم صرف حجاج کو لے کر آئیں تو ہم غالب رہیں گے (اور فاسق کی اقتداء میں) کراہت کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کی اقتداء میں نماز پڑھنے سے گریز کریں گے' امام ابو یوسف نے ''امالی'' میں کہا: میرے نزدیک امام کا صاحب بدعت ہونا اس لیے مکروہ ہے کہ لوگ اس کی اقتداء میں نماز پڑھنے سے متنفر ہوں گے۔ (المبسوط ج ۱ ص ۴۱۔ ۴۰ مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت)

علامہ قاضی خاں اوزجندی حنفی فرماتے ہیں:

جہمیہ' قدریہ اور غالی رافضی کے سوا باقی لوگوں کی اقتداء میں نماز پڑھنا جائز اور مکروہ (تنزیہی) ہے' اسی طرح اس شخص کی اقتداء بھی جائز ہے جو سود خوری میں معروف ہو اور فاسق معلن ہو' یہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ سے مروی ہے' اور جب کوئی شخص فاسق یا بدعتی کے پیچھے نماز پڑھ لیتا ہے تو اس کو جماعت کا ثواب مل جاتا ہے۔

(فتاویٰ قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ج ۱ ص ۹۲۔ ۹۱ مطبوعہ بولاق' مصر' ۱۳۱۰ھ)

علامہ ابن ہمام حنفی لکھتے ہیں:

''محیط'' میں لکھا ہے کہ اگر فاسق یا بدعتی کے پیچھے نماز پڑھی تو اس کو جماعت کا ثواب مل جائے گا لیکن متقی امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا ثواب نہیں ملے گا' اھ۔

''محیط'' کی عبارت میں بدعتی سے مراد وہ شخص ہے جس کی بدعت کفر تک نہ پہنچی ہو اور اس تفصیل کے ساتھ تمام اہل اہواء کی اقتداء میں نماز جائز ہے' البتہ جہمیہ' قدریہ' غالی روافض' خلق قرآن کے قائلین' خطابیہ اور مشبہہ کے پیچھے نماز جائز نہیں' خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص ہمارے قبلہ والا ہو اور غلو نہ کرتا ہو اور اس کی تکفیر نہ کی گئی ہو اس کے پیچھے نماز کراہت کے ساتھ جائز ہے' البتہ عذاب قبر' شفاعت' رویت باری اور کراماً کاتبین کے منکروں کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے۔

(فتح القدیر ج ۱ ص ۳۰۴' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر)

علامہ ابن نجیم حنفی فرماتے ہیں:

اگر تم یہ سوال کرو کہ ان لوگوں کی اقتداء میں نماز پڑھنا افضل ہے یا تنہا نماز پڑھنا بہتر ہے اس کا جواب یہ ہے کہ فاسق کی اقتداء میں نماز پڑھنا بہر حال بہتر ہے جیسا کہ ہم اس سے پہلے کتب فتاویٰ سے نقل کر چکے ہیں' خلاصہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا امام بننا اور ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے' اگر ان کے علاوہ کسی اور کی اقتداء میں نماز پڑھنا ممکن ہو تو فبہا ورنہ تنہا نماز پڑھنے سے ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا اولیٰ ہے' اور ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا اس وقت مکروہ ہے جب دوسروں کی اقتداء میں نماز پڑھنا میسر ہو ورنہ کوئی کراہت نہیں ہے۔ (البحر الرائق ج ۱ ص ۳۴۹' مطبوعہ مطبعہ علمیہ' مصر' ۱۳۱۱ھ)

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

غلام' اعرابی' فاسق اور نابینا کی امامت مکروہ تنزیہی ہے۔

(در مختار علی ہامش رد المحتار ج ۱ ص ۳۷۶' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

علامہ ابن عابدین شامی مکروہ تنزیہی کی وجہ میں لکھتے ہیں:

کیونکہ امام محمد نے اصل (مبسوط) میں لکھا ہے کہ ان لوگوں کے غیر کی امامت میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے' پھر فرمایا: ان کا امام بننا اور ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے' اگر ان کے علاوہ دوسروں کی اقتداء میں نماز پڑھنا ممکن ہو تو افضل ہے ورنہ اکیلے نماز پڑھنے سے ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا بہتر ہے۔

(رد المحتار ج ۱ ص ۳۷۶' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ طحطاوی نے بھی ''در مختار'' کی شرح میں کراہت تنزیہی کی یہی وجہ بیان کی ہے اور یہی لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اکیلے نماز پڑھنے کی بہ نسبت فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا اولیٰ ہے۔

(حاشیۃ الطحطاوی علی الدر ج ۱ ص ۲۴۲' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۵ھ)

علامہ عالم بن العلاء الانصاری لکھتے ہیں:

بدعتی خواہ فاسد تاویل کرتا ہو اگر اس کی بدعت حد کفر تک نہ پہنچی ہو تو اس کی اقتداء میں نماز کراہت (تنزیہی) کے ساتھ جائز ہے (الی قولہ) ''منتقی'' میں مذکور ہے: امام محمد سے شارب خمر کی اقتداء کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: اس کی اقتداء میں نماز نہیں پڑھنی چاہیے اور اس میں کراہت (تحریمی) نہیں ہے۔

امام ابو یوسف کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے۔ (فتاویٰ تاتارخانیہ ج ۱ ص ۶۰۲ - ۶۰۱' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۱۱ھ)

علامہ عبداللہ بن محمود بن مودود موصلی حنفی لکھتے ہیں:

فاسق کی اقتداء میں نماز کراہت (تنزیہی) کے ساتھ جائز ہے۔ (الاختیار ج ۱ ص ۵۸ مطبوعہ دار فراس للنشر والتوزیع مصر)

علامہ طاہر بن عبد الرشید بخاری حنفی لکھتے ہیں:

اگر فاسق یا بدعتی کے پیچھے نماز پڑھی تو اس کو جماعت کا ثواب مل جائے گا لیکن ایسا ثواب نہیں ملے گا جو متقی کے پیچھے نماز پڑھنے سے ملتا ہے۔ (جامع الرموز ج ۱ ص ۱۵۰ مطبوعہ منشی نولکشور لکھنؤ)

علامہ قہستانی لکھتے ہیں:

اعرابی فاسق' نابینا اور بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج ۱ ص ۷۷ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

ملا علی قاری لکھتے ہیں:

صحیح یہ ہے کہ فاسق کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز کا اعادہ نہیں ہے (الی قولہ) ''منتقی'' میں لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ سے اہل سنت و جماعت کے مذہب کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا: تم حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو فضیلت دو' حضرت عثمان اور حضرت علی سے محبت رکھو' موزوں پر مسح کو جائز سمجھو اور ہر نیک اور بد کے پیچھے نماز پڑھو (کیونکہ معتزلہ فاسق کی امامت کے قائل نہیں ہیں)۔ (شرح فقہ اکبر ص ۷۶ مطبوعہ مطبع مصطفی البابی واولادہ مصر ۱۳۷۵ھ)

علامہ ابوسعود حنفی لکھتے ہیں:

اگر غیر فاسق موجود ہو تو فاسق کی اقتداء میں نماز مکروہ تنزیہی ہے ورنہ کوئی کراہت نہیں ہے (بحر) اور ''النہر'' میں لکھا ہے کہ فاسق اور بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے سے جماعت کا ثواب مل جائے گا۔ (فتح المعین علی ملا مسکین ج ۱ ص ۲۰۸۔ ۲۰۷)

خلاصہ یہ ہے کہ فقہاء احناف میں سے امام ابویوسف (۱) علامہ زیلعی حنفی (۲) علامہ شرنبلالی (۳) علامہ حلبی حنفی (۴) اور علامہ ابن بزاز کردری (۵) کے نزدیک فاسق کی اقتداء میں نماز مکروہ تحریمی ہے اور امام ابوحنیفہ (۱) امام محمد شیبانی (۲) شمس الائمہ سرخسی (۳) علامہ قاضی خاں اوزجندی (۴) علامہ المرغینانی صاحب ''ہدایہ'' (۵) علامہ ابن ہمام (۶) صاحب ''محیط'' (۷) علامہ ابن نجیم حنفی (۸) علامہ علاؤ الدین حصکفی (۹) علامہ ابن عابدین شامی (۱۰) علامہ سید طحطاوی (۱۱) علامہ عالم بن العلا انصاری دہلوی صاحب ''فتاویٰ تاتارخانیہ'' (۱۲) علامہ عبداللہ بن محمود صاحب ''الاختیار'' (۱۳) علامہ عبد الرشید بخاری صاحب ''خلاصۃ الفتاویٰ'' (۱۴)' علامہ قہستانی (۱۵) علامہ ابوسعود حنفی (۱۶) صاحب ''النہر الفائق'' (۱۷) اور ملا علی قاری (۱۸) کے نزدیک فاسق کی اقتداء میں نماز مکروہ تنزیہی ہے۔

فقہاء احناف کے ان کثیر حوالہ جات کو پیش کرنے سے ہمارا مقصد فاسق کی امامت کی حوصلہ افزائی نہیں ہے بلکہ اس سے ہمارا صرف اتنا مقصد ہے کہ یہ محقق ہو جائے کہ اس مسئلہ میں فقہاء احناف کا کیا مذہب ہے۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ کسی متقی امام کی اقتداء نہ ملنے کی وجہ سے فاسق کی اقتداء میں نماز پڑھ لینا ایک الگ چیز ہے اور اسی کو فقہاء احناف نے کراہت تنزیہی کے ساتھ جائز کہا ہے اور کسی فاسق معلن کا از خود امام بننا یا لوگوں کا اس کو امام بنا دینا ایک الگ بات ہے اور فقہاء احناف میں سے کسی نے اس کو جائز نہیں کہا' یہ بالاتفاق مکروہ تحریمی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ولا یوم فاجر مومنا. کوئی فاسق کسی مومن کا امام نہ بنے''۔ (سنن ابن ماجہ ص ۷۵) امام بیہقی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو تم میں سے سب سے بہتر ہوں ان کو امام بناؤ۔ (سنن کبریٰ ج ۳ ص ۹۰) اس لیے جب امام بننے کا مرحلہ ہو تو اس شخص کو امام بنایا جائے جو عالم اور متقی ہو' اور جو شخص فاسق معلن ہو اس کو امام بنانا ناجائز اور گناہ ہے' ڈاڑھی منڈانے والا بھی فاسق معلن ہے اگرچہ اس کا فسق ظنی ہے' اس کو امام نہ بنایا جائے اور جو شخص فرنچ کٹ

ڈاڑھی یا خشخشی ڈاڑھی رکھتا ہو اس کو بھی امام نہ بنایا جائے' جس شخص کی ڈاڑھی سنت کے مطابق ہو اور اس کا ظاہر حال نیک ہو' وہ عالم ہو اور اس پر کسی وجہ سے فسق کی تہمت نہ ہو اس کو امام بنایا جائے' ''شرح صحیح مسلم'' جلد دوم میں بھی میں نے یہی تحقیق کی ہے' فاسق کے امام بنانے یا از خود امام بننے کو ناجائز لکھا ہے۔ (شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۱۰) اور اس کی اقتداء میں نماز پڑھنے کو اکثر یا بعض فقہاء کے حوالوں سے جائز لکھا ہے۔ (شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۱۱) لیکن بعض معاندین نے ان عبارات کو گڈ مڈ کر دیا اور میری طرف یہ منسوب کیا کہ وہ فاسق اور ڈاڑھی منڈے کے امام بنانے کو جائز کہتے ہیں' فالی اللہ المشتکی۔ اسی طرح میں نے فاسق کی اقتداء میں نماز پڑھنے کے متعلق مذاہب بیان کیے اور باحوالہ لکھا کہ بعض احناف کے نزدیک اس کی اقتداء میں نماز مکروہ تحریمی ہے اور اکثر احناف کے نزدیک اس کی اقتداء میں نماز مکروہ تنزیہی ہے اور ان سب کے حوالہ جات بیان کیے لیکن بعض معاندین نے ان حوالوں کو حذف کر کے میری طرف یہ منسوب کر دیا کہ ایک جگہ یہ فاسق کی اقتداء میں نماز کو مکروہ تحریمی کہتا ہے اور ایک جگہ مکروہ تنزیہی کہتا ہے' خیر اللہ تعالیٰ کے ہاں ان سب باتوں کا حساب ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (ابراہیم نے کہا:) اور میری اولاد سے بھی! اللہ نے فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا O (البقرہ: ۱۲۴)

حضرت ابراہیم کے مطلقاً ذریت کے لیے دعا کرنے کی توجیہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں سے بعض کے لیے امامت کی دعا کی' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا' حضرت ابراہیم علیہ السلام کو علم تھا کہ ظالم اور کافر امام نہیں بن سکتے لیکن اس دعا کے وقت ان کا ذہن اس طرف متوجہ نہیں تھا اس لیے انہوں نے اپنی دعا میں یہ قید نہیں لگائی کہ میری اولاد میں سے مومنین اور صالحین کو امامت عطا فرما اور مطلقاً عرض کیا: اور میری اولاد سے بھی' اللہ تعالیٰ نے مسئلہ واضح کرنے کے لیے فرما دیا کہ میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ

اور (یاد کیجئے) جب ہم نے بیت اللہ (کعبہ) کو لوگوں کے لیے معبد اور امن کی جگہ بنا دیا' اور مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے

مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ

کی جگہ بنا لو اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے تاکیداً فرمایا کہ میرے گھر کو

اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

طواف کرنے والوں' اعتکاف کرنے والوں' رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو O

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ

اور (یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب! اس جگہ کو امن والا شہر بنا دے اور اس میں رہنے والوں میں

اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ

سے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائیں ان کو پھلوں سے رزق عطا فرما'

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ

فرمایا: اور جس نے کفر کیا میں اس کو (بھی) تھوڑا سا فائدہ پہنچاؤں گا' پھر اس کو مجبور کر کے دوزخ میں ڈالوں گا'

وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٢٦﴾

اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانہ ہے O

''مثابة'' کا معنی ہے: لوٹنے کی جگہ کیونکہ جو شخص بھی بیت اللہ سے واپس جاتا ہے وہ سیر نہیں ہوتا اور پھر دوبارہ وہاں جاتا ہے یا جانا چاہتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی ہو: اجر و ثواب کی جگہ' کیونکہ عبادت پر جس قدر اجر و ثواب یہاں ملتا ہے کہیں اور نہیں ملتا۔

حرم میں قصاص لینے اور حدود جاری کرنے کے متعلق مذاہب ائمہ

''امنا'' کا معنی ہے: امن کی جگہ' ہر چند کہ یہ بیت اللہ کی صفت ہے لیکن اس سے مراد پورا حرم ہے۔

اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ کعبہ میں کسی پر حد نہیں جاری کی جائے گی لیکن باقی حرم میں بھی حد جاری کی جائے گی یا نہیں؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ حرم میں حد جاری کی جائے گی اور ''من دخله كان امنا'' منسوخ ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۱۱' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

امام رازی شافعی لکھتے ہیں:

حرم میں حد جاری کرنا جائز ہے کیونکہ حضرت عاصم بن ثابت بن افلح اور حضرت خبیب کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اگر وہ قادر ہوں تو ابوسفیان کو مکہ میں اس کے گھر میں قتل کر دیں اور اس وقت مکہ حرم تھا' اور قرآن مجید میں جو ہے: یہ امن کی جگہ ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جنگ نہیں کی جائے گی یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قحط اور آفات سے امن کی جگہ بنا دیا ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۴۷۲' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ جس شخص نے کسی اور جگہ جرم کیا ہو پھر وہ حرم میں آ کر پناہ لے لے' تو وہ مامون ہے لیکن اہل مکہ کو چاہیے کہ وہ اس کو کوئی چیز فروخت کریں نہ کھلائیں نہ پلائیں اور نہ اس کو پناہ دیں نہ اس سے کلام کریں حتیٰ کہ وہ حرم کی حدود سے نکل جائے اور جب وہ حرم کی حدود سے باہر آ جائے تو اس پر حد جاری کر دیں۔ امن کی جگہ بیت اللہ کی صفت ہے لیکن اس سے مراد پورا حرم ہے جیسے فرمایا: ''هديا بالغ الكعبة. قربانی جو کعبہ کو پہنچنے والی ہے۔'' یہاں بھی کعبہ سے مراد پورا حرم ہے کیونکہ کعبہ اور مسجد حرام میں جانور کو ذبح نہیں کیا جاتا۔

(زاد المسیر ج ۱ ص ۱۴۱' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک حرم میں کسی شخص سے قصاص لیا جائے گا نہ کسی پر حد جاری کی جائے گی' اگر کسی مجرم نے حرم میں آ کر پناہ لے لی تو اس پر کھانا پینا بند کر دیا جائے گا اور اس سے کوئی معاملہ نہیں کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ حرم سے باہر آ جائے اور جب وہ باہر آ جائے گا تو اس پر حد جاری کر دی جائے گی۔ (روح المعانی ج ۱ ص ۳۷۸' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ آیت ہے:

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (آل عمران: ۹۷) اور جو حرم میں داخل ہو وہ مامون ہے۔

علامہ قرطبی مالکی نے جو کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے' اس پر انہوں نے کوئی دلیل قائم نہیں کی' اور امام رازی شافعی نے جو لکھا ہے کہ حضرت عاصم اور حضرت خبیب کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ مکہ میں جا کر ابوسفیان کو قتل کر دیں یہ برتقدیر صحت روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت پر محمول ہے' نیز امام رازی نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس شہر میں جنگ نہیں کی جائے گی یا یہ شہر قدرتی آفات سے مامون ہے یہ تاویلات اس آیت سے مطابقت نہیں رکھتیں: جو حرم میں داخل ہو وہ مامون ہے' ظاہر قرآن میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد کی تائید ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔ (البقرہ: ۱۲۵)

مقام ابراہیم کی تعیین کی تحقیق

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کے دوران یہ جملہ معترضہ ہے اور اس کی توجیہ یہ ہے کہ جب ہم نے کعبہ کو یہ عظمت اور جلالت عطا کی کہ اس کو مشرق اور مغرب سے لوگوں کے بار بار آنے کی جگہ بنادیا اور اس کو تمہارے لیے عبادت اور امن کی جگہ بنادیا اور اس کو تمام روئے زمین کے نمازیوں کے لیے قبلہ بنادیا تو جس شخص نے اس عظیم کعبہ کو بنایا ہے اس کے کھڑے ہونے کی جگہ کو تم اپنا مصلیٰ بنالو۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے کہا: میں نے اپنے رب کی تین چیزوں میں موافقت کی ہے' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کاش! ہم مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالیں! تو یہ آیت نازل ہوگئی: ''وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى'' (البقرہ: ۱۲۵) اور آیت حجاب میں' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کاش! آپ اپنی ازواج کو یہ حکم دیں کہ وہ حجاب میں رہیں کیونکہ ان سے نیک اور بد (ہر قسم کا شخص) کلام کرتا ہے تو آیت حجاب نازل ہوگئی' اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج غیرت میں مجتمع ہوگئیں تو میں نے کہا: اگر وہ تمہیں طلاق دے دیں تو بعید نہیں کہ ان کا رب تمہارے بدلہ میں ان کو تم سے بہتر بیویاں دے دے تو یہ آیت نازل ہوگئی: ''عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ'' الآیہ. (التحریم: ۵)

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

نیز امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کے سات طواف کیے' پھر مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعات نماز پڑھی' اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

مقام ابراہیم کی تعیین میں کئی اقوال ہیں' عکرمہ اور عطاء نے کہا: پورا حج مقام ابراہیم ہے' شعبی نے کہا: عرفہ' مزدلفہ اور جمار مقام ابراہیم ہیں' نخعی نے کہا: پورا حرم مقام ابراہیم ہے' اور سب سے صحیح قول یہ ہے کہ وہ پتھر جس کو اب لوگ مقام ابراہیم کے عنوان سے پہچانتے ہیں اور جس کے پاس طواف کی دو رکعت پڑھتے ہیں' وہ مقام ابراہیم ہے' اور یہ حضرت جابر بن عبداللہ' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور قتادہ وغیرہ کا قول ہے' امام مسلم نے ایک طویل حدیث میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بیت اللہ کو دیکھا تو حجر اسود کو تعظیم دی' اور پہلے تین طوافوں میں رمل کیا

اور اس کے بعد چار طواف معمول کے مطابق چل کر کیے پھر مقام ابراہیم کی طرف گئے اور طواف کی دو رکعتیں پڑھیں' اور امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس کو اس وقت بلند کر دیا گیا تھا جب حضرت ابراہیم کو ان پتھروں کے اٹھانے سے ضعف لاحق ہوا جو ان کو حضرت اسماعیل لا کر دے رہے تھے اور حضرت ابراہیم کے قدموں کے نشان اس پتھر میں نقش ہو گئے تھے' حضرت انس نے کہا: میں نے ''مقام'' میں حضرت ابراہیم کی انگلیوں' ایڑیوں اور تلووں کے نشان ثبت دیکھے۔ سدی نے بیان کیا ہے کہ مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس کو حضرت اسمٰعیل کی زوجہ نے حضرت ابراہیم کا سر دھوتے وقت ان کے قدموں کے نیچے رکھا تھا۔ (تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۱۱۳۔ ۱۱۲' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ۱۳۸۷ھ)

میں کہتا ہوں کہ امام بخاری کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

حضرت اسماعیل پتھر لاتے تھے اور حضرت ابراہیم ان پتھروں کو جوڑ کر لگاتے تھے' جب کعبہ کی عمارت بلند ہو گئی تو وہ اس پتھر کو لائے اور اس کو حضرت ابراہیم کے لیے رکھا' حضرت ابراہیم اس پتھر پر کھڑے ہو کر بنانے لگے اور حضرت اسماعیل ان کو پتھر لا کر دے رہے تھے۔ (الحدیث) (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۷۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام رازی نے سدی کی روایت کو ترجیح دی ہے (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۴۷۳) لیکن صحیح یہ ہے کہ امام بخاری کی روایت کو ترجیح ہے۔ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنانے کے حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء کا مقام کس قدر بلند ہے اور آثار انبیاء سے برکتیں حاصل ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب! اس جگہ کو امن والا شہر بنا دے۔ (الآیۃ) (البقرہ: ۱۲۶)

آیا مکہ مکرمہ ابتداء آفرینش سے حرم ہے یا حضرت ابراہیم کی دعا کے بعد سے؟

اس میں اختلاف ہے کہ آیا مکہ مکرمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے حرم بنایا اس سے پہلے حرم تھا' ایک قول یہ ہے کہ جابر حکمران' زلزلہ' زمین کا دھنسنا' قحط' خشک سالی اور دیگر مصائب اور قدرتی آفات جو دوسرے شہروں میں نازل ہوتی ہیں مکہ مکرمہ ہمیشہ سے ان سے مامون اور محفوظ رہا ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے' امام بخاری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اس شہر کو اللہ نے اس دن حرام کیا جس دن آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا' پس یہ شہر اللہ کے حرام کرنے سے قیامت تک کے لیے حرام ہے' اور مجھ سے پہلے اس شہر میں کسی کے لیے بھی جنگ کرنا جائز نہ تھا' اور میرے لیے صرف دن کی ایک ساعت میں یہ جنگ کرنا جائز ہوا اور اب یہ اللہ کے حرام کرنے سے قیامت تک کے لیے حرام ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۴۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۳۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

دوسرا قول یہ ہے کہ پہلے شہر مکہ حرم نہیں تھا' حضرت ابراہیم کی دعا کے بعد یہ حرم ہوا' اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک حضرت ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا اور اہل مکہ کے لیے دعا کی اور میں مدینہ کو حرم بناتا ہوں جیسا کہ حضرت ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا تھا اور میں مدینہ کے صاع اور مد میں اس سے دگنی برکت کی دعا کرتا ہوں جو حضرت ابراہیم نے اہل مکہ کے لیے کی تھی۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۴۰ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ مکہ مکرمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے بعد حرم بنا' لیکن اس حدیث کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اصل میں مکہ ابتداء آفرینش سے حرم ہے اور حضرت ابراہیم نے اس کی تحریم کی تجدید اور تحریم کی بقاء اور دوام کے لیے دعا کی تھی' اس وجہ سے ان کی طرف تحریم کی نسبت کی جاتی ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا' اس لیے حضرت ابراہیم نے دعا میں یہ کہا کہ اس میں رہنے والے مومنوں کو رزق عطا فرما' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور جس نے کفر کیا میں اس کو (بھی) تھوڑا سا فائدہ پہنچاؤں گا' پھر اس کو مجبور کر کے دوزخ میں ڈالوں گا' اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے O

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا

اور (یاد کیجئے) جب ابراہیم اور اسماعیل کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے' (اور اس وقت وہ یہ دعا کر رہے تھے:) اے ہمارے رب!

تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ

ہم سے قبول فرما' بے شک تو ہی بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے O اور اے ہمارے رب! ہمیں خالص اپنی فرمانبرداری

لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا

پر برقرار رکھ' اور ہماری اولاد میں سے ایک امت کو خاص اپنا فرمانبردار کر' اور ہمیں حج کی عبادات بتا

وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۸﴾

اور ہماری توبہ قبول فرما' بے شک تو ہی بہت توبہ قبول فرمانے والا بہت رحم فرمانے والا ہے O

تعمیر کعبہ کی تاریخ کے متعلق روایات کا بیان

اس مسئلہ میں مختلف روایات اور مختلف اقوال ہیں کہ سب سے پہلے کعبہ کی تعمیر فرشتوں نے کی تھی' یا حضرت آدم نے کی تھی یا حضرت ابراہیم نے کی تھی۔ امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عطاء بیان کرتے ہیں کہ حضرت آدم نے کہا: اے میرے رب! میں فرشتوں کی آواز نہیں سنتا' فرمایا: اس کی وجہ تمہاری (ظاہری) خطا ہے لیکن تم زمین پر اتر جاؤ اور میرے لیے ایک بیت (گھر) بناؤ' پھر اس کے گرد طواف کرو جس طرح تم نے آسمان میں میرے بیت کے گرد فرشتوں کو طواف کرتے ہوئے دیکھا تھا' پھر حضرت آدم نے حرا' طور زیتا' طور سینا' جبل لبنان اور جودی پانچ پہاڑوں سے مٹی لے کر بیت اللہ کو بنایا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو جنت سے اتارا تو فرمایا: میں تمہارے ساتھ ایک بیت (بھی) اتاروں گا' جس کے گرد اس طرح طواف کیا جائے گا جس طرح میرے عرش کے گرد طواف کیا جاتا ہے اور اس کے پاس ایسے نماز پڑھی جائے گی جیسے میرے عرش کے پاس نماز پڑھی جاتی ہے' طوفان کے زمانہ میں اس بیت کو اٹھا لیا گیا انبیاء اس کا حج کرتے تھے اور انہیں اس کی جگہ کا علم نہیں تھا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اس کی جگہ سے مطلع کیا۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۴۲۸ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

ان دونوں روایتوں کو حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی بیان کیا ہے۔

(فتح الباری ج ۶ ج ۴۰۷ ـ ۴۰۶ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

دوسری روایت کو علامہ عینی نے بھی بیان کیا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۹ ص ۲۱۶ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیر یہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

علامہ سہیلی لکھتے ہیں:

کعبہ کو پانچ مرتبہ بنایا گیا ہے' پہلی بار شیث بن آدم نے بنایا' دوسری بار ان ہی بنیادوں پر حضرت ابراہیم نے بنایا' تیسری بار ظہور اسلام سے پانچ سال پہلے قریش نے بنایا' چوتھی مرتبہ حضرت ابن الزبیر نے بنایا اور حطیم کو کعبہ میں شامل کر لیا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا تھا' پانچویں بار عبدالملک بن مروان نے بنایا اور حطیم کو پھر باہر کر دیا' ایک قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کے بعد جب ایک یا دو بار سیلاب آیا تو اس کو قوم جرہم نے بنایا اور امام ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ سب سے پہلے کعبہ کو حضرت ابراہیم نے بنایا تھا۔ (الروض الانف ج ۱ ص ۱۲۸ ـ ۱۲۷ 'مطبوعہ مکتبہ فاروقیہ' ملتان)

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدم نے کعبہ کو بنایا' اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے ایک حدیث مرفوع مروی ہے لیکن اس کی سند ضعیف ہے' اور قوی قول یہ ہے کہ کعبہ کو سب سے پہلے حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے بنایا' حضرت علی بن ابی طالب سے روایت ہے کہ پھر کعبہ منہدم ہو گیا' پھر اس کو عمالقہ نے بنایا' پھر منہدم ہو گیا' پھر اس کو جرہم نے بنایا' پھر منہدم ہو گیا' پھر اس کو قریش نے بنایا اور یہ آپ کی بعثت سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے' ایک قول یہ ہے کہ پندرہ سال پہلے کا واقعہ ہے اور زہری سے روایت ہے کہ اس وقت آپ بلوغت کے قریب تھے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۲۸ ـ ۱۲۷ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۳ھ)

میں کہتا ہوں کہ "صحیح بخاری" سے امام زہری کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

علامہ بدر الدین عینی لکھتے ہیں:

اس میں اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کعبہ کو کس نے بنایا' ایک قول یہ ہے کہ اس کو سب سے پہلے فرشتوں نے بنایا' امام ابن اسحاق نے کہا: اس کو سب سے پہلے حضرت آدم نے بنایا' اور ایک قول یہ ہے کہ اس کو سب سے پہلے حضرت شیث بن آدم نے بنایا۔ (عمدۃ القاری ج ۱۶ ص ۲۸۸ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیر یہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

علامہ احمد قسطلانی نے ان تمام اقوال اور روایات کو جمع کر کے یہ فرمایا کہ کعبہ کو دس مرتبہ بنا گیا:

(۱) پہلی بار کعبہ کو فرشتوں نے بنایا (۲) دوسری مرتبہ حضرت آدم نے بنایا (۳) تیسری بار حضرت شیث بن آدم نے بنایا (۴) چوتھی بار حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا (۵) پانچویں بار قوم عمالقہ نے بنایا (۶) چھٹی بار جرہم نے بنایا (۷) ساتویں بار قصی بن کلاب نے بنایا (۸) آٹھویں بار قریش نے بنایا (۹) نویں بار حضرت عبداللہ بن زبیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب منشا کعبہ کو بنایا' اس میں دو دروازے رکھے' ایک داخل ہونے اور ایک خارج ہونے کا' اور حطیم کو کعبہ میں داخل کیا اور یہی بناء ابراہیم تھی' قریش اپنے وسائل میں کمی کی وجہ سے اس کو مکمل بناء ابراہیم پر نہیں بنا سکے تھے' اور آپ کی خواہش تھی کہ اس کو بناء ابراہیم پر بنا دیا جائے لیکن فتنہ کے خدشہ سے آپ نے نہیں بنایا تھا (۱۰) دسویں بار عبدالملک بن مروان کے حکم سے حجاج بن یوسف نے اس کو پھر منہدم کر کے قریش کی بناء کے مطابق بنا دیا۔

(ارشاد الساری ج ۳ ص ۱۴۲۔ ۱۴۳ مطبوعہ مطبعہ میمنہ مصر ۱۳۰۶ھ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

جب ھارون رشید کو یہ روایت پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کو اس طرح بنانا چاہتے تھے تو اس نے چاہا کہ کعبہ کو پھر حضرت ابن الزبیر کی بناء کے مطابق بنا دے لیکن امام مالک نے اس کو منع کیا اور فرمایا: میں تم کو قسم دیتا ہوں اب کعبہ کو اس طرح رہنے دو' بار بار منہدم کرنے اور بنانے سے اس کی ہیبت اور جلال میں کمی آئے گی۔ اسعد حمیری نے سب سے پہلے کعبہ کو غلاف چڑھایا تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برا کہنے سے منع فرمایا ہے' اور حجاج بن یوسف نے سب سے پہلے اس پر ریشم کا غلاف چڑھایا تھا۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۲۵ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے دعا کی:) اور ہمیں خاص اپنی فرمانبرداری پر برقرار رکھ اور ہماری اولاد میں سے ایک امت کو خاص اپنا فرمانبردار کر۔ (البقرہ: ۱۲۸)

حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کے مسلمان کرنے کی دعا پر اعتراض اور اس کا جواب

قرآن مجید کی اس آیت میں "واجعلنا" کا لفظ ہے یعنی ہم کو اپنے لیے مسلم کر دے' اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل پہلے بھی تو مسلم ہی تھے! اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اسلام کا معنی اطاعت ہے اور یہ اطاعت میں زیادتی کی دعا ہے یعنی ہم کو اور زیادہ مطیع اور فرمانبردار کر دے' دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ اطاعت اور فرمانبرداری میں دوام کے حصول کی دعا ہے' یعنی جس طرح ہم اب مطیع ہیں' ہمیں آئندہ بھی اپنا مطیع اور فرمانبردار رکھنا' تیسرا جواب یہ ہے کہ اسلام سے مراد یہاں تمام احکام شرعیہ کو ماننا اور قضاء وقدر کو تسلیم کرنا اور اس پر راضی رہنا ہے یعنی ہمارے دلوں کو ایسا بنا دے کہ احکام شرعیہ پر عمل کرنے کے خلاف دل میں کوئی تنگی نہ آئے اور قضاء وقدر کے معاملات کے خلاف دل میں کوئی ملال نہ آئے' چوتھا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد صرف تسمیہ ہے یعنی ہمارا نام مسلم کر دے۔

اپنی اولاد کے لیے دعا کی تخصیص کا جواب

دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کے لیے خصوصاً دعا کیوں کی عام لوگوں کے لیے دعا کیوں نہیں فرمائی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاد شفقت اور مصلحت کی زیادہ مستحق ہوتی ہے' قرآن مجید میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا. اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔ (التحریم: ٦)

نیز جب انبیاء علیہم السلام کی اولاد نیک اور صالح ہوگی تو وہ دوسرے لوگوں کی نیکی اور خیر کا بھی ذریعہ بنے گی' اس دعا پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی ذریت میں سے کوئی عرب مسلمان نہیں تھا۔

امام رازی اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

قفال نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی ذریت میں ہمیشہ موحد رہے ہیں جو صرف اللہ کی عبادت کرتے تھے' زمانہ جاہلیت میں زید بن عمرو بن نفیل اور قس بن ساعدہ تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد حضرت عبد المطلب بن ہاشم بھی موحد تھے' اسی طرح عامر بن الظرب تھے۔ یہ سب موحد تھے' قیامت اور ثواب اور عقاب کے قائل تھے' مردار کھاتے تھے نہ بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۴۸۱ مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے کہا: اور ہم کو ہمارے مناسک دکھا۔ (البقرہ: ۱۲۸)

حضرت ابراہیم کو مناسک حج کی تعلیم کا بیان

شریعت میں "منسك" عبادت کا نام ہے اور یہاں "مناسك" سے مراد حج کی عبادات ہیں۔
علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

زہیر بن محمد سے روایت ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ کو بنانے سے فارغ ہو گئے تو دعا کی: اے رب! میں اس کو بنانے سے فارغ ہو گیا' اب ہم کو ہماری عبادات بتا' تب اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل کو بھیجا اور انہوں نے حضرت ابراہیم کے ساتھ حج کیا' حتیٰ کہ جب وہ میدان عرفات سے لوٹے اور یوم نحر (دس ذوالحجہ) آیا تو شیطان ظاہر ہوا' حضرت جبرائیل نے کہا: اس کو کنکریاں ماریئے تو حضرت ابراہیم نے اس کو سات کنکریاں ماریں' پھر دوسرے اور تیسرے روز' پھر حضرت ابراہیم ثبیر (مکہ اور منیٰ کے درمیان ایک پہاڑ) پر چڑھے' اور فرمایا: اے اللہ کے بندو! جواب دو' تو جس شخص کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی ایمان تھا اس نے کہا: "لبيك اللّٰهم لبيك" اور روئے زمین پر ہمیشہ کم از کم سات آدمی مسلمان رہے ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین اور زمین والے ہلاک ہو جاتے۔ حضرت جبرائیل نے حضرت ابراہیم کو تمام مناسک دکھائے' صفا' مروہ' منیٰ اور مزدلفہ وغیرہ۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۲۹۔ ۱۲۸' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ھ)

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ

اے ہمارے رب! ان میں ان ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیج دے' جو ان لوگوں پر تیری آیات کی تلاوت کرے اور

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ

ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس کی اصلاح کرے' بے شک تو ہی بہت غالب ہے

الْحَكِيمُ ﴿۱۲۹﴾

بڑی حکمت والا O

حضرت ابراہیم نے جس عظیم رسول کی بعثت کی دعا کی وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا کی تھی کہ مکہ میں اہل مکہ میں سے ایک عظیم رسول بھیج دے اس سے مراد حضرت سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اس پر حسب ذیل دلائل ہیں:

(۱) تمام مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ اس رسول سے مراد حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ اجماع حجت ہے۔

(۲) امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک میں اللہ کے نزدیک خاتم النبیین لکھا ہوا تھا اور اس وقت حضرت آدم اپنی مٹی میں گندھے ہوئے تھے اور میں تم کو اپنی ابتداء کی خبر دیتا ہوں' میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں' اور عیسیٰ کی بشارت ہوں اور میں اپنی ماں کا وہ خواب ہوں جو انہوں نے میری پیدائش کے وقت دیکھا تھا' ان سے ایک ایسا نور نکلا تھا جس سے ان کے لیے شام کے

محلات روشن ہو گئے تھے[1] اس حدیث کو امام بزار[2] امام طبرانی[3] امام ابن حبان[4] امام حاکم[5] امام ابو نعیم[6] امام بیہقی[7] اور امام بغوی[8] نے بھی بیان کیا ہے۔

(۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا اہل مکہ کے لیے کی ہے اور مکہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی نبی کو مبعوث نہیں کیا۔

اہل مکہ ہی میں سے رسول کو مبعوث کرنے کی حکمت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی کہ مکہ میں اہل مکہ ہی میں سے ایک عظیم رسول مبعوث فرما! اس میں ایک بات تو یہ بتائی ہے کہ یہ رسول انسانوں کی جنس سے ہے' فرشتوں یا جنات کی جنس سے نہیں ہے کیونکہ اگر وہ رسول فرشتہ یا جن ہوتا تو انسان اس کو دیکھ نہ سکتے' اس کا کلام سن نہ سکتے' اور اس کی سیرت انسانوں کے لیے نمونہ اور حجت نہ ہوتی' دوسری بات یہ ہے کہ جب وہ رسول اہل مکہ میں سے ہوگا' تو اہل مکہ اس کی پیدائش' اس کی تربیت اور اس کی نشو و نما سے واقف ہوں گے' اس کا صدق' اس کی امانت اور دیانت اور اس کی زندگی کا ایک ایک گوشہ ان پر عیاں اور بیاں ہوگا اور پھر اس کی رسالت کو تسلیم کرنے کے لیے خود اس کی زندگی ہی میں ان کو قرائن اور دلائل مل جائیں گے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے' ان کافروں سے کہیے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○ میں اس سے پہلے تم میں عمر (کا ایک حصہ) گزار چکا ہوں' تو کیا تم نہیں سمجھتے ○ (یونس: ۱۶)

نیز حضرت ابراہیم نے اہل مکہ میں سے اپنی ذریت کے لیے دعا کی تھی اور ان کو یہ علم تھا کہ جب وہ رسول مکہ میں پیدا ہوگا تو یہ ان کی ذریت کے لیے باعث عزت اور فخر ہوگا' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا دو ہزار سات سو پچھتر سال بعد قبول ہوئی' اس سے معلوم ہوا کہ دعا کا دیر سے قبول ہونا مقبولیت کے منافی نہیں ہے۔

نماز میں حضرت ابراہیم پر صلوٰۃ کی تخصیص اور ان کے ساتھ تشبیہ کی حکمتیں

حضرت ابراہیم نے ہمارے رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک بار دعا کی اور آپ نے ہر نماز میں تشہد کے بعد ان کے لیے دعا کی ہدایت کر دی کہ جب مجھ پر صلوٰۃ پڑھو تو حضرت ابراہیم پر بھی صلوٰۃ پڑھو اور جب میرے لیے برکت کی دعا کرو تو حضرت ابراہیم کے لیے بھی برکت کی دعا کرو' باقی رہا یہ اعتراض کہ اس دعا میں ہے: اے اللہ! سیدنا محمد اور سیدنا محمد کی آل پر صلوٰۃ نازل فرما جس طرح تو نے ابراہیم پر اور آل ابراہیم پر صلوٰۃ نازل فرمائی ہے' دعا میں سیدنا محمد مشبہ ہیں اور حضرت ابراہیم مشبہ بہ ہیں اور مشبہ بہ' مشبہ سے اقویٰ ہوتا ہے' اس سے حضرت ابراہیم کی حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت

---

[1] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۴ ص ۱۲۸۔ ۱۲۷' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

[2] حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ' کشف الاستار عن زوائد البزار ج ۳ ص ۱۱۳' مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ' بیروت

[3] امام ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ' المعجم الکبیر ج ۱۸ ص ۲۵۲' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت

[4] حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ' موارد الظمآن عن زوائد ابن حبان ص ۵۱۲' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت

[5] امام ابو عبداللہ محمد بن حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ' المستدرک ج ۲ ص ۶۰۰' مطبوعہ مکتبہ دار الباز' مکہ مکرمہ

[6] امام ابو نعیم احمد بن عبداللہ اصفہانی متوفی ۴۳۰ھ' حلیۃ الاولیاء ج ۶ ص ۹۰۔ ۸۹' مطبوعہ دار الکتب العربی' ۱۴۰۷ھ

[7] امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۱۳۰' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت

[8] امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ' شرح السنۃ ج ۷ ص ۱۳' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۲ھ

لازم آئے گی حالانکہ آپ تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ اس اعتراض کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(۱) یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات مشبہ افضل ہوتا ہے جیسے قرآن مجید میں ہے: "مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ" (النور: ۳۵) "اللہ کے نور کی مثال جیسے ایک طاق ہو"۔

(۲) تشبیہ ابراہیم اور آل ابراہیم کے مجموعہ سے ہے اور آل ابراہیم میں دیگر انبیاء کے ساتھ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں۔

(۳) یہ تشبیہ نفس صلوٰۃ میں ہے اس کی کیفیت سے قطع نظر کے ساتھ‘ جس طرح قرآن مجید میں ہے: "اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ كَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ" (النساء: ۱۶۳) "ہم نے آپ کو ایسی وحی کی ہے جیسے نوح کی طرف کی تھی" حالانکہ آپ پر جو وحی ہے وہ قرآن ہے اور وہ بالاجماع افضل ہے۔

(۴) اس دعا میں کاف تشبیہ کے لیے نہیں ہے بلکہ تعلیل کے لیے ہے جیسے "وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ" (البقرہ: ۱۸۵) "تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تم کو ہدایت دی ہے" میں ہے‘ اور اس دعا کا معنی ہے: اے اللہ! سیدنا محمد پر اور سیدنا محمد کی آل پر صلوٰۃ نازل فرما کیونکہ تو نے ابراہیم پر اور ان کی آل پر صلوٰۃ نازل کی ہے۔

کتاب وحکمت کی تعلیم اور تزکیہ نفس کی تشریح

اس عظیم رسول کی صفت بیان کرتے ہوئے حضرت ابراہیم نے کہا: وہ تیری آیات کی تلاوت کرے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس کی اصلاح کرے۔

آیات کی تلاوت کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ ان پر قرآن مجید کی تلاوت کریں یا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر جو دلائل‘ آیات اور علامات ہیں ان کو بیان کریں۔

کتاب کی تعلیم سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید میں بیان کیے ہوئے احکام پر عمل کر کے دکھائیں اور جن آیات کی تفصیل کی ضرورت ہے ان کی تفصیل کریں اور جن آیات کے شرعی معنی بیان کرنے کی ضرورت ہے ان کے شرعی معنی بیان کریں۔

حکمت کا معنی ہے: معرفت الموجودات اور فعل الخیرات‘ اور یہاں اس سے مراد ہے: قرآن کے ناسخ اور منسوخ اور محکم اور متشابہ کو جاننا یا قرآن مجید کے اسرار اور دقائق کو جاننا‘ یا حکمت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی احادیث ہیں۔

اور اصلاح نفس سے مراد یہ ہے کہ آپ ان کو معصیت کی آلودگی سے پاک کرتے ہیں‘ ان کے ظاہر اور باطن کو رذائل اور نقائص سے دور کرتے ہیں اور ان کی عبادات میں خلوص‘ للہیت اور دوام کو اجاگر کرتے ہیں جس سے ان کا دل تجلیات الٰہیہ کا آئینہ بن جاتا ہے۔

وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ

اور ملت ابراہیم سے اس شخص کے سوا کون منحرف ہو گا جو بے وقوف ہو‘ اور

لَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (۱۳۰)

بے شک ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کر لیا‘ اور بے شک وہ آخرت میں صالحین میں سے ہیں O

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۙ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

اور (یاد کیجئے) جب ان سے ان کے رب نے کہا میری اطاعت پر (برقرار) رہو انہوں نے کہا میں تمام جہانوں کے رب کی اطاعت پر قائم ہوں O

ملت کا معنی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

ملت ان احکام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی زبانوں سے اپنے بندوں کے لیے مشروع فرمائے تاکہ بندوں کو اللہ کا قرب حاصل ہو دین کا بھی یہی معنی ہے لیکن دین اور ملت میں یہ فرق ہے کہ دین کی اضافت اللہ کی طرف بھی ہوتی ہے جیسے ''لَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ'' (النور: ۲) اور انبیاء علیہم السلام کی طرف بھی دین کی اضافت ہوتی ہے جیسے ''قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ'' (یونس: ۱۰۴) اور مسلمانوں کی طرف بھی دین کی اضافت ہوتی ہے جیسے ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ'' (المائدہ: ۳) اس کے برعکس ملت کی اضافت صرف انبیاء علیہم السلام کی طرف کی جاتی ہے۔

(المفردات ص ۴۷۱ 'مطبوعہ المکتبۃ المرتضویۃ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

دین' ملت' شریعت وغیرہا کے مفاہیم اور ان کا باہمی فرق ہم نے سورہ فاتحہ میں ''مالک یوم الدین'' کی تفسیر میں بیان کیا ہے۔

ملت ابراہیم سے انحراف کا حماقت ہونا

اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ بیان کیا تھا کہ حضرت ابراہیم اللہ تعالیٰ کی آزمائش میں پورے اترے' اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام لوگوں کا امام بنایا' انہوں نے اللہ کے حکم سے بیت اللہ بنایا اور فرمایا کہ ان کو اپنی اولاد پر شفقت تھی' انہوں نے اس کے لیے دعا کی' مدینہ میں رہنے والے یہود اپنا نسب حضرت اسحٰق کے واسطہ سے حضرت ابراہیم سے ثابت کرتے تھے اور نصاریٰ بھی حضرت عیسیٰ کی ماں کے واسطے سے حضرت ابراہیم کی طرف خود کو منسوب کرتے تھے اور قریش مکہ حضرت اسماعیل کے واسطہ سے خود کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے' الغرض یہ سب حضرت ابراہیم کی طرف منسوب ہونے میں اپنا فخر سمجھتے تھے اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت ابراہیم نے حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی دعا کی تھی اور آپ نے جس دین کی دعوت دی وہی ملت ابراہیم ہے تو اب جو شخص خود کو ابراہیمی کہتا ہو اور دین ابراہیم سے اعراض اور انحراف کرتا ہو اس سے بڑا بے وقوف اور کون ہوگا!

تمام انبیاء کا پیدائشی مومن ہونا

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اسلم. اسلام لاؤ'' امام رازی نے کہا: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ کس وقت فرمایا' ایک قول یہ ہے کہ یہ نبوت سے پہلے فرمایا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ستارے' چاند اور سورج کے ڈوبنے سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر استدلال کر رہے تھے اور جب حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اسلام لاؤ' اور انہوں نے کہا: میں تمام جہانوں کے رب پر اسلام لایا۔

امام رازی نے کہا: اکثر علماء کی یہی رائے ہے' اور بعض علماء نے کہا: یہ حکم نبوت کے بعد تھا اور اس کا معنی ہے: اسلام پر مستقیم رہو اور توحید پر قائم رہو۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۴۸۷ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علامہ ابوالحیان اندلسی نے بھی یہی لکھا ہے۔ (البحر المحیط ج ۱ ص ۶۳۱ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

اور علامہ آلوسی نے بھی یہ دو قول ذکر کیے ہیں۔ (روح المعانی ج ا ص ۳۸۸ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

بہر حال یہ حکم نبوت سے پہلے ہو یا بعد انبیاء علیہم السلام پیدائشی مومن ہوتے ہیں اور نبوت سے پہلے کفر سے معصوم ہوتے ہیں اس لیے اس کا معنی ہے: اعضاء سے اطاعت کرو یا اسلام پر ثابت قدم رہو یا اپنے آپ کو ہمیں سونپ دو اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ ایمان لے آؤ جس سے یہ وہم ہو کہ آپ پہلے مومن نہیں تھے۔ معاذ اللہ

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى

اور اسی ملت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی اور یعقوب نے (بھی) اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے تمہارے لیے اس

لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ

دین کو پسند کر لیا، پس تم تادم مرگ مسلمان رہنا O کیا تم اس وقت حاضر تھے

اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ

جب یعقوب کو موت آئی؟ جب یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا: تم میرے بعد

بَعْدِىْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ

کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا: ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں گے اور آپ کے باپ دادا، ابراہیم، اسمٰعیل

وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ

اور اسحٰق کے معبود کی، ایک معبود کی، اور ہم سب اسی کے فرمانبردار ہیں O وہ امت

قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْــَٔـلُوْنَ

گزر چکی ہے، اس نے جو کام کیے اس کے لیے ان کا بدلہ ہے اور تم نے جو کام کیے تمہارے لیے ان کا بدلہ ہے، اور ان کے

عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

کاموں کے متعلق تم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا O

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹوں کی سوانح

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل تھے، ان کی ماں ھاجر قبطیہ تھیں، حضرت ابراہیم ان کو شیر خوارگی میں مکہ لے آئے، یہ اپنے بھائی حضرت اسحاق سے چودہ سال بڑے تھے، جس وقت حضرت اسماعیل کی وفات ہوئی تو ان کی عمر ایک سو سینتیس (۱۳۷) سال تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات کے وقت ان کی عمر نواسی (۸۹) سال تھی، حضرت اسماعیل

ہی ذبیح اللہ ہیں۔ حضرت اسحاق کی والدہ سارہ ہیں' ایک قول یہ ہے کہ وہ ذبیح ہیں (علامہ قرطبی کے نزدیک حضرت اسحاق ہی ذبیح ہیں لیکن ہمیں اس سے اختلاف ہے' ان شاء اللہ سورہ الصافات میں یہ بحث آئے گی) ان کی اولاد بنی اسرائیل ہیں' حضرت اسحاق کی عمر ایک سو اسی (۱۸۰) سال تھی' یہ ارض مقدسہ میں فوت ہوئے اور اپنے باپ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے پاس دفن کیے گئے' جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ حضرت سارہ فوت ہو گئیں تو انہوں نے قطورا بنت یقطن کنعانیہ سے شادی کر لی' اور ان سے مدین' مداین' نہشان' زمران' نشیق اور شیوخ پیدا ہوئے' پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام فوت ہو گئے' ان کی وفات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے درمیان تقریباً تین ہزار سال کا عرصہ ہے۔ یہود اس مدت سے چار سو سال کم کرتے ہیں' حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا ذکر ان شاء اللہ سورہ یوسف میں آئے گا' حضرت یعقوب اپنے جد امجد حضرت ابراہیم کی وفات کے بعد پیدا ہوئے' اور جس طرح حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی حضرت یعقوب نے بھی اسی طرح اپنے بیٹوں کو وصیت کی' حضرت یعقوب ایک سو سینتالیس (۱۴۷) سال زندہ رہے اور مصر میں فوت ہوئے' آپ نے وصیت کی تھی کہ آپ کو ارض مقدسہ میں لے جایا جائے اور وہاں آپ کے باپ حضرت اسحاق کے پاس دفن کیا جائے تو حضرت یوسف نے آپ کو ان کے پاس دفن کیا۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۳۶۔ ۱۳۵ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا تم اس وقت حاضر تھے جب یعقوب کو موت آئی؟ (البقرہ: ۱۳۳)

یہود یہ کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے ان کے دین پر تھے' اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ کیا تم یعقوب کی موت کے وقت حاضر تھے اور کیا تم کو معلوم ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو کیا وصیت کی تھی؟ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب نے تو اپنے اپنے بیٹوں کو اسلام پر ثابت رہنے اور توحید پر قائم رہنے کی وصیت کی تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ امت گزر چکی ہے' اس نے جو کام کیے اس کے لیے ان کا بدلہ ہے اور تم نے جو کام کیے تمہارے لیے ان کا بدلہ ہے۔ (البقرہ: ۱۳۴)

جبریہ اور قدریہ کے نظریہ کا رد

اس آیت میں یہ بتایا کہ بندہ کے عمل اور کسب کی اس کی طرف نسبت کی جاتی ہے' اگرچہ بندہ کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور جو نیک کام ہیں وہ اللہ کے فضل سے ہوتے ہیں اور جو برے کام ہیں وہ بندہ کے اپنے نفس کی شامت ہیں' اہل سنت و جماعت کا یہی مذہب ہے' قرآن مجید کی بہت سی آیات اور بہت سی احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں' بندہ صرف کسب کرتا ہے اور کسب کا معنی ہے: کسی فعل کا ارادہ کرنا خواہ وہ اچھا ہو یا برا اور جس وقت بندہ ارادہ کرتا ہے اللہ اسی وقت اس میں اس فعل کی قدرت پیدا کر دیتا ہے اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ بندہ فعل کا کسب کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ فعل کو خلق کرتا ہے۔ اس کے برعکس جبریہ یہ کہتے ہیں: بندہ کا فعل میں کوئی دخل نہیں اور اس کو فعل پر کوئی قدرت اور اختیار نہیں جیسے درختوں کے پتے ہواؤں سے اپنے اختیار کے بغیر ہل رہے ہیں اسی طرح بندہ اپنے اختیار کے بغیر افعال کر رہا ہے لیکن یہ بداہۃً باطل ہے' ہم اپنے اختیار سے کسی کام کو کرتے ہیں یا ترک کرتے ہیں' جس شخص پر رعشہ طاری ہو اس کے اختیار کے بغیر اس کا ہاتھ حرکت کرتا ہے جبکہ ہم اپنے اختیار سے اپنے ہاتھ کو حرکت دیتے ہیں' پھر اگر بندہ کا فعل پر بالکل اختیار نہ ہو تو انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں بھیجنا' قیامت اور جزا اور سزا کا نظام عبث ہو کر رہ جائے گا' معتزلہ اور قدریہ یہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے اور یہ قرآن مجید کی اس آیت کے صراحۃً خلاف ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ○ (الصافات: ۹۶) اور اللہ نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان کے کاموں کے متعلق تم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا○ (البقرہ: ۱۳۴)

کسی کے گناہ کی سزا دوسرے کو نہ دینا

یعنی کسی شخص کے گناہ کی وجہ سے دوسرے شخص سے مواخذہ نہیں ہوگا' اور اسی کی مثل قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ط. (الزمر: ۷) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

یہاں پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ایک حدیث اس آیت کے خلاف ہے؟ امام بخاری حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بھی ظلماً قتل کیا جائے گا اس کے خون (کی سزا) کا ایک حصہ آدم کے بیٹے (قابیل) پر ہوگا کیونکہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کا طریقہ ایجاد کیا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۶۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بعد کے قاتلوں کو عذاب نہیں ہوگا اور ان کے گناہ کا عذاب قابیل کو ہوگا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قاتل کو اپنے گناہ کی پوری پوری سزا ملے گی' لیکن ظلماً قتل کرنے کو قابیل نے ایجاد کیا تھا' لہٰذا ہر قتل کا سبب قابیل قرار پایا اور قیامت تک جتنے بھی قتل ہوں گے سب کے قتل کا سبب ہونے کی سزا قابیل کو ملے گی اور ان قاتلوں کی اپنی سزا میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اس کی وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے:

امام مسلم حضرت ابن جریر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: جس شخص نے کسی برے کام کو ایجاد کیا اس پر اپنی برائی کا بھی بوجھ ہوگا اور اس کے بعد اس برائی پر عمل کرنے والوں کا بھی بوجھ ہوگا اور ان برائی کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۲۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۳۵۷' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

اس مسئلہ کی وضاحت اس حدیث سے بھی ہوتی ہے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ وار کیے گئے تو حضرت صہیب روتے ہوئے آئے اور کہنے لگے: ہائے میرے بھائی! ہائے میرے صاحب! حضرت عمر نے کہا: اے صہیب! تم مجھ پر رو رہے ہو حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: میت کے گھر والوں میں سے کسی کے رونے سے اس میت کو عذاب ہوتا ہے' حضرت ابن عباس نے کہا: جب حضرت عمر فوت ہو گئے تو میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس حدیث کا ذکر کیا' حضرت عائشہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت عمر پر رحم فرمائے' بہ خدا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ میت کے گھر والوں کے رونے سے میت کو عذاب دیا جاتا ہے' اور تمہارے لیے قرآن مجید کی یہ آیت کافی ہے: "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ط". (الزمر: ۷)

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۷۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام بخاری نے لکھا ہے کہ اگر میت نے یہ وصیت کی ہو کہ اس پر نوحہ کیا جائے تو پھر گھر والوں کے رونے سے اس کو عذاب ہوگا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۷۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

قرآن اور حدیث کی بناء پر اکابر علماء سے اختلاف کرنے کا جواز

حضرت عمر یہ کہتے تھے کہ میت پر گھر والوں کے رونے سے اس میت کو عذاب ہوگا اور حضرت عائشہ نے حضرت ابن عباس

کے سامنے اس کا قرآن مجید سے رد کیا (صحیح بخاری) حالانکہ حضرت عمر دوسرے خلیفہ راشد ہیں اور ان کا مرتبہ حضرت عائشہ سے بڑا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ دلیل کے ساتھ اکابر علماء سے اختلاف کرنا جائز ہے۔ اسی طرح حضرت عمر اور عثمان حج تمتع کرنے سے منع کرتے تھے اور حضرت علی' حضرت عمران بن حصین وغیرہما ان سے اختلاف کرتے تھے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حج تمتع کرنا ثابت ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

مروان بن الحکم بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عثمان اور حضرت علی کے زمانہ میں حاضر تھا' حضرت عثمان تمتع کرنے سے منع کررہے تھے' جب حضرت علی نے یہ دیکھا تو حضرت علی نے حج اور عمرہ کا احرام باندھا اور فرمایا: میں کسی شخص کے قول کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ترک نہیں کروں گا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۱۲ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ کے عہد میں تمتع کیا اور قرآن مجید بھی نازل ہوا ("فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ". (البقرہ: ۱۹۶) "جس نے حج کے ساتھ عمرہ ملا کر تمتع کیا تو اس پر وہ قربانی لازم ہے جو اسے آسان ہو۔") اور ایک شخص (حضرت عمر) نے اپنی رائے سے جو چاہا کہا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۱۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

سالم بن عبد اللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ شام کے ایک شخص نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے تمتع کے متعلق سوال کیا' انہوں نے کہا: یہ حلال ہے' شامی نے کہا: آپ کے باپ (حضرت عمر) اس سے منع کرتے تھے! حضرت ابن عمر نے فرمایا: یہ بتاؤ کہ اگر میرے باپ نے تمتع سے منع کیا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا ہو تو میرے باپ کے حکم پر عمل کیا جائے گا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر عمل کیا جائے گا؟ اس شخص نے کہا: بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر عمل کیا جائے گا' حضرت ابن عمر نے فرمایا: تو بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا ہے' امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (جامع ترمذی ص ۱۴۱ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت علی' حضرت عمران بن حصین اور حضرت ابن عمر علم و فضل اور مرتبہ و مقام میں حضرت عمر اور حضرت عثمان سے کم درجہ کے تھے لیکن انہوں نے دلائل کی بناء پر اپنے سے بڑے درجہ کے صحابہ سے اختلاف کیا اور ان کا رد کیا اور اس چیز کو ان کے مرتبہ کی خلاف ورزی یا بے ادبی نہیں سمجھا گیا' آج اگر قرآن اور حدیث کی بناء پر کسی مشہور عالم سے اختلاف کیا جائے تو اس کے معتقدین کہتے ہیں کہ ان کو قرآن اور حدیث کا علم نہیں تھا؟ لیکن حضرت ابن عمر وغیرھم پر کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ کیا حضرت عمر اور عثمان کو قرآن اور حدیث کا علم نہیں تھا؟ کیونکہ خیر القرون میں لوگ اس قدر غلو کا شکار نہیں تھے اور کسی شخص کی رائے اور اس کے قول کو قرآن اور حدیث پر فوقیت نہیں دیتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنبی کے لیے تیمم کو جائز نہیں قرار دیتے تھے' حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث کی بناء پر ان سے اختلاف کیا۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

عبد الرحمان بن ابزی بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آ کر حضرت عمر سے پوچھا: میں جنبی ہو گیا اور مجھے پانی نہیں ملا' حضرت عمار بن یاسر نے حضرت عمر بن الخطاب سے کہا: کیا آپ کو یاد نہیں کہ میں اور آپ ایک سفر میں تھے' ہم دونوں جنبی ہو

گئے' آپ نے تو نماز نہیں پڑھی اور میں زمین میں لوٹ پوٹ ہو گیا اور میں نے نماز پڑھ لی' پھر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں اس طرح کر لینا کافی تھا' پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہتھیلیاں زمین پر ماریں' ان پر پھونک ماری اور چہرے اور ہاتھوں پر تیمم کیا۔ (صحیح بخاری ج ١ ص ٤٨ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ١٣٨١ھ)

شقیق بن سلمہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابوموسیٰ کے پاس بیٹھا ہوا تھا' حضرت ابوموسیٰ نے حضرت ابن مسعود سے پوچھا: جب ایک شخص جنبی ہو اور اس کو پانی نہ ملے تو وہ کیا کرے؟ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: جب تک پانی نہ ملے وہ نماز نہ پڑھے' حضرت ابوموسیٰ نے کہا: پھر آپ حضرت عمار کی حدیث کا کیا جواب دیں گے؟ حضرت ابن مسعود نے کہا: کیا تم کو معلوم نہیں کہ حضرت عمر ان کی روایت سے مطمئن نہیں تھے؟ حضرت ابوموسیٰ نے کہا: اچھا حضرت عمار کی حدیث کو چھوڑیں آپ اس آیت کا کیا جواب دیں گے: "أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا". (المائدہ: ٦) "جب تم جنبی ہو جاؤ اور پانی نہ ملے تو تیمم کرو"' حضرت ابن مسعود کو اس آیت کا کوئی جواب نہ آیا' پھر وہ کہنے لگے: اگر میں لوگوں کو اس کی اجازت دے دوں تو جس کو سردی لگے گی وہ غسل کی جگہ تیمم کر لے گا۔

(صحیح بخاری ج ١ ص ٥٠ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ١٣٨١ھ)

اس مسئلہ میں بھی جمہور امت نے حضرت عمر کے قول اور حضرت ابن مسعود کی رائے پر عمل نہیں کیا بلکہ قرآن اور حدیث پر عمل کیا ہے۔

بعض جمود پسند لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ صحابہ سب مجتہد تھے' ان کا ایک دوسرے سے اختلاف جائز ہے' ہم مقلد ہیں' ہمارا ائمہ اور اکابر علماء سے اختلاف جائز نہیں' میں کہتا ہوں کہ دلائل کی بناء پر ہمارے فقہاء نے امام ابوحنیفہ سے بھی اختلاف کیا ہے' مثلاً علامہ ابن نجیم نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک شوال کے چھ روزے رکھنا مکروہ ہے خواہ وہ متفرق رکھے جائیں یا متصلاً اور امام ابویوسف کے نزدیک یہ روزے متصلاً رکھنا مکروہ ہیں لیکن عام متاخرین کے نزدیک ان میں کراہت نہیں ہے۔

(البحر الرائق ج ٢ ص ٢٥٨ 'مطبوعہ مطبع علمیہ' مصر' ١٣١١ھ)

اور علامہ شرنبلالی نے لکھا ہے کہ شوال کے چھ روزے رکھنے مستحب ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے رمضان کے بعد متصل چھ روزے رکھے اس کو دائماً روزہ رکھنے کا اجر ملے گا۔ (صحیح مسلم ج ١ ص ٣٦٩)

(مراقی الفلاح ص ٣٨٧ 'مطبوعہ مطبع مصطفی البابی واولادہ' مصر' ١٣٥٦ھ)

اسی طرح عقیقہ کو امام ابوحنیفہ نے مباح کہا ہے لیکن ہمارے فقہاء نے حدیث کی بناء پر کہا: یہ سنت ہے اور کار ثواب ہے' بہرحال قرآن اور حدیث سب پر مقدم ہیں اور قرآن اور حدیث کے دلائل کی وجہ سے اکابر علماء سے اختلاف کرنا جائز ہے اور میری زندگی کا یہی مشن ہے کہ قرآن اور حدیث کی بالادستی بیان کروں۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ

اور اہل کتاب نے کہا: یہودی یا عیسائی ہو جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے آپ کہیے: (نہیں) بلکہ ہم ابراہیم کی ملت پر ہیں جو باطل سے

حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٣٥﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ

اعراض کرنے والے تھے' اور مشرکین میں سے نہ تھے ○ (اے مسلمانو!) تم کہو: ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو

اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ

ہماری طرف نازل کیا گیا اور اس پر جو ابراہیم' اسماعیل' اسحاق'

یَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَمَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰی وَمَاۤ اُوۡتِیَ

یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل کیا گیا' اور اس پر جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور اس پر

النَّبِیُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ ۫ۖ وَ نَحۡنُ لَهٗ

جو دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ہم (ایمان لانے میں) نبیوں میں سے کسی ایک میں (بھی) فرق نہیں کرتے اور ہم

مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا ۚ

اسی (ایک رب) کے فرمانبردار ہیں O سو اگر وہ ان کی مثل پر ایمان لے آئیں جن پر تم ایمان لائے ہو تو بے شک وہ ہدایت پائیں گے'

وَ اِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِیۡ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَکۡفِیۡکَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ

اور اگر وہ انحراف کریں تو (جان لیجئے) کہ وہ محض ضد اور ہٹ دھرمی پر ہیں تو عنقریب ان کے (شر سے بچانے کے) لیے اللہ

السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۳۷﴾ ؕ

آپ کو کافی ہوگا' اور وہ بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے O

حنیف کا معنی

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن صوریا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہدایت صرف ہمارے دین میں ہے' اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ ہماری پیروی کریں تو ہدایت پا جائیں گے! اور عیسائیوں نے بھی اسی طرح کہا' تب یہ آیت نازل ہوئی: آپ کہیے کہ نہیں بلکہ ہم ابراہیم کی ملت پر ہیں جو حنیف ہے۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۴۴۴۔ ۴۴۰ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۱۰ھ)

حنیف کے معنی ہیں: مستقیم' یعنی ابراہیم کا دین مستقیم ہے' بعض اہل تاویل نے کہا: حنیف کا معنی ہے: حج کرنے والا' اور حضرت ابراہیم کے دین کو حنیف اس لیے فرمایا کہ وہ اپنے زمانہ سے لے کر قیامت تک کے حج کرنے والوں کے امام ہیں اور بعض علماء نے کہا: حنیف کا معنی اسلام ہے۔

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

جو شخص ٹیڑھے راستے سے انحراف کرکے سیدھے راستہ پر چلے وہ حنیف ہے' اہل عرب حج اور ختنہ کرنے والے کو حنیف کہتے تھے کیونکہ وہ ملت ابراہیم پر ہے۔ (المفردات ص ۱۳۳ 'مطبوعہ المکتبۃ المرتضویۃ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے مسلمانو!) تم کہو: ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور اس پر جو ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل کیا گیا۔ الایہ (البقرہ: ۱۳۶)

تمام انبیاء پر ایمان لانے کی وجہ

جب یہود اور عیسائیوں نے یہ کہا: تم یہودی ہو جاؤ یا عیسائی ہو جاؤ تو پہلے فرمایا: آپ کہیے کہ نہیں بلکہ ہم ابراہیم کی ملت پر ہیں' اب فرمایا: تم کہو: ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا الخ' کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی معرفت کی دلیل ان کے صدق پر معجزہ کا ظہور ہے اور جب سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے صدق پر معجزہ ظاہر ہو گیا' تو آپ پر ایمان لانا واجب ہے' اسی طرح باقی انبیاء علیہم السلام کی نبوت اور رسالت کی جب قرآن نے شہادت دی تو ان پر بھی ایمان لانا واجب ہوا اور ہم انبیاء علیہم السلام میں یہ فرق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں جس طرح یہود اور نصاریٰ ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے۔

باقی انبیاء پر جو نازل کیا گیا اس پر ایمان لانے کے محامل

اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' یعقوب اور ان کی اولاد پر جو نازل کیا گیا ہم اس پر بھی ایمان لاتے ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کے جو احکام ان پر نازل کیے گئے ہم ان سب پر ایمان لاتے ہیں کیونکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین واحد ہے' دین ان عقائد اور ان اصول کو کہتے ہیں جو تمام انبیاء میں مشترک ہیں' مثلاً الوہیت' توحید' رسالت' قیامت' مرنے کے بعد اٹھنا' قضاء وقدر کا حق ہونا' عبادت کا فرض ہونا' شرک' قتل ناحق اور جھوٹ کا حرام ہونا وغیرہ اور ہر زمانہ کے مخصوص حالات کے اعتبار سے عبادات اور معاشرت کے جو احکام ہوتے ہیں ان کو شریعت کہتے ہیں اور ہر نبی کی شریعت الگ ہے' تو اگر اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ ہم ان انبیاء سابقین کی شرائع پر ایمان لاتے ہیں تو اس کا محمل یہ ہے کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں کہ ہر نبی کی شریعت اس کے زمانہ میں برحق تھی اور اب اللہ تعالیٰ نے تمام شرائع منسوخ کر کے صرف شریعت محمدی کو قیامت تک کے لیے جاری کر دیا ہے اور اگر اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم انبیاء سابقین پر نازل ہونے والے صحائف پر ایمان لاتے ہیں تو اس کا محمل یہ ہے کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں کہ جو اصل صحائف اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل کیے تھے وہ برحق ہیں اور بعد میں ان کی امتوں نے ان میں جو تحریف کر دی اس کی ہم تصدیق نہیں کرتے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اہل کتاب تورات کو عبرانیہ میں پڑھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے عربی میں اس کی تفسیر کرتے تھے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ ان کی تکذیب کرو بلکہ کہو: "امنا باللہ وما انزل الینا"۔ الایہ۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۴۴' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (کہو:) ہم اسی (ایک رب) کے فرمانبردار ہیں۔ (البقرہ: ۱۳۶)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ان سب انبیاء پر ایمان لانا اسلام کی وجہ سے ہے اور قرآن کی شہادت کے سبب سے ہے کیونکہ نبوت کا ثبوت معجزہ کے ظہور سے ہوتا ہے اور معجزہ کے ظہور کے بعد کسی کو مانا جائے اور کسی کو نہ مانا جائے تو یہ خواہش نفس کی اتباع ہے دلیل کی اتباع نہیں ہے' سو یہود اور عیسائیوں نے اگر حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کو ظہور معجزہ کی وجہ سے نبی مانا ہے تو ان پر لازم ہے کہ حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نبی مانیں ورنہ لازم آئے گا کہ وہ دلیل کے متبع نہیں ہیں بلکہ خواہش نفس کے متبع ہیں جس کو چاہا نبی مانا اور جس کو چاہا نہ مانا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو اگر وہ ان کی مثل پر ایمان لے آئیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو بے شک وہ ہدایت پا ئیں گے۔ (البقرہ: ۱۳۷)

اللہ کی مثل پر ایمان لانے میں اشکال اور اس کے جوابات

اس جگہ یہ اعتراض ہے کہ جن پر مسلمان ایمان لائے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید ان کی تو مثل ہے ہی نہیں بلکہ ان کی مثل کا ہونا محال ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیسے فرمایا: اگر وہ ان کی مثل پر ایمان لے آئیں جن پر تم ایمان لائے ہو حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس آیت میں مثل کا لفظ زائد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مثل نہیں ہے اور اس کا معنی ہے: اگر وہ اس پر ایمان لے آئیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو ہدایت پالیں گے۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۴۴۳ مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت ۱۴۱۰ھ) دوسرا جواب یہ ہے کہ جس طرح مسلمان قرآن مجید پر بغیر تحریف اور تغییر کے ایمان لائے ہیں اسی طرح اگر یہود بھی تورات پر بغیر تحریف اور تغییر کے ایمان لائیں تو ہدایت پا جائیں گے تیسرا جواب یہ ہے کہ یہاں مؤمن بہ میں مماثلت مراد نہیں ہے بلکہ ایمان میں مماثلت مراد ہے یعنی اگر یہ اللہ اور رسول پر تمہاری طرح ایمان لائیں اور تمہاری طرح تصدیق کریں تو یہ ہدایت پا جائیں گے اور اگر یہ ضد اور عناد کی وجہ سے ایمان نہ لائیں تو ان کے شر سے بچانے کے لیے آپ کو اللہ کافی ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور یہ وعدہ پورا ہوا اس آیت میں پیش گوئی ہے جو صادق ہوئی اور غیب کی خبر ہے اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق کی دلیل ہے علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق حضرت عثمان کو شہید کیا گیا تو اس آیت "فسیکفیکھم اللہ" پر حضرت عثمان کا خون گرا تھا۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۴۳ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ) واضح رہے کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی کافر آپ کو قتل نہیں کر سکے گا رہا ایذاء اور تکالیف کا پہنچنا تو وہ اس آیت کے منافی نہیں ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ

(تم ان سے کہو:) ہم نے خود کو اللہ کے رنگ میں رنگ لیا اور اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ بہتر ہوگا؟ اور ہم اسی کی عبادت

عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ

کرتے ہیں O آپ کہیے: کیا تم اللہ کے متعلق ہم سے بحث کرتے ہو حالانکہ وہ ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے اور ہمارے لیے

اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ

ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں اور ہم اسی کے ساتھ مخلص ہیں O کیا تم کہتے ہو کہ

اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا

بے شک ابراہیم اسماعیل اسحاق یعقوب اور ان کی اولاد یہودی

هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ

یا عیسائی تھے؟ آپ کہیے: کیا تم زیادہ جاننے والا ہو یا اللہ؟ اور اس سے زیادہ کون ظالم ہو گا

مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ

جس نے اس شہادت کو چھپایا جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے ہے' اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل

عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ

نہیں ہے O وہ ایک امت ہے جو گزر چکی ہے' اس نے جو کام کیے اس کے لیے ان کا بدلہ ہے اور تم نے جو کام کیے تمہارے

لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع

لیے ان کا بدلہ ہے' اور ان کے کاموں کے متعلق تم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا O

''صبغۃ اللہ'' (اللہ کا رنگ) کی تفسیر

اللہ کے رنگ میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں' ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ کا دین ہے' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض عیسائی اپنے بچوں کو پیلے رنگ میں رنگتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ اس کے لیے تطہیر ہے اور اب وہ عیسائیت میں داخل ہو گیا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ کے رنگ کو طلب کرو اور وہ دین اسلام ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ کے رنگ سے مراد اللہ کی فطرت ہے' یعنی جس فطرت اور خلقت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے' اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ کی سنت ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کے رنگ سے مراد اس کی صفات ہوں اور اللہ کے رنگ میں رنگنے سے مراد یہ ہو کہ بندہ اللہ کی صفات سے متصف ہو جائے یا اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہیے: کیا تم اللہ کے متعلق ہم سے بحث کرتے ہو' حالانکہ وہ ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں اور ہم اسی کے ساتھ مخلص ہیں۔ (البقرہ: ۱۳۹)

حسن بصری نے بیان کیا ہے کہ بحث یہ تھی کہ یہود مسلمانوں سے یہ کہتے تھے کہ تمہاری بہ نسبت ہم اللہ کے زیادہ قریب ہیں کیونکہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں اور ہمارے آباء اور ہماری کتابیں تم سے پہلے کی ہیں' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان سے کہہ دو کہ مقدم ہونے کا کوئی اعتبار نہیں ہے' اعتبار صرف عمل کا ہے اور اس عمل کا اعتبار ہے جس میں اللہ کے لیے اخلاص ہو۔

اخلاص کا معنی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

خالص کا معنی ہے: صاف' جس چیز میں ملاوٹ ہو اور وہ ملاوٹ دور کر دی جائے تو اس کو خالص کہتے ہیں' (جس چیز میں ملاوٹ ہو سکتی ہو لیکن ملاوٹ نہ ہو اس کو بھی خالص کہتے ہیں) قرآن مجید میں مسلمانوں کو مخلص فرمایا ہے کیونکہ وہ یہود کی تشبیہ اور نصاریٰ کی تثلیث سے بری ہیں اور اخلاص کی حقیقت ہے: اللہ کے سوا ہر چیز سے بری ہونا۔

(المفردات ص ۱۵۵۔ ۱۵۴' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ جس عبادت میں ریاکاری کی بالکل آمیزش نہ ہو اس کو اخلاص کہتے ہیں۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

عمل کو مخلوق کے ملاحظہ سے صاف کر لینا اخلاص ہے' جنید بغدادی نے کہا: اخلاص اور اللہ کے درمیان ایک راز ہے' نہ اس کو فرشتے جانتے ہیں کہ لکھ سکیں نہ اس کو شیطان جانتا ہے کہ اس کو فاسد کر سکے' اور نہ اس کو خواہش جانتی ہے کہ اس کو کسی طرف مائل کر سکے' ابوالقاسم قشیری وغیرہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے جبرائیل سے پوچھا: اخلاص کیا ہے؟ انہوں نے کہا: میں نے رب العزت سے اخلاص کے متعلق پوچھا' فرمایا: وہ میرا ایک راز ہے جس کو میں نے اپنے محبوب بندہ کے دل میں رکھا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۴۶ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ھ)

علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں:

سعید بن جبیر نے کہا: اخلاص یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے اور اپنا عمل کسی کو نہ دکھایا جائے' فضیل بن عیاض نے کہا: لوگوں کی وجہ سے عمل کو ترک کرنا ریا ہے اور لوگوں کی وجہ سے عمل کرنا شرک ہے اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تمہیں ان دونوں سے محفوظ رکھے' ابن معاذ نے کہا: اخلاص یہ ہے کہ جس طرح دودھ کو گوبر اور خون کے درمیان سے نکالا جاتا ہے اس طرح عمل صالح کو گناہوں سے متمیز کیا جائے۔ ابویعقوب نے کہا: اخلاص یہ ہے کہ اس عمل کو نہ فرشتے لکھ پائیں' نہ شیطان فاسد کر سکے' نہ اس پر کوئی انسان مطلع ہو یعنی اللہ کے سوا اس پر کوئی مطلع نہ ہو' حذیفۃ المرعشی نے کہا: بندے کے افعال کا ظاہر اور باطن میں برابر ہونا اخلاص ہے' ابویعقوب المکفوف نے کہا: اخلاص یہ ہے کہ بندہ اپنی نیکیوں کو اس طرح چھپائے جس طرح اپنے گناہوں کو چھپاتا ہے' سہل نے کہا: اپنے عمل کو حقیر جاننا اخلاص ہے' ابوسلیمان الدارانی نے کہا: ریاکار کی تین علامتیں ہیں: جب وہ اکیلا ہو تو عبادت سے تھک جاتا ہے' اور جب لوگوں کے درمیان ہو تو تروتازہ ہوتا ہے اور جب اس کی تعریف کی جائے تو نیک عمل زیادہ کرتا ہے' اور اخلاص ریا کے بالمقابل ہے۔ (البحر المحیط ج ۱ ص ۶۵۸-۶۵۹ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا تم کہتے ہو کہ بے شک ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' یعقوب اور ان کی اولاد یہودی یا عیسائی تھے؟ آپ کہیے: کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ (البقرہ: ۱۴۰)

حضرت ابراہیم اور اسماعیل وغیرہ کے دین یہودیت اور عیسائیت پر نہ ہونے کا بیان

یہود کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد میں سے یہ انبیاء یہودی تھے اور عیسائی ان کو عیسائی کہتے تھے' اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کا رد فرمایا ہے' یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضرت ابراہیم موحد تھے' اسی طرح ان کی اولاد میں سے یہ انبیاء بھی موحد تھے اور حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب نے وفات سے پہلے اپنے بیٹوں سے توحید پر تادم مرگ قائم رہنے کا اقرار کرایا جیسا کہ قرآن مجید میں گزر چکا ہے' اور یہود مشرک تھے کیونکہ وہ عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور عیسائی بھی شرک کرتے ہیں کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں' اس لیے یہود اور عیسائیوں کا حضرت ابراہیم اور ان انبیاء کو اپنے اپنے دین پر کہنا بداہۃً باطل ہے۔

واضح رہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین واحد ہے اور وہ اسلام ہے "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ"۔ (آل عمران: ۱۹) اور ان کی شریعت الگ الگ ہے "لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا" (المائدہ: ۴۸) یعنی انسان کے فکری اور تہذیبی ارتقاء اور زمانہ اور ماحول کے خصوصی تقاضوں کی وجہ سے ہر نبی کے دور میں عبادات اور معاملات کے الگ الگ طریقے مشروع (مقرر) کیے گئے' البتہ عقائد سب کے ایک ہی تھے اور بعض غیر متبدل اصول بھی ہر دور میں برقرار رہے جیسا کہ ہم "مالك یوم الدین"

کی تفسیر میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جس نے اس شہادت کو چھپایا جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے ہے۔ (البقرہ: ۱۴۰)

اس شہادت کا بیان جس کو یہودیوں اور عیسائیوں نے چھپایا

اس شہادت کے متعلق دو قول ہیں' ایک یہ کہ یہود اور عیسائیوں کو یہ علم تھا کہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد میں یہ انبیاء یہودی یا عیسائی نہیں تھے اور انہوں نے علم کے باوجود اس شہادت کو چھپایا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی کتابوں میں حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر شہادت موجود تھی لیکن انہوں نے اس کو چھپایا' حالانکہ بعض راہبوں نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی جیسا کہ ورقہ بن نوفل نے آپ کی تصدیق کی اور قرآن مجید میں ہے: "یَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ" (الانعام: ۲۰) "وہ اس نبی کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں"۔ اس کے باوجود وہ حسد اور عناد کی وجہ سے اس شہادت کو چھپاتے تھے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ ایک امت ہے جو گزر چکی ہے' اس نے جو کام کیے اس کے لیے ان کا بدلہ ہے اور تم نے جو کام کیے تمہارے لیے ان کا بدلہ ہے۔ (البقرہ: ۱۴۱)

ایک شخص کے عمل سے دوسرے کو فائدہ پہنچنے کی تحقیق

یعنی ہر شخص کو اس کے عمل کی جزا ملے گی' یہ معنی برحق ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے عمل سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور اس کلیہ کی وجہ سے فوت شدہ مسلمانوں کے لیے ایصال ثواب کے جواز کا انکار کرنا باطل ہے' بعض لوگ قرآن مجید کی اس آیت کی بناء پر ایصال ثواب کا انکار کرتے ہیں:

اَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۙ (النجم: ۳۹) — انسان کے لیے صرف اسی کی کوشش کا اجر ہے O

اور ایصال ثواب میں دوسرے کے عمل سے فائدہ پہنچتا ہے اس لیے وہ ناجائز ہے' یہ دلیل باطل ہے اور اس کی متعدد وجوہ ہیں۔
علامہ سید احمد طحطاوی لکھتے ہیں:
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت اس دوسری آیت سے منسوخ ہو گئی:

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَاتَّبَعَتۡهُمۡ ذُرِّیَّتُهُمۡ بِاِیۡمَانٍ اَلۡحَقۡنَا بِهِمۡ ذُرِّیَّتَهُمۡ وَمَاۤ اَلَتۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَمَلِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ ؕ (الطور: ۲۱) — اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان میں ان کی پیروی کی' ان کی اولاد کو ہم ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے عمل میں کسی قسم کی کمی نہیں کریں گے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ اس آیت سے پہلے صحف ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کا ذکر ہے' اس لیے یہ حکم ان کی امتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔
رہی یہ امت تو اس کو اپنی سعی کا اجر بھی ملے گا اور جو اس کے لیے سعی کریں گے اس کا اجر بھی ملے گا' تیسرا جواب یہ ہے کہ علامہ ربیع بن انس اور علامہ ثعلبی نے فرمایا: اس آیت میں انسان سے مراد کافر ہیں اور کافروں کو صرف ان کی سعی کا اجر ملتا ہے اور وہ بھی صرف دنیا میں' آخرت میں ان کے لیے کوئی چیز نہیں ہے' چوتھا جواب یہ ہے کہ علامہ حسین بن فضل نے کہا: اس آیت میں دوسروں کی سعی سے جس اجر کی نفی ہے وہ بہ طریق عدل ہے اور جس اجر کا ثواب ہے وہ بہ تقاضاء فضل ہے' پانچواں

جواب یہ ہے کہ علامہ ابوبکر وراق نے کہا: اس آیت میں سعی نیت کے معنی میں ہے یعنی انسان کو صرف اپنی نیت کا اجر ملتا ہے' چھٹا جواب یہ ہے کہ آیت میں لام بہ معنی '' علی '' ہے یعنی انسان کو صرف اس کے عمل سے گناہ ہوتا ہے دوسروں کے عمل کا بار اس پر نہیں' ساتواں جواب یہ ہے کہ علامہ زعفرانی نے کہا: اس آیت میں سعی سے مراد عام ہے انسان نے خود سعی کی ہو یا سعی کا سبب فراہم کیا ہو مثلاً جس انسان کی اولاد' دوست احباب اور ملنے والے اس کے لیے دعا کرتے ہیں اور استغفار کرتے ہیں تو یہ بھی اس کی سعی کا سبب ہے کیونکہ وہ اپنی اولاد کی ایسی تربیت کرتا ہے اور قرابت داروں اور ملنے جلنے والوں سے ایسا حسن سلوک کرتا ہے جس کی بناء پر وہ اس کے لیے دعا اور استغفار کرتے ہیں گویا کہ اس دعا اور استغفار کا سبب اس شخص کی سعی سے قائم ہوا' آٹھواں جواب یہ ہے کہ علامہ عینی نے فرمایا: یہ حصر اصل مقصود کے اعتبار سے ہے کل کے اعتبار سے نہیں ہے۔

(حاشیہ مراقی الفلاح ص ۳۷۷' مطبوعہ مصطفی البابی مصر' الطبعۃ الثالثۃ' ۱۳۵۶ھ)

مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن بھوپالی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: شیخ الاسلام تقی الدین ابوالعباس احمد بن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا: جس شخص کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کو صرف اس کے عمل سے نفع ہوتا ہے وہ اجماع کا مخالف ہے اور یہ متعدد وجوہ سے باطل ہے' ایک وجہ یہ ہے کہ انسان کو دوسرے شخص کی دعا سے فائدہ پہنچتا ہے اور یہ عمل غیر سے فائدہ پہنچا' دوسری وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میدان محشر میں پہلے حساب کے لیے شفاعت فرمائیں گے' پھر جنت میں دخول کے لیے سفارش کریں گے اور آپ کے عمل سے دوسروں کو فائدہ پہنچے گا' تیسری وجہ یہ ہے کہ مرتکب کبیرہ (گنہگار) شفاعت کے ذریعہ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور یہ نفع عمل غیر سے ہوگا' چوتھی وجہ یہ ہے کہ فرشتے زمین والوں کے لیے دعا اور استغفار کرتے ہیں' پانچویں وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض ایسے گناہ گاروں کو جہنم سے نکالے گا جن کا کوئی عمل صالح نہیں ہوگا اور یہ نفع بغیر عمل اور سعی کے حاصل ہوا' چھٹی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اولاد اپنے آباء کے عمل سے جنت میں جائے گی اور یہ عمل غیر سے نفع ہے۔ ساتویں وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو یتیم لڑکوں کے قصہ میں بیان فرمایا: '' وکان ابوھما صالحا '' ان لڑکوں کو اپنے باپ کی نیکی سے فائدہ پہنچا۔ آٹھویں وجہ یہ ہے کہ سنت اور اجماع سے ثابت ہے کہ میت کو دوسروں کے کیے ہوئے صدقات سے فائدہ پہنچتا ہے' نویں وجہ یہ ہے کہ حدیث سے ثابت ہے کہ میت کے ولی کی طرف سے حج کرنے سے میت سے حج مفروض ساقط ہو جاتا ہے اور یہ فائدہ بھی عمل غیر سے ہے' دسویں وجہ یہ ہے کہ حدیث میں ہے کہ نذر مانا ہوا حج اور نذر مانا ہوا روزہ بھی غیر کے کرنے سے ادا ہو جاتا ہے' گیارہویں وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقروض کی نماز جنازہ نہیں پڑھی حتیٰ کہ ابوقتادہ نے اس کا قرض ادا کر دیا' اس طرح غیر کے عمل سے قرض ادا ہوا' بارہویں وجہ یہ ہے کہ ایک شخص تنہا نماز پڑھ رہا تھا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص اس پر صدقہ کیوں نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ مل کر نماز پڑھے اور اس کو جماعت کا ثواب مل جائے' تیرہویں وجہ یہ ہے کہ اگر کسی میت کی طرف سے لوگ قاضی کے حکم سے قرض ادا کریں تو میت کا قرض ادا ہو جاتا ہے' چودھویں وجہ یہ ہے کہ جس شخص پر لوگوں کے حقوق ہیں اگر لوگ وہ حقوق معاف کر دیں تو وہ بری ہو جاتا ہے' پندرہویں وجہ یہ ہے کہ نیک پڑوسی سے زندگی میں اور موت کے بعد بھی نفع حاصل ہوتا ہے' سولہویں وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے: ذکر کرنے والوں کی مجلس میں بیٹھا ہوا ایک ایسا شخص بخشا گیا جس نے ذکر نہیں کیا تھا' صرف ان کی مجلس میں بیٹھنے کی وجہ سے بخشا گیا' سترہویں وجہ یہ ہے کہ میت پر نماز جنازہ پڑھنا اور اس کے لیے استغفار کرنا' عمل غیر کا نفع ہے' اٹھارہویں وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: '' وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ '' (الانفال: ۳۳) ''اور اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ ان کو عذاب دے حالانکہ آپ ان میں موجود ہوں'' اور انیسویں وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: '' لَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ

وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ ''(الفتح: ۲۵) اور فرمایا: ''وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ ''(البقرہ: ۲۵۱) ''اور اگر بعض لوگوں کی نیکیوں کے سبب اللہ تعالیٰ بعض بروں سے عذاب نہ ٹالے تو زمین تباہ و برباد ہو جائے'' اور یہ عمل غیر سے نفع ہے بیسویں وجہ یہ ہے کہ نابالغ کی طرف سے بالغ صدقۂ فطر ادا کرتا ہے' اکیسویں وجہ یہ ہے کہ (ائمہ ثلاثہ کے نظریہ کے مطابق) نابالغ کی طرف سے اس کا ولی زکوٰۃ ادا کرے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور یہ عمل غیر سے نفع حاصل کرنا ہے' معلوم ہوا کہ کتاب' سنت اور اجماع کی روشنی میں عمل غیر سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

(فتح البیان ج ۹ ص ۱۴۳۔ ۱۴۴' مطبوعہ مطبع بولاق مصر' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۳۰۱ھ)

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ

عنقریب بیوقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں کو) ان کے اس قبلہ (بیت المقدس) سے کس نے پھیر دیا جس پر وہ (پہلے) تھے

الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ

آپ کہیے کہ مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں' وہ جسے چاہے

يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے O اور اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ وَ

تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور یہ رسول تمہارے حق میں گواہ ہو جائیں' اور

مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ

(اے رسول!) جس قبلہ پر آپ پہلے تھے ہم نے اس کو اسی لیے قبلہ بنایا تھا تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول

يَّنْقَلِبُ عَلٰي عَقِبَيْهِ ۭ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَي الَّذِيْنَ هَدَى

کی پیروی کرتا ہے اور اس کو اس سے ممتاز کر دیں جو اپنی ایڑیوں پر پلٹ جاتا ہے' اور بے شک جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے

اللّٰهُ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ

ان کے سوا سب پر یہ (قبلہ کا بدلنا) بھاری ہے' اور اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے' بے شک اللہ لوگوں

رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

پر بہت مہربان ہے بے حد رحم فرمانے والا ہے O

آیا مکہ میں ابتداءً آپ کا قبلہ کعبہ تھا یا بیت المقدس؟

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

اس میں اختلاف ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ابتداءً نماز فرض ہوئی تو آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے یا خانہ کعبہ کی طرف' حضرت ابن عباس کا قول یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں اور مدینہ منورہ کے ابتدائی سترہ مہینوں میں آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے' پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا' علامہ بدرالدین عینی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۴۰) تاہم آپ مکہ مکرمہ میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ کعبہ کی طرف پیٹھ نہیں ہوتی تھی۔ دوسروں نے یہ کہا ہے کہ جب آپ پر ابتداءً نماز فرض ہوئی تو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا' حافظ ابوعمرو ابن عبدالبر نے کہا: میرے نزدیک یہ قول زیادہ صحیح ہے' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں آئے تو آپ نے یہود کی تالیف قلب کے لیے ان کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تاکہ دین اسلام کو قبول کرنے کے لیے ان میں زیادہ داعیہ ہو اور جب آپ ان کے قبول اسلام سے مایوس ہو گئے تو آپ نے یہ چاہا کہ آپ کو پھر کعبہ کی طرف پھیر دیا جائے۔ ایک قول یہ ہے کہ کعبہ کی طرف منہ کرنے میں اہل عرب کے قبول اسلام کا زیادہ داعیہ تھا' ایک قول یہ ہے کہ آپ نے یہود کی مخالفت کی بناء پر ایسا کیا۔

تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ مکہ میں آپ کا قبلہ کعبہ تھا تو پھر دو بار قبلہ کا منسوخ ہونا لازم آئے گا اس لیے محققین کا یہ نظریہ ہے کہ آپ ابتداءً مکہ مکرمہ میں بھی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔

تحویل قبلہ کا بیان

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت براء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابتداءً مدینہ میں آئے تو اپنے نانا یا ماموں کے گھر ٹھہرے اور آپ نے سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی اور آپ کو یہ پسند تھا کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ ہو جائے اور آپ نے اس کی طرف منہ کر کے جو پہلی نماز پڑھی وہ عصر کی نماز تھی' آپ کے ساتھ ایک جماعت نے نماز پڑھی' پھر آپ کے ساتھ نماز پڑھنے والوں میں سے ایک شخص ایک مسجد والوں کے پاس سے گزرا وہ اس وقت رکوع میں تھے' اس نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے' وہ لوگ نماز کی حالت میں بیت اللہ کی طرف پھر گئے' یہود اور دیگر اہل کتاب کو یہ پسند تھا کہ آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہیں' جب آپ نے بیت اللہ کی طرف منہ کر لیا تو ان کو یہ ناگوار ہوا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۱۔ ۱۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں کہ اس مسجد کے نمازیوں کو خبر واحد سے یہ علم ہو گیا کہ قبلہ بدل گیا ہے' اب ان کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس نماز کو توڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے اور تحویل قبلہ کی تحقیق کرتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس خبر پر اعتماد کر کے نماز میں قبلہ بدل لیتے' انہوں نے اجتہاد سے دوسری صورت پر عمل کیا' اس سے معلوم ہوا کہ خبر واحد حجت ہے اور اپنے اجتہاد سے نماز میں قبلہ کی سمت بدلنا جائز ہے' بلکہ اگر ہر رکعت میں اس پر قبلہ مشتبہ ہو تو وہ اپنے اجتہاد سے ہر رکعت میں سمت بدل لے۔ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۲۴۸' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

''صحیح بخاری'' کی اس روایت میں یہ مذکور ہے کہ تحویل قبلہ کے بعد بیت اللہ کی طرف جو نماز سب سے پہلے پڑھی گئی وہ عصر کی نماز تھی' اور امام مالک کی روایت میں ہے: وہ صبح کی نماز تھی اور ایک قول یہ ہے کہ یہ حکم بنو سلمہ کی مسجد میں نازل ہوا' اس وقت آپ ظہر کی نماز میں تھے اور دو رکعت پڑھ چکے تھے' پھر نماز ہی میں آپ نے قبلہ بدل لیا اور باقی دو رکعتیں بیت اللہ کی طرف منہ کر کے پڑھیں اور اس مسجد کا نام مسجد القبلتین رکھا گیا' چونکہ بیت اللہ اور بیت المقدس ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں اس لیے نماز میں مرد گھوم کر عورتوں کی جگہ آ گئے اور عورتیں گھوم کر مردوں کی جگہ چلی گئیں۔

ابو حاتم البستی نے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں نے سترہ ماہ اور تین دن بیت المقدس کی طرف نمازیں پڑھیں' کیونکہ آپ بارہ ربیع الاول کو مدینہ منورہ آئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو منگل کے دن نصف شعبان کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔

بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی کیفیت میں علماء کے تین اقوال ہیں:

(۱) حسن' عکرمہ اور ابو العالیہ نے کہا: آپ نے اپنی رائے اور اجتہاد سے بیت المقدس کی طرف منہ کیا تھا۔

(۲) طبری نے کہا: آپ کو بیت المقدس اور بیت اللہ میں سے کسی ایک کی طرف منہ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا' آپ نے یہود کے ایمان لانے کی خواہش کی وجہ سے بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کو اختیار کر لیا۔

(۳) حضرت ابن عباس نے کہا: آپ نے اللہ کی وحی اور اس کے حکم سے بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کو اختیار کیا تھا کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

جس قبلہ پر آپ پہلے تھے ہم نے اس کو اسی لیے قبلہ بنایا تھا تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے (اور اس کو اس سے ممتاز کر دیں' جو اپنی ایڑیوں پر پلٹ جاتا ہے) اور یہی جمہور کا مسلک ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۵۰ - ۱۴۸ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہیے کہ مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں وہ جسے چاہے صراط مستقیم پر چلاتا ہے O (البقرہ: ۱۴۲)

تحویل قبلہ سے متعلق مسائل

اس آیت میں منافقین اور یہود کے اعتراض کا جواب دیا ہے کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ بیت المقدس خود مستقل بالذات ہے کیونکہ مشرق اور مغرب سب اس کی ملک ہیں' وہ جس طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے وہی قبلہ ہے اور اس کے حکم پر عمل کرنا ہی صراط مستقیم کی ہدایت ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت اور اس کی تفسیر میں جو ''صحیح بخاری'' کی روایت ذکر کی گئی ہے ان سے حسب ذیل مسائل مستنبط ہوتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عنقریب یہ بے وقوف یہ کہیں گے کہ ''مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے کس نے پھیر دیا جس پر وہ تھے'' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غیب کی خبر دی ہے اور یہ پیش گوئی پوری ہو گئی اور یہ حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید کی صداقت کی قوی دلیل ہے۔

(۲) اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ایسے احکام بھی ہیں جو ناسخ اور منسوخ ہیں اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن مجید نے جس حکم کو سب سے پہلے منسوخ کیا ہے وہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا ہے۔

(۳) بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم قرآن میں نہیں تھا' یہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت تھا اور قرآن مجید نے اس حکم کو منسوخ کر دیا' اس سے معلوم ہوا کہ قرآن سنت کا ناسخ ہے۔

(۴) خبر واحد پر عمل کرنا جائز ہے' کیونکہ اہل قبا کو جب یہ خبر پہنچی کہ قبلہ بدل گیا ہے تو انہوں نے نماز کی حالت میں اپنا قبلہ بدل لیا۔

(۵) جب تک کسی حکم کے منسوخ ہونے کا علم نہ ہو اس پر عمل کرنا جائز ہے کیونکہ تحویل قبلہ کے بعد بھی اہل قبا۔ نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی کیونکہ ان کو اس وقت تک تحویل قبلہ کا علم نہیں ہوا تھا۔

(۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید تدریجاً نازل ہوتا تھا اور حسب ضرورت احکام نازل ہوتے رہتے تھے۔

نماز کے لیے کسی ایک جہت کی طرف منہ کرنے کے اسرار

تمام نمازیوں کے لیے کسی ایک جہت کو قبلہ بنانے کی حسب ذیل حکمتیں ہیں:

(۱) اگر نماز میں کسی ایک جہت کی طرف منہ کرنے کا حکم نہ دیا جاتا تو کوئی مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا کوئی مغرب کی طرف اور کوئی شمال کی طرف اور کوئی جنوب کی طرف اور اس طرح عبادت میں مسلمانوں کی وحدت' نظم اور جمعیت نہ رہتی اور جب تمام دنیا کے مسلمان ایک جہت کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں گے تو ان کی عبادت میں وحدت' نظم اور جمعیت پائی جائے گی اور اسلام نے تمام عبادات میں مسلمانوں کو وحدت اور نظم کے تابع کیا ہے۔

(۲) جب انسان کسی صاحب اقتدار کے پاس جاتا ہے تو اس کی طرف متوجہ ہو کر اپنی درخواست پیش کرتا ہے' نماز میں انسان اللہ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی حمد و ثناء کرتا ہے' اس کی تسبیح کرتا ہے اور اس کے سامنے اپنی درخواست پیش کرتا ہے تو اس کی توجہ کے ارتکاز کے لیے قبلہ بنایا گیا۔

(۳) نماز میں اصل یہ ہے کہ خضوع' خشوع' اور حضور قلب ہو' اگر انسان مختلف جہات کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھے تو اس سے حضور قلب حاصل نہیں ہو گا اس لیے ایک قبلہ بنایا گیا تا کہ سب اس کی طرف متوجہ ہو کر حضور قلب کے ساتھ نماز پڑھیں۔

کعبہ کو قبلہ بنانے کے اسرار

(۱) اللہ تعالیٰ نے کعبہ کے متعلق فرمایا: یہ میرا گھر ہے" اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ "(البقرہ: ۱۲۵) تو اپنی عبادت کرنے والوں کے لیے اپنے بیت کو قبلہ بنا دیا۔

(۲) یہود نے سمت مغرب کو قبلہ بنایا تھا کیونکہ حضرت موسیٰ کو مغرب کی جانب سے ندا آئی تھی: " وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ "(القصص: ۴۴) اور عیسائیوں نے جہت مشرق کو قبلہ بنایا کیونکہ حضرت جبرائیل حضرت مریم کے پاس جانب شرق سے گئے تھے" وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا " (مریم: ۱۶) تو مسلمانوں کا قبلہ کعبہ بنایا کیونکہ یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا قبلہ ہے اور سیدنا محمد حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد ہے اور اللہ کا حرم اور بیت اللہ ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (آل عمران: ۹۶-۹۷)

بے شک (اللہ کی عبادت کے لیے) سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور تمام جہانوں کے لیے ہدایت ہے ۝ اس میں کھلی کھلی نشانیاں ہیں' مقام ابراہیم ہے' جو اس میں داخل ہوا وہ مامون ہو گیا۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ . اللہ نے کعبہ کو عزت والا گھر اور لوگوں کے قیام کا سبب بنادیا۔ (المائدہ: ۹۷)

(۳) کعبہ زمین کے وسط میں ہے' اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو زمین کے وسط کی طرف متوجہ کیا تا کہ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں کیفیت متوسط (عدل) کو اختیار کریں۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو قبلہ بنا کر یہ ظاہر فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں' کیونکہ کعبہ کو قبلہ بنانے کی یہ وجہ بیان فرمائی:

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۪ (البقرہ: ۱۴۴) ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف ضرور پھیر دیں گے جس پر آپ راضی ہیں۔

وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ○ اور رات کے کچھ اوقات اور دن کے اطراف میں اس کی تسبیح کیجئے تا کہ آپ راضی ہو جائیں○ (طٰہٰ: ۱۳۰)

دنیا میں آپ کو راضی کرنے کے لیے کعبہ کو قبلہ بنایا' اور دن رات میں تسبیح پڑھنے کا حکم دیا اور آخرت میں آپ کو راضی کرنے کے لیے مقام محمود اور شفاعت کبریٰ سے نوازا:

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ○ عنقریب آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر جلوہ گر فرمائے گا○ (بنی اسرائیل: ۷۹)

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۞ (الضحیٰ: ۵) اور عنقریب ضرور آپ کا رب آپ کو (اتنا) دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے○

(۵) حضرت آدم نے پانچ پہاڑوں سے مٹی لے کر کعبہ بنایا تھا' اس میں یہ اشارہ ہے کہ اگر تمہارے گناہ پہاڑ جتنے بھی ہوئے تو کعبہ کی طرف نماز پڑھنے سے جھڑ جائیں گے۔

(۶) جب مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے تو یہود طعنہ دیتے تھے کہ تم ہماری مخالفت کرتے ہو اور ہماری مسجد کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہو تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا قبلہ بدل دیا' اور کعبہ کو قبلہ بنا دیا۔

(۷) مسلمان ملت ابراہیم کے اتباع کے داعی تھے اس لیے حضرت ابراہیم کے بنائے ہوئے کعبہ کو ان کا قبلہ بنا دیا۔

(۸) جب قریش نے کعبہ کی تعمیر کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے تو اس کو قبلہ بنانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم ہے۔

استقبال کعبہ کے فقہی مسائل

(۱) نماز میں مسجود لہ اللہ تعالیٰ ہے' کعبہ کو سجدہ کرنے کی نیت کرنا کفر ہے۔

(۲) کعبہ سے مراد وہ جگہ ہے اور تحت الثریٰ سے لے کر عرش عظیم تک وہ فضاء ہے جہاں کعبہ بنا ہوا ہے حتیٰ کہ اگر بیت اللہ کی یہ عمارت نہ بھی ہو تو اس جگہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جائے گی۔

(۳) مکہ اور مدینہ میں رہنے والوں کے لیے عین کعبہ کی طرف منہ کرنا ضروری ہے اور دوسروں کے لیے کعبہ کی جہت کی طرف منہ کرنا کافی ہے۔

(۴) اگر کسی شخص کو اندھیرے یا لاعلمی کی وجہ سے کعبہ کی سمت کا پتا نہ ہو تو وہ غور و فکر کرے اور جس جانب اس کا ظن غالب ہو

اس طرف منہ کر کے نماز پڑھے اگر بعد میں یہ پتا چلے کہ اس نے غلط سمت کی طرف نماز پڑھی تو اس پر اعادہ نہیں ہے اگر نماز کی ہر رکعت میں اس کی رائے بدل جائے تو اپنی رائے کے مطابق ہر رکعت میں پھرتا رہے۔

(۵) نفل نماز چلتی سواری پر جائز ہے خواہ سواری کا قبلہ کی طرف منہ نہ ہو۔

(۶) عذر کی وجہ سے فرض نماز چلتی سواری (خواہ چلتی ٹرین ہو) پر جائز ہے خواہ سواری کا قبلہ کی طرف منہ نہ ہو اور بعد میں اس کا اعادہ نہیں ہے۔ (درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۱ ص ۲۹۱ - ۲۸۶ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

کعبہ کا اولیاء اللہ کی زیارت کے لیے جانا

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی [1]' علامہ ابن عابدین شامی حنفی [2] اور علامہ سید احمد طحطاوی حنفی [3] نے لکھا ہے کہ کعبہ کا اولیاء اللہ کی زیارت کے لیے جانا جائز ہے اور اس مسئلہ کو نجم الملۃ والدین علامہ عمر نسفی اور علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی نے نقل کیا ہے۔

شیخ اشرف علی تھانوی نے بھی لکھا ہے کہ یہ جائز ہے اور اس پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے' امام ترمذی روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابن عمر نے کعبہ کو دیکھ کر فرمایا: تیری حرمت کس قدر عظیم ہے لیکن مومن کی حرمت اللہ کے نزدیک تجھ سے زیادہ ہے' اور امام ابن ماجہ نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کا طواف فرما رہے تھے اور فرما رہے تھے: تو کتنا پاکیزہ ہے اور تیری خوشبو کتنی اچھی ہے اور تیری حرمت کتنی عظیم ہے اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں محمد کی جان ہے! اللہ کے نزدیک مومن کی حرمت تجھ سے زیادہ ہے' سو جب بندہ مومن کعبہ سے افضل ہے تو کعبہ کا اولیاء اللہ کی زیارت کے لیے جانا بعید نہیں ہے' رہا یہ شبہ کہ اگر کعبہ اولیاء اللہ کی زیارت کے لیے جاتا ہے تو اتنا بھاری بھرکم جسم کیسے منتقل ہوتا ہے اور تاریخ میں کہیں منقول نہیں کہ کعبہ اپنی جگہ سے کبھی غائب ہوا ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قریش نے (واقعہ معراج میں) میری تکذیب کی تو میں حطیم میں کھڑا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے میرے لیے بیت المقدس کو منکشف کر دیا اور حضرت ابن عباس کی روایت میں ہے کہ بیت المقدس کو لا کر میرے سامنے دار عقیل کے پاس رکھ دیا اور میں اس کو دیکھ رہا تھا' بیت المقدس بھی ایک بھاری جسم ہے اور اس کا منتقل ہونا بھی عادۃً محال ہے اور اس کے متعلق بھی تاریخ میں کہیں منقول نہیں کہ وہ اپنی جگہ سے غائب ہوا ہو اس حدیث کی یہ توجیہ ہے کہ بیت المقدس کی مثال اس کی جگہ پر تھی اور اس کی حقیقت آپ کے سامنے رکھ دی گئی اس طرح ہو سکتا ہے کہ حقیقت کعبہ زیارت کے لیے گئی ہو اور اس کی مثال وہاں اس کے قائم مقام کر دی گئی ہو۔

(بوادر النوادر ص ۱۳۷ - ۱۳۵ ملخصاً 'مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز' ۱۹۶۳ء)

اور قرآن مجید میں پلک جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس لانے کا واقعہ مذکور ہے' اس سے یہ شبہ بھی دور ہو جاتا ہے کہ ایک بھاری جسم کیسے منتقل ہو سکتا ہے۔

علامہ یافعی یمنی لکھتے ہیں:

روایت ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو دور دراز کے شہروں سے کعبہ دکھایا' ایک اور شخص نے بعض منکرین کو دکھایا

---

[1] علامہ علاء الدین محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفی متوفی ۱۰۸۸ھ' درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۲ ص ۶۳۰ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ

[2] علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ' ردالمحتار ج ۲ ص ۶۳۰ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ

[3] علامہ سید احمد طحطاوی حنفی متوفی ۱۲۳۱ھ' حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج ۲ ص ۱۳۹ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۵ھ

کہ وہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا' اور ہم نے تحقیق کے ساتھ یہ سنا ہے کہ تحقیق سے ثابت ہے کہ یہ مشاہدہ کیا گیا کہ کعبہ ایک جماعت کا حقیقتاً طواف کر رہا تھا اور میں نے بعض معتمد اولیاء اور مستند علماء کو دیکھا ہے جنہوں نے کعبہ کو اولیاء کا طواف کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (روض الریاحین فی حکایات الصالحین ص ۲۴۳ 'مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی واولادہ مصر)

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں کعبہ کی تعظیم اور توقیر اور ہیبت اور جلال اور زیادہ کرے' ہمیں یہ نقول اور دلائل بہت عجیب دغریب معلوم ہوتے ہیں خصوصاً اس لیے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سید الانبیاء والاولیاء ہیں لیکن آپ نے کعبہ کا طواف کیا اور آپ کے گرد کعبہ کا طواف کرنا ثابت نہیں ہے' اگر ان مستند فقہاء اور علماء نے کعبہ کے طواف کرنے کو نقل نہ کیا ہوتا تو ہم اس کو صراحۃً رد کر دیتے' جو فضیلت آپ کے لیے ثابت نہ ہو اس فضیلت کو ہم آپ کے امتی کے لیے ثابت کرنے کی جرات نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اسی طرح ہم نے تمہیں متوسط (بہترین) امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور یہ رسول تمہارے حق میں گواہ ہو جائیں۔ (البقرہ: ۱۴۳)

امت مسلمہ کا باقی امتوں پر گواہ ہونا

اس کلام کے اول اور آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے' اول میں ہے: آپ کہیے کہ مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں اور آخر میں ہے: (اے رسول!) جس قبلہ پر آپ پہلے تھے الخ اور درمیان میں اس کلام سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو خطاب کیا گیا ہے' اس میں یہود کو بتایا گیا ہے کہ تم مسلمانوں کے قبلہ کا کیوں انکار کرتے ہو اور ان کے دین کو کیوں قبول نہیں کرتے حالانکہ مسلمان قیامت کے دن تمہارے خلاف شہادت دیں گے اور ان کی شہادت قبول کی جائے گی' اس لیے تم کو چاہیے کہ تم دنیا میں ان کی مخالفت نہ کرو اور ان کے دین کی پیروی کرو۔

امام بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں یہ حدیث ذکر کی ہے:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت نوح کو قیامت کے دن بلایا جائے گا' وہ کہیں گے: میں حاضر ہوں اے رب! اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم نے تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے: ہاں! پھر ان کی امت سے پوچھا جائے گا: کیا نوح نے تم کو تبلیغ کی تھی؟ ان کی امت کہے گی: ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا! اللہ تعالیٰ حضرت نوح سے فرمائے گا: تمہارے حق میں کون گواہی دے گا؟ وہ کہیں گے: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی امت' اور وہ گواہی دیں گے کہ حضرت نوح نے ان کو تبلیغ کی تھی' یہ اس آیت کی تفسیر ہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۴۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام نسائی روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ قیامت کے دن ایک نبی آئے گا اور اس کے ساتھ ایک شخص ہوگا' اور ایک نبی آئے گا اس کے ساتھ دو شخص ہوں گے اور ایک نبی آئے گا اس کے ساتھ زیادہ لوگ ہوں گے' اس سے کہا جائے گا: کیا تم نے اپنی قوم کو تبلیغ کی تھی؟ وہ کہے گا: ہاں! پھر اس کی قوم کو بلایا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا: کیا انہوں نے تم کو تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے: نہیں' پھر اس نبی سے کہا جائے گا: تمہارے حق میں کون گواہی دے گا؟ وہ کہیں گے: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت' پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو بلایا جائے گا اور کہا جائے گا: کیا انہوں نے تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے ہاں! پھر کہا جائے گا: تم کو اس کا کیسے علم ہوا؟ وہ کہیں گے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ خبر دی تھی کہ (سب) رسولوں نے تبلیغ کی ہے' اور یہ اس آیت کی تفسیر ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۶ ص ۲۹۲ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۱ھ)

دین اسلام اور مسلک اہل سنت و جماعت کا سب سے افضل ہونا

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ہم نے تم کو ہدایت یافتہ بنایا ہے اور تمہارے قبلہ کو تمام امتوں کے قبلہ سے افضل بنایا ہے اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط یعنی سب سے افضل امت بنایا ہے۔ دائرہ میں جس نقطہ (مرکز) سے محیط کی طرف تمام مساوی خطوط نکلتے ہیں ان مساوی خطوط کو خط وسط کہتے ہیں اور عرف میں وسط سے وہ کیفیت مراد ہے جو افراط اور تفریط کے درمیان ہو' مثلاً اسراف اور بخل کے درمیان سخاوت ہے اور رہبانیت اور فسق و فجور کے درمیان عفت ہے اور کیفیت متوسط سب سے افضل ہوتی ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تم کو سب سے افضل امت بنایا ہے۔ باقی امتوں میں سے یہود و نصاریٰ ہیں جو ایک سے زیادہ خدا مانتے ہیں اور یاد ہریے ہیں جو خدا کے وجود کے منکر ہیں' ان میں مسلمان متوسط ہیں جو خدا کے وجود کے قائل ہیں اور صرف ایک خدا مانتے ہیں' ہندو نبوت کے قائل نہیں اور مرزائی قیامت تک نبوت کو جاری مانتے ہیں اور مسلمان نبوت کے قائل ہیں اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کو ختم مانتے ہیں' اسی طرح اسلام کے فرقوں میں اہل سنت و جماعت متوسط ہیں' رافضیہ صحابہ کو سب اور لعنت کرتے ہیں' ناصبیہ اہل بیت کو سب کرتے ہیں اور اہل سنت و جماعت صحابہ اور اہل بیت دونوں کی تعظیم کرتے ہیں' جبریہ کہتے ہیں: انسان مجبور محض ہے' معتزلہ کہتے ہیں: انسان اپنے افعال کا خالق ہے اور اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ انسان کو کسب کا اختیار ہے اور افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے' خوارج کہتے ہیں کہ صغیرہ یا کبیرہ گناہ کرنا کفر ہے اور مرجئہ کہتے ہیں کہ گناہ کرنے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کرنے سے انسان ایمان سے خارج نہیں ہوتا اور اگر وہ توبہ نہ کرے تو عذاب کا مستحق ہوتا ہے' خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام متوسط ہے اور اسلام کے تمام فرقوں میں اہل سنت و جماعت متوسط ہیں اور متوسط ہونا افضل ہونے کو مستلزم ہے۔

عدالت صحابہ اور حجیت اجماع

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں امت مسلمہ کو گواہ قرار دیا ہے اور گواہی اس کی مقبول ہوتی ہے جو عادل اور نیک ہو اور اس آیت کے اولین مخاطب اور مصداق حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں' سو یہ آیت اس بات کو مستلزم ہے کہ تمام صحابہ عادل اور نیک ہیں اور شیعہ کا یہ کہنا باطل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد تین چار کے سوا باقی تمام صحابہ (العیاذ باللہ) مرتد ہو گئے تھے' نیز صحابہ کرام کے علاوہ قیامت تک کے تمام مسلمان بھی امت مسلمہ میں ثانیا و بالعرض داخل ہیں اور اس میں یہ دلیل ہے کہ امت مسلمہ کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی کیونکہ ان کا گمراہی پر مجتمع ہونا ان کی عدالت اور نیکی کے خلاف ہے اور جو عادل نہ ہو وہ گواہ نہیں ہو سکتا اس لیے امت مسلمہ کا گواہ ہونا امت مسلمہ کے اجماع کے حق اور حجت ہونے کو مستلزم ہے' اور یہ واضح رہے کہ کفر اور بدعت عدالت کے منافی ہے اس لیے امت مسلمہ کے اجماع میں روافض' خوارج اور مشبہہ وغیرہ داخل نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یہ رسول تمہارے حق میں گواہ ہو جائیں۔ (البقرہ: ۱۴۳)

قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں پچھلی امتوں اور اس امت کے افعال اور احوال کا ــــــــ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کیا جانا

عربی قواعد کے مطابق ''علی'' جب شہادت کا صلہ ہو تو اس کا معنی ہے: کسی کے خلاف گواہی دینا اور یہاں مقصود یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت مسلمہ کے حق میں گواہی دیں گے اور ان کے عادل اور نیک ہونے کو بیان کریں گے' علامہ بیضاوی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہاں شہید رقیب اور مہیمن (نگہبان) کے معنی کو متضمن ہے اور ''علی'' رقیب کا صلہ ہے'

اس کا معنی ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت پر نگہبان اور ان کے احوال پر مطلع ہیں اس لیے ان کے حق میں گواہی دیں گے۔
(انوار التنزیل ص ۲۹ مطبوعہ دار فراس للنشر والتوزیع)

بہ کثرت احادیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پچھلی امتیں پیش کی گئیں اور اس امت کے افعال اور اعمال آپ پر پیش کیے گئے اور چونکہ آپ سب کے احوال اور افعال پر مطلع ہیں اس لیے سب کے متعلق گواہی دیں گے۔

قرآن مجید میں ہے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ۝ (النساء: ۴۱)

اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور آپ کو ان (سب) پر گواہ بنا کر لائیں گے O

علامہ بیضاوی نے لکھا ہے کہ ہر نبی اپنی امت کے فاسد عقائد اور برے اعمال کے خلاف گواہی دے گا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں کی گواہی کے صدق پر گواہی دیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام امتوں کے احوال پر مطلع ہوں گے' کیونکہ بغیر علم کے گواہی جائز نہیں ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تمام امتوں کے احوال اور افعال پر مطلع فرمایا ہے اور ان کی دنیا اور آخرت کا آپ کو علم عطا فرمایا ہے اور خصوصاً آپ کی امت کے اعمال قبر انور میں آپ پر پیش کیے جاتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی' پھر وہاں چاشت کے وقت تک بیٹھے رہے' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے' پھر اسی جگہ بیٹھے رہے' پھر آپ نے ظہر' عصر' مغرب اور عشاء پڑھیں اور اس دوران کسی سے بات نہیں کی' پھر گھر تشریف لے گئے' لوگوں نے حضرت ابوبکر سے کہا: آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا نہیں کہ آج کا دن آپ نے غیر معمولی طور پر گزارا' حضرت ابوبکر نے پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا اور آخرت کے امور میں سے جو کچھ بھی ہونے والا تھا وہ سب مجھ پر آج پیش کیا گیا' تمام اولین اور آخرین کو ایک میدان میں جمع کیا گیا' لوگ گھبرا کر حضرت آدم کے پاس گئے درآں حالیکہ وہ لوگ منہ تک پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ الحدیث (مسند احمد ج ۱ ص ۴' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۳۹۸ھ)

اس حدیث کو امام ابوعوانہ نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند ابوعوانہ ج ۱ ص ۱۷۷۔ ۱۷۶' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر امت کے اچھے اور برے (تمام) اعمال پیش کے جاتے ہیں' میں نے نیک اعمال میں دیکھا کہ نجاست کو راستہ سے ایک طرف کر دیا گیا' اور برے اعمال میں دیکھا کہ ناک کی رینٹ کو مسجد میں ڈال دیا گیا اور اس کو دفن نہیں کیا گیا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۰۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کو امام احمد[1]' امام ابوعوانہ[2] اور امام بیہقی[3] نے بھی روایت کیا ہے۔

---

[1] امام احمد حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۵ ص ۱۸۰' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۳۹۸ھ

[2] امام ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق اسفرائنی متوفی ۳۱۶ھ' مسند ابوعوانہ ج ۱ ص ۴۰۶' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت

[3] امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' سنن کبریٰ ج ۲ ص ۲۹۱' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان

امام محمد بن سعد روایت کرتے ہیں:

بکر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری حیات تمہارے لیے بہتر ہے' تم باتیں کرتے ہو اور تمہارے لیے حدیث بیان کی جاتی ہے اور جب میں وفات پا جاؤں گا تو میری وفات تمہارے لیے بہتر ہوگی' مجھ پر تمہارے اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ جب میں نیک عمل دیکھتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں اور جب میں برا عمل دیکھتا ہوں تو تمہارے لیے استغفار کرتا ہوں۔ (الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۱۹۴' مطبوعہ دار صادر' بیروت' ۱۳۸۸ھ)

حافظ سیوطی نے اس حدیث کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔ (الجامع الصغیر ج ۱ ص ۵۸۲' مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

حافظ ابن حجر عسقلانی[1]' علامہ علی متقی ہندی[2] اور علامہ مناوی[3] نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔

حافظ ابن کثیر' امام بزاز کی سند بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے سیاحت کرنے والے ہیں' وہ مجھے میری امت کا سلام پہنچاتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری حیات تمہارے لیے بہتر ہے' تم باتیں کرتے ہو اور تمہارے لیے حدیث بیان کی جاتی ہے اور میری وفات تمہارے لیے بہتر ہے' تمہارے اعمال مجھ پر پیش کیے جاتے ہیں۔ میں جو نیک عمل دیکھتا ہوں اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں' اور میں جو برا عمل دیکھتا ہوں اس پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں۔ (البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۲۷۵' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۳ھ)

حافظ نور الدین الہیثمی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام بزار نے بیان کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۹ ص ۲۴' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

امام عبداللہ بن عدی الجرجانی روایت کرتے ہیں:

خراش بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری حیات تمہارے لیے بہتر ہے اور میری موت تمہارے لیے بہتر ہے' حیات اس لیے بہتر ہے کہ میں تم سے حدیث بیان کرتا ہوں' اور میری موت اس لیے بہتر ہے کہ ہر پیر اور جمعرات کو تمہارے اعمال مجھ پر پیش کیے جاتے ہیں' سو جو نیک عمل ہوتے ہیں میں ان پر اللہ کی حمد کرتا ہوں اور جو برے عمل ہوتے ہیں تو میں تمہارے لیے استغفار کرتا ہوں۔ (الکامل فی ضعفاء الرجال' ج ۳ ص ۹۲۵' مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

اس حدیث کو امام ابن جوزی نے حضرت انس کی روایت سے ذکر کیا ہے' اس روایت میں ہر جمعرات کو عرض اعمال کا ذکر ہے پیر کا ذکر نہیں ہے۔ (الوفاء ص ۸۱۰' مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی واولادہ' مصر' ۱۳۶۹ھ)

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے دنوں میں سب سے زیادہ فضیلت والا دن جمعہ ہے' اس دن مجھ پر بہت زیادہ صلوٰۃ (درود) پڑھا کرو' کیونکہ تمہاری صلوٰۃ مجھ پر پیش کی جاتی ہے' ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہماری صلوٰۃ آپ پر کیسے پیش کی جائے گی حالانکہ آپ کا جسم بوسیدہ ہو چکا ہوگا؟ آپ نے فرمایا:

---

[1] حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ' المطالب العالیہ ج ۴ ص ۲۳۔ ۲۲' مطبوعہ توزیع عباس احمد الباز' مکہ مکرمہ

[2] علامہ علی متقی بن حسام الدین ہندی متوفی ۹۷۵ھ' کنز العمال ج ۱۱ ص ۴۰۷' مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ' بیروت' ۱۴۰۵ھ

[3] علامہ عبدالرؤف مناوی متوفی ۱۰۰۳ھ' فیض القدیر ج ۳ ص ۴۰۱' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۱ھ

اللہ نے انبیاء کے اجسام کھانے کو زمین پر حرام کر دیا ہے۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۱۴۹۔ ۱۵۰ مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور ۱۴۰۵ھ)

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر میری امت کے (نیک کاموں کے) اجر پیش کیے گئے حتیٰ کہ مسجد سے کوڑا کرکٹ نکال کر پھینکنے کا اجر پیش کیا گیا اور میری امت کے گناہ پیش کیے گئے تو میں نے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ کسی شخص کو قرآن مجید کی کوئی سورت یا کوئی آیت دی گئی ہو اور اس نے اس کو بھلا دیا۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۶۶ مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث کو امام ترمذی [۱] امام بیہقی [۲] امام طبرانی [۳] اور امام عبدالرزاق [۴] نے بھی روایت کیا ہے۔

امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی امت پر جو کچھ مفتوح تھا وہ آپ پر پیش کر دیا گیا۔ (المعجم الکبیر ج ۱۰ ص ۲۷۷ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

حافظ نورالدین الہیثمی امام بزار کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر میری امت کو پیش کیا گیا اور ان میں تابع ہو یا متبوع مجھ پر کوئی مخفی نہیں رہا۔ (مجمع الزوائد ج ۱ ص ۷۲ مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت ۱۴۰۲ھ)

امام ابونعیم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر تمام امتیں پیش کی گئیں: ایک نبی کے ساتھ ایک جماعت گزری ایک نبی کے ساتھ ایک اور دو آدمی گزرے۔

(حلیۃ الاولیاء ج ۴ ص ۳۰۲ مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت ۱۴۰۷ھ)

اس حدیث کو امام ابوعوانہ [۵] اور امام طبرانی [۶] نے تفصیل کے ساتھ روایت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (اے رسول!) جس قبلہ پر آپ پہلے تھے ہم نے اس کو اسی لیے قبلہ بنایا تھا تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور اس کو اس سے ممتاز کر دیں جو اپنی ایڑیوں پر پلٹ جاتا ہے۔ (البقرہ: ۱۴۳)

بعض ترجموں سے اللہ تعالیٰ کے علم کی نفی کا اشکال اور اس کے جوابات

اس آیت کا لفظی معنی یہ ہے: تاکہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے، لیکن اس ترجمہ سے یہ لازم آتا ہے کہ تحویل قبلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ کو یہ علم نہیں تھا کہ رسول کی پیروی کرنے والے اور دین سے پھر جانے والے کون ہیں، بعض مترجمین نے اسی طرح ترجمہ کیا ہے:

۱۔ امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، جامع ترمذی ص ۴۱۴ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی

۲۔ امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ، سنن کبریٰ ج ۲ ص ۴۴۰ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان

۳۔ امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ، المعجم الصغیر ج ۱ ص ۱۸۹ مطبوعہ مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ ۱۳۸۸ھ

۴۔ امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی متوفی ۲۱۱ھ، المصنف ج ۳ ص ۳۶۱ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۳۹۰ھ

۵۔ امام ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق اسفرائنی متوفی ۳۱۶ھ، مسند ابوعوانہ ج ۱ ص ۸۵ مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت

۶۔ امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ، المعجم الکبیر ج ۱۰ ص ۵ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت

شیخ محمود الحسن اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ جس پر تو پہلے تھا' مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کہ کون تابع رہے گا اور کون پھر جائے گا الٹے پاؤں۔

شیخ اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں وہ تو محض اس لیے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ کون تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

پہلے جس طرف تم رخ کرتے تھے اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پیر پھر جاتا ہے۔

اس عبارت میں دیکھنے سے متبادر بھی جاننا ہے اس لیے یہ عبارت محل اشکال ہے کیونکہ اس قسم کی عبارت میں دیکھنے کا لفظ جاننے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

اور ہم نے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے:

اور (اے رسول!) جس قبلہ پر آپ پہلے تھے ہم نے اس کو اسی لیے قبلہ بنایا تھا تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور اس کو اس سے ممتاز کر دیں جو اپنی ایڑیوں پر پلٹ جاتا ہے۔

ہم نے اس آیت میں علم کو اظہار اور تمیز کے معنی پر محمول کیا ہے تاکہ صرف اردو پڑھنے والے لوگ جن کی عربی تفاسیر تک رسائی نہیں ہے یہ وہم نہ کریں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کی نفی ہو رہی ہے۔ معاذ اللہ!

اس آیت کا ظاہری معنی ہے: تاکہ ہم جان لیں یا تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے' اس معنی پر جو اشکال ہے اس کے امام رازی نے متعدد جواب دیے ہیں:

(۱) تاکہ ہم جان لیں' اس کا معنی ہے: تاکہ ہمارے نبی اور ایمان والے جان لیں' جیسے بادشاہ کہتا ہے: فلاں شہر ہم نے فتح کیا' یعنی ہماری فوجوں نے فتح کیا۔

(۲) علم بہ معنی تمیز ہے یعنی تاکہ ہم رسول کے متبعین کو غیر متبعین سے ممتاز کر دیں۔

(۳) علم بہ معنی مشاہدہ ہے' یعنی تاکہ ہم یہ مشاہدہ کر لیں کہ کون متبع ہے' اللہ کو اس کا علم تو پہلے تھا لیکن مشاہدہ تحویل قبلہ کے وقت ہوا۔

(۴) اس آیت میں حدوث علم مخاطبین کی طرف راجع ہے یعنی تاکہ تم لوگ یہ جان لو کہ کون متبع ہے اور کون پھرنے والا ہے۔

(۵) علم بہ معنی تحقق ہے یعنی تاکہ واقع میں متبعین متحقق ہو جائیں اور آپ کی اتباع سے پھرنے والے متحقق ہو جائیں۔

(تفسیر کبیر ج ۲ ص ۱۱ - ۱۰ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

یہ کلام بہ طور تمثیل ہے یعنی تحویل قبلہ کا یہ فعل اس شخص کے فعل کی مثل ہے جو یہ جاننا چاہے کہ کون متبع ہے اور کون غیر متبع ہے' دوسرا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد جگہ علم بہ معنی جزاء آیا ہے اور اس آیت میں بھی علم بہ معنی جزاء ہے' یعنی تاکہ ہم آپ کی اتباع کرنے والے کو جزا دیں اور آپ کی اتباع سے پھرنے والے کو سزا دیں۔

(روح المعانی ج ۲ ص ۱۰ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے ان کے سوا سب پر یہ (قبلہ کا بدلنا) بھاری ہے۔ (البقرہ: ۱۴۳)

اہل کتاب پر تحویل قبلہ کے بھاری ہونے کی وجہ

اللہ تعالیٰ نے قبلہ بدل کر لوگوں کو امتحان میں ڈالا اور یہ امتحان ان پر اس لیے بھاری تھا کہ جو چیز مالوف ہو اور جس کی عادت ہو اس کو ترک کرنا اور اپنے آباء واجداد کے طریقہ کو چھوڑنا بہت دشوار ہوتا ہے اور ہر نئی چیز سے انسان متوحش ہوتا ہے' البتہ جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت پیدا کر دی اور اس نے اپنی طبیعت کو شریعت میں ڈھال لیا' اس کو نفسہ کسی چیز سے رغبت نہیں ہوتی' اس کی رغبت تو اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنے میں ہے' اس کے نزدیک بیت المقدس کی جہت مقصود ہے نہ کعبہ کی سمت' اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا تو وہ اس کا قبلہ تھا اور اب اللہ اور رسول نے کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا تو وہ اس کا قبلہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمان کو ضائع کر دے۔ (البقرہ: ۱۴۳)

نمازوں پر ایمان کے اطلاق کی توجیہ

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت براء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کچھ مسلمان تحویل قبلہ سے پہلے فوت ہو گئے' کچھ شہید ہو گئے اور ہم نے نہیں جانا کہ ہم (بیت المقدس کی طرف ان کی پڑھی ہوئی نمازوں کے متعلق) کیا کہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

(ترجمہ) اور اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۱ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی)

اس آیت میں بیت المقدس کی طرف پڑھی ہوئی نمازوں پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے' اس سے محدثین اور ائمہ ثلاثہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ ایمان میں اعمال داخل ہیں' اور متکلمین اور امام ابو حنیفہ یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں ایمان سے مراد ایمان کامل ہے اور ایمان کامل میں ہمارے نزدیک بھی اعمال داخل ہیں' البتہ نفس ایمان صرف تصدیق کو کہتے ہیں۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۪

بے شک ہم آپ کے چہرے کا آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں' سو ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف ضرور پھیر دیں گے

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا

جس پر آپ راضی ہیں' پس آپ اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو اپنا چہرہ اسی کی طرف

وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ

پھیر لو اور بے شک اہل کتاب کو علم ہے کہ یہ (حکم) ان کے رب کی طرف سے

الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ

حق ہے' اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں' اللہ اس سے غافل نہیں ہے ○ اور اگر آپ

اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ

اہل کتاب کے پاس ہر قسم کا معجزہ بھی لے کر آئیں پھر بھی وہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ آپ ان کے

بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ

قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں اور (اے مخاطب!) اگر علم حاصل

اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ

ہونے کے بعد تو نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو تو بے شک ضرور

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ

ظلم کرنے والوں میں سے ہوگا O جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس نبی کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے

اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

بیٹوں کو پہچانتے ہیں' اور ان میں سے ایک فریق یقیناً جان بوجھ کر حق کو چھپاتا ہے O

نماز میں قبلہ کی طرف منہ کرنے کی تحقیق

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آسمان کی طرف چہرہ کیے ہوئے تھے اور آپ یہ چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کعبہ کی طرف پھیر دے تو یہ آیت نازل ہوئی: (ترجمہ) بے شک ہم آپ کے چہرہ کا آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں' سو ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس پر آپ راضی ہیں۔ (البقرہ: ۱۴۴)

(جامع البیان ج ۲ ص ۱۳ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۱۰ھ)

حسن بیان کرتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر یہ خبر دی کہ عنقریب اللہ تعالیٰ قبلہ کو بیت المقدس سے پھیر کر کسی اور سمت پر کر دے گا' اور یہ نہیں بیان کیا تھا کہ کس سمت آپ کو پھیرے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ یہ محبوب تھا کہ کعبہ کو قبلہ بنا دیا جائے' اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چہرہ کو آسمان کی طرف پھیر کر وحی کا انتظار کر رہے تھے' تب یہ آیت نازل ہوئی۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۱۴ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۱۰ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو اپنا چہرہ اسی کی طرف پھیر لو۔ (البقرہ: ۱۴۴)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں پر مسجد حرام کی طرف منہ کرنا فرض کر دیا خواہ وہ کسی جگہ ہوں' اگر کوئی شخص بیت المقدس میں بھی ہو تو اس پر بیت اللہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے۔ علامہ حصکفی حنفی نے لکھا ہے کہ جو شخص بیت اللہ کا مشاہدہ کر رہا ہو اس پر بعینہٖ کعبہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے اور جو شخص کعبہ سے غائب ہو اس پر اس کی سمت کی طرف منہ کرنا فرض ہے۔ (در مختار علی ھامش رد المختار ج ۱ ص ۲۸۷ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

وقف لازم — وقف منزل

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسجد (حرام) والوں کے لیے بیت اللہ قبلہ ہے' اور اہل حرم کے لیے مسجد قبلہ ہے اور تمام روئے زمین پر میری امت کے مشرق اور مغرب والوں کے لیے مسجد حرام قبلہ ہے' اور جو شخص مسجد حرام میں ہو اس کو اپنے چہرے کا رخ کعبہ کی طرف کرنا چاہیے کیونکہ روایت ہے کہ کعبہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے' اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ نماز کی حالت قیام میں نظر سامنے قبلہ کی طرف ہونی چاہیے' نیز قیام کا حکم سارے جسم کے لیے ہے اور چہرہ اشرف الاعضاء ہے' اس کے قیام کا حکم بہ طریق اولیٰ ہوگا اور چہرہ کا قیام اس وقت ہوگا جب چہرہ کا رخ بیت اللہ کی جانب ہو اور یہی امام مالک کا مذہب ہے' اس کے برخلاف امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ قیام میں سجدہ کی جگہ نظر ہو' رکوع میں قدموں کی جگہ اور سجدہ میں ناک کی طرف نظر ہو۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۶۰۔ ۱۵۹ 'ملخصاً' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو)

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

قیام میں نظر موضع سجود کی طرف ہونی چاہیے اور رکوع میں قدموں کی پشت پر اور سجدہ میں ناک کے نرم گوشے کی طرف اور بیٹھنے وقت گود میں اور سلام کے وقت کندھوں کی طرف' اس کے اطلاق کا تقاضا یہ ہے کہ جو شخص کعبہ کا مشاہدہ کر رہا ہو اس کی نظر بھی ان ہی مواضع کی طرف ہو' کیونکہ اس سے مقصود خشوع ہے' جب وہ قصداً ان مواضع کی طرف دیکھے گا تو اس کی توجہ ادھر ادھر ہٹنے سے محفوظ رہے گی اور جب کہ مقصود خشوع ہے اور ان مواضع کی طرف دیکھنے سے خشوع حاصل نہ ہو تو ان سے عدول کر سکتا ہے۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۳۲۱ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

خشوع کا معنی ہے: عجز اور انکسار کرنا اور آنکھیں نیچی کرنا' اور اللہ تعالیٰ نے خشوع کے ساتھ نماز پڑھنے کی مدح فرمائی ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ (المومنون: ۲۔۱)
بے شک ایمان والے کامیاب ہوئے ۝ جو خشوع کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں ۝

اس لیے نماز کی حالت قیام میں سجدہ گاہ پر نظر رکھنا' خشوع کے ساتھ نماز پڑھنے کا طریقہ ہے اور یہ کعبہ کی طرف چہرہ کرنے کے منافی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک اہل کتاب کو علم ہے کہ یہ (حکم) ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔ (البقرہ: ۱۴۴)

اہل کتاب کو تحویل قبلہ کے برحق ہونے کا علم

یعنی یہود اور نصاریٰ کو یہ علم ہے کہ تحویل قبلہ کا یہ حکم ان کے رب کی طرف سے حق ہے' اس پر یہ اعتراض ہے کہ یہود و نصاریٰ کو کیسے یہ علم ہوگا حالانکہ یہ حکم ان کے دین میں تھا نہ ان کی کتاب میں لکھا ہوا تھا' اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو اپنی کتاب سے یہ علم تھا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم برحق نبی ہیں' آپ اللہ کی وحی کے سوا کوئی بات نہیں کہتے اور آپ کی کہی ہوئی ہر بات حق اور صواب ہے' دوسرا جواب یہ ہے کہ ان کو اپنے دین سے یہ معلوم تھا کہ احکام منسوخ ہوتے رہتے ہیں اس لیے ان کو علم تھا کہ یہ حکم بھی منسوخ ہو سکتا ہے اس لیے تحویل قبلہ پر اعتراض کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی' تیسرا جواب یہ ہے کہ ان کو اپنی کتاب سے علم تھا کہ کعبہ ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا اور یہی اللہ کا سب سے پہلا گھر ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملت ابراہیم کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے' چوتھا جواب یہ ہے کہ معجزات اور دیگر دلائل سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ثابت ہو چکی تھی'

اس لیے ان کو لامحالہ علم تھا کہ جس جانب کو آپ نے قبلہ قرار دیا ہے وہی قبلہ ہے' پانچواں جواب یہ ہے کہ ان کی کتاب میں تحویل قبلہ کا حکم بھی لکھا ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (اے مخاطب!) اگر علم حاصل ہونے کے بعد تو نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو تو بے شک ضرور ظلم کرنے والوں میں سے ہوگا ○ (البقرہ: ۱۴۵)

علماء سے معصیت کے صدور کا زیادہ قبیح ہونا

اس آیت میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے جن کے لیے خواہش کی اتباع کرنا محال نہیں ہے' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں' اور آپ کا ظالم ہونا آپ کی نبوت کے منافی ہے اور محال بالغیر ہے۔

اس آیت میں فرمایا ہے کہ علم حاصل ہونے کے بعد اگر اہل کتاب کی اتباع کی تو ضرور تو ظالموں میں سے ہوگا' اس آیت میں علم کی قید لگائی ہے' اس سے معلوم ہوا کہ کسی معصیت پر علماء کے حق میں وعید بہت شدید ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں علم سب سے عظیم نعمت ہے اور جس کو سب سے عظیم نعمت دی ہے اس سے نافرمانی اور گناہ کا صدور سب سے زیادہ قبیح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ (البقرہ: ۱۴۶)

اہل کتاب کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بیٹوں سے زیادہ پہچاننا

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری نے متعدد اسانید کے ساتھ قتادہ' ربیع' حضرت ابن عباس' سدی' ابن زید اور ابن جریج سے نقل کیا ہے کہ یہ ضمیر تحویل قبلہ کی طرف لوٹتی ہے یعنی اہل کتاب تحویل قبلہ کے حق ہونے کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۱۲ مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۱۰ھ)

علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں:

یہ ضمیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے' مجاہد' قتادہ وغیرہما سے یہی روایت ہے' زجاج' تبریزی اور زمخشری کا بھی مختار ہے' پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صیغہ خطاب سے ذکر کیا تھا اور اب ضمیر غائب سے ذکر کیا ہے' سو یہ باب التفات سے ہے' یعنی اہل کتاب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح معرفت حاصل تھی' ان کو آپ کی معرفت میں کوئی شک نہیں تھا نہ آپ کی دی ہوئی خبروں کے صادق ہونے میں کوئی تردد تھا اور جن چیزوں کا آپ کو مکلف کیا گیا تھا مثلاً بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا منسوخ ہونا' ان کی صداقت پر ان کو یقین تھا کیونکہ ان کی کتاب میں آپ کا ذکر اور آپ کی صفات لکھی ہوئی تھیں' قرآن مجید میں ہے:

يَجِدُونَهٗ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ. (الاعراف: ۱۵۷) جس رسول کا ذکر وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس ضمیر کے لوٹنے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے سوال کیا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل کی ہے کہ "اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ" (البقرہ: ۱۴۶) تو یہ معرفت کیسی ہے' حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا: اے عمر! جب میں نے آپ کو دیکھا تو فوراً پہچان لیا جیسے اپنے بیٹے کو پہچانتا ہوں' اور میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بیٹے سے زیادہ پہچانتا ہوں' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہماری کتاب میں آپ کی صفات بیان کی ہیں اور اپنے بیٹوں کے متعلق ہمیں پتا نہیں کہ عورتیں کیا کرتی ہیں' میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے برحق رسول ہیں' حضرت عمر نے ان کے سر کو بوسہ دیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہیں توفیق دی

ہے۔(البحر المحیط ج ۲ ص ۲۳۔ ۲۲ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۲ھ)

علامہ قرطبی نے بھی اس روایت کو بیان کیا ہے اور یہ لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ اس نبی کو اپنے آپ سے زیادہ پہچانتے ہیں کیونکہ انسان کو اپنی پیدائش سے لے کر ایک زمانہ تک اپنی معرفت نہیں ہوتی اور وہ اپنے بیٹے کو شروع سے پہچانتا ہے اور اس کی معرفت کے بغیر اس پر کوئی زمانہ نہیں گزرتا۔

(الجامع الاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۶۳ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ)

امام فخر الدین رازی حضرت عمر کی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

چونکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت معجزات سے ثابت ہو گئی تھی اس لیے آپ کے نبی ہونے کا ان کو قطعی علم تھا جبکہ اپنے بیٹے کے متعلق ان کو قطعیت کے ساتھ یہ علم نہیں تھا کہ یہ ان کا بیٹا ہے اس لیے آپ کی معرفت بیٹوں کی معرفت سے زیادہ قوی تھی نیز امام رازی فرماتے ہیں:

اس آیت میں ضمیر کو تحویل قبلہ کی طرف لوٹانے کے قول سے یہ قول راجح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر نہیں دی کہ ان کی کتابوں میں تحویل قبلہ کا ذکر ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ تورات اور انجیل میں آپ کا ذکر لکھا ہوا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ اس آیت سے پہلی آیت میں آپ کا ذکر ہے" وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ" "وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ" اور تحویل قبلہ کا ذکر اس سے بعید ہے اور قریب کو مرجع بنانا اولیٰ ہے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ معجزات سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا صادق ہونا ثابت ہوا ہے اس لیے اہل کتاب آپ کی نبوت کے صدق کو پہچانتے تھے اور تحویل قبلہ کا برحق ہونا آپ کے برحق ہونے کی فرع ہے اس لیے اس ضمیر کو آپ کی طرف لوٹانا زیادہ اولیٰ ہے۔(تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۴۔ ۲۵ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ)

حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ ثعلبی نے از سدی صغیر از کلبی روایت کیا ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آئے تو حضرت عمر بن الخطاب نے حضرت عبداللہ بن سلام سے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر یہ آیت نازل کی ہے:" يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ " (البقرہ: ۱۴۶) اے عبداللہ! یہ معرفت کیسی ہے؟ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا: جب میں نے آپ کو دیکھا تو آپ کو اس طرح پہچان لیا جس طرح میں اپنے بیٹے کو پہچانتا ہوں بلکہ مجھے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت اپنے بیٹے سے زیادہ تھی کیونکہ ہماری کتاب میں اللہ تعالیٰ نے ان کی صفات بیان کی ہیں تو میں نے دیکھتے ہی آپ کو پہچان لیا کہ یہ برحق نبی ہیں اور اپنے بیٹوں کے متعلق میں نہیں جانتا کہ عورتیں کیا کرتی ہیں حضرت عمر نے کہا: اے عبداللہ بن سلام! تم کو اللہ نے توفیق دی۔

(در منثور ج ۱ ص ۱۴۷ مطبوعہ آیت اللہ العظمیٰ ایران)

امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں دین کو تلاش کرنے کے لیے نکلا تو مجھے اہل کتاب کے باقی لوگوں میں سے چند راہب ملے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:" يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ " (البقرہ: ۱۴۶) وہ کہتے تھے کہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں عنقریب سرزمین عرب سے ایک نبی ظاہر ہوگا اس کی خاص علامات ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے کندھوں کے درمیان تلوں کے گول مجموعہ کی شکل میں مہر نبوت ہوگی میں عرب میں پہنچا اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہو چکا تھا۔ میں نے ان تمام علامات کو دیکھا اور مہر نبوت کو بھی دیکھا پھر میں نے کلمہ پڑھ لیا" لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ " الحدیث۔(المعجم الکبیر ج ۲ ص ۲۶۸۔ ۲۶۷ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿١٤٧﴾ وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ

(یہ تحویل قبلہ) تمہارے رب کی طرف سے برحق ہے (تو اے مخاطب!) تم شک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہونا O اور ہر ایک

هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ

کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ (نماز میں) منہ کرتا ہے سو تم نیکیوں میں دوسروں سے آگے نکلو تم جہاں کہیں بھی ہو گے

جَمِيعًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٤٨﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ

اللہ تم سب کو لے آئے گا' بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے O اور (اے رسول!) آپ جہاں سے بھی باہر نکلیں

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ

اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں' اور بے شک یہ (تحویل قبلہ) آپ کے رب کی طرف سے برحق ہے

وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ

اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں ہے O اور (اے رسول!) آپ جہاں سے بھی باہر نکلیں اپنا منہ

وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ

مسجد حرام کی طرف پھیر لیں' اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے چہروں کو اس کی طرف

شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ

پھیر لو تاکہ لوگوں کے لیے تمہارے خلاف کوئی حجت نہ رہے البتہ ان میں سے جو ظالم ہیں (وہ تم پر ضرور ناحق الزام تراشی کریں گے)

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ

سو تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو (اور کعبہ کی طرف منہ کرو) تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں اور تاکہ تم

تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا

ہدایت پا جاؤ O اسی طرح ہم نے تم ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیجا ہے' جو تم پر ہماری آیات

وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا

تلاوت کرتا ہے اور تمہاری باطنی اصلاح کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تم کو ان تمام چیزوں کی تعلیم دیتا ہے

تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ ع

جن کو تم نہیں جانتے تھے O سو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر ادا کرتے رہو اور میری ناشکری نہ کرو O

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (یہ تحویل قبلہ) تمہارے رب کی طرف سے برحق ہے (تو اے مخاطب!) تم شک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہونا O (البقرہ: ۱۴۷)

قبلہ کے بارے میں شک کرنے کی ممانعت کی توجیہ

اس آیت میں بھی تعریض ہے' صراحتاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور مراد آپ کی امت ہے' کیونکہ اس آیت میں شک کرنے سے منع کیا ہے اور جس چیز سے منع کیا جائے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ پہلے واقع ہو چکی ہو یا متوقع ہو ورنہ منع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ توقع نہیں ہے کہ آپ قبلہ کے برحق ہونے میں شک کریں گے اس لیے منع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے' اور اللہ تعالیٰ کا خطاب بے فائدہ نہیں ہو سکتا اس لیے یہاں خطاب سے بہ طور تعریض آپ کی امت مراد ہے' اس جگہ ایک اور سوال یہ ہے کہ شک کرنا یا نہ کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے' اور غیر اختیاری چیز کا مکلف نہیں کیا جاتا' اس کا جواب یہ ہے کہ شک کو زائل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دلائل بیان کر دیئے اس لیے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان دلائل پر غور کرو تاکہ شک پیدا نہ ہو' اور دلائل یہ ہیں کہ مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں' وہ کسی جہت اور سمت کے ساتھ مختص نہیں ہے اس لیے جس سمت کی طرف منہ کر کے سجدہ کرو گے اسی کو سجدہ ہوگا اور اس نے کعبہ کو اس لیے قبلہ بنایا کہ وہ تمہارے نبی کے باپ ابراہیم کا قبلہ اور تمہارے نبی کا مولد ہے۔

اللہ کی ذات کا حضور کے لیے قبلہ ہونا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ (نماز میں) منہ کرتا ہے۔ (البقرہ: ۱۴۸)

اس آیت کی دو تفسیریں کی گئی ہیں' ایک یہ ہے کہ ہر علاقہ کے مسلمانوں کے لیے کعبہ کی ایک جہت اور سمت ہے جس کی طرف وہ منہ کرتے ہیں بعض علاقوں کے مسلمانوں کے شمال کی طرف کعبہ ہے' اور بعض علاقہ والوں کے جنوب کی طرف کعبہ ہے' بعض کے مشرق کی طرف اور بعض کے مغرب کی طرف کعبہ ہے' مثلاً ایتھوپیا کے شمال کی طرف کعبہ ہے' ماسکو کے جنوب کی طرف' وسطی افریقہ کے مشرق کی طرف اور برصغیر کے مغرب کی طرف کعبہ ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اصحاب شریعت اور رسولوں میں سے ہر ایک کا الگ الگ قبلہ ہے جس کی طرف وہ منہ کرتے ہیں' مقربین کا قبلہ عرش ہے' روحانیین کا قبلہ کرسی ہے' کروبین کا قبلہ بیت المعمور ہے' انبیاء سابقین کا قبلہ بیت المقدس ہے اور آپ کا قبلہ کعبہ ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۷ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ کعبہ آپ کے جسم کا قبلہ ہے اور آپ کی روح کا قبلہ میری ذات ہے اور میرا قبلہ آپ ہیں۔

(روح المعانی ج ۲ ص ۱۵ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

اگر یہ سوال کیا جائے کہ آپ کی روح کا قبلہ اللہ کی ذات ہو یہ تو متصور ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کا قبلہ آپ کی ذات ہو یہ کیسے متصور ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ قبلہ سے مراد جہت عبادت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد مرکز توجہ ہے یعنی آپ کی توجہ اللہ کی طرف رہتی ہے اور اللہ کی خاص توجہ آپ کی طرف رہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو تم نیکیوں میں دوسروں سے آگے نکلو۔ (البقرہ: ۱۴۸)

پانچوں نمازوں کے مستحب اوقات

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے میں تم دوسروں سے آگے نکلو اور یہ اس کو متضمن ہے کہ ہر نیکی میں سبقت کرو۔ فقہاء شافعیہ نے اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ نماز کو اول وقت میں پڑھنا مستحب ہے' امام ابوحنیفہ کے مذہب کے اعتبار سے اس آیت کی یہ توجیہہ ہوگی کہ ہر نماز کو اس کے مستحب وقت میں پڑھنے میں سبقت کی جائے' فجر کی نماز کا مستحب وقت ہے جب طلوع فجر کے بعد سفیدی ہو جائے' ظہر کی نماز کو گرمیوں میں ٹھنڈا کر کے اور ایک مثل سائے تک موخر کر کے پڑھنا مستحب ہے' عصر کی نماز کو موخر کر کے سورج کے زرد ہونے سے پہلے پڑھنا مستحب ہے' مغرب کی نماز کو غروب آفتاب کے فوراً بعد جلدی پڑھنا مستحب ہے' اور عشاء کی نماز کو تہائی رات تک موخر کر کے پڑھنا مستحب ہے۔

فجر کے مستحب وقت کی دلیل یہ حدیث ہے' امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سفیدی پھیلنے کے بعد فجر کی نماز پڑھو' اس میں زیادہ اجر ہے۔ (جامع ترمذی ص ۳۹' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اور حضرت عائشہ سے جو روایت ہے کہ ہم منہ اندھیرے نماز پڑھتے تھے' یہ عمل اس حدیث سے منسوخ ہے نیز یہ حدیث قولی ہے اور حضرت عائشہ کی حدیث فعلی ہے اور حدیث قولی حدیث فعلی پر راجح ہے۔

گرمیوں میں ظہر کی نماز کو ٹھنڈا کرنے اور ایک مثل تک موخر کرنے پر یہ دلیل ہے' امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب گرمی شدید ہو تو نماز کو ٹھنڈا کرو' کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کے بھڑکنے سے ہوتی ہے۔ (جامع ترمذی ص ۵۰' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا موذن ظہر کی اذان دینے لگا تو آپ نے فرمایا: ٹھنڈا کرو' ٹھنڈا کرو اور فرمایا: گرمی کی شدت جہنم کے بھڑکنے سے ہوتی ہے' سو نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھو' حتیٰ کہ ہم نے ٹیلوں کا سایا دیکھا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۷۶۔۷۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث میں یہ دلیل بھی ہے کہ ظہر کا وقت دو مثل سائے تک رہتا ہے اور ایک مثل سائے سے ظہر کا وقت ختم نہیں ہوتا۔

عصر کے مستحب وقت کے متعلق یہ حدیث ہے' امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ منافق کی نماز ہے' وہ سورج کو دیکھتا رہتا ہے' حتیٰ کہ جب سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہو جاتا ہے تو وہ کھڑا ہو کر چار ٹھونگیں مار لیتا ہے اور اللہ کا بہت کم ذکر کرتا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۲۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورج کے زرد ہونے سے پہلے عصر کی نماز پڑھ لینی چاہیے اور امام حاکم روایت کرتے ہیں:

زیاد بن عبداللہ نخعی بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد اعظم میں بیٹھے ہوئے تھے' موذن نے آ کر کہا: نماز یا امیر المومنین! آپ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ' وہ بیٹھ گیا' اس نے پھر اٹھ کر کہا: نماز یا امیر المومنین! آپ نے فرمایا: یہ کتا ہمیں سنت کی تعلیم دیتا ہے! پھر حضرت علی نے کھڑے ہو کر ہمیں عصر کی نماز پڑھائی' پھر ہم واپس آ کر وہیں بیٹھ گئے جہاں پہلے

بیٹھے ہوئے تھے' پھر ہم گھٹنوں کے بل جھک کر سورج کو غروب کے لیے اترتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ امام حاکم نے کہا: اس حدیث کی سند صحیح ہے اور اس کو امام بخاری اور امام مسلم نے روایت نہیں کیا۔ (المستدرک ج ۱ ص ۱۹۲' مطبوعہ مکتب دار الباز' مکہ مکرمہ)

چونکہ عصر کی نماز کے بعد نفل پڑھنا مکروہ ہے اس لیے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ عصر کی نماز تاخیر سے پڑھنا مستحب ہے تاکہ نفل پڑھنے کے لیے زیادہ وقت مل سکے' اس کی تائید حضرت علی کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

اور مغرب کے مستحب وقت کے متعلق یہ حدیث ہے' امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تک میری امت مغرب کی نماز کو ستاروں کے نکلنے تک مؤخر نہیں کرے گی وہ خیر پر رہے گی یا فرمایا: نیکی پر رہے گی۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۶۰' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اور عشاء کے مستحب وقت کے متعلق یہ حدیث ہے' امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر مجھے اپنی امت پر دشوار نہ ہوتا تو میں اس کو یہ حکم دیتا کہ وہ عشاء کی نماز کو تہائی یا نصف رات تک مؤخر کرے۔

(جامع ترمذی ص ۵۱' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

تاہم قرآن مجید کی اس آیت سے اول وقت میں نماز پڑھنے پر استدلال کرنا ضعیف ہے' کیونکہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ نیکی کرنے میں دوسروں پر سبقت کرو' نیکی کرنے میں دوسروں سے آگے نکلو یا بڑھ چڑھ کر نیکی کرو' جن اوقات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیں پڑھی ہیں' اور جن اوقات میں آپ نے نماز پڑھنے کی تلقین کی ہے اور ترغیب دی ہے ان ہی اوقات میں نماز پڑھنا مستحب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تم جہاں کہیں بھی ہو گے اللہ تم سب کو لے آئے گا۔ (البقرہ: ۱۴۸)

یہ آیت یا تو خاص نمازیوں کے متعلق ہے یعنی تم کعبہ کے شمال میں ہو یا جنوب میں' مشرق میں ہو یا مغرب میں' تم دور دراز کی مختلف جہات اور مختلف علاقوں میں جہاں سے بھی کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو گے اللہ تعالیٰ ان نمازوں کو عین کعبہ کی طرف نماز قرار دے گا۔

یا یہ آیت تمام لوگوں کے متعلق ہے کہ موت کے بعد تمہارے بدن کے اجزاء' خاک میں مل کر ہواؤں اور آندھیوں سے اور دیگر قدرتی آفات سے بکھر کر خواہ کہیں پہنچ جائیں' اللہ تعالیٰ تمہارے ان اجزاء کو قیامت کے دن مجتمع کر دے گا' کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (اے رسول!) آپ جہاں سے بھی باہر نکلیں اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں' اور بے شک یہ (تحویل قبلہ) آپ کے رب کی طرف سے برحق ہے۔ اس کے بعد پھر فرمایا: اور (اے رسول!) آپ جہاں سے بھی باہر نکلیں اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں' اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے چہروں کو اس کی طرف پھیر لو' تاکہ لوگوں کے لیے تمہارے خلاف کوئی حجت نہ رہے (الیٰ قولہ) تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں اور تاکہ تم ہدایت پا جاؤ○ (البقرہ: ۱۵۰-۱۴۹)

کعبہ کی طرف منہ کرنے کے حکم کو تین بار ذکر کرنے کی حکمتیں

اس رکوع میں تین مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو مسجد حرام کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے' بظاہر یہ تکرار ہے لیکن حقیقت میں یہ تکرار نہیں ہے کیونکہ ہر مرتبہ اس حکم کی ایک نئی علت بیان فرمائی ہے' پہلی بار اس حکم کی علت رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم ہے اور آپ کی رضا جوئی کے لیے مسجد حرام کو قبلہ بنایا اور نماز میں اس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا' دوسری مرتبہ یہ علت بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے کہ وہ ہر قوم کا الگ الگ قبلہ بناتا ہے جس کی طرف وہ منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں سو اس نے مسلمانوں کا قبلہ مسجد حرام کو بنایا' اور اس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا' اور تیسری دفعہ اس کی علت یہ بیان فرمائی تاکہ یہود مسلمانوں کے خلاف حجت قائم نہ کریں' کیونکہ تحویل قبلہ سے پہلے یہود یہ کہتے تھے کہ تورات میں جس نبی کے مبعوث ہونے کے متعلق لکھا ہوا ہے اس کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا' اور (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں' لہٰذا یہ وہ نبی نہیں ہیں جن کے مبعوث ہونے کی ہماری کتاب میں پیش گوئی کی گئی ہے' سو مسلمانوں کو تیسری بار اسی وجہ سے مسجد حرام کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا تاکہ یہود مسلمانوں پر اعتراض نہ کریں۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ نماز پڑھنے کے تین احوال ہیں' ایک حال یہ ہے کہ مسجد حرام میں نماز پڑھی جارہی ہو' دوسرا حال یہ ہے کہ مسجد حرام سے باہر شہر مکہ مکرمہ میں نماز پڑھی جارہی ہو' تیسرا حال یہ ہے کہ مکہ مکرمہ سے باہر کسی اور شہر میں نماز پڑھی جا رہی ہو' پہلی آیت اس پر محمول ہے کہ مسجد حرام میں کعبہ کی طرف منہ کیا جائے' دوسری آیت اس پر محمول ہے کہ مکہ مکرمہ میں کعبہ کی طرف منہ کیا جائے اور تیسری آیت اس پر محمول ہے کہ دیگر شہروں میں سے جہاں کہیں بھی ہوں کعبہ کی طرف منہ کیا جائے۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ پہلی بار کعبہ کی طرف منہ کرنے کے حکم کے ساتھ بتایا کہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کے معاملہ کا یہود و نصاریٰ کو علم ہے اور تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ہے' دوسری بار اس حکم کے ساتھ فرمایا: اللہ کے نزدیک کعبہ کا قبلہ ہونا برحق تھا اس لیے کعبہ کو قبلہ بنایا اور تیسری بار فرمایا: یہ حکم اس لیے ہے تاکہ اللہ تم پر اپنی نعمت پوری کر دے کیونکہ عرب اپنے تمام افعال میں اتباع ابراہیم کو پسند کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے اور بیت المقدس کی طرف منہ کرنے سے تنگ ہوتے تھے اس لیے کعبہ کی طرف منہ کرنا ان کے لیے نعمت تھا' نیز یہ حکم ملت ابراہیم کی طرف ہدایت تھا۔

چوتھی توجیہ یہ ہے کہ پہلی بار فرمایا: آپ کی رضا کے لیے کعبہ کو قبلہ بنایا' دوسری بار اس لیے فرمایا کہ آپ کی رضا کے علاوہ فی نفسہ یہ تحویل برحق ہے اور تیسری بار اس لیے فرمایا کہ یہ حکم عارضی نہیں ہے' دائمی ہے اور تمام زمانوں اور تمام علاقوں کے لیے ہے۔

پانچویں توجیہ یہ ہے کہ پہلی آیت تمام احوال کے لیے ہے' دوسری آیت تمام علاقوں کے لیے ہے اور تیسری تمام زمانوں کے لیے ہے۔

چھٹی توجیہ یہ ہے کہ پہلی آیت حالت اختیار میں قلب اور بدن کے ساتھ تحقیقاً کعبہ کی طرف منہ کرنے پر محمول ہے' دوسری آیت اشتباہ قبلہ کی صورت میں اپنے ظن کے مطابق کعبہ کی طرف منہ کرنے پر محمول ہے اور تیسری آیت حالت اضطرار میں (مثلاً جب سواری پر ہو جیسے ٹرین یا جہاز) اپنے قلب کے ساتھ کعبہ کی طرف منہ کرنے پر محمول ہے۔

اور ساتویں توجیہ یہ ہے کہ تحویل قبلہ کی صورت میں پہلی بار نسخ کا حکم مسلمانوں میں متعارف ہوا اور چونکہ یہود نسخ کا انکار کرتے تھے اور اس کو بداء کہتے تھے اس لیے یہ ایک عظیم بالشان امر تھا' لہٰذا اس حکم کو بار بار دہرا کر اس کی تاکید کی گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو تم ان سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو (اور کعبہ کی طرف منہ کرو) تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں۔ (البقرہ: ۱۵۰)

تمام نعمت کا مصداق

یعنی یہود اور نصاریٰ تمہارے قبلہ پر جو چہ میگوئیاں کرتے ہیں اور اس پر زبان طعن دراز کرتے ہیں تو تم اس سے مت ڈرو

اور مت گھبراؤ اور ان کے اعتراضات کی وجہ سے کعبہ کی طرف منہ کرنے کو ترک مت کرو بلکہ اس کو ترک کرنے کی وجہ سے میرے عذاب سے ڈرو' یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ انسان ہر وقت اللہ کے عذاب کو اپنے پیش نظر رکھے اور ہر کام کے وقت صرف یہ دیکھے کہ اس کام کے کرنے یا نہ کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے یا ناراض ہوتا ہے۔اس آیت میں تمام نعمت کا ذکر ہے' امام ترمذی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک شخص کے پاس سے گزر ہوا' وہ دعا کر رہا تھا: اے اللہ! میں تجھ سے صبر کا سوال کرتا ہوں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے بلاء (مصیبت) کا سوال کیا ہے' اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو' ایک اور شخص کے پاس سے آپ کا گزر ہوا' وہ دعا کر رہا تھا: اے اللہ! میں تجھ سے تمام (پوری) نعمت کا سوال کرتا ہوں' آپ نے فرمایا: اے ابن آدم! کیا تم جانتے ہو کہ تمام نعمت کیا ہے؟ اس نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے نیکی کی توقع پر دعا کی ہے' آپ نے فرمایا: تمام نعمت جنت میں داخل ہونا اور جہنم سے نجات پانا ہے۔ایک اور شخص کے پاس سے گزر ہوا' وہ کہہ رہا تھا: یا ذا الجلال والاکرام! آپ نے فرمایا: تمہاری دعا قبول ہو گی' سوال کرو۔

(جامع ترمذی ص ۵۰۸۔ ۵۰۷' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام بخاری[۱] امام احمد[۲]' امام طبرانی[۳] اور امام ابن ابی شیبہ[۴] نے بھی روایت کیا ہے۔

حافظ سیوطی[۵] نے اس حدیث کا امام بیہقی کی ''کتاب الاسماء والصفات'' کے حوالے سے بھی ذکر کیا ہے اور علامہ علی متقی[۶] نے بھی اس حدیث کو متعدد حوالوں سے ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اسی طرح ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیجا ہے۔(البقرہ: ۱۵۱)

اس آیت میں رسول کے بھیجنے کو تشبیہ دی گئی ہے' اس کے مشبہ بہ کے متعلق حسب ذیل اقوال ہیں:

(۱) جس طرح میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں گا' بایں طور کہ تم کو آخرت میں جنت میں داخل کروں گا' اسی طرح میں نے دنیا میں تم میں سے ایک عظیم رسول بھیج کر تم پر نعمت پوری کی ہے۔

(۲) جس طرح میں نے ابراہیم کی یہ پہلی دعا قبول کر کے (اور ہماری اولاد میں سے ایک امت کو خاص اپنا فرمانبردار بنا دے) اپنی نعمت پوری کی' اسی طرح ہم نے تم ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیج کر اپنی نعمت پوری کی۔

(۳) جس طرح میں نے ابراہیم کی یہ دوسری دعا قبول کر کے (اے ہمارے رب! ان میں ان ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیج دے) اپنی نعمت پوری کی' اسی طرح ہم نے تم ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیجا۔

(۴) جس طرح ہم نے تم کو امت وسط (افضل) بنایا' اسی طرح ہم نے تم ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیجا۔

(۵) جس طرح ہم نے کعبہ کو تمہارا قبلہ بنایا جو قیامت تک تمہارا قبلہ رہے گا جس کے بعد کوئی اور سمت قبلہ نہیں ہو گی اور جو آخر القبلات ہے' جس طرح ہم نے تم پر یہ نعمت پوری کی ہے' اسی طرح ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیجا'

۱۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ' الادب المفرد ص ۱۸۸' مطبوعہ مکتبہ اثریہ' سانگلہ ہل

۲۔ امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۵ ص ۲۳۱' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

۳۔ امام ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ' المعجم الکبیر ج ۲۰ ص ۵۶۔ ۵۵' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

۴۔ امام ابو بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ' المصنف ج ۱۰ ص ۲۷۰' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ

۵۔ حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ' الدر المنثور ج ۲ ص ۲۶۵' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران

۶۔ علامہ علی متقی بن حسام الدین ہندی متوفی ۹۷۵ھ' کنز العمال ج ۲ ص ۱۷' مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ' بیروت' ۱۴۰۵ھ

جس کی شریعت قیامت تک جاری رہے گی' جس کے بعد کوئی اور نبی مبعوث نہیں ہوگا' جو آخر الانبیاء ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو تم پر ہماری آیات تلاوت کرتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ (البقرہ: ۱۵۱)

دعاء ابراہیم میں تزکیہ کا مؤخر ہونا اور دعاء استجابت میں مقدم ہونا

اللہ تعالیٰ نے اس رسول کی یہ صفت ذکر کی ہے کہ وہ ہماری آیات کی تلاوت کرتا ہے' اس میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ آپ امی تھے اور کسی امی کا ایسی آیات کی تلاوت کرنا بشری طاقت سے باہر ہے جو انتہائی فصیح و بلیغ ہوں' غیب کی خبروں پر مشتمل ہوں اور ان میں بنی نوع انسان کی دنیا اور آخرت کی صلاح اور فلاح کے لیے ایک مکمل نظام حیات ہو۔

اور وہ رسول تمہارا تزکیہ کرتا ہے' تزکیہ کے کئی معنی ہیں: تحسین کرنا' بڑھانا اور پاک کرنا' اس رسول نے تمہاری تحسین کی ہے اور تم کو تمام امتوں میں بہترین امت قرار دیا ہے' اور دن رات مؤثر تبلیغ کر کے تم کو باقی امتوں سے بڑھایا ہے اور تم کو شرک اور کفر کی آلودگی سے پاک کیا ہے اور وہ کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں' کتاب سے مراد قرآن مجید ہے اور حکمت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

ایک سوال یہ ہے کہ اس آیت میں تزکیہ' کتاب اور حکمت کی تعلیم پر مقدم ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں مؤخر ہے کیونکہ انہوں نے کہا: ان میں ان ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیج دے جو ان پر تیری آیتوں کی تلاوت کرے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تزکیہ' کتاب اور حکمت کی تعلیم کے لیے علت غائیہ ہے اور علت غائیہ ذہن میں مقدم ہوتی ہے اور خارج میں مؤخر ہوتی ہے' کتاب اور حکمت کی تعلیم کی غرض اور غایت یہ ہے کہ انسان کے ظاہر اور باطن کی اصلاح ہو' لہٰذا جس تزکیہ اور اصلاح کے لیے تعلیم دی جاتی ہے' اس سے پہلے ذہن میں اس کا تصور ہوگا' پھر اس کے حصول کے لیے آیتوں کی تلاوت کی جائے گی اور کتاب اور سنت کی تعلیم دی جائے گی' پھر اس کے نتیجہ میں ظاہر اور باطن کی اصلاح عمل اور وجود میں آئے گی' اس آیت میں وجود ذہنی کے لحاظ سے تزکیہ کو مقدم کیا ہے اور حضرت ابراہیم کی دعا میں وجود خارجی کے لحاظ سے تزکیہ کو مؤخر کیا ہے' اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قوت نظریہ کے کمال کے بعد قوت عملیہ کا کامل ہونا یا اصلاح عقائد کے بعد اصلاح عمل ہونا اور ظاہر اور باطن کا نیک ہونا تزکیہ ہے۔

دعاء ابراہیم میں اور اس آیت میں رسول کی بعثت کا ذکر کیا گیا ہے' اس لیے ہم یہاں نبی اور رسول کی تعریف' ان کی شرائط اور ان کی تعداد کا بیان کر رہے ہیں۔

نبی اور رسول کی تعریف

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

نبی وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف کی ہوئی وحی کی تبلیغ کے لیے بھیجا ہو' رسول کی بھی یہی تعریف ہے اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے اور ایک قول یہ ہے کہ رسول وہ انسان ہے جس کے پاس شریعت ہو اور اس پر کتاب نازل کی گئی ہو یا اس کے لیے پہلی شریعت کا کچھ حصہ منسوخ کیا گیا ہو۔ (مسایرہ مع المسامرہ ص ۲۰۷' مطبوعہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ' مکران)

علامہ تفتازانی نے بھی یہی دو تعریفیں لکھی ہیں' پھر دوسری تعریف کے اعتبار سے رسول کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے

ہیں:

رسول نبی سے خاص ہے رسول وہ ہے جس کی اپنی شریعت ہو اور اس کے پاس کتاب ہو اس پر یہ اعتراض ہے کہ حدیث میں رسولوں کی تعداد کتابوں سے زیادہ بیان کی گئی ہے اس لیے رسول کی تعریف میں یہ تاویل کی گئی ہے کہ اس کے پاس کتاب ہو یا شریعت سابقہ میں سے کچھ احکام اس کے لیے مخصوص کیے گئے ہوں جیسے حضرت یوشع علیہ السلام۔

(شرح المقاصد ج ۵ ص ۱۰ مطبوعہ منشورات الرضی ایران ۱۴۰۹ھ)

صدر الشریعت مولانا امجد علی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

عقیدہ: نبی اس بشر کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے لیے وحی بھیجی ہو اور رسول بشر ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ملائکہ میں بھی رسول ہیں (جیسے حضرت جبرئیل وغیرہ)۔

عقیدہ: انبیاء سب بشر تھے اور مرد نہ کوئی جن نبی ہوا نہ عورت۔ (بہار شریعت ج ا ص ۹ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ لاہور)

نبی اور رسول کو مبعوث کرنے کی حکمتیں

رسولوں کا بھیجنا محض اللہ تعالیٰ کا بندوں پر لطف اور اس کی رحمت ہے اور اس کی بے شمار حکمتیں ہیں بعض حکمتیں حسب ذیل ہیں:

(۱) بعض احکام انسانوں کی عقل سے ماوراء ہیں جیسے اللہ کا وجود اس کی وحدانیت اس کا علم اور اس کی قدرت وغیرہ اللہ تعالیٰ رسولوں کو بھیج کر اپنے بندوں کی ان امور کی طرف رہنمائی فرماتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا دکھائی دینا اللہ تعالیٰ کا کلام اور قیامت کے بعد جزاء اور سزا عقل از خود ان کو معلوم نہیں کر سکتی اس وجہ سے ان امور کی تعلیم کے لیے رسولوں کو بھیجا۔

(۳) ایک ہی کام بعض اوقات میں اچھا اور بعض اوقات میں بُرا ہوتا ہے مثلاً طلوع غروب اور زوال کے وقت نماز پڑھنا بُرا ہے اور باقی اوقات میں اچھا ہے یا عید اور ایام تشریق میں روزہ رکھنا بُرا ہے اور باقی اوقات میں اچھا ہے یا بعض افراد کے اعتبار سے ایک کام اچھا اور بعض افراد کے اعتبار سے بُرا ہوتا ہے جیسے کافر حربی کو قتل کرنا اچھا ہے اور مومن یا کافر ذمی کو قتل کرنا بُرا ہے اور یہ فرق نبی کے علاوہ اور کوئی نہیں بتا سکتا۔

(۴) کیا چیز کھانی حلال ہے اور کیا چیز کھانی حرام ہے اس کو بھی صرف نبی ہی بتا سکتا ہے۔

(۵) ایک شخص کے اعتبار سے نیک اور بد افعال ایک خاندان کے اعتبار سے نیک اور بد افعال اور ایک ملک اور قوم کے اعتبار سے نیک اور بد افعال نیکی اور بدی کی یہ تفصیل صرف نبی ہی بتا سکتا ہے۔

(۶) نیکی پر ابھارنے کے لیے نیکوکار کے ثواب کی تفصیل اور بدی سے بچانے کے لیے بدی کے عذاب کی خبر بھی صرف نبی ہی بیان کر سکتا ہے۔

(۷) ایک فرد ایک خاندان اور ایک ملک کے حقوق اور فرائض کا تعین بھی صرف نبی ہی کر سکتا ہے۔

(۸) انسان کی قوت علمی اور قوت عملی کو کامل کر کے اس کے ظاہر اور باطن کو پاک صاف کرنا اور مزین کرنا یہ بھی صرف نبی کا منصب ہے۔

(۹) مختلف غذاؤں کے فوائد اور نقصانات بیان کرنا اسی طرح مختلف صنعتوں کے اسرار بیان کرنا یہ بھی صرف نبی کا حصہ ہے۔

(۱۰) نبی کو دنیا میں بھیج کر اللہ تعالیٰ بندوں پر اپنی حجت پوری کرتا ہے تاکہ قیامت کے دن کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ ہم اس لیے گمراہ ہو گئے کہ ہم کو کوئی بتانے والا نہیں تھا۔

نبی کی شرائط

علامہ ابن ہمام نے نبی کی حسب ذیل شرائط بیان کی ہیں:

(۱) نبی کا مذکر ہونا شرط ہے' کیونکہ مؤنث ہونا نقص ہے۔

(۲) عقل اور خلقت کے اعتبار سے نبی اپنے زمانہ میں سب سے کامل ہو' لیکن یہ کمال بعثت کے وقت ضروری ہے' کیونکہ بعثت سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی جیسا کہ قرآن مجید میں ہے' انہوں نے بعثت کے وقت لکنت کے ازالہ کے لیے دعا کی۔

(۳) ذہانت اور رائے کی اصابت اور قوت کے اعتبار سے وہ سب سے کامل ہو کیونکہ نبی پوری قوم کے معاملات کا منتظم اور ان کی مشکلات کا مرجع ہوتا ہے۔

(۴) نبی کے آباء میں کوئی ایسا وصف نہ ہو جس کی وجہ سے ان کو حقیر جانا جاتا ہو اور اس کی ماں کی عفت اور پارسائی پر تہمت نہ ہو۔

(۵) نبی کا دل سخت نہ ہو' کیونکہ انسان کے باقی جسم کی سلامتی کا مدار اس کے دل پر ہے۔

(۶) نبی میں کوئی ایسا جسمانی عیب یا بیماری نہ ہو جس سے لوگ متنفر ہوتے ہوں' جیسے برص اور جذام۔

(۷) وہ وقار کے خلاف اور معیوب کام نہ کرتا ہو' مثلاً بازاروں میں راستہ چلتے ہوئے کسی چیز کو کھانا۔

(۸) جو پیشے لوگوں میں معیوب سمجھے جاتے ہوں جیسے حجامت بنانا' نبی ایسے پیشے نہ کرتا ہو' کیونکہ نبوت مخلوق میں سب سے زیادہ عزت کا منصب ہے تاکہ لوگ اس کو احترام کی نگاہ سے دیکھیں' اس لیے وہ وقار کے منافی کسی مبتذل پیشے میں نہ ہو۔

(۹) نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد نبی کفر سے بالاجماع معصوم ہو (باقی معاصی میں تفصیل ہے' بعض کے نزدیک اعلان نبوت سے پہلے صغیرہ کا ارتکاب جائز ہے' ہماری تحقیق یہ ہے کہ نبی نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد عمداً معصیت کے ارتکاب سے معصوم ہے' ہاں بعض اوقات نسیان یا اجتہاد سے بہ ظاہر خطاء ہو جاتی ہے)۔

(۱۰) نبی کے صدق کو ظاہر کرنے کے لیے معجزہ کا اظہار بھی شرط ہے۔

ہر نبی کے پیدائشی نبی ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق

بعض لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ ہر نبی پیدائشی نبی ہوتا ہے لیکن مجھے اس سلسلہ میں کوئی صریح عبارت نہیں ملی' قرآن مجید میں یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کی مدد کرنے کا عہد و میثاق اور قول و اقرار لیا' اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی نبوت علم الٰہی میں پہلے سے متحقق تھی' لیکن اس پر یہ اشکال ہے کہ ہر چیز کی حیثیت علم الٰہی میں پہلے سے متحقق ہے' البتہ قرآن مجید سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ثابت ہے کہ وہ پیدائشی نبی تھے' اور حضرت یحییٰ کے متعلق بھی قرآن مجید میں ہے کہ ان کو بچپن میں نبوت ملی اور ہمارے نبی سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیدائشی نبی تھے' کیونکہ امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یارسول اللہ! آپ کے لیے نبوت کب واجب ہوئی؟ آپ نے فرمایا: جب آدم روح اور جسم کے درمیان تھے۔

(جامع ترمذی ص ۵۱۹ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

صدر الشریعت مولانا امجد علی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

عقیدہ: انبیاء علیہم السلام شرک و کفر اور ہر ایسے امر سے جو خلق کے لیے باعث نفرت ہو جیسے کذب و خیانت و جہل وغیرہا صفات ذمیمہ سے' نیز ایسے افعال سے جو وجاہت اور مروت کے خلاف ہیں' قبل نبوت اور بعد نبوت بالا جماع معصوم ہیں اور کبائر سے بھی مطلقاً معصوم ہیں اور حق یہ ہے کہ تعمد صغائر سے بھی قبل نبوت اور بعد نبوت معصوم ہیں۔

(بہار شریعت ج ۱ ص ۱۱ 'مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ لاہور)

اگر ہر نبی پیدائشی نبی ہوتا ہے تو پھر قبل نبوت اور بعد نبوت کی قید بے فائدہ ہوگی اور یہ صرف صدر الشریعت کی عبارت نہیں ہے بلکہ تمام متکلمین اور مفسرین نے جہاں بھی عصمت انبیاء سے بحث کی ہے قبل نبوت اور بعد نبوت کی قید کا ذکر کیا ہے یہ بھی واضح رہے کہ علماء کی عبارات میں مفہوم مخالف معتبر ہوتا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی کے متعلق یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ وہ پیدائشی نبی ہوتا ہے۔

نبیوں' رسولوں' کتابوں اور صحیفوں کی تعداد کی تحقیق

امام ابونعیم اصبہانی نے اپنی سند کے ساتھ ایک بہت طویل حدیث روایت کی ہے' اس موضوع سے متعلق اس روایت کا درمیانی حصہ ہم پیش کر رہے ہیں:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! انبیاء کتنے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار' میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! رسول کتنے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تین سو تیرہ جم غفیر ہیں' میں نے کہا: بہت اچھے ہیں' میں نے کہا: یا رسول اللہ! پہلا نبی کون ہے؟ آپ نے فرمایا: آدم' میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا وہ نبی مرسل ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور ان میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی' پھر ان کو اپنے سامنے بنایا' پھر آپ نے فرمایا: اے ابوذر! چار نبی سریانی ہیں: آدم' شیث اور خنوخ' یہ ادریس ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قلم سے خط کھینچا اور نوح' اور چار نبی عرب ہیں: ھود' صالح' شعیب اور تمہارے نبی' اے ابوذر! میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے کتنی کتابیں نازل کیں؟ آپ نے فرمایا: سو صحیفے اور چار کتابیں' شیث پر پچاس صحیفے نازل کیے گئے' خنوخ پر تیس صحیفے نازل کیے گئے' ابراہیم پر دس صحیفے نازل کیے گئے اور موسیٰ پر تورات سے پہلے دس صحیفے نازل کیے گئے اور تورات' انجیل' زبور اور فرقان کو نازل کیا گیا۔ (حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۱۶۷ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اس حدیث کو امام ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

(موارد الظمآن ص ۵۴۔ ۵۲ 'مطبوعہ دار الکتاب العلمیہ' بیروت)

امام احمد نے بھی دو سندوں سے اس حدیث کو حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے مگر اس میں تین سو پندرہ رسولوں کا ذکر ہے۔ (مسند احمد ج ۵ ص ۲۶۶۔ ۱۷۹ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

امام ابن عساکر نے بھی اس حدیث کو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

(تہذیب تاریخ دمشق ج ۶ ص ۳۵۷۔ ۳۵۶ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

حافظ الہیثمی نے بھی امام احمد اور امام طبرانی کے حوالوں سے تین سو پندرہ رسولوں کا ذکر کیا ہے اور اس حدیث کو ضعیف لکھا ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۵۹ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حافظ سیوطی نے "الجامع الکبیر" میں اس حدیث کو امام ابن حبان، امام اصبہانی اور امام ابن عساکر کے حوالوں سے لکھا ہے اور اس میں تین سو تیرہ رسولوں کا ذکر ہے۔ (جامع الاحادیث الکبیر ج ۱۷ ص ۲۰۶۔ ۲۰۴ مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ)

علامہ علی متقی نے بھی اس حدیث کا حافظ سیوطی کے حوالوں سے ذکر کیا ہے۔

(کنز العمال ج ۱۶ ص ۱۳۴۔ ۱۳۳ مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ بیروت، ۱۴۰۵ھ)

حافظ سیوطی نے "الدر المنثور" میں لکھا ہے: امام عبد بن حمید، امام حکیم ترمذی نے "نوادر الاصول" میں، امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں، امام حاکم اور امام ابن عساکر نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! انبیاء کتنے تھے؟ فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی تھے، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ان میں سے رسول کتنے تھے؟ فرمایا: تین سو تیرہ کا جم غفیر تھا، اس حدیث کو امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں وارد کیا ہے اور امام ابن الجوزی نے "موضوعات" میں وارد کیا ہے اور یہ دونوں متضاد ہیں، اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے نہ موضوع ہے نہ صحیح ہے جیسا کہ میں نے "مختصر الموضوعات" میں بیان کیا ہے۔ (الدر المنثور ج ۲ ص ۲۴۶ مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی ایران)

امام ابویعلی روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو میرے بھائی نبی پہلے گزرے ہیں ان کی تعداد آٹھ ہزار ہے پھر عیسیٰ بن مریم آئے پھر میں۔ (مسند ابویعلی ج ۴ ص ۱۴۳ مطبوعہ دارالمامون تراث بیروت، ۱۴۰۴ھ)

نیز امام ابویعلی روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آٹھ ہزار نبی مبعوث کیے، چار ہزار بنو اسرائیل کی طرف اور چار ہزار باقی لوگوں کی طرف۔

(مسند ابویعلی ج ۴ ص ۱۵۷ مطبوعہ دارالمامون تراث بیروت، ۱۴۰۴ھ)

امام حاکم نے اس حدیث کو حضرت انس سے موقوفاً روایت کیا ہے۔ (المستدرک ج ۲ ص ۵۹۷ مطبوعہ دارالباز مکہ مکرمہ)

امام ابویعلی اور امام حاکم نے جن سندوں سے اس حدیث کو روایت کیا ہے ان میں ابراہیم اور یزید رقاشی نام کے دو راوی ہیں۔ امام ذہبی نے ان دونوں کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ضعیف راوی ہیں۔

(تلخیص المستدرک ج ۲ ص ۵۹۷ مطبوعہ دارالباز مکہ مکرمہ)

علامہ بدرالدین عینی نے امام ابن حبان کی صحیح اور امام ابن مردویہ کی تفسیر کے حوالوں سے حضرت ابوذر کی حدیث ذکر کی ہے اور امام ابویعلی اور حافظ ابوبکر اسماعیلی کے حوالوں سے حضرت انس کی روایت ذکر کی ہے اور کوئی محاکمہ نہیں کیا۔

(عمدۃ القاری ج ۱۵ ص ۲۰۴ مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر، ۱۳۴۸ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

حضرت ابوذر نے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی ہیں اور ان میں سے تین سو تیرہ رسول ہیں، اس حدیث کو امام ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۱ مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور، ۱۴۰۱ھ)

حافظ ابن حجر نے امام ابویعلی اور امام حاکم کی روایت کا ذکر نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روایت ان کے نزدیک معتبر نہیں ہے اور امام ذہبی نے اس کے راویوں کی جو تضعیف کی ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور انہوں نے امام ابن حبان کی تصحیح کو بلا تبصرہ نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت ان کے نزدیک صحیح ہے، اور حدیث کی تحقیق کے سلسلہ میں حافظ

ابن حجر عسقلانی بہت معتمد ہیں اس لیے یہی صحیح ہے کہ انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور ان میں سے تین سو تیرہ رسول ہیں۔

علامہ تفتازانی نے لکھا ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ دو لاکھ چوبیس ہزار انبیاء ہیں۔

(شرح عقائد ص ۹۷ 'مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی)

علامہ پرھاروی نے لکھا ہے کہ میرا گمان ہے کہ حافظ سیوطی نے کہا ہے کہ میں اس روایت سے واقف نہیں ہوں۔

(نبراس ص ۴۴۷ 'مطبوعہ مکتبہ قادریہ' لاہور' ۱۳۹۷ھ)

میں نے اس سلسلہ میں تمام متداول کتب حدیث اور علماء کی تصانیف کو دیکھا ہے' لیکن دو لاکھ کی روایت کہیں نہیں ملی' حافظ ابن کثیر اور حافظ سیوطی نے اس سلسلہ میں تمام روایات کو جمع کیا لیکن دو لاکھ کی روایت ان میں نہیں ہے اور حافظ ابن کثیر اور حافظ سیوطی کے مقابلہ میں علم روایت حدیث پر علامہ تفتازانی کی نظر بہت کم ہے' بلکہ علامہ تفتازانی نے کئی ایسی احادیث ذکر کی ہیں جن کا کوئی وجود نہیں مثلاً یہ حدیث: جس نے اپنے زمانہ کے امام کو نہیں پہچانا وہ جاہلیت کی موت مرا۔

(شرح عقائد ص ۱۰۶' شرح مقاصد ج ۵ ص ۲۳۹)

حافظ ابن کثیر نے ان تمام احادیث کو تفصیل اور سندوں کے ساتھ لکھا ہے جن کے ہم نے حوالے دیئے ہیں اور ان سب کو ضعیف قرار دیا ہے' پھر اس کے آخر میں انہوں نے لکھا ہے کہ امام احمد اور امام ابویعلی نے حضرت ابوسعید سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ہزار یا اس سے زیادہ نبیوں کا خاتم ہوں' امام احمد کی یہ سند زیادہ صحیح ہے' اور اس حدیث کو امام بزار نے بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۵۴ 'مطبوعہ ادارۃ اندلس' بیروت' ۱۳۸۵ھ)

ہرچند کہ حافظ ابن کثیر کی تحقیق یہی ہے لیکن زیادہ تر محدثین کا اعتماد حضرت ابوذر کی اس روایت پر ہے کہ انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور ان میں سے تین سو تیرہ رسول ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ (البقرہ: ۱۵۲)

ذکر کی اقسام اور ذکر کے متعلق اقوال

کسی عمل کے وقت تم میرے امر اور نہی کو یاد کرو' یعنی میرے حکم کے مطابق کسی کام کو کرو یا میرے منع کرنے کے مطابق کسی کام سے رکو تو میں تم کو اس عمل کی جزا سے یاد کروں گا' تم مجھے عبادت اور اطاعت سے یاد کرو میں تم کو ثواب سے یاد کروں گا' ایک قول یہ ہے کہ تم راحت میں مجھ کو عبادت اور دعا سے یاد کرو میں مصیبت میں تم کو عطاء اور نعمت سے یاد کروں گا' ایک قول یہ ہے کہ تم مجھ کو سوال سے یاد کرو میں تم کو عطا سے یاد کروں گا' ایک قول یہ ہے کہ تم مجھ کو توبہ سے یاد کرو میں تم کو عفو اور کرم سے یاد کروں گا' تم مجھے دنیا میں یاد کرو میں تم کو آخرت میں یاد کروں گا۔

کبھی ذکر زبان سے ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرنا' تسبیح کرنا' قرآن مجید کی تلاوت کرنا' وعظ اور نصیحت کرنا' اور کبھی ذکر دل سے ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے دلائل پر غور و فکر کرنا' (علامہ جصاص نے لکھا ہے کہ یہ ذکر کی سب سے افضل قسم ہے' احکام القرآن ج ۱ ص ۱۹۳) اللہ تعالیٰ کے احکام بجالانے کے طریقوں پر غور کرنا' اور اللہ کی مخلوق کے اسرار پر غور کرنا' اور کبھی اعضاء سے ذکر ہوتا ہے جیسے اپنے جسم کے تمام اعضاء کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں صرف کرنا' عام مؤمنین کا ذکر زبان سے ذکر کرنا ہے' امام ابن ماجہ حضرت عبداللہ بن بسر سے روایت کرتے ہیں: ایک اعرابی نے عرض کیا:

یارسول اللہ! اسلام کے احکام بہت ہیں مجھے کوئی ایسی چیز بتایئے جو میں اپنے اوپر لازم کرلوں آپ نے فرمایا: تم اپنی زبان کو اللہ کے ذکر سے ہمیشہ تر رکھو۔ (سنن ابن ماجہ ص ۲۶۸) نیز حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جب بندہ میرے ذکر سے اپنے ہونٹ ہلاتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ (سنن ابن ماجہ ص ۲۶۸)

خواص مومنین اور عارفین دل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں ان کے دل میں ہر وقت صرف اللہ کی یاد رہتی ہے اور وہ اپنے دل میں غیر کا خیال نہیں آنے دیتے۔ ذکر کا اصل معنی ہے: یاد کرنا' قرآن مجید میں ہے: "وَاذْكُرْ رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ" (الکہف: ۲۴) "جب آپ بھول جائیں تو اپنے رب کو یاد کیجئے"۔ زبان سے ذکر کو بھی اس لیے ذکر کہتے ہیں کہ زبان دل کی ترجمان ہے' تاہم بغیر حضور قلب کے فقط زبان سے ذکر کرنا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے' ابوعثمان سے کسی نے شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں مگر دل میں اس کی حلاوت محسوس نہیں کرتے' انہوں نے کہا: اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے کم از کم تمہارے ایک عضو کو تو اپنی اطاعت میں لگالیا ہے۔ ابوعثمان نہدی نے کہا: میں اس وقت کو جانتا ہوں جب اللہ تعالیٰ مجھے یاد کرتا ہے' پوچھا: وہ کون سا وقت ہے؟ کہا: جب میں اسے یاد کرتا ہوں۔ ذوالنون مصری نے کہا: جو حقیقت میں اللہ کا ذکر کرتا ہے وہ اس کے ماسوا کو بھول جاتا ہے اور اللہ ہر چیز سے اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو ہر چیز کا بدل عطا فرماتا ہے' اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کے ذکر سے زیادہ اور کوئی عمل اللہ کے عذاب سے نجات دینے والا نہیں ہے۔ (سنن ابن ماجہ ص ۲۶۸' الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۷۲۔۱۷۱)

حق تو یہ تھا کہ ہم اس کو یاد کرتے رہتے اور وہ توجہ نہ فرماتا' کیونکہ ہم بندے ہیں اور وہ مولیٰ ہے' ہم حاجت مند ہیں اور وہ بے نیاز ہے! لیکن یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے بندہ اور مولیٰ سے قطع نظر فرما کے مساوی سلوک کی دعوت دی: آؤ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا' لیکن ہم اس کے ساتھ مساوی سلوک پر بھی تیار نہیں' ہم اس کو یاد نہیں کرتے اور چاہتے یہ ہیں کہ وہ ہمیں یاد رکھے' ہماری ہر ضرورت پوری کر کے ہماری ہر دعا قبول کرے۔ "وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ" (الانعام: ۹۱) بنو اسرائیل سے فرمایا: "اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ" (البقرہ: ۴۰) "میری نعمت کو یاد کرو" اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے فرمایا: "فَاذْكُرُوْنِيْ" (البقرہ: ۱۵۲) "میری ذات کو یاد کرو" ان کے نبی اللہ کی صفت کے مظہر تھے تو انہیں صفت کو یاد کرنے کا حکم دیا' ہمارے نبی اللہ کی ذات کے مظہر تھے تو ہمیں ذات کو یاد کرنے کا حکم دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور میرا شکر ادا کرتے رہو اور میری ناشکری نہ کرو O (البقرہ: ۱۵۲)

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کر کے میرا شکر ادا کرو اور معصیت کر کے میری ناشکری نہ کرو' اور اس کا یہ معنی بھی ہے کہ میری نعمتوں کا اعتراف کر کے میری حمد و ثناء کرو۔ شکر کا معنی یہ ہے کہ انسان نعمت دینے والے کا احسان مند ہو' اس کے احسان کی قدر کرے' اس کی دی ہوئی نعمت کو اس کی مرضی کے مطابق استعمال کرے اور وہ اپنے منعم اور اپنے محسن کا وفادار رہے' اور کفرانِ نعمت یہ ہے کہ یا تو انسان سرے سے اپنے محسن کا احسان ہی نہ مانے اور اس نعمت کو اپنی ذاتی قابلیت یا کسی اور کی عنایت یا سفارش کا نتیجہ سمجھے' یا اس کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کرے اور اس کو ضائع کر دے یا منعم کی تعظیم نہ کرے یا اس کی نعمت کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کرے یا اس کے احسانات کے باوجود اس سے بے وفائی اور غداری کرے' اس قسم کے کفر کو ہماری زبان میں بالعموم احسان فراموشی' نمک حرامی' غداری اور ناشکرے پن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ

اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد طلب کرو بے شک اللہ تعالیٰ

الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٣﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ

صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے O اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کو مردہ مت کہو' بلکہ

اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿١٥٤﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ

وہ زندہ ہیں لیکن تم (ان کی زندگی کا) شعور نہیں رکھتے O اور البتہ ہم تم کو کچھ ڈر'

وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ

بھوک اور (تمہارے) مالوں' جانوں اور پھلوں کے نقصان میں ضرور مبتلا کریں گے' اور ان صبر

الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٥﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ

کرنے والوں کو بشارت دیجیے O جن کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور

اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿١٥٦﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۫ وَ

بے شک ہم اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں O یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے خصوصی نوازشیں ہیں اور رحمت ہے اور

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿١٥٧﴾

یہی لوگ ہدایت پر ثابت قدم ہیں O

ربط آیات

اس آیت میں دو وجہوں سے صبر کا حکم دیا ہے' ایک تو اس وجہ سے کہ کعبہ کو قبلہ بنانے پر یہودی اعتراضات کرتے تھے اور مسلمانوں کو طعنے دیتے تھے' اس سے مسلمانوں کو جو اذیت پہنچتی تھی اس پر صبر کرنے کا حکم دیا' دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ حکم ہر قسم کی عبادات کو بجالانے کے حکم کو متضمن ہے اور عبادات میں جو مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے اس پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے اور تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس سے پہلی آیت میں شکر کرنے کا حکم دیا ہے اور نعمت ملنے پر شکر کیا جاتا ہے' سو اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ جس طرح نعمت ملنے پر اللہ کا شکر کرنا لازم ہے اسی طرح نعمت زائل ہونے پر صبر کرنا واجب ہے۔

صبر کے ساتھ ساتھ نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے کیونکہ مصائب ٹوٹنے پر صبر کے ساتھ ساتھ نماز سے بھی مدد حاصل ہوتی ہے' امام احمد اپنی سند کے ساتھ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی مصیبت پہنچتی تو آپ نماز پڑھتے۔ (مسند احمد ج ۵ ص ۳۸۸' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

صبر اور نماز کے معانی ہم سورۂ بقرہ کی آیت ۴۵ میں بیان کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم (ان کی زندگی کا) شعور نہیں رکھتے O (البقرہ: ۱۵۴)

اللہ کے نزدیک موت اور حیات کا معنی اور شانِ نزول

اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر فرمایا:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ O فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ O (آل عمران: ۱۷۰۔ ۱۶۹)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے ان کو ہرگز مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں انہیں رزق دیا جاتا ہے O اللہ نے انہیں اپنے فضل سے جو کچھ دیا ہے وہ اس پر خوش ہیں اور اپنے بعد کے مسلمانوں کے متعلق جو ان سے ابھی نہیں ملے یہ بشارت پا کر خوش ہوتے ہیں کہ ان پر (بھی) نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے O

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو زمین پر چلتا پھرتا ہو وہ زندہ ہے اور جو زمین کے نیچے دفن کر دیا جائے وہ مردہ ہے لیکن ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک زندہ وہ ہے جس کی زندگی اللہ کی راہ میں بسر ہو وہ زمین کے اوپر ہو پھر بھی زندہ ہے اور زمین کے نیچے ہو پھر بھی زندہ ہے اور جس کی زندگی لہو و لعب اور کفر میں بسر ہو وہ زمین کے اوپر بھی مردہ ہے اور زمین کے نیچے بھی مردہ ہے' اسی لیے فرمایا: '' اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ''. (النمل: ۸۰) '' آپ مُردوں کو تو نہیں سناتے '' کافر زمین پر چلتے پھرتے تھے ان کو مردہ فرمایا اور شہید زمین کے نیچے دفن ہو گئے لیکن ان کو زندہ فرمایا۔

امام رازی سورۂ بقرہ کی اس آیت کے شان نزول میں لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ یہ آیت شہداء بدر کے متعلق نازل ہوئی ہے' جنگ بدر کے دن چودہ مسلمان شہید ہوئے تھے' چھ مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے' مہاجرین میں سے عبیدہ بن حارث' عمر بن ابی وقاص' ذوالشمالین' عمرو بن نفیلہ' عامر بن بکر اور مجع بن عبد اللہ اور انصار میں سے سعید بن خیثمہ' قیس بن عبد المنذر' زید بن حارث' تمیم بن ہمام' رافع بن معلیٰ' حارثہ بن سراقہ' معوذ بن عفراء اور عوف بن عفراء' اس وقت لوگ یہ کہتے تھے کہ فلاں مر گیا اور فلاں مر گیا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ راہ خدا میں مرنے والوں کو مردہ نہ کہو' اس آیت کے شانِ نزول میں دوسرا قول یہ ہے کہ کفار اور منافقین یہ کہتے تھے کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رضا کی خاطر مسلمان بے فائدہ اپنے آپ کو قتل کرا رہے ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر کبیر ج ۲ ص ۳۵' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

برزخ میں حیات کا بیان

اس آیت میں شہداء کی حیات کو بیان کیا گیا ہے' قبر میں حیات کئی قسم کی ہے:

حیات کی ایک قسم برزخی حیات ہے' یہ حیات ہر مومن اور کافر کو حاصل ہے' دو چیزوں کے درمیان حد اور حجاب کو برزخ کہتے ہیں' اور یہاں برزخ سے مراد موت سے لے کر قیامت تک کا وقت ہے' قرآن مجید میں ہے:

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ O (المؤمنون: ۱۰۰)

اور ان کے آگے اس دن تک ایک حجاب ہے جس دن میں وہ اٹھائے جائیں گے O

حیات برزخی پر دلیل یہ ہے کہ کافروں اور فاسقوں پر قبر میں عذاب ہوتا ہے اور نیک مسلمانوں کو قبر میں ثواب ہوتا ہے اور

حیات کے بغیر عذاب اور ثواب متصور نہیں ہے' انسان کا جسم تو کچھ عرصہ بعد گل سڑ جاتا ہے اور ہڈیاں بھی ریزہ ریزہ ہو کر خاک ہو جاتی ہیں' پھر عذاب اور ثواب کیا صرف روح کو ہوتا ہے؟ اس میں تحقیق یہ ہے کہ انسان کے بدن کے اصلی جز کو اللہ تعالیٰ ہر حال میں قائم رکھتا ہے اور اس جز کے ساتھ روح متعلق ہو جاتی ہے اور عذاب اور ثواب کا ترتب روح اور بدن کے اس جز پر ہوتا ہے' لیکن دنیاوی احکام میں یہ مردہ ہوتے ہیں۔

اولیاء اللہ کی جسمانی حیات کا بیان

اولیاء اللہ کو قبر میں جسمانی حیات حاصل ہوتی ہے' اس پر دلیل یہ ہے کہ امام ترمذی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ بندہ مومن جب فرشتوں کے سوال کا صحیح جواب دے دیتا ہے تو اس کی قبر میں ستر در ستر وسعت کر دی جاتی ہے اور فرشتے اس سے کہتے ہیں کہ اس عروس (دلہن) کی طرح سو جا جس کو اس کے محبوب اہل (زوج) کے سوا کوئی بیدار نہیں کرتا' حتیٰ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو اس قبر سے اٹھائے۔ (جامع ترمذی ص ۱۷۳' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بندہ مومن قیامت تک قبر میں سوتا رہے گا اور سونا حیات کی فرع ہے اور جب کہ عام مشاہدہ یہ ہے کہ قبر میں بالعموم مسلمانوں کے اجسام گل سڑ جاتے ہیں اس لیے اس حدیث کو خواص مومنین یعنی اولیاء اللہ پر محمول کیا جائے گا اور اولیاء اللہ کی قبر میں حیات کے متعلق بہ کثرت نقول موجود ہیں۔ شیخ رشید احمد گنگوہی نے لکھا ہے کہ اولیاء کرام بھی بحکم شہداء ہیں اور مشمول آیت "بل احیاء عند ربھم" (البقرہ: ۱۶۹) کے ہیں۔

(فتاویٰ رشیدیہ کامل مبوب ص ۸۷' مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی)

علامہ قرطبی بیان کرتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ ثواب کی نیت سے اذان دینے والا اس شہید کی طرح ہے جو اپنے خون میں لتھڑا ہوا ہو اگر وہ مر گیا تو اس کی قبر میں کیڑے نہیں پڑیں گے۔ اس حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو مومن ثواب کی نیت رکھتا ہو اس کو بھی زمین نہیں کھاتی۔[1] یہ حدیث اولیاء اللہ کی جسمانی حیات پر واضح دلیل ہے۔

شہداء کی حیات کا بیان

شہداء کی حیات بھی جسمانی ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت: ۱۷۰ میں ذکر ہے' شہداء کو رزق بھی دیا جاتا ہے' اور سورۂ بقرہ کی اس آیت میں فرمایا ہے کہ تم ان کی حیات کا شعور نہیں رکھتے یعنی تم اپنے حواس سے ان کی حیات کا ادراک نہیں کر سکتے' بایں طور کہ ہم ان کو رزق کھاتا ہوا دیکھیں' یا چلتا پھرتا ہوا دیکھیں جس طرح ہم دنیا میں اور زندہ لوگوں میں آثار حیات دیکھتے ہیں اس طرح شہداء میں ہم کو آثار حیات دکھائی نہیں دیں گے' لیکن شہداء بھی دنیاوی احکام میں مردہ ہیں' کیونکہ ان کی شہادت کے بعد ان کی بیویوں سے عدت پوری ہونے کے بعد نکاح کرنا جائز ہے اور ان کا ترکہ ان کے وارثوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

شہادت کے بعد بعض جسموں کے تغیر سے ان کی حیات پر معارضہ کا جواب

حیات شہداء پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم کئی بار میدان جنگ میں مسلمان مقتولین کو دیکھتے ہیں' چند دن گزرنے کے بعد ان کا جسم پھول اور پھٹ جاتا ہے اور اس سے بدبو آنے لگتی ہے' قبروں میں ان کا جسم ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اور ان کی ہڈیاں بوسیدہ ہو جاتی ہیں اور یہ جسمانی حیات کے منافی ہے' اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو میدان جہاد میں مقتول

[1] علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ' التذکرۃ فی احوال الموتی وامور الآخرۃ ص ۱۸۵' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت

ہوئے لیکن ان کی نیت صحیح نہیں تھی، یہ لوگ صرف روزی کمانے کے لیے فوج میں بھرتی ہوئے یا شہرت اور ناموری کے لیے فوج میں بھرتی ہوئے، ان کے دلوں میں اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جان دینا یا راہ خدا میں قتل ہونے کا جذبہ نہیں تھا، اس لیے باوجود میدان جہاد میں مارے جانے کے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہید نہیں تھے، اس لیے ان کو جسمانی حیات سے بھی نہیں نوازا گیا۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک اعرابی نے حاضر ہو کر کہا: یا رسول اللہ! ایک شخص مال غنیمت کی خاطر لڑتا ہے، ایک شخص نام آوری کے لیے لڑتا ہے اور ایک شخص اظہار شجاعت کے لیے لڑتا ہے، ان میں سے اللہ کے لیے لڑنے والا کون ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جہاد کرے وہی (درحقیقت) اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۳۹، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایک شخص دنیا کو حاصل کرنے کے لیے جہاد کا ارادہ کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کے لیے کوئی اجر نہیں ہے۔

اور جن مسلمانوں کی نیت صحیح ہوتی ہے ان کو شہادت کے بعد جسمانی حیات حاصل ہوتی ہے، اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

امام مالک روایت کرتے ہیں کہ ان کو یہ حدیث پہنچی ہے:

حضرت عمرو بن الجموح انصاری اور حضرت عبداللہ بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہما کی قبروں کو سیلاب نے اکھاڑ دیا تھا، ان کی قبریں سیلاب کے قریب تھیں، یہ دونوں ایک قبر میں مدفون تھے، یہ دونوں جنگ احد میں شہید ہوئے تھے، ان کی قبر کھودی گئی تاکہ ان کی قبر کی جگہ تبدیل کی جاسکے، جب ان کے جسموں کو قبر سے نکالا گیا تو ان کے جسموں میں کوئی تغیر نہیں ہوا تھا، یوں لگتا تھا جیسے وہ کل فوت ہوئے ہوں، ان میں سے ایک زخمی تھا اور اس کا ہاتھ اس کے زخم پر تھا، اس کو اسی طرح دفن کیا گیا تھا، اس کے ہاتھ کو اس کے زخم سے ہٹا کر چھوڑا گیا تو وہ پھر اپنے زخم پر آ گیا، جنگ احد اور قبر کھودنے کے درمیان چھیالیس (۴۶) سال کا عرصہ تھا۔ (موطا امام مالک ص ۲۸۳۔ ۲۸۲، مطبوعہ مطبع مجتبائی، پاکستان، لاہور)

امام بیہقی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۴ ص ۵۸۔ ۵۷، مطبوعہ نشر السنۃ، ملتان)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کاملین کو اصلی جسم کے ساتھ حیات عطا کی جائے اور عام مسلمانوں کو اس جسم معروف کے ساتھ حیات عطا نہ کی جائے بلکہ جسم مثالی کے ساتھ حیات عطا کی جائے۔ اس مسئلہ کو زیادہ تفصیل اور تحقیق کے ساتھ ہم نے "شرح صحیح مسلم" جلد خامس میں بیان کیا ہے۔

سبز پرندوں میں شہید کی روح کے متمثل ہونے سے تناسخ کا جواب

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام مالک، امام احمد اور امام ترمذی نے تصحیح سند کے ساتھ اور امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے، حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شہداء کی روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوتی ہیں، وہ جنت کے پھلوں یا درختوں پر ہوتے ہیں۔

امام عبدالرزاق نے "مصنف" میں حضرت عبداللہ بن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شہداء کی روحیں سبز پرندوں کی صورتوں میں جنت کی قندیلوں سے معلق ہوتی ہیں' حتیٰ کہ قیامت کے دن اللہ انہیں (ان کے بدنوں میں) لوٹا دے گا۔ (الدرالمنثور ج ۱ ص ۱۵۵' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ 'ایران)

امام عبدالرزاق کی اس ثانی الذکر روایت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ شہادت کے بعد شہید کی روح کا سبز پرندہ کی صورت میں متشکل ہو جانا بعینہٖ تناسخ ہے' اس اعتراض کا ایک جواب یہ ہے کہ تناسخ انکار معاد پر مبنی ہے اور اس حدیث میں معاد کو بیان کیا گیا ہے' دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے اور زیادہ قوی اول الذکر حدیث ہے جس کی صحت کی امام ترمذی نے تصریح کی ہے اور اس حدیث پر یہ اعتراض نہیں ہے' کیونکہ شہید کی روح پرندہ کے پوٹے میں حلول نہیں کرتی بلکہ پرندہ میں اپنی روح ہوتی ہے اور شہید کی روح بہ منزلہ سوار اور پرندہ اس کی سواری ہے' اور اس روح کا اپنے اصل جسم یا جسم مثالی کے ساتھ تعلق قائم رہتا ہے' لہٰذا یہ حدیثیں شہید کی جسمانی حیات کے منافی نہیں ہیں اور ان سے تناسخ ثابت نہیں ہوتا۔

انبیاء علیہم السلام کی حیات کا بیان

انبیاء علیہم السلام کی حیات بھی قبر میں جسمانی ہے اور یہ سب سے اعلیٰ' افضل اور قوی حیات ہے' اور انبیاء علیہم السلام دنیاوی احکام میں بھی زندہ ہوتے ہیں' ان کی وفات کے بعد ان کی میراث تقسیم نہیں کی جاتی اور وفات کے بعد ان کی ازواج مطہرات سے کسی شخص کے لیے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی حیات پر قرآن مجید کی یہ آیت دلیل ہے:

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ○ (سباء: ۱۴)

تو جب ہم نے سلیمان پر موت کا حکم نافذ کر دیا تو جنات کو ان کی موت پر سوائے زمین کی دیمک کے کسی نے مطلع نہیں کیا جو سلیمان کے عصا کو کھاتی رہی' پھر جب سلیمان زمین پر آ رہے تو جنوں پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں نہ پڑے رہتے ○

حضرت سلیمان علیہ السلام جنوں سے مسجد بیت المقدس کی تعمیر کی تجدید کرا رہے تھے' جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو موت کے وقت سے مطلع کر دیا تو آپ نے جنوں کو نقشہ بنا کر دیا اور خود ایک شیشہ کے مکان میں دروازہ بند کر کے عصا سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو گئے' اسی حالت میں فرشتے نے روح قبض کر لی اور آپ کا جسم مبارک اس عصا کے سہارے کھڑا رہا اور کسی کو آپ کی وفات کا احساس نہ ہو سکا' وفات کے بعد مدت دراز تک جن بہ دستور تعمیر کرتے رہے' جب تعمیر پوری ہو چکی تو وہ عصا دیمک کے گھن لگنے کی وجہ سے گر پڑا' تب سب کو آپ کی وفات کا حال معلوم ہوا اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ جنوں کو غیب کا علم نہیں ہوتا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ انبیاء پر موت طاری ہونے کے بعد ان کا جسم صحیح سلامت رہتا ہے' پھولنے' پھٹنے' گلنے اور سڑنے سے محفوظ رہتا ہے' لیکن ان کی جسمانی حیات کی کیفیت ہمارے دائرہ احساس اور شعور سے خارج ہے۔ عصا میں جب گھن لگ گیا اور وہ زمین پر گر گیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا جسم مبارک بھی زمین پر آ رہا تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی حیات جسمانی ہوتی ہے لیکن اس پر دنیاوی حیات کے آثار مرتب نہیں ہوتے' ورنہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا جسم اپنے قیام میں عصا کا محتاج نہ ہوتا اور عصا گرنے کے باوجود آپ کا جسم مبارک قائم رہتا۔ انبیاء علیہم السلام زائرین کے سلام کا جواب دیتے ہیں اور جو ان سے دعا کی درخواست کرتے ہیں ان کی شفاعت کرتے ہیں' اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں' اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے مشاہدہ اور مطالعہ میں مستغرق رہتے ہیں اور احوال برزخ پر بھی نظر رکھتے

ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اذن سے کائنات میں تصرف بھی کرتے ہیں لیکن یہ تمام امور متشابہات میں سے ہیں' یہ امور ایسے نہیں ہیں جیسے دنیا میں کسی انسان سے صادر ہوتے ہیں' ان کی کیفیت ہم ایسے عام لوگوں کے دائرہ ادراک اور شعور سے خارج ہے' احادیث میں بھی انبیاء علیہم السلام کی جسمانی حیات اور ان کے جسمانی تصرفات پر دلیل ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادی ازرق میں گزرے آپ نے فرمایا: یہ کون سی وادی ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: یہ وادی ازرق ہے' آپ نے فرمایا: گویا کہ میں (حضرت) موسیٰ کو دیکھ رہا ہوں' وہ باآواز بلند تلبیہ پڑھتے ہوئے اس وادی سے اتر رہے ہیں' پھر آپ وادی ھرشیٰ سے گزرے آپ نے فرمایا: یہ کون سی وادی ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: یہ وادی ھرشیٰ ہے' آپ نے فرمایا: گویا کہ میں (حضرت) یونس بن متیٰ کی طرف دیکھ رہا ہوں' وہ ایک سرخ رنگ کی فربہ اونٹنی پر سوار ہیں' جس کی مہار کھجور کی چھال کی ہے' انہوں نے ایک اونی جبہ پہنا ہوا ہے اور وہ "اللھم لبیک" کہتے ہوئے اس وادی سے گزر رہے ہیں۔ (صحیح مسلم ج ا ص ۹۴' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

علامہ نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام حج اور تلبیہ کس طرح کرتے ہیں' حالانکہ وہ وفات پا چکے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام بہ منزلہ شہداء ہیں بلکہ ان سے افضل ہیں اور شہداء اپنے رب کے نزدیک زندہ ہیں' اس لیے ان کا حج کرنا اور نماز پڑھنا بعید نہیں ہے جیسا کہ دوسری حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

(شرح مسلم ج ا ص ۹۴' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

شیخ عثمانی لکھتے ہیں: انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں اس لیے ان کے حج کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے' (الی قولہ) اس حدیث کی توجیہ یہ ہے کہ آپ نے ان کی روح کو دیکھا تھا' آپ کے لیے ان کی روحوں کو اس طرح متمثل کر دیا گیا جس طرح شب معراج انبیاء علیہم السلام کی روحوں کو متمثل کر دیا گیا تھا اور ان کے اجسام قبروں میں تھے' علامہ ابن منیر وغیرہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نبی کی روح کے لیے ایک جسم مثالی بنا دیتا ہے' پھر وہ جس طرح خواب میں دکھائی دیتے ہیں' اسی طرح بیداری میں دکھائی دیتے ہیں۔ (فتح الملہم ج ا ص ۳۳۰' مطبوعہ مکتبۃ الحجاز' کراچی)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں (حضرت) موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا' اس وقت وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۶۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

نیز امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اپنے آپ کو انبیاء علیہم السلام کی ایک جماعت میں پایا' میں نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نماز پڑھ رہے ہیں اور ان کے بال قبیلہ شنوءہ کے لوگوں کی طرح گھنگریالے تھے' اور اس وقت حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے' عروہ بن مسعود ثقفی ان سے بہت مشابہ ہیں اور اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اور تمہارے نبی ان کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ ہیں' پھر نماز کا وقت آیا اور میں نے ان سب نبیوں کی امامت کی۔

(صحیح مسلم ج ا ص ۹۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

علامہ نووی لکھتے ہیں:

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے ہوئے کیسے دیکھا تھا' حالانکہ آپ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو بیت المقدس میں نماز پڑھائی اور آپ نے ان کو آسمانوں میں بھی اپنے اپنے مراتب میں دیکھا اور ان کو سلام کیا اور انہوں نے آپ کو خوش آمدید کہا' اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں بیت المقدس جاتے ہوئے آسمانوں پر چڑھنے سے پہلے دیکھا ہو' پھر حضرت موسیٰ آپ سے پہلے آسمان پر پہنچ گئے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے انبیاء علیہم السلام کو پہلے نماز پڑھائی ہو اور پھر ان کو آسمانوں پر دیکھا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ سے واپسی کے بعد آپ نے انبیاء علیہم السلام کو نماز پڑھائی ہو اور حضرت موسیٰ کو دیکھا ہو۔

(شرح مسلم ج ۲ ص ۹۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

شیخ اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

حضرت آدم علیہ السلام جمیع انبیاء میں اس کے قبل بیت المقدس میں بھی مل چکے ہیں اور اسی طرح وہ اپنی قبر میں بھی موجود ہیں اور اسی طرح بقیہ سمٰوات میں جو انبیاء علیہم السلام کو دیکھا سب جگہ یہی سوال ہوتا ہے' اس کی حقیقت یہ ہے کہ قبر میں تو اصلی جسد سے تشریف رکھتے ہیں اور دوسرے مقامات پر ان کی روح کا تمثل ہوا ہے یعنی غیر عنصری جسد سے جس کو صوفیہ جسم مثالی کہتے ہیں' روح کا تعلق ہو گیا اور اس جسد میں تعدد بھی اور ایک وقت میں روح کا سب کے ساتھ تعلق بھی ممکن ہے لیکن ان کے اختیار سے نہیں بلکہ محض بقدرت و مشیت حق۔ (نشر الطیب ص ۶۵۔ ۶۴' مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی)

اللہ تعالیٰ کی قدرت تو محل کلام نہیں ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس قسم کے اختیار عطا فرماتا ہے۔

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے دنوں میں جمعہ کا دن سب سے افضل ہے' اس دن مجھ پر بہ کثرت درود پڑھا کرو' کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے' صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! آپ پر ہمارا درود کس طرح پیش کیا جائے گا حالانکہ آپ کا جسم بوسیدہ ہو چکا ہو گا؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے جسم کھانے کو حرام کر دیا ہے۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۱۴۴' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس وقت بھی کوئی شخص مجھ پر سلام پیش کرتا ہے اس وقت اللہ نے مجھ پر روح لوٹائی ہوئی ہوتی ہے حتیٰ کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۷۹' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

حیات انبیاء پر حضرت سلیمان علیہ السلام کے گرنے سے معارضہ کے جوابات

قرآن مجید میں ذکر ہے کہ وفات کے بعد عصا کا سہارا نہ ہونے کی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام کا جسم زمین پر آ رہا' اور احادیث صحیحہ میں وفات کے بعد انبیاء علیہم السلام کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا' نمازیں پڑھنا' حج کرنا' سلام کا جواب دینا اور باتیں کرنا مذکور ہے۔ ان میں توفیق اور تطبیق کی حسب ذیل صورتیں ہیں:

(۱) عام انسانوں اور جنات کی نظروں میں انبیاء علیہم السلام کے اجسام پر وفات کے بعد آثار حیات نہیں ہوتے۔ ان میں آثار حیات کا مشاہدہ صرف اہل اللہ اور انبیاء علیہم السلام ہی کر سکتے ہیں۔

(۲) انبیاء علیہم السلام کے اجسام عنصریہ میں حس اور حرکت ارادی کے آثار نہیں ہوتے' البتہ ان کی روح کے ساتھ اجسام مثالیہ کو متعلق کر دیا جاتا ہے اور تصرف کے جس قدر واقعات کا ذکر احادیث میں ہے' یہ سب اجسام مثالیہ ہیں۔

(۳) وفات کے بعد انبیاء علیہم السلام کے اجسام کے احوال مختلف ہوتے ہیں بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنی کسی حکمت کو ظاہر کرنے کے لیے ان سے آثار حیات کو سلب فرما لیتا ہے (جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں جنوں کے دعویٰ علم غیب کو رد کرنا مقصود تھا یا ان کی وفات ظاہر کر کے ان کی تجہیز و تکفین اور ان کو قبر میں دفن کرانا تھا) اور بعض اوقات اپنی کسی حکمت کو ظاہر کرنے کے لیے ان کے اجسام میں آثار حیات جاری فرما دیتا ہے' جیسے ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور شان ظاہر کرنے کے لیے شب معراج آپ کی اقتداء میں سب نبیوں سے نماز پڑھوائی اور عبادت میں ان کا شغف ظاہر کرنے کے لیے وفات کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو انہیں نماز پڑھتا ہوا اور حج کرتا ہوا دکھایا۔

وفات کے بعد انبیاء علیہم السلام کے دکھائی دینے کی کیفیت کا بیان

امام غزالی لکھتے ہیں:

صوفیاء کی پہلی منزل مکاشفات اور مشاہدات سے شروع ہوتی ہے' حتیٰ کہ وہ بیداری میں فرشتوں کا اور ارواح انبیاء کا مشاہدہ کرتے ہیں' ان کی آوازیں سنتے ہیں اور ان سے فوائد حاصل کرتے ہیں۔

(المنقذ من الضلال ص ۵۰' مطبوعہ بیت الاوقاف لاہور' ۱۹۷۱ء)

علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

آیا ذات مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت آپ کے جسم اور روح کے ساتھ ہوتی ہے یا جسم مثالی کے ساتھ؟ امام غزالی نے کہا ہے کہ ارباب احوال آپ کے جسم اور روح کو نہیں دیکھتے بلکہ مثال کو دیکھتے ہیں (علامہ سیوطی فرماتے ہیں:) آپ کی ذات مبارک کی جسم اور روح کے ساتھ زیارت ممتنع نہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں اور آپ سب کی روحیں آپ کے جسموں میں لوٹا دی گئی ہیں اور تمام انبیاء کو اپنی قبروں سے باہر آنے کا اور تمام کائنات میں تصرف کرنے کا اذن دیا گیا ہے اور امام بیہقی نے حیات انبیاء میں ایک رسالہ لکھا ہے اور ''دلائل النبوۃ'' میں لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام شہداء کی طرح اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔ (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۶۳' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ فیصل آباد)

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح دکھائی دیتی ہے بایں طور کہ وہ مختلف صورتوں میں دکھائی دیتی ہے اور اس کا تعلق جسد انور کے ساتھ باقی رہتا' جیسا کہ جبرائیل علیہ السلام حضرت دحیہ کلبی کی صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتے تھے اور سدرۃ المنتہیٰ سے جدا نہیں ہوتے تھے اور یا آپ کا جسم مثالی دکھائی دیتا ہے جس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح متعلق ہوتی ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ بے شمار اجسام مثالیہ ہوں اور ان سب کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح واحد متعلق ہو جیسا کہ ایک جسم کے متعدد اعضاء کے ساتھ روح واحد متعلق ہوتی ہے۔ (روح المعانی ج ۲۲ ص ۳۷' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

شیخ انور شاہ کشمیری لکھتے ہیں:

میرے نزدیک بیداری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ممکن ہے کیونکہ منقول ہے کہ علامہ سیوطی نے بائیس مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ سے چند احادیث کی صحت کے متعلق سوال کیا اور آپ کے تصحیح فرمانے کے بعد ان احادیث کو صحیح لکھا اور علامہ شعرانی نے لکھا ہے کہ انہوں نے آپ کی بیداری میں زیارت کی اور آٹھ ساتھیوں کے ساتھ آپ سے

"بخاری" پڑھی جن میں سے ایک حنفی تھا۔ (فیض الباری ج ۱ ص ۲۰۴ مطبوعہ مطبع حجازی مصر ۱۳۵۷ھ)

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبور مبارکہ میں اپنے جسد عنصری کے ساتھ زندہ ہیں اور اپنی عبادت اور اللہ تعالیٰ کی تجلیات کے مشاہدہ میں مشغول ہیں' ان پر اعمال پیش کیے جاتے ہیں' نیک اعمال دیکھ کر وہ اللہ کی حمد کرتے ہیں اور بُرے اعمال دیکھ کر امت کے لیے استغفار کرتے ہیں' اور اہل اللہ اور خاص خاص بندگانِ خدا ان کی زیارت سے مستفید ہوتے ہیں' ان کا کلام سنتے ہیں اور وہ اپنی قبروں سے باہر بھی آتے ہیں اور زمین اور آسمان میں جہاں چاہیں تشریف لے جاتے ہیں' ایک وقت میں کئی جگہ بھی تشریف لے جاتے ہیں' اس وقت ان کی روح کئی صورتوں میں متشکل ہوتی ہے یا ایک وقت میں کئی جگہ ان کے اجسام مثالیہ نظر آتے ہیں' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حاضر ناظر کہا جاتا ہے اس کا یہی مفہوم ہے' حاضر ناظر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ اپنے جسم معروف اور جسد عنصری کے ساتھ ایک وقت میں ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔

شہید کا معنی

شہید کا معنی گواہ اور حاضر ہے۔ اللہ کی راہ میں مارے جانے والے کو شہید کہتے ہیں' اس کو شہید اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے لیے جنت کی شہادت دی گئی ہے' ایک قول یہ ہے کہ اللہ کے فرشتے اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں' ایک قول یہ ہے کہ مرنے کے فوراً بعد شہید کی روح جنت میں حاضر ہو جاتی ہے' جب کہ دوسروں کی روحیں فوراً جنت میں نہیں جاتیں' ایک قول یہ ہے کہ شہید راہِ خدا میں جان دے کر اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس نے خدا سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ (التوبہ: ۱۱۱)

اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا۔

اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ ہی کو خوب علم ہے کہ کون اس کی راہ میں زخمی ہوتا ہے۔

شہداء کی تعداد کا بیان

جو شخص دین کی سربلندی کے لیے راہِ خدا میں مارا جائے وہ حقیقۃً شہید ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے علاوہ بھی چند مرنے والوں کو شہید فرمایا ہے' ہم نے "شرح صحیح مسلم" جلد خامس میں احادیث کے حوالوں سے پینتالیس شہداء کا ذکر کیا ہے۔ علامہ قرطبی نے بھی اپنی کتاب "التذکرہ" میں احادیث کے حوالوں سے بعض شہداء کا ذکر کیا ہے' ہم اس میں سے یہاں ان شہداء کا ذکر کر رہے ہیں جن کا ذکر "شرح صحیح مسلم" میں نہیں ہے۔

علامہ قرطبی "التذکرہ" میں لکھتے ہیں:

امام آجری نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے انس! اگر ہو سکے تو تم ہمیشہ باوضو رہو کیونکہ ملک الموت جس بندہ کی روح قبض کرے اور وہ اس وقت باوضو ہو اس کے لیے شہادت لکھ دی جاتی ہے۔

امام شعبی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے چاشت کی نماز پڑھی' ہر ماہ تین روزے رکھے' اور سفر اور حضر میں وتر کو ترک نہیں کیا اس کے لیے شہادت کا اجر لکھ دیا جاتا ہے' اس حدیث کو امام ابونعیم نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

امام حکیم ترمذی اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: ہر شخص کے

پاس کوئی نہ کوئی ایسا پسندیدہ جانور ہوتا ہے جس کے ذبح کرنے سے وہ انکار کرتا ہے اور اللہ کی بھی ایک ایسی مخلوق ہے جس کو ذبح کرنے سے وہ انکار ہے' کچھ لوگ بستروں پر مرتے ہیں اور ان کے لیے شہداء کا اجر تقسیم کیا جاتا ہے[۱] ان تین قسموں کو ملانے کے بعد شہداء کی تعداد اڑتالیس ہو گئی۔

شہید کے متعلق فقہی احکام

علامہ مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

جس شخص کو مشرکین قتل کر دیں یا جو میدان جنگ میں مردہ پایا جائے اور اس پر زخموں کے نشان ہوں' یا جس کو مسلمان ظلماً قتل کر دیں اور اس کے قتل کرنے پر ان پر دیت واجب نہ ہو وہ شہید ہے' اس کو کفن دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اس کو غسل نہیں دیا جائے گا کیونکہ وہ شہداء احد کے معنی میں ہے' جن کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انہیں ان کے زخموں اور خون میں لپیٹ دو اور ان کو غسل نہ دو (یہ حدیث غریب ہے' صحیح حدیث یہ ہے: امام بخاری حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احد کے دن فرمایا: انہیں ان کے خون کے ساتھ دفن کر دو اور ان کو غسل نہیں دلوایا۔ ج ا ص ۱۷۹)۔

ہر وہ شخص جو کسی دھار والے آلہ کے ساتھ قتل کیا گیا ہو بہ شرطیکہ وہ طاہر ہو (جنبی نہ ہو) اور بالغ ہو' اور اس کے قتل کی وجہ سے کوئی مالی عوض واجب نہ ہو' وہ شہداء احد کے معنی میں ہے اور وہ ان کے ساتھ لاحق ہوگا' امام شافعی شہید کی نماز جنازہ میں ہماری مخالفت کرتے ہیں' وہ کہتے ہیں: اس کا تلوار سے مارا جانا اس کے گناہوں کا کفارہ ہے' لہٰذا وہ نمازیوں کی شفاعت سے مستغنی ہے' ہم کہتے ہیں کہ میت پر نماز پڑھنا اس کی تعظیم اور توقیر کے اظہار کے لیے ہے' اور شہید اس توقیر کے زیادہ لائق ہے اور جو گناہوں سے پاک ہو وہ مسلمانوں کی دعا سے مستغنی نہیں ہوتا' جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور بچوں کے لیے دعا کی جاتی ہے اور جس مسلمان کو اہل حرب' یا باغی یا ڈاکو قتل کر دیں' خواہ وہ اس کو کسی چیز سے بھی قتل کریں اس کو غسل نہیں دیا جائے گا کیونکہ تمام شہداء احد کو تلوار اور ہتھیاروں سے قتل نہیں کیا گیا تھا۔ (ہدایہ اولین ص ۱۸۳' مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ' ملتان)

شہید کی نماز جنازہ پڑھی جانے کے متعلق فقہاء احناف کی دلیل یہ حدیث ہے:

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور شہداء احد پر نماز جنازہ پڑھی' پھر آپ منبر کی طرف لوٹ گئے اور فرمایا: میں تمہارا پیش رو ہوں اور تمہارے حق میں گواہ ہوں' اور بے شک بہ خدا! میں ضرور اس وقت اپنے حوض کی طرف دیکھ رہا ہوں' اور مجھے تمام روئے زمین کے خزانوں کی چابیاں دے دی گئی ہیں اور بے شک بہ خدا! مجھے تم سے اندیشہ نہیں ہے کہ تم (سب) میرے بعد مشرک ہو جاؤ گے لیکن مجھے تم سے یہ اندیشہ ہے کہ میرے بعد تم دنیا میں رغبت کرو گے۔ (صحیح بخاری ج ا ص ۱۷۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علم اور شعور کا فرق

اس آیت میں فرمایا ہے: تم شہداء کی حیات کا شعور نہیں رکھتے۔ حواس سے ادراک کرنے کو شعور کہتے ہیں اور عقل سے ادراک کرنے کو علم کہتے ہیں۔ علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں: "لا تشعرون" کا معنی ہے: تم حواس سے ادراک نہیں کرتے اور "لا تشعرون" کی جگہ "لا تعقلون" کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ کئی ایسی چیزیں ہیں جن کا حواس سے ادراک نہیں ہوتا لیکن

[۱] علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ' التذکرہ ص ۱۸۲۔ ۱۸۰' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' ۱۴۰۷ھ

عقل سے ان کا ادراک ہو جاتا ہے[1] نیز راغب اصفہانی لکھتے ہیں: کسی شے کی حقیقت کا ادراک کرنا علم ہے اور علم کی دو قسمیں ہیں: ایک علم عقل سے حاصل ہوتا ہے اور دوسرا خبر سے۔ (المفردات ص ۳۴۳ مطبوعہ المکتبۃ المرتضویۃ ایران' ۱۳۴۲ھ)

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

علم صاحب عقل کی وہ صفت ہے جس سے اس کے لیے ذکر کی ہوئی چیز منکشف ہو جائے اور فرشتوں' انسانوں اور جنوں کے لیے علم کے تین اسباب ہیں: حواس سلیمہ' خبر صادق اور عقل۔ (شرح عقائد ص ۱۰۔۹ مطبوعہ محمد سعید تاجران کتب' کراچی)

علامہ شمس الدین خیالی' علامہ تفتازانی پر اعتراض کرتے ہیں:

حواس کے ادراک کو علم میں شمار کرنا عرف اور لغت کے خلاف ہے' کیونکہ عرف اور لغت میں بہائم (حیوانات) ذوی العلم نہیں ہیں۔ (حاشیۃ الخیالی ص ۲۴ مطبوعہ یوسفی فرنگی محلی' لکھنؤ)

علامہ خیالی کا یہ اعتراض صحیح نہیں ہے' کیونکہ علامہ تفتازانی نے انسانوں کے لیے حواس کو علم کا سبب بنایا ہے' مطلقاً حواس کو علم کا سبب نہیں کہا۔

شیخ اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

پھر یہ کہ آپ کی ذات مقدسہ پر علم غیب کا حکم کیا جانا اگر بقول زید صحیح ہو تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس غیب سے مراد بعض غیب ہے یا کل غیب' اگر بعض علوم غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا تخصیص ہے' ایسا علم غیب تو زید عمرو بلکہ ہر صبی و مجنون بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کے لیے بھی حاصل ہے کیونکہ ہر شخص کو کسی نہ کسی ایسی بات کا علم ہوتا ہے جو دوسرے شخص سے مخفی ہے تو چاہیے کہ سب کو عالم الغیب کہا جاوے۔ (حفظ الایمان ص ۷ مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ' دیوبند' یوپی)

اس عبارت پر حسب ذیل اعتراضات ہیں:

(۱) اس عبارت میں حیوانات اور بہائم کے ادراک پر علم غیب کا اطلاق کیا ہے' حالانکہ حیوانات کے ادراک پر علم کا اطلاق بھی صحیح نہیں ہے' چہ جائیکہ حیوانات کے ادراک پر علم غیب کا اطلاق کیا جائے۔

(۲) مکتب فکر دیوبند کی تعلیم کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم پر بھی علم غیب کا اطلاق جائز نہیں بلکہ عطائی علم غیب کو بھی انہوں نے کفر لکھا ہے' شیخ سرفراز نے لکھا ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب ثابت کرنے والا کافر اور مشرک ہے۔ (خلاصہ ازالۃ الریب ص ۳۸) پھر جانوروں کے لیے علم غیب ثابت کرنے کا کیا حکم ہوگا؟

(۳) تھانوی صاحب کی اس عبارت سے لازم آتا ہے کہ آپ کو عالم بھی نہ کہا جائے کیونکہ کل علم آپ کو حاصل نہیں اور بعض میں آپ کی تخصیص نہیں۔

(۴) عام لوگوں کو جن بعض غیوب کا علم ہوتا ہے (جیسے جنت' دوزخ وغیرہ) یہ بعض قلیل ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جن بعض غیوب کا علم ہے وہ بعض کثیر ہے' آپ کے علم کے سامنے تمام مخلوق کا علم ایسا ہے جیسے قطرہ سمندر کے سامنے ہو اور اللہ کے مقابلہ میں آپ کے علم کی وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ اور سمندر میں ہے کیونکہ قطرہ اور سمندر میں محدود کی نسبت محدود کی طرف ہے اور آپ کے اور اللہ کے علم میں محدود کی نسبت لامحدود کی طرف ہے اور بعض قلیل کی بناء پر وصف کا اطلاق نہیں ہوتا اور بعض کثیر کی بناء پر وصف کا اطلاق ہوتا ہے' مثلاً ہر مسلمان کو دین کے بعض مسائل کا علم ہے' لیکن اس کو عالم نہیں کہتے' اور عالم دین کو عالم کہتے ہیں' حالانکہ اسے بھی کل مسائل کا علم نہیں ہوتا' بعض مسائل ہی کا علم ہوتا ہے لیکن اس

[1] علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ' المفردات ص ۳۴۳ مطبوعہ المکتبۃ المرتضویۃ ایران' ۱۳۴۲ھ

کو چونکہ بعض کثیر کا علم ہوتا ہے اس لیے اس کو عالم کہتے ہیں۔ باقی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عالم الغیب کا اطلاق کرنا ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے' ہر چند کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطاء الٰہی سے غیب کا علم ہے' لیکن چونکہ عرف اور شرع میں عالم الغیب کا لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اس لیے آپ کو عالم الغیب کہنا جائز نہیں ہے' جیسا کہ آپ میں برکت اور بلندی کا معنی پایا جاتا ہے اس کے باوجود محمد تبارک و تعالیٰ کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ عرف اور شرع میں تبارک و تعالیٰ' اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور البتہ ہم تم کو کچھ خوف' بھوک اور (تمہارے) مالوں' جانوں اور پھلوں کے نقصان میں ضرور مبتلا کریں گے۔ (البقرہ: ۱۵۵)

دنیا میں مصائب پیش آنے کی وجوہات

خوف سے مراد دشمنوں کا خوف ہے' بھوک سے مراد قحط ہے' مالوں کے نقصان سے مراد مویشیوں کا مر جانا' حادثاتی طور پر فصلوں کا تباہ ہو جانا اور گاڑیوں کا ٹکراؤ سے برباد ہو جانا ہے' روپے پیسے وغیرہ کا لٹ جانا بھی اس میں شامل ہے' جانوں کے نقصان سے مراد دوستوں اور رشتہ داروں کی موت ہے اور ثمرات کے نقصان سے مراد اولاد کی موت ہے' اولاد پر ثمرات کا اطلاق مجاز مشہور ہے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب کسی بندہ کا بچہ مر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے: تم نے میرے بندہ کے بچہ کی روح قبض کر لی' وہ کہتے ہیں: ہاں! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تم نے میرے بندے کے دل کے ثمرہ پر قبضہ کر لیا' وہ کہتے ہیں: ہاں! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندہ نے (اس پر) کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں: تیری حمد کی اور ''انا لله و انا الیه راجعون'' پڑھا' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندہ کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔

(جامع ترمذی ص ۱۲۶' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

دنیا میں لوگوں کا جو حادثات اور قدرتی آفات سے جانی اور مالی نقصان ہوتا ہے' اس کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے' دوسری قسم مکافات عمل اور کفارہ ذنوب ہے' کسی شخص نے کسی دوسرے شخص کو کسی جانی اور مالی نقصان سے دوچار کیا ہوتا ہے اور وہ شخص اس پر صبر کر لیتا ہے تو اللہ اس کی طرف سے بدلہ لیتا ہے اور اس کو بھی جانی اور مالی نقصان میں مبتلا کر دیتا ہے اور بعض اوقات یہ جانی اور مالی نقصان آدمی کے گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں اور اس کے گناہوں میں تخفیف ہو جاتی ہے یا وہ بالکل گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کو جب بھی کانٹا چبھنے کی یا اس سے بھی کم کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے اور اس کا ایک گناہ مٹا دیتا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کو جب بھی کوئی تھکاوٹ یا جسمانی درد لاحق ہوتا ہے یا کوئی غم پیش آتا ہے یا کوئی بیماری لگتی ہے یا کسی چیز کا اندیشہ اور خوف دامن گیر ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ (جامع ترمذی ص ۱۵۸' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اور مکافات عمل کے نتیجہ میں جو مصائب پیش آتے ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (الشوریٰ: ۳۰)

اور جو مصیبت تمہیں پہنچی تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی اور وہ تمہاری بہت سی خطاؤں کو معاف فرما دیتا ہے O

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان صبر کرنے والوں کو بشارت دیجئے O جن کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور بے شک ہم اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں O (البقرہ: ۱۵۶۔۱۵۵)

صبر کے معانی اور مصیبت پر صبر کرنے کی فضیلت

صبر کے معنی ہیں: نفس کو روکنا اور کسی چیز کو برداشت کرنا' حرام اور فحش کاموں کی ترغیب اور تحریک کے وقت اپنے نفس کو گناہ سے روکنا صبر ہے' فرائض' واجبات اور سنن کی ادائیگی میں مشقت کو برداشت کرنا اور نفس کو آرام طلبی اور عبادت نہ کرنے سے روکنا بھی صبر ہے۔ لوگوں کی اذیت رسانی پر اپنے آپ کو انتقام لینے سے روکنا بھی صبر ہے اور مصیبت پہنچنے پر واویلا کرنے اور شکوہ اور شکایت کرنے سے خود کو روکنا بھی صبر ہے اور اس آیت میں یہی مراد ہے۔

جب انسان کو کوئی مصیبت پہنچے یا اس سے کوئی نعمت چلی جائے تو وہ اس پر غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کے مقابلہ میں لاکھوں نعمتیں اس کو دی ہوئی ہیں اگر یہ ایک نعمت جاتی رہی تو کیا غم ہے اور اس کی دی ہوئی اور لاکھوں نعمتیں موجود ہیں' پھر جب اس نے خود ہی ایک دن اس دنیا سے چلے جانا ہے تو اس ایک نعمت کے چلے جانے سے کیا فرق پڑے گا۔

امام غزالی لکھتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جب میں اپنے بندوں میں سے کسی بندے کے بدن' یا مال یا اولاد میں کوئی مصیبت بھیجتا ہوں' پھر وہ اس پر صبر جمیل کرتا ہے تو میں قیامت کے دن اس کے لیے میزان قائم کرنے یا اس کا نامۂ اعمال کھولنے سے حیا کرتا ہوں۔ (کامل ابن عدی)

نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل نے فرمایا: اے جبرائیل! اس شخص کی کیا جزا ہے جس کی بینائی کو میں سلب کرلوں اور وہ اس پر صبر کرے؟ انہوں نے کہا: اے اللہ! تو پاک ہے' ہمیں صرف اس چیز کا علم ہے جس کا تو نے ہمیں علم عطا فرمایا ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کی جزا میرے گھر میں ہمیشہ رہنا ہے اور میرا دیدار کرنا ہے۔ (صحیح بخاری' معجم اوسط' کامل ابن عدی' ابو یعلیٰ)

امام مالک ''موطا'' میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل فرماتا ہے: جب میں اپنے بندہ کو کسی مصیبت میں مبتلا کروں اور وہ اس پر صبر کرے اور اپنے عیادت کرنے والوں سے میری شکایت نہ کرے تو میں اس کے گوشت کو بہتر گوشت سے اور اس کے خون کو بہتر خون سے بدل دیتا ہوں اور جب میں اس کو صحت مند کرتا ہوں تو اس کا کوئی گناہ نہیں رہتا اور اگر میں اس کو وفات دوں تو وہ میری رحمت کی طرف ہے۔

(احیاء العلوم ج ۴ ص ۱۲۴' مطبوعہ دارالخیر' بیروت' ۱۴۱۳ھ)

''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھنے کی فضیلت

امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کو ایک ایسی چیز دی گئی ہے جو پہلی امتوں میں سے کسی کو نہیں دی گئی' وہ مصیبت کے وقت ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھنا ہے۔

(معجم کبیر ج ۲۱ ص ۲۲ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

امام مسلم روایت کرتے ہیں: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا کہ جب مسلمان پر کوئی مصیبت آئے اور وہ اللہ کے حکم کے مطابق "انا للّٰہ و انا الیہ راجعون" پڑھے اور یہ دعا کرے: اے اللہ! اس مصیبت پر اجر عطا فرما اور مجھے اس کا بہتر بدل عطا فرما' تو اللہ تعالیٰ اس کو اس سے بہتر بدل عطا فرمائے گا' جب ابوسلمہ (حضرت ام سلمہ کے سابق شوہر) فوت ہو گئے تو میں نے سوچا: ابوسلمہ سے بہتر اور کون ہوگا' جن کے گھر نے سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی تھی' بہرحال میں نے یہ دعا پڑھ لی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بدلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میرا عقد کر دیا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۰۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں: امام بزار نے سند ضعیف کے ساتھ اور امام بیہقی نے "شعب الایمان" میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کسی شخص کی رسی ٹوٹ جائے تو وہ "انا للّٰہ و انا الیہ راجعون" پڑھے' کیونکہ یہ بھی مصائب میں سے ہے۔

امام عبد بن حمید اور امام ابن ابی الدنیا نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چراغ بجھ گیا تو آپ نے فرمایا: "انا للّٰہ و انا الیہ راجعون" آپ سے عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! کیا یہ مصیبت ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! ہر وہ چیز جو مومن کو ایذا دے وہ اس کے لیے مصیبت ہے اور اس میں اس کے لیے اجر ہے۔ امام ابن ابی الدنیا اور امام بیہقی حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں: جس شخص میں چار خصلتیں ہوں اللہ تعالیٰ جنت میں اس کا گھر بنا دیتا ہے' جو لا الٰہ الا اللہ سے اپنی (جان اور مال کی) حفاظت کرے' اور جب اس کو مصیبت پہنچے تو "انا للّٰہ و انا الیہ راجعون" پڑھے اور جب اس کو کوئی چیز دی جائے تو الحمد للہ کہے' اور جب وہ کوئی گناہ کرے تو استغفر اللہ کہے۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۱۵۷۔ ۱۵۶' مطبوعہ مکتبہ آیت اللہ العظمٰی' ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے صلوات ہیں اور رحمت ہے' اور یہی لوگ ہدایت پر ثابت قدم ہیں ○ (البقرہ: ۱۵۷)

صلوٰۃ کا معنی اور غیر انبیاء پر صلوٰۃ بھیجنے کی شرعی حیثیت

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

اکثر اہل لغت نے کہا ہے کہ صلوٰۃ کا معنی دعا ہے اور تبریک اور تمجید ہے' جب اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر صلوٰۃ پڑھے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں پر صلوٰۃ پڑھیں تو اس کا معنی ان کو پاک اور صاف کرنا ہے اور جب فرشتے صلوٰۃ پڑھیں تو اس کا معنی دعا اور استغفار ہے۔ (المفردات ص ۲۸۵' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

علامہ آلوسی نے نقل کیا ہے کہ صلوٰۃ کا معنی تعریف اور ثناء کرنا ہے اور تعظیم کرنا ہے۔

(روح المعانی ج ۲ ص ۲۳' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

یعنی اللہ تعالیٰ مصیبت پر صبر کرنے والوں کی تعریف کرتا ہے یا ان کے باطن کو پاک اور صاف کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمانوں پر صلوٰۃ بھیجنا ان کے باطن کو پاک اور صاف کرنے کے معنی میں ہے' اور امام مالک' امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک امت کے لیے غیر نبی پر مستقل صلوٰۃ بھیجنا جائز نہیں ہے' یعنی "اللھم صل علی ابی بکر" کہنا جائز نہیں ہے اور سلام بھیجنا جائز ہے' "السلام علی ابی بکر" کہنا صحیح ہے۔ علامہ خفاجی حنفی نے اس کو بھی مکروہ تنزیہی کہا ہے۔ (نسیم الریاض ج ۳ ص ۵۱۰) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انبیاء کے علاوہ اور کسی پر صلوٰۃ نہ بھیجی جائے۔

(مصنف عبد الرزاق ج ۲ ص ۲۱۶) علامہ نووی نے کہا ہے کہ عرف میں صلوٰۃ کا لفظ انبیاء کے ساتھ خاص ہو چکا ہے اس لیے غیر نبی پر صلوٰۃ نہیں بھیجی جائے گی۔ اس مسئلہ کو ہم نے "شرح صحیح مسلم" ج ۲ ص ۸۷ ۱۰ میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔

مروجہ ماتم کی شرعی حیثیت

اس آیت میں مصیبت کے آنے پر صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور کسی چیز کا امر اس کی ضد کی حرمت کو مستلزم ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت پر ماتم کرنا حرام ہے۔

شیخ کافی کلینی روایت کرتے ہیں:

ابو عبد اللہ علیہ السلام بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مصیبت کے وقت مسلمان کا اپنے ہاتھ کو اپنے زانو پر مارنا اس کے اجر کو ضائع کر دیتا ہے۔ (الفروع من الکافی ج ۳ ص ۲۲۴ مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ تہران ۱۳۹۱ھ)

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: صبر بہ قدر مصیبت نازل کیا جاتا ہے، جس شخص نے مصیبت کے وقت اپنا ہاتھ اپنے زانو پر مارا اس کا عمل ضائع کر دیا جاتا ہے۔ (نہج البلاغہ ص ۱۲۳۹ مطبوعہ انتشارات زرین ایران)

ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ امام حسین نے میدان کربلا میں جانے سے پہلے اپنی بہن حضرت زینب کو یہ وصیت کی:

اے میری معزز بہن! میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ جب میں اہل جفا کی تلوار سے عالم بقا میں رحلت کر جاؤں تو گریبان چاک نہ کرنا، چہرے پر خراشیں نہ ڈالنا اور واویلا نہ کرنا۔ (جلاء العیون ج ۲ ص ۵۵۳ (فارسی) مطبوعہ کتاب فروشے اسلامیہ ایران)

"شرح صحیح مسلم" جلد اول (طبع خامس) میں ہم نے مروجہ ماتم کے حرام ہونے پر بہت دلائل پیش کیے ہیں اور اہل تشیع کے تمام شبہات کا ازالہ کیا ہے۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، سو جس نے بیت اللہ کا حج یا

اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا

عمرہ کیا اس پر ان دونوں کا طواف (سعی) کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے، اور بے شک جس نے خوشی سے کوئی (نفلی) نیکی کی

فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿١٥٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ

تو بے شک اللہ جزا دینے والا خوب جاننے والا ہے ○ بے شک جو لوگ ہمارے نازل کیے ہوئے

الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ

روشن دلائل اور ہدایت کو چھپاتے ہیں جب کہ ہم ان کو لوگوں کے لیے کتاب میں بیان کر چکے ہیں، تو یہی وہ

يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا

لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت فرماتا ہے اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں ○ البتہ جن لوگوں نے توبہ کی اور اصلاح کر لی

وَبَيَّنُوا فَأُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

اور (چھپائی ہوئی باتوں کو) ظاہر کر دیا تو میں ان لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہوں اور میں توبہ قبول فرمانے والا بڑا مہربان ہوں O

ربط آیات

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ پر اعتراضات کے جواب دیئے اور مخالفین کے اعتراضات اور طعنوں کی وجہ سے مسلمانوں کو جو اذیت پہنچی تھی اس پر صبر کرنے کا حکم دیا اور فرمایا تھا کہ صبر کرنے والوں پر اللہ کی رحمت ہے اور وہ ہدایت پر ہیں' اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حج اور عمرہ کا ذکر شروع کیا' کیونکہ اس سے پہلے نمازوں میں کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم تھا اور اب حج اور عمرہ کے ذریعہ کعبہ کی زیارت اور اس کے گرد طواف کا حکم دیا' نیز اس سے پہلے صبر کا حکم تھا اور صبر کرنے میں نفس کو مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور اب حج اور عمرہ کا ذکر کیا' ان میں جسم کو مشقت اٹھانی پڑتی ہے' نیز اس سے چند آیات پہلے بناء کعبہ کا ذکر تھا اور یہ فرمایا تھا کہ ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو یہ حکم دیا تھا کہ میرے بیت (کعبہ) کو طواف کرنے والوں' اعتکاف کرنے والوں اور رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو' اور بناء کعبہ کا سب سے عظیم مقصد حج اور عمرہ ہے اور طواف کے ذکر میں ان کی طرف اشارہ ہے' سو یہاں صراحۃً حج اور عمرہ کا ذکر فرمایا' نیز اس سے پہلے حضرت ابراہیم کی اس دعا کا ذکر تھا کہ ہمیں مناسک (احکام حج) بتا تو اب حج اور عمرہ کے احکام میں سے صفا اور مروہ کی سعی کا حکم بیان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔

صفا اور مروہ کے معنی

صفا اور مروہ کعبہ کے سامنے دو پہاڑیاں ہیں۔ صفا کے معنی ہیں: چکنا پتھر' اور مروہ کے معنی ہیں: سفید اور ملائم پتھر' ایک قول یہ ہے کہ صفا کے معنی ہیں: صاف اور خالص' اور مروہ کے معنی ہیں: چھوٹے چھوٹے پتھر۔ ایک قول یہ ہے کہ صفا کو اس لیے صفا کہتے ہیں کہ اس پر حضرت آدم صفی اللہ بیٹھے تھے اور مروہ کو اس لیے مروہ کہتے ہیں اس پر ان کی امراۃ (بیوی) بیٹھی تھیں۔

''شعائر'' ''شعیرۃ'' کی جمع ہے۔ ''شعیرۃ'' کا معنی علامت ہے اور ''شعائر اللّٰہ'' کا معنی ہے: اللہ کے دین کی علامتیں اور خصوصیات' اور وہ اعمال جن کو اللہ نے عبادت اور دین کی علامتیں قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو جس نے بیت اللہ کا حج یا عمرہ کیا اس پر ان دونوں کا طواف (سعی) کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (البقرہ: ۱۵۸)

حج اور عمرہ کا لغوی اور شرعی معنی

حج کا لغوی معنی ہے: قصد' اور اس کا شرعی معنی ہے: بیت اللہ کی زیارت کا قصد کرنا۔ زندگی میں ایک بار حج کرنا فرض ہے۔ اسلام' حریت' عقل' بلوغ اور حج کی استطاعت حج کی فرضیت کے لیے شرط ہیں۔ وقوف عرفات اور طواف زیارت حج میں فرض ہیں۔ حج کے واجبات یہ ہیں: میقات یا اس سے پہلے احرام باندھنا' غروب آفتاب تک میدان عرفات میں رہنا' وقوف مزدلفہ' صفا اور مروہ میں دوڑنا' شیطان کو منیٰ میں کنکریاں مارنا' سر منڈوانا یا بال کٹانا اور غیر ملکی کے لیے طواف وداع کرنا۔ حج میں یہ کام ممنوع ہیں: عمل زوجیت' بال کاٹنا' ناخن کاٹنا' خوشبو لگانا' سر اور چہرہ ڈھانپنا' سلا ہوا کپڑا پہننا' کسی دوسرے محرم کا سر مونڈنا' حل اور حرم میں شکار کے درپے ہونا۔ (فتح القدیر ج ۲ ص ۳۲۱۔ ۳۲۰' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

علامہ شرنبلالی نے لکھا ہے کہ حدیث صحیح میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یوم عرفہ افضل الایام ہے اور

جب یہ دن جمعہ کا ہو تو یہ ستر حجوں سے افضل ہے۔ (مراقی الفلاح ص ۴۳۵ مطبوعہ مطبع مصطفی البابی واولادہ مصر ۱۳۵۶ھ)

علامہ زبیدی لکھتے ہیں: اس حدیث کو رزین بن معاویہ العبدری نے ''تجرید الصحاح'' میں طلحہ بن عبید اللہ کریز سے روایت کیا ہے اور اس پر موطا کی علامت ہے لیکن یہ حدیث یحییٰ بن یحییٰ کی موطا میں نہیں ہے کسی اور موطا میں ہے۔

(اتحاف السادۃ المتقین ج ۴ ص ۲۷۴ مطبوعہ مطبع میمنہ مصر ۱۳۱۱ھ)

میں نے ''شرح صحیح مسلم'' جلد ثالث میں بڑی تفصیل اور تحقیق سے لکھا ہے کہ جمعہ کے دن اگر حج ہو تو اس کا ثواب ستر سے زیادہ ہوتا ہے اور یہ حج اکبر ہے۔ کتاب الحج کے آخر میں' میں نے دعا کی: اے اللہ! مجھ کو بھی حج اور عمرہ کی سعادت عطا فرما۔ یہ دعا ۱۹ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ میں کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے تین سال بعد مجھے عمرہ کی سعادت عطا کی اور ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ کو بروز جمعہ میں نے عمرہ کیا اور اس کے تین سال بعد ۱۴۱۴ھ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے حج کی نعمت عطا کی اور یہ حج بھی جمعہ کے روز تھا اور حج اکبر تھا۔ الہ العالمین! جس طرح آپ نے میری یہ دعا قبول فرمائی ہے میری باقی دعائیں بھی قبول فرمانا۔

علامہ شرنبلالی لکھتے ہیں: عمرہ کا لغوی معنی ہے: زیارت اور اس کا شرعی معنی ہے: بیت اللہ کی زیارت کرنا' عمرہ کرنا سنت ہے۔ اس میں میقات سے احرام باندھنا' کعبہ کا طواف کرنا' صفا اور مروہ میں سعی کرنا اور حلق یا قصر کرنا واجب ہے اور احرام باندھنا شرط ہے اور طواف کا اکثر حصہ فرض ہے۔ (مراقی الفلاح ص ۴۳۵ مطبوعہ مطبع مصطفی البابی واولادہ مصر ۱۳۱۱ھ)

شوال میں عمرہ کرنے والے پر استطاعت کے بغیر حج فرض ہونے کی تحقیق

ہمارے زمانہ میں یہ مشہور ہے کہ جس شخص نے پہلے حج نہ کیا ہو وہ اگر ماہ شوال میں عمرہ کرے تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے' خواہ اس کے پاس ایام حج تک وہاں ٹھہرنے اور کھانے پینے کی استطاعت نہ ہو اور خواہ اس کے پاس وہاں ٹھہرنے کے لیے سعودی عرب کا ویزا نہ ہو' اگر وہ حج کیے بغیر واپس آ گیا تو اس کے ذمہ حج فرض ہوگا' اس پر لازم ہے کہ وہ کسی سے قرض لے کر یا کسی بھی طرح حج کرے اگر اس نے حج نہیں کیا اور مر گیا تو گنہ گار ہوگا۔

یہ فتویٰ قرآن' حدیث اور فقہ کے صراحۃً خلاف ہے' قرآن مجید میں ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ (آل عمران: ۹۷) اور لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ اس کے گھر کا حج کریں جو اس کے راستہ کی استطاعت رکھتے ہوں۔

اس آیت سے واضح ہو گیا کہ استطاعت کے بغیر حج فرض نہیں ہوتا' استطاعت کی تفسیر میں صدر الشریعت مولانا امجد علی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

سفر خرچ اور سواری پر قادر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ چیزیں اس کی حاجت سے فاضل ہوں' یعنی مکان' لباس' خادم اور سواری کا جانور اور پیشہ کے اوزار اور خانہ داری کے سامان اور دین (قرض) سے اتنا زائد ہو کہ سواری پر مکہ معظمہ جائے اور وہاں سے سواری پر واپس آئے اور جانے سے واپسی تک عیال کا نفقہ اور مکان کی مرمت کے لیے کافی مال چھوڑ جائے اور جانے آنے میں اپنے نفقہ اور گھر اہل وعیال کے نفقہ میں قدر متوسط کا اعتبار ہے نہ کمی نہ اسراف۔ عیال سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا نفقہ اس پر واجب ہے۔ (درمختار' عالمگیری) (بہار شریعت ج ۲ ص ۱۲۔ ۱۱ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز' کراچی)

اس عبارت سے واضح ہو گیا کہ شوال میں عمرہ کرنے والے جس شخص کے پاس حج کرنے تک مکہ مکرمہ میں ٹھہرنے اور

طعام کی استطاعت نہیں ہے اس پر حج فرض نہیں ہے۔

امام دارمی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو حج کرنے سے کوئی ظاہری حاجت (طعام' قیام اور سفر خرچ کی کمی) مانع نہ ہوئی نہ ظالم بادشاہ نہ کوئی ایسی بیماری جو حج سے مانع ہو' وہ شخص اس حال میں مر جائے کہ اس نے حج نہ کیا ہو تو خواہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔ (سنن دارمی ج ۱ ص ۳۶۰ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

اس حدیث کو حافظ منذری [1] اور صدر الشریعت [2] نے بھی ذکر کیا ہے۔

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ ظالم بادشاہ کے منع کرنے سے بھی حج فرض نہیں ہوتا اور جو شخص شوال میں واپسی کا ویزا لے کر عمرہ کرنے گیا ہے اس کو سعودی حکام مکہ میں قیام کرنے سے منع کرتے ہیں' وہ لوگوں کی تلاشی لیتے رہتے ہیں اور جو پکڑا جائے اس کو پہلے گرفتار کر کے سزا دیتے ہیں' پھر واپس اس کے ملک بھیج دیتے ہیں' اس لیے شوال میں عمرہ کرنے والے پر حج کو فرض کہنا اس حدیث کے بھی خلاف ہے' نیز جو نادار آدمی کسی کی طرف سے حج بدل کرتا ہے وہ حج کے ایام میں مکہ مکرمہ پہنچ جاتا ہے' اگر صرف حج کے ایام میں مکہ پہنچ جانے سے حج فرض ہو جاتا ہے تو حج بدل کرنے والے نادار پر بھی حج فرض ہونا چاہیے' حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے' نیز شوال حج کا مہینہ ہے اور فقہاء نے لکھا ہے کہ حج کے مہینوں میں صرف عمرہ کرنا جائز ہے' ''عالم گیری'' میں لکھا ہے:

المفرد بالعمرة يحرم للعمرة من الميقات او قبل الميقات فى اشهر الحج او فى غير اشهر الحج. (عالم گیری ج ۱ ص ۲۳۷ 'مطبوعہ مطبع امیریہ کبریٰ' بولاق' مصر' ۱۳۱۰ھ)	صرف عمرہ کرنے والا میقات سے عمرہ کا احرام باندھے یا میقات سے پہلے' حج کے مہینوں میں یا حج کے مہینوں کے علاوہ۔

اور اس جگہ یہ نہیں لکھا کہ جو شخص حج کے مہینوں میں صرف عمرہ کرے اس پر حج لازم ہو جاتا ہے حالانکہ موضع البیان میں بیان کرنا لازم ہوتا ہے۔ میں نے اس مسئلہ میں بعض علماء کا فتویٰ دیکھا' انہوں نے شوال میں عمرہ کرنے پر حج فرض ہونے کے متعلق ''عالم گیری'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مکہ مکرمہ اور اس کے گرد رہنے والوں پر حج فرض ہو جاتا ہے' خواہ ان کو سواری پر قدرت نہ ہو' بہ شرطیکہ وہ خود چل سکتے ہوں۔ اول تو ہمارا کلام اس شخص کے بارے میں ہے جو یہاں سے عمرہ کے لیے جائے کیونکہ حج کرنے تک رہائش اور کھانے کی استطاعت اسی سے متعلق ہے' مکہ میں رہنے والوں کے لیے رہائش کی استطاعت کا مسئلہ نہیں ہے' ثانیاً انہوں نے فتویٰ میں ''عالم گیری'' کی آدھی عبارت نقل کی ہے' ''عالم گیری'' کی پوری عبارت کا ترجمہ اس طرح ہے:

''ینابیع'' میں مذکور ہے: اہل مکہ اور تین دن کی مسافت سے کم اس کے گرد رہنے والوں پر حج کرنا واجب ہے جب کہ وہ چلنے پر قوت رکھتے ہوں' خواہ ان کو سواری پر قدرت نہ ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ ان کے پاس دستور کے مطابق طعام کی اتنی مقدار ہو جو ان کے اہل وعیال کے لیے واپس آنے تک کے لیے کافی ہو' اسی طرح ''السراج الوھاج'' میں ہے۔

(عالم گیری ج ۱ ص ۲۱۷ 'مطبوعہ مطبع امیریہ کبریٰ' بولاق' مصر' ۱۳۱۰ھ)

---

[1] حافظ زکی الدین عبد العظیم بن عبد القوی المنذری المتوفی ۶۵۶ ھ' الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۲۱۱ 'مطبوعہ دار الحدیث' قاہرہ' ۱۴۰۷ھ

[2] مولانا مولوی حکیم محمد امجد علی متوفی ۱۳۷۶ھ' بہار شریعت ج ۶ ص ۹ 'مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز' کراچی

غور فرمائیے! جب اہل مکہ اور اس کے گرد رہنے والوں پر بھی واپس آنے تک طعام کی استطاعت کے بغیر حج فرض نہیں ہے تو دور دراز کے علاقوں سے مکہ مکرمہ پہنچنے والوں پر رہائش اور طعام کی استطاعت کے بغیر حج کیسے فرض ہوگا۔

اس فتوٰی میں دوسری دلیل یہ لکھی ہے کہ اگر کسی شخص پر استطاعت کی وجہ سے حج فرض تھا اور اس نے حج نہیں کیا' حتیٰ کہ اس کا مال تلف ہوگیا تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ قرض لے کر حج کرے' خواہ وہ وفات تک اس قرض کی ادائیگی پر قادر نہ ہو' اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قرض کے ادا نہ کرنے کی وجہ سے اس سے مواخذہ نہیں فرمائے گا' جب کہ اس کی نیت یہ ہو کہ وہ قادر ہونے پر اس قرض کو ادا کر دے گا۔ (درمختار ج ۲ ص ۱۴۰)

یہ عبارت ہمارے بحث سے خارج ہے کیونکہ یہ عبارت اس شخص کے متعلق ہے جس پر مالی استطاعت کی وجہ سے حج فرض ہو چکا ہو اور اس نے حج نہ کیا ہو اور پھر اس کا مال تلف ہو گیا ہو اور ہماری گفتگو اس شخص کے بارے میں ہے جس کے پاس حج کر کے واپس آنے تک رہائش اور طعام کے لیے اپنے اور اپنے عیال کا خرچ نہیں ہے' سو ظاہر ہے اس پر حج فرض ہوا ہی نہیں' نیز علامہ شامی نے لکھا ہے کہ جس پر حج فرض تھا اس نے حج نہیں کیا اور اس کا مال تلف ہو گیا' اس کے لیے قرض لینا اس وقت جائز ہے جب کہ اس کا غالب گمان یہ ہے کہ وہ اپنی وفات سے پہلے اس قرض کو ادا کر دے گا اور اگر اس کا غالب گمان یہ ہو کہ وہ اپنی وفات سے پہلے اس قرض کو ادا نہیں کر سکے گا تو اس کے لیے افضل قرض نہ لینا ہے۔

(ردالمحتار ج ۲ ص ۱۴۱' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ جو لوگ شوال میں عمرہ کرنے والے پر بغیر استطاعت کے حج کرنے کو فرض کہتے ہیں ان کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو جس نے بیت اللہ کا حج یا عمرہ کیا' اس پر ان دونوں کا طواف (سعی) کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ (البقرہ: ۱۵۸)

یہ فرمانے کی وجہ کہ صفا اور مروہ میں سعی گناہ نہیں ہے

صفا اور مروہ میں طواف کو مسلمان دو وجہوں سے گناہ سمجھتے تھے' ایک وجہ یہ تھی کہ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ بتوں کی عبادت اور ان کی تعظیم کے لیے صفا اور مروہ میں طواف کرتے تھے' اس لیے اسلام لانے کے بعد انہوں نے اس کو عمل جاہلیت کی بناء پر گناہ سمجھا اور بعض لوگ زمانۂ جاہلیت میں صفا اور مروہ میں طواف کو گناہ سمجھتے تھے تو انہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد ان میں طواف کرنے کو گناہ سمجھا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

امام ابن جریر روایت کرتے ہیں:

شعبی بیان کرتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں صفا پر اساف نام کا ایک بت رکھا ہوا تھا اور مروہ پر نائلہ نام کا ایک بت رکھا ہوا تھا' اہل جاہلیت جب بیت اللہ کا طواف کرتے تو ان بتوں کو چھوتے تھے' جب اسلام کا ظہور ہوا اور بت توڑ دیئے گئے تو مسلمانوں نے کہا: صفا اور مروہ میں تو ان بتوں کی وجہ سے سعی کی جاتی تھی اور ان میں طواف کرنا شعائر اسلام سے نہیں ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۲۸' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

حافظ سیوطی نے اس حدیث کو سعید بن منصور' عبد بن حمید' ابن جریر اور ابن منذر کے حوالوں سے بیان کیا ہے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۱۶۰' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

عروہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے: سو جس نے بیت اللہ کا حج یا عمرہ کیا اس پر ان دونوں کی سعی کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے (ان کا مطلب تھا: یہ سعی واجب نہیں ہے) سو بہ خدا! اگر کوئی شخص صفا اور مروہ میں سعی نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا! حضرت عائشہ نے فرمایا: اے بھتیجے! تم نے غلط کہا: جس طرح تم نے اس آیت کی تاویل کی ہے اگر اسی طرح ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرماتا: جو ان کے درمیان سعی نہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں ہے اور اس طرح فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ آیت انصار کے متعلق نازل ہوئی ہے وہ اسلام سے پہلے منات (ایک بت) کے لیے احرام باندھتے تھے جس کی وہ مشلل کے پاس عبادت کرتے تھے تو جو شخص احرام باندھتا وہ صفا اور مروہ کے درمیان طواف کرنے میں گناہ سمجھتا تھا جب وہ اسلام لے آئے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق سوال کیا انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ہم صفا اور مروہ کے طواف میں گناہ سمجھتے تھے تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: سو جس نے بیت اللہ کا حج یا عمرہ کیا اس پر ان دونوں کی سعی کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے حضرت عائشہ نے فرمایا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طواف کو مقرر کیا ہے اور کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ان کے درمیان طواف کرنے کو ترک کردے عروہ نے کہا: بلاشک وشبہ یہ علم کی بات ہے میں نے اس سے پہلے اس کو نہیں سنا اور حضرت عائشہ کے بیان کرنے سے پہلے میں نے لوگوں سے یہ سنا تھا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ منات کے لیے احرام باندھتے تھے اور وہ سب لوگ صفا اور مروہ میں طواف کرتے تھے اور جب اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا ذکر فرمایا اور قرآن میں صفا اور مروہ کے درمیان طواف کا ذکر نہیں فرمایا تو صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم صفا اور مروہ میں طواف کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا حکم نازل کیا ہے اور صفا کا ذکر نہیں کیا' آیا اگر ہم صفا اور مروہ میں طواف کرلیں تو کوئی حرج ہے؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: جس نے بیت اللہ کا حج یا عمرہ کیا اس پر ان دونوں کا طواف کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ ابوبکر بن عبد الرحمان (حدیث کے راوی) نے کہا: سنو! یہ آیت دونوں فریقوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو لوگ زمانہ جاہلیت میں صفا اور مروہ کے طواف کو گناہ سمجھتے تھے اور جو لوگ زمانہ جاہلیت میں ان کا طواف کرتے تھے' پھر ظہور اسلام کے بعد انہوں نے ان کے طواف کو گناہ سمجھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا ذکر فرمایا اور صفا اور مروہ کے طواف کا ذکر نہیں فرمایا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۲۳۔ ۲۲۲' ج ۲ ص ۶۴۶۔ ۶۴۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام ترمذی[1] اور امام نسائی[2] نے بھی روایت کیا ہے۔

ان احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ جو کام اصل میں عبادت ہو اور شریعت میں صحیح ہو وہ اپنی اصل پر صحیح رہتا ہے' خواہ جاہل اور بد مذہب بعد میں اس کام کو کسی غلط نیت اور فاسد عقیدہ سے کرنے لگیں' جس طرح سیاہ عمامہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے' بعد میں روافض اور شیعہ نے سوگ کی نیت سے سیاہ عمامہ باندھنا شروع کردیا تو ان کے اس عمل کا اعتبار نہیں ہوگا اور سیاہ عمامہ باندھنا اپنی اصل کے اعتبار سے مسنون رہے گا۔

صفا اور مروہ کے درمیان سعی میں مذاہب ائمہ

صفا اور مروہ کے درمیان سات بار سعی کرنا واجب ہے' یہ سعی صفا سے شروع ہو کر مروہ پر ختم ہوگی' ائمہ ثلاثہ اور امام شافعی کا صحیح مذہب یہ ہے کہ صفا سے مروہ تک ایک طواف ہے' علامہ نووی نے لکھا ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ امام شافعی کے نزدیک صفا

1. امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی ص ۲۲۲۔ ۲۲۱' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی
2. امام احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ' سنن کبریٰ ج ۲ ص ۲۹۳' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۱ھ

سے مروہ پھر مروہ سے صفا تک سعی ایک طواف ہے' یہ غلط ہے۔ امام شافعی کا مذہب جمہور کے مطابق ہے۔

(شرح المہذب ج ۸ ص ۷۲۔۷۱ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

صفا اور مروہ میں سعی کے متعلق امام احمد کے دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہ سعی رکن ہے' اس کے بغیر حج تمام نہیں ہوتا کیونکہ امام مسلم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ جس نے صفا اور مروہ میں طواف نہیں کیا اللہ نے اس کا حج تمام نہیں کیا' سعی کرنا حج اور عمرہ دونوں میں رکن ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ سعی سنت ہے کیونکہ قرآن مجید میں ہے کہ اس سعی میں کوئی گناہ نہیں ہے' اس سے معلوم ہوا کہ یہ مباح ہے' لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو شعائر اللہ میں داخل کیا ہے اس لیے اس کا مرتبہ سنت سے کم نہیں ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۱۹۴ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں: حج میں صفا اور مروہ میں سعی کرنا رکن ہے' دم دینے سے اس کی تلافی نہیں ہوگی' اور محرم اس کے بغیر حلال نہیں ہوگا۔ (روضۃ الطالبین ج ۲ ص ۳۷۲ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ ابوالعباس رملی شافعی نے لکھا ہے کہ صفا اور مروہ کا طواف کرنا عمرہ کا بھی رکن ہے۔

(نہایۃ المحتاج ج ۳ ص ۳۲۲ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۴ھ)

علامہ حطاب مالکی لکھتے ہیں: حج اور عمرہ دونوں میں صفا اور مروہ میں سعی کرنا رکن ہے۔

(مواہب الجلیل ج ۳ ص ۸۴ 'مطبوعہ مکتبۃ النجاح' لیبیا)

علامہ المرغینانی حنفی لکھتے ہیں کہ صفا اور مروہ میں طواف کرنا (حج اور عمرہ میں) واجب ہے' رکن نہیں ہے' امام شافعی یہ کہتے ہیں کہ یہ رکن ہے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی فرض کر دی' پس سعی کرو۔ (مسند احمد ج ۶ ص ۴۲۱) ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہے کہ صفا اور مروہ میں طواف کرنا گناہ نہیں ہے اور یہ مباح ہونے کو مستلزم ہے اور فرضیت کے منافی ہے' نیز ہم نے رکن سے وجوب کی طرف اس لیے عدول کیا ہے کہ یہ حدیث خبر واحد ہے اور رکنیت دلیل قطعی سے ثابت ہوتی ہے۔ (ہدایہ اولین ص ۲۴۳ 'مطبوعہ شرکت علمیہ' ملتان)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک جس نے خوشی سے کوئی (نفلی) نیکی کی تو بے شک اللہ جزا دینے والا اور خوب جاننے والا ہے O (البقرہ: ۱۵۸)

امام رازی[1]' علامہ قرطبی[2]' علامہ ابوالحیان اندلسی[3] اور علامہ ماوردی[4] وغیرہ نے کہا ہے کہ اس نیکی سے مراد نفلی نیکی ہے' کیونکہ قرآن اور حدیث کے اطلاقات میں تطوع کا نفل پر اطلاق ہوتا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے فرض کی ادائیگی کے بعد نفلی طور پر حج یا عمرہ کیا' اور علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ اس سے مراد عام نیکی ہے خواہ فرض ہو یا نفل۔

(روح المعانی ج ۲ ص ۲۹ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ شاکر علیم ہے۔ (البقرہ: ۱۵۸)

اللہ تعالیٰ لوگوں کے قصد اور نیت کو جانتا ہے اور ان کی نیکیوں کی جزا دیتا ہے یا اللہ تعالیٰ قلیل نیکی کی بھی جزاء دیتا ہے اور

---

[1] امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ' تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۵ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ

[2] علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ' الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۸۱ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران

[3] علامہ ابوالحیان محمد بن یوسف غرناطی متوفی ۷۵۴ھ' البحر المحیط ج ۲ ص ۶۷ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ

[4] علامہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی البصری المتوفی ۴۵۰ھ' النکت والعیون ج ۱ ص ۲۱۳ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت

اس کو ثواب کا علم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک جو لوگ ہمارے نازل کیے ہوئے روشن دلائل اور ہدایت کو چھپاتے ہیں جب کہ ہم ان کو لوگوں کے لیے کتاب میں بیان کر چکے ہیں' تو یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت فرماتا ہے اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں O (البقرہ: ۱۵۹)

علم چھپانے پر وعید کا بیان

ان دلائل اور ہدایت کو چھپانے والوں سے مراد یہود اور نصاریٰ کے علماء ہیں کیونکہ وہ لوگوں سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کے دین کو چھپاتے تھے اور ان کی کتابوں میں آپ کی بعثت اور آپ کی صفات کے متعلق جو کچھ لکھا ہوا تھا اس کو بیان نہیں کرتے تھے' حالانکہ تورات اور انجیل میں یہ سب لکھا ہوا تھا۔

امام ابوجعفر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل' حضرت سعد بن معاذ اور حضرت خارجہ بن زید رضی اللہ عنہم نے علماء یہود سے پوچھا کہ تورات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا لکھا ہوا ہے تو انہوں نے ان سے چھپایا اور ان کو بتانے سے انکار کر دیا' اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۳۲' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ ماوردی نے لکھا ہے کہ یہ چھپانے والے کعب بن اشرف' کعب بن اسد' ابن صوریا اور زید بن تابوت نام کے رؤساء یہود تھے۔ (النکت والعیون ج ۱ ص ۲۱۴' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

ہر چند کہ اس آیت کا شان نزول خاص ہے لیکن اس کا حکم عام ہے اور جو شخص بھی اللہ کے دین میں سے کسی چیز کے علم کو چھپائے وہ اس آیت کی وعید میں داخل ہے اور لعنت کرنے والوں کی لعنت کا مصداق ہے' کیونکہ صحابہ کرام نے اس آیت سے عموم ہی سمجھا تھا' امام ابن جریر روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اگر کتاب اللہ میں یہ آیت نہ ہوتی تو میں تم کو یہ حدیث بیان نہ کرتا' پھر انہوں نے یہ آیت تلاوت کی۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۳۳' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص سے کسی چیز کے علم کے متعلق سوال کیا گیا اور اس نے اس کو چھپایا' قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۹' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

علامہ ابونصر حمیدی نے کہا: جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے اس کو پوری کوشش اور جدوجہد سے علم کو پھیلانا چاہیے' خواہ اس سلسلہ میں اس کو مشقت برداشت کرنی پڑے اور اپنا پیسہ خرچ کرنا پڑے' ورنہ علم مٹ جائے گا۔

لعنت کرنے والوں سے مراد فرشتے ہیں یا جن اور انس میں سے مؤمنین ہیں یا جن اور انس کے ماسوا حیوانات اور حشرات الارض ہیں' امام ابن جریر روایت کرتے ہیں: مجاہد بیان کرتے ہیں کہ حیوانات اور حشرات الارض ان پر لعنت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بنو آدم کے گناہوں کی وجہ سے ہم بارش سے محروم ہو گئے۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۳۳' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

نااہل لوگوں کے سامنے علم اور حکمت کو بیان کرنے کی ممانعت

امام بخاری بیان کرتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگوں کے سامنے ایسی حدیثیں بیان کرو جن کو وہ پہچانتے ہوں' کیا تم اس کو پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی جائے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۴ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ دو قسم کے علم محفوظ ہیں' ایک علم کو میں نے لوگوں میں پھیلا دیا' اور اگر دوسرے علم کو پھیلایا تو یہ حلقوم کاٹ دیا جائے گا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۴ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب تم لوگوں کے سامنے ایسی حدیث بیان کرو گے جو ان کی عقلوں کے مطابق نہیں ہوگی تو وہ بعض لوگوں کے لیے فتنہ بن جائے گی۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی)

امام دارمی روایت کرتے ہیں:

کثیر بن مرہ نے کہا: بے وقوف لوگوں کے سامنے حکمت کی باتیں نہ بیان کرو وہ تمہاری تکذیب کریں گے۔

(سنن دارمی ج ۱ ص ۸۸ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں چاہوں تو تمہارے سامنے ایک ہزار ایسے کلمات بیان کروں جن کو سن کر تم مجھ سے بغض رکھو' مجھ سے دور بھاگو اور میری تکذیب کرو۔ (معجم کبیر ج ۳ ص ۱۹۳ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

حافظ الہیثمی بیان کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص لوگوں کے ہر استفتاء (سوال) کا جواب دیتا ہے وہ مجنون ہے۔ حافظ الہیثمی نے ان دونوں حدیثوں کو امام طبرانی کی "معجم کبیر" کے حوالہ سے درج کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ دونوں حدیثوں کی سندوں میں ثقہ راوی ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۸۳ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' ۱۴۰۲ھ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

کافر کو قرآن مجید کی تعلیم دینا جائز نہیں ہے حتیٰ کہ وہ مسلمان ہو جائے' اسی طرح جو بدعتی اہل حق سے مناظرے کرتا ہو اس کو تعلیم دینا جائز نہیں ہے اور کسی شخص کو ایسی حجت کی تلقین کرنا جائز نہیں جس سے وہ کسی کا مال ہڑپ کرنے' اور نہ حاکم کو ایسی تاویل سکھانا جائز ہے جس سے وہ عوام کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے اور نہ عام لوگوں کو ایسی شرعی رخصتیں اور شرعی حیلے بتانا جائز ہیں جن سے کام لے کر وہ حرام کام کریں اور واجبات کو ترک کریں' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل لوگوں کے سامنے حکمت کے بیان سے نہ رکو ورنہ تم ان پر ظلم کرو گے اور نا اہل لوگوں کے سامنے حکمت کو بیان نہ کرو ورنہ تم اس حکمت پر ظلم کرو گے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۸۵ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ھ)

لعنت کا لغوی اور شرعی معنی اور اس کے شرعی احکام

لغت میں لعنت کا معنی ہے: اللہ کی رحمت سے دور کرنا' لعنت کی تین قسمیں ہیں:

(۱) شریعت میں جس عام وصف کے ساتھ لعنت کی گئی ہو اس وصف عام کے ساتھ لعنت کرنا' جیسے قرآن مجید میں ہے: کافروں پر اللہ کی لعنت ہو' فاسقوں پر اللہ کی لعنت ہو' جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو' اور "صحیح بخاری" میں ہے: جو مرد عورتوں کی مشابہت کریں اور جو عورتیں مردوں کی مشابہت کریں ان پر اللہ کی لعنت ہو۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۷۴ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

(۲) جس شخص کی موت کفر پر دلیل قطعی سے ثابت ہو اس پر لعنت کرنا جائز ہے جیسے ابلیس اور ابولہب پر لعنت کرنا جائز ہے۔

(۳) جو شخص ظاہر حال کے اعتبار سے مومن ہو یا کافر ہو اور اس کا کفر پر مرنا معلوم نہ ہو اس پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کافر کو اسلام کی توفیق دے دے "جامع ترمذی" میں ہے: مومن بہت لعنت کرنے والا نہیں ہوتا[1] نیز اس میں ہے: اللہ کی لعنت کے ساتھ لعنت نہ کرو[2] اور "سنن ابوداؤد" میں ہے: جس نے اس شخص پر لعنت کی جو لعنت کا مستحق نہیں ہے تو وہ لعنت' لعنت کرنے والے پر لوٹے گی۔[3] لعنت کافروں پر بھی کی گئی ہے اور گناہ کبیرہ کرنے والے مسلمانوں پر بھی وصف عام کے ساتھ لعنت کی گئی ہے جیسے جھوٹوں پر لعنت ہو' کافروں پر جو لعنت ہے اس کا معنی ہے: اللہ کی رحمت سے بالکلیہ دور کر دینا اور گناہ کبیرہ کرنے والے مسلمانوں پر جو لعنت ہے اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کے قرب خاص' اس کی خصوصی رحمت اور رضا سے دور کر دینا۔

بعض اسلاف نے یہ کہا ہے کہ جو شخص فوت ہو گیا ہو اس پر لعنت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے' اور جمہور علماء نے کہا ہے کہ بغیر تعیین کے تمام کافروں پر لعنت کرنا جائز ہے اور بعض نے اس کو واجب کہا ہے اور جمہور علماء نے کہا ہے کہ کسی معین کافر پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معین کافروں پر لعنت فرمائی ہے۔ امام نسائی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز میں رکوع کے بعد کھڑے ہو کر مسلمانوں کے لیے دعا کرتے اور کفار پر لعنت کرتے' اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ تک رعل' ذکوان اور لحیان پر لعنت کی اور حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد کھڑے ہو کر منافقوں کا نام لے لے کر فرماتے: اے اللہ! فلاں پر لعنت کر' فلاں پر لعنت کر' پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ۝ (آل عمران: ۱۲۸)

آپ اس میں کسی چیز کے مالک نہیں ہیں یا اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے یا ان کو عذاب دے' بے شک یہ ظالم ہیں۔

(سنن نسائی ج ۱ ص ۱۶۴' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس آیت کی تشریح ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کافروں اور منافقوں کے لیے لعنت فرمائی جن کے متعلق آپ کو وحی سے معلوم تھا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے' پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو لعنت کرنے سے روک دیا کیونکہ بہ ظاہر یہ آپ کی رحمت کے منافی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: البتہ جن لوگوں نے توبہ کی اور اصلاح کر لی اور (چھپائی ہوئی باتوں کو) ظاہر کر دیا تو میں ان لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہوں۔ (البقرہ: ۱۶۰)

توبہ کے قبول ہونے کے لیے گناہ کو ترک کرنے اور اس کی تلافی کرنے کی شرط

یہاں توبہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی آیتوں کو چھپانے والے یہودی کفر کو ترک کر کے اسلام لے آئیں اور اصلاح سے مراد یہ ہے کہ اپنی باطنی اصلاح کر لیں' اور ظاہری اعمال کو درست کر لیں' یا اس سے مراد ہے: اپنی قوم اور اپنے پیروکاروں کو

---

[1] امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی ص ۱۹۶۔ ۱۹۵' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[2] امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی ص ۱۹۶' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[3] امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ' سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۳۱۶' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ

اسلام کی تبلیغ کر کے ان کی اصلاح کریں اور تورات میں حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے متعلق جو لکھا ہوا ہے اس کا بیان کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوا ہے کہ توبہ کے قبول ہونے کی یہ شرط ہے کہ جس برائی سے توبہ کی ہے اس کو ترک کر دیا جائے اور اس برائی کی تلافی کی جائے' کیونکہ یہود کی برائی یہ تھی کہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو چھپاتے تھے' تو ان کی توبہ قبول کرنے کی یہ شرط بیان فرمائی کہ وہ اپنی اصلاح کریں یعنی آپ کی صفات چھپانے کو ترک کر کے اسلام لائیں اور چھپائی ہوئی صفات کو اب لوگوں میں بیان کریں' یہ پچھلی برائی کی تلافی ہے' اس لیے اب کوئی قادیانی مثلاً مسلمان ہو تو اس پر لازم ہے کہ مرزا کے دعویٰ نبوت سے برأت کا بیان کرے اور اس کے کفر کا اقرار کرے اور کوئی عیسائی مسلمان ہو تو حضرت عیسیٰ کے بندہ اور رسول ہونے کا اقرار کرے اور ان کے خدا ہونے کی نفی کرے اور اسی طرح جو مسلمان جس گناہ سے توبہ کرے دوبارہ اس گناہ کا ارتکاب نہ کرے اور اس کی جو تلافی ممکن ہو وہ تلافی کرے اور جو شخص جب کسی گناہ سے توبہ کر لے' پھر اس کو اس گناہ پر ملامت نہیں کرنی چاہیے۔

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص گناہ سے توبہ کر لے وہ اس شخص کی مثل ہے جس کا گناہ نہ ہو۔ (سنن ابن ماجہ ص ۳۱۳' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ حالت کفر میں مر گئے' یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں

اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ

کی اور سب لوگوں کی (لعنت) ہے O وہ اس (لعنت) میں ہمیشہ (گرفتار) رہیں گے' ان سے عذاب کم

عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿١٦٢﴾ وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا

کیا جائے گا نہ ان کو مہلت دی جائے گی O اور تمہارا معبود ایک معبود ایک ہے' اس کے سوا

إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٣﴾

کوئی عبادت کا مستحق نہیں وہ نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے O

اللہ تعالیٰ نے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت چھپانے والوں کا ذکر کیا اور ان پر لعنت فرمائی' پھر ان میں سے توبہ کرنے والوں کا ذکر فرمایا اور اب ان کا ذکر فرمایا جنہوں نے اپنے اس کفر سے توبہ نہیں کی' کفر پر اصرار کیا اور کفر پر ہی مر گئے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان پر اللہ کی' فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔

اللہ کی لعنت کا معنی ہے: عذاب کی خبر دینا اور فرشتوں اور انسانوں کی لعنت کا معنی ہے: اللہ کی رحمت سے دور کرنے کی بددعا دینا۔

مردہ کافروں پر لعنت کرنے کا جواز اور زندہ کافروں پر لعنت کرنے کی ممانعت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر لعنت کی ہے جو کفر پر مر گئے اس سے جمہور علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ جس کی موت علی الکفر معلوم نہ ہو اس پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن بعض کفار پر لعنت کی ہے ان کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے معلوم تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اور کفر پر مریں گے۔ علامہ ابوبکر ابن العربی نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! بے شک عمرو بن العاص نے میری ہجو کی ہے اور اس کو علم ہے کہ میں شاعر نہیں ہوں تو اس کی ہجو فرما اور جتنی بار اس نے میری ہجو کی ہے اتنی بار اس پر لعنت فرما۔ اس حدیث کو امام رویانی اور امام ابن عساکر نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں کلام ہے۔

(کنز العمال ج ۱۳ ص ۵۴۸ 'مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ ابوبکر ابن العربی نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ جس شخص کا ظاہر حال کفر ہو اس پر لعنت کرنا جائز ہے جیسے اس سے جہاد کرنا جائز ہے' حالانکہ عمرو بن العاص بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۷۵ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۰۸ھ)

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو اس حدیث کی سند میں کلام ہے' ثانیاً اس حدیث میں یہ ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کا بدلہ لیا حالانکہ حدیث صحیح میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی ذات کا بدلہ نہیں لیا۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اپنے ساتھ کی جانے والی زیادتی کا بدلہ لیتے ہوئے نہیں دیکھا' جب تک اللہ تعالیٰ کی حدود کو نہ توڑا جاتا اور اگر اللہ تعالیٰ کی حدود کو توڑا جاتا تو آپ سے زیادہ غضب میں کوئی نہیں ہوتا تھا۔ (جامع ترمذی ص ۵۹۶ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

البتہ یہ اعتراض صحیح ہے کہ امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ احد کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: اے اللہ! ابوسفیان پر لعنت کر' اے اللہ! حارث بن ہشام پر لعنت کر' اے اللہ! صفوان بن امیہ پر لعنت کر' تب یہ آیت نازل ہوئی:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ۝ (آل عمران: ۱۲۸)

آپ اس میں کسی چیز کے مالک نہیں ہیں' یا اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے' یا ان کو عذاب دے' بے شک یہ ظالم ہیں ۝

سو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی' وہ اسلام لے آئے اور انہوں نے اسلام میں اچھے عمل کیے۔ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ (جامع ترمذی ص ۴۲۷ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ کتب' کراچی)

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ پہلے کا واقعہ ہے' جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کافروں پر لعنت سے روک دیا تو پھر آپ نے ان پر لعنت نہیں کی' اس سے یہ موقف اور مضبوط ہو گیا کہ زندہ کافروں پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے' کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں' اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کافروں پر لعنت کرنے سے منع کر دیا تو کسی اور کے لیے کب جائز ہو سکتا ہے' اور علامہ ابن العربی کا اس کو کافروں سے قتال کرنے پر قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ کافروں سے قتال کرنا تبلیغ اسلام کا سبب ہے جو رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے' اس کے برخلاف زندہ کفار پر لعنت کرنا ان کو رحمت سے دور کرنے کی دعا ہے۔

مسلمانوں پر لعنت کرنے کی ممانعت

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے مسلمان کو لعنت کی تو یہ اس کو قتل کرنے کی مثل ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۹۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عبداللہ نام کا ایک شخص تھا جس کا لقب حمار تھا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسایا کرتا تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو شراب نوشی پر حد لگایا کرتے تھے' ایک دن اس شخص کو حد لگائی جارہی تھی کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص نے کہا: اے اللہ! اس پر لعنت کر' اس کو کتنی بار حد لگائی گئی ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو لعنت نہ کرو' بہ خدا! تم کو معلوم نہیں ہے یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۲ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

البتہ گناہ کبیرہ کرنے والوں پر بلاتعیین نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ چوری کرنے والے پر لعنت کرے' وہ بیضہ (لوہے کا گولہ) چراتا ہے اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے اور وہ (جہاز کی) رسی چراتا ہے اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس آیت میں فرمایا ہے: جو کفر پر مرے اس پر سب انسان لعنت کرتے ہیں' حالانکہ کافر تو اس پر لعنت نہیں کرتے' اس کا جواب یہ ہے کہ کافر اس پر آخرت میں لعنت کریں گے' دوسرا جواب یہ ہے کہ انسان سے مراد کامل انسان ہے اور کامل انسان مسلمان ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان سے نہ عذاب کم کیا جائے گا نہ ان کو مہلت دی جائے گی O (البقرہ: ۱۶۲)

کفار کے عذاب میں تخفیف نہ ہونے پر دلائل اور ابولہب وغیرہ کے عذاب میں تخفیف کے جوابات

نیک اعمال کے مقبول ہونے کی شرط ایمان ہے' ایمان کے بغیر نیکیاں اکارت ہو جاتی ہیں' قرآن مجید میں ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ O (النحل: ۹۷)

مرد یا عورت جس نے کوئی نیک عمل کیا بہ شرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم ضرور اس کو پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھیں گے' اور ان کے اچھے کاموں کا ان کو ضرور اجر دیں گے O

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا O (الفرقان: ۲۳)

اور انہوں نے جو بھی (نیک) کام کیے ہم ان کی طرف قصد فرمائیں گے' پھر ہم انہیں باریک غبار کے بکھرے ہوئے ذرات بنادیں گے O

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۚ (المائدہ: ۵)

اور جس نے ایمان لانے سے انکار کیا تو بے شک اس کا عمل ضائع ہوگیا۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ابن جدعان زمانہ جاہلیت میں رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتا تھا' اور مسکین کو کھانا کھلاتا تھا' آیا اس کو یہ عمل نفع دے گا؟ آپ نے فرمایا: یہ عمل اس کو نفع نہیں دے گا کیونکہ

اس نے ایک دن بھی یہ نہیں کہا: اے اللہ! قیامت کے دن میری خطاؤں کو بخش دینا۔
(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۵ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۷۵ھ)

قرآن مجید کی ان آیات اور اس حدیث صحیح سے یہ ثابت ہے کہ کفار کی نیکیاں ضائع ہو جائیں گی ان پر اجر ملے گا نہ ان کے عذاب میں تخفیف ہوگی لیکن اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ "صحیح بخاری" میں ہے کہ پیر کے دن ابولہب کے عذاب میں تخفیف کی جاتی ہے کیونکہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خوشی میں اپنی باندی ثویبہ کو آزاد کیا تھا[1] اور "صحیح مسلم" میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کو آگ سے کھینچ کر نکال لیا اور صرف اس کے ٹخنوں تک آگ رہ گئی کیونکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کرتے تھے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۵ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۷۵ھ)

علامہ نووی لکھتے ہیں کہ حافظ بیہقی نے "کتاب البعث والنشور" میں کہا ہے کہ کفر کی وجہ سے جو عذاب ہوگا اس میں تخفیف نہیں ہوگی اور باقی جرائم پر جو عذاب ہوگا اس میں نیکیوں کی وجہ سے تخفیف ہو جائے گی۔
(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۵ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

لیکن اس جواب پر یہ اعتراض ہے کہ پھر تو کافر کی نیکیاں ضائع نہ ہوئیں حالانکہ قرآن مجید میں یہ تصریح ہے کہ اس کی نیکیاں ضائع ہو جائیں گی اس لیے صحیح جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور آپ کی وجاہت کی خصوصیت کی وجہ سے ابولہب اور ابو طالب اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں دوسرا جواب یہ ہے کہ کفار کے عذاب میں تخفیف نہ کرنا اللہ تعالیٰ کا عدل ہے اور ابو طالب کے عذاب میں تخفیف کر دینا اللہ تعالیٰ کا فضل ہے تیسرا جواب یہ ہے کہ تخفیف نہ کرنے کا تعلق مدت سے ہے یعنی عذاب کی غیر متناہی مدت میں کمی نہیں ہوگی اور جن کے عذاب میں تخفیف کی ہے ان کا تعلق عذاب کی کیفیت سے ہے یعنی عذاب کی شدت میں کمی کر دی جائے گی چوتھا جواب یہ ہے کہ تخفیف نہ کرنے کا تعلق عذاب آخرت سے ہے اور تخفیف کرنے کا تعلق عذاب برزخ سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور تمہارا معبود ایک معبود ہے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ (البقرہ: ۱۶۳)

واحد کا معنی اور لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کی فضیلت

اس سے پہلی آیات میں حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بیان کیا تھا اور فرمایا تھا کہ یہود اپنی کتابوں میں آپ کی نبوت کو چھپاتے تھے اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور توحید کو بیان فرمایا ہے اور ظاہر فرمایا ہے کہ یہود اللہ تعالیٰ کی توحید کو چھپاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے واحد ہونے کا معنی یہ ہے کہ الوہیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور عبادت کا مستحق ہونے میں وہ منفرد ہے اور اس کی کسی صفت میں کوئی اس کا مثیل شبیہ اور نظیر نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ہم البقرہ: ۲۱ میں دلائل بیان کر چکے ہیں۔

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کا آخری کلام ہو لا الٰہ الا اللہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۸۸ مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث کا امام ترمذی نے بھی ذکر کیا ہے۔ (جامع ترمذی ص ۱۶۱ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی)

امام حاکم نے کہا ہے کہ اس حدیث کو امام بخاری اور مسلم نے روایت نہیں کیا لیکن یہ حدیث صحیح ہے۔

---

[1] امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۶۴ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ

(المستدرک ج ۱ ص ۳۵۱ 'مطبوعہ دار الباز للنشر والتوزیع' مکہ مکرمہ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

شبلی سے منقول ہے کہ وہ صرف اللہ کہتے تھے' لا الہ الا اللہ نہیں کہتے تھے' جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: مجھے خوف ہے کہ میں نے لا الہ کہا اور اسی وقت مر گیا اور الا اللہ پر نہ پہنچ سکا تو خدا کی نفی کرتا ہوا مروں گا' لیکن یہ ان کی محض علمی موشگافی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے' مقصود دل سے اللہ کو ماننا ہے' اگر کوئی شخص دل سے اللہ کو مانتا ہو اور لا الہ الا اللہ کہنے کا ارادہ رکھتا ہو اور صرف لا الہ پر اس کو موت آ جائے تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے مطابق اہل جنت میں سے ہو گا' اس لیے وہی پڑھنا چاہیے جس کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے اور اپنی طرف سے باریکیاں نہیں نکالنی چاہیے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۱۹۱ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ھ)

ملا علی قاری لکھتے ہیں:

شیخ محی الدین ابن العربی نے کہا ہے کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ جس شخص نے ستر ہزار مرتبہ لا الہ الا اللہ پڑھا اس کی مغفرت کر دی جائے گی اور جس کے لیے پڑھا گیا اس کی بھی مغفرت کر دی جائے گی' میں نے ستر ہزار بار یہ کلمہ پڑھ لیا تھا اور کسی کے لیے خصوصی نیت نہیں کی تھی' ایک مرتبہ میں ایک کھانے کی دعوت میں پہنچا' وہاں ایک نوجوان کشف میں مشہور تھا' کھانے کے دوران وہ رونے لگا' میں نے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا: میں نے اپنی ماں کو عذاب میں گرفتار دیکھا ہے' میں نے دل ہی دل میں ان ستر ہزار کلمات کا ثواب اس کی ماں کو بخش دیا اور اب وہ نوجوان ہنسنے لگا اور کہا: اب میں نے اپنی ماں کو اچھے حال میں دیکھا ہے' تو مجھے اس حدیث کی صحت کا اس نوجوان کے کشف سے یقین ہوا اور اس کے کشف کی صحت کا اس حدیث سے یقین ہو گیا۔ (مرقات ج ۳ ص ۹۹ - ۹۸ 'مطبوعہ مکتبہ امدادیہ' ملتان' ۱۳۹۰ھ)

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ

بے شک آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے' رات اور دن کے بدل کر آنے اور ان کشتیوں میں

الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ

جو لوگوں کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے سمندر میں رواں دواں ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے

السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا

آسمان سے نازل کیا' پھر اس سے مردہ زمین کو زندہ کیا اور اس میں ہر قسم کے

مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ

جانور پھیلا دیئے اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان اللہ کے تابع ہیں'

السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

ضرور ان (سب) میں عقل والوں کے لیے (اللہ کی معرفت کی) نشانیاں ہیں O

اللہ تعالیٰ کے وجود اس کی وحدت اور اس کے علم پر دلائل

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ تمہارا معبود واحد ہے اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خالق اور واحد ہونے پر دلائل قائم کیے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدت پر دلائل بھی ہیں اور انسان کے حق میں نعمتیں بھی ہیں۔

آسمان کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی یہ نشانی ہے کہ وہ بغیر ستونوں کے قائم ہے نہ اس کے اوپر کوئی ایسی چیز ہے جس سے وہ لٹکا ہوا ہو اور عام عادت کے خلاف بغیر ستونوں کے آسمانوں کو قائم رکھنا بغیر کسی زبردست قادر اور خالق کے ممکن نہیں ہے۔

زمین میں سمندر اور دریا ہیں معدنیات ہیں جنگلات ہیں باغات اور فصلیں ہیں اور ان سب میں اللہ تعالیٰ کے وجود پر نشانیاں ہیں سمندروں کی روانی اور زمین کی پیداوار کا ہمیشہ ایک جہت اور ایک نظم پر قائم رہنا یہ بتاتا ہے کہ ان سب کا بنانے والا ایک ہے کیونکہ کبھی سیب کے درخت سے انگور پیدا نہیں ہوتا اور نہ کبھی سمندر کے مدوجزر کا نظام بدلتا ہے۔

دن اور رات میں نشانیاں ہیں دن کو روشنی اور رات کو اندھیرے کا سبب بنایا پھر دن اور رات میں کمی اور بیشی کا نظام ایک بہت بڑی حکمت پر مبنی ہے۔ ہمیشہ جون اور جولائی میں دن بڑے اور راتیں چھوٹی ہوتی ہیں اور نومبر دسمبر میں راتیں بڑی اور دن چھوٹے ہوتے ہیں اس نظام میں کبھی فرق نہیں آتا اس سے معلوم ہوا کہ اس نظام کا خالق بھی واحد ہے۔

سمندروں پر رواں دواں کشتیوں میں نشانیاں ہیں جو محض اللہ کی قدرت سے پانی پر قائم رہتی ہیں اور لوگوں کو اور ان کے ساز و سامان کو لے کر ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہوتی ہیں ہمیشہ لکڑی اور پلاسٹک کی چیزیں سطح آب پر قائم رہتی ہیں اور تیرتی ہیں اور لوہے اور پیتل کی چیزیں پانی میں ڈوب جاتی ہیں ان تمام چیزوں کا واحد طبعی شعور یہ بتاتا ہے کہ ان کا بنانے والا بھی واحد ہے۔

بارش میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر نشانیاں ہیں کہ کس طرح بخارات سے حاصل شدہ پانی فضا میں جمع ہوتا ہے اور کس طرح منتشر ہوتا ہے اور اس جہان کی بقاء میں وہ کیا رول ادا کرتا ہے اور اس سے سبزیوں اور پھلوں کی کس طرح روئیدگی ہوتی ہے اور اس نظام کی وحدت بھی مخفی نہیں ہے۔ زمین میں اللہ تعالیٰ نے جو حیوانات اور حشرات الارض پیدا کیے ہیں ان میں عجیب و غریب حکمتیں اور فوائد ہیں کچھ جانور انسان کی خوراک کے لیے حلال کر دیئے اور کچھ جانور اس کے امتحان کے لیے حرام کر دیئے کچھ اس کی سواری کے کام آتے ہیں کچھ جانوروں کو عبرت کے لیے پیدا کیا اور کتنے ہی جانور ایسے ہیں جن کو پیدا کرنے کی حکمت سے ہماری عقل عاجز ہے پھر ان تمام جانوروں کی پیدائش نشوونما اور ان کی موت کا نظام واحد ہے متعدد نہیں ہے تو ان کے پیدا کرنے والے متعدد کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہواؤں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر بہت نشانیاں ہیں بعض ہوائیں بانجھ ہوتی ہیں بعض ہوائیں ثمر آور ہوتی ہیں بعض ہوائیں سرد ہوتی ہیں بعض گرم ہوتی ہیں بعض ہوائیں فصلوں کو اجاڑ دیتی ہیں اور ہلاکت کا سبب ہوتی ہیں ہوا کے ذریعہ انسان سانس لیتا ہے ہوا کے لیے عربی میں ریح اور ریاح دونوں لفظ آتے ہیں ریح کا لفظ زیادہ تر ہلاکت اور تباہی والی ہواؤں کے لیے آتا ہے اور ریاح کا لفظ خوشگوار اور رحمت والی ہواؤں کے لیے آتا ہے امام ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ریح اللہ کی رحمت سے

ہے جو رحمت لاتی ہے اور عذاب کو لاتی ہے جب تم ریح (آندھی) کو دیکھو تو اس کو برا نہ کہو اور اللہ تعالیٰ سے اس کی خیر کا سوال کرو اور اس کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرو اور امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ صبا [1] سے میری مدد کی گئی اور قوم عاد کو دبور سے ہلاک کیا گیا۔

انسان کو زندہ رہنے کے لیے خوراک' پانی اور ہوا کی ضرورت ہے' خوراک کے بغیر وہ چند دن زندہ رہ سکتا ہے اس لیے خوراک حاصل کرنے کے لیے اسے روزی حاصل کرنے اور مشقت کرنے کا مکلف کر دیا' پانی کی اس سے زیادہ شدید ضرورت ہے تو اس کا حصول اس کے لیے بہت سہل اور ارزاں کر دیا' اور ہوا کے بغیر وہ چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا تو اس کا حصول بالکل عام کر دیا' ہر شخص کو ہر جگہ اور ہر وقت بغیر کسی محنت اور معاوضہ کے ہوا میسر ہے' کیا یہ عجیب وغریب حکمت نہیں ہے۔

بادلوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر نشانیاں ہیں' کس طرح بادل بنتے ہیں' کس طرح وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں اور بغیر کسی ظاہری سبب کے کس طرح فضا میں معلق ہیں' بادلوں کے گرجنے سے کس قدر ہیبت ناک اور ہولناک آواز پیدا ہوتی ہے۔ آسمان سے بارش ہونے کا بھی ہمیشہ سے ایک طریقہ ہے' اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوئی' کیا اس سے یہ پتا نہیں چلتا کہ اس نظام کا خالق بھی واحد ہے' اس میں کوئی تعدد نہیں ہے' اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ ان تمام مظاہر قدرت میں غور وفکر اور تدبر کرے کہ یہ تمام چیزیں متغیر اور حادث ہیں اور ان کا حدوث اس بات کا متقاضی ہے کہ ان کا کوئی بنانے والا ہونا چاہیے اور چونکہ ان تمام چیزوں کے نظام عمل میں انتشار اور اختلاف نہیں ہے بلکہ ہم آہنگی اور وحدانیت ہے اس لیے ان کا بنانے والا بھی واحد ہی ہونا چاہیے' پھر ان تمام چیزوں میں جو بے شمار حکمتیں اور فوائد ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بنانے والا انتہائی علیم اور حکیم ہے اور یہ ساری کائنات کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے' اس کا نظم اور ربط اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ بالکل صحیح منصوبہ بندی سے وجود میں آئی ہے' اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور وہ واحد ہے اور علیم اور حکیم ہے۔ والحمد للّٰہ رب العلمین.

ہم نے عام تعلیم یافتہ لوگوں کے سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یہ دلیل ذکر کی ہے اور بالخصوص علماء اور فقہاء کی ضیافت طبع کے لیے متکلمین کے طریقہ پر اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلیل کی تقریر اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا ہے اگر ان چیزوں کے پیدا کرنے میں کوئی اور معبود بھی اللہ تعالیٰ کا شریک ہے تو اس کو بھی ان مقدورات پر قادر ماننا پڑے گا' اب سوال یہ ہے کہ ان مقدورات کو پیدا کرنے میں دونوں کا ارادہ متفق ہے یا نہیں' اگر دونوں متفق ہیں تو ایک شئے کو پیدا کرنے کے لیے دو مستقل علتوں کا ہونا لازم آئے گا اور یہ باطل ہے' کیونکہ معلول علت مستقلہ کے غیر سے مستغنی ہوتا ہے ورنہ وہ علت مستقلہ نہیں ہوگی اور اگر ایک معلول کی دو علت مستقلہ ہوں تو معلول ان میں سے ہر ایک کا محتاج بھی ہوگا اور ہر ایک سے مستغنی بھی ہوگا اور یہ باطل ہے' اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ ان دو علتوں میں سے صرف ایک تاثیر کرسکتی ہے دوسری تاثیر نہیں کرسکتی تو یہ ترجیح بلا مرجح بھی ہے اور دوسرے کا عجز بھی ہے اور عجز الوہیت کے منافی ہے اور اگر ان مقدورات کو پیدا کرنے میں دونوں کا ارادہ متفق نہیں ہے بلکہ ایک پیدا کرنا چاہتا ہے اور دوسرا نہیں چاہتا تو یا تو دونوں کا ارادہ پورا ہوگا' پھر لازم آئے گا کہ وہ چیز بیک وقت ہو اور نہ ہو اور یہ اجتماع نقیضین کو مستلزم ہے یا کسی کا ارادہ پورا نہیں ہو گا اور یہ ارتفاع نقیضین کو مستلزم ہے اور یہ دونوں باطل ہیں اور یا ایک کا ارادہ پورا ہوگا اور دوسرے کا ارادہ پورا نہیں ہوگا تو جس کا ارادہ پورا نہیں ہوگا وہ مجبور ہوگا اور مجبور خدا نہیں ہوسکتا' اس سے واضح ہوگیا کہ خدا ایک ہی ہے دوسرا خدا نہیں ہوسکتا۔

---

[1] مشرق سے مغرب کی طرف چلنے والی ہوا کو صبا اور مغرب سے مشرق کی طرف چلنے والی ہوا کو دبور کہتے ہیں۔ منہ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ

اور بعض لوگ اللہ کے غیر کو اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں اور ان سے اللہ جیسی محبت کرتے ہیں'

كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ

اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے والے ہیں اور اگر یہ ظالم (دنیا میں اس عذاب کو) جان

ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ

لیتے جس عذاب کو یہ قیامت کے دن دیکھیں گے (تو یہ دنیا میں ضرور اقرار کر لیتے) کہ تمام قوت اللہ ہی کے لیے ہے اور یہ کہ اللہ

شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا

سخت عذاب دینے والا ہے ○ جن لوگوں کی (دنیا میں) پیروی کی گئی تھی جب وہ (آخرت میں) پیروی کرنے والوں سے

وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ

بری الذمہ ہو جائیں گے اور عذاب کو دیکھ لیں گے اور ان کے تمام وسائل منقطع ہو جائیں گے ○ اور (ان کی) پیروی کرنے والے کہیں گے:

اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ

کاش! ہمارے لیے دنیا میں لوٹنا (ممکن) ہوتا تو ہم ان سے اسی طرح بری الذمہ ہو جاتے جس طرح یہ ہم سے بری الذمہ ہو گئے ہیں' اسی طرح

يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ

اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو باعث حسرت بنا کر انہیں دکھائے گا' اور وہ نار جہنم سے ہرگز

النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع

نکلنے والے نہیں ہیں ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بعض لوگ اللہ کے غیر کو اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں اور ان سے اللہ جیسی محبت کرتے ہیں۔

(البقرہ: ۱۶۵)

مومن کے نزدیک محبوبین کے مدارج

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے وجود' علم' قدرت اور وحدانیت پر دلائل دیئے ہیں' اور اب فرما رہا ہے کہ ان عظیم اور واضح دلائل کے ہوتے ہوئے بعض لوگ انداد (غیر اللہ کو اللہ کا شریک) بناتے ہیں انداد سے مراد وہ بت ہیں جن کی مشرکین اللہ کی طرح عبادت کرتے ہیں' اور جس طرح مومنین اللہ سے بربناء حق محبت کرتے ہیں یہ مشرکین بتوں سے بربناء باطل محبت

کرتے ہیں' ایک قول یہ بھی ہے کہ انداد سے مراد ان کے کافر پیشوا ہیں جن کی وہ اللہ کی معصیت میں اطاعت کرتے تھے' اور جتنی محبت مشرکین اپنے بتوں سے کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ محبت مؤمنین اللہ سے کرتے ہیں بلکہ مومن سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتا ہے' اور اس کی تعظیم اور تقدیس کرتا ہے' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے اور آپ کی تعظیم اور توقیر کرتا ہے' پھر اپنے والدین کی تعظیم اور اطاعت کرتا ہے' اس کے بعد اپنے نفس سے محبت کرتا ہے' پھر اس کے بعد اپنے اہل و عیال' اقرباء' پڑوسیوں اور عام مسلمانوں سے محبت کرتا ہے۔ اسی طرح پہلے تعظیم اور محبت میں قرآن مجید کا مرتبہ ہے' پھر احادیث کا' پہلے مسجد حرام کا مرتبہ ہے اور پھر مسجد نبوی کا' مکہ مکرمہ' مدینہ منورہ سے زیادہ افضل ہے' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے مطابق مدینہ منورہ' مکہ مکرمہ سے زیادہ محبوب ہے اور جس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر آرام فرما ہے وہ جگہ کائنات کی ہر جگہ سے افضل ہے' پھر اس کے بعد دیگر انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کے مقابر اور مزارات کے مراتب ہیں اور حدود شرع کے مطابق ان کی تعظیم کرنا برحق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر یہ ظالم (دنیا میں اس عذاب کو) جان لیتے۔ (البقرہ: ۱۶۵)

البقرہ کی آیت: ۱۶۵ کے متعدد نحوی تراکیب کے اعتبار سے آٹھ معانی

اس آیت کا ترجمہ بہت دقیق ہے اور عربی قواعد اور نحوی قوانین کے اعتبار سے اس کی متعدد ترکیبیں ہیں جن کی نوعیت خالص علمی ہے' ہم ان ابحاث کو چھوڑ کر صرف یہ ذکر کر رہے ہیں کہ مختلف تراکیب کے اعتبار سے اس آیت کے کیا معانی ہیں۔

علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں:

عطاء نے اس آیت کا یہ معنی بیان کیا ہے: اگر یہ ظالم مشرکین قیامت کے دن کا عذاب دیکھ لیں تو یہ ضرور جان لیں گے کہ تمام قدرت اللہ ہی کے لیے ہے اور بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ اگر یہ لوگ دنیا میں اس عذاب کو جان لیتے جس عذاب کو یہ قیامت کے دن دیکھیں گے تو یہ ضرور اقرار کر لیتے کہ تمام قوت اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے (ہم نے اپنے ترجمہ میں اسی معنی کو اختیار کیا ہے)۔

زمخشری نے کہا ہے کہ معنی یہ ہے: اگر مشرکین یہ جان لیتے کہ تمام قدرت اللہ کو ہے نہ کہ ان کے خود ساختہ معبودوں کو' اور ظالموں پر عذاب کی شدت کو جان لیتے جب قیامت کے دن یہ عذاب کی شدت کا معائنہ کریں گے تو انہیں بڑی شدید حسرت اور ندامت ہوتی۔ (البحر المحیط ج ۲ ص ۹۰' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

امام رازی نے یہ معنی بیان کیا ہے:

اگر یہ ظالم اللہ کی قدرت اور اس کے عذاب کی شدت کو جان لیتے تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے۔

دوسرا معنی یہ بیان کیا ہے:

اگر قیامت کے دن عذاب کے مشاہدہ کے وقت یہ ظالم اپنے عاجز ہونے کو جان لیتے تو ضرور کہتے کہ تمام قدرت اللہ ہی کو ہے اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۲ ص ۷۴' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

ابوعبید نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اگر یہ ظالم دنیا میں عذاب آخرت کو دیکھ لیتے تو ضرور جان لیتے کہ تمام قوت اللہ ہی کے لیے ہے' اور اخفش نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اگر یہ ظالم اللہ کی قدرت اور اس کے عذاب کی شدت کو (حقیقۃً) جان لیتے تو خدا کا

شریک بنانے کے نقصان سے بچ جاتے۔

ایک قراءت میں "ولو یری" کی جگہ "ولو تری" ہے خطاب آپ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے اس صورت میں معنی یہ ہے: اور اے محمد! اگر آپ ان ظالموں کو عذاب کا مشاہدہ کرتے وقت دیکھ لیتے تو آپ ضرور جان لیتے کہ تمام قدرت اللہ ہی کو ہے۔

حالانکہ آپ اس امر کو جانتے تھے اس لیے یہاں خطاب آپ کو ہے اور اس سے مراد آپ کی امت ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۲۰۵۔ ۲۰۴ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جن (لوگوں) کی (دنیا میں) پیروی کی گئی تھی۔ (البقرہ: ۱۶۶)

گمراہ کرنے والے متبوعین کا اپنے تابعین سے قیامت کے دن بری ہونا

قتادہ عطاء اور ربیع نے کہا ہے کہ جن رئیسوں اور سرداروں کے حکم سے دنیا میں مشرکین نے کفر کیا تھا جب وہ دونوں آخرت میں عذاب کو دیکھ لیں گے تو اپنے متبعین کے کفر سے بری ہو جائیں گے سدی نے کہا ہے کہ گمراہ کرنے والے شیاطین انسانوں سے بری ہو جائیں گے اور ایک قول یہ ہے کہ ہر گمراہ کرنے والا متبوع اپنے تابع سے بری ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان کے اسباب منقطع ہو جائیں گے ○ (البقرہ: ۱۶۶)

سبب کے معنی ہیں: وہ رسی جس سے کسی چیز کو باندھ کر کھینچتے ہیں پھر اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے کہ جس سے کسی چیز کو کھینچا جائے یہاں اسباب سے کیا مراد ہے؟ اس میں مختلف اقوال ہیں: مجاہد نے کہا: اس سے مراد ہے: دنیا میں جن کے ساتھ کافر میل جول کر رہتے تھے ابن جریج نے کہا: جن رشتہ داروں کے ساتھ وہ دنیا میں شفقت کرتے تھے سدی نے کہا: جن اعمال کو وہ نیکی سمجھ کر لازماً کرتے تھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا جو وہ عہد و پیمان کرتے تھے اور حلف اٹھاتے تھے خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں جن لوگوں اور جن چیزوں کو وہ نجات کا سبب سمجھتے تھے آخرت میں وہ سب ان سے منقطع ہو جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (ان کی) پیروی کرنے والے کہیں گے: کاش! ہمارے لیے دنیا میں لوٹنا (ممکن) ہوتا تو ہم ان سے اسی طرح بری الذمہ ہو جاتے۔ (البقرہ: ۱۶۷)

تابعین اپنے متبوعین کے جواب میں کہیں گے کہ کاش! دنیا میں دوبارہ لوٹ کر جانا ہوتا تو ہم بھی ان سے اسی طرح بری الذمہ ہو جاتے ہیں جس طرح آج یہ ہم سے بری الذمہ ہو گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اسی طرح اللہ ان کے اعمال کو باعث حسرت بنا کر انہیں دکھائے گا۔ (البقرہ: ۱۶۷)

علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری نے اپنی سندوں کے ساتھ اس آیت کی دو تفسیریں نقل کی ہیں:

(۱) سدی بیان کرتے ہیں کہ کافروں کو جنت دکھائی جائے گی اور جنت میں ان کے مکان دکھائے جائیں گے کہ اگر وہ اللہ کی اطاعت کر لیتے تو یہ مکان ان کو دے دیئے جاتے پھر وہ مکان مسلمانوں میں تقسیم کر دیے جائیں گے اور وہ کافروں کے وارث ہوں گے اس وقت کافروں کو ندامت اور حسرت ہو گی۔

(۲) ابن زید اور ربیع وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ کافروں کو اللہ تعالیٰ ان کے برے اعمال دکھائے گا پھر ان کو حسرت اور پشیمانی ہو گی کہ انہوں نے کیوں برے عمل کیے اور کیوں نہ اچھے عمل کیے تا کہ وہ عذاب سے نجات پا جاتے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۴۵۔ ۴۳ مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت ۱۴۰۹ھ)

امام ابن جریر نے کہا ہے کہ یہ دوسری تاویل آیت کے زیادہ مناسب ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوا

اے لوگو! زمین کی ان چیزوں میں سے کھاؤ جو حلال طیب ہیں اور شیطان کے قدموں کی پیروی

خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ

نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ○ وہ تمہیں صرف برائی

بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

اور بے حیائی (کے کاموں) کا حکم دیتا ہے اور اللہ کے متعلق ایسی بات کہنے کا (حکم دیتا ہے) جس کو تم نہیں جانتے ○

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں: بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے

عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۗ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

جس پر اپنے باپ دادا کو پایا، خواہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں ○

ربط آیات

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے "يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ" (البقرہ: ۲۱) سے امور دین کو تفصیل سے بیان فرمایا تھا اور اب "يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ" (البقرہ: ۱۶۸) سے دنیاوی امور کو بیان فرما رہا ہے، دین روح کی غذا ہے اور کھانا پینا جسم کی غذا ہے، پہلے اللہ تعالیٰ نے روح کی غذا کا تفصیل سے بیان فرمایا ہے اور اب جسم کی غذا کا تفصیل سے بیان فرما رہا ہے تا کہ روح کی ترقی اور بدن کی نشوونما کے صحیح ذرائع میسر ہو جائیں۔

ثقیف، خزاعہ اور بنومدلج نے اپنے اوپر کچھ جانوروں کو حرام کر لیا تھا، ان کے رد میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: زمین کی ان چیزوں سے کھاؤ جو حلال طیب ہیں اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ (البقرہ: ۱۶۸)

حلال اور طیب اور گناہ اور بدعت کا معنی

جس چیز سے حرمت کی گرہ کھل گئی ہو وہ حلال ہے اور طیب وہ چیز ہے جو حلال ذرائع سے حاصل ہوئی ہو، سہل بن عبداللہ نے کہا کہ نجات تین چیزوں میں ہے: حلال کھانا، فرائض کو ادا کرنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کرنا، نیز سہل نے کہا: حلال مال وہ ہے جو سود، حرام، رشوت، خیانت، مکروہ اور شبہ سے محفوظ ہو۔

جو کام شریعت کے مخالف ہو وہ شیطان کا طریقہ ہے، اگر اس کو کار ثواب اور نیکی سمجھ کر کیا جائے تو وہ بدعت ہے اور اگر اس کو برا سمجھ کر کیا جائے تو وہ گناہ ہے، مثلاً ماتم اور تعزیہ داری شریعت کے خلاف ہے اور اس کو نیکی سمجھ کر کیا جاتا ہے، یہ بدعت ہے اور چوری اور قتل بھی شریعت کے خلاف ہیں اور ان کو برا سمجھ کر کیا جاتا ہے، یہ گناہ ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ بدعت اور گناہ کا عمل

کرنا شیطان کے قدموں پر چلنا ہے اور اس کے طریقہ کی پیروی کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ تمہیں صرف برائی اور بے حیائی (کے کاموں) کا حکم دیتا ہے' اور اللہ کے متعلق ایسی بات کہنے کا (حکم دیتا ہے)۔ (البقرہ: ۱۶۹)

''سوء'' اور ''فحشاء'' کا معنی

''سوء'' کے معنی ہیں: برائی اور ''فحشاء'' کے معنی ہیں: بے حیائی' ہر وہ کام جس سے شریعت نے منع کیا ہو وہ ''سوء'' اور ''فحشاء'' ہے' قرآن مجید میں ''فحشاء'' کا اطلاق زیادہ تر زنا پر آیا ہے اور ایک جگہ اس کا اطلاق بخل پر ہے' حضرت ابن عباس نے فرمایا: جس کام پر حد نہ ہو وہ ''سوء'' ہے اور جس پر حد ہو وہ ''فحشاء'' ہے۔

مشرکین ''بحیرہ' سائبہ' وصیلہ'' اور ''حام'' (بتوں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانور) کو حرام قرار دیتے تھے اور یہ گمان کرتے تھے کہ ان جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان جانوروں کو اللہ نے حرام نہیں کیا' لیکن یہ مشرکین اللہ پر افتراء باندھتے ہیں اور اس آیت میں یہ بتلایا کہ شیطان نے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف اس تحریم کو منسوب کرنے کا حکم دیا ہے۔

جب اونٹنی پانچ بچے جن لیتی جن میں آخری نر ہوتا تو مشرکین اس کے کان کو چیر دیتے اور اس پر سوار ہونے' بوجھ لادنے اور اس کے ذبح کو حرام کر دیتے اور اس کو ''بحیرہ'' کہتے' اور جو کوئی شخص دور دراز کے سفر سے واپس آتا' یا بیماری سے تندرست ہوتا یا کسی جنگ یا مصیبت سے نجات پاتا تو وہ اعلان کر دیتا کہ میری اونٹنی بتوں کے لیے چھوڑی گئی ہے اور اس پر سواری اور اس کے ذبح کو حرام کر دیتا اور اس کو کسی جگہ بھی گھاس چرنے یا پانی پینے سے منع نہ کیا جاتا' اس کو ''سائبہ'' کہتے تھے' جب کوئی اونٹنی یکے بعد دیگرے مادہ کو جنم دیتی تو اس کو بھی بتوں کے تقرب کے لیے ذبح نہیں کرتے تھے' اس کو ''وصیلہ'' کہتے تھے اور جب ایک معین تعداد میں اونٹ جفتی کر لیتا تو اس کو بھی بتوں کے لیے چھوڑ دیتے' اس کو ''حام'' کہتے تھے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۶۵)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں: بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ (البقرہ: ۱۷۰)

مشرکین سے جب کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو حرام نہیں کیا' ان کا کھانا جائز ہے' سو ان کو ذبح کر کے کھاؤ اور ان سے نفع اٹھاؤ تو وہ کہتے کہ ہم اپنے باپ دادا سے یہی سنتے چلے آتے ہیں کہ ان جانوروں کا کھانا حرام ہے' ہم ان ہی کی پیروی کریں گے خواہ ان کے باپ دادا بے علم اور بے ہدایت ہوں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفر اور معصیت میں آباء واجداد کی تقلید کرنا باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تقلید کی مذمت کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جن کی تقلید کی جا رہی تھی وہ بے علم اور بے ہدایت تھے۔

تقلید کی تعریف

مسائل فرعیہ فقہیہ میں تقلید کرنا جائز ہے' تقلید کی تعریف ہے: کسی شخص کے قول کو بلا دلیل قبول کرنا' کیونکہ عام آدمی میں اتنی اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ کتاب اور سنت سے مسائل کا استنباط کر سکے' اس لیے وہ ہر پیش آمدہ مسئلہ میں علماء سے رجوع کرے گا اور علماء اس کو اللہ اور رسول کا جو حکم بتائیں گے وہ اس پر عمل کرے گا' اسی طرح تمام علماء بھی تمام احکام شرعیہ کو براہ راست کتاب' سنت' آثار صحابہ' اجماع اور قیاس سے نہیں نکال سکتے اور وہ اس معاملہ میں کسی فقیہ اور مجتہد کے استنباط کردہ مسائل پر

اعتماد کرتے ہیں جس کی فقہ اور جس کے اجتہاد پر انہیں وثوق ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَۙ اگر تم نہیں جانتے تو علم والوں سے سوال کرو O

(النحل: ۴۳)

امت کا اس پر اجماع ہے کہ عقائد میں تقلید کرنا جائز نہیں ہے' ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ کتاب اور سنت اور عقل سے غور وفکر کر کے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے واحد ہونے کا علم حاصل کرے اور دلیل سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو حق جانے اور مانے۔ ''شرح صحیح مسلم'' جلد ثالث میں ہم نے تقلید اور اجتہاد پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے' اس موضوع پر بصیرت حاصل کرنے کے لیے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ

اور کافروں کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو ایسے شخص کو پکارے جو بلانے اور آواز دینے کے سوا اور کچھ نہ سنتا ہو'

اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ يٰۤاَيُّهَا

یہ بہرے' گونگے' اندھے ہیں تو یہ کچھ نہیں سمجھتے O اے ایمان والو!

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ

ان پاک چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں' اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم

كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ

اسی کی عبادت کرتے ہو O اللہ نے تم پر جس کا (کھانا) حرام کیا ہے' وہ صرف مردار' خون'

وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ

خنزیر کا گوشت اور وہ جانور ہے' جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو' سو جو شخص مجبور ہو جائے جب کہ وہ نافرمانی کرنے والا

بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو تو اس پر (کھانے یا استعمال میں) کوئی گناہ نہیں ہے' بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد مہربان ہے O

''نعق'' کا معنی

''نعق'' کا معنی ہے: چرواہے کا اپنی بکریوں کو ڈانٹنا اور للکارنا۔

اس آیت میں جو مثال دی گئی ہے' اس کی حسب ذیل تفسیریں کی گئی ہیں:

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کفار کو دین اسلام کی دعوت دیتے ہیں اور وہ اس دعوت پر کان نہیں دھرتے اور لبیک نہیں کہتے' اس کی

مثال ایسے ہے جیسے کوئی مویشیوں کو چرانے والا اپنی بکریوں اور اونٹوں کو آوازیں دے کر بلا رہا ہو اور وہ جانور اس کی صرف آواز سن رہے ہوں اور ان کو پتا نہ چل سکے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما' مجاہد' عکرمہ' سدی' زجاج' فراء اور سیبویہ وغیرہ سے یہ تفسیر منقول ہے۔

(۲) کفار اپنے باطل معبودوں کو جو پکارتے ہیں اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی آدمی رات کو چلا رہا ہو اور اس کی آواز گونج رہی ہو۔

(۳) کفار اپنے بتوں کو جو پکارتے ہیں اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی چرواہا اپنے گم شدہ مویشیوں کو پکار رہا ہو اور اس کو پتا نہ ہو کہ وہ مویشی کہاں ہیں۔

''صم بکم عمی'' کی تفسیر البقرہ: ۱۸ میں گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! ان پاک چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں' اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ (البقرہ: ۱۷۲)

حرام کھانے کا وبال

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ پاک چیز کے سوا اور کسی چیز کو قبول نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو وہی حکم دیا ہے جو رسولوں کو حکم دیا تھا' سو فرمایا: اے رسولو! پاک چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو' میں تمہارے کاموں سے باخبر ہوں' اور فرمایا: اے مسلمانو! ہماری دی ہوئی چیزوں سے پاک چیزیں کھاؤ' پھر آپ نے ایسے شخص کا ذکر کیا جو لمبا سفر کرتا ہے' اس کے بال غبار آلود ہیں' وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتا ہے: یا رب! یا رب! اس کا کھانا پینا حرام ہو' اس کا لباس حرام ہو' اس کی غذا حرام ہو تو اس کی دعا کیسے قبول ہوگی!

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۲۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کو امام دارمی نے بھی روایت کیا ہے۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۱۱۱۔ ۱۱۰' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

شکر کا معنی البقرہ: ۱۵۲ کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ نے تم پر جس کا (کھانا) حرام کیا ہے' وہ صرف مردار' خون' خنزیر کا گوشت اور وہ جانور ہے جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ (البقرہ: ۱۷۳)

حرام کیے ہوئے مردہ جانوروں میں سے مستثنیات کا بیان

''میتہ'' (مردار): ذبح کیے جانے والے جانوروں میں سے جو جانور بغیر ذبح کے اپنی طبعی موت مر گیا ہو اس کو مردار کہتے ہیں۔

قرآن مجید کی اس نص قطعی سے ہر مردار کا کھانا حرام ہے' تاہم اس کے عموم سے سمندر کے مردہ جانوروں کو خاص کر لیا گیا ہے' قرآن مجید میں ہے:

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ (المائدہ: ۹۶)

تمہارے اور مسافروں کے فائدہ کے لیے سمندر کا شکار اور اس کا طعام حلال کر دیا گیا ہے۔

امام احمد اور امام شافعی کے نزدیک' مچھلی ہو یا کوئی اور سمندری جانور سب بغیر ذبح کے حلال ہیں' امام مالک کے نزدیک

سمندری خنزیر کے علاوہ سب حلال ہیں اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک صرف مچھلی حلال ہے باقی سمندری جانور حرام ہیں' امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں: مچھلی کے علاوہ باقی سمندری جانوروں سے گھن آتی ہے اور گھناؤنے جانور حرام ہیں' قرآن مجید میں ہے: '' وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ . (الاعراف: ۱۵۷) اور ناپاک چیزیں آپ ان پر حرام کرتے ہیں''۔

امام احمد نے قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کیا ہے' اور اس حدیث سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سمندر کا پانی پاک کرنے والا ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔ (سنن ابو داؤد ج ۱ ص ۱۱ 'مطبع مجتبائی' لاہور) امام احمد نے فرمایا: یہ حدیث سو حدیثوں سے بہتر ہے' حضرت ابن عباس نے فرمایا: سمندر کے طعام سے مراد سمندر کے مردار جانور ہیں' البتہ جو جانور طبعی موت سے مر کر سطح آب کے اوپر آ جائے وہ بدبودار ہو جاتا ہے' اس کا کھانا بدبو کی وجہ سے مکروہ ہے۔

(المغنی ج ۹ ص ۳۱۵۔ ۳۱۴ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

امام مالک کے نزدیک قرآن مجید کے حکم عام کی سنت سے تخصیص جائز نہیں ہے' اس لیے اگر ٹڈی اپنی طبعی موت سے مر جائے تو اس کا کھانا ان کے نزدیک جائز نہیں ہے کیونکہ وہ خشکی کا شکار ہے اور بغیر ذبح کے اللہ تعالیٰ نے صرف سمندر کا شکار حلال کیا ہے' اور امام ابوحنیفہ' امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک مچھلی اور ٹڈی کو بغیر ذبح کے کھانا جائز ہے اور ان کی دلیل یہ حدیث ہے۔ (الجامع الاحکام القرآن ج ۲ ص ۲۱۷ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ھ)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارے لیے دو مردار اور دو خون حلال کیے گئے ہیں' رہے مردار تو وہ مچھلی اور ٹڈی ہیں اور رہے دو خون تو وہ کلیجی اور تلی ہیں۔

(سنن ابن ماجہ ص ۲۳۸ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام احمد[1] اور امام دار قطنی نے بھی روایت کیا ہے۔ (سنن دار قطنی ج ۴ ص ۲۷۲ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

عنبر کی تحقیق

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

اسی طرح حضرت جابر کی عنبر کے متعلق حدیث ہے جس کی سند صحیح ہے اور وہ عموم قرآن کی تخصیص کرتی ہے' اس کو امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ (الجامع الاحکام القرآن ج ۲ ص ۲۱۷ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ھ)

ان حدیثوں کو بیان کرنے سے پہلے ہم عنبر کا معنی بیان کرنا چاہتے ہیں۔

علامہ مجد الدین فیروز آبادی لکھتے ہیں:

عنبر ایک خوشبودار چیز ہے' یہ سمندری جانور کی لید ہے یا سمندر کی گہرائی میں چشمہ سے نکلتی ہے' (ازھری نے کہا:) یہ ایک سمندری مچھلی ہے' بعض نے کہا: یہ زعفران ہے' بعض نے کہا: یہ سمندری مچھلی کی ڈھال ہے۔

(قاموس ج ۲ ص ۱۳۷ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

علامہ زبیدی سمندری مچھلی کی تشریح میں لکھتے ہیں: اس مچھلی کا طول پچاس ذراع (پچھتر فٹ) ہوتا ہے۔

(تاج العروس ج ۳ ص ۴۲۹ 'مطبوعہ المطبعۃ الخیریۃ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

---

[1] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۲ ص ۹۷ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

امام بخاری لکھتے ہیں: حضرت ابن عباس نے فرمایا: عنبر دفینہ نہیں ہے وہ ایک چیز ہے جس کو سمندر نکال کر (ساحل پر) پھینک دیتا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۰۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حکیم مظفر حسین اعوان لکھتے ہیں:

یہ ایک مچھلی (سپرم ویل) کے شکم سے نکلتا ہے اور سمندر میں سطح آب پر تیرتا ہوا یا ساحل بحر سے ملتا ہے' اس کی صورت اکثر گول ہوتی ہے (اس لیے اسے شامہ بھی کہتے ہیں) 'اس کا وزن نصف سیر سے لے کر دس سیر تک ہوتا ہے' یہ موی مادہ ہے جو سرد پانی میں حل نہیں ہوتا' لیکن گرم پانی میں گداز ہو جاتا ہے اور چکنا محسوس ہوتا ہے' عنبر اشہب بہترین خیال کیا جاتا ہے' اشہب اس سیاہ رنگ کو کہتے ہیں جس میں سفیدی غالب ہو' رنگ: بھورا یا سیاہی مائل و چکنا اور سنگ مرمر کی طرح جوہر دار' ذائقہ: قدرے تلخ وخوشبودار' مزاج: گرم اور خشک' مقام پیدائش: سپرم ویل برازیل' امریکہ کے جنوبی ساحل' بحر ہند اور خلیج بنگال میں پائی جاتی ہے' اس کی تجارت کے مرکز ممباسہ اور دار السلام ہیں' افعال و استعمال: مفرح اور مقوی قلب و دماغ ہے' حواس کو تقویت دیتا ہے' زیادہ تر اعصاب' دماغ اور قلب کے امراض میں مستعمل ہے۔

(کتاب المفردات ص ۳۶۲ 'مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز' کراچی)

علامہ قرطبی نے عنبر کے متعلق جن حدیثوں کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں' امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ کی قیادت میں بھیجا' ہم قریش کے قافلہ کو تلاش کر رہے تھے' زادراہ میں ہمارے پاس صرف کھجوروں کی ایک تھیلی تھی' حضرت ابوعبیدہ ہمیں ہر روز ایک ایک کھجور دیتے تھے' راوی نے پوچھا: آپ اس ایک کھجور کو کس طرح کھاتے تھے؟ حضرت جابر نے کہا: ہم اس کو اس طرح چوستے تھے جس طرح بچہ چوستا ہے' پھر ہم اس کے بعد پانی پیتے تھے تو وہ ہمیں ایک دن اور رات کے لیے کافی ہوتی تھی' اور ہم لاٹھیوں سے درختوں کے پتے جھاڑتے' پھر ان کو پانی میں بھگو کر کھا لیتے تھے۔ ایک دن ہم ساحل سمندر پر گئے' وہاں کنارے پر ایک بڑے ٹیلے کی مانند کوئی چیز پڑی ہوئی تھی' ہم اس کے پاس گئے' دیکھا تو وہ ایک جانور ہے' جس کو عنبر کہا جاتا تھا۔ حضرت ابوعبیدہ نے کہا: یہ مردار ہے' پھر کہا: نہیں! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے ہیں اور اللہ کے راستہ میں ہیں اور تم لوگ حالت اضطرار میں ہو' سو اس کو کھالو' ہم لوگ تین سو تھے اور وہاں ایک ماہ ٹھہرے تھے اور اس کو کھا کر ہم موٹے ہو گئے تھے' مجھے یاد ہے کہ ہم نے اس کی آنکھ کے ڈھیلے سے مشکوں سے بھر بھر کر اس جانور سے چربی نکالی تھی' اور اس میں سے بیل کے برابر گوشت کے ٹکڑے کاٹتے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ نے ہم میں سے تیرہ آدمیوں کو لے کر اس کی آنکھ کے ڈھیلے میں بٹھا دیئے اور اس کی ایک پسلی کو کھڑا کیا اور سب سے بڑے اونٹ کی پیٹھ پر کجاوہ کس کر اس کے نیچے سے گزار لیا' اور اس کے گوشت کو ابال کر ہم نے زادراہ تیار کر لیا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے اس واقعہ کا ذکر کیا' آپ نے فرمایا: یہ ایک رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم کو عطا فرمایا ہے' کیا تمہارے پاس اس کے گوشت میں سے کچھ ہے؟ اگر ہے تو ہمیں کھلاؤ' حضرت جابر کہتے ہیں: پھر ہم نے اس میں سے کچھ گوشت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور آپ نے اس کو تناول فرمایا (اس حدیث میں مچھلی پر عنبر کا اطلاق مجازاً کیا گیا ہے)۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۴۷ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۲۹۔ ۸۲۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ سپرم ویل مچھلی کے پیٹ سے نکلنے والے ایک خوشبودار موی مادہ کو عنبر کہتے ہیں اور اس حدیث میں یہ

دلیل ہے کہ سمندری مردہ جانوروں کو بغیر ذبح کے کھانا جائز ہے اور یہ صحیح حدیث قرآن مجید میں ''میتہ'' کی عمومی حرمت کے لیے مخصص ہے۔

سطح آب پر آنے والی مردہ مچھلی کا شرعی حکم

جو مچھلی طبعی موت سے پانی کے اندر مر جائے اور بدبودار ہو کر سطح آب پر ابھر آئے' امام شافعی کے نزدیک اس کو بھی کھانا جائز ہے' اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کا کھانا جائز نہیں ہے' امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ حدیث ہے:

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو سمندر پھینک دے یا جس جانور سے پانی منقطع ہو جائے اس کو کھالو اور جو جانور پانی میں مر کر اوپر آ جائے اس کو مت کھاؤ۔

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۷۸ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

ملکی اور غیر ملکی صابنوں کو استعمال کرنے کا شرعی حکم

خشکی کے مردہ جانوروں کی چربی کو بھی کھانا اور استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فتح مکہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ اور اس کے رسول نے شراب' مردار' خنزیر اور بتوں کی بیع کو حرام کر دیا ہے' آپ سے عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! مردار کی چربی کے متعلق بتایئے کیونکہ اس چربی سے کشتیوں پر روغن کیا جاتا ہے اور اس کا تیل کھالوں پر لگایا جاتا ہے اور لوگ اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں' آپ نے فرمایا: نہیں! وہ حرام ہے' پھر اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کرے' جب اللہ نے مردار کی چربی کو حرام کر دیا تو انہوں نے اس کو پگھلا کر فروخت کیا اور اس کی قیمت کو کھایا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۹۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مردار کی چربی حرام ہے' اس کا بیچنا اور خریدنا جائز نہیں ہے' اس کا استعمال بھی جائز نہیں ہے' عام طور پر مشہور ہے کہ صابن میں مردار کی چربی ہوتی ہے خاص طور پر غیر ملکی صابن میں' لیکن یہ امر یقینی نہیں ہے' اس لیے اس کا استعمال ناجائز نہیں ہوگا' نیز نفس چربی تو نجس ہے لیکن اگر چربی کسی چیز میں مل جائے اور وہ چیز کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جائے تو وہ چیز شرعاً نجس نہیں ہوگی' اس لیے صابن ملکی ہو یا غیر ملکی اس کے استعمال سے ہاتھ یا بدن نجس نہیں ہوگا' خصوصاً اس لیے کہ صابن لگانے کے بعد ہاتھ یا بدن پر بغیر صابن کے پانی بہالیا جاتا ہے۔

علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے سوال کیا کہ اگر چربی میں چوہا گر جائے تو کیا کریں؟ آپ نے پوچھا: کیا وہ جمی ہوئی ہے؟ اس نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: چوہے کو اور اس کے اردگرد کی چربی کو پھینک دو اور اپنی چربی کھالو' صحابی نے پوچھا: یا رسول اللہ! اگر وہ چربی پگھلی ہوئی ہو تو؟ آپ نے فرمایا: اس سے نفع حاصل کرو اور اس کو کھانا نہیں۔ اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کھانے سے منع فرمایا ہے اور اس کے علاوہ اس سے ہر قسم کے نفع حاصل کرنے کی اجازت دی ہے' حضرت ابن عمر' حضرت ابوسعید خدری' حضرت ابوموسیٰ اشعری اور دیگر سلف صالحین نے اس قسم کی چربی سے نفع حاصل کرنے کو جائز کہا ہے' البتہ کھانے سے منع کیا ہے۔ ہمارے اصحاب نے کہا

ہے کہ اس قسم کی چربی کو بیچنا جائز ہے اور بائع کو اس کا عیب بیان کر دینا چاہیے۔

یہ بحث اس چربی میں ہے جس میں چوہا گر گیا ہو‘ مفتی محمد شفیع دیوبندی نے اس کو مطلقاً مردار کی چربی پر محمول کیا ہے اور لکھا ہے: نیز اس وجہ سے بھی کہ بعض صحابہ کرام ابن عمر‘ ابوسعید خدری‘ ابوموسیٰ اشعری نے مردار کی چربی کا صرف کھانے میں استعمال حرام قرار دیا ہے‘ خارجی استعمال کی اجازت دی ہے‘ اس لیے اس کی خرید و فروخت کو بھی جائز رکھا ہے۔ (جصاص)

(معارف القرآن ج ۱ ص ۴۱۸‘ مطبوعہ ادارۃ المعارف‘ ۱۴۱۴ھ)

مفتی صاحب کا یہ استنباط صحیح نہیں ہے‘ نہ مذکور الصدر صحابہ کرام کا یہ نظریہ ہے‘ نہ علامہ جصاص کی یہ عبارت مطلقاً مردار کی چربی کے متعلق ہے بلکہ یہ بحث اس پگھلی ہوئی چربی میں ہے جس میں چوہا گر گیا ہو‘ علامہ جصاص اس بحث کے اخیر میں لکھتے ہیں:

یہ چربی ان کے نزدیک مردار کی چربی کے قائم مقام نہیں ہے‘ کیونکہ وہ مردار کے گوشت کی طرح بعینہٖ حرام ہے‘ اور جس پگھلی ہوئی چربی میں چوہا گر گیا ہو وہ بعینہٖ حرام نہیں ہے‘ مردار کی مجاورت سے اس کا صرف کھانا حرام ہے اور اس سے باقی ہر طرح کا نفع حاصل کرنا جائز ہے۔

علامہ جصاص نے اس حدیث سے یہ اصول مستنبط کیا ہے:

جو چیز فی نفسہٖ نجس ہو وہ کسی چیز میں گر جائے تو جتنے حصہ میں وہ نجس چیز ہوگی اس نجس چیز کی مجاورت کی وجہ سے وہ حصہ نجس ہو جائے گا اور جو حصہ اس نجس حصہ سے مجاور ہے وہ نجس نہیں ہوگا‘ کیونکہ جس حصہ میں چوہا گرا اس کو آپ نے نجس فرمایا اور چربی کا باقی حصہ جو اس حصہ سے ملا ہوا ہے اس سے نفع حاصل کرنے کو جائز فرمایا۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۱۱۹ ـ ۱۱۸‘ مطبوعہ سہیل اکیڈمی‘ لاہور‘ ۱۴۰۰ھ)

اس بناء پر ہم کہتے ہیں کہ اگر بالفرض صابن میں مردار کی چربی ہو تب بھی چربی کی وجہ سے صابن نجس ہوگا لیکن صابن جب بدن پر ملا جائے گا تو اس سے بدن نجس نہیں ہوگا کیونکہ جو چیز کسی کی مجاورت کی وجہ سے نجس ہو‘ وہ دوسری چیز کو نجس نہیں کرتی اور اگر بالفرض نجس ہو تب بھی پانی بہا لینے کے بعد کسی قسم کی نجاست نہیں رہی‘ اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ مردار کی چربی سے صابن بنانا ناجائز ہے‘ لیکن جو صابن بالفرض اس چربی سے بنا ہوا ہو اور اس میں دیگر اور بہت سے کیمیائی مادے شامل ہوں تو اس صابن کو استعمال کرنا مردار کی چربی کو استعمال کرنا نہیں ہے‘ جب کہ ظن غالب یہ ہے کہ مسلمان اور عیسائی ممالک میں مذبوح جانور کی چربی کو استعمال کیا جاتا ہے‘ اس لیے ملکی اور غیر ملکی صابنوں کو استعمال کرنا جائز ہے اور ان سے ہاتھ یا بدن نجس نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ نے تم پر جس کا (کھانا) حرام کیا ہے وہ صرف مردار‘ خون .... (البقرہ: ۱۷۳)

بہائے ہوئے خون کا بالاجماع حرام ہونا

اس آیت میں مطلقاً خون کو حرام فرمایا ہے اور سورۃ الانعام میں اس کو بہائے ہوئے خون کے ساتھ مقید فرمایا ہے:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝

آپ کہ دیجئے کہ مجھ پر جو وحی کی جاتی ہے اس میں کسی کھانے والے کے کھانے پر کوئی چیز حرام نہیں کی گئی‘ ماسوا مردار یا بہائے ہوئے خون یا خنزیر کے گوشت کے‘ بے شک وہ (خنزیر) نجس ہے یا وہ فسق (جانور) جس پر ذبح کے وقت غیر

اللہ کا نام پکارا گیا ہو‘ سو جو شخص مجبور ہو جائے (اور) وہ نافرمانی کرنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو (اور وہ ان کو کھالے یا استعمال کرلے) تو آپ کا رب بخشنے والا بڑا مہربان ہےO (الانعام: ۱۴۵)

تمام ائمہ اور مجتہدین نے یہاں مطلق کو مقید پر محمول کیا ہے اور یہاں خون سے بہایا ہوا خون مراد ہے‘ کیونکہ جو خون گوشت کے ساتھ مخلوط ہوتا ہے وہ بالاجماع حرام نہیں ہے‘ اسی طرح جگر اور تلی کے حلال ہونے پر بھی اجماع ہے اور مچھلی کے ساتھ جو خون لگا ہوا ہوتا ہے وہ حرام اور نجس نہیں ہے۔

ضرورت کی وجہ سے ایک شخص کے جسم میں دوسرے شخص کے خون کو منتقل کرنے کا جواز

قرآن مجید کی ان مذکور الصدر دونوں آیتوں میں شرعی ضرورت کے بغیر مردار اور خون وغیرہ کو حرام کیا گیا ہے اور جب شرعی ضرورت متحقق ہو یعنی ان چیزوں کے استعمال سے جان بچانے کا مسئلہ ہو یا بیماری کو زائل کرنا اور صحت کو قائم رکھنا مقصود ہو تو پھر ان چیزوں کے استعمال میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ؕ اور اللہ تعالیٰ نے دین کے احکام میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی۔ (الحج: ۷۸)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم صرف آسان احکام بیان کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو‘ اور مشکل احکام بیان کرنے کے لیے نہیں بھیجے گئے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۵ ‘مطبوعہ نور محمد اصح المطابع‘ کراچی ۱۳۸۱ھ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

دین سے مشقت اور بوجھ کو اٹھالیا گیا ہے اور شریعت میں قاعدہ یہ ہے کہ جس عبادت کی ادائیگی میں امت کو حرج اور تنگی ہو وہ عبادت امت سے اٹھالی گئی ہے‘ کیا تم نہیں دیکھتے کہ مضطر (مجبور) مردہ کھالیتا ہے‘ اور مریض روزہ توڑ دیتا ہے اور تیمم کر لیتا ہے اس کی اور مثالیں بھی ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۲۳۲ ‘مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران‘ ۱۳۸۷ھ)

مجبوری کی بعض حالتوں میں ایک بیمار یا زخمی انسان کے جسم میں دوسرے انسان کے خون کو منتقل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے‘ ایک وجہ یہ ہے کہ جب کسی حادثہ کی بناء پر جسم سے بہت زیادہ خون نکل جائے جس کی وجہ سے فوری طور پر اس کی جان بچانے کے لیے اس کے جسم میں خون منتقل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے‘ دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی شخص کا جگر خون بنانا بند کر دیتا ہے‘ اس وقت اس کو زندہ رکھنے کے لیے اس کے جسم میں مسلسل خون منتقل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے‘ تیسری وجہ بلڈ کینسر (خون کا سرطان) ہے جس میں بعض اوقات ہر ماہ جسم کا پورا خون بدلنا پڑتا ہے‘ چوتھی وجہ کوئی بڑا آپریشن ہے (مثلاً دل کا بائی پاس آپریشن) جس کی وجہ سے بعض اوقات جسم کا اتنا خون نکل جاتا ہے کہ اگر اس کے جسم میں دوسرا خون نہ منتقل کیا جائے تو اس کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔

یہ تمام اضطرار کی صورتیں ہیں اور قرآن مجید نے اضطرار کی صورت میں خون کو استعمال کرنے کی اجازت دی ہے‘ اس لیے ان صورتوں میں ایک شخص کے جسم میں دوسرے شخص کا خون منتقل کرنا جائز ہے۔

حرام چیزوں سے علاج کی ممانعت کے متعلق احادیث

بعض علماء مذکور ذیل احادیث کی بناء پر حرام دواؤں سے علاج کو ناجائز کہتے ہیں خواہ مریض مر جائے مگر حرام چیزوں سے علاج نہ کرے۔

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بیماری اور دوا دونوں نازل کی ہیں اور ہر بیماری کے لیے دواء ہے سو تم دوا کرو اور حرام دوا نہ لو۔

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۸۵ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبیث دوا سے منع فرمایا ہے۔

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۸۵ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

حضرت سوید بن طارق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کے متعلق پوچھا' آپ نے اس سے منع فرمایا' انہوں نے پھر سوال کیا' آپ نے پھر منع فرمایا' انہوں نے کہا: یا نبی اللہ! یہ دوا ہے' آپ نے فرمایا: نہیں' بلکہ یہ بیماری ہے۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۸۵ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نشہ آور چیزوں کے متعلق فرمایا: اللہ نے ان چیزوں میں تمہاری شفا نہیں رکھی جن کو تم پر حرام کیا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۴۰ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

مفتی محمد شفیع دیوبندی نے ''صحیح بخاری'' کی اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد لکھا ہے۔ (معارف القرآن ج ۱ ص ۴۲۶) حالانکہ ''صحیح بخاری'' میں یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

علامہ علی متقی نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ (کنز العمال ج ۱۰ ص ۵۳ 'مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میری بیٹی بیمار ہو گئی' میں نے اس کے لیے ایک کوزہ میں نبیذ بنایا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے' اس وقت نبیذ میں جوش آ رہا تھا' آپ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: میری بیٹی بیمار تھی' سو میں نے اس کے لیے یہ نبیذ بنایا ہے' آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس چیز میں تمہاری شفا نہیں رکھی جس کو تم پر حرام کیا ہے۔

(المعجم الکبیر ج ۲۳ ص ۳۲۷ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

اس حدیث کو امام ابویعلیٰ [۱]' امام ابن حبان [۲]' اور امام بیہقی [۳] نے بھی روایت کیا ہے۔

اس حدیث کو علامہ علی متقی نے بھی بیان کیا ہے۔ (کنز العمال ج ۱۰ ص ۵۲ 'مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۵ ص ۸۶ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

۱۔ امام احمد بن علی المثنی التمیمی الموصلی المتوفی ۳۰۷ھ مسند ابویعلیٰ ج ۶ ص ۲۷۰ 'مطبوعہ دار المامون للتراث' بیروت' ۱۴۰۴ھ

۲۔ امام ابو حاتم محمد بن حبان بستی متوفی ۳۵۴ھ' موارد الظمآن ص ۳۳۹ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت

۳۔ امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' سنن کبریٰ ج ۱۰ ص ۵ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان

علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ (الجامع الصغیر ج ۱ ص ۲۷۲ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

فقہاء اسلام کے نزدیک احادیث مذکورہ کا محمل

امام بیہقی تحریر فرماتے ہیں:

یہ دونوں حدیثیں (اللہ نے حرام میں شفا نہیں رکھی' اور حرام دوا سے علاج نہ کرو) اگر صحیح ہوں تو ان کا محمل یہ ہے کہ نشہ آور دوا سے علاج کرنا ممنوع ہے یا بغیر ضرورت کے ہر حرام دوا سے علاج کرنا ممنوع ہے تاکہ ان حدیثوں میں اور عرنیین کی حدیث میں تطبیق رہے۔ (سنن کبریٰ ج ۱۰ ص ۵ 'مطبوعہ نشر السنہ' ملتان)

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

ہمارے اصحاب (شافعیہ) کہتے ہیں کہ نجس چیز کو اس وقت بہ طور دوا استعمال کرنا جائز ہے جب اس کے قائم مقام پاک چیز نہ مل سکے' اگر پاک چیز مل جائے تو پھر نجس چیز بالاتفاق حرام ہے اور جس حدیث میں یہ ہے: اللہ نے اس چیز میں تمہاری شفا نہیں رکھی جس کو تم پر حرام کیا ہے' اس کا یہی محمل ہے کہ جب حرام دوا کے علاوہ حلال دوا بھی موجود ہو تو پھر حرام دوا کا استعمال حرام ہے' اور جب حرام دوا کے علاوہ کوئی اور دوا موجود نہ ہو تو پھر وہ حرام نہیں ہے' ہمارے اصحاب نے کہا: یہ اس وقت جائز ہے جب معالج طب کا عارف ہو اور اس کو علم ہو کہ اس دوا کا اور کوئی بدل نہیں ہے یا کوئی مسلمان نیک طبیب اس کی خبر دے' اور علامہ بغوی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ صرف ایک طبیب کی خبر بھی کافی ہے۔ (شرح المہذب ج ۹ ص ۵۱۔ ۵۰ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

علامہ احمد قسطلانی شافعی لکھتے ہیں:

امام ابوداؤد نے حضرت ام سلیم (بلکہ ام سلمہ) سے روایت کیا ہے کہ اللہ نے اس چیز میں تمہاری شفا نہیں رکھی جس کو تم پر حرام کیا ہے' یہ حالت اختیار پر محمول ہے لیکن ضرورت کے وقت یہ حرام نہیں ہے' جیسے ضرورت کے وقت مردار حرام نہیں ہے۔

(ارشاد الساری ج ۱ ص ۱۹۴ 'مطبوعہ مطبع میمنہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

علامہ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس حدیث کا یہی محمل بیان کیا ہے کہ حالت اختیار میں حرام چیز میں شفا نہیں ہے اور ضرورت کے وقت حرام دوا سے علاج کرنا جائز ہے۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۳۳۸ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

چونکہ ان دو حدیثوں میں حرام چیز کے ساتھ علاج کرنے سے منع فرمایا ہے' اس لیے عرنیین کی حدیث (جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنیوں کے پیشاب کو بہ طور دوا استعمال کرایا اور عرنیین تندرست ہو گئے) (صحیح بخاری' صحیح مسلم) ضرورت کی صورت پر محمول ہے' کیونکہ زہر کے ساتھ علاج کرنا جائز ہے اور اس کا پینا جائز نہیں ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۲۳۱ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ھ)

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس سے وہ صورت مراد ہے جب انسان کو حلال اور حرام دونوں دواؤں کے استعمال کا اختیار ہو' لیکن جب حرام دواء کے علاوہ اور کوئی دوا نہ ہو تو پھر وہ دوا شرعاً حرام نہیں رہے گی' جیسے ضرورت کے وقت مردار حرام نہیں رہتا۔ (عمدۃ القاری ج ۳ ص ۱۵۵ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

علامہ قاضی خاں حنفی لکھتے ہیں:

اس حدیث سے مراد وہ اشیاء ہیں جن میں شفا نہیں ہے لیکن جب کسی چیز میں شفا ہو تو پھر اس کے استعمال میں کوئی حرج

نہیں ہے' کیا تم نہیں دیکھتے کہ ضرورت کے وقت پیاسے کے لیے شراب پینا جائز ہے۔

(فتاویٰ قاضی خاں ج ۳ ص ۴۰۴' مطبوعہ مطبع کبریٰ امیریہ بولاق مصر' ۱۳۱۰ھ)

علامہ ابن بزاز کردری حنفی لکھتے ہیں:

اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ جب حرام دوا میں شفا کا علم ہو تو پھر اس کا استعمال حرام نہیں ہے' جیسے پھنسے ہوئے لقمہ کو حلق سے اتارنے کے لیے (جب پانی نہ ہو تو) شراب کا گھونٹ پینا جائز ہے' اسی طرح پیاسے کے لیے شراب پینا جائز ہے۔

(فتاویٰ بزازیہ علی ہامش الہندیہ ج ۶ ص ۳۶۵' مطبوعہ مطبع کبریٰ امیریہ بولاق)

علامہ حموی حنفی لکھتے ہیں:

علامہ تمرتاشی نے "شرح الجامع الصغیر" میں تہذیب سے نقل کیا ہے کہ بیمار کے لیے مردار کھانا' اور خون اور پیشاب کو پینا جائز ہے' بہ شرطیکہ مسلمان طبیب یہ کہے کہ اس میں شفاء ہے اور اس کے قائم مقام جائز چیز نہ ملے۔

(غمز عیون البصائر ج ۱ ص ۲۷۵' مطبوعہ دار الباز' مکہ مکرمہ' ۱۴۰۵ھ)

علامہ شامی حنفی لکھتے ہیں:

جس چیز میں شفا ہو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے' جس طرح ضرورت کے وقت پیاسے کے لیے شراب حلال ہے' صاحب "ہدایہ" نے "تجنیس" میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۱۴۰' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

ضرورت کے وقت حرام چیزوں سے علاج کے متعلق احادیث اور فقہاء اسلام کی تشریحات

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عکل یا عرینہ سے کچھ لوگ آئے اور انہیں مدینہ کی آب و ہوا موافق نہ آئی' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ اونٹنیوں کا دودھ اور پیشاب پئیں' جب وہ تندرست ہو گئے تو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چرواہوں کو قتل کر دیا۔

علامہ بدر الدین عینی لکھتے ہیں:

امام بخاری نے اس حدیث کو آٹھ سندوں سے روایت کیا ہے' امام مسلم نے اس حدیث کو سات سندوں سے روایت کیا ہے' امام ابوداؤد اور امام نسائی نے بھی اس حدیث کو متعدد سندوں سے روایت کیا ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۳ ص ۱۵۱' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' ۱۳۴۸ھ)

نیز اس حدیث کو امام ترمذی نے کتاب الطہارۃ' اطعمہ اور الطب میں روایت کیا ہے' امام ابن ماجہ نے کتاب الحدود میں روایت کیا ہے' امام احمد بن حنبل نے مسند احمد (ج ۱ ص ۱۹۲' ج ۳ ص ۱۰۷۔ ۱۶۱۔ ۱۷۷۔ ۱۹۸۔ ۲۰۵۔ ۲۸۷۔ ۲۹۰۔ ۳۷۰) میں روایت کیا ہے۔

علامہ بدر الدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ پیشاب پینا تو حرام ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس وقت حرام ہے جب دوسری دوا کا بھی اختیار ہو۔ (عمدۃ القاری ج ۳ ص ۱۵۵' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' ۱۳۴۸ھ)

علامہ نووی شافعی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ خمر اور باقی نشہ آور مشروبات کے سوا ہر نجس چیز کے ساتھ علاج کرنا جائز ہے۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۵۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

لیکن علامہ نووی نے ''شرح المہذب'' میں لکھا ہے کہ ضرورت کی بناء پر شراب سے بھی علاج جائز ہے۔

(شرح المہذب ج ۹ ص ۵۱ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خارش کی وجہ سے حضرت عبدالرحمان بن عوف اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو ریشم کی قمیص پہننے کی اجازت دی۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۰۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ بدرالدین عینی حنفی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

علامہ نووی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث امام شافعی اور ان کے موافقین کے موقف پر صراحۃً دلالت کرتی ہے کہ اگر مردوں کو خارش ہو تو ان کے لیے ریشم پہننا جائز ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۲ ص ۱۹۶ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

ملا علی قاری حنفی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

جوؤں یا خارش کی وجہ سے ریشم پہننے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (مرقات ج ۸ ص ۲۳۲ 'مطبوعہ مکتبہ امدادیہ' ملتان' ۱۳۹۰ھ)

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

عبدالرحمن بن طرفہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے دادا عرفجہ بن اسعد کی جنگ کلاب میں ناک کٹ گئی' انہوں نے چاندی کی ناک لگائی' اس میں بدبو پیدا ہو گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سونے کی ناک بنانے کا حکم دیا۔ امام ابوداؤد نے اس حدیث سے دانت کو سونے کے ساتھ باندھنے کے جواز پر استدلال کیا ہے۔

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۲۵ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

امام ترمذی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور اس حدیث سے دانت کو سونے کے ساتھ باندھنے کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ (جامع ترمذی ص ۲۶۸ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام نسائی[1] اور امام احمد[2] نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث کی بناء پر سونے کی ناک لگانے اور سونے کے ساتھ دانت کے باندھنے کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

(مرقات ج ۸ ص ۲۸۰ 'مطبوعہ مکتبہ امدادیہ' ملتان' ۱۳۹۰ھ)

ہم نے اس بحث میں فقہاء احناف' فقہاء شافعیہ اور فقہاء مالکیہ کی تصریحات پیش کی ہیں کہ ضرورت کے وقت حرام دواؤں سے علاج کرنا جائز ہے' فقہاء حنبلیہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے' بعض منع کرتے ہیں اور جمہور جائز کہتے ہیں' علامہ مرداوی حنبلی لکھتے ہیں:

جمہور اصحاب کے نزدیک اضطرار کے وقت حرام چیز بہ قدر ضرورت کھانا جائز ہے اور اضطرار اس وقت ہے جب جان کی ہلاکت کا خدشہ ہو یا جان کے نقصان کا خدشہ ہو یا مرض کا خدشہ ہو یا مرض کے بڑھنے کا خدشہ ہو اور اگر مرض کے طول کا خدشہ ہو تو صحیح مذہب یہ ہے کہ پھر بھی اضطرار ہے۔ (الانصاف ج ۱۰ ص ۳۷۰ - ۳۶۹ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۳۷۴ھ)

---

[1] امام احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ' سنن نسائی ج ۲ ص ۲۸۵ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[2] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۵ ص ۲۳ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

صحت اور زندگی کی حفاظت کا حکم باقی تمام احکام پر مقدم ہے

بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ خون کی حرمت قطعی ہے اور خون منتقل کرنے سے مریض کا بچ جانا یا اس کا صحت یاب ہو جانا ظنی ہے اور ظنی فائدہ کی امید پر حرام قطعی کا ارتکاب کرنا جائز نہیں ہے' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عرنیین کو بیماری میں اونٹنیوں کا پیشاب پلایا تھا' اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو وحی کے ذریعہ علم تھا کہ ان کی اسی سے شفا ہو گی اور وحی کا علم قطعی ہے' اس لیے اس سے معارضہ نہیں کیا جا سکتا' اور فقہاء نے شدید بھوک کی حالت میں مردار اور خنزیر کھانے کا جو جواز لکھا ہے اس سے بھی معارضہ صحیح نہیں ہے' کیونکہ کسی چیز کے کھانے سے بھوک کا زائل ہونا قطعی ہے اور دوا سے بیماری کا علاج ظنی ہے' اسی طرح یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر حلق میں لقمہ پھنسا ہوا ہو اور کوئی اور پینے کی چیز نہ ملے تو شراب کا گھونٹ پی کر لقمہ کو حلق سے نیچے اتارنا جائز ہے کیونکہ کسی مشروب سے لقمہ کا حلق سے اتر جانا قطعی ہے اور دوا سے صحت اور شفا کا حاصل ہونا ظنی ہے اور ظنی کو قطعی پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔

اس اعتراض کی قوت اور متانت میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن معترض نے اس پر توجہ نہیں کی کہ جان کو بچانا اور صحت کو قائم رکھنا فرض ہے اور یہ فرض باقی تمام فرائض پر مقدم ہے اور خواہ جان بچانا اور مرض سے محفوظ رکھنا کسی ظنی امر پر موقوف ہو اس کے لیے فرض قطعی کو ترک کر دیا جائے گا' قرآن مجید میں ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ (النساء: ۲۹)

اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو' بے شک اللہ تم پر بے حد رحم فرمانے والا ہے ۝

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ (البقرہ: ۱۹۵)

اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

رمضان میں روزہ رکھنا فرض قطعی ہے' لیکن اگر روزہ رکھنے سے بیمار پڑنے یا مرض بڑھنے کا خدشہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے رمضان میں روزہ نہ رکھنے اور بعد میں اس کو قضاء کرنے کا حکم دیا ہے:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ (البقرہ: ۱۸۵)

تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں موجود ہو تو وہ ضرور اس ماہ کے روزے رکھے' اور جو شخص بیمار یا مسافر ہو (اور روزے نہ رکھے) تو اسے دوسرے دنوں میں (قضا شدہ) عدد پورا کرنا لازم ہے' اللہ تم پر آسانی کا ارادہ فرماتا ہے اور تنگی کا ارادہ نہیں فرماتا اور تاکہ تم عدد پورا کرو۔

روزہ رکھنے سے بیماری لاحق ہونا' یا بیماری کا بڑھنا' اسی طرح سفر سے مشقت کا لاحق ہونا ایک امر ظنی ہے لیکن اس امر ظنی کی وجہ سے فرض قطعی کو ترک کرنے کا حکم دیا ہے' اس سے واضح ہو گیا کہ زندگی اور صحت کی حفاظت کرنے کا حکم باقی تمام فرائض پر مقدم ہے اور اگر کوئی شخص روزہ رکھنے کے حکم پر عمل کرنے کو صحت کی حفاظت پر مقدم کرے اور سفر کی مشقت برداشت کر کے روزہ رکھے تو وہ گنہ گار ہو گا۔ امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہِ رمضان میں مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ آپ نے روزہ رکھ لیا' حتیٰ کہ آپ کراع الغمیم پر پہنچ گئے' سو لوگوں نے بھی روزہ رکھ لیا تھا' پھر آپ نے پانی کا پیالہ منگایا اور اس کو اوپر اٹھا کر پی لیا' جس کو سب لوگوں نے دیکھ لیا' پھر آپ کو بتایا گیا کہ بعض لوگ بدستور روزہ سے ہیں اور ان پر روزہ دشوار ہو رہا ہے' آپ نے فرمایا: یہ لوگ نافرمان ہیں' یہ لوگ نافرمان ہے۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۵۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۷۵ھ)

علامہ نووی لکھتے ہیں:

یہ حدیث اس شخص پر محمول ہے جس کو سفر میں روزہ رکھنے سے ضرر ہو۔

(شرح مسلم ج ۱ ص ۳۵۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ صحت کو قائم رکھنا روزہ رکھنے پر مقدم ہے حالانکہ روزہ رکھنا فرض قطعی ہے اور سفر میں روزہ رکھنے سے مشقت کا لاحق ہونا ایک امر ظنی ہے اور اس امر ظنی کی بناء پر اس فرض قطعی کو ترک کرنا واجب ہے اور اس پر عمل کرنا گناہ ہے۔

نیز امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے ہم میں سے بعض روزہ دار تھے اور بعض نے روزہ نہیں رکھا تھا اس دن بہت سخت گرمی تھی ہم نے ایک جگہ قیام کیا ہم میں سے اکثر لوگ چادروں سے اپنے اوپر سایا کیے ہوئے تھے اور بعض اپنے ہاتھوں سے اپنے اوپر سایا کر رہے تھے روزہ دار (بے ہوش ہو کر) گر گئے اور روزہ نہ رکھنے والوں نے ان پر سایا کیا اور ان پر پانی کے چھینٹے ڈالے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج روزہ نہ رکھنے والے اجر لے گئے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۵۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۷۵ھ)

علامہ المرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

جو شخص رمضان میں بیمار ہو اور اس کو یہ خدشہ ہو کہ اگر اس نے روزہ رکھا تو اس کا مرض بڑھ جائے گا تو وہ روزہ نہ رکھے اور قضاء کرے امام شافعی کہتے ہیں کہ وہ روزہ رکھے وہ (روزہ نہ رکھنے کے لیے) جان کی ہلاکت یا عضو کی ہلاکت کا اعتبار کرتے ہیں اور ہم یہ کہتے ہیں کہ مرض کا زیادہ ہونا اور اس کا بڑھنا کبھی ہلاکت کا موجب ہوتا ہے اس لیے اس سے احتراز کرنا واجب ہے۔ (ہدایہ اولین ص ۲۲۱ مطبوعہ شرکت علمیہ ملتان)

مرض کا زیادہ ہونا ایک امر ظنی ہے اسی طرح امام شافعی کے اعتبار سے روزہ رکھنے سے جان یا عضو کی ہلاکت بھی ایک امر ظنی ہے اور اس امر ظنی کی وجہ سے رمضان میں روزہ رکھنے کے قطعی حکم کے ترک کرنے کو نہ صرف جائز بلکہ واجب قرار دیا گیا ہے اس سے واضح ہو گیا کہ صحت اور زندگی کی حفاظت کا حکم باقی تمام احکام پر مقدم ہے۔

نیز علامہ المرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

اگر ایک شخص مسافر ہو اور اس کو روزہ سے ضرر نہ ہو تو اس کا روزہ رکھنا افضل ہے اور اگر وہ روزہ نہ رکھے تو جائز ہے کیونکہ سفر مشقت سے خالی نہیں ہوتا اس لیے سفر میں نفس مشقت کو (روزہ نہ رکھنے کا) عذر قرار دیا گیا ہے اس کے برخلاف مرض میں کبھی روزہ رکھنے سے فائدہ ہوتا ہے (جیسے ہیضہ میں) اس لیے مرض میں روزہ نہ رکھنے کے لیے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ روزہ رکھنے سے ضرر ہو۔

امام شافعی یہ کہتے ہیں کہ سفر میں (مطلقاً) روزہ نہ رکھنا افضل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔ (صحیح بخاری)

ہمارے نزدیک یہ حدیث اس سفر پر محمول ہے جس میں مشقت ہو اور اگر مریض اور مسافر اسی حال میں مر جائیں تو ان پر قضا لازم نہیں ہے۔ (ہدایہ اولین ص ۲۲۱ مطبوعہ شرکت علمیہ ملتان)

سفر میں مشقت کا لاحق ہونا بھی ایک امر ظنی ہے جس کی بناء پر رمضان میں روزہ کے قطعی حکم کو ترک کرنے کی رخصت دی گئی ہے۔

نیز علامہ المرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں جب (رمضان میں) روزہ رکھنے سے اپنے اوپر یا اپنے بچہ کے اوپر (ضرر کا) خوف محسوس کریں تو روزہ نہ رکھیں اور قضا کریں تاکہ ان پر تنگی نہ ہو۔ (ہدایہ اولین ص ۲۲۲ مطبوعہ شرکت علمیہ ملتان)

حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کو روزہ رکھنے سے ضرر کا لاحق ہونا بھی ایک امر ظنی ہے۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۱۱۶)

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

غلبہ ظن' علامات' تجربہ یا مسلمان ماہر طبیب کے بتانے سے اگر تندرست شخص کو روزہ رکھنے سے بیمار پڑنے کا خدشہ ہو تو ان کے لیے (رمضان میں) روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور جب وہ روزہ رکھنے پر قادر ہوں تو اس کی لازماً قضا کریں۔

(درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۲ ص ۱۱۷۔ ۱۱۶ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

جو شخص بہت بوڑھا ہو یا جس کو ایسا مرض لاحق ہو جس سے شفاء کی امید نہیں ہے (جیسے ذیابیطس اور ہائی بلڈ پریشر) اور اس وجہ سے اس کو روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو اس کے لیے روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے اور اس پر ہر روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کے طعام کا (دو کلو گندم) فدیہ دینا لازم ہے' قرآن مجید میں ہے:

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۭ (البقرہ: ۱۸۴) اور جو لوگ روزہ کی طاقت نہ رکھتے ہوں' ان پر ایک مسکین کے طعام کا فدیہ لازم ہے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

شیخ فانی اور جس شخص کو ایسا مرض لاحق ہو جس سے شفا کی امید نہ ہو' اس رخصت میں داخل ہیں۔

(ردالمحتار ج ۲ ص ۱۱۹ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

کسی مرض سے شفا کی امید نہ ہونا بھی امر ظنی ہے' جس کا مدار تجربہ' مشاہدہ اور طبیب کے قول پر ہے اور ان میں سے کوئی چیز قطعی نہیں ہے اور اس کی بناء پر دائماً روزہ کو ترک کرنے اور اس کے بدلہ میں فدیہ دینے کا حکم دیا گیا ہے' حالانکہ روزہ کا حکم فرض قطعی ہے۔

امام بخاری نے ایک باب کا یہ عنوان قائم کیا ہے: جب جنبی کو اپنے نفس پر موت کا یا مرض کا خدشہ ہو یا پیاس کا اندیشہ ہو تو وہ تیمم کرلے اور اس کے تحت یہ حدیث ذکر کی ہے:

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سردی کی ایک رات میں جنبی ہو گئے' انہوں نے تیمم کیا اور یہ آیت تلاوت کی:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ (النساء: ۲۹) اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو' بے شک اللہ تم پر بے حد رحم فرمانے والا ہے ۝

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کا ذکر کیا گیا تو آپ نے اس پر ملامت نہیں کی' یعنی اس عمل کو صحیح قرار دیا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۹ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

جنبی کے لیے غسل کرنے کا حکم فرض قطعی ہے اور سردی میں غسل کرنے سے موت یا مرض کا اندیشہ محض ظن پر مبنی ہے' حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اس ظن کی بناء پر فرض قطعی کو ترک کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو

مقرر رکھا اور صحیح قرار دیا اور امام بخاری نے اس سے یہ مسئلہ مستنبط کیا کہ جنبی کے لیے مرض یا موت کے اندیشہ سے غسل کی بجائے تیمم کرنا جائز ہے۔

قرآن مجید' احادیث' محدثین اور فقہاء کی تصریحات سے یہ واضح ہو گیا کہ صحت اور زندگی کی حفاظت کا حکم باقی تمام احکام پر مقدم ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک یہ یقین نہ ہو کہ حرام چیز کے علاوہ اور کسی چیز میں شفا نہیں ہے اس کا استعمال جائز نہیں ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ غیر نبی کے لیے یقین کا حصول ممکن نہیں ہے اس لیے عام مکلفین کے لیے صرف غلبہ ظن کا اعتبار کیا جائے گا۔ علامہ شامی لکھتے ہیں:

تم کو معلوم ہے کہ اطباء کے قول سے یقین حاصل نہیں ہوتا اور ظاہر یہ ہے کہ تجربہ سے بھی غلبہ ظن حاصل ہوتا ہے یقین حاصل نہیں ہوتا' البتہ فقہاء علم اور یقین سے غلبہ ظن مراد لیتے ہیں اور ان کی عبارات میں یہ اطلاق عام اور شائع ہے۔

(ردالمحتار ج ا ص ۱۴۰' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اللہ کی دی ہوئی رخصت پر عمل کرنا واجب ہے

اس بحث میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ ہم اپنی زندگی کے مالک نہیں ہیں' ہمارے پاس یہ زندگی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے' ہم اس کو ضائع کرنے یا نقصان پہنچانے کے مجاز نہیں ہیں' اس لیے کسی مضر چیز کو استعمال کر کے زندگی اور صحت کو نقصان پہنچانا جائز ہے نہ بیماری میں علاج کو ترک کر کے زندگی اور صحت کو نقصان پہنچانا جائز ہے' بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بیماری میں حرام چیز سے علاج نہ کرنا عزیمت اور تقویٰ ہے اور علاج کرنا رخصت اور فتویٰ ہے اور عزیمت اور تقویٰ پر عمل کرنا افضل ہے' یہ محض جہالت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عذر کی حالت میں جو رخصت دی ہے اس پر عمل کرنا واجب ہے اور عمل نہ کرنا گناہ ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے تمہارے لیے جو رخصت دی ہے اس رخصت پر عمل کرنا تم پر واجب ہے۔ (صحیح مسلم ج ا ص ۳۵۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اللہ کی دی ہوئی رخصت کو قبول نہیں کیا اس کو میدان عرفات کے پہاڑوں کے برابر گناہ ہو گا۔

(مسند احمد ج ۲ ص ۷۱' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

حضرت عبد اللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ جس طرح اپنی معصیت کو ناپسند فرماتا ہے' اسی طرح اپنی دی ہوئی رخصت پر عمل کرنے کو پسند فرماتا ہے۔

(مسند احمد ج ۲ ص ۱۰۸' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (اس جانور کا کھانا حرام ہے) جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ (البقرہ: ۱۷۳)

"وما اھل بہ لغیر اللہ" کی تحقیق

امام ابن جریر طبری فرماتے ہیں' اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) مجاہد نے کہا: اس سے مراد وہ جانور ہیں جن کو غیر اللہ کے لیے ذبح کیا گیا ہو' قتادہ نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ جس

جانور پر اللہ کا نام لیے بغیر غیر اللہ کے لیے ذبح کیا گیا ہو' حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہود اور نصاریٰ کے علاوہ دیگر کافروں نے جس جانور کو بتوں کے لیے ذبح کیا ہو' اس سے وہ جانور مراد ہے۔

(۲) ربیع نے کہا: اس سے مراد وہ جانور ہے جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو' ابن وہب نے کہا: اس سے مراد وہ جانور ہیں جن کو بتوں کے لیے ذبح کیا جائے اور ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۵۱ 'مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ ابوبکر جصاص لکھتے ہیں: مسلمانوں کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس سے مراد وہ ذبیحہ ہے جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا جائے۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۱۲۵ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے: وآنچہ آواز بلند کردہ شود در ذبح وے بغیر خدا۔

علامہ ابو الحیان اندلسی لکھتے ہیں:

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے لیے ذبح کیا گیا ہو وہ حرام ہے' اور بت' مسیح وغیرہ یہ سب غیر اللہ میں داخل ہیں' اس کو اہلال (آواز بلند کرنا) کہتے ہیں کیونکہ ذبح کے وقت یہ بلند آواز سے اس کا نام لیتے ہیں جس کے لیے جانور کو ذبح کرتے ہیں' پھر اس کے مفہوم میں وسعت دی گئی اور ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے لیے ذبح کیا گیا ہو اس کو "ما اهل به لغير الله" کہا جانے لگا' خواہ بلند آواز سے اس کا ذکر کیا گیا ہو یا نہیں' اور عطاء' مکحول' حسن بصری' شعبی' ابن المسیب' اوزاعی اور لیث وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ جانور ہیں جن کو بتوں کی قربان گاہ پر ذبح کیا جائے اور وہ کہتے ہیں کہ مسیح کے نام پر نصرانی کا کیا ہوا ذبیحہ جائز ہے اور امام ابو حنیفہ' امام ابو یوسف' امام محمد' امام زفر' امام مالک اور امام شافعی یہ کہتے ہیں کہ جب نصرانی مسیح کے نام پر جانور کو ذبح کریں تو ان کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا۔

(البحر المحیط ج ۲ ص ۱۱۵ 'مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۲ھ)

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

امیر یا کسی معظم شخص کی آمد پر جانور کو ذبح کیا گیا تو یہ ذبیحہ حرام ہے کیونکہ یہ "ما اهل به لغير الله" ہے' خواہ اس کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو' اور اگر مہمان کے لیے جانور کو ذبح کیا گیا تو یہ حرام نہیں ہے کیونکہ یہ حضرت ابراہیم کی سنت ہے اور فرق یہ ہے کہ اگر اس نے جانور کو کھانے کے لیے ذبح کیا ہے تو ذبح کرنا اللہ کے لیے ہے اور منفعت مہمان یا دعوت کے لیے ہے اور اگر اس نے کھانے کے لیے ذبح نہیں کیا بلکہ غیر اللہ کے لیے ذبح کرتا ہے تو یہ غیر اللہ کی تعظیم کی وجہ سے حرام ہے' علامہ شامی نے وضاحت کی ہے کہ اگر ذبح سے غیر اللہ کی تعظیم کا قصد ہوگا تو ذبیحہ حرام ہوگا (مثلاً کوئی بڑا آدمی آیا تو اس کی تعظیم کے لیے جانور کا خون بہا دیا' تو یہ ذبیحہ حرام ہے[1]) اور اگر یہ قصد نہیں ہے تو ذبیحہ جائز ہے مثلاً مکان کی بنیاد ڈالتے وقت جانور ذبح کیا جائے' یا کسی کے بیمار ہونے پر یا کسی کے بیماری سے شفا پانے پر' تو اس ذبیحہ کے حلال ہونے میں کوئی شک نہیں ہے' کیونکہ اس ذبیحہ سے مقصد اس کے گوشت کو صدقہ کرنا ہے' حموی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی شخص نے یہ نذر مانی کہ اگر وہ سمندر کے سفر سے سلامت واپس آ گیا تو اللہ کی رضا کے لیے ایک جانور ذبح کرے گا' بحر۔ اس پر لازم ہے کہ وہ اس کے گوشت کو صرف فقراء پر صدقہ کرے' شبلی۔ آیا غیر اللہ کی تعظیم کے لیے ذبح کرنے والا کافر ہو جائے گا یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں' بزازیہ و شرح وہبانیہ۔

---

[1] ہو سکتا ہے ان فقہاء کے زمانہ میں کسی بڑے آدمی کے آنے پر اس کی تعظیم کے لیے جانور کو ذبح کر کے اس کا خون بہایا جاتا ہو مگر اب یہ کہیں مروج نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ''منیہ'' کی کتاب الصید میں ہے کہ یہ فعل مکروہ ہے اور وہ کافر نہیں ہوگا کیونکہ ہم کسی مسلمان کے ساتھ یہ بدگمانی نہیں کرتے کہ وہ اس ذبح سے کسی آدمی کا تقرب حاصل کرے گا۔ (علامہ شامی فرماتے ہیں: یعنی تقرب علی وجہ العبادۃ کیونکہ وہی کفر کا سبب ہے' اور یہ مسلمان کے حال سے بہت بعید ہے' لہٰذا جو شخص کسی بڑے آدمی کے آنے پر جانور کو ذبح کرتا ہے اس کا مقصد یا تو دنیاداری ہے یا اس جانور کو ذبح کر کے اس شخص سے اظہار محبت کرنا اور اس کے نزدیک مقبول ہونا اس کا مقصود ہے' لیکن جب کہ اس فعل میں اس کی تعظیم داخل ہے تو اس جانور پر بسم اللہ پڑھنا حکماً محض اللہ کے لیے نہ ہوا اور یہ ایسا ہو گیا جیسے اس نے بسم اللہ اور بسم فلاں پڑھا تو یہ ذبیحہ حرام ہو جائے گا لیکن حرمت اور کفر میں تلازم نہیں ہے)۔

(درمختار مع ردالمحتار ج ۵ ص ۱۹۸۔ ۱۹۷' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اگر کوئی شخص غیر اللہ کی نذر مانے مثلاً یہ کہے کہ اگر فلاں بزرگ نے میرا کام کر دیا تو میں اس بزرگ کے لیے ایک بکرا ذبح کروں گا' سو یہ نذر حرام ہے کیونکہ ''البحر الرائق'' اور فقہ کی دیگر کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ نذر عبادت ہے اور مخلوق کی نذر ماننا حرام ہے اور اگر اس شخص نے اس بزرگ کی تعظیم کے لیے اس بکرے کو ذبح کیا تو فقہاء کی تصریحات مذکورہ کی بناء پر وہ ذبیحہ حرام ہوگا اور ''وما اهل به لغير الله'' کا مصداق ہوگا اور اگر اس نے اللہ کی نذر مانی مثلاً یہ کہا کہ اگر اللہ نے میرا فلاں کام کر دیا تو میں اس کے لیے ایک بکرا ذبح کروں گا تو یہ نذر جائز ہے' اور یہ ذبیحہ بھی جائز ہے اور اگر وہ نذر ماننے کے بعد یہ کہے کہ میں اس بکرے کا گوشت فلاں بزرگ کے مزار کے فقراء میں تقسیم کروں گا اور اس نذر کا ثواب فلاں بزرگ کو پہنچاؤں گا تو یہ بھی جائز ہے' لیکن یہاں نذر کے لفظ سے احتراز کرنا چاہیے تاکہ اس عرفی نذر کا شرعی نذر سے التباس نہ ہو اور ان پڑھ عوام کے عقائد خراب نہ ہوں' اس طرح ایصال ثواب کرنے کو علماء دیوبند نے بھی جائز کہا ہے' شیخ محمود الحسن لکھتے ہیں:

البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کر کے فقراء کو کھلائے اور اس کا ثواب کسی قریب' یا پیر اور بزرگ کو پہنچا دے' یا کسی مردہ کی طرف سے قربانی کر کے اس کا ثواب اس کو دینا چاہیے کیونکہ یہ ذبح غیر اللہ کے لیے ہرگز نہیں۔

(حاشیہ بر قرآن ص ۳۲' مطبوعہ سعودی عربیہ)

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُونَ بِهٖ

بے شک جو لوگ اس کو چھپاتے ہیں جس کو اللہ نے کتاب میں نازل کیا ہے' اور اس کے بدلے میں تھوڑا سا معاوضہ

ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولٰٓئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ

لیتے ہیں یہ لوگ اپنے پیٹوں میں محض آگ بھر رہے ہیں اور اللہ قیامت کے دن ان سے کلام

اللَّهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾ أُولٰٓئِكَ

نہیں کرے گا' اور نہ ان کو (گناہوں سے) پاک کرے گا' اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے O یہ وہ لوگ

الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ

ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو خرید لیا' اور مغفرت کے بدلہ میں عذاب کو (خرید لیا) وہ آگ پر

اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ

کس قدر صبر کرنے والے ہیں O یہ (مخالفت) اس لیے ہے کہ اللہ نے حق کے ساتھ کتاب نازل کی' اور بے شک

الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع

جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا وہ بہت زیادہ مخالفت میں ہیں O

تورات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کو چھپانے کا گناہ ہونا

اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے ان کو کھانا' اور پاک اور صاف چیزوں کو نہ کھانا جس طرح گمراہی اور گناہ ہے' اسی طرح تورات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف بیان کیے ہیں ان کو چھپانا اور ان کے عوض دنیا کا قلیل مال حاصل کرنا گمراہی اور گناہ ہے۔ جس چیز سے بعینہٖ فائدہ حاصل نہ کیا جا سکے بلکہ اس کو خرچ کر کے کوئی فائدہ کی چیز حاصل کی جا سکے اس کو ثمن کہتے ہیں' علماء یہود تورات کی آیات کو چھپا کر جو دنیاوی فوائد اور نذرانے حاصل کرتے تھے اس کو ثمن قلیل اس لیے فرمایا کہ اس سے فائدہ حاصل کرنے کی مدت قلیل ہے اور دنیا کی متاع بجائے خود قلیل ہے۔ یہ فرمایا کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں' تاکہ کھانے کا معنی مؤکد ہو جائے اور یہ وہم نہ ہو کہ یہاں آگ کھانا مجاز ہے' اس آیت کی تفصیل البقرہ: ۴۱ میں گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلام نہ کرنے اور نظر نہ فرمانے کی توجیہ

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخصوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا' نہ ان کی طرف نظر رحمت فرمائے گا' نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو تین بار پڑھا' حضرت ابوذر نے کہا: یہ لوگ نقصان اٹھانے والے اور نامراد ہیں۔ یا رسول اللہ! یہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: (تکبر سے) چادر کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والا' احسان جتانے والا اور جھوٹی قسم کھا کر سودا بیچنے والا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخصوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا' نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا' اور نہ ان کی طرف نظر رحمت فرمائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے' بوڑھا زانی' جھوٹا بادشاہ اور متکبر فقیر۔ حضرت ابو ہریرہ سے ایک اور روایت میں ہے: جو شخص جنگل میں مسافر کو فالتو پانی دینے سے (بھی) منع کرے' جو شخص عصر کے بعد کسی کو جھوٹی قسم کھا کر سودا فروخت کرے اور یہ کہے کہ خدا کی قسم! اس نے وہ چیز اتنے کی لی تھی حالانکہ اس طرح نہ ہو اور وہ شخص اس کو سچا سمجھے' اور جو شخص کسی امام سے مال دنیا کی خاطر بیعت کرے اگر وہ اس کو مال دے تو وہ اس سے وفا کرے اور مال نہ دے تو اس سے وفا نہ کرے۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۷۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس وعید کے متعلق امام مسلم نے تین مختلف حدیثیں روایت کی ہیں' ہر حدیث میں تین مختلف شخصوں کا بیان ہے جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا' خلاصہ یہ ہے کہ یہ نو ایسے گناہ ہیں جن کی وجہ سے قیامت کے دن انسان اللہ تعالیٰ

کے لطف وکرم سے محروم ہوگا اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس امت میں ان کبائر میں مبتلا ہیں گے اور بغیر توبہ کے مرجائیں گے اور قرآن مجید میں اس عذاب کا مصداق ان یہودیوں کو قرار دیا ہے جو تورات میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آیات کو چھپاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو اختیار کرلیا۔ (البقرہ: ۱۷۵)

اس آیت کی تفسیر کے لیے البقرہ: ۱۶ ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا وہ بہت زیادہ مخالفت میں ہیں O (البقرہ: ۱۷۶)

ایک قول یہ ہے کہ اختلاف کرنے والے یہودی تھے نصاریٰ یہ کہتے تھے کہ تورات میں حضرت عیسیٰ کی صفت ہے اور یہود اس کی مخالفت کرتے تھے یا تورات میں ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات تھیں یہود ان کی مخالفت کرتے تھے یا یہودی قرآن مجید کے احکام کی مخالفت کرتے تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اختلاف کرنے والے مشرکین تھے بعض کہتے تھے کہ یہ قرآن سحر ہے بعض کہتے تھے کہ یہ "اساطیر الاولین" ہے یعنی پچھلے لوگوں کے قصے اور بعض کہتے تھے کہ اس میں اللہ پر افتراء ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ

(اصل) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو لیکن (اصل)

الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَ

نیکی اس شخص کی ہے جو اللہ پر ایمان لائے اور یوم آخرت اور فرشتوں اور کتابوں اور

النَّبِيِّينَ ۚ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَ

نبیوں پر ایمان لائے اور مال سے اپنی محبت کے باوجود (اللہ کے حکم سے) رشتہ داروں یتیموں

الْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَ

مسکینوں مسافروں سوالیوں اور غلام آزاد کرانے کے لیے خرچ کرے اور

أَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ ۚ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۖ

نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے جب وہ عہد کریں

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ

اور تکلیف اور سختی میں اور جہاد کی مشقت میں صبر کرنے والے ہیں

الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

سچے لوگ ہیں اور یہی متقی ہیںO

آیت مذکورہ کے شان نزول کے متعلق اقوال

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے' یعنی صرف یہ نیکی نہیں ہے کہ تم نماز پڑھ لو اور اس کے سوا اور کوئی نیک عمل نہ کرو۔

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ یہود مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور نصاریٰ مشرق کی طرف منہ کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی کہ صرف مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر لینا کوئی نیکی نہیں ہے۔

ایک اور سند کے ساتھ قتادہ نے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی کے متعلق سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو بلایا اور اس پر یہ آیت تلاوت فرمائی' اور فرائض کے نازل ہونے سے پہلے جب کوئی شخص توحید و رسالت کی گواہی دے دیتا تو اس کے حق میں خیر کی توقع کی جاتی تھی۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۵۶۔ ۵۵ 'مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اللہ تعالیٰ' یوم آخرت' فرشتوں' کتابوں اور نبیوں پر ایمان لانے کا معنی

اللہ پر ایمان لانے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرے' اس کو ہر عیب اور نقص سے منزہ مانے' اس کی تمام صفات کو قدیم مانے اور اس کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ کرے' اس کے سوا کسی کو نہ واجب اور قدیم مانے اور نہ اس کے سوا کسی کو عبادت کا مستحق مانے اور اس کے تمام رسولوں کی تصدیق کرے اور حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی اور آپ کی شریعت کو آخری شریعت مانے۔

یوم آخرت پر ایمان لانے کا معنی یہ ہے کہ قیامت کی' مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کی' عذاب قبر اور قیامت کے بعد جزا' سزا' حساب و کتاب کی' صراط' میزان اور انبیاء اور رسل علیہم السلام کی شفاعت کی تصدیق کرے۔

فرشتوں پر ایمان لانے کا معنی یہ ہے کہ فرشتوں کے معصوم ہونے' اور رسل ملائکہ کی رسالت' کراما کاتبین کے اعمال کو لکھنے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ان کے عمل کرنے کی تصدیق کرے اور تذکیر و تانیث سے فرشتوں کو بری مانے۔

کتاب پر ایمان لانے کا معنی یہ ہے کہ اس کا اقرار کرے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جس کو حضرت جبرائیل نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر نازل کیا ہے' یہ آخری کتاب ہے' اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی نہ کوئی اس کی کسی ایک سورت کی بھی مثل لا سکتا ہے۔

تمام نبیوں پر ایمان لانے کا معنی یہ ہے کہ یہ مانے کہ تمام انبیاء اور رسل برحق ہیں اور سب پر ایمان لانا ضروری ہے یہ جائز نہیں ہے کہ بعض نبیوں پر ایمان لایا جائے اور بعض کا کفر کیا جائے' چونکہ ایمان کامل میں اعمال بھی داخل ہیں' اس لیے ایمان کے بعد اعمال کا ذکر شروع فرمایا۔

رشتہ داروں پر مال خرچ کرنے کی فضیلت

اور مال سے اپنی محبت کے باوجود خرچ کرے' اس کا معنی یہ ہے کہ انسان تندرست ہو' اس کو پیسوں کی ضرورت بھی ہو'

تاکہ وہ اپنے مستقبل کے لمبے لمبے منصوبوں کو پورا کرے اور اسے فقر کا خدشہ بھی لاحق ہو پھر بھی وہ اللہ کی راہ میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلین وغیرہ پر خرچ کرے۔ امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے، پھر آپ نے اس آیت کو تلاوت فرمایا۔

(جامع ترمذی ص ۱۱۹، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

بعض علماء نے کہا: یہ بھی زکوٰۃ میں داخل ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ زکوٰۃ کا اس کے بعد ذکر فرمایا ہے اور یہ قول حدیث مذکور کے بھی خلاف ہے، امام مالک نے کہا: اس سے مراد فدیہ دے کر قیدیوں کو چھڑانا ہے، زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات واجبہ بھی اس سے مراد ہو سکتے ہیں۔

حضرت ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے افضل صدقہ، پہلو تہی کرنے والے مخالف رشتہ دار پر صدقہ کرنا ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۷ ص ۲۷۰، مطبوعہ نشر السنۃ، ملتان)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے: اس حدیث کو امام طبرانی نے "معجم کبیر" میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۳ ص ۱۱۶، مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۰۲ھ)

زکوٰۃ، قربانی، عشر اور صدقۂ فطر صدقات واجبہ ہیں، باقی صدقات نفل اور مستحب ہیں۔ صدقات واجبہ ماں باپ، اولاد اور شوہر یا بیوی کے علاوہ ان رشتہ داروں کو دیے جائیں گے جو غیر سادات اور فقراء ہوں، اور صدقات نفلیہ دینے کے لیے کوئی شرط نہیں ہے، وہ ہر رشتہ دار کو دیے جا سکتے ہیں۔ امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رشتہ دار پر صدقہ کرنے کا دو مرتبہ دگنا اجر دیا جاتا ہے۔ (المعجم الکبیر ج ۸ ص ۲۰۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

یتیم، مسکین اور ابن السبیل کا معنی

یتامیٰ: یتیم کی جمع ہے، یتیم اس نابالغ شخص کو کہتے ہیں جس کا باپ فوت ہو چکا ہو۔

مساکین: مسکین کی جمع ہے، مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس قدر کفایت یعنی گزارے کے لیے کوئی چیز نہ ہو۔ امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص مسکین نہیں ہے جو لوگوں کے گرد چکر کاٹتا ہے اور ایک لقمہ، دو لقمے یا ایک کھجور یا دو کھجور لے کر چلا جاتا ہے، صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! پھر مسکین کون ہے؟ آپ نے فرمایا: جس کے پاس گزارے کے لیے کوئی چیز نہ ہو، اور نہ اس کے ظاہر حال سے اس کی مسکینی کا پتہ چلے تاکہ اس پر صدقہ کیا جائے اور نہ وہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال کرے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۳۳، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

ابن السبیل: اس مسافر کو کہتے ہیں جو حالت سفر میں ضرورت مند ہو اور اس کے پاس ضرورت پوری کرنے کے لیے کوئی چیز نہ ہو چونکہ راستہ میں اس کے ماں باپ نہیں ہوتے اور راستہ کے سوا اس کا کسی سے تعلق نہیں ہوتا اس لیے اس کو ابن السبیل کہتے ہیں۔

سوال کرنے کی جائز حد

سائلین: سائل کی جمع ہے، بلا ضرورت سوال کرنا شرعاً حرام ہے، اور سائل کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے

زیادہ کا سوال نہ کرے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنا مال بڑھانے کے لیے لوگوں سے سوال کرتا ہے وہ انگاروں کا سوال کرتا ہے' خواہ کم سوال کرے یا زیادہ۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۳۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام ابن عساکر روایت کرتے ہیں:

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص اپنے اوپر سوال کرنے کا دروازہ نہیں کھولتا مگر اللہ تعالیٰ اس کے اوپر فقر کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

(مختصر تاریخ دمشق ج ۴ ص ۲۳۸' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

حضرت قبیصہ بن مخارق ہلالی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخصوں کے علاوہ اور کسی شخص کے لیے سوال کرنا جائز نہیں ہے' ایک وہ شخص جو مقروض ہو' اس کے لیے اتنی مقدار کا سوال جائز ہے جس سے اس کا قرض ادا ہو جائے' اس کے بعد وہ سوال سے رک جائے۔ دوسرا وہ شخص جس کے مال کو کوئی ناگہانی آفت پہنچی ہو جس سے اس کا مال تباہ ہو گیا ہو' اس کے لیے اتنی مقدار کا سوال کرنا جائز ہے جس سے اس کا گزارہ ہو جائے۔ تیسرا وہ شخص جو فاقہ زدہ ہو اور اس کے قبیلہ کے تین عقل مند آدمی یہ گواہی دیں کہ واقعی یہ فاقہ زدہ ہے' تو اس کے لیے بھی اتنی مقدار کا سوال کرنا جائز ہے' جس سے اس کا گزارہ ہو جائے' اور اے قبیصہ! ان تین شخصوں کے علاوہ سوال کرنا حرام ہے اور جو (ان کے علاوہ) سوال کرتا ہے وہ حرام کھاتا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۳۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

تین آدمیوں کی گواہی کی شرط بہ طور استحباب ہے' ورنہ دو آدمیوں کی گواہی بھی کافی ہے اور یہ شرط اس شخص کے لیے ہے جو معاشرہ میں مال دار مشہور ہو اور جس شخص کا مال دار ہونا مشہور نہ ہو اس کے فاقہ زدہ ہونے کی خبر کے لیے اس کا اپنا قول کافی ہے۔

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مال دار کے لیے صدقہ لینا جائز ہے اور نہ صحیح الاعضاء اور قوی شخص کے لیے۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۳۱' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے سوال کیا درآں حالیکہ اس کے پاس اتنا مال تھا جو اس کو سوال سے مستغنی کر سکتا تھا وہ جہنم کے انگارے جمع کرتا ہے' راوی نے پوچھا: مال میں کتنی مقدار ہو تو سوال نہیں کرنا چاہیے؟ فرمایا: جس کے پاس صبح اور شام کا کھانا ہو وہ سوال نہ کرے' ایک اور روایت میں ہے: جس کے پاس اتنا کھانا ہو کہ وہ ایک دن اور ایک رات سیر ہو کر کھا سکے وہ سوال نہ کرے۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۳۰' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں: جس شخص کے پاس ایک دن کی خوراک ہو' خواہ وہ خوراک بنفسہ موجود ہو یا اس شخص میں اس خوراک کو کما کر لانے کی صلاحیت ہو بایں طور کہ وہ تندرست اور کمانے والا ہو' ایسے شخص کے لیے خوراک کا سوال کرنا جائز نہیں ہے' اور اگر خیرات دینے والے کو اس کے حال کا علم ہو اور اس کے باوجود وہ اس کو بھیک دے تو وہ گنہ گار ہوگا'

کیونکہ وہ ایک حرام کام میں مدد کر رہا ہے اور اگر سائل ضرورت مند ہو اور کپڑوں کا سوال کرے یا جہاد یا طلب علم میں مشغول ہونے کی وجہ سے خوراک کا سوال کرے اور اس کو ان چیزوں کی ضرورت بھی ہو تو اس کا سوال کرنا جائز ہے اور اس کو دینا بھی جائز ہے۔ (درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۲ ص ۶۹ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت)

سائلین کو دینے کے متعلق مصنف کی تحقیق

مصنف کی تحقیق یہ ہے کہ جو شخص تندرست ہو اور کمانے کے لائق ہو' اس کے باوجود پیشہ ور گداگری کرتا ہو اس کو خیرات بالکل نہ دی جائے' سوال سے پہلے نہ سوال کرنے کے بعد' تا کہ اس کی حوصلہ شکنی ہو اور وہ جائز طریقہ سے کسب معاش کرے لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب حتمی طور پر معلوم ہو کہ وہ سائل تندرست اور کمانے کے لائق ہے اور جب یہ معلوم نہ ہو تو کسی مسلمان سائل کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہوئے اس کے سوال کو جائز صورت پر محمول کیا جائے' مثلاً یہ کہ ہو سکتا ہے کہ وہ کپڑوں کے لیے سوال کر رہا ہو' یا اپنے بیوی بچوں کے علاج یا کسی اور شدید ضرورت کی وجہ سے سوال کر رہا ہو' یا وہ طالب علم ہو یا مسافر' اور جن کے متعلق معلوم ہو کہ وہ ضرورت مند ہیں یا بے روزگار ہیں' یا ان کی آمدنی ان کی خوراک' لباس' رہائش' تعلیم اور علاج وغیرہ کے لیے کافی نہیں ہے تو ان کی سوال کے بغیر از خود مدد کرنی چاہیے اور جو لوگ مسجد میں آ کر سوال کرتے ہیں' ان کے حال کا اکثر و بیشتر لوگوں کو علم نہیں ہوتا' اگر وہ نمازیوں کے آگے سے نہ گزریں' اور لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگیں اور گڑگڑا کر سوال نہ کریں تو ان مسلمان سائلوں کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہوئے ان کے سوال کو جائز صورت میں محمول کرنا چاہیے اور حتی الوسع ان کی مدد کرنی چاہیے۔

غلام آزاد کرنے' نماز پڑھنے اور زکوٰۃ وغیرہ کے معانی

غلام کو آزاد کرنے کے دو معنی ہیں: یا تو مکمل غلام خرید کر اس کو آزاد کیا جائے اور یا جو غلام مکاتب ہو اسے بدل کتابت دے کر اس کو آزاد کرایا جائے۔ غلام آزاد کرنے کا بہت اجر ہے۔ امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کسی مسلمان غلام کو آزاد کیا' اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلہ میں آزاد کرنے والے کا ہر عضو جہنم سے آزاد کر دے گا حتیٰ کہ اس کی فرج کے بدلہ میں فرج آزاد کر دے گا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۹۵' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اور نماز قائم کرے: یعنی کعبہ کی طرف منہ کر کے باقی شرائط کے ساتھ نماز کے اوقات میں نماز پڑھے۔

اور زکوٰۃ ادا کرے: یعنی جو شخص نصاب کا مالک ہو وہ ایک سال گزر جانے کے بعد اس مال کا چالیسواں حصہ مستحقین کو ادا کرے۔ نماز پڑھنے سے روح کی تطہیر ہوتی ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے مال کا تزکیہ ہوتا ہے اس لیے قرآن مجید میں دونوں کو ایک ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے جب وہ عہد کریں' اس کے دو مطلب ہیں:

(۱) بندہ جب اللہ سے کسی عبادت کی نذر مانے تو اس نذر کو پورا کرے (۲) بندہ لوگوں کے ساتھ جو عہد کرے اس کو پورا کرے۔ ان دونوں عہدوں کو پورا کرنا واجب ہے۔ عہد کو پورا کرنا ایمان صحیح کی علامت ہے اور عہد پورا نہ کرنا نفاق کی علامت ہے' لیکن اگر کسی سے گناہ کا عہد کیا ہے تو اس کو توڑنا واجب ہے۔

اور تکلیف اور تنگی میں صبر کرنے والے: اس آیت کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) یہ آیت تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ ان کے سوا اور کوئی پوری طرح اس آیت پر عمل نہیں

کرسکتا (۲) یہ آیت تمام لوگوں کے حق میں عام ہے' کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عموی خطاب فرمایا ہے۔ جب کسی ناگہانی مصیبت سے آدمی فقر میں مبتلا ہو جائے' یا مرض طاری ہونے یا اپنے بچوں کی موت سے غم میں مبتلا ہو جائے یا معرکہ جہاد میں شدت میں مبتلا ہو جائے تو ان حالات میں صبر کرنا نصف ایمان ہے کیونکہ صبر کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ شخص قضاء وقدر پر راضی ہے اور اللہ تعالیٰ سے اجر اور ثواب کی امید رکھتا ہے۔

یہی سچے لوگ ہیں اور یہی متقی ہیں: یعنی جو لوگ نیکی کی ان تمام اقسام کے ساتھ متصف ہیں یہی اپنے ایمان میں سچے ہیں اور یہی لوگ حقیقتاً متقی ہیں' کیونکہ یہ لوگ معاصی سے اجتناب کی وجہ سے اللہ کے غضب اور اس کے عذاب سے محفوظ ہو گئے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے اجر وثواب کے ساتھ کامیاب ہو گئے اور حق یہ ہے کہ جس نے اس ایک آیت پر عمل کر لیا اس کا ایمان کامل ہو گیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ؕ

اے ایمان والو! تم پر مقتولین کے خون (ناحق) کا بدلہ لینا فرض کیا گیا ہے'

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِىَ

آزاد کے بدلہ آزاد' غلام کے بدلہ غلام اور عورت کے بدلہ میں عورت' سو جس (قاتل) کے لیے اس کے

لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَىْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ

بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا تو (اس کا) دستور کے مطابق مطالبہ کیا جائے اور نیکی کے ساتھ اس کی ادائیگی کی جائے'

ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ

یہ (حکم) تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے' پھر اس کے بعد جو حد سے

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ

تجاوز کرے اس کے لیے دردناک عذاب ہے O اور اے عقل مند لوگو! تمہارے لیے خون کا بدلہ (مشروع کرنے) میں زندگی ہے'

تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

تاکہ تم (ناحق قتل کرنے سے) بچو O

اس سے پہلے عبادات اور معاملات کے متعلق احکام بیان کیے گئے تھے اب فوجداری معاملات سے متعلق احکام شرعیہ بیان کیے جا رہے ہیں۔

آیت مذکورہ کا شان نزول

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری روایت کرتے ہیں:

زمانۂ جاہلیت میں جب دو قبیلے آپس میں لڑتے' ایک معزز قبیلہ ہوتا اور دوسرا پسماندہ اور پسماندہ قبیلہ کا غلام معزز قبیلہ کے غلام کو قتل کر دیتا تو معزز قبیلہ کہتا تھا کہ ہم اپنے غلام کے بدلہ میں پسماندہ قبیلہ کے آزاد شخص کو قتل کریں گے' اسی طرح اگر پسماندہ قبیلہ کی کوئی عورت معزز قبیلہ کی کسی عورت کو قتل کر دیتی تو معزز قبیلہ کہتا تھا کہ ہم اپنی عورت کے بدلہ میں پسماندہ قبیلہ کے مرد کو قتل کریں گے تو ان کے رد میں یہ آیت نازل ہوئی' اللہ تعالیٰ نے اس تکبر اور بغاوت سے منع کیا اور فرمایا: آزاد کے بدلہ میں آزاد کو' غلام کے بدلہ میں غلام کو اور عورت کے بدلہ میں عورت کو قتل کیا جائے گا' اور سورۂ مائدہ میں فرمایا: جان کا بدلہ جان ہے' آنکھ کا بدلہ آنکھ ہے' ناک کا بدلہ ناک ہے' کان کا بدلہ کان ہے' دانت کا بدلہ دانت اور ہر زخم کے بدلہ میں زخم ہے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۶۱' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۱۰ھ)

غلام اور ذمی کے خون کا قصاص نہ لینے کے حق میں ائمہ ثلاثہ کے دلائل

امام مالک' امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک مسلمان کو کافر کے بدلہ میں اور آزاد کو غلام کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۲۴۶' المغنی ج ۸ ص ۲۱۴)

قاضی بیضاوی شافعی لکھتے ہیں:

امام مالک اور امام شافعی رضی اللہ عنہما نے آزاد شخص کو غلام کے بدلہ میں قتل کرنے سے منع کیا ہے' خواہ وہ غلام اس قاتل کا ہو یا اس کے غیر کا' کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے غلام کو قتل کر دیا' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو کوڑے مارے' اس کو ایک سال کے لیے شہر بدر کر دیا' اور اس سے اس کے غلام کا قصاص نہیں لیا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۳۰۴) نیز حضرت علی نے فرمایا: سنت یہ ہے کہ مسلمان کو ذمی کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے اور نہ آزاد کو غلام کے بدلہ میں قتل کیا جائے۔ (سنن کبریٰ ج ۸ ص ۳۴' مطبوعہ ملتان) اور اس لیے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بحضر صحابہ میں آزاد کو غلام کے بدلہ میں قتل نہیں کرتے تھے' اس پر کوئی انکار نہیں کرتا تھا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۹ ص ۳۰۵) نیز اس پر اتفاق ہے کہ غلام کے اعضاء کے بدلہ میں آزاد کے اعضاء نہیں کاٹے جاتے' اور قرآن مجید میں جو ہے: "النفس بالنفس جان کا بدلہ جان ہے" خواہ غلام کی جان ہو یا آزاد کی ہو' اس سے معارضہ نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ یہ تورات کا حکم ہے اور تورات کا حکم قرآن کے اس حکم کے لیے ناسخ نہیں ہو سکتا کہ آزاد کو آزاد کے بدلہ میں قتل کیا جائے۔

(انوار التنزیل ص ۳۶-۳۷' مطبوعہ دار فراس للنشر والتوزیع' بیروت)

اس آیت میں مفہوم مخالف سے استدلال نہیں کیا گیا ہے جیسا کہ شروع میں قاضی بیضاوی نے بھی اعتراف کیا ہے' پھر قاضی بیضاوی کا اپنے مذہب کو قرآن کا حکم قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

ائمہ ثلاثہ کے موقف پر یہ حدیث بھی دلیل ہے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اس صحیفہ میں کیا مرقوم ہے؟ فرمایا: دیت اور قیدی کو چھڑانے کے احکام ہیں اور یہ کہ مسلمان کو کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

غلام اور ذمی کے قصاص کے متعلق امام ابوحنیفہ کا مذہب

علامہ عبداللہ بن محمود موصلی حنفی لکھتے ہیں:

آزاد کو آزاد اور غلام کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا' مرد کو عورت کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا' چھوٹے کو بڑے کے بدلہ

ہیں اور مسلمان کو ذمی کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا اور مسلمان اور ذمی کو مستامن کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا اور مستامن کو مستامن کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا اور صحیح الاعضاء کو اپاہج' اندھے' مجنون اور ناقص الاعضاء کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا اور کسی شخص کو اس کے بیٹے' اس کے غلام' اس کے بیٹے کے غلام اور اس کے مکاتب کے بدلہ میں نہیں قتل کیا جائے گا۔

(الاختیار ج ۳ ص ۲۷۔ ۲۶' مطبوعہ دارفراس للنشر والتوزیع' مصر)

آزاد سے غلام کا قصاص لینے کے ثبوت میں قرآن اور سنت سے دلائل

ائمہ ثلاثہ نے امام ابوحنیفہ سے دو صورتوں میں اختلاف کیا ہے' پہلا اختلاف یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک غلام کے بدلہ میں آزاد کو قتل کرنا جائز نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہے' امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ (البقرہ: ۱۷۸)

اے ایمان والو! تم پر مقتولین کے خون (ناحق) کا بدلہ لینا فرض کیا گیا ہے۔

اس آیت میں مقتول کا لفظ عام ہے' یہ ہر مقتول کو شامل ہے' خواہ آزاد ہو یا غلام' مسلمان ہو یا ذمی' اس کا بدلہ اس کے قتل کرنے والے سے لیا جائے گا' خواہ وہ آزاد ہو یا غلام' لہٰذا اگر آزاد شخص نے کسی کے غلام کو قتل کر دیا تو اس غلام کا قصاص اس آزاد سے لیا جائے گا۔ دوسری دلیل یہ ہے:

اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ (المائدہ: ۴۵)

بے شک جان کا بدلہ جان ہے۔

اس آیت میں بھی مطلقاً فرمایا ہے کہ جان کا بدلہ جان ہے اور آزاد یا غلام کا فرق نہیں کیا گیا اور اس پر علامہ بیضاوی کا یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید نے یہ تورات کا حکم بیان کیا ہے' یہ اعتراض اس وقت صحیح ہوتا جب اللہ تعالیٰ نے اس حکم کا رد کیا ہوتا' اور سابقہ شریعتوں کے جو احکام قرآن اور سنت میں بلانکیر بیان کیے گئے ہیں وہ ہم پر حجت ہیں۔

اس آیت کے ہمارے حق میں حجت ہونے پر دلیل یہ حدیث ہے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مسلمان شخص اس کی شہادت دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں' اس کا خون صرف تین وجہوں میں سے کسی ایک وجہ سے بہانا جائز ہے: جان کا بدلہ جان' شادی شدہ زانی اور دین سے مرتد ہونے والا اور جماعت کو ترک کرنے والا۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۱۴' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۵۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً فرمایا: جان کا بدلہ جان ہے اور اس سے واضح ہو گیا کہ سورۂ مائدہ کی مذکور الصدر آیت ہمارے لیے بیان کی گئی ہے اور وہ تورات کے ساتھ خاص نہیں ہے' نیز ہماری دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ (البقرہ: ۱۷۹)

اور قصاص کے حکم میں تمہارے لیے زندگی ہے۔

اس آیت میں بر سبیل عموم فرمایا ہے کہ قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے اور اس کو آزاد یا غلام کے ساتھ خاص نہیں کیا' قصاص کی وجہ سے مسلمان کسی کو قتل کرنے سے باز رہیں گے' آزاد غلام کو قتل کرے گا نہ غلام آزاد کو۔

امام ابوحنیفہ کے موقف کے ثبوت پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے' حافظ الہیثمی بیان کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان' مسلمان کا بھائی ہے'

اس سے خیانت کرے نہ اس کو ذلیل کرے ان کا خون ایک دوسرے (کے کفو) کی مثل ہے الحدیث۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے ''معجم اوسط'' میں روایت کیا ہے اس کی سند میں ایک راوی کا نام قاسم بن ابی الزناد لکھا ہے حالانکہ اس کا نام ابو القاسم بن ابی الزناد ہے اس کے علاوہ حافظ الہیثمی نے اس حدیث پر اور کوئی جرح نہیں کی۔

(مجمع الزوائد ج ۶ ص ۲۸۳ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت ۱۴۰۲ھ)

آزاد سے غلام کا قصاص نہ لینے کے متعلق ائمہ ثلاثہ کے دلائل کا جواب

قاضی بیضاوی نے ائمہ ثلاثہ کے موقف پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنے غلام کو قتل کر دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو کوڑے مارے اور اس سے قصاص نہیں لیا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۹ ص ۳۰۴) اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث امام ابوحنیفہ کے موقف کے خلاف نہیں ہے کیونکہ امام اعظم کا مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو قتل کر دے تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا' اختلاف اس صورت میں ہے جب کوئی آزاد شخص کسی دوسرے شخص کے غلام کو قتل کر دے۔

دوسری حدیث جس سے قاضی بیضاوی نے استدلال کیا ہے اس کو امام بیہقی نے ''سنن کبریٰ'' میں از جابر از عامر حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ سنت یہ ہے کہ آزاد کو غلام کے بدلہ میں نہ قتل کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ امام بیہقی نے خود ''کتاب المعرفۃ'' میں لکھا ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے کیونکہ اس روایت میں جابر جعفی منفرد ہے اور اس کے معارض حضرت علی سے دو روایتیں ذکر کی ہیں کہ جب آزاد غلام کو قتل کر دے تو اس میں قصاص ہے ہر چند کہ ان روایتوں کو بھی انہوں نے منقطع لکھا ہے۔ (معرفۃ السنن والآثار ج ۸ ص ۱۵۹ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۲ھ)

قاضی بیضاوی نے تیسری دلیل یہ قائم کی ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما غلام کے بدلہ میں آزاد کو قتل نہیں کرتے تھے اور اس پر کوئی انکار نہیں کرتا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک یہ اس صورت پر محمول ہے جب کوئی آزاد شخص اپنے غلام کو قتل کر دے کیونکہ اسی صورت میں قصاص نہ لینے پر اتفاق ہے' حافظ الہیثمی نے امام طبرانی کی ''معجم اوسط'' کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے ایک شخص سے کہا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نہ سنا ہوتا کہ مملوک کا قصاص مالک سے نہیں لیا جائے گا اور نہ بیٹے کا باپ سے تو میں تم سے قصاص لیتا۔ (مجمع الزوائد ج ۶ ص ۲۸۸ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت ۱۴۰۲ھ)

نیز متعدد صحابہ اور تابعین کا یہ موقف ہے کہ اگر آزاد کسی کے غلام کو قتل کر دے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں:

حضرت علی اور حضرت ابن مسعود نے کہا کہ جب آزاد غلام کو قتل کر دے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔

ابراہیم نے کہا کہ آزاد کو غلام کے بدلہ میں اور غلام کو آزاد کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔

سعید بن المسیب نے کہا کہ اگر آزاد غلام کو قتل کر دے تو اس کو قتل کیا جائے گا' پھر کہا: بہ خدا! اگر تمام یمن والے مل کر ایک غلام کو قتل کریں تو میں ان سب کو قتل کر دوں گا۔

شعبی نے کہا: آزاد کو غلام کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔

سفیان نے کہا: اگر کوئی شخص دوسرے کے غلام کو قتل کر دے تو اس کو قتل کیا جائے گا اور اگر اپنے غلام کو قتل کرے تو پھر اس کو قتل نہیں کیا جائے گا جیسے کوئی شخص اپنے بیٹے کو قتل کر دے تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

(المصنف ج ۹ ص ۳۰۷۔ ۳۰۶ 'مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی '۱۴۰۶ھ)

ان روایات سے قطع نظر امام اعظم ابوحنیفہ کا مذہب قرآن مجید کی صریح آیات پر مبنی ہے اور امام اعظم کے مذہب میں انسانیت کی تکریم ہے کیونکہ آپ نے آزاد اور غلام مسلمانوں کے خون میں کوئی فرق نہیں کیا۔

مسلمان سے ذمی کا قصاص لینے کے متعلق قرآن اور سنت سے دلائل

مسلمان کو ذمی کے بدلہ میں قتل نہ کیے جانے کے متعلق ائمہ ثلاثہ کی طرف سے ''صحیح بخاری'' کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے کہ مسلمان کو کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا' امام ابوحنیفہ کی طرف سے اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث کافر حربی پر محمول ہے' اور امام ابوحنیفہ کی دلیل سورۂ بقرہ کی یہ آیت ہے: اے ایمان والو! تم پر قتل (مقتول) میں قصاص فرض کیا گیا ہے' مقتول کا لفظ عام ہے مسلمان اور ذمی دونوں کو شامل ہے' اور حربی کافر' قرآن مجید کی ان آیتوں سے مستثنیٰ ہے جن میں کفار اور مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے' اسی طرح سورۂ مائدہ میں ہے: جان کا بدلہ جان ہے' اور ''صحیح بخاری'' اور ''صحیح مسلم'' میں یہ حدیث ہے کہ جان کا بدلہ جان ہے۔

نیز امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

عبدالرحمان سلیمانی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مسلمان شخص کو لایا گیا جس نے ایک ذمی شخص کو قتل کر دیا تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی گردن مار دی اور فرمایا: میں ذمی کا ذمہ پورا کرنے کا زیادہ حق دار ہوں۔

عبداللہ بن عبدالعزیز بن صالح حضرمی بیان کرتے ہیں کہ خیبر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا جس نے ایک کافر کو دھوکے سے قتل کر دیا تھا اور فرمایا: میں اس کا ذمہ پورا کرنے کا زیادہ حق دار ہوں۔

(مراسیل ابوداؤد ص ۱۲ 'مطبوعہ نور محمد اینڈ سنز' کراچی)

امام بیہقی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔

(سنن کبریٰ ج ۸ ص ۳۰ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

نیز امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک مسلمان شخص نے ایک ذمی کو عمداً قتل کر دیا' یہ مقدمہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پیش کیا گیا' حضرت عثمان نے اس کو قتل نہیں کیا اور اس پر بھاری دیت مقرر کی جیسے مسلمان کے قتل ناحق پر مقرر کی جاتی ہے۔

امام بیہقی نے کہا: یہ حدیث متصل ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۸ ص ۳۳ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

یہ حدیث بھی امام ابوحنیفہ کی دلیل ہے کیونکہ دیت قصاص کی فرع ہے' فریقین میں صلح یا کسی اور وجہ سے قصاص کی جگہ دیت فرض کی گئی۔ انسانیت کی تکریم اور عدل و انصاف کے قریب امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ جب ذمی سے اس کی جان اور مال کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا اور اس سے اس کے بدلہ میں جزیہ لیا گیا تو اس کا بھی تقاضا ہے کہ اگر ذمی کو مسلمان بھی قتل کر دے تو اس سے قصاص لیا جائے' اس سے اسلام میں اخلاق کی بلندی' اصول کی برتری اور تکریم انسانیت کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

متعدد لوگوں کی جماعت سے ایک شخص کے قصاص لینے کا بیان

ظاہریہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر چند آدمیوں کی جماعت مل کر ایک شخص کو قتل کر دے تو ان سے قصاص نہیں لیا جائے گا'

کیونکہ ظاہر آیت نے قصاص اور مساوات کی شرط لگائی ہے اور واحد اور جماعت میں مساوات نہیں ہے لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے' کیونکہ آیت کا معنی یہ ہے کہ قاتل کو قصاص میں قتل کر دیا جائے گا خواہ قاتل واحد ہو یا متعدد۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک لڑکے کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا' حضرت عمر نے فرمایا: اگر اس کے قتل میں (تمام) اہل صنعاء شریک ہوتے تو میں ان سب کو قتل کر دیتا' اور مغیرہ بن حکیم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ چار آدمیوں نے مل کر ایک بچے کو قتل کیا تو حضرت عمر نے اس کی مثل فرمایا۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۱۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

سلاطین اور حکام سے قصاص لینے کے متعلق احادیث اور آثار

علماء کا اس پر اجماع ہے کہ سلطان اگر اپنی رعیت میں سے کسی شخص پر زیادتی کرے تو وہ خود اپنی ذات سے قصاص لے گا' کیونکہ سلطان اللہ تعالیٰ کے احکام سے مستثنیٰ نہیں ہے' اللہ تعالیٰ نے مقتول کے سبب سے تمام مسلمانوں پر قصاص کو فرض کیا ہے' اگر سلطان کسی شخص کو بے قصور قتل کر دیتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ خود کو قصاص کے لیے پیش کرے۔ امام نسائی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی چیز تقسیم کر رہے تھے' ایک شخص آپ پر جھک گیا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک چھڑی چبھوئی' اس نے ایک چیخ ماری' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آؤ بدلہ لے لو' اس شخص نے کہا: نہیں! یا رسول اللہ! میں نے معاف کر دیا۔

(سنن نسائی ج ۲ ص ۲۴۴۔ ۲۴۳' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ اس کے چہرہ پر زخم لگ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آؤ مجھ سے بدلہ لے لو' اس نے کہا: میں نے معاف کر دیا۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۶۸' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

امام نسائی روایت کرتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش کیا ہے۔ (سنن نسائی ج ۲ ص ۲۴۴' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۱ ص ۴۱' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

ابوفراس بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا: میں عاملوں کو اس لیے نہیں بھیجتا کہ وہ لوگوں کے جسموں پر ضرب لگائیں اور نہ اس لیے کہ وہ ان کا مال لیں' جس شخص کے ساتھ کسی حاکم نے ایسا کیا وہ مجھ سے شکایت کرے' میں اس سے قصاص لوں گا' حضرت عمرو بن العاص نے کہا: اگر کوئی شخص اپنی رعیت کو تادیباً مارے آپ پھر بھی اس سے قصاص لیں گے؟ حضرت عمر نے فرمایا: ہاں خدا کی قسم! جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے میں اس سے قصاص لوں گا' اور بے شک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے' آپ نے اپنے نفس کو قصاص کے لیے پیش کیا تھا۔

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۶۸' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث کو امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۸ ص ۴۸' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

ابونضرہ وغیرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص نے (سرخ رنگ کی) خوشبو لگائی ہوئی تھی' آپ نے وہ تیر اس کو چبھو کر فرمایا: کیا میں نے تم کو اس سے منع نہیں کیا تھا؟ اس شخص نے کہا: رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے' اور بے شک آپ نے مجھے زخمی کر دیا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر اس کے آگے ڈال دیا اور فرمایا: تم اپنا بدلہ لے لو' اس شخص نے کہا: یا رسول اللہ! جب آپ نے مجھے تیر چبھویا تھا تو میرے بدن پر کپڑا نہیں تھا اور آپ نے قمیص پہنی ہوئی ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھا دیا' اس شخص نے جھک کر آپ کے بدن مبارک کا بوسہ لے لیا۔

حضرت سواد بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' اس وقت میں نے سرخ رنگ کی خوشبو لیپی ہوئی تھی' جب آپ نے مجھے دیکھا تو فرمایا: اے سواد بن عمرو! تم نے ورس (ایک خوشبودار گھاس جس سے سرخ رنگ ہو جاتا ہے) کا لیپ کیا ہوا ہے' کیا میں نے تم کو اس خوشبو سے منع نہیں کیا تھا؟ آپ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی' آپ نے مجھے وہ چبھوئی جس سے مجھے درد ہوا' میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ مجھے بدلہ دیں' آپ نے اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھا دیا اور میں آپ کے پیٹ کو بوسہ دینے لگا۔

ابویعلیٰ بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسید بن حضیر بہت ہنسانے والے تھے' ایک دن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے باتیں کر رہے تھے اور ان کو ہنسا رہے تھے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی اس کی کوکھ میں چبھوئی' انہوں نے کہا: آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے' آپ نے فرمایا: بدلہ لے لو' انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ نے قمیص پہنی ہوئی ہے اور میں نے قمیص نہیں پہنی ہوئی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص اٹھا دی' وہ آپ کے بدن سے لپٹ گئے اور آپ کے پہلو کا بوسہ لے لیا اور کہنے لگے: یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں اور باپ فدا ہوں' میرا یہی ارادہ تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک حبشی شخص کو لشکر میں بھیجا' اس نے واپس آ کر کہا کہ لشکر کے امیر نے بغیر کسی قصور کے میرا ہاتھ کاٹ دیا' حضرت ابوبکر نے فرمایا: اگر تم سچے ہو تو میں اس سے ضرور تمہارا بدلہ لوں گا۔ الحدیث ملخصاً

جریر بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابوموسیٰ کے ساتھ مل کر دشمن پر غلبہ پایا اور مال غنیمت حاصل کیا' حضرت ابوموسیٰ نے اس کو اس کا حصہ دیا اور تمام مال غنیمت نہیں دیا' اس نے منع کیا اور کہا: وہ تمام مال غنیمت لے گا' حضرت ابوموسیٰ نے اس کو بیس کوڑے مارے اور اس کا سر مونڈ دیا' اس نے وہ تمام بال جمع کیے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور حضرت ابوموسیٰ کی شکایت کی اور وہ بال نکال کر دکھائے' حضرت عمر نے حضرت ابوموسیٰ کے نام خط لکھا: سلام کے بعد واضح ہو کہ فلاں شخص نے مجھ سے تمہاری شکایت کی ہے اور میں نے یہ قسم کھائی ہے کہ اگر واقعی تم نے اس شخص کے ساتھ یہ زیادتی لوگوں کے مجمع میں کی ہے تو میں لوگوں کے مجمع میں تم سے اس شخص کا قصاص لوں گا اور اگر تم نے تنہائی میں اس شخص کے ساتھ یہ زیادتی کی ہے تو میں تنہائی میں تم سے اس شخص کا قصاص لوں گا' لوگوں نے سفارش کی اور کہا: ابوموسیٰ کو معاف کر دیجئے' حضرت عمر نے فرمایا: نہیں! خدا کی قسم! میں کسی شخص کے ساتھ رعایت نہیں کروں گا' جب حضرت عمر نے اس شخص کو وہ خط دیا اور قصاص لینے کے لیے تیار ہو گئے تو اس شخص نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا: میں نے ان کو اللہ کے لیے معاف کر دیا۔

(سنن کبریٰ ج ۸ ص ۵۰۔ ۴۸' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

قصاص لینا حکومت کا منصب ہے

تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ از خود قصاص لے' قصاص لینے کے لیے ضروری ہے کہ حاکم کے پاس مرافعہ کیا جائے' پھر حاکم خود قصاص لے گا یا کسی شخص کو قصاص لینے کے لیے مقرر کرے گا' قانون پر عمل کرنے کا منصب صرف حکومت کا ہے' ہر شخص کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں ہے' اسی طرح جادوگر اور مرتد کو قتل کرنا اور حدود اور تعزیرات کو جاری کرنا حکومت کا منصب ہے۔

کیفیت قصاص اور آلۂ قتل میں ائمہ مذاہب کی آراء اور ان کے دلائل

امام مالک' امام شافعی اور امام احمد کا راجح مذہب یہ ہے کہ جس طرح اور جس کیفیت سے قاتل نے مقتول کو قتل کیا ہے اسی طرح اور اسی کیفیت سے قاتل کو قتل کیا جائے اور یہی قصاص کا تقاضا ہے کیونکہ قصاص کا معنی ہے: بدلہ' اور بدلہ اسی صورت میں ہوگا' نیز حدیث میں ہے کہ ایک یہودی نے پتھر مار کر ایک باندی کو قتل کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس یہودی کا پتھر سے سر پھاڑ کر اس کا بدلہ لیا' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے دو پتھروں کے درمیان ایک باندی کا سر پھاڑ دیا' اس باندی سے پوچھا گیا: کس نے تمہارا سر پھاڑا ہے' کیا فلاں نے' یا فلاں نے' حتیٰ کہ اس یہودی کا نام لیا گیا تو اس باندی نے سر ہلایا' اس یہودی کو بلایا گیا' اس نے قتل کرنے کا اقرار کر لیا تو اس کا سر بھی پتھر سے پھاڑ دیا گیا۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام ابوحنیفہ اور ایک قول کے مطابق امام احمد کے نزدیک قصاص صرف تلوار سے لیا جائے گا اور اس حدیث میں مثلہ کرنے کی ممانعت سے پہلے کے واقعہ کا بیان ہے' جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلہ کرنے سے منع فرما دیا تو پھر اس کیفیت سے قصاص لینا منسوخ ہو گیا' امام ابوحنیفہ اور امام احمد کی دلیل یہ حدیث ہے' امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تلوار کے سوا کسی چیز سے قصاص لینا (جائز) نہیں ہے۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۹۱' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں:

حسن بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تلوار کے بغیر کسی چیز سے قصاص لینا جائز نہیں ہے۔

ابراہیم نے کہا: جس شخص کو پتھروں سے قتل کیا جائے یا اس کا مثلہ کیا جائے اس کا قصاص صرف تلوار سے لیا جائے گا' اس کو مثلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ شعبی نے کہا: تلوار کے سوا کسی چیز سے قصاص لینا جائز نہیں ہے۔

قتادہ نے کہا: تلوار کے سوا کسی چیز سے قصاص لینا جائز نہیں ہے۔ (المصنف ج ۹ ص ۳۵۵۔ ۳۵۴' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی)

علامہ ابن رشد مالکی لکھتے ہیں:

جس کیفیت سے قاتل نے قتل کیا ہے اسی کیفیت سے اس کو قتل کیا جائے گا' اگر اس نے غرق کیا ہے تو اس کو غرق کیا جائے گا' اور اگر اس نے پتھر سے قتل کیا ہے تو اس کو پتھر سے قتل کیا جائے گا' امام مالک اور امام شافعی کا یہی قول ہے' البتہ اگر اس کیفیت سے زیادہ عذاب ہو تو پھر اس کو تلوار سے قتل کیا جائے گا اور جس نے آگ سے جلا کر قتل کیا اس کے متعلق امام مالک کے مختلف قول ہیں۔ (بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۰۳' مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

جو شخص کسی کو عمداً قتل کرے گا تو جس کیفیت سے اس نے قتل کیا ہے اسی کیفیت سے اس سے قصاص لیا جائے گا' اگر کسی نے تلوار سے قتل کیا ہے تو اس کو تلوار سے قتل کیا جائے گا اور اگر اس نے پتھر یا لکڑی سے قتل کیا ہے تو اس کو پتھر یا لکڑی سے قتل کیا جائے گا۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۵۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

اگر کسی شخص نے دوسرے شخص پر متعدد وار کر کے زخمی کر دیا' پھر زخم مندمل ہونے سے پہلے اس کو قتل کر دیا تو اس کی گردن پر تلوار مار کر اس کو صرف قتل کیا جائے گا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: بغیر تلوار کے قصاص لینا جائز نہیں ہے۔ عطاء' ثوری' امام ابو یوسف' اور امام محمد کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام احمد کا دوسرا قول یہ ہے کہ جس صفت سے قاتل نے قتل کیا ہے اسی صفت سے اس کو قتل کیا جائے گا حتیٰ کہ اگر اس نے آگ میں جلایا ہے تو اس کو آگ میں جلایا جائے گا' اور اگر اس نے دریا میں غرق کیا ہے تو اس کو غرق کیا جائے گا کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۚ (النحل: ۱۲۶)
اور اگر تم انہیں سزا دو تو ایسی ہی سزا دو جس طرح تمہیں تکلیف پہنچائی گئی تھی۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ (البقرہ: ۱۹۴)
جو شخص تم پر زیادتی کرے تو تم اس پر اسی طرح زیادتی کرو جس طرح اس نے تم پر زیادتی کی تھی۔

امام احمد نے یہودی کا پتھر سے قصاص لینے پر بھی استدلال کیا ہے اور تلوار سے قصاص لینے والی حدیث کے متعلق کہا ہے: اس کی سند درست نہیں ہے۔ (المغنی ج ۸ ص ۲۳۰ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ المرغینانی الحنفی لکھتے ہیں:

قصاص صرف تلوار سے لیا جائے گا کیونکہ حدیث میں ہے: تلوار کے بغیر قصاص لینا جائز نہیں ہے۔

(ہدایہ اخیرین ص ۵۶۳ 'مطبوعہ مکتبہ علمیہ' ملتان)

امام ابو حنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی آدمی کو مثلہ کر کے قتل کیا یعنی اس کے جسم کے مختلف اعضاء کاٹ ڈالے اور اگر پھر قاتل سے اسی کیفیت سے قصاص لیا جائے تو لازم آئے گا کہ اس قاتل کو مثلہ کیا جائے حالانکہ احادیث صحیحہ میں مثلہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا نام لے کر اللہ کے راستہ میں جہاد کرو' جو شخص اللہ کے ساتھ کفر کرے اس کے ساتھ قتال کرو' خیانت نہ کرو' عہد شکنی نہ کرو' مثلہ نہ کرو (کسی شخص کے اعضا کاٹ کر اس کے جسم کو نہ بگاڑو)۔ الحدیث (صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۲ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کو امام ترمذی' امام ابن ماجہ' امام مالک' امام دارمی اور امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔

تاہم قرآن مجید کی یہ آیات اور سورۂ نحل اور سورۂ بقرہ کی آیتیں ائمہ ثلاثہ کے موقف کی تائید کرتی ہیں۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ (الشوریٰ: ۴۰)
اور برائی کا بدلہ اسی کی مثل برائی ہے۔

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ (المومن: ۴۰)
جس نے برائی کی تو اس سے اسی کی مثل بدلہ لیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو جس (قاتل) کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا تو (اس کا) دستور کے مطابق مطالبہ کیا جائے اور نیکی کے ساتھ اس کی ادائیگی کی جائے' یہ (حکم) تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے' پھر اس کے بعد جو حد سے تجاوز کرے اس کے لیے دردناک عذاب ہے O (البقرۃ: ۱۷۸)

ولی مقتول کے معاف کرنے کی تفصیل

یعنی مقتول کے ولی نے قاتل کو معاف کر دیا' قاتل کو مقتول کے بھائی سے تعبیر فرمایا ہے تاکہ ولی کی مقتول کو معاف کرنے میں رغبت ہو اور وہ قصاص کا مطالبہ ترک کر دے اور دستور کے مطابق دیت کا مطالبہ کیا جائے یعنی شریعت میں جو دیت کی مقدار مقرر کی گئی ہے ولی مقتول اس سے زیادہ کا مطالبہ نہ کرے اور قاتل کے عصبات دیت کی ادائیگی کی مدت میں تاخیر اور مقدار میں کمی نہ کریں اور معاف کرنے اور دیت ادا کرنے کا حکم تمہارے رب کی طرف سے تخفیف ہے اور اس میں تم پر رحمت ہے کیونکہ یہود کی شریعت میں صرف قصاص واجب تھا اور نصاریٰ کی شریعت میں صرف دیت واجب تھی' اور تمہارے لیے یہ آسانی ہے کہ مقتول کا ولی قاتل سے قصاص لے' یا دیت لے یا بالکل معاف کر دے۔ تمہیں ہر طرح اختیار کی وسعت دی گئی اور کوئی ایک شق واجب نہیں کی گئی' اور جس نے اس کے بعد حد سے تجاوز کیا یعنی اگر ولی مقتول نے معاف کرنے کے بعد قاتل کو قتل کیا تو اس کو دنیا اور آخرت میں عذاب ہوگا' دنیا میں اس کو قتل کیا جائے گا اور آخرت کا عذاب الگ ہوگا۔

دیت کی مقدار اور عاقلہ کا بیان

(ا) دیت کی مقدار سو اونٹ' یا ہزار دینار (۴.۳۷۴ کلو سونا) یا دس ہزار درہم (۳۰.۶۱۸ کلو چاندی) ہے۔

(ب) دیت کو تین سال میں قسط وار ادا کرنا قاتل کی عاقلہ پر لازم ہے۔

(ج) عاقلہ سے مراد قاتل کے حمایتی اور مددگار ہیں' یہ اس کے اہل قبیلہ' اہل محلہ اور اہل صنعت و حرفت ہو سکتے ہیں' جو شخص کسی مل یا کارخانہ میں ملازم ہو' اس مل یا فیکٹری کے مالکان اور کارکنان کو بھی عاقلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

دیت پر مفصل بحث ان شاء اللہ سورۂ نساء آیت: ۹۲ میں بیان کی جائے گی۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ الْوَصِيَّةُ

جب تم میں سے کسی کو موت آئے (سو) اگر اس نے مال چھوڑا ہے (تو) اس پر ماں باپ اور رشتہ داروں

لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ

کے لیے دستور کے موافق وصیت کرنا فرض کیا گیا ہے' یہ پرہیزگاروں پر حق ہے O سو جس نے

بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ

وصیت کو سننے کے بعد اس کو تبدیل کیا تو اس کا گناہ صرف تبدیل کرنے والوں پر ہے' بے شک

اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا

اللہ سب کچھ سننے والا بہت جاننے والا ہے O پھر جس کو وصیت کرنے والے سے بے انصافی یا گناہ کا خوف ہو'

فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾

پس وہ ان کے درمیان صلح کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں' بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے O

ربط آیات اور خلاصۂ تفسیر

اس سے پہلی آیتوں میں قتل اور قصاص کا ذکر تھا جس کے ضمن میں موت کا معنی تھا' اور لوگ عام طور پر موت کے وقت وصیت کرتے ہیں' اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وصیت کے متعلق ہدایت دی کہ جب کوئی شخص مرض الموت میں مبتلا ہو یا کسی اور وجہ سے اس پر موت کی علامات ظاہر ہوں اور اس کے پاس مال ہو تو اس پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کے لیے وصیت کرے' اور وصیت کرنے والے کی موت کے بعد اس کی وصیت کو تبدیل کرنا سخت گناہ ہے' اگر مرنے والے نے دستور کے مطابق وصیت کی تھی اور بعد میں کسی نے اس کو تبدیل کر دیا تو وصیت کرنے والے سے آخرت میں باز پرس نہیں ہوگی' اس کا گناہ صرف وصیت تبدیل کرنے والے کو ہوگا۔ اگر کسی شخص کو قرآن سے یا وصیت کرنے والے کے کسی بیان سے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کسی وارث کو محروم کرنا چاہتا ہے یا کسی وارث کو دستور سے زیادہ دینا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ اصلاح کی کوشش کرے' اور وصیت کرنے والے کو عدل و انصاف کی تلقین کرے۔

وصیت کا لغوی اور شرعی معنی

علامہ سید زبیدی لکھتے ہیں:

وصیت کا معنی اتصال ہے' اور وصیت کو اس لیے وصیت کہتے ہیں کہ یہ میت کے معاملات کے ساتھ متصل ہوتی ہے۔

(تاج العروس ج ۱۰ ص ۳۹۲' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

علامہ راغب اصفہانی نے کہا: دوسروں کے عمل کرنے کے لیے پیشگی کوئی بات بہ طور تاکید کہنا وصیت ہے۔

(المفردات ص ۵۲۵' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

علامہ میر سید شریف نے کہا: موت کے بعد کسی کو کسی چیز کا بہ طور احسان مالک بنانا وصیت ہے۔

(کتاب التعریفات ص ۱۱۱' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے کہا: کسی شخص کا اپنے ترکہ میں ایسا تصرف کرنا جس کا اثر موت کے بعد مرتب ہو' یہ وصیت ہے۔

(التفسیر المنیر ج ۲ ص ۱۱۸' مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

وصیت کی اقسام

علامہ شامی نے وصیت کی چار اقسام بیان کی ہیں:

(۱) واجب: انسان اللہ تعالیٰ کے جن حقوق کو ادا نہیں کرسکا ان کی وصیت کرنا اس پر واجب ہے' مثلاً جن سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کی' یا حج نہیں کیا تو ان کے متعلق وصیت کرے یا اس سے نمازیں اور روزے چھوٹ گئے جن کی قضاء نہیں کی' ان کے فدیہ کے بارے میں وصیت کرے یا مالی کفارے ادا نہیں کیے' ان کے لیے وصیت کرے' اسی طرح انسان بندوں کے جن حقوق کو ادا نہیں کرسکا ان کے متعلق وصیت کرے' مثلاً کسی کا قرض دینا ہے' جس کا کسی کو پتا نہیں' کسی کی امانت لوٹانی ہے' کسی کی کوئی چیز غصب کرلی تھی اس کو واپس کرنا ہے' اس قسم کی وصیت کرنا واجب ہے۔

(۲) مستحب: دینی مدارس' مساجد' علماء' دینی طلبہ' غریب قرابت داروں اور دیگر امور خیر کے لیے وصیت کرنا مستحب ہے۔

(۳) مباح: امیر رشتہ داروں اور دنیاداروں کے لیے وصیت کرنا مباح ہے۔
(۴) مکروہ: فساق اور فجار کے لیے وصیت کرنا مکروہ ہے۔ (ردالمحتار ج ۵ ص ۴۱۵ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

مصنف کی تحقیق یہ ہے کہ جن حقوق کا ادا کرنا فرض ہے ان کے لیے وصیت فرض ہوگی جیسے زکوٰۃ اور جن حقوق کا ادا کرنا واجب ہے ان کے بارے میں وصیت واجب ہوگی جیسے روزے کا کفارہ (کیونکہ اس کا ثبوت حدیث سے ہے اور ظنی ہے) اسی طرح غریب فساق اور فجار کے لیے وصیت کرنا مکروہ تنزیہی ہے اور امیر فساق اور فجار کے لیے وصیت کرنا مکروہ تحریمی ہے' کیونکہ اگر وہ غریب ہیں تو ہوسکتا ہے اس مال کو وہ اپنی کفالت پر خرچ کریں اور اگر امیر ہیں تو ظن غالب ہے کہ وہ معصیت اور فسق و فجور پر خرچ کریں گے اور معصیت کے اداروں کے لیے وصیت کرنا حرام ہے' مثلاً فلم سٹوڈیو' آرٹ کونسل' ریس کورس وغیرہ' اسی طرح کفار کے لیے وصیت کرنا بھی حرام ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مصنف کی تحقیق کے مطابق وصیت کی سات قسمیں ہیں: (۱) فرض (۲) واجب (۳) مستحب (۴) مباح (۵) مکروہ تنزیہی (۶) مکروہ تحریمی (۷) حرام (مستحب اور مباح کی وہی مثالیں ہیں جو اوپر مذکور ہیں)۔

وصیت کی شرائط اور رکن

وصیت کی حسب ذیل شرائط ہیں:

(۱) وصیت کرنے والا مالک بنانے کا اہل ہو' اس لیے نابالغ' مجنون اور مکاتب کی وصیت صحیح نہیں ہے۔
(۲) وصیت کرنے والے کے ترکہ پر قرض محیط نہ ہو کیونکہ قرض کی ادائیگی وصیت پر مقدم ہے۔
(۳) جس کے لیے وصیت کی جائے وہ وصیت کے وقت زندہ ہو خواہ تحقیقاً یا تقدیراً (جیسے حاملہ کے بطن میں بچہ کے لیے وصیت کی جائے)۔
(۴) جس کے لیے وصیت کی جائے وہ وارث نہ ہو۔
(۵) جس کے لیے وصیت کی جائے وہ قاتل نہ ہو' خواہ قتل عمد ہو یا قتل خطاء' البتہ قتل بالسبب وصیت کے منافی نہیں ہے۔
(۶) جس چیز کی وصیت کی ہو وہ تملیک کے قابل ہو' خواہ وہ اس وقت موجود ہو یا اس کا وجود بعد میں ہو' مثلاً ایک سال یا ہمیشہ کے لیے باغ یا درخت کے پھلوں کی وصیت کی جائے۔
(۷) کل ترکہ کے تہائی مال میں وصیت کی جائے۔

وصیت کا رکن یہ ہے کہ وصیت کرنے والا کہے: میں نے فلاں چیز کی فلاں شخص کے لیے وصیت کی ہے۔

(درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۵ ص ۴۱۶ - ۴۱۵ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت)

وصیت کا لزوم

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے پاس کوئی وصیت کے لائق چیز ہو اور وہ اس میں وصیت کرنا چاہتا ہو اس کے لیے وصیت لکھے بغیر دو راتیں گزارنا بھی جائز نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے' وصیت لکھے بغیر مجھ پر ایک رات بھی نہیں گزری۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۹ - ۳۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

ورثاء کے لیے وصیت کا منسوخ ہونا اور غیر ورثاء کے لیے تہائی مال کی وصیت کا استحباب

جمہور علماء اور اکثر مفسرین کے نزدیک یہ آیت 'میراث کی آیتوں سے منسوخ ہے' کیونکہ والدین اور دیگر رشتہ داروں کے اللہ تعالیٰ نے خود حصے مقرر فرما دیئے اس لیے ان کے حق میں وصیت کرنے کا وجوب اب منسوخ ہو گیا۔ امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبہ میں فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے' سو وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔ الحدیث

(جامع ترمذی ص ۳۰۸' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۴۰' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث کی وجہ سے اب ورثاء کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں ہے اور اگر کسی نے وارث کے لیے وصیت کی تو وہ نافذ نہیں ہوگی' اور جو رشتہ دار وارث نہ ہوں' ان کے لیے تہائی مال سے وصیت کرنا مستحب ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع میں مجھے ایسا درد لاحق ہوا کہ میں قریب المرگ ہو گیا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے' میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ دیکھ رہے ہیں کہ درد سے میری کیا حالت ہے! میں ایک مال دار شخص ہوں اور ایک لڑکی کے سوا میرا اور کوئی وارث نہیں ہے' کیا میں دو تہائی مال صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں! میں نے کہا: نصف مال صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں! تہائی مال صدقہ کرو' تہائی مال بہت ہے' اگر تم اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑ کر جاؤ تو یہ ان کو محتاج چھوڑنے سے بہتر ہے' جس کے سبب وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے رہیں' اور تم جو کچھ اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرو گے' تم کو اس کا اجر ملے گا حتیٰ کہ اس لقمہ کا بھی اجر ملے گا جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو۔ الحدیث (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

احادیث کی روشنی میں وصیت کے احکام

امام دار قطنی روایت کرتے ہیں:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ عزوجل نے تمہاری وفات کے وقت تمہارے تہائی مال سے تم پر صدقہ کیا ہے' یہ تمہاری نیکیوں میں زیادتی ہے تاکہ تمہارے اعمال کو اس صدقہ سے پاکیزہ کر دے۔ (سنن دار قطنی ج ۴ ص ۱۵۰' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

اگر تمام وارث تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کرنے کی اجازت دیں تو یہ جائز ہے کیونکہ تہائی مال کی حد ورثاء کا حق محفوظ کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے' سو اگر ورثاء خود اپنے حق سے دستبردار ہو رہے ہوں تو پھر تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کرنا جائز ہے۔

امام دار قطنی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں ہے' البتہ اگر ورثاء چاہیں تو جائز ہے۔

حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وارث کے لیے وصیت کرنا

جائز نہیں ہے' البتہ اگر (دیگر) وارث اجازت دیں تو پھر جائز ہے۔ (سنن دار قطنی ج ۴ ص ۱۵۲ مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

اگر کوئی شخص کسی وارث کو محروم کر دے یا کسی شخص کے لیے اس قدر زیادہ وصیت کرے جس سے دوسرے حق داروں کے حصوں میں کمی ہو تو وہ شخص گنہ گار ہوگا۔ امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک مرد اور عورت ساٹھ سال تک اللہ کی عبادت کرتے رہتے ہیں پھر ان کو موت آجاتی ہے اور وہ وصیت میں (کسی کو) ضرر پہنچاتے ہیں تو ان کے لیے دوزخ واجب ہو جاتی ہے۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۴۰ مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

زندگی میں صحت کے وقت صدقہ کرنے میں موت کے وقت صدقہ کی وصیت کرنے کی بہ نسبت بہت زیادہ فضیلت ہے' امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یا رسول اللہ! کون سے صدقہ میں زیادہ فضیلت ہے؟ آپ نے فرمایا: تم اس وقت صدقہ کرو جب تم صحت مند ہو' مال پر حریص ہو' زندگی کی امید ہو اور تنگ دستی کا خوف ہو' اور صدقہ میں تاخیر نہ کرتے رہو' حتیٰ کہ جب موت حلقوم تک پہنچ جائے تو کہو: یہ چیز فلاں کے لیے اور یہ چیز فلاں کے لیے' یہ تو (اب تم کہو یا نہ کہو) فلاں کے لیے ہو ہی جائے گی۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص اپنی زندگی میں ایک درہم صدقہ کرے تو وہ موت کے وقت سو درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۴۰ مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى

اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر روزے رکھنا فرض کیا گیا تھا

ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَٰتٍ ۚ فَمَن

تاکہ تم متقی بن جاؤ O معدودے چند دنوں میں' سو جو شخص

كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ

تم میں سے بیمار ہو یا مسافر (اور وہ روزے نہ رکھے) تو دوسرے دنوں میں عدد (پورا کرنا لازم ہے)'

وَعَلَى ٱلَّذِينَ يُطِيقُونَهُۥ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ

اور جن لوگوں پر روزے رکھنا دشوار ہو (ان پر ایک روزہ کا) فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے' پھر جو خوشی سے فدیہ

خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُۥ ۚ وَأَن تَصُومُوا۟ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

کی مقدار بڑھا کر زیادہ نیکی کرے تو یہ اس کے لیے زیادہ بہتر ہے' اور اگر تمہیں علم ہو تو روزہ رکھنا تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے O

ربط آیات

سابقہ آیات میں پہلے قصاص کا حکم دیا گیا تھا جس کا تقاضا یہ ہے کہ قاتل اپنے جسم کو حکام اور ولی مقتول کے حوالے کر دے تاکہ وہ اس کو قتل کر دیں' اس حکم پر عمل کرنا انسان کے لیے بہت مشکل اور دشوار ہے' اس کے بعد وصیت کرنے کا حکم دیا' اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے مال کو اپنی ملکیت سے نکال کر دوسروں کے حوالے کر دے' یہ حکم پہلے حکم کی بہ نسبت بہت کم مشکل اور کم دشوار ہے' پھر اس کے بعد روزہ رکھنے کا حکم دیا' یہ اس سے بھی کم مشکل ہے کیونکہ روزہ رکھنے سے انسان کے صرف کھانے پینے کے معمولات بدل جاتے ہیں' اب وہ فجر سے پہلے سحری کرے گا اور دن بھر غروب آفتاب تک بھوکا پیاسا رہے گا' پھر مغرب کے بعد کھانا کھائے گا' یہ حکم پہلے دو حکموں کی بہ نسبت اور بھی کم مشکل ہے تو ان احکام ثلاثہ میں ترتیب یہ ہے کہ پہلے ایک زیادہ مشکل کام کا حکم دیا' پھر بہ تدریج اس مشکل کو کم کر کے احکام دیئے' نیز اسلام کے پانچ ارکان میں سے توحید و رسالت پر ایمان' نماز' زکوٰۃ اور ضمناً حج کا بھی ذکر اس سے پہلی آیات میں آچکا تھا سو اب روزہ کا ذکر فرمایا'

قصاص اور وصیت کی روزہ کے ساتھ یہ مناسبت بھی ہے کہ قصاص میں نفس انسان کو حسی طور پر قتل کیا جاتا ہے اور روزہ میں شہوت کو قتل کیا جاتا ہے اور شہوت وطی کا سبب ہے اور وطی نفس انسان کے پیدا ہونے کا حساً سبب ہے' نیز قصاص میں معنوی طور پر اجسام کی حیات ہے اور روزہ میں ارواح کی حیات ہے' کیونکہ روزہ سے ذہن پاکیزہ ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی نعمتوں اور اپنی بُری عادتوں اور گناہوں میں غور و فکر کرتا ہے جس سے ندامت ہوتی ہے اور وہ توبہ کرتا ہے اور اس کے دل میں خوف خدا پیدا ہوتا ہے اور وہ گناہوں سے بچتا ہے اور دنیا کی رنگینیوں کو ترک کرتا ہے اور فرشتوں کے اوصاف سے متصف ہو جاتا ہے' اسی سبب سے اس مہینہ میں فرشتہ کی وساطت سے قرآن نازل ہوا' بہ ایں ہمہ روزہ کا حکم وصیت کے مناسب تھا' کیونکہ وصیت کے ذریعہ پاکباز لوگوں کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ اب ان سے فرشتوں کی ملاقات کا وقت آ رہا ہے' اس لیے وہ مال دنیا کو ترک کر دیں اور دنیا کا مال وصیت کر کے دوسرے ضرورت مندوں کے حوالے کر دیں' پھر وصیت کے حکم کو مغفرت اور رحمت پر ختم کیا اور اس کے بعد روزہ کا حکم شروع کیا تاکہ معلوم ہو کہ مغفرت اور رحمت سب سے زیادہ روزہ داروں کو حاصل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا تھا۔ (البقرۃ: ۱۸۳)

روزہ کا لغوی اور شرعی معنی اور اس کی مشروعیت کی تاریخ

روزہ کا لغوی معنی ہے: کسی چیز سے رکنا اور اس کو ترک کرنا' اور روزہ کا شرعی معنی ہے: مکلف اور بالغ شخص کا ثواب کی نیت سے طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے' پینے اور جماع کو ترک کرنا اور اپنے نفس کو تقویٰ کے حصول کے لیے تیار کرنا۔

تمام ادیان اور ملل میں روزہ معروف ہے' قدیم مصری' یونانی' رومن اور ہندو سب روزہ رکھتے تھے' موجودہ تورات میں بھی روزہ داروں کی تعریف کا ذکر ہے' اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چالیس دن روزہ رکھنا ثابت ہے' یروشلم کی تباہی کو یاد رکھنے کے لیے یہود اس زمانہ میں بھی ایک ہفتہ کا روزہ رکھتے ہیں' اسی طرح موجودہ انجیلوں میں بھی روزہ کو عبادت قرار دیا گیا ہے اور روزہ داروں کی تعریف کی گئی ہے' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر روزہ فرض کیا گیا تھا اسی طرح تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے' تاکہ مسلمانوں کو روزہ رکھنے میں رغبت ہو کیونکہ جب کسی مشکل کام کو عام لوگوں پر لاگو کر دیا

جاتا ہے تو پھر وہ سہل ہو جاتا ہے۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی نے لکھا ہے کہ ہجرت کے ڈیڑھ سال اور تحویل قبلہ کے بعد دس شعبان کو روزہ فرض کیا گیا۔

(درمختار علی هامش ردالمحتار ج ۲ ص ۸۰ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

سب سے پہلے نماز فرض کی گئی' پھر زکوٰۃ فرض کی گئی' اس کے بعد روزہ فرض کیا گیا' کیونکہ ان احکام میں سب سے سہل اور آسان نماز ہے اس لیے اس کو پہلے فرض کیا گیا' پھر اس سے زیادہ مشکل اور دشوار زکوٰۃ ہے کیونکہ مال کو اپنی ملکیت سے نکالنا انسان پر بہت شاق ہوتا ہے' پھر اس کے بعد اس سے زیادہ مشکل عبادت روزہ کو فرض کیا گیا' کیونکہ روزہ میں نفس کو کھانے پینے اور عمل تزویج سے روکا جاتا ہے اور یہ انسان کے نفس پر بہت شاق اور دشوار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے بہ تدریج احکام شرعیہ نازل فرمائے اور اسی حکمت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارکان اسلام میں نماز اور زکوٰۃ کے بعد روزہ کا ذکر فرمایا' قرآن مجید میں بھی اس ترتیب کی طرف اشارہ ہے:

وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ. (الاحزاب: ۳۵)

اور نماز میں خشوع کرنے والے مرد اور نماز میں خشوع کرنے والی عورتیں اور صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں۔

رمضان اور روزوں کے فضائل کے متعلق احادیث

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ ڈھال ہے' روزہ دار نہ جماع کرے' نہ جہالت کی باتیں کرے' اگر کوئی شخص اس سے لڑے یا اس کو گالی دے تو وہ دو مرتبہ یہ کہے کہ میں روزہ دار ہوں' اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وہ اپنے کھانے' پینے اور نفس کی خواہش کو میری وجہ سے ترک کرتا ہے' روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا' اور (باقی) نیکیوں کا اجر دس گنا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۵۴ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت سہل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں ایک دروازہ ہے' جس کا نام ریان ہے' اس دروازہ سے قیامت کے دن روزہ دار داخل ہوں گے' ان کے علاوہ اور کوئی اس دروازہ سے داخل نہیں ہوگا' کہا جائے گا کہ روزہ دار کہاں ہیں؟ پھر روزہ دار کھڑے ہو جائیں گے' ان کے علاوہ اور کوئی اس دروازہ سے داخل نہیں ہوگا' ان کے داخل ہونے کے بعد اس دروازہ کو بند کر دیا جائے گا' پھر اس میں کوئی داخل نہیں ہوگا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۵۴ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب رمضان داخل ہوتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے۔

امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے ایک روایت میں جنت کے دروازوں کا ذکر کیا ہے اور دوسری روایت میں رحمت کے دروازوں کا ذکر کیا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۴۶)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے حالت ایمان میں ثواب کی نیت

سے لیلۃ القدر میں قیام کیا اس کے پہلے (صغیرہ) گناہ بخش دیئے جائیں گے اور جس نے حالت ایمان میں ثواب کی نیت سے روزہ رکھا اس کے پہلے (صغیرہ) گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جس نے جھوٹی بات اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑا تو اللہ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی حاجت نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: روزے کے سوا ابن آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہوتا ہے' روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا' روزہ ڈھال ہے اور جب تم میں سے کوئی شخص روزہ سے ہو تو وہ نہ جماع کی باتیں کرے نہ شور وشغب کرے' اگر کوئی شخص اس کو گالی دے یا اس سے لڑے تو وہ یہ کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں' اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے' روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں' ایک خوشی افطار کے وقت ایک خوشی اپنے رب سے ملاقات کے وقت ہوگی' اس وقت وہ اپنے روزہ سے خوش ہوگا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۵۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کے روزے رکھے تو صحابہ نے بھی وصال کے روزے رکھے' ان پر یہ روزے دشوار ہوئے' آپ نے ان کو منع فرمایا' صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! آپ بھی تو وصال کے روزے رکھتے ہیں' آپ نے فرمایا: تم میں میری مثل کون ہے؟ مجھے تو کھلایا جاتا ہے اور پلایا جاتا ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۵۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے رمضان کا ایک روزہ بھی بغیر عذر یا بغیر مرض کے چھوڑا تو اگر وہ تمام دہر بھی روزے رکھے تو اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۵۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ایک دن اللہ کی راہ میں روزہ رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ کو جہنم سے ستر سال کی مسافت دور کر دیتا ہے۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۶۴' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حافظ منذری لکھتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانچ نمازیں ایک جمعہ سے دوسرا جمعہ' اور ایک رمضان سے دوسرا رمضان ان کے درمیان ہونے والے گناہوں کا کفارہ ہیں جب کہ گناہ کبیرہ سے بچا جائے۔

(صحیح مسلم)

حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے' جب آپ نے پہلی سیڑھی پر پیر رکھا تو فرمایا: آمین! جب دوسری سیڑھی پر پیر رکھا تو فرمایا: آمین! پھر جب تیسری سیڑھی پر پیر رکھا تو فرمایا: آمین! پھر آپ نے فرمایا: میرے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے اور کہا: اے محمد! جس نے رمضان کو پایا اور اس کی بخشش نہیں کی گئی اللہ اس کو (اپنی رحمت سے) دور کر دے' میں نے کہا: آمین! اور کہا: جس نے اپنے ماں باپ یا ان میں سے کسی ایک کو پایا اس کے باوجود دوزخ میں داخل ہو گیا' اللہ اس کو اپنی رحمت سے دور کر دے' میں نے کہا: آمین! اور کہا: جس کے سامنے آپ کا ذکر

کیا گیا اور وہ آپ پر درود نہ پڑھے اللہ اس کو (اپنی رحمت سے) دور کر دے میں نے کہا: آمین! ۔ (صحیح ابن حبان)

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری دن خطبہ دیا اور فرمایا: اے لوگو! تمہارے پاس ایک عظیم اور مبارک مہینہ آ پہنچا ہے اس مہینہ میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے' اللہ نے اس مہینہ میں روزہ کو فرض کر دیا ہے اور اس کی رات میں قیام کو نفل کر دیا ہے' جو شخص اس مہینہ میں کوئی نیکی کرے تو وہ دوسرے مہینہ میں فرض ادا کرنے کی مثل ہے' اور جو شخص اس مہینہ میں فرض ادا کرے تو وہ ایسا ہے جیسے دوسرے مہینہ میں ستر فرض ادا کیے' یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے' یہ غمگساری کرنے کا مہینہ ہے' یہ وہ مہینہ ہے جس میں مومن کے رزق میں زیادتی کی جاتی ہے' اس مہینہ میں جو کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرائے اس کے لیے گناہوں کی مغفرت ہے اور اس کی گردن کے لیے دوزخ سے آزادی ہے' اور اس کو بھی روزہ دار کی مثل اجر ملے گا اور اس روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی' صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! ہم میں سے ہر شخص کی یہ استطاعت نہیں ہے کہ وہ روزہ دار کو افطار کرا سکے' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی عطا فرمائے گا جو روزہ دار کو ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی یا ایک گھونٹ دودھ سے روزہ افطار کرائے' یہ وہ مہینہ ہے جس کا اوّل رحمت ہے' جس کا اوسط مغفرت ہے اور جس کا آخر جہنم سے آزادی ہے' جس شخص نے اس مہینہ میں اپنے خادم سے کام لینے میں تخفیف کی اللہ اس کی مغفرت کر دے گا اور اس کو دوزخ سے آزاد کر دے گا۔ اس مہینہ میں چار خصلتوں کو جمع کرو' دو خصلتوں سے تم اپنے رب کو راضی کرو اور دو خصلتوں کے بغیر تمہارے لیے کوئی چارہ کار نہیں ہے' جن دو خصلتوں سے تم اپنے رب کو راضی کرو گے وہ کلمۂ شہادت پڑھنا ہے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنا ہے' اور جن دو خصلتوں کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے وہ یہ ہیں کہ تم اللہ سے جنت کا سوال کرو اور اس سے دوزخ سے پناہ طلب کرو اور جو شخص کسی روزہ دار کو پانی پلائے گا' اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض سے پلائے گا' اسے پھر کبھی پیاس نہیں لگے گی حتیٰ کہ وہ جنت میں چلا جائے گا۔
(صحیح ابن خزیمہ' بیہقی' صحیح ابن حبان)

امام ابن حبان نے یہ بھی روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے رمضان کے مہینہ میں اپنی حلال کمائی سے کسی روزہ دار کو روزہ افطار کرایا تو رمضان کی تمام راتوں میں فرشتے اس کے لیے استغفار کرتے ہیں اور لیلۃ القدر میں جبریل علیہ السلام اس سے مصافحہ کرتے ہیں اور جس سے جبریل علیہ السلام مصافحہ کرتے ہیں اس کے دل میں رقت پیدا ہوتی ہے اور اس کے بہت آنسو نکلتے ہیں۔ حضرت سلمان نے کہا: یا رسول اللہ! یہ فرمائیے اگر کسی شخص کے پاس افطار کرانے کے لیے کچھ نہ ہو؟ آپ نے فرمایا: وہ ایک مٹھی طعام دے دے' میں نے کہا: یہ فرمائیے اگر اس کے پاس روٹی کا ایک لقمہ بھی نہ ہو؟ آپ نے فرمایا: وہ ایک گھونٹ دودھ دے دے' میں نے عرض کیا: اگر اس کے پاس وہ بھی نہ ہو؟ فرمایا: ایک گھونٹ پانی دے دے (امام ابن خزیمہ اور بیہقی نے بھی اس کو روایت کیا ہے)۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رمضان آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے پاس رمضان آ گیا ہے' یہ برکت کا مہینہ ہے' اللہ تعالیٰ تم کو اس میں ڈھانپ لیتا ہے' اس میں رحمت نازل ہوتی ہے اور گناہ جھڑ جاتے ہیں اور اس میں دعا مقبول ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ اس مہینہ میں تمہاری رغبت کو دیکھتا ہے سو تم اللہ کو اس مہینہ میں نیک کام کر کے دکھاؤ کیونکہ وہ شخص بدبخت ہے جو اس مہینہ میں اللہ عزوجل کی رحمت سے محروم رہا (اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں' البتہ اس کے ایک راوی محمد بن قیس کے متعلق مجھے کوئی جرح یا تعدیل مستحضر نہیں ہے)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب ماہ رمضان کی پہلی رات آتی ہے' تو جنتوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور پھر پورے ماہ ان میں سے ایک دروازہ بھی بند نہیں کیا جاتا' اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور پھر پورے ماہ ان میں سے کوئی دروازہ کھولا نہیں جاتا' اور سرکش جنوں کے گلوں میں طوق ڈال دیا جاتا ہے اور ہر رات صبح تک ایک منادی آسمان سے ندا کرتا ہے: اے نیکی کے طلب کرنے والے! نیکی کا قصد کر اور زیادہ نیکی کر' اور اے برائی کے طلب کرنے والے! برائی میں کمی کر اور آخرت میں غور و فکر کر' کوئی مغفرت طلب کرنے والا ہے تو اس کی مغفرت کر دی جائے اور کوئی توبہ کرنے والا ہے تو اس کی توبہ قبول کی جائے اور کوئی دعا کرنے والا ہے تو اس کی دعا قبول کی جائے اور کوئی سوال کرنے والا ہے تو اس کا سوال پورا کیا جائے' اور اللہ تعالیٰ ماہ رمضان کی ہر رات میں ساٹھ ہزار لوگوں کو جہنم سے آزاد کرتا ہے' اور رمضان کی ہر رات میں جتنے لوگوں کو جہنم سے آزاد کرتا ہے عید کے دن اس سے تیس گنا زیادہ لوگوں کو جہنم سے آزاد کرتا ہے (اس حدیث کو امام بیہقی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث حسن ہے)۔

حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کا ذکر کیا اور تمام مہینوں پر اس کی فضیلت بیان کی' پس فرمایا: جس نے رمضان میں ایمان کی حالت میں ثواب کی نیت سے قیام کیا وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جائے گا جس طرح آج ہی اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہو (اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے)۔

حضرت عمرہ بن مرہ جہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: یا رسول اللہ! یہ بتایئے اگر میں اللہ کے وحدہٗ لاشریک ہونے اور آپ کے رسول اللہ ہونے کی گواہی دوں' اور پانچوں نمازیں پڑھوں اور زکوٰۃ ادا کروں اور رمضان کے روزے رکھوں اور قیام کروں تو میرا کن لوگوں میں شمار ہوگا؟ آپ نے فرمایا: صدیقین اور شہداء میں۔

(مسند بزار' صحیح ابن خزیمہ' صحیح ابن حبان) (الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۱۰۶۔ ۹۲ ملتقطا مطبوعہ دارالحدیث' قاہرہ)

بعض نفلی روزوں کی فضیلت

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبداللہ! کیا مجھے یہ خبر نہیں دی گئی ہے کہ تم دن کو روزہ رکھتے ہو اور رات کو قیام کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں' یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: نہ کرو' روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو (بغیر روزہ کے رہو)' قیام بھی کرو اور سوؤ بھی' کیونکہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے' اور تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے' اور تمہارے لیے یہ کافی ہے کہ تم ہر مہینہ کے تین دن روزے رکھو' اور تمہیں ہر نیکی کا دس گنا اجر ملے گا اور یہ تمہارے پورے دہر کے روزے ہو جائیں گے' میں نے شدت کی اور کہا: یا رسول اللہ! میں قوت پاتا ہوں تو آپ نے فرمایا: اللہ کے نبی داؤد کے روزے رکھو اور اس پر زیادتی نہ کرو' میں نے عرض کیا: اللہ کے نبی داؤد کے روزے کس طرح تھے؟ آپ نے فرمایا: نصف دہر (ایک دن روزہ' ایک دن افطار)۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۶۵ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

ابن ملحان قیسی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ایام بیض کے روزے رکھنے کا حکم دیتے تھے تیرھویں' چودھویں اور پندرھویں تاریخ کے روزے کا اور فرماتے: ان روزوں سے پورے دہر کے روزوں کا اجر ملے

گا۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۳۳۲ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

تین روزوں کا دس گنا اجر ملے گا جیسا کہ "صحیح بخاری" کی روایت میں ہے تو ہر ماہ تین روزے رکھنے سے پورے ماہ کے روزوں کا اجر ملے گا اور جو شخص ہمیشہ یہ روزے رکھے گا اس کو تمام دہر کے روزوں کا اجر ملے گا۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے' پھر اس نے شوال کے چھ روزے رکھے تو اس کو تمام دہر کے روزوں کا اجر ملے گا۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۶۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

ہر نیکی کا دس گنا اجر ہوتا ہے تو چھتیس روزوں کا اجر ۳۶۰ روزوں کے برابر ہوا' گویا وہ پورا سال روزہ دار رہا۔

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یوم عرفہ کا روزہ رکھنے سے مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہ مٹا دے گا اور دس محرم کا روزہ رکھنے سے مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ایک سال پہلے کے گناہ مٹا دے گا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۶۷ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

قدامہ بن مظعون بیان کرتے ہیں کہ وہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے ساتھ وادی القریٰ میں اپنے مال کی طلب میں گئے' حضرت اسامہ پیر اور جمعرات کا روزہ رکھتے تھے' قدامہ نے کہا: آپ بوڑھے آدمی ہیں' آپ پیر اور جمعرات کا روزہ کیوں رکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیر اور جمعرات کا روزہ رکھتے تھے' آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: پیر اور جمعرات کو بندوں کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۳۳۱ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ماہِ رمضان کے بعد سب سے افضل روزے اللہ کے مہینہ محرم کے روزے ہیں اور فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز رات کی نماز ہے۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۳۳۰ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مسلسل) روزے رکھتے حتیٰ کہ ہم کہتے کہ اب آپ افطار (روزہ ترک کرنا) نہیں کریں گے' اور آپ روزے نہ رکھتے حتیٰ کہ ہم کہتے: اب آپ روزے نہیں رکھیں گے' اور میں نے رمضان کے علاوہ آپ کو کسی ماہ کے مکمل روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ شعبان کے مہینہ سے زیادہ کسی اور مہینہ میں روزے رکھتے ہوئے دیکھا۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۳۳۱۔ ۳۳۰ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

بعض ایام میں روزہ رکھنے کی ممانعت

امام ابوداؤد بیان کرتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دنوں میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا' عید الاضحیٰ کے دن کیونکہ اس دن تم اپنی قربانی کا گوشت کھاتے ہو اور عید الفطر کے دن کیونکہ اس دن تم اپنے روزوں سے افطار کرتے ہو۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۳۲۸ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

حضرت عقبہ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یوم عرفہ' یوم نحر اور ایام تشریق ہم اہل اسلام کی عید ہیں اور یہ کھانے پینے کے ایام ہیں۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۳۲۹۔ ۳۲۸ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

میدانِ عرفات میں یوم عرفہ کا روزہ رکھنا منع ہے اور دوسری جگہوں میں اس دن روزہ رکھنا کارِ ثواب ہے اور عیدین میں روزہ رکھنا ممنوع ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ عرفات میں یوم عرفہ کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۳۳۱ مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص (صرف) جمعہ کے دن کا روزہ نہ رکھے الا یہ کہ اس سے ایک دن پہلے اور ایک دن بعد بھی روزہ رکھے۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۳۲۹ مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

ابوداؤد نے کہا: یہ حدیث منسوخ ہے۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۳۲۹ مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

یہود ہفتہ کے دن کی تعظیم کی وجہ سے اس دن کا روزہ رکھتے تھے' ان کی مشابہت کی وجہ سے اس دن کے روزے سے منع فرمایا۔

روزہ کے اسرار و رموز

(۱) روزہ رکھنے سے کھانے پینے اور شہوانی لذات میں کمی ہوتی ہے' اس سے حیوانی قوت کم ہوتی ہے اور روحانی قوت زیادہ ہوتی ہے۔

(۲) کھانے پینے اور شہوانی عمل کو ترک کر کے انسان بعض اوقات میں اللہ عزوجل کی صفت صمدیہ سے متصف ہو جاتا ہے اور بہ قدر امکان ملائکہ مقربین کے مشابہ ہو جاتا ہے۔

(۳) بھوک اور پیاس پر صبر کرنے سے انسان کو مشکلات اور مصائب پر صبر کرنے کی عادت پڑتی ہے اور مشقت برداشت کرنے کی مشق ہوتی ہے۔

(۴) خود بھوکا اور پیاسا رہنے سے انسان کو دوسروں کی بھوک اور پیاس کا احساس ہوتا ہے اور پھر اس کا دل غرباء کی مدد کی طرف مائل ہوتا ہے۔

(۵) بھوک پیاس کی وجہ سے انسان گناہوں کے ارتکاب سے محفوظ رہتا ہے۔

(۶) بھوکا پیاسا رہنے سے انسان کا تکبر ٹوٹتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ کھانے پینے کی معمولی مقدار کا کس قدر محتاج ہے۔

(۷) بھوکا رہنے سے ذہن تیز ہوتا ہے اور بصیرت کام کرتی ہے' حدیث میں ہے: جس کا پیٹ بھوکا ہو اس کی فکر تیز ہوتی ہے۔

(احیاء العلوم ج ۳ ص ۸۱)

اور پیٹ (بھر کر کھانا) بیماری کی جڑ ہے اور پرہیز علاج کی بنیاد ہے۔ (احیاء العلوم ج ۳ ص ۱۲۱) اور لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی: اے بیٹے! جب معدہ بھر جاتا ہے تو فکر سو جاتی ہے اور حکمت گونگی ہو جاتی ہے اور عبادت کرنے کے لیے اعضاء سست پڑ جاتے ہیں' دل کی صفائی میں کمی آ جاتی ہے اور مناجات کی لذت اور ذکر میں رقت نہیں رہتی۔

(۸) روزہ کسی کام کے نہ کرنے کا نام ہے' یہ کسی ایسے عمل کا نام نہیں ہے جو دکھائی دے اور اس کا مشاہدہ کیا جائے' یہ ایک مخفی عبادت ہے' اس کے علاوہ باقی تمام عبادات کسی کام کے کرنے کا نام ہیں وہ دکھائی دیتی ہیں اور ان کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور روزہ کو اللہ کے سوا کوئی نہیں دیکھتا' باقی تمام عبادات میں ریا ہو سکتا ہے روزہ میں نہیں ہو سکتا' یہ اخلاص کے سوا اور کچھ

نہیں۔

(۹) شیطان انسان کی رگوں میں دوڑتا ہے اور بھوک پیاس سے شیطان کے راستے تنگ ہو جاتے ہیں اسی طرح روزہ سے شیطان پر ضرب پڑتی ہے۔

(۱۰) روزہ امیر اور غریب' شریف اور خسیس سب پر فرض ہے' اس سے اسلام کی مساوات مؤکد ہو جاتی ہے۔

(۱۱) روزانہ ایک وقت پر سحری اور افطار کرنے سے انسان کو نظام الاوقات کی پابندی کرنے کی مشق ہوتی ہے۔

(۱۲) فربہی' تبخیر اور بسیار خوری ایسے امراض میں روزہ رکھنا صحت کے لیے بہت مفید ہے۔

روزہ کے فساد و عدم فساد کے بعض ضروری مسائل

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

اگر روزہ دار بھولے سے کھالے یا پی لے یا جماع کرے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا' اگر روزہ دار کے حلق میں غبار یا مکھی یا دھواں داخل ہو خواہ اس کو روزہ یاد ہو تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ ان سے بچنا مشکل ہے' تیل لگانے سے یا سرمہ لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا خواہ ان کا ذائقہ حلق میں محسوس ہو' فصد لگوانے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا' بوسہ لینے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا بہ شرطیکہ اس سے انزال نہ ہو' احتلام سے بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا' کلی کرنے کے بعد جو تری منہ میں رہ گئی اس کو نگلنے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا' کان میں پانی داخل ہونے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا' اگر دانتوں کے درمیان سے خون نکلا اور اس کو نگل لیا تو اگر خون غالب تھا تو روزہ ٹوٹ گیا ورنہ نہیں' استمنا بالید سے اگر انزال ہو گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا' ورنہ نہیں۔ اگر ناک (رینٹ) کو اندر کھینچ لیا اور وہ حلق میں چلی گئی تو روزہ نہیں ٹوٹے گا' کسی چیز کے چکھنے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا' اگر رات سمجھ کر سحری کی اور صبح ہو چکی تھی یا غروب آفتاب سمجھ کر روزہ افطار کیا اور آفتاب غروب نہیں ہوا تھا تو روزہ ٹوٹ گیا اور اس پر صرف قضاء ہے اور کفارہ نہیں ہے' اگر کوئی شخص رمضان کے روزہ میں عمداً جماع کرے' یا عمداً دوا یا غذا کھائے یا پئے تو ان تمام صورتوں میں قضا اور کفارہ ہے' اور اگر از خود قے آئے اور وہ اس کو واپس حلق میں نہ لوٹائے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا خواہ قے منہ بھر کر آئے یا منہ بھر کر نہ آئے' اور اگر خود بخود واپس حلق میں چلی جائے پھر بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا' اور اگر عمداً قے لوٹالی تو روزہ ٹوٹ جائے گا بہ شرطیکہ منہ بھر کر قے آئی ہو' یہ مختار مذہب ہے' اور اگر از خود قے کی تو اگر منہ بھر کر قے کی ہے تو اجماعاً روزہ ٹوٹ جائے گا اور اس میں صرف قضاء ہے کفارہ نہیں ہے۔

روزہ میں کسی چیز کو بلا عذر چکھنا مکروہ ہے' دنداسہ چبانا مکروہ ہے' بوسہ لینا اور معانقہ کرنا مکروہ ہے' مونچھوں پر تیل لگانا اور سرمہ لگانا مکروہ نہیں ہے' مسواک کرنا مکروہ نہیں ہے خواہ شام کے وقت کی جائے۔

(در مختار علی ہامش رد المختار ج ۲ ص ۱۱۴۔ ۱۰۷ ملخصاً مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

انجکشن لگوانے سے روزہ ٹوٹنے کا بیان

تحقیق یہ ہے کہ انجکشن لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے' قدیم فقہاء کے دور میں انسانی جسم کی اور اس کے تمام اعضاء کی مکمل تحقیق نہیں ہوئی تھی اور ان کے نظریات محض مفروضات پر مبنی تھے' انہوں نے انسان کے جسم کا مکمل مشاہدہ اور تجزیہ نہیں کیا تھا اور اب تحقیق اور تجربہ سے ان کے کئی نظریات غلط ثابت ہو گئے' مثلاً ان کا مفروضہ تھا کہ دماغ اور معدہ کے درمیان ایک منفذ (راستہ) ہے اور دماغ سے معدہ میں یا معدہ سے دماغ میں کوئی چیز چلی جاتی ہے' حالانکہ دماغ اور معدہ میں کوئی منفذ نہیں ہے' نیز ان کا مفروضہ تھا کہ کان اور معدہ میں منفذ ہے حالانکہ کان اور معدہ میں کوئی منفذ نہیں ہے' انہیں مفروضات کی بناء پر

انہوں نے یہ کہا کہ جوف معدہ یا جوف دماغ میں کوئی غذا یا دوا چلی جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا' لیکن یہ فقہاء اس غلطی میں معذور تھے کیونکہ اس زمانہ میں پوسٹ مارٹم کے ذریعہ جسم کے تمام رگ و ریشہ کا مکمل مطالعہ اور مشاہدہ نہیں کیا گیا تھا' نیز ان کے زمانہ میں جسم کو غذا یا دوا کے ذریعہ منفعت پہنچانے کا ذریعہ صرف معدہ کا نظام ہضم تھا' اس لیے انہوں نے کہا: دوا یا غذا معدہ میں پہنچ جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا' جب ہم منہ کے ذریعہ دوا کھاتے ہیں تو معدہ کے ہضم کرنے کے بعد وہ دوا خون میں پہنچ جاتی ہے اور جب تک وہ دوا خون میں نہ مل جائے اس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا' پہلے دوا سے استفادہ کا صرف یہی ایک طریقہ تھا' لیکن اب میڈیکل سائنس نے ترقی کر لی ہے اور انجکشن کے ذریعہ دوا کو براہِ راست خون میں پہنچا دیا جاتا ہے' بعض اوقات کسی عارضہ کی وجہ سے معدہ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اور منہ سے دوا کھانے کا کوئی اثر نہیں ہوتا' بعض دفعہ اس قدر الٹیاں آتی ہیں کہ جو دوا کھاؤ وہ فوراً الٹی کے ذریعہ نکل جاتی ہے' پہلے اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں تھا' لیکن اب جب معدہ کام نہ کرے یا کسی چیز کو قبول نہ کرے یا دوا کا اثر جلدی مطلوب ہو تو دوا کو انجکشن کے ذریعہ براہِ راست خون میں پہنچا دیا جاتا ہے' لہٰذا منہ کے ذریعہ دوا کھانے سے جو فائدہ مطلوب ہوتا ہے وہ انجکشن کے ذریعہ دوا خون میں پہنچانے سے بہ طریق اتم اور اکمل حاصل ہو جاتا ہے' فرق یہ ہے کہ منہ کے ذریعہ دوا کھانے سے معدہ کے عمل ہضم کے بعد دوا خون میں پہنچتی ہے اور انجکشن کے ذریعہ اسی وقت براہِ راست دوا خون میں پہنچ جاتی ہے اور اثر کرتی ہے اس لیے جس طرح منہ کے ذریعہ دوا کھانے سے روزہ ٹوٹتا ہے اسی طرح دوا کا انجکشن لگوانے سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا۔

بعض علماء یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ پھر مچھر یا بھڑ کے ڈنگ لگانے سے روزہ کیوں نہیں ٹوٹتا' اس کا جواب یہ ہے کہ روزہ ٹوٹنے کا مدار اس پر ہے کہ انسان اپنے قصد اور اختیار سے کوئی دوا یا غذا جسم میں پہنچائے اور مچھر یا بھڑ کے کاٹنے میں انسان کا قصد اور اختیار نہیں ہے۔ ثانیاً ان کے ڈنک سے جو زہر جسم میں پہنچتا ہے وہ دوا یا غذا نہیں ہے نہ اس میں جسم کی منفعت ہے بلکہ اس سے جسم کو ضرر لاحق ہوتا ہے۔ دوا یا گلوکوز کا انجکشن لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس میں صرف قضا ہے کفارہ نہیں ہے' کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز صورۃً اور معنیً دونوں طرح مفطر ہو اس سے قضا اور کفارہ دونوں لازم آتے ہیں اور جو صرف صورۃً یا صرف معنیً مفطر ہو اس سے صرف قضا لازم ہے کفارہ لازم نہیں ہے اور دوا یا گلوکوز کا انجکشن لگوانا صرف معنیً مفطر ہے صورۃً مفطر نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر مکمل با دلائل اور باحوالہ بحث میں نے "شرح صحیح مسلم" جلد اول طبع خامس میں کی ہے' وہاں مطالعہ فرمائیں' اس کا کچھ ذکر "شرح صحیح مسلم" جلد ثالث کے ضمیمہ میں بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا مسافر ہو (اور وہ روزے نہ رکھے) تو دوسرے دنوں میں عدد (پورا کرنا لازم ہے)۔ (البقرہ: ۱۸۴)

مریض کے روزہ قضا کرنے کے متعلق مذاہب ائمہ

علامہ ابو اسحاق شیرازی شافعی لکھتے ہیں:

جو شخص مرض کی وجہ سے روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو' روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کو مرض کے بڑھنے کا خدشہ ہو اور اس مرض کے زائل ہونے کی توقع ہو تو اس پر روزہ رکھنا واجب نہیں ہے اور جب مرض زائل ہو جائے تو اس پر ان روزوں کی قضا کرنا واجب ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے: " فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ " (البقرہ: ۱۸۴) اور اگر کسی شخص نے صبح کو تندرستی کی حالت میں روزہ رکھا پھر بیمار ہو گیا تو وہ روزہ توڑ دے کیونکہ ضرورت کی وجہ سے اس کے لیے روزہ توڑنا جائز ہے اور ضرورت متحقق ہے لہٰذا روزہ توڑنا جائز ہے۔ (المہذب مع شرح المہذب ج ۶ ص ۲۵۸۔ ۲۵۷ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

علامہ نووی شافعی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:
جو شخص کسی ایسے مرض کی وجہ سے روزہ رکھنے سے عاجز ہو جس کا زائل ہونا متوقع ہو اس پر اس وقت روزہ رکھنا لازم نہیں ہے' اور اس پر قضا لازم ہے' یہ اس وقت ہے جب اس کو روزہ رکھنے سے مشقت ہو اور اس میں یہ شرط نہیں ہے کہ اس کا مرض اس حالت کو پہنچ جائے کہ اس کے لیے روزہ رکھنا ممکن ہی نہ ہو' بلکہ ہمارے اصحاب نے یہ کہا ہے کہ افطار کے مباح ہونے کی شرط یہ ہے کہ روزہ رکھنے سے اس کو مشقت ہو' اگر اس کو پورے وقت بخار رہتا ہو تو وہ رات کو روزے کی نیت نہ کرے' اور اگر کسی وقت بخار ہو اور کسی وقت نہ ہو اگر روزہ کے شروع کے وقت بخار ہو تو روزہ کی نیت نہ کرے اور اگر بخار نہ ہو تو روزہ کی نیت کرے' پھر اگر بعد میں بخار ہو جائے اور روزہ توڑنے کی ضرورت ہو تو روزہ توڑ دے۔ اسی طرح اگر تندرست آدمی صبح روزہ رکھے اور بعد میں بیمار ہو جائے تو اس کے لیے بغیر کسی اختلاف کے روزہ توڑنا جائز ہے۔
(شرح المہذب ج ۶ ص ۲۵۶ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:
تمام اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ مریض کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور اس کی دلیل سورۂ بقرہ کی یہ آیت (۱۸۴) ہے۔ جس مرض کی وجہ سے روزہ نہ رکھنا جائز ہے یہ وہ مرض ہے جو روزہ رکھنے سے زیادہ یا روزہ رکھنے کی وجہ سے دیر میں صحیح ہو' امام احمد سے کہا گیا کہ مریض کب روزہ نہ رکھے؟ کہا: جب روزہ کی طاقت نہ رکھے' پوچھا گیا: مثلاً بخار' تو کہا: بخار سے بڑھ کر اور کون سا مرض ہوگا؟ (المغنی ج ۳ ص ۴۱ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)
نیز علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:
جو شخص تندرست ہو اور روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کو بیمار پڑنے کا خدشہ ہو وہ اس مریض کی طرح ہے جس کو روزہ رکھنے کی وجہ سے مرض کے بڑھنے کا خدشہ ہو۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۲ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)
علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:
مریض کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت یہ ہے کہ اس میں روزہ رکھنے کی مطلقاً طاقت نہ ہو' اس حالت میں اس پر روزہ نہ رکھنا واجب ہے' دوسری حالت یہ ہے کہ وہ تکلیف اور مشقت برداشت کر کے روزہ رکھ سکتا ہو' اس حالت میں اس کے لیے روزہ نہ رکھنا مستحب ہے اور اس صورت میں صرف جاہل ہی روزہ رکھے گا۔ (الی قولہ) جمہور علماء نے یہ کہا ہے کہ جب روزہ رکھنے سے کسی شخص کو درد ہو یا تکلیف پہنچے یا روزہ رکھنے کی وجہ سے مرض کا طول پکڑنے یا زیادہ ہونے کا خدشہ ہو تو اس کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ امام مالک کے مذہب کے ماہرین کا یہی مذہب ہے۔
(الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۲۷۶ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں:
امام ابوحنیفہ' امام ابو یوسف اور امام محمد نے کہا: جب یہ خوف ہو کہ اس کی آنکھ میں درد زیادہ ہوگا یا بخار زیادہ ہو جائے گا تو روزہ نہ رکھے۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۱۷۲ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور' ۱۴۰۰ھ)
علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں:
سفر شرعی کرنے والے مسافر' حاملہ اور دودھ پلانے والی کو غلبہ ظن سے اپنی جان یا اپنے بچے کی جان کا خوف ہو یا مرض بڑھنے کا خوف ہو' یا تندرست آدمی کو غلبہ ظن' تجربہ' علامات یا طبیب کے بتانے سے مرض پیدا ہونے کا خوف ہو یا خادمہ کو ضعف

کا خوف ہو تو ان کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور بعد میں ان ایام کی قضاء کریں۔

(درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۲ ص ۱۱۷۔ ۱۱۶ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت)

جس شخص کے گردہ میں پتھری ہو یا جس کو درد گردہ کا عارضہ ہو اس کو دن میں بیس پچیس گلاس پانی پینے ہوتے ہیں یا جو شخص ہسپتال کے انتہائی نگہداشت کے شعبہ میں داخل ہو یہ لوگ اس بیماری کے دوران روزے نہ رکھیں اور بیماری زائل ہونے کے بعد ان روزوں کی قضا کریں۔

مسافر کے روزہ قضا کرنے کے متعلق مذاہب اربعہ

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں بھیڑ دیکھی اور دیکھا کہ ایک شخص پر سایہ کیا گیا ہے' آپ نے پوچھا: اس کو کیا ہوا؟ عرض کیا: یہ روزہ دار ہے' فرمایا: سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۶۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کرتے' روزہ دار روزہ نہ رکھنے والے کی مذمت کرتا تھا نہ روزہ نہ رکھنے والا روزہ دار کی مذمت کرتا تھا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۶۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے مکہ گئے' جب آپ عسفان پر پہنچے تو آپ نے پانی منگایا اور اس کو اپنے ہاتھ سے اوپر اٹھایا تاکہ اس کو لوگ دیکھ لیں' پھر آپ نے روزہ کھول لیا (اس کے بعد آپ نے روزے نہیں رکھے) حتیٰ کہ مکہ پہنچ گئے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۶۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

مسافر کے لیے روزہ رکھنا اور روزہ نہ رکھنا دونوں جائز ہیں' اگر اس کو روزہ رکھنے سے ضرر نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے اور اگر ضرر ہو تو روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ (روضۃ الطالبین ج ۲ ص ۳۶۹ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

مسافر کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے' اگر اس نے روزہ رکھ لیا تو یہ مکروہ ہے لیکن روزہ ہو جائے گا۔

(المغنی ج ۳ ص ۴۴ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

علماء کا اختلاف ہے کہ کس سفر پر روزہ نہ رکھنے اور نماز قصر کرنے کی رخصت ہے۔ حج' جہاد یا دیگر عبادات کے لیے سفر ہو تو اس میں اس رخصت پر اجماع ہے۔ رشتہ داروں سے ملاقات اور طلب معاش کے لیے سفر بھی اس کے ساتھ لاحق ہے' تجارات اور مباح سفر (مثلاً سیر و سیاحت) میں اختلاف ہے لیکن ان میں بھی رخصت کا ہونا زیادہ راجح ہے' اور جو سفر معصیت ہو (مثلاً چوری یا ڈاکے کے لیے سفر کرے) اس میں اختلاف ہے اور اس میں رخصت کا ممنوع ہونا راجح ہے' اور سفر کی مسافت کی مقدار امام مالک کے نزدیک وہی ہے جتنی مسافت میں قصر جائز ہوتی ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۲۷۷ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ھ)

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

سفر شرعی میں روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے جو تین دن تین راتوں کی مسافت پر مشتمل ہو خواہ یہ سفر معصیت ہو۔
(ردالمحتار ج ۲ ص ۱۱۶ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت '۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جن لوگوں پر روزہ رکھنا دشوار ہو (ان پر ایک روزہ کا) فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ (البقرہ: ۱۸۴)

"الذین یطیقونہ" کے معنی کی تحقیق میں احادیث اور آثار

اس آیت کے معنی میں اختلاف ہے آیا اس کا معنی ہے: جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہیں وہ روزہ نہ رکھیں اور ایک مسکین کا کھانا فدیہ میں دیں اور پھر یہ آیت اس دوسری آیت سے منسوخ ہو گئی:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۗ (البقرہ: ۱۸۵) تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں موجود ہو وہ ضرور اس ماہ میں روزہ رکھے۔

یا اس آیت میں "یطیقونہ" "یطوقونہ" کے معنی میں ہے: یعنی جن لوگوں پر روزہ رکھنا سخت دشوار ہو وہ روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں اور یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔

اوّل الذکر معنی کی تائید میں یہ حدیث ہے، امام بخاری روایت کرتے ہیں:

"وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۗ" (البقرہ: ۱۸۴) حضرت ابن عمر اور حضرت سلمہ بن اکوع نے کہا: اس کو اس آیت نے منسوخ کر دیا: "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۗ" (البقرہ: ۱۸۵)۔

ابن ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب بیان کرتے ہیں کہ رمضان نازل ہوا اور صحابہ پر روزہ رکھنا دشوار ہوا تو بعض صحابہ جو روزہ کی طاقت رکھتے تھے وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتے اور روزہ ترک کر دیتے' انہیں اس کی رخصت دی گئی تھی' پھر اس رخصت کو اس آیت نے منسوخ کر دیا: "وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ" (البقرہ: ۱۸۴) روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے" تو انہیں روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا۔ نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر نے "فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ" (البقرہ: ۱۸۴) کو پڑھا اور فرمایا: یہ منسوخ ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۶۱ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اور ثانی الذکر معنی کی تائید میں یہ حدیث ہے' امام دار قطنی روایت کرتے ہیں:

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب بوڑھا شخص روزہ رکھنے سے عاجز ہو تو وہ ایک مد (ایک کلو) طعام کھلا دے' اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (سنن دار قطنی ج ۲ ص ۲۰۴ مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام دار قطنی نے ایک اور سند سے روایت کیا:

عطاء بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے "وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۗ" (البقرہ: ۱۸۴) کی تفسیر میں فرمایا: ایک مسکین کو کھانا کھلائے اور "فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا" (البقرہ: ۱۸۴) کی تفسیر میں فرمایا: اگر ایک سے زیادہ مسکین کو کھلائے تو زیادہ بہتر ہے' اور فرمایا: یہ آیت منسوخ نہیں ہے' البتہ اس میں اس بوڑھے شخص کو رخصت دی گئی ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا اور اس کو طعام کھلانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حدیث کی سند ثابت اور صحیح ہے۔

امام دار قطنی نے ایک اور سند سے اس حدیث کو عطاء سے روایت کیا ہے اس میں حضرت ابن عباس نے فرمایا: "یطیقونہ" کا معنی ہے: "یکلفونہ" یعنی جو سخت دشواری سے روزہ رکھیں وہ اس کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلائیں اور جو ایک سے زیادہ مسکین کو کھلائے تو یہ اس کے حق میں زیادہ بہتر ہے اور یہ آیت منسوخ نہیں ہے اور تمہارا روزہ رکھنا بہتر ہے' یہ رخصت

صرف اس بوڑھے شخص کے لیے ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا یا اس مریض کے لیے ہے جس کو بیماری سے شفا کی توقع نہیں ہے۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

امام دار قطنی نے ایک اور سند کے ساتھ مجاہد اور عطاء سے حضرت ابن عباس کی یہ روایت ذکر کی ہے اور کہا: اس کی سند صحیح ہے۔

امام دار قطنی نے ایک اور سند کے ساتھ عکرمہ سے روایت کیا:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بوڑھے شخص کو یہ رخصت دی گئی ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے اور ہر روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھلائے اور اس پر قضاء نہیں ہے۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

امام دار قطنی نے چودہ صحیح سندوں کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔

(سنن دار قطنی ج ۲ ص ۲۰۷ ۔ ۲۰۵ 'مطبوعہ نشر السنہ' ملتان)

نیز امام دار قطنی روایت کرتے ہیں:

نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر سے ایک حاملہ عورت نے سوال کیا تو انہوں نے کہا: تم روزہ نہ رکھو اور ہر روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلاؤ اور قضاء نہ کرو۔

نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر کی بیٹی ایک قرشی کے نکاح میں تھیں' وہ حاملہ تھیں' ان کو رمضان میں پیاس لگی تو حضرت ابن عمر نے فرمایا: وہ روزہ نہ رکھے اور ہر روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔

ایوب بیان کرتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک ایک کمزوری کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکے تو انہوں نے ایک تھال میں ثرید (گوشت کے سالن میں روٹی کے ٹکڑے ڈال دیئے جائیں) بنایا اور تیس مسکینوں کو سیر کر کے کھلایا۔

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ موت سے پہلے حضرت انس کمزور ہو گئے تو انہوں نے روزے نہ رکھے اور گھر والوں سے کہا: ہر روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلائیں' تو انہوں نے تیس مسکینوں کو کھلایا۔

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ قیس بن سائب نے کہا: رمضان کے مہینہ میں ہر شخص روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھلاتا ہے تم میری طرف سے دو مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جس شخص کو بڑھاپا آ جائے اور وہ روزہ نہ رکھ سکے اس پر لازم ہے کہ ہر روزہ کے بدلہ میں ایک کلو گندم دے۔ (سنن دار قطنی ج ۲ ص ۲۰۸ ۔ ۲۰۷ 'مطبوعہ نشر السنہ' ملتان)

ان تمام آثار صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے اور جو کسی دائمی مرض یا بڑھاپے کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے وہ فدیہ دے اور اس کے بعد جو "وان تصوموا خیرلکم" ہے' اس کا معنی ہے: مسافر اور مریض کا روزہ رکھنا بہتر ہے' یہ آیت فدیہ کی ناسخ نہیں ہے۔ امام مالک کو یہ حدیث پہنچی ہے کہ حضرت انس بن مالک بوڑھے ہو گئے حتیٰ کہ وہ روزہ رکھنے پر قادر نہ رہے تو وہ فدیہ دیتے تھے۔ (موطا امام مالک ص ۱۵۰ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور)

امام مالک کو یہ حدیث پہنچی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر سے سوال کیا گیا کہ حاملہ عورت کو جب اپنے بچہ کی جان کا خوف ہو اور اس پر روزہ دشوار ہو تو کیا کرے؟ فرمایا: وہ روزہ نہ رکھے اور ہر روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو ایک کلو گندم کھلائے۔

(موطا امام مالک ص ۱۵۱ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور)

امام نسائی نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جن لوگوں پر روزہ سخت دشوار ہو وہ ایک روزہ

کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلائیں' یہ رخصت صرف اس بوڑھے کے لیے ہے جو روزہ نہ رکھ سکے یا اس مریض کے لیے جس کو شفا کی امید نہ ہو۔ (سنن کبریٰ ج ۴ ص ۲۷۱۔ ۲۷۲ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام طبرانی روایت کرتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ جب موت سے ایک سال پہلے کمزور ہو گئے تو انہوں نے روزے نہیں رکھے اور فدیہ دیا۔ (المعجم الکبیر ج ۱ ص ۲۴۲ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے: اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۳ ص ۱۶۳ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

امام طبرانی روایت کرتے ہیں کہ حضرت قیس بن سائب نے کہا: رمضان کے مہینہ میں انسان ہر روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلاتا ہے تم میری طرف سے ایک مسکین کو ہر روز ایک صاع (چار کلو) طعام دو۔

(المعجم الکبیر ج ۱۸ ص ۳۶۳ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

امام بیہقی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت جب روزہ نہ رکھ سکیں تو فدیہ دیں' اور حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے حاملہ عورت کے متعلق فدیہ دینے کی روایت ذکر کی ہے۔

(سنن کبریٰ ج ۴ ص ۲۳۰ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام بغوی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس آیت کا معنی ہے: جو بہت مشکل سے روزہ رکھیں' ان کے لیے روزہ کی جگہ فدیہ دینا جائز ہے اور بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت روزہ نہ رکھیں اور فدیہ دیں' اور حضرت انس جب کمزور ہو گئے تو انہوں نے فدیہ دیا۔ (شرح السنۃ ج ۳ ص ۳۰۵۔ ۳۰۴ 'مطبوعہ دار الکتاب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

امام دارقطنی' امام مالک' امام نسائی' امام طبرانی' امام بیہقی اور امام بغوی نے متعدد اسانید صحیحہ کے ساتھ یہ آثار نقل کیے ہیں کہ بوڑھا شخص اور دائمی مریض جن پر روزہ رکھنا دشوار ہے' وہ روزہ کے بدلہ میں فدیہ دیں۔

''الذین یطیقونہ'' کے معنی کی تحقیق میں مفسرین کی آراء

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری نے ''الذین یطیقونہ'' کے معنی اور اس کے منسوخ ہونے یا نہ ہونے کے متعلق متعدد آثار اور اقوال نقل کیے ہیں اور اخیر میں لکھا ہے:

عکرمہ نے ''الذین یطیقونہ'' کی تفسیر میں کہا ہے: حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد بوڑھا شخص ہے۔

سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ''وعلی الذین یطوقونہ'' اس کا معنی ہے: جو مشقت اور تکلیف سے روزہ رکھیں۔ عطاء نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا کہ ''الذین یطیقونہ'' کا معنی ہے: جو لوگ مشقت سے روزہ رکھیں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں' یہ رخصت صرف اس بوڑھے شخص کے لیے ہے جو روزہ نہ رکھ سکے یا اس بیمار کے لیے ہے جس کو شفا کی امید نہ ہو' مجاہد نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۸۱ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ ابو الحیان اندلسی لکھتے ہیں:

جو صحابہ اور فقہاء تابعین یہ کہتے ہیں کہ ''الذین یطیقونہ'' سے مراد بوڑھے اور عاجز لوگ ہیں' ان کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں ہے' بلکہ محکم ہے' اور اس میں اختلاف ہے کہ یہ آیت حاملہ اور دودھ پلانے والی کو شامل ہے یا نہیں۔

(البحر المحیط ج ۲ ص ۱۹۰ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے' حضرت ابن عباس کا یہی مختار ہے' اور نسخ کا قول بھی صحیح ہے' البتہ یہ احتمال ہے کہ نسخ بمعنی تخصیص ہو (الی قولہ) اس پر اجماع ہے کہ جو بوڑھے روزے کی طاقت نہیں رکھتے یا جو بہت مشقت سے طاقت رکھتے ہو وہ روزہ نہ رکھیں اور فدیہ کے وجوب میں اختلاف ہے' ربیعہ اور امام مالک کے نزدیک ان پر فدیہ واجب نہیں۔(الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۲۸۹۔ ۲۸۸ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

علامہ ابوالحسن ماوردی شافعی لکھتے ہیں:

''وعلی الذین یطیقونہ'' اس آیت کی تاویل یہ ہے کہ جو لوگ تکلیف اور مشقت سے روزہ رکھیں' جیسے بوڑھے' حاملہ اور دودھ پلانے والی' یہ لوگ روزہ نہ رکھیں اور ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں' ان پر قضا نہیں ہے۔

(النکت والعیون ج ۱ ص ۲۳۸ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں:

عکرمہ سے مروی ہے کہ یہ آیت حاملہ اور دودھ پلانے والی کے متعلق نازل ہوئی' حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت ابن عباس نے اس آیت میں یہ قرأت کی ''وعلی الذین یطوقونہ'' (جو مشکل سے روزہ رکھیں) اس سے بوڑھے لوگ مراد ہیں۔

(زاد المسیر ج ۱ ص ۱۸۶ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابوبکر رازی جصاص حنفی لکھتے ہیں:

صحابہ اور تابعین میں سے اکثر یہ کہتے ہیں کہ ابتداء میں روزہ رکھنے کا اختیار تھا' جو شخص روزہ کی طاقت رکھتا ہو خواہ وہ روزے رکھے خواہ فدیہ دے' بعد میں روزہ کی طاقت رکھنے والوں سے یہ اختیار ''فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ'' سے منسوخ ہو گیا (الی قولہ) اس آیت کا ایک اور معنی یہ ہے کہ جو لوگ مشقت اور صعوبت سے روزہ رکھتے ہیں وہ روزہ رکھنے کی طاقت رکھنے والے نہیں ہیں' وہ بھی روزے کے مکلف ہیں لیکن ان پر روزہ کے قائم مقام فدیہ ہے' کیا تم نہیں دیکھتے کہ جو شخص پانی سے طہارت حاصل کرنے پر قادر نہ ہو وہ بھی پانی سے طہارت حاصل کرنے کا مکلف ہے لیکن اس کے لیے مٹی کو پانی کے قائم مقام بنا دیا گیا ہے۔(احکام القرآن ج ۱ ص ۱۷۷۔ ۱۷۶ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور' ۱۴۰۰ھ)

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

اکثر صحابہ اور فقہاء تابعین کے نزدیک پہلے روزہ کی طاقت رکھنے والوں کے لیے روزہ رکھنے اور روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا اختیار تھا بعد میں یہ منسوخ ہو گیا' اور حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ نے اس آیت کو ''یطوقونہ'' پڑھا' یعنی جو مشکل سے روزہ رکھیں وہ فدیہ دے دیں اور کہا: یہ آیت منسوخ نہیں ہے اور بعض علماء نے اس آیت کو ''الذین یطیقونہ'' قرأت متواترہ کے مطابق پڑھا اور کہا: یہ آیت منسوخ نہیں ہے کیونکہ وسعت اور طاقت میں فرق ہے' وسعت کا معنی ہے: کسی چیز پر سہولت سے قدرت ہونا اور طاقت کا معنی ہے: کسی چیز پر مشقت سے قدرت ہونا' تو آیت کا معنی ہے: جو لوگ مشقت سے روزہ رکھیں وہ فدیہ دیں یا اس میں ہمزہ سلب ماخذ کے لیے ہے یعنی جو لوگ روزہ کی طاقت نہ رکھیں وہ فدیہ دیں۔

(روح المعانی ج ۲ ص ۵۹۔ ۵۸ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

بڑھاپے یا دائمی مرض کی وجہ سے روزہ نہ رکھنے کے متعلق مذاہب اربعہ

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

جب بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت پر روزہ رکھنا سخت دشوار ہو تو ان کے لیے جائز ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر روزہ کے

بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں' حضرت علی' حضرت ابن عباس' حضرت ابو ہریرہ' حضرت انس رضی اللہ عنہم اور سعید بن جبیر' طاؤس' ثوری اور اوزاعی کا یہی قول ہے۔ اس قول کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت بوڑھے شخص کی رخصت کے لیے نازل ہوئی ہے' اور اس لیے کہ روزہ رکھنا واجب ہے اور جب عذر کی وجہ سے اس سے روزہ ساقط ہوگا تو اس کے بدلہ میں قضا کی طرح کفارہ لازم آئے گا۔

نیز وہ مریض جس کے مرض کے زائل ہونے کی توقع نہیں ہے' وہ بھی روزہ نہیں رکھے گا اور یہ روزہ کے بدلہ میں ایک مریض کو کھانا کھلائے گا کیونکہ وہ بھی بوڑھے شخص کے حکم میں ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۳۸' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

امام شافعی اور ان کے اصحاب نے یہ کہا ہے کہ وہ بوڑھا شخص جس کو روزہ رکھنے میں شدید مشقت ہو اور وہ مریض جس کے مرض کے زوال کی توقع نہ ہو اس پر بالاجماع روزہ فرض نہیں ہے اور اس پر وجوب فدیہ کے متعلق دو قول ہیں' زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس پر فدیہ واجب ہے۔ (شرح المہذب ج ۶ ص ۲۵۸' مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

اس پر اجماع ہے کہ جو بوڑھے روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے یا سخت مشقت سے روزے رکھتے ہیں' ان کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور اس میں اختلاف ہے کہ ان پر کیا واجب ہے؟ ربیعہ اور امام مالک نے کہا: ان پر کوئی چیز واجب نہیں ہے' البتہ امام مالک نے کہا: اگر وہ ہر روزے کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں تو یہ مستحب ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۲۸۹' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ھ)

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

جو شخص بہت بوڑھا اور روزہ رکھنے سے عاجز ہو' اسی طرح جس مریض کے مرض کے زوال کی توقع نہ ہو وہ ہر روزہ کے لیے فدیہ دیں۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۱۱۹' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

ایک روزہ کے لیے نصف صاع یعنی دو کلو گندم یا اس کی قیمت فدیہ دے' روزہ کے فدیہ میں فقراء کا تعدد شرط نہیں ہے اور ایک فقیر کو متعدد ایام کا فدیہ دے سکتا ہے اور مہینہ کی ابتداء میں بھی دے سکتا ہے۔

(درمختار علی هامش ردالمحتار ج ۲ ص ۱۱۹' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

شوگر' بلڈ پریشر' دمہ اور جوڑوں کا درد یہ چار بیماریاں ایسی ہیں جن کا کوئی علاج نہیں ہے' ان کو دواؤں سے کنٹرول تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بیماریاں زائل نہیں ہو سکتیں' ان میں جوڑوں کا درد روزے کے منافی نہیں ہے' اور عام حالت میں دمہ بھی روزوں کے منافی نہیں ہے' لیکن جب شوگر زیادہ ہو تو زیادہ گولیاں لینی پڑتی ہیں جس سے وقفہ وقفہ سے شدید بھوک لگتی ہے' اسی طرح جب بلڈ پریشر زیادہ ہو تو پانی پینا پڑتا ہے اس لیے جن لوگوں کو شوگر یا بلڈ پریشر کا عارضہ ہو اور ڈاکٹر انہیں روزہ رکھنے کی اجازت نہ دے تو وہ روزہ کی جگہ فدیہ دے دیں۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ

رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا' لوگوں کو ہدایت دینے والا اور

بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ

روشن دلیلیں ہدایت دینے والیں اور حق اور باطل میں فیصلہ کرنے والیں' سو تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں موجود ہو وہ ضرور

فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ

اس ماہ کے روزے رکھے' اور جو مریض یا مسافر ہو (اور روزے نہ رکھے) تو وہ دوسرے دنوں سے (مطلوبہ) عدد پورا

أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا

کرے' اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ فرماتا ہے اور تمہیں مشکل میں ڈالنے کا ارادہ نہیں فرماتا' اور تا کہ تم (مطلوبہ)

الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۸۵﴾

عدد پورا کرو' اور اللہ کی کبریائی بیان کرو کہ اس نے تم کو ہدایت دی ہے اور تا کہ تم شکر ادا کرو O

اللہ تعالیٰ نے تمام قرآن کو لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر ماہِ رمضان کی لیلۃ القدر میں نازل کیا' پھر حسب مصلحت تئیس سال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل قرآن کو نازل فرمایا' اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کو نازل کرنے کی ابتداء رمضان کے مہینہ میں ہوئی اور تیسری تفسیر یہ ہے کہ روزہ کو فرض کرنے کے احکام ماہ رمضان میں نازل ہوئے۔

حافظ ابن عساکر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے ابراہیم پر صحائف رمضان کی پہلی شب میں نازل کیے اور حضرت موسیٰ پر تورات رمضان کی چھٹی شب میں نازل کی' اور حضرت عیسیٰ پر انجیل رمضان کی اٹھارویں شب میں نازل کی' اور سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن رمضان کی چوبیسویں شب میں نازل کیا۔

(تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۱۹۵' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۰۴ھ)

رمضان کے اسرار و رموز اور رمضان میں نزول قرآن کا بیان

امام رازی لکھتے ہیں:

مجاہد نے کہا کہ رمضان اللہ تعالیٰ کا نام ہے اور رمضان کے مہینہ کا معنی ہے: اللہ کا مہینہ' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ یہ نہ کہو کہ رمضان آیا اور رمضان گیا' بلکہ یہ کہو کہ رمضان کا مہینہ آیا اور رمضان کا مہینہ گیا' کیونکہ رمضان' اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔

دوسرا قول ہے کہ رمضان مہینہ کا نام ہے جیسا کہ رجب اور شعبان مہینوں کے نام ہیں۔ خلیل سے منقول ہے: رمضان' رمضاء سے بنا ہے اور رمضاء خریف کی اس بارش کو کہتے ہیں جو زمین سے گرد و غبار کو دھو ڈالتی ہے' اسی طرح رمضان بھی اس امت کے گناہوں کو دھو ڈالتا ہے اور ان کے دلوں کو گناہوں سے پاک کر دیتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ رمضان رمض سے بنا ہے اور رمض سورج کی تیز دھوپ کو کہتے ہیں اور اس مہینے میں روزہ داروں پر بھوک اور پیاس کی شدت بھی تیز دھوپ کی طرح

سخت ہوتی ہے یا جس طرح تیز دھوپ میں بدن جلتا ہے اسی طرح رمضان میں گناہ جل جاتے ہیں اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رمضان اللہ کے بندوں کے گناہ جلا دیتا ہے۔

رمضان کے مہینہ میں نزول قرآن کی ابتداء اس وجہ سے کی گئی کہ قرآن اللہ عزوجل کا کلام ہے اور انوار الٰہیہ ہمیشہ متجلی اور منکشف رہتے ہیں' البتہ ارواح بشریہ میں ان انوار کے ظہور سے حجابات بشریہ مانع ہوتے ہیں اور حجابات بشریہ کے زوال کا سب سے قوی سبب روزہ ہے' اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کشف کے حصول کا سب سے قوی ذریعہ روزہ ہے' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر بنی آدم کے قلوب میں شیطان نہ گھومتے تو وہ آسمانوں کی نشانیوں کو دیکھ لیتے' اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں اور رمضان میں عظیم مناسبت ہے' اس لیے نزول قرآن کی ابتداء کے لیے اس مہینہ کو خاص کر لیا گیا۔

(تفسیر کبیر ج ۲ ص ۱۲۱۔ ۱۲۰' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۳۹۸ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں موجود ہو وہ ضرور اس ماہ کے روزے رکھے۔ (البقرہ: ۱۸۵)

قطبین میں روزے اور نماز کی تحقیق

بہ ظاہر اس آیت پر یہ اشکال ہے کہ اس آیت سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس مہینہ سے غائب بھی ہو سکتا ہے' ہو سکتا ہے کہ پہلے یہ بات عجیب معلوم ہو لیکن اب جب کہ یہ محقق ہو گیا کہ قطبین میں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے تو وہاں کے رہنے والے رمضان کے مہینہ میں حاضر نہیں ہوتے' اس لیے قطبین کے رہنے والوں پر رمضان کے روزے فرض نہیں ہیں' البتہ جب باقی دنیا میں رمضان کا مہینہ ہو ان دنوں میں کسی قریبی اسلامی ملک کے حساب سے وہاں کے رہنے والے طلوع فجر اور غروب آفتاب کے اوقات کا اپنے علاقہ کی گھڑیوں کے وقت کے حساب سے ایک نظام الاوقات مقرر کر لیں اور اتنا وقت روزہ سے گزاریں تو بہت بہتر ہے' اور اب جب کہ تمام دنیا کا ٹائم بتانے والی گھڑیاں ایجاد ہو چکی ہیں' یہ ایسا مشکل بھی نہیں ہے' وہاں کے رہنے والے اگر گھڑیوں کے حساب سے نمازیں پڑھیں تو یہ بھی بہت بہتر ہے ہر چند کہ سورج کے طلوع اور غروب کے لحاظ سے ان پر ایک سال میں صرف ایک دن کی نمازیں فرض ہوں گی۔

سعودی عرب کے حساب سے روزے رکھتا ہوا پاکستان آیا تو عید کس حساب سے کرے گا؟

پاکستان میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ سعودی عرب سے ایک یا دو روز پہلے روزے رکھتے ہوئے آتے ہیں اور ان کے تیس روزے پورے ہو جاتے ہیں اور یہاں ہنوز رمضان ہوتا ہے تو چونکہ مذاہب اربعہ کے محققین فقہاء کے نزدیک بلاد بعیدہ میں اختلاف مطالع معتبر ہے' اس لیے اس کو روزے رکھنے چاہئیں' نیز قرآن مجید میں ہے: "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" (البقرہ: ۱۸۵) تم میں سے جو اس مہینے میں موجود ہو تو وہ ضرور اس کے روزے رکھے"۔ اور اس شخص نے اس صورت میں رمضان کا مہینہ پایا ہے اس لیے وہ سب کے ساتھ روزے رکھے' نیز امام ترمذی روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الصوم یوم تصومون والفطر یوم تفطرون. جس دن لوگ روزہ رکھیں اس دن روزہ ہے اور جس دن لوگ عید کریں اس دن عید ہے۔ (جامع ترمذی ص ۱۲۴)" اس حدیث کا بھی یہ تقاضا ہے کہ جو شخص پاکستان میں آ گیا وہ یہاں کے لوگوں کے ساتھ روزے رکھے اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ عید کرے۔ ایک رائے یہ ہے کہ اگر اس کے تیس روزے پورے ہو چکے ہیں تو اس پر اب روزے لازم نہیں' کیونکہ حدیث کے اعتبار سے مہینہ انتیس یا تیس دنوں کا ہوتا ہے اور وہ ایک مہینہ کے روزے رکھ چکا ہے' لیکن پہلی رائے کے دلائل زیادہ قوی ہیں۔

پاکستان سے روزے رکھتا ہوا سعودی عرب گیا تو عید کس حساب سے کرے گا؟

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص نے پاکستان میں چاند دیکھ کر روزے رکھنے شروع کیے اور اثناء رمضان میں سعودی عرب چلا گیا جہاں لوگوں نے ایک یا دو روز پہلے روزے رکھنے شروع کیے تھے اور ابھی اس کے اٹھائیس یا انتیس روزے ہوئے تھے کہ انہوں نے عید کر لی اس صورت کے بارے میں علامہ نووی لکھتے ہیں:

ایک شخص نے ایک ایسے شہر سے سفر کیا جنہوں نے رمضان کا چاند نہیں دیکھا اور اس شہر میں پہنچا جس میں (اس کے حساب سے) ایک دن پہلے چاند دیکھ لیا گیا تھا اور ابھی اس نے انتیس روزے رکھے تھے کہ انہوں نے عید کر لی۔ اب اگر ہم عام حکم رکھیں یا یہ کہیں کہ اس کے لیے اس شہر کا حکم ہے تو وہ عید کر لے اور ایک دن کے روزے کی قضاء کرے اور اگر ہم حکم عام نہ رکھیں اور یہ کہیں کہ اس کے لیے پہلے شہر کا حکم ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس دن روزہ رکھے۔

چونکہ مذاہب اربعہ کے محققین فقہاء کے نزدیک بلاد بعیدہ میں اختلاف مطالع معتبر ہے اس لیے پاکستان سے سعودی عرب پہنچنے کے بعد اس شخص پر سعودی عرب کے مطلع کے احکام لازم ہوں گے وہ اس کے حساب سے روزے رکھے گا اور ان کے حساب سے عید کرے گا' لیکن اس کے روزے تیس سے کم ہیں تو وہ کم دنوں کی احتیاطاً قضا کرے۔

سعودی عرب سے عید کے دن سوار ہو کر پاکستان آیا اور یہاں رمضان ہے

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص مثلاً سعودی عرب سے عید کے دن جہاز پر سوار ہو کر پاکستان پہنچا اور یہاں ہنوز رمضان ہے۔ ایسی صورت کے بارے میں علامہ نووی لکھتے ہیں: اگر ایک شخص نے ایک شہر میں چاند دیکھا تو صبح عید کی اور وہ کشتی کے ذریعہ کسی دور دراز شہر میں پہنچا جہاں لوگوں کا روزہ تھا۔ شیخ ابو محمد نے کہا: اس پر لازم ہے کہ وہ بقیہ دن کھانے پینے سے اجتناب کرے۔ یہ اس صورت میں ہے جب ہم یہ کہیں کہ اس پر اس شہر کا حکم لازم ہے اور اگر ہم حکم عام رکھیں یا اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کریں تو اس پر افطار کرنا لازم ہے۔

چونکہ بلاد بعیدہ میں اختلاف مطالع معتبر ہے' اس لیے جو شخص سفر کر کے دور دراز علاقہ میں پہنچے گا اس پر وہاں کے جغرافیائی حالات کے اعتبار سے شرعی احکام لازم ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جو مریض یا مسافر ہو (اور روزے نہ رکھے) تو وہ دوسرے دنوں سے (مطلوبہ) عدد پورا کرے۔ (البقرہ: ۱۸۵)

روزہ کی رخصت کے لیے شرعی مسافت کا بیان

اس حکم کو دوبارہ ذکر فرمایا تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ یہ رخصت منسوخ ہو گئی ہے۔ کتنی مسافت کے سفر میں روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے' داؤد ظاہری کے نزدیک مسافت کم ہو یا زیادہ اس پر شرعی سفر کے احکام نافذ ہو جاتے ہیں' خواہ ایک میل کی مسافت کا سفر ہو' امام احمد کے نزدیک دو دن کی مسافت کا اعتبار ہے' امام شافعی کے نزدیک بھی دو دن کی مسافت کا اعتبار ہے' امام مالک کے نزدیک ایک دن کی مسافت معتبر ہے' امام ابوحنیفہ سفر شرعی کے لیے تین دن کی مسافت کا اعتبار کرتے ہیں' ان کی دلیل یہ حدیث ہے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی عورت بغیر محرم کے تین دن کا سفر نہ کرے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۴۷ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

جمہور فقہاء احناف نے تین دن کی مسافت کا اندازہ اٹھارہ فرسخ کیا ہے۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۵۲۷ - ۵۳۱) اٹھارہ فرسخ ۵۴

شرعی میل کے برابر ہیں جو انگریزی میلوں کے حساب سے اکتیس میل' دو فرلانگ' بیس گز ہے اور ۲۲۔۹۸ کلو میٹر کے برابر ہے۔ مسافت قصر کی پوری تفصیل اور تحقیق ہم نے "شرح صحیح مسلم" جلد ثانی میں بیان کی ہے۔

میت کی طرف سے روزے رکھنے میں مذاہب ائمہ

جو شخص فوت ہو گیا اور اس نے رمضان کے روزے نہ رکھے ہوں تو امام مالک' امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک کوئی شخص اس کی طرف سے روزے نہیں رکھ سکتا' ان کی دلیل یہ آیت ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۔ (الانعام: ۱۶۴) کوئی شخص کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

علامہ مرداوی حنبلی لکھتے ہیں:

جب کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس پر نذر کے روزے ہوں تو صحیح مذہب یہ ہے کہ اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھ سکتا ہے اور صحیح مذہب یہ ہے کہ ایک جماعت میت کی طرف سے روزے رکھ سکتی ہے' نیز صحیح مذہب یہ ہے کہ ولی کا غیر بھی میت کی طرف سے اس کی اجازت سے اور اس کی اجازت کے بغیر روزے رکھ سکتا ہے' اگر ولی روزے نہ رکھے تو میت کے مال سے ہر روزہ کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ (الانصاف ج ۳ ص ۳۳۷۔ ۳۳۶ ' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی)

علامہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں:

ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوفاً روایت ہے کہ کوئی شخص کسی کی طرف سے روزہ نہ رکھے اور نہ کوئی شخص کسی کی طرف سے نماز پڑھے۔ (موطا امام مالک ص ۲۳۵ ' مطبوعہ لاہور) دوسری دلیل یہ ہے کہ زندگی میں عبادات کی ادائیگی میں کوئی شخص کسی کا نائب نہیں ہو سکتا' لہٰذا موت کے بعد بھی نہیں ہو سکتا' کیونکہ عبادت کا مکلف کرنے سے یہ مقصود ہے کہ مکلف کے بدن پر اس عبادت کی مشقت ہو اور نائب کے ادا کرنے سے مکلف کے بدن پر کوئی مشقت نہیں ہوتی' البتہ اس کی طرف سے ہر دن ایک مسکین کو کھانا کھلایا جائے گا' کیونکہ اب اس مکلف کا خود روزہ رکھنا ممکن نہیں ہے تو فدیہ اس کے روزہ کا قائم مقام ہو جائے گا جیسا کہ شیخ فانی کی صورت میں ہے اور اگر اس نے فدیہ ادا کرنے کی وصیت کی ہو تو اس کے تہائی مال سے کھانا کھلانا لازم ہے اور امام شافعی کے نزدیک وہ وصیت کرے یا نہ کرے اس کی طرف سے کھانا کھلانا لازم ہے' فدیہ کی مقدار ہمارے نزدیک دو کلو گندم ہے اور امام شافعی کے نزدیک ایک کلو گندم ہے۔

(المبسوط ج ۳ ص ۸۹ ' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۸ ھ)

حاملہ اور مرضعہ کے لیے روزہ کی رخصت میں مذاہب ائمہ

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

حاملہ اور دودھ پلانے والی کو جب اپنی جان کا خوف ہو تو وہ روزہ نہ رکھیں اور فقط ان روزوں کی قضا کریں اور اگر ان کو اپنے بچہ کی جان کا خوف ہو تو وہ روزہ نہ رکھیں' ان پر قضا بھی ہے اور فدیہ بھی' ہر روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔

(المغنی ج ۳ ص ۳۷ ' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۰۵ ھ)

علامہ العبدری مالکی لکھتے ہیں:

اگر حاملہ پر روزہ دشوار ہو تو وہ روزہ نہ رکھے اور صرف قضا کرے اور اگر دودھ پلانے والی پر روزہ دشوار ہو تو وہ روزہ نہ رکھے وہ قضا بھی کرے اور فدیہ بھی دے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ صرف قضا کرے۔

(التاج والاکلیل شرح مختصر خلیل ج ۲ ص ۴۴۷ ' مطبوعہ مکتبۃ النجاح' لیبیا)

علامہ شمس الدین رملی شافعی لکھتے ہیں:

حاملہ اور دودھ پلانے والی کو اگر اپنی جان کا خوف یا اپنی اور بچہ دونوں کی جان کو خوف ہو تو وہ روزہ نہ رکھیں' صرف قضا کریں اور اگر صرف بچہ کی جان کا خوف ہو تو روزہ کی قضا بھی کریں اور فدیہ بھی دیں۔

(نہایۃ المحتاج ج ۳ ص ۱۹۴ مطبوعہ دار الکتب' بیروت' ۱۴۱۴ھ)

علامہ المرغینانی الحنفی لکھتے ہیں:

حاملہ اور دودھ پلانے والی کو جب اپنی جان کا خوف ہو یا اپنے بچہ کا خوف ہو تو وہ روزہ رکھیں اور قضا کریں' تاکہ ان پر تنگی نہ ہو ان پر فدیہ لازم نہیں ہے' کیونکہ وہ عذر کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ رہیں' امام شافعی یہ کہتے ہیں کہ اگر بچہ کا خوف ہو تو فدیہ دیں' وہ اس کو شیخ فانی پر قیاس کرتے ہیں' ہم کہتے ہیں کہ شیخ فانی میں فدیہ کا وجوب خلاف قیاس ہے اور یہاں روزہ نہ رکھنا بچہ کے سبب سے ہے اور بچہ شیخ فانی کے حکم میں نہیں ہے کیونکہ شیخ فانی روزہ کے وجوب کے بعد عاجز ہوا' اور بچہ پر اصلا روزہ کا وجوب نہیں ہے' اس لیے یہ قیاس صحیح نہیں ہے۔ (ہدایہ اولین ص ۲۲۲' مکتبہ شرکت علمیہ' ملتان)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ فرماتا ہے اور تمہیں مشکل میں ڈالنے کا ارادہ نہیں فرماتا۔ (البقرہ: ۱۸۵)

اسلام دین یسر ہے

اسلام نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا جس سے امت حرج اور دشواری میں مبتلا ہو جائے۔ قرآن مجید میں ہے:

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ (المائدہ: ۶)

اللہ تعالیٰ یہ ارادہ نہیں فرماتا کہ تم پر تنگی کی جائے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: ۷۸)

اللہ تعالیٰ نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں کی۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ○ (النساء: ۲۸)

اللہ تعالیٰ تم سے تخفیف کرنے کا ارادہ فرماتا ہے اور انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے ○

ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ (البقرہ: ۱۷۸)

(قصاص کے ساتھ دیت کی گنجائش رکھنا) یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔

قصاص کے ساتھ دیت کی گنجائش' پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو تو تیمم کی سہولت' بیمار اور مسافر کے لیے روزہ قضا کرنے کی رخصت' بوڑھے اور دائمی مریض کے لیے روزے کے فدیہ کی اجازت' جو کھڑا ہو کر نماز نہ پڑھ سکے اس کے لیے بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھنے کی وسعت' اگر سواری سے اتر نہ سکے تو سواری پر نماز پڑھنے کی اجازت' جو شخص خود حج نہ کر سکے اس کے لیے حج بدل کی وسعت' سفر میں نماز کو قصر کرنا اور بہت سے احکام ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام شرعیہ میں مشقت کی صورت میں رخصت پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے' وصال کے روزوں' صیام دہر' عمر بھر شادی نہ کرنے اور ساری رات قیام کرنے سے منع کیا ہے' اسی طرح مشکل عبادات کی نذر ماننے پر ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے' تمام مال کو صدقہ کرنے سے منع کیا ہے اور اضطرار کی حالت میں حرام چیزوں کے استعمال کی اجازت دی ہے' بہ کثرت احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسان احکام اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین آسان ہے' جو شخص بھی دین پر غالب آنے کی کوشش کرے گا (بایں طور کہ آسان طریقہ کو چھوڑ کر مشکل طریقہ کو اختیار کرے) دین اس پر غالب آجائے گا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: تم لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو اور ان کو مشکل میں ڈالنے کے لیے نہیں بھیجے گئے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت سعید بن ابی بُردہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سُنا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے والد کو اور حضرت معاذ بن جبل کو یمن بھیجا اور فرمایا: آسانی کرنا' مشکل میں نہ ڈالنا' خوشخبری دینا' متنفر نہ کرنا اور آپس میں موافقت کرنا۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۶۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے اصحاب میں سے کسی کو اپنے کسی کام کے لیے بھیجتے تو یہ فرماتے: خوشخبری دینا' متنفر نہ کرنا' آسانی کرنا اور مشکل میں نہ ڈالنا۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو کاموں میں سے کسی ایک کا اختیار دیا جاتا تو آپ اس پر عمل کرتے جو زیادہ آسان ہوتا بہ شرطیکہ وہ گناہ نہ ہو' اگر وہ گناہ ہوتا تو آپ سب سے زیادہ اس سے بچنے والے ہوتے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۰۳' ج ۲ ص ۱۰۰۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دین وہ ہے جو باطل ادیان سے الگ ہو اور آسان اور سہل ہو۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا بہترین دینی عمل وہ ہے جو سب سے زیادہ آسان ہو' تمہارا بہترین دینی عمل وہ ہے جو سب سے زیادہ آسان ہو' تمہارا بہترین دینی عمل وہ ہے جو سب سے زیادہ آسان ہو۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۳۳۸' ج ۵ ص ۳۵' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص فیصلہ کرنے اور تقاضا کرنے میں آسانی کرنے کی وجہ سے جنت میں داخل ہو گیا۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۱۱۰' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

بعض مفتی فتویٰ دیتے وقت ڈھونڈ ڈھونڈ کر لوگوں کو مشکل اور ناقابل عمل احکام بیان کرتے ہیں' مثلاً اگر کسی عورت کا خاوند گم ہو جائے تو کہتے ہیں وہ نوے سال تک انتظار کرے' پھر عقد ثانی کرے' جس عورت کو اس کا خاوند کھانے پینے کا خرچ دے نہ آباد کرے اور نہ اس کو طلاق دے تو کہتے ہیں کہ خاوند کی طلاق کے بغیر اس کی نجات نہیں ہو سکتی' عدالت نے جس کا نکاح فسخ کر دیا ہو اس کو نکاح کی اجازت نہیں دیتے' انگریزی دواؤں اور انتقال خون کو حرام کہتے ہیں' ریڈیو اور ٹی وی پر رؤیت

ہلال کے اعلان کو ناجائز کہتے ہیں' پرفیوم کے استعمال کو ناجائز کہتے ہیں' چلتی ٹرین اور ہوائی جہاز میں نماز کو ناجائز کہتے ہیں' تعلیم نسواں کو حرام کہتے ہیں' نماز میں سجدہ کے دوران اگر پیروں کی تین انگلیاں اٹھ جائیں' کہتے ہیں کہ نماز فاسد ہو گئی' بعض علماء سجدہ میں انگلیوں کے پیٹ لگانے کو فرض کہتے ہیں' گھڑی کے چین کو ناجائز کہتے ہیں' جس مسئلہ میں فقہاء کے متعدد اقوال ہوں تو اس قول پر فتویٰ دیتے ہیں جس پر عمل کرنا سب سے مشکل اور سخت ہو' حالانکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آسان اور سہل احکام بیان کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ لوگ اس کے برعکس کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ کی کبریائی بیان کرو کہ اس نے تم کو ہدایت دی ہے اور تاکہ تم شکر ادا کرو○ (البقرہ: ۱۸۵)

عیدگاہ جاتے وقت تکبیرات پڑھنے میں مذاہب ائمہ

علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب مسلمان شوال کا چاند دیکھیں تو ان پر حق ہے کہ وہ اللہ کی تکبیر کہیں' حتیٰ کہ وہ عید سے فارغ ہو جائیں اور زہری' نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ عید الفطر کے دن جب عیدگاہ جاتے تو تکبیر پڑھتے اور جب نماز پڑھ لیتے تو تکبیر منقطع کر دیتے' حضرت علی' ابوقتادہ' حضرت ابن عمر' سعید بن مسیب' عروہ' قاسم' خارجہ بن زید' نافع بن جبیر بن مطعم وغیرہم سے مروی ہے کہ وہ عید کے دن عیدگاہ کو جاتے وقت تکبیر پڑھتے تھے۔ حنش بن معتمر نے بیان کیا کہ عید الاضحیٰ کے دن حضرت علی اپنے خچر پر سوار ہو کر گئے اور تکبیر پڑھتے رہے حتیٰ کہ جبانہ پہنچ گئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام شعبہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے عیدگاہ کی طرف جاتے ہوئے لوگوں کو تکبیر پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا: یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ کیا امام تکبیر پڑھ رہا ہے؟ میں نے کہا: نہیں' فرمایا: تو کیا یہ لوگ پاگل ہیں؟ اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ حضرت ابن عباس نے عیدگاہ کی طرف جانے کے راستہ میں تکبیر پڑھنے کا انکار کیا' اس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک اس آیت میں تکبیر سے مراد وہ تکبیریں ہیں جو امام خطبہ میں پڑھتا ہے' اور حضرت ابن عباس سے جو یہ روایت ہے کہ مسلمانوں پر حق ہے کہ شوال کا چاند دیکھ کر تکبیر پڑھیں اس سے مراد آہستہ تکبیر پڑھنا ہے' اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ جب وہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نماز پڑھنے کے لیے جاتے تو عیدگاہ تک بلند آواز سے تکبیر پڑھتے۔

اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: عید الاضحیٰ کے لیے جاتے ہوئے بلند آواز سے تکبیر پڑھے اور عید الفطر کے لیے جاتے ہوئے بلند آواز سے تکبیر نہ پڑھے اور امام ابو یوسف عید الفطر اور عید الاضحیٰ دونوں میں تکبیر پڑھتے تھے' قرآن مجید میں کسی چیز کی تعیین نہیں ہے' امام محمد نے فرمایا کہ عیدین میں تکبیر پڑھے' اور حسن بن زیاد نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے کہ عیدین میں تکبیر پڑھنا واجب نہیں ہے' راستہ میں نہ عیدگاہ میں' تکبیر صرف عید کی نماز میں واجب ہے۔ امام اوزاعی اور امام مالک نے کہا ہے کہ دونوں عیدوں میں عیدگاہ کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں تکبیر پڑھے' جب امام آجائے تو تکبیر منقطع کر دے اور واپسی میں تکبیر نہ پڑھے۔ امام شافعی نے فرمایا: دونوں عیدوں کی رات میں بلند آواز سے تکبیر پڑھنا مستحب ہے اور صبح جب عیدگاہ کو جائے تو امام کے آنے تک تکبیر پڑھنا مستحب ہے۔

علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ اولیٰ یہ ہے کہ بلند آواز سے تکبیر پڑھے اور ہلال شوال دیکھ کر آہستہ تکبیر پڑھنا بھی جائز ہے' اس پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ بلند آواز سے تکبیر پڑھنا واجب نہیں ہے اور جس نے بلند آواز سے تکبیر پڑھنے کے لیے کہا اس نے بہ طور استحباب کہا ہے۔ امام طحاوی نے کہا ہے کہ ابن ابی عمران نے ذکر کیا ہے کہ ہمارے تمام اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ عید الفطر کے دن عیدگاہ کی طرف جاتے ہوئے تکبیر پڑھنا سنت ہے' یہ قول امام ابوحنیفہ کے مذہب کے زیادہ مناسب ہے' کیونکہ

ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ گنتی پوری کرنے کے بعد تکبیر پڑھی جائے اور گنتی پورا کرنا عید الاضحیٰ کی بہ نسبت عید الفطر کے زیادہ مناسب ہے کیونکہ عید الفطر میں روزوں کا عدد پورا کیا جاتا ہے اور جب امام ابوحنیفہ کے نزدیک عید الاضحیٰ میں تکبیر پڑھنا سنت ہے تو عید الفطر میں بھی سنت ہونا چاہیے کیونکہ دونوں عیدوں کی نمازوں میں تکبیر کے حکم میں کوئی اختلاف نہیں ہے نہ اس کے بعد خطبہ میں نہ سنتوں میں' سو چاہیے کہ عیدگاہ کی طرف جاتے ہوئے تکبیر پڑھنے میں بھی دونوں عیدوں میں اختلاف نہ ہو۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۲۲۶۔ ۲۲۲ ملخصاً 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

علامہ ابوبکر جصاص نے امام شافعی کا مذہب صحیح نقل نہیں کیا۔ امام شافعی کے نزدیک یہ تکبیرات واجب ہیں اسی طرح ان کا جہر کے استحباب کو متفق علیہ قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک ان تکبیرات کو جہر سے پڑھنا واجب ہے۔

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں:

عید الفطر کی رات اور عید الاضحیٰ کی رات میں بلند آواز سے تکبیر پڑھنا سنت ہے اور جب عیدگاہ کی طرف جائیں' امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ جب عیدگاہ پہنچ جائیں تو تکبیرات منقطع کر دیں اور ایک روایت ہے: جب امام خطبہ سے فارغ ہو۔

(زاد المسیر ج ۱ ص ۱۸۸ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

اگر طلوع شمس کے بعد عیدگاہ کے لیے روانہ ہو تو عیدگاہ کے راستہ میں امام کے آنے تک تکبیرات پڑھے' اس میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ برابر ہیں اور اگر طلوع شمس سے پہلے روانہ ہو تو پھر نہ پڑھے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۳۰۷۔ ۳۰۶ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

اس عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ امام مالک کے نزدیک عیدین کی تکبیرات واجب ہیں۔

علامہ خازن شافعی لکھتے ہیں:

امام شافعی نے کہا: عیدین کی تکبیروں کو بلند آواز سے پڑھنا واجب ہے' اور یہی امام مالک کا قول ہے۔

(لباب التاویل ج ۱ ص ۱۲۳ 'مطبوعہ دار الکتب العربیہ پشاور)

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اور (اے رسول!) جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں (تو آپ فرما دیں کہ) بے شک میں ان کے قریب ہوں' دعا

اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

کرنے والا جب دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو چاہیے کہ وہ (بھی) میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان برقرار رکھیں تاکہ وہ کامیابی حاصل کریں O

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ

تمہارے لیے روزہ کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا' وہ تمہارے لیے لباس ہیں

تَكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ

اور تم ان کے لیے لباس ہو' اللہ کو علم ہے کہ تم اپنے نفسوں میں خیانت کرتے تھے

اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ

سو اللہ نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تمہیں معاف کر دیا' سو اب تم (چاہو تو) ان سے عمل زوجیت کرو اور جو اللہ نے تمہارے لیے

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ

مقدر کر دیا ہے اس کو طلب کرو اور کھاتے پیتے رہو' یہاں تک کہ فجر کا سفید دھاگا (رات کے)

الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا

سیاہ دھاگے سے ممتاز ہو جائے' پھر روزہ کو

الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي

رات آنے تک پورا کرو' اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو (کسی وقت بھی) اپنی بیویوں

الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ

سے عمل زوجیت نہ کرو' یہ اللہ کی حدود ہیں سو تم ان کے قریب نہ جاؤ' اللہ اسی طرح اپنی آیتیں لوگوں

اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

کے لیے بیان فرماتا ہے تاکہ وہ متقی بن جائیں O

شانِ نزول

اس آیت کے شانِ نزول میں اختلاف ہے۔ امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حسن بصری بیان کرتے ہیں: صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ہمارا رب کہاں ہے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی: جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق سوال کریں تو بتایئے کہ میں قریب ہوں۔

عطاء نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی: مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا' تو صحابہ نے پوچھا: ہم کس وقت دعا کریں؟ تو یہ آیت نازل ہوئی: جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق سوال کریں تو بتایئے کہ میں قریب ہوں اور جب کوئی دعا کرنے والا دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۹۳۔ ۹۲' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اللہ سے دعا کرنے کے متعلق احادیث

ہمارے زمانہ میں بعض جہلا اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کے بجائے اپنی حاجتوں کا سوال پیروں' فقیروں سے کرتے ہیں اور

قبروں اور آستانوں پر جا کر اپنی حاجات بیان کرتے ہیں اور اولیاء اللہ کی نذر مانتے ہیں' حالانکہ ہر چیز کی دعا اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہیے اور اسی کی نذر ماننی چاہیے' کیونکہ دعا اور نذر دونوں عبادت ہیں اور غیر اللہ کی عبادت جائز نہیں ہے' البتہ دعا میں انبیاء کرام اور اولیاء عظام کا وسیلہ پیش کرنا چاہیے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارا رب تبارک وتعالیٰ ہر رات کے آخری حصہ میں آسمان کی طرف نزول فرماتا ہے اور فرماتا ہے کہ کون مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرلوں! کون مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اس کو عطا کروں اور کون مجھ سے مغفرت طلب کرتا ہے تو میں اس کی مغفرت کردوں۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۳۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دعا عبادت کا مغز ہے۔

(جامع ترمذی ص ۴۸۶' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنی ہر حاجت کا اللہ سے سوال کرو حتیٰ کہ جوتی کے تسمہ ٹوٹنے کا۔ (جامع ترمذی ص ۵۱۸' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ سے سوال نہیں کرتا اللہ اس پر غضب ناک ہوتا ہے۔ (جامع ترمذی ص ۴۸۶' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو اس سے خوشی ہو کہ اللہ سختیوں اور مصیبتوں میں اس کی دعا قبول کرے' وہ عیش و آرام میں اللہ تعالیٰ سے بہ کثرت دعا کرے۔

(جامع ترمذی ص ۴۸۷' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا' آپ نے فرمایا: اے بیٹے! میں تم کو چند کلمات کی تعلیم دیتا ہوں' تم اللہ کے حقوق کی حفاظت کرو' اللہ تمہاری حفاظت کرے گا' تم اللہ کے حقوق کی حفاظت کرو تم اللہ کی تقدیر کو اپنے سامنے پاؤ گے' جب تم سوال کرو تو اللہ سے سوال کرو اور جب تم مدد چاہو تو اللہ سے مدد چاہو۔

(جامع ترمذی ص ۳۶۱' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے متعلق احادیث

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت مالک بن یسار رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اللہ سے سوال کرو تو اپنی ہتھیلیوں کے باطن سے سوال کرو اور ہتھیلیوں کی پشت سے سوال نہ کرو۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۰۹' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا رب حیا والا کریم ہے' جب اس کا کوئی بندہ اس کی طرف اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ ان کو خالی لوٹانے سے حیا فرماتا ہے۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۰۹' مطبوعہ مطبع مجتبائی' لاہور)

اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ (جامع ترمذی ص ۵۱۲ مطبوعہ کراچی)

حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ سوال کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے کندھوں کے برابر اٹھاؤ' اور استغفار کا طریقہ یہ ہے کہ ایک انگلی سے اشارہ کرو اور گڑگڑا کر سوال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلاؤ۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۰۹ مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان لاہور)

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں:

ابوبحر بز رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب تم اللہ سے سوال کرو تو ہتھیلیوں کے باطن سے سوال کرو' ہتھیلیوں کی پشت سے سوال نہ کرو۔ (المصنف ج ۱ ص ۲۸۶ مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں ہاتھ بلند کرتے اور ہاتھوں کو نیچے نہ گراتے حتیٰ کہ ان کو چہرے پر مل لیتے۔ (جامع ترمذی ص ۴۸۸ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

ہمارے زمانہ میں بعض علماء ہر دعا کے وقت ہاتھ اٹھانے کو سنت نہیں قرار دیتے اور بغیر ہاتھ اٹھاکے دعا کرنے کی تلقین کرتے ہیں' اس لیے میں نے ایسی احادیث بیان کیں جن میں دعا کرنے کا طریقہ یہ بیان کیا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کی جائے۔

فرض نمازوں کے بعد دعا کرنے کے متعلق احادیث

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عرض کیا گیا: یارسول اللہ! کس وقت کی دعا زیادہ مقبول ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا: رات کے آخری حصہ میں اور فرض نمازوں کے بعد۔ (جامع ترمذی ص ۵۰۲ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد ان کلمات سے اللہ کی پناہ چاہتے تھے: اے اللہ! میں بزدلی سے تیری پناہ میں آتا ہوں' میں بخل سے تیری پناہ میں آتا ہوں' میں ارذل عمر سے تیری پناہ میں آتا ہوں اور دنیا کے فتنہ اور عذاب قبر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔ (جامع ترمذی ص ۵۱۳ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام نسائی روایت کرتے ہیں:

مسلم بن ابی بکرہ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد ہر نماز کے بعد یہ دعا کرتے تھے: اے اللہ! میں کفر' فقر اور عذاب قبر سے تیری پناہ میں آتا ہوں' میں بھی یہ دعا کرنے لگا' میرے والد نے پوچھا: اے بیٹے! یہ دعا کہاں سے حاصل کی؟ میں نے کہا: آپ سے' انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد یہ دعا کرتے تھے۔

(سنن نسائی ج ۱ ص ۱۹۶ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں:

ابوبکر بن ابوموسیٰ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جب نماز سے فارغ ہوتے تو یہ دعا کرتے: اے اللہ! میرے گناہ کو بخش دے' میرے معاملہ کو آسان کر اور میرے رزق میں برکت دے۔

(المصنف ج ۱۰ ص ۲۳۹ مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ)

حضرت مغیرہ بن شعبہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرنے کے بعد پڑھتے تھے: ''لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر' اللھم لا مانع لما اعطیت و لا معطی لما

منعت و لا ینفع ذا الجد منک الجد"۔ (المصنف ج ۱۰ ص ۲۳۱ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۴۰۶ھ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد فرماتے تھے: "اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذالجلال و الاکرام"۔ (المصنف ج ۱۰ ص ۲۳۲ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۴۰۶ھ)

ابوالزبیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما ہر نماز کے بعد بلند آواز سے پڑھتے تھے: "لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر' ولا حول ولا قوۃ الا باللہ ولا نعبد الا ایاہ لہ النعمۃ ولہ الفضل ولہ الثناء الحسن' لا الہ الا اللہ مخلصین لہ الدین ولو کرہ الکافرون" پھر حضرت ابن الزبیر نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد ان کلمات کو بلند آواز سے پڑھتے تھے۔

(المصنف ج ۱۰ ص ۲۳۲ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۴۰۶ھ)

اس حدیث کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۱۸ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی ۱۳۷۵ھ)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کا سلام پھیرنے کے بعد دعا کرتے: اے اللہ! میں تجھ سے علم نافع' پاک رزق اور عمل مقبول کا سوال کرتا ہوں۔

(المصنف ج ۱۰ ص ۲۳۴ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۴۰۶ھ)

اس حدیث کو امام ابن السنی نے بھی روایت کیا ہے۔ (عمل الیوم واللیلہ ص ۲۹۔ ۲۸ مطبوعہ مجلس الدائرۃ المعارف' حیدرآباد دکن)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام طبرانی نے "معجم صغیر" میں روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۱۱ مطبوعہ دارالکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

زاذان کہتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی نے مجھ سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد سو مرتبہ دعا کرتے: اے اللہ! میری مغفرت فرما' میری توبہ قبول فرما' بے شک تو بہت توبہ قبول فرمانے والا بہت بخشنے والا ہے۔

(المصنف ج ۱۰ ص ۲۳۵ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۴۰۶ھ)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے: اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۱۰۔۱۱۹ مطبوعہ دارالکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

امام نسائی روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس ایک یہودی عورت آئی اور کہنے لگی: پیشاب کی وجہ سے عذاب قبر ہوتا ہے' میں نے کہا: تم جھوٹی ہو' اس نے کہا: کیوں نہیں؟ ہم کھال اور کپڑے کو پیشاب کی وجہ سے کاٹ دیتے تھے' ہماری آوازیں بلند ہو رہی تھیں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے جا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا: کیا بات ہے؟ تو میں نے سارا واقعہ عرض کیا' آپ نے فرمایا: وہ سچی ہے' اس دن کے بعد آپ ہر نماز کے بعد یہ دعا کرتے تھے: اے جبرائیل' میکائیل اور اسرافیل کے رب! مجھے آگ کی گرمی اور عذاب قبر سے اپنی پناہ میں رکھ۔

(سنن کبریٰ ج ۱ ص ۴۰۰ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۱ھ)

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی کو پڑھا' اس کو جنت میں داخل ہونے سے موت کے سوا اور کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔

(سنن کبریٰ ج ۶ ص ۳۰ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۱ھ)

اس حدیث کو امام طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔ (المعجم الکبیر ج ۸ ص ۱۱۴ مسند الشامیین ج ۲ ص ۹ مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ بیروت)
اس حدیث کو امام ابن السنی نے بھی روایت کیا ہے۔ (عمل الیوم واللیلۃ ص ۳۳ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن ۱۳۱۵ھ)
حافظ الہیثمی نے لکھا ہے: اس حدیث کی سند جید ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۰۲ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت ۱۴۰۲ھ)
امام ابن السنی روایت کرتے ہیں:
حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز ادا کر لیتے تو اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پر پھیرتے پھر پڑھتے: "اشهد ان لا اله الا الرحمن الرحيم" اس کے بعد دعا کرتے: اے اللہ! مجھ سے غم اور فکر دور کر دے۔ (عمل الیوم واللیلۃ ص ۳۹ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن ۱۳۱۵ھ)
اس حدیث کو امام طبرانی نے "معجم اوسط" میں اور امام بزار نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے اور متعدد ائمہ نے اس کی توثیق کی ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۱۰ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت ۱۴۰۲ھ)
حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں جب بھی کسی فرض یا نفل نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوا تو آپ کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا: اے اللہ! میرے گناہوں اور خطاؤں کو بخش دے' اے اللہ! مجھے ہلاکت سے بچا' اے اللہ! مجھے نیک اعمال اور اخلاق کی ہدایت دے' تیرے سوا کوئی نیک اعمال کی ہدایت دینے والا نہیں ہے اور تیرے سوا کوئی بُرے اعمال سے بچانے والا نہیں ہے۔ (عمل الیوم واللیلۃ ص ۴۱۔ ۴۰ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن ۱۳۱۵ھ)
حافظ الہیثمی لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔
(مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۱۲ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت ۱۴۰۲ھ)
حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تو آپ نے فرمایا: اے معاذ! میں تم سے محبت کرتا ہوں' تم کسی نماز کے بعد یہ دعا نہ چھوڑو: "اللهم اعنى على ذكرك وشكرك وحسن عبادتك"۔
(عمل الیوم واللیلۃ ص ۴۱ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن ۱۳۱۵ھ)
حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی ہم کو فرض نماز پڑھائی اس کے بعد ہماری طرف منہ کر کے یہ دعا کی: اے اللہ! میں ہر اس عمل سے تیری پناہ میں آتا ہوں جو مجھے شرمندہ کرے' میں ہر اس شخص سے تیری پناہ میں آتا ہوں جو مجھے ہلاک کرے' اور ہر اس امید سے تیری پناہ میں آتا ہوں جو مجھے غافل کر دے' میں ہر اس فقر سے تیری پناہ میں آتا ہوں جو تجھے بھلا دے اور ہر اس غنیٰ سے تیری پناہ میں آتا ہے جو مجھے سرکش بنا دے۔
(عمل الیوم واللیلۃ ص ۴۲۔ ۴۱ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن ۱۳۱۵ھ)
حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام بزار نے حضرت انس سے روایت کیا ہے اور اس کی توثیق کی گئی ہے اور اس کو امام ابو یعلیٰ نے بھی روایت کیا ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۱۰ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت ۱۴۰۲ھ)
حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز کے بعد یہ دعا کرتے: اے اللہ! میری آخری زندگی کو خیر کر دے اور میرے سب سے اچھے عمل پر میرا خاتمہ کر اور میرا سب سے اچھا دن وہ بنا دے' جس دن تجھ سے ملاقات ہو۔ (عمل الیوم واللیلۃ ص ۴۳ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن ۱۳۱۵ھ)
اس حدیث کو امام طبرانی نے "اوسط" میں روایت کیا ہے اور اس کا ایک راوی ضعیف ہے۔
(مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۱۰ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت ۱۴۰۲ھ)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں ہر نماز کے بعد "معوذات" ("قل اعوذ برب الفلق" اور "قل اعوذ برب الناس") کو پڑھا کروں۔

(عمل الیوم واللیلۃ ص ۴۲ مطبوعہ حیدر آباد دکن' ۱۳۱۵ھ)

حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں صبح کی نماز پڑھنے کے بعد تین بار بلند آواز سے یہ دعا فرماتے: اے اللہ! میرے دین کی اصلاح فرما جس کو تو نے میرے امر کی حفاظت بنایا ہے' اے اللہ! میری دنیا کی حفاظت فرما جس کو تو نے میری معاش بنایا ہے' اور تین بار یہ دعا فرماتے: اے اللہ! میری آخرت کی اصلاح فرما' جس کو تو نے میرا مرجع بنایا ہے اور تین بار فرماتے: اے اللہ! میں تیری ناراضگی سے تیری رضا کی پناہ میں آتا ہوں' اے اللہ! میں تجھ سے تیری پناہ میں آتا ہوں' جو تو عطا کرے اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جس کو تو روک دے اس کا کوئی دینے والا نہیں' اور تیرے مقابلہ میں کسی کی کوشش نفع نہیں دے سکتی۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۱۱ مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حافظ الہیثمی لکھتے ہیں: اس حدیث کا امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ایک ضعیف راوی ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۱۱ مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حافظ الہیثمی لکھتے ہیں:

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے جب بھی تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز پڑھی تو آپ نے نماز کے بعد یہ دعا کی: اے اللہ! میری کل خطاؤں اور ذنوب کو بخش دے' اے اللہ! مجھے ہلاکت سے بچا' میرے ٹوٹے ہوئے کام جوڑ دے' اور مجھے نیک اعمال اور اخلاق کی ہدایت دے' تیرے سوا نیک اعمال کی ہدایت دینے والا اور برے اعمال سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے "معجم صغیر" اور "معجم اوسط" میں روایت کیا ہے اور اس کی سند عمدہ ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۱۱ مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص نماز پڑھائے اور دعا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کی مغفرت کر دیتا ہے' اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ایک ضعیف راوی ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۱۱ مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

فرض نمازوں کے بعد دعا کرنے کے متعلق فقہاء اسلام کی آراء

علامہ حلبی حنفی لکھتے ہیں:

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد صرف "اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذالجلال والاکرام" کی مقدار بیٹھتے تھے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ آپ بعینہٖ یہی کلمات فرماتے تھے یا بس اتنی ہی دیر بیٹھتے تھے' اس سے تحدید مراد نہیں ہے اس لیے یہ حدیث "صحیح بخاری" اور "صحیح مسلم" کی اس حدیث کے منافی نہیں ہے جس میں حضرت عبداللہ بن الزبیر سے طویل ذکر مروی ہے۔ (غنیۃ المستملی (حلبی کبیر) ص ۳۴۲ مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور' ۱۴۱۲ھ)

علامہ ابن ہمام حنفی لکھتے ہیں:

اس میں اختلاف ہے کہ فرض کے بعد متصلا سنت پڑھنا اولیٰ ہے یا دعا اور وظائف پڑھنے کے بعد سنتیں پڑھنا اولیٰ ہے' امام حلوانی نے کہا ہے کہ فرائض اور سنتوں کے درمیان وظائف اور اوراد پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (الی قولہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد کم مقدار میں بھی ذکر کیا ہے اور زیادہ مقدار میں بھی' اور اس وقت سنت یہ ہے کہ اتنی مقدار میں تاخیر

کے بعد سنتیں پڑھی جائیں۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۳۸۲۔ ۳۸۳ مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

علامہ شرنبلالی حنفی لکھتے ہیں:

مستحب یہ ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد ائمہ اپنے لیے اور مسلمانوں کے لیے دعا کریں کیونکہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کس وقت دعا مقبول ہوتی ہے تو آپ نے فرمایا: آدھی رات کو اور فرض نمازوں کے بعد' اور آپ نے حضرت معاذ سے فرمایا: بہ خدا! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ تم کسی نماز کے بعد یہ دعا ترک نہ کرنا: ''اللھم اعنی علی ذکرك وشكرك وحسن عبادتك''. (مراقی الفلاح ص ۱۸۹ مطبوعہ مطبع مصطفی البابی واولادہ' مصر' ۱۳۵۶ھ)

علامہ طحطاوی حنفی لکھتے ہیں: ہر فرض نماز کے بعد تین بار اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے۔

(حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص ۱۸۸ مطبوعہ مطبع مصطفی البابی واولادہ' مصر' ۱۳۵۶ھ)

علامہ علاؤ الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

امام کے لیے مستحب ہے کہ وہ سلام پھیرنے کے بعد تین بار استغفار کرے' آیۃ الکرسی اور معوذات پڑھے اور سو تسبیحات پڑھے اور دعا کرے اور ''سبحان ربك رب العزة عما يصفون'' پر ختم کرے۔

(درمختار علی ہامش حاشیۃ الطحطاوی' ج ۱ ص ۲۳۲ مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت)

علامہ طحطاوی حنفی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: کیونکہ فرض نمازوں کے بعد دعا مقبول ہوتی ہے۔

(حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج ۱ ص ۲۳۲ مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۵ھ)

نیز علامہ حصکفی نے لکھا ہے کہ فرض نماز کے بعد متصلاً سنتیں پڑھنے یا دعا اور ذکر کے بعد سنتیں پڑھنے میں فقہاء کا اختلاف افضلیت میں ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ فرض کے بعد اوراد اور دعا سے منع کرنے والوں کا قول اگر اس پر محمول کیا جائے کہ فرض نمازوں کے بعد وظائف میں زیادہ دیر لگانا مکروہ تنزیہی ہے اور کم مقدار میں دعا اور وظائف پڑھنا بلا کراہت جائز ہے تو پھر اختلاف نہیں رہے گا۔ (درمختار علی ہامش حاشیۃ الطحطاوی ج ۱ ص ۲۳۳ مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۵ھ)

علامہ حطاب مالکی طرابلسی مغربی لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ امام مقتدیوں کو بھی اپنی دعا میں شریک کرے' روایت ہے کہ جس نے ان کو نہیں شریک کیا اس نے ان سے خیانت کی' اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ نماز کے بعد دعا کرنا جائز ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدھی رات اور فرض نمازوں کے بعد دعا زیادہ مقبول ہوتی ہے' امام حاکم نے امام مسلم کی شرط کے مطابق یہ حدیث روایت کی ہے' جب بھی مسلمان جمع ہوں بعض دعا کریں اور بعض آمین کہیں تو اللہ ان کی دعا کو قبول فرماتا ہے۔

(مواہب الجلیل ج ۱ ص ۱۲۷۔ ۱۲۶ مطبوعہ مکتبہ النجاح' لیبیا)

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

نماز کے بعد کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا سنت ہے' اس سلسلہ میں بہت احادیث ہیں' اور سلام پھیرنے کے بعد آہستہ دعا کرنا مسنون ہے' الا یہ کہ کوئی شخص امام ہو اور وہ حاضرین کو دعا پر مطلع کرنے کا ارادہ کرے تو وہ بلند آواز سے دعا کرے۔ (روضۃ الطالبین ج ۱ ص ۳۷۲۔ ۳۷۳ مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

سلام پھیرنے کے بعد اللہ کا ذکر کرنا اور دعا کرنا مستحب ہے' حضرت ثوبان سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز

پڑھنے کے بعد پھر جاتے اور تین بار استغفر اللہ کہتے اور "اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذا الجلال والاکرام" پڑھتے' حضرت سعد کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد یہ دعا کرتے: اے اللہ! میں بزدلی سے تیری پناہ میں آتا ہوں' میں بخل سے تیری پناہ میں آتا ہوں' میں ارذل عمر سے تیری پناہ میں آتا ہوں' میں دنیا کے فتنہ اور عذاب قبر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔ (المغنی ج ۱ ص ۳۲۷' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۰۵ھ)

چونکہ بہ کثرت احادیث میں فرض نماز کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جہراً ذکر کرنا اور دعا کرنا ثابت اور مصرح ہے جیسا کہ ہم نے باحوالہ بیان کیا ہے اس لیے ہمارے نزدیک یہی راجح ہے کہ فرض نماز کے بعد مختصر ذکر کیا جائے اور دعا کی جائے اور جن فقہاء نے اس کو غیر افضل یا مکروہ تنزیہی کہا ہے ہمارے نزدیک ان کا قول صحیح نہیں ہے' ہم نے اس مسئلہ میں اس لیے طویل بحث کی ہے کہ ہمارے زمانہ میں بعض حنبلی المسلک علماء اور بعض صوفیاء فرض نماز کے بعد دعا مانگنے سے لوگوں کو منع کرتے ہیں اور ان کا یہ قول بکثرت احادیث صحیحہ کے خلاف ہے۔

طلب جنت کی دعا کرنے کا قرآن اور سنت سے بیان

ہمارے زمانہ میں بعض جہلا جنت کی بہت تنقیص اور بہت تحقیر کرتے ہیں اور جنت کی دعا کرنے کو بہت گھٹیا درجہ قرار دیتے ہیں' بعض کہتے ہیں: ہمیں جنت نہیں مدینہ چاہیے' حالانکہ مدینہ کی عظمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ کی وجہ سے ہے اور آپ کا روضہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی جنت میں ہیں اور آخرت میں بھی جنت میں ہوں گے تو اگر سرکار کے مسکن کی وجہ سے مدینہ کو محبوب رکھا جاتا ہے تو دنیا اور آخرت میں آپ کا مسکن جنت ہے اس کی تنقیص کیوں کی جاتی ہے؟ بلکہ اس کو مدینہ سے زیادہ محبوب جاننا چاہیے کہ وہ اب آپ کا مسکن ہے اور آخرت میں بھی آپ کا مسکن ہے! بعض کہتے ہیں کہ جنت کا درجہ کم ہے اور اللہ کی رضا کا درجہ زیادہ ہے اس لیے وہ جنت کو کم قرار دیتے ہیں اور جنت کی دعا نہیں کرتے' لیکن وہ غور نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جنت کی بہت تعریف اور توصیف کی ہے اور اس کی طرف بہت رغبت دلائی ہے تو اللہ نے جس چیز کی تعریف و توصیف کی ہو اس کی تنقیص کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی ہوگا یا ناراض! اور اللہ کی رضا اور اس کا دیدار اہل جنت کو ہوگا تو اللہ کی رضا اور اس کے دیدار کا وسیلہ جنت ہے اس لیے جنت کو محبوب رکھنا چاہیے' جس طرح انبیاء علیہم السلام کو اس لیے محبوب رکھا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا وسیلہ ہیں' نیز قرآن اور سنت میں جنت کو طلب کرنے اور اس کے حصول کی دعا کی ہدایت دی گئی ہے:

وَسَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۳)

اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جلدی کرو جس کی پہنائی آسمان اور زمینیں ہیں جو متقین کے لیے تیار کی گئی ہے ۝

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے بڑھ کر اللہ کی رضا کا کون طالب ہوگا انہوں نے جنت کے حصول کے لیے دعا کی:

وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۝ (الشعراء: ۸۵)

اور مجھے نعمت والی جنت کے وارثوں میں سے بنادے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کے حصول کی دعا کرنے کا حکم دیا ہے' امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اللہ سے سوال کرو تو اس سے فردوس کا سوال کرو۔ (جامع ترمذی ص ۳۶۳۔ ۳۶۲' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے تین مرتبہ اللہ سے جنت کا سوال کیا' جنت کہتی ہے: اے اللہ! اس کو جنت میں داخل کر دے اور جس نے تین بار جہنم سے پناہ طلب کی' جہنم کہتی ہے: اے اللہ! اس کو جہنم سے پناہ میں رکھ۔ (جامع ترمذی ص ۳۶۸' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ دعا سکھائی: اے اللہ! میں تجھ سے دنیا اور آخرت کی ہر اس خیر کا سوال کرتی ہوں جو تجھے معلوم ہے اور مجھے معلوم نہیں' اور میں تجھ سے ہر اس شر سے پناہ طلب کرتی ہوں جو تجھے معلوم ہے اور مجھے معلوم نہیں' اے اللہ! میں تجھ سے اس خیر کا سوال کرتی ہوں جس کا تیرے بندے اور تیرے نبی نے سوال کیا اور ہر اس شر سے تیری پناہ طلب کرتی ہوں جس سے تیرے بندے اور نبی نے پناہ طلب کی' اے اللہ! میں تجھ سے جنت کا سوال کرتی ہوں اور اس قول اور عمل کا سوال کرتی ہوں جو جنت کے قریب کر دے' اے اللہ! میں تجھ سے دوزخ سے پناہ طلب کرتی ہوں اور اس قول اور عمل سے پناہ طلب کرتی ہوں جو دوزخ کے قریب کر دے' اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتی ہوں کہ تو میرے لیے جو چیز مقدر کرے تو اچھی چیز مقدر کر۔ (المصنف ج ۱۰ ص ۲۶۴' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۶ ص ۱۳۴' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

نیز امام احمد روایت کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو یہ دعا سکھائی:

اے اللہ! میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور اس قول یا عمل کا جو جنت کے قریب کر دے اور تجھ سے جہنم سے پناہ طلب کرتا ہوں اور اس قول یا عمل سے جو جہنم کے قریب کر دے۔

(مسند احمد ج ۱ ص ۱۷۲' ج ۱ ص ۱۸۳' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

یہ حدیث کنز العمال میں بھی ہے' حدیث نمبر: ۵۰۷۲' ۳۸۴۳' ۳۶۱۰۔

دعا قبول ہونے کی شرائط اور آداب

(۱) دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرے اور ہتھیلیوں کا باطنی حصہ اپنے کندھوں کے بالمقابل رکھے اور دعا کے بعد ہاتھوں کو چہرے پر پھیرے۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۰۹' جامع ترمذی ص ۴۸۸)

(۲) حافظ الہیثمی نے امام طبرانی سے روایت کیا ہے' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب تم میں سے کوئی شخص دعا کرے تو پہلے اللہ کی ایسی حمد و ثناء کرے جس کا وہ اہل ہے' پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ پڑھے' اس کے بعد سوال کرے تو اس کی قبولیت متوقع ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۶۰' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲)

(۳) حافظ الہیثمی نے امام طبرانی سے روایت کیا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے تو پہلے اپنے لیے دعا کرتے' یہ حدیث حسن ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۵۱' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

(۴) امام ترمذی روایت کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی کا ذکر کر کے اس کے لیے دعا کرتے تو پہلے اپنے لیے دعا کرتے۔ (جامع ترمذی ص ۴۳۳' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

(۵) امام بخاری حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص دعا کرے تو پورے عزم سے سوال کرے' یوں نہ کہے: اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے عطا کر۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۳۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

(۶) امام ترمذی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص دعا کرتا ہے تو یا تو اللہ اس کی دعا قبول کر لیتا ہے یا اس سے اس کی مثل کوئی برائی دور کر دیتا ہے' بہ شرطیکہ وہ گناہ کی دعا کرے نہ قطع رحم کی۔ (جامع ترمذی ص ۴۸۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی)

حضرت ابوسعید خدری کی روایت میں تین چیزوں کا ذکر ہے: دعا جلد قبول کرنا یا آخرت میں اجر عطا کرنا یا مصیبت ٹال دینا۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۵۱' مطبوعہ دار الکتاب العربی' ۱۴۰۲ھ)

(۷) حافظ الہیثمی نے امام احمد سے روایت کیا ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! جب تم اللہ سے دعا کرو تو قبولیت کے یقین سے دعا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی دعا قبول نہیں کرتا جو غافل دل سے دعا کرتا ہے' یہ حدیث حسن ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۴۸' مطبوعہ دار الکتاب العربی)

امام غزالی لکھتے ہیں:

(۸) قبولیت کے اوقات میں دعا کرے' مثلاً رات کے آخری حصہ میں' فرض نمازوں کے بعد' اسی طرح قبولیت کے ایام میں' مثلاً یوم عرفہ کو' رمضان میں' جمعہ میں۔

(۹) قبولیت کے احوال میں دعا کرے' مثلاً بارش کے وقت' حضرت انس سے روایت ہے کہ اذان اور اقامت کے درمیان دعا مسترد نہیں ہوتی۔

امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ بندہ کا اللہ سے سب سے زیادہ قرب سجدہ میں ہوتا ہے تو سجدہ میں بہ کثرت دعا کیا کرو' نیز امام مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ سجدہ میں دعا کی قبولیت متوقع ہے۔

(۱۰) قبلہ کی طرف منہ کر کے دعا کرے' امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان عرفات میں قبلہ کی طرف منہ کیا اور غروب آفتاب تک دعا کرتے رہے۔

(۱۱) بہت زیادہ گلا پھاڑ کر دعا نہ کی جائے' امام بخاری حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! تم کسی بہرے اور غائب سے دعا نہیں کر رہے۔

(۱۲) تصنع اور تکلف سے مسجع مقفیٰ عبارات کے ساتھ دعا نہ کرے' امام ابوداؤد حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب ایک قوم دعا میں حد سے تجاوز کرے گی۔

(۱۳) شوق اور خوف سے دعا کرے: "یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا" (الانبیاء: ۹۰) وہ ہم سے رغبت اور خوف سے دعا کرتے ہیں"۔

(۱۴) گڑگڑا کر اور خشوع سے دعا کرے: "اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً" (الاعراف: ۵۵) اپنے رب سے دعا کرو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے"۔

(۱۵) تین بار دعا کرے' امام مسلم حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے تو تین بار دعا کرتے اور جب سوال کرتے تو تین بار سوال کرتے۔

(۱۶) قبولیت کے لیے جلدی نہ کرے' امام بخاری اور امام مسلم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تک جلدی نہیں کی جائے گی تمہاری دعا قبول ہوتی رہے گی' تم میں سے ایک شخص کہتا ہے: میں نے دعا کی اور میری دعا قبول نہیں ہوئی' جب تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو تو بہ کثرت سوال کرو کیونکہ تم کریم سے دعا

کر رہے ہو۔ (حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی دعا کی جو تقریباً تین ہزار سال بعد قبول ہوئی' حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ تین سو سال بعد قبول فرمائی۔ تفسیر خازن ج ۱ ص ۴۷)

(۱۷) قبولیت دعا کے لیے سب سے ضروری امر یہ ہے کہ انسان اپنے گناہوں سے توبہ کرے' لوگوں کے جو حقوق دبا رکھے ہیں وہ ان کو واپس کرے' جس پر جو ظلم کیا ہے وہ اس سے معاف کرائے' کعب احبار نے بیان کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں قحط پڑ گیا' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کے ساتھ مل کر تین بار بارش کی دعا کی لیکن بارش نہیں ہوئی' اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی کی: تمہارے درمیان ایک چغل خور ہے' جب تک وہ درمیان سے نہیں نکلے گا تمہاری دعا قبول نہیں ہوگی' حضرت موسیٰ نے پوچھا: یا رب! وہ کون ہے؟ فرمایا: میں تم کو چغلی سے منع کرتا ہوں تو میں تم سے اس کی چغلی کیسے کروں گا' پھر موسیٰ علیہ السلام نے سب کو توبہ کرنے کا حکم دیا' جب سب نے توبہ کر لی تو بارش ہو گئی۔ (احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۳۰۷۔ ۳۰۳' مطبوعہ دار الخیر' بیروت' ۱۴۱۳ھ)

(۱۸) قبولیت دعا کی ایک اور شرط یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي۔ (البقرہ: ۱۸۶) دعا کرنے والا جب دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو چاہیے کہ وہ بھی میرا حکم مانیں''۔ انسان بندہ اور محتاج ہو کر اللہ کی بات نہ مانے اور اس کے حکم پر عمل نہ کرے اور یہ چاہے کہ وہ معبود بے نیاز ذات اس کا کہا مان لے یہ کیسی بے انصافی ہے!

(۱۹) حافظ الہیثمی نے امام طبرانی سے روایت کیا ہے کہ تین شخصوں کی دعا قبول ہوتی ہے' والد کی' مسافر کی اور مظلوم کی۔ یہ حدیث صحیح ہے' نیز امام طبرانی' حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ غائب شخص کے لیے دعا کی جائے تو مسترد نہیں ہوتی۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۵۲۔ ۱۵۱' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

(۲۰) قبولیت دعا کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور تقدیر کے خلاف نہ ہو۔

دعا قبول نہ ہونے کی وجوہات

قرآن مجید میں ہے:

أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۔ (البقرہ: ۱۸۶) میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے۔

اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ کئی بار ہم دعا کرتے ہیں اور وہ قبول نہیں ہوتی' اس کا ایک جواب یہ ہے کہ وہ دعا' قبولیت کی ان شرائط اور آداب کے مطابق نہیں مانگی جاتی جن کو ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے' دوسرا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات ہم جس چیز کی دعا کرتے ہیں وہ مآل کار ہمارے حق میں مضر ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ دعا قبول نہ کر کے ہم کو اس کے ضرر سے بچا لیتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (البقرہ: ۲۱۶) اور ہو سکتا ہے کہ کسی چیز کو تم برا سمجھو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۝

تیسرا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات ہماری دعا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق نہیں ہوتی اس لیے وہ اس کو قبول نہیں فرماتا' قرآن مجید میں ہے:

بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (الانعام: ۴۱) بلکہ تم اسی سے دعا کرو گے اور اگر وہ چاہے گا تو وہ اس مصیبت کو دور کر دے گا جس کے لیے تم اس سے دعا کرو گے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اللہ تعالیٰ سے تین چیزوں کا سوال کیا' اللہ تعالیٰ نے مجھے دو چیزیں عطا کر دیں اور ایک چیز کے سوال سے مجھے روک دیا' میں نے سوال کیا کہ میری (تمام) امت قحط سے ہلاک نہ ہو' اللہ نے مجھے یہ عطا کر دیا' میں نے سوال کیا کہ ان کا مخالف دشمن ان (سب) پر مسلط نہ ہو' اللہ نے یہ عطا کر دیا' میں نے یہ سوال کیا: میری امت آپس میں جنگ نہ کرے تو اللہ نے مجھے اس سوال سے روک دیا۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (جامع ترمذی ص ۳۱۷' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب اور مستجاب ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا مسترد نہیں کی بلکہ آپ کو اس دعا کے کرنے سے منع فرما دیا' دوسرا جواب یہ ہے کہ اس ایک دعا کے سوا آپ کی تمام دعائیں قبول کی گئیں اور چونکہ آپ کی زندگی میں ہر عمل کے لیے حسین نمونہ ہے تو دعا قبول نہ ہونے پر صبر و ضبط کرنے کا نمونہ بھی آپ کی حیات طیبہ میں ہونا چاہیے تھا' سو اس حکمت کی وجہ سے آپ کی ایک دعا قبول نہیں کی گئی۔ اصل سوال کا چوتھا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والے کی دعا قبول نہیں فرماتا' قرآن مجید میں ہے:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ (الاعراف: ۵۵) اپنے رب سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعا کرو' بے شک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ۝

اور جو شخص علم سے یا بغیر علم کے گناہ کبیرہ پر اصرار کرتا ہو وہ حد سے بڑھنے والا ہے' اس کی دعا کیسے قبول ہوگی!

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے' اس کے بال بکھرے ہوئے اور غبار آلود ہوتے ہیں' وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتا ہے: یا رب! یا رب! اس کا کھانا پینا حرام ہو' اس کا لباس حرام ہو' اس کی غذا حرام ہو تو اس کی دعا کہاں قبول ہوگی۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۲۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حافظ ابن عساکر روایت کرتے ہیں:

ابراہیم بن نصر کرمانی یکے از ابدال ہیں' وہ بیان کرتے ہیں کہ دس وجوہات سے لوگوں کی دعا قبول نہیں ہوتی' (۱) اللہ کا اقرار کرتے ہیں اور اس کا حکم نہیں مانتے (۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے ہیں اور آپ کی سنت کی اتباع نہیں کرتے (۳) قرآن مجید پڑھتے ہیں اور اس پر عمل نہیں کرتے (۴) جنت کو پسند کرتے ہیں اور اس کے راستہ پر نہیں چلتے (۵) جہنم کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کے راستہ پر دھکم پیل کرتے ہیں (۶) ابلیس کو اپنا دشمن کہتے ہیں اور اس کی موافقت کرتے ہیں (۷) لوگوں کو دفن کرتے ہیں اور اپنی موت کو یاد نہیں کرتے (۸) اپنے بھائیوں کے عیوب تلاش کرتے ہیں اور اپنے عیوب نہیں دیکھتے (۹) مال جمع کرتے ہیں اور حساب کے دن کو یاد نہیں رکھتے (۱۰) قبریں کھودتے ہیں پھر بھی عالیشان مکان بناتے ہیں۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۴ ص ۱۹۹' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کو بعینہٖ عبادت اور عبادت کا مغز فرمایا ہے' اس لیے میں نے چاہا کہ دعا کے متعلق تمام اہم مباحث کو یہاں بیان کر دیا جائے۔ وما توفیقی الا باللہ و لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تمہارے لیے روزہ کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا۔ (البقرہ: ۱۸۷)

روزہ کی رات میں سونے کے بعد کھانے پینے اور عمل زوجیت کی اجازت

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں: مسلمان ابتداء میں ہر ماہ میں تین دن روزے رکھتے تھے پھر رمضان کے روزے فرض ہو گئے' جب کوئی شخص افطار کے وقت کھانا کھائے بغیر سو جاتا تو پھر اگلے روز افطار تک کھانا نہیں کھا سکتا تھا' اور اگر وہ سو جاتا یا اس کی بیوی سو جاتی تو پھر وہ بیوی سے عمل زوجیت نہیں کر سکتا تھا' انصار میں سے صرمہ بن مالک نام کا ایک بوڑھا شخص تھا' اس نے افطار کے وقت اپنی بیوی سے کہا: کھانا لاؤ' بیوی نے کہا: میں گرم کر کے لاتی ہوں' اتنی دیر میں اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ سو گیا (اور اگلے دن بھوک سے اس کی حالت غیر ہو گئی) دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ حضرت عمر نے اپنی بیوی کو عمل زوجیت کے لیے بلایا' انہوں نے کہا: میں سو چکی ہوں' حضرت عمر نے یہ گمان کیا کہ وہ بہانے کر رہی ہیں اور ان سے اپنی خواہش پوری کر لی اور دونوں نے رات گزار لی تو اللہ نے یہ آیت نازل کی: اللہ کو علم ہے کہ تم اپنے نفسوں میں خیانت کرتے تھے' سو اللہ نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تمہیں معاف کر دیا' سو اب (چاہو تو) تم ان سے عمل زوجیت کرو' اور جو اللہ نے تمہارے لیے مقدر کر دیا ہے اس کو طلب کرو' اور کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ فجر کا سفید دھاگا (رات کے) سیاہ دھاگے سے ممتاز ہو جائے' پھر روزہ کو رات آنے تک پورا کرو۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۹۵' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے مسلمان سونے سے پہلے کھاتے پیتے رہتے تھے اور جماع کرتے تھے' اور سونے کے بعد کھانے پینے اور جماع کو ترک کر دیتے تھے' ابوصرمہ نام کا ایک انصاری شخص زمین میں کھیتی باڑی کرتا تھا' افطار کے وقت وہ سو گیا اور پھر صبح روزہ کے ساتھ کی' وہ بھوک پیاس سے بے حال ہو گیا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر پوچھا: کیا ہوا؟ تو اس نے واقعہ بیان کیا' ادھر دوسرے شخص نے خیانت کی اور بیوی سے اس کے سونے کے بعد جماع کر لیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۹۵' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

سفید دھاگے اور کالے دھاگے کا بیان اور طلوع فجر کے بعد سحری کھانے کی ممانعت

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ نے مجھے اسلام کی تعلیم دی' اور ہر نماز کے وقت میں نماز پڑھنا سکھایا' پھر فرمایا: جب رمضان آئے تو کھاتے پیتے رہنا حتیٰ کہ فجر کا سفید دھاگہ رات کے سیاہ دھاگے سے ممتاز ہو جائے' پھر رات تک روزہ پورا کرنا' حضرت عدی بن حاتم کہتے ہیں: میں نہیں سمجھ سکا کہ کالے اور سفید دھاگے سے کیا مراد ہے' میں فجر تک ان دونوں دھاگوں کو دیکھتا رہا اور وہ مجھے ایک جیسے دکھائی دیئے' پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا' پھر میں نے کہا: یا رسول اللہ! ہر وہ چیز جس کی آپ نے مجھے وصیت کی تھی مجھے یاد ہے' البتہ سفید دھاگے اور کالے دھاگے کا مطلب مجھے یاد نہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے گویا کہ آپ کو معلوم ہو گیا کہ میں نے کیا کیا تھا' میں نے کہا: میں نے ان دونوں دھاگوں کو بٹ لیا اور رات بھر انہیں دیکھتا رہا' مجھے یہ ایک جیسے دکھائی دیئے' رسول اللہ ہنسے حتیٰ کہ آپ کی ڈاڑھیں دکھائی دیں' پھر آپ نے فرمایا: کیا میں نے تم سے فجر کا لفظ نہیں کہا تھا' اس سے مراد رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی ہے۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۱۰۰' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

سید مودودی لکھتے ہیں:

سحر میں سیاہی شب سے سپیدۂ سحر کا نمودار ہونا اچھی خاصی گنجائش اپنے اندر رکھتا ہے اور ایک شخص کے لیے یہ بالکل صحیح

ہے کہ اگر عین طلوع فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی ہو تو وہ جلدی سے اٹھ کر کچھ کھا پی لے حدیث میں آتا ہے کہ حضور نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی شخص سحری کھا رہا ہو اور اذان کی آواز آ جائے تو فوراً چھوڑ نہ دے بلکہ اپنی حاجت بھر کھا پی لے۔

(تفہیم القرآن ج ا ص ۱۳۱ 'مطبوعہ ترجمان القرآن لاہور' مارچ ۱۹۸۳ء)

سید مودودی نے یہ صحیح نہیں لکھا' طلوع فجر کے بعد سحری کھانا جائز نہیں ہے اور جس حدیث سے انہوں نے بلا حوالہ استدلال کیا ہے اس میں طلوع فجر کے بعد کھانے پینے کی اجازت کا ذکر نہیں ہے۔ اصل حدیث یہ ہے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلال رات کو اذان دیتے ہیں تم کھاتے پیتے رہو حتیٰ کہ ابن ام مکتوم اذان دیں۔ (صحیح بخاری ج ا ص ۸۷۔۸۶ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی)

رمضان میں حضرت بلال رات کے وقت اذان دیتے تھے تاکہ سحری کرنے والے جاگ اٹھیں اور جس نے تہجد پڑھنی ہو وہ اٹھ کر تہجد پڑھ لے اور حضرت ابن ام مکتوم طلوع فجر کے وقت صبح کی اذان دیتے تھے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن ام مکتوم کی اذان کو سحر کی انتہاء قرار دیا ہے' اس سے طلوع فجر کے بعد کھانے پینے کی اجازت کہاں نکلتی ہے!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو (کسی وقت بھی) اپنی بیویوں سے عمل زوجیت نہ کرو۔

(البقرہ: ۱۸۷)

اعتکاف کا لغوی اور اصطلاحی معنی اور اس کی اقسام

علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں:

اعتکاف کا لغت میں معنی ہے: ٹھہرنا' اور اصطلاح شرع میں اس کا معنی ہے: مسجد میں رہنا' روزہ سے رہنا' جماع کو بالکل ترک کرنا اور اللہ عزوجل سے تقرب کی نیت کرنا' اور جب تک یہ معانی پائے نہ جائیں شرعاً اعتکاف متحقق نہیں ہوگا' لیکن مسجد میں رہنے کی شرط صرف مردوں کے اعتبار سے ہے' عورتوں کے لیے یہ شرط نہیں ہے' ہر مسجد میں اعتکاف ہو سکتا ہے' البتہ بعض فقہاء نے جامع مسجد کی شرط لگائی ہے۔ (احکام القرآن ج ا ص ۲۴۲ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

اعتکاف کی تین قسمیں ہیں' واجب: یہ وہ اعتکاف ہے جس کی نذر مانی جائے' سنت مؤکدہ: رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف اور نفل' جو اعتکاف سنت مؤکدہ ہے اس کی بھی وہی شرائط ہیں جو اعتکاف واجب کی ہیں۔

اعتکاف کی شرائط

(۱) اعتکاف کی نیت کرنا شرط ہے (۲) جس مسجد میں اذان اور اقامت ہو اور باجماعت نماز ہو' اس میں اعتکاف کیا جائے (۳) اعتکاف واجب میں روزہ شرط ہے' اعتکاف نفل میں روزہ شرط نہیں اور نہ اس میں وقت کی تحدید ہے (۴) اسلام (۵) عقل (۶) جنابت' حیض اور نفاس سے پاک ہونا ضروری ہے' بالغ ہونا اعتکاف کے لیے شرط نہیں ہے اور نہ آزاد ہونا اور مرد ہونا شرط ہے۔ عورتیں گھر میں نماز کی جگہ کو اعتکاف کے لیے مخصوص کر لیں اور اس جگہ بیٹھیں۔

اعتکاف کے آداب

معتکف اچھی بات کے سوا اور کوئی بات نہ کرے' رمضان کے دس دن اعتکاف کرے' سب سے افضل مسجد میں اعتکاف کرے' مثلاً مسجد حرام' مسجد نبوی اور جامع مسجد' قرآن اور حدیث کی تلاوت اور فقہ کی کتابیں پڑھنے میں مشغول رہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی سیرت اور حکایات صالحین کے پڑھنے میں منہمک رہے' اللہ عزوجل کا ذکر کرے' استغفار

کرے درود شریف پڑھے' زندگی کی قضا نمازیں اور نوافل پڑھے' جن باتوں میں گناہ نہ ہو ان باتوں کے کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے' اعتکاف کرنے والا خود کو دنیا کے مشاغل سے الگ کر کے بالکلیہ عبادت الٰہی کے سپرد کر دیتا ہے اور اعتکاف کے ایام میں بندہ فرشتوں کے مشابہ ہو جاتا ہے' جو اللہ کی بالکل معصیت نہیں کرتے' اللہ کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور دن رات اس کی تسبیح کرنے میں مشغول رہتے ہیں' نمازی نماز پڑھ کر مسجد سے چلے جاتے ہیں لیکن معتکف اللہ کے گھر کو نہیں چھوڑتا اور وہیں دھرنا مار کر بیٹھا رہتا ہے' سو اس کے لیے اللہ کی عطا اور نوال زیادہ متوقع ہے۔

اعتکاف کے مفسدات

بلا عذر شرعی مسجد سے نکلنے سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے' بول و براز کے لیے جانا اور جمعہ پڑھنے کے لیے جانا عذر شرعی ہیں' وضو کے لیے جانا بھی عذر شرعی ہے' کھانے' پینے اور سونے کے لیے مسجد سے باہر جانا جائز نہیں ہے' جان اور مال کو بچانے کے لیے مسجد سے جانا جائز ہے' مریض کی عیادت کے لیے نہ جائے' نماز جنازہ پڑھنے کے لیے مسجد سے باہر گیا تو اعتکاف فاسد ہو جائے گا' مسجد سے سر باہر نکالنا تاکہ اس کے گھر والے سر دھو دیں جائز ہے' (ٹھنڈک حاصل کرنے یا صفائی حاصل کرنے کے لیے مسجد سے غسل کرنے کے لیے جانا جائز نہیں ہے' البتہ غسل جنابت کے لیے جانا جائز ہے) جماع کرنا' بوسہ دینا' لمس اور معانقہ کرنا یہ تمام امور ناجائز ہیں اور اعتکاف کے لیے مفسد ہیں' بے ہوش ہونے یا جنون سے بھی اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے۔

اعتکاف کے بعض ضرور مسائل

اعتکاف میں عبادت سمجھ کر خاموش رہنا منع ہے لیکن زبان کے گناہوں سے بچنے کے لیے خاموش رہنا عظیم عبادت ہے' جو چیز اعتکاف میں اعتکاف کی وجہ سے منع ہے مثلاً جماع اور مسجد سے نکلنا اس میں عمد اور نسیان میں فرق نہیں ہے اور جو چیز اعتکاف میں روزے کی وجہ سے منع ہے' مثلاً کھانا پینا ان میں عمداً ارتکاب کی وجہ سے اعتکاف فاسد ہوگا اور نسیاناً نہیں' اعتکاف میں خوشبو لگا سکتا ہے اور سر میں تیل ڈال سکتا ہے' اگر اعتکاف واجب فاسد ہو جائے تو اس کی قضا واجب ہے' جب اعتکاف کی نذر مانے تو اس کو زبان سے کہنا ضروری ہے' اگر مثلاً تین دن یا دو دن اعتکاف کی نذر مانے تو اس میں راتیں شامل ہیں اور اگر مثلاً تین یا دو رات اعتکاف کی نذر مانی تو اس میں دن شامل ہیں اور اگر صرف دن یا صرف ایک رات کے اعتکاف کی نذر مانی تو یہ بھی جائز ہے' اور اگر ایک دن اعتکاف کی نذر مانی تو اس میں رات شامل نہیں ہے' فرض روزہ بلا عذر توڑنے میں قضا اور کفارہ واجب ہے اور نفل روزہ عمداً توڑنے میں صرف قضا واجب ہے۔ رمضان' کفارۂ قتل' کفارۂ ظہار' کفارۂ قسم' کفارۂ افطار رمضان اور نذر کے روزوں کو مسلسل رکھنا واجب ہے۔ (عالم گیری ج ۱ ص ۲۱۳۔ ۲۱۱' مطبوعہ مطبع امیریہ کبریٰ بولاق مصر' ۱۳۱۰ھ)

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف ہر چند کہ نفل ہے لیکن شروع کرنے سے لازم ہو جاتا ہے' اگر کسی شخص نے ایک دن کا اعتکاف فاسد کر دیا تو امام ابو یوسف کے نزدیک اس پر پورے دس دن کی قضا لازم ہے اور امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک اس پر صرف اسی دن کی قضا لازم ہے' اس کے برعکس نفل میں اگر کچھ دیر مسجد میں بیٹھ کر باہر نکل گیا تو اس پر قضا نہیں کیونکہ اس کے باہر نکلنے سے وہ اعتکاف ختم ہو گیا۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۱۳۱' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

چونکہ آخری عشرہ کا اعتکاف شروع کرنے سے لازم ہو جاتا ہے' اس لیے ہم نے لکھا ہے کہ اس پر واجب کے احکام لاگو ہوں گے۔

برطانیہ اور ہالینڈ وغیرہ میں لیز پر جگہ حاصل کر کے مساجد بنائی جاتی ہیں' وہ شرعاً مساجد نہیں ہیں کیونکہ ان پر گورنمنٹ کی

ملکیت ہوتی ہے' ان میں نماز پڑھنے سے مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب نہیں ہوگا اور نہ ان میں اعتکاف صحیح ہوگا' شرعاً مسجد اس وقت ہوگی جب کسی زمین کو اپنی صحیح ملکیت میں لے کر مسجد کے لیے وقف کر دیا جائے' اسی طرح ان ممالک میں بعض مسلمان حکومت سے بیروزگاری الاؤنس لیتے ہیں اور ان کو ایک مقررہ تاریخ پر جا کر سائن کر کے الاؤنس لینا ہوتا ہے' بعض دفعہ اعتکاف کے دوران وہ تاریخ آ جاتی ہے اور وہ سائن کرنے چلے جاتے ہیں' اس سے اعتکاف ٹوٹ جائے گا' لیکن ان پر صرف اس ایک دن کی قضا لازم ہوگی۔

وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ

اور ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق نہ کھاؤ' اور نہ (بہ طور رشوت) وہ مال حاکموں کو دو

لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

تاکہ تم جان بوجھ کر لوگوں کا کچھ مال گناہ کے ساتھ کھاؤ O

مال حرام کھانے کی حرمت

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام امت کو خطاب ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کا مال ناحق نہ کھائے' جوا' سود' دھوکے سے لیا ہوا مال' غصب شدہ مال' کسی کے حق کا انکار مثلاً کسی کی مزدوری' اجرت یا کرایہ کا انکار کر کے اس کا حق مار لینا' یا وہ مال جس کو شریعت نے حرام کر دیا ہے' مثلاً فاحشہ کی اجرت' اور شراب اور مردار کی قیمت یہ تمام قسم کے مال حرام ہیں اور ان کا کھانا ناجائز ہے۔

مال حرام سے صدقہ کرنے کا شرعی حکم

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

''ظہیریہ'' میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے ثواب کی نیت سے فقیر کو مال حرام سے کچھ دیا تو وہ کافر ہو جائے گا اور اگر فقیر کو معلوم تھا اور اس نے دینے والے کے لیے دعا کی اور اس نے آمین کہی تو دونوں کافر ہو جائیں گے' میں کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ فقیر کو دینے کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اگر اس نے ثواب کی نیت سے مسجد بنائی اور کوئی مالی عبادت کی تو وہ کافر ہو جائے گا' البتہ اس مسئلہ میں یہ قید ہے کہ اس مال حرام کی حرمت قطعی ہو جیسے چوری اور ڈاکے کا مال' سحر کی کمائی' سود اور جوا' خمر' مردار اور خنزیر کی قیمت' زنا کی اجرت' یا غصب کیا ہوا مال وغیرہ' کیونکہ ان کے صدقہ پر ثواب کی امید رکھنا ان کو حلال سمجھنے پر موقوف ہے اور حرام قطعی کو حلال قرار دینا کفر ہے' العیاذ باللہ! (ردالمحتار ج ۲ ص ۲۶' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

گانے بجانے کی حرمت ظنی ہے' ڈاڑھی مونڈنے کی اجرت' فوٹو گرافی کی اجرت' سینما کی آمدنی' اداکاروں کی آمدنی' رقص کی اجرت' فلم کی وڈیو کیسٹ کے کاروبار کی آمدنی' جان داروں کی تصویریں بنانے والے پینٹرز کی آمدنی' کاہن اور نجومی کی آمدنی وغیرہ ان سب کی آمدنی حرام ظنی ہے' اگر اس مال سے صدقہ کیا جائے اور ثواب کی امید رکھی جائے تو یہ کفر نہیں ہے' لیکن سخت حرام' شدید گناہ کبیرہ اور گمراہی ہے۔

اگر کسی شخص کے پاس رشوت' چوری' سود' غصب یا کسی اور ناجائز ذریعہ سے حاصل کیا ہوا کسی کا مال ہے اور اب وہ خوف خدا سے اس مال کے وبال سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ مال اس شخص کو واپس کر دے' اگر وہ شخص فوت ہو چکا ہو تو اس

کے وارثوں کو وہ مال واپس کر دے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کو یہ بتائے کہ میں نے تم سے یا تمہارے مورث سے یہ مال ناجائز طور پر لیا تھا' اور اگر وہ شخص یا اس کے وارثوں میں سے کسی کا پتا نہ چلے تو اس مال کو اس شخص کی طرف سے صدقہ کر دے اور اپنی اور اس کی مغفرت کی دعا کرے' اور اگر اس نے حکومت کے مال کو ناجائز طریقہ سے حاصل کیا تھا تو وہ مال حکومت کے کسی فنڈ میں داخل کر دے یا سرکاری ریل یا ہوائی جہاز کے ٹکٹ خرید کر ان کو استعمال نہ کرے اور اگر اس کے پاس کسب حرام کا مال ہے' مثلاً سینما کی آمدنی یا رقص اور موسیقی کی آمدنی تو اس تمام مال کو اپنے ذمہ سے بری اور ساقط کرنے کی نیت سے کسی غریب کو خیرات کر دے' اس میں صدقہ کے ثواب کی نیت نہ کرے' بلکہ یہ نیت کرے کہ وہ اپنے فرض سے سبکدوش اور ذمہ سے عہدہ برآ ہو رہا ہے۔

اگر کسی شخص نے کسی فنی مجبوری سے غیر اسلامی ملک میں سود لیا' مثلاً اس نے غیر اسلامی ملک کے بینک میں پیسہ رکھا اور اب اپنے اکاؤنٹ کو اپنے ملک میں ٹرانسفر کراتا ہے اور اس میں سود کی رقم بھی فنی وجہ سے آ گئی تو اس رقم سے نجات کی ایک صورت تو وہ ہے جو اوپر ذکر کی گئی' دوسری صورت یہ ہے کہ کسی غیر مسلم سے قرض لے کر اتنی رقم کسی کار خیر میں صرف کر دے اور پھر اس سود کی رقم سے اس غیر مسلم کا قرض ادا کر دے' لیکن عام حالات میں جان بوجھ کر سود لینا اور پھر کسی غریب کو وہ سود کھلانا جائز نہیں ہے' حدیث میں ہے: سود کھانے والے اور سود کھلانے والے دونوں پر لعنت کی گئی ہے۔

رشوت کا معنی

علامہ سید محمد مرتضیٰ زبیدی رشوت کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کوئی شخص حاکم یا کسی اور کو کچھ چیز دے تاکہ وہ اس کے حق میں فیصلہ کر دے یا حاکم کو اپنی منشاء پوری کرنے پر ابھارے۔

علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں: کچھ پیسے دے کر اپنی حاجت پوری کرانا یہ رشوت ہے۔

علامہ زبیدی لکھتے ہیں کہ رشوت اصل میں رشاء سے ماخوذ ہے اور رشاء اصل میں ڈول کی اس رسی کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کنویں سے پانی نکالا جاتا ہے اور راشی وہ شخص ہے جو کسی باطل چیز کو حاصل کرنے کے لیے کسی کی مدد کرتا ہے اور مرتشی رشوت لینے والے کو کہتے ہیں اور رائش اس شخص کو کہتے ہیں جو راشی اور مرتشی کے درمیان رشوت کا معاملہ طے کراتا ہے' اور جو چیز حق کو حاصل کرنے کے لیے دی جائے یا ظلم کو دور کرنے کے لیے دی جائے وہ رشوت نہیں ہے اور ائمہ تابعین سے منقول ہے کہ اپنی جان اور مال کو ظلم سے بچانے کے لیے رشوت دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(تاج العروس ج ۱۰ ص ۱۵۰' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر' ۱۳۰۶ھ)

قرآن مجید کی روشنی میں رشوت کا حکم

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرہ: ۱۸۸)

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ (بطور رشوت) وہ مال حاکموں تک پہنچاؤ تاکہ تم لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ کے ساتھ کھاؤ حالانکہ تم جانتے ہو (کہ یہ فعل ناجائز ہے)○

اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ (المائدہ: ۴۲)

بہت حرام خور (رشوت کھانے والے)۔

احادیث اور آثار کی روشنی میں رشوت کا حکم

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۱۰ ص ۱۳۹ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

مسروق بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ "سحت" کا کیا معنی ہے؟ انہوں نے کہا: رشوت' پھر سوال کیا کہ فیصلے پر رشوت لینے کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا: یہ کفر ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ (احکام) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ (سنن کبریٰ ج ۱۰ ص ۱۳۹ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

ان احادیث میں فیصلہ کے لیے رشوت دینے اور باطل کام کرانے کے لیے رشوت دینے کو حرام قرار دیا ہے' اور حسب ذیل احادیث اور آثار میں ظلم اور ضرر سے بچنے کے لیے کچھ دینے کو جائز قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ رشوت نہیں ہے۔

علامہ ابوبکر جصاص بیان کرتے ہیں:

روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کا مال غنیمت تقسیم کیا اور بڑے بڑے عطیات دیئے اور عباس بن مرداس کو بھی کچھ مال دیا تو وہ اس پر ناراض ہو گیا اور شعر پڑھنے لگا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (کچھ اور مال دے کر) ہمارے متعلق اس کی زبان بند کر دو' پھر اس کو کچھ اور مال دیا حتیٰ کہ وہ راضی ہو گیا۔

(احکام القرآن ج ۲ ص ۴۳۳ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب وہ حبشہ کی سرزمین پر پہنچے تو ان سے کچھ سامان چھینا گیا۔ انہوں نے اس سامان کو اپنے پاس رکھا اور دو دینار دے دیئے' پھر ان کو چھوڑ دیا گیا۔ (سنن کبریٰ ج ۱۰ ص ۱۳۹ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

وہب بن منبہ بیان کرتے ہیں کہ جس کام میں رشوت دینے والا گنہگار ہوتا ہے یہ وہ نہیں ہے جو اپنی جان اور مال سے ظلم اور ضرر کو دور کرنے کے لیے دی جائے۔ رشوت وہ چیز ہے جس میں دینے والا گنہگار ہوتا ہے بایں طور کہ تم اس چیز کے لیے رشوت دو جس پر تمہارا حق نہیں ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۱۰ ص ۱۳۹ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

رشوت کی اقسام

علامہ قاضی خاں اوزجندی لکھتے ہیں: جب قاضی رشوت دے کر منصب قضاء کو حاصل کرے تو وہ قاضی نہیں ہو گا اور قاضی اور رشوت لینے والے دونوں پر رشوت حرام ہو گی' رشوت کی چار قسمیں ہیں:

(۱) پہلی قسم یہی ہے یعنی منصب قضاء کو حاصل کرنے کے لیے رشوت دینا' اس رشوت کا لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔

(۲) کوئی شخص اپنے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے قاضی کو رشوت دے' یہ رشوت جانبین سے حرام ہے' خواہ وہ فیصلہ حق اور انصاف پر مبنی ہو یا نہ ہو' کیونکہ فیصلہ کرنا قاضی کی ذمہ داری اور فرض ہے (اسی طرح کسی افسر کو اپنا کام کرانے کے لیے رشوت دینا یہ بھی جانبین سے حرام ہے' کیونکہ وہ کام کرنا اس افسر کی ڈیوٹی ہے۔ سعیدی غفرلہ)۔

(۳) اپنی جان اور مال کو ظلم اور ضرر سے بچانے کے لیے رشوت دینا' یہ لینے والے پر حرام ہے دینے والے پر حرام نہیں ہے' اسی طرح اپنے مال کو حاصل کرنے کے لیے بھی رشوت دینا جائز ہے اور لینا حرام ہے۔

(۴) کسی شخص کو اس لیے رشوت دی کہ وہ اس کو بادشاہ یا حاکم تک پہنچا دے تو اس رشوت کا دینا جائز ہے اور لینا حرام ہے۔

(فتاویٰ قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ج ۲ ص ۳۶۳۔ ۳۶۲ مطبوعہ مطبع امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۰ھ)

رشوت کی یہ چار اقسام قاضی خاں کے حوالے سے علامہ ابن ہمام[1] علامہ بدر الدین عینی[2] علامہ زین الدین ابن نجیم[3] اور علامہ ابن عابدین شامی نے بھی بیان کی ہیں۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۳۴۲۔ ۳۴۱ مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ استنبول ۱۳۲۷ھ)

علامہ ابوبکر جصاص نے بھی رشوت کی یہ چار قسمیں بیان کی ہیں۔

(احکام القرآن ج ۲ ص ۴۳۳ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور ۱۴۰۰ھ)

قاضی اور دیگر سرکاری افسروں کے ہدیہ قبول کرنے کی تحقیق

شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں کہ قاضی ہدیہ اور تحفہ کو قبول نہ کرے ہر چند کہ شریعت میں ہدیہ قبول کرنا مستحب ہے' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک دوسرے کو ہدیہ دو اور ایک دوسرے سے محبت کرو' لیکن ہدیہ لینے کا یہ جواز اس شخص کے لیے ہے جو مسلمانوں کے اعمال میں سے کسی عمل کے لیے متعین نہ ہو اور جو شخص کسی عمل کے لیے متعین ہو گیا' جیسے قاضی اور حاکم وغیرہ ان پر لازم ہے کہ یہ کسی سے ہدیہ قبول نہ کریں' خصوصاً اس شخص سے جو اس منصب پر مقرر ہونے سے پہلے انہیں ہدیہ نہ دیتا ہو' کیونکہ ہدیہ دینے والا کسی کام یا قضاء کو اپنے حق میں کرنے کے لیے ہدیہ دیتا ہے اور یہ بھی رشوت اور سحت کی ایک قسم ہے اور اس کی اصل یہ حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن اللتبیہ کو مسلمانوں سے صدقات وصول کرنے کے لیے مقرر فرمایا' جب وہ صدقات لے کر آیا تو کہنے لگا کہ یہ تمہارا مال ہے اور یہ مجھے لوگوں نے ہدیہ دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا: ان لوگوں کا کیا حال ہے جن کو ہم کسی جگہ کا عامل بنا کر بھیجتے ہیں اور وہ واپس آ کر یہ کہتے ہیں کہ یہ تمہارا مال ہے اور یہ ہمیں ہدیہ ملا ہے' یہ لوگ اپنی ماں کے گھر میں کیوں نہ بیٹھ گئے' پھر یہ دیکھا جاتا کہ ان کو کوئی ہدیہ دیتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو کسی جگہ کا عامل بنایا' ان کے پاس کافی مال جمع ہو گیا۔ حضرت عمر نے ان سے پوچھا: تمہارے پاس یہ مال کہاں سے آیا؟ انہوں نے کہا: گھوڑوں کی نسل بڑھی اور لوگوں نے تحفے دیئے۔ حضرت عمر نے فرمایا: اے اللہ کے دشمن! تم اپنے گھر میں کیوں نہ بیٹھ گئے' پھر ہم دیکھتے کہ تم کو کوئی ہدیہ دیتا ہے یا نہیں؟ اور وہ مال بیت المال میں داخل کر لیا' اس حدیث اور اثر سے یہ معلوم ہوا کہ جب کسی شخص کو کسی منصب کی جہت سے کوئی ہدیہ ملے تو وہ رشوت ہے' لہٰذا جو لوگ قاضی کو منصب قضاء پر فائز ہونے سے پہلے تحفے دیتے تھے ان کے سوا اور کسی شخص سے قاضی کو ہدیہ اور تحفہ قبول کرنا جائز نہیں ہے۔ (المبسوط ج ۱۶ ص ۸۲ مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' الطبعۃ الثالثۃ' ۱۳۹۸ھ)

جھوٹی گواہی سے حکم رد ہوتا ہے یا نہیں؟

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میرے پاس مقدمات لے کر آتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے موقف کو دوسرے کی بہ نسبت زیادہ دلائل کے ساتھ پیش کرے اور اس سماعت کے اعتبار سے میں (بالفرض) اس کے حق میں فیصلہ کر دوں' سو جس شخص کو میں اس کے بھائی کا حق دے دوں وہ اس کو نہ لے کیونکہ میں اس کو آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۷۴ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

---

[1] علامہ کمال الدین ابن ہمام حنفی متوفی ۸۶۱ھ' فتح القدیر ج ۶ ص ۳۸۵ مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر

[2] علامہ محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ' بنایہ شرح ہدایہ الجزء الثالث ص ۳۴۹ مطبوعہ ملک سنز' فیصل آباد

[3] علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی متوفی ۹۷۰ھ' البحر الرائق ج ۶ ص ۲۶۲۔ ۲۶۱ مطبوعہ مطبعہ علمیہ' مصر' ۱۳۱۱ھ

علامہ یحییٰ بن شرف نووی لکھتے ہیں: صحابہ کرام' فقہاء تابعین' امام شافعی' امام احمد اور جمہور فقہاء اسلام کا یہ نظریہ ہے کہ حاکم کا حکم باطن میں کسی چیز کو حلال کرتا ہے نہ حرام کرتا ہے' لہٰذا جب دو جھوٹے گواہ کسی کے حق میں مال کی گواہی دیں اور حاکم اس گواہی کی بناء پر مدعی کے حق میں مال کا فیصلہ کر دے تو مدعی کے لیے اس مال کو لینا جائز نہیں ہے اور اگر دو جھوٹے گواہ کسی شخص کے خلاف یہ گواہی دیں کہ اس شخص نے فلاں شخص کو قتل کیا ہے تو اگر مقتول کے ولی کو یہ علم ہو کہ یہ گواہ جھوٹے ہیں تو اس کے لیے ملزم کو قتل کرنا جائز نہیں ہے' اور اگر دو شخص کسی کے خلاف یہ جھوٹی گواہی دیں کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے اور قاضی نے اس گواہی کی بناء پر تفریق کر دی ہے تو جس شخص کو علم ہو کہ یہ گواہی جھوٹی ہے اس کے لیے اس عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے' اور امام ابوحنیفہ یہ کہتے ہیں کہ قاضی کے حکم سے عورت تو حلال ہو جاتی ہے مال حلال نہیں ہوتا' لہٰذا ان کے نزدیک اس صورت میں نکاح جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ کا یہ قول اس حدیث صحیح اور اجماع متقدمین کے خلاف ہے' اسی طرح ان کا یہ قول خود ان کے اور جمہور کے اس قاعدہ کے بھی خلاف ہے کہ عورت سے وطی کے معاملہ میں نکاح کی بہ نسبت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۷۵۔ ۷۴' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

علامہ ابوعبداللہ وشتانی مالکی لکھتے ہیں: علامہ مازری مالکی نے کہا ہے کہ ہمارا مذہب یہ ہے کہ جان' مال اور عورت اگر حرام ہو تو وہ قاضی کے حکم سے حلال نہیں ہوگی اور امام ابوحنیفہ نے یہ کہا ہے کہ قاضی کے حکم سے عورت حلال ہو جاتی ہے' پس اگر دو گواہ کسی شخص کے خلاف یہ جھوٹی گواہی دیں کہ اس شخص نے اپنی عورت کو طلاق دے دی تو جس شخص کو یہ علم ہو کہ انہوں نے جھوٹی گواہی دی ہے اس کے لیے بھی اس عورت سے نکاح کرنا حلال ہے۔ اس قول کی وجہ سے امام ابوحنیفہ پر لے دے کی گئی کہ انہوں نے مال کی حفاظت کی اور عورت کی حفاظت نہیں کی' حالانکہ عورت کی حفاظت مقدم ہے' ہمارے اصحاب نے اس حدیث کے عموم سے استدلال کیا ہے۔ (اکمال اکمال المعلم ج ۵ ص ۸' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت)

قضاء کے ظاہراً اور باطناً نافذ ہونے میں فقہاء احناف کا موقف

علامہ علاؤ الدین حصکفی حنفی نے اس سلسلہ میں فقہاء احناف کا موقف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جھوٹے گواہوں سے ظاہراً اور باطناً قضاء نافذ ہو جاتی ہے' بشرطیکہ محل اس حکم کا قابل ہو (یعنی محارم میں سے کسی پر دعویٰ نہ ہو) اور قاضی کو گواہوں کے جھوٹے ہونے کا علم نہ ہو' یہ قضاء عقود (مثلاً بیع اور نکاح) اور فسوخ (مثلاً اقالہ اور طلاق) دونوں میں نافذ ہو جاتی ہے' کیونکہ حضرت علی نے اس عورت سے فرمایا تھا کہ تمہارے گواہوں نے تمہارا نکاح کر دیا' اور امام ابویوسف' امام محمد' امام زفر اور ائمہ ثلاثہ یہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں صرف ظاہراً قضاء نافذ ہوتی ہے' اور اسی قول پر فتویٰ ہے۔

(درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۴ ص ۳۶۳' مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ' استنبول' ۱۳۲۷ھ)

علامہ شامی لکھتے ہیں کہ امام طحاوی نے نقل کیا ہے کہ امام محمد کا قول بھی امام ابوحنیفہ کی طرح ہے' نیز علامہ شامی بیان کرتے ہیں کہ "قہستانی" اور "البحر الرائق" میں حقائق اور ابواللیث سے منقول ہے کہ فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے' لیکن "فتح القدیر" میں ہے کہ امام اعظم کا قول ہی معتبر ہے اور علامہ قاسم نے بھی اسی کی تائید کی اور عام متون میں بھی امام اعظم کا قول مذکور ہے۔

(ردالمحتار ج ۴ ص ۳۶۳' مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ' استنبول' ۱۳۲۷ھ)

جن صورتوں میں فقہاء احناف کے نزدیک قضاء ظاہراً اور باطناً نافذ ہو جاتی ہے

علامہ شامی نے جھوٹی گواہی کی بناء پر عقود اور فسوخ میں قاضی کے حکم کی حسب ذیل مثالیں بیان کی ہیں:

(۱) ایک باندی نے کسی شخص پر یہ دعویٰ کیا کہ اس شخص نے اس باندی کو اتنے روپوں میں خریدا ہے' اس شخص نے اس دعویٰ کا

انکار کیا، قاضی نے اس کو قسم کھانے کا حکم دیا اس نے قسم کھانے سے انکار کیا اور قاضی نے اس انکار کی بناء پر اس شخص کے خلاف فیصلہ کر دیا تو اب وہ باندی اس شخص پر دیانۃً اور قضاءً دونوں طرح حلال ہے۔

(۲) ایک شخص نے کسی عورت پر نکاح کا دعویٰ کیا اور اس کے ثبوت میں دو جھوٹے گواہ پیش کر دیئے' قاضی نے مدعی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔

(۳) ایک عورت نے کسی شخص پر نکاح کا دعویٰ کیا اور اس کے ثبوت میں دو جھوٹے گواہ پیش کر دیئے اور قاضی نے مدعیہ کے حق میں فیصلہ کر دیا تو ان دونوں صورتوں میں مرد کے لیے عورت سے وطی کرنا اور عورت کا اس کو وطی کا موقع دینا جائز ہے۔

(۴) ایک عورت نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کے شوہر نے اس کو تین طلاقیں دے دی ہیں' شوہر منکر ہے' عورت نے دو جھوٹے گواہ پیش کر دیئے اور قاضی نے اس جھوٹی گواہی کے پیش نظر ان کے درمیان تفریق کا فیصلہ کر دیا اور عدت گزر جانے کے بعد عورت نے کسی اور شخص سے نکاح کر لیا تو اس دوسرے شخص کو اس عورت سے وطی کرنا جائز ہے خواہ اس کو گواہوں کے جھوٹے ہونے کا علم ہو اور گواہوں میں سے کوئی ایک اس سے نکاح کر سکتا ہے اور وطی بھی کر سکتا ہے' اور پہلا شوہر اب وطی نہیں کر سکتا نہ عورت اس کو وطی کا موقع فراہم کر سکتی ہے۔

(۵) ایک باندی یہ دعویٰ کرے کہ اس کے مالک نے اس کو آزاد کر دیا ہے اور مالک منکر ہو' باندی اس پر دو گواہ پیش کر دے اور قاضی اس کے آزاد ہونے کا فیصلہ کر دے تو اب وہ باندی کسی شخص سے نکاح کر سکتی ہے اور اس شخص کا اس باندی سے وطی کرنا اور باندی کا اس کو وطی کا موقع فراہم کرنا جائز ہے خواہ اس شخص کو علم ہو کہ گواہ جھوٹے تھے۔

(۶) ایک شخص نے کسی مکان کے بارے میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس مالک نے اس کو وقف کر دیا تھا' مالک منکر ہے' اس شخص نے اس وقف پر دو جھوٹے گواہ پیش کر دیئے اور قاضی نے فیصلہ کر دیا تو مدعی کا اس جگہ پر وقف کے احکام لاگو کرنا صحیح ہے۔

(۷) کسی شئے کو کرایہ پر حاصل کرنے کا دعویٰ کیا اور اس پر دو جھوٹے گواہ پیش کر دیئے اور قاضی نے مدعی کے حق میں فیصلہ کر دیا تو مدعی کے لیے اس شے میں تصرف کرنا جائز ہے۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۳۹۳۔ ۳۹۲' مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ' استنبول' ۱۳۲۷ھ)

فقہاء احناف کے نزدیک قضاء کے ظاہراً اور باطناً نافذ ہونے کی شرائط

فقہاء احناف کے نزدیک قضاء کے ظاہراً اور باطناً نافذ ہونے کی حسب ذیل شرائط ہیں:

(۱) قاضی کو یہ علم نہ ہو کہ یہ گواہ جھوٹے ہیں۔

(۲) مدعی نے ملک مطلق کا دعویٰ نہ کیا ہو بلکہ ملکیت کا سبب بھی بیان کیا ہو' قرض کا بھی یہی حکم ہے' اگر کسی شخص پر مطلقاً قرض کا دعویٰ کیا تو باطناً قضا نافذ نہیں ہوگی جب تک کہ یہ نہ بتائے کہ اس پر فلاں سبب سے قرض ہے' کسی شخص پر وراثت کے دعویٰ کرنے کا بھی یہی حکم ہے' اس میں بھی باطناً قضا نافذ نہیں ہوگی۔

(۳) مدعی نے جس چیز پر دعویٰ کیا ہے وہ اس کے دعویٰ کا محل بننے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو' اگر اس میں اس کے دعویٰ کی صلاحیت نہیں ہے تو اس میں باطناً قضا نافذ نہیں ہوگی' مثلاً منکوحہ غیر یا معتدہ غیر کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ وہ اس کی بیوی ہے اور اس پر دو جھوٹے گواہ پیش کر دیئے تو اس میں ظاہراً قضاء نافذ ہوگی نہ باطناً' مرتدہ اور دیگر محارم کا بھی یہی حکم ہے۔

(۴) مدعی کا دعویٰ اس چیز کے متعلق ہو جس میں انشاء ممکن ہو' انشاء سے مراد ان کلمات کو بولنا ہے جن سے کسی چیز کو واقع کیا

جائے' مثلاً ''میں نے یہ چیز خریدی'' کہہ کر بیع کو واقع کیا جیسے عقد بیع' فسخ بیع' نکاح اور طلاق' اور جس چیز میں انشاء ممکن نہ ہو اس میں باطناً قضاء نافذ نہیں ہو گی جیسے وراثت' کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں اور اس پر دو جھوٹے گواہ پیش کر دے۔

(۵) قاضی یہ فیصلہ منکر کی قسم پر نہ کرے' اگر قاضی نے منکر کی قسم پر فیصلہ کر دیا تو یہ قضا باطناً نافذ نہیں ہو گی' مثلاً ایک عورت نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کے شوہر نے اس کو تین طلاقیں دے دی ہیں' اس کے پاس گواہ نہیں ہیں' قاضی نے شوہر سے قسم طلب کی' شوہر نے جھوٹی قسم کھائی تو اگر عورت کو یہ علم ہے کہ شوہر تین طلاقیں دے چکا ہے تو اس عورت کے لیے اس کو وطی کا موقع دینا جائز نہیں ہے اور مرد کے لیے بھی اس عورت سے وطی کرنا جائز نہیں ہے' کیونکہ اس صورت میں انشاء نکاح نہیں ہے بلکہ جو نکاح پہلے سے قائم تھا قاضی نے اس کے برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے اس وجہ سے یہاں باطناً قضاء نافذ نہیں ہو گی' خلاصہ یہ ہے کہ باطناً قضاء اس وقت نافذ ہوتی ہے جب وہ قضاء گواہی کی بناء پر ہو یا انکار قسم کی بناء پر ہو اور وہ فیصلہ کسی عقد یا فسخ کے انشاء پر مبنی ہو اور محل انشاء بننے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

(۶) جن گواہوں کی بنیاد پر قاضی نے فیصلہ کیا ہے وہ مسلمان' آزاد اور عادل ہوں اگر وہ گواہ کافر' غلام یا محدود فی القذف ہوئے تو باطناً قضاء نافذ نہیں ہو گی۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۳۶۳۔ ۳۶۲' مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ استنبول' ۱۳۲۷ھ)

قضاء باطنی کے نفاذ میں فقہاء احناف کے دلائل اور ائمہ ثلاثہ کے دلائل کا تجزیہ

شمس الائمہ سرخسی حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: امام ابوحنیفہ کے نزدیک عقود' فسوخ' نکاح' طلاق اور عتاق میں جھوٹے گواہوں سے بھی قاضی کا فیصلہ ظاہراً اور باطناً نافذ ہو جاتا ہے' پہلے امام ابو یوسف کی بھی یہی رائے تھی۔ امام ابو یوسف کے دوسرے قول اور امام محمد اور امام شافعی کے نزدیک ان صورتوں میں قاضی کا فیصلہ صرف ظاہراً نافذ ہوتا ہے باطناً نافذ نہیں ہوتا' حتیٰ کہ جب کسی شخص نے ایک عورت پر نکاح کا دعویٰ کیا اور نکاح کے ثبوت میں دو جھوٹے گواہ پیش کر دیئے اور قاضی نے نکاح کا فیصلہ کر دیا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس شخص کے لیے اس عورت سے وطی کرنا جائز ہے' امام ابو یوسف کا پہلا قول بھی یہی تھا' البتہ امام ابو یوسف کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس شخص کے لیے اس عورت سے وطی کرنا جائز نہیں ہے' امام محمد اور امام شافعی کا بھی یہی قول ہے۔

ائمہ ثلاثہ کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ (البقرہ: ۱۸۸)	اور ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق نہ کھاؤ' اور نہ (بطور رشوت) وہ مال حکام تک پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ تم گناہ کے ساتھ (ناجائز طریقہ پر) کھاؤ' حالانکہ تم جانتے ہو ○

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حاکم کے فیصلہ سے مال غیر کے ناجائز طریقہ سے کھانے کو حرام کر دیا ہے' لہٰذا یہ اس پر نص صریح ہے کہ اگر قاضی نے جھوٹے گواہوں کی بناء پر کسی چیز کا فیصلہ کر دیا تو اس چیز کا لینا ناجائز ہو گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے: تم میرے پاس مقدمات لے کر آتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے موقف کو دوسرے کی بہ نسبت زیادہ چرب زبانی اور طلاقت لسانی سے پیش کرے' پس اگر میں (ظاہری حجت کی بناء پر) کسی شخص کے لیے اس کے بھائی کے حق کا فیصلہ کر دوں تو میں (درحقیقت) اس کے لیے آگ کے ایک ٹکڑے کا فیصلہ کر رہا ہوں' وہ چاہے

اس کو لے یا چھوڑ دے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس فیصلہ کی بناء ایک سبب باطل پر ہے اس لیے یہ فیصلہ باطنا نافذ نہیں ہوگا' جس طرح قاضی' غلام' کافر یا محدود فی القذف کی گواہی پر فیصلہ کرے تو اس کا فیصلہ باطنا نافذ نہیں ہوتا' اور اس فیصلہ کی بناء جھوٹی گواہی پر ہے اور یہ ایک باطل سبب ہے کیونکہ جھوٹی گواہی گناہ کبیرہ ہے اور قضا کی حجت ایک امر شرعی ہے اور گناہ کبیرہ اس کی ضد ہے اور جب جھوٹ کی تہمت کی وجہ سے گواہی مقبول نہیں ہوتی اور وہ گواہی فیصلے کی حجت نہیں بن سکتی تو حقیقتاً جھوٹی گواہی بدرجہ اولیٰ نامعتبر ہوگی' نیز قاضی نے جس چیز کا فیصلہ کیا ہے اس کا واقع میں کوئی وجود نہیں ہے' لہٰذا یہ قضا باطل ہوگی جیسا کہ اگر قاضی جھوٹے گواہوں کی بناء پر کسی کے لیے منکوحہ غیر کا فیصلہ کردے تو وہ فیصلہ باطل ہوتا ہے' نیز اس فیصلہ کو انشاء عقد قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے' کیونکہ قاضی انشاء عقد کا قصد نہیں کرتا' بلکہ مدعی نے جس عقد کا دعویٰ کیا تھا قاضی اس کو ثابت کرتا ہے۔

امام ابوحنیفہ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عدالت میں ایک شخص نے ایک عورت پر نکاح کا دعویٰ کیا اور اس کے ثبوت میں دو گواہ پیش کر دیئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے درمیان نکاح کا فیصلہ کر دیا' اس عورت نے کہا: اے امیر المؤمنین! اگر اس نکاح کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے تو پھر آپ میرا اس سے نکاح کر دیجئے' کیونکہ ہمارے درمیان نکاح نہیں ہے' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہارے گواہوں نے تمہارا نکاح کر دیا۔ دیکھئے اس عورت نے زنا سے بچنے کے لیے عقد نکاح کا مطالبہ کیا' لیکن حضرت علی نے اس کا مطالبہ پورا نہیں کیا' ہوسکتا ہے کہ کوئی یہ کہے کہ حضرت علی نے ان کے درمیان نکاح کا مطالبہ اس لیے پورا نہیں کیا کہ اس کا خاوند راضی نہیں تھا لیکن یہ غلط خیال ہے کیونکہ اس کا خاوند نکاح پر راضی تھا' اسی وجہ سے وہ نکاح کا دعویٰ کر رہا تھا اور عورت بھی راضی تھی' کیونکہ اس نے کہا تھا کہ میرا اس سے نکاح کر دیجئے اور حضرت علی کے لیے ان کا نکاح کرنا آسان تھا کیونکہ خاوند کو اس میں رغبت تھی' اس کے باوجود حضرت علی نے یہ نکاح نہیں کیا' بلکہ یہ بیان فرمایا کہ ان کے فیصلہ سے ان کا مقصود حاصل ہو گیا' اور یہ فرمایا کہ تمہارے گواہوں نے تمہارا نکاح کر دیا یعنی ان گواہوں نے تمہارے درمیان نکاح کا فیصلہ مجھ پر لازم کر دیا' لہٰذا اس فیصلہ سے نکاح ثابت ہو گیا اور حضرت علی کا یہ اثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مرفوع کے حکم میں ہے' کیونکہ اس حکم کو عقل اور قیاس سے جاننا ممکن نہ تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس اثر سے یہ واضح ہو گیا کہ قرآن مجید کی آیت (ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ) اور حدیث "اگر میں (ظاہری حجت) کی بناء پر کسی شخص کے لیے اس کے بھائی کے حق کا فیصلہ کر دوں تو میں اس کے لیے آگ کے ٹکڑے کا فیصلہ کر رہا ہوں' املاک مرسلہ (سبب ملکیت بتائے بغیر کسی چیز پر ملکیت کا دعویٰ کرنا) کے بارے میں وارد ہے اور امام ابوحنیفہ اس کے قائل ہیں اور اس کی علت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن معاملات میں قاضی کو انشاء کی ولایت دی ہے' قاضی نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان معاملات میں فیصلہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ فیصلہ حقیقتاً نافذ ہوگا' کیونکہ یہ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ قاضی کو فیصلہ کرنے کا حکم دے' پھر اس فیصلہ کے نفاذ کو روک دے۔ قاضی اس بات کا مکلف تھا کہ علی الاعلان اور خفیہ طریقہ سے گواہوں کی عدالت کے بارے میں معلومات حاصل کرے اور جب اس نے تزکیہ شہود کر لیا اور اس کے نزدیک گواہوں کی عدالت ثابت ہو گئی تو اس گواہی کے مطابق اس پر فیصلہ کرنا واجب ہے' حتیٰ کہ اگر اس نے یہ فیصلہ نہیں کیا تو وہ گنہگار ہوگا اور اس کو اس کے عہدہ سے معزول کر دیا جائے گا' اس لیے ہم کو یہ معلوم ہو گیا کہ قاضی فیصلہ کرنے پر مامور ہے اور حقیقت میں کسی گواہ کے صدق یا کذب کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور جس چیز کی حقیقت کو جاننے کا کوئی شرعی طریقہ نہ ہو قاضی اس کے جاننے کا شرعاً مکلف بھی نہیں ہے' کیونکہ انسان کو اس کی وسعت اور طاقت کے اعتبار سے مکلف کیا جاتا ہے اور

قاضی کی وسعت میں صرف اتنا ہی تھا کہ وہ گواہوں کے احوال کی جانچ پڑتال کرے اور جب اس نے اچھی طرح تزکیہ شہود کر لیا تو وہ اپنے عہدہ سے بری الذمہ ہو گیا اور اس پر لازم ہو گیا کہ وہ گواہوں کی گواہی کے اعتبار سے فیصلہ کر دے' اور قاضی کے فیصلہ پر ظاہراً اور باطناً عمل کرنا واجب ہے ورنہ قاضی کو قضاء پر مامور کرنا عبث ہوگا' اور اس صورت میں قضاء کے دو طریقے تھے: ایک نکاح کا اظہار کرنا' دوسرا عقدِ نکاح کر دینا' اور جب ان کے درمیان عقد نکاح نہیں تھا تو اس فیصلہ سے نکاح کا اظہار کرنا متعذر ہے' اس لیے اب انشاء نکاح متعین ہو گیا' کیونکہ اور کوئی طریقہ نہیں ہے' لہٰذا دلیل شرعی کی اس نوع سے قاضی کے لیے ولایت انشاء ثابت ہوگی اور جس طرح اور نزاعی معاملات میں قاضی کی ولایت انشاء سے فیصلہ نافذ العمل ہوتا ہے اس صورت میں بھی قاضی کا فیصلہ نافذ العمل ہوگا بلکہ یہاں زیادہ اولیٰ ہے۔

کیا یہ نہیں دیکھتے کہ جب شوہر اور بیوی آپس میں لعان کرتے ہیں تو قاضی کو انشاء تفریق کی ولایت حاصل ہوتی ہے اور وہ اسی اختیار سے زوجین کے درمیان تفریق کر دیتا ہے' اسی طرح قاضی ولایت انشاء تزویج سے نابالغ بچہ اور نابالغ بچی کا نکاح کر دیتا ہے' لہٰذا اس صورت میں بھی اس کو ولایت انعقاد عقد نکاح حاصل ہے تاکہ وہ عورت کو زنا سے محفوظ رکھ سکے اور قاضی کا یہ فیصلہ عورت کو زنا کا موقع دینے سے بچاتا ہے۔ جب دو فریق لعان کرتے ہیں تو ایک فریق یقیناً کاذب ہوتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ یہ جانتا ہے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے اور باوجود اس حقیقت کے کہ ان میں سے کوئی ایک کاذب ہے اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے قاضی کو ولایت انشاء تفریق حاصل ہوتی ہے اور قاضی ان کے درمیان تفریق کر دیتا ہے' اسی طرح یہاں بھی گواہوں کے جھوٹے ہونے کے باوجود قاضی کو انشاء نکاح کی ولایت حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہ شرعاً قضاء کرنے پر مامور ہے۔ (المبسوط ج ۱۶ ص ۱۸۳۔ ۱۸۰' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں: حضرت علی' حضرت ابن عمر' اور امام شعبی کا بھی اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کی طرح موقف ہے' امام ابو یوسف نے عمرو بن مقدام سے روایت کیا ہے کہ ایک قبیلہ کے ایک شخص نے ایک ایسی عورت کو نکاح کا پیغام دیا' جو شرف اور مرتبہ میں اس سے زیادہ تھی' اس عورت نے اس شخص سے نکاح کرنے سے انکار کر دیا' اس شخص نے یہ دعویٰ کر دیا کہ اس کا عورت سے نکاح ہو چکا ہے اور حضرت علی کی عدالت میں اس پر دو گواہ پیش کر دیئے۔ اس عورت نے کہا: میرا اس شخص سے نکاح نہیں ہوا' حضرت علی نے فرمایا: ان دو گواہوں نے تمہارا نکاح کر دیا' امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ شعبہ بن حجاج' زید سے روایت کرتے ہیں کہ دو آدمیوں نے ایک شخص کے خلاف جھوٹی گواہی دی کہ اس نے اپنی عورت کو طلاق دے دی ہے' قاضی نے ان کے درمیان تفریق کر دی' پھر ان گواہوں میں سے ایک شخص نے اس عورت سے نکاح کر لیا' شعبی نے کہا: یہ جائز ہے اور حضرت ابن عمر نے ایک غلام کو عیب سے مبرا قرار دے کر فروخت کر دیا' خریدار اس غلام کو حضرت عثمان کی عدالت میں لے گیا' حضرت عثمان نے حضرت ابن عمر سے کہا: کیا تم اللہ کی قسم کھا کر یہ کہہ سکتے ہو کہ جب تم نے اس کو فروخت کیا تھا تو تم نے اس کی بیماری کو نہیں چھپایا تھا' حضرت ابن عمر نے قسم کھانے سے انکار کیا' حضرت عثمان نے وہ غلام ان کو واپس کر دیا اور بعد میں حضرت ابن عمر نے وہ غلام زیادہ نفع کے ساتھ فروخت کر دیا' اس مسئلہ میں حضرت ابن عمر نے غلام کی بیع کو جائز قرار دیا حالانکہ ان کو علم تھا کہ باطن میں ایسا نہیں ہے اور باطن کا حکم ظاہر کے خلاف ہے (کیونکہ انہوں نے بری الذمہ ہو کر غلام کو فروخت کیا تھا' اس وجہ سے باطن میں اس غلام کو واپس کرنا صحیح نہیں تھا) اگر حضرت عثمان کو بھی حضرت ابن عمر کی طرح اس بات کا علم ہوتا تو وہ بیع کو رد نہ کرتے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عمر کا بھی یہ مذہب تھا کہ اگر حاکم عقد کو فسخ کر دے تو وہ بائع کی ملک میں آ جاتا ہے' اگرچہ باطن میں حقیقت اس کے برعکس ہو۔

امام ابوحنیفہ کے قول کی صحت پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت بھی دلیل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلال بن امیہ اور اس کی بیوی کے درمیان لعان کرایا' پھر فرمایا: اگر اس عورت کے ہاں اس طرح کا بچہ ہوا تو وہ ہلال بن امیہ کا ہے اور اگر دوسری شکل وصورت کا ہوا تو وہ شریک بن سمحاء کا ہوگا جس کے ساتھ ہلال بن امیہ کی بیوی کو متہم کیا گیا تھا' پھر اس عورت کے ہاں ناپسندیدہ صورت پر بچہ پیدا ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ان کے درمیان لعان نہ ہو چکا ہوتا تو پھر میں اس عورت کو دیکھتا! ہلال بن امیہ کا صدق اور اس کی بیوی کا کذب ظاہر ہو گیا' اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تفریق کو باطل نہیں کیا جو لعان کی وجہ سے ہوئی تھی اور یہ اس کی دلیل ہے کہ حاکم جب کسی عقد کو فسخ کر دے تو وہ ظاہراً اور باطناً نافذ ہو جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہ کے اس قول پر اس سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ جب حاکم کے پاس ایسے گواہ گواہی دیں جن کا ظاہری حال صدق ہو تو حاکم پر واجب ہے کہ ان کی گواہی کے اعتبار سے فیصلہ کرے اور اگر اس نے گواہی کے بعد فیصلہ کرنے میں توقف کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا تارک اور گنہ گار ہوگا کیونکہ اس کو ظاہر کا مکلف کیا گیا ہے اور اس کو اس علم باطن کا مکلف نہیں کیا گیا جو اللہ تعالیٰ کا غیب ہے۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۲۵۳' مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور' ۱۴۰۰ھ)

علامہ بابرتی حنفی اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جو چیز پہلے ثابت ہو اس کا اظہار قضاء ہوتا ہے اور جو چیز پہلے نہ ہو اس کا اثبات قضاء نہیں ہوتا اور نکاح پہلے ثابت نہیں تھا تو پھر کس طرح قضاء باطناً نافذ ہوگی' اس کا جواب یہ ہے کہ نکاح بہ طریقہ اقتضاء مقدم ہے گویا کہ قاضی نے اس عورت سے کہا: میں نے اس شخص سے تیرا نکاح کر دیا اور تم دونوں کے درمیان نکاح کا حکم کر دیا تا کہ ان کے درمیان نزاع نہ رہے اور وہ شخص اس عورت کے ساتھ وطی کر سکے۔ بعض علماء نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ نزاع ختم کرنے کے لیے یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ قاضی اس شخص سے کہتا کہ تم اس عورت کو طلاق دے دو' اس کا جواب یہ ہے کہ طلاق سے کیا مراد ہے' طلاق مشروع یا طلاق غیر مشروع؟ طلاق غیر مشروع کا تو کوئی اعتبار نہیں ہے اور طلاق مشروع اس کی مقتضی ہے کہ اس سے پہلے نکاح ثابت ہونا چاہیے' لہٰذا ہر حال میں نکاح کا قول کرنا پڑے گا۔ (عنایہ علی هامش فتح القدیر ج ۳ ص ۱۵۴' مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ

لوگ آپ سے ہلال (پہلی تاریخ کے چاند) کے متعلق دریافت کرتے ہیں' آپ کہیے: یہ لوگوں کے (دینی اور دنیاوی کاموں) اور حج

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ

کے اوقات کی نشانیاں ہیں' اور یہ کوئی نیکی کا کام نہیں کہ تم گھروں میں پیچھے سے داخل ہو' لیکن (حقیقت میں) نیکی اس شخص

مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ

کی ہے جو تقویٰ اختیار کرے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو' اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم

تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ

کامیابی حاصل کرو ○ اور اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے

وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (۱۹۰)

تجاوز نہ کرو' بے شک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا O

اسلامی تقویم کا بیان

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے روزوں کے مہینہ اور روزوں کے دن اور رات کے احکام بیان فرمائے' اسلام کے بہت سے احکام ھلال کے طلوع پر موقوف ہیں مثلاً قربانی اور حج' عید الفطر اور رمضان' عدت وفات کی گنتی ۴ ماہ ۱۰ دن اور جس کے حیض کی مدت تین ماہ ہو اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے ایک سال کا تعین' ایلاء کے لیے ۴ ماہ کا تعین' کفارہ کے روزوں کے لیے ۲ ماہ کا تعین ان تمام امور میں مدت کا تعین ھلال کے طلوع سے ہوتا ہے' یہ تو دین کے احکام ہیں اور دنیا کے احکام ہیں مثلاً ۴ ماہ بعد کسی نے قرض کی ادائیگی کرنی ہو یا اسی طرح کا کوئی اور معاملہ ہو تو وہ چاند پر موقوف ہے۔ لوگ آپ سے چاند کے گھٹنے' بڑھنے کی کیفیت اور اس کی ماہیت کے متعلق سوال کرتے تھے کہ کیا وجہ ہے کہ چاند کبھی ایک باریک لکیر کی طرح نظر آتا ہے' کبھی موٹی لکیر کی طرح' کبھی آدھا اور کبھی پورا چاند نظر آتا ہے' اللہ تعالیٰ نے یہ جواب دیا کہ اس میں تمہارے دین اور دنیا کے کاموں اور خصوصاً حج کے اوقات کی نشانیاں ہیں اور اس جواب سے اس امر پر متنبہ کیا کہ چاند کے گھٹنے' بڑھنے سے تمہارے دینی اور دنیاوی کاموں کی جو غرض متعلق ہوتی ہے تمہیں صرف اس سے سروکار رکھنا چاہیے' باقی رہا چاند کا کبھی آدھا اور کبھی پورا نظر آنا' تو اس کا تعلق علم ہیئت' علم نجوم اور علم الافلاک سے ہے اور نبی کا منصب احکام شرعیہ بیان کرنا ہے' علم توقیت کے احکام بیان کرنا نبی کا منصب نہیں ہے۔

تاہم اس سے یہ سمجھنا غلط ہے کہ قمری تقویم اسلامی ہے اور شمسی تقویم غیر اسلامی ہے۔ چاند اور سورج دونوں اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور دونوں کی گردش بھی اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق ہے' بعض عبادات چاند کی گردش کے حساب سے ہیں' جیسے حج' رمضان اور عیدین اور بعض عبادات سورج کی گردش کے حساب سے مربوط ہیں' جیسے ہر روز کی پانچ نمازیں' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ (بنو اسرائیل: ۱۲)

اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے' پھر ہم نے رات کی نشانی کو مٹایا اور دن کی نشانی کو دیکھنے کا ذریعہ بنا دیا تاکہ تم اپنے رب کے فضل کو (روزی کو) حاصل کر سکو اور تم برسوں کی گنتی اور (دوسرے) حساب کو جان سکو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شمسی تقویم کو بھی برسوں کی گنتی اور حساب کا معیار قرار دیا ہے' اس لیے اگر ہفتہ وار اجرت اور ماہانہ تنخواہ کا حساب شمسی تقویم سے کیا جائے تو وہ بھی اسلام کے مطابق ہے' اسی طرح بیع وشراء اور دوسرے کاروباری معاملات کو شمسی تقویم سے حاصل کرنا جائز ہے اور غیر اسلامی نہیں ہے۔

اپنی طرف سے عبادت کے طریقے مقرر کرنے کی مذمت

جس طرح چاند کے گھٹنے' بڑھنے کی علت کو دریافت کرنا کوئی نیکی نہیں تھی' اسی طرح حج کے موقع پر گھروں میں پیچھے سے داخل ہونا بھی کوئی نیکی نہیں ہے' امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت براء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انصار جب حج کر کے لوٹتے تو گھروں میں دروازوں سے داخل نہیں ہوتے

تھے بلکہ پیچھے سے داخل ہوتے تھے' ایک انصاری حج کے بعد گھر میں دروازہ سے داخل ہوا تو لوگوں نے اس کو ملامت کی' تب یہ آیت نازل ہوئی کہ گھروں میں پیچھے سے داخل ہونا کوئی نیکی نہیں ہے' حقیقت میں نیکی خوف خدا سے گناہوں کو ترک کرنا ہے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۱۰۸' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اس سے معلوم ہوا کہ اپنی عقل سے عبادت کے طور طریقے وضع کرنا جائز نہیں ہے' لوگ اپنی عقل سے عبادت کے طریقے وضع کر لیتے ہیں' پھر اس کی تائید میں دلائل شرعیہ تلاش کرتے ہیں اور جو ان کے بنائے ہوئے طریقے کے مطابق عبادت نہ کریں ان کو لعنت ملامت کرتے ہیں' اسی کا نام احداث فی الدین اور بدعت سیئہ ہے' عبادت صرف اسی طریقہ سے کرنی چاہیے جس طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کی ہے اور جس طرح آپ نے ہدایت دی ہے اور جماعت صحابہ کا اس پر عمل رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں' اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ (البقرہ: ۱۹۰)

اجازت جہاد کی پہلی آیت کا بیان

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے روزہ کا ذکر فرمایا تھا' اور اب جہاد کا ذکر فرما رہا ہے' روزہ اور جہاد میں ایک گونہ مناسبت ہے' کیونکہ دونوں میں دنیا کو ترک کرنا پڑتا ہے' نیز حدیث میں ہے: میری امت کی سیاحت روزہ ہے اور میری امت کی رہبانیت جہاد ہے' اور اصل اور اہم عبادات میں سے بعض کی ادائیگی کے لیے اوقات مخصوص مقرر ہیں جیسے نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج اور بعض امہات عبادات کی ادائیگی کے لیے کوئی مخصوص وقت مقرر نہیں ہے جیسے جہاد اور ذکر' تو پہلے عبادات موقتہ کا ذکر فرمایا' اب عبادات غیر موقتہ میں سے جہاد کا ذکر شروع فرمایا ہے۔

بعض علماء نے کہا کہ یہ پہلی آیت ہے جس میں مسلمانوں کو کفار کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا اور یہ پابندی لگائی کہ جو تم سے جنگ کریں ان سے جنگ کرو اور جو تم سے جنگ نہ کریں ان کے خلاف تلوار نہ اٹھاؤ' پھر اس کے بعد سورۂ توبہ کی آیت سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ربیع بیان کرتے ہیں کہ یہ پہلی آیت ہے جو مدینہ میں قتال کے متعلق نازل ہوئی' جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ان کے خلاف جہاد کرتے جو آپ پر حملہ آور ہوتے اور جو آپ پر حملہ نہ کرتے آپ بھی ان سے جنگ نہ کرتے' حتیٰ کہ سورۂ توبہ نازل ہو گئی۔

ابن زید نے کہا: سورۂ بقرہ کی اس آیت کو سورۂ توبہ کی حسب ذیل آیت نے منسوخ کر دیا:

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ؕ (التوبہ: ۵)	پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو تم مشرکین کو جہاں پاؤ انہیں قتل کر دو' اور انہیں پکڑو اور ان کا محاصرہ کرو اور ان کی تاک میں ہر جگہ گھات لگا کر بیٹھو۔

ان علماء کی رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے: حد سے تجاوز نہ کرو' اس کا معنی یہ ہے کہ جو تم سے نہ لڑیں ان سے نہ لڑو اور سورۂ توبہ کے نازل ہونے کے بعد یہ پابندی منسوخ ہو گئی' اس کے برعکس دوسرے علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہوئی اور حد سے تجاوز کرنے سے جو منع فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں' بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرو۔

قتال اور جہاد میں بچوں' بوڑھوں اور عورتوں وغیرہ کو قتل کرنے کی ممانعت

امام ابن جریر روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: حد سے تجاوز نہ کرو کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں' بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرو اور نہ اس کو قتل کرو جو ہتھیار ڈال دے' اگر تم نے ان کو قتل کیا تو تم حد سے تجاوز کرنے والے ہو گے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۱۱۱۔ ۱۱۰' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شخص کو لشکر کا امیر بناتے تو اس کو خصوصیت کے ساتھ خوف خدا کی وصیت کرتے اور فرماتے: بسم اللہ پڑھ کر جہاد کرو' اور جو اللہ کا کفر کرے اس سے قتال کرو اور خیانت نہ کرنا' عہد شکنی نہ کرنا اور مثلہ نہ کرنا (کسی کے اعضاء نہ کاٹنا) اور کسی بچے کو قتل نہ کرنا۔ الحدیث

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۴' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام مالک' یحییٰ بن سعید سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یزید بن ابی سفیان کی قیادت میں شام کی طرف ایک لشکر روانہ کیا تو ان کو یہ وصیت کی: عنقریب تم راہبوں سے ملو گے' جنہوں نے اپنے زعم میں خود کو اللہ کے لیے وقف کیا ہوا ہے ان کو چھوڑ دینا' اور عنقریب تم مجوسیوں سے ملو گے جو سر کے درمیان سے بال کاٹتے ہیں ان کو قتل کر دینا' اور میں تم کو دس چیزوں کی وصیت کرتا ہوں: کسی عورت کو قتل نہ کرنا' نہ کسی بچے کو' نہ کسی بوڑھے کو اور نہ کسی پھل دار درخت کو کاٹنا اور نہ کسی بکری یا اونٹ کی کونچیں کاٹنا اور نہ کسی کھجور کے درخت کو جلانا' نہ کسی آبادی کو ویران کرنا اور نہ کسی کو غرق کرنا اور نہ مال غنیمت میں خیانت کرنا اور نہ بزدلی کرنا۔ (موطا امام مالک ص ۴۶۶' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور)

ہجرت سے پہلے قتال کی ممانعت

اس پر اتفاق ہے کہ ہجرت سے پہلے کفار سے قتال کرنا ممنوع تھا' اس پر حسب ذیل آیات دلالت کرتی ہیں:

اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ السَّیِّئَۃَ ؕ نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَصِفُوۡنَ ○ (المومنون: ۹۶)
برائی کو اچھائی سے دفع کیجئے' آپ کے متعلق جو یہ باتیں بناتے ہیں ہم انہیں خوب جانتے ہیں ○

فَاعۡفُ عَنۡہُمۡ وَاصۡفَحۡ ؕ (المائدہ: ۱۳)
آپ ان مشرکین کو معاف کر دیجئے اور ان سے درگزر کیجئے۔

وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاہۡجُرۡہُمۡ ہَجۡرًا جَمِیۡلًا ○ وَذَرۡنِیۡ وَالۡمُکَذِّبِیۡنَ اُولِی النَّعۡمَۃِ وَمَہِّلۡہُمۡ قَلِیۡلًا ○ (المزمل: ۱۱)
اور کافر جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کیجئے اور ان کو خوش اسلوبی سے چھوڑ دیجئے ○ اور جھٹلانے والے مال داروں کو مجھ پر چھوڑ دیجئے' اور انہیں تھوڑی سی مہلت دیجئے ○

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ○ (النحل: ۸۲)
سو اگر یہ اعراض کریں' تو آپ کا کام تو صرف صاف صاف احکام پہنچا دینا ہے ○

فَذَکِّرۡ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُذَکِّرٌ ؕ لَسۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ ○ (الغاشیہ: ۲۲۔ ۲۱)
سو آپ نصیحت کیجئے' آپ صرف نصیحت کرنے والے ہیں ○ آپ ان کو جبر سے منوانے والے نہیں ہیں ○

وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِجَبَّارٍ ۟ (قٓ: ۴۵)
اور آپ ان کو جبر سے منوانے والے نہیں ہیں۔

ان آیات میں کفار کی ایذا رسانیوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کرنے اور درگزر کرنے کا حکم دیا ہے اور وہ پہلی آیت جس میں ان کے حملوں کے جواب میں حملہ کرنے کا حکم دیا ہے وہ سورۂ بقرہ کی زیر بحث آیت ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک یہی راجح ہے۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا: سب سے پہلے جس آیت میں جہاد کی اجازت دی گئی ہے وہ یہ آیت ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا۔ جن (مسلمانوں) سے ناحق قتال کیا جاتا ہے ان کو (جہاد کی) اجازت دے دی گئی کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ (الحج: ۳۹)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت حقیقۃً پہلی ہو اور سورۂ حج کی یہ آیت اضافۃً پہلی ہو۔

وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ

اور تم ان (کافروں) کو قتل کرو جہاں تم انہیں پاؤ' اور ان کو نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں

أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِندَ

نکالا ہے' اور (شرک اور ارتداد کا) فساد قتل سے بڑھ کر ہے' اور مسجد حرام کے پاس

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ

ان سے اس وقت تک جنگ نہ کرو' جب تک کہ یہ تم سے وہاں جنگ نہ کریں' اگر یہ تم سے جنگ کریں تو تم ان کو قتل کر دو'

كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿١٩١﴾ فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ

اسی طرح کافروں کی سزا ہے O پھر اگر وہ کفر سے باز آ جائیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا

رَّحِيمٌ ﴿١٩٢﴾ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ

بڑا مہربان ہے O اور ان سے جہاد کرتے رہو حتیٰ کہ فتنہ (شرک) نہ رہے' اور اللہ ہی کا دین

لِلَّهِ ۖ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٩٣﴾

رہ جائے' پھر اگر وہ (شرک سے) باز آ جائیں تو صرف ظالموں کو ہی سزا دی جائے O

خلاصہ آیات

اور جب تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان جنگ اپنے پنجے گاڑ دے تو پھر تم ان کو جہاں اور جس جگہ پاؤ قتل کر دو' خواہ سرزمین حرم ہو اور ان کو مکہ سے نکال باہر کرو' جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا تھا' یہ ایمان نہیں لاتے اور الٹا تم کو کفر کی طرف لوٹانا چاہتے ہیں حالانکہ شرک اور ارتداد کا فساد قتل اور خوں ریزی کے فساد سے زیادہ بڑا ہے' نیز یہ تم کو سرزمین حرم میں قتال کرنے پر ملامت کرتے ہیں' حالانکہ شرک اور کفر کا فساد حرم میں قتال کرنے سے زیادہ بڑا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور مسجد حرام کے پاس ان سے اس وقت تک جنگ نہ کرو جب تک کہ یہ تم سے وہاں جنگ نہ کریں۔ (البقرہ: ۱۹۱)

حرم میں ابتداءً قتال کرنے کی ممانعت کا منسوخ ہونا اور کفار سے مدافعانہ جنگ کا جائز ہونا

اس آیت کے منسوخ ہونے یا منسوخ نہ ہونے میں دو قول ہیں' ایک قول یہ ہے کہ پہلے مشرکین سے حرم میں ابتداءً جنگ کرنے کی اجازت نہیں تھی بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ امام ابن جریر طبری روایت کرتے ہیں:

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ جب تک مشرکین مسجد حرام کے پاس جنگ نہ کریں ان سے جنگ نہ کرو' پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو اس آیت سے منسوخ کردیا:

فَإِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۔ (التوبہ: ۵)

پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو تم مشرکین کو جہاں پاؤ انہیں قتل کردو۔

مجاہد اور طاؤس نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت محکم ہے اور مکہ مکرمہ میں ابتداءً کسی سے جنگ کرنا جائز نہیں ہے' ہاں! اگر کافر اور مشرک مسلمانوں پر حرم میں حملہ کریں تو ان کے خلاف مدافعانہ جنگ کرنا جائز ہے۔ (امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ' جامع البیان ج ۲ ص ۱۱۲' مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ) اور یہی صحیح قول ہے' امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا یہی مذہب ہے۔ اس قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوشریح رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا: مکہ کو اللہ نے حرم بنایا ہے' اس کو لوگوں نے حرم نہیں بنایا' سو جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مکہ میں خون بہائے اور نہ اس کے کسی درخت کو کاٹے' اگر کوئی شخص مکہ میں قتال کے جواز پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتال سے استدلال کرے تو اس سے کہو: اللہ نے اپنے رسول کو اجازت دی تھی اور تمہیں اجازت نہیں دی' اور میرے لیے دن کی ایک ساعت میں اجازت دی گئی تھی' پھر آج اس کی حرمت اسی طرح لوٹ آئی ہے جس طرح اس کی کل حرمت تھی اور جو شخص (یہاں) حاضر ہے وہ غائب کو (یہ حدیث) پہنچادے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۶ ہجری میں اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ مکرمہ عمرہ کرنے کے لیے گئے' جب آپ حدیبیہ کے قریب پہنچے تو مشرکین نے آپ کو مکہ مکرمہ جانے سے منع کردیا' آپ ایک ماہ تک حدیبیہ میں ٹھہرے اور مشرکین سے اس بات پر صلح ہوئی کہ آپ اگلے سال عمرہ کرنے کے لیے آئیں اور اگلے سال تین دن آپ مکہ مکرمہ میں ٹھہر سکیں گے' اور اس بات پر صلح ہوئی کہ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان دس سال تک جنگ نہیں ہوگی' پھر آپ مدینہ لوٹ گئے اور جب آپ اگلے سال ۷ ہجری میں اس عمرہ کو ادا کرنے کے لیے آئے تو مسلمانوں کو کفار کی عہد شکنی کا خطرہ ہوا' اور وہ حرمت والے مہینہ میں حرم میں جنگ کرنے کو برا جانتے تھے' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اگر کفار تم سے حرم میں جنگ کریں تو تمہارے لیے بھی حرم میں جنگ کرنا جائز ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۳۴۷' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان سے جہاد کرتے رہو حتیٰ کہ فتنہ (شرک) نہ رہے' اور اللہ ہی کا دین رہ جائے' پھر اگر وہ (شرک سے) باز آجائیں تو صرف ظالموں کو ہی سزا دی جائے O (البقرہ: ۱۹۳)

اللہ کے دین کا مطلب ہے: اللہ کی اطاعت' یعنی انسان دین اور دنیا کے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کریں' اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق عبادت کریں' اس کے آگے سر جھکائیں اور اسی سے اپنی حاجات طلب کریں اور اپنی انفرادی' عائلی' اجتماعی' نجی' تمدنی اور کاروباری زندگی کے تمام معاملات میں اسی کے دیئے ہوئے نظام پر عمل کریں' اس کے برعکس اسلام کے علاوہ تمام ادیان اور مذاہب میں لوگ خود ساختہ طریقوں سے عبادت کرتے ہیں اور انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے: انسانوں کو انسانوں کی بندگی کرنے سے آزاد کراؤ اور سب انسانوں کو اللہ کی اطاعت میں داخل کر دو اور جو شخص بھی اس مہم میں مزاحمت کرے اس کے خلاف قتال اور جہاد کرو حتیٰ کہ ساری دنیا کے انسان اللہ کے مطیع ہو جائیں۔ اس آیت کا منشاء یہ ہے کہ ہر اس مشرک اور کافر کے خلاف جہاد کیا جائے جو دعوت اسلام کو مسترد کر دے اور اسلامی نظام کو برپا کرنے کی مہم میں مزاحم ہو' اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اس وقت تک لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ وہ یہ شہادت نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں' اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں' جب وہ ایسا کریں گے تو حق اسلام کے ماسوا وہ اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کر لیں گے اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ

حرمت والے مہینہ کا بدلہ حرمت والا مہینہ ہے' اور تمام محترم چیزوں کا بدلہ ہے' سو جو شخص

اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪

تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے تم پر زیادتی کی ہے

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ

اور اللہ سے ڈرتے رہو' اور جان لو کہ اللہ ان کے ساتھ ہے جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں ○ اور اللہ کی راہ میں

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَاَحْسِنُوْا ۛۚ

خرچ کرو' اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو' اور نیکی کرو

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

بے شک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ○

حرمت والے مہینوں کا بیان

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمانہ گھوم کر پھر اپنی اس حالت پر آ گیا ہے جس حالت پر اللہ نے اس کو زمین اور آسمانوں کے پیدا کرنے کے وقت بنایا تھا' سال کے بارہ مہینے ہیں' تین مہینے پے در پے حرمت والے ہیں' ذوالقعدہ' ذوالحجہ' محرم اور رجب' رجب کا مہینہ جمادی اور شعبان کے درمیان ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۵۴' ج ۲ ص ۶۳۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ لوگ دور دراز سے حج کے لیے ذوالقعدہ' ذوالحجہ اور محرم میں آنے جانے کا سفر کرتے تھے اور رجب کے مہینہ میں عمرہ کے لیے سفر کرتے تھے' اس لیے ان مہینوں کو حرمت والے مہینے کہا جاتا تھا اور ان مہینوں کے احترام کی وجہ سے عرب ان مہینوں میں باہمی لڑائیوں کو موقوف کر دیتے تھے' بعض دفعہ جب ان کے نزدیک لڑائی ناگزیر ہوتی تو وہ محرم کو ایک مہینہ مؤخر کر دیتے اور صفر کے مہینہ کو محرم قرار دیتے اور محرم میں لڑائی کر لیتے اور وہ یونہی محرم کو مؤخر کرتے رہے حتیٰ کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کیا تو محرم گھوم کر اپنی اصلی حالت اور اصل مہینہ میں آ چکا تھا' اسلام نے مہینوں کو مؤخر کرنا حرام کر دیا' قرآن مجید میں ہے:

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ. (التوبہ: ۳۷) مہینوں کو مؤخر کرنا صرف کفر میں زیادتی ہے۔

پہلے ان مہینوں میں جہاد کرنا ممنوع تھا لیکن حسب ذیل آیت کے نازل ہونے کے بعد یہ حرمت منسوخ ہو گئی:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ. تم مشرکین کو جہاں پاؤ انہیں قتل کر دو۔

(التوبہ: ۵)

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً. (التوبہ: ۳۶) اور تم تمام مشرکین سے جنگ کرو۔

بعض علماء کے نزدیک ان مہینوں میں ابتداءً قتال کرنا منسوخ نہیں ہوا اور بدستور حرام ہے' البتہ مدافعانہ جنگ کرنا جائز ہے' لیکن صحیح رائے جمہور کی ہے۔

ان آیات کا شان نزول بھی وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ۷ ہجری میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کرنے کے لیے پہنچے تو مسلمانوں کو خدشہ ہوا کہ کہیں کفار عہد شکنی نہ کریں اور وہ حرم میں اور حرمت والے مہینہ میں جنگ کرنے کو بہت برا جانتے تھے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس مہینہ اور اس جگہ کی حرمت سب کے لیے یکساں ہے' اگر وہ اس مہینہ اور اس جگہ میں جنگ چھیڑتے ہیں تو تم بھی مدافعانہ جنگ کرو اور انہوں نے تم کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے ان سے اتنا ہی بدلہ لو' ان کا زیادتی کرنا ظلم اور مسلمانوں کا بدلہ لینا عدل ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے دونوں کے فعل کو ''اعتداء'' زیادتی فرمایا کیونکہ صورۃً دونوں فعل ایک جیسے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ (البقرہ: ۱۹۵)

خود کو ہلاکت میں ڈالنے کی تفسیر

اس آیت کی متعدد تفسیریں کی گئی ہیں' امام ابن جریر طبری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کسی آدمی کا اللہ کی راہ میں قتل ہو جانا ہلاکت نہیں ہے' اللہ کی راہ میں مال خرچ نہ کرنا ہلاکت ہے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کسی شخص کا گناہ کرنا اور پھر اس کی مغفرت سے مایوس ہو کر توبہ نہ کرنا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مسلمانوں کا اپنے اہل و عیال اور مال اور متاع کی دیکھ بھال میں مشغول رہنا اور اس شغل میں افراط کی وجہ سے جہاد کو ترک کر دینا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۱۱۹۔ ۱۱۷ ملتقطاً 'مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ ابو الحیان اندلسی نے چند مزید اقوال بیان کیے ہیں:
ابو القاسم بلخی نے بیان کیا کہ بلاوجہ کسی سے بغض اور عداوت رکھنا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے' بعض علماء نے کہا: تبلیغ اسلام کو ترک کر دینا ہلاکت ہے۔

عکرمہ نے کہا: حرام مال سے صدقہ کرنا ہلاکت ہے' ابو علی نے کہا: تمام مال کو صدقہ کرنا ہلاکت ہے' بعض علماء نے کہا: ریا کاری یا احسان جتلا کر اپنی نیکیوں کو ضائع کر دینا ہلاکت ہے۔ (البحر المحیط ج ۲ ص ۲۵۲۔ ۲۵۱ 'مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۲ھ)

یہ تمام اقوال اپنی جگہ درست ہیں' لیکن ان میں سب سے زیادہ معتمد اور محقق قول یہ ہے کہ جہاد کو ترک کرنا اور تبلیغ اسلام نہ کرنا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے' آج امت مسلمہ جو ہر طرف سے دبی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صدیوں سے جہاد اور تبلیغ اسلام کو ترک کر چکی ہے' مسلمان حکمرانوں نے صدیوں ہندوستان پر حکومت کی لیکن غیر مسلم ریاستوں سے جہاد نہ کیا' نہ ان کو تبلیغ اسلام کی' اگر مسلمان اس فریضہ کو ترک نہ کرتے تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ

اور حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو' سو اگر تم کو (حج یا عمرہ سے) روک دیا جائے تو جو قربانی تم کو آسانی

مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ

سے حاصل ہو وہ بھیج دو' اور جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے اس وقت تک اپنے سروں کو

مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ

نہ منڈاؤ' پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو وہ

فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۫ فَمَنْ

اس کے بدلہ میں روزے رکھے یا کچھ صدقہ دے یا قربانی کرے' سو جب تم حالت امن میں ہو تو جو شخص

تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ

حج کے ساتھ عمرہ ملائے تو وہ ایک قربانی کرے جس کو وہ آسانی کے ساتھ کر سکے اور جو قربانی نہ

يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ

کر سکے وہ تین روزے ایام حج میں رکھے اور سات روزے جب تم لوٹ آؤ' یہ

عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ

کامل دس (روزے) ہیں' یہ (حج تمتع کا) حکم اس شخص کے لیے ہے جس کے اہل و عیال مسجد حرام (مکہ مکرمہ)

الْحَرَامِ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿١٩٦﴾

کے رہنے والے نہ ہوں' اور اللہ سے ڈرتے رہو' اور جان لو کہ بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے O

فرضیت حج کی تاریخ اور حج کی اقسام

علامہ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ یہ آیت ۶ ہجری میں نازل ہوئی ہے[1] ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ فرضیت حج کی تاریخ میں اختلاف ہے' ۵ ہجری' ۶ ہجری اور ۹ ہجری۔ ۸ ہجری فتح مکہ کے سال میں حضرت عتاب بن اسید نے مسلمانوں کو حج کرایا' ۹ ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق نے اور دس ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کرایا۔

(مرقات ج ۵ ص ۲۹۳' مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان' ۱۳۹۰ھ)

حج کا لغوی اور شرعی معنی' حج کے فرائض' واجبات' سنن اور موانع ہم البقرہ: ۱۵۸ میں بیان کر چکے ہیں' اسی طرح عمرہ کے واجبات اور شرائط بھی ہم وہاں بیان کر چکے ہیں۔ حج کی تین قسمیں ہیں: (۱) حج افراد: جس میں صرف مناسک حج ادا کیے جائیں اور اس سے پہلے عمرہ نہ کیا جائے' یہ صرف مکہ مکرمہ میں رہنے والوں کے لیے ہے (۲) حج تمتع: میقات سے عمرہ کا احرام باندھ لیا جائے اور عمرہ کرنے کے بعد سر کے بال کٹوا کر یا منڈوا کر حلال ہو جائے اور پھر آٹھ تاریخ کو حج کا احرام باندھ لے اور مناسک حج ادا کرنے کے بعد حلال ہو جائے (۳) حج قران: میقات سے احرام باندھ لیا جائے اور عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام کو برقرار رکھا جائے' پھر اسی احرام کے ساتھ حج کرے اور مناسک حج ادا کرنے کے بعد سر کے بال کٹوا کر یا منڈوا کر احرام کھول دے۔ حج قران میں زیادہ مشقت ہے اور اس کا اجر بھی بہت زیادہ ہے' اکثر روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حج کیا تھا وہ حج قران تھا' حج قران اور حج تمتع یہ دونوں مکہ مکرمہ سے باہر کے رہنے والوں کے لیے ہیں۔

احرام میں ممنوع کام

مرد کے احرام کے لیے دو پاک صاف' نئی دھلی ہوئی چادریں ہوں' ایک چادر' تہبند کی طرح باندھ لے اور دوسری چادر اوپر اوڑھ لے سر کھلا رکھے' اور عورت سلے ہوئے کپڑے پہنے' سر اور پورا جسم ڈھانپ کر رکھے صرف چہرہ کھلا رکھے' احرام میں حسب ذیل پابندیاں ہیں:

(۱) محرم جماع کرنے سے یا اپنی بیوی سے جماع کا ذکر کرنے سے احتراز کرے گا' اپنی بیوی کو شہوت سے نہیں چھوئے گا نہ بوسہ دے گا (۲) کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں کرے گا (۳) کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کرے گا (۴) خشکی کے جانوروں کو شکار نہیں کرے گا' نہ ان کی طرف اشارہ کرے گا' نہ ان کی طرف رہنمائی کرے گا (۵) قصداً یا بلاقصد خوشبو نہیں لگائے گا (خوشبو کا سونگھنا مکروہ ہے' خوشبودار صابن سے نہانا یا شیمپو استعمال کرنا جائز نہیں) اگر خوشبودار چیز پکی ہوئی تھی تو حرج نہیں' اگر کچی ہو اور دوسری چیز سے مخلوط ہو اور خوشبو مغلوب ہو تو جائز ہے اگر غالب ہو تو جائز نہیں' اگر بعینہٖ خوشبودار چیز کھائی تو اس پر دم ہے (۶) ناخن نہ کاٹے (۷) چہرے کو نہیں ڈھانپے گا' چہرہ کا بعض حصہ مثلاً منہ یا ٹھوڑی کو ہتھیلی سے نہیں ڈھانپے گا (۸) سر کو نہیں ڈھانپے

[1] علامہ کمال الدین بن ہمام متوفی ۸۶۱ھ' فتح القدیر ج ۲ ص ۲۲۵' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر

گا (۹) ڈاڑھی نہیں کاٹے گا' سر میں تیل نہیں ڈالے گا نہ بالوں میں خضاب لگائے گا' نہ ہاتھوں پر مہندی لگائے گا (۱۰) سر کے بال یا بدن کے بال نہیں منڈائے گا (۱۱) سلے ہوئے کپڑے نہیں پہنے گا (۱۲) عمامہ یا ٹوپی نہیں پہنے گا (۱۳) چمڑے کے موزے نہیں پہنے گا البتہ اگر ان کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ دیا جائے کہ پنڈلیاں اور ٹخنے کھلے رہیں تو جائز ہے (ایسی چپل پہن سکتا ہے جس سے وسط قدم چھپا ہوا ہو اور ٹخنے کھلے ہوئے ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ موزوں کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ کر پہن سکتا ہے) جرابیں پہننا جائز نہیں کیونکہ ان سے ٹخنے چھپ جاتے ہیں (۱۴) جس کپڑے کو ایسی چیز سے رنگا گیا ہو جس سے رنگنے کے بعد خوشبو آئے مثلاً زعفران اور ورس وغیرہ اس کو نہ پہنے (۱۵) مکہ مکرمہ کے کسی درخت کو نہ کاٹے۔

احرام میں جائز کام

محرم حمام میں داخل ہو سکتا ہے' کسی مکان اور محمل کے سائے کو حاصل کر سکتا ہے (مثلاً چھتری استعمال کر سکتا ہے) لیکن کوئی چیز اس کے چہرہ یا سر کو مس نہ کرے' پیسے وغیرہ رکھنے کے لیے همیان کمر میں باندھ سکتا ہے (احرام کی چادر پر چمڑے کی پٹی باندھ لی جاتی ہے جس میں پیسے رکھنے کے لیے بٹوہ ہوتا ہے' وہ بھی اسی حکم میں ہے)' منطقہ (کمر باندھنے کی پیٹی) بھی باندھ سکتا ہے' بغیر خوشبو کا سرمہ لگا سکتا ہے' ختنہ کرا سکتا ہے' فصد لگوا سکتا ہے' ڈاڑھ نکلوا سکتا ہے' ٹوٹی ہوئی ہڈی جڑوا سکتا ہے' سر یا کمر کو کھجا سکتا ہے لیکن اس احتیاط سے کہ بال نہ اکھڑیں' اگر تین بال اکھڑ جائیں تو ایک مٹھی طعام صدقہ کردے۔ احرام باندھنے سے پہلے غسل کرنا اور بدن پر خوشبو لگانا جائز ہے خواہ بعد میں خوشبو آتی رہے۔

احرام میں مستحب کام

محرم بہ کثرت تلبیہ پڑھے: ''لبیك اللهم لبیك' لبیك لا شریك لك لبیك ان الحمد والنعمة لك والملك لا شریك لك''۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۱۰) جب نماز پڑھے یا جب کسی بلندی پر چڑھے یا کسی وادی سے اترے' یا سواروں سے ملے' یا سحری کا وقت ہو تو تلبیہ پڑھے۔ جب مکہ میں داخل ہو تو پہلے مسجد حرام میں باب السلام سے داخل ہو اور جب کعبہ کو دیکھے تو تین بار تکبیر اور کلمہ طیبہ پڑھے' کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی دعا کرے' اس وقت کی دعا مقبول ہوتی ہے اور یہ دعا بھی کرے: اے اللہ! ہمارے دلوں میں کعبہ کی محبت' اس کی تعظیم اور اس کی ہیبت کو زیادہ کر۔

عمرہ کرنے کا طریقہ

غیر ملکی میقات سے عمرہ کا احرام باندھ لے' پاکستان کے رہنے والے ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں اس لیے وہ اپنے گھر میں غسل کر کے احرام باندھ لیں' اور ائرپورٹ کے لاؤنج میں دو رکعت نماز پڑھ کر عمرہ کی نیت کر لیں: اے اللہ! میں عمرہ کے لیے حاضر ہوں' اس کو میرے لیے آسان کردے اور میری طرف سے قبول فرما' پھر راستہ میں بہ کثرت تلبیہ پڑھے: ''لبیك اللهم لبیك' لبیك لا شریك لك لبیك ان الحمد والنعمة لك والملك لا شریك لك'' مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ ادا کرے یعنی بیت اللہ کا سات مرتبہ طواف کرے' اس طواف میں اضطباع کرے (احرام کی اوپر والی چادر کو دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر بائیں کندھے کے اوپر ڈال دے) پہلے تین چکروں میں رمل کرے (کندھے ہلا ہلا کر دوڑتے ہوئے طواف کرے) جب بھی حجر اسود کے سامنے سے گزرے تو اگر ممکن ہو تو اس کو بوسہ دے ورنہ اس کی طرف منہ کر کے اس کی طرف دونوں ہتھیلیاں اس طرح کرے جیسے اس پر رکھ رہا ہو' اور ''الله اکبر الله اکبر لا اله الا الله والله اکبر الله اکبر ولله الحمد'' پڑھے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے' پھر اپنی ہتھیلیوں کو بوسہ دے' جب رکن یمانی کے پاس سے گزرے تو اس کو

بھی چھو کر اس کی تعظیم کرے اس کو بوسہ دینے میں فقہاء احناف کے دو قول ہیں' ایک قول منع کا ہے اور ایک جواز کا' اگر اس کی تعظیم نہ کر سکے تو پھر اس کے قائم مقام ہاتھ سے اشارہ کرنا مشروع نہیں ہے۔ حجر اسود کی تعظیم کے ساتھ طواف کو ختم کرے' پھر مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت طواف پڑھے۔ اس کے بعد سعی کے سات چکر لگائے' سعی صفا سے شروع کرے اور مروہ پر ختم کرے' صفا پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے "اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد" پڑھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ پڑھے' پھر دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا کرے' پھر مروہ کی طرف روانہ ہو' راستہ میں دو سبز نشانوں کے درمیان سے دوڑتا ہوا گزرے' طواف اور سعی کے دوران اس کو جو دعائیں اور اذکار یاد ہوں ان کو خضوع اور خشوع کے ساتھ پڑھتا رہے۔

صفا اور مروہ میں طواف مکمل کرنے کے بعد محرم سر کے بال کٹوالے یا منڈوالے' اب اس کا عمرہ مکمل ہو گیا اور وہ احرام کی پابندیوں سے آزاد ہو گیا لیکن پھر بھی کوئی گناہ نہ کرے' فحش باتیں نہ کرے اور کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرے' آٹھ ذوالحجہ تک حسب استطاعت عمرے کرتا رہے اور مسجد حرام میں زیادہ سے زیادہ طواف کرتا رہے' عمرہ اور طواف میں طواف کی زیادہ فضیلت ہے' مسجد حرام میں کم از کم ایک بار قرآن مجید ختم کرنا چاہیے۔

حج کرنے کا طریقہ

حج کرنے والا آٹھ ذوالحجہ کو صبح کی نماز مسجد حرام میں ادا کرے' حج کی نیت سے غسل کر کے احرام باندھے' دو رکعت نماز پڑھے اور یہ دعا کرے: اے اللہ! میں حج کا ارادہ کرتا ہوں تو اس کو میرے لیے آسان کر دے اور قبول فرما' اور فجر کی نماز کے بعد مکہ سے منیٰ کے لیے روانہ ہو جائے اور ظہر کی نماز وہاں پہنچ کر پڑھے' حج کی سعی کو طواف پر مقدم کرنا جائز ہے' اس لیے آسانی اس میں ہے کہ سات ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھ لے اور حج کی سعی کر لے اور آٹھ تاریخ کو فجر کی نماز کے بعد منیٰ روانہ ہو جائے' اور بقیہ نمازیں منیٰ میں ادا کرے اور طلوع فجر کے بعد منیٰ سے عرفات کے لیے روانہ ہو' اگر امام کے ساتھ نماز پڑھے تو ظہر کے وقت میں ظہر اور عصر دونوں نمازوں کو جمع کر کے پڑھے' ورنہ ہر نماز اپنے وقت میں پڑھے' اس کے بعد جبل رحمت کے قریب جا کر قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو اور بلند آواز سے گڑگڑا کر دعا مانگے اور زندگی کے تمام گناہوں سے توبہ کرے' تاہم کھڑا ہونا شرط یا واجب نہیں ہے' اگر بیٹھ کر دعا کی پھر بھی جائز ہے۔ اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقوف فرمایا تھا' یہ جگہ میدان عرفات کے وسط میں ہے' اگر یہاں موقع نہ ملے تو وادی عرنہ کے سوا تمام میدان عرفات موقف ہے' میدان عرفات میں جس جگہ بھی کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر دعا کر لی' حج ہو جائے گا' غروب آفتاب تک میدان عرفات میں رہنا واجب ہے' غروب آفتاب کے بعد میدان عرفات سے مزدلفہ کے لیے روانہ ہو' راستہ میں "اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد" پڑھتا رہے۔ پیدل جانا مستحب ہے' مزدلفہ میں مغرب کی نماز عشاء کے وقت میں پڑھے' مغرب میں ادا کی نیت کرے اور اس کی سنتوں کو ترک کر دے' اس رات کو جاگ کر عبادت کرنا لیلۃ القدر میں جاگنے سے افضل ہے' اسی رات میں رمی کے لیے ستر اسی کنکریاں چن لے۔ طلوع فجر کے بعد صبح کی نماز منہ اندھیرے پڑھے' اس کے بعد وقوف کرے (کھڑے ہو کر دعا کرے) وقوف کا وقت طلوع فجر سے لے کر طلوع شمس تک ہے' خواہ اس وقت چل رہا ہو وقوف ہو جائے گا۔ (اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد) پڑھے' تلبیہ پڑھے' درود شریف پڑھے اور دعا کرے' اور جب خوب روشنی پھیل جائے تو منیٰ کے لیے روانہ ہو اور جمرہ عقبہ کو رمی کرے' پانچ ہاتھ کے فاصلہ سے سات کنکریاں مارے' ہر کنکری مارتے وقت اللہ اکبر کہے' رمی کے بعد قربانی کرے' پھر سر کے بال منڈوالے یا کٹوالے' منڈوانا افضل ہے' اگر بال

کٹوائے تو ایک پور کے برابر کٹوائے' چوتھائی سر کے بال کٹوانا واجب ہے اور پورے سر کے بالوں کو کٹوانا مستحب ہے' سر منڈوانے کے بعد وہ حلال ہو گیا اور بیوی سے جماع کے علاوہ اس پر ہر چیز حلال ہو گئی' پھر ایام نحر کے تین دنوں میں سے کسی ایک دن مکہ جا کر طواف زیارت کرے'اگر پہلے سعی کر چکا ہے تو اس طواف میں رمل نہیں کرے گا' اور اگر پہلے سعی نہیں کی تو پہلے تین چکروں میں رمل کرے گا اور سات چکر پورے کرے' دو رکعت نماز طواف پڑھے گا اور اس کے بعد سعی کرے گا' طواف زیارت کے بعد اس پر بیوی بھی حلال ہو جائے گی۔ اگر اس نے طواف زیارت کو قربانی کے تین دنوں کے بعد کیا تو یہ فعل مکروہ تحریمی ہے اور اس پر دم لازم آئے گا (طواف زیارت کا وقت ساری عمر ہے) وقوف عرفات اور طواف زیارت کرنے کے بعد حج کے فرائض ادا ہو گئے' وقوف مزدلفہ' حج کی سعی اور رمی جمرات واجب ہیں' ان میں سے کسی ایک کے بھی ترک سے دم لازم آئے گا' دس ذوالحجہ کو طواف زیارت کرنے کے بعد منیٰ لوٹ آئے اور رات وہاں گزارے' اور گیارہ تاریخ کو زوال کے بعد تینوں جمرات پر رمی کرے اور ہر جمرہ پر سات سات کنکریاں مارے' پھر بارہ تاریخ کو اسی طرح کنکریاں مارے۔ دس تاریخ کو رمی کا وقت فجر سے غروب تک ہے اور گیارہ اور بارہ تاریخ کو زوال سے لے کر غروب تک ہے' تیرہ تاریخ کو طلوع فجر سے پہلے منیٰ سے مکہ روانہ ہو سکتا ہے اور اگر تیرہ تاریخ کی فجر کو پا لیا تو پھر اس دن کی رمی کرنی ہوگی۔ جب مکہ مکرمہ سے روانہ ہونے کا ارادہ کرے تو الوداعی طواف کرے' اس کو طواف صدر کہتے ہیں' یہ طواف واجب ہے' افتتاحی طواف کو طواف قدوم کہتے ہیں' یہ مستحب ہے' طواف زیارت فرض ہے اور طواف صدر یا طواف وداع واجب ہے۔ طواف وداع کرنے کے بعد حج کے تمام ارکان اور واجبات ادا ہو گئے اور حج مکمل ہو گیا' اس کے بعد مدینہ منورہ کا سفر کرے اور وہاں آٹھ یا نو دن کے قیام میں کوشش کرے کہ مسجد نبوی میں متواتر چالیس نمازیں پڑھے۔

مسجد حرام اور مسجد نبوی میں نمازوں کا اجر و ثواب

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے میری مسجد میں چالیس نمازیں پڑھیں اور اس کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی اس کے لیے جہنم سے برأت اور عذاب سے نجات لکھ دی جائے گی اور وہ نفاق سے بری ہو جائے گا۔ (مسند احمد ج ۳ ص ۱۵۵ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

حافظ منذری نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح ہیں اور اس حدیث کو امام طبرانی نے "اوسط" میں روایت کیا ہے۔ (الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۲۱۵ 'مطبوعہ دار الحدیث' قاہرہ' ۱۴۰۷ھ)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۴ ص ۸ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسجد حرام میں نماز پڑھنے کا ایک لاکھ نمازوں کا اجر ہے اور میری مسجد میں نماز پڑھنے کا ایک ہزار نمازوں کا اجر ہے اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کا پانچ سو نمازوں کا اجر ہے۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے "معجم کبیر" میں روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۴ ص ۸ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حافظ المنذری لکھتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ایک شخص اپنے گھر میں نماز پڑھے

لے تو اس کو ایک نماز کا اجر ملتا ہے اور اگر محلہ کی مسجد میں نماز پڑھے تو پچیس نمازوں کا اجر ملتا ہے اور اگر جامع مسجد میں نماز پڑھے تو پانچ سو نمازوں کا اجر ملتا ہے اور میری مسجد میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا اجر ملتا ہے اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا اجر ملتا ہے' اور مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے ایک لاکھ نمازوں کا اجر ملتا ہے' اس حدیث کو ائمہ ستہ میں سے صرف امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

(الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۲۱۵' مطبوعہ دارالحدیث' قاہرہ)

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ ہمارے اصحاب کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ ثواب میں اضافہ مسجد حرام کے ساتھ نہیں ہے بلکہ پورے حرم مکہ میں کسی جگہ بھی نماز پڑھی جائے تو اتنا ہی ثواب ہوگا۔

(ردالمحتار ج ۲ ص ۱۸۸' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا طریقہ

علامہ شرنبلالی لکھتے ہیں:

جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا قصد رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ آپ پر درود شریف پڑھے' کیونکہ آپ خود بھی درود شریف کو سنتے ہیں اور فرشتے بھی آپ کے پاس درود شریف پہنچاتے ہیں' جب زائر مدینہ منورہ کی دیواروں کو دیکھے تو درود شریف پڑھ کر یہ کہے:

اے اللہ! یہ تیرے نبی کا حرم ہے اور تیری وحی کے نازل ہونے کی جگہ ہے' تو مجھے یہاں حاضر ہونے کی نعمت عطا فرما اور یہاں کی حاضری کو میرے لیے جہنم سے نجات کا ذریعہ بنا دے اور مجھے قیامت کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے بہرہ مند فرما اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے پہلے غسل کرے' اچھا لباس زیب تن کرے' خوشبو لگائے' پھر انتہائی تواضع اور انکسار کے ساتھ آپ کے روضہ کی طرف روانہ ہو اور درود شریف پڑھتا ہو اور اپنی مغفرت کی دعائیں مانگتا ہوا چلتا رہے اور یہ پڑھے: ''بسم اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا اللھم اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب رحمتک'' پھر مسجد شریف میں داخل ہو اور دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے' آپ کی قبر شریف اور منبر کے درمیان کی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے' اس جگہ دو رکعت بہ طور شکر پڑھے' پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قبر سے چار ہاتھ کے فاصلہ پر ادب سے کھڑا ہو' آپ کے مواجہ شریف (سر اور چہرہ) کی طرف منہ اور کعبہ کی طرف پیٹھ کرے اور یوں سلام عرض کرے: ''السلام علیک یا سیدی یا رسول اللہ' السلام علیک یا نبی اللہ' السلام علیک یا حبیب اللہ' السلام علیک یا نبی الرحمۃ' السلام علیک یا شفیع الامۃ' السلام علیک یا سید المرسلین' السلام علیک یا خاتم النبیین' السلام علیک یا مزمل' السلام علیک یا مدثر' السلام علیک وعلی اصولک الطیبین' واھل بیتک الطاھرین'' میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں' آپ نے فریضۂ رسالت کو ادا کر دیا اور امانت کو پہنچا دیا اور امت کی خیر خواہی کی اور واضح دلائل بیان کیے' اور اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا کیا' اور دین کو قائم کیا حتیٰ کہ آپ رفیق اعلیٰ سے واصل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ پر صلوٰۃ وسلام نازل فرمائے' جس جگہ آپ اپنے جسد اطہر کے ساتھ تشریف فرما ہیں وہ جگہ تمام جگہوں سے افضل جگہ ہے' اللہ تعالیٰ آپ پر اور اس جگہ پر ہمیشہ اتنی بار صلوٰۃ وسلام نازل فرمائے جس کا عدد اللہ ہی کے علم میں ہے۔ یا رسول اللہ! ہم آپ کے حرم مقدس اور آپ کی عظیم بارگاہ میں حاضر ہیں' ہم دور دراز کے علاقوں سے آپ کے حضور میں آپ کی شفاعت کی امید سے آئے ہیں' آپ

ہمارے رب کے حضور ہماری شفاعت فرمائیں' گناہوں کے بوجھ سے ہماری کمر ٹوٹ رہی ہے' آپ ہی ایسے شفاعت کرنے والے ہیں جن سے شفاعتِ کبریٰ' مقام محمود اور وسیلہ کا وعدہ کیا گیا ہے اور اللہ نے فرمایا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا٥ (النساء: ۶۴)

اور اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم کر گزریں' تو آپ کے پاس آئیں اور اللہ سے مغفرت طلب کریں اور رسول بھی ان کی شفاعت کریں' تو یہ بے شک اللہ تعالیٰ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا پائیں گے٥

اور بے شک ہم اپنی جانوں پر ظلم کر کے آپ کے پاس آئے ہیں اور اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں' سو آپ ہمارے لیے اپنے رب سے شفاعت کیجئے اور اللہ سے دعا کیجئے کہ آپ کی سنت پر خاتمہ فرمائے اور آپ کے دین میں ہمیں قیامت کے دن اٹھائے اور ہمیں آپ کے حوضِ کوثر پر وارد کرے اور بغیر کسی شرمندگی اور رسوائی کے ہمیں آبِ کوثر پلائے' یارسول اللہ! شفاعت فرمایئے' یارسول اللہ! شفاعت فرمایئے' یارسول اللہ! شفاعت فرمایئے (تین بار کہے) اے اللہ! ہماری مغفرت فرما' اور جو ہم سے پہلے فوت ہو گئے ہیں ان کی مغفرت فرما اور مسلمانوں کے خلاف ہمارے دلوں میں کینہ نہ رکھ' اے رب! تو رؤف رحیم ہے' پھر جن لوگوں نے آپ کو سلام پہنچانے کی درخواست کی تھی' ان کا سلام پیش کرے اور کہے: یارسول اللہ! فلاں' فلاں کی طرف سے آپ کو سلام ہو' یارسول اللہ! وہ آپ سے شفاعت کے طلب گار ہیں' ان کی شفاعت فرمایئے' پھر درود شریف پڑھ کر جو چاہے دعا کرے۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سر کے بالمقابل کھڑا ہو اور کہے: ''السلام عليك يا خليفة رسول الله صلى الله عليه وسلم ' السلام عليك يا صاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم انيسه في الغار ورفيقه في الاسفار وامينه في الاسرار'' اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین جزا عطا فرمائے' آپ نے بہترین نیابت کی' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر قائم رہے' اور آپ کے طریقہ کے مطابق کار خلافت انجام دیئے' آپ نے مرتدین اور مبتدعین سے قتال کیا اور اسلام کے قلعہ کو مضبوط کیا' آپ بہترین امام تھے' آپ تادم حیات دین کی خدمت کرتے رہے' آپ اللہ سبحانہ سے دعا کریں کہ وہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ آپ کی محبت رکھے اور قیامت کے دن ہمیں آپ کی جماعت میں اٹھائے اور ہماری زیارت کو قبول فرمائے' السلام علیک ورحمۃ اللہ۔

اس کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سر کے بالمقابل کھڑا ہو اور یوں سلام عرض کرے: ''السلام عليك يا امير المومنين ' السلام عليك يا مظهر الاسلام ' السلام عليك يا مكسر الاصنام'' اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری طرف سے بہترین جزا عطا فرمائے' آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی نصرت فرمائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بڑے بڑے شہروں کو فتح کیا۔ یتیموں کی کفالت کی اور صلہ رحمی کی' اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیرو! رفیقو! مشیرو! اور دین قائم کرنے میں آپ کی معاونت کرنے والو! اور آپ کے بعد مسلمانوں کی بہتری کے لیے کارہائے نمایاں کرنے والو! آپ دونوں پر سلام ہو' اللہ آپ کو ہماری طرف سے تمام مسلمانوں کی طرف سے بہترین جزا عطا فرمائے' ہم آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کریں کہ حضور ہماری شفاعت فرمائیں اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائیں کہ وہ ہمارے اس حج اور زیارت کو قبول فرمائے' ہمیں آپ کے دین پر زندہ رکھے اور اسی پر ہمارا خاتمہ فرمائے اور آپ کی جماعت میں ہمارا حشر فرمائے' پھر اپنے لیے دعا کرے' اپنے والدین کے لیے دعا کرے اور جنہوں نے دعا کی

درخواست کی تھی ان کے لیے دعا کرے پھر تمام مسلمانوں کے لیے دعا کرے پھر دوبارہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مواجہہ شریف میں جا کر کھڑا ہو اسی طرح سلام پیش کرے اور آپ سے شفاعت کی درخواست کرے اور اسی طرح دعا کرے۔

حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے ستون کے پاس نماز پڑھے اور دیگر متبرک مقامات پر نمازیں پڑھے' بقیع شریف میں جائے' شہداء احد کی قبروں پر جائے' حضرت سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبر پر فاتحہ پڑھے' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ' حضور کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ' ازواج مطہرات اور دیگر شہداء کی قبروں پر حاضر ہو اور تمام مزارات پر آیۃ الکرسی پڑھے' گیارہ بار سورۂ اخلاص پڑھے اور اگر یاد ہو تو سورۂ یٰس پڑھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ان کا ثواب ان تمام ارواح قدسیہ کو پہنچائے' مسجد قبا میں حاضر ہو کر وہاں نماز پڑھے۔ وہاں دو رکعت نماز پڑھنے کا اجر عمرہ کے برابر ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۵ ص ۲۴۸) مسجد قبلتین' مساجد سبع اور تمام مشاہد کی زیارت کرے۔

(مراقی الفلاح ص ۴۵۱۔۴۴۸ ملخصاً مطبوعہ مصطفی البابی واولادہ' مصر' ۱۳۵۶ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو۔ (البقرہ: ۱۹۶)

اس کا معنی یہ ہے کہ حج اور عمرہ کے تمام شرائط' فرائض اور واجبات کو ادا کرو' کہ یہ کامل ہوں ناقص نہ رہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو اگر تم کو (حج یا عمرہ سے) روک دیا جائے تو جو قربانی تم کو آسانی سے حاصل ہو وہ بھیج دو اور جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے اس وقت تک اپنے سروں کو نہ منڈواؤ۔ (البقرہ: ۱۹۶)

یعنی اپنے احرام پر برقرار رہو اور حلال نہ ہو۔

احصار (حج یا عمرہ کے سفر میں پیش آنے والی رکاوٹ) کی تعریف میں مذاہب ائمہ

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اگر دشمن سفر حج پر نہ جانے دے اور راستہ میں کسی جگہ روک لے تو یہ احصار ہے' اب محرم حرم میں قربانی بھیج دے اور جب قربانی ذبح ہو جائے گی تو وہ حلال ہو جائے گا' امام ابوحنیفہ کے نزدیک راستہ میں دشمن کے روکنے کے علاوہ راستہ میں بیمار ہو جانا اور سفر کے قابل نہ رہنا بھی احصار ہے اور لغت میں احصار اسی کو کہتے ہیں اور احادیث بھی اس کی مؤید ہیں' علماء مذاہب کی تصریحات حسب ذیل ہیں:

اگر دشمن حج یا عمرہ کے لیے جانے نہ دے تو یہ احصار (روک دینا) ہے' حضرت ابن عباس' حضرت ابن عمر اور حضرت انس بن مالک کا یہی قول ہے اور یہی امام شافعی کا مذہب ہے۔ (النکت والعیون ج ۱ ص ۲۵۵ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت)

علامہ ابن عربی مالکی لکھتے ہیں:

احصار دشمن کے منع کرنے اور روکنے کے ساتھ خاص ہے' حضرت ابن عباس' حضرت ابن عمر اور حضرت انس بن مالک کا یہی قول ہے اور امام شافعی کا یہی مذہب ہے' لیکن اکثر علماء لغت کی رائے یہ ہے کہ ''احصر'' کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی شخص کو مرض عارض ہو اور وہ اس کو کسی جگہ جانے سے روک دے۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۱۷۰ مطبوعہ دارالمعرفہ' بیروت' ۱۴۰۸ھ)

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں:

احصار صرف دشمن کے روکنے سے ہوتا ہے مریض کو محصر نہیں کہتے' حضرت ابن عمر' حضرت ابن عباس اور حضرت انس کا یہی قول ہے' امام مالک' امام شافعی اور امام احمد کا یہی مذہب ہے' لیکن ابن قتیبہ نے یہ کہا ہے کہ جب مرض یا دشمن سفر کرنے سے روک دیں تو یہ احصار ہے۔ (زاد المسیر ج ۱ ص ۲۰۴ مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں:

کسائی' ابوعبیدہ اور اکثر اہل لغت نے یہ کہا ہے کہ مرض اور زادِ راہ گم ہو جانے کی وجہ سے جو سفر جاری نہ رہ سکے اس کو احصار کہتے ہیں' اور اگر دشمن سفر نہ کرنے دے تو اس کو حصر کہتے ہیں' حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس میں دشمن اور مرض برابر ہیں۔ ایک دم (ھدی کے قربانی کا جانور) بھیج کر محرم حلال ہو جائے گا جب کہ اس جانور کو حرم میں ذبح کر دیا جائے' امام ابوحنیفہ' امام ابویوسف' امام محمد' امام زفر اور ثوری کا یہی مذہب' علامہ جصاص کہتے ہیں کہ جب لغت سے ثابت ہو گیا کہ احصار کا معنی مرض کا روکنا ہے تو اس آیت کا حقیقی معنی یہی ہے کہ جب کوئی مرض تم کو حج یا عمرہ سے روک دے' اور دشمن کا روکنا اس میں حکماً داخل ہے۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۲۶۸' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

امام ابوحنیفہ کے موقف پر ائمہ لغت کی تصریحات

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ائمہ لغت میں سے ابن قتیبہ' ابوعبیدہ اور کسائی نے یہ کہا ہے کہ سفر میں مرض کا لاحق ہونا احصار ہے' اسی سلسلہ میں مشہور امام لغت فراء لکھتے ہیں:

جو شخص سفر میں خوف یا مرض کے لاحق ہونے کی وجہ سے حج یا عمرہ کو پورا نہ کر سکے اس کے لیے عرب احصار کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ (معانی القرآن ج ۱ ص ۱۱۷' مطبوعہ بیروت)

علامہ حماد جوہری لکھتے ہیں:

ابن السکیت نے کہا: جب کسی شخص کو مرض سفر سے روک دے تو کہتے ہیں: "حصرہ المرض" اخفش نے کہا: جب کسی شخص کو مرض روک دے تو کہتے ہیں: "احصرنی مرضی"۔ (الصحاح ج ۲ ص ۶۳۲' مطبوعہ دار العلم' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

امام ابوحنیفہ کے موقف پر احادیث سے استدلال

احادیث میں تصریح ہے کہ جب کوئی شخص مرض لاحق ہونے کی وجہ سے حج یا عمرہ کا سفر جاری نہ رکھ سکے تو اگلے سال اس کی قضاء کرے۔ امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت حجاج بن عمرو انصاری کہتے ہیں کہ جس شخص کی ہڈی ٹوٹ گئی یا ٹانگ ٹوٹ گئی تو وہ حلال ہو گیا اور اس پر اگلے سال حج ہے' ایک اور سند سے روایت ہے: یا وہ بیمار ہو گیا۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۵۷' مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث کو امام ترمذی[1]' امام ابن ماجہ[2] اور امام ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے[3]۔

امام بخاری لکھتے ہیں:

عطاء نے کہا: ہر وہ چیز جو حج کرنے سے روک دے وہ احصار ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۴۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

نیز امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس شخص کو کوئی عذر حج کرنے سے روک دے یا اس کے سوا اور کوئی چیز مانع ہو تو وہ حلال ہو جائے اور رجوع نہ کرے اور جس وقت وہ محصر ہو تو اگر اس کے پاس قربانی ہو اور وہ اس کو حرم میں بھیجنے کی

---

[1] امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی ص ۱۵۶' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[2] امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ' سنن ابن ماجہ ص ۲۲۳' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[3] امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ' المصنف ج ۱/۴ ص ۱۳۹-۱۳۸' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ

استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہیں ذبح کر دے اور اگر وہ اس کو حرم میں بھیجنے کی استطاعت رکھتا ہو تو جب تک وہ قربانی حرم میں ذبح نہیں ہوگی وہ حلال نہیں ہوگا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۴۳۔ ۲۴۴ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع 'کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث میں عذر کے لفظ سے استدلال ہے جو عام ہے اور دشمن کے منع کرنے اور بیمار پڑنے دونوں کو شامل ہے۔

امام ابوحنیفہ کے موقف پر آثار صحابہ سے استدلال

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جس شخص نے حج کا احرام باندھا' پھر وہ بیمار ہو گیا یا کوئی اور رکاوٹ پیش آ گئی تو وہ وہاں ٹھہرا رہے حتیٰ کہ ایام حج گزر جائیں' پھر عمرہ کر کے لوٹ آئے اور اگلے سال حج کرے۔

(المصنف ج ۱/ ۴ ص ۱۳۹ 'مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ)

سلیمان بیان کرتے ہیں کہ معبد بن حراسہ مخزومی مکہ کے راستہ میں بے ہوش ہو گئے' ان کے بیٹے ان پر پانی ڈالنے لگے' حضرت ابن عباس' حضرت ابن عمر اور مروان بن الحکم سے ملاقات ہوئی' انہوں نے کہا: وہ علاج کرے' اور جب تندرست ہو جائے تو حج کا احرام فسخ کر کے عمرہ کر لے' اگلے سال حج کرے اور قربانی حرم میں بھیجے۔

(المصنف ج ۱/ ۴ ص ۱۴۰ 'مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ)

عبدالرحمان بن یزید بیان کرتے ہیں کہ ہم عمرہ کرنے گئے' جب ہم ذات الشقوف میں پہنچے تو ہمارے ایک ساتھی کو (سانپ یا) بچھو نے ڈس لیا' ہم راستہ میں بیٹھ گئے تاکہ اس کا شرعی حکم معلوم کریں' ناگاہ ایک قافلہ میں حضرت ابن مسعود آ پہنچے' ہم نے بتایا کہ ہمارا ساتھی ڈسا گیا ہے' حضرت ابن مسعود نے فرمایا: اس کی طرف سے ایک قربانی حرم میں بھیجو اور ایک دن مقرر کر لو' جب وہ ھدی حرم میں ذبح کر دی جائے تو یہ حلال ہو جائے گا۔

(المصنف ج ۱/ ۴ ص ۱۴۱ 'مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ)

امام ابوحنیفہ کے موقف پر اقوال تابعین سے استدلال

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

مجاہد بیان کرتے ہیں: جس شخص کو حج یا عمرہ کے سفر میں کوئی رکاوٹ درپیش ہو خواہ مرض ہو یا دشمن وہ احصار ہے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۱۲۴ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

عطاء نے کہا: ہر وہ چیز جو سفر سے روک دے وہ احصار ہے۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۱۲۴ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

قتادہ نے کہا: جب کوئی شخص مرض یا دشمن کی وجہ سے سفر جاری نہ رکھ سکے تو وہ حرم میں ایک قربانی بھیج دے اور جب وہ قربانی ذبح ہو جائے گی تو وہ حلال ہو جائے گا۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۱۲۴ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

ابراہیم نخعی نے کہا: مرض ہو یا ہڈی ٹوٹ جائے یا دشمن نہ جانے دے' یہ سب احصار ہیں۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۱۲۴ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

امام ابوحنیفہ کے موقف کی ہمہ گیری اور معقولیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد' آثار صحابہ اور اقوال تابعین' ائمہ لغت کی تصریحات ان سب سے امام ابوحنیفہ کا مسلک ثابت ہے کہ احصار دشمن کے روکنے اور مرض کے خارج ہونے دونوں کو شامل ہے اور اس میں یسر اور سہولت ہے' اسلام ہر مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے' ائمہ ثلاثہ کے موقف پر یہ اشکال ہوگا کہ جو شخص حج یا عمرہ کے سفر میں کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جائے

جس کی وجہ سے وہ اپنا سفر جاری نہ رکھ سکے تو اس کے لیے اسلام میں کیا حل ہے؟ ہر چند کہ اب ہوائی جہاز کے ذریعہ بیشتر حجاج کرام حج اور عمرہ کا سفر کرتے ہیں لیکن پھر بھی بہت سے علاقوں سے لوگ سڑک کے ذریعہ سفر کرتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۶ ہجری میں اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ عمرہ کے لیے روانہ ہوئے تھے' جب آپ مقام حدیبیہ پر پہنچے تو کفار نے آپ کو مکہ جانے سے روک دیا۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن عمر کے دو بیٹے سالم اور عبید اللہ بیان کرتے ہیں کہ جن دنوں حجاج نے حضرت ابن الزبیر پر مکہ میں حملہ کیا ہوا تھا' ان دنوں میں حضرت ابن عمر نے حج کا ارادہ کیا' ان کے بیٹوں نے منع کیا کہ اس سال آپ حج نہ کریں' ہمیں خدشہ ہے کہ آپ کو بیت اللہ جانے سے روک دیا جائے گا' حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے' آپ کے اور بیت اللہ کے درمیان کفار حائل ہو گئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قربانی کی اونٹنی کو نحر کیا اور اپنا سر مونڈ لیا اور میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے اپنے اوپر عمرہ لازم کر لیا ہے' میں ان شاء اللہ روانہ ہوں گا' اگر کوئی رکاوٹ نہ ہوئی تو میں عمرہ کروں گا اور اگر کوئی رکاوٹ پیش آئی تو میں اس طرح کروں گا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا' پھر انہوں نے عمرہ کا احرام باندھا' پھر کچھ دور چل کر کہا: احصار میں عمرہ اور حج دونوں برابر ہیں' میں عمرہ کے ساتھ حج کی نیت کرتا ہوں' پھر یوم نحر کو قربانی کر کے وہ حلال ہو گئے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۴۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

ہر چند کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو احصار پیش آیا تھا' وہ دشمن کی وجہ سے تھا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض کی وجہ سے رکاوٹ کا بھی یہی حل بیان فرمایا ہے اس لیے دلائل شرعیہ کی قوت' یسر' ہمہ گیری اور معقولیت کے اعتبار سے ائمہ ثلاثہ کے موقف کی بہ نسبت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک راجح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو اگر تم کو (حج یا عمرہ سے) روک دیا جائے تو جو قربانی تم کو آسانی سے حاصل ہو وہ بھیج دو اور جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے اس وقت تک اپنے سروں کو نہ منڈواؤ۔ (البقرہ: ۱۹۶)

محصر کے لیے قربانی کی جگہ کے تعین میں امام ابو حنیفہ کا مسلک

امام ابو حنیفہ کے نزدیک جو شخص راستہ میں مرض یا دشمن کی وجہ سے رک جائے وہ کسی اور شخص کے ہاتھ قربانی (اونٹ' گائے یا بکری) یا اس کی قیمت بھیج دے اور ایک دن مقرر کر لے کہ فلاں دن اس قربانی کو حرم میں ذبح کیا جائے گا اور اس دن وہ اپنا احرام کھول دے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس وقت تک سر نہ منڈواؤ جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے' اور قربانی کی جگہ حرم ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جس جگہ کسی شخص کو رک جانا پڑے وہیں قربانی کر کے احرام کھول دے' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیبیہ میں رک جانا پڑا تھا اور آپ نے حدیبیہ میں ہی قربانی کی' اور امام بخاری نے لکھا ہے کہ حدیبیہ حرم سے خارج ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۴۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ بدر الدین عینی اس دلیل کے جواب میں فرماتے ہیں کہ حدیبیہ کا بعض حصہ حرم سے خارج ہے اور بعض حصہ حرم میں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے جس حصہ میں رکے تھے وہ حرم میں تھا' اس کی دلیل یہ ہے کہ امام ابن ابی شیبہ نے ابو عمیس سے روایت کیا ہے کہ عطاء نے کہا ہے کہ حدیبیہ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام حرم میں تھا۔

(عمدۃ القاری ج ۱۰ ص ۱۴۹ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

علامہ ابو حیان اندلسی لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس جگہ روک دیا گیا تھا آپ نے وہیں قربانی کی تھی' وہ جگہ حدیبیہ کی ایک طرف تھی جس کا

نام الربی ہے اور یہ اسفل مکہ میں ہے اور وہ حرم ہے' زہری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اونٹ کو حرم میں نحر کیا تھا' واقدی نے کہا: حدیبیہ مکہ سے نو میل کے فاصلہ پر طرف حرم میں ہے۔

(البحر المحیط ج ۲ ص ۲۵۷' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۲ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حتیٰ کہ قربانی اپنے محل میں پہنچ جائے۔ (البقرہ: ۱۹۶)

محصر کے لیے قربانی کی جگہ کے تعین میں ائمہ ثلاثہ کا مذہب

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں:

محل کے متعلق دو قول ہیں' ایک یہ کہ اس سے مراد حرم ہے' حضرت ابن مسعود' حسن بصری' عطاء' طاؤس' مجاہد' ابن سیرین' ثوری اور امام ابوحنیفہ کا یہی مذہب ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ جگہ ہے جس جگہ محرم کو رکاوٹ پیش آئی' وہ اس جگہ قربانی کا جانور ذبح کر کے احرام کھول دے' امام مالک' امام شافعی اور امام احمد کا یہی مذہب ہے۔

(زاد المسیر ج ۱ ص ۲۰۵' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ ماوردی شافعی [1] اور علامہ ابن العربی [2] مالکی نے بھی یہی لکھا ہے۔

قوت دلائل کے اعتبار سے ابوحنیفہ کا مسلک راجح ہے اور یسر اور سہولت کے اعتبار سے ائمہ ثلاثہ کا مسلک راجح ہے کیونکہ بیمار یا دشمن میں گھرے ہوئے آدمی کے لیے اس وقت تک انتظار کرنا جب تک قربانی حرم میں ذبح ہو بہت مشکل اور دشوار ہوگا' اس کے برعکس موضع احصار میں قربانی کر کے احرام کھول دینے میں اس کے لیے بہت آسانی ہے' جب کہ اس طریقہ کو محصر کی آسانی ہی کے لیے مشروع کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو وہ اس کے بدلہ میں روزے رکھے یا کچھ صدقہ دے یا قربانی کرے۔ (البقرہ: ۱۹۶)

ضرورت کی وجہ سے منٰی میں پہنچنے سے پہلے سر منڈانے کی رخصت

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

عبداللہ بن معقل بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کے پاس مسجد کوفہ میں بیٹھا ہوا تھا' میں نے ان سے روزہ کے فدیہ کے متعلق سوال کیا' انہوں نے کہا: مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جایا گیا درآں حالیکہ میرے منہ پر جوئیں ٹپک رہی تھیں' آپ نے فرمایا: میں تم پر کیسی مصیبت دیکھ رہا ہوں' کیا تمہارے پاس (قربانی کے لیے) ایک بکری نہیں ہے؟ میں نے کہا: نہیں' آپ نے فرمایا: تین دن کے روزے رکھو یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ' ہر مسکین کو نصف صاع (دو کلو گرام) طعام (گندم) دو' اور اپنا سر منڈاؤ' یہ آیت خاص میرے متعلق نازل ہوئی ہے لیکن تمہارے لیے بھی عام ہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۴۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

ملا جیون حنفی لکھتے ہیں:

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص مریض ہو اور اس کو فوراً سر منڈانے کی حاجت ہو' یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو مثلاً کوئی زخم ہو یا جوئیں ہوں' تو پھر اس کے لیے منٰی پہنچنے اور قربانی کرنے تک سر منڈانے کو موقوف کرنا ضروری نہیں

[1] علامہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب شافعی ماوردی بصری متوفی ۴۵۰ھ' النکت والعیون ج ۱ ص ۲۵۵' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت

[2] علامہ ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی مالکی متوفی ۵۴۳ھ' احکام القرآن ج ۱ ص ۱۷۶' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۰۸ھ

ہے البتہ سر منڈانے کے بعد اس پر فدیہ دینا واجب ہوگا' قربانی کرے' تین دن کے روزے رکھے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ قربانی کو حرم میں ذبح کرنا ضروری ہے اور روزہ رکھنا یا مسکینوں کو کھانا کھلانا حرم میں ضروری نہیں ہے۔

(تفسیرات احمدیہ ص ۸۸ مطبوعہ مطبع کریمی' بمبئی)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو جب تم حالت امن میں ہو تو جو شخص حج کے ساتھ عمرہ ملائے تو وہ ایک قربانی کرے جس کو وہ آسانی کے ساتھ کر سکے' اور جو قربانی نہ کر سکے وہ تین روزے ایام حج میں رکھے اور سات روزے جب تم لوٹ آؤ' یہ کامل دس (روزے) ہیں یہ (حج تمتع کا) حکم اس شخص کے لیے جس کے اہل و عیال مسجد حرام (مکہ مکرمہ) کے رہنے والے نہ ہوں۔

(البقرہ: ۱۹۶)

حج تمتع کا بیان

اس آیت کی ایک تفسیر تو یہی ہے کہ اس آیت میں زمانہ امن میں حج تمتع کا بیان فرمایا ہے' دوسری تفسیر یہ ہے کہ اے مسلمانو! اگر تم سفر حج میں روک دیئے جاؤ تو تم کو جو قربانی سہولت سے حاصل ہو وہ قربانی کر کے احرام کھول دو' اور جب تم سے دشمن کا خوف جاتا رہے یا مرض دور ہو جائے اور تم حج کے ساتھ عمرہ ملاؤ تو ایک قربانی کرو جس کو آسانی کے ساتھ کر سکو۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تمتع کیا اور قرآن (اس کے موافق) نازل ہو چکا تھا' پھر ایک شخص نے اپنی رائے سے جو چاہا کہا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۱۳ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس قول میں حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی طرف تعریض ہے جو تمتع کرنے سے تنزیہا منع کرتے تھے' اکابر علماء صحابہ نے ان کی مخالفت کی اور اس کا انکار کیا اور حق ان ہی کے ساتھ ہے۔

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حج تمتع کے متعلق سوال کیا گیا' انہوں نے فرمایا: مہاجرین اور انصار اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج اور ہم نے حجۃ الوداع میں احرام باندھا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن لوگوں نے قربانی کے جانوروں کے گلے میں ہار ڈال دیا ہے[1] ان کے سوا باقی لوگ حج کے احرام میں عمرہ کی نیت کر لیں' سو ہم نے بیت اللہ کا طواف کیا' صفا اور مروہ میں سعی کی' اور (احرام کھول کر) اپنی اپنی ازواج سے مقاربت کی اور سلے ہوئے کپڑے پہن لیے' اور جن لوگوں نے اپنی قربانی کے جانوروں میں قلادہ (ہار) ڈال دیا تھا وہ (عمرہ کرنے کے بعد بھی) بہ دستور اپنے احرام پر برقرار رہے' کیونکہ جب تک ان کی قربانی اپنی جگہ پر ذبح نہ ہو جاتی وہ احرام نہیں کھول سکتے تھے' پھر آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم آٹھ ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھ لیں' سو جب ہم عرفات اور مزدلفہ کے وقوف سے فارغ ہو گئے تو ہم نے بیت اللہ میں آ کر طواف (زیارت) کیا' اور صفا اور مروہ میں سعی کی تو ہمارا حج مکمل ہو گیا اور ہم پر ایک قربانی لازم تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: " فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (البقرہ: ۱۹۶) اور ایک بکری کی قربانی کافی ہے" سو ان لوگوں نے ایک سال میں حج اور عمرہ کی دو عبادتیں جمع کر لیں' اس حکم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے اور یہ اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور اس تمتع کو مکہ والوں کے سوا باقی تمام مسلمانوں کے لیے مشروع فرمایا ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي

---

[1] کیونکہ قربانی کے گلے میں ہار ڈالنے سے حج کی نیت ہو گئی اور جنہوں نے ہار نہیں ڈالا تھا ان کی نیت نہیں ہوئی تھی' ان کو آپ نے عمرہ کرنے کی نیت کا حکم دیا۔

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ " (البقرہ: ۱۹۶) اور حج کے جن مہینوں کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے وہ شوال' ذوالقعدہ اور ذوالحجہ ہیں' سو جو شخص ان مہینوں میں تمتع کرے اس پر قربانی لازم ہے یا روزے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۱۲۔ ۲۱۳ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حج کیا وہ حج قران تھا اور یہی سب سے افضل حج ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ

حج کے مہینے معروف ہیں پس جو شخص ان مہینوں میں (حج کی نیت کر کے) حج کو لازم کر لے تو حج میں نہ

وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ

عورتوں سے جماع کی باتیں ہوں' نہ گناہ اور نہ جھگڑا' اور تم جو نیکی کرتے ہو اس کا اللہ

اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ؗ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

کو علم ہے' اور سفر خرچ تیار کرو' اور بہترین سفر خرچ تقویٰ (سوال سے رکنا) ہے' اور اے عقل والو! مجھ ہی سے ڈرتے رہو ○

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ

(حج کے دوران) اپنے رب کا فضل (روزی) تلاش کرنے میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے' اور جب تم

اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠

عرفات سے (مزدلفہ میں) واپس آؤ تو مشعر حرام کے پاس اللہ کو یاد کرو'

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾

اور جس طرح اس نے تم کو ہدایت دی ہے اس طرح اس کا ذکر کرو' اور بے شک اس سے پہلے تم ضرور گمراہوں میں سے تھے ○

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ

پھر تم وہیں سے واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں اور اللہ سے بخشش طلب کرو'

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

بے شک اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے ○

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حج اور عمرہ کو پورا کرنے کا حکم دیا تھا اور عمرہ کا کوئی وقت معین نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے بتلایا کہ حج کا وقت معین ہے اور اس کے مہینے معروف اور مشہور ہیں۔

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

حج کے مہینوں کے متعلق فقہاء امت کے نظریات

حضرت عبد اللہ بن مسعود' حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم' عطاء' طاؤس' مجاہد' زہری' ربیع اور امام مالک کے نزدیک شوال' ذوالقعدہ اور ذوالحجہ پورے کے پورے حج کے مہینے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباس' حضرت عبد اللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم' ابن سیرین' حسن' شعبی' نخعی' قتادہ' مکحول' سدی' امام ابوحنیفہ اور امام مالک سے ایک روایت یہ ہے کہ شوال' ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس دن حج کے مہینے ہیں۔
(البحر المحیط ج ۲ ص ۲۷۷ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

اور امام احمد بن حنبل کا بھی یہی نظریہ ہے۔ (زاد المسیر ج ۱ ص ۲۰۹ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو شخص ان مہینوں میں (حج کی نیت کر کے) حج کو لازم کر لے۔ (البقرہ: ۱۹۷)

فرضیت حج کے سبب میں ائمہ مذاہب کے اقوال

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حج کا احرام باندھ کر تلبیہ پڑھنے سے حج فرض ہو جاتا ہے' عطاء' طاؤس اور صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت نے کہا: حج کی نیت سے تلبیہ پڑھنے سے حج فرض ہو جاتا ہے' امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک حج کی نیت کے ساتھ احرام باندھ کر تلبیہ پڑھنے یا حج کی نیت سے احرام باندھ کر قربانی کے گلے میں قلادہ (ہار) ڈال کر اس کو روانہ کرنے سے حج فرض ہو جاتا ہے' یا حج کی نیت سے احرام باندھ کر اشعار کرنے سے حج فرض ہو جاتا ہے' امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک تلبیہ کے بغیر بھی حج کی نیت کے ساتھ احرام باندھنے سے حج فرض ہو جاتا ہے۔
(البحر المحیط ج ۲ ص ۲۷۹ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

امام احمد بن حنبل نے یہ تصریح کی ہے کہ حج کی نیت سے صرف احرام باندھنے سے حج فرض ہو جاتا ہے خواہ تلبیہ نہ پڑھا جائے۔ (زاد المسیر ج ۱ ص ۲۱۰ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نہ عورتوں سے جماع کی باتیں ہوں' نہ گناہ اور نہ جھگڑا۔ (البقرہ: ۱۹۷)

ایام حج میں فحش باتیں' گناہ اور جھگڑا کرنے کی ممانعت

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما' ابن جبیر' قتادہ' حسن' عکرمہ' مجاہد' زہری اور سدی نے بیان کیا کہ رفث سے مراد یہاں جماع ہے' اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور طاؤس وغیرہم نے کہا: اس سے مراد عورتوں سے فحش کلام کرنا ہے۔ فسق سے مراد ہر قسم کے گناہ ہیں اور جدال سے مراد بحث مباحثہ میں غضب ناک ہونا ہے' یہ حضرت ابن مسعود' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم عطاء اور مجاہد کی رائے ہے' اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: اس سے مراد گالی دینا ہے۔ ابن زید اور امام مالک نے کہا: اس سے مراد اس بات میں اختلاف کرنا ہے کہ کون اپنے باپ دادا کے موقف میں کھڑا ہے' کیونکہ عرب کسی اور کے موقف میں وقوف کرتے' پھر اس میں اختلاف اور بحث کرتے' قاسم نے کہا: یا اس میں اختلاف کریں کہ حج آج ہے یا کل۔
(البحر المحیط ج ۲ ص ۲۸۱۔ ۲۸۰ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

فحش باتیں' فسق اور جھگڑا کرنا ہر وقت اور ہر جگہ ممنوع ہے لیکن یہ ممانعت اس وقت شدید ہے جب انسان بیت اللہ کی زیارت اور اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے دور دراز سے چل کر یہاں آئے' ویسے تو تمام سفر حج میں انسان ان برائیوں میں مجتنب رہے لیکن حج کا احرام باندھنے سے لے کر مناسک حج مکمل ہونے تک جو شخص ان برے کاموں سے بچا رہا اس کا حج' حج مبرور ہے۔

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اس بیت اللہ کا حج کیا اور فحش باتیں نہیں کہیں اور فسق نہیں کیا وہ اپنے گناہوں سے اس دن کی طرح پاک ہو کر نکلے گا جس دن اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ (زاد المسیر ج ۲ ص ۱۹۱ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

ایام حج یا غیر ایام حج میں تم جو کام بھی کرتے ہو خواہ نیک ہو یا بد ان سب کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور سفر خرچ تیار کرو اور بہترین سفر خرچ تقویٰ (سوال سے رکنا) ہے اور اے عقل والو! مجھ ہی سے ڈرتے رہو○ (البقرہ: ۱۹۷)

حج کے لیے سفر خرچ تیار کرنے کا حکم

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اہل یمن حج کرتے تھے اور سفر خرچ تیار نہیں کرتے تھے' اور کہتے تھے کہ ہم توکل کرنے والے ہیں' جب وہ مکہ پہنچتے تو مانگنا شروع کر دیتے' تب یہ آیت نازل ہوئی کہ "سفر خرچ تیار کرو" کیونکہ بہترین سفر خرچ سوال نہ کرنا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۰۶ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے۔ (سنن ابو داؤد ج ۱ ص ۲۴۲ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اس آیت کی یہ تفسیر بھی کی گئی ہے کہ دنیا سے آخرت کی طرف جو سفر ہے اس کے لیے سفر خرچ تیار کرو اور نیک اعمال کرو کیونکہ بہترین سفر خرچ تقویٰ اور خوفِ خدا ہے' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں معنی مراد ہوں' راستہ میں اور قیام حرمین کے دوران کھانے پینے اور سواری کا انتظام کر کے چلو' اور اعمال صالحہ کا زادِ راہ تیار کرو اور عقلِ سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ صرف اللہ ہی سے ڈرو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (حج کے دوران) اپنے رب کا فضل (روزی) تلاش کرنے میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ (البقرہ: ۱۹۸)

حج کے دوران روزی کمانے کا جواز

جب اللہ تعالیٰ نے ایام حج میں جدال (بحث اور تکرار) کرنے سے منع کیا تو یہ وہم پیدا ہوا کہ شاید ایام حج میں تجارت بھی ممنوع ہو کیونکہ اس میں قیمت پر بحث ہوتی ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ عکاظ' مجنہ اور ذوالمجاز زمانہ جاہلیت کے بازار تھے' جب اسلام آیا تو مسلمانوں نے ان بازاروں میں تجارت کرنے کو گناہ سمجھا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ (زمانہ حج میں) اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۷۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے۔ (سنن ابو داؤد ج ۱ ص ۲۴۲ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اس آیت سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ ایام حج میں تجارت کرنا' محنت مزدوری اور ہر جائز طریقہ سے کسب معاش کرنا جائز ہے اور اس سے حج کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

امام عبد الرزاق' امام سعید بن منصور' امام ابن ابی شیبہ' امام عبد بن حمید' امام ابوداؤد' امام ابن جریر' امام ابن المنذر' امام ابن ابی حاتم' امام حاکم اور امام بیہقی روایت کرتے ہیں: ابو امامہ تیمی نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کیا: ہم لوگ

محنت مزدوری کرتے ہیں کیا ہمارے لیے حج کا اجر وثواب ہوگا؟ حضرت عبد اللہ بن عمر نے کہا: کیا تم لوگ بیت اللہ کا طواف نہیں کرتے؟ اور کیا تم اپنے سروں کو نہیں مونڈتے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں' حضرت ابن عمر نے کہا: ایک شخص نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا جو تم نے مجھ سے کیا ہے' آپ نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا حتیٰ کہ جبریل علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے کہ (زمانہ حج میں) اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۲۲۲ ' مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

اگر حج کے دوران ضمناً تجارت یا محنت مزدوری ہو جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن اگر کوئی شخص بالقصد ایام حج میں تجارت کے لیے یا مزدوری کے لیے جائے اور ضمناً حج کر لے تو یہ اخلاص کے منافی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب تم عرفات سے (مزدلفہ میں) آؤ تو مشعر حرام کے پاس اللہ کو یاد کرو اور جس طرح اس نے تم کو ہدایت دی ہے اس طرح اس کا ذکر کرو۔ (البقرہ: ۱۹۸)

مشعر حرام کا بیان

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عرفات کو عرفات اس لیے کہتے ہیں کہ حضرت جبرائیل نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مناسک کی تعلیم دی اور بار بار کہتے: ''عرفت عرفت'' (آپ نے جان لیا' آپ نے جان لیا) تو اس جگہ کا نام میدان عرفات پڑ گیا۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۱۶۷ ' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

مشعر حرام کی تفسیر میں امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ابراہیم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے لوگوں کو مزدلفہ میں ایک پہاڑ کے پاس جمع ہوتے ہوئے دیکھا تو آپ نے کہا: اے لوگو! تمام مزدلفہ مشعر حرام ہے۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۱۶۷ ' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

سدی بیان کرتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیر سے مشعر حرام کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا: دو پہاڑوں کے درمیان جو جگہ ہے وہ مشعر حرام ہے۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۱۶۷ ' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

عمرو بن میمون کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے مشعر حرام کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے اس کو اپنے ساتھ لے جا کر دکھایا کہ عرفات کے بعد جہاں سے مزدلفہ کی ابتداء ہوتی ہے وہاں سے لے کر حرم تک مزدلفہ کی ساری وادی مشعر حرام ہے۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۱۶۸ ' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

مشعر حرام کے پاس ذکر کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی جائے' اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کیا جائے اور اپنے گناہوں پر معافی طلب کی جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر تم وہیں سے واپس آؤ' جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں اور اللہ سے بخشش طلب کرو' بے شک اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے O (البقرہ: ۱۹۹)

نسلی برتری کے تفاخر کا ناجائز ہونا

قریش اور ان کی اولاد حمس[1] کہلاتے تھے اور یہ حج میں عرفات کے بجائے' مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے اور عام لوگوں

[1] حمس: قریش' کنانہ' خزاعہ' ثقیف' جشم' بنو عامر اور بنو نضر کا لقب حمس تھا' کیونکہ یہ لوگ اپنے دین میں بہت متشدد اور سخت تھے' حمس کا لغوی معنی بہادر ہے۔ سعیدی غفرلہٗ

سے اپنے آپ کو منفرد سمجھتے تھے' اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ تم بھی عرفات میں وقوف کر کے پھر مزدلفہ میں آؤ جہاں سے اور لوگ آتے ہیں۔ امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ قریش اور ان کے دین پر چلنے والے حمس تھے' وہ مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے' وہ کہتے تھے: ہم خدام حرم ہیں' اور باقی لوگ عرفات میں وقوف کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۱۶۹' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اور زمانۂ جاہلیت میں تم نے جو مناسک حج میں ترمیم کر دی تھی اس پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو' بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے میں سب برابر ہیں اور رنگ و نسل اور علاقہ اور زبان کی اس میں کوئی خصوصیت نہیں ہے اور کسی شخص کا رنگ و نسل اور علاقہ اور زبان کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور اعلیٰ سمجھنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے' امام احمد نے ابونضرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام تشریق میں فرمایا: سنو! تم سب کا رب ایک ہے' کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر' کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے مگر تقویٰ سے[1] اور جب نسلی برتری کے گھمنڈ پر عبادت میں احساس برتری جائز نہیں ہے تو دنیاوی معاملات میں کب جائز ہوگا' سو بعض سادات کرام کا نسلی برتری کی بنا پر اپنے غیر کفو میں رشتہ دینے کو حرام کہنا جائز نہیں ہے' "شرح صحیح مسلم" جلد سادس میں ہم نے اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اس تفسیر میں بھی ان شاء اللہ النساء: ۳ میں اس مسئلہ کو وضاحت سے بیان کریں گے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ

پھر جب تم حج کی عبادات مکمل کر چکو تو اس طرح اللہ کا ذکر کرو جیسے اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے تھے بلکہ اس

اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا

سے بھی زیادہ کرو' اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں دے اور

لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝۲۰۰ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي

ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے O اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں

الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۲۰۱ اُولٰٓئِكَ

اچھائی عطا فرما اور آخرت میں (بھی) اچھائی عطا فرما' اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا O یہ وہ لوگ ہیں

[1] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۵ ص ۱۵۸' مطبوعہ مکتبہ اسلامی بیروت' ۱۳۹۸ھ

لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّمَّا كَسَبُوۡا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذۡكُرُوا

جن کے لیے ان کی کمائی سے حصہ ہے' اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے O اور گنے چنے

اللّٰهَ فِىۡٓ اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِىۡ يَوۡمَيۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ

دنوں میں اللہ کو یاد کرو' سو جس نے دو دنوں میں (روانہ ہونے کی) جلدی کی تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے'

عَلَيۡهِ ۚ وَمَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

اور جس نے تاخیر کی اس پر (بھی) کوئی حرج نہیں ہے' یہ (حکم) اس کے لیے ہے جو اللہ سے ڈرے' اور اللہ سے ڈرتے رہو'

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾

اور جان لو کہ بے شک تم سب اسی کی طرف جمع کیے جاؤ گے O

زمانہ جاہلیت میں لوگ حج کی عبادات سے فارغ ہونے کے بعد اپنے آباء واجداد کی بڑائی بیان کرتے تھے اور ان کے کارناموں کا ذکر کرتے تھے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد تم اپنے آباء اجداد کی بڑائی بیان کرنے کے بجائے اللہ کی کبریائی اور اس کی عظمتوں کا ذکر کرو اور جتنا اپنے آباء واجداد کا ذکر کرتے تھے اس سے زیادہ اللہ کا ذکر کرو۔ امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ لوگ حج میں اپنے آباء کا ذکر کرتے تھے' بعض کہتے کہ میرا باپ لوگوں کو کھانا کھلاتا تھا' بعض کہتے کہ میرا باپ تلوار کا دھنی تھا' بعض کہتے کہ میرے باپ نے فلاں' فلاں کی گردنیں اڑا دیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں دے اور ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے O (البقرہ: ۲۰۰)

دوزخ سے پناہ اور جنت کی طلب کی دعا کرنا' انبیاء کرام اور صحابہ کا طریقہ ہے

اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے: اے مسلمانو! حج کی عبادات سے فارغ ہو کر زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر کرو اور اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت کی خیر مانگنے میں رغبت کرو' اور اللہ تعالیٰ سے بہت عاجزی اور گڑگڑا کر دعا کرو' خالص اللہ عزوجل کی رضا جوئی کے لیے عبادت کرو اور یہ دعا کرو کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں خیر عطا فرما اور آخرت میں خیر عطا فرما اور ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے آخرت کے بدلہ میں دنیا کی زندگی کو خرید لیا اور وہ صرف دنیا اور اس کی زینت کے لیے عمل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بھی صرف متاع دنیا کا سوال کرتے ہیں' ان کے لیے اجر وثواب میں سے کوئی حصہ نہیں ہے۔ امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ابوبکر بن عیاش بیان کرتے ہیں کہ حج سے فارغ ہو کر لوگ یہ دعا کرتے تھے: اے اللہ! ہمیں اونٹ دے' ہمیں بکریاں دے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ لوگ بیت اللہ کا برہنہ طواف کرتے اور یہ دعا کرتے: اے اللہ! ہم پر بارش نازل کر! اے اللہ! ہمیں ہمارے دشمنوں پر فتح عطا کر۔

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ وہ دنیا میں مدد اور رزق مانگتے تھے اور آخرت کے متعلق کوئی سوال نہیں کرتے تھے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۱۷۴ مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت ۱۴۰۹ھ)

دنیا کی بھلائی سے مراد ہے: عافیت' نیک بیوی' علم' عبادت' پاکیزہ مال' نیک اولاد' صحت' دشمنوں پر فتح' نیک لوگوں کی رفاقت' اسلام پر ثابت قدمی اور ایمان پر خاتمہ اور آخرت کی بھلائی سے مراد جنت' بُرے حساب اور محشر کے خوف سے سلامتی' حورعین اور دیدار الٰہی کی لذت ہے۔

ان آیات میں یہ تصریح ہے کہ حج کی عبادات سے فارغ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے دنیا کی خیر کے لیے اور آخرت کی خیر کے لیے اور اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرنا چاہیے اور دوزخ سے پناہ طلب کرنی چاہیے' ہمارے زمانہ کے جاہل صوفیوں میں یہ مشہور ہے کہ عبادت بے غرض کرنی چاہیے' جنت کی طلب اور دوزخ سے پناہ کی دعا نہیں کرنی چاہیے' وہ کہتے ہیں کہ رابعہ بصریہ ایک ہاتھ میں پانی اور ایک ہاتھ میں آگ لیے جارہی تھیں' کسی نے پوچھا: اے رابعہ! یہ کیا ہے؟ کہا: لوگ جنت کی طلب اور دوزخ کے ڈر سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں' میں چاہتی ہوں کہ جنت کو آگ لگادوں اور دوزخ کی آگ بجھادوں تاکہ جنت کا شوق رہے نہ دوزخ کا خوف اور سب بغیر کسی غرض اور عوض کے اللہ کی عبادت کریں۔

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

بعض جعلی صوفیوں سے منقول ہے کہ ہم اللہ کی عبادت محض اس کی ذات کی وجہ سے کرتے ہیں اور ہم اس سے کسی قسم کی غرض یا کسی عوض کی طلب نہیں رکھتے ان کا یہ قول بہت بڑا جہل ہے اور قریب بہ کفر ہے جیسا کہ امام غزالی نے فرمایا: بغیر غرض کے کوئی کام کرنا یہ اللہ تعالیٰ کے کاموں کا خاصہ ہے' جب کہ بعض علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال بھی کسی حکمت پر مبنی ہوتے ہیں' تو بندہ کے افعال بغیر کسی حکمت اور غرض کے کیسے ہوسکتے ہیں' ہاں بعض اوقات انسان کی توجہ محض اللہ کی رضا کی طرف ہوتی ہے اور وہ جنت کے شوق اور دوزخ کے خوف سے قطع نظر کرکے محض اس کی رضا کے لیے عبادت کرتا ہے لیکن یہ بہت اونچا مقام ہے اور سوائے اس کے مخلصین کے اور کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔

(روح المعانی ج ۲ ص ۹۰ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد فرماتا ہے:

وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ (التوبہ: ۷۲)

اور دائمی رہائش کی جنتیں ہیں اور اللہ کی رضا (ان) سب سے زیادہ بڑی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ (البقرہ: ۲۰۷)

اور بعض (بلند ہمت) لوگ وہ ہیں جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنی جان کا سودا کرلیتے ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مخلصین اور بلند ہمت لوگ جنت کی طلب اور دوزخ سے پناہ کی دعا نہیں کرتے۔ انبیاء کرام اور صحابہ عظام سے زیادہ مخلص اور بلند ہمت اور کون ہوگا' انہوں نے جنت کے حصول کی دعا کی ہے اور دوزخ سے پناہ طلب کی ہے۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا مذکور ہے:

وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۙ (الشعراء: ۸۵)

اور مجھ کو نعمت والی جنت کے وارثوں میں شامل کردے O

خلاف سنت ہے' اور چونکہ شریعت میں اس کا حکم ہے' اس لیے ان شرائط کے بعد ان کا پڑھنا واجب ہوگا۔ امام ابو یوسف نے کہا: اگر امام تکبیر بھول جائے پھر بھی مقتدی پر تکبیر پڑھنا واجب ہے۔ (ھدایہ اولین ص ۱۷۵' مکتبہ شرکت علمیہ ملتان)

ذکر بالجہر میں امام ابو حنیفہ کا موقف

صحیح بخاری' صحیح مسلم اور بہ کثرت احادیث صحیحہ میں فرض نماز کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر بالجہر کرنے کی تصریح ہے' اس لیے امام اعظم ابو حنیفہ سے یہ منصوص نہیں ہے کہ وہ تکبیرات تشریق کو بدعت یا خلاف سنت قرار دیں گے' اور علامہ مرغینانی صاحب ''ھدایہ'' نے کہا ہے کہ امام اعظم نے تکبیرات تشریق میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کو اس لیے اختیار کیا ہے کہ ان کے قول میں تکبیرات کا عدد کم ہے اور چونکہ بلند آواز سے تکبیر کہنا بدعت ہے اس لیے انہوں نے حضرت ابن مسعود کے قول کو اختیار کیا' صاحب ''ھدایہ'' کا یہ استدلال ان کے وہم پر مبنی ہے اور صحیح نہیں ہے' صحیح وجہ یہ ہے کہ اختلافات صحابہ میں عام طور پر امام اعظم حضرت ابن مسعود کے قول کو اختیار کرتے ہیں کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس کی بہ نسبت حضرت ابن مسعود زیادہ فقیہ تھے' اس لیے تکبیرات تشریق میں حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس کی روایات کے مقابلہ میں امام اعظم نے حضرت ابن مسعود کی روایت کو اختیار فرمایا۔

علامہ ابن بزاز کردری حنفی لکھتے ہیں:

بہر حال بلند آواز سے ذکر کرنا جائز ہے جیسے اذان اور خطبہ میں ہے اور تکبیرات تشریق میں امام اعظم اور صاحبین کا اختلاف اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ بلند آواز سے تکبیر پڑھنا بدعت ہے کیونکہ اختلاف اس بات میں ہے کہ اصل نماز پر تکبیرات کی زیادتی کتنی نمازوں میں سنت ہے' مثلاً اس میں اختلاف ہے کہ ظہر کی چار سنتوں کو ایک سلام کے ساتھ پڑھنا اولیٰ ہے یا دو سلاموں کے ساتھ اور یہ اختلاف اس پر دلالت نہیں کرتا کہ اگر ظہر کی سنتوں کو دو سلاموں کے ساتھ پڑھا جائے تو وہ بدعت یا حرام ہوں گی۔ (فتاویٰ بزازیہ علی ہامش الہندیہ ج ۶ ص ۳۷۹' مطبوعہ مطبع کبریٰ امیریہ بولاق مصر)

علامہ علاؤ الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

امام اعظم اور امام ابو یوسف اور امام محمد میں جو تکبیرات کے عدد کا اختلاف ہے اس میں تمام زمانوں اور تمام شہروں میں امام ابو یوسف اور امام محمد کے قول پر عمل کیا گیا ہے' اسی قول پر اعتماد ہے اور اسی قول پر فتویٰ ہے۔

(درمختار علی ہامش ردالمختار ج ۱ ص ۵۶۴' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب امام اعظم اور صاحبین میں اختلاف ہو تو قوت دلیل کا اعتبار ہوتا ہے اور یہی وجہ صحیح ہے جیسا کہ ''الحاوی القدسی'' میں مذکور ہے' یا اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحبین کا قول بھی درحقیقت امام اعظم کا قول ہوتا ہے' علامہ ابن ہمام نے ''فتح القدیر'' میں اس مسئلہ میں امام اعظم کے قول کو ترجیح دی ہے' یہ صحیح نہیں ہے۔ (البحر الرائق)

(ردالمختار ج ۱ ص ۵۶۴' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

نیز علامہ شامی لکھتے ہیں:

''مجتبیٰ'' میں مذکور ہے کہ امام ابو حنیفہ سے کہا گیا کہ اہل کوفہ وغیرہا کو چاہیے کہ ان دس دنوں میں بازاروں اور مسجدوں میں تکبیرات پڑھیں' امام ابو حنیفہ نے فرمایا: ہاں' اور فقیہ ابو اللیث نے ذکر کیا ہے کہ ابراہیم بن یوسف ان جگہوں میں تکبیرات پڑھنے کا حکم دیتے تھے اور فقیہ ابو جعفر نے کہا: میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ عام لوگوں کو تکبیرات پڑھنے سے منع نہیں کرنا چاہیے

کیونکہ عوام کی خیر میں رغبت کم ہوتی ہے اور ہم اسی پر عمل کرتے ہیں۔ اس عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ تکبیرات پڑھنا اولیٰ ہے۔
(ردالمحتار ج ۱ ص ۵۶۳ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ)

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

عید الفطر کی تکبیرات بھی عید الاضحیٰ کی تکبیرات کی طرح ہیں' یہی امام ابو یوسف اور امام محمد کا مسلک ہے اور امام اعظم سے بھی ایک روایت یہی ہے بلکہ "مسند امام اعظم" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ذکر بالجہر کو مطلقاً مستحب قرار دیتے ہیں۔
(روح المعانی ج ۱۲ ص ۱۶۲ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو جس نے دو دنوں میں (روانہ ہونے کی) جلدی کی' تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے اور جس نے تاخیر کی اس پر (بھی) کوئی حرج نہیں ہے۔ (البقرہ: ۲۰۳)

قیام منیٰ کی مدت کا بیان

ملا جیون حنفی لکھتے ہیں:

جو شخص ایام منیٰ میں سے صرف دس اور گیارہ تاریخ کو منیٰ میں' فقط دو دن ٹھہرا اور اس نے دو دن رمی کی اور تیسرے دن رمی نہیں کی اس پر کوئی حرج نہیں ہے' اور جس نے تاخیر کی اور تیسرے دن بھی رمی کی اس پر بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ صاحب "ہدایہ" نے یہ ذکر کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ جائز ہے کہ وہ طلوع فجر سے پہلے چوتھے دن بغیر رمی کے مکہ روانہ ہو جائے اور اگر چوتھے دن کی فجر منیٰ میں طلوع ہو گئی تو وہ رمی کے بغیر مکہ روانہ نہیں ہو سکتا اور افضل یہ ہے کہ وہ چوتھے دن بھی منیٰ میں ٹھہرے اور چوتھے دن کی رمی کر کے مکہ مکرمہ روانہ ہو' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کیا تھا' اور اگر اس نے چوتھے دن زوال سے پہلے رمی کر لی تو یہ بھی امام ابو حنیفہ کے نزدیک جائز ہے کیونکہ جب وہ رمی کو ترک کر سکتا ہے تو اس کو وقت سے پہلے بھی کر سکتا ہے۔ یہ قرآن کریم میں مسائل حج کا آخری عنوان ہے۔
(تفسیرات احمدیہ ص ۹۹۔ ۹۸' مطبوعہ مطبع کریمی' بمبئی)

البقرہ: ۱۹۶ سے لے کر البقرہ: ۲۰۳ تک اللہ تعالیٰ نے مسائل حج سے متعلق آیات نازل کیں اور ان آیات کی تفسیر لکھنے کا حسین اتفاق ایام حج عشرہ ذوالحجہ میں پیش آیا اور تکبیرات کی تفسیر میں نے ایام تشریق میں لکھی اور بارہ ذوالحجہ ۱۴۱۵ھ کو ان آیات کی تفسیر مکمل ہو گئی۔ والحمد لله رب العالمين و الصلوة و السلام على خاتم النبيين و على اله و اصحابه و ازواجه اجمعين. الٰہ العالمین! مجھے باقی قرآن مجید کی تفسیر بھی مکمل کرنے کی توفیق اور سعادت عطا فرما اور اس کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما' اس کو تاقیام قیامت باقی' فیض آفریں اور اشاعت پذیر رکھ' امين يا رب العلمين بجاه حبيبك سيد المرسلين۔

حجاج کرام کے اجر و ثواب اور ان سے مصافحہ کرنے کے متعلق احادیث و آثار

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام ابن ابی شیبہ' شعبی سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ مناسک حج اس لیے بنائے ہیں تاکہ بنو آدم کے گناہوں کا کفارہ ہو جائیں۔ امام بیہقی نے "شعب الایمان" میں روایت کیا ہے کہ حسن بصری سے پوچھا گیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ حج کرنے والا بخش دیا جاتا ہے' انہوں نے کہا: بہ شرطیکہ وہ ان گناہوں کو ترک کر دے جن کو پہلے کرتا تھا۔

امام اصبہانی نے "ترغیب" میں روایت کیا ہے کہ ابراہیم نے کہا کہ حجاج کے گناہوں میں آلودہ ہونے سے پہلے مصافحہ کر
لو۔

امام اصبہانی نے روایت کیا ہے کہ حسن بصری سے پوچھا گیا کہ حج مبرور کی کیا تعریف ہے؟ انہوں نے کہا: وہ حج کرنے کے بعد دنیا سے مستغنی ہو اور آخرت میں راغب ہو۔

امام حاکم نے تصحیح حدیث کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم حج پورا کرلو تو جلد گھر کی طرف روانہ ہو اس سے زیادہ اجر ملے گا۔

امام مالک' امام بخاری' امام مسلم' امام ابوداؤد' امام نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج یا عمرہ سے لوٹنے کے بعد کسی بلند جگہ کھڑے ہو کر تین مرتبہ تکبیر پڑھتے' پھر یہ دعا کرتے: "لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ وھو علی کل شیء قدیر ائبون تائبون عابدون ساجدون لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ"۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۲۳۷' مطبوعہ مکتبہ آیت اللہ العظمیٰ' ایران)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام عرض کرنے اور شفاعت طلب کرنے کے متعلق احادیث اور آثار

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام ابن حبان نے "الضعفاء" میں' امام ابن عدی نے "کامل" میں اور امام دار قطنی نے "العلل" میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے حج کیا اور میری زیارت نہیں کی اس نے مجھ سے بے وفائی کی۔

امام سعید بن منصور' امام ابو یعلیٰ' امام طبرانی' امام ابن عدی' امام بیہقی اور امام ابن عساکر نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے حج کیا اور میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی گویا اس نے میری حیات میں میری زیارت کی۔ (سنن کبریٰ ج ۵ ص ۲۴۶' المعجم الکبیر ج ۱۲ ص ۳۱۰' مجمع الزوائد ج ۴ ص ۲)

امام حکیم ترمذی' امام بزار' امام ابن خزیمہ' امام بن عدی' امام دار قطنی اور امام بیہقی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو گئی۔ (کامل ابن عدی ج ۶ ص ۲۳۵' شعب الایمان ج ۳ ص ۴۹۰' مجمع الزوائد ج ۴ ص ۲' کنز العمال رقم الحدیث: ۴۲۵۸۳)

امام طبرانی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بغیر کسی اور کام کے صرف میری زیارت کے لیے آیا مجھ پر واجب ہے کہ میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں۔
(المعجم الکبیر ج ۱۲ ص ۲۲۵)

امام طیالسی اور امام بیہقی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی میں اس کی شفاعت کروں گا یا شہادت دوں گا' اور جو شخص حرمین میں سے کسی ایک حرم میں فوت ہو گیا وہ قیامت کے دن امن والوں میں سے اٹھے گا۔ (سنن کبریٰ ج ۵ ص ۲۴۵' شعب الایمان ج ۳ ص ۴۹۶)

امام بیہقی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر آکر سلام عرض کرتے اور قبر کو چھوتے نہیں تھے' پھر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی قبر پر سلام عرض کرتے۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں کہ محمد بن منکدر نے کہا کہ میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس روتے ہوئے دیکھا' انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری قبر اور منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۳۶، سنن کبریٰ ج ۵ ص ۲۴۶، کشف الاستار ج ۲ ص ۵۶، کنز العمال ج ۱۲ ص ۲۱۰)

امام ابن ابی الدنیا اور امام بیہقی نے منیب بن عبد اللہ بن ابی امامہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے دیکھا حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر آ کر کھڑے ہوئے اور بڑی دیر تک ہاتھ بلند کیے رہے، حتیٰ کہ میں نے گمان کیا کہ وہ نماز کی نیت کر رہے ہیں، پھر سلام عرض کیا اور چلے گئے۔ (شعب الایمان ج ۳ ص ۴۹۱)

امام بیہقی، حاتم بن مروان سے روایت کرتے ہیں کہ عمر بن عبد العزیز کسی قاصد کو مدینہ میں بھیجتے تا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام عرض کرے۔ (شعب الایمان ج ۳ ص ۴۹۲ - ۴۹۱)

امام بیہقی، ابوحرب ہلالی سے روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے حج کیا، جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے دروازہ پر آیا تو اس نے اپنی اونٹنی کو وہاں باندھ دیا، پھر مسجد میں داخل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں اور باپ فدا ہوں، میں آپ کے پاس اپنے گناہوں اور خطاؤں کے بوجھ تلے دبا ہوا آیا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ”وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ الآیہ“ (النساء: ۶۴) ”اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو آپ کے پاس آ کر اللہ سے استغفار کریں اور رسول بھی ان کی شفاعت کر دیں تو وہ اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا مہربان پائیں گے“ اور میں گناہوں سے بوجھل ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں، آپ اپنے رب کے حضور میری شفاعت کریں کہ وہ میرے گناہوں کو بخش دے اور آپ کی شفاعت کو قبول فرمائے۔

(شعب الایمان ج ۳ ص ۴۹۶ - ۴۹۵) (الدر المنثور ج ۱ ص ۲۳۸ - ۲۳۷ ملتقطاً مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ ایران)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ

اور لوگوں میں سے ایک شخص ایسا ہے جس کی بات آپ کو دنیا کی زندگی میں اچھی لگتی ہے اور

اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى

وہ اپنے دل کے خلوص پر اللہ کو گواہ بناتا ہے، حالانکہ وہ سب سے زیادہ جھگڑالو ہے O اور جب وہ پیٹھ موڑ کر جاتا ہے تو

الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا

اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے اور کھیتوں کو (برباد) اور جانوروں کو ہلاک کرے، اور اللہ

يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ

فساد کو پسند نہیں فرماتا O اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو وہ ضد میں آ کر (اور) گناہ کرتا ہے، سو

فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

اس کے لیے جہنم کافی ہے اور ضرور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے O

دنیا اور آخرت کو برباد کرنے والا

آیات حج میں اللہ تعالیٰ نے اس شخص کا بیان فرمایا تھا جو صرف دنیا میں رغبت کرتا ہے اور صرف دنیا کے حصول کی دعائیں کرتا ہے اور اس شخص کا ذکر فرمایا تھا جو دنیا اور آخرت میں رغبت کرتا ہے اور دونوں کے لیے دعا کرتا ہے' عقلی طور پر یہاں دو قسمیں اور بھی ہیں' ایک وہ شخص جس کی رغبت دنیا میں ہو نہ آخرت میں' ان آیات میں اس شخص کا ذکر ہے' اور دوسری قسم وہ ہے جس کی رغبت صرف آخرت میں ہو اور وہ آخرت کی خاطر دنیا کو چھوڑ دے' ان آیات کے بعد آیت: ۲۰۷ میں اسی شخص کا ذکر آ رہا ہے' پہلے اللہ تعالیٰ نے اس منافق کا ذکر فرمایا جو دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کرتا ہے۔

یہ آیت اخنس بن شریق کے متعلق نازل ہوئی ہے' وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور کہا: میں اسلام لانے کا ارادہ کرتا ہوں' اور قسم کھائی کہ وہ صرف اسی لیے آیا ہے' پھر جب آپ کے پاس سے اٹھا تو باہر جا کر مسلمانوں کے اموال کو تباہ کر دیا' امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

سدی بیان کرتے ہیں کہ اخنس بن شریق ثقفی بنو زہرہ کا حلیف تھا' وہ مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور اسلام کا اظہار کیا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی باتیں اچھی لگیں' اس نے کہا: میں اسلام قبول کرنے کے ارادہ سے آیا ہوں' اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اپنی بات میں سچا ہوں' پھر جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھا تو مسلمانوں کے کھیتوں اور گدھوں کے پاس سے گزرا' اس نے مسلمانوں کے کھیتوں میں آگ لگا دی اور ان کے گدھوں کی کونچیں کاٹ دیں' تب اس کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۱۸۲۔۱۸۱' مطبوعہ دار المعرفہ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

"اَلَدُّ الْخِصَامِ" (سخت جھگڑالو) کا بیان

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

مجاہد نے کہا: جو شخص کج بحث' ہٹ دھرم اور ظالم ہو وہ "الد الخصام" ہے۔

امام احمد' امام بخاری' امام مسلم' امام ترمذی' امام نسائی اور امام بیہقی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے' وہ بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے مبغوض شخص "الد الخصام" (بہت جھگڑا کرنے والا) ہے۔

امام ترمذی اور امام بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے گنہگار ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ تم ہمیشہ جھگڑتے رہو۔

امام بیہقی نے عبدالکریم الجزری سے روایت کیا ہے کہ متقی کبھی جھگڑا نہیں کرتا۔

امام بیہقی نے ابن عمرو بن العلاء سے روایت کیا ہے کہ جب دو شخص جھگڑا کرتے ہیں تو جو زیادہ برا ہوتا ہے وہ غالب آ جاتا ہے۔

امام احمد' حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ تمہارے گناہ کے لیے یہ کافی ہے کہ تم ہمیشہ لڑتے رہو اور تمہارے ظلم کے لیے یہ کافی ہے کہ تم ہمیشہ جھگڑتے رہو اور تمہارے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ تم ہمیشہ باتیں کرتے رہو' ماسوا اس گفتگو کے جو اللہ کے متعلق کی جائے' نیز امام احمد' حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جو بہت باتیں کرتا ہے وہ بہت جھوٹ بولتا ہے اور جو بہت قسمیں کھاتا ہے وہ بہت گناہ کرتا ہے اور جو بہت جھگڑا کرتا ہے اس کا دین سلامت نہیں رہتا۔[1] اس کے بعد فرمایا:

---

[1] حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ' الدر المنثور ج ۱ ص ۲۳۹' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران

اور جب اس منافق سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو اور اللہ کی نافرمانی نہ کرو تو وہ ضد اور تکبر میں آ کر اور بڑھ چڑھ کر فساد کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ

اور لوگوں میں سے ایک شخص ایسا ہے جو اللہ کی رضا جوئی کے بدلہ اپنی جان کو فروخت کر دیتا ہے اور اللہ

رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰۷ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ

بندوں پر بہت مہربان ہے O اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ

كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۲۰۸

اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے O

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

پھر اگر روشن دلیلیں آنے کے بعد بھی تم پھسلنے لگو تو یقین رکھو کہ اللہ بہت غالب

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۰۹ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ

بڑی حکمت والا ہے O وہ صرف اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ (کا عذاب) بادلوں کے سائبانوں میں

مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۲۱۰ ع

اور (عذاب کے) فرشتے ان کے پاس آ جائیں اور کام تمام ہو جائے 'اور اللہ ہی کی طرف تمام امور لوٹائے جاتے ہیں O

رضاء الٰہی کی خاطر دنیا ترک کرنے والا

اس آیت میں باقی ماندہ اقسام میں اس شخص کا بیان ہے جو آخرت کی خاطر دنیا کو ترک کر دیتا ہے اور وہ صرف آخرت میں رغبت رکھتا ہے۔

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام ابن مردویہ نے حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب میں نے مکہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو مجھ سے قریش نے کہا: اے صہیب! جب تم ہمارے پاس آئے تھے تو تمہارے پاس کچھ مال نہ تھا' اور اب تم یہ سارا مال لے کر جا رہے ہو' خدا کی قسم! ہرگز نہیں ہو سکتا' میں نے ان سے کہا: یہ بتاؤ کہ اگر میں اپنا سارا مال تم کو دے دوں تو پھر تم مجھے جانے دو گے؟ انہوں نے کہا: ہاں! میں نے ان سے کہا: یہ سارا مال لے لو اور مجھے جانے دو' جب میں مدینہ پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ فرمایا: صہیب تمہاری تجارت نے نفع پایا۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۲۴۰ - ۲۳۹ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

حافظ ابن عساکر روایت کرتے ہیں:

سعید بن مسیب بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت صہیب ہجرت کر کے مدینہ جانے لگے تو قریش نے ان کا پیچھا کیا' حضرت صہیب سواری سے اتر گئے اور اپنی کمان کو سیدھا کر لیا اور کہا: اے قریش کی جماعت! تم کو معلوم ہے میں تم سب سے بڑا تیرانداز ہوں اور خدا کی قسم! جب تک میرے ترکش میں ایک تیر بھی باقی ہو گا تم مجھ تک نہیں پہنچ سکو گے' پھر جب تک میرے ہاتھ میں تلوار رہے گی میں تم سے مقابلہ کرتا رہوں گا' اب جو چاہو کرو اور اگر تم چاہو تو میں تم کو بتاتا ہوں میرا مال کہاں رکھا ہے بہ شرطیکہ تم میرا راستہ چھوڑ دو' انہوں نے کہا: ہاں! سو انہوں نے ایسا ہی کیا' جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ نے دو مرتبہ فرمایا: تمہاری بیع نفع یاب ہوئی اور یہ آیت نازل ہوئی: اور لوگوں میں سے ایک شخص ہے جو اللہ کی رضا جوئی کے بدلہ میں اپنی جان فروخت کر دیتا ہے۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۱۱ ص ۱۱۷' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

امام ابن جریر روایت کرتے ہیں:

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت صہیب بن سنان اور حضرت ابوذر غفاری جندب بن سکن رضی اللہ عنہما کے متعلق نازل ہوئی ہے' حضرت ابوذر کو ان کے گھر والوں نے پکڑ لیا تھا' وہ ان کی گرفت سے نکل کر بھاگے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو مشرکین مکہ نے پکڑ لیا' وہ فدیہ میں ان کو اپنا مال دے کر ہجرت کے لیے چل پڑے' راستہ میں منقذ بن عمیر بن جدعان نے ان کو پکڑ لیا' وہ اس کو باقی ماندہ مال دے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

ربیع بیان کرتے ہیں کہ مکہ والوں میں سے ایک شخص مسلمان ہو گیا' اس نے ہجرت کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے کا ارادہ کیا' راستہ میں مشرکین نے ان کو پکڑ لیا' انہوں نے کہا: میں تم کو اپنا گھر اور اپنا سارا مال و متاع دیتا ہوں' تم مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے دو' پھر وہ اپنا سب کچھ دے کر مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ راستہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی' انہوں نے کہا: تمہاری بیع نفع بخش ہے' اس میں کوئی گھاٹا نہیں ہے' انہوں نے پوچھا: کیسی بیع؟ کہا: تمہارے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

مغیرہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے ایک لشکر بھیجا۔ لشکر والوں نے ایک قلعہ کا محاصرہ کر لیا' پھر لشکر میں ایک مسلمان نکلا اور قلعہ والوں سے قتال کیا حتیٰ کہ وہ شہید ہو گیا' لوگ کہنے لگے: اس نے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالا ہے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے کہا: نہیں یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی جان دے کر اللہ کی رضا کو خرید لیا ہے۔

حسن بیان کرتے ہیں کہ ایک مسلمان کا کافر سے مقابلہ ہوا' مسلمان نے کافر سے کہا: "لا الٰہ الا اللہ" پڑھو' تم یہ کلمہ پڑھ لو گے تو تمہاری جان اور مال پر حملہ نہیں ہو گا' کافر نے انکار کیا' مسلمان نے کہا: میں اپنی جان کو اللہ کے ہاتھ بیچتا ہوں' یہ کہہ کر اس کافر پر حملہ کیا اور راہِ حق میں شہید ہو گیا۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۱۸۷۔۱۸۶' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ آلوسی نے کواشی کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ آیت حضرت زبیر بن عوام اور حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہما کے متعلق نازل ہوئی ہے' اہل مکہ نے حضرت خبیب کو سولی پر لٹکا دیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو خبیب کو سولی پر سے اتارے گا اس کے لیے جنت ہے' حضرت زبیر نے کہا: میں اور میرا ساتھی مقداد اتاریں گے' اور شیعہ نے کہا: یہ آیت حضرت علی کے متعلق نازل ہوئی ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مکہ میں اپنے بستر پر سلا کر چلے گئے تھے۔

(روح المعانی ج ۲ ص ۹۷' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

یہ تمام آثار اس آیت کے نزول کے متعلق اور مطابق ہیں لیکن درحقیقت یہ آیت ان تمام لوگوں کے حق میں عام ہے جو نیکی کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں اور جو شخص نیکی کی راہ میں مزاحم ہو تو وہ محض اللہ کی رضا کی خاطر اپنی جان اور مال سے اس کے خلاف جہاد کرتے ہیں' وہ خود بھی نیک کام کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی نیکی کی تلقین کرتے ہیں' خود بھی برائی سے بچتے ہیں اور دوسروں کو بھی برائی سے روکتے ہیں اور اس عظیم مقصد کے لیے محض اللہ کی رضا کی خاطر ہر قسم کی جانی اور مالی قربانی دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو۔ (البقرہ: ۲۰۸)

دین اسلام کے ساتھ کسی اور دین کی رعایت یا موافقت کا ناجائز ہونا

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت ثعلبہ' عبداللہ بن سلام' ابن یامین' اسد بن کعب' اسید بن کعب' شعبہ بن عمرو اور قیس بن زید رضی اللہ عنہم کے متعلق نازل ہوئی ہے' یہ سب یہود سے اسلام لائے تھے' انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ہم ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے آپ ہمیں اس دن کی تعظیم کرنے دیں کیونکہ تورات بھی اللہ کی کتاب ہے' اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۱۸۹' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں کے متعلق نازل ہوئی ہے' وہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے اور اونٹنیوں کے گوشت اور ان کے دودھ کو مکروہ جانتے تھے' مسلمانوں نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے کہا: ہم دونوں شریعتوں پر عمل کرنے کی طاقت رکھتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ تورات بھی اللہ کی کتاب ہے' آپ ہمیں اس پر بھی عمل کرنے دیں' تب یہ آیت نازل ہوئی کہ اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ' دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت منافقین کے متعلق نازل ہوئی کہ تم اسلام میں ظاہراً و باطناً داخل ہو جاؤ اور نفاق کر کے شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو' تیسرا قول یہ ہے کہ جو اہل کتاب' کتب سابقہ پر ایمان لائے تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اصل مقصود ان کی شریعت پر اسلام لانا ہے' ان سے خطاب فرمایا گیا ہے کہ تم ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اور دین اسلام میں داخل ہو جاؤ' یہی دین اسلام ہے۔ (روح المعانی ج ۲ ص ۹۷' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ دین اسلام کے ساتھ کسی اور دین اور شریعت کی رعایت یا موافقت کرنا جائز نہیں ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

تم اس حکم کی مخالفت کر کے اور متعدد شریعتوں میں متفرق ہو کر شیطان کی پیروی نہ کرو' بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر اگر روشن دلیلیں آنے کے بعد بھی تم پھسلنے لگو تو یقین رکھو کہ اللہ بہت غالب' بڑی حکمت والا ہے O (البقرہ: ۲۰۹)

بینات کی تفسیر

اگر پہلی آیت میں کفار سے خطاب ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اگر بینات (روشن دلیلیں) آنے کے بعد تم کفر کرو تو یقین کرو کہ اللہ بہت غالب ہے اور اگر اس میں مسلمانوں سے خطاب ہے تو مراد یہ ہے کہ اگر بینات آنے کے بعد تم معصیت کرو' یا خطا کرو یا گمراہی پر رہو تو یقین رکھو کہ اللہ بہت غالب ہے' بڑی حکمت والا ہے۔

بینات سے مراد اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلائل ہیں یا اس سے مراد حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں' اور آپ کو تعظیماً جمع سے تعبیر فرمایا ہے' ہر چند کہ آپ واحد بالشخص ہیں' لیکن آپ معنیً کثیر ہیں یا اس سے مراد قرآن مجید ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ صرف اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ (کا عذاب) بادلوں کے سائبانوں میں اور (عذاب کے) فرشتے ان کے پاس آ جائیں اور کام تمام ہو جائے۔ (البقرہ: ۲۱۰)

بادلوں کے ساتھ عذاب کی تمثیل کا بیان

اس آیت میں فرمایا ہے کہ وہ صرف اللہ کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں اور چونکہ آنا جانا اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں ہے' اس لیے اس کو مجاز پر محمول کیا گیا ہے' ایک معنی یہ ہے کہ وہ اللہ کے انتقام کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں' دوسرا یہ ہے کہ وہ اللہ کی وعید کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں اور بہترین توجیہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے عذاب کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا ہے: اللہ کا عذاب ان کے پاس بادلوں کے سائبانوں میں آ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے بادلوں اور سائبانوں کے ساتھ عذاب کو تشبیہ دی اور اس کی تصویر کشی کی ہے کیونکہ جب گھٹا ٹوپ گھرے بادل مہیب آوازوں کے ساتھ گرج رہے ہوں تو اس سے بہت خوف اور دہشت معلوم ہوتی ہے یا جس طرح بادل قطرہ قطرہ کر کے بے حساب برستے ہیں اسی طرح عذاب بھی بے حساب ہوتا ہے' قرآن مجید میں کئی جگہ عذاب آنے کی مثال بادلوں کے ساتھ دی ہے:

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيلًا○ (الفرقان: ۲۵)
اور جس دن آسمان پھٹ کر بادل کی صورت میں ہو گا اور فرشتوں کی جماعتیں اتاری جائیں گی○

وَإِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ. (لقمان: ۳۲)
اور جب سائبانوں کی طرح موج انہیں ڈھانپ لیتی ہے۔

اور کام تمام ہو جائے' اس سے مراد ہے: ان کے عذاب سے ہلاک ہونے کا کام پورا ہو جائے یا قیامت کا انتظار ختم ہو جائے اور قیامت آ جائے یا ان کا حساب پورا ہو جائے اور ان پر عذاب واجب ہو جائے۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ

بنو اسرائیل سے پوچھیے ہم نے ان کو کتنی نشانیاں دی تھیں؟ اور جو اللہ کی نعمت

نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

حاصل ہونے کے بعد اس کو بدل دے تو (وہ سن لے کہ) اللہ سخت عذاب دینے والا ہے○

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ

کافروں کے لیے دنیا کی زندگی مزین کر دی گئی ہے' وہ ایمان والوں کا مذاق

اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ

اڑاتے ہیں' حالانکہ وہ قیامت کے دن (کافروں سے) سربلند ہوں گے' اور اللہ جسے چاہے بے حساب

وقف لازم

يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۱۲)

روزی دیتا ہے O

بنو اسرائیل کا اللہ کی نعمتوں کو کفر سے تبدیل کرنا

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ وہ صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ بادلوں کے سائبانوں میں اللہ کا عذاب آجائے' بہ ظاہر یہ امر بہت حیران کن تھا' لیکن بنو اسرائیل میں بادلوں کی آیات اور نشانیوں کا کئی بار مشاہدہ کر چکے تھے' جب انہیں مصر سے نکالا گیا تھا اور پہاڑ طور پر وہ ان آیات کا مشاہدہ کر چکے تھے' اس لیے فرمایا: اگر تم کو یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہو تو بنو اسرائیل سے پوچھو ہم ان کو کتنی نشانیاں دے چکے ہیں' وہ اس کا انکار نہیں کر سکتے اور ان آیات کا نازل ہونے کے بعد ان کا سکوت کرنا ان کے اقرار کی دلیل ہے۔ اس آیت کا منشاء یہ ہے کہ مسلمان بنو اسرائیل کی تاریخ پر توجہ کریں' ان کے بادشاہوں' علماء' ان کے بدلتے ہوئے حالات اور ان کے فرقوں میں تقسیم ہونے پر غور کریں اور وہ جس طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرے ہیں ان سے عبرت حاصل کریں۔ اس آیت کا یہ منشا نہیں ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ بنو اسرائیل سے جا کر پوچھیں کہ تم پر اللہ کی کتنی نشانیاں اتر چکی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کو بہت سی نعمتیں عطا فرمائی تھیں جن کو انہوں نے تبدیل کر دیا تھا اور اس کی وجہ سے ان پر طرح طرح کے عذاب آتے رہے' ان کو اللہ تعالیٰ نے تورات عطا کی' انہوں نے اس پر عمل کرنے کے بجائے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا' پھر پہاڑ طور کو ان کے سروں پر معلق کر دیا اور فرمایا: اس کو قبول کرو ورنہ یہ پہاڑ تم پر آگرے گا' ان کو اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کی نعمت عطا کی' انہوں نے اس کا صلہ یہ دیا کہ اللہ کو دیکھے بغیر اس پر ایمان لانے سے انکار کر دیا' سو ایک کڑک نے ان کو ہلاک کر دیا۔ ان پر من وسلویٰ نازل کیا گیا' انہوں نے نافرمانی کر کے اس کو بچا کر رکھنا شروع کیا' نتیجۃً وہ سڑنے لگا' ان سے کہا گیا کہ ''حطة'' کہنا' انہوں نے اس کے بجائے ''حنطة في شعيرة'' کہا' ان سے کہا گیا تھا: شرک نہ کرنا' انہوں نے گوسالہ پرستی کی' ان سے کہا گیا تھا کہ ہفتہ کو مچھلیوں کا شکار نہ کرنا' انہوں نے ہفتہ کے دن مچھلیوں کو حوضوں میں جمع کر لیا جس کی سزا میں ان کو بندر اور خنزیر بنا دیا گیا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ کا قاعدہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی نعمت ملنے کے بعد اس کو بدل دیتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کو سخت عذاب دیتا ہے۔

یہ تو بنو اسرائیل کے آباء و اجداد کو دی ہوئی نعمتوں' ان کی ناشکری اور اس پر ملنے والی سزاؤں کا بیان تھا اور نزول وحی کے زمانہ میں جو بنو اسرائیل تھے انہوں نے اللہ کی جس نعمت کے ساتھ کفر کیا وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ہے۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے '' الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا ''. (ابراہیم: ۲۸) کی تفسیر میں فرمایا: اللہ کی نعمت کو بدلنے والے کفار قریش ہیں اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی نعمت ہیں۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۶۶ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

تمام نعمتوں کی اصل اور نعمت عظمیٰ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مسعود ہے' بنو اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی نعمت عظمیٰ عطا فرمائی لیکن انہوں نے ناشکری کی اور آپ پر ایمان لانے کے بجائے آپ کا کفر کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کافروں کے لیے دنیا کی زندگی مزین کر دی گئی ہے۔ (البقرہ: ۲۱۲)

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو کفر کے ساتھ تبدیل کرنے کا سبب

جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ بنو اسرائیل نے اللہ کی نعمتوں کو کفر کے ساتھ تبدیل کر دیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا کوئی شخص اللہ کی نعمتوں کو کفر کے ساتھ بھی بدل سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کے قبضہ میں جو اس کی پسندیدہ' خوش نما اور دیدہ زیب چیزیں ہوتی ہیں وہ صرف انہی کو دیکھتا ہے' اور دنیا کی زندگی کے ظاہری حسن و جمال اور وقتی فوائد کو دیکھتا ہے اور عقل کی آنکھوں سے ان چیزوں کی باطنی خرابیوں کو نہیں دیکھتا' دنیا کی رنگینیاں اور عیش و آرام انسان کے دل کو لبھاتے ہیں' شیطان نے اللہ تعالیٰ سے کہا تھا:

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (الحجر: ۳۹)

شیطان نے کہا: اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا ہے اس لیے میں ضرور زمین میں ان کے لیے (برے کاموں کو) مزین کر دوں گا اور میں ضرور ضرور ان سب کو گمراہ کر دوں گا ۝

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۭ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ۭ (التوبہ: ۳۷)

جس کو اللہ نے حرام کیا یہ اس کو حلال کرتے ہیں' ان کے برے اعمال مزین کر دیئے گئے۔

تو اللہ کی نعمتوں کا کفر کرنے کا سبب یہ ہے کہ شیطان نے ان کے لیے کفر اور برے اعمال کو مزین کر دیا ہے اور ان کے لیے خوش نما بنا دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ ایمان والوں کا مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ وہ قیامت کے دن (کافروں سے) سر بلند ہوں گے اور اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے ۝ (البقرہ: ۲۱۲)

حضرت بلال' حضرت صہیب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم ایسے فقراء مسلمین کو دیکھ کر کافر ان کا مذاق اڑاتے تھے اور اپنے دنیاوی مال و دولت اور عیش و آرام کی وجہ سے اپنے آپ کو ان سے بلند اور بڑا سمجھتے تھے' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی' کہ قیامت کے دن یہ نیک مسلمان سر بلند ہوں گے اور کفار ذلت کے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ کفار نے کہا: اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہوتے تو ہمارے بڑے بڑے ان کی اتباع کرتے' بہ خدا! ان کی اتباع تو عبداللہ بن مسعود ایسے لوگ کر رہے ہیں۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۱۹۴' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ

تمام لوگ ایک امت تھے (جب وہ مختلف ہو گئے) تو اللہ تعالیٰ نے خوشخبری دینے والے اور

مُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ

ڈرانے والے نبی بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب حق نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان کی

فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ

اختلاف کردہ باتوں میں فیصلہ کریں' اس میں صرف ان ہی لوگوں نے اختلاف کیا تھا جنہیں

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ

کتاب دی گئی تھی' انہوں نے روشن دلائل آنے کے باوجود محض باہمی سرکشی کی وجہ سے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ

یہ اختلاف کیا تھا تو اللہ نے اس اختلاف میں ایمان والوں کو اپنے اذن سے حق بات (دین حق) کی ہدایت دی اور اللہ

يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

جسے چاہے صراط مستقیم کی ہدایت دیتا ہے O

تاریخ انسانیت

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ لوگ دنیا کی محبت کی وجہ سے کفر پر اصرار کرتے ہیں' اب یہ بیان فرمایا ہے کہ کفر اور گمراہی کا یہ سبب نیا نہیں ہے بلکہ پہلے بھی یہی سبب تھا' تمام لوگ پہلے دین حق پر تھے' پھر دنیا کی محبت کی وجہ سے انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف بغاوت کی اور مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

تمام لوگ امت واحدہ تھے اس کا معنی ہے: تمام لوگ دین واحد پر تھے' حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا: یہاں لوگوں سے مراد وہ قرن ہیں جو حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان تھے اور یہ دس قرن ہیں جو دین حق پر رہے' پھر بعد میں ان کے درمیان اختلاف ہوا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو مبعوث فرمایا' ابن ابی خیثمہ نے کہا: اس سے حضرت آدم سے لے کر حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کے قرن مراد ہیں اور یہ پانچ ہزار آٹھ سو سال کے زمانہ پر محیط لوگ ہیں' ایک قول یہ ہے کہ اس سے زیادہ زمانہ کے لوگ ہیں' حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان بارہ سو سال گزرے' حضرت آدم نو سو ساٹھ سال زندہ رہے' ان کے زمانہ میں تمام لوگ ایک دین پر تھے' فرشتے ان سے مصافحہ کرتے تھے' پھر حضرت ادریس علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد ان میں اختلاف ہوا' لیکن اس قول پر یہ اعتراض ہے کہ حضرت ادریس' حضرت نوح علیہ السلام کے بعد مبعوث ہوئے تھے' کلبی اور واقدی نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی کشتی کے لوگ ہیں' یہ تمام لوگ دین حق پر تھے' حضرت نوح کی وفات کے بعد ان میں اختلاف ہو گیا۔

(الجامع الاحکام القرآن ج ۳ ص ۳۱۔ ۳۰' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

حضرت ابن عباس کی تفسیر یہ ہے کہ تمام لوگ امت واحدہ تھے یعنی تمام لوگ کافر تھے' اور حضرت ابن مسعود کی قراءت سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ پہلے تمام لوگ دین حق پر تھے' بعد میں انہوں نے مختلف دنیاوی اغراض کی بناء پر ایک دوسرے سے اختلاف کیا اور بغاوت کی' تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے انبیاء اور رسل بھیجے' ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کل نبیوں کی

تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور ان میں تین سو تیرہ رسول ہیں۔ محققین کے نزدیک اس آیت کی صحیح تفسیر یہی ہے کہ پہلے تمام لوگ دین حق پر تھے بعد میں ان کے درمیان اختلاف ہوا اور اس پر حسب ذیل دلائل ہیں:

ابتداء میں نوع انسان کے دین حق پر ہونے کے دلائل

(۱) اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ پہلے تمام لوگ ایک دین پر تھے پھر ان میں اختلاف ہوا تو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بھیجا۔ اگر وہ تمام لوگ کفر پر تھے تو رسولوں کو پہلے بھیجنا چاہیے تھا۔

(۲) نقل متواتر سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو ان کی اولاد کی طرف مبعوث فرمایا۔ ان کی تمام اولاد مسلمان اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزار تھی اور اس وقت تک ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوا حتیٰ کہ قابیل نے حسد سے ہابیل کو قتل کر دیا۔

(۳) جب طوفان سے تمام روئے زمین کے لوگ غرق ہو گئے اور صرف کشتی کے لوگ بچے یہ باقی ماندہ لوگ سب دین حق پر تھے پھر اس کے بعد ان میں اختلاف ہوئے۔

(۴) امام بخاری حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر مولود فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی بنا دیتے ہیں یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ الحدیث (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۸۱ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اگر کسی بچہ کو اس کی اصلی فطرت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ کسی باطل دین پر نہیں ہوگا کسی باطل دین کو اختیار کرنے کے سبب اس کے والدین کی کوشش ہوتی ہے یا دنیا کی محبت یا حسد بغض اور دیگر اغراض فاسدہ ہوتی ہیں۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے یوم میثاق میں فرمایا تھا: ”اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى . (الاعراف: ۱۷۲) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا: کیوں نہیں!“ اس دن سب لوگوں کا ایک ہی دین تھا اور وہ دین حق تھا۔

تمام انسانوں کا دین صرف اسلام ہے

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام نوع انسان کے لیے ایک ہی دین ہے اور وہ دین اسلام ہے اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں اور رسولوں کو اسی دین کی رہنمائی کے لیے بھیجا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ (الشوریٰ: ۱۳)

اللہ نے تمہارے لیے اسی دین کو مقرر کیا ہے جس دین کی اس نے نوح کو وصیت کی تھی اور جس دین کی ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی ہے اور جس دین کی ہم نے ابراہیم موسیٰ اور عیسیٰ کو وصیت کی تھی کہ تم اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ (آل عمران: ۱۹)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی دین ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ (آل عمران: ۸۵)

اور جس شخص نے اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو طلب کیا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

ان آیات سے واضح ہو گیا کہ حضرت آدم سے لے کر ہمارے رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام نبیوں اور رسولوں کا ایک ہی دین تھا اور وہ دین اسلام ہے' البتہ شریعتیں سب نبیوں کی الگ الگ ہیں' دین سے مراد وہ اصول اور عقائد ہیں جو تمام نبیوں میں مشترک ہیں' جیسے الوہیت' توحید باری' نبوت' تقدیر' وحی' فرشتے' کتب سماویہ' قیامت' حساب و کتاب اور جنت اور دوزخ پر ایمان لانا اور ہر نبی کے زمانہ میں اس زمانہ کے مخصوص حالات' تہذیب اور رسم و رواج کے اعتبار سے عبادت کے جو طریقے مقرر کیے گئے وہ اسی نبی کی شریعت ہیں' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۚ (المائدہ: ۴۸) ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے الگ شریعت اور راہ عمل بنائی ہے۔

زیر بحث آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسانیت کی ابتداء نور اور ہدایت سے ہوئی تھی' پھر لوگوں نے شیطانی راستوں اور نفسانی خواہشوں کی بناء پر اس نور کو ظلمت سے بدل لیا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ

کیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی تک تم پر ایسی آزمائشیں نہیں آئیں جو

خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى

تم سے پہلے لوگوں پر آئی تھیں' ان پر آفتیں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ (اس قدر) جھنجوڑ دیئے گئے کہ

يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ

(اس وقت کے) رسول اور اس کے ساتھ ایمان والے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ سنو! بے شک

اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَاۤ

اللہ کی مدد عنقریب آئے گی ○ یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہیے کہ تم

اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَ

ماں باپ' رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں پر جو اچھی

الْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ

چیز بھی خرچ کرو گے' تو وہ ان کا حق ہے' اور تم جو نیک کام بھی کرو گے تو بے شک اللہ

بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى

کو اس کا علم ہے ○ تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے اور وہ تم پر دشوار ہے اور ہو سکتا ہے کہ

اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ۚ وَعَسٰۤى اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـئًا

تم پر کوئی چیز شاق گزرے اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہارے نزدیک اچھی ہو

وَّهُوَ شَرٌّ لَّـكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ (۲۱۶)

اور وہ تمہارے حق میں بُری ہو اور اللہ ہی کو علم ہے اور تمہیں علم نہیں ہے O

راہِ حق میں پیش آنے والے مصائب

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ جسے چاہے صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے اور صراطِ مستقیم پر چلنے سے جنت حاصل ہوتی ہے اب اللہ تعالیٰ یہ بیان فرما رہا ہے کہ جنت کے حصول کے لیے صراطِ مستقیم پر چلنا آسان نہیں ہے اس راہ میں بہت مشقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور بہت مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں بہت آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے اور بہت قربانیاں دینی پڑتی ہیں

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے   لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

چوں میگویم مسلمانم بلرزم   کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی مخالفت ان کے ساتھ آئے دن کی لڑائیوں ان کے طعنوں استہزاء اور ان کی فتنہ سامانیوں سے گھبرا نہ جانا ابھی تو تمہارا ایسی آزمائشوں سے سابقہ نہیں پڑا ہے جن آزمائشوں سے تم سے پہلے مسلمان گزر چکے ہیں۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اس وقت آپ کعبہ کے سائے میں ایک چادر سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے انہوں نے کہا: آپ ہمارے لیے مدد کیوں نہیں طلب کرتے اور ہمارے لیے دعا کیوں نہیں کرتے؟ آپ نے فرمایا: تم سے پہلی امتوں میں ایک شخص کے لیے زمین میں گڑھا کھودا جاتا اور اس کو گڑھے میں کھڑا کیا جاتا پھر آرے کو اس کے سر پر رکھ کر اس کا سارا جسم چیر دیا جاتا اور یہ چیز اس کو اس کے دین سے نہیں ہٹا سکتی تھی اور کسی شخص کے جسم کو لوہے کی کنگھی سے چھیل دیا جاتا وہ کنگھی اس کے گوشت اور اس کی ہڈیوں کو کاٹتی ہوئی چلی جاتی اور اس کے پائے ثبات میں جنبش نہیں آتی تھی۔ الحدیث (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۰ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۵ ص ۱۱۱۔ ۱۱۰۔ ۱۰۹ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۳۹۸ھ)

اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق متعدد اقوال ہیں بعض نے کہا: یہ ہجرت کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئی بعض نے کہا: جنگ احد کے موقع پر نازل ہوئی امام ابن جریر طبری نے قتادہ کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ یہ آیت جنگ خندق کے موقع پر نازل ہوئی[1] جب ۵ ہجری میں کفار کی متعدد جماعتیں مدینہ پر حملہ آور ہوئیں اور مسلمانوں نے شہر کے گرد خندق کھود کر مدینہ کا دفاع کیا ان دنوں میں سخت سردی پڑ رہی تھی اور مسلمانوں کے پاس ہتھیار اور خوراک کی بہت کمی تھی اور یہود کے تعاون سے مشرکین کے متعدد قبائل نے مرکز اسلام کا محاصرہ کیا ہوا تھا اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب میں اس وقت مسلمانوں کی حالت کا

[1] امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ جامع البیان ج ۲ ص ۱۹۸ مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت ۱۴۰۹ھ

اس طرح نقشہ کھینچا ہے:

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۝ (الاحزاب: ۱۱۔ ۱۰)

جب تمہارے اوپر اور نیچے سے کافر تم پر چڑھ آئے اور جب آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں اور دل منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے متعلق (امید و بیم میں) طرح طرح کے گمان کرنے لگے ۝ یہ وہ وقت تھا جب مسلمانوں کی آزمائش کی گئی تھی اور وہ نہایت سختی سے جھنجھوڑ دیئے گئے تھے ۝

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہیے کہ تم ماں باپ' رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں پر جو اچھی چیز بھی خرچ کرو گے تو وہ ان کا حق ہے۔ (البقرہ: ۲۱۵)

راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کے مصارف

اس سورت میں جن چیزوں کو زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے' جیسا کہ شروع میں فرمایا تھا: ''وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ'' (البقرہ: ۳) پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو بار بار دہرایا اور حج سے متعلق جن آیات کا ابھی ذکر ہوا ہے' ان میں بھی صدقہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے' نیز اس کے بعد آنے والی آیات میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے اور جہاد کا عظیم ستون بھی اللہ کی راہ میں مال کو خرچ کرنا ہے' اس لیے اس آیت میں صدقہ اور خیرات کا ذکر فرمایا ہے' نیز اس سے پہلی آیت میں بتایا تھا کہ مصائب پر صبر کرنا دخول جنت کا سبب ہے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا اور اس خرچ کی وجہ سے مالی نقصان پر صبر کرنا بھی دخول جنت کا سبب ہے۔ بہ ظاہر اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ وہ اللہ کی راہ میں کیا چیز خرچ کریں؟ لیکن سوال کے لائق یہ چیز نہیں تھی کہ وہ کیا خرچ کریں بلکہ سوال اس چیز کا کرنا چاہیے تھا کہ وہ مال کو کس طرح خرچ کریں' اس لیے اللہ تعالیٰ نے جواب میں صدقہ کے مادہ کی بجائے پہلے صدقہ کے مصرف کا بیان فرمایا کہ تمہارے صدقات کے مستحق تمہارے والدین' رشتہ دار' یتیم' مسکین اور مسافر ہیں' اس آیت میں صدقہ کی مقدار کو بیان نہیں فرمایا کیونکہ یہ آیت زکوٰۃ کی فرضیت سے پہلے نازل ہوئی تھی اور جب زکوٰۃ فرض ہوئی تو یہ بیان کر دیا گیا کہ کس قدر مال پر کتنا وقت گزرنے کے بعد کتنی مقدار میں زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے اور اس کے کیا کیا مصارف ہیں' امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں' سدی نے کہا: یہ آیت زکوٰۃ کی فرضیت سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ ابن جریج نے کہا: یہ آیت نفلی صدقات سے متعلق ہے اور زکوٰۃ اس کے علاوہ ہے' ابن زید کا بھی یہی قول ہے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۲۰۰' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

حافظ سیوطی ذکر کرتے ہیں:

امام ابن منذر نے امام ابن حبان سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرو بن جموح نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ہم اپنے مال میں سے کیا چیز خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں تو یہ آیت نازل ہوئی۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۲۴۳' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ ایران)

صدقہ کا مصرف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے صدقہ کا مادہ بیان فرمایا: تم جو ''خیر'' بھی خرچ کرو' اور خیر حلال اور طیب چیز ہوتی ہے' حلال سے مراد یہ ہے کہ وہ چیز فی نفسہٖ حلال ہو جیسے بکری نہ کہ کتا اور خنزیر' اور طیب سے مراد یہ ہے کہ وہ چیز حلال ذرائع سے حاصل ہوئی ہو' یعنی وہ چوری یا ڈاکہ سے حاصل شدہ بکری نہ ہو' اگر وہ چوری یا ڈاکہ سے حاصل شدہ بکری

ہے تو وہ فی نفسہٖ حلال تو ہے لیکن طیب نہیں ہے' اس لیے اللہ کی راہ میں خیر کو خرچ کرو جو حلال اور طیب ہو' اور تم اللہ کی راہ میں جس خیر کو بھی خرچ کرو گے اللہ کو اس کا علم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے اور وہ تم پر دشوار ہے اور ہو سکتا ہے کہ تم پر کوئی چیز شاق گزرے اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہارے نزدیک اچھی ہو اور وہ تمہارے حق میں بُری ہو' اور اللہ ہی کو علم ہے اور تمہیں علم نہیں ہے O (البقرہ: ۲۱۶)

جہاد کی تعریف اور اس کی اقسام

اس سے پہلے آیت: ۲۱۴ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جنت میں داخل ہونے کے لیے سختیاں اور مشقتیں برداشت کرنی پڑیں گی' پھر آیت: ۲۱۵ میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا اور یہ بھی ایک مشقت ہے' اور اب اس آیت میں جہاد کی مزید مشقت برداشت کرنے کا حکم دیا ہے۔ جہاد کا لغوی معنی ہے: اللہ کے دشمنوں سے جنگ کرنے میں اپنی پوری وسعت اور طاقت کو خرچ کرنا' اور جہاد کا شرعی معنی ہے: اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کفار سے جنگ میں اپنی پوری طاقت اور وسعت کو خرچ کرنا۔

جہاد کی دو قسمیں ہیں: فرض عین اور فرض کفایہ' اسلام کی تبلیغ کے لیے کافروں کو اسلام کی دعوت دینا اور اگر وہ اسلام کو قبول نہ کریں تو پھر ان کو جزیہ ادا کرنے کے لیے کہنا اور اگر وہ اس کو بھی قبول نہ کریں تو پھر ان سے جہاد کرنا فرض کفایہ ہے اور اگر کسی اسلامی شہر پر کافر حملہ کریں تو اس شہر کے مسلمانوں پر اپنے شہر کے دفاع کے لیے جہاد کرنا فرض عین ہے اور اگر اس شہر کے مسلمان اپنا دفاع نہ کر سکیں تو اس کے قریب کے شہر والوں پر جہاد کرنا فرض عین ہو جائے گا۔ علیٰ ھذا القیاس اگر ایک اسلامی ملک اپنے دفاع کی استطاعت نہ رکھے تو اس کے قریب کے ملک پر جہاد کرنا فرض عین ہو گا۔

علامہ کاسانی حنفی نے لکھا ہے: اگر جہاد کے لیے روانہ ہونے کا مسلمانوں کو عام حکم دیا جائے تو جہاد فرض عین ہے اور اگر عام حکم نہ ہو تو جہاد فرض کفایہ ہے اور بعض مسلمانوں کے جہاد کرنے سے باقی مسلمانوں سے جہاد کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۹۸' مطبوعہ ایچ۔ ایم۔ سعید اینڈ کمپنی' ۱۴۰۰ھ)

جہاد کرنے میں عزت اور جہاد ترک کرنے میں ذلت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو مکہ میں توحید کا حکم دیا اور نماز پڑھنے کا' زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا اور مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے سے منع کیا' اور جب آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو باقی فرائض نازل ہوئے اور مسلمانوں کو کفار سے جنگ کرنے کی اجازت دے دی گئی' تب یہ آیت نازل ہوئی کہ تم پر قتال (جہاد) فرض کر دیا گیا ہے' اور قتال سے ممانعت کے بعد تم کو قتال کی اجازت دے دی گئی ہے اور اگرچہ یہ طبعاً تم پر گراں اور بھاری ہے لیکن انجام کار تمہارے لیے خیر ہے کیونکہ کافروں کو مغلوب کر کے تم ایک اسلامی ریاست قائم کر سکو گے اور آزادی کے ساتھ باعزت طریقہ سے زندگی گزار سکو گے اور اسلام کے تمام احکام پر بے خوف وخطر عمل کر سکو گے' اور جنگ کے ذریعہ تم کو دشمنوں کا جو مال غنیمت حاصل ہو گا اس سے تم پر خوش حالی آئے گی' اور اگر تم راہِ حق میں شہید ہو گئے' تو تمہارے لیے بے پناہ اجر ہے اور اگر تم کافروں سے جہاد نہیں کرو گے تو وقتی طور پر تمہیں آرام ملے گا لیکن مآل کار تمہارے ملک پر کافر قبضہ کر کے تمہیں آزادی سے محروم کر دیں گے۔ تمہیں اپنا غلام بنالیں گے اور پھر تم کو ذلت اور خواری کی زندگی گزارنی ہو گی۔

جہاد کے درجات اور اجروثواب کے متعلق احادیث

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام احمد' امام بخاری' امام مسلم' امام نسائی' امام ابن ماجہ اور امام بیہقی نے (شعب الایمان میں) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کون سا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا' آپ سے کہا گیا کہ پھر کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد کرنا' آپ سے عرض کیا گیا: پھر کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: حج مبرور۔ امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے افضل عمل نماز کو اس کے وقت میں پڑھنا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔

امام ترمذی' امام بزار' امام حاکم اور امام بیہقی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک شخص کا جنگل میں میٹھے پانی کے ایک چشمہ سے گزر ہوا' اس نے سوچا: کاش میں لوگوں کو چھوڑ کر یہیں رہ جاؤں' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر یہیں آ جاؤں گا' جب اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا: ایسا نہ کرو' ساٹھ سال اپنے گھر میں نماز پڑھنے سے تمہارا ایک وقت اللہ کی راہ میں گزارنا افضل ہے' کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہاری مغفرت کر دے اور تم کو جنت میں داخل کر دے! اللہ کی راہ میں جہاد کرو' جو شخص اونٹنی کا دودھ دوہے جانے کے وقت کے برابر بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے۔

امام طبرانی نے فضالہ بن عبید سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کے تین درجے ہیں: ادنیٰ' اوسط اور اعلیٰ' ادنیٰ درجہ کا اسلام یہ ہے کہ جس میں عام مسلمان ہیں' تم جس سے بھی سوال کرو گے وہ کہے گا: میں مسلمان ہوں' اور اوسط درجہ میں بعض مسلمانوں کے عمل بعض سے افضل ہوتے ہیں اور سب سے اعلیٰ درجہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔

امام بزار نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کے آٹھ حصے ہیں' اسلام (قبول کرنا) ایک حصہ ہے' نماز ایک حصہ ہے' زکوٰۃ ایک حصہ ہے' روزہ ایک حصہ ہے' حج بیت اللہ کا حصہ ہے۔ نیکی کا حکم دینا ایک حصہ ہے' برائی سے روکنا ایک حصہ ہے اور جہاد فی سبیل اللہ ایک حصہ ہے' اور وہ شخص نامراد ہے جس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

امام مسلم' امام ابوداؤد' امام نسائی' امام حاکم اور امام بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص جہاد کرنے کی تمنا کیے بغیر مر گیا وہ نفاق کے ایک حصہ کے ساتھ مرا ہے۔

امام احمد' امام بخاری' امام ترمذی اور امام نسائی نے عبد الرحمان بن جبر ان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے پیر اللہ کی راہ میں غبار آلودہ ہوئے اللہ ان پیروں پر جہنم کی آگ حرام کر دیتا ہے۔

امام حاکم' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ تین آنکھیں ایسی ہیں جن کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی: ایک وہ آنکھ جو اللہ کی راہ میں نکال دی گئی' دوسری وہ آنکھ جو اللہ کی راہ میں جاگتی رہی اور تیسری وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روتی رہی۔

امام عبد الرزاق' امام احمد' امام ابوداؤد' امام ترمذی' امام نسائی' امام ابن ماجہ' امام ابن حبان' امام حاکم اور امام بیہقی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اونٹنی کا دودھ دوہنے کے برابر وقت میں جہاد کیا اس کے لیے جنت واجب ہو گئی اور جس شخص نے صدق دل سے شہادت کے حصول کی دعا کی وہ مر

جائے یا قتل کر دیا جائے اس کو شہادت کا اجر ملے گا' اور جو اللہ کی راہ میں زخمی ہو تو وہ قیامت کے دن اسی طرح زخمی اٹھے گا' اس کے خون کا رنگ زعفران کی طرح ہوگا اور اس سے مشک کی خوشبو آ رہی ہوگی۔

امام مسلم' امام ترمذی اور امام حاکم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کے دروازے تلواروں کے سایوں کے نیچے ہیں۔

امام طبرانی نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جو قوم جہاد کو ترک کر دیتی ہے اللہ اس پر عام عذاب بھیجتا ہے۔ امام بیہقی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب لوگ دنیاداری' روپے پیسے اور کھیتی باڑی میں منہمک ہو جائیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کو ترک کر دیں اور بیع عینہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان پر مصیبتیں نازل فرماتا ہے اور جب تک وہ اپنے دین کی طرف رجوع نہ کریں وہ مصیبتیں ان سے دور نہیں کرتا۔

(الدرالمنثور ج ا ص ۲۳۹۔ ۲۴۲' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ

لوگ آپ سے ماہ حرام میں جنگ کے متعلق پوچھتے ہیں' آپ کہیے کہ اس ماہ میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے اور

كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ق

(لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام جانے سے روکنا

وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ

اور ساکنین حرم کو وہاں سے نکالنا' اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ بڑا گناہ ہے' اور فساد ڈالنے کا گناہ قتل سے زیادہ بڑا ہے'

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ

اور وہ (کافر) تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے' حتیٰ کہ اگر ان کے بس میں ہو تو وہ تمہیں دین سے پھیر دیں'

اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ

اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے مرتد ہو گیا اور وہ حالت کفر میں مر گیا تو ان لوگوں کے

فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ

(نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور وہ لوگ

اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۱۷) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ

جہنمی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے O بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے

هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ

ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا' وہ لوگ اللہ کی رحمت کی امید

اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

رکھتے ہیں اور اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے O

ربط آیات اور شانِ نزول

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر قتال اور جہاد کو فرض کر دینے کے متعلق آیات نازل کی تھیں' اس لیے یہاں اس سوال کی گنجائش تھی کہ آیا حرمت والے مہینے میں بھی قتال جائز ہے یا نہیں؟ ادھر دو ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے احوال پر نظر رکھنے کے لیے حضرت عبداللہ بن جحش کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا تھا۔ اس لشکر میں سے ایک شخص نے عمرو بن حضرمی نام کے ایک مشرک کو قتل کر دیا' مؤرخین کا اس میں اختلاف ہے کہ آپ نے یہ لشکر جمادی الاخریٰ میں بھیجا تھا یا رجب میں' بہر حال عمرو بن حضرمی کا قتل رجب میں ہوا (اور وہ حرمت والا مہینہ ہے) اس پر مشرکین نے مسلمانوں پر اعتراض کیا کہ ایک طرف تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے دین پر عمل کی دعوت دیتے ہیں' ادھر ان کے پیروکاروں کا یہ حال ہے کہ انہوں نے ماہِ حرام میں ایک شخص کو قتل کر دیا' حالانکہ حرمت والے مہینہ میں قتال کرنا ملت ابراہیم کے مطابق حرام ہے' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ یہ لوگ آپ سے ماہِ حرام میں جنگ کے متعلق پوچھتے ہیں' آپ کہیے کہ اس ماہ میں قتال کرنا بڑا گناہ ہے' لیکن لوگوں کو اسلام کے قبول کرنے سے منع کرنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور لوگوں کو مسجد حرام میں جانے سے روکنا اور ساکنین حرم کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کر گناہ ہے' تو جو لوگ ان بڑے گناہوں میں ملوث ہیں وہ کس منہ سے ماہِ حرام میں قتال کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن جحش کے لشکر کی تفصیل امام ابن جریر طبری نے اس طرح بیان کی ہے:

حضرمی کے قتل کی تاریخ کی تحقیق

ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ رجب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو آٹھ مہاجرین کے ساتھ روانہ کیا' اور واقدی کا گمان یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ بارہ مہاجرین کو روانہ کیا تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش کو ایک خط دیا اور فرمایا: دو دن سفر کرنے کے بعد اس خط کو کھول کر پڑھنا اور اس میں درج ہدایات پر عمل کرنا اور کسی کو مجبور نہ کرنا' اس خط میں لکھا تھا کہ تم نخلہ (مکہ اور طائف کے درمیان ایک مقام) پہنچ جاؤ' قریش کا ایک قافلہ وہاں سے گزرے گا' تم اس کی گھات لگا کر بیٹھو اور اس کے احوال کی خبر ہمیں پہنچاؤ' حضرت عبداللہ بن جحش نے خط پڑھ کر اپنے اصحاب کو سنایا' وہ سب بہ خوشی ان کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئے۔ جب وہ معدن میں پہنچے تو حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عتبہ بن غزوان کے اونٹ گم ہو گئے' وہ دونوں اپنے اپنے اونٹوں کی تلاش میں نکل گئے اور حضرت عبداللہ بن جحش اپنے بقیہ اصحاب کے ساتھ نخلہ میں پہنچ گئے' وہاں سے قریش کا ایک تجارتی قافلہ گزرا جس میں خوراک اور دیگر تجارتی سامان تھا' اس قافلہ میں عمرو بن الحضرمی' عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اس کا بھائی نوفل وغیرہ تھے۔ مسلمانوں نے ان کو دیکھ کر انہیں دھمکایا اور اس قافلہ کو روک لیا اور ان کے متعلق غور کیا' اس دن رجب کی آخری تاریخ تھی'

بعض نے کہا: اگر تم نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ حرم میں پہنچ جائیں گے اور تم سے محفوظ ہو جائیں گے اور اگر تم نے ان سے جنگ کی تو تم ماہِ حرام میں جنگ کرنے کا ارتکاب کرو گے۔ وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ ان سے جنگ کی جائے اور جس کو قتل کر سکیں اس کو قتل کر دیں' باقی کو گرفتار کر لیں اور ان کا مال لوٹ لیں' پھر حضرت واقد بن عبد اللہ تمیمی نے تیر مار کر عمرو بن الحضرمی کو قتل کر دیا اور عثمان بن عبد اللہ اور حکم بن کیسان کو گرفتار کر لیا' اور نوفل بن عبد اللہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا' حضرت عبد اللہ بن جحش اس قافلہ کے سامان اور دو قیدیوں کو لے کر اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچ گئے' ان لوگوں نے اس مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے الگ کر لیا تھا اور باقی آپس میں تقسیم کر لیا تھا' یہ اسلام میں پہلا مالِ غنیمت اور پہلا خمس تھا' جب یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ نے فرمایا: میں نے تم کو ماہِ حرام میں قتال کرنے کا حکم نہیں دیا تھا' ان کا قافلہ اور دو قیدی وہاں ٹھہرے رہے' آپ نے اس میں سے کسی چیز کو بھی لینے سے انکار کر دیا' اس وقت ان مسلمانوں کو بہت پشیمانی ہوئی اور دیگر مسلمانوں نے بھی ان کو ملامت کی اور کہا: تم نے وہ کام کیا ہے جس کا تمہیں حکم نہیں دیا گیا تھا' تم نے ماہِ حرام میں قتال کیا حالانکہ تم کو لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا' ادھر قریش نے طعنہ دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے اصحاب نے ماہِ حرام کو حلال کر لیا ہے اور اس ماہ میں خون ریزی کی ہے اور لوٹ مار کی ہے' ادھر یہودیوں نے اس واقعہ کو خوب اچھالا اور کہا: واقد بن عبد اللہ نے جنگ کی آگ بھڑکا دی ہے اور حضرمی کے قتل سے جنگ کی نوبت آ گئی ہے' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ یہ تم سے ماہِ حرام میں قتال کے متعلق دریافت کرتے ہیں' ان سے کہیں کہ یہ گناہ ہے اور اس سے بھی بڑا گناہ وہ ہے جو تم کر رہے ہو' لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے روکتے ہو' اللہ کا کفر کرتے ہو' مسلمانوں کو مسجد حرام جانے نہیں دیتے اور ساکنین حرم کو وہاں سے نکالتے ہو' اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مسلمانوں کا غم دور ہوا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قافلہ اور قیدیوں پر قبضہ کر لیا' قریش نے ان دو قیدیوں کا فدیہ بھیجا' آپ نے فدیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا' ان میں سے حکم بن کیسان مسلمان ہو گئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ منورہ ہی میں رہے حتیٰ کہ بیر معونہ کے واقعہ میں شہید ہو گئے۔ رضی اللہ عنہ (تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۱۲۶۔ ۱۲۴' مطبوعہ دار القلم بیروت)

علامہ ابن اثیر جزری نے بھی اسی طرح اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے' اس کے بعد لکھا ہے کہ ایک قول یہ ہے کہ جس دن حضرمی کو قتل کیا گیا وہ جمادی کا آخری دن تھا اور رجب کی پہلی شب تھی۔

(الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۸۰' مطبوعہ دار الکتاب العربیہ بیروت' ۱۴۰۰ھ)

حافظ ابن کثیر نے ابن اسحاق کے حوالے سے پہلی اور امام احمد اور امام بیہقی کے حوالے سے دوسری روایت لکھی ہے اور لکھا ہے کہ اللہ ہی جانتا ہے کون سی روایت صحیح ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۵۲۔ ۲۴۸' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۳۹۳ھ)

اکثر و بیشتر مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کو مغالطہ ہو گیا تھا' انہوں نے سمجھا کہ یہ جمادی کی آخری تاریخ ہے لیکن درحقیقت وہ رجب کی پہلی تاریخ تھی اور انہوں نے دانستہ ماہ حرام میں قتال نہیں کیا تھا' لیکن قرآن مجید کی اس آیت سے ابن اسحاق کی روایت کی تائید ہوتی ہے کہ انہوں نے دانستہ ماہ حرام میں قتال کیا تھا' تب ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے' یہ فعل گناہ ہے لیکن جو تم کر رہے ہو وہ اس سے بڑھ کر گناہ ہے اور امام ابن جریر طبری اور علامہ جزری وغیرھم نے اسی پر اعتماد کیا ہے۔

حرمت والے مہینوں میں ممانعت قتال کے منسوخ ہونے کی تحقیق

چار مہینوں میں جنگ کرنا حرام ہے: ذوالقعدہ' ذوالحجہ' محرم اور رجب' اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تین مہینوں میں لوگ حج کے لیے اور حج سے واپسی کا سفر کرتے ہیں اور رجب میں عمرہ کا سفر کرتے ہیں' ان مہینوں کو اشہر حرام (حرمت والے مہینے)

کہتے ہیں' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ ہی سے ان مہینوں میں جنگ نہ کرنے کا دستور چلا آ رہا تھا تا کہ لوگ زمانہ امن میں حج اور عمرہ کا سفر کریں' اس میں اختلاف ہے کہ یہ حرمت اب بھی قائم ہے یا منسوخ ہو گئی' جمہور کی رائے یہ ہے کہ یہ حرمت منسوخ ہو گئی اور ان کی دلیل یہ آیت ہے:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ. تم مشرکین کو جہاں پاؤ انہیں قتل کر دو۔

(التوبہ: ۵)

وجہ استدلال یہ ہے کہ اس آیت میں ہر جگہ مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے اور ہر جگہ ان کو قتل کرنے کا عموم اس بات کو مستلزم ہے کہ ہر زمانہ اور ہر وقت میں ان کو قتل کیا جائے اور ہر زمانہ میں حرمت والے مہینے بھی داخل ہیں' لہٰذا ان مہینوں میں بھی مشرکین کو قتل کیا جائے گا' اس سے ظاہر ہوا کہ ان مہینوں میں قتال کرنے کی حرمت اب منسوخ ہو گئی۔

علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ ان مہینوں میں قتال کی حرمت اس سے منسوخ ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ثقیف سے ماہ حرام میں قتال کیا تھا اور آپ نے ماہ حرام میں قتال کے لیے ابو عامر کو اوطاس روانہ کیا تھا۔

عطاء نے کہا ہے کہ یہ حرمت منسوخ نہیں ہوئی' وہ اللہ کی قسم کھا کر کہتے تھے کہ لوگوں کے لیے حرم میں اور حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنا جائز نہیں' الا یہ کہ ان کو مدافعانہ جنگ کرنی پڑے' اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرمت والے مہینوں میں جنگ نہیں کرتے تھے الا یہ کہ آپ سے جنگ کی جائے اور آپ کو مدافعانہ جنگ کرنی پڑے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ان مہینوں میں جنگ کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

اس آیت کا غیر منسوخ ہونا اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ ابن وہب نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرمی کے قتل کی دیت ادا کی اور مال غنیمت اور دونوں قیدیوں کو واپس کر دیا' نیز اس کے بعد جو قتال کی آیات نازل ہوئیں وہ زمانہ کے اعتبار سے عام ہیں اور یہ آیت خاص ہے اور عام خاص کو بالاتفاق منسوخ نہیں کرتا۔

(البحر المحیط ج ۲ ص ۳۸۵ـ ۳۸۴' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۱۲ھ)

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

ہمارے آئمہ احناف کے نزدیک خاص کو عام سے منسوخ کرنا جائز ہے اور حضرت ابن عباس سے اس آیت کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: یہ آیت منسوخ ہے اور ماہ حرام میں قتال کرنا جائز ہے' البتہ عطاء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔

(روح المعانی ج ۲ ص ۱۰۹' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

جمہور کے نزدیک اس آیت کا حکم منسوخ ہے' البتہ عطاء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۳ ص ۴۳' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

علامہ ماوردی شافعی لکھتے ہیں:

زہری نے کہا: حرمت والے مہینوں میں قتال کی ممانعت کا حکم منسوخ ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً. اور تم تمام مشرکوں سے جنگ کرو جس طرح وہ تم سب سے جنگ کرتے ہیں۔

(التوبہ: ۳۶)

اور عطاء نے کہا: یہ حکم منسوخ نہیں ہوا اور پہلا قول صحیح ہے کیونکہ بہ کثرت احادیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن سے حنین میں اور ثقیف سے طائف میں ان مہینوں میں جنگ کی اور آپ نے ابوالعاص (یا ابو عامر) کو اوطاس میں ان مہینوں میں جنگ کے لیے بھیجا اور قریش سے قتال کے لیے بیعت رضوان بھی ذوالقعدہ میں ہوئی تھی۔

(النکت والعیون ج ۱ ص ۲۷۵ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں:

عطاء قسم کھا کر کہتے تھے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی' اور سعید بن مسیب اور سلیمان بن یسار یہ کہتے تھے کہ ماہ حرام میں قتال کرنا جائز ہے وہ سورۂ توبہ: ۱۹ اور توبہ: ۵ سے استدلال کرتے ہیں' جن میں مشرکین سے بالعموم قتال کرنے کا حکم دیا ہے اور تمام شہروں کے فقہاء کا یہی قول ہے۔ (زادالمسیر ج ۱ ص ۲۷۳ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

قاضی ثناء اللہ مظہری کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں ہے' ان کے نزدیک ان مہینوں میں ابتداءً قتال کرنا جائز نہیں ہے' البتہ مدافعانہ جنگ جائز ہے' ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ ۚ (التوبہ: ۳۶)

بے شک اللہ کے نزدیک اس کی کتاب میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے' جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے' ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں' یہی صحیح دین ہے تو ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔

لیکن قاضی مظہری نے اس آیت کے دوسرے حصے پر غور نہیں کیا جس سے جمہور ان مہینوں کی حرمت کے منسوخ ہونے پر استدلال کرتے ہیں' وہ یہ ہے:

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ۚ (التوبہ: ۳۶)

اور تم تمام مشرکوں سے قتال کرو جس طرح وہ تم سے قتال کرتے ہیں۔

قاضی مظہری نے لکھا ہے کہ خاص کا عام سے منسوخ ہونا قطعی نہیں ہے' شوافع کا اس میں اختلاف ہے۔

(تفسیر مظہری ج ۱ ص ۲۴۳۔ ۲۴۱ مطبوعہ بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ)

لیکن انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ شوافع کے نزدیک بھی یہ آیت منسوخ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمت والے مہینوں میں قتال کیا ہے' اس کے معارض انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا محاصرہ شوال میں کیا تھا' لیکن یہ جمہور کے خلاف نہیں ہے کیونکہ جمہور نے یہ کہا ہے کہ طائف اور حنین کی جنگیں شوال سے لے کر ذوالقعدہ کے بعض ایام تک جاری رہیں اور ذوالقعدہ ماہِ حرام ہے۔

امام ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

ہم نے جو کہا ہے کہ سورۂ توبہ: ۳۶ سے یہ آیت منسوخ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بہ کثرت احادیث مشہورہ میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن سے حنین میں اور ثقیف سے طائف میں جنگ کی اور ابو عامر کو مشرکین سے جنگ کے لیے طائف میں بھیجا اور یہ جنگیں شوال اور ذوالقعدہ کے بعض ایام میں ہوئیں' اور ذوالقعدہ ماہ حرام ہے' اگر ان مہینوں میں قتال اور جہاد حرام اور گناہ ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان مہینوں میں قتال نہ کرتے کیونکہ آپ سب سے زیادہ حرام اور معصیت سے اجتناب کرنے والے تھے' دوسری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے تمام جامعین اس پر متفق ہیں کہ قریش کے

خلاف جنگ کرنے کی بیعت رضوان ذوالقعدہ میں منعقد ہوئی تھی' اگر بالفرض حضرت عثمان کو کفار قریش نے قتل کر دیا ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا قصاص لینے کے لیے ان سے ذوالقعدہ میں جنگ کرتے اور وہ ماہ حرام ہے' اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان مہینوں میں قتال کرنا ان مہینوں میں جنگ کو حرام قرار دینے سے پہلے ہے تو وہ جاہل ہوگا کیونکہ زیر بحث آیت جس میں ان مہینوں میں قتال کو بڑا گناہ فرمایا ہے اس وقت نازل ہوئی جب حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ایک مسلمان نے عمرو بن الحضرمی کو قتل کر دیا تھا' اور یہ واقعہ دو ہجری جمادی الآخرۃ کا ہے اور حنین اور طائف کا واقعہ شوال و ذوالقعدہ آٹھ ہجری کو پیش آیا۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۲۰۶ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

ہمارے نزدیک اس بحث میں جمہور کا قول صحیح ہے جن کے نزدیک ان مہینوں میں جنگ کی حرمت منسوخ ہے اور علامہ قاضی مظہری کی رائے صحیح نہیں ہے۔

جب کہ کفار کا مسلمانوں سے قتال کرنا صرف اس لیے تھا کہ ان کو دین حق سے پھیر کر دین باطل پر کر دیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور وہ کافر تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے' حتیٰ کہ اگر ان کے بس میں ہو تو وہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں' اور جب وہ دین باطل پر ہونے کے باوجود تم کو دین سے پھیرنے کی سعی کرتے ہیں تو تم دین حق پر ہونے کی وجہ سے اس بات کے زیادہ حق دار ہو کہ تم ہمیشہ دین حق پر قائم رہو اور ان کو کامیاب نہ ہونے دو' کیونکہ تمہارا اعتماد اللہ پر ہے اور ان کا اعتماد اپنی قوت پر ہے اور جو اپنے آپ پر اعتماد کرے وہ ضائع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ جو شخص کفار کے ڈالے ہوئے شبہات کا شکار ہو گیا اور دین حق سے مرتد ہو گیا اس کا کیا حکم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے مرتد ہو گیا اور وہ حالت کفر میں ہی مر گیا تو ان لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور یہ لوگ جہنمی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ○ (البقرہ: ۲۱۷)

مرتد کی تعریف اور اس کا شرعی حکم

جو مسلمان صاحب عقل ہو' مکلف ہو اور بغیر نیند اور نشہ کے دین اسلام سے منحرف ہو کر کوئی اور دین قبول کر لے وہ مرتد ہے' عام ازیں کہ اس کا کفر کو اختیار کرنا قولاً ہو یا فعلاً' اور عام ازیں کہ اس کا قول سنجیدگی سے ہو یا استہزاءً یا عناداً ہو۔

علامہ شمس الدین سرخسی حنفی لکھتے ہیں:

جب کوئی مسلمان معاذ اللہ مرتد ہو جائے تو اس پر اسلام پیش کیا جائے اور اسلام کے خلاف جو اس کے شبہات ہیں ان کو زائل کیا جائے' اگر وہ مسلمان ہو جائے تو فبہا ورنہ اس کو اسی جگہ قتل کر دیا جائے' البتہ اگر وہ مہلت طلب کرے تو اس کو تین دن کی مہلت دی جائے' حضرت علی' حضرت ابن مسعود' حضرت معاذ وغیرہم سے مروی ہے کہ مرتد کو قتل کرنا واجب ہے۔

(المبسوط ج ۱۰ ص ۹۸ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علامہ ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت معاذ' حضرت ابوموسیٰ' حضرت ابن عباس اور حضرت خالد رضی اللہ عنہم سے مرتد کو قتل کرنے کا حکم منقول ہے اور اس کا انکار نہیں کیا گیا' لہٰذا قتل مرتد پر اجماع ہو گیا۔ (المغنی ج ۹ ص ۱۶ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

قتل مرتد پر قرآن اور سنت سے دلائل

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ (الفتح: ۱۶)

ان پیچھے رہنے والے دیہاتیوں سے آپ فرما دیجئے: عنقریب تم ایک ایسی قوم (مرتدین اہل یمامہ) کی طرف

بلائے جاؤ گے جو سخت جنگجو ہو گی' تم ان سے لڑتے رہو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے۔

اس آیت سے وجہ استدلال یہ ہے کہ مرتدین کے لیے صرف دو راستے ہیں یا ان سے جنگ کی جائے یا وہ مسلمان ہو جائیں' تیسری کوئی صورت نہیں ہے۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اس کو قتل کر دو۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۲۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام ابوداؤد[1]' امام ترمذی[2]' امام نسائی[3]' امام ابن ماجہ[4] اور امام احمد[5] نے بھی روایت کیا ہے۔

امام مالک روایت کرتے ہیں:

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اس کی گردن اڑا دو۔ (موطا امام مالک ص ۶۴۱' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور)

امام عبدالرزاق روایت کرتے ہیں:

حضرت معاویہ بن حیرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے دین کو تبدیل کرے اس کو قتل کر دو۔ (المصنف ج ۱۰ ص ۱۶۸' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۰ھ)

اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں اور اس کو امام ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے۔

(المصنف ج ۱۰ ص ۱۳۹' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ)

مرتدہ کو قتل کرنے کے متعلق مذاہب فقہاء اور فقہاء احناف کے دلائل

علامہ ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ امام احمد' امام مالک' اور امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ مرتد خواہ مرد ہو یا عورت اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اس کو قتل کر دو' اور امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ صحابہ میں سے حضرت علی اور تابعین میں سے حسن بصری اور قتادہ کا یہی موقف ہے' کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کو قتل نہ کرو۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۴) اور جب عورت کو کفر اصلی کی وجہ سے قتل نہیں کیا جاتا تو کفر طاری کی وجہ سے بھی قتل نہیں کیا جائے گا' نیز حضرت ابوبکر نے بنو حنیفہ کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا تھا اور ان میں سے ایک عورت حضرت علی کو دی تھی' جس سے محمد بن حنفیہ پیدا ہوئے اور حضرت ابوبکر نے محضر صحابہ میں یہ کام کیا تھا' اس لیے اس پر اجماع ہو گیا۔ (المغنی ج ۹ ص ۱۶' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

امام دار قطنی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب عورتیں اسلام سے مرتد ہو جائیں تو ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

---

[1] امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ' سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۴۲' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ

[2] امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی ص ۲۳۰' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[3] امام احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ' سنن نسائی ج ۲ ص ۱۶۹' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[4] امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ' سنن ابن ماجہ ص ۱۸۲' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[5] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۱ ص ۲۳۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۲۔ ۷۔ ۲' ج ۵ ص ۲۳۱' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

(سنن دار قطنی ج ۳ ص ۱۱۸ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان)

اس حدیث کو امام محمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (کتاب الآثار ص ۱۲۸ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۴۰۷ھ)

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب عورتیں اسلام سے مرتد ہو جائیں تو ان کو قتل نہیں کیا جائے گا لیکن ان کو قید کیا جائے گا اور ان کو اسلام کی دعوت دی جائے گی۔ امام ابن ابی شیبہ نے عطاء اور حسن سے بھی اس قول کو روایت کیا ہے۔

کیا مرتد کو قتل کرنا آزادی فکر کے خلاف ہے؟

بعض مخالفین اسلام اور مستشرقین قتل مرتد کے حکم پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ حکم آزادی فکر اور حریت اعتقاد کے خلاف ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے فکر کو علی الاطلاق اور بے لگام نہیں چھوڑا' مثلاً اگر کسی شخص کا یہ نظریہ ہو کہ زنا کرنا اور چوری کرنا درست ہے تو کیا اس کو مسلمانوں کی لڑکیوں سے بدکاری کرنے اور اموال چرانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے گا؟ اور اگر کسی کا یہ نظریہ ہو کہ قتل کرنا درست ہے تو اس کو قتل کرنے کے لیے بے مہار چھوڑ دیا جائے گا؟ اور اگر ان اخلاقی مجرموں کو سزا دی جائے تو کیا یہ آزادی فکر اور حریت اعتقاد کے خلاف ہوگا؟

تمام دنیا کے ملکوں میں یہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی شخص حکومت وقت کے خلاف بغاوت کرے اور حکومت کو الٹنے اور انقلاب کے پروگرام بنائے تو ایسے شخص کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے' پھر کیا ایسے شخص کو موت کی سزا دینا آزادی فکر اور حریت اعتقاد کے خلاف نہیں ہے؟ جب کہ تمام دنیا میں باغیوں اور ملک کے غداروں کو موت کی سزا دی جاتی ہے اور جب ملک کے غدار کو موت کی سزا دینا حریت فکر اور آزادی رائے کے خلاف نہیں ہے تو دین کے غدار کو موت کی سزا دینا کیونکر آزادی رائے کے خلاف ہو سکتا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انصاف اور امن کے لیے آزادی رائے اور حریت فکر کو بے لگام اور بے مہار نہیں چھوڑا جا سکتا' ورنہ کسی کی جان' مال' عزت اور آبرو کا کوئی تحفظ نہیں ہوگا' اس لیے ضروری ہے کہ فکر اور اعتقاد کے لیے حدود اور قیود مقرر کی جائیں اور ان حدود کا تقرر یا عقل محض سے ہوگا یا وحی الٰہی سے' اگر ان حدود کا تقرر عقل محض سے کیا جائے تو ان حدود میں غلطی' خطاء' ظلم اور جور کا امکان ہے' اس لیے ان حدود اور قیود میں وحی پر اعتماد کرنا ہوگا اور یہ وحی الٰہی ہے جس نے مرتد کی سزا قتل کرنا بیان کی ہے' جیسا کہ ہم قرآن مجید' احادیث صریحہ' اور آثار صحابہ وتابعین سے واضح کر چکے ہیں۔

بعض مستشرقین کہتے ہیں کہ مرتد کو قتل کی سزا دینا خود قرآن مجید کے خلاف ہے' کیونکہ قرآن مجید میں ہے: "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ. (البقرہ: ۲۵۶) دین (قبول کرنے) میں جبر نہیں ہے"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت کافر اصلی کے متعلق ہے یعنی جو ابتداءً کافر ہو' مرتد کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ پوری آیت اس طرح ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ. (البقرہ: ۲۵۶)

دین (قبول کرنے) میں جبر نہیں ہے' ہدایت گمراہی سے خوب واضح ہو چکی ہے' جو شخص شیطان کے حکم کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو بے شک اس نے ایسا مضبوط دستہ تھام لیا جو کبھی نہیں ٹوٹے گا۔

ارتداد سے نیک عمل ضائع ہونے کے متعلق مذاہب فقہاء

امام شافعی کے نزدیک ارتداد سے نیک عمل اس وقت تک باطل نہیں ہوتے جب تک اس شخص کی موت ارتداد پر نہ ہو' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے مرتد ہو گیا اور وہ حالت کفر میں مر گیا تو ان لوگوں کے نیک

اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے' لہٰذا ایک شخص نے وضو کیا اور وہ معاذ اللہ مرتد ہو گیا' پھر وضو ٹوٹنے سے پہلے وہ مسلمان ہو گیا تو وہ اس وضو سے نماز پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے حج کر لیا اور پھر وہ مرتد ہو گیا اور دوبارہ پھر مسلمان ہو گیا تو اب اگر وہ صاحب استطاعت ہے تو اس پر دوبارہ حج فرض نہیں ہو گا' اسی طرح اگر کوئی صحابی العیاذ باللہ مرتد ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد دوبارہ مسلمان ہو گیا تو وہ بدستور صحابی ہے' اور امام ابوحنیفہ' امام مالک اور امام احمد کے نزدیک صرف ارتداد سے نیک عمل ضائع ہو جاتے ہیں' لہٰذا اگر کسی شخص نے وضو کیا اور مرتد ہو گیا تو اس کا وضو ٹوٹ گیا' اگر اس نے حج کیا تھا تو وہ ضائع ہو گیا اور مسلمان ہونے کے بعد صاحب استطاعت ہونے کے بعد اس پر از سر نو حج اسلام فرض ہو گا' اسی طرح جو صحابی العیاذ باللہ مرتد ہو گیا تو اس کا شرف صحابیت باطل ہو گیا' اب اگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مسلمان ہوا ہے تو وہ تابعی کہلائے گا صحابی نہیں ہو گا۔ ائمہ ثلاثہ کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں دو جرم اور دو سزائیں بیان کی ہیں' ایک جرم ہے: مرتد ہونا' دوسرا جرم ہے: تاحیات مرتد رہنا اور ارتداد پر ہی مرنا اور رجوع الی الاسلام نہ کرنا' اور ایک سزا ہے: ان کے نیک اعمال کا ضائع ہونا اور دوسری سزا ہے: ہمیشہ جہنم میں رہنا۔ پہلی سزا کا تعلق پہلے جرم کے ساتھ ہے اور دوسری سزا کا تعلق دوسرے جرم کے ساتھ ہے یعنی مرتد ہونے سے نیک اعمال ضائع ہو جائیں گے اور اگر وہ مرتے دم تک مرتد رہا تو جہنمی ہو گا۔ اب ہم اس چیز کو مفسرین اور فقہاء کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:

نیک اعمال کے ضائع ہونے کے لیے ارتداد کو موت کے ساتھ مقید فرمایا ہے جیسا کہ امام شافعی کا مذہب ہے۔

(انوار التنزیل ص ۱۴۷' دار فراس للنشر والتوزیع' مصر)

قاضی ابوبکر بن العربی مالکی لکھتے ہیں:

ائمہ کا اس میں اختلاف ہے کہ نفس ارتداد سے نیک عمل ضائع ہوتے ہیں یا جب تک ارتداد پر اس کی موت نہ ہو نیک عمل ضائع نہیں ہوتے' امام شافعی کے نزدیک جب تک وہ تادم مرگ مرتد نہ رہے اس کے نیک عمل ضائع نہیں ہوتے اور امام مالک کے نزدیک نفس ارتداد سے نیک عمل ضائع ہو جاتے ہیں۔ ثمرہ اختلاف یہ ہے کہ ایک آدمی نے حج کیا' پھر مرتد ہو گیا' پھر مسلمان ہو گیا تو امام مالک کے نزدیک اس پر دوبارہ حج فرض ہے کیونکہ اس کا حج مرتد ہونے سے باطل ہو گیا اور امام شافعی کے نزدیک اس کا حج باقی ہے ضائع نہیں ہوا اس لیے اس پر دوبارہ حج فرض نہیں ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے:

لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ۔ (الزمر: ۶۵) اگر آپ نے (بہ فرض محال) شرک کیا تو آپ کے (نیک) عمل ضائع ہو جائیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نفس ارتداد سے عمل ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس آیت میں خطاب آپ سے ہے اور مراد آپ کی امت ہے کیونکہ آپ کا مرتد ہونا شرعاً محال ہے۔ شافعی یہ کہتے ہیں: بلکہ اس آیت سے آپ ہی مراد ہیں اور یہ آیت بہ طور تغلیظ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے بلند مرتبہ کے باوجود یہ فرمایا ہے کہ اگر آپ نے بھی شرک کیا تو آپ کے عمل ضائع ہو جائیں گے تو تمہاری کیا حیثیت ہے! (احکام القرآن ج ۱ ص ۲۰۷' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۸ھ)

(اللہ جانے اس تقریر سے امام شافعی کا مدعا کیسے پورا ہو گا۔) ہمارے موقف پر یہ آیات بالکل واضح ہیں:

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۔ اور جس نے ایمان لانے سے انکار کیا تو اس کا (نیک) عمل ضائع ہو گیا۔ (المائدہ: ۵)

وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (الانعام: ۸۸)

اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کے (نیک) اعمال ضائع ہو جاتے ○

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ (الحجرات: ۲)

اے ایمان والو! اس نبی کی آواز پر آواز بلند نہ کرو اور ان کے سامنے بلند آواز سے اس طرح باتیں نہ کرو جس طرح تم ایک دوسرے سے بلند آواز سے باتیں کرتے ہو ورنہ تمہارے (نیک) عمل ضائع ہو جائیں گے اور تمہیں شعور بھی نہیں ہوگا ○

یعنی اگر کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (گستاخانہ لہجہ میں) بلند آواز سے بات کی تو وہ مرتد ہو جائے گا' اس کے نیک عمل ضائع ہو جائیں گے۔ ان تمام آیات میں نیک اعمال ضائع ہونے کا سبب نفس ارتداد کو قرار دیا ہے اور اس کو موت کے ساتھ مقید نہیں فرمایا اور یہ ائمہ ثلاثہ کے مؤقف پر واضح دلیل ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

اگر کوئی مسلمان مرتد ہو گیا تو وہ وضو کے بغیر نماز نہیں پڑھ سکتا خواہ اس نے ارتداد سے پہلے وضو کیا ہو۔ امام ابوحنیفہ' امام مالک اور امام شافعی نے کہا: ارتداد سے اس کا وضو باطل نہیں ہوگا۔ (المغنی ج ۱ ص ۱۱۵ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ ابن قدامہ کو یہاں بیان مذاہب میں تسامح ہوا ہے' امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک بھی اس کا وضو باطل ہو گیا' البتہ امام شافعی کے نزدیک اس کا وضو نہیں ٹوٹتا۔

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

امام شافعی کے نزدیک ارتداد پر موت سے نیک عمل ضائع ہوتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک صرف ارتداد سے نیک عمل ضائع ہو جاتے ہیں۔ ثمرہ اختلاف یہ ہے کہ ایک شخص نے مثلاً ظہر کی نماز پڑھی اور مرتد ہو گیا اور ظہر کا وقت ختم ہونے سے پہلے دوبارہ مسلمان ہو گیا تو امام شافعی کے نزدیک اس پر ظہر کی نماز کا اعادہ نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس پر ظہر کی نماز کا اعادہ ہے کیونکہ ارتداد سے اس کی پہلے پڑھی ہوئی نماز باطل ہو گئی۔ (روح المعانی ج ۲ ص ۱۱۱ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے ○ (البقرہ: ۲۱۸)

دارالاسلام' دارالکفر' اور دارالحرب کی تعریفات

پہلے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا بیان فرمایا تھا جن کے لیے قطعی طور پر جہنم ہے' اب ان لوگوں کا بیان فرما رہا ہے جو جنت کی امید رکھنے کے حق دار ہیں۔ مسلمانوں پر پہلے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا فرض تھا اور فتح مکہ کے بعد یہ ہجرت منسوخ ہو گئی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے لیکن جہاد اور نیت ہے۔[1] البتہ جب کبھی کہیں مکہ جیسے حالات پیدا ہوں جہاں اس کا ایمان' جان' مال اور عزت محفوظ نہ ہو تو اس کے لیے وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے۔ آج کل جس قدر کافر ملک ہیں کسی میں ایسے حالات نہیں ہیں' ہو سکتا ہے اسرائیل میں یہ کیفیت ہو' اس لیے ان ممالک سے ہجرت کرنا واجب نہیں ہے' بلکہ برطانیہ' مغربی جرمنی' کینیڈا' فرانس اور ہالینڈ میں رہنے والے مسلمان پاکستان سے زیادہ مامون اور

[1] امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ' صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۳۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ

محفوظ ہیں' یہ تمام ملک دارالکفر ہیں اور جن ملکوں سے بالفعل حالت جنگ برپا ہو وہ دارالحرب ہیں اور جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اوران میں نظام اسلام جاری کرنے کی اہلیت ہو وہ دارالاسلام ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ

لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں' آپ کہیے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے

وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْـمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ

اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے (بھی) ہیں' اور ان کا گناہ ان کے فائدہ سے زیادہ بڑا ہے' اور یہ آپ سے سوال کرتے ہیں

مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ

کہ کیا چیز خرچ کریں' آپ کہیے کہ جو ضرورت سے زائد ہو' اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱۹ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ

بیان فرماتا ہے تاکہ تم تدبر کرو ○ دنیا اور آخرت کے کاموں میں' اور یہ لوگ آپ سے

عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ

یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں' آپ کہیے کہ ان کی خیر خواہی کرنا بہتر ہے' اور اگر تم اپنا اور ان کا خرچ مشترک رکھو

فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ

(تو کوئی حرج نہیں) وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ کون خیر خواہی کرنے والا ہے اور کون بدخواہی کرنے والا' اور اگر اللہ چاہتا

لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۲۰

تو تم کو ضرور تنگی میں ڈال دیتا' بے شک اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہے ○

قرآن مجید سے خمر (شراب) کی تحریم کا بیان

اس سے پہلی آیت میں جہاد کا بیان کیا گیا تھا اور عربوں میں شراب پینے کا عام رواج تھا اور شراب اور جہاد دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے کیونکہ شراب کے نشہ میں انسان کو اپنے پرائے کی تمیز نہیں رہتی تو ایسا شخص کافروں سے جہاد کب کر سکتا ہے' نیز وہ شراب کے نشہ میں جوا کھیلا کرتے تھے اور جیتی ہوئی رقم غریبوں میں تقسیم کرتے تھے اور بہ ظاہر یہ اچھا کام تھا اس لیے صحابہ نے ان دونوں کا حکم معلوم کیا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ اگرچہ اس میں کچھ لوگوں کا فائدہ ہے' لیکن ان کا نقصان زیادہ ہے کیونکہ شراب کے نشہ سے عقل زائل ہو جاتی ہے اور انسان جھوٹ بولتا ہے اور گالم گلوچ کرتا ہے اور جوئے کے ذریعہ دوسروں کا مال ہتھیا لیتا ہے۔

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

زید بن علی بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خمر (شراب) کے متعلق تین آیتیں نازل کی ہیں ایک یہ آیت ہے (شراب پینے سے وقتی جوش اور ہیجان پیدا ہوتا ہے اور جوئے کے ذریعہ آسانی سے جیتی ہوئی رقم حاصل ہو جاتی ہے اور زمانہ جاہلیت میں یہ رقم غرباء پر خیرات کر دی جاتی تھی ان فوائد کی بناء پر لوگوں نے آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کیا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ اگرچہ ان میں کچھ فائدہ ہے لیکن ان کا نقصان زیادہ ہے) تب لوگوں نے شراب پینے کے معمول کو جاری رکھا حتیٰ کہ دو آدمیوں نے شراب پی کر نماز پڑھی اور نماز میں بدکلامی کی تب یہ آیت نازل ہوئی:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ. (النساء: ۴۳ ـ ۴)

اے ایمان والو! نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب نہ جاؤ' حتیٰ کہ تم یہ جان لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

پھر جو لوگ شراب پیتے تھے وہ نماز کے اوقات میں شراب سے اجتناب کرتے تھے' حتیٰ کہ ایک دن ابو القموص نے نشہ کی حالت میں مقتولین بدر کے نوحہ اور مرثیہ میں چند اشعار پڑھے' جن میں مقتولین بدر کی تعظیم اور تکریم کی' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ خبر پہنچی تو آپ غضب میں گھبرائے ہوئے چادر کو گھسیٹتے ہوئے آئے' جب اس نے آپ کو دیکھا تو آپ نے اس کو مارنے کے لیے کوئی چیز اٹھائی' اس نے کہا: میں اللہ اور اس کے رسول کے غضب سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں' بہ خدا! میں اب کبھی شراب نہیں پیوں گا' تب یہ آیت نازل ہوئی:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۞ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۞ (المائدہ: ۹۰)

اے ایمان والو! خمر (شراب)' جوا' بتوں کے چڑھاووں کی جگہ اور بتوں کے پاس فال نکالنے کے تیر محض ناپاک ہیں' شیطانی کاموں سے ہیں' ان سے اجتناب کرو تاکہ تم فلاح پاؤ ۞ شیطان کا صرف یہ ارادہ ہے کہ وہ شراب اور جوئے کے سبب سے تمہارے درمیان بغض اور عداوت پیدا کر دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے' تو کیا تم باز آنے والے ہو؟ ۞

حضرت عمر نے جب یہ آیت سنی تو کہا: ہم باز آئے' ہم باز آئے!۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۲۱۱' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اس آیت میں شراب کی حرمت پر دس دلیلیں ہیں: (۱) شراب کا ذکر جوئے' بتوں کے چڑھاووں کی جگہ اور بتوں کے پاس فال نکالنے کے تیروں کے ساتھ کیا ہے اور یہ سب حرام ہیں (۲) شراب کو رجس (نجس) فرمایا اور ہر نجس چیز حرام ہے (۳) شراب کو شیطانی کام فرمایا اور شیطانی کام حرام ہیں (۴) شراب پینے سے اجتناب کا حکم دیا' لہٰذا اس سے اجتناب کرنا فرض ہوا اور جس سے اجتناب فرض ہو اس کا ارتکاب حرام ہے (۵) حصول فلاح کو شراب سے اجتناب پر معلق فرمایا' اس لیے اس سے اجتناب فرض اور اس کا ارتکاب حرام ہوا (۶) شراب کے سبب سے شیطان عداوت پیدا کرتا ہے' اور عداوت حرام ہے اور حرام کا سبب بھی حرام ہوتا ہے' لہٰذا شراب حرام ہوئی (۷) شراب کے سبب سے شیطان بغض پیدا کرتا ہے اور بغض حرام ہے (۸) شراب کی تاثیر سے شیطان اللہ کے ذکر سے روکتا ہے اور اللہ کے ذکر سے روکنا حرام ہے (۹) شراب کی تاثیر سے شیطان نماز سے روکتا ہے اور نماز سے روکنا حرام ہے (۱۰) اللہ تعالیٰ نے استفہاماً انتہائی بلیغ ممانعت کرتے ہوئے فرمایا: کیا تم (شراب نوشی سے) باز آنے والے ہو؟

احادیث سے خمر (شراب) کی تحریم کا بیان

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے دنیا میں خمر (شراب) پی وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ زنا کرتے وقت زانی میں ایمان (کامل) نہیں ہوتا اور خمر پیتے وقت شرابی میں ایمان (کامل) نہیں ہوتا اور چوری کرتے وقت چور میں ایمان (کامل) نہیں ہوتا۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۳۶ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابو عبیدہ' حضرت ابوطلحہ اور حضرت ابی بن کعب کو ادھ پکی کھجوروں اور چھواروں کی شراب پلا رہا تھا کہ ایک آنے والے نے کہا: خمر کو حرام کر دیا گیا' تو حضرت ابوطلحہ نے کہا: اے انس! اٹھو اور اس تمام شراب کو انڈیل دو۔

حضرت ابو مالک یا حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو زنا' ریشم' خمر اور آلات موسیقی کو حلال کہیں گے اور عنقریب کچھ لوگ پہاڑ کے دامن میں رہیں گے' جب شام کو وہ اپنے جانوروں کا ریوڑ لے کر لوٹیں گے اور ان کے پاس کوئی فقیر اپنی حاجت لے کر آئے گا تو کہیں گے: کل آنا۔ اللہ تعالیٰ پہاڑ گرا کر ان کو ہلاک کر دے گا' اور دوسرے لوگوں (زنا' شراب اور آلات موسیقی کو حلال کرنے والوں) کو مسخ کر کے قیامت کے دن بندر اور خنزیر بنا دے گا۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۳۷ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عمر نے دعا کی کہ اے اللہ! خمر کے متعلق شافی حکم بیان فرما تو سورۂ بقرہ کی یہ آیت نازل ہوئی: ''یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ'' (البقرہ: ۲۱۹) عمر نے پھر دعا کی تو یہ آیت نازل ہوئی: ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى'' (النساء: ۴۳) تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے نداء کی کہ کوئی شخص نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جائے' عمر نے پھر دعا کی: اے اللہ! خمر کے متعلق شافی حکم نازل فرما تو یہ آیت نازل ہوئی: ''فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝'' (المائدہ: ۹۰) حضرت عمر نے کہا: ہم باز آ گئے۔

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۶۱ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر وہ چیز جو عقل کو ڈھانپ لے وہ خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور جس شخص نے کسی نشہ آور چیز کو پیا اس کی چالیس دن کی نمازیں ناقص ہو جائیں گی۔ اگر اس نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالے گا اور اگر اس نے چوتھی بار شراب پی تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ اس کو طینۃ الخبال سے پلائے۔ پوچھا گیا کہ طینۃ الخبال کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: دوزخیوں کی پیپ۔

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۶۲ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے خمر پر لعنت فرمائی ہے اور خمر پینے والے پر' پلانے والے پر' بیچنے والے پر' خریدنے والے پر' خمر کو (انگوروں سے) نچوڑنے والے پر' اس کو بنانے والے پر' خمر کو لادنے والے پر اور جس کے پاس لاد کر لائی جائے۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۶۱ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص خمر پیے اس کو کوڑے مارو اگر وہ چوتھی بار پیے تو اس کو قتل کردو۔ (جامع ترمذی ص ۲۲۸ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام عبدالرزاق روایت کرتے ہیں:

حسن بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خمر پینے کی بناء پر اسی کوڑے مارے۔

(المصنف ج ۷ ص ۳۷۹ 'مطبوعہ کتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۰ھ)

امام طحاوی روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص خمر پیے اس کو اسی کوڑے مارو۔

(شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۹۱ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۴ھ)

خمر کی تعریف میں ائمہ مذاہب کا نظریہ اور امام ابوحنیفہ کے موقف پر دلائل

امام مالک' امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور اس کے پینے پر حد واجب ہے خواہ قلیل مقدار میں پیے یا کثیر مقدار میں۔ (الجامع الاحکام القرآن ج ۳ ص ۵۲ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کے متعلق شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں:

قرآن مجید نے خمر کو حرام کیا ہے' اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک خمر اس کچے شیرے کا نام ہے جو پڑے پڑے جوش کھانے لگے اور جھاگ چھوڑ دے' اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے: " اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ (یوسف: ۳۶) میں نے خواب میں دیکھا کہ خمر کو نچوڑ رہا ہوں" یعنی انگوروں کو نچوڑ رہا ہوں جو خمر ہو جائیں گے۔ (المبسوط ج ۲۴ ص ۲ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

امام ابوحنیفہ کے نزدیک صرف خمر حرام قطعی ہے' اس کا پینا' پلانا' بیچنا' خریدنا' رکھنا سب حرام قطعی ہے' خمر کے علاوہ تین مشروب اور حرام ہیں: ایک باذق ہے یعنی انگور کا پکا ہوا شیرہ جو پکنے کے بعد ایک تہائی رہ جائے یا جو پڑے پڑے جوش کھانے لگے اور جھاگ چھوڑ دے' دوسرا سکر ہے یعنی تازہ کھجوروں کا کچا شیرہ جب جھاگ چھوڑ دے' تیسرا نقیع الزبیب ہے یعنی کشمش کا کچا شیرہ جو پڑے پڑے جھاگ چھوڑ دے۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۲۹۰ - ۲۸۸ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

ان تینوں مشروبات کی حرمت ظنی ہے اور ان کی نجاست خفیفہ ہے جب کہ نشہ آور مقدار میں پیا جائے اور اس سے کم مقدار میں یہ حرام ہیں نہ نجس۔

علامہ مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

خمر کا ایک قطرہ بھی پی لیا جائے تو حد واجب ہوگی' اور باقی تین شرابوں کے پینے سے اس وقت حد واجب ہوگی جب نشہ ہو جائے۔ (ہدایہ اخیرین ص ۴۹۵ 'مطبوعہ شرکت علمیہ' ملتان)

امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ خمر تو بعینہ حرام ہے اور باقی نشہ آور مشروب اگر مقدار نشہ میں پیے جائیں تو وہ بھی حرام ہیں اور اگر اس سے کم مقدار میں پیے جائیں تو وہ حرام نہیں ہیں اور باقی ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جو مشروب نشہ آور ہو وہ خمر ہو یا کوئی اور مشروب خواہ وہ قلیل مقدار میں پیا جائے یا کثیر مقدار میں وہ بہر حال حرام ہے' امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ حدیث ہے۔

امام ابوحنیفہ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: خمر (مطلقاً) حرام کی گئی ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر اور ہر مشروب میں سے نشہ آور (مقدار) کو حرام کیا گیا ہے۔ (مسند امام اعظم ص ۲۵۴ 'مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی)

امام ابو یوسف نے بھی اس حدیث کو امام ابوحنیفہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ (کتاب الآثار ص ۲۲۸)

امام ابن ابی شیبہ[1] اور امام دار قطنی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ (سنن دار قطنی ج ۴ ص ۲۵۶ 'مطبوعہ نشر السنہ' ملتان)

امام طبرانی تین مختلف اسانید کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: شراب کو بعینہٖ حرام کیا گیا ہے اور ہر مشروب میں سے نشہ آور مقدار کو۔

(معجم کبیر ج ۱۰ ص ۳۳۹۔ ۳۳۸ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ بعض سندوں کے ساتھ یہ حدیث صحیح ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۵ ص ۵۳ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

امام نسائی نے اس حدیث کو چار مختلف سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(سنن نسائی ج ۲ ص ۲۸۹ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام بیہقی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۸ ص ۲۹۷ 'مطبوعہ نشر السنہ' ملتان)

ہم نے اس حدیث کے متعدد طرق اور اسانید اس لیے بیان کیے ہیں تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ جس حدیث پر امام ابوحنیفہ کے مسلک کی بنیاد ہے وہ بہت قوی حدیث ہے اور جس حدیث میں ہے کہ جس مشروب کی کثیر مقدار حرام ہے اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے' یہ حدیث ضعیف ہے' ''شرح صحیح مسلم'' جلد سادس میں ہم نے اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور امام ابوحنیفہ کی تائید میں بہت سی احادیث اور آثار نقل کیے ہیں۔

جوئے کی تعریف اور اس کے حرام ہونے کا بیان

عربی میں جوئے کے لیے میسر اور قمار دونوں لفظ استعمال کیے جاتے ہیں' میسر کا لفظ یسر سے بنا ہے جس کا معنی آسانی ہے' چونکہ جوئے میں جیتنے والا آسانی سے رقم حاصل کر لیتا ہے اس لیے اس کو میسر کہتے ہیں' میر سید شریف قمار کی تعریف میں لکھتے ہیں:

ہر وہ کھیل جس میں یہ شرط ہو کہ مغلوب کی کوئی چیز غالب کو دے دی جائے گی قمار ہے۔

(التعریفات ص ۷۷ 'مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

قمار قمر سے ماخوذ ہے جو کبھی کم ہوتا ہے کبھی زیادہ اور جوئے کو قمار اس لیے کہتے ہیں کہ جوا کھیلنے والوں میں سے ہر ایک اپنا مال اپنے ساتھی کو دینے اور اپنے ساتھی کا مال لینے کو (شرط کے ساتھ) جائز سمجھتا ہے اور یہ نص قرآن سے حرام ہے اور اگر صرف ایک جانب سے شرط لگائی جائے تو جائز ہے۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۲۵۸ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں:

اہل علم کا قمار کے عدم جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور باہم شرط لگانا بھی قمار ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آپس میں شرط لگانا قمار ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنے مال اور بیوی کی شرط لگاتے تھے' پہلے یہ مباح تھا' بعد میں اس

[1] امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ' المصنف ج ۵ ص ۸ 'مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی

کی تحریم نازل ہو گئی' جب سورۂ روم نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر نے رومیوں کے ایرانیوں سے غالب ہونے پر مشرکین سے شرط لگائی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شرط میں زیادتی کرو اور مدت بڑھا دو' پھر بعد میں اس سے منع فرمایا اور قمار کی حرمت نازل ہو گئی' اس کی حرمت میں کوئی اختلاف نہیں ہے' البتہ شتر سواری' گھوڑے سواری اور نیزے بازی کی سابقیت کی شرط لگانے کی رخصت ہے بلکہ سب سے آگے نکلنے والے کو انعام دیا جائے اور پیچھے رہ جانے والے کو نہ دیا جائے' اور اگر یہ شرط لگائی جائے کہ دونوں میں سے جو آگے نکل جائے گا وہ لے گا اور جو پیچھے رہ جائے گا وہ دے گا تو یہ ناجائز ہے اور اگر وہ کسی تیسرے شخص کو داخل کر دیں کہ اگر وہ آگے نکل گیا تو لے گا اور اگر پیچھے رہ گیا تو کچھ نہیں دے گا یہ جائز ہے' اس دخیل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محلل فرمایا ہے۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۳۲۹' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

لاٹری اور انعامی بانڈز وغیرہ کا شرعی حکم

لاٹری' معمہ بازی' ریس کورس میں گھڑ دوڑ' تاش' شطرنج' کیرم اور دیگر کھیلوں میں ہار جیت پر رقمیں لگانا' کرکٹ' فٹ بال اور سکواش وغیرہ کے ملکی اور بین الاقوامی کھیلوں میں سٹہ کھیلنا یہ سب قمار اور میسر (جوا) ہیں' گناہ کبیرہ اور حرام قطعی ہیں' انعامی بانڈز پر جو انعامی رقم ملتی ہے وہ جائز ہے' قمار نہیں کیونکہ اس میں کسی فرد کی رقم ضائع نہیں ہوتی' ہر شخص جب چاہے اپنے بانڈز کو بینک سے کیش کرا سکتا ہے' اس میں خریداری کی ترغیب دینے کے لیے بعض نمبروں پر حکومت انعام کی رقم کا اعلان کرتی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے بعض صابن ساز ادارے یا ٹوتھ پیسٹ بنانے والے کوئی اسکیم جاری کرتے ہیں اور خریداروں کو کوئی اضافی چیز انعام میں دیتے ہیں یا بعض ٹھنڈے مشروبات والے (مثلاً کوکا کولا) بوتل کے بعض ڈھکنوں پر انعامی رقم رکھتے ہیں۔ اس کی تفصیل اور تحقیق ہم نے "شرح صحیح مسلم" جلد رابع میں بیان کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں' آپ کہیے کہ جو ضرورت سے زائد ہو۔ (البقرۃ: ۲۱۹)

اس آیت کے پہلے حصہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ شراب اور جوئے میں گناہ زیادہ ہے' اس سے معلوم ہوا کہ شراب اور جوئے سے روحانی اور بدنی بیماری ہوتی ہے اور ان میں پیسہ خرچ کرنا لائق مذمت ہے۔ تب یہ سوال پیدا ہوا کہ کس چیز میں پیسہ خرچ کرنا لائق تحسین ہے؟ اور چونکہ اس کلام کا سیاق جہاد ہے اور جہاد کا عظیم ستون اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا ہے' اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اس سوال کو پھر دہرایا کہ کیا چیز خرچ کریں؟ آپ کہیے کہ "عفو" جو ضرورت سے زائد ہو۔

"عفو" (زائد از ضرورت) کے معانی اور محامل

حافظ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

امام ابن جریر' امام ابن المنذر اور امام ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ضرورت سے زائد خرچ کرنے کا حکم اس وقت تھا جب زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی تھی۔

امام طبرانی اور امام بیہقی نے "عفو" کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جو چیز اہل و عیال پر خرچ کرنے سے بچ رہے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کی جائے۔

امام ابن المنذر نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ "عفو" کے تین معنی ہیں: (۱) گناہ سے درگزر کرنا (۲) میانہ روی سے خرچ کرنا' اور اس آیت میں یہی مراد ہے یعنی اللہ کی راہ میں میانہ روی سے خرچ کرو (۳) لوگوں کے ساتھ احسان کرنا' یہ معنی اس آیت میں ہے: "اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ط" (البقرۃ: ۲۳۷) (دخول سے پہلے مطلقہ عورت کو)

شوہر بہ طور احسان نصف مہر سے زیادہ دے دے''۔

امام عبد بن حمید نے عطاء سے روایت کیا ہے کہ'' عفو '' کا معنی ہے: ضرورت سے زائد۔

امام عبد بن حمید نے طاؤس سے روایت کیا ہے کہ'' عفو '' کا معنی ہے: جس کا خرچ کرنا آسان ہو اور مجاہد نے کہا: اس سے مراد زکوۃ ہے۔

امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے'' عفو '' کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اس سے مراد صدقہ کی کوئی معین مقدار نہیں ہے اس کے بعد فرائض کو معین کر کے نازل کیا گیا ہے' نیز امام ابن جریر نے سدی سے'' عفو '' کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اس حکم کو زکوۃ نے منسوخ کر دیا۔ (الدرالمنثور ج ۱ ص ۲۵۳ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

'' عفو '' کے لفظ سے سوشلزم کے جواز پر استدلال اور اس کا جواب

جمہوری طریقہ سے رائے عامہ کو ہموار کر کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنا اور اسمبلی کی منظوری سے زرعی' صنعتی اور تجارتی اداروں کو ان کے مالکوں سے معاوضہ دے کر یا بلا معاوضہ چھین کر قومیا لینا سوشلزم ہے اور نادار اور محنت کش عوام کو منظم کر کے تاجروں' صنعت کاروں اور زمینداروں کے خلاف جنگ کر کے انقلاب لانا اور تمام پیداواری اداروں کو قومیا لینا کمیونزم ہے۔

۱۹۷۰ء میں جب پاکستان میں سوشلزم کا زور تھا اس وقت بعض سوشلسٹ علماء نے اس آیت سے سوشلزم کے اسلامی ہونے پر استدلال کیا تھا کہ اللہ نے ضرورت سے زائد ہر چیز کو خرچ کرنے کا حکم دیا ہے' لہٰذا تمام بڑے بڑے کاروباری اور صنعتی اداروں کو قومی ملکیت میں لینا جائز ہے کیونکہ وہ تمام ادارے ان کے مالکوں کی ضرورت سے زائد ہیں' اس وقت اس کے جواب میں یہ کہا گیا تھا کہ اس آیت میں راہ خدا میں خرچ کرنے اور دینے کا حکم ہے' لوگوں کے اموال کو بالجبر لینے یا قومیانے کا حکم نہیں ہے' نیز یہ حکم بہ طور استحباب ہے' بہ طور فرض نہیں ہے' فرض صرف زکوۃ اور زرعی پیداوار سے عشر یا نصف عشر ادا کرنا ہے۔

اب ہم اس آیت کو ذرا زیادہ گہرائی سے دیکھتے ہیں' اس آیت میں لفظ'' عفو '' سے استدلال کیا گیا ہے' ہم نے ائمہ تفسیر سے اس لفظ کے تین معنی نقل کیے ہیں: زائد از ضرورت' میانہ روی اور آسان۔ جن صحابہ' تابعین اور ائمہ تفسیر نے اس کا معنی زائد از ضرورت بیان کیا ہے انہوں نے تصریح کر دی ہے کہ زائد از ضرورت مال خرچ کرنے کا حکم زکوۃ کی فرضیت اور اس کی مقدار بیان کرنے سے پہلے تھا' اور اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا' اور جن ائمہ تفسیر نے یہ بیان کیا کہ اس کا معنی ہے: راہ خدا میں میانہ روی سے خرچ کرو یا جس کا خرچ کرنا آسان ہو اس کو خرچ کرو' سو اس معنی میں یہ حکم اب بھی باقی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر'' عفو '' کا معنی زائد از ضرورت ہے تو زکوۃ کی فرضیت کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اگر اس کا معنی ہے: میانہ روی سے خرچ کرنا یا جس کو خرچ کرنا آسان ہو اس کو خرچ کرنا تو یہ حکم اب بھی باقی ہے۔ ہم نے جو کچھ لکھا اس کی تائید حسب ذیل احادیث سے ہوتی ہے:

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام بخاری اور امام نسائی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہترین صدقہ وہ ہے جس کے بعد خوشحالی رہے' اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے (یعنی سارا مال صدقہ نہ کرو کہ اس کے بعد بھیک مانگتے پھرو)' خرچ کی ابتداء اپنے اہل وعیال سے کرو' بیوی کہے گی: یا مجھے نفقہ دو یا مجھے طلاق دو' خادم کہے گا: مجھے کھانا دو اور مجھ سے کام لو' بیٹا کہے گا: مجھے کھلاؤ' تم مجھے کس پر چھوڑتے ہو؟

امام بخاری' امام مسلم' امام ابوداؤد اور امام نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہترین صدقہ وہ ہے جس کے بعد خوشحالی رہے اور خرچ کی ابتداء اپنے عیال سے کرو۔

امام ابوداؤد' امام نسائی' امام ابن جریر' امام ابن حبان اور امام حاکم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کرنے کا حکم دیا تو ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے پاس ایک دینار ہے' آپ نے فرمایا: اس کو اپنے نفس پر خرچ کرو' اس نے کہا: میرے پاس ایک اور دینار ہے' آپ نے فرمایا: اس کو اپنی اولاد پر خرچ کرو' اس نے کہا: میرے پاس ایک اور دینار ہے' آپ نے فرمایا: اس کو اپنی بیوی پر خرچ کرو' اس نے کہا: میرے پاس ایک اور دینار ہے' آپ نے فرمایا: اس کو اپنے خادم پر خرچ کرو' اس نے کہا: میرے پاس ایک اور دینار ہے' آپ نے فرمایا: تم اس کے خرچ کے متعلق بہتر جانتے ہو۔

امام ابن سعد' امام ابوداؤد اور امام حاکم نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص انڈے کے برابر سونے کا ایک ٹکڑا لے کر آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! مجھے ایک معدن (کان) سے یہ سونا ملا ہے' میں اس کو صدقہ کرتا ہوں' آپ اس کو لے لیجئے' میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اعراض کیا۔ اس نے دوبارہ پیچھے سے آ کر عرض کیا' آپ نے اس سے وہ سونا لے کر اس کی طرف اتنے زور سے پھینکا کہ اگر اس کو لگ جاتا تو اس کو بہت چوٹ لگتی یا اس کی آنکھ پھوٹ جاتی' آپ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنا (کل) مال لے کر میرے پاس آ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے' پھر وہ بیٹھ کر لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائے گا' بہترین صدقہ وہ ہے جس کے بعد خوشحالی رہے اور خرچ کی ابتداء اپنے عیال سے کرو۔

(الدرالمنثور ج ۱ ص ۲۵۴۔ ۲۵۳' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

ان احادیث سے یہ واضح ہو گیا کہ اپنی ضروریات سے زائد کل مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنا شرعاً محمود اور مستحسن بھی نہیں ہے۔ اگر ہر شخص پر یہ لازم ہوتا کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد چیز خدا کی راہ میں دے دے تو کوئی شخص صاحب نصاب نہ ہوتا نہ کسی کے نصاب پر سال گزرتا اور پھر زکوٰۃ کا فرض کرنا بالکل لغو اور بے فائدہ ہوتا' نہ کسی شخص پر قربانی واجب ہوتی نہ کسی پر حج فرض ہوتا' نہ صدقہ فطر ہوتا تو پھر قربانی اور حج کی مشروعیت کے احکام بھی عبث ہوتے' کیونکہ جب مال جمع کرنا شرعاً جائز ہی نہیں ہے تو پھر ان احکام کے کیا معنی؟ اور عشر اور نصف عشر کے احکام صحیح نہ ہوتے' یہ حکم نہ ہوتا کہ اپنی زرعی پیداوار کا دسواں حصہ راہِ خدا میں دو بلکہ یہ حکم ہوتا کہ اپنی ضرورت کا غلہ رکھ کر باقی سارا غلہ راہِ خدا میں دے دو' چور کا ہاتھ کاٹنا بھی غلط ہوتا بلکہ الٹا چور مالک سے باز پرس کرتا کہ تم نے اتنا مال جمع ہی کیوں کیا جس کو چرایا جا سکے' غرضیکہ سوشلسٹ علماء کے مزعوم کے مطابق اگر اس آیت کی (بزعم خود غلط) تفسیر کی گئی تو ساری شریعت اسلامیہ ہی غلط ہو جائے گی۔ العیاذ باللہ!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یہ لوگ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں' آپ کہیے کہ ان کی خیر خواہی کرنا بہتر ہے اور اگر تم اپنا اور ان کا خرچ مشترک رکھو (تو کوئی حرج نہیں) وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں' اور اللہ جانتا ہے کہ کون خیر خواہی کرنے والا ہے اور کون بدخواہی کرنے والا۔ (البقرہ: ۲۲۰)

زیر کفالت یتیم کے ساتھ طرز معاشرت

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے متعلق سوال کا ذکر کیا گیا تھا' اس آیت میں مال خرچ کرنے کا ایک مصرف اور محل بتایا ہے کہ جو چیزیں تمہاری ضرورت سے زائد ہوں ان کو یتیموں پر خرچ کرو۔

اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام ابوداؤد' امام نسائی' امام ابن جریر' امام ابن المنذر' امام ابن ابی حاتم' امام حاکم اور امام بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں:

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۚ. (الانعام: ۱۵۲)

اور اچھے طریقہ کے سوا مال یتیم کے قریب نہ جاؤ' حتیٰ کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ○ (النساء: ۱۰)

بے شک جو لوگ ناجائز طور پر یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں محض آگ بھر رہے ہیں' اور وہ عنقریب بھڑکتی ہوئی آگ میں پہنچیں گے ○

تو ہر وہ شخص جس کی زیر کفالت کوئی یتیم تھا' اس نے اپنا اور یتیم کا کھانا الگ الگ کر لیا' بعض اوقات یتیم کا کھانا بچ جاتا اور بعد میں سڑ کر خراب ہو جاتا' نیز الگ الگ دو سالن پکانے میں مشقت اور دشواری مستزاد تھی' انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یتیم کے مال کے ضیاع اور اپنی دشواری کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اگر تم خیر خواہی کی نیت سے اپنا اور ان کا کھانا مشترک رکھو تو کوئی حرج نہیں ہے' اور اگر اللہ چاہتا تو (یہ آسانی مہیا نہ کر کے) تم کو مشقت میں ڈال دیتا' لیکن اللہ تعالیٰ غالب ہونے کے ساتھ ساتھ حکمت والا بھی ہے۔ (الدر المنثور ج ا ص ۲۵۵' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا کہ اللہ پر دلوں کا حال روشن ہے' وہ خیر خواہ اور بدخواہ کو جانتا ہے' اس کو علم ہے کہ یتیم کے مال کو ضیاع سے بچانے کے لیے کون مشترک کھانا پکایا کرتا ہے اور یتیم کے مال سے (بہ طور خیانت) فائدہ اٹھانے کے لیے کون ایسا کرتا ہے' یتیم کی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے نقد مال اور باقی رہنے والی چیزوں کو الگ اس کے حساب میں رکھو اور جو چیزیں جلد خراب ہونے والی ہیں ان میں اپنا اور یتیم کا کھانا بہ قدر حساب مشترک رکھو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نیک نیتی اور خیر خواہی کے ساتھ یتیم کا ولی یتیم کے مال میں تصرف کر سکتا ہے' یتیم کے مال کی خرید و فروخت اور اس میں تجارت اور مضاربت کر سکتا ہے اور اگر یتیم کا فائدہ ہو تو یتیم کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر تجارت بھی کر سکتا ہے اور مضاربت بھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کے ساتھ اختلاط کی اجازت دی ہے تو ان کے مال کے ساتھ بھی اختلاط کر سکتا ہے اور ان کے نسب کے ساتھ بھی' یتیم لڑکے کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کر سکتا ہے اور یتیم لڑکی کے ساتھ اپنے بیٹے کا نکاح کر سکتا ہے اور خود بھی اس سے نکاح کر سکتا ہے' بہ شرطیکہ ان تمام مالی اور جسمانی تصرفات سے یتیم کی خیر خواہی مقصود ہو' اس کے مال اور نفس سے اپنے خود غرضانہ فوائد مطلوب نہ ہوں۔

وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو حتیٰ کہ وہ ایمان لے آئیں' اور مسلمان باندی (آزاد) مشرک عورت

مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ

سے بہتر ہے' خواہ وہ تم کو اچھی لگتی ہو' اور مشرک مردوں سے (اپنی عورتوں کا) نکاح نہ کرو حتیٰ کہ

يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۗ

وہ ایمان لے آئیں؛ اور مسلمان غلام (آزاد) مشرک مرد سے بہتر ہے خواہ وہ تم کو اچھا لگتا ہو؛

اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَ

یہ (مشرکین) دوزخ کی آگ کی طرف بلاتے ہیں؛ اور اللہ اپنے اذن سے جنت اور

الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

مغفرت کی طرف بلاتا ہے؛ اور لوگوں کے لیے اپنی آیات بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں O

مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کے ساتھ مسلمانوں کے نکاح کا عدم جواز

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یتیم کے ساتھ مخالطت کا جواز بیان فرمایا تھا' جس کا تقاضا یہ تھا کہ یتیم کے مال کے ساتھ اپنا مال مخلوط کرنا بھی جائز ہے اور یتیم لڑکے یا یتیم لڑکی کے ساتھ اپنا یا اپنی اولاد کا نکاح کرنا بھی جائز ہے' تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نکاح کے بعض مسائل بیان فرمائے کہ مشرک مردوں کے ساتھ مسلمان عورتوں کا اور مشرک عورتوں کے ساتھ مسلمان مردوں کا نکاح جائز نہیں ہے' کیونکہ نکاح کی وجہ سے شوہر اور بیوی کے ساتھ جسمانی اور ذہنی قرب ہوتا ہے' وہ دونوں ایک دوسرے کے عقائد' نظریات' افکار اور خیالات سے متاثر ہوتے ہیں اس لیے یہ خدشہ ہے کہ مشرک شوہر کے عقائد سے مسلمان بیوی متاثر ہو یا مشرک عورت کے نظریات سے مسلمان شوہر متاثر ہو' اس لیے اسلام نے یہ راستہ ہی بند کر دیا' اگر چہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مسلمان شوہر یا بیوی سے مشرک بیوی یا شوہر متاثر ہو جائے لیکن جب کوئی چیز نفع اور نقصان کے درمیان دائر ہو تو نقصان سے بچنے کو نفع کے حصول پر مقدم کیا جاتا ہے اس لیے اسلام نے مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان مناکحت کا معاملہ کلیۃً منقطع کر دیا۔ یہاں شرک سے مراد کفر ہے' اس لیے ملحد' مجوسی' بت پرست اور کسی قسم کے بھی کافر سے نکاح جائز نہیں ہے مسلمان مرد کا نہ مسلمان عورت کا۔

حافظ جلال الدین سیوطی اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق لکھتے ہیں:

امام ابن ابی حاتم اور امام ابن المنذر نے مقاتل بن حیان سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابو مرثد غنوی کے متعلق نازل ہوئی ہے' انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ وہ عناق نامی ایک مشرکہ عورت سے نکاح کر لیں جو نہایت حسین و جمیل عورت تھی اور حضرت ابو مرثد مسلمان ہو چکے تھے' انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! وہ عورت مجھے بہت اچھی لگتی ہے' تب یہ آیت نازل ہوئی: اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ الایۃ (الدر المنثور ج ۱ ص ۲۵۶' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

اس آیت میں یہ بھی فرمایا ہے کہ آزاد مشرک کی بہ نسبت مسلمان غلام بہتر ہے' اور کسی آزاد مسلمان عورت کا نکاح مسلمان غلام سے کر دینا اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ اس کا نکاح آزاد مشرک سے کیا جائے' حالانکہ غلام آزاد کا کفو نہیں ہے' سو غیر کفو میں نکاح کے جواز کے لیے یہ آیت صریح جزیہ ہے' ہم ان شاء اللہ سورۂ نساء میں اس موضوع پر مفصل گفتگو کریں گے' "شرح صحیح مسلم" جلد ثالث اور جلد سادس میں ہم نے اس موضوع پر بہت تفصیل اور تحقیق سے بحث کی ہے۔

مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کے باوجود اہل کتاب سے نکاح کے جواز کی توجیہ

اسلام میں یہ جائز ہے کہ اہل کتاب عورتوں کے ساتھ مسلمان مرد نکاح کر لیں لیکن اہل کتاب مردوں کے ساتھ مسلمان عورتوں کا نکاح کرنا جائز نہیں ہے' قرآن مجید نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کے باوجود کتابیہ یعنی یہودی یا عیسائی عورت کے ساتھ نکاح کی اجازت دی ہے:

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۖ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ (المائدہ: ۵)

اور اہل کتاب کا ذبیحہ تمہارے لیے حلال ہے' اور تمہارا ذبیحہ ان کے لیے حلال ہے اور (تمہاری) آزاد پاک دامن مسلمان عورتیں' اور تم سے پہلے اہل کتاب کی آزاد پاک دامن عورتیں (تمہارے لیے حلال ہیں) جب کہ تم ان سے نکاح کر کے ان کا مہر ادا کرو' نہ ان سے ظاہراً بدکاری کرو اور نہ خفیہ آشنائی کرو۔

اب یہ سوال ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کر دی تھی تو پھر کتابیہ سے نکاح کی اجازت کیوں دی جب کہ اہل کتاب یہودی اور عیسائی بھی مشرک ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ (التوبہ: ۳۰)

اور یہود نے کہا: عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا: مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چند کہ یہود و نصاریٰ دونوں مشرک ہیں لیکن قرآن مجید کی اصطلاح ہے کہ اس نے بت پرستوں پر مشرکین کا اطلاق کیا ہے اور یہود و نصاریٰ پر اہل کتاب کا' قرآن مجید میں ہے:

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ . (البقرہ: ۱۰۵)

کافروں میں سے اہل کتاب اور مشرکین یہ پسند نہیں کرتے کہ ۔۔۔۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ (البینہ: ۱)

کافر اہل کتاب اور مشرکین بغیر واضح دلیل کے اپنے دین کو چھوڑنے والے نہ تھے O

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہر چند کہ مشرک عورتوں میں اہل کتاب عورتیں بھی داخل تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے مشرکات کے عموم سے اہل کتاب عورتوں کو مستثنیٰ کر لیا' اور یہ اصطلاح میں عام مخصوص عنہ البعض ہے' حافظ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

امام ابن جریر' امام ابن المنذر' امام ابن ابی حاتم اور امام بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ''وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ'' (البقرہ: ۲۲۱) کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت سے اہل کتاب کی عورتوں کو مستثنیٰ کر لیا ہے اور دلیل استثناء یہ آیت ہے:

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۔ (المائدہ: ۵)

اور اہل کتاب کی آزاد پاک دامن عورتیں (تمہارے لیے حلال ہیں)۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۲۵۶' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ ایران)

باقی رہی یہ بحث کہ خالص مشرک عورتوں اور اہل کتاب میں نکاح کے جواز کا فرق کرنے کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مشرک نہ خدا کو مانتا ہے نہ کتاب کو نہ رسول کو نہ قیامت اور جزاء اور سزا کو' نہ حلال اور حرام کا قائل ہوتا ہے' اس کے

برعکس اہل کتاب ان تمام امور کو مانتے ہیں' ان کے کفر کی صرف یہ وجہ ہے کہ انہوں نے غلو محبت میں اپنے اپنے رسول کو خدا اور خدا کا بیٹا کہہ دیا۔

دوسری بحث یہ ہے کہ مسلمان مردوں کا اہل کتاب عورتوں کے ساتھ نکاح جائز قرار دیا ہے اور مسلمان عورتوں کا اہل کتاب مردوں کے ساتھ نکاح جائز نہیں کیا' اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عائلی اور گھریلو زندگی میں مرد حاکم ہوتا ہے اور اس کا گھر میں قبضہ اور اقتدار ہوتا ہے اور عورت فطرۃً منفعل مزاج اور گھر میں محکوم ہوتی ہے۔ اگر کسی یہودی یا عیسائی مرد کے ساتھ مسلمان عورت کا نکاح جائز ہوتا تو عین ممکن تھا کہ وہ مسلمان عورت اپنے کافر شوہر کے معتقدات اور خیالات سے متاثر ہو جاتی اور اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو جاتی۔ اس کے برعکس جب شوہر مسلمان ہو اور بیوی یہودی یا عیسائی ہو تو چونکہ گھر میں حاکم اور مقتدر شوہر ہوتا ہے اس لیے گھر میں اسلامی ماحول اور لٹریچر فراہم ہوگا اور اس اہل کتاب عورت کو اسلام کو قریب سے دیکھنے' پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملے گا' اسلامی معاشرہ' اسلام کی تہذیب اور مسلمان خاندان سے میل جول اور ربط و ضبط کی وجہ سے اس کے اسلام قبول کرنے کے بہت ذرائع میسر ہوں گے اور وہ جلد یا بہ دیر مسلمان ہو جائے گی اور اگر بالفرض وہ مسلمان نہ بھی ہو تو بچے بہر حال باپ کے دین کے تابع رہیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ تمام مواقع دارالاسلام میں ہی میسر ہوتے ہیں' اس لیے ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ دارالکفر میں اہل کتاب عورت کے ساتھ نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ وہاں کفر کا غلبہ ہوتا ہے اور جس حکمت کی وجہ سے اہل کتاب عورت کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے اس کے پورے ہونے کے مواقع وہاں میسر نہیں ہیں۔ باقی اس مسئلہ میں فقہاء' صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے مذاہب ہم ان شاء اللہ سورۂ مائدہ میں اس آیت کی تفسیر میں بیان کریں گے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا

اور یہ آپ سے حیض کا حکم معلوم کرتے ہیں' آپ کہیے کہ وہ گندگی ہے' سو عورتوں سے

النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا

حالت حیض میں الگ رہو' اور ان سے عمل زوجیت نہ کرو حتیٰ کہ وہ پاک ہو جائیں' اور جب وہ

تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

مکمل پاک ہو جائیں تو ان کے پاس (وہاں) آؤ' جہاں سے (آنے کا) اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے' بے شک اللہ توبہ کرنے

التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝۲۲۲ نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠

والوں کو پسند کرتا ہے اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ○ تمہاری عورتیں تمہارے (بیج ڈالنے کے) لیے کھیتیاں ہیں

فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

تو تم اپنی کھیتیوں میں جس طرح چاہو آؤ' اور اپنے لیے نیک عمل بھیجے رہو' اور اللہ سے ڈرتے رہو'

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ مُّلٰقُوۡهُ‌ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۲۳﴾

اور یہ یقین رکھو کہ بے شک تم اس سے ملاقات کرنے والے ہو اور آپ مؤمنوں کو بشارت دے دیجئے O

حیض کا حکم بیان کرنے کا شانِ نزول

اس سے پہلی آیت میں نکاح کا ذکر کیا گیا تھا اور نکاح کے لوازم سے بیوی کے ساتھ جماع کرنا ہے' سو ان آیتوں میں بتایا ہے کہ کس حالت میں عورت کے ساتھ جماع کرنا ہے اور کس حالت میں نہیں کرنا اور چونکہ جماع کا مقصد حصول اولاد ہے' محض قضاء شہوت نہیں ہے' اس لیے فرمایا کہ جس جگہ سے حصول اولاد ہو وہاں تخم ریزی کرو' یعنی عمل معکوس نہ کرو' خواہ اس عمل (تخم ریزی) کے لیے کوئی طریقہ اختیار کرو۔

حافظ جلال الدین سیوطی اس آیت کے شانِ نزول میں لکھتے ہیں:

امام احمد' امام دارمی' امام مسلم' امام ابوداؤد' امام ترمذی' امام ابن ماجہ' امام ابویعلیٰ' امام ابن المنذر' امام ابن ابی حاتم' امام ابن حبان اور امام بیہقی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ یہود کے ہاں جب کسی عورت کو حیض آ جاتا تو وہ اس کو گھر سے نکال دیتے' اس کے ساتھ کھاتے نہ پیتے نہ اس کے ساتھ گھروں میں رہتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان عورتوں کو گھروں میں رکھو اور عمل زوجیت کے سوا ان کے ساتھ سب کچھ کرو' جب یہود کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے کہا: یہ شخص ہر بات میں ہماری مخالفت کرتا ہے' پھر حضرت اسید بن حضیر اور حضرت عباس بن بشر آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے: یا رسول اللہ! یہود اس اس طرح کہہ رہے ہیں تو کیوں نہ ہم اپنی عورتوں سے جماع بھی کر لیں' یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو گیا حتیٰ کہ ہم نے یہ گمان کیا کہ آپ ان سے ناراض ہو گئے ہیں' اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہدیہ میں دودھ آیا تو آپ نے وہ دودھ ان دونوں کے لیے بھیجا' اس سے ان دونوں نے یہ جانا کہ آپ ان سے ناراض نہیں ہوئے۔

(الدرالمنثور ج ۱ ص ۲۵۸' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

اس سے معلوم ہوا کہ استاد یا ماں باپ' شاگرد یا اولاد کو اگر کسی بات پر ڈانٹیں تو بعد میں کسی طرح ان کی دل جوئی کر کے اس کی تلافی بھی کریں۔

حائضہ سے مباشرت کرنے کی دینی اور دنیاوی خرابی

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حائضہ عورت سے جماع کے سوا باقی سب کچھ کر سکتے ہو۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۹۴' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث کی بناء پر ہمارے فقہاء نے یہ کہا ہے کہ شوہر ایام حیض میں اپنی بیوی سے جسمانی قرب اور جسمانی لذت حاصل کر سکتا ہے' البتہ ناف کے نیچے سے لے کر گھٹنوں تک احتراز کرے' کیونکہ اگر اس میں بھی دست درازی کرے گا تو خطرہ ہے کہ وہ عمل زوجیت میں مبتلا ہو جائے گا۔

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے حائضہ عورت سے

جماع کیا یا کسی عورت کی سرین میں دخول کیا یا کسی شخص نے کاہن کے قول کی تصدیق کی تو اس نے (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل شدہ دین کے ساتھ کفر کیا۔ (سنن ابن ماجہ ص ۴۷ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی)

جدید میڈیکل سائنس سے بھی واضح ہو گیا کہ حائضہ عورت کے ساتھ مباشرت کرنے سے مرد کے عضو مخصوص میں سوزاک ہو جاتا ہے اور بعض اوقات مرد اور عورت دونوں بانجھ ہو جاتے ہیں۔

حیض کا لغوی اور اصطلاحی معنی

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

جو خون رحم سے وقت مخصوص میں وصف مخصوص کے ساتھ خارج ہو اس کو حیض کہتے ہیں۔

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

لغت میں حیض کا معنی ہے: سیلان (بہنا)' جب کوئی وادی بہنے لگے تو کہتے ہیں: "حاض الوادی" اوقات مخصوص میں خون بہنے کی وجہ سے اس خون کو حیض کہتے ہیں اور اصطلاح شرع میں حیض اس صفت شرعیہ کو کہتے ہیں جو ان کاموں کے کرنے سے مانع ہو جن کے لیے حیض سے پاک ہونا شرط ہے' مثلاً نماز پڑھنا' قرآن مجید کو چھونا' روزہ رکھنا' مسجد میں داخل ہونا اور عمل زوجیت کرنا۔

علامہ حصکفی نے حیض کی یہ تعریف کی ہے: وہ خون جو بالغہ کے رحم سے بغیر وقت ولادت کے خارج ہو۔ رحم کی قید سے استحاضہ خارج ہو گیا' کیونکہ یہ خون ایک رگ سے خارج ہوتا ہے اور یہ افعال مذکورہ سے مانع نہیں ہے' رحم اس ظرف کو کہتے ہیں جس میں بچہ ہوتا ہے یعنی بچہ دانی' اور بغیر وقت ولادت کی قید سے نفاس خارج ہو گیا (نفاس بھی افعال مذکورہ سے مانع ہے)' ولادت کے بعد عورت کے رحم سے جو خون نکلتا ہے اس کو نفاس کہتے ہیں۔

حیض کا سبب یہ ہے کہ حضرت حواء نے شجر ممنوع کھا لیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حیض میں مبتلا کر دیا' امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حیض کے متعلق فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں پر اس کو مقدر کر دیا ہے' حیض کا رکن یہ ہے کہ خون رحم سے نکل کر فرج داخل کے باہر آ جائے' اگر وہ خون فرج داخل ہی میں رہے تو وہ حیض نہیں ہے۔ (المفردات ص ۱۳۶ مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

ایام حیض کے تعین میں مذاہب ائمہ

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

حیض کی کم از کم مدت ایک دن اور ایک رات ہے' اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے' اور عموماً حیض چھ یا سات دن ہوتا ہے' اور دو حیضوں کے درمیان کم از کم طہر (پاکیزگی کے ایام) کی مدت پندرہ دن ہے۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۱۸۹۔۱۸۸ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ دردیر مالکی لکھتے ہیں:

حیض کی کم از کم مدت کی کوئی حد نہیں ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے۔

(روضۃ الطالبین ج ۱ ص ۱۳۸۔۱۳۷ مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

حیض کی کم از کم مدت ایک دن اور ایک رات ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے۔

(المغنی ج ۱ ص ۱۸۹ 'مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

حیض کی کم از کم مدت تین دن اور تین راتیں ہیں اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے۔

(درمختار علی ھامش ردالمحتار ج ۱ ص ۱۸۶ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

فقہاء احناف کی دلیل حسب ذیل احادیث ہیں: امام دار قطنی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی کنواری اور شادی شدہ عورت کا حیض تین دن سے کم اور دس دن سے زیادہ نہیں ہوتا' دس دن کے بعد نکلنے والا خون استحاضہ ہے۔ حائضہ ایام حیض کے بعد کی نمازوں کی قضا کرے۔ حیض میں سرخی مائل سیاہ گاڑھا خون ہوتا ہے اور استحاضہ میں زرد رنگ کا پتلا خون ہوتا ہے۔

(سنن دار قطنی ج ۱ ص ۲۱۸ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام دار قطنی نے ایک اور سند سے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ (سنن دار قطنی ج ۱ ص ۲۱۸ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حیض کم از کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہوتا ہے۔ (سنن دار قطنی ج ۱ ص ۲۱۹ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام دار قطنی نے ان احادیث کی سند کو ضعیف کہا ہے لیکن تعدد اسانید کی وجہ سے یہ احادیث حسن لغیرہ ہو گئیں اور ان سے استدلال صحیح ہے' نیز ان احادیث کی تقویت حسب ذیل آثار سے ہوتی ہے:

امام دار قطنی روایت کرتے ہیں:

معاویہ بن قرہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت انس نے فرمایا: حیض کی کم از کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔

وکیع نے کہا: حیض تین سے دس دن تک ہے' اس کے علاوہ استحاضہ ہے۔ (سنن دار قطنی ج ۱ ص ۲۱۰ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام دار قطنی نے ایک اور سند سے بھی یہ اثر بیان کیا' اور سفیان کا بھی یہی قول نقل کیا ہے۔

(سنن دار قطنی ج ۱ ص ۲۱۰ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ متعدد اسانید کے ساتھ چھ صحابہ سے منقول ہے کہ حیض کم از کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۱۸۹ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

امام ابن عدی نے ''کامل'' میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین دن سے کم حیض نہیں ہوتا اور دس دن سے زیادہ حیض نہیں ہوتا۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۱۴۳ 'مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر)

امام ابن جوزی نے ''علل متناھیہ'' میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حیض کی کم از کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ (العلل المتناھیہ 'مطبوعہ مکتبہ اثریہ' فیصل آباد' ۱۴۰۱ھ)

حیض' نفاس اور استحاضہ میں مبتلا خواتین کے مسائل

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(۱) حالت حیض میں طہارت (پاکیزگی) کے حصول کے لیے وضو کرنا منع ہے' صفائی کے لیے غسل کرنا جائز ہے جیسے دوران حج بدن صاف کرنے کے لیے غسل کرتے ہیں' اسی طرح جن وظائف کے پڑھنے کی اس کی عادت ہو' مثلاً تکبیر' تہلیل'

درود شریف ان کے لیے وضو کرنا جائز ہے' کیونکہ فقہاء نے کہا ہے کہ حائضہ کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ ہر نماز کے وقت وضو کر کے اتنی دیر جائے نماز پر بیٹھ کر وظیفہ پڑھتی رہے جتنی دیر میں وہ نماز پڑھتی تھی تاکہ اس کی نماز کی عادت قائم رہے' اس عمل سے اس کو بہترین نماز پڑھنے کا اجر ملے گا۔

(۲) حیض کی حالت میں نماز پڑھنا منع ہے' خواہ کسی قسم کی نماز ہو یا سجدۂ شکر ہو' حالت حیض میں جو نمازیں ہو گئیں ان کی قضا نہیں ہے۔

(۳) حائضہ کا اعتکاف کرنا منع ہے اور اگر دورانِ اعتکاف اس کو حیض آ گیا تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔

(۴) حالت حیض میں طواف صدر (وداع) ممنوع ہے۔

(۵) حالت حیض میں طلاق دینا حرام ہے۔

(۶) حیض آنے سے لڑکی بالغہ ہو جاتی ہے۔

(۷) عدت پوری ہونے کا تعلق بھی حیض سے ہے' آزاد عورت کی عدت تین حیض ہے اور باندی کی عدت دو حیض ہے۔

(۸) استبراء کا تعلق بھی حیض سے ہے' جب مالِ غنیمت سے کوئی باندی ملے یا کسی باندی کو خریدے تو ایک حیض تک اس سے وطی نہ کرے' ایک حیض گزر جانے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ اس کے رحم میں استقرار نطفہ ہے یا نہیں۔

(۹) حیض منقطع ہونے کے بعد غسل کرنا واجب ہے۔

(۱۰) رمضان کے روزہ کے کفارہ اور قتل کے کفارے میں مسلسل روزے رکھے جاتے ہیں' اگر ان روزوں کے درمیان حائضہ کو حیض آ گیا تو اس کا تسلسل نہیں ٹوٹے گا۔

(۱۱) حائضہ عورت پر روزہ رکھنا منع ہے لیکن وہ ان فوت شدہ روزوں کی قضا کرے گی' اس نے نفل روزہ شروع کیا اور پھر حیض آ گیا تو اس کی قضا کرے گی۔

(۱۲) حائضہ عورت کا مسجد میں داخل ہونا منع ہے۔

(۱۳) حائضہ کے لیے کعبہ کا طواف کرنا منع ہے۔

(۱۴) حائضہ کی ناف سے گھٹنے تک اس کے شوہر کا قریب ہونا منع ہے۔

(۱۵) تلاوت قرآن کے قصد سے قرآن پڑھنا منع ہے' البتہ دعا کے قصد سے سورۂ فاتحہ یا کسی اور آیت کو پڑھنا یا تبرک کے قصد سے بسم اللہ پڑھنا جائز ہے۔

(۱۶) قرآن مجید کو چھونا منع ہے خواہ وہ متصل یا منفصل غلاف میں ہو۔

(۱۷) اللہ کا ذکر کرنا' تسبیح کرنا' قبروں کی زیارت کرنا جائز ہے' اسی طرح عیدگاہ میں جانا جائز ہے۔

(۱۸) ہاتھ دھونے اور کلی کرنے کے بعد کھانا پینا جائز ہے' اور ہاتھ منہ دھوئے بغیر جنبی کے لیے کھانا مکروہ ہے' حائضہ کے لیے مکروہ نہیں ہے۔

(۱۹) جب اکثر مدت پوری ہونے کے بعد حیض منقطع ہو (یعنی دس دن کے بعد) تو شوہر کا اس کے ساتھ بغیر اس کے غسل کے وطی کرنا جائز ہے اور غسل کے بعد وطی کرنا مستحب ہے۔

(۲۰) اگر کم مدت گزرنے کے بعد اس کا حیض منقطع ہوا تو حائضہ وضو کرے اور آخری وقت میں نماز پڑھ لے۔

(۲۱) اگر حائض کے ایام مقرر ہیں اور اس سے کم وقت میں حیض منقطع ہو گیا تو اس کے شوہر کے لیے اس سے مباشرت جائز

نہیں ہے؛ البتہ وہ احتیاطاً نماز پڑھے اور روزہ رکھے۔

(۲۲) اگر حیض کم مدت میں منقطع ہو گیا تو شوہر کا اس سے اس وقت تک وطی کرنا جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ غسل نہ کرے۔

(۲۳) اگر حیض منقطع ہونے کے بعد حائضہ نے نماز کا اتنا وقت پا لیا جس میں تکبیر تحریمہ پڑھی جا سکتی ہے تو اس پر وہ نماز فرض ہو گئی اور اس کی قضا کرے گی۔

(۲۴) جو شخص حائضہ عورت سے حلال سمجھ کر مباشرت کرے گا وہ کافر ہو جائے گا۔

(۲۵) مدت حیض سے کم یا مدت حیض کے بعد آنے والا خون استحاضہ ہے، اس کا حکم اس طرح ہے جس طرح کسی معذور شخص کی ناک سے ہمیشہ خون جاری ہو تو اس سے نماز روزہ ساقط نہیں ہوتا' اسی طرح مستحاضہ سے بھی نماز روزہ ساقط نہیں ہوتا۔ اس کی طہارت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ نماز کے ایک وقت میں وضو کرے' یہ وضو اس پورے وقت میں شرعاً قائم رہے گا' بہ شرطیکہ کسی اور وجہ سے وضو نہ ٹوٹے' وہ اس وضو سے پورے وقت میں تمام عبادتیں کر سکتی ہے اور وقت ختم ہونے کے بعد اسے دوسرے وقت کے لیے وضو کرنا ہوگا۔

(۲۶) ولادت کے بعد رحم سے جو خون نکلتا ہے اس کو نفاس کہتے ہیں۔ اس کے کم ہونے کی کوئی حد نہیں ہے اور اکثر نفاس کی حد چالیس دن ہے اور چالیس دن کے بعد جو خون آتا رہے وہ استحاضہ ہے' استحاضہ کے دوران وہ نمازیں پڑھے گی اور روزے رکھے گی اور معذور شخص کی طرح وضو کرے گی۔

(۲۷) نفاس کا خون نکلنے سے عدت پوری ہو جاتی ہے خواہ وہ عدت طلاق ہو یا عدت وفات ہو۔

(۲۸) حیض اور نفاس میں مبتلا دونوں عورتیں ان ایام میں نماز نہیں پڑھیں گی اور ان پر ان ایام کی قضا نہیں ہے' البتہ ان ایام میں اگر رمضان کے روزے آ گئے تو روزے نہیں رکھیں گی' بعد میں فوت شدہ روزوں کی قضا کریں گی۔

(رد المحتار ج ۱ ص ۲۰۰ ـ ۱۸۱' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا

اور تم نیکی، تقویٰ اور لوگوں کی خیر خواہی سے بچنے کے لیے اللہ کے نام کی قسمیں کھانے کو بہانہ نہ بناؤ

وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ

اور اللہ خوب سننے والا، بہت جاننے والا ہے ○ اللہ تم سے تمہاری

اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ

بے ارادہ کھائی ہوئی قسموں پر مواخذہ نہیں فرمائے گا، لیکن ان قسموں پر تم سے مواخذہ فرمائے گا جو تم نے پختہ ارادوں سے کھائی ہیں؛

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ تَرَبُّصُ

اور اللہ بہت بخشنے والا بہت بردبار ہے ○ جو لوگ اپنی عورتوں سے مباشرت نہ کرنے کی قسم کھا لیتے ہیں ان کے لیے

أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءُوْ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۲۶) وَإِنْ

چار مہینے کی مہلت ہے اگر انہوں نے (اس مدت میں) رجوع کر لیا تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے O اور اگر

عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۲۷)

انہوں نے طلاق ہی کا ارادہ کر لیا ہے تو بے شک اللہ خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے O

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں اور تم جس طرح چاہو اپنی کھیتیوں میں آؤ' پھر فرمایا: ایام حیض میں اپنی عورتوں سے مباشرت نہ کرنا' یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض اوقات میں جماع کی ممانعت تھی' بعض لوگ از خود چار ماہ مباشرت نہ کرنے کی قسم کھا کر اپنے آپ کو عورتوں سے روک لیتے تھے اس خاص قسم کو ایلاء کہتے ہیں' ایلاء کا حکم بیان کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عام قسموں کا بھی حکم بیان فرمایا۔ بعض لوگ نیکی' پرہیزگاری اور لوگوں کے ساتھ بھلائی اور خیر خواہی نہ کرنے کی قسم کھا لیتے تھے' پھر اگر کوئی ان کو ٹوکتا کہ تم یہ کار خیر کیوں نہیں کرتے؟ تو وہ کہتے کہ ہماری قسم ٹوٹ جائے گی' ہم نے ان کاموں کے نہ کرنے کی قسم کھائی ہے۔

حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: ایک شخص یہ قسم کھا لیتا کہ وہ اپنے رشتہ دار سے کلام نہیں کرے گا' یا صدقہ نہیں دے گا' یا ان دو آدمیوں میں صلح نہیں کرائے گا جو آپس میں لڑے ہوئے ہیں۔ وہ کہتا کہ میں حلف اٹھا چکا ہوں کہ میں یہ کام نہیں کروں گا' تب یہ آیات نازل ہوئیں کہ نیکی اور خدا خوفی کے کاموں سے رکنے کے لیے اللہ کی قسموں کو بہانہ نہ بناؤ اور گویا اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ تم ایسی قسموں کو توڑ کر ان نیکی کے کاموں کو کرو اور اپنی قسموں کا کفارہ دو۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۲۶۸' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں یمین (قسم) اور ایلاء کا بیان شروع کیا ہے اس لیے ہم یہاں یمین کا لغوی اور شرعی معنی اور یمین اور ایلاء کے شرعی احکام بیان کریں گے۔ فنقول وباللہ التوفیق وبہ الاستعانۃ یلیق

قسم کا لغوی اور اصطلاحی معنی اور قسم کی شرائط اور ارکان

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

یمین اصل میں دائیں ہاتھ کو کہتے ہیں' قرآن مجید میں ہے: "واصحاب الیمین." اس میں قوت اور برکت کے معنی کا اعتبار ہے اور یمین کا استعارہ حلف سے بھی کیا جاتا ہے کیونکہ جب کوئی شخص کسی سے عہد کرتا ہے تو اپنے دائیں ہاتھ کو اس کے دائیں ہاتھ پر رکھ کر عہد کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ — یا تمہارے لیے ہم پر کچھ عہد و پیمان (قسمیں) ہیں جو قیامت تک پہنچنے والے ہیں۔ (القلم: ۳۹)

قرآن مجید کی زیر بحث آیت میں بھی یمین کا لفظ حلف کے معنی میں ہے۔

(المفردات ص ۵۵۳' المکتبۃ المرتضویہ ایران' ۱۳۴۲ھ)

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

یمین اس قوی عقد کو کہتے ہیں جس کے ساتھ قسم کھانے والا کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا عزم کرتا ہے۔ اس کی شرائط یہ ہیں: اسلام' مکلف ہونا اور قسم پوری ہونے کا ممکن ہونا۔ اس کا حکم یہ ہے: قسم کو پورا کرنا یا قسم توڑ کر اس کا کفارہ ادا کرنا۔ اس کا رکن وہ الفاظ ہیں جن کے ساتھ قسم کھائی جاتی ہے' کیا غیر اللہ کے ساتھ حلف اٹھانا مکروہ ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ ہاں' کیونکہ حدیث میں ہے: جو شخص حلف اٹھائے وہ اللہ کے نام سے حلف اٹھائے ورنہ نہ اٹھائے' اور عام فقہاء نے یہ کہا ہے کہ یہ مکروہ نہیں ہے' ہمارے فقہاء نے اسی قول پر فتویٰ دیا ہے' خاص طور پر ہمارے زمانہ میں اور حدیث کی ممانعت کو اس پر محمول کیا ہے' جب بغیر یقین دلانے کے قسم کھائی جائے جیسے تمہارے باپ کی قسم! اور تمہاری زندگی کی قسم! (یعنی اللہ کے نام کے ساتھ حلف اٹھانا یقین دلانے اور وثوق کے ساتھ مخصوص ہے اور بغیر وثوق کے غیر اللہ کے ساتھ حلف اٹھانا جائز ہے)۔

(درمختار علی ہامش الردج ۳ ص ۴۹ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

غیر اللہ کی قسم' اور مستقبل اور ماضی میں طلاق اور عتاق کی قسم کھانے کی تحقیق

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

علامہ زیلعی نے کہا ہے کہ غیر اللہ کی یمین (قسم) بھی مشروع ہے اور یہ جزاء کو شرط پر معلق کرنا ہے اور یہ اصطلاحاً یمین نہیں ہے' اس کو فقہاء کے نزدیک یمین کہا جاتا ہے' کیونکہ اس سے بھی یمین باللہ (اللہ کی قسم) کا معنی حاصل ہوتا ہے' اور وہ ہے کسی کام پر ابھارنا یا کسی کام سے رکنا' اور اللہ کی قسم کھانا مکروہ نہیں ہے اور زیادہ قسمیں کھانے کے بجائے کم قسمیں کھانا زیادہ بہتر ہے' اور بعض فقہاء کے نزدیک غیر اللہ کی قسم کھانا مکروہ ہے اور اکثر فقہاء کے نزدیک مکروہ نہیں ہے کیونکہ اس سے مخالف کو یقین اور وثوق حاصل ہوتا ہے' خاص طور پر ہمارے زمانہ میں' اور حدیث میں جو غیر اللہ کی قسم کھانے کی ممانعت ہے (جو شخص حلف اٹھائے تو اللہ کے ساتھ حلف اٹھائے ورنہ خاموش رہے۔ صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۸۳) یہ اس پر محمول ہے جب بغیر وثوق دلانے کے قسم کھائی جائے' جیسے کوئی کہے: تمہارے باپ کی قسم! میری زندگی کی قسم! ''فتح القدیر'' میں بھی اسی طرح مذکور ہے' خلاصہ یہ ہے کہ غیر اللہ کی قسم سے کبھی یقین دلایا جاتا ہے تاکہ فریق مخالف حلف اٹھانے والے کی بات پر یقین کرلے' مثلاً طلاق اور عتاق پر تعلیق کی جائے (اور یوں کہے کہ اگر میں نے فلاں کام کیا یا نہ کیا تو میری بیوی کو تین طلاق یا میرا غلام آزاد) یہ اس قسم کا حلف ہے جس میں حرف قسم نہیں ہوتا' اور کبھی غیر اللہ کی قسم سے وثوق اور یقین دلانا مقصود نہیں ہوتا' اس میں قسم پوری نہ ہونے سے قسم کھانے والا حانث نہیں ہوتا اور کفارہ لازم نہیں آتا' لہٰذا اس قسم سے فریق مخالف کو حلف اٹھانے والے کی بات پر وثوق اور یقین حاصل نہیں ہوتا' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد ہے: جو شخص حلف اٹھائے وہ اللہ کا حلف اٹھائے' یہ اکثر فقہاء کے نزدیک غیر تعلیق پر محمول ہے' کیونکہ غیر تعلیق میں جب کوئی شخص غیر اللہ کی قسم کھائے گا تو وہ غیر اللہ کے نام کو تعظیم میں اللہ کے مساوی قرار دے گا۔ رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خود غیر اللہ کی قسم کھائی ہے جیسے والضحیٰ' واللیل' والنجم وغیرہا' تو فقہاء نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے' اللہ تعالیٰ مالک ہے' وہ جس کو چاہے معظم قرار دے' اور ہمارے لیے ممانعت کے بعد غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں ہے اور رہی تعلیق تو اس میں غیر اللہ کی تعظیم نہیں ہے (کیونکہ اس میں غیر اللہ کا ذکر ہی نہیں ہے) بلکہ اس میں حصول وثوق کے ساتھ کسی کام پر خود کو ابھارنا ہے یا کسی کام سے خود کو روکنا ہے' لہٰذا یہ بالاتفاق مکروہ نہیں ہے جیسا کہ ہماری تقریر سے ظاہر ہے' بلکہ ہمارے زمانہ میں اللہ کے نام سے حلف اٹھانے کی بہ نسبت طلاق یا عتاق کی قسم سے مخالف کو زیادہ وثوق اور یقین حاصل ہوتا ہے کیونکہ لوگ حانث ہونے اور لزوم کفارہ کی بہت کم پرواہ کرتے ہیں' اس لیے حلف اٹھانے والا بیوی کو طلاق پڑنے یا غلام آزاد ہوجانے کے ڈر سے قسم پوری نہ کرنے یا قسم کے خلاف کرنے سے باز رہے گا' اور ''معراج'' میں

مذکور ہے کہ اگر کسی نے یقین دلانے کے بغیر یا ماضی کے کسی واقعہ پر طلاق یا عتاق کے ساتھ حلف اٹھایا تو یہ مکروہ (تحریمی) ہے۔

(ردالمحتار ج ۳ ص ۴۷۔ ۴۹ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر غیر اللہ کی قسم کھانا جائز ہے کیونکہ اس سے وثوق اور حث مطلوب نہیں ہوتا' اور علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اس پر اکثر فقہاء کے نزدیک طلاق اور عتاق کی قسم کھانا بھی جائز ہے کیونکہ یہ اصطلاحاً قسم نہیں ہے نہ اس میں قسم کے الفاظ ہیں' اور اللہ کی قسم کی بہ نسبت اس میں زیادہ وثاقت ہے' اس لیے خصوصاً یا اصطلاحاً قسم نہیں ہے نہ اس میں قسم کے الفاظ ہیں' اور اللہ کی قسم کی بہ نسبت اس میں زیادہ وثاقت ہے' اس لیے خصوصاً ہمارے زمانہ میں یہ قسم جائز ہے مثلاً کوئی شخص کہے کہ اگر میں نے یہ کام کیا یا نہیں کیا تو میری بیوی کو طلاق یا تین طلاقیں۔ اس کے برعکس ماضی کی کسی بات پر اور دعویٰ میں طلاق اور عتاق کے ساتھ حلف اٹھانا اکثر فقہاء کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے۔ علامہ علاء الدین حصکفی نے ''کتاب الدعویٰ'' میں لکھا ہے:

ہر چند کہ مخالف اصرار کرے پھر بھی طلاق اور عتاق کے ساتھ حلف نہ اٹھائے (تاتارخانیہ) کیونکہ ان کے ساتھ حلف اٹھانا حرام ہے۔ (خانیہ) اور ایک قول یہ ہے کہ اگر ضرورت ہو تو یہ قاضی کی رائے پر موقوف ہے' سو اگر قاضی نے مدعیٰ علیہ کو حلف دیا اور اس نے انکار کیا اور مال کے دعویٰ میں قاضی نے اس کے خلاف فیصلہ کر دیا تو اکثر کے قول کے مطابق اس کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا۔ فیصلہ کا عدم نفوذ اکثر کے قول پر مبنی ہے لیکن جن فقہاء کے نزدیک مدعیٰ علیہ کو طلاق اور عتاق کا حلف دینا جائز ہے' ان کے نزدیک مدعیٰ علیہ کے انکار پر اس کے خلاف قاضی کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا ورنہ اس کو حلف دینے کا کیا فائدہ ہے۔

(درمختار علی ہامش الرد ج ۴ ص ۴۲۸ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

ظاہر یہ ہے کہ جو فقہاء طلاق اور عتاق کے ساتھ قسم دینے کے قائل ہیں ان کے نزدیک ہر چند کہ طلاق اور عتاق کے ساتھ حلف دینا مشروع ہے' اس کے باوجود مدعیٰ علیہ پر یہ حلف پیش کیا جائے گا کیونکہ جس میں معمولی بھی دیانت ہوگی وہ طلاق اور عتاق کا جھوٹا حلف نہیں اٹھائے گا' کیونکہ اس سے یا تو اس کی بیوی پر طلاق واقع ہو جائے گی یا اس کی باندی آزاد ہو جائے گی یا لازم آئے گا کہ وہ ان کو بہ سبیل حرام اپنے پاس رکھے' اس کے برخلاف جب اس نے اللہ کی قسم کھائی تو اس میں ہر زمانہ میں لوگ بہت تساہل کرتے ہیں۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۴۲۸ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ)

حاصل کلام یہ ہے کہ مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر طلاق کی قسم کھانا جائز ہے' مثلاً یوں کہے کہ اگر میں نے فلاں کام نہیں کیا یا کیا تو میری بیوی کو تین طلاقیں یا میری باندی آزاد' علامہ زیلعی' علامہ ابن ہمام' علامہ شامی اور اکثر فقہاء کی یہی تحقیق ہے اور جب کسی شخص پر دعویٰ کیا جائے کہ مثلاً اس نے کسی شخص کے ہزار روپے دینے ہیں یا اس نے کسی کی زمین غصب کر لی ہے' مدعی کے پاس گواہ نہ ہوں اور مدعیٰ علیہ پر قسم آئے تو اب مدعیٰ علیہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ اس کے ذمہ ہزار روپے نہیں ہیں یا اس نے زمین غصب نہیں کی اور علامہ ابن ہمام' علامہ زیلعی' علامہ حصکفی' علامہ شامی اور اکثر فقہاء کے نزدیک اس کے لیے طلاق اور عتاق کے ساتھ حلف اٹھانا جائز نہیں ہے مثلاً یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ اگر اس نے زمین غصب کی ہو تو اس کی بیوی پر تین طلاقیں' اور بعض علماء کے نزدیک اس زمانہ میں یہ حلف دینا جائز ہے کیونکہ لوگ اللہ کی قسم جھوٹی کھا لیتے ہیں' لیکن بیوی پر طلاق پڑنے سے ڈرتے ہیں۔ تنقیح مقام یہ ہے کہ مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر طلاق اور عتاق کی قسم کھانا اکثر فقہاء کے نزدیک جائز ہے اور ماضی کی کسی بات پر طلاق اور عتاق کے ساتھ حلف اٹھانا اکثر فقہاء کے نزدیک مکروہ

تحریمی ہے اور بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے اور ان کے نزدیک بھی یہ مکروہ تنزیہی ہے۔

یمین غموس (جھوٹی قسم)

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

قسم کی تین قسمیں ہیں: (۱) یمین غموس (۲) یمین لغو اور (۳) یمین منعقدہ۔

اگر کوئی شخص عمداً جھوٹ پر قسم کھائے تو یہ یمین غموس ہے مثلاً کسی نے کسی شخص کے ایک ہزار روپے دینے ہوں اور وہ قسم کھائے: اللہ کی قسم! میں نے اس کے ایک ہزار روپے نہیں دینے' حالانکہ اس کو علم ہو کہ اس نے ایک ہزار روپے دینے ہیں۔ اس کو غموس اس لیے کہتے ہیں کہ یہ قسم' قسم کھانے والے کو گناہ میں ڈبو دیتی ہے' یہ قسم مطلقاً گناہ کبیرہ ہے خواہ اس قسم کے ذریعہ کسی مسلمان کا حق دبائے یا نہ دبائے' کیونکہ ''صحیح بخاری'' میں ہے: کبائر یہ ہیں: اللہ کے ساتھ شرک کرنا' ماں باپ کی نافرمانی کرنا' قتل ناحق کرنا اور یمین غموس۔ علامہ سرخسی نے لکھا ہے کہ اس پر یمین کا اطلاق مجازاً ہے کیونکہ یمین ایک عقد مشروع ہے اور یہ محض گناہ کبیرہ ہے۔ اس پر توبہ لازم ہے۔

یمین لغو (بلاقصد قسم)

یمین لغو یہ ہے کہ انسان ماضی یا حال کی کسی بات پر اپنی دانست میں سچی قسم کھائے اور در حقیقت وہ جھوٹ ہو' اس کو لغو اس لیے کہتے ہیں کہ اس پر کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا' نہ گناہ نہ کفارہ' اس میں قسم کھانے والے کی بخشش کی امید کی گئی ہے۔ امام شافعی یہ کہتے ہیں کہ یمین لغو اس قسم کو کہتے ہیں جو انسان کی زبان پر بلاقصد جاری ہو جیسے ''لا واللّٰه بلی واللّٰه'' نہیں خدا کی قسم' ہاں خدا کی قسم۔ (درمختار علی هامش الرد ج ۳ ص ۴۸۔ ۴۷' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

یمین لغو کی جو تعریف مصنف نے ذکر کی ہے ''ہدایہ'' اس کی شروحات اور دیگر متون میں اسی طرح لکھا ہے لیکن علامہ زیلعی نے امام ابوحنیفہ سے امام شافعی کی طرح یمین لغو کی تعریف نقل کی ہے' اسی طرح ''بدائع'' میں ہمارے اصحاب کی طرف سے پہلے پہلی تعریف نقل کی ہے' پھر لکھا ہے: امام محمد نے امام ابوحنیفہ سے نقل کیا ہے کہ لوگوں کی زبان پر جو نہیں خدا کی قسم اور ہاں خدا کی قسم! جاری ہوتا ہے یہ یمین لغو ہے' ہمارے نزدیک یہ قسم ماضی اور حال پر موقوف ہے اور ہمارے نزدیک یہ لغو ہے اور ہمارے اور امام شافعی کے درمیان اختلاف کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بلاقصد مستقبل کے متعلق قسم کھائے تو یہ امام شافعی کے نزدیک یمین لغو ہے اور اس میں کفارہ نہیں ہے اور ہمارے نزدیک یہ یمین منعقدہ ہے اور اس میں کفارہ ہے۔ یمین لغو صرف وہ ہے جو ماضی یا حال کے متعلق بلاقصد کھائی جائے۔ (ردالمحتار ج ۳ ص ۴۸' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ ماوردی شافعی لکھتے ہیں:

یمین لغو وہ ہے جو زبان پر بلاقصد جاری ہو جاتی ہے جیسے نہیں خدا کی قسم! اور ہاں خدا کی قسم!' یہ حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے' اور امام شافعی کا یہی مذہب ہے۔ (النکت والعیون ج ۱ ص ۲۸۶' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں:

یمین لغو میں ایک قول یہ ہے کہ ایک شخص اپنے گمان کے مطابق کسی بات پر حلف اٹھائے' پھر اس پر منکشف ہو کہ واقعہ اس کے خلاف ہے' حضرت ابوہریرہ' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما' عطاء' شعبی' ابن جبیر' مجاہد' قتادہ' امام مالک اور مقاتل کا یہی قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کوئی شخص قسم کھانے کے قصد کے بغیر کہے: نہیں خدا کی قسم! ہاں خدا کی قسم!' یہ حضرت عائشہ

رضی اللہ عنہا' طاؤس' عروہ' نخعی اور امام شافعی کا قول ہے' اس قول پر اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے: "لیکن اللہ ان قسموں پر تم سے مواخذہ کرے گا جو تم نے پختہ ارادوں سے کھائی ہیں"۔ یہ دونوں قول امام احمد سے منقول ہیں' تیسرا قول یہ ہے کہ آدمی غصہ میں جو قسم کھائے وہ یمین لغو ہے' چوتھا قول یہ ہے کہ آدمی کسی گناہ پر قسم کھائے' پھر قسم توڑ کر کفارہ دے اس پر کوئی گناہ نہیں ہے' وہ یمین لغو ہے' یہ سعید بن جبیر کا قول ہے' پانچواں قول یہ ہے کہ آدمی کسی چیز پر قسم کھائے' پھر اس کو بھول جائے' یہ نخعی کا قول ہے۔ (زاد المسیر ج ۱ ص ۲۵۵۔ ۲۵۴' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی لکھتے ہیں:

امام مالک کے نزدیک یمین لغو یہ ہے کہ آدمی اپنے گمان کے مطابق کسی چیز پر قسم کھائے اور واقعہ اس کے خلاف ہو۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۲۲۱' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۸ھ)

یمین منعقدہ (بالقصد قسم)

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

اگر مستقبل کے کسی کام پر قسم کھائی جائے تو وہ یمین منعقدہ ہے لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ وہ کام فی نفسہ ممکن ہو' اگر کوئی شخص یہ قسم کھائے کہ خدا کی قسم! میں نہیں مروں گا' یا خدا کی قسم! سورج طلوع نہیں ہوگا تو یہ یمین غموس ہے۔ اگر اس قسم کو پورا نہیں کیا تو اس میں کفارہ ہے (مثلاً اس نے قسم کھائی: خدا کی قسم! میں کل روزہ رکھوں گا' اب اگر اس نے کل روزہ نہیں رکھا تو اس کو کفارہ دینا ہوگا۔) (در مختار علی ہامش الرد ج ۳ ص ۴۹' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

کفارہ کی تفصیل اور اس کی دلیل یہ آیت ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ (المائدہ: ۸۹)

بلا قصد کھائی ہوئی قسموں پر اللہ تم سے مواخذہ نہیں فرمائے گا' لیکن تمہاری بالقصد کھائی ہوئی قسموں (یمین منعقدہ) پر تم سے مواخذہ فرمائے گا' تو اس قسم کا کفارہ تمہارے درمیانی قسم کے کھانوں میں دس مسکینوں کا کھانا دینا ہے جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو' یا دس مسکینوں کو کپڑے دینا ہے' یا ایک غلام آزاد کرنا ہے اور جس کو ان میں سے کسی پر قدرت نہ ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھا کر (توڑ دو) اور اپنی قسموں کی (ٹوٹنے سے) حفاظت کرو۔

احکام شرعیہ کے اعتبار سے قسم کی اقسام

حالات اور واقعات کے اعتبار سے قسم کھانے کی یہ قسمیں ہیں: فرض' واجب' مستحب' مباح' مکروہ اور حرام۔

(۱) اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر قسم کھانا فرض ہے۔

(۲) اگر اپنی جان یا کسی مسلمان کی جان کو بچانا قسم کھانے پر موقوف ہو تو قسم کھانا واجب ہے' مثلاً کوئی شخص قتل کے الزام سے بری ہو اور اس پر قسامت کے ذریعہ قسم لازم آ رہی ہو یا کوئی اور مسلم بری ہو اور اس کو علم ہو تو اس پر قسم کھا کر اپنی اور اس مسلمان کی جان بچانا واجب ہے۔

(۳) اگر دو مسلمانوں میں صلح کرانے کے لیے یا کسی مسلمان کے دل سے بغض زائل کرنے کے لیے یا دفع شر کے لیے قسم کھائی

پڑے تو قسم کھانا مستحب ہے۔

(۴) کسی مباح کام پر قسم کھانا مباح ہے' محمد بن کعب القرظی نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر عصا لیے ہوئے کھڑے تھے' انہوں نے فرمایا: اے لوگو! تم اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے قسم کھانے سے گریز نہ کرو' اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! میرے ہاتھ میں عصا ہے۔

(۵) کسی مستحب کام کے ترک پر یا کسی مکروہ کام کے ارتکاب پر قسم کھانا مکروہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ (البقرہ: ۲۲۴)

اور تم نیکی' تقویٰ اور لوگوں کی خیر خواہی سے بچنے کے لیے اللہ کے نام کی قسمیں کھانے کو بہانہ نہ بناؤ۔

روایت ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ حضرت مسطح نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جھوٹی تہمت لگائی ہے تو انہوں نے قسم کھائی کہ وہ حضرت مسطح کو جو صدقات اور خیرات دیا کرتے تھے اب اس کو بند کر دیں گے' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ (النور: ۲۲)

اور تم میں سے جو لوگ اصحاب فضل اور ارباب وسعت ہیں وہ یہ قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے رشتہ داروں' مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ نہیں کریں گے انہیں معاف کرنا اور درگزر کرنا چاہیے' کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں بخش دے۔

(۶) جھوٹی قسم کھانا حرام ہے۔ قرآن مجید میں منافقوں کے متعلق ہے:

وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ (المجادلہ: ۱۴)

اور وہ دانستہ جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں ○

امام بخاری روایت کرتے ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی مسلمان کا مال کھانے کے لیے جھوٹی قسم کھائی وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضب ناک ہوگا۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۸۷)

ایلاء کا معنی اور ایلاء کے بعد وقوع طلاق میں فقہاء احناف کا موقف

ایلاء کا لغوی معنی ہے: قسم کھانا' اور اصطلاح شرع میں اس کا معنی ہے: مدت مخصوصہ تک اپنی منکوحہ سے جماع نہ کرنے کی قسم کھانا' اور زیادہ صحیح تعریف یہ ہے کہ اپنی منکوحہ سے چار مہینے تک جماع نہ کرنے کی قسم کھانا۔

علامہ مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

جب کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہے کہ اللہ کی قسم! میں تم سے مقاربت نہیں کروں گا' یا کہے: اللہ کی قسم! میں تم سے چار مہینے مقاربت نہیں کروں گا تو وہ ایلاء کرنے والا ہے کیونکہ قرآن مجید میں ہے: جو لوگ اپنی عورتوں سے مباشرت نہ کرنے کی قسم کھا لیتے ہیں ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے' اگر انہوں نے (اس مدت میں) رجوع کر لیا تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا بڑا بردبار ہے' اور اگر انہوں نے طلاق ہی کا ارادہ کر لیا ہے تو بے شک اللہ خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے۔ (البقرہ: ۲۲۷۔۲۲۶)

اگر اس نے چار مہینے کے اندر اپنی بیوی سے مباشرت کر لی تو اس کی قسم ٹوٹ جائے گی اور اس پر کفارہ لازم ہوگا اور ایلاء ساقط ہو جائے گا' اور اگر اس نے چار مہینے اپنی بیوی سے مقاربت نہیں کی تو اس کی بیوی پر از خود طلاق بائنہ واقع ہو جائے گی۔

امام شافعی نے کہا کہ قاضی کے تفریق کرنے سے طلاق بائنہ واقع ہو گی جیسا کہ مفقود الخبر اور نامرد کے مسئلہ میں قاضی کی تفریق سے طلاق بائنہ واقع ہوتی ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ اس نے عورت کے حق کو اس سے سلب کر کے اس پر ظلم کیا ہے اس لیے شریعت نے اس کو یہ سزا دی ہے کہ اس مدت کے پوری ہونے پر نکاح کی نعمت اس سے زائل ہو جائے گی۔ حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت عبداللہ بن مسعود' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے اسی طرح منقول ہے اور ان کی اقتداء کرنی ہمارے لیے کافی ہے اور اس لیے کہ زمانہ جاہلیت میں قسم کھاتے ہی فوراً طلاق واقع ہو جاتی تھی اور شریعت اسلامیہ نے وقوع طلاق کے لیے مدت پوری ہونے کی حد مقرر کر دی۔

اگر اس نے چار ماہ تک مقاربت نہ کرنے کی قسم کھائی تھی تو چار ماہ کے بعد قسم ساقط ہو جائے گی اور اگر اس نے یہ قسم کھائی تھی کہ میں کبھی بھی اس سے مقاربت نہیں کروں گا تو چار ماہ بعد اس کی بیوی کو طلاق بائنہ ہو جائے گی اور قسم باقی رہے گی' پھر اگر اس نے اس سے دوبارہ نکاح کر لیا اور اس کے بعد مقاربت کر لی تو فبہا اور اسے اس قسم کے توڑنے کا کفارہ دینا ہوگا' اور اگر اس نے پھر چار ماہ تک مقاربت نہیں کی تو اس کی بیوی پر دوبارہ طلاق بائنہ پڑ جائے گی' اور اگر اس نے اس سے پھر تیسری بار نکاح کر لیا تو پھر اسی طرح ہوگا یعنی اگر اس نے مقاربت کر لی تو فبہا ورنہ چار ماہ بعد پھر اس کی بیوی پر طلاق بائنہ پڑ جائے گی اور اس کے بعد حلالہ شرعیہ کے بغیر وہ اس سے چوتھی بار نکاح نہیں کر سکتا اور چوتھی بار نکاح کرنے کے بعد پھر اسی طرح ہوگا۔

اگر اس نے چار ماہ سے کم کی قسم کھائی ہے تو یہ ایلاء نہیں ہے' کیونکہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: چار ماہ سے کم میں ایلاء نہیں ہے' کیونکہ جس شخص نے ایک ماہ مقاربت نہ کرنے کی قسم کھائی اور پھر چار ماہ تک مقاربت نہیں کی تو بقیہ تین ماہ کے عرصہ میں اس نے بغیر قسم کے مقاربت نہیں کی اور جو بغیر قسم کے تین ماہ بلکہ اس سے زائد عرصہ تک بھی مقاربت نہ کرے تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ (ہدایہ اولین ص ۴۰۲ ـ ۴۰۱ مطبوعہ شرکۃ علمیہ' ملتان)

علامہ المرغینانی نے امام شافعی کا جو یہ مذہب نقل کیا ہے کہ چار ماہ کی مدت گزرنے کے بعد قاضی کی تفریق سے طلاق بائن ہو گی' یہ نقل صحیح نہیں ہے' بلکہ امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ مدت گزرنے کے بعد شوہر کو اختیار ہے چاہے تو رجوع کر لے اور چاہے تو طلاق دے دے۔

ایلاء کے بعد وقوع طلاق میں ائمہ ثلاثہ کا مذہب اور دلائل اور فقہاء احناف کی طرف سے جوابات

علامہ ماوردی شافعی لکھتے ہیں:

چار ماہ گزرنے کے بعد وقوع طلاق کے متعلق دو قول ہیں' حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت ابن زید' حضرت زید بن ثابت' حضرت ابن مسعود' حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہے کہ اس مدت کے گزرنے کے بعد طلاق بائنہ واقع ہو جاتی ہے' اور حضرت عمر اور حضرت علی کا دوسرا قول' اور ایک روایت میں حضرت عثمان کا دوسرا قول یہ ہے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد شوہر کو اختیار ہے خواہ رجوع کرے خواہ طلاق دے دے' امام شافعی اور اہل مدینہ کا یہی مذہب ہے۔

(النکت والعیون ج ۱ ص ۲۹۰ ـ ۲۸۹ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

علامہ ابن جوزی حنبلی نے بھی مؤخر الذکر قول نقل کیا ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

ابوصالح نے بیان کیا کہ بارہ صحابہ سے یہی (مؤخر الذکر) قول منقول ہے اور امام مالک' امام احمد اور امام شافعی کا بھی مذہب ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد از خود طلاق واقع ہو جائے گی' اور یہ طلاق بائن ہو گی' حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت ابن عمر' حضرت زید بن ثابت اور حضرت قبیصہ بن ذویب سے بھی منقول ہے۔

(زاد المسیر ج ۱ ص ۲۵۷ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت '۱۴۰۷ھ)

قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ . (البقرہ: ۲۲۷) پس اگر وہ طلاق کا ارادہ کریں" اس میں یہ دلیل ہے کہ مدت گزرنے سے از خود طلاق واقع نہیں ہوتی بلکہ طلاق اس وقت واقع ہوگی جب شوہر طلاق دینے کا قصد کرے گا' امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے یہ کہا ہے کہ چار ماہ تک اس کا رجوع نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا عزم طلاق ہے' ہمارے علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ چار ماہ تک رجوع نہ کرنا اس کا ماضی ہے اور ماضی پر عزم کرنا محال ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد اگر وہ طلاق کا عزم کریں' اس سے معلوم ہوا کہ چار ماہ گزرنے کے بعد اس کے طلاق دینے سے طلاق واقع ہوگی۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۱۴۷ مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۸ھ)

قاضی ابوبکر ابن العربی کا یہ استدلال درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: اگر وہ طلاق کا عزم کریں یہ نہیں فرمایا کہ وہ زبان سے طلاق دیں' جب کہ ائمہ ثلاثہ کا یہ مذہب ہے کہ شوہر جب زبان سے طلاق دے گا تو طلاق واقع ہوگی' اور قرآن مجید میں زبان سے طلاق دینے کا ذکر نہیں ہے بلکہ طلاق کے عزم کا ذکر ہے اور اس کا چار ماہ تک رجوع نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا عزم طلاق دینا تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پس اگر وہ طلاق کا عزم کریں' اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ اس مدت کے بعد وہ عزم کریں' بلکہ اس کا معنی ہے: اگر وہ طلاق کے عزم پر مستمر اور برقرار رہیں تو اللہ خوب سننے والا ہے' بہت جاننے والا ہے' یعنی ان کے دل کی بات کو سننے والا ہے اور ان کی نیت کو جاننے والا ہے' سننے کا تعلق صرف کلام لفظی سے نہیں ہوتا بلکہ کلام نفسی سے بھی ہوتا ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ

اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقد ثانی سے) روکے رکھیں' اور اگر وہ اللہ

لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ

اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس چیز کو چھپائیں جو اللہ نے

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ

ان کے رحموں (بچہ دانیوں) میں پیدا کیا ہے' اور ان کے خاوند اس مدت میں (طلاق رجعی کو) واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں بشرطیکہ

اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

ان کا ارادہ حسن سلوک کے ساتھ رہنے کا ہو' اور عورتوں کے لیے بھی دستور کے مطابق مردوں پر اسی طرح حقوق ہیں جس طرح

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں' اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت ہے' اور اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہے ۝

۲۸ ع ۷ ۱۲

مطلقہ عورتوں کی عدت مقرر کرنے کا شان نزول

اس سے پہلے ایلاء کی دو آیتوں کو اللہ تعالیٰ نے طلاق پر ختم کیا تھا اور طلاق کو عدت لازم ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عدت کا حکم بیان فرمایا ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے اس آیت کے شان نزول میں حسب ذیل احادیث ذکر کی ہیں:

امام ابوداؤد' امام ابن ابی حاتم اور امام بیہقی نے روایت کیا ہے کہ حضرت اسماء بنت یزید بن السکن انصاریہ بیان کرتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں طلاق دی گئی' اس وقت مطلقہ کے لیے کوئی عدت نہیں ہوتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے طلاق کی عدت کو بیان فرمایا اور یہ آیت نازل فرمائی۔ وہ پہلی خاتون ہیں جن کے متعلق عدت طلاق نازل ہوئی۔

امام عبد بن حمید نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں طلاق کی کوئی عدت نہیں ہوتی تھی۔

(الدرالمنثور ج ۱ ص ۲۷۴' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

مطلقہ عورتوں کی اقسام اور ان کی عدتوں کا بیان

اس آیت میں مطلقات کی عدت تین قروء (تین حیض) بیان کی گئی ہے اور مطلقہ کے کئی افراد ہیں غیر مدخولہ کی سرے سے عدت ہی نہیں ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا۝ (الاحزاب: ۴۹)

اے مسلمانو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو' پھر تم ان کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دو تو پھر تمہارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں جسے تم شمار کرو' سو تم ان کو کچھ فائدہ پہنچاؤ اور حسن سلوک کے ساتھ انہیں چھوڑ دو۝

اور جو عورت مطلقہ ہو اور حاملہ ہو اس کی عدت وضع حمل ہے:

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ (الطلاق: ۴)

اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔

اور جو عورت مطلقہ ہو' غیر حاملہ ہو لیکن صغر سن یا بڑھاپے کی وجہ سے اس کو حیض نہ آتا ہو' اس کی عدت تین ماہ ہے:

وَالّٰٓـئِىْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـئِىْ لَمْ يَحِضْنَ ۚ (الطلاق: ۴)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں اگر تمہیں اشتباہ ہو (کہ ان کی عدت کیا ہو گی؟) تو ان کی عدت تین مہینے ہے' اور جن عورتوں کو ابھی حیض آنا شروع نہیں ہوا (ان کی عدت بھی تین ماہ ہے)۔

اور جو مطلقہ عورت مدخولہ ہو' غیر حاملہ ہو' بالغہ اور جوان ہو لیکن باندی ہو اس کی عدت دو حیض ہے' سو اس آیت میں جس مطلقہ عورت کی عدت تین حیض بیان کی گئی ہے وہ ایسی مطلقہ عورت ہے جو مدخولہ ہو' غیر حاملہ ہو' بالغہ اور جوان ہو اور آزاد ہو اور مطلقات کے عموم سے مطلقہ عورتوں کے باقی افراد مستثنیٰ ہیں اس لیے یہ آیت عام مخصوص عنہ البعض ہے۔

عدت کا لغوی اور شرعی معنی اور عدت کے احکام

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ

اے نبی! (مسلمانوں سے کہیے:) جب تم (اپنی) عورتوں کو طلاق دو تو ان کو عدت کے لیے (اس زمانہ میں جس میں

بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ (الطلاق:۱)

جماع نہ کیا ہو) طلاق دو اور عدت کو شمار کرو اور اپنے رب اللہ سے ڈرتے رہو تم مطلقہ عورتوں کو دوران عدت ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود (بھی) نہ نکلیں البتہ اگر وہ کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں (تو پھر نکال دو) اور یہ اللہ کی حدود ہیں اور جس نے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔

عدت کا لغوی معنی ہے: گننا اور شمار کرنا اور اس کا اصطلاح شرع میں یہ معنی ہے کہ زوال نکاح کے بعد عورت کا شوہر کے مکان میں ایک مدت معینہ تک ٹھہرنا اور انتظار کرنا۔ عورت کے حق میں عدت کا رکن یہ ہے کہ دوران عدت اس کا گھر سے باہر نکلنا حرام ہے اور دوران عدت نکاح کرنا یا نکاح کا پیغام قبول کرنا حرام ہے اور مرد پر لازم ہے کہ وہ عدت کے زمانہ میں عورت کو رہائش اور کھانے کا خرچ مہیا کرے۔ اگر اس نے تین طلاقیں دی ہیں تو مطلقہ اس کے گھر میں اجنبی عورت کی طرح رہے گی اور اس سے پردہ کرے گی۔ عدت کے دوران مرد پر مطلقہ کی بہن اس کی پھوپھی اس کی خالہ اس کی بھتیجی اور اس کی بھانجی سے نکاح کرنا حرام ہے اسی طرح اگر مطلقہ اس کی چوتھی بیوی تھی اور بقیہ تین اس کے نکاح میں ہیں تو اب وہ دوران عدت مزید کسی عورت سے نکاح نہیں کر سکتا۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۵۹۹۔ ۵۹۸ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

عدت مقرر کرنے کی حکمتیں

عدت کی حکمت یہ ہے کہ عورت کے رحم کا استبراء ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ وہ حاملہ ہے یا نہیں کیونکہ اگر اس کو حیض آ گیا تو وہ حاملہ نہیں ہو گی اور اس کی عدت تین حیض ہو گی ورنہ وضع حمل تک اس کی عدت ہو گی دوسری حکمت یہ ہے کہ اگر عورت دوسرا نکاح کرتی ہے تو اس نکاح اور دوسرے نکاح کے درمیان وقفہ ہونا چاہیے تا کہ اس وقفہ میں عورت کے دل و دماغ پر پہلے شوہر کے جو اثرات نقش ہو چکے تھے وہ محو ہو جائیں اور وہ خالی الذہن ہو کر دوسرے شوہر کے نکاح میں جائے تیسری حکمت یہ ہے کہ عدت کے دوران عورت طلاق کے عواقب اور نتائج پر غور کرے کہ اس کی کس خطا یا زیادتی کی وجہ سے طلاق واقع ہوئی تا کہ دوسرے نکاح میں وہ ان غلطیوں کا اعادہ نہ کرے اور اگر شوہر کی کسی بدسلوکی یا زیادتی کے نتیجے میں طلاق واقع ہوئی ہے تو اب دوسرے نکاح میں زیادہ غور و فکر اور تامل سے کام لے اور احتیاط سے نکاح کرے تا کہ پھر اسی قماش کے شوہر کے پلے نہ بندھ جائے چوتھی حکمت یہ ہے کہ اگر ایک طلاق یا دو طلاقوں کی عدت گزار رہی ہے تو شوہر کے لیے اس طلاق سے رجوع کرنے کا موقع باقی رہے اور جس جھگڑے یا فساد کی بناء پر یہ طلاق واقع ہوئی تھی بعد میں جب فریقین کا جوش غضب ٹھنڈا ہو جائے تو اس جھگڑے کے عوامل پر غور کریں اور شوہر حسن سلوک کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے رجوع کر لے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے: اور ان کے خاوند اس مدت میں (طلاق رجعی کو) واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں بہ شرطیکہ ان کا ارادہ حسن سلوک کے ساتھ رہنے کا ہو اس لیے یہ ضروری ہے کہ صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ دو طلاقیں دی جائیں تا کہ رجوع کا موقع باقی رہے اور تین طلاقیں دے کر بعد میں پچھتانا نہ پڑے اور بچوں کی زندگی ویران نہ ہو ہمارے زمانہ میں یہ وبا عام ہے کہ لوگ جب طلاق دیتے ہیں تو تین طلاقوں سے کم نہیں دیتے یا وثیقہ نویس سے طلاق لکھواتے ہیں اور وہ تین طلاقیں لکھ کر دستخط کرا لیتا ہے اور جب جھگڑے کا جوش ختم ہو جاتا ہے تو میاں بیوی دونوں دربدر مارے مارے پھرتے ہیں غیر مقلد مولوی سے فتویٰ لیتے ہیں یا حلالہ کی ناگوار صورت اختیار کرتے ہیں۔

قرء کے معانی کے متعلق ائمہ لغت کی تصریحات

اللہ تعالیٰ نے مطلقہ کی عدت تین قروء بیان فرمائی ہے لیکن قروء کی تفسیر میں مجتہدین کا اختلاف ہے' امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک قروء کا معنی حیض ہے' اور امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک قروء کا معنی طہر ہے۔ لغت میں قرء کا معنی حیض اور طہر ہے اور یہ لغت اضداد سے ہے۔ علامہ فیروز آبادی لکھتے ہیں:

قرء کا معنی حیض' طہر اور وقت ہے۔ (قاموس ج ۱ ص ۱۳۶۱' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

علامہ جوہری لکھتے ہیں:

قرء کا معنی حیض ہے' اس کی جمع قروء اور اقراء ہے' حدیث میں ہے: اپنے ایام اقراء میں نماز کو ترک کردو' اس حدیث میں قروء کا اطلاق حیض پر ہے اور قرء کا معنی طہر بھی ہے' یہ لغت اضداد سے ہے۔ (الصحاح ج ۱ ص ۶۴' مطبوعہ دار العلم' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

علامہ ابن منظور افریقی نے بھی یہی لکھا ہے۔ (لسان العرب ج ۱ ص ۱۳۰' مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ' قم' ایران' ۱۴۰۵ھ)

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

قرء حقیقت میں طہر سے حیض میں داخل ہونے کا نام ہے' اور جب کہ یہ لفظ حیض اور طہر دونوں کا جامع ہے تو اس کا ہر ایک پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو (نکاح ثانی سے) تین قروء تک روکے رکھیں' یعنی تین حیض تک روکے رکھیں' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنے ایام اقراء میں نماز پڑھنے سے بیٹھی رہو' یعنی اپنے ایام حیض میں۔ اہل لغت نے کہا ہے کہ قرء کا معنی ہے: جمع ہونا اور ایام حیض میں رحم میں خون جمع ہوتا ہے۔

(المفردات ص ۴۰۲' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

قرء بہ معنی حیض کی تائید میں احادیث اور فقہاء احناف کے دلائل

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

عدی بن ثابت اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مستحاضہ کے متعلق فرمایا: تم اپنے ان ایام اقراء میں نماز چھوڑ دو جن میں تم کو حیض آتا ہے' پھر تم غسل کرو اور ہر نماز کے لیے وضو کرو' نماز پڑھو اور روزہ رکھو۔ (جامع ترمذی ص ۳۲' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث میں یہ دلیل بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرء کا اطلاق حیض پر کیا ہے اور یہ دلیل بھی ہے کہ حیض کی کم از کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے کیونکہ اقراء عربی قواعد کے اعتبار سے جمع قلت ہے اور اس کا اطلاق کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ دس پر ہوتا ہے اور آپ نے حیض کے لیے اقراء کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

اس حدیث کو امام ابوداؤد[1]' امام نسائی[2] اور امام دار قطنی[3] نے بھی روایت کیا ہے۔

نیز امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: باندی کی طلاق (مغلظہ) دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں۔ (جامع ترمذی ص ۱۹۱' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

۱۔ امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ' سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۳۷' مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ

۲۔ امام ابوعبدالرحمان نسائی متوفی ۳۰۳ھ' سنن نسائی ج ۱ ص ۶۵' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

۳۔ امام علی بن عمر دار قطنی متوفی ۳۸۵ھ' سنن دار قطنی ج ۱ ص ۲۱۲' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان

اس حدیث کو امام ابوداؤد[1]، امام ابن ماجہ[2]، امام مالک[3]، امام دارمی[4] اور امام احمد نے بھی روایت کیا ہے[5]۔

اس حدیث سے وجہ استدلال یہ ہے کہ اس پر اتفاق ہے کہ آزاد اور باندی کی عدت کے عدد میں فرق ہے جنس میں فرق نہیں ہے اور جب باندی کی عدت دو حیض ہے تو آزاد عورت کی عدت تین حیض ہوئی، اور حدیث میں یہ تصریح ہے کہ قرء سے مراد حیض ہے۔

حافظ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

امام عبدالرزاق، امام ابن جریر اور امام بیہقی نے عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کہا: الاقراء سے مراد حیض ہے۔

امام ابن جریر اور امام بیہقی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ''ثلاثة قروء'' سے مراد تین حیض ہیں۔

امام عبد بن حمید نے مجاہد سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اس سے مراد حیض ہے۔

وکیع نے حسن سے روایت کیا ہے کہ عورت حیض کے ساتھ عدت گزارے خواہ اس کو ایک سال کے بعد حیض آئے۔

امام عبدالرزاق نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ الاقراء حیض ہیں، طہر نہیں ہیں۔

امام عبدالرزاق اور امام بیہقی نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ طلاق دینا مردوں پر موقوف ہے اور عدت عورتوں پر موقوف ہے۔ (الدرالمنثور ج ۱ ص ۲۷۵۔ ۲۷۴ مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی ایران)

فقہاء احناف نے ''ثلاثة قروء'' میں لفظ ''ثلثة'' سے بھی استدلال کیا ہے کیونکہ اگر قرء کا معنی طہر لیا جائے تو جس طہر میں طلاق دی جائے گی اس طہر کو شمار کیا جائے گا یا نہیں، اگر اس طہر کو شمار کیا جائے تو دو طہر اور ایک طہر کا کچھ حصہ یعنی اڑھائی طہر عدت قرار پائے گی اور اگر اس طہر کو شمار نہ کیا جائے تو ساڑھے تین طہر عدت قرار پائے گی اور تین قروء صرف اسی صورت میں عدت ہو سکتی ہے جب قرء کا معنی حیض کیا جائے۔

فقہاء احناف نے قرء بہ معنی حیض لینے پر یہ عقلی استدلال کیا ہے کہ عدت مشروع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ استبراء رحم ہو جائے یعنی یہ معلوم ہو جائے کہ عورت کے رحم میں شوہر کا نطفہ استقرار پا گیا ہے اور بچہ بننے کا عمل شروع ہو گیا ہے یا اس کا رحم خالی اور صاف ہے سو اگر عورت کو حیض آ گیا تو معلوم ہوا کہ اس کا رحم خالی ہے اور اگر حیض نہیں آیا تو معلوم ہوا کہ اس میں نطفہ ٹھہر گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عدت کی حکمت حیض سے پوری ہوتی ہے نہ کہ طہر سے، اس لیے صحیح یہی ہے کہ قرء کا معنی حیض کیا جائے۔

فقہاء شافعیہ اور مالکیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے: '' فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ''. (الطلاق: ۱) انہوں نے کہا: اس آیت میں لام توقیت کے لیے ہے اور آیت کا معنی ہے: ان کو عدت کے وقت میں طلاق دو، اور چونکہ حیض میں طلاق دینا مشروع نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عدت کا وقت طہر ہے اس لیے ''ثلثة قروء'' میں قروء بہ معنی طہر ہے، اس کا جواب یہ

[1] امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ، سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۹۸، مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور، ۱۴۰۵ھ

[2] امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ، سنن ابن ماجہ ص ۱۵۰، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی

[3] امام مالک بن انس اصبحی متوفی ۱۷۹ھ، موطا امام مالک ص ۵۲۱، مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور

[4] امام عبداللہ بن عبدالرحمان متوفی ۲۵۵ھ، سنن دارمی ج ۲ ص ۲۹۸، مطبوعہ نشر السنۃ ملتان

[5] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ، مسند احمد ج ۶ ص ۱۱۷، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت

ہے کہ یہاں لام توقیت کے لیے نہیں بلکہ اختصاص کے لیے ہے یعنی طلاق عدت کے ساتھ مختص ہے اور عدت حیض سے شروع ہوتی ہے اس لیے طلاق حیض سے پہلے دینی چاہیے نہ کہ دوران حیض اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ایک قراءت میں ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو یوں بھی پڑھا ہے: "فی قبل عدتھن. (روح المعانی ج ۱ص ۱۳۲) یعنی ان کو عدت سے پہلے طلاق دو" نیز قرء بہ معنی حیض پر یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "ثلثة قروء" کے بعد فرمایا ہے: "عورتوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس چیز کو چھپائیں جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے" اور یہ واضح ہے کہ اس کا تعلق حیض سے ہے نہ کہ طہر سے۔

قرء کے معنی کی تعیین میں دیگر ائمہ مذاہب کی آراء

علامہ ماوردی شافعی لکھتے ہیں:

قرء کے متعلق دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد حیض ہے یہ حضرت عمر' حضرت علی' حضرت ابن مسعود' حضرت ابوموسیٰ' مجاہد' قتادہ' ضحاک' عکرمہ' سدی' امام مالک اور ابوحنیفہ کا قول ہے (علامہ ماوردی کو نقل میں تسامح ہوا ہے امام مالک کے نزدیک اس کا معنی حیض نہیں' طہر ہے' البتہ امام احمد کے نزدیک اس کا معنی حیض ہے) دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا معنی طہر ہے یہ حضرت عائشہ' حضرت ابن عمر' حضرت زید بن ثابت' زہری' ابان بن عثمان' امام شافعی اور اہل حجاز کا قول ہے۔

(النکت والعیون ج ۱ص ۲۹۱۔ ۲۹۰' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

اس آیت سے مراد یہ ہے کہ مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین ادوار یا تین انتقالات تک (عقد ثانی سے) روکے رکھیں' اور مطلقہ کبھی حیض سے طہر کی طرف اور کبھی طہر سے حیض کی طرف منتقل ہوتی ہے' اور یہاں طہر سے حیض کی طرف انتقال تو قطعاً مراد نہیں ہے کیونکہ حیض میں طلاق دینا تو اصلاً مشروع نہیں ہے' اور جب کہ طلاق دینا طہر میں مشروع ہے تو پھر عدت تین انتقالات ہے اور پہلا انتقال اس طہر سے ہے جس میں طلاق واقع ہے۔

(الجامع الاحکام القرآن ج ۳ص ۱۱۵۔ ۱۱۴' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں:

اقراء کے متعلق فقہاء کے دو قول ہیں' ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد حیض ہے' حضرت عمر' حضرت علی' حضرت ابن مسعود' حضرت ابوموسیٰ' حضرت عبادہ بن الصامت' حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہم' عکرمہ' ضحاک' سدی' سفیان ثوری' اوزاعی' حسن بن صالح' امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے' امام احمد نے کہا: میں پہلے یہ کہتا تھا کہ قرء بہ معنی طہر ہے' اور اب میرا مذہب یہ ہے کہ قرء کا معنی حیض ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اقراء سے مراد اطہار ہیں' حضرت زید بن ثابت' حضرت ابن عمر' حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہم' زہری' ابان بن عثمان' امام مالک بن انس اور امام شافعی کا یہی مذہب ہے۔ (زاد المسیر ج ۱ص ۲۶۰۔ ۲۵۹' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت)

علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں:

ہر چند کہ قرء کا اطلاق حیض اور طہر دونوں پر ہوتا ہے' لیکن چند دلائل کی وجہ سے قرء بہ معنی حیض راجح ہے' ایک دلیل یہ ہے کہ اہل لغت نے کہا ہے کہ قرء کا معنی اصل لغت میں وقت ہے اور اس لحاظ سے اس کا بہ معنی حیض ہونا راجح ہے' کیونکہ وقت کسی چیز کے حادث ہونے کا ہوتا ہے اور حادث حیض ہوتا ہے کیونکہ طہر تو حالت اصلی ہے اور بعض نے کہا: قرء کا معنی اصل لغت میں جمع اور تالیف ہے' اس اعتبار سے بھی حیض اولیٰ ہے کیونکہ ایام حیض میں رحم میں خون جمع ہوتا رہتا ہے' دوسری دلیل یہ ہے کہ اس

عورت کو ذات الاقراء کہا جاتا ہے جس کو حیض آتا ہو اور جو کم سن ہو یا بڑھیا یا بانجھ ہو اس کو ذات الاقراء نہیں کہا جاتا' حالانکہ طہر تو ان کو اس وقت حاصل ہوتا ہے' تیسری دلیل یہ ہے کہ لغت قرآن پر اتھارٹی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرء کو حیض کے معنی میں استعمال فرمایا ہے' طہر کے معنی میں استعمال نہیں فرمایا کیونکہ آپ نے فرمایا: مستحاضہ اپنے ایام اقراء میں نماز پڑھنا چھوڑ دے' اور آپ نے حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش سے فرمایا: جب تمہارا قرء آئے تو نماز چھوڑ دو اور جب وہ چلا جائے تو غسل کر کے نماز پڑھو' اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: باندی کی طلاقیں دو ہیں اور اس کا قرء دو حیض ہیں' اور ایک روایت میں فرمایا: اس کی عدت دو حیض ہیں' اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اوطاس کی باندیوں کے متعلق فرمایا: وضع حمل سے پہلے حاملہ سے وطی نہ کی جائے اور جب تک ایک حیض سے استبراء نہ ہو جائے غیر حاملہ سے وطی نہ کی جائے۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۳۶۷۔ ۳۶۴ ملخصاً مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور)

امام بخاری بیان کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب وطی شدہ باندی کو ہبہ کیا جائے یا اسے فروخت کیا جائے یا وہ آزاد ہو جائے تو ایک حیض کے ساتھ اس کے رحم کا استبراء کیا جائے اور کنواری باندی کا استبراء نہ کیا جائے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۹۸۔ ۲۹۷ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور عورتوں کے لیے بھی دستور کے مطابق مردوں پر اسی طرح حقوق ہیں' جس طرح مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت ہے۔ (البقرہ: ۲۲۸)

اسلام میں عورتوں کے مردوں پر حقوق

اس آیت کی تفسیر میں ہم پہلے یہ بیان کریں گے کہ اسلام نے عورتوں کو کیا حقوق دیئے ہیں' اس کے بعد مردوں کے حقوق اور ان کی فضیلت بیان کریں گے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ○ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ○ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ○ (النساء: ۲۰۔ ۱۸)

اے ایمان والو! تمہارے لیے زبردستی عورتوں کا وارث بن جانا جائز نہیں ہے اور ان سے اپنے دیئے ہوئے مہر کا بعض حصہ لینے کے لیے ان کو نہ روکو' ماسوا اس کے کہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی کا کام کریں' اور تم ان کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ زندگی گزارو' پس اگر تم ان کو ناپسند کرو گے تو یہ ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تمہارے لیے اس میں خیر کثیر رکھ دے ○ اور اگر تم ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری بیوی سے نکاح کا ارادہ کرو اور تم ان میں سے کسی ایک کو بہت زیادہ مال دے چکے ہو تو اس سے کوئی چیز واپس نہ لو' کیا تم اس مال کو بہتان باندھ کر واپس لو گے اور کھلے گناہ کا ارتکاب کرو گے ○ اور تم اس مال کو کیسے واپس لو گے حالانکہ تم (خلوت میں) ایک دوسرے سے باہم مل چکے ہو؟ اور وہ تم سے (عقد نکاح کے

ساتھ) پختہ عہد لے چکی ہیں O

ان آیتوں کا شانِ نزول یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جب کسی عورت کا خاوند مر جاتا تو اس کے خاوند کا سوتیلا بیٹا یا بھائی یا کوئی اور رشتہ دار اس سے بالجبر نکاح کر لیتا یا کسی دوسرے شخص سے اس کا بالجبر نکاح کر دیتا اور اس کے کل مہر یا آدھے مہر پر قبضہ کر لیتا' اسلام نے عورتوں پر اس ظلم اور بُری رسم کو مٹایا اور زبردستی عورتوں کا کسی سے بھی نکاح کرنے سے منع فرمایا' دوسری اہم چیز ہے مہر کا تحفظ کرنا۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ مختلف حیلوں بہانوں سے عورتوں کا مہر دبا لیتے تھے' اسلام نے اس بُری رسم کو مٹایا' واضح رہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے بھی عورتوں کے لیے مہر کو لازم نہیں کیا' صرف اسلام نے ہی عورتوں کو یہ حق دیا ہے' مہر کا فائدہ یہ ہے کہ اگر خاوند عورت کو طلاق دے دے یا مر جائے تو عورت کے پاس مہر کی صورت میں ایک معقول آمدنی ہو جس کے ذریعہ وہ اپنے نئے مستقبل کا آغاز کر سکے۔

ان آیتوں میں عورتوں کا خاوند پر تیسرا حق یہ بیان کیا ہے کہ مردوں کو ہدایت دی کہ وہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ رہائش میں' کھانے پینے' بات چیت کرنے میں اور دیگر عائلی اور خانگی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ رہیں۔

چوتھا حق یہ بیان کیا ہے کہ اگر عورت کی صورت یا سیرت تم کو ناپسند ہو پھر بھی اس کے ساتھ ازدواج کے ناطے نہ توڑو اور صبر و شکر کے ساتھ اس کے ہمراہ زندگی گزارو' ہو سکتا ہے کہ اس سے ایسی صالح اولاد پیدا ہو کہ اسے دیکھ کر تم بیوی کی بدصورتی یا اس کی بُری عادتوں کو بھول جاؤ یا کسی اور وجہ سے اللہ تمہارے لیے اس نکاح میں ڈھیروں برکتیں نازل فرمائے۔

پانچواں حق یہ بیان کیا ہے کہ اگر عورت کو تم سونے چاندی کے پل کے برابر ڈھیروں مال بھی دے چکے ہو خواہ مہر کی صورت میں یا ویسے ہی بہ طور ہبہ' تو اس مال کو اب اس سے واپس نہ لو' تم نے صرف مال دیا ہے عورت تو اپنا جسم اور بدن تمہارے حوالے کر چکی ہے اور جسم و جان کے مقابلہ میں مال کی کیا حقیقت ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً . (النساء: ۴-۳)

پھر اگر تمہیں یہ خدشہ ہو کہ تم ان (متعدد ازواج) میں عدل قائم نہ رکھ سکو گے' تو فقط ایک سے نکاح کرو' یا اپنی مملوکہ باندیوں پر اکتفاء کرو' یہ کسی ایک زوجہ کی طرف بہت مائل ہونے سے زیادہ قریب ہے O اور عورتوں کو ان کا مہر خوشی سے ادا کرو۔

اسلام نے ضرورت کی بناء پر تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے' لیکن جو ان میں عدل کر سکے' اور جو عدل نہ کر سکے اس کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ صرف ایک نکاح پر اکتفاء کرے۔ ان آیتوں میں عورتوں کا مردوں پر ایک حق یہ بیان کیا ہے کہ ان میں عدل و انصاف کیا جائے اور دوسرا حق یہ بیان کیا ہے کہ ان کا مہر خوشی سے ادا کیا جائے۔ سورۂ نساء کی ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مہر کی ادائیگی کے متعلق بہت تاکید کی ہے اور ہمارے دور میں اس معاملہ میں بہت سستی کی جاتی ہے۔

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ . (البقرہ: ۲۳۳)

اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق اس شخص کے ذمہ ہے جس کا بچہ ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ عورتوں کا مردوں پر یہ حق ہے کہ وہ ان کو کھانا اور کپڑا مہیا کریں' اگر عورتیں امور خانہ داری انجام دیتی ہیں اور کھانا پکاتی ہیں تو یہ ان کی طرف سے احسان ہے اور ازواج مطہرات اور صحابیات کی سنت ہے۔

فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ ۝ (الطلاق: ۶)

پھر اگر وہ تمہارے لیے (بچہ کو) دودھ پلائیں تو انہیں ان کی اجرت دو' اور آپس میں دستور کے ساتھ مشورہ کرو اور اگر تم باہم دشواری محسوس کرو تو بچہ کو کوئی اور عورت دودھ پلا دے گی ۝

اس آیت میں بتایا ہے کہ بچہ کو دودھ پلانا عورت کی ذمہ داری نہیں ہے' اور عورت مرد کی غلام نہیں ہے' اور مرد ڈکٹیٹر نہ بنے بلکہ گھریلو معاملات کو باہمی مشاورت سے چلائیں اور اگر عورت بچہ کو دودھ پلائے تو اس کا یہ حق ہے کہ مرد سے اس کی اجرت لے لے اور یہ کہ عورت کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

اگر شوہر اور بیوی کے درمیان کوئی مناقشہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے عورت کے حقوق کی محافظت کرتے ہوئے فرمایا:

وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ ۚ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا ۗ (النساء: ۳۴)

اور جن عورتوں سے تمہیں نافرمانی کا خوف ہو' ان کو (نرمی سے) نصیحت کرو اور انہیں ان کی خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو (اگر وہ پھر بھی باز نہ آئیں) تو انہیں (تادیبا خفیف سا) مارو' پھر وہ اگر تمہاری فرمانبرداری کریں تو انہیں تکلیف پہنچانے کا کوئی بہانہ تلاش نہ کرو۔

تعدد ازدواج کی صورت میں عدل و انصاف کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ۖ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِنْ سَعَتِهِ ۗ (النساء: ۱۲۹)

اور خواہ تم عدل کرنے پر حریص ہو پھر بھی تم متعدد ازواج میں عدل نہ کر سکو گے (تو جس کی طرف تم کو رغبت نہ ہو) اس سے مکمل اعراض نہ کرو کہ اسے یوں چھوڑ دو گویا وہ درمیان میں لٹکی ہوئی ہے' اور اگر تم اپنی اصلاح کر لو اور خدا سے ڈرو تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے ۝ اور اگر شوہر اور بیوی علیحدگی اختیار کر لیں' تو اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اپنی وسعت سے مستغنی کر دے گا۔

اگر عورت کو طلاق دے دی جائے تو اللہ تعالیٰ نے دوران عدت عورت کے حقوق بیان کرتے ہوئے فرمایا:

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ ۚ وَإِنْ كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ (الطلاق: ۶)

ان عورتوں کو اپنی وسعت کے مطابق وہیں رکھو جہاں خود رہتے ہو اور انہیں تنگ کرنے کے لیے تکلیف نہ پہنچاؤ' اور اگر وہ عورتیں حاملہ ہوں تو وضع حمل تک ان کو خرچ دیتے رہو۔

یہ تو اس مطلقہ عورت کے حقوق تھے جس کے ساتھ مباشرت ہو چکی ہو اور جس عورت کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی ہو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ (البقرہ: ۲۳۷)

اگر تم نے عورتوں کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی درآں حالیکہ تم ان کا مہر مقرر کر چکے تھے تو تم پر آدھا مہر ادا کرنا واجب ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ. (البقرہ: ۲۳۶)

اگر تم مباشرت سے پہلے عورتوں کو طلاق دے دو تو کوئی حرج نہیں ہے' یا تم نے ان کا کچھ مہر مقرر نہ کیا ہو' اور ان کو استعمال کی کچھ چیزیں دو' خوشحال اپنی وسعت کے مطابق اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق۔

وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ. (البقرہ: ۲۳۱)

اور ان کو ضرر پہنچانے کے لیے ان کو (اپنے نکاح میں) نہ روکو تا کہ تم ان پر زیادتی کرو۔

اس آیت سے ائمہ ثلاثہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر خاوند عورت کو خرچ دے نہ طلاق دے تو عدالت اس نکاح کو فسخ کر سکتی ہے اور ضرورت کی بنا پر علماء احناف کو بھی اسی قول پر فتویٰ دینا چاہیے۔ واضح رہے کہ اگر شوہر نامرد ہو تو فقہاء احناف کے نزدیک بھی عدالت نکاح کو فسخ کر سکتی ہے جب کہ نفقہ پر بقاء حیات کا مدار ہے اور شوہر کے مرد ہونے پر صرف خواہش نفسانی کی تکمیل کا مدار ہے۔

عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں قرآن مجید کی آیات ذکر کرنے کے بعد اب ہم اس سے متعلق چند احادیث پیش کر رہے ہیں:

حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

امام ترمذی' امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے حضرت عمرو بن الاحوص سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سنو! تمہاری ازواج پر تمہارا حق ہے اور تمہاری ازواج کا تم پر حق ہے' تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر تمہارے ناپسندیدہ لوگوں کو نہ آنے دیں' اور نہ تمہارے ناپسندیدہ لوگوں کو تمہارے گھروں میں آنے دیں' اور ان کا تم پر حق یہ ہے کہ تم ان کو اچھے کپڑے پہناؤ اور اچھے کھانے کھلاؤ۔

امام احمد' امام ابوداؤد' امام نسائی' امام ابن ماجہ' امام ابن جریر' امام حاکم اور امام بیہقی نے حضرت معاویہ بن حیدہ قشیری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ عورت کا اس کے خاوند پر کیا حق ہے؟ آپ نے فرمایا: جب وہ کھانا چاہے تو اس کو کھانا کھلائے اور جب پہننا چاہے تو اس کو پہنائے' اس کے چہرے پر نہ مارے' اس کو برا نہ کہے اور (تادیبا) صرف گھر میں اس سے علیحدگی اختیار کرے۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۲۷۶' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

حافظ منذری بیان کرتے ہیں:

میمون اپنے والد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی عورت سے کوئی مہر مقرر کر کے نکاح کرے خواہ کم ہو یا زیادہ' اور اس کا ارادہ مہر ادا کرنے کا نہ ہو اور وہ اسے دھوکے میں رکھے اور تادم مرگ اس کا مہر ادا نہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ سے زانی ہونے کی حالت میں ملاقات کرے گا۔

امام ترمذی اور امام ابن حبان نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومنوں میں سے اس شخص کا ایمان کامل ہوگا اور اس شخص کے اخلاص سب سے اچھے ہوں گے جس کے اخلاق اپنی ازواج کے ساتھ اچھے ہوں گے۔

امام ابن حبان حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سب سے بہتر شخص وہ ہے جو اپنی اہلیہ کے ساتھ بہتر ہو اور میں تم سب سے زیادہ اپنے اہل کے ساتھ بہتر ہوں۔

امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کرو' کیونکہ عورت کو پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اور سب سے زیادہ ٹیڑھی پسلی سب سے اوپر والی ہوتی ہے' اگر تم اس کو سیدھا کرنے لگو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی' سو عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کرو۔

امام ابن ماجہ اور امام ترمذی حضرت عمرو بن الاحوص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اللہ کی حمد و ثناء اور وعظ و نصیحت کے بعد فرمایا: سنو! عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کرو' وہ صرف تمہاری مددگار ہیں' تم ان پر صرف اس صورت میں حق رکھتے ہو جب وہ کھلی بدکاری کریں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ان کی خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو' اور ان کو معمولی سا مارو' پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرلیں تو ان کو مزید مارنے کے لیے کوئی بہانہ نہ بناؤ' سنو! تمہارا تمہاری بیویوں پر حق ہے اور تمہاری بیویوں کا تم پر حق ہے' تمہارا ان پر حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر ان کو نہ آنے دیں' جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور نہ ان کو گھروں میں آنے دیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو' سنو ان کا تم پر حق یہ ہے کہ تم ان کے کھانے اور پینے میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ (الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۵۰۔ ۴۸ ' ملتقطاً ' مطبوعہ دار الحدیث' قاہرہ)

اسلام میں مردوں کے عورتوں پر حقوق

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ (النساء: ۳۴)

مرد عورتوں کے (حاکم یا) منتظم ہیں' کیونکہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے' اور اس لیے بھی کہ انہوں نے ان پر اپنے مال خرچ کیے ہیں سو نیک عورتیں فرمانبردار ہوتی ہیں' مردوں کی غیر حاضری میں بھی اللہ کی حفاظت کے ساتھ (شوہر کی عزت اور اس کے مال کی) حفاظت کرتی ہیں اور تمہیں جن عورتوں کی نافرمانی کرنے کا خدشہ ہو ان کو نصیحت کرو اور انہیں ان کی خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو' اور انہیں (تادیباً) مارو' اور اگر وہ تمہاری فرمانبرداری کرلیں تو پھر ان کو مارنے کے لیے بہانے تلاش نہ کرو۔

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے اور ان کو جسمانی اور عقلی قوت زیادہ عطا کی ہے' دوسری فضیلت یہ ہے کہ مرد کو عورت کے اخراجات کا کفیل بنایا ہے اور اس کے گھر کا منتظم بنایا ہے' تیسری فضیلت یہ ہے کہ مرد کو عورت پر حاکم بنایا ہے اور عورت کو مرد کی فرمانبرداری کا پابند کیا ہے' چوتھی فضیلت یہ ہے کہ مرد کو عورت پر یہ فوقیت دی ہے کہ وہ اس کو اس کی نافرمانی پر تادیباً مار سکتا ہے' اور پانچویں فضیلت یہ دی ہے کہ عورت کو اس کا پابند کیا ہے کہ وہ مرد کی غیر حاضری میں اس کی عزت کی حفاظت کرے اور اپنی پارسائی کو مجروح نہ کرے اور شوہر کی غیر حاضری میں اس کے مال کی بھی حفاظت کرے' غرضیکہ جسمانی قویٰ' کھانے پینے' رہائش اور لباس کے اخراجات اور شوہر کے احکام کی تعمیل اور اس کے مال اور اپنی عفت کی حفاظت' ہر اعتبار سے عورت کو مرد کا تابع اور محکوم قرار دیا ہے۔

بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ (البقرہ: ۲۳۷) نکاح کی گرہ مرد کے ہاتھ میں ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ نکاح کی گرہ کو قائم رکھنے یا طلاق کے ذریعہ اس کو توڑنے کا اختیار اللہ تعالیٰ نے مرد کے ہاتھ

میں رکھا ہے۔ عورت کے ذمہ مرد کے فرائض اور مرد کے ذمہ جو عورتوں کے حقوق ہیں ان کا بیان حسب ذیل احادیث میں ہے:
حافظ منذری بیان کرتے ہیں:
امام ترمذی' امام ابن ماجہ اور امام حاکم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو عورت اس حال میں مری کہ اس کا خاوند اس سے راضی تھا وہ جنت میں داخل ہو گئی۔
امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو عورت پانچ وقت کی نمازیں پڑھے' اپنی پارسائی کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے وہ جس دروازے سے چاہے گی جنت میں داخل ہو جائے گی۔
امام بزار اور امام حاکم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی' اس نے کہا: میں فلانہ بنت فلاں ہوں' آپ نے فرمایا: میں تمہیں پہچانتا ہوں' بتاؤ کیا کام ہے؟ اس نے کہا: فلاں عبادت گزار میرا عم زاد ہے۔ آپ نے فرمایا: میں اس کو جانتا ہوں' اس نے کہا: وہ مجھے نکاح کا پیغام دے رہا ہے' مجھے بتائیں کہ مرد کا بیوی پر کیا حق ہے؟ اگر میں اس کا حق ادا کرنے کی طاقت رکھوں گی تو اس سے نکاح کرلوں گی۔ آپ نے فرمایا: مرد کا حق یہ ہے کہ اگر بالفرض مرد کے نتھنوں سے خون اور پیپ بہہ رہا ہو اور تم اس کو چاٹ لو پھر بھی اس کا حق ادا نہیں ہوا۔ اگر کسی بشر کے لیے سجدہ جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ جب خاوند آئے تو عورت اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ امام حاکم نے کہا: اس حدیث کی سند صحیح ہے۔
امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ خاوند کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر (نفلی) روزہ رکھے اور نہ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو گھر میں آنے کی اجازت دے۔
امام حاکم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے خاوند کے گھر میں کسی ایسے شخص کو آنے کی اجازت دے جس کو وہ ناپسند کرتا ہو' اور نہ اس کی مرضی کے بغیر گھر سے نکلے اور نہ اس معاملہ میں کسی اور کی اطاعت کرے' اور نہ اس سے الگ بستر پر سوئے' اور نہ اس کو ستائے' اگر اس کا خاوند ظلم کرتا ہو تو وہ اس کے پاس جائے حتیٰ کہ اس کو راضی کرے' اگر وہ اس کی معذرت قبول کرلے تو فبہا اور اللہ بھی اس کے عذر کو قبول کرلے گا' اس کی حجت صحیح ہوگی اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اور اگر خاوند پھر بھی اس سے راضی نہیں ہوا تو اللہ کے نزدیک اس کی حجت تمام ہوگئی' امام حاکم نے کہا: یہ حدیث صحیح ہے۔
امام طبرانی نے سند جید کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قبیلہ خثعم کی ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی: یا رسول اللہ! مجھے بتائیے کہ خاوند کے بیوی پر کیا حقوق ہیں؟ میں بے نکاح عورت ہوں' اگر میں نے ان حقوق کے ادا کرنے کی طاقت پائی تو نکاح کرلوں گی ورنہ بے نکاح رہوں گی' آپ نے فرمایا: بیوی پر شوہر کے حقوق میں سے یہ ہے کہ اگر وہ اونٹ کے کجاوہ پر بیٹھی ہو اور شوہر اسے مباشرت کے لیے بلائے تو وہ انکار نہ کرے' اور اس کا بیوی پر یہ حق ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر (نفلی) روزہ نہ رکھے' اگر اس نے اس کی اجازت کے بغیر روزہ رکھا تو وہ محض فاقہ ہے اس کا روزہ قبول نہیں ہوگا' اور اس کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہ نکلے' اور اگر وہ اس کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلی تو اس کے واپس آنے تک آسمان کے فرشتے' رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے اس پر لعنت کرتے

رہیں گے۔ اس عورت نے کہا: یہ حقوق ضروری ہیں اور میں کبھی نکاح نہیں کروں گی۔

امام ترمذی اور امام ابن ماجہ' حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بھی دنیا میں کوئی عورت اپنے خاوند کو ایذاء پہنچاتی ہے تو جنت میں اس کی بیوی بڑی بڑی آنکھوں والی حور اس سے کہتی ہے: اللہ تجھے ہلاک کرے تو اس کو نہ ستا' یہ تیرے پاس عارضی طور پر ہے اور عنقریب ہمارے پاس آنے والا ہے۔

امام ترمذی' امام نسائی اور امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مرد عورت کو اپنے کسی کام سے بلائے تو عورت فوراً آ جائے خواہ تنور پر بیٹھی ہو۔

امام بخاری' امام مسلم' امام ابوداؤد اور امام نسائی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مرد عورت کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ نہ آئے اور شوہر ناراضگی میں رات گزارے تو صبح تک اس پر فرشتے لعنت کرتے رہتے ہیں۔

امام ترمذی' امام ابن ماجہ اور امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخصوں کی نماز ان کے سروں سے ایک بالشت بھی اوپر نہیں جاتی۔ جو شخص کسی قوم کی امامت کرے اور وہ اس کو (کسی شرعی عیب کی وجہ سے) ناپسند کرتے ہوں' اور جو عورت اس حال میں رات گزارے کہ اس کا خاوند اس پر ناراض ہو اور دو مسلمان بھائی جو آپس میں لڑے ہوئے ہوں۔

امام طبرانی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو عورت اپنے خاوند کی مرضی کے بغیر گھر سے نکلے اس کے واپس آنے تک آسمان کے سارے فرشتے اور جن انسانوں اور جنوں کے پاس سے وہ گزرتی ہے سب اس پر لعنت کرتے ہیں۔ (الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۵۹۔ ۵۲ 'ملتقطاً' مطبوعہ دارالحدیث' قاہرہ' ۱۴۰۷ھ)

آیا عورت پر مرد کی خدمت واجب ہے یا نہیں؟

فقہاء مالکیہ کا اس میں اختلاف ہے' بعض علماء مالکیہ نے کہا ہے کہ بیوی پر شوہر کی خدمت کرنا واجب نہیں ہے' کیونکہ عقد نکاح کا تقاضا یہ ہے کہ عورت اس کو مباشرت کا موقع دے نہ کہ خدمت کا' کیونکہ یہ مزدوری کا عقد نہیں ہے اور نہ نکاح کے ذریعہ عورت اس کی باندی بن گئی' یہ عقد اجارہ ہے نہ عقد تملیک' یہ صرف عقد مباشرت ہے (نکاح کا معنی مباشرت ہے) لہٰذا عورت سے شوہر مباشرت کے علاوہ اور کسی چیز کا مطالبہ نہیں کر سکتا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر وہ تمہاری فرمانبرداری کرلیں تو تم ان کو مارنے کے لیے بہانے نہ ڈھونڈو۔ (النساء: ۳۴)

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ عورت پر خاوند کی خدمت کرنا واجب ہے۔ اگر اس کا تعلق معزز اور خوشحال گھرانے سے ہو تو گھر کی دیکھ بھال اور خانگی امور کی نگرانی اس کے ذمہ ہے اور اگر وہ متوسط گھرانے کی ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ خاوند کا بستر وغیرہ بچھائے اور اگر وہ غریب گھرانے کی ہو تو اس پر گھر کی صفائی کرنا' کپڑے دھونا اور کھانا پکانا لازم ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: عورتوں کے اتنے ہی حقوق ہیں جتنے دستور کے مطابق ان کے فرائض ہیں۔ (البقرہ: ۲۲۸) اور یہ معقول رائے ہے اور ہر زمانے میں مسلمانوں کے گھرانوں میں اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی ازواج محترمات چکی سے آٹا پیستی تھیں' کھانا پکاتی تھیں' بستر بچھاتی تھیں اور اپنے خاوندوں کے لیے کھانا لا کر رکھتی تھیں اور دیگر انواع کی خدمت کرتی تھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرت کی ذمہ داریوں کو مرد اور عورت پر تقسیم کر دیا تھا' حضرت سیدتنا فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ذمہ خانگی ذمہ داریاں تھیں اور حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کے ذمہ کسب معاش اور کمانے کی ذمہ داریاں تھیں۔

حاصل بحث

حاصل بحث یہ ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہیں۔ مردوں پر لازم ہے کہ وہ اپنی عورتوں کے ساتھ اچھے اخلاق اور حسن سلوک کے ساتھ رہیں' ان کو ضرر نہ پہنچائیں۔ ہر فریق اس معاملہ میں اللہ سے ڈرے بیوی خاوند کی اطاعت کرے اور ہر ایک دوسرے کے لیے بن سنور کر رہے۔ امام ابن جریر طبری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ میں اپنی بیوی کے لیے بن سنور کر رہتا ہوں جیسے وہ میرے لیے بن ٹھن کر رہتی ہے' ضرورت کے وقت ہر فریق دوسرے کے کام آئے اور بیماری میں ہر فریق دوسرے کا علاج اور خدمت کرے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ

دوبار طلاق دینے کے بعد یا تو دستور کے مطابق روک لینا ہے' یا اس کو حسن سلوک کے ساتھ چھوڑ دینا ہے'

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ

اور تمہارے لیے اس (مہر یا ہبہ) سے کچھ بھی لینا جائز نہیں ہے جو تم ان کو دے چکے ہو' مگر جب دونوں

يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ

فریقوں کو یہ خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے' سو (اے مسلمانو!) اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ یہ دونوں اللہ کی

اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ

حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو عورت نے جو بدل خلع دیا ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے' یہ اللہ کی حدود ہیں

فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

سو تم اللہ کی حدود سے تجاوز نہ کرو' اور جنہوں نے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا تو وہی لوگ

الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ

ظالم ہیں ○ پھر اگر اس کو (تیسری) طلاق دے دی تو وہ عورت اس (تیسری طلاق) کے بعد اس پر حلال نہیں ہے یہاں تک کہ

زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ

وہ عورت اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کرے' پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اس کو طلاق دے دے تو پھر ان پر کوئی حرج نہیں

ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ

ہے کہ وہ اس (طلاق کی عدت کے بعد) پھر باہم رجوع کر لیں اگر ان کا یہ گمان ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے'

يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

اور یہ اللہ کی حدود ہیں جن کو اللہ ان لوگوں کے لیے بیان فرماتا ہے جو علم والے ہیں O

طلاق کا لغوی معنی

امام اللغت سید زبیدی طلاق کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "عباب" میں ہے کہ عورت کی طلاق کے دو معنی ہیں: (ا) نکاح کی گرہ کو کھول دینا (ب) ترک کر دینا' چھوڑ دینا۔ "لسان العرب" میں ہے کہ عثمان اور زید کی حدیث ہے: طلاق کا تعلق مردوں سے ہے اور عدت کا تعلق عورتوں سے ہے۔ (تاج العروس ج ۶ ص ۴۲۵' مطبوعہ مطبعہ خیریہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

طلاق کا اصطلاحی معنی

علامہ ابن نجیم طلاق کا فقہی معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: الفاظ مخصوصہ کے ساتھ فی الفور یا از روئے مآل نکاح کی قید کو اٹھا دینا' طلاق ہے۔ الفاظ مخصوصہ سے مراد وہ الفاظ ہیں جو مادہ طلاق پر صراحۃً یا کنایۃً مشتمل ہوں' اس میں خلع بھی شامل ہے اور نامردی اور لعان کی وجہ سے نکاح کی قید از روئے مآل اٹھ جاتی ہے۔ (البحر الرائق ج ۳ ص ۲۳۵' مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ' کوئٹہ)

طلاق کی اقسام

طلاق کی تین قسمیں ہیں: احسن' حسن اور بدعی۔

طلاق احسن: جن ایام میں عورت ماہواری سے پاک ہو اور ان ایام میں بیوی سے مقاربت بھی نہ کی ہو' ان ایام میں صرف ایک طلاق دی جائے' اس میں دورانِ عدت مرد کو رجوع کا حق رہتا ہے اور عدت گزرنے کے بعد عورت بائنہ ہو جاتی ہے' اور فریقین کی باہمی رضا مندی سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔

طلاق حسن: جن ایام میں عورت پاک ہو اور مقاربت بھی نہ کی ہو ان ایام میں ایک طلاق دی جائے اور جب ایک ماہواری گزر جائے تو بغیر مقاربت کیے دوسری طلاق دی جائے اور جب دوسری ماہواری گزر جائے تو بغیر مقاربت کیے تیسری طلاق دی جائے' اس کے بعد جب تیسری ماہواری گزر جائے تو عورت مغلظہ ہو جائے گی اور اب شرعی حلالہ کے بغیر اس سے دوبارہ عقد نہیں ہو سکتا۔

طلاق بدعی: اس کی تین صورتیں ہیں: (ا) ایک مجلس میں تین طلاقیں دفعۃً دی جائیں خواہ ایک کلمہ سے مثلاً تم کو تین طلاقیں دیں یا کلمات متعددہ سے' مثلاً کہے: تم کو طلاق دی' تم کو طلاق دی' تم کو طلاق دی (ب) عورت کی ماہواری کے ایام میں اس کو ایک طلاق دی جائے' اس طلاق سے رجوع کرنا واجب ہے اور یہ طلاق شمار کی جاتی ہے (ج) جن ایام میں عورت سے مقاربت کی ہو' ان ایام میں عورت کو ایک طلاق دی جائے' طلاق بدعی کسی صورت میں ہو اس کا دینے والا گنہ گار ہوتا ہے۔

(در مختار علی ہامش رد المختار' ج ۲ ص ۵۷۸۔ ۵۷۳' مطبوعہ استنبول' ۱۳۲۷ھ)

صریح لفظ طلاق کے ساتھ ایک یا دو طلاقیں دی جائیں تو یہ طلاق رجعی ہے اور اگر صریح لفظ طلاق نہ ہو' کنایہ سے طلاق دی جائے تو یہ طلاق بائن ہے' مثلاً طلاق کی نیت سے بیوی سے کہا تو میری ماں کی مثل ہے' طلاق رجعی میں دوبارہ رجوع کیا جا سکتا ہے' لیکن پچھلی طلاقیں شمار ہوں گی' اگر پہلے دو طلاقیں دی تھیں تو رجوع کے بعد صرف ایک طلاق کا مالک رہ جائے گا' طلاق بائن سے فی الفور نکاح منقطع ہو جاتا ہے لیکن اگر تین سے کم طلاقیں بائن ہوں تو باہمی رضا مندی سے دوبارہ عقد ہو سکتا ہے لیکن پچھلی طلاقوں کا شمار ہو گا۔

طلاق کیوں مشروع کی گئی؟

اسلام کا منشاء یہ ہے کہ جو لوگ رشتہ نکاح میں منسلک ہو جائیں ان کے نکاح کو قائم اور برقرار رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی جائے اور اگر کبھی ان کے درمیان اختلاف یا نزاع پیدا ہو تو رشتہ دار اور مسلم سوسائٹی کے ارباب حل و عقد اس اختلاف کو دور کر کے ان میں صلح کرائیں اور اگر ان کی پوری کوشش کے باوجود زوجین میں صلح نہ ہو سکے اور یہ خطرہ ہو کہ اگر یہ بدستور رشتہ نکاح میں بندھے رہے تو یہ حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے اور نکاح کے مقاصد فوت ہو جائیں گے تو ان کی عدم موافقت اور باہمی نفرت کے باوجود ان کو نکاح میں رہنے پر مجبور نہ کیا جائے' اس صورت میں ان کی' ان کے رشتہ داروں اور معاشرہ کے دیگر افراد کی بہتری اور مصلحت اسی میں ہے کہ عقد نکاح کو توڑنے کے لیے شوہر کو طلاق دینے سے نہ روکا جائے۔ طلاق کے علاوہ عقد نکاح کو فسخ کرنے کے لیے دوسری صورت یہ ہے کہ عورت شوہر کو کچھ دے دلا کر خلع کرالے اور تیسری صورت قاضی کی تفریق ہے اور چوتھی صورت یہ ہے کہ جن دو مسلمان حکموں کو نزاعی حالت میں یہ معاملہ سپرد کیا گیا ہو وہ نکاح کو فسخ کرنے کا فیصلہ کر دیں۔

صرف ناگزیر حالت میں طلاق دی جائے

قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ اگر شوہر کو بیوی ناپسند ہو پھر بھی وہ اس سے نباہ کرنے کی کوشش کرے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝ (النساء: ۱۹)

اور اپنی بیویوں کے ساتھ بھلائی اور حسن سلوک کے ساتھ رہو' اور اگر تم کو وہ ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت سی بھلائی پیدا کر دے ۝

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

حضرت محارب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے' ان میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلاق سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۹۶' مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ طلاق ہے۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۹۶' مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

قرآن اور سنت کی ان ہدایات کی روشنی میں شوہر پر یہ لازم ہے کہ اختلاف اور نزاع کی حالت میں حتی الامکان طلاق سے گریز کرے اور اگر طلاق دینا ناگزیر ہو تو صرف ایک طلاق رجعی دے کیونکہ اس کے بعد عدت کے تین ماہ تک اس معاملہ پر نظر ثانی کا موقع رہے گا ورنہ عدت کے بعد عورت علیحدہ ہو جائے گی' آج کل کے لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تین بار کہے بغیر طلاق نہیں ہوتی' اس لیے یا تو وہ خود تین طلاقیں دیتے ہیں' وکیل اور وثیقہ نویس ان کو تین طلاقیں لکھ دیتے ہیں اور جب طلاق نافذ ہو جاتی ہے تو یہ لوگ پشیمان ہوتے ہیں اور مفتیوں کے پاس جاتے ہیں کہ دوبارہ نکاح یا رجوع کا کوئی حیلہ بتائیں' حتیٰ کہ یہ لوگ حلالہ کی ناگوار صورت کو قبول کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں' حالانکہ اس قسم کے حلالہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے' لیکن بعد میں بچوں کی دربدری اور دوسرے برے نتائج سے بچنے کے لیے اس وقت فریقین ہر قیمت پر صلح کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ میری تیس سالہ افتاء کی زندگی کا تجربہ ہے۔

صرف مرد کو طلاق کا اختیار کیوں دیا گیا؟

طلاق دینے کا حق مرد کو تفویض کیا گیا ہے حالانکہ عقد نکاح عورت اور مرد دونوں کی باہمی رضامندی سے وجود میں آتا

ہے تو پھر عورت کو یہ اختیار کیوں نہیں ہے کہ وہ بھی جب چاہے اس عقد کو ختم کر دے؟

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ عورت مغلوب الغضب ہوتی ہے اور اس کو جلد غصہ آتا ہے' اگر طلاق دینے کا معاملہ عورت کے اختیار میں ہوتا تو وقوع طلاق کی شرح دو چند سے بھی زیادہ بڑھ جاتی۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ عورت کے مطالبہ اور اس کی ضد پر شوہر طلاق دیتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مرد کے مقابلہ میں عورت کی قوت فیصلہ کمزور ہوتی ہے' خصوصاً حیض کے ایام میں عورت ذہنی اضطراب میں مبتلا ہوتی ہے اور ان ایام میں اس کا ذہن منتشر اور مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے' اس لیے اگر طلاق دینے کا معاملہ عورت کے سپرد کیا جاتا تو شرح طلاق زیادہ ہو جاتی اور اکثر ہنستے بستے گھر ویران ہو جاتے' تیسری وجہ یہ ہے کہ عورتیں ناقصات العقل ہوتی ہیں جیسا صحیح بخاری' صحیح مسلم' جامع ترمذی' سنن ابن ماجہ' سنن ابو داؤد' مسند احمد بن حنبل اور مستدرک [1] میں اس کی تصریح ہے اور فسخ نکاح کا معاملہ ناقص العقل کے سپرد کرنے کے لائق نہیں ہے

طلاق کا معاملہ مرد کو مفوض کرنے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ چونکہ مرد اپنا مال خرچ کر کے حقوق زوجیت حاصل کرتا ہے اس لیے ان حقوق سے دست کش ہونے کا اختیار بھی اسی کو دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ خرچ کر کے کوئی چیز حاصل کرتا ہے وہ اس چیز کو آخری حد تک رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور صرف اس وقت اس چیز کو چھوڑتا ہے جب اس کو چھوڑنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے۔ اس کے برخلاف حقوق زوجیت کو قائم کرنے میں عورت کو کوئی محنت کرنی پڑتی ہے نہ پیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے اس لیے اگر طلاق کی باگ ڈور عورت کے ہاتھ میں دے دی جاتی تو عورت کو طلاق واقع کرنے میں اس قدر سوچ و بچار اور تامل کی ضرورت نہ ہوتی۔ علاوہ ازیں یہ اقدام عدل وانصاف کے بھی خلاف ہوتا۔

طلاق میں عورت کی رضامندی کا اعتبار کیوں نہیں ہے؟

یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات عورت طلاق لینا نہیں چاہتی اور اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر وہ اپنے شوہر کے نکاح میں ہی رہنا چاہتی ہے لیکن مرد بد مزاج اور ظالم ہوتا ہے اور عورت کی مرضی کے خلاف وہ اس کو طلاق دیتا ہے' ایسی صورت میں بعض عورتیں یہ کہتی ہیں کہ جب نکاح کے عقد میں اس کی مرضی کا دخل ہے تو طلاق میں اس کی رضامندی کا دخل کیوں نہیں ہے؟ اور اس کی مرضی کے بغیر طلاق کیوں مؤثر قرار دی جاتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی عقد کو بھی قائم کرنے کے لیے فریقین کی رضامندی ضروری ہے (مثلاً وکالت' اجارت' مضاربت وغیرہ) لیکن عقد کو فسخ کرنے کے لیے دونوں فریقوں کی رضامندی ضروری نہیں ہوتی' کوئی ایک فریق بھی دوسرے کی مرضی کے خلاف عقد توڑ سکتا ہے' اس لیے اگر کوئی شخص کسی عورت کو اپنے نکاح میں رکھنے پر آمادہ نہ ہو اور اس کے ساتھ عمل زوجیت پر تیار نہ ہو تو اس سے بہ زور یہ عمل نہیں کرایا جا سکتا' نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تم خواہی نخواہی اس عورت کو اپنے نکاح میں رکھو اور اس کو خرچ دیتے رہو اور چونکہ ازدواجی زندگی کی گاڑی میں اہم رول مرد ادا کرتا ہے کیونکہ عمل زوجیت اور نفقہ کی ادائیگی میں مرد فاعل ہوتا ہے اور عورت اس کے فعل کی محل یا منفعل ہوتی ہے اس لیے عقد نکاح کو قائم رکھنے یا اس کو فسخ کرنے کا اختیار بھی صرف مرد کو دیا گیا ہے۔

خلع

طلاق کو مرد کے اختیار میں دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وقوع طلاق میں عورت کا بالکل دخل نہیں ہے' عورت کو خلع کا اختیار دیا گیا ہے' اگر عورت کو مرد کی شکل وصورت پسند نہ ہو یا کسی اور طبعی نامناسبت کی وجہ سے وہ مرد کو ناپسند کرتی ہو تو وہ اپنا مہر

[1] بخاری ج ۱ ص ۴۴ ـ ۱۴۳ ـ ج ۱ ص ۹۷ ـ ج ۱ ص ۱۳۱ ـ ج ۱ ص ۲۱۱ ـ ج ۱ ص ۳۶۳' مسلم ج ۱ ص ۶۰' ابو داؤد ج ۱ ص ۲۸۷' ترمذی ص ۳۷۵' ابن ماجہ ص ۲۸۹ ـ ۲۸۸' مسند احمد بن حنبل ج ۲ ص ۶۷' مستدرک ج ۲ ص ۱۹۰

چھوڑ کر یا کچھ اور دے دلا کر شوہر سے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

سید محمد قطب شہید لکھتے ہیں: امام بخاری اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ثابت بن قیس ابن شماس کی بیوی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں ثابت کے خلق اور اس کے دین کے بارے میں کوئی حرف گیری نہیں کرتی' لیکن میں اسلام کے بعد کفر (ناشکری یا شوہر کے حقوق کو ادا نہ کرنا) کو ناپسند کرتی ہوں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اس کا باغ واپس کر دو گی؟ (ثابت نے ان کو مہر میں باغ دیا تھا) انہوں نے کہا: ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت سے فرمایا: باغ لے لو اور اس کو طلاق دے دو۔

(فی ظلال القرآن ج ۲ ص ۱۹۹ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۳۸۶ھ)

اس حدیث کی روشنی میں یہ ہونا چاہیے کہ جب کسی عورت کو کسی طبعی ناہمواری کی وجہ سے شوہر ناپسند ہو اور یہ نفرت اس قدر بڑھ جائے کہ وہ اس نفرت کی وجہ سے شوہر کے حقوق ادا نہ کر سکے تو پھر وہ قاضی اسلام سے رجوع کرے اور قاضی مہر واپس کر کے شوہر سے طلاق دلا دے' یاد رہے کہ یہاں قاضی شوہر سے طلاق دلوائے گا از خود نکاح فسخ نہیں کرے گا۔

قاضی اور حکمین کی تفریق

طلاق دینا مرد کے اختیار میں ہے لیکن اگر مرد عورت پر تعدی اور ظلم کرتا ہے اور اس کو طلاق نہیں دیتا تو عورت کو حق ہے کہ وہ عدالت سے نکاح فسخ کرا لے اور مذہب مالکیہ کے مطابق یہ تفریق نافذ ہو جائے گی' اسی طرح اگر خاوند تنگ کرنے کے لیے عورت کو نفقہ دے نہ طلاق دے' تب بھی عورت عدالت سے تفریق کرا سکتی ہے' اگر کسی نوجوان عورت کا خاوند پاگل ہو جائے اور ٹھیک نہ ہو سکے یا کسی اور ناقابل علاج بیماری میں مبتلا ہو جائے اور حقوق زوجیت ادا نہ کر سکے تب بھی عورت عدالت سے تفریق کرا سکتی ہے' اگر کسی نوجوان عورت کا خاوند کسی جرم کی وجہ سے لمبی مدت کے لیے سزا یاب ہو یا اس کو عمر قید ہو جائے تب بھی عورت عدالت سے تفریق کرا سکتی ہے' اگر کسی نوجوان عورت کا خاوند لاپتا ہو جائے اور عورت کے گزر بسر کا ذریعہ نہ ہو تو عدالت تحقیق کے بعد فی الفور تفریق کر دے گی۔ اگر عورت اور مرد میں اختلاف ہو اور وہ حکمین کو مقرر کر لیں اور حکمین تفریق کا فیصلہ کر دیں تو تفریق ہو جائے گی۔ یہ تمام صورتیں امام مالک کے نزدیک جائز ہیں اور فقہاء احناف نے تصریح کی ہے کہ ضرورت کے وقت امام مالک کے مذہب پر عمل درست ہے اور یہ بھی تصریح ہے کہ قاضی اپنے اجتہاد سے مذہب غیر کے مطابق فیصلہ کر سکتا ہے اور اس پر عمل صحیح ہے' ان تمام امور کی باحوالہ' مکمل مفصل' اور مدلل بحث ہم نے ''شرح صحیح مسلم'' جلد ثالث باب ۲۰۴ (ص ۱۱۲۱۔ ۱۰۹۲) میں بیان کر دی ہے۔

تین طلاقوں کی تحدید کی وجوہات' مصالح اور حکمتیں

اسلام نے صرف تین طلاقوں کی گنجائش رکھی ہے' پہلی اور دوسری طلاق دینے کے بعد مرد کو اس طلاق سے رجوع کرنے کا اختیار ہے لیکن تیسری طلاق دینے کے بعد مرد کو رجوع کرنے کا اختیار نہیں ہے' اب اگر وہ مرد اور عورت پھر ملنا چاہیں تو اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے' عورت عدت گزارنے کے بعد کسی اور شخص سے نکاح کرے' نکاح کرنے کے بعد وہ شخص اس سے عمل زوجیت (صحبت) کرے اور پھر اپنی مرضی سے جب اس کو طلاق دے دے تو پھر وہ عورت اس کی عدت گزار کر پہلے شوہر کے نکاح میں جا سکتی ہے' ظاہر ہے کہ یہ ناگوار اور مشکل صورت ہے اس لیے مرد کو تیسری طلاق دینے سے پہلے اچھی طرح سوچ وبچار اور غور وفکر کرنا چاہیے تاکہ بعد میں پریشانی اور پچھتاوے کا سامنا نہ کرنا پڑے اور رو دھو کر مفتیوں سے حیلے نہ پوچھے جائیں اور اپنا مذہب چھوڑ کر غیر مقلدیت کے دامن میں پناہ لینے کی ضرورت نہ پڑے' اسلام نے اسی لیے بیک وقت تین طلاقیں دینے

سے روکا ہے اور اس فعل کو معصیت اور گناہ قرار دیا ہے۔

سنت کے مطابق اور احسن طریقے سے طلاق دینے کے فوائد

جب کوئی شخص سنت کے مطابق صحیح طریقہ سے عورت کی پاکیزگی کے ان ایام میں جن میں اس نے جماع نہ کیا ہو صرف ایک طلاق دے گا اور دوسری طلاق کے لیے اگلی پاکیزگی کے ایام تک رکا رہے گا جو تقریباً ایک ماہ کے برابر ہیں تو اس عرصہ میں وہ اس معاملہ پر سو دفعہ سے زیادہ غور کرے گا اور گمان غالب ہے کہ اس کی رائے بدل جائے گی (کیونکہ میں تیس سالہ افتاء کی زندگی میں بارہا دیکھ چکا ہوں کہ کل شوہر نے تین طلاقیں دی ہیں اور آج وہ دوڑا چلا آ رہا ہے کہ کوئی حیلہ بتلائیں کہ نکاح قائم رہ سکے۔ جب ایک دن میں رائے بدل جاتی ہے' حالات بدل جاتے ہیں تو ایک ماہ میں تو بہت گنجائش ہے)۔ اگر بیوی کے مطالبہ یا اس کے غلط طرز عمل کی وجہ سے یہ اختلاف کی صورت پیدا ہوئی ہے تو ایک ماہ میں اس کے طرز عمل میں تبدیلی یا مطالبہ طلاق ترک کر دینے کا غالب امکان ہے' اس طرح دوسری طلاق پڑنے کا خطرہ ٹل جائے گا اور تیسری طلاق کی نوبت نہیں آئے گی' جب کہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق احسن طریقہ یہ ہے کہ زمانہ طہر میں بشرط عدم مجامعت صرف ایک طلاق دی جائے اور عدت کے پورے زمانہ میں دوبارہ طلاق نہ دی جائے اور عدت کے اس تین ماہ میں طلاق سے رجوع کرنے کا زیادہ موقع رہے گا اور بالفرض رجوع نہیں کیا اور عدت گزر گئی اور عورت بائنہ ہوگئی اور بعد میں حالات سازگار ہوئے تو اب دوبارہ نکاح کرنے کی گنجائش ہے اور کسی حلالہ کی ضرورت نہیں ہے جب کہ تین طلاقیں دینے کے بعد یہ گنجائش نہیں رہتی۔

طلاق کی تدریج میں مرد کی اور تحدید میں عورت کی رعایت ہے

تین طلاق کی تحدید سے دراصل عورت کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے کیونکہ اگر طلاق میں کوئی تحدید نہ ہوتی تو عورت کی گلوخلاصی کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا۔ زمانہ جاہلیت میں مرد عورت کو طلاق دیتا اور عدت پوری ہونے سے پہلے رجوع کر لیتا' پھر طلاق دے دیتا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا تھا۔

امام رازی نے ''الطلاق مرتان'' کا شانِ نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آ کر یہ شکایت کی کہ اس کا شوہر اس کو بار بار طلاق دیتا ہے اور پھر رجوع کر لیتا ہے جس کی وجہ سے اس کو ضرر ہوتا ہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ (البقرہ: ۲۲۹)

دوبارہ طلاق دینے کے بعد دستور کے مطابق عدت میں روکنا ہے یا حسن سلوک کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ (البقرہ: ۲۳۰)

پھر اگر اسے (تیسری) طلاق دے دی تو وہ عورت اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ (وہ عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کرے' پھر اگر (دوسرا خاوند) اس کو طلاق دے دے تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (دوسرے خاوند کی عدت گزارنے کے بعد) وہ آپس میں رجوع کر لیں اگر وہ سمجھیں کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے۔

ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کے نتائج

چونکہ تیسری طلاق آخری حد ہے اور اس کے بعد رجوع کی گنجائش نہیں ہے اس لیے تیسری طلاق دینے سے پہلے بہت سوچ و بچار اور غور و خوض کرنا چاہیے اور اس آخری قدم اٹھانے سے پہلے دوستوں اور رشتہ داروں سے مشورہ بھی کر لینا چاہیے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اسلام کی ہدایت کے مطابق طلاق وقفہ وقفہ سے دی جائے' اگر ایک مجلس میں بیک وقت تین طلاقیں دے دی گئیں تو پھر بعد میں پریشانی اور پشیمانی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوگا اس لیے بکثرت احادیث اور آثار میں بیک وقت تین طلاقیں دینے کو معصیت اور گناہ فرمایا ہے' لیکن اگر کسی شخص نے بدقسمتی سے معصیت کا ارتکاب کر کے ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دیں تو اس کو اب صبر و استقامت اور حوصلہ سے اس اقدام کے نتیجہ اور انجام کا سامنا کرنا چاہیے اور اپنے ہاتھوں کی ہوئی اس علیحدگی کو قبول کر لینا چاہیے۔ حلالہ کا مکروہ حیلہ اختیار کرے نہ غیر مقلد مولویوں کے خلاف شرع فتویٰ پر عمل کرنے کے لیے در بدر مارا مارا پھرے' کیونکہ تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دینا عقل اور درایت کے بھی خلاف ہے اور قرآن اور حدیث کے بھی خلاف ہے۔ عددی معاملات میں یہ کہیں نہیں ہوتا کہ کوئی شخص تین یا پانچ یا دس عدد کو ایک عدد قرار دے اور اگر کوئی شخص دس روپوں کو ایک روپیہ قرار دے تو یہ منطق اور قانون دونوں کے خلاف ہے' پھر تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیتے وقت ان لوگوں کی منطق کہاں رخصت ہو جاتی ہے۔ آئندہ مباحث میں ہم ان شاء اللہ ایک مجلس کی تین طلاقوں پر گفتگو کریں گے۔ پہلے ہم ایک مجلس کی تین طلاقوں کے جواز اور عدم جواز میں اختلاف فقہاء بیان کریں گے' پھر تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دینے پر غیر مقلدین کے دلائل پیش کر کے ان کا جائزہ لیں گے' اس کے بعد قرآن مجید' احادیث' آثار صحابہ اور اقوال تابعین کی روشنی میں جمہور فقہاء اسلام کا یہ موقف پیش کریں گے کہ اگر کسی شخص نے بدقسمتی سے معصیت کا ارتکاب کر کے ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دیں تو وہ بہرحال نافذ ہو جائیں گی۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

بیک وقت تین طلاقیں دے کر عورت کو بدر کر دینا نصوص صریحہ کی بناء پر معصیت ہے۔ علماء امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاق مغلظہ کے حکم میں لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں۔

حالانکہ امام شافعی کا اس میں اختلاف ہے' وہ بیک وقت تین طلاقوں کو بدعت اور گناہ نہیں' مباح کہتے ہیں اور امام احمد کا ایک قول بھی یہی ہے۔ سید ابو الاعلیٰ نے مذاہب فقہاء کی تحقیق کیے بغیر یہ لکھ دیا ہے۔

(حقوق الزوجین ص ۱۵۰' مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن' لاہور' بائیسویں بار' ۱۹۸۶ء)

بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کے حکم میں جمہور کا موقف

جمہور علماء اہل سنت کے نزدیک بیک وقت دی گئی تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں: امام شافعی' امام مالک' امام ابوحنیفہ اور قدیم و جدید جمہور علماء کے نزدیک یہ تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔

(شرح مسلم ج ۱ ص ۴۷۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: جس شخص نے بیک وقت تین طلاقیں دیں وہ واقع ہو جائیں گی خواہ دخول سے پہلے دی ہوں یا دخول کے بعد۔ حضرت ابن عباس' حضرت ابن عمر' حضرت ابو ہریرہ' حضرت عبد اللہ بن عمرو' حضرت ابن مسعود اور

حضرت انس رضی اللہ عنہم کا یہی نظریہ ہے اور بعد کے تابعین اور ائمہ کا بھی یہی موقف ہے۔[1] قاضی ابن رشد مالکی لکھتے ہیں کہ جمہور فقہاء کا یہی موقف ہے کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقوں سے تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔

(بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۴۹ مطبوعہ دارالفکر بیروت)

علامہ الحصکفی الحنفی لکھتے ہیں کہ بار بار لفظ طلاق کا تکرار کرنے سے تمام طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور اگر طلاق دینے والا تاکید کی نیت کرے تو اس کا دیانۃ اعتبار ہوگا[2] (یعنی قضاءً اعتبار نہیں ہوگا۔)

بیک وقت دی گئی تین طلاقوں میں شیخ ابن تیمیہ اور ان کے موافقین کا موقف

شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: اگر کسی شخص نے ایک طہر میں ایک لفظ یا متعدد الفاظ کے ساتھ تین طلاقیں دیں' مثلاً کہا کہ تم کو تین طلاقیں یا کہا کہ تم کو طلاق ہے' تم کو طلاق ہے' تم کو طلاق ہے' یا کہا: تم کو تین طلاقیں یا دس طلاقیں یا سو طلاقیں' یا ہزار طلاقیں' اس قسم کی عبارات میں متقدمین اور متاخرین علماء کے تین نظریات ہیں اور ایک چوتھا قول بھی ہے جو محض من گھڑت اور بدعت ہے' پہلا قول یہ ہے کہ یہ طلاق مباح اور لازم ہے' یہ امام شافعی کا قول ہے۔ امام احمد کا بھی ایک یہی قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ طلاق حرام اور لازم ہے' یہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا قول ہے' امام احمد کا بھی ایک قول یہی ہے۔ یہ قول متقدمین میں بکثرت صحابہ اور تابعین سے منقول ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ طلاق حرام ہے لیکن اس سے صرف ایک طلاق لازم آتی ہے' یہ قول صحابہ میں سے حضرت زبیر بن عوام' حضرت عبدالرحمان بن عوف سے منقول ہے۔ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود سے بھی مروی ہے اور حضرت ابن عباس کے دو قول ہیں' تابعین اور بعد کے لوگوں میں سے طاؤس' خلاص بن عمرو' محمد بن اسحاق سے منقول ہے' داؤد اور ان کے اکثر اصحاب کا یہی قول ہے' ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین اور ان کے بیٹے جعفر بن محمد کا بھی یہی قول ہے' اسی وجہ سے شیعہ حضرات کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام ابوحنیفہ' امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے بعض اصحاب کا بھی یہی قول ہے۔ چوتھا قول بعض معتزلہ اور بعض شیعہ کا ہے' وہ یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاق دینے سے کوئی طلاق نہیں پڑتی' سلف صالحین میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں تھا اور تیسرا قول ہی وہ ہے جس پر کتاب وسنت سے دلائل موجود ہیں۔

(مجموع الفتاویٰ ج ۳۳ ص ۷-۹ مطبوعہ بامر فہد بن عبدالعزیز آل السعود)

شیخ ابن قیم لکھتے ہیں کہ بیک وقت تین طلاقوں کے وقوع کے بارے میں چار مذاہب ہیں' پہلا مذہب یہ ہے کہ تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں' یہ قول ائمہ اربعہ' جمہور تابعین اور بکثرت صحابہ کا ہے' (رضی اللہ عنہم) دوسرا مذہب یہ ہے کہ یہ طلاق واقع نہیں ہوتی بلکہ مردود ہے کیونکہ یہ بدعت محرمہ ہے اور بدعت اس حدیث کی وجہ سے مردود ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے ایسا عمل کیا جو ہمارے دین میں نہیں ہے وہ مردود ہے۔ اس مذہب کو ابو محمد بن حزم نے بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ امام احمد نے فرمایا: یہ باطل ہے اور رافضیوں کا قول ہے۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ اس سے ایک رجعی طلاق واقع ہوتی ہے' یہ مذہب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے' جیسا کہ امام ابوداؤد نے ذکر کیا ہے' امام احمد نے کہا: یہ ابن اسحاق کا مذہب ہے' وہ کہتے ہیں کہ جو شخص سنت کی مخالفت کرے اس کو سنت کی طرف لوٹانا چاہیے۔ (تابعین میں سے) طاؤس اور عکرمہ کا بھی یہی قول ہے اور شیخ ابن تیمیہ کا بھی یہی نظریہ ہے' چوتھا مذہب یہ ہے کہ مدخول بہا اور غیر مدخول بہا میں فرق ہے' مدخول بہا کو تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور غیر مدخول بہا کو ایک طلاق واقع ہوتی ہے' یہ قول حضرت ابن عباس کے تلامذہ کا

---

[1] علامہ ابو محمد عبداللہ بن احمد بن قدامہ حنبلی متوفی ۶۲۰ ھ' المغنی ج ۷ ص ۲۸۲ مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۰۵ ھ

[2] علامہ علاؤ الدین الحصکفی الحنفی متوفی ۱۰۸۸ ھ' در مختار علی ہامش رد المحتار ج ۲ ص ۴۳۲ مطبوعہ استنبول' ۱۳۲۷ ھ

ہے اور اسحاق بن راھویہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ (زاد المعاد ج ۲ ص ۵۴ ‘مطبوعہ مطبع مصطفی البابی واولادہ ‘مصر)

بیک وقت دی گئی تین طلاقوں میں علماء شیعہ کا موقف

جیسا کہ شیخ ابن تیمیہ نے لکھا ہے ‘بعض شیعہ کا موقف یہ ہے کہ اگر بیک وقت تین طلاقیں دی جائیں تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ (شرائع الاسلام ج ۲ ص ۵۷)

اور جمہور شیعہ کا مذہب یہ ہے کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقوں سے ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔ شیخ ابوجعفر کلینی روایت کرتے ہیں:

زرارہ کہتے ہیں کہ میں نے کسی ایک علیہ السلام سے پوچھا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک مجلس یا متعدد مجالس میں تین طلاقیں دیں درآں حالیکہ وہ عورت حیض سے پاک تھی؟ انہوں نے کہا: یہ ایک طلاق ہوگی۔

(الفروع من الکافی ج ۶ ص ۷۱۔ ۷۰ ‘مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ ‘ایران)

عمرو بن براء کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبد اللہ علیہ السلام سے کہا کہ ہمارے اصحاب یہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص جب اپنی بیوی کو ایک طلاق دے یا سو طلاقیں دے تو صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے اور ہمیں آپ سے اور آپ کے آباء علیہم السلام سے یہ حدیث پہنچی ہے کہ جب کوئی شخص ایک بار طلاق دے یا سو بار طلاق دے تو وہ ایک طلاق ہوتی ہے۔ ابوعبد اللہ علیہ السلام نے کہا: مسئلہ اسی طرح ہے جس طرح تمہیں پہنچا ہے۔

(الفروع من الکافی ج ۶ ص ۷۱ ‘مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ ‘ایران ‘۱۳۶۲ھ)

تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دینے پر شیخ ابن تیمیہ اور ان کے موافقین کے دلائل

شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ’’الطلاق مرتان‘‘ اس سے معلوم ہوا کہ وہ طلاق رجعی جس میں طلاق کے بعد رجوع کیا جاتا ہے ایک بار دینے کے بعد دوسری مرتبہ دی جاتی ہے ‘جیسے کسی شخص نے کہا: جاؤ ‘دو بار تسبیح کرو یا تین بار تسبیح کرو یا سو بار تسبیح کرو ‘اس پر عمل کے لیے ضروری ہے کہ وہ اتنی بار تسبیح کرے کہ یہ عدد پورا ہو جائے ‘مثلاً کہے: سبحان اللہ ‘سبحان اللہ تو یہ دو بار ہوگا اور اگر اس نے کہا: دو بار سبحان اللہ! (سبحان اللہ مرتان) یا سو بار سبحان اللہ (سبحان اللہ مأۃ مرۃ) کہا تو یہ ایک تسبیح شمار کی جائے گی ‘علیٰ ہذا القیاس جس شخص نے اپنی بیوی سے کہا: تمہیں دو طلاقیں یا تمہیں تین طلاقیں یا تمہیں دس طلاقیں یا تمہیں ہزار طلاقیں تو یہ ایک طلاق شمار کی جائے گی۔ اس کو واضح کرنے کے لیے شیخ ابن تیمیہ نے ایک یہ مثال دی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع فرمایا ہے کہ نماز کے بعد تینتیس بار سبحان اللہ ‘تینتیس بار الحمد للہ اور تینتیس بار اللہ اکبر کہا جائے ‘اب اگر کوئی شخص کہے: سبحان اللہ ‘الحمد للہ ‘اللہ اکبر عدد خلقہ (اس کی مخلوق کی تعداد کے برابر) تو یہ صرف ایک تسبیح شمار کی جائے گی۔

شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: ہمارے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ کسی شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک لفظ کے ساتھ تین طلاقیں دی ہوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر تین طلاقیں لازم کر دی ہوں ‘اس بارے میں کوئی حدیث صحیح یا احسن مروی نہیں ہے اور نہ کسی مستند کتاب میں کوئی ایسی حدیث نقل کی گئی ہے ‘اس سلسلے میں جتنی احادیث نقل کی گئی ہیں وہ سب ائمہ حدیث کی تصریح کے مطابق ضعیف ہیں ‘بلکہ موضوع ہیں ‘بلکہ ’’صحیح مسلم‘‘ اور دیگر سنن اور مسانید میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے اور حضرت ابوبکر کے زمانۂ خلافت میں اور حضرت عمر کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جاتا ہے ‘حضرت عمر نے فرمایا: لوگوں نے اس

کام میں عجلت کرنی شروع کر دی ہے جس میں انہیں مہلت دی گئی تھی اگر ہم ان پر یہ تین طلاقیں نافذ کر دیں تو بہتر ہوگا' پھر آپ نے یہ تین طلاقیں نافذ کر دیں' اس سلسلے میں دوسری حدیث یہ ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں' پھر سخت غمگین ہوئے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے سوال کیا: تم نے کس طرح طلاق دی تھی؟ انہوں نے کہا: میں نے تین طلاقیں دی تھیں۔ آپ نے فرمایا: ایک مجلس میں؟ انہوں نے کہا: جی! آپ نے فرمایا: یہ ایک طلاق ہوئی ہے اگر تم چاہو تو اس سے رجوع کر سکتے ہو۔ حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ پھر حضرت رکانہ نے رجوع کر لیا۔ شیخ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ استفسار فرمایا: ایک مجلس میں؟ اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اگر ایک مجلس میں تین طلاقیں نہ دی جائیں تو پھر وہ ایک نہیں قرار دی جائیں اور جب ایک مجلس میں تین طلاقیں دی جائیں تو وہ ایک قرار دی جائے گی' حضرت رکانہ کی یہ حدیث شیخ ابن تیمیہ نے ''مسند احمد'' کے حوالے سے بیان کی ہے۔

(مجموع الفتاوی ج ۳۳ ص ۱۴۔ ۱۱ مطبوعہ بامر فہد بن عبد العزیز)

شیخ ابن تیمیہ اور ان کے موافقین کے دلائل کے جوابات

شیخ ابن تیمیہ نے ''الطلاق مرتان'' سے یہ استدلال کیا ہے کہ ہر طلاق الگ الگ دی جائے' تب وہ متعدد طلاقیں متصور ہوں گی اور اگر کسی نے کہا: ''تم کو تین طلاقیں'' تو چونکہ یہ طلاق ایک بار دی گئی ہے' اس لیے یہ ایک طلاق ہی شمار ہوگی' شیخ ابن تیمیہ کا یہ استدلال خود انہیں بھی مفید نہیں ہے کیونکہ اس استدلال کا یہ تقاضا ہے کہ کسی شخص نے ایک مجلس میں تین بار کہا: میں نے تم کو طلاق دی' میں نے تم کو طلاق دی' میں نے تم کو طلاق دی' تو یہ تین طلاقیں واقع ہونی چاہئیں کیونکہ یہ تین بار دی گئی ہیں' حالانکہ شیخ کے نزدیک یہ بھی ایک طلاق ہے جیسا کہ اس سے پہلے باحوالہ گزر چکا ہے۔

زنا کی شہادات اور قسامت کی قسموں پر قیاس کے جوابات

شیخ ابن قیم جوزیہ نے زنا کی چار شہادتوں اور قسامت کی پچاس قسموں سے بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دینے پر استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں چار بار گواہی دیتا ہوں کہ فلاں شخص نے زنا کیا ہے' تو اس کی یہ گواہی مردود ہوگی جب تک چار آدمی الگ الگ گواہی نہ دیں' اسی طرح اگر ایک آدمی یہ کہے کہ میں پچاس قسمیں کھاتا ہوں کہ میں نے قتل کیا نہ قاتل دیکھا ہے تو اس کی یہ قسم معتبر نہیں ہوگی جب تک کہ پچاس آدمی الگ الگ قسمیں نہ کھائیں' اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں تم کو تین طلاقیں دیتا ہوں تو یہ تین طلاقیں بھی معتبر نہیں ہوں گی' جب تک کہ وہ الگ الگ تین طلاقیں نہ دے۔ (زاد المعاد ج ۴ ص ۵۵ 'مطبوعہ مصطفی البابی واولادہ' مصر' ۱۳۶۹ھ)

اس استدلال کا ایک جواب تو یہی ہے کہ یہ دلیل خود شیخ ابن قیم کو بھی مفید نہیں ہے کیونکہ اس دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ ایک مجلس میں اگر تین بار الگ الگ تین طلاقیں دی جائیں تو وہ واقع ہو جانی چاہئیں' حالانکہ ان کے نزدیک ایک مجلس میں الگ الگ تین طلاقیں دی جائیں تو وہ بھی واقع نہیں ہوتیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ زنا کی شہادت اور قسامت پر طلاق کا قیاس درست نہیں ہے کیونکہ جو شخص یہ کہے کہ میں زنا کی چار گواہیاں دیتا ہوں یا میں قتل نہ کرنے کی پچاس قسمیں کھاتا ہوں اس کی گواہی اور قسم مطلقاً مردود ہے' برخلاف طلاق کے کیونکہ جو شخص کہے: میں تم کو تین طلاقیں دیتا ہوں اس کی طلاق ان کے نزدیک بھی مطلقاً مردود نہیں ہے بلکہ ایک طلاق واقع ہو جائے گی۔ یہ دوسرا جواب علامہ آلوسی کی عبارت سے مستفاد ہے۔

علامہ آلوسی نے اس استدلال کے جواب میں لکھا ہے کہ شہادات لعان اور رمی جمرات پر طلاق کو قیاس کرنا قیاس مع

الفارق ہے' دونوں کے احکام الگ الگ ہیں' اور ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا' علاوہ ازیں طلاق کا معاملہ حلت اور حرمت سے ہے' اور اس میں احتیاط یہی ہے کہ جو تین طلاقیں بیک وقت دی گئی ہیں وہ واقع مان لی جائیں' [1] اور یہ مسلم اصول ہے کہ جب اباحت اور تحریم میں تعارض ہو تو تحریم کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کو شیخ ابن تیمیہ اور ان کے موافقین ایک طلاق دے کر نکاح کو مباح کہتے ہیں اور جمہور ان تین طلاقوں کو تین ہی شمار کر کے نکاح کو حرام کہتے ہیں اور اس اصول کے مطابق جمہور کے قول کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ اباحت اور تحریم کے تعارض میں تحریم ہی کو ترجیح دی جاتی ہے۔

تسبیح فاطمہ پر قیاس کے جوابات

پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں: حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لخت جگر خاتون جنت سے فرمایا تھا کہ ہر نماز کے بعد ۳۳ بار سبحان اللہ' ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھا کرو' یہ لونڈیوں سے بہتر ہے' اب اگر کوئی شخص سبحان اللہ تینتیس بار (ایک دفعہ) کہہ دے تو کیا وہ اس اجر وثواب کا مستحق ہوگا؟ [2] (پیر صاحب اس سے یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ تین طلاقیں کہنے سے تین طلاقیں واقع نہیں ہوتیں)۔

یہ دلیل سب سے پہلے شیخ ابن تیمیہ نے قائم کی تھی' اس کے بعد شیخ ابن تیمیہ کے متبعین مزید مثالوں کے ساتھ اس کو نقل کرتے چلے گئے ہیں' ہم اس دلیل کے چار جواب بیان کر چکے ہیں کہ یہ استدلال ان حضرات کو بھی مفید نہیں ہے کیونکہ ایک مجلس میں کلمات متعددہ سے تین بار تین طلاقیں دی جائیں تو اس دلیل کے اعتبار سے وہ نافذ ہونی چاہئیں حالانکہ یہ لوگ اس کو بھی تین طلاق نہیں مانتے بلکہ ایک طلاق کہتے ہیں' دوسرا یہ کہ جب اباحت اور تحریم میں تعارض ہو تو ترجیح تحریم کی ہوتی ہے' تیسرا جواب ہم نے علامہ آلوسی سے نقل کیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک دفعہ مثلاً یوں کہہ دے کہ سو بار سبحان اللہ تو اس حدیث پر عمل نہیں ہوگا اور یہ تسبیح فاطمہ نہیں ہوگی اور وہ اس کے اجر کا مستحق نہیں ہوگا' اس کے برخلاف اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے: تم کو تین طلاقیں تو آپ بھی یہ تو مانتے ہیں کہ ایک طلاق ہو جائے گی اس لیے یہ قیاس صحیح نہیں ہے۔ علامہ آلوسی نے جو دوسرا جواب دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دینا حرام کو حلال کرنا ہے' اس لیے اس قسم کی تک بندیوں اور ڈھکوسلوں سے اللہ اور رسول کے حرام کردہ کو حلال نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت عمر پر عہد رسالت کے معمول کو بدلنے کے الزام کے جوابات

شیخ ابن تیمیہ اور ان کے موافقین کی دوسری دلیل "صحیح مسلم" کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے عہد میں بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیا جاتا ہے اور حضرت عمر نے یہ کہا کہ اگر ان کو تین طلاق ہی قرار دیا جائے تو بہتر ہوگا اور پھر انہوں نے ایسا ہی کر دیا' جس طرح شیخ ابن تیمیہ اور ان کے موافقین نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے' اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی صریح مخالفت کی اور تمام صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کو قبول کر لیا' اگر اس بات کو مان لیا جائے تو حضرت ابوبکر اور ان کے دور میں فوت ہونے والے صحابہ کے علاوہ کوئی صحابی اس قابل نہیں رہے گا کہ اس کے دین پر اعتماد کیا جائے اور اس کی روایت کو قبول کیا جائے' یہی وجہ ہے کہ جمہور فقہاء اسلام نے اس حدیث کا ظاہر معنی نہیں لیا' اور اس حدیث کے متعدد جوابات دیئے

[1] علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ' روح المعانی ج ۲ ص ۱۳۹' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت

[2] پیر محمد کرم شاہ الازہری' دعوت فکر ونظر مع ایک مجلس کی تین طلاقیں ص ۱۲۹' مطبوعہ نعمانی کتب خانہ' لاہور' ۱۹۸۹ء

ہیں[1] ایک جواب یہ ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

صحیح مسلم کی زیر بحث روایت غیر صحیح اور مردود ہے

قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں' جیسا کہ ان شاء اللہ عنقریب واضح ہوگا اور ''صحیح بخاری'' اور ''صحیح مسلم'' کی متفق علیہ حدیث ہے جس کو صحاح ستہ کے دیگر مؤلفین نے بھی روایت کیا ہے کہ حضرت عویمر رضی اللہ عنہ نے ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاقوں کو نافذ کر دیا' نیز دیگر احادیث صحیحہ اور بکثرت آثار صحابہ اور اقوال تابعین سے ثابت ہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں (جس کا تفصیلی بیان عنقریب آ رہا ہے) اور ''صحیح مسلم'' میں حضرت ابن عباس کی یہ روایت چونکہ قرآن مجید' احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ کی صراحت کے خلاف ہے اس لیے یہ روایت شاذ اور معلل ہے اور استدلال سے خارج ہے۔

صحیح مسلم کی زیر بحث روایت کے غیر صحیح ہونے پر دوسری دلیل

اس روایت کے شاذ' معلل اور مردود ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما خود یہ فتویٰ دیتے تھے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ متصور نہیں ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک چیز روایت کریں اور فتویٰ اس کے خلاف دیں' اس لیے یہ روایت شاذ ہے اور حضرت ابن عباس کی طرف اس روایت کو منسوب کرنے میں طاؤس کو وہم ہوا ہے۔

(فتح الباری ج ۹ ص ۳۶۳' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

''صحیح مسلم'' کی اس زیر بحث حدیث کو طاؤس نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی کی صراحت کے مطابق یہ طاؤس کا وہم ہے' اس کی مزید وضاحت امام بیہقی کے بیان سے ہوتی ہے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں: یہ حدیث ان احادیث میں سے ہے جن میں امام بخاری اور امام مسلم کا اختلاف ہے' امام مسلم نے اس کو روایت کیا ہے اور امام بخاری نے اس کو ترک کر دیا ہے' اور میرا گمان یہ ہے کہ امام بخاری نے اس حدیث کو اس لیے ترک کیا ہے کہ یہ روایت حضرت ابن عباس کی باقی روایات کے مخالف ہے' پھر امام بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ عکرمہ نے کہا: حضرت ابن عباس کی باقی روایات کے مخالف ہے' پھر امام بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ عکرمہ نے کہا: حضرت ابن عباس نے فرمایا: پہلے انسان تین طلاق دینے کے بعد رجوع کر لیتا تھا ''الطلاق مرتان'' نے اس کو منسوخ کر دیا۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا: جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں وہ اس پر حرام ہو گئی' مجاہد کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس سے پوچھا: میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں' حضرت ابن عباس نے فرمایا: تم تین طلاقیں لے لو اور ستانوے طلاقوں کو چھوڑ دو' مجاہد سے ہی روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیں' حضرت ابن عباس نے فرمایا: تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی' تمہاری بیوی تم سے علیحدہ ہو گئی' تم نے اللہ کا خوف نہیں کیا' اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے کوئی مخرج نہیں رکھا' ان کے علاوہ عطاء' عمرو بن دینار اور مالک بن حارث وغیرہ طاؤس کے علاوہ حضرت ابن عباس کے تمام تلامذہ حضرت ابن عباس سے یہی روایت کرتے ہیں کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں' اس کے

---

[1] حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری محقق سنی حنفی عالم ہیں' اس مسئلہ میں ان کی رائے ائمہ اربعہ کے متفق علیہ موقف سے مختلف ہے تاہم ہماری معلومات کے مطابق انہوں نے اس رائے پر فتویٰ نہیں دیا' لیکن چونکہ غیر مقلد حضرات ان کا رسالہ مسلسل چھاپ رہے ہیں اس لیے ہم نے ان کے دلائل کا جواب ضروری سمجھا تاکہ عوام اہل سنت ان کے حوالے سے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ (غلام رسول سعیدی غفرلہٗ)

برخلاف صرف طاؤس نے حضرت ابن عباس سے یہ روایت کیا ہے کہ عہد رسالت اور عہد ابوبکر میں تین طلاقیں ایک قرار دی جاتی تھیں اس لیے یہ روایت طاؤس کے وہم پر محمول کی جائے گی اور صحیح نہیں ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۷ ص ۳۳۷ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان)

اعتبار راوی کی روایت کا ہے یا اس کی رائے کا؟

پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں: اس حدیث کا یہ جواب بھی دیا گیا ہے کہ صحابہ کرام کا عمل اس حدیث کے خلاف ہے' خصوصاً حضرت ابن عباس راوی حدیث کا فتویٰ بھی اس کے خلاف ہے تو اس روایت پر عمل کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے' الیٰ قولہ۔ اس کے متعلق مختصر یہ گزارش ہے کہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان عالیشان کے سامنے کسی کا قول حجت نہیں' نیز حضرت ابن عباس سے بھی دو روایتیں آئی ہیں' ایک وہ جو اوپر گزری' دوسری وہ جسے مسند میں امام احمد نے نقل کیا ہے: حضرت ابن عباس کا نظریہ یہ تھا کہ ہر طہر کے وقت طلاق دی جائے۔ دوسرے صحابہ کرام کے اقوال کا ذکر جا بجا گزر چکا ہے' نیز اصول فقہ کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ ''اعتبار راوی کی روایت کا ہے نہ کہ اس کی ذاتی رائے کا''۔

(دعوت فکر و نظر مع ایک مجلس کی تین طلاقیں ص ۱۲۹' مطبوعہ نعمانی کتب خانہ' لاہور' ۱۹۷۹ء)

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان عالیشان کے مقابلہ میں کسی کا قول حجت نہیں ہے لیکن یہ کون سی حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیا جائے۔ اگر مسلم کی حدیث مذکور مراد ہے تو اولاً تو اس میں آپ کے کسی فرمان کا ذکر نہیں ہے۔ ثانیاً اسی حدیث میں تو بحث ہو رہی ہے کہ یہ ثابت اور صحیح نہیں ہے طاؤس کا وہم ہے۔ مشہور غیر مقلد عالم قاضی شوکانی نے بھی اعتراف کیا ہے:

امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ حضرت ابن عباس کے تمام شاگردوں نے حضرت ابن عباس سے طاؤس کے برخلاف روایت کیا ہے۔ سعید بن جبیر' مجاہد اور نافع نے حضرت ابن عباس سے اس کے برخلاف روایت کی ہے۔

(نیل الاوطار ج ۸ ص ۱۲' مطبوعہ مکتبۃ الکلیات الازہریہ' قاہرہ' ۱۳۹۸ھ)

اور چونکہ ''صحیح مسلم'' کی یہ روایت طاؤس کے وہم پر مبنی ہے اس لیے صحیح نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر عہد رسالت کے معمول کی مخالفت اور تمام صحابہ پر مداہنت کی تہمت لگانے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ایک معقول وجہ (طاؤس کے وہم) کی بنیاد پر اس حدیث کو مسترد کر دیا جائے!

پیر محمد کرم شاہ صاحب نے لکھا ہے: نیز اصول فقہ کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ ''اعتبار راوی کی روایت کا ہے نہ کہ اس کی رائے کا'' اس کے بارے میں گزارش ہے کہ عام راویوں کے بارے میں بے شک ایسا ہی ہے لیکن جب صحابی رسول کسی حدیث کی روایت کریں اور ان کا عمل یا فتویٰ اس حدیث کے خلاف ہو تو پھر دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ روایت صحیح نہیں یا اس صحابی کے نزدیک منسوخ ہو چکی ہے کیونکہ صحابی رسول سے یہ متصور نہیں کہ وہ ایک حدیث بیان کرے اور عمل اس کے خلاف کرے۔ کتب صحاح میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کرتے تھے اور امام طحاوی نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت ابن عمر کے پیچھے نماز پڑھی' انہوں نے تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کیا۔ اس روایت کو بیان کرنے کے بعد امام طحاوی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رفع یدین کرتے ہوئے دیکھا' پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کو ترک کر دیا اور یہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ان کے نزدیک کسی دلیل سے رفع یدین منسوخ ہو چکا ہو[1] نیز حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ جس برتن میں کتا

[1] امام ابوجعفر احمد بن محمد الطحاوی الحنفی متوفی ۳۲۱ھ' شرح معانی الآثار ج ۱ ص ۱۳۳' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۴ھ

منہ ڈال دے اس کو سات مرتبہ دھونا ضروری ہے اور خود تین مرتبہ دھوتے تھے۔ امام طحاوی لکھتے ہیں کہ ہم حضرت ابوہریرہ کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں کرتے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سن کر اس پر عمل کرنا ترک کر دیں گے' اور اگر وہ ایسا کریں تو ان کی عدالت (نیکوکاری) ساقط ہو جائے گی اور وہ اس قابل بھی نہیں رہیں گے کہ ان کی کوئی بات قبول کی جائے چہ جائیکہ ان کی روایت قبول کی جائے' اس لیے ضروری ہے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت ابوہریرہ کے نزدیک یہ روایت منسوخ ہو چکی ہے۔ (شرح معانی الآثار ج ۱ ص ۱۳' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۴ھ)

جب صحابی رسول کا عمل یا فتویٰ اس کی روایت کے خلاف ہو تو اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس روایت کی نسبت اس صحابی کی طرف صحیح نہیں ہے' یا پھر اس روایت میں کوئی تاویل ہے۔ علامہ پرہاروی لکھتے ہیں:

راوی کا عمل جب حدیث کے خلاف ہو تو یہ اس حدیث کی صحت میں طعن کا موجب ہے' یا اس حدیث کے منسوخ ہونے پر دلیل ہے یا پھر اس حدیث میں تاویل ہے اور اس کا ظاہری معنی مراد نہیں ہے۔

(النبراس ص ۱۳' مطبوعہ شاہ عبدالحق اکیڈمی' بندیال' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۳۹۷ھ)

حضرت ابن عباس کی یہ حدیث جس کو طاؤس نے بیان کیا ہے' ایسی ہی ہے' قوی ترین بات یہ ہے کہ چونکہ یہ طاؤس کا وہم ہے اس لیے صحیح اور ثابت نہیں ہے۔ جمہور فقہاء اسلام نے اس کو منسوخ قرار دے کر بھی جواب دیا ہے اور اس کا ظاہری معنی چھوڑ کر تاویل بھی کی ہے' عنقریب ہم بعض تاویلات کا ذکر کریں گے۔

پیر محمد کرم شاہ صاحب نے اس بحث میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''حضرت ابن عباس کی روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف میں رمل کرتے تھے اور ان کا قول یہ ہے کہ رمل سنت نہیں ہے''۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رمل کے معاملہ میں حضرت ابن عباس کی رائے جمہور کے خلاف ہے اور تین طلاقوں کے مسئلہ میں ان کی روایت دیگر احادیث اور جمہور کے موافق ہے' اور ان کی منفرد رائے کو ترک کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کی جو روایت جمہور کے موافق ہو اس کو بھی ترک کر دیا جائے۔

نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر راوی کا عمل اور فتویٰ اس کی روایت کے خلاف ہو تو غیر مقلدین اور شوافع کا وہی مسلک ہے جو پیر محمد کرم شاہ صاحب نے ''فتح الباری'' کے حوالے سے بیان کیا ہے اور ''نیل الاوطار'' میں بھی مشہور غیر مقلد عالم قاضی شوکانی نے ایسا ہی لکھا ہے[1] اور حق اور صواب احناف اور مالکیہ کا نظریہ ہے' جس کو ہم نے امام طحاوی اور علامہ پرہاروی کے حوالوں سے بیان کیا ہے۔

صحیح مسلم میں درج طاؤس کی روایت کے غلط اور شاذ ہونے پر مزید دلائل

طاؤس کی اس روایت کے وہم اور غلط ہونے پر ایک اور واضح قرینہ یہ ہے کہ خود طاؤس کا فتویٰ بھی اس روایت کے خلاف تھا' طاؤس یہ کہتے تھے کہ اگر غیر مدخولہ کو ایک مجلس میں تین لفظوں کے ساتھ تین طلاقیں دی جائیں تو یہ ایک طلاق ہوگی (کیونکہ وہ پہلی طلاق کے بعد بائنہ ہو جاتی ہے اور بعد کی طلاقوں کا محل نہیں رہتی) طاؤس مدخولہ کی تین طلاقوں کو ایک طلاق نہیں قرار دیتے تھے۔ امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں: لیث بیان کرتے ہیں کہ طاؤس اور عطاء کہتے تھے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو مقاربت سے پہلے تین طلاقیں دے تو وہ ایک طلاق ہوگی۔

(المصنف ج ۵ ص ۲۶' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۴۰۶ھ)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ طاؤس مطلقاً تین طلاقوں کو ایک نہیں کہتے تھے اس لیے طاؤس کی یہ روایت جس کو امام مسلم

1. قاضی محمد بن علی بن محمد شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ' نیل الاوطار ج ۸ ص ۱۴' مطبوعہ مکتبۃ الکلیات الازہریہ' قاہرہ' ۱۳۹۸ھ

نے بیان کیا ہے وہم اور مغالطہ سے خالی نہیں ہے۔

علامہ ماردینی طاؤس کی اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

علامہ ابن عبد البر (صاحب "استذکار") نے کہا ہے کہ طاؤس کی یہ روایت وہم اور غلط ہے۔ علماء میں سے کسی نے اس کو قبول نہیں کیا۔ حضرت ابن عباس سے طاؤس کی یہ روایت اس لیے صحیح نہیں ہے کہ ثقہ راویوں نے حضرت ابن عباس سے اس کے خلاف روایت کیا ہے۔ (الجوہر النقی علی ہامش البیہقی ج ۷ ص ۳۳۸۔ ۳۳۷ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان)

نیز علامہ ابو جعفر بن نحاس "کتاب الناسخ والمنسوخ" میں لکھتے ہیں کہ طاؤس ہر چند کہ نیک شخص ہیں لیکن وہ حضرت ابن عباس سے بہت سی روایات میں منفرد ہیں' اہل علم ان روایات کو قبول نہیں کرتے' ان روایات میں سے ایک روایت وہ بھی ہے جس میں انہوں نے حضرت ابن عباس سے تین طلاقوں کے ایک ہونے کی روایت کی ہے' لیکن حضرت ابن عباس اور حضرت علی سے صحیح روایت یہی ہے کہ تین طلاقیں' تین ہی ہوتی ہیں۔

طاؤس کی روایت کا صحیح محمل

جمہور فقہاء اسلام نے اولاً تو اس حدیث کے فنی سقم کی وجہ سے اس کو قبول نہیں کیا' ثانیاً بر سبیل تنزل اس میں تاویل کی اور کہا کہ دور رسالت اور دور صحابہ میں لوگ تاکید کی نیت سے تین بار طلاق دیتے تھے' بعد میں حضرت عمر کے دور میں لوگوں نے تین طلاق دینے کی نیت سے تین بار طلاق کہنا شروع کر دیا اس لیے حضرت عمر نے ان کی نیات کے اعتبار سے ان تین طلاقوں کو تین طلاقیں ہی قرار دیا۔ ان جوابات سے واضح ہو گیا کہ حضرت عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی امر کو نہیں بدلا بلکہ اسی چیز کو نافذ کیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت ہے' امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت رکانہ کہتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: یا رسول اللہ! میں نے اپنی بیوی کو طلاق البتہ دی ہے۔ آپ نے فرمایا: تم نے طلاق البتہ سے کیا مراد لیا تھا؟ میں نے کہا: ایک طلاق! آپ نے فرمایا: قسم بخدا! میں نے کہا: قسم بخدا! آپ نے فرمایا: پس یہ وہی طلاق ہے جس کا تم نے ارادہ کیا ہے' یعنی ایک[1] اس حدیث کو امام ابوداؤد نے تین اسانید کے ساتھ بیان کیا ہے[2] امام ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے[3] اس حدیث سے ظاہر ہو گیا کہ مجلس واحد میں لفظ واحد سے تین طلاقوں کا ارادہ کیا جائے تو یہ جائز ہے کیونکہ اگر یہ جائز نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت رکانہ سے یہ استفسار نہ کرتے کہ تم نے اس لفظ سے کیا مراد لیا ہے اور ان کی مراد پر قسم طلب نہ فرماتے بلکہ صاف فرما دیتے کہ ایک مجلس میں ایک عبارت سے صرف ایک طلاق ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت رکانہ سے طلاق کی تعداد کا دریافت کرنا اور ان کی مراد پر قسم لینا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مجلس واحد میں لفظ واحد سے تین طلاقیں مؤثر ہو جاتی ہیں' اور حضرت عمر نے جو فیصلہ نافذ کیا وہ اس حدیث کے مطابق تھا اور جمہور فقہاء اسلام کا نظریہ بھی اسی حدیث کے تابع ہے۔

حضرت رکانہ سے متعلق مسند احمد کی روایت کے فنی اسقام

شیخ ابن تیمیہ نے حضرت رکانہ سے متعلق ایک دوسری روایت "مسند احمد" کے حوالے سے ذکر کی ہے جس میں یہ ہے کہ حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک طلاق قرار دیا اور انہیں رجوع

---

1. امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی ص ۱۸۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی
2. امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ' سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۳۰۰' مطبوعہ مطبع مجتبائی' لاہور' ۱۴۰۵ھ
3. امام ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ' سنن ابن ماجہ ص ۱۴۸' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

کرنے کا حکم دیا۔ شیخ ابن تیمیہ نے ''مسند احمد'' کی اس حدیث کو جامع ترمذی' سنن ابن ماجہ' سنن ابوداؤد کی مذکورۃ الصدر روایت پر ترجیح دی ہے' لیکن شیخ ابن تیمیہ کا جامع ترمذی' سنن ابن ماجہ اور سنن ابوداؤد کی روایت پر مسند احمد کو ترجیح دینا عدل و انصاف سے سخت بعید ہے' کیونکہ اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ ''مسند احمد'' میں صرف احادیث صحیحہ کو جمع کرنے کا التزام نہیں کیا گیا' اس میں ضعیف' حسن' صحیح ہر قسم کی احادیث ہیں برخلاف جامع ترمذی' سنن ابن ماجہ اور سنن ابوداؤد کے' کیونکہ یہ ان کتب احادیث میں سے ہیں جن میں احادیث صحیحہ جمع کرنے کا التزام کیا گیا ہے' یہی وجہ ہے کہ جامع ترمذی' سنن ابن ماجہ اور سنن ابوداؤد کو صحاح ستہ میں شمار کیا جاتا ہے اور مسند احمد کو صحاح ستہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ امام ابوداؤد کے علم میں بھی مسند احمد کی یہ روایت تھی جس میں طلاق البتہ کی بجائے تین طلاقوں کا ذکر ہے' لیکن انہوں نے اس روایت کو اپنی کتاب میں درج نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ بیان کی: ''ھذا اصح من حدیث ابن جریج ان رکانۃ طلق امراتہ ثلاثا لانھم اھل بیتہ وھم اعلم بہ۔[1] یہ حدیث ابن جریج کی روایت کی بہ نسبت صحیح ہے جس میں ہے کہ حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں کیونکہ اس حدیث کی روایت حضرت رکانہ کے اہل بیت نے کی ہے اور وہ اپنے گھر کے واقعات کو دوسروں کی نسبت زیادہ جاننے والے تھے''۔ امام ابوداؤد نے اپنی تینوں احادیث یزید بن رکانہ سے روایت کی ہیں' اسی طرح امام ترمذی نے بھی یزید بن رکانہ کی روایت سے حدیث بیان کی ہے' اس کے برخلاف امام احمد نے ''مسند احمد'' میں ابن جریج سے حضرت رکانہ کی روایت بیان کی ہے اور یہ بالکل معقول اور انصاف کی بات ہے کہ حضرت رکانہ کے گھر کا واقعہ وہی درست ہوگا جو ان کے بیٹے نے بیان کیا ہے اور ان کے بیٹے کی روایت کے خلاف اگر کسی غیر متعلق شخص نے کوئی واقعہ بیان کیا ہے تو وہ درست قرار نہیں دیا جائے گا۔

شیخ ابن تیمیہ نے البتہ والی روایت کو مرجوح قرار دینے کے لیے کسی کتاب کا حوالہ دیئے بغیر لکھا ہے: امام احمد بن حنبل' امام بخاری' ابوعبید اور ابومحمد بن حزم نے البتہ والی روایت کو ضعیف قرار دیا اور بیان کیا ہے کہ اس کے راوی مجہول ہیں' ان کی عدالت اور ضبط کا حال معلوم نہیں ہے۔ (مجموع الفتاویٰ ج ۳۳ ص ۱۵' مطبوعہ بامر فہد بن عبد العزیز آل السعود)

امام احمد بن حنبل چونکہ اس روایت کو اپنی کتاب میں درج کرنے والے ہیں اس لیے وہ ایک فریق کی حیثیت رکھتے ہیں لہذا اگر ان کی تضعیف بالفرض ہو بھی تو خارج از بحث ہے اور ابن حزم کا حوالہ دینا' شیخ ابن تیمیہ کی مغالطہ آفرینی ہے۔ شیخ ابن حزم نے ''سنن ابوداؤد'' کی ایک اور روایت کو بعض بنی ابی رافع کی وجہ سے مجہول لکھا ہے جس کا ذکر باحوالہ آگے آرہا ہے۔ رہے امام بخاری تو ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ انہوں نے البتہ والی روایت کی تضعیف کی ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ امام بخاری نے ''مسند احمد'' والی روایت کو مضطرب اور معلل قرار دیا ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے'[2] اور علامہ ابن عبد البر نے اس کو ''تمہید'' میں ضعیف قرار دیا ہے۔

علامہ ابن جوزی ''مسند احمد'' والی حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: یہ حدیث صحیح نہیں ہے' اس کی سند کا ایک راوی ابن اسحاق مجروح ہے اور دوسرا راوی داؤد اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ امام ابن حبان نے کہا ہے کہ اس کی روایات سے اجتناب کرنا واجب ہے اور البتہ والی (صحاح ستہ کی) روایت صحت کے قریب ہے اور ''مسند احمد'' والی روایت میں راویوں کی غلطی ہے۔

(العلل المتناہیہ فی الاحادیث الواہیہ ج ۲ ص ۱۵۱' مطبوعہ ادارۃ العلوم الاثریہ فیصل آباد)

علامہ ابوبکر رازی جصاص نے ''مسند احمد'' کی اس روایت کے بارے میں یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔

---

1. امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ' سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۳۰۱' مطبوعہ مطبع مجتبائی' لاہور' ۱۴۰۵ھ
2. حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ' تلخیص الحبیر ج ۳ ص ۱۲۵۵' نزار مصطفیٰ الباز' مکہ مکرمہ' ۱۴۱۷ھ

(احکام القرآن ج ۱ ص ۳۸۸ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور '۱۴۰۰ھ)

علامہ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ رکانہ کی حدیث منکر ہے اور صحیح روایت وہ ہے جو ابوداؤد ' ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو طلاق البتہ دی تھی ۔ (فتح القدیر ج ۳ ص ۳۳۱ 'مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

حضرت رکانہ سے متعلق صحاح کی روایت کی تقویت

شیخ ابن تیمیہ نے حضرت رکانہ کی البتہ والی روایت پر جرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس حدیث کے راوی مجہول ہیں اور ان کی عدالت اور ضبط کا حال معلوم نہیں ہے ۔ شیخ ابن تیمیہ کی یہ بات بھی عدل و انصاف اور حقیقت اور صداقت سے بہت دور ہے یہ حدیث ترمذی 'ابن ماجہ اور ابوداؤد میں ہے 'اور امام ابوداؤد نے اس کو تین مختلف سندوں کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ اختصار کے پیش نظر ہم صرف امام ترمذی کی سند کے راویوں کی عدالت اور ضبط کا حال بیان کررہے ہیں ۔

امام ترمذی نے اس حدیث کو از ھناد از قبیصہ از جریر بن حازم از زبیر بن سعید از عبداللہ بن علی بن یزید بن رکانہ بیان کیا ہے ۔ سند کے پہلے راوی ھناد ہیں 'ان کے بارے میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں : امام احمد بن حنبل نے کہا : تم ھناد کو لازم رکھو' ابوحاتم نے کہا : وہ بہت سچے ہیں 'قتیبہ نے کہا : میں نے دیکھا کہ وکیع 'ھناد سے زیادہ کسی کی تعظیم نہیں کرتے تھے 'امام نسائی نے کہا کہ وہ ثقہ ہیں 'امام ابن حبان نے بھی ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے ۔

(تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۷۱ 'مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف 'ہند '۱۳۲۵ھ)

اس سند کے دوسرے راوی قبیصہ ہیں 'ان کے بارے میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ حافظ ابوزرعہ سے قبیصہ اور ابونعیم کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا : ان دونوں میں قبیصہ افضل ہیں ۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں : میں نے اپنے والد سے قبیصہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا : وہ بہت سچے ہیں 'اسحاق بن یسار نے کہا : میں نے شیوخ میں سے قبیصہ سے بڑھ کر کوئی حافظ نہیں دیکھا 'امام نسائی نے کہا : ان سے روایت میں کوئی حرج نہیں اور امام ابن حبان نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے ۔

(تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۴۹ ـ ۳۴۸ 'مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف 'ہند '۱۳۲۵ھ)

اس حدیث کے تیسرے راوی ہیں : جریر بن حازم 'ان کے بارے میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں : موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حماد جتنی تعظیم جریر بن حازم کی کرتے تھے کسی اور کی نہیں کرتے تھے 'عثمان دارمی نے ابن معین سے نقل کیا ہے کہ یہ ثقہ ہیں 'دوری کہتے ہیں : میں نے یحییٰ سے پوچھا کہ جریر بن حازم اور ابوالاشہب میں کس کی روایت بہتر ہے ؟ انہوں نے کہا : جریر کی روایت احسن اور اسند ہے ۔ ابوحاتم نے کہا : یہ بہت سچے اور نیک ہیں ۔

(تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۷۰ 'مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف 'ہند '۱۳۲۵ھ)

اس حدیث کے چوتھے راوی زبیر بن سعید ہیں 'ان کے بارے میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں : دوری نے ابن معین سے نقل کیا کہ یہ ثقہ ہیں 'دارقطنی نے کہا : یہ معتبر ہیں 'اور امام ابن حبان نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے ۔

(تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۱۵ 'مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف 'ہند '۱۳۲۵ھ)

اس حدیث کے پانچویں راوی ہیں : عبداللہ بن یزید بن رکانہ 'یہ خود حضرت رکانہ کے اہل بیت سے ہیں 'امام ابن حبان نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے [1] اور حافظ ابن حجر نے اس کو مقرر رکھا ہے [2] ۔

---

[1] حافظ محمد بن حبان تمیمی متوفی ۳۵۴ھ 'کتاب الثقات ج ۷ ص ۱۵ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت '۱۴۰۱ھ

[2] حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ 'تہذیب التہذیب ج ۵ 'ص ۳۲۵ 'مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف 'ہند '۱۳۲۶ھ

حضرت رکانہ سے متعلق "سنن ابوداؤد" کی ایک شاذ روایت کے ضعف کا بیان

پیر محمد کرم شاہ صاحب نے "سنن ابوداؤد" کی اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے کہ جس میں ہے: حضرت عبد یزید ابورکانہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم اپنی بیوی ام رکانہ سے رجوع کرلو۔ انہوں نے کہا: یارسول اللہ! میں نے تو اسے تین طلاقیں دے دی ہیں' آپ نے فرمایا: میں جانتا ہوں' تم اس سے رجوع کرلو۔

(سنن ابوداؤد ج ا ص ۲۹۹۔ ۲۹۸ مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث سے پیر صاحب کا استدلال اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس کی سند میں بعض بنی ابی رافع موجود ہیں' جو مجہول ہیں۔ غیر مقلدین کے بہت بڑے عالم شیخ ابن حزم اس حدیث کی سند پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (شیخ ابن تیمیہ نے "سنن ابوداؤد" کی جس حدیث کے بارے میں ابن حزم کا حوالہ دیا تھا' وہ اصل میں یہ حدیث ہے)

ہمارے علم میں اس حدیث کے سوا ان لوگوں کی اور کوئی دلیل نہیں ہے' اور یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ ابورافع کی اولاد میں سے جس شخص سے یہ روایت ہے اس کا نام نہیں لیا گیا' اور مجہول راوی کی روایت دلیل نہیں ہوسکتی۔

(المحلی ج ۱۰ ص ۱۶۸' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' ۱۳۵۲ھ)

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "مستدرک" کی بعض روایات میں بعض بنی ابی رافع کی تعیین محمد بن عبید اللہ بن ابی رافع سے کردی گئی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی محمد بن عبید اللہ بن ابی رافع کے بارے میں لکھتے ہیں: امام بخاری نے کہا: یہ منکر الحدیث ہے۔ ابن معین نے کہا: یہ "لیس بشئی" ہے' ابوحاتم نے کہا: یہ ضعیف الحدیث' منکر الحدیث اور ذاہب الحدیث ہے۔ ابن عدی نے کہا: یہ کوفہ کے شیعہ میں سے ہے' اور فضائل میں اس نے ایسی روایات بیان کی ہیں جن کا کوئی متابع نہیں ہے' ابن حبان نے اس کا ثقات میں ذکر کیا۔ برقانی نے دارقطنی سے روایت کیا کہ یہ متروک ہے' یاد رہے کہ امام بخاری نے فرمایا ہے: جس شخص کے بارے میں میں یہ کہوں کہ یہ منکر الحدیث ہے اس سے روایت کرنا صحیح نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ملحوظ ذہنی چاہیے کہ امام ابن عدی نے اس کو شیعہ لکھا ہے اور تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دینا شیعہ حضرات کا مسلک ہے۔

(تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۲۱' مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف' ہند' ۱۳۲۶ھ)

اس روایت کی سند اس پائے کی نہیں ہے' جس سے حلال اور حرام کے مسئلہ میں استدلال ہوسکے' خصوصاً جب کہ اس روایت سے وہ چیز حلال ہو رہی ہو جو قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کی صراحت سے حرام ہو چکی ہو اور ائمہ اربعہ اور جمہور مسلمین کا اس کی حرمت پر اتفاق ہو۔

شیخ ابن تیمیہ اور ان کے حامیوں کے پاس تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دینے کے لیے صرف یہ تین روایات تھیں: ایک صحیح مسلم کی روایت جو طاؤس کا وہم اور شاذ روایت ہے' دوسری "مسند احمد" کی روایت جو مضطرب' منکر' معلل اور ضعیف روایت ہے' تیسری "سنن ابوداؤد" کی یہ روایت جو مجہول' منکر اور متروک کی روایت ہے۔

بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کے تین ہونے پر جمہور کے قرآن مجید سے دلائل

اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کا یہ قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ دو طلاقوں کے بعد بھی خاوند کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ان طلاقوں سے رجوع کرلے اور چاہے تو رجوع نہ کرے لیکن:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ (البقرہ: ۲۳۰)

پس اگر اس نے اس کو ایک اور طلاق دے دی تو اب وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہے تاوقتیکہ وہ کسی اور شخص سے

نکاح کرے۔

اس آیت سے پہلے ''الطلاق مرتان '' کا ذکر ہے یعنی طلاق رجعی دو مرتبہ دی جا سکتی ہے' اس کے بعد فان طلقھا فرمایا' اس کے شروع میں حرف ''فا'' ہے جو تعقیب بلا مہلت کے لیے آتا ہے اور اب قواعد عربیہ کے اعتبار سے معنی یہ ہوا کہ دو رجعی طلاقیں دینے کے بعد خاوند نے اگر فوراً تیسری طلاق دے دی تو اب وہ عورت اس مرد کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہے جب تک کہ وہ شرعی قاعدہ کے مطابق کسی اور مرد کے ساتھ نکاح نہ کرے' اس آیت میں اگر حرف ''ثم'' یا اس قسم کا کوئی اور حرف ہوتا جو مہلت اور تاخیر پر دلالت کرتا تو علی التعیین یہ کہا جا سکتا تھا کہ ایک طہر میں ایک طلاق اور دوسرے طہر میں دوسری طلاق اور تیسرے طہر میں تیسری طلاق دی جائے گی' لیکن قرآن مجید میں ''ثم'' کی بجائے ''فا'' کا ذکر کیا گیا ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خاوند نے دو طلاقیں دینے کے بعد فوراً تیسری طلاق دے دی تو اس کی بیوی اس کے لیے حلال نہیں رہے گی۔

قرآن مجید نے ''الطلاق مرتان '' فرمایا ہے' یعنی دو مرتبہ طلاق دی جائے اور دو مرتبہ طلاق دینا اس سے عام ہے کہ ایک مجلس میں دو مرتبہ طلاق دی جائے یا دو طہروں میں دو مرتبہ طلاق دی جائے اور اس کے بعد فوراً اگر تیسری طلاق دے دی تو اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی' اس سے واضح ہو گیا کہ اگر کسی شخص نے ایک مجلس میں تین بار طلاق دی اور بیوی سے کہہ دیا: میں نے تم کو طلاق دی' میں نے تم کو طلاق دی' میں نے تم کو طلاق دی تو یہ تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی۔ غیر مقلدوں کے مشہور' مستند اور ان کے بہت بڑے عالم شیخ ابن حزم اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ آیت بیک وقت دی گئی تین طلاقوں اور الگ الگ دی گئی طلاقوں دونوں پر صادق آتی ہے اور اس آیت کو بغیر کسی نص کے طلاق کی بعض صورتوں کے ساتھ خاص کرنا جائز نہیں ہے۔ (المحلی ج ۱۰ ص ۱۷۰ مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' ۱۳۵۲ھ)

قرآن مجید کی اس آیت سے بھی جمہور فقہاء اسلام کا استدلال ہے:

اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ (الاحزاب: ۴۹)	جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو' پھر ان کو مقاربت سے پہلے طلاق دے دو' تو ان پر تمہارے لیے کوئی عدت نہیں جس کو تم گنو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غیر مدخولہ کو طلاق دینے کا ذکر فرمایا ہے اور طلاق دینے کو اس سے عام رکھا ہے کہ بیک وقت اکٹھی تین طلاقیں دی جائیں یا الگ الگ طلاقیں دی جائیں اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے مطلق اور عام رکھا ہو اس کو اخبار آحاد اور احادیث صحیحہ سے بھی مقید اور خاص نہیں کیا جا سکتا چہ جائیکہ ماوشما کی غیر معصوم آراء اور غیر مستند اقوال سے اس کو مقید کیا جا سکے۔

قرآن مجید سے استدلال پر اعتراض کے جوابات

پیر محمد کرم شاہ الازہری نے اس استدلال کے جواب میں لکھا ہے: دوسری آیت اور سنت نبوی نے ان کے اطلاق کو مقید کر دیا ہے' اور ان کے احکام اور شرائط کو بیان کر دیا ہے' نیز ان آیات میں ایک ساتھ طلاق دینے کی بھی تو کہیں تصریح نہیں۔

(دعوت فکر و نظر مع ایک مجلس کی تین طلاقیں' ص ۲۲۴' مطبوعہ نعمانی کتب خانہ' لاہور' ۱۹۷۹ء)

قرآن مجید کی کسی آیت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ بیک وقت اجتماعی طور پر دی گئی تین طلاقیں ایک ہوں گی جس کو اس آیت کے عموم کی تخصیص پر قرینہ بنایا جا سکے' نہ کسی حدیث صحیح میں یہ تصریح ہے' ہاں! یہ ضروری ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کا موجب ہے اور بدعت اور گناہ ہے اور یہی احناف کا مسلک ہے' اور سنت طریقہ الگ

الگ طہروں میں تین طلاقیں دینا ہے لیکن اس میں گفتگو نہیں ہے' گفتگو اس میں ہے کہ اگر کسی شخص نے خلاف سنت طریقہ سے بیک وقت تین طلاقیں دے دیں تو آیا وہ نافذ ہوں گی یا نہیں! البتہ بکثرت احادیث اور آثار سے یہ ثابت ہے کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقیں نافذ ہو جائیں گی' جیسا کہ عنقریب واضح ہوگا۔ غیر مقلدوں کے امام ثانی ابن حزم اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں عموم ہے اور تین' دو اور ایک طلاق دینے کی اباحت ثابت ہوتی ہے۔

(المحلی ج ۱۰ص ۱۷۹' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر' ۱۳۵۲ھ)

جمہور فقہاء اسلام نے اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے:

لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۔ (البقرہ: ۲۴۱) مطلقہ عورتوں کو رواج کے مطابق متاع (کپڑوں کا جوڑا) دینا چاہیے۔

شیخ ابن حزم اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مطلقہ کو عام رکھا ہے خواہ وہ ایک طلاق سے مطلقہ ہو یا دو سے یا تین سے اور ان میں سے کسی کے ساتھ اس کو خاص نہیں کیا۔ (المحلی ج ۱۰ص ۱۷۱' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر' ۱۳۵۲ھ)

اس آیت میں مطلقہ عورتوں کو متعہ (کپڑوں کا جوڑا) دینے کی ہدایت کی ہے خواہ وہ عورتیں تین طلاقوں سے مطلقہ ہوں یا دو طلاقوں سے مطلقہ ہوں یا ایک سے' اور کسی ایک طلاق کے ساتھ مطلقہ کی تخصیص نہیں فرمائی' یہی چیز شیخ ابن حزم نے بیان کی ہے۔ قرآن مجید میں طلاق کے عموم اور اطلاق کی اور بھی آیات ہیں لیکن ہم بغرض اختصار انہی آیات پر اکتفا کرتے ہیں۔

بیک وقت دی گئی تین طلاقوں پر جمہور فقہاء اسلام کے احادیث سے دلائل

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: یارسول اللہ! یہ بتلایئے کہ ایک شخص اپنی عورت کے ساتھ کسی مرد کو دیکھ لے تو اس کو قتل کر دے یا کیا کرے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں قرآن مجید میں لعان کا مسئلہ ذکر فرمایا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے اور تیری بیوی کے درمیان اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا' حضرت سہل کہتے ہیں کہ ان دونوں نے میرے سامنے مسجد میں لعان کیا' جب وہ لعان سے فارغ ہو گئے تو اس شخص نے کہا: اب اگر میں اس عورت کو اپنے پاس رکھوں تو میں خود جھوٹا ہوں' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے پہلے لعان سے فارغ ہوتے ہی اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لی' آپ نے فرمایا: سب لعان کرنے والوں کے درمیان یہ تفریق ہے۔ ابن شہاب کہتے ہیں: اس کے بعد یہ طریقہ مقرر ہو گیا کہ سب لعان کرنے والوں کے درمیان تفریق کر دی جائے۔

(صحیح البخاری ج ۲ص ۸۰۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ ابن حجر عسقلانی اس حدیث کی شرح میں علامہ نووی کی "شرح مسلم" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

اس نے اس لیے تین طلاقیں دی تھیں کہ اس کا گمان یہ تھا کہ لعان سے اس کی بیوی حرام نہیں ہوئی تو اس نے کہا: اس کو تین طلاقیں ہیں۔ (فتح الباری ج ۹ص ۴۵۱' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور' ۱۴۰۱ھ)

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ صحابہ کرام کے درمیان یہ بات معروف اور مقرر تھی کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے

سے بیوی حرام ہو جاتی ہے' اسی وجہ سے اس شخص نے اپنی بیوی سے تفریق اور تحریم کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کو تین طلاقیں دیں' اگر ایک مجلس میں تین طلاقوں سے ایک طلاق رجعی واقع ہوتی تو اس صحابی کا یہ فعل عبث ہوتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے فرماتے: بیک وقت تین طلاقوں سے تمہاری مفارقت نہیں ہوگی۔

اس سلسلے میں امام بخاری نے یہ حدیث بھی روایت کی ہے:

حضرت سہل کہتے ہیں کہ ان دونوں نے مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لعان کیا درآں حالیکہ میں بھی لوگوں کے ساتھ تھا۔ حضرت عویمر نے کہا: یا رسول اللہ! اب اگر میں نے اس کو اپنے پاس رکھا تو میں جھوٹا ہوں' پھر حضرت عویمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم دینے سے پہلے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔

(صحیح البخاری ج ۲ ص ۸۰۰ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' الطبعۃ الاولی ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے[1] امام نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے[2] اور ابوداؤد میں بھی ہے۔

علامہ نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک نفس لعان سے تفریق ہو جاتی ہے اور محمد بن ابی صفرہ مالکی نے کہا ہے کہ نفس لعان سے تفریق نہیں ہوتی' ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر نفس لعان سے تفریق ہوتی تو حضرت عویمر اس کو تین طلاقیں نہ دیتے' اور شوافع نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں دینا مباح ہے۔

(شرح مسلم ج ۱ ص ۴۸۹ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

بخاری اور مسلم کی اس حدیث سے یہ بات بہر حال واضح ہوگئی کہ صحابہ کرام کے درمیان یہ بات معروف اور متفق علیہ تھی کہ تین طلاقوں سے تفریق اور تحریم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد رجوع جائز نہیں ہے ورنہ حضرت عویمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تفریق کے قصد سے اپنی بیوی کو لفظ واحد سے تین طلاقیں نہ دیتے۔

اس واقعہ میں "سنن ابوداؤد" کی درج ذیل حدیث نے مسئلہ بالکل واضح کر دیا ہے:

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ اس واقعہ میں بیان کرتے ہیں کہ حضرت عویمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین طلاقیں دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان طلاقوں کو نافذ کر دیا۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۳۰۶ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ حضرت عویمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاقوں کو نافذ کر دیا۔ صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن نسائی اور سنن ابوداؤد میں حضرت عویمر رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد کسی انصاف پسند شخص کے لیے اس مسئلہ میں تردد کی گنجائش نہیں رہنی چاہیے کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں۔ والحمد للہ رب العلمین۔

حضرت عویمر کی حدیث سے استدلال پر اعتراض کے جوابات

پیر محمد کرم شاہ الازہری اس حدیث سے جمہور فقہاء اسلام کے استدلال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: جہاں تک اس حدیث کی سند کا تعلق ہے اس کی صحت میں کسی کو کلام نہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے لیکن کیا اس حدیث سے

1. امام ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۸۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ
2. امام عبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ' سنن نسائی ج ۲ ص ۱۸۱ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

استدلال درست ہے تو یہ ذرا تفصیل طلب ہے' خود ابوبکر الجصاص اور شمس الائمہ سرخسی نے فرمایا کہ اس حدیث سے استدلال درست نہیں۔ (دعوت فکر ونظر مع ایک مجلس کی تین طلاقیں ص ۱۲۵ 'مطبوعہ نعمانی کتب خانہ لاہور' ۱۹۷۹ء)

پیر محمد کرم شاہ صاحب کا یہ استدلال سخت حیرت کا باعث ہے۔ جمہور فقہاء اسلام نے اس حدیث سے اس پر استدلال کیا ہے کہ تین طلاقیں اگر بیک وقت دی جائیں تو تینوں واقع ہو جاتی ہیں' علامہ ابوبکر جصاص اور علامہ سرخسی نے اس استدلال کا رد نہیں کیا' بلکہ یہ کہا ہے کہ احناف کے نزدیک بیک وقت تین طلاقیں دینا گناہ ہے اور امام شافعی کہتے ہیں کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا مباح ہے اور اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ اگر بیک وقت تین طلاقیں دینا گناہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ کے تین طلاقیں دینے پر انکار فرماتے اور آپ کا انکار نہ فرمانا بیک وقت تین طلاقوں کے مباح ہونے کی دلیل ہے۔ علامہ ابوبکر الجصاص اور علامہ سرخسی نے ان کے اس استدلال کا رد فرمایا ہے۔ اب ہم پہلے علامہ ابوبکر الجصاص کی اصل عبارت ذکر کرتے ہیں۔

علامہ ابوبکر الجصاص الرازی فرماتے ہیں:

امام شافعی نے فرمایا کہ جب شارع صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاقیں بیک وقت دینے سے منع نہیں فرمایا تو اس سے ثابت ہوا کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا مباح ہے' (علامہ جصاص فرماتے ہیں:) اس حدیث سے امام شافعی کا استدلال کرنا درست نہیں ہے کیونکہ ان کا مذہب یہ ہے کہ عورت کے لعان سے پہلے خاوند کے لعان کرنے سے تفریق ہو جاتی ہے اور عورت اس سے علیحدہ ہو جاتی ہے اور اس کے بعد طلاق لاحق نہیں ہوتی' اور جب طلاق واقع ہوئی نہ اس کا حکم ثابت ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا کیسے انکار فرماتے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ تمہارے یعنی احناف کے مذہب پر اس حدیث کی کیا توجیہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ طلاق دینے کا طریقہ اور وقت مقرر کرنے سے پہلے کا واقعہ ہو اور ایک طہر میں تین طلاقوں کو جمع کرنے کی ممانعت سے پہلے انہوں نے تین طلاقیں دی ہوں۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۳۸۴ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

اس عبارت سے واضح ہو گیا کہ علامہ جصاص کی بحث اس بات میں ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا ممنوع ہے یا مباح ہے' اس میں بحث نہیں ہے کہ تین طلاقیں دینے کے بعد ایک طلاق واقع ہوتی ہے یا تین!

اب ہم آپ کے سامنے علامہ سرخسی کی اصل عبارت پیش کر رہے ہیں' علامہ سرخسی فرماتے ہیں:

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: تین طلاقوں کے جمع کا بدعت ہونا اور ان کو الگ الگ دینے کا سنت ہونا' میں نہیں جانتا' بلکہ سب طرح طلاق دینا مباح ہے اور بسا اوقات کہتے ہیں کہ تین طلاقوں کو جمع کر کے دینا سنت ہے حتیٰ کہ جب کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا: تم کو سنت کے مطابق تین طلاقیں ہیں تو تینوں واقع ہو جائیں گی اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر وہ اکٹھی تین طلاقوں کی نیت کرلے تو تینوں اکٹھی واقع ہو جاتی ہیں کیونکہ الفاظ کے برخلاف نیت کرنا باطل ہے۔ امام شافعی نے حضرت عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ سے حدیث سے استدلال کیا ہے' جب حضرت عویمر نے اپنی بیوی سے لعان کر لیا تو کہا: یا رسول اللہ! میں نے اگر اب اس عورت کو رکھ لیا تو میں جھوٹا قرار پاؤں گا' اس کو تین طلاقیں۔

(المبسوط ج ۶ ص ۴ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' الطبعۃ الثالثۃ ۱۳۹۸ھ)

اس کے بعد علامہ سرخسی نے امام شافعی کے اور بھی دلائل ذکر کیے ہیں اور اخیر میں اس حدیث کا جواب دیتے ہوئے اور احناف کے مسلک پر دلیل قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جب اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رجوع کرنے کا حکم دیا' انہوں نے پوچھا: یہ بتلایئے کہ اگر میں اس کو تین طلاقیں دے دوں تو کیا پھر بھی رجوع کر سکتا ہوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں' تمہاری بیوی تم سے علیحدہ ہو جائے گی اور تین طلاق دینا گناہ ہے (یہی احناف کی دلیل ہے۔ سعیدی غفرلہٗ) ان احادیث سے یہ ظاہر ہو گیا کہ آپ نے حضرت عویمر عجلانی کو تین طلاقیں دینے سے اس وجہ سے نہیں روکا تھا کہ وہ اس وقت سخت غصہ میں تھے اور آپ کو علم تھا کہ اس وقت وہ آپ کی بات نہیں مانیں گے اور اس وجہ سے کافر ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے آپ نے از روئے شفقت انکار کو کسی اور وقت کے لیے مؤخر کر دیا' دوسرا جواب یہ ہے کہ جب آپ نے یہ فرمایا تھا کہ جاؤ تمہارا اس پر کوئی حق نہیں ہے تو یہی آپ کا انکار تھا۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ تین طلاقوں کو بیک وقت دینا اس وقت مکروہ ہے جب وہ بلاضرورت ہوں اور ان کی تلافی اور تدارک ممکن ہو' اور حضرت عویمر عجلانی کے حق میں یہ وجہ متحقق نہیں تھی' کیونکہ جو میاں بیوی آپس میں لعان کرنے پر مصر ہوں ان کی طلاق کا تدارک نہیں ہو سکتا اور حضرت عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ لعان کرنے پر مصر تھے۔ (المبسوط ج ۶ ص ۶۔ ۵ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' الطبعۃ الثالثۃ' ۱۳۹۸ھ)

دیکھئے شمس الائمہ سرخسی کیا فرما رہے ہیں! اور پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری ان کے حوالے سے کیا سمجھا رہے ہیں؟ فیاللاسف

صحیحین کی ایک اور حدیث سے استدلال پر اعتراض کا جواب

امام بخاری "باب من اجاز الطلاق الثلاث. جس نے بیک وقت تین طلاقوں کو جائز قرار دیا" کے باب میں اس حدیث کو روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں' اس عورت نے کہیں اور شادی کر لی' اس نے بھی طلاق دے دی' پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آیا یہ عورت پہلے خاوند پر حلال ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں' جب تک کہ دوسرا خاوند پہلے خاوند کی طرح اس کی مٹھاس نہ چکھ لے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۹۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۶۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۳۷۵ھ)

علامہ عینی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ اس شخص نے اس کو تین طلاقیں مجموعی طور پر (ایک مجلس میں) دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے اس حدیث کو اس باب میں ذکر کیا ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۲۰ ص ۲۳۷ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

علامہ ابن حجر عسقلانی نے بھی حدیث کی باب سے مطابقت بیان کرتے ہوئے یہی لکھا ہے۔

(فتح الباری ج ۹ ص ۳۶۷ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

صحیح بخاری و مسلم کی اس حدیث سے بھی واضح ہو گیا کہ بیک وقت تین طلاقوں کے بعد تحریم ہو جاتی ہے اور رجوع جائز نہیں رہتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیک وقت تین طلاقیں دی جانے کے بعد فرمایا کہ یہ اس شوہر پر حلال نہیں ہے' اور یہ استدلال بالکل واضح ہے کیونکہ بیک وقت تین طلاقوں کے بعد رجوع کا نا جائز ہونا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہے۔ بیک وقت تین طلاقوں کی تحریم میں یہ حدیث بھی بالکل واضح ہے۔

پیر محمد کرم شاہ الازہری اس حدیث سے جمہور کے استدلال کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حدیث میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ تین طلاقیں ایک ساتھ دی گئیں تھیں بلکہ ''طلق ثلاثا'' کا مطلب تو یہ ہے کہ اس نے تین بار طلاقیں دیں' اس لیے اس حدیث سے بھی استدلال درست نہ ہوا۔

(دعوت فکر و نظر مع ایک مجلس کی تین طلاقیں ص ۲۳۶ 'مطبوعہ نعمانی کتب خانہ لاہور' ۱۹۷۹ء)

جمہور فقہاء اسلام کا اس حدیث سے استدلال بالکل درست ہے اور طلق ثلاثا کا یہی معنی ہے کہ اس نے بیک وقت تین طلاقیں دیں۔ پیر صاحب جو کہہ رہے ہیں کہ اس کا مطلب ہے: اس نے تین بار طلاقیں دیں اس کے لیے ''طلق ثلاثا'' کی جگہ ''طلق ثلث مرات'' کا لفظ ہونا چاہیے تھے اور اس سے بھی پیر صاحب کا مدعا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ایک مجلس میں تین لفظوں سے تین بار طلاق دی جائے تو وہ بھی ان کے نزدیک ایک طلاق ہوتی ہے۔ پیر صاحب کا مدعا تب ثابت ہوتا جب حدیث کے الفاظ یوں ہوتے: ''طلق ثلاث تطليقات في ثلاثة اطهار. تین طہروں میں تین طلاقیں دیں'' لیکن بخاری اور مسلم کی روایت میں ہے: ''طلق ثلاثا'' یعنی انہوں نے بیک وقت تین طلاقیں دیں اور اس سے جمہور فقہاء اسلام ہی کا مدعا ثابت ہوتا ہے' لہٰذا اس حدیث سے جمہور کا استدلال بالکل درست ہے۔

سوید بن غفلہ کی روایت کی تحقیق

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

سوید بن غفلہ بیان کرتے ہیں کہ عائشہ خثعمیہ' حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے نکاح میں تھیں' جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو اس نے حضرت حسن سے کہا: آپ کو خلافت مبارک ہو' حضرت حسن نے کہا: تم حضرت علی کی شہادت پر خوشی کا اظہار کر رہی ہو' جاؤ! تم کو تین طلاقیں دیں' اس نے اپنے کپڑے لیے اور بیٹھ گئی' حتیٰ کہ اس کی عدت پوری ہو گئی' حضرت حسن نے اس کی طرف اس کا بقیہ مہر اور دس ہزار کا صدقہ بھیجا' جب اس کے پاس قاصد یہ مال لے کر آیا تو اس نے کہا: مجھے اپنے جدا ہونے والے محبوب سے یہ تھوڑا سا سامان ملا ہے' جب حضرت حسن تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: اگر میں نے اپنے نانا سے یہ حدیث نہ سنی ہوتی یا کہا: اگر میرے والد نے یہ بیان نہ کیا ہوتا کہ انہوں نے میرے نانا سے سنا ہے: جس شخص نے بھی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں خواہ الگ الگ طہروں میں یا بیک وقت تو وہ عورت اس کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہے جب تک کہ وہ کسی اور خاوند سے نکاح نہ کر لے' تو میں اس سے رجوع کر لیتا۔

(السنن الکبریٰ ج ۷ ص ۳۳۶ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

یہ حدیث انتہائی واضح اور صریح ہے کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقوں سے تین طلاقیں ہی واقع ہوتی ہیں۔

امام دار قطنی نے بھی اس حدیث کو سوید بن غفلہ سے دو سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(سنن دار قطنی ج ۴ ص ۳۱۔ ۳۰ 'مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام الہیثمی نے بھی اس حدیث کو طبرانی کے حوالے سے سوید بن غفلہ اور ابو اسحاق سے روایت کیا ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۴ ص ۳۳۹ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت' ۱۴۰۲ھ)

غیر مقلدوں کے عالم شیخ شمس الحق عظیم آبادی' امام دار قطنی کی بیان کردہ اس حدیث کی پہلی سند پر جرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس حدیث کی سند میں عمرو بن قیس رازی ارزق ہے' یہ راوی بہت سچا ہے لیکن اس کے اوہام ہیں' امام ابو داؤد نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں لیکن اس کی حدیث میں خطاء ہے اور اس کی سند میں سلمہ بن فضل قاضی رے ہے۔ ابن راھویہ نے اس کو

ضعیف قرار دیا ہے اور امام بخاری نے کہا: اس کی احادیث میں منکر روایات بھی ہیں ابن معین نے کہا: یہ تشیع کرتا تھا جس نے اس کی احادیث لکھی ہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے' ابو حاتم نے کہا: اس کی احادیث سے استدلال نہیں ہوتا۔ ابو زرعہ نے کہا کہ رے کے لوگ اس کی غلط رائے اور ظلم کی وجہ سے اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔

(التعلیق المغنی علی دارقطنی ج ۴ ص ۳۰ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان)

شیخ عظیم آبادی نے اس حدیث کے دو راویوں کے بارے میں صرف جرح کے اقوال نقل کر دیئے ہیں' حالانکہ ان دونوں کی زیادہ تر تعدیل کی گئی ہے' حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: عمرو بن قیس رازی ازرق سے' امام بخاری نے تعالیق میں روایت کی ہے' امام ترمذی' امام ابوداؤد' امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے ان کی روایات کو ذکر کیا ہے اور ان سے استدلال کیا ہے' رے کے لوگ امام ابوسفیان ثوری کے پاس گئے اور ان سے احادیث سننے کی درخواست کی۔ انہوں نے فرمایا: کیا تمہارے پاس عمرو بن ابی قیس نہیں ہیں؟ امام ابوداؤد نے ایک جگہ کہا کہ ان کی حدیث میں خطاء ہوتی ہے اور دوسری جگہ فرمایا: ان سے روایت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ امام ابن حبان اور ابن شاہین نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے۔ عثمان بن ابی شیبہ نے کہا: ان سے روایت میں کوئی حرج نہیں ہے' ہاں! ان سے حدیث میں کچھ وہم بھی ہے۔ امام بزار نے فرمایا: یہ مستقیم الحدیث ہیں' یعنی ان کی روایت صحیح ہوتی ہے۔ (تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۹۵۔ ۹۴ مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف' ہند)

اس حدیث کی سند کے جس دوسرے راوی پر شیخ عظیم آبادی نے جرح کی ہے' وہ ہیں سلمہ بن فضل قاضی رے (طہران)' حافظ ابن حجر عسقلانی اس کے بارے میں لکھتے ہیں: امام ابن معین ان کو ایک روایت میں ثقہ اور ایک میں '' لیس بہ بـــاس '' کہتے ہیں' ابن سعد ان کو ثقہ اور صدوق کہتے ہیں' محدث ابن عدی فرماتے ہیں: ان کی حدیث میں غرائب و افراد تو ہیں' لیکن میں نے ان کی کوئی حدیث نہیں دیکھی جو حد انکار تک پہنچی ہو' ان کی احادیث متقارب اور قابل برداشت ہیں۔ امام ابن حبان نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے۔ اور لکھتے ہیں: '' یـخـطـی و یخالف '' امام ابوداؤد ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں: میں ان کے بارے میں سوائے خیر کے اور کچھ نہیں جانتا۔

(تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۵۴۔ ۱۵۳ مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف' ہند' ۱۳۲۵ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث کی سند کے دو راویوں عمرو بن ابی قیس رازی اور سلمہ بن فضل قاضی رے (طہران) کے بارے میں جو ائمہ حدیث کی آراء پیش کی ہیں ان میں ان کی زیادہ تر تعدیل کی گئی ہے اور ان کے حفظ اور اتقان کی توثیق' اور حافظ الہیثمی اس حدیث کی سند کے راویوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے' اس کے راویوں میں کچھ ضعف ہے لیکن ان کی توثیق کی گئی ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۴ ص ۳۳۹ مطبوعہ دار الکتاب العربی الطبعۃ الثالثۃ' ۱۴۰۲ھ)

پھر اس حدیث کو طبرانی کی دوسری سند سے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ان دونوں کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور پہلی حدیث کے راوی حدیث صحیح کے راوی ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۴ ص ۳۴۰۔ ۳۳۹ مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حافظ نور الدین الہیثمی کا علم رجال میں بہت اونچا مقام ہے' اور جب انہوں نے یہ تصریح کر دی ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے تو ایک انصاف پسند شخص کو اس کی سند میں تردد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' علاوہ ازیں یہ حدیث متعدد اسانید سے مروی ہے' دو سندوں سے امام دارقطنی نے روایت کیا ہے' دو سندوں سے امام طبرانی نے روایت کیا ہے' امام بیہقی نے لکھا ہے کہ سوید

بن غفلہ سے اس کو عمرو بن شمر اور ابراہیم بن عبد الاعلیٰ نے بھی روایت کیا ہے اس طرح اس حدیث کی سات اسانید کا بیان آ گیا ہے جس سے اس حدیث کو مزید تقویت پہنچتی ہے[1]

سنن نسائی کی روایت سے استدلال پر اعتراض کا جواب

بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کے واقع ہونے کے ثبوت میں یہ حدیث بھی بہت واضح اور صریح ہے:

امام نسائی روایت کرتے ہیں:

محمود بن لبید روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے دیں۔ آپ غصہ سے کھڑے ہو گئے اور فرمایا: میرے سامنے کتاب اللہ کو کھیل بنایا جا رہا ہے؟ حتیٰ کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا: یا رسول اللہ! میں اس کو قتل نہ کر دوں۔ (سنن نسائی ج ۲ ص ۱۸۱ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اگر بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کے نافذ ہونے کا عہد رسالت میں معمول نہ ہوتا اور تین طلاقوں سے ایک طلاق مراد لینے کا معمول ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر ناراض کیوں ہوئے تھے؟ ظاہر ہے کہ ایک طلاق تو سنت ہے اور اگر بیک وقت دی گئی طلاقیں بھی ایک طلاق کے مترادف ہیں تو وہ حکماً سنت قرار پائیں گی اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غضب اور ناراضگی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا بدعت اور گناہ ہے' ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر ناراض نہ ہوتے۔

پیر محمد کرم شاہ الازہری اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: حضور کا ایسے شخص پر ناراض ہونا جس نے تین طلاقیں ایک بار دی تھیں اس امر پر صراحۃً دلالت کرتا ہے کہ ایسا کرنا حکم الٰہی کے سراسر خلاف ہے۔

(دعوت فکر ونظر مع ایک مجلس کی تین طلاقیں ص ۲۳۱ 'مطبوعہ نعمانی کتب خانہ لاہور' ۱۹۷۹ء)

یقیناً خلاف ہے اور یہی احناف کا مذہب ہے' اسی لیے وہ بیک وقت تین طلاقوں کو بدعت اور گناہ کہتے ہیں' لیکن پیر صاحب کا مدعا یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقوں سے ایک طلاق ہوتی ہے اور وہ اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے برخلاف جمہور فقہاء اسلام کا موقف ثابت ہوتا ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دینے سے تین طلاقیں ثابت ہو جاتی ہیں۔

حافظ الہیثمی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی' پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دینے کے بعد رجوع کر سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا: تین طلاقیں دینے کے بعد تمہاری بیوی تم سے علیحدہ ہو جائے گی اور تمہارا بیوی کو تین طلاقیں دینا گناہ ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے' اس میں علی بن سعید ایک راوی ہے۔ دارقطنی نے کہا: وہ قوی نہیں ہے اور دوسروں نے اس کو عظیم قرار دیا اور اس کے باقی تمام راوی ثقہ ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۴ ص ۳۳۶ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حافظ الہیثمی نے اس حدیث کی فنی حیثیت بھی متعین کر دی ہے کہ امام دارقطنی نے اس کے ایک راوی علی بن سعید رازی کی ثقاہت سے اختلاف کیا ہے اور اس حدیث کے باقی تمام راویوں کی ثقاہت پر اتفاق ہے اور صرف امام دارقطنی کے اختلاف سے اس حدیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس حدیث میں یہ بھی تصریح ہے کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقیں واقع

---

[1] پیر محمد کرم شاہ الازہری نے اس حدیث کو بیہقی کی ایک سند کے حوالے سے بیان کیا ہے اور اس سند پر جرح کی ہے جب کہ ہم نے "سنن دارقطنی" کی ایک روایت کی سند کی صحت کو ثابت کیا ہے اور اس کی سند کی جرح کا جواب دیا ہے اور "مجمع الزوائد" سے اس کی توثیق کی ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

ہو جاتی ہیں اور یہ بھی ہے کہ یہ فعل گناہ ہے۔

بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کے واقع ہونے میں آثار صحابہ اور اقوال تابعین

امام عبدالرزاق روایت کرتے ہیں: سالم بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں' وہ واقع ہو جائیں گی اور اس شخص نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔

(المصنف ج ۶ ص ۳۹۵' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۳۹۲ھ)

یہ حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۷۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

مجاہد کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے بیان کیا کہ ان سے ایک شخص نے کہا: اے ابو عباس! میں نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دی ہیں۔ حضرت ابن عباس نے (طنزاً) فرمایا: یا ابا عباس! پھر فرمایا: تم میں سے کوئی شخص حماقت سے طلاق دیتا ہے' پھر کہتا ہے: اے ابو عباس! تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تمہاری بیوی تم سے علیحدہ ہو گئی۔

(المصنف ج ۶ ص ۳۹۷' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۳۹۲ھ)

امام ابوبکر بن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں:

واقع بن سحبان بیان کرتے ہیں کہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دیں؟ حضرت عمران بن حصین نے کہا: اس شخص نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کی بیوی اس پر حرام ہو گئی۔ (المصنف ج ۵ ص ۱۱' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۴۰۶ھ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی ایسا شخص لایا جاتا جس نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دی ہوں تو آپ اس کو مارتے تھے اور ان کے درمیان تفریق کر دیتے تھے۔

(المصنف ج ۵ ص ۱۱' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۴۰۶ھ)

زہری کہتے ہیں کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے دیں اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کی بیوی اس سے علیحدہ ہو گئی۔ (المصنف ج ۵ ص ۱۱' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۴۰۶ھ)

شعبی سے پوچھا گیا: اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے علیحدہ ہونا چاہے؟ اس نے کہا: اس کو تین طلاقیں دے دے۔

(المصنف ج ۵ ص ۱۲' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۴۰۶ھ)

علقمہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دیں؟ آپ نے فرمایا: تین طلاقوں سے اس کی بیوی حرام ہو گئی اور باقی ستانوے طلاقیں حد سے تجاوز ہیں۔

(المصنف ج ۵ ص ۱۲' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۴۰۶ھ)

حبیب کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر ایک شخص کہنے لگا: میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دی ہیں' آپ نے فرمایا: تمہاری بیوی تین طلاقوں سے علیحدہ ہو گئی' باقی طلاقیں اپنی بیویوں میں تقسیم کر دو۔

(المصنف ج ۵ ص ۱۳' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۴۰۶ھ)

معاویہ بن ابی یحییٰ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان کے پاس ایک شخص نے آ کر کہا: میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں؟ آپ نے فرمایا: تین طلاقوں سے تمہاری بیوی تم پر حرام ہو گئی اور باقی ستانوے طلاقیں حد سے تجاوز ہیں۔

(المصنف ج ۵ ص ۱۳' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' الطبعۃ الاولیٰ' ۱۴۰۶ھ)

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دی ہیں۔ آپ نے فرمایا: تین طلاقوں نے اس پر اس کی بیوی کو حرام کر دیا اور ستانوے طلاقیں زائد ہیں۔

(المصنف ج ۵ ص ۱۲۔ ۱۳ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۶ھ)

شعبی کہتے ہیں کہ شریح سے کسی نے پوچھا: میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دی ہیں۔ انہوں نے کہا: تمہاری بیوی تین طلاقوں سے علیحدہ ہو گئی اور باقی طلاقیں اسراف اور معصیت ہیں۔

(المصنف ج ۵ ص ۱۴ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۶ھ)

حسن بصری سے ایک شخص نے کہا: میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں؟ آپ نے فرمایا: تمہاری بیوی تم سے علیحدہ ہو گئی۔ (المصنف ج ۵ ص ۱۴ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۶ھ)

حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے مقاربت سے پہلے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ آپ نے فرمایا: اس کی بیوی اس کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہے جب تک دوسرا شوہر اس سے مقاربت نہ کر لے۔ (المصنف ج ۵ ص ۲۲ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۶ھ)

حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم تینوں یہ فتویٰ دیتے تھے کہ جس شخص نے مقاربت سے پہلے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں تو اس کی بیوی اس پر اس وقت تک حلال نہیں ہے جب تک وہ دوسرے شخص سے نکاح نہ کر لے۔ (المصنف ج ۵ ص ۲۳ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۶ھ)

ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ جب کسی شخص نے مقاربت سے پہلے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں تو وہ اس پر اس وقت تک حلال نہیں ہے جب تک کہ وہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کر لے۔

(المصنف ج ۵ ص ۲۳ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۶ھ)

مذکور الصدر تینوں روایات میں غیر مدخولہ پر جن تین طلاقوں کے واقع کرنے کا حکم کیا گیا ہے اس سے مراد بیک وقت دی گئی لفظ واحد سے تین طلاقیں ہیں کیونکہ اگر الفاظ متعددہ سے تین طلاقیں دی جائیں تو پہلی طلاق سے غیر مدخولہ عورت بائنہ ہو جاتی ہے اور بقیہ طلاقوں کا محل نہیں رہتی اور وہ طلاقیں لغو ہو جاتی ہیں۔ حسب ذیل حدیث سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جب کوئی شخص دخول سے پہلے تین طلاقیں دے تو وہ عورت اس پر اس وقت تک حلال نہیں ہے جب تک کہ دوسرے شخص سے نکاح نہ کر لے اور اگر اس نے متفرق الفاظ سے یہ طلاقیں دی ہیں تو عورت پہلی طلاق سے بائنہ ہو جائے گی۔ (المصنف ج ۵ ص ۲۵ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۶ھ)

ہم نے مذکور الصدر روایات میں حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عمران بن حصین، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ام سلمہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم ایسے گیارہ جلیل القدر فقہاء صحابہ اور امہات المؤمنین کے فتاویٰ اور تصریحات پیش کی ہیں کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقیں تین ہی واقع ہوتی ہیں اور فقہاء تابعین میں سے ابن شہاب زہری، شعبی، شریح، حسن بصری، اور ابراہیم نخعی کے فتاویٰ پیش کیے ہیں، قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کی صراحت کے بعد جمہور فقہاء اسلام کا موقف انہی نفوس قدسیہ کی اتباع پر مبنی ہے۔

حرف آخر

تین طلاقوں کے مسئلہ میں، میں نے اس قدر تفصیل اور تحقیق اس لیے کی ہے کہ آج کل غیر مقلدین کی عام روش یہ ہے کہ

جس شخص نے بھی اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دیں وہ اس کو ایک طلاق قرار دے کر ثبوت میں طاؤس کی روایت لکھ کر دے دیتے ہیں جس کی وجہ سے عام مسلمان شکوک وشبہات میں مبتلا ہوتے ہیں' جب میں نے یہ دیکھا کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کر دیا ہے اس کو بکثرت حلال کیا جا رہا ہے حتیٰ کہ ملک کے عائلی قانون میں بھی تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دے دیا گیا ہے تو میں نے اللہ اور اس کے رسول کی قائم کردہ حدود کے علمی تحفظ اور دفاع کے لیے یہ صفحات لکھ دیئے۔

اے اللہ! اس تحریر کو نفع آور بنا' منکرین کے لیے اس کو ذریعہ ہدایت اور ماننے والوں کے لیے سبب استقامت کر دے' اس کے مصنف' معاون اور پڑھنے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف فرما اور ان کے لیے دارین کی سعادتوں اور کامرانیوں کو مقدر کر دے۔ والحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی محمد خاتم النبیین شفیع المذنبین قائد الغر المحجلین و علی الہ واصحابہ وازواجہ امہات المؤمنین اجمعین۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ

اور جب تم عورتوں کو (رجعی) طلاق دو' پھر وہ اپنی عدت (کی میعاد) کو پہنچیں تو انہیں دستور کے مطابق (اپنے نکاح میں) روک لو

أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا

یا ان کو حسن سلوک کے ساتھ چھوڑ دو' اور ان کو ضرر پہنچانے کے لیے نہ روکے رکھو تاکہ تم ان پر

لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا

زیادتی کرو' اور جس نے ایسا کیا تو بے شک اس نے اپنی جان پر ظلم کیا' اور اللہ کی

تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ

آیتوں کو مذاق نہ بناؤ' اور تم پر جو اللہ کی نعمت ہے (اس کو) یاد کرو

عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ

اور اللہ نے تم پر جو کتاب اور حکمت نازل کی ہے

يَعِظُكُم بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

وہ تم کو اس کی نصیحت کرتا ہے' اور اللہ سے ڈرتے رہو' اور یقین رکھو کہ اللہ ہر چیز کو

عَلِيمٌ ﴿٢٣١﴾ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا

خوب جاننے والا ہے ○ اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو' اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں

تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا

تو انہیں ان کے (انہی پہلے خاوندوں کے) ساتھ نکاح کرنے سے نہ روکو جب وہ دستور کے مطابق

بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ

ایک دوسرے سے راضی ہو جائیں' اس حکم کے ساتھ ہر اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے

يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ

جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو' یہ (حکم) تمہارے لیے زیادہ ستھرا اور پاکیزہ ہے'

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۳۲)

اور اللہ (ہی) جانتا ہے اور تم نہیں جانتے O

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان (عورتوں) کو ضرر پہنچانے کے لیے (اپنے نکاح میں) نہ روکے رکھو تا کہ تم ان پر زیادتی کرو اور جس نے ایسا کیا تو اس نے بے شک اپنی جان پر ظلم کیا۔ (البقرہ: ۲۳۱)

جس عورت کو خاوند خرچ نہ دے اس کی گلو خلاصی میں آراء ائمہ

ائمہ ثلاثہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ کسی شخص کا اپنی منکوحہ کو بہ طور ظلم اور زیادتی کے اپنے نکاح میں روکے رکھنا جائز نہیں ہے' بایں طور کہ اس کو نہ کھانے' پینے' کپڑوں اور رہائش کے اخراجات دے اور نہ اس کو اپنے نکاح کی قید سے آزاد کرے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس صورت کا حکم یہ ہے کہ قاضی ان کا نکاح فسخ کر دے اور عدت کے بعد وہ عورت نکاح ثانی کے لیے آزاد ہے اور فقہاء احناف کے نزدیک اس صورت میں قاضی کو تفریق کا حق نہیں ہے۔ ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں کہ جب خاوند نامرد ہو تو فقہاء احناف کے نزدیک بھی قاضی کو تفریق کا حق ہے' جب کہ خاوند کے مرد ہونے سے عورت کی شہوانی تسکین ہوتی ہے اور کھانے پینے کے خرچ نہ ہونے سے اس کی زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی اس لیے اس صورت میں قاضی تفریق کرنے کا زیادہ مستحق ہے' فقہاء احناف نے اس آیت کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ استدلال اس آیت کے شان نزول کے خلاف ہے' علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

بعض علماء نے اس آیت کو بہ طور ظلم عورت کو نکاح میں روکنے کی ممانعت اور حسن معاشرت کے ساتھ عورت کے ہمراہ رہنے کے حکم پر محمول کیا ہے' لیکن یہ تقریر اس آیت کے شان نزول کے خلاف ہے کیونکہ امام ابن جریر' امام ابن المنذر وغیرہ نے سدی سے روایت کیا ہے کہ ثابت بن یسار انصاری نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور جب اس کی عدت ختم ہونے میں دو یا تین دن رہ گئے تو اس سے رجوع کر لیا اور اس کو پھر طلاق دے دی اور جب دوبارہ اس کی عدت ختم ہونے میں دو یا تین دن رہ گئے تو اس سے پھر رجوع کر لیا اور سہ بارہ اسی طرح کیا حتیٰ کہ اس عورت کی عدت نو ماہ ہو گئی' تب یہ آیت نازل ہوئی کہ اپنی عورتوں کو ضرر پہنچانے کے لیے (عدت میں) نہ روکے رکھو۔ (روح المعانی ج ۲ ص ۱۴۳۔ ۱۴۲ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

علامہ آلوسی کا یہ جواب صحیح نہیں ہے کیونکہ خصوصیت مورد کا لحاظ نہیں ہوتا بلکہ عموم الفاظ کا لحاظ ہوتا ہے اور اس میں کوئی

شک نہیں کہ انسانی ہمدردی، قوت استدلال اور عدل وانصاف اور ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کے لحاظ سے ائمہ ثلاثہ کا مسلک راجح ہے اور علماء احناف کو اس خالص انسانی مسئلہ میں ائمہ ثلاثہ کے مسلک پر فتویٰ دینا چاہیے جب کہ فقہاء احناف نے یہ تصریح کی ہے کہ ضرورت کے وقت مذہب غیر پر فتویٰ دینا جائز ہے۔ میں نے ''شرح صحیح مسلم'' جلد ثالث کے اخیر میں اس مسئلہ پر بہت تفصیل اور تحقیق سے گفتگو کی ہے۔

خرچ سے محروم عورت کی گلو خلاصی پر جمہور فقہاء کے دلائل

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دستور کے مطابق عورتوں کو نکاح میں رکھنے کا حکم دیا ہے اور دستور کے مطابق رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ خاوند اس کو کھانے پینے کا خرچ دے اور اگر یہ نہیں دے سکتا تو پھر اس کو طلاق دے دے اور اگر وہ اس کو پھر بھی طلاق نہیں دیتا تو وہ عورت کو دستور کے مطابق رکھنے کے حکم سے خارج ہو گیا' اب حاکم اس عورت پر طلاق واقع کر دے گا تا کہ شوہر کی طرف سے نفقہ نہ ملنے کی وجہ سے عورت کو ضرر نہ لاحق ہو' کیونکہ بھوک اور پیاس پر کوئی صبر نہیں کر سکتا (اس کے برعکس شہوانی خواہش پوری نہ ہونے پر صبر ہو سکتا ہے)۔ امام مالک' امام شافعی' امام احمد' اسحاق' ابو ثور' ابو عبید' یحییٰ قطان اور عبد الرحمان بن مہدی کا یہی مذہب ہے' صحابہ میں سے حضرت عمر' حضرت علی اور حضرت ابو ہریرہ کا یہی مذہب ہے اور تابعین میں سے سعید بن مسیب کا یہی مذہب ہے اور انہوں نے کہا: یہی سنت ہے اور اس کو حضرت ابو ہریرہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

اس کے برعکس امام ابو حنیفہ' ثوری اور زہری کا یہ قول ہے کہ جب شوہر خرچ نہ دے تو عورت پر صبر لازم ہے اور حاکم کے حکم سے یہ نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيۡسَرَةٍ ؕ — اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو اس کو فراخ دستی تک مہلت دو۔ (البقرہ: ۲۸۰)

(قرض لے کر بیوی کو کھلانا اس وقت متصور ہوگا جب اس کی نیت بیوی کو تنگ کرنا اور ضرر پہنچانا نہ ہو' اور مفروضہ صورت میں شوہر دانستہ بیوی کو خرچ نہیں دیتا) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ وَالصّٰلِحِيۡنَ مِنۡ عِبَادِكُمۡ وَاِمَآئِكُمۡ ؕ اِنۡ يَّكُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ يُغۡنِهِمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ — اور تم اپنے بے نکاح (آزاد) مردوں اور عورتوں کا نکاح کر دو اور اپنے نیک غلاموں اور باندیوں کا نکاح کر دو' اگر وہ فقراء ہیں تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ (النور: ۳۲)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فقراء کا نکاح کرنے کا حکم دیا ہے' اس لیے فقر علیحدگی کا سبب نہیں بن سکتا (کسی شخص کا فقر کی وجہ سے نفقہ دینے پر قادر نہ ہونا اور بات ہے وہ قرض لے کر بھی بیوی کو کھلا سکتا ہے اور کسی شخص کا قدرت کے باوجود عورت کو محض تنگ کرنے کے لیے نفقہ نہ دینا اور چیز ہے اور ہماری بحث اسی میں ہے اور زیر بحث آیت میں بھی عورت کو ضرر پہنچانے کی نیت سے نکاح میں روکے رکھنے سے منع کیا ہے۔ سعیدی غفرلہ)

نیز شوہر اور بیوی کے درمیان اجماعاً نکاح منعقد ہو گیا' اب یہ نکاح اجماع سے منسوخ ہوگا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے جس کا کوئی معارض نہیں ہے۔ ائمہ ثلاثہ کی رائے کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے: امام بخاری حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: افضل صدقہ وہ ہے جس کے بعد خوشحالی ہو' اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے' اپنے عیال سے خرچ کی ابتداء کرو' عورت کہے گی: یا مجھے کھلاؤ یا مجھے طلاق دو' غلام کہے گا: مجھے کھلاؤ

اور مجھ سے کام لو بیٹا کہے گا: مجھے کھلاؤ مجھے کس پر چھوڑتے ہو؟ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۰۶' مسند احمد ج ۲ ص ۵۲۷۔ ۵۲۴۔ ۲۵۲)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ بیوی کو یا خرچ دیا جائے ورنہ اس کو طلاق دے دی جائے اور یہ ائمہ ثلاثہ کے موقف پر قوی دلیل ہے بلکہ اس اختلاف میں بہ منزلہ حکم ہے۔ نفقہ نہ دینے کی وجہ سے قاضی جو تفریق کرے گا وہ امام شافعی کے نزدیک طلاق بائنہ ہے اور امام مالک کے نزدیک طلاق رجعی کے قائم مقام ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۳ ص ۱۵۶۔ ۱۵۵' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ۔ (البقرہ: ۲۳۱)

مذاق میں دی ہوئی طلاق کا نافذ ہونا

حافظ جلال الدین سیوطی بیان کرتے ہیں: امام ابن المنذر اور امام ابن ابی حاتم نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک آدمی کسی شخص سے کہتا: میں نے تم سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا' پھر کہتا: میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا اور کوئی شخص کہتا: میں نے غلام آزاد کر دیا اور پھر کہتا: میں تو مذاق کر رہا تھا' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ ''اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں کہ کوئی شخص ان کو مذاق سے کہے یا بغیر مذاق کے وہ نافذ ہو جائیں گی: طلاق' عتاق اور نکاح۔

امام ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص بغیر ارادہ طلاق کے مذاق سے طلاق دے دیتا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ ''اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق کو لازم کر دیا۔

امام ابوداؤد' امام ترمذی' امام ابن ماجہ' امام حاکم اور امام بیہقی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور مذاق بھی سنجیدگی ہے: نکاح' طلاق اور رجوع کرنا۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۲۸۶' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

احکام شرعیہ کو مذاق بنالینا حرام ہے' اور ان کا مذاق اڑانا کفر ہے' مذاق میں طلاق دینا حرام ہے اور یہ طلاق نافذ ہو جائے گی۔ اسی طرح عمل گناہ کرتے رہنا اور زبان سے توبہ کرتے رہنا بھی احکام شرعیہ کو مذاق بنانا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں ان کے (ان ہی پہلے خاوندوں کے) ساتھ نکاح کرنے سے نہ روکو جب وہ دستور کے مطابق ایک دوسرے سے راضی ہو جائیں۔ (البقرہ: ۲۳۲)

بغیر ولی کے عورت کے کیے ہوئے نکاح کے متعلق مذاہب اربعہ

امام بخاری روایت کرتے ہیں: حسن بیان کرتے ہیں کہ حضرت معقل بن یسار کی بہن کو ان کے خاوند نے طلاق دے دی اور ان کو چھوڑے رکھا حتیٰ کہ ان کی عدت پوری ہو گئی' پھر ان کی بہن کے خاوند نے دوبارہ نکاح کا پیغام دیا تو حضرت معقل نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۶۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ولی کی اجازت کے بغیر عورت کا از خود نکاح کرنا جائز نہیں ہے' وہ اس آیت سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ اگر بغیر ولی کے عورت کا از خود نکاح کرنا جائز ہوتا تو حضرت معقل کی بہن از خود اپنا نکاح اپنے پچھلے خاوند سے کر لیتیں اور ان کے خاوند کو یہ ضرورت نہ پڑتی کہ وہ ان کے بھائی سے رشتہ مانگیں' اور نہ ان کے بھائی کے منع کرنے کی کوئی وجہ ہوتی' اسی لیے امام شافعی نے کہا ہے کہ بغیر ولی کے عورت کے نکاح کے عدم جواز پر یہ آیت قوی دلیل ہے' نیز ائمہ ثلاثہ کی دلیل یہ حدیث ہے:

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس عورت نے اپنے اولیاء کی اجازت کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے' یہ تین بار فرمایا' نیز فرمایا: جس عورت کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۸۴ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ جائز ہے کہ بالغہ عورت اپنا نکاح از خود کر لے' ان کا استدلال بھی اسی آیت سے ہے' وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں نکاح کا اسناد عورتوں کی طرف کیا گیا ہے اور ان کو نکاح سے روکنے سے منع فرمایا ہے اور اس لیے بھی کہ یہ خاص ان کا حق ہے کیونکہ وہی اہل مباشرت ہیں اس لیے ان کا یہ تصرف صحیح ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا یہ جواب دیتے ہیں کہ وہ نابالغہ اور مجنونہ پر محمول ہے۔

بغیر ولی کے عورت کے کیے ہوئے نکاح کے جواز کے متعلق احادیث اور آثار

امام ابوحنیفہ کا استدلال حسب ذیل احادیث سے ہے:

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غیر شادی شدہ لڑکی (خواہ کنواری ہو یا بیوہ) ولی کی بہ نسبت اپنے نکاح کی زیادہ حق دار ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۵۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام بخاری روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غیر شادی شدہ لڑکی کا نکاح اس کے مشورے کے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے' عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! اس کی اجازت کیسے ہوگی؟ فرمایا: اس کی خاموشی۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۷۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت خنساء بنت خذام انصاریہ بیان کرتی ہیں کہ ان کے باپ نے ان کا نکاح کر دیا درآں حالیکہ وہ بیوہ تھیں اور ان کو یہ نکاح ناپسند تھا' وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ نے اس نکاح کو مسترد کر دیا۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۷۱ - ۷۷۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوسلمہ بن عبد الرحمن بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر ایک عورت نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے بیٹے کے چچا (دیور) نے میرے نکاح کا پیغام دیا' اور میرے باپ نے اس نکاح کو مسترد کر دیا اور میرا نکاح وہاں کر دیا جہاں مجھے پسند نہیں تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے والد کو بلایا اور اس سے یہ معاملہ دریافت فرمایا' اس کے باپ نے کہا: میں نے اس کے نکاح میں کسی خیر کو ترک نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ نکاح نہیں ہوا' (اور عورت سے فرمایا:) جاؤ جس سے چاہو نکاح کرلو۔

(المصنف ج ۴ ص ۱۳۶ - ۱۳۷ 'مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ)

قاسم بن محمد کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر کی بیٹی حفصہ کا نکاح منذر بن الزبیر سے کر دیا۔ اس وقت حضرت عبد الرحمن موجود نہیں تھے' جب وہ آئے تو انہوں نے ناراض ہو کر کہا: اے خدا کے بندو! کیا مجھ ایسے شخص کی بیٹی کا نکاح اس کے مشورہ کے بغیر کیا جا سکتا ہے؟ حضرت عائشہ ناراض ہوئیں اور فرمایا: کیا تم منذر کو ناپسند کرتے ہو؟

(المصنف ج ۴ ص ۴ 'مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ولی کے بغیر ایک عورت کے نکاح کو جائز قرار دیا اس عورت کی مرضی سے اس کی ماں نے اس کا نکاح کر دیا تھا۔ (المصنف ج ۳ ص ۱۳۳ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۴۰۶ھ)

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں یہ (حکم) اس کے لیے ہے جو دودھ پلانے کی مدت

اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ

کو پورا کرنا چاہے اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ دستور کے موافق ان (ماؤں) کا کھانا اور

كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا

پہننا ہے کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کیا جائے گا نہ ماں کو

تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى

اس کے بچے کی وجہ سے ضرر دیا جائے اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے ضرر دیا جائے اور

الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ

وارث پر بھی اسی طرح لازم ہے پھر اگر ماں اور باپ باہمی مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر

مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ

کوئی حرج نہیں ہے اور اگر تم دائیوں سے اپنے بچوں کو

تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ

دودھ پلوانا چاہو تو تم پر کوئی حرج نہیں ہے بہ شرطیکہ تم (ان کو) دستور کے مطابق

اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا

اجرت ادا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تمہارے

تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

کاموں کو دیکھنے والا ہے ○

دودھ پلانے کے شرعی احکام

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے طلاق کے احکام بیان کیے جس سے فرقت واقع ہوئی ہے اور اب ان چیزوں کے احکام بیان کیے جو نکاح کے نتیجہ میں واقع ہوتی ہیں' کیونکہ بعض مطلقہ عورتوں کے دودھ پیتے بچے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ماں باپ کے جھگڑوں کی وجہ سے دودھ پیتے بچے ضائع ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات باپ سے انتقام لینے کے لیے ان کو مائیں دودھ نہیں پلاتیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے ماؤں کو یہ نصیحت کی کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلائیں اور یہ کہ باہمی رضامندی سے وہ بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں اور بچوں کے باپ پر یہ لازم کیا کہ وہ اپنی طاقت اور وسعت کے مطابق دودھ پلانے والیوں کو کھانے اور کپڑوں کا خرچ مہیا کریں اور یہ کہ بچوں کی وجہ سے ماں باپ میں سے کوئی فریق دوسرے پر زیادتی نہ کرے' مثلاً ماں بچوں کو پالنے اور پرورش کرنے کی وجہ سے باپ کو ضرر پہنچائے اور کھانے اور کپڑوں کا دستور سے زیادہ خرچ طلب کرے' یا ماں بچوں کو دودھ پلانا چاہتی ہے اور باپ زبردستی بچوں کو ماں سے چھین لے یا اس کو دودھ پلانے پر مجبور کرے یا اس کے خرچ میں قدر معروف سے کمی کرے۔ اس تفسیر کی بناء پر اس آیت میں وہ مطلقہ عورتیں مراد ہیں جن کی ان کے خاوندوں سے اولاد ہو' اور اجنبی دائیوں کی بہ نسبت دودھ پلانے کی وہ زیادہ حق دار ہیں اور بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ اس آیت میں مطلقاً دودھ پلانے والی مائیں مراد ہیں خواہ وہ مطلقہ عورتیں ہوں یا منکوحہ عورتیں ہوں۔

امام مالک کے نزدیک ماں پر دودھ پلانا واجب ہے خواہ وہ منکوحہ ہو یا مطلقہ اور جمہور کے نزدیک ماں پر اس وقت دودھ پلانا واجب ہے جب بچہ کسی اور عورت کا دودھ نہ پیئے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کی مکمل مدت دو سال ہے' کیونکہ اس مدت میں بچہ کو اپنی نشوونما کے لیے دودھ کی حاجت ہوتی ہے' نیز اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ کم از کم دودھ پلانے کی کوئی حد نہیں ہے اور ماں باپ باہمی مشورہ سے جتنے عرصہ تک چاہیں دودھ پلائیں اور اس کے بعد دودھ چھڑا دیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کا خرچ باپ کے ذمہ ہے اور دایہ کی اجرت بھی باپ کے ذمہ ہے اور امام شافعی کے نزدیک بچہ کی ماں کا بھی دودھ پلانے کی اجرت طلب کرنا جائز ہے' خواہ وہ نکاح میں ہو یا عدت میں' اور بچہ کا خرچ بھی باپ کے ذمہ ہے اور اگر باپ زندہ نہ ہو تو باپ کے وارث کے ذمہ بھی یہی احکام ہیں' اس پر لازم ہے کہ وہ دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کا خرچ دے اور دودھ پلانے کی اجرت دے اور دودھ پلانے والی کو ترک نہ کرے۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک یہ آیت محارم کے نفقہ کے وجوب کی اصل ہے' ان کے نزدیک ہر ذورحم محرم پر خرچ واجب ہے مثلاً ماموں اور پھوپھی پر اور امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک بچوں کا خرچ صرف والدین پر واجب ہے' بچہ کا خرچ باپ پر واجب ہے' باپ فوت ہو گیا ہو تو اس کے ترکہ سے خرچ کرنا واجب ہے اور اگر اس کا مال نہ ہو تو پھر ماں پر واجب ہے' قرآن مجید کی اس آیت سے امام ابوحنیفہ اور امام احمد کی رائے کی تائید ہوتی ہے کیونکہ قرآن مجید نے باپ کے بعد وارث پر بچہ کے خرچ کو واجب کیا ہے۔

دودھ پلانے کی مدت میں ائمہ مذاہب کی آراء

علامہ ماوردی شافعی لکھتے ہیں: دو سال کی مدت کی تفسیر میں دو قول ہیں' ایک قول یہ ہے کہ جس عورت کے ہاں چھ ماہ کے بعد بچہ پیدا ہو جائے وہ دو سال دودھ پلائے تاکہ تیس مہینے پورے ہو جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ (الاحقاف: ۱۵) اور حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے۔

یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور عطاء اور ثوری کا قول یہ ہے کہ ہر بچہ کو دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے۔

(النکت والعیون ج ۱ ص ۳۰۰ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت)

قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی نے لکھا ہے کہ دودھ پلانے کی کم از کم مدت کی کوئی حد نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ حد دو سال ہے۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۲۷۳ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۸ھ)

علامہ ابن قدامہ حنبلی نے لکھا ہے کہ دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے' حضرت عمر' حضرت علی' حضرت ابن مسعود' حضرت ابن عباس' حضرت ابوہریرہ' حضرت عائشہ کے علاوہ باقی ازواج مطہرات' امام مالک' امام شافعی' امام ابویوسف' امام محمد' شعبی' اوزاعی اور ابوثور کا یہی مسلک ہے۔ (المغنی ج ۸ ص ۱۴۲ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ المرغینانی الحنفی لکھتے ہیں: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دودھ پلانے کی مدت تیس مہینے ہے اور امام ابویوسف اور امام محمد کے نزدیک دو سال ہے' امام شافعی کا بھی یہی قول ہے اور امام زفر کے نزدیک یہ مدت تین سال ہے' کیونکہ دو سال کے بعد بچے کو دفعۃً دودھ سے غذا کی طرف لانا مشکل ہے۔ اس لیے بعد کے ایک سال میں دودھ کے ساتھ اس کو غذا کا عادی بنایا جائے اور تین سال کے بعد مکمل دودھ چھڑا دیا جائے۔ امام ابویوسف اور امام محمد کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے۔ (الاحقاف: ۱۵) اور کم از کم حمل کی مدت چھ ماہ ہے تو دودھ چھڑانے کے لیے دو سال باقی بچے' امام دارقطنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طفولیت کی دو سال کی عمر کے بعد دودھ پلانے کا محمل نہیں ہے۔ (سنن دارقطنی ج ۴ ص ۱۷۴) اس حدیث کو امام عبدالرزاق اور امام مالک نے بھی روایت کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل یہی آیت ہے اور اس کی توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں ذکر کیں (حمل اور دودھ چھڑانا) اور دونوں کی ایک مدت ذکر فرمائی یعنی تیس مہینے' لہٰذا ان میں سے ہر ایک کی مدت مکمل تیس ماہ ہوگی لیکن ان میں ایک یعنی حمل کی مدت ایک حدیث سے دو سال متعین ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ بچہ ماں کے پیٹ میں دو سال سے زیادہ نہیں باقی رہتا۔ (سنن دارقطنی ج ۳ ص ۳۲۲ 'مطبوعہ ملتان' سنن بیہقی ج ۷ ص ۴۴۳ 'مطبوعہ ملتان)

ان میں سے ایک کی مدت اس حدیث کی بناء پر دو سال رہ گئی تو دوسرے یعنی دودھ چھڑانے کی مدت اپنی اصل پر تیس ماہ رہے گی' نیز دو سال تک بچہ کو دودھ پلانے کے بعد فوراً غذا کی طرف راجع کرنا مشکل ہوگا اس لیے اس کو بقیہ چھ مہینے میں بہ تدریج غذا کا عادی بنایا جائے گا اور اڑھائی سال کے بعد کلی طور پر دودھ چھڑا دیا جائے گا اور سورۂ بقرہ میں جو ارشاد ہے: اور مائیں اپنے بچوں کو مکمل دو سال دودھ پلائیں۔ (البقرہ: ۲۳۳) اور حدیث میں ہے: دو سال کے بعد دودھ پلانا نہیں ہے' اس آیت اور اس حدیث کا محمل یہ ہے کہ دو سال سے زیادہ بچے کو دودھ پلانے کا استحقاق نہیں ہے۔

(ہدایہ اولین ص ۳۵۱۔ ۳۵۰ 'مطبوعہ مکتبہ شرکتہ علمیہ' ملتان)

ہر چند کہ امام اعظم اور صاحبین دونوں کے قول مفتیٰ بہ ہیں لیکن علامہ حصکفی نے امام اعظم کے قول کو ترجیح دی ہے۔

(درمختار علی ھامش الرد ج ۱ ص ۴۰۳ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت)

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں' تو وہ (عورتیں) اپنے آپ

بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا

کو (عقد ثانی سے) چار ماہ دس دن روکے رکھیں' اور جب وہ اپنی عدت پوری کر لیں' تو وہ دستور کے موافق جو

جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ

کام اپنے لیے کریں اس میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے'

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ

اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کی خوب خبر رکھنے والا ہے ○ اور تم پر اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ تم (عدت والی عورتوں کو)

بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ

اشارۃً کنایہ سے نکاح کا پیغام دو' یا تم اپنے دلوں میں چھپاؤ' اللہ کو علم ہے کہ

اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ

(عدت کے بعد) عنقریب تم ان عورتوں کا ذکر کرو گے' لیکن تم (عدت سے پہلے) ان سے کوئی خفیہ وعدہ نہ کرو'

تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۗ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى

البتہ شریعت کے موافق ان سے بات کرو' اور جب تک عدت پوری نہ ہو جائے (ان سے) عقد نکاح

يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

کا عزم نہ کرو' اور یقین رکھو کہ اللہ تمہارے دلوں کی باتوں کو جانتا ہے

فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ ع

سو اس سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا نہایت حلم والا ہے ○

ع ۳۰ ۱۴

عدت وفات کا بیان اور عدت کی تعریف

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مطلقہ عورت کی عدت کا ذکر فرمایا تھا اور اب بیوہ کی عدت کا ذکر فرما رہا ہے۔
وہ مدت جس میں عورت شوہر کے گھر میں بغیر نکاح کے ٹھہری رہے اور بغیر عذر شرعی کے گھر سے باہر نہ نکلے تاکہ اس کے رحم کا استبراء ہو جائے یا شوہر کی موت پر سوگ ہو' مطلقہ کے لیے یہ مدت تین حیض ہے اور بیوہ کے لیے یہ عدت چار ماہ دس دن ہے اور جو عورت حاملہ ہو اس کی عدت وضع حمل ہے خواہ شوہر کی موت کے ایک ساعت بعد وضع حمل ہو جائے' عدت وفات میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا کا کوئی فرق نہیں ہے۔ چار ماہ دس دن تک سوگ کرنا صرف شوہر کی موت کے ساتھ خاص ہے اور

کسی عزیز یا رشتہ دار کی موت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنا جائز نہیں ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

زینب بنت ابی سلمہ بیان کرتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئی' انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو عورت اللہ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کی مرگ پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے' سوائے شوہر کے' اس پر چار ماہ دس دن سوگ کرے' پھر جب حضرت زینب بنت جحش کے بھائی فوت ہو گئے تھے تو میں ان کے پاس گئی' انہوں نے خوشبو منگا کر اپنے جسم پر لگائی اور کہا: مجھے خوشبو لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' البتہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ جو عورت اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائی ہو اس کے لیے کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنا جائز نہیں ہے' البتہ خاوند (کی موت) پر چار ماہ دس دن تک سوگ کرے گی۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۷۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

عدت کے مسائل اور شرعی احکام

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

مسلمان منکوحہ بالغہ عورت جب طلاق ثلاثہ مغلظہ کی عدت گزارے یا عدت وفات گزارے تو انقطاع نکاح پر افسوس کے اظہار کے لیے زینت کو ترک کردے' زیورات اور ریشمی کپڑے نہ پہنے' باریک دندانوں کی کنگھی سے بال نہ سنوارے' خوشبو اور تیل نہ لگائے' سرمہ اور مہندی نہ لگائے' زعفران اور سرخ یا زرد رنگ میں رنگے کپڑے نہ پہنے' ہاں عذر کی وجہ سے ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی اختیار کرسکتی ہے' کالے اور نیلے رنگ کے کپڑے پہن سکتی ہے' کافرہ' صغیرہ' مجنونہ' نکاح فاسد' وطی بالشبہ اور طلاق رجعی کی معتدہ پر سوگ نہیں ہے' دیگر رشتہ داروں کی موت پر صرف تین دن تک سوگ کرنا مباح ہے' خاوند کے لیے جائز ہے کہ عورت کو تین دن سے زیادہ سوگ کرنے پر منع کرے کیونکہ عورت کا مزین ہونا اس کا حق ہے' ہاں اگر خاوند کو اعتراض نہ ہو یا عورت شادی شدہ نہ ہو تو پھر تین دن سے زیادہ بھی سوگ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (علامہ شامی نے کہا ہے کہ علامہ حصکفی کا تین دن سے زیادہ سوگ کی اجازت دینا صحیح نہیں ہے اور یہ حدیث کے خلاف ہے جیسا کہ ابھی ''صحیح بخاری'' کے حوالے سے گزرا ہے۔ سعیدی غفرلہٗ) ہر قسم کی عدت گزارنے والی کو نکاح کا پیغام دینا حرام ہے' البتہ اشارہ کنایہ سے اپنا مدعا ظاہر کرنا جائز ہے مثلاً کہے: مجھے امید ہے کہ ہم اکٹھے رہیں گے' یا آپ بہت خوبصورت ہیں یا نیک ہیں' بہ شرطیکہ وہ عورت عدت وفات گزار رہی ہو اور عدت طلاق میں ایسا کہنا مطلقاً جائز نہیں ہے' کیونکہ اس سے اس کے شوہر کے ساتھ عداوت پیدا ہوگی۔ جو عورت عدت گزار رہی ہو خواہ وہ طلاق رجعی کی عدت ہو یا طلاق بائن کی وہ گھر سے بالکل نہ نکلے' نہ رات کو نہ دن کو' اور اگر حویلی میں دوسرے لوگوں کے گھر ہوں تو اس کے صحن میں بھی نہ جائے خواہ شوہر کی اجازت ہو' کیونکہ یہ اللہ کا حق ہے' اور جو عورت عدت وفات گزار رہی ہو وہ دن اور رات میں گھر سے باہر جاسکتی ہے لیکن رات کا اکثر حصہ اپنے گھر میں گزارے۔ وجہ فرق یہ ہے کہ مطلقہ کے خرچ کا کفیل اس کا خاوند ہے اس لیے اس کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے اور جو عدت وفات گزار رہی ہے' اس کے خرچ کا کوئی کفیل نہیں ہے اس لیے اس کو طلب معاش کے لیے دن اور رات کے وقت میں نکلنا ہوگا' ہاں! اگر اس کے خرچ کی کفالت کا انتظام ہو تو پھر اس کو بھی مطلقہ کی طرح گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے اور وہاں عدت گزارے خواہ عدت طلاق ہو یا عدت وفات' اور اس گھر سے نہ نکلے' ماسوا اس صورت کے کہ اس کو اس گھر سے نکال دیا جائے' یا وہ گھر منہدم ہو جائے یا اس گھر کے انہدام کا خدشہ ہو یا وہاں اس کے مال کے تلف ہونے کا خطرہ ہو' اس کے پاس اس گھر کا

کرایہ نہ ہو اس قسم کی اگر کوئی ناگزیر صورت ہو مثلاً وہ اس گھر میں تنہا ہو اور اس کی جان کو خطرہ ہو' ایسی صورت میں وہ اس گھر کے قریب کسی گھر میں منتقل ہو سکتی ہے اور عدت طلاق میں جہاں اس کا شوہر چاہے' وہاں منتقل ہو جائے' جب عورت عدت طلاق گزار رہی ہو تو اس کے اور شوہر کے درمیان ایک پردہ ضروری ہے اور اگر گھر تنگ ہو یا شوہر فاسق ہو تو پھر اس کا اس گھر سے نکل جانا بہتر ہے۔ (درمختار علی ھامش الردج ۲ ص ۶۲۱ - ۶۱۶ "ملخصاً" مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

عدت کے دوران عورتوں کو جن کاموں سے منع کیا ہے مثلاً بغیر عذر شرعی کے گھر سے باہر نکلنا یا بناؤ سنگھار کرنا' یا کسی سے عقد ثانی کا عہد و پیمان کرنا' اگر عورتیں عدت کے دوران ان میں سے کوئی کام کریں تو اس عورت کے وارثوں اور سرپرستوں پر لازم ہے کہ عورت کو اس سے منع کریں اور اگر وہ منع نہیں کریں گے تو گنہگار ہوں گے اور اگر اس عورت کے اولیاء نہ ہوں تو پھر یہ حکام اور عام مسلمانوں کا فریضہ ہے' کیونکہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور جب وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو وہ دستور کے موافق جو کام اپنے لیے کریں اس میں تم پر کوئی حرج (یا گناہ) نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انہوں نے عدت سے پہلے یہ کام کیے اور تم نے ان کو نہ روکا تو تمہیں گناہ ہوگا۔

اس آیت میں عدت وفات چار ماہ دس دن بیان کی گئی ہے لیکن یہ عدت وفات غیر حاملہ کے ساتھ مخصوص ہے' جو عورت حاملہ ہو اس کی عدت وضع حمل ہے خواہ شوہر کی وفات کے ایک منٹ بعد وضع حمل ہو جائے' قرآن مجید میں ہے:

وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ

اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے۔ (الطلاق: ۴)

اس سے پہلے عدت وفات ایک سال تھی جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے:

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ

اور تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ (مرنے سے پہلے) اپنی بیویوں کے لیے یہ وصیت کر جائیں کہ ان کو گھر سے نکالے بغیر ان کو ایک سال کا خرچ دیا جائے۔ (البقرہ: ۲۴۰)

سورۂ بقرہ کی زیر بحث آیت سے یہ آیت منسوخ ہو گئی اور اب ایک سال کے بجائے چار ماہ دس دن عدت وفات ہے' اس آیت کی تفسیر ان شاء اللہ عنقریب بیان کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب تک عدت پوری نہ ہو جائے (ان سے) عقد نکاح کا عزم نہ کرو۔ (البقرہ: ۲۳۵)

گناہ کے ارتکاب پر مواخذہ ہونے اور گناہ کے ارادہ پر مواخذہ نہ ہونے کی تحقیق

اس آیت میں طلاق یا وفات کی عدت گزارنے والی عورت سے نکاح کرنے کے ارادہ سے بھی منع فرمایا ہے اور دوران عدت اس سے نکاح کا عزم (پکا ارادہ) کرنا حرام ہے اور حرام کا ارتکاب گناہ کبیرہ ہے' اور عزم کرنا دل کا فعل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دل کے افعال پر بھی مواخذہ ہوتا ہے۔ حرام کام کا کرنا بھی گناہ کبیرہ ہے اور اس کا عزم بھی گناہ کبیرہ ہے' عام طور پر مشہور ہے کہ برائی کا ارتکاب گناہ ہے اور اس پر مواخذہ ہوتا ہے لیکن اگر برائی کا صرف عزم کیا جائے اور برائی کا ارتکاب نہ کیا جائے تو مواخذہ نہیں ہوتا' یہ قاعدہ صحیح نہیں ہے' برائی کا عزم بھی گناہ ہے اور اس پر مواخذہ ہوتا ہے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب دو مسلمان تلواروں سے لڑیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ تو قاتل ہے' مقتول کے جہنمی ہونے کی کیا وجہ ہے؟ آپ

نے فرمایا: یہ بھی اپنے حریف کے قتل پر حریص تھا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۹ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ اگر کسی شخص نے قتل نہ کیا ہو بلکہ صرف قتل کا عزم کیا ہو وہ پھر بھی جہنمی ہوگا' اس سے معلوم ہوا کہ فعل حرام کا عزم اور پکا ارادہ بھی حرام اور گناہ کبیرہ ہے اور اس پر استحقاق عذاب ہے' البتہ ''ھم'' پر مواخذہ نہیں ہوتا ''ھم'' اور ''عزم'' میں یہ فرق ہے کہ اگر کوئی شخص راجح اور غالب طور پر کسی کام کو کرنا چاہے اور مرجوح اور مغلوب طور پر کام نہ کرنا چاہے تو یہ ''ھم'' ہے اور جب سو فیصد کسی کام کا پختہ ارادہ ہو تو یہ عزم ہے' اس کی تفصیل یہ ہے کہ دل میں کسی کام کے کرنے کا اچانک خیال آئے تو اس کو ھاجس کہتے ہیں' اور بار بار یہ خیال آئے تو اس کو خاطر کہتے ہیں اور جب ذہن اس کام کو کرنے کا منصوبہ اور پروگرام بنائے تو اس کو حدیث نفس کہتے ہیں' اور جب راجح اور غالب جانب اس کام کے کرنے کی اور مرجوح اور مغلوب جانب اس کا کو نہ کرنے کی ہو مثلاً ۹۹ فیصد کرنا چاہتا ہو اور ایک فیصد نہ کرنا چاہتا ہو تو اس کو ''ھم'' کہتے ہیں اور جب یہ ایک فیصد بھی ختم ہو جائے اور سو فیصد کام کرنا چاہتا ہو تو یہ عزم ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کا کوئی دشمن ہو اور اس کے دل میں اچانک اس کو قتل کرنے کا خیال آئے تو یہ ھاجس ہے' یہ خیال بار بار آئے تو خاطر ہے' اور جب وہ اس کو قتل کرنے کا منصوبہ اور پروگرام بنائے مثلاً فلاں جگہ سے پستول حاصل کرے گا اور فلاں وقت اور فلاں جگہ جا کر اس کو قتل کرے گا تو یہ حدیث نفس ہے' اور جب ۹۹ فیصد اس کو قتل کرنا چاہے لیکن ایک فیصد اس کو قتل نہ کرنا چاہے مبادا پکڑا جائے اور اس کو پھانسی ہو جائے تو یہ ''ھم'' ہے اور جب یہ ایک فیصد نفی بھی زائل ہو جائے اور وہ دشمن کو قتل کرنے کا پختہ ارادہ کرلے خواہ اس کو نتیجہ میں پھانسی ہو جائے تو یہ عزم ہے' اس عزم کے بعد اگر وہ کسی وجہ سے اس کو قتل نہ بھی کرے تب بھی وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب قرار پائے گا اور اس سے مواخذہ ہوگا۔ بہ اعتبار لغت کے ھم اور عزم دونوں کے معنی ارادہ ہیں لیکن اصطلاح شرع میں ''ھم'' وہ ارادہ ہے جس میں جانب مخالف کی بھی کسی درجہ میں گنجائش ہو اور عزم وہ ارادہ ہے جس میں جانب مخالف کی بالکل گنجائش نہ ہو اور حرام فعل کا ارتکاب اور حرام فعل کا عزم دونوں گناہ کبیرہ ہیں جب کہ حرام فعل کا ''ھم'' گناہ نہیں ہے' پچھلی امتوں سے معصیت کے ''ھم'' پر بھی مواخذہ ہوتا تھا اور ہماری امت سے صرف معصیت کے عزم پر مواخذہ ہوتا ہے اور ھاجس' خاطر اور حدیث نفس کے درجہ میں ان سے مواخذہ ہوتا تھا نہ ہم سے مواخذہ ہوتا ہے' نیز نیکی کا اگر ''ھم'' کرلیا جائے (یعنی ارادہ تو ہو لیکن سو فیصد نہ ہو) اور پھر بعد میں وہ نیکی نہ کی جائے تو اس ھم پر اجر و ثواب مل جاتا ہے' لیکن اگر معصیت کا ''ھم'' کیا جائے اور وہ معصیت نہ کی جائے تو گناہ نہیں ہوتا' یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور احسان ہے۔ امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل فرماتا ہے: جب میرا بندہ کسی معصیت کا ''ھم'' مثلاً (۹۹ فیصد) ارادہ کرے تو اس کو نہ لکھو اور جب وہ اس معصیت کا ارتکاب کرے تو اس کی ایک معصیت لکھ دو' اور جب وہ کسی نیکی کا ''ھم'' (مثلاً ۹۹ فیصد ارادہ) کرے اور اس نیکی کو نہ کرے (تو پھر بھی) اس کی ایک نیکی لکھ دو اور جب وہ اس نیکی کو کرلے تو اس کی دس نیکیاں لکھ دو' ایک اور سند سے یہ روایت ہے کہ دس سے سات سو تک نیکیاں لکھ دو۔[1]

اس حدیث کی مکمل تفصیل اور تحقیق ہم نے ''شرح صحیح مسلم'' کی جلد اوّل میں کی ہے۔

---

[1] امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم ج ۱ ص ۷۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ

تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اگر تم عورتوں کو اس وقت طلاق دے دو جب تم نے ان کو ہاتھ نہ لگایا ہو

أَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ

یا تم نے ان کا مہر مقرر نہ کیا ہو اور تم انہیں استعمال کے لیے کوئی چیز دے دو، خوشحال پر اس کے

قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا ۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى

موافق ہے اور تنگ دست پر اس کے لائق، دستور کے مطابق انہیں فائدہ پہنچانا نیکی کرنے

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ

والوں پر (ان کا) حق ہے O اور اگر تم نے عورتوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دی

وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّآ

دراں حالیکہ تم ان کا مہر مقرر کر چکے تھے تو تمہارے مقرر کیے ہوئے مہر کا نصف (ادا کرنا واجب) ہے، البتہ

أَنْ يَّعْفُوْنَ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۗ وَأَنْ

عورتیں کچھ چھوڑ دیں، یا جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ کچھ زیادہ دے دے (تو درست ہے)، اور تمہارا

تَعْفُوْٓا أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۗ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۗ إِنَّ

زیادہ ادا کرنا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، اور تم ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کرنے کو فراموش نہ کرو، بے شک

اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

اللہ تمہارے کیے ہوئے کاموں کو دیکھنے والا ہے O

غیر مدخولہ کے مہر اور متاع کی ادائیگی کا بیان

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے عورت کی عدت کے مفصل احکام بیان فرمائے تھے اور اس کے ضمن میں یہ بھی بیان کیا گیا کہ مردوں کے حقوق عورتوں سے زیادہ ہیں اور عدت طلاق ہو یا عدت وفات اس کے نتیجے میں عورت کے مہر کی ادائیگی مرد پر واجب ہو جاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں مہر کے بعض احکام بیان فرمائے، جس عورت کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی گئی اس کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہے جس کا نکاح کے وقت کوئی مہر مقرر نہیں کیا گیا اور دوسری وہ ہے جس کا نکاح کے وقت مہر مقرر کیا گیا ہو، اول الذکر کو شوہر اپنی حیثیت کے مطابق کچھ استعمال کی چیزیں دے دے اور ثانی الذکر کو نصف

مہر ادا کرنا لازم ہے الا یہ کہ عورت نصف مہر سے کچھ رقم معاف کر دے یا شوہر نصف مہر سے زائد ادا کرے اور شوہر کا نصف مہر سے زائد ادا کرنا مکارم اخلاق کے زیادہ قریب ہے۔ غیر مدخولہ کو استعمال کی کچھ چیزیں یا نصف مہر ادا کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ مباشرت سے پہلے فوراً اس کو طلاق دینے سے اس کے مستقبل پر برا اثر پڑے گا اور اس قدر جلد طلاق ہونے سے چہ میگوئیاں ہوں گی اور اس کے لیے جو نکاح کے مزید پیغام آنے ہیں ان میں کمی ہوگی تو اس کی اشک شوئی اور تلافی کے لیے اس کے واسطے نصف مہر کو لازم کیا گیا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر نکاح سے پہلے مہر کو مقرر نہ کیا جائے تو نکاح پھر بھی صحیح ہے' تاہم اس صورت میں مہر مثل ادا کرنا لازم ہوتا ہے یعنی اس جیسی لڑکی یا اس لڑکی کے خاندان میں جتنے مہر کو مقرر کرنے کا رواج ہو اتنا مہر ادا کیا جائے۔

مطلقہ کی متاع کی مقدار میں ائمہ مذاہب کی آراء

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ مطلقہ کی متاع میں اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک خادم دیا جائے' اس سے کم درجہ یہ ہے کہ چاندی دی جائے اور اس سے کم یہ ہے کہ کپڑے دیئے جائیں۔

شعبی نے کہا: متوسط مطلقہ کی متاع دوپٹہ' قمیص' چادر اور ملحفہ ہے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۳۲۸ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ ماوردی شافعی نے لکھا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک مطلقہ کی متاع حاکم کے اجتہاد پر موقوف ہے۔

(النکت والعیون ج ۱ ص ۳۰۵ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں: امام احمد کے اس میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہ حاکم کے اجتہاد پر موقوف ہے' اور دوسرا قول یہ ہے کہ جتنے کپڑوں کے ساتھ عورت نماز ادا کر سکے وہ مطلقہ کی متاع ہے۔

(زاد المسیر ج ۱ ص ۲۸۰ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں: امام مالک نے کہا ہے کہ ہمارے نزدیک مطلقہ کی متاع کی کوئی معین مقدار نہیں ہے' قلیل متاع کی کوئی حد ہے نہ کثیر کی اور ائمہ کا اس کی حد میں اختلاف ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۳ ص ۲۰۱ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ھ)

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں: جس عورت سے بلا مہر نکاح کیا گیا ہو اور مباشرت سے پہلے اس کو طلاق دے دی گئی ہو اس کو متاع دینا واجب ہے اور یہ قمیص' دوپٹہ اور ملحفہ ہے (سر سے قدم تک اوڑھے جانے والی چادر' علامہ شامی نے لکھا ہے اس کے ساتھ ازار بھی ضروری ہے۔) یہ متاع نصف مہر مثل سے زائد نہیں ہونی چاہیے' خواہ زوج خوشحال ہو' اور نہ پانچ درہم سے کم ہو' تنگ دستی اور خوشحالی میں عورت کے حال کا اعتبار کیا جائے گا' اس کے سوا باقی مطلقہ عورتوں کے لیے متاع مستحب ہے' البتہ جس عورت کا مہر مقرر کیا گیا ہو اور اس کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی گئی اس کے لیے متاع کو دینا مستحب نہیں ہے۔ مطلقات کی چار قسمیں ہیں: مطلقہ کا مہر پہلے مقرر کیا گیا تھا یا نہیں اور ہر تقدیر پر مباشرت سے پہلے طلاق دی گئی یا مباشرت کے بعد' سو جس کا مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا اور اس کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی گئی اس کو متاع دینا واجب ہے اور باقی قسموں کی مطلقات کو متاع دینا مستحب ہے' علامہ حصکفی نے لکھا ہے کہ جس مطلقہ کا مہر مقرر کیا گیا ہو اور اس کو وطی سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو اس کو متاع دینا مستحب نہیں ہے' لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ مبسوط' محیط' کنز اور ملتقی وغیرہا میں لکھا ہے کہ اس کو بھی متاع دینا مستحب ہے اور یہی صحیح ہے۔

(درمختار علی ھامش الردج ۲ ص ۲۳۶ ـ ۲۳۵ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

مطلقہ کی متاع کے شرعی حکم کے متعلق ائمہ مذاہب کی آراء

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں: مطلقہ کی متاع کے شرعی حکم میں صحابہ کرام 'فقہاء تابعین اور ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے۔ حضرت علی 'حسن بصری 'ابو العالیہ اور زہری کا مذہب یہ ہے کہ ہر مطلقہ کے لیے متاع واجب ہے' حضرت ابن عمر 'قاسم بن محمد' شریح اور ابراہیم کا یہ نظریہ ہے کہ جس مطلقہ کا مہر مقرر کیا گیا ہو اور مباشرت سے پہلے اس کو طلاق دے دی گئی ہو اس کے سوا ہر مطلقہ کے لیے متاع واجب ہے' اور اس مطلقہ کے لیے نصف مہر واجب ہے' امام اوزاعی' ثوری' امام ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ جس عورت کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو اور اس کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو اس کے لیے متاع واجب ہے' اور اگر اس کے ساتھ مباشرت کی گئی ہو تو پھر اس کو متاع نہیں دی جائے گی۔ امام مالک' لیث بن سعد' حکم اور ابن ابی لیلیٰ کے نزدیک متاع مستحب ہے اور کسی عورت کے لیے واجب نہیں ہے خواہ اس عورت کا مہر مقرر کیا گیا ہو یا نہیں اور اس کے ساتھ مباشرت کی گئی ہو یا نہیں۔ (زاد المسیر ج ۱ ص ۲۸۰ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ ماوردی شافعی نے لکھا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک جس عورت کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو اور اس کو دخول سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو اس کو متاع دینا واجب ہے۔ (النکت والعیون ج ۱ ص ۳۰۶ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

قاضی ابو بکر ابن العربی مالکی لکھتے ہیں:

ہمارے علماء کے نزدیک مطلقہ کی متاع واجب نہیں ہے' اولاً اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے متاع کی مقدار بیان نہیں فرمائی بلکہ اس کو دینے والے کے اجتہاد پر مطلق فرمایا' ثانیاً اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ○" (البقرہ: ۲۳۶) یہ محسنین پر واجب ہے' "اگر مطلقہ کی متاع واجب ہوتی تو مطلقاً تمام مسلمانوں پر واجب ہوتی۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۲۸۰ 'مطبوعہ دار المعرفتہ' بیروت' ۱۴۰۸ھ)

متاع کے وجوب پر فقہاء احناف کے دلائل

علامہ ابو بکر رازی جصاص حنفی لکھتے ہیں: امام ابو حنیفہ' امام ابو یوسف' امام محمد اور امام زفر کے نزدیک جس عورت کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو اور اس کو دخول سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو اس کو متاع دینا واجب ہے' وجوب کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فمتعوھن. ان کو متاع دو"۔ یہ امر کا صیغہ ہے اور امر وجوب کا تقاضا کرتا ہے الا یہ کہ اس کے خلاف استحباب پر کوئی دلیل قائم ہو اور وہ یہاں نہیں ہے' نیز فرمایا: "وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ. (البقرہ: ۲۴۱) دستور کے مطابق متاع مطلقات کی ملکیت ہے" کیونکہ لام تملیک کے لیے ہے اور جو چیز کسی کی ملکیت اور اس کا حق ہو اس کا ادا کرنا واجب ہوتا ہے اور تیسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "حقا علی المحسنین" اور "حقا علی المتقین" یہ وجوب کی تاکید ہے۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۴۲۸ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور' ۱۴۰۰ھ)

متاع کے وجوب کے خلاف فقہاء مالکیہ کے دلائل کے جوابات

علامہ ابن عربی مالکی نے جو یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر متاع واجب ہوتی تو ہر مسلمان پر واجب ہوتی صرف متقین اور محسنین پر واجب نہ ہوتی' اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وجوب کی تاکید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ متاع محسنین اور متقین پر حق ہے' اور حق سے زیادہ اور کوئی وجوب کے لیے مؤکد نہیں ہے' جس طرح "ھدی للمتقین" سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن مجید تمام مسلمانوں کے لیے ہدایت نہ ہو اسی طرح "حقاً علی المتقین" سے یہ لازم نہیں آتا کہ مطلقہ کی متاع ہر مسلمان پر

واجب نہ ہو' نیز اس کا معنی ہے: جو تقویٰ اور احسان کی طرف رجوع کرنے والا ہو اور ہر مسلمان تقویٰ اور احسان کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔ باقی یہ جو کہا ہے کہ اگر متاع واجب ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کی مقدار کا بیان فرماتا' اس کا جواب یہ ہے کہ مال و دولت کے لحاظ سے لوگوں کے احوال مختلف ہوتے ہیں' اس لیے تمام مسلمانوں کے لیے ایک مقدار معین نہیں کی جا سکتی' اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: خوشحال پر (یہ متاع) اس کے (حال کے) موافق ہے اور تنگ دست پر اس کے لائق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: البتہ عورتیں کچھ چھوڑ دیں یا جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ کچھ زیادہ دے دے (تو درست ہے)۔ (البقرہ: ۲۳۷)

نکاح کی گرہ کا مالک شوہر ہے یا عورت کا ولی؟

اس میں اختلاف ہے کہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اس سے مراد شوہر ہے یا عوت کا ولی' اگر اس سے مراد شوہر ہو تو اس آیت کا وہ معنی ہوگا جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے اور اگر اس سے مراد عورت کا ولی ہو تو معنی یہ ہوگا: البتہ عورتیں (نصف مہر سے) کچھ معاف کر دیں یا جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے یعنی ولی وہ کچھ معاف کر دے۔ امام ابوحنیفہ' امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اس سے مراد شوہر ہے اور امام مالک کے نزدیک اس سے مراد عورت کا ولی ہے۔

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں: جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اس سے ولی کے مراد ہونے پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: البتہ عورتیں (نصف مہر سے) کچھ معاف کر دیں' اور یہ بات معلوم ہے کہ ہر عورت اپنے مہر کو معاف نہیں کر سکتی' کیونکہ صغیرہ اور مجنونہ اپنے حقوق میں خود تصرف نہیں کر سکتی' اس کے حق میں اس کا ولی تصرف کرتا ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے ذکر کے بعد اس کے ولی کا ذکر فرمایا' یعنی جس کو وہ معاف کر سکتی ہیں وہ معاف کر دیں اور جس کو وہ معاف نہیں کر سکتیں اس کو ان کا ولی معاف کر دے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۳ ص ۲۰۷' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران)

علامہ قرطبی کی یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ ولی یعنی لڑکی کے باپ کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ لڑکی کے مال سے کسی کو کوئی چیز ہبہ کرے' خود کو نہ کسی اور کو' نیز جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ صرف شوہر ہے' اسی کو اختیار ہے کہ وہ نکاح پر برقرار رہ کر نکاح کی گرہ کو قائم رکھے یا طلاق دے کر نکاح کی گرہ کو کھول دے اور لڑکی کے ولی کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ مطلق نہیں ہے' حقیقۃً نہ مجازاً' علامہ ابوبکر جصاص حنفی نے اسی طرح لکھا ہے۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۴۴۰' مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور' ۱۴۰۰ھ)

شوہر کے حق میں عقد نکاح کی ملکیت پر جمہور کے دلائل

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں: جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اس کے مصداق کے متعلق تین قول ہیں:

(۱) حضرت علی' حضرت ابن عباس' حضرت جبیر بن مطعم' ابن المسیب' ابن جبیر' مجاہد' شریح' جابر بن زید' ضحاک' محمد بن کعب القرظی' الربیع بن انس' ابن شبرمہ' امام شافعی' امام احمد' امام ابوحنیفہ اور دیگر فقہاء رضی اللہ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ اس سے مراد شوہر ہے۔

(۲) حضرت ابن عباس' حسن' علقمہ' طاؤس' شعبی' ابراہیم اور دیگر حضرات کا یہ نظریہ ہے کہ اس سے مراد ولی ہے۔

(۳) عورتوں کا معاف کرنا شادی شدہ عورتوں پر محمول ہے اور اگر لڑکی کنواری ہو تو پھر اس کا ولی معاف کرے گا' یہ بھی حضرت ابن عباس اور ابوالشعثاء سے منقول ہے۔

ان تینوں اقوال میں پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ نکاح کے بعد نکاح کی گرہ ولی کے ہاتھ سے نکل کر خاوند کے ہاتھ میں آ گئی' اور معاف کرنے کا تعلق اس چیز کے ساتھ ہے جو انسان کی ملکیت میں ہو' اور مہر ولی کی ملکیت میں نہیں ہے تو وہ اس کو

معاف کرنے کا بھی مالک نہیں ہے' نیز اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور تم ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کرنے میں (ہبہ کرنے) کو فراموش نہ کرو اور انسان اپنے مال سے کسی کو کوئی چیز ہبہ کر سکتا ہے' دوسرے کے مال سے کوئی چیز ہبہ نہیں کر سکتا' لہٰذا سیاق وسباق کے اعتبار سے یہاں شوہر کو مراد لینا ہی صحیح ہے۔ (زاد المسیر ج ۱ ص ۲۸۱' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

شوہر کے حق میں عقد نکاح کی ملکیت کے متعلق احادیث

حافظ جلال الدین سیوطی نے اس آیت میں شوہر کے مراد ہونے پر متعدد روایات بیان کی ہیں' بعض ازاں یہ ہیں:

امام ابن جریر' امام ابن ابی حاتم' امام طبرانی اور امام بیہقی نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ شوہر ہے۔

امام ابن ابی شیبہ' امام عبد بن حمید' امام ابن جریر' امام ابن ابی حاتم' امام دار قطنی اور امام بیہقی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ شوہر ہے۔

امام ابن ابی شیبہ' امام ابن المنذر' امام ابن جریر اور امام بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ شوہر ہے۔

امام ابن ابی شیبہ نے سعید بن جبیر' مجاہد' ضحاک' شریح' ابن المسیب' شعبی' نافع اور محمد بن کعب سے روایت کیا ہے کہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ شوہر ہے۔

امام عبد الرزاق نے ابن المسیب سے روایت کیا ہے کہ زوج کا عفو یہ ہے کہ وہ پورا مہر دے' اور بیوی کا عفو یہ ہے کہ وہ نصف مہر معاف کر دے۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۲۹۲' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ

تمام نمازوں کی پابندی کرو اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی' اور اللہ کے سامنے ادب سے

قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ

قیام کرو ○ پس اگر تم حالت خوف میں ہو تو پیدل چلتے ہوئے یا سواری پر (نماز پڑھ لو)' پھر جب خوف جاتا رہے تو پھر

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِيْنَ

اسی طرح اللہ کا ذکر کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے جس کو تم نہیں جانتے تھے ○ اور تم میں سے جو لوگ

يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ

مر جائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں' وہ اپنی بیویوں کے لیے وصیت

مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ

کر جائیں کہ انہیں ایک سال تک خرچ دیا جائے اور (گھر سے) نکالا نہ جائے' پھر اگر وہ خود نکل جائیں

عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ

تو تم پر (ان کے) اس کام کا کوئی گناہ نہیں ہے جو انہوں نے دستور کے مطابق کیا ہے اور اللہ

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا

بہت غالب بڑی حکمت والا ہے O اور مطلقہ عورتوں کے لیے دستور کے مطابق متاع ہے جو اللہ

عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ

سے ڈرنے والوں پر واجب ہے O اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کو بیان فرماتا ہے

تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع

تاکہ تم سمجھو O

۳۱ ع ۱۵

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا تھا کہ بیاز وجہ نصف مہر سے کچھ مقدار معاف کر دے یا شوہر اس کو پورا مہر ادا کر دے اور فرمایا تھا کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ احسان اور نیکی کرنے کو فراموش نہ کرو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے نمازوں پر پابندی اور مداومت کرنے کا حکم دیا' کیونکہ نماز انسان کو بے حیائی اور برائی کے کاموں سے روکتی ہے اور اس کو نیکی اور اچھائی کے کاموں پر برانگیختہ کرتی ہے اور قدر واجب سے زیادہ دینا بھی اچھائی کا کام ہے' نیز پہلی آیت میں مخلوق پر شفقت کا حکم تھا اور اس آیت میں اللہ کی تعظیم کا حکم ہے' تا کہ انسان حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی رعایت کرے' نیز اس آیت سے بھی اللہ تعالیٰ نے اہل وعیال کے احکام بیان کیے اور اس آیت کے بعد پھر عائلی احکام بیان فرمائے اور درمیان میں پابندی اور دوام کے ساتھ نماز پڑھنے کا ذکر فرمایا اور اس میں یہ تنبیہ ہے کہ بیوی بچوں کے ساتھ تعلق' محبت اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں اس قدر مشغول نہ ہو جانا کہ اپنے مولیٰ کے حقوق کی ادائیگی کو بھول جاؤ اور امور خانہ داری اور دنیا داری میں اس قدر منہمک نہ ہو جاؤ کہ نمازوں کے اوقات میں بھی بیوی بچوں کے گورکھ دھندوں میں پڑے رہو اور یادِ خدا کو بالکل فراموش کر بیٹھو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ (المنافقون: ۹)

اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں' اور جنہوں نے ایسا کیا تو وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں O

نماز کی حفاظت کا معنی یہ ہے کہ نماز کو اس کے مستحب وقت میں پڑھا جائے اور یہ کوشش کی جائے کہ نماز میں کسی قسم کا سہو اور نقصان واقع نہ ہو۔

حفاظت نماز کی تاکیدات اور نماز میں سستی اور اس کو ترک کرنے پر وعیدات

حافظ جلال الدین سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام بخاری' امام مسلم اور امام نسائی حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ

وسلم کے پاس آ کر عرض کیا: مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جو مجھے جنت کے قریب اور دوزخ سے دور کردے آپ نے فرمایا: اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ شریک نہ کرو نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو اور رشتہ داروں سے نیک سلوک کرو جب وہ شخص چلا گیا تو آپ نے فرمایا: اگر اس شخص نے اس پر عمل کیا تو جنت میں داخل ہو جائے گا۔

امام ابو یعلیٰ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے دین کی جس چیز کو سب سے پہلے لوگوں پر فرض کیا وہ نماز ہے اور جو چیز سب سے آخر میں باقی رہے گی وہ نماز ہے اور سب سے پہلے جس چیز کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے بندوں کی نمازوں کو دیکھو اگر وہ مکمل ہوں تو مکمل لکھ دی جائیں گی' اور اگر وہ ناقص ہوں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: دیکھو کیا اس کے نوافل ہیں؟ اگر اس کے نوافل ہوں گے تو فرائض کی کمی نوافل سے پوری کر دی جائے گی' پھر فرمائے گا: دیکھو اس کی زکوۃ پوری ہے؟ اگر زکوۃ پوری ہو تو پوری لکھ دی جائے گی اور اگر ناقص ہو تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: دیکھو اس نے کوئی صدقہ کیا ہے؟ اگر اس نے صدقہ کیا ہوگا تو اس صدقہ سے اس کی زکوۃ پوری کر دی جائے گی۔

امام طبرانی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن جس چیز کا سب سے پہلے بندے سے حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے اگر نماز درست ہو تو باقی عمل بھی درست ہوں گے اور اگر نماز فاسد ہو تو باقی عمل بھی فاسد ہوں گے۔

امام طبرانی' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص امانت دار نہ ہو اس کا کوئی ایمان نہیں' جس کا وضو نہ ہو اس کی کوئی نماز نہیں اور جس کی نماز نہ ہو اس کا کوئی دین نہیں' دین میں نماز ایسی ہے جیسے جسم میں سر ہے۔

امام بزار' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کی نماز نہ ہو اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔

امام طبرانی' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن جو شخص پانچ نمازیں لے کر آیا جن کے وضو' ان کے اوقات اور ان کے رکوع اور سجود کی اس نے حفاظت کی ہوئی ہو' اس شخص کے ساتھ اللہ کا عہد ہے کہ وہ اس کو عذاب نہیں دے گا' اور جس نے ان میں سے کسی چیز میں کمی کی اس کے ساتھ اللہ کا کوئی عہد نہیں ہے' اگر اللہ چاہے تو اس پر رحم فرمائے اور چاہے تو اس کو عذاب دے۔

امام طبرانی' حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے تین چیزوں کی حفاظت کی وہ یقیناً (اللہ کا) ولی ہے اور جس نے ان کو ضائع کیا وہ یقیناً (اللہ کا) دشمن ہے: نماز' روزہ اور جنابت۔

امام طبرانی' حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اپنے وقت میں نماز پڑھی اور اس کے لیے مکمل وضو کیا اور نماز کے قیام' خشوع' رکوع اور سجود کو پوری طرح ادا کیا تو وہ نماز سفید اور روشن ہوگی اور اس شخص سے کہے گی: اللہ تیری بھی اسی طرح حفاظت کرے جس طرح تو نے میری حفاظت کی ہے' اور جس نے وقت نکلنے کے بعد نماز پڑھی' اس کے لیے مکمل وضو نہیں کیا اور نہ اس کے خشوع' رکوع اور سجود کو پوری طرح ادا کیا وہ نماز سیاہ اندھیری ہوگی اور کہے گی: اللہ تجھے بھی اسی طرح ضائع کرے جس طرح تو نے مجھے ضائع کیا ہے حتیٰ کہ جب اللہ چاہے گا اس نماز کو پرانے کپڑے میں لپیٹ کر اس شخص کے منہ پر مار دے گا۔

امام احمد' امام طبرانی اور امام ابن مردویہ' حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن ہم ظہر کی نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ ہم نے کہا: نہیں! آپ نے فرمایا: تمہارا رب یہ فرماتا ہے کہ جس شخص نے نماز اپنے وقت میں پڑھی' اس کی حفاظت کی اور اس کے حق کو معمولی سمجھ کر ضائع نہیں کیا اس کے ساتھ میرا یہ عہد ہے کہ میں اس کو جنت میں داخل کروں گا' اور جس شخص نے نماز اپنے وقت میں نہیں پڑھی' اس کی حفاظت نہیں کی' اور اس کے حق کو معمولی جان کر ضائع کیا' اس کے ساتھ میرا کوئی عہد نہیں ہے' اگر میں چاہوں تو اس کو عذاب دوں اور اگر میں چاہوں تو اس کو معاف کر دوں۔

امام دارمی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کی چابی نماز ہے۔

امام دیلمی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نماز دین کا ستون ہے۔

امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کون سی چیز دین میں سب سے زیادہ محبوب ہے؟ آپ نے فرمایا: نماز کو اپنے وقت میں پڑھنا' جس شخص نے نماز کو ترک کیا اس کا کوئی دین نہیں' نماز دین کا ستون ہے۔

امام ابن ماجہ' امام ابن حبان' امام حاکم تصحیح سند کے ساتھ اور امام بیہقی اپنی سنن میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مستقیم رہو اور تم ہرگز نہ رہ سکو گے اور جان لو کہ تمہارا بہترین عمل نماز ہے اور مومن کے سوا اور کوئی شخص ہمیشہ باوضو ہرگز نہ رہ سکے گا۔

امام مسلم' امام ابوداؤد' امام نسائی اور امام ابن ماجہ' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: جس شخص کو اس سے خوشی ہو کہ وہ کل اللہ سے حالت اسلام میں ملاقات کرے' اسے چاہیے کہ جب ان نمازوں کی اذان ہو تو وہ ان کی حفاظت کرے۔ امام ابوداؤد کی روایت یہ ہے کہ جب اذان ہو تو پانچوں نمازوں کی حفاظت کرو' کیونکہ جماعت سنن الھدیٰ میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے سنن الھدیٰ کو مشروع کیا ہے' اور ہمارے عہد میں منافق کے سوا اور کوئی جماعت کو نہیں چھوڑتا تھا' اور ہم نے دیکھا ہے کہ ایک آدمی دو آدمیوں کے سہارے سے چل کر صف میں جا کر کھڑا ہوتا تھا' اور ہر شخص کے لیے اس کے گھر میں نماز کی جگہ ہوتی ہے اور اگر تم نے اپنے گھروں میں نماز پڑھی اور اپنی مسجدوں کو چھوڑ دیا تو تم اپنے نبی کی سنت کو ترک کرو گے اور اگر تم نے اپنے نبی کی سنت کو ترک کیا تو تم کافر ہو جاؤ گے۔

اس حدیث کی توجیہ یہ ہے کہ جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بہ طور استخفاف یا بہ طور اہانت ترک کیا وہ کافر ہو جائے گا' یا کفر بہ معنی کفرانِ نعمت ہے۔

امام ترمذی' امام نسائی' امام ابن ماجہ اور امام حاکم تصحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن بندہ کے عمل سے جس چیز کا سب سے پہلے حساب لیا جائے گا وہ اس کی نماز ہے' اگر وہ صحیح ہوئی تو وہ کامیاب اور کامران ہو گیا اور اگر وہ فاسد ہوئی تو وہ ناکام اور نامراد ہو گیا اور اگر اس کے فریضہ میں کچھ کمی ہوئی تو رب فرمائے گا' دیکھو میرے بندہ کا کوئی نفل ہے' جس سے اس کا فرض پورا کیا جائے' پھر باقی اعمال کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا۔

امام احمد اور امام طبرانی نے حضرت ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص لوگوں کی ایک

جماعت کے پاس سے گزرا اور ان کو سلام کیا' لوگوں نے اس کے سلام کا جواب دیا' جب وہ گزر گیا تو ان میں سے ایک شخص نے کہا: بہ خدا! میں اس شخص سے اللہ کے لیے بغض رکھتا ہوں' لوگوں نے کہا: تم نے بہت بری بات کی ہے' اے فلاں شخص! جاؤ اس کو بلا کر لاؤ' وہ شخص اس کو بلا کر لے آیا' اور اس کو بتایا کہ اس کے متعلق کیا کہا گیا ہے' وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گیا اور کہا: یا رسول اللہ! میں مسلمانوں کی ایک مجلس کے پاس سے گزرا' میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا' جب میں چلا گیا تو ایک شخص نے میرے متعلق کہا: میں اللہ کے لیے اس شخص سے بغض رکھتا ہوں۔ یا رسول اللہ! اس شخص کو بلائیے اور اس سے بغض کی وجہ معلوم کیجئے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو بلایا تو اس نے اعتراف کیا کہ اس نے یہ کہا تھا' اس نے کہا: یہ شخص میرا پڑوسی ہے' بہ خدا! میں نے اس کو فرض نماز کے سوا اور کوئی نماز پڑھتے نہیں دیکھا جس کو ہر نیک اور بد پڑھتا ہے' اس نے کہا: یا رسول اللہ! اس سے پوچھئے کبھی میں نے نماز کو وقت سے مؤخر کر کے پڑھا یا اس کے وضو میں کوئی کمی کی' یا رکوع اور سجود میں کوئی کوتاہی کی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا: نہیں' پھر اس نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے اس شخص کو رمضان کے سوا اور کوئی روزہ رکھتے نہیں دیکھا جس مہینہ میں ہر نیک و بد روزہ رکھتا ہے' اس نے کہا: یا رسول اللہ! اس سے پوچھئے میں نے کبھی روزہ کے حق میں کوئی کوتاہی یا کمی کی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا: نہیں' پھر اس نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے زکوٰۃ کے سوا اس کو کبھی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہوئے نہیں دیکھا اور زکوٰۃ تو ہر نیک و بد ادا کرتا ہے' اس نے کہا: یا رسول اللہ! اس سے پوچھئے میں نے کبھی زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی یا کمی کی؟ اس نے کہا: نہیں' آپ نے فرمایا: اٹھو! یہ تم سے بہتر ہے۔

امام طبرانی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' ان سے پوچھا گیا: اسلام کا کون سا درجہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: نماز اور جس نے نماز نہیں پڑھی اس کا کوئی دین نہیں۔

امام ابن ابی شیبہ' امام احمد' امام ابوداؤد' امام ترمذی' امام مسلم' امام نسائی اور امام ابن ماجہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان اور اس کے کفر کے درمیان نماز کا ترک کرنا ہے۔

امام ابن ابی شیبہ' امام احمد' امام ابوداؤد' امام ترمذی' امام نسائی' امام ابن ماجہ' امام ابن حبان' اور امام حاکم' حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارے اور ان کے درمیان نماز کا عہد ہے' جس نے نماز کو ترک کیا اس نے کفر کیا۔

امام طبرانی نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میرے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سات چیزوں کی نصیحت کی' فرمایا: اللہ کے ساتھ بالکل شرک نہ کرو' خواہ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں' یا تم کو جلا دیا جائے یا تم کو سولی پر چڑھا دیا جائے' اور نماز کو عمداً ترک نہ کرو کیونکہ جس نے عمداً نماز کو ترک کیا وہ ملت اسلام سے نکل گیا' اور معصیت کا ارتکاب نہ کرو' کیونکہ اس میں اللہ کی ناراضگی ہے اور شراب نہ پیو کیونکہ یہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

امام ترمذی اور امام حاکم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نماز کے سوا اور کسی چیز کے ترک کو کفر نہیں کہتے تھے۔

امام طبرانی' حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کفر اور ایمان کے درمیان نماز ہے' جس نے نماز کو ترک کیا اس نے شرک کیا۔

امام بزار اور امام طبرانی' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جب ان کی آنکھوں میں تکلیف ہو گئی

تو ان سے کہا گیا کہ ہم آپ کا علاج کرتے ہیں' آپ چند دن نماز چھوڑ دیں' حضرت ابن عباس نے فرمایا: نہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے نماز چھوڑ دی وہ اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ اس پر غضب ناک ہوگا۔

امام ابن حبان حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بارش کے دن جلدی نماز پڑھ لو کیونکہ جس نے نماز کو ترک کیا اس نے کفر کیا۔

امام اصبہانی' حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے عمداً نماز کو ترک کیا اللہ اس کے عمل کو ضائع کر دیتا ہے اور اس کا ذمہ اللہ سے بَری ہو جاتا ہے حتیٰ کہ وہ اللہ سے توبہ کرلے۔

امام ابن ابی شیبہ نے ''مصنف'' میں اور امام بخاری نے اپنی ''تاریخ'' میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جس نے نماز نہیں پڑھی وہ کافر ہے اور ایک روایت ہے: اس نے کفر کیا۔

امام مالک نے نافع سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب نے اپنے عمال کی طرف لکھا کہ میرے نزدیک تمہارے کاموں میں سب سے اہم کام نماز ہے۔ جس نے نماز کی حفاظت کی اس نے اپنے دین کی حفاظت کی اور جس نے نماز کو ضائع کیا وہ باقی دین کو زیادہ ضائع کرنے والا ہے۔

امام ترمذی اور امام حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے بغیر عذر کے دو نمازوں کو جمع کیا اس نے گناہ کبیرہ کیا۔

امام نسائی اور امام ابن حبان نے حضرت نوفل بن معاویہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کی ایک نماز فوت ہوگئی گویا اس کے اہل اور مال ہلاک ہو گئے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۱۹۸۔ ۱۹۴ ملتقطا' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

صلوٰۃ وسطیٰ کے متعلق فقہاء اسلام کی آراء

علامہ آلوسی حنفی بیان کرتے ہیں: صلوٰۃ وسطیٰ (درمیانی نماز) کی تعیین میں متعدد اقوال ہیں:

(۱) اس سے مراد ظہر کی نماز ہے کیونکہ یہ دن کے وسط میں پڑھی جاتی ہے' امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔

(۲) اس سے مراد عصر کی نماز ہے' کیونکہ یہ دن کی دو نمازوں اور رات کی دو نمازوں کے درمیان پڑھی جاتی ہے' حضرت علی' حضرت ابن عباس' حسن اور متعدد صحابہ اور فقہاء کا یہی نظریہ ہے' امام شافعی کا بھی یہی مسلک ہے۔

(۳) اس سے مراد مغرب کی نماز ہے' کیونکہ یہ چار رکعت اور دو رکعت کی نمازوں کے درمیان متوسط ہے' حضرت قبیصہ بن ذویب کا یہی نظریہ ہے۔

(۴) اس سے مراد عشاء کی نماز ہے' کیونکہ یہ مغرب اور فجر کی نمازوں کے درمیان ہے جن میں قصر نہیں ہے۔

(۵) اس سے مراد فجر کی نماز ہے' کیونکہ یہ دن اور رات کی نمازوں کے درمیان ہے' نیز یہ وہ منفرد نماز ہے جو دوسری نماز کے ساتھ ملا کر نہیں پڑھی جاتی۔ حضرت معاذ' حضرت جابر' عطاء' عکرمہ اور مجاہد کا یہی قول ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وتر ہے' ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد چاشت کی نماز ہے' ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد عید الفطر ہے' ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد عید الاضحیٰ ہے' ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد تہجد ہے' ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد نماز جمعہ ہے' ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد جماعت کے ساتھ نماز ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد صلوٰۃ خوف ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی اقوال ہیں۔ (روح المعانی ج ۲ ص ۱۵۶' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

زیادہ تر احادیث میں عصر کی نماز کو صلوٰۃ وسطیٰ کہا گیا ہے اور ظہر اور فجر کی نماز کے متعلق بھی احادیث ہیں' ہم اختصار کے ساتھ ان احادیث کا بیان کریں گے۔ فنقول وباللہ التوفیق وبہ الاستعانۃ یلیق.

فجر کی نماز کے صلوٰۃ وسطیٰ ہونے کے متعلق احادیث

حافظ جلال الدین سیوطی بیان کرتے ہیں: امام مالک نے ''موطا'' میں لکھا ہے کہ ہمیں حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یہ حدیث پہنچی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ صلوٰۃ وسطیٰ صبح کی نماز ہے' اس حدیث کو امام بیہقی نے بھی اپنی ''سنن'' میں روایت کیا ہے۔

امام ابن جریر نے ابو العالیہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے بصرہ کی جامع مسجد میں صبح کی نماز پڑھائی اور رکوع سے پہلے دعائے قنوت پڑھی اور فرمایا: یہ وہ صلوٰۃ وسطیٰ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے۔

امام سعید بن منصور نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: صلوٰۃ وسطیٰ صبح کی نماز ہے جس کو اندھیرے میں پڑھا جاتا ہے۔

امام ابن جریر نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ صبح کی نماز ہے۔

امام ابن ابی شیبہ نے حبان ازدی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر نے فرمایا: صلوٰۃ وسطیٰ صبح کی نماز ہے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۳۰۱' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

ظہر کی نماز کے صلوٰۃ وسطیٰ ہونے کے متعلق احادیث

امام طبرانی نے ''معجم اوسط'' میں ثقہ راویوں کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ صلوٰۃ وسطیٰ کون سی نماز ہے تو انہوں نے کہا: ہم یہ کہتے تھے کہ صلوٰۃ وسطیٰ وہ نماز ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کی طرف متوجہ کیا گیا اور وہ ظہر کی نماز ہے۔

امام احمد' امام بخاری نے اپنی ''تاریخ'' میں' امام ابوداؤد' امام ابن جریر' امام طحاوی' امام ابویعلیٰ' امام طبرانی اور امام بیہقی نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز دوپہر میں پڑھتے تھے اور یہ نماز آپ کے اصحاب پر سب سے زیادہ دشوار تھی' تب یہ آیت نازل ہوئی: ''حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى'' (البقرہ: ۲۳۸) نیز اس نماز سے پہلے بھی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد بھی دو نمازیں ہیں۔

امام طیالسی' امام ابن ابی شیبہ نے ''مصنف'' میں' امام بخاری نے اپنی ''تاریخ'' میں' امام ابن ابی حاتم' امام ابویعلیٰ اور امام بیہقی نے زہرہ بن معبد سے روایت کیا ہے کہ ہم حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو لوگوں نے حضرت اسامہ کے پاس کسی کو بھیجا اور ان سے صلوٰۃ وسطیٰ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: یہ ظہر کی نماز ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کے وقت پڑھتے تھے۔

امام نسائی اور امام طبرانی نے زہری کی سند سے روایت کیا ہے کہ سعید بن مسیب نے کہا: میں لوگوں کے پاس بیٹھا تھا' وہ اس میں بحث کر رہے تھے کہ صلوٰۃ وسطیٰ کون سی نماز ہے؟ میں ان میں سب سے کم سن تھا۔ انہوں نے مجھے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تاکہ میں ان سے معلوم کروں کہ صلوٰۃ وسطیٰ کون سی نماز ہے؟ میں نے ان کے پاس جا کر پوچھا تو انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ظہر کی نماز دوپہر میں پڑھاتے تھے' لوگ اس وقت گھروں میں سوئے ہوئے ہوتے تھے اور بازاروں میں ہوتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک صف یا دو صفیں ہوتی تھیں' تو یہ آیت نازل

ہوئی: '' حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ '' (البقرہ: ۲۳۸) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ باز آجائیں ورنہ میں ان کے گھروں میں آگ لگا دوں گا۔

امام ابن جریر نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صلوٰۃ وسطٰی ظہر کی نماز ہے۔

امام بیہقی اور امام ابن عساکر نے حضرت سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے سنا کہ صلوٰۃ وسطٰی ظہر کی نماز ہے' پھر وہاں سے حضرت ابن عمر کا گزر ہوا تو لوگوں نے حضرت ابن عمر سے معلوم کیا' انہوں نے کہا: صلوٰۃ وسطٰی ظہر کی نماز ہے۔

امام ابن جریر نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے اور امام ابن ابی شیبہ نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ صلوٰۃ وسطٰی ظہر کی نماز ہے۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۳۰۲۔ ۳۰۱ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

عصر کی نماز کے صلوٰۃ وسطٰی ہونے کے متعلق احادیث

امام عبدالرزاق' امام ابن ابی شیبہ' امام احمد' امام بخاری' امام مسلم' امام ابوداؤد' امام ترمذی' امام نسائی' امام ابن ماجہ' امام ابن جریر اور امام بیہقی' زر سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے کہا: عبیدہ سے کہو کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نماز وسطٰی کے متعلق سوال کریں' انہوں نے سوال کیا تو حضرت علی نے جواب دیا: ہم یہ خیال کرتے تھے کہ صلوٰۃ وسطٰی فجر کی نماز ہے حتیٰ کہ میں نے جنگ خندق کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ان کے ساتھ (جنگ میں) مشغول رہنے کی وجہ سے ہم صلوٰۃ وسطٰی صلوٰۃ العصر نہیں پڑھ سکے' اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو اور ان کے پیٹوں کو آگ سے بھر دے۔

امام عبدالرزاق' امام ابن ابی شیبہ' امام مسلم' امام نسائی اور امام بیہقی شُتیر بن شکل سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے کہا: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صلوٰۃ وسطٰی کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا: ہمارا خیال یہ تھا کہ یہ صبح کی نماز ہے حتیٰ کہ میں نے جنگ خندق کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے کیونکہ انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطٰی پڑھنے سے مشغول کر دیا حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غروب آفتاب تک ظہر اور عصر کی نماز نہیں پڑھی تھی۔

امام ابن ابی شیبہ' امام ترمذی اور امام ابن حبان نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صلوٰۃ وسطٰی نماز عصر ہے۔

امام ابن جریر' امام ابن المنذر اور امام طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خندق کے دن فرمایا: انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطٰی پڑھنے سے مشغول کر دیا حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا' اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو اور ان کے پیٹوں کو آگ سے بھر دے۔

امام طبرانی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطٰی صلوٰۃ عصر پڑھنے سے محروم کر دیا' اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں کو اور ان کے دلوں کو آگ سے بھر دے۔

امام احمد' امام ابن جریر اور امام طبرانی نے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ '' (البقرہ: ۲۳۸) اور ہمارے لیے صلوٰۃ وسطٰی کا نام صلوٰۃ عصر رکھا۔

امام عبدالرزاق نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس

شخص کی عصر کی نماز فوت ہوگئی گویا اس کے اہل اور مال ہلاک ہوگئے۔

امام ابن ابی شیبہ ربیع بن خیثم سے روایت کرتے ہیں: ان سے کسی شخص نے صلوٰۃ وسطیٰ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: تمام نمازوں کی حفاظت کرو صلوٰۃ وسطیٰ انہیں میں سے کوئی ایک ہے۔

(الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۰۵۔ ۳۰۲ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ کے سامنے ادب سے قیام کرو O (البقرہ: ۲۳۸)

باتیں نہ کرنے اور خضوع اور خشوع سے نماز پڑھنے کا حکم

امام بخاری' امام مسلم' امام ابو داؤد' امام ترمذی' امام نسائی' امام ابن جریر' امام ابن خزیمہ' امام طحاوی' امام ابن حبان' امام طبرانی اور امام بیہقی' حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نماز میں باتیں کیا کرتے تھے' ہم میں سے ایک شخص اپنے ساتھ نماز میں کھڑے ہوئے شخص سے باتیں کرتا تھا' حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: ''وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ'' (البقرہ: ۲۳۸) پھر ہمیں نماز میں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور باتیں کرنے سے منع کر دیا گیا۔

امام عبد الرزاق' امام ابن المنذر اور امام ابن جریر نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ پہلے مسلمان نماز میں باتیں کرتے تھے' ایک شخص نماز میں اپنے بھائی کو کسی کام کا حکم دیتا تھا' پھر یہ آیت نازل ہوئی: ''وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ'' (البقرہ: ۲۳۸) پھر ان کو کلام سے روک دیا گیا' قنوت کا معنی سکوت ہے اور قنوت کا معنی طاعت ہے۔

امام ابن جریر نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نماز میں باتیں کیا کرتے تھے' ایک شخص نماز میں اپنے ساتھی سے سرگوشی کرتا' ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے اور جواب دیتے' حتیٰ کہ میں ایک دن نماز میں شامل ہوا اور میں نے سلام کیا تو میرے سلام کا کسی نے جواب نہیں دیا' مجھے اس سے بہت رنج ہوا' جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پوری کر لی تو آپ نے فرمایا: مجھے تمہارے سلام کا جواب دینے سے اور کوئی چیز مانع نہیں تھی سوا اس کے کہ ہمیں نماز میں خاموش کھڑے رہنے اور باتیں نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور قنوت سکوت ہے۔

امام سعید بن منصور' امام ابن جریر' امام اصبہانی اور امام بیہقی نے اس آیت کی تفسیر میں مجاہد سے روایت کیا ہے کہ رکوع' خشوع اور لمبا رکوع بھی قنوت کا معنی ہے' یعنی طویل قیام کرنا' نظر نیچے رکھنا' بازو جھکائے رکھنا اور اللہ سے ڈرتے رہنا' اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے فقہاء جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو ادھر ادھر التفات کرنے' کنکریاں ہٹانے' آنکھیں بند کرنے' کسی چیز کے ساتھ کھیلنے یا دنیاوی کاموں کے متعلق غور وفکر کرنے سے اللہ سے ڈرتے تھے۔

امام ابن ابی شیبہ' امام مسلم' امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: افضل نماز وہ ہے جس میں طویل قنوت (قیام) ہو۔

امام بخاری' امام مسلم' امام ابو داؤد' امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتے تھے اور آپ ہمیں جواب دیتے تھے۔ جب ہم نجاشی کے پاس سے واپس آئے' ہم نے آپ کو سلام کیا' آپ نے ہمیں جواب نہ دیا' ہم نے (نماز کے بعد) عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم آپ کو سلام کرتے تھے اور آپ جواب دیتے تھے؟ آپ نے فرمایا: نماز میں مشغولیت ہے۔

(الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۰۶ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس اگر تم حالت خوف میں ہو تو پیدل چلتے ہوئے یا سواری پر (نماز پڑھ لو) پھر جب خوف جاتا رہے تو پھر اسی طرح اللہ کا ذکر کرو (نماز پڑھو) جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے۔ (البقرہ: ۲۳۹)

چلتی ٹرین اور طیارہ وغیرہ میں نماز پڑھنے کا بیان

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے پانچوں نمازوں کی حفاظت کا اور ان کو خاموشی اور خضوع اور خشوع کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا تھا اور انسان کو زندگی میں بعض مرتبہ نماز کے اوقات میں خوف اور خطرہ لاحق ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس حالت میں نماز کا حکم اور اس کا طریقہ بیان فرمایا کہ اگر تم کو نماز کے وقت میں خوف اور خطرہ لاحق ہو تو پیدل چلتے ہوئے نماز پڑھو' یا سواری پر سوار ہونے کی حالت میں نماز پڑھو' اس خوف سے مراد عام ہے' خواہ دشمن کا خوف ہو یا درندے کا خوف ہو یا سیلاب کا خوف ہو' پس ہر وہ امر جس سے اس کی جان کا خوف ہو اس کی وجہ سے پاپیادہ یا سواری پر نماز پڑھنا جائز ہے' اسی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ چلتی ٹرین' بحری جہاز یا ہوائی جہاز میں دورانِ سفر نماز کا وقت آ جائے اور پورے وقت میں وہ سواری چلتی رہے اور اس چلتی سواری سے چھلانگ لگا کر اترنے میں جان جانے کا خطرہ ہو تو اس چلتی ہوئی سواری پر نماز پڑھنا جائز ہے اور اس نماز کا اعادہ نہیں ہے' اس کے مزید دلائل اور فقہاء کی عبارات ہم نے ''شرح صحیح مسلم'' جلد ثانی میں بیان کیے ہیں۔

حالت خوف میں نماز پڑھنے کے متعلق ائمہ کی آراء

امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک اس آیت کا تعلق جنگ اور قتال سے بھی ہے یعنی اگر دوران قتال شدید خطرہ اور خوف ہو تو پاپیادہ اور سواری پر بھی نماز پڑھنا جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جہاد اور قتال میں صلوٰۃ خوف پڑھی جائے اور اگر جنگ کی شدت کی وجہ سے صلوٰۃ خوف نہ پڑھی جا سکے تو نماز مؤخر کر دی جائے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خندق کے دن چار نمازیں مؤخر کر دی تھیں اور قتال کے علاوہ اور کسی صورت میں دشمن کا خوف ہو تو پاپیادہ یا سواری پر نماز پڑھ لی جائے۔

ملا احمد جیون حنفی لکھتے ہیں: حالت خوف میں نماز پڑھتے وقت ضرورت کی بناء پر قبلہ سے توجہ ساقط ہو جاتی ہے' یعنی اگر تم کو دشمن سے خوف ہو یا درندہ کا خوف ہو یا کسی اور چیز کا خوف ہو تو تم پر قیام فرض نہیں ہے بلکہ تم کو اس کا اختیار ہے کہ تم پیدل چلتے ہوئے نماز پڑھو یا سواری پر نماز پڑھو اور جس طرف سواری کا منہ ہو اسی طرف اشاروں سے نماز پڑھو' اسی طرح ''مدارک'' میں ہے' اور صاحب ''ہدایہ'' نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے کہ اگر شدید خوف ہو تو الگ الگ سواری پر نماز پڑھیں اور اشارہ سے رکوع اور سجود کریں' خواہ جس طرف منہ ہو بشرطیکہ وہ قبلہ کی طرف منہ پر قادر نہ ہوں اور جس وقت تلواریں ٹکرا رہی ہوں اور تیر چل رہے ہوں اس حال میں ہمارے نزدیک نماز جائز نہیں ہے اور امام شافعی کے نزدیک جائز ہے' امام ابوحنیفہ کے نزدیک ''رجالاً'' کا معنی ہے: اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے نماز پڑھیں' اور امام شافعی کے نزدیک اس کا معنی ہے: چلتے ہوئے نماز پڑھیں' اسی لیے قاضی بیضاوی نے کہا ہے کہ اس آیت میں امام شافعی کی دلیل ہے کہ تلواروں سے لڑائی کی حالت میں نماز جائز ہے' امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس حالت میں نماز کو مؤخر کر دیں اور بعد میں پڑھیں۔

(التفسیرات الاحمدیہ ص ۱۵۸ 'مطبوعہ مطبع کریمی' بمبئی)

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

امام شافعی نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر لڑائی کی حالت میں سواری ٹھہرانا ممکن نہ ہو تو تلواروں سے لڑتے ہوئے بھی نماز جائز ہے اور ہمارے امام کا یہ مذہب ہے کہ چلنے سے اور لڑنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نماز

میں قنوت کا حکم دیا ہے اور چلنا اور لڑنا قنوت کے منافی ہے اور جب ایسی صورت ہو تو نماز کو مؤخر کر دے اور جب امن اور سکون ہو تو نماز پڑھ لے اگر تم انصاف سے کام لو تو تمہیں علم ہو گا کہ یہ آیت امام شافعی کے موقف میں بالکل صریح ہے کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اللہ کے لیے قیام کرو اور دین آسان ہے اور مشکل نہیں ہے اور مقامات مختلف ہوتے ہیں اور مشکل کی وجہ سے آسان حکم کو نہیں چھوڑا جاتا اور جس کام کو مکمل طور پر حاصل نہیں کیا جا سکتا اس کو مکمل طور پر ترک بھی نہیں کیا جاتا۔ (روح المعانی ج ۲ ص ۱۵۸ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

حالت خوف میں نماز پڑھنے کے متعلق احادیث

حافظ جلال الدین سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام طیالسی امام عبد الرزاق امام ابن ابی شیبہ امام احمد امام نسائی امام ابو یعلیٰ اور امام بیہقی نے اپنی "سنن" میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جنگ خندق کے دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ہم ظہر عصر مغرب اور عشاء کی نمازوں کو جنگ کی مشغولیت کی وجہ سے نہ پڑھ سکے حتیٰ کہ ہم لڑائی سے بچا لیے گئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ" (الاحزاب: ۲۵) (زبردست آندھی بھیج کر) اللہ مسلمانوں کے لیے جنگ سے کافی ہو گیا" یعنی ان کو لڑنے سے بچا لیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو (اذان کا) حکم دیا اور ہر نماز کے لیے اقامت کہی یہ واقعہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے تھا: "فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا" (البقرہ: ۲۳۹) اگر تم حالت خوف میں ہو تو پیادہ اور سواری پر نماز پڑھو"۔

امام ابن ابی شیبہ امام مسلم اور امام نسائی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض ایام میں صلوٰۃ خوف پڑھی ایک جماعت آپ کے ساتھ تھی اور ایک جماعت دشمن کے سامنے کھڑی رہی جو جماعت آپ کے ساتھ تھی آپ نے اس کو ایک رکعت نماز پڑھائی پھر وہ لوگ چلے گئے اور دوسری جماعت آ گئی آپ نے اس دوسری جماعت کو ایک رکعت نماز پڑھائی پھر دونوں جماعتوں نے باقی ماندہ ایک ایک رکعت نماز پڑھی حضرت ابن عمر نے کہا: اور اگر اس سے زیادہ خوف ہو تو پھر تم کھڑے ہوئے اور سواری پر اشارہ سے نماز پڑھو۔

امام مالک امام شافعی امام عبد الرزاق امام بخاری امام ابن جریر اور امام بیہقی نے نافع سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جب صلوٰۃ خوف کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: امام ایک جماعت کو ایک رکعت نماز پڑھائے اور دوسری جماعت ان کے اور دشمن کے درمیان کھڑی رہے اور نماز نہ پڑھے اور جب وہ جماعت ایک رکعت نماز پڑھ لے تو وہ اس دوسری جماعت کی جگہ چلی جائے جس نے نماز نہیں پڑھی تھی اور یہ لوگ سلام نہ پھیریں اور جس جماعت نے پہلے نماز نہیں پڑھی تھی وہ امام کے پیچھے آ کر کھڑی ہو اور امام اس کو بھی ایک رکعت پڑھائے پھر امام چلا جائے اس کی دو رکعتیں ہو گئیں اور امام کے چلے جانے کے بعد ہر جماعت اپنی باقی ماندہ ایک ایک رکعت پڑھے اور اگر اس سے زیادہ خوف ہو تو اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے نماز پڑھیں یا سواری پر نماز پڑھیں خواہ منہ قبلہ کی طرف ہو یا غیر قبلہ کی طرف نافع کہتے ہیں کہ مجھے یہی یقین ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح سنا تھا۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۵۲ ۔ ۶۵۱)

امام بزار حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تلواروں سے لڑائی کی حالت میں نماز ایک رکعت ہے انسان جس طریقہ سے بھی یہ رکعت پڑھ لے اس کے لیے کافی ہے اور وہ اس کو نہیں دہرائے گا۔

امام ابن ابی حاتم نے "فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا" (البقرہ: ۲۳۹) کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سوار اپنی سواری پر نماز پڑھے اور پیدل چلنے والا اپنے پیروں پر نماز پڑھے اور جب خوف دور ہو جائے تو سوار اور پیادہ معمول کے مطابق نماز پڑھیں' جس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں سکھایا ہے۔

امام ابن ابی حاتم اور امام ابن المنذر نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب تلواروں سے جنگ ہو رہی ہو تو اپنے سر کے اشارہ سے نماز پڑھے خواہ اس کا منہ کسی طرف ہو' "فرجالا او رکبانا" کی یہی تفسیر ہے۔

امام ابن المنذر اور امام ابن جریر نے مجاہد سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے: چلتے ہوئے اور سواری پر' اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے فرمایا کہ جب تم جنگ میں سواریوں پر ہو اور خوف زیادہ ہو تو ہر شخص کسی بھی سمت کھڑا ہو کر یا سواری پر سر کے اشارہ سے یا زبان کے کلام سے جس طرح بھی ممکن ہو نماز پڑھے۔

(الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۰۹۔ ۳۰۸ ملخصاً' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

حالت خوف میں نماز پڑھنے کے متعلق فقہاء شافعیہ کا مذہب

علامہ ماوردی شافعی لکھتے ہیں:

یعنی اگر تمہیں دشمن کا خوف ہو تو تم اپنے پیروں پر یا اپنی سواریوں پر ٹھہرے ہوئے یا چلتے ہوئے نماز پڑھو خواہ منہ قبلہ کی طرف ہو یا غیر قبلہ کی طرف' اشارہ سے یا بغیر اشارہ کے جس طرح بھی قدرت ہو' اس حالت میں نماز کی مقدار میں اختلاف ہے' جمہور کا قول یہ ہے کہ وہ طریقہ کے مطابق دو رکعت نماز پڑھے گا' اور حسن نے کہا: جب اسے خوف ہو تو ایک رکعت نماز پڑھے' اہل حجاز (شافعیہ) نے کہا: اس پر بعد میں اس نماز کا اعادہ نہیں ہے کیونکہ وہ معذور تھا' اور اہل عراق (احناف) نے کہا: اس پر اعادہ واجب ہے کیونکہ چلنا نماز کے اعمال میں سے نہیں ہے۔

حالت خوف میں نماز پڑھنے کے متعلق فقہاء مالکیہ کا مذہب

قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ہر حالت میں نماز کی حفاظت کا حکم دیا ہے' مرض ہو' حضر ہو' سفر ہو' قدرت ہو' عجز ہو' خوف ہو' امن ہو' نماز مکلف سے کسی حال میں ساقط نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھڑے ہو کر نماز پڑھو' اگر اس پر قدرت نہ ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھو' اور اگر اس پر بھی قدرت نہ ہو تو لیٹ کر۔ (صحیح بخاری' سنن ابوداؤد' جامع ترمذی' سنن ابن ماجہ' مسند احمد) اور حضرت عبد اللہ بن عمر نے صلوٰۃ خوف کے ذکر میں فرمایا: اگر زیادہ خوف ہو تو کھڑے ہوئے اور سواری پر نماز پڑھو' خواہ منہ قبلہ کی طرف ہو یا نہ ہو۔ (سنن کبریٰ ج ۳ ص ۲۵۶) اس سے مقصود یہ ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو نماز پڑھ لی جائے اور کسی حالت میں بھی نماز ساقط نہیں ہوگی' حتیٰ کہ اگر صرف آنکھ کے اشارہ سے نماز پڑھی جا سکے تو اسی طرح لازم ہے' اسی وجہ سے نماز باقی عبادات سے ممتاز ہے' کیونکہ نماز کے علاوہ باقی عبادات عذر کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہیں' اور اسی سبب سے ہمارے علماء نے کہا ہے کہ تارک نماز کو قتل کر دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا ہے کہ جنگ کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ حضرت ابن عمر کی حدیث اور یہ آیت ان کے خلاف قوی دلیل ہے۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۲۰۳۔ ۲۰۲' مطبوعہ دار المعرفہ' بیروت' ۱۴۰۸ھ)

حالت خوف میں نماز پڑھنے کے متعلق فقہاء حنبلیہ کا مذہب

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں: یہ آیت سورۂ نساء کی اس آیت کے بعد نازل ہوئی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ الخوف پڑھنے کا طریقہ بیان فرمایا ہے:

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ (النساء: ۱۰۲)

اور جب آپ ان میں ہوں اور (جنگ کے دوران) انہیں نماز پڑھائیں تو ان میں سے ایک گروہ کو آپ کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے اور وہ لوگ اپنے ہتھیار لیے رہیں' پھر جب وہ سجدہ کر لیں تو (اے مسلمانو!) وہ تمہارے پیچھے چلے جائیں اور دوسرا وہ گروہ آ جائے جس نے نماز نہیں پڑھی' اور انہیں آپ کے ساتھ نماز پڑھنی چاہیے اور وہ بھی اپنی حفاظت کا سامان اور اپنا اسلحہ لیے رہیں۔

اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر تمہیں اس سے زیادہ خوف ہو تو تلواروں سے لڑائی کے درمیان تم کو جس طرح قدرت ہو اس طرح نماز پڑھو' اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خندق کے دن ظہر' عصر' مغرب اور عشاء کی نمازیں شفق کے غائب ہونے کے بعد پڑھیں یعنی عین حالت جنگ میں یہ نمازیں نہیں پڑھیں جیسا کہ اس آیت میں ہے اور ان کو مؤخر کر دیا۔ (ترمذی' ابویعلیٰ' بیہقی) تو اس حدیث اور اس آیت میں کیسے موافقت ہوگی' اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جنگ خندق کا یہ واقعہ اس آیت (فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ (البقرہ: ۲۳۹)) کے نزول سے پہلے کا ہے۔ (سنن نسائی' صحیح ابن حبان)

(زاد المسیر ج ۱ ص ۲۸۵۔ ۲۸۴ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

حالت خوف میں نماز پڑھنے کے متعلق فقہاء احناف کا مذہب

علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں:

اس آیت میں خوف کی حالت میں پا پیادہ اور سواری پر نماز پڑھنے کا حکم بیان فرمایا ہے' دوران جنگ اس طرح نماز پڑھنے کا حکم نہیں ہے (بلکہ دوران جنگ نماز پڑھنے کا وہی طریقہ ہے جو سورۂ نساء میں ہے)' جب کسی شخص کو دشمن گھیر لے اور اس کو سخت خطرہ ہو تو اس کے لیے اس طرح نماز پڑھنا جائز ہے اور جب خوف کی وجہ سے اس کے لیے سواری پر نماز پڑھنا جائز ہے اور اس کے لیے رکوع اور سجود کو ترک کرنا جائز کر دیا تو اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ وہ قبلہ کی طرف منہ کرے یا نہ کرے' اب اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ نے خوف کی حالت میں بھی نماز کے ترک کرنے کی اجازت نہیں دی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم قتال میں مشغول تھے اور قتال میں مشغول ہونا نماز سے مانع ہے' اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ ان کی قبروں اور ان کے گھروں کو آگ سے بھر دے کیونکہ ان کے خلاف جنگ میں مشغول رہنے کی وجہ سے ہم صلوٰۃ وسطیٰ نہیں پڑھ سکے' اگر یہ کہا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خندق کے دن ظہر' عصر' مغرب اور عشاء کی نمازوں کو کیوں ترک کر دیا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خوف کی حالت میں اس طرح نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے' دوران قتال اسی طرح نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا اور جنگ خندق کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم قتال میں مشغول تھے اور قتال میں مشغول ہونا نماز سے مانع ہے' اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ ان کی قبروں اور گھروں کو آگ سے بھر دے کیونکہ ان کے خلاف جنگ میں مشغول ہونے کی وجہ سے ہم صلوٰۃ وسطیٰ نہیں پڑھ سکے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خندق کے دن نمازیں اس لیے نہیں پڑھی تھیں کہ اس وقت تک صلوٰۃ خوف پڑھنے کا حکم نازل نہیں ہوا تھا' اس کا جواب یہ ہے کہ محمد بن اسحاق اور واقدی کا اس پر اتفاق ہے کہ غزوہ ذات الرقاع' غزوہ خندق سے پہلے ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ ذات الرقاع میں صلوٰۃ خوف

پڑھی تھی اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا غزوہ خندق میں نماز نہ پڑھنا قتال کی وجہ سے تھا اور قتال نماز کی صحت سے مانع اور اس کے منافی ہے۔

بعض فقہاء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ جو شخص خوف زدہ ہو اس کے لیے چلتے ہوئے بھی نماز پڑھنا جائز ہے خواہ وہ کسی پر حملہ آور ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اگر تم حالت خوف میں ہو تو پا پیادہ نماز پڑھو یا سواری پر یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں چلنے کا ذکر نہیں علاوہ ازیں حملہ آور خوف زدہ نہیں ہوتا کیونکہ اگر وہ حملہ کرنے کی بجائے واپس چلا جائے تو اسے کوئی خوف اور خطرہ نہیں ہوگا' اللہ سبحانہ نے اس طرح نماز پڑھنا خوف زدہ کے لیے مشروع کیا ہے اور یہ اس وقت ہوگا جب اس پر حملہ کیا جائے' اس وقت حالت خوف میں اس کے لیے جائز ہے کہ وہ سواری پر نماز پڑھے یا چلتے ہوئے۔

(احکام القرآن ج ا ص ۴۴۹ ـ ۴۴۸ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نماز کا معاملہ کس قدر سنگین ہے' باقی تمام عبادات عذر کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہیں لیکن جب جان کا خوف اور خطرہ ہو نماز اس وقت بھی معاف نہیں ہے اور اس حال میں بھی یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم چلتے ہوئے یا سواری پر جس طرح بھی بن پڑے نماز پڑھو لو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی بیویوں کے لیے وصیت کر جائیں کہ انہیں ایک سال تک خرچ دیا جائے اور (گھر سے) نکالا نہ جائے' پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر (ان کے) اس کام کا کوئی گناہ نہیں ہے جو انہوں نے دستور کے مطابق کیا ہے۔ (البقرہ: ۲۴۰)

حفاظت نماز اور عدت وفات میں مناسبت کا بیان

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے ساتھ نکاح' معاشرت' ان کے حقوق اور فرائض' ان کی طلاق اور عدت کے احکام بیان فرمائے تھے اور چونکہ ان کے ساتھ زیادہ اشتغال عبادات میں حارج ہے اس لیے ان احکام کے درمیان میں نماز کی حفاظت اور اس کی تاکید کو بیان فرمایا حتیٰ کہ عین جنگ کی حالت میں بھی نماز ساقط نہیں ہوتی اور پا پیادہ یا سواری پر جس حال میں اور جس طرح بھی بن پڑے نماز پڑھی جائے گی' اس تنبیہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھر عورتوں کے ساتھ معاشرت کے احکام بیان فرمائے اور چونکہ پہلے ازدواج' طلاق' وفات' اور مطلقات غیر مدخولہ کے مہر اور ان کی متاع کا ذکر کیا تھا اس لیے ان احکام کو اب شوہر کی موت کے ذکر پر ختم کیا اور شوہر کی موت کے بعد بیوہ کی عدت کا ذکر فرمایا اور چونکہ پہلے مطلقات غیر مدخولہ کے مہر اور متاع کا ذکر فرمایا تھا تو اب مطلقات مدخولہ کے مہر اور ان کی عدت کا ذکر فرمایا۔

ایک سال تک عدت وفات کے منسوخ ہونے کا بیان

اس آیت میں فرمایا ہے کہ جو لوگ موت کی آہٹ محسوس کریں یا قریب المرگ ہوں وہ اپنی بیویوں کے لیے یہ وصیت کریں کہ انہیں ایک سال تک خرچ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالا جائے' جمہور فقہاء اور مفسرین کے نزدیک یہ آیت سورۂ بقرہ کی اس آیت سے منسوخ ہے' جس میں فرمایا ہے: تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں' وہ (عورتیں) اپنے آپ کو چار ماہ دس دن تک (عقد ثانی سے) روکے رکھیں۔ (البقرہ: ۲۳۴)

امام ابن جریر طبری نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ پہلے جب کسی عورت کا خاوند فوت ہو جاتا تھا تو خاوند کے مال سے اس کے لیے ایک سال کی رہائش اور خرچ مہیا کیا جاتا تھا' پھر جب سورۂ نساء میں عورت کی میراث مقرر کر دی گئی کہ اگر اس کے خاوند کی اولاد نہ ہو تو اس کو خاوند کے مال کا چوتھائی حصہ ملے گا اور اگر اس کی اولاد ہو تو پھر اس کو خاوند کے مال کا آٹھواں حصہ

ملے گا' تو پھر رہائش اور نفقہ کا یہ حکم منسوخ ہو گیا' البتہ مجاہد کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں ہے' ان کے نزدیک اس کا محمل یہ ہے کہ بیوہ پر چار ماہ دس دن عدت گزارنا تو واجب ہے جیسا کہ البقرہ: ۲۳۴ میں مذکور ہے' اس کے بعد سال کے باقی ماندہ سات ماہ بیس دن میں عدت گزارنے کا اسے اختیار ہے چاہے وہ یہ عدت گزارے یا نہ گزارے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۳۴۲ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن الزبیر نے حضرت عثمان سے کہا: "وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا". (البقرہ: ۲۴۰) "الـی قوله غیر اخراج" "اس آیت کو سورۂ بقرہ کی دوسری آیت نے منسوخ کر دیا ہے' تو پھر آپ نے اس آیت کو مصحف میں کیوں لکھا ہے؟ حضرت عثمان نے کہا: اے بھتیجے! ہم اس آیت کو اسی طرح رہنے دیں گے' قرآن مجید کی کسی آیت کو اس کی جگہ سے تبدیل نہیں کریں گے (یعنی قرآن مجید کی آیات کو لکھنا امر توقیفی تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس آیت کی جو جگہ بتائی تھی اس کو وہیں لکھا گیا تھا)۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۵۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں:

زمانہ جاہلیت میں جب کوئی شخص مر جاتا تو اس کی بیوی ایک سال تک عدت گزارتی' اس پر اس کی وراثت سے ایک سال تک خرچ کیا جاتا' جب ایک سال پورا ہو جاتا تو وہ اپنے شوہر کے گھر سے نکلتی اور اس کے پاس ایک مینگنی ہوتی' وہ ایک کتے کو مینگنی مارتی اور شوہر کی عدت سے باہر آ جاتی' اور مینگنی کو مارنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ کہتی کہ میرے نزدیک خاوند کی وفات کے بعد میرا اس کی عدت گزارنا میرے نزدیک اس مینگنی کو مارنے سے زیادہ آسان تھا' اسلام نے اپنے ظہور کے بعد ان کو پہلے اپنے اسی دستور پر قائم رکھا اور بیوہ کی عدت ایک سال ہی برقرار رہی' پھر اس کے بعد اس حکم کو سورۂ البقرہ: ۲۳۴ سے منسوخ کر دیا گیا اور بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن مقرر کر دی گئی۔ (زاد المسیر ج ۱ ص ۲۸۶ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

عدت وفات کے شرعی حکم میں اختلاف فقہاء

امام مالک کے نزدیک اگر خاوند کا اپنا یا کرایہ کا مکان ہو تو بیوہ کا اس گھر میں عدت گزارنا واجب ہے اور عدت سے پہلے گھر سے نکلنا مطلقاً جائز نہیں ہے' امام شافعی کا ظاہر قول یہ ہے کہ خاوند کے مال سے بیوہ کے لیے عدت تک رہائش مہیا کرنا واجب ہے۔ امام احمد کے نزدیک اگر بیوہ غیر حاملہ ہو تو اس کے لیے عدت کی رہائش کا استحقاق نہیں ہے اور اگر وہ حاملہ ہو تو پھر ان کے دو قول ہیں' اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک بیوہ کا خاوند کے گھر میں عدت گزارنا واجب ہے لیکن وہ دن کے اوقات میں گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔

حدیث سے عدت وفات کا بیان

امام مالک روایت کرتے ہیں:

زینب بنت کعب بن عجرہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت فریعہ بنت مالک بن سنان جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں وہ روایت کرتی ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں اور آپ سے یہ سوال کیا کہ وہ بنو خدرہ میں اپنے خاندان میں جا سکتی ہیں' کیونکہ ان کے شوہر اپنے چند بھاگے ہوئے غلاموں کو ڈھونڈنے گئے تھے حتیٰ کہ جب وہ قدوم کے راستہ میں پہنچے تو انہوں نے ان غلاموں کو جا لیا' سو ان غلاموں نے ان کے شوہر کو قتل کر دیا' وہ کہتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا کہ آیا میں بنو خدرہ میں اپنے میکہ میں جا سکتی ہوں تا کہ وہاں عدت وفات گزاروں کیونکہ میرے

خاوند نے اپنی ملکیت میں کوئی مکان چھوڑا ہے نہ نفقہ' وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! وہ کہتی ہیں کہ جب میں واپس ہوئی حتی کہ میں (ابھی) حجرہ میں تھی' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آواز دی' یا مجھے کسی سے آواز دے کر بلوایا' آپ نے پوچھا: تم نے کیا کہا تھا؟ میں نے پھر آپ سے اپنے خاوند کی وفات کا پورا قصہ دہرایا' آپ نے فرمایا: تم اپنے گھر میں ٹھہری رہو حتی کہ تمہاری عدت پوری ہو جائے' وہ کہتی ہیں کہ میں نے چار ماہ دس دن عدت گزاری' جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت تھا تو انہوں نے مجھ سے اس کے متعلق سوال کیا' میں نے یہ حدیث بیان کی تو انہوں نے اس حدیث کی پیروی کی اور اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ (موطا امام مالک ص ۵۲۱۔ ۵۲۰' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور)

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۳۱۵۔ ۳۱۴' جامع ترمذی ص ۱۹۳' سنن نسائی ج ۲ ص ۱۲۱' سنن ابن ماجہ ص ۱۴۶' سنن دارمی ج ۲ ص ۹۰)

عدت وفات کے متعلق فقہاء حنبلیہ کا نظریہ

علامہ ابن قدامہ حنبلی بیان کرتے ہیں:

اگر بیوہ غیر حاملہ ہو تو اس کے لیے سکنیٰ (رہائش) نہیں ہے' یہ قول واحد ہے اور اگر وہ حاملہ ہو تو پھر دو قول ہیں' ایک قول کے مطابق خاوند کے ترکہ سے وہ رہائش کی مستحق ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ رہائش کی مستحق نہیں ہے۔

اگر وہ غیر حاملہ ہو تو اس کے لیے رہائش نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاوند کے ترکہ سے بیوی کو چوتھائی یا آٹھواں حصہ دیا ہے اور باقی ترکہ دوسرے وارثوں کا ہے اور رہائشی مکان بھی ترکہ میں سے ہے' اس لیے واجب ہے کہ وہ اپنے حصہ سے زیادہ کی مستحق نہ ہو' نیز موت کے بعد وہ اپنے شوہر سے بائن (منقطع) ہو گئی اور اب وہ مطلقہ ثلاثہ کے مشابہ ہے (حنابلہ کے نزدیک مطلقہ ثلاثہ رہائش اور نفقہ کی مستحق نہیں ہوتی) اس لیے وہ رہائش کی مستحق نہیں ہو گی۔

اور اگر وہ حاملہ ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ رہائش کی مستحق ہو گی کیونکہ وہ اپنے خاوند سے حاملہ ہے تو مطلقہ رجعیہ پر قیاس کرتے ہوئے اس کے لیے رہائش واجب ہو گی اور جب ہم کہتے ہیں کہ وہ رہائش کی مستحق ہے تو وہ اس مکان میں رہائش کی مستحق ہے جس میں وہ دیگر ورثاء کے ساتھ رہتی تھی۔ امام مالک' امام شافعی' امام ابوحنیفہ اور جمہور علماء کا بھی یہی قول ہے' اگر کسی وجہ سے اس مسکن میں رہائش نہ ہو سکے تو وارث پر لازم ہے کہ میت کے مال سے اس کے لیے کرائے کا مکان حاصل کرے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو حاکم اس کو مجبور کرے اور بغیر عذر کے بیوہ کے لیے اس مکان سے دوسری جگہ منتقل ہونا جائز نہیں ہے' کیونکہ اس مکان میں عدت گزارنا اللہ کے حقوق سے ہے اور یہ سوگ کرنے کا تتمہ ہے' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ان عورتوں کو ان گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں الا یہ کہ وہ کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں۔ (الطلاق: ۱) ہمارا دوسرا قول یہ ہے کہ حاملہ بیوہ کے لیے رہائشی مکان کا استحقاق نہیں ہے' اگر وارث یا سلطان یا کوئی اجنبی خوشی سے اس کو شوہر کے مکان میں رہنے دے تو اس پر وہاں عدت گزارنا لازم ہے' اور اگر وہ منع کریں تو اس کے لیے دوسری جگہ عدت گزارنا جائز ہے اور اس کے وہی دلائل ہیں جو ہم نے غیر حاملہ کے سلسلہ میں بیان کیے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فریعہ کے لیے مکان کو لازم کیا تھا' وہ ایک خاص واقعہ تھا' ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہو کہ اس کے وارثوں نے اس کو اس مکان میں رہنے کی اجازت دے دی ہے' آپ نے بیوہ کے لیے استحقاق رہائش کا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں بیان فرمایا تھا۔ (المغنی ج ۸ ص ۱۲۹۔ ۱۲۸' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

عدت وفات کے متعلق فقہاء شافعیہ کا نظریہ

علامہ ابوالعباس رملی شافعی لکھتے ہیں:

زیادہ ظاہر قول یہ ہے کہ جو عورت عدت وفات گزارے اس کے لیے بھی رہائش مہیا کرنا واجب ہے کیونکہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے حضرت فریعہ سے فرمایا تھا: تم اپنے شوہر کے گھر رہو حتیٰ کہ تمہاری عدت پوری ہو جائے' سو انہوں نے اس گھر میں چار ماہ دس دن عدت گزاری' امام ترمذی وغیرہ نے یہ کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے' دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے لیے جس طرح نفقہ کا استحقاق نہیں ہے اسی طرح اس کے لیے رہائش کا بھی استحقاق نہیں ہے اور پہلے قول کی دلیل یہ ہے کہ رہائش اس کے پانی (منی) کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے اور وہ اس کی وفات کے بعد بھی موجود ہے' اور نفقہ کا وجوب خاوند کے تمتع کی وجہ سے ہوتا ہے اور موت سے وہ منقطع ہو گیا' نیز نفقہ عورت کا حق ہے اور وہ میراث سے ساقط ہو گیا اور رہائش اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور وہ ساقط نہیں ہوا۔ (نہایۃ المحتاج ج ۷ ص ۱۵۴' دار الکتب العلمیہ' بیروت)

عدت وفات کے متعلق فقہاء مالکیہ کا نظریہ

علامہ قرطبی مالکی حضرت فریعہ کی حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: حجاز اور عراق کے علماء کے درمیان یہ حدیث معروف ہے اور اس حدیث کی بناء پر وہ کہتے ہیں کہ بیوہ شوہر کے گھر عدت گزارے اور گھر سے باہر نہ نکلے۔ داؤد ظاہری یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید نے بیوہ پر عدت گزارنا لازم کیا ہے' یہ لازم نہیں کیا کہ وہ شوہر کے گھر عدت گزارے' حضرت علی' حضرت ابن عباس' حضرت عائشہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم کا بھی یہی قول ہے' ''موطا امام مالک'' میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیوہ عورتوں کو عدت سے پہلے حج پر جانے سے بھی منع کرتے تھے' یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد تھا' ان کے نزدیک بیوہ کا خاوند کے گھر عدت گزارنا لازم تھا' اور قرآن اور سنت کا بھی مقتضیٰ ہے' اس لیے عدت سے پہلے بیوہ کا حج اور عمرہ کے لیے بھی جانا جائز نہیں ہے' امام مالک نے کہا: جب تک بیوہ نے احرام نہ باندھا ہو اس کو گھر لوٹا دیا جائے گا۔ یہ حکم اس وقت ہے جب خاوند کا گھر اس کی ملکیت میں ہو۔ امام مالک' امام شافعی' امام ابوحنیفہ' امام احمد اور اکثر فقہاء کا یہی مسلک ہے جیسا کہ حضرت فریعہ کی حدیث میں ہے اور اگر خاوند اس گھر میں رہتا ہو لیکن اس کا مالک نہ ہو تو عدت کے دوران بیوہ کے لیے اس میں رہنے کا استحقاق ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو گیا تھا کہ حضرت فریعہ کے خاوند اس گھر کے مالک نہیں تھے' پھر بھی آپ نے حضرت فریعہ سے فرمایا: تم عدت پوری ہونے تک اس گھر میں رہو' امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا اس میں اختلاف ہے' یہ حکم اس وقت ہے جب اس کا خاوند اس مکان کا کرایہ دیتا رہا ہو لیکن اگر خاوند نے اس مکان کا کرایہ نہ دیا ہو تو خاوند خواہ امیر ہو اس کے مال سے بیوہ کے لیے رہائش کا کوئی استحقاق نہیں ہے کیونکہ بیوہ کا رہائش پر استحقاق اس وقت ہو گا جب خاوند کی مکان پر مکمل ملکیت ہو۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۳ ص ۱۷۸۔۱۷۷' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران)

عدت وفات کے متعلق فقہاء احناف کا نظریہ

علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں:

مطلقہ اور بیوہ اس گھر سے باہر نہ نکلے جس میں وہ رہتی تھی' البتہ بیوہ دن میں باہر جا سکتی ہے لیکن رات اس گھر میں آ کر گزارے' مطلقہ کے باہر نہ نکلنے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ (الطلاق: ۱)

ان مطلقہ عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو نہ وہ خود نکلیں الا یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں۔

اور بیوہ کے گھر سے باہر نہ جانے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ (البقرہ: ۲۴۰)

بیوہ عورتوں کو ایک سال تک خرچ دیا جائے اور گھر سے نکالا نہ جائے۔

پھر چار ماہ دس دن سے زائد مدت کو البقرہ: ۲۳۴ سے منسوخ کر دیا اور چار ماہ دس دن کی مدت تک یہ حکم باقی رہا اور حضرت فریعہ کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فریعہ کو ان کے خاوند کے گھر سے منتقل ہونے سے منع فرما دیا تھا' اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں' اول یہ کہ بیوہ خاوند کے گھر سے منتقل نہ ہو اور ثانی یہ کہ بیوہ کا گھر سے باہر نکلنا ممنوع نہیں ہے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر سے باہر نکلنے سے منع نہیں فرمایا اور حضرت عبداللہ بن مسعود' حضرت عمر' حضرت زید بن ثابت' حضرت ام سلمہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے کہ بیوہ عورت دن میں گھر سے باہر نکل سکتی ہے لیکن رات اس گھر میں گزارے۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۴۱۹۔ ۴۱۸' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور مطلقہ عورتوں کے لیے دستور کے مطابق متاع ہے جو اللہ سے ڈرنے والوں پر واجب ہے O (البقرہ: ۲۴۲)

مطلقہ عورتوں کے مہر کی ادائیگی کا وجوب

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیوہ عورتوں کو فائدہ پہنچانے کا ذکر فرمایا تھا کہ انہیں ایک سال کا نفقہ اور رہائش مہیا کی جائے' اور اس آیت میں مطلقہ عورتوں کا ذکر فرمایا جو طلاق یافتہ اور مدخول بہا عورتیں ہیں کہ اگر ان کا مہر پہلے مقرر تھا تو طلاق کے وقت ان کو ان کا پورا مہر ادا کیا جائے اور اگر پہلے ان کا مہر مقرر نہیں تھا تو ان کو مہر مثل ادا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے بیوہ عورتوں کے حقوق کے بعد مطلقہ عورتوں کے حقوق کا ذکر فرمایا' اس میں یہ اشارہ ہے کہ طلاق بھی بہ منزلہ موت ہے کیونکہ جس طرح شوہر کی موت کے بعد شوہر کی علیحدگی ہو جاتی ہے' اسی طرح طلاق کے بعد بھی شوہر سے علیحدگی ہو جاتی ہے۔ مہر کی پوری تفصیل اور تحقیق ان شاء اللہ ہم النساء: ۴ میں بیان کریں گے۔

اس آیت میں مطلقات سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کو مباشرت کے بعد طلاق دی گئی ہو کیونکہ جن عورتوں کو مباشرت سے پہلے طلاق دی گئی ہو ان کا حکم البقرہ: ۲۳۶ میں بیان کیا جا چکا ہے' اور متاع سے مراد مہر ہے' اور طلاق کے بعد مہر کا ادا کرنا واجب ہے' خواہ مقرر شدہ مہر ہو یا مہر مثل' بعض علماء نے کہا ہے کہ متاع سے مراد عورت کا لباس وغیرہ ہے یعنی مطلقہ عورتوں کو مہر کے علاوہ لباس وغیرہ بھی دیا جائے' اور جس عورت کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو اور اس کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی گئی اس کو لباس دینا واجب ہے اور باقی تین قسم کی مطلقہ عورتوں (جن کا مہر مقرر کیا گیا ہو خواہ مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ' اور وہ مدخولہ جس کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو) کو لباس دینا مستحب ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں موت کے خوف سے

حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ

اپنے گھروں سے نکلے' سو اللہ نے ان سے فرمایا: مر جاؤ' پھر اللہ نے ان کو زندہ کر دیا'

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ

بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے' لیکن اکثر لوگ

لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ

شکر ادا نہیں کرتے O اور (اے مسلمانو!) تم اللہ کی راہ میں جہاد کرو' اور یقین رکھو کہ اللہ بہت

اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا

سننے والا بہت جاننے والا ہے O وہ کون ہے جو اللہ کو

حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَ

قرض حسن دے؟ تو اللہ اس کو بڑھا کر اس کے لیے کئی گنا کر دے' اور اللہ ہی تنگی اور

يَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

کشادگی فرماتا ہے اور اسی کی طرف تم (سب) لوٹائے جاؤ گے O

طاعون سے ڈر کر بھاگنے والوں کا مرنا اور دوبارہ زندہ ہونا

یہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ طلاق بہ منزلہ موت ہے اور طلاق سے رجوع کرنا بہ منزلہ حیات ہے' اور یہ موت اور حیات مجازاً ہے اور جہاد کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں جان دینا بہ ظاہر موت ہے اور حقیقۃً شہادت کی صورت میں حیات ہے' سو اس سے پہلی آیت میں دنیاوی اور معاشرتی زندگی کے اعتبار سے موت اور حیات کا ذکر کیا گیا تھا اور ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ دینی اور اخروی اعتبار سے موت اور حیات کا ذکر فرما رہا ہے' اور چونکہ قریب ترین امت بنو اسرائیل تھی' اس لیے اللہ تعالیٰ نے جہاد کے معاملہ میں بنو اسرائیل کے احوال بیان فرمائے' یہ لوگ طاعون کی صورت میں موت کے ڈر سے بھاگے' اللہ نے ان پر موت طاری کی اور پھر ان کو زندہ کیا۔ اس میں بھی موت اور حیات کا ذکر ہے' پھر ان کو جہاد کا حکم دیا' اس میں بھی موت اور حیات کا ذکر ہے۔

حافظ جلال الدین سیوطی بیان فرماتے ہیں: امام ابن جریر' امام ابن المنذر اور امام حاکم نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان لوگوں کی تعداد چار ہزار تھی اور یہ داوردان نام کے ایک شہر کے رہنے والے تھے' یہ لوگ طاعون کے ڈر سے اس شہر سے بھاگ نکلے۔ امام ابن جریر' امام ابن المنذر اور امام ابن ابی حاتم نے سدی کی سند سے حضرت ابو مالک سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ داوردان نام کی ایک بستی جو واسط کے قریب تھی' اس میں طاعون پھیل گیا۔ لوگوں کی ایک جماعت تو اس میں ٹھہری رہی اور ایک جماعت بھاگ نکلی' جو لوگ ٹھہرے رہے تھے ان میں سے کچھ مر گئے اور بھاگنے والے بچ گئے' جب طاعون ختم ہو گیا تو وہ لوگ واپس آ گئے' اس شہر کے زندہ بچنے والے لوگوں نے کہا: ہمارے بھائی ہم سے زیادہ سمجھ دار نکلے' کاش! ہم سب ان کی طرح نکل جاتے اور سب بچ جاتے' اور اگر ہم اگلے طاعون تک زندہ رہے تو ایسا ہی کریں گے۔ اگلے سال پھر طاعون آیا' اس بار سب نکل بھاگے' جو پہلے رہ گئے تھے وہ بھی اور جو نکل گئے تھے وہ بھی' ان لوگوں کی تعداد تیس ہزار سے زائد تھی' وہ لوگ دو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی میں قیام پذیر ہوئے' اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس دو فرشتے بھیجے' ایک فرشتہ وادی کے اوپر تھا اور دوسرا وادی کے نیچے تھا' ان دونوں فرشتوں نے ان کو ندا کر کے

کہا: مر جاؤ' تو وہ سب مر گئے' پھر جب تک اللہ نے چاہا وہ اسی طرح مردہ پڑے رہے' پھر وہاں سے حضرت حزقیل نبی علیہ السلام کا گزر ہوا انہوں نے اتنی ساری ہڈیوں کو دیکھا تو بہت حیران ہوئے' اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کہ آپ یہ ندا کریں کہ اے ہڈیو! اللہ تعالیٰ تمہیں مجتمع ہونے کا حکم دیتا ہے' تو وادی کے اوپر اور نیچے سے تمام ہڈیاں مجتمع ہو گئیں اور ہر جسم کی ہڈیاں آپس میں جڑ گئیں اور بغیر خون اور گوشت کے ہڈیوں کے اجسام بن گئے' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ آپ یہ کہیں کہ اے ہڈیو! اللہ تمہیں گوشت سے ملبوس ہونے کا حکم دیتا ہے تو تمام ہڈیوں پر گوشت آ گیا' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی کی کہ آپ ان کو ندا کر کے یہ کہیں کہ اللہ تمہیں کھڑے ہونے کا حکم دیتا ہے تو وہ سب زندہ ہو کر اٹھ گئے اور بے اختیار ان کی زبانوں پر جاری ہوا: "سبحانک لا الہ الا انت" اور پھر وہ اپنے شہروں کی طرف واپس گئے' وہ وہاں رہنے لگے مگر وہ جب بھی کوئی لباس پہنتے تو وہ ان کے جسم پر ایک بوسیدہ کفن کی صورت اختیار کر لیتا جس سے اس زمانہ کے لوگوں نے پہچان لیا کہ یہ لوگ درحقیقت مر چکے ہیں' وہ لوگ اپنی طبعی حیات پوری ہونے تک وہاں رہے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۳۱۰' مطبوعہ مکتبہ آیت اللہ العظمیٰ' ایران)

وقت سے پہلے موت آنے اور تیسری موت کے اشکال کا جواب

اس روایت پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اللہ نے تو فرمایا ہے:

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○ (یونس: ۴۹)

ہر گروہ کے لیے ایک وقت مقرر ہے' جب ان کا وقت آ جائے گا تو وہ اس سے ایک ساعت پیچھے ہٹیں گے نہ آگے بڑھیں گے ○

پھر طاعون سے بھاگنے والے ان لوگوں کو وقت سے پہلے موت کیسے آ گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ موت وہ نہیں تھی جو طبعی حیات مکمل ہونے کے بعد طاری ہوتی ہے' وہ موت اپنا وقت پورا ہونے کے بعد ان پر طاری ہوئی' یہ موت طاعون سے بھاگنے کی سزا کے طور پر تھی اور اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت حزقیل علیہ السلام کی وجاہت کو ظاہر فرمایا کہ ان کی دعا سے مردوں کو زندہ کر دیا' اسی طرح یہ اشکال ہے کہ قرآن مجید میں ہے کہ قیامت کے دن کفار کہیں گے:

رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ (المومن: ۱۱)

اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو بار موت دی اور دو بار زندہ فرمایا۔

اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان کے لیے دو موتیں اور دو زندگیاں ہیں' ایک موت نطفہ کی صورت میں اور اس کے بعد ولادت کی صورت میں حیات' دوسری موت طبعی حیات پوری ہونے کے بعد اور دوسری حیات قیامت کے دن جب مردوں کو اٹھایا جائے گا' اور ان لوگوں کے لیے تین موتیں اور تین حیاتیں ہو گئیں' اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو دو موتوں اور دو زندگیوں کا ذکر فرمایا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص کے لیے عادۃً اور معمول کے مطابق دو موتیں اور زندگیاں ہیں اور ان پر جو تیسری موت اور تیسری حیات آئی وہ خلاف عادت اور خلاف معمول تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا۔ (البقرہ: ۲۴۳)

"الم تر" (کیا آپ نے نہیں دیکھا) کی تحقیق

رویت کے معنی دیکھنا ہے اور یہ لفظ رویت قلبی یعنی علم کے معنی میں بھی آتا ہے' اس لیے کیا آپ نے نہیں دیکھا' اس کا معنی ہے: کیا آپ نے نہیں جانا؟ یہ جملہ ان چیزوں کے لیے کہا جاتا ہے جو پہلے مذکور ہوں اور جن کا پہلے علم ہو' اور ان کا

استعمال ان چیزوں کو یاد دلانے ان کو مقرر اور ثابت کرنے اور ان پر تعجب میں ڈالنے کے لیے ہوتا ہے اور کبھی اس کے بغیر بھی اس جملہ کو استعمال کیا جاتا ہے اور اس وقت یہ کسی چیز کی خبر دینے اور اس خبر پر تعجب میں ڈالنے کے لیے ہوتا ہے اور کبھی اس کو مجازاً استعمال کرتے ہیں اور جس نے کسی چیز کو نہیں دیکھا ہوا ہوتا اس کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں جس نے اس چیز کو دیکھا ہوا ہوتا ہے تاکہ مخاطب اس پر متنبہ ہو کہ یہ چیز اس پر مخفی نہیں ہونی چاہیے تھی اور اس کو اس پر تعجب ہونا چاہیے تھا یا یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ یہ چیز شہرت کے اس درجہ میں ہے کہ کسی پر مخفی نہیں ہے حتیٰ کہ مخاطب پر بھی مخفی نہیں ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اس کے بعد جو واقعہ ذکر کیا جا رہا ہے اس پر غور و فکر کیا جائے اور اس سے عبرت حاصل کی جائے' اور اس واقعہ میں لائق غور یہ چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہزاروں لوگوں پر موت طاری کرنے کے بعد ان کو زندہ کر دیا اور جو اس دنیا میں موت کے بعد زندہ کرنے پر قادر ہے وہ قیامت کے دن بھی مردوں کے زندہ کرنے پر قادر ہے اور عبرت کا تعلق اس چیز سے ہے کہ طاعون سے ڈر کر شہر چھوڑ کر بھاگنا اللہ تعالیٰ کے غضب کا موجب ہے' سو طاعون سے گھبرا کر شہر نہیں چھوڑنا چاہیے' اس میں تقدیر پر ایمان رکھنے کے علاوہ یہ حکمت ہے کہ طاعون زدہ علاقہ کے لوگ جب دوسرے علاقوں میں جائیں گے تو طاعون کے جراثیم اپنے ساتھ لے جائیں گے اور دوسرے علاقوں میں بھی طاعون پھیل جائے گا' طاعون زدہ علاقہ میں جانا بھی نہیں چاہیے' شام کے علاقہ عمواس میں طاعون پھیلا ہوا تھا' حضرت عمر وہاں نہیں گئے اور فرمایا: ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر ہی کی طرف بھاگ رہے ہیں۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم کسی علاقہ میں طاعون کے متعلق سنو تو وہاں مت داخل ہو اور اگر تم کسی علاقہ میں ہو اور وہاں طاعون پھیل جائے تو وہاں سے نہ نکلو۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۵۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

طاعون کی مفصل بحث ہم البقرہ: ۵۹ میں کر چکے ہیں' اس آیت سے معلوم ہوا کہ تقدیر پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور موت سے نہیں بھاگنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے مسلمانو!) تم اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ (البقرہ: ۲۴۴)

جہاد کی تحریک

اس سے پہلی آیت میں طاعون سے بھاگنے والوں کا جو قصہ بیان کیا گیا وہ مسلمانوں کو جہاد پر ابھارنے کے لیے تھا کیونکہ موت سے کسی کو مفر نہیں تو کیوں نہ موت کو شہادت کی صورت میں گلے لگایا جائے۔ پہلے فرمایا تھا: ان لوگوں کے واقعہ میں غور و فکر کرو اور اب فرمایا ہے: اللہ کی راہ میں جہاد کرو' اس سورت میں دین اسلام کے بنیادی احکام بیان کیے گئے ہیں اور نماز' روزہ' حج اور جہاد کا بار بار عجیب و غریب پیرایوں سے ذکر کیا گیا ہے' اور اس میں یہ تنبیہ ہے کہ مسلمانوں کو معاشرتی مصروفیات اور کاروبار حیات میں مشغولیت کی وجہ سے جہاد سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے؟ تو اللہ اس کو بڑھا کر اس کے لیے کئی گناہ کر دے۔

(البقرہ: ۲۴۵)

اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دینے کا بیان

کائنات کی ہر چیز اللہ کی ملک ہے اس لیے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرنے کو مجازاً قرض فرمایا ہے یا اللہ کے بندوں کو قرض

دینا گویا اللہ کو قرض دینا ہے اور اس میں مناسبت یہ ہے کہ جس طرح مقروض' قرض خواہ کو قرض واپس کر دیتا ہے' اسی طرح تم جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اللہ آخرت میں اس کا اجر عطا فرمائے گا۔

اس سے پہلی آیت میں جہاد کا حکم دیا تھا اور جہاد مال کے بغیر نہیں ہو سکتا کیونکہ جہاد کے لیے سواریاں' آلات حرب اور خوراک اور رسد کو مال کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا' اس لیے اس آیت میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے' اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے مال خرچ کرنے کو اللہ کو قرض دینے کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے اور اس میں بتایا ہے کہ یہ مال ضائع نہیں ہو گا بلکہ آخرت میں کئی گنا اجر وثواب کے ساتھ تمہیں مل جائے گا' دنیا میں لوگ زیادہ سے زیادہ دگنے چوگنے سود پر قرض دے دیتے ہیں' اللہ تمہیں اس مال کا اجر دس گنا' ستر گنا' سات سو گنا' چودہ سو گنا اور اس سے بھی زائد عطا فرمائے گا' دوسری وجہ یہ ہے کہ آدمی کسی محبت اور تعلق کی وجہ سے قرض دیتا ہے تو اللہ سے زیادہ اور کون محبت کا مستحق ہے' سو اگر تم محبت کی بناء پر مال خرچ کرتے ہو تو اللہ سے اور اللہ کے دین کی سربلندی سے زیادہ اور کوئی محبت کا محل نہیں ہے اور اگر فائدہ اور بڑھوتری کے لیے مال خرچ کرتے ہو تو اس سے زیادہ اور کوئی فائدہ کی صورت نہیں ہے' اور اس قرض کو قرض حسن فرمایا یعنی یہ قرض اخلاص نیت اور پاکیزہ مال کے ساتھ دیا جائے' لوگ جو آپس میں قرض کا لین دین کرتے ہیں وہ برابر برابر ہونا چاہیے' اگر قرض دینے والا یہ شرط لگائے کہ وہ اصل رقم سے ایک معین رقم زائد لے گا تو یہ سود ہے اور اگر مقروض بغیر کسی پیشگی شرط کے قرض خواہ کو اصل رقم سے کچھ زائد ادا کر دے تو یہ قرض حسن ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم عموماً جب کسی سے قرض لیتے تو اس کو اصل سے زائد ادا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا: لوگوں میں اچھا شخص وہ ہے جو قرض کو اچھی طرح ادا کرے' اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا: وہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن یعنی اچھا قرض دے' اور چونکہ انسان فطرتاً بخیل ہے' اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں اس قرض کا اجر کئی گنا زائد بڑھا چڑھا کر عطا فرمائے گا' نیز فرمایا: اللہ ہی تنگی اور کشادگی کرتا ہے' یہ اس لیے فرمایا کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے تم تنگی میں مبتلا ہو جاؤ گے' کیونکہ اس سے تنگی نہیں ہوتی' تنگی اور کشادگی اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ وقدرت میں ہے۔

قبض اور بسط کا معنی

اللہ تعالیٰ اپنی جبروتیت سے موحدین کی ارواح کو نور ازلی میں قبض کر لیتا ہے' اور عارفین کے اسرار کو مشاہدہ ذات میں بسط کر دیتا ہے' ایک قول یہ ہے کہ قبض اللہ کا سر ہے اور بسط اس کا کشف ہے' ایک قول یہ ہے کہ مریدین کے لیے قبض ہے اور مرادین کے لیے بسط ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ مشتاقین کے لیے قبض ہے اور عارفین کے لیے بسط ہے' اور مشہور یہ ہے کہ قبض اور بسط بندہ کی ترقی کی دو حالتیں ہیں' جب عارف پر خوف کا غلبہ ہو تو یہ قبض کی حالت ہے اور جب اس پر رجاء کا غلبہ ہو تو یہ بسط کی حالت ہے اور جب اس کے قلب پر واردات غیبیہ ہوں تو آثار جلال کو قبض اور آثار جمال کو بسط کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دینے کے متعلق احادیث

حافظ جلال الدین سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام سعید بن منصور' امام ابن سعد' امام بزار' امام ابن جریر' امام ابن المنذر' امام حکیم ترمذی' امام طبرانی اور امام بیہقی' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: وہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے؟ تو اللہ اس کو بڑھا کر اس کے لیے کئی گناہ کر دے' تو حضرت ابوالدحداح انصاری نے کہا: یا رسول اللہ! کیا واقعی اللہ ہم سے قرض چاہتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں ابوالدحداح! انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! اپنا ہاتھ بڑھائیں' آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا' انہوں نے کہا: میں

نے اپنا باغ اپنے رب کو قرض دے دیا اور ان کے باغ میں چھ سو کھجور کے درخت تھے' ام الدحداح اور ان کے بچے اس باغ میں تھے' ابو الدحداح وہاں گئے اور ام الدحداح کو آواز دے کر کہا: اے ام الدحداح! یہاں سے نکلو' میں نے یہ باغ اپنے رب عزوجل کو قرض دے دیا ہے۔

امام ابوالشیخ اور امام بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ پر ایک فرشتہ یہ کہتا رہتا ہے کہ وہ کون ہے جو آج اللہ کو قرض حسن دے اور کل اس کی جزا لے لے اور ایک اور دروازہ پر فرشتہ یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس خرچ کا بدل عطا فرما اور بخیل کے مال کو ضائع کر دے' اور ایک دروازہ پر فرشتہ یہ کہتا ہے کہ اے لوگو! اپنے رب کی طرف بڑھو' وہ قلیل مال جو کافی ہو وہ اس زیادہ مال سے بہتر ہے جو غافل کرنے والا ہو' اور ایک اور دروازہ پر فرشتہ یہ کہتا ہے کہ اے بنو آدم! موت کے لیے جھگڑے پالو اور ویران ہونے کے لیے مکان بناؤ۔

امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں حسن سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل فرماتا ہے: اے ابن آدم! اپنے خزانے کو میرے پاس امانت رکھو' نہ جلے گا' نہ ڈوبے گا' نہ چوری ہوگا اور تمہاری ضرورت کے وقت میں تم کو دے دوں گا۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۳۱۳۔ ۳۱۲ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَاءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ

کیا آپ نے موسیٰ (کی وفات) کے بعد بنو اسرائیل کے ایک گروہ کو نہیں دیکھا!

إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ

جب انہوں نے (اپنے) نبی سے کہا: ہمارے لیے کوئی بادشاہ مقرر کر دیں تو ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے'

قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ

(نبی نے) کہا: اگر تم پر قتال فرض کر دیا جائے تو شاید تم قتال نہیں کرو گے'

قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا

انہوں نے کہا: ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال نہ کریں حالانکہ ہمیں اپنے گھروں

مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا

اور اہل و عیال سے نکال دیا گیا ہے' پھر جب ان پر قتال فرض کیا گیا تو چند لوگوں کے سوا باقی

إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٢٤٦﴾ وَقَالَ لَهُمْ

سب نے روگردانی کی' اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے O اور ان کے نبی نے ان سے کہا:

نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا

بے شک اللہ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر فرما دیا ہے' انہوں نے کہا:

أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ

اس کی بادشاہی ہم پر کیسے ہو گی' حالانکہ ہم اس سے زیادہ بادشاہی کے مستحق ہیں

وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ

اور اس کو مالی وسعت بھی نہیں دی گئی' (ان کے) نبی نے کہا: بے شک اللہ نے اس کو تمہارے لیے

عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي

منتخب فرما لیا ہے اور اس کو علم اور جسم میں زیادہ کشادگی عطا فرمائی ہے' اور اللہ جسے چاہے

مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴۷﴾

اپنا ملک عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا' بہت علم والا ہے O

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو بنو اسرائیل کی ایک جماعت کے جہاد کی طرف متوجہ کرنے کے اسرار

اس سے پہلی آیتوں میں مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا حکم دیا تھا اور مسلمانوں کو جہاد کی طرف راغب کرنے کے لیے پچھلی امتوں میں سے ان لوگوں کے احوال کو بیان فرمایا تھا جو موت سے ڈر کر بھاگے' پھر بھی ان کو موت نے آ لیا تاکہ مسلمان یہ غور کریں کہ جب موت سے مفر نہیں ہے تو کیوں نہ شہادت کے آئینہ میں موت کا استقبال کیا جائے اور ان آیتوں میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کو جو جہاد کا مکلف کیا ہے وہ ان پر کوئی پہلا یا نیا حکم نہیں ہے' ان سے پہلے بھی بنو اسرائیل کو جہاد کا مکلف کیا گیا تھا' اور جب کسی حکم کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کسی ایک جماعت کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر زمانہ میں ہر امت کو اس حکم کا مکلف کیا جاتا رہا ہے تو اس حکم کا بار مشقت کم ہو جاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے زمانہ کے بنو اسرائیل اللہ کے حکم کی اطاعت اور آپ کی نبوت پر ایمان لانے میں فضول ضد بحث اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے تھے' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی ضد اور کج بحثی سے ملال ہوتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسلی کے لیے یہ آیات نازل فرمائیں اور آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ایک نبی کے زمانے میں بنو اسرائیل کی ضد اور ہٹ دھرمی کی طرف متوجہ فرمایا کہ یہ ضد اور ہٹ دھرمی ہمیشہ سے بنو اسرائیل کا وتیرہ رہا ہے اور یہ ان کے عمل کا ایک تسلسل ہے جو آپ کے زمانہ کے بنو اسرائیل میں بھی پایا جاتا ہے۔

بنو اسرائیل کی اس جماعت کے نبی آیا شمویل تھے یا شمعون؟

اس آیت میں جس نبی کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے' وہب بن منبہ نے بیان کیا کہ وہ نبی شمویل

تھے۔ سدی نے کہا: اس نبی کا نام شمعون ہے۔ معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ یہ نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع بن نون تھے۔

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

وہب بن منبہ نے بیان کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد بنو اسرائیل میں حضرت یوشع بن نون خلیفہ ہوئے اور انہوں نے تورات کے احکام کو نافذ کیا۔ ان کے بعد حضرت کالب بن یوفنا خلیفہ ہوئے' انہوں نے بھی تورات کے احکام کو نافذ کیا' ان کی وفات کے بعد حضرت حزقیل بن بوزی خلیفہ ہوئے' ان کی وفات کے بعد بنو اسرائیل میں کئی حوادث ہوئے اور انہوں نے تورات کے احکام کو فراموش کر کے بت پرستی شروع کر دی' پھر اللہ تعالیٰ نے ان میں الیاس بن نسی فنحاص بن العیزار بن ہارون بن عمران کو مبعوث کیا' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان نبیوں کو تورات کے احکام کی تجدید کے لیے فرمایا تھا' حضرت الیاس کے ساتھ بنو اسرائیل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا جس کا نام احاب تھا' اس وقت تمام بنو اسرائیل بت پرستی کرتے تھے اور حضرت الیاس ان کو اللہ وحدہٗ کی عبادت کی دعوت دیتے تھے' حضرت الیاس کی دعوت کو بنو اسرائیل مسترد کر دیتے تھے' صرف ایک بادشاہ ان کی دعوت سنتا تھا اور وہ بھی بت پرستی میں مشغول ہو گیا' پھر ان کے بعد حضرت الیسع خلیفہ ہوئے' وہ بھی کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے' پھر یکے بعد دیگرے نبی آتے رہے' ان کے پاس ایک تابوت تھا جو آباء و اجداد سے ان کے پاس چلا آتا تھا' اس میں سکینہ اور آل موسیٰ اور آل ہارون کے بقیہ تبرکات تھے' ان کا جب بھی کسی دشمن سے مقابلہ ہوتا وہ اس تابوت کو آگے کر دیتے اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان کو دشمنوں پر فتح عطا فرماتا' پھر ان میں ایک بادشاہ ہوا جس کا نام ایلاء تھا' اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایلیا کے پہاڑ میں برکت رکھی تھی' اس طرف سے ان پر دشمن حملہ نہیں کرتا تھا اور جب ان کی برائیاں حد سے بڑھ گئیں تو وہ تابوت ان کے ہاتھ سے جاتا رہا' وہ بادشاہ مارا گیا اور انہوں نے اپنے دشمن سے شکست فاش کھائی' اس وقت میں حضرت شمویل نبی تھے اور یہی وہ نبی ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے ذکر کیا ہے کہ اے نبی! کیا آپ نے موسیٰ کے بعد بنو اسرائیل کے ایک گروہ کو نہیں دیکھا' جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا: ہمارے لیے کوئی بادشاہ مقرر کر دے تو ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے (نبی نے) کہا: اگر تم پر قتال فرض کر دیا جائے تو شاید تم قتال نہیں کرو گے' انہوں نے کہا: ہمیں کیا ہوا کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال نہ کریں حالانکہ ہمیں اپنے گھروں اور اہل و عیال سے نکال دیا گیا ہے' پھر جب ان پر قتال فرض کیا گیا تو چند لوگوں کے سوا باقی سب نے روگردانی کی اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے۔ امام ابن اسحاق نے وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ جب بنو اسرائیل پر مصیبتیں نازل ہوئیں اور انہیں ان کے شہروں سے نکال دیا گیا تو انہوں نے اپنے نبی حضرت شمویل بن بالی سے کہا: ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں' ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں گے' اور بنو اسرائیل کے ہاں یہ طریقہ تھا کہ بادشاہ دنیاوی امور کا انتظام کرتا تھا اور نبی اللہ کی طرف سے احکام بیان کرتا تھا اور دین میں رہنمائی کرتا تھا' جب وہ دونوں کی اطاعت کرتے تو ان کے حالات درست رہتے اور جب بادشاہ سے سرکشی کرتے اور انبیاء کی اطاعت نہ کرتے تو ان کے حالات خراب ہو جاتے' ان پر اسی طرح لگاتار مصیبتیں آتی رہیں' حتیٰ کہ انہوں نے اپنے نبی سے کہا: ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں' ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں گے' نبی نے ان سے کہا: تم نے کبھی وعدہ پورا نہیں کیا اور نہ جہاد سے تمہیں کوئی رغبت ہے' انہوں نے کہا: ہم کیسے جہاد سے بھاگیں گے حالانکہ ہمیں ہمارے شہروں سے نکال دیا گیا ہے۔

امام ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں دوسری روایت یہ بیان کی ہے:

سدی نے بیان کیا ہے کہ بنو اسرائیل عمالقہ سے جنگ کرتے رہتے تھے اور عمالقہ کا بادشاہ جالوت تھا' عمالقہ نے بنو اسرائیل کو شکست دی اور ان پر جزیہ مقرر کر دیا اور ان کی تورات چھین لی' بنو اسرائیل اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے کہ ان میں کوئی نبی مبعوث فرمائے جس کے ساتھ مل کر وہ عمالقہ سے اپنی شکست کا بدلہ لیں' نبوت کے خاندان کے سب لوگ فوت ہو چکے تھے ان میں سے صرف ایک حاملہ عورت باقی بچی تھی' بنو اسرائیل نے اس عورت کو قید کر لیا' اس نے اللہ سے دعا کی کہ اس کے ہاں لڑکا پیدا ہو' سو اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا اور اس عورت نے اس کا نام شمعون تھا' جب وہ بڑا ہوا تو اس کو بیت المقدس میں تورات کی تعلیم کے لیے بھیجا' ایک شیخ نے اس کی تربیت کی' جب وہ بالغ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مقام نبوت پر فائز کیا۔ حضرت جبریل نے ان سے کہا: آپ اپنی قوم کے پاس جائیں اور ان کو اللہ کا پیغام سنائیں' جب وہ قوم کے پاس پہنچے تو قوم نے ان کو جھٹلایا اور کہا: تم بہت جلدی نبی بن گئے' اور کہا: اگر تم سچے ہو تو ایک بادشاہ مقرر کرو' ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں گے اور یہ تمہاری نبوت کی دلیل ہوگی' حضرت شمعون نے کہا: جب تم پر قتال فرض کر دیا جائے تو شاید تم قتال نہ کرو۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۳۷۵۔ ۳۷۴' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر جب ان پر قتال فرض کیا گیا تو چند لوگوں کے سوا باقی سب نے روگردانی کی۔ (البقرہ: ۲۴۶)

یہود کو سرزنش

جب ان پر ان کے دشمنوں سے قتال اور اللہ کی راہ میں جہاد فرض کیا گیا تو چند لوگوں کے سوا باقی سب قتال سے پیٹھ موڑ کر بھاگ گئے' اور انہوں نے اپنے نبی سے جہاد کی فرضیت کا جو سوال کیا تھا اس کو ضائع کر دیا اور جن چند لوگوں کا اللہ تعالیٰ نے استثناء فرمایا ہے یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے طالوت کے ساتھ دریا کو عبور کر لیا تھا۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اصحاب جو آپ کے ساتھ بدر میں تھے ان کی تعداد طالوت کے اصحاب کے برابر تھی' جنہوں نے ان کے ساتھ دریا کو عبور کر لیا تھا' اور وہ تین سو دس اور کچھ تھے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۶۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے O (البقرہ: ۲۴۶)

ظالم سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد شکنی اور وعدہ خلافی کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا' اور اس میں ان یہود پر زجر و توبیخ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت موجود تھے' کیونکہ وہ اس رسول کی بعثت کے منتظر تھے انہوں نے تورات کی وساطت سے اس نبی کی اطاعت کا عہد کیا تھا' یہ اس نبی کے توسل سے فتح کی دعائیں کیا کرتے تھے اور جب یہ نبی مبعوث ہو گئے تو انہوں نے سارے عہد و میثاق پس پشت ڈال دیے اور صاف اور صریح علامتیں پائی جانے کے باوجود اس نبی کو نہیں مانا اور اس نبی کا کفر کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان کے نبی نے ان سے کہا: بے شک اللہ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر فرما دیا ہے' انہوں نے کہا: اس کی بادشاہی ہم پر کیسے ہوگی؟ حالانکہ ہم اس سے زیادہ بادشاہی کے مستحق ہیں اور اس کو مالی وسعت بھی نہیں دی گئی۔ (البقرہ: ۲۴۷)

طالوت کا بیان

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

جب بنی اسرائیل کی جماعت نے حضرت شمویل سے بادشاہ کا مطالبہ کیا تو حضرت شمویل نے اللہ سے دعا کی کہ وہ ایک بادشاہ کو بھیج دے' اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: تمہارے گھر باورچی خانہ میں جو تیل پڑا ہوا ہے اسے دیکھتے رہو' جب کسی شخص کے آنے کی وجہ سے وہ تیل جوش مارنے لگے تو وہی بنو اسرائیل کا بادشاہ ہوگا۔ حضرت شمویل باورچی خانہ میں رکھے ہوئے تیل کو دیکھنے لگے کہ کب کوئی شخص آتا ہے اور اس میں جوش آتا ہے۔ طالوت' بنیامین بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے' ان کی نسل میں نبوت رہی تھی نہ بادشاہت' وہ چمڑے کا کام کرتے تھے' ایک دن طالوت اپنے غلام کے ساتھ اپنے گم شدہ جانور کو ڈھونڈنے نکلے' جب وہ حضرت شمویل کے گھر کے پاس سے گزرے تو غلام نے کہا: اس نبی کے گھر چلیں شاید یہ ہمارے گم شدہ جانور کے متعلق کچھ بتائیں' جب طالوت حضرت شمویل سے بات کر رہے تھے تو اچانک مطبخ میں رکھا ہوا تیل جوش مارنے لگا' حضرت شمویل نے ان کو قریب بلایا اور ان کے سر پر وہ تیل لگایا اور کہا: تم بنو اسرائیل کے بادشاہ ہو' اللہ نے مجھے حکم دیا کہ میں تم کو ان کا بادشاہ بناؤں' طالوت نے کہا: آپ کو علم ہے کہ میں بنو اسرائیل کے نچلے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں؟ فرمایا: ہاں! کہا: آپ کو علم ہے کہ میرا قبیلہ اور میرا گھر سب سے پست اور نچلے درجہ کا ہے؟ فرمایا: ہاں! پھر بنو اسرائیل کو بتایا کہ طالوت ان کا بادشاہ ہے' انہوں نے اعتراض کیا کہ ہم اس سے زیادہ بادشاہی کے مستحق ہیں اور اس کے پاس زیادہ مال بھی نہیں ہے' فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کو تمہارے لیے منتخب کر لیا ہے اور اس کو تم سے زیادہ علم اور جسم عطا فرمایا ہے' بنو اسرائیل کی تسلی کے لیے حضرت شمویل نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک عصا دیا اور کہا: تمہارے بادشاہ کا قد اس کے برابر ہوگا اور جب طالوت کو اس عصا کے ساتھ ناپا تو وہ ان کے قد کے برابر تھا۔ (جامع البیان ج ۲ ص ۳۷۹۔ ۳۷۸' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں:

طالوت کا نام سریانی زبان میں شاول بن قیس بن امال بن ضرار بن تحرب بن افیح بن اس بن بنیامین بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کا نام شارک تھا' ان کو ان کے بہت لمبے قد کی وجہ سے طالوت کہا گیا ہے' یہ وہی ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے قرآن عزیز میں ذکر فرمایا ہے' جنہوں نے جالوت کو قتل کیا اور ان کی بیٹی سے حضرت داؤد علیہ السلام نے نکاح کیا۔ کعب احبار نے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو بادشاہ بنایا' وہ پہلے گدھوں کو چراتے تھے' وہ فقیر تھے اور بالکل کنگال تھے' ان کے دو گدھے گم ہو گئے' وہ ان کی تلاش میں نکلے' تلاش میں بہت دیر ہو گئی اور ان کو سخت بھوک لگی' حضرت شمویل کے گھر سے مساکین کھانا کھاتے تھے' اللہ تعالیٰ نے حضرت شمویل کی طرف وحی کی: میں تمہارے پاس اس شخص کو بھیج رہا ہوں جو گدھا ڈھونڈنے نکلا ہے' وہی بنو اسرائیل کا بادشاہ ہوگا' جب وہ تمہارے پاس آئے تو ایک سرکنڈے سے اس کی پیمائش کرنا' پھر وہ سرکنڈا بنو اسرائیل کو دے دینا کہ جس شخص کا قد اس سرکنڈے کے برابر ہوگا وہی تمہارا بادشاہ ہوگا' اس سرکنڈے کی لمبائی آٹھ ذراع (بارہ فٹ) تھی' حضرت شمویل نے وہ سرکنڈا بنو اسرائیل کو دیا کہ اس کے برابر قد کے شخص کو تلاش کرو' انہوں نے بہت تلاش کیا مگر ان کو بنو اسرائیل میں اتنا لمبا شخص کوئی نہیں ملا' حضرت شمویل نے ان کو بتایا: وہ شخص طالوت ہے جو گدھے چراتا ہے' انہوں نے اس کی پیمائش کی تو طالوت کا قد اس سرکنڈے کے برابر تھا' انہوں نے پوچھا: تم کس کی سبط (اولاد) ہو؟ طالوت نے کہا: میں سبط بنیامین سے ہوں تو وہ اس سے متنفر ہوئے اور اس کو ناپسند کیا' نیز طالوت کنگال اور مقروض تھا' بنو اسرائیل نے کہا: جو شخص کنگال اور مقروض ہو وہ ہمارا بادشاہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اس کے بادشاہ ہونے کی کیا علامت ہے؟ حضرت شمویل نے کہا: اس کی علامت یہ ہے کہ اس کے پاس تمہارا گم شدہ تابوت آئے گا' بنو اسرائیل نے کہا: اگر یہ ہمارا تابوت واپس کر دے تو ہم اس کی بادشاہت پر راضی ہو جائیں گے' وہ تابوت ان کے دشمن جالوت نے چھین لیا تھا' اس نے وہ

تابوت اپنے بت خانہ میں رکھا تو سارے بت اوندھے ہو کر گر پڑے اور سب سے بڑا بت اس تابوت کے سامنے سجدہ میں گر پڑا' عمالقہ یہ منظر دیکھ کر غضب ناک ہوئے اور اس تابوت کو بول و براز کی جگہ ڈال دیا' اس اہانت کی پاداش میں رات کو جو بے ان کا پیٹ کاٹ کر ان کے مبرز سے نکل جاتے' اس سے انہوں نے یہ سمجھا کہ ان پر یہ مصیبت اس تابوت کی وجہ سے آئی ہے' پھر انہوں نے دو بیلوں کے جوئے پر یہ تابوت رکھ کر انہیں ہانک دیا اور فرشتے اس تابوت کو اٹھا کر طالوت کے پاس لے آئے۔

حضرت ابن عباس نے بیان کیا: اس تابوت میں تورات کی الواح کے ٹکڑے تھے' حضرت موسیٰ کا عصا تھا اور حضرت ہارون کا عمامہ تھا اور ان کی قبا (اچکن) تھی' اور سبز زمرد سے بنا ہوا بلی کا سر تھا' سکینہ سے یہی مراد ہے' جب لڑائی ہوتی تو بنو اسرائیل اس تابوت کو آگے رکھتے' بلی کے اس سر سے چیخ نکلتی اور زنانے دار ہوا چلتی اور تابوت فضا میں بلند ہو جاتا اور اس سے دو بازو باہر نکلتیں' ایک میں نور ہوتا اور ایک میں ظلمت' مسلمانوں پر نور پھیل جاتا اور کفار پر ظلمت چھا جاتی' پھر بنو اسرائیل کو جنگ میں کامیابی حاصل ہوتی تھی۔ (مختصر تاریخ دمشق' ج ۱۱ ص ۱۲۶۔ ۱۲۴' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ

اور ان کے نبی نے ان سے کہا: بے شک اس بادشاہ کی سلطنت کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک تابوت

فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ

آئے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکینہ (سکون آور چیز) ہے اور آل موسیٰ

وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ

اور آل ہارون کی چھوڑی ہوئی باقی ماندہ کچھ چیزیں ہیں اس تابوت کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے' اگر تم مومن ہو تو بے شک

إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٤٨﴾ ع

اس میں ضرور تمہارے لیے ایک عظیم نشانی ہے O

ع ۳۲ / ۶ / ۱۶

بنو اسرائیل کے تابوت کی تحقیق

علامہ ابو الحیان اندلسی لکھتے ہیں: حضرت ابن عباس اور حضرت ابن السائب رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ یہ صندوق شمشاد کی لکڑی سے بنا ہوا تھا' اور اس پر سونے کے پترے چڑھے ہوئے تھے' یہ تین ہاتھ لمبا اور دو ہاتھ چوڑا تھا' اس تابوت کی عظمت بنو اسرائیل کے نزدیک مشہور و معروف تھی' وہ اس کو گم کر چکے تھے' اللہ تعالیٰ نے اس کے مندرجات کو مبہم رکھا ہے اور اس کی تصریح نہیں فرمائی کہ اس صندوق میں کیا تھا' اس کو فرشتے اٹھائے ہوئے تھے' ہم اس صندوق کے متعلق اس چیز کو اختصار سے بیان کریں گے جس کو مفسرین اور مؤرخین نے بیان کیا ہے' مؤرخین نے ذکر کیا ہے کہ یہ تابوت حضرت آدم علیہ السلام پر اتارا گیا تھا' اس میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے گھروں کی تصویریں تھیں' اور آخری گھر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا' حضرت آدم علیہ السلام کے بعد یہ تابوت حضرت شیث علیہ السلام سے منتقل ہوتا ہوا حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا' پھر حضرت اسماعیل

علیہ السلام کے پاس رہا' پھر ان کے بیٹے قیدار کے پاس' پھر ان سے ان کے عم زاد اولاد اسحاق نے اس میں تنازع کیا' اور یہ کہا: اس نور کے سوا تم سے نبوت لے لی گئی ہے' انہوں نے تابوت نہ دیا' اور ایک دن اس کو کھولنے کی کوشش کی تو ان سے نہیں کھلا' پھر آسمان سے ایک منادی نے ان کو ندا کی کہ نبی کے سوا اس کو کوئی نہیں کھول سکتا' تم یہ اپنے عم زاد یعقوب کو دے دو' سو انہوں نے اس کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر اپنے عم زاد حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچا دیا' پھر یہ تابوت بنو اسرائیل میں منتقل ہوتا رہا' یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام تک پہنچا' انہوں نے اس میں تورات کو رکھا اور اپنی بعض دوسری چیزیں رکھیں' پھر یہ بنو اسرائیل کے انبیاء میں منتقل ہوتا ہوا حضرت شمویل تک پہنچا۔ (البحر المحیط ج ۲ ص ۵۸۱' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

سکینہ کا معنی اور اس کے مصداق کی تحقیق

سکینہ کا معنی ثبات' امن اور سکون ہے' قرآن مجید میں ہے: "ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ. (التوبہ: ۲۶) پھر اللہ نے اپنے رسول اور مسلمانوں پر سکون اور اطمینان نازل کیا"۔

صحابہ کرام اور فقہاء تابعین سے سکینہ کے متعدد معانی منقول ہیں: زناٹے دار ہوا' پروں اور دم والی کوئی چیز' سونے کا طشت' زمرد یا یاقوت کی تصویر جس کا سر اور دم بلی کی ہو' وہ بشارات جو اللہ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام پر نازل کیں' طالوت کی فتح کی بشارت' وہ جانی پہچانی آیات جن سے سکون حاصل ہو' رحمت اور وقار وغیرہ۔

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: سکینہ انسان کے چہرہ کی طرح ایک چہرہ ہے یا پھر یہ زناٹے دار ہوا ہے۔

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ سکینہ کے دو پر اور ایک دم ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ سکینہ سونے کا ایک جنتی طشت ہے جس میں انبیاء علیہم السلام کے قلوب کو غسل دیا جاتا ہے۔

ربیع نے کہا: سکینہ تمہارے رب کی طرف سے رحمت ہے۔ قتادہ نے کہا: سکینہ وقار ہے' سب سے اولیٰ تفسیر وہ ہے جس کو عطاء بن ابی رباح نے بیان کیا کہ سکینہ وہ معروف علامتیں ہیں جن سے دلوں کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۳۸۷۔ ۳۸۵' ملخصاً' مطبوعہ دارالمعرفہ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ سکینہ کا معنی طمانیت ہے اور جب کہ بنو اسرائیل کو تابوت کے آنے سے طمانیت حاصل ہوئی تو تابوت کو سکینہ کے لیے مجازاً ظرف قرار دیا گیا۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں: حضرت براء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی سورۂ کہف پڑھ رہا تھا' اور اس کا گھوڑا دو لمبی رسیوں سے بندھا ہوا تھا' اس شخص کو ایک بادل نے ڈھانپ لیا' وہ بادل چکر لگاتا ہوا قریب ہو رہا تھا اور اس کا گھوڑا اس سے ڈر کر متوحش ہو رہا تھا' جب صبح ہوئی تو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: وہ سکینہ تھا جو قرآن کی وجہ سے نازل ہوا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۶۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

علامہ نووی نے لکھا ہے کہ سکینہ کے کئی معنی ہیں اور مختار یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی چیز ہے جس میں طمانیت اور رحمت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ فرشتے ہوتے ہیں۔

نیز امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ ایک رات حضرت اسید بن حضیر اپنے اصطبل میں قرآن مجید پڑھ رہے تھے' ناگاہ ان کا گھوڑا اچھلنے لگا اور حضرت اسید کو یہ خوف ہوا کہ کہیں وہ ان کے بچے یحییٰ کو کچل نہ دے' میں (حضرت اسید کہتے ہیں) اس کی

طرف کھڑا ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سر کے اوپر فضا میں چراغوں کی شکل سائبان ہے۔ صبح میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کو عرض کیا' آپ نے فرمایا: یہ فرشتے تھے جو تمہارا قرآن سن رہے تھے' اگر تم پڑھتے رہتے تو صبح سب لوگ ان کو دیکھ لیتے اور وہ کسی پر مخفی نہ رہتے۔ (صحیح مسلم ج ۱ص ۲۶۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حضرت براء کی حدیث میں سکینہ سے تعبیر کیا اور حضرت اسید کی حدیث میں اس کو فرشتوں سے تعبیر فرمایا' آپ نے فرشتوں کو سکینہ اس لیے فرمایا کہ ان کا ایمان غایت طمانیت میں ہوتا ہے' وہ ہمیشہ اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی کبھی معصیت نہیں کرتے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستہ پر جائے' اللہ تعالیٰ ان کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے اور جو جماعت اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں کتاب اللہ کی تلاوت کرتی ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ درس کا تکرار کرتی ہے ان پر سکینہ نازل ہوتی ہے' انہیں رحمت ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں۔ (صحیح مسلم ج ۲ص ۳۴۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حضرت ابو ہریرہ کی اس حدیث میں اللہ کے گھر میں کتاب اللہ کی تلاوت کرنے والوں اور اس کے درس کی تکرار کرنے والوں پر نزول سکینہ کا بیان ہے کیونکہ جو شخص کتاب اللہ کی تلاوت کرتا ہے اور اس کے معانی میں تدبر اور تفکر کرتا ہے اس کو طمانیت اور انشراح قلب حاصل ہوتا ہے۔

آل موسیٰ اور آل ہارون کے باقی ماندہ تبرکات کا بیان

بنو اسرائیل کے تابوت میں آل موسیٰ اور آل ہارون کے باقی ماندہ تبرکات تھے' ان کی تعیین میں صحابہ اور فقہاء تابعین کے مختلف اقوال ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے' امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان باقی متروکہ چیزوں میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور الواح تورات کے ٹکڑے تھے۔ ابو صالح نے بیان کیا: اس میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کا عصا' تورات کی دو تختیاں اور من رکھے ہوئے تھے۔

عطیہ بن سعد نے بیان کیا: اس میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی لاٹھیاں' ان کے کپڑے اور الواح تورات کے ٹکڑے تھے اور بعض نے کہا: اس میں ان کی لاٹھیاں اور نعلین تھیں

ابن زید نے بیان کیا کہ دن کے وقت فرشتے تابوت کو لے کر آئے اور بنو اسرائیل ان کو اپنے سامنے دیکھ رہے تھے سدی نے کہا ہے کہ فرشتوں نے وہ تابوت طالوت کے گھر کے سامنے لا کر رکھ دیا' تب بنو اسرائیل حضرت شمعون (یا حضرت شمویل) کی نبوت اور طالوت کی بادشاہت پر ایمان لے آئے۔ (جامع البیان ج ۲ص ۳۸۹۔ ۳۸۷ 'مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ ابو الحیان اندلسی لکھتے ہیں:

قتادہ نے بیان کیا ہے کہ اس تابوت کو حضرت موسیٰ نے حضرت یوشع کے پاس میدان تیہ میں چھوڑا تھا' وہ وہیں پر رکھا رہا اور بنو اسرائیل اس پر مطلع نہ ہو سکے حتیٰ کہ فرشتوں نے اس کو اٹھا کر طالوت کے گھر میں رکھ دیا' پھر وہ طالوت کی بادشاہت پر ایمان لے آئے۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ اس تابوت کو بھجوایا تا کہ اس نشانی کی عظمت پر لوگ متنبہ ہوں' کیونکہ فرشتے بڑے بڑے

کاموں کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت عظیم قوت عطا کی ہے' کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ کی کتابوں کو اللہ کے پاس سے لاتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام پر نازل کرتے ہیں۔ انہوں نے اللہ کے نافرمانوں پر ان کی سرزمین الٹ دی تھی' وہ روحوں کو قبض کرتے ہیں اور عرش الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہیں' ایسی قوت والے فرشتے جس تابوت کو اٹھا کر لائیں گے وہ اللہ کی طرف سے بہت بڑی نشانی ہوگی!

وہب بن منبہ نے بیان کیا ہے کہ بنو اسرائیل نے اپنے نبی سے پوچھا کہ تابوت کس وقت آئے گا؟ انہوں نے فرمایا: صبح کو وہ تمام رات نہ سوئے حتیٰ کہ صبح انہوں نے آسمانوں اور زمین کے درمیان فرشتوں کے چلنے کی آواز سنی۔

(البحر المحیط ج ۲ ص ۵۸۴' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

امام رازی لکھتے ہیں:

یہ تابوت حضرت آدم علیہ السلام پر نازل کیا گیا تھا' اس میں ان کی اولاد میں سے انبیاء علیہم السلام کی تصویریں تھیں۔ یہ اولاد آدم علیہ السلام سے منتقل ہوتا ہوا حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچا' پھر بنو اسرائیل کے پاس رہا' ان کا جب کسی چیز میں اختلاف ہوتا تو وہ اس تابوت کو حکم بناتے اور جب دشمنوں سے جنگ ہوتی تو اس تابوت کو اپنے آگے رکھتے اور اس کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ سے اپنے دشمنوں کے خلاف فتح کی دعا کرتے' اور فرشتے اس تابوت کو ان کے لشکر کے اوپر اٹھا لیتے' وہ لشکر سے لڑتے رہتے اور جب اس تابوت سے ایک چیخ کی آواز آتی تو ان کو فتح اور نصرت کا یقین ہو جاتا' جب بنو اسرائیل نے اللہ کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد کیا تو اللہ نے ان کے دشمن عمالقہ کو ان پر مسلط کر دیا' عمالقہ نے ان کو شکست دے دی' اور ان سے تابوت چھین کر لے گئے' پھر جن کافروں نے ان سے تابوت چھینا تھا انہوں نے اس تابوت کو گندگی اور بول و براز کی جگہ ڈال دیا' اس وقت کے نبی نے ان کے خلاف دعاء ضرر کی تو اللہ نے ان کافروں کو ایک بلاء میں مبتلا کر دیا' جو شخص بھی اس تابوت کے پاس گندگی ڈالتا اللہ تعالیٰ اس کو بواسیر میں مبتلا کر دیتا' تب ان کافروں نے یہ جانا کہ ان پر یہ مصیبت اس تابوت کی بے حرمتی کی وجہ سے نازل ہوئی ہے' انہوں نے دو بیلوں کے جوئے پر اس تابوت کو رکھ کر ہانک دیا' وہ بیل چلتے رہے' اللہ تعالیٰ نے چار فرشتے ان بیلوں کے ساتھ محافظ کر دیئے حتیٰ کہ وہ فرشتے اس تابوت کو طالوت کے پاس لے آئے اور تب بنو اسرائیل کو طالوت کی بادشاہت کا یقین ہو گیا۔

قفال رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس تابوت کی اضافت حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی آل کی طرف کی گئی ہے' حالانکہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے دور کے صدیوں بعد عہد طالوت تک یہ بنو اسرائیل کی تحویل میں رہا ہے اور تورات میں جو چیزیں تھیں ان کے وارث حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے متبع علماء تھے' اس لیے یہاں پر آل متبعین کے معنی میں ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: "اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ" (المومن: ۴۶)۔

(تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۹۱۔ ۲۸۹' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

دیگر انبیاء علیہم السلام اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات سے استفادہ اور حصول شفاء

قرآن مجید کی اس آیت اور امام رازی کی بیان کردہ تفسیر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی استعمال کی ہوئی چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے کس قدر برکت رکھی ہے' ان تبرکات (عصا' کپڑے اور نعلین) کے وسیلہ سے بنو اسرائیل نے فتح اور نصرت کی دعائیں کیں' وہ فتح یاب ہوئے اور قوم عمالقہ نے ان تبرکات کی بے حرمتی کی تو وہ بواسیر ایسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ اس کی تائید سورۂ یوسف میں ہے' جب حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر رکھی گئی

تو ان کی بینائی لوٹ آئی:

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِىْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِىْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ (یوسف: ۹۳) میری یہ قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔

احادیث میں بھی انبیاء علیہم السلام کے تبرکات سے استفادہ اور استفاضہ کا بیان ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت اسماء بنت ابی بکر کے غلام عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت اسماء نے حضرت عبد اللہ بن عمر کے پاس بھیجا اور کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ ہے' انہوں نے ایک طیالسی کسروانی جبہ نکالا جس کی آستینوں اور گریبانوں پر ریشم کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے' حضرت اسماء نے کہا: یہ جبہ حضرت عائشہ کی وفات تک ان کے پاس تھا' اور جب ان کی وفات ہوئی تو پھر میں نے اس پر قبضہ کر لیا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس جبہ کو پہنتے تھے' ہم اس جبہ کو دھو کر اس کا پانی بیماروں کو پلاتے تھے اور اس جبہ سے ان کے لیے شفا طلب کرتے تھے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۹۲ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عثمان بن عبد اللہ بن موہب بیان کرتے ہیں کہ مجھے میرے گھر والوں نے حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس پانی کا ایک پیالہ دے کر بھیجا۔ اسرائیل نے تین انگلیاں سکیڑ کر اشارہ کیا کہ وہ چھوٹا پیالہ تھا' اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں میں سے ایک بال تھا' اور لوگوں کی عادت تھی کہ جب کسی انسان کو نظر لگ جاتی یا اور کوئی مرض لاحق ہو جاتا تو وہ حضرت ام المؤمنین کے پاس ایک تغار بھیجتا' سو میں نے گھنٹی کی شکل میں ایک نلکی دیکھی جس میں (آپ کے) سرخ رنگ کے موئے مبارک تھے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۷۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

مراد یہ ہے کہ جو شخص بیمار ہو جاتا وہ اپنا برتن حضرت ام سلمہ کے پاس بھیجتا' وہ اس برتن میں ان مبارک بالوں کو رکھ دیتیں اور اس برتن میں ان بالوں کو بار بار دھوتیں' پھر برتن والا حصول شفاء کے لیے اس غسالہ (دھوون) کو پی لیتا یا اپنے بدن پر ملتا تو اس کو اس کی برکت حاصل ہوتی۔ (فتح الباری ج ۱۰ ص ۳۵۳ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

جعفر بیان کرتے ہیں کہ جنگ یرموک کے دن حضرت خالد بن ولید کی ٹوپی گم ہو گئی' انہوں نے کہا: اس کو تلاش کرو' انہوں نے بار بار ڈھونڈا' وہ ٹوپی نہیں ملی' بالآخر وہ ٹوپی مل گئی' وہ بہت بوسیدہ ٹوپی تھی' حضرت خالد نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کیا اور سر کے بال منڈوائے تو صحابہ ہر طرف سے آپ کے بال مبارک لینے کے لیے جھپٹ پڑے' میں نے بھی آپ کے چند بال لے لیے اور میں نے ان کو اس ٹوپی میں رکھ لیا' اس کے بعد میں جس جنگ میں بھی شریک ہوا تو یہ ٹوپی میرے ساتھ ہوتی تھی اور مجھے اس جنگ میں فتح نصیب ہوتی تھی۔ (دلائل النبوۃ ج ۶ ص ۲۴۹ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

اس حدیث کو امام حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔ (المستدرک ج ۳ ص ۲۹۹ 'مطبوعہ دار الباز' مکہ مکرمہ)

حافظ الہیثمی نے اس حدیث کو امام ابویعلیٰ اور امام طبرانی کے حوالوں سے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ دونوں سندیں صحیح ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۹ ص ۳۴۹ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

خبیب بن عبد الرحمان بیان کرتے ہیں کہ جنگ بدر میں خبیب بن عدی کا ہونٹ کٹ کر لٹک گیا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعاب دہن لگا کر اس کو جوڑ دیا۔ (دلائل النبوۃ ج ۳ ص ۹۸۔ ۹۷ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

امام ابویعلیٰ روایت کرتے ہیں:

حضرت قتادہ بن نعمان بیان کرتے ہیں کہ جنگ بدر میں ان کی ایک آنکھ کا ڈھیلا نکل کر رخسار پر لٹک گیا' لوگوں نے ارادہ کیا کہ اس کو کاٹ دیں' انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا' آپ نے فرمایا: نہیں' پھر آپ نے ان کو بلایا اور اپنی ہتھیلی سے اس ڈھیلے کو اپنی جگہ پر رکھ کر دبایا' پھر قتادہ بن نعمان کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان کی کون سی آنکھ کا ڈھیلا نکلا تھا۔

(مسند ابو یعلیٰ موصلی ج ۲ ص ۱۲۶ 'مطبوعہ دار المامون تراث' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

اس حدیث کو امام بیہقی [1]' امام ابن اثیر [2]' حافظ ابن کثیر [3] اور حافظ ابونعیم [4] نے بھی روایت کیا ہے۔

حافظ نور الدین الہیثمی نے اس حدیث کو امام بزار اور امام طبرانی کے حوالوں سے بیان کیا ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۹۵ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام بغوی اور امام دار قطنی نے بھی روایت کیا ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ ان کی سب سے زیادہ صحیح آنکھ تھی۔ (الاصابہ ج ۳ ص ۲۲۵ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

حافظ الہیثمی بیان کرتے ہیں:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ احد کے دن ان کی آنکھ زخمی ہو گئی' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں لعاب دہن لگایا تو وہ ان کی سب سے بہتر آنکھ تھی۔ (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۹۸ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ خیبر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل میں جھنڈا اس شخص کو دوں گا جس کے ہاتھوں پر اللہ فتح فرمائے گا' وہ شخص اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس شخص سے محبت کرتا ہے' اس رات صحابہ یہ غور کرتے رہے کہ کل آپ کس کو جھنڈا عطا فرماتے ہیں' صبح کو صحابہ آپ کے پاس گئے اور ہر ایک کو امید تھی کہ آپ اس کو جھنڈا عطا کریں گے' آپ نے فرمایا: علی بن ابی طالب کہاں ہیں؟ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! ان کی آنکھیں دکھ رہی ہیں' آپ نے فرمایا: انہیں بلاؤ' وہ بلائے گئے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن ڈالا تو ان کی آنکھیں اس طرح ٹھیک ہو گئیں کہ گویا کبھی ان میں درد ہی نہیں ہوا تھا۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۰۶۔ ۶۰۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام احمد بن حنبل روایت کرتے ہیں:

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حضرت علی کو بلانے کے لیے بھیجا' اور فرمایا: آج میں جھنڈا اس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے یا فرمایا: جس سے اللہ اور اس کا

---

[1] امام احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' دلائل النبوۃ ج ۳ ص ۱۰۰ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت

[2] امام ابوالحسن علی بن ابی الکرم المعروف بابن الاثیر الجزری المتوفی ۶۳۰ھ' اسد الغابہ ج ۴ ص ۱۹۵ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت

[3] حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ' البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۹۱ 'مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۳ھ

[4] حافظ ابونعیم احمد بن عبد اللہ اصبہانی متوفی ۴۳۰ھ' دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۴۸۴۔ ۴۸۳ 'مطبوعہ دار النفائس

رسول محبت کرتے ہیں' حضرت علی کی آنکھیں دکھتی تھیں' میں ان کو سہارے سے پکڑ کر لایا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھ میں لعاب دہن ڈالا اور ان کو جھنڈا عطا فرمایا' حضرت علی نے اپنی تلوار سے مرحب کا سر اڑا دیا اور اللہ نے ان کے ہاتھ پر خیبر فتح فرمایا۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۵۲' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

قاضی عیاض مالکی لکھتے ہیں:

عقیلی نے حبیب بن فدیک سے روایت کیا ہے کہ ان کے والد کی آنکھیں سفید ہو گئیں اور انہیں کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن ڈالا تو ان کی آنکھیں روشن ہو گئیں اور میں نے دیکھا کہ وہ اسی سال کی عمر میں سوئی میں دھاگا ڈال لیتے تھے۔

جنگ احد کے دن کلثوم بن حصین کے سینہ میں زخم لگا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں لعاب دہن ڈالا تو وہ ٹھیک ہو گیا۔

جنگ خیبر کے دن حضرت سلمہ بن اکوع کی ٹوٹی ہوئی پنڈلی پر لعاب دہن لگایا تو وہ جڑ گئی۔

کعب بن اشرف کے قتل کے معرکہ میں حضرت زید بن معاذ کی ٹانگ ٹوٹ گئی' آپ نے لعاب دہن لگایا تو وہ جڑ گئی۔

جنگ خندق کے دن حضرت علی بن الحکم کی پنڈلی ٹوٹ گئی' آپ نے لعاب دہن ڈالا تو وہ جڑ گئی۔

جنگ بدر کے دن ابوجہل نے حضرت معوذ بن عفراء کا ہاتھ کاٹ دیا' آپ نے لعاب دہن لگا کر وہ ہاتھ جوڑ دیا۔

جنگ بدر کے دن حضرت حبیب بن یساف کے کندھے پر ضرب لگی' کندھا کٹ کر ایک طرف جھک گیا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کندھا جوڑ کر لعاب دہن لگایا' وہ جڑ گیا۔

قبیلہ خثعم کی ایک عورت آپ کے پاس اپنے بچہ کو لے کر آئی' وہ کسی بیماری کی وجہ سے بول نہیں سکتا تھا' آپ نے پانی منگایا' کلی کی اور ہاتھ دھوئے' پھر وہ غسالہ اس بچہ کو پلایا تو وہ بچہ صحیح ہوش و حواس سے باتیں کرنے لگا۔

آپ کے سامنے کھانا رکھا تھا' آپ وہ کھانا کھا رہے تھے' ایک لڑکی میں حیا بہت کم تھی' وہ کہنے لگی: آپ اپنے منہ سے نوالہ نکال کر مجھے دے دیں' آپ نے وہ نوالہ اس کو دے دیا' آپ سے جس چیز کا بھی سوال کیا جاتا تھا تو آپ منع نہیں فرماتے تھے' جب وہ نوالہ اس کے پیٹ میں پہنچا تو پورے مدینہ میں اس سے زیادہ باحیا کوئی لڑکی نہیں تھی۔

(الشفاء ج ۱ ص ۲۲۲۔ ۲۲۳' مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی ملتان)

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۙ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ

پھر جب طالوت اپنے لشکروں کو لے کر روانہ ہوا تو اس نے (اہل لشکر سے) کہا: بے شک اللہ تمہیں ایک دریا کے ذریعہ

بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ

آزمائش میں مبتلا کرے گا' سو جس نے اس سے (پانی) پی لیا وہ میرے طریقہ پر نہیں ہو گا' اور جس نے اس دریا

فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ فَشَرِبُوا مِنْهُ

سے صرف ایک آدھ چلو کے علاوہ نہ پیا وہ میرے طریقہ پر ہو گا' تو چند لوگوں کے سوا

إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۚ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ

سب نے اس سے خوب پانی پیا' پھر جب طالوت اور اس کے ساتھ ایمان والے اس دریا سے گزر گئے تو (پانی پینے والوں نے)

قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ الَّذِينَ

کہا: آج جالوت اور اس کے لشکریوں سے لڑنے کی ہم میں طاقت نہیں ہے' جن لوگوں کو یہ یقین تھا کہ وہ اللہ سے ملاقات کرنے

يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ

والے ہیں انہوں نے کہا: بہت دفعہ اللہ کے حکم سے قلیل جماعتیں کثیر جماعتوں

فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٢٤٩﴾ وَلَمَّا بَرَزُوا

پر غالب آ جاتی ہیں' اور اللہ (مدد کرنے کے لیے) صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ○ اور جب وہ جالوت

لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ

اور اس کے لشکریوں کے سامنے صف آرا ہوئے تو انہوں نے دعا کی: اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے اور ہم کو ثابت

أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٥٠﴾ فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ

قدم رکھ اور کافروں کی قوم کے خلاف ہماری مدد فرما ○ سو اللہ کے حکم سے انہوں نے ان (کافروں)

اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَ

کو شکست دے دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے انہیں سلطنت اور حکمت عطا فرمائی اور جن چیزوں کا چاہا

عَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ

انہیں علم عطا فرمایا' اور اگر اللہ بعض لوگوں (کے شر) کو بعض (نیک) لوگوں کے سبب سے دور نہ فرماتا تو ضرور زمین

لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٢٥١﴾ تِلْكَ

تباہ ہو جاتی لیکن اللہ تمام جہانوں پر فضل فرمانے والا ہے ○ یہ اللہ

آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٢٥٢﴾

کی آیات ہیں جنہیں ہم حق کے ساتھ آپ پر تلاوت فرماتے ہیں' اور بے شک آپ ضرور رسولوں میں سے ہیں ○

طالوت کی فتح اور جالوت کی شکست کا بیان

طالوت عمالقہ سے قتال کرنے کے لیے اپنے لشکر کے ساتھ بیت المقدس سے روانہ ہوئے' اس کی تفسیر میں حافظ جلال الدین سیوطی نے یہ حدیثیں بیان کی ہیں:

امام ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت کیا ہے کہ اسی ہزار بنو اسرائیل طالوت کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے' اس زمانہ میں جالوت سب سے زیادہ طاقت ور شخص تھا اور اس کی بہت زیادہ ہیبت تھی' وہ اپنے لشکر میں سب سے آگے رہتا تھا اور ابھی اس کا لشکر اس تک نہیں پہنچ پاتا تھا کہ وہ دشمن کو شکست دے دیتا تھا' جب طالوت کا لشکر روانہ ہوا تو طالوت نے اہل لشکر سے کہا: عنقریب اللہ تمہیں ایک دریا کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا کرے گا' سو جس نے اس دریا سے (سیر ہو کر) پی لیا وہ میرے طریقہ پر نہیں ہوگا' اور جس نے اس سے صرف ایک آدھ چلو کے علاوہ نہ پیا وہ میرے طریقہ پر ہو گا' چار ہزار کے سوا باقی سب نفوس نے جالوت کی ہیبت سے اس دریا سے پانی پی لیا اور ان چار ہزار افراد نے ہی اس دریا کو عبور کیا اور باقی ماندہ چھہتر ہزار لشکری دریا عبور نہ کر سکے' جن لوگوں نے دریا سے سیر ہو کر پانی پیا تھا وہ سخت پیاس میں مبتلا ہو گئے اور جنہوں نے چلو بھر کر پانی پیا تھا ان کو پیاس نہیں لگی' اور جب طالوت نے اور اس کے ساتھ مومنوں نے دریا عبور کر لیا اور انہوں نے جالوت کو دیکھا تو انہوں نے کہا: آج ہم جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے اور ان میں سے بھی تین ہزار چھ سو اسی نفوس واپس ہو گئے اور طالوت اہل بدر کی تعداد کے مطابق تین سو تیرہ نفوس کے ساتھ باقی رہ گئے۔

امام ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جس دریا میں ان کو مبتلا کیا گیا تھا وہ فلسطین میں تھا۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۳۱۸' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

حافظ ابن عساکر روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: طالوت کا لشکر ایک لاکھ تین ہزار تین سو تیرہ افراد پر مشتمل تھا' تین سو تیرہ افراد کے سوا باقی سب نے اس دریا سے پانی پی لیا' اور یہ غزوہ بدر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی تعداد کے برابر تین سو تیرہ افراد تھے۔ طالوت نے ان سب کو واپس کر دیا اور ان کے ساتھ صرف تین سو تیرہ افراد رہ گئے' جب طالوت اور ان کے ساتھ مومنوں نے دریا کو عبور کر لیا تو انہوں نے طالوت سے کہا: آج ہم جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے' اور جو لوگ آخرت اور اللہ سے ملاقات پر یقین رکھتے تھے' انہوں نے کہا: کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ اللہ کے حکم سے قلیل جماعت کثیر جماعت پر غالب آ جاتی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کی مدد کرتا ہے' انہوں نے اللہ تعالیٰ سے فتح اور نصرت کی دعا کی اور دعا وہ واحد ہتھیار ہے جو صرف مومنوں کے پاس ہے اور کافروں کے پاس نہیں ہے۔ حضرت شمویل علیہ السلام نے طالوت کو ایک زرہ دی اور فرمایا: جس شخص کے جسم پر یہ زرہ پوری آ جائے گی وہ اللہ کے حکم سے جالوت کو قتل کر دے گا' اور طالوت کے منادی نے ندا کی: جو شخص جالوت کو قتل کرے گا میں اس کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کر دوں گا اور اپنا آدھا ملک اور آدھا مال اس کو دے دوں گا (یہ زرہ حضرت داؤد پر پوری آئی تھی)' حضرت داؤد کا پورا نام و نسب یہ ہے:

داؤد بن ایشا بن حصرون بن فانص بن یہودا بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام۔

وہب بن منبہ نے بیان کیا ہے کہ جب حضرت داؤد نے اپنے توبرے میں ہاتھ ڈالا تو تین پتھر مل کر ایک پتھر بن گئے' حضرت داؤد نے اس پتھر کو نکال کر اپنی منجنیق میں ڈال دیا' اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ میرے بندے داؤد کی مدد کرو' جب حضرت داؤد نے آگے بڑھ کر اللہ اکبر کہا تو جن و انس کو چھوڑ کر تمام فرشتوں اور حاملین عرش نے نعرۂ تکبیر بلند کیا' جب جالوت

نے اللہ اکبر کی گونج دار آوازوں کو سنا تو اس نے یہ سمجھا کہ تمام دنیا نے مل کر اس پر حملہ کر دیا ہے' زور سے آندھی چلی اور ان پر اندھیرا چھا گیا' جالوت خود الٹ کر گر گیا' حضرت داؤد نے منجنیق میں پتھر ڈال کر اسے چھوڑا تو اس سے تین پتھر نکلے' ایک پتھر جالوت کی پیشانی پر لگ کر آر پار ہو گیا اور وہ مقتول ہو کر زمین پر جا گرا' دوسرا پتھر لشکر جالوت کے میمنہ پر جا کر گرا اور ان کو تباہ کر دیا' تیسرا پتھر ان کے میسرہ پر گرا اور ان کو یوں لگا جیسے ان پر پہاڑ آ گرا ہو' وہ سب گھبرا کر پیٹھ موڑ کر بھاگے اور ایک دوسرے کے پاؤں تلے روندے گئے اور کچلے گئے' طالوت بنو اسرائیل میں کامیاب اور کامران ہو کر لوٹے' اللہ نے ان کو ان کے دشمنوں پر فتح اور نصرت عطا فرمائی' طالوت نے حسب وعدہ حضرت داؤد سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا اور ان کو نصف سلطنت اور نصف مال عطا کر دیا۔ اس کے بعد حافظ ابن عساکر نے حضرت ابن عباس اور مکحول سے ایک طویل قصہ روایت کیا ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس فتح کے بعد بنو اسرائیل حضرت داؤد علیہ السلام کو زیادہ پسند کرنے لگے اور وہ چاہتے تھے کہ پورا ملک ان ہی کو دے دیا جائے' طالوت کو اس سے حسد ہوا اور اس نے حضرت داؤد کو قتل کرنے کا پروگرام بنایا لیکن طالوت کی بیٹی جو حضرت داؤد کی اہلیہ تھیں انہوں نے ان کو بروقت سازش سے آگاہ کر دیا' طالوت اور اس کے گھر والے مارے گئے اور تمام بنو اسرائیل حضرت داؤد کی زیر سلطنت آ گئے' اللہ تعالیٰ نے ان کو زبور عطا کی اور ان کو زرہ بنانے کا عمل سکھایا اور پہاڑوں اور پرندوں کو ان کے حکم کے تابع کر دیا' جب حضرت داؤد تسبیح کرتے تو وہ ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ طبری نے بیان کیا ہے کہ طالوت کی حکومت چالیس سال رہی۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۱۱ ص ۱۷۰۔ ۱۶۷ ملخصاً 'مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۰۴ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر اللہ بعض لوگوں (کے شر) کو بعض (نیک) لوگوں کے سبب سے دور نہ فرماتا تو ضرور زمین تباہ ہو جاتی۔ (البقرہ: ۲۵۱)

نیکوکاروں کی برکت سے گنہ گاروں سے عذاب کا دور ہونا

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جالوت اور اس کے لشکر کے فساد کو طالوت اور اس کے لشکر سے دور فرما دیا اور جالوت کو حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ سے قتل کرا دیا' اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ عام قاعدہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے کہ وہ مفسدین کے شر کو مصلحین سے دور فرماتا ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ زمین تباہ ہو جاتی اور قیامت آ جاتی' اس آیت میں مفسدین اور مصلحین کے متعلق کئی تقریریں کی گئی ہیں' بعض ازاں یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ ظالم اور جابر حکمران کے جبر کو کسی نیک شخص کے سبب سے دور کر دیتا ہے جیسے فرعون کے جبر کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جالوت کے جبر کو حضرت داؤد علیہ السلام سے دور کر دیا۔

(۲) اللہ تعالیٰ لوگوں کے کفر کو انبیاء علیہم السلام کی ہدایت اور تبلیغ سے دور فرما دیتا ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ (ابراہیم: ۱)

یہ کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کو (کفر کے) اندھیروں سے (ایمان کی) روشنی کی طرف نکالیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ علماء اور صالحین کے سبب سے لوگوں کو معاصی اور برائیوں سے دور کر دیتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ (آل عمران: ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جس کو لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے' تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ

برائی کو اچھے طریقہ سے دور کرو۔

(المومنون: ۹۶)

وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ. (القصص: ۵۴) اور وہ بدی کو نیکی کے ذریعہ دور کرتے ہیں۔

اس مفہوم میں وہ حکام بھی داخل ہیں جو اللہ کے احکام کو نافذ کرتے ہیں اور اللہ کی حدود کو قائم کرتے ہیں:

(۴) اللہ تعالیٰ انبیاء‘ خلفاء‘ سلاطین اور حکام کے ذریعہ لوگوں سے قتل و غارت گری‘ لوٹ مار اور فتنہ و فساد کو دور فرماتا ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا. (الحج: ۴۰) اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ فرماتا تو ضرور راہبوں کی عبادت گاہیں اور گرجے اور کلیسے اور مسجدیں گرادی جاتیں جن میں اللہ کے نام کا بہ کثرت ذکر کیا جاتا ہے۔

امام (خلیفہ) یا سلطان یا حاکم کی حجت اور اس کی اطاعت پر حسب ذیل احادیث شاہد ہیں:

حافظ نور الدین الہیثمی بیان کرتے ہیں:

حضرت ابوبکرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے دنیا میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے سلطان کی عزت کی اللہ قیامت کے دن اس کو عزت عطا کرے گا‘ اس حدیث کو امام احمد اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور امام احمد کے راوی ثقہ ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم پر میرا حق ہے اور تم پر امراء کا بھی حق ہے‘ جب تک وہ تین چیزوں کو قائم رکھیں‘ جب ان سے رحم طلب کیا جائے تو رحم کریں‘ جب وہ فیصلہ کریں تو عدل کریں اور جب وہ عہد کریں تو اس کو پورا کریں اور جس نے یہ نہیں کیا اس پر اللہ کی‘ فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو‘ ان کا فرض قبول نہ ہوگا نہ نفل‘ اس کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس میں بعض راوی غیر معروف ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۵ ص ۲۱۴۔ ۲۱۵‘ مطبوعہ دار الکتاب العربی‘ بیروت‘ ۱۴۰۲ھ)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بغیر امام کے مر گیا وہ زمانہ جاہلیت کی موت مرا۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند ضعیف ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۵ ص ۲۱۸‘ مطبوعہ دار الکتاب العربی‘ بیروت‘ ۱۴۰۲ھ)

(۵) اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام اور صالحین کے سبب سے کفار اور فساق پر ہونے والے عذاب کو دور کر دیتا ہے‘ اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتا تو اس عذاب سے زمین تباہ ہو جاتی‘ اس کی تصدیق ان آیات میں ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ. (الانفال: ۳۳) اور اللہ (کے شایان شان) نہیں کہ وہ انہیں عذاب دے درآں حالیکہ آپ ان میں موجود ہیں۔

لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○ (الفتح: ۲۵) اگر وہ ایمان والے وہاں سے نکل جاتے تو ہم ان (مکہ والوں میں سے) کافروں کو دردناک عذاب دیتے ○

حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہما السلام نے گاؤں والوں کی ایک گرتی ہوئی دیوار بنادی حالانکہ ان لوگوں نے ان کی میزبانی اور ضیافت سے انکار کر دیا تھا‘ اور دیوار بنانے کی اجرت بھی نہیں لی‘ حضرت خضر نے اس کی وجہ بیان کی:

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا. اور رہی دیوار تو وہ شہر میں رہنے والے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس دیوار کے نیچے ان کا خزانہ تھا اور ان کا باپ ایک

(الکہف: ۸۲) نیک آدمی تھا۔

اور اس کی تصدیق ان احادیث میں ہے' حافظ جلال الدین سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام ابن جریر اور امام ابن عدی نے سند ضعیف کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نیک مسلمان کے سبب سے اس کے پڑوس کے سو گھروں سے بلاؤں کو دور کر دیتا ہے۔

امام ابن جریر نے سند ضعیف کے ساتھ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ایک نیک مسلمان کے سبب سے اس کی اولاد' اولاد در اولاد' اس کے اہل خانہ اور اس کے پڑوس کی اصلاح فرما دیتا ہے اور جب تک وہ شخص ان میں رہے اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرماتا ہے۔

امام ابن ابی حاتم اور امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نمازیوں کے سبب بے نمازیوں سے عذاب کو دور کر دیتا ہے' اور حج کرنے والوں کے سبب سے حج نہ کرنے والوں سے عذاب کو دور کر دیتا ہے' زکوٰۃ دینے والوں کے سبب سے زکوٰۃ نہ دینے والوں کے عذاب کو دور کر دیتا ہے۔

امام احمد' حکیم ترمذی اور امام ابن عساکر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شام میں چالیس ابدال ہیں' جب بھی ان میں سے کوئی شخص فوت ہوتا ہے تو اللہ دوسرے کو اس کا بدل بنا دیتا ہے' ان کے وسیلہ سے بارش ہوتی ہے اور دشمنوں کے خلاف مدد حاصل ہوتی ہے' اور ان کے سبب سے اہل شام سے عذاب دور کیا جاتا ہے اور امام ابن عساکر کی روایت میں ہے' ان کے سبب سے روئے زمین سے بلاء اور غرق کیے جانے کو دور کیا جاتا ہے۔

امام طبرانی نے ''معجم کبیر'' میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں تیس ابدال ہیں' انہی کے وسیلہ سے زمین قائم ہے' انہی کے وسیلہ سے بارش ہوتی ہے اور انہی کے وسیلہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۳۲۰' مطبوعہ مکتب آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں ہم حق کے ساتھ آپ پر تلاوت فرماتے ہیں' اور بے شک آپ ضرور رسولوں میں سے ہیں۔ (البقرہ: ۲۵۲)

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر دلیل اور آپ کو تسلی دینے کا بیان

ان آیات کا اشارہ ان ہزاروں اسرائیلیوں کی طرف ہے جو طاعون کی صورت میں موت کو دیکھ کر شہر چھوڑ کر بھاگے' اللہ تعالیٰ نے ان پر موت طاری کر دی' پھر ایک نبی کی دعا سے ان کو زندہ کر دیا' اور طالوت کو بادشاہ بنایا اور اس کی بادشاہت کی دلیل پر تابوت کو نازل کیا' اور عمالقہ اور جالوت کو حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں قتل کرایا' اور یہ تمام واقعات اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت' اس کی حکمت اور اس کی رحمت پر دلالت کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ان آیات کو آپ پر ہم تلاوت فرماتے ہیں' حالانکہ ان آیات کو آپ پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے تلاوت کیا تھا' اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت جبرائیل کا پڑھنا گویا اللہ کا پڑھنا ہے' اس میں حضرت جبرائیل کو اسی طرح مشرف فرمایا ہے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت افزائی کے لیے فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ ط بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔ (الفتح: ۱۰)

اور اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا: ہم ان آیات کو حق کے ساتھ آپ پر تلاوت کرتے ہیں' تو اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) جس طرح سابقہ امتوں نے اللہ کی راہ میں سختیوں اور مصائب کو برداشت کیا اس طرح آپ کی امت کو بھی جہاد فی سبیل اللہ میں سختیوں اور مشقتوں کو برداشت کرنا چاہیے یعنی یہ واقعات حق ہیں اور ان میں تدبر کر کے ان پر عمل کرنا چاہیے۔

(۲) حق سے مراد یقین ہے یعنی ان واقعات کے ثبوت میں کوئی شک نہیں ہے' کیونکہ سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی یہ واقعات اسی طرح لکھے ہوئے ہیں۔

(۳) ہم نے ان واقعات کو ایسی فصیح و بلیغ عبارات میں بیان کیا ہے کہ کوئی شخص ان کی نظیر نہیں لاسکتا' اور یہ آپ کے برحق ہونے پر دلیل ہے۔

(۴) یہ آیات حق ہیں' یعنی یہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں' یہ القاء شیطان سے ہیں نہ کاہنوں اور جادوگروں کی تحریف ہیں نہ شعر و شاعری ہیں' اس کے بعد فرمایا: بے شک آپ ضرور رسولوں میں سے ہیں' کیونکہ یہ آیات دو وجہ سے آپ کی رسالت پر دلالت کرتی ہیں:

(۱) آپ نے سابقہ امتوں کے یہ واقعات بیان فرمائے جن کی تصدیق اس زمانہ کی آسمانی کتابوں میں موجود تھی حالانکہ سب جانتے تھے کہ آپ نے کسی مکتب میں جا کر پڑھنا نہیں سیکھا' نہ علماء اہل کتاب سے آپ نے یہ واقعات سنے' اس کے باوجود جب آپ نے بغیر پڑھے اور سنے یہ واقعات بالکل درست بیان فرما دیئے تو یہ اس بات پر روشن دلیل ہے کہ اللہ نے اپنی وحی کے ذریعہ آپ کو ان سے مطلع فرمایا اور اس نے اپنا کلام آپ پر نازل فرمایا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر آپ کو یہ بتایا کہ ہر زمانہ میں رسولوں کی مخالفت ہوتی رہی ہے اور ان کا انکار کیا جاتا رہا ہے' سو اگر کچھ لوگ آپ کو نہیں مانتے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے' رسولوں سے ہمیشہ اسی طرح ہوتا آیا ہے' ہر زمانہ میں رسولوں کو اسی لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے اللہ کا پیغام پہنچا دیں اور وہ اپنی خوشی اور اختیار سے اس کو قبول کرلیں' کسی رسول کو بھی جبراً مسلمان کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا' سو اگر بعض ضدی اور ہٹ دھرم لوگ آپ کی رسالت کو نہیں مانتے تو آپ غم نہ کریں کیونکہ آپ کا کلی طور پر نہ مانا جانا عین تاریخ رسالت کے مطابق ہے اور اگر یہ آپ کو رسول نہیں مانتے تو کیا ہوا ہم تو کہتے ہیں کہ آپ ضرور اللہ کے رسولوں میں سے ہیں!

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ

ان سب رسولوں (میں سے) ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے' ان میں سے بعض سے

مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ

اللہ نے کلام فرمایا اور بعض کو (بے شمار درجوں کی) بلندی عطا فرمائی' اور ہم نے عیسیٰ ابن

مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ

مریم کو واضح نشانیاں دیں' اور ہم نے روح القدس (جبرائیل) سے اس کی مدد فرمائی' اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے

الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا

واضح نشانیاں آنے کے بعد آپس میں قتال نہ کرتے' لیکن انہوں نے اختلاف کیا'

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫

سو ان میں سے کوئی ایمان لے آیا اور کسی نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں قتال نہ کرتے'

وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ ﴿۲۵۳﴾ ع

لیکن اللہ وہی کرتا ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے O

رکوع ۳۳ ع ۵ ۱

رسولوں کی باہمی فضیلت

اس سے پہلے اس سورت میں متعدد نبیوں اور رسولوں کا ذکر آ چکا ہے' مثلاً حضرت آدم' حضرت ابراہیم' حضرت اسماعیل' حضرت اسحاق' حضرت یعقوب' حضرت شموئیل' حضرت حزقیل' حضرت داؤد' حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم وعلیٰ نبینا سیدنا محمد الصلوٰۃ والسلام' اس لیے پڑھنے والے کے ذہن میں یہ تجسس پیدا ہوگا کہ آیا یہ تمام نبی اور رسول درجہ اور مرتبہ میں برابر ہیں یا ان میں درجات اور مراتب کا فرق ہے؟ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ان سب رسولوں (میں سے) ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے' یعنی بعض رسولوں کو ایسی خصوصیات اور فضیلتیں عطا فرمائی ہیں جو دوسرے بعض رسولوں کو عطا نہیں فرمائیں' اور چونکہ اس سورت کا اکثر حصہ بنو اسرائیل کے احوال پر مشتمل تھا اور ان میں زیادہ تر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبع تھے اور ان کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار تھے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنو اسرائیل کے آخری نبی تھے اس لیے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی فضیلتوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا کہ ہم نے بعض کو کلام سے سرفراز فرمایا' یعنی ان سے بلاواسطہ کلام فرمایا' ان سے حضرت آدم' حضرت موسیٰ اور حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں' اس کے بعد فرمایا: اور بعض کو (بے شمار درجوں کی) بلندی عطا فرمائی' اس سے مراد سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں' اللہ تعالیٰ نے یہاں صراحۃً آپ کا نام نہیں لیا کیونکہ غیر متناہی درجات کے ساتھ آپ کا مخصوص ہونا اس قدر مشہور اور معروف ہے کہ آپ کا صراحۃً ذکر نہ کیا جائے پھر بھی ذہن آپ کے سوا اور کسی کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا' اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ آپ کو درجات کی بلندی عطا کی ہے' یہ نہیں بیان فرمایا کہ کتنے درجات کی بلندی عطا فرمائی ہے کیونکہ عالم اعداد میں کوئی عدد ایسا ہے ہی نہیں جو آپ کے تمام درجات کو بیان کر سکے اور کسی حد اور کسی عدد کا ذکر نہ فرما کر اس پر متنبہ کیا ہے کہ آپ کے درجات کا کوئی شمار نہیں نہ ان کی کوئی حد ہے' کہ آپ رحمت للعالمین اور خاتم النبیین ہیں' لواء حمد کے حامل اور مقام محمود پر فائز ہیں' تمام سابقہ شریعتوں کے ناسخ ہیں' کوثر و سلسبیل کے ساقی ہیں' عالم میثاق میں تمام انبیاء اور مرسلین سے آپ پر ایمان لانے اور آپ کی نصرت کرنے کا عہد و پیمان لیا گیا' آپ تمام انبیاء اور مرسلین کے قائد ہیں' شب معراج اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے دیدار سے مشرف فرمایا' روز حشر تمام اہل محشر کو آپ کی شفاعت کی احتیاج ہوگی' آپ کی امت کو تمام امتوں پر فضیلت دی گئی ہے' کائنات اللہ کو راضی کرتی ہے اور اللہ آپ کو راضی فرماتا ہے' اور ایسے بہت سے فضائل اور خصائص ہیں جو صرف آپ ہی کو حاصل ہیں' یہ اجمالی ذکر ہے اور ان شاء اللہ ہم اس کو تفصیل سے بھی بیان کریں گے' اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا علیحدہ ذکر فرمایا کیونکہ

ان کے معجزات زیادہ تر حسی تھے' مثلاً مردوں کو زندہ کرنا' مادر زاد اندھوں کو بینا کرنا اور برص اور کوڑھ کے مریضوں کو تندرست کرنا وغیرھا' پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے واضح نشانیاں آنے کے بعد آپس میں قتال نہ کرتے لیکن انہوں نے اختلاف کیا۔ (البقرہ: ۲۵۳)

بعض کفار عرب کے اسلام نہ لانے پر آپ کو تسلی دینا

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ امتوں کی خبر دی ہے کہ حضرت موسیٰ کی قوم نے واضح دلائل اور معجزات دیکھنے کے باوجود کہا: ہمیں اللہ کو ظاہر بابر دکھاؤ' اور ہمارے لیے ایک معبود بنادو جیسے ان کا معبود ہے' اسی طرح حضرت عیسیٰ کی قوم نے روشن دلائل اور معجزات مثلاً مردوں کو زندہ کرنا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنا دیکھا' اس کے باوجود انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اور ان کو قتل کرنے کے درپے ہوئے' اب آپ کو یہ بتایا جارہا ہے کہ آپ بھی سابقہ رسولوں کی طرح ایک رسول ہیں تو اگر آپ کے دلائل اور معجزات پیش کرنے کے باوجود آپ کی قوم کے بعض لوگ آپ کی تکذیب کررہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے:

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ۝ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ۝ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى. (الحج: ۴۲۔ ۴۴)

اور اگر یہ آپ کی تکذیب کرتے ہیں (تو آپ پریشان نہ ہوں) سو ان سے پہلے نوح کی قوم نے اور عاد نے اور ثمود نے تکذیب کی تھی ۝ اور ابراہیم کی قوم نے اور لوط کی قوم نے ۝ اور اصحاب مدین نے (بھی تکذیب کی تھی) اور موسیٰ کی تکذیب کی گئی۔

نیز فرمایا:

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝ (آل عمران: ۱۸۴)

اگر یہ آپ کی تکذیب کریں (تو غم نہ کریں) آپ سے پہلے رسولوں کی بھی تکذیب کی گئی ہے جو واضح دلائل' آسمانی صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے ۝

اور اگر اللہ چاہتا تو نہ وہ لوگ اختلاف کرتے اور نہ آپ کی قوم کے بعض لوگ مخالف ہوتے' اور اللہ تعالیٰ ان سب کو جبراً مسلمان کردیتا اور دنیا میں کبھی کوئی شخص کسی نبی کا مخالف اور کافر نہ ہوتا لیکن یہ چیز اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کے خلاف ہے' اس نے انسان کو حریت فکر اور سوچ و بچار کی آزادی عطا کی ہے' اس نے کفر اور ایمان اور ہدایت اور گمراہی کے راستے پیدا کیے' شیطان کو پیدا کیا جو انسان کو کفر اور گمراہی کی طرف بلاتا ہے اور انبیاء اور رسل مبعوث فرمائے جو اس کو ایمان اور ہدایت کی دعوت دیتے ہیں اور انسان کو عقل سلیم عطا کی' سچ اور جھوٹ اور کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے کا شعور دیا' اب وہ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ انبیاء اور رسل کی دعوت پر کتنے لوگ صراط مستقیم کو اختیار کرتے ہیں اور شیطان کے بہکانے میں آکر کتنے لوگ کفر اور گمراہی کو اختیار کرتے ہیں' اس لیے فرمایا: لیکن انہوں نے اختلاف کیا' سو ان میں سے کوئی ایمان لے آیا اور کسی نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں قتال نہ کرتے لیکن اللہ وہی کرتا ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے۔

اب ہم قرآن مجید اور احادیث صحیحہ مشہورہ سے بیان کریں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں اور رسولوں سے افضل ہیں۔ فنقول و باللہ التوفیق و بہ الاستعانة یلیق۔

''رحمۃ للعلمین'' ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

(۱) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ (الانبیاء: ۱۰۷) اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی تو بھیجا ہے ○

آپ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں اور اپنے وجود اور بقاء میں ہر چیز کو رحمت کی ضرورت ہے تو ساری کائنات آپ کی محتاج ہوئی اور محتاج الیہ محتاج سے افضل ہوتا ہے اس لیے آپ ساری کائنات سے افضل قرار پائے' اور یہ اس کو مستلزم ہے کہ آپ تمام نبیوں اور رسولوں سے بھی افضل ہوں' آپ سے پہلے جو نبی آئے ان کی قوموں نے ان کی تکذیب کی تو ان قوموں پر عذاب آیا' جب آپ کی قوم کے کافروں نے آپ کی تکذیب کی اور عذاب کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ (الانفال: ۳۳) اور اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ آپ کے ہوتے ہوئے ان کافروں کو عذاب دے۔

انبیاء سابقین کے آنے کے بعد کافروں سے عذاب ٹل نہیں سکتا تھا اور آپ کے آنے کے بعد عذاب آ نہیں سکتا تھا۔

تمام نبیوں اور رسولوں کے نبی ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ○ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (آل عمران: ۸۲۔۸۱)

اور یاد کیجئے جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا کہ میں تم کو جو کتاب اور حکمت دوں' پھر تمہارے پاس ایک عظیم رسول آ جائے جو اس (کتاب اور حکمت) کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہے' تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا' فرمایا: کیا تم نے اس کا اقرار کر لیا اور اس پر میرے بھاری عہد کو قبول کر لیا؟ ان سب نے کہا: ہم نے اقرار کیا' فرمایا: سو گواہ ہو جاؤ اور میں خود تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں ○ پھر اس عہد کے بعد جو اس سے پھرا تو وہی لوگ نافرمان (فاسق) ہیں ○

اس آیت سے واضح ہوا کہ انبیاء سابقین میں سے جس نبی کے زمانہ میں بھی آپ مبعوث ہو جاتے' اس نبی پر لازم ہوتا کہ وہ آپ پر ایمان لائے۔

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کے بعد جس نبی کو بھی بھیجا اس سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ عہد لیا کہ اگر اس نبی کی زندگی میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو جائیں تو وہ ضرور ضرور ان پر ایمان لائے اور ضرور ضرور ان کی نصرت کرے اور اپنی قوم کو بھی ان پر ایمان لانے کا حکم دے۔

(جامع البیان ج ۳ ص ۲۳۶' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو میری پیروی کے سوا ان کے لیے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

(المصنف ج ۹ ص ۴۷ 'مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۹ھ)

اس حدیث کو امام بغوی نے بھی روایت کیا ہے۔ (شرح السنہ ج ۳ ص ۱۲۹ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' ۱۴۱۲ھ)

امام ابو یعلی روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم! اگر موسیٰ تمہارے زمانہ میں زندہ ہوتے تو ان کے لیے میرے سوا کسی کی پیروی کرنا جائز نہ ہوتا۔

(مسند ابو یعلی ج ۲ ص ۲۴۷ 'مطبوعہ دار المامون تراث' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

امام احمد نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۳ ص ۳۳۸ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

حافظ الہیثمی [1] اور حافظ سیوطی [2] نے بھی اس حدیث کو بیان کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء اور رسل حکماً اور تقدیراً ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں اور نبی امت سے افضل ہوتا ہے' اس سے واضح ہوا کہ آپ تمام نبیوں اور رسولوں سے افضل ہیں۔

تمام نبیوں اور رسولوں کو عالم میثاق میں کیے ہوئے اس عہد کو پورا کرنے کا انتظار تھا اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○ (البقرہ: ۱۲۹)

اے ہمارے رب! ان میں ایک عظیم رسول بھیج دے' جو ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی باطنی اصلاح کرے' بے شک تو ہی بڑا غالب اور بہت حکمت والا ہے ○

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ کے آنے کی بشارت دی:

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ۖ (الصف: ۶)

اور یاد کیجئے جب عیسیٰ بن مریم نے کہا: اے بنو اسرائیل! بے شک میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں مجھ سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور اس عظیم رسول کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام نامی احمد ہے۔

امام احمد اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ کے نزدیک خاتم النبیین لکھا ہوا تھا اور بے شک (اس وقت) آدم اپنی مٹی میں تھے' اور عنقریب میں تم کو اپنی ابتداء کے متعلق بتاؤں گا' میں ابراہیم کی دعا ہوں اور عیسیٰ کی بشارت ہوں اور میں اپنی ماں کا خواب ہوں جو انہوں نے میری ولادت کے وقت دیکھا اور بے شک ان سے ایک نور نکلا جس سے (ملک) شام کے محلات روشن ہو گئے۔ [3]

---

[1] حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ' مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۷۴ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ

[2] حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ' الدر المنثور ج ۲ ص ۴۸ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران

[3] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۴ ص ۱۲۸ ـ ۱۲۷ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

اس حدیث کو امام طبرانی[1]، امام بزار[2]، امام ابن حبان[3]، امام ابونعیم[4]، امام حاکم[5]، امام بیہقی[6] اور امام بغوی[7] نے بھی روایت کیا ہے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے اس حدیث کی سند صحیح ہے۔[8]

تمام انبیاء کے اوصاف اور کمالات کے جامع ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۚ (الانعام: ۹۰) یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے' سو آپ بھی ان کے طریقہ پر چلیں۔

اس آیت میں عقائد اور اصول مراد نہیں ہیں کیونکہ عقائد اور اصول میں تقلید جائز نہیں ہے اور نہ فروع اور اعمال مراد ہیں کیونکہ آپ کی شریعت تمام شرائع سابقہ کے لیے ناسخ ہے' سو اس سے مراد یہ ہے کہ آپ محاسن اخلاق میں تمام انبیاء علیہم السلام کی پیروی کیجئے' اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تمام اوصاف حمیدہ اور تمام اخلاق حسنہ جو تمام انبیاء علیہم السلام میں متفرق طور پر پائے جاتے تھے آپ ان تمام اوصاف اور اخلاق کے جامع ہیں' گویا آپ کی صفات کو پھیلاؤ تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کی صفات ہیں اور ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کی صفات کو سمیٹو تو وہ تنہا آپ کی صفات ہیں آپ کی ذات بہ منزلہ متن ہے اور تمام انبیاء بہ منزلہ شرح ہیں' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (القلم: ۴) اور بے شک آپ ضرور خلق عظیم پر فائز ہیں ۝

علیٰ کا لفظ استعلاء اور تفوق کے لیے آتا ہے' جیسے کہتے ہیں کہ فلاں شخص سواری پر سوار ہے' سو آپ بہ منزلہ سوار ہیں اور خلق عظیم بہ منزلہ سواری ہے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ دوسرے لوگ نیک ہونے میں نیکی کے تابع ہوتے ہیں اور یہاں نیکی آپ کے تابع ہے' آپ جس کام کو کرلیں وہ اچھا ہے اور جس سے منع فرمادیں وہ برا ہے' خلق عظیم کی باگیں آپ کے ہاتھ میں ہیں' آپ جس طرف ان کا رخ موڑ دیں' عظمتیں وہیں ہیں' آپ عظمتوں کے تابع نہیں ہیں' عظمتیں اپنے عظیم ہونے میں آپ کے تابع ہیں:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (الحشر: ۷) اور رسول تمہیں جو کچھ دیں وہ لے لو' اور جس سے منع فرمائیں اس سے باز رہو۔

يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۚ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ۚ (النور: ۳۵) قریب ہے کہ (آپ کی نبوت کا) تیل خود ہی روشن ہو جائے خواہ اسے (وحی کی) آگ نہ چھوئے' (نزول وحی کے بعد) وہ نور علیٰ نور ہے۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

---

[1] امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ' معجم کبیر ج ۱۸ ص ۲۵۲' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت

[2] امام احمد بن عمرو بن عبدالخالق البزار المتوفی ۲۹۲ھ' کشف الاستار عن زوائد البزار ج ۳ ص ۱۱۳' مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ' بیروت

[3] امام ابوحاتم محمد بن حبان بستی متوفی ۳۵۴ھ' موارد الظمآن ص ۵۱۲' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت

[4] امام ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی متوفی ۴۳۰ھ' حلیۃ الاولیاء ج ۶ ص ۸۹' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ

[5] امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ' المستدرک ج ۲ ص ۶۰۰' مطبوعہ مکتبہ دار الباز' مکہ مکرمہ

[6] امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۱۳۰' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت

[7] امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ' شرح السنۃ ج ۷ ص ۱۳' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۲ھ

[8] علامہ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی متوفی ۷۴۸ھ' تلخیص المستدرک ج ۲ ص ۶۰۰' مطبوعہ مکتبہ دار الباز' مکہ مکرمہ

قریب ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی استعداد کا تیل اپنی صفائی اور ذکاوت کی وجہ سے خود ہی روشن ہو جاتا خواہ اس کو نور قرآن نے نہ چھوا ہوتا۔ امام بغوی نے محمد بن کعب القرظی سے روایت کیا ہے کہ قریب ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن لوگوں کے سامنے وحی سے پہلے ظاہر ہو جاتے۔ (روح المعانی ج ۱۸ ص ۱۷۱ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

قاضی عیاض لکھتے ہیں: قریب ہے کہ اس تیل کی طرح سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت لوگوں پر آپ کے دعوی نبوت سے پہلے ہی ظاہر ہو جاتی۔ (الشفاء ج ۱ ص ۱۱ مطبوعہ عبد التواب اکیڈمی ملتان)

علامہ شہاب الدین خفاجی نے لکھا ہے:

اس آیت میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو اس تیل سے تشبیہ دی گئی ہے جو از خود روشن ہو جاتا ہے۔

(نسیم الریاض ج ۱ ص ۱۱۳ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

ملا علی قاری نے لکھا ہے:

کیونکہ آپ کا ظاہر اور باطن صاف تھا' آپ میں نبوت اور رسالت مجتمع تھی' آپ میں انوار الہیہ بہت قوی تھے اور آپ انوار صمدیہ کے مظہر تھے اور آپ ایسے کامل تھے کہ اگر آپ دعوی نبوت نہ کرتے پھر بھی لوگوں پر آپ کی نبوت ظاہر ہو جاتی۔

(شرح الشفاء علی ھامش نسیم الریاض ج ۱ ص ۱۱۳ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: یا ام المومنین! مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق کے متعلق بتائیے؟ آپ نے فرمایا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں! حضرت عائشہ نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن تھا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۵۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کو امام بخاری[۱]' امام ابو داؤد[۲]' امام نسائی[۳]' امام ابن ماجہ[۴]' امام احمد[۵]' امام دارمی[۶]' اور امام بیہقی[۷] نے بھی روایت کیا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل اور شمائل کی جامع عبارت قرآن مجید ہے اور قرآن مجید کے تیس پاروں کو اگر انسانی پیکر میں ڈھالا جائے تو وہ پیکر مصطفیٰ ہے۔

امام مالک نے فرمایا: ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حسن اخلاق کو مکمل کرنے کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔ (موطا امام مالک ص ۷۰۵ مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور)

امام بغوی روایت کرتے ہیں:

۱۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ' الادب المفرد ص ۸۷۔۸۶ مطبوعہ مکتبہ اثریہ' سانگلہ ہل

۲۔ امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ' سنن ابو داؤد ج ۱ ص ۱۹۰۔۱۸۹ مطبوعہ مکتبہ مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ

۳۔ امام احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ' سنن نسائی ج ۱ ص ۲۴۷ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

۴۔ امام ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ' سنن ابن ماجہ ص ۱۶۸ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

۵۔ امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۶ ص ۲۱۶۔۱۸۸۔۱۱۱۔۹۱۔۵۴ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۳۹۸ھ

۶۔ امام عبداللہ بن عبدالرحمان دارمی متوفی ۲۵۵ھ' سنن دارمی ج ۱ ص ۳۴۸ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان

۷۔ امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' دلائل النبوۃ ج ۱ ص ۳۱۰ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے مکارم اخلاق کو تمام تک پہنچانے اور محاسن افعال کو کمال تک پہنچانے کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔

(شرح السنۃ ج ۷ ص ۱۰۔۹ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

ان احادیث سے واضح ہو گیا کہ آپ سے پہلے کوئی نبی اور رسول مکارم اخلاق اور محاسن افعال کا جامع نہیں تھا' حضرت داؤد اور سلیمان نے شاہی کی زندگی گزاری اس میں فقر کا نمونہ نہیں ہے' حضرت یحییٰ اور عیسیٰ نے تجرد کی زندگی گزاری اس میں ازدواجی زندگی اور عائلی حیات کا نمونہ نہیں ہے' ایسی کامل زندگی جو انسانیت کے ہر شعبہ پر محیط ہو وہ صرف آپ کی زندگی ہے۔ آپ نے بکریاں چرائیں' گڈریوں اور چرواہوں کو اعزاز بخشا' دودھ دوہا' گوالوں کی عزت افزائی کی' جوتی مرمت کر لی' موچیوں کا مقام اونچا کیا' پھٹے ہوئے کپڑے سی لیے' خندقیں کھودیں' تجارت ہو' صنعت و حرفت ہو' حکومت کا کوئی شعبہ ہو' امامت ہو' خطابت ہو' سپہ سالاری ہو' ہر شعبہ میں آپ کا نمونہ ہے۔ اگر ایک حاکم فخر سے کہے کہ میں حکومت چلا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عامل ہوں تو پیوند لگے ہوئے لباس پہن کر زمین کھودنے والا مزدور بھی کہے گا کہ میں بھی رسول اللہ کی سنت کا امین ہوں' سو ایسی کامل زندگی نبیوں اور رسولوں میں سے کسی نے نہیں گزاری' آپ تمام نبیوں اور رسولوں میں مکارم اخلاق اور محاسن افعال کے سب سے زیادہ جامع ہیں' اس لیے سب رسولوں میں آپ ہی سب سے افضل ہیں۔

رسالت کے عموم کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا (سبا: ۲۸)

اور ہم نے آپ کو (قیامت تک کے) تمام لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہی بنا کر بھیجا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ آپ قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے رسول ہیں' نیز فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِىۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰى عَبۡدِهٖ لِيَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِيۡنَ نَذِيۡرَا ۙ‏ (الفرقان: ۱)

وہ بڑی برکت والا ہے جس نے اپنے (مقدس) بندہ پر فیصلہ کرنے والی کتاب نازل کی تا کہ وہ تمام جہانوں کے لیے ڈرانے والے ہوں ○

اسی طرح احادیث میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا عموم اور شمول بیان کیا گیا ہے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی (نبی) کو نہیں دی گئیں' ایک ماہ کی مسافت سے میرا رعب طاری کر کے میری مدد کی گئی ہے' تمام روئے زمین میرے لیے مسجد بنا دی گئی ہے اور طہارت (تیمم) کا ذریعہ بنا دی گئی ہے' سو میری امت کا جو شخص بھی نماز کا وقت پائے وہ (جہاں بھی ہو) نماز پڑھ لے' اور میرے لیے مال غنیمت کو حلال کر دیا گیا اور وہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں کیا گیا' اور مجھے شفاعت (کبریٰ) عطا کی گئی ہے اور ہر نبی بالخصوص اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام بغوی[1] اور امام دارمی[2] نے بھی روایت کیا ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

۱۔ امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ' شرح السنۃ ج ۷ ص ۵ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۲ھ

۲۔ امام عبد اللہ بن عبد الرحمان دارمی متوفی ۲۵۵ھ' سنن دارمی رقم الحدیث: ۱۳۹۵' دار المعرفۃ' بیروت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے چھ وجوہ سے انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے' مجھے جوامع الکلم عطا کیے گئے' میری رعب سے مدد کی گئی' میرے لیے مال غنیمت حلال کر دیا گیا' تمام روئے زمین کو میرے لیے طہارت کا آلہ (تیمم) اور مسجد بنا دیا گیا' مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا اور مجھ پر نبوت ختم کی گئی۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۹۹' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں' مجھے ہر کالے اور گورے کی طرف مبعوث کیا گیا ہے اور میرے لیے تمام زمین مسجد اور آلہ طہارت (تیمم) بنا دی گئی ہے۔ الحدیث (مسند احمد ج ۴ ص ۴۱۶' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے تمام راوی صحیح ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۵۸' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

امام احمد نے اس حدیث کو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔

(مسند احمد ج ۵ ص ۱۶۲۔ ۱۶۱' مطبوعہ مکتبہ اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

حافظ الہیثمی نے امام بزار کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نبی بالخصوص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور میں تمام جن اور انس کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔

(مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۵۸' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

حافظ ابن عساکر روایت کرتے ہیں:

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمیں چار ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو ہم سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں اور میں نے اپنے رب سے پانچویں چیز مانگی تو میرے رب نے وہ بھی عطا کر دی' پہلے نبی کسی ایک شہر (قوم) کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور اس سے تجاوز نہیں کرتا تھا اور مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۲ ص ۱۳۴' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں اور مجھے اس پر فخر نہیں ہے' مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے کالوں کی طرف اور گوروں کی طرف اور مجھ سے پہلے نبی کو ایک قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا۔ الحدیث

(مختصر تاریخ دمشق ج ۲ ص ۱۳۴' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

اس حدیث کو امام طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔ (معجم کبیر ج ۱۱ ص ۶۱۔ ۵۱' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

امام طبرانی نے اس حدیث کو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت کیا ہے۔

(معجم کبیر ج ۱۲ ص ۴۱۵' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

قرآن مجید اور بہ کثرت احادیث صحیحہ سے واضح ہو گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام جن و انس بلکہ تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیے گئے ہیں' ہم البقرہ: ۴۷ کی تفسیر میں باحوالہ بیان کر چکے ہیں کہ گوہ اور ہرنی نے آپ کا کلمہ پڑھا' درختوں نے آپ کی اطاعت کی' پتھروں نے آپ کو سلام عرض کیا اور اونٹنی آپ کے فراق میں روئی اور یہ وہ عظیم خصوصیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے سوا اور کسی نبی کو عطا نہیں کی' اس سے واضح ہوا کہ آپ تمام نبیوں اور رسولوں سے افضل ہیں۔

خاتم الانبیاء ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسول ہونا

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ (الاحزاب: ۴۰) محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے آخر۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخر النبیین ہیں' ہر نبی کی شریعت بعد میں آنے والے نبی سے منسوخ ہوتی رہی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخر الانبیاء ہیں اور قیامت تک کے نبی ہیں اس لیے آپ کی شریعت باقی اور غیر منسوخ ہے اور اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ تمام انبیاء سے افضل ہوں۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پانچ اسماء ہیں: میں محمد اور احمد ہوں' میں ماحی ہوں جس کے سبب سے اللہ کفر کو مٹاتا ہے' میں حاشر ہوں لوگ میرے قدموں میں جمع کیے جائیں گے' اور میں عاقب (آخری نبی) ہوں۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۰۱' ج ۲ ص ۷۴۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں محمد اور احمد ہوں' میں ماحی ہوں جس کے سبب سے اللہ کفر کو مٹاتا ہے' میں حاشر ہوں میری ایڑیوں پر لوگ جمع کیے جائیں گے اور میں عاقب ہوں اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۶۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی)

اس حدیث کو امام ترمذی [۱] اور امام بغوی [۲] نے بھی روایت کیا ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے نبیوں کی مثال ایسے ہے جیسے کسی شخص نے بہت حسین و جمیل گھر بنایا لیکن اس کے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ باقی ہو' لوگ اس گھر کے گرد طواف کریں اور تعجب کریں اور کہیں کہ کیوں نہ یہ ایک اینٹ بھی رکھ دی گئی تو میں وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں [۳] اس حدیث کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۴۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنو اسرائیل کے انبیاء ان کا سیاسی نظام چلاتے تھے۔ جب بھی کوئی نبی فوت ہوتا تو دوسرا نبی اس کا خلیفہ ہو جاتا اور بے شک میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔
(صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۹۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام مسلم [۴] اور امام احمد [۵] نے بھی روایت کیا ہے۔

۱۔ امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی ص ۵۹۷' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

۲۔ امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ' شرح السنۃ ج ۷ ص ۱۵' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۲ھ

۳۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ' صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۰۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ

۴۔ امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۲۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ

۵۔ امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۷' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کی طرف روانہ ہوئے اور حضرت علی کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا' حضرت علی نے کہا: آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں' آپ نے فرمایا: کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم میرے لیے ایسے ہو جیسے موسیٰ کے لیے ہارون تھے' مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔
(صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۳۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی)

اس حدیث کو امام مسلم[1]' امام ترمذی[2]' امام ابن ماجہ[3]' امام احمد[4] اور امام ابن حبان[5] نے بھی روایت کیا ہے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد رسالت اور نبوت منقطع ہو چکی ہے' سو میرے بعد کوئی رسول ہوگا نہ نبی[6]

اس حدیث کو امام احمد[7]' امام حاکم[8] اور امام ابن ابی شیبہ[9] نے بھی روایت کیا ہے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تک میری امت کے قبائل مشرکین کے ساتھ لاحق نہ ہوں' اور جب تک بتوں کی عبادت نہ کی جائے' اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی' اور عنقریب میری امت میں تیس کذاب ہوں گے جن میں ہر ایک نبوت کا دعویٰ کرے گا حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ (جامع ترمذی ص ۳۲۳ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام ابوداؤد[10]' امام احمد[11] اور امام بیہقی[12] نے بھی روایت کیا ہے۔

کثرت معجزات کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ○ بے شک ہم ہی نے قرآن نازل کیا اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں○ (الحجر: ۹)

---

[1] امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ

[2] امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی ص ۵۳۵۔ ۵۳۴ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[3] امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ' سنن ابن ماجہ ص ۱۲ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[4] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۱ ص ۱۸۳۔ ۱۸۲۔ ۱۷۷' ج ۳ ص ۳۳۸۔ ۳۲ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

[5] امام ابوحاتم محمد بن حبان البستی متوفی ۳۵۴ھ' الاحسان بہ ترتیب صحیح ابن حبان ج ۱۰ ص ۴۱ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۰۷ھ

[6] امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی ص ۳۳۱ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

[7] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۳ ص ۲۶۷ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

[8] امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ' المستدرک ج ۴ ص ۳۹۱ 'مطبوعہ مکتبہ دار الباز' مکہ مکرمہ

[9] امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ' المصنف ج ۱۱ ص ۵۳ 'مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ

[10] امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ' سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۲۸ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ

[11] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۵ ص ۲۷۸ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

[12] امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' دلائل النبوۃ ج ۶ ص ۳۸۱ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ (حم السجدہ: ۴۲) اس قرآن مجید میں سامنے سے باطل آ سکتا ہے نہ پیچھے سے۔

پہلی آیت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن مجید میں کسی آیت بلکہ کسی حرف کی کمی نہیں ہو سکتی اور دوسری آیت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن مجید میں کسی حرف کا اضافہ نہیں ہو سکتا' غرض قرآن مجید کے یہ دو دعوے ہیں' اس میں کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی ہو سکتی ہے' اور تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ کوئی شخص قرآن مجید کی کسی سورت بلکہ کسی آیت کی بھی نظیر اور مثیل نہیں لا سکتا:

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ ۖ (البقرہ: ۲۳) اور ہم نے جو اپنے (مقدس) بندے پر کلام نازل کیا ہے اگر تم اس کے (منزل من اللہ ہونے کے) متعلق شک میں ہو تو اس (کلام) کی مثل کوئی سورت لے آؤ۔

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ۝ (الطور: ۳۴) اگر وہ سچے ہیں تو اس قرآن جیسی کوئی آیت لے آئیں O

قرآن مجید کی چھ ہزار سے زیادہ آیتیں ہیں اور ہر آیت میں قرآن مجید کی حقانیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت پر تین دلیلیں ہیں: (۱) قرآن مجید میں زیادتی نہیں ہو سکتی (۲) قرآن مجید میں کمی نہیں ہو سکتی (۳) اس کی کوئی مثل نہیں لا سکتا' اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے صدق پر اٹھارہ ہزار سے زائد دلائل ہو گئے۔

علوم وفنون میں دن بدن ترقی ہو رہی ہے اور اسلام کے مخالفین اور آپ کی رسالت کے منکرین کی تعداد بھی دن بدن بڑھ رہی ہے' اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ چودہ سو سال سے زیادہ گزر گئے اور اب تک کسی نے اس چیلنج کو نہیں توڑا' نہ کوئی شخص قرآن مجید کی کسی آیت کی کوئی مثال لا سکا نہ اس میں کمی یا زیادتی کر سکا' اگر اس چیلنج کو توڑنا کسی کے بس کی بات ہوتی تو اب تک وہ اس چیلنج کو توڑ چکا ہوتا۔

دوسرے انبیاء علیہم السلام کے معجزات مثلاً لاٹھی اور اونٹنی وغیرہ اعیان و جواہر کے قبیل سے تھے لیکن وہ باقی نہ رہے اور قرآن مجید اعراض اور معانی کے قبیل سے ہے اور ہنوز باقی ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک بلکہ اس کے بعد تک باقی رہے گا' خلاصہ یہ ہے کہ جس قدر کثیر اور قوی دلائل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر قائم کیے گئے وہ کسی اور نبی اور رسول کی نبوت پر قائم نہیں کیے گئے' دیگر انبیاء علیہم السلام کی نبوت پر دلیل فانی معجزات ہیں' آپ کی نبوت پر دلیل باقی رہنے والا' اللہ کا کلام قرآن مجید ہے۔

آپ کے دین کے ناسخ الادیان ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

اللہ تعالیٰ نے آپ کے لائے ہوئے دین کو اپنی نعمت تامہ قرار دیا اور فرمایا:

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۚ (المائدہ: ۳) آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا۔

آپ کے دین کو ادیان سابقہ کے لیے ناسخ قرار دیا اور فرمایا:

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ (آل عمران: ۸۵) اور جس شخص نے اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو طلب کیا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام انبیاء اور رسل پر عظیم فضیلت ہے کہ آفتاب محمدیت کے طلوع کے بعد اب کسی نبی یا رسول کی شریعت کا چراغ نہیں جلے گا' حتیٰ کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ظاہری حیات سے زندہ ہوتے تو آپ کی پیروی کرتے اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا تو وہ بھی آپ کی شریعت کی پیروی کریں گے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس وقت تمہارا کیا مرتبہ ہوگا جب تم میں ابن مریم کا نزول ہوگا اور امام تم میں سے ہوگا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۹۰ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا دین تمام ادیان سے افضل ہے اس لیے ضروری ہوا کہ آپ تمام انبیاء اور رسل سے افضل ہوں۔

امت کی کثرت اور افضلیت کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (آل عمران: ۱۱۰) تم ان امتوں میں سب سے بہترین امت ہو جن کو لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا' تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

آپ کی امت کے افضل ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ سابقہ امتوں میں بھی ایمان لانے والے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی امت کو ''یایھا الذین امنوا. اے ایمان والے'' کہہ کر مخاطب نہیں فرمایا بلکہ 'مثلاً یا بنی اسرائیل' کہہ کر پکارا اور یہ اس امت کی بہت بڑی فضیلت ہے کہ اس کو ''یایھا الذین امنوا'' سے خطاب کیا کیونکہ اس پر ایمان لانے کے تو بہت دعویٰ دار ہیں لیکن فضیلت ان کی ہے جن کو وہ خود ''یایھا الذین امنوا'' فرمائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن جب انبیاء علیہم السلام کی ان کے امتی تکذیب کریں گے اور کہیں گے: ہمیں کسی نے خدا کے عذاب سے نہیں ڈرایا' اس وقت انبیاء علیہم السلام کی صداقت پر آپ کی امت گواہی دے گی:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ. (البقرہ: ۱۴۳) اور اے مسلمانو! اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا تاکہ تم لوگوں (انبیاء علیہم السلام) پر گواہ ہو جاؤ۔

اور یہ اس امت کی کتنی بڑی فضیلت ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے مقدمہ میں گواہ ہوگی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کے متعلق فرمایا:

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ. (البقرہ: ۴۷) اے بنو اسرائیل! میری نعمت کو یاد کرو۔

اور آپ کی امت کے متعلق فرمایا:

فَاذْكُرُوْنِيْٓ. (البقرہ: ۱۵۲) تم میری ذات کو یاد کرو۔

بنو اسرائیل کی رسائی صرف اللہ کی صفت انعام تک تھی اور آپ کی امت کی رسائی اللہ کی ذات تک ہے' کیونکہ باقی امتوں کے نبیوں نے اللہ کی صفات کا مشاہدہ کیا اور آپ نے اللہ کی ذات کا مشاہدہ کیا' وہ صرف صفات کے مظہر تھے آپ عین ذات کے مظہر ہیں' اس لیے ان کی امتیں صفات کو یاد کرتی ہیں اور آپ کی امت ذات کو یاد کرتی ہے۔

امت کی وجہ سے آپ کے افضل الرسل ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کی امت کی تعداد تمام امتوں کے مجموعہ سے بھی زیادہ ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نبی کو اتنے معجزات دیئے گئے جن کی مثل پر ایک بشر ایمان لے آئے اور مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام عطا فرمایا ہے اور مجھے امید ہے کہ میری امت قیامت کے دن ان سب سے زیادہ ہوگی۔[1] اس حدیث کو امام مسلم[2] اور امام بغوی[3] نے بھی روایت کیا ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر امتیں پیش کی گئیں' میں نے ایک نبی کو دیکھا ان کے ساتھ ایک جماعت تھی' ایک اور نبی کو دیکھا ان کے ساتھ ایک اور دو آدمی تھے' ایک اور نبی کو دیکھا ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا' پھر میرے سامنے ایک عظیم جماعت بلند کی گئی' میں نے گمان کیا یہ میری امت ہوگی! مجھے بتایا گیا کہ یہ حضرت موسیٰ کی امت ہے' البتہ آپ آسمان کے کنارے پر دیکھیں' میں نے دیکھا تو ایک بہت بڑی جماعت تھی' پھر مجھ سے کہا گیا: آپ دوسرے کنارے کو دیکھیں تو وہاں بھی ایک بہت بڑی جماعت تھی' مجھ سے کہا گیا کہ یہ آپ کی امت ہے اور ان کے ساتھ ستر ہزار ایسے لوگ ہیں جو جنت میں بغیر حساب اور عذاب کے داخل ہوں گے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان کے سوا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا' اے اللہ! کیا میں نے تبلیغ کر دی ہے؟ اے اللہ! تو گواہ ہو جا' پھر فرمایا: کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تم چوتھائی اہل جنت ہو؟ ہم نے کہا: ہاں! یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تم اہل جنت کی تہائی ہو؟ ہم نے عرض کیا: ہاں! یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تم نصف اہل جنت ہو؟ تمہارے مقابلہ میں دوسری امتیں ایسی ہوں گی جیسے سفید بیل میں ایک سیاہ بال ہو یا سیاہ بیل میں ایک سفید بال ہو۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث میں ہے کہ آپ کی امت نصف اہل جنت ہوگی اور دوسری حدیث میں ہے کہ اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی ان میں سے اسی صفیں آپ کی امت کی ہوں گی یعنی آپ کی امت کل اہل جنت کی دو تہائی ہوگی اور آپ کی امت کا کل نبیوں کی امتوں سے تعداد میں سب سے زیادہ ہونا اور مرتبہ میں سب سے افضل ہونا اس کی دلیل ہے کہ آپ تمام نبیوں اور رسولوں میں سب سے افضل ہیں۔

مقام محمود پر فائز ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا○ عنقریب آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر جلوہ گر فرمائے گا○ (الاسراء: ۷۹)

مقام محمود سے مراد وہ مقام ہے جس مقام پر فائز ہونے والے کی تمام اولین اور آخرین حمد کریں گے' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا' اور آپ کو شفاعت کبریٰ عطا کی جائے گی اور آپ تمام اہل محشر کی شفاعت کریں گے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

---

1. امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ' صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۴' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ
2. امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم ج ۱ ص ۸۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ
3. امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ' شرح السنۃ ج ۷ ص ۵' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۲ھ

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اذان سننے کے بعد یہ کہا: اے اللہ! اس دعوت تامہ اور اس کے بعد کھڑی ہونے والی نماز کے رب! محمد کو وسیلہ (جنت میں ایک بلند مقام) اور فضیلت عطا فرما اور ان کو اس مقام محمود پر فائز فرما جس کا تو نے وعدہ کیا ہے' اس شخص کے لیے میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔ (جامع ترمذی ص ۵۸' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اور امام مسلم نے روایت کیا ہے:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم مؤذن سے اذان سنو تو اذان کے کلمات کی مثل کہو' پھر مجھ پر درود پڑھو کیونکہ جو شخص مجھ پر ایک بار درود پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے' پھر میرے لیے وسیلہ کی دعا کرو' وہ جنت میں ایک مقام ہے' جو اللہ کے بندوں میں سے صرف ایک بندہ کو ملے گا اور مجھے امید (بہ معنی یقین) ہے کہ وہ بندہ میں ہوں' سو جس نے میرے لیے وسیلہ کی دعا کی اس کے حق میں میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۶۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حافظ ابن عساکر روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل نے حضرت موسیٰ کو کلام عطا کیا اور مجھے دیدار عطا کیا اور مجھے مقام محمود اور حوض مورود (جس حوض پر لوگ وارد ہوں گے) کی فضیلت عطا کی۔

(مختصر تاریخ دمشق ج ۲ ص ۱۰۸' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

قرآن مجید اور ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مقام محمود صرف ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہو گا' نیز وسیلہ (جنت میں مقام بلند) بھی صرف آپ کو عطا ہو گا اور اس میں آپ کے افضل الرسل ہونے کی واضح دلیل ہے۔

اللہ کی رضا جوئی کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۪ (البقرہ: ۱۴۴)

بے شک ہم آپ کے رخ (انور) کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں' سو ہم آپ کو ضرور اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس پر آپ راضی ہیں۔

وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۝ (طٰہٰ: ۱۳۰)

اور رات کے کچھ اوقات (مغرب اور عشاء) میں اس کی تسبیح کیجئے اور دن کے درمیانی کناروں میں اس کی تسبیح کیجئے تاکہ آپ راضی ہو جائیں ۝

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝ (الضحیٰ: ۵)

اور عنقریب آپ کا رب آپ کو ضرور اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے ۝

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں صرف یہی جانتی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی خواہش پوری کرنے میں بہت جلدی فرماتا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۶۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۷۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

نیز امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ وہ آیات تلاوت کیں جن میں حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ کے شفاعت کرنے کا ذکر ہے' پھر آپ نے ہاتھ بلند کیے اور روتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! میری امت! میری امت! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبرائیل! محمد کے پاس جاؤ حالانکہ آپ کا رب خوب جانتا تھا (پھر بھی) فرمایا: ان سے پوچھو آپ کس وجہ سے رو رہے ہیں؟ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آ کر آپ سے پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بتایا کہ آپ نے کیا کہا تھا' حالانکہ اللہ خوب جانتا تھا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبرائیل! محمد کے پاس جاؤ اور کہو: بے شک ہم آپ کو آپ کی امت کے متعلق راضی کر دیں گے اور آپ کو رنجیدہ نہیں ہونے دیں گے۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

تمام انبیاء اور رسل اللہ کو راضی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہمارے رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرتا ہے اور یہ آپ کے افضل الرسل ہونے کی واضح دلیل ہے۔

آپ کے ذکر کی رفعت کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ (الم نشرح: ۴) اور ہم نے آپ کے لیے آپ کا ذکر بلند کر دیا ۝

دنیا میں ہر وقت کسی نہ کسی جگہ پر سورج غروب ہو رہا ہے اور غروب آفتاب کے وقت مغرب کی اذان ہو رہی ہے' اسی طرح ہر وقت کہیں نہ کہیں فجر ہو رہی ہے اور جہاں طلوع فجر ہے وہاں فجر کی اذان ہو رہی ہے وعلی ہذا القیاس' اور اذان میں جہاں اللہ کا نام بلند کیا جا رہا ہے وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی بلند کیا جا رہا ہے' خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر وقت کسی نہ کسی جگہ پر آپ کا نام بلند کیا جا رہا ہے اور جس طرح کلمۂ شہادت میں' اذان میں' اور تشہد میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ آپ کا نام رکھا ہے' انبیاء سابقین میں سے کسی کا نام اپنے نام کے ساتھ نہیں رکھا' نیز اللہ تعالیٰ نے آپ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا' آپ کی بیعت کو اپنی بیعت قرار دیا' فرمایا:

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۚ (النساء: ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ ۗ (الفتح: ۱۰) بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ نے آپ کی عزت کو اپنی عزت کے ساتھ مقرون کیا اور فرمایا: ''وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ''. (المنافقون: ۸) ''اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ''. (التوبہ: ۶۲)

اور آپ کی اجابت کو اپنی اجابت کے ساتھ مقرون کیا اور فرمایا: ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ'' (الانفال: ۲۴)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی بلندی کا اس سے اندازہ کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عزت اور سر بلندی کے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو اپنے ساتھ ذکر کیا ہے اور فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ (الاحزاب: ۵۶) اللہ تعالیٰ اور اس کے سارے فرشتے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر صلوٰۃ پڑھتے (رحمت بھیجتے) رہتے ہیں۔

گویا ازل سے لے کے ابد تک کوئی وقت نہیں گزرتا مگر اس وقت میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ پڑھتا رہا ہے' حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ پر یوم ولادت' یوم وفات اور یوم بعثت میں صرف تین بار اللہ نے سلام نازل کرنے کا ذکر

فرمایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر زمان و مکان کی کسی قید کے بغیر اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ نازل کرنے کا ذکر فرمایا' پھر وہاں سلام کا ذکر تھا یہاں صلوٰۃ کا ذکر ہے' وہاں تین ایام کی قید ہے' یہاں اعداد و شمار کا ذکر نہیں ہے نہ الوہیت کے عدم کا تصور ہے نہ آپ کے ذکر کے انقطاع کا تصور ہے۔ ورفعنا لك ذكرك.

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہی پر پہنچے تو آپ نے اپنے رب سے کلام کیا' آپ نے عرض کیا: تو نے ابراہیم کو خلیل بنایا اور ان کو ملک عظیم عطا کیا' اور موسیٰ سے کلام کیا اور داؤد کو ملک عظیم عطا کیا اور ان کے لیے لوہے کو نرم کیا' اور ان کے لیے پہاڑوں کو مسخر کیا اور سلیمان کو ملک عظیم عطا کیا اور ان کے لیے پہاڑ' جن اور انسان مسخر کر دیئے اور شیطانوں اور ہوا کو ان کے لیے مسخر کر دیا' اور ان کو ایسی سلطنت عطا کی جو ان کے بعد اور کسی کو سزاوار نہ ہوگی' اور عیسیٰ کو تورات اور انجیل کا علم دیا' اور ان کو یہ حکمت دی کہ وہ برص اور کوڑھ کے مریضوں کو تندرست کرتے تھے اور تیرے اذن سے مردوں کو زندہ کرتے تھے' اور تو نے ان کو اور ان کی ماں کو شیاطین سے اپنی پناہ میں رکھا' اللہ عزوجل نے فرمایا: میں نے آپ کو خلیل بنایا اور تورات میں لکھا ہوا ہے کہ وہ خلیل الرحمن ہیں' اور آپ کو تمام لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنایا اور آپ کے لیے شرح صدر کیا' اور آپ سے مشکل احکام کا بوجھ دور کیا' اور آپ کے ذکر کو بلند کیا' اور جب بھی میرا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ آپ کا ذکر کیا جاتا ہے اور آپ کی امت کو سب سے بہتر امت بنایا' اور امت وسط بنایا اور آپ کی امت کو اول اور آخر بنایا' اور آپ کی امتوں کے دل اناجیل کی کیفیت پر بنائے اور آپ کی امت جب بھی خطبہ پڑھتی ہے تو یہ شہادت دیتی ہے کہ آپ میرے بندے اور میرے رسول ہیں' اور آپ کو باعتبار خلقت کے اول الانبیاء اور بہ لحاظ بعثت کے آخر الانبیاء بنایا اور آپ کو عرش کے خزانہ کے نیچے سے سورۂ فاتحہ دی گئی جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئی' اور آپ کو فاتح اور خاتم بنایا۔ (دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۴۰۳۔ ۴۰۲' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

آپ کے ذکر کی رفعت سے متعلق قرآن مجید کی آیات اور اس حدیث میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل الرسل ہونے کا واضح بیان ہے۔

دنیا میں اعلان مغفرت ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا ۝ (الفتح: ۳۔۱)

بے شک ہم نے آپ کو روشن فتح عطا فرمائی ○ تاکہ اللہ آپ کے لیے آپ کے اگلے اور پچھلے (بہ ظاہر) خلاف اولیٰ سب کام معاف فرما دے اور آپ پر اپنی نعمت پوری کر دے اور آپ کو صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھے ○ اور اللہ آپ کو غالب نصرت عطا فرمائے ○

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حدیبیہ سے لوٹتے وقت یہ آیت نازل ہوئی: "ليغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر"[1] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر ایک ایسی آیت نازل ہوئی ہے جو

---

[1] ذنب کا معنی ہے: خطا' جرم اور اثم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال پر ذنب کا اطلاق مجازاً ہے کیونکہ آپ معصوم ہیں اور معصوم کا ذنب نہیں ہوتا اس لیے یہاں ذنب سے مراد ہے: بہ ظاہر خلاف اولیٰ کام۔ اب سوال یہ ہے کہ جب آپ کے گناہ نہیں ہیں تو مغفرت ذنوب کا کیا معنی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب معصوم کے ساتھ مغفرت کا تعلق ہوتا ہے' تو اس سے مراد ہوتا ہے درجات کا بلند کرنا اور اپنی رحمت سے نوازنا۔

مجھے تمام روئے زمین سے زیادہ محبوب ہے' پھر آپ نے اس آیت کو صحابہ کرام کے سامنے پڑھا' صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کو مبارک ہو' اللہ تعالیٰ نے بیان کر دیا کہ آپ کے ساتھ قیامت کے دن کیا کیا جائے گا' لیکن ہمارے ساتھ کیا کیا جائے گا؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ان جنات میں داخل کرے گا جن کے نیچے دریا بہتے ہیں۔ آپ نے یہ آیت ''فوزاً عظیماً'' تک تلاوت فرمائی۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(جامع ترمذی ص ۴۷۹' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام بخاری[1] اور امام مسلم[2] نے بھی روایت کیا ہے:

امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام لوگوں کو جمع فرمائے گا' لوگ کہیں گے: کاش! ہم اپنے رب کے حضور شفاعت طلب کرتے' حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس جگہ ہم کو راحت عطا فرماتا' پھر وہ حضرت آدم کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ آپ وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور آپ میں اپنی (پسندیدہ) روح پھونکی اور فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا اور انہوں نے آپ کو سجدہ کیا' آپ ہمارے رب کے حضور ہماری شفاعت کیجئے' حضرت آدم فرمائیں گے: میں تمہارا کام نہیں کر سکتا' اور اپنی (اجتہادی) خطاء یاد کریں گے' تم نوح کے پاس جاؤ (اخیر حدیث تک) پھر لوگ حضرت عیسیٰ کے پاس جائیں گے' وہ کہیں گے کہ میں تمہارا کام نہیں کر سکتا' تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ' ان کے اگلے اور پچھلے ذنب (یعنی بہ ظاہر خلاف اولیٰ کاموں) کی مغفرت کر دی گئی ہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۷۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت میں ذکر کیا ہے کہ جب لوگ حضرت عیسیٰ کے پاس جائیں گے تو وہ فرمائیں گے:

میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ' پھر لوگ میرے پاس آئیں گے اور کہیں گے: اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں اور تمام انبیاء کے خاتم ہیں' اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے اور پچھلے ذنب (یعنی خلاف اولیٰ کاموں) کو بخش دیا ہے' اپنے رب کے پاس ہماری شفاعت کیجئے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام ترمذی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ (جامع ترمذی ص ۳۵۱' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام بزار نے سند جید کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے انبیاء (سابقین) پر چھ وجوہ سے فضیلت دی گئی ہے' مجھ سے پہلے کسی کو وہ فضیلتیں نہیں دی گئیں' میرے اگلے اور پچھلے ذنب (یعنی خلاف اولیٰ کاموں) کی مغفرت کر دی گئی' میرے لیے غنیمتوں کو حلال کر دیا گیا' میری امت کو سب سے بہتر امت قرار دیا گیا' تمام روئے زمین کو میرے لیے مسجد بنا دیا گیا اور اس سے تیمم کو جائز کر دیا گیا' مجھے کوثر عطا کی گئی اور میری رعب سے مدد کی گئی' اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! تمہارے نبی کے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا اور آدم اور ان کے ماسوا سب قیامت کے دن اس جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ (خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۱۹۶' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' فیصل آباد)

---

[1] امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ' صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۱۹۔ ۷۰۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ

[2] امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۰۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ

حافظ الہیثمی نے اس حدیث کو "کشف الاستار" [1] میں امام بزار کی سند سے روایت کیا ہے اور "مجمع الزوائد" [2] میں ان کے حوالہ سے درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ امام بزار کی سند جید ہے۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر مجھے السدرۃ المنتہیٰ کی بلندی پر لے جایا گیا' اس کا ہر پتا اتنا بڑا تھا کہ وہ اس امت کو چھپا لیتا' اس کے نیچے سے ایک چشمہ جاری تھا جس کا نام سلسبیل تھا اور اس سے دو دریا نکلتے تھے' ایک کوثر اور ایک رحمت' میں نے اس میں غسل کیا' پھر میرے اگلے اور پچھلے ذنب کی مغفرت کر دی گئی۔ (دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۳۹۳' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

حافظ ابن عساکر روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے کچھ چیزیں دی گئی ہیں جن کا میں فخر سے ذکر نہیں کرتا' وہ مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں' میرے اگلے اور پچھلے ذنب کی مغفرت کر دی گئی ہے اور میری امت کو سب امتوں سے بہتر بنایا گیا ہے' اور میرے لیے مال غنیمت حلال کر دیا گیا اور مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں کیا گیا اور میرے لیے تمام روئے زمین کو مسجد اور آلہ طہارت بنا دیا گیا اور مجھے کوثر دی گئی اور میری رعب سے مدد کی گئی اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! بے شک تمہارے پیغمبر ہی قیامت کے دن حمد کا جھنڈا اٹھانے والے ہوں گے۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۲ ص ۱۳۵' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے غائب ہو گئے اور باہر نہیں آئے حتیٰ کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ تشریف نہیں لائیں گے' پھر آپ باہر آئے اور آپ نے اتنا طویل سجدہ کیا کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ کی روح قبض ہو گئی' پھر آپ نے سجدہ سے سر اٹھا کر فرمایا: میرے رب نے مجھ سے میری امت کے متعلق مشورہ کیا کہ میں ان کے ساتھ کیا کروں؟ میں نے کہا: اے میرے رب! جو تو چاہے' وہ تیری مخلوق اور تیرے بندے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ مشورہ کیا' میں نے پھر یہی کہا' اس نے پھر مشورہ کیا' میں نے پھر اسی طرح کہا' پھر اللہ نے فرمایا: اے محمد! میں نے آپ کی امت میں سزا نہیں رکھی اور مجھے یہ بشارت دی کہ میری امت سے ستر ہزار کا ایک گروہ پہلے جنت میں داخل ہو گا اور ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ہوں گے' ان سے حساب نہیں ہو گا' پھر اللہ نے میری طرف پیغام بھیجا: آپ دعا کریں قبول ہو گی۔ آپ سوال کریں آپ کو دیا جائے گا۔ میں نے اللہ کے سفیر سے کہا: کیا اللہ میرے سوال کو عطا کرے گا؟ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کرنے کے لیے ہی تو بھیجا ہے' اور میں بغیر فخر کے کہتا ہوں کہ اللہ نے مجھے یہ چیزیں عطا کی ہیں: میرے اگلے اور پچھلے ذنب کی مغفرت کر دی اور میرا سینہ کھول دیا اور مجھے یہ نعمت دی کہ میری امت بھوکی نہیں رہے گی اور نہ مغلوب ہو گی' اور مجھے جنت میں ایک نہر کوثر عطا کی جو میرے حوض میں بہ رہی ہے' اور مجھے عزت اور نصرت عطا کی' اور ایک ماہ کی مسافت سے میرا رعب طاری رہتا ہے اور مجھے یہ نعمت دی کہ میں انبیاء میں سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گا' اور میرے اور میری امت کے لیے غنیمت کو حلال کر دیا' اور ہم سے پہلی امتوں پر جن بہت سی چیزوں میں سختی کی گئی تھی وہ ہم پر حلال کر دیں اور ہم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی اور میں نے (ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے) اس سجدہ کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں پایا۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۲ ص ۱۳۶۔ ۱۳۵' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

---

1. حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ' کشف الاستار ج ۳ ص ۱۴۷' مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ' بیروت' ۱۴۰۴ھ
2. حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ' مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۶۹' مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت' ۱۴۰۲ھ

حافظ ابن کثیر نے سورۂ فتح کی اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خصائص میں سے ہے جن میں کوئی اور آپ کا شریک نہیں ہے' آپ کے علاوہ اور کسی شخص کے لیے کسی حدیث صحیح میں یہ نہیں ہے کہ اس کی اگلی اور پچھلی (ظاہری) خطاؤں کی مغفرت کر دی گئی ہو اور اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت تعظیم اور تشریف ہے اور اطاعت' نیکی اور پارسائی میں اولین اور آخرین میں سے کسی نے آپ کے مقام کو نہیں پایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا اور آخرت میں علی الاطلاق اکمل البشر اور سید البشر ہیں۔

(تفسیر ابن کثیر ج ٦ ص ٣٢٩' مطبوعہ ادارہ اندلس بیروت' ١٣٨٥ھ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مغفرت کی نسبت کے محامل

شیخ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

علامہ سبکی نے اس آیت کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ ہر چند کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا' لیکن اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف اور مرتبہ کو ظاہر کرنے کے لیے یہ فرمایا: ہم نے آپ کے اگلے اور پچھلے ذنب بخش دیئے کیونکہ بادشاہوں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ اپنے خواص اور مقربین کو نوازنے کے لیے کہتے ہیں کہ ہم نے تمہارے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیئے اور تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا حالانکہ بادشاہ کو علم ہوتا ہے کہ اس شخص نے کوئی گناہ نہیں کیا' نہ آئندہ کرے گا لیکن اس کلام سے اس شخص کی تعظیم اور تشریف کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔

بعض محققین نے یہ کہا کہ "لیغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر" کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی اگلی اور پچھلی زندگی میں گناہوں سے بچائے رکھے گا اور آپ کو عصمت پر قائم رکھے گا' اس آیت میں مغفرت' عصمت سے کنایہ ہے اور قرآن مجید میں بعض مقامات پر مغفرت سے عصمت کا کنایہ کیا گیا ہے۔

شیخ عز الدین بن عبد السلام نے کتاب "نہایۃ السؤل فیما تسنح من تفضیل الرسول" میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دی ہے' پھر انہوں نے فضیلت کی وہ وجوہات ذکر کی ہیں اور ان فضیلت کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے اور پچھلے تمام ذنوب (یعنی بظاہر خلاف اولیٰ کاموں) کو بخش دیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ انبیاء سابقین میں سے اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی مغفرت کی خبر نہیں دی' یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن جب دیگر انبیاء علیہم السلام سے شفاعت طلب کی جائے گی تو سب نفسی نفسی کہیں گے اور ہیبت الٰہی سے شفاعت نہیں کریں گے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگ شفاعت طلب کریں گے تو آپ فرمائیں گے: یہ میرا کام ہے' اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آپ کے لیے فتح مبین کو ثابت کیا' پھر مغفرت ذنوب کا ذکر کیا' پھر اپنی نعمت پوری کرنے اور صراط مستقیم کی ہدایت پر ثابت رکھنے اور نصر عزیز کا ذکر کیا جس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اس آیت سے مقصود گناہوں کا ثابت کرنا نہیں بلکہ گناہوں کی نفی کرنا ہے۔

ابن عطاء رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے متعدد نعمتوں کو جمع کر دیا ہے' فتح مبین عطا فرمائی جو اجابت کی علامت ہے' مغفرت عطا فرمائی جو محبت کی علامت ہے' اتمام نعمت سے سرفراز کیا جو آپ کے اختصاص کی نشانی ہے اور ہدایت عطا فرمائی جو ولایت کی علامت ہے' پس مغفرت سے مراد تمام عیوب اور نقائص سے آپ کی تنزیہ ہے اور اتمام نعمت سے مراد آپ کو درجۂ کاملہ پر پہنچانا ہے اور ہدایت سے مراد آپ کو مشاہدہ ذات وصفات کے اس مرتبہ پر پہنچانا ہے' جس سے بڑھ کر کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ (مدارج النبوۃ ج ١ ص ٧٣-٧٢' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

قاضی عیاض مالکی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے سورۂ فتح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتوقیر کا جو بیان فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو حضور کا مرتبہ اور مقام ہے اس کا جو ذکر کیا ہے اس کی ابتداء اللہ تعالیٰ نے دشمنوں پر حضور کے غلبہ اور آپ کی شریعت کی سربلندی کی خبر دینے سے کی ہے اور یہ بیان فرمایا ہے کہ آپ مغفور ہیں اور ماضی اور مستقبل کی کسی چیز پر آپ سے مواخذہ نہیں ہوگا' بعض علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا کہ آپ سے کوئی چیز ہوئی ہے یا نہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اس کی مغفرت کر دی ہے۔

(شفاء ج ۱ ص ۲۱ 'مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی' ملتان)

علامہ شہاب الدین خفاجی لکھتے ہیں:

علامہ تجانی نے کہا ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتوقیر بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے جیسے کوئی شخص کسی سے اظہار محبت کے لیے کہے: اگر تمہارا کوئی پہلا یا پچھلا گناہ ہو بھی تو ہم نے اس کو معاف کر دیا۔ اس کلام سے اس شخص کا یہ ارادہ نہیں ہوتا کہ اس نے فی الواقع کوئی گناہ کیا ہے اور وہ اس کو معاف کر رہا ہے اور میں کہتا ہوں کہ ذنب کا معنی ستر ہے جو نہ دکھائی دینے کا تقاضا کرتا ہے اور اس کو لازم ہے عدم ذنب یعنی جب گناہ ہے ہی نہیں تو کیسے دکھائی دے گا' کیونکہ اگر گناہ ہوتا تو دکھائی دیتا اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مقدم اور مؤخر دونوں کا ذکر کیا ہے حالانکہ مؤخر کا وجود ہی نہیں ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ آپ کا گناہ مقدم ہے نہ مؤخر' سو آپ سے مطلقاً گناہ سرزد نہیں ہوا۔

(نسیم الریاض ج ۱ ص ۲۷۳ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں:

زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ ہر چند کہ بندہ اپنے مقسوم کے مطابق اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جائے پھر بھی وہ اللہ کی مغفرت سے مستغنی نہیں ہوتا کیونکہ بندہ اپنے بشری عوارض کی بناء پر تقاضائے ربوبیت کے مطابق عبادت کا حق ادا کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مباح امور میں مشغول ہونے کی وجہ سے یا امت کے اہم کاموں میں منہمک اور مستغرق ہونے کی وجہ سے جو حضرت الوہیت میں غفلت واقع ہوتی ہے' حضرات انبیاء علیہم السلام اپنے بلند مقام کے اعتبار سے اس کو بھی سیئہ اور گناہ خیال کرتے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کے نزدیک گناہ ہوتی ہیں۔

(شرح الشفاء علی هامش نسیم الریاض ج ۱ ص ۲۷۳ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بکثرت عبادت کا جو حال مشہور تھا اس کا لحاظ رکھتے ہوئے اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کی بلندی پر جو دلالت ہے اس کو الفاظ بیان کرنے سے قاصر ہیں اور حدیث صحیح میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نفلی روزے رکھے اور نفلی نمازیں پڑھیں حتیٰ کہ آپ کے قدم مبارک سوج گئے اور سالخوردہ مشک کی طرح آپ کا جسم لاغر ہو گیا' آپ سے کہا گیا کہ آپ عبادت میں اس قدر مشقت کیوں کرتے ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذنب (یعنی بہ ظاہر خلاف اولیٰ کاموں) کی مغفرت کر دی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ (روح المعانی ج ۲۶ ص ۹۱ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

بعض علماء نے اس آیت کی توجیہ میں یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور آپ کی امت کے گناہ معاف کر دیئے' یعنی مغفرت کا تعلق آپ کے ساتھ نہیں ہے' حضرت آدم اور آپ کی امت کے ساتھ ہے۔ ملا علی قاری اس سے اختلاف کرتے

ہوئے لکھتے ہیں:

اس شخص کا قول بہت بعید ہے جس نے یہ کہا کہ آپ کے اگلے ذنب سے مراد حضرت آدم کے ذنب ہیں اور آپ کے پچھلے ذنب سے مراد امت کے ذنب ہیں' اور ظاہر یہ ہے کہ اس سے آپ کے وہ افعال مراد ہیں جن کو آپ نے سہواً ترک کر دیا یا جن میں آپ نے نسیان سے تاخیر کر دی اور خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے فضل سے کوئی بھی مستغنی نہیں ہے' اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنے عمل کے سبب سے نجات نہیں پائے گا' صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! آپ بھی نہیں؟ فرمایا: میں بھی نہیں' ماسوا اس کے کہ اللہ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے' اس سے معلوم ہوا کہ اللہ عدل کرے تو تمام اولین اور آخرین کو عذاب دے گا اور یہ اس کا ظلم نہیں ہے' ہم اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرتے ہیں اور اس کے عدل سے اس کی پناہ میں آتے ہیں۔ (جمع الوسائل ج ۲ ص ۸۱ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

باعث تخلیق کائنات ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب حضرت آدم علیہ السلام سے اجتہادی خطا ہو گئی تو انہوں نے سر اٹھا کر عرش کی طرف دیکھا اور دعا کی: میں محمد کے حق سے سوال کرتا ہوں تو میری مغفرت فرما' اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ محمد کون ہیں؟ حضرت آدم نے کہا: جب تو نے مجھے پیدا کیا تھا تو میں نے عرش کی طرف سر اٹھا کر دیکھا تھا' وہاں یہ لکھا ہوا تھا: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ' سو میں نے جان لیا کہ جس کا نام تو نے اپنے نام کے ساتھ ملا کر لکھا ہے وہ تیرے نزدیک بہت عظیم مرتبہ کا ہوگا' اللہ عزوجل نے ان کی طرف وحی کی کہ اے آدم! وہ آپ کی اولاد سے آخر النبیین ہیں اور ان کی امت آپ کی اولاد میں سے آخری امت ہے' اور اے آدم! اگر وہ نہ ہوتے تو میں آپ کو پیدا نہ کرتا۔

(معجم صغیر ج ۲ ص ۸۳ 'مطبوعہ مکتبہ سلفیہ' مدینہ منورہ' ۱۳۸۸ھ)

حافظ الہیثمی نے اس حدیث کو "معجم صغیر" اور "معجم اوسط" کے حوالے سے بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند میں ایسے راوی ہیں جن کو میں نہیں پہچانتا۔ (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۵۳ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

امام ابن جوزی نے بھی اس حدیث کو حضرت عمر بن الخطاب سے روایت کیا ہے۔

(الوفا ج ۱ ص ۳۳ 'مطبوعہ مکتبہ رضویہ' فیصل آباد)

امام بیہقی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے' اس میں یہ الفاظ ہیں:

اللہ عزوجل نے فرمایا: اے آدم! تم نے محمد کو کیسے پہچانا' حالانکہ ابھی میں نے ان کو پیدا نہیں کیا؟ حضرت آدم نے کہا: اے میرے رب! اس لیے کہ جب تو نے مجھے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور مجھ میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی تو میں نے عرش کے پایوں پر لکھا ہوا دیکھا: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ' تو میں نے جان لیا کہ جس نام کو تو نے اپنے نام کے ساتھ ملا کر لکھا وہ تجھے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہوگا' اللہ عزوجل نے فرمایا: اے آدم! آپ نے سچ کہا' بے شک وہ مجھے اپنی تمام مخلوق میں بہت زیادہ محبوب ہیں اور جب آپ نے ان کے وسیلہ سے سوال کیا ہے تو میں نے آپ کو بخش دیا' اور اگر محمد نہ ہوتے تو میں آپ کو پیدا نہ کرتا۔ اس حدیث کی سند میں عبدالرحمن بن زید ایک ضعیف راوی ہیں۔

(دلائل النبوۃ ج ۵ ص ۴۸۹ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

امام حاکم نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور اس میں بھی یہ الفاظ ہیں: اگر محمد نہ ہوتے تو میں آپ کو پیدا نہ کرتا' اور امام حاکم

نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (المستدرک ج ۲ ص ۶۱۵ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت)

امام حاکم نے ایک اور سند کے ساتھ روایت کیا ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ محمد پر ایمان لائیے اور اپنی امت کو حکم دیں جو ان کا زمانہ پائے وہ ان پر ایمان لائے' اگر محمد نہ ہوتے تو میں آدم کو پیدا نہ کرتا' نہ جنت کو پیدا کرتا' نہ دوزخ کو پیدا کرتا' میں نے عرش کو پانی پر پیدا کیا تو وہ ہلنے لگا' میں نے اس پر لکھا: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ' تو وہ ساکن ہو گیا' اس حدیث کی سند صحیح ہے لیکن امام بخاری اور مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔

(المستدرک ج ۲ ص ۶۱۵ 'مطبوعہ مکتبہ دارالباز' مکہ مکرمہ)

قائد المرسلین ہونے اور بعض دیگر فضائل کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ عزوجل نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کو فضیلت دی اور کنانہ سے قریش کو فضیلت دی اور قریش سے بنو ہاشم کو فضیلت دی اور بنو ہاشم سے مجھے فضیلت دی۔[1] اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔[2]

نیز امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! قریش اپنی مجلسوں میں اپنے حسب ونسب کا ذکر کرتے ہیں اور آپ کی مثال وہ اس طرح دیتے ہیں جیسے کسی زمین میں کھجور کا درخت ہو' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا تو مجھے ان کے بہترین فریقین میں رکھا' پھر اللہ نے مجھے سب سے بہتر قبیلہ میں رکھا' پھر سب سے افضل گھر میں رکھا' پس گھرانے اور شخصیت کے اعتبار سے میں سب سے افضل ہوں۔

(جامع ترمذی ص ۵۱۹ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قبروں سے اٹھنے والوں میں' میں سب سے پہلا ہوں' جب لوگوں کے وفد آئیں گے تو میں خطبہ دوں گا' اور جب لوگ مایوس ہو جائیں گے تو میں بشارت دوں گا' اس دن حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا' اولادِ آدم میں اپنے رب کے نزدیک میں سب سے مکرم ہوں اور مجھے فخر نہیں ہے۔ (جامع ترمذی ص ۵۱۹ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب زمین شق ہو گی تو سب سے پہلے میں اٹھوں گا' مجھے جنت کے حلوں میں سے حلہ پہنایا جائے گا' پھر میں عرش کی دائیں طرف کھڑا ہوں گا اور میرے سوا مخلوق میں سے کوئی شخص اس مقام پر کھڑا نہیں ہوگا۔ (جامع ترمذی ص ۵۱۹ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن میں نبیوں کا امام اور خطیب ہوں گا' اور میں ہی ان کی شفاعت کرنے والا ہوں گا' اس پر فخر نہیں ہے۔

(جامع ترمذی ص ۵۲۰ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

---

1. امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۴۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ
2. امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی ص ۵۱۹ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن اولاد آدم کا میں سردار ہوں گا' اور اس پر فخر نہیں اور میرے ہی ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا اور اس پر فخر نہیں اور آدم اور ان کے علاوہ جتنے نبی ہیں سب میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور جب زمین شق ہوگی تو سب سے پہلے میں اٹھوں گا اور اس پر فخر نہیں۔
(جامع ترمذی ص ۵۲۰' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حافظ ابن عساکر روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں قائد المرسلین ہوں اور فخر نہیں ہے اور میں خاتم النبیین ہوں اور فخر نہیں ہے اور میں پہلا شفاعت کرنے والا اور میں ہی وہ پہلا شخص ہوں جس کی شفاعت قبول ہوگی اور اس پر فخر نہیں ہے۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۲ ص ۱۰۶' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں قیامت کے دن تمام لوگوں کا سردار ہوں گا اور مجھے اس پر فخر اور ریا نہیں ہے' اور قیامت کے دن ہر شخص میرے جھنڈے کے نیچے کشادگی کا انتظار کر رہا ہوگا اور میرے ہی ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا' جب میں چلوں گا تو لوگ میرے ساتھ چلیں گے حتیٰ کہ میں جنت کے دروازہ پر پہنچ کر اس کو کھلوا دوں گا' کہا جائے گا: یہ کون ہے؟ میں کہوں گا: محمد' اس وقت میں اپنے رب عزوجل کو دیکھ کر اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑوں گا' مجھ سے کہا جائے گا: اپنا سر اٹھایئے' آپ کہیے آپ کی بات مانی جائے گی' آپ شفاعت کیجئے آپ کی شفاعت قبول ہوگی' پھر اللہ کی رحمت اور میری شفاعت سے دوزخ سے ایسے لوگ نکالے جائیں گے جو جل چکے ہوں گے۔
(مختصر تاریخ دمشق ج ۲ ص ۱۰۸' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۴ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا' آپ کے لیے نبوت کب واجب ہوئی؟ فرمایا: جب آدم کو پیدا کر کے ان میں روح پھونکی جا رہی تھی۔[1] اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔
(جامع ترمذی ص ۵۱۹' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

خالق اور خلق کے محبوب ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝ (التوبہ: ۲۴)

آپ فرمایئے کہ تمہارے باپ دادا' اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور تمہارے کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کے گھاٹے کا تمہیں خوف ہے اور تمہارے پسندیدہ مکان اگر تم کو اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں تو پھر انتظار کرو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے اور اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ۝

ماں باپ اور بھائی بہنوں سے طبعی محبت ہوتی ہے' بیوی سے شہوانی محبت ہوتی ہے اور مال و دولت' تجارت اور مکانوں سے عقلی محبت ہوتی ہے' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ محبت کی جو قسم بھی ہو اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے مغلوب کر دو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو ہر محبت پر غالب کر دو۔

[1] حافظ ابوالقاسم علی بن الحسن ابن العساکر متوفی ۵۷۱ھ' مختصر تاریخ دمشق ج ۲ ص ۱۰۹' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۴ھ

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت تھی وہ اپنی جان سے' ماں باپ اور اولاد سے' بیویوں سے اور مال و دولت سے اور ہر چیز سے زیادہ تھی' جنگ بدر میں حضرت ابوبکر اپنے بیٹے کے خلاف صف آرا تھے' جنگ احد میں حضرت ابوعبیدہ نے اپنے باپ کو قتل کر دیا' حضرت مصعب بن عمیر نے جنگ احد میں اپنے بھائی کو قتل کر دیا' جنگ بدر میں حضرت عمر نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو قتل کر دیا اور حضرت علی نے اپنے کئی رشتہ داروں کو قتل کر دیا۔

(نسیم الریاض ج ۳ ص ۳۱۸ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

قاضی عیاض لکھتے ہیں: ابن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ جنگ احد میں ایک عورت کا باپ' بھائی اور شوہر قتل کر دیا گیا' اس نے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ صحابہ نے کہا: الحمد للہ! وہ تمہاری تمنا کے مطابق خیریت سے ہیں' اس نے کہا: مجھے دکھاؤ' حتیٰ کہ میں آپ کو دیکھ لوں' جب اس نے آپ کو دیکھا تو کہا: آپ (کی خیریت) کے بعد ہر مصیبت آسان ہے۔ (شفاء ج ۲ ص ۱۸ 'مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی' ملتان)

نیز قاضی عیاض لکھتے ہیں کہ کفار مکہ حضرت زید بن دثنہ کو قتل کرنے کے لیے حرم سے باہر لے جانے لگے۔ اس وقت ان سے ابوسفیان بن حرب نے کہا: اے زید! میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں یہ بتاؤ کہ کیا تم کو یہ پسند ہے کہ اس وقت تمہاری جگہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے اور تمہارے بدلے ہم ان کی گردن اتار دیتے؟ حضرت زید نے کہا: خدا کی قسم! مجھے تو یہ بھی پسند نہیں ہے کہ میں اپنے گھر میں آرام سے ہوں اور آپ کے کانٹا چبھ جائے' ابوسفیان نے کہا: میں نے اصحاب محمد کی طرح کسی شخص کو کسی سے محبت کرتے نہیں دیکھا۔ (شفاء ج ۲ ص ۱۹ 'مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی' ملتان)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

حضرت حنظلہ بن ابی عامر اور حضرت عبد اللہ بن عبد اللہ بن ابی ابن سلول نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مشرک اور منافق باپ کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی' مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہ دی' حضرت حنظلہ بن ابی عامر جنگ احد میں شہید ہو گئے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرشتے ان کو غسل دے رہے ہیں' جاؤ ان کی بیوی سے جا کر پوچھو بیوی نے کہا: جس وقت انہوں نے جہاد کی آواز سنی تو یہ غسل کیے بغیر حالت جنابت میں جہاد کے لیے نکل گئے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی لیے فرشتے ان کو غسل دے رہے تھے۔ (اصابہ ج ۱ ص ۳۶۱ 'مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

یہ اپنی جان' اپنے ماں باپ' اولاد اور رشتہ داروں کی طبعی محبت سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے کی مثالیں ہیں' اور حنظلہ بن ابی عامر کے واقعہ میں شہوانی محبت سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی دلیل ہے اور جن صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر مکہ میں اپنے مال و دولت' مکانات اور تجارت کو چھوڑ کر مدینہ ہجرت کی اس میں ان کی عقلی محبت سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے کا بیان ہے' ثابت ہوا کہ صحابہ کرام کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہر محبت پر غالب تھی' صرف انسان ہی نہیں' شجر و حجر اور حیوان بھی آپ سے محبت کرتے تھے' آپ نے فرمایا: احد پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے' کھجور کا تنا آپ کے فراق میں چیخیں مار کر روتا تھا' اور جب آپ قربانی کرتے تو ہر اونٹنی آگے بڑھ بڑھ کر آپ کی چھری کے قریب ہوتی تھی۔ (صحیح بخاری' سنن ابوداؤد)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ بیٹھے ہوئے آپ کا انتظار کر رہے تھے' آپ (حجرے سے) نکل کر ان کے قریب ہو کر ان کی باتیں سننے لگے' ان میں سے بعض نے تعجب سے کہا: اللہ تعالیٰ اپنی

مخلوق سے ایک خلیل بنانے لگا تو حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا۔ دوسرے نے کہا: اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو ہم کلام ہونے کا شرف بخشا' ایک اور نے کہا: حضرت عیسیٰ اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں' دوسرے نے کہا: اور حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے صفی بنایا' آپ نے ان کے پاس آ کر ان کو سلام کیا اور فرمایا: میں نے تمہارا کلام اور اس پر تعجب سنا کہ ابراہیم اللہ کے خلیل ہیں' وہ ایسے ہی ہیں اور موسیٰ اللہ کے کلیم ہیں' وہ ایسے ہی ہیں اور عیسیٰ اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں' وہ ایسے ہی ہیں اور آدم کو اللہ نے صفی بنایا اور وہ ایسے ہی ہیں' سنو! میں اللہ کا محبوب ہوں اور مجھے اس پر کوئی فخر نہیں ہے' میں قیامت کے دن حمد کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہوں گا اور مجھے اس پر فخر نہیں ہے' میں قیامت کے دن سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں' اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہوگی اور اس پر فخر نہیں' میں سب سے پہلے جنت کی کنڈی کھٹکھٹاؤں گا' پھر اللہ میری خاطر جنت کو کھولے گا اور اس میں مجھ کو داخل کرے گا اور میرے ساتھ فقراء مؤمنین ہوں گے اور اس پر فخر نہیں اور میں اولین اور آخرین میں سب سے زیادہ معزز ہوں اور اس پر فخر نہیں۔ (جامع ترمذی ص ۵۲۰' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے محبوب ہیں' اور امام بخاری روایت کرتے ہیں' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میرا یہی گمان ہے کہ آپ کا رب آپ کی خواہش بہت جلد پوری کرتا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۰۶' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

خلیل اور حبیب میں فرق کا بیان

قاضی عیاض مالکی نے خلیل اور حبیب کا فرق بیان کرتے ہوئے امام ابوبکر بن فورک کے حوالے سے لکھا ہے:

خلیل' اللہ تک بالواسطہ پہنچے:

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (الانعام: ۷۵)

اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمینوں کی ساری بادشاہی دکھائی۔

اور حبیب' اللہ تک بلاواسطہ پہنچے:

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ (النجم: ۹۔۸)

پھر (اللہ' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے) قریب ہوا' پھر زیادہ قریب ہوا ۝ پھر دو کمانوں کی مقدار کے برابر اللہ کے قریب ہوئے یا اس سے بھی زیادہ قریب ہوئے ۝

خلیل کی مغفرت کا بیان مرتبہ طمع میں ہے:

وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۝ (الشعراء: ۸۲)

اور جس سے میری امید وابستہ ہے وہ قیامت کے دن میری خطا معاف فرمادے گا ۝

اور حبیب کی مغفرت کا بیان مرتبہ یقین میں ہے:

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ. (الفتح: ۲۔۱)

بے شک ہم نے آپ کو روشن فتح عطا فرمائی ۝ تاکہ اللہ آپ کے لیے اگلے اور پچھلے (بہ ظاہر) خلاف اولیٰ سب کام معاف فرمادے۔

خلیل نے دعا کی کہ اللہ انہیں روز حشر شرمندہ نہ کرے:

وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۝ (الشعراء: ۸۷)

اور مجھے روز حشر شرمندہ نہ فرمانا ۝

اور حبیب کو بن مانگے یہ مقام عطا فرمایا:

يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ (التحریم: ۸) جس دن اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو شرمندہ کرے گا نہ ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو۔

امتحان کے موقع پر خلیل نے کہا:

حَسْبِيَ اللّٰهُ. مجھے اللہ کافی ہے۔

اور حبیب کے لیے اللہ نے از خود فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الانفال: ۶۴) اے نبی! آپ کے لیے اللہ اور وہ ایمان لانے والے کافی ہیں جنہوں نے آپ کی اتباع کی ہے ۝

خلیل نے دعا کی:

وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ (الشعراء: ۸۴) اور بعد کے آنے والوں میں میرا ذکر جمیل جاری کردے ۝

اور حبیب کے لیے از خود فرمایا:

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ (الانشراح: ۴) اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا ذکر بلند کر دیا ۝

سو قیامت تک کلمہ اذان نماز اور خطبہ میں مسلمانوں کی زبان سے آپ کا ذکر بلند ہوتا رہے گا۔

خلیل نے دعا کی:

وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ (ابراہیم: ۳۵) اور مجھے اور میرے (خاص) بیٹوں کو بتوں کی عبادت سے اجتناب پر برقرار رکھ ۝

اور حبیب کے لیے بلا طلب از خود فرمایا:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝ (الاحزاب: ۳۳) اے اہل بیت رسول! اللہ یہی ارادہ فرماتا ہے کہ تم سے ہر قسم کی ناپاکی دور کر کے تم کو خوب پاکیزہ کر دے ۝

قاضی عیاض فرماتے ہیں: ہم نے جو یہ چند آیات ذکر کی ہیں ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال اور آپ کے مقامات کی افضلیت کی ایک جھلک معلوم ہو جاتی ہے اور ان آیات سے ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق مفہوم اخذ کرتا ہے اور تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون احسن طریقہ پر ہے۔ (شفاء ج ۱ ص ۱۳۲۔ ۱۳۳ مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی ملتان)

کلیم اور حبیب میں فرق کا بیان

کلیم اور ان کے بھائی حضرت ہارون نے فرعون کے پاس جاتے وقت اپنا خوف عرض کیا:

رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَاۤ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝ (طٰہٰ: ۴۵) اے ہمارے رب! ہمیں یہ خدشہ ہے کہ وہ (فرعون) ہم پر کوئی زیادتی یا سرکشی کرے گا ۝

اور حبیب کے لیے از خود فرمایا:

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ (المائدہ: ۶۷) اور اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

کلیم دعا کرتے ہیں:

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ (طٰہٰ: ٢٥)

اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے ۝

حبیب کے لیے از خود فرمایا:

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ (الم نشرح: ١)

کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کا سینہ نہیں کھولا ۝

کلیم دعا کرتے ہیں:

رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ . (الاعراف: ١٤٣)

اے رب! مجھے اپنی ذات دکھا میں تجھے دیکھوں۔

حبیب سے فرمایا:

أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ . (الفرقان: ٤٥)

کیا آپ نے اپنے رب کی طرف نہیں دیکھا۔

کلیم سے فرمایا:

لَنْ تَرَانِي . (الاعراف: ١٤٣)

تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے۔

حبیب سے فرمایا:

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۝ . (النجم: ١٧)

نہ نظر ایک طرف مائل ہوئی اور نہ حد سے بڑھی ۝

کلیم اپنے رب کی رضا چاہتے ہیں:

وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَىٰ ۝ (طٰہٰ: ٨٤)

اے میرے رب! میں نے تیرے پاس حاضر ہونے میں جلدی کی تاکہ تو راضی ہو جائے ۝

اور حبیب کی رضا رب تعالیٰ چاہتا ہے:

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا . (البقرہ: ١٤٤)

ہم ضرور آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس سے آپ راضی ہوں گے۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝ (الضحیٰ: ٥)

اور بے شک آپ کو آپ کا رب اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے ۝

وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ ۝ (طٰہٰ: ١٣٠)

اور رات کے کچھ اوقات اور دن کے کناروں میں تسبیح کیجیے تاکہ آپ راضی رہیں ۝

کلیم نے اپنے اور اپنی قوم کے لیے دعا کی:

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ . (الاعراف: ١٥٦)

ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں۔

حبیب کی امت کے متعلق فرمایا:

فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ . (الاعراف: ١٥٦-١٥٧)

عنقریب میں اس (بھلائی) کو ان لوگوں کے حق میں لکھ دوں گا جو پرہیز گاری کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں ۝ جو اس رسول، نبی امی (اللقب) کی پیروی کرتے ہیں جس کا نام ان کے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ہے۔

دیکھیے مانگا حضرت کلیم نے اور ملا آپ کے غلاموں کو معلوم ہوا کہ زمانہ کسی نبی کا ہو سکہ کسی رسول کا ہو سکہ چلتا تھا تو مصطفے کا چلتا تھا اور ڈنکا بجتا تھا تو مصطفے کا بجتا تھا۔

انبیاء سابقین علیہم السلام کے معجزات پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی افضلیت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلام الٰہی لینے کے لیے طور پر جانا پڑا اور آپ کو کلام الٰہی کے لیے کہیں جانا نہیں پڑتا تھا' آپ جہاں ہوتے کلام الٰہی وہیں نازل ہو جاتا تھا' حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ تھا کہ انہوں نے زمین پر لاٹھی ماری تو پانی نکل آیا' لیکن زمین میں عادۃً پانی ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ فرمائی تو آپ کی انگلیوں سے پانی کے چشمے ابل پڑے اور جہاں عادۃً پانی نہیں ہوتا وہاں سے پانی نکل آیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم کر دیا گیا تھا اور وہ اس سے زرہ بنا لیتے تھے لیکن لوہے کو بھی عادۃً آگ سے گرم کیا جا سکتا ہے' آپ کے لیے تو پتھر نرم ہو گیا جو کبھی نرم نہیں ہوتا' حافظ ابونعیم نے روایت کیا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غار میں گئے اور آپ نے اس میں سر مبارک داخل کیا تو وہ نرم ہوتا چلا گیا' اور ''صحیح بخاری'' میں ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احد ایک پہاڑ ہے یہ ہم سے محبت کرتا ہے ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ (ج ۲ ص ۵۸۵) دیکھیے پتھر وہ جنس ہے جس میں محبت پیدا نہیں ہوتی حتیٰ کہ جس شخص کو کسی سے محبت نہ ہو اس کو سنگدل کہتے ہیں' لیکن یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز ہے کہ جس چیز کی حقیقت میں محبت نہیں ہے وہاں بھی اپنی محبت پیدا کر دی' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پہاڑ نے تسبیح کی اور آپ کے ہاتھ میں سنگ ریزوں نے تسبیح پڑھی' کہاں لوہے کا نرم ہونا اور کہاں پتھروں کا محبت کرنا' سنگ ریزوں کا تسبیح پڑھنا۔

حضرت داؤد سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى . (ص: ۲۶) اور آپ خواہش کی پیروی نہ کریں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۞ (النجم: ۳) وہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی خواہش سے بات نہیں کرتے O

سبحان اللہ! آپ وہ ہیں جن کی اللہ کی رضا کے مقابلہ میں اپنی کوئی خواہش نہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرندوں سے گفتگو کا ملکہ دیا اور جنات اور ہوا کو مسخر کیا گیا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بکری کے گوشت کے ٹکڑے نے کلام کیا' اور آپ سے کہا: مجھ میں زہر ملا ہوا ہے' ہرن اور اونٹ نے آپ سے شکایت کی اور سنگ ریزوں نے آپ کے ہاتھ پر تسبیح پڑھی' پتھروں نے سلام عرض کیا اور درختوں نے آپ کی اطاعت کی' آپ کے حکم سے درخت ایک جگہ سے دوسری جگہ چل کر آیا اور پھر واپس چلا گیا' یہ امور پرندوں کے ساتھ گفتگو کرنے کی بہ نسبت زیادہ عجیب و غریب اور باکمال ہیں' ہوا کے مسخر کرنے کا قصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان اپنے تخت پر بیٹھ کر ہوا میں اڑتے تھے اور صبح کی سیر میں ایک ماہ کی مسافت طے کر لیتے اور شام کی سیر میں ایک ماہ کی مسافت طے کر لیتے:

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ . (سبا: ۱۲) اور سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا' اس کی صبح کی رفتار ایک مہینہ کی راہ تھی اور شام کی رفتار ایک مہینہ کی راہ تھی۔

ہوا مسخر سہی' لیکن حضرت سلیمان جس جگہ کا قصد کرتے انہیں وہاں جانا پڑتا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہیں جانا نہیں پڑتا تھا۔ آپ جس جگہ کا جہاں قصد کرتے وہ جگہ وہیں آ جاتی تھی' معراج سے واپسی کے بعد جب کفار قریش نے آپ سے

بیت المقدس کے متعلق سوالات کیے تو بیت المقدس کو آپ کے سامنے دار ارقم میں لاکر رکھ دیا گیا۔

(مشکوٰۃ ص ۵۳۰ مطبوعہ اصح المطابع دہلی)

نیز آپ نے فرمایا:

ان اللہ زوی لی الارض فرایت مشارقھا ومغاربھا. اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمین کو میرے لیے سمیٹ دیا اور میں نے زمین کے تمام مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۹۰ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۷۵ھ)

اور رہا حضرت سلیمان کے لیے جنات کا مسخر ہونا تو اس کے مقابلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے جنات مسلمان ہو گئے اور جنت کا مسخر ہونا اور بات ہے اور ان کا مسلمان ہونا اور چیز ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اندھوں اور کوڑھیوں کے تندرست کرنے اور مردہ زندہ کرنے کا معجزہ عطا فرمایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت قتادہ بن نعمان کی نکلی ہوئی آنکھ دوبارہ لوٹا دی' حضرت سلمہ بن اکوع کی ٹوٹی ہوئی پنڈلی جوڑ دی' آپ کے بلانے سے درخت چل کر آئے' کھجور کا تنا آپ کے فراق میں چیخیں مار کر رویا' اور یہ سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے کہیں بڑھ کر کمالات اور معجزات ہیں' کیونکہ مردے میں پہلے جان آ چکی ہوتی ہے' آپ نے ان چیزوں میں حیات جاری کی جہاں عادۃً حیات نہیں ہوتی' آنکھ والے کو دکھانا اور کان والے کو سنانا اور بات ہے اور بغیر آنکھوں کے دکھانا اور بغیر کانوں کے سنانا اور چیز ہے۔ الغرض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معجزات اور کمالات دیئے گئے وہ تمام نبیوں کے معجزات اور کمالات سے فائق اور ان پر غالب تھے' آپ کے معجزات کی تعداد' کیفیات اور حیثیات ہر اعتبار سے سب پر بلند و بالا تھے' دوسرے نبیوں نے نبوت کا دعویٰ کرتے ہی معجزات پیش کیے اور آپ نے اعلانِ نبوت کے بعد کسی معجزہ کو پیش کرنے کی بجائے اپنی زندگی کو پیش کر دیا اور یوں ظاہر ہوا کہ آپ کو اپنی نبوت ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی معجزہ کی احتیاج نہیں تھی' آپ کی زندگی خود سراپا معجزہ تھی' یوں ہی تو نہیں فرمایا تھا: '' لَعَمْرُكَ . (الحجر: ۷۲) تمہاری زندگی کی قسم!''۔

حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کی:

رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ○ (المؤمنون: ۲۶) اے میرے رب! میری مدد فرما کیونکہ انہوں نے مجھے جھٹلایا○

آپ سے بلا طلب فرمایا:

وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيزًا ○ (الفتح: ۳) اور اللہ آپ کی قوی مدد فرمائے گا○

حضرت نوح نے اپنی قوم کے کافروں کی ہلاکت کی دعا کی:

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِينَ دَيَّارًا ○ (نوح: ۲۶) اے میرے رب! زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑ○

اور آپ سے فرمایا:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ (الانفال: ۳۳) اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ آپ کے ہوتے ہوئے ان کو عذاب دے۔

سب سے پہلے قبر سے اٹھنے والی حدیث کا حضرت موسیٰ کے پہلے اٹھنے والی حدیث سے تعارض کا جواب

حدیث میں ہے: سب سے پہلے قبر سے میں اٹھوں گا' اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو' کیونکہ قیامت کے دن لوگ بے ہوش ہوں گے' میں بھی ان کے ساتھ بے ہوش ہوں گا' میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا' اس وقت حضرت موسیٰ عرش کی ایک جانب پکڑے کھڑے ہوں گے' میں نہیں جانتا کہ وہ بے ہوش ہوئے تھے اور مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے یا ان لوگوں میں سے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے بے ہوش ہونے سے مستثنیٰ رکھا تھا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۲۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں:

ان حدیثوں میں تعارض نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ''صحیح بخاری'' کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد ہے: اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ علم نہ ہو کہ آپ مطلقاً سب سے پہلے قبر سے اٹھائے جائیں گے اور مسلم کی روایت میں جو ارشاد ہے وہ بعد کا واقعہ ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۲۵۱ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

علامہ وشتانی ابی مالکی نے بھی اس تعارض کا یہی جواب دیا ہے۔ (اکمال اکمال المعلم ج ۶ ص ۹۷ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت)

جس حدیث میں آپ نے دوسرے انبیاء پر فضیلت دینے سے منع کیا ہے' اس کے جوابات

امام بخاری نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انبیاء میں (کسی کو) فضیلت نہ دو۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۲۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: مجھے حضرت موسیٰ پر فضیلت نہ دو۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۲۵ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

''صحیح بخاری'' کی ان روایات سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگر انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دینا ممنوع ہے حالانکہ صحیح مسلم کی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء علیہم السلام پر اپنی فضیلت بیان کی ہے' اس تعارض کے جواب میں علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

علامہ ابن التین نے کہا ہے کہ ''انبیاء میں کسی کو فضیلت نہ دو'' اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ بغیر علم کے کسی نبی کو کسی پر فضیلت نہ دو' ورنہ انبیاء علیہم السلام کی ایک دوسرے پر فضیلت کو اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمایا ہے: ''تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ (البقرہ: ۲۵۳) یہ سب رسول' ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے''۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فضیلت کا علم ہونے سے پہلے یہ فرمایا تھا۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فضیلت دینے سے منع فرمایا ہے جو دوسرے نبی کی تنقیص کو مستلزم ہو۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی فضیلت دینے سے منع فرمایا ہے جو دوسرے نبی کی دل آزاری کا موجب ہو۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نفس نبوت میں فرق کرنے سے منع فرمایا ہے۔

چھٹا جواب یہ ہے کہ آپ کا یہ قول تواضع پر محمول ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۲۵۱ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ

اے ایمان والو! ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں

يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ

اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی نہ (کافروں کی) کسی سے دوستی ہو گی اور نہ

الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

(کفار کے لیے) شفاعت ہوگی' اور کفار ہی ظالم ہیں O

راہ خدا میں مال خرچ کرنے کی تاکید

سابقہ آیات میں مسلمانوں کو بدن کے ساتھ جہاد کرنے پر برانگیختہ کیا تھا اور چونکہ جہاد اور قتال کے لیے مال کو خرچ کرنا بہت ضروری ہے اس لیے ان آیات میں مال کے خرچ کرنے کو بیان فرمایا ہے اور اس حکم کو قیامت کے دن کی یاد دلا کر مزید مؤکد فرمایا ہے۔ دنیا میں تو انسان اپنے آپ کو مصیبت اور تکلیف سے بچانے کے لیے بعض چیزیں خرید لیتا ہے' کبھی کوئی دوست اس سے تکلیف دور کر دیتا ہے' کبھی کسی کی سفارش سے اس سے مصیبت ٹل جاتی ہے' لیکن قیامت کے دن کوئی خرید و فروخت ہو سکے گی نہ کسی کی دوستی کام آئے گی نہ کسی کی سفارش۔

اس میں اختلاف ہے کہ یہاں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے کون سا خرچ مراد ہے' بعض علماء نے کہا: اس سے قتال اور جہاد میں خرچ کرنا مراد ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس سے زکوٰۃ اور صدقات فرضیہ مراد ہیں اور صدقات نفلیہ مراد نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خرچ نہ کرنے پر وعید فرمائی ہے اور نفل کے ترک کرنے پر وعید نہیں ہوتی لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں وعید نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہ فرمایا ہے کہ قیامت کا دن آنے سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور جب تک تم دنیا میں ہو آخرت کے لیے منافع حاصل کرو' کیونکہ ان منافع کا آخرت میں حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔

آخرت میں دوستی اور سفارش سے مسلمانوں کے انتفاع کا بیان

ہر چند کہ اس آیت سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کسی شخص کی کسی شخص سے دوستی کام نہیں آئے گی نہ کسی کی کسی کے لیے سفارش کام آئے گی لیکن قرآن مجید کی دوسری آیات سے یہ متعین ہو گیا ہے کہ یہ محرومی صرف کفار کے لیے ہے اور مسلمانوں کی مسلمانوں سے دوستی بھی کام آئے گی اور سفارش بھی' قرآن مجید میں ہے:

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ۞ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۞ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۞ (الزخرف: ۶۹۔ ۶۷)

متقین کے سوا گہرے دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے O اے میرے بندو! آج تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہو گے O جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے اور ہمارے احکام کے تابع رہے O

اور مسلمانوں کی شفاعت کے متعلق فرمایا:

وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (الانبیاء: ۲۸)

اور (فرشتے) صرف اس کی شفاعت کرتے ہیں جس (کی

شفاعت) پر اللہ راضی ہو۔

شفاعت پر سیر حاصل بحث ہم البقرہ: ۴۸ میں بیان کر چکے ہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ

اللہ اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں وہ زندہ (جاوید) ہے اور دوسروں کو قائم کرنے والا ہے اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند

مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے (سب) اسی کی ملکیت ہے کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کی بارگاہ

اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ

میں شفاعت کرے وہ جانتا ہے جو ان (لوگوں) کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور اس کے علم میں سے وہ

بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ

(لوگ) کسی چیز کو حاصل نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے اس کی کرسی (حکومت) آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہے

وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾ لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ۙ

اور ان کی حفاظت اس کو تھکاتی نہیں ہے اور وہی بہت بلند بڑی عظمت والا ہے ○ دین میں جبر نہیں ہے

قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ

بے شک ہدایت گمراہی سے خوب واضح ہو چکی ہے سو جو شخص طاغوت سے کفر کر کے اللہ پر ایمان لے آیا

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ

تو اس نے ایسا مضبوط دستہ پکڑ لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ خوب سننے والا

عَلِیْمٌ ﴿۲۵۶﴾

بہت جاننے والا ہے ○

قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ توحید' رسالت اور آخرت سے متعلق عقائد اور مختلف احکام شرعیہ کو بار بار ایک دوسرے کے بعد دہراتا رہتا ہے' مسلسل عقائد کا ذکر جاری رہتا ہے نہ متواتر احکام کا' تاکہ قاری کا ذہن اکتاہٹ کا شکار نہ ہو اس لیے اللہ تعالیٰ عقائد کے مضمون کے بعد احکام کا مضمون شروع کر دیتا ہے اور عقائد میں بھی توحید' رسالت اور آخرت کے مضمون کا تنوع ہے اور اسی طرح احکام میں بھی مختلف انواع کے حکم کا ایک دوسرے کے بعد ذکر فرماتا ہے تاکہ قاری یکسانیت کا شکار نہ ہو

اور ہر بار اس کو غور وفکر کی نئی راہیں ملیں۔

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ نجات کا مدار انسان کے اعمال صالحہ پر ہے اور قیامت کے دن اس کا مال اس کی دوستی اور کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی اور یہ فرمایا تھا کہ تمام رسل علیہم السلام کے مراتب اور درجات اگرچہ متفاوت اور مختلف ہیں لیکن تمام رسولوں کی دعوت اور ان کا پیغام واحد ہے اور ان کا دین واحد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کو واحد مانو اور صرف اسی کی عبادت کرو۔

اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کی جامع آیت "آیت الکرسی" ہے' ہم پہلے آیت الکرسی کے مفردات کے معانی بیان کریں گے اور پھر اس کے فضائل کے متعلق احادیث کا ذکر کریں گے۔

آیت الکرسی کے مفردات اور جملوں کی تشریح

اللہ: یہ اللہ تعالیٰ کا اسم ذاتی ہے۔ اس کا معنی ہے: وہ ذات جو واجب الوجود (قدیم بالذات) ہو' تمام صفات کمالیہ کی جامع ہو اور تمام نقائص سے بری ہو اور عبادت کی مستحق ہے۔

الحی: جو ہمیشہ سے از خود زندہ ہو' اپنی حیات میں کسی کا محتاج نہ ہو اور ہمیشہ زندہ رہے' اور کبھی اس پر موت نہ آئے۔

القیوم: جو از خود قائم ہو' دوسروں کا قائم کرنے والا ہو' جو تمام کائنات کو قائم رکھے ہوئے ہے اور ان کے نظام کی تدبیر فرماتا ہے۔ "وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ" (الروم: ۲۵) اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں"۔

اونگھ اور نیند سے بری: تھکاوٹ اور سستی سے غفلت کی جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ اونگھ ہے اور یہ نیند کا مقدمہ ہے اور نیند کا معنی ہے: دماغ کے اعصاب کا ڈھیلا پڑ جانا جس کے بعد علم اور ادراک معطل ہو جاتا ہے اور حواس کا شعور اور ادراک بھی موقوف ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ معنی محال ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے غفلت محال ہے' وہ اس عظیم کائنات کا موجد اور اس کے نظام کو جاری رکھنے والا ہے اور ہر آن اور ہر لحہ اس کائنات میں تبدیلی اور تغیر واقع ہو رہا ہے اور اس کے علم اور اس کی توجہ سے ہو رہا ہے' وہ ہر وقت ہر چیز کے ہر حال کا عالم ہے' بے خبر اور سونے والا نہیں ہے۔

آسمانوں اور زمینوں کی ہر چیز اس کی ملکیت ہے: تمام آسمانوں اور زمینوں کی مخلوق' سب اس کے بندے اور اس کی ملکیت ہیں' ہر چیز اس کی قدرت اور اس کی مشیت کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ؕ (مریم: ۹۳)	آسمانوں اور زمینوں میں ہر ایک رحمان کے حضور عبد بن کر حاضر ہوگا۔

اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور شفاعت نہیں ہوگی: اللہ تعالیٰ کی عظمت' جلالت اور اس کی کبریائی کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص اس کے حضور شفاعت نہیں کر سکے گا' حشر کے دن تمام انبیاء' رسل' اولیاء' علماء اور شہداء اللہ تعالیٰ کے جلال سے سہمے ہوئے ہوں گے' اس دن ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوں گے' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے محمد! اپنا سر اٹھائیے' آپ کہیے آپ کی بات سنی جائے گی' آپ شفاعت کیجئے آپ کی شفاعت قبول ہو گی' پھر اللہ تعالیٰ ایک حد مقرر فرمائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حد کے مطابق شفاعت فرمائیں گے' یہ حدیث تفصیل کے ساتھ باحوالہ "ورفع بعضھم درجت" کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے اور لوگوں کو اتنا ہی علم ہے جتنا اس نے دیا: اللہ تعالیٰ کا علم تمام کائنات کے ماضی' حال

اور مستقبل کو محیط ہے' وہ دنیا اور آخرت کے تمام امور کو تفصیلاً جانتا ہے' اس کو ایک ذرہ کا علم بھی غیر متناہی وجوہ سے ہوتا ہے' مثلاً ایک ذرہ کو کتنے انسانوں' کتنے جانوروں' کتنے جنات اور کتنے فرشتوں نے دیکھا' اس ایک ذرہ کی دیگر ذرات کے ساتھ کتنی نسبتیں ہیں' اس پر کتنے ہوا کے جھونکے اور کتنے بارش کے قطرے گزرے' اس میں کتنے فائدے' کتنے نقصانات' کتنی حکمتیں ہیں' اس ذرہ کی کتنی عمر ہے' وہ کہاں کہاں رہا اور ایسی بے شمار وجوہ ہیں' تمام کائنات کا علم تو الگ رہا ایک ذرہ کے متعلق اللہ کا علم کتنا وسیع ہے انسان کی عقل اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی' مخلوق کو اتنا ہی علم ہوتا ہے جتنا وہ عطا فرماتا ہے۔

اس کی کرسی تمام آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہے: کرسی کی کئی تفسیریں کی گئی ہیں' کرسی سے مراد علم ہے' اسی وجہ سے علماء کو بھی کراسی کہتے ہیں' یا اس لیے کہ انسان کرسی پر ٹیک لگاتا ہے اور اعتماد کرتا ہے اور علماء کا اعتماد بھی علم پر ہوتا ہے' ایک قول یہ ہے کہ کرسی سے مراد عظمت ہے' ایک قول یہ ہے کہ کرسی سے مراد ملک اور حکومت ہے۔ امام مقدسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کی کرسی تمام آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہے اور وہ اس طرح چرچراتی ہے جیسے نیا پالان سواروں کے بوجھ سے چرچراتا ہے۔ (الاحادیث المختارہ ج ۱ ص ۲۲۸' مطبوعہ مکتبۃ النہضۃ الحدیثہ' مکہ مکرمہ' ۱۴۱۰ھ)

کرسی کے متعلق حافظ سیوطی نے بہت احادیث ذکر کی ہیں' ہم ان میں سے چند احادیث ذکر کر رہے ہیں:

امام ابن المنذر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اگر سات آسمانوں اور سات زمینوں کو بچھا دیا جائے تب بھی وہ کرسی کے مقابلہ میں اس طرح ہیں جیسے ایک انگشتری کسی وسیع میدان میں پڑی ہو۔

امام ابن جریر' امام ابن مردویہ اور امام بیہقی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرسی کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا: اے ابوذر! سات آسمان اور سات زمینیں کرسی کے مقابلے میں اس طرح ہیں جیسے کسی جنگل میں انگوٹھی کا چھلہ پڑا ہو' اور عرش کی فضیلت کرسی پر اس طرح ہے جیسے جنگل کی فضیلت اس انگوٹھی کے چھلے پر ہے۔

امام ابوالشیخ نے ابو مالک سے روایت کیا ہے کہ کرسی عرش کے نیچے ہے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۳۲۸' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

امام رازی کا مختار یہ ہے کہ کرسی ایک عظیم جسم ہے جو سات آسمانوں اور سات زمینوں کو محیط ہے۔ وہ فرماتے ہیں: بغیر کسی دلیل کے ظاہر قرآن اور ظاہر حدیث سے عدول کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۲ ص ۳۱۳۔ ۳۱۴' مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

کرسی کا معنی ہے: جس پر کوئی شخص بیٹھے اور بیٹھنے کے بعد اس میں جگہ نہ بچے اور یہاں یہ کلام بہ طور تمثیل ہے' ورنہ کوئی کرسی ہے نہ کوئی بیٹھنے والا' اکثر متاخرین نے یہی کہا ہے تاکہ اللہ کے لیے جسم ہونا لازم نہ آئے' اور احادیث میں بھی استعارہ ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے اور حق وہی ہے جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور توہم جسمیت کا کوئی اعتبار نہیں ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات کا انکار لازم آئے گا اور متقدمین نے یہ کہا کہ یہ متشابہات میں سے ہے اور حقیقت میں اس سے کیا مراد ہے اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۱۰' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

آسمانوں اور زمینوں کی حفاظت اللہ کو نہیں تھکاتی: آسمانوں اور زمینوں کی حفاظت اللہ پر بھاری اور دشوار نہیں ہے بلکہ اللہ کے نزدیک بہت سہل اور آسان ہے' وہ ہر چیز کو قائم رکھنے والا اور ہر چیز کا محافظ اور نگہبان ہے' وہ جو چاہتا ہے وہ کرتا

ہے' اس کا ارادہ اٹل ہے اور جس کا وہ ارادہ کرلے اس کو ضرور کر گزرتا ہے' وہ ہر چیز پر غالب ہے اور ہر شے سے بلند اور برتر ہے اور وہی سب سے عظیم ہے' کبریائی اور بڑائی اسی کو زیبا ہے۔

آیت الکرسی کے فضائل

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام احمد' امام مسلم' امام ابوداؤد اور امام حاکم' حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے (امتحاناً) سوال کیا کہ کتاب اللہ کی کون سی آیت سب سے عظیم ہے؟ انہوں نے کہا: آیۃ الکرسی! آپ نے فرمایا: اے ابوالمنذر! تم کو یہ علم مبارک ہو۔

امام بخاری نے اپنی ''تاریخ'' میں' امام طبرانی اور امام ابونعیم نے مستند راویوں سے روایت کیا ہے: حضرت ابن الاسقع بکری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پوچھا کہ قرآن مجید کی کون سی آیت سب سے عظیم ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ '' (البقرہ: ۲۵۵) اور پوری آیت پڑھی۔

امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی کو پڑھا' اللہ تعالیٰ اس کو دوسری نماز تک اپنی حفاظت میں رکھتا ہے اور آیت الکرسی کی حفاظت صرف نبی' صدیق یا شہید ہی کرتا ہے۔

امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ہر نماز کے بعد آیت الکرسی کو پڑھے اس کو جنت میں داخل ہونے سے موت کے سوا اور کوئی چیز مانع نہیں ہوگی اور وہ مرتے ہی جنت میں داخل ہو جائے گا۔ (امام نسائی از حضرت ابوامامہ' سنن کبریٰ ج ۶ ص ۳۰' عمل الیوم واللیلۃ ص ۴۹' امام طبرانی از حضرت ابوامامہ' المعجم الکبیر ج ۸ ص ۱۱۴' مسند الشامیین ج ۲ ص ۹' کتاب الدعاء ص ۱۱۴' امام ابن السنی' عمل الیوم واللیلۃ ص ۴۳' حافظ الہیثمی' مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۰۲)

امام بخاری' امام نسائی اور امام ابونعیم نے ''دلائل'' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے زکوٰۃ کی حفاظت پر مامور کیا' ایک شخص آیا اور مٹھی بھر طعام لے جانے لگا' میں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا: میں تجھے ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جاؤں گا' اس نے کہا: مجھے چھوڑ دو' میں محتاج اور عیال دار ہوں اور مجھے بڑی سخت ضرورت تھی' میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوہریرہ! گزشتہ رات کے تمہارے قیدی کا کیا ہوا؟ میں نے کہا: یارسول اللہ! اس نے اپنی سخت حاجت بیان کی' مجھے اس پر ترس آیا اور میں نے اس کو چھوڑ دیا' آپ نے فرمایا: وہ جھوٹا ہے اور وہ پھر آئے گا' مجھے یقین ہو گیا کہ وہ پھر آئے گا تو میں اس کی گھات لگا کر بیٹھا' وہ آیا اور مٹھی بھر طعام لے جانے لگا' میں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا: میں تجھے ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جاؤں گا' اس نے کہا: مجھے چھوڑ دو' میں ضرورت مند اور عیال دار ہوں' میں دوبارہ نہیں آؤں گا' مجھے اس پر ترس آیا اور میں نے اس کو چھوڑ دیا' صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گزشتہ رات کے تمہارے قیدی کا کیا ہوا؟ میں نے کہا: یارسول اللہ! اس نے اپنی اور اپنے عیال کی سخت مجبوری بیان کی' مجھے ترس آیا اور میں نے اس کو چھوڑ دیا' آپ نے فرمایا: وہ جھوٹا ہے وہ پھر آئے گا۔ میں تیسری رات پھر اس کی گھات میں بیٹھا' وہ آیا اور پھر مٹھی بھر کر طعام لے جانے لگا' میں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا: آج آخری بار ہے' میں تجھ کو ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جاؤں گا' تو یہ کہتا ہے کہ میں نہیں آؤں گا اور پھر آجاتا ہے' اس نے کہا: مجھے چھوڑ دو میں تم کو چند ایسے کلمات بتاتا ہوں جن سے تم کو نفع ہوگا' میں نے پوچھا: وہ کون سے کلمات ہیں؟ اس نے کہا: جب تم

بستر پر جاؤ تو آیۃ الکرسی پڑھنا تو صبح تک اللہ تمہاری حفاظت کرے گا اور تمہارے پاس صبح تک شیطان نہیں آئے گا' صبح کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہے تو وہ جھوٹا لیکن یہ بات اس نے سچ کہی ہے۔

امام ابن الضریس نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ جو شخص بستر پر لیٹ کر آیۃ الکرسی پڑھتا ہے صبح تک دو فرشتے اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ (الدر المنثور ج ا ص ۳۲۷۔ ۳۲۲ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

کرسی پر بیٹھنے کی تحقیق

آیۃ الکرسی کی اس بحث میں ہم کرسی پر بیٹھنے کا شرعی حکم بیان کرنا چاہتے ہیں کیونکہ بعض علماء نے اس مسئلہ میں تشدد کیا ہے اور کرسی پر بیٹھنے کو ناجائز اور مکروہ تحریمی لکھا ہے اور بعض علماء نے کرسی پر بیٹھنے کو بدعت کہا ہے۔

علامہ ابوطالب مکی لکھتے ہیں:

پہلے صوفیاء کے بیٹھنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مجتمع ہو کر گھٹنوں کو کھڑا کر لیتے تھے بعض اپنے قدموں پر بیٹھتے اور اپنی کہنیاں گھٹنوں پر رکھ لیتے' خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے زمانہ سے علماء دین کا یہی طریقہ تھا۔ حسن البصری کے زمانہ سے لے کر ابوالقاسم جنید تک صوفیاء کا یہی طریقہ تھا' اس وقت تک کرسیاں نہیں ہوتی تھیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی مروی ہے کہ آپ اکڑوں بیٹھتے تھے اور گھٹنوں کے گرد کلائیوں سے حلقہ بنا لیتے اور ایک روایت میں ہے کہ آپ قدموں پر بیٹھتے تھے اور کلائیاں گھٹنوں پر رکھ لیتے تھے۔ صوفیاء میں سے جو شخص سب سے پہلے کرسی پر بیٹھا وہ مصر کے یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ تھے اور بغداد میں ان کی موافقت ابوحمزہ نے کی اور مشائخ نے ان کی مذمت کی۔ کرسی پر بیٹھنا ان عارفین کی سیرت سے نہیں ہے جو علم معرفت میں کلام کرتے ہیں' چارزانو (آلتی پالتی مار کر بیٹھنا) نحویوں' لغویوں' دنیادار علماء اور مفتیوں کا طریقہ ہے اور یہ متکبرین کی وضع ہے اور تواضع کا طریقہ سمٹ کر یا جڑ کر بیٹھنا ہے۔

(قوت القلوب ج ا ص ۱۲۹ 'مطبوعہ مطبعہ میمنیہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

علامہ ابوطالب مکی کی عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ کرسی پر بیٹھنا اور چارزانو بیٹھنا جنید بغدادی کے بعد صوفیاء میں شروع ہوا' عہد صحابہ سے لے کر جنید تک یہ طریقہ نہیں تھا' سو یہ بدعت اور سنت کے خلاف ہے اور متکبرین کے بیٹھنے کا طریقہ ہے۔

علامہ ابوطالب مکی کی رائے صحیح نہیں ہے بلکہ کتاب وسنت کے خلاف ہے' کرسی پر بیٹھنا انبیاء علیہم السلام' فرشتوں اور صحابہ کا طریقہ ہے اور چارزانو بیٹھنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے' پہلے ہم کرسی پر بیٹھنے کے متعلق بحث کریں گے اس کے بعد چارزانو بیٹھنے پر گفتگو کریں گے۔

کرسی کا لغوی معنی

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

کرسی لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جس پر ٹیک لگا کر بیٹھا جاتا ہے' ثعلب نے کہا: کرسی وہ ہے جو عرب کے نزدیک بادشاہوں کی کرسی کی حیثیت سے معروف ہے (ٹیک لگانے کی قید سے کرسی تخت سے ممتاز ہو گئی)۔

(لسان العرب ج ۶ ص ۱۹۴ 'مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ' قم' ایران' ۱۴۰۵ھ)

علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں:

زمخشری نے کہا ہے کہ کرسی وہ ہے جس پر بیٹھنے کے بعد مقعد سے زائد جگہ نہ بچے (یہ تخت اور کرسی میں فرق ہے' تخت پر بیٹھنے کے بعد جگہ باقی رہتی ہے اور کرسی میں نہیں رہتی)۔ (عمدۃ القاری ج ا ص ۶۶' ج ۹ ص ۲۳۷ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

قرآن مجید' احادیث اور آثار سے کرسی پر بیٹھنے اور چار زانو بیٹھنے کا جواز

قرآن مجید سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کرسی پر بیٹھتے تھے:

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا. اور بے شک ہم نے سلیمان کی آزمائش کی اور ان کی کرسی پر ایک جسم ڈال دیا۔ (ص: ۳۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل کو ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس وقت میں جا رہا تھا تو میں نے آسمان سے ایک آواز سنی' میں نے نظر اوپر اٹھائی تو دیکھا کہ جو فرشتہ میں نے حرا میں دیکھا تھا وہ زمین و آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی کرسی پر بیٹھے ہیں' امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو رفاعہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا' اس وقت آپ خطبہ دے رہے تھے' میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ایک مسافر آیا ہے' وہ دین کے متعلق سوال کر رہا ہے' وہ نہیں جانتا کہ اس کا دین کیا ہے؟ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو گئے' حتیٰ کہ میرے پاس آئے' ایک کرسی لائی گئی' آپ اس پر بیٹھ گئے' میرا گمان ہے کہ اس کے پائے لوہے کے تھے' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے دیئے ہوئے علم سے مجھے دین کی تعلیم دی' پھر آ کر اپنا خطبہ مکمل کیا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۸۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

علامہ نووی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرسی پر اس لیے بیٹھے تھے کہ سب لوگ آپ کا کلام سنیں اور آپ کی زیارت کریں[1] اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بھی کرسی تھی' امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گزشتہ رات میں نے گھر میں آہٹ سنی تو باہر جبرئیل علیہ السلام تھے' میں نے کہا: آپ گھر کے اندر کیوں نہیں آتے؟ کہا: گھر میں کتا ہے' میں نے گھر جا کر دیکھا تو کرسی کے نیچے حسن کے کتے کا بچہ تھا۔ (مسند احمد ج ۱ ص ۱۰۷' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۳۹۸ھ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی کرسی پر بیٹھے تھے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

ابو وائل بیان کرتے ہیں کہ میں شیبہ کے ساتھ کعبہ میں کرسی پر بیٹھا اور کہا: اس بیٹھنے کی جگہ پر حضرت عمر بھی بیٹھے تھے۔
(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۱۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اور متعدد احادیث میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی کرسی پر بیٹھے تھے' امام نسائی روایت کرتے ہیں:

عبد خیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی کے لیے کرسی لائی گئی اور وہ اس پر بیٹھے۔
(سنن نسائی ج ۱ ص ۲۷' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام نسائی نے اس حدیث کو دو سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے' اور امام احمد نے بھی اس کو دو سندوں سے روایت کیا ہے۔
(مسند احمد ج ۱ ص ۱۳۹۔ ۱۲۲' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۳۹۸ھ)

---

[1] علامہ یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ' شرح مسلم ج ۱ ص ۲۸۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ

[2] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' مسند احمد ج ۵ ص ۸۰' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۳۹۸ھ

امام احمد نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوہ میں بھیجے ہوئے بارہ صحابہ کے متعلق فرمایا: وہ شہید ہو گئے ان کے چہرے جنت میں چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک رہے تھے ان کے لیے سونے کی کرسیاں لائی گئیں۔

(مسند احمد ج ۳ ص ۱۳۵ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۳۹۸ھ)

کرسی پر بیٹھنے کے جواز کو بیان کرنے کے بعد اب ہم چارزانو (آلتی پالتی مار کر) بیٹھنے کا جواز بیان کر رہے ہیں:

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز پڑھنے کے بعد اچھی طرح سورج نکلنے تک چارزانو بیٹھے رہتے تھے۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۳۱۰ مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور ۱۴۰۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: دین میں جبر نہیں ہے بے شک ہدایت گمراہی سے خوب واضح ہو چکی ہے۔ (البقرہ: ۲۵۶)

دین میں جبر نہ ہونے کی تحقیق

اس سے پہلے آیت الکرسی میں اللہ عزوجل کی صفات بیان کی گئی تھیں اور یہ بتایا گیا تھا کہ تمام آسمانوں میں صرف اسی کی سلطنت ہے اور آسمانوں اور زمینوں کی حفاظت سے اس کو تھکاوٹ نہیں ہوتی اور اس کو ہر چیز کا علم ہے اور جب انسان نے یہ جان لیا تو پھر اس کے اسلام قبول کرنے اور اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے اور انسان اگر اس کائنات میں غور و فکر کرے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والا اور اس کو باقی رکھنے والا وہی رب عظیم ہے اب اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ اللہ کی ذات و صفات کو جاننے کے بعد انسان کو ازخود اس پر ایمان لانا چاہیے اور اس کے لیے کسی جبر و اکراہ کی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن مجید میں ایک اور جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ منشا نہیں ہے کہ لوگ جبراً اسلام میں داخل ہوں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًاؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ۝ (یونس: ۹۹)

اور اگر آپ کا رب چاہتا تو زمین میں جتنے لوگ ہیں سب ہی ایمان لے آتے تو کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کریں گے۝

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ (الکہف: ۲۹)

اور آپ کہیے کہ یہ حق (ہے) تمہارے رب کی طرف سے سو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

امام ابن جریر روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انصار کے ایک قبیلہ بنو سالم بن عوف کے حصین نامی ایک شخص کے دو بیٹے نصرانی تھے اور وہ خود مسلمان تھے انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ان کے بیٹے اسلام قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں کیا وہ ان کو جبراً مسلمان کریں تو یہ آیت نازل ہوئی کہ دین میں جبر نہیں ہے۔

(جامع البیان ج ۳ ص ۱۰ مطبوعہ دار المعرفہ بیروت ۱۴۰۹ھ)

"دین میں جبر نہیں ہے" (البقرہ: ۲۵۶) اس آیت کے متعلق علماء تفسیر کا اختلاف ہے بعض علماء نے کہا: یہ آیت اس دور میں نازل ہوئی جب کفار سے جہاد اور قتال کا حکم نازل نہیں ہوا تھا جب ان کی زیادتیوں پر معاف کرنے اور درگزر کرنے کا حکم تھا اور یہ حکم تھا کہ ان کی برائی کو اچھائی سے دور کرو اور عمدہ طریقہ سے ان سے بحث کرو اور جب جاہل مسلمانوں سے بات

کرتے تو وہ سلام کہتے' اور جب جہاد اور قتال کی آیات نازل ہوئیں تو ان آیات کا حکم منسوخ ہو گیا' جہاد اور قتال کی بعض آیات یہ ہیں:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ (التوبہ: ۷۳)
اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ . (التوبہ: ۵)
پس تم مشرکین کو جہاں بھی پاؤ انہیں قتل کر دو۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (الانفال: ۳۹)
اور کافروں سے قتال کرتے رہو حتیٰ کہ کفر کا غلبہ نہ رہے اور (پورا) دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے حتیٰ کہ وہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی گواہی دیں' جب وہ ایسا کرلیں گے تو وہ مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کرلیں گے ماسوا حق اسلام کے اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۸' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس سلسلہ میں تحقیق یہ ہے کہ اس آیت کا حکم منسوخ نہیں ہے بلکہ یہ آیت اہل کتاب کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جو لوگ کسی دین کو ماننے والے ہیں ان پر دین اسلام کو قبول کرنے کے معاملہ میں جبر نہیں کیا جائے گا اور رہے کفار اور بت پرست جن کا کسی آسمانی دین سے تعلق نہیں ہے تو ان کے اور ہمارے درمیان صرف تلوار ہے' وہ اسلام قبول کرلیں ورنہ ان کو قتل کر دیا جائے گا' اس کے برخلاف یہود و نصاریٰ اگر جزیہ ادا کر دیں تو ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا' امام ابن جریر کا بھی یہی نظریہ ہے اور اس کی تائید حسب ذیل احادیث سے ہوتی ہے' امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا کہ جزیرۂ عرب میں بت پرستوں سے قتال کریں اس لیے آپ نے ان سے "لا الہ الا اللہ" یا تلوار کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں کیا' اور باقی لوگوں سے جزیہ کو قبول کرنے کا حکم دیا اور فرمایا: دین میں جبر نہیں ہے۔

زید بن اسلم نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں دس سال رہے اور آپ کسی شخص پر دین میں جبر نہیں کرتے تھے اور مشرکین آپ سے قتال کرنے کے سوا اور کسی بات کو نہیں مانے' تب اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان سے قتال کرنے کی اجازت دی۔ (جامع البیان ج ۳ ص ۱۲۔ ۱۱' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ ابوبکر جصاص رازی حنفی لکھتے ہیں:

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں مشرکین سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اہل کتاب جب جزیہ ادا کر دیں تو وہ اہل اسلام کے حکم میں داخل ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب سے تلوار یا اسلام کے سوا اور کسی چیز کو قبول نہیں کیا اور جو مشرک بھی یہودی یا نصرانی ہو جائے اس کو قبول اسلام پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۴۵۲' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۴۰۰ھ)

مشروعیت جہاد پر نفی جبر کی وجہ سے اعتراض اور معاصر مفسرین کے جوابات

غیر مسلم سکالرز اور مستشرقین اسلام کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے اس سے مرعوب ہو کر ہمارے بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس آیت میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ "دین میں جبر نہیں ہے" اور جہاد کا حکم صرف مدافعانہ جنگ کے لیے ہے یعنی جب کوئی قوم مسلمانوں پر حملہ آور ہو تو وہ اپنے تحفظ اور دفاع کے لیے جہاد کریں۔

پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

اسلام جس طرح یہ گوارا نہیں کرتا کہ کسی کو جبراً مسلمان بنایا جائے اسی طرح وہ یہ بھی برداشت نہیں کرتا کہ کوئی اس کے ماننے والوں پر تشدد کر کے انہیں اسلام سے برگشتہ کرے یا جو خوشی سے اسلام کی برادری میں شریک ہونا چاہتے ہیں ان کو ایسا کرنے سے زبردستی روکا جائے اور اگر کہیں ایسی صورت پیدا ہو جائے تو اس وقت اسلام اپنے ماننے والوں کو حکم دیتا ہے کہ ایسی حالت میں وہ ظالم قوت کا مقابلہ کریں اور یہی اسلام کا نظریہ جہاد ہے اسلام کے بعض نکتہ چیں جہاد کو اکراہ فی الدین سے تعبیر کرتے ہیں اور اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں وہ سن لیں کہ اسلام ان کی خوشنودی کا پروانہ حاصل کرنے کے لیے اپنے ماننے والوں کو دشمنان دین وایمان کے جور وستم کا تختہ مشق بننے نہیں دے گا۔ (ضیاء القرآن ج ۱ ص ۱۷۹ مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور)

شیخ امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

اسی طرح ہمیں اس امر سے انکار نہیں ہے کہ مجرد کسی قوم کے اندر کفر کا وجود اس امر کے لیے کافی وجہ نہیں ہے کہ اسلام کے علمبرداران کے خلاف جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور تلوار کے زور سے ان کو اسلام پر مجبور کر دیں جہاد اصلاً فتنہ اور فساد فی الارض کے مٹانے کے لیے مشروع ہوا ہے اگر یہ چیز کہیں پائی جاتی ہے تو اہل ایمان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ استطاعت رکھتے ہوں تو وہ اس فتنہ اور فساد کو مٹانے کے لیے جہاد کریں خاص طور پر اس فتنہ کو مٹانے کے لیے جو اہل کفر کے ہاتھوں اس لیے برپا کیا جائے کہ اہل ایمان کو ان کے دین سے پھیرا جائے یا اسلامی نظام کو برباد کیا جائے صرف مشرکین بنی اسماعیل کا معاملہ اس کلیہ سے استثناء کی نوعیت رکھتا ہے۔ (تدبر قرآن ج ۱ ص ۵۹۴ مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن لاہور پاکستان)

اسی طرح مفتی محمد شفیع دیوبندی نے بھی گول مول طریقہ سے لکھا ہے:

اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم لوگوں کو قبول ایمان پر مجبور کرنے کے لیے نہیں ہے ورنہ جزیہ لے کر کفار کو اپنی ذمہ داری میں رکھنے اور ان کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کرنے کے لیے اسلامی احکام کیسے جاری ہوتے بلکہ دفع فساد کے لیے ہے کیونکہ فساد اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے جس کے کافر درپے رہتے ہیں۔ (معارف القرآن ج ۱ ص ۶۱۶ مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی)

جوابات مذکورہ پر بحث ونظر

اسلام میں جہاد صرف مدافعانہ جنگ کے لیے نہیں ہے جیسا کہ علامہ ازہری نے لکھا ہے اور نہ صرف فتنہ اور فساد کو دور کرنے کے لیے ہے جیسا کہ مؤخر الذکر علماء نے لکھا ہے بلکہ اسلام میں جہاد اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (الانفال: ۳۹)

اور کافروں سے قتال کرتے رہو حتیٰ کہ کفر کا غلبہ نہ رہے اور پورا دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے۔

اس آیت میں یہ واضح حکم دیا گیا ہے کہ جب تک کہ پورا دین اللہ کے لیے نہ ہو جائے اس وقت تک کافروں سے جنگ اور جہاد کرتے رہو۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے قتال کرتا رہوں جب تک کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت نہ دیں' اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں' اگر انہوں نے ایسا کرلیا تو وہ مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو بچالیں گے ماسوا اسلام کے حق کے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ص ۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

مشرکین کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ جب تک وہ اسلام نہ قبول کرلیں ان سے جہاد اور قتال کیا جائے:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۚ (التوبہ: ۵)

سو تم مشرکین کو جہاں پاؤ انہیں قتل کردو' ان کو گرفتار کرو' ان کا محاصرہ کرو' اور ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ بیٹھو' پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔

اور اہل کتاب کے متعلق فرمایا: انہیں اسلام کی دعوت دو اگر وہ نہ مانیں تو ان سے قتال کرو اور اگر وہ تمہارے ماتحت ہو کر جزیہ دینا قبول کرلیں تو ان کو چھوڑ دو:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (التوبہ: ۲۹)

ان لوگوں سے قتال کرو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اس چیز کو حرام نہیں کہتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اور دین حق کو قبول نہیں کرتے جو کہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اہل کتاب ہیں حتیٰ کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں ۝

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قوم سے اس وقت تک قتال نہیں کیا جب تک ان کو اسلام کی دعوت نہیں دی۔

حافظ الہیثمی لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام احمد' امام ابو یعلیٰ اور امام طبرانی نے کئی سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے اور امام احمد کی سند صحیح ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۵ص ۳۰۴ 'مطبوعہ دارالکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شخص کو کسی بڑے یا چھوٹے لشکر کا امیر بناتے تو اس کو بالخصوص اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتے اور اس کے ساتھی مسلمانوں کو نیکی کی وصیت کرتے' پھر فرماتے: اللہ کا نام لے کر اللہ کے راستہ میں جہاد کرو' جو شخص اللہ کے ساتھ کفر کرے اس کے ساتھ جنگ کرو' خیانت نہ کرو' عہد شکنی نہ کرو' کسی شخص کے اعضاء کاٹ کر اس کی شکل نہ بگاڑو' اور کسی بچہ کو قتل نہ کرو' جب تم دشمن مشرکوں (اہل کتاب) سے مقابلہ کرو تو ان کو تین چیزوں کی دعوت دینا' وہ ان میں سے جس کو بھی مان لیں اس کو قبول کرلینا اور جنگ سے رک جانا' پہلے ان کو اسلام کی دعوت دو' اگر وہ اسلام لے آئیں تو ان کا اسلام قبول کرلو اور ان سے جنگ نہ کرو' اور ان سے یہ کہو کہ وہ اپنا شہر چھوڑ کر مہاجرین کے شہر میں آجائیں (الی قولہ) اور اگر وہ مہاجرین کے شہر میں آنے سے انکار کردیں تو ان کو یہ خبر دو کہ پھر ان پر دیہاتی مسلمانوں کا حکم ہوگا (الی قولہ) اگر وہ اس دعوت کو قبول نہ کریں تو پھر ان سے جزیہ کا سوال کرو' اگر وہ اس کو تسلیم کرلیں تو تم بھی اس کو قبول

کرلو اور ان سے جنگ نہ کرو اور اگر وہ اس کا انکار کریں تو پھر اللہ کی مدد کے ساتھ ان سے جنگ شروع کردو۔ الحدیث
(صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۲ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:
جنگ خیبر کے ایام میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جھنڈا عطا فرمایا تو انہوں نے کہا: جب تک وہ مسلمان نہیں ہوں گے ہم ان سے قتال کرتے رہیں گے' آپ نے فرمایا: اسی طرح کرنا' حتیٰ کہ جب تم ان کے علاقہ میں داخل ہو تو (پہلے) ان کو اسلام کی دعوت دینا' اور ان کو یہ خبر دینا کہ ان پر کیا احکام واجب ہیں' اللہ کی قسم! اگر ایک شخص بھی تمہارے سبب سے ہدایت یافتہ ہو جائے تو وہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں (دنیا کی خیر) سے بہتر ہے۔
(صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۱۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

مصنف کی طرف سے مشروعیت جہاد پر اعتراض کے جوابات

یہودی اور عیسائی مستشرقین معترضین کو سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ کفار کے خلاف جنگ اور جہاد کرنے میں اسلام تنہا اور منفرد نہیں ہے' بلکہ موجودہ تورات (کتاب مقدس' بائبل) میں بھی اپنے مخالف کفار کے ساتھ جنگ اور جہاد کرنے کی تلقین اور ترغیب دی گئی ہے' اور موجودہ انجیل میں تصریح ہے کہ تورات کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہے' اب آپ تورات کے اس اقتباس کا مطالعہ فرمائیں:

جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام دینا O اور اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے اور اپنے پھاٹک تیرے لیے کھول دے تو وہاں کے سب باشندے تیرے باج گزار بن کر تیری خدمت کریں O اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے لڑنا چاہے تو تو اس کا محاصرہ کرنا O اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا O لیکن عورتوں اور بال بچوں اور چوپایوں اور اس شہر کے سب مال اور لوٹ کو اپنے لیے رکھ لینا اور تو اپنے دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھ کو دی ہو کھانا O ان سب شہروں کا یہی حال کرنا جو تجھ سے دور ہیں اور ان قوموں کے شہر نہیں ہیں O پر ان قوموں کے شہروں میں جن کو خداوند تیرا خدا میراث کے طور پر تجھ کو دیتا ہے کسی ذی نفس کو جیتا نہ بچا رکھنا O بلکہ تو ان کو یعنی حتی اور اموری اور کنعانی اور فرزی اور حوی اور یبوسی قوموں کو جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھ کو حکم دیا ہے بالکل نیست کر دینا O تاکہ وہ تم کو اپنے سے مکروہ کام کرنے نہ سکھائیں جو انہوں نے اپنے دیوتاؤں کے لیے کیے ہیں اور یوں تم خداوند اپنے خدا کے خلاف گناہ کرنے لگو O (استثناء باب: ۲۰' آیت: ۱۸۔ ۱۰) (عہد نامہ قدیم: ۱۸۶)

واضح رہے کہ عیسائیوں کے نزدیک بھی کفار کے خلاف جہاد کا یہ حکم باقی ہے منسوخ نہیں ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں O کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے O (متی باب: ۵' آیت ۱۸۔ ۱۷) (نیا عہد نامہ: ۸)

جو غیر مسلم مستشرقین اسلام کے نظریہ جہاد پر اعتراض کرتے ہیں انہیں تورات اور انجیل کے ان اقتباسات کو بہ غور پڑھنا چاہیے۔ اب جہاد کے متعلق اسلام کا نظریہ ملاحظہ کریں:

جہاد کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کے شہر پر حملہ کیا جائے اور مسلمان مدافعانہ جنگ کریں' یہ جہاد فرض عین

ہے' اس کی مثال غزوۂ بدر' غزوۂ احد اور غزوۂ خندق ہیں ہے اور ظاہر ہے کہ یہ لا اکراہ فی الدین کے خلاف نہیں ہے اور نہ اس پر کوئی ہوش مند اعتراض کر سکتا ہے اور جہاد کی دوسری صورت یہ ہے کہ تبلیغ اسلام کے لیے جہاد کیا جائے اور بہ شرط استطاعت ازخود کافروں کے ملک پر حملہ کیا جائے' یہ جہاد فرض کفایہ ہے' فتح مکہ' فتح طائف اور فتح خیبر میں اس کی مثالیں ہیں اور بعد میں مسلمانوں نے مصر' شام' عراق' ایران اور بہت سے علاقوں میں تبلیغ اسلام کے لیے جہاد کیا اور دنیا کے تین براعظموں میں مسلمانوں کی حکومت پہنچ گئی اور اس میں یہ تفصیل ہے کہ جب مشرکین سے جہاد کیا جائے تو یہ تلوار ہے یا اسلام' اور اہل کتاب کے ساتھ جنگ ہو تو پھر تین صورتیں ہیں یا وہ اسلام قبول کریں یا جزیہ دیں یا پھر جنگ کریں۔

اہل کتاب کے ساتھ جزیہ کی رعایت اس لیے رکھی ہے کہ وہ الوہیت اور رسالت کے کسی نہ کسی طور پر قائل ہیں' آخرت پر ایمان رکھتے ہیں جزا سزا اور حلال و حرام کے اصولی طور پر معترف ہیں اور جب وہ جزیہ دے کر مسلمانوں کے باج گزار ہو جائیں گے اور ان کا مسلمانوں کے ساتھ میل جول ہوگا تو مسلمانوں کو ان میں تبلیغ اسلام کے مواقع میسر ہوں گے اور انہیں بھی اسلام کی تعلیمات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا اور وہ جلد یا بہ دیر اسلام کو قبول کر لیں گے اور ان کا اسلام کو قبول کرنا بہ رضا و رغبت ہوگا' اس میں جبر کا کوئی دخل نہیں ہے' جہاد کی اس شکل پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔

اب صرف ایک شکل رہ جاتی ہے اور وہ ہے تبلیغ اسلام کے لیے مشرکین کے خلاف جہاد' یا وہ اسلام کو قبول کر لیں ورنہ ان کو قتل کر دیا جائے گا اور اس پر بادی النظر میں اعتراض ہوتا ہے کہ یہ جبر و اکراہ ہے لیکن درحقیقت یہ بھی جبر نہیں ہے' اگر کوئی شخص کسی ملک کا باشندہ ہو' اس ملک کے بادشاہ کی مہیا کی ہوئی سہولتوں اور فائدوں سے بہرہ اندوز ہوتا اور اس ملک کی زمین میں گھر بنا کر رہتا ہو اور تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہو لیکن وہ اس ملک کے بادشاہ یا حکمران کی حکومت کو نہ مانے' اس کے قوانین پر عمل نہ کرے اور اس کے برعکس اس حکومت کے مخالف اور دشمن ملک اور حکومت کا علی الاعلان دم بھرتا ہو اور اس کی وفاداری کا اعلان کرتا ہو تو کیا اس کو گردن زدنی نہیں قرار دیا جائے گا اور اس کو غدار قرار دے کر قتل نہیں کیا جائے گا' کیا آج دنیا کے تمام مہذب ملکوں کا اس پر عمل نہیں ہے اور اگر اس شخص سے یہ کہا جائے کہ یا تو تم اس ملک کی وفاداری کا اعلان کرو ورنہ تم کو قتل کر دیا جائے گا تو یہ کیوں عدل و انصاف کے مطابق نہیں ہے جب کہ آج کی نام نہاد مہذب دنیا میں ایسے شخص کو یہ موقع دیئے بغیر قتل کر دیا جاتا ہے' سو اسی طرح جو شخص اللہ کی بنائی ہوئی زمین میں رہتا ہے اور اس کی دی ہوئی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن وہ اللہ کو مانتا ہے نہ اس کے کسی اصول اور قانون کو اور دنیا میں آسمانی مذاہب کی جتنی شکلیں ہیں ان میں سے وہ کسی کو بھی نہیں مانتا تو اس سے یہ کہنا بجا اور عدل و انصاف کے مطابق ہے کہ یا تو اللہ کے دین کو قبول کرو ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ' نیز جس طرح ہر حکومت میں ریاست کے غدار کی سزا موت ہے اسی طرح اسلام میں بھی مرتد کی سزا یہ ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے' اس کو تین دن موقع دیا جاتا ہے کہ وہ غور و فکر کرے اور اگر اس کو اسلام کے خلاف کوئی شبہ ہے تو اس کو زائل کیا جائے لیکن اگر وہ اس کے باوجود اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہتا ہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے جب کہ غدار وطن کے لیے یہ رعایت نہیں ہوتی۔

تمام مہذب دنیا میں جرائم پر سزاؤں کا نظام جاری ہے' اور جب کسی قاتل' چور' ڈاکو یا ریاست کے غدار کو سزا دی جائے تو یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ جبر ہے اور حریت فکر اور آزادی رائے کے خلاف ہے' اسی طرح جب مشرک کو ایمان نہ لانے پر جہاد میں قتل کیا جائے یا مرتد کو توبہ نہ کرنے پر قتل کیا جائے تو یہ بھی ان کے جرائم کی سزا ہے' جبر نہیں ہے اور حریت فکر اور آزادی رائے کے خلاف نہیں ہے۔

کیا دین اسلام قبول کرنے میں جبر کا نہ ہونا مشروعیت جہاد کے خلاف ہے؟ میں اس اشکال کے جواب میں کئی دن غور کرتا رہا، میں نے اس سوال کے جواب کی تلاش کے لیے قدیم اور جدید متعدد تفاسیر کو دیکھا، لیکن میں نے دیکھا کہ کسی نے بھی اس کو حل نہیں کیا اور مدافعانہ جنگ اور جزیہ کے اختیار سے اصل اشکال کو ٹالنے، دفع وقتی اور فرار کی کوشش کی، بہرحال میرے ذہن میں جو جواب آیا وہ میں نے لکھ دیا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو یہ میری فکر کی کمی ہے اور آئندہ آنے والے علماء کے لیے دعوت فکر ہے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ؕ

اللہ ایمان والوں کا مددگار ہے، انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے،

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ

اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے دوست شیطان ہیں، وہ ان کو روشنی سے اندھیروں کی

اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓـئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵۷ ع

طرف نکالتے ہیں، وہ دوزخی لوگ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے O

مومنوں کو ظلمات سے نکالنے کے محامل

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا: ہدایت گمراہی سے خوب واضح ہو چکی ہے، اس پر یہ سوال ہوتا تھا کہ جب ہدایت گمراہی سے خوب واضح ہو چکی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ سب لوگ ایمان نہیں لائے؟ لہذا اس آیت میں بتایا ہے کہ ایمان کی دولت اللہ کی توفیق سے نصیب ہوتی ہے اور جن لوگوں نے شیاطین سے دوستی رکھی وہ اللہ کی توفیق سے محروم ہو گئے اور شیطان نے انہیں کفر کے اندھیروں میں دھکیل دیا۔

ولی کا یہاں معنی ہے: مددگار، محب اور کارساز، یعنی اللہ مومنین کا محب ہے یا مددگار ہے یا کارساز ہے، اس آیت میں فرمایا ہے: اللہ مومنوں کو ظلمات سے نور کی طرف نکالتا ہے، اس پر سوال ہے کہ مومن تو ایمان کی وجہ سے پہلے ہی نور میں ہیں نہ کہ ظلمات میں پھر ان کو ظلمات سے نکالنے کا کیا معنی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اخراج کے دو معنی ہو سکتے ہیں، حقیقت اور مجاز، اگر حقیقت مراد ہو تو ایمان والوں سے مراد ہے: جنہوں نے ایمان لانے کا ارادہ کیا تو ان کو اللہ کفر کے اندھیروں سے ایمان کے نور کی طرف نکالتا ہے یا معنی ہے: اللہ مومنوں کو ان کے نفوس کی ظلمانیت سے آداب شریعت کی طرف نکالتا ہے یعنی ان کو رضا، صدق، توکل، معرفت اور محبت الٰہی کی راہ میں ڈال دیتا ہے، یا معنی ہے: ان کو وحشت اور فرقت کے اندھیروں سے سکون اور وصل کے نور کی طرف نکالتا ہے، یا اخراج سے مجازاً باز رکھنا مراد ہے یعنی اللہ مومنوں کو ظلمات کفر سے دور رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے دوست طاغوت ہیں وہ ان کو روشنی سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔ (البقرہ: ۲۵۷)

کفار کو نور سے نکالنے کے محامل

یہاں پر بھی یہ سوال ہے کہ کفار کے لیے نور کب ثابت ہے جو انہیں نور سے نکال کر ظلمت کی طرف لایا گیا' کفر تو ہے ہی ظلمت' اس کے متعدد جوابات ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا: اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کے وہ لوگ ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے' پھر شیطان کے بہکانے میں آ کر وہ ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے اور آپ کے ساتھ انہوں نے کفر کیا اور یوں وہ نور سے نکل کر ظلمت میں آ گئے۔ بعض نے کہا: اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے وسیلہ سے فتح کی دعائیں کرتے رہے اور جب آپ مبعوث ہو گئے تو انہوں نے شیطان کے کہنے میں آ کر آپ کے ساتھ کفر کیا اور یوں روشنی سے اندھیرے میں آ گئے' بعض نے کہا: انہوں نے فطرت اسلام کے نور کو ترک کر کے کفر کے اندھیرے کو اختیار کیا' بعض نے کہا: عالم ارواح میں انہوں نے ''بلیٰ'' کہہ کر جو اقرار کیا تھا اس کے نور سے نکل کر وہ کفر کے اندھیروں میں آ گئے۔

طاغوت کا معنی

طاغوت کا لفظ طغیان سے ماخوذ ہے' اور طغیان کا معنی ہے: کسی چیز کی حد سے تجاوز کرنا' یہ لفظ اصل میں ملکوت کی طرح مصدر ہے اور اس میں تاء زائد ہے۔ طاغوت سے مراد بت ہیں یا شیطان' بعض محققین نے کہا: طاغوت چار ہیں: (۱) ابلیس لعنہ اللہ (۲) وہ شخص جو اپنی عبادت کیے جانے پر راضی ہو (۳) وہ شخص جو لوگوں کو اپنی عبادت کرنے کی دعوت دے (۴) جو شخص وحی الٰہی کے بغیر علم غیب کا مدعی ہو۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ

(اے محبوب!) کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے ان کے رب کے متعلق جھگڑا کیا (کیونکہ) اللہ نے

اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ

اس کو سلطنت دی تھی' جب ابراہیم نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے' اس نے کہا: میں زندہ کرتا ہوں

وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ

اور مارتا ہوں' ابراہیم نے کہا: بے شک اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے

فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا

تو اس کو مغرب سے لے آ' تو کافر حیران اور لاجواب ہو گیا' اور اللہ ظلم

يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ ﴿۲۵۸﴾ اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ

کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا ○ یا اس شخص کی طرح جو ایک بستی پر گزرا دراں حالیکہ

هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ

وہ بستی اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھی' اس نے (تعجب سے) کہا: اللہ اس بستی والوں کو مرنے کے بعد کیسے

مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ

زندہ کرے گا! تو اللہ نے سو برس تک اس پر موت طاری کر دی' پھر اس کو زندہ کر کے اٹھایا' فرمایا: تم نے کتنی مدت قیام کیا؟

قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ

اس نے کہا: تمام دن یا دن کا کچھ حصہ! اللہ نے فرمایا: بلکہ تم ایک سو سال تک ٹھہرے رہے'

عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ

پس تم اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو جو اب تک سڑی (بدبودار) نہیں' اور اپنے

اِلٰى حِمَارِكَ ۟ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ

گدھے کو دیکھو اور تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے اپنی قدرت کی نشانی بنائیں اور (ان) ہڈیوں کی طرف دیکھو ہم کس طرح

كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ

ان کو ملا کر جوڑتے ہیں' پھر انہیں گوشت پہناتے ہیں' پھر جب ان پر (موت کے بعد زندہ ہونا) منکشف ہو گیا تو انہوں نے کہا:

اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

میں یقین رکھتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے O

مومن کے نور اور کافر کی ظلمت کی مثالیں

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ مومنوں کا مددگار ہے' اور کفار کے دوست شیاطین ہیں' اب اللہ تعالیٰ ایک مثال مومن کی اور ایک مثال کافر کی بیان فرما رہا ہے تاکہ اس قاعدہ کی وضاحت ہو اور اس قاعدہ پر دلیل قائم ہو' مومن کی مثال میں حضرت ابراہیم کو بیان کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات اور صفات پر دلائل پیش کرنے کی توفیق عطا کی اور انہوں نے کافر کے شبہات کا قلع قمع کیا اور کافر کی مثال میں نمرود بادشاہ کو بیان کیا جو اپنے شکوک اور شبہات کے اندھیروں میں رہا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے مباحثہ کا پس منظر اور پیش منظر

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ جس شخص کے سامنے حضرت ابراہیم نے اللہ کے رب ہونے پر دلیل پیش کی تھی' اس کا نام نمرود

بن کنعان تھا' یہ زمین پر پہلا بادشاہ تھا' اس نے بابل میں قلعہ بنایا تھا اور یہ پہلا شخص تھا جو اللہ کی ربوبیت پر دلیل قائم ہونے کے بعد زمین پر لا جواب اور حیران ہوا۔

زید بن اسلم بیان کرتے ہیں کہ زمین پر سب سے پہلا بادشاہ نمرود تھا' لوگ اس کے پاس خوراک طلب کرنے کے لیے جاتے تھے' ایک دن لوگوں کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس کے پاس گئے' وہ لوگوں سے پوچھتا: تمہارا رب کون ہے؟ لوگ کہتے کہ آپ ہیں' حتیٰ کہ جب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو پوچھا: تمہارا رب کون ہے؟ حضرت ابراہیم نے کہا: جو لوگوں کو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے؟ اس نے کہا: میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں' حضرت ابراہیم نے کہا: اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال' تو وہ کافر حیران اور لا جواب ہو گیا' پھر اس نے حضرت ابراہیم کو خوراک اور طعام دیئے بغیر واپس کر دیا' واپسی میں حضرت ابراہیم کا ایک ریت کے ٹیلہ سے گزر ہوا' انہوں نے سوچا کیوں نہ میں کچھ ریت کپڑے میں باندھ کر لے جاؤں تاکہ گھر والوں کو کوئی بندھی ہوئی چیز دیکھ کر تسکین ہو' گھر جا کر انہوں نے گٹھڑی کو رکھ دیا' اہلیہ نے کھول کر دیکھا تو وہ بہترین طعام تھا' حضرت ابراہیم نے جان لیا کہ یہ طعام انہیں اللہ نے دیا ہے' پھر اللہ نے اس بادشاہ کی طرف ایک فرشتہ بھیجا کہ وہ اللہ پر ایمان لائے' اللہ اسے اس کے ملک پر برقرار رکھے گا' نمرود نے کہا: میرے سوا اور کون رب ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے پاس تین بار فرشتے کو بھیجا' اس نے ہر بار انکار کیا' پھر فرشتے نے اس سے کہا: تم تین دن کے اندر اپنے سب لوگوں کو جمع کراؤ' جب سب لوگ جمع ہو گئے' تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر مچھر چھوڑ دیئے' مچھروں نے ان لوگوں کا گوشت کھا لیا اور خون پی لیا اور وہ لوگ صرف ہڈیوں کا پنجر رہ گئے' اللہ تعالیٰ نے ایک مچھر اس کے نتھنے کے ذریعہ اس کے دماغ میں بھیج دیا' چار سو سال تک نمرود کے سر کو ہتھوڑوں سے کوٹا جاتا تھا' چار سو سال تک وہ اس عذاب میں مبتلا رہا' لوگ اس کو دیکھ کر رحم کھاتے تھے' بالآخر وہ مر گیا' یہ وہی شخص ہے جس نے آسمان کی جانب ایک قلعہ بنایا تھا' اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: بے شک ان سے پہلے لوگوں نے فریب کیا تو اللہ نے ان کی عمارت بنیادوں سے اکھاڑ دی' سو ان پر ان کے اوپر سے چھت گر پڑی اور ان پر وہاں سے عذاب آیا جہاں سے انہیں وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

ربیع بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے تو نمرود نے دو آدمیوں کو بلایا' ایک کو چھوڑ دیا اور دوسرے کو مار دیا' حضرت ابراہیم نے کہا: بے شک اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال تو پھر وہ کافر حیران اور لا جواب ہو گیا۔

سدی بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کو آگ سے نکال کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا' اس سے پہلے وہ بادشاہ کے سامنے پیش نہیں ہوئے تھے' بادشاہ نے ان سے بات کی اور پوچھا: تمہارا رب کون ہے؟ حضرت ابراہیم نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے' نمرود نے کہا: میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں' اس نے چار آدمیوں کو بلایا اور ان کا کھانا پینا بند کر دیا' جب وہ بھوک سے مرنے لگے تو اس نے ان میں سے دو آدمیوں کو کھلایا اور پلایا' وہ زندہ رہے اور باقی دو کو بدستور بھوکا رکھا' وہ مر گئے' تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جانا کہ اس کو اپنی سلطنت میں اقتدار حاصل ہے اور وہ اس طرح کے کام کر سکتا ہے' تب پھر انہوں نے کہا: بے شک میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال' یہ سن کر وہ حیران اور لا جواب ہو گیا' اس نے کہا: یہ شخص مجنون ہے اس کو لے جاؤ' کیا تم نے نہیں دیکھا اس نے تمہارے خداؤں پر جرأت کی اور انہیں توڑ دیا اور آگ اس کو جلا نہیں سکی اور نمرود کو یہ ڈر تھا کہ وہ اپنی قوم کے سامنے رسوا ہو جائے گا' پھر اس نے حضرت ابراہیم کو نکالنے کا حکم دیا۔ (جامع البیان ج ۳ ص ۱۸۔ ۱۹ ملتقطا مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دلائل کا خلاصہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے سامنے جو دلیل پیش کی تھی اس کی ایک تقریر تو یہ ہے کہ نمرود حضرت ابراہیم کی پہلی دلیل نہیں سمجھ سکا' وہ اس قدر موٹی عقل کا انسان تھا کہ اس نے زندہ کرنے کا معنی زندہ چھوڑنا سمجھا' حالانکہ زندہ کرنے کا معنی ہے: بے جان جسم میں جان ڈالنا' اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسری واضح دلیل پیش کی' اور دوسری تقریر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف منتقل نہیں ہوئے' بلکہ دونوں مرتبہ ایک ہی دلیل پیش کی البتہ اس کی دو مثالیں بیان فرمائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دلیل کی تقریر یہ ہے کہ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ بہت سی ایسی چیزیں حادث ہوتی ہیں جن کے وجود میں کسی شخص کا دخل نہیں ہوتا' مثلاً زندہ کرنا' مارنا' بادلوں کی کڑک اور بجلی کا چمکنا' سورج' چاند اور دیگر کواکب سیارہ کی حرکات' نمرود کا کسی کو زندہ چھوڑ دینا اور کسی کو قتل کر دینا' اس کا زندہ کرنا اور مارنا نہیں ہے' کیونکہ اس سے پہلے بھی لوگ پیدا ہوتے تھے اور مرتے تھے' وہ خود بھی پیدا ہوا اور اس نے ایک مقررہ دن میں مرنا تھا' جب اس مثال سے اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا استدلال واضح نہیں ہو سکا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسری آسان مثال دی۔

مناظرہ اور مباحثہ کے احکام اور آداب

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کو ملک (بادشاہ) کہنا جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اللہ نے اس کو ملک دیا تھا' نیز اس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو دنیا میں نعمتیں عطا فرماتا ہے' اور آخرت میں ان کو محروم کر دیتا ہے اور دوزخ کے سوا ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے' نیز اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ دین کو ثابت کرنے کے لیے مخالفین سے مباحثہ اور مناظرہ کرنا جائز ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے' ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب سے مباحثہ کیا اور دلیل قائم کرنے کے بعد مباہلہ کیا یعنی یہ دعا کی: جو ہم میں سے ظالم اور باطل ہو اللہ اس پر لعنت کرے' اسی طرح صحابہ میں سے مہاجرین اور انصار نے سقیفہ بنو ساعدہ میں اس بات پر مباحثہ کیا کہ مہاجرین اور انصار میں خلافت کا مستحق کون ہے' مناظرہ اور مباحثہ کا مقصد صرف حق کو ثابت کرنا اور باطل کا رد ہونا چاہیے' مناظرہ کا معنی ہے: فریقین کے دلائل میں نظر کرنا' انانیت' ہٹ دھرمی' کج بحثی اور اپنی ضد پر قائم رہنا اور اپنے موقف پر اڑے رہنا مناظرہ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مناظرہ کے حسب ذیل آداب بیان فرمائے ہیں:

فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۚ (آل عمران: ۶۶) تم اس چیز میں کیوں بحث کرتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بغیر علم کے مناظرہ نہیں کرنا چاہیے۔ امام اعظم نے اپنے بیٹے حماد کو مناظرہ سے منع کیا' انہوں نے کہا: آپ خود تو مناظرہ کرتے ہیں' امام اعظم نے کہا: تمہارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کب مخالف کوئی کفریہ بات کہے اور ہم اس کی گرفت کریں اور ہم مخالف کو ایسے موقع پر سنبھال لیتے ہیں اور اس کو اس درجہ کی ضد سے بچا لیتے ہیں۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۚ (النحل: ۱۲۵) حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اپنے رب کے راستہ کی طرف بلایئے اور ان سے عمدہ طریقہ سے بحث کیجئے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مخلوق میں سے کوئی شے اللہ کے مشابہ نہیں ہے اور حقائق کائنات میں غور و فکر کرنے سے اللہ تعالیٰ کی توحید کا علم حاصل ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ کے افعال اور آثار سے اس کی ذات اور صفات پر

استدلال کیا ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یا اس شخص کی طرح جو ایک بستی پر گزرا درآں حالیکہ وہ بستی اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھی اس نے (تعجب سے) کہا: اللہ اس بستی والوں کو مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا! تو اللہ نے سو برس تک اس پر موت طاری کردی پھر اس کو زندہ کر کے اٹھایا۔ (البقرہ: ۲۵۹)

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے حضرت ابراہیم کا جو واقعہ بیان کیا تھا اس میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کو ثابت کرنے کا بیان تھا اور اس واقعہ میں قیامت کے بعد لوگوں کو زندہ کرنے اور حشر کو ثابت کرنے کا بیان ہے۔

تباہ شدہ بستی اور اس کے پاس سے گزرنے والے شخص کی تحقیق

جو شخص اس تباہ شدہ بستی کے پاس سے گزرا تھا وہ کون تھا؟ اس کے متعلق مفسرین کے کئی اقوال ہیں امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے:

سلیمان بن بریدہ' قتادہ' ربیع' عکرمہ' سدی' ضحاک اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے۔

وہب بن منبہ' عبید بن عمیر اور ابن وہب نے کہا کہ وہ ارمیاہ بن حلقیا یعنی حضرت خضر علیہ السلام تھے۔

امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نبی علیہ السلام کے تعجب کا ذکر کیا ہے کہ اللہ مرنے کے بعد لوگوں کو کیسے زندہ فرمائے گا اور اس نبی کے نام کی تعیین نہیں کی' ہوسکتا ہے کہ وہ حضرت عزیر ہوں اور ہوسکتا ہے کہ وہ حضرت خضر ہوں' اس لیے ہمیں بھی اس کی تعیین کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔ (جامع البیان ج ۳ ص ۲۰ مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں:

حضرت علی' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم' عکرمہ' ابوالعالیہ' سعید بن جبیر' قتادہ' ربیع' ضحاک' سدی' مقاتل' سلیمان بن بریدہ' ناجیہ بن کعب اور سالم خواص نے کہا: وہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے۔

وہب' مجاہد' ابن عمیر' بکر بن مضر' ابن اسحاق اور نقاش نے کہا: وہ حضرت ارمیاہ یعنی خضر علیہ السلام تھے۔

حسن بصری نے کہا کہ وہ ایک کافر تھا جو گدھے پر سوار تھا' اس کے پاس انجیر کی ایک ٹوکری تھی' مجاہد نے ملی سے نقل کیا ہے کہ وہ بنو اسرائیل کا کوئی شخص تھا' ایک قول یہ ہے کہ وہ لوط علیہ السلام کا غلام تھا' ایک قول یہ ہے کہ وہ شعیا۔ تھے۔ (فقہاء صحابہ اور تابعین کی اکثریت نے چونکہ یہ کہا ہے کہ وہ حضرت عزیر تھے اس لیے ہمارا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ سعیدی غفرلہ)

حضرت عزیر کا جس تباہ شدہ بستی سے گزر ہوا تھا' اس کے متعلق وہب' قتادہ' ضحاک' عکرمہ اور ربیع نے کہا ہے کہ وہ بیت المقدس کا شہر تھا' یا بیت المقدس سے دو فرسخ (نو انگریزی میل) کے فاصلہ پر انگوروں کے باغ کی ایک بستی تھی' ضحاک نے کہا: وہ ارض مقدسہ تھی' ابن زید نے کہا: یہ وہ بستی تھی جس سے لوگ طاعون سے ڈر کر بھاگے تھے' حضرت ابن عباس نے کہا: وہ دیر ھرقل تھا' کلبی نے کہا: شاہ ورآباد تھا' سدی نے کہا: وہ سلماباذ تھا۔ (البحر المحیط ج ۲ ص ۶۳۲ مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۱۲ھ)

امام ابن جریر نے عکرمہ سے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ جس بستی کے پاس سے حضرت عزیر گزرے تھے وہ بیت المقدس کے قریب ایک بستی تھی جس کو بخت نصر نے تباہ کردیا تھا۔ (جامع البیان ج ۳ ص ۲۰ مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

زمخشری نے کہا ہے کہ وہ شخص کافر تھا تاکہ یہ واقعہ نمرود کے واقعہ کے ساتھ منسلک ہو' ابوعلی نے کہا: وہ کافر ہی تھا کیونکہ نبی کو مرنے کے بعد اٹھنے میں شک نہیں تھا لیکن یہ دونوں دلیلیں کمزور ہیں' وہ حضرت عزیر تھے اور یہ قصہ حضرت ابراہیم کے قصہ

کے ساتھ منسلک ہے اور ان کو شک نہیں تھا بلکہ انہوں نے ازراہِ تعجب کہا تھا' نیز اس واقعہ کے آخر میں ہے: اس نے بعث بعد الموت کی تصدیق کی اور کافر تصدیق نہیں کرتا اور اتنی بڑی نشانی دکھانے کا اعزاز نبی کے لیے ہی ہو سکتا ہے کافر کے لیے نہیں' اور نہ کافر کا یہ مقام ہے کہ اللہ اس کے تعجب کو زائل کرنے کے لیے اپنی عظیم الشان قدرت کو ظاہر فرمائے۔

حضرت عزیر کو حیات بعد الموت کا مشاہدہ کرانا

بعض مفسرین کا یہ مختار ہے کہ حضرت عزیر زندہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک سو سال تک ان سے حس اور حرکت کو سلب کر لیا' پھر ان میں دوبارہ حس اور حرکت کو لوٹا دیا گویا کہ وہ سوئے تھے پھر بیدار ہو گئے اور ان کے حواس معطل ہونے کے ستر سال بعد وہ بستی دوبارہ تعمیر ہو گئی تھی اور اس میں بنو اسرائیل لوٹ آئے تھے' اللہ تعالیٰ نے کسی فرشتہ کے واسطہ سے ان سے سوال کیا یا ھاتف غیبی نے ندا کی کہ آپ کتنی دیر ٹھہرے؟ یہ سوال اس لیے کیا تا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے کاموں کا احاطہ نہیں کر سکتے' اور اکثر مفسرین کا مختار یہ ہے کہ ان پر حقیقۃً موت طاری ہو گئی تھی' انہوں نے جو کہا تھا کہ میں نے ایک دن یا دن کے کچھ حصہ میں قیام کیا ہے یہ انہوں نے اپنے گمان سے کہا تھا کیونکہ دن کے ابتدائی حصہ میں ان پر موت طاری ہوئی تھی' دن کے آخری حصہ میں ان کو زندہ کیا گیا' جب انہوں نے دیکھا کہ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تو انہوں نے گمان کیا کہ انہوں نے دن کے کچھ حصہ میں قیام کیا ہے' ہر چند کہ ان کا یہ کلام صورت واقع کے خلاف تھا لیکن یہ کذب نہیں ہے' کیونکہ ان کے گمان میں ایسا ہی تھا' کذب تب ہوتا جب وہ قصد اور ارادہ سے واقعہ کے خلاف خبر دیتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلکہ تم ایک سو سال ٹھہرے ہو تم ہماری قدرت کے دلائل پر غور کرنے کے لیے دیکھو' سو سال میں تمہارا طعام اور مشروب (انجیر یا میوے اور انگور کا شیرہ' البحر المحیط) سڑا نہیں' حالانکہ عام عادت جاریہ یہ ہے کہ اتنا عرصہ میں طعام اور مشروب بدبودار اور خراب ہو جاتا ہے' اور ان کا گدھا مر چکا تھا' اس کا گوشت پوست گل گیا تھا' اس کی ہڈیاں بکھر گئی تھیں' دیکھو کس طرح اس کی بوسیدہ اور بکھری ہوئی ہڈیاں جمع ہوتی ہیں اور جڑتی ہیں اور کس طرح ہم ان ہڈیوں پر گوشت پہناتے ہیں اور اس کی رگوں میں خون رواں دواں کرتے ہیں' پھر اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے اس گدھے کے جسم میں روح پھونک دی اور وہ اللہ عزوجل کے اذن سے زندہ ہو کر رینکنے لگا۔ حضرت عزیر نے مشاہدہ کر لیا جو سو سال بعد مردہ کو زندہ کر دیتا ہے' وہ ہزاروں اور لاکھوں سال بعد بھی مردہ کو زندہ کرنے پر قادر ہے' گدھے میں انہوں نے حیات بعد الموت کا مشاہدہ کر لیا اور خود اپنی ذات پر حیات بعد الموت کا تجربہ حاصل ہوا اور انہیں موت کے بعد حیات کا پہلے علم الیقین تھا اور اب عین الیقین اور حق الیقین بھی حاصل ہو گیا۔

اس واقعہ میں جزوی طور پر حیات بعد الموت پر دلیل ہے اور تمام کائنات کو قیامت کے دن دوبارہ زندہ کرنے اور حشر و نشر کے ثبوت پر حسب ذیل آیتیں دلیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ؕ (الاعراف: ۲۹) جس طرح اللہ نے تمہیں ابتداء ً پیدا کیا ہے اسی طرح تمہیں لوٹائے گاO

كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ (الانبیاء: ۱۰۴) جس طرح ہم نے ابتداءً تمہاری آفرینش کی ہے اسی طرح ہم اس کا اعادہ کریں گے۔

قرآن مجید میں ہے کہ زندگی صرف دو بار ہے' ایک اس وقت جب اللہ تعالیٰ نطفہ میں جان ڈالتا ہے اور دوسری قیامت کے بعد' حضرت عزیر کے لیے تین بار زندگی ہوگی' اس کا جواب ہم نے البقرہ: ۲۴۳ میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰىؕ قَالَ اَوَلَمْ

اور (یاد کیجئے) جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا' اللہ نے فرمایا: کیا آپ کو

تُؤْمِنْؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً

یقین نہیں؟ عرض کیا: کیوں نہیں' مگر تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے' فرمایا: چار پرندے لیں

مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ

اور ان کو خود سے مانوس کر لیں (پھر ان کو ذبح کر کے) ان کے جسم کا ایک ایک ٹکڑا ہر پہاڑ پر رکھ دیجئے' پھر انہیں

جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًاؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ

بلایئے وہ آپ کے پاس دوڑتے ہوئے آ جائیں گے' اور یقین رکھیے اللہ بہت غالب'

حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾

بڑی حکمت والا ہے O

ع ۳۵ ۴

حضرت ابراہیم کو حیات بعد الموت کا مشاہدہ کرانا

اس سے پہلی آیت میں حضرت عزیر علیہ السلام کو حیات بعد الموت کے مشاہدہ کرانے اور ان کے تعجب کو زائل کرنے کا ذکر تھا' اور اس آیت میں حضرت ابراہیم کو حیات بعد الموت کے مشاہدہ کرانے کا ذکر ہے' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو یہ سوال کیا تھا کہ انہیں دکھایا جائے اللہ مردوں کو کیسے زندہ کرے گا' اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم کو اس میں شک تھا یا اللہ کی قدرت میں شک تھا بلکہ وہ دوبارہ زندہ کرنے کی کیفیت کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے کیونکہ انسان کی طبیعت میں ان دیکھی چیز کو دیکھنے کا اشتیاق ہوتا ہے' ان کو بعث بعد الموت اور حشر ونشر پر جو ایمان علم الیقین کے درجہ میں تھا اس کو عین الیقین کے درجہ میں ترقی دینا چاہتے تھے' امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبر مشاہدہ کی طرح نہیں ہے۔ الحدیث (مسند احمد ج ۱ ص ۲۷۱' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

اس حدیث کو امام ابن عدی نے بھی روایت کیا ہے۔

(الکامل فی ضعفاء الرجال ج ۱ ص ۲۰۳' ج ۳ ص ۱۵۸۰' ج ۷ ص ۲۳۹۳' مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

امام طبرانی نے اس حدیث کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

(معجم اوسط ج ۱ ص ۴۹' مطبوعہ مکتبۃ المعارف' ریاض' ۱۴۰۵ھ)

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک راستہ سے گزر رہے تھے' انہوں نے دیکھا کہ راستہ میں ایک

مردہ گدھا پڑا ہوا ہے‘ جس کا گوشت نوچ نوچ کر درندے اور پرندے کھا رہے ہیں‘ جب درندے چلے گئے اور پرندے اڑ گئے اور اس مردہ گدھے کی صرف ہڈیاں باقی بچ گئیں تو حضرت ابراہیم کو تعجب ہوا‘ وہ کہنے لگے: اے میرے رب! مجھے یقین ہے کہ تو اس گدھے کو ان درندوں اور پرندوں کے پیٹوں سے جمع کرے گا‘ اے میرے رب! تو مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا‘ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا آپ کو اس پر ایمان نہیں ہے؟ عرض کیا: کیوں نہیں! لیکن خبر معائنہ کی طرح نہیں ہے۔

(جامع البیان ج ۳ ص ۳۳ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

قرآن مجید میں جن چار پرندوں کو ذبح کر کے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا بیان ہے اس کی تفسیر میں امام ابن جریر نے روایت کیا ہے:

مجاہد نے بیان کیا ہے کہ یہ چار پرندے مرغ‘ مور‘ کوا اور کبوتر تھے۔ (جامع البیان ج ۳ ص ۳۵ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ بیضاوی نے لکھا ہے کہ بعض روایات میں کبوتر کی جگہ گدھ کا ذکر ہے‘ اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ نفس انسانی کو حیات ابدیہ اس وقت حاصل ہوگی جب وہ اپنی شہوات اور حسن و زیبائش کو ذبح کر دے جو مور کی صفت ہے اور دوسروں پر حملہ کرنے کے جذبہ کو فنا کر دے جو مرغ کی صفت ہے اور نفس کی خساست اور گھٹیا پن کو دور کر دے جو کوے کی صفت ہے اور اپنی خواہشات کو جلدی پورا کرنے کی عادت کو دور کر دے جو کبوتر کی صفت ہے‘ روایت ہے کہ حضرت ابراہیم کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ان پرندوں کو ذبح کر دیں‘ ان کے پر نوچ ڈالیں اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کو خلط ملط کر دیں‘ پھر ان منتشر اجزاء کو مختلف پہاڑوں پر ڈال دیں‘ پھر ان کو بلائیں‘ جب حضرت ابراہیم نے ان کو بلایا تو وہ اجزاء متمیز ہوئے اور ہر جسم کے اجزاء آپس میں مل گئے اور اخیر میں ان کے ساتھ ان کا سر جڑ گیا۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اگر انسان حیات ابدیہ چاہتا ہے تو وہ اپنے بدن کی طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے (غالباً اس سے یہ مراد ہے کہ اللہ کے احکام سے روگردانی اور سرکشی کی طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے) پھر جب وہ اپنے بدن کو احکام شرعیہ پر عمل کرنے کے لیے بلائے گا تو وہ اس کی اطاعت کرے گا اور اس کو دائمی حیات حاصل ہو جائے گی۔ (انوار التنزیل ص ۷۰ 'مطبوعہ دار فراس للنشر والتوزیع' مصر)

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانے

حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ

کی طرح ہے جس نے سات ایسے خوشے اگائے کہ ہر خوشے میں سو دانے ہیں‘

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ

اور اللہ جس کے لیے چاہے ان کو دگنا کر دیتا ہے‘ اور اللہ بڑی وسعت والا بہت علم والا ہے ○ جو لوگ

يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا

اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں پھر جو کچھ خرچ کیا اس پر نہ احسان جتاتے ہیں نہ تکلیف پہنچاتے ہیں

مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ

ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے اور ان پر نہ کچھ خوف ہے اور

لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ

نہ وہ غمگین ہوں گے O (لوگوں سے) اچھی بات کہنا اور درگزر کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے

صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

جس کے بعد تکلیف پہنچے اور اللہ بے نیاز اور بہت بردبار ہے O اے ایمان والو!

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ

احسان جتا کر اور اذیت پہنچا کر اپنے صدقات ضائع نہ کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال ریاکاری

رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ

کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا' اس کی مثال

صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۗ لَا

اس چکنے پتھر کی طرح ہے جس پر کچھ مٹی ہو' پھر اس پر زور کی بارش ہوئی جس نے اس پتھر کو بالکل صاف کر دیا' وہ

يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

اپنی کمائی سے کسی چیز پر قدرت نہیں پائیں گے اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا O

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ

اور جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دلوں کو مضبوط رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں'

تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ

ان کی مثال اونچی زمین پر ایک باغ کی طرح ہے جس پر زوردار بارش

فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ

ہو تو وہ اپنا پھل دگنا لائے' پھر اگر اس پر زوردار بارش نہ ہو تو اسے شبنم ہی کافی ہے' اور اللہ

بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ

تمہارے سب کاموں کو دیکھنے والا ہے ○ کیا تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا کھجوروں

نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ

اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور اس کے نیچے دریا بہہ رہے ہوں' اس کے لیے اس باغ میں

الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ

ہر قسم کے پھل ہوں اور اس کو بڑھاپا آ جائے' اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں تو (اچانک)

اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ

اس باغ میں گرم ہوا کا ایک بگولہ آئے جس میں آگ ہو اور وہ باغ جل جائے' اللہ تمہارے لیے اسی طرح

الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

آیتیں بیان فرماتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو ○

حیات بعد الموت کے ذکر کے بعد صدقہ و خیرات کے ذکر کی مناسبت

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر اور حضرت ابراہیم کا قصہ بیان کیا' ان دونوں قصوں میں حیات بعد الموت پر دلائل قائم کیے گئے تھے اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی پیش آنے کا ذکر کیا گیا تھا' ان آیتوں میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ اس دوسری زندگی میں کیا چیز انسان کے کام آ سکتی ہے' اور کون سا عمل وہاں نفع دے سکتا ہے' اور وہ صدقہ اور خیرات ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو ہزاروں کی تعداد میں موت کے ڈر سے بھاگے اور ان کے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد فرمایا: وہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے؟ پھر جالوت اور طالوت کا قصہ بیان کیا اور اس کے بعد فرمایا: اے ایمان والو! اس دن کے آنے سے پہلے ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرو جب خرید و فروخت ہو سکے گی' نہ کسی کی دوستی کام آئے گی نہ کسی کی (بلا اذن) شفاعت کام آ سکے گی' اسی طرح یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر اور حضرت ابراہیم کے قصوں کو بیان کرنے کے بعد صدقہ اور خیرات پر اپنے بہت زیادہ اجر عطا فرمانے کا ذکر فرمایا۔

انفاق فی سبیل اللہ کے مصارف

قرآن کریم میں جگہ جگہ صدقہ و خیرات کی فضیلت اور اس کا اجر و ثواب بیان کیا ہے اور صدقہ و خیرات کی بہت ترغیب دی ہے' کیونکہ صدقہ و خیرات کرنے سے دولت معاشرہ میں گردش کرتی رہتی ہے' غرباء اور فقراء کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور رفاہ عام کے بہت سے کام انجام پاتے ہیں اور ملک و ملت کی بقاء میں صدقہ و خیرات کا بہت بڑا دخل ہے' ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اللہ کی سبیل (راہ) میں خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے اور اللہ کی سبیل کی کئی انواع ہیں: علم دین کی نشر و اشاعت میں حصہ لینا' دینی مدارس کی مدد کرنا' مساجد بنانا' لائبریری قائم کرنا' سرائے بنانا' محتاج خانے اور اپاہج خانے تعمیر کرنا' مروجہ علوم

کے لیے اسکولوں اور کالجوں کو گرانٹ دینا' یتیموں اور بیواؤں کے لیے وظائف جاری کرنا' بیماروں کے علاج معالجہ کے لیے ہسپتال بنانا اور ان کے لیے دوائیں فراہم کرنا' جو لوگ عدالتی اخراجات کی وجہ سے اپنے حقوق حاصل نہ کر سکیں ان کے کام آنا' اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں میں جو تنگ دست ہوں ان کی مدد کرنا' فقراء اور مساکین کی کفالت کرنا' قرض کی ادائیگی میں مقروض لوگوں کی مدد کرنا' اور سبیل اللہ کی انواع میں سب سے بڑی اور اہم نوع جہاد کے راستہ میں خرچ کرنا ہے تاکہ اللہ کا دین سر بلند ہو۔

دس گنے' سات سو گنے اور بے حساب اجر دینے کی وجوہات

اس رکوع میں صدقہ وخیرات کی ترغیب دیتے ہوئے البقرہ: ۲۶۱ سے لے کر ۲۶۶ تک چھ آیتیں بیان کی گئی ہیں۔

قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ (الانعام: ۱۶۰) جو شخص ایک نیکی لے کر آئے گا اس کو اس جیسی دس نیکیوں کا اجر ملے گا۔

اور یہاں البقرہ کی آیت: ۲۶۱ میں فرمایا ہے: جو شخص اللہ کی راہ میں ایک دانہ خرچ کرے گا اس کو سات سو گنا اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے گا اس اجر کو دگنا کر دے گا۔

ایک اور مقام پر فرمایا ہے:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝ (الزمر: ۱۰) صبر کرنے والوں کو ان کا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا ۝

کسی نیکی کا اجر دس گنا ہے' کسی نیکی کا اجر سات سو گنا ہے اور کسی نیکی کا اجر بے حساب ہے' اب سوال یہ ہے کہ اجر کے یہ مختلف مدارج کس حساب سے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو اللہ کی راہ میں حساب سے خرچ کرتا ہے اس کو اللہ حساب سے اجر دیتا ہے اور جو اللہ کی راہ میں بے حساب خرچ کرتا ہے اس کو اللہ بے حساب اجر دیتا ہے' دوسرا جواب یہ ہے کہ اجر وثواب کے مدارج کا یہ فرق نیت اور خلوص کے مدارج کے اعتبار سے ہے' جس شخص میں جتنا زیادہ اخلاص ہوگا اس کو اتنا زیادہ اجر ملے گا' تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ فرق حالات کے اعتبار سے ہے' مثلاً ایک کروڑ پتی کسی بھوکے کو دو روٹیاں دے یہ بھی نیکی ہے' ایک متوسط آمدنی والا کسی بھوکے کو دو روٹیاں دے یہ بھی نیکی ہے اور جس کی کل کائنات دو روٹیاں تھیں وہ اگر بھوکے کو دو روٹیاں دے گا تو خود بھوکا رات گزارے گا' اس کا بھوکے کو دو روٹیاں دینا بھی نیکی ہے' لیکن یہ تینوں نیکیاں برابر نہیں ہیں تو ان کا اجر برابر کیسے ہوگا' جس کی کل متاع دو روٹیاں ہیں' اس کا دو روٹیاں دینا ایسے ہے جیسے ایک کروڑ پتی اپنی ساری دولت کسی کو دے دے' اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ کروڑ پتی کو اس نیکی کا اجر دس گنا ملے' متوسط آمدنی والے کو سات سو گنا اجر ملے اور جس کے پاس تھیں ہی دو روٹیاں اس کو بے حساب اجر ملے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کے لیے بے حساب اجر کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ اللہ کی راہ میں از خود خرچ کرنا آسان ہے اور کسی ناگہانی آفت اور نقصان پر شکوہ وشکایت نہ کرنا اور خاموشی سے اس نقصان کو برداشت کرنا مشکل ہے' کیونکہ جب آدمی اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو وہ اس کے منصوبہ اور پروگرام کے مطابق خرچ ہوتا ہے' اس کو خرچ کرنے سے طمانیت اور تسکین حاصل ہوتی ہے' کسی غریب اور فقیر کی حالت زار کو دیکھ کر جو اس کے دل میں رقت پیدا ہوتی ہے اور اس کی تکلیف سے اس کو جو تکلیف ہوتی ہے اس کا ازالہ ہوتا ہے لیکن اچانک اور ناگہانی نقصان ہو جائے جس میں اس کے پروگرام اور منصوبہ کا دخل نہ ہو' جس میں کسی وجہ سے خوشی اور تسکین اور کوئی پہلو نہ ہو ماسوا

اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس غم کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرلے اور کسی کے سامنے حرف شکایت زبان پر نہ لائے' یہ عمل اپنے پروگرام اور منصوبہ کے مطابق خرچ کرنے کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہے۔

صدقات وخیرات کے آداب وشرائط

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس رکوع کی پہلی آیت میں اللہ کی راہ میں صدقہ وخیرات کرنے کا اجر وثواب بیان فرمایا ہے' دوسری آیت میں یہ فرمایا ہے کہ یہ اجر وثواب تب حاصل ہوگا جب صدقہ دینے کے بعد احسان جتایا جائے نہ طعنہ دے کر اس کو اذیت پہنچائی جائے جس کو صدقہ دیا ہے' امام رازی نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان نے جب غزوۂ تبوک میں ایک ہزار اونٹ مع کجاووں کے دیئے اور ایک ہزار دینار دیئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی: اے میرے رب! میں عثمان سے راضی ہوگیا تو بھی عثمان سے راضی ہو جا' اور حضرت عبد الرحمان بن عوف نے اپنے مال سے چار ہزار دینار صدقہ کیے تو یہ آیت نازل ہوئی: جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں پھر جو کچھ خرچ کیا اس پر احسان جتاتے ہیں نہ تکلیف پہنچاتے ہیں' ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے' ان پر کچھ خوف ہے نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (البقرہ: ۲۶۲)

(تفسیر کبیر ج ۲ ص ۳۳' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۳۹۸ھ)

اور تیسری آیت میں یہ فرمایا ہے: اگر کسی کو صدقہ دینے کے بعد طعنہ دے کر اس کو اذیت پہنچائی تو اس سے بہتر ہے کہ اس کو صدقہ نہ دیا جائے اور اس سے کوئی نیک اور اچھی بات کہہ دی جائے' مثلاً سائل سے یہ کہہ دے کہ اس وقت ہمارے پاس گنجائش نہیں ہے اور اس سے معذرت کرے' یا اس کی کسی اور دینے والے کی طرف رہنمائی کردے' یا کسی مسلمان کو کوئی نصیحت کرنا' اس کی خیر خواہی میں کوئی بات کرنا' کسی کو نیک مشورہ دینا ایسے صدقہ کرنے سے بہتر ہے جس کے بعد اس شخص کی دل آزاری کی جائے جس کو صدقہ دیا ہے اور اس رکوع کی چوتھی آیت میں یہ فرمایا ہے کہ صدقہ اور خیرات کرنے والے اخلاص کے ساتھ' محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے صدقہ دیں' لوگوں کو دکھانے اور سنانے کے لیے صدقہ نہ دیں' وہ ضرورت مندوں سے اپنی سخاوت اور دریا دلی کے قصیدے سننے کی خواہش نہ رکھیں' نہ یہ چاہیں کہ عام لوگوں میں ان کی فیاضی کا ذکر ہو' اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کا یہ تمام عمل ضائع ہو جائے گا اور اس پر کوئی ثواب نہیں ملے گا' اور ان کی مثال ایسے ہے جیسے کسی چکنے پتھر پر مٹی جمع ہوگئی اور بارش نے اس کو بالکل صاف کر دیا' خلاصہ یہ ہے کہ صدقہ کی مقبولیت اور اس پر اجر ملنے کی تین شرطیں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں: (۱) احسان نہ جتایا جائے (۲) جس کو صدقہ دیا ہو اس کو طعنہ دے کر اذیت نہ پہنچائی جائے (۳) اخلاص کے ساتھ صدقہ دیا جائے' لوگوں کو دکھانے اور سنانے کے لیے نہ دیا جائے۔

صدقات کے مصارف' اجر وثواب اور آداب وشرائط کے متعلق احادیث

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام طبرانی نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک شخص گزرا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے اس کے حسن اور اس کی تندرستی کو دیکھ کر کہا: یا رسول اللہ! کاش یہ شخص اللہ کی راہ میں ہوتا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ شخص اپنے چھوٹے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے جا رہا ہے تو یہ اللہ کی راہ میں ہے' اگر یہ اپنے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کے لیے جا رہا ہے تو یہ اللہ کی راہ میں ہے' اگر یہ اپنی ضروریات میں خود کو سوال سے روکنے کے لیے جا رہا ہے تو یہ اللہ کی راہ میں ہے اور اگر یہ لوگوں کو دکھانے اور فخر کے لیے جا رہا ہے تو یہ شیطان کی راہ میں ہے۔

امام احمد اور امام بیہقی نے ''سنن کبریٰ'' میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جس شخص نے

اللہ کی راہ میں کسی زائد چیز کو خرچ کیا اس کو سات سو گنا اجر ملے گا' اور جس نے اپنی ذات پر اور اپنے اہل پر خرچ کیا اور کسی مریض کی عیادت کی یا راستہ سے کوئی تکلیف دہ چیز ہٹادی تو اس کو دس گنا اجر ملے گا اور جب تک روزہ کو فاسد نہ کرے وہ اس کے لیے ڈھال ہے اور جس شخص کو اللہ کسی جسمانی بیماری میں مبتلا کرے تو اس کو بھی اجر ملے گا۔

امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعمال کی سات قسمیں ہیں' دو عمل واجب کرتے ہیں' دو عملوں کا بدلہ ایک مثل ہے' ایک عمل کا بدلہ دس گنا ہے' ایک عمل کا بدلہ سات سو گنا ہے اور ایک عمل ایسا ہے کہ اس کے ثواب کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا' رہے وہ دو عمل جو واجب کرتے ہیں تو جو شخص اس حال میں اللہ سے ملاقات کرے کہ اس نے اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کی ہو اور شرک بالکل نہ کیا ہو اس کے لیے جنت واجب ہے اور جس نے اللہ سے اس حال میں ملاقات کی ہو کہ اس نے شرک کیا ہو اس کے لیے دوزخ واجب ہے' (اور جن دو کاموں کا ایک مثل اجر ہے تو) جس نے برا کام کیا اس کو ایک برائی کی سزا ملے گی' اور جس نے نیکی کا صرف ارادہ کیا اس کو ایک نیکی کا اجر ملے گا' (اور جن کاموں کا سات سو گنا اجر ہے تو) جس نے اللہ کی راہ میں ایک درہم خرچ کیا اس کو سات سو درہموں کا اجر ملے گا اور جس نے اللہ کی راہ میں ایک دینار خرچ کیا اس کو سات سو دیناروں کا اجر ملے گا' اور روزہ اللہ کے لیے ہے' اس کے عامل کے ثواب کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

امام ابن ابی حاتم نے حسن سے روایت کیا ہے کہ کچھ لوگ کسی آدمی کو اللہ کی راہ میں بھیجتے ہیں یا کسی آدمی پر خرچ کرتے ہیں' پھر اس پر احسان رکھتے ہیں اور اس کو ایذاء پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں: میں نے اللہ کی راہ میں اتنا اتنا خرچ کیا' اللہ کے نزدیک اس عمل کا شمار نہیں ہوگا' اور جو لوگ کسی کو دے کر یہ کہتے ہیں کہ کیا میں نے تم کو فلاں فلاں چیز نہیں دی تھی' وہ اس کو ایذاء پہنچاتے ہیں۔

امام ابن ابی شیبہ' امام احمد' امام ابن المنذر اور امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احسان جتانے والا' ماں باپ کا نافرمان' عادی شرابی' جادو پر ایمان رکھنے والا اور کاہن جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

امام بزار اور امام حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن اللہ تین شخصوں کی طرف نظر (رحمت) نہیں فرمائے گا: ماں باپ کا نافرمان' عادی شرابی اور کچھ دے کر احسان جتانے والا۔ (الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۳۹۔ ۳۳۶' مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دلوں کو مضبوط رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں' ان کی مثال اونچی زمین پر ایک باغ کی طرح ہے' جس پر زوردار بارش ہو تو وہ اپنا پھل دگنا لائے' پھر اگر اس پر زوردار بارش نہ ہو تو اسے شبنم ہی کافی ہے۔ (البقرہ: ۲۶۵)

جہاد اور اللہ کی رضا جوئی میں خرچ کرنے کی مثالوں کا فرق

اس سے پہلے فرمایا تھا کہ جو اللہ کی راہ (جہاد) میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں' ان کی مثال اس دانے کی طرح ہے جس نے سات ایسے خوشے اگائے کہ ہر خوشے میں سات سو دانے ہیں' اور اسی پر عطف کرتے ہوئے فرمایا: اور جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتے ہیں' ان کی مثال اونچی زمین پر ایک باغ کی طرح ہے' دنیا میں زراعت سے غلہ اور پھل حاصل ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ان کے اجر و ثواب کی مثال بھی دانوں (غلہ) اور پھلوں سے دی ہے' اور

جس نے اللہ کی راہ (جہاد) میں خرچ کیا اس کے اجر کی مثال دانوں سے دی ہے اور جس نے اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کیا اس کی مثال باغ سے دی ہے اور جو رضا جوئی اور اسلام پر اپنا دل مضبوط رکھنے کے لیے خرچ کرتا ہے اس کی مثال باغ کے ساتھ دینے میں یہ لطافت ہے کہ جس طرح باغ میں درختوں کی جڑیں زمین میں پیوست اور مضبوط ہوتی ہیں اسی طرح اس خرچ کرنے والے کے سینہ میں اسلام کی جڑیں پیوست اور مضبوط ہیں۔ اس کے برخلاف غلہ کے دانے کھیتوں سے حاصل ہوتے ہیں اور کھیت کی جڑیں زمین میں پیوست اور مضبوط نہیں ہوتیں' نیز کھیت میں پانی لگانے کی ہر کھیتی کے وقت ضرورت ہوتی ہے اور باغ پانی لگانے سے مستغنی ہوتا ہے' سو اسی طرح جہاد کے لیے ہر مرتبہ جہاد کے وقت مال خرچ کرنے کی ضرورت ہے اور جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتا ہے اس کے لیے کسی وقت اور موقع کی قید نہیں ہے' وہ ہر وقت اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتا ہے۔

ریاکار منافق اور مخلص مومن کے راہ خدا میں خرچ کرنے کی مثالوں کا فرق

اس سے پہلی آیت (البقرہ: ۲۶۴) میں اللہ تعالیٰ نے منافق کے خرچ کرنے کی مثال دی تھی کہ جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا اور ریاکاری سے اپنا مال خرچ کرتا ہے' اس کی مثال اس چکنے پتھر کی طرح ہے جس پر (کچھ) مٹی ہو' پھر اس پر زور کی بارش ہوئی جس نے اس پتھر کو بالکل صاف کر دیا' احسان جتانے والے' ایذاء پہنچانے والے اور منافق کو چکنے پتھر سے تشبیہ دی ہے اور ان کے خرچ کرنے کے ظاہری عمل کو چکنے پتھر پر پڑی ہوئی تھوڑی سی مٹی سے تشبیہ دی ہے اور قیامت کے دن کو زوردار بارش سے تشبیہ دی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے نیکی کے راستوں میں بہ ظاہر جو کچھ خرچ کیا ہے قیامت کے دن ان کے نامۂ اعمال سے وہ سب دھل کر صاف ہو جائے گا جیسا کہ اس آیت میں ہے:

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ○ (الفرقان: ۲۳)

اور (ان کافروں نے اپنے زعم میں جو بھی نیک) عمل کیے ہیں' ہم ان کی طرف قصد فرمائیں گے' پھر ہم انہیں (فضاء میں) بکھرے ہوئے (غبار کے) باریک ذرے بنا دیں گے ○

اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اخلاص سے خرچ کرنے والے مومن کی مثال دی ہے جو اللہ کی رضا جوئی اور اسلام پر اپنے دل کو مضبوط رکھنے کے لیے خرچ کرتا ہے' اس کے اجر وثواب کی مثال بلندی پر لگے ہوئے اس باغ کی طرح ہے جس پر زور کی بارش ہو تو وہ اپنا پھل دگنا لائے اور اگر زور کی بارش نہ ہو تو اس باغ کی ثمر آوری کے لیے معمولی شبنم ہی کافی ہے' سو اسی طرح اخلاص اور اللہ کی رضا جوئی اور دین پر ثابت قدم رہنے کے لیے زیادہ خرچ کرے یا کم خرچ کرے اللہ کے ہاں اس کے اجر وثواب کا جو باغ لگا ہوا ہے وہ پھلتا پھولتا رہے گا' اس میں مخلص مسلمانوں کو یہ تسلی دینا ہے کہ اگر کوئی مسلمان تنگ دست اور کم حیثیت ہے تو وہ یہ غم نہ کرے کہ اگر اس نے اللہ کی راہ میں اپنی تنگ دستی کی وجہ سے کم خرچ کیا تو اللہ کے نزدیک اس کی کم حیثیت ہو گی' بلکہ یہ فرمایا کہ مومن اخلاص اور اللہ کی رضا جوئی کے لیے حسب حیثیت کم خرچ کرے یا زیادہ آخرت میں اس کے اجر وثواب کا باغ پھلتا پھولتا رہے گا۔

اللہ کی رضا جوئی اور اسلام پر ثابت قدمی کے لیے خرچ کرنے کی صورتیں

اس آیت (البقرہ: ۲۶۵) میں اللہ کی رضا جوئی اور اسلام پر ثابت قدمی کے لیے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے' اور اس کی حسب ذیل صورتیں ہیں:

(۱) اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دلوں کو اسلام پر مضبوط رکھنے کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو احکام شرع پر عمل کرنے کا عادی

جائیں اور اپنے نیک اعمال کو ایسی نیتوں اور ایسے کاموں سے محفوظ رکھیں جن سے وہ نیک اعمال فاسد ہو جائیں' ایسی نیتوں میں ریاکاری اور دکھاوے کی نیت ہے اور ایسے کاموں میں صدقہ لینے والے پر احسان جتانا اور طعنہ دے کر اسے تکلیف پہنچانا ہے۔

(۲) دل کا ثابت قدم رہنا صرف اللہ کے ذکر سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: سنو! اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے' تو جو شخص اس کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اس کا دل اسلام پر اس وقت تک مطمئن اور مضبوط نہیں ہوتا جب تک اس کا خرچ کرنا محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے نہ ہو' اسی وجہ سے حضرت علی نے خرچ کرتے وقت فرمایا: ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے کھلاتے ہیں' ہم تم سے کسی صلہ اور ستائش کے طالب نہیں ہیں' اور جب حضرت ابوبکر نے حضرت بلال کو بھاری قیمت پر خرید کر آزاد کیا اور مشرکوں نے کہا: ضرور بلال نے ابوبکر پر کوئی احسان کیا ہوگا جس کا بدلہ چکانے کے لیے ابوبکر نے بلال کو اتنی گراں قیمت پر خرید کر آزاد کیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر کی مدح میں فرمایا:

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝ (اللیل: ۲۱۔۱۹)

اور اس پر کسی کا کچھ احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے ۝ وہ صرف اپنے رب کی رضا جوئی کے لیے (اپنا مال خرچ کرتا ہے) جو سب سے بلند ہے ۝ اور ضرور وہ عنقریب راضی ہوگا ۝

اسی طرح حضرت صہیب رومی جب اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنا سارا مال و متاع مکہ میں چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ آ گئے تو یہ آیت نازل ہوئی:

''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۔ (البقرہ: ۲۰۷) اور بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنے نفس فروخت کر دیتے ہیں'' سو جب انسان کی طبیعت میں یہ چیز راسخ ہو جاتی ہے کہ وہ محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنے مال کو خرچ کرتا ہے اور اس خرچ سے کوئی نفسانی منفعت مطلوب نہیں ہوتی تو اس کے دل میں اسلام کی جڑیں پیوست ہو جاتی ہیں اور اسلام پر اس کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر' حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت صہیب رومی اور دیگر صحابہ کرام اسی پائے کے مخلصین تھے۔

(۳) جب انسان بار بار اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتا ہے تو اللہ کی رضا جوئی اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے اور اگر کبھی اس سے کسی نیک کام میں غفلت بھی ہو جائے تو اس کا دل فوراً اللہ کی جناب کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور یہی اسلام پر ثابت قدم رہنے کا وہ مرتبہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے۔

(۴) مخلصین جب اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو ان کو یقین ہوتا ہے کہ اللہ ان کے عمل کو ضائع نہیں کرے گا اور ان کو جو اللہ سے ثواب کی امید ہے وہ پوری ہوگی کیونکہ ان کو یوم قیامت اور ثواب و عذاب کا یقین ہوتا ہے' اس کے برعکس منافق جب خرچ کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس کا یہ عمل ضائع ہو رہا ہے کیونکہ اس کو آخرت پر ایمان نہیں ہوتا' اور مخلصین کا آخرت پر یقین رکھنا ہی اسلام پر ثابت قدمی سے عبارت ہے۔

(۵) مخلصین جب اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو اپنے مال کو صحیح مصارف میں خرچ کرتے ہیں اور نیکی کے راستہ میں لگاتے ہیں اور خوب چھان بین کر اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور اس بات سے ڈرتے ہیں کہ ان کا مال کہیں اللہ کی نافرمانی اور کسی گناہ کے کام میں نہ لگ جائے' اور یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رضا جوئی اور اسلام پر ثابت قدمی کی نیت سے اللہ کی

راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور اس کے نیچے دریا بہہ رہے ہوں' اس کے لیے اس باغ میں ہر قسم کے پھل ہوں' اس کو بڑھاپا آ جائے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں' تو (اچانک) اس باغ میں گرم ہوا کا ایک بگولا آئے جس میں آگ ہو اور وہ باغ جل جائے۔ (البقرہ: ۲۶۶)

سخت حاجت کے وقت باغ کے جل جانے کی مثال کی دو تقریریں

جو شخص صدقہ و خیرات کرنے کے بعد احسان جتائے اور ایذاء پہنچائے اس کی محرومی کی ایک مثال پہلے البقرہ: ۲۶۴ میں دی تھی اور دوسری مثال اس آیت میں دی ہے۔ پہلی مثال میں یہ ذکر کیا تھا کہ کسی چکنے پتھر پر مٹی ہو اور اس مٹی کو تیز بارش بہا کر لے جائے' اس مثال میں یہ بتایا ہے کہ کسی شخص کا بہت حسین اور پھل دار باغ ہو' وہ اس وقت بوڑھا ہو اور کمانے سے عاجز ہو اور اس پر چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کا بھی بوجھ ہو تو ظاہر ہے اس وقت اس کو باغ کی بہت سخت ضرورت ہو گی کیونکہ وہ خود بڑھاپے کی وجہ سے کما نہیں سکتا' بچے جوان نہیں جو اس کو کما کر لا دیں بلکہ خود ان بچوں کی پرورش کی اس پر ذمہ داری ہے' اب اچانک اگر وہ باغ کسی آگ والے بگولے سے جل جائے تو اس کے نقصان اور محرومی کا کیا عالم ہو گا' اسی طرح انسان اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے اور فقراء اور مساکین کو صدقہ و خیرات دے اور اس کو یہ امید ہو کہ آخرت میں جب وہ نیک عمل کرنے سے بالکل عاجز ہو گا اور اس کو نیکیوں پر اجر و ثواب کی سخت حاجت ہو گی اور کہیں اور کسی ذریعہ سے کسی نیکی کے ملنے کا امکان نہیں ہو گا اور اس کی واحد امید وہ صدقات و خیرات ہوں جو اس نے دنیا میں کیے تھے' پھر اس کو اچانک معلوم ہو کہ اس نے جو ان صدقات پر احسان جتایا تھا اور فقراء کو طعنے دے کر ایذاء پہنچائی تھی اس سے وہ تمام صدقات ضائع ہو چکے ہیں تو اس شخص کی محرومی کا کیا عالم ہو گا۔

اس مثال کی دوسری تقریر یہ ہے' حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام عبد بن حمید نے عطاء سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: اے امیر المؤمنین! اللہ نے یہ مثال بیان کی ہے کہ کیا تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کرتا ہے کہ وہ ساری عمر صالح اور نیک عمل کرتا رہے حتیٰ کہ جب وہ بوڑھا ہو جائے' اس کی موت قریب آ لگے اور اس کی ہڈی کمزور ہو چکی ہو اور اس وقت اس کو اس بات کی سب سے زیادہ احتیاج ہو کہ اس کے اعمال کا خاتمہ نیکیوں پر ہو' اور اس وقت وہ دوزخیوں کے سے بُرے کام کرنا شروع کر دے اور ایسے بُرے کام کرے جن سے اس کے سابقہ سارے نیک کام اور صالح عمل اکارت چلے جائیں اور ضائع ہو جائیں اور اس کی زندگی کے سارے نیک کاموں کا باغ اس آخری برائی سے جل کر راکھ ہو جائے' اس مثال کا حضرت عمر پر بڑا گہرا اثر ہوا اور وہ حیران ہو گئے۔

اے بار الٰہ! مصنف اور اس کتاب کے قارئین کو ایسی برائی سے اپنی پناہ میں رکھنا جو زندگی کی ساری نیکیوں کو جلا ڈالے اور ہمیں حسن عاقبت سے محروم نہ کرنا اور ایمان اور اعمال صالحہ پر ہمارا خاتمہ کرنا' مصنف اپنی زندگی کے آخری حصہ میں ہے' اس کو اپنی پناہ اور امان میں رکھنا' آمین!

امام طبرانی نے "معجم اوسط" میں اور امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کرتے تھے: اے اللہ! جب میرا بڑھاپا ہو اور میری عمر کے انقطاع کا وقت ہو اس وقت مجھے اپنا سب سے وسیع رزق عطا فرمانا۔ (معجم اوسط ج ۱ ص ۳۳۰ 'مطبوعہ مکتبۃ المعارف ریاض' ۱۴۰۵ھ)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ

اے ایمان والو! (اللہ کی راہ میں) اپنی کمائی سے اچھی چیزوں کو خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم

اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ

نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں اور (اللہ کی راہ میں) ایسی ناکارہ

تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا

اور ناقابل استعمال چیز دینے کا قصد نہ کرو جس کو تم خود بھی آنکھیں بند کیے بغیر لینے والے نہیں ہو اور یقین رکھو

اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ

کہ اللہ بہت بے نیاز بہت تعریف کیا ہوا ہے O شیطان تم کو تنگدستی سے ڈراتا ہے

بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ

اور تم کو بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور اپنے فضل کا وعدہ فرماتا ہے اور اللہ

وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ يُّؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ

بڑی وسعت والا بہت جاننے والا ہے O وہ جسے چاہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے

الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا

حکمت دی گئی تو بے شک اسے خیر کثیر دی گئی اور صرف عقل والے

الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ

ہی نصیحت قبول کرتے ہیں O اور تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو اور تم جو

نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

بھی نذر مانتے ہو بے شک اللہ اس کو جانتا ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے O

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَ

اگر تم علانیہ صدقات دو تو وہ کیا ہی خوب ہے اور اگر تم ان کو مخفی رکھو اور

تُؤْتُوهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن

فقراء کو دو تو وہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اور (یہ صدقہ کرنا) تمہارے کچھ گناہوں کو مٹا دے گا

سَيِّـَٔاتِكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٧١﴾ لَّيْسَ عَلَيْكَ

اور تمہارے سب کاموں سے اللہ خبر رکھنے والا ہے O (اے رسول!) انہیں ہدایت یافتہ

هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَآءُ ۗ وَمَا تُنفِقُوا

کرنا آپ کے ذمہ نہیں ہے' لیکن اللہ جسے چاہتا ہے اسے ہدایت یافتہ بنا دیتا ہے' اور تم جو

مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ

اچھی چیز خرچ کرتے ہو سو وہ تمہارے نفع کے لیے ہے' اور تم صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہی خرچ کرتے ہو

وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٢﴾

اور تم جو اچھی چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے ان کا تم کو پورا اجر دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا O

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ

(یہ خیرات) ان فقراء کا حق ہے جو خود کو اللہ کی راہ میں وقف کیے ہوئے ہیں' جو (اس میں شدت اشتغال کی وجہ سے)

ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَآءَ مِنَ

زمین میں سفر کی طاقت نہیں رکھتے' ناواقف شخص ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے ان کو خوش حال

التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْـَٔلُونَ النَّاسَ

سمجھتا ہے' (اے مخاطب!) تم (ان میں بھوک کے آثار دیکھ کر) ان کو صورت سے پہچان لو گے' وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال

إِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿٢٧٣﴾

نہیں کرتے' اور تم جو اچھی چیز بھی (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہو' بے شک اللہ اس کو خوب جاننے والا ہے O

الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَ

جو لوگ رات اور دن میں خفیہ اور علانیہ اپنے مالوں کو خرچ

عَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ

کرتے ہیں ان کے رب کے پاس ان کے لیے اجر ہے اور نہ ان پر کوئی خوف ہو گا

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۲۷۴﴾

اور نہ وہ غمگین ہوں گے O

وقف منزل

صدقہ میں دیئے جانے والے مال کی صفات کا بیان

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے صدقات اور خیرات کے متعلق چھ آیتوں میں یہ بتایا تھا کہ صدقہ کرنے والے کی نیت میں اخلاص ہونا چاہیے اور لوگوں کو دکھانے اور سنانے کی غرض نہیں ہونی چاہیے اور صدقہ و خیرات کرنے کے بعد فقراء پر احسان جتانا چاہیے اور نہ طعنے دے کر انہیں اذیت پہنچانی چاہیے اور محض صفاء باطن اور تزکیہ نفس کے لیے صدقہ اور خیرات کرنی چاہیے۔ اس کے بعد آنے والی آٹھ آیتوں (البقرہ: ۲۷۴۔ ۲۶۷) میں بتایا ہے کہ اللہ کی راہ میں جو مال دیا جائے اس مال کی صفت کیسی ہو وہ ردی' ناکارہ اور ناقابل استعمال نہ ہو' نیز یہ فرمایا ہے کہ اللہ تمہیں اچھا مال دینے کا جو حکم فرما رہا ہے' اس میں اس کی کوئی غرض نہیں ہے' اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے اور آخرت میں تم کو اس کا پورا پورا اجر دے دیا جائے گا' بہ شرطیکہ تم صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے صدقہ اور خیرات کرو' نام و نمود کے لیے نہیں' نیز یہ فرمایا ہے کہ تمہارے صدقات کے اصل میں مستحق وہ فقراء ہیں جنہوں نے خود کو علم دین کے حصول کے لیے وقف کیا ہوا ہے' جو باوجود سخت ضرورت اور بھوک و پیاس کے اپنی خودداری کی وجہ سے کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے اور ان کی اس روش کی وجہ سے ناواقف لوگ انہیں خوشحال سمجھتے ہیں' نیز یہ فرمایا ہے کہ اگر نیت درست ہو تو علانیہ اور خفیہ ہر طرح صدقہ و خیرات کرنا درست ہے اور صدقہ و خیرات کرنے والے آخرت میں کسی خوف سے دوچار ہوں گے نہ غم سے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت ہم انصار کے متعلق نازل ہوئی' ہم لوگوں کے کھجوروں کے درخت تھے' اور جس شخص کے پاس جتنی زیادہ یا کم کھجوریں درختوں سے اترتی تھیں وہ اسی حساب سے کھجوریں لاتا تھا' کوئی شخص کھجوروں کا ایک گچھا لاتا کوئی دو گچھے لاتا اور ان کو مسجد میں لٹکا دیتے' اور اہل الصفہ (وہ صحابہ جنہوں نے قرآن و حدیث کو محفوظ کرنے کے لیے خود کو وقف کر لیا تھا اور وہ دن رات مسجد نبوی میں رہتے تھے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے ایک چبوترہ بنوا دیا تھا' اس وجہ سے ان کو اصحاب الصفہ کہا جاتا ہے' صفہ کے معنی چبوترہ ہیں) کے پاس کھانا نہیں ہوتا تھا' ان میں سے جب کسی کو بھوک لگتی تو وہ ان گچھوں پر لاٹھی مارتا تو اس سے ادھ پکی کھجوریں اور چھوارے گر جاتے اور وہ ان کو کھا لیتے' ادھر لوگوں کو صدقہ اور خیرات میں خاص رغبت نہیں تھی' وہ کھجوروں کے ایسے گچھے لے کر آتے جن میں سوکھی ہوئی' ردی اور بے کار کھجوریں ہوتیں' اور وہ ان کو لا کر لٹکا دیتے' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: اے ایمان والو! (اللہ کی راہ میں) اپنی پاکیزہ کمائی سے اچھی اور عمدہ چیزوں کو خرچ کرو' اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں' اور (اللہ کی راہ میں) ایسی ناکارہ اور ناقابل استعمال چیز دینے کا قصد نہ کرو جس کو تم خود بھی آنکھیں بند کیے بغیر لینے والے نہیں ہو۔ (جامع ترمذی ص ۴۲۵۔ ۴۲۴' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اللہ تبارک وتعالیٰ کی راہ میں اس چیز کو صدقہ کرنا چاہیے جو فی نفسہ حلال اور طاہر ہو اور وہ چیز حلال اور جائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہو جو چیز فی نفسہ حلال نہ ہو مثلاً مردار یا حرام جانور اس کا صدقہ کرنا جائز نہیں ہے یا وہ چیز فی نفسہ حلال ہو لیکن ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہو مثلاً سود رشوت یا کسب حرام سے جو پیسہ حاصل ہو اس سے کوئی چیز خرید کر صدقہ کی جائے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے پاکیزہ کمائی سے ایک کھجور کے برابر صدقہ کیا' اور اللہ صرف پاکیزہ چیز ہی کو قبول فرماتا ہے' تو اللہ اس صدقہ کو اپنے دائیں ہاتھ سے قبول فرماتا ہے' پھر اللہ اس صدقہ کو پالتا (بڑھاتا) رہتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنے گھوڑے کو پالتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ کھجور کا صدقہ پہاڑ جتنا ہو جاتا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۸۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! (اللہ کی راہ میں) اپنی کمائی سے اچھی چیزوں کو خرچ کرو۔ (البقرہ: ۲۶۷)

حلال کمائی کی مدح اور بر بناء ضرورت اولاد کے مال سے کھانے کا جواز

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام احمد نے حضرت ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ سب سے اچھا کسب (کمائی) کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا: جائز تجارت اور اپنے ہاتھ سے کام کرنا۔

امام عبد بن حمید نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے' حضرت عائشہ نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اپنی پاکیزہ کمائی سے کھاؤ' اور تمہاری اولاد تمہاری پاکیزہ کمائی ہے' تمہاری اولاد اور ان کے اموال تمہاری ملکیت ہیں۔

امام احمد' امام عبد بن حمید' امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے عمدہ کھانا وہ ہے جس کو انسان اپنی کمائی سے کھائے اور انسان کی اولاد بھی اس کی کمائی ہے۔

امام عبد بن حمید حضرت محمد بن منکدر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! میرے پاس مال بھی ہے اور میری اولاد بھی ہے اور میرے باپ کے پاس بھی مال ہے اور اس کی اولاد بھی ہے' اور میرا باپ میرے مال سے لیتا ہے؟ آپ نے فرمایا: تم خود اور تمہارا مال تمہارے باپ کی ملکیت ہے۔

امام عبد بن حمید نے حسن سے روایت کیا ہے کہ والد اپنی اولاد کے مال سے جو چاہے لے سکتا ہے' اسی طرح والدہ بھی' اور اولاد کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے والد کے مال سے اس کی مرضی کے بغیر کوئی چیز لے۔

امام عبد الرزاق اور امام عبد بن حمید نے زہری سے روایت کیا ہے کہ کوئی شخص بغیر ضرورت کے اپنی اولاد کا مال بالکل نہ لے اور ضرورت کے وقت دستور کے مطابق لے اور ابراہیم سے روایت ہے کہ کھانے' کپڑے اور لباس کے علاوہ اور کچھ نہ لے۔ (الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۴۷ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

حرام مال سے صدقہ کرنے کا وبال

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام طبرانی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جس کی کمائی حرام ہے اس سے زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔

امام طبرانی نے "معجم اوسط" میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب کوئی شخص اپنی حلال کمائی سے حج کے لیے جاتا ہے اور سواری پر بیٹھ کر ندا کرتا ہے: "اللھم لبیک" تو آسمان سے فرشتہ ندا کرتا ہے: "لبیک وسعدیک" تمہارا زادِ راہ حلال ہے اور تمہاری سواری حلال ہے' تمہارا حج مبرور ہے اس میں گناہ نہیں ہے' اور جب کوئی شخص حرام کمائی سے حج کے لیے جاتا ہے اور سواری پر بیٹھتا ہے اور "لبیک اللھم لبیک" کہتا ہے تو آسمان سے فرشتہ ندا کرتا ہے: تمہارا "لبیک" کہنا مقبول نہیں' تمہارا سفرِ خرچ حرام ہے' تمہارا حج غیر مبرور ہے اور مقبول نہیں ہے۔

امام اصبہانی نے "الترغیب" میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے حرام مال سے حج کیا اور "لبیک اللھم لبیک" کہا' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تمہارا "لبیک" کہنا مردود ہے' تمہارا حج مردود ہے۔ (الدر المنثور ج ۱ ص ۳۴۷' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ بغیر طہارت کے نماز قبول نہیں کرتا اور چوری کے مال سے صدقہ قبول نہیں کرتا۔ (جامع ترمذی ص ۳۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی)

اگر کسی شخص کے پاس ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ مال ہو اور اب اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مال اصل مالکوں کو واپس کر دے' اگر وہ فوت ہو چکے ہوں تو ان کے وارثوں کو واپس کر دے' اور اگر ان کا پتا نہ چلے تو اس مال کو ان مالکوں کی طرف سے صدقہ کر دے اور یہ بہر حال جائز نہیں ہے کہ وہ مال حرام سے زکوٰۃ ادا کرے' صدقات و خیرات اور حج اور عمرہ کرے علامہ شامی لکھتے ہیں:

جس شخص نے کسی فقیر کو مال حرام سے کوئی چیز دی اور اس میں ثواب کی امید رکھی تو وہ کافر ہو جائے گا' اور اگر فقیر کو معلوم ہو کہ اس کو مال حرام سے دیا ہے' اور اس نے دینے والے کو دعا دی اور دینے والے نے آمین کہی تو دونوں کافر ہو جائیں گے' لیکن تکفیر اس وقت ہو گی جب اس مال حرام کی حرمت قطعی ہو مثلاً سود' یا خمر اور زنا کی آمدنی۔

(رد المحتار ج ۲ ص ۲۶' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! (اللہ کی راہ میں) اپنی کمائی سے اچھی چیزوں کو خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں۔ (البقرہ: ۲۶۷)

عشر کا بیان

اس آیت میں صدقات فرضیہ زکوٰۃ اور عشر ادا کرنے کا حکم دیا ہے' امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عبیدہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے متعلق پوچھا: "اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں" تو حضرت علی نے فرمایا: یعنی دانے (غلہ)' پھل اور ہر وہ چیز جس پر زکوٰۃ ہے۔ (جامع البیان ج ۳ ص ۵۵۔ ۵۴' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

چونکہ اس آیت میں اصالۃً زمین کی پیداوار سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا ہے' اس لیے ہم زرعی پیداوار پر عشر میں مذاہب فقہاء بیان کر رہے ہیں۔

عشر کے نصاب میں فقہاء کے نظریات

غلہ اور پھلوں کی زکوٰۃ (عشر) کے نصاب میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل حدیث مذکور کی روشنی میں غلہ اور پھلوں کے لیے پانچ وسق (بتیس من) کو نصاب قرار دیتے ہیں۔ جس شخص کے کھیتوں اور باغات سے

پانچ وسق یا اس سے زائد پیداوار حاصل ہو جائے اس پر عشر واجب ہوگا اور جس شخص کی پیداوار پانچ وسق سے کم ہو اس پر عشر واجب نہیں ہوگا۔ اس کے برخلاف امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زمین کی پیداوار کے لیے کوئی نصاب مقرر نہیں ہے۔ غلہ' پھل اور سبزیوں کی زمین سے جس قدر پیداوار بھی حاصل ہو اس پر عشر یا نصف عشر دینا واجب ہوگا۔

عشر کے نصاب میں ائمہ ثلاثہ کا نظریہ

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: امام مالک' امام ثوری' امام اوزاعی' امام ابن ابی لیلیٰ' امام شافعی' امام ابو یوسف' امام محمد اور تمام اہل علم کا قول یہ ہے کہ پھلوں اور غلہ میں زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب ان کی مقدار پانچ وسق کو پہنچ جائے' البتہ امام ابوحنیفہ اور مجاہد کہتے ہیں کہ قلیل اور کثیر سب میں زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالعموم فرمایا ہے: جس زمین کو بارش سیراب کرے اس میں عشر ہے' اور چونکہ زمین کی پیداوار میں سال گزرنے کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے اس لیے اس کا کوئی نصاب مقرر نہیں ہے' اور ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانچ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ یہ حدیث خاص ہے اور امام ابوحنیفہ کی پیش کردہ حدیث عام ہے' جس کی اس حدیث سے تخصیص کرنا واجب ہے۔

(المغنی ج ۲ ص ۲۹۶' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۰۵ھ)

عشر کے نصاب میں امام ابوحنیفہ کا نظریہ

امام ابوحنیفہ کا نظریہ یہ ہے کہ زرعی پیداوار کا کوئی نصاب نہیں ہے اور زمین سے جس قدر بھی پیداوار حاصل ہو اس پر عشر یا نصف عشر واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ (الانعام: ۱۴۱) درخت کا پھل جب پھل دے تو اس سے کھاؤ اور اس کی کٹائی کے دن اس کا حق ادا کرو۔

اس آیت سے وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پھلوں سے زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے پھلوں کا کوئی نصاب نہیں بیان کیا' اس سے معلوم ہوا کہ درخت کے پھلوں پر مطلقاً عشر واجب ہے' خواہ ان کی مقدار کثیر ہو یا قلیل' نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ (البقرہ: ۲۶۷) اے ایمان والو! اپنی کمائی سے اچھی چیزوں کو خرچ کرو اور جو کچھ زمین سے ہم نے تمہارے لیے نکالا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں خرچ کرو)۔

امام ابوحنیفہ کا استدلال یوں ہے کہ اس آیت میں ''ما'' عام ہے جس کا تقاضا ہے: زمین سے ہم نے جو بھی تمہارے لیے نکالا ہے اس میں سے خرچ کرو' اور پانچ وسق والی حدیث خبر واحد ہے اور خبر واحد سے قرآن مجید کے عام کو خاص نہیں کیا جا سکتا کیونکہ خبر واحد ظنی ہے اور قرآن مجید کا عموم قطعی ہے اور ظنی دلیل سے قطعی کی تخصیص کرنا صحیح نہیں ہے۔

خبر واحد سے قرآن مجید کے عام کو خاص نہ کرنا' امام ابوحنیفہ کا مشہور قاعدہ ہے' اور یہ انتہائی دقت نظری اور باریک بینی پر مبنی ہے' اس قاعدہ میں فرق مراتب ملحوظ رکھا گیا ہے اور قرآن مجید سے ثابت شدہ چیز کو حدیث شریف سے ثابت شدہ چیز پر ترجیح اور فوقیت دی گئی ہے۔ فقہ حنفی کے متعدد احکام اس قاعدہ پر موقوف ہیں اور یہ صرف فقہ حنفی کی خصوصیت ہے' جب کہ دیگر ائمہ ثلاثہ اس اصول کو پیش نظر نہیں رکھتے اور قرآن مجید کے عموم قطعی کی احادیث غیر متواترہ سے تخصیص کر کے قرآن مجید کو حدیث کے تابع کر دیتے ہیں' اسی وجہ سے وہ آیت کریمہ ''اخرجنا لکم من الارض'' کی پانچ وسق والی حدیث سے تخصیص کر دیتے ہیں۔

علامہ وشتانی مالکی لکھتے ہیں:

ہم آیت کریمہ کے عموم کے مقابلہ میں پانچ وسق والی حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور قرآن کریم کے عموم کی خبر واحد سے تخصیص کرنے میں اختلاف ہے۔ (اکمال اکمال المعلم ج ۳ ص ۱۱۰ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

قرآن مجید کے علاوہ احادیث صحیحہ میں بھی زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم عام ہے امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو زمین بارش یا چشموں سے سیراب ہو یا دریائی پانی سے سیراب ہو اس پر عشر (۱/۱۰) ہے اور جس زمین کو کنویں کے پانی سے اونٹوں کے ذریعہ سیراب کیا جائے اس پر نصف عشر ہے (یعنی ۱/۲۰)۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۰۱ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قلیل اور کثیر کا فرق کیے بغیر مطلقاً زمین سے حاصل شدہ پیداوار پر عشر یا نصف عشر کا حکم عائد فرمایا اور یہ حدیث عموم قرآن کے مطابق ہے نیز امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس زمین کو دریا یا بارش سیراب کرے اس پر عشر (۱/۱۰) ہے اور جس زمین کو کنویں کے پانی سے اونٹوں کے ذریعہ سیراب کیا جائے اس پر نصف عشر (۱/۲۰ بیسواں حصہ) ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۱۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی الطبعۃ الثانیہ ۱۳۷۵ھ)

امام ابوداؤد نے بھی اپنی اسانید کے ساتھ حضرت ابن عمر اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم کی ان دونوں روایات کو ذکر فرمایا ہے۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۲۵ مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور الطبعۃ الثانیہ ۱۴۰۵ھ)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس زمین کو بارش یا چشمے سیراب کریں اس میں عشر ہے اور جس کو اونٹوں کے ذریعہ کنویں سے سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر ہے۔

(سنن ابن ماجہ ص ۱۳۰ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی)

اس حدیث کے بعد امام ابن ماجہ نے حضرت جابر کی حدیث کو بھی اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

امام عبدالرزاق بن ہمام نے اپنی "مصنف" میں اس مضمون کی انیس احادیث روایت کی ہیں ہم ان میں سے چند کا ذکر کر رہے ہیں۔

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ معمر نے کہا: میں نے تمام (معتبر) لوگوں کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لکھا ہوا فرمان دیکھا کہ جس زمین کو رسیوں اور ڈولوں کے ذریعہ کنویں کے پانی سے سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر ہے (معمر کہتے ہیں کہ میرے علم میں اس بات میں کسی کا اختلاف نہیں ہے) اور جس زمین کو بارش یا دریائی پانی سے سیراب کیا جائے اس میں عشر ہے معمر کہتے ہیں کہ میرے علم میں اس بات میں بھی کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

(المصنف ج ۴ ص ۱۳۴ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۹۰ھ)

اس حدیث کو امام بیہقی نے بھی اپنی "سنن" میں روایت کیا ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۴ ص ۱۳۰ مطبوعہ نشر السنہ ملتان)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس زمین کو دریائی پانی بارش اور چشمے سیراب کریں اس میں عشر ہے اور جس کو رسیوں کے ذریعہ کنویں کے پانی سے سیراب کیا جائے اس میں نصف

عشر ہے۔ (المصنف ج ۴ ص ۱۳۲ 'مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۹۰ھ)

عاصم بن ضمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس زمین کو بارش سیراب کرے اس میں عشر ہے اور جس زمین کو ڈول کے ذریعہ کنوئیں سے سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر ہے۔

(المصنف ج ۴ ص ۱۳۳ 'مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۹۰ھ)

مجاہد بیان کرتے ہیں: زمین جس چیز کو بھی نکالے خواہ قلیل ہو یا کثیر اس میں عشر یا نصف عشر ہے۔

(المصنف ج ۳ ص ۱۳۹ 'مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۶ھ)

حماد کہتے ہیں: ہر وہ چیز جس کو زمین نکالے اس میں عشر ہے یا نصف عشر ہے۔

(المصنف ج ۳ ص ۱۳۹ 'مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۶ھ)

ابراہیم کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس کو زمین نکالے اس میں زکوۃ ہے۔

(المصنف ج ۳ ص ۱۳۹ 'مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۶ھ)

ائمہ ثلاثہ جو پانچ وسق سے کم میں زکوۃ کو واجب نہیں قرار دیتے قرآن کریم کی عمومی آیت اور ان تمام احادیث اور آثار کے تارک ہیں اور عمومی دلائل کے پیش نظر ان کا نظریہ صحیح نہیں ہے۔

پانچ وسق والی احادیث کی احناف یہ توجیہ کرتے ہیں کہ یہ احادیث اموال تجارت پر محمول ہیں کیونکہ اس وقت پانچ وسق (بارہ سو کلوگرام) دو سو درہم کے برابر ہوتے تھے اس لیے فرمایا کہ پانچ وسق سے کم میں صدقہ نہیں ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

عشری اور خراجی اراضی کی تعریفیں

جو زمین عشری ہو اس سے عشر (زمین کی پیداوار کا دسواں حصہ) لیا جاتا ہے اور جو زمین خراجی ہو اس سے خراج لیا جاتا ہے' عشر کی ادائیگی عبادت ہے اور یہ صرف مسلمانوں سے وصول کیا جاتا ہے' اور خراج اصالۃً غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے اور اس کی مختلف پیداوار کے اعتبار سے ادائیگی کی مختلف شرح ہے جس کی تفصیل ان شاء اللہ عنقریب آ رہی ہے' اگر مسلمان کسی خراجی زمین کو خرید لے تب بھی اس سے حسب سابق خراج ہی وصول کیا جائے گا' عشری اور خراجی زمین کے بیان میں علامہ المرغینانی لکھتے ہیں:

ہر وہ زمین جہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہو' یا جس زمین کو جنگ سے فتح کر کے مال غنیمت حاصل کرنے والوں (مجاہدین) میں تقسیم کر دیا ہو وہ زمین عشری ہے' اور ہر وہ زمین جس کو جنگ سے فتح کیا گیا ہو اور وہاں کے رہنے والوں کو اسی زمین پر برقرار رکھا گیا ہو وہ زمین خراجی ہے اور اسی طرح اس زمین کا حکم ہے جہاں کے رہنے والوں سے صلح کر کے اس پر قبضہ کیا ہو' اور مکہ مکرمہ اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جنگ اور غلبہ سے فتح کیا اور وہاں کے رہنے والوں کو وہیں رہنے دیا اور ان پر خراج مقرر نہیں کیا' اور ''جامع صغیر'' میں مذکور ہے کہ ہر وہ زمین جس کو جنگ سے فتح کیا گیا ہو اور اس میں دریاؤں کا پانی پہنچتا ہو تو وہ خراجی زمین ہے اور اگر اس تک دریاؤں کا پانی نہ پہنچتا ہو اور اس زمین سے چشمہ نکالا جائے تو وہ عشری زمین ہے' کیونکہ عشر کا تعلق اس زمین سے ہوتا ہے جس میں نشوونما ہو' اور نشوونما کا تعلق اس زمین کے پانی سے ہے اس لیے عشر کے پانی یا خراج کے پانی سے سیرابی کا اعتبار کیا جائے گا۔

جس شخص نے کسی غیر آباد زمین کو آباد کیا تو امام ابو یوسف کے نزدیک اس زمین کے عشری یا خراجی ہونے میں اس کے

قرب کا اعتبار کیا جائے گا' اگر وہ خراجی زمین کے قریب ہے تو خراجی ہے اور اور اگر عشری زمین کے قریب ہے تو عشری ہے اور امام محمد نے کہا: اگر اس نے اس زمین میں کنواں کھود کر اس کے پانی کو سیراب کیا ہے یا اس زمین کے چشمہ سے اس کو سیراب کیا ہے یا ان بڑے بڑے دریاؤں سے اس کو سیراب کیا ہے جن کا کوئی مالک نہیں ہے تو وہ زمین عشری ہے' اسی طرح اگر اس زمین کو بارش کے پانی سے سیراب کیا ہے تو بھی وہ زمین عشری ہے اور اگر اس زمین کو عجمیوں کی کھودی ہوئی نہروں سے سیراب کیا ہے تو وہ زمین خراجی ہے۔ (ہدایہ اولین ص ۵۹۱ _ ۵۹۰ 'مطبوعہ شرکت علمیہ' ملتان)

خراج کی مقدار کا بیان

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کو فتح کرنے کے بعد ہر جریب (تمیں گز زمین) پر ایک صاع (چار کلو گرام غلہ) اور ایک درہم مقرر کیا تھا' بہ شرطیکہ اس زمین میں پانی پہنچتا ہو اور جس زمین میں ککڑی' خربوزے اور بینگن وغیرہ سبزیوں کی کاشت ہو اس میں ہر جریب پر پانچ درہم مقرر کیے اور جس زمین میں انگور کی بیلیں لگی ہوں یا کھجور کے درخت ہوں اس میں ہر جریب پر دس درہم مقرر کیے' حضرت عمر نے صحابہ کی جماعت کے سامنے یہ شرح مقرر کی اور کسی نے اس پر انکار نہیں کیا' اس لیے اس پر اجماع ہو گیا' نیز اس لیے کہ کاشتکاری میں کم و بیش مشقت ہوتی ہے' انگوروں کی بیل لگانے میں سب سے کم مشقت اور غلہ اگانے میں سب سے زیادہ مشقت ہے اور سبزیوں کی کاشت میں درمیانی مشقت ہے اور مشقت کے فرق کی وجہ سے وظیفہ خراج میں بھی تفریق کی گئی اور انگوروں کی بیل میں سب سے زیادہ یعنی دس درہم فی جریب وظیفہ مقرر کیا گیا اور غلہ کی کھیتی باڑی میں سب سے کم یعنی ایک صاع غلہ اور ایک درہم فی جریب مقرر کیا گیا اور سبزیوں کی کاشت میں درمیانی وظیفہ یعنی پانچ درہم فی جریب مقرر کیا گیا' ان کے علاوہ زراعت کی دیگر اجناس مثلاً زعفران اور باغات (جن کے گرد چار دیواری ہو) میں کاشتکاری کی مشقت کے اعتبار سے خراج مقرر کیا جائے گا اور یہ امام کے اجتہاد پر موقوف ہے' ہمارے مشائخ نے یہ کہا ہے کہ ان زمینوں سے پیداوار کے نصف سے زیادہ خراج نہ لیا جائے کیونکہ کاشتکار نصف پیداوار سے زیادہ ادا کرنے کا متحمل نہیں ہو گا' اگر کاشتکار امام کے مقرر کردہ خراج کو ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھے تو پھر امام کو اس کی مقدار میں کمی کر دینی چاہیے۔

(ہدایہ اولین ص ۵۹۲ _ ۵۹۱ 'مطبوعہ شرکت علمیہ' ملتان)

ایک درہم ۳٫۰۶ گرام چاندی کے برابر ہے اور پانچ درہم ۱۵٫۳ گرام چاندی کے برابر ہیں اور دس درہم ۳۰٫۶ گرام چاندی کے برابر ہیں۔

اراضی پاکستان کے عشری ہونے کا بیان

جو زمینیں پاکستان کے زمینداروں کی ملکیت میں ہیں ان پر قطعیت کے ساتھ عشری یا خراجی ہونے کا حکم لگانا بہت مشکل ہے' کیونکہ جب سلاطین اسلام نے ابتداءً ہندوستان کے اس حصہ کو فتح کیا تھا تو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان سلاطین نے کون سی صورت اختیار کی تھی' بعض صورتیں عشری زمین کی ہیں اور بعض خراجی زمین کی' اور جو زمینیں مسلمانوں کے زیر تصرف ہوں اور ان کے متعلق عشری یا خراجی ہونا یقینی اور متحقق نہ ہو ان کو عشری زمین پر محمول کیا جائے گا۔

علامہ شمس الدین سرخسی لکھتے ہیں:

ہر وہ شہر جس کے رہنے والے بہ خوشی مسلمان ہوئے اس کی زمین عشری ہے' کیونکہ مسلمانوں کے مسلمانوں پر وظیفہ (زمین کا محصول) مقرر کرنے کی ابتداء خراج سے نہیں کی جائے گی تاکہ مسلمان کو ذلت سے محفوظ رکھا جائے' لہٰذا ان پر عشر ہو گا۔ (المبسوط ج ۳ ص ۷ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

لہٰذا جب پاکستان بنا اور مسلمان مسلمانوں پر حاکم ہوئے تو یہاں کے کاشتکاروں سے زمین میں زراعت کرنے کے وظیفہ کی ابتداء بھی عشر سے کی جائے گی نہ کہ خراج سے' کیونکہ عشر اصالۃً مسلمانوں کا فریضہ ہے اور خراج اصالۃً کافروں پر ہے۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

زمینیں وظیفہ (محصول یا ٹیکس) کی ادائیگی سے خالی نہیں ہیں اور یہ وظیفہ یا عشر ہوگا یا خراج اور مسلمانوں کے زیر تصرف زمین میں عشر سے ابتداء کرنا اولیٰ ہے کیونکہ عشر میں عبادت کا معنی ہے' خراج میں ذلت کا معنی ہے۔

(بدائع الصنائع ج ۲ ص ۵۷ 'مطبوعہ ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی' کراچی' ۱۴۰۰ھ)

اسی طرح حکومت پاکستان نے جو زمینیں مسلمانوں کو الاٹ کردیں یا ان کو بہ طور عطیہ دیں' یا کسی کارگزاری یا خدمت کے معاوضہ میں دیں وہ بھی عشری ہیں' علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

جس زمین کو مال غنیمت حاصل کرنے والوں (مجاہدین) کے غیر میں ہماری حکومت تقسیم کرے وہ بھی عشری ہے کیونکہ مسلمان پر ابتداءً خراج مقرر نہیں کیا جاتا۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۲۵۴ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: شیطان تم کو تنگ دستی سے ڈراتا ہے' اور تم کو بے حیائی کا حکم دیتا ہے' اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور اپنے فضل کا وعدہ فرماتا ہے۔ (البقرہ: ۲۶۸)

بخل کو بے حیائی کے ساتھ تعبیر کرنے کی توجیہ

فحشاء کا معنی بے حیائی ہے اور اس آیت میں بخل پر بے حیائی کا اطلاق کیا گیا ہے' کیونکہ حیاء کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو اس کی ضروریات سے زیادہ مال دیا ہے اور جب اس کے سامنے کوئی ضرورت مند سائل سوال کرے تو وہ اس کی ضرورت کو پورا کرے اور اس کو یہ خیال آئے کہ آخر وہ بھی تو اپنی ضرورتوں کے لیے اللہ کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے اور اللہ جب اس کو ضرورت سے زیادہ عطا کرتا ہے تو وہ اللہ کے حکم سے سائل کو خالی ہاتھ لوٹانے سے حیاء کرے' اور جو انسان کسی کو صدقہ اور خیرات دینے کا ارادہ کرتا ہے شیطان اس کو مستقبل کی ضرورتیں یاد دلاتا ہے' اور اس کو پیش آنے والی تنگ دستی یاد دلاتا ہے' اس کو صدقہ دینے سے منع کرتا ہے اور اسے سائل کو بری طرح جھڑکنے کا حکم دیتا ہے' اور اللہ صدقہ کرنے پر تم سے مغفرت اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے کہ وہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور جتنا تم دو گے آخرت میں تم کو اس سے زیادہ اجر عطا فرمائے گا۔ قرآن مجید میں ہے:

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ۝ (سبا: ۳۹)

اور تم جو کچھ (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو گے وہ تمہیں اس کا بدل عطا کرے گا اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے ۝

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام ترمذی تحسین سند کے ساتھ' امام نسائی' امام ابن جریر' امام ابن المنذر' امام ابن ابی حاتم' امام ابن حبان اور امام بیہقی ''شعب الایمان'' میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابن آدم کے پاس ایک شیطان ہوتا ہے اور ایک فرشتہ ہوتا ہے۔ شیطان اس کو شر سے ڈراتا ہے اور حق کی تکذیب کرتا ہے اور فرشتہ اس سے خیر کا وعدہ کرتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے' پھر آپ نے یہ آیت پڑھی:

شیطان تم کو تنگ دستی سے ڈراتا ہے اور تم کو بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۳۴۸ 'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ جسے چاہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت دی گئی تو بے شک اسے خیر کثیر دی گئی۔

(البقرہ: ۲۶۹)

حکمت کے مصداق میں صحابہ اور فقہاء تابعین کے اقوال

علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں:

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ مجاہد ضحاک اور مقاتل نے کہا: حکمت سے مراد قرآن ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قرآن مجید کے ناسخ اور منسوخ محکم اور متشابہ اور مقدم اور مؤخر کی معرفت حکمت ہے۔ سدی نے کہا: حکمت سے مراد نبوت ہے۔ ابراہیم ابوالعالیہ اور قتادہ نے کہا: حکمت سے مراد فہم قرآن ہے لیث نے مجاہد سے روایت کیا: اس سے مراد علم اور فقہ ہے ابن نجیح نے مجاہد سے روایت کیا: اس سے مراد قول اور فعل کا درست ہونا ہے۔ حسن نے کہا: اس سے اللہ کے دین میں تقویٰ مراد ہے۔ ربیع بن انس نے کہا: اس سے مراد خشیت (خوف خدا) ہے ابن زید نے کہا: اس سے مراد اللہ کے حکم میں تعقل ہے شریک نے کہا: فہم ہے ابن قتیبہ نے کہا: علم اور عمل کا مجموعہ ہے مجاہد نے کہا: کتابت ہے ابن المقفع نے کہا: جس چیز کی صحت کی عقل گواہی دے قشیری نے کہا: اللہ کے احکام میں غور وفکر کرنا اور ان کا اتباع کرنا نیز انہوں نے کہا: اللہ کی اطاعت فقہ دین اور اس پر عمل کرنا عطاء نے کہا: مغفرت ابو عثمان نے کہا: وہ نور جس کی وجہ سے وسوسہ اور الہام میں فرق ہو قاسم بن محمد نے کہا: اپنی خواہشات کی بجائے حق کے مطابق فیصلہ کرنا بندار بن حسین نے کہا: سرعت کے ساتھ صحیح جواب دینا مفضل نے کہا: کسی چیز کو صحت کی طرف لوٹانا کتانی نے کہا: جس چیز سے روحوں کو سکون ملے اور یہ اقوال ہیں: ہر حال میں حق کی گواہی دینا دین کی بہتری اور دنیا کی اصلاح کرنا علم لدنی اللہ تعالیٰ کی ذات میں تفکر کرنا اور الہام کا مورد بننے کے لیے صفاء باطن کرنا یہ کل پچیس اقوال ہیں۔ (البحر المحیط ج ۲ ص ۶۸۲۔ ۶۸۳ مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۱۲ھ)

حکمت کی تعریف اور اس کی اقسام

حکمت کی دو قسمیں ہیں: حکمت نظری اور حکمت عملی حکمت نظری کی یہ تعریف ہے کہ بشری طاقت کے مطابق حقائق اشیاء کا اس طرح علم ہو جس طرح وہ اشیاء واقع میں ہیں اور حکمت عملی یہ ہے کہ انسان برے اخلاق کو ترک کرے اور اچھے اخلاق کو اپنائے اور ایک تعریف یہ ہے کہ بشری طاقت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متخلق ہونا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام پر عمل کرنا اور آپ کے تمام افعال کی اتباع کرنا حکمت عملی کی تین قسمیں ہیں اگر اس کا تعلق ایک فرد کی اصلاح کے ساتھ ہو تو اس کو تہذیب اخلاق کہتے ہیں اور اگر اس کا تعلق ایک خاندان کی اصلاح کے ساتھ ہو تو اسے تدبیر منزل کہتے ہیں اور اگر اس کا تعلق ایک شہر یا ملک کی اصلاح کے ساتھ ہو تو اس کو سیاست مدنیہ کہتے ہیں۔

حکمت کے متعلق احادیث

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام احمد نے کتاب الزہد میں مکحول سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے چالیس دن اللہ کے ساتھ اخلاص کیا اس کے قلب سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے پھوٹ پڑیں گے۔

امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے جہاں سے بھی حکمت ملے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔

امام طبرانی نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لقمان نے اپنے

بیٹے سے کہا: اے بیٹے! علماء کی مجالس کو لازم رکھو اور حکماء کا کلام سنو' کیونکہ اللہ تعالیٰ حکمت کے نور سے مردہ دل کو اس طرح زندہ کر دیتا ہے جس طرح مردہ زمین تیز بارش سے زندہ ہو جاتی ہے۔

امام طبرانی نے ''معجم اوسط'' میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کم علم بہت عبادت سے بہتر ہے اور کسی شخص کے فقیہ ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے' اور کسی شخص کے جاہل ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ (قرآن اور سنت کے خلاف) اپنی رائے کو پسند کرے۔

امام طبرانی نے ''معجم اوسط'' میں' امام دار قطنی نے اور امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین میں فقہ حاصل کرنے سے افضل کوئی عبادت نہیں ہے اور ایک فقیہ شیطان کے نزدیک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہوتا ہے' اور ہر چیز کا ایک ستون ہوتا ہے اور اس دین کا ستون فقہ ہے اور حضرت ابو ہریرہ نے کہا: اگر میں ایک ساعت بیٹھ کر دین کا علم حاصل کروں تو یہ میرے نزدیک ساری رات جاگ کر عبادت کرنے سے بہتر ہے۔

امام طبرانی نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بندوں کو جمع کرے گا' پھر ان میں سے علماء کو الگ کرے گا' پھر فرمائے گا: اے علماء کے گروہ! میں نے تمہیں عذاب دینے کے لیے تم میں اپنا علم نہیں رکھا تھا' جاؤ! میں نے تم کو بخش دیا ہے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۳۵۱۔ ۳۵۰' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو اور تم جو بھی نذر مانتے ہو بے شک اللہ اس کو جانتا ہے۔

(البقرہ: ۲۷۰)

نذر کا لغوی اور شرعی معنی اور نذر کی اقسام

علامہ فیروز آبادی نے لکھا ہے: نذر کا معنی ہے: تاوان' کسی چیز کو واجب کرنا' اللہ کے لیے منت ماننا۔

(القاموس المحیط ج ۲ ص ۱۹۸' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت)

علامہ راغب اصفہانی نذر کا شرعی معنی بیان کرتے ہیں:

نذر یہ ہے کہ تم کسی کام کے ہونے کی بناء پر اپنے اوپر ایسی عبادت کو واجب کر لو جس کو تم پر واجب نہیں کیا گیا ہے۔

(المفردات ص ۴۸۷' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ (آل عمران: ۳۵)

جب عمران کی بیوی نے کہا: اے میرے رب! میں نے تیرے لیے نذر مانی ہے کہ میرے پیٹ میں جو آزاد کیا ہوا ہے (وہ خالص تیرے لیے ہے) تو اس کو میری طرف سے قبول فرما۔

فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۚ (مریم: ۲۶)

(اے مریم!) تم کہنا: میں نے رحمان کے لیے (خاموشی کے) روزہ کی نذر مانی ہے' سو میں آج ہرگز کسی انسان سے بات نہیں کروں گی ○

وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ . (الحج: ۲۹) اور ان پر لازم ہے کہ وہ اللہ کے لیے مانی ہوئی نذروں کو پورا کریں۔

علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں:

نذر کی دو قسمیں ہیں' ایک قسم حرام ہے اور یہ ہر وہ نذر ہے جو اللہ کی اطاعت میں نہ ہو' اور زمانہ جاہلیت میں زیادہ تر نذریں ایسی ہوتی تھیں' اور دوسری قسم ہے مباح' یہ کبھی کسی کام کے ساتھ مشروط ہوتی ہے اور کبھی مطلق ہوتی ہے' مثلاً اگر میں فلاں مرض سے شفا پا جاؤں تو میں ایک دینار صدقہ کروں گا' (یہ نذر مشروط ہے) یا میں اللہ کے لیے ایک غلام آزاد کروں گا' (یہ غیر مشروط ہے) اور کبھی نذر مطلق ہوتی ہے' مثلاً اگر میں صحت مند ہو گیا تو میں صدقہ کروں گا۔

(البحر المحیط ج ۲ ص ۶۲۸' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

نذر صحیح اور نذر باطل کا بیان

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

اکثر عوام جو فوت شدہ بزرگوں کی نذر مانتے ہیں اور اولیاء کرام کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ان کے مزارات پر جو روپے' موم بتی اور تیل کی نذر مانتے ہیں' وہ بالاجماع باطل اور حرام ہے' جب تک ان چیزوں کو فقراء پر خرچ کرنے کا ارادہ نہ کیا جائے' لوگ اس آفت میں بہت مبتلا ہیں خصوصاً ہمارے زمانہ میں۔

(درمختار علی ہامش رد المحتار ج ۲ ص ۱۲۸' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

علامہ ابن عابدین شامی حنفی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

مثلاً کوئی شخص اولیاء اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اپنی نذر میں کہتا ہے: اے میرے سردار فلاں بزرگ! اگر میرا گم شدہ شخص واپس آ جائے یا میرا بیمار صحت مند ہو جائے یا میری حاجت پوری ہو جائے' تو میں آپ کے لیے اتنا سونا یا چاندی' یا کھانا' یا موم بتی یا تیل دوں گا۔ (البحر الرائق) یہ نذر کئی وجوہ سے باطل اور حرام ہے: (۱) یہ مخلوق کی نذر ہے اور مخلوق کی نذر باطل اور حرام ہے' کیونکہ نذر عبادت ہے اور مخلوق کی عبادت جائز نہیں ہے (۲) جس کی نذر مانی گئی ہے' وہ فوت شدہ ہے' اور فوت شدہ شخص کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا (۳) اگر نذر ماننے والے کا یہ گمان ہے کہ وہ فوت شدہ شخص اللہ کے اذن کے بغیر تصرف کرتا ہے تو یہ اعتقاد کفر ہے' ہاں! اگر اس نے یہ کہا کہ اے اللہ! میں تیرے لیے نذر مانتا ہوں کہ اگر تو نے میرے مریض کو شفاء دے دی یا میرے گم شدہ شخص کو لوٹا دیا' یا میری حاجت پوری کر دی تو میں سیدہ نفیسہ کے مزار پر بیٹھے ہوئے فقراء کو کھانا کھلاؤں گا' یا امام شافعی یا امام لیث کے مزار پر بیٹھنے والے فقراء کو کھانا کھلاؤں گا' یا اس نے ان کی مساجد کے لیے چٹائی اور روشنی کے لیے تیل یا دیگر کاموں کے لیے روپیہ دیا جس میں فقراء کا نفع ہو' یہ نذر خاص اللہ کے لیے ہو اور شیخ کا ذکر صرف نذر کو خرچ کرنے کے محل کے لیے ہوتا کہ اس مزار یا مسجد میں بیٹھنے والے فقراء اور مستحقین پر ان چیزوں کو خرچ کر دیا جائے تو اس اعتبار سے یہ نذر جائز ہے' اور کسی غنی یا سید پر ان چیزوں کا خرچ کرنا جائز نہیں ہے' اور جو نذر مخلوق کے لیے مانی گئی ہو اس کو پورا کرنا حرام ہے اور مزار کے متولی کے لیے اس کا لینا جائز نہیں ہے' جب تک نذر ماننے والا اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے نذر نہ مانے اور فقراء پر اس کو خرچ کرنے کی نیت نہ کرے۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۱۲۸' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہ العزیز اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

نذر عرف میں ہدیہ اور پیشکش کو کہتے ہیں' اور شرع میں نذر عبادت اور قربت مقصودہ ہے' اسی لیے اگر کسی نے گناہ کی نذر

کی تو وہ صحیح نہیں ہوئی نذر خاص اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے اور یہ جائز ہے کہ اللہ کے لیے نذر کرے اور کسی ولی کے آستانہ کے فقراء کو نذر کے لیے صرف کا محل مقرر کرے مثلاً کسی نے یہ کہا کہ یارب! میں نے نذر مانی کہ اگر تو میرا فلاں مقصد پورا کر دے کہ فلاں بیمار کو تندرست کر دے تو میں فلاں ولی کے آستانہ کے فقراء کو کھانا کھلاؤں یا وہاں کے خدام کو روپیہ پیسہ دوں یا ان کی مسجد کے لیے تیل یا بوریا حاضر کروں تو یہ نذر جائز ہے۔ (ردالمختار) (خزائن العرفان ص ۶۷ مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور)

جواز کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان اللہ کے لیے نذر مانے اور اس عبادت کا ثواب کسی بزرگ کو پہنچا دے۔

اردو لغات میں نذر کا معنی ہدیہ اور تحفہ بھی ہے اور منت اور چڑھاوا بھی ہے۔ (قائد اللغات ص ۹۵۹) لیکن عربی میں نذر کا وہی معنی ہے جس کو ہم نے "قاموس" کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

امام مالک' امام بخاری' امام ابو داؤد' امام ترمذی' اور امام ابن ماجہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر مانی ہے وہ اس کی اطاعت کرے اور جس نے اس کی معصیت کی نذر مانی ہے وہ اس کی معصیت نہ کرے۔ امام مسلم' امام ترمذی اور امام نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نذر نہ مانا کرو' کیونکہ نذر تقدیر سے مستغنی نہیں کرتی' نذر تو صرف بخیل آدمی مانتا ہے۔ (الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۵۱' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر تم علانیہ صدقات دو تو وہ کیا ہی خوب ہے' اور اگر ان کو مخفی رکھو اور فقراء کو دو تو وہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اور (یہ صدقہ کرنا) تمہارے کچھ گناہوں کو مٹا دے گا۔ (البقرہ: ۲۷۱)

علامہ ابو الحیان اندلسی لکھتے ہیں:

صدقہ فرضیہ کو ظاہر کر کے دینا افضل ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی مختار ہے' امام طبری نے اس پر اجماع نقل کیا ہے' اور قاضی ابو یعلیٰ کا بھی یہی مختار ہے' نیز حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ نفلی صدقہ کو مخفی طور پر دینا افضل ہے' اور حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ نفلی صدقہ کو خفیہ طور پر دینا علانیہ صدقہ سے ستر درجہ افضل ہے' اور صدقہ فرضیہ کو علانیہ دینا' خفیہ دینے سے پچیس درجہ افضل ہے۔ علامہ قرطبی نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس یہ بات اپنی رائے سے نہیں کہہ سکتے' اس لیے یہ اس پر محمول ہے کہ انہوں نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوگا' زجاج نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں زکوٰۃ کو خفیہ طور پر دینا بھی احسن تھا' لیکن اب لوگ بدگمانی کرتے ہیں اس لیے زکوٰۃ کو ظاہر کر کے دینا افضل ہے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے کہ خفیہ اور علانیہ صدقات کی ایک دوسرے پر افضلیت کے متعلق کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔

(البحر المحیط ج ۲ ص ۶۸۹۔ ۶۸۸' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام بیہقی نے "شعب الایمان" میں سند ضعیف کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خفیہ عمل علانیہ عمل سے افضل ہے' اور جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کی اقتداء کی جائے اس کے لیے علانیہ عمل افضل ہے۔

امام بخاری' امام مسلم اور امام نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات آدمی اللہ کے سائے میں ہوں گے' جس دن اللہ کے سائے کے سوا کسی کا سایا نہیں ہوگا' امام عادل' وہ نوجوان جس کی اللہ کی عبادت میں نشو و نما ہوئی' وہ شخص جس کا دل مسجد میں معلق رہتا ہے' وہ دو آدمی جو اللہ کی محبت کی وجہ سے ملتے ہیں اور

اللہ کی محبت کی وجہ سے جدا ہوتے ہیں' وہ شخص جس کو کسی خوب صورت اور متمول عورت نے گناہ کی دعوت دی اور اس نے کہا: میں اللہ سے ڈرتا ہوں' وہ شخص جس نے خفیہ صدقہ دیا حتیٰ کہ بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے اور وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا حتیٰ کی اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔

امام طبرانی نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیکی کے کام بری آفتوں سے بچاتے ہیں' اور خفیہ صدقہ کرنا اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے' اور رشتہ داروں سے نیک سلوک کرنا عمر کو بڑھاتا ہے۔

امام ابوداؤد نے' امام ترمذی نے تصحیح سند کے ساتھ' امام نسائی نے' امام ابن خزیمہ نے' امام ابن حبان نے اور امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمیوں سے اللہ محبت رکھتا ہے اور تین آدمیوں سے اللہ بغض رکھتا ہے' جن سے اللہ محبت رکھتا ہے وہ یہ ہیں: ایک شخص لوگوں کے پاس گیا اور اس نے ان سے محض اللہ کی وجہ سے سوال کیا' اس کی ان سے قرابت داری نہیں تھی' ایک شخص ان کے پیچھے سے اٹھا اور اس کو خفیہ طور پر صدقہ دیا' اللہ کے سوا اس صدقہ کا کسی کو علم نہیں تھا' یا اس سائل کو علم تھا' کچھ لوگوں نے رات کو سفر کیا اور ایک جگہ ٹھہر کر سو گئے' ان میں سے ایک شخص رات کو اٹھا اور اللہ کو یاد کرنے لگا اور اس کی آیات تلاوت کرنے لگا' ایک شخص کسی لشکر میں تھا' ان کا دشمن سے مقابلہ ہوا' انہوں نے دشمن کو شکست دے دی' اس شخص نے آگے بڑھ کر مقابلہ کیا حتیٰ کہ وہ شہید ہو گیا یا فتح یاب ہو گیا اور جن تین لوگوں سے اللہ بغض رکھتا ہے وہ یہ ہیں: بوڑھا زانی' متکبر فقیر اور ظالم تونگر۔

امام ابن ماجہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! موت آنے سے پہلے اللہ سے توبہ کرلو اور مشغول ہو جانے سے پہلے نیک عمل کرلو' اور اللہ کو بہت یاد کر کے اس سے وصل کرو' اور خفیہ اور علانیہ صدقہ دو' تمہیں رزق دیا جائے گا' تمہاری مدد کی جائے گی اور تمہارا نقصان پورا کیا جائے گا۔

امام احمد' امام ابن خزیمہ' امام ابن حبان' امام حاکم تصحیح سند کے ساتھ اور امام بیہقی ''شعب الایمان'' میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن جب تک لوگوں کے درمیان فیصلہ ہوگا اس وقت تک ہر شخص اپنے صدقہ کے سائے میں رہے گا۔

امام طبرانی اور امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقہ کرنے والوں کے لیے ان کا کیا ہوا صدقہ قبر کی گرمی کو دور کرے گا اور قیامت کے دن مومن صرف اپنے صدقہ کے سائے میں ہوگا۔

امام ترمذی نے تحسین سند کے ساتھ اور امام ابن حبان نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقہ کرنا رب کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بُری موت کو دور کرتا ہے۔

امام طبرانی نے حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقہ برائی کے ستر دروازوں کو بند کرتا ہے۔

امام طبرانی نے حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان کا صدقہ عمر میں اضافہ کرتا ہے' بُری موت کو دور کرتا ہے اور اس کی وجہ سے اللہ تکبر اور فخر کو دور کرتا ہے۔

(الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۵۵۔ ۳۵۳' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے رسول!) انہیں ہدایت یافتہ کرنا آپ کے ذمہ نہیں ہے' لیکن اللہ جسے چاہتا ہے اسے ہدایت یافتہ بنا دیتا ہے۔ (البقرہ: ۲۷۲)

اہل الذمہ کو نفلی صدقات دینے کا جواز

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے (نفلی) صدقات اپنے مشرک رشتہ داروں کو نہیں دیتے تھے' اسی طرح انصار بنو قریظہ اور بنو نضیر کو صدقات نہیں دیتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ اسلام لے آئیں تو یہ آیت نازل ہوئی کہ (اے رسول!) انہیں ہدایت یافتہ کرنا آپ کے ذمہ نہیں ہے' لیکن اللہ جسے چاہتا ہے اسے ہدایت یافتہ بنا دیتا ہے۔

(جامع البیان ج ۳ ص ۶۳' مطبوعہ دار المعرفہ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ نفلی صدقات ذمی کافروں کو دیئے جا سکتے ہیں یعنی جو کافر مسلمانوں کے ملک میں حکومت کی امان کے ساتھ رہتے ہیں وہ اہل ذمہ کے حکم میں ہیں' ان کو نفلی صدقات دیئے جا سکتے ہیں اور صدقات فرضیہ غیر مسلم کو دینا جائز نہیں ہے اور حربی کافر کو کسی قسم کا صدقہ دینا جائز نہیں ہے۔

نیز اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ ہدایت کو لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنا آپ کا فریضہ اور منصب نہیں ہے' آپ کا کام صرف ہدایت کو پہنچانا اور بیان کرنا ہے' قرآن مجید میں ہے:

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلٰغُ ۗ. (الشوریٰ: ۴۸)

سو اگر یہ (اسلام قبول کرنے سے) منہ موڑیں تو ہم نے آپ کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا' آپ کا منصب تو صرف دین کو پہنچا دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ (خیرات) ان فقراء کا حق ہے جو خود کو اللہ کی راہ میں وقف کیے ہوئے ہیں جو (اس میں شدت اشتغال کی وجہ سے) زمین میں سفر کی طاقت نہیں رکھتے۔ (البقرہ: ۲۷۳)

علامہ ابو الحیان اندلسی لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس اور مقاتل نے کہا: یہ فقراء اہل صفہ تھے جنہوں نے خود کو اللہ کی عبادت کے لیے وقف کر لیا تھا' ان کے پاس بالکل مال نہیں تھا' ان کی تعداد تقریباً چار سو تھی' مجاہد نے کہا: یہ قریش کے فقراء مہاجرین تھے' سعید بن جبیر نے کہا: یہ وہ صحابہ تھے جو مختلف غزوات میں زخمی ہو کر اپاہج ہو گئے تھے۔ نسائی نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ وہ مرض کی وجہ سے زندگی کے کام کاج کرنے اور سفر کرنے سے معذور ہو گئے تھے' سدی نے کہا: کفار نے ان کو گھیرے میں لے لیا تھا' اور وہ کفار کے غلبہ کی وجہ سے گھر گئے تھے' قتادہ نے کہا: انہوں نے خود کو جہاد کے لیے وقف کر لیا تھا' لیکن فقر کی وجہ سے جہاد نہیں کر سکتے تھے' محمد بن فضل نے کہا: یہ وہ فقراء تھے جو اپنی بلند ہمت اور خودداری کی وجہ سے صرف اللہ سے دعا کرتے تھے اور کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتے تھے' زمخشری نے کہا: یہ وہ فقراء تھے جو جہاد میں مشغول رہنے کی وجہ سے تجارت کرنے کے لیے زمین میں سفر نہیں کر سکتے تھے۔ (البحر المحیط ج ۲ ص ۶۹۶' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

ہر چند کہ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں ان فقراء کے متعدد مصداق بیان کیے ہیں' لیکن ہمارے نزدیک مختار یہ ہے کہ ان فقراء سے مراد اہل صفہ ہیں جنہوں نے خود کو علم دین کے حصول کے لیے وقف کیا ہوا تھا' یہ ستر نادار صحابہ تھے جو مسجد نبوی میں رہتے تھے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے ایک چبوترہ بنوایا تھا' یہ اپنی بلند ہمت اور خودداری کی وجہ سے کسی کے آگے

دست سوال دراز نہیں کرتے تھے نہ انہوں نے اپنی وضع قطع مسکینوں اور درویشوں کی سی بنائی ہوئی تھی کہ ان کی ظاہری حالت قابل رحم ہو اور دیکھنے والا ان کو ضرورت مند سمجھ کر ان کی مدد کرے یہ صحابہ ''خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر'' کی عملی تصویر تھے یہ شدید ضروریات میں بھی اپنی سفید پوشی کو قائم رکھتے تھے اور اپنے چہروں سے اپنی بھوک اور پیاس کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے اور ان سے باتیں کرنے والا اور ان کی ظاہری حالت کو دیکھنے والا ان کو خوش حال اور شکم سیر گمان کرتا تھا' اس کا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے' امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اصحاب صفہ اہل اسلام کے مہمان تھے' ان کا کوئی گھر نہیں تھا نہ مال' اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے! میں بھوک کی شدت سے اپنے جگر کو زمین سے لگائے رکھتا تھا اور بھوک کے غلبہ کے وقت اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تھا' ایک دن میں ایک راستہ پر بیٹھا تھا جہاں سے لوگ گزر رہے تھے' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گزرے تو میں نے ان سے قرآن مجید کی ایک آیت کے متعلق پوچھا' میں نے ان سے صرف اس لیے پوچھا تھا کہ شاید وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں اور مہمان بنا کر کھانا کھلائیں' وہ گزر گئے اور مجھے نہیں لے گئے' پھر حضرت عمر گزرے' میں نے ان سے بھی قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی' ان سے بھی اسی لیے پوچھا تھا' وہ بھی مجھے نہیں لے گئے' پھر سیدنا ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا' آپ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: ابوہریرہ! میں نے عرض کیا: لبیک یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: میرے ساتھ آؤ اور چل پڑے' میں بھی آپ کے ساتھ گیا' آپ گھر چلے گئے' میں نے اندر آنے کی اجازت طلب کی' آپ نے اجازت دے دی' گھر میں دودھ کا ایک پیالہ تھا' آپ نے پوچھا: یہ دودھ کہاں سے آیا ہے؟ گھر والوں نے بتایا کہ ہمارے لیے فلاں شخص نے ہدیہ بھیجا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوہریرہ! میں نے عرض کیا: لبیک' آپ نے فرمایا: جاؤ تم اہل صفہ کو بلا لاؤ' وہ اہل اسلام کے مہمان ہیں' ان کا گھر بار ہے نہ مال ہے' آپ کے پاس جب کوئی صدقہ آتا تھا تو آپ اس کو ان کے پاس بھیج دیتے تھے اور خود اس میں سے بالکل نہیں کھاتے تھے اور جب آپ کے پاس کوئی ہدیہ آتا تھا' تو آپ ان کے پاس بھی بھیجتے تھے' اور خود بھی اس میں سے تناول فرماتے تھے' مجھے آپ کا یہ فرمانا ناگوار لگا' میں نے سوچا: یہ ایک پیالہ دودھ تمام اصحاب صفہ کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے' اب میں ان کو بلا کر لاؤں گا' پھر فرمائیں گے: ان کو یہ دودھ پلاؤ' میرے لیے تو اس میں سے ایک قطرہ بھی نہیں بچے گا' اور مجھے یہ امید تھی کہ شاید آپ یہ سارا دودھ مجھے دے دیں گے' لیکن اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا' میں گیا اور ان کو بلا کر لایا' وہ سب آ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے' آپ نے فرمایا: ابوہریرہ! یہ پیالہ لو اور ان کو پیش کرو' میں نے وہ پیالہ لیا اور ان میں سے ایک شخص کو پلایا' اس نے اس پیالے سے دودھ پیا حتیٰ کہ وہ سیر ہو گیا' پھر میں نے دوسرے کو پلایا حتیٰ کہ اخیر میں میں اس پیالہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا' اور تمام اصحاب صفہ سیر ہو کر پی چکے تھے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پیالہ لے کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا' پھر آپ سر اٹھا کر مسکرائے' اور فرمایا: اے ابوہریرہ! پیو' میں نے پیا' آپ نے فرمایا: (اور) پیو' میں نے پیا' میں اسی طرح پیتا رہا اور آپ فرماتے رہے: پیو' حتیٰ کہ میں نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے! اب بالکل گنجائش نہیں ہے' آپ نے وہ پیالہ لیا' اللہ کی حمد کی اور بسم اللہ پڑھ کر پی لیا۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

(جامع ترمذی ص ۳۵۷۔ ۳۵۶' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ اصحاب صفہ وہ فقراء صحابہ تھے جن کا گھر بار تھا نہ ان کے پاس مال و منال تھا' انہوں نے علم دین کے حصول کے لیے خود کو وقف کیا ہوا تھا' وہ سخت بھوک و پیاس کے عالم میں بھی کسی کے آگے دست سوال دراز

نہیں کرتے تھے اور ان کی ظاہری حالت سے ان کی اندرونی کیفیات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا' قرآن مجید کے بیان کردہ اوصاف انہی پر پوری طرح صادق آتے تھے' نیز حسب ذیل احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اس آیت کا مصداق اصحاب صفہ ہی تھے۔

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام ابن المنذر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس آیت سے مراد اصحاب صفہ ہیں۔

امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: جاؤ اصحاب صفہ کو بلا لاؤ' اور اصحاب صفہ اسلام کے مہمان تھے' ان کا گھر تھا نہ ان کے پاس مال تھا' جب آپ کے پاس کوئی صدقہ آتا تو آپ ان کے پاس بھیج دیتے اور خود اس سے تناول نہیں فرماتے تھے اور جب آپ کے پاس کوئی ہدیہ آتا تو ان کے پاس بھی بھیجتے اور خود بھی تناول فرماتے۔

امام ابونعیم نے ''حلیہ'' میں حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھاتے تو کچھ لوگ بھوک کی شدت سے قیام کے دوران گر پڑتے تھے' یہ اصحاب صفہ تھے' دیہاتی لوگ ان کو مجنون گمان کرتے تھے۔

امام ابن سعد' عبد اللہ بن احمد اور امام ابونعیم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اصحاب صفہ کی تعداد ستر تھی' ان میں کسی کے پاس چادر نہیں تھی۔

امام محمد بن سعد نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت اصحاب صفہ کے متعلق نازل ہوئی ہے' ان کا مدینہ میں کوئی گھر تھا نہ کوئی قبیلہ' اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ان پر صدقہ کرنے کی ترغیب دی ہے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۳۵۸ ملتقطاً مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ناواقف شخص ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے ان کو خوش حال سمجھتا ہے' اے مخاطب تم (ان میں بھوک کے آثار دیکھ کر) ان کو صورت سے پہچان لو گے' وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے۔ (البقرہ: ۲۷۳)

گداگری کی مذمت اور سوال نہ کرنے کی فضیلت میں احادیث

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام بخاری' امام مسلم' امام ابوداؤد' امام نسائی' امام ابن المنذر' امام ابن ابی حاتم اور امام ابن مردویہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص مسکین نہیں ہے جس کو ایک کھجور یا دو کھجور لوٹا دیں' یا ایک لقمہ یا دو لقمے لوٹا دیں' مسکین تو صرف وہ شخص ہے جو سوال کرنے سے باز رہے اور اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو: وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے۔

امام بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اپنے فاقہ یا اپنے گھر والوں کے فاقہ کے بغیر سوال کیا' قیامت کے دن اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا' اور اللہ تعالیٰ اس پر فاقوں کا دروازہ کھول دے گا جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوگا۔

امام طبرانی نے ''معجم اوسط'' میں حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے بلاضرورت سوال کیا قیامت کے دن اس کے چہرے پر خراشیں پڑی ہوں گی۔

امام ابن ابی شیبہ' امام مسلم اور امام ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے مال بڑھانے کے لیے سوال کیا وہ صرف انگاروں کا سوال کر رہا ہے' کم سوال کرے یا زیادہ۔

امام احمد' امام ابوداؤد' امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو آدمی مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ لوگوں سے سوال نہیں کرے گا میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں۔

امام بخاری' امام مسلم' امام ابوداؤد' امام ترمذی اور امام نسائی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص کثرت مال سے غنی نہیں ہوتا' بلکہ غنی وہ شخص ہے جس کا دل غنی ہو۔

امام طبرانی نے ''معجم اوسط'' میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم حرص کرنے سے بچو' کیونکہ حرص ہی درحقیقت فقر ہے اور اس بات سے بچو کہ تم سے معذرت کی جائے۔

امام ابن ابی شیبہ' امام بخاری اور امام ابن ماجہ نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص رسی سے لکڑیوں کا ایک گٹھا باندھ کر اپنی کمر پر لادے اور اس کو فروخت کر کے سوال کرنے سے بچے' وہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے' وہ اس کو دیں یا منع کر دیں۔

امام احمد' امام ابویعلیٰ' امام ابن حبان' امام طبرانی اور امام حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت خالد بن عدی الجہنی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے پاس اس کے بھائی کی طرف سے کوئی چیز بغیر کسی طمع اور بغیر کسی سوال کے پہنچی ہو وہ اس کو قبول کر لے' یہ اس کو اللہ نے رزق عطا کیا ہے۔

(الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۶۴ ـ ۳۵۸ 'ملتقطاً' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

سوال کرنے کی حد جواز

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

جس شخص کے پاس ایک دن کا کھانا ہو یا اتنی بدنی طاقت ہو کہ وہ محنت مزدوری کر کے ایک دن کی خوراک حاصل کر سکے' اس کے لیے سوال کرنا جائز نہیں ہے اور اگر دینے والے کو یہ علم ہو اور اس کے باوجود وہ اس کو دے تو وہ گنہ گار ہو گا کیونکہ وہ حرام کام میں مدد کر رہا ہے' اور اگر وہ شخص طلب علم دین یا جہاد میں مشغول ہو اور وہ کپڑوں کا سوال کرے تو جائز ہے' بہ شرطیکہ اس کو کپڑوں کی ضرورت ہو۔ (درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۲ ص ۶۹ ' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

علامہ شامی لکھتے ہیں:

جس شخص کے لیے سوال کرنا جائز نہیں ہے' اس کے سوال پر اس کو دینا تو حرام ہے' لیکن جو شخص صاحب نصاب نہ ہو اس کو اس کے سوال کے بغیر بہ طور صدقہ اور خیرات کے دینا جائز ہے اور کار ثواب ہے اور جو شخص صاحب نصاب ہو اس کو بہ طور ہدیہ اور ہبہ کے دینا جائز ہے۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۶۹ ' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

مسجد میں سائل کو دینے کی تحقیق

ہمارے زمانہ میں لوگ مسجدوں میں آ کر سوال کرتے ہیں اور بعض علماء ایسے سوال کرنے والوں کو مطلقاً منع کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

علامہ حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

مسجد میں سائل کو دینا مکروہ ہے' ہاں! اگر وہ لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے تو پھر قول مختار کے مطابق وہ مکروہ نہیں ہے' اسی طرح ''اختیار'' اور ''مواہب الرحمان'' میں مذکور ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز کی حالت میں انگوٹھی صدقہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح میں قرآن کی آیت نازل کی: جو لوگ رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

(درمختار علی ھامش ردالمحتار ج ۵ ص ۲۶۸ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

''اختیار'' میں مذکور ہے کہ اگر سائل نمازیوں کے آگے سے گزرتا ہے اور لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہے تو اس کو دینا مکروہ ہے' کیونکہ یہ لوگوں کو ایذاء دینے پر معاونت ہے' حتیٰ کہ کہا گیا ہے کہ اس طرح ایک پیسہ دینے کا کفارہ ستر پیسے بھی نہیں ہو سکتے' علامہ طحطاوی نے کہا ہے کہ یہ کراہت نمازیوں کی گردنیں پھلانگنے کی وجہ سے ہے جس کو ایذاء لازم ہے اور جب وہاں گزرنے کے لیے کشادہ جگہ ہو تو پھر کوئی کراہت نہیں ہے جیسا کہ اس عبارت کے مفہوم مخالف سے معلوم ہوتا ہے۔

(ردالمحتار ج ۵ ص ۲۶۸ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابن بزار کردری احکام مسجد کے بیان میں لکھتے ہیں:

جو مسکین کھانے میں فضول خرچی کرتے ہوں' اور گڑگڑا کر مانگتے ہوں ان کو دینے سے بھی اجر ملے گا' لیکن اگر کسی معین شخص کے متعلق معلوم ہو کہ وہ فضول خرچی کرتا ہے اور گڑگڑا کر مانگتا ہے تو پھر اس کو دینے سے اجر نہیں ہوگا۔

(فتاویٰ بزازیہ علی ھامش الہندیہ ج ۶ ص ۳۵۸۔ ۳۵۷ 'مطبوعہ مطبع کبریٰ امیریہ بولاق مصر' ۱۳۱۰ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ جو سائل مسجد میں نمازی کے آگے سے گزرے یا نمازیوں کی گردنیں پھلانگے' یا گڑگڑا کر سوال کرے یا اس کے متعلق دینے والے کو معلوم ہو کہ یہ فضول خرچی کرتا ہے یا اس کو معلوم ہو کہ اس کے پاس ایک دن کی خوراک ہے یا یہ شخص صحت مند ہے اور محنت مزدوری کر کے کما سکتا ہے اس کے سوال پر اس کو دینا جائز نہیں ہے' اور اگر یہ موانع اور عوارض نہ پائے جائیں تو اس سائل کو مسجد میں دینا جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو لوگ رات اور دن میں خفیہ اور علانیہ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے رب کے پاس ان کے لیے اجر ہے' اور نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ○ (البقرہ: ۲۷۴)

خفیہ اور علانیہ صدقہ کی آیت کے شانِ نزول میں متعدد اقوال

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے صدقہ کرنے کی بار بار ترغیب دی ہے' اب یہ فرما رہا ہے کہ صدقہ کرنے کے لیے کوئی وقت معین نہیں ہے' دن اور رات کے کسی بھی وقت میں خفیہ یا علانیہ صدقہ کیا جا سکتا ہے' اس آیت کے شانِ نزول میں متعدد اقوال ہیں' حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں۔

امام ابن المنذر' امام ابن ابی حاتم اور امام واحدی' حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جس شخص نے اللہ کی راہ میں گھوڑا باندھا اور اس کا یہ عمل دکھانے اور سنانے کے لیے نہیں تھا تو وہ اس آیت کا مصداق ہے۔

امام عبد الرزاق' امام عبد بن حمید' امام ابن جریر' امام ابن المنذر' امام طبرانی اور امام ابن عساکر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی' ان کے پاس چار درہم تھے' ایک درہم انہوں نے رات میں خرچ کیا' ایک دن میں' ایک خفیہ اور علانیہ۔

امام ابن جریر اور امام ابن المنذر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو اللہ کی

راہ میں صدقات فرضیہ خرچ کرتے ہیں وہ اسراف کرتے ہیں نہ تنگی کرتے ہیں نہ فساد کرتے ہیں۔

امام ابن ابی حاتم نے ضحاک سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کی فرضیت سے پہلے نازل ہوئی تھی۔

امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت سورۂ توبہ سے پہلے نازل ہوئی تھی' جب سورۂ توبہ میں صدقات فرضیہ اور ان کی تفصیل نازل ہوئی تو تمام صدقات اس تفصیل کے مطابق خرچ کیے جانے لگے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۳۶۳' مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن صرف اس شخص کی طرح کھڑے

الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ

ہوں گے جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس کر دیا ہو' اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں

قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ

نے کہا تھا کہ بیع سود ہی کی مثل ہے' اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود

الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا

کو حرام کیا ہے' سو جس شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی' پس وہ (سود سے) باز

سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

آ گیا تو جو کچھ وہ پہلے لے چکا ہے وہ اس کا ہو گیا اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے' اور جس نے دوبارہ اس کا اعادہ کیا تو وہی لوگ

النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي

دوزخی ہیں' وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ○ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو

الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ

بڑھاتا ہے' اور اللہ کسی ناشکرے گنہ گار کو پسند نہیں کرتا ○ بے شک جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ

ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے اور نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دیتے رہے'

وقف غفران

أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٧﴾

ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے O

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود کو چھوڑ دو

إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ

اگر تم مومن ہو O پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے

اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ

اعلان جنگ سن لو اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے اصل مال تمہارا حق ہیں نہ تم ظلم کرو

وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ

اور نہ تم ظلم کیے جاؤ گے O اور اگر (مقروض) تنگ دست ہے تو اسے اس کی فراخ دستی تک مہلت دو

وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾ وَاتَّقُوا

اور (قرض کو معاف کر کے) تمہارا صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہے اگر تم جانتے ہو O اور اس دن

يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا

سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا

كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٨١﴾ ع

بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا O

۳۸ ع ۸ ۶

صدقہ کے بعد سود کی آیات ذکر کرنے کی مناسبت

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اللہ کی راہ میں صدقہ دینے کا ذکر کیا تھا اور اب ان آیتوں میں سود کو حرام کرنے کا ذکر فرما رہا ہے' صدقہ میں انسان کسی ظاہری اور دنیاوی معاوضہ کے بغیر ضرورت مند کو اپنے مال سے کچھ دیتا ہے اور اپنے مال کو کم کرتا ہے جب کہ سود میں انسان ضرورت مند کو قرض دے کر ایک مدت معینہ کے بعد اس سے اصل رقم سے ایک معین زیادتی کو وصول کرتا ہے اور اپنے مال کو بڑھاتا ہے' صدقہ دینے والا بلا معاوضہ اپنا مال دیتا ہے' اور سود کھانے والا بلا معاوضہ دوسرے کا مال لیتا ہے' صدقہ دینے والے کے مال میں اللہ برکت دیتا ہے اور سود کھانے والے کی برکت مٹاتا ہے' صدقہ دینے والے کی

نظر صرف آخرت پر ہوتی ہے اور سود لینے والے کی نظر صرف دنیا پر ہوتی ہے' صدقہ کا باعث خدا ترسی اور ہمدردی ہے اور سود کا محرک خدا سے بے خوفی اور خود غرضی ہے' صدقہ دینے والا مشکلات میں مبتلا لوگوں کو سہارا دیتا ہے' اور سود کھانے والا مصیبت کے مارے لوگوں کی رگوں سے خون نچوڑ لیتا ہے' یوں سود کھانا' صدقہ دینے کی مکمل ضد ہے اور ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے' اس وجہ سے قرآن مجید ایمان کے بعد کفر کا' نور کے بعد ظلمت کا اور جنت کے بعد دوزخ کا ذکر فرماتا ہے اور یہاں پر صدقہ کے بعد سود کا ذکر فرمایا ہے' سود لینے کو سود کھانے سے تعبیر فرمایا ہے کیونکہ جو چیز لے لی جائے اس کی واپسی کا امکان ہوتا ہے اور جو چیز کھالی جائے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں رہتا' اس سے کسی چیز کی وصول یابی کا شدید ہونا ظاہر ہوتا ہے' اسی لیے سود لینے والوں کو سود خور کہا جاتا ہے' سود کو عربی میں ربا کہتے ہیں' ہم اس ربا کا لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کریں گے' پھر ربا کی دو قسمیں ربا النسیئہ اور ربا الفضل بیان کریں گے' ربا الفضل میں ائمہ اربعہ کی بیان کردہ علت پر سیر حاصل بحث کریں گے' ربا الفضل کی حرمت کی وجہ بیان کریں گے اور بینک کے سود کے مجوزین کے دلائل بیان کریں گے' ان کے شبہات کے جوابات پیش کریں گے' دارالحرب میں سود کی بحث کا اور دارالکفر میں کافروں کے مال ہڑپ کرنے کا ذکر کریں گے' اس کے بعد اس رکوع کی آیات کی تفسیر بیان کریں گے۔ فنقول وباللہ التوفیق۔

ربا کا لغوی معنی

لغت میں ربا کے معنی زیادتی' بڑھوتری اور بلندی ہیں' علامہ زبیدی لکھتے ہیں کہ علامہ راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ اصل مال پر زیادتی کو ربا کہتے ہیں اور زجاج نے کہا ہے کہ ربا کی دو قسمیں ہیں' ایک ربا حرام ہے اور دوسرا حرام نہیں ہے۔ ربا حرام ہر وہ قرض ہے جس میں اصل رقم سے زیادہ وصول کیا جائے یا اصل رقم پر کوئی منفعت لی جائے اور ربا غیر حرام یہ ہے کہ کسی کو ہدیہ دے کر اس سے زیادہ لیا جائے۔ (تاج العروس شرح القاموس ج ۱۰ ص ۱۴۳' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ' مصر' ۱۳۰۶ھ)

علامہ عینی نے "شرح المہذب" کے حوالے سے لکھا ہے کہ ربا کو الف' واؤ' یا تینوں کے ساتھ لکھنا صحیح ہے یعنی ربا' ربو اور ربی۔ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۱۹۹' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' ۱۳۴۸ھ)

ربا کا اصطلاحی معنی

اصطلاح شرع میں ربا کی دو قسمیں ہیں: ربا النسیئہ (اس کو ربا القرآن بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کو قرآن مجید نے حرام کیا ہے) اور ربا الفضل (اس کو ربا الحدیث بھی کہتے ہیں)۔ ربا الفضل یہ ہے کہ ایک جنس کی چیزوں میں دست بدست زیادتی کے عوض بیع ہو' مثلاً چار کلوگرام گندم کو نقد آٹھ کلوگرام گندم کے عوض فروخت کیا جائے۔ ربا الفضل کن چیزوں میں ہے اس میں ائمہ اربعہ کا اختلاف ہے' جس کو ان شاء اللہ ہم تفصیل سے بیان کریں گے۔ ربا النسیئہ یہ ہے کہ ادھار کی میعاد پر معین شرح کے ساتھ اصل رقم سے زیادہ وصول کرنا یا اس پر نفع وصول کرنا۔ آج کل دنیا میں جو سود رائج ہے اس پر بھی یہ تعریف صادق آتی ہے۔

علامہ بدر الدین عینی لکھتے ہیں: علامہ ابن اثیر نے کہا ہے کہ شریعت میں ربا بغیر عقد بیع کے اصل مال پر زیادتی ہے اور ہمارے نزدیک ربا یہ ہے کہ مال کے بدلے مال میں جو مال بلاعوض لیا جائے مثلاً کوئی شخص دس درہم کو گیارہ درہم کے بدلے میں فروخت کرے تو اس میں ایک درہم زیادتی بلاعوض ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۱۱۹' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' ۱۳۴۸ھ)

علامہ ابن اثیر نے جو تعریف کی ہے وہ ربا النسیئہ پر صادق آتی ہے اور علامہ عینی نے جو تعریف کی ہے وہ ربا النسیئہ پر اس لیے صادق نہیں آتی کیونکہ اس میں ادھار کا ذکر نہیں ہے اور چونکہ اس میں مجانست کی قید نہیں ہے اس لیے ربا الفضل پر بھی

صادق نہیں آتی۔

ربا النسیئہ کی صحیح اور واضح تعریف امام رازی نے کی ہے' لکھتے ہیں: ربا النسیئہ زمانہ جاہلیت میں مشہور اور معروف تھا۔ وہ لوگ اس شرط پر قرض دیتے تھے کہ وہ اس کے عوض ہر ماہ (یا ہر سال) ایک معین رقم لیا کریں گے اور اصل رقم مقروض کے ذمہ باقی رہے گی' مدت پوری ہونے کے بعد قرض خواہ' مقروض سے اصل رقم کا مطالبہ کرتا اور اگر مقروض اصل رقم ادا نہ کر سکتا تو قرض خواہ مدت اور سود دونوں میں اضافہ کر دیتا' یہ وہ ربا ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا۔

(تفسیر کبیر ج ۲ ص ۳۵۱' مطبوعہ دار الفکر بیروت' الطبعۃ الثالثۃ' ۱۳۹۸ھ)

ربا الفضل کی تعریف اور اس کی علت کے متعلق مذاہب اربعہ

ربا الفضل یہ ہے کہ ایک مخصوص مال کو اس کی مثل سے نقد زیادتی کے ساتھ یا ادھار فروخت کیا جائے مثلاً پانچ کلوگرام گندم کو دس کلوگرام گندم کے عوض نقد فروخت کیا جائے یا پانچ کلوگرام کو پانچ کلوگرام گندم کے عوض ایک سال کے ادھار پر فروخت کیا جائے اس کو ربا الحدیث بھی کہتے ہیں' کیونکہ امام مسلم نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سونا سونے کے عوض' چاندی چاندی کے عوض' گندم گندم کے عوض' جو جو کے عوض' کھجور کھجور کے عوض' نمک نمک کے عوض برابر برابر فروخت کرو اور نقد بہ نقد اور جب یہ اجناس مختلف ہو جائیں تو پھر جس طرح چاہو فروخت کرو بہ شرطیکہ نقد بہ نقد ہوں' اور ایک روایت میں ہے: جس نے زیادہ لیا یا زیادہ دیا اس نے سودی کاروبار کیا۔ دینے والا اور لینے والا دونوں برابر ہیں' اور ایک روایت میں ہے کہ ایک دینار کو دو دیناروں کے بدلہ میں اور ایک درہم کو دو درہم کے بدلہ میں فروخت نہ کرو۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۱۔ ۲۵۔ ۲۴' مطبوعہ کراچی)

علامہ نووی لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزوں میں ربا الفضل کے حرام ہونے کی تصریح کی ہے' سونا' چاندی' گندم' جَو' چھوارے اور نمک' غیر مقلدین کہتے ہیں کہ ان چھ چیزوں کے علاوہ اور کسی چیز میں کمی و زیادتی کے ساتھ بیع حرام نہیں ہے' کیونکہ وہ قیاس کے منکر ہیں۔ ان کے علاوہ باقی تمام فقہاء یہ کہتے ہیں کہ حرمت کا یہ حکم ان چھ چیزوں کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ جو چیزیں ان کے معنی میں شریک ہوں ان میں بھی تفاضل کے ساتھ بیع حرام ہے' پھر ان فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ ان چھ چیزوں میں حرمت ربا کی علت کیا ہے؟ امام شافعی نے کہا: سونے اور چاندی میں علت حرمت ان کا جنس ثمن سے ہونا ہے اس لیے باقی وزنی چیزوں میں کمی اور بیشی کے ساتھ بیع حرام نہیں ہو گی' کیونکہ علت حرمت مشترک نہیں ہے' امام شافعی نے فرمایا: باقی چار چیزوں میں علت حرمت کھانے کی جنس سے ہونا ہے' سو ہر کھانے کی چیز میں تفاضل کے ساتھ بیع حرام ہو گی' امام مالک کا قول سونے اور چاندی میں امام شافعی کی طرح ہے اور باقی چار چیزوں میں ان کے نزدیک علت حرمت خوراک کے لیے ذخیرہ ہونے کی صلاحیت ہے' سو انہوں نے منقیٰ میں تفاضل کو حرام قرار دیا ہے' کیونکہ گندم اور جَو کی طرح اس کا بھی ذخیرہ کیا جا سکتا ہے' امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ سونے اور چاندی میں علت وزن ہے اور باقی چار چیزوں میں علت ماپنا ہے' پس ہر وہ چیز جس کی بیع وزن اور ماپنے سے ہوتی ہو اتحاد جنس کی صورت میں اس کی تفاضل کے ساتھ بیع حرام ہے' اور سعید بن مسیب' امام احمد اور امام شافعی کا قول قدیم یہ ہے کہ ان چار چیزوں میں علت حرمت طعام کا وزن یا ماپ کے ساتھ فروخت ہونا ہے' اس بناء پر کھانے پینے کی جو چیزیں عدداً فروخت ہوتی ہیں جیسے انڈا وغیرہ ان میں تفاضل کے ساتھ بیع حرام نہیں ہے' نیز فقہاء کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ ایک سود والی جنس کو دوسری سود والی جنس کے ساتھ کمی و بیشی اور ادھار کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے مثلاً سونے کی گندم کے بدلے میں یا چاندی کی جو کے بدلے میں کمی اور بیشی کے ساتھ بیع کی جائے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ

ایک سود والی جنس کی اپنی جنس کے ساتھ ادھار بیع جائز نہیں ہے اور سود والی جنس کی اپنی جنس کے بدلے میں تفاضل کے ساتھ نقد بیع بھی جائز نہیں ہے' مثلاً سونے کی سونے کے بدلے میں ادھار بیع جائز ہے نہ نقد تفاضل کے ساتھ۔

(شرح مسلم ج ۲ ص ۲۳۔ ۲۴ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی الطبعۃ الاولی)

امام ابوالقاسم خرقی حنبلی لکھتے ہیں: ہر وہ چیز جو وزن یا ماپ کے ذریعہ فروخت کی جائے اس کی اس جنس کے بدلہ میں تفاضل سے بیع جائز نہیں ہے[1] (اور یہی امام ابوحنیفہ کا نظریہ ہے)۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: امام احمد سے دوسری روایت یہ منقول ہے کہ سونے اور چاندی میں حرمت کی علت ثمنیت ہے اور باقی چیزوں میں طعم حرمت کی علت ہے اور یہی امام شافعی کا مذہب ہے۔ (المغنی ج ۴ ص ۲۷ مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۰۵ ھ)

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: امام احمد سے تیسری روایت یہ ہے کہ سونے اور چاندی کے علاوہ حرمت کی علت یہ ہے کہ وہ چیز جنس طعام سے ہو اور ماپ یا وزن سے بکتی ہو' لہٰذا جو چیزیں عدداً فروخت ہوتی ہیں ان کی کمی اور بیشی کے ساتھ بیع جائز ہوگی۔ (المغنی ج ۴ ص ۲۷ مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۰۵ ھ)

علامہ وشتانی مالکی لکھتے ہیں: امام مالک کے نزدیک سونے اور چاندی میں حرمت کی علت ثمنیت ہے اور باقی چار میں حرمت کی علت خوراک کا ذخیرہ ہونا یا خوراک کی صلاحیت ہے۔ (اکمال اکمال المعلم ج ۴ ص ۲۷۹ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت)

امام مالک کے مذہب پر نوٹ اور دوسرے سکوں میں سود کا ہونا بالکل واضح ہے' کیونکہ ان میں ثمنیت موجود ہے۔ علامہ ابوالحسین مرغینانی حنفی لکھتے ہیں: ہمارے نزدیک حرمت کی علت قدر مع الجنس ہے۔

(ہدایہ اخیرین ص ۷۷ مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ' ملتان)

ربا الفضل میں ائمہ کی بیان کردہ علت کا ایک جائزہ

ائمہ کرام نے احادیث مبارکہ کو سامنے رکھ کر حتی المقدور اس امر کی سعی اور کوشش فرمائی ہے کہ سود کے لیے کوئی اصول وضع کیا جاسکے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ احادیث میں جن چھ چیزوں (سونا' چاندی' گندم' جَو' کھجور اور نمک) میں زیادتی کے ساتھ بیع کرنے کو ربا فرمایا ہے' ان میں حصر نہیں ہے بلکہ ان چیزوں کو بطور مثال ذکر کیا ہے' اسی لیے ائمہ اور مجتہدین نے انتہائی محنت اور جانفشانی سے ان چیزوں میں کوئی امر مشترک تلاش کر کے اس کو علت ربا قرار دیا ہے جیسا کہ مذکور الصدر تفصیل سے ظاہر ہو چکا ہے۔ ان بزرگوں نے نہایت کاوش کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مبارکہ کو سمجھا اور سمجھایا ہے' ہم نے جب ان احادیث پر غور کیا تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "اذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شئتم. (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۵ مطبوعہ اصح المطابع' کراچی) جب دو نوع مختلف ہو جائیں تو جس طرح چاہو فروخت کرو" اور جب ان میں اختلاف نہ ہو تو فرمایا: مثلاً بمثل فروخت کرو اور مثل میں مساوات کا مطلب ہے: قدر میں مساوات اور قدر وزن' کیل اور عدد تینوں کو شامل ہے جس طرح ایک کلو یا ایک صاع گندم دو کلو یا دو صاع گندم کے برابر نہیں ہیں' اسی طرح ایک درجن اخروٹ اور انڈے دو درجن اخروٹ اور انڈوں کی مثل اور برابر نہیں ہیں۔ یہ ایک بالکل بدیہی بات ہے اور اس میں کوئی خفا نہیں ہے اور اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں بھی وزناً کیلاً (ماپ کے ذریعہ) یا عدداً فروخت ہوتی ہیں خواہ وہ از قبیل ثمن ہوں یا از قبیل طعام ہوں یا عام استعمال کی چیزیں ہوں' لائق ذخیرہ ہوں یا نہ ہوں جب ان کی بیع مثلاً بمثل یعنی وزن' ماپ یا عدد کے اعتبار سے برابر برابر اور یداً بید یعنی نقد کی جائے گی تو وہ جائز ہوگی اور اگر وزن' عدد یا ماپ میں زیادتی کے ساتھ یا ادھار بیع ہو

[1] علامہ ابوالقاسم عمر بن الحسین بن عبداللہ بن احمد الخرقی متوفی ۳۳۴ھ' مختصر الخرقی مع المغنی ج ۴ ص ۲۵ مطبوعہ دارالفکر' بیروت

گی تو ناجائز اور حرام ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حرمت ربا کے سلسلہ میں جتنی بھی احادیث روایت کی گئی ہیں سب میں مثلاً بمثل کی قید ہے اور فقہاء نے مثل کا معنی قدر کیا ہے اور قدر وزن' ماپ اور عددیتوں کو شامل ہے' یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ ایک کلو یا ایک صاع گندم تو دو کلو یا دو صاع گندم کے غیر مثل ہوں اور ایک درجن انڈے یا اخروٹ دو درجن انڈوں یا اخروٹوں کے غیر مثل نہ ہوں اس لیے مثل میں جس طرح وزنی اور ماپ والی چیزیں شامل ہیں اسی طرح عددی چیزیں بھی شامل ہیں اور اس پر سب سے واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: '' لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ. (النساء: ۱۱) مرد کے لیے عورتوں کی دو مثل (دوگنا) حصہ ہے''۔ فرض کیجئے لڑکی کو ایک کلو چاندی ملتی ہے تو لڑکے کو دو کلو چاندی ملے گی' لڑکی کو ایک سو صاع گندم ملتی ہے تو لڑکے کو دو سو صاع گندم ملے گی اور اگر لڑکی کو ایک ہزار روپے ملتے ہیں تو لڑکے کو دو ہزار روپے ملیں گے' اس سے معلوم ہوا کہ مثل' ماپ والی' وزنی' عددی ہر قسم کی مساوی چیز کو کہتے ہیں' حدیث شریف میں ہے امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک دینار کو دو دینار اور ایک درہم کو دو درہموں کے عوض نہ فروخت کرو۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۴' سنن کبریٰ ج ۵ ص ۲۷۸)

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق جس طرح وزنی اور ماپ والی ایک نوع کی دو چیزوں میں زیادتی کے ساتھ بیع ربا ہے اسی طرح ایک نوع کی عددی چیزوں میں بھی زیادتی کے ساتھ بیع ربا ہے۔ ان دلائل کی روشنی میں بہ ظاہر یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ ایک نوع کی دو چیزیں خواہ وہ از قبیل طعام ہوں یا استعمال ہوں یا ثمن ہوں اگر ان کی بیع کمی یا زیادتی کے ساتھ ہو خواہ کمی یا زیادتی عدد میں ہو یا کیل میں ہو یا وزن میں ہو یا بیع ادھار ہو تو وہ ربا ہے اور اگر برابر اور نقد بیع ہو تو جائز اور صحیح ہے۔ هذا ما عندى و العلم التام عند الله.

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ایک نوع کی ماپ اور تول والی چیزوں میں سود ہے' ان کے نزدیک علت ربا ماپ اور تول اور اشتراک جنس ہے' وہ عددی چیزوں میں حرمت ربا کے قائل نہیں ہیں مثلاً سیب وزناً بکتا ہے اس لیے ایک کلوگرام سیب کو دو کلوگرام سیب کے عوض فروخت کرنا ان کے نزدیک سود ہے اور کیلے عدداً فروخت ہوتے ہیں اس لیے ایک درجن کیلوں کو دو درجن کیلوں کے عوض فروخت کرنا ان کے نزدیک سود نہیں ہے' اور یہ انتہائی تعجب خیز امر ہے کہ سیب میں زیادتی کے ساتھ بیع سود ہو اور کیلوں میں زیادتی کے ساتھ بیع سود نہ ہو۔ بعض چیزوں میں عدداً اور وزناً فروخت ہونے کا عرف بدلتا رہتا ہے' مثلاً پشاور میں پہلے روٹی تول کر فروخت ہوتی تھی اور اب عدداً فروخت ہوتی ہے اور اخروٹ تول کر بھی بکتے ہیں اور عدداً بھی فروخت ہوتے ہیں یعنی آپ اگر عدداً اخروٹ خریدیں تو سو کے بدلے میں دو سو اخروٹ لے سکتے ہیں اور یہ سود نہیں ہے اور وزناً خریدیں تو ایک کلو کے بدلہ میں دو کلو اخروٹ نہیں لے سکتے اور یہ سود ہے' بعض شہروں میں مالٹے ایک ہی دوکان پر عدداً بھی بکتے ہیں اور تول کر بھی اور یہ بڑی حیرت انگیز بات ہوگی کہ ایک ہی دوکان دار سے ایک چیز کو وزناً زیادتی کے ساتھ لینا سود ہو اور عدداً لینا سود نہ ہو' ہو سکتا ہے کہ اس کی کوئی توجیہ ہو لیکن میری ناقص فہم میں یہ بات نہیں آ سکی۔ رہا یہ کہ بعض احادیث میں ایک حیوان کی دو حیوانوں کے ساتھ بیع کا جواز ہے تو اولاً تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شارع ہیں' جس کا چاہیں استثناء فرما دیں' اس لیے یہ حدیث خلاف قیاس ہونے کی وجہ سے اپنے مورد میں بند رہے گی۔ ثانیاً ہو سکتا ہے کہ اس کی یہ وجہ ہو کہ جس طرح دو غیر جاندار چیزوں میں عین کے لحاظ سے مساوات ہوتی ہے اس طرح دو جاندار چیزوں میں عیناً مساوات نہیں ہوتی اور صفات میں فرق ہوتا ہے مثلاً ایک غلام عالم ہو تو وہ دس جاہل غلاموں سے قیمتی ہوگا' ایک گھوڑا اعلیٰ نسل کا ہو تو وہ ادنیٰ نسل

کے دس گھوڑوں سے قیمتی ہوگا اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حیوان کی دو حیوانوں کے ساتھ بیع جائز فرمائی ہو اور آپ کی تمام حکمتوں کو کون جان سکتا ہے۔

امام شافعی کے نزدیک حرمت کی علت طعم اور ثمنیت ہے' لہٰذا تمام کھانے پینے کی چیزوں اور سونے اور چاندی میں ہم جنس چیزوں کی زیادتی کے ساتھ بیع ان کے نزدیک سود ہے لیکن جو چیزیں کھانے پینے کی اور ثمن نہ ہوں' مثلاً تانبا' پیتل' چونا' کپڑا اور لکڑی وغیرہ ان میں امام شافعی کے نزدیک ہم جنس اشیاء کی زیادتی کے ساتھ بیع سود نہیں ہے اور یہ عجیب وغریب بات ہے کہ ایک کلو چاندی کی دو کلو چاندی کے بدلہ میں بیع سود ہو اور ایک کلو تانبا یا پیتل کی دو کلو تانبے یا پیتل کے بدلہ میں بیع سود نہ ہو اور تانبا' پیتل' چونا اور کپڑے وغیرہ میں امام شافعی کے نزدیک سود نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک سود ہے اور کھانے پینے کی عددی اشیاء مثلاً انڈے اور اخروٹ میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک سود نہیں ہے' اور امام شافعی کے نزدیک سود ہے۔

امام مالک کے نزدیک حرمت کی علت ثمن ہونا اور خوراک کا قابل ذخیرہ ہونا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ تانبا' پیتل' لوہا' لکڑی اور دیگر عام استعمال کی اشیاء میں زیادتی کے ساتھ بیع کرنا ان کے نزدیک سود نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک ان اشیاء میں زیادتی کے ساتھ بیع کرنا سود ہے۔

اور طعام کے علاوہ استعمال کی جو چیزیں عدداً فروخت ہوتی ہیں: جیسے پین' پنسل' ہتھیار' میز' کرسی' اور عام فرنیچر ان میں زیادتی کے ساتھ بیع کرنا کسی امام کے نزدیک بھی سود نہیں ہے یعنی ایک انڈے یا ایک اخروٹ کی دو انڈوں یا دو اخروٹوں کے بدلے میں بیع کرنا امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک سود ہے لیکن ایک پین یا ایک بندوق کی دو پین یا دو بندوقوں کے بدلہ میں بیع کرنا کسی امام کے نزدیک سود نہیں ہے اور یہ انتہائی عجیب بات ہے۔

ربا الفضل کی حرمت کا سبب

ربا الفضل اس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک ہی جنس کی دو چیزوں کے دست بدست لین دین میں ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربوٰ الفضل کو اس لیے حرام قرار دیا ہے کہ اس سے ربا النسیئہ کا دروازہ کھلتا ہے اور انسان میں وہ ذہنیت پرورش پاتی ہے جس کا آخری ثمرہ سود خوری ہے' یہ حکمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بیان فرمائی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک دینار کو دو دیناروں کے عوض اور ایک درہم کو دو درہموں کے بدلے میں نہ فروخت کرو' مجھے خوف ہے کہیں تم سود خوری میں نہ مبتلا ہو جاؤ۔

علامہ علی متقی نے یہ حدیث طبرانی کے حوالے سے بیان کی ہے۔ (کنز العمال ج ۴ ص ۱۸۷۔ ۱۱۷ مطبوعہ بیروت)

ظاہر ہے کہ ایک جنس کی دو چیزوں کی آپس میں بیع کی ضرورت صرف اس وقت پیش آتی ہے جب کہ اتحادِ جنس کے باوجود ان کی نوعیتیں مختلف ہوں' مثلاً چاول اور گندم کی ایک قسم کی دوسری قسم کے ساتھ بیع ہو' یا سونے کی ایک قسم کی دوسری قسم کے ساتھ بیع ہو۔ ایک جنس کی مختلف اقسام کی چیزوں کا کمی و بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنے سے اس ذہنیت کے پرورش پانے کا اندیشہ ہے جو بالآخر سود خوری اور ناجائز نفع اندوزی تک جا پہنچتی ہے' اس لیے شریعت نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ ایک جنس کی مختلف اقسام کے باہمی تبادلہ کی اگر ضرورت ہو تو یا تو برابر مبادلہ کر لیا جائے اور ان کی قیمتوں میں جو فرق ہو اس کو نظر انداز کر دیا جائے یا ایک چیز کا دوسری چیز سے براہِ راست تبادلہ کرنے کے بجائے ایک شخص اپنی چیز کو روپوں کے عوض بازار کے بھاؤ پر فروخت کرے اور دوسرے شخص سے اس کی چیز بازار کے بھاؤ پر خریدے۔

گندم کی گندم کے بدلے میں بیع کو برابر برابر نقد ہو تو جائز کیا گیا ہے اور ادھار کو حرام کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

مثلاً زید آج دس کلوگرام گندم فروخت کرتا ہے اور اس کے بدلے میں چھ ماہ بعد عمرو سے دس کلوگرام گندم لیتا ہے تو یہ ممکن ہے کہ جس وقت زید گندم فروخت کر رہا ہے اس وقت گندم کی قیمت پانچ روپے فی کلو ہو اور جب عمرو اس کو اس کے بدلے میں گندم دے گا اس وقت گندم کی قیمت آٹھ روپیہ کلو ہو تو زید کو پچاس روپیہ کے بدلہ میں چھ ماہ بعد کی مدت کے عوض اسی روپے حاصل ہو گئے اور یہی سود ہے۔

نفع اور سود میں فرق

اللہ تعالیٰ نے بیع کو جائز کہا ہے اور سود کو ناجائز کہا ہے اور ان میں فرق بالکل واضح ہے' ہم دوکاندار سے پانچ روپیہ کی چیز چھ روپے میں بہ خوشی خرید لیتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر چند کہ یہ چیز پانچ روپے کی ہے لیکن اس چیز پر دوکاندار کی محنت' ذہانت اور وقت کا خرچ ہوا ہے اور اس ایک زائد روپے کو ہم اس کی ذہنی اور جسمانی محنت کا عوض قرار دیتے ہیں لیکن جب ایک شخص پانچ روپے پر ایک روپیہ سود لیتا ہے تو اس ایک روپیہ میں وقت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی جس کو اس ایک روپیہ کا بدل قرار دیا جا سکے اس لیے تجارت میں نفع لینا جائز ہے اور روپیہ پر سود لینا جائز نہیں ہے۔

بینک کے سود کے مجوزین کے دلائل

معیشت کے بعض جدید مفکرین یہ کہتے ہیں: قرآن مجید میں ربا اس خاص سود کو کہا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا۔ کوئی غریب شخص شادی' بیماری یا کفن دفن کی کسی نجی ضرورت میں کسی مہاجن سے قرض لیتا تھا اور کسی مصیبت زدہ شخص کی مدد کرنے کے بجائے اس سے قرض پر سود لینا بے شک ظلم اور سنگ دلی ہے' اسی وجہ سے قرآن مجید میں اس سود کو حرام کیا گیا ہے لیکن آج کل کا مروجہ سود اس سے بالکل مختلف ہے' آج کل بینکوں سے غریب اور مصیبت زدہ شخص قرض نہیں لیتے' بلکہ متمول اور سرمایہ دار تاجر اور صنعت کار قرض لیتے ہیں اور ان سے قرض کی رقم پر بینک جو سود وصول کرتا ہے وہ ان پر کوئی ظلم نہیں ہے کیونکہ اگر وہ بینک کو چودہ فیصد سود ادا کرتے ہیں تو خود قرض کی رقم سے وہ ساٹھ ستر فیصد تک کماتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بینک سے قرض لے کر ایک کارخانہ لگاتے ہیں اور اس کارخانے سے پھر دوسرا اور تیسرا کارخانہ لگ جاتا ہے' اس طرح تاجروں کی تجارت میں اضافہ ہو جاتا ہے' اس لیے اگر بینک کو وہ چودہ فی صد سود دیتے ہیں تو ان پر یہ کوئی بوجھ نہیں ہے' اور بینک میں روپیہ عام لوگوں کا جمع کیا ہوا ہوتا ہے اس لیے اگر بینک عام لوگوں کو سات آٹھ فیصد سود ادا کرے تو بینک پر کوئی بوجھ نہیں پڑتا' سرمایہ دار اور بینک دونوں خوشی سے سود ادا کرتے ہیں' کسی پر ظلم نہیں ہے اور چونکہ بینکوں میں عموماً غریب اور متوسط لوگ اپنی فاضل بچت کی رقمیں جمع کراتے ہیں تو سود کے ذریعہ ان کو سات فیصد سالانہ کا فائدہ پہنچتا رہتا ہے۔ غرضیکہ زمانہ جاہلیت کا ربا غریبوں سے سود لینا تھا اور اس زمانہ کی ترقیاتی سکیم بینکوں کے ذریعہ غریبوں کو سود دیتی ہے۔ وہ ربا غرباء پر ظلم تھا اور یہ غریبوں کی خوشحالی اور مال کی ترقی کا سبب ہے اس لیے شخصی اور نجی ضروریات کے قرضوں پر سود ناجائز ہونا چاہیے اور تجارتی قرضوں پر بینک کا سود جائز ہونا چاہیے۔

بینک کے سود کے جائز ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ افراطِ زر کی وجہ سے روپے کی قدر (VALUE) دن بدن گرتی جا رہی ہے اور اجناس کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔ اب سے انتیس سال پہلے (۱۹۶۶ء میں) سونا' ایک سو روپیہ تولہ تھا' اصلی دیسی گھی پانچ روپیہ کلو' ڈالڈا دو روپیہ کلو' دیسی انڈا دو آنے کا' تنوری روٹی ایک آنے کی' دودھ آٹھ آنے کلو اور ڈاک کا لفافہ چھ پیسے (ڈیڑھ آنے کا) ملتا تھا اور اب (۱۹۹۵ء میں) سونا تقریباً پانچ ہزار روپیہ تولہ' دیسی گھی ایک سو تیس روپیہ کلو' ڈالڈا گھی چالیس روپیہ کلو' دیسی انڈا تین روپیہ کا' تنوری روٹی ڈیڑھ روپیہ کی' دودھ اٹھارہ روپیہ کلو اور ڈاک کا لفافہ ڈیڑھ روپے کا ہو گیا۔ اس تجزیہ

سے معلوم ہوتا ہے کہ انتیس سال میں روپیہ کی قدر بارہ سے لے کر پچاس گنا (پچیس سو فیصد سے لے کر پانچ ہزار فی صد تک) گر گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے انتیس سال پہلے بینک میں سو روپیہ رکھوایا تھا اب اس کی قیمت دو' چار روپیہ رہ گئی ہے اور اگر سونے کے بھاؤ سے تناسب کیا جائے تو اب تک سو روپیہ تقریباً دو روپے کا رہ گیا ہے' اگر اس سو روپیہ پر سال بہ سال بینک کا سود لگتا رہتا تو اس کی ساکھ کسی حد تک بحال رہتی اور جو لوگ بینک میں اپنی فاضل بچتوں کو جمع کراتے ہیں ان کا نقصان نہ ہوتا اس لیے بینک کا سود جائز ہونا چاہیے۔

مجوزین سود کے دلائل کے جوابات

اس سلسلہ میں پہلے یہ بات جان لینی چاہیے کہ قرآن مجید نے مطلقاً سود کو حرام کیا ہے' خواہ نجی ضروریات کے قرضوں پر سود ہو یا تجارتی قرضوں پر سود ہو' خواہ اس سود سے غریبوں کو نقصان ہو یا فائدہ' اللہ تعالیٰ نے امارت اور غربت کا فرق کیے بغیر سود کو علی الاطلاق حرام کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۗ — اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔

(البقرہ: ۲۷۵)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ (البقرہ: ۲۷۹۔ ۲۷۸) — اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اگر تم مومن ہو تو (زمانہ جاہلیت کا) باقی ماندہ سود چھوڑ دو ۝ اور اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو!

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے سود کو مطلقاً حرام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سود مفرد کو بھی حرام کیا ہے اور ''لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠'' (آل عمران: ۱۳۰) دگنا چوگنا سود نہ کھاؤ'' فرما کر سود مرکب کو بھی حرام کیا ہے اور ہر جگہ مطلقاً سود کو حرام کیا ہے اور نجی اور کاروباری قرضوں کا فرق نہیں کیا۔ علاوہ ازیں تاریخ اور حدیث سے ثابت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کاروباری قرضوں پر سود لینے کا بھی عام رواج تھا۔

ابن جریر ''وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا'' (البقرہ: ۲۷۸) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ وہ سود تھا جس کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں لوگ خرید و فروخت کرتے تھے۔

علامہ سیوطی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

امام ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم نے اپنی اپنی اسانید کے ساتھ سدی سے یہ روایت بیان کی ہے کہ یہ آیت حضرت عباس بن عبد المطلب اور بنو مغیرہ کے ایک شخص کے متعلق نازل ہوئی ہے' یہ دونوں زمانہ جاہلیت میں شریک تھے اور انہوں نے ثقیف کے بنو عمرو بن عمیر میں لوگوں کو سودی قرض پر مال دے رکھے تھے۔ جب اسلام آیا تو ان دونوں کا بڑا سرمایہ سود میں لگا ہوا تھا۔ (در منثور ج ا ص ۳۶۶' مطبوعہ مطبعہ میمنیہ' مصر' ۱۳۱۴ھ)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بڑے بڑے تاجر خوردہ فروشوں کے ہاتھ ادھار پر مال فروخت کرتے تھے اور اس پر سود لگاتے تھے اور اس سے واضح ہو گیا کہ زمانہ جاہلیت میں کاروباری اور تجارتی قرضوں پر سود لگانے کا عام رواج تھا اور اس کو الربٰو کہا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے عموم کے صیغہ سے سود کی ممانعت کی ہے خواہ وہ سود نجی قرضوں پر ہو یا تجارتی قرضوں پر۔

رہا دوسرا اعتراض کہ بینک کے سود کے ناجائز قرار دینے کی بناء پر افراط زر کی وجہ سے روپیہ کی قدر گر جاتی ہے' اگر بینک سے سود نہ لیا جائے تو بیس یا بائیس سال بینک میں رکھوایا ہوا ایک سو روپیہ سوا تین روپے کا رہ جائے گا' اور یہ نقصان بینک سے سود نہ لینے کی وجہ سے ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے ناطے سے ہمارا ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنے اور اس کے منع کردہ کام سے بچنے کی وجہ سے اگر ہمیں کوئی مادی نقصان ہوتا ہے تو ہمیں اس کو خوشی سے گوارا کرنا چاہیے۔ مسلمان کے نزدیک نفع اور نقصان کا معیار دنیاوی اور مادی اعتبار سے نہیں ہے بلکہ اخروی اور معنوی اعتبار سے ہے۔ دنیاوی اور مادی اعتبار سے زکوٰۃ' قربانی اور حج کے لیے زرکثیر خرچ کرنا بھی مال کا ضیاع ہے اور نقصان ہے تو کیا اس مادی نقطۂ نظر سے ان تمام مالی عبادات کو خیرباد کہہ دیا جائے گا؟ اور جب مسلمان مالی عبادات کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں تو سود کھا کر اللہ اور رسول سے اعلان جنگ کے لیے کیسے تیار ہو سکتے ہیں؟ ایک سچے مسلمان کے نزدیک سود چھوڑنے کی وجہ سے روپے کی قدر کا کم ہو جانا خسارہ نہیں ہے بلکہ اصل خسارہ یہ ہے کہ سود لینے کی وجہ سے آخرت برباد ہو جائے!

اس سوال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ نقصان دراصل ہماری ایک اجتماعی تقصیر کی سزا ہے اور وہ یہ کہ ہم نے اسلامی طریقہ مضاربت کو رواج نہیں دیا' کرنا یہ چاہیے کہ لوگ اپنے روپے کو بینک کی معرفت کاروبار میں لگائیں اور بینک ان کا روپیہ امانت رکھنے کی بجائے ان سے ایک عام شراکت نامہ طے کرے اور ایسے تمام اموال کو مختلف قسم کے تجارتی' صنعتی' زراعتی یا دوسرے ان جائز کاروبار میں جو بینک کے دائرہ عمل میں آسکتے ہوں لگائے اور اس مجموعی کاروبار سے جو منافع حاصل ہو اسے ایک طے شدہ نسبت کے ساتھ ان لوگوں میں اسی طرح تقسیم کر دے جس طرح خود بینک کے حصہ داروں میں منافع تقسیم ہوتا ہے۔

افراطِ زر کی صورت میں اصل زر کو بحال رکھنے کا حل

ڈالر' ین' پونڈ اور ریال وغیرہ مستحکم کرنسی ہیں اور عرف اور تعامل سے یہ مقرر اور ثابت ہے کہ ان کی قدر برقرار رہتی ہے' پاکستان' بھارت' بنگلہ دیش اور دیگر پس ماندہ ممالک کی طرح افراط زر کے نتیجہ میں وقت گزرنے کے ساتھ ان کی قدر میں کمی نہیں ہوتی' سو جو شخص چار پانچ سال یا زائد عرصہ کے لیے بینک میں اپنا پیسہ رکھنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنی رقم کو ڈالرز یا کسی اور مستحکم کرنسی میں منتقل کر کے ان بینکوں میں اپنی رقم رکھے جو غیر ملکی کرنسی میں بھی اکاؤنٹ کھولتے ہیں' اسی طرح جو شخص کسی دوسرے شخص کو ملکی کرنسی میں مثلاً ایک ہزار روپے قرض دیتا ہے اور وہ شخص اس کو دس سال بعد ایک ہزار روپے واپس کرتا ہے تو دس سال بعد اس ایک ہزار روپے کی قدر ایک سو روپے رہ جائے گی' اس ضرر سے بچنے کا بھی یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنی رقم کو ڈالر میں منتقل کر کے قرض دے اور جتنے ڈالر دیئے تھے اتنے ہی واپس لے لے۔

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اگر اس نے ملکی کرنسی میں رقم قرض دی تھی اور مثلاً دس سال بعد اس کی قدر کم ہو گئی تو وہ اب بھی دس سال پہلے کی ملکی کرنسی جتنے ڈالر کے مساوی تھی' دس سال بعد اتنی ملکی کرنسی واپس لے سکتا ہے' مثلاً پہلے ایک ہزار روپے جتنے ڈالر کے مساوی تھے دس سال بعد اگر اتنے ڈالر کے دس ہزار روپے بنتے ہیں تو وہ دس ہزار روپے لے سکتا ہے' لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں وہ بہرحال ایک ہزار روپے دے کر دس ہزار روپے لے رہا ہے اور معنوی طور پر خواہ ان کی قدر برابر ہو لیکن یہ صورۃً اصل رقم سے زائد لینا ہے اور ظاہری اور صوری طور پر اس کے سود ہونے میں کوئی شک نہیں ہے' نیز چونکہ یہ پہلے سے طے نہیں کیا گیا اس لیے یہ موجب نزاع بھی ہے' افراطِ زر سے بچنے کے لیے ملکی کرنسی کو سونے چاندی سے بدل کر قرض دینا بھی جائز نہیں ہے' کیونکہ سونے چاندی میں ادھار جائز نہیں ہے۔

دارالحرب کے سود میں جمہور فقہاء کا نظریہ

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: دارالحرب میں سود اسی طرح حرام ہے جس طرح دارالاسلام میں حرام ہے (امام احمد) امام مالک' امام اوزاعی' امام ابو یوسف' امام شافعی اور امام اسحاق کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا کہ مسلمان اور حربی کے درمیان دارالحرب میں ربا جاری نہیں ہوگا اور ان سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ دو شخص دارالحرب میں مسلمان ہو گئے تو ان کے درمیان ربا نہیں ہوگا' اور ان کے اموال مباح ہیں۔ (امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو دارالحرب میں احکام شرعیہ نافذ کرنے کی ولایت حاصل نہیں ہے' یہ مطلب نہیں ہے کہ دارالحرب میں مسلمانوں کا سود کھانا جائز ہے۔ سعیدی غفرلہٗ)

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''حَرَّمَ الرِّبٰوا'' (البقرہ: ۲۷۵) اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام کر دیا' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ'' (البقرہ: ۲۷۵) جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت کے دن) نہ کھڑے ہوں گے مگر جیسے کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جسے شیطان نے مخبوط الحواس کر دیا ہو' نیز فرمایا: ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا'' (البقرہ: ۲۷۸) اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود چھوڑ دو' اور احادیث میں بالعموم تفاضل کی ممانعت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا اس نے سودی معاملہ کیا' باقی احادیث میں بھی اسی طرح تفاضل کی ممانعت ہے اور اس لیے کہ جو کام (مسلمانوں پر) دارالاسلام میں حرام ہیں وہ دارالحرب میں بھی حرام ہیں جس طرح مسلمانوں میں سود کا لین دین حرام ہے' اور امام ابوحنیفہ نے جس حدیث کا ذکر کیا ہے وہ مرسل ہے جس کی صحت کا ہمیں علم نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس حدیث میں النفی کی بجائے نہی کے لیے ہو' یعنی مسلمان دارالحرب میں حربی سے سود نہ لیں' اور جس چیز کو قرآن مجید نے علی العموم والاطلاق حرام کر دیا ہے اور سنت مشہورہ سے بھی اس کی علی الاطلاق حرمت ثابت ہے اور اس کے حرام ہونے پر اجماع ہو چکا ہے' اس کے عموم اور اطلاق کو ایسی خبر مجہول کے سبب سے ترک کر دینا جائز نہیں ہے جو کسی کتاب صحیح میں ہے نہ مسند میں نہ کسی معتمد اور مستند کتاب میں ہے' اور اس کے علاوہ یہ کہ وہ حدیث مرسل ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس میں النفی کا نہ ہو بلکہ نہی کا ہو جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ''فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ'' (البقرہ: ۱۹۷) حج میں جماع' فسوق اور لڑائی جھگڑا نہیں ہے''۔ (المغنی ج ۴ ص ۴۷' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

دارالحرب کے سود میں فقہاء احناف کا نظریہ

علامہ ابوالحسن مرغینانی لکھتے ہیں: مسلمان اور حربی کے مابین دارالحرب میں ربا نہیں ہے۔ اس میں امام ابو یوسف اور امام شافعی رحمہما اللہ کا اختلاف ہے' وہ اس پر قیاس کرتے ہیں کہ حربی جب امان لے کر دارالاسلام میں آئے تو اس سے سود لینا جائز نہیں ہے' اور ہماری دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے: مسلمان اور حربی کے مابین دارالحرب میں ربا نہیں ہے' اور اس لیے بھی کہ دارالحرب میں ان کا مال مباح ہے خواہ مسلمان جس طریقہ سے ان کا مال حاصل کرے وہ مال مباح ہے بہ شرطیکہ دھوکا نہ دے اور عہد شکنی نہ کرے' اور مستامن پر قیاس کرنا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ جب وہ امان لے کر دارالاسلام میں داخل ہوا تو اس کے مال کا لینا ممنوع ہو گیا۔ (ہدایہ اخیرین ص ۸۶' مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ' ملتان)

دارالحرب میں جواز ربا والی حدیث کی فنی حیثیت

علامہ زیلعی حنفی لکھتے ہیں: امام بیہقی نے امام شافعی کی ''کتاب السیر'' کے حوالے سے اس حدیث کو ''معرفۃ'' میں ذکر کیا

ہے امام شافعی نے کہا: امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: بعض مشائخ نے مکحول سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل حرب کے مابین ربا نہیں ہے میرا گمان ہے کہ آپ نے فرمایا: اور اہل اسلام کے مابین امام شافعی نے فرمایا: یہ ثابت ہے نہ اس میں کوئی حجت ہے۔ (نصب الرایہ ج ۴ ص ۴۴ 'مطبوعہ مجلس علمی سورت' ہند)

علامہ ابن ہمام نے بھی اس حدیث کی فنی حیثیت کے بارے میں یہی کچھ نقل کیا ہے۔
(فتح القدیر ج ۶ ص ۱۷۸ 'مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

دار الحرب میں ربا کے متعلق فقہاء احناف کے دلائل کا تجزیہ

ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف نے کہا ہے کہ مکحول کی روایت اول تو ثابت نہیں ہے اور بر تقدیر ثبوت اس میں قرآن مجید اور احادیث صحیحہ مشہورہ سے معارضہ کی صلاحیت نہیں ہے۔ علامہ ابن ہمام نے اس کے جواب میں یہ کہا ہے کہ قرآن مجید نے جو ربا کو مطلقاً حرام کیا ہے وہ مال محظور میں حرام کیا ہے اور حربی کا مال مباح ہے اور اس توجیہ کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مکحول کی یہ مرسل روایت نہ بھی ہوتی تب بھی دار الحرب میں حربی سے سود لینا مباح ہوتا۔ (فتح القدیر ج ۶ ص ۱۷۸ 'مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

علامہ ابن ہمام کا یہ جواب اس لیے صحیح نہیں ہے کہ وہ ''مال محظور'' کی قید لگا کر اپنی رائے سے قرآن مجید کے عموم اور اطلاق کو مقید کر رہے ہیں اور جب قرآن مجید کے عموم قطعی کو حدیث رسول سے بھی مقید کرنا صحیح نہیں ہے تو علامہ ابن ہمام کی رائے میں اتنی قوت کہاں کہ وہ قرآن مجید کے عموم اور اطلاق کے مزاحم ہو سکے۔ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ مشہورہ نے علی الاطلاق سود کو حرام کر دیا ہے' خواہ مسلمان سے سود لیا جائے یا کافر سے اور کافر خواہ حربی ہو یا ذمی اور دار الاسلام میں سود لیا جائے یا دار الحرب میں' قرآن مجید نے ہر قسم کے سود کو حرام کر دیا ہے اور اس عموم کو نہ مکحول کی مرسل اور غیر ثابت روایت سے مقید کیا جا سکتا ہے نہ علامہ ابن ہمام کی رائے سے۔

مکحول کی روایت کا محمل

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مکحول کی یہ روایت صحیح ہے اور واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے: ''لا ربو بین المسلم والحربی. مسلمان اور حربی میں سود نہیں ہے'' تو اس حدیث کی حسب ذیل توجیہات ہیں:

اوّل: اس حدیث میں ''لا'' نفی کا نہیں ہے بلکہ نہی کا ہے اور اس کا معنی ہے: مسلمان اور حربی کے مابین سود کی ممانعت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ''فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ'' (البقرہ: ۱۹۷) حج میں جماع' فسوق اور لڑائی جھگڑا نہیں ہے'' یعنی ان افعال کی ممانعت ہے۔

ثانی: اس حدیث میں حربی سے مراد محض غیر ذمی کافر نہیں ہے بلکہ برسر جنگ قوم کا ایک فرد مراد ہے اور جس قوم کے ساتھ حالت جنگ قائم ہو اس کو ہر طرح سے جانی اور مالی اعتبار سے زک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے' اس لیے اس قوم کے کسی حربی کافر سے اگر کسی مسلمان نے سودی معاملہ کے ذریعہ اس کا مال لے لیا تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا۔

ثالث: لا ربو کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ حربی کافر سے جو سود لیا جائے گا وہ سود نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ دار الحرب میں رہنے والا مسلمان اگر چہ حربی کافر سے سود لیتا ہے تو اگر چہ یہ فعل گناہ ہے لیکن قانون اور حرمت اور ممانعت سے مستثنیٰ ہے یعنی مسلمان حکومت اس شخص سے باز پرس نہیں کر سکتی کہ تم نے یہ عقد فاسد کیوں کیا ہے اور سود کیوں لیا ہے اور اس مسلمان کو اس کے اس غلط کام پر سزا نہیں دے سکتی کیونکہ دار الحرب میں رہنے والا مسلمان' مسلمانوں کی ولایت میں نہیں ہے اور اس پر اسلامی ریاست کے احکام جاری نہیں ہو سکتے' اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ (الانفال: ۷۲) اور جو لوگ ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) نہیں آئے ان پر تمہاری کوئی ''ولایت'' نہیں ہے حتیٰ کہ وہ ہجرت کر لیں۔

اس آیت میں یہ اصول بتایا گیا ہے کہ ولایت کا تعلق صرف ان مسلمانوں سے ہوگا جو دارالاسلام کے باشندے ہوں' یہ آیت دارالاسلام سے باہر کے مسلمانوں کو (دینی اخوت کے باوجود) دارالاسلام کے مسلمانوں کے ساتھ سیاسی اور تمدنی رشتے سے خارج کر دیتی ہے' اس عدم ولایت کے نتیجہ میں دارالاسلام اور دارالحرب کے مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے اور ایک دوسرے کے قانونی ولی نہیں ہو سکتے۔

ہم نے جو یہ بیان کیا ہے کہ دارالحرب میں بھی سود لینا گناہ ہے اور ''لا ربوبین المسلم والحربی'' کا مفاد یہ ہے کہ اس پر سود لینے کی دنیاوی سزا جاری نہیں ہوگی کیونکہ وہ مسلمانوں کی ولایت میں نہیں ہے اس کی تائید علامہ سرخسی کی ذکر کردہ ان احادیث سے ہوتی ہے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے نصاریٰ کی طرف لکھا: جس شخص نے سود لیا' ہمارے اور اس کے درمیان کوئی عہد نہیں ہے' اور مجوس ہجر کی طرف لکھا: یا تو تم سود چھوڑ دو' یا اللہ اور اس کے رسول سے اعلان جنگ قبول کر لو۔

(المبسوط ج ۱۴ ص ۵۸' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

نصاریٰ نجران اور مجوس ہجر حربی تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی اپنے علاقوں میں سود لینے کی اجازت نہیں دی اور جب آپ نے حربی کافروں کو سود لینے کی اجازت نہیں دی ہے تو آپ دارالحرب کے مسلمانوں کو سود خوری کی اجازت کب دے سکتے ہیں!

پیر محمد کرم شاہ الازہری نے مکحول کی روایت کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حالت اضطرار میں مسلمان حربی کافر سے سود لے سکتا ہے[1] یہ توجیہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سود دینے میں تو اضطرار ہو سکتا ہے مثلاً کسی شخص کو اپنی ناگزیر ضرورت میں بغیر سود کے قرض نہ ملے لیکن سود لینے میں اضطرار کا کوئی تعلق نہیں ہے' سود لینے کی وجہ صرف مال کی حرص اور جلب زر کی خواہش ہوتی ہے۔

دارالحرب کے سود کے بارے میں امام ابوحنیفہ کے قول کی وضاحت

امام اعظم نے جو یہ کہا ہے کہ دارالحرب میں مسلمان اور حربی کے درمیان ربا نہیں ہے ان کی بھی اس قول سے یہی مراد ہے کہ چونکہ دارالحرب مسلمانوں کی ولایت میں نہیں ہے اس لیے مسلمان حکام وہاں کسی مسلمان کے سود لینے پر اس سے مواخذہ نہیں کریں گے اور وہ اس کا مالک ہو جائے گا لیکن اس کا یہ فعل گناہ ہے اور وہ اس پر اخروی عذاب کا مستحق ہے' اس کی وضاحت علامہ سرخسی کی اس عبارت سے ہوتی ہے۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ دارالاسلام کی حفاظت میں آنے سے پہلے اسلام سے جو عصمت ثابت ہوتی ہے وہ صرف امام کے حق میں ہے' احکام کے حق میں نہیں ہے' کیا تم نہیں دیکھتے کہ اگر ان دو مسلمانوں میں سے کوئی ایک دوسرے کا مال یا اس کی جان تلف کر دے تو اس پر ضمان نہ ہوگا حالانکہ وہ اس فعل کی وجہ سے گنہ گار ہوگا' دراصل احکام میں عصمت صرف دارالاسلام میں رہنے سے ہوتی ہے نہ کہ دین کی وجہ سے' کیونکہ دین تو حق شرع کے لحاظ سے ان لوگوں کو روکتا ہے جو اس دین کا اعتقاد رکھتے

[1] ماہنامہ ضیائے حرم' ربیع الاول ۱۴۰۸ھ

ہیں اور جو اس کا اعتقاد نہیں رکھتے ان کو نہیں روکتا اس کے برخلاف جب انسان دارالاسلام میں ہو تو اس کے مال کی حفاظت اس شخص سے بھی کی جائے گی جو اس کی حرمت کا اعتقاد رکھتا ہے یا اس دین کا اعتقاد نہیں رکھتا' پس گناہ ہونے کی حیثیت سے جو عصمت ثابت ہے اس اعتبار سے ہم نے کہا: ان کا یہ فعل مکروہ ہے اور قانون کے لحاظ سے عدم عصمت کی بناء پر (چونکہ مسلمانوں کی ولایت میں نہیں ہے) ہم نے یہ کہا کہ اس کا لیا ہوا مال واپس کرنے کا حکم نہیں دیا جائے گا کیونکہ ان میں سے ہر ایک جب دوسرے کا مال لیتا ہے تو شخص لینے کی وجہ سے ہی اس مال کا مالک ہو جاتا ہے۔

(المبسوط ج ۱۴ ص ۵۸' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

امام اعظم کا یہ اصول ہے کہ اگر مسلمان دارالحرب میں کوئی عقد فاسد کرے تو وہ اس سے مالک تو ہو جائے گا لیکن اس کا یہ فعل گناہ ہے۔ علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

اگر دو حربی مسلمان ہو جائیں اور دارالحرب سے ہجرت نہ کریں اور آپس میں سود کا معاملہ کریں تو میں اس کو مکروہ (تحریمی) قرار دیتا ہوں لیکن یہ سود واپس نہیں کروں گا اور یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔

(المبسوط ج ۱۴ ص ۵۸' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

ان عبارات سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر دارالحرب میں رہنے والے مسلمان آپس میں سود لیں یا مسلمان حربی کافر سے سود لے تو وہ اس سود کا مالک تو ہو جائے گا لیکن سود لینے والا مسلمان بہر حال گنہ گار ہوگا۔

کیا سود اور دیگر عقود فاسدہ کے ذریعہ حربی کافروں کا پیسہ بٹورنا جائز ہے؟

جب مسلمان کسی کافر قوم سے برسر جنگ ہوں اس وقت کافروں کا ملک دارالحرب ہوتا ہے اور اس وقت دارالحرب کے کافروں کی جان اور اموال مباح ہیں لیکن جن ممالک سے مسلمان برسر جنگ نہیں ہیں ان سے سفارتی تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں اور ان کے ہاں پاسپورٹ اور ویزے میں آنا جانا جاری اور معمول ہے اور ان ممالک میں مسلمانوں کو جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ حاصل ہے بلکہ وہاں انہیں اسلامی احکام پر عمل کرنے کی بھی آزادی ہے جیسے امریکہ' برطانیہ' کینیڈا اور جرمنی وغیرہ' ایسے ممالک دارالحرب نہیں ہیں بلکہ دارالکفر ہیں اور ایسے ممالک کے کافروں کے اموال ان پر مباح نہیں ہیں۔ بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ کافروں کا مال مسلمانوں پر مباح ہے خواہ جس طرح حاصل ہو بشرطیکہ اس سے مسلمانوں کا وقار مجروح نہ ہو' ان کا استدلال قرآن مجید کی اس آیت سے ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ‌ (النساء: ۲۹) اے ایمان والو! آپس میں اپنے اموال کو ناحق نہ کھاؤ الا یہ کہ تمہاری آپس کی رضامندی سے تجارت ہو۔

اس آیت سے یہ لوگ اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ قرآن مجید نے مسلمانوں کو آپس میں ناجائز طریقے سے مال کھانے سے منع کیا ہے اور اگر مسلمان کافروں کا مال ناجائز طریقے سے کھالیں تو اس سے منع نہیں کیا گیا' سو مسلمانوں کے لیے کفار کے اموال عقد فاسد سے یا ناجائز طریقے سے کھانا جائز ہے۔

یہ استدلال اس لیے صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید کا عام اسلوب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مکارم اخلاق سے مسلمانوں کو خطاب کرتا ہے لیکن اس سے قرآن کا منشاء یہ نہیں ہے کہ نیکی صرف مسلمانوں کے ساتھ کی جائے اور کفار کے ساتھ سلوک میں مسلمان نیکیوں کو چھوڑ کر بدترین برائیوں پر اتر آئیں حتیٰ کہ کفار کے نزدیک مسلمان ایک خائن اور بدکردار قوم کے نام سے معروف ہوں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ (النور: ۳۳)

اور اپنی باندیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو جب کہ وہ پاک دامن رہنا چاہتی ہوں تاکہ تم (اس بدکاری کے کاروبار کے ذریعہ) دنیا کا عارضی فائدہ طلب کرو۔

کیا اس آیت کی رو سے مسلمانوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کسی دارالکفر میں کافر عورتوں کا کوئی قحبہ خانہ کھول کر کاروبار کرنا شروع کردیں؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (الانفال: ۲۷)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو درآں حالیکہ تم جانتے ہو ○

کیا اس آیت سے مسلمانوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کافروں کی امانتوں میں خیانت کرلیا کریں؟

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ ۚ (النحل: ۹۴)

اور اپنی قسموں کو آپس میں دھوکا دینے کے لیے بہانہ نہ بناؤ۔

کیا اس آیت کا یہ معنی ہے کہ کافروں سے دروغ حلفی میں کوئی مضائقہ نہیں؟

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ (النور: ۱۹)

بے شک جو لوگ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانا پسند کرتے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

کیا اس آیت سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ کافروں میں بے حیائی اور بدکاری کو پھیلانا جائز اور صواب ہے اور اخروی ثواب کا موجب ہے؟

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا منشاء یہ ہے کہ اخلاق اور کردار کے اعتبار سے دنیا میں مسلمان ایک آئیڈیل قوم کے لحاظ سے پہچانے جائیں' غیر اقوام مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق اور کردار کو دیکھ کر متاثر ہوں' مسلمانوں کی امانت اور دیانت کی ایک عالم میں دھوم ہو' کیا آپ نہیں دیکھتے کہ کفار قریش ہزار اختلاف کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی راست بازی' پارسائی' امانت اور دیانت کے معترف اور مداح تھے۔ اسلام کی تبلیغ واشاعت میں تلوار اور جہاد سے زیادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باکمال سیرت کا حصہ ہے۔ مسلمانوں کی کفار سے لڑائی تیروتفنگ کی نہیں اصول اور اخلاق کی لڑائی ہے' اس کا نصب العین زر اور زمین کا حصول نہیں بلکہ دنیا میں اپنے اصول اور اقدار کو پھیلانا ہے۔ اب اگر اس نے اپنے مکارم اخلاق ہی کو کھو دیا اور خود ہی ان اصولوں اور تعلیمات کو قربان کردیا جن کو پھیلانے کے لیے وہ کھڑا ہوا ہے تو پھر اس میں اور دوسری اقوام میں کیا فرق رہے گا اور کس چیز کی وجہ سے اس کو دوسروں پر فتح حاصل ہوگی اور کس قوت سے وہ دلوں اور روحوں کو مسخر کرسکے گا؟

جو لوگ دارالکفر میں حربی کافروں سے سود لینے کو جائز کہتے ہیں اور حربی کافروں کے اموال کو عقد فاسد کے ساتھ لینے کو جائز قرار دیتے ہیں وہ اس پر کیوں غور نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے اس عمل کی مذمت کی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کا حق کھانے کے لیے یہ مسئلہ گھڑ لیا تھا کہ عرب کے اُمی جو ہمارے مذہب پر نہیں ہیں ان کا مال جس طرح ملے روا ہے' غیر مذہب والوں کی امانت میں خیانت کی جائے تو کچھ گناہ نہیں خصوصاً وہ عرب جو اپنا آبائی وطن چھوڑ کر مسلمان بن گئے ہیں' خدا نے ان کا مال ہمارے لیے حلال کردیا ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۗ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ (آل عمران: ۷۵)

اور ان یہودیوں (میں سے) بعض ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک اشرفی امانت رکھو تو جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ رہو وہ تم کو واپس نہیں دیں گے یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے کہہ دیا کہ امیوں (مسلمانوں) کا مال لینے سے ہماری پکڑ نہیں ہوگی اور یہ لوگ جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں ۝

غور کیجئے جو لوگ دار الکفر میں حربی کافروں سے سود لینے اور عقد فاسد پر ان سے معاملے کو جائز کہتے ہیں ان کے عمل میں اور یہودیوں کے اس مذموم عمل میں کیا فرق رہ گیا؟

حضرت ابوبکر کے قمار کی وضاحت

جو لوگ حربی کافروں سے سود لینے کو جائز کہتے ہیں ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر نے مکہ میں ابی بن خلف سے اہل روم کی فتح پر شرط لگائی تھی' اس وقت مکہ دار الحرب تھا' حضرت ابوبکر نے ابی بن خلف سے شرط جیت کر وہ رقم وصول کر لی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رقم لینے سے منع نہیں کیا تھا' اس سے معلوم ہوا کہ حربی کافروں سے قمار اور دیگر عقود فاسدہ کے ذریعہ رقم بٹورنا جائز ہے۔

یہ استدلال بالکل بے جان ہے کیونکہ حضرت ابوبکر کے شرط لگانے کا ذکر جن روایات میں ہے وہ باہم متعارض ہیں۔ قاضی بیضاوی' بغوی' علامہ آلوسی اور دیگر مفسرین نے بغیر کسی سند کے یہ واقعہ ذکر کیا ہے' جس میں حضرت ابوبکر کے شرط جیتنے کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر نے ابی بن خلف سے یہ شرط لگائی کہ اگر تین سال کے اندر رومی ایرانیوں سے ہار گئے تو وہ دس اونٹ دیں گے اور اگر تین سال کے اندر رومی ایرانیوں سے جیت گئے تو ابی کو دس اونٹ دینے ہوں گے' پھر جب حضور سے اس شرط کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: یہ تم نے کیا کیا ہے' بضع کا لفظ تو تین سے لے کر نو تک بولا جاتا ہے تم شرط اور مدت دونوں کو بڑھا دو' پھر حضرت ابوبکر نے نو سال میں سو اونٹوں کی شرط لگائی جب ساتواں سال شروع ہوا اور ابن ابی حاتم اور ابن عساکر کی روایت میں ہے کہ جنگ بدر کے دن رومی ایرانیوں پر غالب آ گئے' حضرت ابوبکر نے ابی کے ورثاء سے اونٹ لے لیے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ اونٹ لے کر آئے' آپ نے فرمایا: یہ سحت (مال حرام) ہے' اس کو صدقہ کر دو حالانکہ اس وقت تک حرمت قمار کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ (روح المعانی ج ۲۱ ص ۱۸' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

علامہ آلوسی نے ترمذی کے حوالے سے بھی حضرت ابوبکر کے جیت جانے کا واقعہ لکھا ہے لیکن یہ علامہ آلوسی کا تسامح ہے۔ ''جامع ترمذی'' میں حضرت ابوبکر کے شرط ہارنے کا ذکر ہے' حافظ ابن کثیر نے بھی ترمذی کے حوالے سے ہارنے ہی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ تابعین کی ایک جماعت نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے اور مفسرین کی ذکر کردہ مذکور الصدر روایت کا عطاء خراسانی کے حوالے سے بیان کیا ہے اور اس کو اغرب قرار دیا ہے۔

(تفسیر القرآن العظیم ج ۵ ص ۳۴۲۔ ۳۴۱' مطبوعہ دار الاندلس بیروت)

''جامع ترمذی'' کی روایت کا متن یہ ہے:

نیار بن اسلمی بیان کرتے ہیں: جب یہ آیات نازل ہوئیں: '' الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۝ (الروم: ۴۔ ۱) الم اہل روم قریب کی زمین میں (فارس سے) مغلوب ہو گئے اور وہ

اپنے مغلوب ہونے کے بعد چند سالوں میں غالب ہو جائیں گے''۔ جن دنوں یہ آیات نازل ہوئیں ان دنوں میں ایرانیوں کو رومیوں پر برتری تھی اور مسلمانوں کی خواہش تھی کہ رومی ایرانیوں پر فتح پا جائیں کیونکہ وہ اور رومی اہل کتاب تھے اور اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: '' وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ (الروم: ۵۔۴) جس دن مسلمان اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے اللہ تعالیٰ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور وہ عزیز رحیم ہے'' اور قریش یہ چاہتے تھے کہ ایرانی غالب ہو جائیں کیونکہ وہ دونوں نہ اہل کتاب تھے نہ بعثت پر ایمان رکھتے تھے جب یہ آیات نازل ہوئیں تو حضرت ابوبکر نے مکہ کے اطراف میں یہ اعلان کر دیا: الٓمّٓ اہل روم قریب کی زمین میں (فارس سے) مغلوب ہو گئے اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے چند سالوں میں غالب آ جائیں گے۔ قریش کے کچھ لوگوں نے حضرت ابوبکر سے یہ کہا: تمہارے پیغمبر یہ کہتے ہیں کہ چند سالوں میں رومی ایرانیوں پر غالب ہو جائیں گے کیا ہم اس پر شرط نہ لگائیں' حضرت ابوبکر نے کہا: کیوں نہیں' اور یہ قمار کی حرمت نازل ہونے سے پہلے کا واقعہ تھا' پھر حضرت ابوبکر اور مشرکین نے شرط لگائی' مشرکین نے کہا: '' بضع سنین '' تین سالوں سے لے کر نو سال تک ہے' تم ہمارے درمیان اس کی درمیانی مدت طے کر لو' پھر انہوں نے یہ مدت چھ سال طے کی' پھر چھ سال گزر گئے اور رومی غالب نہ ہوئے' پھر مسلمانوں نے حضرت ابوبکر پر تنقید کی کہ انہوں نے '' بضع سنین '' کو چھ سال کیوں قرار دیا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو '' بضع سنین '' فرمایا تھا (اور وہ نو سال تک کو کہتے ہیں) امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ (جامع ترمذی ص ۴۶۰' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت ابوبکر کے قمار سے جو یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ حربی کافروں کا مال ناجائز طریقے سے بھی لینا جائز ہے' اس روایت کی تحقیق کے بعد اس کے حسب ذیل جواب ہیں:

(۱) حضرت ابوبکر کے قمار کا واقعہ جن روایات سے ثابت ہے وہ مضطرب ہیں' بعض روایات میں حضرت ابوبکر کے جیتنے کا ذکر ہے اور بعض میں ہارنے کا ذکر ہے اور مضطرب روایات سے استدلال صحیح نہیں ہے۔

(۲) قمار کا یہ واقعہ بالاتفاق حرمت قمار سے پہلے کا ہے کیونکہ یہ شرط فتح مکہ سے پہلے لگائی گئی تھی اور قمار کی حرمت سورۂ مائدہ میں نازل ہوئی ہے جو مدینہ میں سب سے آخر میں نازل ہوئی تھی۔

(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال کو نہ خود قبول فرمایا نہ حضرت ابوبکر کو لینے دیا' بلکہ فرمایا: یہ مال حرام ہے' اس کو صدقہ کر دو (اس میں یہ دلیل ہے کہ جب انسان کسی مال حرام سے بری ہونا چاہے تو براءت کی نیت سے اس کو صدقہ کر دے)۔

دار الحرب' دار الکفر اور دار الاسلام کی تعریفات

شمس الائمہ سرخسی دار الحرب کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک دار الحرب کی تین شرطیں ہیں' ایک یہ کہ اس پورے علاقے میں کافروں کی حکومت ہو اور درمیان میں مسلمانوں کا کوئی ملک نہ ہو' دوسری یہ کہ اسلام کی وجہ سے کسی مسلمان کی جان' مال اور عزت محفوظ نہ ہو اسی طرح ذمی بھی محفوظ نہ ہو' تیسری شرط یہ ہے کہ اس میں شرک کے احکام ظاہر ہوں۔

یہ تعریف اس ملک پر صادق آئے گی جس ملک سے مسلمان عملاً برسر جنگ ہوں' اس ملک کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم نہ ہوں اور وہاں کسی مسلمان کی اس کے مسلمان ہونے کی حیثیت سے جان' مال اور عزت محفوظ نہ ہو جیسا کہ کسی زمانہ میں اسپین میں تھا' وہاں ایک ایک مسلمان کو چن چن کر قتل کر دیا گیا' وہاں مذہب اسلام پر قائم رہنا قانوناً جرم تھا۔ ایسے ملک سے مسلمانوں پر ہجرت کرنا فرض ہے۔ فقہاء احناف نے حربی کافروں کی جان اور مال کے مباح ہونے کی جو تصریح کی اس سے اسی

دارالحرب کے باشندے مراد ہیں۔

کافروں کے وہ ملک جن سے مسلمانوں کے سفارتی تعلقات ہیں' تجارت اور دیگر انواع کے معاہدات ہیں' پاسپورٹ اور ویزے کے ساتھ ایک دوسرے کے ملک میں آتے جاتے ہیں' مسلمانوں کی جان' مال اور عزت محفوظ ہیں بلکہ مسلمانوں کو وہاں اپنے مذہبی شعائر پر عمل کرنے کی بھی آزادی ہے جیسے امریکا' برطانیہ' ہالینڈ' جرمنی اور افریقی ممالک' یہ ملک دارالحرب نہیں ہیں بلکہ دارالکفر ہیں۔ فقہاء احناف نے اسلامی احکام پر عمل کرنے کی آزادی کے پیش نظر ایسے ملکوں کو دارالاسلام کہا ہے لیکن یہ حکما دارالاسلام ہیں حقیقۃً دارالکفر ہیں۔ بعض اوقات فقہاء دارالکفر پر مجازاً دارالحرب کا اطلاق بھی کر دیتے ہیں لیکن یہ ملک حقیقۃً دارالاسلام ہیں نہ دارالحرب بلکہ دارالکفر ہیں' کافروں کی حکومت کی وجہ سے کبھی ان پر دارالحرب کا اطلاق کر دیا جاتا ہے اور اسلامی احکام پر عمل کی آزادی کی وجہ سے کبھی ان پر دارالاسلام کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن صرف اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس کر دیا ہو۔ (البقرہ: ۲۷۵)

قیامت میں سود خور کے مخبوط الحواس ہو کر اٹھنے سے جن چڑھنے پر استدلال اور اس کا جواب

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے آپ کو ان گناہوں سے بچاؤ جن کی مغفرت نہیں ہوگی' مال غنیمت میں خیانت کرنے سے' سو جس نے خیانت کی وہ قیامت کے دن خیانت کی ہوئی چیز کو لے کر آئے گا' اور سود کھانے سے' سو جس نے سود کھایا وہ قیامت کے دن مخبوط الحواس پاگل کی طرح اٹھے گا' پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن صرف اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس کر دیا ہو۔ (معجم کبیر ج ۱۸ ص ۶۰ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سود خوروں کی یہ علامت بنا دے گا' اور قیامت کے مجمع عظیم میں جو شخص پاگلوں کی طرح مخبوط الحواس کھڑا ہوگا اسے دیکھ کر قیامت کے دن سب پہچان لیں گے کہ یہ شخص دنیا میں سود خور تھا۔

مس کا اصل معنی چھونا ہے' بعض اوقات اس کا استعمال کسی برائی اور مصیبت پہنچنے کے لیے بھی ہوتا ہے' قرآن مجید میں ہے' حضرت ایوب علیہ السلام نے دعا کی:

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ○ شیطان نے مجھے بڑی اذیت اور سخت تکلیف پہنچائی ہے ○

(ص: ۴۱)

نیک بندوں پر تو شیطان کا اس سے زیادہ اثر نہیں ہوتا کہ وہ ان کو کسی اذیت اور آزمائش میں مبتلا کر دے' لیکن عام لوگ جن کی رگوں میں شیطان سیال خون کی طرح دوڑتا ہے' ان میں سے جو فاسق و فاجر ہوتے ہیں کبھی کبھی ان کی عقل اور دماغ پر بھی شیطان کا تسلط ہو جاتا ہے' اور وہ پاگلوں کی طرح کپڑے پھاڑتے ہیں' اور منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے' پریشان حال' پراگندہ بال جدھر سینگ سمائے خاک اڑاتے پھرتے ہیں۔ ان کو یہ سزا اس لیے دی جائے گی کہ دنیا میں سود خور اپنا مال بڑھانے کی حرص میں اس طرح دیوانہ ہو چکا تھا کہ اس کو نہ خوف خدا تھا نہ کسی ضرورت مند اور مصیبت زدہ پر اس کو ترس آتا تھا اور سود خوری کی محبت میں وہ بالکل مجنون ہو چکا تھا' اس لیے قیامت کے دن اس کو پاگلوں کی طرح مخبوط الحواس اٹھایا جائے گا۔ اہل عرب پاگل شخص کو مجنون کہتے ہیں یعنی یہ آسیب زدہ شخص ہے یا اس پر جن بھوت کا سایہ ہے یا جن کے چھونے کی وجہ سے یہ پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا ہے اور مخبوط الحواس اٹھے گا' عرب کے اسی اسلوب اور محاورہ کے مطابق قرآن مجید نے یہ بیان کیا ہے

کہ قیامت کے دن سود خور پاگلوں کی طرح مخبوط الحواس اٹھے گا' اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی آدمی پر جن چڑھ جاتا ہے' پھر اس کے جسم پر جن کا تصرف ہوتا ہے' جن اس کی زبان سے باتیں کرتا ہے اور مافوق الفطرت کام کرتا ہے' قرآن مجید اس مفہوم کی تائید اور تصدیق نہیں کر رہا جیسا کہ علامہ آلوسی نے سمجھا ہے۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

کبھی کسی جسم میں ایک متعفن روح داخل ہو جاتی ہے جس کی اس جسم کی روح کے ساتھ مناسبت ہو' پھر اس شخص پر مکمل جنون طاری ہو جاتا ہے اور بعض اوقات یہ بخار (متعفن روح) انسان کے حواس پر غالب ہو کر اس کو معطل کر دیتا ہے' پھر یہ خبیث روح اس کے جسم پر مستقل تصرف کرتی ہے' اس کی زبان سے کلام کرتی ہے اور اس کے اعضاء میں تصرف کرتی ہے اور جس شخص کے جسم میں یہ روح تصرف کرتی ہے اسے اس کا بالکل شعور نہیں ہوتا' اور یہ چیز محسوس اور مشاہدہ میں ہے' اس کا صرف وہی شخص انکار کرے گا جو مشاہدات کا منکر ہو گا۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۴۹ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

علامہ آلوسی بڑے پائے کے محقق ہیں' ہمارے دل میں ان کا بڑا احترام ہے' اس کے باوجود وہ انسان ہیں اور انسانی فروگزاشت سے خالی نہیں ہیں' یہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے تحقیق کے خلاف لکھا ہے' اللہ تعالیٰ کسی انسان کے جسم پر کسی اور روح کو تصرف کرنے کا اختیار نہیں دیتا' اللہ تعالیٰ نے انسان کو احکام شرعیہ کا مکلف کیا ہے' یہ چیز اس قاعدہ کے خلاف ہے' نیز اگر ایسا ہو تو ایک آدمی کسی کو قتل کر دے گا اور بعد میں کہہ دے گا کہ یہ کام میں نے نہیں کیا' مجھے اس کا پتا نہیں' مجھ پر اس وقت کسی جن کا اثر تھا' یہ قتل اسی نے کیا ہے' اسی طرح ہر شخص کوئی بھی قانون شکنی کر کے عدالت سے یہ کہہ کر بری ہو سکتا ہے کہ اس قانون شکنی کے وقت میں کسی خبیث جن کے زیر اثر تھا' اور یوں دنیا فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن جائے گی اور امن اور سکون غارت ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ بیع سود ہی کی مثل ہے' اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ (البقرہ: ۲۷۵)

ربا اور بیع کا فرق

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ سود خوروں کو قیامت کے دن مجنون اور مخبوط الحواس شخص کی طرح اس سے لیے اٹھایا جائے گا کہ وہ دنیا میں کہا کرتے تھے کہ بیع سود ہی کی مثل ہے' بہ ظاہر ان کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ سود بیع ہی کی مثل ہے' لیکن انہوں نے سود کے جائز اور حلال ہونے میں مبالغہ کیا' اور جواز اور حلت میں سود کو اصل اور مشبہ بہ قرار دیا' ان کا یہ قیاس فاسد تھا' اللہ تعالیٰ نے صریح عبارت سے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا: اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔

سود خوروں کا یہ کہنا کہ سود بیع کی طرح ہے بداہۃً باطل ہے' سود اور بیع کے فرق کی بہت سی وجوہ ہیں جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

(۱) بیع میں تاجر دس روپے کی چیز کو مثلاً بارہ روپے کی بیچتا ہے' اور دس روپے کی چیز پر دو روپے زائد لیتا ہے' اور سود میں سود خور ایک ماہ کے لیے مثلاً دس روپے قرض دیتا ہے اور اس کے عوض بارہ روپے وصول کرتا ہے' اور اس سے اصل رقم پر دو روپے زائد وصول کرتا ہے' لیکن ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ تاجر دس روپے کی چیز کو منڈی سے تھوک فروشوں سے تھوک کے حساب سے زیادہ مقدار میں خریدتا ہے' وہاں سے کسی گاڑی میں وہ سامان لاد کر لاتا ہے' پھر وہ چیز بارہ روپے میں فروخت کرتا ہے' اس پورے عمل میں اس دو روپے کے نفع پر تاجر کا وقت' اس کی محنت اور اس کی ذہانت صرف ہوتی ہے اس لیے خریدار اس نفع کو تاجر کا جائز حق سمجھتا ہے اور وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اگر وہ اپنا وقت اور کرایہ خرچ کر کے منڈی

جائے تب بھی اس کو تھوک فروشوں سے تھوک کے بھاؤ پر یہ چیز نہیں ملے گی' اس کے برعکس سود خور دس روپے پر ایک ماہ بعد جو دو روپے زائد لے رہا ہے اس کے لیے اس کے وقت' محنت اور ذہانت میں سے کوئی چیز خرچ نہیں ہوئی۔

(۲) تاجر جب اپنا روپیہ تجارت میں لگاتا ہے تو اس میں نفع اور نقصان کے دونوں امکان ہیں' اس کے برعکس سود خور جو اپنے روپے پر سود وصول کر رہا ہے اس کو نقصان کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

(۳) تجارت میں مبیع اور قیمت کے تبادلہ کے بعد بیع مکمل ہو جاتی ہے لیکن سود میں اصل رقم واپس کرنے کے بعد اس پر سود در سود کا سلسلہ عرصہ دراز تک قائم رہتا ہے۔

ربا کو بہ تدریج حرام کرنے کا بیان

شراب کی طرح سود کو بھی اللہ تعالیٰ نے بہ تدریج حرام کیا ہے' سب سے پہلے مکہ مکرمہ میں سود کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاۡ فِىْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ○ (الروم: ۳۹)

اور جو مال تم سود حاصل کرنے کے لیے دیتے ہو کہ وہ مال لوگوں کے مال میں شامل ہو کر بڑھتا ہی رہے' تو وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا' اور جو تم اللہ کی رضا جوئی کے لیے زکوٰۃ دیتے ہو تو وہی لوگ اپنا مال (بہ کثرت) بڑھانے والے ہیں ○

اس آیت میں صراحۃً سود کو حرام نہیں فرمایا' صرف اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے۔

سود کے متعلق یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی اور باقی آیات مدینہ میں نازل ہوئیں' دوسری آیت یہ ہے' اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: یہود کے ظلم کی وجہ سے ہم نے ان پر کئی ایسی پاک چیزیں حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال کی گئی تھیں' اور اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بہ کثرت روکتے تھے' نیز فرمایا:

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ . (النساء: ۱۶۱)

اور ان کے سود لینے کی وجہ سے حالانکہ ان کو سود لینے سے منع کیا گیا ہے اور اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے۔

اس آیت میں بھی مسلمانوں کو سودی کاروبار سے صراحۃً منع نہیں فرمایا صرف یہ اشارہ فرمایا کہ یہود پر عتاب کی وجہ ان کا سودی کاروبار تھا' پھر یہ آیت نازل فرمائی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ . (آل عمران: ۱۳۰)

اے ایمان والو! دگنا چوگنا سود نہ کھاؤ۔

اس آیت میں بھی مطلقاً سود سے منع نہیں فرمایا بلکہ سود در سود سے منع فرمایا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں مطلقاً سود کو حرام فرما دیا:

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ . (البقرہ: ۲۷۵)

اللہ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام کر دیا۔

نیز فرمایا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَذَرُوا۟ مَا بَقِىَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓا۟ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ (البقرہ: ۲۷۸)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود کو چھوڑ دو اگر تم مومن ہو O

ربا کو حرام قرار دینے کی حکمتیں

اسلام نے حرکت اور عمل کی تعلیم دی ہے' رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک' ہمسایوں سے ہمدردی' فقراء اور مساکین اور دیگر ضرورت مندوں کے ساتھ شفقت اور ایثار کی تلقین کی ہے' اسلام کسی ایسے کسب کی اجازت نہیں دیتا جس میں انسان کی کوشش اور جدوجہد کا دخل نہ ہو' وہ صدقہ کرنے اور قرض حسن دینے کی ترغیب دیتا ہے اور ضرورت مندوں کے استحصال سے منع کرتا ہے' اور ہر اس چیز کو حرام قرار دیتا ہے جو عداوت' بغض' مناقشہ اور نزاع کا موجب ہے' اور کینہ' حسد' حرص اور طمع کی بیخ کنی کرتا ہے اور مال کو صرف جائز اور مشروع طریقہ سے لینے کی اجازت دیتا ہے جس میں کسی پر ظلم نہ ہو' اور چند ہاتھوں میں دولت کے مرتکز ہو جانے کو ناپسند کرتا ہے' ان اصولوں کی روشنی میں ربا کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں ہے' اس لیے ربا کے حرام ہونے کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) سودخوری کی وجہ سے انسان بغیر کسی عمل کے پیسہ کمانے کا عادی ہو جاتا ہے کیونکہ سود کے ذریعہ تجارت یا صنعت وحرفت میں کوئی جدوجہد کیے بغیر پیسہ حاصل ہو جاتا ہے۔

(۲) سود میں بغیر کسی عوض کے نفع ملتا ہے' اور شریعت نے بغیر حق شرعی کے مال لینے کو ناجائز قرار دیا ہے اور کمزوروں اور ناداروں کے استحصال سے منع کیا ہے۔

(۳) سودخوری کی وجہ سے مفلسوں اور ناداروں کے دلوں میں امراء اور سرمایہ داروں کے خلاف کینہ اور بغض پیدا ہوتا ہے۔

(۴) سودخوری کی وجہ سے صلہ رحمی کرنے' صدقہ وخیرات کرنے اور قرض حسن دینے ایسے مکارم اخلاق مٹ جاتے ہیں' پھر انسان ضرورت مند غریب کی مدد کرنے کے بجائے اس کو سود پر قرض دینے کو ترجیح دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو جس شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی پس وہ (سود سے) باز آ گیا تو جو کچھ وہ پہلے لے چکا ہے وہ اس کا ہو گیا اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے' اور جس نے دوبارہ اس کا اعادہ کیا تو وہی لوگ دوزخی ہیں' وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے O (البقرہ: ۲۷۵)

سودخور کے لیے دائماً دوزخ کی وعید کی توجیہ

یعنی جس شخص کو سود کا حرام ہونا معلوم ہو گیا' اور وہ سودخوری سے رک گیا' تو سود کی تحریم سے پہلے وہ جو کچھ لے چکا ہے وہ اس سے واپس نہیں لیا جائے گا' اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے' اس کی دو تفسیریں ہیں' ایک یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو اس کو آئندہ سودخوری سے محفوظ رکھے گا' اور اگر چاہے گا تو ایسا نہیں کرے گا' دوسری تفسیر یہ ہے کہ جو شخص نصیحت پہنچنے کے بعد اخلاص اور صدق نیت سے سودخوری چھوڑ دے گا' اس کو اللہ تعالیٰ جزا دے گا' یا اللہ جو چاہے گا اس کے متعلق فیصلہ فرمائے گا' کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ وہی مالک اور حاکم علی الاطلاق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ جس نے دوبارہ سود لیا تو وہی لوگ دوزخی ہیں وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے' اس سے معتزلہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہمیشہ دوزخ میں رہتا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص جائز اور حلال سمجھ کر دوبارہ سود لے وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا' کیونکہ حرام قطعی کو حلال سمجھنا کفر ہے' دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص سود کے حرام ہونے کے بعد دوبارہ سود لے وہ دوزخ میں دائماً رہنے کا مستحق ہے' یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو یہ سزا نہ دے

تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ وعید مشیت کے ساتھ مقید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرے گا اور اس کی جزا اس کو دے گا' جس مومن نے سود لیا' اس کا ایمان بھی تو ایک نیکی ہے' اگر اس کو ہمیشہ دوزخ میں رکھا گیا تو اس کے ایمان کی اس کو جزا نہیں ملے گی اس لیے ضروری ہے کہ کچھ عرصہ دوزخ میں سزا دینے کے بعد اسے جنت میں بھیج دیا جائے تا کہ وہ اپنی برائی اور نیکی' دونوں کی جزا پائے' اس لیے یہ آیت مشیت کے ساتھ مقید ہے' یعنی اگر اللہ چاہے تو اس کو دوزخ میں دائماً رکھے گا' لیکن اللہ ایسا نہیں چاہے گا کیونکہ اس نے فرمایا ہے: جس نے نیکی کی اس کو اس کی نیکی کی جزا ملے گی۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ — سو جس نے ایک ذرہ کے برابر بھی نیکی کی وہ اس (کی جزا) کو دیکھے گا ۝ (الزلزال: ۷)

چوتھا جواب یہ ہے کہ زیادہ عرصہ دوزخ سے سزا دینے کو اللہ تعالیٰ نے مجازاً دوام کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے' اور اللہ کسی ناشکرے گنہ گار کو پسند نہیں کرتا ۝ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے اور نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دیتے رہے' ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے' اور ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۝ (البقرہ: ۲۷۷۔ ۲۷۶)

سود کا کم ہونا اور صدقہ کا بڑھنا

سود کے مال میں برکت نہیں رہتی اور جس مال میں سود کا مال شامل ہوتا ہے وہ مال بھی ضائع ہو جاتا ہے۔

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام احمد' امام ابن ماجہ' امام ابن جریر' امام حاکم تصحیح سند کے ساتھ اور امام بیہقی ''شعب الایمان'' میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سود اگرچہ بہت زیادہ ہو لیکن اس کا انجام مال کی کمی ہے۔

امام ابن المنذر نے اس آیت کی تفسیر میں ضحاک سے نقل کیا کہ دنیا میں سود کی آمدنی بہت زیادہ ہو جاتی ہے' لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کو مٹا دیتا ہے۔

امام طبرانی نے حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ روٹی کے ایک ٹکڑے کو صدقہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر احد پہاڑ جتنا کر دیتا ہے۔

(معجم کبیر ج ۱۲ ص ۳۶۶۔ ۳۶۵ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود کو چھوڑ دو اگر تم مومن ہو ۝ پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو' اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے اصل مال تمہارا حق ہیں' نہ تم ظلم کرو اور نہ تم ظلم کیے جاؤ گے ۝ (البقرہ: ۲۷۹۔ ۲۷۸)

سودی کاروبار ترک نہ کرنے والوں کے خلاف جنگ کرنے کا حکم

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ اے ایمان والو! سود حرام قرار دیئے جانے کے بعد لوگوں کے اوپر جو تمہاری سودی رقوم ہیں ان کو چھوڑ دو' اور ان سے صرف اپنی اصل رقم وصول کرو' امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

سدی بیان کرتے ہیں کہ یہ آیات حضرت عباس بن عبد المطلب اور بنو مغیرہ کے ایک شخص کے متعلق نازل ہوئی ہیں' وہ دونوں زمانہ جاہلیت میں شریک تھے' جس وقت وہ مسلمان ہوئے تو لوگوں کے اوپر ان کے سود کی بڑی بھاری رقمیں تھیں' اور اللہ

تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ زمانہ جاہلیت میں جو سود تھا اس کو وصول مت کرو۔

ابن جریر نے بیان کیا ہے کہ ثقیف نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر صلح کر لی کہ ان کا جو سود لوگوں پر ہے اور لوگوں کا جو سود ان پر ہے وہ سب چھوڑ دیا جائے گا' فتح مکہ کے بعد حضرت عتاب بن اسید مکہ مکرمہ کے عامل بنائے گئے' اس وقت بنو عمرو بن عمیر بن عوف' بنو مغیرہ سے سود لیتے تھے اور بنو مغیرہ ان کو جاہلیت میں سود ادا کرتے تھے' جب وہ مسلمان ہوئے تو ان پر بہت زیادہ سود کی رقمیں واجب الادا تھیں' بنو عمرو نے آ کر ان سے اپنے سود کا مطالبہ کیا' بنو مغیرہ نے مسلمان ہونے کے بعد ان کو سود ادا کرنے سے انکار کر دیا' یہ مقدمہ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کے پاس پیش کیا گیا' حضرت عتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملہ کا حکم معلوم کرنے کے لیے خط لکھا' تو یہ آیت نازل ہوگئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتاب بن اسید کو جواب لکھا کہ اگر بنو عمرو' سود کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوں تو ان سے اعلان جنگ کر دو۔

(جامع البیان ج ۳ ص ۷۱' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو ثقیف سود لینے سے باز آ گئے اور کہا: ہم اللہ اور رسول سے جنگ کی طاقت نہیں رکھتے۔

علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ جو لوگ سود لینے کو ترک نہ کریں ان سے اسی طرح جنگ کی جائے گی جس طرح مرتدین اور باغیوں سے جنگ کی جاتی ہے۔ جمہور مفسرین کا یہی مختار ہے۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۵۳' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت)

سود پر وعید کے متعلق احادیث

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام مسلم اور امام بیہقی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے' سود کھلانے والے' سود پر گواہی دینے والے اور سود کے لکھنے والے پر لعنت کی ہے اور فرمایا: یہ سب برابر ہیں۔

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ بینک سے سود وصول کر کے غریبوں کو کھلانا جائز نہیں ہے' اور نہ بینک کی ملازمت کرنا جائز ہے۔

امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ وہ چار آدمیوں کو جنت میں داخل نہ کرے اور ان کو جنت کی نعمتیں نہ چکھائے' عادی شرابی' سود خور' ناحق مال یتیم کھانے والا اور ماں باپ کا نافرمان۔

امام طبرانی نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان سود کا جو ایک درہم وصول کرتا ہے وہ اللہ کے نزدیک اسلام میں تینتیس بار زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے۔

امام طبرانی نے ''معجم اوسط'' میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سود کے بہتر درجے ہیں اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرے۔

امام ابو یعلیٰ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس قوم میں زنا اور سود کی کثرت ہو جاتی ہے' اس قوم پر اللہ کا عذاب حلال ہو جاتا ہے۔

امام احمد نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس قوم میں سود کی کثرت ہوتی ہے اس قوم پر قحط مسلط کر دیا جاتا ہے' اور جس قوم میں رشوت کی کثرت ہوتی ہے' اس پر رعب طاری کر دیا

جاتا ہے۔

امام ابوداؤد' امام ابن ماجہ اور امام بیہقی اپنی سنن میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ کوئی شخص سود کھانے سے نہیں بچے گا' جو شخص سود نہیں کھائے گا اس کو سود کا غبار پہنچے گا۔ (الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۶۷' مطبوعہ مکتبہ آیت اللہ العظمی' ایران)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس رات مجھے معراج کرائی گئی مجھے ایک ایسی قوم کے پاس سے گزارا گیا جن کے پیٹ کوٹھڑیوں کی طرح تھے' ان کے پیٹوں میں باہر سے سانپ دکھائی دے رہے تھے' میں نے پوچھا: اے جبرائیل! یہ کون ہیں؟ کہا: یہ لوگ سود کھانے والے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سود کے ستر گناہ ہیں اور ان میں سب سے ہلکا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۶۵۔ ۱۶۴' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صبح کو اپنا خواب بیان فرمایا کہ مجھے جبرائیل اور میکائیل لے گئے' میں نے دیکھا کہ خون کا ایک دریا ہے' جس کے وسط میں ایک شخص کھڑا ہوا ہے اور دریا کے کنارے ایک شخص ہاتھ میں پتھر لیے ہوئے کھڑا ہے' جب دریا میں کھڑا ہوا شخص کنارے کی طرف آنے کی کوشش کرتا ہے تو کنارے پر کھڑا ہوا شخص اس کے منہ پر پتھر مارتا ہے اور اس کو پھر دریا کے وسط میں دھکیل دیتا ہے اور وہ جب بھی دریا سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اس کے ساتھ یہی ہوتا ہے اور قیامت تک ہوتا رہے گا' مجھے جبرائیل اور میکائیل نے بتایا کہ خون کے دریا میں ڈوبے ہوئے یہ لوگ سود خور تھے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۸۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث میں سود خوروں کے عذاب قبر کا بیان ہے اور چونکہ یہ لوگ دنیا میں غریبوں کی رگوں سے خون نچوڑتے تھے اس لیے ان کو خون کے دریا میں ڈبویا گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر (مقروض) تنگ دست ہے تو اسے اس کی فراخ دستی تک مہلت دو' اور (قرض کو معاف کر کے) تمہارا صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہے اگر تم جانتے ہو O (البقرہ: ۲۸۰)

مقروض کو مہلت دینے اور اس سے قرض وصول کرنے کا طریقہ

جب اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ سود چھوڑ کر قرض خواہ کی اصل رقم واپس کر دی جائے اور ثقیف نے اپنی اصل رقوم کا بنو مغیرہ سے مطالبہ کیا تو بنو مغیرہ نے اپنی تنگ دستی کی شکایت کی اور کہا: اس وقت ہمارے پاس مال نہیں ہے' اور کہا: جس وقت ہمارے پھل اتریں گے ہم اس وقت ادائیگی کر دیں گے' تب یہ آیت نازل ہوئی: اور اگر مقروض تنگ دست ہے تو اسے اس کی فراخ دستی تک مہلت دو اور تمہارا صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔

جس شخص پر لوگوں کے بہت زیادہ قرض ہوں' اور قرض خواہ مطالبہ کر رہے ہوں' تو حاکم کے لیے یہ جائز ہے کہ مقروض کی ضروریات کے سوا باقی مال نیلام کر کے قرض خواہوں کے قرض ادا کر دے' اگر مقروض لوگوں کے واجبات ادا نہ کرے تو امام ابوحنیفہ' امام مالک' امام شافعی اور دیگر فقہاء کے نزدیک اس کو قید کرنا جائز ہے الا یہ کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے پاس واقعی مال نہیں ہے۔ (تفسیر منیر ج ۳ ص ۱۰۱ ملخصا' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

مقروض کو ادائیگی کی مہلت دینا واجب ہے اور اس کا قرض معاف کر دینا مستحب ہے اور اس معاملہ میں مستحب کا اجر واجب سے زیادہ ہے۔

مقروض کو مہلت دینے اور قرض معاف کرنے کے اجر وثواب کے متعلق احادیث

مقروض کا قرض معاف کرنے کی فضیلت میں حسب ذیل احادیث ہیں:

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام احمد' امام مسلم اور امام ابن ماجہ نے حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے تنگ دست کو مہلت دی یا اس کو معاف کر دیا اللہ اس کو اس دن اپنے سائے میں رکھے گا جس دن اس کے سائے کے سوا اور کسی کا سایا نہیں ہوگا۔

امام احمد' امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ عزوجل کے سامنے ایک شخص کو پیش کیا جائے گا' اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا: تم نے دنیا میں کیا کیا؟ وہ شخص کہے گا: میں نے دنیا میں ایک ذرہ برابر بھی نیکی نہیں کی' تین بار یہی مکالمہ ہوگا' تیسری بار وہ کہے گا: میں دنیا میں اپنا فاضل مال دے دیا کرتا تھا' میں لوگوں کو چیزیں فروخت کرتا' امیر آدمی پر آسانی کرتا اور غریب کو مہلت دیتا تھا' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہم تم سے زیادہ معاف کرنے کے حق دار ہیں' میرے بندے سے درگزر کرو' پھر اس کو بخش دیا جائے گا۔

امام احمد نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کا کسی آدمی پر کوئی حق ہو اور وہ اس کو مؤخر کر دے تو اس کو ہر روز صدقہ کا اجر ملے گا۔

امام احمد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کی دعا قبول کی جائے اور اس کی مصیبت دور کی جائے وہ تنگ دست کے لیے کشادگی کرے۔

امام طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے رویت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے تنگ دست کو کشادگی تک مہلت دی اللہ تعالیٰ اس کو گناہوں سے توبہ کرنے کی مہلت دے گا۔

امام احمد' امام ابن ماجہ' امام حاکم نے صحیح سند کے ساتھ اور امام بیہقی نے "شعب الایمان" میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے تنگ دست کو مہلت دی اس کو ہر دن قرض کے برابر صدقہ کا اجر ملے گا' پھر میں نے آپ سے سنا کہ جس نے تنگ دست کو مہلت دی اس کو ہر دن اس قرض کے دگنے صدقہ کا اجر ملے گا' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! پہلے تو آپ نے قرض کے برابر صدقہ کے اجر کا فرمایا تھا' اور اب آپ نے دگنے صدقہ کے اجر کا فرمایا ہے' آپ نے فرمایا: جب تک قرض کی میعاد پوری نہیں ہوگی اس کو ہر روز اس قرض کے برابر صدقہ کا اجر ملے گا اور جب میعاد پوری ہو جائے گی اور وہ اس کو مہلت دے گا تو پھر اس کو ہر روز اس کے دگنے صدقہ کا اجر ملتا رہے گا۔[1]

(مسند احمد ج ۵ ص ۳۶۰' سنن ابن ماجہ ص ۱۷۴' شعب الایمان ج ۷ ص ۵۳۸)

امام احمد' امام دارمی اور امام بیہقی نے "شعب الایمان" میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ

---

[1] اس حدیث میں قرض سے مراد دین ہے' یعنی کاروباری قرض' مدت معینہ کے ادھار پر کوئی چیز خریدنا' کیونکہ نجی قرضوں میں مدت کا تعین قرض دینے والے کی طرف سے جائز نہیں ہے ورنہ وہ قرض سود ہو جائے گا' مثلاً سو روپے دے کر ایک ماہ کے تعین کے بعد سو روپے لینا ربا النسیہ ہے اور اگر مدت کا تعین نہ ہو تو پھر جائز ہے۔ ہاں! اگر قرض لینے والا مدت کا تعین کرے پھر جائز ہے' مثلاً وہ کہے: میں ایک ماہ بعد ادا کروں گا۔ منہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے مقروض کو مہلت دی یا اس کو معاف کر دیا وہ قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوگا۔[1]
(مسند احمد ج ۲ ص ۳۵۹' سنن داری ج ۲ ص ۱۷۹' شعب الایمان ج ۷ ص: ۵۳۵)

امام احمد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جس شخص نے کسی تنگ دست کو مہلت دی یا اس کا قرض معاف کر دیا اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی تپش سے محفوظ رکھے گا۔ (الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۶۹۔ ۳۶۸ ملتقطا' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے' پھر ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گاO (البقرہ: ۲۸۱)

قرآن مجید میں نازل ہونے والی آخری آیت

اللہ تعالیٰ نے آیات ربا کو اس بلیغ نصیحت پر ختم کیا ہے کہ دنیا جانے والی ہے اور آخرت آنے والی ہے اور باقی ہے اور اس کے بعد وہ حساب پیش آنے والا ہے جو یقینی ہے' لہٰذا اس آیت میں اللہ تعالیٰ اس دن سے ڈرا رہا ہے' جس دن تم سب لوگ اللہ سے ملاقات کرو گے' اس دن تمہارے وہ بُرے اعمال سامنے آئیں گے جو تم کو ہلاک کر دیں گے' اور تمہیں لوگوں کے سامنے شرمندہ اور رسوا کریں گے' وہ اعمال کی جزا کا دن ہے' اس دن کوئی نیک عمل ہو سکے گا نہ کسی بُرے کام پر توبہ ہو سکے گی' وہ ثواب' عتاب اور محاسبہ کا دن ہے' اس دن ہر شخص کو اس کے کیے ہوئے کاموں کی پوری پوری جزا دی جائے گی' خواہ اس کے عمل نیک ہوں یا بد' خیر ہوں یا شر' اس دن ہر عمل سامنے آ جائے گا اور کوئی چھوٹا یا بڑا عمل باقی نہیں بچے گا' پھر اللہ تعالیٰ ان اعمال کی جزا دے گا اور تم پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا' اور اس ذات سے ظلم کیسے متصور ہو سکتا ہے جو برائی پر صرف اتنی ہی سزا دیتا ہے' جتنی وہ برائی ہو اور نیکی کا دس گنا بڑھا کر اجر دیتا ہے' بلکہ کبھی ایک نیکی پر سات سو گنا' کبھی اس سے بھی زیادہ اور کبھی بے حساب اجر دیتا ہے' اے بدکار! وہ تجھ پر عدل کرے گا' تو اس دن کے آنے سے پہلے توبہ کر لے اور اپنے آپ کو اس کے فضل و کرم کا سزاوار کر لے اور اے نیکوکار! اس دن کے آنے سے پہلے اپنی نیکیوں کو اور بڑھا لے' وہ تجھ پر فضل کرے گا۔ بعض روایات کے مطابق یہ قرآن مجید کی آخری آیت ہے' امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آخری آیت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔

یہ آیت ہفتہ کے دن نازل ہوئی تھی' اس کے نزول کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نو دن حیات (ظاہری کے ساتھ) رہے اور پیر کے دن رفیق اعلیٰ سے واصل ہو گئے۔ (جامع البیان ج ۳ ص ۷۶' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام ابو عبید' امام عبد بن حمید' امام نسائی' امام ابن جریر' امام ابن المنذر اور امام بیہقی نے "دلائل النبوۃ" میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی قرآن مجید کی یہ آخری آیت تھی۔

امام بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت منٰی میں نازل ہوئی تھی اور اس کے اکیاسی دن بعد آپ کا وصال ہو گیا۔ (الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۷۰' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

اس آیت کے نزول کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدت حیات میں مختلف اقوال ہیں: نو راتیں' سات دن' تین گھنٹے' اکیس

---

[1] مسند احمد ج ۵ ص ۳۶۰ میں اسی طرح روایت ہے اور "سنن ابن ماجہ" اور "شعب الایمان" میں اسی طرح ہے کہ قرض کی میعاد پوری ہونے تک اس کو صدقہ کا اجر ملے گا اور مہلت دینے کے بعد اس قرض کی مثل صدقہ کا اجر ملے گا' نیز مسند احمد ج ۵ ص ۳۵۱ میں بھی اسی طرح ہے۔ منہ

دن اور اکیا سی دن۔

امام بخاری' امام ابو عبید' امام ابن جریر اور امام بیہقی نے شعبی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو آخری آیت نازل ہوئی وہ آیت ربا ہے' یہ اس آیت کے آخری آیت ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ اس سے مراد یہ ہے کہ بیوع سے متعلق آیات میں آخری آیت' آیت ربا ہے' یا مراد یہ ہے کہ آیت ربا آخر میں نازل ہوئی ہے' اور تمام آیتوں کے لحاظ سے جو آخری آیت ہے وہ یہی آیت ہے۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۵۵ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى

اے ایمان والو! جب تم کسی مقررہ مدت تک آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو'

فَٱكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِٱلْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن

اور تمہارے درمیان کسی کاتب کو عدل کے ساتھ دستاویز لکھنی چاہیے اور جس شخص کو اللہ نے

يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ ٱللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ ٱلَّذِى عَلَيْهِ ٱلْحَقُّ

لکھنا سکھایا ہو اس کو لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے' اور جس شخص پر قرض ہو لکھوانا اس کی ذمہ داری

وَلْيَتَّقِ ٱللَّهَ رَبَّهُۥ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ۚ فَإِن كَانَ ٱلَّذِى

ہے اور اس کو اللہ سے ڈرنا چاہیے جو اس کا رب ہے' اور اس (قرض) سے کچھ کم نہ کرے' اور اگر مقروض کم عقل ہو یا

عَلَيْهِ ٱلْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ

کمزور ہو یا وہ خود لکھوانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی (سرپرست) عدل سے

وَلِيُّهُۥ بِٱلْعَدْلِ ۚ وَٱسْتَشْهِدُوا۟ شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن

لکھوا دے' اور تم اپنے مردوں میں سے دو کو گواہ بنا لو' پھر اگر

لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَٱمْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ

دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (ان کو گواہ بنا لو) جن کو تم گواہوں سے پسند

ٱلشُّهَدَآءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَىٰهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَىٰهُمَا ٱلْأُخْرَىٰ ۚ وَ

کرتے ہو کہ ان دو میں سے کوئی ایک (عورت) اگر بھول جائے تو اس ایک کو دوسری یاد دلا دے' اور

لَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ وَلَا تَسْـَٔمُوٓا أَنْ تَكْتُبُوهُ

جب گواہوں کو (گواہی کے لیے) بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں اور (قرض) چھوٹا ہو یا بڑا

صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰٓ أَجَلِهِۦ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ

اس کی میعاد تک اس (کی دستاویز) کو لکھنے میں تساہل نہ کرو، اللہ کے نزدیک یہ بہت عادلانہ

لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰٓ أَلَّا تَرْتَابُوٓا ۖ إِلَّآ أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً

کارروائی ہے اور گواہی دینے کے لیے بہت درست طریقہ ہے اور شکوک وشبہات دور کرنے کے بہت قریب ہے، ہاں! جو تجارتی

تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ

لین دین تم آپس میں دست بدست کرتے ہو اس کو نہ لکھنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے

وَأَشْهِدُوٓا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ

اور جب تم آپس میں خرید وفروخت کرو تو گواہ بنا لیا کرو، اور نہ کسی لکھنے والے کو ضرر پہنچایا جائے اور نہ گواہ کو،

وَإِنْ تَفْعَلُوا فَإِنَّهُۥ فُسُوقٌۢ بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ

اور اگر تم نے ایسا کیا تو وہ بے شک تمہارا گناہ ہو گا، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور اللہ تمہیں

اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٨٢﴾ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ

سکھاتا ہے، اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ○ اور اگر تم سفر میں ہو (اور تمہیں نے دین پر مبنی کوئی معاملہ کرنا ہو)

وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَٰنٌ مَّقْبُوضَةٌ ۖ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ

اور تمہیں دستاویز لکھنے والا نہ ملے تو قبضہ دی ہوئی رہن (کی بنا پر دین کا معاملہ کر لو)، پھر اگر تم کو ایک دوسرے پر

بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَٰنَتَهُۥ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُۥ ۗ وَلَا

اعتبار ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا اسے چاہیے کہ وہ اس کی امانت ادا کرے، اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے، اور

تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُۥٓ ءَاثِمٌ قَلْبُهُۥ ۗ وَاللَّهُ بِمَا

گواہی نہ چھپاؤ، اور جو شخص گواہی چھپائے گا اس کا دل گناہ آلود ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ

تَعۡمَلُوۡنَ عَلِیۡمٌ ﴿۲۸۳﴾ ع

اس کو خوب جاننے والا ہے O

سود کے بعد تجارتی قرضوں کے تحفظات کے ذکر کی مناسبت

اس سے پہلی آیتوں میں صدقہ دینے اور سود نہ لینے کا حکم دیا تھا اور ان آیتوں میں کاروبار اور تجارت میں لین دین کے احکام بیان فرمائے ہیں' صدقہ دینا اور سود نہ لینا مال میں کمی کا سبب ہے اور تجارت' مال میں افزائش کا سبب ہے' اس سے پہلے رکوع میں سود کا ذکر تھا اور اس رکوع میں کاروبار میں ادھار کے تحفظات کا ذکر ہے' سود قرض کی ناجائز صورت ہے اور کاروبار میں بلاسود قرض' قرض کی جائز صورت ہے۔ صدقہ اور قرض میں ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور تعاون ہے اور سود میں سنگ دلی اور سرکشی ہے' اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام کر کے مال میں اضافہ کرنے کے ناجائز طریقہ سے روکا اور تجارت کو حلال کر کے مال میں اضافہ کرنے کے جائز طریقہ کی طرف رہنمائی کی۔

مال کے مذموم یا محمود ہونے کا مدار

اس آیت کو آیت مداینہ کہتے ہیں' یہ قرآن مجید کی سب سے طویل آیت ہے' اس میں مال کو محفوظ کرنے کا طریقہ بتایا ہے کہ جب کسی چیز کو مدت معینہ کے ادھار پر فروخت کیا جائے تو بائع اور مشتری کسی تیسرے فریق سے لکھوالیں کہ کتنی رقم ادا کرنی ہے اور کب ادا کرنی ہے اور اس دستاویز پر دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالیا جائے اور اگر فریقین سفر میں ہوں جہاں کاتب اور گواہ میسر نہ ہوں تو مقروض بائع کے پاس اپنی کوئی چیز رہن رکھ کر اس کے قبضہ میں دے دے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اسلام کے نزدیک مال و دولت کوئی بُری چیز نہیں ہے' بہ شرطیکہ وہ مال فی نفسہ حلال ہو' حلال ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو اور اس مال کو جائز اور نیکی کے راستوں میں خرچ کیا جائے' اس لیے اسلام نے کسب حلال اور تجارت کی حوصلہ افزائی کی ہے جیسا کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت دی ہے کہ کاروبار کرنے والے اپنے مال کو محفوظ کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کریں اور ادھار مال فروخت کرتے وقت خریدار سے کس قسم کے تحفظات حاصل کریں' ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ. (الجمعہ: ۱۰) — پھر جب نماز پڑھ لی جائے تو زمین میں پھیل جاؤ' اور اللہ کے فضل کو طلب کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کو اللہ کا فضل فرمایا ہے۔

اور امام عبد الرزاق روایت کرتے ہیں:

حضرت ایوب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے اہل کو سوال سے روکنے کے لیے (رزق) حلال کی طلب میں نکلے وہ بھی اللہ کے راستہ میں ہے اور جو شخص اپنے آپ کو سوال سے روکنے کے لیے (رزق) حلال کی طلب میں نکلے وہ بھی اللہ کے راستہ میں ہے۔

(المصنف ج ۵ ص ۲۷۲۔ ۲۷۱' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۰ھ)

اور جو شخص مال کو اللہ کی راہ میں نیکی کے راستہ میں خرچ نہ کرے وہ مال مذموم ہے' اس کے متعلق فرمایا:

الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ ۖ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ؕ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ (الھمزہ: ۷۔۲)

جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا○ اس نے گمان کیا کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ (دنیا میں) زندہ رکھے گا○ ہرگز نہیں! وہ ضرور چورا چورا کر دینے والی میں پھینک دیا جائے گا○ اور آپ کیا سمجھے چورا چورا کر دینے والی کیا چیز ہے؟○ اللہ کی آگ ہے بھڑکائی ہوئی○ جو دلوں پر چڑھ جائے گی○

اور امام عبدالرزاق روایت کرتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص مال کو کثیر بنانے کی طلب میں نکلے وہ شیطان کے راستہ میں ہے۔

(المصنف ج ۵ ص ۲۷۲۔ ۲۷۱ 'مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۳۹۰ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! جب تم کسی مقررہ مدت تک آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

(البقرہ: ۲۸۲)

بیع مطلق اور بیع سلم کی تعریفات

اس آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ جب وہ خرید و فروخت کا کوئی معاملہ ادھار پر کریں تو اس کے تحفظ کے لیے اس کو لکھ لیں اور اس پر گواہ بنا لیں۔ اس آیت میں دین کا ذکر ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ آیت بیع سلم کے متعلق نازل ہوئی ہے' اس لیے ہم بیع مطلق' بیع سلم' دین اور قرض کی تعریفات کو ذکر کریں گے۔ جب باہمی رضامندی سے ایک چیز کا دوسری چیز سے تبادلہ کیا جائے تو اس کو بیع کہتے ہیں' اس میں سودے کو مبیع اور اس کی قیمت کو ثمن کہتے ہیں۔ بیع تین قسم کی ہے' کسی چیز کو نقد قیمت دے کر خریدا جائے' کسی حاضر چیز کو مدت معینہ کے ادھار پر خریدا جائے یہ دونوں قسمیں جائز ہیں' تیسری قسم یہ ہے کہ کسی ادھار (غائب) چیز کو ادھار پر خریدا جائے مثلاً زید کے عمرو پر دس سیر گندم واجب ہیں' اور خالد کے بکر پر پندرہ سیر جو واجب ہیں تو زید' خالد کو اپنے وہ دس سیر گندم فروخت کر دے جو عمرو کے ذمہ ہیں' اور اس کے معاوضہ میں خالد سے وہ پندرہ سیر جو لے لے جو خالد کے بکر کے ذمہ ہیں' اس کو بیع الدین بالدین یا بیع الکالئی بالکالئی کہتے ہیں' یہ بیع جائز نہیں ہے' نقد کو عربی میں عین کہتے ہیں' اور ادھار کو دین کہتے ہیں۔ اس آیت میں بیع کی دوسری قسم کا ذکر ہے جس میں ایک عوض نقد ہو اور دوسرا مدت معینہ کے ادھار پر ہو' اگر مبیع (سودا) نقد ہو اور ثمن (قیمت) مدت معینہ کے ادھار پر ہو تو یہ بیع مطلق ہے اور اگر ثمن نقد ادا کر دی جائے اور بیع کو ایک مدت معینہ کے بعد وصول کیا جائے تو اس کو بیع سلم کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس کے نزدیک یہ آیت خاص بیع سلم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

امام ابن جریر روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت گندم کی بیع سلم کے متعلق نازل ہوئی ہے' (گندم کی قیمت کی پیشگی ادائیگی کر دی جائے اور فصل کٹنے کے بعد گندم کو وصول کیا جائے)' اس میں گندم کی مقدار بھی معلوم ہو اور اس کی مدت بھی معلوم ہونی چاہیے۔ (جامع البیان ج ۳ ص ۷۶ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (میں نے عرض کیا:) یارسول اللہ! میرے پاس کوئی شخص ایک چیز خریدنے کے لیے آتا ہے جو میرے پاس نہیں ہے' آیا میں اس کے لیے بازار سے چیز خرید لوں؟ آپ نے فرمایا: جو چیز

تمہارے پاس موجود نہیں ہے اس کو فروخت مت کرو۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۳۹ مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث کی بناء پر جو چیز موجود نہ ہو اس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرورت کی بناء پر بیع سلم کی اجازت دی ہے۔ امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آئے تو لوگ ایک یا دو سال کی مدت پر پھلوں میں بیع سلم کرتے تھے تو آپ نے فرمایا: جو شخص کھجوروں میں بیع سلم کرے اس کا کیل معلوم ہو اور وزن معلوم ہو (یعنی مقدار معلوم ہو) اور اس کی مدت معلوم ہو۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۱ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

بیع سلم کی شرائط

بیع سلم کو بیع سلف بھی کہتے ہیں' سلم اور سلف کا معنی ہے: تسلیم اور تقدیم' کسی چیز کو پہلے دینا' اور اس کو سپرد کرنا' شریعت میں بیع سلم اس عقد کو کہتے ہیں جس میں ثمن پہلے واجب ہو اور مبیع بعد میں میعاد مقرر پر واجب ہو۔

علامہ عبداللہ بن محمود موصلی حنفی لکھتے ہیں:

ہر وہ چیز جس کی صفت اور مقدار کو منضبط کرنا ممکن ہو اس کی بیع سلم جائز ہے' ورنہ نہیں' بیع سلم کی شرائط یہ ہیں: ان چیزوں کو معین کیا جائے: جنس' نوع' وصف' مدت' مقدار' جس جگہ مبیع کو سپرد کیا جائے' کیل' وزن اور عدد کی تعیین کرنا' اور عقد کے بعد علیحدگی سے پہلے ثمن پر قبضہ کرنا ضروری ہے' اس چیز میں بیع سلم صحیح نہیں ہے جو عقد کے وقت سے لے کر تسلیم کرنے کی مدت تک موجود نہ رہے' نہ جواہر میں صحیح ہے' حیوان' اس کے گوشت اور اس کے اعضاء میں بھی صحیح نہیں ہے' خشک سمندری مچھلی میں صحیح ہے' کسی معین شہر کے غلہ میں بیع سلم صحیح نہیں ہے' اگر کپڑے کا طول اور عرض معین کر دیا جائے تو صحیح ہے' جس چیز میں بیع سلم کی گئی ہے اس میں قبضہ سے پہلے تصرف کرنا صحیح نہیں ہے اور نہ اس کے ثمن میں قبضہ سے پہلے تصرف کرنا صحیح ہے۔

(الاختیار ج ۲ ص ۳۸۔ ۳۳ مطبوعہ دار فراس للنشر والتوزیع' مصر)

دین اور قرض کی تعریفیں اور ان کا فرق

علامہ شامی لکھتے ہیں:

جو چیز کسی عقد یا کسی چیز کے ضائع یا ہلاک کرنے سے کسی کے ذمہ واجب ہو گئی ہو' یا کسی چیز کو قرض لینے کی وجہ سے کسی کے ذمہ لازم ہو گئی ہو وہ دین ہے' دین قرض سے عام ہے' دین میں مدت کا مقرر کرنا واجب ہے عام ازیں کہ مدت معلوم ہو یا مجہول ہو' لیکن اگر جہالت معمولی ہو جیسے فصل کی کٹائی یا دانہ کو بھوسے سے الگ کرنے کا وقت تو یہ جائز ہے اور اگر غیر معمولی ہو تو جائز نہیں ہے' جیسے جب آندھی آئے گی' "ہدایہ" وغیرہ میں ہے کہ معمولی جہالت دین میں برداشت کی جاتی ہے۔

(ردالمحتار ج ۴ ص ۱۶۶ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

نیز علامہ شامی لکھتے ہیں:

اور قرض میں مدت کا تعین کرنا لازم نہیں ہے' یعنی اگر قرض میں مدت کا تعین کر دیا جائے تو وہ غیر لازم ہونے کے باوجود صحیح ہے اور قرض دینے والا مدت کا تعین کرنے کے بعد اس سے رجوع کر سکتا ہے' لیکن "ہدایہ" میں یہ کہا ہے کہ قرض میں مدت کا تعین کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ قرض ابتداءً اعارہ ہے اور انتہاءً معاوضہ ہے اور ابتداء کے اعتبار سے اس میں مدت کا تعین کرنا لازمی نہیں ہے جیسا کہ عاریۃً چیز دینے میں ہے اور انتہاء کے اعتبار سے اس میں مدت کا تعین کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ قرض انتہاءً معاوضہ ہے' اگر کسی قرض دینے والے نے ایک درہم ایک ماہ کے لیے قرض دیا اور اس کے عوض میں ایک ماہ بعد ایک

درہم واپس لیا تو یہ ایک درہم کی ایک درہم کے عوض ایک ماہ کے ادھار پر بیع ہوگی اور یہ ربا النسیئہ (سود) ہے اس لیے قرض میں مدت کا تعین کرنا جائز نہیں ہے۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۱۷۰ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ)

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

لغت میں قرض کا معنی ہے: جس کو تقاضا کرنے کے لیے دیا جائے اور شرع میں اس کا معنی ہے: جو مثلی چیز تقاضا کرنے کے لیے دی جائے، مثلی سے مراد وہ مکیل موزون اور معدود چیز ہے یعنی اس چیز کی مثل میں ایسا فرق نہ ہو جس سے قیمت مختلف ہو جائے جیسے انڈا اور اخروٹ وغیرہ اس لیے درہم دینار اخروٹ انڈے گوشت روٹی کاغذ اور سکوں وغیرہ میں قرض کا لین دین جائز ہے۔ (درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۴ ص ۱۷۲-۱۷۱ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

آیت مداینہ کے حکم کا تمام دیون کو شامل ہونا

علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خبر دی ہے کہ بیع سلم جس میں مدت مقررہ کے بعد مبیع کی ادائیگی کی جاتی ہے وہ بھی اس آیت کے عموم میں داخل ہے لہٰذا ہر وہ دین جس میں مدت مقرر ہو وہ اس آیت میں مراد ہے خواہ وہ کسی منافع کا بدل ہو یا کسی معین چیز کا عوض ہو اس لیے جس اجرت اور مہر کی میعاد مقرر ہو اسی طرح عقد خلع، قتل عمد کی دیت اور بدل کتابت جن کی ادائیگی کی میعاد مقرر ہو وہ سب اس آیت سے مراد ہیں کیونکہ یہ وہ دیون ہیں جو کسی عقد سے ثابت ہیں اور ان میں ادائیگی کی میعاد مقرر ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو دین کے لکھنے اور اس پر گواہ بنانے کا حکم دیا ہے وہ ان تمام عقود اور دیون پر لاگو ہے اسی طرح گواہوں کا عدد اور ان کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں وہ بھی ان تمام عقود میں جاری ہوتے ہیں کیونکہ اس آیت کے الفاظ کسی ایک دین کے ساتھ خاص نہیں ہیں اسی وجہ سے جب نکاح میں عورت کا مہر دین موجل ہو تو اس پر دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنایا جاتا ہے اسی طرح عقد اجارہ بدل صلح وغیرہ تمام دیون کے عقود میں اسی طرح حکم جاری ہو جائے گا۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۴۸۴-۴۸۳ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور ۱۴۰۰ھ)

دین پر مبنی عقود کی دستاویز لکھوانے اس پر گواہ بنانے یا رہن رکھنے کا شرعی حکم

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے معاملہ کو لکھنے اور اس پر گواہ بنانے کا حکم دیا ہے اس کے متعلق علامہ جصاص لکھتے ہیں:

فقہاء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس آیت میں دین کے معاملہ کو لکھنے اس پر گواہ بنانے اور اس کے لیے کسی چیز کو رہن رکھنے کا جو حکم دیا ہے یہ حکم استحباب ہماری بہتری اور خیر خواہی ارشاد اور دین اور دنیا میں احتیاط کے لیے ہے اور اس میں کوئی چیز بھی واجب نہیں ہے اور ابتداء سے آج تک تمام امت مسلمہ تمام شہروں میں دین پر مبنی عقود بغیر کسی کو گواہ بنائے کرتی رہی ہے اور ہر دور میں علماء فقہاء اور اہل فتویٰ حضرات کو اس کا علم ہوتا تھا اور ان میں سے کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا اگر اس قسم کے ادھار کے معاملات کی دستاویز لکھنا یا اس پر گواہ بنانا یا رہن رکھنا واجب ہوتا تو اس کے ترک پر اعتراض کیا جاتا اور یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ امور مستحب ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر آج تک یہی منقول ہے اور اگر صحابہ اور تابعین ان عقود پر لازماً گواہ بناتے تو یہ چیز تواتر سے منقول ہوتی۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۴۸۲ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور ۱۴۰۰ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور تم اپنے مردوں میں سے دو کو گواہ بنالو پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (ان کو گواہ بناؤ) جن کو تم گواہوں سے پسند کرتے ہو کہ ان دو میں سے کوئی ایک (عورت) اگر بھول جائے تو اس ایک کو دوسری یاد دلا دے۔

(البقرہ: ۲۸۲)

شہادت کا لغوی اور اصطلاحی معنی

علامہ ابن اثیر الجزری لکھتے ہیں:

جس چیز کا مشاہدہ کیا ہو یا جس پر کوئی شخص حاضر ہو اس کی خبر دینا لغت میں شہادت ہے۔

(نہایہ ج ۲ ص ۵۱۴ مطبوعہ ایران ۱۳۶۴ ھ)

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

بصیرت سے یا آنکھوں کے ساتھ دیکھنے سے جس چیز کا علم حاصل ہو اس کی خبر دینے کو شہادت کہتے ہیں۔

(المفردات ص ۲۶۸ مطبوعہ ایران ۱۳۴۲ ھ)

علامہ بویطی شافعی لکھتے ہیں:

جو شخص کسی جگہ حاضر ہو یا اس نے کبھی کسی چیز کو دیکھا ہو اس کی یقینی خبر دینے کو شہادت کہتے ہیں اور کبھی اس چیز کی خبر کو شہادت کہتے ہیں جس کا اس کو یقین ہو یا وہ چیز مشہور ہو۔ (شرح المہذب ج ۲۰ ص ۱۲۵ مطبوعہ بیروت)

علامہ ابن ہمام حنفی لکھتے ہیں:

کسی حق کو ثابت کرنے کے لیے ''میں گواہی دیتا ہوں'' کے الفاظ کے ساتھ مجلس قضاء میں سچی خبر دینا شہادت ہے۔

(فتح القدیر ج ۶ ص ۴۴۹ مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

علامہ ابن نجیم نے لکھا ہے کہ ''اشھد'' کا لفظ اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ قسم کو متضمن ہے گویا کہ گواہ یہ کہتا ہے کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے یہ واقعہ اسی طرح دیکھا ہے اور اب میں اس کی خبر دے رہا ہوں۔

شہادت کی اقسام

(الف) عینی شہادت: یعنی گواہ آنکھوں سے دیکھے ہوئے کسی واقعہ کو بیان کرے، یہی شہادت فیصلہ کن ہوتی ہے۔

(ہدایہ اخیرین ص ۱۵۹)

(ب) سمعی شہادت: یعنی گواہ کسی چیز کو سن کر اس کی شہادت دے، جن امور کا تعلق مسموعات سے ہو ان میں سمعی شہادت اتنی ہی معتبر ہوتی ہے جتنی عینی شہادت ہے۔ (ہدایہ اخیرین ص ۱۶۰)

(ج) شہادت علی الشہادت: اصل گواہ کسی شخص کو اپنی شہادت پر شاہد بنائے تب یہ گواہ اصل کی شہادت دے سکتا ہے۔

(ہدایہ اخیرین ص ۱۵۸)

قرآن مجید کی روشنی میں شہادت کا بیان

شہادت کے ساتھ دو حکم متعلق ہوتے ہیں ایک تحمل شہادت ہے اور دوسرا اداء الشہادت۔ تحمل شہادت کا مطلب کسی وقوعہ کا معائنہ کر کے اس کو سمجھ کر منضبط کرنا[1] اور اداء الشہادت کا مطلب ہے: اس شہادت کو قاضی کے سامنے ادا کرنا۔ تحمل شہادت کے متعلق قرآن مجید کی یہ آیات ہیں:

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ ۔ (البقرہ: ۲۸۲)

اور اپنے مردوں سے دو گواہ بناؤ، پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو۔

[1] ڈاکٹر وہبہ زحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۶ ص ۵۵۸ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۰۵ ھ

وَاَشۡهِدُوۡۤا اِذَا تَبَايَعۡتُمۡ ۔ (البقرہ: ۲۸۲) اور جب تم خرید و فروخت کرو تو گواہ بنالو۔

وَّاَشۡهِدُوۡا ذَوَىۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ ۔ (الطلاق: ۲) اور اپنوں میں دو عادل (نیک) شخصوں کو گواہ بنالو۔

اور اداء شہادت کے متعلق قرآن مجید کی یہ آیات ہیں:

وَاَقِيۡمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۔ (الطلاق: ۲) اور اللہ کی خاطر شہادت ادا کرو۔

وَلَا يَاۡبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوۡا ۔ (البقرہ: ۲۸۲) اور جب گواہوں کو (گواہی کے لیے) بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔

وَلَا تَكۡتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنۡ يَّكۡتُمۡهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلۡبُهٗ ۔ (البقرہ: ۲۸۲) اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو گواہی چھپاتا ہے تو بے شک اس کا دل گنہ گار ہے۔

شہادت کا حکم

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں کہ تحمل شہادت اور اداء شہادت دونوں فرض کفایہ ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَلَا يَاۡبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوۡا ۔ اور جب گواہوں کو گواہی کے لیے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں'' نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَلَا تَكۡتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنۡ يَّكۡتُمۡهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلۡبُهٗ ۔ (البقرہ: ۲۸۲) اور گواہی نہ چھپاؤ اور جو گواہی چھپائے تو بے شک اس کا دل گنہ گار ہے'' نیز اس لیے کہ شہادت ایک امانت ہے اور باقی امانتوں کی طرح اس کا ادا ہونا لازم ہے۔

(المغنی ج ۱۰ ص ۱۲۵ مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ ابوالحسن مرغینانی (صاحب ''ہدایہ'') لکھتے ہیں: شہادت کا ادا کرنا واجب ہے' اور جب مدعی شاہد کو بلائے تو شہادت کو چھپانا جائز نہیں ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَلَا يَاۡبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوۡا ۔ (البقرہ: ۲۸۲)'' اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَلَا تَكۡتُمُوا الشَّهَادَةَ ۔ (البقرہ: ۲۸۲)'' اور مدعی کا گواہ کو طلب کرنا اس لیے شرط ہے کہ یہ مدعی کا حق ہے' سو باقی حقوق کی طرح یہ بھی طلب پر موقوف ہے' اور حدود میں شہادت دینے پر گواہ کو اختیار ہے کہ خواہ ستر کرے خواہ اظہار کرے کیونکہ دونوں چیزوں میں ثواب ہے پردہ پوشی میں بھی اور اقامت حدود میں بھی اور ستر افضل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ہزال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کاش تم اپنے کپڑے سے اس کا ستر کر لیتے۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۲۵) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ اس کی دنیا اور آخرت میں پردہ پوشی کرے گا۔ (بخاری ج ۱ ص ۳۳۰) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے حدود ساقط کرنے کے بارے میں جو روایات منقول ہیں ان سے ستر کا افضل ہونا صراحۃً معلوم ہوتا ہے۔ (ہدایہ اخیرین ص ۱۵۴ مطبوعہ مکتبہ شرکۃ علمیہ' ملتان)

علامہ مرغینانی کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطلقاً ستر افضل ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے' اگر کوئی شخص گناہ کرنے کے بعد اس پر نادم ہو تو اس کی پردہ پوشی کرنا افضل ہے اور جو شخص علی الاعلان بدکاری کرتا ہو جس سے حدود الٰہیہ کا احترام مجروح ہوتا ہو تو پھر اس کے خلاف شہادت دینا افضل ہے۔

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ تحمل شہادت میں مسلمان کے حق کا تحفظ ہے اور مسلمان کے حق کا تحفظ کرنا اولیٰ ہے' اور تحمل شہادت سے انکار کرنا خلاف اولیٰ یا مکروہ تنزیہی ہے اور قرآن مجید کی جن آیات میں شہداء کا لفظ آیا ہے اس سے مراد اداء شہادت کرنے والا ہے کیونکہ شہادت تحمل کرنے والے کو شاہد مجازاً کہا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب شاہد کو مدعی بلائے تو شہادت ادا کرنا فرض ہے اور تحمل شہادت کرنا مستحب ہے۔ (فتح القدیر ج ۶ ص ۷ ۔ ۴۳۶ مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

شہادت کی تعریف ' رکن اور سبب وغیرہ کا بیان

مجلس قضاء میں کسی شخص کے حق کو ثابت کرنے کے لیے لفظ ''اشہد'' (میں گواہی دیتا ہوں) کے ساتھ سچی خبر بیان کرنا شہادت ہے۔ (فتح القدیر)

شہادت کا رکن لفظ ''اشھد'' ہے' یعنی میں گواہی دیتا ہوں۔ (تبیین الحقائق)

شہادت کو ادا کرنے کا سبب یہ ہے کہ مدعی گواہ سے شہادت طلب کرے یا مدعی از خود گواہی دے جب کہ گواہ کو یہ علم ہو کہ مدعی کو اپنے حق پر شہادت کا علم نہیں ہے اور اس کے گواہی نہ دینے کی صورت میں مدعی کے حق کے ضائع ہونے کا خدشہ ہو۔

شہادت کا حکم یہ ہے کہ شہادت کے بعد قاضی پر واجب ہے کہ اس شہادت کے مطابق فیصلہ کرے۔ (عنایہ)

تحمل شہادت کی شرائط

شہادت کی شرائط دو قسم کی ہیں' تحمل شہادت (حصول شہادت) کی شرائط اور ادائیگی شہادت کی شرائط' تحمل شہادت کی شرائط یہ ہیں کہ جس وقت گواہ کسی واقعہ کو دیکھ رہا ہے اور گواہی کو حاصل کر رہا ہے تو وہ شخص مجنون نہ ہو' ناسمجھ بچہ نہ ہو اور یہ شخص بصیر ہو' لہٰذا اندھے کا تحمل شہادت کرنا جائز نہیں ہے' نیز مشہود بہ (جس چیز کی گواہی دینی ہے) کا وہ خود مشاہدہ کرے کسی اور کے مشاہدہ کا تحمل نہ کرے' البتہ بعض اشیاء میں لوگوں سے سن کر تحمل شہادت کرنا بھی جائز ہے۔ (بدائع الصنائع) تحمل شہادت کے لیے بلوغ' حریت' اسلام اور عدالت (نیک چلنی) شرط نہیں ہے حتیٰ کہ اگر تحمل شہادت کے وقت وہ سمجھ دار بچہ ہو یا غلام ہو یا کافر ہو یا فاسق ہو' پھر بچہ بالغ ہو جائے یا غلام آزاد ہو جائے یا کافر مسلمان ہو جائے یا فاسق توبہ کرلے اور پھر وہ قاضی کے پاس شہادت دیں تو ان کی شہادت قبول کی جائے گی۔ (البحر الرائق)

بلحاظ شاہد ادائیگی شہادت کی شرائط

شہادت ادا کرنے کے لیے شاہد میں عقل' بلوغ' بصر اور نطق (گویائی) کی شرط ہے اور یہ کہ اس کو حد قذف نہ لگی ہو (یہ شرط احناف کے نزدیک ہے) اور یہ کہ وہ محض اللہ کے لیے شہادت دے اور اس شہادت سے اس کا مقصد نہ کسی نفع کو حاصل کرنا ہو اور نہ کسی ضرر کو دور کرنا ہو اور یہ کہ اس مقدمہ میں وہ شخص خود فریق نہ ہو اور یہ کہ اداء شہادت کے وقت اس کو مشہود بہ کا علم ہو اور وہ اس کو یاد ہو (یہ شرط امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہے' صاحبین کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے)۔ (بدائع الصنائع)

عدالت کی تعریف

گواہوں کا عادل (نیک) ہونا قاضی پر وجوب قبول کے لیے شرط ہے' نفس شہادت کے جواز کے لیے گواہوں کا عادل ہونا شرط نہیں ہے۔ (البحر الرائق) امام ابوحنیفہ کے نزدیک عدالت ظاہر یہ شرط ہے اور عدالت حقیقیہ جو تزکیہ شہود اور تعدیل سے ثابت ہوتی ہے وہ امام اعظم کے نزدیک شرط نہیں ہے اور امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک عدالت حقیقیہ شرط ہے۔ (البدائع الصنائع) اس زمانہ میں فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔ (کافی) امام ابو یوسف سے جو عدالت کی تفسیر منقول ہے وہ یہ ہے کہ شہادت میں عدل یہ ہے کہ شاہد کبائر سے مجتنب ہو اور صغائر پر اصرار کرنے والا نہ ہو اور اس کی نیکیاں اس کی برائیوں سے زیادہ ہوں اور اس کی درست باتیں اس کی غلط باتوں سے زیادہ ہوں' یہ عدالت کی سب سے بہترین تفسیر ہے۔ (نہایہ)

عورت کی شہادت کے متعلق فقہاء اسلام کے نظریات

(۱) زنا کے اثبات کے لیے چار آزاد مسلمان مردوں کی گواہی ضروری ہے اور اس میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں ہے۔ علامہ

ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ' امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا یہی نظریہ ہے۔[1]
علامہ بن ہمام حنفی[2]' علامہ یحییٰ بن شرف نووی[3] اور علامہ ابن رشد مالکی نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔[4]

(۲) بقیہ حدود اور قصاص میں کم از کم دو آزاد اور مسلمان مردوں کی گواہی ضروری ہے اور عورتوں کی گواہی جائز نہیں ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے تصریح کی ہے کہ امام ابوحنیفہ' امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا یہی نظریہ ہے۔[5]

(۳) عطاء اور حماد سے منقول ہے کہ تین مردوں اور دو عورتوں کی گواہی سے بھی زنا ثابت ہو جائے گا' اسی طرح عطاء اور حماد کہتے ہیں کہ ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی بقیہ حدود اور قصاص کے اثبات کے لیے کافی ہے۔ یہ حضرات حدود اور قصاص کو بھی اموال پر قیاس کرتے ہیں۔ (المغنی ج ۱۰ص ۱۵۶۔ ۱۵۵' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۰۵ھ)

(۴) شیخ ابن حزم نے فقہاء اربعہ کے اجماع کی مخالفت کی ہے' وہ کہتے ہیں کہ حدود اور قصاص میں عورت کی شہادت مطلقاً مقبول ہے' چنانچہ آٹھ عورتوں کی گواہی سے زنا ثابت ہو جائے گا اور بقیہ حدود اور قصاص میں ایک مرد اور دو عورتیں یا چار عورتیں گواہی دیں تو وہ ثابت ہو جائیں گے۔ (المحلیٰ ج۹ص ۳۹۶۔ ۳۹۵' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' ۱۳۴۹ھ)

(۵) تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ قرض اور کاروباری معاملات میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت جائز ہے' علامہ ابن قدامہ حنبلی نے اس کی تصریح کی ہے۔ (المغنی ج ۱۰ص ۱۵۸' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۰۵ھ)
علامہ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ فقہاء احناف کے نزدیک مالی حقوق کے علاوہ میں مثلاً نکاح' طلاق' وصیت' عدت' حوالہ' وقف اور صلح وغیرہ میں بھی ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت جائز ہے' یعنی حدود اور قصاص کے سوا تمام معاملات میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنانا جائز ہے اور امام مالک اور شافعی کے نزدیک ان معاملات میں عورت کو گواہ بنانا جائز نہیں ہے اور امام احمد کے اس میں دو قول ہیں۔ (فتح القدیر ج ۶ص ۴۵۱' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

(۶) وہ تمام امور جن پر مرد مطلع نہیں ہوتے' مثلاً حیض' عدت' رضاعت' ولادت' بکارت اور عورتوں کے عیوب وغیرہ ان میں صرف ایک عورت کی گواہی بھی جائز ہے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن چیزوں کو دیکھنے کی مرد استطاعت نہیں رکھتے ان میں عورتوں کی گواہی جائز ہے۔ (مصنف عبدالرزاق) علامہ مرغینانی حنفی[6]' شارح المہذب شافعی[7]' علامہ ابن قدامہ حنبلی[8] اور علامہ ابن رشد مالکی[9] وغیرہم نے اس کی تصریح کی ہے۔

۱۔ علامہ موفق الدین ابومحمد عبداللہ بن احمد بن قدامہ حنبلی متوفی ۶۲۰ھ' المغنی ج ۱۰ص ۱۵۵' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۰۵ھ
۲۔ علامہ کمال الدین بن ہمام حنفی متوفی ۸۶۱ھ' فتح القدیر ج ۶ص ۴۵۰' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر
۳۔ علامہ یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ' روضۃ الطالبین وعمدۃ المفتین ج ۱۱ص ۲۵۲' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۴۰۵ھ
۴۔ قاضی ابوالولید محمد بن احمد بن رشد مالکی اندلسی متوفی ۵۹۵ھ' بدایۃ المجتہد ج ۲ص ۳۴۸' مطبوعہ دارالفکر بیروت
۵۔ علامہ موفق الدین ابومحمد عبداللہ بن احمد بن قدامہ حنبلی متوفی ۶۲۰ھ' المغنی ج ۱۰ص ۱۵۰' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۰۵ھ
۶۔ علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی متوفی ۵۹۳ھ' ہدایہ اخیرین ص ۱۵۵' مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ ملتان
۷۔ شرح المہذب ج ۲۰ص ۲۵۶' مطبوعہ دارالفکر بیروت
۸۔ علامہ موفق الدین ابومحمد عبداللہ بن احمد بن قدامہ حنبلی متوفی ۶۲۰ھ' المغنی ج ۱۰ص ۱۶۱' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۰۵ھ
۹۔ قاضی ابوالولید محمد بن احمد بن رشد مالکی اندلسی متوفی ۵۹۵ھ' بدایۃ المجتہد ج ۲ص ۳۴۸' مطبوعہ دارالفکر بیروت

مالی معاملات میں ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کی شہادت مقرر کرنے کی وجوہات

عورتوں کی شہادت کے متعلق فقہاء اسلام کے مذاہب بیان کرنے کے بعد ہم دو چیزوں کی وضاحت کریں گے۔ ایک یہ کہ قرض کے لین دین اور کاروباری معاملات میں ایک مرد کی گواہی کے مقابلہ میں دو عورتوں کی گواہی کو کیوں مشروع کیا گیا ہے اور دوم یہ کہ حدود اور قصاص میں عورتوں کی گواہی کا کیوں اعتبار نہیں کیا گیا۔

سب سے پہلے یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ جس بات میں دو مرد میسر نہ آنے کی صورت میں ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنانے کا حکم دیا ہے' یہ اختیاری شہادت کا بیان ہے یعنی یہ وہ صورت نہیں ہے کہ جب کسی ہنگامی' ناگہانی یا اضطراری واقعہ میں کسی مالی معاملہ یا کسی انسانی حق میں موقع پر موجود کسی شخص کی گواہی کو اس معاملہ یا حق کے ثبوت میں پیش کرنا ہو' ایسے کسی ہنگامی اور ناگہانی واقعہ میں ایک مسلمان عورت تو الگ رہی' کفار کی شہادت سے بھی وہ معاملہ یا حق ثابت ہو جائے گا' قرآن مجید کی زیر بحث جس آیت میں ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کو گواہ بنانے کا حکم دیا گیا ہے' اس میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جب تم اپنے قصد اور اختیار سے اپنے کسی کاروباری معاملہ یا قرض کے لین دین پر گواہ بنانا چاہو تو اپنی پسند اور مرضی سے گواہ بناؤ اور وہ دو مسلمان مرد ہیں یا ایک مسلمان مرد اور دو مسلمان عورتیں ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ توسع اور اختیار کی حالت میں ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتیں کیوں رکھی گئی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عدالت میں مدعیٰ علیہ کے خلاف گواہی دینا بہت بڑی جرأت' حوصلہ اور دلیری کی بات ہے' کیونکہ جس فریق کے خلاف گواہی دی جاتی ہے' فطری طور پر وہ فریق اس گواہ کا دشمن ہو جاتا ہے اور فریق مخالف' گواہ کو ڈراتا اور دھمکاتا ہے اور مختلف ہتھکنڈوں سے اس کو مرعوب اور متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ عورتیں جب گواہی دینے کے لیے آتی ہیں تو رونے لگتی ہیں یا کوسنا شروع کر دیتی ہیں یا وکیل مخالف کے اعتراضات سے گھبرا کر بے ربط اور اول فول باتیں کرنا شروع کر دیتی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ عورتیں مردوں سے فطرۃً کمزور ہوتی ہیں اور ان میں مردوں کی بہ نسبت جرأت اور حوصلہ بہت کم ہوتا ہے' یہی وجہ ہے کہ عورتوں کو سپہ سالار' جرنل اور کمانڈر نہیں بنایا جاتا' دنیا میں معدودے چند عورتیں پائلٹ ہیں اور بالعموم ساری دنیا میں عورتوں کو پائلٹ نہیں بنایا جاتا' غرض ہمت' دلیری اور شجاعت کے تمام کام مردوں کے سپرد کیے جاتے ہیں اور عورتوں کو ان کاموں سے الگ رکھا جاتا ہے۔ چونکہ فریق مخالف کے خلاف گواہی دینا بہت جرأت اور حوصلہ کا کام ہے' اس وجہ سے اسلام نے یہ کام اصالۃً اور بالذات دو مردوں کے سپرد کیا ہے اور اگر کسی عقد اور معاملہ کے وقت دو مرد میسر نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنانے کا حکم دیا ہے' کیونکہ عین ممکن ہے کہ عدالت میں فریق مخالف کی جرح یا اس کے خوف سے عورت اپنی طبعی کمزوری سے گھبرا کر کچھ کا کچھ کہہ دے تو دوسری عورت اس کو صحیح بات یاد دلا دے' اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ تاکہ ایک عورت بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے۔

(البقرہ: ۲۸۲)

علامہ قرطبی اس آیت کی تفسیر میں ضلال کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شہادت میں ضلال یہ ہے کہ ایک چیز یاد رہے اور دوسری یاد نہ رہے اور انسان سرگشتہ و حیران ہو۔

(الجامع الاحکام القرآن ج ۳ ص ۳۹۷' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

وکلاء بیان کرتے ہیں کہ بچانوے فی صد مقدمات میں جب عورتیں گواہی کے لیے پیش ہوتی ہیں تو یا رو پڑتی ہیں یا گھبرا کر اول فول باتیں کرتی ہے یا کوسنا شروع کر دیتی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مرد فطرۃً قوی جرأت مند اور دلیر ہوتا ہے اور فریق مخالف کے دباؤ سے مرعوب اور متاثر نہیں ہوتا اس لیے وہ عدالت میں حوصلہ ہارے بغیر ٹھیک ٹھیک گواہی پیش کرتا ہے۔ اسلام نے جو نظام حیات پیش کیا ہے وہ چونکہ فطرتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اس وجہ سے اس نے ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کی گواہی رکھی ہے تاکہ گواہی کے موقعہ پر ان دونوں عورتوں کو ایک دوسری سے طمانیت خاطر رہے اور ڈھارس بندھی رہے اور جب کوئی عورت بوکھلا جائے اور گھبراہٹ میں کچھ کا کچھ کہنے لگے تو دوسری عورت اس کو صحیح بات یاد دلا دے۔

ایک مرد کی گواہی کے مقابلہ میں دو عورتوں کی گواہی کو مقرر کرنے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ تجارتی مال کی پیچیدگیوں' لین دین کی باریکیوں اور قرض کی ضروری شرائط اور قیود سے عام طور پر مرد پوری طرح واقف ہوتے ہیں' اس کے برخلاف عورت چونکہ فطری اور شرعی طور پر صرف امور خانہ داری کی ماہر ہوتی ہے اور عام دنیاوی معاملات میں وہ براہ راست ملوث نہیں ہوتی اور نہ اس کی باریکیوں سے کماحقہٗ واقف ہوتی ہے' اس وجہ سے کسی لین دین اور معاہدہ کے وقت فریق مخالف یہ چاہتا ہے کہ اس کے معاملہ پر زیادہ سے زیادہ تجربہ کار اور اہل شخص گواہی دے اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اولین مرحلہ میں دو مردوں کو گواہ بنایا جائے اور اگر دو مرد میسر نہ آسکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا دیا جائے تاکہ اس کے معاہدہ پر زیادہ سے زیادہ بہتر گواہی پیش کی جاسکے اور اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے اس نے انسانی فطرت کے قریب گواہی کا یہ ضابطہ مقرر کیا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عورت چونکہ فطرۃً منفعل مزاج ہوتی ہے' اس لیے فریق مخالف کے وکیل کی جرح کے موقع پر اس کا اصل موقف سے پھسل جانا اور فریق مخالف کے دلائل سے متاثر ہو جانا زیادہ ممکن ہے اس لیے اس کو اصل موقف پر قائم رکھنے کے لیے ایک اور گواہ کی ضرورت ہے تاکہ جب وہ منفعل یا متاثر ہو کر اصل موقف سے پھسلنے لگے تو دوسری گواہ اس کو سنبھال سکے اور اس کو بروقت اصل موقف یاد دلا دے۔

وہ امور جن میں صرف عورت کی گواہی معتبر ہے

مذکور الصدر بحث سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ مالیات کے اختیاری معاملات میں ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کی گواہی مشروع اور مقرر کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اسلام کے نزدیک عورت آدھی انسان ہے یا وہ حقیر یا کم درجہ کی مخلوق ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فطرۃً منفعل مزاج ہے یا مرد کے مقابلہ میں جرأت اور حوصلہ کم رکھتی ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ عادۃً' فطرۃً گھریلو معاملات اور امور خانہ داری میں ماہر ہوتی ہے اور مالیاتی نظام کی باریکیوں اور کاروباری نزاکتوں سے واقف اور ان امور کی ماہر نہیں ہوتی اس لیے ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کی گواہی مشروع اور مقرر کی گئی ہے ورنہ جن معاملات پر اس کی دسترس ہوتی ہے یعنی عورتوں سے متعلق معاملات' ان میں تنہا ایک عورت کی گواہی ہی مشروع اور مقرر کی گئی ہے۔ اگر اسلام کے نزدیک عورت آدھی انسان ہوتی یا ساقط الاعتبار ہوتی تو عورتوں کے مخصوص معاملات میں صرف ایک عورت کی گواہی کو کیوں کافی قرار دیا جاتا؟ اب ہم قارئین کے سامنے ایسی احادیث پیش کر رہے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ عورتوں کے مخصوص معاملات میں صرف عورتوں کی گواہی کافی ہے۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک عورت سے شادی کی' ایک اور عورت نے آ کر کہا: میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے' میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا کر یہ واقعہ عرض کیا' آپ نے فرمایا: تم اس عورت کو اب نکاح میں کس طرح رکھ سکتے ہو جب کہ یہ شہادت ہو چکی ہے۔ اس عورت کو طلاق دے دو۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۶۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی '۱۳۸۱ ھ)

اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ صرف ایک عورت نے یہ شہادت دی کہ اس نے حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ کو دودھ پلایا ہے اور صرف اسی ایک عورت کی شہادت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عقبہ بن عامر کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں' ہر چند کہ فقہاء احناف اور دیگر ائمہ کے نزدیک یہ حدیث استحباب پر محمول ہے' اور رضاعت میں صرف ایک عورت کی شہادت پر فیصلہ کرنا واجب نہیں ہے تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رضاعت میں ایک عورت کی شہادت پر فیصلہ کر دیا۔

نیز جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مرد جن امور کو دیکھنے کے شرعاً مجاز نہیں ہیں ان امور میں تنہا عورتوں کی شہادت پر فیصلہ کر دیا جائے گا' بلکہ صرف ایک عورت کی شہادت پر بھی فیصلہ کر دیا جائے گا۔ امام عبدالرزاق روایت کرتے ہیں:

ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ ابن شہاب نے کہا: اس بات پر سنت کے مطابق عمل ہوتا رہا ہے کہ عورتوں کے بچہ جننے' نومولود بچہ کے رونے اور عورتوں کے ان معاملات میں جن پر مرد مطلع نہیں ہوتے اور صرف عورتیں ہی ان معاملات کی نگہبان ہوتی ہیں' ان میں صرف عورتوں کی شہادت جائز ہے' پس جب بچہ جننے والی ایک مسلمان عورت گواہی دے یا ایک عورت سے زیادہ عورتیں نومولود کے رونے کی گواہی دیں تو یہ شہادت جائز ہے۔ (المصنف ج ۸ ص ۳۳۳ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۰ ھ)

نیز امام عبدالرزاق روایت کرتے ہیں:

ابن شہاب بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب نے نومولود کے رونے میں ایک عورت کی شہادت کو جائز قرار دیا۔
(المصنف ج ۸ ص ۳۳۴ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۰ ھ)

قعقاع بن حکیم بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تنہا عورتوں کی شہادت حمل اور حیض وغیرہ صرف ان امور میں جائز ہے جن پر صرف عورتیں ہی مطلع ہوتی ہیں۔ (المصنف ج ۸ ص ۳۳۳ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۰ ھ)

امام شعبی اور حسن بصری نے کہا کہ جن امور پر مرد مطلع نہیں ہوتے ان میں ایک عورت کی شہادت بھی جائز ہے۔
(المصنف ج ۸ ص ۳۳۳ 'مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۰ ھ)

عورت کی شہادت کو نصف شہادت قرار دینے کی حکمتیں

مذکور الصدر احادیث' آثار' اقوال تابعین اور ائمہ مذاہب کی تصریحات سے یہ واضح ہو گیا کہ جو امور عورتوں کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں' ان میں صرف ایک عورت کی شہادت پر بھی فیصلہ کرنا جائز ہے اس لیے یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ مالی معاملات کی اختیاری گواہی میں چونکہ ایک مرد کی گواہی کے مقابلہ میں دو عورتوں کی گواہی رکھی گئی ہے اس لیے اسلام نے عورت کو آدھا انسان قرار دیا ہے یا اس کی گواہی کو کمتر قرار دیا ہے' اگر اسلام کے نزدیک عورت آدھا انسان ہوتی یا وہ ذلیل اور حقیر ہوتی تو ان معاملات میں صرف ایک عورت کی گواہی پر فیصلہ کا مدار کیوں رکھا جاتا؟

اگر مرد یہ اعتراض کریں کہ بعض نسوانی معاملات میں ان کی شہادت اصلاً معتبر نہیں ہے' جب کہ ان معاملات میں عورتوں میں سے ایک عورت کی گواہی قبول کر لی جاتی ہے تو مردوں کو اسلام نے بالکل ساقط الاعتبار کر دیا اور ان کو آدھے انسان کا درجہ بھی نہیں دیا تو کیا مردوں کا یہ اعتراض درست اور معقول ہو گا؟ نہیں! بلکہ یہی کہا جائے گا کہ جن دنیاوی معاملات میں مردوں کو شہادت کی اہلیت ہے وہاں مردوں کی شہادت قبول کی جاتی ہے اور جن نسوانی معاملات میں عورتیں شہادت کی اہل ہیں وہاں عورتوں کی شہادت قبول کی جاتی ہے' اسلام نے جس صنف کی شہادت کا جس جگہ اعتبار کیا ہے وہ عین حکمت اور فطرت کے

مطابق ہے۔ سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

مزید غور فرمایئے کہ اثبات زنا میں دو کے بجائے چار مردوں کی گواہی مقرر کی گئی ہے' اب کیا مرد یہ کہہ سکتے ہیں کہ جناب ہماری گواہی تو آدھی کردی گئی ہے کیونکہ باقی حدود اور معاملات میں دو مردوں کی گواہی کافی ہوتی ہے اور اب زنا میں بجائے دو کے چار مردوں کی گواہی ضروری قرار دی گئی ہے تو گویا دو مردوں کو ایک کے قائم مقام کیا ہے اور یہ مردوں کو آدھا انسان قرار دینا ہے۔ اس کے جواب میں بھی یہی کہا جائے گا کہ چونکہ زنا کی سزا بہت سخت رکھی گئی ہے جس میں شادی شدہ زانی کو رجم کردیا جاتا ہے اس لیے اس کے ثبوت کی بھی کڑی شرط رکھی ہے اور ثبوت زنا کو چار مسلمان مردوں کی گواہی پر موقوف کیا گیا ہے۔

پھر یہ چیز بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ شہادت دینا کوئی حق یا انعام نہیں ہے' اگر ایسا ہوتا تو عورتیں کہہ سکتی تھیں کہ ہمارا حق کم کر دیا گیا ہے' عدالت میں جا کر فریق مخالف کے خلاف گواہی دینا اور اس کی دشمنی مول لینا یہ تو ایک ابتلاء اور مصیبت ہے' بعض اوقات شہادت دینے کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر جانا پڑتا ہے اور سفر کی صعوبتیں اٹھانی پڑتی ہیں' اسلام نے صنف نازک پر جیسے اور احسانات کیے ہیں کہ اس پر معاش اور بچوں کی کفالت کا بوجھ نہیں رکھا' ایام حیض میں نمازوں کا مکلف نہیں کیا' حالت حیض' حمل اور رضاعت میں روزے قضاء کرنے کی سہولت دی ہے' اسی طرح اسلام کا عورتوں پر یہ بھی احسان اور انعام ہے کہ اس پر شہادت ادا کرنے کا بوجھ کم سے کم رکھا ہے' حدود اور قصاص کے معاملات جن کی گواہی دینے میں زیادہ خطرہ اور مشقت ہے ان میں اس کو شہادت کا بالکل مکلف نہیں کیا اور مالی معاملات میں اس کے بوجھ کو کم کر دیا ہے اور جو بوجھ ایک مرد پر ڈالا جاتا ہے وہ دو عورتوں پر تقسیم کر دیا۔ الحمد للہ علی احسانہ و انعامہ۔

اس مسئلہ کے دیگر پہلوؤں کو جاننے کے لیے ''شرح صحیح مسلم'' جلد خامس کا مطالعہ فرمائیں' ہم نے وہاں اس مسئلہ کے اور پہلوؤں پر بھی بحث کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب گواہوں کو (گواہی کے لیے) بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ (البقرہ: ۲۸۲)

گواہی کے لیے بلائے جانے پر گواہوں کے جانے کا شرعی حکم

اگر کسی معاملہ پر متعدد گواہ ہیں تو ہر گواہ کا گواہی دینا واجب نہیں ہے' بلکہ یہ وجوب کفائی ہے' ان میں سے کسی بھی دو گواہوں نے گواہی دے دی تو باقی سب سے وجوب ساقط ہو جائے گا اور اگر کسی نے گواہی نہیں دی تو سب گنہ گار ہوں گے' اور اگر کسی معاملہ پر صرف دو گواہ ہوں تو ان کا گواہی دینا متعین ہے اور جب ان کو گواہی کے لیے بلایا جائے تو ان کا جانا واجب ہے اور نہ جانا مکروہ تحریمی ہے۔

علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس' قتادہ اور ربیع وغیرہ نے کہا ہے کہ جب گواہوں کو گواہی کے لیے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں' عطاء اور حسن بصری نے کہا: یہ ممانعت تحریم کے لیے نہیں ہے' گواہ کے لیے گواہی دینا اور نہ گواہی دینا دونوں جائز ہیں' شعبی نے کہا: اگر اس کے علاوہ اور کوئی گواہ نہیں ہے تو اس پر گواہی دینا متعین ہے ورنہ اس کو اختیار ہے' مجاہد' عکرمہ' سعید بن جبیر وغیرہ نے کہا کہ اگر وہ اس سے پہلے شہادت دے چکے ہیں تو جب ان کو ادا شہادت کے لیے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں' نقاش نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح مروی ہے اور اگر یہ روایت صحیح ہے تو پھر اس سے عدول نہیں کیا جائے گا اور ادا شہادت سے انکار کی ممانعت تحریمی ہوگی۔

حسن بصری نے کہا: مسلمانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا مستحب ہے' اگر گواہ زیادہ ہوں اور مدعی کے حق

میں معطل ہونے کا خدشہ نہ ہو تو جس گواہ کو بلایا گیا ہے اس کا جانا مستحب ہے اور کسی عذر کی وجہ سے ان کا نہ جانا بھی جائز ہے اور اس میں گناہ نہیں ہے اور اگر گواہ کو یہ خدشہ ہو کہ اس کے نہ جانے سے کسی کا حق معطل ہو جائے گا تو پھر اس کا شہادت دینے کے لیے جانا واجب ہے۔ (البحر المحیط ج ۲ ص ۷۲۵ 'مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۲ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور نہ کسی لکھنے والے کو ضرر پہنچایا جائے اور نہ گواہ کو اور اگر تم نے ایسا کیا تو وہ بے شک تمہارا گناہ ہو گا۔ (البقرہ: ۲۸۲)

کاتب اور گواہ کے ضرر کا بیان

اس آیت کی دو قرأتیں ہیں ایک قرأت کے مطابق معنی یہ ہے کہ نہ کاتب کو ضرر پہنچایا جائے نہ گواہ کو' اس قرأت کے مطابق صاحب حق کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ وہ کاتب اور گواہ کو ان کے کاموں سے روک کر انہیں لکھنے اور گواہی دینے کے لیے مجبور کریں یا ان کو اس سلسلہ میں ہونے والے اخراجات ادا نہ کریں یا لکھنے اور گواہی دینے میں جو ان کا وقت خرچ ہو اس کا معاوضہ ان کو ادا نہ کریں۔

اور دوسری قرأت کے مطابق معنی یہ ہے کہ کاتب اور گواہ صاحب حق کو ضرر نہ پہنچائیں' مثلاً کاتب صاحب حق کے املاء کرانے کے خلاف کچھ کا کچھ لکھ دے' یا گواہ اپنی طرف سے گواہی میں کچھ بڑھا دے یا کچھ کم کر دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر تم سفر میں ہو (اور تمہیں دین پر مبنی کوئی معاملہ کرنا ہو) اور تمہیں دستاویز لکھنے والا نہ ملے تو قبضہ دی ہوئی رہن (کی بنا پر دین کا معاملہ کرو) پھر اگر تم کو ایک دوسرے پر اعتبار ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ وہ اس کی امانت ادا کر دے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ (البقرہ: ۲۸۳)

سفر اور حضر میں رہن رکھنے کا جواز

اس آیت میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ اگر تم سفر میں ہو اور تم نے کسی شخص سے کوئی چیز ادھار خریدنی ہے اور بائع کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے تمہیں دوران سفر کاتب یا گواہ دستیاب نہ ہوں تو بائع کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے اپنی کوئی چیز اس کے پاس رہن رکھ دو اور اور مقبوضہ کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ بائع اس چیز پر صرف قبضہ کرے گا' وہ اس میں تصرف کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کا مجاز اور مختار نہیں ہے' بعض فقہاء تابعین نے یہ کہا ہے کہ اگر کاتب موجود ہو تو پھر کسی چیز کو گروی رکھنا جائز نہیں ہے۔

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ضحاک نے کہا: اگر کوئی شخص سفر میں ہو اور وہ مدت معینہ کے ادھار پر کسی چیز کی بیع کرے' اور اس کو کاتب نہ ملے تو اس کے لیے رہن پر قبضہ کرنا جائز ہے اور اگر کاتب ہو تو پھر اس کے لیے رہن پر قبضہ کرنا جائز نہیں ہے۔

(جامع البیان ج ۳ ص ۹۲ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

اور بعض فقہاء تابعین نے یہ کہا ہے کہ صرف سفر میں رہن رکھنا جائز ہے اور حضر میں رہن رکھنا جائز نہیں ہے۔

امام ابن جریر روایت کرتے ہیں:

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ رہن پر قبضہ کرنا صرف سفر میں جائز ہے' حضر میں جائز نہیں ہے۔

(جامع البیان ج ۳ ص ۹۲ 'مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ)

لیکن یہ دونوں قیدیں اتفاقی ہیں اور ان کا مفہوم مخالف معتبر نہیں ہے' علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں:

تمام اہل علم کے نزدیک یہ حکم اس طرح نہیں ہے اور تمام شہروں کے فقہاء اور عامۃ السلف کے نزدیک شہر میں بھی کسی چیز کا گروی رکھنا جائز ہے۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۵۲۳ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور '۱۴۰۰ھ)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کے بدلہ اپنی زرہ رہن رکھی' میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو کی روٹی اور پرانی چربی لے کر گیا اور میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: آل محمد کے پاس صبح اور شام کے لیے صرف ایک صاع ہے۔ (چار کلو گرام)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ گروی رکھ کر ایک یہودی سے طعام خریدا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۳۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی '۱۳۸۱ھ)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے مدت معینہ کے ادھار پر طعام خریدا اور اپنی زرہ گروی رکھ دی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ گروی رکھی اور اس سے اپنے اہل کے لیے جو خریدے۔

(سنن ابن ماجہ ص ۱۷۵ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

رہن کی تعریف اور رہن سے فائدہ اٹھانے میں مذاہب فقہاء

رہن کا معنی ہے: گروی رکھنا' اصطلاح شرع میں اس کا معنی ہے: دوسرے کے مال کو اپنے حق میں اس لیے روکنا' کہ اس کے ذریعہ سے اپنے حق کو کلا یا جزءً وصول کرنا ممکن ہو' رہن میں رکھی ہوئی چیز کو مرہون' رہن رکھنے والے کو راہن اور جس کے پاس کوئی چیز رہن رکھی جائے اس کو مرتہن کہتے ہیں' عقد رہن بالاجماع جائز ہے۔ (ہدایہ اخیرین ص ۵۱۶ 'مطبوعہ شرکت علمیہ' ملتان)

امام ابوحنیفہ' امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک رہن شدہ چیز سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے' اور امام شافعی کے نزدیک جائز ہے' ان کی دلیل یہ حدیث ہے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رہن شدہ سواری پر اس کے خرچ کے بدلہ میں سواری کی جائے گی' اور اس کے تھنوں سے دودھ نکال کر پیا جائے گا اور جو اس پر سواری کرے گا یا پیئے گا خرچ اس کے ذمے ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۴۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی '۱۳۸۸ھ)

علامہ بدرالدین عینی حنفی اس حدیث کے جواب میں لکھتے ہیں:

اس حدیث سے ابراہیم نخعی' امام شافعی اور ظاہریہ (غیر مقلدین) نے اس پر استدلال کیا ہے کہ رہن رکھوانے والا (مقروض) سواری پر اپنے خرچ کے باعث سواری کرے گا اور اس کا دودھ پیئے گا' ابن حزم نے "محلیٰ" میں لکھا ہے کہ رہن رکھوانے والا جس طرح رہن رکھوانے سے پہلے اس سے منافع حاصل کرتا تھا اسی طرح رہن رکھوانے کے بعد بھی اس چیز سے منافع حاصل کرتا رہے گا اور اس سے کسی منفعت کو روکا نہیں جائے گا اور رہن شدہ جانور پر سواری کرنے اور اس کا دودھ پینے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح پہلے یہ منافع رہن رکھوانے والے کے لیے تھے اب بھی رہیں گے' ہاں! اگر وہ ان جانوروں کو ضائع کرے تو پھر وہ ان پر خرچ نہیں کرے گا' اور رہن رکھنے والا (راہن) ان پر خرچ کرے گا اور وہی اس پر سواری کرنے اور اس سے دودھ پینے کا نفع بھی حاصل کرے گا' اور اس کی رقم کو اس کے قرض میں محسوب نہیں کیا جائے گا' قرض کم ہو یا زیادہ'

اور یہ اس لیے کہ رہن رکھوانے والے کی ملکیت مرہون میں باقی ہے اور وہ مرہون چیز اس کی ملکیت سے خارج نہیں ہوئی 'لیکن اس جانور پر سواری کرنا اور اس کا دودھ دوہنا خصوصیت سے اس شخص کا حق ہے جو اس جانور پر خرچ کرے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں ہے۔

امام ابوحنیفہ' امام ابو یوسف' امام محمد' امام مالک اور ایک روایت میں امام احمد نے یہ کہا ہے کہ رہن رکھوانے والے کا رہن سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے 'کیونکہ یہ رہن رکھنے کے منافی ہے 'رہن کا معنی ہے: دائمی طور پر کسی چیز کو محبوس کرنا' لہٰذا وہ اس سے نفع اٹھانے کا مالک نہیں ہے 'اور مرہون سے خدمت طلب کرنا' اس پر سواری کرنا' اس کا دودھ دوہنا اور اس میں سکونت رکھنا وغیرہ اس کے لیے جائز نہیں ہے 'اور رہن رکھنے والے کے سوا اور اس کی اجازت کے بغیر کسی اور کے ہاتھ پر مرہون کو فروخت کرنا بھی اس کے لیے جائز نہیں ہے' اور اگر اس نے فروخت کر دیا تو یہ مرتہن (رہن رکھنے والے) کی اجازت پر موقوف ہے' اگر اس نے اجازت دے دی تو یہ فروخت کرنا جائز ہو گا اور اب قیمت اس کے پاس رہن ہوگی' اسی طرح مرتہن کے لیے بھی رہن سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے' حتیٰ کہ اگر غلام رہن ہو تو وہ اس سے خدمت طلب نہیں کرے گا' سواری کا جانور ہو تو اس پر سواری نہیں کرے گا' اگر کپڑا ہو تو اس کو نہیں پہنے گا' مکان ہو تو اس میں سکونت نہیں کرے گا اور مصحف ہو تو اس کی تلاوت نہیں کرے گا' اور راہن (رہن رکھوانے والے) کی اجازت کے بغیر مرتہن کے لیے رہن کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ امام طحاوی نے کہا ہے کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ رہن کا خرچ راہن کے ذمہ ہے اور اس پر خرچ کرنا مرتہن کی ذمہ داری نہیں ہے اور جس حدیث سے امام شافعی نے استدلال کیا ہے وہ مجمل ہے' اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کون رہن پر سواری کرے گا اور کون اس کا دودھ پیئے گا' پس مخالف کے لیے یہ کہاں سے جائز ہو گیا کہ اس کو راہن کے ساتھ مخصوص کر دے نہ کہ مرتہن کے لیے اور بغیر دلیل کے اس کو ان میں سے کسی ایک کے ساتھ خاص کر دینا جائز نہیں ہے' اور ہشیم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب سواری کا جانور رہن ہو تو مرتہن پر اس کو چارہ ڈالنا لازم ہے اور اس کے تھنوں سے دودھ نکالا جائے گا اور اس کا خرچ اس کے ذمہ ہے جو اس کا دودھ پیئے گا' اور اس پر سواری کرے گا' اس حدیث سے یہ متعین ہو گیا کہ ''صحیح بخاری'' کی حدیث میں سواری کرنے اور دودھ پینے کے منافع مرتہن پر محمول ہیں نہ کہ راہن پر' مرتہن رہن پر سواری کرے گا اور اس کا دودھ نکالے گا اور اس کے معاوضہ میں اس کا خرچ اٹھائے گا' ہمارے نزدیک یہ حکم اس وقت تھا جب سود لینا مباح تھا اور اس قرض سے منع نہیں فرمایا تھا جس میں نفع لیا جائے' اور نہ غیر مساوی چیزوں کی بیع سے منع فرمایا تھا' اس کے بعد آپ نے سود کو حرام کر دیا اور ہر اس قرض سے منع فرما دیا جس سے کوئی منفعت حاصل ہو۔

علماء کا اس پر اجماع ہے کہ رہن کا خرچ راہن کے ذمہ ہے مرتہن کے ذمہ نہیں ہے اور مرتہن کے لیے رہن کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ رہن کا تقاضا یہ ہے کہ راہن اس کو مرتہن کے قبضہ میں دے دے اور پھر اس سے سروکار نہ رکھے' اسی لیے اس پر اجماع ہے کہ اگر راہن اپنی لونڈی رہن رکھ دے تو وہ اس سے مباشرت نہیں کر سکتا' نیز امام طحاوی نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ رہن سے کوئی نفع حاصل نہیں کیا جائے گا۔ (عمدۃ القاری ج ۱۳ ص ۷۲ - ۷۳ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ)

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

رہن سے نفع حاصل کرنا مطلقاً جائز نہیں ہے' اس سے خدمت لے سکتا ہے' نہ اس میں سکونت کر سکتا ہے' نہ اس کو پہن سکتا ہے' نہ اس کو کرایہ پر دے سکتا ہے نہ کسی کو عاریۃً دے سکتا ہے' نہ راہن نہ مرتہن' ہاں! اگر راہن مرتہن کو یا مرتہن راہن کو اجازت دے دے تو پھر جائز ہے' کہا گیا ہے کہ مرتہن کے لیے اجازت کے باوجود نفع لینا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ سود ہے' اور یہ بھی کہا گیا

ہے کہ یہ سود اس وقت ہوگا جب رہن کے عقد میں یہ شرط ہو کہ مرتہن اس سے نفع حاصل کرے گا ورنہ سود نہیں ہے۔ "اشباہ" اور "جواہر" میں مذکور ہے کہ راہن نے مرتہن کے لیے درخت کے پھلوں کا کھانا' یا گھر میں رہنا یا بکری کا دودھ پینا مباح کر دیا اور اس نے یہ منافع حاصل کیے تو وہ اس کا ضامن نہیں ہوگا' نیز "اشباہ" میں لکھا ہے کہ مرتہن کے لیے نفع حاصل کرنا مکروہ ہے۔

(درمختار علی ھامش ردالمحتار ج ۵ ص ۳۱۱۔ ۳۱۰ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

رہن کی شرائط اور ضروری مسائل

عقد رہن ایجاب اور قبول سے منعقد ہوتا ہے' مثلاً راہن یہ کہے کہ تمہارا دین جو میرے ذمہ ہے اس کے مقابلہ میں' میں نے یہ چیز تمہارے پاس رکھی' رہن کی شرائط حسب ذیل ہیں:

(۱) راہن اور مرتہن عاقل ہوں' نا سمجھ بچے اور مجنون کا رہن رکھنا صحیح نہیں ہے۔

(۲) رہن کسی شرط پر معلق نہ ہو اور اس کی اضافت وقت کی طرف کی جائے۔

(۳) جو چیز غیر منقسم اور غیر متمیز ہو اس کو رہن رکھنا صحیح نہیں ہے' مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ میں اپنا آدھا مکان رہن رکھتا ہوں اور آدھے کی تحدید اور تعیین نہ کرے۔

(۴) جس چیز کو رہن رکھا ہے وہ قابل فروخت ہو اور وہ چیز اس وقت موجود ہو اور مال متقوم ہو' درخت پر جو پھل نہیں لگے' جانور کے پیٹ میں جو بچہ ہے اور مردار اور خون ایسی حرام چیزوں کو رہن رکھنا جائز نہیں ہے۔

مرہون چیز کی مالیت مرتہن کی ضمان میں ہوتی ہے اور خود وہ چیز مرتہن کے پاس امانت ہوتی ہے' ان کے فرق کی وضاحت اس طرح ہے کہ اگر مرتہن مرہون کو راہن سے خرید لے' تو اس چیز پر مرتہن کا قبضہ خریداری کے قائم مقام نہیں ہوگا کیونکہ یہ اس کے قبضہ میں امانت ہے' اور خریداری کے لیے قبضہ ضمان چاہیے' اور مرہون کا خرچ راہن کے ذمہ ہے' مرتہن کے ذمہ نہیں ہے' اگر مرہون غلام تھا اور وہ مر گیا تو اس کی تجہیز وتکفین راہن کے ذمہ ہے' اگر مرہون چیز راہن کے پاس ہلاک ہو جائے تو دین اور اس چیز کی قیمت میں جو مقدار کم ہوگی اس کو ہلاک قرار دیا جائے گا' مثلاً ہزار روپے دین کے مقابلہ میں دو ہزار روپے کا گھوڑا گروی رکھا تھا تو گھوڑا ہزار روپے کے مقابلہ میں ہلاک ہو گیا اور اب مرتہن راہن کو کچھ نہیں دے گا اور اگر صورت مفروضہ میں گھوڑے کی قیمت پانچ سو روپے تھی تو ہزار روپے رہن میں سے پانچ سو روپے ساقط ہو گئے اور باقی ماندہ پانچ سو روپے راہن کے ذمہ واجب الادا ہیں' اور اگر دین اور مرہون کی مالیت برابر ہو مثلاً اس صورت میں گھوڑا ہزار روپے کا ہو تو کسی کے ذمہ کچھ واجب نہیں ہے۔

اگر مرتہن نے دین میں کوئی ایسا تصرف کیا جس سے وہ چیز ہلاک ہو گئی یا اس میں نقصان پیدا ہو گیا تو وہ اس کا ضامن ہوگا' یعنی اس کا تاوان ادا کرے گا' مثلاً ایک شیروانی دو ہزار کی تھی' مرتہن نے راہن کی اجازت سے اس کو پہنا اور اس پر داغ دھبے لگ گئے' جس سے وہ ہزار روپے کی رہ گئی تو اس ہزار روپے کی کمی کا تاوان مرتہن راہن کو ادا کرے گا' اور اس نے وہ دھلنے کے لیے دی اور دھوبی نے گم کر دی تو وہ دو ہزار روپے کا ضامن ہوگا' اگر مرتہن نے راہن کی اجازت کے بغیر رہن سے فائدہ اٹھایا اور وہ چیز ہلاک ہوئی تو بھی مرتہن کو تاوان ادا کرنا ہوگا' مرہون کی حفاظت کا خرچ مثلاً اس کے لیے مکان کا کرایہ اور چوکیدار کی تنخواہ مرتہن کے ذمہ ہے' اور مرہون کی بقا کا خرچ مثلاً جانوروں کے چارے کا خرچ یا باغ میں پانی لگانے اور پھل توڑنے کے اخراجات وغیرہ یہ راہن کے ذمہ ہیں۔

(عالم گیری ج ۵ ص ۴۴۳۔ ۴۳۴' ردالمحتار ج ۵ ص ۳۱۲۔ ۳۰۷' ہدایہ اخیرین ص ۵۲۰۔ ۵۱۶ 'ملخصاً)

فقہاء نے یہ نہیں لکھا کہ گروی رکھے ہوئے جانوروں کے دودھ کی آمدنی اور باغ کے پھلوں کی آمدنی کا کون مالک ہوگا' مرتہن تو اس کا مالک نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ سود ہے' اس لیے ظاہر ہے کہ اس آمدنی کا مالک راہن ہی ہوگا' کیونکہ ''درمختار'' میں مذکور ہے کہ مرتہن کی اجازت سے راہن مرہون سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر اگر تم کو ایک دوسرے پر اعتبار ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ وہ اس کی امانت ادا کرے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ (البقرہ: ۲۸۳)

اعتماد کی صورت میں وثیقہ لکھوانے' گواہ بنانے اور گروی رکھنے کو ترک کرنے کی رخصت

یعنی اگر دائن کو مقروض کی امانت داری پر اعتماد ہو اور وہ دستاویز لکھنے' کسی کو گواہ بنانے اور قرض کے مقابلہ میں کسی چیز کو گروی رکھنے کے بغیر اپنا مال مقروض کے حوالے کر دے یا اپنا مال اس کو فروخت کر دے' تو مقروض پر لازم ہے کہ وہ دائن کے اعتماد پر پورا اترے اور اس کی امانت اس کو ادا کر دے' یہ امر وجوب کے لیے ہے اور اس پر اجماع ہے کہ قرضوں کا ادا کرنا واجب ہے' حاکم کو چاہیے کہ وہ مقروض کو قرض ادا کرنے کا حکم دے اور مقروض کو قرض ادا کرنے پر مجبور کرے۔

احادیث کی روشنی میں دین اور قرض کے ضروری مسائل

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے لوگوں سے اموال لیے اور وہ ان کو ادا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تو اللہ تعالیٰ ان اموال کو اس کی طرف سے ادا کر دے گا اور جس نے لوگوں کے مال لیے درآں حالیکہ وہ ان کو تلف کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اللہ تعالیٰ اس شخص کو تلف کر دے گا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۲۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

یعنی جس شخص نے کوئی تقصیر نہیں کی' اس کی نیت قرض ادا کرنے کی تھی' لیکن اس کو اتنے پیسے دستیاب نہیں ہوئے' یا اس کو اچانک موت آ گئی اور اس کو قرض ادا کرنے کی مہلت نہیں ملی حالانکہ اس کی نیت ادا کرنے کی تھی' تو اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کی طرف سے قرض خواہ کو ادائیگی کر دے گا اور اس سے مطالبہ نہیں ہوگا اور جیسا کہ طریقہ ہے کہ اگر مقروض نے قرض ادا نہ کیا ہو تو اس کی نیکیاں قرض خواہ کو دے دی جاتی ہیں یا قرض خواہ کے گناہ مقروض کے نامہ اعمال میں ڈال دیئے جاتے ہیں' اس کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوگا' اور جس شخص کی نیت یہ ہو کہ وہ دائن کو اس کا مال نہیں دے گا' تو اللہ تعالیٰ اس کے جسم کو ضائع کر دے گا یا اس کے مال کو ضائع کر دے گا یا آخرت میں اس کو عذاب دے گا۔

امام ابن ماجہ اور امام حاکم نے محمد بن علی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جعفر لوگوں سے قرض لیتے تھے' ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے: جب تک مقروض قرض کو ادا نہ کرے اللہ مقروض کے ساتھ ہوتا ہے' اس حدیث کی سند حسن ہے' نیز امام حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ جس بندہ کی نیت قرض کو ادا کرنا ہو' اس کے ساتھ اللہ کی مدد ہوتی ہے۔

(فتح الباری ج ۵ ص ۵۴' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' ۱۴۰۱ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا ہو تو مجھے اس سے خوشی نہیں ہوگی کہ میرے پاس تین دن تک اس میں سے کوئی چیز رہے ماسوا اس کے جس کو میں قرض کی ادائیگی

کے لیے رکھ لوں۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۲۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سختی کے ساتھ قرض کا تقاضا کیا' آپ کے اصحاب نے اس کو مارنے یا ڈانٹنے کا ارادہ کیا' آپ نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو' کیونکہ صاحب حق کو بات کرنے کی گنجائش ہوتی ہے اور اس کے لیے اونٹ خرید دو اور اس کا قرض ادا کر دو' صحابہ نے کہا: جتنی عمر کا اونٹ اس کو ادا کرنا ہے اس سے زیادہ کامل رہا ہے' آپ نے فرمایا: وہی خرید لو اور اس کو ادا کر دو' کیونکہ تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اچھی طرح قرض ادا کرے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۲۱ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مدت پوری ہونے کے بعد قرض کا مطالبہ کرنا جائز ہے' اور قرض خواہ کا مطالبہ میں سختی کرنا بھی درست ہے اور مقروض کو اس کی سختی کا جواب سختی سے نہیں دینا چاہیے اور مقروض اصل قرض سے زیادہ ادا کرے تو مستحسن ہے بہ شرطیکہ قرض خواہ کی طرف سے اس کا مطالبہ نہ ہو ورنہ حرام ہے' اور اچھے جائز کاموں کے لیے قرض لینا درست ہے' اور امام کے لیے بیت المال پر قرض لینا جائز ہے اور جو شخص امام کے ساتھ بدتمیزی کے ساتھ پیش آئے وہ تعزیر کا مستحق ہے الا یہ کہ امام معاف کر دے' اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زبردست حوصلہ' حلم' تواضع اور آپ کے خلق عظیم کا بیان ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں یہ دعا کرتے تھے کہ اے اللہ! میں گناہ اور قرض سے تیری پناہ میں آتا ہوں' کسی شخص نے کہا: آپ قرض سے بہت پناہ مانگتے ہیں' آپ نے فرمایا: جب انسان مقروض ہوتا ہے تو وہ بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور وعدہ کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۲۲ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غنی کا (قرض کی ادائیگی میں) تاخیر کرنا ظلم ہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۲۳ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور گواہی نہ چھپاؤ اور جو شخص گواہی چھپائے اس کا دل گناہ آلودہ ہے۔ (البقرۃ: ۲۸۳)

گواہی دینے کا وجوب اور دل کی طرف گناہ کی اضافت کی حکمتیں

یہ نہی تحریم ہے اور گواہی کا چھپانا حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر وعید معلق فرمائی ہے کہ جو شخص گواہی کو چھپائے گا اس کا دل گناہ آلودہ ہے' گواہی چھپانے کا معنی یہ ہے کہ انسان گواہی ادا کرنے سے اپنے آپ کو روک لے اور گواہی چھپانا اس وقت حرام ہے جب اس کے گواہی نہ دینے سے صاحب حق کا حق ضائع ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: جو شخص گواہی چھپائے گا اس کا دل گناہ آلودہ ہے' اور گناہ کی اضافت دل کی طرف کی ہے کیونکہ شہادت چھپانے اور اس کو ادا نہ کرنے کی نیت کا تعلق دل سے ہے' اور جب کسی فعل کی اضافت کسی عضو کی طرف کی جاتی ہے تو اس میں زیادہ تاکید ہوتی ہے' جیسے کہتے ہیں: میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا' اور میرے دل میں فلاں کی محبت ہے اور خصوصاً دل کی طرف اضافت اس لیے کی ہے کہ دل انسان کے اجزاء میں اشرف اجزاء اور رئیس اعضاء ہے اور اس کا فعل باقی اعضاء کی بہ نسبت زیادہ عظیم ہے' اور ایک توجیہ یہ کی گئی ہے کہ گناہ کی اضافت دل کی طرف اس لیے کی ہے کہ یہ گمان نہ کیا جائے کہ شہادت چھپانے کے گناہ کا تعلق صرف زبان کے ساتھ ہے اور یہ معلوم ہو جائے کہ گناہ کا اصل سرچشمہ اور معدن انسان کا دل ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سنو! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ صحیح ہو تو پورا جسم صحیح ہوتا ہے اور جب وہ خراب ہوتا ہے تو پورا جسم خراب ہوتا ہے' سنو! وہ قلب ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

یا قلب کی طرف اضافت اس لیے کی ہے کہ گناہ کا اثر قلب میں ظاہر ہوتا ہے۔

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے' اگر وہ توبہ کرے' اس کام سے باز آ جائے اور استغفار کرے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر وہ زیادہ گناہ کرے تو اس کے دل میں اور سیاہ نکتے پیدا ہو جاتے ہیں اور یہی وہ رین (ران) ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ ہرگز نہیں بلکہ ان کے کاموں نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا۔ (المطففین: ۱۴)

(سنن ابن ماجہ ص ۳۱۳' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۷' مطبوعہ کتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

وثیقہ لکھنے' گواہ بنانے اور رہن رکھنے کے اسرار اور حکمتیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مدت معینہ کے ادھار پر کی جانے والی بیع کی دستاویز لکھنے' اس بیع پر گواہ بنانے اور مقروض کی کسی چیز کو گروی رکھنے کا جو حکم دیا ہے وہ دین اور دنیا کی صلاح پر مبنی ہے' دنیا کی صلاح یہ ہے کہ اگر اس بیع کو لکھا نہ جائے تو اس میں اختلاف' تنازع اور فساد ہو سکتا ہے اور انسان کے ہاتھ سے دین اور دنیا جاتی رہے گی' اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: تم ایک دوسرے کے ساتھ نزاع نہ کرو ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ (الانفال: ۴۶) اور جب خرید و فروخت کے معاملات لکھے ہوئے ہوں گے اور ان پر گواہ موجود ہوں گے تو کوئی فریق دوسرے فریق کے حق کا انکار نہیں کر سکے گا اور نہ اس کے حق میں کوئی کمی کر سکے گا اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بیع کرنے سے منع فرمایا دیا جس میں مبیع یا ثمن کی مقدار مجہول ہو یا مبیع یا ثمن کو ادا کرنے کی مدت مجہول ہو' کیونکہ اس جہالت کی وجہ سے فریقین میں اختلاف اور نزاع ہوگا' اور یہ اختلاف آپس میں لڑائی جھگڑے' کینہ' بغض اور عداوت کا موجب ہوگا اور اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کو حرام کرنے کا بھی یہ سبب بیان کیا ہے کہ ان کی وجہ سے عداوت اور بغض پیدا ہوتا ہے (المائدہ: ۹۰)۔

نیز اللہ تعالیٰ نے دستاویز لکھنے' گواہ بنانے اور رہن رکھنے کا حکم اس لیے دیا ہے کہ بائع کا مال محفوظ رہے اور خریدار کی نادہندگی سے مامون رہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد جگہ یہ حکم دیا ہے کہ مال کی حفاظت کی جائے اور اس کو ضائع ہونے سے بچایا جائے' ارشاد فرمایا:

اور کم عقلوں (ناسمجھ یتیموں) کو ان کے (وہ) مال نہ دو (جو تمہاری تحویل میں ہیں) جن (اموال) کو اللہ نے تمہاری گزر اوقات کا ذریعہ بنایا ہے۔ (النساء: ۵)

نیز فرمایا: اور وہ لوگ جو خرچ کرتے وقت نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ تنگی سے کام لیتے ہیں اور ان کا خرچ میانہ روی اور اعتدال سے ہوتا ہے۔ (الفرقان: ۶۷) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ

تمہاری تین عادتوں کو ناپسند کرتا ہے: قیل وقال کرنا' بہ کثرت سوال کرنا اور مال ضائع کرنا۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۷۵)

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن اور سنت کا منشاء یہ ہے کہ مسلمان آپس میں اختلاف اور نزاع نہ کریں اور اس کی وجہ سے باہمی عداوت اور بغض میں مبتلا نہ ہوں اور مسلمان اپنے مالوں کو ضائع ہونے سے بچائیں اور ان کی حفاظت کریں اور بیع کی دستاویز لکھنے' اس پر گواہ بنانے اور قیمت کے مقابلہ میں مقروض کا مال گروی رکھنے سے یہ دونوں امر حاصل ہوتے ہیں اس لیے اس آیت میں وثیقہ لکھنے' گواہ بنانے اور رہن رکھنے کا حکم دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے تمام اسرار اور حکمتوں کو وہی خوب جانتا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ

اللہ ہی کی ملکیت میں ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمینوں میں ہے' اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے

اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ

تم اس کو ظاہر کرو یا تم اس کو چھپاؤ' اللہ تم سے اس کا حساب لے گا' سو جس کو چاہے گا بخش دے گا

وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ

اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا' اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ○ (ہمارے)

الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ

رسول اس (کلام) پر ایمان لائے جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا اور مومن (بھی ایمان لائے) اللہ پر

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ

اس کے فرشتوں پر' اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر سب (یہ کہتے ہوئے) ایمان لائے کہ ہم (ایمان لانے میں) ان

مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ

رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے' اور انہوں نے کہا: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اے ہمارے رب! ہم تیری بخشش

اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا

کے طالب ہیں' اور (ہمیں) تیری ہی طرف لوٹنا ہے ○ اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا' جو اس (شخص)

مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ

نے نیک کام کیے ہیں ان کا نفع (بھی) اس کے لیے ہے اور جو اس نے برے کام کیے ہیں ان کا نقصان (بھی) اس کے لیے

نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

بھول جائیں یا ہم سے غلطی ہو جائے تو ہماری گرفت نہ کرنا‘ اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بھاری بوجھ نہ ڈالنا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا

جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا‘ اے ہمارے رب! ہم پر ان احکام کا بوجھ نہ ڈالنا جن کی ہمیں طاقت نہ ہو

بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا

اور ہمیں معاف فرما‘ اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما‘ تو ہمارا مالک ہے

فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع

تو کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما○

بیع اور دین کے بعد اعمال صالحہ سے مکلف کرنے کی مناسبت

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اصول اور فروع‘ اور عقائد اور اعمال میں سے متعدد اہم امور بیان فرمائے ہیں‘ توحید‘ رسالت‘ قیامت اور جزاء اور سزا کے دلائل کا ذکر فرمایا اور نماز‘ زکوٰۃ‘ صدقات‘ روزہ‘ حج‘ جہاد‘ قصاص‘ حیض‘ طلاق‘ عدت‘ خلع‘ ایلاء‘ رضاعت‘ ربا‘ بیع‘ دین اور رہن کے احکام بیان فرمائے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان عقائد کو ماننے اور ان احکام پر عمل کرنے کا مکلف فرمایا ہے تو یہاں ہمیں مکلف کرنے کی دلیل ذکر فرمائی کہ تمام آسمانوں میں جو کچھ ہے اور تمام زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ اس کا مالک ہے اور آسمانوں اور زمینوں کی ہر چیز اس کی مملوک ہے اور مالک کو حق ہے کہ وہ اپنی مملوک کو جس چیز کا چاہے مکلف کرے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں توحید و رسالت‘ اور قیامت اور جزا اور سزا کے ماننے کا مکلف کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جن عقائد کا مکلف کیا ہے ان کو ماننے کا تعلق ہمارے دلوں سے ہے‘ اور جن احکام شرعیہ پر عمل کرنے کا مکلف کیا ہے‘ ان کی جزاء یا سزا کا مدار ہماری نیتوں پر ہے اور ہماری نیتوں کا تعلق بھی ہمارے دلوں کے ساتھ ہے‘ اس لیے فرمایا: اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اس کو ظاہر کرو یا تم اس کو چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا‘ چونکہ وہ ہر چیز کا مالک ہے اور ہر چیز اس کی مملوک ہے اس لیے حساب لینا اس کا حق ہے اور وہ ہر چیز کا عالم ہے خواہ کوئی چیز چھوٹی ہو یا بڑی‘ ظاہر ہو یا مخفی اسے ہر چیز کا علم ہے اور ہر چیز کی گرفت کرنے پر وہ قادر ہے‘ اس کا علم ہر شے کو محیط ہے اور اس کی قدرت ہر چیز کو شامل ہے۔

خواطر قلب کی تکلیف کے منسوخ ہونے کا بیان

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی: اللہ ہی کی ملکیت میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے‘ اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ‘ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا‘ سو جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا‘ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے‘ تو رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر یہ آیت بہت شاق گزری' وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ہمیں نماز' روزہ' جہاد اور صدقہ کا مکلف کیا گیا' یہ ایسے اعمال ہیں جن کی ہم طاقت رکھتے ہیں اور اب آپ پر جو آیت نازل کی گئی ہے اس پر عمل کرنے کی ہم طاقت نہیں رکھتے (کیونکہ اس آیت میں یہ مذکور ہے کہ تمہارے دلوں کی چھپی ہوئی باتوں کا بھی حساب لیا جائے گا اور دل میں غیر اختیاری طور پر بہت سی باتوں کا خیال آتا ہے جو اچھی بھی ہوتی ہیں اور بری بھی اور دل میں آنے والی باتوں کے دور کرنے پر انسان قادر نہیں ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم اس طرح کہو جس طرح تم سے پہلے کتاب والوں (یہود و نصاریٰ) نے کہا تھا: ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی' بلکہ تم کہو: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی' اے ہمارے رب! ہم تیری بخشش کے طالب ہیں' اے ہمارے رب اور (ہمیں) تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ جب مسلمانوں نے اس طرح پڑھا اور ان کی گردنیں جھک گئیں تو اللہ عزوجل نے اس کے بعد یہ آیت نازل فرمائی: (ہمارے) رسول اس کلام پر ایمان لائے جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا اور مومن بھی ایمان لائے' اللہ پر' اس کے فرشتوں پر' اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر سب (یہ کہتے ہوئے) ایمان لائے کہ ہم (ایمان لانے میں) ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور انہوں نے کہا: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی' اے ہمارے رب! ہم تیری بخشش کے طالب ہیں' اور ہمیں تیری طرف لوٹنا ہے۔ جب مسلمانوں نے یہ کہا تو اللہ تعالیٰ نے اس پہلے حکم کو منسوخ کر دیا' اور یہ آیت نازل فرمائی: اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا' جو اس (شخص) نے نیک کام کیے ہیں ان کا نفع (بھی) اس کے لیے ہے اور جو اس نے بُرے کام کیے ہیں ان کا نقصان (بھی) اس کے لیے ہے' اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے غلطی ہو جائے تو ہماری گرفت نہ کرنا' اللہ نے فرمایا: ہاں! (حضرت ابن عباس کی روایت میں ہے' اللہ نے فرمایا: میں نے ایسا کر دیا) اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بھاری بوجھ نہ ڈالنا جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا' اللہ نے فرمایا: ہاں! (حضرت ابن عباس کی روایت میں ہے' فرمایا: میں نے کر دیا) اے ہمارے رب! ہم پر ان احکام کا بوجھ نہ ڈالنا جن کی ہمیں طاقت نہ ہو' فرمایا: ہاں! (یا فرمایا: میں نے کر دیا) اور ہمیں معاف فرما' اور ہمیں بخش دے' اور ہم پر رحم فرما' تو ہمارا مالک ہے تو کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما' فرمایا: ہاں! یا فرمایا: میں نے کر دیا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۷۸-۷۷' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے' اکثر مفسرین اس کے قائل ہیں کہ پہلے مسلمان دل میں بُرے خیالات اور وسوسوں سے بھی اجتناب کے مکلف تھے' پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا کیونکہ وسوسوں سے اجتناب کرنا ان کی وسعت اور طاقت میں نہیں ہے جیسا کہ اس حدیث میں اس کی تصریح ہے' اور بعض متاخرین نے کہا: یہاں نسخ نہیں ہے' کیونکہ نسخ انشاء (اوامر اور نواہی) میں ہوتا ہے' اخبار میں نہیں ہوتا' لیکن ان متاخرین کی یہ رائے صحیح نہیں ہے' کیونکہ ان کو پہلے یہ حکم دیا گیا تھا کہ وساوس سے اجتناب کرو اور بعد میں اس حکم کو منسوخ کیا گیا ہے اور اس آیت میں اس سابق حکم اور اس کے منسوخ ہونے کی خبر دی گئی ہے' بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ نسخ سے مراد یہاں ازالہ ہے یعنی ان کے دلوں میں یہ بات مرکوز ہو گئی تھی کہ ان کو ایک سخت' دشوار اور ناقابل عمل فعل کا مکلف کر دیا گیا ہے' تو ان کے دلوں سے اس بات کو زائل کیا گیا کہ اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا' یہ قاضی عیاض کی رائے ہے اور واحدی کا مختار یہ ہے کہ یہ آیت محکمہ ہے' منسوخ نہیں ہے۔

''ھم'' اور ''عزم'' کی تحقیق

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: جب میرا بندہ گناہ کا ''ھم'' (ارادہ) کرے تو اس کا گناہ نہ لکھو اور اگر وہ اس گناہ کو کر لے تو ایک گناہ لکھ دو اور جب وہ نیکی کا ''ھم'' کرے اور اس نے ابھی وہ نیکی نہ کی ہو تو اس کی ایک نیکی لکھ دو اور اگر وہ اس نیکی کو کر لے تو اس کی دس نیکیاں لکھ دو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل نیکیاں اور برائیاں لکھتا ہے سو جو شخص نیکی کا ''ھم'' کرے اور ابھی اس نیکی کو نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے پاس اس کو ایک مکمل نیکی لکھ لیتا ہے' اور اگر وہ اس نیکی کو کر لے تو اس کے لیے دس نیکیوں سے لے کر سات سو نیکیوں تک لکھ دیتا ہے اور اگر وہ گناہ کا ''ھم'' کرے اور اس گناہ کو نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی ایک مکمل نیکی لکھ دیتا ہے' اور اگر وہ گناہ کا ''ھم'' کرے اور وہ گناہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کا ایک گناہ لکھ دیتا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۷۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نووی لکھتے ہیں:

امام مازری نے کہا: قاضی ابو بکر بن الطیب کا مذہب یہ ہے کہ جس نے دل سے معصیت کا عزم کیا وہ اپنے اعتقاد اور عزم میں گنہ گار ہوگا' اور اگر اس نے معصیت کا عزم نہیں کیا' وہ معصیت صرف اس کے ذہن میں آئی' اس کا ذہن میں استقرار نہیں ہوا تو یہ ''ھم'' ہے اور ھم اور عزم میں فرق کیا جاتا ہے (اگر کسی کام میں راجح جانب کرنے کی ہو اور مرجوح سا خیال نہ کرنے کا ہو تو یہ ''ھم'' ہے اور اگر کام نہ کرنے کی مرجوح جانب بھی ختم ہو جائے اور اس کام کو کرنے کا سو فیصد ارادہ ہو جائے خواہ نفع ہو یا نقصان تو اس کو عزم کہتے ہیں) بہت سے فقہاء اور محدثین نے اس قاعدہ کی مخالفت کی ہے اور ظاہر حدیث پر عمل کیا ہے۔

قاضی عیاض نے کہا کہ عامۃ السلف' فقہاء اور محدثین کا وہی مذہب ہے جو قاضی ابو بکر کا مذہب ہے' کیونکہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ دل کے عمل پر بھی مواخذہ ہوتا ہے لیکن انہوں نے کہا ہے کہ اگر کوئی برائی کا عزم کرے تو ایک برائی لکھ لی جاتی ہے اور اگر برائی کا ''ھم'' کرے تو برائی نہیں لکھی جاتی' کیونکہ ''ھم'' کے بعد عمل نہیں کیا جاتا اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ عمل نہ کرنے کی وجہ خوف الٰہی ہو لیکن نفس اصرار اور عزم معصیت ہے' اس لیے عزم کے بعد ایک معصیت لکھ دی جاتی ہے اور اگر عزم کے بعد اس پر عمل کر لیا تو دوسری معصیت لکھ لی جائے گی اور اگر اس نے عزم معصیت کے بعد خدا کے خوف سے اس معصیت کو ترک کر دیا تو ایک نیکی لکھ دی جائے گی۔

معصیت کے ''ھم'' کے بعد معصیت نہیں لکھی جاتی' کیونکہ ''ھم'' میں نفس اپنے آپ کو اس معصیت پر آمادہ نہیں کرتا' نہ اس کا عقد' عزم اور نیت کرتا ہے' متکلمین نے اس میں بحث کی ہے کہ جب وہ اس معصیت کو خوف خدا کے علاوہ کسی اور وجہ سے ترک کرے' مثلاً لوگوں کے خوف کی وجہ سے ترک کرے تو اس کی نیکی لکھی جائے گی یا نہیں' بعض علماء نے کہا: اب اس کی نیکی نہیں لکھی جائے گی' لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۷۹۔۷۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

قرآن مجید کی نصوص قطعیہ اور احادیث صریحہ سے یہ ثابت ہے کہ معصیت کے عزم' عقد اور گناہ کی نیت سے مواخذہ ہوتا ہے خواہ اس پر عمل کیا جائے یا نہیں۔

دل کے افعال پر مواخذہ کی تحقیق

قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (النور: ۱۹)	بے شک جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی کی بات پھیلے ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک

عذاب ہے۔

اس آیت میں صرف دل کے عمل پر عذاب کی وعید ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ٘ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ . (الحجرات: ۱۲) اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو بے شک بعض گمان گناہ ہیں۔

اس آیت میں بدگمانی کو گناہ قرار دیا ہے اور وہ دل اور ذہن کا فعل ہے۔

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ . (البقرہ: ۲۳۵) اور (عدت کے دوران) عقد نکاح کا عزم نہ کرو۔

اس آیت میں عزم سے منع کیا گیا ہے اور عزم دل کا فعل ہے اور عدت میں کسی عورت سے نکاح کا عزم کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

نیز امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب دو مسلمان تلواروں سے مقابلہ کرتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہیں میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ قاتل تو ہوا مقتول کا کیا گناہ ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ بھی اپنے مقابل کے قتل پر حریص تھا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۹ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث سے بھی یہ واضح ہوا کہ جس طرح مسلمان کو قتل کرنا گناہ کبیرہ ہے اسی طرح مسلمان کو قتل کرنے کا عزم کرنا بھی گناہ ہے۔

قرآن مجید اور حدیث شریف کی تصریحات کے علاوہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ حسد کرنا مسلمانوں کو حقیر جاننا اور ان سے کینہ اور بغض رکھنا حرام ہے اور یہ تمام دل کے افعال ہیں ان دلائل سے یہ واضح ہو گیا کہ معصیت کا عزم بھی معصیت ہے خواہ اس عزم کے بعد معصیت کا ارتکاب کرے یا نہ کرے البتہ معصیت کا "ہم" معصیت نہیں ہے۔

"ہم" اور "عزم" کی مزید وضاحت کے لیے یہ جاننا چاہیے کہ ذہن میں وارد ہونے والے امور کی پانچ قسمیں ہیں۔

علامہ احمد صاوی مالکی لکھتے ہیں:

(۱) ہاجس: اچانک کسی چیز کا خیال آئے۔

(۲) خاطر: کسی چیز کا بار بار خیال آئے۔

(۳) حدیث نفس: جس چیز کا خیال آئے ذہن اس کی طرف راغب ہو اور اس کے حصول کے لیے منصوبہ بنائے۔

(۴) ہم: غالب جانب اس چیز کو حاصل کرنے کی ہو اور مغلوب سا خیال ہو کہ اس کو حاصل نہ کیا جائے کیونکہ ہو سکتا ہے اس سے ضرر ہو۔

(۵) عزم: مغلوب جانب بھی زائل ہو جائے اور اس چیز کے حصول کا پختہ ارادہ ہو وہ اپنے نفس کو اس کے حصول پر آمادہ کر لے اور اس کی نیت کر لے۔

اگر کسی شخص کے ذہن میں خیال آئے تو ہاجس خاطر حدیث نفس اور ہم کے مرتبہ میں اس سے مواخذہ نہیں ہوتا البتہ اگر گناہ کا عزم کر لے تو وہ مستحق مواخذہ ہے خواہ اس کے بعد گناہ کا فعل نہ کرے۔

(تفسیر الصاوی ج ۱ ص ۹۹ مطبوعہ دار احیاء الکتب العربیہ مصر)

اس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی انسان کا کوئی دشمن ہو اور ایک دن اس کے ذہن میں اچانک اس کو قتل کرنے کا خیال آئے تو

یہ ھاجس ہے اور اگر بار بار اس کو قتل کرنے کا خیال آئے تو یہ خاطر ہے اور جب اس کا ذہن اس کے قتل کی طرف راغب ہو اور وہ اس کے قتل کا منصوبہ بنائے کہ اس کو مثلاً پستول سے قتل کرے گا اور فلاں جگہ سے پستول کو حاصل کرے گا تو یہ حدیث نفس ہے اور جب وہ اس کو قتل کرنے کا ارادہ کرلے اور غالب جانب اس کو قتل کرنے کی ہو لیکن مغلوب سا یہ خیال ہو کہ وہ کہیں پکڑا نہ جائے اس لیے نہ قتل کرے تو بہتر ہے تو یہ ھم ہے اور جب یہ مغلوب جانب بھی زائل ہو جائے اور وہ یہ طے کرلے کہ اس کو قتل کرنا ہے خواہ وہ پکڑا کیوں نہ جائے اور اس کے بدلہ میں قتل کیوں نہ کر دیا جائے اور اس کو قتل کرنے کی نیت کرے تو یہ عزم ہے' پہلے چار مرتبوں پر اس سے مواخذہ نہیں ہوگا لیکن جب وہ قتل کرنے کا عزم کرلے گا تو اس عزم پر مواخذہ ہوگا خواہ اس نے قتل نہ کیا ہو' مثلاً وہ شخص اس کو قتل کرنے گیا لیکن جب وہ اس کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی طبعی موت سے ابھی ابھی مرا ہے' اب ہرچند کہ اس نے قتل نہیں کیا لیکن اس نے بہرحال اس کو قتل کرنے کی نیت کرلی تھی اس لیے اس نیت کی وجہ سے اس کی گرفت ہوگی۔

ھاجس' خاطر اور حدیث نفس کے مرتبہ میں معصیت پہلی امتوں پر بھی معاف تھی اور اس امت پر بھی معاف ہے' لیکن پچھلی امتوں کا ''ھم'' پر مواخذہ ہوتا تھا اس امت پر ''ھم'' معاف ہے البتہ اگر معصیت کا عزم کرلیا جائے تو اس امت پر بھی مواخذہ ہوگا۔

معصیت کی حدیث نفس مذموم ہے اور نیکی کی حدیث نفس جائز بلکہ مستحسن ہے خواہ حالت نماز ہو۔

امام بخاری بیان کرتے ہیں:

حضرت عمر نے کہا: میں نماز کی حالت میں لشکر کی صفیں مرتب کرتا رہتا ہوں۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۶۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دینی امور کے متعلق نماز میں سوچ و بچار اور غور و فکر کرنا جائز ہے۔

امام بخاری' امام مسلم' امام ابوداؤد' امام ترمذی' امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت اپنے دل میں جن کاموں کے منصوبے بناتی ہے (حدیث نفس) جب تک ان کی بات نہ کرے یا ان پر عمل نہ کرے' اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرماتا ہے۔

امام فریابی' امام عبد بن حمید اور امام ابن المنذر' محمد بن کعب قرظی سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ نے جس نبی اور رسول کو مبعوث کیا اور اس پر کتاب نازل کی۔ اس پر یہ آیت نازل فرمائی: جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اس کو ظاہر کرو یا تم اس کو چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا' پس جس کو چاہے گا اس کو بخش دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا' اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ سابقہ امتوں نے اپنے نبیوں اور رسولوں سے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا اور کہا: ہمارے دلوں میں جو باتیں آئیں اور ہم ان پر عمل نہ کریں تو ہم سے ان پر کیسے گرفت ہوگی' سو وہ کافر اور گمراہ ہو گئے' اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر بھی یہ آیت اسی طرح دشوار ہوئی جس طرح پچھلی امتوں پر دشوار ہوئی تھی' انہوں نے کہا: یارسول اللہ! ہمارے دلوں میں جو باتیں آئیں اور ہم ان پر عمل نہ کریں کیا پھر بھی ہم سے ان باتوں پر مواخذہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! تم سنو اور تم اطاعت کرو' اور جب مسلمانوں نے یہ کہا کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے حدیث نفس (دل کی باتوں) پر محاسبہ کو ساقط کر دیا' جب تک کہ وہ اس پر عمل نہ کرلیں' اور ان کو انہی کاموں کا مکلف کیا جن کی وہ طاقت رکھتے تھے اور جب انہوں نے کہا: اے ہمارے رب! نسیان اور خطا پر ہماری گرفت نہ کرنا تو ان سے نسیان اور خطا پر مواخذہ کو

ساقط کر دیا اور جب انہوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم پر ایسے سخت احکام کا بوجھ نہ ڈالنا جیسے سخت احکام پچھلی امتوں پر تھے‘ تو ان کو ایسے سخت احکام کا مکلف نہیں کیا گیا‘ اور ان کو معاف کر دیا‘ ان کی مغفرت کی اور ان کی مدد فرمائی۔

(الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۷۴۔ ۳۷۳‘ مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمٰی ایران)

تکلیف مالایطاق پر استدلال اور اس کا جواب

علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے: ”جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے‘ تم اس کو ظاہر کرو یا تم اس کو چھپاؤ‘ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا“ انسان اپنے دل میں جن وسوسوں اور حدیث نفس کو چھپاتا ہے وہ اس میں داخل نہیں ہیں‘ کیونکہ ان سے قلب کو فارغ کرنا اس کی طاقت اور اختیار میں نہیں ہے‘ البتہ جس چیز کا وہ اعتقاد کرتا ہے اور اس کا عزم کرتا ہے وہ اس میں داخل ہے‘ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس آیت کو تلاوت کیا اور کہا: اگر اللہ نے اس پر ہمارا مواخذہ کیا تو ہم ہلاک ہو جائیں گے‘ پھر وہ رونے لگے‘ جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس واقعہ کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ ابوعبدالرحمان پر رحم کرے‘ جس طرح ان کو رنج ہوا ہے مسلمانوں کو بھی اس طرح رنج ہوا تھا‘ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کرتا‘ ان روایات کی بناء پر بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے‘ لیکن زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں محکم ہے‘ اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے اعمال کا محاسبہ کرے گا اور انہوں نے جن کاموں کا پختہ عزم کیا ہے خواہ انہوں نے وہ کام نہیں کیے ان کا بھی محاسبہ کرے گا اور مومنین کی مغفرت فرما دے گا اور کفار اور منافقین کا مواخذہ فرمائے گا‘ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: دل میں جو خواطر اور وساوس آتے ہیں ان کی سزا میں دنیا میں مصائب اور آلام پہنچتے ہیں۔ بعض علماء نے اس آیت سے تکلیف مالایطاق پر استدلال کیا ہے کیونکہ خواطر قلب سے بچنا انسان کی طاقت میں نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا مکلف کیا ہے‘ ابن عطیہ نے کہا: یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ خواطر قلب کی یہاں تاویل نیات‘ عزائم اور اعتقادات سے کی گئی ہے اور وہ انسان کے اختیار میں ہیں۔

(البحرالمحیط ج ۲ ص ۷۵۴‘ ملخصاً مطبوعہ دارالفکر بیروت‘ ۱۴۱۲ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (ہمارے) رسول اس (کلام) پر ایمان لائے جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا‘ اور مومن (بھی ایمان لائے)۔ (البقرہ: ۲۸۵)

سورۂ بقرہ کے افتتاح اور اختتام کی مناسبت

اس سورت کی ابتداء میں بھی اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی صفات بیان فرمائی تھیں کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں‘ نماز قائم کرتے ہیں‘ اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں‘ اور جو اس (کلام) پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا‘ اور یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ آخرت میں فلاح پانے والے ہیں‘ اور سورت کے اختتام میں بھی مومنوں کی صفات بیان کی گئی ہیں کہ وہ اس کلام پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اور اے ہمارے رب! ہم تیری مغفرت کے طالب ہیں اور تیری ہی طرف ہمیں لوٹنا ہے۔ الآیۃ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ پر‘ اس کے فرشتوں پر‘ اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر سب (یہ کہتے ہوئے) ایمان لائے کہ ہم (ایمان لانے میں) ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ (البقرہ: ۲۸۵)

اللہ‘ فرشتوں‘ کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے کے ذکر کی ترتیب

اس آیت میں پہلے اللہ پر ایمان لانے کا ذکر کیا ہے‘ کیونکہ ہر ذی عقل سب سے پہلے وجود صانع پر استدلال کرتا ہے‘ اس کے بعد فرشتوں پر ایمان لانے کا ذکر ہے‘ کیونکہ اللہ اور بندوں کے درمیان فرشتے واسطہ ہیں‘ اس لیے ان کا دوسرے درجہ میں ذکر ہے‘ پھر کتابوں پر ایمان لانے کا ذکر ہے‘ کیونکہ کتابیں وہ وحی ہیں جن کو فرشتہ اللہ سے لے کر نبیوں تک پہنچاتا ہے‘ اس لیے ان کا تیسرے مرتبہ میں ذکر ہے‘ اس کے بعد رسولوں پر ایمان لانے کا ذکر ہے‘ کیونکہ وہی وحی کے انوار سے اقتباس کرتے ہیں‘ اس لیے ان کا چوتھی جگہ ذکر ہے۔

اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لانے میں ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے‘ جیسے یہود اور نصاریٰ نے فرق کیا کہ بعض نبیوں پر ایمان لائے اور بعض پر ایمان نہیں لائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا۔ (البقرہ: ۲۸۶)

امام ابن جریر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا‘ تو صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم ہاتھ‘ پاؤں اور زبان کے کاموں سے توبہ اور رجوع کرتے ہیں‘ وسوسوں سے کیسے رجوع کریں تو جبریل اس آیت کو لے کر آئے: اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا‘ بے شک تم وسوسوں سے باز رہنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

امام بخاری‘ امام مسلم‘ امام ابوداؤد‘ امام ترمذی‘ امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے سینہ میں جو وسوسے آتے ہیں‘ اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرمالیتا ہے‘ جب تک کہ وہ ان پر عمل نہ کریں اور ان کی بات نہ کریں۔ (الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۷۹‘ مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ ایران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو اس (شخص) نے نیک کام کیے ہیں ان کا نفع (بھی) اس کے لیے ہے‘ اور جو اس نے بُرے کام کیے ہیں ان کا نقصان (بھی) اس کے لیے ہے۔ (البقرہ: ۲۸۶)

کسب اور اکتساب کا معنی اور شر کو اکتساب کے ساتھ مخصوص کرنے کی توجیہ

جس کام کو انسان قصد اور ارادہ سے کرے اس کو کسب اور اکتساب کہتے ہیں‘ اور خواطر اور وساوس میں انسان کے قصد اور ارادہ کا دخل نہیں ہوتا اس لیے ان پر گرفت نہیں ہوگی‘ اسی طرح جو کام انسان سے نسیاناً اور خطاءً ہو جائے یا جو کام اضطراری طور پر صادر ہو‘ اس پر بھی گرفت نہیں ہوگی۔

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان کاموں کو معاف کر دیا جو خطاءً ہوں‘ نسیاناً ہوں یا جن کاموں پر انہیں مجبور کیا گیا ہو۔

(سنن ابن ماجہ ص ۱۴۷‘ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب‘ کراچی)

اہل لغت کے نزدیک کسب اور اکتساب کا معنی واحد ہے‘ اور بعض نے کسب اور اکتساب میں فرق بیان کیا ہے‘ کسب عام ہے خواہ انسان وہ کام صرف اپنے لیے کرے یا دوسرے کے لیے‘ اور اکتساب اس کام کو کہتے ہیں جو صرف اپنے لیے کیا جائے‘ زمخشری نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خیر کے لیے کسب اور شر کے لیے اکتساب کو استعمال کیا ہے‘ کیونکہ باب افتعال کا خاصہ ہے! کسی چیز کو زیادہ محنت اور کوشش سے حاصل کرنا‘ اور جب انسان کسی بُرے کام کی خواہش کرتا ہے تو اس کی تحصیل میں زیادہ

عمل کرتا ہے اس کے لیے اکتساب فرمایا' اور بعض نے کہا: نیکی کے کام انسان کی فطرت کے مطابق ہوتے ہیں اس لیے ان کو کرنے کے لیے زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑتی اور برائی کے کام چونکہ انسان کی فطرت کے خلاف ہوتے ہیں اس لیے ان کو کرتے وقت انسان کا نفس بوجھل ہوتا ہے اور ان کے لیے زیادہ عمل کرنا پڑتا ہے اس لیے ان کے لیے اکتساب فرمایا' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس کی سرشت میں خیر اور نیکی ہو وہ اگر برا کام کسی وجہ سے کرے گا تو اس کا ضمیر مزاحمت کرے گا اور اسے برائی کے لیے زیادہ دشواری ہوگی' اور جس کی سرشت میں شر اور برائی ہو وہ برے کام کو زیادہ دلچسپی اور زیادہ کوشش سے کرے گا' اس طرح ہر صورت میں برے کام میں زیادہ عمل ہوگا اس لیے برے کام کے لیے اکتساب کا لفظ فرمایا جس میں زیادہ عمل ہے کیونکہ زیادتی لفظ زیادتی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

دوسروں کے عمل سے نفع یا ضرر پہنچنے کا بیان

بہ ظاہر اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو صرف ان ہی کاموں کا نفع یا ضرر ہوگا جو اس نے خود کیے ہوں' لیکن تحقیق یہ ہے کہ جن کاموں کے وجود میں آنے کے لیے کسی طور سے بھی کسی انسان کا دخل ہو تو اگر وہ اچھے کام ہیں تو اس کو ان کا نفع پہنچے گا اور اگر وہ برے کام ہوں تو اس کو ان کا ضرر پہنچے گا' مثلاً ایک آدمی نے مسجد بنوادی یا لائبریری قائم کردی تو جب تک اس مسجد میں نمازیں پڑھی جاتی رہیں گی اس کو اس کا اجر ملتا رہے گا اور جب تک اس لائبریری میں کتابیں پڑھی جاتی رہیں گی اس کو اجر ملتا رہے گا' اس طرح اولاد کے دعا کرنے سے اور کسی استاذ کے پڑھائے ہوئے علم سے اجر ملتا رہے گا' اور جس شخص نے کوئی جوا خانہ' قحبہ خانہ یا شراب خانہ بنایا ہے تو جب تک وہاں برائی کے کام ہوتے رہیں گے اس کے نامہ اعمال میں گناہ لکھے جاتے رہیں گے۔ امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اون کے کپڑے پہنے ہوئے کچھ دیہاتی حاضر ہوئے' آپ نے ان کی بدحالی اور ضرورت کو دیکھا' پھر آپ نے لوگوں کو صدقہ کرنے کی ترغیب دی' لوگوں نے کچھ توقف کیا جس سے آپ کے چہرۂ انور پر کبیدگی کے آثار ظاہر ہوئے' پھر ایک انصاری درہموں کی تھیلی لے کر آیا' پھر دوسرا آیا' اور پھر صدقہ لانے والوں کا تانتا بندھ گیا' حتیٰ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر خوشی کے آثار ظاہر ہوئے' تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے مسلمانوں میں کسی نیک طریقہ کی ابتداء کی' اور اس کے بعد اس طریقہ پر عمل کیا گیا تو اس طریقہ پر عمل کرنے والوں کا اجر بھی اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا اور عمل کرنے والوں کے اجر میں کمی نہیں ہوگی اور جس شخص نے مسلمانوں میں کسی برے طریقہ کی ابتداء کی اور اس کے بعد اس طریقہ پر عمل کیا گیا تو اس طریقہ پر عمل کرنے والوں کا گناہ بھی اس شخص کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا اور عمل کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۴۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام بخاری بیان کرتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو بھی ظلماً قتل کیا جائے گا اس کے گناہ میں ایک حصہ پہلے ابن آدم کا ہوگا (یعنی قابیل کا جس نے ہابیل کو ظلماً قتل کیا تھا) کیونکہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کا طریقہ نکالا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۷۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے غلطی ہو جائے تو ہماری گرفت نہ کرنا۔ (البقرہ: ۲۸۶)

خطاء نسیان اور جو کام جبراً کرائے جائیں ان پر مواخذہ نہ کرنا

امام ابن ماجہ امام ابن المنذر امام ابن حبان امام طبرانی امام دار قطنی امام حاکم اور امام بیہقی نے اپنی ''سنن'' میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری امت کی خطاء نسیان اور جس کام پر اس کو مجبور کیا گیا ہو اس سے درگزر فرمالیا ہے۔

امام طبرانی نے اس حدیث کو حضرت ثوبان' حضرت ابن عمر اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم سے بھی روایت کیا ہے اور امام ابن ماجہ نے اس حدیث کو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' اور امام ابن عدی نے ''کامل'' میں' امام ابونعیم نے ''تاریخ'' میں اور امام سعید بن منصور نے اپنی ''سنن'' میں اس کو حسن سے روایت کیا ہے' ہم اس سے پہلے امام مسلم کی روایت سے بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی' امام ابن جریر نے بھی اس روایت کو بیان کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بھاری بوجھ نہ ڈالنا جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا۔ (البقرہ: ۲۸۶)

سابقہ امتوں کے سخت احکام

امام ابن جریر نے ابن جریج سے روایت کیا ہے کہ ہم کو ایسے احکام کا مکلف نہ کرنا جن کو ہم ادا نہ کر سکیں' جس طرح ہم سے پہلے یہود و نصاریٰ پر سخت احکام کا بوجھ ڈالا گیا' وہ ان احکام پر عمل نہ کر سکے' پھر اس کی سزا میں ان کو بندر اور خنزیر بنا دیا گیا۔

امام ابن ابی شیبہ' امام ابوداؤد' امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے عبد الرحمان بن حسنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بنو اسرائیل کے کپڑوں پر پیشاب لگ جاتا تو وہ اس کو قینچی سے کاٹ دیتے تھے۔

امام ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ بنو اسرائیل میں جب کوئی شخص گناہ کرتا تو اس سے کہا جاتا کہ تمہاری توبہ یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو قتل کرو' سو وہ قتل کرتا' اس امت سے ایسے سخت احکام کا بوجھ اٹھا لیا گیا۔

(الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۷۷' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران)

سابقہ امتوں پر بہت سخت اور دشوار احکام تھے' ان پر پچاس نمازیں فرض تھیں' زکوٰۃ میں چوتھائی مال کو ادا کرنا فرض تھا' نجس کپڑا کاٹے بغیر پاک نہیں ہوتا تھا۔ مال غنیمت حلال نہیں تھا' مسجد کے سوا کسی اور جگہ نماز نہیں پڑھ سکتے تھے' تیمم کی سہولت نہیں تھی' قربانی کو کھانے کی اجازت نہیں تھی' اونٹ کا گوشت حرام تھا' چربی حرام تھی' ہفتہ کے دن شکار کی اجازت نہ تھی' کوئی گناہ کرتے تو فوراً دنیا میں اس کی سزا مل جاتی تھی' قصاص میں قتل کرنا لازم تھا' شرک کی توبہ قتل کرنا تھی' جس عضو سے گناہ ہوتا تھا اس کو کاٹ دیا جاتا تھا' دیت کی سہولت نہیں تھی' بعض گناہوں کی سزا میں ان کی صورتوں کو مسخ کر کے بندر اور خنزیر بنا دیا جاتا تھا۔

سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کی فضیلت

امام عبد بن حمید نے عطاء سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت جبرائیل نے سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا تو آپ نے کہا: آمین۔

امام احمد' امام دارمی' امام بخاری' امام مسلم' امام ابوداؤد' امام ترمذی' امام نسائی' امام ابن ماجہ اور امام بیہقی نے اپنی ''سنن'' میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جس نے رات میں سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کو پڑھا تو وہ اس کے لیے کافی ہیں۔

امام طبرانی نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کو بار بار پڑھو کیونکہ

اللہ نے ان کی وجہ سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فضیلت دی ہے۔

امام احمد نے اور امام بیہقی نے "شعب الایمان" میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں عرش کے نیچے سے دی گئی ہیں' مجھ سے پہلے یہ کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔

امام طبرانی نے سند جید کے ساتھ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے ایک کتاب لکھی' اس میں سے دو آیتیں نازل کیں اور سورۂ بقرہ کو ان پر ختم کیا' جس گھر میں تین راتیں ان دو آیتوں کو پڑھا جائے گا اس گھر میں شیطان نہیں ٹھہرے گا۔

(الدرالمنثور ج ۱ ص ۳۷۸' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی' ایران)

کلمات تشکر

۱۰ رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ/ بہ مطابق ۲۱ فروری ۱۹۹۴ء کو میں نے "تبیان القرآن" لکھنے کا آغاز کیا تھا' اسی سال اللہ تعالیٰ نے مجھے فریضہ حج کی ادائیگی سے نوازا اور اپنے کرم سے حج اکبر عطا کیا' حج سے پہلے اور بعد حج کی مصروفیات اور تھکاوٹ کی وجہ سے لکھنے میں تاخیر ہوتی رہی' ۲۸ فروری ۱۹۹۵ء کو مقدمہ تفسیر' سورۂ فاتحہ اور پہلے پارہ کی تفسیر مکمل ہوئی' ۱۰ جولائی ۱۹۹۵ء کو دوسرے پارہ کی تفسیر مکمل ہوئی اور ۱۱ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ/ ۱۰ اگست ۱۹۹۵ھ کو سورۂ بقرہ کی تفسیر مکمل ہوگئی' فالحمد للہ رب العالمین۔

۱۰ رمضان المبارک کو "تبیان القرآن" کی پہلی جلد کا افتتاح ہوا اور بارہ ربیع الاول جشن آمد رسول کے مبارک دن یہ جلد مکمل ہوگئی' اس جلد کا افتتاح اور اختتام مبارک ایام میں ہوا ہے' سو الٰہ العلمین! اس کتاب کو مبارک بنا دے' ہمارے دلوں کو قرآن مجید کی ہدایات سے معمور کر دے اور ہماری روحوں کو احادیث مبارکہ کے انوار سے منور کر دے اور ہمارے بدن اور ہمارے تمام اعضاء کو قرآن اور سنت کے تابع کر دے۔ رب العلمین! جس طرح تو نے "تبیان القرآن" کی اس پہلی جلد کو مکمل کرنے کی توفیق دی ہے' اسی طرح اپنے کرم سے اس کی باقی جلدوں کو بھی مکمل کرنے کی سعادت عطا فرما' اس کتاب کو مقبولیت عامہ عطا فرما اور تا قیامت اس کے فیض کے چشموں کو جاری رکھ اور اس کے مندرجات پر مجھ سمیت سب کو عمل کی توفیق عطا فرما' اس کتاب کو مخالفین کے لیے ہدایت اور موافقین کے لیے استقامت کا موجب بنا' اس کو میرے لیے صدقہ جاریہ کر دے۔ مجھے' میرے والدین کو' میرے اقرباء کو' میرے اساتذہ اور تلامذہ کو' میرے احباب اور معاونین کو' "تبیان القرآن" کے ناشر کاتب اور مصحح کو اور جملہ مسلمانوں کو دنیا اور آخرت کے مصائب' آفات اور بلاؤں سے محفوظ اور مامون رکھ اور دنیا اور آخرت کی ہر خیر' ہر سعادت اور ہر کامرانی عطا فرما۔ آمین واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین قائد المرسلین شفیع المذنبین وعلی الہ الطیبین الطاھرین واصحابہ الکاملین الراشدین وازواجہ امھات المومنین وعلی اولیاء امتہ وعلماء ملتہ من المفسرین والمحدثین والمجتھدین الراسخین اجمعین الی یوم الدین۔

غلام رسول سعیدی غفرلہ
خادم الحدیث' دارالعلوم نعیمیہ
۲۱ رجب ۱۴۲۷ھ/ ۱۹ اگست ۲۰۰۶ء
فون: ۹۰۳۶۵۱۲-۰۳۰۰/ ۴۴۷۱۲۰۲-۰۳۲۱

مآخذ و مراجع

کتب الٰہیہ

۱۔ قرآن مجید

۲۔ تورات

۳۔ انجیل

کتب احادیث

۴۔ امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت متوفی ۱۵۰ھ' مسند امام اعظم' مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی

۵۔ امام مالک بن انس اصبحی متوفی ۱۷۹ھ' موطا امام مالک' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور

۶۔ امام ابویوسف یعقوب بن ابراہیم متوفی ۱۸۲ھ' کتاب الآثار' مطبوعہ مکتبہ اثریہ' سانگلہ ہل

۷۔ امام محمد بن حسن شیبانی متوفی ۱۸۹ھ' موطا امام محمد' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

۸۔ امام محمد بن حسن شیبانی متوفی ۱۸۹ھ' کتاب الآثار' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۷ھ

۹۔ امام سلیمان بن داؤد بن جارود طیالسی حنفی متوفی ۲۰۴ھ' مسند طیالسی' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۳۹۱ھ

۱۰۔ امام محمد بن ادریس شافعی متوفی ۲۰۴ھ' المسند' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۰۰ھ

۱۱۔ امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی متوفی ۲۱۱ھ' المصنف' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۳۹۰ھ

۱۲۔ امام عبداللہ بن الزبیر حمیدی متوفی ۲۱۹ھ' المسند' مطبوعہ عالم الکتب' بیروت

۱۳۔ امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ' المصنف' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ

۱۴۔ امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' المسند' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ

۱۵۔ امام ابوعبداللہ بن عبدالرحمان دارمی متوفی ۲۵۵ھ' سنن دارمی' مطبوعہ نشر السنہ' ملتان

۱۶۔ امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ' صحیح بخاری' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ

۱۷۔ امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ' الادب المفرد' مطبوعہ مطبعہ اثریہ' سانگلہ ہل

۱۸۔ امام ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ

۱۹۔ امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ' سنن ابن ماجہ' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

۲۰۔ امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی متوفی ۲۷۵ھ' سنن ابوداؤد' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۵ھ

۲۱۔ امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی متوفی ۲۷۵ھ' مراسیل ابوداؤد' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

۲۲۔ امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' جامع ترمذی' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

۲۳۔ امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' شمائل ترمذی' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

۲۴۔ امام علی بن عمر دارقطنی متوفی ۲۸۵ھ' سنن دارقطنی' مطبوعہ نشر السنہ' ملتان

۲۵۔ امام احمد عمرو بن عبدالخالق بزار متوفی ۲۹۲ھ' البحر الزخار المعروف بمسند البزار' مطبوعہ مؤسسۃ القرآن' بیروت' ۱۴۰۹ھ

۲۶۔ امام ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ' سنن نسائی' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی

۲۷- امام ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ عمل الیوم واللیلۃ' مطبوعہ موسسۃ الکتب الثقافیہ' بیروت' ۱۴۰۸ھ
۲۸- امام ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ' سنن کبریٰ' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۱ھ
۲۹- امام احمد بن علی المثنی التمیمی المتوفی ۳۰۷ھ' مسند ابویعلیٰ موصلی مطبوعہ دار المامون تراث' بیروت' ۱۴۰۴ھ
۳۰- امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ متوفی ۳۱۱ھ' صحیح ابن خزیمہ' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۵ھ
۳۱- امام ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق متوفی ۳۱۶ھ' مسند ابوعوانہ' مطبوعہ دار الباز' مکہ مکرمہ
۳۲- امام ابوعبداللہ محمد الحکیم الترمذی المتوفی ۳۲۰ھ' نوادر الاصول' مطبوعہ دار الریان التراث' القاہرہ' ۱۴۰۸ھ
۳۳- امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی متوفی ۳۲۱ھ' شرح مشکل الآثار' مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ' بیروت' ۱۴۱۵ھ
۳۴- امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی متوفی ۳۲۱ھ' شرح معانی الآثار' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور' ۱۴۰۴ھ
۳۵- امام ابوحاتم محمد بن حبان البستی متوفی ۳۵۴ھ' الاحسان بہ ترتیب صحیح ابن حبان' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۰۷ھ
۳۶- امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی المتوفی ۳۶۰ھ' معجم صغیر' مطبوعہ مکتبہ سلفیہ' مدینہ منورہ' ۱۳۸۸ھ
۳۷- امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی المتوفی ۳۶۰ھ' معجم اوسط' مطبوعہ مکتبۃ المعارف' ریاض' ۱۴۰۵ھ
۳۸- امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی المتوفی ۳۶۰ھ' معجم کبیر' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت
۳۹- امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی المتوفی ۳۶۰ھ' مسند الشامیین' مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ' بیروت' ۱۴۰۹ھ
۴۰- امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی المتوفی ۳۶۰ھ' کتاب الدعاء' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۳ھ
۴۱- امام ابوبکر احمد بن اسحاق دینوری المعروف بابن السنی متوفی ۳۶۴ھ' عمل الیوم واللیلۃ' مطبوعہ مجلس الدائرۃ المعارف' حیدرآباد دکن
۴۲- امام عبداللہ بن عدی الجرجانی المتوفی ۳۶۵ھ' الکامل فی ضعفاء الرجال' مطبوعہ دار الفکر' بیروت
۴۳- امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ' المستدرک' مطبوعہ دار الباز' مکہ مکرمہ
۴۴- امام ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی متوفی ۴۳۰ھ' حلیۃ الاولیاء' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ
۴۵- امام ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی متوفی ۴۳۰ھ' دلائل النبوۃ' مطبوعہ دار النفائس' بیروت
۴۶- امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' سنن کبریٰ' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان
۴۷- امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' معرفۃ السنن والآثار' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت
۴۸- امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' دلائل النبوۃ' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت
۴۹- امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' شعب الایمان' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۰۱ھ
۵۰- امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ' شرح السنۃ' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۲ھ
۵۱- امام ابوالقاسم علی بن الحسن ابن عساکر متوفی ۵۷۱ھ' مختصر تاریخ دمشق' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۴ھ
۵۲- امام ابوالقاسم علی بن الحسن ابن عساکر متوفی ۵۷۱ھ' تہذیب تاریخ دمشق' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۷ھ
۵۳- امام ضیاء الدین محمد بن عبدالواحد مقدسی حنبلی متوفی ۶۴۳ھ' الاحادیث المختارۃ' مطبوعہ مکتبہ النہضہ الحدیثیہ' مکہ مکرمہ' ۱۴۱۰ھ
۵۴- امام زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری المتوفی ۶۵۶ھ' الترغیب والترہیب' مطبوعہ دار الحدیث' قاہرہ' ۱۴۰۷ھ
۵۵- امام ولی الدین تبریزی متوفی ۷۴۲ھ' مشکوٰۃ' مطبوعہ اصح المطابع' دہلی
۵۶- حافظ جمال الدین عبداللہ بن یوسف زیلعی متوفی ۷۶۲ھ' نصب الرایہ' مطبوعہ مجلس علمی سورت' ہند' ۱۳۵۷ھ

۵۷- حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی، المتوفی ۸۰۷ھ، مجمع الزوائد، مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۰۲ھ

۵۸- حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی، المتوفی ۸۰۷ھ، کشف الاستار، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۰۴ھ

۵۹- حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی، المتوفی ۸۰۷ھ، موارد الظمآن، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت

۶۰- امام محمد بن محمد جزری متوفی ۸۳۳ھ، حصن حصین، مطبوعہ مصطفیٰ البابی واولادہ، مصر، ۱۳۵۰ھ

۶۱- حافظ علاء الدین بن علی بن عثمان ماردینی ترکمانی متوفی ۸۴۵ھ، الجوہر النقی، مطبوعہ نشر السنۃ، ملتان

۶۲- حافظ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی متوفی ۸۴۸ھ، تلخیص المستدرک، مطبوعہ مکتبہ دار الباز، مکہ مکرمہ

۶۳- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ، المطالب العالیہ، مطبوعہ مکتبہ دار الباز، مکہ مکرمہ

۶۴- حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ، الجامع الصغیر، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت، ۱۳۹۱ھ

۶۵- حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ، جامع الاحادیث الکبیر، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۴ھ

۶۶- حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ، الخصائص الکبریٰ، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ، سکھر

۶۷- علامہ عبد الوہاب شعرانی متوفی ۹۷۳ھ، کشف الغمہ، مطبوعہ مطبعہ عامرہ عثمانیہ، مصر، ۱۳۰۳ھ

۶۸- علامہ علی متقی بن حسام الدین ہندی برہان پوری متوفی ۹۷۵ھ، کنز العمال، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۰۵ھ

کتب تفسیر

۶۹- حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما متوفی ۶۸ھ، تنویر المقباس، مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ، ایران

۷۰- امام حسن بن عبد اللہ البصری، المتوفی ۱۱۰ھ، تفسیر الحسن البصری، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۳ھ

۷۱- امام ابو زکریا یحییٰ بن زیاد فراء متوفی ۲۰۷ھ، معانی القرآن، مطبوعہ بیروت

۷۲- شیخ ابو الحسن علی بن ابراہیم قمی متوفی ۳۰۷ھ، تفسیر قمی، مطبوعہ دار الکتاب، ایران، ۱۴۰۶ھ

۷۳- امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، جامع البیان، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت، ۱۴۰۹ھ

۷۴- امام ابو اسحاق ابراہیم بن محمد الزجاج متوفی ۳۱۱ھ، اعراب القرآن، مطبوعہ مطبعہ سلمان فارسی، ایران، ۱۴۰۶ھ

۷۵- امام ابو بکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ، احکام القرآن، مطبوعہ سہیل اکیڈمی، لاہور، ۱۴۰۰ھ

۷۶- علامہ ابو اللیث نصر بن محمد سمرقندی متوفی ۳۷۵ھ، تفسیر سمرقندی، مطبوعہ مکتبہ دار الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۳ھ

۷۷- شیخ ابو جعفر محمد بن حسن طوسی متوفی ۳۸۵ھ، التبیان فی تفسیر القرآن، مطبوعہ عالم الکتب، بیروت

۷۸- علامہ مکی بن ابی طالب متوفی ۴۳۷ھ، مشکل اعراب القرآن، مطبوعہ انتشارات نور، ایران، ۱۴۱۲ھ

۷۹- علامہ ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب ماوردی شافعی متوفی ۴۵۰ھ، النکت والعیون، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت

۸۰- علامہ جار اللہ محمود بن عمر زمخشری متوفی ۵۳۸ھ، کشاف، مطبوعہ مطبعہ بہیہ، مصر، ۱۳۴۳ھ

۸۱- علامہ ابو بکر محمد بن عبد اللہ المعروف بابن العربی مالکی متوفی ۵۴۳ھ، احکام القرآن، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت، ۱۴۰۸ھ

۸۲- علامہ ابو بکر قاضی عبد الحق بن غالب بن عطیہ اندلسی متوفی ۵۴۶ھ، المحرر الوجیز، مطبوعہ مکتبہ تجاریہ، مکہ مکرمہ

۸۳- شیخ ابو علی فضل بن حسن طبرسی متوفی ۵۴۸ھ، مجمع البیان، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو، ایران، ۱۴۰۶ھ

۸۴- علامہ ابو الفرج عبد الرحمان بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ھ، زاد المسیر، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۴۰۷ھ

۸۵- خواجہ عبد اللہ انصاری من علماء القرن السادس، کشف الاسرار وعدۃ الابرار، مطبوعہ انتشارات امیر کبیر، تہران، ۱۳۷۱ھ

۸۶- امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ تفسیر کبیر مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ
۸۷- علامہ محی الدین ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ تفسیر القرآن الکریم مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۹۷۸ء
۸۸- علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ الجامع لاحکام القرآن مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ
۸۹- قاضی ابو الخیر عبد اللہ بن عمر بیضاوی شیرازی شافعی متوفی ۶۸۵ھ انوار التنزیل مطبوعہ دار فراس للنشر والتوزیع مصر
۹۰- علامہ ابو البرکات احمد بن محمد نسفی متوفی ۷۱۰ھ مدارک التنزیل مطبوعہ دار الکتب العربیہ پشاور
۹۱- علامہ علی بن محمد خازن شافعی متوفی ۷۲۵ھ لباب التاویل مطبوعہ دار الکتب العربیہ پشاور
۹۲- علامہ نظام الدین حسین بن محمد قمی متوفی ۷۲۸ھ تفسیر نیشاپوری مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت ۱۴۰۹ھ
۹۳- علامہ تقی الدین ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ التفسیر الکبیر مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۰۹ھ
۹۴- علامہ ابو الحیان محمد بن یوسف اندلسی متوفی ۷۵۴ھ البحر المحیط مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۲ھ
۹۵- حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی متوفی ۷۷۴ھ تفسیر القرآن مطبوعہ ادارہ اندلس بیروت ۱۳۸۵ھ
۹۶- علامہ عبد الرحمان بن محمد بن مخلوف ثعالبی متوفی ۸۷۵ھ تفسیر الثعالبی مطبوعہ مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات بیروت
۹۷- علامہ ابو الحسن ابراہیم بن عمر البقاعی المتوفی ۸۸۵ھ نظم الدرر مطبوعہ دار الکتاب الاسلامی قاہرہ ۱۴۱۳ھ
۹۸- حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ الدر المنثور مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ قم ایران
۹۹- حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ جلالین مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی
۱۰۰- علامہ محی الدین محمد بن مصطفیٰ قوجوی متوفی ۹۵۱ھ حاشیہ شیخ زادہ علی البیضاوی مطبوعہ مکتبہ یوسفی دیوبند
۱۰۱- شیخ فتح اللہ کاشانی متوفی ۹۷۷ھ منہج الصادقین مطبوعہ خیابان ناصر خسرو ایران
۱۰۲- علامہ ابو السعود محمد بن محمد عمادی حنفی متوفی ۹۸۲ھ تفسیر ابو السعود مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ
۱۰۳- علامہ احمد شہاب الدین خفاجی مصری حنفی متوفی ۱۰۶۹ھ عنایۃ القاضی مطبوعہ دار صادر بیروت ۱۲۸۳ھ
۱۰۴- علامہ احمد جیون جونپوری متوفی ۱۱۳۰ھ التفسیرات الاحمدیہ مطبع کریمی بمبئی
۱۰۵- علامہ اسماعیل حقی حنفی متوفی ۱۱۳۷ھ روح البیان مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ
۱۰۶- شیخ سلیمان بن عمر المعروف بالجمل متوفی ۱۲۰۴ھ الفتوحات الالٰہیہ مطبوعہ المطبعۃ البہیۃ مصر ۱۳۰۳ھ
۱۰۷- علامہ احمد بن محمد صاوی مالکی متوفی ۱۲۲۳ھ تفسیر صاوی مطبوعہ دار احیاء الکتب العربیہ مصر
۱۰۸- قاضی ثناء اللہ پانی پتی متوفی ۱۲۲۵ھ تفسیر مظہری مطبوعہ بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ
۱۰۹- شاہ عبد العزیز محدث دہلوی متوفی ۱۲۳۹ھ تفسیر عزیزی مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی
۱۱۰- شیخ محمد بن علی شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ فتح القدیر مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت
۱۱۱- علامہ ابو الفضل سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ روح المعانی مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
۱۱۲- نواب صدیق حسن خان بھوپالی متوفی ۱۳۰۷ھ فتح البیان مطبوعہ مطبع امیریہ کبریٰ بولاق مصر ۱۳۰۱ھ
۱۱۳- علامہ محمد جمال الدین قاسمی متوفی ۱۳۳۲ھ تفسیر القاسمی مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ
۱۱۴- علامہ محمد رشید رضا متوفی ۱۳۵۴ھ تفسیر المنار مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت
۱۱۵- علامہ حکیم شیخ طنطاوی بن جوہری مصری متوفی ۱۳۵۹ھ الجواہر فی تفسیر القرآن المکتبۃ الاسلامیہ ریاض

۱۱۶- شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ بیان القرآن مطبوعہ تاج کمپنی لاہور
۱۱۷- سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶۷ھ خزائن العرفان مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور
۱۱۸- شیخ محمود الحسن دیو بندی متوفی ۱۳۳۹ھ و شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ حاشیۃ القرآن مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور
۱۱۹- سید محمد قطب شہید متوفی ۱۳۸۵ھ فی ظلال القرآن مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۳۸۶ھ
۱۲۰- مفتی احمد یار خاں نعیمی متوفی ۱۳۹۱ھ نور العرفان مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ گجرات
۱۲۱- مفتی محمد شفیع دیو بندی متوفی ۱۳۹۶ھ معارف القرآن مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی ۱۳۹۷ھ
۱۲۲- سید ابو الاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ تفہیم القرآن مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور
۱۲۳- علامہ سید احمد سعید کاظمی متوفی ۱۴۰۶ھ التبیان مطبوعہ کاظمی پبلیکیشنز ملتان
۱۲۴- علامہ محمد امین بن محمد مختار جکنی شنقیطی اضواء البیان مطبوعہ عالم الکتب بیروت
۱۲۵- استاذ احمد مصطفیٰ المراغی تفسیر المراغی مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
۱۲۶- آیت اللہ مکارم شیرازی تفسیر نمونہ مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ ایران ۱۳۶۹ھ
۱۲۷- جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری متوفی ۱۴۱۸ھ ضیاء القرآن مطبوعہ ضیاء القرآن پبلیکیشنز لاہور
۱۲۸- شیخ امین احسن اصلاحی تدبر قرآن مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن لاہور
۱۲۹- علامہ محمود صافی اعراب القرآن وصرفہ وبیانہ مطبوعہ انتشارات زرین ایران
۱۳۰- استاذ محی الدین درویش اعراب القرآن وبیانہ مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت
۱۳۱- ڈاکٹر وہبہ زحیلی تفسیر منیر مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۲ھ

کتب علوم قرآن

۱۳۲- علامہ بدر الدین محمد بن عبد اللہ زرکشی متوفی ۷۹۴ھ البرہان فی علوم القرآن مطبوعہ دار الفکر بیروت
۱۳۳- علامہ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ الاتقان فی علوم القرآن مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور
۱۳۴- علامہ محمد عبد العظیم زرقانی مناہل العرفان مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

کتب شروح حدیث

۱۳۵- حافظ ابو عمرو ابن عبد البر مالکی متوفی ۴۶۳ھ تمہید مطبوعہ مکتبہ القدوسیہ لاہور ۱۴۰۴ھ
۱۳۶- علامہ ابو الولید سلیمان بن خلف باجی مالکی اندلسی متوفی ۴۷۴ھ المنتقیٰ مطبوعہ مطبع السعادۃ مصر ۱۳۳۲ھ
۱۳۷- علامہ یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ شرح مسلم مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۷۵ھ
۱۳۸- علامہ ابو عبد اللہ محمد بن خلفہ وشتانی ابی مالکی متوفی ۸۲۸ھ اکمال اکمال المعلم مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
۱۳۹- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ فتح الباری مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور ۱۴۰۱ھ
۱۴۰- حافظ بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ عمدۃ القاری مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۸ھ
۱۴۱- علامہ محمد بن محمد سنوسی مالکی متوفی ۸۹۵ھ مکمل اکمال المعلم مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
۱۴۲- علامہ احمد قسطلانی متوفی ۹۱۱ھ ارشاد الساری مطبوعہ مطبعہ میمنہ مصر ۱۳۰۶ھ
۱۴۳- علامہ عبد الرؤف مناوی شافعی متوفی ۱۰۰۳ھ فیض القدیر مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت ۱۳۹۱ھ

۱۴۴- علامہ عبد الرؤف مناوی شافعی متوفی ۱۰۰۳ھ' شرح الشمائل' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی
۱۴۵- علامہ علی بن سلطان محمد القاری متوفی ۱۰۱۴ھ' جمع الوسائل' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی
۱۴۶- علامہ علی بن سلطان محمد القاری متوفی ۱۰۱۴ھ' شرح مسند ابی حنیفہ' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۰۵ھ
۱۴۷- علامہ علی بن سلطان محمد القاری متوفی ۱۰۱۴ھ' مرقات' مطبوعہ مکتبہ امدادیہ' ملتان' ۱۳۹۰ھ
۱۴۸- علامہ علی بن سلطان محمد القاری متوفی ۱۰۱۴ھ' الحرز الثمین' مطبوعہ مطبعہ امیریہ' مکہ مکرمہ' ۱۳۰۴ھ
۱۴۹- شیخ محمد بن علی بن محمد شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ' تحفۃ الذاکرین' مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی واولادہ' مصر' ۱۳۵۰ھ
۱۵۰- شیخ عبد الحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ' اشعۃ اللمعات' مطبوعہ مطبع تیج کمار' لکھنؤ
۱۵۱- شیخ عبد الرحمن مبارک پوری متوفی ۱۳۲۵ھ' تحفۃ الاحوذی' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان
۱۵۲- شیخ انور شاہ کشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ' فیض الباری' مطبوعہ مطبع حجازی' مصر' ۱۳۷۵ھ
۱۵۳- شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ' فتح الملہم' مطبوعہ مکتبۃ الحجاز' کراچی

کتب اسماء رجال

۱۵۴- علامہ ابو الفرج عبد الرحمن بن علی جوزی متوفی ۵۹۷ھ' العلل المتناہیہ' مطبوعہ مکتبہ اثریہ' فیصل آباد' ۱۴۰۱ھ
۱۵۵- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ' تہذیب التہذیب' مطبوعہ دائرۃ المعارف' دکن' ۱۳۲۶ھ
۱۵۶- علامہ علی بن سلطان محمد القاری المتوفی ۱۰۱۴ھ' موضوعات کبیر' مطبوعہ مطبع مجتبائی' دہلی

کتب لغت

۱۵۷- علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری متوفی ۳۹۸ھ' الصحاح' مطبوعہ دار العلم' بیروت' ۱۴۰۴ھ
۱۵۸- علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ' المفردات' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ
۱۵۹- علامہ محمد بن اثیر الجزری متوفی ۶۰۶ھ' نہایہ' مطبوعہ مؤسسۃ مطبوعات ایران' ۱۳۶۴ھ
۱۶۰- علامہ یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ' تہذیب الاسماء واللغات' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت
۱۶۱- علامہ جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور افریقی متوفی ۷۱۱ھ' لسان العرب' مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ' قم' ایران' ۱۴۰۵ھ
۱۶۲- علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی متوفی ۸۱۷ھ' القاموس المحیط' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت
۱۶۳- علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ' تاج العروس' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ' مصر
۱۶۴- لوئیس معلوف الیسوعی' المنجد' مطبوعہ المطبعۃ الکاثولیکیہ' بیروت' ۱۹۲۷ء
۱۶۵- شیخ غلام احمد پرویز متوفی ۱۴۰۵ھ' لغات القرآن' مطبوعہ ادارہ طلوع اسلام' لاہور
۱۶۶- ابو نعیم عبد الحکیم خان نشتر جالندھری' قائد اللغات' مطبوعہ حامد اینڈ کمپنی' لاہور

کتب تاریخ' سیرت و فضائل

۱۶۷- امام محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ' الطبقات الکبریٰ' مطبوعہ دار صادر بیروت' ۱۳۸۸ھ
۱۶۸- امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ' تاریخ الامم والملوک' مطبوعہ دار القلم بیروت
۱۶۹- حافظ ابو عمرو یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر متوفی ۴۶۳ھ' الاستیعاب' مطبوعہ دار الفکر' بیروت
۱۷۰- قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ' الشفاء' مطبوعہ عبد التواب اکیڈمی' ملتان

۱۷۱- علامہ عبدالرحمان بن علی جوزی متوفی ۵۹۷ھ' الوفا' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر
۱۷۲- علامہ ابوالحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بابن الاثیر متوفی ۶۳۰ھ' اسد الغابہ' مطبوعہ دارالفکر' بیروت
۱۷۳- علامہ ابوالحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بابن الاثیر متوفی ۶۳۰ھ' الکامل فی التاریخ' مطبوعہ دارالکتب العربیہ' بیروت
۱۷۴- علامہ شمس الدین احمد بن محمد بن ابی بکر بن خلکان متوفی ۶۸۱ھ' وفیات الاعیان' مطبوعہ منشورات الشریف الرضی' ایران
۱۷۵- حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی متوفی ۷۷۴ھ' البدایہ والنہایہ' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۳۹۳ھ
۱۷۶- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی' متوفی ۸۵۲ھ' الاصابہ' مطبوعہ دارالفکر' بیروت
۱۷۷- علامہ نور الدین علی بن احمد سمہودی متوفی ۹۱۱ھ' وفاء الوفاء' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت' ۱۴۰۱ھ
۱۷۸- علامہ احمد قسطلانی متوفی ۹۱۱ھ' المواہب اللدنیہ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت
۱۷۹- علامہ احمد بن حجر مکی شافعی متوفی ۹۷۴ھ' الصواعق المحرقہ' مطبوعہ مکتبۃ القاہرہ' ۱۳۸۵ھ
۱۸۰- علامہ علی بن سلطان محمد القاری متوفی ۱۰۱۴ھ' شرح الشفاء' مطبوعہ دارالفکر' بیروت
۱۸۱- شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ' مدارج النبوت' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر
۱۸۲- علامہ احمد شہاب الدین خفاجی حنفی متوفی ۱۰۶۹ھ' نسیم الریاض' مطبوعہ دارالفکر' بیروت
۱۸۳- علامہ محمد عبدالباقی زرقانی متوفی ۱۱۲۲ھ' شرح المواہب اللدنیہ' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۳۹۳ھ
۱۸۴- شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ' نشر الطیب' مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ' کراچی

کتب فقہ حنفی

۱۸۵- شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی متوفی ۴۸۳ھ' المبسوط' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت' ۱۳۹۸ھ
۱۸۶- شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی متوفی ۴۸۳ھ' شرح سیر کبیر' مطبوعہ المکتبۃ الثورۃ الاسلامیہ' افغانستان' ۱۴۰۵ھ
۱۸۷- علامہ طاہر بن عبدالرشید بخاری متوفی ۵۴۲ھ' خلاصۃ الفتاویٰ' مطبوعہ امجد اکیڈمی' لاہور' ۱۳۹۷ھ
۱۸۸- علامہ ابوبکر بن مسعود کاسانی متوفی ۵۸۷ھ' بدائع الصنائع' مطبوعہ ایچ۔ ایم سعید اینڈ کمپنی' کراچی' ۱۴۰۰ھ
۱۸۹- علامہ حسین بن منصور اوزجندی متوفی ۵۹۲ھ' فتاویٰ قاضی خاں' مطبوعہ مطبعہ کبریٰ امیریہ' بولاق' مصر' ۱۳۱۰ھ
۱۹۰- علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی متوفی ۵۹۳ھ' ہدایہ اولین و اخیرین' مطبوعہ شرکت علمیہ' ملتان
۱۹۱- علامہ محمد بن محمود بابرتی متوفی ۷۸۶ھ' عنایہ' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر
۱۹۲- علامہ عالم بن العلاء انصاری دہلوی متوفی ۷۸۶ھ' فتاویٰ تاتارخانیہ' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۱۱ھ
۱۹۳- علامہ ابوبکر بن علی حداد متوفی ۸۰۰ھ' الجوہرۃ النیرہ' مطبوعہ مکتبہ امدادیہ' ملتان
۱۹۴- علامہ محمد شہاب الدین بن بزاز کردری متوفی ۸۲۷ھ' فتاویٰ بزازیہ' مطبوعہ مطبع کبریٰ امیریہ' بولاق' مصر' ۱۳۱۰ھ
۱۹۵- علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی متوفی ۸۵۵ھ' بنایہ' مطبوعہ ملک سنز' فیصل آباد
۱۹۶- علامہ کمال الدین بن ہمام متوفی ۸۶۱ھ' فتح القدیر' مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر
۱۹۷- علامہ جلال الدین خوارزمی' کفایہ' مکتبہ نوریہ رضویہ' سکھر
۱۹۸- علامہ معین الدین الہروی المعروف بہ محمد ملا مسکین متوفی ۹۵۴ھ' شرح الکنز' مطبوعہ جمعیۃ المعارف المصریہ' مصر' ۱۲۸۷ھ
۱۹۹- علامہ ابراہیم بن محمد حلبی متوفی ۹۵۶ھ' غنیۃ المستملی' مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور' ۱۴۱۲ھ

۲۰۰- علامہ محمد خراسانی متوفی ۹۶۲ھ، جامع الرموز، مطبوعہ مطبع منشی نولکشور، ۱۲۹۱ھ
۲۰۱- علامہ زین الدین بن نجیم متوفی ۹۷۰ھ، البحر الرائق، مطبوعہ مطبعہ علمیہ، مصر ۱۳۱۱ھ
۲۰۲- علامہ حامد بن علی قونوی رومی متوفی ۹۸۵ھ، فتاویٰ حامدیہ، مطبوعہ مطبعہ میمنہ، مصر ۱۳۱۰ھ
۲۰۳- علامہ ابوالسعود محمد بن محمد عمادی، متوفی ۹۸۲ھ، حاشیہ ابوسعود علی ملا مسکین، مطبوعہ جمعیۃ المعارف المصریہ، مصر ۱۲۸۷ھ
۲۰۴- علامہ خیر الدین رملی متوفی ۱۰۸۱ھ، فتاویٰ خیریہ، مطبوعہ مطبعہ میمنہ، مصر ۱۳۱۰ھ
۲۰۵- علامہ علاء الدین محمد بن علی بن محمد حصکفی متوفی ۱۰۸۸ھ، الدر المختار، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۰۷ھ
۲۰۶- علامہ سید احمد بن محمد حموی متوفی ۱۰۹۸ھ، غمز عیون البصائر، مطبوعہ دار الکتاب العربیہ، بیروت ۱۴۰۷ھ
۲۰۷- ملا نظام الدین متوفی ۱۱۶۱ھ، فتاویٰ عالم گیری، مطبوعہ مطبع کبریٰ امیریہ، بولاق، مصر ۱۳۱۰ھ
۲۰۸- علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ، منحۃ الخالق، مطبوعہ مطبعہ علمیہ، مصر ۱۳۱۱ھ
۲۰۹- علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ، تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ، مطبوعہ دار الاشاعۃ العربی، کوئٹہ
۲۱۰- علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ، رسائل ابن عابدین، مطبوعہ سہیل اکیڈمی، لاہور ۱۳۹۶ھ
۲۱۱- علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ، رد المحتار، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۰۷ھ
۲۱۲- امام احمد رضا قادری ۱۳۴۰ھ، فتاویٰ رضویہ، مطبوعہ مکتبہ رضویہ، کراچی
۲۱۳- امام احمد رضا قادری متوفی ۱۳۴۰ھ، فتاویٰ افریقیہ، مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی
۲۱۴- علامہ امجد علی متوفی ۱۳۷۶ھ، بہار شریعت، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، کراچی
۲۱۵- علامہ نور اللہ نعیمی متوفی ۱۴۰۳ھ، فتاویٰ نوریہ، مطبوعہ کمبائن پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۳ء

کتب فقہ شافعی

۲۱۶- علامہ ابو اسحاق شیرازی متوفی ۴۵۵ھ، المہذب، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت، ۱۳۹۳ھ
۲۱۷- امام محمد بن محمد غزالی متوفی ۵۰۵ھ، احیاء علوم الدین، مطبوعہ دار الخیر، بیروت، ۱۴۱۳ھ
۲۱۸- علامہ یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ، شرح المہذب، مطبوعہ دار الفکر، بیروت
۲۱۹- علامہ یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ، روضۃ الطالبین، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۴۰۵ھ
۲۲۰- علامہ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ، الحاوی للفتاویٰ، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ، فیصل آباد
۲۲۱- علامہ شمس الدین محمد بن ابی العباس رملی متوفی ۱۰۰۴ھ، نہایۃ المحتاج، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۴ھ
۲۲۲- علامہ ابو الضیاء علی بن علی شبراملسی متوفی ۱۰۸۷ھ، حاشیہ ابو الضیاء علی نہایۃ المحتاج، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت

کتب فقہ مالکی

۲۲۳- امام سحنون بن سعید تنوخی مالکی متوفی ۲۵۶ھ، المدونۃ الکبریٰ، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت
۲۲۴- قاضی ابو الولید محمد بن احمد بن رشد مالکی اندلسی متوفی ۵۹۵ھ، بدایۃ المجتہد، مطبوعہ دار الفکر، بیروت
۲۲۵- علامہ خلیل بن اسحاق مالکی متوفی ۷۶۷ھ، مختصر خلیل، مطبوعہ دار صادر، بیروت
۲۲۶- علامہ ابو عبد اللہ محمد بن محمد الحطاب المغربی المتوفی ۹۵۴ھ، مواہب الجلیل، مطبوعہ مکتبۃ النجاح، لیبیا
۲۲۷- علامہ علی بن عبد اللہ علی الخرشی المتوفی ۱۱۰۱ھ، الخرشی علی مختصر خلیل، مطبوعہ دار صادر، بیروت

۲۲۸- علامہ ابوالبرکات احمد دردیر مالکی متوفی ۱۱۹۷ھ، الشرح الکبیر، مطبوعہ دارالفکر، بیروت
۲۲۹- علامہ شمس الدین محمد بن عرفہ دسوقی متوفی ۱۲۱۹ھ، حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر، مطبوعہ دارالفکر، بیروت

کتب فقہ حنبلی

۲۳۰- علامہ موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامہ متوفی ۶۲۰ھ، المغنی، مطبوعہ دارالفکر، بیروت، ۱۴۰۵ھ
۲۳۱- علامہ موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامہ متوفی ۶۲۰ھ، الکافی، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۴ھ
۲۳۲- شیخ ابوالعباس تقی الدین بن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ، مجموعۃ الفتاوی، مطبوعہ ریاض
۲۳۳- علامہ ابوالحسین علی بن سلیمان مرداوی متوفی ۸۸۵ھ، الانصاف، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۰۶ھ

کتب شیعہ

۲۳۴- شیخ ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینی متوفی ۳۲۹ھ، الاصول من الکافی، مطبوعہ دارالکتب الاسلامیہ، تہران
۲۳۵- شیخ ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینی متوفی ۳۲۹ھ، الفروع من الکافی، مطبوعہ دارالکتب الاسلامیہ، تہران
۲۳۶- شیخ کمال الدین میثم بن علی بن میثم البحرانی المتوفی ۶۷۹ھ، شرح نہج البلاغہ، مطبوعہ مؤسسۃ النصر، ایران، ۱۳۸۷ھ
۲۳۷- ملا باقر بن محمد تقی مجلسی متوفی ۱۱۱۰ھ، حق الیقین، مطبوعہ خیابان ناصر خسرو، ایران، ۱۳۴۷ھ
۲۳۸- ملا باقر بن محمد تقی مجلسی متوفی ۱۱۱۰ھ، حیات القلوب، مطبوعہ کتاب فروشے اسلامیہ، تہران

کتب عقائد و کلام

۲۳۹- امام محمد بن محمد غزالی متوفی ۵۰۵ھ، المنقذ من الضلال، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۵ھ
۲۴۰- علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۱ھ، شرح عقائد نسفی، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی
۲۴۱- علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۱ھ، شرح المقاصد، مطبوعہ منشورات الشریف الرضی، ایران، ۱۴۰۹ھ
۲۴۲- علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۱۶ھ، شرح المواقف، مطبوعہ منشورات الشریف الرضی، ایران، ۱۳۲۵ھ
۲۴۳- علامہ کمال الدین بن ہمام متوفی ۸۶۱ھ، مسایرہ، مطبوعہ مطبعۃ السعادۃ، مصر
۲۴۴- علامہ کمال الدین محمد بن محمد المعروف بابن ابی الشریف الشافعی المتوفی ۹۰۶ھ، مسامرہ، مطبوعہ مطبعۃ السعادۃ، مصر
۲۴۵- علامہ علی بن سلطان محمد القاری المتوفی ۱۰۱۴ھ، شرح فقہ اکبر، مطبوعہ مطبع مصطفی البابی واولادہ، مصر، ۱۳۷۵ھ
۲۴۶- علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶۷ھ، کتاب العقائد، مطبوعہ تاجدار پبلشنگ کمپنی، کراچی

کتب اصول فقہ

۲۴۷- علامہ علاء الدین عبدالعزیز بن احمد البخاری المتوفی ۷۳۰ھ، کشف الاسرار، مطبوعہ دارالکتاب العربی، ۱۴۱۱ھ
۲۴۸- علامہ محب اللہ بہاری متوفی ۱۱۱۹ھ، مسلم الثبوت، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ، کوئٹہ
۲۴۹- علامہ احمد جونپوری متوفی ۱۱۳۰ھ، نورالانوار، مطبوعہ ایچ۔ایم سعید اینڈ کمپنی، کراچی
۲۵۰- علامہ عبدالحق خیر آبادی متوفی ۱۳۱۸ھ، شرح مسلم الثبوت، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ، کوئٹہ

کتب متفرقہ

۲۵۱- شیخ ابوطالب محمد بن الحسن المکی المتوفی ۳۸۶ھ، قوت القلوب، مطبوعہ مطبعہ میمنہ، مصر، ۱۳۰۶ھ
۲۵۲- علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، التذکرہ، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۷ھ

۲۵۳- شیخ تقی الدین احمد بن تیمیہ حنبلی متوفی ۷۲۸ھ' قاعدہ جلیلہ' مطبوعہ مکتبہ قاہرہ' مصر' ۱۳۷۳ھ
۲۵۴- علامہ عبداللہ بن اسد یافعی متوفی ۷۶۸ھ' روض الریاحین' مطبوعہ مطبع مصطفی البابی واولادہ' مصر' ۱۳۷۴ھ
۲۵۵- علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۱۶ھ' کتاب التعریفات' مطبوعہ المطبعۃ الخیریۃ' مصر ۱۳۰۶ھ
۲۵۶- امام احمد سرہندی مجدد الف ثانی متوفی ۱۰۳۴ھ' مکتوبات امام ربانی' مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی' کراچی' ۱۹۷۰ء
۲۵۷- علامہ سید محمد بن محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ' اتحاف السادۃ المتقین' مطبوعہ مطبعہ میمنہ' مصر' ۱۳۱۱ھ
۲۵۸- شیخ رشید احمد گنگوہی متوفی ۱۳۲۳ھ' فتاویٰ رشیدیہ کامل' مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز' کراچی
۲۵۹- علامہ مصطفیٰ بن عبداللہ الشہیر بحاجی خلیفہ' کشف الظنون' مطبوعہ مطبعہ اسلامیہ' طہران' ۱۳۷۸ھ
۲۶۰- امام احمد رضا قادری متوفی ۱۳۴۰ھ' الملفوظ' مطبوعہ نوری کتب خانہ' لاہور
۲۶۱- شیخ وحید الزمان متوفی ۱۳۲۸ھ' ہدیۃ المہدی' مطبوعہ میور پریس' دہلی' ۱۳۲۵ھ.
۲۶۲- شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ' بہشتی زیور' مطبوعہ ناشران قرآن لمیٹڈ' لاہور
۲۶۳- شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ' حفظ الایمان' مطبوعہ مکتبہ تھانوی' کراچی
۲۶۴- علامہ عبدالحکیم شرف قادری نقشبندی' نداء یارسول اللہ' مطبوعہ مرکزی مجلس رضا لاہور' ۱۴۰۵ھ

✡✡✡✡✡